سیدنا الامام الکبیر حضرت مولانا محمد قاسم النانوتوی قدس اللہ سرہ

## حصہ اول

رئیس القلم حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ تعالیٰ

مکتبہ رحمانیہ
اقرا سنٹر۔ غزنی سٹریٹ
اردو بازار، لاہور

یعنی

# سیرت شمس الاسلام

سیدنا الامام الکبیر حضرت مولانا محمد قاسم النانوتوی قدس سرہ

حصہ اول

رئیس القلم حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ
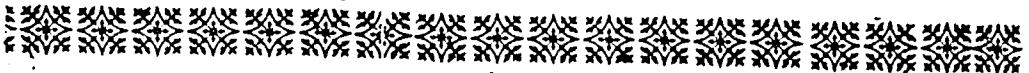
ناشران

مکتبہ رحمانیہ ○ اردو بازار ○ لاہور ○ مکتبہ چراغ اسلام قذافی مارکیٹ اردو بازار لاہور

# تقریب

للّٰہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد ز پسِ پردۂ تقدیر پدید

بانیٔ دارالعلوم شمس الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نور اللہ مرقدہ کی سوانح حیات کی تڑپ ہر ایک فرزندِ دارالعلوم کے دل میں مدتوں سے موجزن تھی، اور ہر بہی خواہِ دارالعلوم خواہشمند تھا کہ بانیٔ دارالعلوم کی سوانح حیات بھی دارالعلوم کی طرح نور افزائے دیدہ و دل ہو لیکن کلُّ امرٍ مرہون بوقتہٖ کے اصول پر حضرت صاحب سوانح کی وفات کے پورے چھہتّر (۷۶) برس بعد تیاریٔ سوانح کی یہ سعادت حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کی قسمت میں لکھی ہوئی تھی ممدوح نے اپنے دل کی لگی سے یہ اہم کام حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی دام فیضہ کے سپرد کیا مولانائے ممدوح نے بطیب خاطر قبول فرماکر دو تین سال کی مدت میں کافی محنت و عرق ریزی سے اسے اختتام تک پہنچایا۔ اور آج ہم اس قابل ہیں کہ حضرت قاسم العلوم والخیرات کے کمالات و سوانح زندگی کا یہ مقدس ذخیرہ انتہائی مسرت و ابتہاج کے ساتھ ملک اور قوم کے سامنے پیش کر دیں۔ ابتداءً یہ سوانح ذاتی طور پر حضرت مولانا محمد طیب صاحب نے مولانائے ممدوح سے لکھوائی۔ لیکن میری گذارش پر اس سے اپنا حق اٹھا کر اسے شعبۂ نشر و اشاعت دارالعلوم دیوبند کے حوالہ فرما دیا اور آج ۲۵ رجب ۱۳۷۳ھ کی مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے اپنے متفقہ ریزولیوشن کی رو سے یہ کتاب ادارۂ نشر و اشاعت سے لیکر براہ راست دارالعلوم دیوبند کی ملکیت قرار دیدی ہے، اور اس سوانح کو اس کا واجبی حقدار قرار دیا ہے کہ اسے براہ راست دارالعلوم طبع اور شائع کرائے اور دارالعلوم ہی اس کا اور اس کے منافع کا حقدار ہو، جیسا کہ اس سوانح کی عظمت و شان کا اقتضاء تھا۔ مجلس کے ریزولیوشن کے الفاظ یہ ہیں۔

"حضرت اقدس مولانا نانوتوی قدس سرہٗ کی سوانح عمری جو حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے تالیف فرمائی ہے اس کی مستحق ہے بلکہ اس کا حق ہے کہ اسے دارالعلوم دیوبند کی جانب سے طبع کرا کر شائع کیا جائے ..... اس کتاب کے جمیع منافع دارالعلوم کی ملکیت ہوں گے"۔

اندازہ کیجئے کہ صاحب سوانح تو حضرت نانوتوی رح ہوں اور سوانح نگار حضرت مولانا مناظر احسن صاحب جیسا اہلِ قلم، اہلِ دماغ اور اہلِ دل بزرگ ہو اور اس کا سب سے بڑا طلبگار اور کفیل دارالعلوم دیوبند ہو تو کتاب کی عظمت و افادیت کس درجہ کی ہوگی۔

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

۲۵ رجب ۱۳۷۳ھ

# فہرست مضامین سوانح قاسمی

# فہرست مضامین سوانح قاسمی جلد دوم

# فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# مقدمہ

(از حضرت الحاج مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ العالی مہتمم دارالعلوم دیوبند)

## اَلْحَمْدُ لِحَضْرَةِ الْجَلَالَة وَالنَّعْتُ لِخَاتَمِ الرِّسَالَة

### امّا بعد

دنیا میں مذہبی اور قومی مقتداؤں کی سوانح نگاری کا معمول قدیم سے چلا آرہا ہے، اور ان میں بھی خصوصیت سے ایسی ممتاز و معتمد شخصیتوں کی سیرت و سوانح کا تحفظ اور بھی زیادہ ضروری سمجھا گیا ہے جو اپنے ذاتی اوصاف و کمالات کے ساتھ کوئی خاص نصب العین اور نظریہ لے کر اٹھی ہوں، اور اپنی دعوت و رہنمائی سے کسی قوم کا مرکز و مدار قرار پا گئی ہوں۔ ایسی شخصیتوں کی زندگی کا دنیا کے سامنے پیش کیا جانا محض اس لئے ضروری نہیں ہوتا کہ وہ زندہ رہیں، بلکہ اس لئے کہ اُن کے زندگی بخش نصب العین سے قومیں زندہ رہیں۔ یعنی ایک رہنمائے ملّت کو مرنے کے بعد اس لئے زندہ نہیں رکھا جاتا کہ صرف اس کا نام باقی رہے بلکہ اسلئے کہ اس کا کام باقی رہے اور کام سے اسکی قوم کامیاب ہو کر باقی رہے۔ پھر ایسی شخصیت جبکہ کسی قوم کے ناہموار اور بگڑے ہوئے حالات میں سامنے آئے اور اپنی قریب المرگ قوم کو سہارا دے کر سنبھال لے جائے تو کوئی شبہ نہیں کہ ایسی شخصیت کو مدام باقی رکھنا درحقیقت اس کے اصلاحی نقوش کو قائم رکھنا ہے تاکہ اُن سے اس جیسی شخصیتیں آئندہ بھی بنتی رہیں۔ پس ایسی منفرد شخصیت کا اس کے اصول و نظریات کے پردہ میں قائم رکھنا حقیقتاً شخصیت سازی کی فیکٹری قائم کرنا ہے۔ جس سے ڈھل ڈھل کر

شخصیتوں کے بنتے رہنے کا غیر منقطع سلسلہ قائم رہے، اور یہ یقیناً کسی ایک شخصیت کے قائم رکھنے سے کہیں زیادہ اہم اور ضروری ہے۔

حُجَّۃُ الاِسْلَام حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہٗ بارہویں صدی ہجری کی ایسی ہی ایک فرد فرید اور ممتاز شخصیت ہیں جو نہ صرف اپنے منتخب علم وعمل، ممتاز اخلاق وکردار اور مثالی کمالات وفضائل ہی کے ساتھ ہندوستان کی سرزمین پر نمایاں ہوئے بلکہ ساتھ ہی ایک ایسا جامع اور ہمہ گیر نصب العین بھی لے کر اٹھے، جس میں مردہ دلوں میں روح پھونکنے اور قوم کے پژمردہ پیکر میں ازسرنو جان ڈالنے کی اسپرٹ موجود تھی، اور جس نے عملی طور پر بالآخر یہی تاثیر دکھلائی بھی۔ اور انہیں قوم کا ایک یگانہ روزگار ہیرو بنا کر پیش کیا۔

حضرت مولاناؒ ایک مسیحائے ملت کی حیثیت سے اس وقت نمایاں ہوئے، جب کہ ۱۸۵۷ء کے انقلابی دور میں ہندوستان اپنی آٹھ سو سالہ اسلامی عظمت وشوکت سے محروم ہو رہا تھا، اس کی سیاست کے ساتھ اس کی دیانت کے چہرہ پر بھی مردنی چھا چکی تھی، مشرق کا آفتاب مغرب میں ڈوب رہا تھا، ایشیائیت کے ساتھ اسلامیت بھی رخصت ہو رہی تھی، نئی شوکت کے زیر اثر اسلامی نظام کو مانع ترقی اور مخرب قومیت باور کرانے کی آوازیں خود مسلم حلقوں سے اٹھنے لگی تھیں اسلامی علوم وفنون پر سفاکانہ اور قاتلانہ حملے منظم طریق پر شروع ہو چکے تھے اسلامی تہذیب وشائستگی کی راہیں بے نشان اور ناقابل گذر بنائی جانے لگی تھیں، ملی استقلال نصرانیت کی پُرفریب ڈپلومیسیوں کے دھاروں میں بہا چلا جا رہا تھا۔ غرض جبکہ ہندوستان کے دین ودیانت سیاست شوکت علم اخلاق خودداری اور خوداختیاری کا آفتاب گہن میں آچکا تھا اور صدیوں کی ایک اقتدار یافتہ قوم بے بسی اور بے کسی کے بھنور میں پھنسی ہوئی ہچکولے کھا رہی تھی، اس وقت حضرت شمس العلوم شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ نہ صرف اپنے غیر معمولی علم وفضل اور زہد واتقاء کے ساتھ بصورت آفتاب سرزمین ہند پر چمکے بلکہ

ایک ایسے علمی، اخلاقی اور ملی نصب العین کے ساتھ رونما ہوئے جس کے جوہری اجزاء ترویج کتاب وسنت، تہذیب اخلاق وکردار اور نظام استقلال ملی تھے۔ آپ کی مسیحا نفسی نے قوم کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سہارا دیا۔ اُن کے لئے علم الٰہی کی روشنی کو ملک گیر ہی نہیں گیر بنایا جس سے قوم ورطۂ حیرت سے نکلی۔ خلق وعمل کا میدان ہموار کیا، جس سے قوم کا تعطل اور جمود ختم ہوا، قومی خود ارادیت کا پرداز ڈالا جس سے بے بسی اور بے کسی اور احساس کمتری کے وساوس کافور ہوئے۔ غرض علم، اخلاق اور قدرتی تنظیم کے روشن نصب العین سے قوم کی ذہنیت میں روشنی آئی اور وہ اندھیریوں میں بھٹکنے کے بجائے روشنی کی فضاؤں میں گامزن ہونے کے لئے کمربستہ ہوگئے۔ ’’وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا‘‘

آپ کے نصب العین کا مرکزی نقطہ تعلیمی نہضۃ تھی جس سے علم الٰہی کی شعاعیں ہند و بیرون ہند پر پڑیں، پھر اس کے تحت آپ کی اخلاقی قوتوں کے تصرفات کا مرکز تربیت وارشاد تھا جس سے وجد و حال کے نقشے طالبوں کے دلوں میں جمے، آپ کے جوش عمل کا نقطہ اعلاء کلمۃ اللہ تھا جس سے جوش جاں سپاری مجاہدوں میں پیدا ہوا۔ آپ کی دینی مدافعت بیضۂ اسلام کی حفاظت اور تمام غیر اسلامی حملوں سے مذہبی سرحدات کی نگہداشت تھی جس سے دین کو قرار ہوا۔ آپ کی اندرونی طور پر عقلی آزادی اور فکری بے قیدی کے حملوں کی علمی مدافعت کا نقشہ آپ کی وہ فلسفیانہ تصانیف تھیں، جنہوں نے وقت کے فلسفہ پسند اور منطق نواز حلقوں میں ہلچل پیدا کردی۔ قوم کے عملی نقائص اور معاشرتی کمزوریاں رفع کرنے کے لئے آپ کے اصلاحی اقدامات کا خاکہ علمی مواعظ اور عملی تنظیم تھی جس سے بگڑی ہوئی معاشرت درست ہوئی پھر دفاع وتعمیر کے اس مرکب نصب العین کو بروئے کار لانے اور منظم طریق پر چلانے کے لئے آپ نے جو اہم ترین مرکزی مورچہ تیار کیا وہ دار العلوم دیوبند تھا جس میں آپ کے نصب العین کے تمام بنیادی نقوش مرتسم تھے جو ایک ایک کر کے ابھرے۔ اس یادگار زمانہ مرکز کے راستہ سے آپ نے ایک ایسا حکیمانہ نظام یادگار چھوڑا جس سے بیک وقت عالم درویش، مجاہد اور صالح و مصلح افراد ڈھل ڈھل کر نکلتے رہیں اور کام چند شخصیتوں تک محدود

نہ رہ جائے۔ آپ کی اس مرکزی دعوت اور بنیادی دعایت نے نہ صرف نگاہوں اور دلوں کے رخ ہی آپ کی طرف پھیر دیئے بلکہ وقت کے نازک حالات کی ان چارہ سازیوں نے جو آپ کے وجود باجود سے نمایاں ہوئیں، عرب و عجم کی توجہات کو آپ کی ذات میں مرکوز بنا دیا، اور آپ ایک ایسے محبوب القلوب اور مرجع خلائق زعیم و رہنما کی صورت سے قوم میں نمودار ہوئے کہ لوگ جوق جوق آپ کے پیش کردہ نصب العین کے دامن میں پناہ لینے لگے۔ اس حقیقت کو حضرت والا کے جانشین خاص و تلمیذ ارشد مجاہد بے بدل حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن نور اللہ مرقدہ نے اپنے جلیل القدر استاد کے مرثیہ میں بسلسلۂ ذکر بنا دارالعلوم چند اشعار میں ظاہر کیا ہے۔ جن کا اضافہ اس مقدمہ کے لئے نور اور ناظرین کے لئے سرمایۂ سرور ہوگا۔ فرمایا

اتنے میں دیکھتے کیا ہیں کہ اک مردِ خدا[1] — آرہا تیز روی سے ہے لئے ساتھ عَلَم

بے نیازی و توکل رُخِ روشن سے نمود — قطعِ منزل کے لئے دونوں قدم تیغِ دودَم

چہرۂ خوب سے انوارِ تواضع ظاہر — نظرِ نیک سے آثارِ غنا مُستفہَم

کس بلا کی تھی نظر پڑتے ہی جس کے فی الفو — پڑ گئی جان میں جان آہی گیا دَم میں دَم

ناتوانوں کو ملا اس کی حمایت سے یہ زور — زینۂ بامِ ترقی پہ بڑھا سب کا قدم

تھی نرالی ہی کچھ اس مردِ صفا کی سج دھج — تھے عجائب ہی کچھ اس شیرِ خدا کے دَم خَم

گاڑ کر اس نے عَلَم ایک ندا کی ایسی — یک بیک چونک پڑے اہلِ مَدَر اہلِ خِیَم

اس کی آواز تھی یا بانگِ خلیل اللّٰہی — کہہ کے لبیک چلے اہلِ عرب اہلِ عَجَم

عقل و انصاف کا جس سر میں ذرا بھی تھا اثر — ذوقِ علمی کا تھا جس سینہ میں تھوڑا بھی دَم

دین کا ذرہ بھی تھا قلب میں جس کے مُودَع — خیر کا شمّہ بھی تھا جس کے مقدر میں رَقَم

باندھ کر حسبت کمر کہتے ہوئے نحن معک — چل پڑے جو بھی ملا اس یمِ رحمت کا قدم

اس مربی دل و جان کی مسیحائی سے — علمِ دیں زندہ ہوا جہل نے لی راہِ عَدَم

[1] مراد حضرت نانوتوی قدس سرہ

ظلمت جہل و ضلالت میں پڑے سوتے تھے　　نورِ علمی سے ہوا اس کے جہاں صبح ودم
ابرِ علم وعمل و فضل کا بادل برسا　　جس جگہ اس یم رحمت کا پڑا نقش قدم
جہل کو جب سبھی کہنے لگے اِخسأ اِخسأ　　چلدیا پاؤں دبے چپکے سے بابخت دژم
علم کو لاکے ثریا سے ثریٰ پر رکھا　　آنکھوں سے دیکھ لیا عَلَّم مالم یعلم
دولت علم سے سیراب کیا عالم کو　　قاسم علم بھلا کیوں نہ ہو پھر اس کا عَلَم
اس کی آواز تھی بیشک قم عیسیٰ کی صدا　　جس کے صدقے ہی لیا علم نے دوبارہ جنم
طائرِ علم شریعت کے لئے یہ دُیَین　　برکتِ حضرتِ قاسم سے ہے مامون حرم
سلسلے علم کے امصار و قری تک جاری　　اس کی ہمت سے ہوئے بل یہ ترا فیض اعم
جملہ اعیان واکابر تھے جلو میں اس کے　　اسکی شوکت کو پہنچتی تھی کہاں شوکتِ جَم

دارالعلوم دیوبند ہی کے اس ہمہ گیر تعلیمی نظام نے جو مدارس کی صورت میں ہندوستان بھر میں پھیلا، دہریت والحاد کے اس سیلاب پر بند لگایا جس کا دھارا مغرب کی جانب سے بہتا ہوا دیارِ ہند کے گھروں میں داخل ہوا اور چاہتا تھا کہ خشک وتر کو بہالیجائے۔ اگر لارڈ میکالے نے یہ کہہ کر اپنا نظام تعلیم ہندوستان میں پھیلایا کہ ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے جو رنگ ونسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں، اور روح وفکر کے لحاظ سے انگریز۔ تو اس جلیل القدر شخصیت نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالتے ہوئے لسان حال سے یہ عملی صدا بلند کی کہ ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ ونسل کے لحاظ سے ہندی وسندھی ایرانی وافغانی خراسانی وترکستانی ہوں۔ لیکن روح وفکر کے لحاظ سے عربیت واسلامیت کی روح سے معمور اور بھرپور ہوں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانانِ ہند کی قومیت کی تخریب کے لئے جو سیلاب تعلیمی رنگ سے میکالے کے روپ میں اٹھا، اور ان کی مذہبی تخریب کے لئے جو دھارا پادریوں کی منظم تبلیغ یا آریوں کے منظم پرچار کی صورت میں بہا اس پر بند لگانے کا کام صرف اس تعلیمی تحریک نے کیا جو حضرت نانوتوی قدس سرہ کے روپ میں نمودار ہوئی، اور

جس کو آپ نے شخصی رکھنے کے بجائے جمہوری اصول پر چلا کر ہمہ گیر بنایا اور دین کے سپاہی بنانے کی ایک ایسی مشین (دارالعلوم) تیار کر دی کہ فلسفہ، و سیاست اگر سو برس تک بھی نئے نئے روپ میں سامنا کرتے رہے تو اس تعلیمی نظام کے کل پرزے اسے ہر رنگ میں پہچانتے اور دفع کرتے رہیں گے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

بہرحال ملک کے ان مایوس کن حالات میں حضرت قاسم العلوم نے اٹھ کر اسلام کی تعمیر و دفاع کیلئے اپنے آپ کو ظاہری و باطنی کمالات کے ساتھ پیش کیا۔ تلوار کے وقت تلوار سے، قلم کے وقت قلم سے اور زبان کے وقت زبان سے اسلام اور ملک و ملت کی نادر روزگار خدمت انجام دی۔ تعلیم کتاب و سنت کی ترویج کے لئے آپ کا مرکزی مورچہ دارالعلوم دیوبند تھا جس میں دنیائے اسلام کے ہر منطقہ کے طالبان علوم کا ہجوم ہوا۔ تربیت اخلاق کیلئے چھتہ کی مسجد آپ کی خانقاہ بنی جس میں طالبوں کیلئے حلقے جمنے لگے۔ اعلاء کلمۃ اللہ کے سلسلہ میں سنانی جوہر نمائیوں کیلئے شاملی کا میدان ہموار ہوا جس میں مجاہدین کے جھتے جمع ہوئے۔ دینی مدافعت کا میدان مباحثہ شاہجہانپور و رڑکی و میرٹھ بنا جس میں مذاہب کے جمگھٹوں میں اسلام کی منادی کی۔ مذہبی اور مسلکی دفاع کیلئے حلقہ درس اور مجالس مذاکرہ منعقد کی گئیں جن میں مریضان فکر و نظر کو چشمۂ حق میں دیا جانے لگا۔ اثبات مذہب حق کے لئے فلسفیانہ علوم اور ایک نئی اور اچھوتی حکمت کی بنیاد ڈالی جس میں عقلی ہی نہیں حسی انداز میں اصول و فروع اسلام کو مضبوط اور مدلل طریق پر پیش کیا گیا، اور فکر و نظر کو اسی انداز میں ڈھال دینے کا ایک دائمی راستہ ہموار کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی جامع زندگی اگر ہمہ وقت مسلمانوں کے ساتھ نمایاں رکھی جائے تو بلاشبہ وہ رکھی جانے کی مستحق ہے، اور اندازہ کیا جائے کہ اس کے اسوہ سے مسلمانوں کے حوصلے کہاں سے کہاں پہنچ سکتے ہیں لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ جہاں ہمارے لئے یہ حقیقت خوش کن ہے کہ اس دور آخر میں حضرت قاسم العلوم جیسی ہستی ہمیں ملی جن کے بارہ میں خود ان کے

شیخ حضرت اقدس حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کی شہادت ہے کہ

"ایسے لوگ صدیوں پہلے پیدا ہوا کرتے رہتے تھے کئی صدی بعد اللہ نے ایسی شخصیت پیدا فرمائی ہے۔"

اور ضیاء القلوب میں ارشاد فرمایا کہ

"قصہ برعکس ہوگیا میں ان کی جگہ ہونا (یعنی مرید بنتا) اور وہ میری جگہ ہوتے (یعنی میرے پیر بنتے)۔"

وہیں یہ تلخ حقیقت بھی انتہائی تکلیف دہ ہے کہ ان کی سبق آموز زندگی اور سوانح حیات سے اب تک ہم محروم رہے۔

اس سے انکار نہیں (اور انکار کفرانِ نعمت بھی ہوگا) کہ قاسمی علوم و اخلاق اور عزائم و افکار کا ذوق فی الجملہ قدیم اساتذۂ دارالعلوم اور مشائخ دیوبند کی مجلسوں تقریروں اور حلقہ ہائے درس کی بدولت مستفیدین کی ذہنیت میں پیوست ہوتا رہا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ طریقہ غیر شعوری فیضان کا تھا جو شخصیات کے ذریعہ زبان بزبان اور عمل اور بعمل منتقل ہوتا رہا، کبھی بانتساب اور کبھی بلا انتساب۔ کوئی اصولی اور علمی یا باضابطہ افادہ کا انداز نہ تھا جس کا مقصد خالص اسی زندگی کا پہنچانا ہوتا۔ اور چونکہ اس کا مدار شخصیتوں کے قول و عمل یا اتفاقی بیان و تحدیث سے رہا۔ اسلئے نتیجہ یہ ہوا کہ شخصیات کے اٹھتے رہنے سے وہ فیضان بھی کم اور گم ہوتا رہا اور اس کے باضابطہ منضبط نہ ہونے سے سوائے اہل درس اور مجلس نشین یا صحبت یافتہ افراد کے عام علمی حلقے تک بھی اس سے مستفید نہ ہو سکے۔ بلکہ خواص کی حد تک بھی اگر یہ کہہ دیا جائے تو بے محل نہ ہوگا کہ قاسمی زندگی کا فیض تو کسی حد تک ہی پہنچا، لیکن زندگی سامنے نہ آئی۔

بہر حال اس قاسمی زندگی کا جامع اسوہ بھی عام نہ ہو سکا اور خاص طبقہ میں کسی حد تک غیر شعوری انداز سے آیا بھی تو وسائل فیضان کے اٹھ جانے سے اس میں بھی کمی آگئی۔ پھر کم و بیش جو کچھ بھی آیا وہ بھی دوسروں کی زندگی کے سانچوں میں ڈھل کر آیا، جسے خالص اسوۂ قاسمی بھی کہنا

مشکل ہے اس لئے ضرورت تھی اور بہت پہلے سے تھی کہ محض رابطہ کے انداز سے نہیں بلکہ ضابطہ سے بھی اصولی اور عملی طور پر اس کے افادہ کی صورتیں پیدا کی جاتیں، اور حضرت قاسم العلوم کی زندگی ان ہی کی زندگی کہہ کر سامنے لائی جاتی، جو افسوس ہے کہ اب تک نہیں لائی جاسکی۔

اس کی یہ وجہ نہیں کہ اس زندگی کے منضبط کرنے کی طرف جماعت دیوبند میں سے کسی نے توجہ نہیں کی، یا مجلسی فیضان کو کافی سمجھ کر اس کے علمی انضباط کو غیر ضروری سمجھا گیا۔ نہیں بلکہ یہ زندگی بطون اوراق میں منضبط کی گئی اور بار بار کی گئی اور بہت سے سوانح نگار اہل قلم نے اس میدان میں عملی تگ و تاز کی لیکن واقعات کی رفتار سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں یہ انضباطی قوتیں اپنا کام کر رہی تھیں وہیں کچھ مخفی اور پس پردہ تخریبی قوتیں اپنے کام میں لگی ہوئی تھیں جو اس زندگی کو ملک اور اہل ملک کے سامنے آنے دینا نہیں چاہتی تھیں اور جس حد تک ان کے علی الرغم یہ زندگی بطور سوانح حیات سامنے آگئی اور بطون اوراق میں منضبط ہو کر خواص وعوام میں پھیلی وہ ایک ناکافی تاریخ تھی جس سے شخصیت کی مکمل تصویر سامنے نہیں آسکتی تھی۔ مثلاً اس سلسلہ میں حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی وفات کے بعد متصلاً سب سے پہلے جو سوانح مرتب ہوئی وہ حضرت اقدس جامع کمالات ظاہری وباطنی عالم ربانی عارف بعلام الغیوب مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس سرہ العزیز نے مختصر مگر جامع طریق پر تالیف فرمائی اور کوئی شبہ نہیں کہ حضرت مؤلف کے صاحب سوانح سے بوجوہ مختلفہ قریب تر ہونیکے سبب یہ تالیف مشاہدات اور عینی بیانات پر مشتمل اور ساتھ ہی اپنی بلیغ عبارت اور جامع تعبیر کے سبب حضرت والا کی زندگی کے بہت سے گوشوں پر اشاراتی انداز میں حاوی ہے اور بقول حضرت مولانا مناظر احسن صاحب دام فضلہٗ ایک کراماتی سوانح ہے جس میں ہر قسم کے واقعات کے اشارے ملتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ انتہائی اختصار اور کمال اجمال کے سبب سوانح نہیں بلکہ سوانح قاسمی کی ایک فہرست ہے جس کی واقعات پر عبور رکھنے والا بطور یادداشت کے فائدہ اٹھا سکتا ہے ایک بے خبر از سر نو اس سے واقعات پر حاوی نہیں ہو سکتا حقیقت یہ ہے کہ یہ عجالہ بطور سوانح عمری لکھا بھی نہیں گیا تھا، بلکہ میں نے اپنے

بزرگوں سے سنا ہے کہ حضرت نانوتوی قدس سرہ کی وفات کے حادثہ سے خواص وعوام پر جو کوہِ غم آپڑا، جس سے ہر شخص پر ایک سکتہ اور تحیر کا عالم طاری تھا۔ قلوب کا کرب و اضطراب رفع نہیں ہوتا تھا جن میں مولانا محمد یعقوب صاحبؒ بھی شامل تھے تو مولانا نے لوگوں کی تسلی اور اپنے غم دل کو ہلکا کرنے کے لئے قلم برداشتہ یہ چند اوراق تحریر فرمائے۔ اس لئے اس کو ایک تسلی نامہ تعزیت شمار کہنا چاہیئے جس کا مقصد ہی زندگی کو منضبط کرکے پیش کرنا نہ تھا بلکہ اذکروا محاسن موتاکم کے تحت ذکر رفتگان سے اپنے دلوں کے بوجھ کو ہلکا کرنا تھا اس لئے اسے سوانح کہہ کر ناقص یا ناتمام کہنے کی جرأت کرنا ہی بے جا جسارت ہوگا۔ بلکہ وہ جس مقصد کیلئے تحریر کی گئی اُس میں کافی ہی نہیں بلکہ اس حد تک مکمل ہے کہ اس پر کسی اضافہ کی گنجائش نہیں۔ اس لئے اسے سوانحعمری کے نقطۂ نظر سے دیکھنا ہی نہ چاہیئے۔ ورنہ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک جامع ذات کی جامع زندگی جو زندگیٔ اقوام کے اہم نصب العین کی علمی و عملی تفصیلات اپنے اندر رکھتی ہے، صرف ۳۲ صفحات میں ادا کی جا سکتی ہے؟ کوزہ میں کوزہ ہی کی قدر پانی سما سکتا ہے دریا نہیں سما سکتا۔ چنانچہ اس مختصر سوانح کا تذکرہ حبیب حضرت قطب وقت آیۃ من آیات اللہ مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کی مجلس میں ہوا تو فرمایا کہ مولانا محمد قاسم کی سوانح مولانا محمد یعقوب کیا لکھ سکتے ہیں۔ دنیا میں اگر ان کی حقیقی سوانح حیات کوئی لکھ سکتا ہے تو وہ صرف میں ہوں۔ مگر میں کیا کروں آنکھوں سے معذور ہوں۔ پس یہ سوانح درحقیقت سوانح کا ایک اجمالی خاکہ اور تفصیلی سوانح کا ایک جامع متن ہے جس سے صرف باخبر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ عام حلقے کماحقہ اس سے پیاس نہیں بجھا سکتے۔

اسی لئے اس کے بعد متعدد بزرگ سوانح نگاری پر متوجہ ہوئے اور سوانح عمریاں کافی مواد کے ساتھ تفصیلی طور پر مرتب ہوئیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ صورت واقعات یہ ہے کہ سوانح عمریاں مرتب ہوتی رہیں اور کسی مخفی ہاتھ سے سامنے آنے سے پہلے ہی تلف بھی ہوتی رہیں۔

حضرت والد مرحوم نے فرمایا کہ میں نے حضرت نانوتوی رح کے وصال کے بعد بڑے مولانا (شیخ الہند رحمہ اللہ) سے عرض کیا کہ وقت کا تقاضا ہے کہ آپ دو چیزیں مرتب فرمادیں ایک قرآن شریف کا اردو ترجمہ اور اس کے مختصر تفسیری فوائد اور دوسرے حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی سوانح حیات مولانا نے بڑی امنگ اور آرزو سے فرمایا کہ میں انشاءاللہ ضرور ان دونوں باتوں کی تعمیل کروں گا۔ اس پر والد مرحوم نے فرمایا کہ "پھر میں وہ تمام مواد آپ کی خدمت میں پیش کردوں جو میرے پاس موجود ہے؟ فرمایا کہ ضرور"۔ اس پر میں نے ایک بہت بڑا پلندہ جس میں حضرت کے ملفوظات واقعات، علوم مکتوبات اور حالات کا ایک ذخیرہ بندھا ہوا تھا لاکر پیش کردیا۔ مولانا اس سے بہت مسرور ہوئے اور فرمایا کہ اب سوانح مرتب کروں گا اور ان قلمی یادداشتوں سے میرا ذہن ان سیکڑوں واقعات کی طرف منتقل ہوگا جو میرے ذہن اور سینہ کی امانت ہیں۔ اب انشاءاللہ وہ سب سینہ سے سفینہ میں آجائیں گے۔ حضرت والد مرحوم نے فرمایا کہ مولانا اس پلندے کو مردانہ بیٹھک کی الماری میں رکھ کر خوش خوش گھر میں تشریف لے گئے۔ شاید ایک گھنٹہ بعد ہی جب اس ذخیرہ کو لینے کے لئے باہر تشریف لائے اور الماری کھولی تو وہ پلندہ غائب تھا۔ پھر ہر چند اسی جگہ جگہ تلاش کیا اور خاک تک چھان ماری مگر پلندہ نہ ملا۔ فرمایا کہ حضرت مولانا اور ہم سب پر اس درجہ اس کا صدمہ پڑا کہ جیسے حضرت نانوتوی کی وفات آج ہوئی ہے۔ اور عرصہ دراز تک یہ صدمہ اور حسرت ہم پر چھایا رہا آخر صبر کرکے بیٹھ رہے۔

حضرت والد مرحوم ہی نے فرمایا کہ حضرت نانوتوی قدس سرہ کی ایک مفصل سوانح جس میں کثرت سے علوم و معارف اور مختلف علمی حقائق کو اسباب حدوث اور واقعات کے ساتھ بیان کیا گیا تھا مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی رح (تلمیذ خاص حضرت نانوتوی قدس سرہ) نے مرتب کی جو تقریباً ایک ہزار صفحات تک پہنچ چکی تھی اور سلسلہ آگے بھی چلا۔ یہ گویا حضرت کی علمی سوانح تھی جس میں سیرت و کردار پر بھی کافی روشنی ڈالی گئی تھی۔ چنانچہ اس کا تذکرہ مولانا فخر الحسن صاحب کے بعض اعلانات میں بھی ملتا ہے جس کی طباعت کا وعدہ بھی، طباعت و کتابت اور کاغذ کی سہولت

بیسر آجانے پر کیا گیا تھا حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ مولانا فخر الحسن اپنی خانگی مجبوریوں سے گنگوہ کی سکونت ترک فرما کر کانپور منتقل ہوئے، مکان کا ایک حصہ اپنی کتابوں کے لئے مخصوص کر لیا۔ اسی میں یہ سب قلمی یادداشتیں بھی رکھ دیں۔ اس کتب خانہ کی ترتیب کے چند دن بعد ہی ان کے کتب خانہ کو آگ لگائی گئی۔ جس سے سارا کتب خانہ جل کر راکھ ہو گیا اور اسی میں وہ سوانح کا مسودہ بھی ضائع ہو گیا۔

حضرت والد مرحوم ہی نے یہ بھی فرمایا کہ مدراس کے ایک عالم حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے پاس بغرض بیعت و تعلیم حاضر ہوئے اور انہوں نے مجلس نشینی کے ساتھ ہی حضرت کے ملفوظات اور متعلقہ حالات قلمبند کرنے کا بھی التزام کیا اور مسلسل دو برس دیوبند قیام کر کے کم و بیش پندرہ سو صفحات کا ایک عظیم تاریخی اور علمی ذخیرہ جمع کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ حضرت کے وصال کے بعد میں نے خطوط کے ذریعہ ان کا پتہ چلانا چاہا۔ اور جب مراسلت سے پتہ نہ چلا تو مدراس کا سفر اسی ضرورت سے کیا۔ لیکن ان مسودات کا کوئی سراغ نہ ملا۔ بجز اس کے کہ ان سے کچھ لوگ اس ذخیرہ کو لے گئے اور پھر پتہ نہیں دیا۔ غرض اس طرح یہ ذخیرہ بھی گم یا گمنام ہو گیا اور اس کا تذکرہ ہماری حسرت و یاس بڑھانے کے لئے باقی رہ گیا۔

ابھی چند سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ مجھے جناب قاری محمد عتیق صاحب مجوّد دار العلوم کے پاس سے حضرت کی سوانح کا ایک ناقص مسودہ من حیث لا یحتسب دستیاب ہوا، جو ص۲ سے ص۵۶ تک مسلسل ہے اور درمیان کے کچھ منتشر اوراق مسودہ کے بیچ میں سے نکلے۔ اس میں فہرست مضامین کے اوراق مکمل ملے جن میں ۲۴ عنوانات اصولی قائم کئے گئے ہیں اور ہر اصولی عنوان کے نیچے ضمنی عنوانات کی کافی تعداد ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سوانح سوانح کے اصول پر نہایت مکمل طریقہ سے مرتب کی گئی ہے۔ سنِ ولادت سے لیکر سنِ وفات تک مکمل حالات بیان ہوئے ہیں جیسا کہ عنوانات سے واضح ہوتا ہے حتیٰ کہ وفات کے عنوان کے نیچے مرض وفات تک کی توضیح۔ نوعیتِ علاج معالجین کی فہرست۔ انداز علاج۔ حالاتِ نزع و وفات بعد وفات مبشرات و منامات

نماز جنازہ کی تفصیلی کیفیت جنازہ پر غیر معمولی ہجوم کے واقعات۔ تعزیت کنندوں کا مہینوں ہجوم، مراثی اور قصائد تعزیت و تواریخ۔ اخبارات میں مضامین تعزیت وغیرہ اتنے ضمنی عنوانات صرف ایک عنوان وفات کے نیچے درج ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس قدر مکمل صورت میں یہ سوانح مرتب ہوئی ہوگی۔ درمیانی اوراق میں بعض صفحات پر ص ۱۵۰ کا ہندسہ پڑا ہوا ہے اور بعض پر اس سے بھی آگے کا۔ جس سے واضح ہے کہ اس سوانح کی ضخامت بھی کافی ہوگی۔ سوانح نگار عموماً مشاہدات بیان کرتا ہے۔ اکثر واقعات میں اپنی شرکت بھی ظاہر کرتا ہے۔ حتیٰ کہ خانگی معاملات درج کرتے ہوئے ان میں بھی اپنا معتمدانہ دخل ظاہر کرتا ہے۔ جس سے واضح ہے کہ سوانح نگار حضرت صاحب سوانح کے مزاج میں دخیل اور بارسوخ فرد ہے۔ مگر افسوس کہ سوانح کا اول و آخر ندارد ہے جس سے مؤلف کا پتہ چل سکتا۔

مگر اس میں بھی حیرتناک بات یہ ہے کہ ص ۵۶ سے آگے جہاں سے عنوانات فہرست میں جہاد اور اجتماعی خدمات کا ذکر ہے وہیں سے مسودات غائب ہیں۔ یعنی ذاتی سیرت تو ص ۵۶ تک فی الجملہ آگئی ہے مگر خدمات و معاملات کا حصہ غائب ہے۔ اس حصہ کے منتشر اور پھٹے ہوئے کچھ اوراق ملے جن میں حضرت کا جنگ روم و روس کے سلسلہ میں ترکوں کے لئے چندہ کرنا۔ خلافت اسلامیہ ترکی سے مسلمانان ہند کو وابستہ رکھنے کی مساعی۔ دارالعلوم کے احاطہ میں طلبہ کو فنون سپہ گری سکھلانا۔ دارالعلوم میں محکمۂ قضاء قائم کر کے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ کو قاضی بنانا اور مسلمانوں کے معاملات کو شرعی اصول پر طے کرنے کی صورتیں پیدا کرنا وغیرہ مذکور ہے مگر ناقص انداز میں، کوئی صفحہ ندارد ہے کوئی پھٹا ہوا ہے، کوئی ناقابل انتفاع ہے۔ بمشکل آئی گلاس سے کچھ پڑھا جاتا ہے۔ بہرحال اس سوانح کے چند اوراق ملنے سے جہاں خوشی ہوئی وہیں دو چند اوراق نہ ملنے سے قلق و صدمہ بھی ہوا۔

ان واقعات سے جہاں یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت والا کی سوانح نگاری پر کافی توجہ کی گئی اور ایک نہیں کئی کئی سوانح عمریاں کئی کئی اندازوں سے کئی کئی مصنفوں نے مرتب کیں۔ وہیں یہ بھی

اندازہ ہوتا ہے کہ ان سوانحات کے مسودوں کا مسلسل ضائع ہوتے رہنا اور وہ بھی خصوصیت سے مخصوص گوشہ ہائے زندگی کا۔ جو اس زندگی کی روح اور عطر زندگی کہلائے جانے کے مستحق تھے۔ محض اتفاقی نہیں۔ بخت واتفاق کا قضیہ ایک آدھ بار ہو سکتا ہے لیکن مسلسل اور ایک ہی انداز سے یہ اضاعتِ اوراق پتہ دیتی ہے کہ کوئی مخفی ہاتھ ان مسودات کے پیچھے لگا ہوا تھا، اور منصوبہ یہ تھا کہ یہ زندگی سامنے نہ آنے پائے۔ یہ ہاتھ کون تھا، اور کس کا تھا؟ اگر کسی ایک ہی جگہ اضاعت کے یہ سب واقعات پیش آتے تو کسی ایک مقامی گروہ یا شخص کی طرف انہیں منسوب کیا جا سکتا تھا، لیکن ایسے متعدد مواقع میں حوادث کا پیش آنا جن میں مشرق و مغرب کا فرق تھا۔ کوئی دیوبند میں کوئی مدراس میں اور کوئی کانپور میں، اس کی واضح دلیل ہے کہ اضاعت مسودات کے درپے کوئی منظم جماعت تھی جو ہر جگہ کی خبریں رکھتی اور ہر وقت اپنا تخریبی مشن انجام کو پہنچاتی تھی۔ بظاہر یہ درپے جماعت وہی ہو سکتی ہے جس کے درپے خود حضرت والا تھے۔ جن کی تعلیمی عدالتی تمدنی معاشرتی اور سیاسی شوکت انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ وہی ان کی اور ان کے آثار کی تخریب کو موضوع بنا سکتے تھے اور جو گروہ حضرت والا کی حیات میں خود ان کی ذات ہی کی نگرانی ضروری سمجھتا تھا، وہی ان کی وفات کے بعد ان کے آثار کی نگرانی بلکہ انہیں مٹا دینے کی فکر کر سکتا تھا کیونکہ حضرت کی وفات کے بعد ان کے یہ علمی اور اصلاحی آثار ہی ان کی قائم مقامی کر سکتے تھے، اور ظاہر ہے کہ اسی طاقتور گروہ کے اعضاء و اجزاء من و تو میں ملے ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے، جو ہر وقت اور ہر جگہ اپنا کام بسہولت انجام دے سکتے تھے۔

بہر حال اس صورت حال کو سامنے رکھ کر یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت والا کے پسماندوں نے ان کے آثار کو باقی رکھنے کی فکر نہیں کی۔ البتہ اس حد تک ہمیں اپنی تقصیر کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ یہ تمام مساعی حضرت والا کے بلاواسطہ تلامذہ اور مستفیدین کی طرف سے وفات کے قریب العہد دور میں رونما ہوئیں جس پر تقریباً پون صدی کا عرصہ گذر چکا ہے۔ اس پچہتر سالہ دور میں جماعتی حیثیت سے یقیناً کوئی اقدام پھر اس سلسلہ میں نہیں کیا گیا۔ بجز اس کے کہ اکابر کی مختلف مجالس میں

حضرت والا کے تذکرے حاضرین کے سامنے کسی وقتی محرک سے ہو جاتے تھے جن کو کسی نے یاد کرلیا اور کسی نے فراموش کر دیا۔ تاہم اسی میں کسی نے اپنے ذاتی جذبہ اور شوق سے ان منتشر واقعات کو قلمبند کرلیا تو وہ بطون اوراق میں محفوظ ہو گئے ورنہ دماغوں کی لوح محفوظ میں محفوظ رہ کر عالم بالا کی لوح کی طرف رجوع کر گئے۔

ظاہر ہے کہ اب جبکہ اس قرن کے افراد طبقاتی حیثیت سے ختم ہو چکے ہیں کوئی باقی بھی ہے تو علم میں نہیں اور علم میں ہے تو وہ ان احوال کا حافظ و مبصر نہیں۔ حضرت والا اور ان کے احوال و سوانح کو بالمشافہ مشاہدہ کرنے والے موجود نہیں۔ خود حضرت کے وصال پر ہی ۶۰ برس گذر چکے ہیں۔ سوانح کے سلسلہ میں جو ذخیرہ بھی مل سکتا ہے وہ کاغذی ہی ہو سکتا ہے۔ سماع و مشاہدہ کا اب سوال ہی باقی نہیں۔ سو اس کاغذی ذخیرہ کے سلسلہ میں جس حصہ سے استفادہ کیا جا سکتا تھا وہ حسب ذیل ہے۔

(۱) مختصر سوانح قاسمی۔ مؤلفہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔ (مطبوعہ)

(۲) مختصر حالات زندگی۔ جمع کردہ مولانا منصور علی خاں صاحب مرادآبادی تلمیذ رشید حضرت نانوتوی رح بضمن رسالہ مذہب منصور مؤلفہٗ خود۔ (مطبوعہ)

(۳) الکلم الطیب، متفرق واقعات۔ مؤلفہ احقر راقم الحروف۔ جو اپنے مختلف بزرگوں سے سنکر اس رسالہ میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ (مطبوعہ)

(۴) امیر الروایات۔ مختلف واقعات جمع کردہ مولانا حبیب احمد صاحب کیرانوی مرحوم از امیر شاہ خان صاحب مرحوم۔ (مطبوعہ)

(۵) اشرف التنبیہ مختصر احوال از حضرت حکیم الامۃ تھانوی قدس سرہ العزیز (مطبوعہ)

(۶) سوانح مخطوطہ۔ مؤلف کا پتہ معلوم نہیں ہوا مگر واقعات مستند اور بزرگوں کے شواہد سے مؤید ہیں۔ (مخطوطہ)

(۷) منتشر احوال وواقعات - از قصص الاکابر، قصص الاصاغر از حضرت حکیم الامۃ تھانوی قدس سرہٗ (مطبوعہ)

(۸) استطرادی واقعات - جو کتب ذیل میں جا بجا ملتے ہیں - الہدیۃ السنیہ مولفہ حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب رحمہ اللہ - مواعظ از حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ - حیات شیخ الہند از حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمہ اللہ (مطبوعات) تذکرۃ الرشید از مولانا عاشق الٰہی صاحب مرحوم جس میں ضمناً کچھ واقعات آ گئے ہیں - سوانح خود نوشت حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی تصانیف سے اُن ہی کی عبارات وکلمات سے جو سوانح جمع کی ہیں ان کا مجموعہ مگر ناتمام (مطبوعہ بہ رسالہ دار العلوم)

(۹) یادداشت واقعات - جو احقر نے اوقات مختلفہ میں خاندانی بزرگوں سے پوچھ پوچھ کر یا سن کر قلمبند کر لئے - (مخطوطۃ)

(۱۰) ذیلی مضامین - جو مختلف اخبارات میں آئے جیسے سرسید نے تہذیب الاخلاق میں بذیل تعزیت حضرت کے واقعات کی طرف اشارے کئے - (مطبوعہ)

(تلك عشرۃ كاملۃ)

ظاہر ہے کہ ان منتشر مطبوعہ اور مخطوطہ یادداشتوں سے واقعات کو چن کر ترتیب دینا اور انہیں ایک سوانح کی صورت سے سامنے لانا آسان کام نہ تھا - پہلے میں نے خود ارادہ کیا کہ اس کیلئے وقت دوں لیکن اول تو تاریخ نگاری کی واقعی مجھ میں اہلیت بھی نہ تھی - سلیقہ تو بجائے خود ہے اور پھر دار العلوم کی اہم ذمہ داریوں کے ہجوم میں وقت نکالنا بھی بس کی بات نہ تھی - اس لئے علمائے جماعت میں نگاہ دوڑائی - حضرت مولانا عماد الدین صاحب شیرکوٹی مدفیوضہم پر نگاہ پڑی، مراسلت کی - مولانا نے آمادگی ظاہر فرمائی اور اُن کے وعدہ پر یہ مسودات ان کی خدمت میں جالندھر ارسال کر دیئے گئے - ممدوح نے ابتدا کے دو تین ورق لکھ کر بطور نمونہ میرے پاس بھیجے، اور اس کے کچھ ہی عرصہ بعد قلت فرصت اور قلت بضاعت کا عذر کر کے مسودات واپس فرما دیئے - آمادگی اور عزم کے بعد

بیک دم ترک عزم کی کوئی وجہ وجیہ ذہن میں نہ آئی۔ مگر چند ہی روز کے بعد مسودّات کی واپسی من اللہ ایک انعام خداوندی ثابت ہوئی۔ اِدھر مسودات واپس آئے اور اُدھر دس بیس ہی دن کے بعد ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں جالندھر کے مسلمان وطن سے بے وطن ہو کر پاکستان جانے پر مجبور ہوئے جن میں مولانا ممدوح بھی بصد مصائب و مشکلات جان بچا کر لاہور پہنچ گئے۔ اُن کا مکان لوٹ لیا گیا اور وہ کتب خانہ جلا دیا گیا جس میں یہ مسودات رکھے گئے تھے۔ اب واضح ہوا کہ حق تعالیٰ نے ان کے قلب کو سوانح نویسی سے ہٹا کر مسودے واپس کر دینے پر گویا اس لئے مجبور فرمایا تھا کہ ان مسودات کو بچانا اور باقی رکھنا منظور تھا۔ ورنہ پہلے مسودات کی طرح یہ مسودے بھی ہمارے ہاتھ سے جا چکے تھے لیکن اس صورت حال کے بعد سوانح کی تدوین و تالیف کا مسئلہ پھر بدستور اپنی جگہ قائم اور میرے لئے موجب خلجان بنا رہا۔

آخر کار تالیف سوانح کے لئے برخوردار مولوی حافظ قاری محمد سالم سلمہ کی تحریک اور توجہ دلانے پر دارالعلوم دیوبند کے مایۂ ناز فرزند ملک کے مشہور فاضل یگانہ، انشاء و ادب عابر سبیل تاریخ بارع طریق تصنیف عارج ادج روایت شناور بحر درایت سلالۂ آل رسول مخدوم و محترم حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی دام تعارہ کا اسم گرامی سامنے آیا جسے میں رحمانی خطرہ اور الہامی داعیہ سمجھتا ہوں جو برخوردار موصوف کے ذہن میں آیا اور اپنے کو عَلَی الْخَبِیْرِ سَقَطْتَ کا مصداق پایا گوان کے ایک مایۂ ناز قاسمی فرزند ہونے کی حیثیت سے میں اپنے آپ کو اس کا حقدار سمجھتا تھا کہ اس بارہ میں ان پر اخلاقی دباؤ ڈال کر انہیں مجبور کروں لیکن ادباً گذارش احوال واقعی کو کافی سمجھا اور التماس نامہ بھیج دیا۔ جواب آنے پر حیرت اور حیرت کے ساتھ مسرت ہوئی کہ گویا وہ بھی رضا و تسلیم کے لئے تیار ہی بیٹھے تھے۔ پہلے ہی مراسلہ پر جواب موصول ہوا کہ میری انشاء اور علم نگاری کی ابتداء بھی القاسم[1] ہی سے ہوئی تھی، کیا عجب ہے کہ انتہا بھی القاسم (یعنی حضرت قاسم العلوم کی سوانح نگاری) ہی پر ہو جائے۔

---

[1] مولانا بعد فراغ دارالعلوم ہی میں روک لئے گئے اور رسالہ القاسم دارالعلوم کے مدیر کی حیثیت سے عرصۂ دراز تک القاسم کی قلمی خدمت فرماتے رہے۔ محمد طیب غفرلہٗ

(متعنا اللہ بطول حیاتہم)۔

طلب وقبول کے اس توافق کو منجانب اللہ سمجھتے ہوئے میں نے تمام مذکورہ مسودات اور متعلقہ اوراق مولانا کی خدمت میں روانہ کر دیئے اور ممدوح نے بکمال توجہ و اعتناء یہ اہم کام شروع فرمادیا جو پوری جماعت پر بطور ایک واجب الاداء قرضہ کے عائد تھا اور جس کی کئی ضخیم جلدیں ایک ہزار صفحات سے زائد پر آج نور افزائے دیدۂ و دل ہیں جن میں سے پہلی جلد ذاتی و عائلی حالات، دوسری جلد خدمات و اصلاحات اور تیسری جلد افکار و نظریات پر مشتمل ہے۔

تالیف اور مؤلف کے بارہ میں کچھ لکھنا مادح خورشید مداح خود است کا مصداق ہے۔ مولانا کے تفقہ و کمال باریک بینی نکتہ آفرینی سنجیدہ کلامی عذوبہ بیانی اور فقہ سنجی سے کون ناواقف ہے، جو کچھ لکھ کر انھیں متعارف بنایا جائے۔ اس سوانح کی نوعیت اور اس کے روایتی و درایتی وزن کا اندازہ سوانح نگار کی مشہور زمانہ ہستی کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے۔ مجھے اس سوانح کی بہت سی خصوصیات مثلاً اتقان روایت ایقان درایت نخاط استنباط اور واضح تعلیل و قیاس وغیرہ کو سراہنا نہیں اور وہ میری ستائش سے بالاتر بھی ہیں۔ مجھے تو اس سوانح نگاری کی ایک اہم اور امتیازی خصوصیت پر بطور بیان واقعہ نہ بطور مدح سرائی روشنی ڈالنا ہے اور وہ یہ کہ

یہ سوانح یقیناً بعد از وقت لکھی جا رہی ہے جب کہ واقعات متعلقہ جاننے اور مشاہدہ کرنے والوں کا دور ختم ہو چکا ہے بجز اس کے کہ لکھی پڑھی جزئیات کو کسی اچھی ترتیب سے جوڑ دیا جائے۔ اضافۂ معلومات کی کوئی صورت نہیں اور جو لوگ معلومات اپنے سینوں میں لئے ہوئے رہگزائے عالم جاودانی ہو چکے ہیں۔ اُن کے یا ان کی معلومات کے لوٹالانے کی کوئی سبیل نہیں۔ لیکن حق تعالیٰ نے اس فقدان معلومات کا تدارک مولانا ممدوح کے دماغ کی اعلیٰ افتاد سے کرادیا۔ گویا اس ناقص مواد کی صورت میں سوانح نگاری کے لئے مولانا کا انتخاب اسی لئے مقدر فرمادیا کہ ان روایتوں کی قلت کی تلافی ان کی مخصوص و ممتاز درایت سے کرائی جائے اور وہ یہ کہ واقعات میں سے واقعات پیدا کر لینا اور ایک جزئی واقعہ سے اس کا اندرونی کلیہ نکال کر بقیہ جزئیات واقعہ کا پھر اس سے استنباط

کر لینا اور پھر قرائن و شواہد سے انہیں مشیّد اور مضبوط کر کے دکھلا دینا مولانا ہی کی ایک بے مثال خصوصیت ہے منصوص حکم میں سے فقہی طور پر بذریعہ علت جامعہ کسی استنباطی حکم کا نکال لانا باب استنباط و اجتہاد کا ایک عام معمول اور مقررہ طریق ہے۔ لیکن واقعہ میں سے واقعہ نکال لینا اور روایت میں سے روایتی واقعہ استخراج کر لینا بلاشبہ تاریخی درایت کا ایک عجیب و غریب شاہکار ہے جو ہر ایک دماغ کو نصیب نہیں۔ اس دور میں یہ صرف مولانا ہی کی خصوصیت نظر آتی ہے۔ مولٰنا ممدوح نے اس سوانح میں محض واقعہ نگاری اور حوادث نویسی کا کام نہیں کیا جو بقول ان کے محض بہی کھاتہ کا حساب کتاب ہے کہ اعداد و شمار لکھ کر آخر میں میزان لگا دی جائے۔ بلکہ حاصل شدہ معلومات میں سے غور و تدبر کی راہ اور فکر و نظر کی مدد سے کلیات پیدا کر کے کلی ہی رنگ میں ان جزئیات معلومہ کو سپرد قلم کرنا جس سے زندگی جزوی ہونے کے بجائے اصولی نظر آئے محض مورخ کا کام نہیں بلکہ فقیہ فی التاریخ کا کام ہے۔ پس وہ جزئیات جو روات کے فقدان سے مفقود ہو چکی تھیں مولانا کے کلیت پسند قلم نے انہیں بطون غیب سے کھینچ کر نکالا اور فقدان روایت کا وجدان درایت سے تدارک فرما دیا۔

مجتہدین دین کا رتبہ عام فقہاء اور محدثین سے نیابت رسول میں اسی لئے بالاتر ہے کہ رسول شرائع اصلیہ لاتے ہیں اور یہ مجتہدین ان میں سے شرائع وضعیہ نکال کر ظاہر کر دیتے ہیں۔ جس سے انبیاء کا دین مفصل اور مدلل ہو کر ایک مرتب گلدستہ اور باغ و بہار نظر آنے لگتا ہے جس میں ہر رنگ کے پھول اپنی اپنی جگہ نصب اور کھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بالکل اسی طرح مورخین اگر جزئیات معلومہ پیش کرتے ہیں تو فقیہ فی التاریخ اصولی رنگ سے ان جزئیات اصلیہ میں سے جزئیات فرعیہ نکال کر تاریخ کے خالی گوشوں کو پر کر دیتے ہیں جس سے روایت اور راویوں کے فقدان کا قرار واقعی تدارک ہو جاتا ہے۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ اگر اس سوانح کے روایتی مواد کے ساتھ مولانا کی درایت کا مواد شامل نہ ہوتا تو یہ سوانح ناقص اور چند جزئیات میں محدود ہو کر رہ جاتی اور اصولی تو کسی طرح بھی نہ بن سکتی جو اس کا واقعی مقام تھا۔ پھر مولانا کا یہ درایتی مواد محض استنباطِ جزئیات

تک ہی محدود نہیں رہا۔ بلکہ ممدوح نے معلومہ جزئیات کو بھی ترتیب ایسے اصولی اور کلیاتی رنگ سے دیا ہے جس سے ان جزئیات کے پردہ میں بھی ساری سوانح اصولی نظر آنے لگی ہے اصل یہ ہے کہ مولانا ممدوح نے کمال فراست سے حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی طبیعت اور فطری رفتار کو بھانپ لیا ہے کہ وہ خلقۃً اصولی ہے اور ان کی زندگی کا ہر گوشہ اصولیت و ہمہ گیری کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ اس لئے انہوں نے حضرت والا کے ہر شعبۂ زندگی کی جزئیات کو اس کے متعلقہ اصول سے منسلک کر کے اس پرداز پر اٹھایا ہے کہ منقول جزئیات تو اپنے اپنے اصول پر چسپاں ہوتی چلی گئی ہیں اور غیر منقول جزئیات اس اصولی راہ کے تقاضا سے ذہنوں میں خطور کرتی چلی گئی ہیں اور اس طرح منقول سے غیر منقول واقعات تک پہنچنے کا راستہ بھی ہموار ہو گیا اور منقول اور غیر منقول جزئیات نے اصولی رنگ بھی اختیار کر لیا۔ پس مولانا نے تفریعی جزئیات ہی پیش نہیں کیں بلکہ تفریع کا راستہ بھی تیار کر دیا ہے جس سے یہ فرعیات ذہنوں میں از خود گھومنے لگتی ہیں اور زندگی کے خالی گوشے بھی متعلقہ جزئیات سے خود بخود بھرے ہوئے متخیل ہونے لگتی ہیں۔ جس سے حضرت والا کی زندگی کا اصلی اور مکمل رخ اور صحیح نقشہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر حضرت والا کی زندگی کے ان سارے جزئی واقعات کا مکمل نقشہ خالص روایات سے بھرا جاتا تو وہ بغیر ان تمام شخصیتوں کے مجتمع ہوئے جو ان واقعات سے متعلق تھیں یا بغیر ان کی اپنی اپنی روایتیں جمع کئے جو ان واقعات پر مشتمل تھیں یہ نقشہ نہیں بن سکتا تھا۔ لیکن عادۃً یہ ممکن کب تھا۔؟ اس لئے سوانح کے غیر روایتی حصہ کی تکمیل کا راستہ بجز حاضر دماغ مؤلف کی اصول پسندی، کلیۃ آفرینی اور تفریع نمائی کے دوسرا نہ تھا۔ پس یہ سوانح اپنی جمع و ترتیب میں ہر طرف سے ہر پھر کر ایسے ہی دماغ کی متلاشی تھی جو اس کے روایتی حصہ کو اپنے درایتی حصہ سے پورا کر سکے اور پھر روایتی اور درایتی جزئیات کو اصول کا جامہ پہنا کر اس طرح پیش کرے کہ اصولاً زندگی کا ہر رخ جزئیات سے بھرپور دکھائی دینے لگے۔ الحمد للہ کہ یہ دماغ بہار کے ایک چھوٹے سے موضع گیلانی میں ایسے دستیاب ہو گیا، اور سوانح کے

اس روایتی مواد کا یہ تقاضا خدا نے پورا کر دیا۔
میں سمجھتا ہوں کہ مذکورہ سوانحات کے مسودات کے مسلسل تلف وضیاع کا زخم موجودہ مختصر سوانح کی روایتی تکمیل سے انشاء اللہ بھر جائے گا۔ اور اس لئے سوانح نگاری کے سلسلہ میں مولانا کی شخصیت کا انتخاب من جانب اللہ ایک الہامی واقعہ نظر آتا ہے۔
حق تعالیٰ مولانا ممدوح کو ہم سب خدام قاسمی کی طرف سے جزاء خیر عطا فرمائے اور اُن کے مراتب میں اس سے زیادہ ترقی فرمائے جتنی کہ اس سوانح سے مستفید ہونے والوں کو قاسمی نقش قدم پر چل کر ملنے والی ہے۔ وما ذٰلک علی اللہ بعزیز۔
سوانح کا مسودہ موصول ہونے پر ضرورت سمجھی گئی کہ ایک بار اس کی خواندگی کر لی جائے تاکہ کتابت وغیرہ کے سلسلہ میں کوئی فروگذاشت ہو گئی ہو تو اسے درست کر دیا جائے۔ چونکہ کتاب اہم تھی اس لئے بجائے کسی ایک شخص کو یہ کام سپرد کرنے کے ایک کمیٹی کے سپرد کیا گیا۔ جس کے تین ارکان تجویز ہوئے۔ حضرت الاستاذ العلامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی استاذ دارالعلوم دیوبند دامت برکاتہم۔ مولانا اشتیاق احمد صاحب صدر شعبہ کتابت دارالعلوم دیوبند احقر راقم الحروف محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ ہم تینوں نے روزانہ مقررہ وقت پر جمع ہو کر مسودہ کی خواندگی کی اور باجازت حضرت مؤلف دام مجدہٗ نظر ثانی کے طور پر کی۔ اثناء خواندگی میں
(۱) اگر عبارت میں کوئی حرف یا کلمہ کتابت میں آنے سے رہ گیا تھا تو اسے سیاق سباق کی مدد سے بڑھا دیا ہے اور مکرر آ گیا تو حذف کر دیا گیا ہے۔
(۲) روایت واقعہ میں اگر رواۃ کی طرف سے کہیں تسامح پایا گیا یا کسی روایت کا دوسری روایت سے تعارض محسوس ہوا تو اس کا مناسب تدارک اور رفع تعارض کر دیا گیا۔
(۳) کسی مختصر واقعہ کی تفصیل ضروری سمجھی گئی تو اسے حاشیہ میں لے لیا گیا ہے۔
(۴) کہیں کہیں توثیق روایت کے لئے کوئی تائیدی واقعہ جو دوران خواندگی میں ذہنوں میں آیا

تو وہ حاشیہ میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔

(۵) کہیں کہیں واقعات کے شرعی ماخذ بھی حسب ضرورت حاشیہ میں درج کر دیئے گئے ہیں۔

(۶) کسی نامتمام روایت کی تکمیل کی ضرورت سمجھی گئی تو واقعہ کا باقی ماندہ حصہ حاشیہ یا متن میں اندرون بریکٹ درج کر دیا گیا ہے۔

(۷) کسی استنباط میں اگر تعبیر مجمل یا موہم دیکھی گئی جس سے خلاف مراد مطلب اخذ کیے جانے کا احتمال ہوا تو اس تعبیر کی ضرورت کی حد تک تشریح حاشیہ میں دے دی گئی ہے۔

(۸) کسی واقعہ کی مناسبت سے کوئی واقعہ ہی ذہنوں میں آ گیا تو اسے بھی حاشیہ میں درج کر دیا گیا ہے۔

(۹) کسی اصول کی مثالوں کے بارہ میں حضرت مصنف نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے آرزو ظاہر کی کہ کاش اس کی کوئی مثال درج کتاب ہوتی اور وہ اتفاق سے ہم لوگوں کے ذہن میں آگئی تو اسے بھی حاشیہ میں لے لیا گیا ہے۔

(۱۰) کسی جگہ صراحت سے اگر حضرت مصنف نے ہی خود توجہ دلائی کہ یہاں اضافہ ہونا چاہئے تو وہاں بطور تعمیل ایماء مصنف ممدوح حاشیہ میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔

(تلك عشرة كاملة)

بہرحال حضرت مصنف دام مجدہ کی اجازت اور فراخ حوصلگی پر اعتماد کرتے ہوئے قرأت و سماعت کی اس مجلس میں متعدد مواقع پر اس قسم کی تشریح و تنقیح حذف و ازدیاد اور توضیح و تصحیح وغیرہ سے کام لیا گیا ہے مگر اسی حد تک کہ اصل کلام کی روح پر کوئی اثر نہ پڑنے پائے اور ہر ایسے موقع پر احقر نے اپنے دستخط ثبت کر دیئے ہیں۔

سوانحات قاسمیہ کے سلسلہ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ کی مؤلفہ سوانح چونکہ ایک جامع متن کی حیثیت رکھتی ہے اور بقول حضرت مولانا مناظر احسن صاحب ایک کراماتی سوانح ہے جس میں ہر ایک واقعہ کا اشارہ مل جاتا ہے۔ گویا یہ مفصل سوانح عمری اسی متن کی

شرح ہے۔ نہایت ہی نامناسب اور ناقدرشناسی ہوتی اگر اس تفصیلی سوانح کو اسکے حق میں حجاب بناکر اسے ہمیشہ کے لئے چھپادیا جاتا۔ اس لئے ابتدار کتاب میں اس تفصیلی سوانح کے متن کے طور پر یہ مختصر سوانح بھی بجنسہ لے لی گئی ہے تاکہ اجمال و تفصیل دونوں سے بیک وقت فائدہ اٹھایا جاکے۔ اور تفصیلی سوانح میں جہاں بھی اس مختصر کا کہیں حوالہ آیا ہے وہاں اس کے صفحات کا عدد بھی نقل کردیا گیا ہے تاکہ اصل عبارت کتاب کی طرف رجوع کرنا آسان ہوجائے۔

افادۂ مزید کے لئے حضرت والا کی مخصوص نامزد اشیاء کے چند فوٹو بھی ناظرین کی دلچسپی کے لئے جابجا شامل کتاب کردیئے گئے ہیں۔ تاکہ سیرت کے ساتھ بعض چیزیں اپنی صورت کے ساتھ بھی سامنے آجائیں۔

دعا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ اس خدمت کو قبول فرمائے اور لوگوں کو اس کے علمی و عملی پہلوؤں سے نفع اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے اور حضرت صاحب سوانح کی مقبولیت کے طفیل میں ہم سب کو حسن خاتمہ کی نعمت سے سرفراز فرمائے۔ والحمد للہ اولاً و آخراً والیہ یصعد الکلم الطیّب والعمل الصالح یرفعہ۔

محمد طیب غفرلہٗ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۱۰ ر جمادی الاولیٰ ۱۳۷۳ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

# سَوَانحِ عُمری

## سَیّدنا الامام الکبیر حضرت شمس الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب

قدس سرہٗ

مؤلفہ

مصنف امام" حضرت اقدس عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی

قدس سرہٗ

الٰہی تیری قدرت کا ظہور ہے کہ یہ تماشے دکھلاتا ہے۔ پھر ان کو پردۂ اختفا میں چھپاتا ہے۔ کیا کیا آفتاب طلوع ہوئے اور چمک دمک دکھلا کر پھر غروب ہو گئے سب صفت و ثنا تیری ہی ہے جس کسی تعریف ہے اور سب وصف و کمال تیرا ہی ہے جس کسی کی توصیف ہے تو ہر عیب سے پاک و بری اور سب تیرے قبضہ میں خشکی ہو یا تری۔ آسمان ایک بلبلہ ہے اور زمین ایک مشت خاک۔ اور تو سب میں جلوہ گر اور سب سے برتر اور پاک۔ کس زبان سے تیری ثنا ہو سکے جب فخر الاولین و الآخرین سید المرسلین رحمۃ للعالمین حضرت سیدنا محمد رسول اللہ فرماتے ہیں لَآ اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْكَ اَنْتَ كَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ لاکھوں بلکہ لا انتہا رحمت و سلام و صلوٰۃ نثار روح پاک اور تمام آل و اصحاب پر بلکہ تمام ازواج طیبین و طاہرین علماء و زہاد و فقرا و عباد پر۔ آمین۔ **بعد** حمد و صلوٰۃ بندۂ احقر ذرۂ کمتر محمد یعقوب نانوتوی[1] ابن مقدام العلماء جناب مولوی مملوک العلی مرحوم نانوتوی

---

[1] نانوتہ ایک چھوٹا سا قصبہ آباد ہے اول ایسی آب و ہوا خراب نہ تھی۔ اب نہر کے سبب آب و ہوا یہاں کی نہایت خراب ہو گئی اور آبادی میں بھی کمی آ گئی دیوبند سے بارہ کوس غرب میں اور سہارنپور سے (باقی اگلے صفحہ پر)

عرض رساں خدمت احباب ہے کہ آپ صاحبوں نے احقر سے فرمایا تھا کہ جو کچھ حال و سوانحمری حضرت مخدوم مکرم جناب مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم کے یاد آئیں۔ مناسب ہے کہ بذیل تحریر جمع ہو جائیں۔ تا ہمارے اور آئندہ لوگوں کے لئے یادگار رہے۔ آپ لوگوں کے امر کی اجابت واجب سمجھ کر باوجود قلت فرصت۔ مختصر مختصر جو جو یاد آتا ہے لکھتا ہوں۔ مولانا احقر سے چند ماہ بڑے تھے۔ ان کی پیدائش شعبان یا رمضان سنہ[1] بارہ سو اڑتالیس[2] ہے اور نام تاریخی خورشید حسین اور بندہ کی پیدائش صفر کی تیرہویں سنہ بارہ سو انچاس ہے اور نام تاریخی منظور احمد اور حقیر کے اور مولوی صاحب کے (علاوہ قرب نسب) بہت سے روابط اتحاد تھے ایک مکتب میں پڑھا ایک وطن ایک نسب ہمزلف ہوئے ایک استاد سے ایک وقت میں علم حاصل کیا اور بعضی کتابیں میں نے مولانا سے پڑھیں ایک پیر کے مرید ہوئے ہمسفر دو سفر حج کے رہے اور ایک زمانہ دراز تک ساتھ رہے مگر ان کے کمالات کا اثر ہمارے قصور استعداد سے ہم میں ظاہر نہ ہوا۔ مولوی صاحب کے والد شیخ اسد علی صاحب ہر چند جناب والد مرحوم کے ساتھ دہلی گئے تھے اور شاہنامہ وغیرہ کتابیں پڑھی تھیں اور اپنی پڑھنے کے زمانہ کی (ہمارے سامنے) حکایتیں بیان فرمایا کرتے تھے مگر حال ایسا تھا کہ گویا

(گذشتہ صفحہ سے) پندرہ کوس جنوب میں اور گنگوہ سے نو کوس مشرق میں اور دہلی سے چار منزل ساٹھ کوس شمال میں ہے۔ ۱۲

(متعلقہ صفحہ ہذا) [1] جناب مولوی صاحب کی پیدائش کا سن تاریخی نام سے معلوم تھا اور مہینہ اور تاریخ محفوظ نہ تھا میرا یاد ربیع الثانی یا جمادی الثانی تھا اور تاریخ محفوظ رہی نہیں اور جن جن صاحبوں پر اس کے معلوم ہونے کا گمان تھا ان سے پوچھا ہر کسی نے مختلف بیان کیا ایک صاحب پندرہویں شعبان کہا مگر میرے ماموں صاحب جناب حکیم صاحب نے اس کی تغلیط کی اور ایک نے انتیسویں رمضان اور ایک صاحب نے ۲۷ محرم اور یہ بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ۱۲ محمد یعقوب

[2] مطابق سنہ اٹھارہ سو بتیس عیسوی (۱۸۳۲ء) ۱۲

علم سے کچھ مناسبت ہی نہیں رکھتے۔ تمام عمر کھیتی کی اور ویسے ہی عادات اور ڈھنگ موٹے قصبات کے سے تھے مگر نہایت ہی صاحب مروت و اخلاق کنبہ پرور، مہمان نواز نمازی پرہیزگار تھے۔ ان کے والد شیخ غلام شاہ تھے۔ احقر نے ان کی بھی زیارت کی تھی تھوڑے پڑھے ہوئے تھے مگر ذاکر شاغل تھے درویشوں کی خدمت کرتے۔ تعبیر خواب میں مشہور تھے جناب مولوی صاحب نے ایام طفلی میں یہ خواب دیکھا تھا کہ گویا میں اللہ جل شانہ کی گود میں بیٹھا ہوا ہوں ان کے والد نے یہ تعبیر فرمائی کہ تم کو اللہ تعالیٰ علم عطا فرمائے گا اور بہت بڑے عالم ہوگے، اور نہایت شہرت ہوگی یہ تعبیر ان کی درست ہوئی! اور میری بہن نے خواب میں دیکھا کہ ایک ترازو چھوٹی (جیسے لڑکے کھیلا کرتے ہیں) آسمان سے گری ہے اور اس پر ابابیل جانور سیاہ رنگ کے بہت لپٹے ہوئے ہیں اگر چھڑاتے ہیں تو چھوٹتے نہیں۔ سن کر یوں فرمایا کہ قحط ہوگا چنانچہ وہ قحط جس میں باندیاں بک گئیں واقع ہوا غالباً پانچا کال اس کو کہتے تھے میرا نسب اور مولانا کا شیخ غلام شاہ کے پردادا میں ملتا ہے اس طرح محمد قاسم بن اسد علی بن غلام شاہ بن محمد بخش ابن علاؤ الدین بن محمد فتح بن محمد مفتی بن عبد السمیع بن مولوی محمد ہاشم اور محمد یعقوب بن مملوک العلی ابن احمد علی بن غلام شرف بن عبد اللہ بن محمد فتح بن محمد مفتی بن عبد السمیع بن مولوی محمد ہاشم اور میاں شیخ محمد بخش کے بھائی شیخ خواجہ بخش میرے والد اور شیخ کرامت حسین دیوبندی کے نانا ہوتے تھے جوانی میں دکن گئے وہاں نکاح کیا تھا وہاں ایک بیٹا محمد ہاشم نام تھا یہاں اولاد پسری نہ تھی۔ اس سبب سے میرے والد کے نانا ان کے چچا ہوتے ہیں اور انواع رشتے جیسے برادری میں ہوا کرتے ہیں باہم مرتبط ہیں، مولوی صاحب کے نانا مولوی وجیہ الدین صاحب نانوتوی فارسی بہت عمدہ جانتے تھے اردو کے شاعر تھے اور کچھ کچھ عربی سے بھی آگاہ تھے بڑے تجربہ کار اور پرانے آدمی ہنگام آمدن حکومت انگریزی سہارنپور میں وکیل ہوئے اور نہایت عزت واحترام اور تمول سے گذران کی نہایت طباع اور خوش فہم تھے اور چند پشت اوپر مولوی محمد ہاشم صاحب مرحوم میں ہمارے نسب میں جا ملتے ہیں اور آگے نسب حضرت قاسم بن محمد بن

مولوی صاحب کا ایام طفلی میں ایک خواب دیکھنا

مولوی صاحب کا نسب نامہ

مولوی صاحب کا نام اور نسب اور خاندان مختصر حال

ابی بکر صدیق رضؓ میں جا پہنچتا ہے یہ مولوی محمد ہاشم زمان شاہجہاں میں مقرب بادشاہی ہوئے اور نانوتہ میں مکان بنائے اور چند دیہات جاگیر تھے جو تبدل حکومات کے سبب ان کی اولاد کے پاس نہ رہے مولوی صاحب کے اور کوئی بھائی نہ تھا۔ ایک بہن دیوبند میں اب زندہ موجود ہیں اور ان کے والد اور دادا صاحب کے بھی کوئی بھائی نہ تھا۔ بھائی پیدا ہوئے مگر لڑکپن میں مر گئے اور چچا جوانی میں مر گئے اور دادا کے بھائی تھے وہ کسی لڑائی میں جوان عمر شہید ہوئے اور اوپر جو بھائی تھے ان کے اولاد پسری یہاں کوئی نہیں رہی دکن میں ان کے اولاد ہوئی بقاعدہ معروف وہ بھی گویا ایک ہی تھے۔ غرضکہ چار پشت تک مولانا متفرد ہوئے جناب مولوی صاحب لڑکپن سے ذہین۔ طباع۔ بلند ہمت۔ تیز۔ وسیع حوصلہ۔ جفاکش جری۔ چست و چالاک تھے۔ مکتب میں اپنے سب ساتھیوں سے ہمیشہ اول رہتے تھے قرآن شریف بہت جلد ختم کر لیا۔ خط اس وقت سب سے اچھا تھا۔ نظم کا شوق اور حوصلہ تھا اپنے کھیل اور بعض قصے نظم فرماتے اور لکھ لیتے چھوٹے رسالے اکثر نقل کئے۔

حاجی امداد اللہ صاحب سے تعلق کا حال

جناب مخدوم العالم حاجی امداد اللہ صاحب سے جو ربط نسب کا تھا حضرت مخدوم کی ننہال ہمارے خاندان میں تھے اور بہن ان کی یہاں بیاہی تھی اکثر نانوتہ تشریف لاتے تھے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور نہایت محبت و اخلاص فرماتے جزو بندی کتاب کی حضرت سے ہم دونوں نے سیکھی اور اپنی لکھی ہوئی کتابوں کی جلدیں باندھیں۔ ہمارے وطن میں ایک قضیہ پیش آیا۔ شیخ تفضل حسین شیعہ مذہب ہو گئے تھے اور ہماری جائداد کی شریک تھے اُن سے اور مولوی صاحب کے دادا شیخ غلام شاہ سے فساد ہوا اور شیخ تفضل حسین مولوی صاحب کے ماموں میاں فصیح الدین کے ہاتھ سے زخمی ہو کر مر گئے ہرچند کہ اس مقدمہ میں خیریت رہی اور حاکم کی طرف سے کسی کو کچھ سزا نہ ہوئی۔ مگر بنائے مخاصمت کچھ پہلے سے تھی اب زیادہ ہو گئی۔ تب یہ خوف ہوا کہ بادا کوئی صدمہ مخالفوں کے ہاتھ سے ان کو پہنچے اس لئے دیوبند بھیجدیا یہاں مولوی مہتاب علی صاحب کا مکتب تھا،

مولوی صاحب کا فارسی کتابوں کا پڑھنا اور عربی شروع کرنا

شیخ کرامت حسین مرحوم کے گھر پر شیخ نہال احمد پڑھتے تھے۔ مولوی صاحب کو انہوں نے عربی شروع کرائی پھر سہارنپور اپنے نانا کے پاس رہے۔ وہاں مولوی محمد نواز صاحب سہارنپوری سے کچھ پڑھا۔ فارسی اور عربی کی کتابیں اول کی کچھ حاصل کیں۔ اسی[1] زمانہ میں احقر کے والد مرحوم حج کو تشریف لے گئے۔ احقر ایک برس کامل وطن رہا۔ حفظ قرآن شریف پورا ہو گیا تھا مگر صاف نہ تھا صاف کرتا تھا مولوی صاحب سہارنپور سے وطن آئے اور ان کے نانا کا انتقال اس سال کے وبائی بخار میں، معہ بہت سے لوگوں کے ہو گیا تھا اس زمانہ میں مولوی صاحب کا ساتھ رہا۔ مولوی صاحب جیسے پڑھنے میں سب سے بڑھ کر رہتے تھے ہر کھیل میں خواہ ہوشیاری کا ہو یا محنت کا سب سے اول اور غالب رہتے تھے خوب یاد ہے کہ اس زمانہ میں ایک کھیل جوڑ توڑ نام ہم کھیلتے تھے اور بہت پرانے مشاق لوگ اس کو عمدہ کھیلتے تھے اور ہم نئے کھیلنے والے مات کھا جاتے تھے۔ مولوی صاحب نے جب اس کا قاعدہ معلوم کر لیا پھر یاد نہیں کسی سے مات کھایا ہو بہت ہوا تو برابر رہے بلکہ ہر کھیل میں جو مرتبہ کمال ہوتا تھا وہاں تک اس کو پہنچا کر چھوڑتے دروازہ مکان کا ایک دراز کوچہ تھا اور وحشت ناک جگہ تھی اور وہاں آسیب بھی مشہور تھا مگر راتوں کو بہت بہت دیر سے بے تکلف گھر جاتے اور کچھ

[1] سنہ بارہ سو ساون ہجری میں حضرت مولانا محمد اسحٰق صاحب اور جناب مولانا محمد یعقوب صاحب دہلوی نے کہ دونوں نواسے اور جانشین مولانا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے تھے اچانک ارادہ ہجرت کا کیا ذی قعدہ میں شاید روانہ ہو گئے دہلی میں اندھیرا ہو گیا اور آپ صاحبوں کے ساتھ ایک بہت بڑا قافلہ عرب کو روانہ ہوا یہ دیکھ کر حضرت والد مرحوم کو بھی حج کا دھیان ہوا خفیہ تدبیر رخصت اور سامان سفر کرتے رہے آخر جب رخصت ایک سال کی مل گئی اور سرکار نے براہ قدردانی آدھی تنخواہ بھی دی۔ رجب سنہ ۱۲۵۸ ہجری میں وطن سے روانہ ہوئے اور اول ذی الحجہ کو مکہ پہنچے زیارت حرمین سے فارغ ہو کر برس دن میں پھر دہلی پہنچے اس وقت یہ سفر جلد طے ہونے میں عجیب تھا رخصت کے دن پورے ہو چکے تھے وطن نہ آ سکے ذی الحجہ میں جب چھٹی سالانہ ہوئی وطن تشریف لائے اور مولوی صاحب کو دہلی ساتھ لے گئے۔

خوف نہ کرتے جب والد مرحوم حج سے تشریف لائے اور وطن آئے تب مولوی صاحب سے کہا کہ
میں تم کو ساتھ لے جاؤنگا بعد اجازت والدہ کے دہلی روانہ ہوئے ذی الحجہ سنہ اونسٹھ کے آخر میں
وطن سے چلے اور دوسری محرم سنہ ساٹھ کو دہلی پہنچے چوتھی کو سبق شروع ہوئے مولوی صاحب
نے کافیہ شروع کیا اور احقر نے میزان اور گلستان والد مرحوم نے میرے ابواب کا سننا اور
تعلیلات کا پوچھنا ان کے سپرد کیا تھا اور ہر جمعہ کی رات کو کہ چھٹی ہوتی تھی صیغوں اور ترکیبوں
کا پوچھنا معمول تھا۔ یاد ہے کہ مولوی صاحب سب میں عمدہ رہتے تھے اسی زمانہ میں ہمارے
مکان سے قریب مولوی نوازش علی صاحب کی مسجد میں طالب علموں کا مجمع تھا ان سے پوچھ پاچھ
بحث شروع ہوئی مولوی صاحب کی جب باری آئی سب پر غالب آئے اور جب گفتگو ہوتی
اس میں مولوی صاحب کو غلبہ ہوتا بلکہ ہم میں سے جو کوئی مغلوب معلوم ہوتا مولوی صاحب سے
مدد چاہتا یا مولوی صاحب خود اس کو مدد دیتے پھر تو مولوی صاحب ایسا چلے کہ کسی کو ساتھ ہونے
کی گنجایش نہ رہی۔ یہ معقول کی مشکل کتابیں میر زاہد۔ قاضی۔ صدرا۔ شمس بازغہ ایسا پڑھا کرتے
تھے جیسے حافظ منزل سناتا ہے کہیں کہیں کوئی لفظ فرماتے جاتے اور ترجمہ تک نہ کرتے والد
مرحوم کے بعض شاگردوں نے کہا بھی کہ حضرت یہ تو کچھ سمجھتے نہیں معلوم ہوتے۔ جناب والد مرحوم نے
فرمایا کہ میرے سامنے طالب علم بے سمجھے چل نہیں سکتا اور واقعی ان کے سامنے بے سمجھے چلنا
مشکل تھا وہ طرز عبارت سے سمجھ لیتے تھے کہ یہ مطلب سمجھا ہوا ہے یا نہیں اور یہی حال جناب مولوی
رشید احمد صاحب گنگوہی سلمہ اللہ تعالیٰ کا تھا۔ مولوی صاحب سے اسی زمانہ سے دوستی اور ہم سبقی
رہی آخر حدیث جناب شاہ عبد الغنی صاحب مرحوم کی خدمت میں پڑھی اور اسی زمانہ میں دونوں صاحبوں
نے جناب قبلہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب دام ظلہ سے بیعت کی اور سلوک شروع کیا والد مرحوم
نے مولوی صاحب کو مدرسہ عربی سرکاری میں داخل کیا اور مدرس ریاضی کو فرمایا کہ ان کے حال سے
متعرض نہ ہوجیو میں ان کو پڑھالونگا اور فرمایا کہ تم اقلیدس خود دیکھ لو اور قواعد حساب کی مشق کر لو چند
روز میں چرچا ہوا کہ مولوی صاحب سب معمولی مقالے دیکھ چکے اور حساب پورا کر لیا ازبسکہ یہ واقعہ

مولوی صاحب کا دہلی آنا اور کافیہ شروع کرنا

مولوی صاحب کا سب طالب علموں پر غالب ہونا

معقول کی مشکل کتابوں کا بطور حافظ منزل سنانا

مولوی صاحب کا حضرت شاہ عبد الغنی صاحب سے حدیث پڑھنا

مولوی صاحب کا اقلیدس خود دیکھنا

نہایت تعجب انگیز تھا طلبہ نے پوچھ پاچھ شروع کی یہ کب عاری تھے ہر بات کا جواب باصواب تھا
آخر منشی ذکاء اللہ چند سوال نے کسی ماسٹر کے بھیجے ہوئے لائے اور وہ نہایت مشکل سوال تھے اُن کے
حل کر لینے پر مولانا کی نہایت شہرت ہوئی اور حساب میں کچھ ایسا ہی حال تھا جب امتحان سالانہ کے
دن ہوئے مولوی صاحب امتحان میں شریک نہ ہوئے اور مدرسہ چھوڑ دیا سب اہل مدرسہ کو علی الخصوص ہیڈ
ماسٹر صاحب کو کہ اس وقت مدرس اول انگریزی تھے نہایت افسوس ہوا پھر مولوی صاحب نے مطبع احمدی
میں تصحیح کتب کی کچھ مزدوری کر لی اور کتابیں معمولی تمام کر چکے تھے حدیث حضرت شاہ عبدالغنی صاحب
کی خدمت میں پوری کی اس عرصہ میں والد مرحوم کا گیارہویں ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ کو بمرض یرقان قبل السابع
انتقال ہوگیا ایام مرض والد مرحوم کے ممتد نہ تھے گیارہ روز کل مرض رہا مگر چار پانچ روز بہت غفلت
اور کرب رہا لخلخہ سونگھانا اور پنکھا کرنا ہر وقت تھا ہم سو جاتے تھے اور مولوی صاحب برابر بیٹھے رہتے
تھے بعد انتقال مولانا والد مرحوم کے احقر اپنے مکان ملوک میں جو چیلوں کے کوچہ میں تھا جا رہا۔
مولوی صاحب بھی میرے پاس آرہے کوٹھے پر ایک جھلنگا پڑا ہوا تھا اس پر پڑے رہتے تھے
روٹی کبھی پکوا لیتے تھے اور کئی کئی وقت تک اسی کو کھا لیتے تھے میرے پاس آدمی روٹی پکانیوالا
نوکر تھا اس کو یہ کہہ رکھا تھا کہ جب مولوی صاحب کھانا کھاویں سالن دے دیا کرو مگر بدقت کبھی
اس کے اصرار پر لے لیتے تھے۔ ورنہ وہی روکھا سوکھا ٹکڑا چبا کر پڑ رہتے تھے ایک سال کے قریب
(بعد انتقال والد مرحوم) احقر دہلی رہا پھر اجمیر کی نوکری کے سبب دہلی چھوٹی اور مولوی صاحب سے
جدائی پیش آئی۔ مولوی صاحب چند روز اسی مکان میں تنہا رہے پھر چھاپہ خانہ میں رہے،
پھر دار البقا میں چند روز رہے اس زمانہ میں جناب مولوی صاحب. مولوی احمد علی صاحب سہارنپوری
نے تحشیہ اور تصحیح بخاری شریف کی کہ پانچ چھ سیپارہ آخر کے باقی تھے مولوی صاحب
کے سپرد کیا مولوی صاحب نے اس کو ایسا لکھا کہ اب دیکھنے والے دیکھیں کہ اس سے بہتر
اور کیا ہو سکتا ہے اس زمانہ میں بعض لوگوں نے کہ مولوی صاحب کے کمال سے آگاہ نہ
تھے جناب مولوی احمد علی صاحب کو بطور اعتراض کہا تھا کہ آپ نے یہ کیا کام کیا آخر کتاب کو

مولوی صاحب کا حساب کے مشکل سوالوں کا حل کرنا

وفات حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب

مولوی صاحب کا روکھی روٹیوں پر قناعت کرنا

مولوی صاحب کا بخاری پر تحشیہ کرنا

ایک نئے آدمی کے سپرد کیا اس پر مولوی احمد علی صاحب نے فرمایا تھا کہ میں ایسا نادان نہیں ہوں
کہ بدون سمجھے بوجھے ایسا کروں اور پھر مولوی صاحب کا تحشیہ ان کو دکھلایا جب لوگوں نے جانا اور وہ
جگہ بخاری میں سب جگہ سے مشکل ہے علی الخصوص تائید مذہب حنفیہ کا جو اول سے التزام ہے اور
اس جگہ پر امام بخاری نے اعتراض مذہب حنفیہ پر کئے ہیں اور ان کے جواب لکھنے معلوم ہے
کہ کتنے مشکل ہیں اب جس کا جی چاہے اس جگہ کو دیکھ لے اور سمجھ لے کہ کیسا حاشیہ لکھا ہے
اور اس حاشیہ میں یہ بھی التزام تھا کہ کوئی بات بے سند کتاب کے محض اپنے فہم سے نہ
لکھی جائے۔ اس وقت کی اکثر حکایات سنی سنائی عرض کرتا ہوں۔ کیونکہ پانچ برس تک پھر ملاقات
مولوی صاحب سے نہیں ہوئی جب احقر اجمیر گیا مولوی صاحب اسی مکان میں رہتے تھے
اور بعض ایک دو آدمی اور تھے اور پھر اتفاق سے سب متفرق ہو گئے اور مولوی صاحب تنہا
رہ گئے۔ مکان مقفل رہتا تھا رات کو مولوی صاحب کواڑ اتار کر اندر جاتے تھے اور پھر کواڑ کو
درست کر دیتے تھے اور صبح کو کواڑ اتار کر باہر ہو جاتے تھے اور پھر کواڑ درست کر دیتے تھے
چند ماہ اسی ہو کے مکان میں گذر گئے جس زمانہ میں مولوی صاحب میرے پاس رہتے تھے
مولوی صاحب کی صورت پر جذب کی حالت برستی تھی بال سر کے بڑھ گئے تھے نہ دھونا نہ کنگھی
نہ تیل نہ کترے نہ درست کئے عجب صورت تھی مولوی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہیبت عنایت
کی تھی ان کے سامنے بولنے کا ہر کسی کو حوصلہ نہ تھا۔ باوجودیکہ نہایت خوش مزاج اور عمدہ
اخلاق تھے اس لئے میں تو کچھ کہہ نہ سکا ایک اور دوست سے کہلایا تب بمشکل بال کتروا کر
درست کئے اور دھلوائے جوئیں بہت ہو گئیں تھیں ان سے نجات ہوئی مزاج تنہائی
پسند تھا اس لئے کچھ عرض نہ ہو سکتا تھا مولوی صاحب کو اول عمر سے اللہ تعالیٰ نے یہ بات
عنایت فرمائی تھی اکثر ساکت رہتے اس لئے ہر کسی کو کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ اور باوجود
خوش مزاجی اور ظرافت کے ترش رو مغموم جیسی صورت رکھتے اور ان کے حال سے بھلا ہو یا
برا نہ کسی کو اطلاع ہوتی نہ آپ کہتے یہاں تک کہ بیمار بھی اگر ہوتے تب بھی شدت کے وقت کبھی

مولوی صاحب کی سادگی کا وصف

کسی نے جان لیا تو جان لیا ورنہ خبر بھی نہ ہوئی اور دوا کرنا تو کہاں بعضے احباب کی زبانی سنا ہے کہ چھاپہ خانہ میں جناب مولوی احمد علی صاحب کے جب مولوی صاحب کام کیا کرتے تھے مدتوں یہ لطیفہ رہا کہ لوگ مولوی کہہ کر پکارتے اور آپ بولتے نہیں کوئی نام لے کر پکارتا خوش ہوتے تعظیم سے نہایت گھبراتے بے تکلف ہر کسی سے رہتے اب تک جو شاگرد یا مرید تھے ان سے یارانہ کے طور پر رہتے اور کچھ اپنے لئے صورت تعظیم کی نہ رکھتے۔ علماء کی وضع عمامہ یا کرتہ کچھ نہ رکھتے ایک دن آپ فرماتے تھے کہ اس علم نے خراب کیا ورنہ اپنی وضع کو ایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا۔ میں کہتا ہوں اس شہرت پر بھی کسی نے کیا جانا جو کمالات تھے وہ کس قدر تھے کیا اس میں سے ظاہر ہوئے اور آخر سب کو خاک میں ہی ملا دیا اپنا کہنا کرد کھلایا مسئلہ کبھی نہ بتلاتے حوالہ کسی پر فرماتے فتوی پکا نام لکھنا اور مہر کرنا تو درکنار۔ اول امامت سے بھی گھبراتے آخر کو اتنا ہوا کہ وطن میں نماز پڑھا دیتے تھے۔ وعظ بھی نہ کہتے تھے۔ جناب مولوی مظفر حسین صاحب مرحوم کاندھلوی نے اول وعظ کہلوایا اور خود بھی بیٹھ کر سنا اور بہت خوش ہوئے جناب مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی اس آخری زمانہ میں قدما کے نمونہ تھے تقوے اللہ اکبر ایسا تھا اور اس سے وہ نسبت پیدا تھی کہ مشتبہ چیز اگر معدہ میں پہنچ گئی تو اسی وقت قے ہو جاتی تھی اور اتباع سنت نہ ایسا دیکھا اور نہ ایسا سنا سبحان اللہ بیواؤں کے نکاح کی بنا ان اطراف میں اولاً اُن سے ہی ہوئی اور والد مرحوم نے اس کو نہایت خوبصورتی سے اجرا فرمایا اور اُن دونوں بزرگواروں کے قدم قدم حضرت مولانا نے اس کو پورا شائع کیا یہ اجران صاحبوں کے نامہ اعمال میں تا بہ قیامت رہے گا، اور ایک یہ کیا ہزاروں دین کی باتیں ایسی ہی کیں جناب مولوی مظفر حسین صاحب کی خدمت میں اس زمانہ سے نیاز تھا جب کہ حضرت مولوی صاحب دہلی تشریف لاتے تو والد مرحوم کے پاس ہمارے مکان میں فروکش ہوتے اور والد مرحوم جب وطن جاتے کاندھلہ ہو کر جاتے جب وطن سے لوٹتے کاندھلہ ٹھہر کر دہلی روانہ ہوتے اور یہی حال جناب حاجی امداد اللہ صاحب سے تھا تھانہ بھون میں آتے جاتے ملاقات کر آتے۔ یا وہاں مقام ہی ہوتا۔ سبحان اللہ کیا جلسہ تھا۔ پیر محمد والی مسجد میں

مولوی صاحب کی عجز و انکساری

مولوی صاحب کا وعظ

وہ گلزار تھا کہ شب و روز سوائے ذکر اور قال اللہ قال الرسول کچھ اور دھیان نہ تھا۔ آخر شب میں ذکر جہر کا یہ رنگ ہوتا کہ غافل بھی جاگ اٹھتے اور توفیق ذکر اللہ کی پاتے غرضکہ یہ آنا جانا اور ملاقاتیں ان صاحبوں کی خدمت میں نیاز کے سبب ظاہرا ہوئی ورنہ جو لکھا ہوا تھا وہ ہر طرح ہوتا تھا۔ مولوی صاحب نکاح نہ کرتے تھے اور جناب بھائی اسد علی صاحب حضرت کے والد کو ادھر تو ترک نوکری اور اختیار درویشی کا رنج تھا ادھر یہ فکر ہوئی کہ دیوبند رشتہ کیا تھا آخر جناب حاجی امداد اللہ صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت کے فرمانے سے نکاح پر راضی ہوئے مگر یہ شرط کی کہ تمام عمر زوجہ کے نفقہ اور اولاد کی پرورش کے لئے کچھ کمالانے کے مجھ سے متقاضی نہ ہوں بے چاروں نے ناچار یہ شرط قبول کی نکاح ہوگیا۔ اب نوکری آپ نے اگر کی تو کیا کی کسی چھاپہ خانہ میں چار پانچ روپے کی تصحیح کی خدمت قبول کی اور پھر مزاج میں مہمان نوازی اور سخاوت بھلا کیا بچتا کہ گھر دیتے بلکہ جب وطن آتے اور یہاں مہمان آتے والدین کو دشواری ہوتی تب یہ کیا کہ بی بی کا زیور اس کی اجازت سے بیچ کر صرف کر دیا وہ ایسی تابعدار تھیں کہ والدین کی خدمت میں جو مشقت اٹھائی مولوی صاحب کی مزاج داری ان کو علاوہ بر آں ہوئی اور والدین کی رضا کے لئے جب ناخوش ہوتے تو ان کو ہی کچھ کہہ لیتے آخر میں ان کے بڑے شکر گزار رہے اور اللہ جل شانہ نے بہت کچھ عنایت فرمایا جو کچھ فتوح ہوتی ان کے حوالہ کر دیتے وہ اللہ کی بندی خدا سلامت رکھے ایسی سخی اور دست کشادہ ہے کہ جناب مولوی صاحب کی مہمانداری کو اسی کے باعث رونق تھی کبھی یاد نہیں کہ کسی وقت کوئی آگیا ہو اور گھر میں کھانا نہ ملا ہو۔ بلکہ خود فرماتے کہ ہماری سخاوت احمد[1] کی والدہ کی بدولت ہے جو میں قصد کرتا ہوں وہ مہمان نوازی میں اس سے بڑھ کر کرتی ہے۔ چاول نانوتہ میں بہت پیدا ہوتے ہیں مہمانوں سے فرماتے کہ ہم نے تمہارے لئے چاول پکانے میں تکلف نہیں کیا بلکہ ہمارے گھر آمدنی اراضی کے یہی چاول ہوتے ہیں وہی تمہارے آگے پکا کر رکھ دیتے ہیں اور مہمانوں کے کھلانے میں مولوی صاحب کو کچھ

مولوی صاحب کا بوجہ ترک نوکری انکار نکاح سے اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے کہنے سے نکاح کرنا

مولوی صاحب کی سخاوت کا حال

[1] احمد مولانا مرحوم کے بڑے صاحبزادے کا نام ہے ۱۲

دریغ نہ ہوتا تھا۔ ایک بار دسترخوان پر کھچڑی کے ساتھ بہت ساگھی آیا۔ دس پندرہ آدمی تھے
جناب مولوی رشید احمد صاحب نے فرمایا کہ اتنا گھی یہ فضول ہے اس میں سے آدھا رکھ لیا
اور آدھا گھر بھیج دیا ایک بار مہمانوں کی کسی سواری کے لئے دانے کی ضرورت تھی چنے نہ ملے کہ
دانہ دَل کر دیویں گھر میں کابلی چنے رکھے ہوئے تھے وہی دَلوا کر دانہ دیدیا۔ مہمان نوازی مولوی
صاحب پر ختم ہے مجھے یاد ہے کہ مولوی صاحب نے لڑکپن میں ایک خواب دیکھا تھا اس کی
تعبیر یہی تھی یوں دیکھا تھا کہ میں مرگیا ہوں اور لوگ مجھے دفن کر آئے تب قبر میں حضرت
جبریل تشریف لائے اور کچھ نگین سامنے رکھے اور کہا یہ اعمال تمہارے ہیں اُن میں
ایک نگین بہت خوشنما اور کلاں ہے اس کو فرمایا کہ یہ عمل حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا ہے۔
ایام طالب علمی میں مولوی صاحب نے ایک اور خواب دیکھا تھا کہ میں خانہ کعبہ کی چھت پر
کھڑا ہوں اور مجھ میں سے نکل کر ہزاروں نہریں جاری ہورہی ہیں۔ جناب والد مرحوم سے ذکر
کیا انہوں نے فرمایا کہ تم سے علم دین کا فیض بکثرت جاری ہوگا جس زمانہ میں نکاح ہوا اور
والد کو یہ خیال تھا کہ ابنائے زمانہ کی طرح جب فکر ہوگا آپ نوکری کر ہی لیں گے اور بعد گذرنے
کتنی مدت کے کچھ نہ کیا تب مایوس ہوگئے اور ان کو اس امر کا بہت رنج تھا کہ اور بھائی پڑھ کر نوکر
ہوگئے کوئی پچاس کا کوئی سو کا کوئی کم کوئی زیادہ۔ سب خوش و خرم ہیں اور ان کا حال ویسا ہی
اور آمدنی آراضی کی مکتفی خرچ کو نہ ہوتی تھی جناب حاجی امداد اللہ صاحب مدظلہ سے شکایت
کی کہ بھائی میرے تو یہی ایک بیٹا تھا اور مجھے کیا کچھ امید تھی کچھ کماتا تو ہمارا یہ افلاس دور ہوجاتا
تم نے اسے خدا جانے کیا کردیا کہ یہ نہ کچھ کماتا ہے نہ نوکری کرتا ہے۔ حضرت اس وقت تو
ہنسکر چپ ہورہے پھر کہلا بھیجا کہ یہ شخص ایسا ہونے والا ہے کہ وہ سو پچاس والے سب
اس کی خادمی کریں گے اور ایسی شہرت ہوگی کہ اسی کا نام ہر طرف پکارا جائے گا اور تم تنگی
کی شکایت کرتے ہو خدا تعالیٰ بے نوکری ہی اتنا کچھ دے گا کہ ان نوکروں سے بڑھتا رہے گا
جناب بھائی اسد علی صاحب کی ہی زندگی میں اللہ تع نے وسعت دی اور مولوی صاحب سے

بہت خوش انہوں نے انتقال کیا اور تصدیق اس پیشینگوئی کی اپنی آنکھ سے دیکھ گئے قدر مریدوں کی پیر ہی پہچانے اور جو ایسی نظر رکھے وہی جانے حضرت نے آخر میں ضیاء القلوب کی چند سطر ان دونوں صاحبوں کی تعریف میں لکھی ہیں نہایت درست ہیں۔ یوں حضرت نے اپنی کسر نفسی کو کام فرمایا ہے مگر اظہار مرتبہ ان دونوں صاحبوں کا اس سے منظور ہے اور خود احقر سے ارشاد فرمایا تھا اول حج میں جب حاضر خدمت ہوا تھا کہ مولوی رشید احمد صاحب میں اور مجھ میں کچھ فرق نہیں لوگوں کو یہاں آنے کی کیا ضرورت ہے' اور مولوی محمد قاسم صاحب کو فرمایا تھا کہ ایسے لوگ کبھی پہلے زمانہ میں ہوا کرتے تھے اب مدتوں سے نہیں ہوتے اور اللہ تعالیٰ نے اس کمال پر یہ ضبط عنایت فرمایا کہ کبھی کوئی کلمہ خودستائی کا یا کسی طرح کوئی صورت رعونت یا خود بینی کی خلوت جلوت تنہائی مجمع اپنے بیگانوں میں کبھی ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ اب اس سفر میں حضرت حاجی صاحب نے فرمایا تھا کہ مولوی صاحب کی تحریر و تقریر کو محفوظ رکھا کرو اور غنیمت جانو ہائے افسوس یہ خبر نہ تھی کہ اس کے یہ معنی ہیں اور یہ واقعہ یوں اچانک آجائے گا۔ چند بار شدت مرض ہو کر اللہ تعالیٰ نے شفا دی تھی۔ اب کی بار بھی وہی خیال باندھ رکھا تھا کیا کیجئے جو باتیں رہ گئیں رہ گئیں۔ اب سوائے افسوس کیا ہو سکتا ہے جو تحریریں ناتمام رہ گئیں اب بھلا کون ان کو تمام کر سکتا ہے اور جن میں کچھ نقصان ہو گیا ان کی تکمیل کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ بعد نکاح والد اکثر مکدر رہتے تھے اور آرزو کرتے تھے کہ کوئی پوتا ہوتا تو اس سے امید نسل جاری ہونے کی بندھتی اول کئی لڑکیاں ہوئیں جن میں سے دو زندہ اب ہیں۔ ایک بزرگ نے کہا کہ تم یہ آرزو کرتے ہو اور مولوی صاحب کو ناخوش رکھتے ہو اُن کو مکدر نہ کرو اللہ تعالیٰ تم کو بھی خوش کرے گا تب سے مولوی صاحب کی اکثر مزاج داری کرتے اور مہمانوں کی خدمت اور تواضع سے کسی طرح نہ گھبراتے تب اللہ تعالیٰ نے میاں احمد کو عنایت کیا۔ آج بحمدہ تعالیٰ میاں احمد جوان ہیں اٹھارہ برس کی عمر ہے اللہ تعالیٰ اپنے والد کی مثل کرے آمین اور میاں ہاشم پیدا ہوئے آج انکی عمر

حاجی صاحب کا اپنی کتاب میں مولانا کا اعزاز لکھنا۔

حاجی صاحب کا زبانی مولوی صاحب کے فضائل بیان کرنا۔

حاجی صاحب کا مولوی صاحب کی ہم لوگوں کو تحریر و تقریر محفوظ رکھنے کا ارشاد۔

مولوی صاحب کی اولاد کا حال

آٹھ برس کی ہے یہ نام مولوی صاحب کے والد کا رکھا ہوا ہے۔ اس عرصہ میں کئی لڑکے لڑکیاں
پیدا ہوئیں اور چھوٹی ہی عمر میں چل بسیں اب ایک لڑکی تین چار برس کی آخری اولاد ہے اللہ
ان سب کو عمر و سعادت و خوبی نصیب کرے اور مولوی صاحب کا نام ان کی نسل سے قائم رکھے
ہمارے بھائی اسد علی صاحب بڑے سیدھے آدمی تھے حقہ بہت پیتے تھے مولوی صاحب
کو حقہ سے نفرت تھی ایک بار حقہ بھرنے کو کہا مولوی صاحب باپ کے تابعدار حقہ بھر کر
سامنے لا رکھا جب لوگوں نے سنا بہت ملامت کی کہا ایں کہہ کر خود نادم ہوا پھر کبھی مولوی
صاحب سے نہ کہا۔ والد سے اس بات پر اکثر تکدر رہتا تھا۔ مولوی صاحب مسجد میں
رہتے رات کو مسجد میں سو رہتے کھانا مسجد میں کھاتے۔ پیر بھائی دو تین تھے ان کو کہا تھا کہ
سب کھانا لایا کرو اور مل کر کھا لیا کریں گے۔ پا پیادہ چلتے جفاکشی کرتے ان کو رنج نہ ہوتا۔
مولوی صاحب ایسے جفاکش تھے اول میں جب ضرورت نہانے کی ہوتی تھی مسجد میں پانی
گرم ہوتا تھا اور تہجد کے وقت نہاتے مگر شرم کے سبب تالاب میں جا کر نہا لیتے۔ یہ
کڑکڑات کا جاڑا اور پالا اور مولوی صاحب تالاب میں نہائیں۔ مولوی صاحب نے ریاضتیں
ایسی کی ہیں کہ کیا کوئی کرے گا اشغال دشوار جیسے حبس اور سہ پایہ مدت تک کئے ہیں اور
بارہ تسبیح اور ذکر ارّہ کا دوام تھا ہی سر کے بال شدت حرارت کے سبب اڑ گئے تھے حرارت مزاج
میں ایسی آگئی تھی کہ کسی صورت سے فرو نہ ہوتی تھی کیونکہ یہ حرارت قلب تک تھی اور اس کے نکلنے کی
کوئی صورت نہ ہوئی۔ یہی آخر مرض کا باعث ہوئی اور اسی میں آخر انتقال کیا۔ آمد معانی اور مضامین
کی ایسی تھی یوں فرماتے تھے کہ بعضی بار حیران ہو جاتا ہوں کہ کیا کیا بیان کروں اور اکثر تقریر طویل
کے سبب کہیں سے کہیں نکل جاتے باقی احوال کو اللہ جانے باوجودیکہ کشف تام تھا مگر
کبھی زبان سے کچھ نہ فرماتے ادنیٰ ادنیٰ اہل نسبت کے پاس بیٹھنے سے اثر ہوتا ہے مولانا کو
یہ ضبط تھا کہ کبھی کچھ اثر ظاہر نہ ہوتا تھا۔ ایک بار مولوی صاحب نے میرٹھ میں مثنوی مولانا روم
پڑھانا شروع کی دو چار شعر ہوتے اور عجیب غریب بیان ہوتے۔ ایک صاحب کہ کچھ

رنگ باطنی رکھتے تھے سن کر یوں سمجھے کہ یہ اثر تبحر علمی کا ہے اور چاہا کہ کچھ مولانا کو فیض باطنی
دیا جائے درخواست کی کہ کبھی تنہا ملئے آپ نے فرمایا کہ مجھے کار چھاپہ خانہ کا اور پڑھانا طلبہ کا
رہتا ہے تنہائی کہاں آپ جب چاہیں تشریف لائیں وہ صاحب ایک روز تشریف لائے اور کہا
کہ آپ ذرا میری جانب متوجہ ہوں اور خود آنکھ بند کر کر مراقب ہوئے مولانا سبق پڑھا رہے
تھے البتہ موقوف کر دیا مگر کبھی آنکھ کھلی اور کبھی قدرے بند اُن کی طرف متوجہ ہوئے اُن کا یہ
حال ہوتا تھا کہ کبھی قریب گرنے کے ہو جاتے تھے اور پھر سنبھل بیٹھتے تھے کچھ دیر یہ معاملہ رہا
پھر وہ اٹھ کر نیچی نگاہ کئے چلے گئے پھر بہت معذرت کی مولانا کی کسر نفسی نے اُن کے
کمال کو ہرگز ظاہر نہ ہونے دیا اور جو کچھ ظاہر ہوا میرے گمان میں بامر اللہ تھا۔ ہرگز اپنی طرف سے
اظہار کسی امر کا نہ فرماتے تھے بات کہاں سے کہاں پہنچی جب احقر بنارس سے وطن کی طرف
پہنچا اتفاق نانوتہ جانے کا نہ ہوا دیوبند میں اہل و عیال کو چھوڑ کر رڑکی چلا گیا وہاں کام نوکری
کا کرنے لگا اتفاق گھر جانے کا نہ ہوا مولوی صاحب گھر تھے میں نے عرض کر بھیجا کہ ملنے کو جی
چاہتا ہے اور مجھے فرصت نہیں، خود پیادہ یا دو منزلہ کر کے احقر کے ملنے کو تشریف لائے اور ہمیشہ
جب تک قوت تھی کبھی سواری کی طرف رخ نہ تھا۔ اسی عرصہ میں غدر ہو گیا بعد رمضان احقر
کو سہارنپور لینے کو تشریف لائے چند آدمی اور وطن دار ساتھ تھے اس وقت راہ چلنا بدون
ہتھیار اور سامان دشوار تھا جب احقر وطن پہنچا چند ہنگامے مفسدین کے پیش آئے
جس میں مولانا کی کمال جرأت و ہمت ظاہر ہوئی۔ اسی زمانہ میں ہمارے بھائی ہم عمر اکثر بندوق
اور گولی لگانے میں مشق کرتے رہتے تھے ایک دن آپ مسجد میں سے آئے کہ ہم گولیاں
لگا رہے تھے اور نشانہ کی جائے پر ایک نیم کا پتہ رکھا تھا اور اس کے گرد ایک دائرہ کھینچا تھا
قریب سے بندوق لگاتے تھے گولیاں مٹی کی تھیں مولوی صاحب نے فرمایا کہ بندوق کیونکر لگاتے
ہیں مجھے بھی دکھلاؤ کسی نے ایک فیر کی اور قاعدہ نشانہ کا ذکر کیا آپ بندوق ہاتھ میں لیکر فیر کی۔
صاف گولی نشانہ پر لگی اور وہ سب مشاق کتنی دیر سے لگا رہے تھے دائرہ میں لگ جانے کو نشانہ پر

پہنچا جانتے تھے اور یہ بات اتفاقی نہ تھی اپنی فہم سے حقیقت نشانہ بازی کی سمجھ کر بدن ایسی وضع پر سادھ لیا جو فرق ہو جانے کی وجہ تھی نہ ہوئی تیر اندازوں کو دیکھا ہے کہ سر سے پا تک ایک خط مستقیم ہو جاتے ہیں حاصل یہ کہ اس طوفان بے تمیزی سے سب لوگ گھبراتے تھے، ہم نے کبھی مولانا کو گھبراتے نہ دیکھا خبروں کا اس وقت میں چرچا تھا۔ جھوٹی سچی ہزاروں گپ شپ اڑا کرتی تھی مگر مولوی صاحب اپنے معمولی کام بدستور انجام فرماتے تھے چند بار مفسدوں سے نوبت مقابلہ کی آگئی اللہ رے مولوی صاحب ایسے ثابت قدم تلوار ہاتھ میں اور بندوقچیوں کا مقابلہ ایک بار گولی چل رہی تھی یکایک سر پکڑ کر بیٹھ گئے جس نے دیکھا جانا گولی لگی ایک بھائی دوڑے پوچھا کیا ہوا فرمایا کہ سر میں گولی لگی عمامہ اتار کر سر کو جو دیکھا کہیں گولی کا نشان تک نہ ملا اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر۔ انہیں دنوں ایک نے منہ در منہ بندوق ماری جس کے سنبھے سے ایک موچھ اور کچھ داڑھی جل گئی اور کچھ قدرے آنکھ کو صدمہ پہنچا اور خدا جانے گولی کہاں گئی اور اگر گولی نہ تھی تو اتنے پاس سے سنبھ بھی بس تھا مگر حفاظت الٰہی بر سر تھی کچھ اثر نہ ہوا اس زخم کی خبر اجمالی بعض دشمنوں نے جو سنی تو سرکار میں مخبری کی کہ تھانہ بھون کے فساد میں شریک تھے۔ حالانکہ مولانا فسادوں سے کوسوں دور تھے ملک و مال کے جھگڑے اگر سر رکھتے تو یہ صورت ہی کیوں ہوتی کہیں کے ڈپٹی یا صدر الصدور ہوتے اس لئے حاجت روپوشی کی ہوئی حضرت حاجی صاحب بھی ایسے ہی باعث سے روپوش ہو گئے تھے۔ ایام روپوشی میں ایک روز دیوبند تھے زنانہ مکان کے کوٹھے پر مردوں میں سے کوئی تھا نہیں زینہ میں آکر فرمایا پردہ کر لو میں باہر جاتا ہوں عورتوں سے رک نہ سکے باہر چلے گئے بعضے مرد بازار میں تھے ان کو اطلاع کی وہ اتنے میں مکان پر پہنچے دوڑ سرکاری آدمیوں کی پہنچ گئی تھی انہوں نے آکر تلاشی لی ہر چند بظاہر مولوی صاحب کی تلاش نہ تھی مگر پھر خوف کی جگہ تھی اس کے بعد سے مسجد میں رہتے اور پھر کسی نے تعرض نہ کیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے چند بار بچایا اس زمانہ کی کیفیات عجیب غریب گذری ہیں لکھنا ان کا طول ہے۔ اسی وقت میں دیوبند

مولوی صاحب کا ایام غدر میں نہ گھبرانا

مولوی صاحب کا بندوقچیوں سے سر بکف مقابلہ کرنا

مولوی صاحب پر ایک شخص نے بندوق ماری

مولوی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ہر آفت سے بچایا

اور املیا وغیرہ مختلف جائے پر متفرق اوقات بن رہے۔ بوڑیہ، گمتھلہ۔ لاڈوہ۔ پنجلاسہ۔ جمنا پار کئی دفعہ گئے آئے آخر حضرت حاجی صاحب عرب کو روانہ ہو گئے احقر کو بعد ان کے یہی سوجھی کہ تو بھی چل مولانا کی روپوشی محض عزیز و اقارب کے کہنے سے تھی ورنہ ان کو اپنی جان کا کچھ خیال نہ تھا مولانا نے بھی ارادہ کیا اس روپوشی کی بلا کے سبب والدین نے بخوشی اجازت دیدی احقر بے سامان تھا قلیل سا زادراہ بہم پہنچایا تھا مگر مولوی صاحب کے بدولت وہ سب راہ بخیر و خوبی طے ہوئی ہر چند مولوی صاحب بھی بے سامان تھے مگر بدولت توکل سب راہ بخیر و خوبی پوری ہوئی اور سب کام انجام ہو گئے کشتیوں کی راہ پنجاب ہو کر سندھ کی طرف کو گئے کراچی سے جہاز میں بیٹھے۔ جمادی الثانی سنہ ۱۲۷۷ بارہ سو ستتر میں روانہ ہوئے اور آخر ذی قعدہ میں مکہ معظمہ پہنچے بعد حج مدینہ شریف روانہ ہوئے اول صفر مراجعت کی اسی مہینہ کے آخر میں جہاز میں بیٹھے ربیع الاول کے آخر میں بمبئی آئے۔ جمادی الثانی تک وطن پہنچے جاتی دفعہ کراچی سے جہاز بادبانی میں سوار ہوئے تھے۔ رمضان کا چاند دیکھ کر مولوی صاحب نے قرآن شریف یاد کیا تھا اول وہاں سنایا اور جہاز میں کیا سیر تھا بعد عید مکہ پہنچکر حلوائے مسقط خرید فرما کر شیرینی ختم دوستوں کو تقسیم فرمائی۔ مولوی صاحب کا اس سے پہلے قرآن یاد کرنا کسی کو ظاہر نہ ہوا تھا آہستہ آہستہ پڑھتے اور یاد کر لیتے اور حافظوں کے نزدیک ٹھہرا ہوا ہے کہ بلند آواز سے یاد ہوتا ہے۔ بعد ختم مولوی صاحب فرماتے تھے کہ فقط دو سال رمضان میں میں نے یاد کیا ہے اور جب یاد کیا پاؤ سیپارہ کی قدر یا کچھ اس سے زائد یاد کر لیا اور جب سنایا ایسا صاف سنایا جیسے اچھے پرانے حافظ۔ پھر تو اکثر بہت بہت پڑھتے۔ ایک بار یاد ہے کہ ستائیس پارے ایک رکعت میں پڑھے اگر کوئی اقتدا کرتا رکعت کر کر اس کو منع فرما دیتے اور تمام شب تنہا پڑھتے رہتے۔ بعد زیارت حرمین شریفین ایک برس کچھ کم و زیادہ میں وطن آئے۔ مراجعت براہ بمبئی اور ناسک ہوئی ریل ناسک تک تھی وہاں سے گاڑیوں میں آئے پیچھے بعد تحقیقات سرکار نے مطالبۂ عام

مولوی صاحب اور حاجی صاحب کا سفر معظمہ کو جانا

مولوی صاحب کا قرآن شریف حفظ کرنا

ماہ رمضان ... ستائیس پارے ... ایک رکعت میں

اٹھادیا تھا۔ چند خاص شخصوں کی نسبت جن پر سرکار کا شبہ قوی تھا اشتہار جاری رہا۔ پھر گھر پر اپنے رہے غدر میں دہلی کا تو سب کارخانہ درہم برہم ہو گیا تھا مولوی احمد علی صاحب کا مطبع گیا گذرا تھا اس زمانہ میں سوائے وطن اور کوئی جگہ جانے کی نہ تھی کبھی وطن کبھی دیوبند رہتے تھے اسی وقت میں احقر نے حضرت سے بخاری قدرے پڑھی پھر منشی ممتاز علی صاحب نے میرٹھ میں چھاپہ خانہ کیا مولوی صاحب کو پرانی دوستی کے سبب بلالیا وہی تصحیح کی خدمت تھی۔ یہ کام برائے نام تھا مقصود ان کا مولوی صاحب کو اپنے پاس رکھنا تھا احقر اس زمانہ میں بریلی اور لکھنؤ ہو کر میرٹھ میں اسی چھاپہ خانہ میں نوکر ہو گیا۔ منشی جی حج کو گئے تھے، اس وقت میں ایک جماعت نے مسلم پڑھی احقر بھی اس میں شریک رہا۔ وہی زمانہ تھا کہ مدرسہ دیوبند کی بنیاد ڈالی گئی۔ مولوی فضل الرحمٰن اور مولوی ذوالفقار علی صاحب اور حاجی محمد عابد صاحب نے یہ تجویز کی کہ ایک مدرسہ دیوبند میں قائم کریں۔ مدرس کے لئے تنخواہ پندرہ روپے تجویز ہوئے اور چندہ شروع ہوا چند ہی روز گذرے کہ چندہ کو افزونی ہوئی اور مدرس بڑھائے گئے اور مکتب فارسی اور حافظ قرآن مقرر ہوئے اور کتب خانہ جمع ہوا مولوی محمد قاسم صاحب شروع مدرسہ میں دیوبند آئے اور پھر ہر طرح اس مدرسہ کے سرپرست ہوئے۔ مدرسہ کے احوال لکھنا یہاں طول لاطائل ہے سالانہ کیفیتوں سے یہ سب امر واضح ہو جاتے ہیں ۱۲۸۵ھ ہجری میں مولانا کو حج کی پھر سوجھی چند رفقاء کو ساتھ لے کر حج کر آئے اور منشی ممتاز علی صاحب بھی اسی سال بقصد قیام عرب کو گئے مگر ایک سال بعد واپس آ گئے پھر مولوی صاحب دہلی گئے۔ منشی جی کا چھاپہ خانہ دہلی میں ہوا منشی جی کے پیچھے میرٹھ میں مولوی محمد ہاشم صاحب کے مطبع میں کام کیا اس زمانہ میں پڑھانا اکثر تھا سب کتابیں بے تکلف پڑھاتے تھے اور اس طرح کے مضامین بیان فرماتے تھے کہ کسی سے سنے نہ سمجھے اور عجائب و غرائب تحقیقات ہر فن میں بیان فرماتے جس سے تطبیق اختلافات اور تحقیق ہر مسئلہ کی بیخ و بن تک ہو جاتی

مولوی صاحب کی مدرسی کی ترقی — دیوبند کے مدرسہ کی بنیاد

مولانا صاحب کا عمر بھر درس دینا اور کلمات عجیب و غریب بیان کرنا

مولوی صاحب کا اعتبار اور پادریوں کے مقابلہ میں وعظ کہنا

ابتدائے مباحثات و مناظرات میلہ

تھی۔ آج ان کے فیض تعلیم کا اثر موجود ہے ہر چند ذرہ آفتاب کا کیا نمونہ مگر پھر اسی جمال کا آئینہ ہے اور وہی اس کے حوصلہ کی بموجب اس میں جلوہ گر ہے جو چاہیں دیکھ لیں اور ان کی تحریرات و تقریرات کو سن لیں مولوی صاحب نے اس عرصہ میں چند تحریرات کے بعضے جواب کسی سوال کے بعض فرمایش کسی دوست کی بعض اتفاقیہ اگرچہ مجموعہ ان کا کثیر ہے مگر ایسے پریشان ہیں کہ اجتماع ان کا مشکل ہے زیادہ تر فیض رسانی کی طرف اسی زمانہ میں توجہ ہوئی مولوی صاحب سے پڑھنا نہایت ہی دشوار تھا جو شخص طباع ہو اور پہلے سے اصل کتاب سمجھا ہوا ہو تب مولوی صاحب کی بات سمجھ سکتا تھا ہرچند مولوی صاحب نہایت ہندی کی چندی کر کر بیان فرماتے مگر پھر مشکل بات مشکل ہی ہوتی ہے اسی زمانہ کے درمیان میں دہلی میں پادریوں کے وعظ کا چرچا تھا اور مسلمانوں میں سے بعضے بیچارے اپنی ہمت سے ان سے مقابلہ کرتے تھے کوئی اہل علم جن کا یہ کام تھا اس طرف توجہ نہ کرتا تھا مولوی صاحب نے اپنے شاگردوں کو فرمایا کہ تم بھی کھڑے ہو کر بازار میں کچھ بیان کیا کرو اور جہاں وہ لوگ بمقابلہ نصاریٰ بیان کرتے ہیں ان کی امداد کیا کرو آخر مباحثہ کی ٹھہری اور مولوی صاحب بے کسی صورت و شکل بنائے اور اپنا نام چھپا جا موجود ہوئے، ایک پادری تارا چند نام تھا اس سے گفتگو ہوئی آخر وہ بند ہوا اور گفتگو سے بھاگا اسی زمانہ میں مولوی منصور علی صاحب دہلوی سے جو فن مناظرہ اہل کتاب میں یکتا ہیں ملاقات ہوئی مولوی منصور علی صاحب بیبل کے گویا حافظ ہیں اور ان کا طرز مناظرہ بھی جداگانہ ہے اب انہیں کے شاگرد بمقابلہ پادریوں کے دہلی میں وعظ کہا کرتے ہیں۔ اتفاقات تقدیر سے ۱۲۹۳ھ بارہ سو ترانوے ہجری میں چاندپور ضلع شاہجہاں پور میں کوئی تعلقہ دار ہے پیارے لال اصل ہندو کبیر پنتھی ہے اس کو شاید میل نصرانیت کی طرف ہوا اس نے ہندو پنڈت اور پادری نصاریٰ اور عالم مسلمانوں کو جمع کرنا چاہا باہم ایک گفتگو ہو اور تحقیق مذہبی کا ایک میلہ

قائم کیا اور میلہ خدا شناسی اس کا نام رکھا بریلی اور وہاں کے اطراف کے لوگوں نے مولوی صاحب کو اطلاع کی مولوی صاحب نے سامان سفر درست کیا اور روانہ ہوئے اور دہلی سے مولوی منصور علی صاحب کو بلوایا اور یہاں سے بعضے اور لوگ ساتھ روانہ ہوئے شاہجہانپور پہنچے اور وہاں سے اس گاؤں میں پہنچے اول گفتگو کے باب میں اور اس کے وقت مقرر کرنے میں ایک بحث رہی پھر آخر گفتگو ہوئی طرز گفتگو کی نہ تھی بلکہ ہر شخص اپنی باری پر کچھ بیان کرتا تھا ہر چند وقت مقید تھا مگر مولوی صاحب نے ابطال تثلیث و شرک اور اثبات توحید ایسا بیان کیا کہ حاضرین جلسہ مخالف و موافق مان گئے کیفیت اس جلسہ کی چھپی ہوئی ہے جو کوئی چاہے دیکھ لے مولانا کی تقریر اس میں مندرج ہے آخر میں حسب عادت پادریوں نے بحث تقدیر پیش کی پادری جب عاجز آتے ہیں یہی مسئلہ پیش کیا کرتے ہیں مولانا نے اس مشکل مسئلہ کو ایسا بیان فرمایا کہ ہر خاص و عام کی سمجھ میں بخوبی آگیا۔ اگلے سال یعنی ۱۲۹۴ھ میں پھر اس جلسہ کی خبر ہوئی پھر مولانا تشریف لے گئے اس سال میں مجمع ہنود میں ایک بہت بڑے پنڈت دیانند سرستی نامور تھے۔ ہر چند نو ایجاد مذہب ان کا توحید اور انکار بت پرستی میں اور عام ہنود کی نسبت جداگانہ ہے مگر دید کے ایمان اور بعضے اور مسائل جیسے آواگون وغیرہ میں برابر ہیں تقریر اس شخص کی اکثر سنسکرت کے ساتھ ملی ہوتی تھی اس لئے دشواری ہوئی مگر مولوی محمد علی صاحب جو بمقابلہ مذہب ہنود مشہور ہیں، انہوں نے کچھ اس کا جواب کہا پھر مولانا نے بحث وجود اور توحید کا ذکر کیا اور ایسا بیان کیا کہ حاضرین کو سوائے سکوت اس بے استماع کے اور کام نہ تھا پھر کچھ گفتگو تحریف کی ہوئی یہ بھی بحمداللہ تعالیٰ الزام تحریف کا ان کے اقرار سے ثابت ہوا حتّٰی کہ پادری لوگ عین جلسہ میں سے ایسے بے سروپا بھاگے کہ ٹھکانا نہ معلوم ہوا۔ اپنی بعض کتابیں بھی بھول گئے اس جلسہ سے جناب کامیاب واپس آئے اور نصرت دین اسلام کہ تا بقیام قیامت منصور رہے گا اُن کی ذات سے پوری ظاہر ہوئی اور ان دو سال کے جلسوں میں عام مخلوق نے جان لیا کہ یہ شخص کس پایہ کا

ہے اور فضل الٰہی کی کیا صورت ہوا کرتی ہے۔ جز بتائید آسمانی نیست کا نقشہ ظاہر ہو گیا حتیٰ کہ پادری بھی بول اٹھے کہ اگر تقریر پر ایمان لایا جاتا تو یہ تقریر خوش ایسی لطیف اور دل میں اثر کرنے والی ہے کہ اس پر ایمان لائے مگر ایمان جس کے نصیب میں ہے وہی اس سے مشرف ہوتا ہے ورنہ حق واضح ہے کیفیت اس میلہ کی وہاں سے آکر مرتب ہو گئی تھی مگر اتفاق طبع کا نہ ہو سکا اب کہ مرض اور وقت آخر تھا طبع اس کا شروع ہوا اب امید ہے کہ ختم ہو کر مشتہر[1] ہو اور سب صاحب اس سے مستفید ہوں اس وقت میں یہ سنا تھا کہ غالباً حاجت کسی تحریر کے پیش کرنے کی بھی ہوگی اس پر مولوی صاحب نے وہیں بیٹھ کر کچھ تحریر کیا تھا اور اس کا نام حجۃ الاسلام رکھا ہے وہ کتاب طبع ہو گئی ہے پھر اسی سال ارادہ جناب مولنا مولوی رشید احمد صاحب کا حج کو جانے کا تھا احقر بھی تیار ہوا اور چلتے میں مولانا کو بھی ساتھ لے ہی لیا اور مولوی صاحب کے ساتھ اور کچھ کتنے ہی معتقد و خادم آپ کے روانہ ہوئے شوال ۹۴ھ میں روانہ ہوئے اور ربیع الاول ۹۵ھ کے اول پھر اپنے وطن واپس آئے۔ اس سفر میں تمام قافلہ علماء کا تھا اٹھارہ بیس مولوی فاضل ساتھ تھے اور عجب لطف کا مجمع تھا حضرت کی زیارت سے اور ان متبرک مکانوں کی زیارت سے مشرف ہو کر جب واپس ہوئے ہدہ پہنچکر مولانا کو بخار ہو گیا یہ خیال ہوا کہ جدائی ایسے بزرگ اور بزرگ مقاموں اور پیادہ پا زیادہ چلنے کے سبب سے ہے اور نہ کچھ پہلے حج سے بھی طبیعت ناساز بھی جدہ پہنچتے ہی جہاز پر سوار ہو گئے اس جہاز کا لنگر اٹھنے والا تھا اور دیگر جہازوں کی خبر عشرہ بلکہ دو ہفتہ تک کی تھی اس لئے یہ خیال کیا کہ پندرہ روز میں بمبئی جا پہنچیں گے اور اتنی تکلیف اٹھا لیں گے واقعی اس جہاز میں اتنی ہی تکلیف ہوئی جتنی جاتی دفعہ جہاز میں آسائش و راحت پائی تھی دو دو روز جہاز پر چڑھے ہوئے تھے کہ مولانا کو دورہ صفراے معمولی ہوا اور بخار بھی۔ وہاں نہ جگہ راحت کی نہ دوا نہ کچھ تدبیر مرض کی شدت ہوئی ایک دن یہ نوبت ہوئی

---

[1] مدت ہوئی کہ وہ کتاب طبع ہو گئی ۱۲

ماتمہ طبع حجۃ الاسلام ۱۲۹۴ھ

ہمراہی مولانا رشید احمد صاحب احقر اور مولوی صاحب کا مکہ کو جانا ۔ ف

[illegible]

کہ ہم سب مایوس ہو گئے اور جہاز میں وبا تھی ہر روز ایک دو آدمی انتقال کرتے تھے عدن پہنچے وہاں
قرنطینہ ہو گیا یعنی بہ سبب مرض نہ جہاز کے آدمی کنارہ پر اتر سکے اور نہ شہر کے آدمی جہاز پر آسکے بعدہٗ
پھر مکلا میں قدرے قیام کیا وہاں سے البتہ نیمبو بکنے آئے وہ لئے تربوز اور گلاب اور بعض ادویہ
جہاز میں مل گئیں تھیں جہاز کے ڈاکٹر نے کونین دی اور مرغ کا شوربہ غذا کو کہا وہاں مرغ کہاں
میسر تھا آخر مرغ بھی اپنے پاس سے دیا مولانا کو دورہ میں غذا سے نفرت مطلق ہو جاتی تھی اب
کچھ رغبت شروع ہوئی بمبئی ایسے پہنچے کہ بیٹھنے کی طاقت دشواری سے تھی دو تین روز ٹھہر کر وطن
کو روانہ ہوئے ہر چند موسم سرما تھا مگر جبلپور کے میدانوں میں دوپہر کو لو چلنے لگی اور مولانا کی طبیعت
بگڑی خیر الحمد للہ اس وقت نارنگی نیمبو یہ چیزیں پاس تھیں کھلائیں پانی پلایا وطن پہنچنے کے
بعد مرض رفع ہوا گو نہ طاقت آئی مگر کھانسی ٹھہر گئی اور کبھی کبھی دورہ سانس کا ہوتا زیادہ بولنا دیر تک
کچھ فرمانا مشکل ہو گیا پھر اس میں بھی کسی قدر تخفیف ہوئی اسی سال شعبان میں روڑکی سے خبر ملی کہ
پنڈت دیانند تشریف لائے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کے مذہب پر کچھ اعتراض مشتہر کئے ہیں۔
اہل روڑکی مولانا کو مجبر ہوئے کہ آپ تشریف لائیں مولانا باوجود ضعف اور مرض کے تشریف لیگئے
اور بہت سے خادم ساتھ ہوئے اور اطراف و جوانب سے بہت سی مخلوق مولانا کی تقریر کے
اشتیاق میں جمع ہو گئی مگر وہ بندہ اللہ کا گفتگو پر ٹیکانہ ہوا اینڈی بینڈی شرطیں کرتا تھا جس سے
عاقلان خود میدانند اس کی نیت سمجھ میں آتی تھی آخر غرض وہ چلدیا اور مولانا نے وہاں ایک وعظ
کہا اور اس کے اعتراضوں کے جواب ذکر فرمائے پھر واپس دیوبند تشریف لاکر رمضان وطن میں
کیا اور اس عرصہ میں تحریر اُس تقریر کی شروع کی جو اس کے جواب میں فرمائی تھی اصل اعتراض
اس کا استقبال قبلہ پر تھا کہ یہ بت پرستی ہے اس رسالہ کا نام قبلہ نما ہے بہت بڑے حجم کا
رسالہ ہے پھر پنڈت دیانند کہیں پھر پھرا کر میرٹھ پہنچے اور وہاں وہی ان کے دعوے تھے اچھی
جس کو شرم نہ ہو جو چاہے کرے۔ اتفاقاً جناب مولوی صاحب بھی ان دنوں میرٹھ کا ارادہ فرما رہے
تھے کہ وہاں سے بعضے صاحبوں نے بلانے کے بارہ میں تحریک کی غرض مولانا میں ہر چند

مولوی صاحب کے نام سے دیانند کا فرار ہونا اور مولوی صاحب کا وعظ فرمانا۔

مرض کے بقیہ اور ضعف کے سبب قوت نہ تھی مگر ہمت کر کے پہنچے تو وہ بہانہ و حیلہ کر کے
وہاں سے کافور ہوگیا وہاں بھی اس کا جواب ویسے ہی مولانا نے کچھ بیان فرمایا اور پھر کچھ تحریر
شروع کی جس کو مولوی عبدالعلی صاحب نے بطرز جواب لکھا اور نام جواب ترکی بترکی رکھا پنڈت
کے بعض معتقدوں نے کچھ تحریر بجواب مولانا۔ بے سروپا لکھی تھی اور کچھ اوٹ پٹانگ مسلمانوں
کے مذہب پر اعتراض کئے تھے یہ رسالہ اس کے جواب میں ہے اور اس عرصہ میں
چند بار جلد جلد وہی دورہ ہوا اور کئی بار صورت سانس کی سی ہوگئی پھر اللہ جل شانہ نے تخفیف
فرمادی یوں خیال تھا کہ اب یہ مرض ٹھہر گیا خیر دورہ ہے ہر چند صحت اور نجات کی امید
پوری نہ تھی۔ کیونکہ علاج ہر قسم کے ہوئے صورت آرام کی نہ ہوئی یونانی طبیبوں نے ہر قسم
کا علاج کیا ڈاکٹروں نے ہر طرح سے تدبیر کی ہندی ادویہ کشتے رس وغیرہ برتے مگر مرض
رفع نہ ہوا دو برس اسی کیفیت پر گذر گئے کہ گاہ کچھ صورت تخفیف کی ہو کر قدرے طاقت آئی اور
پھر دورہ سانس کا ہوا اور وہی صورت ضعف کی ہوگئی ایک روز کے مرض میں مدتوں کی طاقت
سلب ہوجاتی تھی اور مولانا نے برخلاف عادت اس مرض میں جو علاج ہوا اسکو قبول کیا جو دوا کھلائی
کھالی جو تدبیر کسی نے کی اس کو کرلیا البتہ مزاج لطیف و نفیس تھا ویسی ہی دوا کو پسند فرماتے اور
بعد عرض کرنے خدام کے جو دوا ہوتی استعمال فرمالیتے کئی بار مسہل بھی ہوا سردست تخفیف ہوجاتی
تھی مگر جڑ مرض کی نہیں جاتی تھی۔ حکیم مشتاق احمد صاحب دیوبندی آخر تک مصروف رہے اور ڈاکٹر
حافظ عبدالرحمن صاحب مظفر نگری نے علاج میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ مگر تقدیر سے چارہ نہیں اور
موت کا کچھ علاج نہیں اور وقت مقدر ٹلتا نہیں اگر دوا اور تدبیر پر کام ہوتا بیشک مولانا کو صحت ہوتی
وہ دوائیں مولانا کے لئے میسر ہوئیں کہ جو امراء کو بھی شاید بدشواری میسر آویں اور ویسا علاج ہوا کہ
جو بادشاہوں کو بھی شاید ہی نصیب ہو کہاں طمع اور خوف کی بات اور کہاں عقیدت قلبی آخر کو صورت
مرض کی یہ ہوئی کہ جناب مولوی احمد علی صاحب کو فالج ہوگیا تھا اس میں سہارنپور تشریف لے گئے اور
حافظ عبدالرحمن صاحب کو مظفر نگر سے بلایا تھا اسی روز گئے اور پھر شام کو واپس ریل میں آئے۔

مولوی صاحب کا تقریر فرمانا اور مولوی عبدالعلی کا جواب ترکی بترکی نام رکھنا

مولوی صاحب کا بسبب مرض کبھی صحت پانا اور کبھی بیمار ہوجانا

مولانا کا سہارنپور جانا مولوی احمد علی صاحب کو دیکھنے

نکان کے سبب طبیعت علیل ہوگئی مگر چند روز کے بعد صحت ہوگئی جب قوت آئی علاء الدین
بندہ زادہ کی استدعا پر کچھ پڑھانا بھی شروع کیا۔ بعد عصر کچھ ترمذی کی ایک دو حدیث ہوتی جب تک
کھانسی نہ اٹھتی بیان فرماتے تھے اور جب کھانسی کم ہوتی تب بھی ذرا ٹھہر کر بیان فرماتے اور جب
شدت ہو جاتی موقوف فرما دیتے پھر اسی عرصہ میں سہارنپور کا قصد کیا اور جناب مولوی احمد علی صاحب
کو تخفیف اصل مرض میں ہوگئی تھی مگر بخار اور ضعف شدید تھا مولوی صاحب ٹھہرنے کے باعث
ہوئے دو ہفتہ وہاں قیام فرمایا اور اتنا قیام خلاف عادت تھا وہاں دورہ ہوا اور ساتھ ہی اس کے
ذات الجنب بھی ہوا یہاں دوسرے دن خبر ہوئی اسی روز حافظ انوار الحق صاحب روانہ ہوئے اور
صبح کو مولوی صاحب کو ریل میں لے آئے مگر آئے کیا کہ سانس نہ آتی تھی ناچار فصد لی درد موقوف
ہوا پھر کچھ درد کا اثر معلوم ہوا اس کے لئے جونک لگائی دو تین دن طبیعت صاف رہی اس عرصہ
میں دہلی سے کچھ دوائیں مقوی آئی تھیں ان کا استعمال ہوا ضعف نہایت تھا بات کرنی دشوار تھی
اس میں حرارت کو شدت ہوگئی اور کبھی کبھی غفلت ہو جاتی تھی اول ایک مُلیّن دیا تھا رائے
ہوئی کہ پھر مُلیّن دیا جائے ملیّن دیا دو دست ہو کر غفلت کو شدت ہوئی ظہر کے وقت تک جواب
دیتے تھے مگر ہوش نہ تھا یہاں تک کہ نماز کے لئے کہا تو سوائے اچھا کے اور کچھ نہ کر سکے
نہ تیمم کی طرف توجہ ہوئی نہ نماز کی طرف تب ایک صورت یاس کی ہوئی یہ منگل کا دن تھا آخر روز
میں وہ جواب بھی موقوف ہوگیا اور ایک تشنج کی آمد شروع ہوئی اس کو نزع اور یوں جانا کہ
اب وقت آخر ہے مگر وہ رات اور دن اور اگلی رات اور دوپہر جمعرات کے اسی کیفیت پر گذرے
اس وقت میں سب احباب امروہہ۔ مرادآباد۔ میرٹھ۔ سہارنپور۔ گنگوہ۔ نانوتہ وغیرہ سے جمع ہوگئے
تھے چوتھی جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ بارہ سو ستانوے ہجری جمعرات کو بعد نماز ظہر اچانک دم آخر ہوگیا
اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ ایک قیامت ہوگئی گھر میں وسعت نہ تھی مدرسہ میں لاکر جنازہ
رکھا اور بعد غسل و کفن باہر شہر ایک قطعہ زمین حکیم مشتاق احمد صاحب نے خاص قبرستان
کے لئے اسی وقت وقف کر دیا وہاں اول مولانا صاحب کو دفن کیا مغرب سے پہلے نماز ہوئی

مولوی صاحب کا دار فانی سے رحلت فرمانا

باہر شہر کے میدان میں نماز ہوئی اتنا مجمع ان بستیوں میں کبھی دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا بعد مغرب دفن
کیا اور اس خزانہ خوبی کو سپرد زمین کردیا اور ہاتھ جھاڑ کر چلے آئے مولوی صاحب کے انتقال کا سا غم والم
کبھی نہیں دیکھا تھا ایک ماتم عام تھا ہر چند شور و غوغا اور سر پیٹنا اور کپڑے پھاڑنا نہ تھا کیونکہ بہ برکت
صحبت مولانا جتنے لوگ تھے حدود شرعی سے باہر نہ ہوتے تھے مگر ایسا غم عام ہم نے دیکھا
نہ سنا اللہ تعالیٰ درجات عالی جنت میں نصیب فرماوے اور جوار خیر میں جگہ دیوے جناب مولوی
رشید احمد صاحب گنگوہی سلمہٗ کو منگل کے روز خبر کی بدھ کے دوپہر سے پہلے مولوی صاحب تشریف
لائے اور جمعہ کے روز سہارنپور کو تشریف لے گئے مولوی صاحب کو یہ ایسا صدمہ ہوا ہے کہ اس
سے زیادہ کیا متصور ہوگا مگر ایسے ضابط کہ سکوت اور نماز میں اکثر گذرتی رہی مولوی صاحب کی
طبیعت پہلے سے بھی ناساز تھی اب یہ صدمہ ہوا سہارنپور پہنچکر شنبہ کے روز جناب مولوی احمد علی صاحب
کا انتقال ہوگیا یہ آفت پر آفت اور مصیبت پر مصیبت ہوگئی مگر مولوی صاحب کے صدمہ کے
جنب اور مقابلہ میں یہ صدمہ بہت ہی کم ہوگیا ورنہ خدا جانے اس کا کتنا صدمہ ہوتا۔ جناب
مولوی صاحب نے دو صاحبزادے چھوڑے ایک میاں احمد جن کی عمر اٹھارہ برس کی ہے۔
شادی ہوگئی طالب علمی میں مصروف ہیں بحمد اللہ طبیعت تیز مزاج سنجیدہ ہے مولانا کے قدم
بقدم خدا تعالیٰ کرے اور ویسی ہی شہرت اور عزت خدا نصیب کرے اور صلاح و تقوے اور
نشر علم و خیر ان کی ذات سے فرماوے چھوٹے صاحبزادے میاں محمد ہاشم آٹھ برس کی عمر
بہت ذی ہوش مستقیم مزاج ہیں قرآن شریف حفظ کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ کمالات ظاہری اور
باطنی نصیب فرماوے اور تین صاحبزادیاں ہیں ایک بی بی اکرامن یہ سب سے میاں احمد
سے بھی بڑی ہیں۔ مولوی صاحب کی اول اولاد یہی ہیں نکاح ان کا جناب مولوی صاحب نے میاں
پیرجی مولوی عبداللہ صاحب سے کیا ہے یہ احقر کے ہمشیرہ زادے ہیں اور اولاد میں شاہ ابوالمعالی
انبہٹوی کے ہیں اور مولوی انصار علی صاحب مرحوم کے بیٹے ہیں۔ احقر سے اکثر کتابیں پڑھی ہیں
اور جناب مولوی صاحب سے بھی پڑھا ہے نہایت عمدہ آدمی ہیں ان کے تین لڑکیاں اس وقت

مولوی احمد علی صاحب کا انتقال

صاحبزادوں کا حال

صاحبزادیوں کا حال

ایک جام بارگاہ قاسمی ... خزانہ خوبی ... بھی ہے

موجود ہیں اللہ تعالیٰ ان کی نسل میں برکت کرے مولوی صاحب کی سب اولاد میں صلاح و خوبی
عام ہے اخلاق عمدہ مہمان نوازی عادت مستمرہ ہے ان سے چھوٹی بی بی رقیہ ہیں ان کا نکاح مولوی
پیرجی محمد صدیق سے کیا ہے یہ مولوی صاحب کے ماموں مولوی امین الدین صاحب مرحوم کے
نواسے ہیں اور اولاد میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں نہایت نیک اور
سنجیدہ مزاج ہیں ان کے ایک لڑکا ہے جناب مولوی صاحب نے دونوں لڑکیوں کا نکاح بالکل
سنت کے موافق کیا بدون اطلاع کسی کے جمعہ کے روز بعد جمعہ نکاح کر دیا البتہ جناب
مولوی رشید احمد صاحب کو بلوا لیا تھا اور ان کو غالباً اطلاع فرما دی تھی اور کسی کو خبر نہ تھی اور نہ
کچھ جہیز وغیرہ کی فکر کی گئی مگر بعنایت خداوندی دونوں کے پاس زیور کپڑا جیسے ہماری برادری
میں ہوا کرتا ہے موجود ہے نہایت خوش و خرم گذران ہے۔ اللہ کا شکر اور احسان ہے۔
چھوٹی صاحبزادی بی بی عائشہ ان کی عمر چار برس کی ہے۔ مولوی صاحب کو ان سے بہت
محبت تھی بخلاف اور اولاد کے مولوی صاحب ان کو پاس بٹھلا لیتے اور ان سے باتیں کرتے
اللہ تعالیٰ عمر و صلاح نصیب فرما دے یہ اس عمر پر بہت ہوشیار اور خوش مزاج ہیں اللہ تعالیٰ
اور مزید فرما دے جناب مولوی صاحب سے بہت سے لوگوں کو نسبت شاگردی ہے مگر عمدہ
ان میں سے ایک مولوی محمود حسن صاحب فرزند کلاں مولوی ذوالفقار علی صاحب دیوبندی ہیں
اکثر کتابیں مدرسہ دیوبند میں پڑھیں اور حدیث مولانا کی خدمت میں حاصل کی اور تکمیل وہاں
ہوئی دیوبند مدرسہ کی طرف سے ان کو دستار فضیلت اول بار بندھی دوسرے مولوی فخرالحسن
صاحب گنگوہی ہیں وارستگی مزاج میں مولانا کے قدم بقدم بلکہ کچھ بڑھ کر ہیں عمدہ استعداد ہے
انہوں نے بھی مدرسہ دیوبند میں تحصیل کی ہے اور اول جناب مولوی رشید احمد صاحب
سے تحصیل کی تھی تیسرے مولوی احمد حسن امروہوی ان سے مولانا کو کمال محبت تھی نہایت عمدہ
ذہن و ذکار اور اعلیٰ درجہ کی عمدہ استعداد ہے اور جناب مولانا سے کمال مناسبت ہے اور ان صاحبوں
کے علاوہ مولانا کے بہت سے شاگرد ہیں۔ مولانا باوجود اجازت حضرت حاجی صاحب مخدوم و مکرم

ایسے کے اعلیٰ درجہ کے شاگردوں کا کمال

وقبلہ ایک زمانہ تک کسی کو بیعت نہ کرتے تھے پھر آخر بہت تاکید کے بعد چند لوگ بیعت ہوئے اور
بہت سے ان میں محقق صاحب حال ہیں مگر مولوی صاحب نے کسی کو اجازت نہیں فرمائی اور اب
آخر میں بیعت سے انکار فرما دیتے تھے اگر کوئی طالب ہوا کچھ وظیفہ بتلا دیتے جیسے مولٰنا کے
شاگرد اور مرید فدائی اور جاں نثار خادم ہیں ایسے کہاں ہوتے ہیں حالانکہ مولانا سب کی ساتھ دوستانہ
اور برابری کا سا برتاؤ رکھتے تھے بلکہ تعظیم و تکریم سے گھبراتے تھے ؛ بعد انتقال جناب مولوی
صاحب بہت سی تاریخیں اکثر صاحبوں نے نکالیں سب کا یہاں ذکر کرنا طول ہے ان میں دو
مادے پسند احقر ہوئے ہیں ان کو ذکر کرتا ہوں۔ ایک خود احقر نے نکالا ہے "کیا چراغ گل ہوا"
اور اس کو نظم بھی کیا ہے۔ کئی طور پر اور دوسرا مادہ نہایت عمدہ بغایت پسندیدہ مولوی فضل الرحمٰن
صاحب دیوبندی نے بھی نکالا ہے۔ "وفات سرور عالم کا یہ نمونہ ہے" مولوی صاحب نے ایک
قطعہ نظم بھی فرمایا ہے جس کا یہ ایک مصرعہ ہے اور دونوں بزرگوں کی وفات کی تاریخ عبدالرحمٰن خاں
صاحب مالک مطبع نظامی کانپور نے نہایت عمدہ نکالی ہے یہ ہے رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا
دَائِمًا اور احقر نے یہ مادہ اس کے لئے پایا ہے مصیبت پر آئی مصیبت فقط

اب دعا پر ختم کلام کرتا ہوں۔ یا اللہ یا رب یا کریم اپنے فضل عمیم و عنایت عام و تفضل تام
سے ان حضرات کو اعلیٰ علیین میں مقام کرامت فرما اور ہم پس ماندوں کو ان کے طریق مستقیم
ہدایت پر استقامت نصیب فرما اسی پر زندہ رہیں اور اسی پر مریں اور اسی پر حشر ہو آمین
ثم آمین۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# سوانح قاسمی

جلد اول

## ذاتی اور عائلی حالات

الحمد للہ وکفی والصلوٰۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

**تمہید** ہند کی قدیم راجدھانی دہلی کے شمالی مغربی سمت میں دامن ہمالیہ کے نیچے جو علاقہ شرقاً و غرباً دور تک پھیلا ہوا ہے، یہی نہیں کہ ہندوستان کے دونوں بابرکت دریا گنگا و جمنا پہاڑ سے اتر کر اسی سرزمین کی مٹی چومتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں، اور شمالی ہند کے میدانوں کو ہر سال نئی زندگی ان ہی کی بدولت میسر آتی ہے، بلکہ اسی خطۂ پاک سے ان دونوں باطنی اور معنوی نہروں کے بھی سوتے پھوٹے ہیں، جن کی طراوت بخشیوں سے شمال کے ساتھ جنوب کی بھی روح صدیوں سے سرو تازگی حاصل کر رہی ہے، کلیر جلیل و برتر کی علائی بارگاہ اور گنگوہ پرشکوہ کی قدوسی درگاہ کو خانوادۂ چشت کے دائرے میں مرکزیت کا مقام حاصل ہو اس سے کون ناواقف ہے، ان کے سوا بھی تھانہ بھون[1]

[1] سرکار سہارنپور میں تھانہ کے نام سے دو پرگنے موسوم تھے تمیز کے لئے ایک کو "تھانہ بھیم" اور دوسرے کو "تھانہ بھون" یا "بھیون" کہتے تھے اخیر زمانہ میں حکیم الامۃ قدس اللہ سرہ کے قیام نے تو اسلامی مرکزوں میں سے ایک مستقل مرکز تھانہ بھون کو بھی بنا دیا، مگر حضرت والا سے پہلے بھی خود حضرت کے پیر و مرشد المہاجر الامام المکی نور اللہ ضریحہ اور حافظ ضامن شہید جیسی زندۂ جاوید ہستیاں تھانہ بھون کی سرزمین مسلمانوں کو عطا کر چکی تھی، صاحبِ کشاف العلوم قاضی عبد الاعلی مولانا شیخ محمد جیسے اہل علم و فضل کی بدولت اس کا نام شہرت کے آسمان پر پہنچ چکا تھا۔ عربی انسائکلوپیڈیا یا دائرۃ المعارف میں "التھانوی" کا مستقل عنوان قائم کر کے کشاف العلوم کے مصنف کا تذکرہ کافی مدح و ستائش کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ حال کے اردو انشاء پردازوں میں "شوکت تھانوی" نثر میں خاص طرز کے بانی ہونے کی حیثیت سے ملک میں روشناس ہیں اور بھی مختلف حیثیتوں سے تھانہ بھون کا قصبہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔ ۱۲

انبہٹہ[1]۔ منگلور[2]۔ کاندھلہ[3]۔ کیرانہ[4]۔ جیسی فضائل خیز اور محاسن ریز برگزیدہ آبادیاں جن میں ہر آبادی اپنی مستقل تاریخ رکھتی ہے، ان کو سوچئے، اور تاریخ کے مختلف ادوار میں جو مختلف خدمات ان کے باشندوں نے انجام دیں ان کو پیش نظر رکھئے بلکہ حافظہ مدد دے تو اس واقعہ کو بھی یاد کیجئے کہ خود دلی جب حیاتی سرگرمیوں سے خالی ہو کر جسد بے جان کی شکل میں پڑی ہوئی تھی تو پایۂ تخت ہند کے اس مرکزی شہر کی رگوں میں بھی نیا اور تازہ علمی و دینی گرم خون نواح دہلی کے اسی علاقے کے اَلْبَدْو[5] یا دہقانی آبادی پھلت نامی سے دوڑایا گیا تھا، جو رہتک کے بعد

[1] حضرت شاہ ابو المعالی جو صوفیہ ہند کے اساطین میں شمار کئے جاتے ہیں اور شارح سنن ابو داؤد مولانا خلیل احمد کا مولد پاک یہی قصبہ ہے ۱۲ [2] بعض مشہور اہل دل مثلاً شاہ رحم الٰہی شاہ اسمٰعیل وغیرہ کے سوا مسلمانوں کے روشن مستقبل کے مصنف مولوی طفیل احمد منگلور ہی کے باشندوں میں تھے ۱۲ [3] مثنوی مولانا روم کے خاتمہ نگار مفتی الٰہی بخش کاندھلہ ہی کے تھے، ان کے سوا مولانا مظفر حسین، پچھلے زمانہ کے جلیل القدر بزرگ سے، کاندھلہ میں غیر معمولی عظمت پیدا ہوئی، ممکن ہے کسی موقعہ پر ان کے کچھ حالات کا اس کتاب میں بھی تذکرہ کیا جائے، مولانا نور الحسن جن کا بڑے شاندار الفاظ میں سرسید نے آثار الصنادید میں ذکر کیا ہے، ان کی اولاد و احفاد میں موروثی طور پر علم و فضل آج تک منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، مولانا یحییٰ اور ان کے برادر خورد مولانا الیاس (بستی نظام الدین) مرحوم کی مخلصانہ خدمات سے آج دنیا واقف ہے۔ شیخ الحدیث مظاہر العلوم مولانا زکریا اور شارح مشکوٰۃ مولانا ادریس سب کاندھلوی ہیں ۱۲ [4] علاوہ دوسرے مشاہیر کے کاسر صلیب، فنذر کوب مولانا رحمۃ اللہ الہندی کیرانہ ہی کی خاک پاک سے اٹھے مکہ معظمہ میں آپ کا قائم کیا ہوا مدرسہ صولتیہ سرزمین حجاز میں مسلمانان ہند کی نمائندگی اس وقت تک کر رہا ہے ۱۲ [5] حضرت یوسف علیہ السلام کا خاندان فلسطین کی صحرائی آبادی سے جب مصر منتقل ہوا تو اس وقت حضرت یوسفؑ نے اپنے دہقانی وطن کو البدو فرمایا تھا، اس موقع پر فلسفی مورخ ابن خلدون کے ایک اجتہادی نقطۂ نظر کا خیال آتا ہے جس سے اسلام کے ساتھ حق تعالیٰ کے "لطف خفی" کی ایک عجیب و غریب شہادت سامنے آجاتی ہے، تاتاری ترک تانے اسلامی ممالک خصوصاً دار الخلافہ بغداد کی پامالی کا ذکر کر کے ابن خلدون نے لکھا ہے کہ مسلمانان عالم اس زمانہ میں عیش و نشاط میں غرق تھے تصنع اور تکلف کی عیاشانہ زندگی میں حد سے گذر چکے تھے، ہمتیں ان کی پست، باہمی امداد کا جذبہ ان میں مردہ ہو چکا تھا، بہادری غیرت، مردانہ صفات کا ان کے ازالہ ہو چکا تھا، اس وقت حق تعالیٰ کے مخفی لطف و کرم نے ایمانی زندگی کے بچا لینے میں عجیب معجزہ نمائی کی، حالات نے اس زمانہ میں مصر کو اسلام کا مرکز بنا دیا، مصر کے امراء عموماً اس زمانہ میں ترکی النسل تھے، ان میں یہ عام مذاق پھیل گیا کہ ترکستان کے علاقے سے تجار ترکی غلاموں کو مصر فروخت کرنے کیلئے لاتے اور مصر کے یہ امراء ان کے خریدار بنتے، یہ ترکی غلام جنہیں قدرت غلامی کی چادر اڑھا کر مصر لاتی اسی چادر میں حق تعالیٰ کا لطف و کرم پوشیدہ پاتے جن غلاموں کو شاہی محل سرا میں داخل ہونے کا موقع ملتا تھا عموماً وہ مسلمان ہو جاتے تھے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

خانوادۂ ولی اللّٰہی کا مرجع و منشار تھا، اس کا افسوس ہے کہ مہا بھارت کی رزمیہ نظم کے تاریخی استناد کی ذمہ داری مورخین اپنے سر لینا نہیں چاہتے، ورنہ ہندوستان کی ارض الفصل (یعنی اہم معرکوں کے فیصلہ کی سرزمین) اور اس کے تاریخی میدان کا بھی بہت بڑا رقبہ آپکو اسی عجیب غریب علاقہ میں نظر آسکتا تھا جو پانی پت کی طرف منسوب ہو کر نہ جاننے والوں کے نزدیک حد سے زیادہ مختصر ہو کر رہ گیا ہے۔[۱۵]

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ان کا ایمان پختہ ہوتا تھا کیونکہ ان کو باضابطہ قرآن و حدیث و فقہ اور اسلامی علوم کی تعلیم دلائی جاتی تھی، ساتھ ہی حربی فنون کی عملی مشق بھی کرتے تھے شہ سواری نیزہ بازی تیر اندازی شمشیر زنی میں ماہر بنائے جاتے سیاسی بصیرت کے مواقع بھی ان کو بآسانی میسر آتے تھے، ان خصوصیتوں کے ساتھ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان کے اخلاق "بدوی" تھے۔ جو تمدنی آلودگیوں سے قطعاً پاک تھے، شہری زندگیوں کی نزاکتوں سے بھی تازہ وارد ہونے کی وجہ سے لگاؤ نہیں رکھتے تھے نتیجہ یہ تھا کہ اپنی ان ہی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے حکومت میں ترقی کی راہیں ان پر کھلتی جاتی تھیں تا آنکہ حکومت کے آخری اقتدار پر بھی ان ہی کا قبضہ ہو جاتا تھا ابن خلدون کے آخری الفاظ یہ ہیں کہ یہ سب کچھ "عناية من الله سابقة ومطالعه فى خلقه ساوية" کے ظہور کی شکل تھی ان ہی کی بدولت اس عہد میں اسلام کے باغ میں پھر بہار آئی۔ دیکھو ابن خلدون ص۳۷۱ ج۴ مصر کے ممالک سلاطین کی طرف ابن خلدون نے مذکورہ بالا الفاظ میں اشارہ کیا ہے، غالباً اس بیچارے کو یہ معلوم نہ تھا کہ بجنسہ اسی لطف خفی کا ظہور سرزمین ہند میں بھی اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ابتداء میں ہوا۔ غلاموں کے خاندان کی حکومت میں وہی ساری باتیں دہرائی گئی تھیں جن کا ذکر ابن خلدون نے مصر کے متعلق کیا ہے، اسلام نے بنی آدم کے قابل رحم طبقہ یعنی غلاموں کے ساتھ جو حسن سلوک کیا تھا میرے خیال میں اسی کا غلاموں کی طرف سے یہ قدرتی جواب تھا کہ جب احرار اسلامی امانت کی حفاظت کی صلاحیت سے محروم ہو گئے، تو قدرت نے غلاموں سے اسلام کی حفاظت کا انتظام کرالیا، انشاء اللہ آئندہ بھی آخری نبوت کی آخری کتاب کی حفاظت کے سلسلہ میں اسی قسم کی معجزہ نمائیوں سے قدرت کام لیتی رہیگی فتربصوا حتى ياتى الله بامره (متعلقہ صفحہ ہذا) [۱۵] سری رام صاحب ماتھر دہلوی نے مہا بھارت کا جو اردو ترجمہ کیا ہے اسی ترجمہ کی جلد چہارم کے شروع میں کورو اور پانڈو کے جنگی صفوف کو نقشہ کی صورت میں سمجھاتے ہوئے بیان کیا ہے کہ کورو کی فوج کی ترتیب ایسی تھی کہ گرڑ (گدھ) کی شکل اس سے بن جاتی تھی، اور پانڈو نے اسکے مقابلہ میں اپنی فوج کو جس طریقہ سے مرتب کیا تھا اس سے مگر مچھ کی شکل بن جاتی تھی اسی لئے کورو اور کورو کے ساتھ لڑنے والوں کی فوج گرڑ بیوہ اور پانڈوں کی فوج مگر بیوہ کے نام سے موسوم ہوئی۔ بہرحال گرڑ اور مگر ان دونوں شکلوں کو بنا کر ایک کو دوسرے کے مقابلہ میں کھڑا کیا، سری رام صاحب نے دونوں فوجوں کے درمیانی زمین کا جغرافیائی نقشہ بنا کر ان ناموں کو اس نقشہ میں درج کیا ہے جو آج کل اس علاقے کے مختلف مقامات کے مشہور ہیں، اسی سلسلہ میں کورو کی فوج بہ شکل گرڑ کی چونچ کے نیچے انھوں نے سہارنپور اور سہارنپور کے نیچے دیوبند، دیوبند کے نیچے مظفر نگر پھر سردھنہ اور میرٹھ کو لکھ کر دادری پر اس کو ختم کیا ہے اور پانڈو کے مگر بیوہ کے سامنے بھٹنڈہ کو مگر کے منہ کے بالمقابل درج کرتے ہوئے تلونڈی سرسہ، بالا خورتیہ کے مقام پر اس کو ختم کیا ہے جس سے اس میدان جنگ کے طول و عرض کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ جس علاقہ سے ہم بحث کر رہے ہیں وہ بھی اسی میدان میں داخل تھا ۱۲

اور مہابھارت یا اس کی روایتوں کے متعلق کچھ بھی کہا جائے مگر اس علاقہ کے مشرقی گوشہ میں ہردوار اور مغربی سری پر تھانیسر کے قریب کورکشیتر کی قدیم تیرتھ گاہیں کیا بجائے خود اسکی زندہ شہادتیں نہیں ہیں کہ اس خاص خطہ کی عظمت و احترام کی تاریخ قدیم اور بہت پرانی ہے۔

ایسی صورت میں اگر یہ سمجھا جائے تو غالباً اس کو صرف خوش اعتقادی نہ قرار دیا جائے گا، کہ شاید اُعجوبہ طرازیوں اور نادرہ نمائیوں کیلئے ازل ہی سے نواح دہلی کے اس ہمالیائی وادیٔ ایمن کو قدرت کی نظر انتخاب نے چن لیا ہے، وہی ازلی تقدیر اسباب و تدبیر کا قالب اختیار کر کے اپنے اپنے وقت پر جلوہ گر ہوتی رہی ہے۔ ماضی سے گذر کر حال کی طرف آئیے۔

**قصبہ نانوتہ** دیکھئے ستّو سال کی مدت بھی شکل سے پوری ہوئی ہوگی اسی وادیٔ ایمن کے بقعہ مبارکہ میں عرب ہوتا تو شاید ہم نخلستان ہی کا لفظ استعمال کرتے، مگر ہندوستان کا چونکہ واقعہ ہے، اس لئے یوں سمجھئے کہ دیسی کھجوروں کے ایک کافی طویل و عریض گھنے بن کے بیچ میں ایک آبادی نانوتہ[۱] نامی تھی اور وہ بحمد اللہ اس وقت بھی موجود ہے، دلّی سے ساٹھ کوس اترا اور سہارنپور سے پندرہ کوس دکھن، گنگوہ سے نوکوس پورب، دیوبند سے بارہ کوس پچھم، یہی اس آبادی کی حدود اربعہ ہیں، جب تک ریل نہ تھی، چار دن میں چار منزلوں میں اترتے ہوئے دلّی اور نانوتہ کے درمیانی فاصلہ کو لوگ طے کیا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ

---

[۱] آئین اکبری میں ابوالفضل نے "صوبہ دہلی" کی آٹھ سرکاروں میں سرکار سہارنپور کو بھی شریک کرتے ہوئے اسی کے ذیلی پرگنوں میں "نانوتہ" نامی پرگنہ کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن ایک جگہ تو اس کا وہی مشہور نام "نانوتہ" ہی اس نے درج کیا ہے اور دوسری جگہ بجائے "نانوتہ" کے اس نے "نانوتھ" لکھا ہے، واللہ اعلم بالصواب یہ کتابت کی غلطی ہے، یا تلفظ کی یہ دونوں شکلیں مروج تھیں"

سہارنپور کی ایک پرانی تاریخ لالہ نندکشور پرشاد نے ۱۸۶۰ء میں لکھی ہے جس میں انھوں نے غالباً دہقانی عوام سے سن سنا کر لکھا ہے کہ "نانو" نام کی کوئی قوم جو گوجر یا راجپوت تھی اس کی طرف منسوب ہو کر ابتداء میں یہ آبادی "نانوتہ" کے نام سے مشہور ہوئی۔ مگر میرے نزدیک وجہ تسمیہ یہ افواہی روایت چنداں دل آویز نہیں معلوم ہوتی۔ اس قصبہ کی آبادی ۱۸۶۵ء میں بلحاظ مردم شماری ۷۰۸۸ تھی جیسا کہ جغرافیہ ضلع سہارنپور مصنفہ مولانا فصیح الدین صاحب دیوبندی برادر خورد حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ مہتمم اول دار العلوم دیوبند سے واضح ہے (جغرافیہ سہارنپور صفحہ مطبوعہ)

کاندھلہ، تھانہ بھون وغیرہ قصبات راستے میں ملتے تھے، جب سے سہارنپور شاہدرہ کے درمیان چھوٹی پٹری والی لائن قائم ہوگئی ہے، اب ایک اسٹیشن کھجور بن کے درمیان والی یہ آبادی نانوتہ بھی ہے۔

قدرت کی ان کارفرمائیوں کو ملاحظہ کیجئے، کہتے ہیں کہ کھجور کے بن والی اس آبادی کو آس پاس کے قصبوں اور دیہاتوں میں لوگ چھوٹا شہر کے نام سے موسوم کرتے تھے، خیال یہ پھیلا ہوا تھا کہ صبح سویرے باسی منہ "نانوتہ" کا لفظ جس کے منہ سے نکل جاتا ہے، دن بھر روٹی سے پھر اس کی ملاقات ناممکن ہو جاتی ہے، گویا اپنی ہم زلف آبادیوں میں وہ منحوس ٹھیرایا گیا تھا، حقارت اور ذلت کی نظر سے قرب و جوار کے لوگ اس کو دیکھتے تھے، اسی لئے بجائے "نانوتہ" کے نام کی نحوست سے بچنے کے لئے اس کو "چھوٹا شہر"[۱] کہتے تھے، مگر یہ کون جانتا تھا کہ ہندوستان کے ٹوٹے ہوئے مسلمانوں کے جوڑنے کا کام اسی چھوٹے شہر کی مٹی سے قدرت لیگی، لوگ مغالطہ میں مبتلا ہوئے اگرچہ یہ مغالطہ بھی کوئی نیا مغالطہ نہ تھا، یہ غلط فہمی تو کھجور بن کے درمیان کی ایک ہندوستانی آبادی کے متعلق ہوئی مگر "العرش العظیم"[۲] سے بھی عرب کی جس نخلستانی آبادی کی خاک کا

[۱] کہتے ہیں کہ نانوتہ کے نام "چھوٹے شہر" سے قصبہ کے بعض باشندوں کو برہم پاکر حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بھائی یہ بگڑنے کی کیا بات ہے، بلکہ اس نام سے تو خوش ہونا چاہئے، ہندوستان میں گنتی ہی کے تو چند مقامات ایسے ہیں جن کے آخر میں "شہر" لفظ جزء بنا ہوا ہے۔ مثلاً بلند شہر، مچھلی شہر، ان ہی میں آپ کا یہ "چھوٹا شہر" بھی ہے۔ یہی فخر کیا کم ہے کہ "شہرت" کو لوگوں نے اس کے قوام حقیقت میں داخل کر دیا ہے، اس لطیفہ کا ذکر حضرت والا کے حفید رشید وسعید مولانا محمد طیب صاحب نے اپنے ایک گرامی نامہ میں فرمایا ہے کہتے ہیں مولانا روم کا شعر بھی مشہور ہے کہ ع دہ مرد دہ مرد لا احمق کند ۔ کم از کم نانوتہ تو اس عیب سے شہر کہلانے کی وجہ سے پاک ہو جاتا ہے اور ضمناً اپنی حماقت کا گویا وہ اعتراف کرتے ہیں جن کی آبادی کے نام میں "شہر" کے لفظ کا یہ فصل نہیں پایا جاتا ۱۲

[۲] مرقد انور کا وہ حصہ جسے نبوت کبریٰ کی خواب گاہ ہونے کا شرف حاصل ہوا، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا جاتا ہے کہ العرش العظیم سے اس کو افضل قرار دیتے تھے۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے شرح موطا وغیرہ

پایہ بلند و بالا ہونے والا تھا، کون نہیں جانتا کہ نہ جاننے والوں نے ملامت و نفرت کا مستحق قرار دے کر اسی طیبہ و طاہرہ آبادی کو مدت تک "یثرب" کے نام سے بدنام کر رکھا تھا، کچھ بھی ہو اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ "نانوتہ" کو ایک زمانہ تک لوگ "چھوٹا شہر" کہتے رہے، وہ کیا جانتے تھے کہ یہی ٹوٹی ہوئی کشتی مسلمانان ہند کے لئے کشتی خضر بننے والی ہی اور اسی ٹوٹی پھوٹی دیوار کے نیچے ان غریبوں، بے کسوں کا خزانہ دبا ہوا ہے، جن کے آباؤ اجداد اس ملک میں صالحین و قانتین کی شکل میں وارد ہوئے تھے، اگرچہ اب تو اس کو نکتہ بعد الوقوع ہی قرار دیا جائیگا۔

## نانوتہ کی وجہ تسمیہ

ورنہ میں تو کہتا ہوں کہ الاسماء تنزل من السماء کی روایت میں الاسماء کا لفظ اگر ہر قسم کے اسماء اور ناموں کو عام ہے، تو اسی سے شاید پانے والے اس آسمانی اشارے کو پا سکتے تھے کہ کسی قسم کی دعوت کا نیا نیوتہ یا جدید پیغام اسی چھوٹے شہر سے تقسیم ہونے والا ہے۔

بہر حال یہ تو بتانا مشکل ہے کہ اس کھجور بن کے بیچ میں یہ آبادی کب سے قائم ہے، لیکن آئین اکبری سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبری جدید تنظیم کے سلسلے میں سرکار سہارنپور کا ایک پرگنہ "نانوتہ" نامی بھی قرار دیا گیا تھا، اگرچہ اس کتاب کے مطبوعہ اعداد و شمار کی صحت پر زیادہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، تاہم اس کا پتہ چلتا ہے کہ اس پرگنہ کا آباد رقبہ جس میں کاشتکاری ہوتی تھی انتیس ہزار دو سو چھ بیس بیگھے پر مشتمل تھا، اور سائرات وغیرہ کی زمین آباد رقبہ سے بہت زیادہ تھی، دستور کے مطابق اس پرگنہ میں بھی حکومت کی طرف سے چالیس سوار اور تین سو پیادے مقرر تھے جو عموماً افغان تھے (دیکھو آئین اکبری صفحہ ۱۴۱ ج ۲)

کھجوروں کے بن سے گھرے ہوئے ہونے کی وجہ سے جیسا کہ چاہئے، نانوتہ کی آب و ہوا شروع ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ زیادہ بہتر نہ تھی، سوانح قدیم کے مصنف علام جو نانوتہ ہی سے وطنی تعلق رکھتے تھے آب و ہوا کے متعلق ان کے الفاظ یہ ہیں۔

"اول ایسی آب و ہوا خراب نہ تھی"

اس فقرے میں "ایسی" کا لفظ بتا رہا ہے کہ اس مقام کی آب و ہوا قابل تعریف تو کسی زمانہ میں نہیں سمجھی گئی، اسی بنیاد پر یہ خیال گذرتا ہے کہ بجز ان افغانوں، یا پٹھانوں کے جو سرکاری حیثیت سے یہاں رہنے پر مجبور تھے یا خستہ حال سادات کے وہ گھرانے جن کے بچے کچھے لوگ اب بھی نانوتہ اور نانوتہ کے قریب کے موضع تین پور میں پائے جاتے ہیں، شاید مسلمانوں کے شریف لکھے پڑھے کھاتے پیتے، اچھی زندگی رکھنے والے گھرانوں کی زیادہ توجہ "نانوتہ" میں مسکن پذیر ہونے کی طرف غالباً نہ ہوئی[۵۱]

## شاہجہانی عہد میں مولوی محمد ہاشم کا نانوتہ میں قیام

اور جیسا کہ سوانح قدیم کے مصنف امام نے لکھا ہے۔

"مولوی محمد ہاشم زمان شاہجہاں میں مقرب بادشاہی ہوئے اور نانوتہ میں مکان بنائے" ص۲۵ سوانح قدیم

اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ سادات کے بعد شرفاء اسلام کا پہلا خانوادہ جس نے نانوتہ میں قیام پذیر ہو کر اس کو ایک اسلامی قصبہ کی حیثیت عطا کی، اس کی بنیاد غالباً عہد شاہجہانی میں ان ہی مولانا مولوی محمد ہاشم مرحوم کے وجود باجود سے قائم ہوئی۔

یہ مولوی محمد ہاشم، حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دودمان عالی سے نسلی تعلق رکھتے تھے، گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ صدیقی شیوخ کی "قاسمی شاخ" سے مجدین کی یہ آبادی اسلامی شرفا کی بستی بن گئی، یہ قدرتی نیرنگیاں ہیں کہ ابتدا بھی اس شاخ کی "قاسم ہی نام

[۵۱] مگر لالہ نند کشور نے اپنی کتاب تاریخ ضلع سہارنپور میں جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہاں گوجر یا راجپوت قوم کے لوگ آباد تھے۔ بعد کو سادات کا کوئی خاندان اسلامی عہد میں یہاں متوطن ہوا، لالہ صاحب کا بیان ہے کہ اکبر کے زمانہ میں ایک بزرگ سید احمد نامی نانوتہ میں کافی مشہور و معزز ہستی شمار ہوتی تھی ان ہی سید احمد کے صاحبزادے سید مصطفیٰ جہانگیر کے زمانہ میں اچھے ممتاز درویشوں میں گنے جاتے تھے صوبہ دار اس علاقہ کا ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ شاہ مصطفی کے متعلق یہ بھی لالہ صاحب ہی کا بیان ہے کہ وہ شاعر بھی تھے اور یہ کہ ان کا مزار قصبہ نانوتہ میں اب بھی موجود ہے، لالہ صاحب جو سہارنپور کے ڈپٹی کلکٹر بھی رہ چکے تھے تحقیق سے ان کو پتہ چلا کہ خود نانوتہ اور اسی کے قریب موضع تین پور میں سیدوں کے چند خستہ حال گھرانے جو پائے جاتے ہیں وہ ان ہی سید مصطفےٰ سے نسبی تعلق رکھتے ہیں ۱۲

سے ہوئی، اور ہند ہی نہیں بلکہ بیرون ہند کے مسلمانوں کی بھی کافی معقول تعداد کو اس مبارک شاخ کے سایہ تلے پناہ لینے کی جب سعادت میسر آئی تو اس کی تکمیل کا کام بھی جیسا کہ دنیا جانتی ہے "قاسم" ہی نام والی مبارک ہستی سے لیا گیا۔ سوانح قدیم کے مصنف امام نے یہ بھی ارقام فرمایا ہے کہ مولوی محمد ہاشم صاحب مرحوم کو شاہجہانی دربار سے "چند دیہات جاگیر تھے"۔

جس کا مطلب بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ علاقہ نانوتہ کے اس پرگنہ کے دیہات بھی مولوی محمد ہاشم صاحب کی جاگیر میں شریک تھے۔ فضل و کمال کی قدرشناسیوں کا بازار شاہجہانی عہد میں جتنا گرم ہوا، علم و ہنر کا نرخ اس زمانہ میں جتنا اونچا ہوا اس سے تھوڑی بہت واقفیت جو رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ "مقرب" ہو جانے کے بعد کسی صاحب علم کا مذکورہ بالا جاگیر تک رسائی پانا یقیناً دشوار نہ تھا، اگر نانوتہ پرگنہ کے تحت کے سارے گاؤں، سمجھا جائے کہ مولوی صاحب کی جاگیر میں داخل تھے تو اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے۔[1]

بلکہ سوانح قدیم کے مصنف امام نے نانوتہ کی آب و ہوا کا تذکرہ کرتے ہوئے خود اپنا یہ ذاتی مشاہدہ جو درج فرمایا ہے کہ

---

[1] پادشاہ نامہ میں عہد شاہجہانی کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے "دریں دولت خداداد کہ بازار دانش رواج دیگر گرفتہ ست و کار دانشور ان رونق از لبسر" ص ۳۴۱ ج ۱ یہ یا اسی قسم کے الفاظ تاریخوں میں جو پائے جاتے ہیں، صرف الفاظ نہیں بلکہ واقعات کی صحیح تعبیر ہے، کون نہیں جانتا کہ اسی زمانہ میں علماء درحقیقت زر و نقرہ کے ساتھ تولے جاتے تھے "ملا عبدالحکیم سیالکوٹی دو دو دفعہ بزر سنجیدہ شد" طالب کلیم آملی کا منہ موتیوں سے بھر گیا، مولوی غلام علی آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ صرف ایک دفعہ قاری نے قرآن کی چند آیتیں شاہجہاں کو سنائیں، دل بادشاہ کا خوش ہوا، ایک گاؤں قاری صاحب کو جاگیر میں عطا فرمایا گیا، اور دور کیوں جائیے اسی نانوتہ کے قریب کیرانہ کا قصبہ ہے حسو نامی جراح کی جاگیر میں پورا قصبہ دے دیا گیا تھا، لکھا ہے کہ لاکھ روپے کی آمدنی تھی، امیر کبیر کی شان کے ساتھ یہی حسو جراح کیرانہ میں زندگی گذارتا تھا، ایک سو چالیس بیگھے میں باغ لگایا تھا اور پختہ دیوار سے باغ گھیرا گیا تھا، ایک بہترین حوض بھی اس میں تھا، سارے جہان کے پھل پھول کے درخت اس باغ میں نصب کئے گئے تھے۔ آم برہانپور اور دکن سے منگوائے گئے تھے، کہتے ہیں کہ پستہ ہندوستان میں سرسبز نہیں ہوتا، مگر حسو جراح کے باغ میں لگایا گیا تو بڑھا، پھلا پھولا"۔ دیکھو ماثر الامراء ج ۳

"اب (یعنی عہد انگریزی میں) نہر کے سبب آب و ہوا وہاں کی (یعنی نانوتہ کی) نہایت خراب[۱] ہوگئی، اور آبادی میں بھی کمی آگئی" ص۲۳

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں نانوتہ کی جتنی آبادی ہے، پہلے اس کی آبادی یقیناً اس سے زیادہ تھی، غالباً اس "کھجور بن" کی طرف کشش و انجذاب کا سبب بھی "جاگیر" بنی، مگر بایں ہمہ ان ہی کے ان الفاظ سے یعنی

"نانوتہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے"

ایک طرف تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ بجائے دیہات کے نانوتہ کا شمار بہرحال "قصبات" کے ذیل میں کیا جاتا تھا، مگر اسی سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اطراف و جوانب کے مقابلہ میں نسبتاً نانوتہ چھوٹا قصبہ سمجھا جاتا تھا، ابوالفضل نے بھی سرکار سہارنپور کے پرگنوں کی فہرست درج کرتے ہوئے "نانوتہ" کا ذکر سب سے آخر میں جو کیا ہے شاید اس کی وجہ بھی یہی ہو، مگر یہ کون جانتا تھا کہ جو چھوٹا سمجھا جا رہا ہے بڑائی اسی کے لئے مقدر ہو چکی ہے، اور کھجوروں کے جس تیرہ و تار بن میں آبادی کا تخیل بھی دشوار تھا[۲]، وہاں شرفاء اسلام کا قصبہ آباد ہوگا، اور کیسا قصبہ؟ دیکھنے میں خواہ کتنا ہی چھوٹا نظر آرہا ہو، مگر بن جانے سے خدا ہی جانتا ہے کتنی اسلامی آبادیاں آج اسی کی بدولت محفوظ ہوگئیں، اللهم حرسها واحفظها عن النوائب

---

[۱] مولوی ذکاء احمد نے تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ میں لکھا ہے کہ لارڈ آک لینڈ کی منظوری سے نہر جمن کھودی گئی، مولوی صاحب نے اسی موقع پر یہ بھی لکھا ہے کہ دہلی اور کرنال کے اضلاع میں اس نہر کے سبب سے وبائی بخار ایسا پھیلا تھا کہ کرنال سے انبالہ میں چھاؤنی کو منتقل کرنا پڑا، مگر ۱۸۴۷ء میں لارڈ ہارڈنگ کے زمانہ میں پانی کی نکاسی کا انتظام معقول کیا گیا ۱۲

[۲] قصص الاکابر میں حضرت حکیم الامت تھانوی نور اللہ ضریحہ کی طرف یہ بیان منسوب کیا گیا ہے کہ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جہاں اپنی شخصیت کو کسی مصلحت سے مخفی رکھنا چاہتے تو پوچھنے پر فرما دیتے کہ میرا وطن الٰہ آباد ہے توجیہ اس کی خود یہ فرماتے کہ ہر آبادی اللہ میاں ہی کی آباد کی ہوئی ہے، پس نانوتہ کو بھی اگر الٰہ آباد کہا جائے تو واقعہ کا اقرار ہے، اسی کے ساتھ اگر یہ سمجھا جائے کہ ظاہر اسباب کی رو سے شرفاء اسلام کا اس مقام پر آباد ہونا جہاں نانوتہ واقع ہے بظاہر دشوار تھا مگر باوجود اس کے مشیت الٰہی نے وہاں آبادی قائم کی اسی لئے اس اس لدنی آبادی کو "الٰہ آباد" اگر کہا جائے تو ایسے حالات کی رو سے اس نام کی وہ مستحق ہے ۱۲

کچھ بھی ہو، سوانح قدیم کے مصنف امام نے مولوی محمد ہاشم کا ذکر کرنے کے بعد جو یہ لکھا ہے کہ

"چند پشت اوپر مولوی محمد ہاشم صاحب مرحوم میں ہمارے نسب جا ملتے ہیں" ص۲۵

اس فقرے میں "ہمارے" کے لفظ سے میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ نانوتہ میں قیام پذیر ہونے کے بعد مصنف امام کے زمانہ تک جو تقریباً دو سَو سال کا زمانہ گذرا ہے ان دو صدیوں میں مولوی ہاشم صاحب مرحوم کی اولاد و احفاد کی تعداد کافی طور پر بڑھ چکی تھی[۱]۔ دوسرے ذرائع اور خود ان کے بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نانوتہ کے ان صدیقی قاسمی شیخزادوں کے رشتے شادی بیاہ کے ذریعہ اطراف و جوانب کے دوسرے قصبات مثلاً تھانہ بھون، گنگوہ، دیوبند، رامپور (منہیاران) وغیرہ کے شرفاء سے قائم ہوتے رہے، جن میں بعض عثمانی، بعض فاروقی، بعض انصاری وغیرہ شیخ زادوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

رشتہ داریوں کا یہ سلسلہ الحمد للہ اس وقت تک جاری ہے، اس زمانہ میں سواریوں کی وجہ سے ظاہر ہے کہ اس مسئلہ میں کوئی اہمیت باقی نہیں رہی ہے، مگر جس زمانہ میں نہ سڑکیں تھیں نہ سریع السیر سواریاں، اس وقت براتوں کے ساتھ آمد و رفت یقیناً آسان نہ تھی، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ مولوی محمد ہاشم کے بعد آخر زمانہ ہی میں نہیں، بلکہ ابتدائی پشتوں ہی میں ان قصبات کے شیخزادوں میں یہ روابط قائم تھے، خصوصاً دیوبند جو نانوتہ سے کافی فاصلہ رکھتا ہے یعنی پندرہ سولہ میل دور ہے، یہاں سے نانوتہ براتیں آتی جاتی رہتی تھیں، سوانح قدیم کے مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوبند کے شیخزادوں کا جو خاندان محلہ دیوان کی طرف منسوب ہے اور آجتک اس ڈیوڑھی کی شکستہ در و دیوار سے قصبہ دیوبند کے ان صنادید کی رفعت شان کا اندازہ ہوتا ہے"

---

[۱] اس کا پتہ نہ چل سکا کہ مولوی محمد ہاشم مرحوم کی اولاد جو اس وقت بیسیوں خاندانوں کی شکل میں یہاں آباد ہے ان کی صحیح تعداد کیا ہے، البتہ شیوخ صدیقی کے اس مفصل نسب نامہ سے اس پر ایک حد تک روشنی پڑ سکتی ہے جو نانوتہ میں تاحال منشی اقبال احمد ابن منشی ظفر احمد صاحب صدیقی کے یہاں محفوظ ہے جس میں اس نسب نامہ کے مورث اعلیٰ شیخ میراں کی تمام شاخوں کا تفصیلی سلسلہ اور وقتاً فوقتاً ان شاخوں کے جابجا منتقل ہونے کے حوالے دیئے گئے ہیں ۱۲ محمد طیب غفرلہ

اس خاندان کی رشتہ داری نانوتہ والوں سے بہت قدیم ہے، شاہجہانی عہد کے مولوی محمد ہاشم کی پانچویں پشت میں خواجہ بخش نامی ایک شیخزادے تھے، ان کی لڑکی کی شادی دیوبند کے دیوان والوں کے خاندان میں ہوئی تھی، دیوبند کے مشہور رئیس شیخ کرامت حسین (جو حضرت نانوتوی کے خسر ہوتے ہیں) کے نانا شیخ خواجہ بخش تھے۔

مگر یہ عجیب بات ہے کہ نانوتہ کے شیخ زادے بھی حالانکہ صدیقی تھے، اور ان کی رشتہ داریاں بھی جہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ صدیقیوں کے عثمانی اور فاروقی شیخ زادوں ہی کے گھرانوں تک محدود رہیں، چاہئے تو یہی تھا کہ ایسی صورت میں اپنے موروثی عقیدہ سنیت ہی پر وہ قائم رہتے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی جاگیر اور جائداد جو ان کی رفاہیت کی بنیاد تھی، ان کی دینی زندگی کے لئے خطرہ بنتی چلی گئی، تفصیلات کا علم تو نہ ہوسکا، مگر سوانح قدیم کے مصنف امام نے مولوی ہاشم کی جاگیر کا تذکرہ فرماتے ہوئے اخیر میں جو یہ ارقام فرمایا ہے، کہ

"تبدل حکومت کے سبب ان کی اولاد کے پاس نہ رہی" ص ۲۶

اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلطان اورنگ زیب عالمگیر انار اللہ برہانہ کے بعد مغل حکومت کے حکمرانوں میں عمومی طور پر مختلف تاریخی مؤثرات کے تحت اعتقادی انقلاب جو برپا ہوا، خود بہادر شاہ، عالمگیر کے بعد ہندوستان کا جو مغل بادشاہ ہوا، تشیع[۱] کا شکار ہو چکا تھا،

[۱] میرا اشارہ شاہ عالم بہادر شاہ کی طرف ہے جسے ستر سال کی عمر میں بادشاہی کی قدیم آرزو کی تکمیل کا موقعہ ملا تھا، اس وقت وہ کافی بوڑھا ہو کر سٹھیا چکا تھا، سب سے پہلے تو اس نے اپنے "سید" ہونے کا اعلان کیا اور ایک بے سروپا قصہ پر اس کی بنیاد قائم کی گئی، پھر تمام ممالک محروسہ میں یہ شاہی گشتی جاری ہوئی کہ امام خطبہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے وصی ہونے کا برسر منبر اعلان و اقرار کرے، احمد آباد میں سخت خونیں فساد برپا ہوا، لاہور میں بھی ہنگامے ہوئے، وہ فاضل اجل ہونے کا دھوکہ بھی اپنے متعلق رکھتا تھا، لاہور کے علماء جن میں مولانا یار محمد سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز تھے ان کو بلا کر اس نے براہ راست خود مناظرہ کیا، مولانا یار محمد جب اس کی باتوں کا کھرے الفاظ میں جواب دینے لگے تو بولا کہ تم میری بادشاہی کی قوت سے نہیں ڈرتے تو مولانا نے فرمایا کہ جس سے تم ڈراتے ہو اسی کو تم سے میں مانگنے آیا ہوں، مجھے شہادت کی آرزو ہے، کاش میری اس آرزو کو تم پوری کرو ۱۲

اور اس کے بعد پے درپے ایسے حالات مسلسل رونما ہوتے رہے جن کا لازمی نتیجہ تھا کہ نہ صرف مرکز بلکہ صوبوں پر بھی ان ہی لوگوں کا سیاسی اقتدار قائم ہو گیا جو کھلم کھلا شیعہ تھے، ورنہ تشیع کی طرف رجحان کے مرض سے تو شاید ہی اس زمانہ کی کوئی قابل ذکر ممتاز ہستی پاک نظر آتی ہے، یہ ایک عام وبا تھی، جس میں ہند کی اسلامی حکومت اپنے ایام سکرات میں مبتلا ہو گئی تھی اور شاید مسلمانوں کی یہی ازلی تقدیر ہے کہ جس علاقہ میں بھی ان کے خاتمہ کا وقت آجاتا ہے، تو عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ اس علاقہ کے مسلمان حکمرانوں پر تشیع کا جنون سوار ہو جاتا ہے، مسلمانوں کی سیزدہ صد سالہ تاریخ اس واقعہ کی شہادتوں سے لب ریز ہے۔[1]

توحید جو اسلام کی بنیادی روح ہے اس کے اثر کو کھوتے ہوئے جب اس حد تک قلوب پہنچ جاتے ہیں کہ خالق کے رحم و کرم سے زیادہ مخلوق کے سایہ میں امن اور چین کی توقعات زیادہ نظر آنے لگتی ہیں، تو تشیع کا نظریہ ان کی پشت پناہی کے لئے تیار ہو جاتا ہے، گویا یوں سمجھئے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر جس حد تک شرک اور شر کے جذبات سے آدمی قریب ہوتا جاتا ہے اسی حد تک تشیع کے نظام کی دل کشی اس پر مسلط ہوتی چلی جاتی ہے، مسلم و مشرک دونوں متضاد عنوانوں میں تشیع مصالحت کی ایک عجیب و غریب دلچسپ شکل ہے۔

خیر میں کیا کہنے لگا، بات بہت طویل ہو جائے گی، میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ "اعتقادی انقلاب" کا جو دورہ مغل حکومت پر پڑا تھا اور عام ہلچل مسلمانوں میں اس انقلاب کی وجہ سے جو پیدا ہوئی، معلوم ہوتا ہے، کہ اس سے صدیقی و عثمانی و فاروقی وغیرہ شیخ زادوں کے یہ قصبات بھی محفوظ نہ رہ سکے، ہم جب یہ جانتے ہیں کہ بارہا کے سادات جو آخر میں بادشاہ ہی نہیں بلکہ تاریخ کی زبان میں "مغل حکومت" میں "بادشاہ گر" بنے ہوئے تھے، یہ شیعہ بھی تھے، اور ان کا وطن بھی اسی علاقہ میں تھا

[1] یہ افسانہ بڑا طویل اور کافی دردناک ہے تشیع سے اسلامی فتنہ کی ابتدا ہوئی حضرت عثمان خلیفہ سوم اس فتنے کے پہلے شکار ہیں، تاتاریوں سے نہ مندمل ہونے والا زخم مسلمانوں کی تاریخ کو جو لگا کون نہیں جانتا کہ اس زخم میں سب سے بڑا ہاتھ ان ہی لوگوں کا تھا حتیٰ کہ آج یورپ کے پاؤں کے نیچے اسلامی ممالک جو روندے جارہے ہیں لوگوں کو شاید اس کا علم نہ ہوگا کہ ابتدا میں یورپ کے سلاطین کی ہمت افزائیوں میں مصر کے فاطمی سلاطین کا ہاتھ تھا ۱۲

جس میں ان شیخ زادوں کے قصبات آباد تھے، ایسی صورت میں سوانح قدیم کے مصنف امام کی الفاظ "تبدل حکومت" کا مطلب سمجھا جاسکتا ہے کہ کیا تھا، آخر اودھ کی شیعہ حکومت جیسا کہ دنیا جانتی ہے دھڑا دھڑ سنیوں کو ان کی قدیم جاگیروں سے جب محروم کرتی چلی جا رہی تھی، اور شیعہ ہونے پر جاگیر کی بحالی کے قصے اس زمانہ میں بکثرت پیش آتے رہتے تھے، تو اس پر کیوں تعجب کیا جائے، اگر سادات بارہا کے ہم وطن سنی شیخ زادوں کے لئے ان کی جاگیریں باعث فتنہ بن گئی ہوں۔

حضرت میر شاہ خاں مرحوم مغفور کی طرف کتاب "امیر الروایات" میں روایت جو منسوب کی گئی ہے وہ فرماتے تھے کہ

"الدہن، میرٹھ، ہاپوڑ، گلاوٹی، بلند شہر کا حال تو مجھے معلوم ہے کہ یہاں کے لوگ سب تفضیلی بلکہ بعض تو رافضی تھے"۔

یہ شہادت جو ان کے ذاتی علم پر مبنی ہے، اس کے تذکرے کے بعد اپنے سماعی علم کا اظہار ان الفاظ میں خاں صاحب مرحوم ہی نے فرمایا ہے کہ

"اور سنا ہے کہ دیوبند میں بھی سب تفضیلی تھے"۔

اکے دکے نہیں بلکہ دیوبند کے سارے عثمانی شیخزادوں کے متعلق یہ روایت کہ "سب تفضیلی ہوگئے تھے"، اگر یہ صحیح ہے تو اس سے تشیع کے اس دباؤ کی غیر معمولی قوت کا اندازہ ہوتا ہے جس کے نیچے مغل حکومت کے آخری دور میں ہندوستان کے مسلمان آگئے تھے، اور یہ تو خیر میر شاہ خاں صاحب کا بیان ہے، خود حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے اس مشہور مکتوب میں جو حکیم ضیاء الدین مرحوم کے نام ہے، اور فیوض قاسمیہ کے نام سے حضرت ممدوح کے چند مکاتیب کا مجموعہ جو شائع ہوچکا ہے اسی مجموعہ میں یہ خط بھی شریک ہے۔ اس خط میں آپ نے مولوی حامد حسین صاحب لکھنوی (مجتہد شیعہ) سے اپنی ملاقات اور مکالمہ کا ذکر فرماتے ہوئے ارقام فرمایا ہے کہ

| بعد اس کے میں نے عرض کیا کہ جس علاقے میں احقر کا وطن ہے وہاں شیعہ اور سنی دونوں فرقے باہم ایک دوسرے کی | پس ازاں عرض کردم کہ بنواحی کہ زاد و بوم احقر ست، شیعیان و سنیان چناں مخلوط اند |
|---|---|

| | |
|---|---|
| ساتھ کچھ اس طرح گھلے ملے ہوئے ہیں کہ دونوں فرقوں میں رشتہ داریوں کے تعلقات بھی مضبوطی کے ساتھ قائم ہیں۔ | کہ رشتہ و رابطہ قرابت طرفین رابطرفین محکم و مستحکم ست ص۵ فیوض قاسمیہ |

یقیناً اس سے بھی میر شاہ صاحب مرحوم کے بیان کی توثیق ہوتی ہے۔ اگرچہ مولانا مرحوم نے اپنے اس نامہ گرامی میں صراحتاً اپنے قصبہ نانوتہ کے متعلق یہ نہیں ظاہر فرمایا ہے کہ وہاں کے صدیقی شیوخ اور عام مسلمانوں کا تشیع کی طرف رجحان تھا یا نہیں، لیکن جو حالات تھے ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے نانوتہ کا استثنا ریوں ہی مشکل ہے۔

ماسوا اس کے سوانح قدیم کے مصنف امام نے بھی ایک قصہ کے ذیل میں بیان کیا ہے کہ نانوتہ کے قاسمی صدیقی برادری کے ایک رکن جن کا نام شیخ تفضل حسین تھا، اور خاندانی جائداد میں ان کی بھی شرکت تھی، وہی

"شیخ تفضل حسین شیعہ مذہب ہو گئے تھے" ص۲۶

جو اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ سنیت کے موروثی عقیدہ کو ترک کر کے شیعہ عقائد کے اختیار کرنے والے قصبہ نانوتہ میں بھی پائے جاتے تھے، اور آخر زمانہ تک تبدیلی کا سلسلہ اس قصبہ میں بھی جاری تھا،

میرا مطلب یہ ہے کہ جیسے الدآبن، ہاپوڑ، گلاؤٹھی، دیوبند وغیرہ قصبات میں تفضیل اور تفضیل سے بھی آگے بڑھ کر رفض کے جراثیم پھیل گئے تھے، نانوتہ بھی اس اثر سے پاک نظر نہیں آتا، ایسی حالت میں تشیع و تسنن کی آویزش ظاہر ہے کہ قدرتی بات ہے، خود مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے اسی مکتوب گرامی میں جس کا ذکر ابھی گذرا، اسی میں یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ فقیر جس علاقہ کا باشندہ ہے، وہاں شیعہ اور سنی باہم ایک دوسرے کے ساتھ ملے جلے ہوئے ہیں، اس واقعہ کا بھی اظہار کیا ہے، کہ

| | |
|---|---|
| اسی لئے ان دونوں فرقوں کے لوگوں کی ایک دوسرے سے ملاقات بھی عموماً ہوتی رہتی ہے اور ہر قسم کی باتیں باہم کرتے ہیں، | ازیں وجہ اتفاق ملاقات بیش تر می افتد و گفتگوئے ہر قسم بمیاں می آید تا آنکہ گاہ |

| | |
|---|---|
| بے گرگفتگوئے مذہبی نیز برزبان می آمد (فیوض قاسمیہ صہ) | جن میں کبھی کبھی مذہبی گفتگو بھی چھڑ جاتی ہے |

بلکہ شیخ تفضل حسین کے شیعہ ہو جانے کے قصے کو بیان کرتے ہوئے سوانح قدیم کے مصنف امام نے جو یہ خبر دی ہے کہ مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے جد امجد اور شیخ تفضل حسین کے درمیان جھگڑا ہو گیا، اور یہ جھگڑا بالآخر اس حد تک ترقی کر کے پہنچا کہ

"مولوی صاحب (یعنی مولانا محمد قاسم رح) کے ماموں میاں فصیح الدین کے ہاتھ سے (شیخ تفضل حسین) زخمی ہو کر مر گئے" صـ۲۶

اگر اس فساد کا تعلق تشیع و تسنن ہی کے قصے سے تھا، اور بظاہر یہی بات معلوم بھی ہوتی ہے تو سمجھنا چاہئے کہ زبان سے آگے بڑھ کر ہاتھ اور ہتھیار تک بھی ترقی کر کے کبھی کبھی نانوتہ کے شیعوں اور سنیوں کی یہ آویزش پہنچ جاتی تھی۔

اور میں تو سمجھتا ہوں کہ "خانہ جنگی" کا یہی "شر" شاید اس "خیر" کا مقدمہ تھا، جس سے نانوتہ ہی نہیں بلکہ "اسلامی ہند" کی عام آبادیاں آئندہ زمانہ میں مستفید ہونیوالی تھیں۔

**تیرہویں صدی کے مجدد کا ظہور اور نانوتہ میں انکی تشریف فرمائی**

میرا اشارہ "اسلامی ہند" کے اس دینی تلاطم، اور روحانی انقلاب کی لاہوتی نعمت کی طرف ہے، جو مادی حکومت سے محروم ہو جانے کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کو قدرت کی طرف سے عطا ہوئی، یہ حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا وجود باجود تھا، حضرت شہید کی قدر و قیمت خصوصاً اس زمانہ میں آپ کی سیاسی جدوجہد سے وابستہ سمجھی جاتی ہے، جو سرحد کی پہاڑیوں میں تطہیر پنجاب کے لئے کی گئی، جیسا کہ معلوم ہے تطہیر پنجاب کا مقصد بحمد اللہ پورا ہوا، اسی لئے ان کی اس سیاسی جدوجہد کو بھی ناکام قرار دینے والے کم از کم میرے نزدیک سید شہید کے نصب العین کے سمجھنے میں ناکام ہوئے ہیں، بہر حال جہاں سید شہید کے تجدیدی کارناموں میں "تطہیر پنجاب" بھی اس میں شک نہیں کہ بڑا تابناک کارنامہ ہے وہیں ان سیاسی کاروبار بلکہ صحیح معنوں میں مجاہدانہ فرائض کے علاوہ واقعہ یہ ہے کہ سید صاحب

کی تجدید کا تعلق ایک طرف تو خود اسلام سے تھا، جو طول امد اور مسلمانوں کی قساوت قلب کی وجہ سے پہچانا نہیں جارہا تھا، اور دوسری طرف مسلمانوں کے ان قلوب کو آپ نے نشانہ بنایا تھا، جن کا ایمانی احساس اسی قساوت قلبی کی بیماری کی وجہ سے غباوت کا شکار ہو چکا تھا، گویا ایک طرف تو اپنی تجدیدی شستت وشو سے سید شہید "الدین الخالص" اور "ان الدین عند اللہ الاسلام" کی واقعی حقیقت کو نمایاں فرمانا چاہتے تھے، اور دوسری طرف آپ کی کوشش یہ تھی کہ ممکنہ حد تک مسلمانوں میں ایسے لوگ پیدا کر دیئے جائیں جن میں اسی "الدین الخالص" کی شناخت و یافت کا صحیح سلیقہ ہو، چنانچہ آپ اور آپ کے باوقار وزراء کار کی جد وجہد نے ایمانی زندگی کی نئی رو دوڑا کر مختلف آبادیوں میں اسی قسم کے صالح افراد کی کافی تعداد پیدا کر دی،

اسی لئے کسی گوشہ میں بیٹھ کر سید شہید نے کام نہیں کیا، بلکہ "منصب تجدید" کی ذمہ داریاں جس دن سے ان کے اندر پیدا ہوئیں، اسی دن سے وہ اٹھ کھڑے ہوئے، اور جن بزرگوں کی وزارت سے ان کی پشت مبارک مضبوط کی گئی تھی، ان کو لے کر ملک کے اطراف وجوانب میں گھومنے لگے اسی سلسلہ میں آپ علاقہ دلی کے اس شمالی مغربی حصہ میں بھی داخل ہوئے، بڑے بڑے شہروں کے سوا ایسے قصبات مثلاً گنگوہ، دیوبند، انبہٹہ وغیرہ میں پہنچ کر اسلام کی تطہیر اور مسلمانوں کے تزکیہ میں سب مشغول نظر آتے ہیں تفصیل کے لئے حضرت والا کی مستقل سوانح عمریوں کو پڑھنا چاہیے خصوصاً آپ ہی کے دودمان عالی کے چشم وچراغ الشاب الصالح السعید التقی والنقی مولانا ابوالحسن سید علی سلمہ اللہ تعالیٰ وایدہ اللہ بروح منہ کی "سیرت سید احمد شہید" آپ کے سامنے دین کی اس نعمت کبریٰ کی حقیقت واضح کریگی، جو دنیا کی سلطنت کو کھونے کے بعد ہند کے مسلمانوں کو میسر آئی، جہاں تک میرا خیال ہے مسلمان فکر معقول سے اگر کام لیں گے تو شاید وہ یہ پائیں گے کہ مبادلہ کے اس معاملہ میں انشاء اللہ وہ خسارے میں نہیں رہے ہیں ع ان کان فی القلب ایمان واسلام

بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت سید شہید اپنے اس تجدیدی دورے اور گشت کے سلسلہ میں کھجوروں کے بن والے اس قصبے میں بھی تشریف فرما ہوئے، جو اپنے ہم چشم قصبوں میں

چھوٹا اور اس وقت تک چھوٹا شہر سمجھا جاتا تھا،

اس دور افتادہ مقام میں سید صاحب کے قدم رنجہ فرمانے کا ظاہری سبب جہاں تک میں سمجھتا ہوں غالباً وہی "تسنن و تشیع" کی آویزش کا "شر" تھا، جس سے "یہ خیر" پیدا ہوئی۔ تفصیلات کا تو علم نہ ہو سکا، لیکن سیدنا الامام الربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے تذکرۃ الرشید میں یہ روایت درج کی گئی ہے کہ

"ہنگام قیام نانوتہ میں مسمی غلام حسین شیعوں کا مولوی تھا، وہ بھی سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ ایک مکان میں بیٹھے تھے، جب وہ اندر آیا تو آپ متوجہ نہ ہوئے، اس پر جوں ہی اثر پڑا، تو وہ بد نصیب جوتیاں بھی وہیں چھوڑ کر بھاگا، کہ یہ شخص سید بڑا جادوگر ہے، اور جب تک سید صاحب نانوتہ میں مقیم رہے وہ جنگل میں رہا کیا، شہر میں نہ آیا" ص ۲۷۳ ج ۲

اسی طبقہ کے ایک بزرگ سے ملنے کے لئے شیعوں کے کسی عامی آدمی کا نہیں، بلکہ ان کے مولوی کا آنا یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے، شیعہ و سنی تعلقات سے جو واقف ہیں وہی سمجھ سکتے ہیں کہ بجز خاص حالات کے یہ صورت بہت کم پیش آتی ہے، اور خواہ سید صاحب نے ظاہری طور پر بے توجہی سے کام لیا ہو، مگر غلام حسین کا متاثر ہونا، اور اس حد تک متاثر ہونا کہ بے اختیار ہو کر بھاگنا یہ واقعہ خود بتا رہا ہے کہ سید شہید نے غلام حسین پر باطنی توجہ ضرور ڈالی تھی،

بہر حال یہی واقعہ جو ایک ثقہ و حجت امام سے مروی ہے یہ بتا رہا ہے کہ نانوتہ کی سرفرازی میں اس قصبے کے مسلمانوں کا وہ رجحان بھی ضرور دخیل تھا، جو تشیع کی طرف ان میں پیدا ہو گیا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس آویزش میں تسنن پر جن لوگوں کا اصرار تھا، ان ہی لوگوں کی دعوت پر سید صاحب غالباً نانوتہ تشریف لائے، اس کا پتہ تو نہ چلا کہ نانوتہ کے رافضیوں میں بھی کسی کو توبہ نصیب ہوئی، یا "غلام حسین" نے "ساحر" کا جو شرارہ چھوڑا، اسی شرارے میں خود بھی جلا اور دوسروں کو بھی جلاتا رہا، مگر مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ہی سے یہ دوسری روایت

تذکرۃ الرشید میں جو نقل کی گئی ہے یعنی مولانا نے فرمایا کہ

"سید صاحب جب نانوتہ تشریف لے گئے تھے، وہاں بھی بہت سے لوگ مرید ہوئے، ایک مرید نے بیان کیا کہ "میری آنکھوں میں پھر رہا ہے کہ سید صاحب مسجد جامع کے وسطی دروازے میں کھڑے ہیں، نہایت شکیل وجمیل تھے اور آپ نے اپنی پگڑی اتار کر ایک سرا اپنے ہاتھ میں لیکر باقی بیعت کرنے والوں کو پکڑوادی، لوگ برابر دوسرے سرے تک اسکو پکڑے ہوئے تھے، اور پگڑی کن کھجورے کی شکل معلوم ہوتی تھی، کیونکہ دونوں طرف سے اس کو تھامے ہوئے تھے"۔ ص۲۷۲

اس روایت کی بنیاد پر یہ سمجھا جا سکتا ہے، کہ نانوتہ کے مسلمانوں کی عمومیت سید شہید سے کافی طور پر متاثر ہوئی۔ ظاہر ہے کہ جو شیعہ تو نہیں ہوئے تھے، لیکن بقول امیر شاہ خاں اس اطراف کے عام قصبوں میں تشیع کا مقدمہ یعنی تفضیل کی بیماری پھیلی ہوئی تھی، اس بیماری سے جیسے دوسرے قصبات کو صحت نصیب ہوئی، نانوتہ نے بھی اس خوش نصیبی میں اپنا حصہ ضرور پایا ہوگا، اور ایک اسی بیماری کا نام کیوں لیجئے، سید شہید کی تجدید کا رخ جن دو اصولی باتوں کی طرف تھا، یعنی غیر اسلامی آلودگیوں سے اسلام کی تطہیر اور اسی کے ساتھ خود مسلمانوں کے نفس کا ایسا تزکیہ کہ حقیقی اسلام کے پہچاننے میں ان کو دشواری پیش نہ آئے، ان دونوں نعمتوں سے کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ مستفید نہ ہوئے، جنھوں نے سید صاحب کے عمامہ پر بیعت کی تھی۔

بلکہ سوانح قدیم میں ایک اطلاع جو یہ دی گئی ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسمؒ کے جد امجد کے والد کے ایک سگے بھائی جن کا نام شیخ خواجہ بخش تھا، وہی

"جوانی میں دکن گئے وہاں نکاح کیا، وہاں ایک بیٹا محمد ہاشم نام تھا"۔ ص۲۵

اس سے نانوتہ اور دکن کے ایک قدیم تعلق کا جہاں پتہ چلتا ہے، وہیں اگر یہ سوچا جائے کہ جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے اس وقت دامن ہمالہ کی ایک آبادی سے دکن کی سطح مرتفع کی طرف سفر یوں ہی آسان نہ تھا، پھر اسی کے ساتھ جب ہم یہ جانتے ہیں کہ "مرہٹہ گردی" کے

فتنوں نے راستے کے خطرات میں غیر معمولی اضافہ بھی کر دیا تھا۔ ایسی صورت میں شیخ خواجہ بخش نے اپنے وطن مالوف کو چھوڑ کر دکن ہی کو وطن ثانی بنانے کے لئے کیوں ترجیح دی؟

جہاں تک میرا خیال ہے شیخ خواجہ بخش کی ہجرت کا یہ زمانہ وہی ہے، جب دکن میں آصفی حکومت قائم ہو چکی تھی، طوائف الملوکی کے ان ایام میں آصفی حکومت ہی سرزمین ہند میں ایسی حکومت تھی جس کے زیر سایہ اطمینان کی سانس ان لوگوں کو میسر آسکتی تھی جو سنن کے مسلک پر اصرار کرتے ہوئے مرنا چاہتے تھے، ورنہ خود دلّی، اودھ کے شیعہ نواب وزیر کے نمائندوں کے زیر اثر تھی اور لکھنؤ تو نواب وزیر کی حکومت کا مرکز ہی تھا، یہی حال بنگال و بہار کی نظامت کا تھا یعنی مرشد آباد پر بھی شیعوں کا اقتدار قائم تھا۔

کچھ بھی ہو، قطعی فیصلہ تو مشکل ہے، مگر میرا خیال یہی ہے کہ نانوتہ سے شیخ خواجہ بخش کی یہ ہجرت غالباً اسی "تبدل حکومات" کے زیر اثر ہوئی، جس سے تمام ملک متاثر ہو رہا تھا شیخ تفضل حسین جیسے لوگ تو

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

کے اصول پر عمل کرتے ہوئے اسی طرف گھوم جاتے تھے، جدھر گھوم جانے کی دعوت زمانہ دے رہا تھا، بڑے بڑے قصبات، مثلاً بلگرام امروہہ وغیرہ کے متعلق تاریخ بتاتی ہے کہ یہاں کے باشندوں نے اس سلسلے میں عموماً زمانہ سازی سے کام لیتے ہوئے اپنی جاگیروں اور انعامی زمینوں وغیرہ کی حفاظت[۱] کی، مگر ان ہی کے ساتھ تقریباً ہر آبادی میں دوسرا گروہ بھی مسلمانوں کا تھا، جو زمانہ کے ہر اشارے کو ٹھکراتے ہوئے اپنے دین کو بچانے کے لئے دنیا اور دنیا کے

---

[۱] مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی کتاب مآثر الکرام میں آپ کو اودھ کی چیرہ دستیوں اور زبردستیوں کی تفصیل ملے گی۔ تذکرہ کاملان رامپوری میں لکھا ہے کہ اودھ کے تسلط روہیل کھنڈ کے وقت امروہہ کے امراء نے تبدیل مذہب اور حاضری دربار کی بدولت اپنی جاگیروں کو قائم رکھا، اسی میں ہے کہ لیکن محمد رشید علی خاں جو رؤسا امروہہ سے تھے ان کا خاندان شیعہ نہ ہوا اس لئے کثیر حصہ جائداد کا ضبط ہو گیا۔ دیکھو کتاب مذکور ص۱۳۱

ہر قسم کے منافع کو قربان کرنے پر آمادہ ہو گیا، اسے حسن ظن خیال کیجئے یا جو کچھ بھی سمجھئے میرا خیال یہی ہے کہ شیخ خواجہ بخش اور ان کے خاندان کا تعلق غالباً اسی ثانی الذکر گروہ سے تھا، شیخ خواجہ بخش تو وطن کو خیرباد کہنے پر آمادہ ہو گئے، لیکن ان کے بھائی جن کا نام شیخ محمد بخش تھا، یہی شیخ محمد بخش مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے جدامجد کے والد مرحوم تھے، سوانح قدیم کے مصنف امام نے مولوی محمد ہاشم کی اولاد کے جن خاندانوں کے متعلق یہ لکھا ہے کہ

"تبدل حکومات کے سبب دیہات جو جاگیر میں تھے ان کے پاس نہ رہے"

ان ہی میں معلوم ہوتا ہے کہ "محمد بخش" صاحب کا خاندان بھی تھا، جس کا تفصیلی ذکر انشاء اللہ آئندہ کیا جائے گا۔

اس وقت مذکورہ بالا معلومات کے پیش کرنے سے میری غرض یہ ہے کہ نانوتہ کا دینی ماحول زمانہ کے اقتضاء کے مطابق اس وقت جو کچھ ہو کر رہ گیا تھا، اس کا کچھ اندازہ لوگوں کو ہو جائے۔

اگرچہ تفصیلاً ان لوگوں کا تو مجھے علم نہ ہو سکا، جن کی انگلیاں کن کھجوروں کی طرح حضرت سید شہید کے عمامے کے ساتھ نانوتہ کی جامع مسجد میں لپٹی نظر آتی تھیں، لیکن خوش قسمتی سے سوانح قدیم کے مصنف امام کے بیان سے پھر بھی چند باتوں کا پتہ چلتا ہے، مثلاً

(۱) اسی زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہی شیخ محمد بخش جن کے نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں رکھنے والوں نے ان کا یہ نام رکھا تھا، اس وقت مسلمان اس کی تمیز بھی کھو بیٹھے تھے کہ اولاد بخشی کی قوت خالق تعالیٰ جل مجدہ کی ذات واحد کے ساتھ وابستہ ہے یا نہیں، اس کا نتیجہ تھا کہ باوجود مؤمن مسلم ہونے کے اس معاملہ میں لاپروائیوں سے کام لینے لگے تھے، خود ان ہی شیخ محمد بخش صاحب کے بھائی جو نانوتہ سے ہجرت کر کے دکن چلے گئے تھے آپ سن چکے کہ ان کا نام بھی "خواجہ بخش" تھا۔ اور تو اور امام ربانی حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جو والد کے ظل عاطفت سے ایام طفلی ہی میں محروم ہو گئے تھے، اسی لئے دادا کی آغوش شفقت میں آپ کی تربیت و پرورش ہوئی، مگر کتنی عجیب بات ہے کہ حضرت گنگوہی کے پالنے پوسنے والے ان کے جد بزرگوار تک

کا نام "پیر بخش" تھا[1]۔

بہر حال میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ نانوتہ کے ان ہی شیخ محمد بخش کے صاحب زادے جن کا اسم گرامی "غلام شاہ" تھا، ان ہی کے متعلق مصنف امام نے یہ ذاتی شہادت سوانح قدیم میں درج فرمائی ہے، یعنی یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ "احقر نے بھی ان کی زیارت کی تھی" اپنا یہ مشاہدہ بیان کیا ہے کہ وہ یعنی غلام شاہ صاحب

"تھوڑے پڑھے ہوئے تھے، مگر ذاکر شاغل تھے، درویشوں کی خدمت کرتے تھے"۔ ص۲۵

قطعی طور پر تو نہیں کہا جا سکتا، لیکن ذکر و شغل کی یہ دولت باوجود کم پڑھے لکھے ہونے کے جہاں تک میرا خیال ہے، غالباً حضرت سید شہید ہی کی بیعت کے بعد "غلام شاہ" تک منتقل ہوئی تھی، کیونکہ سنین کے ملانے سے اتنی بات تو یقینی ہے کہ غلام شاہ صاحب بھی نانوتہ میں اس وقت موجود تھے جب سید صاحب کی تشریف آوری کی سعادت سے یہ قصبہ بہرہ اندوز ہوا تھا۔

خیال کرنے کی بات ہے کہ درویشوں کی خدمت جس کا فطری ذوق تھا، اس کے وطن میں حضرت سید شہید جیسے کھلے ہوئے درویش جب تشریف فرما ہوئے تھے، تو ان کی خدمت سے وہ کیسے محروم رہ سکتے تھے، میرے پاس کوئی تاریخی وثیقہ تو نہیں ہے لیکن غلام شاہ صاحب کے اسی ذوق کی بنیاد پر دل میں یہ بات آتی ہے کہ سید شہید اگر ان کے یہاں بھی رہے ہوں تو یہ کچھ بعید نہیں ہے، کچھ بھی ہو میرا احساس، قرائن و قیاسات کی روشنی میں یہی ہے کہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے متاثر ہونیوالوں میں نانوتہ کے یہ شیخ غلام شاہ بھی تھے، اور "ذکر و شغل سے ان کا تعلق بھی یہ سید شہید ہی کی بیعت یا کم از کم عقیدت کا رہین منت معلوم ہوتا ہے، سوانح قدیم کے

---

[1] اسی زمانہ میں ایک مولوی سالار بخش نامی بھی تھے، اپنے نام کی توجیہہ کرتے ہوئے کہتے کہ "سال آر" کے معنی سال کا لانے والا ہے اور ظاہر ہے کہ سال و ماہ کا لانے والا خدا ہی ہے، پس میں خدا بخش ہوں اس لطیفہ کا ذکر حکیم الامت کے ملفوظات میں کیا گیا ہے ۱۲

مصنف امام ہی کے بیان سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ "مسلمانوں کی باطنی تزکیہ" کا جو نصب العین سید شہید کے سامنے تھا، اس سے بھی غلام شاہ صاحب کو بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ کچھ حصہ ملا تھا یعنی غلام شاہ صاحب کے ذاکر و شاغل ہونے کا تذکرہ فرماتے ہوئے آگے مصنف امام نے یہ بھی ارقام فرمایا ہے کہ

"تعبیر خواب میں مشہور تھے"

"تاویل الاحادیث" جس کی بڑی اہم قسم "تعبیر خواب" ہے، عموماً یہ نعمت ان ہی لوگوں کو عطا ہوتی ہے جو احسانی مشاغل سے اپنی ایمانی فراست کو چمکانے اور مجلی کرنے میں کامیابی حاصل کرتے ہیں، مصنف امام نے اپنی کتاب میں ان کی بعض سچی تعبیروں کا بھی ذکر فرمایا ہے، جن میں ایک خواب اور اس کی تعبیر کا تذکرہ تو انشاء اللہ آئندہ کیا جائیگا، مگر خواب کی دوسری تعبیر تو ایسی تھی، کہ صرف نانوتہ ہی نہیں بلکہ شاید پورے ہندوستان نے اس تعبیر کی صحت کی توثیق کی تھی، مصنف امام نے بیان کیا ہے کہ ان کی خواہر محترمہ نے خواب دیکھا کہ ایک چھوٹی ترازو (جیسے لڑکے کھیلا کرتے ہیں) آسمان سے گری ہے، اس پر ابابیل سیاہ رنگ کے بہت لپٹے ہوئے ہیں، اگر چھڑاتے ہیں، تو چھوٹتے نہیں "غلام شاہ صاحب سے اس خواب کی تعبیر پوچھی گئی،

"سن کر فرمایا کہ قحط[1] ہوگا"

تعبیر بیان کرنے کے بعد زیادہ دن نہیں گذرے تھے، کہ بقول مصنف امام

"وہ قحط جس میں باندیاں بک گئیں واقع ہوا، غالباً پانچا کال اس کو کہتے تھے" ص۲۵

اس موقع پر اگر اس واقعہ کی یاد کو بھی تازہ کر لیا جائے کہ شیعہ ہو جانے کی وجہ سے شیخ تفضل حسین کے قتل کا جو قصہ نانوتہ میں پیش آیا تھا، اس میں دوسرے فریق یعنی سنیوں کے سرگروہ

---

[1] بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اناج جو انسان کے رزق کا اہم عنصر ہے اس کا لین دین ترازو ہی سے ہوتا ہے آسمان سے ایسی ترازو کا اترنا جس کی شکل تو ترازو کی تھی مگر لین دین کا کام اس سے نہیں لیا جا سکتا تھا، یہ گویا علامت تھی کہ روزی میں تنگی پیدا ہوگی اور لوگ اسی لاحاصل سے لپٹ پڑینگے مگر ان کو اس سے فائدہ حاصل نہ ہوگا، واللہ اعلم بالصواب

یہی غلام شاہ صاحب تھے، میں نے اس کا ذکر پہلے بھی کہیں کیا ہے، یہاں اس امر کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ رفض کے خلاف جوش و خروش کی اس کیفیت میں اگر سید شہید کی تاثیری صحبت و معیت کو دخیل خیال کیا جائے تو سید شہید کے حالات اور اصلاحی خصوصیات سے جو واقف ہیں جن کا ضمناً ذکر میں نے بھی تھوڑی دیر پہلے کیا ہے، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس خیال کو بے بنیاد ٹھہرانے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

(۲) دوسری بات اس سلسلہ کی یہ ہے کہ نانوتہ کے صدیقی شیوخ کے جد اعلیٰ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، مولوی محمد ہاشم مرحوم نے شاہجہاں کے عہد میں اس قصبہ کو اپنا وطن بنایا، خود وہ تو عالم و فاضل تھے، اور ان کے پوتے کا نام بھی مصنف امام نے "محمد مفتی" ارقام فرمایا ہے، واللہ اعلم بالصواب "مفتی" ان کا علَم تھا، یا افتاء کا کام کرتے تھے، اسی لئے اسی صفاتی لقب سے مشہور ہوئے، مگر اس کے بعد اس کا سراغ نہیں ملتا کہ نانوتہ کے شیوخ میں علم و فضل کا شوق آئندہ نسلوں میں باقی رہا، یا جیسے عموماً اس قسم کے خاندانوں میں زیادہ "علم پدر" کا شمار "میراث" میں نہیں کیا جاتا، بلکہ صرف مادی دولت و ثروت پر قناعت کر کے بقول مولانا حالی ان کا کل سرمایۂ نازیہ رہ جاتا ہے کہ ع

اجداد تھے ان کے مقبول داور

اسی عام مصیبت کا شکار یہ خاندان بھی ہو گیا تھا۔

بہر حال عدم العلم، اگرچہ شئی کے عدم کو مستلزم نہیں، مگر قرائن و قیاسات کا اقتضاء ہے کہ "علم پدر" کی طرف نانوتہ کے شیخ زادوں کی توجہ (بہ ظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ) زیادہ دن تک باقی نہ رہی، اگر یہ صورت نہیں پیش آئی تو مولوی اور مفتی کی اولاد کے ناموں میں "محمد بخش" "خواجہ بخش" وغیرہ ناموں کی شرکت کی توجیہ آخر ہم کیا کر سکتے ہیں؟

مگر ٹھیک اس زمانہ کے بعد یعنی سید شہید کی رونق افروزی نانوتہ میں جب ہوئی، اسی کے بعد ہم یہ پاتے ہیں کہ "غلام شاہ" صاحب اور ان کے ہم عصروں میں متعدد حضرات ایسے نظر آتے ہیں، جن کے قلوب میں "میراث پدر" کے حصول کا جذبہ اچانک بیدار ہو جاتا ہے، خود

تو معمر ہو چکے تھے، اسی لئے اپنے بچوں کو یہی نہیں کہ نانوتہ کے مکتب خانوں، یا نانوتہ کے قریب سہارنپور وغیرہ جیسے مقامات میں تعلیم کیلئے بھیج رہے ہیں، بلکہ ہندوستان کی راجدھانی دتی جو سلطنت ہی کا نہیں بلکہ سارے کمالات کا اس زمانہ میں مرکز بھی اور گو نانوتہ سے دتی زیادہ دور نہ تھی، تاہم چار دن سے کم میں وہاں بھی لوگ اس زمانہ میں پہنچ نہیں سکتے تھے، مگر تمام خطرات سے بے پرواہ ہو کر اپنے جگر کے ٹکڑوں کو اپنی آنکھوں سے دور کر کے دلی روانہ کر رہے تھے۔

غلام شاہ جن کے صاحبزادے کا نام "اسد علی" تھا، مصنف امام نے ان ہی کے متعلق لکھا ہے کہ

"جناب والد مرحوم کے ساتھ دہلی گئے تھے" ص۲۴

والد مرحوم سے مصنف امام کی مراد جیسا کہ معلوم ہے مولانا مملوک العلی صاحب ہیں، ان ہی کے ساتھ پڑھنے کے لئے غلام شاہ صاحب کے یہ صاحبزادے دتی تشریف لے گئے، تھے مصنف امام ہی نے اس کی بھی خبر دی ہے کہ "اسد علی صاحب" اپنے والد کے اکلوتے صاحبزادے تھے اس سے اس واقعہ کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے، اور ان کے اسی فقرے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا مملوک العلی صاحب جن کے والد کا نام شیخ احمد علی تھا، اور غلام شاہ مرحوم کے معاصر تھے انہوں نے بھی اپنے لڑکے کو دتی تعلیم کے لئے روانہ کیا تھا، مولنا مملوک العلی صاحب نے دتی میں جو کچھ بھی لکھا پڑھا، اس کا تفصیلی ذکر تو انشاء اللہ اپنے مقام پر کیا جائے گا، لیکن اس کا اندازہ کرنے کے لئے کہ نانوتہ میں حصول علم کا جو شوق اور نیا ولولہ پیدا ہوا تھا، اس کا پیمانہ کیا تھا، ڈاکٹر سر سید احمد مرحوم کا یہ قول کافی ہو سکتا ہے، مولنا مملوک العلی صاحب کے متعلق ایک موقعہ پر لکھتے ہیں لکھتے کیا ہیں اپنی چشم دید شہادت ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں کہ

"کتب درسیہ کا استحضار ایسا ہے کہ اگر فرض کرو کہ ان کتابوں سے گنجینۂ عالم خالی ہو جائے، تو ان کے لوح حافظہ سے پھر نقل ان کی ممکن ہے"[1]

[1] آثار الصنادید حصہ دوم ص۱۲

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ طالب العلمی کے دنوں میں شاید ہر وہ کتاب مولانا مملوک العلی کو زبانی یاد ہو گئی تھی، جو دلّی میں انھیں پڑھائی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ طالب علم کے حسن ذوق کی یہ آخری حد ہو سکتی ہے۔

بہرحال مجھے کہنا یہ ہے کہ مولٰنا مملوک العلی صاحب کے ساتھ نانوتہ سے پڑھنے کے لئے دوسرے صاحب شیخ اسد علی دلّی جو تشریف لے گئے تھے، مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دلّی میں ان کی طالب العلمی کی مدت بھی کچھ کم نہ تھی، اسد علی صاحب کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"اپنے پڑھنے کے زمانہ کی حکایتیں ہمارے سامنے بیان فرمایا کرتے تھے" صـ۲۴

جس زمانہ کا یہ قصہ ہے، اس وقت سرکاری دفاتر میں "فارسی" کی حیثیت وہی تھی جو آج کل انگریزی کی ہے اور اس دفتری فارسی نصاب کی انتہائی کتابوں میں فردوسی کا شاہنامہ حصہ نظم کا اہم ترین عنصر تھا، شاہ نامہ کے ختم کرنے والوں کی حقیقت اس زمانہ کے حساب سے گویا سمجھنا چاہئے کہ وہی تھی، جو آج بی۔اے کے گریجویٹوں کی ہے، مصنف امام نے لکھا ہے کہ شیخ اسد علی صاحب نے دلّی کے قیام کے زمانہ میں

"شاہ نامہ وغیرہ کتابیں پڑھی تھیں" صـ۲۴

فارسی میں شاہ نامہ تک پہنچنے کے لئے خصوصاً جس زمانہ کا یہ قصہ ہے کافی مدت درکار تھی، اسی لئے میرا خیال ہے کہ شیخ اسد علی صاحب کے قیام کی مدت بھی دلّی میں سمجھنا چاہئے کہ کافی تھی،

خلاصہ یہ ہے کہ نانوتہ میں مذکورہ بالا مثالوں سے جس تعلیمی ہلچل کا پتہ چلتا ہے، اتنی بات تو یقینی ہے کہ سید شہید بریلوی قدس اللہ سرہ اس قصبہ میں جب تشریف لائے ہیں تو لوگوں کو اپنی بیعت میں داخل کیا ہے، یہ قصہ اسی کے بعد کا ہے، پھر اسی کے ساتھ جب ہم یہ پاتے ہیں کہ دلّی جہاں اس زمانہ میں نت نئی قسموں کی دکانیں، دین و علم کے نام سے لوگوں نے قائم کر رکھی تھیں مگر نانوتہ کے ان طالب علموں کو دیکھا جاتا ہے کہ سب کی طرف سے نظر پھیرے ہوئے، خصوصیت کے ساتھ درس کے ان ہی حلقوں میں جا کر شریک ہوتے ہیں جن کا تعلق حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے

تعلیمی وتدریسی سلسلے سے تھا، اسی سے خیال گذرتا ہے کہ بصیرت کی یہ تمیز سید شہید ہی کی تاثیر نظر ہی سے پیدا ہو سکتی تھی، اسلامی آبادیوں میں "دیدہ وروں" کا پیدا کرنا جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، ان کی مہم کا بڑا اہم جز تھا، وہ ان آبادیوں میں پہنچ کر صلاحیت رکھنے والوں کا تزکیہ فرماتے تھے جس کے بعد حق و باطل کی تمیز کی قوت ان میں خود بخود پیدا ہو جاتی تھی، بلکہ ان کی تجدید کا دوسرا جز یعنی غیر اسلامی آلودگیوں سے "اسلامی تعلیمات" کی تطہیر اس میں شک نہیں کہ اس سلسلے میں بھی سید صاحب نے بہت کچھ کیا، لیکن درحقیقت شاہ ولی اللہ اور ولی اللہی اسباط علماً اس کام کو کر چکے تھے، اسی لئے اس سلسلے میں سید صاحب کے کام کا بجائے علم کے زیادہ تر تعلق "عمل" سے ہے، یعنی "ولی اللہی" سلسلے میں جو علمی نتائج منقح ہو چکے تھے، ان کی عام اشاعت سید صاحب کے ذریعہ ہندوستان کے طول و عرض میں ہوئی، فجزاہ اللہ عنا وعن امۃ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم خیر الجزاء؛

خیر سید شہیدؒ کی رونق افروزی کے بعد میرے خیال کے مطابق نانوتہ کے باشندوں میں جس قسم کے انقلابی آثار کا مشاہدہ کیا گیا، اور جیسا کہ حضرت حکیم الامت تھانوی قدس اللہ سرہ اپنے استاد مولنا محمد یعقوبؒ (جن کا ذکر اس کتاب میں مصنف امام کے عنوان سے آپ سن رہے ہیں) ان ہی کے حوالہ سے یہ روایت بیان کیا کرتے تھے کہ

"ایک مرتبہ میں مسجد میں تھا (شاید نانوتہ اپنے وطن ہی کی مسجد میں تھے)، کہ نہایت نورانیت مسجد میں معلوم ہوئی، مجھے اس کی ٹٹول ہوئی، دیکھا کہ ایک صاحب ہیں، جن کا باطن نہایت نورانی تھا، اور ان کے تمام لطائف ذاکر تھے، میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے مجاہدہ وریاضت کی ہے، انھوں نے جواب دیا کہ نہیں تو" ---------

مولانا یعقوبؒ فرماتے ہیں کہ اسی کے بعد اس شخص نے کہا کہ

"البتہ میں تھوڑی دیر حضرت سید احمد صاحب کی خدمت میں بیٹھا ہوں؛"

(قصص الاکابر در الہادی ۱۳۵۶ھ جمادی الثانی)۔

خیال کرنے کی بات ہے کہ جس شخص کی صحبت میں تھوڑی دیر کی شرکت ان عجیب وغریب نتائج کو پیدا کردیا کرتی تھی، جو سالہاسال کی ریاضتوں کے بعد بھی لوگوں کو میسر نہیں آتے، اگر اسی ہستی گرامی کی طرف نانوتہ کے ان انقلابی آثار و نتائج کو میں منسوب کرتا ہوں، تو اس کے انکار کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔

بہرحال میرا خیال یہی ہے، اس سلسلے میں آگے بڑھنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند مؤثرات وعوامل کا ذکر کرلیا جائے جن سے نانوتہ کے مستقبل کی تاریخ متاثر ہوتی ہے،

عرض کرچکا ہوں کہ سید شہید اپنے تبلیغی دوروں کے سلسلے میں اس علاقہ کے مرکزی شہر سہارنپور بھی تشریف فرما ہوئے تھے، بیان یہ کیا جاتا ہے کہ سہارنپور میں ایک مسجد "بونی والی" کے نام سے مشہور تھی، سید صاحب اسی مسجد کے پاس سے گذر رہے تھے کہ اچانک ٹھٹکے اور دریافت فرمایا کہ اس مسجد میں کوئی بزرگ رہتے ہیں؟ لوگوں نے عرض کیا کہ جی ہاں! سید صاحب مسجد میں آکر ان صاحب سے ملے اور اسی کے بعد وہ عجیب وغریب واقعہ پیش آیا، جس کا ذکر یہاں مقصود ہے۔

کہتے ہیں کہ بونی والی مسجد میں جو صاحب تھے، ان کا نام شاہ عبدالرحیم ولائتی تھا، پہلے یہ پنجلاسہ (مشرقی پنجاب) کے ایک بزرگ جن کا نام شاہ رحم علی تھا، مرید ہوئے تھے، اور ان کے زیر تربیت رہ کر کالاآم کے پہاڑ میں بڑی بڑی سخت ریاضتیں کی تھیں، مگر اپنے اس پیر سے مجاز نہ ہوسکے تب امروہہ پہنچکر حضرت شاہ عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ سے مرید ہوئے، اور ان کی تعلیم و تربیت سے مستفید ہو ہی رہے تھے کہ ان کا بھی انتقال ہوگیا، اور خلافت کی سند ان سے بھی نہ مل سکی، سہارنپور میں آکر بونی والی مسجد میں قیام فرمالیا تھا کہ اچانک دولت بیدار خود ان کے سرہانے آگئی، یعنی سید شہید رحمۃ اللہ علیہ جیسا کہ عرض کیا گیا ان کے پاس ملنے کے لئے بونی کی مسجد میں تشریف لائے، بیان کیا جاتا ہے کہ ملنے کے ساتھ ہی خلوت ہوگئی، پھر بڑے بڑے قصے درمیان میں پیش آئے، آخری نتیجہ یہی تھا کہ دو پیروں سے مرید ہونے اور باضابطہ تعلیم پانے کے بعد بھی

سید شہید کے دستِ حق پرست پر شاہ عبدالرحیم نے بیعت فرمائی اور اجازت بھی ان کو سید صاحب ہی سے حاصل ہوئی، حضرت تھانوی کی روایت ہے کہ

"ثقات سے سنا ہے کہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوکر کیفیات و نسبت کا مبادلہ کرتے تھے" ارواح ثلاثہ ص۱۲۵

اسی کتاب میں امیر شاہ خاں صاحب مرحوم کا یہ بیان بھی درج ہے کہ

"مولٰنا محمد قاسم نانوتوی سے انھوں نے سنا تھا، فرماتے تھے کہ آخر میں شاہ عبدالرحیم صاحب پر سید صاحب کی نسبت کا غلبہ ہوگیا تھا" ص۱۲۶

مشائخ دیوبند کے شیخ الشیوخ یعنی حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے مرشدِ برحق حضرت میانجی نور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پیر یہی حضرت شاہ عبدالرحیم ولائتی ہیں جن پر سید شہید کی نسبت کا غلبہ بقول حضرت نانوتوی رح ہوگیا تھا، خلافت و اجازت بھی میاں جی جھنجھانوی قدس اللہ سرہ کو شاہ عبدالرحیم ہی سے حاصل[۱] ہوئی۔

حضرت میانجی صاحب جھنجھانوی قدس اللہ سرہ العزیز تک دین جس شکل میں شاہ عبدالرحیم ولائتی سے منتقل ہوکر پہنچا تھا، اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہی تھی کہ ایک طرف جیسا کہ خود شاہ عبدالرحیم ولائتی کا بیان براہ راست ان ہی سے یہ نقل کیا جاتا ہے کہ سید شہید

---

[۱] جیسے شاہ عبدالرحیم ولائتی رحمہ اللہ دو پیروں سے مرید ہونے کے بعد بھی مجاز نہ ہو سکے، اور قدرت کا ازلی فیصلہ تھا کہ سید شہید کی مہم کی تکمیل کا کام ان سے لیا جائے گا، کچھ یہی صورت حضرت حاجی امداد اللہ کے ساتھ پیش آئی، ابتدا میں وہ حضرت شاہ محمد آفاق دہلوی کے خلیفہ شاہ نصیر الدین صاحب سے بیعت ہوئے مگر شاہ نصیر الدین کی وفات کی وجہ سے اپنی تکمیل کیلئے شیخ کی ضرورت باقی رہی، آخر بعض مبشرات کے تحت حضرت میانجی نور محمد جھنجھانوی کی خدمت میں پہنچکر سید شہید کی عطا کردہ نعمت و دولت کو جو شاہ عبدالرحیم ولائتی کے ذریعہ ان تک پہنچی تھی حضرت حاجی امداد اللہ نے حاصل فرمائی، مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے متعلق جو یہ مشہور ہے کہ حاجی امداد اللہ رح کو کبھی فرماتے وہ میرے بھتیجے ہیں اور میں ان کا چچا ہوں، اس کا مطلب یہی ہے کہ مولانا مرادآبادی شاہ آفاق کے خلیفہ تھے ۱۲

کی خدمت میں انھوں نے عرض کیا۔

"میں ذکر وشغل حضرات قادریہ وچشتیہ کے کر چکا ہوں" (ارواح ثلٰثہ ص۱۲۳)

اور دوسری طرف سید شہید کی نسبت کے غالب آجانے کے بعد ان سے جب پوچھا گیا کہ سید شہید سے آپ کو نئی چیز کیا ملی تو فرمایا کہ

"سید صاحب کی برکت سے نماز پڑھنی بھی آگئی، اور روزہ رکھنا بھی آگیا۔" ص۱۲۵

جہاں تک میں سمجھتا ہوں شاہ عبدالرحیم صاحب کے ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ باطنی حالات کے استغراق میں شریعت کے عملی مطالبات کی طرف سے صوفیہ میں گونہ ایک قسم کی لاپروائی آخر زمانہ میں عموماً جو پیدا ہوگئی تھی، سید شہید کی برکت سے اس کوتاہی کی تکمیل ہوگئی یعنی باطن کے ساتھ ظاہر، غرض دین کے دونوں ضروری پہلوؤں کی تعمیر مستحکم بنیادوں پر اس راہ سے ہوگئی اور ظاہر وباطن کی جامعیت کی یہی دولت سرمدی تھی جو میانجی نور محمد صاحب جھنجھانوی کو اپنے پیر سے ملی، اسی کا نتیجہ تھا، جیسا کہ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ کسی خوش گلو نعت خواں کے متعلق میاں صاحب سے لوگوں نے عرض کیا کہ نعت بہت اچھی پڑھتا ہے، حضرت بھی سن لیں تو کیا مضائقہ ہے، جواب میں فرمایا کہ

"لوگ مجھے کبھی کبھی امام بنا دیتے ہیں، اور غنا، بلا مزامیر میں بھی علماء کا اختلاف ہے" (ارواح ثلٰثہ ص۱۳۱)

صوفی صافی اور چشتی وصابری ہونے کے باوجود محض منصب امامت کے احترام کو پیش نظر رکھتے ہوئے علماء کے اختلافی نقطۂ نظر کی اتنی رعایت بتا رہی ہے کہ جامعیت کا کتنا پختہ رنگ میاں جی صاحب قدس اللہ سرہ پر چڑھا ہوا تھا۔

میں نے براہ راست حضرت مولانا حبیب الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ نائب مہتمم دیوبند (بلکہ اپنے عہد میں دیوبند کے تعلیمی نظام کی بھی روح رواں) سے ایک دفعہ (حضرت میانجی نور محمد جھنجھانوی کا تذکرہ فرماتے ہوئے) ان کا یہ فقرہ سنا ہے کہ حضرت میانجی رح فرماتے تھے، کہ

"میاں میں نے ایک ایسی ہنڈیا پکائی ہے، جو نہ سو برس پہلے پکی تھی، اور نہ سو سال بعد پکے گی۔"

غالباً یہ "جامعیت" کی یہی ہنڈیا تھی، جس میں ایک طرف پوری طاقت کے ساتھ ان باطنی کمالات کی نشو و نما کی ضمانت پوشیدہ ہے، جو حضرات مشائخ چشت میں سلفاً و خلفاً منتقل ہوتے چلے آرہے تھے اور دوسری طرف اسی کے ساتھ علماء شرع کے متعین کئے ہوئے حدود کی بھی رعایت اس حد تک محفوظ رکھی گئی ہے جس کی مثال مذکورہ بالا واقعہ ہو سکتا ہے۔

بہر حال یہی "محمدی نور" یا "نور محمدی" تھا جس سے حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا سینہ فیض گنجینہ جگمگا اٹھا تھا، پہلوں کو بھی اس پر تعجب ہوا اور آج بھی حیرت ہوتی ہے کہ حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ باوجودیکہ خود باضابطہ عالم یا سند یافتہ عالم نہ تھے[۱] لیکن وقت کے علماء راسخین کی اکثریت ان کے قدموں پر کیوں جھک گئی تھی، خدائے بخشندہ کی بخشش قبول عام کی اس عام اور حقیقی توجیہ کے سوا اگر یہ سوچا جائے کہ خدائی مرضی کا ظہور کن اسباب و علل کے پیرایہ میں ہوا، تو بادنیٰ تامل یہ واضح ہو سکتا ہے کہ اسلام کے ظاہر و باطن یا جسم و روح کے خدام (علماء و صوفیاء) میں بہ تدریج منافرت کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتے ہوئے جب اس نقطہ پر پہنچ گئی کہ تقریباً ان دونوں طبقوں میں سے ہر ایک نے اپنے آپ کو دوسرے سے مستغنی ٹھہرا لیا، اور مسلمانوں کے

---

[۱] حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بعض کتابوں میں خود ان ہی کی زبانی یہ بیان نقل کیا گیا ہے کہ بھائی ہم نے ایک باب اور دیباچہ گلستاں کا اور ایک باب بوستاں کا اور کچھ مفید نامہ اور کچھ دستور المبتدی اور چند ورق زلیخا کے پڑھے تھے، اور حصن حصین مولوی قلندر صاحب سے پڑھی تھی - ص۲ کرامات امدادیہ - مگر ارواح ثلٰثہ میں مولٰنا تھانوی کے حوالہ سے منقول ہے کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے صرف کافیہ تک پڑھا تھا ص۱۲۲ نیز قصص الاکابر میں مولانا تھانوی رحہی کے حوالہ سے منقول ہے کہ حضرت حاجی صاحب کی ظاہری تحصیل صرف کافیہ تک تھی اور اس کے بعد کچھ مشکوٰۃ و بس ص۱۵ قصص

بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ باضابطہ طالب العلمی کے دنوں میں صرف وہی کتابیں پڑھی تھیں جن کا ذکر خود فرماتے تھے، بعد کو شوقیہ کچھ کافیہ اور پھر مشکوٰۃ بھی کچھ پڑھ لی ہوگی ۱۲

دین کے ان دونوں نمائندہ طبقوں میں مختلف اسباب و وجوہ کے زیر اثر ایک قسم کی رقابت پیدا ہوگئی، اور بڑھتے بڑھتے یہی رقابت اس حد تک پہنچ گئی کہ ہر ایک دوسرے کے وجود کو غیر ضروری بلکہ الاسلام کے لئے مضر خیال کرنے لگا، اور ساتھ ہی تعبیریں ایسی پھیلادی گئیں، جن سے سمجھا جانے لگا کہ خود الدین ہی کی حقیقت کی تعیین میں یہ اختلاف ہے، شریعت و طریقت و حقیقت وغیرہ الفاظ کے پردے میں کچھ اسی قسم کی باتیں باور کرائی جاتی تھیں کہ علماء کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے کہتے تھے کہ شریعت یعنی جو کچھ ان کی فقہی کتابوں میں لکھا ہوا ہے، یہی دین کا اول بھی ہے اور آخر بھی، ظاہر بھی یہی ہے اور باطن بھی یہی ہے، اور صوفی یعنی "مشائخ" کے زمرے میں شمار ہونے والے سکھاتے تھے کہ "وہی سب کچھ ہے جو فقہاء اور علماء کی کتابوں میں نہیں پایا جاتا، بلکہ سینوں سے سینوں تک جو کچھ ان کے یہاں چلا آتا ہے، یا ان کے یہاں کے سفینوں میں لکھا ہوا ہے، حقیقی "اسلام" وہی ہے۔

جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں، شریعت و طریقت وغیرہ کا یہ افسانہ کافی طویل ہے، یہاں میری غرض صرف یہ ہے کہ جھگڑے کی اصل بنیاد نہ شریعت تھی نہ طریقت نہ حقیقت، بلکہ یہ سارا قصہ طبقاتی کش مکش کی ایک شکل تھی، یعنی بالکلیہ یہ مولویوں اور صوفیوں کا جھگڑا تھا، جسے خواہ مخواہ الاسلام کی طرف منسوب کرکے ہر طبقہ والے اپنے وجود کی ضرورت کو ثابت کرتے ہوئے اس غلطی کے مرتکب ہوئے تھے کہ دوسرے طبقہ کے وجود کو غیر ضروری ہی نہیں بلکہ آخر میں تو دین کے لئے مضر حتی کہ مہلک تک ٹھیرانے لگے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف یہ روایت تذکرۃ الرشید میں منسوب کی گئی ہے کہ نماز پڑھنے سے مسلمانوں کو روکنا، اور ناپاکی (جنابت) سے پاک ہونے کے لئے بجائے غسل کے صرف بھبوت کا بدن پر مل لینا، فدا حسین[1] کے طریقہ کی خصوصیت تھی،

---

[1] یہ وہی شاہ فدا حسین ہیں جن کا ذکر کرتے ہوئے مولانا حالی نے حیات جاوید میں لکھا ہے کہ سرسید احمد خاں مرحوم کے نانا خواجہ فریدالدین دبیرالدولہ امین الملک شاہ فدا حسین کے حقیقی بھائی تھے (بقیہ برصفحہ آئندہ)

مولانا گنگوہیؒ سے یہ روایت بھی اسی کتاب میں منقول ہے کہ اسی زمانہ میں جلال آباد (تھانہ بھون سے چند میل کے فاصلے پر ہے) اس قصبہ میں ایک شخص ضامن علی نامی تصوف کے مدعی ہو کر رنڈیوں سے کہتے تھے کہ

"بی تم شرماتی کیوں ہو، کرنے والا کون، اور کرانے والا کون

وہ تو وہی ہے" ص ۲۴۲ ج ۲ تذکرۃ الرشید

اسلامی ہند کے جس دور سے ہمارے اس مضمون کا تعلق ہے، یعنی حضرت حاجی امداد اللہؒ جس زمانے میں پیدا ہوئے ہیں، اسی وقت ذرا دتی کے دینی حلقوں کا جائزہ لیجئے، آپ کو مولویوں اور صوفیوں کی یہ کشمکش اپنی انتہائی شکل میں نظر آئے گی، ایک طرف مولوی محبوب علی صاحب تھے جو باوجودے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، مگر نفل کی دو رکعتیں جو صوفیوں میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب ہے، اور حضرت شاہ صاحب نفل کی اس نماز کو فعل مشائخ قرار دیتے ہیں، مگر شاہ صاحب کے سامنے مولوی محبوب علی صاحب محض اسلئے کہ نفل کی ان دو رکعتوں کا انتساب حضرت غوث پاک کی طرف کیا جاتا ہے، بھرے مجمع میں اعلان

(بقیہ صفحہ گذشتہ) سید صاحب کا شاہ فدا حسین — اس تعلق کا انکشاف میں خیال کرتا ہوں کہ سید صاحب کے دینی عقائد اور خیالات کے تجزیہ وتحلیل میں بہت زیادہ معاون ثابت ہوگا۔ سید صاحب پر اپنے نانا خواجہ فریدالدین کا غیر معمولی اثر تھا انھوں نے "سیرت فریدیہ" کے نام سے اپنے نانا صاحب کی سوانح عمری بھی لکھی ہے، خواجہ فرید اپنے بھائی شاہ فدا حسین کے رسول شاہی فرقہ کے ایک فقیر مکا شاہ کے مرید بھی تھے اور گو چار ابرو کا صفایا جو اس طریقہ کی خصوصیت تھی، خواجہ فرید نے زندگی بھر نہیں کرایا، مگر مولانا حالی نے لکھا ہے کہ "مرنے سے دو برس پہلے ان کو یہ خیال ہوا کہ ایک دفعہ تو مرشد کی پوری پوری پیروی بھی کرنی چاہئے۔ آخر ایک دن چار ابرو کا صفایا کرا دیا" ص ۲۳ حیات جاوید۔ بہرحال عام طور پر یہ مشہور ہے کہ کلیۃً مغربی خیالات ہی سے سید صاحب متاثر تھے، اس مشہور خیال میں ممکن ہے کہ مذکورہ بالا انکشاف کو پیش نظر رکھتے ہوئے ترمیم کرنی پڑے کہ سید صاحب کے قلم کی ناقابل برداشت بے باکیاں جہاں تک میرا خیال ہے ان کے ان ہی غیر شعوری احساسات کے بہ ظاہر نتائج ہیں جن کی پرورش ایام طفولیت ہی میں خود ان کے گھر میں ہوئی تھی" ۱۲

کہتے ہیں کہ

"سن لو حضرت (شاہ عبدالعزیز) اس نماز کو ناجائز فرما رہے ہیں، مگر گالیوں کے ڈر سے صاف جواب نہیں دے سکتے۔" (ص۲۴ تذکرۃ الرشید ج ۲)

اور دوسری طرف اسی زمانے میں اسی دلی میں حضرت شاہ عبدالعزیز ہی کے معاصر یہ صوفی فدا حسین نامی تھے، جن کا تعلق فقیروں کے ایک خاص گروہ سے تھا، جسے لوگ "رسول شاہی" کہتے تھے، ان لوگوں کا حال کتابوں میں پڑھئے۔

بہرحال ان قصوں کو میں کہاں تک بیان کروں، یہ تو ایک مستقل کتاب کا مضمون ہے، میں صرف مولوی وصوفی کی کش مکش کے ان نتائج کو مثالوں سے سمجھانا چاہتا ہوں، ملاحظہ کیجئے کہ ایک ہی دین کے پیرو، عوام نہیں بلکہ اس دین کے مختلف شعبوں پر کام کرنیوالوں کی جماعتی رقابتوں کی آگ ترقی کر کے کہاں تک پہنچ چکی تھی۔

وہ بڑی مبارک ومسعود گھڑی تھی جس وقت سہارنپور میں بونبی کی مسجد کے پاس حضرت سید شہید کا گذر ہوا، اور حضرت شاہ عبدالرحیم ولایتی رحمۃ اللہ علیہ پر سید شہید کا اور سید شہید پر شاہ عبدالرحیم کی نسبتوں کا اثر پڑا، رخ وہیں سے بدلا، حضرت میانجی نور محمد جھنجھانوی قدس اللہ سرہ العزیز کے ذریعہ مولویت وصوفیت کی یہی جنگ صلح کے قالب میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نور اللہ ضریحہ تک پہنچی، چنانچہ حضرت حاجی صاحب کے حالات اور انکی خصوصیات کے تذکروں میں لوگ اس قسم کی چیزوں کا ذکر عموماً پاتے ہیں، مثلاً مرشد تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز کمالات امدادیہ میں فرماتے ہیں،

"حضرت صاحب (یعنی حاجی امداد اللہ ان کے مرشد) علماء کی، گو وہ حضرت کے خادم ہی ہوں، اس قدر توقیر فرماتے تھے کہ اکثر ان کی طرف سے جو ہدایا دتحفے، حضور میں پیش ہوتے ان کو یہ کہکر کہ مولوی صاحب کا تبرک ہے اپنے سر پر رکھ لیتے، چنانچہ میرے روبرو بھی ایسا واقعہ پیش آیا۔" (کمالات امدادیہ ص۴۲)

کیا صوفی اور مولوی کی جماعتی لاگ ڈانٹ کے سلسلے میں طرزِ عمل کی یہ عجیب و غریب تبدیلی کوئی معمولی واقعہ ہے، جسے پڑھ لیا جاوے، اور پڑھ کر کچھ سوچے بغیر پڑھنے والے آگے بڑھ جائیں۔ ذرا غور تو کیجئے، مولویت کے اس احترام کو باوجود خادم اور مرید ہونے کے محض اس لئے کہ تحفہ بھیجنے والے آدمی کا تعلق مولویوں کے گروہ سے ہے، اس کے تحفہ اور ہدیہ کو حاجی صاحب جس وقت یہ فرماتے ہوئے کہ "یہ مولوی صاحب کا تبرک ہے" اپنے فرقِ اقدس پر رکھ لیا کرتے تھے، اس کا نفسیاتی اثر دیکھنے والے اور سننے والے مولویوں پر کیا پڑتا ہوگا؟

حضرت تھانوی جو خود بھی علماء ہی کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اپنے ذاتی مشاہدے حضرت حاجی صاحب کے اس طرزِ عمل کی توثیق فرماتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں۔

"اکثر مشائخ علماء سے منقبض رہا کرتے ہیں، حضرت کی یہ توقیر دلیل ہے کہ شریعت کی آپ کے قلب میں نہایت ہی عظمت تھی" (کمالات امدادیہ صـ۴۲)

شریعت سے یہاں حکیم الامت کی مراد الدین کا وہ شعبہ ہے جس پر کام کرنے والوں کا اصطلاحی نام علماء ہے اور مقصد وہی ہے کہ علماء سے انقباض کا جو سلسلہ دراز ہوتے ہوئے اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ صوفیوں کی ایک جماعت باضابطہ اس کی تبلیغ کرتی پھرتی تھی کہ دین کے جس شعبہ کی خدمت مولویوں نے کی ہے وہ دین ہی نہیں ہے جس کا ایک نمونہ اسی زمانہ میں رسول شاہی فقراء کی جماعت بنی ہوئی تھی، امیر شاہ خاں صاحب نے رسول شاہیوں کے ساتھ اسی عہد کے فقیروں کے ایک اور گروہ کا تذکرہ کیا ہے جو امام[1] شاہیوں کے نام سے مشہور تھا، خاں صاحب ان ہی امام شاہیوں کے ایک مرشد نسیم شاہ نامی کا قصہ بیان کیا کرتے تھے کہ وہ حضرت سند الوقت شیخ الکل شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک دن حاضر ہوا اور خطاب کر کے کہنے لگا کہ

[1] امام شاہیوں کا تذکرہ دوسری کتابوں میں بھی کیا گیا ہے، کتاب مناقب العارفین میں ان کے بفوات و خرافات کا ذکر جن الفاظ میں کیا گیا ہے ان کے دہرانے کی ہمت بھی اپنے اندر نہیں پاتا، وہ العیاذ باللہ قرآن کا مضحکہ بھی اڑاتے تھے اور اپنے آپ کو دین اسلام کا پیرو بھی کہتے تھے نسیم شاہ کو گلزار شاہ سے خلافت ملی تھی، (ارواح ثلثہ)

"شاہ صاحب! شریعت کی قید میں کب تک رہوگے، نکلو اس قید سے اور چھوڑ دو اس شریعت کو" (ارواح ثلاثہ) ص۲۶

اور یہ تو خیر انتہائی شکل تھی، مگر جیسا کہ حضرت تھانوی ؒ نے ارقام فرمایا ہے۔

"اکثر مشائخ علماء سے منقبض رہا کرتے ہیں"

انقباض کی یہ کیفیت اس زمانہ میں عام طور پر مولویوں کی طرف سے صوفیوں میں پائی جاتی تھی، ایسے وقت میں حضرت حاجی صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے بجائے انقباض کے ان ہی مولویوں کے ساتھ اتنا انبساطی تعلق یقیناً ایک انقلابی طرز عمل تھا۔

خصوصاً جب اسی کے ساتھ اس کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ حاجی صاحب قبلہ اپنی زندگی کی ابتدائی ایام سے آخر وقت تک بجز ایک "صوفی" کے اور کچھ نہ تھے، میرا مقصد یہ ہے جیسا کہ سب جانتے ہیں، ابھی اس کا ذکر گزرا بھی کہ جن علوم کی تعلیم آدمی کو مولوی بناتی ہے، ان علوم سے حاجی صاحب کو کسی زمانہ میں اکتسابی تعلق قائم کرنے کا موقعہ نہ مل سکا تھا۔

خود ہی فرمایا کرتے تھے کہ فارسی ادب کی بعض کتابوں کے پڑھ لینے کے بعد ہی،

"شوق درود وظائف کا ہوا اور دہلی میں آکر شاہ نصیر الدین صاحب سے بیعت کی" (ص۷ کرامات امدادیہ)

اور حکیم الامت تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز کی اس روایت کو اگر سامنے رکھ لیا جائے، جسے "قصص الاکابر" میں آپ کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے فرماتے تھے کہ

"حضرت حاجی صاحب کی عمر جبکہ ۲۵-۳۰ سال کی تھی تب ہی سے دہلی کے شہزادے اور بیگمات وغیرہ آپ کے معتقد تھے" (ص۹۶ قصص)

تو اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ آخر زمانہ میں تو خیر اپنے وقت کے شیخ المشائخ وہ تھے ہی، مگر زندگی کے ابتدائی ایام میں بھی لوگوں نے ان کو صوفی سمجھا، اور صوفی ہی پایا، مولوی یا ملا ہونے یا اس طبقہ کے لوگوں میں گنے جانے کا موقعہ کسی زمانہ میں بھی ان کو نہ ملا، ایسی

صورت میں مولویوں کے ساتھ ان کے طرزِ عمل کی اس غیر معمولی تبدیلی کی توجیہ بجز اس انتساب گرامی کے اور کس واقعہ سے کی جائے جو حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ حضرت میانجی نور محمد جھنجھانوی کے توسط سے ان کو میسر آیا تھا، ازلی توفیق، کا مجھے انکار نہیں، بلکہ حضرت حاجی صاحب کے حالات میں اس غیبی لطیفہ کا جو تذکرہ کیا گیا ہے، قصص الاکابر میں حضرت حکیم الامت تھانوی کی زبانی یہ منقول ہے کہ

"حضرت (یعنی حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ) نے خواب دیکھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، حضرت کی ایک بھاوج تھیں، وہ کھانا پکانے کا انتظام کیا کرتی تھیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا کہ تم ہٹو، ان کے (حاجی صاحب) کے مہمان علماء ہیں اور ان کی مہمانی ہمارے ذمہ ہے، ہم انتظام کریں گے۔" ص۶۱

اس سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، کہ "مولویت و صوفیت" کی جنگ کا اختتام کم از کم سرزمین ہند میں حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ کے لئے غیب ہی سے مقدر ہو چکا تھا، لیکن جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، ہر غیبی واقعہ عالم شہادت کے اسبابی پردوں ہی کو چہرے پر ڈالے ہوئے نمایاں ہوتا ہے یہاں بھی اس غیبی لطیفہ کا ظہور مذکورہ بالا شکل میں ہوا۔

بلکہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف اس قسم کے مکاشفات کا انتساب ان کے سوانح نگاروں نے جو کیا ہے، مثلاً حضرت حکیم الامت تھانوی نے اپنی کتاب "کرامات امدادیہ" میں مولوی عبد الغنی بہاری مرحوم کی کتاب "شمائم امدادیہ" کے حوالہ سے خود حضرت حاجی صاحب کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ طلب حق کے ابتدائی دنوں میں ایک دفعہ خواب میں بارگاہ رسالت پناہی کی سعادت حاجی صاحب کو حاصل ہوئی، خواب ہی میں دیکھتے ہیں کہ ان کے جد امجد جن کا اسم گرامی حاجی حافظ بلاقی رحمۃ اللہ علیہ تھا، وہی حاجی صاحب کے ہاتھ کو پکڑے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں پیش فرما دیتے تھے، سننے کی بات اسی کے بعد آپ کے بیان کا یہ جز ہے کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ لیکر حوالہ حضرت میاں جیو صاحب چشتی (یعنی میاں جی نور محمد جھنجھانوی قدس اللہ سرہ العزیز) کے کردیا۔" ص۲۷ کرامات امدادیہ

خواب میں یہ واقعہ اس زمانہ میں پیش آیا تھا کہ بقول حاجی صاحب کے

"اس وقت تک بعالم ظاہر حضرت میاں جیو صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ سے کسی طرح کا تعارف نہ تھا۔"

اس کے بعد پھر میاں جیو صاحب کی خدمت میں حاضری کی تفصیل بیان کی ہے۔

میری غرض اس واقعہ کے ذکر سے یہ ہے کہ حضرت شاہ عبدالرحیم ولایتی کے توسط سے حضرت سید احمد شہید کی عطا فرمودہ جو نعمت میاں جیو تک پہنچی تھی اس نعمت کی تقسیم عام کے لئے حضرت حاجی امداد اللہ ہی کا انتخاب غیب میں کیا گیا تھا، اس کی تائید یقیناً عالم رؤیا کے اس مکاشفے سے بھی ہوتی ہے اور یہ قصہ تو اس وقت کا ہے جب تک میاں جیو صاحب سے حاجی صاحب کا تعارف بھی نہ ہوا تھا، میاں جیو کی غلامی میں داخل ہونے کے بعد تقریباً اسی مسئلہ کا اعادہ بجائے رؤیا اور خواب کے مراقبہ کی حالت میں حاجی صاحب کے سامنے جو فرمایا گیا ہے، اس کا تذکرہ بھی اسی کتاب کرامات امدادیہ میں کیا گیا ہے، یعنی حضرت حاجی صاحب خود فرماتے تھے کہ مدینہ منورہ میں ایک دفعہ مسجد نبوی کے اس خاص مقام میں جسے روضہ جنت کہتے ہیں، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار اقدس سے متصل مسجد نبوی میں اُس جگہ واقع ہے جسے گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سرہانا ہم کہہ سکتے ہیں، صحیح حدیثوں میں اس کو جنت کے باغوں میں کا ایک باغ فرمایا گیا ہے، بہرحال اسی "روضۃ من ریاض الجنۃ" میں حاجی صاحب فرماتے ہیں کہ میں مراقب تھا "مراقبہ" میں ان پر منکشف ہوا کہ

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر مقدس سے بصورت میاں جیو قدس اللہ سرہ (یعنی میاں نور محمد جھنجھانوی نکلے، اور عمامہ لپٹا ہوا اور تر (یعنی بھیگا ہوا) اپنے دست مبارک میں لئے ہوئے تھے، میرے سر پر غایت شفقت سے رکھدیا اور کچھ

نہ فرمایا اور واپس تشریف لے گئے "۔ (کمالات ص۳۰)

تعلق سے پہلے بھی بارگاہ رسالت سے حاجی صاحب میاں جیو قدس اللہ سرہ کے سپرد کئے جاتے ہیں اور تعلق پیدا ہو جانے کے بعد بھی، میاں جیو ہی کی شکل میں مرشد حقیقی کی حقیقت حاجی صاحب کے سامنے جلوہ افروز ہوتی ہے، بلاشبہ یہ اتفاقی واقعہ نہیں، بلکہ غیب و شہادت کے تعلقات سے تھوڑی بہت سی واقفیت جو رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ "غیب و شہادت کے اتفاق" کے سوا اس کی دوسری توجیہ نہیں ہو سکتی، بلکہ "عمامہ" جو مولویت کی عام علامت ہے اس کو "تر" یعنی بھیگی ہوئی شکل میں حاجی صاحب کے سر پر جو رکھا گیا، فقیر کے ناقص خیال میں یہ "خشک مولویت اور صوفیت" کے اس اجتماع کی طرف بظاہر غیبی اشارہ معلوم ہوتا ہے[۱]، جو حضرت حاجی صاحب کے مشرب ناب کا طغرائے امتیاز ہے، بہر حال کچھ ہو، یہ واقعہ ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ

برنگ فقر چوں ملائی آمد
بہ فیض امداد الٰہی آمد

لیکن واسطہ فی الفیض اس قصہ میں جہاں تک میرا ناچیز خیال ہے حضرت میاں جیو نور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات ہی معلوم ہوتی ہے، ان ہی کے ذریعہ سے حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کا چڑھایا ہوا انقلابی رنگ حاجی صاحب قبلہ تک منتقل ہوا، بلکہ اسی کے ساتھ اگر حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے اس بیان کو بھی پیش نظر رکھ لیا جائے، "جو کرامات امدادیہ" میں براہ راست ان ہی کی طرف منسوب کر کے درج کیا گیا ہے، یعنی حاجی صاحب نے فرمایا کہ

"ظاہر میں اول بیعت میری طریقہ نقشبندیہ میں حضرت نصیر الدین صاحب دہلوی خلیفہ حضرت شاہ محمد آفاق صاحب سے ہوئی، اور باطن میں بلا واسطہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح ہوئی، کہ میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

[۱] اگرچہ حکیم الامت قدس اللہ سرہ العزیز نے اس کی توجیہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ سلوک بعد جذب و تمکین بعد تلوین و بقاء بعد فنا" کی طرف اشارہ ہے ممکن ہے کہ اس کی طرف بھی اشارہ ہو ۱۲

ایک بلند جگہ پر رونق افروز ہیں، اور حضرت سید احمد شہید کا ہاتھ آپ کے دست مبارک
میں ہے، اور میں بھی اسی مکان میں بوجہ ادب کھڑا ہوں حضرت سید صاحب نے میرا ہاتھ
پکڑ کے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھ میں دیدیا" ص۱۲

اس سے تو واقعہ بالکل صاف اور یہ دعویٰ انشاء اللہ غیر مشتبہ ہو جاتا ہے کہ حضرت حاجی صاحب قبلہ کا وجود گویا ایک حیثیت سے حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ ہی کا نقش ثانی، اور بروز صفائی تھا، اسی "نصب العین" کی تکمیل کے لئے قدرت نے ان کو چن لیا تھا، جس کے لئے بارہویں صدی کے مجدد کو اٹھایا گیا تھا۔

تمام شعبوں میں نہ سہی، مگر "صوفی وملا" کی باہمی رقابت اور طبقاتی کشمکش کے قصوں کو ختم کر کے فقیری میں ملائیت اور ملائیت میں فقیری کو سمونے اور جذب کرنے کی نظریاتی کوشش درحقیقت شاہ ولی اللہ نے فرمائی تھی، اسی میں عمومیت اور مسلمانان ہند کی اکثریت کو اسی مسلک کے زیر اثر لانے کی تکمیل کی ذمہ داری (جس کا آغاز سید شہید نے فرمایا تھا) کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تھانہ بھون کے اسی فاروقی شیخ زادے کے سپرد کی گئی جو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ سے آج دنیا میں پہچانے جاتے ہیں۔

مرشد تھانوی حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ کے ملفوظات میں ایک سے زائد مقامات میں اس قسم کے فقرے ملتے ہیں، مثلاً قصص الاکابر میں ہے، مولانا تھانوی نے فرمایا

"حضرت حاجی (یعنی حضرت حاجی امداد اللہ صاحب) اپنے زمانہ میں مثل حضرت سید احمد کے تھے" ص۶۶

ان دونوں بزرگوں میں منجملہ دوسرے اشتراکی وجوہ کے ایک خاص مشترک شان یہ بھی ہے کہ مولویت کے تعلیمی نصاب کی تکمیل کا رہین منت نہ حضرت سید شہید کا "دین مبین" تھا اور نہ حضرت حاجی صاحب کی دینی زندگی درسی کتابوں کی احسان مند تھی، حکیم الامت ہی کی طرف اسی کتاب میں جو یہ الفاظ منسوب کئے گئے ہیں کہ

"مثل شاہ سید احمد صاحب کے ابتدا ہی سے آپ کی (یعنی حضرت حاجی امداد اللہ کی)
ایسی حالت تھی" صٓـ۶۸ قصص الاکابر

اس کا مطلب بھی یہی ہے،

سیدنا حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مذکورہ بالا معلومات جو پیش کئے گئے ہیں ان کو حافظہ میں محفوظ کرتے ہوئے اب سید شہید کے ان ہی مثنیٰ حاجی صاحب کی بابت سوانح قدیم کے مصنف امام کی ان شہادتوں کو بھی سن لیجئے، حاجی صاحب کا ذکر کرتے ہوئے وہ ارقام فرماتے ہیں کہ

"حضرت مخدوم (حاجی صاحب) کی نانہال ہمارے خاندان میں تھی"۔ صٓـ۲۶

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ حضرت حاجی صاحب قبلہ کی نانہال ہونے کا شرف نانوتہ کو حاصل تھا، بالفاظ دیگر یہ سمجھنا چاہئے کہ حاجی صاحب کا مادری وطن یعنی آپ کی والدہ ماجدہ کا گھر نانوتہ ہی تھا، صرف یہی نہیں، مصنف امام نے آگے لکھا ہے کہ

"اور بہن ان (حاجی صاحب) کی یہاں (نانوتہ میں) بیاہی تھیں"۔ صٓـ۲۶

رشتے کے ان ہی تعلقات کا نتیجہ یہ تھا جیسا کہ وہی فرماتے ہیں کہ حاجی صاحب

"اکثر نانوتہ تشریف لایا کرتے تھے"۔ صٓـ۲۶

"کرامات امدادیہ" جو حضرت تھانوی کی تالیف ہے، اس میں مولانا محمد منیر نانوتوی کے متعلق ایک غیر معمولی واقعہ کا تجربہ درج کیا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ مولوی محمد منیر صاحب جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے ہم عمروں میں تھے، وہی بچپن میں بیمار ہوئے، اطباء کی طرف سے سخت پرہیز کا حکم تھا، مہینوں پرہیزی کھانا کھاتے کھاتے تنگ آچکے تھے، اتفاقاً حضرت حاجی صاحب نانوتہ تشریف لائے، مولانا محمد منیر صاحب کی والدہ صاحبہ نے ان کی دعوت کی، دعوت کے کھانے میں حاجی صاحب نے مولوی محمد منیر کو صرف شرکت ہی کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ فرمایا کہ جی بھر کر کھالو، دوسرے دن ان کی خالہ کے یہاں دعوت ہوئی، وہاں بھی یہی حکم

ان کو دیا گیا، مولوی منیر صاحب کا بیان تھا کہ سیر ہو کر دونوں جگہ مرغن کھانے میں نے کھائے مگر اطباء نے جن خطروں کی دھمکی دی تھی ان میں کوئی خطرہ پیش نہ آیا، اسی قصے کے ذیل میں مولوی محمد منیر نے یہ بھی فرمایا کہ

"دونوں صاحبہ (یعنی ان کی والدہ اور خالہ دونوں) حضرت حاجی صاحب سے مرید تھیں" ۲۵

جس کا مطلب یہی ہوا کہ نانوتہ کو صرف حاجی صاحب کے مادری وطن اور ننہال ہونے ہی کی سعادت حاصل نہیں ہے، بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نوعمری ہی کے زمانے سے نانوتہ والے حاجی صاحب کے معتقد بھی تھے، جب ان کی بیعت وارادت کے دائرے میں بھی لوگ داخل ہو چکے تھے تو آگے عقیدت ونیاز کے لئے کیا چیز باقی رہ جاتی ہے۔

اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ نانوتہ کی تاریخ کے جس دور تک ہم اس وقت تک پہنچے ہیں، اس زمانے میں عموماً نانوتہ کے شرفاء کے قلوب پر حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا کافی وزن پڑا ہوا تھا، یہ اس قصبے کے باشندوں کی خوش قسمتی تھی کہ قدرت کی طرف سے ان کو ایک ایسا "دل" عطا کیا گیا تھا، جو ولی اللہی رنگ سے رنگین، اور ولی اللہی نور سے منور تھا۔

اور ٹھیک جیسے اس ولی اللہی قلب کی روشنی سے یہ قصبہ اپنی تاریخ کے اس عہد میں جگمگا رہا تھا یہ خدا ہی کی طرف کی بات تھی، اور اسی کے لطف خفی کے ظہور کی یہ شکل تھی کہ حضرت سید شہید کی رونق افروزی کے بعد یہاں کے باشندوں میں طلب علم کا نیا جوش و ولولہ پیدا ہوا تھا، اور جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ اسی کے بعد ایک تعلیمی وفد طلب علم کی مہم پر نانوتہ سے دلی روانہ ہوا تھا، اسی سلسلہ میں یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ وفد کے ارکان میں سب سے زیادہ نمایاں کامیابی شیخ احمد علی نانوتوی کے صاحبزادے مولوی مملوک العلی نے حاصل کی تھی، سرسید احمد خاں کی ذاتی شہادت ان ہی کے متعلق گذر چکی جس کا حاصل یہ تھا کہ درسی کتابیں دنیا سے اگر ناپید بھی ہو جائیں تو سید صاحب کا خیال تھا کہ مولانا مملوک العلی کے حافظہ سے دنیا ان کتابوں کی نقل بآسانی حاصل کر سکتی ہے، گویا یہ ساری کتابیں ان کو زبانی یاد تھیں۔

بہر حال مولانا مملوک العلی کے فضل و کمال کی داستان تو الگ ہے، اس وقت میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جیسے نانوتہ اس زمانے میں ایک ولی اللہی قلب کے زیر قدم آگیا تھا، اسی طرح جس دماغ کے دباؤ کے نیچے اس زمانہ میں اس قصبہ کے شیوخ اور عام شرفا، کو ہم پاتے ہیں اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہی نظر آتی ہے کہ اس کی تربیت کا کام بھی کلیۃً ولی اللہی طریقۂ تعلیم کے ماحول میں انجام پایا تھا۔

تفصیل کا تو یہاں موقعہ نہیں ہے، لیکن مولانا مملوک العلی کے طلب علم کے ابتدائی ایام کے متعلق جو روایت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کر کے کتاب ارواح ثلثہ میں درج کی گئی ہے، میرے نزدیک تو نتیجہ تک پہنچانے کے لئے یہی روایت کافی ہو سکتی ہے، مولانا گنگوہی فرماتے تھے کہ

"مولانا مملوک العلی صاحب نانوتوی جب تحصیل علم کے لئے دہلی تشریف لے گئے تو صورت حال یہ تھی کہ جس استاد سے پڑھنا شروع کرتے وہ کچھ قلت مناسبت محسوس کر کے ایک سبق کے بعد دوسرا سبق نہ پڑھاتا تھا، مولنا سخت ملول و غمگین تھے، اسی عالم پریشانی میں حضرت شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا غم سنایا، کہ میں علوم کے شوق میں وطن چھوڑ کر آیا ہوں جس سے پڑھنا شروع کرتا ہوں، ایک سبق کے بعد پڑھانے کا نام نہیں لیتا، شاہ صاحب نے فرمایا اچھا کل آنا، مولانا اگلے روز حاضر ہوئے، حضرت شاہ صاحب نے ہدایت النحو کا ایک سبق پڑھا دیا۔ اور فرمایا کہ جاؤ اب جس استاد سے پڑھو گے، وہ پڑھانے سے انکار نہ کرے گا۔" صفحہ ۱۴۶ ارواح

اس روایت سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً مولانا مملوک العلی کے استاذوں نے علمی مناسبت ان میں نہیں پائی جو نانوتہ کے اس ماحول کا نتیجہ تھا، جس سے نکل کر مولانا مرحوم دلّی کے علمی حلقوں کے نو گرفتاروں میں شریک ہوئے تھے، وہیں دلّی جہاں ہر قسم کی اونچی اونچی

دکانیں علوم و فنون کی بھی اور فقر و درویشی کی بھی چل رہی تھیں، اسی دلّی میں اپنے درد و غم کے اظہار کے لئے حضرت شاہ عبدالعزیز کی بارگاہ عالی کا انتخاب مولانا نے کیا، یہ صورت حال بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ خانوادہ ولی اللّٰہی کی عظمت و عقیدت کے ساتھ وہ دلّی میں داخل ہوئے تھے، میرے اس خیال کی کہ نانوتہ کی اس نئی علمی ہل چل میں حضرت سید شہید کا مبارک ہاتھ نظر آتا ہے اس واقعہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، اور اس کو بھی جانے دیجئے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ جو اس زمانے میں درس و تدریس کا مشغلہ ترک کر چکے تھے انھوں نے ایک سبق تبرکاً مولانا کو پڑھا کر صرف اسی بات کی اجازت نہ دی کہ دلّی کے جس استاذ سے چاہو پڑھو، بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے کشفی پیشین گوئی بھی شاہ صاحب نے فرمادی کہ جس استاذ سے بھی پڑھو گے، وہی تمہیں پڑھائیگا، مگر اس اجازت عام اور کشف تام کے باوجود جانتے ہو مولٰنا مملوک العلی نے کیا کیا؟

حالانکہ اس زمانہ میں جیساکہ جاننے والے جانتے ہیں دلّی اہل کمال سے بھری ہوئی تھی، قدم قدم پر تدریسی حلقے قائم تھے، لیکن حیرت ہوتی ہے کہ مولانا مملوک العلی کے استاذوں کی فہرست میں بجز ایک نام کے کم از کم کوئی دوسرا نام مجھے تو آج تک نہیں ملا ہے، اور ان کے یعنی مولانا مملوک العلی کے ان معلّم فرید، استاذ وحید کی خصوصیت کیا تھی؟

"شاگرد رشید، اور مخلص خالص العقیدت جناب جنت مآب زبدۂ اکابر روزگار مولٰنا رفیع الدین رضوان اللہ علیہ کے تھے، اور ان کی خدمت میں ایسا اخلاص وافر رکھتے تھے کہ حضرت موصوف آپ کی تربیت میں مادام الحیات ایسے مصروف تھے، جیسے باپ فرزند کی تربیت میں۔" (ص ۱۵ حصہ سوم آثار الصنادید)

مولانا مملوک العلی کے استاذ وحید کی خصوصیت مذکورہ بالا الفاظ میں ڈاکٹر سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں بیان کی ہے،

اب جو حضرت مولانا رفیع الدین کی شخصیت سے واقف نہ ہے، اور جانتا ہے کہ یہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے اور مولانا شاہ عبدالعزیز کے حقیقی بھائی کا

نام ہے، وہ سمجھ سکتا ہے کہ مولانا مملوک العلی کے دماغ کو خانوادہ ولی اللٰہی کا ساختہ پرداختہ دماغ اگر میں قرار دیتا ہوں، تو ایک واقعہ کے اظہار کے سوا یقیناً یہ اور کچھ نہیں ہے، مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ان تلمیذ رشید کا اسم گرامی مولوی رشید الدین خاں تھا، مولانا مملوک العلی کے سوانح نگاروں کا اس پر اتفاق ہے کہ انھوں نے اول سے آخر تک جو کچھ بھی پڑھا، ان ہی مولانا رشید الدین خاں صاحب ہی سے پڑھا، سرسید احمد خاں نے بھی مولنٰنا مملوک العلی کا تعارف "شاگرد رشید مولوی رشید الدین خاں" کے الفاظ سے کراتے ہوئے آگے مولانا کے دوسرے حالات کا ذکر کیا ہے۔

بہرحال شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے براہ راست صاجزادے مولانا رفیع الدین صاحب نے اپنے جس شاگرد کی تعلیم و تربیت سرسید احمد خاں کی شہادت کے مطابق اپنے فرزند کی طرح کی تھی اور مادام الحیات یعنی جیتے جی شاہ صاحب اپنے اس محبوب شاگرد کی ساخت و پرداخت تراش و خراش میں مشغول رہے، دینی علوم جو خانوادہ ولی اللٰہی کا سرمایۂ امتیاز تھا، صرف وہی نہیں بلکہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کے صاجزادے مولوی بشیر احمد صاحب نے دلّی کی جو تاریخ لکھی ہے اس میں تصریح کی ہے کہ

"مولوی رشید الدین خاں کو خصوصیت کے ساتھ شاہ رفیع الدین نے ریاضیات کی تعلیم دی" ص۹۰۴/۲ تاریخ دارالحکومت دلّی

جس سے معلوم ہوا کہ نقلی و عقلی علوم حتیٰ کہ ریاضی جیسے خالص عقلی فن تک کی تعلیم بھی مولوی رشید الدین خاں صاحب کی ولی اللٰہی خاندان میں پوری ہوئی، مولوی رشید الدین خاں کی اسی جامعیت کا غالباً یہ نتیجہ تھا کہ مولانا مملوک العلی کو ان کے سوا کسی دوسرے استاذ کے پاس جانے کی ضرورت نہ ہوئی، کیونکہ اس زمانہ میں جو کچھ بھی لکھایا پڑھایا جاتا تھا، سب کے لئے ان کے یہی ایک استاد مولوی رشید الدین کافی تھے۔

خیال کرنے کی بات ہے کہ نانوتہ سے جس تعلیمی وفد میں شریک ہو کر مولانا مملوک العلی طلب علم

کے لئے دلی تشریف لائے تھے، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، خود یہ واقعہ اُس تحریک کا نتیجہ تھا، جس سے سید شہید کی رونق افروزی کے بعد اہل نانوتہ کو ہم متاثر پاتے ہیں، دلی پہنچ کر پا بوسی کے بعد حصول علم میں کامیابی کی ضمانت بھی مولانا مملوک العلی صاحب کو شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عطا کی گئی، اور اس کے بعد اول سے آخر تک مولانا مملوک العلی نے سب کچھ مولوی رشید الدین خاں صاحب سے پڑھا، ان سارے تاریخی مؤثرات و عوامل کو سامنے رکھ لینے کے بعد اس پر کیوں تعجب کیا جائے، اگر مولانا مملوک العلی کو میں ایک ایسا ولی اللہی دماغ یقین کروں جس میں جو کچھ بھی آیا ولی اللہی سرچشمہ سے ہی آیا، اسی گھاٹ پر وہ اترے بھی اور اسی ایک گھاٹ سے سیر ہو کر وہ واپس بھی ہوئے، ان میں دین کی سوجھ بوجھ بھی اسی راہ سے پیدا ہوئی، اور دنیاوی عقل کی نشوونما میں بھی ان کا دماغ ولی اللہی توانائیوں کے سوا کسی دوسرے کا کسی حیثیت سے منت کش نہ ہوا، اور میں تو سمجھتا ہوں کہ مولانا مملوک العلی جن کی زندگی بعد کو جیسا کہ آئندہ معلوم ہو گا دلی میں گذری اور دلی ہی میں آپ کی وفات بھی ہوئی تو وفات کے بعد دلی والوں نے جو یہ طے کیا کہ شہر کے ہزار ہا ہزار قبرستانوں کے مقابلہ میں مولٰنا کی تدفین کے لئے اسی حظیرۃ القدس کا انتخاب کیا جائے جس میں خود حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے اسلاف و اخلاف آرام فرما ہیں تو خود یہ واقعہ بتا رہا ہے کہ مولٰنا مملوک العلی کی ولی اللہیت دلی والوں کے نزدیک بھی ایک اجماعی مسئلہ کی صورت اختیار کر چکی تھی، ورنہ کوچہ چیلان جہاں مولٰنا مملوک العلی کی وفات اپنے ذاتی مکان میں ہوئی تھی، وہاں سے پرانی دلی کے اس دور دراز مقام تک آپ کے جنازے کو لے جانا کیا آسان تھا؟ جہاں حضرت شاہ ولی اللہ کا خاندانی مدفن ہے۔ بلکہ شاہ صاحب کے خاندان والوں کا اس پر راضی ہو جانا کہ مولٰنا مملوک العلی کو ان کے خاندانی ہڈواڑ میں جگہ دی جائے، خود یہی واقعہ اس خصوصیت کی بین شہادت ہے، جو مولانا مرحوم کو حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے دودمان عالی سے اپنوں اور غیروں کے نزدیک حاصل تھی، گویا یہ مان لیا گیا تھا کہ

مولانا مملوک العلی بھی اسی خاندان کے ایک رکن رکین ہیں، آخر ولی اللہی خاندان کے بزرگوں کے حلقہ میں جس نے ساری زندگی گذار دی، اور ان ہی بزرگوں کے قدموں کے نیچے قیامت تک کے لئے جو سو گیا، جس کے محیا اور ممات کی یہ حالت ہو، اس کی ولی اللّٰہیت میں بتایا جائے کہ شک کی گنجائش ہی کیا پیدا ہوتی ہے۔

بہر حال کھجوروں کے بن والی آبادی (نانوتہ) جیسے ایک خالص ولی اللہی قلب و روح یعنی حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ مہاجر مکی کے زیر قدم قدرت کی مخفی کارفرمائیوں کی بدولت آگئی، اب دیکھئے کہ قدرت کا وہی پوشیدہ ہاتھ اسی آبادی کو ایسے دماغ (یعنی مولنا مملوک العلی) کے نیچے کیسے لاتا ہے جس کی تربیت و پرداخت اور نشو و نما بالکلیہ ولی اللہی ماحول میں انجام پائی تھی۔

قصہ کی پوری تفصیل کی تو یہاں گنجائش نہیں، لیکن اس سرگذشت کے جتنے اجزا کی ضرورت ہے ان کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ قصہ کے ان ہی اجزا میں آپ کو انشاء اللہ وہ روشنی بھی مل جائیگی جو آپ کے سامنے ان گم شدہ کڑیوں کو بھی پیش کر دے گی، جن سے مسلمانان ہند کی تعلیمی تاریخ کے ماضی از حال میں تسلسل پیدا ہو جاتا ہے، اور واضح ہوگا کہ نئی تبدیلیاں اس ملک کے مسلمانوں کی دینی اور غیر سرکاری تعلیم کے نظام میں جو پیدا ہوئیں، یہ تبدیلیاں کس راہ سے داخل ہوئیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان پر قابو یافتہ ہونے کے بعد تعلیم کے جس نظام کو انگریزوں نے اس ملک میں جاری کیا تھا اس کے پیچھے جو نیت کارفرما تھی، اب تو وہ طشت از بام ہو چکی ہے تعلیم کے اس نظام کے نتائج جو سب کے سامنے ہیں ان کے سوا اس قسم کے اعترافات مثلاً میکالے کی رپورٹ کے الفاظ یعنی

"ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو، اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہئے جو خون

اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو، مگر مذاق اور رائے، الفاظ
اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو"

(مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۱۴۷ بحوالہ ہجر باسو ص ۸۵)

یہ اور اسی نوعیت کی شہادتوں کا اس وقت تک کافی ذخیرہ جمع ہو چکا ہے، نہ صرف خواص بلکہ عوام بھی تقریباً ان سے واقف ہیں۔

مگر اس مقصد تک پہنچنے کے لئے درمیان میں تجربے کی جن منزلوں سے حکومت تسلط کو گذرنا پڑا، اس کی داستان کافی دلچسپ لیکن اسی کے ساتھ حد سے زیادہ طویل بھی ہے، ہم اپنی اس کتاب میں اس کی گنجایش نہیں نکال سکتے، مگر اسی "شر" سے چونکہ "خیر" کا ایک پہلو بھی پیدا ہوا اس لئے چند جوہری حقائق کا تذکرہ مفید ہوگا۔

اسی زمانہ میں جب "ایسٹ انڈیا کمپنی" کا نقاب حکومت کے چہرے سے ابھی اترا بھی نہ تھا، ہندوستان کے مختلف گوشوں میں اشاعت تعلیم کے نام سے مختلف ادارے مختلف خصوصیتوں کے ساتھ قائم ہونے لگے تھے، غیر مسلم آبادی کے لئے کلکتہ، پونا، بمبئی، بنارس وغیرہ شہروں میں جو تجربے خانے اس سلسلہ میں جاری کئے گئے، میرے دائرہ بحث سے ان کا قصہ خارج ہے، اس کے لئے لارڈ میکالے کا وہ خانگی پوشیدہ خط ہی کافی ہو سکتا ہے، جسے بڑی امیدوں کے ساتھ بطور بشارت کے اپنے والد کے نام لاٹ صاحب نے بھیجا تھا، جس میں لکھا تھا کہ

"اس تعلیم کا اثر ہندوؤں پر بہت زیادہ ہے، کوئی ہندو جو انگریزی دان ہے کبھی اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا" (ص ۱۳۸ مسلمانوں کا روشن مستقبل)

بہر حال ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے خصوصیت کے ساتھ اس نئی قائم ہونے والی حکومت نے تجربات کا جو سلسلہ شروع کیا تھا جہاں تک میرا خیال ہے ان کی ابتدا مسلمانوں کے دار السلطنت دلی کے اس کالج سے ہوئی جو پہلے شاید مدرسہ شاہجہاں آباد کے نام سے مشہور رہا، اور بعد کو دلی کے اسی کالج کا نام عربک کالج ہو گیا تھا، غالباً مسلمانوں کے لئے الگ تجربے خانے کی ضرورت

اسی لئے محسوس ہوئی، کہ جس راہ سے ہندوؤں کو اپنے ڈھب کا بنایا جارہا تھا، وہی راہ اس سلسلہ میں مسلمانوں کے لئے چنداں نتیجہ خیز نہیں ثابت ہورہی تھی۔

اپنے خط میں لارڈ میکالے نے ہندوؤں کا ذکر جس طریقہ سے کیا ہے خود ہی اس خیال کی تائید کے لئے کافی ہے، کچھ بھی ہو، دلی میں عربی کالج قائم کیا گیا، اور تجربوں کا جو سلسلہ اس کالج میں شروع ہوا اس کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے، کہ اس کالج کے قیام پر ابھی کل سولہ سال گذرے تھے، مسٹر ٹامسن نے اسی زمانے میں اسی کالج کے متعلق حکومت میں رپورٹ پیش کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

"یہ (یعنی دلی کالج) سولہ سال سے قائم ہے، اور اس عرصے میں بے شمار تجویزوں اور تحریکوں کا یکے بعد دیگرے تجربہ کیا گیا۔" (ص۹۶ مرحوم دہلی کالج)

سولہ سال کی محدود مدت میں "بے شمار تجویزوں اور تحریکوں کے تجربہ" کی آماجگاہ جو مدرسہ بنا ہوا تھا، بجائے تعلیم گاہ کے "تجربہ خانہ" ہی کے نام سے موسوم ہونے کا شاید زیادہ مستحق ہے، یہ تجربے کئے جاتے تھے اور ان کے نتائج حکومت کے سامنے پیش ہوتے رہتے تھے، تفصیلات کے لئے تو دلی کالج کی متعلقہ رپورٹوں اور ان کتابوں کو پڑھئے جن میں اس کالج کی تاریخ بیان کی گئی ہے لیکن مثلاً بعض رپورٹوں کے ان اقتباسات کو پڑھئے، اسی کالج کے صدر مسٹر بترو نے اپنی رپورٹ میں ایک دفعہ لکھا تھا

"نتیجہ یہ ہوا کہ ان علوم نے (جو دلی کالج میں پڑھائے جاتے تھے) اس تعصب اور تنگ خیالی میں جو محض عربی و فارسی کے طلبہ میں پائی جاتی ہے، تخفیف اور اعتدال پیدا کردیا ہے۔" ص۳۴

یہ ایک منفی اور سلبی اثر تھا جو مسٹر بترو کے نزدیک اس کالج کی تعلیم پر مرتب ہوا تھا، اور اس منفی و سلبی اثر کے ساتھ جو ایجابی و اثباتی نتیجہ اپنے تجربوں کا مسٹر بترو کو خوشگوار محسوس ہوا تھا اسی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہوئے کہ

"جو تعلیم مشرقی کالج کے نوجوانوں کو دی گئی ہے اس کا ایک "خوش گوار نتیجہ" یہ ہے"۔

یہ "خوش گوار نتیجہ" کیا تھا۔ ان ہی سے سنئے فرماتے ہیں۔

"وہ (یعنی مشرقی کالج میں تعلیم پانے والے نوجوان) بڑی مستعدی سے کوشش کر رہے ہیں، تاکہ "تلاش حق" میں زیادہ آزادی سے کام کر سکیں"۔ (مرحوم دہلی کالج ص۳۴)

ظاہر ہے کہ "حق کی تلاش" کا جذبہ حق سے محرومی کے احساس کے بعد ہی پیدا ہو سکتا ہے، پھر مسٹر بٹرو نے دلی کالج کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس میں اور مسٹر میکالے نے جدید نظام تعلیم کے تحت تعلیم پانیوالے ہندوؤں کے متعلق جو رپورٹ کی تھی کہ ان میں کوئی

"اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا"۔

دونوں میں سوچئے کیا فرق تھا، بس روح تو ایک ہی تھی، البتہ اس روح کے پیدا کرنے کے لئے دلی کالج میں جو قالب اختیار کیا گیا تھا، وہ دوسرے مقامات کی قائم ہونے والی تعلیم گاہوں سے کچھ مختلف تھا، سنہ ۱۸۴۶ء میں دلی کالج کے متعلق ۔۔۔ کی طرف سے جو رپورٹ حکومت میں پیش ہوئی تھی، اسی رپورٹ پر ریمارک کرتے ہوئے دفت کے لفٹنٹ گورنر نے لکھا تھا کہ

"ہم ان نوجوانوں کو زیادہ تر اپنی درس گاہ (عربی کالج دہلی) کی روشن خیالی کے اثر میں لانے کے خواہش مند ہیں جو آئندہ چل کر اپنے اہل وطن کی نظروں میں اپنی قدیم عالمانہ زبانوں کے فاضل سمجھے جائیں گے"۔ (ص۱۰۳ مرحوم دہلی کالج)

اسی سے دلی کے اس عربی کالج کے بیرونی قالب کے خدوخال کو آپ پہچان سکتے ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ باطنی روشن خیالی کے ساتھ چاہا گیا تھا کہ مولوی اور عالم ہونے کے لئے ہندوستان کے عوام جن چیزوں کو ضروری سمجھتے ہیں ان سے بھی ان کے ظاہر کو آراستہ کیا جائے میکالی نے تو لکھا تھا کہ

"خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں۔ لیکن عربی کالج کی مشین میں جو کل پرزے ڈھالے جاتے تھے ان کے متعلق یہ طے کیا گیا تھا کہ "صورت و شکل

اور دیگر بیرونی لوازم کے حساب سے تو وہ مولوی[ل] ہوں" اور "مذاق ورائے سمجھ کے اعتبار سے آزادی کے ساتھ حق کی تلاش کرنے والی جماعت ہو"

اسی ضرورت (یعنی قدیم عالمانہ زبانوں کے فاضل اپنے اہل وطن کی نظروں میں اسی کالج سے فارغ التحصیل ہونے والے حضرات سمجھے جائیں) اسی کا اقتضا ریہ ہوا کہ گو کالج ہمیشہ یوروپین لوگوں کی سخت اور کڑی نگرانی میں رہا۔ مگر ملک کی عالمانہ زبانوں کا فاضل بنانے کے لئے ان زبانوں کے جاننے والوں اور پڑھانے والوں کی طرف بھی توجہ کی گئی، جو افلاک سے گر کر خاک پر لوٹ رہے تھے، ان کی تنگ دلی اور تنگ نظری سے خطرہ بھی حکومت محسوس کرتی تھی مگر بغیر ان کے کام کے چلنے کی کوئی دوسری صورت بھی نظر نہیں آتی تھی، یہ سوچ کر جیسا کہ مسٹر بترد نے لکھا ہے

"جب موجودہ نسل کے اساتذہ رخصت ہو جائیں گے اور اُن کے جانشیں وہ ہونگے، جنہوں نے جدید طریقے پر تعلیم پائی ہے، تو روشن خیالی میں اور بھی زیادہ ترقی ہو جائے گی" (۳۸ مرحوم دہلی کالج)

غریب مولویوں کو منھ لگانے کا ارادہ کیا گیا، جہاں تک معلومات اب تک فراہم ہوئے ہیں، ان کی مدد سے میں اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ دلّی کے اس کالج میں غالباً سب سے پہلے جس مولوی کا تقرر ہوا، وہ مولانا مملوک العلی کے استاد مولانا رشید الدین خاں صاحب مرحوم تھے، آثار الصنادید میں سرسید احمد خاں مرحوم نے مولوی رشید الدین خاں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابتدا میں حکومت کی طرف سے قضا کا عہدہ ان کے آگے پیش کیا گیا، لیکن اپنے تدریسی مشاغل کی وجہ سے آپ نے انکار فرما دیا تب :۔

---

[ل] چاہئے تو یہی تھا کہ مولوی کے ساتھ پنڈت کے لفظ کا بھی اضافہ اس موقعہ پر کیا جاتا، کیونکہ دلی کے عربی کالج میں عربی فارسی کے ساتھ سنسکرت اور ہندی کی تعلیم کا نظم بھی کیا گیا تھا، لیکن جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت اور ہندی کی طرف جیسی توجہ اس کالج میں چاہئے تھی نہیں کی جاتی تھی، بلکہ مختلف اوقات میں سنسکرت اور ہندی کو کالج سے خارج کر دینے کی تجویزیں بھی ہوتی رہیں، خود اس کالج کے نام میں "عربی" کا لفظ جو پایا جاتا ہے یہی غمازی کر رہا ہے کہ نشانے پر کن لوگوں کو رکھا گیا تھا ۱۲

"بہ تقاضائے احیان مختلفہ حکام کی طرف سے وقوع میں آیا اور بجد رہے
بہ سبب کمال قناعت کے ایک امر جزدی پر قانع ہو کر عہدۂ مدرسی
شاہ جہاں آباد قبول فرمایا۔" (ص ۵ ج ۳ آثار الصنادید)

بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں صرف عربی و فارسی وغیرہ کی پرانی نصابی کتابوں کی تعلیم سے اس مدرسہ کی ابتدا کی گئی۔ لیکن کالج کے قیام کا جو حقیقی نصب العین تھا اس کو اس سے قریب کرنے کے لئے کافی احتیاط سے تدریجی قدم اٹھایا جاتا تھا۔

اگرچہ ان کتابوں کا اس زمانہ میں پتہ نہیں چلتا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں چاہا گیا تھا کہ عربی ہی زبانوں میں ان کتابوں کو مغربی زبانوں سے ترجمہ کر کے پڑھایا جائے، جن سے آزادی کے ساتھ تلاشِ حق کا جذبہ طلبہ میں پیدا ہو، افسوس ہے کہ اس مسئلہ کی طرف توجہ نہیں کی گئی، ورنہ اس قسم کی شہادتیں مل سکتی تھیں مثلاً مولوی عبدالحق[۵۷] صاحب نے اپنی کتاب "مرحوم دہلی کالج" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ

"ایک کتاب کے عربی ترجمہ کے لئے تیس ہزار روپے کی منظوری دی گئی۔"

مولوی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"بہت سا روپیہ ان کتابوں کے چھاپنے پر صرف ہوتا تھا۔"

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان میں مغربی علوم و فنون کی کتابوں کے تراجم نہ صرف کرائے گئے، بلکہ یہ ترجمے چھاپے بھی گئے، پھر مولوی صاحب نے اسی سلسلہ میں جو یہ خبر دی ہے کہ

"اگر ترجمہ ایسا ہوتا جو سمجھ میں نہ آتا تو اس کی تشریح کے لئے مترجم کو معقول تنخواہ پر ملازم رکھ لیا جاتا تھا۔" ص ۱۶

جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ کتابوں کو نصاب میں شریک کر کے سمجھنے اور سمجھانے کی

[۵۷] مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو مصنف مرحوم دہلی کالج ۱۲ (محمد طیب غفرلہٗ)

کوشش بھی کی جاتی تھی،

مگر افسوس ہے کہ ان کتابوں کا یہ حشر کیوں ہوا کہ اس وقت تک کسی کتب خانہ میں بھی مجھے اس سلسلے کی کوئی کتاب باوجود تلاش کے نہ مل سکی۔ شاید اس کی وجہ وہی ہو جو مولوی عبدالحق صاحب نے لکھی ہے کہ

"ان کتابوں کی عام طور پر مانگ نہ ہوتی تھی، اسی لئے ان کا سارا بار الماریوں پر تھا۔" ص۲۱

غالباً ان ہی الماریوں سے یہ کتابیں ان کیڑوں کے پیٹ میں منتقل ہوگئیں جن کی گذر بسر کا بڑا ذریعہ یہی علمی سرمائے ہیں۔

عربی زبان کے لباس میں مانوس بنا لینے کے بعد عربی زبان کو ترک کرکے اردو زبان کا انتخاب جدید علوم و فنون کی کتابوں کے لئے کیا گیا، اردو کے ساتھ ہندی خط اور زبان کی بھی تعلیم اس مدرسہ میں طلبہ کو دی جاتی تھی۔

سچی بات تو یہ ہے کہ مجموعی حیثیت سے ہندوستان کیلئے جو مناسب ترین نصاب ہو سکتا تھا، اس کی بڑی اچھی ابتدا دلی کے اس کالج میں آج سے سوا سو برس پہلے ہو چکی تھی لیکن کاش! یہ سب کچھ علم کے لئے ہوتا، مگر سدی کا مطلب جیسا کہ معلوم ہو چکا دوسرا تھا، شاید یہی چیز اس مفید ترین نصاب کے مقبول اور مرجح ہونے میں مانع ہوئی جس پر تھوڑی بہت بحث آئندہ بھی کی جائے گی۔[ع]

---

ع خاکسار نے اپنی کتاب نظام تعلیم و تربیت میں وحدت نصاب کے جس نظریہ کو پیش کیا ہے، تقریباً اس کا حاصل بھی یہی ہے لیکن دلی کالج میں مولویوں کو مسٹر بنانے کے لئے یہ نصاب نافذ کیا گیا تھا اور ہم مسٹروں کو مولوی بنانے کے لئے چاہتے ہیں کہ نصاب کی دوئی کو ختم کرکے مشرقی و مغربی اسلامی و غیر اسلامی علوم کے نصاب کو متحد کر دیا جائے دلی کالج کے قیام کی جو غرض تھی اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ اول سے آخر تک اس کالج کو ہمیشہ انگریزوں کی براہ راست نگرانی میں رکھا گیا، سب سے پہلے ناظم یا سپرنٹنڈنٹ اس کے مسٹر ٹیلر تھے پھر مسٹر تبروس، ان کے بعد ڈاکٹر اسپرنگر، پھر مسٹر کارگل، اسکے پرنسپل رہے۔ آخر غدر سے پہلے مسٹر ٹیلر کا تقرر پرنسپل کے عہدے پر ہوا، اور ان ہی پر کالج کا پہلا دور ختم ہو گیا، ظاہر ہے کہ مسٹروں کی نگرانی میں کسی قسم کی درسگاہ بھی چلائی جائے، نکلنے والے اس سے مسٹر ہی بن بن کر نکلیں گے۔ اس سے غیر معمولی فرق نتائج میں پیدا ہو جاتا ہے ۱۲

خیر یہ قصہ تو طویل ہے کہنا یہ ہے کہ "اپنے اہل وطن کی نظروں میں قدیم عالمانہ زبانوں کے فاضل سمجھے جائیں" اس مقصد کی تکمیل کے لئے مولویوں کا اور ذیلی طور پر اس کالج میں چند پنڈتوں کا تقرر بھی عمل میں آیا۔

مولویوں کے سلسلے میں صدارت کی خدمت جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، مولانا رشید الدین کے سامنے پیش کی گئی، اور اصرار بلیغ کے بعد مولانا نے اس خدمت کو قبول فرمایا۔ ۱۷۹۲ء جو مولوی عبدالحق صاحب کی تحقیق کی رو سے اس کالج کے قیام کا سن ہے، اس وقت مولانا مملوک العلی صاحب کی عمر تقریباً پانچ سال کی تھی، اس لئے یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ دلی پہنچ کر مولانا رشید الدین خاں کے حلقہ درس میں مولانا مملوک العلی اسی زمانہ میں شریک ہوئے، جب دلی کالج میں مع الفار رشید الدین خاں کام کر رہے تھے۔ سر سید احمد خاں نے مولانا رشید الدین کے ذکر میں لکھا ہے کہ

"ازبسکہ اپنے اوقات کو بیشتر تربیت مستفیضان کمال میں مصروف رکھتے تھے"۔ ص۵۱

کچھ اس سے بھی، اور اس زمانہ کا جو عام دستور تھا اس کی بنیاد پر بھی یہ سمجھنا چاہئے کہ علاوہ کالج کے اوقات کے یقیناً مولانا رشید الدین خاں خانگی طور پر بھی لوگوں کو پڑھایا کرتے تھے، اسی لئے یقینی طور پر تو یہ کہنا مشکل ہے کہ مولانا رشید الدین صاحب سے مولانا مملوک العلی نے جو تعلیم حاصل کی اس کی نوعیت کیا تھی۔ کالج میں باضابطہ شریک ہو کر مولانا سے مستفید ہوئے تھے یا گھر پر پڑھتے تھے، جہاں تک قرائن و قیاس کا اقتضاء ہے میرا خیال یہی ہے کہ مولانا مملوک العلی کالج میں بھی شریک تھے اور خارج اوقات میں بھی پڑھا کرتے تھے۔ سید صاحب نے مولانا مملوک العلی کو شاگرد رشید مولانا رشید الدین خاں جو قرار دیا ہے، اس سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، نیز جس معاشی انقلاب کے شکار مسلمان اس زمانہ میں ہو گئے تھے، اس کا اقتضاء بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ دلی کالج کے تعلیمی وظائف سے مستفید ہونے کے مواقع جن لوگوں کو حاصل تھے وہ اس غنیمت باردہ سے کیوں نہ فائدہ حاصل کرتے۔

بہرحال میرا خیال یہی ہے کہ مولانا مملوک العلی کو ایام طلب علم میں بھی نئے رنگ ڈھنگ اور

نئے قوانین و قواعد والی اس درسگاہ کے تجربہ کا موقعہ بھی میسر آیا اور بعد کو جیسا کہ سرسید احمد خاں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، مولانا مرحوم اس کالج کے تدریسی اسٹاف میں شریک ہو گئے۔

سید صاحب کے الفاظ مولانا مملوک العلی کے متعلق یہ ہیں کہ

"اگرچہ چودہ پندرہ برس سے مدرسہ شاہ جہان آباد میں عہدہ مدرسی رکھتے تھے۔ لیکن اب کئی سال سے سرگروہ مدرسین ہیں، کہ مدرسی اول اس سے عبارت ہے۔" صنہ

جس کا مطلب یہی ہوا کہ شروع میں مولانا مملوک العلی کا تقرر صدر مدرسی پر نہیں ہوا، بلکہ ہیڈ مولوی کی ماتحتی میں مددگاروں کی حیثیت سے اس کالج میں چند مولوی جو کام کرتے تھے[1] ان ہی مددگاروں میں ایک مددگار مولوی مدرس کی حیثیت کالج میں آپ کی تھی، لیکن چودہ پندرہ برس بعد اپنی خاص امتیازی قابلیت اور شاید اس لئے بھی کہ مولانا رشید الدین خاں کے رشید شاگرد شہر دہلی میں وہی سمجھے جاتے تھے، مولانا رشید الدین کی وفات کے بعد آپ ہی کا انتخاب صدارت کی اس جلیل خدمت کے لئے ہوا۔

جیسا کہ میں نے حاشیہ میں لکھا ہے قطعی طور پر یہ کہنا تو دشوار ہے کہ ابتدائی تقرر مولنٰنا مملوک العلی صاحب کا کالج میں جب ہوا تو اس وقت آپ کی تنخواہ کیا تھی، لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ پچاس پچاس روپئے کی دو اسامیوں میں سے کسی ایک اسامی پر آپ کا تقرر ہوا تھا تو گو اس زمانہ کے لحاظ سے اس تنخواہ کی ظاہر ہے کہ کوئی اہمیت نہیں ہے، اب جبکہ کالج

---

[1] مولوی عبدالحق صاحب نے "مرحوم دہلی کالج" میں لکھا ہے کہ ہیڈ مولوی جس کی تنخواہ ایک سو بیس روپیہ ماہوار تھی، ان کے سوا دتی کالج میں پچاس پچاس روپے کے دو مولویوں کے سوا پچیس پچیس، تیس تیس روپے ماہوار پانے والے اور بھی چند مولوی تھے، یقینی طور پر تو اس کا پتہ نہ چلا کہ مولانا مملوک العلی کا تقرر مددگار مدرسی پر جب ہوا تھا تو اس وقت ان کی تنخواہ کیا تھی مگر بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ابتدائی تقرر غالباً پچاس روپیہ ماہوار والی جگہ پر ہوا ہوگا، اسی لئے صدارت کے عہدے پر ترقی میں آسانی ہوئی کہ مقابلہ میں صرف ایک ہی آدمی تھا ۱۲

کے چپراسیوں کی بھی عام تنخواہ پچاس ہی کردی گئی ہے تو پچاس روپے پانے والے مدرس غریب کو کون پوچھتا ہے، لیکن اجڑی دلّی کے جس زمانے کا یہ قصہ ہے۔اس زمانہ میں یہ مقدار بہت تھی۔

بقول مولوی عبد الحق صاحب دلی کالج کے طلبہ پر جب تعلیمی فیس حکومت کی طرف سے عائد کی گئی اور حکم دیا گیا کہ

"۳۵ روپئے ماہوار سے زیادہ جن طلبہ کے والدین کی آمدنی ہو ان سے یہ فیس وصول کی جائے، تو اس اصول کے عمل درآمد سے معلوم ہوا کہ شاید ہی کوئی شخص ایسا ہوگا جس کی آمدنی ۳۵ روپئے ماہوار سے زیادہ ہو"

مولوی صاحب نے پرانے وثائق سے اسی کے بعد یہ شہادت نقل کی ہے کہ

"جملہ تعداد طلبہ کی ۳۴۴ تھی اس میں صرف ۱۶ طالب العلم ایسے تھے جو فیس ادا کرتے تھے"

آخر میں خود بھی لکھتے ہیں کہ

"اس سے اہل دہلی کی خوش حالی کا اندازہ ہوسکتا ہے" (مرحوم دہلی کالج ص۱۰)

ہندوستان کی راجدھانی کے رہنے والوں کی اس عجیب و غریب معاشی پستی کے زمانے میں ظاہر ہے کہ پچاس روپے ماہوار کی تنخواہ ہی نے جیسا کہ ظاہر ہے "مولانا مملوک العلی کو ممتاز کردیا ہوگا" پھر مددگاری سے ترقی کر کے مولانا مرحوم بقول سرسید احمد خاں "سرگروہ مدرسین کہ مدرسی اول اس سے عبارت ہے"، کی غیر معمولی خدمت پر جب فائز ہوئے ہوں گے، تو خود ہی سوچنا چاہئے کہ مالی اعتبار سے اسی دلی میں وہ کیا کچھ نہ سمجھے جاتے ہوں گے، جہاں ۳۵ روپئے ماہوار سے زیادہ آمدنی رکھنے والوں کا حال آپ پڑھ چکے، اور جب پایۂ تخت کے باشندوں کا یہ حال تھا، تو نانوتہ جیسے قصبوں کے رہنے والوں کی زبوں حالیوں کا اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے، طالب العلم کی شکل میں جو دلی آیا تھا، اور اسی شہر میں جو لٹ لٹانے کے بعد بھی اس وقت تک نام نہاد ہی سہی مگر تخت شاہی کا مستقر تھا،

اسی شاہی مستقر کی سب سے بڑی سرکاری تعلیم گاہ میں سرگروہ مدرسین ہو جانا، اور ماہوار آمدنی کی جس تعداد کا تصور بھی اس شہر کے رہنے والوں کے لئے دشوار تھا، اسی ماہوار کے حاصل کرنے میں اسی طالب العلم کا کامیاب ہو جانا دلّی کے لئے نہ سہی مگر نانوتہ کیلئے ایک بڑے اہم تاریخی واقعہ کی حیثیت اگر اس نے حاصل کر لی ہو تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے کچھ بھی ہو، مولانا مملوک العلی صاحب کی مالی برتری خواہ اس زمانہ کے اعتبار سے کتنی ہی ناقابل لحاظ ہو۔ لیکن جس عہد کا یہ واقعہ ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ نانوتہ کی عام آبادی اس برتری سے متاثر ہوئی تو میرے اس خیال کو بے بنیاد ٹھہرانے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی۔

صرف تنخواہ ہی نہیں بلکہ مولوی عبد الحق صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس کالج میں امتحان کا جدید طریقہ بھی نافذ ہو چکا تھا، یعنی ممتحنوں سے پرچے بنوائے جاتے تھے، مثلاً ایک موقع پر مولوی صاحب نے لکھا ہے،

"ریاضیات اور تاریخ کے پرچے گورنمنٹ نے مرتب کرا کر
بھیجے، باقی پرچے کالج کے مدرسین نے تیار کئے" ص۴۵

قطع نظر اس سے کہ "کالج کے مدرسین" میں کوئی وجہ نہیں کہ مولانا مملوک العلی ہی نہ ہونگے مولوی عبد الحق نے اسی موقعہ پر تصریح بھی کی ہے۔

"باقی جماعتوں کے امتحان مولوی مملوک علی نے اور
انگریزی کا قائم مقام پرنسپل نے لیا" ص۵۱

جس کا مطلب یہی ہوا کہ امتحان کے معاملہ میں قائمقام پرنسپل اور مولانا مملوک علی کی حیثیت اس کالج میں گویا مساوی سمجھی جاتی تھی۔

اگرچہ صراحةً اس کا پتہ تو نہ چلا کہ دلی کالج میں امتحانی کاروبار کا یہ سلسلہ موجودہ یونیورسٹیوں کی طرح کاروباری طریقہ پر جاری تھا۔

لیکن اپنے سارے اصول وضوابط میں دلی کا یہ کالج جب کالج ہی تھا تو "امتحان" کے میدان میں بھی کالج کی اس تجارتی خصوصیت سے کیوں سمجھا جائے کہ اس کو محروم رکھا گیا ہوگا

اسی کے ساتھ اس کو بھی سوچئے، کہ ان ہی دنوں میں یعنی جب دہلی کا یہ کالج ترقی کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ "دہلی ورناکیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی یا انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنہ ملکی" کی بنیاد بھی پڑ چکی تھی جس میں علاوہ اراکین کے شاہ اودھ اور ان کے شاہی خانوادے کے امراء کی مالی امدادیں بھی شریک تھیں، حیدرآباد کے امیر کبیر شمس الامرا، نیز سر سالار جنگ، راجہ رام بخش وغیرہ کے بھی اس سلسلہ میں چندے وصول کئے گئے تھے اور معقول معاوضہ لیکر انگریزی، عربی، سنسکرت وغیرہ علمی زبانوں سے کتابیں ترجمہ کرائی جاتی تھیں۔

اور گو سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں مولانا مملوک العلی کے متعلق لکھا ہے، کہ

"انشار نظم ونثر کی طرف کم توجہ ہے اگر ایسا فاضل اس طرف متوجہ ہوتا، تو یقین ہے کہ اس فن میں اقران وامثال سے ممتاز ہوتا" ص ۲

لیکن باوجود کم توجہی کے مولانا مملوک العلی کے ایک معاصر بزرگ مولوی کریم الدین اپنی کتاب طبقات الشعرار میں یہ اطلاع دیتے ہیں کہ مولانا مملوک العلی نے

"تحریر اقلیدس کا ترجمہ اردو میں چار مقالہ اول کا اور دو مقالوں آخر گیارھویں اور بارھویں کا کیا ہے" (ص ۱۴۹ مرحوم دہلی کالج)

یعنی اقلیدس کے چھ مقالوں کا ترجمہ مولانا مرحوم نے اردو میں کیا تھا، نیز مولوی عبد الحق صاحب اسی کے اوپر اس پر مزید اضافہ یہ کرتے ہیں کہ

"مولوی صاحب (مولانا مملوک العلی) نے سنن ترمذی کا ترجمہ بھی اردو

---

لہ مرحوم دہلی کالج سے یہ معلومات ماخوذ ہیں، مولوی عبد الحق صاحب نے لکھا ہے کہ ترجموں کے مسودے بہ شرح ۲ تا ایک روپیہ فی صفحہ ابتدا میں خریدے جاتے تھے، بعد کو طے ہوا کہ ادبی وتاریخی کتابوں کے لئے فی صفحہ ۲ اور سائنس وفلسفہ کے لئے فی صفحہ ۱۰ شرح مقرر کی جائے، دیکھو کتاب مذکور ص ۱۲

میں کیا تھا" ص۱۴۹

بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ براہ راست تصنیف و تالیف کا خاص ذوق مولٰنا مملوک العلی نہیں رکھتے تھے، لیکن مذکورہ بالا انجمن ہی کے حکم اور تقاضے سے ترجمہ کے یہ دونوں کام مولانا نے انجام دیئے۔ افسوس ہے کہ آج یہ دونوں کتابیں ناپید ہیں، ان کی صحیح ضخامت کا پتہ نہ چل سکا۔ لیکن اتنی بات تو بہر حال ماننی ہی چاہئے کہ آمدنی کا ایک ذریعہ ترجمہ کا یہ کام بھی ہوگا۔

مولانا مملوک العلی کے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب نے سوانح قدیم میں لکھا ہے کہ

"بعد انتقال والد مرحوم کے احقر اپنے مکان مملوک میں جوکہ کوچہ چیلان میں تھا جارہا" ص۲۹

آگے کی عبارت سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ مکان معمولی نہ تھا، بلکہ اس میں بالاخانہ بھی تھا۔ خود یہ بھی مولانا مملوک العلی کی مالی رفاہیت و وسعت کی دلیل ہے اور نانوتہ جیسی آبادی کو زیر اثر لانے کے لئے قدرت کا یہی انعام اور اس کی طرف سے بخشا ہوا یہ امتیاز کافی تھا، مگر بات اسی حد پر ختم کب ہوتی ہے، بعد والوں نے نہیں، بلکہ مولانا مملوک العلی کے زمانہ کے مصنفوں کی کتابوں میں ہمیں جب اس قسم کی شہادتیں ملتی ہیں، مثلاً مولوی کریم الدین صاحب یہ لکھتے ہوئے کہ

"عمر ان کی (یعنی مولانا مملوک العلی کی) ۱۸۴۳ء میں "ساٹھ برس کی ہوگی" (مرحوم دلی کالج) ص۱۴۹

آگے مولانا کی خصوصیتوں کو گنواتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ

"بہت خندہ پیشانی، اور عقل مند و ذکی و ذہین اور تیز فہم اور محقق و مدقق ہیں "

ان اجمالی صفات کے ساتھ وہی بیان کرتے ہیں کہ

"فارسی اور اردو، اور عربی تینوں زبانوں میں کمال رکھتے ہیں، ہر ایک علم و فن میں جو ان زبانوں میں ہے مہارت تامہ ان کو حاصل ہے "

اور آخر مولانا کے ان ہی معاصر مصنف کی شہادت یہ ہے کہ

"ایسے فاضل بے بدل بہت کم ہوتے ہیں، اور واقع میں بنائے مدرسہ عربی (دہلی عربی کالج) ان کی ذات سے مستحکم ہے۔"

ان ہی کے الفاظ یہ بھی ہیں کہ

"مدرسہ میں ان کی ذات بابرکات سے اتنا فیض ہوا ہے کہ شاید کبھی کسی زمانہ میں کسی استاد سے ایسا ہوا ہو۔"

"المعاصرۃ اصل المنافرۃ" عربی کی مشہور ضرب المثل ہے، "سخن گستران پیشین" میں "محویت" دنیا کا پرانا قاعدہ ہے۔ "درزمانہ تست" بے قدری کا ہمیشہ بڑا اہم سبب اہل کمال کے لئے ثابت ہوا ہے، مگر آپ دیکھ رہے ہیں، ہندوستان کے دارالسلطنت میں بیٹھ کر ہندوستان کے ایک زندہ عالم کے متعلق اس کا ایک ہم عصر مصنف جب اپنے احساسات کو مذکورہ بالا الفاظ میں ظاہر کر رہا ہوگا، تو اس کے علمی و نظری امتیازات کے متعلق خود اس کے مولد و موطن یعنی نانوتہ پر اس کا کیا رد عمل ہوتا ہوگا۔

میں نے جو یہ دعویٰ کیا تھا کہ نانوتہ کی آبادی کو ایک ولی اللہی دماغ کے نیچے اس زمانے میں قدرت کا ہاتھ لے آیا تھا، اس کا یہی مطلب تھا۔

واقعہ یہ ہے جیسا کہ مولانا مملوک العلی کے دوسرے دیکھنے والے یعنی سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید میں یہ گواہی دی ہے کہ

"سیرت و سریرت میں "درویشانہ" تھے۔"

مگر بجائے سیرت و سریرت کے صورت یعنی مولانا کی ظاہری وضع و طریقہ سید صاحب ہی کا بیان ہے کہ وہ

"نری دنیاداروں کی ہے"۔

ممکن ہے کہ سید صاحب کے ان الفاظ سے مولانا مملوک العلی کے عقیدت مندوں کے قلوب کو کچھ اذیت محسوس ہوئی ہو۔ مگر میرے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں ہے، "سریرت

وسیرت" کو محفوظ کر لینے کے بعد شرعی حدود کی پابندی کرتے ہوئے اگر کسی خاص پیشہ کے پیشہ وروں کی ظاہری شکل وصورت کی پابندی کو اپنے لئے کوئی ضروری نہیں قرار دیتا تو پیشہ ورانہ اعتراض تو اس پر ہو سکتا ہے، مگر دین کی طرف سے خلاف ورزی کا الزام قائم کرنے والے شاید دین کے خود مجرم بن جاتے ہیں۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مولویوں کی ٹیپ ٹاپ، اور جبہ ودستار کے طمطراق سے مولانا کو فطرۃً مناسبت نہ تھی۔ ان کے دوسرے معاصر مولوی عبدالکریم صاحب نے اپنی ایک اور کتاب جس کا نام "قرائد الدہر" ہے، اور عربی زبان کے شعراء کا یہ ایک مبسوط تذکرہ ہے، اس میں بھی مولانا مملوک العلی کا تذکرہ کرتے ہوئے جو یہ لکھا ہے کہ

"باوجود کثرت علم وفضل کبھی وعظ عام نہیں کیا"

اس سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے کہ دوسروں پر مولویت اور پیشوائیت کا اثر قائم ہو، کچھ اس قسم کی چیزوں سے مولانا کنارہ کش تھے۔

سچ پوچھئے تو مولانا مملوک العلی کو بجائے دل کے "ولی اللٰہی دماغ" قرار دینے کی بڑی وجہ یہی ہوئی، ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ جن خصوصیات اور نشانیوں کو دیکھ کر ماننے والے آدمی کو روحانیت وباطنی راہوں کا سالک ومرشد مان لیتے ہیں۔ بظاہر ان چیزوں سے مولٰنا مملوک العلی صاحب اپنے آپ کو خالی رکھنے کی کوشش کرتے تھے، اسی لئے بجائے تقدس وتشیخ کے ان کے علم وتحقیق، فکر ونظر کی گہرائیوں سے لوگ زیادہ متاثر نظر آتے ہیں، دنیا ان کو اسلامی علوم کا متبحر فاضل اور وقت کا یگانہ عالم سمجھتی تھی۔

اردو زبان جس کے متعلق مہارت تامہ کا دعویٰ ان کے معاصر مولوی عبدالکریم صاحب نے بھی کیا ہے، یہ بھی آپ پڑھ چکے کہ عربی کالج میں اردو زبان کا امتحان بھی مولٰنا ممدوح لیا کرتے تھے، اگرچہ علماء دین کے عام مذاق کے مقابلہ میں ہم اردو زبان کے ساتھ مولانا کی اس دلچسپی کو بھی ان کی خصوصیت قرار دے سکتے ہیں، لیکن اس سے بھی زیادہ عجیب بات وہ ہے جس کا اظہار مولوی عبدالکریم

صاحب ہی نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ

"جس فن کی کتاب اردو زبان میں انگریزی سے ترجمہ ہوتی ہے اُسکے اصل اصول سے بہت جلد اُن کا ذہن چسپاں ہوجاتا ہے گویا اس فن کو اول ہی سے جانتے تھے" (ص۱۴۵ مرحوم دہلی کالج)

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ یورپ کے جدید علوم وفنون کے سمجھنے اور اُنکی تہ تک پہنچنے کا مولانا کو صرف شوق ہی نہیں تھا، بلکہ اپنے اس شوق کو جہاں تک اُن کے امکان میں تھا اس کو پورا بھی کیا تھا، وہی شوق جس کا ذوق افسوس ہے کہ دینی مدارس کے علماء میں ابتک پیدا نہیں ہوا ہے، اور اس سے مولانا مرحوم کی جبلّت اور فکر وخیال کی آزادی، انصاف پسندی کا اندازہ ہوتا ہے، اس میں شک نہیں کہ جدید علوم وفنون سے دلچسپی میں عربی کالج کے ماحول کو ضرور دخل تھا، لیکن اس ماحول کے مفید پہلوؤں سے استفادہ کرنے میں جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں، نہ وقت کا تقلیدی رواج مانع ہوا، اور نہ علم کا زعم بے جا اس راہ میں رکاوٹ بنا، مولانا مملوک العلی کے اس خصوصی رجحان میں چونکہ مجھے ان تبدیلیوں کی جھلک نظر آتی ہے، جو دینی علوم کے تدریسی نظام میں بعد کو رونما ہوئیں۔ اسی لئے مولانا کی اس مذاقی خصوصیت کا میں نے ذکر بھی کیا ہے،

ورنہ ذکر تو نانوتہ کا اور ان امور کا ہو رہا تھا، جن سے تیرھویں صدی ہجری کے ابتدائی سالوں میں ضلع سہارنپور کا یہ قصبہ قدرتاً اثر پذیر ہو رہا تھا، ایک طرف مثیل سید شہید حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ العزیز کی شکل میں ولی اللہی قلب وضمیر کی روشنی وحرارت اس قصبہ کو گرما رہی تھی اور دوسری طرف مولانا مملوک العلی نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ولی اللہی دماغ تھا، جس کی علمی وعقلی عالی دماہی سربلندیاں ٹوٹی، اور چھوٹی ہوئی ہمتوں کے لئے نہوض وقیام کا پیغام بنتی چلی جارہی تھیں، نکوبت وادبار کے اس تاریک عہد میں مولانا مرحوم کا وجود عزت وراحت کی زندگی کے امکان کا قصبہ کے افسردہ خاطر، پژمردہ دل باشندوں کے آگے پیش کر رہا تھا، دہلی سے تھوڑے

تھوڑے دنوں کے وقفہ سے اپنے ایک ہم وطن کی کدوکاوش جدوجہد کے نتائج و ثمرات
دن دونی ترقیوں اور غیر معمولی عزت افزائیوں کی خبروں کی شکل میں ان کی ڈھارس بندھا رہا تھا
زمانہ تیزی کے ساتھ ان ہی حالات میں آگے کی طرف بڑھ رہا تھا، مولانا مملوک العلی اپنی عمر
کے چھیالیسویں سال میں قدم رکھ چکے تھے، اور حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ بھی ناسوتی
زندگی کے حساب سے پچیسویں منزل میں داخل ہو چکے تھے، یہ حال تو نانوتہ اور نانوتہ کے
باشندوں اور ان بزرگوں کا تھا، جن سے میرے نزدیک اس قصبہ میں "نئے نیوتہ" یا "جدید پیغام"
کی بنیاد قائم ہو رہی تھی،

اور نانوتہ سے باہر ہندوستان کے عام مسلمان اس "فاجعہ کبریٰ" کے شکار ہو کر تڑپ رہے
تھے، جو سرزمین ہند کے اسلامیوں کے لئے گویا "کربلائی حوادث" کا اعادہ تھا، جس گھرانے
کے پاک خون سے کربلا کی قربان گاہ سیراب ہوئی تھی، اسی گھرانے کے ایک فرزند سعید
یعنی حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ دودمان ولی اللہی کے چشم و چراغ مولانا اسمٰعیل شہید
اور دوسرے عاشقان پاک طینت کے ساتھ بالاکوٹ کے دامن کو لالہ زار بنا کر خود تو حیات جاوید
کے آشیانوں میں اپنا مسکن بنا چکے تھے، لیکن مسلمانان ہند امید کے اس بھڑکتے ہوئے چراغ
کے اچانک گل ہو جانے کے ساتھ ہی اپنی قومی زندگی کو موت کے تیرہ و تار گڑھے کے سامنے
کھڑی ہوئی پا رہے تھے۔ ان کی سیاسی جدوجہد اسی پہاڑی درے میں اپنی آخری سانس
بظاہر پوری کر چکی تھی اور کچھ ہند ہی نہیں بلکہ انیسویں صدی عیسوی کے اس عہد تک تمام دنیائے
اسلام کی عام زبوں حالیوں کو دیکھ دیکھ کر صرف مسلمان ہی یاس و ہراس میں مبتلا ہو کر اپنے
ڈراؤنے مستقبل سے سہم نہیں رہے تھے، بلکہ کامل گم گشتگی یا "ضلال مبین" کا ایسا گھپ اندھیرا
عالم اسلام پر چھایا ہوا تھا کہ

"اب اسلام صرف چند سالوں کا مہمان ہے"[1]

---

[1] موج کوثر مشنا مولانا محمد اکرام صاحب ایم۔ اے ۱۲

یہ یا اسی قسم کی پیشگوئیاں، اور بد فالیاں بازاریوں کی زبانوں ہی پر نہیں بلکہ زوئمر، کرومر اور میور جیسے ڈاکٹروں، اور لارڈوں کے قلم سے نکل نکل کر کاغذی صفحات پر ثبت ہونے لگی تھیں، امنگیں خصوصاً ہندوستان کے متعلق اس حد تک بلند ہو چکی تھیں کہ انڈیا کی سپریم کونسل کے باوقار رکن سر چارلس ٹریلیوین جو اسی ملک میں حکومت کی طرف سے گورنری کے عہدے پر بھی فائز ہو چکے تھے وہ یہ امیدیں باندھنے لگے کہ

"جس طرح ہمارے بزرگ کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہو گئے تھے اسی طرح یہاں (ہندوستان) میں بھی سب ایک ساتھ عیسائی ہو جائیں[1] گے۔"

سر چارلس ٹریلیوین نے اپنی مذکورہ بالا بد اندیشی کو درج کرتے ہوئے یعنی یہ لکھتے ہوئے کہ ہندوستان کا ہر باشندہ ایک ساتھ عیسائی ہو جائے گا۔ دعویٰ کیا تھا کہ

"یہ میرا یقین ہے"

مگر یہ تدبیری مقدمات کے نتائج تھے، جن کا عقلی ناخنوں سے جال بننے والے انتظار کر رہے تھے۔ لیکن تدبیر کرنے والی عقل کا جو پیدا کرنے والا ہے، اس کی تقدیر تدبیر کے ان گورکھ دھندوں پر ہنس رہی تھی، دیکھنے والے اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کا خواب دیکھ رہے تھے مگر جس کے قاہر ارادوں کے ساتھ ہر آرزو کی تکمیل وابستہ ہے وہ اپنی قیومی زندہ قوتوں کے ساتھ جاگ رہا تھا، لاہوتی تقدیر کے آگے ناسوتی تدبیروں کی رسوائیوں کا یہ بڑا دلچسپ تماشا تھا۔

مسلمانان ہند کے دین کی وہی روشنی جسے بالاکوٹ اوٹ میں دیکھنے والوں نے دیکھا تھا کہ ۱۲۴۶ھ ہجری میں غائب ہو گئی،

ابھی غیبوبیت کے اس حادثہ پر پورے دو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ ۱۲۴۸ھ ہجری میں اسی دین کا

"آفتاب تازہ"

---

[1] مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۱۲۳

اسی ہندوستان کے قصبہ نانوتہ کے نخلستانی افق سے پایا گیا کہ طلوع ہو رہا ہے، الہامی سنوح کے سوا اسے اور کیا سمجھا جائے کہ ۱۲۴۸ھ کے اعداد کو ابجد کے حروف پر منطبق کرنے کا ارادہ جب کیا گیا تو اس کا مجموعہ بھی

"خورشید حسین"

ہی نکلا، حسین کے گھر کی روشنی کو دین کا یہ آفتاب اس ملک میں واپس لائے گا، قدرت کی طرف سے الہام کئے ہوئے اس نام میں کون کہہ سکتا ہے اس کا اشارہ مخفی نہ تھا۔

یہ حضرت قاسم العلوم والخیرات سیدنا الامام الکبیر الاجل مولانا **محمد قاسم** النانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز کی ذات بابرکات تھی، جن کی خدمات و مساعی سے آگاہی حاصل کئے بغیر انیسویں صدی اور اس کے بعد کی صدیوں کا مورخ مسلمانان ہند کی دینی زندگی کے کسی پہلو کا بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ تصور بھی نہیں کر سکتا، آپ کے سامنے اسی تاریخی حقیقت کی آگاہی کا سامان ضروری تمہید کے بعد پیش کیا جاتا ہے۔ واللہ ولی الامر والتوفیق

# آغازِ سوانح

## نسب نامہ

سیدنا الامام الکبیر حضرت مولٰنا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کا نسبی سلسلہ شاہجہانی عہد کے عالم مولوی محمد ہاشم صاحب پر منتہی ہوتا ہے جو جاگیر پاکر نانوتہ میں آباد ہوئے، صدیقی شیوخ اس قصبہ کے عموماً ان ہی مولوی ہاشم کی اولاد میں ہیں، سوانح قدیم کے مصنف امام نے مولانا مرحوم کے شجرہ نسب کو درج کرتے ہوئے لکھا ہے۔

محمد قاسم بن اسد علی بن غلام شاہ بن محمد بخش بن علاء الدین بن محمد فتح بن محمد مفتی بن عبد السمیع، بن مولوی محمد ہاشم" ص۲۵

جس کا مطلب یہ ہوا کہ درمیانی سات واسطوں سے مولانا مرحوم کا نسب مولوی محمد ہاشم سے جاکر مل جاتا ہے، یہ تو گذر چکا کہ مولوی ہاشم صاحب کی جاگیریں چند دیہات تھے، لیکن حکومتوں کے انقلاب سے جیساکہ مصنف امام نے لکھا تھا،

مولوی محمد ہاشم صاحب کی پچھلی نسلوں کی معاشی حیثیت بگڑ گئی، اسی کے ساتھ یہ بھی تو سوچنا چاہئے کہ جاگیر خواہ جتنی بڑی بھی ہو، لیکن مسلمانوں میں وراثت کا جو عام قانون ہے، اس کی وجہ سے تقسیم ہو ہو کر جاگیریں اور جائدادیں عموماً اپنی بڑائی کو قدرتاً کھوتی رہتی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو حکومتوں کے انقلاب کا بھی اثر ہوا اور کچھ قانون وراثت کے تحت مولوی محمد ہاشم کی اولاد کی وہ حالت باقی نہ رہی، جو ابتدا میں تھی، ظاہر ہے کہ اس حادثے کے شکار جیسے دوسرے خاندان ہوئے اسی طرح مولٰنا محمد قاسم جس خاندان میں پیدا ہوئے تھے، اس خاندان کا بھی حصہ رسدی کے مطابق متاثر ہونا ناگزیر تھا۔

مگر اسی کے ساتھ مصنف امام ہی نے ایک خبر دی ہے جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ تقریباً چار پشتوں سے مولٰنا محمد قاسم کے خاندان میں اتفاقاً مسلسل یہ عجیب صورت

پیش آتی رہی کہ جائداد پر تقسیم کا عمل نہ ہو سکا یا ہوا تو بہت کم ہوا، مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"مولوی صاحب (یعنی خود مولانا محمد قاسم) کے لڑکوئی بھائی نہ تھا، ایک
بہن دیوبند میں اب زندہ موجود ہیں، اور ان کے (یعنی مولانا محمد قاسم
کے) والد اور دادا صاحب کے بھی کوئی بھائی نہ تھا" ص۲۶

بھائی نہ تھا، اس کا مطلب آگے وہی یہ بیان کرتے ہیں کہ

"بھائی پیدا ہوئے، مگر لڑکپن میں مر گئے"

مراد ان کی جیسا کہ آگے کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ خود مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے چند بھائی پیدا ہوئے، مگر بچپن ہی میں سب کا انتقال ہو گیا، افسوس ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ان بھائیوں کے نام کا پتہ نہ چلا، اسی طرح مولانا کے والد صاحب اور دادا صاحب کے متعلق بھی بھائی کے نہ ہونے کا دعویٰ مصنف امام نے جو کیا ہے اس کا مطلب خود ہی یہ بیان کرتے ہیں کہ مولانا محمد قاسم

"کے چچا جوانی میں مر گئے اور دادا کے بھائی تھے وہ کسی لڑائی میں
جوان عمر شہید ہوئے" ص۲۶

حاصل یہی ہوا کہ مولانا مرحوم کے والد صاحب اور دادا صاحب کے بھی اگرچہ بھائی تھے، لیکن جائداد کے وارث اور مالک ہونے سے بیشتر وفات پا گئے، مذکورہ بالا بیان میں مصنف امام نے مولٰنا کے جد امجد کے بھائی کے متعلق جو یہ اطلاع دی ہے کہ کسی لڑائی میں جوان عمر شہید ہوئے"، افسوس ہے کہ نہ اُن کے نام ہی کا پتہ چل سکا اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ جس جنگ میں شریک ہو کر وہ شہید ہوئے یہ جنگ کہاں کس کے مقابلہ میں ہوئی تھی، شہید کا لفظ جو ایک ذمہ دار عالم کے قلم سے نکلا ہے، بظاہر اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ شاید مسلمانوں سے یہ مقابلہ نہ تھا، نیز اس سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ سرفروشی اور جاں بازی غالباً اس خاندان کی کچھ موروثی خصوصیت تھی،

۱۳۱۱ھ میں

کچھ بھی ہو یہاں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ تین پشتوں تک تو یوں اس خاندان کی موروثی جائداد تقسیم ہونے سے بچی رہی - آگے چوتھی پشت یعنی مولٰنا محمد قاسم کے پردادا جن کا اسم گرامی محمد بخش تھا، پہلے بھی ان کے بھائی شیخ خواجہ بخش کا ذکر "نانوتہ کے اجمالی تبصرہ" کے سلسلے میں آچکا ہے، بتایا گیا تھا کہ شیخ خواجہ بخش نانوتہ سے منتقل ہوکر دکن چلے گئے، اور وہیں بودوباش اختیار کرکے دکنی ہی ہوگئے تھے۔

بہرحال ان ہی شیخ محمد بخش اور شیخ خواجہ بخش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"اور اوپر جو بھائی تھے ان کی اولاد پسری یہاں کوئی نہیں رہی، دکن میں ان کی اولاد ہوئی"۔ ص۲۶

مقصد ان کا شیخ خواجہ بخش سے ہے" جو دکن چلے گئے تھے، آگے اسی کے بعد ارقام فرماتے ہیں کہ

"بقاعدہ معروف وہ بھی (یعنی مولانا کے پردادا شیخ محمد بخش) گویا ایک ہی تھے"۔ ص۲۶

بقاعدہ معروف کے الفاظ کا مطلب غالباً یہی ہوسکتا ہے کہ دکن جیسے دوردراز علاقے میں چلے جانے کی وجہ سے اپنی موروثی جائداد سے استفادہ کا موقعہ شیخ خواجہ بخش کو نہ مل سکا، اور شیخ محمد بخش اور ان کے صاحبزادے شیخ غلام شاہ ہی کے قبضے میں ان کے ترکے کی بھی جائداد رہی۔ بلکہ مصنف امام نے شیخ خواجہ بخش کے متعلق جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"ان کی (یعنی شیخ خواجہ بخش کی) پسری اولاد یہاں کوئی نہیں رہی"۔ ص۲۶

اس فقرے میں "پسری" کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ خواجہ بخش کی دختری اولاد موجود تھی، ورنہ اس قید کے اضافہ کی ضرورت ہی کیا تھی، علاوہ اس کے مصنف امام نے اس سے پیشتر بھی ایک موقعہ پر اسی کتاب میں یہ اطلاع بھی دی ہے کہ انکے

والد یعنی مولانا ملوک العلی اور دیوبند کے رئیس شیخ کرامت حسین دیوبندی ان دونوں حضرات کے نانا بھی شیخ خواجہ بخش تھے، جس کا مطلب یہی ہوا کہ شیخ خواجہ بخش کی دختری اولاد نانوتہ اور دیوبند میں باقی رہ گئی تھی، واللہ اعلم بالصواب مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف امام نے جو یہ لکھا ہے کہ "بقاعدہ معروف مولانا محمد قاسم کے پردادا شیخ محمد بخش گویا ایک ہی تھے" اس سے شاید انہوں نے ادھر اشارہ کیا ہے کہ گو شیخ محمد بخش کے بھائی خواجہ بخش کی دختری اولاد دکن میں نہیں بلکہ نانوتہ اور نانوتہ کے قرب وجوار میں موجود تھی لیکن اس پر بھی ان کی حیثیت ایک ہی وارث کی باقی رہی، اور عہد انحطاط میں اس ملک کے مقامی باشندوں کے عام رجحانات سے متاثر ہو کر لڑکیوں کو باپ کی جائداد سے محروم کر دینے کا عمومی رواج خود مسلمانوں میں بھی جو پھیل گیا تھا، شاید "قاعدہ معروف" سے ان کا اشارہ اسی طرف ہو۔[۱]

صاف لفظوں میں اس لئے نہ لکھا کہ شیخ خواجہ بخش کی دختری اولاد میں مولانا محمد یعقوب خود بھی شریک تھے، آئندہ اس کا ذکر جو آئے گا کہ اپنی موروثی جائداد کی تقسیم کے سلسلے میں مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے نظر ثانی فرمائی اور تلاش کر کر کے حقداروں تک اُن کے جائز شرعی حقوق کے پہنچانے کی کوشش فرمائی۔ غالباً اسی قسم کی مروجہ بے احتیاطیوں کی بنیاد پر آپ نے اس طرز عمل کو اختیار کیا تھا۔

بہر حال اسباب خواہ کچھ ہوں، لیکن مصنف امام نے جیسا کہ لکھا ہے۔

"غرضکہ چار پشت تک مولنا منفرد تھے"

---

[۱] قصص الاکابر حجہ سیدنا المرشد التھانوی کے بعض ملفوظات کے ایک مجموعہ کا نام ہے، اس میں ایک ملفوظ یہ بھی ہے یعنی مولانا تھانوی نے فرمایا۔ "مولنا محمد قاسم فرمایا کرتے تھے کہ جلال آباد کی جائداد خرید نا جائز نہیں کیونکہ وہاں لڑکیوں کا حق نہیں دیا جاتا" (قصص از الہادی جمادی الاولی ۱۳۵۳ھ)
جلال آباد تھانہ بھون کے قریب ایک مشہور قصبہ کا نام ہے، اس سے میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ دختری حصہ کے اسقاط کا رواج جیسے ملک کے دوسرے علاقوں میں ہو گیا تھا، اسی طرح تھانہ نانوتہ وغیرہ کے قرب وجوار میں بھی معلوم ہوتا ہے کہ لوگ عادی تھے ۱۲

اتفاقاً اس خاندان میں جس میں مولانا محمد قاسم پیدا ہوئے تھے، یہی صورت پیش آئی، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھنا چاہئے کہ تقریباً ایک صدی تک اس خاندان کی موروثی جائداد بدستور بغیر کسی تقسیم کے ایک سے ایک تک منتقل ہوتی ہوئی پہنچتی رہی،

اس کا اندازہ تو مشکل ہے کہ بجائے خود اس موروثی جائداد کی قدر و قیمت کیا تھی[1]، لیکن اتنی بات تو بہر حال تسلیم ہی کرنی پڑے گی کہ اس ایک صدی میں شیوخ نانوتہ کے دوسرے خاندانوں کی ایسی جائدادوں کے مقابلہ میں جن میں تقسیم و تجزیہ کا عمل قانون وراثت کے تحت جاری رہا ہوگا، مولٰنا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کی اس موروثی جائداد نے گونہ امتیاز اس قصبے میں ضرور حاصل کر لیا ہوگا۔

اسی کے ساتھ جب ہم سوچتے ہیں کہ دیوبند کے غیر معمولی ثروت و دولت رکھنے والے دیوان والوں کے خاندان جن کی امارت رفتہ کی یادگار اس وقت تک دارالعلوم دیوبند کی فلک بوس عمارتوں کے سامنے اپنی امتیازی شان کو باقی رکھے ہوئے ہے، جس کا ذکر گذر چکا ہے۔

اسی کافی خوش حال اور فارغ البال خاندان سے مولٰنا محمد قاسم کے خاندان کے بزرگوں سے مسلسل رشتہ داریوں کا سلسلہ جاری تھا، آپ مجھ ہی سے سن چکے کہ شیخ کرامت حسین دیوبندی جو دیوبند کے اسی خاندان کے ایک مشہور رئیس گذرے ہیں، ان کی والدہ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے جد امجد کی حقیقی بھتیجی تھیں، یعنی

---

[1] حضرت والا کے حفید رشید، سعید مولانا محمد طیب صاحب رئیس الاہتمام دارالعلوم دیوبند نے دریافت کرنے پر اپنے گرامی نامہ میں جو کچھ ارقام فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کانگریسی حکومت کے نئے قوانین بننے سے پہلے کی غذائی ضرورتیں آپ کے پورے خاندان اور کثیر مہمانوں کی اسی جائداد کی پیداوار سے پوری ہوتی تھیں، اگرچہ اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ زمین کی کچھ مقدار کا بعد کو مولانا طیب صاحب کے والد ماجد حضرت حافظ محمد احمد صاحب مرحوم نے بھی اضافہ فرمایا تھا، لیکن اسی کے ساتھ اس کو بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حافظ صاحب مرحوم اپنی چند بہنوں کے ساتھ والد کی موروثی جائداد کے وارث ہوئے تھے غالباً اسی کی تکمیل جدید خریداری سے کی گئی تھی ۱۲

شیخ خواجہ بخش کی صاحبزادی تھیں، یہ مانا کہ جیسے آجکل ہندوستان کے مسلمانوں میں ازدواجی تعلقات کی بنیاد عموماً مالی حیثیت پر جو قائم ہوگئی ہے، ہم نسل ہونے سے زیادہ یہ دیکھا جاتا ہی کہ جس خاندان سے رشتہ قائم ہورہا ہے اس کی مالی حیثیت کیا ہے۔

پچھلے زمانہ میں "لچھمی دیوی" کی پوجا مسلمانان ہند میں اس طریقہ سے عام طور پر جاری تھی، اور کفو کا خیال مالی معیار پر غالب تھا، تاہم ہم کفو ہونے کے بعد اس کا بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس زمانے میں بھی کھاتے پیتے گھرانے کے لوگ اس کا خیال بھی کسی نہ کسی حد تک ضرور رکھتے تھے کہ باپ کے گھر میں لڑکی جس قسم کے معاشی ماحول میں رہی ہے سسرال میں بھی کم ازکم اسی قسم کا ماحول اس کو میسر آئے تو اچھا ہے، خصوصاً جس زمانے کا حال ہم بیان کررہے ہیں، یہ مسلمانوں کے انحطاط کا زمانہ تھا، آج تناور درختوں کی شکل میں جتنے بُرے رسوم اور رواج ہمارے گھروں میں کھڑے نظر آرہے ہیں، ان کے پودے انحطاط اور تنزل کے ان ہی ایام میں نصب ہوچکے تھے،

کچھ بھی ہو، میرا خیال یہی ہے کہ دیوبند کے اس خاندان میں مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان والوں کی رشتہ داریاں جس زمانہ میں قائم ہوئی ہیں، میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اس زمانہ میں مولنا مرحوم کے گھرانے کی معاشی حالت اگر دیوبند کے دیوان والوں کے یہاں سے بہتر نہ بھی تو کمتر ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی، دیوان والوں کی مالی برتری کا اندازہ علاوہ ان شکستہ در و دیوار کے جو اس وقت بھی اپنے بنانے والوں کے متعلق اس کی شہادت دے رہے ہیں کہ قصبہ کے "صنادید"[1] میں ان کا شمار تھا، اس قسم کی روائتیں اسی گھرانے

[1] مولوی سید محمد میاں صاحب جو خود بھی خاص قصبہ دیوبند سے وطنی موروثی تعلق رکھتے ہیں انھوں نے لکھا ہے کہ سلطان اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے دیوان جن کا نام شیخ لطف اللہ تھا، دہی دیوان محلہ کے رہنے والوں کے مورث اعلیٰ تھے افسوس ہے کہ باوجود جستجو کے تاریخ کی عام کتابوں میں خصوصاً مآثر الامراء میں بھی دیوبند کے شیخ لطف اللہ کا مجھے پتہ نہ چل سکا۔ ورنہ علاوہ عمارت کے مغل حکومت کے عہدہ دیوانی پر سرفرازی اس خاندان کی امارت و وجاہت کی کافی دلیل ہوسکتی ہے ۱۲

کے اسلاف کے متعلق زبان زد عام ہیں۔ مثلاً مولنا محمد میاں صاحب نے اسی خاندان کے ایک بزرگ (شیخ کرامت حسین اور ان کے بیٹے شیخ نہال احمد) کے متعلق اپنی کتاب "مسلمانوں کا شاندار ماضی" نامی میں لکھا ہے کہ

"بہت مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ اس طرف سے گذرنے والی بارات کو اپنے یہاں ٹھہرالیا ہے اور اس کی دعوت کی" ص۵۹ کتاب مذکور حصہ پنجم

میں نے دوسرے مقامات سے بھی اس قصبہ کو سنا ہے "اتفاقاً ایک آدھ دفعہ نہیں، بلکہ "بہت مرتبہ" راہ سے گذرنے والی باراتوں کو اپنے یہاں مہمان بنالینا، اور ان کی دعوت کا بغیر سابقہ تیاری کے اچانک انتظام کی قدرت، ظاہر ہے غیر معمولی ثروت ورفاہیت کے بغیر عام حالات میں آسان نہیں ہے، خصوصاً اس زمانے کی باراتوں کا جو حال تھا، دستور کے مطابق کافی تعداد باراتیوں کی بھی ہوتی ہو گی، چھکڑے، گاڑیاں، گھوڑے، ہاتھی، اونٹ وغیرہ سارے سازوسامان کے ساتھ باراتیں چلتی تھیں۔

بہرحال میرا قیاس جو معقول وجوہ پر مبنی ہے اگر صحیح ہے، تو یہ ماننا چاہئے کہ مولنا محمد قاسم کے خاندان میں چار پشتوں تک جس جائداد میں تقسیم وتجزیہ کا عمل نہ ہوا تھا، وہ کافی اور معقول تھی، اس خاص مسئلہ پر زور دینے کی ضرورت اس لئے بھی محسوس ہوئی کہ مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد شیخ اسد علی صاحب کے متعلق بعض لطائف تقریروں اور تحریروں میں، جو پھیل گئے ہیں ان سے کافی غلط فہمی جہانتک میرا احساس ہے پھیلی ہوئی ہے مثلاً ارواح ثلثہ میں امیر شاہ خاں صاحب کی طرف منسوب کرکے یہ لطیفہ درج کیا گیا ہے کہ اپنے وقت کے مشہور ادیب جلیل مولنا فیض الحسن، صاحب سہارنپوری جو مولنا فضل حق خیرآبادی کے شاگرد اور مولوی شبلی اور مولوی عبداللہ ٹونکی وغیرہ مشاہیر کے استاذ تھے، ادب کی نصابی کتابوں، سبعہ معلقہ، حماسہ وغیرہ پر عربی زبان میں مولنا نے مستقل شرحیں لکھی ہیں، بیضاوی اور مشکوٰۃ شریف پر بھی ان کے فاضلانہ حواشی ہیں، لاہور کے اورنٹیل کالج کے پہلے صدر غالباً مولانا فیض الحسن ہی تھے،

بہر حال کہنا یہ ہے کہ مولانا فیض الحسن اور مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ میں ہم عمری کی وجہ سے ایک گونہ ایسے تعلقات تھے کہ باہم دونوں میں مزاح اور ظرافت کی گفتگو بھی کبھی کبھی ہو جایا کرتی تھی، اسی سلسلہ میں کہتے ہیں کہ ایک دن مولانا فیض الحسن صاحب نے مولانا نانوتوی کو خطاب کر کے کہنا شروع کیا کہ

"اے اسد علی کے بیٹے تو تو کھیتی کرتا تجھے کس نے مولوی بنا دیا تیرے پاس تو دو بیل ہوتے اور ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر تک تک، بر بر کرتا ہوتا۔" ارواح ثلاثہ (۲۷۷)

الفاظ کے معمولی رد و بدل کے ساتھ اسی کتاب میں یہی لطیفہ مولانا محمد طیب صاحب نے بھی اپنے والد مرحوم کی طرف منسوب کر کے نقل کیا ہے، (دیکھو ص۱۸۳ ارواح ثلاثہ) پچھلی روایت میں "اسد علی کے بیٹے" کی جگہ

"بے حیا گنوار کے لونڈے"

کے الفاظ ہیں۔

مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے مولوی فیض الحسن کی خبر جس چبھتے ہوئے فقرے سے اس کے بعد جواباً لی ہے، اس کا ذکر تو انشاء اللہ مولانا مرحوم کی ان لطیف بذلہ سنجیوں کے ذیل میں کیا جائے گا، جن میں "نبوت کبریٰ" کے اسوہ اور نمونے کی جھلک پائی جاتی ہے۔ لیکن یہاں اس کے نقل کرنے سے میری غرض یہ ہے کہ یہ یا اسی قسم کی بعض روایتیں لوگوں میں جو مشہور ہو گئی ہیں ان سے نہ جاننے والے ممکن ہے کہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں کہ مولانا مرحوم کے والد ماجد شیخ اسد علی صاحب شاید نرے کسان تھے۔

غنیمت ہے کہ امیر شاہ صاحب والی روایت کو درج کرتے ہوئے خود امیر شاہ صاحب کی طرف سے یا راوی نے اپنی طرف سے ان الفاظ کا اضافہ قوسین میں کر دیا ہے کہ

"مولانا (یعنی مولانا محمد قاسمؒ) کے والد ماجد باوجود خواندہ ہونے کے کھیتی کرتے تھے۔"

ورنہ جن الفاظ میں راویوں نے مولٰنا فیض الحسن صاحب مرحوم کے لطیفہ کا چرچا پھیلا دیا ہے ان کے سننے والے پر شاید یہی اثر مرتب ہو سکتا تھا کہ مولٰنا کے والد لکھے پڑھے بھی نہ تھے، اور خود ہل جوتا کرتے تھے، مگر آپ مجھ ہی سے سن چکے، نانوتہ کے اجمالی تبصرہ میں بیان کر چکا ہوں کہ حضرت سید شہید کے مواعظ اور صحبت سے اثر پذیر ہونے کے بعد نانوتہ سے جو تعلیمی وفد طلب علم کے سلسلہ میں دلی روانہ ہوا تھا، اس وفد میں شیخ اسد علی صاحب بھی شریک تھے مصنف امام کی چشم دید شہادت گذر چکی جس میں انھوں نے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ شاہ نامہ تک فارسی کی کتابیں دلی میں پڑھ چکے تھے اور ان کے سامنے اپنے پڑھنے کے زمانہ کی حکایتیں بیان فرمایا کرتے تھے (سوانح قدیم ص۳) میں نے عرض کیا تھا کہ شاہ نامہ اس زمانہ کے اعتبار سے فارسی ادب کے حصہ نظم کی آخری کتاب تھی، شاہ نامہ تک پڑھ چکنے کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ فارسی ادب کے کامل نصاب کی تعلیم شیخ اسد علی صاحب حاصل کر چکے تھے، موجودہ رواج کے مطابق جو حیثیت انگریزی ادب کے گریجویٹ کی ہوتی ہے گویا فارسی ادب کے لحاظ سے شیخ اسد علی تعلیم کے اس معیار کی تکمیل کر چکے تھے، میرے خیال میں تو کسی ایسے تعلیم یافتہ آدمی کے متعلق یہ کہنا کہ وہ "خواندہ" تھے بجائے ازالہ کے اس غلط فہمی کو شاید بڑھا ہی دیتا ہے، جو لطائف و ظرائف کی ان روایتوں کی بدولت عموماً پھیل گئی ہے، امیر خاں صاحب کی روایت میں یہ استدراک کہ وہ "خواندہ" تھے خود بتا رہا ہے کہ غلط فہمی کے احتمال کو پا کر راوی نے اس کا ازالہ کرنا چاہا مگر جس لفظ سے ازالہ کی کوشش کی گئی ہے، میرے نزدیک وہ بھی واقعہ کی صحیح تعبیر نہیں ہے، خیال کرنے کی بات ہے کہ فارسی جیسی ادبی و علمی زبان کے اعلیٰ معیاری نصاب کو جو ختم کر چکا ہو، نانوتہ یا سہارنپور میں نہیں بلکہ اس زمانہ میں سارے ہندوستان کے کمالات کا جو سب سے بڑا مرکز تھا، یعنی دلی کے علمی حلقوں میں جس شخص کو اپنی مذکورہ بالا تعلیم کی تکمیل کے مواقع میسر آئے ہوں، اس کے متعلق صرف "خواندہ" کے لفظ کا اطلاق کس حد تک درست ہو سکتا ہے،

اسی طرح یہ کہنا کہ "شیخ اسد علی صاحب کھیتی کرتے تھے" اور مولوی فیض الحسن صاحب کے لطیفہ کو

پیش نظر رکھ کر یہ سمجھ لینا کہ واقعۃً شیخ صاحب خود ہل جوتتے تھے، میرے نزدیک یہی واقعہ کی صحیح تعبیر نہ ہوگی، اتنی بات صحیح ہے کہ دلّی سے واپس آنے کے بعد شیخ اسد علی صاحب نے کوئی دوسرا معاشی ذریعہ اختیار نہیں کیا، بلکہ جو موروثی زمینداری ان کے گھر میں چلی آ رہی تھی، اسی کی دیکھ بھال میں مشغول رہے، ان کی اسی مشغولیت کی تعبیر یہ کی گئی ہے کہ وہ کھیتی کرتے تھے۔ بالفاظ دگر مطلب یہ تھا کہ ان کی گذربسر کا ذریعہ وہی کاشتکاری تھی جو ان کے گھر ہوتی تھی۔

اور یہ میں اسلئے کہہ رہا ہوں کہ قطع نظر دوسری معلومات کے یہ مشکل ہے کہ دلّی جیسے متمدن شہر کی تعلیمی صحبتوں میں زندگی گذارنے کے بعد ہل جوتنے کی صلاحیت آدمی میں باقی رہے، خواہ یہ حال افسوس ناک ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ انسان کی چند اہم فطری صلاحیتوں میں سے ایک بڑی مفید صلاحیت کا یہ فقدان اور انسانی کمالات میں سے ایک بڑے کمال سے یہ محرومی ہے، مگر کیا کیجئے کہ دماغی اور ذہنی قوتوں میں تعلیم سے جتنی زیادہ بلندی پیدا ہوتی ہے؛ اسی نسبت سے جسمانی قوتیں انحطاط وضعف کا شکار ہوتی چلی جاتی ہیں پہلے بھی یہی تھا اور آج تک تعلیم کا جو نظام دنیا میں جاری ہے خواہ جدید ہو یا قدیم دونوں میں یہ نقص باقی ہے۔

بہرحال کم از کم میرے لئے یہ باور کرنا آسان نہیں ہے کہ دلی کی اس تعلیم کے بعد شیخ اسد علی صاحب میں ہل جوتنے کی صلاحیت باقی رہی ہوگی، مولوی فیض الحسن صاحب نے ان کی طرف اگر اس کا انتساب کیا ہے تو ہم اس انتساب کو مجازی انتساب سے زیادہ اور کچھ قرار نہیں دے سکتے، کاشتکاری کے لوازم میں چونکہ قلبہ رانی بھی ہے، اسلئے ملزوم کو دیکھ کر لازم کو انھوں نے شیخ صاحب کی طرف مزاح وظرافت کے موقعہ پر منسوب کردیا اور ہر قسم کی گفتگو میں اتنا مجاز متحمل ہے، بلکہ ظرافت ظرافت ہی کب باقی رہتی ہے، اگر مجاز کا رنگ اس پر نہ چھڑکا جائے۔

باقی جن دوسری معلومات کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے وہ یہ ہیں کہ دہلی سے واپسی کے بعد جیسا کہ مصنف امام کے بیان سے بھی معلوم ہوتا ہے شیخ اسد علی صاحب جب نانوتہ اپنے وطن تشریف لائے تو جیسا کہ چاہئے تھا دلی سے تعلیم پاکر واپس لوٹنے والے اس نوجوان پر لوگوں کی نظریں پڑنے لگیں، سب کا حال تو معلوم نہ ہو سکا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ نانوتہ ہی کے رہنے والے ایک وکیل صاحب جن کا اسم گرامی شیخ وجیہ الدین تھا، اور اپنے علاقے کے ضلع یعنی سہارنپور میں وکالت کرتے تھے، مصنف امام نے لکھا ہے کہ جس زمانے میں انگریزوں نے سہارنپور میں حکومت کا نظم قائم کیا تو شیخ وجیہ الدین

"سہارنپور میں وکیل ہوئے، اور نہایت عزت واحترام وتمول سے گذران کی" ص۲۵ سوانح قدیم

یہی وکیل صاحب جو عزت واحترام کے ساتھ "تمول" میں بھی نمایاں حیثیت کے مالک تھے مصنف امام کا بیان ہے کہ

"وہ (شیخ وجیہ الدین نانوتوی) فارسی بہت عمدہ جانتے تھے اردو کے شاعر تھے اور کچھ کچھ عربی سے بھی آگاہ تھے، بڑے تجربہ کار اور پرانے آدمی تھے" ص۲۵

بہر حال کہنا یہ ہے کہ ان ہی شیخ وجیہ الدین صاحب وکیل نے شیخ اسد علی صاحب کو اپنی دامادی کے لئے قبول فرمایا، اور ان کا عقد وکیل صاحب کی صاحبزادی صاحبہ سے ہو گیا، اسلام کی یہی عفیفہ خاتون وہ خوش بخت، بلند اختر بیوی صاحبہ ہیں، جن کو سیدنا الامام الکبیر النانوتوی قدس اللہ سرہ کی والدہ ماجدہ ہونے کا تاریخی شرف وامتیاز قدرت کی طرف سے عطا ہوا،

میں پوچھتا ہوں کہ شیخ اسد علی صاحب اگر واقعی ہل جوتنے والے گنوار کسان تھے، تو کوئی وجہ ہو سکتی تھی کہ شیخ وجیہ الدین صاحب متمول عزت واحترام رکھنے والے تعلیم یافتہ

آدمی ان کا انتخاب اپنی دامادی کے لئے کرتے، کیا برادری میں اپنی لڑکی کے لئے ان کو دوسرا لڑکا نہیں ملتا تھا یا نہیں مل سکتا تھا۔

میرے نزدیک تو وکیل صاحب کا یہ انتخاب ہی، ان ساری غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے کافی ہے، جو خواہ مخواہ ان مزاحی روایتوں کی بدولت لوگوں میں پھیل گئی ہیں، اور بات وہی ہے کہ گو نانوتہ کے ان صدیقی شیوخ کی مالی حالت بہت کچھ بگڑ چکی تھی،

تاہم ایسے خانوادے جن میں ورثہ کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ خصوصاً مولانا محمد قاسم کا خاندان جو چار پشتوں سے بقول مصنف امام "منفرد" چلا آرہا تھا، یعنی ایک کے بعد ایک ہی آدمی ساری موروثی جائداد کا وارث بنتا ہوا چلا آرہا تھا، ایسے خاندانوں کا معاشی معیار پھر بھی غنیمت تھا، اور اسی بنیاد پر میں سمجھتا ہوں کہ شیخ اسد علی صاحب اس زمانے کے حساب سے ایک مرفہ الحال بزرگ تھے، پھر دلی کی تعلیم نے ان کی شخصیت میں کم از کم نانوتہ جیسے قصبہ کے لحاظ سے گونہ امتیاز بھی پیدا کر دیا تھا، اگرچہ اس کا کوئی تاریخی وثیقہ میرے پاس موجود نہیں ہے،

لیکن شیخ وجیہ الدین نے اپنی دامادی کے لئے شیخ اسد علی کا انتخاب اگر اسلئے کیا ہو کہ وکالت کا امتحان دلا کر اسی پیشہ میں ان کو بھی لگا دیا جائیگا، جس میں وہ خود مشغول تھے، تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے، اس زمانہ میں جب انگریزوں نے اس ملک میں اپنی حکومت کے نئے نظام کو نافذ کیا، جس کا ایک بڑا امتیازی عنصر "وکلاء" کا وجود بھی تھا،

تو جیسا کہ دنیا جانتی ہے، وکیل بننے کے لئے جس قابلیت کی ضرورت تھی، اس سے شیخ اسد علی صاحب کافی طور پر بہرہ ور ہو چکے تھے، آخر گلستاں بوستاں تک کے پڑھنے والے لوگ اس زمانے میں قانونی امتحان میں کامیاب ہو ہو کر جب مشہور وکیلوں میں شمار ہوئے، ان میں بعضوں نے لاکھوں روپئے کمائے[۱]، تو شیخ اسد علی جو دلی سے شاہنامہ سکندر نامہ تک کی

---

[۱] غیر انگریزی خواں وکیلوں میں یوپی صوبہ کے ایک مشہور وکیل منشی امتیاز علی صاحب مرحوم بھی گذرے ہیں، بعد کو تو خیر ریاست بھوپال کے وزیر اعظم ہی ہو گئے تھے، لیکن وزارت سے پہلے ان کی سوانحعمری میں لکھا ہے کہ "بیس بائیس برس میں صرف اسی پیشۂ وکالت کے سبب سے تیس تیس لاکھ روپئے پیدا کیا" صلا۳

تعلیم کی تکمیل کر کے واپس ہوئے تھے، ان کے لئے وکالت کا امتحان اور وکیل بن کر کامیاب ہونے میں دشواری ہی کیا ہوتی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مولانا نانوتوی جیسا بیٹا جس شخص نے علم و عقل کی دنیا میں پیش کیا ہو، ایسے بیٹے کے باپ کے متعلق سوچئے تو سہی کہ وکالت کے میدان میں ناکام ہونے کی وجہ ہی کیا ہو سکتی تھی۔

یہ سوال میرے دل میں پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے یعنی شیخ اسد علی صاحب نے آخر تمول اور عزت و احترام کی اس کھلی ہوئی راہ یعنی وکالت کے پیشے کو جو اُن کے خسر کا پیشہ تھا، کیوں نہ اختیار کیا، یہ نہیں تو حکومت قائمہ کی کچہریوں، اور دوسرے سرکاری دفاتر میں بے شمار نئی جائدادیں جو قائم ہو رہی تھیں، جن میں یہی اردو فارسی کے پڑھے ہوئے لوگ بکثرت لئے جا رہے تھے، اُن کے خسر حکومت میں کافی اثر بھی رکھتے تھے، چاہتے تو اپنے داماد کو ان محکموں کی ملازمتوں میں بآسانی شریک کرا سکتے تھے، مگر اس قسم کے تمام قریبی امکانات سے دامن کش ہو کر انھوں نے نانوتہ کے قصبے میں قیام کر کے ایک ایسی زندگی کیوں اختیار کی، کہ ہل جوتنے کے انتساب کی بھی گنجائش ان کی اس زندگی میں نہ سمجھنے والوں کے لئے نکل آئی، میں نے جیسا کہ عرض کیا شیخ اسد علی صاحب کے متعلق یہ خیال کہ واقعی وہ ہل جوتنے والے کسان تھے"۔ اگرچہ صرف خیال ہے، تاہم اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دلی سے لوٹنے کے بعد ان کو نانوتہ اور نانوتہ کی قصباتی زندگی ہی میں غرق پایا جاتا ہے، مصنف امام جنھوں نے شیخ اسد علی صاحب کو براہ راست دیکھا تھا، اور دیکھا تھا کیا معنی، ان ہی کے ساتھ زمانہ تک زندگی گذاری تھی، ان کی شہادت بھی یہی ہے۔

"تمام عمر کھیتی کی"۔ ص۲۴

جس کا مطلب میرے نزدیک اگرچہ یہی ہے، کہ موروثی جائداد کی کاشتکاری کی نگرانی کی یہ تعبیر ہے، اور یہ عام تعبیر ہے، جو اس قسم کے زمینداروں کے متعلق عموماً مروج ہے، بہر حال مذکورہ بالا شہادت میں "تمام عمر" کا لفظ بتا رہا ہے کہ دلی سے واپس ہونے کے بعد کھیتی کے سوا کوئی دوسرا مشغلہ شیخ اسد علی صاحب نے اختیار نہیں کیا، آخر ایسا کیوں ہوا، اسی قصبہ کے رہنے والے شیخ

وجیہ الدین ان کے خسر بھی تھے، جب وہ وکالت کرتے تھے تو وکالت یا اسی قسم کی دوسری سرکاری خدمات میں حصہ نہ لینے میں یہ سوچنے کی بات ہے، کون سی چیز مانع ہوئی؟

بعض روایتیں یا حکایتیں اس سلسلہ میں جو مشہور ہیں، مثلاً ارواح ثلاثہ میں بعض ثقات کی تحریروں کے حوالہ سے ایک روایت پائی جاتی ہے کہ

"ایک مرتبہ مولانا نانوتوی کے والد ماجد (شیخ اسد علی) نے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ سے شکایت کی، کہ بھائی میرے تو یہی ایک بیٹا تھا، اور مجھے کیا کچھ امیدیں تھیں، کچھ کماتا تو افلاس دور ہو جاتا، تم نے خدا جانے کیا کر دیا کہ نہ کچھ کماتا ہے اور نہ نوکری کرتا ہے۔" صـ۲۰۱

اسی طرح اس کا بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ مولانا نانوتوی نے اپنے والد کی زندگی میں جب اپنی موروثی جائداد کے متعلق شرعی نقطۂ نظر سے نظر ثانی کر کے کئی کئی پشتوں کے محروم الارث لوگوں تک ان کے جائز شرعی حصوں کی واپسی کا نظم فرمایا، تو اُن کے والد شیخ اسد علی صاحب کیلئے مولانا کا یہ طرزِ عمل باعث گرانی ثابت ہوا، کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں بھی حاجی صاحب قبلہ قدس اللہ سرہ سے شیخ اسد علی صاحب نے شکایت کی کہ

"دنیا کی اولاد اپنے گھروں کو بھرتی ہے، اور یہ (مولانا محمد قاسم) "گھر کھوُ" پیدا ہوا ہے کہ بنی بنائی جائداد کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔" (ماخوذ از تحریری یادداشت مولانا محمد طیب الحفید)

یہ اور اسی قسم کی دوسری روایتوں سے جیسا کہ ظاہر ہے، عام خیال بھی پیدا ہو سکتا ہے اور شاید دوسروں کا یہی خیال ہو بھی کہ فطرتاً مولانا نانوتوی کے والد ماجد طالب دنیا اور جیسا کہ عام مسلمانوں کا حال اس زمانے میں ہو گیا تھا کہ جائز و ناجائز کی تمیز کے بغیر "جو کچھ مل جائے لئے چلے جاؤ" اسی حال میں وہ بھی گرفتار تھے۔

بلاشبہ مذکورہ بالا روایات کا اقتضا یہی ہے، مگر میں کیا کروں، میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا کہ آخر جب ان پر طلب دنیا کا جذبہ اسی طرح سے سوار تھا، جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے، تو اسی زرکشی

اور دنیا طلبی کے وسیع امکانات جو اُن کے سامنے کھلے ہوئے تھے، ان امکانات سے مستفید ہونے میں انھوں نے گریز کی راہ قصداً کیوں اختیار کی، ان سارے امکانات پر لات مار کر تمام عمر کھیتی کی، ان چند لفظوں میں ان کی پوری سوانح عمری سمٹ کر کیوں ختم ہوگئی۔

الحمد للہ کہ نظریۂ آبائیت[۱] کی آلودگی سے قرآن نے مسلمانوں کی ذہنیت کو پاک کردیا ہے آذر سے ابراہیم، اور نوح سے پسر نوح کی پیدائش کے قرآنی قصوں نے کسی بڑے کے باپ یا بیٹے ہونے کی ان کے نزدیک کوئی قیمت باقی نہیں چھوڑی ہے، حضرت یوسفؑ کے بھائی بھی جب اخوان یوسف بن سکتے ہیں، تو رشتہ کی قربت اور نزدیکی کا رعب یقیناً بے معنی رعب بن کر مسلمانوں کے لئے رہ گیا ہے، اسی صورت میں آئندہ جو کچھ میں عرض کروں گا، اس کے متعلق کسی خوش اعتقادی کے مغالطہ کا خیال خود مغالطہ ہوگا، بلکہ شواہد اور تاریخی روایات کی روشنی نے جس نتیجہ تک مجھے پہنچایا ہے محض اس کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔

میرا مطلب یہ ہے کہ مولٰنا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد شیخ اسد علی مرحوم کے متعلق جو سوال میں نے اٹھایا ہے غور و فکر کے بعد اس سوال کا جو جواب مجھے ملا ہے، ممکن ہے کہ دوسروں کو شاید مولٰنا نانوتوی کے ساتھ میری خوش عقیدگی کی شدت اس جواب میں دخیل

---

[۱] یہ میری ذاتی اصطلاح ہے جو قرآن سے ماخوذ ہے، قرآن نے ایک سے زائد مقامات میں دو خاص طبقوں کا ذکر کیا ہے جنمیں ایک کی خصوصیت تو یہ بیان کی گئی ہے کہ حق کا معیار ان کے نزدیک صرف یہ ہے کہ ان کے باپ دادا اسکو حق مانتے تھے ماوجدنا علیہ اٰبائنا الاولین (جس پر ہم نے اپنے اگلے باپ دادوں کو پایا) یہی حق کا سب سے بڑا معیار ان کے نزدیک تھا، اسی نظریہ کی تعبیر میں "آبائیت" سے کرتا ہوں جو شخص خود والد بننے والا ہے اُسکے لئے یہ کیسی مضحکہ خیز بات ہوگی کہ کسی چیز کو اس لئے حق قرار دے رہا ہے کہ اسکے والد مرحوم اسی کو حق خیال کرتے تھے۔ اسکے مقابلہ میں دوسرا طبقہ وہ ہے جسے میں "افکیہ" کہتا ہوں، ان کے نزدیک کسی چیز کے غلط ہونے کی یہ کافی دلیل ہے کہ پہلے زمانہ کے لوگ اس کو حق تسلیم کرتے تھے، قرآن میں ہے کہ ان ھذا الا افک قدیم (نہیں ہے یہ مگر پرانا جھوٹ) اسی مقدمہ کو کسی حقیقت کی تغلیط کے لئے وہ کافی خیال کرتے تھے، افک کے لفظ کی طرف منسوب کرکے میں نے اس طبقہ کا نام "افکیہ" رکھ چھوڑا ہے، اسی مقدمہ کی تعبیر وہ کبھی ان ھذا الا اساطیر الاولین (نہیں ہے یہ مگر اگلوں کے اسطورے یا قصے) کے الفاظ میں بھی کرتے تھے، یہ عجیب بات ہے کہ اس وقت تک یہ دونوں متقابل طبقات تقریباً دنیا کے اکثر اقوام و ممالک میں پائے جاتے ہیں ۱۲

نظر آتی ہو، لیکن اپنے حال سے میں خود زیادہ واقف ہوں۔ عقیدت و نیاز کا تعلق حضرت والا کی ذات گرامی سے میں ضرور رکھتا ہوں۔ مگر یقین کیجئے کہ اس جواب میں عقیدت سے زیادہ حقیقت نے میری راہ نمائی کی ہے۔

بہر حال سوچنے والے جو کچھ سوچیں اس کا ان کو اختیار ہے، پر دل میں میرے جو بات آئی ہے اُسے کیسے چھپاؤں۔ اس سے تو لوگ واقف ہی ہوں گے، قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ

| | |
|---|---|
| اللہ یجتبی الیہ من یشآء ویھدی الیہ من ینیب (شوریٰ)۔ | اللہ تعالیٰ جسے چاہتے ہیں چن لیتے ہیں، اور اپنی طرف راہ نمائی فرماتے ہیں اس شخص کی جو ان کی طرف جھکتا ہے۔ |

اسی سے یہ قانون پیدا کیا گیا ہے، کہ بارگاہ الٰہی میں جن لوگوں کو قرب و نزدیکی کا امتیاز بخشا جاتا ہے۔ ان میں کچھ لوگ تو اجتبائی ہوتے ہیں، یعنی مشیت حق اپنے قرب اور نزدیکی کے لئے ان کو نامزد کرکے چن لیتی ہے، اور ان ہی میں کچھ ہوتے ہیں جنھیں انابت اور جھکنے کے بعد ہدایت کی روشنی بخشی جاتی ہے۔

جس کا حاصل یہی ہوا کہ دوسری صورت میں پیش قدمی انابت کی شکل میں بندے کی طرف سے ہوتی ہے، جس کے صلہ میں ہدایت کی نعمت سے وہ سرفراز کئے جاتے ہیں۔ لیکن اجتبائی رنگ میں بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ داد حق ہی ان کی دستگیری کرتی ہے، ظاہر ہے کہ قادر مقتدر کی بارگاہ استغنا و کرم میں دونوں ہی کی گنجائش ہے، بجائے حیوان و نبات، و جماد کے نوع انسانی میں پیدا ہونے کے لئے انتخاب جیسے کسی سابقہ عمل کا نتیجہ نہیں ہوتا، تو اسی انسان کو اجتبائی مقام سے اگر امتیاز بخشا جائے تو اس پر تعجب کی کیا وجہ ہو سکتی ہے،

اس تمہیدی مقدمہ کے بعد میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر النانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق فقیر نے جو کچھ سنا یا کتابوں میں پڑھا ہے، مجموعی حیثیت سے ان چیزوں کو سامنے رکھتے ہوئے قدرتاً یہی خیال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت والا کا تعلق بھی ان ہی برگزیدہ نفوس و ارواح

طیبہ سے معلوم ہوتا ہے جو اجنبائی رنگ میں چنے جاتے ہیں، جو تھوڑی بہت واقفیت بھی آپ کی خصوصیات و حالات سے رکھتے ہیں، اگر غور کریں گے تو میرے اس خیال کی تائید سے جہانتک میں سمجھتا ہوں مشکل ہی سے ہچکچائیں گے، اور جو نہیں واقف ہیں، ان کو چاہئے کہ صبر سے کام لیں، اسی کتاب میں ان کو ایسی چیزیں ملتی چلی جائیں گی، جن کی روشنی میں انشاء اللہ ان کو بھی وہی نظر آئے گا جسے میں دیکھ رہا ہوں کچھ نہیں یہی واقعہ کہ جسکی ناسوتی زندگی کا وقفہ پچاس سال سے بھی کم تھا، وہی ہندوستان جیسے طویل و عریض کروڑہا کروڑ مسلمانوں سے بھرے ہوئے ملک کی تاریخ کا ایک ایسا سوال کیسے بن گیا کہ تیرھویں صدی اور اس کے بعد کی صدیوں میں اس ملک کے ان ہی مسلمانوں کی دینی زندگی کے کسی پہلو کو کوئی اس سوال کے حل کئے بغیر سمجھ ہی نہیں سکتا، کیا یہ کوئی معمولی واقعہ ہے۔

اور اس کو بھی جانے دیجئے، کیونکہ ابھی تو یہ دعویٰ اجمال کے رنگ میں آپ۔ کے سامنے آیا ہے دعویٰ کا وزن تو تفصیلات کے علم کے بعد ہی ہو سکتا ہے، مگر اپنے اس احساس میں فقیر تنہا بھی تو نہیں ہے، افسوس ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے ایک سابق مہتمم حضرت شاہ مولانا رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی بلندیوں سے عوام واقف نہیں ہیں، تاہم ان کی جلالت قدر کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم مبرور مولانا عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ ان ہی مولانا رفیع الدین کے ساختہ پرداختہ تھے، مفتی صاحب ان ہی کے مرید تھے، اور باطنی راہوں کا سلوک ان ہی کی راہ نمائی میں طے فرمایا تھا، حضرت مفتی صاحب کے دیکھنے والے بحمد اللہ ابھی زندہ ہیں، ان کی معصومیت، جو للہیت و صدیقیت کی ایک جیتی جاگتی زندہ تصویر تھی، جس نے اس کا مشاہدہ کیا ہے، وہ سمجھ سکتا ہے کہ مفتی صاحب کی شخصیت کا معمار خود کیسا اور کیا ہوگا۔[1]

---

[1] اپنی زندگی کے قیمتی اوقات میں ان لمحوں کو یہ کوتاہ نصیب بھی گرانمایہ یقین کرتا ہے جو حضرت مفتی صاحب رہ کی دید میں کبھی گذرے تھے، تراویح کی چند نمازیں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم کی معیت میں مفتی صاحب کے پیچھے میسر آئی تھیں اللہ اللہ برزوا للہ الواحد القہار (اور کھل پڑے لوگ اللہ واحد قہار کے آگے) تجوید و قراءۃ کی صفتوں سے آزاد تلاوت مفتی صاحب نے نماز میں اس آیت کی کی، پھر اسی فقیر ہی نے نہیں بلکہ صف میں (بقیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کیجئے)

بہر حال کہنا یہ ہے کہ ان ہی مولٰنا رفیع الدین صاحب مرحوم کی طرف منسوب کر کے ارواح ثلاثہ میں بروایت مولانا نظام الدین حیدر آبادی مرحوم جو یہ قول ان کا پایا جاتا ہے یعنی مولانا رفیع الدین حضرت نانوتوی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ

میں نے انسانیت سے بالا درجہ ان کا (مولانا نانوتوی کا) دیکھا، وہ شخص ایک فرشتہ مقرب تھا، جو انسانوں میں ظاہر کیا گیا تھا" ص۱۸۳ ارواح ثلاثہ

مولٰنا رفیع الدین کہتے تھے کہ اسی احساس اور یافت کا یہ اثر اور نتیجہ ہے

"میں پچیس ۲۵ برس حضرت مولانا نانوتوی کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، اور کبھی بلا وضوء نہیں گیا"

یہ ایک ایسی شخصیت کی شہادت ہے، جس کے قرب و ولایت کی تصدیق اس کے عہد کے اللہ والوں نے کی ہے۔

اور مولانا رفیع الدین کے متعلق تو ممکن ہے کہ قرب و صحبت کی وجہ سے شدت گرویدگی کا شبہ بھی کیا جائے، لیکن حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہ العزیز جو حضرت نانوتوی سے عمر میں تقریباً چونتیس سال بڑے[1] تھے، گویا مولٰنا گنج مرادآبادی کے مقابلہ میں مولانا نانوتوی بچے تھے، دونوں حضرات میں تلمذاً یا ارشاداً کسی قسم کا ظاہری تعلق بھی نہ تھا، بلکہ جہاں تک میں جانتا ہوں ایک کی دوسرے سے شاید شفاہی ملاقات بھی نہ تھی، لیکن بایں ہمہ جانتے ہیں، حضرت گنج مرادآبادی جیسی بین الکرامات والکشوف ہستی نے مولٰنا نانوتوی کو کیا پایا تھا، حافظ تجمل حسین مرحوم دسنوی نے اپنی کتاب کمالات رحمانی میں حضرت گنج مرادآبادی سے براہ راست یہ الفاظ سن کر نقل کئے ہیں یعنی مولٰنا نانوتوی کے ذکر پر حضرت گنج مرادآبادی نے فرمایا۔

"اس کم سنی میں ان کو ولایت ہوگئی" ص۱۲۴ کمالات رحمانی

---

(بقیہ صفحہ گذشتہ) جتنے بھی شریک تھے سبھوں نے جو کچھ دیکھا اور جو حال لوگوں پر طاری ہوا ملاحظہ سے یہ کیفیت کیا مل سکتی ہے مولانا شبیر احمد صاحب تک چیخ مار کر چت، گرے ہوئے تھے، ہر ایک مدہوش تھا، مفتی صاحب قبلہ بار بار اسی آیت کی تکرار فرماتے جاتے تھے"

(متعلقہ صفحہ ہذا) [1] حضرت گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہ العزیز کی ولادت ۱۲۱۳ھ میں ہوئی اور مولانا نانوتوی ۱۲۴۸ھ میں پیدا ہوئے تھے"

ہے تو یہ مختصر سا فقرہ لیکن ہم جب سوچتے ہیں کہ پیدا ہونے کے بعد آدمی زندگی کی مختلف منزلوں سے گذرتا ہے، بچپن، جوانی، کہولت وغیرہ عام طور سے زندگی کے ان سارے ادوار میں لغزشوں سے قطعاً بے لاگ ہو کر گذر جانا آسان نہیں ہے، لیکن اب تک مولنٰا نانوتوی کے جو حالات ہم تک پہنچے ہیں اُن سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہی دشوار مسئلہ ان کے لئے اتنا آسان کر دیا گیا تھا کہ کہنے والا شاید یہ کہہ سکتا ہے کہ پانے والوں نے جس حال میں ان کو زندگی کے آخری دنوں میں پایا، تقریباً یہی حال ان کا جوانی میں بھی تھا، اور شاید بچپن میں بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ولی بنے نہیں تھے، بلکہ ولی ہی پیدا ہوئے تھے، اور ان کی اسی پیدائشی ولایت نے اسی لئے کم سنی ہی میں فعلیت کی شکل اختیار کر لی تھی، جس کی شہادت وقت کی سب سے بڑی مکاشف ہستی نے ادا کی،

آخر میں پوچھتا ہوں کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے اُن کے والد بزرگوار یعقوب علیہ السلام نے

| كذلك يجتبيك ربك | یوں ہی تیرا رب تجھے چن لے گا۔ |
|---|---|

کے الفاظ کے ساتھ جو بشارت سنائی تھی، تو حضرت یوسف کی اس اجتبائی شان پر استدلال جیسا کہ قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے، اسی سے تو کیا گیا تھا کہ جو بڑائیاں عالم شہادت میں حضرت یوسف کے سامنے آئندہ زندگی میں آنے والی تھیں، غیب کے عالم میں وہی بڑائیاں مثالی رنگ میں بحالت خواب اُن کو دکھائی گئی تھیں۔

پھر آپ ہی سوچئے بیان کرنے والوں سے جب ایک نہیں بلکہ اس قسم کی متعدد روایتیں ہم تک پہنچتی ہیں مثلاً

سوانح قدیم ہی میں مصنف امام رقم طراز ہیں

(۱)

"مولوی صاحب (یعنی حضرت نانوتوی رح) نے ایام طفلی میں یہ خواب دیکھا تھا کہ گویا

میں اللہ جل شانہ کی گود میں بیٹھا ہوا ہوں۔" ص۲۵

اور جیسے ایام طفلی ہی میں حضرت یوسف علیہ السلام نے سورج چاند اور گیارہ ستاروں کو اپنے سامنے خواب میں سربسجود پاکر اس خواب کا تذکرہ اپنے والد ماجد حضرت یعقوب علیہ السلام سے فرمایا تھا جس کی تعبیر میں ان کے والد پیغمبر نے "مقام اجتبار" کی خوش خبری ان کو سنائی تھی۔ مصنف امام کا بیان ہے کہ حضرت نانوتوی نے بھی اپنے اس خواب کا تذکرہ اپنے جد امجد شیخ غلام شاہ صاحب سے فرمایا۔ جن کے متعلق گذر چکا کہ ذاکر وشاغل تھے اور خوابوں کی تعبیر یعنی تاویل الاحادیث کی نعمت ان کو عطا کی گئی تھی، اپنے پوتے کے اس خواب کو سن کر فرمایا کہ

"تم کو اللہ تعالیٰ علم عطا فرمائے گا، اور بہت بڑے عالم ہو گے اور نہایت شہرت ہوگی۔" ص۲۵ سوانح قدیم

کیا اس تعبیر میں اسی اجتبائی رنگ کی جھلک نظر نہیں آتی،

(۲) اسی طرح ارواح ثلاثہ میں ہے۔

"مولانا محمد قاسم صاحب نے بچپن میں ایک خواب دیکھا کہ میں مرگیا ہوں، اور لوگ مجھے دفن کر رہے ہیں، تب قبر میں حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے، اور کچھ نگینے سامنے رکھے، اور یہ کہا کہ یہ تمہارے اعمال ہیں، اس میں ایک نگینہ بہت خوش نما اور کلاں ہے، اس کو فرمایا کہ یہ عمل حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے۔" ص۲۰۲

میرے خیال میں یہ خواب بھی جو بچپن ہی میں حضرت کو دکھایا گیا تھا، عالم شہادت کے اس واقعہ کا جسے آج دنیا بچشم سر دیکھ رہی ہے، اسی کا یہ مثالی عکس تھا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہی تو ہے کہ انی جاعلک للناس اماما (یعنی خدا نے کہا کہ تمہیں لوگوں کا میں امام بناؤں گا) کا وعدہ اُن سے کیا گیا، اور یہ وعدہ

پورا ہوا، اور پورا ہو رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک اولوالعزم پیغمبر کے ساتھ خدا کا وعدہ تھا۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک امتی حضرت نانوتوی کو امام ماننے والوں کو بھی آج کوئی گننا چاہے، تو کیا گن سکتا ہے، ذرا سوچئے! ان لوگوں کو جو تقریباً ایک صدی سے عالم دین بن بن کر دارالعلوم دیوبند سے نکل رہے ہیں، اور ملک کے طول و عرض میں پھیل رہے ہیں، اور خود وہی نہیں، بلکہ کون نہیں جانتا کہ ان میں ایسے کتنے ہیں، جن کے ماننے والوں اور ان سے اثر پذیر ہونے والے عقیدتمندوں کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہے، ان میں حکیم الامت مرشد تھانوی، شیخ الہند حضرت مولنا محمود حسن، حضرت امام کشمیری، شیخ الاسلام مولنا شبیر احمد عثمانی حضرت مولنا حسین احمد مدنی مولانا خلیل احمد انبھٹوی وغیرہم جیسے حضرات ہیں، جن میں ایک ایک اپنے وقت اور حلقۂ اثر میں مستقل امام اور پیشوا مانے جاتے ہیں۔

بہرحال کھلی ہوئی بات ہے کہ بالآخر علماء دیوبند کے اکابر و اصاغر کی ساری اماموں اور پیشوائیوں کی انتہا اسی ہستی پر ہوتی ہے جس کے سامنے ایام طفولیت ہی میں حضرت ابراہیم کا عمل ایک خوش نما کلاں نگینہ کی شکل میں پیش ہوا تھا کہ اس کی تمام شانوں اور خصوصیتوں میں یہی شان اور یہی خصوصیت سب سے زیادہ نمایاں و درخشاں ہے۔

(۳) اسی کتاب ارواح ثلاثہ میں یہ روایت بھی پائی جاتی ہے کہ

"مولانا (محمد قاسم) نے ایک خواب ایام طالب العلمی میں دیکھا کہ میں خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں اور مجھ میں سے ہزاروں نہریں جاری ہو رہی ہیں" ص۲۰۱

یقیناً آج جو کچھ آنکھوں سے دیکھا جا رہا ہے، اسی کی یہ مثالی شکل تھی، جو ظہور سے پہلے دیکھنے والے کے سامنے اس لئے پیش ہوئی تھی، کہ دین اور علم کی جو جلیل خدمت اس کے ہاتھوں انجام پائی اس خدمت کے لئے وہ پہلے ہی سے چن لیا گیا تھا، اور یہی "اجتباء" کا مطلب ہے۔

(۴) اسی کتاب ارواح ثلاثہ میں دوسری جگہ ص۱۶۹ میں امیر شاہ صاحب کی طرف منسوب کر کے

ایک روایت یہ بھی درج کی گئی ہے کہ

"خان صاحب نے فرمایا کہ مولانا نانوتوی نے خواب میں دیکھا تھا کہ خانہ کعبہ کی چھت پر کسی اونچی شئے پر بیٹھا ہوں، اور کوفہ کی طرف میرا منھ ہے، اور ادھر سے ایک نہر آتی ہے، جو میرے پاؤں سے ٹکرا کر جاتی ہے۔" ص۱۶۹

بہ ظاہر یہ رؤیا بھی حضرت والا کو کم عمری میں ہوئی، کیونکہ آگے اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ اپنے اس خواب کا تذکرہ مولٰنا نانوتوی نے حضرت شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ محدث دہلوی کے بھائی مولانا محمد یعقوب سے فرمایا، مولانا محمد یعقوب سے جو واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مولانا کی ملاقات ان سے کم عمری ہی کے عہد میں ہو سکتی تھی۔

میرے نزدیک اس میں بھی مولٰنا نانوتوی کے اجتہائی مقام ہی کی طرف اشارہ ہے۔ اسکی بحث تو اپنی جگہ پر آئندہ آئے گی کہ تیرھویں صدی کے آخر میں مسلمانان ہند کی دینی زندگی کی وحدت کو جو شدید خطرہ فتنۂ غیر مقلدیت کے طوفان کی وجہ سے پیش آگیا تھا، اور قریب تھا کہ یک جہتی کا یہ شیرازہ بکھر کر پراگندہ ہو جائے بے مہاری کے اس سیلاب میں ڈر تھا کہ، سلف کے سارے کارنامے شاید تہ و بالا ہو کر رہ جاویں، اس کڑے وقت، اور کٹھن گھڑیوں میں درس حدیث کے قاسمی یا دیوبندی طریقہ کی خصوصیت نے کیا کام کیا۔ لیکن اتنی بات تو سب کے سامنے ہے کہ فرقہ اہل حدیث کی طرف سے امام ابوحنیفہ اور ان کے اجتہادی مسائل پر جو حملے پہلے ہوئے یا اس وقت تک ہوتے رہتے ہیں ان حملوں کے مقابلہ میں محدثانہ تحقیقی رنگ میں جواب دینے کی جتنی اچھی صلاحیت دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتوں میں پائی جاتی ہے، انصاف کی بات یہی ہے کہ اس کی نظیر ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ بیرون ہند کے اسلامی ممالک کے علماء میں بھی مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ اسی کتاب میں لکھا ہے کہ مولٰنا یعقوب نے اس خواب کو سن کر فرمایا کہ خواب دیکھنے والے

"شخص سے مذہب حنفی کو بہت تقویت ہو گی۔" ص۱۶۹

بوقت ضرورت اس سلسلہ میں مزید شواہد اور تائیدوں کو پیش کیا جاسکتا ہے، لیکن اس وقت تک آپ کے سامنے جو کچھ پیش ہو چکا ہے، اس کے متعلق یہ سوچتے ہوئے کہ عموماً ان روایتوں کے راوی فہمیدہ و سنجیدہ حضرات ہیں، ان میں دارالعلوم دیوبند کے صدر اول حضرت تھانوی کے استاذ جلیل مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں، اور ارواح ثلاثہ کی روائتوں کے راوی عمومی حضرت امیر شاہ صاحب سے ذاتی واقفیت جو نہیں رکھتے، وہ تو معذور ہیں لیکن اس ملکوتی صفات ہستی کو جنھوں نے دیکھا اور برتا ہے، وہی جانتے ہیں کہ اپنے بزرگوں کے متعلقہ روایات کے بیان کرنے میں وہ کتنے محتاط اور نزاکت پسند واقع ہوئے تھے، جہاں تک ان کے امکان میں تھا، عموماً ان ہی الفاظ کے دہرانے کی کوشش کرتے تھے جو ان بزرگوں سے اُن کے کانوں تک پہنچے تھے، یہی چوتھی روایت یعنی کعبہ کی چھت والے خواب کو بیان کر کے خانصاحب مزید یہ اضافہ بھی کرتے تھے کہ

"میں نے یہ خواب اور اس کی تعبیر خود مولانا نانوتوی سے سنی ہے۔" ص۱۶۹

یہی نہیں بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی بیان کرتے تھے کہ

"اس وقت میں اکیلا تھا اور پاؤں دبا رہا تھا، اور مولانا نے بے تکلف مجھ سے اپنا نام لیا۔"[1]

بہر حال یہ اور اسی قسم کے دوسرے قرائن و شواہد کی روشنی میں یہی محسوس ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر قدس اللہ سرہ العزیز ناسوتی زندگی میں قدم رکھنے سے پہلے وہ سب کچھ ہو چکے تھے، جس کا تفصیلی معائنہ اسی زندگی کی مختلف منزلوں میں دنیا کو کرایا گیا، بالفاظ دگر پیدا ہو کر وہ بڑے نہیں بنے تھے۔ بلکہ پیدائش سے پیشتر جن بڑائیوں سے وہ سرفراز ہو چکے تھے، پیدا ہونے کے بعد ان ہی بڑائیوں کا صرف ظہور ہوا تھا، انابت کے بعد ہدایت کی نعمت سے

[1] اس اضافہ کی ضرورت خاں صاحب کو اس لئے ہوئی تھی کہ حضرت نانوتوی کا عام دستور جیسا کہ خانصاحب ہی نے بیان کیا ہے، یہ تھا کہ اس قسم کے خوابوں کا ذکر عام محفلوں میں اگر آجاتا تو بجائے اپنے نام کے فرماتے کہ ایک شخص نے ایسا خواب دیکھا تھا ۱۲

جو نوازے جاتے ہیں، اور انابت کے بغیر ہی جنھیں چن لیا جاتا ہے، یعنی اجتباء کا منصب جلیل جنھیں عطا ہوتا ہے، خود ہی بتائیے، دونوں میں فرق ہی کیا رہے گا، اگر یہ نہ مانا جائے جس کے ماننے پر حقائق و واقعات نے مجھے مجبور کیا ہے۔

اس موقعہ پر اجتبائی امتیاز کو تقدیر کے مسئلہ سے مخلوط نہ کیا جائے، تقدیر کے ذیل میں اگر اس کو داخل کیا جائے گا تو اجتبائیوں کا امتیاز ہی کیا باقی رہے گا، قانون تقدیر کا مطلب تو یہ ہے کہ جو کچھ ہونے والا ہے، بڑا ہونے والا ہے، یا چھوٹا ہونے والا، سب ہی کے متعلق ہونے سے پہلے جانا جاتا ہے کہ وہ کیا ہوگا۔ یہ علم ہے جس میں عالم کا کمال ہی یہ ہے کہ اسکا علم معلوم کے عین مطابق ہو، اسی لئے کہتے ہیں کہ تقدیر میں عالم اپنے معلوم کا تابع ہوتا ہے، اور اجتباء تو حکم ہے، جس میں محکوم حاکم اور حاکم کے حکم و مرضی کا تابع ہوتا ہے[۱]۔

خیر میں کن جھگڑوں میں پھنس گیا۔ عرض یہ کر رہا تھا کہ خواہ دوسروں کی تشفی و تسلی ہوئی ہو یا نہ ہوئی، لیکن مجھ تک جو معلومات پہنچی ہیں، اضطراراً اسی نتیجہ تک انھوں نے مجھے پہنچا دیا ہے کہ جس غنی عن العالمین کی داد قابلیت کے ساتھ مشروط نہیں ہے۔ بلکہ ہر قابلیت اس کی داد و دہش کے ساتھ مشروط ہے، اسی نے بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کو منصب اجتباء سے سرفراز فرما کر پیدا کیا تھا، اسی اجتبائی شان کے کچھ آثار و لوازم تو وہ تھے جن کا ذکر آپ سن چکے

[۱] انشاء اللہ اس مسئلہ کی تفصیل سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کے حکیمانہ نظریات اور دین کی عارفانہ تشریحات کے باب میں کی جائے گی، اس موقعہ پر شبہ کا ازالہ ضروری تھا، اس لئے مسئلہ کی طرف اجمالی اشارہ کر دیا گیا، لوگوں کو یہ سمجھنا چاہئے کہ ایسی باتیں مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور قول کہ کنت نبیا و آدم منجدل بین الماء و الجسد (او کما قال) یعنی میں نبی تھا اسی زمانہ میں جب آدم بھی اس وقت پانی اور ڈھانچہ کے درمیان پڑے ہوئے تھے، اگر اس کو تقدیر کے ذیل میں شمار کیا جائے گا تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز ہی کیا باقی رہے گا، تقدیر کے لحاظ سے تو ہر مچھر اور ہر مکھی یہ کہہ سکتی ہے کہ میں اسی وقت مچھر اور مکھی بن چکی تھی، جب آدم ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ کیونکہ تقدیر الٰہی کی رو سے تو کائنات کا ہر ذرہ یہی حیثیت رکھتا ہے، یہی اصولی فرق اجتباء اور تقدیر میں ہے، مقام اجتباء ایک لاہوتی امتیاز ہے جس سے خاص بندوں کو نوازا جاتا ہے، اور تقدیری بات تو عام ہے ۱۲

وہ عالم بھی بنے، کروڑ ہا کروڑ انسانوں کو ان کی امامت پر فخر اور ناز بھی ہے، ان کی جاری کی ہوئی نہریں ہندو بیرون ہند کی علمی وادیوں میں دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں کہ کھیل بھی رہی ہیں، ان سے اسلامی دین کی وہ تشریحی شکل جو امام ابو حنیفہ اور ان کے ماننے والے ائمہ و علماء کی جدوجہد کی بدولت صورت پذیر ہوئی، یہ ان کا صدقہ ہے کہ دین کا یہ حنفی قالب شکست و ریخت، ٹوٹ پھوٹ کے خطرے سے ہندوستان میں محفوظ رہا بلاشبہ یہ سب کچھ دیکھا گیا اور دیکھا جا رہا ہے، مگر ہم سب نے تو وقوع کے بعد دیکھا جو کچھ دیکھا۔ لیکن جس نے یہ سب کچھ دکھایا اس نے تو وقوع و ظہور سے پہلے بہت پہلے ان سارے تماشوں کو دیکھ لیا تھا، آخر "اجتبائیت" کے لئے آپ ہی بتائیے کہ اور کیا دکھایا جاتا۔

اور میرا خیال ہے اور اسی خیال کے ظاہر کرنے کے لئے مجھے ایک طویل تمہیدی گفتگو کرنی پڑی کہ سیدنا الامام الکبیر کے والد ماجد شیخ اسد علی مرحوم جن کا اور جن کی بعض خصوصیات و حالات کا میں ذکر کر رہا تھا، ان کے متعلق اس قسم کی پھیلی ہوئی افواہیں کہ شاید وہ ناخواندہ تھے، یا اسی حد تک نوشت و خواند سے معمولی تعلق رکھتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ ان پر "خواندہ" کے لفظ کا اطلاق کیا جا سکتا تھا۔

یا واقعۃً وہ ایسے دہقانی کسان تھے کہ خود ہل جوتتے تھے، عرض کر چکا ہوں کہ ان افواہوں کی حیثیت اگر بازاری گپوں کی نہیں تو کم از کم سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ غلط عقیدت مندیوں کی یہ پیداواریں ہیں، اور ممالک کا تو حال معلوم نہیں، لیکن ہندوستان کے لوگوں کو نہ معلوم کسی بڑے آدمی کے متعلق اس قسم کی باتوں کے منسوب کرنے میں کیوں مزہ آتا ہے کہ اس کی بڑائیاں حد سے زیادہ گہری پستیوں سے پیدا ہوئیں، بجائے خود جیسا کہ میں کہہ بھی چکا ہوں اگر واقعۃً ایسی صورت پیش آئے اور اس قسم کے واقعات بھی ضرور پیش آتے رہے ہیں، اور آتے رہیں گے حی (زندہ) سے میت (مردہ) اور میت (مُردے) سے حی (زندے) کو نکالنے کا قرآنی قانون کائنات کا عام قانون ہے، آذر سے ابراہیم، نوح سے پسر نوح کی پیدائش جب ہو سکتی ہے تو اس دنیا میں

اس کے بعد سب کچھ ہو سکتا ہے، مگر گفتگو کو لذیذ کرنے کیلئے یا جس کے ساتھ عقیدت کا اظہار کیا جا رہا ہو، یہ سمجھ لینا کہ بیرونی اضافوں کے بغیر گفتگو ہی میں لذت رہے گی اور نہ عقیدت مندی کے فرائض سے ہم سبکدوش ہوں گے، میرے خیال میں یہ بڑی جسارت اور حد سے گذری ہوئی تفریط و بد احتیاطی ہے، مثالاً دیکھئے

دیو بند سے تعلق رکھنے والوں میں شاید ہی کوئی شخص ہوگا جو اس قصے کو مزے لیکر نہیں بیان کرتا، کہ مولٰنا محمد قاسم کو ایک دفعہ کسی مؤمن بھائی نے اپنے قبیلہ کا آدمی سمجھ لیا، جہاں تک میں جانتا ہوں، اتنی بات تو غالباً صحیح ہے، حضرت مولٰنا اشرف علی کے ملفوظات قصص الاکابر میں بھی ہے کہ

"ایک مرتبہ مولٰنا (محمد قاسم) دیو بند سے نانوتہ تشریف لے جارہے تھے ایک جولاہے نے بوجہ سادگی (وضع و قطع) کے اپنا ہم قوم سمجھ کر پوچھا کہ سوت کا آج کیا بھاؤ ہے، مولانا نے جواب دیا کہ بھائی آج بازار جانا نہیں ہوا، وہ جولاہہ کچھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔"

(الہادی ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۷ھ)

مگر ایک دفعہ نہیں بیسیوں بار جن مزید اضافوں کے ساتھ مختلف محفلوں میں اسی قصہ کو میں نے یا دوسروں نے سنا ہے کیا اسی حد پر وہ ختم ہو جاتے ہیں کہا جاتا ہے کہ اسی مغالطہ میں مبتلا ہو کر کہ مولٰنا کا تعلق قوم مؤمن سے ہے، کسی صاحب نے آپ کو راستہ میں پکڑا اور سر پر گٹھری غالباً کہنے والے گھاس بھی کہتے ہیں لدوا کر دور تک لے گیا، اور بیگار بنے ہوئے مولانا بھی چلے گئے پھر خدا جلنے اور کیا کیا ہوا، شاید جس کے پاس لے گئے وہ آپ کو پہچانتا تھا، بے چارا حد سے زیادہ ذلیل ہوا، وغیرہ وغیرہ

مگر جہاں تک میں سمجھتا ہوں اصل واقعہ کل اتنا ہے جس کا ذکر حضرت تھانوی نے فرمایا ہے، اس پر لذت گوش و زبان کے لئے ماہروں کے یہ اضافے ہیں، عموماً اس قسم کی روایتوں کا نام میں نے "جیونی روایات" رکھ چھوڑا ہے، ضرورت ہے کہ گپ تراشیوں کی اس عادت بد سے لوگوں کو روکا جائے

ان بزرگوں کے واقعی حالات وکیفیات ہی اتنے اثر انگیز، عبرت خیز ہیں، کہ اختراعی اضافوں کی قطعاً ضرورت باقی نہیں رہتی۔

بہرحال شیخ اسد علی صاحب مولانا کے والد مرحوم کے متعلق صحیح معلومات کی روشنی میں جہاں تک میں پہنچا ہوں وہ یہی ہے کہ ایک ذاکر و شاغل تعبیری بصیرت رکھنے والے باپ کے وہ صاحبزادے تھے، اس عہد کی دفتری زبان فارسی کی اعلیٰ تعلیم کی تکمیل دہلی کے علمی حلقوں میں کی، اور زندگی کا ایک حصہ دہلی کی متمدن مجلسوں میں ان کا گذرا تھا، سہارنپور کے متمول، صاحب علم وکیل کے وہ داماد تھے اسی لئے میرا خیال ہے کہ دنیاوی ترقیوں کی راہیں ان پر کھلی ہوئی تھیں، مگر خلاف توقع یہ چشم دید شہادت سوانح عمری قدیم کے مصنف امام ہمیں سناتے ہیں، اور عجیب الفاظ میں سناتے ہیں، یعنی لکھتے ہیں کہ

"مگر حال (شیخ اسد علی صاحب) کا ایسا تھا کہ گویا علم سے کچھ مناسبت ہی نہیں رکھتے" ص۴۲

اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ شیخ اسد علی صاحب پر بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ خاص قسم کا کوئی حال طاری تھا، ایسا حال جس نے دلی کے سارے لکھے پڑھے کو ان کے لئے کچھ ایسا بنا دیا کہ گویا انھوں نے کچھ نہیں پڑھا تھا۔

"جو کچھ لکھا پڑھا تھا نیاز نے اسے ایک دم بھلا دیا"

بعضوں پر تو یہ حال کسب و کوشش کے بعد طاری ہوتا ہے، لیکن اجتبائی قانون کے تحت جو چنے جاتے ہیں

(حاشیہ متعلقہ ص۱۳۸) ؎ یہ مشہور بزرگ و عالم حضرت ملاجیون رحمۃ اللہ علیہ کے اسم گرامی کی طرف اشارہ ہے، ملا صاحب مرحوم کو اورنگ زیب عالمگیر کا استاد قرار دے کر ان کے عقیدت مندوں نے خرافات کا ایک طومار تیار کر دیا ہے جو ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گیا ہے ان کی معصومیت کے بیان کو رنگین کرنے کیلئے یہ ساری داستانیں جہاں تک میرا خیال ہے، تراشی گئی ہیں، ورنہ جس نے ملا صاحب کی کتابیں نور الانوار و تفسیرات احمدیہ وغیرہ پڑھی ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس قسم کی کتابوں کے لکھنے والے کی طرف اتنی احمقانہ باتوں کا انتساب کسی حیثیت سے بھی صحیح ہو سکتا ہے، میرے نزدیک تو عالمگیر کے استاد ہونے کا قصہ بھی فرضی ہے، تفسیرات احمدیہ کے مقدمہ میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہی اس خیال کی تردید کے لئے علاوہ دوسرے دلائل کے کافی ہے ۱۲

ان کی ساری چیزیں غیر کسبی اور اجتبائی رنگ ہی میں رنگین ہوتی ہیں، جو چنا گیا تھا، اور مقام اجتبار سے جسے سرفرازی بخشی گئی تھی، وہ آ رہا تھا، اسی کی آمد آمد کی یہ تمہیدی شعاعیں تھیں، گویا طلوع خورشید سے پہلے تباشیر صبح کی حیثیت ان امور کی ہوتی ہے، اور اس کا تجربہ پہلی دفعہ نہیں بلکہ "اجتبائی ہستیوں" کے ظہور سے پیشتر عموماً کیا گیا ہے، اصطلاحاً ان ہی چیزوں کا نام "ارھاص" ہے، ذرا خیال تو کیجئے، شیخ اسد علی صاحب کے اس "حال" کو ایک طرف علمی زندگی گذارنے کے بعد ان کی نفس کی باطنی اور اندرونی حالت تو ایسی ہو گئی کہ دیکھنے والا یہ باور کرنے پر مجبور ہوتا تھا کہ گویا ان کو علم سے مناسبت بھی نہیں ہے، اس کے متعلق تو شاید یہ خیال بھی گذر سکتا ہے کہ علمی مشغلوں سے علیحدگی کی وجہ سے ممکن ہے کہ ان کا یہ حال ہو گیا ہو، مگر ہم اس کی توجیہ کیا کریں کہ تہذیب و شائستگی کے سب سے بڑے مرکز دہلی کی سوسائٹیوں میں پرورش پانے والے نوجوان کے متعلق مصنف امام ہی کی یہ شہادت ہے کہ باطن ہی نہیں بلکہ اسی باطن کے مطابق شیخ اسد علی صاحب کے "ظاہر" کی حالت بھی یہ ہو گئی تھی کہ ان کے

"عادات، اور ڈھنگ موٹے قصبات کے سے تھے"

شہری ماحول میں مہینے دو مہینے نہیں بلکہ سالہا سال تک زندگی گذارنے کے بعد اس قسم کا انقلاب قلب کی غیر معمولی شکستگی اور انکسار کے بغیر عام حالات میں آسان نہیں ہے جس کی سب سے بین اور روشن دلیل یہ ہے، خود ان ہی مصنف امام کی چشم دید گواہی اسی کے ساتھ یہ بھی ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ ایک طرف تو شیخ اسد علی صاحب کا یہ حال تھا، جو بیان کیا گیا، لیکن ان ہی شیخ اسد علی کی زندگی کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ وہ

"نہایت ہی صاحب مروت و اخلاق، کنبہ پرور، مہمان نواز، نمازی، پرہیزگار تھے" ص ۲۵

قدرا "نہایت ہی" کے تاکیدی الفاظ کو پیش نظر رکھئے، اور اسی کے ساتھ اس کا بھی خیال کیجئے کہ یہ بیان کسی شاعر، یا افسانہ نگار کا نہیں، بلکہ وقت کے قطب، صاحب دل، امام علامہ کے ذمہ دار قلم کا یہ تحریری وثیقہ ہے، گو یاد یکھنے میں یہ چند الفاظ ہیں مگر تعلق مع اللہ و تعلق مع الخلق دونوں کے اعتبار سے فضائل و کمالات کی کونسی قسم ہے، جو ان ہی مختصر الفاظ میں سمٹی ہوئی نظر نہیں آ رہی ہے۔

عام مخلوق کے ساتھ "مروت واخلاق" اقربا کے ساتھ "کنبہ پروری" مسافروں اور اجنبیوں کے ساتھ "مہمان نوازی" کے فرائض کی تکمیل اعلیٰ پیمانے پر کرتے ہوئے، خالق کے دربار کی پنجوقتہ حاضری، اور اس کے نشان زدہ حدود سے آگے بڑھنے میں "پرہیز" یا "تقویٰ" کے اصول پر قیام، دونوں سلسلوں میں "غایت ونہایت" تک پہنچتے ہوئے ہونے کی گواہی جس کے متعلق ایک شاہد عدل ثقہ و حجت دے رہا ہو، ہم اس کے متعلق اس کے سوا اور کیا سمجھ سکتے ہیں کہ دلی کے حاصل کئے ہوئے سرمایہ سے ان ہی چیزوں کو اس نے چھوڑ دیا تھا، جو چھوڑنے ہی کے قابل تھیں، اور باقی وہی رہ گئی تھیں جو باقی رہنے ہی کی مستحق تھیں۔

اور یہ جو کچھ ہو رہا تھا، خود شیخ اسد علی صاحب کو اس کی خبر ہو، یا نہ ہو، مگر بہ ظاہر قدرت کے "قانون اجتبا،" کا یہ عام اقتضار تھا، وہ اپنی صدی کی غیر معمولی "انقلابی ہستی" کے امین تھے، اور عرض کر چکا ہوں کہ پہلی دفعہ نہیں، بلکہ اس قسم کی انقلابی ہستیوں کے امینوں کے متعلق اسی قسم کے آثار کا عموماً مشاہدہ ہر زمانہ میں کیا گیا ہے۔

دراصل ان ہی معلومات، اور غیر مشتبہ شہادتوں کی روشنی میں اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ شیخ اسد علی مرحوم کے متعلق اس قسم کے عام لطیفے جو زبان زد عوام ہیں کہ مولانا نانوتوی کے دینی رجحانات کی شدت کو دیکھ ان کے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے اس بات کی شکایت کی کہ ہمارا لڑکا عام دنیاداروں کے لڑکوں کی طرح "کماؤ" نہیں ہے، یا موروثی جائداد پر نظر ثانی کا ارادہ حضرت نانوتوی نے جب فرمایا تو ان کے والد نے ان کو "گھر کھوؤ" قرار دے کر حاجی صاحب سے گلہ کیا، یہ یا اسی طرح اور بھی جو باتیں بیان کی جاتی ہیں، سننے والوں کو چاہئے کہ سننے کے ساتھ انہیں تسلیم نہ کریں، بلکہ دوسرے حالات اور واقعات سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے کہ ان لطائف کا انتساب شیخ صاحب مرحوم کی طرف کس حد تک صحیح ہو سکتا ہے۔

آخر میں پوچھتا ہوں کہ ان افواہی لطائف کی سند کیا ہے، جہاں تک میری جستجو اور تلاش کا تعلق ہے، ان کی نوعیت افواہی روایتوں سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی، برعکس اس کے

شیخؒ صاحب کی پرہیزگاری، دینداری، اخلاق و مروت، جود و سخا کا تحریری وثیقہ دارالعلوم دیوبند کے صدر اول حکیم الامت تھانوی کے استاذ مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ آپ کے سامنے میں پیش کر رہا ہوں، ایک ایسے ثقہ و حجت و امام کی چشم دید عینی شہادت کے مقابلہ میں ان افواہی روایتوں کی وقعت ہی کیا رہ جاتی ہے، زیادہ سے زیادہ ان روایتوں کی بنیاد پر اگر کسی حیثیت سے ان کی صحت تسلیم بھی کر لی جائے تو بھی کہا جا سکتا ہے کہ جائز ذرائع سے آمدنی کی توفیر کا خیال وہ بھی رکھتے تھے، خصوصاً کنبہ پروری مہمان نوازی کا جذبہ جس پر مستولی ہو، عام حالات میں اس قسم کا خیال ان کے متعلق خلاف توقع نہیں ہو سکتا، گھر میں ان کے ایک ہونہار لڑکا پیدا ہوا تھا، امید بندھی ہو گی کہ توفیر آمدنی کی اس حال میں اس سے مدد ملیگی مگر مولانا نانوتوی نے "جائز" کے دائرے کو بھی تنگ کر کے مالابد منہ یا ناگزیر ضروریات ہی کی حد تک اپنی معاشی جد و جہد کو چونکہ محدود فرما لینے کا عزم بالجزم کر لیا تھا جسکی تفصیل انشاء اللہ آئندہ آئے گی، تو یہ ہو سکتا ہے کہ ان کے اس حال سے شیخ صاحب کو گونہ گرانی محسوس ہوئی ہو، جس کا اظہار حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے انھوں نے بے تکلفی کی وجہ سے کبھی کر دیا ہو، اسی طرح موروثی جائداد کی "شرعی تقسیم" کے ارادے سے سرگرانی کا جو قصہ ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اگر مان بھی لیا جائے کہ اس کی کچھ اصلیت تھی، تو یہ سوچنے کی بات ہے کہ تین پشتوں سے جیسا کہ گذر چکا شیخ صاحب کے خاندان میں ایک مورث کا وارث بھی ایک ہی ہوتا چلا آرہا تھا، اس لئے قریب کی پشتوں میں بے احتیاطی کی گنجائش ہی نہ تھی، یہ ممکن ہے کہ تین چار پشت آگے "قاعدہ معروفہ" کے مطابق لڑکیوں کو محروم کر کے جائداد پر قبضہ کر لیا گیا ہو، ایسی صورت میں شیخ صاحب جیسے آدمی کے متعلق یہ توقع دشوار ہے کہ پشتہا پشت کی ان گئی گذری بھولی بسری باتوں کا خیال ان کو ہوتا، خصوصاً یہ اس زمانہ کی بات ہے جب ہندوستان کی حکومت بھی انقلاب کا شکار ہو چکی تھی۔

بجائے دارالاسلام کے اب اس ملک میں غیر اسلامی حکمرانوں کا سیاسی اقتدار قائم ہو چکا تھا،

ایسی صورت میں اچانک دینی ذمہ داریوں کے احساس کی جس شدید ذکاوت و نزاکت کا ظہور ان کے صاحبزادے (حضرت نانوتوی) میں ہوا، اور علمی طور پر پشتہا پشت کے ان ختم شدہ قصوں کے جگانے پر جب وہ آمادہ ہوئے ہونگے، تو شیخ صاحب کو ان کے طرز عمل سے کچھ گرانی اگر پیدا ہوئی ہو، تو یہ خلاف توقع گرانی نہیں ہو سکتی، مگر اسی کے ساتھ بالاتفاق یہ بھی جب بیان کیا جاتا ہے کہ بالآخر نظر ثانی کی جو تجویز ان کے صاحبزادے نے پیش کی تھی، شیخ صاحب نے اس تجویز کو صرف مان ہی نہیں لیا، بلکہ اپنی زندگی ہی میں اپنی مملوکہ جائداد کے ٹکڑے، پرچے، تکہ بوٹی کرانے پر راضی ہو گئے، اور یوں مقبوضہ جائداد کے معقول حصے سے بخوشی دست بردار ہو گئے، تو کیا یہ واقعہ خود ان کی اسی پرہیزگاری کی دلیل نہیں ہے، جس کی گواہی مصنف امام نے دی ہے، حالانکہ اپنے لڑکے سے وہ کہہ سکتے تھے کہ تم کو جو کچھ کرنا ہے میرے مرنے کے بعد اس جائداد کے مالک و قابض ہونے کے بعد کیجیو، مگر میں جب تک زندہ ہوں، جائداد کا شرعاً و قانوناً میں مالک ہوں، تم کو میری جائداد پر نظر ثانی کرانے کا کیا حق ہے، خدانخواستہ اگر ان کا دینی جذبہ اسی قدر مردہ ہوتا جو ان افواہی روایات کا اقتضاء ہے، تو غالباً وہ یہی کرتے، اور مولانا نانوتوی کم از کم قانوناً ان کو نظر ثانی کے اس قصے پر مجبور نہیں کر سکتے تھے، اسی لئے ان روایتوں پر جہاں تک میں خیال کرتا ہوں غور کرنے کے بعد شیخ صاحب کے متعلق آدمی اسی نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے، جس کا علم مصنف امام کی مذکورہ بالا تحریری شہادت سے ہو رہا ہے۔

بہر حال میرا خیال یہی ہے کہ ایک بڑے بیٹے کے شیخ صاحب اتنے بڑے باپ تو یقیناً نہ تھے جتنی بڑائیاں ان کے صاحبزادے کو قدرت کی طرف سے ارزانی ہوئی تھیں، لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ اتنے چھوٹے بھی نہ تھے کہ حضرت نانوتوی قدس اللہ سرہ جیسے بیٹے کے پدر بزرگوار ہونے کا انتساب ان کی طرف کسی حیثیت سے موجب شرمندگی ہو، بلکہ چشم بینا کے سامنے تو بیٹے کی بڑائیاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود باپ کے اندر سے جھانک رہی ہیں، حضرت نانوتوی کی طرف تقریباً تواتر کی شکل میں یہ الفاظ روایتوں میں عموماً منسوب

کئے گئے ہیں، فرمایا کرتے تھے۔

"اسی علم نے خراب کیا، ورنہ اپنی وضع کو ایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا" ارواح ص۲۰۵

اسی ملفوظ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت تھانوی یہ بھی اضافہ فرماتے تھے کہ حضرت نانوتوی نے فرمایا

"ایسا گم ہوتا کہ کوئی نہ پہچانتا کہ قاسم دنیا میں پیدا بھی ہوا تھا" (قصص الہادی ص۳۱ ماہ جمادی الاولیٰ)

اس کیفیت میں اور شیخ اسد علی صاحب کے متعلق آپ جو یہ سن چکے کہ لکھنے پڑھنے کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو ایسا بنا لیا تھا کہ بقول مصنف امام

"کہ گویا علم سے کچھ مناسبت ہی نہیں رکھتے" ص۲۴

روشنی کی ان دونوں کرنوں میں کیا فرق ہے۔

اور یہ واقعہ ہے کہ شیخ اسد علی صاحب حالانکہ اپنے فرزند سعید کی مقدرہ بڑائیوں کے ظہور کے بعد بھی زندہ رہے اور کافی مدت تک زندہ رہے، لیکن بڑے بیٹے کے باپ بن جانے کے بعد بھی روپوش رہنے کی کوشش کو انھوں نے مسلسل جاری رکھا، اسی کا آج یہ نتیجہ ہے کہ ان مختصر معلومات کے سوا جن کا ذکر کیا گیا، اور کوئی بات ان کے متعلق نہ معلوم ہوسکی۔

اور یہ حال تو حضرت نانوتوی کے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا تھا، باقی آپ کی والدہ ماجدہ طیب اللہ ثراہا، سو بجز اس کے کہ سہارنپور کے ایک متمول و معزز و محترم وکیل شیخ وجیہ الدین نانوتوی کی وہ صاحبزادی تھیں، باوجود تلاش کے اور کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ حتیٰ کہ ان کے اسم گرامی کا بھی ذکر کتابوں میں نہیں کیا گیا ہے، اور مخدرات اسلامی کے لحاظ سے یہ بات قابل تعجب بھی نہیں ہے، صرف حضرت والا کے حفید سعید مولانا محمد طیب صاحب کی ایک تحریری یادداشت میں ایک واقعہ کا تذکرہ کیا گیا ہے جس میں والدہ ماجدہ کا ذکر آگیا ہے، اور واقعہ بھی ایسا ہے کہ "اجتبائیت" کا جو دعویٰ خاکسار کی طرف سے پیش کیا گیا ہے جب تک اس کو تسلیم نہ کر لیا جائے عام حالات میں شاید ہی سننے والے اس کو باور کرنے پر آمادہ ہوسکتے ہیں۔ مولانا محمد طیب سلمہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ارقام فرمایا ہے، اس کا حاصل یہ ہے، کہ حضرت نانوتوی کی عمر غالباً پانچ چھ

سال کی تھی، مولانا کے نانا یعنی مولوی وجیہ الدین صاحب وکیل نے عید کے لئے ایک عمدہ جوڑا سلوا کر اپنی صاحبزادی کے پاس بھیجا کہ بچے کو بھی جوڑا عید میں دینا، لکھا ہے کہ اس جوڑے کو دکھا کر آپ کی والدہ نے فرمایا

"ایسا جوڑا عید میں کسی کے پاس نہ نکلے گا"

اب یہی سننے کی بات ہے، بچہ کی عمر پانچ چھ سال کی ہو، بیان کیا گیا ہے کہ اس فقرے کے سننے کے ساتھ دیکھا گیا کہ حضرت نانوتوی جو اس وقت صرف پانچ یا چھ سال کے "قاسم" تھے "رو پڑے" اور کہا کہ میں ایسے قیمتی کپڑے پہنوں گا؟ مجھ جیسے پر ایسا اچھا جوڑا پھبے گا؟ حضرت کی "اجتبائی شان" کو جب تک تسلیم نہ کر لیا جائے؟ خود ہی سوچئے کہ ایک بچے سے اس ردعمل کی کسی حیثیت سے بھی توقع کا امکان ہے، بچوں میں عموماً مقابلہ اور تفرد کا غیر شعوری جذبہ زیادہ نمایاں ہوتا ہے لیکن تفرد و امتیاز کا خود خیال تو کیا آتا خیال دلانے پر بجائے اترانے اور اکڑنے کے آپ دیکھ رہے ہیں، اسی خیال نے ان کو رلا دیا، سچ تو یہ ہے کہ اسی "معصوم گریہ" میں مستقبل کا پیش آنے والا "خندہ" مسکرا رہا تھا، مگر والدہ صاحبہ کا دھیان اس "بشریٰ" کی طرف نہ گیا، جو مژدہ سنا رہا تھا کہ اے خاتون اسلام مبارک ہو تجھے ایسا بچہ جو دوسروں کو بلند کرنے کے لئے خود پستی کی زندگی اختیار کرے گا، اور دوسروں کو ہنسانے کے لئے خود روئے گا، مگر دنیا کے عام بچوں پر قیاس کر کے اپنے بچے کی اس حرکت پر بیان کیا جاتا ہے کہ ان کو غصہ آیا اور فرمانے لگیں۔

"جب کوئی اچھی چیز آتی ہے، تو تیرے یہاں رونا ہی پڑ جاتا ہے، کبھی خوش ہو کر اچھا کپڑا نہیں پہنا، اچھا کھانا نہیں کھایا"

لکھا ہے کہ والدہ ماجدہ کے ان الفاظ پر مولانا اور زیادہ روئے، اور رونے ہی پر بس نہیں کیا، بلکہ کسی کام سے دیکھا کہ والدہ کہیں چلی گئی ہیں، تو جیسا کہ مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں ہے کہ مولانا نے

"چپکے سے جا کر جوڑے کو چولھے میں رکھ دیا جو جل کر راکھ ہو گیا"

اس قصے کو نقل کر کے مولنٰا طیب نے یہ بھی آخر میں ارقام فرمایا ہے کہ

"مزاج کی یہ افتاد ابتدا ہی سے تھی کہ تکاثر و تفاخر کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔"

میں پوچھتا ہوں کہ "اجتبائیت" کے دعوے کے غیر شعوری اعتراف کے سوا مولانا کے اس بیان کو اور کیا قرار دیا جائے، اور انھوں نے تو اپنے جد امجد کو دیکھا نہیں تھا سنی سنائی باتوں نے اس نتیجہ تک ان کو پہنچا دیا ہے، مگر حضرت والا کی والدہ ماجدہ کی طرف مذکورہ بالا الفاظ جو منسوب کئے گئے ہیں یعنی کبھی خوش ہو کر اچھا کپڑا نہیں پہنا، اور اچھا کھانا نہیں کھایا اگر واقعی یہ ان ہی کے الفاظ ہیں، تو حضرت کے ایام طفولیت کی زندگی کے ایک خاص پہلو کی گویا یہ ایک مکمل روداد ہے، جس میں "اجتبائی تجلیوں" کی روشنی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا، ورنہ یہ دوامی عادت کسی بچے کی عام حالات میں کیا قابل تصور ہو سکتی ہے، مگر جو پیدا ہونے کے بعد نہیں بنتا، بلکہ بنا بنایا ہوا ہی وہ پیدا کیا جاتا ہے، اس قسم کی اجتبائی اور انتخابی ہستیوں کی عام حالت یہی ہوتی ہے۔

بہر کیف آپ کی والدہ ماجدہ کے متعلق یہی ایک روایت ہے جس میں ان کا ذکر بڑی معلومات کی حد تک ملتا ہے۔

مصنف امام کے حوالے سے یہ بات تو گذر چکی کہ علاوہ ایک ہمشیرہ صاحبہ کے مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے "بھائی پیدا ہوئے مگر لڑکپن میں مر گئے"۔ مگر اس کا پتہ نہ چل سکا کہ ان بھائیوں اور بہن میں مولانا نانوتوی کی بڑے یا چھوٹے ہونے کے اعتبار سے کیا حیثیت تھی، بہ ظاہر جس کی تائید بعض قرائن سے ہوتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ہمشیرہ صاحبہ جن کا ذکر عقد بیوگان کی مہم کے سلسلے میں انشاء اللہ آیندہ آئے گا، شاید عمر میں آپ سے بڑی تھیں۔

**تاریخ ولادت** اب کچھ بھی ہوا اپنے بہن بھائیوں میں آپ بڑے ہوں یا چھوٹے اتنی بات یقینی ہے، کہ ۱۲۴۸ھ ہجری کے کسی مہینہ میں بہ مقام نانوتہ آپ کی ولادت باسعادت سے ظلمت کدہ ہند منور و روشن ہوا، مہینہ کے متعلق اتنے اختلاف ہیں کہ عیسوی حساب سے ہجری کا یہ سن

۱۸۳۲ء اور ۱۸۳۳ء دونوں میں واقع ہو سکتا ہے۔

آئندہ جن بڑائیوں کے ساتھ آپ دنیا کے سامنے نمایاں ہوئے، ظاہر ہے کہ ولادت کے وقت ان کا اندازہ کون کر سکتا تھا، اور یہ بات دنیا کے اکثر بڑے آدمیوں کے متعلق عام ہے، میں تو اسی کو غنیمت خیال کرتا ہوں کہ حضرت والا کی ولادت کا سال لوگوں نے یاد رکھا، اور کتنی تاریخی ہستیاں ہیں جنکی وفات کی تاریخ کے یاد رکھنے والوں کی تعداد کروڑوں سے متجاوز ہی ہو، مگر ان ہی کی پیدائش کی صحیح تاریخ کا بتانے والا ایک آدمی بھی نہیں ملتا۔

مگر تعجب ہوتا ہے کہ حضرت والا کے لئے تاریخی نام کے نکالنے کی جب کوشش کی گئی عرض کر چکا ہوں کہ پانے والوں نے "خورشید حسین" کے حروف کی ابجد کے حساب سے ۱۲۴۸ھ میزان پائی، یہی آپ کا تاریخی نام تجویز کیا گیا، اپنی بعض تحریروں میں حضرت نے اپنے اس تاریخی نام کا تذکرہ بھی فرمایا ہے، مشہور نام کا کسی وقتی مصلحت کی وجہ سے کبھی اخفاء اگر مقصود ہوتا، تو بجائے "محمد قاسم" کے فرمایا کرتے، میرا نام "خورشید حسین" ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرفاء نانوتہ میں بچوں کی ولادت کی تاریخ کو کسی قسم کی اہمیت ضرور حاصل تھی، مصنف امام نے بھی سوانح قدیم میں حضرت کے اس تاریخی نام کا ذکر کرتے ہوئے ضمناً یہ بھی لکھا ہے کہ خود ان کا نام "منظور احمد" رکھا گیا تھا، اور اسی کے ساتھ اس کی بھی تصریح انھوں نے کی ہے کہ "بندہ کی پیدائش صفر ۱۳، ۱۲۴۹ھ کی ہے۔

اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ پیدائش کے سال و ماہ کے یاد رکھنے کا دستور نانوتہ کے شیوخ میں مروج تھا، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر میرا ذہن تو کچھ ادھر بھی جاتا ہے کہ حضرت والا کا عام مشہور نام "محمد قاسم" جو رکھا گیا تھا، یہ محض کوئی اتفاقی واقعہ غالباً نہ تھا۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ صدیقی شیوخ کا یہ خانوادہ جو نانوتہ میں آباد ہوا تھا، اپنے شجرۂ نسب کو محمد بن ابی بکر الصدیق کے صاحبزادے "قاسم بن محمد" پر ختم کرتا تھا، میں یہ مانتا ہوں کہ ہندوستان کے قصباتی مسلمانوں کے تمام حالات کو دیکھتے ہوئے یہ دعوے شاید خلاف توقع

ہوگا کہ اپنے مورثِ اعلیٰ "قاسم بن محمد" کے حالات، اور ان کی علمی و دینی خصوصیات سے نانوتہ کے شیوخ کما حقہ واقف[1] تھے۔ اور اپنے ان ہی تاریخی معلومات کی بنیاد پر شیخ اسد علی صاحب نے خاندان کی اس مرکزی ہستی کے نام پر اپنے صاحبزادے کا نام "محمد قاسم" رکھا ہوگا۔

مگر "فیوضِ قاسمیہ" کے نام سے حضرت والا کے بعض مکاتیب کا ایک مجموعہ جو شائع ہوا ہے، ان ہی میں ایک مکتوبِ گرامی حضرت محمد بن قاسم کے متعلق بعض ایسی نادر غیر مشہور معلومات پر مشتمل ہے، کہ اپنی حد تک میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آج تک تاریخ کی کسی بڑی یا چھوٹی کتاب میں یہ چیزیں باوجود تلاش کے مجھے نہیں مل سکی ہیں۔

مولانا نے اس مکتوب میں ارقام فرمایا ہے، کہ یزدجرد شاہ ایران کی شہزادی "شہر بانو" جو سیدنا امام زین العابدین کی والدہ ماجدہ تھیں، ان کے سوا ماہ بانو، اور مہر بانو نامی یزدجرد کی دو شہزادیاں اور بھی تھیں، جن میں ایک "قاسم بن محمد" کی والدہ تھیں طرزِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قاسم بن محمد کی والدہ کا نام "ماہ بانو" تھا۔

اس میں شک نہیں کہ یزدجرد کی ان تینوں شہزادیوں کا ذکر بعض مورخین نے اپنی کتابوں میں بھی کیا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان میں ایک تو امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اور باقی دو شہزادیاں خلیفہ اول کے صاحبزادے محمد بن ابی بکر اور خلیفہ دوم کے صاحبزادے عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے سپرد کی گئیں، لیکن جہاں تک میری تلاش کا تعلق ہے، "شہر بانو" کے نام کی تصریح تو کتابوں میں کی گئی ہے، مگر "ماہ بانو" اور "مہر بانو" یہ دونوں نام پہلی دفعہ حضرت والا کے اسی

---

[1] قاسم بن محمد کے تفصیلی حالات طبقات ابن سعد میں پڑھے جا سکتے ہیں' والد کی شہادت کی وجہ سے بچپن ہی سے اپنی پھوپھی ام المومنین صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی آغوش تربیت میں انکی پرورش ہوئی، علم و فضل میں ان کا پایہ کتنا بلند تھا اس کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ عہد تابعین میں مدینہ کے فقہاء سبعہ کے ایک رکن رکین یہ بھی تھے، بیست کردار، دل و دماغ کی بلندی کیلئے یہی کافی ہے کہ بنی امیہ کے لوگوں نے عمر بن عبدالعزیز کو جب زیادہ پریشان کیا تو انہوں نے دھمکی دی تھی کہ مدینہ جاکر خلافت کو مسلمانوں کی شوریٰ کے سپرد کردوں گا، اور فرمایا کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے سب سے بڑے حق دار قاسم بن محمد ہیں۔ دیکھئے طبقات ۱۲

مکتوب میں فقیر کی نظر سے گذرے، اسی طرح اسی مکتوب میں ایک خبر آپ نے یہ بھی دی ہے کہ ان کے مورث اعلیٰ "قاسم بن محمد" امام جعفر صادق کے نانا بھی تھے۔ (فیوض قاسمیہ ص۱۶)

میں قطعی طور پر تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت والا تک اپنے مورث اعلیٰ قاسم بن محمد کے متعلق یہ نادر غیر مشہور معلومات کن ذرائع سے پہنچی تھیں، لیکن عام مشہور و متداول تاریخی کتابوں میں ان کا نہ ہونا، نیز اسی کے ساتھ اس کو بھی اگر پیش نظر رکھ لیا جائے، کہ "تاریخ" کے فن سے حضرت والا کے مطالعہ کا چنداں خصوصی تعلق بھی چونکہ نہ تھا، اس لئے بظاہر یہی خیال گذرتا ہے کہ غالباً صدیقی شیوخ کے قاسمی خانوادہ میں اپنے مورث اعلیٰ کے متعلق اس قسم کی معلومات خاندانی طور پر منتقل ہوتی ہوئی چلی آتی تھیں، اور ان معلومات پر اس حد تک بھروسہ کیا جاتا تھا کہ تحریر و تقریر میں حضرت نانوتوی جیسے ذمہ دار بزرگ بھی ان معلومات کے تذکرے میں مضائقہ نہیں محسوس فرماتے تھے[۱]۔۔۔

اگرچہ یہ ایک ضمنی بات تھی، لیکن مقصد میرا اس کے ذکر سے یہ ہے کہ حضرت والا کا اسم گرامی خاندان کے مورث اعلیٰ کے نام پر ان ہی معلومات کی بنیاد پر تفاؤلاً اگر رکھا گیا ہو، جو نانوتہ کے شیوخ میں ابا عن جدٍ منتقل ہوتی ہوئی چلی آرہی تھیں، تو اس ضمنی بات کو پیش نظر

---

[۱] دار العلوم دیوبند کے کتب خانہ سے حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک قلمی یادداشت ملی ہے جس میں اپنے دست مبارک سے منجملہ دوسری چیزوں کے حضرت والا نے اپنا نسب نامہ بھی درج فرمایا ہے، اس نسب نامہ میں نانوتہ کے صدیقی قاسمی شیوخ کے مورث اعلیٰ مولوی محمد ہاشم سے اوپر کے اسماء بھی بایں ترتیب پائے جاتے ہیں، یعنی محمد ہاشم بن شیخ شاہ محمد بن قاضی طٰہٰ بن شیخ مفتی مبارک ابن امان اللہ بن جمال الدین بن قاضی شیخ میران بڑے بن قاضی مظہر الدین بن نجم الدین ابن نور الدین بن حسام الدین بن ضیاء الدین بن نور الدین بن نجم الدین بن نور الدین بن رکن الدین بن رفیع الدین بن ضیاء الدین بن شہاب الدین بن خواجہ یوسف بن شیخ جلیل بن صدر الدین بن شیخ رکن الدین سمرقندی بن صدر الدین حاجی بن اسماعیل شہید بن نور الدین قتال بن شیخ محمود بن بہاء الدین بن عبد اللہ بن زکریا بن شیخ نور ابن سراج الدین ابن شیخ سادھن صدیقی ابن وجیہ الدین ابن مسعود بن عبد الرزاق بن قاسم بن محمد بن ابی بکر ابن ابی قحافہ الخ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے خاندانی نسب نامہ سے نانوتہ کے شیوخ کو کافی دلچسپی تھی۔ نسلاً بعد نسلٍ یہ شجرہ ان میں منتقل ہوتا رہا ۱۲

رکھتے ہوئے اس استبعاد کا غالباً ازالہ ہو جاتا ہے، جو ہندوستان کے قصباتی مسلمانوں کے عام حالات کی بنیاد پر پیدا ہو سکتا ہے۔

بہرحال "محمد قاسم" آپ کا عام نام اور "خورشید حسین" تاریخی نام رکھا گیا، اور اسی چیز نے آپ کے سال ولادت کو کم از کم ہجری سن کے حساب سے غیر مشکوک بنا دیا ہے لیکن ماہ ولادت کا مسئلہ صرف اختلافی نہیں بلکہ تعجب انگیز حد تک اختلافی ہے، مصنف امام جو آپ سے عمر میں صرف چند مہینے چھوٹے تھے، نزدیکی و قرب کے گوناگوں تعلقات کے باوجود انھوں نے اس سلسلہ میں رمضان، شعبان، ربیع الثانی، جمادی الثانی، محرم ان پانچ مہینوں کی طرف آپ کی ولادت کی تاریخ کو مختلف اقوال کی بنیاد پر منسوب کیا ہے، حاشیہ میں لکھا ہے کہ ان کی یاد کے مطابق ربیع الثانی یا جمادی الثانی کا مہینہ تھا پھر دوسروں کے اقوال نقل کر کے آخر میں فرماتے ہیں "اور یہ بھی صحیح معلوم نہیں ہوتا"، بھی کے لفظ سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے، صرف آخری قول ہی نہیں، بلکہ اس کے سوا بھی جو دوسرے اقوال بیان کئے جاتے ہیں، قطعی صحت کی ضمانت کسی کے متعلق نہیں لی جا سکتی، اور جب مہینے ہی کا مسئلہ مشتبہ و مشکوک ہے تو تاریخ کا تعین کون کر سکتا ہے۔

پس ماہ ولادت کے مسئلہ میں اسی پر قناعت کرنا چاہئے کہ ۱۲۴۸ھ کے مذکورہ بالا مہینوں میں سے کوئی مہینہ تھا، طرفہ تماشا یہ ہے کہ مہینوں کے نام جو اس سلسلے میں لئے گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ اس سال کے ابتدائی، وسطانی، آخری تینوں قسموں کے مہینوں کی ان میں گنجائش[1] ہے۔

[1] عملاً ماہ ولادت کے اسی اشتباہ کی وجہ سے عیسوی سن کا مسئلہ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں مشتبہ ہو جاتا ہے، یعنی محرم، ربیع الثانی، جمادی الثانی، شعبان کے مہینوں کے حساب سے تو عیسوی سن آپ کی ولادت کا ۱۸۳۲ء قرار پاتا ہے، مگر بجائے ان کے اگر مانا جائے کہ حضرت کی ولادت ماہ رمضان میں ہوئی۔ تو ۱۲۴۸ ہجری کے رمضان کو حساب سے ۱۸۳۳ء میں پڑنا چاہئے۔ گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ تاریخ و ماہ ہی نہیں بلکہ عیسوی سن کے اعتبار سے سن ولادت تک مخفی نہیں تو مشتبہ ضرور ہو گیا۔ گم نام رکھنے کی کوشش میں چاہئے تو اسے کامیابی قرار دے سکتے ہیں ۱۲

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا کی زندگی میں کسی کو اس کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی کہ خود آپ سے آپ کی ولادت کی تاریخ دریافت کرے، اور یہ خوف آپ کے اس بیان پر یعنی اپنے کو "ایسا گم کرنا کہ کوئی نہ پہچانتا کہ قاسم دنیا میں پیدا بھی ہوا تھا" غالباً مبنی تھا، اس قسم کے سوالات عموماً ان ہی لوگوں کے متعلق کئے جاتے ہیں، جن کے حالات کو قلمبند کرنے کا ارادہ کیا جاتا ہے خصوصاً امتیاز حاصل کرنے والی ہستیوں کے متعلق تو یہ قاعدہ عام ہے مصنف امام نے ماہ ولادت کے اختلاف کو حاشیہ میں درج کرتے ہوئے ابتدا میں جو یہ الفاظ لکھے ہیں کہ

"جناب مولوی صاحب (یعنی مولانا محمد قاسم) کی پیدائش کا سن تاریخی نام سے معلوم تھا۔" صـ۲۴

خود اس میں بھی گو نہ اس کا اشارہ پایا جاتا ہے کہ سن کا علم محض تاریخی نام کی بدولت محفوظ رہ گیا، ورنہ خود مولانا سے پوچھنے پر سن کا مسئلہ بھی اگر موقوف رہتا، تو شاید پوچھنے والے بھی پوچھنے کی ہمت نہ کرتے اور جس سے پوچھا جاتا وہ بھی اس کا شافی جواب غالباً لوگوں کو نہ دیتا۔

حضرت والا کے ایام شیر خوارگی، وعہد طفولیت کے حالات پر عام پردہ جو پڑا ہوا ہے، اس کی بڑی وجہ یہی ہے، ورنہ اجتبائیت کی جس شان کو لے کر آپ پیدا ہوئے تھے، اس کا اقتضاء تو یہی ہے کہ زندگی کی ہر منزل میں اس شان کی خصوصیتوں کا ظہور کسی نہ کسی رنگ میں ضرور ہوا ہوگا، مگر بجائے واقفیت کے جس چیز کے متعلق لوگوں کو ناواقف بنانے کی مسلسل کوشش کی گئی ہو، ہم جیسے بے خبروں کی رسائی کی آپ ہی بتائیے کہ کیا شکل ہے۔

مصنف امام جو آپ کے ہمجولی بزرگ ہیں انھوں نے بھی عہد طفولیت کے بعض واقعات و حالات کا اگرچہ ذکر کیا ہے، مگر یہ اس زمانہ کی باتیں ہیں جب ہوش وحواس کی بیداری کی ابتدا کا وقت بچوں کے لئے آجاتا ہے، آغاز بیداری کے اس عہد سے پہلے کی سرگذشت کے متعلق کچھ معلوم نہ ہوسکا، بجز اس کے کہ آپ کے حلیہ نگاروں میں بعضوں نے لکھا ہے کہ

" قدرے داغ چیچک نمودار تھے" (مذہب منصور صـ۱۹۵)

یعنی چہرۂ مبارک پر معلوم ہوتا ہے کہ چیچک کے داغ کے کچھ نشانات تھے قطعی طور پر نہیں

کہا جاسکتا کہ چیچک کا حملہ عمر کی کس منزل میں آپ پر ہوا تھا، مگر عام طور پر چونکہ یہ بچوں ہی کا مرض ہے اس لئے یہ سمجھنا چاہئے کہ بچپن میں چیچک کی بیماری میں بھی آپ مبتلا ہوئے تھے۔

عید کے موقعہ پر نانا جان کے گھر سے آئے ہوئے جوڑے کو نذر آتش کردینے کے جس قصہ کا ذکر گذرا، ظاہر ہے کہ یہ واقعہ بھی طفولیت کے اسی عہد سے مناسبت رکھتا ہے جب بیہوشی کی منزل سے آپ گذر چکے تھے، اسی طرح حضرت والا کے حفید رشید مولانا طیب صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کی تحریری یادداشت میں ایک اور واقعہ کا تذکرہ جو کیا گیا ہے، حاصل جس کا یہ ہے کہ ان ہی دنوں میں جب حضرت کی طفولیت کا زمانہ تھا، شدید قحط پڑا، نتیجہ یہ ہوا کہ اچھے اچھے گھرانوں میں بجائے گیہوں کے جوار ہی کے استعمال پر لوگوں کو مجبور ہونا پڑا، ان ہی گھرانوں میں شیخ اسد علی آپ کے والد کا گھر بھی تھا، لکھا ہے کہ بجائے گیہوں کے اچانک جوار ہی کی روٹیوں کا سلسلہ آپ کے گھر میں بھی جب شروع ہوا، تو عادی نہ ہونے کی وجہ سے مولانا کچھ اکتا سے گئے، اب والدہ نے خیال دلایا یا خود خیال آیا کہ سہارنپور میں نانا جان کے پاس چلا جاؤں جہاں جوار کی اس مصیبت سے نجات ملیگی، مگر خیال ابھی خیال سے آگے نہیں بڑھا تھا کہ اسی کے ساتھ جیسا کہ مولانا طیب کے الفاظ ہیں،

"یہ خیال دل میں آیا کہ خدا نے جوار ہی دی ہے، اور بعض ایسے شخص ہیں کہ ان کو جوار بھی میسر نہیں، پس خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے، اور صبر سے اسی پر قناعت کرنا چاہئے"

زندگی کے موجودہ عبوری دور میں سکون و قرار کا یہ "گر" کہ بجائے اوپر کے، زندگی کے احتیاجی شعبوں میں نیچے کی طرف دیکھ کر تسلی حاصل کرنی چاہئے، یا بریدہ دیکھ کر جیسا کہ سعدی نے لکھا ہے، جوتیوں سے محرومی کی شکایت کا ازالہ ہوگیا، اگر واقعی اسی خیال کے زیر اثر نانا جان کے یہاں جانے کا خیال دل سے آپ کے نکل گیا تھا، تو طفولیت کے جس زمانہ کا یہ قصہ ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کو خدائے بخشندہ کی بخشی ہوئی ازلی سعادت اور سلامت فہم کے سوا اور کیا قرار دیا جائے، یقیناً زور بازو سے حاصل کی ہوئی سعادت کا یہ رنگ نہیں ہوتا، قرآنی اصطلاح کی بنیاد پر اسی کا نام میں نے "اجتبائیت" رکھا ہے، اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ قدم قدم پر اسی کے شواہد و بینات

کتنی واضح شکلوں میں سامنے آتے چلے جا رہے ہیں، ورنہ عام بچوں سے کیا اس کی توقع کیجا سکتی ہے کہ بجائے اترانے کے عید کے ایسے جوڑے دیکھ کر وہ رو دیں جسے پہن کر اپنے ہم عمروں میں انہیں امتیاز حاصل ہو سکتا تھا، یا گیہوں کی روٹیوں کو چھوڑ کر جوار ہی کی روٹیوں پر اس لئے صبر کریں کہ بہتوں کو جوار کی روٹیاں بھی میسر نہیں آ رہی ہیں۔

عہد طفولیت کے ان ہی دنوں کے متعلق مصنف امام نے کھیل کود اور دوسرے طفلانہ مشاغل کا ذکر کرتے ہوئے حضرت والا کی طرف چند ایسی خصوصیتوں کا انتساب کیا ہے کہ آپ کی اجتبائی شان کا سہارا لئے بغیر عام حالات میں بچوں سے اس قسم کی باتوں کی توقع مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے، بلکہ بطور "قدر مشترک"، جونکہ عموماً ان تمام خصوصیتوں میں جہانتک میرا خیال ہے زیادہ تر دخل ان ہی "لاہوتی مواہب" یا خداداد نعمتوں کو ہے جن سے جسمانی طور پر آپ سرفراز کئے گئے تھے، اس لئے جی چاہتا ہے کہ حضرت والا کے جسدی خد و خال یا چاہئے تو اسے حضرت والا کا آپ "حلیہ" بھی قرار دے سکتے ہیں۔ اس کو اسی موقعہ پر درج کر دوں۔

## حلیہ مبارک

موقعہ کی مناسبت سے چاہئے تو یہی تھا کہ بچپن میں آپ کی شکل و صورت کی جو نوعیت تھی اسے درج کرتا۔ مگر جن ذرائع سے کام لے رہا ہوں، اس معاملہ میں ان سے کچھ مدد نہ مل سکی، کوئی چارہ اس کے سوا اور نہ تھا کہ معمر ہونے کے بعد دیکھنے والوں نے آپ کو جس حال میں دیکھا تھا، اور اس زمانہ کا جو "قدوسی حلیہ" حضرت والا کا لوگوں کو نظر آیا اسی کو پیش کر دوں شاید اسی حلیہ سے بچپن کے "حلیہ" کا اندازہ کچھ کر لیا جائے۔

حکیم الامت التھانوی قدس اللہ سرہ اپنے استاد مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ یعنی ہمارے "مصنف امام" کے حوالہ سے فرمایا کرتے تھے کہ ان سے ایک دن کسی نے پوچھا کہ مولانا (یعنی مولانا محمد قاسم) کو یہ کمالات کس طرح حاصل ہوئے، اسی سوال کے جواب میں مولانا محمد یعقوب صاحب نے منجملہ دوسرے اسباب و وجوہ کے یہ بھی فرمایا کہ۔

"مولانا (محمد قاسم)، فطری طور پر معتدل القویٰ اور معتدل المزاج تھے"۔

(قصص الاکابر ص۳ ماہ جمادی الاول ۵۷ھ)

جیسا کہ معلوم ہے مولانا محمد یعقوب صاحب باضابطہ فن طب کے بھی ماہر اور استاذ تھے، مولانا مرحوم کے بچپن کے ساتھی اور رفیق تھے۔ ان کی یہ شہادت کہ فطری طور پر مولانا کے قویٰ اور مزاج دونوں معتدل تھے، میرے نزدیک تو صرف یہی ایک فقرہ حضرت نانوتوی کی جسمانی خصوصیات اور ان غیر معمولی خداداد نعمتوں کے ثبوت کے لئے کافی ہے جن سے جسداً آپ نوازے گئے تھے، اسی کے ساتھ حضرت ہی کے دوسرے طبیب تلمیذ رشید مولانا منصور علی خاں صاحب حیدرآبادی مرحوم کے ان الفاظ کو ملا لیجئے، انھوں نے لکھا ہے کہ مولانا محمد قاسم ان کے استاذ

"میانہ قد، نہ موٹے اور نہ بالکل لاغر تھے"

آگے فرماتے ہیں۔

"چہرہ لانبا، بینی دراز اٹھی ہوئی" (مذہب منصور ص۱۹۷)

سوانح مخطوطہ میں ہے کہ

"پیشانی فراخ، کشادہ ابرو، جلد شفاف و نرم، زبان پتلی، دانت موتی کی لڑی، گردن اونچی، سینہ کشادہ"۔ ص۳

رنگ کے متعلق سوانح مخطوطہ میں تو لکھا ہے کہ "رنگ گندمی" تھا، مگر حکیم منصور علی خاں فرماتے ہیں کہ آپ کا رنگ سانولا تھا؛ واللہ اعلم، اپنے ان الفاظ سے ان حضرات کی کیا مراد ہے اسی سوانح مخطوطہ میں حضرت والا کے معتمد علیہ خاص حاجی محمد یٰسین مرحوم جو "دیوان جی" بھی کہلاتے تھے، اور حضرت کی خانگی زندگی کے جزو کل کا انصرام ان ہی سے متعلق تھا انشاء اللہ مناسب مقام پر ان کا تفصیلی ذکر کیا جائے گا، ان کے حوالہ سے اسی کتاب میں نقل کیا ہے، دیوان جی کہتے تھے کہ

"جب مولانا حجرۂ (ذکر) سے باہر قدم رنجہ فرماتے تو کسی روز چہرہ زرد زعفرانی اور ایسا ہیبت ناک ہوتا کہ دیکھنے والے کو ہیبت اور خوف غالب ہوتا، اور کبھی ایسا سفید و سرخ و صبیح و ملیح ہوتا کہ خواہ مخواہ طبیعت ہنسنے بولنے کو چاہتی" ص۱۵

دیوان جی کے اس بیان سے تو کچھ "گندمی رنگ" ہی کی تائید ہوتی ہے، ممکن ہے کہ جس زمانہ میں مولانا منصور علی خاں کو حضرت کے دربار کی حاضری کی سعادت میسر آئی ہو اس زمانہ میں چہرے کے رنگ میں کچھ تغیر پیدا ہو گیا ہو، اور بجائے گندمی کے ان کو آپ کا رنگ سانولا محسوس ہوا ہو، آئندہ اس تغیر کے اسباب کا انشاء اللہ کچھ تذکرہ کیا بھی جائے گا، تاہم اس زمانہ میں آپ کا رنگ مولانا منصور علی خاں کو سانولا نظر آیا تھا، آپ کے اعضاء مبارک کا یہ رنگ بہر حال باقی تھا حکیم صاحب قبلہ ارقام فرماتے ہیں کہ

"ان کی دست بوسی اور قدم بوسی کے واسطے ہاتھ اور پیر کی نزاکت اور خوبصورتی کافی تھی وہ کچھ ایسے موزوں اور دل کش تھے کہ بے اختیار بوسہ دینے کو جی چاہتا تھا"

اپنے شفیق و رؤف استاد کے متعلق آگے ان کے والہانہ الفاظ قلم سے یہ نکل پڑے ہیں۔

"ان کی سی نزاکت اور دلبری کسی معشوق میں بھی نہ دیکھی" ص۱۹۷

مگر اعتدال مزاج کے جسمانی آثار چڑھاؤ اگر ایکطرف یہ تھے، تو دوسری طرف اسی شفاف و نرم و نازک دست و پا کے متعلق ان ہی حکیم منصور علی خاں صاحب کی چشم دید شہادت یہ بھی ہے، حج کے آخری سفر میں حکیم صاحب قبلہ کو بھی حضرت مولانا کی ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا تھا، انھوں نے لکھا کہ مناسک حج سے فارغ ہونے کے بعد مولانا کے ساتھ مدینہ منورہ جا رہا تھا، قبۂ خضرا جوں ہی نظروں کے سامنے ہوا حکیم صاحب کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا کہ

"جناب مولانا مرحوم نے اپنی نعلین اتار کر بغل میں دبالیں اور پا برہنہ چلنا شروع کیا، میں نے ان کی دیکھا دیکھی اپنی جوتیاں اتار ننگے پیر ہمراہ مولانا مرحوم چلنا شروع کیا"

سننے کی بات اسی کے بعد ہے، حکیم صاحب جو ذاتاً و صفاتاً پٹھان تھے، عمر بھی اس وقت ان کی زیادہ

نہ تھی، عنفوان شباب کا زمانہ تھا، اور مولنا کی کہولت کا عہد تھا، پچاس کے قریب عمر تھی، مگر حکیم صاحب کے سامنے اسی شفاف و نرم و نازک جلد کے متعلق یہ عجیب تجربہ پیش آیا۔ لکھا ہے کہ راستہ نوکیلے خاردار پتھر کے ٹکڑوں سے بھرا ہوا تھا، مولنا کو پابرہنہ دیکھ کر حکیم صاحب بھی پابرہنہ ہو گئے، مگر خود ان ہی کا بیان ہے،

"اس قدر پتھریاں پاؤں میں چبھنے لگیں کہ متحمل نہ ہو سکا آخر جوتا پہن کر چلنے لگا"۔

لیکن جن سنگین کانٹوں کی چبھن ایک نوجوان پٹھان کے پاؤں کے لئے ناقابل برداشت بن چکی تھی، سنئے حکیم صاحب کے بجنسہ الفاظ ہیں کہ

"مگر مولنا مرحوم مدینہ منورہ تک کئی میل آخر شب تاریک میں اسی طرح چل کر پابرہنہ پہنچ گئے"۔

اس تماشے کو دیکھ کر خود حکیم صاحب کو بھی تعجب ہوا بہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

"مولانا مرحوم جو از فرق تا قدم نہایت نازک و نرم اندام تھے"۔

اپنے تعجب کا اظہار ان الفاظ میں حکیم صاحب نے کیا ہے کہ

"تعجب تھا کہ ننگے پیر کیونکر آدمی ان خاردار پتھریوں میں چل سکتا ہے"۔

تو حکیم صاحب نے اس کے بعد اپنے تعجب کا ازالہ ان الفاظ سے کیا ہے، فرماتے ہیں کہ

"مگر قوت عشق کے نزدیک سنگ و گل برابر ہے" [ص ۱۸۱]

حضرت والا کی زندگی کے ایک مستقل اور خاص پہلو کی طرف حکیم صاحب نے مذکورہ بالا الفاظ میں اشارہ کیا ہے، زندگی کا پہلو ہی نہیں بلکہ فقیر کے خیال میں توکل زندگی ہی ان کی یہی تھی، یہی اول بھی تھا اور یہی آخر بھی، یہی ظاہر بھی اور یہی باطن بھی، انشاء اللہ اپنی جگہ پر تفصیلی بحث اس مسئلہ پر کی جائے گی۔

یہاں صرف میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ عشق و سرمستی کا تقاضہ یہ تو ہو سکتا ہے اور یہی ہوا بھی ہے کہ پتھر کے نوکیلے ٹکڑے پھول بن جائیں، لیکن بااین ہمہ چاہئے تھا کہ ایسی صورت میں پائے مبارک

چھالوں اور آبلوں سے بھر جاتے' خیال کرنے کی بات ہے پتھر کے یہ ٹکڑے معمولی پتھر کے ٹکڑے نہ تھے پارہ ہائے سنگ خارا تھے' وقت بھی دن کا نہیں رات کا نہ کہ دیکھ دیکھ کر قدم اٹھانے کا موقعہ ملتا' مگر حکیم صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جس قدم کو لہولہان ہو جانا چاہئے تھا' اس میں نہ کسی قسم کا انشکاف پیدا ہوا اور نہ آبلے ابھرے یہ ہو سکتا ہے کہ یہ اس مشق اور عادت کا نتیجہ ہو' جس کا ذکر اسی کتاب میں دوسرے موقعہ پر حکیم صاحب ہی نے ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ

"باوجود سواری کے اکثر پیدل چلتے تھے" (ص ۱۹۷ مذہب منصور)

لیکن سوال یہی ہے کہ اس مشق کے خوگر ہونے کی ہمت اور جرأت کہاں سے پیدا ہوئی' جب تک یہ نہ مانا جائے کہ مزاج و قوی کے جس اعتدال کی بدولت صوری اور ظاہری خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ ہو کر آپ جیسے پیدا ہوئے تھے' اسی طرح معنوی اور باطنی زیبائیوں اور رعنائیوں سے بھی قدرت نے آپ کو سرفراز کیا تھا' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ظاہر و باطن صورت و معنی دونوں پہلوؤں کے امتیازی آثار کا تجربہ طفولیت ہی کے عہد سے لوگوں کو ہونے لگا تھا۔ مصنف امام نے لکھا ہے کہ نانوتہ میں حضرت والا کا موروثی مکان ایک ایسی جگہ پر تھا جس میں پہنچنے کے لئے بڑی لمبی اور دراز گلی کو طے کرنا پڑتا تھا' ان ہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہے کہ قصبہ کا یہ طویل کوچہ وحشتناک اور کچھ ڈراؤنا سا تھا' اور جیسا کہ ہندوستان کے قصبوں اور دیہاتوں کا عام قاعدہ ہے نانوتہ کا یہ کوچہ آسیب زدہ سمجھا جاتا تھا' بھوت' جن و شیطان وغیرہ جیسی خبیث روحوں کے تعلق سے یہ کوچہ کافی بدنام تھا' عموماً ہندوستان کی عورتوں اور بچوں پر اس قسم کے قصوں کا اثر اب بھی پایا جاتا ہے اور ہم جس زمانہ کی بات کر رہے ہیں' اس وقت تو اس ملک کی قصباتی اور دہقانی زندگی کا یہ لازمی لطیفہ تھا' مصنف امام نے اپنا ذاتی تجربہ اس "بھوتاہی گلی" اور حضرت والا کے متعلق یہ بیان کیا ہے کہ نو عمری کے ان ہی دنوں میں

"راتوں کو بہت بہت دیر سے بے تکلف گھر جاتے اور کچھ خوف نہ کرتے" ص ۲۷

اس عملی مثال کے ساتھ حضرت والا کی ان معنوی خصوصیتوں کا جن کے آثار کا ظہور بچپن ہی کے

زمانہ میں شروع ہوگیا تھا' ان ہی کا ذکر ان الفاظ میں مصنف امام نے کیا ہے' کہ

"مولوی صاحب لڑکپن سے' ذہین' طباع' بلند ہمت' تیز' وسیع حوصلہ'

جفاکش' جری وچست وچالاک تھے" صـ۲۶

اور اب سمجھا جاسکتا ہے کہ خورد سالی کے ان دنوں میں مولانا کیا تھے اور کیسے تھے' ان کے ظاہر و باطن کی تعمیر کتنی عجیب وغریب خصوصیتوں سے ہوئی تھی' ورنہ عام حالات میں یہی دیکھا جاتا ہے کہ باہر میں پانے والے اندر سے کھوکھلے ہیں اور اندر جن کا سرمایہ دار ہے باہر ان کا اسی حد تک عموماً مفلس ہوتا ہے' شاید مردانہ حسن وجمال کا یہی مطلب ہے' جس کا ظہور مولانا کے ظاہر وباطن میں ہوا تھا' بلکہ آپ مجھ سے پوچھتے ہیں تو پھر یہی کہوں گا کہ حضرت والا کی جس "اجتبائی شان" کی یافت مجھے ہوئی ہے منجملہ دوسرے مظاہر کے اسی شان کا ایک "مظہر خاص" آپ کے ظاہر وباطن کا یہ دل کش تناسب' اور دل آویز موزونیت بھی ہے۔

آخر میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں' مجھ ہی سے یہ قصہ بھی آپ سن چکے کہ نانا جان کے گھر کے جس جوڑے کو پہن کر اپنے ہم عمروں کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کا موقعہ آپ کے سامنے آیا تو بجائے ہنسنے کے اس پیش کش پر آپ کی سلیم فطرت بے قرار ہوگئی' حتی کہ رونے لگے' مگر یہ حال آپ پر اس امتیاز کے سلسلے میں طاری ہوا' جو اپنی کوشش کا نہیں بلکہ دوسروں کی دی ہوئی چیز کا رہین منت تھا' اب اسی کے ساتھ اسی خورد سالی کے زمانہ کا دوسرا قصہ سنئے' مصنف امام نے بیان کیا ہے کہ

"مکتب میں اپنے سب ساتھیوں سے ہمیشہ اول رہے" صـ۲۶

دیکھا آپ نے دوسرے کی دی ہوئی چیز سے جو امتیاز پیدا ہوتا تھا' اس سے اتنا گریز' مگر جس امتیاز کا تعلق دوسروں کی نہیں بلکہ اپنی جد وجہد' ذاتی کد وکاوش سے تھا' اس میں ایک دو دفعہ نہیں بلکہ مکتبی زندگی کے سارے دنوں میں "ہمیشہ" ممتاز رہنا' دونوں میں جو جوہری فرق ہے ظاہر ہے کہ عمر کے اس عہد میں اس "فرق" کے تفصیلی شعور کی توقع نہیں کی جاسکتی

مگر بہر حال اس "شعور" کا ظہور آپ ہی میں ہوا، بتایا جائے کہ "خداداد شعور" کے سوا اسے اور کیا قرار دیا جائے، اور نوشت و خواند ہی کے دائرے تک یہ بات محدود نہ تھی، مصنف امام نے یہ لکھتے ہوئے کہ

"مولوی صاحب جیسے پڑھنے میں سب سے بڑھ کر رہتے تھے" ص۲۷

آگے اپنی چشم دید گواہی قلم بند فرمائی ہے کہ

"ہر کھیل میں خواہ ہوشیاری کا ہو، یا محنت کا، سب سے اول اور غالب رہتے تھے"

حالانکہ ہوشیاری والے کاموں میں امتیاز حاصل کرنے والے "محنت" کے کاروبار میں عموماً پھسڈی ہی ثابت ہوتے ہیں، مگر یہاں دونوں باتیں آپ پر آسان کی گئی تھیں وہ "تعلیم گاہ" کے بھی یکہ تاز اور "بازی گاہ" کے بھی شہ باز تھے، بلکہ ایک لطیفہ اسی سلسلے میں مصنف امام نے جو بیان کیا ہے وہ اس لحاظ سے خاص طور پر مستحق توجہ ہے کہ اپنی دلچسپی کے ان دونوں میدانوں یعنی تعلیم گاہ و بازی گاہ دونوں میں ایک خاص قسم کے رشتہ اور ربط پیدا کرنے کی کوشش کا ایک نادر نمونہ ہے، مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"اپنے کھیل اور بعض قصے نظم فرماتے" ص۲۷

بچپن میں نظم یا کلام کو موزوں کرنے کا مذاق بجائے خود یہ تو کوئی اہم بات نہیں ہے، لیکن قصوں کے ساتھ

"اپنے کھیل"

کو بھی نظم کا لباس پہنا کر علم اور کھیل دونوں کے ذوق میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی شاید یہ ایک واحد تاریخی مثال ہے، بلکہ دوسری جگہ مصنف امام ہی نے ان کھیلوں کا تذکرہ کرتے ہوئے جو مولانا بچپن میں کھیلا کرتے تھے یہ لکھتے ہوئے کہ

"خوب یاد ہے کہ اس زمانہ میں ایک کھیل "جوڑ توڑ" نام ہم کھیلتے تھے، اور بہت پرانے مشاق لوگ اس کو عمدہ کھیلتے تھے، اور ہم نئے کھیلنے والے مات

کھا جاتے تھے " ص۲۷

ان "نئے کھیلنے والوں اور مات کھا جانے والوں میں " جیسا کہ مصنف امام کے فحوائے کلام سے معلوم ہوتا ہے خود حضرت مولانا بھی تھے، شاید شکست کی ندامت حد سے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوئی، پھر آپ جانتے ہیں کیا کیا گیا؟ یہ تو آپ سن ہی چکے کہ " کھیل کو بھی نظم کا لباس پہنا کر علم اور کھیل میں رشتہ قائم کیا جاتا تھا " اب سنئے، مصنف امام فرماتے ہیں،

" مولوی صاحب (یعنی مولانا محمد قاسم صاحبؒ) جب اس کا (یعنی جوڑ توڑ کے اس کھیل کا قاعدہ معلوم کر لیا پھر یاد نہیں کہ کسی سے مات کھائی ہو، بہت ہوا تو برابر رہے " ص۲۷

سمجھا آپ نے کیا مطلب؟ جزئیات سے کلیات بنانے کی مشق کا موقعہ تو ان کو اعلیٰ تعلیم گاہوں میں بعد کو ملا، مگر ابھی جب مکتب ہی کی زندگی نانوتہ میں بسر کر رہے تھے، اس میں بھی "جوڑ توڑ" کے کھیل کے بنیادی کلیات کی سراغ رسانی کا کام شروع ہو چکا تھا، اور بالآخر اس "کلی قاعدے" کو معلوم کر کے پرانے گریز مشاق کھیلنے والوں کو چت کرنے لگے، کھیل کود کے ساتھ اس حکیمانہ رجحان کا امتزاج کچھ "جوڑ توڑ" ہی کی حد تک محدود نہ رہا، مصنف امام نے آگے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

" بلکہ ہر کھیل کا جو مرتبۂ کمال ہوتا وہاں تک اس کو پہنچا کر چھوڑتے " ص۲۷

اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ قانون آفرینی اور کلیت سازی کا یہ ذوق ان تمام کھیلوں پر محیط ہو گیا تھا، جن کا نانوتہ کی بازی گاہوں میں اس وقت رواج تھا، شاید نظم کا لباس ان ہی "کلیات" کو عطا کیا جاتا تھا، افسوس ہے کہ کوئی معمولی نمونہ بھی ان نظموں کا ہم تک نہ پہنچ سکا، ورنہ "ملاعب الصبیان" یا لڑکوں کے کھیل کی تاریخ کی وہ کوئی دلچسپ چیز بلکہ شاید اپنی آپ نظیر ہوتی، نیز بچوں کے کھیل کی جن دو مستقل قسموں کی طرف مصنف امام نے اشارہ کیا ہے، یعنی ایک قسم انہی کھیلوں کی ایسی تھی جن کا تعلق ہوشیاری سے تھا، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ بچوں کی فکری و ذہنی قوت کی نشو و نما میں ان سے مدد ملتی تھی، اور دوسری قسم ان ہی کھیلوں کی وہ بھی تھی جس کا تعلق جسمانی محنت و مشقت سے تھا، انگریزی عہد کہئے "بافٹ بال" کرکٹ کے زمانے سے پہلے ہمارے

ملک میں بچوں کے کھیلوں کی تنظیم ان دو قسموں میں تقسیم کر کے جو کی گئی تھی، مولٰنا مرحوم کی ان نظموں میں امید تھی کہ ان کی تفصیل ملتی، ہو سکتا تھا کہ علاوہ عملی فوائد کے اس علمی غلطی کی اصلاح میں بھی اُن سے مدد ملتی جو عام طور پر پھیلی ہوئی ہے کچھ ایسا باور کر لیا گیا ہے کہ مغرب کے

"تبذیری ملاعب"[له]

کے رواج پذیر ہونے سے پہلے بچوں کے کھیلوں کے متعلق کوئی حکیمانہ یا سائنٹفک نقطۂ نظر ہندوستان نہیں رکھتا تھا' اگرچہ اس خیال کی تردید کے لئے مصنف امام کا مذکورہ بالا اجمالی بیان ہی کافی ہے، لیکن جی چاہتا تھا کہ کاش! اس اصول کی تفصیل کا علم مولٰنا مرحوم کی صغرسنی کی ان نظموں سے میسر آتا۔

بہرحال عہد طفولیت میں حضرت والا کی طرف جن فطری رجحانات خصوصیات کا انتساب مصنف امام نے اپنے ذاتی مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں کیا ہے، میرا تو خیال ہے کہ آپ کے کھیلوں کی مذکورہ بالا داستان ہی ان کے ثبوت کے لئے کافی ہے، طباع و ذہین، بلند ہمت، تیز، وسیع حوصلہ، جفاکش، جری، چست، چالاک، سب کچھ آپ کو محض کھیل کی اسی داستان کی بنیاد پر قرار دیا جا سکتا ہے، آپ کی زندگی کی ابتدا بھی ان ہی پیدائشی کمالات کے ظہور سے ہوئی اور سچ پوچھئے تو زندگی کے آخری دنوں تک ان کمالات کی طوفانی موجیں آپ کے اندر سے امنڈتی رہیں، البتہ ان کمالات کے تعلق کی نوعیت بدلتی رہی، جب بچے تھے تو ان کا تعلق "کھیلوں" سے رہا، اور جیسے جیسے عمر بڑھتی چلی گئی "کھیلوں" سے ہٹ کر زندگی کے

---

له مغرب سے کھیلوں کا جو تحفہ ہندوستان پہنچا ہے، ان کی سب سے بڑی خصوصیت تبذیر یعنی فضول خرچی ہے کھیل کو بھی یورپ والوں نے بیوپار بنا دیا ہے، بازی گاہوں کا رشتہ تجارت گاہوں سے قائم کر دیا گیا ہے، اسی کا آج یہ نتیجہ ہے کہ ایک ایک ریکٹ کی قیمت ستر ستر اسی اسی روپئے ہوتی ہے، بچوں کو اپنے اسکولوں اور کالجوں میں منجملہ دوسرے مصارف کے کافی رقم کھیل کی مد میں ادا کرنی پڑتی ہے، ضرورت ہے کہ آزادی کے بعد زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح کھیلوں کی راہ سے جو لعنت ملک میں آئی ہے اس کا بھی ازالہ کیا جائے ۱۲

مختلف دور میں دوسری چیزوں سے ان کا رشتہ قائم ہوتا رہا۔

کھیلوں کے بعد یا کھیلوں کے ساتھ پہلی چیز جس کے ساتھ آپ کے ان فطری رجحانات اور جبلی ودائع کا تعلق قائم ہوا، وہ علم تھا، تعلیم کی ابتداء، نانوتہ ہی کے قصباتی مکتب میں ہوئی اس کا پتہ تو نہ چلا کہ نانوتہ کے اس مکتب میں جس استاذ کے آگے آپ کی تعلیم کی بسم اللہ ہوئی، ان کا نام کیا تھا، اور آپ کے استاذوں میں شاید یہی ایک استاذ ہیں جن کے اسم مبارک کا پتہ نہ چل سکا، ورنہ ان کے سوا یہ عجب حسن اتفاق ہے، کہ ابتدائی تعلیم سے آخر تک جن جن بزرگوں کے آگے زانوئے تلمذ حضرت والا نے تہ کیا تھا، ان کے ناموں کی کامل فہرست بحمد اللہ مل گئی ہے۔

نانوتہ کے مکتب خانہ کی تعلیم کے متعلق بس اسی قدر معلوم ہو سکا کہ منجملہ دوسرے ساتھیوں کے ہمارے مصنف امام یعنی حضرت مولٰنا محمد یعقوب نانوتوی صدر اول دار العلوم دیوبند بھی اس مکتب میں آپ کے ایک ساتھی تھے، مولٰنا مرحوم کے ساتھ اپنے مختلف روابط کو بتاتے ہوئے مصنف امام نے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"ایک مکتب میں پڑھا ہے" ص۲۴

اس سے مراد نانوتہ کا یہی "مکتب" ہے، جہاں پڑھنے کے لئے دونوں ساتھ بٹھائے گئے تھے علم کے ساتھ آپ کے فطری کمالات کا پہلا تعلق اسی مکتب میں قائم ہوا، اور پہلا نتیجہ اس تعلق کا لوگوں کے سامنے جو آیا، بقول مصنف امام وہ یہ تھا کہ

"قرآن شریف بہت جلد ختم کر لیا" ص۲۶

صرف "جلد" نہیں، بلکہ "بہت جلد" کے لفظ سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ہجا شناس ہونے کے بعد قرآن کے ختم کرنے کی جو عام مدت اس زمانہ میں تھی، اس کے لحاظ سے مولانا مرحوم کے ختم قرآن کی مدت غیر معمولی طور پر کم خیال کی گئی تھی۔ بہ ظاہر اسی غیر معمولی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لئے اس کا ذکر بھی مصنف امام نے کیا ہے، اسی بنیاد پر میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ آگے

خصوصیت کے ساتھ انھوں نے جو یہ لکھا ہے کہ

"خط اس وقت سب سے اچھا تھا" ص۲۶

ایک تو یوں ہی ان لفظوں ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مکتب میں جتنے لڑکے اس زمانہ میں شریک تھے، ان سب کے مقابلہ میں مولانا کا خط سب سے اچھا ہو گیا تھا، دوسرے حسن خط کا ذکر بھی اسی پر دلالت کرتا ہے کہ آپ کی خطی خصوصیت بھی مکتب میں خاص طور پر لائق توجہ قرار دی گئی تھی، گویا "اقرء" کے قرآنی حکم کی تعمیل کے بعد "علم بالقلم" کی عملی تفسیر تعلیمی راہ میں آپ کا دوسرا قدم تھا۔

مکتبی زندگی کی یہ تو وہ باتیں تھیں جو آپ کو سکھائی جاتی تھیں، اور آپ سیکھتے جاتے تھے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی کے ساتھ سکھائے بغیر بھی بعض رجحانات کا ظہور اسی زندگی میں آپ کے اندر سے ہونے لگا تھا، کمسنی کے اس زمانہ میں آپ کی طبیعت کا یہ رجحان خواہ جس حد تک بھی مستحق مدح و ستائش سمجھا گیا ہو، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "اجتبائیت" کے جس انتخابی قانون کے تحت آپ پیدا کئے گئے تھے، وہی غالباً مانع آیا، اور غیب کے ہاتھوں نے اس رجحان کی سمت کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

میرا مطلب یہ ہے کہ نانوتہ ہی کے مکتب کی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے مصنف امام نے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"نظم کا شوق اور حوصلہ تھا" ص۲۶

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "شعر و شاعری" کی طرف میلان کا آغاز اسی مکتبی زندگی میں نمو پذیر ہونے لگا تھا، آپ کی دادیہال کے بزرگوں میں تو اس میلان کا پتہ نہیں چلتا، لیکن گذر چکا کہ آپ کے نانا جان شیخ وجیہ الدین صاحب کیل سہارنپور شعر کا اچھا ذوق رکھتے تھے، مصنف امام نے لکھا ہے کہ وہ "اردو کے شاعر تھے" شاید یہ ذوق مولانا میں اسی راہ سے منتقل ہوا تھا، لیکن "وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہ" والے کی راہ پر چلنے بلکہ اسی کے نقش قدم پر مرمٹنے کے لئے جو پیدا ہوا تھا اس کو شاعری کی راہ پر چلنے، اور شاعروں کی طرح ہر وادی میں بھٹکنے کے لئے کیسے چھوڑ دیا جاتا، میرا

خیال ہے کہ شاعری کا یہ ذوق صرف کھیل کود کے کلیات وقوانین کی ترتیب ہی میں جذب ہو کر ہمیشہ کیلئے ختم ہوگیا، جیسا کہ انشاء اللہ آئندہ معلوم ہوگا، ضرورۃً کبھی کبھی آپ کا دبا ہوا یا دبایا ہوا شعری مذاق ابھرا بھی، لیکن ان ہی اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ نکالنے والے نے اس میدان سے ہاتھ پکڑ کر آپ کو نکال لیا تھا، اجتبائی رنگ والوں کو پہلے بھی اس قسم کے مواقع میں الھذا خلقت (کیا تم اسی لئے پیدا کئے گئے ہو) سے تنبیہ کی گئی تھی اور کوئی تعجب نہیں اگر قالاً یا حالاً "اجتبار" کے اسی مقام سے آپ کے کانوں میں بھی الہذا خلقت (کیا تم شاعری کے لئے پیدا کئے گئے ہو) آواز گونجی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب[1]

اور سچ پوچھئے تو شاعری کا یہ ذوق یا حوصلہ مکتبی زندگی میں آپ کے اندر سے جو ہویدا ہونے لگا تھا، اور اسی ذوق کی تسکین کے لئے کھیلوں کے قانونی کلیات اور بعض قصوں کو نظم کا لباس آپ جو پہنانے لگے تھے، جہاں تک میں سمجھتا ہوں شاعری سے زیادہ اس میں دخل آپ کے دوسرے فطری رجحان کو غالباً تھا، اگرچہ یہ رجحان بھی آگے بڑھ کر تکمیل کے مدارج تک پہنچنے سے محروم رہ گیا بلکہ شاید اس کو قصداً محروم کر دیا گیا، میرا اشارہ آپ کے تصنیفی اور تالیفی ذوق کی طرف ہے اس میدان میں حضرت والا کا شدید خامہ باوجود غیر معمولی صلاحیتوں کے اتنا پیچھے تو نہیں ہا جتنا

---

[1] جیسا کہ میں نے وعدہ کیا ہے انشاء اللہ مناسب مقام پر مولانا کی شاعری اور آپ کی نظم کے کچھ نمونوں کا ذکر کیا جائیگا، لیکن حکیم منصور علی خاں صاحب نے اپنی کتاب "مذہب منصور" میں ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے نقل کیا ہے کہ مولانا محمد قاسم ؒ نے اس وقت مومن خاں کے مشہور شعر مانگا کریں گے الخ کو دہرایا۔ اب واللہ اعلم یہ تصرف حکیم صاحب کی طرف سے ہوا یا مولانا مرحوم ہی سے انھوں نے بھی سنا تھا۔ کتاب میں یہ شعر بایں شکل پایا جاتا ہے یعنی ؎ مانگا کریں گے ہم بھی دعا ہجر یار کی ؛ آخر تو ضد ہوئی ہے اثر کو دعا کے ساتھ۔ اس کو دیکھ کر بے ساختہ وہ حدیث یاد آگئی جس میں ذکر کیا گیا ہے کہ ؏ کفی الشیب والاسلام للمرء ناھیا، کو دہراتے ہوئے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہی مصرعہ لفظوں کے تقدم و تاخر سے بایں طور ادا ہوا یعنی "کفی الاسلام والشیب للمرء ناھیا" وزن سے شعر ظاہر ہے کہ گر گیا سننے کے ساتھ حضرت ابوبکر رضؓ نے فرمایا اشھد انک رسول اللہ ما علمک الشعر وما ینبغی لک (یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ بیشک آپ اللہ کے رسول ہیں اللہ نے نہ آپ کو شعر سکھایا اور آپ کے شعر مناسب بھی نہ تھا) بعضوں نے اسی سلسلہ میں بعض دوسرے مصرعوں کا بھی ذکر کیا ہے ۱۲

شاعری کے میدان میں آپ کے تصنیفی کارنامے معقول تعداد میں دنیا کے سامنے آئے لیکن اپنے موقعہ پر جیسا کہ بتایا جائے گا یہ سارے کارنامے جو کچھ بھی منصہ شہود پر آئے محض وقتی تاثر یا اضطراری کیفیات کے نتائج تھے، ورنہ بیشہ ور مصنفین کی طرح آپ نے کوئی کتاب قصداً نہیں لکھی، خیر یہ تو ایک تفصیل طلب مسئلہ ہے، یہاں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ درحقیقت مولٰنا میں تصنیف وتالیف کا ذوق بالکل فطری تھا، اتنا فطری کہ حروف ہجا سے روشناس ہونے کے ساتھ ہی جبلت کے اس تقاضے کا ظہور شروع ہوگیا۔

مگر اس عمر اور حال میں فطرت کے اس تقاضے کی تکمیل کی شکل ہی کیا تھی، بجز اس کے کہ کھیل کود کے متعلق جزئیات سے آپ کا حکیمانہ دماغ جن کلیات کو پیدا کیا کرتا تھا، ان کو نظم کا قالب عطا کر دیا جائے یا بڑی بوڑھیوں سے سنے سنائے قصوں اور کہانیوں کو موزوں کلام بنا دیا جائے، اس عمر میں اس قسم کی معلومات تک رسائی کا امکان تھا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ جیسی چاہیئے، اس سے بھی تسکین نہیں ہوتی تھی، مصنف امام نے بیان کیا ہے کہ علاوہ مذکورہ بالا نظموں کے جنھیں مولٰنا لکھ لیا کرتے تھے،

"چھوٹے چھوٹے رسالے اکثر نقل کئے" ص۲۶

میرے نزدیک اسی تصنیفی ذوق ہی کی تسکین کی ایک شکل شاید یہی تھی، اپنی نہیں تو دوسروں ہی کی تصنیف کی ہوئی چیزوں کو لکھ لکھ کر لکھنے پڑھنے کے جبلی مذاق کے سکون کا سامان اس طریقہ سے فراہم کیا جاتا تھا، کیونکہ جس زمانہ کی یہ بات ہے، پریس، اور طباعت کا ہندوستان میں کافی رواج ہوچکا تھا، کم از کم مکتب خانوں میں پڑھائی جانے والی کتابوں کو جہاں تک میرا خیال ہے لکھ لکھ کر پڑھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی، ایسی صورت میں ان چھوٹے چھوٹے رسالوں کے نقل کرنے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے جو میں نے عرض کیا، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ خطاطی کی مشق میں بھی گونہ اس سے مدد ملیگی، یہ خیال بھی شاید سامنے ہو،

بہرحال باوجود تلاش کے صحیح طور پر یہ تو معلوم نہ ہوسکا کہ نانوتہ کی مکتبی زندگی سے علیحدہ

ہو کر طلب علم کے سلسلے میں جیسا کہ ابھی آپکو معلوم ہوگا جب دیوبند اور سہارنپور جانا پڑا' اس وقت آپ کی عمر کیا تھی مگر ہم جب یہ سوچتے ہیں کہ دیوبند اور سہارنپور کے بعد بالآخر جب آپ دہلی تشریف لے گئے' تو اس وقت بھی حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی عمر کل گیارہ سال کی تھی' اسی سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ نانوتہ کے مکتب خانے سے آپ کا تعلیمی تعلق جس وقت منقطع ہوا اس وقت شاید آٹھ نو سال سے زیادہ عمر غالباً آپ کی نہ ہوگی' جس کا مطلب یہی ہوا کہ آٹھ نو سال کی عمر میں صرف یہی نہیں کہ قرآن آپ نے ختم فرمالیا تھا' اور حسن خط کے لحاظ سے اپنے ساتھیوں میں ممتاز ہو چکے تھے' بلکہ مصنف امام کی چشم دید شہادتوں کی بنیاد پر ہم سکتے ہیں کہ عمر کی اسی قصیر مدت میں آپ گویا چھوٹے موٹے شاعر اور ننھے منے سے مصنف بھی بن چکے تھے' اسی عمر میں اپنی نظموں کو بھی مرتب کر کے لکھ چکے تھے' اور دوسروں کی چھوٹی چھوٹی کتابوں کو نقل کرنے کا کام بھی کر چکے تھے!

اور قصہ صرف ان ہی ذہنی و دماغی کاموں کی حد تک ختم نہیں ہو گیا تھا' بلکہ علاوہ خطاطی کے جسے گونہ دستکاری ہی جیسے کاموں میں شمار کیا جاسکتا ہے' مصنف امام نے بیان کیا ہے' کہ نانوتہ کی مکتبی زندگی کی اسی عمر میں آپ کو کتابوں کی جز بندی اور جز بندی ہی نہیں بلکہ "جلد بندی" کی صنعت کے سیکھنے کا موقعہ ایک خاص وجہ سے مل گیا تھا۔

یاد ہوگا' میں عرض کر چکا ہوں' کہ مشائخ دیوبند کے شیخ اعظم واکبر سیدنا حضرت حاجی امداد اللہ المہاجر المکی قدس اللہ سرہ' کا مادری وطن یعنی ننہال بھی نانوتہ ہی تھا اور حضرت حاجی صاحب کی ہمشیرہ محترمہ کی سسرال بھی نانوتہ ہی میں تھی' اور بھی مختلف قسم کے تعلقات رشتہ داریوں کی وجہ سے تھے اسی کا نتیجہ تھا کہ وقتاً فوقتاً حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نانوتہ کو بھی اپنے قدوم میمنت لزوم سے رونق بخشا کرتے تھے' مصنف امام نے بیان کیا ہے کہ خود وہ بھی اور ان کے ساتھ حضرت مولانا نانوتوی بھی کم عمری کے اسی زمانہ میں جب حاجی صاحب نانوتہ تشریف لاتے تو

"ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور نہایت محبت و اخلاص فرماتے"۔ ص۲۶

اس عمر میں اللہ والوں کی خدمت میں حاضری اور ایسی حاضری کہ محبت و اخلاص کے تعلقات ان سے پیدا ہو جائیں بجائے خود کچھ کم تعجب انگیز نہیں ہے، مگر آگے سنئے، حاجی صاحب قبلہ نے ان بچوں میں کن صلاحیتوں کو محسوس فرمایا کہ کچھ ان کو ابھی سے سکھانا چاہئے، اس کا خیال اُن کے دل میں پیدا ہوا، مصنف امام ارقام فرماتے ہیں کہ

"جز بندی کتاب کی حضرت سے ہم دونوں نے سیکھی، اور اپنی لکھی ہوئی کتابوں کی جلدیں باندھیں"۔ ص۲۶

واللہ اعلم بالصواب کسی ملت و امت کے بکھرے ہوئے افراد کی شیرازہ بندی کا جو کام آئندہ لیا جانے والا تھا، اسی کا یہ نیک شگون اور اچھی فال تھا، یا کیا تھا، مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا علاوہ ذہنی و دماغی کام کے ایک مفید و کارآمد ہنر اور دستکاری کے سیکھنے کا موقعہ بھی کم عمری کے اسی زمانہ میں حضرت والا کو مل گیا تھا، اور جہاں تک اس سلسلے میں معلومات فراہم ہو سکیں ان کی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ نانوتہ کی مکتبی زندگی کی یہ آخری منزل تھی۔

اگر یہ مان لیا جائے جیسا کہ حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھ نو سال سے زیادہ عمر اس وقت حضرت والا کی نہ تھی تو مجموعی حیثیت سے ایک بچے میں ان گوناگوں مختلف الجہات چیزوں کا جمع ہونا منجملہ دوسرے شواہد کے اگر سمجھا جائے تو آپ کی "اجتبائیت" کا تقاضا اسے بھی قرار دیا جا سکتا ہے، یا جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے کہ مزاج و قویٰ کے اعتدال و ثمرات و نتائج میں اسے بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔ اسی موقعہ پر یعنی آپ کے قویٰ اور مزاج کے اعتدال کا ذکر کرتے ہوئے حضرت حکیم الامت تھانوی اپنے بعض مذاکروں میں یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ ان کے استاذ مولانا محمد یعقوب صاحب یعنی ہمارے مصنف امام نے یہ بھی کہا کہ

"اور حسب سنت اللہ اعتدال مزاج سے نفس کامل فائض ہوتا ہے"۔ ص۲۵ قصص

یہ اس زمانے کے مدرسی فلسفہ یا مشائی حکماء کے طریقہ فکر کی ایک تعبیر ہے، مادہ میں جتنی

زیادہ بہتر استعداد اور صلاحیت ہوتی ہے، واجب اول یعنی حق تعالیٰ کی طرف سے صورت کا فیضان بھی اسی کے مطابق ہوتا ہے، اسی مفہوم کو مذکورہ بالا الفاظ میں ادا کرنے کے لوگ اس زمانہ میں عادی تھے، لیکن ایمانی حکمت کی رو سے درحقیقت حضرت نانوتوی کی "اجتبائیت" ہی کا یہ ایک معاصرانہ اقرار ہے، ہمارے یہاں جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں مادّے میں قابلیت اور استعداد بھی دادِ حق ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

وہ چن لئے گئے تھے، چننے والے ہی نے مزاج و قویٰ کے اعتدال کی دولت سے بھی آپ کو سرفراز کیا تھا، اسی نے "نفس کامل" سے بھی آپ کو نوازا، اور اس "نفس کامل" کی جبلت میں ذہانت طباعی، بلند ہمتی، تیزی، وسعت حوصلہ، جفاکشی، جرأت، چستی و چالاکی جیسے فضائل و کمالات کو اسی نے محفوظ کرکے آپ پیدا کیا، آپ کے یہی فطری صفات و کمالات جن کا تخم آپ کی جبلت ہی میں بو دیا گیا تھا، مصنف امام کی شہادت ان کے متعلق گذر چکی کہ "لڑکپن" ہی سے ان کے آثار کا ظہور ہونے لگا تھا، اور نانوتہ کی مکتبی زندگی ہی میں آپ کی سرشت و نہاد کے یہ جواہر اپنی چمک دمک دکھلانے لگے تھے، اور اس میں شک نہیں کہ جیسے جیسے عمر بڑھتی چلی جاتی تھی، تعلیم اور اہل کمال کی صحبت و تربیت کی آبیاریوں کی بدولت ان کمالات میں برگ و بار کا اضافہ ہوتا چلا اور صفائی آب و تاب میں آپ کے یہ فطری جواہر ترقی کرتے چلے گئے، مگر جیسا کہ پہلے بھی شاید یہ عرض کرچکا ہوں کہ کمالات کے یہ ودائع تو خدائے بخشندہ کے بخشے ہوئے تھے، ان ہی کو لے کر آپ پیدا ہوئے تھے، آپ کی "اجتبائی شان" کا یہ اقتضا بھی تھا، آئندہ زیادہ تر یہی ہوا ہے کہ عموماً رخ اور تعلق ان صفات کا حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ بدلتا چلا گیا ہے، نانوتہ کی مکتبی زندگی میں جن چیزوں سے ان کا تعلق تھا، اپنی معلومات کی حد تک اس کو پیش کرچکا ہوں، اب وہ وقت آتا ہے کہ آپ نانوتہ سے قدم باہر نکالتے ہیں، یہی بخشیدہ اجتبائی کمالات آپ کے ساتھ ہیں:

مختلف ماحول کے حساب سے ان کمالات کے تعلق کا رخ بھی جس جس طرح بدلتا چلا گیا ہے!

آئندہ اسی کی تفصیل میرا کام ہوگا، لیکن اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے جی چاہتا ہے کہ دل میں جو ایک خیال آگیا ہے اسے خود اپنی ذات کی حد تک محدود نہ رکھوں۔

میرا مطلب یہ ہے کہ "نانوتہ کی "مکتبی زندگی" کے مشاغل اور مختلف کاروبار جن کا ذکر آپ سن چکے، اجمالاً ان متفرق امور کو سمیٹ کر اگر دیکھئے تو آپ پر بھی واضح ہوگا کہ مولانا مرحوم کی یہ تعلیمی زندگی چند خاص عناصر و اجزاء پر مشتمل ہے:

(۱) قرآن اور خط نویسی (۲) ایسے کھیل جن کا تعلق ہوشیاری سے بھی تھا، اور محنت سے بھی تھا، (۳) دستکاری یا ہنر سے تعلق رکھنے والا مشغلہ یعنی جز وبندی اور جلد بندی (۴) ایک بیدار دل، پاک روح کی خدمت میں حاضری، اور اس کی محبت و اخلاص کے حصول میں کامیابی:

یہ ظاہر ہے کہ آپ کی تعلیمی زندگی کے ابتدائی دور میں یہ چند چیزیں جو جمع ہوگئی تھیں، یہ محض بخت و اتفاق کا نتیجہ تھا، کسی سوچے ہوئے "لائحہ عمل" کے تحت یقیناً یہ صورت پیش نہیں آئی تھی، مگر مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ مختلف اسباب و وجوہ کی بنیاد پر آج ارباب فکر و نظر کی توجہ کی جو مشق گاہ بنا ہوا ہے مجھے تو اس "اتفاقی واقعہ" میں اچانک ایک ایسی روشنی نظر آئی کہ اسی "اتفاقی واقعہ" پر اگر اتفاق کرلیا جائے تو شاید بہت سے مشکلات حل شدہ شکل میں ہمارے سامنے آسکتے ہیں۔

ایسی تعلیم جس میں دماغ کے ساتھ جسم اور جسم کے ساتھ دل اور دل کے ساتھ شکم کے تقاضوں کی تکمیل کا سامان کیا جائے، میں پوچھتا ہوں کہ تعلیم کے ایسے مکمل نظام کے لئے اس سے بہتر اور کیا ہوسکتا ہے جو ہندوستان کے تعلیمی دائرے کی ایک ممتاز ترین ہستی کی "ابتدائی تعلیم" کی روداد میں اتفاقاً ہمیں مل گیا ہے۔ تعلیم کے مختلف نظاموں کے متعلق آج جو یہ شکایت ہے کہ کسی میں دماغ کی تربیت تو میسر آتی ہے مگر جسم کمزور ہوجاتا ہے، اور جسم درست ہوتا ہے تو دل بگڑتے ہیں، یا دل سدھرتے ہیں تو "پیٹ" خالی رہ جاتا ہے، میں اوروں کے متعلق نہیں کہتا۔ لیکن مجھ پر تو یہی منکشف ہوا ہے، کہ اسلامی ہند کی دینی تعلیم

کے سب سے بڑے عَلَم بردار کی ابتدائی تعلیم کے اس نقشہ میں ان ساری کوتاہیوں کے ازالہ کی ضمانت مستور ہے۔ جب کبھی فکر معقول سے کام لیا جائیگا، تو یقین مانئے کہ قرأۃ قرآن اور تعلیم بالقلم کے قرآنی حکم کی تعمیل کے لزوم کیساتھ مسلمانوں کی تعلیم کا صحیح نتیجہ خیز نظام یہی قرار پائیگا کہ تعلیمی زندگی میں جسمانی ریاضت و ورزش کے ساتھ طلبہ کو کسی ایسے ہنر کے سیکھ لینے کا بھی موقعہ دیا جائے کہ اپنے ہاتھ سے کما کھانے کی ضرورت اگر پیش آجائے تو اپنے آپ کو وہ معذور نہ پائیں، اور مدرسہ کی دماغی تعلیم کو خلق خدا کی خدمت کیلئے اس وقت تک کافی نہ سمجھا جائے جب تک کہ قلبی اصلاح کی سند ان لوگوں سے نہ مل جائے جو دل کی راہوں کے چلنے والے ہیں، نانوتہ کی مکتبی زندگی سے عبرت کا درس جو مجھے ملا ہے وہ یہی تھا، نہ معلوم کیوں تقاضا ہوا کہ دوسروں تک بھی اس کو پہنچا دیا جائے۔[1]

ان فی ذلک لذکری لمن کان لہ قلبٌ او القی السمع وھو شھید

[1] دار العلوم دیوبند کو دار العلوم بنانے والی ہستی کی ابتدائی تعلیمی زندگی اتفاقاً جن عناصر اور بنیادوں پر مشتمل ہے اسمیں شک نہیں کہ دماغ کے ساتھ دل کی تربیت کی حد تک دار العلوم کے قاسمی نظام تعلیم میں ابتدا ہی سے اس کی طرف خاص توجہ بزرگوں کی مرتکز رہی اور اس لحاظ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے نتائج کافی شاندار رہے ہیں مگر جسمانی ریاضت اور شکمی تقاضوں کی تکمیل میں جن چیزوں سے مدد مل سکتی تھی، خیال تو ان کا بھی لوگوں کو وقتاً فوقتاً ہوتا رہا مگر عملی شکل جیسی کہ چاہیئے ان کو نہیں مل سکی تھی، تقریباً پون صدی کے بعد دار العلوم میں دار الصنائع کا افتتاح بھی عمل میں آیا، مولانا طاہر القاسمی سلمہ اللہ تعالیٰ جو دار الصنائع کے ناظم ہیں ان کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اپنے جد امجد کی ابتدائی تعلیمی زندگی کے ایک کارآمد نمونہ کی بقا و ارتقا کا موقعہ قدرت کی طرف سے ان کو عطا گیا ہے اصولی طور پر اس کا خیال رکھا جائے کہ زیادہ توجہ ہنر و دستکاریوں کے ان ہی شعبوں کی طرف مبذول رکھی جائے جو مقامی ہوں اور یورپ و امریکہ کی میکانکی صنعتوں سے مقابلہ کا خطرہ جن میں ممکنہ حد تک کم ہو تو مجھے امید ہے کہ افادیت کے لحاظ سے ایسی دستکاریاں زیادہ بہتر اور نتیجہ خیز ثابت ہونگی، بلکہ "جلد بندی" کے جس کام کو مولانا نے سیکھا تھا غور کیا جائے تو اس میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ گویا علم ہی کی ایک شاخ سے اس کا تعلق ہے، نیز یہ ایسی دستکاری ہے جس کیلئے ضرورت مند ہمیشہ مقامی کاریگروں کے محتاج رہینگے جلد بندھوانے کیلئے لوگ اپنی کتابیں یورپ و امریکہ بھیجیں گے اس کا خطرہ مشکل ہی سے پیش آسکتا ہے، بہرحال صنعتیں مقامی ہوں مقابلہ کے خطرہ کی گنجائش ان میں کم ہو اور گونہ علم سے ان کا تعلق ہو، یہ ساری خصوصیات مولانا مرحوم کے اس صنعتی نمونہ میں موجود ہیں، اس راہ میں کاپی نویسی، کمپوزیٹری، طباعت، جرنلزم (اخبار نویسی) وغیرہ بیسیوں ایسی صنعتوں کا انتخاب کیا جا سکتا ہے، یہ خبر بھی مسرت کے ساتھ میں نے سنی ہے کہ جسمانی تربیت کیلئے دار العلوم میں طلبہ کیلئے کھیلوں کا کچھ انتظام کیا گیا ہے، مگر اسی کے ساتھ جب سنتا ہوں کہ دماغ کے ساتھ دلوں کی تربیت کی اہمیت دار العلوم میں کم ہو رہی ہے تو کچھ سناٹا سا چھا جاتا ہے کہ صلاح کے سارے نظام کا دارومدار قلب ہی کی صلاح کے ساتھ وابستہ ہے "اذا فسد فسد الجسد کلہ" نبوت کبریٰ کا الہامی انکشاف ہے ۱۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

**شر سے خیر کی پیدائش** بہر حال نانوتہ کی مکتبی زندگی کے ان ہی ایام میں ایک کافی مہیب وخوفناک حادثہ نانوتہ میں پیش آیا ایسا حادثہ جو بظاہر "شر" کے قالب میں سامنے آیا تھا، لیکن جیسا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ سمجھنے والے بسا اوقات جس چیز کو سمجھتے ہیں کہ وہ بری ہے، وہی انجام کے لحاظ سے بھلی بن جاتی ہے، زندگی کے انفرادی اور اجتماعی تجربات قرآن کے اس دعوی کی شہادتوں سے لبریز ہیں، آج کچھ اسی قسم کی صورت سے ہم نانوتہ میں اپنے آپ کو دوچار پاتے ہیں، اس قصہ کا مصنف امام نے تذکرہ کیا ہے، اپنے تمہیدی بیان میں اس کے بعض اجزاء کا ذکر خاکسار بھی کر چکا ہے، میں نے بیان کیا تھا کہ نانوتہ میں سنیوں کے ساتھ شیعہ طبقہ کے لوگ بھی آباد تھے، مغل حکومت کے آخری سکراتی دور میں چونکہ عموماً ملک کے مرکزی مقامات پر اسی طبقہ کا تسلط قائم ہو گیا تھا، اس لئے "العاجلہ" کو "الآجلہ" پر یا دنیا کو "دین" پر ترجیح دینے والے کمزور دل و دماغ کے لوگ اس زمانہ میں مسلک تسنن کو ترک کر کے دیکھا جا رہا تھا کہ تشیع کا طریقہ اختیار کر رہے ہیں؛

شہروں سے گذر کر قصبات اور دیہات تک "شیعہ گردی" کی یہ وبا اس زمانہ میں پھیل گئی تھی، حتی کہ کھجوروں کے درمیان کی یہ آبادی یعنی نانوتہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے محفوظ نہ رہ سکی۔ مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"ہمارے وطن (یعنی نانوتہ) میں ایک قضیہ پیش آیا" صـ۲۶

یہ قضیہ کیا تھا ان ہی سے سنئے فرماتے ہیں کہ

"شیخ تفضل حسین شیعہ مذہب ہو گئے تھے" صـ۲۶

"اور ہماری جائداد کے شریک تھے"

یہ شیخ تفضل حسین نانوتوی کون تھے، کیا تھے، تفصیلی طور پر ان باتوں کا تو پتہ نہ چل سکا، لیکن آگے مصنف امام نے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"ہماری جائداد کے شریک تھے" صـ۲۶

اس فقرے سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ نانوتہ کے قاسمی صدیقی شیوخ ہی کے خانوادے سے غالباً ان کا تعلق تھا، موروثی جائداد میں شرکت کی عام وجہ رشتہ کا یہی تعلق ہو سکتا ہے۔ "ہماری" کے لفظ سے مصنف امام کی مراد شاید "برادری" ہے، یعنی نانوتہ کے صدیقی شیوخ کو جو جائداد جاگیر میں حکومت کی طرف سے ملی تھی، اس جائداد میں شیخ تفضل حسین بھی شریک تھے۔

کچھ بھی ہو، دو باتیں تو قطعی ہیں، یعنی شیخ تفضل حسین پہلے سنی تھے، اور سنت کے طریقہ کو چھوڑ کر شیعہ ہو گئے تھے اور جس جائداد کے مالک نانوتہ کے صدیقی شیوخ تھے، اس میں شیخ تفضل حسین کا بھی حصہ تھا۔

اب نہیں کہا جا سکتا کہ تبدیلی مذہب اس کا سبب تھا، یا جائداد کی شرکت کی وجہ سے کچھ خرخشہ پیدا ہوا، مگر ہوا یہی کہ شیخ تفضل حسین اور سیدنا الامام الکبیر کے جد امجد شیخ غلام شاہ کے درمیان کشیدگی پیدا ہوئی اور یہ کشیدگی بڑھتی ہی چلی گئی۔

تا اینکہ کشیدگی کی شدت اس نوبت تک ترقی کر کے پہونچ گئی، کہ بقول مصنف امام

"ان سے (یعنی شیخ تفضل حسین سے) اور مولوی صاحب (یعنی مولانا محمد قاسم صاحب) کے دادا شیخ غلام شاہ سے فساد ہوا، اور شیخ تفضل حسین مولوی صاحب (یعنی مولانا محمد قاسم صاحب) کے ماموں میاں فصیح الدین کے ہاتھ سے زخمی ہو کر مر گئے"۔ ص۲۶

جس کا مطلب جیسا کہ ظاہر ہے یہی ہو سکتا ہے کہ نانوتہ نے اس قضیہ میں باضابطہ رزم گاہ کی صورت اختیار کر لی، اور معاملہ اتنا طویل کھنچا کہ نوکروں چاکروں یا کمیروں سے، جن سے عموماً زمیندار طبقہ کے لوگ اس قسم کے مواقع میں کام لیتے ہیں، کام نہ چل سکا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ براہ راست دونوں فریق کے سرغنے اس بلوے میں شریک ہوئے، میاں فصیح الدین حضرت کے ماموں جو غالباً سہارنپور کے وکیل شیخ وجیہ الدین کے صاحبزادے تھے، ان کا میدان میں اترنا اور اترنا ہی نہیں بلکہ غنیم کے گل سرسبد شیخ تفضل حسین پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ اس حملہ سے وہ جاں برنہ ہو سکے اسی سے اس "بلوے" کی اہمیت ظاہر ہو رہی ہے، اور زمانہ بھی اب انگریزوں کا تھا، بگڑے ہوئے

ملک میں امن و آئین کے قائم کرنے میں انگریزوں کی نئی حکومت پوری قوت خرچ کر رہی تھی، قیاس کا اقتضا یہی ہے کہ "بلوہ" اور بلوے میں قصبہ کی ایک متمول صاحب ثروت شخصیت کا قتل ہو جانا، اس نے صورت حال کو کافی نازک اور ہولناک بنا دیا ہوگا، افسوس ہے کہ مصنف امام جو اس واقعہ کے عینی شاہد تھے انھوں نے تفصیل کی طرف توجہ نہ فرمائی، تاہم اسی سلسلہ میں انھوں نے جو یہ لکھا ہے کہ

"ہر چند کہ اس مقدمہ میں خیریت رہی، اور حاکم کی طرف سے کسی کو کچھ سزا نہ ہوئی" ص ۲۶

اس سے اتنی بات تو یقینی طور پر معلوم ہوئی ہے کہ "بلوے" کا یہ مقدمہ حکومت کے سامنے پیش ہوا بلکہ ان کے الفاظ

"کسی کو کچھ سزا نہ ہوئی"

اس سے اگر یہ سمجھا جائے کہ سزایابی کا خطرہ ایک سے زائد آدمیوں کے سامنے پیش آگیا تھا تو یہ بے بنیاد خیال نہ ہوگا، بالکل ممکن ہے کہ میاں فصیح الدین کے ساتھ حضرت والا کے جد امجد شیخ غلام شاہ صاحب اور آپ کے والد ماجد شیخ اسد علی وغیرہ حضرات سب ہی مدعا علیہم قرار پا گئے ہوں، "خیریت رہی" کی خبر جو مصنف امام نے دی ہے، خود یہی خبر بھی یہ بتا رہی ہے کہ دلوں پر کافی دہشت طاری تھی اور صورت حال کے لحاظ سے یہی ہونا بھی چاہئے تھا۔ بلکہ تعجب ہوتا ہے، کہ "بلوہ و قتل" جیسے سنگین جرائم کے ہوتے ہوئے یہ خیریت آخر کیسے گذری، ممکن ہے کہ شیخ وجیہ الدین کی وکالت و وجاہت کام آئی ہو۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نانوتہ میں جب یہ حادثہ پیش آیا، اور حادثے کے بعد مقدمہ قائم ہوا یہ مقدمہ کب تک چلتا رہا، آپ دیکھ رہے ہیں کہ معمولی مقدمہ نہ تھا، بجائے خود جرم کی نوعیت بھی حد سے زیادہ سنگین تھی، پھر جن لوگوں پر الزام لگایا گیا تھا، وہ بھی معمولی لوگ نہ تھے، دور بھی انگریزی حکومت کا تھا، معمولی مقدمات میں غیر معمولی دور از کار موشگافیوں کی وجہ سے کافی وقت صرف ہو جاتا ہے[1]، اور یہ مقدمہ تو اپنی اہمیت کی وجہ سے اس کا مستحق تھا کہ (حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کیجئے)

کافی احتیاط سے کام لیا جائے، اسی لئے میں نہیں کہہ سکتا ہوں کہ اس حادثے کے وقت مولنا کی عمر کیا تھی، تاہم سنین کے مقابلہ د موازنے سے پتہ چلتا ہے اور شاید پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ نانوتہ سے پہلی دفعہ حضرت والا تحصیل علم کی غرض سے جب باہر نکلے ہیں تو اس وقت آپ کی عمر میرے حساب کی رو سے آٹھ اور نو سال کے درمیان میں ہونی چاہیئے، اور اب اسی کو بیان کرنا چاہتا ہوں، دیکھئے یہی خاندانی حادثہ جس نے سارے خاندان کو کافی مدت تک سراسیمہ بنا رکھا تھا، شر کے اسی واقعہ کو "خیر" اور عظیم و کبیر بلکہ عجیب و غریب خیر کا ذریعہ قدرت کے غیبی ہاتھ نے کیسے بنا دیا۔

مصنف امام ہی کے حوالہ سے اس کا تفصیلاً ذکر گذر چکا کہ مسلسل چار پشتوں سے مولنا نانوتوی کے خاندان کے ساتھ یہ اتفاقی واقعہ پیش آ رہا تھا کہ ایک مورث کا ایک ہی شخص تنہا وارث ہوتا چلا آ رہا تھا۔ تجزی و تقسیم سے آپ کی موروثی جائداد زیادہ متاثر نہ ہو سکی تھی یہ تو گویا ایک فائدہ کا پہلو تھا، لیکن اسی کے ساتھ بجنسہ یہی واقعہ ایک نازک خطرے کا سبب بھی قدرتاً بنا ہوا تھا، یعنی خاندان کے آخری وارث کا اختتام پورے خاندان کے اختتام کا مسئلہ بن جاتا تھا، جس زمانہ میں شیخ تفضل حسین کے قتل کا یہ واقعہ نانوتہ میں پیش آیا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہو چکے تھے، اور چار پشتوں کے تنہا چشم و چراغ، صرف آپکی ذات مبارک تھی، ایسی صورت میں بد اندیشوں نے اگر یہ سوچا ہو کہ اس خاندان کو ہمیشہ کے لئے

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ۱۷۳) ۵ؔ انگریزی طریقہ عدل و انصاف فصل خصومات کی غیر معمولی طوالت اور کوہ کندن کاہ بر آوردن کے تماشوں کے دیکھنے والوں سے تو آج ہندوستان بھرا ہوا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ غلام حسین طباطبائی جنھوں نے اپنی کتاب سیر المتاخرین ۱۱۹۵ھ میں ختم کی ہے یعنی تقریباً دو سو سال مدت گذری، ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے انگریزی طریقہ عدالت کا رواج ملک میں اسی وقت ہو چکا تھا طباطبائی نے اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عدالت فصول و موہما دارد عمرہا انتظار آں باید کشید و تاہم انفصال قضایا ہیچ نمی باید فہمید کہ چہ می شود و چہ خواہد گردید پایان کار نتیجہ خواہد انجامید (ص ۸۴۴ سیر المتاخرین) غریب دیہاتیوں کو اسی زمانہ میں ہائی کورٹ تک جانا پڑتا تھا، اسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دراں بلا ہا مبتلا گشتن و از اہل و عیال و اوطان مالوفہ کنارہ گرفتن و پایان کار خود کہ بکجا خواہد رسید ندانستن اعاذنا اللہ تعالیٰ و جمیع عبادہ من ذلک الشرور و الآفات ۱۲

نیست نابود کرنے کی یہ آسان ترین شکل ہے، کہ خاندان کے اس آخری چراغ کو بجھا دیا جائے
تو بداندیشیاں جب حد سے گذر جاتی ہیں، ان کے لحاظ سے اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے؛
خصوصًا جب حکومت کی طرف سے مخالفوں کا گروہ مایوس بھی ہو چکا تھا، یعنی مقدمہ بھی
ہار چکا تھا، تو ایسی حالت میں اس قسم کے مذبوحانہ اقدامات باعثِ حیرت نہیں ہو سکتے؛
خصوصًا ایک معصوم بچہ جو مدافعت اور مقابلہ کی قوت بھی اپنے اندر نہ رکھتا ہو، خیر خواہوں اور
بدخواہوں کی تمیز کی توقع بھی جس سے نہیں کی جا سکتی تھی، کچھ نہیں تو کھلانے پلانے ہی کے بہانے
سے یہ آسان تھا کہ زہر وغیرہ جیسی مخفی چیزوں سے ان کا کام تمام کر دیا جائے۔

مصنف امام نے اس کا ذکر کرنے کے بعد کہ مقدمہ اگرچہ حسبِ دل خواہ فیصل ہوا" اور حاکم
کی طرف سے کسی کو کچھ سزا نہ ہوئی" آگے جو یہ ارقام فرمایا ہے، کہ

"مگر بناء مخاصمت کچھ پہلے سے تھی اب زیادہ ہو گئی" ص۲۶

اس سے میری سمجھ میں بھی آتا ہے کہ ہار کی ذلت اور کھسیانا پن کے جذبہ سے مغلوب ہو کر
گویا بلی کھمبے کے نوچنے پر آمادہ ہو گئی، یعنی کسی ایسی چیز پر اپنے ناخن کی تیزی کو مشق کرنے لگتی
ہے، جو بلی کے پنجوں کا جواب اپنے پنجوں سے نہیں دے سکتا۔ مذکورہ بالا فقرے کے بعد
مصنف امام کے جو یہ الفاظ ہیں کہ

"تب یہ خوف ہوا کہ مبادا کوئی صدمہ مخالفوں کے ہاتھ سے ان کو (یعنی مولانا محمد قاسم
کو) پہنچے" ص۲۶

اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے، کہ شدت مخاصمت کے جنون و دیوانگی کے شکار
ہو کر غیظ و غضب کی آگ کے بجھانے کی تدبیر شیخ تفضل حسین کے طرفداروں کی سمجھ میں یہی آئی
کہ اس چراغ ہی کو بجھا دیا جائے جس کے بجھنے کے ساتھ ہی اس خاندان ہی کی روشنی ہمیشہ
کے لئے گل ہو جائے گی، ورنہ ایک معصوم بچے کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ مخالفوں کی طرف سے
پیدا ہونے کی صورت ہی کیا ہو سکتی ہے۔

بہرحال اسباب خواہ کچھ ہی ہوں مگر مصنف امام کی شہادت سے اتنی بات تو قطعی معلوم ہوتی ہے کہ شیخ تفضل حسین کے اس قصے کی تان بالآخر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ پر ٹوٹی خطرہ پیدا ہوا کہ دشمنوں کی طرف سے کوئی نقصان آپ کو نہ پہنچے "شر" کا یہی خطرہ تھا، اب دیکھئے کہ خطرہ کی اسی تاریک رات سے "خیر" کی صبح کا سپیدہ کس نشان کے ساتھ طلوع ہوتا ہے، اور یہ قرآنی حقیقت کہ

| | |
|---|---|
| وعسیٰ ان تکرھوا شیئًا وھو خیر لکم وعسیٰ ان تحبوا شیئًا وھو شر لکم واللہ یعلم وانتم لا تعلمون | قریب ہے کہ تم کسی چیز کو برا سمجھو اور وہی تمہارے لئے خیر ہو اور قریب ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہی تمہارے لئے بری ہو، اور اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے |

جس کے تفسیری تجربات سے انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی لبریز ہے آج اسی حقیقت کا ظہور "اسلامی ہند" کی تاریخ کے خاص عہد میں کیسے عجیب و غریب طریقے سے ہوا ہے، لاتعلمون (تم نہیں جانتے) کے لفظ سے انسان کے فطری جہل پر جو تنبیہ کی گئی ہے، اسی جہل سے علم پیدا ہوا اور کیسا ہوا؟

ہوا یہ کہ "مخالفوں سے صدمہ پہنچے" کا اندیشہ جب پیدا ہوا تو سوال ہوا کہ اس معصوم بچے کو پہنچنے والے صدمہ سے بچانے کی ممکنہ تدبیر کیا ہو سکتی ہے، نانوتہ میں رہ کر ایسے دشمنوں کی حفاظت کی صورت کیا ہو سکتی ہے، جو گو اس وقت دشمن بن کر غیر ہو گئے تھے مگر تھے تو وہ اپنے ہی، نانوتہ کے جس محلہ میں حضرت والا کا دولت خانہ تھا، اسی محلہ کے رہنے والے وہ بھی تھے، صبح و شام روز و شب ان کی آمد و رفت کا سلسلہ ہر گلی کوچہ میں جاری تھا، جو نشانہ بنایا گیا تھا، وہ اپنی معصومیت کے دور میں تھا، کچھ یہ اور اسی قسم کی باتوں کو سوچ کر یہ طے کیا گیا، کہ گو گھر سے باہر نکلنے کی عمر ابھی نہیں ہوئی ہے، لیکن جب گھر ہی کے لوگ دشمن ہو گئے ہوں تو اس گھر سے "باہر" ہی زیادہ محفوظ ہو سکتا ہے، مگر "باہر" بھیجا جائے تو کہاں بھیجا جائے، تمہیدی بیان میں عرض کر چکا ہوں کہ نانوتہ کے ان صدیقی قاسمی شیوخ کی رشتہ داریاں اطراف و جوانب کے مختلف قصبات کے شیوخ سے قائم تھیں، تھانہ بھون، کاندھلہ، رامپور اور سب سے زیادہ

توسہارنپور علاقہ کا مرکزی مقام یعنی ضلع ہی وہ تھا، جہاں حضرت کے نانا جان شیخ وجیہ الدین ایک خوش باش فارغ البال آدمی کی زندگی گذار رہے تھے، میرے پاس ایسا کوئی تاریخی وثیقہ تو نہیں ہے جس کی بنیاد پر یہ دعوی کروں کہ باہر بھیجنے کا مشورہ جب اس معصوم بچے کے متعلق پیش ہوا تو مذکورہ بالا مقامات کا بھی نام لیا گیا تھا، لیکن عقلاً بھی سمجھ میں آتا ہے کہ جب رشتہ داروں ہی میں کہیں بھیجنا مقصود تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ فہرست میں یہ نام بھی نہ آئے ہوں خصوصاً سہارنپور مختلف وجوہ سے مستحق ترجیح تھا، مگر کہتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے، غلط راہوں سے سوچنے والوں کا ڈر معلوم ہوتا ہے ان کے برے دھیان خدا جانے ان کو کہاں کہاں لے جائیں، حالانکہ "گل" کے ساتھ غریب "بلبل" کو لفظاً صرف لفظاً اگر ہم قافیہ ہونے کی سعادت حاصل ہو گئی ہے تو اس کا یہ کتنا غلط مطلب ہو گا کہ مسکین "بلبل" پر اپنے "محبوب گل" کے ساتھ رنگ و بو کے دعوے کا جنون بھی سوار ہوا ہے، بجز ہرزہ اندیشی، اور بادہ خیالی کے اس قسم کے وسوسوں کو اور کیا سمجھا جائے، لاکھ ہم قافیہ ہو، لیکن بلبل بہرحال بلبل ہے اور "گل" "گل" ہے۔ گل کے ساتھ ہمسری کا ہلکا سا اندیشہ بھی یقیناً "بلبل" کو "بلبل" ہونے کے مقام سے گرائے گا۔

بہرحال کچھ بھی سوچا جائے اور کچھ بھی کہا جائے۔ یہ عرض کرتے ہوئے کہ

یا لائمی فی الھویٰ لعذری معذرۃ ۔۔۔ مِنّی الیک ولو انصفت لوتلم

جو بات دل میں آئی اسے پیش کر دیتا ہوں۔

قصہ یہ ہے کہ باہر بھیجنے کی تجویز جب نانوتہ میں طے ہوئی تو جیسا کہ مصنف امام نے خبر دی ہے بھیجنے والوں نے نہ آپ کو تھانہ بھیجا نہ سہارنپور نہ کہیں اور بلکہ وہی لکھتے ہیں کہ

"اسی لئے (یعنی خطرے سے محفوظ کرنے کیلئے) دیوبند بھیجدیا"، صـ۲۶

دیوبند! وہی دیوبند جو اس وقت بھی آخری منزل، اور خوابگاہ گرامی ہونے کے شرف سے ارجمند ہے نانوتہ کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ وہی آپ کا وطن ثانی، اور دار الہجرت قرار پایا، جن دینی و علمی شعاعوں سے ہند و بیرون ہند کے وسیع علاقے آج جگمگا رہے ہیں، اور

خدا ہی جانتا ہے کہ کب تک جگمگاتے رہیں گے، دیوبند ہی کے افق سے یہ شعاعیں پھوٹیں، ان ہند گیر کرنوں کا آفتاب اسی کے مطلع سے طلوع ہوا کمسنی اور معصومیت کے اس عہد میں اُن کے قدوم سعادت لزوم سے اسی دیوبند کی سرفرازی، سچ پوچھئے تو اچانک اس حال نے دوسرے حال کی طرف مجھے منتقل کر دیا۔ "گل" کے ساتھ "بلبل" کے ہم قافیہ ہونے کا خیال فجارۃً سامنے آگیا تیرہ سو سال پہلے کی تاریخ دماغ میں بیدار ہوگئی، داخل ہونے والے صلوات اللہ علیہ سلامہ داخل ہوتے ہوئے فرما رہے تھے۔

ھذا المنزل ان شاء اللہ تعالیٰ | اترنے کی جگہ یہی ہے انشاء اللہ تعالیٰ

خدا کی مشیت پوری ہوئی، وہیں اترے اور آج تک فرودگاہ عالی ہونے کا شرف اسی سرزمین پاک کو حاصل ہے، اور انسانیت اپنی نجات کے لئے ڈھونڈھے گی، تو اسی خاک پاک سے سر اٹھا کر اشفع تشفع، سل تعطہ کے مقام محمود میں سجدہ ریز ہوگی۔

خیال یہی آیا کہ یہی مدینہ جو منزل بننے کے بعد طابہ وطیبہ بن گیا تھا، اور اب تک بنا ہوا ہے، قیامت تک بنا رہے گا، اسی مدینہ میں جب وہ طیبہ بلکہ یثرب تھا، بیان کیا گیا ہے، کہ والدہ محترمہ کے ساتھ عہد طفولیت میں آپ کو لایا گیا تھا، "گل" کی تاریخ کا یہ حصہ "بلبل" کے اس قصہ کے ساتھ کتنا مشابہ ہے، جو اس وقت پیش آرہا ہے، تابع میں متبوع کا جو رنگ ارادہ اور اختیار سے پیدا ہو، یقیناً حقیقی ستائش کا مستحق یہی اختیاری رنگ ہے۔ مگر جو چنے جاتے ہیں، ان کی "اجتبائیت" کا شاید یہی اقتضاء بھی ہوتا ہے، کہ اپنے متبوع کا رنگ کسی نہ کسی طرح تابع میں بھی اضطراراً بھی جھلکتا ہوا معلوم ہو، یہ شاید "اجتبائیت" کی شان کو ظاہر کرنے کیلئے قدرت کی طرف سے یہ مخفی کارروائیاں ہوتی ہیں تاکہ پہچاننے میں آسانی ہو، اس قسم کے امتیازی نشانوں سے وہ نوازا جاتا ہے۔

دیکھئے تو یہی دیوبند جو عوام کی زبان پر ابھی دیوبند نہیں بلکہ عموماً دے بنٹر کی شکل میں چڑھا ہوا ہے، اسی دے بنٹر میں آٹھ نو سال کا ایک بچہ داخل ہو رہا ہے، کون جانتا تھا کہ کچھ دن بعد

یہی معصوم بچہ اس ٹرے بنٹر کو دیو (شیطان)، کے باندھنے کا ذریعہ بناکر واقعی اس کو دیو بند بنا دے گا۔ سلسلت مردة الجن والشیاطین (یا زنجیر کر دیئے گئے ہیں جن اور شیاطین کے سرکش لوگ) کا عجیب و غریب منظر اسی قصبہ کی بدولت ہندوستان کے ہر ہر شہر قصبات بلکہ دیہات تک میں نگاہوں کے سامنے آئیگا، ہندہی نہیں بلکہ بیرون ہند بھی اس دیو بندی کی اس مہم سے حصہ پائے گا۔

بہرحال ہوا یہی کہ اس کم عمری میں اپنے والدین[۱] سے جدا ہو کر نانوتہ سے باہر پہلی دفعہ آپ اسی آبادی میں پہنچائے گئے، جہاں آپ کی آخری ناسوتی زندگی پوری ہوئی۔

گذر چکا کہ دیو بند والوں سے حضرت والا کے خاندان کی قدیم رشتہ داریاں تھیں، آپ کے پردادا شیخ محمد بخش کے بھائی شیخ خواجہ بخش کی صاحبزادی کی شادی دیو بند کے محلہ دیوان والوں کے یہاں ہوئی تھی جس زمانہ میں پہلی دفعہ حضرت والا کی تشریف آوری دیو بند میں ہوئی ہے تو ان ہی شیخ خواجہ بخش کے نواسے شیخ کرامت حسین کا دیو بند میں دور دورہ تھا، دیوان محلہ کے سرکردہ خاندان بھی شیخ کرامت حسین تھے عرض کر چکا ہوں کہ کسی زمانہ میں دیوان محلہ والوں کی معاشی حالت غیر معمولی طور پر بہتر تھی جس کا اندازہ ان کی امیرانہ ڈیوڑھی کی دو دیوار شکستہ سے ہوتا ہے، جو دار العلوم دیو بند کے صدر مشرقی دروازے کے سامنے اپنے بنانیوالوں کی تمیری اولوالعزمیوں کا خاموش درس دیکھنے والوں اور سننے والوں کو اب بھی دے رہے ہیں۔

---

[۱] دیو بند پہلی دفعہ جس وجہ سے آپ بھیجے گئے، مصنف امام کا بیان تو یہی ہے کہ خطرے سے محفوظ کرنے کیلئے ایسا کیا گیا تھا، ان سے بڑھ کر ظاہر ہے کہ اور کس کی شہادت وزنی ہو سکتی ہے مگر اپنی ایک قلمی یادداشت میں مولانا طیب الحمید سلمہ اللہ تعالیٰ نے ارقام فرمایا ہے کہ "آپ کی (یعنی مولانا محمد قاسم) کی والدہ نے چھوٹی عمر میں آپ کو دیو بند واسطے تعلیم کے بھیجدیا تھا" بظاہر کسی سے سنی ہوئی بات مولانا طیب کے کان میں پڑی ہے مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس عمر میں جس تعلیم کی مولانا کو ضرورت تھی اسکے لئے کیا نانوتہ کافی نہ تھا اس زمانہ کا دیو بند ظاہر ہے کہ آجکل والا دیو بند یقیناً نہ تھا بلکہ جو حال آس پاس کے دوسرے قصبات کا تھا تقریباً تعلیم و تدریس کے لحاظ سے وہی حال دیو بند کا بھی ہوگا۔ یہ احتمال ہے کہ اتنے کم عمر بچے کا خواہ وجہ کچھ بھی ہو، ماں سے جدا ہونا عام حالات میں آسان نہیں ہے خصوصاً اکلوتا بچہ مگر باوجود اسکے آپ کی والدہ صاحبہ کو لوگوں نے کچھ اسی قسم کی باتیں کہہ کر کہ دیو بند میں تمہارے بچہ کی تعلیم اچھی طرح سے ہوگی راضی کر لیا ہوگا، اسی واقعہ کی تعبیر یہ کی گئی کہ تعلیم کے لئے ماں نے آپ کو دیو بند بھیجدیا تھا۔ جب یہ معلوم ہے کہ حضرت کے والد ماجد اس وقت زندہ تھے تو دیو بند بھیجنے کے قصہ کو والدہ ماجدہ کی طرف خصوصیت کے ساتھ منسوب کرنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں، ہاں ماں کا اپنے ایسے کم عمر اکلوتے بچہ کی جدائی پر راضی ہو جانا یہ واقعہ مستحق ہے کہ ان ہی کی طرف منسوب کیا جائے۔

دیوبند میں آپ کو کہاں رکھا گیا، اگرچہ اس کا واضح جواب مصنف امام کی کتاب میں نہیں ملتا لیکن مولانا محمد طیب الخطیب سلمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قلمی یادداشت[۱] میں یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

"دیوبند میں آپ کی (یعنی مولٰنا نانوتوی) کی چند قرابتیں قریبہ بلکہ اقرب ہیں"

یہ خبر دیتے ہیں کہ

"شیخ کرامت حسین کے یاں جن سے مسلسل رشتہ داریاں تھیں قیام کیا۔"

اس سے زیادہ صریح شہادت اور کیا ہوسکتی ہے، اسی لئے ماننا چاہئے کہ حضرت الاجب پہلی دفعہ اپنی طفولیت کے اس عہد میں دیوبند تشریف لائے، توموجودہ دارالعلوم کی عمارت سے جو بالکل متصل حویلی شیخ کرامت حسین کی تھی، یہی آپ کی فرودگاہ قرار پائی۔

گھوم گھوم کر ذہن اس گذرے ہوئے زمانہ کی طرف چلا جاتا ہے، جب دیوان محلہ میں پہلی دفعہ حضرت والا نے نزول اجلال فرمایا، اس ڈیوڑھی کی مغربی سمت والی زمین جو اب دارالعلوم قاسمیہ کی فلک پیما عمارتوں سے بھری ہوئی ہے، دارالحدیث کا قبہ بیض دور دور سے نظر آتا ہے، یہ کون جانتا تھا کہ اس غیر آباد زمین پر اسلامی ہند کی دینی تاریخ کا اتنا بڑا ہنگامہ اسی ننھے منے بچے کے ہاتھوں برپا ہونے والا ہے، انسان کے سوا وہ ساری چیزیں جنکی تسبیح کو قرآنی نص کی رو سے ہم نہیں سمجھتے، کون کہہ سکتا ہے کہ اس سلسلہ کی چیزیں اس میدان یا باغ میں جو پھیلی ہوئی تھیں، ان میں سرگوشیاں نہ ہوتی ہوں گی۔

"سلام ہو تجھ پر اے ہمارے آباد کرنے والے ہمیں متبرک بنانیوالے بچے"

کم از کم شعر کے کانوں میں اس سلام کی آواز اب بھی گونج رہی ہے۔ شاعر کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ اس خطے کا ذرہ ذرہ، جڑی بوٹی، شجر و حجر آنیوالے کا استقبال کر رہے ہیں، اپنے آباد کرنیوالے کے قدم چوم رہے ہیں۔

خیر بے ساختہ خیالات کا ہجوم ہے جو دل و دماغ پر چھاتا چلا جاتا ہے، اپنی ذہنی لذتوں کو اپنی ہی حد تک محدود رکھنے میں کچھ بخل کی بو محسوس ہوئی، اس لئے اضطراراً قلم سے یہ الفاظ ٹپک پڑے آئیے اب اصل قصہ کو سنئے، قیام کا نظم بھی شیخ کرامت حسین مرحوم کی اس ڈیوڑھی میں ہوا، اور گو

---

[۱] کاش مولانا طیب صاحب فٹ نوٹ میں ان قرابت داریوں کی کچھ تفصیل فرما دیتے تو مناسب تھا!

تصریح تو نہ مل سکی، لیکن مولانا طیب الحفید سلمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اسی یادداشت میں بعض واقعات کا جو ذکر کیا ہے، ابھی آپ کے آگے وہ دہرائے بھی جائیں گے، ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ دیوان محلہ کی اسی ڈیوڑھی میں قیام کے ساتھ طعام کا بھی نظم تھا، اور جس زمانہ کی یہ بات ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ خشک قیام پردونہ کے رشتہ والے بھی راضی نہیں ہو سکتے تھے، پھر جس گھر سے مسلسل رشتہ ارباں ہوں اور قرابت قریبہ بلکہ اقرب ہو، اسکے ہوتے ہوئے کیا یہ سوچنے کی بات ہو سکتی ہے کہ ایک بچہ کا کھانا ان لوگوں پر گراں ہو سکتا تھا، یا فیملی گسٹ[1] بنانے کی ہمت اس زمانہ کا کوئی شریف آدمی کر سکتا تھا، خصوصاً شیخ

---

[1] یہ یورپ کا عام دستور ہے ہندوستان یا اسی قسم کے ممالک سے طلب علم کے سلسلہ میں بیچارے طلبہ یورپ جب جاتے ہیں تو مختلف خاندانوں میں وہ قیام کا کرایہ اور طعام کا معاوضہ، غیر معمولی معاوضہ ادا کرنیوالے مہمان بنائے جاتے ہیں، قیام کا کرایہ اور طعام کا معاوضہ ادا کرکے بھی مہمان مہمان ہی باقی رہتا ہے، یورپ کی نئی اصطلاحوں میں ایک جدید اصطلاح ہے، غالباً اسکی وجہ یہی ہے کہ طلبۂ علم کے ساتھ حسن سلوک مغربی تمدن کیلئے ناقابل فہم مسئلہ ہے، انیسویں صدی کے آخری قرن کا مشہور مستشرق فاضل وجاسوس پروفیسر ویمبری جو بھیس بدل بدل کر مدتوں اسلامی ممالک میں گھومتا رہا ہے، اس نے اپنے حالات میں لکھا ہے کہ ہنگری جہاں کا وہ باشندہ تھا، کسی گاؤں میں گھر تھا اسی گاؤں کے متصل کسی قصبہ کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کرتا تھا، غریب تھا اپنے مصارف خود برداشت نہیں کر سکتا تھا لیکن پورے قصبہ میں ایسا کوئی آدمی نہ تھا جو اسے دو وقت کا کھانا دے سکتا ہو، مدرسہ کے بعض امیر لڑکوں نے مقرر کردیا تھا کہ ہفتہ میں باری باری کے ساتھ کھالیا کرے اور ان ہی امیر بچوں کے اترے ہوئے کپڑے ویمبری کو مل جاتے تھے، دیکھئے اس کا سفرنامہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ طلبۂ علم کے ساتھ مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ سے حسن سلوک کا رواج جاگیر وغیرہ کی شکل میں جو پایا جاتا ہے گویا اس راہ سے سینکڑوں سال تک مسلمانوں نے فری لاجنگ اور فری بورڈنگ کے طریقہ کو تعلیمی دائروں میں جو جاری رکھا شاید یہ مسلمانوں کی قومی خصوصیت ہے، صحیح حدیثوں میں طلبہ علم کے احترام کی طرف غیر معمولی توجہ جو دلائی گئی ہے، جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ اسی کا اثر ہے، مسجد نبوی میں صفہ کو قائم کرکے عملی طور پر بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا ہے کہ تشنہ کامان علم کے ساتھ مسلمانوں کو کیا برتاؤ کرنا چاہیے، شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ صرف دینی علوم کے طلبہ ہی نہیں بلکہ جیسا کہ اپنی کتاب نظام تعلیم و تربیت میں فقیر نے لکھا ہے کہ انگریزی عہد کے اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کے ساتھ بھی مسلمان یہی سلوک کرتے رہے، مگر جیسے جیسے مسلمانوں کی زندگی اسلامی اصول وضوابط کے دائرہ سے باہر ہوتی چلی گئی، وہ اس روایتی حسن سلوک سے دور ہوتے چلے گئے، دوسرے مفید مراسم کے ساتھ طلبہ علم کے ساتھ عملی ہمدردیوں کا جوش کم ہوتا چلا جارہا ہے، میں نے اسی کتاب میں لکھا ہے کہ صوبہ بہار کے شہروں میں تیس، چالیس سال پہلے یہ عام بات تھی کہ مسلمان وکیلوں اور مختاروں کے ڈیرے اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پانیوالے طلبہ سے بھرے رہتے تھے، قیام کے ساتھ عموماً ان کے طعام کا بھی مفت نظم قائم تھا، مگر اب ان ہی شہروں میں دیکھ رہا ہوں کہ رشتہ کا بھی خیال نہیں کیا جاتا اور کوئی اس پر آمادہ نہیں کہ اپنے غیر مستطیع رشتہ داروں کے بچوں کیلئے پلنگ برابر خوابگاہ کیلئے جگہ اور دو وقت کا کھانا دے سکے، فانا للہ وانا الیہ راجعون، خود اس فقیر کے ذاتی تجربات اس سلسلے میں بڑے دردناک ہیں، جنکا ذکر بھی شاید اس کتاب میں کردیا گیا ہے ۱۲

کرامت حسین جو بڑی بڑی براتوں کو مہمان بنالینے کے عادی تھے، ان کے متعلق تو اس قسم کا وہم بھی شاید وہم سے بھی زیادہ بدتر بات ہوگی۔

شیخ کرامت حسین مرحوم کی فراغبالی اور سیرچشمی، مہمان نوازی وغیرہ فضائل کے جو قصے عام طور پر مشہور ہیں، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے سمجھ میں تو یہی آتا ہے، کہ اپنے معصوم کمسن مہمان کے آرام و آسائش اور ہر قسم کی سہولتوں کا وہ ضرور خیال کرتے ہوں گے، مگر ظاہر ہے کہ اس قسم کے امیرانہ گھرانوں میں قدرتاً کھانے والوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے، خصوصاً اس زمانہ میں کہ ہلکا سا تعلق بھی کسی کے گھر مہمان بن جانے اور مہینوں پڑے رہنے کے لئے کافی تھا میزبان کو بجائے گرانی کے خوشی ہوتی تھی کہ اس باورچی خانہ سے اتنے آدمی مستفید ہوتے ہیں، اب اسے آپ اچھی رسم قرار دیں یا بری، مگر واقعہ کی صورت اس زمانہ میں کچھ یہی تھی گو "سفرۂ عام" کا یہی ذوق بعض شرمیلے کم سخن مہمانوں کے لئے باعث کلفت بھی بن جاتا تھا۔ جس کا میرے نزدیک ایک نمونہ یہ واقعہ ہی ہوسکتا ہے۔

مولانا محمد طیب صاحب نے عہد طفلی کے اسی قیام دیوبند کا ذکر فرماتے ہوئے اپنی قلمی یادداشت میں مندرجہ ذیل روایت کو خود حضرت نانوتوی کی طرف منسوب کرکے بیان کیا ہے کہ

"مولنا مرحوم (یعنی حضرت نانوتوی) فرماتے تھے کہ میں نے کبھی تازہ باسی روٹی یا دانہ دُنکا مٹھائی کھٹائی اپنی زبان سے نہیں مانگی، اگر کسی نے دے دیا لے لیا، اور کھالیا، ورنہ خیر، بعض دفعہ بھوک بہت لگتی، مگر مانگنے کی تکلیف کو بھوک کی تکلیف پر گوارا کرکے صبر کرتا، اور جب مہینہ دو مہینے میں دو چار روز کے واسطے گھر نانوتہ جاتے اور پھر دیوبند کی واپسی کا وقت قریب آتا، تو آپ بھوک کی تکلیف یاد کرکے بہت روتے، آپ کی والدہ ہر چند پیار کرکے چمکار کے پوچھتیں کہ تجھ کو دیوبند میں کچھ تکلیف ہے۔ مولنا فرماتے کہ میں نے اپنے دل میں یہ خیال کیا کہ اگر میں نے والدہ سے اس تکلیف کا ذکر کیا تو دیوبند والوں کی ناشکری ہوگی، اور ان کو رنج گذریگا،"

اپنے نفس پر تکلیف کا ہونا، مضائقہ نہیں، والدہ کو اصل حال سے مطلع نہیں کیا، اور برابر اسی طرح گذاری"۔ ۔ ۔ ۔

ظاہر ہے کہ براہ راست خود حضرت نانوتوی سے یہ قصہ یقیناً مولانا طیب نے نہیں سنا ہے، بلکہ روایت بالواسطہ ہے، راوی کا نام بھی نہیں بتایا گیا ہے، پھر روایت باللفظ بھی نہیں بلکہ بالمعنی ہے، تاہم اس روایت سے پہلی بات تو یہی ثابت ہوتی ہے کہ شیخ کرامت حسین مرحوم کے یہاں آپ کا قیام فیملی گسٹ یا معاوضہ ادا کرکے رہنے والے مہمانوں کی طرح نہ تھا، اور قیام کے ساتھ ان ہی کے یہاں طعام کا بھی نظم تھا، رہی بھوک کی تکلیف؟ سو خود مولانا ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تکلیف میں زیادہ دخل خود ان کی شرمیلی فطرت اور نہ مانگنے کی عادت کو تھا، بھلا آٹھ نو سال کی عمر میں جس کا دماغ یہ فلسفہ بناتا ہو، کہ بھوک بھی تکلیف ہے اور مانگنے کی ذلت یہ بھی تکلیف ہے، پھر دونوں تکلیفوں میں موازنہ کرکے یہ فیصلہ کہ بھوک کی تکلیف مانگنے کی ذلت کی تکلیف کے مقابلہ میں قابل برداشت ہے، اندازہ کیجئے کہ اس کے اخلاقی احساسات کی نزاکتوں کا کیا حال ہوگا، بھوک کی تکلیف جسمانی تکلیف ہے، اور ذلت و بے آبروئی، یہ روحانی تکلیف ہے، یہ فیصلہ اسی کا قلب سلیم کرسکتا ہے، اور وہ بھی کم عمری کے اس زمانہ میں، جس کے سارے اخلاقی احساسات جبلۃً بیدار ہوں، اس عمر میں بھی جس میں بچوں کی ساری ضرورتوں کی تکمیل کا دارومدار اپنے بڑوں سے مانگنے ہی پر ہوتا ہے، مانگنا ہی نہیں بلکہ مانگنے پر اصرار، بے جا ضد، ہٹ، اس عمر کا عام اقتضاء ہے، مگر جس کا حال یہ ہو خود بیان کرتا ہو کہ کسی سے کبھی کوئی چیز مانگی ہی نہیں، اگر اپنے اس فطری غریزہ کی وجہ سے گھر میں بھی بھوک کی تکلیف میں مبتلا ہونے پر اسے مجبور ہونا پڑے تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے اور شیخ کرامت حسین کا گھر خواہ قریب ترین عزیزوں ہی کا گھر کیوں نہ ہو، مگر اپنا گھر تو وہ یقیناً نہ تھا، مگر اس تکلیف کا شکار وہاں ان کو ہونا پڑا، تو جہاں تک میرا خیال ہے، اس کی ذمہ داری میزبان سے زیادہ غریب میزبان کے اس عجیب و غریب

معصوم مہمان پر اور اس ننھے منے مہمان کے ان جبلی غرائز پر عائد ہوتی ہے، جن کے حلقوں میں اس کے سارے جسمانی و روحانی تقاضے جکڑے ہوئے تھے، خیال تو کیجئے، کہ ایک طرف کمسنی کا تقاضاً اس شکل میں بھی پورا ہو رہا ہے کہ واپسی کے وقت دیوبند کی "بھوک" کی یاد آپکو اشکبار کرتی ہے، بچے تھے، بچوں کی طرح رونے لگتے ہیں، مادر مہربان کی طرف سے بہلائے اور چمکارے جاتے ہیں، مگر کیوں روتے ہو؟ اس سوال کے ساتھ ہی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی جو بچہ تھا، بچوں کی سی باتیں کر رہا تھا، اور بچوں کی طرح رو رہا تھا، اچانک اتنے بلند مقام پر نظر آتا ہے کہ پیران کہن سال کی بھی رسائی عام حالات میں اس مقام تک آسان نہیں، آخر خود سوچئے، مولانا طیب صاحب کی روایت کا یہ جز اگر صحیح ہے اور نہ صحیح ہونے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ والدہ ماجدہ کے اس سوال پر آپ کے سامنے اپنے میزبان کا احسان آکر کھڑا ہو گیا، اور اس سے زیادہ اس احسان کا احساس ٹوکنے لگا، کہ جس نے اپنے یہاں تمہارے قیام کا بھی طعام کا بھی نظم کر رکھا ہے، ماں کے سامنے بھوک کی شکایت پیش کر کے اس کو رسوا کر رہے ہو؟ ایک طرف میزبان کی اس ناشکری کا خیال، اور دوسری طرف یہ بات بھی آپ کی سمجھ میں آئی کہ والدہ کو

"رنج گذرے گا"

مولانا طیب کی روایت کے بجنسہ الفاظ ہیں جس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کی بھوک کی خبر سے ان کو رنج ہو گا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دیوبند والوں کی طرف سے والدہ کے دل میں رنجش پیدا ہو گی بلکہ میرے نزدیک تو دونوں کی گنجائش ہے۔

آٹھ نو سال کی عمر ہی میں جس کا ذہن واقعات اور ان کے مختلف پہلوؤں کے اتنے دور دراز گوشوں تک اچانک پھیل جاتا ہو، اور مسئلہ کے ہر فریق کے جذبات کے متعلق جو اتنا ذکی الحس واقع ہوا ہو، میں نے جیسا کہ عرض کیا باہر کیا گھر میں "بھوک" کی تکلیف اس کے سامنے پیش ہو جائے تو یہ اچنبھے کی بات نہ ہو گی، شیخ کرامت حسین بیچارے تو اس خیال میں ہونگے کہ جیسی عام بچوں کا حال ہوتا ہے یہی حال اس بچے کا بھی ہو گا، بھوک لگے گی مانگ لیا کرے گا مگر انکو کیا

معلوم تھا کہ طفولیت کے اس قالب میں "مکارم اخلاق" کی روح دبی ہوئی ہے، وہ پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ دوسروں کو آرام پہنچانے کیلئے تکلیف ہی میں اپنی ساری زندگی گذار دے گا۔ رحمۃ اللہ علیہ

مولانا طیب صاحب کی اس قلمی یادداشت سے علاوہ مذکورہ بالا امور کے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قیام دیوبند کے اسی زمانہ میں مہینہ دو مہینے پر دیوبند سے دو چار روز کیلئے اپنے وطن نانوتہ بھی تشریف لیجاتے تھے، تمہیدی بیان میں بتا چکا ہوں کہ دیوبند سے نانوتہ کا فاصلہ کل بارہ کوس تھا، والدین بلکہ اس وقت تو آپ کے جدامجد شیخ غلام شاہ صاحب بھی بقید حیات تھے، ان سب کی آنکھوں کی ٹھنڈک لکی خنکی صرف یکی ذات واحد تھی، مہینہ دو مہینے سے زیادہ جدائی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کیلئے ناقابل برداشت بن جاتی تھی اور گو آمد و رفت کے اس سلسلہ میں خطرات بھی تھے، دشمن گھات میں تھے مگر با ایں ہمہ آپ کو ناتو دو چار روز ہی کیلئے سہی بلالیا جاتا تھا۔

بہرحال دیوبند کے قیام کے ان دنوں کی اس خصوصیت کو یاد رکھنا چاہئے، کہ جوع (بھوک) کے ذاتی تجربہ کا موقعہ اس شخص کے لئے مہیا کیا گیا، جسکی بدولت ایک دو نہیں بلکہ ہزار ہزار بارہ بارہ سو طلبہ علم حق کو قریب قریب ایک صدی سے مسلسل دونوں وقت کھانا تقسیم ہو رہا ہے، اور زیادہ تر مفت بغیر کسی معاوضہ کے تقسیم ہو رہا ہے، قرآن میں جب صاحب نبوت کبریٰ علی صاحبہا الف سلام وتحیۃ کو فاما الیتیم فلا تقہر واما السائل فلا تنہر (تو یتیم کو نہ ڈانٹ اور سوال کرنے والے کو نہ جھڑک) کا حکم دیا گیا، تو اس سے پیشتر الم یجدک یتیما فاوی ووجدک ضالا[1] فہدی (کیا نہ پایا تجھے یتیم تو نہیں پناہ

[1] قرآن کے بعض الفاظ کی نوعیت عجیب ہے وطلاء ادنیٰ میں پہلی دفعہ جب وہ کان میں پڑتے ہیں تو کچھ جھجک سی محسوس ہوتی ہے سننے والے کچھ گھبرا جاتے ہیں اور سورۂ والضحیٰ کے اس لفظ "ضال" کا حال بھی یہی ہے سارے جہاں کے ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ضال کے لفظ کا انتساب لوگوں کو پریشان کئے ہوئے ہے اور طرح طرح کی تاویلوں اور توجیہوں میں لوگ الجھ جاتے ہیں، حالانکہ اسی لفظ کا جو ٹھیک لغوی مفہوم ہے اس کے سوا اس واقعہ کے اظہار کی کوئی دوسری شکل ہی نہیں ہو سکتی تھی جسے قرآن بیان کرنا چاہتا ہے، مطلب یہ ہے کہ فہدی (پس خدا نے راہ دکھائی) ظاہر ہے کہ یہ اس ہدایت اور رہنمائی کی تعبیر ہے، جو وحی کے ذریعہ سے کی گئی اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اس ہدایت یعنی وحی سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی متعین راہ نہ تھی اور عربی زبان میں ضال اسی کو کہتے ہیں جو راہ ڈھونڈھ رہا ہو، مگر اسے صحیح راستہ نہ مل رہا ہو، پس وحی سے پہلے خود ہی سوچنا چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے (باقی اگلے صفحہ پر)

دی اور پایا تم کو ناراہ یافتہ تو راہ دکھائی) کے الفاظ میں اس یتیمی اور ناراہ یافتگی کی یاد دلائی گئی تھی جس کے ذاتی تجربے سے خود پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو گذرنا پڑا تھا۔

اور طلب علم کے ایام میں بھوک کا یہ تجربہ کہاں کرایا گیا؟ دیوبند میں، اور دیوبند میں بھی، دیوان محلہ کی اس خاص حویلی میں جس کے مغربی سمت میں ٹھیک پشت پر وہ مطبخ قائم ہے جہاں سے ہر روز سیکڑوں کی تعداد رکھنے والے طلبہ کی جماعت کو بھوک کی تکلیف سے نجات بخشی کا ذریعہ اسی کو بنایا گیا، جو اسی محلہ میں بھوک کے دکھ سے طلب علم کے ابتدائی دنوں میں کبھی تڑپایا اور رلایا گیا تھا۔

دیوبند کی اس پہلی رونق افروزی کے ایام میں قیام وطعام کے نظم کا یہ تذکرہ تھا، باقی جہاں آپ ہی کا قائم کیا ہوا دار العلوم دیوبند یا قاسمی یونیورسٹی ہے، وہاں پہنچکر آپ جہاں پڑھتے تھے جس سے پڑھتے تھے اور جو کچھ اس زمانہ میں آپ نے دیوبند میں پڑھا لکھا، سیکھا ان سوالوں کے تفصیلی جوابات کا علم جیسا کہ چاہیئے اگرچہ نہ ہوسکا، تاہم متفرق ذرائع سے اس سلسلے میں جو باتیں معلوم ہوسکی ہیں، انھیں پیش کر دیا جاتا ہے:

مصنف امام نے اس کا تذکرہ کرنے کے بعد کہ نانوتہ سے آپ دیوبند بھیج دیئے گئے ارقام فرمایا ہے۔

"یہاں (دیوبند میں) مولوی مہتاب علی صاحب کا مکتب تھا، شیخ کرامت حسین مرحوم کے گھر پر شیخ نہال احمد پڑھتے تھے، مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) کو انھوں نے (یعنی مولوی مہتاب علی نے) عربی شروع کرائی" صـ ۲٦

سچ پوچھئے تو ان ہی چند فقروں میں ان ساری باتوں کا اجمالاً ذکر آگیا ہے، جنھیں ہم بیان کرنا چاہتے ہیں

---

بقیہ حاشیہ صـ ۱۸۵) اس حال کی تعبیر آخر کیا کی جاتی، بلکہ اسی سے وحی کی ضرورت کا اندازہ ہوتا ہے، نوع انسانی کا برگزیدہ ترین فرد، سارے انسانی کمالات کا جو اکمل ترین مظہر اتم تھا، وحی کے بغیر جب وہ بھی ضال اور راہ نایافتہ تھا تو وحی کی ہدایت سے خود سوچنا چاہیئے کہ کون مستغنی ہو سکتا ہے، اگر ضال کا لفظ یہاں استعمال نہ ہوتا تو وحی کی قدر و قیمت کا جو صحیح اندازہ اس لفظ کی وجہ سے ہو رہا ہے کیا ہو سکتا تھا، اور میرا تجربہ کچھ اسی ایک لفظ "ضال" کے متعلق ہی نہیں ہے بلکہ قرآن کا ہر وہ لفظ جس سے شروع میں بھڑک پیدا ہو، یقین کیجئے کہ وہ وہاں کوئی بڑی اہم "حقیقت" پوشیدہ رکھتا ہے۔ ۱۲

مصنف امام نے جس وقت اپنی سوانح عمری مرتب فرمائی تھی، اور جن لوگوں کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب لکھی تھی، اس زمانے کے ان لوگوں کے لئے یہ ساری مجمل باتیں جانی پہچانی تھیں لیکن بجز ایک شیخ کرامت حسین مرحوم کے جن کا نام اسی کتاب کی تمہید میں مختلف حیثیتوں سے گذر چکا ہے، تھوڑے بہت حالات سے بھی ان کے کم از کم گذشتہ اوراق کے پڑھنے والے واقف ہو چکے ہیں، مگر ان کے سوا آج کون جانتا ہے کہ یہ مولوی مہتاب علی صاحب جن کا دیوبند میں مکتب قائم تھا، کون بزرگ تھے، اور شیخ نہال احمد جو ان سے پڑھتے تھے ان کی حیثیت کیا تھی، وہ گھر جس میں شیخ نہال احمد مولوی مہتاب علی صاحب سے پڑھتے تھے کہاں تھا؟ اور تو اور جہاں تک میں جانتا ہوں آج دیوبند میں بھی مشکل ہی سے کوئی ایسا آدمی مل سکتا ہے جو ان چیزوں کا صحیح واقف کار اپنے آپ کو پاتا ہو، جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھے گا ناواقفیت کی تاریکی بھی زیادہ گہری ہوتی چلی جائے گی، اسی لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب تک مختلف ذرائع سے ان امور کے متعلق جو معلومات فراہم ہوئی ہیں ان کو درج کر دیا جائے آج ممکن ہے ان کی قیمت کا صحیح اندازہ نہ ہو، مگر کون کہہ سکتا ہے کہ کل تلاش کرنے والے کن کن چیزوں کو تلاش کریں گے۔

بہرحال سنئے یہ شیخ مہتاب علی صاحب ہمارے حضرت الاستاذ الامام شیخنا و شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی نور اللہ مرقدہٗ کے سگے بڑے چچا یعنی تایا تھے، ادب عربی کی نصابی کتابوں کے مشہور شارح حضرت مولانا ذوالفقار علی رحمۃ اللہ علیہ یعنی شیخ الہند کے والد ماجد ان ہی شیخ مہتاب علی کے چھوٹے بھائی تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم کا بہت اچھا سلیقہ شیخ مہتاب علی صاحب مرحوم میں پایا جاتا تھا، مولانا طیب الحفید سلمہ اللہ نے اپنی قلمی یادداشت میں لکھا ہے کہ شیخ الہند کے والد مولانا ذوالفقار علی صاحب نے بھی ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی شیخ مہتاب علی صاحب سے پائی تھی، ان ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نانوتوی رح جس زمانہ میں دیوبند کے اس مہتابی مکتب میں علم کی روشنی حاصل کرنے کے لئے شریک کرائے گئے تھے تو اس وقت شیخ الہند مرحوم کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی بھی اسی مکتب

میں زیرِ تعلیم تھے، اور جس جماعت میں مولانا نانوتوی لئے گئے تھے، مولوی ذوالفقار علی صاحب اس سے اوپر کی جماعت تک ترقی کر کے پہنچ چکے تھے، اتنی باتوں کا تو شیخ مہتاب علی صاحب مرحوم کے متعلق اب تک پتہ چل سکا ہے۔[1]

رہے شیخ نہال احمد انشاء اللہ تعالیٰ ان کا ذکر آگے بھی آئے گا، اور مختلف حیثیتوں سے آئیگا درحقیقت یہ ان ہی شیخ کرامت حسین یعنی دیوان محلہ کی ڈیوڑھی کے رئیس کے صاحبزادے ہیں، ان کے بعد دیوان محلہ کے رئیس وہی قرار پائے، گویا حاصل یہی ہوا کہ جہاں قیام و طعام کا نظم تھا، یعنی وہی دیوان محلہ کی ڈیوڑھی، اسی ڈیوڑھی کے کسی حصہ میں یہ مکتب خانہ قائم تھا اور یہی شیخ کرامت حسین کا گھر تھا، لیکن ڈیوڑھی کے کس حصہ میں یہ مکتب قائم تھا، مولانا طیب الحفید کی قلمی یادداشت میں ہے کہ

"یہ مکتب شیخ نہال احمد کی بیٹھک میں قائم تھا"

واللہ اعلم بالصواب۔ یہ بیٹھک شیخ کرامت حسین کی بیٹھک تھی، جو وراثۃً ان کے بعد نہال احمد کی بیٹھک بن گئی، یا شیخ نہال احمد صاحب کے لئے کوئی الگ بیٹھک بنا دی گئی تھی، جس سے انکے بچپن میں تو مکتب کا کام لیا گیا، اور بعد کو وہی مکتب شیخ نہال احمد کی بیٹھک بن گیا، بظاہر قرینہ یہی ہے کہ دراصل یہ شیخ کرامت حسین ہی کی نشست گاہ تھی، جسے مصنف امام نے تو ان ہی کی طرف منسوب کر دیا، اور چونکہ ان کے بعد شیخ نہال احمد کی بیٹھک بھی وہی رہی اس لئے مولانا طیب صاحب نے اس کو شیخ نہال احمد کی طرف منسوب کیا، بہر حال تھا یہ حصہ اسی دیوان محلہ کے اس قصر عظیم کا جو آج بھی کسی نہ کسی حیثیت کے ساتھ کھڑا ہوا ہے، مولانا طیب صاحب نے اپنی قلمی یادداشت

---

[1] مولانا طیب صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا ذوالفقار علی کا بھی حضرت نانوتوی اسی لئے غیر معمولی ادب کرتے تھے کہ بچپن کے استاد شیخ مہتاب علی صاحب کے وہ چھوٹے بھائی تھے ۱۲ "چھوٹے بھائی کا ادب کرو کہ اسکے بڑے بھائی سے تم نے پڑھا ہے" مزدور اساتذہ سے ڈگری کی خریداری کا بھاؤ بٹہ کرنیوالے شاگردوں کیلئے ممکن ہے کہ "ادب کی یہ قسم عجیب و غریب" معلوم ہو، مگر یہ اس زمانے کی بات ہے جب استاد بھی استاد، اور شاگرد بھی شاگرد تھے، تعلیمی دائروں کو بھی بیوپار کا بازار نہیں بنا دیا گیا تھا ۱۲ فیا الصیعۃ العلم والادب۔

دیوان محلہ کے اس حصہ کی جس سے مراد بیٹھک اور مکتب کا کام لیا جاتا تھا، اس کے محل وقوع کی نشاندہی کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے کہ

"جہاں اس وقت میری (یعنی مولٰنا طیب) کی مردانہ بیٹھک ہے"

جنھوں نے مولانا طیب صاحب کی مردانہ بیٹھک کو دیکھا ہے اور دیوان محلہ کی ڈیوڑھی جو اسی بیٹھک کے سامنے ہے، اس کو بھی دیکھا ہے، وہ مولانا طیب صاحب کے اس انکشاف سے سمجھ سکتے ہیں کہ دیوان محلہ کے جو حدود آج کل ہیں، کسی زمانہ میں ان کی وسعت اس سے بہت زیادہ ہونی چاہیئے۔ گویا یہ ماننا چاہیئے، کہ دیوان محلہ کی ڈیوڑھی اور مولانا طیب کی مردانہ بیٹھک کے درمیان جو ایک قصباتی سڑک[1] واقع ہے، غالباً یہ سڑک پہلے نہ تھی، اور مولٰنا کی بیٹھک دیوان محلہ کی ڈیوڑھی سے بغیر کسی درمیانی فصل کے غالباً ملی ہوئی تھی، خدا کا شکر ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے اس تاریخی "مکتب خانہ" کا محلِ وقوع صرف یہی نہیں کہ مولٰنا طیب الحفید کے مذکورہ بالا بیان کی روشنی میں متعین ہی ہو جاتا ہے، بلکہ زمانہ کے الٹ پھیر نے اسی گھر میں اس تاریخی مکتب خانہ کو پہنچا دیا جس گھر کے ساتھ نہ صرف دیوبند کا دارالعلوم بلکہ سچ پوچھئے تو فراخنائے ہند کی دینی تعلیم کی عمومیت کا نظام تقریباً ایک صدی سے وابستہ ہے، مجھے امید ہے کہ مکتب کے اس تاریخی مکان کی حفاظت کی جائیگی کہ دینی تعلیم کی عمومیت کا سرچشمہ یہیں سے پھوٹا۔

بہرحال جن سے پڑھتے تھے، جہاں پڑھتے تھے، بلکہ شاید اسی کے ساتھ جن لوگوں کے ساتھ پڑھتے تھے کسی نہ کسی حد تک یہ باتیں تو معلوم ہو چکیں، اب رہ گیا آخری سوال یعنی دیوبند کی مکتبی تعلیم کے اس دور میں آپ کو کن کن چیزوں کے پڑھنے کا موقعہ ملا، افسوس ہے کہ مصنف امام کے اس مجمل بیان کے سوا جو گذر چکا یعنی مولوی مہتاب علی صاحب نے اس مکتب میں مولٰنا محمد قاسم کو

[1] قصباتی سڑک سے میری مراد یہ ہے کہ شہروں میں تو عموماً پتھر کی سڑکیں ہوتی ہیں لیکن روہیلکھنڈ کے عام قصبات میں رواج ہے کہ اینٹوں سے پاٹی ہوئی سڑکیں بنائی جاتی ہیں جو شہری سڑکوں کی جیسی چوڑی چکلی تو زیادہ نہیں ہوتیں لیکن صفائی اور مسطح ہونے کے لحاظ سے بہتر ہوتی ہیں۔ عموماً دیوبند میں اسی قسم کی سڑکیں پائی جاتی ہیں اور اس سڑک کا بھی یہی حال ہے ۱۲

عربی شروع کرائی، مزید اور کچھ نہ معلوم ہو سکا، لیکن اسی سے اس کا پتہ چلا کہ نانوتہ سے جس وقت آپ باہر نکلے ہیں، اس وقت اتنی لیاقت اور قابلیت آپ میں پیدا ہو چکی تھی کہ عربی شروع کرانے کی صلاحیت مولوی مہتاب علی صاحب نے آپ کے اندر پائی، عربی شروع کرانے کا مطلب اس زمانہ کے لحاظ سے یہی ہو سکتا ہے کہ میزان ومنشعب کے ذریعہ عربی صرف آپ سیکھنے لگے، جاننے والے جانتے ہیں کہ تھوڑی بہت فارسی جانے بغیر صرف کی ان ابتدائی کتابوں کو کوئی پڑھ نہیں سکتا اس لئے ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ نانوتہ سے جس وقت باہر قدم آپ نے رکھا، اس وقت کم از کم میزان منشعب تک کے سمجھنے کی قابلیت فارسی ادب میں آپ حاصل کر چکے تھے، اور یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آیندہ دیوبند کے بعد سہارنپور پہنچکر پڑھنے کا جو مرحلہ پیش آیا جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، اس میں عربی کے ساتھ اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ "فارسی" کی کتابیں بھی سہارنپور میں آپ نے پڑھیں جس کا مطلب یہی ہوا کہ فارسی ادب کا کامل رواجی نصاب ابھی پورا تو نہیں ہوا تھا، مگر میزان ومنشعب جیسی کتابوں کی فارسی عبارت کے سمجھنے سمجھانے کا سلیقہ آپ میں پیدا ہو چکا تھا۔

دیوبند کے اس مہتابی مکتب کے ایام طالب العلمی کا ایک لطیفہ یہاں قابل ذکر ہے، مولانا طیب الحفید سلمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اس لطیفہ کا تذکرہ اگرچہ ضمناً سرسری طور پر قلمی یادداشت میں فرمایا ہے، مگر جس طریقہ سے انھوں نے اس کا تذکرہ کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لطیفہ عام طور پر لوگوں میں مشہور و معروف تھا، بہ ظاہر یہ ایک لطیفہ ہے، مگر میرے نزدیک وہ لطیفہ نہیں بلکہ حضرت والا کی اجتبائی شان کی جھلک اس میں بھی مجھے محسوس ہوتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت نانوتوی کے متعلق عموماً یہ سمجھا جاتا ہے، اور آپ کی تصنیف کردہ کتابوں سے بھی ایک حد تک اسی کا اندازہ ہوتا ہے، کہ مطالعہ اور کتب بینی کا چنداں ذوق آپ نہیں رکھتے تھے آپ کی کتابوں کو پڑھ جائیے، زیادہ تر آپ کے ذاتی اجتہادی نتائج اور ایسی باتیں جنھیں آپ کی اپج ہم کہہ سکتے ہیں، ان سے عموماً آپ کی گرانمایہ تصنیفات لبریز نظر آئیں گی، رہا دوسروں کی کہی ہوئی باتوں کا حوالہ یا اعادہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عادت نہیں تھی، انشاءاللہ حضرت والا کی

اس علمی خصوصیت پر تفصیلی بحث آئندہ کی جائے گی اور بتایا جائے گا کہ اس عام مشہور قصے کا واقعہ سے کس حد تک تعلق ہے!

یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ کاغذلیسی یا ورق گردانی جو مولویت یا علمی زندگی رکھنے والوں کا گویا ایک مرض ہے، یہ مانا جاتا ہے کہ اس مرض کے آپ مریض اور اس بیماری کے آپ بیمار نہیں تھے نہ صرف عوام بلکہ حضرت حکیم الامت التھانوی قدس اللہ سرہ العزیز تک بھری مجلسوں میں بغیر کسی جھجھک عموماً فرمایا کرتے تھے کہ

"مولانا محمد قاسم صاحب نے کتابیں کچھ بہت نہیں پڑھی تھیں"

ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب تو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا کہ اس زمانہ میں نظامیہ درس کا جو نصاب تھا اسکی تکمیل آپ نے نہیں فرمائی تھی، کیونکہ یہ واقعہ کے خلاف ہے، آپ کے تکمیلی نصاب کی کتابوں کی فہرست جو اپنے موقعہ پر درج ہوگی، اسی سے اس احتمال کی تردید ہو جاتی ہے، حضرت تھانوی سے بڑھ کر اس واقعہ کا علم اور کسے ہو سکتا ہے، بلکہ مقصد مبارک حکیم الامت کا وہی ہے کہ مطالعہ کے ذریعہ کتب بینی کی عام مولویانہ رسم سے آپ کو دلچسپی نہ تھی، اسی لئے کتابوں کے پڑھنے کا زیادہ موقعہ آپ کو نہ مل سکا، اور قصے کو حضرت تھانوی صرف اسی فقرے پر ختم نہیں فرما دیتے تھے، بلکہ آگے اس کا اضافہ بھی فرماتے کہ

"پڑھنے کے زمانہ میں بھی بہت شوق و مشقت سے نہ پڑھا تھا" قصص الاکابر الہادی ۲۹ ماہ جمادی الثانی ۵۷ھ

اس وقت میری اصلی غرض کا تعلق حکیم الامت قدس اللہ سرہ کے بیان کے اسی جزء سے ہے ظاہر ہے کہ شوق و مشقت سے نہ پڑھا تھا" طالب العلمانہ زندگی کی طرف اس کا انتساب کوئی معمولی بات نہیں ہے، کامل اعتماد، اور غیر مشتبہ وثوق تام ہی کے بعد اتنی بڑی اہم شہادت کی گنجائش حضرت حکیم الامت جیسی ذمہ دار ہستی کے بیان میں پیدا ہو سکتی ہے، تواتر اور شہرت کی راہ سے جب تک یہ بات ان تک نہ پہنچی ہوگی، ہرگز وہ اسکی جرأت نہیں فرما سکتے تھے۔

اب ایک طرف رکھئے اس متواتر یا کم از کم مشہور خبر کو کہ حضرت نانوتوی نے پڑھنے کے زمانے

میں بھی بہت شوق اور مشقت سے نہ پڑھا تھا، اور دوسری طرف سنئے اس لطیفے کو جس کا تعلق حضرت نانوتوی کے پڑھنے ہی کے اس زمانے سے ہے، جب آپ دیوبند کے مکتب میں زیر تعلیم تھے، مولانا طیب الحفید سلمہ، نے یہ لکھتے ہوئے کہ

"مولوی مہتاب علی صاحب مرحوم جو مولانا (حضرت نانوتوی) کے استاد تھے، ظریف شخص تھے اور براہ فراست ہر ایک شاگرد کا اس کے حسب حال اس کا نام رکھتے تھے"

حال کے مطابق ظریفانہ ناموں کی تجویز مولوی مہتاب علی صاحب کی جو فراست کیا کرتی تھی، اسی فراست نے حضرت نانوتوی میں جس "حال" کو پایا، اور پا کر اسی کے مطابق نام تجویز کیا، یہ نام کیا تھا؟ سنئے مولٰنا طیب فرماتے ہیں کہ

"چنانچہ مولانا مرحوم (حضرت نانوتوی) کا نام"

"علم کی بکری"

"رکھا تھا"

"علم کی بکری" ہے تو یقیناً ایک ظریفانہ نام، مولوی مہتاب علی صاحب کی فطرت میں مزاح و ظرافت کا جو جذبہ تھا اس کی غمازی خود ان کا رکھا ہوا نام کر رہا ہے، مگر آپ سن چکے کہ یہ نام یوں ہی بلا وجہ کیف ما اتفق نہیں رکھ دیئے جاتے تھے، بلکہ حال کے مطابق مولوی مہتاب علی صاحب کی صرف ظرافت ہی نہیں بلکہ فراست بھی ان ناموں کی تجویز میں دخیل تھی، پس اب یہی سوچنے کی بات ہے کہ مکتب کے جس بچہ کو "علم کی بکری" کا نام دیا گیا تھا، اس کے کس حال کا مشاہدہ مولوی مہتاب علی صاحب کی فراست نے کیا تھا، اور ان کا یہ رکھا ہوا نام اس بچہ کے کس حال کو ہم پر واضح و نمایاں کرتا ہے!

بکری کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہوتی ہے کہ ہر وقت زمین میں منہ جھکائے، کھانے کی جو چیز بھی مل جائے، اسے کھاتی رہتی ہے، اور جنگلوں میں جب بجائے گھاس کے، درخت کے پتوں کے چرنے کا موقعہ اسے مل جاتا ہے تو پتوں کی خاردار شاخیں خواہ جس قسم کے کانٹوں ہی

سے کیوں نہ بھری ہوں۔ لیکن دونوں ٹانگیں اٹھائے جہاں تک ممکن ہوتا ہے بلند سے بلند شاخوں کے پتوں تک پہنچنے اور ان کے چبا لینے کی کوشش سے کبھی نہیں تھکتی، بلکہ بسا اوقات امکانی حدود سے بھی آگے نکل جانے کی کوشش سے باز نہیں آتی[۵]، یا ایسی چیز جسے وہ کھا سکتی ہو، تلاش کرتی رہتی ہے، صبح سے شام تک اسی ایک واحد مشغلے میں بکری مشغول رہتی ہے، اسی بنیاد پر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ دیوبند پہنچنے کے بعد بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے لکھنے کا جتنا سلیقہ مولانا میں پیدا ہو چکا تھا، اور اس وقت تک جو چیزیں آپ پڑھ سکتے تھے ان کا پڑھنا اور پڑھنے میں مستغرق و مشغول رہنا یہی حال آپ کا تھا، جو مولوی مہتاب علی صاحب کی فراست پر منکشف ہوا، اور اپنے ننھے منّے کم سن شاگرد میں مطالعہ کے اسی غیر معمولی شوق و ذوق کو دیکھ کر بکری کی تشبیہ ان کی سمجھ میں آئی، جیسے ہر اس چیز میں جس میں کچھ ملنے کی امید ہو، بکری منھ ڈالتی چلی جاتی ہے، کتابوں کے ساتھ یہی تعلق اپنے شاگرد کا ان کو محسوس ہوا، اور ظرافۃً یہی نام تجویز کر دیا۔ اس کے سوا آپ ہی بتائیے کہ کسی طالب العلم کے کس حال کو بکری کے کسی حال کے مطابق قرار دیا جا سکتا ہے'؟

اب کچھ بھی ہو "علم کی بکری" کے اس ظریفانہ ساتھ ہی فریسانہ نام سے میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے، کہ کتابوں سے یا کتابی معلومات سے جیسا کہ سمجھا جاتا ہے کہ مولنا نانوتوی کو دلچسپی نہ تھی، یا کتابوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، طالب العلمی ہی کے دنوں میں دیکھا جاتا تھا کہ اس کے متعلق زیادہ شوق آپ میں نہیں پایا جاتا۔ اور اس کے سمجھنے یا کرنے میں زیادہ مشقت اور محنت سے کام نہیں لیتے۔ یہ حال آپ کا، اور گو اس عمر کے لحاظ سے جو دیوبند کی مکتبی تعلیم کے زمانہ میں آپ کی تھی، بہ ظاہر اس دعویٰ کا انتساب آپ کی طرف عوام کے لئے

---

[۵] عربی زبان کی ایک ضرب المثل کی تشریح میں لوگ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن کسی پہاڑ پر بکری چرہی تھی، اس عرصہ میں دھنک آسمانی فضا میں نمودار ہوئی، جس کا ایک حصہ اس پہاڑ سے گذرتا تھا جس پر بکری چر رہی تھی، دھنک کو اور اس کے سبز و سرخ منظر کو دیکھ کر بکری نے خیال کیا کہ سامنے ایک بڑی چراگاہ آگئی۔ منھ ملا۔ کنارے پر کھڑی تھی، دھنک تک تو نہ پہنچ سکی، لیکن چرائی کے اس غیر معمولی ذوق و شوق نے غریب بکری کو زمین تک پہنچا دیا، پہاڑ سے گر پڑی اور جاں بحق ہو گئی ۱۲

کچھ ناقابل برداشت ہو، جسے اب میں پیش کرنا چاہتا ہوں، مگر شبر کو شیر پر اگر قیاس نہ کیا جائے اور جو چنے جاتے ہیں ان اجتبائی ہستیوں کے حالات کی پیمائش اس گز سے نہ کی جائے، جس سے عوام ناپے جاتے ہیں تو پھر مسئلہ میں یہی نہیں کہ دشواری باقی نہیں رہتی، بلکہ دل چاہتا ہے، اور پر عقل تقاضا کرتی ہے کہ واقعہ کی نوعیت یہی ہونی چاہئے، جواب آپ کے سامنے آتی ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ بہت سی باتیں ایسی ہیں جو سمجھانے سے بآسانی اس وقت تک سمجھ میں نہیں آتیں جب تک آدمی کو ان کے تجربے کا خود براہ راست موقعہ نہ ملے۔

ذوق این مے نہ شناسی بخدا تا نچشی

اس قسم کے حقائق سے اس فیصلہ کا تعلق ہے من لم یذق لم یدر (جس نے نہ چکھا نہ جانا) مرض عشق کے شکار سے کسی نے پوچھا، اور اس نے پوچھا جو اب تک کسی پر عاشق نہیں ہوا تھا، کہ آخر یہ عاشقی ہے کیا بلا؟ جواب میں غریب عاشق نے کہا کہ "جو کچھ میں ہوں وہی تم ہو جاؤ، تب جانو گے کہ یہ عاشقی کس بلا کا نام ہے، شاعر نے اسی مقصد کو ادا کرتے ہوئے کہا ہے

پرسید یکے کہ عاشقی چیست گفتم کہ چو ما شوی بدانی

بہر حال مجھے کہنا یہ ہے، کہ دیوبند حضرت والا جس وقت تشریف لائے ہیں، جیسا کہ معلوم ہو چکا اس سے پہلے ہی نانوتہ ہی کے مکتب خانوں میں نہ صرف یہی کہ اردو فارسی کے حرف آشنا ہو چکے تھے بلکہ ایک حد تک ان دونوں زبانوں کی مکتبی تعلیم کی کافی منزل طے کر چکے تھے، آخر یہ صورت حال نہ ہوتی، تو دیوبند پہنچنے کے ساتھ مولوی مہتاب علی صاحب ان کو عربی میں کیوں لگا دیتے اور لگا کیسے سکتے تھے، فارسی کی سواد خانی کی کچھ نہ کچھ صلاحیت عربی صرف کی ابتدائی کتابوں (میزان منشعب وغیرہ) کے پڑھنے کے لئے ضروری ہے، بلکہ ذہن و فہم کی شگفتگی بھی ایک خاص حد تک طالب العلم کی جب تک نہ پہنچی ہو، عربی صرف کی ابتدائی کتابیں بھی ایسا استاد شروع نہیں کرا سکتا جو بچوں کی تعلیم کا صحیح سلیقہ اور کافی تجربہ رکھتا ہو، جب تک اپنے شاگرد میں مولوی مہتاب علی صاحب نے یہ محسوس نہ کر لیا ہو کہ جو کچھ اس کو سمجھایا جائے گا، اسے سمجھ لیگا، اس وقت

تک وہ ہرگز آپ کو عربی میں لگانے کی جرأت نہ کرتے۔

اسی لئے میرا خیال ہے کہ دیوبند کے مہتابی مکتب میں جس وقت آپ شریک ہوئے ہیں، اس وقت اردو اور فارسی کی کتابوں کے مطالب کے سمجھ لینے کی قابلیت بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ میں پیدا ہو چکی تھی، خواہ آٹھ نو سال کی عمر کے کسی بچے کے لئے اس قسم کی کیفیت باعث تعجب ہی کیوں نہ ہو، مگر پچاس سال سے کم عمر پانے والی شخصیت سے جو کام آئندہ لیا گیا، کیسا کام؟ کہ سَو سَو سال سے زیادہ جینے والے بھی ہزاروں کی تعداد میں مل کر بھی اس کام کو ان مشکلات اور حالات میں اگر انجام دینا چاہتے، جن میں وہ گھرے ہوئے تھے تو شاید وہ انجام نہ پاتا، پچاس سال سے بھی کم عمر میں جب اس نے یہ کر کے دکھایا، جسے آج دنیا دیکھ رہی ہے، ہندوستان کا ہر صوبہ ہر ضلع ہر سب ڈویژن بلکہ گاؤں گاؤں دیکھ رہا ہے، ہندوستان کے باہر والے بھی دیکھ رہے ہیں۔ تو ایسے شخص کے متعلق اس پر کیوں تعجب کیا جائے کہ اتنی چھوٹی عمر میں ایسی قابلیت اس میں کیسے پیدا ہو گئی، ہو سکتا ہے کہ ہزاروں بلکہ لاکھوں بچوں میں اس کی نظیر نہ مل سکے، مگر میں پوچھتا ہوں کہ جوانوں اور بڈھوں کی لاکھوں لاکھ ہی نہیں کروڑہا کروڑ کی تعداد میں جب اس کی نظیر مشکل ہی سے مل سکتی ہے، جو کام قدرت نے اس سے انجام دلایا اور جن حالات میں انجام دلایا خود سوچئے کہ آٹھ نو کروڑ مسلمانوں سے بھرے ہوئے اس ملک ہندوستان میں اس کی مثال کیا آسانی سے مل سکتی ہے؟ اسلامی ہند کی تیرہویں اور چودھویں صدی میں ڈھونڈھئے، اس کے جوڑ کے کتنے آدمی آپ کو ملیں گے؟ جو نہیں جانتے ہیں وہ تو خیر معذور ہیں، شاید اصل حقیقت ان پر اس کتاب کے پڑھنے سے واضح ہو گی، مگر جو جانتے ہیں میں ان سے پوچھتا ہوں کہ جب جوانوں اور عمر رسیدہ لوگوں میں اس کی نظیر مشکل سے دستیاب ہو سکتی ہے، تو پھر بچوں میں بھی اگر دوسرے ہم سن بچوں کے مقابلہ میں وہ کچھ انوکھا نرالا نرالا سا اپنی ہر شان میں نظر آ رہا تھا، تو یہ اچنبھے کی کون سی بات ہے)

کچھ بھی ہو میرا خیال ہے اور یہ خیال واقعات و حقائق کی روشنی میں میرے اندر پیدا ہوا ہے

کہ آپ جب مولوی مہتاب علی صاحب کے مکتب میں زیر تعلیم تھے، اسی زمانہ میں جو کچھ پڑھ سکتے تھے اور ہر ایسی کتاب جس کے سمجھ لینے کی صلاحیت اپنے اندر پاتے تھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پڑھے بغیر اس کتاب کو ہاتھ سے چھوڑ نہیں سکتے تھے۔

میرے نزدیک آپ کے فریس وظریف استاذ کا عطا کیا ہوا بہ ظریفانہ خطاب یعنی "علم کی بکری" ظرافت کے ساتھ آپ کے ایام طفولیت کے اسی خاص پہلو کا شارح بھی ہے، ہر چیز کے چک لینے اور جو گھاس بھی سامنے آجائے اس کے چر لینے کی عام عادت بکریوں میں جو ہوتی ہے، اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کبھی کبھی امکانی حدود سے تجاوز کر کے دیکھا جاتا ہے کہ بکریاں ببول کے جن درختوں کے ساتھ الجھی ہوئی ہیں بڑی بڑی نوک رکھنے والے تیز کانٹے بھی چبھ رہے ہیں، لیکن ایک شاخ تک پہنچ کر چاہتی ہیں کہ اوپر کی شاخوں کے پتوں تک پہنچ جائیں، اگر مشبہ بہ کی اس خصوصیت کو سامنے رکھ لیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ رسائی کے حدود میں جو کتابیں آپ کو مل جاتی تھیں، صرف ان ہی کو نہیں بلکہ عمر اور علم کے لحاظ سے جن کتابوں کے مضامین آپ کی حد پرواز سے اس زمانہ میں باہر بھی تھے تشبیہ کا اقتضار تو یہی ہے، کہ شاید ان کو بھی نہیں چھوڑتے ہوں گے۔

یہ صحیح ہے کہ اس زمانہ میں طباعت اور پریس کا اتنا رواج ہندوستان میں نہیں ہوا تھا، جس نے آج ملک کے کوچہ و بازار کو کتابوں، رسالوں، اخباروں سے پاٹ دیا ہے، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ جس زمانہ سے ہماری بحث کا تعلق ہے، اس وقت ہندوستان میں مطابع قائم ہو چکے تھے اور اردو کی تو نہیں لیکن فارسی ادب نثر و نظم کی کتابوں کی طباعت نشر و اشاعت کا اگر عہد شباب نہیں تو ریعان شباب کا زمانہ یقیناً وہی تھا، جس زمانہ سے ہم اس وقت گذر رہے ہیں، یہ زمانہ تو کم از کم ہندوستان کی حد تک فارسی ادب کا عہد مرگ ہے، لیکن اس سے پہلے پریس سے روشناس ہونے کے بعد اسی فارسی ادب کی کتابوں پر کامل جوانی کا زمانہ اسی ملک میں گذر چکا ہے، بہتر سے بہتر معیاری کتابیں جو اب تک قلمی شکل میں ملتی تھیں، پریس سے چھپ چھپ کر عام و خاص تک پہنچ رہی تھیں، پرانے علمی خاندانوں کے مرحوم

کتب خانوں کا جائزہ لیجئے، آپ کو معلوم ہوگا کہ جن کتابوں کے نام تک سے ہماری موجودہ نسلیں ناواقف ہیں، گھر گھر پھیلی ہوئی تھیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ظریف وشفیق فریس وقیاف استاذ کی طرف سے یہ ظریفانہ خطاب یقیناً بلاوجہ آپ کو نہیں ملا تھا، دیوبند جس وقت پہنچے تھے، اور دیوبند پہنچنے کے بعد بھی جو کچھ آپ سیکھ رہے تھے، اس کے لحاظ سے یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ اردو اور فارسی زبانوں کی کتابوں کے ساتھ آپ کے غیر معمولی شغف اور دلچسپی کو دیکھ کر استاد نے آپ کا یہ نام رکھ دیا تھا، لیکن جیسا کہ آپ سن چکے دیوبند ہی میں عربی کی ابتدائی کتابیں یعنی عربی زبان کے علم صرف کی ابتدائی کتابیں میزان ومنشعب وغیرہ بھی آپ کو شروع کرادی گئی تھیں، ان کتابوں کے پڑھنے کی وجہ سے ظاہر ہے کہ عربی زبان کی کتابوں کے سمجھنے کی صلاحیت تو پیدا نہیں ہوسکتی، لیکن قدرتاً عربی آمیز فارسی کے سمجھنے میں کچھ نہ کچھ سہولت ضرور پیدا ہوجاتی ہے، عربی آمیز فارسی کے ایسے الفاظ جو عربی صرف سے ناواقف آدمی کے لئے دشوار سمجھے جاتے ہیں، ان کی دشواری میں گونہ کمی ضرور پیدا ہو جاتی ہے، اگرچہ کسی نے صراحۃً اس کا تذکرہ تو نہیں کیا ہے، لیکن ہمارے مصنف امام رحمۃ اللہ علیہ نے دہلی میں آپ کی پہلی تشریف آوری کا جہاں ذکر کیا ہے، وہیں یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

"مولوی صاحب (یعنی حضرت نانوتوی) نے کافیہ شروع کیا، اور احقر (یعنی خود مصنف امام) نے میزان وگلستان" ص۲۵

آگے لکھا ہے کہ

"والد مرحوم نے میرے ابواب کا سننا، اور تعلیلات کا پوچھنا ان کے (یعنی حضرت نانوتوی) کے سپرد کیا تھا"

"ابواب" اور "تعلیلات" علم صرف کی ان فنی اصطلاحوں سے جو واقف ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ کافیہ شروع کرنے والے بچہ کے حوالہ ان صرفی امور کی پوچھ گچھ کا کام اسی وقت

کیا جا سکتا ہے، جب اس کا اطمینان ہو کہ پوچھنے والا ان کے متعلق کافی ملکہ اپنے اندر پیدا کر چکا ہے، اسی بنیاد پر میرا خیال ہے کہ مولوی مہتاب علی صاحب نے بھی صرف کی اس ابتدائی تعلیم میں کافی توجہ سے کام لیا تھا، اور خود مولانا مرحوم بھی کافی محنت اور شوق سے ان چیزوں کو سمجھتے اور یاد کرتے تھے جو کچھ آپ کو اس مکتب میں سکھایا جاتا تھا، مصنف امام نے اسی موقعہ پر یعنی دہلی کی ابتدائی تعلیمی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"ہر جمعہ کی رات کو چھٹی ہوتی تھی، صیغوں اور ترکیبوں کا پوچھنا معمول تھا، یاد ہے کہ مولوی صاحب سب میں عمدہ رہتے تھے۔" صـ۲۸

"ترکیبوں" کے لفظ کا تعلق تو خیر نحو سے ہے، جس کی باری پرانے نصاب کی رو سے بعد کو آتی تھی میں قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ دلی تشریف لے جانے سے پہلے علم نحو کی جو کتابیں "کافیہ" سے پہلے پڑھائی جاتی ہیں، مولانا نانوتوی نے علم نحو کی ان کتابوں کو کہاں پڑھا؟ دیوبند کے اسی مہتابی مکتب میں یا دیوبند کے بعد سہارنپور میں اس کا موقعہ آپ کو ملا۔ کیونکہ دیوبند کے متعلق جیسا کہ نقل کر چکا ہوں، مصنف امام نے صرف یہ لکھا ہے کہ یہاں ان کو عربی شروع کرائی گئی، شروع تو یقیناً صرف ہی کی کتابوں سے ہوا، مگر تعلیم کی جو مدت دیوبند میں گذری اس میں صرف کے ساتھ ساتھ جیسا کہ عام قاعدہ ہے علم نحو کے شروع کرنے کا موقعہ یہاں آپ کو ملا یا نہیں، اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے، اس سلسلہ میں ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ کافیہ سے پہلے اس زمانہ میں عربی پڑھنے والوں کو جو کچھ پڑھایا جاتا تھا، وہ آپ پڑھ چکے تھے، لیکن اس راہ کی مختلف منزلیں کہاں کہاں پوری ہوئیں، کہاں تک دیوبند ہی میں پہنچ چکے تھے، اور دیوبند سے الگ ہونے کے بعد سہارنپور میں کیا کیا پڑھا؟ ان سوالوں کے تفصیلی جوابوں کا علم نہ ہو سکا، اور جو کچھ معلوم ہو سکا ہے اس کا ذکر آئندہ آئے گا۔

بہر حال اتنی بات تو قطعی ہے کہ "ابواب" و "تعلیلات" جن کا براہ راست علم صرف سے تعلق ہے ان کی غیر معمولی مشق بہم پہنچانے کا موقعہ یقیناً آپ کو دیوبند میں بھی ملا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ مولوی مہتاب علی صاحب علم صَرف کی تعلیم کے ساتھ کچھ خصوصی تعلق رکھتے تھے، جس کا کچھ اندازہ خودان کے برادر خورد حضرت شیخ الہند کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب کی ادبی قابلیت سے بھی ہوتا ہے۔

کچھ بھی ہو، میرا خیال یہی ہے، اور مختلف قرائن وقیاسات کی تائید اس خیال کو حاصل ہے کہ دلی پہنچنے کے بعد "ترکیبوں" کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا، مگر "صیغوں" کے پہچاننے اور جاننے میں مولانا نانوتوی بقول مصنف امام جو "سب میں عمدہ رہتے تھے" تو "سب سے" عمدہ رہنے کے اس امتیاز میں اگر کلیۃً نہیں تو اکثر و بیشتر حد تک یہ کہا جاسکتا ہے کہ دیوبند کی مکتبی تعلیم ہی کو زیادہ دخل ہے، وہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی "بنیاد" شروع میں مضبوط اور مستحکم کردی گئی، اور عربی صَرف کی اسی استواری کا یہ نتیجہ اگر ہوا ہو، کہ عربی آمیز فارسی کی کتابوں تک آپ کے مطالعہ کا دائرہ وسیع ہوگیا ہو، تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے۔

اس کا صحیح طور پر علم نہ ہوسکا کہ دیوبند کے اس مہتابی مکتب میں آپ کتنے دنوں زیرِتعلیم رہے بہرحال یہ مدت جتنی بھی ہو، اس مدت میں بجزان دنوں کے جو مہینہ دو مہینے بعد نانوتہ میں گذرتے تھے یعنی تین چار دن کے لئے جیسا کہ گذرا آپ گھر بلائے جاتے تھے، زیادہ حصہ اس عزیز اور قیمتی وقت کا دیوبند ہی میں گذرا، اور ٹھیک اسی محلہ میں گذرا، اسی خطہ میں گذرا، جس کے سامنے آپ کا قائم کردہ دارالعلوم آج قائم ہے، سیدنا الامام الاستاذ مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی طرف کتاب ارواح ثلاثہ میں دارالعلوم دیوبند کی موجودہ پرشکوہ عمارتوں کے متعلق یہ فقرہ جو درج کیا گیا ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ

"حاجی صاحب مرحوم (یعنی حاجی عابد حسین[۱] مرحوم) کے سامنے (دارالعلوم کا) وہ مستقبل

---

[۱] قصبہ دیوبند کے خانوادۂ سادات سے آپ کا تعلق تھا، ان کا ذکر تفصیلاً اپنے موقعہ پر آئے گا، دارالعلوم دیوبند سے ان کا خصوصی تعلق ہے، ابتداء میں حاجی صاحب کا خیال تھا کہ مدرسہ کے لئے دیوبند کی جامع مسجد کے حجرے کافی ہیں ۱۲

نہ تھا، جو حضرت (مولٰنا نانوتوی) کو نظر آ رہا تھا' ان کی فراست کے سامنے یہ مکتب مدرسہ اور پھر مدرسہ سے دار العلوم ہونے والا تھا"۔ ص۱۸۹

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ جن کا شمار بساط قاسمی کے اخص الخواص بزرگوں میں تھا' ان بزرگوں کی زبان مبارک سے سنتے ہوئے اس فقرے نے میرے ذہن کو ایک خاص خیال کی طرف منتقل کر دیا' اگرچہ میرا یہ ایک ذاتی خیال اور ذہنی انتقال ہے، مگر اب جب کہ دیوبند کے اس مکتب سے حضرت والا کی روانگی کے ذکر کا موقعہ آگیا ہے' جی نہیں مانتا کہ اپنے اس ذاتی خیال کو اپنے خیال ہی کی حد تک محدود رکھوں۔

ذرا سوچئے' ان دنوں کو جب آج سے ایک صدی سے بھی پہلے دیوان محلہ کی عمارت کے اندر' یا اسی عمارت سے تعلق رکھنے والے ایک مکان میں مولوی مہتاب علی صاحب کا مکتب خانہ قائم ہے' اس ڈیوڑھی کے سامنے بسمت مغرب اسی وسیع و عریض خطے میں جس میں دار العلوم کی بیسیوں عمارتیں پھیلی ہوئی ہیں' بجائے ان عمارتوں کے وہاں کچھ میدان کچھ تالاب' کچھ باغوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا ہے' بچے مکتب سے چھوٹتے ہونگے' ان کے کھیل کود' سیر و تفریح کا طبعی مرکز سامنے کا یہی علاقہ ہوگا' ان ہی بچوں میں ایک "بچہ" وہ بھی تھا' جس کے لئے قدرت کی طرف سے مقدر ہو چکا تھا کہ اسی علاقہ میں اسی بچے کے ہاتھوں سے چند سال بعد ایک عظیم الشان دار العلوم کا سنگِ بنیاد رکھا جائے گا' اور ایک حد تک اپنی ہی زندگی میں بعض بلند و بالا عمارتوں کو اسی میدان میں اپنے سامنے کھڑی پائے گا' اس خیال کو پیش نظر رکھئے' اور اس کے بعد سوچئے کہ عمر پانے کے بعد جس بچے کے ہاتھوں واقعیت کا قالب جس کام نے اختیار کیا' اگر نو عمری اور طفولیت کے زمانہ میں اسی بچہ کے دل و دماغ میں اسی کا خیال' صرف خیال' اجمالی ہلکا سا خیال' اگر آیا ہو' تو کیا یہ ایسا خیال ہے جس کا ہم خیال بھی نہیں کر سکتے؟ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ کہ حاجی عابد حسین صاحب مرحوم کے سامنے" وہ مستقبل نہ تھا' جو حضرت کو نظر آ رہا تھا' اس سے اتنی بات تو بہر حال ثابت ہے کہ دار العلوم دیوبند کی طویل و عریض' بلند و بالا عمارتیں آج اس

قصبہ کے جس خطہ اور حصہ میں ہر دیکھنے والے کو وقوع پذیر ہونے کے بعد نظر آرہی ہیں، سیدنا الامام الکبیر کے ایک محرم اسرار عاشق زار کی یہ شہادت ہے کہ وقوع سے پہلے وہ ان کو دیکھ رہے تھے؟ بحث اگر کچھ ہو سکتی ہے تو اسی سوال پر، دارالعلوم کا اتنا تفصیلی خاکہ یعنی جو مکتب ہے، وہ مدرسہ، اور مدرسہ بالآخر دارالعلوم بن جائے گا۔

ظاہر ہے کہ عہد طفولیت میں اس کی گنجائش مشکل ہی سے پیدا ہو سکتی ہے بلکہ حضرت شیخ الہند نے جیسا کہ فرمایا ملکۂ فراست کے روشن ہونے کے بعد ہی یہ توقع کرنی چاہئے کہ اس کی روشنی میں اتنی وضاحت کے ساتھ مستقبل کی اتنی مفصل تصویر آپ کے سامنے آئی ہوگی، لیکن اس میں کچھ مضائقہ نہیں اگر ہم یہ سوچیں کہ مکتبی زندگی میں اپنے موجودہ مکتب سے زیادہ بہتر شکل میں درس گاہ کا خیال اسی میدان میں جو مکتب کے سامنے ہی تھا، کبھی کبھی آجاتا ہو، خصوصاً تعمیری وسعت کے لئے محلہ دیوان کی ڈیوڑھی کی عمارتیں تخیل کو سہارا دینے کے لئے وہیں موجود بھی تھیں۔

بہرحال اب اسے شاعری سمجھا جائے یا ایک قسم کا وجدانی احساس کہ دارالعلوم دیوبند کی عمارتیں آج جس علاقے میں پھیلی ہوئی ہیں، کچھ تعجب نہیں اگر مکتبی زندگی میں حضرت والا کو کسی تعلیم گاہ کے قیام کا امکان کسی نہ کسی پیمانہ پر دھندلا محسوس ہوا ہو، اور مناسب و موزوں حالات کی مسلسل آبیاریوں سے جن کا ذکر آگے آرہا ہے اسی اجمالی خیال کے تخم کی پرورش ہوتے ہوئے بالآخر ایک تناور درخت کی شکل اس نے اختیار کرلی ہو، اپنے اس خیالی احساس پر نسبتاً زیادہ زور دینے کی وجہ یہ ہے کہ دارالعلوم کے لئے دیوبند، اور دیوبند میں بھی اس خاص خطہ کا انتخاب کیوں کیا گیا؟ مختلف کتابوں میں اس سوال کو اٹھایا گیا ہے، اور جس کی سمجھ میں جو توجیہ آئی ہے، وہ پیش کی گئی ہے[1]، آئندہ اس کتاب میں بھی

[1] دیکھئے کتاب "مسلمانوں کا شاندار ماضی" مؤلفہ مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی ص ۶۲ حصہ پنجم۔ اور بھی مختلف کتابوں میں بحث مل سکتی ہے ۱۲

مجھے اس سوال پر بحث کرنا ہے، سچ پوچھئے تو اس بحث کی راہ میں چاہتا ہوں کہ آہستہ آہستہ کتاب پڑھنے والوں کے لئے ہموار ہوتی چلی جائے، گویا یوں سمجھئے کہ اسی بحث کی اجمالی قسط آپ کے آگے رکھی گئی ہے، دارالعلوم کے سفرۂ عام یعنی مطبخ کی طرف بھی ہلکا سا اشارہ اسی سلسلہ میں کیا گیا تھا، حیرت ہوتی ہے کہ اسی سوال کے جواب میں علاوہ دوسرے بزرگوں کے مکاشفات کے حضرت سید احمد مجدد شہید رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کشفی قصہ عموماً نقل کیا جاتا ہے۔

"حضرت سید احمد صاحب بریلوی جب سرزمین دیوبند سے گذرے تو اس زمانہ میں اس جگہ جہاں دارالعلوم قائم ہے کوڑیاں پڑا کرتی تھیں، سید صاحب نے فرمایا کہ "یہاں سے علم کی بو آتی ہے۔" (مسلمانوں کا شاندار ماضی حصہ پنجم ص۶۵)

فراست ایمانی کے نور سے کہتے ہیں، کہ حضرت مجدد الف ثانی پر بھی ڈھائی تین سو سال پہلے کچھ اسی قسم کی بات کھولی گئی تھی[1]۔ ایسی صورت میں اب خود خیال کیجئے کہ ایک اجنبائی روح کے متعلق خاکسار کے مذکورہ بالا احساس کو محض بے بنیاد قرار دینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے، ہونہار بچوں کی نفسیاتی کیفیتوں کا تھوڑا بہت بھی مطالعہ جن لوگوں نے کیا ہے، ان کو دارالعلوم دیوبند کے محل وقوع کی بنیاد کا سراغ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کی مکتبی زندگی کی گہرائیوں میں جہاں تک سمجھتا ہوں ڈھونڈھنے سے مل سکتا ہے، دیوبند اور دیوبند میں بھی اس خاص علاقہ ہی کا انتخاب دارالعلوم کے لئے کیوں کیا گیا؟ اس سوال کے جواب کی بہت سی منزلیں صرف اسی مسئلہ سے طے ہو سکتی ہیں، اور اب اس قصہ کو اسی نقطہ پر ختم کر کے جو سوال اٹھایا گیا تھا، یعنی ایک طرف حضرت حکیم الامت جیسے بزرگوں کی یہ شہادت کہ "پڑھنے کے زمانہ میں بھی بہت شوق اور مشقت سے نہیں پڑھا تھا" اور دوسری طرف پڑھنے ہی کے زمانہ میں اپنے ظریف و شفیق استاد کی بارگاہ سے "علم کی بکری" کا ظریفانہ خطاب جو آپ کو عطا ہوا تھا، بظاہر

---

[1] شفاہاً مختلف حضرات سے خاکسار نے یہ بات سنی ہے، مولنا محمد میاں صاحب نے بھی اپنی اسی کتاب میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے ۱۲

ان دونوں باتوں میں گونہ "تضاد" کی کیفیت جو محسوس ہوتی ہے، اسی کے متعلق عرض کررہا تھا، بات یہاں تک پہنچی تھی کہ دیوبند کی مکتبی زندگی میں جیساکہ اس خطاب کا اقتضاء ہے 'کتابوں کے پڑھنے یا ان کے اساتذہ کے محاورے میں کتابوں کے چرلینے کا شدید جذبہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ پر مسلط تھا، اس سلسلے میں جو کچھ مل جاتا تھا، عمر اور رسائی کی حد تک ان کے استاد کی شہادت یہی ہے کہ اسے چاہتے تھے کہ نگلتے ہی چلے جائیں، دیوبند میں قابلیت کے بڑھانے کا بھی موقعہ ملا، اسی سے سمجھنا چاہیئے کہ مطالعہ کا دائرہ بھی روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہوگا، جب تک دیوبند میں رہے اسی حال میں رہے۔

**دیوبند سے سہارنپور** اسباب کا تو علم نہ ہوسکا، مصنف امام نے صرف اتنی اطلاع دی ہے کہ دیوبند کے بعد

"پھر سہارنپور اپنے نانا کے پاس رہے" صـ۲۶

یعنی قیام وطعام کا نظم تو ناناجان کے یہاں تھا، جن کے متعلق گذرچکا کہ "سہارنپور میں وکالت کرتے تھے" اور بقول مصنف امام نہایت عزت واحترام اور تمول سے "زندگی ان کی اس زمانے میں گذرتی تھی، جہاں تک میرا خیال ہے نانا کے گھر سہارنپور میں جتنے دنوں بھی قیام کا موقعہ حضرت کو ملا شاید آپ کی پوری زندگی میں عافیت وآسائش کے ایسے دن آپ کو کم ہی ملے ہوں گے، دیوبند میں بھی گو رشتہ داروں کے یہاں تھے، لیکن شرم وحیا کی وجہ سے آپ سن چکے کہ کبھی کبھی دیوبند میں آپ کو تکلیف بھی اٹھانی پڑی، لیکن سہارنپور میں تو نانا کا گھر آپ کو ملا تھا، اور نانا بھی کیسے خوش حال فارغ البال کامیاب وکیل، اب اسی کے ساتھ اس واقعہ کو بھی ملائیے کہ حضرت کے نانا جان جن کا نام شیخ وجیہ الدین تھا، عرض کرچکا ہوں کہ عربی سے آگاہی کے ساتھ فارسی ادب میں وہ کافی دستگاہ رکھتے تھے، مصنف امام کا قول نقل کرچکا ہوں کہ

"مولوی صاحب کے نانا، مولوی وجیہ الدین صاحب نانوتوی فارسی بہت عمدہ

جانتے تھے" ص۲۵

یہ خبر بھی ان ہی کی ہے کہ شیخ وجیہ الدین "اردو کے شاعر بھی تھے" مصنف امام نے ان کی "طباعی" اور خوش فہمی کی بھی تعریف کی ہے۔

ذرا سوچئے، کہ جس گھر میں اردو فارسی کی شعر و شاعری، نثر و نظم کا چرچا پھیلا ہوا ہو اور طباعی و خوش فہمی کی داد دی جا رہی ہو، اسی گھر میں ایک رکن عزیز کی حیثیت سے اسی شخص کو شریک ہونے کا موقعہ جب ملا ہوگا، جو دیوبند سے اپنے فریس وظریف استاذ کا خطاب "علم کی بکری" لے کر سہارنپور پہنچا تھا، تو شوق کے سمند پر اس ادبی و علمی صحبت کے تازیانہ کا کیا اثر مرتب ہوا ہوگا۔

**مولوی مہتاب علی کے بعد مولوی محمد نواز سہارنپوری آپ کے دوسرے استاذ**

صرف صحبت ہی نہیں، بلکہ مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سہارنپور میں مولوی محمد نواز سہارنپوری نام کے کوئی بزرگ اس زمانہ میں تھے، فارسی اور عربی کی تعلیم لوگوں کو دیا کرتے تھے۔ مولٰنا نانوتوی کو بھی ان کے نانا نے مولوی محمد نواز صاحب کے سپرد کر دیا۔ اور دیوبند میں فارسی و عربی کی تعلیم جن کتابوں تک پہنچ چکی تھی، ان کے بعد کی کتابیں ان ہی مولوی محمد نواز سے مولٰنا پڑھنے لگے، افسوس ہے کہ باوجود تلاش کے حضرت کے ان سہارنپوری استاذ مولوی محمد نواز کے نام اور یہ کہ عربی وفارسی کی تعلیم ان کا کام تھا، اس کے سوا اور کچھ نہ معلوم ہو سکا، اور صحیح طور پر اس کا بھی پتہ نہیں چلتا کہ اپنے سہارنپوری استاذ سے حضرت نانوتوی نے کون کون سی کتابیں پڑھیں، البتہ اتنی بات جس کا پہلے بھی کہیں شاید ذکر آچکا ہے کہ دہلی پہنچکر آپ کو کافیہ شروع کرایا گیا، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سمجھنا چاہئے کہ کافیہ سے پہلے عربی کے صرف و نحو کی جو کتابیں قدیم نظامی نصاب میں پڑھائی جاتی تھیں، ان میں کچھ تو شیخ مہتاب علی صاحب دیوبندی سے آپ نے پڑھیں، اور جو کتابیں وہاں نہ پڑھ سکے وہی کتابیں مولوی محمد نواز سے آپ نے

پڑھی ہوں گی۔ عربی کے ساتھ فارسی کی تعلیم کا بھی اجمالاً ذکر مصنف امام نے کیا ہے، لیکن نام ان فارسی کتابوں کا بھی معلوم نہ ہو سکا، بلکہ صحیح طور پر یہ بھی نہیں بتایا جا سکتا کہ سہارنپور میں قیام کی مدت کیا تھی؟

بہر حال میں جو کچھ عرض کر رہا تھا، وہ یہ بات تھی کہ "علم کی بکری" کے خطاب سے کتابوں کے مطالعہ کے جس شوق مفرط کا پتہ چلتا ہے، یہ حال طاری تو ہوا تھا آپ پر دیوبند میں، اور ایسی کوئی چیز نہیں ملتی جس کی وجہ سے سمجھا جائے کہ مطالعہ کے اس شوق و ذوق میں سہارنپور پہنچ کر کسی قسم کی کمی یا سستی پیدا ہوئی ہو، بلکہ سہارنپور میں جو ماحول آپ کو ملا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ بجائے گھٹنے کے اس میں مزید اضافہ ہی ہوا ہوگا، نانوتہ اور دیوبند کے حساب سے سہارنپور اب بھی شہر ہے اور پہلے بھی شہر ضلع کا مرکزی مقام تھا، توقع اسی کی کی جاتی ہے کہ کتابوں کے ملنے میں بھی یہاں آپ کو سہولت زیادہ میسر آئی ہوگی اور جیسے جیسے نصابی کتابیں فارسی و عربی کی نکلتی جاتی تھیں، قدرتاً مطالعہ کے دائرے میں وسعت بھی پیدا ہوتی چلی جاتی ہوگی علاوہ گھر کے باہر کے شہری ماحول سے اس مذاق کے نکھرنے میں مدد ملی ہوگی۔

سہارنپور کی تعلیمی زندگی کے یہ دن لطف اور مزے کے ساتھ گذر رہے تھے کہ اچانک سہارنپور میں ہولناک قسم کا وبائی بخار پھوٹ پڑا، یہ ۱۸۴۲ء عیسوی مطابق ۱۲۵۸ھ کا واقعہ ہے، مصنف امام نے لکھا ہے کہ

> "ان کے (یعنی مولانا محمد قاسم کے) نانا کا انتقال اس سال (یعنی ۱۲۵۸ ہجری) کے وبائی بخار میں معہ بہت سے لوگوں کے ہو گیا" ص۲

ع آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

سہارنپور کے قیام کی ضمانت ان ہی بیچارے شیخ وجیہ الدین مرحوم کے وجود کے ساتھ وابستہ تھی، سارا قصہ ہی ختم ہو گیا، نہ وکیل صاحب باقی رہے، اور نہ ان کی وکالت نہ وکالت کی آمدنی، لازمی نتیجہ اس حادثہ کا جو ہو سکتا تھا وہ پیش آیا۔ مصنف امام کا بیان ہے کہ

"مولوی صاحب (یعنی مولوی محمد قاسم صاحب) سہارنپور سے وطن آئے"! ص۲۷

جس نانوتہ سے طلب العلم کے لئے باہر نکلے تھے، تقدیر پھر نخلستان کے اسی چھوٹے شہر نانوتہ کی طرف کھینچ کر لے آئی، اور کامل ایک سال تک سہارنپور سے واپس ہونے کے بعد نانوتہ ہی میں مسلسل آپ کا قیام رہا۔

واپسی کے بعد نانوتہ میں ایک سال کی مدت میں آپ کیا کرتے رہے، مصنف امام یعنی حضرت مولٰنا محمد یعقوب صاحب نے اپنے متعلق تو ارقام فرمایا ہے کہ ان کے والد مولانا مملوک العلی صاحب دہلی کالج سے بہ یافت نصف تنخواہ ایک سال کی رخصت حاصل کر کے حج کیلئے روانہ ہوگئے[۱]۔ اسلئے

---

[۱] مصنف امام نے حاشیہ پر لکھا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے خاندان کے دونوں چشم و چراغ یعنی مولٰنا شاہ محمد اسحاق اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا یعقوب جو حضرت شاہ عبد العزیز کے نواسے اور دلی اللٰہی درسگاہ میں شاہ صاحب کے جانشین تھے، دونوں حضرات کے دل میں ہندوستان سے ہجرت کا خیال اچانک ۱۲۵۸ھ میں پیدا ہوا، اور خیال میں اتنی شدت پیدا ہوئی کہ ہندوستان کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ کر دونوں حضرات حجاز تشریف لے گئے، مصنف امام کا بیان ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے ساتھ مسلمانان ہند کا ایک بڑا قافلہ بھی عرب روانہ ہوا۔ اسی حال نے ان کے والد مولٰنا مملوک العلی صاحب کے قلب میں بھی کچھ جذبات پیدا کئے، مگر وہ دہلی کالج میں سرکاری ملازم تھے، ساتھ تو ان دونوں حضرات کا نہ دے سکے مگر کوشش کر کے سفر حج کی رخصت حاصل کی، ان کے لب و لہجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رخصت کی منظوری میں کچھ دشواریاں پیش آئیں، مگر بعد کو رخصت بھی منظور ہوئی اور اس رعایت کے ساتھ منظور ہوئی کہ سال بھر کی نصف تنخواہ بھی دی جائے، بادبانی جہاز سے مولانا مملوک العلی روانہ ہوئے۔ تقریباً چار مہینے میں حجاز پہنچے، شاید چار ہی مہینے واپسی کی نذر ہوئے، حرمین میں قیام اور حج و زیارت کے مشاغل سے فارغ ہونے میں چار مہینے لگے، یوں پورے ایک سال میں یہ سفر پورا ہوا، مصنف امام نے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں سال بھر کی اس مدت کو سفر حج کا مختصر ترین زمانہ سمجھا گیا تھا لوگوں کو حیرت ہوتی تھی کہ اتنا طویل سفر اتنی مختصر مدت میں کیسے پورا ہوا، چونکہ سال ہی بھر کی چھٹی تھی، دلی جس وقت مولٰنا مملوک العلی پہنچے رخصت کی مدت ختم ہو چکی تھی، مجبوراً بجائے وطن کے دہلی کالج میں حاضر ہو کر کام میں مشغول ہوگئے، تقریباً چار مہینے کے بعد ذی الحجہ کے مہینے میں موسمی تعطیل جب ملی تب وطن پہنچکر گھر کے لوگوں سے ملے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کی چھٹی غالباً دہلی کالج میں نہیں ہوتی تھی اور موسمی تعطیل کا رواج تھا، یہاں سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ شاہ اسحاق و شاہ یعقوب مولٰنا مملوک العلی کی اساتذہ و شیوخ نے ہجرت کی ان کے ساتھ اور بھی لوگ گئے مگر حجاز پہنچنے کے بعد مولانا مملوک العلی کو ہندوستان واپس لوٹنے اور انگریزی حکومت کی ملازمت میں مشغول رہنے کی جو اجازت ملی اس کا مطلب کیا ہوا، ہجرت کو فرض قرار دینے والے بزرگوں کو اسلاف کے طرز عمل پر غور کرنا چاہئے، والقصہ یطولہا ۱۲

دلی جہاں اپنے والد کے ساتھ رہتے تھے، وہاں سے وہ بھی نانوتہ بھیج دیئے گئے، ارقام فرماتے ہیں کہ

"احقر ایک برس کامل وطن (نانوتہ) رہا، حفظ قرآن شریف پورا ہوگیا تھا، مگر صاف نہ تھا صاف کرتا تھا۔" ص۲۷

جس کا مطلب یہی ہوا کہ وہ تو قرآن کا دور کرتے رہے، لیکن اسی زمانہ میں سہارنپور سے مولٰنا نانوتوی جو نانوتہ واپس آئے تو کیا کرتے رہے؟ یہ تو لکھا ہے کہ

"اس زمانہ میں مولوی صاحب کا ساتھ رہا۔" ص۲۷

مگر کرتے کیا رہے؟ اس سوال کے جواب میں بجائے کسی تعلیمی شغلہ کے صرف ان کھیلوں کا تذکرہ انھوں نے کیا ہے جو مولانا مرحوم کے ساتھ وہ نانوتہ میں سال بھر کھیلتے رہے تھے، کھیلوں کے سلسلہ میں مولٰنا نانوتوی کے جن کمالات کا ذکر پہلے آچکا ہے، مصنف امام نے ان کا تذکرہ اسی موقعہ پر فرمایا ہے، ہم ان کی تفصیل سے فارغ ہو چکے ہیں اس لئے دوبارہ اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں میرے سامنے صرف یہ سوال ہے کہ دیوبند اور سہارنپور کی تعلیمی زندگی کے بعد کیا نانوتہ پہنچکر سال بھر کی یہ مدت مولانا مرحوم نے صرف کھیل کود میں گذار دی؟ واقعہ یہ ہے کہ ان کے دیوبندی استاد مولوی مہتاب علی صاحب کے عطا فرمودہ خطاب (علم کی بکری) کا علم اگر نہ ہوتا، تو مصنف امام کے ظاہر کلام کی بنیاد پر آپ کا سوانح نگار شاید اسی نتیجہ تک پہنچتا، مگر اس خطاب اور جن مضمرات پر یہ خطاب مشتمل ہے ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ ماننا مشکل ہے کہ علم کے ساتھ اتنے شدید تعلق کے بعد اچانک نانوتہ پہنچکر اس سے منقطع ہو گئے تھے اگرچہ کوئی تصریحی شہادت ہمارے پاس نہیں ہے، لیکن نانوتہ کی زندگی کے اس یک سالہ مدت کے بعد دلی میں جب ہم آپ کو اس حال میں پاتے ہیں کہ مولٰنا مملوک العلی صاحب اپنے صاحبزادے یعنی مولوی محمد یعقوب کی تعلیمی نگرانی مولٰنا کے سپرد فرما دیتے ہیں پہلے بھی کہیں ذکر کر چکا ہوں کہ "ابواب اور تعلیلات" کی مشق ان کا سننا اور پوچھنا یہ سارے کام حضرت والا ہی کے متعلق خود ان کے استاد ہی نے کر دیئے تھے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب یہ مانا جائے کہ ایک سال کی یہ مدت

علم سے کلی بے تعلقی کے ساتھ نہ گذری ہو، ورنہ صرف ونحو کی ابتدائی تعلیم پانے والوں کا عام حال تو یہی ہے کہ سال تو خیر بڑی بات ہے، چند مہینے بھی علمی شغلہ سے اتفاقاً الگ ہونے کی صورت پیش آگئی تو پڑھا بے پڑھا سب اُن کے لئے برابر ہو جاتا ہے، اور یہاں تو کامل سال بھر کی مدت نانوتہ میں سہارنپور سے واپسی کے بعد گذری ہے، بہرحال میرا خیال یہی ہے کہ علم کا جو معمولی ذوق وشوق آپ میں دیوبند کے مکتب کے اندر ابھرا تھا، وہ سہارنپور میں بھی ترقی پذیر ہی رہا اور گو نانوتہ پہنچ کر حالات غیر مناسب ضرور پیش آگئے تھے، لیکن اس ذوق سے کلیۃً بے تعلق ہونے کی بھی کوئی وجہ نہ تھی یہ ہو سکتا ہے کہ نانوتہ کے مکتب خانوں کے پڑھانے والوں کی تعلیم وتدریس کی جو آخری حد تھی، اس سے چونکہ مولٰنا آگے نکل چکے تھے، اس لئے وہاں کے مقامی مکتبی استاذوں سے استفادہ کی کوئی صورت آپ کے لئے باقی نہ رہی ہو لیکن جو دیوبند ہی میں "علم کی بکری" بن چکا ہو، اس کو چرنے کے لئے چرانے والے کی ضرورت ہی کیا باقی رہی تھی؟ مگر عمر کے لحاظ سے مطالعہ کا ذاتی ذوق ایک نادر تجربہ ہے، مگر اس پر کافی بحث ہو چکی ہے کہ اجتبائی ہستیوں کو عام افراد پر قیاس نہ کرنا چاہئے، پیش آنے سے سالہا سال پہلے حضرت یعقوب علیہ السلام کے بچوں میں حضرت یوسف علیہ السلام ہی کو خواب میں واقعہ کیوں دکھلایا گیا۔ حالانکہ سب ہی نبی زادے اور پیغمبروں کے خاندان سے تعلق رکھنے والے تھے، قدرت کے اس انتخابی دین کی بھلا کوئی کیا توجیہ کرے۔

کچھ بھی ہو، اسے حسن ظن ہی خیال کر لیجئے۔ مگر کم از کم میں تو اپنے اندر اس بات کے ماننے کی گنجائش نہیں پاتا کہ سہارنپور سے لوٹنے کے بعد نانوتہ میں مولٰنا نے اپنی زندگی کا پورا ایک سال صرف کھیل کود میں گذار دیا۔ اگرچہ جن کھیلوں کا انتساب اس زمانے میں آپ کی طرف کیا گیا ہے، اور کھیلوں میں بھی "کلیات آفرینی" اور "قانون سازی" کے جن طبعی میلانات کا ظہور اس زمانے میں آپ کے اندر سے ہوا، جن کا تفصیلی ذکر پہلے کر چکا ہوں، ان کو دیکھتے ہوئے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان کھیلوں کو بھی آپ کے غیر معمولی دل و دماغ نے فکری آماجگاہ، اور نظری و ذہنی مشق گاہ کی شکل میں

بدل دیا تھا، اس کے ساتھ کوئی وجہ نہیں ہوسکتی، کہ مطالعہ کا سلسلہ بھی اس زمانہ میں جاری نہ ہوگا بلکہ مصنف امام نے جیسے اپنے متعلق لکھا ہے کہ یاد کر لینے کے بعد اس زمانہ میں قرآن کو صاف کرتے رہتے یعنی یاد کی ہوئی چیز کو پختہ کرنے میں ان کا وقت گذر رہا تھا، کیوں نہ سمجھا جائے کہ ان کو دیکھ ہی کر شاید مولانا نانوتوی میں بھی یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ دیوبند اور سہارنپور کی پڑھی ہوئی چیزوں کو تازہ کرتے رہیں، دلی پہنچکر لوگوں کو جو یہ محسوس ہوا کہ صیغوں اور ترکیبوں کے متعلق مہارت اس بچے میں پائی جاتی ہے، مصنف امام کا بیان نقل کر چکا ہوں کہ

"مولوی صاحب (یعنی مولوی محمد قاسم صاحب) سب میں عمدہ رہتے تھے" ص۲۸

صیغوں اور ترکیبوں کے متعلق دلی پہونچنے کے ساتھ یہ سند آپ کو مل چکی تھی جس کا مطلب یہی ہوا کہ صرف و نحو میں اپنے ہم چشموں کے درمیان مولانا سب سے بہتر اور اچھے قرار دیئے گئے تھے۔ اسی بنیاد پر مولوی یعقوب صاحب کے صرف و نحو کی تعلیمی نگرانی آپ کے سپرد کی گئی تھی، اس سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے کہ دیوبند و سہارنپور میں جن چیزوں کے سیکھنے کا موقعہ آپ کو ملا تھا، ان ہی کو معلوم ہوتا ہے کہ سال بھر کی اس مدت میں آپ پختہ کرتے رہے۔

## تعلیم پانے کیلئے نانوتہ سے دوسری روانگی

باایں ہمہ اتنی بات تو بہرحال معلوم ہوتی ہے کہ تدریسی طور پر درسی کتابوں کے پڑھنے کی راہ سے ترقی کرنے کی راہ اس زمانہ میں آپ پر بند رہی، کیوں بند رہی؟ تفصیلی جواب تک تو رسائی نہ ہوسکی، لیکن بظاہر یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ جہاں تک پہنچ چکے تھے اس سے آگے پڑھانے کی صلاحیت ان لوگوں میں شاید نہیں پائی جاتی تھی جو نانوتہ میں معلمی کا کام کرتے تھے، مولوی محمد یعقوب صاحب نے بھی سال بھر کی یہ مدت صرف اس مشغلہ میں کہ قرآن

"صاف نہ تھا، صاف کرتا تھا"

جو گذاری، اس کی وجہ بھی غالباً یہی تھی،

جن گھرانوں میں امتیاز و معاش کا دار و مدار تعلیم ہی پر ہو، ان کے لئے تدریسی ترقی سے محرومی کی یہ حالت بڑی صبر آزما اور خاندان کے بزرگوں کے لئے ناقابل برداشت بن جاتی ہے، دوسری راہوں سے بچے کچھ بھی سیکھ رہے ہوں، لیکن جن کتابوں کے پڑھنے اور ختم کرنے کے ساتھ امتیاز اور معاشی راہ کی کشائش وابستہ ہو، جن بچوں کو کسی وجہ سے ان کے پڑھنے اور ختم کرنے کا موقعہ نہیں ملتا، تو سمجھا جاتا ہے کہ ان کا وقت بے کاری میں گذر رہا ہے، مولانا مرحوم کے سامنے بھی کچھ اسی قسم کی صورتِ حال معلوم ہوتا ہے کہ پیش آگئی تھی۔

نانوتہ کے لئے تعلیمی راہ کا دروازہ مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے کھل چکا تھا، وہ دہلی میں مقیم تھے، اور دلی کی سب سے بڑی مرکزی درسگاہ دلی کالج کے استاذ تھے، نہ صرف نانوتہ بلکہ عثمانی شیوخ کی برادری اطراف و جوانب کے جن قصبات میں پھیلی ہوئی تھی، وہاں تک کے بچے مولانا مملوک العلی کے ان خاص حالات سے کافی استفادہ کر رہے تھے[۱]۔

مگر غیر مستفید ہو رہے تھے، تو مولانا محمد قاسم جو علاوہ ہم وطن ہونے کے مولانا مملوک العلی سے عزیزداری اور رشتہ داری کے گوناگوں تعلقات رکھتے تھے، ان کے استفادے کا مسئلہ تو ہر لحاظ سے آسان تھا، خصوصاً مولانا نانوتوی کے والد ماجد شیخ اسد علی مرحوم تو اس تعلیمی وفد کے رکن بھی تھے جو نانوتہ سے دلی روانہ ہوا تھا، اگرچہ اس وفد کے ارکان میں غیر معمولی کامیابی مولانا مملوک العلی کو ہوئی اور بے چارے شیخ اسد علی صاحب صرف فارسی ادب کی تکمیل کر کے وطن واپس ہو گئے تھے

[۱] یہ ایک بڑا تفصیل طلب مضمون ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ نانوتہ میں مظاہر العلوم کے مدرس اول مولانا مظہر نانوتوی یا احیاء العلوم وغیرہ جیسی مشہور کتابوں کے مترجم مولوی محمد احسن صدیقی نانوتوی یا دیوبند میں مولانا ذوالفقار علی حضرت شیخ الہند کے والد ماجد مولانا فضل الرحمن مولانا شبیر احمد کے والد ماجد، اور اسی قسم کے بیسیوں بزرگوں کو ہم اس زمانہ میں جو پاتے ہیں، کہ علم و فضل کے ساتھ مشہور رہیں۔ ان میں بعض حضرات انگریزی حکومت کی طرف سے محکمہ تعلیمات کے انسپکٹر بھی تھے، مثلاً شیخ الہند کے والد ماجد اور مولانا شبیر احمد صاحب کے والد ماجد دونوں حضرات کا جو حال ہے، جہاں تک میرا خیال ہے اس علاقہ کی اس جدید علمی روشنی میں بہت زیادہ دخل مولانا مملوک العلی ہی کے وجود باجود کو ہے، دلی پہنچنے اور وہاں کی تعلیمی سہولتوں سے مستفید ہونے کا موقعہ ان لوگوں کو بظاہر مولانا مملوک صاحب ہی کی وجہ سے میسر آیا۔

لیکن مولانا ملوک العلی پر حق تھا کہ شیخ اسد علی صاحب اگر کامیاب نہ ہو سکے، تو ان کے بچے ہی کے ذریعہ اپنے رفیق سفر کو کامیابی کی منزل تک پہنچا دیا جائے۔

مگر اب اس کا علاج کیا تھا؛ جس زمانہ میں مولنا ملوک العلی مولنا نانوتوی کو اپنے ساتھ دلی لے جا سکتے تھے ۔ اس وقت مولنا کی کم عمری اس طویل سفر میں مانع تھی، اسی لئے چھوڑ دیا گیا کہ مقامی طور پر نانوتہ میں جو کچھ پڑھ سکتے ہوں پڑھ لیں، پھر دیوبند اور سہارنپور بھیجدیئے گئے جو دلی سے نسبتاً قریب تھے، لیکن ٹھیک جس وقت مولنا اس قابل ہوئے کہ دلی روانہ ہو سکتے ہوں یعنی عمر بھی اب آپ کی دس سال سے متجاوز ہو چکی تھی، کہ اچانک حجاز کے سفر کا مرحلہ مولانا ملوک العلی کے سامنے پیش آگیا؛ آج کل کا زمانہ ہوتا، تو کوئی بات نہ تھی، بلکہ یہ قصہ اس وقت کا ہے، جب حجاز کے مسافر کے متعلق پہلے تو اسی کی توقع مبہم وموہوم ہوتی تھی کہ واپسی کا موقعہ بھی اسے مل سکیگا یا نہیں، حجاز سے واپسی کے متعلق اس زمانہ میں لوگوں کا جو خیال تھا، اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ کامل ایک سال کے بعد مولانا ملوک العلی سفر سے جب واپس ہوئے تو لوگوں کو اس پر تعجب ہوا کہ اتنا بڑا طویل سفر اس مختصر مدت میں کیسے پورا ہوا، مولانا ملوک العلی صاحب کے متعلق ہجرت ہی کی نیت اس زمانہ میں منسوب کر دی گئی ہو، تو ان کیلئے سفر حج کا جو محرک قریب تھا، اسکو دیکھتے ہوئے شاید یہ انتساب اور عوام کا خیال محل حیرت نہیں ہو سکتا، ان کے صاحبزادے مولنا محمد یعقوب نے جب خود یہ لکھا ہے کہ

"یہ (یعنی شاہ صاحبوں کی ہجرت کو) دیکھ کر والد مرحوم کو بھی حج کا دھیان ہوا" ص۲

تو جن بزرگوں کو دیکھ کر حج کا ارادہ مولنا میں پیدا ہوا تھا، ان ہی بزرگوں کی پیروی میں ہجرت کی نیت کا انتساب ان کی طرف بظاہر بعید بھی نہ تھا، خصوصاً حج ہی کے ارادے کے متعلق ان کے صاحبزادے جب یہ اطلاع دیتے ہیں کہ ارادہ کے بعد اپنے اس ارادہ کا مدت تک مولانا نے اعلان نہ فرمایا بلکہ

"خفیہ تدبیر رخصت اور سامان سفر کی کرتے رہے"۔

تو اسی پر قیاس کر کے ہجرت کی مخفی نیت اگر ان کی طرف منسوب کی گئی ہو تو قطعاً یہ بے بنیاد بات نہ تھی۔

بہر حال سہارنپور میں ذہابی بخار نے مولانا نانوتوی کے نانا کی وفات کا جو حادثہ پیش آیا اور اسکی وجہ سے سہارنپور میں قیام کی بظاہر کوئی صورت باقی نہ رہی، مجبوراً نانوتہ واپس ہونا پڑا۔ ادھر یہی زمانہ ہے مولانا مملوک العلی کا بھی ایک طویل سفر پر روانہ ہو جانا، جس سے واپسی کی توقع بھی مشتبہ تھی، یہ صورت حال ایسی تھی کہ اس کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت نانوتوی کی تعلیمی زندگی کا شاید یہ سب سے زیادہ نازک زمانہ تھا۔

خدا خدا کر کے یہ سال پورا ہوا، اور جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ اس زمانہ میں لوگوں نے اچنبھے کے ساتھ یہ خبر سنی کہ مولانا مملوک العلی صاحب کل ایک سال کے اندر اندر حج و زیارت سے فارغ ہو کر دہلی تشریف لے آئے، چونکہ رخصت مولانا مملوک العلی صاحب کی ختم ہو چکی تھی اس لئے واپسی کے ساتھ ہی سرکاری فرائض یعنی دلی کالج کے کاموں میں مشغول ہو گئے اور اپنے وطن نانوتہ آنے کا موقعہ آپ کو نہ مل سکا۔

ہمارے مصنف امام یعنی مولانا محمد یعقوب نے لکھا ہے کہ ان کے والد مولانا مملوک العلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ رجب ۱۲۵۸ھ میں دلی سے بہ ارادۂ حج روانہ ہوئے تھے، رجب، شعبان، رمضان، شوال، ذیقعدہ گویا پانچ مہینے تو راستے میں صرف ہوئے اور پہلی ذی الحجہ کو مکہ معظمہ پہنچے، مناسک حج سے فارغ ہو کر مدینہ آئے۔

"حرمین کی زیارت سے فارغ ہو کر برس دن میں پھر دلی پہنچے"

جس کا مطلب یہی ہوا کہ رجب ہی کے مہینہ میں دلی پہنچے ہوں گے، واپسی کے بعد مولانا مملوک العلی نے رجب، شعبان، رمضان، شوال، ذیقعدہ کے مہینے دلی ہی میں بسر کئے، ذی الحجہ میں سالانہ تعطیل کالج میں ہوئی، تب وطن والوں سے ملنے کے لئے آپ نانوتہ تشریف لائے ۱۲۵۹ھ کا گویا یہ آخری مہینہ تھا، حضرت مولانا نانوتوی جن کی ولادت ۱۲۴۸ھ میں ہوئی

اس حساب سے آپ کی عمر دس سے متجاوز ہو چکی تھی، گیارہویں سال میں قدم رکھ چکے تھے [illegible]
سال، اس کا پتہ نہ چل سکا کہ دلی کالج میں یہ سالانہ تعطیل کب ہوتی تھی، اس کی مدت کیا تھی، بظاہر
ایک مہینے سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی، مصنف امام نے لکھا ہے کہ ذی الحجہ کی آخری
تاریخوں میں پھر ان کے والد دلی کے ارادے سے روانہ ہوئے، اور یکم محرم کو دلی پہونچ گئے
لکھ چکا ہوں کہ ساٹھ کوس کا فاصلہ دلی اور نانوتہ کے درمیان تھا، چار دن میں یہ فاصلہ ریلوے
کے زمانہ سے پہلے طے ہوتا تھا، اس بنیاد پر یہ سمجھنا چاہئے کہ ۲۶ یا ۲۷ ذی الحجہ کو مولانا مملوک العلی
نانوتہ سے روانہ ہوئے ہوں گے [illegible]
جب مولانا مملوک العلی کے اس سفر کی تاریخوں کو خصوصی اہمیت اس لئے حاصل ہے کہ ان
ہی تاریخوں میں سچ پوچھئے تو مسلمانان ہند کی دینی تقدیر کا فیصلہ قدرت کی طرف سے نافذ ہوا
اور اسلامی ہند کی دینی امامت و قیادت جس کے لئے زوال حکومت کے بعد ازل ہی سے مقدر
ہو چکی تھی، ایک قطعاتی آبادی نے اس کو ہندوستان کے سیاسی اور علمی و دینی مرکز دلی پہنچانے
کا نظم قدرت کی طرف سے عمل میں آیا، [illegible]
لیکن افسوس ہے کہ اس توجیہ جن تفصیلی معلومات کی ضرورت تھی، وہ فراہم نہ ہو سکے، بس اس
قدر معلوم ہو سکا کہ تعطیل ختم ہونے اور واپسی کے بعد نانوتہ میں حضرت نانوتوی دن گذار رہے تھے،
یوں تو مولانا مملوک العلی کے خاندانی تعلقات پہلے ہی سے موجود تھے، مگر بظاہر ایک
اتفاقی واقعہ جو پیش آیا یعنی مولانا مملوک العلی صاحب نے اپنے صاحبزادے مولوی محمد یعقوب
صاحب کو اپنے ساتھ ہی دلی میں رکھنے لگے تھے، اور وہیں قرآن مجید کے حفظ میں ان کو لگا دیا
تھا، حج کے لئے جب جانے لگے، تو مولوی محمد یعقوب صاحب جن کی عمر بھی اس زمانہ
میں نو دس کے درمیان تھی، ان کو نانوتہ چھوڑ گئے، پہلے بھی کسی موقعہ پر بیان کر چکا ہوں کہ دلی سے
مولوی محمد یعقوب صاحب نانوتہ پہنچے اور ٹھیک ان ہی دنوں میں مولانا نانوتوی بھی اپنے
نانا جان کی وفات کی وجہ سے سہارنپور سے گھر لوٹنے پر مجبور ہوئے، دونوں ہم عمر بھی تھے

اور "الارواح جنود مجندة" کے قانون کی رو سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دونوں کی روح میں ازلی ائتلاف کا رشتہ قائم تھا، اسی روحانی رشتہ کے ظہور و استحکام کا موقعہ اس زمانہ میں دونوں کو ملا، مولٰنا محمد یعقوب صاحب نے حضرت نانوتوی کی جو مختصر سوانح عمری لکھی ہے اور میری کتاب کا سب سے بڑا ماخذ یہی کتاب ہے، اس میں حضرت نانوتوی کی رفاقت کے ان دنوں کا ذکر کرتے ہوئے "خوب یاد ہے" یا "یاد ہے" یا اسی قسم کے الفاظ جو استعمال کئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بچپن کے ان بیتے ہوئے دنوں اور جو واقعات ان میں پیش آئے ان سے وہ خود اور ان کا حافظہ غیر معمولی طور پر متأثر تھا، مناسب اور موزوں موقعوں پر ان چیزوں کو اسی کتاب سے اخذ کرکے درج کر چکا ہوں، اس وقت اپنے جس احساس کو پیش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مولٰنا مملوک العلی صاحب کے لخت جگر اور حضرت نانوتوی کے درمیان سال بھر کی اس مدت میں رفاقت و محبت کے جو تعلقات پیدا ہوئے، اور مولٰنا مرحوم کی غیر معمولی ذہانت و ذکاوت اور سب سے زیادہ فطری سعادت کے جن آثار کے تجربہ کا موقعہ مولوی محمد یعقوب صاحب کو جو ملا، شاید اسی تجربہ کی خبر مولٰنا مملوک العلی تک پہنچی، مولٰنا مملوک العلی زمانے سے طلبہ کے پڑھنے پڑھانے کا کام کر رہے تھے، قدرتی صلاحیتوں کے پہچاننے کا ملکہ اس قسم کے لوگوں میں عموماً پیدا ہو جاتا ہے، اور مولانا مملوک العلی تو خیر مولانا مملوک العلی ہی تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذی الحجہ کے اسی مہینے کی مختصر مدت میں انھوں نے کچھ فیصلہ کیا، اب یہ معلوم نہیں کہ مولٰنا کے والد اور جد امجد جو اس وقت تک بقید حیات تھے ان لوگوں سے کیا باتیں ہوئیں اور کیا کیا مشورے ہوئے۔ مصنف امام نے اس فیصلہ کے متعلق صرف اتنی خبر سنائی ہے کہ

"جب والد مرحوم حج سے تشریف لائے اور وطن (نانوتہ) آئے تب مولوی صاحب (یعنی مولوی محمد قاسم صاحب) سے کہا کہ میں تم کو ساتھ لے جاؤں گا۔" ص۲

مولانا مملوک العلی صاحب کے فیصلہ کی اس خبر کو جن الفاظ میں مصنف امام نے اس موقعہ پر درج کیا ہے، دوسروں کے متعلق تو نہیں کہتا، لیکن میرے دماغ میں کچھ اس قسم کے سوالات ابھرنے لگے کہ

کیا حج کے اس سفر میں ان کو کوئی غیبی اشارہ ملا؟ کیا مسلمانان ہند کی دینی تقدیر کا مستقبل اُن کو دکھایا گیا؟ "جب حج سے آئے تب تم کو ساتھ لے جاؤں گا" کا فیصلہ جو مولانا نانوتوی کو سنایا گیا؛ شرط و جزا کے درمیان آخر کچھ تو ربط ہونا چاہئے۔

مگر ظاہر ہے کہ یہ میرا ایک ذاتی خیال، یا ذہنی انتقال ہے، جو کسی دعویٰ کی بنیاد نہیں بن سکتا واللہ اعلم بالصواب، اب کچھ بھی ہوا ہو، بیٹے کے تجربات نے متاثر کیا۔ یا حج کے لئے ہندوستان سے روانہ ہو کر مولانا مملوک العلی صاحب جہاں جہاں تشریف لے گئے تھے، وہاں ان کو کوئی روشنی دکھائی گئی، ہم اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے، بس صرف اتنا جانتے ہیں کہ جب مولانا مملوک العلی بیت اللہ کے حج اور رسول اللہ کے روضۂ پاک کی زیارت سے فارغ ہو کر پھر اسی ملک کے ان مسلمانوں کی طرف واپس ہوئے جن کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ آئندہ ہندوستان میں ان کے ساتھ کیا صورتیں پیش آنے والی ہیں، جس دین کے ساتھ ان کے اسلاف و اکابر اس ملک میں داخل ہوئے تھے، اس دین کے ساتھ ان کے تعلق کی نوعیت کیا ہو گی؟ ان کی مسجدوں کا انجام کیا ہو گا، ان کتابوں کا حشر کیا ہونے والا ہے؟ جو گھر گھر اسی دین کے تعلق سے پھیلی ہوئی ہیں۔

بہرحال ان ہی مسلمانوں میں وہ واپس ہوئے، واپسی کے بعد دیکھا گیا کہ دس گیارہ سال کی عمر والے ایک قصباتی بچے کے متعلق

"میں تم کو ساتھ لے جاؤں گا"

کا فیصلہ ان کے ساتھ ہے، فیصلہ سنایا گیا؟ اپنے ماں باپ کے اکلوتے کم سن بچے کو یہ فیصلہ سنایا گیا، کچھ نہیں معلوم کہ پھر اس بچے کے باپ نے اور دادا نے کیا کہا، صرف بچے کی ماں کے متعلق مصنف امام نے یہ لکھتے ہوئے کہ "بعد اجازت والدہ" خود بچے کے جوابی فیصلہ کی خبر یہ سنائی ہے کہ

"اور دہلی روانہ ہو گئے" ص ۲۵

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ سہارنپور سے واپسی کے بعد نانوتہ میں بیکاری کی جو زندگی مولانا مرحوم کی گذر رہی تھی، آپ کے والد اور دادا کے لئے جیسا کہ چاہئے خود ہی ناقابلِ برداشت ہی ہوئی تھی، اس عمر کے جس حصہ میں آپ تھے، اس وقت پڑھائی کے اس نقصان کو دیکھ دیکھ کر ان بے چاروں پر جو کچھ گذر رہی ہوگی، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس حال میں خدانخواستہ کبھی مبتلا ہوئے ہوں [illegible] ان کے لئے دلی کیا، میں تو سمجھتا ہوں کہ دلی سے بھی دور حصول علم کے لئے بھیجنے میں ان لوگوں کو تامل نہ ہوتا، ہاں ماں کی مامتا کا رنگ اور ہوتا ہے آپ دیکھ چکے کہ بھیجنے کو تو دیوبند مولانا بھیجدیئے گئے تھے، لیکن ہر مہینے دو مہینے میں نانوتہ جو آتے جاتے رہتے تھے تو اس کی وجہ وہی ماں کی کشش تھی، سہارنپور میں تو والدہ کے والد ہی کے زیر عاطفت پہنچے ہوئے تھے، گھر سے بھی زیادہ وہاں آرام کی توقع کی جا سکتی تھی، اور توقع پوری ہو رہی تھی [illegible] مگر اب سوال فاصلہ کا بھی تھا، مانا کہ نانوتہ کے لحاظ سے دلی زیادہ دور نہ تھی، لیکن ساٹھ کوس یا ایک سو بیس میل کا فاصلہ جو چار دنوں میں پورا ہوتا ہو، عہد بخار (یعنی ریلوے) سے پہلے یہ فاصلہ بھی یقیناً کچھ کم نہ تھا، پھر دلی خواہ جس حد تک بھی اجڑ چکی ہو، مگر دلی دلی ہی تھی، ایسے غدار شہر میں اپنے اکلوتے کمسن بچے کے متعلق طرح طرح کے خیالات اگر ماں کی محبت پیدا کرے، تو حالات کا یہ قدرتی اقتضاء تھا، معلوم ہوتا ہے کہ والدہ کی طرف سے کچھ کشمکش کی صورت کسی نہ کسی رنگ میں پیش آئی ہو گی، ورنہ سفر کے لئے رسمی اجازت نہیں والدہ کی کیا خصوصیت ہے، بہرحال جیسے باپ کی رضامندی و اجازت بھی ضروری ہے، مگر اس موقعہ پر مصنف امام نے صرف والدہ محترمہ کی اجازت کا ذکر خصوصیت کے ساتھ جو فرمایا ہے، یہ خود بتا رہا ہے کہ کچھ نہ کچھ اہمیت اس اجازت کو ضرور حاصل تھی، [illegible]

[illegible] بہرحال والدہ کی یہ اجازت حاصل کر لی گئی، اور وہ

"دہلی روانہ ہو گئے" (۱۸)

اور نور افشانی کا تعلق وابستہ تھا، یعنی دارالعلوم دیوبند بھی ۔ اسی محرم کے مہینہ کی ۵ر تاریخ کو قائم ہوا۔

بہر حال حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجری ۱۲۶۰ھ کے ماہ محرم کی ۲ر ۱۸۴۴ء کی ۲۳ر جنوری کے مطابق تھی، گویا ۵۷ء کی بغاوت ہند سے تیرہ سال پیشتر مولانا نانوتوی شہر دھلی میں داخل ہوئے، نام نہاد مغل بادشاہ بہادر شاہ ابھی لال قلعہ ہی میں براج رہے تھے، انکی تخت نشینی پر سات سال گذرے تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا نظام مشہور گورنر جنرل لارڈ الن برا کے قبضۂ اقتدار میں تھا، کمپنی کہئے یا انگریزی علاقے میں سندھ کا اضافہ ان ہی کے زمانہ میں ہوا، اور ہندوستان کی جاندار مرہٹہ حکومت یعنی سندھیا کی ریاست گوالیار کے قابض روح یہی لارڈ الن برا صاحب ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ مولنا نانوتوی کے سارے تحریری ذخیرے میں صرف یہی ایک انگریز لارڈ الن برا کا نام ایک بیان میں بطور مثال کے ملتا ہے، حالانکہ علاوہ عام انگریزوں کے متعدد گورنر جنرلوں کا زمانہ آپ نے پایا ہے، دلی پہنچکر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نوعمری کے ان دنوں میں لارڈ الن برا کے نام کو آپ نے تمام ناموں سے اونچا پایا ۔ اور غیر شعوری طور پر اس کا ارتسام ذہن پر باقی رہا، جس میں کچھ مدد اس واقعہ سے بھی شاید ملی ہو جو چند ہی مہینے بعد پیش آیا، یعنی مولنا نانوتوی جنوری میں دلی تشریف لائے اور جولائی میں یہ خبر ہندوستان کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک مشہور ہوگئی، کہ لارڈ الن برا معتوب و مغضوب بن کر ہندوستان سے بلالئے گئے، ۲۳ر جولائی ۱۸۴۴ء میں بجائے ان کے لارڈ ہارڈنگ اب ہندوستان کے سیاہ سپید کے مالک یعنی گورنر جنرل بنادیئے گئے، خود دلی کے انگریز حاکم بنام رزیڈنٹ اس زمانے میں بے چارے مرزا غالب کے مشہور ممدوح مٹکاف صاحب تھے، جو کشمیری دروازے کی طرف لب سڑک ایک عظیم الشان شاہانہ کوٹھی میں داد عیش و عشرت دے رہے تھے ۔

یہ عجیب بات ہے کہ آج جن لوگوں کا تذکرہ حضرت نانوتوی کے ہم چشموں کے سلسلے میں

خصوصیت کے ساتھ کیا جاتا ہے، یا یوں کہئے کہ علیگڈھ کی جس سیاسی تحریک کا مدمقابل دیوبندیت کے سیاسی نقطۂ نظر کو، اور دلی کی مذہبی تحریک (غیر مقلدیت) کا مدمقابل دیوبندیت کے مذہبی نقطۂ نظر کو سمجھا جاتا ہے، تحریک دیوبند کے ان دونوں ممتاز نشانے کے بانی یعنی ڈاکٹر سر سید احمد خاں مرحوم علیگڈھ تحریک والے اور میاں نذیر حسین مرحوم دلی کی تحریک غیر مقلدیت کے پیش رو اور سپہ سالار، یہ دونوں حضرات دلی ہی میں اس وقت موجود تھے، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ مولانا نانوتوی جن کی عمر اس وقت یعنی ۱۲۶۰ھ ہجری مطابق ۱۸۴۴ء میں بارہ ساڑھے بارہ سال سے زیادہ نہ تھی، سید صاحب آج سے سات سال پہلے یعنی ۱۸۳۷ء ہی میں دلی کے صدر امین کے سررشتہ دار مقرر ہو چکے تھے اور میاں صاحب دہلوی اس زمانہ میں جب مولانا نانوتوی نے دلی میں کافیہ شروع کی تھی، دلی کے عام علمی حلقوں میں باوجود آفاقی ہونیکے کافی امتیاز حاصل کر چکے تھے، اسی سے اندازہ کیجئے کہ ۱۲۶۳ھ یعنی مولانا نانوتوی کی آمد کے تین سال بعد سید احمد خاں صاحب کی "آثار الصنادید نامی کتاب جو شائع ہوئی تھی، اس میں میاں نذیر حسین صاحب کا ذکر کرتے ہوئے سید صاحب نے لکھا ہے کہ

> "مولوی نذیر حسین صاحب بہت صاحب استعداد ہیں، خصوصاً فقہ میں ایسی استعداد کامل بہم پہنچائی ہے کہ اپنے نظائر و اقران سے گوئے سبقت لے گئے ہیں۔ فن روایت میں آج بے نظیر ہیں"

آخر میں لکھا ہے کہ

> "باعتبار سن کے جوان، اور باعتبار طبیعت حلیم، اور وضع متین کے پیر"

جس کا مطلب یہی ہوا کہ نظریۂ عدم تقلید کے امام الائمہ اس وقت جوان تھے، جب دیوبندی تحریک کے بانی ابھی بارہ ساڑھے بارہ سال کی عمر سے متجاوز نہ ہوئے تھے

اگرچہ دودمان ولی اللہی کے حقیقی چشم و چراغ حضرت سیدنا شاہ محمد اسحاق اور ان کے برادر صغیر شاہ محمد یعقوب یہ دونوں حضرات جو اپنے نانا شاہ عبد العزیز بن شاہ ولی اللہ کے دلی میں

جانشین ہوئے تھے، مولانا نانوتوی کی تشریف آوری دلی سے دو ہی سال پہلے یعنی ۱۲۵۸ھ ہی میں بہ نیت ہجرت جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، دلی کو خالی کر کے حجاز تشریف لے جا چکے تھے، نیز مسلمانوں کی حکومت کے زوال و انحطاط کے زمانہ میں طلب کی کمی سے اہل کمال کی جماعت بھی کافی تھا ہو رہی تھی، تاہم حضرت مجدد و شہید ہی رحمۃ اللہ علیہ کے خانوادے کے بعض اکابر مثلاً شاہ احمد سعید اور شاہ عبد الغنی رحمۃ اللہ علیہما ان دونوں بزرگوں کا وجود علماً یا عملاً دلی کی بجھی بجھی روشنی کی عمر میں جان ڈالے ہوئے تھا، ان کے سوا بھی مفتی صدر الدین صاحب بذات خود صدر الصدور ہی کے منصب کے فرائض کے ساتھ درس و تدریس کا مشغلہ بھی جاری کئے ہوئے تھے، اور دلی کی جامع مسجد کے ساتھ دار البقاء کے نام سے عہد شاہ جہانی میں جو شاہی مدرسہ قائم کیا گیا تھا، اور دوسری ابرو زمانہ کے گویا جس کا نام و نشان ہو چکا تھا، لکھتے ہیں کہ مفتی صاحب مرحوم نے بعض رفقا سید احمد خان وغیرہ کی مدد سے اپنے خرچ سے صرف کر کے از سر نو اس مدرسہ کو مرتب کیا، اس مدرسہ میں بھی مفتی صاحب ہی کی طرف سے تنخواہ پانے والے علماء کی معقول تعداد تھی، جن میں حاجی محمد نو میری جو شاہ اسحاق کے شاگردوں میں تھے اور ملا سر فراز ماہر ریاضیات وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان کے سوا بھی مولوی عبد الخالق، نواب قطب الدین خان، مولوی نصیر الدین شافعی، مولوی رستم علی خان، مولوی شیر علی رکن الدین، مولوی منور الدین، مولانا ابو الکلام کے نانا، اور شاہ اسحاق صاحب کے دوسرے شاگردوں کی بھی کافی تعداد دلی میں موجود تھی، بلکہ اس وقت تک شاہ عبد العزیز اور شاہ عبد القادر صاحبان کے خوان علم کے براہ راست زلہ رباؤں کی یادگار دلی میں باقی تھی، مثلاً مشہور میر محبوب علی جو اپنی صلابت اور کرختگی میں کافی شہرت رکھتے تھے، شاہ عبد العزیز ہی کے شاگرد تھے، اسی طرح مولوی امان علی صاحب جن کے ساتھ سید احمد خان غیر معمولی عقیدت رکھتے تھے، یہ حضرت مولانا شاہ عبد القادر (مترجم قرآن) کے شاگرد تھے، بلکہ مولانا فضل حق خیر آبادی جن کی عمر اس وقت غالباً پچاس سال کی ہوگی اور دلی ہی میں وہ کسی بڑے عہدے پر سرفراز تھے، طالب علمی میں شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد، اور مولانا اسمٰعیل شہید کے رفیق درس تھے، فرصت کے اوقات

میں جیسا کہ اس زمانہ میں دستور تھا، فلسفہ اور منطق کا درس دیا کرتے تھے، بہر حال دلی کے علمی آسمان کا آفتاب (شاہ اسحاق) تو لفظ غروب ہو چکا تھا، لیکن ان تاریک گھڑیوں میں بھی ادھر ادھر بحالت انتشار کچھ چھوٹے بڑے ستارے پھر بھی چمکا رہے تھے [illegible]

[illegible] اگر سرراہ نانوتہ سے مولانا مملوک العلی صاحب اپنے ساتھ مولانا نانوتوی کو دلی نہ لاتے بلکہ جیسے مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ دلی بغیر کسی توسط کے طلب علم کی آرزو لے کر پہنچے تھے، یہی حال مولانا نانوتوی کا ہوتا تو شاید استاذ کے انتخاب میں ان کو بھی اسی طرح کچھ دن پاپڑ بیلنے پڑتے جیسے مولانا گنگوہی کو بیلنا پڑا تھا، مولانا گنگوہی فرمایا کرتے تھے [illegible]

[illegible] دلی میں دوسرے اساتذہ سے پڑھتے تھے لیکن تسکین نہیں [illegible] ہوتی تھی، کہیں سبق تھوڑا ہوتا تھا، کہیں شبہات کا جواب نہ ملتا تھا [illegible] (صفحہ ۳۰ تذکرۃ الرشید) [illegible]

آخر مولانا مملوک العلی کے درس میں جب ان کو وہ سب کچھ ملنے لگا جس کی تلاش میں آئے تھے تو دھونی رما کر وہیں بیٹھ گئے، بہر حال مولانا گنگوہی کو تو ادھر ادھر استاذ کے ٹٹولنے اور ڈھونڈھنے میں کچھ وقت صرف بھی کرنا پڑا، لیکن بجائے مرید کے "مراد" بنا کر قدرت نے جس ہستی کو مولانا مملوک العلی کے زیر سایہ عاطفت پہنچایا تھا اس کو تو ایک دن کے لئے بھی کسی دوسری طرف نظر ڈالنے کی ضرورت پیش نہ آئی کوئی صریح شہادت تو ہمارے پاس نہیں ہے۔ لیکن گوناگوں تعلقات جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا مملوک العلی کے درمیان تھے، قیام و طعام کے نظم میں بھی جہاں تک میرا خیال ہے کوئی دشواری پیش نہ آئی، رشتہ کے جو تعلقات ان کے ساتھ تھے، کم از کم اس زمانے کے لحاظ سے یہ ناممکن تھا کہ وہ مولانا نانوتوی کو اپنا مہمان نہ بناتے۔ مولانا گنگوہی کے متعلق تو لکھا ہے کہ یتیم ہو جانے کی وجہ سے دادا کی کفالت میں تھے جو کل تین روپے ماہوار ان کو دلی بھیجا کرتے تھے، انہیں تین میں زندگی کی ساری ضرورتیں پوری

ہوتی تھیں، لیکن مولانا نانوتوی کو شاید اس تین ز دپے کی ضرورت بھی نہیں ہوئی، مولانا مملوک العلی کا گھران کا گھر تھا وہی ان کا مدرسہ بھی تھا اور وہی اقامت خانہ بھی!

غالباً ان قدرتی سہولتوں کا یہ نتیجہ تھا کہ ۲ رمحرم کو مولانا دلی پہنچے ہیں، کم از کم چار دن میں یہ سفر پورا ہوا ہوگا، سفر بھی ریل میں نہیں، بہلی میں پورا ہوا تھا، مگر صرف ۳ رمحرم یعنی ایک دن کے وقفہ کے بعد ٹھیک چوتھی محرم کو مولٰنا مملوک العلی صاحب نے آپ کو سبق شروع کرادیا مصنف امام جو شاید اس سفر میں ساتھ بھی تھے ارقام فرماتے ہیں۔

"دوسری محرم سن ساٹھ کو دہلی پہنچے چوتھی کو سبق شروع ہوئے" ص۲۸

واللہ اعلم ایک دن کا یہ وقفہ جو سبق شروع کرانے میں ہوا، اس کا سبب کیا تھا سفر کی تکان اور ماندگی کا ازالہ مقصود تھا، یا آغاز کتاب کیلئے عموماً چہار شنبہ کے دن کو علماء نے جو پسند کیا ہے اُس دن کے انتظار میں درمیان کے اس ایک دن کو ٹال دیا گیا، ۱۲۶۰ھ کے محرم سے پہلے ذی الحجہ کا مہینہ جو گذرا وہ ۳۰ کا تھا یا ۲۹ کا، چونکہ یہی مسئلہ مشتبہ ہوگیا، اس لئے ۲ رمحرم کا دن بھی کچھ مشکوک سا ہو کر رہ گیا ہے۔ ورنہ چہار شنبہ والی توجیہ ہی شاید ترجیح کی زیادہ حقدار تھی۔

**دلی میں مولانا نانوتوی کی تعلیم کی نوعیت**

"حضرات دیوبند" کے متعلق مختلف حیثیتوں سے متعدد تذکرے ابتک جو شائع ہوئے ہیں ان میں سیدنا الامام الکبیر کی تعلیم جو دلی میں ہوئی اس کے متعلق بعض غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس مسئلہ کو صاف کرلیا جائے۔

تمہیدی بیان میں آپ سن چکے کہ حضرت مولانا مملوک العلی دلی کے عربک کالج میں سرکاری مدرس تھے، عربک کالج سے مولانا مملوک العلی کا بھی تعلق غالباً باعث غلط فہمی بنا ہوا ہے، انتہا یہ ہے کہ مولٰنا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند) جیسے عالم خبیر کی طرف ارواح ثلاثہ میں یہ بیان منسوب کیا گیا ہے، وہ فرماتے تھے کہ

"مولانا نانوتوی دہلی میں مولانا مملوک العلی صاحب سے جب تعلیم پاتے تھے تو وہاں کے کالج میں نام مولانا کا داخل تھا" (ص۱۹۳ ارواح)

اور اس سے بھی زیادہ دل چسپ لطیفہ وہ ہے' جسے قصص الاکابر کے جامع نے سیدنا حکیم الامت قدس اللہ سرہ کی طرف بایں الفاظ منسوب کیا ہے یعنی یہ فرماتے ہوئے۔

"کہ مولنٰا مملوک العلی صاحب جو کہ مولنٰا محمد یعقوب صاحب کے والد اور مولانا رشید احمد و مولانا محمد قاسم صاحب کے استاد ہیں' دہلی میں دار البقار سرکاری مدرسہ تھا' اس میں ملازم تھے۔" صفحہ ۳۲ الہادی ماہ شعبان ۵۶ھ

گویا ان دونوں ملفوظات کو ملا لینے کے بعد ایک عامی آدمی قدرتاً اسی نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے کہ مولنٰا محمد قاسم صاحب کا دلی کے سرکاری مدرسہ میں نام داخل تھا' اور اس سرکاری مدرسہ کا نام "دار البقار" تھا' حاصل جس کا یہی ہوا کہ حضرت نانوتوی مدرسہ دار البقار دلی کے تعلیم یافتہ تھے۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں حضرت حکیم الامت کی طرف "دار البقار" کا لفظ جو منسوب کیا گیا ہے اس میں یا جامع ملفوظات سے کوئی اندراجی غلطی ہوئی ہے یا خود حضرت تھانوی کو عربی کالج اور دار البقار میں اشتباہ واقع ہوا' بہر حال دار البقار سے تو حضرت نانوتوی کو کسی قسم کا تعلیمی تعلق نہ تھا' اتنی بات تو قطعی ہے' باقی عربی کالج میں آپ کے نام کا داخل ہونا جیسا کہ مولنٰا حبیب الرحمٰن کی طرف منسوب کیا گیا ہے' بظاہر اس سے یہ خیال گذرتا ہے کہ ابتدار ہی سے مولانا مملوک العلی نے حضرت نانوتوی کا نام عربی کالج میں شریک کرا دیا تھا' میرے نزدیک کلیتہً یہ انتساب بھی صحیح نہیں ہے' غلط فہمی کا منشار غالباً ہمارے مصنف امام یعنی مولانا محمد یعقوب صاحب کا شاید یہ بیان ہے جو سوانح قدیم میں پایا جاتا ہے' انھوں نے ایک موقعہ پر لکھا ہے کہ

"والد مرحوم (مولنٰا مملوک العلی) نے مولوی صاحب (مولنٰا نانوتوی) کو مدرسہ عربی سرکاری میں داخل کیا' اور مدرس ریاضی کو فرمایا کہ ان کے حال سے معترض نہ ہو جیو میں ان کو پڑھالوں گا اور فرمایا کہ تم اقلیدس خود دیکھ لو' اور قواعد حساب

آگے دوسرا قصہ ہے جس کا ذکر اپنے موقعہ پر کیا جائے گا' اس قصے کے بعد آخر میں مصنف امام ارقام فرماتے ہیں کہ:

"جب امتحان کے دن ہوئے تو مولوی صاحب (مولوی محمد قاسم صاحب) امتحان میں شریک نہ ہوئے اور مدرسہ چھوڑ دیا" ص ۲۹

اوپر اور نیچے کے ان دونوں اجزاء کو پیش نظر رکھتے ہوئے خاکسار اسی نتیجہ تک پہنچا ہے کہ سرکاری عربی کالج میں مولانا نانوتوی کے نام کی شرکت دلی کی تعلیمی زندگی کے صرف ایک سال تک محدود رہا ہے، اور یہ ایک سال بھی جس میں آپ کا اسم مبارک کالج کے باضابطہ رجسٹر میں شریک رہا، غالباً اس وقت کا واقعہ ہے جب عام تعلیم سے آپ فارغ ہو چکے تھے غالباً آئندہ معاشی زندگی کی سہولتوں کا خیال کر کے شفیق استاد نے مشورہ دیا کہ سرکاری سند بھی حاصل کر لو تو مناسب ہے۔

علاوہ دوسرے قرائن کے خود مصنف امام نے مدرسہ چھوڑ دینے کے واقعہ کا ذکر کر کے جو یہ لکھا ہے کہ

"پھر مولوی صاحب (مولانا نانوتوی) نے مطبع احمدی میں تصحیح کتب کی کچھ مزدوری کرلی اور کتابیں معمولی تمام کر چکے تھے" ص ۹

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نانوتوی کی تعلیمی زندگی کے آخری سال کا یہ واقعہ ہے۔

بہر حال کچھ بھی ہو عربی کالج میں ابتداء سے مولانا نانوتوی کا حصول علم کے لئے شریک ہونا قطعاً صحیح نہیں ہے، سب سے بڑی دلیل اس کی یہ ہی ہے کہ مولانا نانوتوی کو مولانا مملوک العلی صاحب اپنے ساتھ سنہ ۱۸۴۳ء مطابق سنہ ۱۲۶۰ ہجری میں دلی میں لائے ہیں، اور دلی کالج کی جو رپورٹ مولوی عبد الخالق صاحب نے بڑی محنت و کاوش سے تیار کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹھیک اسی سال یعنی سنہ ۱۸۴۳ء میں دلی کے اس عربک کالج کے دونوں شعبوں

مشرقی وانگریزی کا نصاب ایک کر دیا گیا تھا۔ یہ لکھنے کے بعد کہ

"دلّی عربی کالج میں انگریزی اور مشرقی شعبے کئی سال تک نصاب تعلیم نیز تقریباً ہر پہلو سے جدا اور مختلف رہے"

مولوی عبدالحق صاحب رقم طراز ہیں کہ

"جب پرنسپل کا تقرر ہوا تو اس نے (مسٹر بترو پرنسپل نے) اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ دونوں شعبوں کی تعلیم کو ملا کر ایک کر دیا جائے"

لفٹنٹ گورنر جن کی منظوری کے بغیر دونوں شعبوں کے انضمام وادغام کی تجویز نافذ نہیں ہو سکتی تھی، پرنسپل نے ان کی خدمت میں اپنی یہ ادغامی وانضامی تجویز پیش کی۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ

"لفٹنٹ گورنر بہادر نے اس تجویز کو پسند فرمایا اور اس کو قائم رکھنے کی خواہش ظاہر کی، نیز انھوں نے (لفٹنٹ گورنر نے) یہ خیال ظاہر کیا کہ دونوں شعبوں کو ایک ہی مکان میں ایک ہی چھت کے نیچے تعلیم دینے سے اس تجویز کی کامیابی میں زیادہ سہولت پیدا ہو گی"

آخر میں مولوی عبدالحق نے یہ اطلاع دی ہے کہ

"۱۸۴۴ء میں اس پر (یعنی دونوں شعبوں کے انضمام کی تجویز پر) عمل درآمد شروع ہوا" (۳۸ مرحوم عربی کالج)

اور مولانا نانوتوی ٹھیک اسی سال ۱۸۴۴ء میں مولانا مملوک العلی کے ساتھ دلی تعلیم پانے کے لئے تشریف لائے ہیں، مولوی عبدالحق صاحب نے دونوں (مشرقی وانگریزی) شعبوں کے انضمام کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ

"دونوں شعبوں میں اخلاقی اور سائنٹفک مضامین کی تعلیم یکساں طور پر دی جائے"

پھر اس اجمال کی تفصیل وہی یہ کرتے ہیں کہ

"ان مضامین کے ذیل میں حساب، جیومیٹری، الجبرا، نیچرل فلاسفی، جغرافیہ تاریخ ہند، پولیٹیکل اکانومی (معاشیات) اور جورس پروڈنس (اصول قانون) کا خاص طور پر ذکر کیا گیا تھا"

جس کا مطلب یہی ہوا کہ علاوہ انگریزی ادب کے جو انگریزی شعبہ کی خصوصیت تھی، جدید علوم و فنون کی کتابیں دونوں شعبوں کے نصاب میں شریک کر دی گئی تھیں۔

جب ہم یہ جانتے ہیں کہ مولانا نانوتوی نے ان جدید علوم و فنون کی تعلیم باضابطہ درسی طور پر نہیں حاصل کی تھی، جس کی ایک کھلی دلیل یہ ہے، کہ جس سال مولانا کا نام عربی کالج میں مولانا مملوک علی نے شریک کرایا تھا اور حکم دیا تھا کہ اقلیدس خود دیکھ لو، اور حساب کی مشق کر لو، تو جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے

"چند روز میں چرچا ہوا کہ مولوی صاحب (مولانا نانوتوی) سب معمولی مقالے دیکھ چکے اور حساب پورا کر لیا از بسکہ یہ واقعہ نہایت تعجب خیز تھا، طلبہ نے پوچھ پاچھ شروع کی، یہ کب عاری تھے ہر بات کا جواب باصواب تھا" ص۲۵ سوانح قدیم

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال سے پہلے ان علوم کی درسی تعلیم کا موقعہ مولانا نانوتوی کو کالج میں نہ ملا تھا، ورنہ "از بسکہ یہ واقعہ نہایت تعجب خیز" کیوں ہوتا، اور طلبہ اپنی حیرت کے ازالہ کے لئے پوچھ پاچھ سے کیوں کام لیتے۔

بہر حال عربی کالج سے مولانا نانوتوی کے تعلیمی تعلق کا مسئلہ اگرچہ مختلف غیر تحقیقی بیانوں کی وجہ سے کچھ زیادہ ژولیدہ اور الجھا ہوا نظر آتا ہے، مگر گرد و پیش کے تمام واقعات و حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اسی نتیجہ تک پہنچنا پڑتا ہے، کہ گو مولانا نانوتوی نے عربی کالج دہلی کے صدر شعبہ مشرقی مولانا مملوک علی صاحب سے تعلیم پائی، لیکن آپ کی یہ تعلیم عربی کالج کے نظام اور نصاب کے تحت نہیں ہوئی، بلکہ صاحب فرائد الدہر جو مولانا مملوک علی صاحب کے دیکھنے والوں میں ہیں اور ان کی یہ کتاب مولانا مملوک علی کی زندگی ہی میں لکھی گئی ہے، اسی

کتاب کے حوالہ سے غالباً یہ فقرہ نقل کر چکا ہوں کہ مولنا مملوک علی صاحب

"سوائے درس دہی طلبائے مدرسہ (عربی کالج) کے اپنے گھر پر بھی لوگوں کو ہر ایک علم کی کتابیں پڑھاتے ہیں، تمام اوقات گرامی ان کے تعلیم طلبا میں نصف شب تک منقسم ہیں۔"

اس بنیاد پر بھی ماننا چاہئے کہ مولانا نانوتوی کی تعلیم کا تعلق بھی "گھر پر" والی تعلیم سے تھا، پہلی کتاب جو مولنا مملوک علی صاحب سے سیدنا الامام الکبیر النانوتوی نے شروع کی، جیساکہ مصنف امام نے لکھا ہے کافیہ تھی، اس کا پتہ نہ چل سکا کہ مولنا نانوتوی تنہا پڑھتے تھے، یا آپ کے ساتھ دوسرے بھی شریک تھے، ظاہر حال کا اقتضا یہی ہے کہ غالباً شروع میں آپ کے درس کی نوعیت انفرادی تھی، مولنا نانوتوی مولسنا مملوک علی کے گھر ہی پر مقیم تھے، جس وقت بھی موقعہ ملتا ہوگا، آپ کو پڑھا دیا کرتے تھے، ہاں ایک سال بعد یعنی ۱۲۶۱ھ میں جب قطب گنگوہ حضرت مولنا رشید احمد قدس اللہ سرہ بھی مولانا مملوک علی کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو دونوں بزرگوں کی رفاقت کا وہ تاریخی سلسلہ شروع ہوا، جس کا رشتہ ابد سے بندھا ہوا تھا، گویا ازل کی تقدیر ۱۲۶۱ھ ہجری میں عالم تدبیر میں جلوہ فرما ہوئی۔

**دلّی میں دونوں حضرات کی تعلیمی مدت**

یہ عجیب بات ہے کہ قطب گنگوہی آئے بھی دلی ایک سال بعد جس وقت تشریف لائے تھے، تو جیساکہ صاحب تذکرۃ الرشید نے لکھا ہے کہ

"اس وقت آپ (قطب گنگوہی) ہدایۃ النحو پڑھتے تھے" (ص۲۶ تذکرۃ الرشید ج ۱)

جس کا مطلب یہی ہوا کہ کافیہ پڑھنے والے طالب العلم کے لحاظ سے ایک درجہ نیچے تھے، سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ ہمدرسی کا تعلق دونوں میں پھر کیسے پیدا ہوا، جہاں تک قرائن و قیاس سے معلوم ہوتا ہے، وجہ اس کی شاید یہ ہو کہ گو نصابی کتاب ہدایۃ النحو کے لحاظ

سے قطب گنگوہی ایک درجہ نیچے تھے ۔ لیکن عمران کی اس وقت جب دتی آپ کے قدوم فرمائی سے رونق اندوز ہوئی، صاحب تذکرۃ الرشید کے بیان کے مطابق سترہ سال کی تھی، برعکس اس کے مولانا نانوتوی جب دلی پہنچے ہیں اس وقت عمر کے لحاظ سے بارہ تیرہ کے درمیان میں تھے، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اسی بنا پر لکھا ہے کہ

"جب آپ کی (مولانا نانوتوی کی) عمر تیرہ برس کی تھی واسطے تحصیل علم ظاہری کے دہلی تشریف لے گئے" (صفحہ ۹ سوانح مخطوطہ)

یوں بھی سن ولادت کے حساب سے دونوں بزرگوں میں چار سال کا تفاوت تھا ہی، قطب گنگوہی کی ولادت ۱۲۴۴ھ میں، اور حضرت نانوتوی کی ۱۲۴۸ھ میں ہوئی، نیز صاحب تذکرۃ الرشید کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قطب گنگوہی جب ہدایۃ النحو پڑھتے ہوئے دتی آئے، تو کچھ دنوں تک پنجاب کے ایک بزرگ قاضی احمد الدین جو جہلم کے رہنے والے تھے، ان ہی سے پڑھتے رہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے دونوں بزرگوں کی نصابی کتابوں میں تفاوت کا جو قصہ تھا، یہ قصہ غالباً مولوی احمد الدین صاحب ہی کے حلقہ درس میں ختم ہو گیا! عمر بھی حضرت قطب گنگوہی کی کافی تھی، آگے بڑھ جانے میں دشواری نہ ہوئی؛ اور گو ہمارے پاس کوئی بیّن صریح شہادت تو نہیں ہے لیکن مذکورہ بالا معلومات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ قطب گنگوہی نے جس وقت مولانا مملوک العلی ہی کے پاس پڑھنے کا آخری فیصلہ فرما لیا، اور مولانا مملوک العلی نے پڑھانا منظور فرما لیا تو بقول صاحب تذکرۃ الرشید

"قابل استاد کا قاعدہ ہے کہ ذکی طالب العلم کو ڈھونڈھتا ہے اور سمجھ دار طالب العلم کا دستور ہے کہ قابل استاد کی ٹوہ لگاتا ہے۔ اس لئے ہر دو جانب سے دلی راحت کے سامان پیدا ہو گئے"

اسی کے بعد ان کے الفاظ ہیں کہ

مولنا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہا چند روز کے بعد
ایسے ہم سبق رہے کہ آخرت میں بھی ساتھ نہ چھوڑا " (صہ ۲۵ تذکرہ)

اگرچہ "چند روز کے بعد" کے الفاظ کچھ مبہم سے ہیں، لیکن بظاہر اس کا مطلب وہی ہے کہ دلی آنے کے بعد دونوں کی نصابی کتابوں میں جو تفاوت تھا، وہ مولوی احمد الدین کے یہاں ختم ہو گیا، اور مولنا مملوک علی صاحب کے پاس الدنیا و الآخرت کے ان دونوں ازلی رفیقوں نے ایک ساتھ پڑھنا شروع کیا اور کتابیں جب ختم ہوئیں تو دونوں بزرگوں کی ایک ساتھ ختم ہوئیں، اور اسی سے حضرت نانوتوی کے ایام تعلیم کی مدت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ صاحب تذکرۃ الرشید (جن کی کتاب قطب گنگوہی کے فلزۃ الکبد مولنا حکیم مسعود احمد مرحوم کی نظر سے گذرنے کی وجہ سے ان امور میں کافی استناد کی مستحق ہے۔) اسی کتاب میں یہ لکھتے ہوئے کہ

"اس وقت جب آپ کی (یعنی قطب گنگوہ) کی عمر تخمیناً اکیس سال تھی، آپ کا زمانہ طالب العلمی ختم ہو لیا، اور آپ نے اپنے وطن مالوف کی طرف مراجعت فرمائی "

آگے بیان کیا ہے کہ

"دہلی میں بزمانہ طالب العلمی جتنا بھی آپ کو (قطب گنگوہ کو) قیام کرنا پڑا، اس کی مدت بہ مشکل چار سال ہوتی ہے " صہ ۳۵

ہمیں جب یہ معلوم ہے کہ مولنا نانوتوی نے قطب گنگوہی سے ایک سال پہلے مولانا مملوک العلی سے پڑھنا شروع کیا تھا، تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوا کہ دلی میں مولانا نانوتوی کی تعلیمی مدت ایک سال زائد یعنی پانچ سال تھی، مگر مشکل یہ ہے کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ مولنا نانوتوی

"سترہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے " صہ ۹

اور جیسا کہ ان ہی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ تیرہ سال کی عمر میں حضرت نانوتوی دلی تشریف

لائے تھے، تو اس حساب سے آپ کی تعلیمی مدت بھی چار سال ہی قرار پاتی ہے، لیکن جہانتک میرا خیال ہے تیرہ سال کی عمر کا دعویٰ دتی پہنچنے کے وقت جوانھوں نے کیا ہے، خود اسی میں کامل احتیاط سے کام نہیں لیا گیا ہے، لیکن اگر یہ مانا جائے کہ اس وقت تیرہ سے کم اور بارہ سے مولٰنا نانوتوی کی عمر متجاوز تھی، اور مولٰنا گنگوہی کے ساتھ تعلیم سے جب فارغ ہوئے تو اس وقت آپ کی عمر سترہ اور اٹھارہ کے درمیان تھی، تو پانچ سال والی بات درست ہو جاتی ہے، اس قسم کی باتوں میں حزم و احتیاط سے کام نہ لینے کا چونکہ عام رواج ہے، اس لئے سوانح مخطوطہ کے مصنف چنداں قابل الزام نہیں ہو سکتے، آخر حضرت نانوتوی ہی کے متعلق ان کے تلمیذ رشید مولٰنا منصور علی مراد آبادی ثم حیدر آبادی جیسے بزرگ کے بیان میں ہم یہ پاتے ہیں، یعنی انھوں نے لکھا ہی کہ ان کے استاد مولٰنا نانوتوی

"بارہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے تھے"۔ (مذہب منصور ص۱۶)

اس کے لحاظ سے خود سوچئے کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف کیا بے پروائی یا لاپروائی کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

بہر حال میرا خیال یہی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی تعلیمی زندگی جو دتی میں گذری اس کی مدت کم وبیش پانچ اور چھ سال کے درمیان تھی، اگرچہ مسئلہ معمولی تھا، لیکن اس قسم کی باتوں نے یعنی مولانا گنگوہی ایک سال بعد اور وہ بھی حضرت نانوتوی کی نصابی کتاب سے ایک درجہ نیچے کی کتاب پڑھتے ہوئے دتی تشریف لائے، لیکن علم سے فارغ دونوں ساتھ ہوئے، مسئلہ کو کافی پیچیدہ کر دیا تھا، سلجھانے کی ممکنہ کوشش میرا فرض تھا۔

**دتی کی تعلیمی زندگی کے سوانح و واقعات** حضرت مولٰنا مملوک العلی سے پڑھنے کے سوا دتی کی تعلیمی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے متعلق اگرچہ معلومات کی بضاعت حد سے زیادہ مزجات ہے یہ ایک کافی بڑی مدت ہے، طالب علمی کا زمانہ ہے، دلی سیاسی و علمی ہستیوں کے اجڑ جانے کے باوجود پھر طرح طرح کے فن کاروں اور باکمالوں کو اپنے آغوش میں سمیٹے ہوئے تھی،

لال قلعہ کا چہرہ کام کے لحاظ سے اگرچہ صفر بن کر زرد پڑ چکا تھا، لیکن اس کے نام کے ساتھ بھی مرکز تعلق ہونے کی بچی کھچی کیفیت باقی تھی، سراج الدین بہادر شاہ مرحوم کے نام نہاد شاہی دربار سے ذوق و غالب جیسے شعراء اس وقت تک وابستہ تھے، ان ہی میں مومن، شیفتہ، نصیر، صہبائی تھے جن کی نواسنجیوں سے اجڑی دلی کے کھنڈر میں داد و تحسین کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں، ان مسیحا نفس اطباء سے دلی ابھی خالی نہیں ہوئی تھی، جن کے نام سے بھی بیماروں کے قلوب اب بھی قوت حاصل کرتے ہیں، بڑے بڑے خوشنویس، پہلوان، پھکیت، تیراک، بقیۃ السلف کی شکلوں میں اب بھی غریب دلی کے دامن کو تھامے اپنے برے بھلے دن اسی مجمع الکمالات قدیم مرکز کے کھنڈروں میں گذار رہے تھے، خطباء تھے، بلغاء تھے، وعاظ تھے، مشاعروں کی محفلیں جمتی رہتی تھیں، وعظ کی مجالس قائم ہوتی تھیں، دنگلوں میں اپنے کمالات اور ہنر کو دکھانے والے دکھا رہے تھے۔

یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نانوتوی جیسی ہمہ گیر ہستی کمالات کے ان شعبوں سے دلچسپی نہ رکھتی ہو لیکن کیا کیجئے کہ بیان کرنے والوں نے اس سلسلہ میں کوئی قابل ذکر چیز ایسی نہیں چھوڑی ہے جو آپ کی سوانح عمری میں قابل اندراج ہو، حد تو یہ ہے کہ علم اور دین جو سیدنا الامام الکبیر کی فطرت و جبلت کے جوہری عناصر ہیں، ان سے بھی تعلق رکھنے والے واقعات کا تذکرہ جیسا کہ چاہئے نہیں کیا گیا ہے، تاہم غنیمت ہے کہ ان دونوں شعبوں کے متعلق دوسرے واقعات کے ذیل میں خبریں مل گئی ہیں، مالا یدرک کلہ لایترک کلہ کے قاعدے کے تحت ان ہی بکھری ہوئی منتشر باتوں کو ایک خاص ترتیب سے پیش کر دیتا ہوں۔

سب سے پہلی بات تو وہی ہے کہ "علم کی بکری" کا ظریفانہ خطاب اپنے استاد شیخ مہتاب علی سے دیوبند میں جو آپ کو عطا ہوا تھا۔ قیام دہلی کے ابتدائی دنوں میں اس خطاب کے آثار و لوازم کا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا پر ابھی کافی اثر قائم تھا، صرف و نحو جو اس زمانہ میں آپ کے تدریسی علوم تھے، ان کے متعلق علاوہ ان خانگی مباحثوں کے جن کا ذکر

مصنف امام کے حوالہ سے گذر چکا، یعنی مولانا مملوک علی کے دولت خانہ پر خصوصیت کے ساتھ جمعہ کی شب میں جس میں چھٹی ہوتی تھی، صیغوں اور ترکیبوں کے پوچھنے اور مشق کا سلسلہ جاری رہتا تھا، لیکن بات گھر کی ان خانگی مجلسوں ہی تک محدود نہ تھی، دلی کے طبقۂ علماء کی ممتاز ہستیوں میں ایک بزرگ مولانا نوازش علی صاحب بھی تھے، حدیث میں حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، اور دوسرے علوم و فنون کی کتابیں دلی کے اچھے اچھے مولویوں سے پڑھی تھیں، آثار الصنادید میں سرسید احمد خاں نے ان کا بھی مستقل تذکرہ درج کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دلی کی ممتاز ہستیوں میں مولوی نوازش علی صاحب کا بھی شمار تھا، منجملہ دوسری باتوں کے ان کی خصوصیات کا اظہار سید صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ

> از بسکہ طبیعت ہدایت و ارشاد کی طرف مائل ہے، اور ساکنین شہر شاہجہان آباد اکثر بہ شوق اہتداء و استرشاد وعظ کہنے کے واسطے اپنے اپنے گھر میں ان کو تکلیف دیتے ہیں، خلق و حلم میں یگانہ روزگار ہیں اور قناعت و توکل میں شہرہ آفاق ہیں۔" (ص۲۷ آثار حصہ سوم)

سید صاحب کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دلی کے عام باشندوں پر مولوی نوازش علی صاحب کا خاص اثر تھا[1]، اتفاق کی بات جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے کہ ان ہی مولوی

---

[1] حیات جاوید میں مولانا حالی نے لکھا ہے کہ (۲۹) سال کی عمر میں سرسید فتحپور سے بدل کر جب دلی آئے تو پڑھنے کا شوق اس عمر میں بیدار ہوا اور ان ہی مولوی نوازش علی صاحب سے پچھلی پڑھی ہوئی کتابوں کو پھر پڑھا، اور جب رہتک ان کا تبادلہ ہوا تو مولوی نوازش علی صاحب کو اپنے ساتھ لے چلنے پر مصر ہوئے، مولوی صاحب نے کہا کہ میرے ساتھ طالب العلموں کی ایک جماعت ہے، ان کے کھانے کا نظم وہاں کیا ہوگا، باوجودیکہ سید صاحب کی تنخواہ اس زمانہ میں معمولی تھی، لیکن علم کے شوق میں انھوں نے وعدہ کر لیا کہ جتنے طالب العلم آپ کے ساتھ رہتک چلیں گے سب کا کھانا میرے ذمہ ہوگا، اس وعدے پر مولوی صاحب ساتھ چلنے پر راضی ہو گئے اور سید صاحب نے وعدہ پورا کیا، یہ بھی لکھا ہے کہ مولوی نوازش علی صاحب نے شروع میں جب رہتک جانے سے انکار کیا تو سرسید نے کہا کہ میں بھی رہتک نہ جاؤں گا، خواہ میری ترقی رک ہی کیوں نہ جائے ۱۲ ص۶۳ ج ۱، ص۴۴، ص۱۵۴ ج ۲

نوازش علی صاحب کی مسجد کے پاس وہ مکان تھا، جس میں مولٰنا مملوک العلی صاحب اس زمانہ میں قیام فرماتے تھے، جہاں مولٰنا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کو دلی تشریف لانے کے بعد مولٰنا مملوک العلی کے ساتھ رہنا پڑا تھا، قرب واتصال کی وجہ سے مولٰنا اسی مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے تشریف لے جایا کرتے تھے، مصنف امام نے لکھا ہے کہ مولوی نوازش علی صاحب کی اس مسجد میں

"طالب علموں کا مجمع تھا"

بہ ظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے جیساکہ سرسید نے لکھا ہے مولٰنا نوازش علی صاحب کا واعظ شہر ہونے کی حیثیت سے شہر دہلی کے عوام وخواص پر کافی اثر تھا "خلق وحلم" میں بقول سرسید یگانہ روزگار تھے، پڑھنے کے لئے باہر سے دلی جو لوگ آتے تھے، مولانا نوازش علی کے "خلق وحلم" سے مستفید ہونے کا کافی موقعہ مل گیا تھا، مختلف گھروں میں اس زمانہ کے دستور کے مطابق طالب العلموں کی جاگیر مولوی نوازش علی صاحب کی کوششوں سے میسر آجاتی تھی، اور ان ہی طالب العلموں کے قیام کا نظم مولوی صاحب نے اپنی مسجد اور مسجد کے متعلقہ حجروں میں کر رکھا ہوگا، افسوس ہے کہ اس مسجد کی وسعت اور اس کے حجروں کی صحیح تعداد وکیفیت کا علم نہ ہوسکا، لیکن قرائن وقیاس کا اقتضاء یہی ہے کہ اس مسجد میں طالب العلموں کی کافی تعداد رہتی تھی،

جیساکہ قاعدہ ہے طلبہ عام طور پر نووارد طالب العلم کو اپنی قابلیت ولیاقت سے مرعوب کرنے کی عموماً کوشش کرتے ہیں، خصوصاً شہری طالب العلموں کے مجمع میں جب کوئی قصباتی طالب علم بے چارہ گھر جائے تو پھر اس بے چارے کی جو درگت بنتی ہے، اس سے وہی واقف ہوسکتے ہیں، جن پر یہ گذری ہو۔

سیدنا الامام الکبیر قصباتی آبادی نانوتہ سے شروع شروع میں دلی تشریف لائے تھے عمر بھی کم تھی، مولوی نوازش علی کی مسجد میں رہنے والے شہر دلی کے مختلف تدریسی حلقوں میں

تعلیم پانے والوں کے لئے اظہار قابلیت کا گویا مغتنم موقع پیش ہوگیا، مصنف امام جو خود اس واقعہ کے شاہد ہیں؛ اُن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بحث و مباحثہ کی طرح مسجد کے ان طالب العلموں نے مولانا سے ڈالی، اپنے دل میں وہ سوچے ہوئے تھے ایک قصباتی طالب العلم کا معاملہ ہے، لیکن ان غریبوں کو کیا معلوم تھا کہ "بکریوں کے گلے میں شیر کا بچہ شریک ہوگیا ہے" حضرت والا کی اجتنابی شان سے واقف ہونے کی وجہ ہی کیا ہوسکتی ہے، مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"پوچھ پاچھ اور بحث شروع ہوئی" صـ۲۵

ایسا معلوم ہوتا ہے، اس پوچھ پاچھ بحث و مباحثہ کی ابتداء مسجد کے طالب العلموں کی طرف سے ہوئی، جب تک وہ اپنی کہتے رہے، مولانا خاموشی کے ساتھ ان کی باتیں سنتے رہے، جب انکی باتیں ختم ہوگئیں، وہ منتظر تھے کہ ان شہری طالب العلموں کے عالمانہ سوالوں کے جواب میں یہ غریب قصباتی نووارد، کم سن طالب العلم کیا کہہ سکے گا، مگر جیسا کہ مصنف امام کا بیان ہے۔

"مولوی صاحب (یعنی مولانا محمد قاسم) کی باری آئی، سب پر غالب آئے" صـ۲۵

افسوس ہے کہ مصنف امام نے اس موقعہ پر حد سے زیادہ اجمال سے کام لیا، نہ یہ بتایا کہ گفتگو کس علم کے کن مسائل پر ہوئی تھی، اور غلبہ کی یہ صورت ابتداء ہی میں پیش آئی، یا رد و قدح کے بعد آخر میں اپنی مغلوبیت اور مولانا کے غالب آنے کا اقرار ان طالب العلموں کو کرنا پڑا، بظاہر حالات کا اقتضا یہی ہے کہ دوسری صورت ہی پیش آئی ہوگی۔

شہر اور وہ بھی دلی جیسے مرکزی شہر کے طالب العلموں کے مجمع میں قصبہ سے آنے والے تازہ تازہ نووارد طالب علم کے غالب آنے کا یہ قصہ مصنف امام کی کتاب میں میری نظر سے جس وقت گذرا، تو اچانک وہ مشہور تمثیلی حکایت یاد آگئی، جس کا ذکر مولانا معنوی نے اپنی مثنوی میں کیا ہے، حاصل جس کا یہ ہے کہ بکریوں کے گلے میں کسی طرح سے شیر کا ایک بچہ گھس مل گیا، ان ہی کے ساتھ رہنے سہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیر کے بچہ نے بھی بکریوں کی عادتیں اختیار کرلیں، ان ہی کی طرح گھاس چرنے لگا، پتے چبانے لگا، لیکن ایک دن جب تالاب کے کنارے بکریوں کے ساتھ شیر کا یہی بچہ پانی

پی رہا تھا، پانی میں اپنی صورت کے عکس پر نظر پڑی، ساتھ ہی ساتھ بکریوں کی صورتوں کے عکس بھی پانی میں جھلک رہے تھے، شیر کے بچہ کو محسوس ہوا کہ اس کی صورت و شکل، اس کا خط و خال بکریوں سے بالکل مختلف ہے، خصوصیتوں کے اسی اختلاف نے شیر کے بچے میں اچانک اس شعور کو بیدار کر دیا کہ وہ بکری نہیں شیر ہے، معاً اسی کے ساتھ ساری شیرانہ صفات کا احساس اس کے اندر جاگ اٹھا اور بکریوں پر جا پڑا، اسے پھاڑا، اسے نوچا، اور ان کی قطار سے نکل کر جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔

مولانا نوازش علی کی مسجد کے "مجمع طلبہ" کے سامنے آج جو صورت پیش آئی ہے، اس میں بھی "شعوری انقلاب" کی فجائی صورت کی جھلک مجھے نظر آتی ہے،

مطلب یہ ہے کہ پہلے سے بھی لوگ مانتے چلے آئے ہیں اور آج بھی یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ نسل انسانی میں پیدا ہونے والوں میں اکثریت تو زیادہ تر ان ہی لوگوں کی ہوتی ہے، جن کے لئے یہی غنیمت ہوتا ہے کہ دوسروں کی سوچی سمجھی، سلجھائی ہوئی باتوں کو وہ سمجھ لیں، طلب علم کی راہ پر چلنے والوں میں بھی زیادہ تعداد اسی قسم کے افراد کی ہوتی ہے، ان میں شوقین سے شوقین طالب العلم کا سب سے بڑا کمال اور انتہائی سعی یہ ہوتی ہے کہ دوسروں نے اپنی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے اس کا مطالعہ کریں اور ممکنہ حد تک اس کو اپنی گرفت میں لانے کی کوشش کریں۔

لیکن ان ہی کے ساتھ زندگی کے ہر شعبہ میں کچھ لوگ ایسے بھی پیدا ہوتے ہیں جن میں دوسروں کے اگلے ہوئے لقموں کو نگلنے کی نہیں بلکہ خود اپنی غذا خود تیار کرنے کی قدرتی صلاحیت اور فطری ملکہ ہوتا ہے، وہ زیادہ تر خود سوچتے ہیں، اور اپنی راہ خود نکالتے ہیں، پہلے زمانہ میں ان استثنائی فطرتوں کی اس جبلی خصوصیت کی تعبیر "عبقریت" کے لفظ سے کرتے تھے، اور آج کل اسی قسم کے افراد کو "جینیس" کہتے ہیں

عرض کر چکا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر کا وجود باجود اجتبائی خصوصیتوں کا حامل تھا، جن کی شعاعیں پھوٹ پھوٹ کر ان سے نکل رہی تھیں "عبقریت" اور "خود فکری" ان کی اس اجتبائی

شان کا لازمہ اور قدرتی اقتضا تھا،

مگر جیسے کہ شیر کا بچہ بکریوں اور بھیڑوں کے گلّے میں شریک ہو کر کچھ دن اپنے فطری اقتضا کے برخلاف گھاس چرنے اور پتے کھانے لگا تھا، کچھ اسی قسم کے حالات میں مولٰنا کو بھی زندگی کے ابتدائی دنوں میں رہنا پڑا، شروع میں ان کی سمجھ میں بھی یہی آیا کہ حصول علم کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ ہم سے پہلے جو کچھ لوگوں نے سوچا سمجھا لکھا پڑھا ہے، اس کو پڑھا اور سمجھا جائے۔ علم کے اس بچّہ شیر کو ظریف استاد نے "علم کی بکری" کا خطاب کتب بینی کے اس غیر معمولی شوق کی بنیاد پر دے دیا تھا۔ نانوتہ، دیوبند سہارنپور وغیرہ کی طالب العلمانہ زندگی میں یہ غیر طبعی مشغلہ ان کا جاری رہا، مگر دتی تشریف لانے کے بعد مسجد نوازش علی کے مجمع طلبہ میں غالب آنے کا واقعہ گویا سمجھئے کہ پانی کا وہ عکس تھا جس نے شیر کے بچہ پر یہ واضح کر دیا کہ وہ "بکری" نہیں "شیر" ہے۔

طلبہ کے اس مجمع میں کن کن کتابوں کے پڑھنے والے اور دتی کے کن کن اساتذہ کے تلامذہ شریک تھے، جن کے سامنے سیدنا الامام الکبیر پر دتی آنے کے بعد پہلی دفعہ اپنی "عبقریت" کی زندہ شہادت پیش ہوئی، تاہم چونکہ یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب آپ کافیہ جیسی کتاب پڑھ رہے تھے، کافیہ جیسی کتاب پڑھنے والے طالب العلم سے بحث کرنے والے طالب العلموں کے متعلق ہمیں یہ ماننا چاہئے کہ ان کی علمی حیثیت بھی لگ بھگ مولٰنا ہی کے قریب ہوگی، مگر پھر بھی صورت حال کی یہ خصوصیتیں یعنی ایک طرف تنہا ایک کمسن طالب العلم، دوسری طرف طلبہ کا مجمع، ایک طرف شہر دلی کے تدریسی حلقوں میں تعلیم پانے والے لوگ اور دوسری طرف ابھی ابھی ایک قصبہ سے نیا نیا آنے والا متعلم، ان خصوصیتوں کا اقتضا یہی ہے کہ مولٰنا کے سامنے کسی نہ کسی شکل میں وہ "آئینہ" اسی وقت آگیا تھا، جس نے آپ پر یہ واضح کیا ہوگا کہ محض کتابوں کے پڑھنے سے اگر علمی کمال حاصل ہو سکتا ہے تو صرف اتنی بات سے کتابوں کے پڑھنے والے طلبہ کے اس مجمع پر ان کو غلبہ نہ ہوتا؛

لیکن قصہ اگر بحث و مباحثہ کی اسی ایک مجلس پر ختم ہو جاتا، تو مولٰنا پر اپنی حقیقت

ممکن تھا کہ پھر مبہم ہو کر رہ جاتی۔

مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طلبہ کے مجمع پر غلبہ پانے کا یہ قصہ طالب العلموں کے دوسرے حلقوں تک بھی بہ تدریج پہنچا، اور علمی زور آزماؤں کی طرف سے چیلنج پر چیلنج آنے لگے، کمسنی کا زمانہ تھا، امنگوں سے قلب مبارک معمور تھا، پیچھے ہٹ جانے کی ظاہر ہے وجہ ہی کیا ہو سکتی تھی، اور یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مسجد نوازش علی کے مجمع طلبہ کے "پوچھ پاچھ بحث" کے قصہ کو بیان کر کے اسی کے بعد مصنف امام رقم طراز ہیں کہ

"اور جب گفتگو ہوتی اس میں مولوی صاحب کو غلبہ ہوتا" ص۲۵

اس میں شک نہیں الفاظ حد سے زیادہ مجمل ہیں لیکن ان کے اس فقرے سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ "بحث و مباحثہ" کا یہ سلسلہ اسی پہلی مجلس تک محدود ہو کر نہیں رہ گیا تھا، مگر یہ بات کہ اس مجلس کے بعد گفتگو جب جب ہوئی تو وہ کہاں کہاں ہوئی۔ مسجد نوازش علی ہی میں ہوئی یا دوسرے مقامات میں بھی ہوئی، نیز کن کن زمانوں میں ہوئی، ان سوالوں کے جواب سے مصنف امام نے تعرض نہیں کیا ہے، اور کوئی دوسرا ذریعہ بھی ہمارے پاس ایسا نہیں ہے جس سے مدد مل سکتی ہو، لیکن مصنف امام کا یہ فقرہ جب عام ہے تو ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ دلی تشریف لانے کے بعد مسجد نوازش علی میں مناظرہ کی اس پہلی مجلس میں طلبہ کے مجمع پر غالب آنے کے بعد بحث و مباحثہ کا یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہا اور مصنف امام کی شہادت ہے کہ ہمیشہ غلبہ الامام الکبیر کو حاصل ہوتا رہا۔

بلکہ اسی کے بعد مصنف امام نے آگے جو یہ بیان کیا ہے کہ

"ہم میں جو کوئی مغلوب ہوتا، مولوی صاحب سے مدد چاہتا یا مولوی صاحب اس کی خود مدد کرتے"۔

اس سے تو اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ براہ راست فریق بن کر مناظروں اور مباحثوں میں شرکت کے سوا ایسے طالب العلموں کی جو بے چارے کچھ کمزور ہوتے، لیکن بحث و جدال میں پھنس جاتے

تھے، ان کی وکالت کا فرض بھی دلی میں مولانا انجام دے رہے تھے، جس کی دو صورتیں ہوتی تھیں، یعنی کبھی تو اس قسم کے طلبہ کی استدعا اور درخواست پر امداد فرمائی جاتی تھی، اور کبھی خود کسی غریب کی علمی بے کسی کو دیکھ کر امداد کا جذبہ مولانا میں خود پیدا ہو جاتا، اور اس غریب کی طرف آپ دست اعانت دراز فرماتے تھے۔

کچھ بھی ہو، خود فریق بن کر مناظرے کی مجلسوں میں شریک ہونا یا دوسرے بحث و مباحثہ کرنے والے طالب العلموں کی اعانت و امداد کا یہ قصہ میرے نزدیک سیدنا الامام الکبیر کے ایام طالب العلمی کی پوری مدت یا پانچ سال سے اگر تعلق نہیں رکھتا تو اتنا ضرور ماننا پڑے گا کہ پانچ سال کی تعلیمی مدت جو دلی میں آپ کی گذری اس مدت کے ایک بڑے حصہ سے اس کا تعلق ضرور رہے۔

گویا ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ ابتداءً تو بحث و مباحثہ کے اس قصہ کی اس وقت ہوئی جب آپ کافیہ پڑھ رہے تھے، اور جیسے جیسے تعلیم میں آپ ترقی کر رہے تھے علمی مقابلوں میں مسلسل غالب آنے کا تجربہ آپ کی "عبقریت" کو نمایاں کرتا چلا جا رہا تھا، بالآخر ان ہی دوامی تجربات کا نتیجہ یہ ہوا، جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"پھر تو مولوی صاحب ایسے چلے کہ کسی کو ساتھ ہونے کی گنجائش نہ رہی" ص۲۵

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ نہ صرف خود ان پر بلکہ دوسروں پر واضح ہو گیا کہ شیر کا بچہ غلطی سے بکریوں کے گلے میں شریک ہو گیا ہے، شیر کے بچہ پر شیر ہونے کا راز جب تک منکشف نہ ہوا ہو، اس وقت تک ممکن ہے کہ بکریوں کو دیکھ کر کچھ دن گھاس اور پتوں ہی پر دن گذار رہا ہو، لیکن شیر کا بچہ، شیر کا بچہ ہے، بکری کا بچہ نہیں ہے، اس حقیقت کی بے نقابی کے بعد اس کے بکریوں کی غذا اور خوراک پر پڑے رہنے کی خود سوچئے کہ کیا وجہ ہو سکتی تھی،

اور اب آپ کی سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ علم کی بکری کے خطاب کا جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے اس میں

اور حضرت مولانا تھانوی کے حوالہ سے یہ فقرہ نقل کیا گیا تھا کہ

"مولٰنا محمد قاسم نے کتابیں کچھ بہت نہیں پڑھی تھیں، بلکہ پڑھنے کے زمانہ میں بھی بہت شوق و شفقت سے نہیں پڑھا تھا" (قصص ص ۲۹ ۱۳)

ان دونوں فقروں یا بیانوں میں حقیقی اختلاف یا تناقض نہیں ہے۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دلّی آنے سے پہلے دوسروں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علمی کمال کے حصول کا ذریعہ کتب بینی ہے، یہی مولٰنا خیال فرماتے رہے، ہمت تو بچپن ہی سے آپ کی بلند تھی، اپنے فطری حوصلہ کے مطابق ایسے زمانہ میں جب عموماً بچوں میں کتابوں کے مطالعہ کا ذوق پیدا نہیں ہوتا، سیدنا الامام الکبیر کتابوں کے مطالعہ میں مشغول ہو گئے، مکتب کے استاد نے ان کے اسی حال کو دیکھ کر "علم کی بکری" کا خطاب عطا کیا تھا، لیکن دلّی آنے کے بعد کتابوں کے پڑھنے والے شروح اور حاشیوں کے چاٹنے والے طلبہ کی حقیقت ان پر مسلسل واضح ہوتی چلی جاتی تھی۔ دلی کے ان تجربات نے آپ کے قلب مبارک میں "کتب بینی" کے جذبہ کو اگر مضمحل کر دیا ہو، تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے۔

ہمارے تعلیمی نظام کا اس زمانے میں عام دستور یہ تھا کہ مثلاً فلسفہ پڑھاتے ہوئے بتایا تو یہ جاتا تھا کہ کائنات کے حقائق و واقعات کے سمجھنے کی عقلی کوشش کا نام فلسفہ ہے، مگر کیا یہ جاتا تھا کہ سینکڑوں بلکہ شاید ہزاروں سال پہلے ان ہی عام حقائق کے متعلق جن پر کائنات مشتمل ہے کسی سوچنے والے مثلاً ارسطو یا افلاطون یا فیثا غورس وغیرہ نے جو کچھ کہہ دیا تھا، اسی کو ایک واقعہ ٹھہرا لیا گیا، قدرتی حقائق سے توجہ ہٹ گئی، اور پچھلے لوگوں کی بتائی ہوئی باتوں کو ہی "حقائق" کی حیثیت عطا کر دی گئی، بجائے کائنات کے اب ان ہی باتوں کو سمجھ لینا ہی فلسفہ کی تعلیم کا آخری نقطہ عروج تھا، اور یہ حال بھی باقی رہتا تو غنیمت تھا، لیکن جیسے جیسے زمانہ آگے کی طرف بڑھتا رہا، اصلی سوچنے والوں کی تعبیروں کی جگہ ان لوگوں کی کتابیں نصاب میں شریک ہوتی رہیں، جنھوں نے اپنی پوری زندگی میں عالم کی کسی چھوٹی بڑی حقیقت کے متعلق خود کچھ سوچنے سمجھنے

کی زحمت غلطی سے بھی کبھی گوارا نہ کی تھی، یہی مذاق بڑھتے بڑھتے اس زمانہ میں جب کہ سیدنا الامام الکبیر دلی میں تعلیم پا رہے تھے، اس نقطہ تک ترقی کر کے پہنچ گیا تھا، کہ عہد عالمگیری بلکہ اس کے بعد کے چند بیٹ بھرو قاضیوں کی ایسی کتابیں پڑھائی جا رہی تھیں جن میں بجائے حقائق و واقعات کے زیادہ زور "فقرہ تراشی" کی صنعت خاص پر دیا گیا ہے، فلسفہ اور منطق کے سنے سنائے مسائل کو معمے یا چیستاں کا قالب ان کتابوں میں عطا کیا گیا ہے، ان معماتی فقروں کے لئے شرح بھی چیستانی زبان ہی میں لکھی جاتی تھی، اسی لئے شرح کے لئے شرح یا حاشیہ کی ضرورت پھر بھی باقی رہتی تھی، بلکہ بسا اوقات حاشیہ کیلئے بھی حاشیہ، اور حاشیہ در حاشیہ کے لئے حاشیہ کا غیر متناہی سلسلہ جاری رہتا تھا، ان لفظی گورکھ دھندوں میں پھنسنے والے یا پھنسا دیئے جانے والے طالب العلموں کو باوجود فلسفہ پڑھنے کے اس کی ہوا بھی نہیں لگتی تھی کہ انھوں نے اسی دنیا یا اسی عالم کے متعلق اپنی نہیں دوسروں ہی کی سوچی ہوئی باتیں پڑھی ہیں۔

مگر یہ واقعہ ہے کہ متون و شروح و حواشی کے طوفانی چکروں میں تہ و بالا ہونے والے طالب العلموں کی حالت حد سے زیادہ قابل رحم ہو جاتی تھی، بے چارے اپنے وقت اپنی محنت کا سب کچھ ان ہی کتابی معموں کے حل کرنے میں لگا دیتے تھے، لیکن حقیقت غریبوں کی گرفت میں کیا آتی، سچی بات تو یہ ہے کہ ان کی بڑی تعداد لفظی پہیلیوں کے سمجھنے سے بھی معذور ہی رہتی تھی، لیکن غریب کیا کرتے ان کے زمانہ میں معراج کمال ہی یہ تھا کہ اپنے ہی جیسے انسانوں کی سوچی ہوئی باتوں کو نہیں بلکہ بنائی اور صرف بنائی ہوئی عبارتوں کو سمجھ لیا جائے، اور سمجھ کر دوسروں کو سمجھا دیا جائے۔ ان طالب العلموں سے بحث و مباحثہ کے قصوں نے سیدنا الامام الکبیر کو ان کتابوں سے افسردہ خاطر بنا دیا اور اس نتیجے تک تو بسا اوقات اول میں نہیں، تو بالآخر عموماً ذہین آدمی پہنچ جاتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ زیادہ سے زیادہ یہ ایک منفی کیفیت ہوتی ہے جو کچھ رکھنے والوں کے قلوب پر طاری ہوتی ہے، شروح و حواشی کے اس طومار میں کچھ نہیں مل سکتا، اس سے زیادہ قنوطی کیفیت اور کسی نتیجہ کو پیدا نہیں کر سکتی، مگر اسی سلبی کیفیت کی مد مقابل ایجابی کیفیت یعنی پھر کچھ ملنے کی صحیح

صورت کیا ہے ؟ اس سوال کا واقعی جواب ہر شخص کے سامنے نہیں آسکتا، اتنا اندازہ تو ممکن ہے کہ دوسروں کو بھی ہو کہ دوسرے سوچنے والوں کی سوچی ہوئی باتوں کا حجاب سامنے سے اٹھا کر براہ راست حقائق و واقعات کو اپنے سامنے لایا جائے، اس میں شک نہیں کہ راہ کی بڑی منزل اس شخص کی بھی کٹ جاتی ہے جو یہاں تک پہنچ گیا ہو، مگر اس کیفیت سے صحیح معنوں میں مستفید وہی ہو سکتا ہے جو "جبلت فائقہ" سے سرفراز ہو، اور "عبقریت" کی خداداد نعمت کے ساتھ دنیا میں پیدا ہوا ہو۔

سیدنا الامام الکبیر کا حال اس باب میں کیا تھا، اس کی شہادت تو گذر ہی چکی، کہ کچھ ہی دن بعد لوگوں نے پالیا کہ ان کے ساتھ ہونے یا چلنے کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے، لیکن یہ تو اجمالی بیان مصنف امام کا تھا، آگے اسی کے بعد انھوں نے لکھا ہے کہ سلم، میبذی جیسی منطق و فلسفہ کی متوسط کتابوں کو نہیں بلکہ وہ ارقام فرماتے ہیں، اور اپنی آنکھوں دیکھی بات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ

"معقول کی مشکل کتابیں میر زاہد، قاضی، صدرا، شمس بازغہ ایسا پڑھا کرتے تھے جیسے حافظ منزل سناتا ہے" ص۲۸

حکیم الامت تھانوی نے خود تو نہیں دیکھا تھا، لیکن دیکھنے والوں سے یہ سنا تھا، سیدنا الامام الکبیر کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

"صدرا، شمس بازغہ کا کبھی ترجمہ نہیں کیا، نہ مطالعہ کیا، ایسا پڑھتے تھے، جیسے تلاوت ہو رہی ہے" (قصص الاکابر ص۲۹ الہادی ماہ جمادی الثانی ۵۷ھ)

اس میں شک نہیں کہ "چنانکہ افتد و دانی" کی منزل سے براہ راست جو نہ گذرا ہو، اور میر زاہد، صدرا و شمس بازغہ جیسی کتابوں کی خصوصیتوں سے واقف ہو، اس کے لئے تو مصنف امام یا مرشد تھانوی کی یہ شہادتیں موجب حیرت ہوں گی۔

عام طور پر دستور کے مطابق روزانہ ان کتابوں کا درس صفحہ آدھ صفحہ سے زیادہ نہیں ہوتا، بلکہ معقولات کی تعلیم و تدریس میں جہاں غیر معمولی غلو اور استغراق سے کام لیا جاتا ہے، وہاں کم از کم میر زاہد

کے متعلق تو میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ دو دو تین تین سطروں سے زیادہ ایک دن کا سبق متجاوز نہیں ہوتا تھا، مگر ان ہی کتابوں کو قرآن کی منزل کی طرح فراٹا بھرتے ہوئے استاد کو سناتے چلا جانا، اس کے وہی مطلب ہو سکتے ہیں، جو نہیں جانتے ہیں، اور سیدنا الامام الکبیر کی عبقری خصوصیتوں، جبلی ملکات فائقہ سے ناواقف ہیں وہ شاید بے ساختہ یہی کہہ بیٹھیں گے کہ ایسی صورت میں ان کی تلاوت لفظی تلاوت سے آگے نہ بڑھتی ہوگی، یعنی معنی مطلب سمجھے بغیر صرف الفاظ کا اعادہ کرتے ہوں گے مصنف امام نے اپنی اس شہادت کو ادا کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا تھا، اس وقت بھی یہ شبہ کیا گیا تھا، ان کا بیان ہے کہ قرآنی منزل کی طرح معقولات کی ان درسی کتابوں کو سناتے ہوئے دیکھ کر

"والد مرحوم (مولٰنا مملوک العلی) کے بعض شاگردوں نے کہا بھی کہ حضرت یہ تو سمجھتے ہوئے معلوم نہیں ہوتے۔" ص۲۵

جواب میں انھوں نے لکھا ہے کہ مولٰنا مملوک العلی صاحب نے ان لوگوں سے کہا کہ

"میرے سامنے طالب العلم بے سمجھے چل نہیں سکتا" ص۲۵

مولانا مملوک العلی کو اس کا اندازہ کس ذریعہ سے ہوتا تھا، مصنف امام نے اپنے ذاتی تجربہ کی بنیاد پر اس کا جواب یہ دیا ہے کہ

"واقعی ان کے (مولانا مملوک العلی کے) سامنے بے سمجھے چلنا مشکل تھا، وہ طرز عبارت سے سمجھ لیتے تھے کہ یہ (طالب العلم) مطلب سمجھا ہوا ہے یا نہیں۔" ص۲۵

جس کا مطلب بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ سمجھی ہوئی عبارت اور بے سمجھی عبارت کے پڑھنے میں بین فرق سننے والے کو محسوس ہوتا ہے، خصوصاً مولانا مملوک العلی صاحب جیسے کہنہ مشق، پرانے ہزاروں کو پڑھائی ہوئی استاد کیلئے یہ مسئلہ یقیناً چنداں دشوار نہ تھا، اسی کے ساتھ ایک اور نکتہ کی طرف مصنف امام ہی نے اشارہ کیا ہے، یعنی انھوں نے لکھا کہ جس وقت سیدنا الامام الکبیر ان کتابوں کو استاذ کے سامنے مذکورہ بالا نوعیت کے ساتھ گذار رہے تھے، تو عربی عبارت کا ترجمہ

اردو زبان میں جیساکہ اس زمانہ میں قاعدہ ہے اور پہلے بھی تھا، نہیں کرتے تھے، مگر اسی کے ساتھ فرماتے ہیں کہ مولٰنا قاسم

"کہیں کہیں کوئی لفظ فرماتے جاتے تھے" ص۲۵

یعنی سوائے ترجمہ کے استاذ پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ عبارت کا مطلب میں نے سمجھ لیا ہے حسب ضرورت بیچ بیچ میں لفظ دو لفظ کا اضافہ اپنی طرف سے کر دیتے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عبارت کی ساری پیچیدگیوں کا حل اسی لفظ دو لفظ کے اضافے میں پوشیدہ تھا، اور استاذ کو مطمئن کر دیتا تھا کہ جو کچھ پڑھا جا رہا ہے سمجھ بوجھ کر پڑھا جا رہا ہے۔

بجائے خود درس کا یہ شاید اچھوتا اور نرالا طریقہ تھا، جس کی نظیر کم از کم میری معلومات کی حد تک نہ اس سے پہلے ملتی ہے اور نہ بعد، نیز اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت حکیم الامت تھانوی کے ان الفاظ سے کہ مولٰنا محمد قاسم نے کتابیں کچھ بہت نہیں پڑھی تھیں، ان سے بعضوں کو جو یہ مغالطہ ہوا کہ نظامیہ نصاب کی تکمیل مولانا نے نہیں فرمائی تھی اس کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے، درس نظامیہ کا مایۂ ناز عنصر معقولات کی یہی کتابیں ہیں، زواہد اور صدرا و شمس بازغہ کے بعد خود بتائیے کہ یہ کہنا کہاں تک درست ہو سکتا ہے کہ "معقولات کی کل نصابی کتابیں مولانا نے نہیں پڑھی تھیں" ہاں ان کتابوں کے پڑھنے کا مذکورہ بالا طریقہ یقیناً عجیب و غریب تھا جس طریقہ سے مولانا ان کو پڑھتے تھے، حکیم الامت کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی درسی کتابوں کے "مطالعہ" کے بھی پابند نہ تھے، جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ نہ سبق پڑھنے سے پہلے جیساکہ دستور ہے اپنے سبق کو دیکھ کر استاذ کے پاس آتے تھے اور شاید پڑھنے کے بعد بھی اس سبق کو دہرانے کے عادی نہ تھے، مطالعہ سے بے پروائی بڑھتے بڑھتے کس حد تک پہنچ گئی تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے جس کا ذکر مولٰنا حبیب الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ سابق مہتمم دارالعلوم کے حوالہ سے ارواح ثلثہ میں کیا گیا ہے حاصل جس کا یہ ہے کہ مفتی صدرالدین خانصاحب نے صدرا جیسی کتاب میں مولانا محمد قاسم کا امتحان لینا چاہا، باوجود اس علم کے کہ صدرا میں امتحان ہوگا، مطالعہ کی زحمت مولٰنا نے پھر بھی برداشت نہ کی، امتحان میں مفتی صاحب

نے کسی عبارت کا مطلب دریافت کیا' مولانا حبیب الرحمٰن فرماتے تھے کہ مولانا محمد قاسم نے یہ جگہ کتاب کی کبھی دیکھی بھی نہ تھی ص۱۹۶ آگے قصہ جو کچھ ہوا' اس کا ذکر اپنے مقام پر کیا جائے گا۔

بہر حال قطعی طور پر کچھ کہنا دشوار ہے' لیکن اِدھر اُدھر بکھری ہوئی منتشر معلومات کو جمع کرنے سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ کتابیوں یا کتاب پڑھنے والے طلبہ کی طرف سے تو افسردگی کی ابتداء ان مناظروں اور مباحثوں سے سیدنا الامام الکبیر کے قلب مبارک میں ہوئی جو وقتاً فوقتاً مولانا نوازش علی مرحوم کی مسجد میں رہنے والے طالب العلموں یا دلی کے دوسرے طالب العلموں سے ہوتے رہے پھر جیسے جیسے تعلیمی ترقیوں کے زینے طے ہوتے جاتے تھے اور بجائے چھوٹی کتابوں کے بڑی کتابیں جن کے ناموں سے اس عہد کے اہل علم مرعوب تھے' جب خود ان کتابوں کے پڑھنے کی نوبت آئی تو خود اپنی ہی جیسے انسانوں کی ساختہ و پراختہ کتابوں سے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسن ظن کا پارہ کچھ نیچے ہی اترتا چلا گیا' اور کتابوں سے بے تعلقی کے جو قصے آپ کے متعلق نقل کئے جاتے ہیں جہاں تک میرا خیال ہے' ان کی بنیاد شاید آپ کی ان ہی تجربی مایوسیوں پر قائم ہے' اور حضرت حکیم الامت تھانوی کی طرف قصص الاکابر میں یہ لطیفہ جو منسوب کیا گیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہما کا ذکر کرتے ہوئے حکیم الامت نے فرمایا کہ

"یہ حضرات جب دلی میں پڑھتے تھے تو آپس میں مزاحاً ایک دوسرے سے کہتے کہ میاں کیا بات ہے کہ ہم ان بڈھوں سے کسی بات میں کم نہیں' بلکہ ہمارا علم تو تازہ ہے' اور ان بڈھوں کا علم پرانا ہو گیا' پھر ہم ذہین بھی ان سے زیادہ ہیں' مگر پھر بھی جو ان کی قدر ہے ہماری نہیں ہے' ان کے سامنے ہم کو کوئی پوچھتا ہی نہیں' یہ کیا بات ہے' دوسرے صاحب کہتے کہ میاں ذرا ان بڈھوں کو کھسکنے دو' بس پھر تو ہم ہونگے اور تم ہو گے"

(قصص الہادی ماہ جمادی الثانی ۵۰ھ ص۳۲)

آگے جامع ملفوظات نے حکیم الامت رح کی طرف عربی زبان کا یہ فقرہ بھی منسوب کیا ہے' یعنی اس لطیفہ کا تذکرہ کرنے کے بعد مولانا تھانوی نے فرمایا کہ

| وقد كان كما تفرسا رضی الله تعالیٰ عنهما | اور واقعہ بھی وہی ہو کر رہا جیسا کہ ان دونوں بزرگوں نے تاڑ لیا تھا۔ |
|---|---|

نہیں کہا جا سکتا کہ مذکورہ بالا مزاحی مکالمہ دونوں حضرات میں جو ہوا تھا، اس میں کون سائل اور کون مجیب تھا، لیکن سوال و جواب کے مجموعہ سے بطور قدر مشترک کے اتنی بات بہر حال سمجھ میں آتی ہے کہ خواہ یہ گفتگو باہم مزاح و مذاق ہی کے پیرائے میں ہوئی ہو لیکن کتابی طلبہ اور جن کتابوں کو اس زمانے میں طلبہ پڑھتے تھے ان کے ساتھ ساتھ شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنے عہد کے علماء یا کم از کم دلی میں اس وقت علم و فضل کی مسندوں پر جو جلوہ گر تھے ان کے متعلق بھی عقیدت کے احساسات دھیمے پڑتے جاتے تھے اور گو بظاہر گونہ عُجب و خود پسندی پر یہ الفاظ دلالت کرتے ہیں، لیکن راستہ کے چلنے والے جانتے ہیں کہ علم صحیح کی یافت تک پہنچنے سے پہلے راہ گیروں کو اس قسم کی منزلوں سے بھی درمیان میں قدرتاً گذرنا پڑتا ہی ہے۔ تباہی اس کے لئے ہے، جو بجائے گذر جانے کے راہ کی ان ہی منزلوں پر ٹھہر جائے جو ٹھہرنے کے لئے نہیں بلکہ صرف اس لئے سامنے لائی جاتی ہیں کہ گذرنے والے ان سے گذر جائیں، تعجب ان کو ہوتا ہے جن کو چلنے کی توفیق ہی میسر نہ ہوئی، ورنہ چلنے والوں نے تو ہمیشہ اسی موقعہ پر "کاش کردے وگذشتے" کی آرزو ظاہر کی ہے، وہ مسکین بے چارہ کیا گذرے گا، جو چلا ہی نہیں اور چلے بغیر بیٹھے بیٹھے طنز و طعن کے تیر چلنے والوں پر چلاتا رہتا ہے، جس گذرنے والے کا یہ حال ہو، گذرنے کے بعد جو کہتا ہو، حکیم الامت ہی راوی ہیں۔

"لوگ جان نہ گئے ہوتے تو ایسا گم ہوتا کہ کوئی بھی نہ پہچانتا کہ قاسم دنیا میں پیدا بھی ہوا تھا" (قصص ص۱۳)

یا اسی مطلب کو امیر شاہ خانصاحب ان الفاظ میں ادا کیا کرتے تھے، یعنی سیدنا الامام الکبیر فرماتے کہ

"اگر مولویت کی یہ قید نہ ہوتی تو قاسم کی خاک تک کا بھی پتہ نہ چلتا، جانوروں کا بھی گھونسلا ہوتا ہے میرے لئے تو یہ بھی نہ ہوتا اور کوئی میری ہوا تک نہ پاتا" (ارواح ص۱۷۱)

اور بڑی بڑی تنخواہوں پر بلانے والوں کو جو یہ جواب کہلا بھیجتا،

"مجھے صاحب کمال سمجھ کر بلاتے ہیں اور میں اپنے اندر کوئی کمال نہیں پاتا" (ارواح ص۱۶)

اور ہمیشہ یہی حال مکالمے کے دوسرے رکن کا تھا، حکیم الامت ہی فرمایا کرتے تھے کہ

"مولانا گنگوہی نے ایک جگہ قسم کھائی کہ مجھ میں کوئی کمال نہیں ہے" قصص ص۲۹

(الہادی ربیع الثانی ۵۷ھ)

ذرا "قسم" کے لفظ پر غور کیجئے، اور سوچئے کہ مولانا گنگوہی جیسی نقیۃ النفس والفطرت ہستی اسلام کے قانون یمین (قسم) کو اپنی بے کمالی کی شہادت میں استعمال کرتی ہے، یقیناً یہ کوئی معمولی بات نہیں ہو سکتی۔[۱]

خیر یہ قصہ تو بعد کا ہے، بدگمانوں میں بدگمانی کا زہر شاید پھوٹ نہ پڑے، اس لئے ضمناً یہاں بھی اس کا ذکر کر دیا گیا، ورنہ اس وقت تو یہ بیان کر رہا تھا کہ "کتاب کی بکری" کے خطاب سے جسکی علمی زندگی دیوبند کے مہتابی مکتب میں شروع ہوئی تھی، آگے علم ہی کی راہ میں کن انقلابی منزلوں سے اسکو گذرنا پڑا، پہلے کتابیوں، یا کتاب کے کیڑے بن کر طالب العلمی کرنے والے طالب العلموں سے اس کے اندر ترشی پیدا ہوئی، پھر وہ ان کتابوں سے بھی گونہ مایوس ہوا، جن میں خدا کی کتاب اور خدا کے رسول کی کتابوں سے بھی زیادہ اور بہت زیادہ دینے والے اپنا وقت دے رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہی کہ بتدریج اپنے عہد کے اہل علم وفضل کا وزن بھی اس کے دل سے کچھ نکلا سا چلا جاتا تھا، یا کہئے تو کہہ سکتے ہیں کہ شاید نکل چکا تھا۔

ایام طلب وتعلیم کی متعلقہ روایتوں میں ہم اس قسم کے قصے جو پاتے ہیں، مثلاً حکیم الامت کا بیان ہے کہ

---

[۱] بیرونی آمیزشوں سے پاک رکھتے ہوئے قرآن کا پڑھنے والا اس کتاب کی پہلی آیت الحمد للہ رب العلمین ہی کی روشنی میں وہی پاتا ہے جس کا اعلان مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ قسم کھا کر فرما رہے تھے، باقی قرآن کے ساتھ جو اپنی حسی معلومات پر بھی بھروسہ کرتے ہیں ان کے لئے حکیم الامت کی یہ توجیہ تشفی بخش ہو سکتی ہے کہ ہر صاحب کمال کا قاعدہ ہے کہ جو کمالات ابھی اسے حاصل نہیں ہوئے ہیں اُنکے مقابلہ میں کمالات حاصلہ کی کوئی قیمت نہیں پاتا جیسے لکھ پتی کے مقابلہ میں چند پیسوں والا اپنے پیسوں کو مال نہیں سمجھتا ۱۲

"مولانا محمد قاسم صاحب فرماتے تھے کہ حدیث پڑھنے کے وقت میں یہی سوچا
کرتا تھا کہ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں فرمائی "
(قصص ص۲۹ الہادی ماہ جمادی الثانی ۵۱ھ)

جس کا مطلب میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ جب آپ حدیث پڑھنے لگے، تو عام طور پر حدیث کے شروح وحواشی میں جن باتوں سے بحث کی جاتی ہے، بجائے ان کے اسلامی احکام وقوانین کی روح اور بنیاد کے دریافت کا نیا شوق اور ولولہ آپ میں پیدا ہو گیا تھا، جس میں نہ ان کو ان کتابوں سے مدد مل سکتی تھی جن کا عموماً اس زمانے کے مدرسوں میں رواج تھا، اور نہ ان اساتذہ سے اس باب میں وہ چنداں مستفید ہو سکتے تھے جو نہ اس طرزِ فکر کے عادی تھے اور نہ اپنے درس میں دین کے اس پہلو پر اس زمانہ میں کوئی بحث کرتا تھا، اور جو حال آپ کا اللہ کے رسول کی حدیثوں اور حدیث کی کتابوں کے متعلق ہو گیا تھا، کچھ یہی کیفیت خود اللہ کی کتاب کے متعلق بھی ان کے اندر پیدا ہو گئی تھی، حضرت حکیم الامت ہی اس خبر کے راوی ہیں کہ

"مولانا محمد قاسم فرمایا کرتے تھے کہ قرآن مجید کے الفاظ میں ہی غور کرنا چاہئے تو مطلب
بالکل صاف ہو جاتا ہے " (قصص ص۳۰ الہادی ماہ جمادی الاولیٰ ۵۱ھ)

ذاتی تجربہ اور پختہ کاری کی یہ ایسی بات ہے جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ان لوگوں کو شاید نہیں ہو سکتا جو قرآن کے قطعی الدلالۃ قطعی الثبوت نصوص اور آیتوں کے حکم واسرار کو ان تخمینی اور ظنی احتمالات کی روشنی میں سمجھنے یا سمجھانے کے عادی ہیں، جن کا ذکر تفسیر کی عام کتابوں میں کیا جاتا ہے، غیر مشکوک کے ساتھ جب مشکوک مقدمات کے معانی کو بھی ملا دیا جائے تو خود سوچئے کہ غیر مشکوک غیر مشکوک کب رہ جاتا ہے؟

بہر حال میرے نزدیک سیدنا الامام الکبیر کے مذکورہ بالا بیان کا مآل اور حاصل بھی یہی ہے کہ اللہ کے رسول کی حدیثوں کے اسرار وحکم سمجھنے میں عام طور پر شروح وحواشی سے مستغنی ہو گئے تھے، کچھ یہی حال ان پر خود اللہ کی کتاب کے متعلق بھی طاری ہو گیا تھا، وہ اپنے اور اپنے خدا کے درمیان

اسرار و حکم قرآن کے سمجھنے کے لئے کسی دوسرے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے، بلکہ ان علوم قرآن کا سب سے آسان طریقہ آپ کے نزدیک یہی تھا کہ بجائے دوسروں کے، براہ راست حق تعالیٰ کے الفاظ ہی میں غور و فکر کیا جائے، اس طریقہ سے ان کا احساس و تجربہ یہ تھا کہ قرآن کا مقصد واضح اور صاف ہو جاتا ہے، ان کے طریقۂ فکر کی ان خصوصیتوں پر تفصیلی بحث تو آئندہ آئے گی، اس وقت اجمالاً ان امور کا ذکر جیسا کہ میں نے عرض کیا صرف اس لئے کیا گیا کہ درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے اپنی تعلیمی زندگی میں وہ جس مقام تک پہنچے اس کا نقشہ ترتیب کے ساتھ لوگوں کے سامنے آجائے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس حد تک میں اپنے کام سے فارغ ہو چکا ہوں، گویا سیدنا الامام الکبیر کی تعلیمی زندگی کے متعلق اب تک صرف اسی سوال کا کہ آپ کس طرح پڑھتے رہے اور پڑھنے کے اس زمانہ میں فکر و نظر کی کن ارتقائی منزلوں سے آپ گذرتے رہے جواب دیا گیا ہے، باقی یہ باتیں کہ کن کن علوم و فنون کی کتابیں اس عرصہ میں آپ پڑھتے رہے اور کن کن استادوں سے پڑھتے رہے، اگرچہ ان کے متعلق بھی گذشتہ اوراق میں کچھ نہ کچھ چیزوں کا، خواہ ضمناً ہی، تھوڑا بہت ذکر آتا رہا ہے، اور جہاں تک میرا خیال ہے، طالب العلم خصوصاً ایسے عبقری الفطرت طالب العلم جیسے حضرت والا تھے، اس قسم کے طلبہ کے متعلق جوہری اور اصلی سوال یہی ہوتا ہے کہ وہ کس طرح پڑھتے رہے، نتیجہ کی نوعیت کلیۃً نہیں تو عموماً اسی طرزِ عمل کی نوعیت کے تابع ہوتی ہے، کتابوں اور استاذوں کا سوال "طبائع فائقہ" کے لئے میرے نزدیک چنداں اہمیت نہیں رکھتا، بقول شخصے

رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بن جائے

جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی مے خانہ بنے

دراصل یہی وجہ ہوئی کہ زیادہ تر اس سلسلہ میں میری توجہ حضرت والا کی تعلیمی زندگی کے اسی سوال پر مرکوز رہی، لیکن آپ کی سوانح عمری جب لکھی جا رہی ہے تو ضرورت ہے کہ اہمیت ہو یا نہ ہو، مگر ان سوالوں پر بحث کی جائے۔

کتابوں کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ معقولات کے سلسلہ میں صدرا، شمس بازغہ، میر زاہد کا

ذکر تو صراحۃً مصنف امام نے فرمایا ہے، درس نظامیہ کے معقولاتی حصہ کی آخری اور یہ چوٹی کی کتابیں ہیں، ان کتابوں کے پڑھنے والوں کے متعلق یہی توقع کی جاتی ہے کہ جن کتابوں کا درجہ تعلیمی ان سے فروتر ہے، کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ وہ نہ پڑھی گئی ہوں، یہ صحیح ہے جیسا کہ آپ سن چکے کہ ایک زمانہ ایام طلب ہی کے دنوں میں ایسا بھی آیا جب اپنے ہی جیسے انسانوں کی بنائی ہوئی کتابوں کے ساتھ حسن ظن کہئے یا مرعوبیت کی وہ کیفیت آپ میں باقی نہیں رہی تھی جو عموماً اس زمانہ کے اہل علم کے قلوب میں پائی جاتی تھی، لیکن اس حال تک آپ اچانک نہیں پہنچے تھے، بلکہ ان ہی معقولات کی کتابوں کے متعلق آپ ہی کا ایک وہ حال بھی تھا، جس کا اندازہ اس قصہ سے ہوتا ہے جس کا ذکر مولوی عاشق الٰہی مرحوم نے تذکرۃ الرشید میں فرمایا ہے۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ درس نظامیہ کے نصاب میں جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں ملا محب اللہ بہاری کے منطقی یا معقولاتی متن سلم العلوم کی ایک نہیں بلکہ متعدد شرحیں داخل ہیں اور باضابطہ لزوماً طلبہ کو پڑھائی جاتی ہیں، ملا حسن اور قاضی مبارک کی شروح سے سلم کے تصورات اور مولوی حمد اللہ سندیلوی کی شرح کے ذریعہ سے سلم کے تصدیقات پڑھائے جاتے تھے، ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ سلم العلوم کے براہ راست متن کے پڑھنے کی ضرورت قدرتاً باقی نہیں رہتی، مگر معقولات کی اسی غیر ضروری کتاب کے متعلق مولوی عاشق الٰہی صاحب کی بیان کردہ اس روایت کو سنئے انہوں نے لکھا ہے۔

"اس کا (یعنی اس قصے کا) تذکرہ خود حضرت امام ربانی (مولانا گنگوہیؒ) نے بارہا فرمایا کہ جب میں اور مولوی محمد قاسم صاحب دہلی میں استاذ (مولٰنا مملوک العلی) سے پڑھتے تھے، ہمارا ارادہ سلم شروع کرنے کا ہوا لیکن مولانا (مملوک العلی صاحب) کو فرصت نہ تھی، اسلئے انکار فرماتے رہے، بالآخر میں نے عرض کیا کہ حضرت ہفتہ میں دوبار صرف پیر اور جمعرات (یا جمعہ) کو پڑھا دیا کیجئے"۔

مولانا گنگوہی فرماتے تھے کہ بڑی آرزو منت سے یہ التجا (یعنی ہفتہ میں دو دن درس کی التجا) چونکہ منظور

ہوئی تھی اس لئے

"اس سبق کی ہمیں بڑی قدر تھی" صلا تذکرۃ الرشید ج ۱

ظاہر ہے کہ یہ "قدر" صرف حضرت گنگوہی تک محدود نہ تھی جمع متکلم "ہمیں" کا لفظ بھی یہی بتا رہا ہے کہ مولٰنا گنگوہی اس قدردانی میں تنہا نہ تھے۔

خیال کرنے کی بات ہے کہ تین تین دفعہ جو متن اپنی شرح کے ساتھ پڑھایا جا رہا ہو، متن کی اس کتاب تک کو جو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہو، اور روزانہ سہی ہفتہ میں دو بار سہی، درس کے دنوں میں موقعہ نہ ہو تو جمعہ تعطیل ہی کے دن سہی، مگر بہر حال اس غیر ضروری متن کو جو پڑھ کر رہا ہو، طلب علم کے ایام میں اس حال سے بھی جو گذر چکا ہو، اس کے متعلق یہ کون سوچ سکتا ہے کہ نصاب کی کوئی کتاب اس کے پڑھنے سے رہ گئی ہوگی۔

پس واقعہ وہی ہے جس کی طرف مصنف امام نے اجمالاً اشارہ فرمایا ہے، یعنی ایک موقعہ پر یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ کتابوں کے پڑھنے میں جو حال مولٰنا نانوتوی کا تھا، یہی حال مولٰنا رشید احمد صاحب گنگوہی کا بھی تھا، یہ اطلاع دیتے ہیں کہ دونوں بزرگوں میں

"اسی زمانہ سے دوستی اور "ہم سبقی" رہی۔" صت۳

جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ "ہم سبقی" کا جو رشتہ دونوں بزرگوں میں قائم ہوا، آخر وقت تک باقی رہا، اسی بنیاد پر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ ان دونوں ہم سبقوں میں سے ایک یعنی مولانا گنگوہی کے متعلق مولوی عاشق الٰہی مرحوم نے جو یہ لکھا ہے کہ

"صحاح ستہ کے علاوہ معقول میں منطق و فلسفہ، ادب و ہیئت و ریاضی اور منقول میں تفسیر و اصول و فقہ و معانی وغیرہا اکثر کتابیں آپ نے مولٰنا الشیخ مملوک العلی صاحب سے پڑھیں۔"

بجنسہ یہی روداد دوسرے "ہم سبق" یعنی مولٰنا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے تعلیمی نصاب کی ہے۔

اس بنیاد پر یہ سمجھنا چاہئے کہ درس نظامیہ کے عام اور متداول علوم کی کتابیں دونوں حضرات

کی مولنا مملوک العلی صاحب کے یہاں پوری ہوئیں۔

مصنف امام نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مولنا مملوک العلی صاحب نے مولانا محمد قاسم کا نام عربک کالج میں لکھوا دیا تھا، تفصیلاً جس پر بحث کرچکا ہوں، اسی سلسلہ میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا مملوک العلی صاحب نے عربک کالج

"کے مدرس ریاضی کو فرمایا کہ ان کے (مولوی محمد قاسم) کے حال سے متعرض نہ ہو جیو میں ان کو پڑھالوں گا، اور فرمایا کہ تم (یعنی مولوی محمد قاسم کو خطاب کرکے کہا تھا کہ) اقلیدس خود دیکھ لو، اور قواعد حساب کی مشق کرلو" ص۲۵

اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ جدید طریقہ سے اقلیدس یا حساب کی جو تعلیم عربی کالج میں ہوتی تھی، مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے لئے ان کے استاذ نے باضابطہ کالج کے کلاس میں شریک ہوکر اس کے پڑھنے کی ضرورت نہیں محسوس کی، جس کی وجہ وہی ہوسکتی ہے کہ قدیم طریقہ سے عربی زبان میں ان چیزوں کی تعلیم مولنا مملوک العلی صاحب سے وہ پا چکے تھے، صرف دیکھ لینا اور حساب کی مشق کرلینا کافی تھا۔

بہر حال حدیث کے سوا جہاں تک لوگوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، سیدنا الامام الکبیر نے دلی میں جو کچھ بھی پڑھا، مولنا مملوک العلی صاحب ہی سے پڑھا، مگر ہفتم سبقی" کے جس دوامی رشتہ کا ذکر مصنف امام نے کیا ہے، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے مولوی عاشق الٰہی مرحوم کی دی ہوئی اس خبر پر اگر غور کیا جائے، یعنی علاوہ مولنا مملوک العلی صاحب کے جن سے وہ بھی لکھتے ہیں کہ مولنا رشید احمد صاحب نے حدیث کے سوا اکثر کتابیں پڑھیں، وہ اطلاع دیتے ہیں کہ دلی میں مولنا گنگوہی نے

"باقی کتابوں میں کلاً یا جزءً" آپ کو دیگر علماء سے تلمذ رہا، انہیں علماء آخر میں مولانا مفتی صدر الدین صاحب اور قاضی احمد الدین پنجابی ہیں رحمہم اللہ وطاب ثراہم" ص۳۵ ج ا تذکرہ

شاید پہلے میں کہیں عرض کرچکا ہوں کہ قاضی احمد الدین پنجابی سے تو مولانا رشید احمد گنگوہی دلی

پہنچکر اس وقت تک پڑھتے رہے، جب تک "ہم سبقی" کا یہ رشتہ مولنٰنا نانوتوی کے ساتھ قائم نہیں ہوا تھا، اس لئے مولوی احمدالدین نے بھی مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کچھ پڑھا ہو، اس کا تو احتمال پیدا نہیں ہوتا، لیکن مفتی صدرالدین رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت گنگوہی کا علمی استفادہ جب یقینی ہے، اور جہاں تک قرائن کا اقتضا ہے، دونوں حضرات کی "ہم سبقی" کے رشتہ کے بعد مفتی صاحب سے مولنٰنا گنگوہی نے استفادہ فرمایا ہے، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ دوسرے "ہم سبق" نے اس استفادہ سے گریز کی راہ کیوں اختیار کی ہوگی، خصوصاً مفتی صاحب پر منقولیت سے زیادہ معقولیت کا غلبہ تھا، جس میں چاہئے تو یہی کہ مولنٰنا گنگوہی سے زیادہ مولانا نانوتوی کے لئے نسبتاً زیادہ کشش تھی۔

اس قسم کے واقعات مثلاً مولوی عاشق الٰہی مرحوم نے تذکرۃ الرشید میں نقل کیا ہے کہ

"غدر کے بعد حضرت (مولنٰنا گنگوہی) کو دہلی تشریف لانے کا اتفاق ہوا، تو مفتی صدرالدین صاحب سے ملنے تشریف لے گئے، مفتی صاحب نہایت ہی شفقت و محبت سے ملے اور سب حالات پوچھنے لگے"۔

ان ہی حالات میں سب سے اہم حال جسے مفتی صاحب اس وقت دریافت فرما رہے تھے، یہ تھا،

"میاں قاسم کیا کرتے ہیں؟"

حضرت گنگوہی نے جواب میں اطلاع دی کہ

"مطبع میں تصحیح کرتے ہیں آٹھ یا دس روپے تنخواہ ہے"

لکھا ہے کہ اس عجیب و غریب خبر کو سن کر مفتی صاحب سناٹے میں آگئے، مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ

"ہاتھ پر ہاتھ مار کر فرمانے لگے، قاسم ایسا سستا قاسم ایسا سستا"

اور آخر میں فرمانے لگے، کہ

"فقیر ہو گئے فقیر ہو گئے" ص۳۲ تذکرۃ الرشید

غالباً خود مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کی ہوئی یہ روایت ہے، جسے مولوی عاشق الٰہی صاحب نے نقل فرمایا ہے، اس مکالمہ میں بھی مفتی صاحب نے جن الفاظ میں سیدنا الامام الکبیر کا ذکر سوز و درد کے جس خاص طریقہ سے فرمایا ہے، اس سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ "ہم سبقی" کا ذکر مصنف امام نے اجمالاً کیا ہے، اس کی تفصیل میں وہ سارے اسباق شریک ہیں، جنھیں ہم سبقی کی ابتدا سے آخر وقت تک دونوں حضرات پڑھتے رہے۔

بہرحال حدیث کے سوا عام علوم و فنون اور ان کی کتابوں کا یہ تذکرہ تھا، باقی رہا علم حدیث، سو مصنف امام اگرچہ یہ فرماتے ہیں کہ

"آخر حدیث جناب شاہ عبدالغنی مرحوم کی خدمت میں پڑھی" ص۲

بظاہر اس سے سمجھنے والے یہی سمجھ سکتے ہیں کہ حدیث کی کل کتابیں دونوں حضرات نے حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں، خصوصاً مولوی عاشق الٰہی مرحوم نے مولانا گنگوہی کے متعلق جو یہ لکھا ہے کہ

"صحاح ستہ قریب قریب کل حرفاً حرفاً حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھا" ص۳۵

"ہم سبقی" کے دوامی تعلق کی بنیاد پر سیدنا الامام الکبیر کے متعلق بھی اسی کو اگر واقعہ مان لیں تو حالات کا اقتضا بھی بظاہر یہی ہے۔

لیکن مصنف امام کے سوا قاسمی سوانح و حالات کے بیان کرنے والوں نے "حدیث" کے متعلق کچھ تفصیل بھی بیان کی ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض ناگزیر اسباب جن کا باوجود تلاش کے اب تک مجھے پتہ نہ چل سکا کہ صحاح ستہ کی (۶) کتابوں میں سے ایک اہم کتاب سنن ابوداؤد حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ سے مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نہ پڑھ سکے، گویا یہی ایک کتاب ایسی ملتی ہے جس کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ ہم سبقی کا یہ قصہ کسی وجہ سے باقی نہ رہا۔ علالت یا کوئی اتفاقی خانگی حادثہ، یا کیا رکاوٹ پیش آئی، عرض کر چکا ہوں کہ اس کا پتہ تو نہ چل سکا، لیکن صحاح ستہ میں

سنن ابو داؤد مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے شاہ عبد الغنی سے نہیں پڑھی، اس کی شہادت تو ان کے براہ راست شاگرد مولانا منصور علی خاں الحیدر آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "مذہب منصور" میں دی ہے، شاہ عبد الغنی رحمۃ اللہ علیہ کا ادر نیز یہ کہ وہ ہجرت کر کے دلّی سے مدینہ چلے گئے تھے، ان باتوں کا تذکرہ کرنے کے بعد مولانا منصور علی خاں صاحب فرماتے ہیں کہ وہ

"مولانا مرحوم (مولانا قاسم) کے استاد حدیث تھے، سوائے ابو داؤد کے صحیحین (بخاری و مسلم) و سنن ثلثہ (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) ان ہی سے پڑھے تھے" ص۱۸۱

باقی ابو داؤد مولانا محمد قاسم صاحب نے کن صاحب سے پڑھی، مولانا منصور العلی خاں فرماتے ہیں کہ

"اور ابو داؤد جو باقی تھی، اس کو اپنی شہرت کے زمانہ میں بغل میں دبا کر جناب مولوی احمد علی صاحب محدث سہارنپوری کی خدمت میں جاکر پڑھ لیا" ص۱۸۲

اور یہی تفصیل ہے اس اجمالی خبر کی جو سوانح مخطوطہ کے مصنف نے ان الفاظ میں دی ہے کہ مولانا محمد قاسم صاحب نے

"حدیث شریف حضرت شاہ عبد الغنی صاحب، قدس اللہ سرہ العزیز دہلوی، اور مولانا احمد علی صاحب مرحوم سہارنپوری سے پڑھی" ص۹

کچھ بھی ہو، اتنی بات یقینی ہے، کہ علم حدیث میں علاوہ شاہ عبد الغنی مہاجر مدنی قدس اللہ سرہ العزیز کے سیدنا الامام الکبیر کو مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری سے بھی تلمذ اور شاگردی کا تعلق تھا۔

باقی مولانا منصور العلی خاں مرحوم نے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ اپنی شہرت کے زمانہ میں ابو داؤد بغل میں دبا کر مولانا احمد علی صاحب کی خدمت میں مولانا محمد قاسم صاحب حاضر ہوا کرتے تھے، اور دنیا کیا کہے گی، اس کا خیال کئے بغیر ایک ایسی ہستی کو استاذ بنانے میں حجاب مانع نہ ہوا جس سے گونہ علمی معاصرت کا تعلق آپ رکھتے تھے، تو اگر ایک طرف از خود رفتگی اور شکستگی کے آثار اس واقعہ میں چمک رہے ہیں، جس کی طرف حکیم صاحب مرحوم و مغفور نے اشارہ کیا ہے تو دوسری طرف یہ بھی سمجھ میں آتا ہے، کہ حدیث کے سلسلے میں اتصال و تصحیح سند کی قیمت آپ کی نظر

میں کتنی تھی، واقعہ یہ ہے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کسی وجہ سے ابوداؤد کے پڑھنے کا موقعہ مولنٰنا شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کو نہ مل سکا تھا، جاننے والے جانتے ہیں کہ صحاح کی چھ کتابوں میں سے پانچ کتابیں جو پڑھ چکا ہو، حدیثوں کے مکرر ہونے کی وجہ سے صرف ایک کتاب کا مسئلہ عام طلبہ کے لئے بھی چنداں اہمیت اپنے اندر نہیں رکھتا، پھر جس فطرت فائقہ سے مولانا سرفراز تھے ان کے متعلق کیسے کہا جا سکتا ہے کہ مطالب و معانی کے سمجھنے کے لئے مولانا احمد علی صاحب سے تلمذ کا تعلق آپ نے پیدا کیا تھا، اب میں کیا کہوں، وہی بے جا خوش اعتقادی کی تہمت سے پھر ڈرتا ہوں، مگر لوگوں نے جن واقعات کا ذکر کیا ہے، انھیں کہاں تک چھپاؤں، اکابر دیوبند کے حالات کی متداول و مشہور کتابوں میں آپ کو یہ روایت ملیگی کہ جن دنوں سیدنا الامام الکبیر دلّی میں پڑھ رہے تھے، جامع مسجد کے پاس دار البقاء مدرسہ کی جو عمارت تھی اس میں ایک مجذوب حافظ عبدالقادر نامی رہتے تھے، مولنٰنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بھی ان کے بعض مکاشفات کا جن کا مولانا نے خود مشاہدہ فرمایا تھا ذکر کیا کرتے تھے، خصوصاً غدر کی عام خوں ریزی سے مہینہ سوا مہینہ پہلے مولنٰنا گنگوہی فرماتے تھے کہ میں حافظ عبدالقادر کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا، کہ اچانک پیچھے مڑے اور مڑ کر مجھ سے پوچھنے لگے کہ کون ہے قدرت اللہ ہے؟

مولانا گنگوہی نے فرمایا کہ حضرت "رشید احمد" ہے، اسکے بعد مولنٰنا گنگوہی کا بیان ہے کہ حافظ صاحب الٹے پاؤں پیچھے ہٹے اور کہتے جاتے تھے کہ ہٹوہ، ہٹوہ، پھر اپنے سینے کی طرف اشارہ کر کے بولنے لگے کہ

"یہ میرے گولی لگی، یہ میرے گولی لگی"

اور یہی کہتے ہوئے بھاگ گئے، مولانا فرماتے تھے کہ اسی کے مہینہ سوا مہینہ بعد غدر کا ہنگامہ شروع ہوا، اور حافظ عبدالقادر مجذوب بے چارے کو گولی لگی، اسی سے شہید ہو گئے، یہ بھی فرماتے تھے کہ "گولی سینہ ہی میں لگی" (ارواح ص۳۱۵)

جس سے معلوم ہوا کہ حافظ عبدالقادر شہید کے جذب صحیح کے "معترف مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ

علیہ بھی تھے، اب سنئے قصہ ان ہی مجذوب حافظ صاحب کا ارواح ثلثہ میں اجزار کی کمی وبیشی کے ساتھ اس واقعہ کا ذکر دو جگہ پر کیا گیا ہے، ایک میں حضرت مولانا گنگوہی کے حوالہ سے قصہ درج ہے اور دوسری جگہ مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم مہتمم دارالعلوم دیوبند کی زبانی روایت نقل کی گئی ہے، دونوں روایتوں کا حاصل یہ ہے کہ ایام طالب العلمی میں ایک دن مولانا محمد قاسم دلّی کے کسی کوچہ سے گذر رہے تھے کہ ان ہی حافظ عبدالقادر مجذوب سے راستہ میں مڈبھیڑ ہو گئی، مولانا کے ہاتھ میں اس وقت بخاری شریف کا نسخہ تھا، (غالباً بخاری اس زمانہ میں پڑھ رہے تھے) حافظ صاحب نے بخاری کا یہ نسخہ آپ سے چھین لیا اور لے کر آگے بڑھ گئے، مولانا اس خیال سے کہ خدا جانے کتاب کو کہاں ڈالدیں گے، آپ بھی ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے، راستہ میں بھڑبھونجہ کی ایک دوکان ملی، حافظ صاحب اسی دکان پر چڑھ گئے اور بھڑبھونجہ کی بھٹی پر بیٹھ کر بخاری شریف کی ورق گردانی شروع کر دی، اوراق کو الٹتے جاتے تھے اور زبان سے مِن مِن مِن کہتے جاتے تھے،

مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم کی روایت میں ہے کہ مجذوب صاحب نے پوچھا تھا کہ یہ کون سی کتاب تیرے ہاتھ میں ہے، جواب دیا گیا بخاری شریف، تب لیکر وہ حرکتیں شروع کیں، بہرحال مولانا کھڑے کھڑے ان کی حرکتوں کو دیکھتے رہے، آخر میں حافظ صاحب نے کتاب بند کی، اور واپس کرتے ہوئے مولانا کو خطاب کر کے فرمایا۔

"جا تو بڑا عالم ہے"

ممکن ہے کہ مستقبل کی پیشگوئی حافظ صاحب کے اس کشفی بیان کو قرار دیا جائے، لیکن میرا ذاتی احساس یہی ہے کہ حضرت والا کی "علمی عبقریت" قوت سے فعل کے رنگ میں جو آچکی تھی، یہ اسی واقعہ کی تعبیر ہے، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ جنھوں نے درسیات کی تکمیل نہیں کی تھی، ان کا تذکرہ کرتے ہوئے خود سیدنا الامام الکبیر "معلومات" اور "علم" ان دونوں کے فرق کو ان الفاظ میں بیان کیا کرتے تھے کہ

"کسی کے مبصرات (یعنی آنکھوں سے دیکھی ہوئی چیزوں کا ذخیرہ) زیادہ ہو، اور

سب چیزوں کو دیکھا ہو، مگر ہے وہ چوندھا، اور کسی کا ابصار (دیکھنے کی قوت) زائد ہو، گو اس نے تھوڑی چیزوں کو دیکھا ہو، لیکن خوب حقیقت تک پہنچا ہو۔"

(قصص منے۳ الہادی صفر ۵۰ھ)

میرا خیال یہی ہے کہ بخاری پڑھنے کے زمانہ میں مجذوب حافظ صاحب نے "بڑا عالم" ہونے کی خبر جو دی تھی، اس سے معلومات کی گرد آوری والا علم مراد نہیں ہے، بلکہ علم کا ملکہ فائقہ آپ کی فطرت میں جو ودیعت تھا، اسی کے ظہور و بروز کی یہ اطلاع ہے۔

ظاہر ہے کہ بخاری شریف کے پڑھنے کے زمانہ میں "بڑے عالم" ہو جانے کی اطلاع کشفی راہ سے جسے مل چکی تھی، اسی کے متعلق اگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ صرف اتصال و تصحیح سند کی غرض سے ابوداؤد اس نے پڑھی تھی، تو اس کو بے جا عقیدت مندی ٹھہرانے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

اسی کے ساتھ اس روایت کو بھی اگر ملا دیجئے، جس کا ارواح ثلاثہ میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے، حاصل جس کا یہ ہے کہ پنجلاسہ (پنجاب) میں ایک بزرگ راؤ عبدالرحمٰن خاں نامی تھے، کشفی حالت ان کی بھی غیر معمولی تھی، دردزہ کے لئے تعویذ لینے کے لئے کوئی آتا تو تعویذ کے ساتھ کہہ دیا کرتے تھے کہ لڑکا ہوگا، یا لڑکی بعضوں نے پوچھا بھی کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہو جاتا ہے، تو بولے کہ کیا کروں، پیدا ہونے والے بچے کی صورت سامنے آجاتی ہے، بہر حال اکابر دیوبند خصوصاً شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ سے ان کے بڑے تعلقات تھے، خود سیدنا الامام الکبیر ان سے ملنے کے لئے پنجلاسہ جایا کرتے تھے، پہلے حج کے سفر کے موقعہ پر بھی حاضر ہوئے اور راؤ صاحب سے مولانا نے عرض کیا کہ میرے لئے دعا فرمائیے، یہ سن کر راؤ صاحب نے فرمایا کہ:

"بھائی تمہارے لئے کیا دعا کروں، میں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں دونوں جہان کے بادشاہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے بخاری شریف پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔" (حتے ۱۹۳ ارواح)

کیا اس کے بعد بھی یہی سمجھا جائے کہ مطلب فہمی کے لئے ان کو استاذ کی ضرورت باقی تھی ؟
بلکہ اسی کے ساتھ آپ ان آثار اور ان علامتوں کو بھی شریک کر لیجئے جو بیعت ہونے کے بعد ذکر و شغل کے سلسلہ میں ابتدائی مشغولیت کے وقت آپ کے سامنے پیش آئے تھے، جن کا تذکرہ علاوہ دوسروں کے حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ بھی یہ کہتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ

"اس زمانہ میں مولٰنا (محمد قاسم رح) محض نوآموز طالب العلم تھے"۔

یہاں یہ کہا جاتا ہے جیسا کہ حکیم الامت تھانوی نے بھی ذکر کیا ہے کہ "بیعت اور ذکر و شغل کی تعلیم کے بعد قاعدہ تھا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے لوگ ان حالات کا تذکرہ کرتے جو ذکر و شغل کے وقت ان کے سامنے پیش آتے تھے، مگر خلاف دستور مولانا محمد قاسم نے اپنے کسی حال کا ذکر حاجی صاحب سے نہیں کیا، آخر ایک دن خود ہی دریافت فرمایا کہ "آپ کچھ نہیں کہتے" اپنے پیر کے اس استفسار پر حضرت تھانوی کا بیان ہے

"مولٰنا (محمد قاسم) رونے لگے"۔

پھر بڑے یاس انگیز الفاظ میں فرمانے لگے کہ اپنا حال کیا بیان کروں،

"جہاں تسبیح لے کر بیٹھا، بس ایک مصیبت ہوتی ہے، اس قدر گرانی کہ جیسے سَو سَو من کے پتھر کسی نے رکھدیئے، زبان و قلب سب بستہ ہو جاتے ہیں"۔

حضرت امیر شاہ خاں صاحب سے فقیر نے سنا تھا کہ زبان معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ ہو گئی، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے،

بہرحال اب یہی سننے کی بات ہے، اپنے جس حال سے سیدنا الامام الکبیر میں حد سے زیادہ مایوسی اپنے متعلق پیدا ہو گئی تھی، راہ و رسم منزل سے جو آگاہ تھا، یعنی آپ کے شیخ عارف نے سن کر حکیم الامت کا بیان ہے

"بے ساختہ فرمانے لگے کہ مبارک ہو"

جانتے ہیں یہ عجیب و غریب کیفیت موجب تبریک و تہنیت کیوں بن گئی، مجھ سے براہ راست

حضرت امیر شاہ خاں صاحب فرماتے تھے کہ حاجی صاحب نے فرمایا کہ

"مولنا حق تعالیٰ کے اسم علیم کے ساتھ آپ کو خصوصی نسبت ہے، اور اسی نسبت خصوصی کے یہ آثار ہیں جن کا تجربہ اور مشاہدہ آپ کو کرایا جا رہا ہے"

پھر اس دعویٰ کی دلیل میں حضرت حاجی صاحب نے یاد دلایا نزول وحی کی اس کیفیت کو جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر طاری ہوئی تھی، جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ غیر معمولی وزن آپ میں پیدا ہو جاتا، اونٹ کی پشت پر ہوتے تو اونٹ بیٹھ جاتا (سوائے قصواء آپ کی خصوصی اونٹنی کے) زید بن ثابت کاتب وحی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تو وہ واقعہ مشہور ہی ہے کہ ان کے زانو پر سر رکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما تھے کہ عین اسی حال میں وحی نازل ہونے لگی، زید کا بیان ہے کہ اتنا غیر معمولی وزن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں اس وقت پیدا ہو گیا کہ گویا میرا زانو چور چور ہو جائیگا، مجھے ایسا محسوس ہونے لگا، اور یہ قصہ تو بخاری شریف کے شروع ہی میں ہے کہ سردیوں کے سخت ترین موسم میں بھی وحی جب نازل ہوتی، تو جبین انور پسینہ سے شرابور ہو جاتی تھی!

الغرض شدت وگرانی کی جو کیفیت نزول وحی کے وقت پیدا ہوتی تھی، اسی کیفیت کو پیش کر کے شیخ عارف نے سمجھایا کہ یہ علمی نسبت کا زور ہے، اور جیسا کہ حکیم الامت سے اس موقعہ پر نقل کیا گیا ہے کہ حاجی صاحب نے مولانا محمد قاسم کو خطاب کر کے فرمایا کہ

"یہ نبوت کا آپ کے قلب پر فیضان ہوتا ہے، اور یہ وہ ثقل ہے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے وقت محسوس ہوتا تھا"

جس کی تشریح حاجی صاحب ہی کے حوالے سے انھوں نے یہ کی ہے کہ

"تم سے (یعنی مولنا محمد قاسم سے) حق تعالیٰ کو وہ کام لینا ہے جو نبیوں سے لیا جاتا ہے جا کر دین کی خدمت کرو، ذکر و شغل کا اہتمام چھوڑ دو"

نبیوں کا جو کام سیدنا الامام الکبیر سے لیا گیا اسے تو دنیا دیکھ رہی ہے، اس وقت میرے سامنے یہ واقعہ نہیں بلکہ فقط یہ بتانا ہے کہ یہ سارے واقعات جن کا ذکر منتشر طور پر لوگ کرتے ہیں،

درحقیقت وہ ایک ہی کلی حقیقت کے مختلف جزئیات یا اس کے ظہور کی مختلف تعینی شکلیں ہیں[1]۔

[1] میرا مطلب یہ ہے کہ خلاف عادت اگر کوئی ایک واقعہ ہو تو شک وشبہ کی گونہ اس میں گنجائش بھی پیدا ہو سکتی ہے، اسی لئے بجائے درایت کے ایسے مواقع میں صرف روایت پر نظر رکھی جاتی ہے اور اسی کی قوت وضعف کے ساتھ اعتماد وعدم اعتماد کی کیفیت وابستہ ہوتی ہے، مگر میں پوچھتا ہوں کہ مسیح علیہ السلام کے متعلق مثلاً اس قسم کے واقعات منسوب کئے جاتے ہیں کہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی سوال وجواب کرنے لگے، مٹی سے پرندے کا ڈھانچہ بناتے پھونک دیتے وہ اڑ جاتا، مُردوں کو زندہ کرتے، اندھوں کو بینا، کوڑھی کو تندرست بنا دیتے، بظاہر دیکھنے میں یہ الگ الگ واقعات نظر آتے ہیں، لیکن جب یہ سوچا جاتا ہے کہ مسیح علیہ السلام کی رُوح کا جس قالب سے ناسوتی تعلق قائم ہوا تھا اس میں بجائے ماں باپ کے صرف ماں کی طرف کا حصہ شریک تھا، اور بشر کی شکل اختیار کر کے جس فرشتہ نے آپ کی والدہ کے حوالہ اس کو کیا تھا، وہ دراصل بشر نہیں بلکہ ملک یعنی فرشتہ تھا، تو کھلی ہوئی بات ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو ان لوگوں پر قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا، جن کی روح کا تعلق ایسے مادی قالب سے قائم ہوتا ہے جس میں ماں کی طرف سے بھی اور باپ کی طرف سے بھی کثیف مادی عناصر شریک ہوتے ہیں، اسی لئے عام طور پر ان لوگوں کی روح بتدریج برسوں میں بیداری کی منزلوں کو طے کر کے ہوش وحواس کو حاصل کرتی ہے، لیکن مسیح علیہ السلام کی روح پاک پر والدہ محترمہ کے عنصری حجاب کے غلاف کے سوا اور کچھ نہ تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی ان میں ہوش وحواس ادراک واحساس کی قوتیں بیدار ہو گئیں، اور روحانیت کے اسی غلبہ کا اثر تھا کہ ان کی تاثیری قوت سے بے جان چیزوں میں کلی یا جزئی جان پیدا ہو جاتی تھی، مٹی کے ڈھانچوں یا مردہ لاشوں میں تو کلی جان پیدا ہوتی تھی اور جس کی آنکھ اپنی زندگی کھو بیٹھتی تھی، یا جس کا جسم زندگی کی قوت سے محروم ہو کر بگڑ جاتا تھا، اُن میں جزئی زندگی پیدا ہو جاتی تھی، یعنی کوڑھ کا ازالہ ہو جاتا تھا، اور میں تو کہتا ہوں کہ ماں باپ سے پیدا ہونے والے انسانوں کی طبعی عمر پر یہی وجہ ہے کہ حضرت مسیح کی عمر طبعی کا قیاس کرنا قطعاً ایک غیر عقلی فیصلہ ہے لطیف روح کا کثیف مادی قالب سے تعلق جو پیدا ہوتا ہے، یقیناً وہ اتنا استوار نہیں ہو سکتا، جو قوت اور استواری اس تعلق میں ہوتی ہے، جو لطیف روح کا لطیف قالب سے ہو، شیر وشکر میں جو تعلق پیدا ہو جاتا ہے، کیا یہی تعلق آپ پتھر کے ٹکڑوں اور دودھ میں پیدا کر سکتے ہیں، لوگوں کو مسیح علیہ السلام کی دراز زندگی پر تعجب ہوتا ہے۔ حالانکہ یہی تعجب کرنے والے جبرئیل، اسرافیل اور اسی قسم کے لامحدود فرشتوں کے لئے ان سے بھی زیادہ طویل زندگی پر یقین رکھتے ہیں۔

بہرحال جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے مختلف خلاف امور کو آپ ایک کلی ضابطہ کے نیچے مندرج پا رہے ہیں، مجھے تو سیدنا الامام الکبیر کی زندگی کے علمی پہلو کا رنگ بھی کچھ اسی طرح کا نظر آتا ہے کہ "ایک ہی حقیقت" کے ظہور کی یہ مختلف شکلیں ہیں، یا چند خوابوں کی یہ واحد تعبیر ہے ۱۲

بہر حال سیدنا الامام الکبیر کی طالب العلمانہ زندگی اور جن باطنی و ذہنی انقلابات سے میرے خیال میں آپ اس عرصہ میں گذرتے رہے، ان کے متعلق جو کچھ معلوم ہو سکا وہ یہی ہے، عام طور پر آپ کے ازلی و ابدی رفیق مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ طلب علم کے ان دنوں میں آپ کے ساتھ ساتھ رہے، لیکن اگر مولوی عاشق الٰہی مرحوم کی اس خبر کو پیش نظر رکھا جائے، یعنی مولانا گنگوہی کے متعلق وہ خبر دیتے ہیں کہ

"جبکہ آپ کی (مولانا گنگوہی کی) عمر شریف تخمیناً اکیس سال کی تھی، آپ کا زمانہ طالب العلمی ختم ہو لیا، اور آپ نے اپنے وطن کی جانب مراجعت فرمائی" (ص ۳۵/۱ تذکرہ)

مولانا گنگوہیؒ کی ولادت باسعادت ۱۲۴۴ھ میں ہوئی، اسلئے اپنی عمر کے اکیسویں سال میں آپ ۱۲۶۵ھ میں پہنچے ہونگے، لہذا مولانا عاشق الٰہی کی اس اطلاع کی بنیاد پر ہمیں یہ ماننا چاہیئے کہ دلی سے مولانا گنگوہی کی واپسی ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۴۸ء میں ہو گئی، اب اسی کے ساتھ ہمارے مصنف امام کے اس بیان کو پیش نظر رکھیئے، سیدنا الامام الکبیر کی تعلیمی زندگی کے اختتام کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ لکھ کر کہ

"کتابیں معمولی تمام کر چکے تھے، حدیث شریف شاہ عبد الغنی صاحب کی خدمت میں پوری کی" ص ۲۹

آگے فرماتے ہیں کہ

"اُس عرصہ میں والد مرحوم (مولانا مملوک العلی صاحب) کا گیارہویں ذی الحجہ ۱۲۶۶ھ کو بمرض یرقان قبل السابع انتقال ہو گیا" ص ۲۹

مصنف امام کے بیان میں "اس عرصے میں" کے جو الفاظ ہیں، ان سے قطعی طور پر تو یہ نہیں معلوم ہوتا ہے لیکن خیال یہی گذرتا ہے کہ ۱۲۶۶ھ یعنی مولانا مملوک علی کی وفات تک سیدنا الامام الکبیر کی طالب العلمانہ زندگی کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں شاید جاری تھا۔

میرا خیال ہے کہ مولانا احمد علی محدث سہارنپوری سے ابوداؤد غالباً مولانا گنگوہی کی واپسی کے بعد آپ نے پڑھی ہے، کیونکہ مصنف امام نے مذکورہ بالا اطلاع سے پہلے ان الفاظ میں کہ

"پھر مولوی صاحب نے مطبع احمدی میں تصحیح کتب کی کچھ مزدوری کر لی" ص ۲۹

یہ خبر دی ہے کہ ۱۲۶۷ھ سے پہلے مطبع احمدی سے سیدنا الامام الکبیر کا تعلق قائم ہو گیا تھا، اور شاید یہی تعلق مولانا احمد علی صاحب سے پڑھنے کا سبب ہوا، یا پڑھنے کے تعلق سے مولانا احمد علی صاحب کے مطبع احمدی سے آپ کا رشتہ قائم ہوا، مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی کی جدائی کا یہی زمانہ ہے، جس میں حضرت گنگوہی تو گنگوہ تشریف لے گئے، لیکن مولانا نانوتوی دلی ہی میں مقیم رہے، یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ۱۲۶۷ھ میں یعنی جس سال مولانا مملوک علی صاحب کا انتقال ہوا، اس وقت بھی سیدنا الامام الکبیر کی عمر انیس سال سے متجاوز نہ ہوئی تھی، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عام درسی کتابوں کا مروجہ نصاب جب ختم ہو گیا تو اپنے خورد و نوش کا بار کسی دوسرے پر ڈالنا مولانا کو گوارا نہ ہوا، اور حسب تقاضائے حمیت طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا کہ بجائے کما کر کچھ بھیجنے کے گھر سے کوئی امداد طلب کی جائے، مصنف امام نے مطبع احمدی کے ساتھ آپ کے جس تعلق کا ذکر فرمایا ہے، غالباً اس کی وجہ یہی تھی، گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ آجکل کے طلبہ جیسے ٹیوشن وغیرہ کر کے اپنی ذاتی ضرورتوں کے لئے کچھ کما لیا کرتے ہیں، اپنی طالب العلمی کے آخر زمانہ میں سیدنا الامام الکبیر نے بھی ایک ذریعۂ آمدنی اختیار فرما لیا تھا، مصنف امام نے اسی لئے اس کی تعبیر بھی "مزدوری" کے لفظ سے فرمائی ہے۔

---

لہ عام طور پر "مطبع احمدی" مولانا احمد علی صاحب کے مطبع کا نام ہے، صحاح ستہ اور مشکوٰۃ الغرض حدیث کی درسی کتابوں کی طباعت و اشاعت میں اس مطبع نے اس وقت جبکہ طباعت کا رواج شروع شروع میں ہندوستان میں ہوا، بڑا کام کیا ہے، غدر سے دو سال پہلے یعنی ۱۲۷۵ھ میں مشکوٰۃ شریف مطبع احمدی دلی کی طبع شدہ فقیر کے پاس ہے، جس پر مشکوٰۃ کی مختلف شرحوں سے بہترین معلومات کا انتخاب کر کے حاشیہ چڑھایا گیا ہے، مگر غدر کے بعد یہ مطبع بھی دستبرد زمانہ کا شکار ہوا، شاید غدر کے بعد اسی "مطبع احمدی" کے نام سے حضرت شاہ ولی اللہ کے خاندان سے تعلق رکھنے والے بعض بزرگوں نے دلی میں مطبع جاری کیا، جس میں مولوی ظہیر الدین صاحب عرف سید احمد کا نام ان کتابوں اور رسالوں پر پایا جاتا ہے جو اس مطبع میں چھپی ہیں، زیادہ تر یہ شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادوں کی کتابیں ہیں، مولوی ظہیر الدین صاحب اپنے آپ کو نبیرۂ مولوی سید ناصر الدین نواسہ شاہ رفیع الدین بتاتے ہیں اور لکھا ہے کہ چالیس سال سے شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کی ہجرت کے بعد شاہ عبد العزیز کا مدرسہ کہنہ ویران پڑا تھا، اسی مدرسہ کہنہ کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے مطبع احمدی جاری کیا گیا ہے۔ (فیوض الحرمین کا حاشیہ)

بہر حال میرے نزدیک سیدنا الامام الکبیر کا تعلق جس مطبع احمدی سے تھا، وہ مولانا احمد علی صاحب والا مطبع تھا، نہ کہ یہ دوسرا مطبع احمدی ۱۲

کچھ بھی ہو، اپنے استاذ کے عین حیات تک کم ازکم میرا احساس یہی ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں سیدنا الامام الکبیر کی طالب العلمانہ زندگی کا سلسلہ باقی رہا، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے استاذ کی وفات تک قیام بھی آپ کا ان ہی کے ساتھ رہا، کیونکہ مصنف امام نے اپنے والد مولانا (مولانا مملوک العلی) کی وفات کی مذکورہ بالا اطلاع کے بعد یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"بعد انتقال مولانا والد مرحوم کے احقر اپنے مکان مملوک میں جو چیلوں کے کوچہ میں تھا جا رہا مولوی صاحب (مولانا محمد قاسم صاحب) بھی میرے پاس آرہے" ص ۲۹

بظاہر اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے۔

**ان سعیکم لشتی کا چو راہہ**

لیکن آپ کے استاذ مرحوم کا جب انتقال ہوگیا، تو اب کیا کرنا چاہئے؟ یہ سوال جیسے علم سے فارغ ہونے والوں کے سامنے عموماً آتا ہے، آپ کے سامنے بھی آیا، طالب العلمانہ زندگی میں حصول امتیاز کی ضمانت خصوصاً اس زمانہ میں تو امتحانات کے نتائج ہی کے ساتھ وابستہ ہے، اور آئندہ زندگی کی راہوں کی ہمواری میں ان ہی امتحانی نتائج سے لوگوں کو مدد ملتی ہے، مگر سیدنا الامام الکبیر نے تعلیم تو بیشک کالج کے استاذ یعنی مولانا مملوک العلی صاحب سے پائی، اور اس کالج میں امتحانات کا طریقہ بھی جاری تھا، مگر عرض کر چکا ہوں کہ میرے نزدیک مولنا مملوک علی سے آپ کی تعلیم کی نوعیت خانگی تعلیم کی تھی، خانگی تعلیم کی صورت میں امتحان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اسی لئے آپ کی تعلیمی زندگی کی اس طویل مدت یعنی چھ سات سال کے زمانہ میں بجز دو امتحانوں کے کسی امتحان کا تذکرہ آپ کے سوانح نگاروں نے نہیں کیا ہے، یعنی ایک تو اسی امتحان کا ذکر مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم کے حوالہ سے ارواح ثلثہ میں کیا گیا ہے، جس کا جزئی تذکرہ شاید پہلے بھی گذرا ہے، پورا واقعہ یہ ہے، مولانا حبیب الرحمن فرماتے تھے کہ

"علوم عربیہ کے ممتحن مفتی صدر الدین صاحب ہوئے، اور مولانا (محمد قاسم) کا صدرا کا امتحان ان کے پاس گیا، انھوں نے کوئی جگہ پڑھوائی، مولانا کے ذہن میں اسکا مطلب نہ تھا، کیونکہ وہ جگہ کبھی دیکھی بھالی نہ تھی تو اس پر تقریر کی، اور خود جان رہے تھے

کہ کتاب کا یہ مقصد نہیں ہے، مفتی صاحب نے اس پر اعتراض کئے تو مولانا نے مفتی صاحب کو ان ہی تقریروں میں الجھا لیا، لیکن اس پر غور کرتے رہے کہ مطلب کیا ہے بالآخر اک دم ذہن میں عبارت کا صحیح مطلب آگیا تو فرمایا کہ مفتی صاحب آپ پوچھنا کیا چاہتے ہیں، انھوں نے فرمایا کہ "یہ بات" فرمایا کہ لاحول ولاقوۃ اس بات کا جواب تو یہ ہے میں کچھ اور سمجھ رہا تھا، مفتی صاحب نے کہا کہ ہاں! یہی تو پوچھنا تھا" صفحہ ۱۹۶ ارواح ثلاثہ

صحیح طور پر یہ کہنا دشوار ہے کہ اس امتحان کی نوعیت کیا تھی، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جن طلبہ کو مولٰنا مملوک العلی صاحب خانگی طور پر پڑھایا کرتے تھے، کبھی کبھی ان کو بھی شہر کے علماء کے سامنے اس لئے پیش کر دیا کرتے تھے کہ ان کی قابلیت کو جانچیں، خود تقریری امتحان، یعنی کتاب کو سامنے رکھ کر طالب العلم سے پوچھ گچھ کا طریقہ بھی یہی بتاتا ہے کہ اس امتحان کی نوعیت بھی خانگی امتحان ہی کی تھی، ورنہ دلّی کالج کے ذریعہ سے امتحان کی جس قسم کا رواج اس ملک میں ہوا تھا اور وہی رواج آج تک یونیورسٹیوں کی درسگاہوں میں جاری ہے، اس میں تو طالب العلم کو کتاب کی ہوا سے بھی پرہیز ضروری ہے، بجائے تقریری کے عموماً تحریری طور پر سرکاری امتحانات لئے جاتے ہیں، مولوی عبدالحق صاحب کی کتاب "دلّی کالج" سے اس کا پتہ نہیں چلتا کہ اس میں زبانی یا تقریری امتحان کا بھی رواج تھا۔

بہرحال اس امتحان میں بھی آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایسی کوئی بات ظاہر نہ ہوئی، جس سے کسی امتیاز کا استحقاق آپ کو حاصل ہوتا، زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ اپنی تیزی طبع سے مولٰنا ناکام ہونے کی رسوائی سے بچ گئے، پوری تعلیمی زندگی میں ایک امتحان تو آپ کا یہی ہوا، اور دوسرا امتحان وہی ہے جس میں شریک ہونے کا ارادہ استاذ یعنی مولٰنا مملوک العلی صاحب کے مشورے سے کر لیا گیا تھا، مگر مصنف امام کے حوالہ سے گذر چکا کہ

"جب امتحان سالانہ کے دن ہوئے مولوی صاحب امتحان میں شریک نہ ہوئے اور مدرسہ چھوڑ دیا"

پہلے بھی اس قصہ کا ذکر آچکا ہے، یہاں مجھے یہی کہنا ہے کہ لے دے کر ان ہی دو امتحانوں کا انتساب سیدنا الامام الکبیر کی طرف کیا گیا ہے جن میں ثانی الذکر امتحان میں تو شرکت ہی کا موقعہ نہ ملا، اور اول الذکر تقریری امتحان میں آپ دیکھ چکے کہ ناکامی سے بچ گئے، یہی مغتنم انجام اس کا ہوا۔

بس امتحان کی راہ سے تو گو اپنے ہم عصر طلبہ میں نمایاں ہونے کے مواقع آپ کے سامنے نہ آئے، لیکن اسی کے ساتھ جب ہم سوچتے ہیں کہ دلی آنے کے ساتھ ہی مولانا نوازش علی کی مسجد کے طلبہ سے بحث و مباحثہ میں نہ صرف اسی مسجد کے طلبہ کو بلکہ گذر چکا کہ باہر بھی لوگوں میں آپ کا چرچا پھیلنے لگا اور جیسا کہ میں نے اپنا خیال ظاہر کیا تھا، کہ مصنف امام نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ طلبہ کے ساتھ علمی زور آزمائیوں کا یہ قصہ کافی دراز تھا، اور صرف یہی نہیں، بلکہ مولانا عاشق الٰہی نے تذکرۃ الرشید میں یہ اطلاع جو دی ہے یعنی یہ لکھتے ہوئے کہ

"یہ طالب العلمی کا سارا زمانہ گنگوہی و نانوتوی آفتاب و ماہتاب کا قریب قریب یک جا اور یک جہتی کے ساتھ گذرا"

آگے وہی فرماتے ہیں کہ

"کبھی کسی مسئلہ میں دونوں حضرات کی باہم بحث بھی ہو جاتی تھی، اور گھنٹوں تک رہا کرتی تھی، ان دونوں مشہور طالب العلموں کا مباحثہ کچھ ایسا نہ ہوتا تھا کہ جس کو دلچسپی کی نظر سے نہ دیکھا جاتا"

پھر دلچسپی کے ساتھ دونوں کے مباحثوں کے دیکھنے والوں میں علاوہ عام طلبہ کے، وہی راوی ہیں کہ

"اساتذہ بڑے شوق اور تعجب سے اس بحث کو سنتے اور سرتاپا کان ہو کر اس جانب متوجہ ہو جاتے تھے"

مولانا عاشق الٰہی نے اس کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ

"کبھی لوگوں کے ٹھٹ لگ جاتے اور عام و خاص کا مجمع ہو جایا کرتا تھا"

الدنیادالآخرۃ کے ان دونوں رفیقوں کے باہمی بحث و مباحثہ کی اہمیت کا اظہار مولانا جیسے محتاط اہل قلم کے ان الفاظ سے جو کچھ ہو رہا ہے وہ تو بجائے خود ہے آگے یہ فرماتے ہوئے کہ

"جانبین سے وہ نکتہ سنجیاں، باریک بینیاں ہوتی تھیں کہ باید و شاید۔"

وہی ایک واقعہ کی خبر ان الفاظ میں دیتے ہیں کہ

"ایک بار ایک استاذ نے دونوں کی گفتگو سن کر یوں فیصلہ فرمایا کہ قاسم ذہین آدمی ہے، اپنی قابلیت سے قابو میں نہیں آتا، ورنہ اس مسئلہ میں رشید احمد حق پر ہے۔"

واللہ اعلم یہ مسئلہ کون سا تھا اور یہ استاذ صاحب کون تھے، جنھوں نے یہ فیصلہ فرمایا، خود ان کے ذاتی رجحانات کیا تھے جب تک یہ باتیں معلوم نہ ہوں، اب یہ فیصلہ کون کر سکتا ہے کہ استاذ صاحب کا یہ فیصلہ کیسا تھا، بہرحال میری غرض تو مولانا عاشق الٰہی کی اس تحریری شہادت نقل کرنے سے یہ ہے کہ گو امتحانات کی راہ سے سیدنا الامام الکبیر کو اپنے ہم چشموں اور ہم عصروں میں ممتاز اور نمایاں ہونے کے مواقع نہ مل سکے، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ "مشک کی خوشبو پھیل رہی ہے اور پھیلتی چلی جا رہی ہے" امتحان نہ سہی لیکن شروع ہی سے آپ کی غیر معمولی ذکاوت و ذہانت کا چرچا لوگوں میں ہونے لگا، اور اس سے زیادہ اور کیا چاہا جاتا ہے کہ خود استاذ اپنے شاگرد کی غیر معمولی ذکاوت کا بھرے مجمعوں میں اقرار کرتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ گو امتحان بھی طلبہ کی اندرونی صلاحیتوں کے جانچنے کا ایک عام اور اچھا ذریعہ ہے، لیکن ہمارے قدیم نظام تعلیم میں بجائے امتحان کے، پڑھانے والے اساتذہ کے تاثرات جو اپنے طلبہ کے متعلق وہ رکھتے تھے ان ہی کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی، میرے نزدیک تو استاذ کا یہ ارشاد کہ

"قاسم ذہین آدمی ہے اپنی ذہانت سے قابو میں نہیں آتا۔"

ہزار ہا امتحانوں کے نتائج سے زیادہ قیمتی اور طالب العلم کی استعداد و صلاحیت کے لئے بہترین وثیقہ ہے، اور مولانا عاشق الٰہی صاحب نے تو اس موقعہ پر استاذ کا نام نہیں بتایا، بظاہر طرز گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید مفتی صدر الدین صاحب مرحوم کے یہ الفاظ ہوں، وہی مفتی صدر الدین جنھوں نے مولانا گنگوہی سے یہ سن کر کہ کسی مطبع میں تصحیح کا مولانا محمد قاسم کرتے ہیں، اور آٹھ یا دس روپے تنخواہ پاتے

ہیں، فرمایا تھا کہ

"قاسم ایسا سستا قاسم ایسا سستا"

واللہ اعلم بالصواب۔ یہ میرا ایک قیاس ہے اور اس پر مبنی ہے کہ مفتی صدرالدین صاحب سے جیسے مولانا گنگوہی نے کچھ کتابیں پڑھی تھیں، اسی طرح مولانا محمد قاسم کو بھی مان لیا جائے کہ مفتی صاحب سے مستفید ہوئے تھے،

لیکن اس سے بھی زیادہ اہم ومحکم آپ کے "الاستاذ" مولانا مملوک العلی کے وہ الفاظ ہیں، سوانح مخلوطہ کے مصنف نے جنھیں نقل کیا ہے، یعنی لکھا ہے کہ مولانا مملوک العلی صاحب سے یہ بات معتبر ذرائع سے ان تک پہنچی ہے کہ مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی طرف اشارہ کرکے کبھی فرماتے کہ

"مولانا محمد اسمٰعیل شہید کو لوگ یاد کرتے ہیں، مگر جو زندہ رہے گا ہمارے اسمٰعیل کو بھی دیکھ لے گا" ص ۹

دلی یا ہندوستان کے دارالخلافہ کے سرکاری وغیر سرکاری حلقے کی سب سے بڑی تدریسی وتعلیمی ہستی کی طرف سے سرزمین ہند کے علمی ودینی مستقبل کے متعلق یہ توقع یا پیشگوئی، معمولی توقع یا پیشگوئی نہ تھی، یہ یا اسی قسم کے دوسرے اعترافات کی بنیاد پر یہ خیال کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد سیدنا الامام الکبیر حکومت کی کسی موزوں ومناسب خدمت کے حاصل کرنے کا ارادہ اگر فرماتے تو معمولی جدوجہد سے بآسانی وہ کامیاب ہو سکتے تھے، شاید یہ خیال صرف خیال نہیں قرار پا سکتا، ہم دیکھ رہے ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر کے ان ہی استاذ محترم مولانا مملوک العلی کے حلقۂ درس سے تعلیم پاکر فارغ ہونے والوں کی جماعت میں ایک طرف شیخ ضیاء الدین صاحب ایل۔ ایل ڈی جیسے نظر آتے ہیں، جو اسی دلی کالج کی معلمی سے ترقی کرتے ہوئے اکسٹرا اسسٹنٹ تک سرکاری خدمات کے سلسلہ میں پہنچے، اور وقت کے حکام کی خوشنودیوں کو حاصل کرکے ہندوستان ہی میں ایل ایل ڈی کی آنریری ڈگری حاصل کی، اور بجائے شیخ ضیاء الدین کے شمس العلماء ڈاکٹر شیخ ضیاء الدین کے نام سے مشہور ہو کر مرے[۱]۔ تو دوسری طرف ان ہی مولانا مملوک علی

[۱] آج تو ان مرحوم شمس العلماء ڈاکٹر شیخ ضیاء الدین ایل ایل ڈی کے نام سے بھی شاید کوئی واقف نہ ہوگا، اپنی کتاب دارالحکومت دہلی میں مولوی بشیر الدین صاحب نے لکھا ہے کہ "منشی ذکاء اللہ، مولوی نذیر احمد اور یہ (یعنی ڈاکٹر ضیاء الدین ایل ایل ڈی)، دلی کالج کے نامی گرامی طلبہ میں تھے، ایک ساتھ پڑھے اور سب کے سب شمس العلماء بن کر چکے" آگے وہی لکھتے ہیں کہ ضیاء الدین اور نذیر احمد اپنے علمی تبحر کی وجہ سے ایل ایل ڈی بھی ہوئے (باقی صفحہ ۲۶۸ پر)

کے ایک شاگرد مولوی سمیع اللہ[ف۱] صاحب کو ہم پاتے ہیں، کہ منصفی کا امتحان دے کر منصف ہوتے ہیں، پھر ہائی کورٹ کے وکیل بنائے جاتے ہیں، اور بالآخر لارڈ بروک گورنر جنرل اور وائسرائے ہند کی نگاہوں میں اتنی عزت حاصل کرتے ہیں کہ مصر کے مشن میں لاٹ صاحب مولوی صاحب کو اپنے ساتھ مصر لے جاتے ہیں اور حسن خدمت کے صلہ میں سی، ایم، جی کے خطاب کا غیر معمولی اعزاز حاصل کر کے سارے ہندوستان میں امتیاز کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔

---

(بقیہ صفحہ ۲۶۷) اسی کتاب میں لکھا ہے کہ مولوی یعنی ڈاکٹر ضیاءالدین مولوی مملوک علی صاحب نانوتوی مشہور عالم کے شاگرد تھے، دیکھو کتاب مذکور ص۱۰۹ دلچسپ کہئے یا دل دوز سانحہ، اسی موقعہ پر یہ بھی درج کیا ہے کہ ڈاکٹر ضیاءالدین کے والد حین کا نام داروغہ خدا بخش تھا، غدر کے زمانہ میں انگریزوں کی حمایت میں انھوں نے جاسوسی کا کام انجام دیا تھا، انعام میں زمین بھی انکو ملی تھی، مگر انگریزی فوج دلی میں جب داخل ہوئی تو انگریزی فوج کے سپاہی کی گولی سے بیچارے کا کام تمام ہوا ۱۲

ف۱ مولوی سمیع اللہ بھی موجودہ نسل میں تقریباً نسیاً منسیا ہو چکے ہیں بجز خاص لوگوں کے مشکل ہی سے ان کا جاننے والا ہندوستان میں رہ گیا ہوگا، مولوی بشیر الدین ہی نے اسی کتاب میں لکھا ہے کہ مولوی سمیع اللہ صاحب نے بھی مولوی مملوک العلی صاحب مشہور و معروف عالم و فاضل سے تعلیم پائی ص۵۳ یہ بھی لکھا ہے کہ موجودہ ایم۔ اے۔ او کالج یعنی جس نے ترقی کر کے اس زمانہ میں مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کی، وہی جب اسکول کی صورت میں علیگڈھ میں قائم ہوا تھا تو اس کے بانی یہی سمیع اللہ خاں تھے اور سرسید نے بھی اس کام میں ان کا ساتھ دیا تھا مولوی سمیع اللہ علیگڈھ میں سب جج تھے، علیگڈھ میں اس اسکول کے قائم ہونے کی وجہ بھی یہی ہوئی آخر میں سید صاحب اور مولوی صاحب میں اَن بن ہو گئی، اور آخر وقت تک دونوں میں تنی ہی رہی، مولوی سمیع اللہ صاحب کا ذکر خیر مفتی جمال الدین افغانی نے بھی اپنے عربی اور فارسی رسائل اور لکچروں میں کیا ہے، مولوی صاحب نے وہی کام جسے داروغہ خدا بخش نے دلی میں انجام دیا تھا۔ لارڈ نارتھ بروک کے اشارے سے مصر میں انجام دیا۔ ان ہی رسالوں میں مفتی صاحب مرحوم نے علیگڈھ کو "بوم کدہ" اور علیگڈھ تحریک کے چلانے والوں کو "اگھوریان[ف۲] ہند" کے خطاب سے سرفراز کیا ہے۔ مولوی سمیع اللہ کے صاحبزادے حیدرآباد میں چیف جسٹس کے عہدے پر ممتاز تھے، نواب سرور جنگ کے داماد تھے ان کو بھی سر بلند جنگ کا خطاب مرحوم میر محبوب علی خاں حضور نظام حیدرآباد سے ملا تھا، کہتے ہیں کہ سرور جنگ و سر بلند جنگ یہ دونوں خطاب ان لوگوں کی درخواست پر مرحوم نظام نے دیا تھا، انگریز جب ان خطابوں کو دیکھتے تو اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے کہ برطانوی حکومت کی طرف سے "سر" کا خطاب ان لوگوں کو ملا ہے ۱۲

ف۲ اگھوری بے تمیز اور ایسے بے حس کو کہتے ہیں جو پاکی ناپاکی میں امتیاز نہ رکھتا ہو، اور خلط ملط کرکے استعمال کرے ۱۲

اور ایک شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین، یا مولوی سمیع اللہ صاحب ہی کیا، سچی بات تو یہ ہے کہ "دلی عربک کالج" کے استاذ ہونے کی وجہ سے مولانا مملوک العلی صاحب سے پڑھنے اور مستفید ہونے کے مواقع جن جن لوگوں کو میسر آئے اور فارغ ہونے کے بعد نئی قائم شدہ حکومت کی مشینری میں شریک ہو کر عروج و ارتقاء کی بلندیوں تک جو پہنچے ان کو آج گن گر کون بتا سکتا ہے، اپنی کتاب "دارالحکومت دہلی" میں مولوی بشیر الدین صاحب نے مولٰنا مملوک العلی کے متعلق یہ لکھتے ہوئے کہ

"تمام ہندوستان آپ کے فیض سے مملو ہے" ص ۵۸۴ ۲۷

اپنی ذاتی واقفیت یہ درج کی ہے کہ

"آپ کے (یعنی مولوی مملوک العلی کے) ہزاروں شاگرد صاحب ثروت و اقتدار تھے" ص ۵۸۴ ۲۷

لیکن علم کے جس "دیوان" سے نکل نکل کر ثروت و اقتدار کے وسیع صحراء کی طرف ہزار ہا ہزار کی تعداد میں لوگ بھاگے جا رہے تھے، ذرا پلٹئے اور دیکھئے دلی میں چیلوں کا ایک کوچہ ہے، اسی کوچہ میں مولانا مملوک العلی کا ذاتی خریدا ہوا مملوکہ مکان تھا جس کا پہلے بھی ذکر آچکا ہے چیلوں کے کوچہ کے اسی مکان کے کوٹھے پر چڑھ جائیے، دیکھئے ہمارے مصنف امام کے قلم کی کھینچی ہوئی تصویر ہے، یہ خبر دیتے ہوئے کہ

"کوٹھے پر ایک جھلنگا پڑا ہوا تھا" ص ۲۹

اور ٹھیک ان ہی دنوں میں جب اپنی اپنی صلاحیت اور اپنی اپنی لیاقت کے حساب سے اسی "دلی" میں مولانا مملوک العلی کے مذکورہ "دیوان علم" میں پڑھنے والے اپنی اپنی کوٹھیوں اور بنگلوں میں براج رہے تھے، ان ہی پڑھنے والوں کا ایک ساتھی اور رفیق، آنکھوں سے بے ساختہ آنسو نکلے چلے آتے ہیں، جب کوچہ چیلان کے کوٹھے کے اس جھلنگے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمارے مصنف امام فرماتے ہیں کہ

"اسی پر (اسی جھلنگے پر) پڑے رہتے تھے" ص ۲۹

کون پڑے رہتے تھے؟ سمجھا آپ نے، یہ ہمارے سیدنا الامام الکبیر حضرت مولٰنا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات با برکات ہے، اور کیا صرف جھلنگے پر پڑے رہنے کی حد تک درد کی یہ داستان،

یارسوائیوں کا یہ سامان ختم ہو جاتا ہے، آگے اپنی چشم دید شہادت مصنف امام ہی نے جو پیش کی ہے، میں اسے نقل کرنا چاہتا ہوں اور نہیں نقل کرسکتا، انگلیاں تھرارہی ہیں، بینائی پر اندھیرا چھایا چلا جاتا ہے، ارقام فرماتے ہیں

"روٹی کبھی پکوا لیتے تھے، اور کئی کئی وقت تک اسی کو کھا لیتے تھے" ص۲۹

اللہ اللہ ان ہی مولانا مملوک العلی سے علم سیکھ کر اسی دلی میں کتنے ہیں، جو حکومت وقت کے حکام وولاۃ کی میزوں پر ڈٹ رکھا ہے ہیں، ہندوستان کے میدان کو اپنی اولوالعزمیوں کے لئے تنگ پاکر ان ہی میں بعض ہیں جو لارڈ نارتھ بروک کی ہمرکابی میں سمندر پھاند کر مصر تک پہنچ جاتے ہیں، لیکن ان ہی کا ہم درس، چیلوں کے کوچہ میں پڑا ہوا ہے، جھلنگے پر پڑا ہوا ہے اور کئی کئی دن کی پکی ہوئی روٹیوں، خشک روٹیوں سے زیادہ جسم کے تعلق کو جان کے ساتھ باقی رکھنے کے لئے جس کے پاس اور کچھ نہیں ہے یہ میں مبالغہ نہیں کر رہا ہوں، یہ ارقام فرمانے کے بعد کہ

"میرے پاس آدمی روٹی پکانے والا نوکر تھا، اس کو یہ کہہ رکھا تھا کہ جب مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) کھانا کھاویں سالن دے دیا کرو" ص۲۹

مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"مگر بدقت کبھی اس کے (باورچی کے) اصرار پر لے لیتے تھے" ص۲۹

"بدقت کبھی" لے لینے کی اس خبر کے بعد ہی فرماتے ہیں، اور فرماتے کیا ہیں، اپنی آنکھوں دیکھی گواہی پیش کرتے ہیں کہ

"ورنہ وہی روکھا سوکھا ٹکڑا چبا کر پڑ رہتے" ص۲۹

کامل ایک صدی تو ابھی پوری نہیں ہوئی ہے، لیکن قریب ہے کہ پوری ہو جائے، ہر سال جس کے طفیل میں دارالعلوم دیوبند کے مطبخ سے گرم گرم تنوری روٹیاں ہزاروں کی تعداد میں سالن کے ساتھ دونوں وقت مسلسل طلبہ میں تقسیم ہو رہی ہیں، قدرت کا یہ کیا عجیب کرشمہ ہے کہ آج وہی چیلوں کے کوچے میں روکھے سوکھے ٹکڑے چبا رہا ہے، کون جانتا تھا کہ ان ہی خشک ٹکڑوں کے اندر سرزمین ہند کے ہزارہا

ہزار علماء کی روزیاں، بلکہ انصاف سے اگر کام لیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ ہزار ہا کروڑ مسلمانوں کی دینی فیروزیاں مستور تھیں۔

بہرحال مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے غدر سے سات سال پہلے ۱۸۵۰ء سے حضرت والا پر اپنے رفقاء درس، اور ہمدرس ساتھیوں کے برخلاف یہ عجیب و غریب حال طاری ہوا، اس وقت حساب سے آپ کی عمر بمشکل (۱۹) سال ہوگی، پوری بیس بہاریں بھی ابھی اس پر نہ گذری تھیں عین شباب کا عالم تھا، جیسے آپ ہی کے دوسرے ہم استاذوں کے سامنے "ثروت و اقتدار" کا وسیع صحرا پھیلا ہوا تھا، یقیناً اس وسیع میدان میں اپنے گھوڑے کو اگر وہ کدانا چاہتے تو اس سے آپ کو کوئی روک نہیں سکتا تھا، بلکہ جن خداداد ملکات، اور فطری کمالات سے سرفراز تھے، ان کو دیکھتے ہوئے یہ بے جا توقع نہ تھی کہ ساتھیوں سے آپ ہی کے عزم اور ارادے کا گھوڑا آگے بڑھ جاتا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وفات سے پہلے استاذ مرحوم نے سرکاری امتحان میں شریک ہونے کا مشورہ جو آپ کو دیا تھا، شاید اس مشورے کی بنیاد اسی پر قائم ہو کہ اس میدان میں اترنے والوں کیلئے "سرکاری سند" اجازت نامہ کی حیثیت رکھتی تھی، مگر عرض کر چکا ہوں کہ باوجود تیار ہونے کے عین وقت پر امتحان کی شرکت کا ارادہ آپ نے فسخ فرما دیا۔ اسی زمانہ میں استاذ مرحوم کی وفات بھی ہوگئی، شاید ان ہی کا کچھ خیال حضرت والا کے فطری میلانات کے ابھار اور ظہور میں بظاہر مانع تھا، ان کی وفات کے بعد یہ دباؤ بھی اٹھ گیا، اچانک اسی کے بعد چیلیوں کے کوچے کے اس مکان میں آپ کو کوٹھے پر پڑے ہوئے جھلنگے پر ہم پاتے ہیں، جہاں کئی کئی دن کی پکی ہوئی روٹیوں کے خشک روکھے سوکھے ٹکڑوں کے سوا اپنے "نفس" کو آپ کچھ نہیں دیتے۔

ہندوستان کا مشہور سیاسی ہنگامہ جس کا مشہور نام غدر ہے، اس سے چند سال پیشتر سیدنا الامام الکبیر پر اس حال کا طاری ہونا، اور جیسا کہ مشہور ہے کہ ہندوستان کے اس سیاسی بھونچال میں حضرت والا کی عملی شرکت بھی ثابت ہے، جس کا ذکر اپنے محل پر آئے گا، نیز آپ کے کچھ بعد بھی بلکہ زندگی میں بھی اس قسم کی باتیں آپ کی طرف منسوب کرنے والے جو عموماً منسوب کیا کرتے تھے

مثلاً امیر شاہ خاں مرحوم نے حوالہ سے ارواح ثلثہ میں نقل کیا گیا ہے کہ رامپور منھاران ضلع سہارنپور جہاں مولانا محمد طیب کی سسرال ہے، وہاں کے بعض باشندوں نے مولانا نانوتوی کی زندگی ہی میں

"حکومت میں یہ درخواست پیش کی کہ مولنا محمد قاسم صاحب نے دیوبند میں ایک مدرسہ گورنمنٹ کے مقابلہ میں کھولا ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ سرحد کے لوگوں سے تعلقات پیدا کئے جائیں تاکہ گورنمنٹ سے جہاد آسان ہو جائے، یہ مدرسہ خفیہ طور پر طلبہ کو قواعد جنگ کی بھی تعلیم دیتا ہے اور ہندوستان پر چڑھائی کرانے کے لئے کابل کو تیار کر رہا ہے" صـ۱۶۸

یہ اور اسی قسم کی دوسری معلومات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر یہ سوچا جائے کہ ہندوستان جن روح فرسا جاں گسل حالات سے اس وقت گذر رہا تھا، علی الخصوص مسلمانوں پر اس ملک میں جو تاریخی افتاد پڑی تھی، شاید ہی کوئی دن طلوع ہوتا ہوگا، جس میں برصغیر کا کوئی علاقہ یا کوئی صوبہ مسلمانوں کے قبضے سے نکل نکل کر دوسروں کے ہاتھ میں مسلسل نہ چلا جا رہا تھا، آج سلطان شہید ٹیپو شہید ہوئے، کل سراج الدولہ والی بنگال و بہار مارا گیا، اور جنوبی ہند میں ارکاٹ کے نوابوں کی نوابی ختم ہو رہی ہے تو شمالی ہند میں اودھ کی سرکار کے الحاق کا اعلان ہو رہا ہے، جو تخت پر تھے وہ پھانسی کے تختوں پر چڑھائے جا رہے تھے، کاخ سے خاک پر گرنے کا نہ ٹوٹنے والا حادثہ تھا، جو گھر گھر میں برپا تھا، لال قلعہ تک محدود نام نہاد مغلی حکومت کے متعلق اگرچہ ۱۸۲۶ء میں لارڈ امہرسٹ نے اعلان کر دیا تھا کہ

"ہماری گورنمنٹ اب کچھ تیموریہ خاندان کی تابع نہیں ہے، بلکہ خود ہندوستان کی بادشاہ ہے"[۱]

لیکن اس زبانی اعلان نے ابھی کاغذی لباس اختیار نہیں کیا تھا، مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ ٹھیک ۱۸۵۲ء جس میں ہمارے مصنف امام نے سیدنا الامام الکبیر کو اس عجیب و غریب حال میں پایا تھا، اسی ۱۸۵۲ء میں لارڈ ڈلہوزی نے کمیٹی قائم کر کے لال قلعہ والی مغلی حکومت کے متعلق یہ طے کرتے ہوئے کہ

"بادشاہ (بہادر شاہ مرحوم) کی وفات کے بعد مرزا فخرو برائے نام بادشاہ ہیں"

لال قلعہ سے بھی تیمور کی اولاد کا رشتہ ہمیشہ کیلئے اس فیصلہ کے ذریعہ منقطع کر دیا گیا کہ مرزا فخرو برائے نام

---

[۱] رسالہ اسباب بغاوت ہند مصنفہ سرسید احمد خاں صـ۱۸ ضمیمہ حیات جاوید

بادشاہ قلعہ کو چھوڑ دیں گے، اور

"قطب میں جاکر رہیں گے" (دارالحکومت دہلی ص۶۹۴)

اس کمیٹی میں بادشاہ اور کمیٹی دونوں فریق کے نمائندے شریک تھے، ایک رکن اس کے مرزا فخرو بھی تھے بابر کے معذور و مجبور وارث بہادر شاہ نے کمیٹی کے اس فیصلہ پر اپنی مہر اور دستخط ثبت کر کے شاہجہاں کے قلعہ کو کمپنی کے حوالہ کر دیا۔

آج تو ان واقعات کا ذکر ہم تاریخی افسانے کی شکل میں کرتے ہیں، لیکن جس وقت لال قلعہ سے بھی بدر ہونے کے اس فیصلہ کا علم مسلمانوں کو ہوا ہوگا، کون اندازہ کر سکتا ہے کہ اس وقت ان پر کیا گذری ہوگی؟

ایک طرف سیاسی انقلابوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ادھر جاری تھا، مستقبل کا ہر انقلاب مسلمانوں کو مسلمانوں کی تاریخ کو اس ملک میں ماضی بناتا چلا جاتا تھا، اور دوسری طرف مذہبی اور دینی دائرے میں جو کچھ ہو رہا تھا، سرسید جیسے محتاط اہل قلم تک کا یہ بیان ہے کہ

"سب کو یقین تھا کہ ہماری گورنمنٹ (کمپنی بہادر) علانیہ جبر، مذہب بدلنے پر نہیں کریگی، بلکہ خفیہ تدبیریں کر کر مثل نابود کر دینے علم عربی و سنسکرت کے، اور مفلس و محتاج کر دینے ملک کے اور لوگوں کو جو ان کا مذہب ہے اس کے مسائل سے ناواقف کر کر"

لوگوں کو مرتد بنانے میں حکومت کامیابی حاصل کرنا چاہتی ہے، ۱۸۳۷ء میں قحط کا شکار ہندوستان ہوا تو سرسید نے لکھا ہے کہ

"قحط سالی میں جو یتیم لڑکے عیسائی کئے گئے وہ تمام اضلاع مغربی و شمالی میں ارادۃً گورنمنٹ کے ایک نمونہ گنے جاتے تھے کہ ہندوستان کو اسی طرح پر مفلس اور محتاج کر کر اپنے مذہب میں لے آئیں گے"

یہ بھی انھوں نے لکھا ہے کہ

"سب جانتے تھے کہ گورنمنٹ نے پادری صاحبوں کو ہندوستان میں مقرر کیا ہے۔"

گورنمنٹ سے پادری صاحبان تنخواہ پاتے ہیں "

اور صرف حکومت ہی نہیں، بلکہ یورپین حکام کے متعلق سرسید ہی کا بیان ہے کہ

"پادری صاحبوں کو بہت سا روپیہ واسطے خرچ کے اور کتابیں بانٹنے کو دیتے ہیں، اور ہر طرح ان کے مددگار اور معاون ہیں "

نیز یورپین حکام اسی سلسلے میں اور کیا کیا کرتے تھے، منجملہ اس کے یہ عام طریقہ بھی ان لوگوں نے اختیار کر رکھا تھا کہ

"اپنے ملازموں کو (جو ان کی ماتحتی میں کام کرتے تھے) حکم دیتے تھے کہ ہماری کوٹھی میں آنکر پادری صاحب کا وعظ سنو، اور ایسا ہی ہوتا تھا (یعنی لوگ تعمیل حکم کرتے تھے) "

اور قصہ صرف اسی پر ختم نہیں تھا، مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذاہب اور مذہبی پیشواؤں پر حد سے زیادہ دل آزار، موذی، اعتراضات سے بھری ہوئی کتابوں سے اس ملک کو بھر دیا گیا تھا، سرسید کا بیان ہے کہ شہروں، قصبوں، دیہاتوں میں ان ہی زہریلی کتابوں کو لے کر پادری گشت کرتے تھے، اور ان کتابوں کے مضامین کو علانیہ کوچہ و بازار میں دہراتے اور بقول سرسید

"کوئی شخص حکام کے ڈر سے مانع نہ ہوتا"

لیکن جہاں روک ٹوک کا اندیشہ ہوتا سرسید نے لکھا ہے کہ ان علاقوں میں

"یہ رواج نکلا کہ پادری صاحبوں کے ساتھ تھانے کا ایک چپراسی جانے لگا "

سرسید کی شہادت ہے کہ

"پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل مقدس ہی کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ غیر مذہب کے مقدس لوگوں کو، اور مقدس مقاموں کو بہت برائی سے اور ہتک سے یاد کرتے تھے، جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور تکلیف پہنچتی تھی "

(ص ۲۷ اسباب بغاوت ہند)

اور مشنری اسکولوں اور کالجوں کا جو جال ملک میں پھیلایا جا رہا تھا، سرسید اس کے راوی ہیں کہ

"بڑے بڑے عالی قدر حکام متعہد ان اسکولوں میں جانے اور لوگوں کو اس میں داخل اور شامل ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔"

اور ان کالجوں میں کیا سکھایا جاتا تھا، اور امتحانی سوالوں کی نوعیت کیا ہوتی تھی، وہی لکھتے ہیں کہ،

"طالب علموں سے جو لڑکے کم عمر ہوتے تھے، پوچھا جاتا تھا کہ تمہارا خدا کون؟ تمہارا نجات دینے والا کون؟"

یہ تو سوالات کی نوعیت ہوتی، اور کامیابی کا معیار کیا تھا، ان ہی کا بیان ہے کہ

"وہ عیسائی مذہب کے موافق جواب دیتے تھے، اس پر ان کو انعام ملتا تھا۔"

الغرض یہ اور اسی قسم کی بے شمار علانیہ اور خفیہ، براہ راست اور بالواسطہ کارروائیوں کا ایک سلسلہ اس ملک کے طول و عرض میں جاری تھا، حتیٰ کہ آخر میں "مخفی ارادہ" اور "پوشیدہ نیت" کا راز پادری ایڈمنڈ کی اس گشتی چٹھی سے طشت از بام ہوگیا، جو تقریباً ہندوستان کے ہر اس شخص کے نام جاری ہوئی تھی جو حکومت کا متوسل تھا، یا ملک میں کسی قسم کا امتیاز رکھتا تھا، یہ ایک مشہور تاریخی چٹھی ہے، جس کی ابتدا ہی ان الفاظ سے ہوئی تھی کہ

"وہ وقت آگیا ہے کہ اس مضمون پر سرگرمی کے ساتھ غور کیا جائے کہ سب لوگوں کو ایک ہی مذہب اختیار کرنا چاہئے یا نہیں۔"

یہ بڑی کافی لمبی چوڑی چٹھی ہے، جس کا پورا ترجمہ مولانا حالی نے سرسید کی سوانحعمری کے آخر میں بطور ضمیمہ کے شریک کر دیا ہے، اگرچہ بعد کو یہ اعلان کیا گیا کہ اس کا تعلق حکومت سے نہیں، لیکن سرسید کا بیان ہے کہ

"ان چٹھیات کے آنے کے بعد خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا، پاؤں تلے کی مٹی نکل گئی، سب کو یقین ہوگیا کہ ہندوستانی جس وقت کے منتظر تھے وہ وقت اب آگیا، اب جتنے سرکاری نوکر ہیں، اول ان کو کرسٹان ہونا پڑے گا، اور پھر تمام رعیت کو"

سرسید نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"سب لوگ بیشک سمجھتے تھے کہ یہ چٹھیاں گورنمنٹ کے حکم سے آئی ہیں، آپس میں ہندوستانی لوگ اہل کاران سرکاری سے پوچھتے تھے کہ تمہارے پاس بھی چٹھی آئی، اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ تم بھی بہ سبب لالچ نوکری کے کرسٹان ہو گئے"

آخر میں وہی لکھتے ہیں کہ

"یہاں تک ہندوستانی اہل کاروں کو الزام لگا یا کہ جن کے پاس چٹھیاں آئی تھیں وہ مارے شرمندگی اور بدنامی کے چھپاتے تھے اور انکار کرتے تھے کہ ہمارے پاس تو نہیں آئی لوگ جواب دیتے تھے کہ اب آجائے گی، کیا تم سرکار کے نوکر نہیں ہو" ص۳۲

خلاصہ یہ ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی دنیا بھی لٹ رہی تھی اور لٹتی چلی جا رہی تھی، اور دین بھی ان کا اچانک ایسے مہیب نرغے میں گھر گیا تھا، جس کے نتائج کو دیکھ دیکھ کر بقول سرسید آنکھوں میں اندھیرا چھاتا چلا جاتا تھا، اور پاؤں تلے کی مٹی نکلی چلی جاتی تھی، ایسی صورت میں ذہن اگر ادھر منتقل ہو، کہ چیلوں کے کوچے والے مکان میں دنیا اور دنیا کی چیزوں سے بے تعلق ہو کر جھلنگے پر جو پڑا ہوا تھا، وہ ملک و ملت کے ان ہی حالات سے متاثر تھا، تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے، اس قسم کے قومی حوادث میں یہ واقعہ ہے، کہ بڑی مصیبت ان ہی لوگوں کے لئے ہوتی ہے، جن کے سینے میں حساس و نازک دل بھی ہو، اور اس حساس و نازک دل کے ساتھ دماغ بھی ان کے سامنے دلی بے چینیوں کے ازالہ کیلئے طرح طرح کی مشوروں اور تجویزوں کے پیش کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔

ہمارے مصنف امام نے ان ہی ایام کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک موقعہ پر جو یہ خبر دی ہے، کہ

"جس زمانہ میں مولوی صاحب (مولانا نانوتوی) میرے مکان میں رہتے تھے، مولوی صاحب کی صورت پر جذب کی حالت برستی تھی" ص۳۲

"جذب کی حالت" سے حضرت والا کے جس حال کی تعبیر وہ کر رہے ہیں، آگے اس کی تشریح جن الفاظ میں کی گئی ہے بیساختہ اس کو دیکھ کر دماغ میں مشہور عنائی شعر

یہ کیسے بال بکھرے ہیں، یہ کیوں صورت بنی غم کی
تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی

چکر کھانے لگا، بلکہ سچ پوچھئے تو سر چکرانے لگا، تباہ ہم ہو رہے تھے، ہم مٹ رہے تھے، یا مٹائے جا رہے تھے، اور سنئے، مصنف امام کی زبانی سنئے وہ فرماتے ہیں کہ آج جنھیں ہم سیدنا الامام الکبیر کے نام سے موسوم کر رہے تھے ان ہی پر یہ حال طاری تھا کہ

"بال سر کے بڑھ گئے تھے نہ دھونا، نہ کنگھی، نہ تیل، نہ کترے، نہ درست کئے"۔ ص۳۰

آخر میں فرماتے ہیں،

"عجیب صورت تھی"۔ ص۳۰

آگے اسی کے بعد وہی راوی ہیں کہ

"جوئیں بھی بہت ہو گئی تھیں" ص۳۰

اور اسی کے ساتھ یہ اطلاع بھی اسی زمانے کے متعلق وہ دیتے ہیں کہ

"باوجود خوش مزاجی اور ظرافت کے ترش رو، اور مغموم جیسی صورت رہتے"۔ ص۳۰

میں کیا مصنف امام کی ان چشم دید شہادتوں کو جو بھی پڑھے گا، اور اس کے ساتھ پھر سوچے گا کہ یہ امور تھا ان کے جن شیوخ نے حضرت والا کے متعلق حکومت میں جو سراغ رسانی کی تھی، اور جیسا کہ امیر شاہ خاں مرحوم کے حوالہ سے ارواح ثلثہ میں یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ اس سراغ رسانی سے حکومت بھی کافی متاثر ہوئی، ان کی روایت کے الفاظ ہیں کہ

"حکومت کے یہاں سے تفتیش حالات کے لئے احکام جاری ہوئے، اور تفتیش کے مراکز گنگوہ، نانوتہ، رامپور جلال آباد قرار پائے، اور ان کا صدر مقام دیوبند بنایا گیا، حکام نے دورے کئے"۔ ص۱۵۱

یہ بھی ان کا بیان ہے کہ حکومت قائمہ کا کوئی افسر نانوتہ پہنچ کر حضرت سے براہ راست ملا بھی، حضرت والا اس وقت مسجد میں تھے، حاکم نے کہلا بھیجا کہ آپ سے ملنے کے لئے میں کیا مسجد میں

داخل ہوسکتا ہوں، لکھا ہے کہ مولانا مرحوم نے آنے کی اجازت دیتے ہوئے صرف یہ فرمایا کہ "اگر اندر آنا چاہتے ہیں تو جوتے اتار کر آئیں" بہرحال وہ آیا اور جوتے اتار کر آیا، بیان کیا جاتا ہے کہ ملنے کے ساتھ ہی وہ حضرت والا کی شکل و صورت ہی سے اتنا مرعوب اور غیر معمولی طور پر متاثر ہوا کہ سامنے بیٹھنے کی بھی ہمت نہ ہوئی، کھڑے کھڑے ادب کے ساتھ کچھ باتیں دریافت کیں اور چلا گیا، اور جاکر اس نے رپورٹ کردی کہ اس قسم کی ہستیوں پر غدر و فساد کا الزام لگانے والے خود مفسد ہیں، اور جو سراغ رسانی کی گئی ہے، صرف شرارت پر اس کی بنیاد قائم ہے۔

ہوسکتا ہے کہ اس افسر نے اسی قسم کی رپورٹ کی ہو، اور یہ واقعہ بھی ہے کہ اس سلسلہ میں حضرت والا کی کارروائیوں کو "غدر و فساد" سے تعبیر کرنا، خود غداروں اور مفسدوں کی عیاری بلکہ غداری تھی، جو چور تھے وہ کوتوال ہی کو چور ٹھہرا کر ڈانٹ رہے تھے، اور کوئی شبہ نہیں کہ سراغ رسانی کرنے والوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا تھا، اس کی بنیاد یقیناً بجائے کسی خیر کے صرف شرارت ہی پر قائم تھی، لیکن بایں ہمہ حضرت والا کی زندگی اور آپ کی خدمات سے جو واقف ہیں وہی فیصلہ کرسکتے ہیں کہ اپنی رپورٹ میں افسر نے حقیقت سے پردہ اٹھایا تھا، یا حقیقت ہی پردہ بن کر اس کی سمجھ پر پڑ گئی تھی[1]۔

---

[1] خود اسی قصہ میں امیر شاہ خاں صاحب مرحوم کی طرف یہ روایت بھی منسوب کی گئی ہے کہ اس واقعہ کے بعد یعنی سرکاری افسر کی ملاقات اور رپورٹ کے بعد حضرت نانوتوی نے فرمایا کہ میں اکثر دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں اور اپنی ردار مبارک میں مجھے ڈھانپ کر کبھی اندر لاتے ہیں اور کبھی باہر لیجاتے ہیں، اسی سلسلہ میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ اکثر اوقات یہی منظر آنکھوں کے سامنے رہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ردار مبارک میں آپ کو لئے رہتے ہیں اور الگ کرنا نہیں چاہتے[1] عالم واقعہ کی اس کشفی آگاہی کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ ایسے نازک ترین حالات سے اس زمانہ میں مولانا نانوتوی گذر رہے تھے کہ براہ راست نبوت کبریٰ کی طرف سے آپ کی حفاظت و نگرانی کا انتظام کیا گیا تھا، بیچارہ مسکین سرکاری افسر کے بس کی بات تھی کہ عالمین کی رحمت کی چادر میں جسے پناہ دی گئی تھی اسکی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے، ۵۷ء کے ہنگامہ میں حضرت والا کی عملی شرکت کا تفصیلی ذکر اپنے محل پر انشاء اللہ آئندہ کیا جائیگا، اس وقت یہی معلوم ہوگا کہ باوجود شدید کد و کاوش کے سیدنا الامام الکبیر کی گرفتاری میں حکومت کامیاب ہوسکی، ظاہر ہے کہ اتنی محفوظ پشتبانی جسے میسر آگئی ہو، اس پر ہاتھ ڈالنے کی گنجائش ہی کیا باقی رہی تھی، افسوس ہے کہ وقت کے تقاضوں اور مصالح کا خیال کرکے سیدنا الامام الکبیر کے (باقی اگلے صفحہ پر)

بہر حال حضرت والا کے سیاسی رجحانات اور اس راہ میں آپ کے عملی اقدامات وخدمات کا وہی انکار کر سکتا ہے، جس کے دل و دماغ پر اسی قسم کا پردہ پڑا ہوا ہو، جیسے اس سرکاری افسر پر پڑ گیا تھا، لیکن یہاں سوال یہ ہے کہ طلب علم کی زندگی سے فارغ ہونے کے بعد اچانک آپ کے تغیر حال کی جو دردناک داستان مصنف امام نے سنائی ہے، کیا اس کے پیچھے صرف آپ کے سیاسی احساسات ہی پوشیدہ تھے ؟

(بقیہ صفحہ ۲۷۸) سیاسی رجحانات وخدمات پر عموماً پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی، لیکن یہی بات یعنی دیوبند کے مدرسہ کے قائم کرنے کی غرض کیا تھی، کسی دوسرے سے نہیں بلکہ براہ راست خاکسار نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ سے ایک خاص موقعہ پر یہ سنا ہے کہ ۵۷ء کی جدوجہد میں ناکام ہونے کے بعد حضرت الاستاذ نے اس مدرسہ کو جو قائم کیا تو تعلیم سے زیادہ ان کی غرض کچھ اور بھی، صحیح الفاظ تو مجھے یاد نہ رہے لیکن حاصل اسکا بھی قریب قریب ہی تھا، جس کا ذکر رامپور والے "جاسوسی نامہ" میں کیا گیا ہے، اور یہ روایت تو شاید دیوبندی حلقہ میں تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہے، خاکسار نے بھی مولانا حبیب الرحمن صاحب مرحوم سے سنا تھا کہ صوبجات متحدہ کے گورنر لارڈ میکڈانلڈ جنھوں نے اردو ہندی کا قصہ اس علاقہ میں کھڑا کیا، یہی میکڈانلڈ ایک دفعہ شملہ جاتے ہوئے دیوبند کے اسٹیشن سے گذر رہا تھا، اسٹاف میں گورنر صاحب کے ایک مسلمان افسر بھی تھے، ان سے اسٹیشن کا نام پوچھا اور یہ معلوم کرکے کہ یہی "دیوبند" ہے مسلمان افسر بیان کرتے تھے کہ چہرہ میکڈانلڈ کا متغیر ہو گیا اور غصہ میں بولنے لگا کہ ساری شرارتوں کا مرکز یہی مقام ہے، اسی وقت اس نے فیصلہ کیا کہ پہلی فرصت میں دیوبند اور اس کے مدرسہ کا معائنہ میں خود کروں گا، تاریخ معائنہ کی مقرر بھی ہو گئی اور مدرسہ والوں کے پاس باضابطہ سرکاری اطلاع بھی پہنچ گئی اندرونی طور پر میکڈانلڈ کے فاسد ارادے کا علم بھی مدرسہ والوں کو مختلف ذرائع سے ہو تا رہا، مولانا حبیب الرحمن صاحب بیان کرتے تھے کہ مدرسہ کے لئے وہ بڑا نازک وقت تھا، ہم لوگ اس زمانہ میں جوان تھے، سیدھے حضرت گنگوہی کی خدمت میں گنگوہ پہنچے اور لاٹ صاحب کی نیت سے مولانا کو مطلع کیا یہ مشہور ہے مولانا حبیب الرحمن بھی فرماتے تھے کہ حضرت والا مراقب ہو گئے، پھر سر اٹھا کر جوش کے عالم میں یہ فقرہ حضرت کی زبان پر جاری ہوا کہ " نہ لاٹ آئے نہ لٹھوری" حکم دیا کہ اطمینان کے ساتھ جاؤ مدرسہ کا کام کرو۔ لاٹ صاحب کے آنے کی تاریخ کے کچھ دن باقی ہی تھے کہ اچانک دیوبند اور اطراف دیوبند میں کالرا کی وبا پھوٹ پڑی، لاٹ صاحب نے ارادہ ملتوی کر دیا، اسی کے بعد ان کی مدت بھی ختم ہو گئی جس کا مطلب یہی ہوا حکومت بھی، مدرسہ کے اس پہلو سے ناواقف یا کم از کم مطمئن نہ تھی جس کا ذکر رامپور کے ہیزم کشوں نے حکومت تک پہنچایا تھا، بہر حال مجھے یہ کہنا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے سیاسی میلانات کا قصہ ایسا قصہ نہیں ہے جس کی تحقیق کے لئے نکتہ آفرینیوں کی ضرورت ہو، آخر خود سوچنا چاہئے کہ "بٹن" جیسی معمولی چیز کو عمر بھر جس نے صرف اس لئے استعمال نہیں فرمایا کہ یہ نصاریٰ یعنی انگریزوں کی لائی ہوئی چیز ہے (دیکھو ارواح ص۱۸۶) خود انگریزوں اور انگریزوں کی حکومت کے متعلق اس کا کیا حال ہوگا۔ ۱۲

جس زمانے سے ہم گذر رہے ہیں، چونکہ عموماً سیاسی خدمات ہی کو غیر معمولی اہمیت مختلف اسباب و وجوہ سے حاصل ہو گئی ہے، شاید ان لوگوں کا جن کے قلوب میں حضرت والا کی عظمت ہے، یہ خواہش ہو کہ آپ کی زندگی میں بھی سب سے زیادہ اسی پہلو کو نمایاں کیا جائے جس کا سیاست سے تعلق ہو، دیکھا جا رہا ہے کہ اس سلسلہ میں رائی کو پربت بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے، تو لوگ اس سے بھی نہیں چوک رہے ہیں، لیکن میرے نزدیک اس قسم کی سیرت نگاری، سیرت نگاری نہیں بلکہ ایک قسم کی وقتی قصیدہ خوانی سے زیادہ وہ اور کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ سوچا جائے تو ایک طرح سے یہ علمی خیانت اور فنی بددیانتی بھی ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ وقت کے تقاضوں نے سیاسی خدمات میں خواہ کتنی بھی اہمیت پیدا کر دی ہو، لیکن موسمی بادل جب پھٹ جائیں گے اور واقعات کو واقعات ہی کے رنگ میں سوچنے کا ماحول جب پیدا ہو گا، تو دنیا پر خود ہی یہ واضح ہو جائے گا کہ سیاسی ہنگامہ آرائیاں اور اس راہ کی قربانیاں خواہ جیسی کچھ بھی ہوں ان کی بذات خود کوئی قیمت نہیں ہے، کام کس لئے کیا گیا اور قربانیاں کس نصب العین کے لئے پیش کی گئیں، دیکھنے کی اصل چیز وہی ہوتی ہے، آخر میں پوچھتا ہوں کہ خدمات اور قربانیوں کی حد تک سید الشہداء حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور غریب ابوجہل میں انصاف سے بتائیے کیا فرق ہے، سید الشہداء اگر سید الشہداء (العیاذ باللہ) صرف اس لئے قرار پائے کہ اپنی جان عزیز کی قربانی انھوں نے پیش کی تھی، تو جان کی حد تک بنایا جائے مسکین ابوجہل نے بھی کیا کمی کی تھی، مگر اپنی تمام قربانیوں کے باوجود ابوجہل ابوجہل ہی رہا جس کی وجہ اس کے سوا اور کیا تھی کہ جس لئے اس نے قربانی پیش کی تھی وہ مقصد غلط تھا۔

خیر یہ قصہ تو بجائے خود بڑا طویل ہے، میرے لئے اس موقعہ پر صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ جن حالات سے ہندوستان کے مسلمان اس زمانہ میں گذر رہے تھے اور ان کی حکومت کا پایۂ تخت شہر دلی جن سیاسی ہچکولوں سے تہ و بالا ہو رہا تھا، اسی دلی میں رہتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر کا دل تو خیر آپ ہی کا دل تھا، معمولی ادنیٰ درجہ کے مسلمان کا بھی ان حالات سے متاثر نہ ہونا یقیناً ناممکن تھا، مسلمانوں کا حکمراں خاندان ان ہی مسلمانوں کے بنائے ہوئے قلعہ سے

نکالا جا رہا تھا، اس خبر سے کونسا مسلمان ہوگا جس کا کلیجہ سینہ سے نہ نکل پڑا ہو، یہ صحیح ہے جیسا کہ حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ حوادث و مصائب کے برداشت کیلئے جن اعصابی قوتوں اور جسمانی صلاحیتوں کی ضرورت ہے، سیدنا الامام الکبیر کو پیدا کرنیوالے نے ان سے بھی مالامال کر کے آپ کو پیدا کیا تھا۔

ہمارے مصنف امام کی یہ شہادت آپ کے ایام طفولیت کی گذر چکی ہے کہ قصبہ نانوتہ میں آپ کا گھر ایسی جگہ تھا، جس میں پہنچنے کے لئے ایک بڑی طویل گلی سے گذرنا پڑتا تھا، مصنف امام نے یہ بھی فرمایا تھا کہ وہ بڑی وحشتناک جگہ تھی، وہاں آسیب بھی مشہور تھا، مگر بایں ہمہ وہی فرماتے ہیں کہ

"راتوں کو بہت بہت دیر سے بے تکلف گھر جاتے اور کچھ خوف نہ کرتے" ص۲۷

اور یہ قصہ تو بچپن کا ہے، وفات سے کچھ دن پیشتر آخری حج میں جب حضرت والا مکہ معظمہ سے واپس ہوئے اور جہاز پر سوار ہونے کے لئے جدہ کی بندرگاہ سے کشتی پر روانہ ہوئے تو کشتی میں دوسروں کے ساتھ آپ کے تلمیذ عزیز مولانا منصور علی خاں صاحب حیدرآبادی مرحوم بھی تھے، یہی مولانا منصور علی خاں راوی ہیں کہ کشتی جب ساحل سمندر سے جہاز تک پہنچنے کے لئے کھلی، تو

"اس قدر تیز و تند ہوا چلنے لگی کہ کشتیاں ادھر ادھر قریب غرق ہونے کے جھک جاتی تھیں"

مولانا منصور علی خاں کا بیان ہے کہ کشتی پر جو لوگ سوار تھے،

"ہر ایک کا رنگ زرد ہو جاتا تھا"

مگر کشتی کے جھکولوں سے جن لوگوں کے چہرے زرد پڑ جاتے تھے، ان ہی میں مولوی منصور علی خاں صاحب مرحوم اپنے استاذ (سیدنا الامام الکبیر) کو دیکھ رہے تھے، فرماتے ہیں کہ

"مگر مولانا مرحوم اپنے حال پر رہے" (مذہب منصور ص۱۸۲)

ابتداء و انتہاء کی ان شہادتوں کے ساتھ زندگی کی درمیانی منزل کی یہ شہادت بھی مصنف امام کی زبانی سن لیجئے، غدر کے ہنگامہ کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ لکھنے کے بعد کہ

"اس طوفان بے تمیزی سے سب لوگ گھبراتے تھے"

وہی یہ گواہی دیتے ہیں کہ

ہم نے کبھی مولانا کو گھبراتے ہوئے نہ دیکھا، خبروں کا اس وقت چرچا تھا، جھوٹی سچی ہزاروں گپ شپ اڑا کرتی تھیں، مگر مولوی صاحب اپنے معمولی کام بدستور انجام فرماتے تھے۔" ص۱۸۱

یہ اور اس قسم کی بیسیوں شہادتیں جن کا ذکر اپنے اپنے محل پر انشاء اللہ تعالیٰ اس کتاب میں بھی کیا جائیگا، ان کو دیکھتے ہوئے "جذباتیت" یا "مغلوب الحالی" کی اس کیفیت کے انتساب کی آپ کی طرف کوئی جرأت نہیں کرسکتا، جس میں اعصابی ضعف کے مریضوں کو عموماً مبتلا پایا گیا ہے، ہوتے تو ہیں یہ بیچارے جسمانی اور مادی بیماری کے شکار، لیکن اس بیماری کے آثار کا ظہور وقتی محرکات کے زیر اثر ان پر جب ہوتا ہے، تو ان کی مذبوحی حرکات کو روحانی کیفیات کا ثمرہ قرار دیا جاتا ہے، جیساکہ میں نے عرض کیا سیدنا الامام الکبیر کے متعلق تو اس کا اندیشہ بھی بد اندیشوں کے سوا کسی متوازن فکر و عقل رکھنے والے کو نہیں ہوسکتا۔

لیکن جسمانی نظام اور اعصابی استحکام کی گواہیاں دینے والوں ہی سے اسی کے ساتھ اس قسم کے مشاہدات کی روایتیں بھی جب ہم سنتے ہیں، مثلاً وہی مولانا منصور علی خاں صاحب حیدرآبادی مرحوم جنھوں نے بحر عرب کے طوفانی تلاطم میں سیدنا الامام الکبیر کو اپنے حال پر قائم و دائم پایا تھا، وہی یہ لکھتے ہوئے کہ ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت والا کے قلبی تعلق کا کیا حال تھا راوی ہیں کہ

"اسم گرامی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا سن کر لرزہ بدن پر پڑجاتا تھا اور چہرہ کا رنگ متغیر ہوجاتا تھا، اور ایک عجیب حالت نمایاں ہوتی تھی، جو معرض بیان میں نہیں آسکتی۔" ص۱۸۱

اور اسی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ "قالب" آپ کا خواہ جتنا بھی آہنی ہو، لیکن اسی آہنی قالب میں قلب مبارک کا جو آبگینہ محفوظ تھا، وہ کتنا رقیق و لطیف، کتنا نازک و حساس تھا، ایسی صورت میں اپنے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی ان زبوں حالیوں سے آپ کو جتنا بھی متاثر تسلیم کیا جائے یقیناً اسکی گنجائش ہے، لیکن صرف ان ہی "سیاسی عوامل و مؤثرات" کے ساتھ آپ کے ان حالات کو وابستہ

کردیا، جن کا ذکر مصنف امام نے فرمایا ہے، میرے نزدیک نہ صرف واقعات ہی سے چشم پوشی کا نتیجہ ہو سکتا ہے، بلکہ جہاں تک خاکسار کا ناقص خیال ہے اس قسم کا دعویٰ شاید حضرت والا کے شایانِ شان بھی نہیں ہے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ اور کسی کے متعلق سوچا جائے یا نہ سوچا جائے، لیکن محمدی اداؤں پر مٹنا اور نبوت کبریٰ ہی کے نقوش پا کی خاک بن کر فنا ہو جانا یہی لے دے کر جسکی زندگی کا سارا سرمایہ اور کل پونجی ہو، حیرت ہوتی ہے کہ لوگ "حرا" سے پہلے اس کو "بدر" میں کیوں ڈھونڈتے ہیں، بلاشبہ وہ "بدر" کے میدان میں بھی اترا، اس کو "احد" کے تجربات سے بھی گذرنا پڑا، آئندہ ان واقعات کی تفصیل آپ کے سامنے بھی آئیگی، لیکن "بدر" و "احد" کے قصوں ہیں آپ ہی بتائیں کہ ان حالات کو کیسے بھلا دیا جائے جو عشق و سرمستی کے اسی سلسلے ہیں اسی کے ساتھ اس وقت پیش آئے، جب "بدر" و "احد" سے پہلے حرائی تجربات و مشاہدات سے اس کو گذرنا پڑا تھا، یا کہیئے تو کہہ سکتے ہیں کہ اپنی اجتبائی شان و خصوصیت کی بنیاد پر حراء کے ان تجربات و مشاہدات سے اس کو گذارا گیا تھا۔

بلاشبہ آج یہ دیکھا جا رہا ہے اور خدا ہی جانتا ہے کہ کب تک دکھانے کا یہ سلسلہ جاری رہے گا کہ دماغوں کو جگا دینے کے بعد جاگنے والوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے کہ جو سوئے ہوئے ہیں ان کے جگانے کا کام شروع کر دیں، لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا کہ دماغ کی بیداری کو جسد کے اس قدوسی مضغہ یا "لاہوتی جوہر" کی بیداری سے کوئی تعلق نہیں ہے، جس کے ساتھ سارے جسدی نظام کی بیداری وابستہ ہے "اَلَا وَہِیَ الْقَلْبُ" کے الفاظ میں نبوت کی زبان ہیں جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور یہ اتنی کھلی ہوئی بات ہے کہ جس کا جی چاہے ایسی ہستیوں کو پا سکتا ہے جن کے دماغ بیدار اور حد سے زیادہ بیدار ہیں، لیکن عین اسی دماغی بیداری کے ساتھ یہ دیکھا جاتا ہے کہ قلب یا دل ان کا سینے میں سویا ہوا ہے، بلکہ دیکھنے والوں کو بسا اوقات محسوس ہوتا ہے کہ مرا ہوا ہے، سلجھنے کے ساتھ ساتھ الجھنے اور الجھ پڑنے کے حوادث کا عام تجربہ عصرِ جدید کے اصلاحی اقدامات و مساعی ہیں آئے دن جو ہوتا رہتا ہے، دنیا کو یہ کیسے سمجھایا جائے کہ یہ سارے خمیازے اسی غفلت اور لاپروائی کے ہیں جو عام طور پر "قلب" اور "دل"

کی جانب سے اس زمانہ میں اختیار کی گئی ہے، بیدار دماغ صرف دماغوں کو بیدار کر سکتا ہے، لیکن جن کے دل خود سوئے ہوں، آپ غلط امید باندھ رہے ہیں کہ وہی دلوں کو جگانے میں کامیاب ہوں گے، جس کے بگڑ جانے سے انسانیت کے طبیب اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا جب یہ فیصلہ ہو کہ سب کچھ بگڑ جاتا ہے تو اس کی سدھار سے بے پروا ہو کر سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ بجائے بگاڑ کے سدھار کی توقع کیوں کرتے ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ دیوبند یا دیوبندی تحریک کی امامت و قیادت کے لئے جس ذات گرامی کا انتخاب قدرت کی طرف سے ہوا تھا، بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ وقت کی دوسری عام تحریکوں کے مقابلہ میں اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہی تھی کہ عمل کے میدان میں اترنے یا اتارنے سے پہلے جہاں دماغی بیداری کے اسباب اس کے لئے فراہم کئے گئے وہیں قدرت ہی کی طرف سے یہ بات تھی کہ دل کے جگانے کی جو قدرتی راہیں ہیں، ان کی اہمیت اس پر شروع ہی میں واضح کر دی گئی تھی۔

واقعہ یہ ہے اپنے تمہیدی بیان میں تفصیل سے عرض کر چکا ہوں کہ اس زمانہ کی غیر معمولی بیدار دل ہستی سیدنا حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت بابرکت میں حاضری اور حاضری ہی نہیں بلکہ محبت و شفقت خاص کی سعادت اندوزی کا موقعہ سیدنا الامام الکبیر کو اسی زمانہ میں میسر آ چکا تھا جب طفولیت کی منزلوں سے آپ کی زندگی نانوتہ میں گذر رہی تھی، نانوتہ سے جب دماغی بیداری کے لئے آپ دلی کی تعلیم گاہ مملوکی میں شریک ہوئے، تو واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حاجی صاحب قبلہ کے ساتھ اس زمانہ میں بھی آپ کے تعلقات قائم تھے مولٰنا عاشق الٰہی نے تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ

"یگانگت اور ارتباط قلبی کے باعث، حضرت مولانا قاسم العلوم نے وطن سے دہلی آتے جاتے، تھانہ بھون کی حاضری اور اعلیٰ حضرت (حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ) کی زیارت کو معمول بنا رکھا تھا۔"

آمدورفت کے سلسلہ نیاز اندوزیوں کے ان مواقع کے سوا مولوی عاشق الٰہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ۔

"اعلیٰ حضرت (حاجی امداداللہ) بھی جب دہلی تشریف لاتے، تو حضرت مولانا مملوک علی صاحب کے پاس قیام فرماتے، اور استاذ الکل (مولانا مملوک العلی) کے رشید شاگرد (سیدنا الامام الکبیر) بھی زیارت سے بہرہ یاب ہوتے۔"

خلاصہ یہی ہے کہ دلّی سے نانوتہ، نانوتہ سے دلّی جاتے ہوئے بھی حضرت حاجی صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضری کے مسلسل مواقع آپ کو ملتے رہے، اور یوں بھی جب کبھی حاجی صاحب دلّی تشریف لاتے تو قدرتی تائیدہی کی اس کو ایک شکل سمجھنا چاہئے کہ دہلی جہاں عرض کرچکا ہوں، شاہی خانوادے کے بھی بعض ارکان تک حاجی صاحب سے بیعت وارادت کا تعلق رکھتے تھے اسی دلی میں بجائے کسی اور جگہ فروکش ہونے کے اسی گھر کو قیام گاہ بنانے کا شرف بخشا جاتا تھا، جہاں سیدنا الامام الکبیر کو حاجی صاحب کے ساتھ تعلقات کے تروتازہ کرنے کا موقعہ بآسانی مل جاتا تھا۔

اور گو باضابطہ حلقہ بگوشی کا باطنی رشتہ حاجی صاحب قبلہ کے ساتھ آپ کا قائم نہیں ہوا تھا، اور ساری توجہ بظاہر ان ہی علوم کی طرف مبذول تھی، جن سے فکرونظر کی قوت کے چمکانے اور بڑھانے میں مدد ملتی ہے، لیکن مجھے تو اس میں بھی آپ کی اجتبائی شان ہی کی شعاعیں نظر آتی ہیں کہ مدرسہ کی طالب العلمی کے ان دنوں میں جب ملائیت کا نشہ طالب العلموں پر چڑھایا جاتا ہے، تجربہ اور مشاہدہ گواہ ہے کہ نشہ کی اس حالت میں عموماً علمی اور فکری کاروبار کے سوا طلبہ کے دلوں میں کسی دوسری چیز کی عظمت و اہمیت مشکل ہی سے باقی رہتی ہے، خام عمری کہئے یا خام عقلی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ جو کچھ ان کی کتابوں میں ہے، اور مدرسہ میں جو کچھ ان کو پڑھایا جاتا ہے وہی ان کے نزدیک اس زمانہ میں سب کچھ ہوتا ہے، خصوصاً عقلی علوم کے ساتھ ساتھ دینی کتابوں کے پڑھنے والوں میں یہ خیال اگر قائم ہوجائے کہ سارا دین یہی ہے، تو جن حالات سے

ملامتیت کی یہ زندگی گذرتی ہے' ان کے لحاظ سے اس پر تعجب بھی نہ کرنا چاہئے' جو کچھ ائمہ نے سمجھا ہے صحابہ سے منقول ہے پیغمبر نے فرمایا ہے اور خالق کائنات نے جن باتوں سے بذریعہ وحی آگاہی بخشی ہے' جو ان ساری چیزوں کو پڑھ رہا ہو' آپ خود خیال کیجئے کہ ذہن کے لئے مزید کسی اور چیز کی ضرورت کا احساس اس کے دل میں اگر باقی نہ رہے تو مدرسوں کے "بند گنبد" کی تعلیم کا اثر اور ہو ہی کیا سکتا ہے عموماً چونکنے والے چونکے بھی ہیں' تو اس "گنبد" سے باہر نکلنے کے بعد ہی چونکے ہیں' اور تو اور وقت کے قطب ارشاد' حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت والا کے ساتھ اسی ملوکی تعلیم گاہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے' خود ان ہی کے متعلق اسی موقعہ پر مولوی عاشق الٰہی نے اس مشہور دلچسپ لطیفہ کا ذکر کیا ہے کہ مولٰنا مملوک العلی سے مولانا گنگوہی اور سیدنا الامام الکبیر دین کی کوئی کتاب نہیں بلکہ منطق کے مشہور متن سلم العلوم کو پڑھ رہے تھے' اسی عرصے میں حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ مولٰنا مملوک العلی صاحب سے ملنے کے لئے تشریف فرما ہوئے' ابھی قریب بھی نہیں پہنچے تھے کہ مولٰنا مملوک العلی صاحب کی نظر حاجی صاحب پر پڑی' دیکھنے کے ساتھ ہی پڑھنے والے طلبہ کو خطاب کر کے مولانا مملوک العلی صاحب نے فرمایا' لو بھائی! کتاب اٹھاؤ' حاجی صاحب آرہے ہیں۔

مولوی عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ اس وقت مولٰنا گنگوہی نے صرف یہی نہیں کہ حاجی صاحب کو دیکھا نہیں تھا' بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرسری واقفیت بھی نہیں رکھتے تھے' استاذ کی زبانی عین ایسے وقت میں جس وقت جوش میں سبق ہو رہا تھا' یہ فقرہ کہ "بھائی کتاب اٹھاؤ" مولٰنا گنگوہی پر حد سے زیادہ گراں اور شاق گذرا' جس ہیئت کذائی کے ساتھ حاجی صاحب اس وقت آئے تھے' یعنی نیلی لنگی کندھے پر پڑی ہوئی تھی' نہ جبہ نہ خرقہ' نہ عمامہ' شاید اس صورت کذائی کا بھی تو اثر ہوگا کہ جھنجھلا کر مولٰنا گنگوہی چپکے چپکے اپنے ساتھی سیدنا الامام الکبیر سے فرمانے لگے (مولوی عاشق الٰہی نے یہی الفاظ نقل کئے ہیں) کہ

"بھئی یہ اچھا حاجی آیا ہمارا سبق ہی گیا"۔

اس ذہنیت کی ٹھیک ٹھیک صحیح ترجمانی مولانا گنگوہی کے اس فقرے سے ہو رہی ہے، جو مدرسہ کی طالب العلمانہ زندگی پیدا کر دیتی ہے، یہ سچ ہے کہ اس وقت مولانا گنگوہی کی عمر سترہ اٹھارہ سال کے لگ بھگ ہوگی، لیکن قابلیت کے لحاظ سے ترقی کر کے اس منزل تک وہ پہنچ چکے تھے جس میں سلم کے پیچیدہ مسائل کے سمجھنے کا استحقاق طالب العلم کو حاصل ہو جاتا ہے، مگر جس قسم کی زندگی اس وقت وہ گذار رہے تھے اس کا لازمی نہ ہی تاہم ایسا نتیجہ ضرور ہے جس کا مشاہدہ عربی مدارس کے طلبہ کی اکثریت میں آج بھی کیا جا سکتا ہے، اسی لئے اس پر مجھے تعجب نہ ہوا، ہاں حیرت کی بات وہ ہے جس کا ذکر اسی کے بعد مولوی عاشق الٰہی صاحب نے کیا ہے کہ مولانا گنگوہی جس وقت یہ فرما رہے تھے کہ "اچھا حاجی آیا ہمارا سبق ہی گیا" ٹھیک اسی وقت ان کے رفیق درس جو عمر میں حالانکہ ان سے چھوٹے تھے یعنی سیدنا الامام الکبیر مولانا گنگوہی سے فرما رہے تھے:

"بابا ایسا مت کہو یہ بزرگ ہیں، اور ایسے ایسے ہیں"

مولوی عاشق الٰہی نے غالباً براہ راست خود مولانا گنگوہی سے اس قصہ کو سنا تھا، یا سننے والوں سے نقل کیا ہے، بہرحال اس قصہ کا تذکرہ خود مولانا گنگوہی فرمایا کرتے تھے اور آخر میں فرماتے کہ

"ہمیں کیا خبر تھی کہ یہی حاجی ہمیں مونڈیں گے"

خیال کرنے کی بات ہے، اپنے عہد میں "قلوب" کا جو طبیب اعظم قرار دیا گیا اور دیدۂ باطن نے "قطب ارشاد" کی لاہوتی بلندیوں پر جس کے جھنڈے کو لہراتا ہوا پایا، اپنی طالب العلمی کے دنوں میں خود ان ہی کا اعتراف ہے کہ اس راہ کے راہ بر سے وہ بے خبر تھے۔ "اجنبائیت" کے سوا آخر اس کی توجیہ اور کیا کی جائیگی کہ ان ہی کے دوسرے رفیق ٹھیک طالب العلمی کی اسی زندگی میں یہی نہیں کہ خود ہی اس سے با خبر تھے، بلکہ دوسروں کو بھی اس کی خبر دے رہے تھے۔ اس وقت "ایسا نہ کہو" کا جو مشورہ دیا گیا اس سے تو شاید مخبری کی ابتدا ہوئی، ورنہ جیسا کہ مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ

"امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس اللہ سرہ سے چونکہ خلوت وجلوت کی شرکت تھی"

اس لئے ان ہی کا بیان ہے کہ مولانا محمد قاسم اور مولانا گنگوہی کے درمیان حضرت حاجی صاحب قبلہ کے متعلق

"خصوصیت کا ذکر ہوتا، بلکہ اس کی کوشش (مولانا محمد قاسم کی طرف سے) تھی کہ حضرت مولانا (گنگوہی) بھی اس مقدس ہاتھ پر بیعت ہوں" ص۴۱

اور یہ مخبری کیا صرف ایک مولانا گنگوہی کی ذات تک محدود تھی، مولانا عاشق الٰہی کی روایت اور شہادت ہے کہ

"حضرت مولانا قاسم العلوم اپنے ہم جماعت طلبہ میں اعلیٰ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کمالات علمیہ و عملیہ کا تذکرہ فرماتے اور خوارق و کرامات کے اظہار و بیان سے آستانہ امدادیہ کی طرف ترغیب دیتے تھے"۔

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ خاص تعلقات کی بنیاد پر کسی ایک دوسے نہیں بلکہ جو بھی آپ کے ساتھ دینی تعلیم اور ان فنون کے حاصل کرنے میں مشغول تھے، جن سے دماغوں کے جگانے کا کام اس زمانہ میں لیا جاتا تھا، عموماً اپنے علم کے ان ساتھیوں کے متعلق سیدنا الامام الکبیر کا طالب العلمی ہی کے زمانے سے نوعمری ہی کے دنوں میں یہ نقطۂ نظر تھا کہ قلبی بیداری کے بغیر صرف دماغی جاگ اور عقلی ارتقا ان نتائج کے پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا جن کی جائز توقع دینی و ملی خدمات میں مشغول ہونے والوں سے کی جا سکتی ہے، آپ کا یہ فیصلہ جو شاید آپ کی سرشت کا جبلی اقتضاء تھا، ممکن ہے کہ واضح شعور اس نقطۂ نظر کا نوعمری کے ان دنوں میں نمایاں نہ ہوا ہو، اور اپنے رفقاء درس کو آستانہ امدادیہ کے ساتھ وابستگی پر جو آپ ابھارا کرتے تھے خود آپ کو اس کا اندازہ نہ ہو کہ اس کی ہدایت آپ کیوں فرما رہے ہیں لیکن تھا یہ آپ کے اسی فطری رجحان کا زور، کم از کم میرا ذاتی خیال تو یہی ہے

بلکہ غور کیجئے تو حضرت والا کی یہ اجتبائی نظرت قرآن حکیم کے اس تربیتی اصول کی غیر شعوری طور پر اقتداء کر رہی تھی جس میں تعلیم کے ساتھ تزکیہ کو لازم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چارگانہ فرائض میں شمار کیا گیا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ ایک آیت میں تو تزکیہ کو تعلیم سے مقدم لایا گیا ہے اور ایک جگہ مؤخر جس سے اس

مقصود کی طرف راہنمائی کرنی مقصود ہے کہ تعلیم سے مقدم تزکیہ اس طرح علمی استعداد پیدا کرائے جانیکا ذریعہ ہے جس سے علم میں استقامت پیدا ہوجائے ذہن میں کسی قسم کی کجی اور زیغ باقی نہ رہے اور جس سے فہم میں مطلوبہ استواری اور ہمواری جڑ پکڑ جائے۔ اور تعلیم سے مؤخر تزکیہ قرب حق کی استعداد پیدا کرائے جانے کا ذریعہ ہے تاکہ راہ سلوک آسان ہوجائے، اس میں کجراہی راہ نہ پائے، اور اخلاق انسانی اخلاق ربانی سے متخلق ہوجائیں۔ حاصل یہ کہ مقدم تزکیہ قوت علمیہ کی تکمیل کا ضامن ہے اور مؤخر تزکیہ قوۃ عملیہ کی تکمیل کا ضمانت دار ہے اور انہی دو قوتوں پر انسانی سیادۃ کا مدار ہے، پس حضرت والا اپنی اجتبائی شان سے ابتداء عمر ہی میں دونوں قسم کے تزکیوں کی طرف فطری رجحان رکھتے تھے۔ آپ ایک طرف علمی قوۃ بڑھانے میں اساتذہ کے واسطہ سے تزکیۂ فہم کے لئے زانوئے ادب تہ کئے ہوئے تھے، اور ایک طرف اخلاقی قوۃ کی قدر و قیمت کے پیش نظر اس مربی اخلاق ہستی کی جو چند دن بعد آپ کے اخلاق کی مربی بننے والی تھی توقیر کرنے اور اپنے رفقاء درس سے توقیر کرانے میں پیش پیش تھے۔ محمد طیب)

سچ پوچھئے تو اسی کے اندر چاہا جائے تو حضرت والا کی زندگی کے ایک خاص پہلو کے راز کو بھی ڈھونڈھا اور پایا جا سکتا ہے؛

مقصد یہ ہے کہ گو کلی دعویٰ تو مشکل ہے، لیکن عام طور پر ان بزرگوں کے متعلق جو گفتار اور قال کی راہوں کو طے کرنے کے بعد رقت و حال کی منزلوں میں داخل ہوئے ہیں، صاف لفظوں میں یوں کہئے کہ ملا بننے کے بعد جن بزرگوں کو فقیر بنتے دیکھا گیا ہے، یعنی دماغ کے بعد دل کو جگانے میں جو کامیاب ہوئے ہیں ان کی زندگی کی یہ گردشی حرکت عموماً کسی دلچسپ، غیر معمولی انقلابی حادثے کی صورت میں وقوع پذیر ہوئی ہے، کافی کشمکش، رستاخیز، شکست و ریخت کے بعد ہی دیکھا گیا ہے کہ ڈالنے والوں نے اس سلسلہ میں اپنی سپر ڈالی ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جو جتنے بڑے تھے ان کی زندگی کا یہ انقلابی حادثہ بھی پایا گیا ہے کہ اسی قدر بڑا تھا، دل دوز اور دلکش پیرایوں میں چڑھنے والوں کے گرنے کی ان دردناک داستانوں کو بیان کرنے والوں نے بیان کیا ہے، اور آج بھی پچھلوں کی محفلوں میں اگلوں کے یہ قصے سرمایۂ نشاط اور پیغام حیات بنے ہوئے ہیں، حال و قال والوں کی باہمی آویزش کی یہ سرگذشت اتنی

دراز و طویل ہے کہ ایک مستقل کتاب ہی اس سے تیار ہو سکتی ہے،

دور کیوں جائیے خود ہمارے سیدنا الامام الکبیر ہی کے رفیق الاولی والآخرہ حضرت مولٰنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جو صورت پیش آئی ہے اس کے دیکھنے والے نہیں، تو دیکھنے والوں سے سننے والے تو شاید آج بھی موجود ہوں گے، وہی حضرت گنگوہی جن کے مقابلہ میں مخالفتوں کا طوفان عظیم سرزمین ہند میں جب بلند ہوا، ملک کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک بدانديشیوں کی آگ بھڑکانے والوں نے بھڑکا رکھی تھی، ثابت[ل] کرنے والے آپ کی تحریروں اور تقریروں سے جو جی میں آرہا تھا ثابت کرنے میں اپنے سارے مولویانہ کرتبوں کو خرچ کر رہے تھے، کتابوں کا انبار لگا دیا گیا تھا، تحقیر و اہانت، بلکہ سب و شتم تک کا کوئی دقیقہ ان کتابوں میں اٹھا نہ رکھا گیا تھا، مگر حضرت والا کو خود تو توجہ اس کی طرف کیا ہوتی مولٰنا عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ آپ کے عقیدت مندوں نے چاہا کہ ان تحریروں کے مقابلہ میں وہ بھی کچھ لکھیں مولوی سراج احمد صاحب نے آپ کے رجحان طبع کا خیال کر کے ایک دفعہ کہا کہ صاف لفظوں میں آپ اجازت نہیں دیتے تو کچھ ایسے کلمات ہی فرما دیجئے جن سے اجازت کا اشارہ ہم لوگوں کو مل جائے، الغرض اصرار پر لوگ اصرار کر رہے تھے کہ جواب میں کچھ لکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے، مگر سب کے جواب میں مولٰنا عاشق الٰہی کا بیان ہے کہ حضرت گنگوہی فرمایا کرتے کہ

"میاں کیا دھرا ہے، ان قصوں میں ان کی تحریر کا جواب لکھنے سے کوئی نفع نہیں تضیع اوقات ہے" (ص۱۶۸ تذکرۃ الرشید ج ۲)

ایک حال حضرت امام ربانی کا یہ تھا، جس وقت قطب ارشاد کے باطنی منصب پر آپ سرفراز تھے

[ل] ایک مطلب تو کسی عبارت یا فقرے کا وہ ہوتا ہی جو واقعی اسکے بولنے والے یا لکھنے والے کی مراد ہوتی ہے، غریب عوام الناس کے نزدیک تو مطلب اور معنے کا ترجمہ یہی ہے لیکن "ملائیت" یا "مولویت" کے دائرہ میں ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ پہلے ایک مقصد طے کر لیا جائے اور جس عبارت یا فقرے سے چاہا جاتا ہے اُسی خود تراشیدہ مطلب کو کھینچکر دکھا دیا جاتا ہے، بولنے والا اور لکھنے والا حیران ہو جاتا ہے، اس غریب کے فرشتوں کو بھی اس کی خبر نہیں ہوتی، یہ "مولویانہ بازی گری" کا ایک طلسمی گر ہے، اسی کرتب کا ناچ ثابت کرتا ہے کہ حضرت گنگوہی کے ساتھ بھی چال چلی گئی اور آپ کی بعض عبارتوں اور فقروں سے ایسے عجیب و غریب مطالب نکال نکال کر دکھائے گئے کہ شاید کوئی کٹر کافر بھی کسی ادنیٰ درجہ کے مسلمان کی طرف بھی اسکے انتساب کو عقلاً جائز نہیں قرار دے سکتا مگر اسلام و ایمان کے مدعیوں کی سینہ زوریاں صرف تھیں کہ العیاذ باللہ مولٰنا گنگوہی کا یہی عقیدہ ہے ۱۲

مگر آخر میں جن کا حال یہ تھا، وہی مولانا گنگوہی جب مدرسہ دہلی سے عالم بن کر شروع شروع میں اپنے وطن مالوف گنگوہ تشریف لائے تھے، تو حد سے زیادہ ایک جزئی معمولی مسئلہ میں تھانہ بھون کے ایک عالم مولانا شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ سے اختلاف پیدا ہو گیا، دونوں طرف سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا، تفصیلی قصہ تو اس کا تذکرۃ الرشید میں پڑھئے؛ میں صرف یہ سنانا چاہتا ہوں کہ مخالفتوں کا طوفان بھی جس کے ارادے میں جنبش پیدا نہیں کر سکتا تھا، مولویانہ مناظرے اور مباحثہ میں صرف اپنے ہی لئے نہیں دوسروں کیلئے بھی تضیع اوقات کے سوا جس کے آگے اور کچھ باقی نہ رہا تھا، پہاڑ بھی اس سلسلہ میں ان کے سامنے آکر رائی بن جاتا تھا، ان ہی پر ایک زمانہ میں یہ کیفیت بھی طاری تھی، مولوی عاشق الٰہی صاحب نے تذکرۃ الرشید میں تفصیلی تذکرہ اس کا کیا ہے، حاصل یہ ہے کہ دلی کے مدرسہ سے فارغ التحصیل ہو کر مولانا گنگوہی جب وطن واپس ہوئے، اتفاقاً ایک معمولی مسئلہ میں تھانہ بھون کے مشہور عالم مولانا شیخ محمد تھانوی سے حضرت والا کا اختلاف ہو گیا، پھر کیا تھا، طرفین سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا، مولانا شیخ محمد صاحب کو یہ بات حد سے زیادہ ناگوار گذر رہی تھی کہ ایک تازہ وارد، نوجوان مجھ پر نکتہ چینی کر رہا ہے، بات بڑھتی ہی چلی گئی، نوبت بایں جارسید کہ تحریر سے کام دیکھا کہ نہیں چل رہا ہے تو تھانے کے بوڑھے عالم کو چت کرنے کے لئے گنگوہ کا نوجوان عالم براہ راست تھانہ بھون پہنچ گیا، تھانہ کا یہ سفر کس شان کے ساتھ کیا گیا تھا، مولوی عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ اچانک گھر والوں کو اطلاع دیئے بغیر روانہ ہو گئے، سواری کا بھی انتظام نہ کیا، پیادہ پا ہی چل پڑے، اور سیدھے تھانہ پہونچ گئے، جس وقت وہاں پہونچے تھے ظہر کا وقت تھا نماز کے خیال سے تھانہ بھون کی اسی تاریخی مسجد میں جس میں ہجرت سے پہلے آن کے پیر و مرشد حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ قیام فرماتے تھے، تشریف لے گئے، نماز ہو چکی تھی، حاجی صاحب تلاوت میں مشغول تھے، متعدد بار حاجی صاحب سے ملاقات ہو چکی تھی، سامنے دیکھ کر سلام کے لئے حاضر ہوئے دیکھ کر حاجی صاحب نے پوچھا یہ آپ تھانہ بھون کہاں؟ علم کے جوش میں بھرے ہوئے تھے۔ جواب میں کہا کہ مولانا شیخ محمد صاحب سے زبانی مناظرہ کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں، اب یہ تقدیری بات

تھی، کہ آئے تھے آگ لینے، کے لئے، اپنی علمی فضلیت کا سکہ جمانے کے لئے کہ اچانک حاجی صاحب قبلہ کی زبان مبارک سے یہ سن کر کہ

"ہاہا ایسا ارادہ نہ کرنا میاں! وہ ہمارے بزرگ ہیں، بڑے ہیں" (ص ۲ ج ۱)

ایسا معلوم ہوا کہ نہ علم کا ادعا باقی تھا، اور نہ مناظرے کا ارادہ، ایک فقرے نے سب کو جلا کر بھسم کر دیا، آئے تھے کہ تھانہ بھون کے شیخ کو چت کریں گے، مگر دیکھا گیا کہ اسی تھانہ کے ایک دوسرے شیخ کے قدموں پر گرے ہوئے ہیں، اسی کے بعد مفت کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے لیکن شاید آپ کی مولویت ہی کا اقتضاء تھا کہ صاف صاف لفظوں میں اپنے پیر حاجی صاحب سے مولنا گنگوہی نے فرما دیا تھا کہ

"مجھ سے ذکر و شغل اور محنت و مجاہدہ کچھ نہیں ہوسکتا اور نہ رات کو اٹھایا جائے" (ص ۲ ج ۱)

مگر ہوا کیا؟ اس سوال کا جواب خود ہی دیا کرتے کہ

"پھر تو مرمٹا" (ص ۲)

بہر حال جو صورت حال حضرت مولنا گنگوہی کے ساتھ پیش آئی ہے، جہاں تک فیقر کی محدود معلومات ہیں عام طور پر دوسرے علماء کو بھی اس راہ میں قدم رکھتے ہوئے کچھ اسی قسم کے قصے پیش آئے ہیں، ابتداء میں وہ بھڑکے ہیں، بدکے ہیں، ہچکچائے اور کسمسائے ہیں، گرے بھی ہیں، تو کافی کشمکش کے بعد گرے ہیں، اسی لئے ان کی زندگی کا یہ "مرحلہ" دلچسپ ہو گیا ہے، عموماً بعد کو خود بھی اور دوسرے بھی اس کا ذکر کرتے رہے ہیں۔

لیکن خلاف دستور سیدنا الامام الکبیر بھی حالانکہ مدرسہ ہی کی راہ سے خانقاہ کی طرف یا ظاہر سے گذرنے کے بعد باطن کی طرف آئے تھے، لیکن اتنی سہولت اور خاموشی کے ساتھ آئے کہ نہ اس زمانہ میں کسی کو یہ محسوس ہوا کہ کوئی انقلابی قدم آپ نے اٹھایا ہے، اور نہ بعد والوں کو اس کیطرف توجہ ہوئی، اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کب مرید ہوئے کہاں مرید ہوئے، کس طرح مرید ہوئے، کن حالات اور واقعات کے بعد مرید ہوئے، ان میں سے کسی ایک سوال کو

بھی آپ کے حالات کے بیان کرنے والوں نے نہیں چھیڑا ہے،
سوانح مخطوطہ میں صرف یہ لکھ کر کہ

"علم باطنی کی تحصیل حضرت فخر المشائخ مرکز خواص و عوام منبع برکات قدسیہ، مظہر فیوضات مرضیہ، جناب حاجی امداد اللہ فاروقی تھانوی سلمہ اللہ تعالیٰ سے فرمائی" ص۹

سوانح نگار صاحب آگے بڑھ گئے، خود ہمارے مصنف امام نے بھی اس کا تذکرہ کر کے کہ ان کے والد مرحوم مولٰنا مملوک العلی دلی سے نانوتہ وطن آتے جاتے تھانہ بھون میں حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھی قیام فرمایا کرتے تھے، صرف ان الفاظ پر قناعت کی ہے کہ

"غرضکہ یہ آنا جانا اور ملاقاتیں ان صاحبوں کی خدمت میں حصول نیاز کا سبب ظاہراً ہوئیں، ورنہ جو لکھا تھا وہ ہر طرح ہونا تھا" ص۳۲

اور سچ تو یہ ہے کہ مولوی اگر فقیری اختیار کرے، تو یہ واقعہ مستحق ہے کہ اس کا چرچا کیا جائے، اور اگر فقیر نے فقیری اختیار کی تو ظاہر ہے کہ اس کا بھلا کوئی کیا ذکر کرے، چڑھنے والوں کے گرنے کو لوگ محسوس کر سکتے ہیں، مگر جو بیچارا خود ہی گرا ہوا ہو وہ گرے گا کیا اور کسی کی توجہ اس کے گرنے پر آخر کیوں ہو، حد تو یہ ہے کہ اس سلسلہ میں تاریخ تک معلوم نہیں، صرف مولوی عاشق الٰہی صاحب نے اپنی کتاب تذکرۃ الرشید میں اور وہ بھی حاشیہ میں اتنی بات لکھی ہے، حضرت مولٰنا گنگوہی فرمایا کرتے تھے کہ

"مولوی محمد قاسم نے اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کی تعریفیں کر کر کے ہمیں مرید کرایا، اور بعد میں اعلیٰ حضرت سے اصرار و کوشش کر کے مولوی محمد قاسم صاحب کو ہم نے مرید بنوایا" ص۴۶ ج۱ (تذکرۃ الرشید)

اور اسی سے مولوی عاشق الٰہی صاحب نے نتیجہ نکالا ہے کہ حاجی صاحب سے پہلے مولٰنا گنگوہی مرید ہوئے اور آپ کے بعد مولٰنا محمد قاسم صاحب حاجی صاحب کے باضابطہ حلقہ ارادت و بیعت میں داخل ہوئے اسی سلسلے میں مولٰنا عاشق الٰہی صاحب نے یہ بھی ارقام فرمایا ہے کہ

"مولٰنا النانوتوی کو اعلیٰ حضرت (حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ) کے ہاتھ پر بیعت کرانے کی کوشش کا ثواب بھی حضرت گنگوہی کو حاصل ہوا" (ص۴۶ ج۱ حاشیہ تذکرۃ الرشید)

یہ ایک روایت ہے، اور ثقہ قابل اعتبار راوی کی روایت ہے، بعد کو بھی کسی نے مولوی عاشق الٰہی مرحوم کی اس روایت پر چونکہ تنقید نہیں کی ہے اس لئے یہی سمجھنا چاہئے کہ واقعہ کچھ اسی شکل میں پیش آیا، گویا "چشمہ" کا سراغ جس نے لگایا تھا، باوجود پیاس کے اس وقت تک اپنے تلاش کئے ہوئے پانی کو اس نے استعمال کرنا مناسب نہ خیال کیا، جب تک کہ دوست کو نہ دیکھ لیا کہ وہ سیراب ہو چکا ہے،

اس موقعہ پر ان صحابیوں کا قصہ قدرۃً یاد آجاتا ہے، جو زخمی ہو کر پیاس کے مارے تڑپ رہے تھے اور پانی پلانے والا ان میں سے جس کے آگے پانی کا پیالہ لیکر پہنچتا تو وہ دوسروں کی طرف اشارہ کردیتا کہ پہلے ان کو پلالو تب مجھے پلانا۔

اور سچ تو یہ ہے کہ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا مرید ہی بن کر جو پیدا ہوا ہو، خود حضرت حاجی صاحب کا بیان جس کے متعلق حد تواتر تک پہنچا ہوا ہو، قصص الاکابر میں حضرت تھانوی کی طرف بھی اس بیان کی روایت منسوب کی گئی ہے، فرمایا کرتے تھے؛

"حضرت حاجی صاحب یوں فرمایا کرتے تھے کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کو جو اصطلاحی عالم نہیں ہوتے، ایک لسان (زبان) عطا کرتے ہیں، چنانچہ حضرت شمس تبریزی کو مولنٰا رومی لسان عطا ہوئے تھے جنھوں نے شمس تبریزی کے علوم کو کھول کھول کر بیان فرمادیا، اسی طرح مجھکو مولوی محمد قاسم لسان عطا ہوئے ہیں"

(ص۔ الہادی ماہ ذی الحجہ ۵۶ھ)

حضرت قبلہ حاجی صاحب کی اس خود اعترافی شہادت کے بعد بھی کیا اسکی ضرورت رہتی ہے کہ مزید اس دعویٰ کے ثبوت میں کسی اور چیز کا اضافہ کیا جائے، گذشتہ اوراق میں کسی موقعہ پر عرض کرچکا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر کے ایام طفولیت میں نانوتہ پہونچ کر حضرت حاجی صاحب اپنی عنایات خصوصی کا حضرتِ والا کے ساتھ اظہار کرتے ہوئے، جب جلد بندی کا طریقہ آپ کو سکھا رہے تھے، آسمان اسی وقت دیکھ رہا تھا کہ کسی مرحوم امت کے

بکھرے ہوئے منتشر افراد کی شیرازہ بندی کا کام تاریخ کے کسی نازک دور میں اس بچے سے لیا جائیگا اسی تعبیر کا یہ خواب تھا، جو خواب میں نہیں بلکہ بیداری میں دکھایا جا رہا تھا،

اسی لئے یہ واقعہ کہ رسمی بیعت کا موقعہ سیدنا الامام الکبیر کو مولٰنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ملا، مولٰنا عاشق الٰہی کی اس روایت پر مجھے تعجب بھی نہ ہوا اور شاید اس پیش قدمی کے دوسرے وجوہ میں سے ایک وجہ یہ بھی ہو جیسا کہ مولٰنا عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ مولٰنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ باوجودیکہ سیدنا الامام الکبیر سے خلوت و جلوت کی صحبتوں میں حاجی صاحب قبلہ کی تعریفیں بھی سنا کرتے تھے، اور مولٰنا ان کو حاجی صاحب سے بیعت کرنے پر آمادہ بھی فرمایا کرتے تھے، ملاقاتیں بھی ایک دفعہ نہیں متعدد بار مولٰنا گنگوہی کی حضرت حاجی صاحب سے ہو چکی تھیں، بعض کرامتوں کے مشاہدہ کا موقعہ بھی مل چکا تھا، لیکن بایں ہمہ بقول مولوی عاشق الٰہی

"الحق گو حضرت مولٰنا (گنگوہی) اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کی زیارت کر چکے تھے، مگر چونکہ شیخ الہند، حضرت حاجی شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت امام ربانی (مولٰنا گنگوہی) نے صحاح بھی پڑھی تھی، اور علم شریعت کا تکملہ کیا تھا، آپ کو حاضری کا بھی اس گھر بار دربار میں زیادہ اتفاق ہوتا رہا، اس لئے آپ کا دل بیعت کے لئے بھی ادھر ہی جھکتا رہا اور یوں ہی راضی ہوتا تھا کہ طریقت میں بھی اسی شفیق استاذ کا دامن پکڑا جائے جس کے جامع بین الشریعت و الطریقت ہونے میں شبہہ نہیں" ص۴۲

یہ بھی انہیں کے الفاظ ہیں کہ

"خوارق عادات اور کشف و کرامات کے دیکھنے سننے سے حضرت مولٰنا (گنگوہی) کی عقیدت اور محبت اور ارادت اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب) کے ساتھ بڑھتی گئی، مگر آپ کے متجسس قلب، اور مبصر و نقاد نظر نے فارغ التحصیل ہونے اور شریعت و علم دین کے تکملہ تک کوئی فیصلہ نہ کیا کہ کہاں جانا، اور کس کی غلامی اختیار کرنی چاہئے" ص۴۴ تذکرہ

خلاصہ یہ ہے کہ تقدیر ازلی تو بہر حال وہی تھی جو پیش آئی لیکن اس قسم کے بیانات سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ بیعت کے مسئلہ میں یکسوئی کی کیفیت مولنٰا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ میں زمانہ تک پیدا نہ ہوئی، حالانکہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علوم کی زبان بنا کر قدرت نے جسے پیدا کیا تھا، اس کی رفاقت کے ساتھ ساتھ مولنٰا گنگوہی کی فطری صلاحیتوں کا اندازہ دیکھنے کے بعد حاجی صاحب نے جب بیعت کرلیا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولنٰا نانوتوی کے ساتھ وہ بھی حاجی صاحب کے ان مریدوں میں شریک ہو چکے تھے جنھیں پیر ہی اپنی مراد بنا لیا کرتا ہے، مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ خود مولنٰا گنگوہی بعد کو بیان کیا کرتے تھے کہ سلّم والے سبق کے قصہ میں پہلی دفعہ حاجی صاحب کی زیارت کا شرف مجھے حاصل ہوا، تو اس کے بعد

"ہم دونوں (مولنٰا نانوتوی و مولنٰا گنگوہی) کا حال دریافت فرمایا کرتے اور یوں کہا کرتے تھے کہ سارے طالب العلموں میں (مولنٰا مملوک العلی) کے وہ دو طالبعلم (مولنٰا گنگوہی و مولنٰا نانوتوی) ہوشیار معلوم ہوتے ہیں" ص۱۲ تذکرہ

دل چسپ قصہ اس سلسلہ کا یہ ہے کہ تقدیری نوشتہ کے ظہور کا وقت جب اتنا قریب ہوگیا یعنی بیعت سے دو تین دن پہلے جب مولنٰا شیخ محمد تھانوی سے مناظرہ کے ارادے سے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں مولنٰا گنگوہی تھانہ تشریف لاکر حاجی صاحب سے ملے اور ان کے منع کرنے سے مناظرہ کا ارادہ ترک کردیا، اس کے بعد بیعت کا خیال آیا، یا شاید اس خیال کو بھی اپنے ساتھ لائے تھے، بہر حال کہنا یہ ہے کہ جب بیعت کا ارادہ حاجی صاحب کی خدمت میں ظاہر فرمایا تو (اب راز و نیاز کے دائرے کی یہ باتیں ہیں، آتش عشق کو تیز کرنے کے لئے عموماً ایسا کیا جاتا ہے گو بظاہر یہ بات ہونے والی ہی تھی) حاجی صاحب نے شروع میں انکار کر کے مولنٰا کو گونہ مایوس فرما دیا۔ اس کی خبر جب مولنٰا شیخ محمد صاحب کو ملی، تو سننے کی بات ہے کہ مولنٰا گنگوہی کو اس پر آمادہ کرنے لگے کہ میاں! لاؤ طریقت کا راستہ میں تمہیں طے کرا دوں گا، مولنٰا کی کم سنی کا زمانہ تھا، جن سے مناظرہ کرنے آئے تھے، وہی ان کو اپنا مرید بنانا چاہتے تھے، بڑوں کی صحبت اٹھائے ہوئے مولانا شیخ محمد صاحب بھی

تھے (مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ کئی دن اسی کشمکش میں گذر گئے، ایک دن حاجی صاحب کے رفیق طریق حضرت حافظ ضامن صاحب شہید کے استفسار پر بلبلا کر فرمانے لگے کہ کیا کروں،

"جدھر دل کا میلان ہے (یعنی حاجی صاحب) وہ قبول نہیں کرتے اور دوسرے (مولانا شیخ محمد صاحب) اپنی طرف کھینچتے ہیں عجیب قصہ ہے" [1] ص ۴۸

آخر حضرت شہید نے بظاہر سفارشی بننے کا فرض انجام دیا، اور جس پر اور جس کی تربیت و تعلیم پر مرشدنا مولانا گنگوہی کے لئے مقدر ہو چکا تھا، آخر اسی کی غلامی میں داخل ہو گئے۔ رحمۃ اللہ علیہم وطاب ثراہم،

بات ذرا طویل ہو گئی، لیکن دلچسپ تھی، اور اسی کے ساتھ مولانا عاشق الٰہی کی روایت سے ممکن ہے بعضوں کو حیرت ہوتی، اس لئے ان قصوں کو مختصراً دہرانا پڑا، ورنہ کہنا تو صرف یہ تھا کہ حضرت حاجی صاحب قبلہ اور ان کے وفادار خادم ہمارے سیدنا الامام الکبیر کے ابتدا ہی سے تعلقات کی نوعیت وہی تھی جو پیر و مرید کے درمیان ہوتی ہے،

خواہ ظاہری اور رسمی بیعت کی نوبت نہ آئی ہو، اسی کا نتیجہ ہے کہ اشارۃً کنایۃً کسی طرح سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حاجی صاحب کے علاوہ سیدنا الامام الکبیر نے اپنی پوری زندگی میں ظاہراً یا باطناً ایک لمحہ کے لئے بھی اس سلسلہ میں کسی اور کی طرف کبھی کسی زمانہ میں کسی قسم کی ہلکی سی بھی توجہ کی ہو، حالانکہ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی محدث و مہاجر رحمۃ اللہ علیہ جیسے مولانا گنگوہی کے استاذ حدیث تھے، گذر چکا کہ سیدنا الامام الکبیر کو بھی حدیث میں آپ ہی سے شرف تلمذ حاصل تھا، اور ان کے سوا بھی اس وقت تک دلی آخر اتنی اجڑی دلی تو نہ تھی، کہ وہ اور دل کی ساری دکانیں اٹھ گئی ہوں، مگر مولانا تھانوی کی شہادت گذر چکی کہ سیدنا الامام الکبیر کو قدرت نے حاجی صاحب قبلہ کے لئے زبان ولسان بنا کر پیدا کیا تھا، یہ خود ان کے مرشد و

---

[1] اپنے جن ذہنی تاثرات کا اشارہ مولانا گنگوہی نے ان الفاظ سے کیا ہے مجھے تو اس میں بھی حضرت حاجی صاحب کے باطنی تصرف کی نشانیاں نظر آتی ہیں خیال کرنے کی بات ہے کہ جیسے جیت کر کے آئے تھے وہی آپکو پچھاڑنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہی نہ، اور بجائے انکار و استنکاف کے بظاہر محسوس یہ ہوتا ہو کہ کچھ کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "ہاہا ایسا نہ کرنا وہ تو بہت بڑے ہیں" حاجی صاحب کے ان الفاظ نے سب کچھ کو میٹ کر رکھ دیا جو گنگوہ سے آپ کے ساتھ آیا تھا اور مدرسہ کی تعلیم نے آپ کے اندر جسے کچھ دن کے لئے داخل کر دیا تھا ۱۲

شیخ کا بیان تھا، گویا وہ مفطور و مخلوق ہی ہوئے تھے، حاجی صاحب قبلہ کے مرید بن کر، ایسی صورت میں رسمی بیعت کا قصہ کچھ دنوں اگر ملتوی رہا تو اس پر تعجب کیوں کیجئے، بلکہ مولانا عاشق الٰہی صاحب کے بیان کا یہ جز، کہ مولانا گنگوہی کی کوشش سے یہ رسمی منزل بھی پوری ہوئی، اس سے تو میری سمجھ میں یہی آتا ہے کہ شاید "ظاہری بیعت" کی ضرورت ہی سیدنا الامام کے لئے فطری اور جبلی تعلقات و روابط کی بنیاد پر نہیں سمجھی جاتی تھی، لیکن مولانا گنگوہی نے اصرار فرمایا ہوگا کہ جب اکابر سلف سے دست بیعت کا طریقہ موروثی طور پر منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، تو اس رسم کو بھی آخر کیوں ترک کیا جائے، حضرت گنگوہی کی جس کوشش کا مولوی صاحب نے تذکرہ کیا ہے، کم از کم میرا ذہن تو اس مسئلہ میں اسی طرف جاتا ہے، والعلم عند اللہ

بہرحال رسمی بیعت یا ہاتھ پکڑنے کی یہ ظاہری رسم کب ادا ہوئی، صحیح تاریخ اس کی باوجود تلاش کے مجھے اب تک نہیں مل سکی، لے دے کر تذکرۃ الرشید کے حاشیہ پر مولوی عاشق الٰہی کی مذکورۂ بالا شہادت سے اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی کے مرید ہونے کے بعد سیدنا الامام الکبیر کو باضابطہ طریقہ سے حضرت قبلہ حاجی صاحب نے اپنے حلقہ بیعت وارادت میں داخل فرمایا اور جیسا کہ خاکسار نے عرض کیا، بظاہر مولوی عاشق الٰہی صاحب کی اس خبر کے مشتبہ ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، البتہ ایک چیز اس سلسلہ میں کچھ ضرور کھٹکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں پر ذکر کرنا چاہئے تھا گذر چکا کہ ہمارے مصنف امام نے وہاں پر تو سیدنا الامام الکبیر کی بیعت کا تذکرہ اجمالی الفاظ میں کیا ہے، لیکن اس موقعہ پر جہاں لکھا ہے کہ حضرت شاہ عبدالغنی مجددی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے دونوں صاحب (مولانا نانوتوی اور مولانا گنگوہی) حدیث پڑھا کرتے تھے مصنف امام ہی کے قلم مبارک سے ایک فقرہ یہ بھی نکل پڑا ہے کہ

"اور اسی زمانہ میں دونوں صاحبوں نے جناب حضرت قبلہ حاجی امداد اللہ صاحب دام ظلہٗ سے بیعت کی، اور سلوک شروع کیا" ص۲۵

جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ طلب حدیث ہی کے زمانہ میں دونوں صاحبوں کو حاجی صاحب

رحمۃ اللہ علیہ سے باضابطہ بیعت ہی کا نہیں، بلکہ سلوک باطنی کی تربیت و تعلیم پانے کا شرف حاصل ہو چکا تھا، آگے پیچھے اس فقرے کے جو باتیں لکھی گئی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اس وقت تک مولنا مملوک العلی دونوں حضرات کے استاذ فنون بھی زندہ تھے، مصنف امام کے اس بیان کو اور اس کے سابقہ و لاحقہ مضامین کو دیکھتے ہوئے دل میں بعض عجیب قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں خصوصاً مولنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی بیعت کے متعلق مولوی عاشق الٰہی صاحب نے جن تفصیلات کو اپنی کتاب میں درج کیا ہے جن سے سمجھ میں آتا ہے کہ عام علوم و فنون اور علم حدیث وغیرہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد گنگوہ میں آکر جب مولنا گنگوہی نے قیام اختیار فرمایا اور کچھ درس و تدریس نوشت و خواند کے مولویانہ کاروبار میں مشغول ہو چکے تھے، تب وہی مولانا شیخ محمد تھانوی کے مناظرہ کا قصہ پیش آیا اور مناظرے کے حیلہ سے تقدیر تھانہ بھون آپ کو حاجی صاحب کے قدموں تک پہونچا دیتی ہے؛

مگر مصنف امام کے فحوی کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ طالب العلمی کا زمانہ دونوں بزرگوں کا ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ حاجی صاحب سے دونوں مرید ہو گئے اور سلوک میں بھی لگ گئے، بظاہر ان دونوں روایتوں میں تطبیق آسان نہیں ہے، اور بجائے تطبیق کے ترجیح کا طریقہ اگر اختیار کیا جائے تو ظاہر ہے کہ ہمارے مصنف امام کی روایت ہر لحاظ سے مولوی عاشق الٰہی صاحب کی روایت کے مقابلہ میں ترجیح کی زیادہ مستحق ہے، اگرچہ تذکرۃ الرشید کے دیباچہ میں مولوی عاشق الٰہی نے اسی کتاب کے سلسلہ میں جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"جو کچھ ہو سکا تھا اس کو دیوبند و سہارنپور و گنگوہ حاضر ہو کر اپنے حضرات کی خدمت میں پیش کرایا" صہ دیباچہ

نیز اسی کے ساتھ اس کا بھی اظہار کیا ہے کہ حضرت گنگوہی کے خلف رشید مولنا حکیم مسعود احمد صاحب مرحوم کی خدمت میں بھی یہ اوراق مدیر نے پیش کئے" اگر اس کا مطلب یہی ہے کہ ان کی کتاب ان بزرگوں کی نظر سے گذرنے کے بعد طبع ہوئی ہے تو تذکرۃ الرشید کی روایتوں میں بھی کافی قوت پیدا ہو جاتی ہے، علاوہ اس کے شائع ہونے کے بعد بھی جہانتک میں جانتا ہوں اس کتاب کے بیانات پر کسی سمت سے

تنقیدی صدا چونکہ نہیں اٹھی، اس لئے یہ بھی مشکل ہے کہ مولوی عاشق الٰہی صاحب کی تفصیلات میں شک اندازی کی جائے، پس مناسب یہی ہے کہ تطبیق کا طریقہ اختیار کرکے تاویل وتوجیہ کی کوئی راہ نکالی جائے جس کی جہانتک میرا خیال ہے کافی گنجائش ہے، لیکن اس مسئلہ کا زیادہ تر تعلق حضرت مولنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے واقعہ بیعت سے ہے، نیز غیر ضروری طوالت کا بھی خوف ہے، اس لئے تاویل وتوجیہ کے اس کام کو پڑھنے والوں کے ذاتی مذاق کے سپرد کرکے جو کچھ مجھے یہاں عرض کرنا ہے، اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں،

کہنا یہ ہے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ خواہ جو صورت بھی پیش آئی ہو، لیکن اپنے مصنف امام کی مذکورہ روایت اور اس کے سابقہ ولاحقہ فقروں کی روشنی میں بہر حال اتنی بات تو ماننی ہی پڑیگی کہ مولنا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ہی میں کم ازکم سیدنا الامام الکبیر ضرور حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صرف حلقہ ارادت ہی میں شریک نہیں ہو چکے تھے، بلکہ مصنف امام کے الفاظ کا اقتضا یہی ہے کہ باطنی سیر وسلوک کے مشاغل میں بھی حاجی صاحب قبلہ نے آپ کو لگا دیا تھا،

بلکہ سیدنا الامام الکبیر کے متعلق غالباً کسی موقعہ پر یہ بات جو شاید گذر بھی چکی ہے اور عام طور پر مشہور بھی ہے کہ ذکر وشغل کی تعلیم شروع شروع میں حاجی صاحب قبلہ سے پانے کے بعد جیسے دوسرے لوگ حاجی صاحب کی خدمت میں ذکر وشغل کے آثار کا تذکرہ کیا کرتے تھے، سیدنا الامام الکبیر نے چند دنوں تک کسی قسم کی کوئی بات اس سلسلہ میں اپنے مرشد کے آگے بیان نہیں کی، اور حاجی صاحب کے دریافت فرمانے پر کہ "آپ کچھ نہیں کہتے" مولنا تھانوی قدس اللہ سرہٗ کے حوالہ سے نقل کرچکا ہوں کہ جواب میں حضرت نانوتوی آب دیدہ ہو کر حاجی صاحب سے عرض کرنے لگے کہ

"حضرت حالات وثمرات تو بڑے لوگوں کو ہوتے ہیں، مجھ سے توجتنا کام حضرت نے فرمایا ہے وہ بھی نہیں ہوتا۔"

اور اپنی اس عجیب وغریب کیفیت کا جو ذکر شروع کرتے ہوئے آپ پر طاری ہوئی تھی ان الفاظ میں اظہار فرمایا کہ

"جہاں تسبیح لے کر بیٹھا' بس ایک مصیبت ہوتی ہے، اس قدر گرانی کہ جیسے سو سو من کے پتھر کسی نے رکھ دیئے ہوں' زبان و قلب سب بستہ ہو جاتے ہیں"

یہ بھی حضرت تھانوی ہی کی روایت میں ہے کہ روتے ہوئے بے ساختہ آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہوئے کہ

حضرت کے کامل یا شفیق ہونے میں شبہ نہیں لیکن؟

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبر کامل ؛ کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

میں ہی بد قسمت ہوں' ایسا ہوتا ہے کہ جیسے کسی نے زبان کو جکڑ دیا ہو" (قصص الاکابر الہادی ماہ ربیع الاول ۵۱ھ)

آپ کی اس کیفیت کو سننے کے بعد وہی بات حاجی صاحب نے فرمائی تھی، جسے پہلے بھی کہیں بیان کر چکا ہوں کہ بشارت دیتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر کی تسلی حاجی صاحب نے ان الفاظ میں کر دی کہ

"مبارک ہو، یہ نبوت کا آپ کے قلب پر فیضان ہوتا ہے' اور یہ وہ ثقل ہے' جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو وحی کے وقت محسوس ہوتا تھا۔"

مسئلہ کے لحاظ سے اس کے متعلق مجھے جو کچھ کہنا تھا شاید اسے عرض کر چکا ہوں' یہاں اس کے ذکر سے یہ غرض ہے کہ حضرت تھانوی نے اس قصہ کو بیان کر کے یہ بھی فرمایا کہ

"اس زمانہ میں (یعنی جب یہ حال طاری ہوا تھا) مولانا (نانوتوی) محض نو آموز طالب العلم تھے اس وقت یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ، یہ اس قدر بڑے عالم ہونے والے ہیں"

جس سے مصنف امام کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے کہ طالب العلمی کے زمانہ میں ہی ذکر و شغل سیر و سلوک میں مرید کرنے کے بعد حاجی صاحب قبلہ نے آپ کو لگا دیا تھا۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک وقتی حال تھا' مرشد کی توجہ سے جیسا کہ معلوم ہے اس کا ازالہ ہو گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا، ترتیب کے ساتھ تو کسی نے اس کو بیان نہیں کیا ہے، لیکن سوانح مخطوطہ کے مصنف نے سیدنا الامام الکبیر کی باطنی صلاحیتوں اور جن خدا داد نعمتوں کو لیکر آپ پیدا ہوئے تھے

مسلسل جس کی تعبیر اپنی اصطلاح میں "اجتبائیت" سے کرتا چلا آرہا ہوں، ان ہی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"طریقت میں آپ کو وہ قابلیت حاصل تھی کہ شیخ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہی آنِ واحد میں وہ مقامات سلوک طے ہو گئے، جو اکثر سالکوں کو سالہا سال کی محنت شاقہ میں بھی وصول نہیں ہوئی۔"

اسی کے بعد یہ بھی ان ہی کا بیان ہے، کہ

"شیخ نے جب آپ کو اس فن کے قابل پایا تو فرمایا کہ تم کو کسی ریاضت کی حاجت نہیں"

اگر روایت صحیح ہے، تو نہیں کہا جا سکتا کہ ذکر کے وقت شروع میں ثقل و گرانی کی جو کیفیت آپ کو محسوس ہوئی تھی، اس کو دیکھ کر شیخ نے یہ فرمایا کہ "تم کو کسی ریاضت کی ضرورت نہیں" یا بیعت لینے کے ساتھ ہی یہ کہدیا تھا، بظاہر پہلی ہی بات دل کو زیادہ لگتی ہے، کیونکہ شیخ کی روشن ضمیری کے باوجود بھی ایسے شیوخ کو جن کے ہاتھ پر بکثرت لوگ بیعت کر رہے ہوں، کسی خاص مرید کی خصوصی صلاحیتوں کا اندازہ عموماً کچھ اسی قسم کے امتیازی آثار و حالات سے ہوتا ہے، خصوصاً ایسا مرید جو بقول مولٰنا تھانوی ابھی نو آموز طالب العلم کی حیثیت سے بظاہر آگے نہ بڑھا ہو،

بہر حال میرا خیال یہی ہے کہ ثقل و گرانی والی حالت کے اظہار ہی کے بعد غالباً حضرت حاجی صاحب نے اجازت دے دی کہ صوفیانہ ریاضتوں کی آپ کو ضرورت نہیں ہے، مگر ہوا کیا! شیخ کی طرف سے بار ہلکا کیا جا رہا ہے، سنئے، سوانح مخطوطہ کے مصنف کی شہادت وہی لکھتے ہیں

"مگر باایں ہمہ شان عبودیت آپ پر (مولٰنا نانوتوی پر) ایسی غالب تھی کہ آپ مدت تک شغل بارہ تسبیح، حبس دم ذکر ارّہ وغیرہ میں مشغول رہے"

اور کیسی مشغولیت؟ تصور بھی آج جس کا دشوار ہے، ان کا بیان ہے کہ

"چھ چھ سات سات گھنٹے برابر ذکر ارّہ اور حبس دم کرتے تھے"

آگے یہ لکھ کر کہ

"جس وقت آپ اس شغل کو کرتے، صرف ایک تہ بند بدن پر رکھتے تھے"

وہی راوی ہیں کہ

"وہ تہ بند عرق بدن (پسینے) سے ایسا تر ہو جاتا تھا کہ بعد الفراغ اس کو بدن سے علیحدہ کر کے اور نچوڑ کر خشک کرتے تھے" ص۱۵ مخطوطہ

اب ایک طرف ان معلومات کو اپنے سامنے رکھ لیجئے اور پھر چلے آیئے، اسی کوچہ چیلان کے کو — پر جس پر مصنف امام نے خبر دی تھی کہ سیدنا الامام الکبیر جو بقول ان کے فطرتاً خوش مزاج، اور ظرافت پسند تھے، اچانک افسردہ غم زدہ چہرے کے ساتھ جھلنگے پر پڑے ہوئے ہیں کئی کئی دن کی پکی ہوئی روٹیوں کے خشک ٹکڑوں کے سوا کسی قسم کی کوئی دوسری غذا استعمال نہیں فرماتے، بال بڑھے ہوئے ہیں جن میں بقول ان ہی کے۔ جوئیں بھی پڑ گئی تھیں، گویا تن بدن کی کوئی خبر اس زمانے میں معلوم ہوتا تھا آپ کو نہیں ہے، میں نے عرض کیا تھا کہ مسلمانوں اور مسلمانوں کی حکومت پر جو کچھ اس زمانہ میں گذر رہا تھا، اس سے اور حضرت والا کے سیاسی رجحانات اور آئندہ ان ہی رجحانات کے مطابق آپ کے اقدامات و خدمات کا تھوڑا بہت علم بھی جو رکھتے ہیں، ان کو آپ کے ان فجائی تغیرات میں ملک کے سیاسی تغیرات و انقلابات کی جھلک نظر آئے تو اس پر تعجب نہ کرنا چاہئے، میں نے کہا تھا کہ حضرت والا تو خیر حضرت والا ہی تھے وہ حالات ہی ایسے تھے کہ مشکل ہی سے مسلمانوں میں کوئی ہوگا جو کم و بیش ان سے متاثر نہ تھا، لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی یاد دلانا چاہتا تھا کہ مصنف امام نے جس زمانہ کے متعلق یہ روئداد سنائی ہے، یہی وہ زمانہ ہے، جب "بدر" سے پہلے قدرت کی طرف سے سیدنا الامام الکبیر کے لئے "حرائی تجربات" سے گذرنے کے مواقع آسان کئے گئے تھے، اور جہاں تک میرا خیال ہے سوانح مخطوطہ کے مصنف نے جن ریاضات ہائلہ کا ذکر اس سلسلے میں کیا ہے، ان کا تعلق زیادہ تر اسی زمانہ سے ہے، ہمارے مصنف امام نے اسی موقع پر جہاں کوچہ چیلان والے مکان کے مذکورۂ بالا امور کا تذکرہ کیا ہے، وہیں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کا وہی مملوکہ مکان جہاں اپنے والد مرحوم مولانا مملوک العلی کی وفات کے بعد وہ آ گئے تھے

کچھ دن تو وہ سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ رہے، لکھا ہے کہ

"ایک سال کے قریب بعد انتقال والد مرحوم احقر دہلی رہا" ص۲۹

لیکن اسی کے بعد جیسا کہ ان ہی کا بیان ہے کہ

"پھر اجمیر نوکری کے سبب دہلی چھوٹی اور مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) سے جدائی پیش آئی" ص۲۹

غالباً اسکول کے ہیڈ مولوی یا ڈپٹی انسپکٹر تعلیمات ہو کر مصنف امام کو اجمیر جانا پڑا، آگے وہی یہ خبر بھی دیتے ہیں کہ

"جب احقر اجمیر گیا، مولوی صاحب اسی مکان (کوچہ چیلان والے) میں رہتے تھے، اور بعض ایک دو آدمی اور تھے" ص۳۰

یہ کون لوگ تھے اس کا پتہ تو نہ چلا، بس اتنا معلوم ہوا کہ مصنف امام کے چلے جانے کے بعد بھی اس مکان میں کچھ دنوں بعض دوسرے لوگوں کے ساتھ حضرت والا کو رہنا پڑا، اور حراء بنانے یا حرائی تجربات کے لئے قدرت نے جس مقام کا انتخاب کیا تھا، ابھی غیروں سے خالی نہیں ہوا تھا، واللہ اعلم پھر کیا صورت پیش آئی، مصنف امام نے صرف یہ خبر اجمالی الفاظ میں دی ہے کہ وہی ایک دو آدمی جو آپ کے ساتھ اس مکان میں مقیم تھے،

"اتفاق سے سب متفرق ہو گئے" ص۳۰

اتفاق سے تفرق کا یہ نتیجہ اگرچہ بظاہر تو اتفاقی واقعہ تھا، لیکن بعد کو اس "تفرق" سے بندے اور بندے کے مالک کے درمیان وفاق کی جو صورت پیش آئی، اس کو دیکھتے ہوئے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ اتفاق سے نہیں، بلکہ توفیق کی غیبی قوتوں کے اتفاق نے اس صورت حال کو شاید قصداً پیدا کیا تھا، مصنف امام ہی راوی ہیں کہ جب یہ ایک دو آدمی بھی متفرق ہو گئے تو

"اور مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) تنہا رہ گئے" ص۳۰

پھر کیا ہوا اور کیا ہوتا رہا، میں کیا کروں، ذہن اچانک دلی کے اس کوچہ چیلان سے وادی غیر ذی زرع کے اس پہاڑ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس کے غار کو تیرہ سو سال پہلے آقا کے لئے خالی کرایا گیا تھا،

اللھم صل علیہ وسلم وبارک:

مصنف امام ہی کے الفاظ سنئے "جو سب کے متفرق" ہونے کے بعد اتفاقات کہئے یا وفاقات کی جو صورتیں اس تنہا مکان میں پیش آئیں وہی رقمطراز ہیں کہ

"مکان مقفل رہتا تھا" صفحہ ۳

بظاہر دن کو بھی مقفل رہتا تھا اور رات کو بھی مقفل ہی رہتا تھا۔ مگر باہر سے جو مکان دیکھنے والوں کو مقفل نظر آتا تھا، دن کو تو نہیں، لیکن جب دن ختم ہو جاتا اور رات اپنی تاریکی کے پردے میں دنیا کو چھپا لیتی تھی، اس وقت جیساکہ مصنف امام ہی کا بیان ہے کہ

"رات کو مولوی صاحب (مولانا نانوتوی) کواڑ اتار کر اندر جاتے تھے اور پھر کواڑ کو درست کر دیتے تھے۔" صفحہ ۳

شاید یہ اسی لئے کیا جاتا تھا کہ آنے والے راہ گیروں پر بھی اثر قائم رہے کہ کوئی اس مکان میں نہیں ہے۔ اور تنہائی میں خلل انداز نہ ہو۔ اور اسی کواڑ چڑھائے ہوئے مقفل مکان میں تن تنہا ساری رات گذرتی تھی یا گذاری جاتی تھی، پھر بقول مصنف امام

"اور صبح کو کواڑ اتار کر باہر جاتے تھے اور پھر کواڑ کو درست کر دیتے تھے۔" صفحہ ۳

اس مقفل مکان میں تنہا، شب باشی، وشب گذاری کی یہ عجیب وغریب صورت حال کبتک پیش آتی رہی، صحیح طور پر تو اس کا بتانا دشوار ہے۔ لیکن مصنف امام نے آگے جو یہ ارقام فرمایا ہے

"چند ماہ اسی ہُو کے مکان میں گذر گئے"......صفحہ ۳

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ چند روز نہیں، بلکہ چند مہینوں سے کم اس کی مدت نہ تھی۔ شاید "ہو" کے اسی مکان کا وہ مشہور واقعہ ہے، جس کا ذکر خاکسار سے براہ راست حضرت مولنا حبیب الرحمن العثمانی سابق مہتمم دارالعلوم بھی فرمایا کرتے تھے، اور مولنا الطیب الحمید سلمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ الاسلام مولنا سید حسین احمد مدنی مدظلہ العالی کے حوالہ سے اپنے گرامی نامہ میں اس کی توثیق فرماتے ہوئے کہ دلی ہی کے قیام کے زمانہ میں یہ واقعہ کہا جاتا ہے پیش آیا:

"حضرت (نانوتویؒ) اپنے بند حجرے میں ذکر میں مشغول تھے تو ہر ضرب کے ساتھ دھماکہ کی آواز بھی آتی تھی، لوگ مشوش ہوئے کہ یہ کیا قصہ ہے، حجرے کے کواڑ اتارے گئے کیونکہ اندر سے زنجیر بند تھی، اندر جا کے دیکھا تو حضرت کے برابر ایک سانپ ہے، اور جب حضرت ضرب لگاتے ہیں تو وہ بھی اپنا سر زمین پر دے مارتا ہے، حضرت گردن اٹھاتے ہیں، تو وہ بھی سر اٹھا کر کھڑا ہوتا ہے، اور جب حضرت ضرب لگاتے ہیں، تو وہ بھی زور سے زمین پر سر ٹپکتا ہے، یہ دھماکہ اسی کا تھا، لوگوں نے اسے مارا، مار کر باہر لائے، لیکن حضرت کو کچھ خبر نہیں ہوئی۔" (مکتوب الحفید السعید مورخہ ۳ ذیقعدہ ۱۳۶۸ھ)

آگے مولنا طیب صاحب نے یہ اضافہ بھی فرمایا ہے کہ

"یہ واقعہ میں نے حضرت امیر شاہ خاں صاحب اور دوسرے متعدد بزرگوں سے سنا ہے۔"

اگر یہ سچ ہے جیسا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ ریاضات و مجاہدات کو حضرت قبلہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سیدنا الامام الکبیر کے لئے غیر ضروری قرار دیا تھا تو معمولی نہیں بلکہ مذکورہ بالا شہادتوں سے "ھو" کے اس مکان میں حضرت والا کے جس غیر معمولی زہرہ گداز، دل دہلانے والے مجاہدات اور اس راہ کی غیر معمولی کوششوں اور محنتوں کا پتہ چلتا ہے، اُن کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ "الاحسان" یعنی بندے کو اپنے رب کا حضور دوام حاصل ہو جائے، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے، کہ جو ہر چیز کو محیط ہے، ہر ایک کے ساتھ ہے وہی اول بھی ہے اور آخر بھی، ظاہر بھی وہی ہے اور باطن بھی وہی ہے، اسی کا رُخ (وجہ) سامنے رہتا ہے، جدھر بھی مڑا جائے جس ذات اقدس و اعلیٰ کی نشاندہی اسی قسم کی ملتی جلتی علامتوں کے ساتھ قرآنی بینات میں فرمائی گئی ہے، اُن ہی کو اپنا وجدانی شعور بنا لینا، اور جو واقعہ ہے اسی کے مطابق علم و دانش کا ہو جانا بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس مقصد کے لئے پیر و مرشد کی تجویز یہی ہوئی کہ ریاضتوں کی ضرورت نہیں، اور ہے بھی یہی بات کہ مہبط وحی ذات رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم جن پر یہ قرآنی حقائق براہ راست منکشف ہوئے تھے، ان پر جس حد تک اعتماد بڑھتا چلا جائے گا خود بخود ان حقائق کی گرفت بھی سخت سے

سخت تر ہوتی چلی جائے گی، علم کے عام معمولی ذرائع بینائی و شنوائی وغیرہ سے حاصل شدہ معلومات پر اعتماد کا راز اسی اعتمادی میں تو پوشیدہ ہے جو اپنے اندر ہم علم کے ان عام اور معمولی ذرائع کے متعلق رکھتے ہیں۔ پھر علم کا وہ غیر مشتبہ قطعی اور یقینی ذریعہ جس کا نام وحی و نبوت ہے، اس کے انکشافی حقائق اور اس راہ سے حاصل شدہ معلومات پر اس شخص کی اعتمادی کیفیت کا حال خود ہی سوچنا چاہئے کہ کیا ہو سکتا ہے جس کے اندر علم کے تمام ذرائع و وسائل میں سب سے زیادہ بھروسہ اور سب سے زیادہ اعتماد کی کیفیت نبوت و وحی کے متعلق پیدا ہو گئی ہو، سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ان کے تلمیذ رشید مولانا منصور علی خاں حیدر آبادی کی یہ چشم دید گواہی آپ سن چکے ہیں کہ

"اسم گرامی جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کا سن کر لرزہ بدن پر پڑ جاتا تھا، چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا، اور ایک عجیب حالت نمایاں ہوتی تھی جو معرض بیان میں نہیں آسکتی"۔ ص۱۸۱

اور جہاں تک تجربہ سے معلوم ہوا ہے، نیز حضرت نانوتوی کے حالات جو سننے میں آئے ہیں، ان سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے کہ بعض لوگ نبوت کے ساتھ غیر معمولی گرویدگی کی اس دولت کبریٰ اور نعمت عظمیٰ سے فطرتاً سرفراز ہوتے ہیں۔

بہرحال حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "ریاضت" و "مجاہدہ" کی مشقتوں کو آپ کے لئے غیر ضروری اسی "احسانی کیفیت" کے سلسلے میں اگر قرار دیا ہو، تو آپ کے جبلی اقتضاؤں کے متعلق اس کے سوا کوئی دوسری تجویز آپ کے لئے شاید مناسب بھی نہیں ہو سکتی تھی!

مگر مجاہدات و ریاضات کا ایک اور مقصد بھی ہوتا ہے "شناخت" جو عربی کے لفظ "معرفت" کا فارسی ترجمہ ہے، اردو میں جس کا ترجمہ ہم "پہچاننا" کرتے ہیں، جو علم کی نہیں، بلکہ کسی جانی ہوئی چیز کے ساتھ دانش کے تعلق کی تعبیر ہے۔ "میں آپ کو پہچانتا ہوں" اس فقرے سے مخاطب کو بولنے والا یہی باور کراتا ہے کہ علم تو پہلے سے آپ کا حاصل تھا، وہی جانی ہوئی بات پھر میرے سامنے پیش آئی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ نبوت کی راہ سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں، ان ہی معلومات کے ساتھ شناخت و معرفت یا پہچاننے کی نسبت قائم کرنے کے لئے بھی۔ مجاہدات و ریاضات سے کام لیا جاتا ہے، اور نبی کی بتائی ہوئی باتوں اور جن راہوں سے غیبی تجربات اُن کو ہوتے ہیں، اُن کا مشاہدہ اُن کی کوشش اور اُنکے ظرف و

گنجائش کے مطابق ان لوگوں کو کرایا جاتا ہے جو ان مجاہدات و ریاضات کی محنتوں کو برداشت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اپنے اپنے حوصلہ اور اپنی اپنی ہمت کی بات ہوتی ہے۔ اسی لئے ہر کسی سے نہ اس کا مطالبہ کیا گیا ہے اور اُن کے متعلق نہ کوئی مسئول ہوگا اور نہ اُن کے ترک پر سرزنش کی دین میں دھمکی دی گئی ہے:

سیدنا الامام الکبیر کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں، اُن کے بچپن کے ساتھی یعنی ہمارے مصنف امام کی شہادتیں گذر چکی ہیں، کہ

"مولوی صاحب جیسے پڑھنے میں سب سے بڑھ کر رہتے تھے، ہر کھیل میں خواہ ہوشیاری کا ہو یا محنت کا سب سے اول اور غالب رہتے تھے" ص۲۷

یہ بھی اُن کی اطلاع ہے کہ

"ہر کھیل میں جو مرتبہ کمال ہوتا تھا، وہاں تک اس کو پہنچا کر چھوڑتے"..... ص۲۷

"کمال کا جو مرتبہ ہوتا" اس مرتبہ تک "ہر کھیل" کو پہنچانے کا جذبہ جس پر جبلّۃً غالب اور مستولی تھا، اسی شخص کے متعلق یہ سوال کہ پیر و مرشد کے غیر ضروری قرار دینے کے باوجود اتنے شدید مجاہدات و ریاضات کی مشقتوں میں اپنے آپ کو اسی نے کیوں مبتلا کیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ حضرت والا کا یہ فطری رجحان تھا، شیخ نے تو صرف غیر ضروری ٹھہرایا تھا، لیکن ان ریاضتوں اور مجاہدوں سے اگر وہ منع بھی کر دیتے تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت اُن کا طرز عمل کیا ہوتا، لیکن غیر ضروری قرار دینے میں گنجائش باقی تھی، خود جب مصر ہوئے ہوں گے، تو "معرفت و شناخت" کے نتیجے تک پہنچنے کے لئے جو طریقے مقرر ہیں، شیخ نے اُن کی تعلیم سے سرفراز فرمایا اور جیسا کہ آپ دیکھ چکے کتنی قوت کے ساتھ اس "غیر ضروری" فرض کو آپ نے انجام دیا:

اس راہ سے جو قطعاً ناآشنا ہے، وہ کیا بتا سکتا ہے کہ "جذب کی حالت برتی تھی" ان الفاظ سے مصنف امام نے آپ کی زندگی کی جس منزل کی تعبیر کی ہے، اور خبر دی ہے کہ بال سر کے بڑھ گئے تھے، نہ دھونا، نہ کنگھی، نہ تیل نہ کترے، نہ درست کئے، الغرض ان ہی کے الفاظ میں حضرت والا کی "عجب صورت" بن گئی تھی، اکثر ساکت رہتے تھے" اور "باوجود خوش مزاجی اور ظرافت کے ترش رو اور مغموم جیسی صورت رہتے"۔

غیبی اور نادیدہ منازل کے جو سالک ہیں وہی اس سلسلہ کی راہ ورسم کی صحیح خبریں دے سکتے ہیں اور ان آثار وکیفیات کی واقعی توجیہ کے جائز حقدار وہی ہیں، ہم جیسے بے بہروں، تہی دستان قسمت کیلئے زیادہ سی زیادہ گنجائش اس سلسلہ میں اگر کچھ پیدا ہوتی ہے تو یہی کہ مصنف امام کی مذکورہ بالا شہادتوں سے شاید ذہن ان واقعات کی طرف منتقل ہو جائے جن کا ذکر ہم صحاح کی ان روایتوں میں پاتے ہیں جو آغاز بعثت کے سلسلے میں محدثین اور ارباب سیر کی کتابوں میں ملتی ہیں، ما بالعرض کے حالات کے سمجھنے میں ما بالذات کے واقعات سے اگر روشنی ملے، یا غلام کی زندگی میں آقا کے ساتھ انتساب کی برکتیں محسوس ہوں تو اس پر تعجب کیوں کیجئے۔

واقعہ یہ ہے کہ مصنف امام نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کو پڑھ کر اگر یہ یاد آجائے اور شاید اس کو یاد ہی آنا چاہئے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی حرائی عہد میں جیسا کہ بخاری وغیرہ میں ہے:

| | |
|---|---|
| حبب الیہ الخلاء | تنہائی (کی زندگی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے محبوب بنادی گئی تھی۔ |

کا حال طاری ہوا تھا۔

ابن اسحاق امام المغازی نے جس کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

| | |
|---|---|
| فلم یکن شئ احب الیہ ان یخلو وحدہ<br>(سیرۃ ابن ہشام ص۱۵۲ ج۱ بر روض الانف) | پس اس سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی بات پسند نہ تھی کہ اکیلے تنہا رہیں۔ |

بلکہ حرا والی روایت میں تحنث کے متعلق

| | |
|---|---|
| ھو تعبد اللیالی ذوات العدد | |

کے الفاظ جو پائے جاتے ہیں، اور محدثین بے چارے پریشان ہیں کہ یہ الفاظ اصل روایت کے ہیں، یا راوی نے تشریحاً ان کو روایت میں شریک کر دیا ہے، یعنی مدرج ہیں، پھر حیران ہیں کہ اللیالی (راتوں) کا تذکرہ یہاں کیوں کیا گیا ہے، بلکہ قرآن میں بھی اربعین موسوی یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چلّے کے سلسلے میں بجائے دن کے راتوں ہی کا نام کیوں لیا گیا ہے۔ یہ اور اسی قسم کے سوالوں کو چاہا جائے تو شاید مصنف امام کے بیان کی روشنی میں ان کو کچھ سمجھا جا سکتا ہے، یا کم از کم اس کا تو بہر حال پتہ چلتا ہے، کہ

اس سلسلے میں دن سے زیادہ راتوں کو کسی قسم کی خاص اہمیت حاصل ہے، آخر سوچنے والوں کو یہ سوچنا چاہیئے کہ کوچہ چیلان کا یہ "ہو" کا مکان جو دن کو مقفل رہتا تھا اور راتوں ہی میں کواڑ اتار کر داخل ہونے والا "ھو" کے اس مکان میں کیوں داخل ہوتا تھا۔ حالانکہ چاہتے تو دن کو بھی اسی ترکیب سے اس مکان میں داخل ہو کر خلوت پسندی کے تقاضے کی تکمیل کر سکتے تھے؛

آغاز بعثت کی ان ہی روایتوں میں ہمیں جب یہ پڑھایا جاتا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آیا جس میں دیکھا گیا کہ

| | |
|---|---|
| حزن النبی صلی اللہ علیہ وسلم حزنا شدیداً (زرقانی بحوالہ ابن سعد) | مغموم ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت زیادہ مغموم۔ |

اور کیسا غم و حزن! بخاری میں جس کا اثر بتایا گیا ہے کہ

| | |
|---|---|
| غدا منہ مراراً کی یتردی من رؤس شواھق الجبال | بار ہا آپ نے صبح کی کہ اپنے آپ کو (شدۃ حزن کے سبب) پہاڑوں کی چوٹیوں سے گرا دیں۔ |

تو مصنف امام نے جن حالات کا ذکر اپنے بیان میں کیا ہے، ان کران روایتوں کی طرف اگر ذہن منتقل ہو جائے تو اس ذہنی انتقال کے اسباب کیا یہاں موجود نہیں ہیں؟

بلکہ سچ تو یہ ہے، کہ اسی سلسلہ کی روایتوں میں ہم جہاں جبرئیل علیہ السلام کے متعلق

| | |
|---|---|
| فغطنی | دبایا اور بھینچا مجھے جبرئیلؑ نے |

کا لفظ بخاری میں پاتے ہیں، وہیں محدثین ہی کی زبانی اسی موقعہ پر "فغتنی" کا تلفظ بھی سنتے ہیں، جس کی شرح کرتے ہوئے علامہ زرقانی نے لکھا ہے کہ

| | |
|---|---|
| ھو حبس النفس | سانس روکنے کی یہ تعبیر ہے؛ |

اور ابو داؤد طیالسی کی روایت میں

| | |
|---|---|
| فاخذ بحلقی | پس پکڑ لیا جبرئیل نے میرے حلق کو |

لہ طبری اور ابن اسحاق میں اس لفظ کا یہی تلفظ پایا جاتا ہے۔ دیکھو زرقانی صفحہ ۲۱۱/ج۱ ۱۲۔

کا تشریحی اضافہ راوی نے کیا ہے،

نیز حافظ ابونعیم نے دلائل النبوۃ میں عبد اللہ بن شداد کے حوالے سے اسی سلسلہ میں جو روایت نقل کی ہے، اس میں،

| | |
|---|---|
| فغمنی | پس گھونٹ دی میری سانس |

کا لفظ جو ملتا ہے جن سے "غط" کی اس کیفیت کی تشریح ہوتی ہے، جس کا ذکر بخاری وغیرہ میں ہے میں پوچھتا ہوں کہ جس کے سامنے صحاح کی یہ روایتیں ہیں اور "حبب الیہ الخلاء" (محبوب کر دی گئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خلوت پسندی) بخاری کی اس خبر کی ان تشریحوں کو جنھوں نے پڑھا ہے، مثلاً

| | |
|---|---|
| ای الخلوۃ التی یکون فیہا فراغ القلب والانقطاع عن الخلق فہی تفرغ القلب عن اشغال الدنیا لدوام ذکر اللہ تعالیٰ فیصفو وتنشرق علیہ انوار المعرفۃ۔ (السیرۃ المحدیہ) | یعنی وہ خلوۃ جس میں فراغ قلب اور مخلوق سے انقطاع ویکسوئی حاصل ہو تو وہ قلب کی فراغت ہے اشغال دنیا سے ذکر اللہ کے دوام کے لئے تو (اس حالت میں) قلب صاف اور منور ہو جاتا ہے اور اس پر انوار معرفۃ چمکنے لگتے ہیں۔ |

اور صاحب قاموس علامہ فیروزآبادی نے اپنی مقبول ومشہور کتاب "سفر السعادۃ" میں حرائی "تحنث" کے متعلق یہ لکھتے ہوئے کہ گو دوسرے خیالات بھی اس کی تشریح میں ظاہر کئے گئے ہیں لیکن مختلف آثار و قرآنی دلائل و شواہد کی بنیاد پر سب سے زیادہ صحیح خیال ان ہی بزرگوں کا معلوم ہوتا ہے جو کہتے ہیں کہ

| | |
|---|---|
| کان تعبدہ بالذکر | "ذکر" کی شکل میں رسول اللہ حرائی عبادت کرتے تھے۔ |

کچھ بھی ہو، یہ تو وہ مواد ہے جو حدیث وسیر کی کتابوں سے اخذ کر کے آپ کے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔ اگر کسی وفادار مخلص وراستباز امتی کے لئے اس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی زندگی کے نمونوں کا پیش کرنا بے ادبی اور گستاخی نہ ہو، تو میں پوچھتا ہوں کہ "ھو" کے مکان میں سیدنا الامام الکبیر کو جن حالات میں مصنف امام نے پایا تھا، اور ان کے اجمیر شریف لے جانے کے بعد اسی "ھو کے مکان" میں آپ کی آمد و رفت کا

کا سلسلہ جس خاص طریقہ سے جاری رہا، اور آپ کے جن مشاغل کا ذکر سوانح مخطوطہ کے مصنف نے کیا ہے
اُن میں کوئی بات بھی ایسی ہے جس کے متعلق اس قسم کی حرف گیریوں کی گنجائش پیدا ہوسکتی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم
کی زندگی میں اس کا نمونہ نہیں پایا جاتا، انتہا یہ ہے کہ "حبس دم" کا شغل جس کے متعلق بعض لوگوں کی طرف کتابوں
میں یہ منسوب کیا گیا ہے کہ اسے "جوگیہ ہند" سے صوفیوں نے یکسوئی کی کیفیت پیدا کرنے کیلئے حاصل کیا ہے آپ دیکھ
رہے ہیں کہ اس کی اصل بھی نبوت کی زندگی میں محدثین ہی کے بیان کے مطابق یہیں پائی جاتی ہے۔

عجیب بات ہے کہ منجملہ دوسری خصوصیتوں کے اسلام کی بڑی خصوصیت یہی سمجھی جاتی ہے، کہ
انسانیت کے لئے وہ کوئی نیا پیغام نہیں ہے، بلکہ جو کچھ اگلوں کو دیا گیا تھا، اسی کو اغلاط و تحریفات کی
آلودگیوں سے پاک کر کے تر و تازہ شکل میں النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے آخری دفعہ دنیا کے
سپرد کیا گیا ہے، اس قسم کے ارشادات، مثلاً

| | |
|---|---|
| لیھدیکم سنن الذین من قبلکم | تاکہ تمہیں ان بزرگوں کے راستہ پر چلائے جو تم سے پہلے گذر چکے |

یا۔

| | |
|---|---|
| اولئك الذين هدى هم الله فبهداهم اقتده | یہی وہ لوگ ہیں جنھیں اللہ نے ہدایت بخشی پس ان ہی لوگوں کے راستہ کو اختیار کر۔ |

وغیرہ میں بار بار خود قرآن ہی اسلام کی اس خصوصیت پر تنبیہ کرتا چلا گیا ہے، مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ
ہونا، ادیان سابقہ پر مھیمن و محیط ہونا خود قرآن ہی کی جب یہ ایک نمایاں اور ممتاز صفت ہے، تو
مسلمانوں کے اندر ایسی چیزوں کو دیکھ کر جو غیر قوموں میں بھی پائی جاتی ہیں سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ لوگوں
کو اچنبھا کیوں ہوتا ہے؟

اگر ایسا نہ ہوتا تو بیشک یہ تعجب کی بات ہوتی، اور مسلمانوں سے یہ پوچھا جا سکتا تھا کہ اپنے پیغمبر کی نبوت
کو نبوت جامعہ اور اپنے رسول کی رسالت کو رسالت کاملہ آخر کس بنیاد پر قرار دیتے ہیں،

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

کے دعوے کی دلیل کیا ہے؟ ساری خوبیاں جو دنیا کی قوموں میں بکھری ہوئی ہیں، اگر اسلام میں

سمٹی اور کھپی ہوئی نہ ہوتیں، تو شاعری کے سوا اس قوم کا دعویٰ کچھ اور بھی باقی رہتا ہے۔

ان میں کچھ لوگ الفاظ سے بھڑکتے ہیں، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے منجملہ دیگر مشاغل کے "ذکراره" کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ قہقہہ لگا کر پوچھتے ہیں کہ یہ "ذکراره" کیا چیز ہے؟ حالانکہ ذکر کے ایک خاص طرز کی تعبیر کے سوا وہ اور کچھ نہیں ہے، بلندی و پستی یا جہر و سر ان دونوں کیفیتوں کے درمیان والی آواز میں ذکر کرنے کو ہندوستان میں غالباً "ذکراره" کے نام سے لوگوں نے موسوم کر رکھا تھا، جیسے آرہ چلانے والے اطمینان کے ساتھ آرہ سے کسی کا کام انجام دیتے ہیں۔ لیکن موٹی سے موٹی شہتیر دیکھا جاتا ہے کہ دو ٹکڑے ہو کر رہ گئی، کچھ اسی قسم کی مشابہت کی بنیاد پر یہ نام ذکر کے اس خاص طریقہ کا رکھ دیا گیا تھا، مانتا ہوں کہ نام بیشک عربی نہیں ہندی یا فارسی ہے، لیکن آپ نام کو کیوں دیکھتے ہیں، کام کو دیکھئے اور پھر سوچئے کہ

| | |
|---|---|
| ولا تجهر بصلاتك و لا تخافت بها وابتغ بين ذلك سبيلا | اپنی نماز میں نہ زور سے پڑھو نہ آہستہ پڑھو (بلکہ) اُن دونوں کے درمیان کا راستہ اختیار کرو۔ |

جو قرآنی حکم ہے، یا قرآن ہی میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ

| | |
|---|---|
| واذكر ربك في نفسك ودون الجهر من القول بالغدو والآصال۔ | رات دن اپنے رب کی یاد اپنے دل میں اور ہلکی آواز سے کرو۔ |

آخر جس کام کا مطالبہ ان آیتوں میں کیا گیا ہے، وہی کام کیا اس نام سے انجام نہیں دیا جاتا تھا، حیرت ہوتی ہے کہ مسلمانوں نے نماز، روزہ، بانگ (اذان) درود وغیرہ بیسیوں نام شرعی بلکہ خالص عباداتی مطالبات کے رکھ لئے ہیں، انتہا یہ ہے کہ خدا اور پیغمبر وغیرہ تک کے ناموں اور لفظوں کے استعمال سے ان میں کوئی نہیں ہچکچاتا، اور کسی کا دھیان ان غیر عربی الفاظ سے ادھر نہیں جاتا کہ مسلمانوں میں ان ناموں سے جو عبادتیں مروج ہیں یا جو خیالات پھیلے ہوئے ہیں وہ غیر عربی یعنی عجمی اقوام سے چرائے گئے ہیں، لیکن ادھر بے چارے صوفیوں کے مشاغل اور ان کے اوراد و وظائف، طور اور طریقوں کا ذکر چھڑا، پھر دیکھئے کہ فیلالوجی کے ماہرین اپنی آستینیں چڑھا لیتے ہیں، فلاں طریقہ یونانیوں سے اور فلاں رومانیوں

سے لیا گیا، صوفیوں نے فلاں مشغلہ بدھ بھکشوؤں سے سیکھا اور فلاں طریقہ کار ان کا ہندو جوگیوں یا عیسائی راہبوں کے طرزِ عمل سے ماخوذ ہے، غوغائیوں کی مجلسیں ان ہی غلغلوں سے گونج اٹھتی ہیں اور ہر ایک اپنی جدید تحقیق کی داد لینے کے لئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دھینگا مشتی میں مصروف ہے۔

حالانکہ الفاظ سے اگر قطع نظر کر لیا جائے تو مشکل ہی سے حضرات صوفیہ کے مشاغل یا عملی طریقوں میں کوئی ایسی چیز مل سکتی ہے جس کی اصل نبوت کبریٰ کے نمونوں میں نہ پائی جاتی ہو، آ ذکر ہی کو دیکھئے قرآن میں رات کے ذکر کے ساتھ اسم ذات کے ذکر کا ہی حکم دیا گیا ہے، اور اس کی کوئی خاص شکل مقرر نہیں کی گئی ہے، بلکہ قیاماً و قعوداً و علی جنوبہم ان تمام حالات کے ذکر کو سراہا گیا ہے، پھر قرآن کے اسی اطلاق سے استفادہ کرتے ہوئے ذکر کے جن خاص طریقوں کو بزرگوں نے زیادہ مفید اور نتیجہ خیز پایا، اسی کو اختیار کر کے پوچھنے والوں کو وہی طریقے بتاتے رہے تو بتایا جائے کہ خلاف ورزی کا الزام آخران پر کس راہ سے لگایا جاتا ہے، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ شق صدر وحی و معراج و معجزات وغیرہ بیسیوں چیزیں جو نبوت کی طرف منسوب ہیں اُن کا سراغ خود بتائیے کہ ان نمونوں کے سوا جو صوفیوں کی زندگی میں پائے جاتے ہیں، کیا کسی اور ذریعہ سے ممکن ہے؟ آج تو مثلاً لطائف سے شق صدر کو، الہام و کشف سے وحی کو، سیر و سلوک اور اس کے مشاہدات سے معراج کو، کرامتوں سے معجزات کو ہم کچھ نہ کچھ سمجھ بھی لیتے ہیں یہ جانتے ہوئے کہ آسمان و زمین ہی کا فرق دونوں سلسلوں میں کیوں نہ ہو، تاہم کچھ تو ان چیزوں کی نوعیت کا پتہ صوفیہ کی زندگی کے ان نمونوں سے چلتا ہے، ایک شکی آدمی چاہے تو ان امور کا کچھ نہ کچھ اندازہ اپنے ذاتی تجربات سے کر سکتا ہے، کیونکہ بند اگر ہوا ہے تو صرف نبوت کا دروازہ بند ہوا ہے اور اب وہ کسی کے لئے رہتی دنیا تک کبھی کھولا نہیں جا سکتا، لیکن غیب سے رشتہ قائم کرنے کی صوفیانہ راہیں نہ پہلے بند تھیں نہ اب بند ہیں نہ آئندہ بند ہوں گی اپنی اپنی صلاحیت و مناسبت کے مطابق کسی نہ کسی شکل میں ان چیزوں کے تجربہ کا موقعہ ہر کاسب اور کوشش کرنے والے کے لئے ہر زمانہ میں باقی ہے اور اس کو باقی رکھا گیا ہے۔

موضوع سے، اس میں شک نہیں، کہ تھوڑی دیر کے لئے مجھے ہٹنا پڑا، لیکن زمانہ کی ستم ظریفیوں کو کیا

کہئے، ہم سے بیش تر سوانح نگاروں نے جن چیزوں کا ذکر آپ کی سوانح عمریوں میں کیا ہے، ان کو اپنے زمانہ کے مذاق کی رعایت کرتے ہوئے چھوڑ دینا بد دیانتی اور خباثت محسوس ہوئی اور ذکر کرنے کے بعد ان زیر لب مسکراہٹوں کا خیال ستانے لگا، جو علم کے جھوٹے مدعیوں میں آج کل کا جہل پیدا کر رہا ہے موضوع سے غیر متعلق یہ چند سطریں، جہل و تمسخر کی ان مسکراہٹوں کو تھوڑی دیر کے لئے فکر و سنجیدگی کے تیوروں سے ہی بدل دینے میں اگر کامیاب ہو گئیں تو میں خیال کروں گا کہ نہ میرا وقت ضائع ہوا، اور نہ پڑھنے والوں کو اپنے وقت کی بربادی کا افسوس ہو گا۔

بہر حال مولانا مملوک العلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات جس زمانہ میں ہوئی یعنی ۱۸۵۱ء میں سیدنا الامام الکبیر کو جن حالات اور کیفیات میں ہم پاتے ہیں، عرض کر چکا ہوں کہ اسی سال لارڈ ڈلہوزی کی قائم کردہ کمیٹی نے فیصلہ کر دیا تھا کہ بہادر شاہ کے بعد لال قلعہ سے مسلمانوں کی حکومت اور بادشاہ کا کوئی تعلق باقی نہیں رہے گا، یہ آخری کیل جب مسلمانوں کی قسمت کے تابوت میں ٹھونک دی گئی، تو واقعہ کی یہ صورت ہی ایسی تھی کہ جو جہاں ہو گا یقیناً تلملا اٹھا ہو گا، پھر دلی ہی میں جس کے سامنے یہ واقعہ اور اس سے پیشتر مصیبت بالائے مصیبت کے دوسرے واقعات مسلسل پیش آتے چلے جا رہے تھے ان سے اس دردمند دل کا متاثر ہونا جو سیدنا الامام الکبیر کے سینے میں تھا، یقیناً موجب حیرت و استعجاب نہیں ہو سکتا۔

آخر مسلمانوں کے سیاسی حالات کے متعلق جس کی حسّی ذکاوت کا یہ حال ہو (جیسا کہ تذکرۃ الرشید میں مولنا عاشق الٰہی صاحب نے نقل کیا ہے) کہ مناسک حج و زیارت سے فارغ ہو کر جس وقت ہندی حاجیوں کا وہ قافلہ جس میں سیدنا الامام الکبیر اور مولٰنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہا بھی شریک تھے، واپسی کے لئے ہر طرح سے تیار ہو چکا تھا، صرف سوار ہونے میں دیر تھی کہ

"عین اسی دن پلونا کے فتح ہونے اور روس کے قبضہ میں آجانے کی وحشت ناک خبر مکہ پہنچی"۔

پھر جانتے ہیں، کیا ہوا؟ شکست ہوئی تھی مسلمانوں کو پلونا کے میدان جنگ میں، مگر پلونا سے

ہزاروں میل دور مکہ میں حاجیوں کا یہ قافلہ جو وطن جانے کی مسرتوں میں مشغول تھا، مولوی عاشق الٰہی کا بیان ہے، کہ اس خبر نے،

"قصد سفر ملتوی کرنے پر مجبور کیا" (ص۲۴۱ ج ۱ تذکرۃ الرشید)

اور گو حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصرار اور تسلی دینے کے بعد التوار کا یہ ارادہ چند دنوں کے بعد فسخ ہوا لیکن جس کی وجہ سے سفر کا ارادہ ملتوی کیا گیا تھا اس پر کیا گذری، اور تو کچھ ہم نہیں جانتے مولوی عاشق الٰہی نے اسی موقعہ پر یہ خبر دی ہے کہ

"البتہ مولٰنا محمد قاسم صاحب کو علالت لاحق ہوئی جو بظاہر خفیف محسوس ہونے کی وجہ سے سفر کی مزاحم یا رفقار کو پریشان بنانے والی تو نہ ہوئی، مگر آہستہ آہستہ بڑھ کر وہی بیماری مرض الموت بنی" (ص۲۴۲/۱۷ تذکرۃ الرشید)

ہائے مرحوم میر کا شعر،

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

اسی لئے حضرت والا کے سیاسی تاثرات کا کلیۃً نہ میں نے انکار کیا ہے، اور نہ انکار کرنے کی کوئی معقول وجہ نظر آتی ہے، لیکن اسی کے ساتھ واقعات ہی کی بنیاد پر یہ کہنا چاہتا تھا کہ اسی زمانے میں چونکہ حضرت والا کے متعلق باطنی مجاہدات، اور قلبی ریاضتوں میں بھی مشغول و منہمک ہونے کی خبریں دینے والوں نے دی ہیں، اس لئے صرف "سیاسی تاثر" سے اس عہد کے حالات و کیفیات جذبات و واردات کی توجیہ درست نہ ہوگی، اس راہ میں بسط کے ساتھ قبض کی کیفیتیں بھی سالک پر پیش آتی ہیں، کہتے ہیں کہ بدو وحی کے بعد فترۃ کا جو نمونہ نبوت کبریٰ کے اندر پایا جاتا ہے، اسی کی یہ پرچھائیاں اور سائے ہیں جو اللہ والوں کی زندگی میں نظر آتے ہیں، واللہ اعلم بالصواب

اس میں کوئی شک نہیں کہ ذکر و فکر کے ان باطنی مشاغل کا سلسلہ آخر وقت تک سیدنا الامام الکبیر کی زندگی میں جاری رہا، ان کے شاگردوں کے آخری طبقہ کے ایک رکن مولٰنا منصور علی خاں

حیدرآبادی رحمۃ اللہ علیہ جن کو حضرت والا سے تلمذ کا شرف اس زمانے میں ملا جس کے بعد ہی آپ کی وفات خود ان کے سامنے ہوئی، انھوں نے دیکھا تھا، جیسا کہ خود ہی لکھتے ہیں کہ

"یاد الٰہی سے کسی وقت غافل نہ تھے، ہمہ تن ذکر بن گئے تھے" ص ۱۹۶ مذہب منصور

اللہ اللہ جس کا حال یہ ہو جیسا کہ مولٰنا منصور علی خاں ہی نے بیان کیا ہے کہ "ہر لقمہ خواہ کھانے کا ہو، یا میوہ یا شیرینی کا بسم اللہ ضرور کہا کرتے" ص ۱۹۱ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نام اور اسم کے ساتھ گرویدگی کی یہ کیفیت ہو تو نام والے کے ساتھ اس کے قلبی تعلق کی کیا کیفیت ہو گی، لیکن جہانتک واقعات کا اقتضا ہے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس راہ میں آپ کی مشغولیت عروج و شباب کے انتہائی نقطہ تک اسی زمانہ میں پہونچ گئی تھی جس زمانہ میں کوچہ چیلان کے "ھو" والے مکان میں آپ کو کامل یکسوئی کا موقعہ میسر آیا تھا، اور اس راہ کے آخری نتائج آپ کے سامنے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجاہدہ اور ریاضت کے ان ہی ایام میں آچکے تھے، وقت کے مسلم عند الکل قطب، اور اس راستہ کے مشہور ماہر سیدنا حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی یہ شہادت کہ

"مولٰنا محمد قاسم کو کم سنی ہی میں ولایت ہو گئی" (کمالات رحمانی ص ۱۶)

جس کا ذکر شاید پہلے بھی کہیں کر چکا ہوں خود اس سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔

"مقام ولایت" سے کمسنی ہی میں سرفرازی کا شاید یہ نتیجہ ہے، کہ باوجود شدید اخفار حال کے اس کے آثار و ثمرات کے تجربہ و مشاہدہ کا موقعہ کمسنی کے بعد والی زندگی کی ہر منزل میں لوگوں کو ملتا رہا، بقول مصنف سوانح مخطوطہ

"مولٰنا مرحوم سے رات دن، کھلی کرامتیں سرزد ہوتی تھیں"

حالانکہ وہی یہ بھی اسی کے بعد لکھتے ہیں کہ

"اپنی خاکساری کی وجہ سے ان کو ایسا چھپاتے تھے جیسے پانی کنوؤں کی تہ میں، اور ہرگز اس کے اظہار کو پسند نہ فرماتے تھے" ص ۱۲

میں نے کسی کتاب میں تو نہیں پڑھا ہے، لیکن اکابر دیوبند سے کہہ سکتا ہوں کہ مختلف طریقوں سے یہ خبر

مجھ تک پہنچی ہے، کہ یہی ۱۸۵۷ء جس کے چند ہی سال بعد غدر کا ہنگامہ ہوا، آئندہ اس میں آپ کی عملی شرکت کے واقعات بیان کئے جائیں گے، اسی سلسلہ میں کہتے ہیں کہ آپ کے سر میں گولی لگی، سر پکڑ کر بیٹھ گئے عمامہ سر پر بندھا ہوا تھا، لوگ دوڑے، مگر ان کی حیرت کی انتہا نہ تھی کہ کسی قسم کا کوئی اثر گولی کا نہ عمامہ میں محسوس ہوا اور نہ سر مبارک میں، ہمارے مصنف امام نے بھی اشارۃً اس واقعہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

"گولی کا نشان تک نہ ملا، حالانکہ خون سے کپڑے تر تھے" ص۳۷

اسی طرح پور قاضی کے شیعوں کی مجلس کا وہ واقعہ جس میں کہا جاتا ہے کہ شیعوں کی طرف سے مطالبہ ہوا تھا کہ سرور کائنات رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بحالت بیداری ہمیں کرا کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ سنوا دیجئے کہ جو کچھ تم (یعنی مولانا نانوتوی) کہتے ہو سچ ہے، تو ہم لوگ سنی ہو جائیں گے۔ ارواح ثلثہ میں ہے کہ جواب میں حضرت والا نے فرمایا کہ

"تم سب اس پر پختہ رہو، تو میں بیداری میں زیارت کرانے کے لئے تیار ہوں" ص۲۰۱

حضرت والا کے ایام شباب اور جوانی کے جوش ہی کا اسے نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے، کیونکہ مخالفوں سے مباحثہ و مناظرہ و مقابلہ کی پھر کسی مجلس و محفل میں نہ آپ کی طرف سے اس قسم کے دعاوی جہاں تک میں جانتا ہوں پیش ہوئے، اور نہ بجائے عام علمی طریقوں کے اس سلسلہ میں کسی غیر معمولی باطنی قوت سے کام لیتے ہوئے آپ کو کبھی پایا گیا۔[1]

---

[1] صرف ایک سماعی روایت اس سلسلہ میں مجھ تک پہنچی ہے پورے طور پر یاد نہ رہا کہ خود حضرت شیخ الہند نے بیان کیا تھا یا بالا کسی نے سنایا تھا اور وہ یہ ہے کہ مناظرے کی کسی مجلس میں فریق مخالف نے تقدیر کے مسئلہ کو چھیڑ دیا، سیدنا الامام الکبیر نے اس وقت ایک ایسی تقریر اس مسئلہ کے متعلق فرمائی کہ ساری الجھنیں جو اس میں پیدا ہوتی ہیں ایک ایک کر کے معلوم ہوتا تھا کہ سلجھتی چلی جا رہی ہیں، مجلس میں حضرت شیخ الہند اور آپ کے دوسرے رفقا بھی شریک تھے اس میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے کہ آج تو حضرت نے ایسی تقریر کی جو کبھی سننے میں نہیں آئی، خیال آتا ہے کہ بعضوں نے اسی وقت نوٹ بھی کر لیا، مسئلہ کے متعلق پوری مجلس مطمئن نظر آتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی قسم کا کوئی شبہ باقی نہ رہا، مجلس کے برخاست ہونے کے بعد جب یہی حضرات جنکی حیثیت اس وقت طلبہ کی تھی فرودگاہ پر واپس آئے اور چاہا کہ ذہن نشین کرنے کے لئے تقریر کا اعادہ کریں، تو نظر آیا کہ کچھ الجھنیں پھر بھی باقی ہی رہ گئی ہیں۔ ردوکد کے بعد اپنے سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ تقریر جس وقت ہو رہی تھی کوئی شبہ باقی نہ رہا تھا، مگر وہاں سے واپسی کے بعد کچھ خدشے بدستور کھٹک رہے ہیں۔ تب سیدنا الامام الکبیر نے مسکرا کر فرمایا کہ کبھی مخاطب کے فہم کے مطابق تقریر کی جاتی ہے اور کبھی ضرورۃً مخاطب کی سمجھ ہی کو اپنی تقریر کے مطابق بنا لیا جاتا ہے۔ شاید اسی قسم کے الفاظ تھے حاصل جس کا یہی سمجھا گیا کہ باطنی تصرف سے اس وقت کام لیتے ہوئے لوگوں کے دل و دماغ ہی کو ایسا بنا لیا گیا کہ اس وقت ان سے جو کچھ کہا جاتا وہ ہی مان لیتے۔

اور صرف بحث و مباحثہ کی مجلسوں اور محفلوں ہی میں نہیں، بلکہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ اپنی زندگی کے اس پہلو کو حتی الوسع حضرت والا پوشیدہ رکھنے کی بلیغ کوشش فرماتے تھے انھوں نے اسی کے ساتھ جو یہ لکھا ہے کہ "رات دن کرامتیں سرزد ہوتی رہتی تھیں" شاید اس سے اشارہ اسی قسم کے واقعات کی طرف ہے، جن سے صرف وہی لوگ واقف ہو سکتے تھے جو صبح و شام حضرت والا کی خدمت میں حاضری کا شرف رکھتے تھے مثلاً مولانا منصور علی خاں صاحب نے بیان کیا ہے کہ آخری حج جس میں ہمرکابی کی سعادت ان کو بھی میسر آئی تھی، واپسی میں جب آپ بیمار ہوئے لکھا ہے کہ

"جہاز میں ایسے بیمار ہو گئے کہ اٹھنے بیٹھنے کی بالکل طاقت نہ رہی، بار بار استفراغ ہوتا تھا، یہ خادم (مولانا منصور علی خاں) اٹھا کر بٹھاتا، اور سلفچی میں استفراغ کراتا تھا، صرف صفرا ہی نکلتا تھا، کلی کرا کر پھر لٹا دیتا تھا، دن رات میں کسی وقت اسقدر سکون نہ تھا کہ اچھی طرح خواب راحت ہو، ذرا دیر ہوئی کہ استفراغ کا تقاضا ہوا"

مگر وہی مریض جس میں نشست و برخواست کی قوت باقی نہ رہی تھی، اور غثیان کے دورے دم لینے کی بھی جسے فرصت نہیں دے رہے تھے، بقول مولانا منصور علی خاں

"ہر وقت لیٹے ہی رہتے تھے"

لیکن اسی کے ساتھ جہاز کے اس پورے سفر میں اس کا مشاہدہ بھی شب و روز کے پانچوں وقتوں میں کیا کرتے تھے کہ

"جب نماز کا وقت آتا وہ استفراغ موقوف ہو جاتا، اور بیٹھ کر اطمینان سے نماز پڑھتے"

مگر جوں ہی کہ اطمینان کے ساتھ نماز ادا ہو جاتی، وہی بیان کرتے ہیں کہ

"نماز کے بعد پھر وہی دورہ پے در پے شروع ہو جاتا" (مذہب منصور ص۱۸۵)

یا اسی قسم کے ایک دوسرے واقعہ کا ذکر مولانا منصور علی خاں صاحب نے بایں الفاظ فرمایا ہے، کہ

"عید الاضحیٰ میں مولانا (نانوتوی) کا دستور تھا کہ سالم گائے کی قربانی کیا کرتے، صبح کے وقت میں حاضر تھا، منشی محمد یٰسین صاحب مولانا صاحب کے ماموں زاد بھائی تشریف

لائے اور عرض کیا کہ گائے کی قیمت سات روپئے ٹھہر گئی ہے "۔

لکھتے ہیں کہ یہ سن کر حضرت والا نے فرمایا کہ "اچھا" منشی محمد یٰسین صاحب اس کے بعد چلے گئے، مولانا منصور علی خاں کہتے ہیں کہ ان کے جانے کے بعد

"ایک گھنٹہ میں ایک مسافر آدمی، جو غریب مسکین معلوم ہوتا تھا آیا اور مصافحہ کرکے بیٹھ کر جیب میں سے کچھ روپے نکال کر مولانا صاحب کی نذر کئے"۔

اب آگے سنئے۔ یہ مولوی منصور علی خاں کی چشم دید شہادت ہے وہ فرماتے ہیں کہ

"مولانا صاحب (مولانا نانوتوی) وہ روپئے مجھ کو دیئے کہ منشی محمد یٰسین کو دے دو"۔

روپئے مولوی صاحب نے لے لئے لے کر اُن کو گنا، کہتے ہیں،

"کہ میں نے دیکھا تو سات ہی روپے تھے، حیران رہ گیا کہ خداوندا یہ کیا اسرار اور راز دنیا ز ہے"۔

ظاہر ہے کہ بساط قرب کے حاشیہ نشینوں کے سوا اس قسم کی جزئیات سے آگاہی کی عوام کے لئے مشکل ہی کیا تھی، اور سوانح مخطوطہ کے مصنف بھی چونکہ ان ہی خوش نصیبوں میں تھے، جنھیں قرب و نزدیکی کی یہ نعمت میسر تھی، معلوم ہوتا ہے کہ صبح و شام، رات، دن اس نوعیت کی چیزوں کے مشاہدہ و تجربہ کے مواقع ملتے رہتے تھے، ورنہ عمومیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ان کی وہی بات صحیح ہے کہ کنوئیں کی تہ میں پانی چھپا رہتا ہے حضرت والا اپنی "ولایت" کے آثار و ثمرات کو چھپاتے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گرد و پیش میں رہنے والوں کے سامنے بھی کوئی بات کسی شدید ضرورت ہی کے وقت ظاہر ہو جاتی تھی، مولوی منصور علی خاں صاحب ہی نے اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ کا تذکرہ کیا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ اپنی ذاتی مصیبتوں، اپنے اقربا کی تکلیفوں کے ازالہ میں باطنی قوت سے کام لینے کی نظیریں جس کی زندگی میں نہیں ملتیں یا بہت کم ملتی ہیں، اپنے رفیق الدنیا و الآخرۃ حضرت مولانا گنگوہی کی گرفتاری اور جیل و حبس کی سزا میں بھی جسے راضی برضا پایا گیا تھا، اسی کے متعلق سنئے مولانا منصور علی خاں کسی دوسرے سے سنی ہوئی نہیں، اپنی چشم دید روئت کی یہ روایت سناتے ہیں۔

"ایک بار (نانوتہ واپس ہوتے ہوئے) سفر میں میں بھی ہمراہ رکاب تھا، واپسی میں جب

نانوتہ ایک میل رہا مولانا صاحب کا حجام نانوتہ سے آتا ہوا ملا' دریافت فرمایا تو عرض کیا کہ میں آپ ہی کے پاس جاتا تھا' فرمایا کیوں ؟"

اب یہی سننے کی بات ہے، حجام قصہ سنانے لگا کہ

"تھانہ دار نانوتہ نے ایک عورت کے بھگانے کا جرم مجھ پر لگا کر چالان کا حکم دیا ہے، میں بالکل بے خطا ہوں' خدا کے واسطے مجھے بچائیے "۔

اللہ اللہ جس کے سامنے خدا جانے کتنے بڑے بڑے امیر، اور کتنے علماء و فضلاء اعزہ و اقرباء غدر کے زمانہ میں چالان کئے گئے، اور پھانسی' یا عبور دریائے شور کی سزاؤں کے مستحق قرار دئے گئے، خود اس پر بھی جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا' وارنٹ حکومت کی طرف سے جاری ہوا' اور برسوں جاری رہا' لیکن ان سارے واقعات میں ایک عامی مسلمان کی طرح جو اول سے آخر تک دم بخود ہو کر دیکھتا رہا' آج اسی کے سامنے اس کے گاؤں کا حجام کھڑا ہے' اور کہتا ہے کہ

"میں بالکل بے خطا ہوں' خدا کے واسطے مجھے بچائیے"

مولانا منصور علی خاں ہی کی زبانی سنئے' کہ ایک ایسے ساکن بحر محیط میں حجام کے اس طرز بیان نے کس قسم کا تلاطم پیدا کر دیا۔ وہی رقمطراز ہیں کہ

"جس وقت مسجد نانوتہ پہونچے، بیٹھتے ہی، مجھ سے فرمایا کہ منشی محمد یٰسین کو بلالاؤ"

جاتے ہیں نانوتہ کی مسجد میں بیٹھ کر، گھر جانے سے بھی پیشتر اپنے خاص کارپرداز منشی محمد یٰسین کی طلبی کس کام کے لئے ہوتی ہے ؟ مولوی منصور علی خاں صاحب یہ بیان کر کے کہ حسب ارشاد منشی محمد یٰسین صاحب کو میں بلا کر لے آیا' وہ حضرت والا کے سامنے کھڑے تھے، اور مولوی منصور علیخاں صاحب کے کان میں جلال و ہیبت میں ملی ہوئی آواز آرہی تھی خود وہی فرماتے ہیں کہ

"ان سے (منشی محمد یٰسین سے) عجب شان جلالی سے فرمایا کہ اس غریب (حجام) کو تمہارا نے بے قصور پکڑا ہے' تم اس سے (تھانہ دار سے) کہدو کہ یہ (حجام) ہمارا آدمی ہے اس کو چھوڑ دو' ورنہ تم کبھی نہ بچو گے"۔

اور بات اسی پر ختم نہیں ہوگئی، اسی کے ساتھ سنایہ گیا کہ خلاف دستور یہ بھی فرما رہے ہیں کہ

"اس کے (حجام کے) ہاتھ میں ہتھکڑی ڈالوگے تو تمہارے ہاتھ میں بھی ہتھکڑی پڑے گی"۔ ص۱۸۱

منشی محمد یسین مرحوم اس رنگ کو دیکھ کر دنگ ہو کر رہ گئے، الٹے پاؤں تھانہ دار صاحب کے پاس پہونچے، اور بقول مولنا منصور علی خاں مرحوم،

"تھانہ دار کے پاس جاکر مولنا صاحب کا ارشاد ہو بہو کہلایا"

مگر تھانہ دار اپنا ہاتھ کاٹ چکا تھا، تھانہ کے روزنامچہ میں مجرم پر جرم کا الزام عائد کر کے اپنے اختیار تمیزی کی قوت ختم کر چکا تھا، گھبرا کر منشی محمد یسین صاحب سے تھانہ دار نے کہا کہ

"اب کیا ہو سکتا ہے روزنامچہ میں اس کا (حجام) کا نام لکھدیا گیا ہے"۔

تھانہ دار بے چارا خیال کرتا تھا کہ مولنا کا حکم اس کے اختیاری حدود تک محدود ہے، مگر منشی محمد یسین صاحب کو دیکھا کہ پھر واپس چلے آرہے ہیں، اور کہہ رہے ہیں، کہ حضرت کا حکم ہے کہ تھانیدار

"جاکر کہدو، کہ اس کا نام روزنامچے سے نکال دو"۔

مغلی نہیں، بلکہ برطانوی طرز حکومت کے تھانہ میں یہ تصرف کہ روزنامچہ میں درج ہونے کے بعد مجرم کا نام کاٹ دیا جائے ظاہر ہے کہ خود جرم اور بدترین جرم تھا، تھانہ دار سخت حیران تھا، منشی محمد یسین صاحب نے جب روزنامچہ سے نام کاٹ دینے کی فرمائش مولنا کی طرف سے پیش کی تو تھانہ دار نے کہا کہ

"نام لکھا ہوا کاٹنا بڑا جرم ہے"

اور بات پوری بھی کرنے نہ پایا تھا کہ عالم سراسیمگی میں منشی محمد یسین صاحب سے کہا کہ

"چلو میں بھی مولنا صاحب کے پاس تمہارے ساتھ چلتا ہوں"

ہانپتے کانپتے، حالت اضطراب میں حضرت والا کے پاس مسجد ہی میں تھانہ دار حاضر ہوا، اور بے کسی کے ساتھ جیسا کہ مولنا منصور علی خاں نے لکھا ہے حضرت کی خدمت میں عرض کر رہا تھا کہ

"حضرت نام نکالنا بڑا جرم ہے"

اور کیسا جرم؟ اسی نے بیان کیا کہ

"اگر نام اس کار (حجام) کا نکالا میری نوکری جاتی رہیگی"

ظاہر ہے جائج سٹیٹ قائم کرنے کے بعد اس قسم کے مجرمانہ تصرف کا یہی نتیجہ تصرف کرنے والے کے سامنے قانوناً آسکتا تھا، اس سے حضرت والا بھی ناواقف نہ تھے، مگر آج رنگ ہی دوسرا تھا، تھانہ دار تو یہ عرض کررہا تھا کہ اس جرم کے بعد میری نوکری جاتی رہے گی، لیکن تھانہ داروں یا سرکاری ملازموں کے عزل ونصب کا اختیار جن ہاتھوں میں لوگوں کو نظر آتا ہے، کیا واقعی یہ اختیار ان ہی کے ہاتھوں میں ہوتا ہے، آج قوانین عالم کا ایک شارح اس کی شرح اپنے ان الفاظ میں تھانہ دار کے آگے کررہا تھا، کہ

"اس کار (حجام) کا نام (روزنامچہ) کاٹ دو، تمہاری نوکری نہیں جائے گی"

کسی ادنیٰ چپراسی یا گاؤں کے چوکیدار کے تقرر یا برطرفی کا اختیار بھی بظاہر جس کے ہاتھ میں نظر نہیں آتا تھا وہ پولیس کے ایک افسر کو اطمینان دلا رہا ہے کہ نوکری نہیں جائے گی، گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس افسر ہی کی نہیں بلکہ حکومت کی مطلق "نوکری" بھی صرف اس کی منشار کی تابع ہے، مولانا منصور علی خاں صاحب بھی موجود تھے اس وقت ان کے جو احساسات تھے ان کا اظہار، ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ

"اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ مولنا صاحب فرمارہے ہیں ایسا ہی ہوگا"

واللہ اعلم ان کو کیا معلوم ہورہا تھا، آگے اسی کے بعد وہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ

"جس نے وہ حالت دیکھی ہے، اس کے یقین میں (یعنی جو کچھ کہا جارہا ہے یہی ہوکر رہیگا) ذرا بھی شک نہیں تھا"

کیا فکنت[1] بصرہ الذی یبصربہ وسمعہ الذی یسمع بہ ویدہ التی یبطش بہا ورجلہ التی

[1] بخاری وغیرہ کے الفاظ ہیں کہ بندہ جب اپنے خالق کا محبوب بن جاتا ہے تو ارشاد ربانی ہے کہ میں اسکی بینائی ہوجاتا ہوں جس سے دیکھتا ہے اس کی شنوائی ہوجاتا ہوں جس سے سنتا ہے، اسکے ہاتھ ہوجاتا ہوں جن سے پکڑتا ہے، اس کے پاؤں ہوجاتا ہوں جن سے چلتا ہے، قرآن میں "راضیۃ" کے عمل کا صلہ "مرضیہ" جو فرمایا گیا ہے شاید اسی کی یہ شرح ہے ۱۲

یمنی بھا کا راز ان کے سامنے بے پردہ ہوگیا تھا، کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کیا حالت تھی کہ جس کے ہاتھ میں کچھ نہ تھا، نظر آرہا تھا کہ اسی کے کہنے اور صرف کہنے سے سب کچھ ہوجائے گا اور جو کچھ کہا جارہا تھا یہ حال تو دیکھنے والوں کا اس کے واقع ہونے سے پہلے کا تھا، پھر ہوا کیا؟ تھانہ دار تھانہ واپس آیا، دم بخود تھا قلم ہاتھ میں تھا، اور باضابطہ سرکاری روزنامچہ سے مجرم کے لکھے ہوئے نام کو کاٹ رہا تھا، یہ سوچتے ہوئے کاٹ رہا تھا کہ اپنی برطرفی کے کاغذ پر خود ہی دستخط کر رہا ہوں، مگر جیسا کہ مولانا منصور علی خاں کی چشم دید شہادت ہے کہ

"اس حجام کو اس نے چھوڑ دیا اور برابر تھانہ دار (تھانہ دار) ہی رہا" ص۱۸۷

کیا دلچسپ تماشہ تھا، وہی جسے رامپور میں دیکھنے والوں نے دیکھا تھا کہ نواب کلب علی خاں مرحوم کے وزیر عثمان خاں اور ان کے سکریٹری سے اس درخواست کے جواب میں کہ نواب صاحب حضرت والا کی زیارت کے بے حد آرزومند ہیں، کمال استغنا سے یہ کہہ رہا ہو کہ

"نواب صاحب ہی تو میری ملاقات کے مشتاق ہیں، میں تو ان کی زیارت کا مشتاق نہیں ہوں، اگر ان کو اشتیاق ہے تو خود مجھ سے ملنے آئیں، ان کے پیروں میں تو منہدی لگی ہوئی نہیں ہے" (ارواح ص۱۹۹)

اور مرحوم نواب محمود علی خاں والی ریاست چھتاری کو یہ جانتے ہوئے کہ وہ مخلص عقیدت مندوں میں ہیں، محض اس لئے کہ لاکھ مخلص ہوں مگر ہیں تو امیر آدمی بقول امیر شاہ خاں صاحب مولانا (نانوتوی) ان سے بھی کبھی نہیں ملے، ہوتا یہ تھا کہ

"اگر حضرت (نانوتوی) نے علیگڈھ آنے کی خبر سنکر وہ (نواب چھتاری) علیگڈھ آئے تو مولانا جھٹ خورجہ تشریف لے گئے، اور جو خورجہ گئے، تو حضرت میرٹھ آئے" ص۱۹۹

اور وقت کے ملک التجار شیخ عبدالکریم رئیس لال کرتی (میرٹھ) کی پیش کی ہوئی روپے کی تھیلی کو واقعی جوتیوں میں ڈلوا کر ٹھوکر لگانے کا جو عادی ہو (دیکھو ارواح ص۲۰۲) وہی نانوتے کے ایک دہقانی حجام کے لئے آج زمین کے قلابے آسمان سے ملا رہا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بس میں جو کچھ بھی ہے،

سب کچھ کر گذرنے کے لئے تیار ہے، اور یہ خاص ادا آپ کی کچھ اسی غریب نانوتوی حجام ہی کے ساتھ مختص نہ تھی بلکہ ہر گرے پڑے کے لئے اٹھنا ہی آپ کی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت تھی، آپ کی زندگی کا یہ ایک مستقل پہلو ہے، موقعہ پر انشاء اللہ اس کا تذکرہ کیا جائے گا۔ اور مثالیں تنہا اسی وقت انشاء اللہ پیش ہوں گی۔

اس وقت تو ذکر اس کا ہو رہا تھا کہ ولایت خاصہ کے جس مقام سے کم سنی میں آپ سرفراز ہو چکے تھے، اس کے آثار و ثمرات کا ظہور اگر ہونا بھی تھا تو اسی قسم کے نا پرساؤں، درماندوں کے لئے ہونا تھا، وہی پوچھے جاتے تھے، جنھیں کوئی نہیں پوچھتا تھا، وہی بڑے بن جاتے تھے جو عام نگاہوں میں چھوٹے سمجھے جاتے تھے، اور اس سلسلہ میں بھی آپ کی شفقت خاص کے زیادہ مستحق دینی علوم کے وہ طلبہ تھے، جنھیں نئی قائم ہونے والی حکومت مسلط نے حکومت ہی کی حدود سے باہر نہیں کر دیا تھا، بلکہ اسی نوزائیدہ حکومت کے مخفی حکیمانہ طرز عمل نے خود اپنی قوم مسلمانوں کا بھی راندہ، اور دُر دُرایا دُھتکارا ہوا طبقہ ان کو بنا دیا تھا، مگر جو کہیں نہیں چلے جاتے تھے، دربار قاسمی میں وہی محبوبیت کے مرکز و حید بنے ہوئے تھے، اور سچ پوچھئے تو دارالعلوم دیوبند کہیے، یا ہندوستان کے طول و عرض میں آپ سے وابستہ علماء و طلباء کی عمومیت جو تقریباً ایک صدی سے دینی خدمات کے ذیل میں علم آموزی کیساتھ غریب الدیار طلبہ اور عام بیکسوں کی مشفقانہ راہنمائی دستگیری اور ہر قسم کی مادی و روحانی اعانتوں میں مشغول ہے، درحقیقت اسی غریب نواز تجلی کا کھلا ہوا مظہر ہے۔ ان کی اسی روشنی سے خاکِ ہند کے ذراتِ جگمگا رہے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس قاسمی روشنی سے کب تک ان کی درخشانی اور تابانی اپنا کام کرتی رہے گی۔

اسی محبوبیت کا نتیجہ ہے کہ باوجود اخفاء و ستر کی انتہائی کوششوں کے ضرورت پڑ جاتی تھی، تو باطنی تصرفات کی ان خداداد قوتوں سے ان ہی غریب طالبعلموں کی کبھی کبھی امداد فرمادی جاتی تھی، خود ہمارے ان ہی مولٰنا منصور علی خاں صاحب کی ایک دلچسپ داستان کتابوں میں پائی جاتی ہے، راوی بھی اسکے حضرت والا کے خلف رشید حافظ محمد احمد مرحوم مہتمم دارالعلوم دیوبند میں

مفصل داستان تو ارواح ثلاثہ میں پڑھئے، حاصل یہ ہے کہ "درہنگام نوجوانی چنانچہ افتد دانی" کے شکار کسی طرح سے اسی زمانہ میں حکیم صاحب یعنی مولٰنا منصور علی خاں صاحب بھی ہو گئے تھے، جب سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، حالت روز بروز بد سے بدتر ہونے لگی، استاد نے افتاد کا اندازہ کر لیا' پہلے تو کچھ عقلی تدبیروں سے کام لیا گیا' اور آخر میں جیساکہ حافظ صاحب مرحوم سے بعد کو مولٰنا منصور علی خاں نے خود بھی بیان کیا کہ مغرب کی نماز کے بعد حکم دیا گیا کہ چھتہ کی مسجد میں حاضر ہوں' صلوٰۃ الاوابین سے فارغ ہو کر مولوی صاحب کہتے تھے کہ میرا ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر میری ہتھیلی کو اپنی ہتھیلی سے اس طرح رگڑا' جیسے بان بٹے جاتے ہیں' آگے مولٰنا منصور علی خاں کے بجنسہٖ الفاظ یہ نقل کئے گئے ہیں کہ

"خدا کی قسم میں نے بالکل عیانا دیکھا کہ میں عرش کے نیچے ہوں' اور ہر چہار طرف سے نور اور روشنی نے میرا احاطہ کر لیا ہے' گویا میں دربار الٰہی میں حاضر ہوں' میں اس وقت لرزاں اور ترساں تھا کہ ساری عمر مجھ پر یہ کیفیت اور یہ خوف طاری نہوا تھا' میں پسینہ پسینہ ہو گیا اور بالکل خودی سے گذر گیا" (ارواح ص۱۸۱)

فرماتے تھے کہ میں تو اس حال میں مستغرق تھا اور حضرت والا برابر میری ہتھیلی پر اپنی ہتھیلی پھیر رہے تھے، جب ہتھیلی پھیرنے کا یہ سلسلہ ختم ہوا تو مولٰنا منصور علی خاں کا بیان ہے کہ "مکاشفہ کی جو حالت ان پر طاری ہوئی تھی وہ حالت جاتی رہی' اور حکم دیا گیا کہ جاؤ' پھر کیا ہوا! خود کہا کرتے تھے۔ دو دن بعد پوچھا گیا تھا بولے کہ جس کے لئے اتنی بے کلی اور بے چینی تھی اس کے تصور کی بھی قلب میں گنجائش باقی نہ رہی فرمایا گیا کہ

"اللہ کا شکر کرو" ص۱۸۱۔

اور یہ روایت تو بالواسطہ ہم تک پہونچی ہے، اپنی کتاب "مذہب منصور" میں مولٰنا منصور علی خاں نے اپنی آپ بیتی" حکایت خود بھی درج کی ہے، واللہ اعلم یہ واقعہ اس "چنانکہ افتد دانی" سے پہلے کا ہے یا بعد کا' بہر حال قصہ یہ ہے، لکھا ہے کہ

"ایک دفعہ میں نے مولانا صاحب (حضرت نانوتوی) سے بربیل تذکرہ شکایت کی کہ مجھکو کبھی رونا نہیں آتا"

شاید یہ ان کی پٹھانیت کا اقتضا تھا، بہر حال شکایت سن لی گئی، کہتے ہیں کہ

"اسی دن دوپہر کو جب سوکر اٹھا، اس قدر رویا کہ ہر چند چاہتا تھا کہ موقوف کروں مگر آنسو نہیں تھمتے تھے اور کوئی وجہ رونے کی بھی معلوم نہیں ہوتی تھی" ص۱۸۱

پھر خود ہی ان کو خیال آیا کہ

"آج میں نے مولانا صاحب سے شکایت کی تھی یہ اسی کا ثمرہ ہے"

اور گو آنسو مولانا منصور علی خان کے بظاہر تھم ہی گئے ہوں گے، اگر سچ پوچھئے تو جیسا کہ انکے جاننے والے جانتے ہیں کہ ساری عمر اس کے بعد ان کی روتے ہی کٹی، سوز و گداز کے سوا شاید وہ اور کچھ باقی نہیں رہے تھے۔ آہن موم ہو گیا، اور موم ہی بن کر زندگی کی آخری سانسیں پوری کیں، فرحمہ اللہ ونصر اللہ ضریحہ۔ ان کی کتاب "مذہب منصور" جو بظاہر علم کلام کی کتاب ہے لیکن اپنے قلب کی اس کیفیت کو وہ چھپا نہیں سکے ہیں؛

اور اس قسم کی باتیں تو کتابوں میں ادھر ادھر مل جاتی ہیں، ورنہ دینی علوم کے ان طلبہ کے ساتھ دستگیریوں کے جو قصے حلقہ دیوبند کے خواص و عوام میں مشہور اور زبان زد ہیں، ان کا تو شمار مشکل ہے، خود حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اپنی گذری ہوئی بیان فرمایا کرتے تھے کہ تعلیم سے جب فارغ ہوا، تو میرا تقرر حضرت الاستاذ نے دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمت کے لئے فرما دیا، غالباً مدرس پنجم کا عہدہ ابتداءً آپ کے لئے تجویز ہوا، تنخواہ شاید پندرہ روپئے ماہوار مقرر ہوئی، فرماتے تھے کہ اس تقرر کی خبر جب مجھے ہوئی تو سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں، جو بھی لوگوں میں کچھ بھرم ہے وہ بھی کھل جائے گا یہ سوچ کر سخت پریشان ہوا، کوئی تدبیر روپوشی کے سوا اس رسوائی سے بچنے کے لئے سمجھ میں نہ آئی، گھر والوں کو بھی خبر دیئے بغیر روپوش ہو گیا۔ حضرت الاستاذ کو میری روپوشی کی خبر ہوئی، تلاش میں لوگ لگا دیئے گئے، کب تک روپوشی نبھتی آخر دس پندرہ دن بعد خدمت والا میں لا کر حاضر کر دیئے گئے،

پوچھنے لگے کیوں میاں محمود! یہ تم نے کیا کیا، حضرت شیخ الہند کا بیان تھا تب آبدیدہ ہو کر عرض کرنے لگے کہ حضرت! آپ کی باتیں مجھے بھلی معلوم ہوتی ہیں، سنتا ہوں تو لذت ملتی ہے، اس لئے محض نام نہاد طور پر پڑھنے کا حیلہ کر کے حلقۂ درس میں آکر بیٹھ جایا کرتا تھا، لیکن پڑھنے کی نیت سے میں نے پڑھا کب مجھے اسی لئے آیا ہی کیا ہے جو دوسروں کو پڑھاؤں (اب الفاظ تو بعینہٖ یاد نہ رہے لیکن مفہوم یہی تھا اور الفاظ بھی اکثر و بیشتر ممکن ہیں یہی ہوں) سیدنا الامام الکبیر کی دوررس نگاہ قدسی جسے سرزمین ہند کا شیخ الکل دیکھ رہی تھی، اس کی زبان سے ان الفاظ کو سنکر مسکرا کر فرمانے لگے، آؤ! محمود سامنے آؤ! پھر جیسے گھوڑے کو تھپکیاں دی جاتی ہیں، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی پشت مبارک پر سیدنا الامام الکبیر نے چند تھپکیاں دیتے ہوئے فرمایا کہ

"جاؤ! جاکر پڑھاؤ"

شاید یہ بھی فرمایا کہ تمہیں تو بہت کچھ پڑھانا ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ توجہ بالید کی سنت کا احیا اس طریقہ سے نہیں کیا جا رہا تھا، بہرحال وہ دن تھا اور اس کے بعد اس زمانہ کو بھی اس ظلوم وجہول نے دیکھا جب پڑھانے میں رسوا ہو جانے کے خوف سے روپوش ہو جانے والے مولانا محمود الحسن طاب ثراہ کو اس حال میں پایا کہ خاتم الفقہاء والمحدثین الامام الکشمیری، اور شیخ مدنی جیسے اکابر علماء طلبہ کے حلقے میں استفادہ کے لئے بیٹھے ہوئے ہیں اور شیخ الہندی کی مسند پر ہند کے شیخ اعظم جلوہ فرما ہیں، یاد آتا ہے کہ اسی قصہ کو دہراتے ہوئے ایک دفعہ حضرت شیخ الہند فرمانے لگے کہ

"بھائی یہی چند کانے کترے لوگ حضرت کے بعد رہ گئے جن سے خدا کام لے رہا ہے"

اپنے ساتھ اپنے دوسرے چند رفقاء درس کا بھی اس سلسلہ میں ذکر فرما رہے تھے ان ہی کی طرف "کانے کترے" کے الفاظ سے اشارہ فرمایا گیا تھا۔

کوئی جمع کرنا چاہے تو طلبہ علم کی دستگیریوں اور چشتی بانیوں کے غیر معمولی مظاہر کا کافی ذخیرہ جمع کر سکتا ہے، اگرچہ روز بروز اب ان کے جاننے والوں کی تعداد گھٹ رہی ہے، اس سلسلہ میں بے ساختہ اس قصے کا خیال آرہا ہے جسے مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم سے تو خاکسار نے سنا ہی تھا

مگر حافظہ اگر غلطی نہیں کر رہا ہے، تو کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ براہ راست خود حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو بیان فرمایا تھا، اور فقیر سن رہا تھا مطلب یہ ہے کہ دینی علوم کے طلبہ کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر کی امدادی کرامتوں کی یوں تو مجسم شہادت خود دارالعلوم دیوبند اور اس کا عریض وطویل نظام ہے ہی، لیکن ان کرامتوں کا تعلق تو زندگی کے ناسوتی دور سے ہے، جن کا سلسلہ بحمداللہ اس وقت تک جاری ہے اور خدا ہی جانتا ہے کہ کب تک قاسمی فیوض و برکات کا یہ سلسلہ جاری رہے گا، لیکن ناسوتی زندگی کے ختم ہونے کے بعد بھی دینی علوم کے طلبہ کے ساتھ آپ کے شغف کا یہی حال ہے، اس کا اندازہ اس روایت سے ہو سکتا ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ کچھ دن ہوئے ایک خستہ حال، شکستہ بال آدمی میرے پاس آیا، اور کہنے لگا کہ میں آپ کے دورۂ حدیث کے حلقہ میں شریک ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں سننا چاہتا ہوں، لیکن چونکہ میری علمی صلاحیت ایسی نہیں ہے کہ امتحان میں شریک ہو سکوں، اس لئے امتحان کی شرط میرے لئے نہ لگائی جائے، اسی کیساتھ یہ بھی اس نے کہا کہ اپنے قیام و طعام کے مصارف بھی میں برداشت نہیں کر سکتا، مدرسہ کی طرف سے اس کا نظم فرما دیا جائے، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بھائی! مدرسہ کا قانون تو یہی ہے کہ وظیفہ پانے والے طلبہ کے لئے امتحان کی شرکت ناگزیر ہے، تم امتحان میں بھی شریک ہونا نہیں چاہتے، اور مدرسہ سے امداد کے بھی خواہاں ہو، آخر اس کا امکان ہی کیا ہے، مگر قابل رحم طالب العلم برابر اصرار کئے جا رہا تھا کہ میرے لئے تو کوئی استثنائی صورت نکالنی ہی پڑے گی، حضرت حیران تھے، دیکھ کر اس کو رحم بھی آتا تھا، لیکن مدرسہ کے قانون کی مجبوری تھی، کوئی صورت سمجھ میں نہ آئی، اس وقت تو طالب العلم کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا گیا کہ اچھا جاؤ، دیکھا جائیگا، حضرت شیخ الہند جب مدرسہ تشریف لائے، تو ڈاک میں دوسرے منی آرڈروں کے ساتھ ایک منی آرڈر جو غالباً بھوپال سے کسی صاحب کا بھیجا ہوا تھا، شاید پانچ روپیہ کا منی آرڈر تھا اور کوپن میں لکھا ہوا تھا کہ ایک سال تک پانچ روپیہ کا یہ وظیفہ

ماہ بماہ بھیجا جائے گا' کسی ایسے طالب العلم کو دیا جائے' جو قانوناً مدرسہ کی امداد کا مستحق نہ ہو
کوپن کی اس عبارت کے ساتھ ہی جیسا کہ چاہئے تھا' حضرت شیخ الہند کا خیال اسی قابل رحم
طالب العلم کی طرف منتقل ہوگیا' اسی وقت یاد فرمایا گیا' اور بشارت سنائی گئی کہ لو تمہارے
طعام کا نظم اللہ میاں کی طرف سے ہوگیا' وظیفہ جاری کردیا گیا' اور اس کی جو آرزو تھی' دورہ
میں شریک ہوکر حدیث سن لی' تعلیمی مدت کے اختتام پر وہ مدرسہ سے چلا گیا' حضرت شیخ الہند
فرماتے تھے کہ چند سال گذر گئے' پھر اس طالب العلم کی کوئی خبر نہ ملی' بلکہ اس کا خیال بھی دماغ
سے نکل گیا' اچانک کئی سال بعد دیکھتا ہوں کہ وہی طالب العلم آیا ہوا ہے' تعارف کرایا
کہ وہی طالب العلم ہوں جو قانوناً مدرسہ کی امداد کا مستحق نہ تھا' حضرت نے پوچھا کہ اس عرصے
میں تم کہاں رہے' یہی قصہ اب سننے کا ہے جو اس نے بیان کیا' کہنے لگا کہ حضرت سے
رخصت ہوکر غالباً وہ پنجاب کی طرف کسی علاقہ میں چلا گیا' اور کسی قصبہ کی مسجد میں لوگوں نے
ان کو امام کی جگہ دے دی' قصبہ والے ان سے کافی مانوس ہوگئے' اور اچھی گذر بسر ہونے لگی
اسی عرصہ میں کوئی مولوی صاحب گشت کرتے ہوئے اس قصبہ میں بھی آدھمکے' وعظ و تقریر
کا سلسلہ شروع کیا' لوگ ان کے کچھ معتقد ہوئے' انھوں نے دریافت کیا کہ یہاں کی مسجد کا
امام کون ہے' کہا گیا کہ دیوبند کے پڑھے ہوئے ایک مولوی صاحب ہیں' دیوبند کا نام سننا
تھا کہ واعظ مولنا صاحب آگ بگولا ہوگئے' اور فتوے دے دیا کہ اس عرصے میں جتنی نمازیں
اس دیوبندی کے پیچھے تم لوگوں نے پڑھی ہیں' وہ سرے سے ادا ہی نہیں ہوئیں' اور جیسا کہ
دستور ہے' دیوبندی یہ ہیں' وہ ہیں' یہ کہتے ہیں' وہ کہتے ہیں' اسلام کے دشمن ہیں رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم سے عداوت رکھتے ہیں' وغیرہ وغیرہ۔

قصباتی مسلمان بے چارے سخت حیران ہوئے کہ مفت میں اس مولوی پر روپے بھی برباد
ہوئے اور نمازیں بھی برباد ہوئیں' ایک وفد اس غریب دیوبندی امام کے پاس پہونچا۔
اور مستدعی ہوا کہ مولنا واعظ صاحب جو ہمارے قصبہ میں آئے ہیں' ان کے جو الزامات ہیں

یا توان کا جواب دیجئے ورنہ پھر بتایئے کہ ہم لوگ آپ کے ساتھ کیا کریں' جان بھی غریب کی خطرے میں آگئی اور نوکری وو کری کا قصہ تو ختم شدہ ہی معلوم ہونے لگا چونکہ علمی مواد بھی ان کا معمولی تھا' خوف زدہ ہوئے کہ خدا جانے یہ واعظ مولنا صاحب کس پائے کے عالم ہیں منطق و فلسفہ بگھاریں گے۔ اور میں غریب اپنا سیدھا سادہ ملا ہوں' ان سے بازی لے بھی جا سکتا ہوں یا نہیں' تاہم چارہ کار اسکے سوا اور کیا تھا' کہ مناظرہ کا وعدہ ڈرتے ڈرتے کرلیا' تاریخ اور محل و مقام سب کا مسئلہ طے ہو گیا واعظ مولنا صاحب بڑا زبردست عمامہ طویلہ و عریضہ سر پر لپیٹے ہوئے کتابوں کے پشتارے کے ساتھ مجلس میں اپنے حواریوں کے ساتھ جلوہ فرما ہوئے، ادھر یہ غریب دیوبندی امام منحنی و ضعیف مسکین شکل مسکین آواز' خوف زدہ' لرزاں و ترساں بھی اللہ اللہ کرتے ہوئے سامنے آیا' سننے کی بات یہی ہے جو اس کے بعد اس دیوبندی امام مولوی نے مشاہدہ کے بعد بیان کی' کہتے تھے کہ مولنا واعظ صاحب کے سامنے میں بھی بیٹھ گیا' ابھی گفتگو شروع نہیں ہوئی تھی کہ اچانک اپنے بازو میں مجھے محسوس ہوا کہ ایک شخص اور جسے میں نہیں پہچانتا تھا وہ بھی آکر بیٹھ گیا ہے' اور مجھ سے وہ اجنبی اچانک نمودار ہونے والی شخصیت کہتی ہے کہ ہاں! گفتگو شروع کرو' اور پھر گرو نہ ڈرو' دل میں غیر معمولی قوت اس سے پیدا ہوئی' اس کے بعد کیا ہوا' دیوبندی امام صاحب کا بیان ہے کہ میری زبان سے کچھ فقرے نکل رہے تھے اور اس طور پر نکل رہے تھے' کہ میں خود نہیں جانتا تھا کہ کیا کہہ رہا ہوں' جس کا جواب مولنا واعظ صاحب نے ابتداء میں تو دیا' لیکن سوال و جواب کا سلسلہ ابھی زیادہ دراز بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک دفعہ مولنا واعظ صاحب کو دیکھتا ہوں کہ اٹھ کھڑے ہوئے میرے قدموں پر سر ڈالے ہوئے رو رہے ہیں' پگڑی بکھری ہوئی ہے' اور کہتے جاتے ہیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ آپ اتنے بڑے عالم ہیں' للہ معاف کیجئے۔ آپ جو کچھ فرما رہے ہیں وہی صحیح اور درست ہے' میں ہی غلطی پر تھا؛

یہ منظر ہی ایسا تھا کہ مجمع دم بخود تھا' کیا سوچ کر آیا تھا اور کیا دیکھ رہا تھا۔ دیوبندی امام صاحب نے کہا کہ اچانک نمودار ہونے والی شخصیت میری نظر سے اس کے بعد اوجھل ہو گئی' اور کچھ نہیں معلوم کہ وہ کون تھے اور یہ قصہ کیا تھا؛

قصہ تو ختم ہو گیا۔ قصبہ کے مسلمان جو پہلے ہی سے دیوبندی امام صاحب کے معتقد تھے ان کی عقیدتمندیوں میں اس واقعہ نے چار چاند لگا دیئے، اور پہلے سے بھی زیادہ راحت و آرام میں دیوبندی امام صاحب کے اضافہ ہو گیا۔

حضرت شیخ الہند فرماتے تھے، میں نے ان مولوی صاحب سے دریافت کیا کہ اچانک نمودار ہو کر غائب ہو جانے والی شخصیت کا حلیہ کیا تھا، حلیہ جو بیان کیا فرماتے تھے کہ سنتا جاتا تھا اور حضرت الاستاذ کا ایک ایک خال و خط نظر کے سامنے آتا چلا جا رہا تھا، جب وہ بیان ختم کر چکے تو میں نے ان سے کہا کہ یہ تو حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ جو تمہاری امداد[1] کے لئے حق تعالیٰ کی طرف سے ظاہر ہوئے۔

[1] جو نہیں جانتے ہیں وہ تو خیر جاہل ہیں لیکن جان کر بھی علماء دیوبند کے متعلق بہتان تراشیوں اور تہمت بافیوں کی خدمت جو انجام دے رہے ہیں ان کو اپنے اعمال کا محاسبہ اسی کے سامنے دینا ہوگا جس کے سامنے نہ منطق ان کی چلے گی اور نہ مولویانہ ہیترے کام آئیں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وفات یافتہ بزرگوں کی روحوں سے امداد کے مسئلہ میں علماء دیوبند کا خیال بھی وہی ہے جو عام اہل السنت والجماعت کا ہے، آخر جب ملائکہ جیسی روحانی ہستیوں سے خود قرآن ہی میں ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کی امداد کراتے ہیں، صحیح حدیثوں میں ہے کہ واقعہ معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تخفیف صلوات کے مسئلہ میں امداد ملی، اور دوسرے انبیاء علیہم السلام سے ملاقاتیں ہوئیں بشارتیں ملیں، تو اسی قسم کی ارواح طیبہ سے کسی مصیبت زدہ مومن کی امداد کا کام قدرت اگر لے تو قرآن کی کس آیت یا کس حدیث سے اس کی تردید ہوتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ آدمی کو عام طور پر جو امداد بھی مل رہی ہے، حق تعالیٰ اپنی مخلوقات ہی سے تو یہ امدادیں پہنچا رہے ہیں، روشنی آفتاب سے ملتی ہے، دودھ ہمیں گائے اور بھینس سے ملتا ہے، یہ تو ایک واقعہ ہے بھلا یہ بھی انکار کرنے کی کوئی چیز ہو سکتی ہے، ہاں! سوال یہ ہے کہ ان چیزوں کے امدادی پہلوؤں سے استفادہ یا ان کے نقصان رساں پہلوؤں سے بچنے کی قدرتی راہ کیا ہے، مشرک قوموں کا طریقہ کار یہ ہے کہ بجائے امداد پہنچانے والی حقیقی قوت کے امداد کے ان ذرائع اور وسائط ہی کو پوجنے لگتی ہیں، مثلاً روشنی کے لئے آفتاب کو پوجتی ہیں یا زہر سے بچنے کے لئے سانپ کو پوجتی ہیں اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ نفع ہو یا نقصان خواہ بلا واسطہ پہونچے یا بالواسطہ ہر حال میں سب کو اسی کی طرف سے سمجھتے ہیں، جو ان ذرائع اور وسائط سے نفع اور نقصان کی صورتوں کو پیدا کر رہا ہے۔ ہم دودھ کے لئے بھینس یا گائے کو نہیں پوجتے بلکہ اس کو پوجتے ہیں، اس سے مانگتے ہیں جو گوشت کی ان تھیلیوں میں دودھ پیدا کرتا ہے بس۔ بزرگوں کی ارواح سے مدد لینے کے ہم منکر نہیں ہیں بلکہ اس امداد کے لئے بزرگوں کی یا ان کی قبروں کی ان کے آثار کی عبادت کو شرک یقین کرتے ہیں۔ موحد اور مشرک کے نقطۂ نظر میں یہی جوہری فرق ہے (بقیہ صفحہ آئندہ)

خلاصہ یہ ہے کہ کچھ اسی قسم کے گرے پڑے، ناپرسان حال غم خواروں کی غم خواریوں، دل افگاروں کی دلدازیوں کے سلسلے میں اب معلوم ہوتا ہے کہ اضطراراً ولایت کے ان آثار و ثمرات کا ظہور آپ سے اتفاقاً ہو جاتا تھا، اگرچہ اس میں بھی کوشش اسی کی کی جاتی تھی کہ ان مصیبت زدوں کا کام بھی نکل جائے، لیکن ان کو اس کا پتہ نہ چلے کہ کام نکالنے والے نے کسی غیر معمولی قوت سے کام لیا ہے۔ دیہی خورجہ کے حاجی محمد اسحٰق بے چارے جو ذاکر و شاغل اور پابند صوم و صلوٰۃ سیدھے سادے مسلمان تھے اچانک ایک دماغی عارضہ میں مبتلا ہوئے، امیر شاہ خاں صاحب نے بیان کیا ہے کہ خود حاجی صاحب مرحوم کہتے تھے کہ

"ایک سخت عذاب میں مبتلا ہوں، جب کوئی گاڑی نکلتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میرے اوپر چل رہی ہے. جب بیلوں کے سانٹا مارا جاتا ہے، تو میں سمجھتا ہوں کہ میرے لگتا ہے، جب کتوں میں آپس میں لڑائی ہوتی ہے، تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ میرے کو کاٹتے ہیں، جب چکی چلتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ گیہوں کے بدلہ میں میں ہی پس رہا ہوں، لڑکے بھاگتے ہیں، تو میں سمجھتا ہوں کہ مجھ پر دوڑ رہے ہیں۔"

آخر میں کہتے ہیں کہ

"میں سخت تکلیف میں مبتلا ہوں اور باہر نہیں نکل سکتا، اور نہ چکی کی آواز سن سکتا ہوں۔"

---

(بقیہ صفحہ ۳۴۲) سیدنا الامام الکبیر کی اس روحانی امداد کا قصہ تو شنیدہ ہے، لیکن اسی سلسلہ کی وہ روایت جس کا ذکر پہلے بھی شاید ہو چکا ہے، یعنی ان شکر رنجیوں کے سلسلے میں جو مولانا احمد حسن امروہی اور مولانا فخر الحسن گنگوہی کے درمیان بر کسی وجہ سے ہو گئی تھیں اور حضرت شیخ الہند بھی کچھ دلچسپی اس قصہ میں لینے لگے تھے یہ اطلاع مولانا رفیع الدین نے دی کہ "ابھی ابھی مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جسد عنصری کے ساتھ میرے پاس تشریف لائے تھے اور فرمایا کہ محمود حسن سے کہہ دو کہ اس جھگڑے میں وہ نہ پڑے ص۱۸۵ ارواح ثلاثہ۔ یہ تو ایسی روایت ہے جو ارواح ثلاثہ والے مجموعہ میں چھپ کر عام علماء دیوبند کی نظروں سے گذر چکی ہے یہ روایت دار العلوم کے مہتمم مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم کی طرف منسوب کی گئی ہے اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی نظر سے گذری ہوئی ہے اس پر مولانا کا حاشیہ بھی ہے جس میں جسد عنصری سے روح کی نمود کی توجیہ فرمائی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ اس میں کیا صورت پیش آتی ہے۔ دیکھو ص۱۸۵ ارواح ثلاثہ

حالت یہ ہوگئی تھی، کہ جماعت کے لئے مسجد آنا جانا بھی ان کے لئے دشوار ہوگیا تھا، کان میں روئی کے روہڑ ٹھونس کر گھر ہی میں پڑے رہتے تھے، امیر شاہ خاں کے حاجی اسحاق دوست بھی تھے سیدنا الامام الکبیر سے بیعت کا شرف بھی ان کو حاصل تھا ان کا حال سن کر خاں صاحب نے فرمایا کہ مناسب ہے، کہ اپنے پیر و مرشد (مولٰنا نانوتوی) کو اپنے حال سے آگاہ کرو، جو حالات گذر رہے تھے، لکھ کر امیر شاہ خاں مرحوم کے حوالہ حاجی صاحب نے کئے، انھوں نے اپنے سفارشی خط کے ساتھ حضرت والا کی خدمت میں بھیجدیئے۔ اس زمانہ میں حضرت کا قیام دلّی ہی میں تھا، جواب میں امیر شاہ خاں کو حضرت کی طرف سے ہدایت ہوئی کہ حاجی اسحاق کو میرے پاس یہیں (دہلی) بھیجدو، حسب الحکم حاضر ہوئے، پھر جیسا کہ خاں صاحب کا بیان ہے کہ

"مولٰنا (نانوتوی) نے کچھ نہیں کیا، صرف اوراد و اشغال کے اوقات بدل دئے"

اور وقت کی صرف اسی ہلکی سی تبدیلی کا نتیجہ یہ دیکھا گیا کہ حاجی اسحاق مرحوم:

"دوسرے ہی دن اچھے ہوگئے"۔

جو کچھ کیا گیا اس کو دیکھ کر بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اوقات کی تبدیلی ازالہ مرض کا سبب بن گئی، لیکن جس قسم کی بیماری میں حاجی صاحب مرحوم مبتلا تھے، کیا اس سے صحت یاب ہونے کے لئے اوراد و اشغال کے اوقات کا بدل جانا کافی تھا، اس راہ کے ایک "محرم اسرار" سے سنئے، اسی قصے کے تحت میں حضرت تھانوی نے ارقام فرمایا ہے کہ

"احقر کا وجدان یہ ہے کہ مولٰنا (نانوتوی) نے تصرف فرمایا ہے، اور اخفار تصرف کے لئے اوراد و اشغال کے اوقات بدلے ہیں" ص ۱۶۹

مرشد تھانوی سے تھوڑا بہت قریبی تعلق جو رکھتے ہیں، یا کم از کم "تربیت السالک" کے نام سے حضرت والا کے مراسلات و مکاتبات کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے، جن لوگوں کی نظر سے وہ کتاب گذر چکی ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس قسم کے نفسیاتی یا اعصابی عوارض میں مبتلا ہونے والوں کی کتنی بڑی تعداد کے علاج کرنے کا موقعہ آپ کو ملا تھا، اسی لئے ان کے اس فیصلہ کو ایک حاذق و تجربہ کار

نفسیاتی طبیب کا وجدانی فیصلہ یقین کرنا چاہئے (اور یوں بھی ظاہر ہے کہ اگر اس معالجہ کے سلسلہ میں محض تبدیلیٔ اوقات و اشغال کافی تھی تو خط کے ذریعہ یہ تدبیر لکھکر بھیجی جاسکتی تھی، دہلی طلب کرکے پاس بلانے کی ضرورت نہ تھی۔ اس سے صاف واضح ہے کہ انھیں توجہ و تصرف کے لئے طلب کیا گیا تھا، اور یہی توجہ و تصرف حسب بیان مرشد تھانوی ان کا حقیقی علاج تھا، لیکن اخفا و ستر کے لئے اوسے تبدیلیٔ اوقات کی طرف منسوب فرمادیا گیا۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں ؛ مصلحت را تہمتے برآہو چیں بستہ اند

اگرچہ اپنے ان مختصر الفاظ میں حضرت تھانوی نے بھی سیدنا الامام الکبیر کے شیوہ ستر و اخفا کی طرف اشارہ فرمایا ہے، لیکن پھر بھی گونہ اس کی حیثیت ایک قیاسی نتیجہ ہی کی ہوسکتی ہے، اگرچہ یہ قیاسی نتیجہ بھی حضرت تھانوی کے ذاتی مشاہدات و تجربات ہی پر مبنی ہے، لیکن اس "فہمیدہ" نتیجہ سے زیادہ دلچسپ "دیدہ شہادت" مشہور صاحب علم و دین امیر نواب مصطفےٰ[1] خاں شیفتہ نور اللہ ضریحہ کی ہے

[1] اجڑی دلّی کے جھلملاتے ہوئے چراغوں میں ایک روشن چراغ نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کا وجود بھی تھا، بڑے امیر باپ کے صاحبزادے تھے، جہانگیر آباد کا علاقہ وراثت میں اپنے والد نواب اعظم الدولہ سرفراز الملک مرتضیٰ خاں مظفر جنگ مرحوم سے نواب مصطفےٰ خاں کو ملا تھا، اور حکومت انگریزی سے ہوڈل پلول کی جاگیر کے معاوضہ میں پنشن بھی ملتی تھی، ۱۸۵۷ء سے پہلے بڑے کروفر سے دلی میں زندگی گذار رہے تھے، والد نے انکی تعلیم پر خاص توجہ کی تھی، ابتدائی تعلیم میانجی مالا مال سے پائی تھی جو دلّی میں معلم الصبیانی میں اپنے وقت کے امام سمجھے جاتے تھے، پھر اعلیٰ علوم و فنون کی تعلیم عربی زبان میں مختلف علماء سے حاصل کی تجوید و قرأۃ کی بھی مشق کی تھی، ۱۲۵۵ھ میں حج و زیارت کی سعادت سے بھی بہرہ اندوز ہوئے، اسی سفر میں انکا جہاز چٹان سے ٹکراکر دریا برد ہوگیا، لیکن حق تعالیٰ نے نواب صاحب کو بچالیا، حرمین کی حاضری کے زمانہ میں وہاں کے محدثین اور علماء سے بھی مستفید ہوئے تھے، جن میں ایک شیخ ان کے شیخ عابد سندھی بھی ہیں، واپسی پر عربی و فارسی زبان میں اپنا سفرنامہ بھی مرتب کیا تھا مگر اب نہیں ملتا۔ کتاب الحکومت دلی میں مولوی بشیر احمد نے لکھا ہے کہ شروع میں شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پرست پر بیعت طریقت نواب صاحب نے کی تھی اور ان کے بعد مولٰنا غلام علی نقشبندی مجددی رحمۃ اللہ علیہ کے جانشینوں شاہ احمد سعید و ابوسعید سے بھی مستفید ہوتے رہے۔ یہ بھی ان ہی کا بیان ہے کہ نماز باجماعت کے علاوہ تین بجے شب سے اٹھ کر تہجد، ذکر و اشغال میں مشغول رہتے اور صبح کی نماز کے بعد بھی اشراق تک ان ہی مشاغل میں وقت صرف ہوتا، اشراق کے بعد دنیا کے کاروبار کی نگرانی کرتے تھے، گھوڑوں کا شوق آخر عمر تک رہا، لکھا ہے کہ ان کا اصطبل گھوڑوں سے بھرا رہتا تھا، بہرحال نواب صاحب کی (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

جس کا ذکر امیر شاہ خاں مرحوم فرمایا کرتے تھے، کتاب ارواح ثلاثہ میں ہے کہ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم عنفوان شباب میں بعض شبابی لغزشوں کے شکار ہو گئے تھے، لیکن آخر میں مہاجر مدنی حضرت مولانا شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ جو سیدنا الامام الکبیر کے استاذ حدیث تھے، ان کی نظر عنایت نے نواب صاحب کو امیر شاہ خاں کا بیان ہے کہ کمالات کے ان بلند مدارج تک پہونچا دیا تھا، کہ مولانا رفیع الدین جیسے اہل کمال کو بھی شاہ عبدالغنی صاحب حکم دیتے تھے کہ

"نواب صاحب (مصطفیٰ خاںؒ) کے پاس جاکر استفادہ کیا کرو"

اسی کے ساتھ یہ بھی فرماتے کہ

"تم ان کی ریاست کو نہ دیکھو! بلکہ ان کے قلب کو دیکھو" ص ۲۷۶

(بقیہ صفحہ ۲۸) زندگی اول سے آخر تک ایک دیندار مسلمان رئیس کی زندگی معلوم ہوتی ہے، لیکن کچھ تو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا جو نقشہ اس زمانہ میں قائم ہو گیا تھا اور کچھ شباب کے تقاضوں کا نتیجہ شاید یہ تھا جسے امیر شاہ خاں صاحب نے بیان کیا ہے، یعنی ایک شاہد بازاری رحموا نامی سے ان کا تعلق تھا، مگر حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ نے نواب صاحب مرحوم کو ہلاکت کے اس گڑھے سے نکال لیا۔ امیر شاہ خاں کا بیان ہے کہ توبہ کی ندامت نواب صاحب پر جب طاری ہوئی تو لوہے کی زنجیروں میں اپنے آپ کو بندھوا کر حکم دیا کہ گھسیٹتے ہوئے لوگ شاہ صاحب کی خدمت میں انکو لے جائیں یہی کیا گیا، شاہ صاحب نے زنجیریں اتروائیں اور پھر ایسا سنبھلے کہ بڑے بڑوں کے لئے ان کی دینی زندگی محل رشک بن گئی۔ غدر کی طوفان بدتمیزی کے شکار یہ بھی ہوئے ایک طرف جہانگیر آباد ان کے دارالریاست کو اطراف کے جاٹوں نے لوٹ کھسوٹ کر برباد کیا اور دوسری طرف انگریزی حکومت کی طرف سے بغاوت کا الزام بھی عائد ہوا کچھ دن جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی، لکھا ہے کہ غدر کے زمانہ میں ایک دفعہ پیادہ پا نواب صاحب جا رہے تھے، دیکھنے والوں نے دیکھا تھا کہ آنکھوں سے آنسو جاری، ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے ہوئے کہتے جاتے تھے تیری شان کریمی کے قربان اتنی ہی سزا دی، ورنہ میں تو اس سے بہت زیادہ کا مستحق تھا، امیر شاہ خاں صاحب نے نواب صاحب کی لغزش کے تذکرہ میں ایک بات یہ بھی بیان کی ہے کہ وہی بازاری عورت جس کا ذکر گذرا اس سے کمہارم کے نواب نے تعلق پیدا کرنا چاہا، مگر وہ راضی نہ ہوتی تھی، آخر میں سوا لاکھ، دیکر نواب لوہارو کی طرف سے صرف ایک شب کا معاوضہ پیش ہوا، مگر پھر بھی وہ راضی نہ ہوئی اور بولی کہ یہ میری قیمت نہیں بلکہ نواب مصطفیٰ خاں کی آبرو کی قیمت نواب لوہارو دینا چاہتا ہے مگر وہ اتنے ارزاں نہیں ہیں (ارواح ص ۲۷۶) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں پر جو مصیبت آئی تھی اس کے اسباب کیا تھے، یہ تھا مسلمانوں کا رنگ کہ سوا سوا لاکھ روپے ایک ایک رات کیلئے مال زادیوں کی نذر ہوتے تھے، اور نواب مصطفیٰ خاں جیسے پاکباز امیر کی پاکبازی کا دامن بھی اس آلودگی سے پاک نہ تھا۔ اخیر خدا کا فضل ہوا، امیر شاہ خاں کی روایت ہے کہ مولانا شاہ عبدالغنی کے خلیفہ اول تھے شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ کے تقویٰ کا معیار جتنا بلند تھا اس کے لحاظ سے یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے لیکن قتل کرنے کے لئے پیغمبر کو ڈھونڈھنے والا جب فاروق اعظم بن سکتا ہے تو نواب مصطفیٰ خاں جو کچھ بھی ہوئے اس پر تعجب کیوں کیجئے؟

مولٰنا رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت سے جو واقف ہیں اس کتاب میں بھی مختلف حیثیتوں سے ان کا تذکرہ گذر چکا ہے، ان کی جلالت قدر کے لئے یہی کافی ہے کہ دار العلوم دیوبند کے مفتی اعظم حضرت مولٰنا عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ ان ہی کے مرید اور خلیفہ خاص تھے. بہر حال کہنا یہ ہے کہ ان ہی نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کا ذاتی تجربہ سیدنا الامام الکبیر کے متعلق امیر شاہ خاں بایں الفاظ نقل کیا کرتے تھے کہ

"نواب مصطفےٰ خاں کی یہ عادت تھی کہ ہمارے اکابر (خانوادہ ولی اللہی) میں سے جب کوئی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو فوراً مراقب ہو کر ان کی نسبت کی ٹوہ میں لگ جاتے تھے، ایک مرتبہ حضرت نانوتوی ان سے ملنے تشریف لے گئے، اور نواب صاحب حسب عادت مراقب ہوئے. سر اٹھایا تو ایک صاحب (موجان نامی) سے خطاب فرمایا کہ میں نے بڑے بڑے لوگ دیکھے، لیکن مولٰنا کی نسبت کا تو کہیں پتہ ہی نہیں ہے." ص ۲۷۷

"بڑے بڑے لوگ دیکھے" نواب صاحب کے ان الفاظ سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ان بڑوں کی باطنی نسبت کا پتہ بآسانی چلا لیتے تھے لیکن سیدنا الامام الکبیر نے اخفائی قوتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے اس موقعہ پر کام لیا کہ نواب صاحب جیسی ہستی بھی اس کا ٹوہ نہ لگا سکی، عوام سے اخفاء و ستر کا مسئلہ دشوار نہیں ہے، لیکن بقول شخصے دائی سے بھی پیٹ کے چھپانے میں کامیاب ہونا بجائے خود میرے نزدیک مستقل کرامت اور بڑا کمال ہے؛

اسی طرح مصلحۃً اخفاء کمال کی کوشش کبھی کبھی ضرورۃً ترک بھی ہو جاتی تھی یا کوشش کی شدت کم ہو جاتی تھی؛ میرٹھ کا ایک قصہ مشہور ہی ہے، ہمارے مصنف امام نے اس کا تذکرہ کیا ہے اور ارواح ثلاثہ میں بھی یہ روایت مولٰنا حبیب الرحمٰن مرحوم سابق مہتمم دار العلوم دیوبند کی طرف منسوب کی گئی ہے، حاصل یہ ہے کہ مثنوی رومی کا درس شروع فرما دیا تھا، حلقہ درس میں اتفاقاً ایک دن ایک صاحب حال و نسبت آدمی بھی شریک ہو گئے، مثنوی شریف سے

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، خاص ذوق حضرت والا کو تھا، بڑے اونچے اونچے مضامین حقائق ونکات اس درس میں بیان ہوتے تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مصنف امام بھی غالباً اس درس میں شریک رہتے تھے لکھتے ہیں کہ

دو چار شعر ہوتے اور عجیب و غریب مضمون بیان ہوتے" ص۳۵

بہر حال جیسا کہ مصنف امام کا بیان ہے صاحب نسبت بزرگ کو خیال گذرا کہ شاید یہ اثر تبحر علمی کا ہے، اور چاہا کہ باطنی کیفیتوں کا لذت شناس بھی اگر ایسے آدمی کو بنا دیا جائے تو یہ اس کے مستحق ہیں، اسی خیال سے انھوں نے کہا کہ آپ مجھ سے کبھی خلوت میں ملیں تو مناسب ہے مگر سیدنا الامام الکبیر نے اپنے مشاغل کی کثرت کا ذکر کر کے ان کو ٹالنا چاہا فرمایا کہ آپ خود تشریف لائیے ایک دن وہ صاحب نسبت بزرگ ایسے وقت میں آئے کہ حضرت والا درس دے رہے تھے۔ جب وہ حلقہ میں پہونچے تو درس بند کر دیا وہ بھی بیٹھ گئے، اور حضرت بھی ان کی طرف متوجہ ہوئے مصنف امام نے لکھا ہے کہ مولانا نانوتوی اس وقت کبھی آنکھوں کو کھلی رکھتے کبھی قدرے بند فرماتے زیادہ وقت نہیں گذرا کہ یہ دیکھا جا رہا تھا کہ صاحب حال و نسبت والے صاحب کی حالت یہ ہوگئی کہ گر گر پڑتے، پھر سنبھلتے، کچھ دیر یوں ہی معاملہ ہوتا رہا پھر کیا ہوا، مصنف امام کے الفاظ ہیں کہ

"وہ نسبت و حال والے صاحب اٹھ کر نیچی نگاہ کئے چلے گئے" ص۱

بعد کو لکھا کہ "معذرت کی" شاید اسی "معذرت" کی تفصیل مولانا حبیب الرحمن نے یہ بیان کی ہے کہ حال و نسبت والے وہی صاحب عرض کر رہے تھے کہ

"مولانا مجھے خبر نہ تھی کہ آپ میں یہ جوہر بھی علی الوجہ الاتم موجود ہے" ص۱۹۵ ارواح

ہمارے مصنف امام نے جنکی شاید یہ چشم دید روایت ہے، اس قصے کو درج کرنے کے بعد ارقام فرمایا کہ

"مولانا (نانوتوی) کے کسر نفسی نے ان کے کمال کو ظاہر ہونے نہ دیا" ص۳۶

اور آخر میں انھوں نے اپنی رائے ان الفاظ میں درج کی ہے کہ

"اور جو کچھ بھی ظاہر ہوا میرے گمان میں بامر اللہ تھا، ہرگز اپنی طرف سے اظہار کسی امر کا

نہ فرماتے تھے " ص۳۶

اور یہی وہ بات ہے جس کا دعویٰ شروع ہی سے کرتا چلا آ رہا ہوں ؎

بہر حال میں بیان یہ کر رہا تھا کہ مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد کوچہ چیلان والے مکان کے کوٹھے پر جن حالات میں سیدنا الامام الکبیر کو پایا گیا تھا، اور خالی ہو جانے کے بعد "ہو" کے اسی مکان میں آپ کی آمد و رفت خاص طریقہ سے جو جاری رہی، یہی وہ زمانہ معلوم ہوتا ہے جس میں ذہنی و دماغی علوم سے فارغ ہونے کے بعد قلب و روح سے تعلق رکھنے والے تجربات و مشاہدات میں آپ مستغرق ہوئے، اور آپ کی فطری صلاحیت و استعداد نے بہت جلد اس راہ کے نتائج و ثمرات کی یافت میں آپ کو کامیابی عطا فرمادی اور حقیقی اقتضاء آپ کی فطرت کا اگرچہ وہی تھا، جسے مختلف بزرگوں کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں یعنی فرمایا کرتے تھے کہ

"ایسا گم ہوتا کہ کوئی بھی نہ پہچانتا کہ قاسم دنیا میں پیدا بھی ہوا تھا" ص۷ الہادی ۵ جمادی الاول ۱۳۵۰ھ

لیکن حالات و واقعات ہی ایسے تھے کہ آپ کو بھی دنیا کے سامنے آنا پڑا، اور دنیا بھی آپ کے سامنے آئی لیکن اس میں بھی کوشش آپ کی جہاں تک معلوم ہوتا ہے یہی رہتی تھی کہ جاننے والے اگر جانیں بھی تو صرف یہی جانیں کہ مسلمانوں کے مذہبی علوم کے مولوی ہونے کے سوا آپ اور کچھ نہیں ہیں اسی سلسلہ میں امیر شاہ خاں صاحب مرحوم ایک قصہ بھی سنایا کرتے تھے، قصہ تو طویل ہے، ارواح ثلاثہ میں تفصیل کو پڑھ لیجئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ خورجہ میں ایک دفعہ کسی نے ایک خوش گلو آدمی کو مجلس مبارک میں لا کر چاہا کہ حافظ کی مشہور غزل

غلام نرگس مست تو تاجدارانند

کے مطلع والی سنوائیں، حضرت کو اس ارادے کا علم اس وقت ہوا جب خوش گلو آدمی نے شعر الاپنا شروع کیا؟ مگر ایک ہی مصرعہ تک بات پہونچی تھی کہ بے چارا گھبرا کر رک گیا اور سیدنا الامام الکبیر کی طرف خطاب کر کے کہنے لگا کہ

"آپ تو مجھے پڑھنے ہی نہیں دیتے"۔ ص۱۱

چونکہ خواہش بھی یہی تھی، کہا بھی گیا کہ بس ختم کرو، معلوم ہوا تمہاری آواز اچھی ہے، مجلس جب برخاست ہوئی، تو جن صاحب نے گانے کی تحریک کی تھی، نام ان کا عبداللہ خاں تھا گلاوٹھی کے رہنے والے تھے ان ہی سے دیکھا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر فرما رہے ہیں اور چیں بجبیں ہوکر فرما رہے ہیں کہ

"میرا ایما معلوم کئے بغیر ایسی فرمائش کی "

اور آخر میں مولوی عبداللہ سے کہنے لگے کہ

"میں جس طرح صوفیوں میں بدنام ہوں، اسی طرح مولویت کا دھبہ بھی مجھ پر لگا ہوا ہے اس لئے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے" ص۱۷۶

جس کا مطلب جیسا کہ ظاہر ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ظہور میں بھی بجائے صوفیوں کے رعایت زیادہ تر آپ اپنے اسی پہلو کی فرماتے تھے، جس کا نام آپ نے "علم کا دھبہ" رکھ چھوڑا تھا، اس موقعہ پر امیر شاہ خاں نے حضرت والا کے ان الفاظ کو بھی دہرایا ہے کہ ان ہی مولوی عبداللہ سے یہ بھی کہا کہ

"اگر مولویت کی قید نہ ہوتی، تو قاسم کی خاک تک کا بھی پتہ نہ چلتا، جانوروں کے گھونسلا بھی ہوتا ہے، میرے لئے یہ بھی نہ ہوتا، اور کوئی میری ہوا تک نہ پاتا" ص۱۷۶

لیکن چھپانے والے نے لاکھ چھپانے کی کوشش کی ہو، مگر ہر چھپی ڈھنکی بات کا جو جاننے والا ہے وہ اس کے چھپنے پر راضی بھی تو ہو؟ مولانا منصور علی خاں حیدرآبادی رحمۃ اللہ علیہ راوی ہیں، اس ناسوتی زندگی، اور خاکی قالب سے انقطاع کی آخری گھڑیوں میں وہ بھی موجود تھے، ان کے کانوں کی سنی ہوئی یہ گواہی ہے کہ

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ۲۹۱)

لہ امیر شاہ خاں کہتے ہیں کہ بعد کو ان ہی گانے والے خوش گلو صاحب سے پوچھا گیا کہ آخر تم کو محسوس کیا ہوا، جواب میں کہا کہ بھائی جب گانے میں آگے بڑھنے کا ارادہ کرتا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زبان پر میرے کسی نے انگلی رکھدی اور اسے ایسا دبا دیا کہ آگے چل ہی نہیں سکتا ۱۲

(ص۱۷۶ ارواح ثلاثہ)

"دو بجے[1] کے بعد پاس انفاس کی آواز اس زور سے آنے لگی کہ باہر دروازے کے بھی میں لے سنی" ص۱۹ (مذہب منصور)

جیسا کہ معلوم ہے "پاس انفاس" (سلطان[2] الاذکار) ذکر اللہ کا ایک طریقہ خاص ہے، جو کام چھپا چھپا کر دبک دبک کر کیا جاتا تھا مگر جس نہ ٹلنے والی گھڑی، اور ناگزیر ساعت کے لئے یہ کیا جاتا تھا، جس وقت وہ سامنے آگئی تو سنانے والے نے سننے والے کانوں کو سنوا دیا کہ آج جو دنیا سے جا رہا ہے، دنیا میں وہ کس لئے آیا تھا، اور کیا کر کے جا رہا ہے،

پہلے بھی متعدد حوالوں سے نقل کر چکا ہوں، خلوت و جلوت کے رفیق، بچپن اور جوانی کے ساتھی ہمارے مصنف امام نے بھی اسی واقعہ کی شہادت ان الفاظ میں جو نقل کی ہے کہ

"مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) نے ریاضتیں ایسی کی ہیں کہ کوئی کیا کرے گا" ص۳۵

پھر خود ہی اجمالی الفاظ میں اس کی تفصیل کرتے ہیں کہ

"اشغال دشوار، جیسے حبس (دم) اور نہ پایہ مدت تک کئے ہیں" ص۳۵

یہ ذکر کے بعض خاص طریقہ کی اصطلاحی تعبیر ہے، آگے وہی لکھتے ہیں کہ

"بارہ تسبیح، اور ذکر ارہ کا دوام تھا" ص۳۵

آج یہی "دوام" کام آ رہا تھا، ورنہ جس وقت سب کچھ بھلا دیا جاتا ہے، ہوش و حواس کی بھی خبر نہیں رہتی، اور آئندہ معلوم بھی ہوگا کہ تقریباً ڈھائی دن ناسوتی زندگی کے بے ہوشی میں گذرے تھے لیکن باقی اگر رہ گیا تھا، تو ساری عمر کی محنت کا وہی ثمرہ جسے دوسروں کے ساتھ مولانا منصور علی خاں مرحوم دروازے پر سن رہے تھے، ایسے وقت اور ایسی حالت میں ذکر کا جاری رہنا

---

[1] حالانکہ آئندہ جیسا کہ تفصیلاً معلوم ہوگا آپ کی وفات بھی قریب قریب دو بجے کے ہوئی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آواز عین حالت نزع میں آ رہی تھی اور اتنی زور سے آ رہی تھی کہ باہر دروازے پر جو تھے وہ سن رہے تھے ۱۲

[2] حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے اپنے بزرگوں سے سنا کہ حضرت والا پر سلطان الاذکار کا اس درجہ غلبہ ہو گیا تھا کہ پاس بیٹھنے والوں کو بدن کے عضو عضو سے ذکر اللہ کی آواز آتی تھی، اسی ذکر کا غلبہ وفات کے وقت بھی ہوا ہے، پاس انفاس کے ذکر میں آواز نہیں ہوتی کہ دوسروں کو اس کا احساس ہو شاید مولانا منصور علی خاں صاحب رحمہ اللہ کو اصطلاحی نام بیان کرنے میں کچھ سہو ہوا ہے ۱۲ محمد طیب غفرلہٗ

بجز خرق عادت کے اور کیا ہو سکتا ہے، اپنی زندگی کے اس پہلو کو آپ نے خود کھولا نہیں تھا بلکہ کھولنے والے نے کھول دیا تھا، کہ دوسروں نے زیادہ سے زیادہ جسے لڑکوں کا پڑھانے والا یا وعظ کہنے والا، کچھ کتابیں لکھنے والا ملّا یا مولوی سمجھ رکھا تھا، درحقیقت اپنے مالک کا کتنا راستباز، بلکہ سچ کہئے تو کہہ سکتے ہیں کہ کتنا بڑا عشق باز محرم راز اور وفادار بندہ تھا!

اور یہ باتیں جنکا ذکر اب تک کیا گیا، ان کا تعلق بجائے علم کے اگر آپ غور کریں گے، تو زیادہ تر عمل سے نظر آئیگا، دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ خرق عوائد یا عام اصطلاح میں "کرامت" کے لفظ سے جس کی تعبیر کی جاتی ہے، بصورت اس کا ظہور اگر ہوا بھی، تو اس کا تعلق کسی عمل اور کام سے تھا، لیکن قرآنی نصوص واتقوا اللہ ویعلمکم اللہ (ڈرو اللہ سے اور تمہیں سکھانے لگے گا) یا ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا (ڈرو اللہ سے۔ اللہ تم کو فرقان عطا کرے گا) یعنی حق و باطل، خطا و ثواب میں امتیاز کا سلیقہ تقویٰ کی زندگی بسر کرنے والوں کو عطا کیا جاتا ہے، یا ارشاد ہوا ہے کہ المحسنین (احسان کا طریقہ دین میں اختیار کرتے ہیں) ان کو حکم یعنی وہی فرقانی ملکہ حق کو باطل سے جدا کرنے کا سلیقہ ارزانی فرمایا جاتا ہے اور علم عطا کیا جاتا ہے[۱]۔ الغرض مدرسہ کے بعد کوچہ چیلاں کے "ھو" والے مکان کی محنتوں یا دربار الٰہی کے دوام حضور کے سلسلے میں کیا کچھ ملا۔ اس کا حال تو یہ ہے کہ نہ جاننے والے تو شاید وہی سمجھتے ہوں جیسے میرٹھ کے صاحبدل بزرگ نے تجربہ سے پہلے خیال کیا تھا، کہ

"یہ اثر تبحر علمی کا ہے" ص۱۶

مگر جو حضرت والا کے صحیح حالات اور زندگی کے مشاغل سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ "تبحر علمی" کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، ان سے آپ کا تعلق کیا تھا، ابتدا میں اس کا کچھ تذکرہ کر چکا ہوں حضرت تھانوی کی شہادت نقل کر چکا ہوں کہ

"مولٰنا محمد قاسم صاحب نے کتابیں کچھ بہت نہیں پڑھی تھیں"۔ الہادی ماہ جمادی الثانی ص۵

[۱] سورۂ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا ہے فلما بلغ اشدہ آتیناہ حکما وعلما وکذلک نجزی المحسنین (جب وہ قوت کی آخری حد تک پہونچے تو میں نے ان کو (یعنی یوسف کو) حکم اور علم عطا کیا اور یوں ہی بدلہ دیا کرتے ہیں ہم محسنین کو (یعنی احسانی زندگی بسر کرنے والوں کو) اسی قرآنی کلیہ کی طرف مذکورہ بالا الفاظ سے اشارہ کیا گیا ہے۔

اور یوں بھی "تبحر علمی" والوں کی کتابوں اور باتوں کا مقابلہ سیدنا الامام الکبیر کی کتابوں اور باتوں سے کرکے شاید ایک عامی بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ قاسمی نظریات و افکار کا سرچشمہ وہ نہیں ہے جہاں سے "تبحر علمی" والے چیزوں کو حاصل کرتے ہیں، ہمارے مصنف امام جنھوں نے آخر عمر میں حضرت والا سے جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، حدیث کی بعض کتابیں پڑھی بھی تھیں، وہی آپ کے علمی پہلو کا تذکرہ کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں۔

"آمد معانی اور مضامین کی ایسی تھی یوں فرماتے تھے کہ بعضے بار حیران ہوجاتا ہوں کہ کیا کیا بیان کروں"۔ ص۳۵

مولانا حبیب الرحمن مرحوم کے حوالہ سے ارواح ثلاثہ میں بھی قریب قریب اسی کے ان کا یہ بیان نقل کیا گیا ہے، وہ فرماتے تھے کہ

"مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اکثر تقریر فرماتے ہوئے بیچ میں چند ایک منٹ سکوت فرماتے، اور ایک دم رک جاتے تھے، اس پر عرض کیا گیا کہ حضرت مسلسل تقریر فرماتے ہوئے آپ کیوں رک جاتے ہیں، فرمایا کہ ایک ہی مضمون کے بیسیوں پیرائے اور عنوان ذہن میں اک دم آتے ہیں، تو طبیعت رک جاتی ہے، اور میں اس پر غور کرنے لگتا ہوں کہ کس کو لوں، اور کس کو چھوڑوں"[۱] ص۱۹۶

[۱] عرفاء و حکماء اسلام کا مسلّمہ مسئلہ ہے کہ مختلف علوم اور علم کے مختلف اور متعدد پہلوؤں کی طرف بیکدم التفات و توجہ کرنا روح کا خاصہ ہی نفس آن واحد میں متعدد امور کی طرف اکدم التفات و توجہ نہیں کرسکتا۔ اس کا التفات تدریجی اور یکے بعد دیگرے ترتیب کے ساتھ ہوتا ہے حضرت والا کا ایک ہی علم کے متعدد پہلوؤں اور مختلف علوم کی طرف بیکدم ملتفت ہونا اور ان کے ذہن مبارک میں ان علمی گوشوں کا آن واحد میں اس طرح جمع ہوجانا کہ ان میں انتخاب کرنے کیلئے تأمل کی ضرورت پڑے یقیناً روحانیت ہی کا اعلیٰ مقام ہے تبحر علمی یا عام عادی التفات و تفکر کی صورت نہیں۔ اسی کی تائید میں یہ واقعہ بھی ذہن نشین کرلینا چاہئے جس کو میں نے حضرت الاستاذ علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی استاذ دار العلوم سے سنا کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ جب استاذ رحمۃ اللہ علیہ (حضرت نانوتویؒ) سے کوئی بات پوچھی جاتی تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس مسئلہ کے تمام دلائل کم ہاتھ جوڑے ہوئے حضرت کے سامنے آکھڑے ہوئے ہیں اور وہ ان میں انتخاب کرکرکے مخاطب کو افادہ فرما رہے ہیں یعنی انتخاب دلائل میں تو دیر لگتی تھی مگر دلائل کے بیکدم جمع ہوجانے اور آکھڑے ہونے میں کوئی تاخیر نہ ہوتی تھی۔ محمد طیب غفرلہٗ

ان ہی کے حوالہ سے اسی کتاب میں یہ روایت بھی درج کی گئی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر سے ایک دفعہ یہ عرض کیا گیا کہ

"جب آپ سے کوئی کسی بات کا سوال کرتا ہے، تو آپ برجستہ فرما دیتے ہیں کہ اس کے تین جواب ہیں، یا پانچ جواب ہیں"

پوچھنے والے نے دریافت کیا کہ

آپ نے کیا پہلے سے سوالوں کے جوابات سوچ کر ان کی فہرست لگا رکھی ہے یا آپ سوچ کر آتے ہیں؟

جواب میں ارشاد ہوا تھا کہ

"نہیں بلا اختیار میری زبان سے یوں ہی نکل جاتا ہے، اور اتنے ہی جواب دیکر میری طبیعت رک جاتی ہے" ص ۱۹۵

فکر و نظر، تعقل و ذہانت کے زور سے پیدا ہونے والے نتیجے اور علم و دانش، فرقان و امتیاز کے جو سوتے تقویٰ کی راہوں سے مومن کے اندر پھوٹ پڑتے ہیں، کچھ اسی قسم کے خصوصی آثار سے دونوں کے باہمی فرق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اگرچہ اس قسم کی تجربی حقیقتوں کا عام کلیہ وہی "من لم یذق لم یدر" کی عربی ضرب المثل ہی ہو سکتی ہے، یعنی جس نے چکھا نہیں وہ ان سے واقف بھی نہیں ہو سکتا،

کور مادرزاد کو کیسے سمجھایا جا سکتا ہے کہ رنگ کیا چیز ہے، یا روشنی کس حقیقت کی تعبیر ہے، آخر آپ ہی بتائیے ارواح ثلاثہ میں ہمارے مصنف امام حضرت مولٰنا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف یہ بیان جو منسوب کیا گیا ہے، کہ چھتہ کی مسجد میں کچھ لوگ جمع تھے، اسی مجمع میں ایک دن فرمانے لگے

"بھائی! آج تو صبح کی نماز میں ہم مر جاتے، بس کچھ ہی کسر رہ گئی"

لوگ حیرت سے پوچھنے لگے کہ آخر کیا حادثہ پیش آیا، سننے کی بات یہی ہے، جواب میں فرماتے تھے

"آج صبح میں سورۂ مزمل پڑھ رہا تھا، کہ اچانک علوم کا اتنا عظیم الشان دریا میرے قلب کے اوپر گذرا کہ میں تحمل نہ کر سکا، اور قریب تھا کہ میری روح پرواز کر جائے"

کہتے تھے کہ وہ تو خیر گذری کہ

"وہ دریا جیسا کہ ایک دم آیا تھا، ویسا ہی نکلا چلا گیا، اس لئے میں بچ گیا"

کہتے تھے کہ علوم کا یہ دریا جو اچانک چڑھتا ہوا ان کے قلب پر سے گذر گیا۔ یہ کیا تھا، خود ہی اس کی تشریح بھی ان ہی سے بایں الفاظ اسی کتاب میں پائی جاتی ہے،

"نماز کے بعد میں نے غور کیا کہ یہ کیا معاملہ تھا، تو منکشف ہوا کہ حضرت مولٰنا نانوتوی ان ساعتوں میں میری طرف میرٹھ میں متوجہ ہوئے تھے، یہ ان کی توجہ کا اثر ہے، کہ علوم کے دریا دوسروں کے قلوب پر موجیں مارنے لگیں اور تحمل دشوار ہو جائے" ص۲۰۱

خود ہی بتائیے کہ فکری و دماغی علوم والے بھلا اس کا کیا مطلب سمجھ سکتے ہیں، کہاں میرٹھ اور کہاں چھتہ کی مسجد میرٹھ سے دیوبند تک کا مکانی فاصلہ درمیان میں حائل نہ ہوا، اور توجہ دینے والا اپنے علوم کا دباؤ دوسرے قبول کرنے والے قلب پر ڈال رہا تھا، مجھ جیسے بے بصیرتوں کی سمجھ میں اسکی توجیہ بھلا کیا آئے وہ کیا بتائے کہ یہ دریا کیا تھا، کس راہ سے آیا اور کس راہ سے گذر گیا۔

ہاں! جس کے دل کے اندر سے یہ دریا گذرا تھا ان ہی کے حوالہ سے اسی کے بعد یہ الفاظ بھی نقل کئے گئے ہیں، حضرت نانوتوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولٰنا محمد یعقوب صاحب نے فرمایا کہ

"اس کے قلب کی وسعت کا کیا حال ہوگا، جس میں وہ علوم سمائے ہوئے ہیں، اور وہ کس طرح ان علوم کا تحمل کئے ہوئے ہوگا" ص۲۰۱ ارواح

حالانکہ خود مولٰنا محمد یعقوب صاحب کے علوم کا سرچشمہ بھی جہاں تک ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے، تقویٰ کی زندگی ہی تھا، اسی لئے میرٹھ کی دی ہوئی توجہ کے اثر کو دیوبند کی مسجد میں ان کے قلب نے محسوس کر لیا، کھلی ہوئی بات ہے کہ جس کی آنکھ میں بینائی ہوگی وہی تو روشنی کو محسوس کر سکتا ہے، ورنہ اندھوں کے لئے روشنی کا وجود و عدم دونوں برابر ہے، بہر حال کچھ بھی ہو تھے وہ بھی مرد اسی راہ کے، خود چکھے ہوئے تھے، اسی لئے جانتے تھے، اور اس کی قدر پہچانتے تھے، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جو ہمارے مصنف امام کے تلمیذ رشید ہیں، اسی سلسلہ کا ایک قصہ نقل بھی کیا کرتے

تھے۔ حاصل یہ ہے کہ مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ یعنی مصنف امام نے ایک نیا مضمون بیان کیا، سننے والوں میں سے کسی نے کہا کہ اس مضمون کو تو مولانا محمد قاسم نے بھی ایک دفعہ بیان کیا تھا، سن کر مصنف امام نے فرمایا

"جہاں سے ہم کہتے ہیں، وہاں ہی سے وہ (مولانا محمد قاسم) بھی فرماتے تھے۔"

جس کا مطلب وہی ہوا کہ سرچشمہ دونوں حضرات کے علوم کا وہی تھا، جو تقویٰ کی زندگی سے فطرت میں پھوٹ پڑتا ہے، مگر اسی کے ساتھ مولانا محمد یعقوب صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ

"مگر اتنا فرق ہے کہ ان کے لئے سمندر کے برابر کھلتا تھا، اور ہمارے لئے سوئی کے ناکے کے برابر کھلتا ہے" ص۲۹ الہادی ماہ جمادی الثانی ۵۷ھ

سمندر اور سوئی کا ناکہ یہ دونوں چیزیں تو ہماری دیکھی بھالی ہیں، لیکن ان مثالوں سے باطن کی جن کیفیتوں کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، تجربے کے بغیر خاک کسی کی سمجھ میں کچھ آسکتا ہے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ باطن کی راہ میں پہلا قدم رکھتے ہوئے جسے ثقل کی وہ کیفیت محسوس ہوئی ہو، جسے سن کر مرشد (حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ) نے مبارک باد دیتے ہوئے یہ بشارت سنائی تھی پہلے بھی اس کا ذکر آچکا ہے یعنی،

"یہ نبوت کا آپ کے قلب پر فیضان ہوتا ہے اور یہ وہ ثقل ہے جو حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے وقت محسوس ہوتا تھا" (ملفوظات حضرت تھانویؒ) الہادی ماہ ربیع الاول ۵۱ھ

تو کوچہ چیلان کے "ھو" کے مکان کے مشاغل و مشاہد کے بعد کمسنی ہی میں "ولایت کبریٰ کی دولت سے سرفراز ہو کر ہی جب نکلے، تو اس وقت علمی جہت میں ان کے لاہوتی فتوحات کا کیا حال ہوگا حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ وصیت سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کے ان ہی فتوحاتی علوم و معارف کے متعلق جو نقل کی گئی ہے، یعنی آخری دفعہ سفر حج سے واپسی کے موقعہ پر حضرت نانوتوی کے رفقار خاص سے حاجی صاحب نے ارشاد فرمایا تھا،

"مولوی صاحب (مولانا نانوتوی) کی تحریر و تقریر کو محفوظ رکھا کرو، اور غنیمت جانو" ص۳۲

راوی اس کے ہمارے مصنف امام ہیں، اور یہ جاننے والے کی شہادت جاننے والے کے متعلق یا پانے والے کی شہادت پانے والے کے متعلق ہے، اور جیسا کہ میں نے عرض کیا جس حد تک سیدنا الامام الکبیر کی تحریر و تقریر کے محفوظ کرنے میں لوگ کامیاب ہوئے ہیں، ان کو دیکھ کر انصاف سے اگر کام لیا جائے تو نا آشنائے راہ عامی آدمی بھی یہ پہچان سکتا ہے کہ ان کتابوں کے مضامین کی نوعیت قطعاً ان کتابوں سے الگ ہے جنھیں فکر و نظر والوں نے لکھا ہے، اتنا بہرحال اس کو تسلیم ہی کرنا پڑیگا کہ مغزی اور دماغی بخارات کی نہ یہ شکل ہوئی ہے نہ یہ صورت، ان کا رنگ ہی اور ہے، اور اس کی نکہت و خوشبو ہی دوسری ہے،

خود ہمارے مصنف امام جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، اسی راہ کے آدمی تھے، اور اس کو چھپاتے بھی نہ تھے ابھی ان کا قول نقل کر چکا ہوں کہ "جہاں سے ہم کہتے ہیں' وہاں ہی سے یہ بھی فرماتے تھے، بایں ہمہ متعدد مقامات پر ان کے قلم سے اضطراراً اس قسم کے فقرے نکل پڑے ہیں، مثلاً سوانح قدیم میں ایک موقعہ پر سیدنا الامام الکبیر کے ان علمی فتوحات و معارف کا تذکرہ فرماتے ہوئے جو قلم بند نہ ہوسکیں بڑے کرب اور بے چینی کے ساتھ ارقام فرماتے ہیں کہ

"کیا کیجئے جو باتیں رہ گئیں اب سوائے افسوس کے اور کیا ہوسکتا ہے" ص۳

اسی کے بعد ان کے الفاظ ہیں

"جو تحریریں نا تمام رہ گئیں، اب بھلا کون ان کو تمام کرسکتا ہے، اور جن میں کچھ نقصان ہوگیا ان کی تکمیل کی کیا صورت ہوسکتی ہے"۔ ص۳

اپنے آپ کو خاک میں ملانے کی فطری آرزو جو سیدنا الامام الکبیر کی تھی، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی ان ہی کی قلم پر غم سے یہ لختہائے جگر نکل کر سطح کاغذ پر پھیل گئے ہیں اس آرزو کے الفاظ کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ

"اس شہرت پر بھی کسی نے کیا جانا، جو کمالات تھے، وہ کس قدر تھے، کیا اس میں سے ظاہر ہوئے"۔ ص۳۱

آخر میں اسی کے بعد فرماتے ہیں۔

"آخر سب کو خاک ہی میں ملا دیا، اپنا کہنا کر دکھلایا" ص۱۳۱

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ظاہر و باطن، دماغ و دل، مدرسہ اور خانقاہ کے اکتسابی کمالات و فضائل سیدنا الامام الکبیر کی خداداد فطری صلاحیتوں، اور جبلی ملکات کے ساتھ اس عہد میں جس خاص طریقہ سے ایک شخصی وجود میں سمٹ کر جمع ہو گئے تھے، ان کو دیکھتے ہوئے بلا خوف تردد یہ کہا جا سکتا ہے کہ کم از کم اپنے عہد میں اس عجیب و غریب "جامعیت" کی وہ اپنی آپ نظیر تھے خود ان کے پیر و مرشد جو اس زمانہ کے ہندی علماء کے گویا تقریباً شیخ الکل تھے، جب وہی یہ فرمایا کرتے تھے، جیسا کہ ہمارے مصنف امام نے یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

"خود احقر (مصنف امام) سے حاجی صاحب ؒ نے ارشاد فرمایا تھا، اول حج میں جب حاضر خدمت ہوا تھا"

ان کی یہ شہادت اپنی کتاب میں سیدنا الامام الکبیر کے متعلق درج کی ہے کہ حضرت والا کا نام لے کر حاجی صاحب ؒ نے کہا کہ

"ایسے لوگ کبھی پہلے زمانہ میں ہوا کرتے تھے، اب مدتوں سے نہیں ہوتے" ص۱۳۱

اکابر دیوبند کے تصنیفات کا ذکر کرتے ہوئے حضرت حکیم الامت تھانوی قدس اللہ سرہ کی طرف یہ الفاظ قصص الاکابر میں جو منسوب کئے گئے ہیں، یعنی فرماتے تھے

"اگر ان حضرات کی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کر دیا جائے اور بتلایا نہ جاوے تو دیکھنے والے رازی و غزالی کے زمانہ کی بتلادیں گے" ص۱۳۱ الہادی ماہ جمادی الاولیٰ

اس میں شک نہیں کہ نام تو حضرت تھانوی نے نہیں لیا ہے، لیکن سچ پوچھئے تو یہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت ہی کی گویا تفسیر ہے۔ اور گو ذکر کرتے ہوئے کچھ ڈر بھی معلوم ہوتا ہے لیکن آدمی اپنے تجربہ اور مشاہدے کا کیا کرے، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن ؒ فرمایا کرتے تھے، کہ

"میں نے اس کا التزام کیا کہ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تصانیف
دیکھ کر حضرت نانوتوی کے درس میں حاضر ہوتا اور وہ باتیں پوچھتا جو حضرت شاہ
صاحب کے کتب میں مشکل ہوتی تھیں"۔

اس التزام اور دریافت کا نتیجہ کیا نکلا، شیخ الہند جیسی ذمہ دار ہستی کے الفاظ اس کے متعلق یہ ہیں کہ

"شاہ صاحب کی کتاب میں جو انتہائی جواب ہوتا تھا
حضرت نانوتوی اول ہی دفعہ میں فرمادیا کرتے تھے"

اور یہ کوئی اتفاقی بات نہ تھی، جو ایک دو دفعہ پیش آئی ہو، اسی بیان کے آخر میں شیخ الہند ہی کے یہ الفاظ بھی درج ہیں کہ

"بارہا اس کا تجربہ کیا" (ارواح ثلاثہ ص۱۷۱)

دینی علوم کے فتوحات، وانکشافات کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس موعودہ ربانی ہدایت کے ثمرات تھے، جس کا وعدہ قرآن میں مجاہدات وریاضات کرنے والوں کو دیا گیا ہے، وہی مجاہدات وریاضت جنھوں نے حضرت والا کو "مجسم تقویٰ" بنا کر رکھ دیا تھا، لیکن اس زمانہ کے نصاب میں دینی علوم کے سوا جن فنون کی تعلیم و تعلم کا رواج تھا، سیدنا الامام الکبیر سے پڑھنے والے اور سننے والے ہی بیان کرتے ہیں، کہ دوسروں سے پڑھنے کے بعد جب قاسمی حلقہ میں شریک ہوئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا انھوں نے اب تک اس فن کے متعلق کچھ پڑھا ہی نہیں تھا، یاد پڑتا ہے، خاکسار جب بجنور (اپنی نوجوانی) کے عہد میں حاضر ہوا تھا، اور سیدنا الامام الکبیر سے براہ راست تلمذ کا شرف رکھنے والی ایک ہستی مولانا حکیم رحیم اللہ صاحب بجنوری طاب ثراہ کی قدم بوسی کی سعادت حاصل ہوئی تھی، تو اس وقت ان ہی سے یہ بات سنی تھی کہ مختلف علماء عصر سے منطق و فلسفہ کی کتابیں پڑھنے کے بعد وہ سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، کہتے تھے کہ جو بات بھی یہاں سننے میں آتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کبھی نہیں سنی تھی، ہمارے مصنف امام نے بھی آپ کے تدریسی مشاغل کا تذکرہ ان الفاظ میں کرنے کے بعد کہ

"سب کتابیں (نصاب مروجہ) کی بے تکلف پڑھاتے تھے" ص۳۹

قریب قریب حکیم صاحب مرحوم ہی کی شہادت کے مطابق اپنی گواہی ان الفاظ میں درج کی ہے

"اس طرح کے مضامین بیان فرماتے تھے کہ نہ کسی نے سنے، اور نہ سمجھے" ص۳۹

آخر میں وہی لکھتے ہیں کہ

عجائب و غرائب تحقیقات ہر فن میں بیان فرماتے" ص۳۹

اور اسی کا نتیجہ تھا جیسا کہ مصنف امام ہی نے بیان کیا ہے۔

"جو شخص طباع ہو، اور پہلے سے اصل کتاب سمجھا ہوا ہو تب مولوی صاحب کی بات سمجھ سکتا تھا"[۱] ص۴۰

انتہا تو یہ ہے کہ اقلیدس جس کے متعلق گذر چکا کہ بغیر استاد کی مدد کے ایام طالب العلمی میں بطور خود سیدنا الامام الکبیر نے مطالعہ فرمالیا تھا، اور اسی زمانہ میں ماسٹر رام چندر نے مولوی ذکاءاللہ مرحوم کو اقلیدس کے چند مشکل سوالات جیسا کہ کہا جاتا ہے سکھا کر کہا کہ مولوی محمد قاسم سے ان کا حل دریافت کرو، جواب میں حل تو حل، شاید لکھ چکا ہوں کہ الٹ کر مولوی ذکاءاللہ کو ایسے چند پیچیدہ سوالات میں آپ نے الجھا دیا کہ بقول مولٰنا حبیب الرحمٰن مولوی ذکاءاللہ جواب میں عاجز ہو کر رہ گئے تھے، اسی اقلیدس کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ کسی انگریز نے "شکل مثلث" کے

---

[۱] میں نے اپنے متعدد بزرگوں سے سنا کہ منطق و فلسفہ وغیرہ کی بڑی بڑی کتابوں کی تدریس کے موقعہ پر جب طالب علم صفحہ ڈیڑھ صفحہ کی عبارت پڑھ لیتا تو حضرت والا کی عادت تھی کہ اس ساری عبارت کا مطلب چند لفظوں میں بیان کر کے فرماتے کہ بس ان کا مطلب یہ ہے اب تم قاسم کی سنو۔ اور پھر اس علم و فن سے متعلق مکنون علوم و فنون کا دریا بہہ پڑتا اسی قسم کے ایک موقعہ کا واقعہ بزرگوں سے سننے میں آیا کہ جب حضرت والا نے حسب عادہ فرمایا کہ اب تم قاسم کی سنو تو مولانا عبدالعلی صاحبؒ نے (جو بعد میں مدرسہ عبدالرب میں دہلی کے محدث ہوئے) عرض کیا کہ نہیں ہم قاسم کی نہیں سنتے ہیں تو کتاب کا مطلب اس کی عبارت سے سمجھا دیا جائے، سننے میں آیا کہ اس کے بعد سے حضرت والا اُن کی بہت رعایت فرمانے لگے اور جب وہ کتاب کا مطلب اور عبارت کتاب سے اس کی تطبیق پوری طرح سمجھ جاتے تب حضرت اپنے علوم و مضامین کی تقریر شروع فرماتے ۱۲ (محمد طیب عفی عنہ)

متعلق ایک اہم سوال پیدا کرکے اشتہار دیا تھا کہ اس سوال کو جو حل کردے گا ڈیڑھ لاکھ روپے بطور انعام کے اس کی خدمت میں میں پیش کروں گا' ایک صاحب جو اس زمانہ میں مظفر نگر میں منصف تھے اور فن اقلیدس سے غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے، انھوں نے کوشش کرکے اپنے نزدیک حل پیدا کیا. اور اس حل کو بعض اہل نظر کے سامنے پیش کرکے یہ اطمینان بھی حاصل کرچکے تھے کہ انعام کا جائز استحقاق ان کو حاصل ہوچکا ہے۔ کہتے ہیں کہ اپنے اس "حل" کو اشتہار دینے والے انگریز کے پاس بھیجنے کی نوبت نہ آئی تھی کہ بدقسمتی کہیے یا خوش قسمتی کہ مظفر نگر کے اسٹیشن پر سیدنا الامام الکبیر سے اتفاقاً منصف صاحب کی ملاقات ہوگئی، باتوں باتوں میں اپنے اس سرمایہ ناز حل کا بھی منصف صاحب نے تذکرہ کیا۔ اسکے متعلق جو مضمون انھوں نے لکھا تھا' جو شاید ان کے ساتھ ساتھ ہی رہتا تھا' وہ بھی مولنا کو سنایا۔ جب مضمون ختم ہوگیا تو راوی کا بیان ہے کہ مضمون اور ان کے حل کی تعریف کرتے ہوئے آخر میں سیدنا الامام الکبیر نے یہ فرمایا کہ

آپکی دلیل کا فلاں مقدمہ نظری ہے، حالانکہ اقلیدس کے تمام دلائل کی انتہا بدیہی مقدمات پر ہوتی ہے" (ارواح ثلاثہ ص۱۹۴)

چونکہ منصف صاحب خود صاحب فن تھے، دکھتی ہوئی رگ ان کی پکڑلی گئی تھی، پھر خود ہی اپنے "حل" کے اعلان کی ہمت ان کو نہ ہوئی! اور عقلی و ذہنی علوم ہی کی حد تک نہیں، تعجب تو اس پر ہوتا ہے کہ دستور اس زمانہ کا یہی تھا کہ فارغ التحصیل ہوجانے کے بعد بھی عربی زبان میں اپنے مطلب کو ادا کرنے کی قدرت عموماً طلبہ میں پیدا نہ ہوتی تھی، اور سیدنا الامام الکبیر کی کوئی یادگار بجز اس عربی قصیدے کے نہیں ہے جو سلطان عبدالحمید کے نام لکھا گیا' اور آپ کی تصنیفات کے سلسلہ میں انشاء اللہ اسکا مستقل تذکرہ کیا جائے گا، بس اس قصیدے کے سوا میں نہیں جانتا کہ عربی زبان میں آپ کی نثر یا نظم کا نمونہ پایا جاتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زمانہ کے دستور کے مطابق آپکو بھی عربی زبان میں تحریر و تقریر کی مشق کا موقعہ نہ ملا تھا، مگر ہمارے مصنف امام نے بیان فرمایا ہے کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں جب مدرسہ سے ابھی فارغ ہی ہوئے تھے، غالباً بائیس تئیس سال سے زیادہ حضرت والا کی

عمر نہ ہوگی، کہ

"مولوی احمد علی صاحب سہارنپوری (محشی وناشر بخاری شریف) نے تحشیہ اور تصحیح بخاری شریف کے پانچ چھ سیپارے آخر کے جو باقی تھے، مولوی صاحب (مولانا نانوتوی) کے سپرد کیا" ۲۹

مصنف امام ہی کا بیان ہے کہ اس کی خبر جب دلی کے علمی حلقوں میں پہونچی، تو

"اس زمانہ میں بعض لوگوں نے کہ مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) کے کمال سے آگاہ نہ تھے، جناب مولوی احمد علی صاحب کو بطور اعتراض کہا تھا کہ آپ نے یہ کیا کام کیا، کہ آخر کتاب کو ایک نئے آدمی کے سپرد کیا" ۲۹

"نئے آدمی" سے مطلب وہی تھا کہ ایک نو آموز آدمی جس کی عمر بھی ابھی زیادہ نہیں ہے، اس کے سپرد ایسی اہم ذمہ داری کا کام کیسے کردیا گیا' علاوہ نوعمری کے دوسرا قصہ بھی تھا، جسکی طرف مصنف امام نے اشارہ کیا ہے، یعنی بخاری شریف کے ان آخری چھ پاروں میں عموماً امام بخاری نے بعض الناس کے الفاظ سے سمجھا جاتا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر چوٹیں کی ہیں، مصنف امام نے بھی لکھا ہے کہ

"وہ جگہ بخاری میں سب جگہ سے مشکل ہے، علی الخصوص تائید مذہب حنفیہ کا جو اول سے آخر تک مولانا احمد علی صاحب کے حاشیہ میں التزام ہے، اور اس جگہ پر امام بخاری نے اعتراض مذہب حنفیہ پر کئے ہیں" ۳۰

وہی لکھتے ہیں اور بالکل درست لکھتے ہیں کہ

"ان کے (امام بخاری کے ان اعتراضوں کے) جواب لکھنے معلوم ہے کہ کتنے مشکل ہیں" ۳۰

مگر مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ نے لوگوں کے اعتراض و تنقید کی پروانہ کی، اور سیدنا الامام الکبیر نے ان کی تعمیل ارشاد کو سعادت خیال فرماتے ہوئے بخاری کے ان آخری چھ پاروں کی تصحیح کے ساتھ حاشیہ نگاری کی خدمت بھی انجام دی"

مولانا احمد علی صاحب حضرت والا کے کام کو دیکھکر جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے، فرمانے لگے کہ

میں ایسا نادان نہیں ہوں کہ بدون سمجھے بوجھے ایسا کروں "۔ ص۳۱

اور اپنے دعویٰ کے ثبوت میں مصنف امام کا بیان ہے کہ

"مولوی صاحب (مولانا نانوتوی) کا تحشیہ ان کو (اعتراض کرنے والوں کو) دکھلایا" ص۳۱

اور بقول مصنف امام

"جب لوگوں نے جانا" ص۳۱

کہ کام مولانا احمد علی صاحب نے اسی شخص کے سپرد کیا تھا، جو اس خدمت کا صحیح معنوں میں ادا تھا، ظاہر ہے کہ بخاری کا جو حصہ حضرت والا کو حاشیہ نگاری کیلئے سپرد کیا گیا تھا اس میں چونکہ امام بخاری کے مناقشوں کا جواب دینا تھا، اور یہ کام وہی انجام دے سکتا تھا، جو ہر قسم کے مطالب و مقاصد کو عربی زبان میں ادا کرنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہو، جس کا اندازہ اصل حاشیہ کے دیکھنے سے ہی ہو سکتا ہے، مصنف امام نے بھی لکھا ہے کہ

"دیکھنے والے دیکھیں کہ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے" ص۳۱

انشاء اللہ اپنے مقام پر اس حاشیہ کے بعض نمونے بھی پیش کئے جائیں گے، اس وقت تو صرف یہ دکھانا ہے کہ علاوہ دینی علوم کے عقلیات و ادبیات میں بھی حضرت والا کا جو رنگ تھا، اس کا کچھ اندازہ ناظرین کو ہو جائے۔ آور گو اور تو کسی سے سننے میں یہ بات نہیں آئی، اور دیوبند کے علمی حلقوں میں اس کا چرچا پایا جاتا ہے، لیکن دلی کے ایک صاحب جن کا نام سید جمال الدین تھا، جن کی شخصیت باوجود تلاش و جستجو کے فقیر کے لئے کچھ نامعلوم ہی سی رہی، تاہم سیدنا الامام الکبیر کے مطبوعہ خطوط کا ایک مختصر مجموعہ بنام "جمال قاسمی" جو عام طور پر ملتا ہے اور ان ہی دہلوی سید صاحب کے نام یہ خطوط ہیں، ان میں خطاب ان الفاظ سے حضرت نانوتوی نے ان کو کیا ہے مثلاً ایک خط کا سرنامہ ہے۔

"مخدوم و مطاع نیاز مندان حامی دین، سلالہ خاندان نبوت جناب مولوی سید

محمد جمال الدین شاہ صاحب مد ظلہم" ص۳ جمال قاسمی

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب "مولوی" بھی تھے، اور "شاہ" کا لفظ جو ان کے نام کے آخر میں بڑھایا گیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ طبقۂ صوفیہ سے بھی ان کا تعلق تھا، کم از کم ان الفاظ سے یہ فیصلہ تو بہر حال ہمیں کرنا ہی چاہئے کہ ان کی روایت کسی عامی آدمی کی روایت نہیں ہو سکتی، بہر حال کہنا یہ ہے کہ ان ہی خطوط کے شروع میں بطور دیباچہ اور تعارف چند سطریں سید صاحب نے لکھی ہیں، ان ہی میں اس کا ذکر کرتے ہوئے کہ سیدنا الامام الکبیر سے ان کی خط و کتابت رہتی تھی، یہ خبر دیتے ہیں، کہ۔

"نئو رسائل، ھندسہ، ہئیت، فلاحت طبعی، جبر و مقابلہ، جر ثقیل وغیرہا علوم میں ایک ایک ورق لکھنے کی فرمائش کی"

اسی کے ساتھ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان کی یہ فرمائش سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں ان کی طرف سے بار بار پیش ہوتی رہی، اس کے جواب میں بجائے یہ لکھنے کے کہ ان علوم سے ہمارا کیا تعلق وہی بیان کرتے ہیں کہ حضرت کی طرف سے صرف اس پر اصرار ہوتا رہا کہ

"ہر رسالہ کی ایک ایک ورق کی قید نہ لگائیے کیونکہ میں قلم کے ہاتھ سے لاچار ہوں" ص۲

پھر یہی دہلوی سید صاحب فرماتے ہیں، کہ حضرت کے اسی اصرار کی وجہ سے جس کے متعلق ان کا بیان ہے، کہ

"بار بار تقریباً مہینے بھر تک مولوی صاحب مرحوم (حضرت نانوتوی) اصرار کئے گئے"

یہ دیکھ کر کہ ایک ورق کی قید سے آزادی کے بعد کتاب کی ضخامت غیر معمولی طور پر بڑھ جائیگی افسوس ہے کہ اس عجیب و غریب کتاب کے لکھوانے کا جو عزم ان میں پیدا ہوا تھا، وہ فسخ ہو گیا سید جمال الدین لکھتے ہیں کہ

"فقیر نے اس سبب سے کہ یہ یادگار ضرور کم از کم ایک سو جزو سے بڑھ جائے گی تو بوجہ اپنی بے سروسامانی کے چھپنے سے رہ جاوے گی قلم کے اختیار کی رخصت نہ دی"

اس سے اور کچھ نہیں تو اتنی بات بہرحال معلوم ہوتی ہے کہ سید جمال الدین صاحب کو ذاتی تجربہ اور ان کے تعلقات کی جو نوعیت حضرت والا سے تھی، اس کی بنیاد پر کم از کم ان کا خیال یہی تھا کہ ان مختلف علوم و فنون پر آپ کا جو رسالہ بھی ہوگا، وہ ایک جزو سے کم نہ ہوگا، جس زمانہ کی یہ بات ہے، مسلمانوں کی معاشی زبوں حالیاں ابتری کی اس آخری حد تک دلی میں پہونچ گئی تھیں کہ، ایک شریف گھرانے کے آدمی نے اس حیرت انگیز تاریخی کتاب کے لکھوانے کے خیال کو دماغ سے اس لئے نکال دیا کہ اپنی بے سروسامانی کو دیکھتے ہوئے سو جزو کی کتاب کے بھی چھپوانے کی ہمت نہیں کر سکتا، بے چارے نے آخر میں خود ہی لکھا ہے کہ :

"اس باعث (یعنی کتاب کی ضخامت اور اپنی بے سروسامانی کی وجہ سے) یہ کام ناتمام رہا"

واللہ اعلم اس اجمالی روایت کے پس پردہ اور بھی کس قسم کی تفصیلات تھیں، اور ان صدگانہ علوم و فنون کی فہرست میں کس کس علم اور کس کس فن کو جگہ دی گئی تھی، صحیح طور پر اس کا پتہ چلانا اب دشوار ہے، لیکن جن علوم کا نام لیا گیا ہے آپ دیکھ رہے ہیں، کہ ان میں کوئی علم بھی ایسا ہے، جسے دینی یا کم از کم نیم مذہبی علم بھی ہم کہہ سکتے ہیں، ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تعلیم کے جس نصاب کی تکمیل سیدنا الامام الکبیر نے کی تھی، اس نصاب میں ان علوم کی کوئی کتاب شریک نہ تھی، پھر ان علوم پر کتابوں کے لکھنے پر آمادہ ہو جانے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اپنے ذاتی ذوق سے ان علوم میں اتنا درک سیدنا الامام الکبیر نے پیدا فرما لیا تھا کہ ان میں سے ہر علم پر کتاب تک لکھنے کی صلاحیت اپنے اندر آپ محسوس فرماتے تھے، باقی ان خالص غیر دینی علوم کے ساتھ اتنی غیر معمولی مناسبت کی بنا کیا تھی؟ غیر معمولی عقیدت مندیوں کے باوجود اس دعوی کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتا "کہ تقویٰ کی زندگی" کا فرقانی نتیجہ یا مجاہدات کے قرآنی وعدے سے اس کی توجیہ کردوں، اس موقعہ پر حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے ایک ملفوظ کا خیال آتا ہے، قصص الاکابر میں بھی یہ ملفوظ پایا جاتا ہے لکھا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے علمی کمالات کا تذکرہ فرماتے ہوئے، حضرت تھانوی نے ایک دن فرمایا کہ

"مولانا محمد قاسم میں وہبیت کے ساتھ ذکاوت بھی غالب تھی"

اور اپنے اس ذاتی احساس یا خیال کا ذکر کرنے کے بعد اسی ملفوظہ میں ہے کہ حکیم الامت نے آخر میں یہ بھی کہا تھا کہ

"مگر یہ ایسی بات ہے کہ اس سے ہمارے مجمع (حلقہ دیوبند) کا کوئی آدمی کم ہی اتفاق کرے گا۔" ص۲۵ الہادی ماہ جمادی الثانی ۵۰ھ

سچ تو یہ ہے کہ "وہبیت" کے مقابلہ میں "ذکاوت" کے غلبہ کا خیال حضرت تھانوی کی طرف اس ملفوظ میں جو منسوب کیا گیا ہے جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ جن معارف وحقائق کی جلوہ گاہ سیدنا الامام الکبیر کا قلب مبارک تھا، ان کے متعلق شاید حضرت تھانوی کا خیال تھا کہ آپ کی غیر معمولی ذہانت و فطانت کو سمجھنا چاہئے کہ اس میں زیادہ دخل تھا۔

اگر واقعی حضرت تھانوی کا منشاء مبارک یہی ہے تو اس سے اتفاق کرنے والے دیوبند کے علمی حلقوں میں مشکل ہی سے مل سکتے ہیں۔ خود فقیر کے لئے بھی "غلبہ" کا یہ دعویٰ جو حضرت تھانوی کی طرف منسوب کیا گیا ہے، کچھ گراں ہی ہے، اگرچہ گرانی کے اس احساس کا جائز مستحق اپنے آپ کو اتنا نہیں سمجھتا، لیکن اپنے احساس کو بھی چھپا نہیں سکتا۔

کچھ بھی ہو، سیدنا الامام الکبیر کے علوم و افکار پر وہبیت کا غلبہ ہو، یا ذکاوت و ذہانت کو ان میں زیادہ دخل ہو، جب بڑوں کی مجلس کا یہ اختلافی مسئلہ بن چکا ہے، تو ہمارے لئے خاموشی ہی اولیٰ ہے، تاہم پھر بھی حد سے گذرا ہوا غلو، اور افراط و تفریط کی اطرائی ہی شکل ہوگی، کہ جر ثقیل اور فلاحت طبعی، جبر و مقابلہ ہندسہ وغیرہ علوم میں بھی بجائے خداداد ذہانت ذکاوت کے الہام و کشف ہی سے ان کے تعلق کو محدود و منحصر کر دیا جائے؛ ہاں قدیم فلسفہ والے "قوت قدسیہ"[۱] سے فکری قوت کی غیر معمولی درجہ کی

[۱] مطلب یہ ہو کہ جانے ہوئے معلومات کی مدد سے مجہولات اور انجانی باتوں کے جاننے کا سلیقہ تو فطرت انسانی کی عام بات ہو، یا بلفظ معقولات ناطق ہونا منطق والوں نے اسی کو انسانی فطرت کا فصل قرار دیا ہو، لیکن ظاہر ہے کہ معلومات سے مجہولات کی طرف منتقلی کی یہ کیفیت ہر شخص میں برابر کے درجہ کی نہیں ہوتی، بعضوں کی ذہنی حرکت اس سلسلہ میں اتنی سست ہوتی ہے کہ ان کی دماغی حالت حیوانوں سے مشکل ہی ممتاز ہوتی ہے، لیکن اسی کے مقابلہ میں بعضوں میں یہی کیفیت اتنی قوی ہوتی ہو کہ جن نامعلوم اور مجہول نتائج تک دوسرے گھنٹوں میں پہونچتے ہیں، وہ ان ہی نتیجوں تک منٹوں بلکہ بسا اوقات اس سے بھی کم مدت میں پہونچ جاتے ہیں، بلکہ عموماً مجہول نتائج تک ان کا ذہن دفعۃً پہونچنے کا عادی ہوتا ہے، مبادی سے مطالب اور مطالب سے مبادی تک دفعۃً منتقل ہونے کی اسی ذہنی خصوصیت کو فلسفہ کی اصطلاح میں "حدس" کہتے ہیں، حدسی قوت کے انتہائی مرتبہ کا نام ان کے نزدیک "قوت قدسیہ" ہے

تعبیر جو کرتے ہیں، اور نہ جاننے کی وجہ سے یہ مالی خولیا پکالیا ہے کہ الہام وکشف بلکہ العیاذ باللہ وحی ونبوت کی راہ سے جن چیزوں کی یافت کا دعویٰ جو کیا جاتا ہے وہ اسی "قوت قدسیہ" ہی کے (فالہمہا اللہ) کرشمے ہیں، تو اس لحاظ سے اس کے ماننے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ "تقویٰ" و "مجاہدہ" کے نتائج وآثار کے سوا، فطرۃً سیدنا الامام الکبیر "اس" قوت قدسیہ" سے بھی سرفراز تھے اور یہ بھی "الخلاق العلام" ہی کی داد کی ایک شکل ہے،

بات بہت طویل ہوگئی اور ہوتی چلی جارہی ہے، میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ غالب آپ یہ چاہے کوئی جہت ہو، لیکن جو کچھ اب تک آپ کے سامنے پیش کیا جاچکا ہے اس کو دیکھ کر بہرحال یہ تسلیم ہی کرنا پڑے گا کہ جس طرح ظاہری علم اور اس کے لوازم وآثار سے آپ آراستہ تھے، قدرت نے ایسے مواقع آپکے لئے پیدا کئے، اور ایسے رجحانات آپ میں ڈالے گئے کہ باطنی اور معنوی کمالات سے بھی اپنی استعداد وجبلت کے مطابق آپ کو کافی اور غیر معمولی حصہ ارزانی ہوا، عملاً وعلماً ان باطنی کمالات کے شواہد وبینات آپ سے تجلی ریز تھے، اور وہی مستقبل کا سوال پھر سامنے آتا ہے کہ کمالات کی اس ہر جہتی دولت کے ساتھ کدھر جاتے ہیں، اور اس عزیز قیمتی سرمایہ کو کس کام میں لگاتے ہیں، اپنے تعلیمی رفقا اور مدرسہ کے ساتھیوں کو اس زمانہ کے طلائی ونقرئی چراگاہوں میں چرتا ہوا چھوڑ کر مدرسہ سے نکلنے کے بعد بصد شان استغنا مسکراتے ہوئے جو آگے نکل گیا تھا بھلا "ھو" کے مرکان سے مربوط ہونے کے بعد اسی کے متعلق اب ان قصوں کے تصور کی کیا گنجائش باقی تھی، جن کے امکانات کا ذکر کرنے والوں نے اپنی کتابوں میں تذکرہ کیا ہے، پہلے بھی اس سلسلہ کی بعض چیزیں گزر چکی ہیں، مطلب یہ ہے کہ ہمارے مصنف امام نے ایک موقعہ پر اپنی کتاب میں یہ ارقام فرمایا کہ

"ملک ومال کے جھگڑے اگر (حضرت نانوتوی اپنے) سر رکھتے تو یہ صورت ہی کیوں ہوتی کہیں کے ڈپٹی کلکٹر، یا صدر الصدور ہوتے" ص۳۱

اس بات کی جو شہادت ادا کی ہے کہ ڈپٹی کلکٹری، یا صدر الصدوری، جو اس زمانہ میں ستم دیدہ مسلمانوں کے دنیاوی اوج واقبال کا ذروہ کمال اور آخری نقطہ عروج تھا، نئی قائم شدہ برطانوی حکومت میں ان

عہدوں تک پہونچنے کے کھلے ہوئے امکانات حضرت والا کے لئے موجود تھے، یا امکان سے بھی آگے بڑھ کر ارواح ثلاثہ میں امیر شاہ خاں صاحب کے حوالہ سے یہ اطلاع جو درج کی گئی ہے کہ

"بھوپال سے (غالباً نواب صدیق حسن خاں صاحب کی طرف سے) مولٰنا (نانوتوی) کی طلبی آئی اور پانچسو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کی" ص۱۶۷ ارواح

ظاہر کے بعد باطن کے کمالات سے معمور اور ان ہی کمالات سے سرشار و مخمور ہونے کے بعد ان چھچھورے جذبات اور پست رجحانات کا تو احتمال ہی باقی نہ رہا تھا۔

بقول امیر شاہ خاں مرحوم براہ راست خاکسار نے ان سے یہ بات سنی تھی کہ حافظ کے شعر

غلام نرگس مست تو تاجدار انند

کے متعلق ایک دفعہ سیدنا الامام الکبیر فرمانے لگے کہ "تیری نرگس مست کے غلام بادشاہ ہیں" مطلب اس شعر کا عام طور سے جو سمجھا جاتا ہے، اس سے زیادہ دل آویز پہلو اسی مصرعہ کے مطلب کا یہ ہو سکتا ہے کہ وہی تاجدار اور بادشاہ ہیں، جو تیری نرگس مست کے غلام ہیں، شاید لپنے احساس اور وجدان ہی کو حافظ کے اس مصرعہ کی طرف منسوب فرمایا جا رہا تھا؛ جس کی یافت و شہود کا یہ رنگ ہو کر کسی کی نرگس مست کی غلامی ہی میں اسے بادشاہی منحصر نظر آ رہی ہو اس کی نگاہوں میں درہم و دینار کی عبدیت و غلامی سے پیدا ہونے والی بادشاہی کی خود ہی سوچنا چاہئے کہ کیا قدر و قیمت باقی رہ گئی

پس وہ اونچے ہو چکے تھے اور بہت زیادہ اونچے، اتنے اونچے کہ اتنی بلندیوں تک رسائی اس عہد میں اگر ان کی ذات کے ساتھ محدود ہو کر نہ رہ گئی ہو، تو اتنا بہرحال ماننا ہی پڑتا ہے کہ کم ہی ہونگے جنھیں ان بلندیوں کا ذاتی تجربہ اس زمانہ میں حاصل ہوا ہوگا، لیکن جیسا کہ کہا گیا ہے "ھو" والے مکان کی جس چوکھٹ اور درگہ تک پہونچنے میں وہ کامیاب ہوئے تھے، اس کے نہ طول ہی کی کوئی انتہا ہے اور نہ عرض کی اور عمق بھی جس کی انتہا ہے، قرآن میں یہ خبر دیتے ہوئے کہ جنت سے نکلنے کی خواہش یا آرزو جنتیوں میں نہ پیدا ہوگی یعنی قرآنی الفاظ لا یبغون عنہا کا جو ترجمہ ہے دوسرے لفظوں میں مطلب جس کا یہ ہے کہ اکتا جانے کی کیفیت بہشتی زندگی میں بہشت کے رہنے والے

اپنے اندر کسی زمانہ میں محسوس نہ کریں گے، کیوں نہ محسوس کریں گے، اسی کی طرف اشارہ اس واقعہ کا ذکر کر کے غالباً قرآن میں کیا گیا ہے کہ کلمات رب جن کے تکوینی مظاہر کے مجموعہ کا نام جنت ہے رب کے ان کلمات کی نہ حد ہے نہ انتہا، سمندروں کے پانی کو بھی روشنائی بنا کر ان کلمات کو کوئی لکھنا چاہے تو پانی سمندروں کے خشک ہو جائیں گے، رب کے ان کلمات کی لامحدودیت پھر بھی باقی ہی رہے گی۔

بہرحال میں کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن اپنے دل کی بات کس طرح ادا کروں، وہ ادا بھی ہو گی یا نہ ہو گی، تاہم کوشش کرتا ہوں، لغزش کی معافی سب سے پہلے اس سے چاہتا ہوں جس کے سامنے اپنی لغزشوں میں آدمی حقیقۃً ذمہ دار ہے، اور ان سے بھی اغماض و چشم پوشی کا خواستگار ہوں جن تک اپنی تعبیری قوت کے ضعف کی وجہ سے شاید صحیح مطلب پہونچانے میں ناکام رہوں، مقصد یہ ہے کہ پھل سے درخت کو پہچانئے، یا درخت سے پھل کو شناخت کرنے کی کوشش کیجئے، الغرض لمّی طور پر دیکھا جائے یا انّی طور پر سوچا جائے، قرآن نے انسانی وجود کو خالق تعالیٰ جل مجدہ کی خلافت کی نمائش گاہ جو قرار دیا ہے، اور فرمایا گیا ہے کہ پیدا کرنے والے کے دونوں ہاتھوں کی کاریگری کا انسان نمونہ ہے، اس میں روح بھی اپنی رب نے پھونکی ہے، جس کا مطلب سمجھانے والوں نے یہی سمجھایا ہے کہ جمال و جلال دونوں قسم کی صفات کے ساتھ حق تعالیٰ نے اپنی ذات کا نمائندہ آدمی کو بنایا ہے، تخلیقی و ارتقائی کمالات کا مظہر اتم قدیم و جدید افکار میں انسان کو جو ٹھہرایا گیا ہے، اس کا یہی مطلب ہے، اور آدم کو خدا نے اپنی صورت پر بنایا، قدیم کتابی روایات، اور اسلام کی جدید روایات کے اس فقرے کا حاصل بھی کہتے ہیں کہ یہی ہے، یہی انسان کا ماعلیہ یا وہ قالب یا سانچہ ہے جس پر وہ پیدا ہوا ہے، لیکن اسی کے ساتھ قرآن ہی نے اعلان کیا ہے کہ دینے والے نے دوسروں کو جو کچھ بھی دیا ہے بمدہبہ و عطیہ دیا ہے، الا ایک الانسان جس نے ان سارے کمالات کو جن کا ذکر کیا گیا، بمدامانت قبول کیا ہے، امانت ہی نے اس پر یہ ذمہ داری عائد کی کہ بجائے اپنی خواہش اور اپنے ارادے کے اس امانتی سرمایہ میں اس کی مرضی اور اس کے

حکم کا پابند رہے، جس کی طرف سے بطور امانت یہ سرمایہ اس کے سپرد ہوا ہے، ماعلیہ یعنی جس قالب پر وہ پیدا ہوا ہے اس کے مقابلہ میں انسانی وجود کی پیدائش کی غرض لیعبدون (تاکہ وہ عبادت کرے) قرار دے کر قرآن میں مالہ یعنی جس مصلحت کے لئے آدمی پیدا کیا گیا ہے، بجائے خلافت کے عبدیت اور بندگی جو ٹھہرائی ہے، یہی ماعلیہ اور مالہ کی کش مکش ہے، جس میں انسانی فطرت مبتلا ہے، جس سانچے اور قالب پر وہ پیدا ہوا ہے، اور جو اس کا ماعلیہ ہے اقتضا اسی کا یہ ہوتا ہے کہ خدائی شانیں اس سے ظاہر ہوں، سب اس کی تعریف کریں، اس کی حمد کا گیت گائیں، سب کا وہ محمود بنا رہے، بلکہ آگے بڑھ کر یہ بھی کہ سب اسی کے آگے جھکے رہیں، سب کا یہ معبود بنا رہے، اس قسم کے الوان نفسیات انسانی کے اسی ماعلیہ کے آثار اور اسی کی لہریں ہیں، جو اس کے اندر رہ رہ کر اٹھتی رہتی ہیں، لیکن جب اسی کے مقابلہ میں مالہ اور اس مقصد وغایت کے اقتضاؤں کا زور بندھتا ہے جس مقصد وغایت کے لئے پیدا کرنے والے نے انسان کو پیدا کیا ہے تب وہی جو سب کچھ بنا چلا جا رہا تھا یا چاہتا تھا کہ سب کچھ بن جائے، دیکھا جاتا ہے کہ کچھ بھی باقی نہ رہے، اسی کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے، اور اپنے قدموں پر جو چاہتا تھا کہ سب کو جھکائے، نظر آتا ہے کہ وہی اب جھکا ہوا ہے، گڑگڑا رہا ہے، اور ہوش و تمیز کے آغاز سے اس وقت تک جب تک احساسات ساتھ دیتے ہیں دن کے چوبیس[۲۴] گھنٹوں میں غریب انسان اپنے "مالہ و ماعلیہ" کی ان ہی کش مکشوں میں غلطاں پیچاں رہتا ہے، وہی نہیں، جنھوں نے نہیں مانا ہے، بلکہ

| یا قوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ | اے میری قوم اللہ کی بندگی کر، تمہارے لئے اس کے سوا کوئی معبود دوسرا نہیں ہے۔ |
|---|---|

کے آسمانی پیغام کا اعادہ آغاز انسانیت سے آخر وقت تک پیدا کرنے والے کی طرف سے بنی آدم کی آبادیوں میں جو مسلسل کرتے رہے ہیں اللہ کے ان برگزیدوں، خالق کائنات کے ان رسولوں کے ماننے والوں، اور ان کے اسی اتفاقی و اجماعی پیغام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کرنے والوں میں، اگرچہ یہی جانا بھی جاتا ہے

اور یہی مانا بھی جاتا ہے، کہ خواہ کسی قالب کسی سانچے یا تقویم پر آدمی پیدا کیا گیا ہو، اس کا ماعلیہ چاہے کچھ ہی ہو لیکن مطالبہ اور مواخذہ دار و گیر، پوچھ گچھ کا بالکلیہ تعلق انسانی وجود کے قدرتی حالہ عبدیت و بندگی ہی سے ہم پوچھے جائیں گے۔ اور جزا پائیں یا سزا، اپنے اسی مقصد حیات ہی کی بنیاد پر پائیں گے۔

لیکن ان میں بھی ان کو نصیبوں، سیاہ بختوں کے سوا جو خدا کا نام لے کر اپنی خودی کے لئے خدائی خوراکوں کی تلاش میں سرگرداں نظر آ رہے ہیں، ان ہی خوراکوں کی بھیک ممبروں اور پنڈالوں کی بلندیوں سے مانگنے میں نہیں شرماتے، مسجد کی محرابوں میں بھی اسی اذوقہ کا ذوق ان پر مسلط رہتا ہے، اور خانقاہوں کے تاریک حجروں میں بھی اسی کو ڈھونڈھتے ہیں، وہ اپنی خودی کو محمود بنانے کے لئے خدا کی حمد کا ترانہ گاتے ہیں، اور خدا کی عبادت کی دعوت اس لئے دیتے ہیں تاکہ ان کی خودی کو معبودیت کا سرور حاصل ہو، خود پوجے جائیں، اس لئے خدا کی پوجا کا چرچا کرتے پھرتے ہیں، ان غریبوں کو تو تبلی السرائر کے دن والی فقد قیل کی ان ہتھوڑیوں ہی کے سپرد کیجئے۔ جو ان کی اندرونی آلائشوں کو باہر نکال کر رکھدیں گی اور وہ سب اگلوا لیا جائے گا۔ جو کچھ انھوں نے نگلا تھا لیکن ان کے سوا بھی ان باطنی آلائشوں سے پاک رکھنے میں جن کی سرگرمیاں امتیاز کی نظروں سے دیکھی گئی ہیں، اور خود اپنے نزدیک بھی تزکیہ، تصفیہ کی کوششوں میں اپنی توانائیوں کو جو صرف کرتے رہے ہیں، یہی بات تو یہی ہے کہ نفسیات انسانی کا قرآنی آئینہ

| بل الانسان علی نفسه بصیرة ولو القی معاذیره | بلکہ انسان اپنی اندرونی بات خود جانتا ہے گو دوسروں کے سامنے اپنے اعذار پیش کرتا ہے |
|---|---|

ان کے سامنے نمایاں کر سکتا ہے کہ وہ کس حد تک اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئے، یا پھر لا تخفی منکم خافیۃ رنہ چھپی رہے گی تم سے کوئی چھپی بات) کی منزل میں آدمی جب داخل ہوگا، اس وقت کامیابی اور ناکامی کا راز کھل کر سامنے آجائے گا۔

تاہم دن کی روشنی اگر بتا سکتی ہے کہ افق پر آفتاب نمایاں ہو چکا ہے، اور دھوئیں کو دیکھ کر پتہ چلایا جا سکتا ہے کہ وہاں آگ ہے، اور اس راہ سے بھی حقیقت کا سراغ کسی نہ کسی حد تک اگر لگایا جا سکتا ہے تو میں آپ کے سامنے واقعات و شواہد کی ایک فہرست پیش کرتا ہوں، ان کو دیکھئے اور سوچئے، میں

خیال کرتا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر کا قدم آئندہ مستقبل میں جس رخ کی طرف آخر وقت تک مسلسل بڑھتا ہی چلا گیا، شاید اس کا کچھ اندازہ ان ہی واقعات وشواہد کی روشنی میں بآسانی کسی غیر معمولی حسن ظن کا سہارا لئے بغیر انشاء اللہ لگایا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ مستقبل کا یہ سوال آپ کی زندگی کی جس منزل پر پہونچ کر اٹھایا گیا تھا اس وقت عام دستور اور رواج کے مطابق آپ ایک باضابطہ سند یافتہ عالم ہونے کے ساتھ ان کمالات و خصوصیات کو بھی حاصل کر چکے تھے، جن کے حاصل کرنے والوں کو صوفی اور درویش صاحب دل سالک وغیرہ اصطلاحی القاب و خطاب کا مستحق سمجھا جاتا ہے دلی کے وہی سید جمال الدین صاحب جنہوں نے سو رسالے سو مختلف علوم وفنون میں ارقام فرمانے کی فرمائش آپ سے کی تھی، اپنے شائع کردہ مکاتیب کے دیباچہ میں حضرت والا کے اسم مبارک کو درج کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"مولوی حافظ حاجی محمد قاسم صاحب صدیقی، نانوتوی حنفی چشتی مرحوم زمانہ کے امام حدیث ہونے کے سوا تصوف میں صوفی صافی" ص۲ جمال قاسمی

یوں بھی اس زمانہ کی پرانی تحریروں میں لوگ مولانا کے ساتھ "شاہ" کے لفظ کا اضافہ اسم گرامی میں جو کرنے لگے تھے اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ دونوں پہلوؤں کی جامعیت کا اعتراف ان الفاظ سے کیا جاتا تھا، آخر جن علمی و عملی مشاغل میں آپ کی زندگی گذر رہی تھی، ان کو دیکھ کر دیکھنے والے آپ کو جو کچھ سمجھنے اور کہنے لگے تھے اس کے سوا اور کیا سمجھتے اور کیا کہتے خطاب و القاب کے مذکورہ عام رواجی الفاظ کے لئے جو کچھ چاہیئے تھا، کون سی بات باقی رہی تھی جو آپ میں نہ پائی جاتی تھی، مگر مدرسہ میں پڑھائے جانے والے علوم جن کو پڑھ کر فارغ ہونے والے مولوی اور مولانا وغیرہ کے ناموں سے موسوم ہوتے ہیں، ان علوم کی حد تک تو کبھی کبھی سننے والوں نے اس قسم کے فقرے آپ کی زبان مبارک سے سن بھی لئے ہیں، پہلے بھی کسی موقعہ پر اس کا ذکر آچکا ہے، یعنی فرماتے کہ

"مولویت کا دھبہ مجھ پر لگا ہوا ہے۔" ص۱۷۶ ارواح

لیکن اس "دھبہ" اور "داغ" کی پروا بھی عملاً کس حد تک کی جاتی تھی اس کا اندازہ اسی واقعہ سے

ہوسکتا ہے، جس کے متعلق یہ فقرہ زبان مبارک پر جاری ہوا تھا، عرض کرچکا ہوں کہ بغیر مزامیر و ساز کے ایک غیر پیشہ ور خوش گلو آدمی خورجہ کے رہنے والے رن مست خاں ... مولوی عبداللہ صاحب گلاؤٹھی والے کے اشارۂ چشم سے حافظ کی غزل کا مطلع

غلام نرگس مست تو تاجدار انند

الاپنے لگے تھے۔ حضرت والا کو یہ بات ناگوار گذری، اور ناگواری کی توجیہ فرماتے ہوئے "مولویت" کے اس دھبہ کا ذکر اتفاقاً فرمادیا گیا تھا۔

اس قسم کا سادہ غنا اگرچہ مولویوں کے عام طبقہ میں بھی چنداں محل شناعت و ملامت نہیں ہے، لیکن مولویوں میں ایک گروہ گانے کی اس سادہ ترین شکل کو بھی جائز نہیں سمجھتا، جہاں تک میرا خیال ہے، اسی طبقہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ نے اپنی مولویت کے "دھبہ" کا یہاں تذکرہ فرمایا تھا، واللہ اعلم بالصواب۔ ہے تو ایک جزئی واقعہ لیکن بظاہر اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ علماء کا جس مسئلہ میں اختلاف ہو، خواہ دلائل کے لحاظ سے اس اختلاف کی نوعیت جیسی کچھ بھی ہو، لیکن شاید آپ کا یہ دینی مذاق تھا کہ اختلاف کی صورت میں اسی پہلو کو اختیار فرماتے تھے جس سے احتیاط کے تقاضوں کی بھی تکمیل ہوتی ہو، اور یہ الزام بھی عائد نہ ہو، کہ علماء کے فتویٰ کا احترام نہ کیا گیا۔

آخر میں پوچھتا ہوں کہ غنا کی مذکورہ بالا سادہ ترین شکل کو علماء کا جو طبقہ ناجائز نہیں سمجھتا، وہ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ ثابت کرسکتا ہے تو غایت مافی الباب اس سے زیادہ تو کوئی بات ثابت نہیں ہوسکتی کہ شریعت کی رو سے اس قسم کا "گانا" جائز ہے، مباح ہے، یعنی اس کے سننے والوں کو گنہگار نہیں قرار دیا جاسکتا، لیکن اس قسم کے گانے کا سننا شرعاً فرض ہے، یا واجب، یا فرض و واجب نہ سہی، مستحب تک اس قسم کے گانے کو بھی شرعی دلائل کی بنیاد پر ثابت کرنا ناممکن ہے، برخلاف اس کے مطلق گانا خواہ کسی شکل میں ہو، علماء کا جو طبقہ اس کو ناجائز قرار دینے کا فتویٰ دیتا ہے، دلائل و براہین کے لحاظ سے ان کے فتویٰ کی نوعیت کچھ ہی ہو مگر ان کے اس فتویٰ کی بنیاد پر اس گانے کے سننے والے شرعاً جرم کے مجرم بھی قرار پاتے ہیں، اور اسی کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ علماء کے

اس فتوی کی انھوں نے پروانہ کی لیکن نہ سننے والوں کو آپ کیا کہہ سکتے ہیں، یقیناً ان پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ سماع کی مذکورہ بالا شکل کے جواز و اباحت کا جن علماء نے فتوی دیا ہے، تم نے ان علماء کے فتوی کو بے وقعت ٹھہرا کر ٹھکرا دیا، کیونکہ جواز و اباحت کے فتوی کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ فعل کے ہر دو پہلو پر عمل کرنے کا اختیار ہے۔ پس جس نے سنا اس نے بھی اسی فتوی پر عمل کیا اور جس نے نہ سنا، یقیناً اس نے بھی اباحت و جواز ہی کے اس فتوے کی تعمیل کی سعادت حاصل کی، اسی کے ساتھ احتیاط کے تقاضے کی تکمیل کا ثواب بھی نہ سننے ہی کی صورت میں محفوظ رہتا ہے

بہر حال جیسا کہ میں نے عرض کیا' گانے کا یہ قصہ اگرچہ ہے تو ایک اتفاقی اور جزئی واقعہ لیکن مولویت کے جس "ذھبہ" کی رعایت کا ذکر اس موقعہ پر فرمایا گیا ہے۔ اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے، کہ علاوہ احتیاط کے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ چاہتے تھے کہ مولویوں کے احترام کے منافی کوئی فعل آپ سے سرزد نہ ہو، لیکن اس ذوق اور رجحان میں کارفرما جذبہ کیا اس علمی رشتہ کا خیال تھا، جو مولویوں کی برادری سے آپ رکھتے تھے، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ جماعتی عصبیت کا کیا یہ نتیجہ اور ثمرہ تھا؟ سرسری نظر سے اسی کا خطرہ دلوں میں پیدا ہو سکتا ہے۔ مگر آپ کو اسی سلسلہ کا ایک اور واقعہ سناتا ہوں، عجب واقعہ جس وقت پہلی دفعہ اس واقعہ کا علم مجھے ہوا، تو تھوڑی دیر تک کچھ متحیر سا ہو کر رہ گیا، لیکن یہ تحیر اسی عام مغالطہ کا نتیجہ تھا کہ پاکوں کے کام کو ہم جیسے ناپاک لوگ اپنے کام سے ناپتے اور اسی پر قیاس کر کے اس کو سمجھنا چاہتے ہیں؛

بات یہ ہے کہ حضرت والا کی منجملہ بہت سی خصوصیتوں کے ایک بڑی مشہور خصوصیت آپ کی نرم مزاجی اور حد سے زیادہ مروت تھی، انشاء اللہ اپنے موقعہ پر ان کے تفصیلی نمونے بھی آپ کے سامنے آئیں گے، یہاں اجمالی اندازہ کے لئے اتنی بات کافی ہو سکتی ہے کہ فرض و واجب تو نہیں لیکن اس قسم کی نمازیں جیسے چاشت و اشراق وغیرہ نفلی نمازوں کا حال ہے بالاتفاق تقریباً تواتر کے رنگ میں لوگوں سے یہ روایتیں نقل کی جاتی ہیں کہ دوسروں کے خیال سے آپ

ان نفلی نمازوں کو بھی ترک فرمادیا کرتے تھے، حالانکہ آپ کے شبانہ یوم کے مشاغل میں یہ نمازیں شریک تھیں اس کے راویوں میں حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں؛ اور امیرشاہ خاں کی طرف یہ روایت جو منسوب کی گئی ہے، اگر صحیح ہے، یعنی یہ کہتے ہوئے کہ

"حضرت نانوتوی کو حرام کے طعام سے جیسے نفرت تھی، ویسے ہی، اس کا احساس بھی بہت جلد کرتے تھے"

لیکن اسی کے ساتھ اپنی فطری مروت اور نرم مزاجی کی وجہ سے کسی کی خاطر شکنی بھی آپ کے لئے ناقابل برداشت تھی، پھر جانتے ہیں ان دو متضاد کیفیتوں میں تطبیق کی عملی صورت کیا اختیار فرمائی جاتی تھی، مذکورہ بالا تمہید کے بعد خان صاحب بیان کیا کرتے تھے کہ ـــ

"مگر دعوت بوجہ دلداری، ہر ایک کی منظور فرمالیتے تھے"

اور اس "دلداری" کے سلسلے میں جیسا کہ چاہئے تھا بعض اوقات ناجائز یا مشتبہ آمدنی رکھنے والوں کی دعوتوں میں شریک ہونے پر آپ کو مجبور ہونا پڑتا تھا۔ شریک بھی ہوتے تھے اور دعوت کرنے والے کی تسلی کے لئے کچھ تناول بھی فرمالیتے تھے، لیکن گھر پہونچ کر خان صاحب کی شہادت ہے کہ

"قے کرتے تھے" ص۱۷۱

اب ایک طرف آپ حضرت والا کی اس فطری خصوصیت کو پیش نظر رکھئے، اور اسی کے ساتھ جیسا کہ معلوم اور دستور ہے، طریقت کے شیوخ اور بیعت کے پیروں کے ساتھ لوگوں کے تعلقات کی کیا نوعیت ہوتی ہے، پھر جو تعلق حضرت والا کو اپنے محبوب شیخ طریقت سیدنا حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تھا، شاید وہ اپنی آپ نظیر تھا، غیر معمولی احترام و عظمت سے لبریز الفاظ بے ساختہ اپنی کتابوں میں حاجی صاحب قبلہ کے متعلق جو نکل آتے ہیں، وہ آج بھی ہر ایک کے سامنے ہیں، خیر بجائے خود یہ ایک الگ مسئلہ ہے، مستقل باب ہی انشاء اللہ اس کے لئے منعقد کیا جائے گا، یہاں صرف حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان

کردہ یہ روایت مقصد کے لئے کافی ہوگی؛ قصص الاکابر میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت حاجی امداداللہ رحمۃ اللہ علیہ کے عطا فرمودہ مسودہ کو مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نقل کر رہے تھے

"اس میں (یعنی حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ارقام فرمودہ مسودہ میں) ایک لفظ سہواً غلط لکھا گیا تھا"

غلط بھی تھا، اور سہواً لکھا گیا تھا، نقل کرنے والے سے زیادہ سہو سے لکھی ہوئی اس غلطی کی تصحیح کا جائز استحقاق اور کسے حاصل تھا، لیکن سہواً یہ غلطی جس کے قلم سے نکلی تھی وہ ان کے پیرو مرشد سیدنا حضرت حاجی امداد اللہ کا قلم مبارک تھا، جانتے ہیں کہ سہواً لکھی ہوئی اس غلطی کے ساتھ نقل کرنے والے فاضل کو باوجود جاننے کے تصحیح کی جرأت نہ ہوسکی مولانا تھانوی فرماتے تھے کہ

"مولانا (محمد قاسم) نے صحیح نہیں کیا، ادب کی وجہ سے"

پھر کیا کیا ان ہی کا بیان ہے کہ

"بلکہ وہاں جگہ چھوڑ دی"

اور اسی شکل میں یہ نقل کیا ہوا مبیضہ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں پیش فرمادیا گیا (اور چھوٹے ہوئے لفظ کے بارہ میں عرض کیا کہ حضرت یہ لفظ سمجھ میں نہیں آیا حضرت حاجی صاحب نے لفظ دیکھ فرمایا کہ اوہو بھائی یہ املا کی غلطی رہ گئی اور یہ کہہ کر اس لفظ کو (محمد طیب عفی عنہ نقلاً عن الشیخ مولانا حبیب الرحمٰن العثمانی رح)

"حضرت حاجی صاحب نے درست فرمادیا" (الہادی ماہ جمادی الاولیٰ ۵۰ھ)

مگر اب سنئے اس واقعہ کو جس نے مجھے تھوڑی دیر کے لئے متحیر بنادیا تھا، اس کے راوی بھی حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ہی ہیں، براہ راست حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے سن کر اس واقعہ کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے، قصص الاکابر میں یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ پائی جاتی ہے، حکیم الامت رح نے فرمایا کہ

"حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ مولوی محمد قاسم صاحب سے جو کچھ میں نے

تقریراً یا تحریراً کہا انھوں نے ہمیشہ خوشی سے قبول کیا"

بیسیوں سال کے تعلقات میں خوشی کے ساتھ ہمیشہ قبول کرنے کی اس شہادت کے بعد حاجی صاحب نے فرمایا کہ

"مگر ایک دفعہ ایسا کورا جواب دیا کہ میں دیکھتا رہ گیا"

ساری زندگی میں صرف ایک دفعہ کورے جواب کی جو صورت پیش آئی اسی کا تذکرہ اس وقت میرا مقصود ہے یہ کورا جواب جس فرمائش کے مقابلہ میں دیا گیا وہی سننے کا واقعہ ہے، حاجی صاحب نے فرمایا کہ ہوا یہ تھا کہ

"نواب محمد علی صاحب[1] رئیس ٹونک نے بعد معزولی مکہ معظمہ میں حرم شریف میں بخاری شریف کا ختم کرانا چاہا"

---

[1] ریاست ٹونک کے بانی نواب امیر خاں مرحوم کے پوتے کا نام محمد علی خاں تھا' سنا جاتا ہے کہ جسمانی کمالات کے ساتھ علوم دینی سے بھی بہرہ یاب تھے، گدی پر بیٹھنے کے بعد دماغ میں آزادی کی ہوا سمائی، ٹونک کی ایک گمنام مختصر سی سرحدی ریاست لاوا نامی سے ٹونک والوں کی کش مکش برسوں سے جاری تھی، لیکن انگریزوں کے دباؤ کی وجہ سے قلع قمع کرنے کا فیصلہ آسان نہ تھا' محمد علی خاں مرحوم سے یہی غلطی سرزد ہوئی، اپنی فوجی طاقت سے لاوا کی ریاست کو انھوں نے تہ و بالا کر دیا' بہت سے آدمی مارے گئے، انگریزوں کی طرف سے پوچھ گچھ ہوئی جس کے منتظر ہی بیٹھے تھے، کہتے ہیں کہ جواب اعلان جنگ کے ساتھ انگریزوں کو بھی نواب بے چارے نے دیا۔ ٹونک کا انگریزی فوج نے محاصرہ کر لیا۔ نواب کے سوا ریاست کے دوسرے ارباب بست وکشاد ناعاقبت اندیشی کے اس فیصلے سے جو نواب صاحب نے اعلان جنگ کی صورت میں کیا تھا، ناراض تھے، نواب نے اپنے فوجی اور سول حکام کو بلا کر مقابلہ کا حکم دیا۔ جواب دیا گیا کہ آپ کی فوج انگریزوں سے لڑنے کو تیار نہیں ہے، ہکا بکا ہو کر رہ گئے، اور انگریزوں کے حوالہ اپنے آپ کو کر دیا۔ انگریزوں نے صرف اتنی سزا پر اکتفا کیا کہ گدی سے ان کو اتار دیا۔ اور کچھ ماہوار ریاست سے جاری کر کے حکم دیا کہ زندگی کے باقی دن بنارس میں گذاریں۔ معزولی کے بعد نواب نے بحالی کی کوششوں میں وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتے تھے، لیکن کامیابی نہ ہوئی' ان ہی کوششوں کے سلسلے میں غالباً یہ کوشش بھی تھی جس کی طرف حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بیان میں اشارہ کیا ہے، تاہم دینی علوم سے چونکہ نواب صاحب کو مناسبت تھی اس لئے لغت حدیث میں مجمع البحار اور بخاری کی فارسی شرح وغیرہ بھی ان کے مصارف سے اسی زمانہ میں شائع ہوئی، اور بنارس میں اسلامی علوم و فنون کے مخطوطات و مطبوعات کا ایک نادر ذخیرہ فراہم ہوا، جو ان کی وفات کے بعد ٹونک منتقل ہوا' پہلے تو اس کتب خانہ کا نظم ان کے چھوٹے صاحبزادے عبدالرحیم خاں مرحوم کی نگرانی میں بہت اچھا اور معقول تھا' اب اس کتبخانہ پر کیا گذری واللہ

اپنی اس آرزو کو نواب صاحب مرحوم نے حضرت حاجی صاحب قبلہ تک پہونچایا، انھوں نے لکھوا دیا کہ اس کا نظم کر دیا جائے گا' اس کے بعد بخاری پڑھنے کی صلاحیت. رکھنے والے دوسرے حضرات سے جہاں حضرت حاجی صاحب نے اس وعدہ کی تکمیل کی فرمائش کی، اسی سلسلہ میں سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ جو اتفاقاً اس زمانہ میں مکہ معظمہ ہی میں تھے، یہ کہا کہ

"میں وعدہ کر چکا ہوں آپ بھی ختم میں شریک ہو جائیں"

حضرت نانوتوی کی جن خصوصیات کا اجمالی تذکرہ کر چکا ہوں، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے سوچئے مشتبہ اور ناجائز آمدنی رکھنے والے مسلمانوں کی دل شکنی بھی جو برداشت نہیں کر سکتا تھا، "تقے" کی مصیبت کا خرید لینا اس سے زیادہ آسان جس کے لئے تھا وہی آج کسی معمولی آدمی سے نہیں بلکہ اپنے اسی پیر و مرشد سے جس کے تحریری و تقریری احکام کی تعمیل ہی میں پیر و مرشد ہی کی شہادت کے مطابق ساری زندگی بسر ہوئی تھی، اسی سے یہ عرض کرتا ہے، کہ

"حضرت میں نے بخاری اس لئے نہیں پڑھی تھی" (ص۲۵ الہادی صفر ۵۰ھ)

انکار و عدم تعمیل کی یہ عجیب و غریب شکل جس میں ہزاروں اقرار کی روح پوشیدہ تھی، اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلے دنیا کے سب سے بڑے مطاع صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بہ مقام حدیبیہ ایک سراپا اطاعت اور مجسم فرماں پذیری کی طرف سے اس وقت پیش ہوئی تھی، جب حکم دیا گیا تھا کہ "رسول اللہ" کا لفظ میرے نام "محمد" کے بعد جو لکھا گیا ہے، اسے مٹا دو، لیکن سب سے بڑے مطاع کے اس حکم کی تعمیل سے انکار کر کے کہ یہ ثابت کیا تھا کہ اس سے بڑا اقرار کرنے والا کوئی نہیں ہے، کچھ اسی سنت کا احیاء و اعادہ ایک امتی مطیع کی طرف سے اپنے مرشد مطاع کے آگے کیا جا رہا تھا' عدم تعمیل کے قالب میں تعمیل حکم کی روح جس دل آویز طریقہ سے اس وقت پیش کی گئی تھی کہ جس کے حکم کی تعمیل سے انکار کیا گیا تھا' وہی اس کو رے جواب کے متعلق یہ فرماتے ہوئے کہ "میں تو دیکھتا رہ گیا" آخر میں حضرت تھانوی سے انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ

"میرے اوپر اس کا بڑا اثر ہوا"

آخر اس کا اثر نہ ہوتا تو کس کا ہوتا، پیری و مریدی تعلیم و تربیت، سیر و سلوک، کے ان سارے قصوں کا مطلب ہی اس کے سوا کیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جھنڈا سب سے اونچا رہے، بلندی صرف اللہ ہی کے کلمہ کی ہو، انکار کی شکل میں جس اقرار کی روح آج جلوہ گر ہوئی تھی، اس سے بہتر نمونہ اس سلسلے میں اور کیا پیش ہوسکتا تھا کہ والی ریاست کی دولت کی پروا تو کیا کی جاتی، جو خود ان کا والی، آقا اور مالک تھا، اپنے آپ کو اس کے حکم کی تعمیل سے بھی اس لئے قاصر، و معذور بتایا جا رہا تھا کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی عزت و وقار کا سوال دامن کش ہے:

بہرحال میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ بقول اپنے مولویت کے جس "دھبہ" کا نمود، وظہور دانستہ یا نادانستہ طور پر سیدنا الامام الکبیر سے ہوجاتا تھا، اس کے متعلق طبقاتی حمیت، یا جماعتی جنبہ داری کے جذبہ کا خیال بڑا پست خیال ہوگا، انکار کی شکل میں اقرار کے جس واقعہ کا ابھی ذکر کیا گیا، اس کو سامنے رکھتے ہوئے میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ علماء کے احترام و عظمت کا سوال آپ کے سامنے آبھی جاتا تھا، تو اس کا تعلق خود علماء سے نہیں بلکہ اس علم سے تھا، جس کی عزت و وقار کے مقابلہ میں آپ نے اس حکم کی تعمیل سے بھی اپنے آپ کو معذور ظاہر کیا، جسکی تعمیل ہی میں ساری عمر گذری تھی، اور زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ناز وہی سعادت تھی جو اس حکم کی تعمیل میں میسر آجاتی تھی۔ اور کچھ اسی قسم کی دینی غیرت دینی علوم کی حمیت ہی کا شاید وہ اضطراری تقاضا تھا، جو ریاست رامپور میں ظاہر ہوا تھا،

قصہ تو بہت طویل ہے، ارواح ثلاثہ میں مولوی حمید الدین سنبھلی مرحوم کے حوالہ سے بھی بروایت مولانا حبیب الرحمن یہ قصہ نقل کیا گیا ہے، نیز حضرت تھانوی کے ملفوظات قصص الاکابر میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے، حاصل یہ ہے، کہ کسی صاحب سے ملنے کے لئے سیدنا الامام الکبیر ایک دفعہ رامپور[1] تشریف لے گئے، رامپور شمالی ہند میں اس وقت مغلی تہذیب و تمدن کا لکھنؤ کے ختم ہوجانے

[1] حضرت تھانوی کے بیان میں رامپور کے ساتھ "افغانان" کا لاحقہ بھی شریک ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ضلع سہارنپور کے نواح میں بھی رامپور نامی جو قصبہ ہے، جیسے امتیاز کے لئے اس کا ذکر کرتے ہوئے لوگ "رامپور منہاران" کہتے ہیں اسی طرح اس علاقہ میں ریاست رامپور کی راجدھانی کو "رامپور افغانان" لوگ کہا کرتے تھے ۱۲

کے بعد آخری ملجا رد ماویٰ تھا' مغل دربار منجملہ دوسری چیزوں کے مولویوں کے اس خاص طبقہ کو خاص اہمیت حاصل تھی، جن کا نام اس عہد میں "معقولی" تھا' گرے پڑے، ٹوٹے پھوٹے ان ہی معقولیوں کے لئے رامپور کے سوا شمالی ہند میں کوئی جائے پناہ نہ تھی' خصوصاً مرحوم نواب کلب علی خاں نے مغل دربار کے لوازم و آثار کی حفاظت میں اپنے بس سے زیادہ اولوالعزمی کا اظہار چونکہ کیا تھا' اس لئے ان کے دور میں معقولی علماء کے امام الائمہ مولٰنا عبدالحق خیرآبادی تک رامپور ہی پہنچ گئے، کہتے ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر کے استاذ مولانا مملوک العلی صاحب نے اقلیدس کا جو ترجمہ اردو زبان میں کیا تھا' اس پر

"مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی نے رکیک الفاظ میں اعتراض کئے تھے" ص ۱۹۹

اس اعتراض کی خبریں سیدنا الامام الکبیر تک بھی پہونچتی رہتی تھیں، نیز اسی زمانہ میں "تحذیر الناس" نامی رسالہ کے بعض دعاوی کی وجہ سے بعض مولویوں کی طرف سے خود سیدنا الامام الکبیر پر طعن و تشنیع کا سلسلہ جاری تھا' الغرض کچھ تو ان واقعات کی وجہ سے اور کچھ اس لئے کہ "معقولیت" کا مطلب ہی اس زمانہ میں یہ تھا کہ آدمی بجائے آدمی کے مُرغ بلند بانگ بن جائے، اور اپنی بانگ کے مقابلہ میں کسی دوسرے مرغ کی بانگ اس کے لئے ناقابل برداشت بن جائے، رامپور اس قسم کے بانگ دینے والے مرغوں سے اس زمانہ میں بھرا ہوا تھا' سیدنا الامام الکبیر نے حالانکہ ان ہی وجوہ سے چاہا کہ آپ کی تشریف آوری کی خبر مشہور نہ ہو لیکن مشک کی خوشبو کو عطار بھی تو چھپانے کے باوجود چھپا نہیں سکتا، خبر پھیل ہی کر رہی' مولویوں اور ان کے عقیدت مند تلامذہ میں ہلچل مچ گئی، خود حضرت والا سے کچھ کہنے سننے کی جرأت تو کوئی نہ کر سکا' البتہ آپ کے ساتھ بعض طلبہ بھی تھے، ان کے ساتھ چھیڑ خانیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا' ارواح ثلاثہ میں ہے کہ ایک دفعہ جب آپ کے طالب العلم (مولٰنا احمد حسن امروہی) کو کسی نے چھیڑا، تو حضرت والا نے جھنجھلا کر اس طالب العلم سے کہا کہ

"اگر یہ (احمد حسن) عاجز ہوئے تو میں ان کی مدد کروں گا' اور اگر تم عاجز ہوئے تو تمہارے استاد تمہاری مدد کریں گے، پھر یہ کیوں نہ ہو کہ تم اپنے استاد کو لے آؤ' اور میری

ان سے گفتگو ہو جائے۔" (ص۱۹۵ ارواح)

بات مناظرہ اور مباحثہ والی تو اسی پر ختم ہو گئی، لیکن اسی کے بعد لوگوں نے وعظ گوئی پر حضرت والا سے اصرار کیا راضی ہو گئے، واللہ اعلم بالصواب مولوی حمید الدین سنبھلی[۱] جیسے ثقہ راوی کی طرف یہ الفاظ منسوب کئے گئے ہیں کہ

"شب کو مجلس وعظ کھچا کھچ بھری ہوئی تھی شہر کے امرا و رؤسا، علما، عمائد شہر طلبہ غرض کہ ہر طبقہ کے لوگ بھر گئے تھے، اور لوگوں کا ایک میلا سا لگ گیا تھا"

آخر وہی کہتے تھے کہ

"بس اس دن شاید بچے اور عورتیں گھروں میں رہ گئی ہوں گی، ورنہ کل شہر مجلس وعظ میں آ گیا تھا۔"

یہ بھی ان ہی کا بیان ہے کہ

"شہر کے تمام مشاہیر علماء سوائے مولوی عبد الحق خیر آبادی کے اس وعظ میں موجود تھے" ص۱۹۵

گویا یوں سمجھئے کہ سارا شہر ہی امنڈ آیا تھا، اس دن کی تقریر کے متعلق منشی حمید الدین یہ بھی بیان کرتے تھے کہ

"ایک غیر معمولی جلال اور جوش کی شان سے (وعظ) بیان فرمایا۔"

اس غیر معمولی جلال اور جوش کی شان کے واقعی اسباب کیا تھے صحیح علم تو اس کا علام الغیوب ہی کو ہے، لیکن منشی حمید الدین کا تاثر جیسا کہ وہی کہتے تھے یہ تھا کہ رامپور

"کے طلبہ نے مولوی احمد حسن (امروہی) سے چھیڑ چھاڑ شروع کی تھی"

---

[۱] مخدوم و محترم مفتی عبد اللطیف صاحب سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ و مسلم یونیورسٹی جنھوں نے مولوی حمید الدین مرحوم کو دیکھا تھا، اور ان کی صحبتوں میں کافی وقت مفتی صاحب کا گذرا ہے؛ وہی مولوی حمید الدین کا ذکر غیر معمولی الفاظ میں کیا کرتے تھے، ان کی عقل کی، ذہن کی، فہم و فراست، سیرت و کردار کی تعریف بھی کرتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان سے غیر معمولی طور پر متاثر ہیں ۱۲

"یہ جوش کی شان اسی وقت سے پیدا ہوئی تھی" ص۱۹۹

بہرحال اسباب و مؤثرات کچھ ہی ہوں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ گو حسب دستور آغاز تقریر کا تو قرآن ہی کی ایک آیت سے فرمایا گیا، لیکن قرآنی الفاظ ہی سے "معقولات" کہئے، یا "فلسفہ مغلیہ" کے سارے سرمایہ ناز مسائل[۱] کے متعلق صحیح صحیح نتائج نکال نکال کر دکھایا اور سنایا جارہا تھا کہ قرآن میں یہ باتیں مل سکتی ہیں، بے چارے معقولی مولویوں کو تو اس کا سان و گمان بھی نہ تھا، سننے والے بہوت و حیران تھے کہ یہ کیا ہورہا ہے اور کیا سنایا جارہا ہے، جیسا کہ عرض کیا گیا، اس وقت جلال اور جوش کا ایک رنگ تھا، سب کچھ سنانے کے بعد منشی حمیدالدین کا بیان تو یہ ہے کہ آخر میں سیدنا الامام الکبیر کی زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری ہوئے کہ

"لوگ گھر میں بیٹھ کر اعتراض کرتے ہیں، اگر کچھ حوصلہ ہے، تو میدان میں آجائیں"

وہی یہ بھی کہتے ہیں کہ خاتمہ اس علمی تحدی یا چیلنج کا ان الفاظ پر ہوا تھا کہ

"مگر ہرگز اس کی توقع لے کر نہ آئیں، کہ وہ قاسم سے عہدہ برآ ہوسکیں گے"

فقرہ تو فقرہ، جہاں تک میرا خیال ہے اس نوعیت کا خطرہ بھی، حضرت والا کے دل و دماغ میں کبھی نہ گذرا ہوگا، مگر آج ہی کہا گیا، یا کہلوایا گیا تھا، دوسری شق ہی میرے نزدیک اس لئے قابل ترجیح ہے کہ معاً اسی کے بعد منشی حمیدالدین نے یہ ارشاد فرماتے ہوئے بھی سنا یعنی جن لوگوں کو چیلنج دیا گیا تھا، ان ہی کو سنا کر فرمارہے تھے کہ

"میں کچھ نہیں ہوں، مگر جن کی جوتیاں میں نے سیدھی کی ہیں، وہ سب کچھ تھے"

ظاہر ہے کہ علماء و فضلاء، معقولات کے جبابرہ اصحاب جدل و مکابرہ سے بھری ہوئی رامپور کی

---

[۱] تقریر کے عنوان کے لئے جس آیت کا انتخاب فرمایا گیا تھا وہ سورۂ واقعہ کی ابتدائی آیتیں تھیں، منشی حمیدالدین کا بیان ہے کہ اجزاء لایتجزی، قیام قیامت، حدوث عالم وغیرہ جیسے معقولات کے اہم مسائل پر اسی آیت کے الفاظ کی روشنی میں بحث فرماتے جاتے تھے، حضرت تھانوی نے دوسرے سن کر عربی زبان میں ان خیالات کو قلم بند فرمادیا تھا صدرا مطبوعہ مطبع مجتبائی کے حاشیہ پر آپ کی قلم بند کی ہوئی تقریر چھاپ بھی دی گئی ہے، حصہ دوم میں سیدنا الامام الکبیر کے علمی نظریات و افکار پر بحث کرنے کا موقعہ اگر میسر آیا، تو انشاء اللہ اسمیں اس تقریر کا خلاصہ بھی درج کردیا جائیگا۔

اس مجلس میں "میں کچھ نہیں ہوں" کے اعتراف و اقرار میں جس نے اپنی اہانت نہیں محسوس کی یقیناً عوام و خواص کے اس بھرے میلے میں جو یہ کہہ سکتا تھا، سابق الذکر فقرے کے متعلق اگر یہ سمجھا جائے کہ اس نے خود نہیں کہا تھا، بلکہ کہلانے والے نے کہلوا دیا تھا، تو آخر خود سوچئے کہ دونوں قولوں میں تطبیق کی صورت ہی کیا ہو سکتی ہے، خصوصاً کسر نفسی کی بنیاد پر غلط بیانی سے کام لینے کی عام عادت کا جس کے متعلق کبھی تجربہ نہ ہوا ہو، اور یہ روایت تو منشی حمید الدین سنبھلی مرحوم کی ہے، لیکن اسی قصے کے بعض اجزا حضرت تھانوی کے ملفوظات طیبہ میں جو پائے جاتے ہیں، جن میں ایک جزء یہ بھی ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر نے اسی موقعہ پر اس کا اعلان بھی فرمایا تھا کہ

"معقول کے تمام مسائل کو نفیاً یا اثباتاً قرآن شریف سے نکال سکتا ہوں"[1] ص۲۵ قصص الہادی ماہ جمادی الثانی ۵۰ھ

افسوس ہے کہ منشی حمید الدین کے بیان میں یہ جزء نہیں پایا جاتا، لیکن ظاہر ہے کہ عدم ذکر کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کی تقریر میں یہ جزء شریک نہ تھا، کچھ بھی ہو، حضرت تھانوی کی روایت کے ان الفاظ کے بعد میرا احساس تو یہ ہے کہ تحدی اور چیلنج کے رنگ میں پیش کرنے والوں نے رامپور والی تقریر کے خاتمہ کو جو پیش کیا ہے، شاید اس رنگ میں خود بیان کرنے والوں کی ذاتی خواہشیں بھی شریک ہو گئی ہیں، ورنہ ان الفاظ کی روشنی میں تحدی سے زیادہ مجھے تو مشورے کا رنگ غالب نظر آتا ہے، مطلب یہ ہے کہ "معقولات" کے نام سے جن علوم کی تعلیم ہمارے قدیم عربی مدارس میں ہوتی تھی، بظاہر تو یہی کہا جاتا تھا کہ منطق اور منطق کے بعد اور منطق کے ساتھ فلسفہ کی کتابیں معقولات کے نام سے

[1] میں نے اس واقعہ کے سلسلہ میں حاجی امیر شاہ خاں صاحب سے یہ جزء بھی سنا ہے کہ اس وعظ میں حضرت نے خطبۂ ماثورہ کے بعد آیت کریمہ اذا وقعت الواقعۃ لیس لوقعتہا کاذبۃ الی قولہ فکانت ہباءً منبثا تک تلاوت فرمائی۔ اور فلسفہ کے تمام معرکۃ الآراء اور مایۂ ناز مسائل کی رد و قدح اسی آیت کے الفاظ سے فرمایا۔ جزء لایتجزی کا ابطال اذا رجت الارض رجا و بست الجبال بسا سے فرما کر قیامت کا اثبات فرمایا۔ گویا اس چیلنج میں صرف اسی کی تحدی نہ تھی کہ میں معقول کے تمام مسائل کو نفیاً یا اثباتاً قرآن سے نکال سکتا ہوں بلکہ بہت سے مشہور اہم اور معرکۃ الآراء مسائل کو نکال کر دکھلا بھی دیا جس سے سامعین ورطۂ حیرت میں غرق تھے۔ خاں صاحب نے فرمایا کہ لوگوں کا عالم کأن علی رؤسہم الطیر کا تھا۔ (محمد طیب غفرلہ)

پڑھائی جاتی ہیں، اور یہ بھی درست ہے کہ فلسفہ کی تعریف کرتے ہوئے شروع میں طالب العلموں کو یہی باور کرایا جاتا تھا کہ انسانی پرواز کی حد تک کائنات کے واقعی حالات کی صحیح جستجو سے جو معلومات حاصل ہوچکی ہیں، فلسفہ کے نام سے ان ہی معلومات کی تعلیم طلبہ کو دی جائے گی۔ فلسفہ کی ابتدائی کتابوں میں اس میں شک نہیں کہ صحیح یا غلط ترجموں کے ذریعہ سے اس سلسلہ میں مسلمانوں تک غیر قوموں کی معلومات جو پہونچی تھیں، طالب العلموں کو وہی بتائی بھی جاتی تھیں، لیکن ان معلومات کا ذخیرہ بس اس قدر ہے کہ ابہری کی ہدایت الحکمت وغیرہ جیسی کتابوں کے چند اوراق میں وہ ختم ہوجاتا ہے۔ چاہئے تو یہی تھا کہ فلسفہ پڑھانے کی ضرورت بھی تھی تو ان کے لئے یہ چند اوراق کافی تھے لیکن دس بیس ورق کے ان مختصر رسالوں سے لوگوں کا جی ظاہر ہے کہ کیسے بھر سکتا تھا، اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کی پیدا کی ہوئی کائنات کی جگہ خود انسانوں کی بنائی ہوئی کتابوں نے لے لی، پھر فلسفہ کی ان ہی کتابوں کے فقرے اور ان کے الفاظ کو ایک قسم کی مستقل ہستی قرار دیتے ہوئے ان ہی کے معانی و مطالب تک رسائی کی کوشش اور اس کوشش سے پیدا ہونے والے نکات و اسرار کی تعلیم فلسفہ کے نام سے ہماری مدارس میں ہونے لگی، بجائے کائناتی فلسفہ کے اسی کتابی فلسفہ کا نام "معقولات" رکھدیا گیا تھا، ایسی کتابیں جن کی تصنیف کرنے والوں کی انشائی قوت خواہ کمزور تھی، یا قصداً انھوں نے بیان کا پیچیدہ اور ژولیدہ طریقہ اختیار کیا تھا، ان کو اس عجیب و غریب کتابی فلسفہ کے عروج کے زمانہ میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگئی، میں مبالغہ نہیں کروں گا اگر یہ کہوں کہ اس قسم کی بعض کتابوں کے ایک ایک لفظ کے متعلق لکھنے والوں نے سیکڑوں صفحات سیاہ کر دیئے۔ یوں کتابی فلسفہ کا ایک طومار پچھلی چند صدیوں میں تیار ہوگیا۔

ظاہر ہے کہ "فلسفہ" کے نام سے اس قسم کی کتابوں کے پڑھنے والوں کو کائنات کے واقعی موجودات

---

لے مثلاً میر زاہد کی شرح قطبیہ کے ایک فقرہ میں بعد تحقق الموصوف کا جو جز ہے اس کے ایک لفظ "بعد" کے متعلق لٹریچر کو دیکھئے، یا حمد اللہ میں وجود رابطی کی تعبیر میں جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ان کی متعلقہ موشگافیوں کو ملاحظہ فرمایئے، الی غیر ذلک من الخرافات ۱۲

اور ان کے واقعی حالات کی تحقیق و تلاش سے دلچسپی پیدا ہونے کی وجہ ہی کیا ہو سکتی تھی، ان غریبوں کی بحث کا موضوع تو بس اس قلم چلانے والے مصنف کی عبارت بن گئی تھی جو اتفاقاً اس سے پہلے پیدا ہو کر کاغذ پر سیاہیوں کو پھیلا کر چلا گیا تھا، تاہم اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ کتابی، اور عبارتی فلسفہ ہی مگر رد و قدح سوال و جواب کی کثرت مشق سے ایک قسم کی باریک بینی، یا بال کی کھال نکالنے کی صلاحیت لوگوں میں اس تعلیم سے ضرور پیدا ہو جاتی تھی، عملی زندگی میں شریک ہونے کے بعد ان کی یہ ذہنی مشق عوام سے ان کو ممتاز کر دیتی تھی، اور اسی پر ان کی مولویت کی دیوار کی بنیاد قائم تھی

ظاہر ہے کہ کائنات، اور کائنات کے قدرتی نظام سے جب تعلق ہی باقی نہ رہا اور بات صرف کتابوں کی عبارتوں، عبارتوں کے الفاظ و حروف ہی تک محدود ہو کر رہ گئی، اور جو ذہنی لچک اس کتابی فلسفہ کے مباحث سے پیدا ہوتی تھی، اسی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا تھا، تو انسانوں کی بنائی ہوئی کتابوں، اور ان کی عبارتوں سے خدا کی کتاب اس کی زیادہ مستحق تھی کہ اس کے الفاظ اور فقروں پر غور و خوض کیا جائے، اور غور و خوض کے اسی مشغلہ سے ذہنی نشو و نما، فکری ارتقاء کا کام لیا جائے،

الغرض آدمیوں کی ساختہ پرداختہ کتابوں سے ہٹا کر اللہ کی کتاب کی طرف معقولی مولویوں کی توجہ کے رخ کو پھیر دینا، ایک کھلا ہوا نیک مشورہ ہو سکتا تھا، خیال بھی گذرتا ہے کہ شاید سیدنا الامام الکبیر نے رامپور کے مولویوں کو ممکن ہے حضرت تھانوی کے روایت کردہ الفاظ میں یہی مشورہ دیا ہو، خود حضرت تھانوی اس مجلس میں شریک نہ تھے، کسی دوسرے سے سنکر روایت کرتے تھے نہیں کہا جا سکتا کہ اسی کے ساتھ اور کیا فرمایا گیا تھا، سننے والوں نے صرف اپنے مذاق کے مطابق جو باتیں تھیں ان ہی کو چن لیا، بہر کیف سیدنا الامام الکبیر نے تحدی کے رنگ میں پیش کیا ہو، یا مشورے کی صورت میں یا دونوں باتیں آپ کے پیش نظر ہوں، ان کی نیت کیا تھی، اب اسے کون بتا سکتا ہے، لیکن آپ کا رامپور کی اس مجلس میں یہ دعویٰ کہ معقول کے تمام مسائل کو نفیاً و اثباتاً قرآن شریف سے نکال سکتا ہوں" میری سمجھ میں تو اس سے یہی آتا ہے

کہ معقولی مولویوں کو متوجہ کرتے ہوئے، آپ یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ جو کام معقولات کی کتابوں سے تم لوگ لے رہے ہو یعنی معقول کی ان کتابوں کی سطر سطر پر جیسے جھونپڑے ڈال ڈال کر پڑ جاتے ہو، اور ان کے مختلف پہلوؤں کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے نتیجے نکالتے ہو، چاہو، تو یہی کام قرآن سے بھی لے سکتے ہو، اور خود تم میں اس کا سلیقہ نہ ہو، تو ہم تمکو اس کا طریقہ بتا کر دکھا سکتے ہیں، بیچ ہیں" نفیاً و اثباتاً" کے الفاظ سے مقصد یہ تھا کہ ہر حال میں یہ سمجھنا کہ قرآن سے ان مسائل کی تائید ہی ہوگی، جو معقولات کی کتابوں میں پڑھائے جاتے ہیں، صحیح نہیں ہے۔ بلکہ ممکن ہے کبھی تائید بھی ہو، اور کبھی قرآنی نتائج ان سے مختلف بھی ہوں، لیکن یہ دوسری بات ہے، باقی ان کتابوں سے دقت پسندی، احتمال آفرینی، وغیرہ کی مشق کا کام جو لیا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ مقصد تو قرآن کے ذریعہ سے بھی حاصل ہو سکتا ہے، پھر سب سے بڑی دولت تو اس راہ سے یہ ملے گی، کہ بجائے مخلوقات کے خالق کے کلام کے سمجھنے اور سمجھانے کی صلاحیت پیدا ہو گی!۔

شاید پھر غیر ضروری طوالت کی جھنجھٹوں میں مبتلا ہو گیا لیکن عربی مدارس میں" معقولات کے نام سے جن کتابوں کے پڑھانے کا دستور چلا آرہا ہے اور اب تک یہ دستور عمومی طور پر ختم نہیں ہوا ہے، ان کے متعلق بڑے کام کی بات کی طرف حضرت والا کے کلام سے جس نکتہ کی طرف ذہن منتقل ہوا، جی نہ مانا کہ اجمال سے کام لیتے ہوئے آگے بڑھ جاؤں، میرا تو خیال ہے کہ واقعی غور و فکر، محنت و کاوش کی جو مقدار اور جو وقت معقولات کی ان کتابوں کی عبارتوں کے سمجھنے میں خرچ کیا جاتا ہے اور اب بھی خرچ کرنے والے بے دردی کے ساتھ اسی مشغلہ میں ان کو صرف کر رہے ہیں، اگر بجائے ان کے اللہ کی کتاب کے ساتھ بھی تعلق پیدا کر لیا جائے۔ تو سیدنا الامام الکبیر کے اس تجربہ کی یعنی

" قرآن مجید کے الفاظ میں ہی غور کرنا چاہیے تو مطلب بالکل صاف ہے"۔ قصص صفحہ ۳ الہادی جمادی الاول ۵۷ھ

حضرت حکیم الامت تھانوی کے حوالہ سے جس کا پہلے بھی کسی موقعہ پر ذکر کر چکا ہوں، اس تجربہ کی لوگوں

کو تصدیق کرنی پڑے گی، اور علم کا نیا باب ان پر کھل جائے گا، اور میں تو سمجھتا ہوں کہ حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ اپنے استاذ مولٰنا محمد یعقوب یعنی ہمارے مصنف امام کے متعلق یہ خبر دیتے ہوئے کہ

"ہر وقت کتابیں دیکھا کرتے تھے"

اسی کے ساتھ یہ بھی جو فرمایا کرتے تھے کہ

"مولٰنا محمد قاسم صاحب تو کتاب سے کچھ کہتے ہی نہ تھے اس فہم خدا داد سے کہتے تھے[1] جس کی نسبت وارد ہے کہ من یرد اللہ بہ خیرا یُفَقِّهْهُ فی الدِّین" ص۲۹ الہادی

ظاہر ہے کہ "کتاب سے کچھ کہتے ہی نہ تھے" اس میں کتاب کے لفظ سے یقیناً وہی کتابیں مراد ہیں جو آدمیوں کی بنائی ہوئی ہیں، ورنہ "الدین" کی فقہ اور سمجھ کی بنیاد جس "الکتاب" پر قائم ہے، واقعہ تو یہ ہے کہ سیدنا الامام الکبیر جو کچھ بھی کہتے تھے، اسی "الکتاب" ہی سے اخذ و استنباط کر کے کہتے تھے، ان کی تحریری یادگاریں موجود ہیں، شہادت کے لئے وہی کافی ہیں، ہاں یہ سچ ہے کہ خالق کی اس "الکتاب" کو پکڑ لینے کے بعد مخلوق (انسانوں) کی بنائی ہوئی کتابوں سے حاصل کر کے کچھ کہنے کی ضرورت ان کو باقی نہیں رہی تھی، اور رامپور کی اس مجلس میں آپ کا مذکورہ بالا دعوٰی بھی اسی خدا داد نعمت ہی پر مبنی تھا، جو "اشتغال بالقرآن" کے صلہ میں آپ کو عطا ہوئی تھی۔

اسی کے ساتھ ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی اپنی اس طوالت سے مقصود تھا، مقصد ہے یہ کہ معقول کے تمام مسائل کو قرآن شریف سے نکالنے کا یہ مطلب لینا کہ معقول سے حضرت والا کی مراد وہ علوم ہیں، جو "فلسفہ" کے عام عنوان کے نیچے درج سمجھے جاتے ہیں جن میں طبیعیات و ریاضیات و ما بعد الطبیعیات اور ان میں ہر ایک کی فنی شاخوں میں جن چیزوں سے بحث کی جاتی ہے، اور ان کے متعلق مسائل و نظریات ان میں پائے جاتے ہیں، ان سب کے متعلق آپ دعوٰی پیش کر رہے تھے کہ قرآن سے نکال کر دکھا سکتا ہوں،

---

[1] بھلائی کا ارادہ جب اللہ تعالیٰ کسی کے متعلق فرماتے ہیں تو اس کو دین سمجھا دیتے ہیں ۱۲

ممکن ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے آپ کے دعویٰ کا یہ مطلب عوام کے لئے خوش کن و خوش گوار ہو لیکن قرآن کی طرف اس قسم کی باتوں کا انتساب کہ اقلیدس کی ساری شکلیں قرآنی عبارتوں سے نکالی جاسکتی ہیں، ستاروں اور سیاروں کی تعداد، ان کی مقدار و رفتار، از قبیل حیوانات و نباتات، معدنیات و جمادات عناصر و بسائط کی خصوصیات و آثار ان ساری چیزوں سے قرآن میں بحث کی گئی ہے، میرے نزدیک جنون میں مبتلا ہونے سے پہلے قرآن کے متعلق اس قسم کے دعویٰ کی جرأت کوئی مشکل ہی سے کرسکتا ہے، ایسی باتیں وہی کہتے یا کہہ سکتے ہیں جنھوں نے سمجھا ہی نہیں ہے کہ قرآن کا موضوع کیا ہے[لہ]، اور کس مقصد و غایت کے لئے نازل کرنے والے نے اپنا یہ کلام نازل فرما کر بندوں کے سپرد کیا ہے[ہ]۔

---

لہ حصۂ دوم میں سیدنا الامام الکبیر کے علمی نظریات پر جب بحث کی جائیگی، وہیں القرآن العظیم کا جو تعلق قرآن ہی کی "سورہ فاتحہ" سے حضرت والا کے نزدیک ہے اس تعلق کی تفصیلی شرح پیش کی جائے گی، یہاں اجمالاً صرف اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ سورۂ فاتحہ میں بندوں کی طرف سے یہ درخواست بارگاہ ربانی میں جو پیش ہوئی ہے کہ اس صراط مستقیم (سیدھی راہ) کی ہدایت فرمائی جائے جس پر چلنے والے حق تعالیٰ کے انعام کے مستحق ہو جاتے ہیں اور مقربین حق کے ساتھ معیت و رفاقت کا تعلق ان ہی بندوں کا قائم ہو جاتا ہے، سورۂ فاتحہ کی اسی درخواست کے جواب کا نام "القرآن العظیم" ہے الم سے والناس کی سورۃ تک علاوہ سورہ فاتحہ کے اللہ کی اس کتاب میں جو کچھ ہے اسی سوال کے جواب کے مختلف پہلوؤں سے اس کا تعلق ہے، بس قرآن میں جو کچھ بھی ڈھونڈھنا ہے وہ اسی موضوع کے متعلق ڈھونڈھنا ہے ۱۲

ہ حقیقتاً اس قسم کی فلسفیانہ موشگافیوں کی تفصیلات کو قرآن میں تلاش کرنا (جن کی چند مثالیں متن میں پیش کی گئی ہیں) قرآن کے موضوع کے منافی ہی نہیں بلکہ اس کے رفیع المرتبت موضوع کی توہین بھی ہے۔ کیونکہ قرآن کا حقیقی موضوع ہدایت انسانی اور اس کے متعلقات سے بحث کرنا ہے، مادی کائنات کے مواد و اشکال اور عناصر و افلاک کی تفصیلات پیش کرنا نہیں، لیکن اصولی طور پر مادی علوم و فنون کے اصلی مبانی اور بنیادی نقطوں کو قرآن کی بلیغ تعبیرات سے اخذ کرنا اور اسے تکوینی عجائبات کے اصول کا کسی حد تک ماخذ قرار دینا نہ مصنف دام مجدہٗ کے متن و حاشیہ کے منافی ہے اور نہ ہی قرآن حکیم کے موضوع کے برخلاف ہے۔ کیونکہ جو مفکر علماء تکوینی اور مادیاتی امور قرآن سے استنباطی طور پر اخذ کرتے ہیں وہ یقیناً اُنہیں قرآن کا موضوع سمجھ کر نہیں بلکہ ضمنی اور استطرادی طور پر بطور لطائف و نکات ہی بیان کرتے ہیں۔ اندریں صورت ان کی حجت

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

اس لئے حضرت والا کے لفظ "معقول" سے مراد بجائے فلسفہ کے خاکسار کے نزدیک وہی
کتابی اور عبارتی الٹ پھیر کی باتیں ہیں، جن میں "معقولات" کے نام سے اس زمانہ کے معقولی مولوی

(حاشیہ بسلسلہ صفحہ ۳۷۸) یہ ہوسکتی ہے کہ قرآن کے پیغام عام نے انسانوں کو مادیات سے منقطع کرکے روحانیات کے راستہ پر نہیں ڈالا بلکہ اس مادی کائنات کے عناصر و قویٰ سے استفادہ کو قائم رکھتے ہوئے تکمیل روحانیات کا سبق دیا ہے جس سے یہ سارے مادی منافع قرآنی مقاصد کیلئے وسائل و ذرائع کی حیثیت میں آجاتے ہیں اور اس طرح وہ قرآنی موضوع کے وسائل میں شامل ہو کر اس سے کلیۃً بے تعلق نہیں رہ جاتے۔ اس صورت میں اگر قرآنی موضوع و مقصد کے ضمن میں محض ایک وسیلہ کی حیثیت سے ان مادی اور تکوینی امور کی طرف بھی نظم قرآنی سے کچھ اشارے نکل آئیں اور ان کے بنیادی اصول کسی حد تک قرآنی تعبیرات سے مستنبط ہو جائیں تو اس سے نہ قرآن کے رفیع المنزلت موضوع پر کوئی بُرا اثر پڑتا ہے اور نہ خود قرآن کے ہدایت نامہ ہونے پر کوئی حرف آسکتا ہے، بلکہ مقاصد کے ضمن میں وسائل کی طرف لطیف اشارے اس کی جامعیت کے حق میں تو سونے پر سہاگہ کا مصداق ہوں گے، اور اس کے مقاصد و وسائل کے باہمی فرق مراتب پر ایک حکیمانہ شہادۃ ثابت ہونگے جو اس کی معجزانہ فصاحتِ کلام اور بلاغتِ بیان کی ایک بے نظیر مثال ہوگی۔

علماء سلف اور عرفاء ملت نے استنباط کی ایسی مثالوں کا نقش قدم چھوڑا ہے، جس سے یہ نوع امت کیلئے کوئی محدث اور انوکھی نوع نہیں رہتی، مثلاً شیخ محی الدین ابن عربی نے قرآن کے حروف مقطعات سے اقوام عالم کے عروج و زوال کی تاریخیں بقید وقت اخذ کر کے ان کے قواعد استخراج تک وضع کر دیئے ہیں گو آج ان کا جاننے پہچاننے والا کوئی باقی نہیں رہا۔ ابن خلکان کی نقل کے مطابق سلطان صلاح الدین زنگی کے حلب اور قلعہ شہباء ختم کر لینے پر وقت کے ایک مصر عالم قاضی محی الدین نے ایک قصیدہ بائیہ لکھا جس میں حلب و شہباء کی فتح کو جو ماہ صفر میں ہوئی تھی فتح قدس کا پیش خیمہ بتلایا اور اس کے وقت تک کی تعیین کے ساتھ قصیدہ میں پیشین گوئی کر دی۔ کہا

وَفَتْحُكَ الْقِلْعَةَ الشَّهْبَاءَ فِی صَفَرٍ ‏ ‏ ‏ مُبَشِّرٌ بِفُتُوحِ الْقُدْسِ فِی رَجَبٍ

یہ آپکا قلعۂ شہباء کو ماہ صفر میں فتح کر لینا ‏ ‏ ‏ بشارت دے رہا ہے کہ قدس شریف بھی رجب میں فتح ہو جائیگا

قاضی صاحب سے اس خبر اور تعیین ماہ کی دلیل پوچھی گئی تو فرمایا کہ میں نے یہ ساختہ آیۃ کریمہ۔ الٓمّٓ غُلِبَت الروم فی ادنی الارض کی تفسیر سے لیا ہے جو تفسیر ابن برجان نے کی ہے جس کی وفات اس واقعہ سے بہت پہلے ہو چکی تھی، وجہ استدلال کی تفصیل ان کی تفسیر میں موجود ہے۔ ابن کمال نے سلطان سلیم کے ہاتھ پر فتح مصر کی پیشگوئی کی اور آیۃ کریمہ ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصّٰلحون سے اسے اخذ کر کے دکھلا دیا۔ جیسا کہ تفسیر روح المعانی کے مقدمہ میں ان واقعات کا تذکرہ موجود ہے، ظاہر ہے کہ ان حضرات نے قرآن کو کوئی تاریخی یا افسانوی کتاب سمجھ کر یہ اقتباسات (بقیہ آئندہ)

الجھے ہوئے تھے۔ گو اسی کے ساتھ چند مسائل فلسفہ مابعد الطبیعیات اور مابعد الطبیعیات کی ایک خاص شاخ فن امور عامہ کے بھی کتابی معقولات کے لپیٹ میں معقولیوں کے حلقہائے درس میں زیر

(حاشیہ سلسلہ صفحہ ۳۷۹)

نہیں لئے بلکہ اس کے موضوع ہدایت کو بجائے خود محفوظ رکھ کر لطائف کے طرز پر اس کے بلیغ ترین نظم سے استنباط کئے جو نہ قواعد شرعیہ کے خلاف تھے نہ قواعد عربیہ کے، اس پر اگر یہ استنباطات مذکورہ کے ماہر و مبصر یہ کہدیں کہ قرآن کے نظم میں اقوام عالم کے عروج و زوال اور فتح و شکست کی تاریخ کے وقائع بھی موجود ہیں جو وجدان صحیحہ کے تحت اس سے اخذ کئے جا سکتے ہیں تو انہیں اس بصیرت کے بعد اس دعویٰ سے کون روک سکتا ہے؟ اس سے جہاں قرآنی نظم کی اعجازی بلاغت نمایاں ہوتی ہے وہیں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ایسے استنباط و اقتباسات اس کے بغیر ممکن بھی نہ تھے کہ قرآن کے اعجازی نظم میں ان کے لئے کچھ گنجائش اور مظان بھی موجود ہوں جن سے یہ اخذ و استنباط ممکن ہو گو وہ ضمنی ہوں اور مقصود نہ ہوں، جیسے خود قرآن نے فن شعر و شاعری کی ہجو کرتے ہوئے اسے پیغمبر سے دور ہی دور بتلایا ہے، مگر اس پر بھی نظم قرآنی میں متعدد آیتیں شعری بحروں پر منطبق ہوتی ہیں جو درحقیقت فن عروض و قافیہ کا اساسی موضوع ہے۔ اس پر ایک کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ قرآنی نظم فن عروض و قافیہ کی اساس و بنا سے خالی نہیں ہے گو تفصیلی اشکال کا بیان اس کی شان سے فروتر ہے جس سے وہ بالاتر ہے۔ حضرات صحابہ سے تکوینی امور کے بارہ میں سوالات کئے جاتے۔ اور قرآن سے جواب مانگا جاتا اور وہ یہ جواب نہیں دیتے تھے کہ قرآن کا موضوع ہدایت ہے اس میں ایسے امور کی گنجائش نہیں بلکہ لطائف کے طور پر قرآن ہی سے اخذ کر کے تکوینیات کے سلسلہ کے جوابات دیتے تھے ہرقل (قیصر روم) نے امیر معاویہ رضہ کے پاس ایک مکتوب بھیجا جس میں تکوین کے سلسلہ کے کئی پیچیدہ سوالات کا جواب قرآن سے مانگا گیا تھا، مثلاً وہ چار چیزیں کیا ہیں جو ذی روح ہیں مگر نہ باپ کی پیٹھ میں رہیں نہ ماں کے پیٹ میں؟ یا وہ کونسی قبر ہے جو صاحب قبر سمیت چلتی پھرتی رہی؟ یا وہ کونسا قطعۂ زمین ہے جس پر صرف ایک ہی دفعہ سورج نے طلوع کیا ہو؟ یا شئی اور لاشئی کیا ہے؟ یا وہ کونسا درخت ہے جو بلا پانی کے اگا اور بڑھ گیا؟ وغیرہ وغیرہ۔ امیر معاویہؓ نے یہ سوالات ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجدیئے جنھوں نے قرآن سے انکے جوابات استخراج کر کے قیصر روم کے پاس بھجوا دیئے۔ پس اس قسم کے تکوینی حقائق سامنے رکھکر نیز دیکھتے ہوئے کہ قرآن نے تکوین اور مادیات کے عجائبات پر بھی گہری روشنی ڈالی ہے اس نے ارض و سما کی تخلیق پہاڑوں اور دریاؤں کی خلقت، چاند سورج اور ثوابت و سیارات کے حرکت و سکون لیل و نہار کے لوٹ پھیر، ہواؤں اور بادلوں کی آمد و رفت، عناصر و افلاک کے آثار و کیفیات، جماد و نبات، حیوان و انسان اور جن و ملک کے افعال و خواص اور عالم انسانی کے اندرونی و بیرونی عوارض و احوال غرض انفس و آفاق کے تکوینی عجائبات پر روشنی ڈال کر بنی آدم کو تفکر و تدبر کا حکم دیا اور ان مصنوعات الٰہیہ سے صانع حقیقی کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ پر ملاحظہ کیجئے)

بحث آجاتے تھے، بس زیادہ سے زیادہ مطلب آپ کے اس دعویٰ کا یہی ہوسکتا ہے کہ چند فنی مسائل جو معقولیوں کا سرمایہ امتیاز ہیں ان کو بھی قرآن سے نفیاً یا اثباتاً نکال کر دکھلایا جاسکتا ہے

(حاشیہ بسلسلہ صفحہ ۳۸۰)

ذات و صفات شئون و افعال اور کمالات و تصرفات کا تعارف کرایا ہے، اگر قرآن کے انہی بلیغ بیانات کی اعجازی تعبیرات اور انداز بیان کے جلی و خفی گوشوں سے کسی کا ذہن صافی ان مادیات اور فلکیات کے تکوینی اصول کی طرف منتقل ہوجائے اور وہ انہیں انہی آیات کی گہرائیوں سے اخذ کرکے کہہ ڈالے کہ قرآن میں فنون مادیہ کے اساسی اصول و مہمات بھی موجود ہیں جو نفیاً یا اثباتاً قرآن سے ثابت کئے جاسکتے ہیں تو ضرورت نہیں ہے کہ اس کے قول کو کسی تاویل کیساتھ قبول کیا جائے جبکہ نظم قرآنی کے تکوینی حصہ میں اس کی گنجائشیں مل سکتی ہیں۔

نیز حدیث نبوی جہاں تشریع کے مسائل کی تفصیلات پر مشتمل ہے وہیں کتنے ہی ایسے تکوینی امور اور مادی حقائق کا ذخیرہ بھی اس میں کافی بھرا ہوا ہے جس سے کسی عقیدہ یا عبرت کا تعلق ہو ظاہر ہے کہ اگر حدیث نبوی قرآن کا بیان اور اس کی شرح ہے (اور بلاشبہ ہے) تو اس کا منطقی نتیجہ اس کے سوا کیا نکل سکتا ہے کہ حدیث کی یہ تمام تکوینی تشریحات قرآن کے مسائل ہیں اور ان مسائل کے ماخذ قرآنی نظم میں قطعاً موجود ہیں۔ بلکہ اس سے یہ اصول نکل آتا ہے کہ قرآن کی شرح و بیان کے سلسلہ میں استخراجی مسائل اسی کے مسائل اور اسی کے اعجازی متن کا بیان کہلائیں گے جن کو اس کی تعبیرات سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ ورنہ شرعیات کے بھی تو بہت سے مسائل استنباطی ہیں کیا محض استنباطی ہونے کی وجہ سے ان کو مخالف قرآن باور کرلیا جائے گا؟ ہرگز نہیں چنانچہ تشریعیات کے سلسلہ میں بھی تمام امہات مسائل سارے کے سارے قرآن کی عبارت میں مذکور نہیں جو باتفاق علماء اجزاء و اعضاء دین اور مقاصد شریعت ہیں انہیں بھی تو فقہاء امت نے اپنی فراست و اجتہاد کے ذریعہ ہی قرآن کی عبارت و دلالت اور اشارت و اقتضاء سے اخذ کیا ہے خواہ اس میں فقہی مسائل ہوں یا فتاوائے صحابہ او رحدیثی استنباطات جس سے قرآن ان کے حق میں ماخذ ثابت ہوتا ہے، اگر قرآن میں ان کے مظان موجود نہ ہوتے تو محض اجتہاد کی کیا پیش چل سکتی تھی۔ اور کس طرح انہیں محض بے قرینہ اور بے دلیل استنباط سے قرآن کے سر تھوپ دیا جاتا اور اگر ایسا کیا بھی جاتا تو امت اسے قبول ہی کب کرتی۔؟ اس لئے نا گزیر طریقہ پر ان استخراجی مسائل کو بالواسطہ قرآنی ہی مسائل کہا جائے گا نہ کہ منافی قرآن ورنہ دین کا ایک عظیم حصہ بے بنیاد رہ جائے گا۔ اس لئے علماء امت کے استخراج کو جبکہ وہ قواعد شرعیہ و عربیہ کے خلاف نہو معتبر مان کر بالواسطہ قرآن ہی سے مربوط کیا جائیگا خواہ وہ تشریعی مسائل ہوں یا تکوینی۔ چنانچہ اسی فراست اخذ و استنباط کے جوش میں بعض اوقات فقہاء ملت و حکماء امت نے یہاں تک دعوے کردیئے ہیں کہ وہ فقہ کا ہر ہر جزوی مسئلہ قرآن سے ثابت کرسکتے ہیں۔ امام شافعی نے ایک دن حرم مکہ میں بیت اللہ کی دیوار سے کمر لگائے ہوئے جوش علم میں فرمایا کہ آج جو شخص مجھ سے کوئی مسئلہ پوچھے گا میں اسے قرآن سے جواب دوں گا۔ کسی نے کہا کہ حرم میں قتل زنبور کا مسئلہ (جو مذہب شافعی ہے) قرآن میں کہاں ہے؟

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ فرمایئے)

اور سب سے بڑا اشارہ آپ کے اس دعویٰ میں کم از کم مجھے یہی ملا کہ جو ذہنی و فکری فائدہ معقولاتی کتابوں کے ردّ و قدح سوال و جواب نیز ان کی عبارتی ژولیدگیوں کے سلجھانے سے حاصل ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے

(حاشیہ بسلسلہ صفحہ ۳۸۱)

تو اسی وقت انھوں نے اس مسئلہ کا ربط قرآن سے واضح کر دیا جس کی تفصیل اپنے موقعہ پر موجود ہے۔ عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے کسی بڑھیا نے کہا کہ کیا آپ واشمہ ومستوشمہ (بدن کو گودنے اور گدوانے والی) پر لعنت کرتے ہیں یہ کتاب اللہ میں کہاں ہے؟ فرمایا کاش تو قرآن پڑھتی ہوتی تو تجھے یہ مسئلہ قرآن میں مل جاتا اور اس کے بعد اس مسئلہ کا ربط قرآن سے دکھلا دیا۔ یا جیسا کہ صاحب سوانح حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے جمعہ فی القریٰ کی تمام فقہی شرائط کو قرآنی نظم سے استنباط کر کے دکھلایا ہے جو منکرین فقہ کے لئے فقہ کے قرآن سے ماخوذ ہونے کی ایک اعلیٰ ترین مثال اور دلیل ہے۔ حتیٰ کہ اس قسم کے استنباطی مسائل کو قرآن کی طرف رجوع کرنے اور قرآن کو ان کا مأخذ بتلانے کے لئے مستقل اصول اور مختلف طریقے علماء امت نے ذکر کئے ہیں جن سے ایسے اخذ کردہ مسائل کا رابط قرآن سے واضح کیا جاتا ہے۔ جو نہ صرف علماء امت کے ہمہ گیر فکر و بصیرۃ ہی کا بے مثال نمونہ ہے بلکہ قرآن کی محیر العقول جامعیت اور ہمہ گیری کا بھی اعلیٰ ترین شاہد عدل ہے۔

پس اگر اسی طرح قرآن حکیم کے اعجازی نظم میں ضمنی طور پر تکوینیات کیلئے بھی لطیف اشارے اور مضبوط مأخذ موجود ہوں اور مفکر علماء عربیت و شریعت کے قواعد میں محدود ہو کر ان مسائل کو اس سے اخذ و استنباط کر لیں تو ہمیں قرآن جیسے سرچشمۂ سخاوت کا کیا نقصان ہے؟ بلکہ اس سے جہاں اس کی ہمہ گیری اور معجزانہ بلاغۃ بیانی نمایاں ہوگی وہیں اس سے مستفید ہونے والے پیرؤوں کی بالغ نظری اور دقتِ فہم و فراست بھی واشگاف ہو جائے گی جو بالآخر اسی کا اعجاز کہلائے گی۔ اس لئے تشریع کی طرح تکوین کے استخراجی مسائل بھی قرآنی ہی مسائل کہے جائیں گے جو اس کے موضوع کے خلاف نہ ہوں گے جبکہ دونوں قسم کے مسائل (تکوینیات اور تشریعیات) میں مقصد و وسیلہ کا فرق قائم رہیگا جو استنباط میں حارج نہ ہوگا۔ بہر حال مصنف دام مجدہٗ نے مادی و ریاضی فنون کی جزئیات اور فنی تفصیلات کو قرآن کے موضوع کے خلاف ٹھہرا کر قرآن کے حق میں ان کے ماخذ ہونے کا انکار کیا ہے جس کا عام مفکرین اثبات نہیں کرتے لیکن مادیات کے بنیادی نقطوں اور اصول و مبانی کے قرآن سے ماخوذ ہو سکنے سے کوئی انکار نہیں کیا جس کا بہت سے مفکرین امت اثبات کر رہے ہیں۔ پس مصنف دام مجدہٗ نے قرآن سے ان تکوینی امور کے استنباط کی مطلقاً نفی نہیں کی بلکہ نفی خاص کی ہے جو فنی تفاصیل و جزئیات کی حد تک ہے۔ پس جو حضرات اس اخذ و استنباط کو مانتے ہیں وہ اجمال و اصول کا استنباط ہے اور مصنف ممدوح جس استنباط کا انکار کر رہے ہیں وہ فنی تفصیلات و جزئیات کا استنباط ہے اس لئے ماننے والے جسے مان رہے ہیں نہ ماننے والے اسکی نفی نہیں کرتے اور نہ ماننے والے جسے رد کر رہے ہیں ماننے والے اسے ثابت نہیں کرتے اس لئے سلف و خلف میں کوئی تعارض باقی نہیں رہا جو متن کی بعض موہم عبارات سے پیدا ہوتا تھا۔ (محمد طیب غفرلہٗ)

اس فائدے کو بھی قرآنی آیتوں میں غور و فکر کرنے سے چاہا جائے تو حاصل کیا جا سکتا ہے، اب جو کچھ بھی خیال کیا جائے، اپنے ان ہی احساسات کہئے، یا وسوسوں کے زیر اثر اس طول بیانی کی مجھے ضرورت محسوس ہوئی، ورنہ کہنا تو صرف یہ تھا کہ "دھبہ" کے نام سے جس اثر کو علم کے تعلق کی بنیاد پر اپنی طرف سیدنا الامام الکبیر منسوب کرتے تھے اس "دھبے" یا "داغ" کی اضطراری نمائش اور غیر اختیاری ظہور ساری زندگی میں کبھی اگر ہوا ہی ہے تو وہ بھی چند گنے چنے مواقع ہیں، محرک بھی اس کی عموماً وہی دینی و علمی غیرت بن جاتی تھی، جسے آپ شاید دبا نہیں سکتے تھے۔ رامپور کی اس تاریخی مجلس میں بھی زبان مبارک پر کچھ الفاظ اگر جاری ہوئے تو آپ دیکھ چکے ہیں، کہ نکلنے کی حد تک تو وہ فقرے بہر حال نکل ہی پڑے لیکن معاً اسی کے ساتھ "میں کچھ نہیں ہوں" سے اس بار کو جو ان الفاظ سے قدرۃً آپ کے قلب نازک پر پڑ گیا تھا، ہلکا کرنا چاہتے تھے، اور اختیار کا دامن جس جذبہ کی بدولت ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا، اسی کی طرف ان الفاظ میں چاہے توجیہ کہئے یا معذرت پیش فرما رہے تھے کہ "مگر میں نے جن کی جوتیاں سیدھی کی ہیں وہ سب کچھ تھے"

مراد آپ کی خانوادہ ولی اللّٰہی کے علماء سے تھی جن سے آپ نے تعلیم پائی تھی، (اور احقر کے علم کے مطابق جو بزرگوں سے سنا ہے اشارہ اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کی طرف تھا، جن کی تربیت کی بدولت علم لدنی کا یہ ذخیرہ انھیں ملا تھا اور اسی بناء پر حضرت حاجی صاحب انھیں اپنی لسان سے تعبیر فرماتے تھے اور تشبیہ دیا کرتے تھے کہ جیسے شمس تبریز کو عارف رومی زبان بنا کر دیئے گئے تھے ایسے ہی مجھے مولانا محمد قاسم زبان بنا کر دیئے گئے ہیں) (محمد طیب غفرلہٗ)

عرض کر چکا ہوں کہ آپ کے استاذ مولٰنا مملوک العلی صاحب نے اقلیدس کا ترجمہ اردو میں جو کیا تھا اس ترجمہ پر مولٰنا عبد الحق صاحب کی طرف سے مشہور کیا گیا تھا کہ رکیک الفاظ میں تنقید کی گئی ہے، اگر یہ واقعہ ہوا بھی تھا، تو اس کی حیثیت سمجھنا چاہئے کہ قریبی محرک کی تھی، ورنہ مولٰنا اسمٰعیل شہید اور مولانا فضل حق خیر آبادی (جو مولانا عبد الحق خیر آبادی کے والد ماجد تھے) ان

دونوں بزرگوں میں باوجود ہمدرس ہونے کے مسئلہ امتناع نظیر پر علمی زور آزمائیوں کا سلسلہ شروع ہوا، اور آخر میں بات بہت دور تک پہنچ گئی، اسی کے بعد ولی اللہی خاندان کے دینی علماء اور خیرآبادی کے معقولاتی مولویوں کے درمیان اختلاف کی خلیج بہت زیادہ وسیع ہو گئی، تقریر و تحریر میں علمی حدود سے تجاوز کر کے سب و شتم پر لوگ اتر آئے۔

مسلمانوں کا قومی مزاج نقطۂ اعتدال سے منحرف ہوتے ہوئے بدترین اخلاقی زبوں حالیوں کا شکار تھا، معمولی پھنسی بھی سرطان و خنازیر کی شکل اختیار کر لیتی تھی، ناگفتہ بہ قصے پیش آئے، خدا کا شکر ہے کہ اب ان کے آثار تقریباً مٹ چکے ہیں، اس خوابیدہ فتنہ کا جگانا میرے خیال میں خود ایک فتنہ ہو گا، اسی لئے خاکسار نے شاید مقدمہ میں بھی ان قصوں کو جگہ نہیں دی ہے، اور یہاں بھی ان اجمالی اشاروں کے سوا تفصیل میں فائدے سے زیادہ مضرت ہی کا احتمال ہے، حالانکہ رامپور میں رنجے افتادِ طبع کے برخلاف حسب غیر معمولی برہمی، جلال و جوش کا ظہور سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے ہوا صحیح طور پر اس کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو ولی اللہی اور خیرآبادی ہندوستان کے ان دونوں تعلیمی تدریسی خانوادے کے حریفانہ تعلقات سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں[1]!

---

[1] جیسا کہ میں نے عرض کیا قصہ کی ابتدا مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا فضل حق خیرآبادی کی نوک جھونک سے ہوئی، مولانا فضل حق کا دعویٰ تھا کہ رسول اللہ کو پیدا کرنے کے بعد اب رسول اللہ کی نظیر یعنی جن صفات سے آپ موصوف تھے، ان ہی صفات رکھنے والی دوسری ہستی کو خدا پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے، اسکی قدرت ہی سے یہ بات خارج ہو گئی ہے، مولانا شہید فرماتے تھے کہ رسول اللہ جیسی ہستی یہ تو صحیح ہے نہ پہلے پیدا ہوئی اور نہ آئندہ کبھی پیدا ہو گی لیکن آپ کی نظیر یعنی آپ کی جیسی ہستی کے پیدا کرنے پر خدا (العیاذ باللہ) قادر بھی نہ رہا یہ خدا کی ذات کے ساتھ بڑی جرأت ہے، منطقی زور کے زور سے چونکہ سب کچھ ثابت کیا جا سکتا ہے، مولانا شہید کی اس سیدھی سادی بات کو مولانا فضل حق صاحب نے اپنی منطقی زور آزمائیوں کی جولانگاہ بنا لیا۔ دونوں طرف سے موٹی موٹی کتابیں شائع ہوئیں، لیکن ٹھیک ان ہی دنوں میں جب دلّی مولویانہ بیتروں کی دنگل بنی ہوئی تھی، یہ بھی دیکھا گیا کہ مولانا اسمٰعیل دلّی سے نکلے اور پنجاب کے مسلمانوں کو ظلم و ستم کے پنجوں سے نکالنے کی کوششوں میں شہید ہونے کا ایمانی مقام بالاکوٹ کے پہاڑ کے نیچے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے، اور اسی کے بعد جب غدر کے نام سے ہندوستان میں ہنگامہ برپا ہوا تو دیکھا گیا کہ قلم کو توڑ کر کاغذ پھاڑ کر، مولانا فضل حق فوجی کمان ہندوستان کے ان باشندوں کی اپنے

(بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

خلاصہ یہ ہے کہ محرکات خواہ کچھ ہی ہوں لیکن ایک تو وہی رامپور والی مجلس کے قصے ہیں، اور دو ایک جگہ خانگی مجلسوں میں جہاں تک میری تلاش وجستجو کا تعلق ہے، علم کے اس غریب "دھبے" کو بھی نمایاں ہونے کا موقعہ نہیں دیا گیا' اور ساری عمر جس جدوجہد، کدوکاوش میں گذری، اس کا اندازہ آپ کو ان بکھرے ہوئے واقعات وسوانح سے ہو سکتا ہے، جو ادھر اُدھر مختلف بیانوں کے ذیل میں بحمداللہ محفوظ رہ گئے ہیں، سب کا استیعاب تو مشکل ہے لیکن نتیجے تک پہونچنے کے لئے شاید اتنی چیزیں بھی کافی ہوسکتی ہیں جو اب آپ کے سامنے رکھی جاتی ہیں، اس سلسلہ میں پہلی بات تو وہی ہے جس کا عموماً لوگوں نے تذکرہ کیا ہے، میں اپنے مصنف امام کی کتاب سے اسے نقل کرتا ہوں، انھوں نے سیدنا الامام الکبیر کی خصوصی عادات' والتزامات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"مسئلہ کبھی نہ بتلاتے، حوالہ کسی پر فرماتے" ص۳۱

"کبھی" کے لفظ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے، کہ آپ کی یہ دوامی عادت تھی، حضرت حکیم الامت کے

بقیہ حاشیہ ص۳۸۴ ہاتھوں میں لئے ہوئے ہیں جو باہر سے آئے ہوئے انگریزوں کی حکومت کا جوا اپنی گردن سے اتار دینے پر تل گئے تھے، اس مہم کی ناکامی کے بعد دوسروں کے ساتھ مولانا فضل حق بھی گرفتار ہوئے مقدمہ چلا، تو اتر کیساتھ بیان کیا جاتا ہے کہ بغاوت کا جو جرم ان پر عائد کیا گیا تھا، اگر اس جرم کا انکار کر دیتے، تو رہائی مل جاتی، لیکن جو واقعہ تھا' اسی کو بیان کرتے رہے۔ عبور دریائے شور کی سزا ہوئی، انڈمان جلا وطن کر دیئے گئے، وہیں وفات بھی ہوئی کہتے ہیں کہ قرآن مجید بھی انڈمان ہی میں زبانی یاد کیا۔ یہ یاد رکھنا چاہئے میں نے اجمالاً اشارہ بھی کیا ہے کہ حدیث کی تعلیم مولانا فضل حق نے مولانا اسمٰعیل کے ساتھ ایک ہی حلقہ میں شاہ ولی اللہ کے منجھلے صاحبزادے مترجم قرآن مولانا شاہ عبدالقادر صاحب سے پائی تھی جو مولانا اسمٰعیل کے حقیقی چچا تھے، خیرآباد کے تدریسی سلسلے سے تعلق رکھنے والوں سے تو نہیں لیکن دیوبندی حلقہ کے علماء میں اس قسم کے متعدد قصے منقول ہیں کہ جب مولانا فضل حق کو خبر ملی کہ مولانا اسمٰعیل شہید ہوگئے تو جواب میں ان کے جو کتاب لکھ رہے تھے اسی وقت اس کا لکھنا بند کر دیا، حکیم الامت تھانوی بھی اس کے راویوں میں ہیں، اسی طرح کہتے ہیں کہ ایک شخص مولانا فضل حق کے پاس اس نیت سے پہنچا کر چھیڑ کر مولانا شہید کو کچھ برا بھلا ان سے کہلواؤں مولانا فضل حق کو کسی طرح اس کا پتہ چل گیا سخت غضب ناک ہوئے اور اسی وقت گھر سے نکلوا دیا۔ بہرحال ونزعنا ما فی صدورھم من غل اخوانا علی سرر متقابلین کی آیت کے صادق ہونے کی صورت ہوئی، کچھ ایسے موقعے بھائیوں میں بھی پیش آجاتے ہیں۔ ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین امنوا ربنا انک رؤف رحیم ۱۲

ملفوظات میں بھی ہے کہ

"مولانا محمد قاسم صاحب فتویٰ نہیں دیتے تھے" (الہادی ربیع الثانی ۵۳ھ)

لیکن مطلب اس کا بظاہر یہی ہے کہ عام عادت حضرت والا کی یہی تھی، اور زیادہ تر تعلق اس کا ان سوالات سے معلوم ہوتا ہے جو زبانی لوگ حوادث یومیہ کے متعلق پوچھا کرتے ہیں، ورنہ تحریراً اگرچہ وہ بھی بطور ندرت زیادہ تر کسی اہم اصولی سوال، یا جس میں اندیشہ ہوتا کہ مسلمانوں کو لوگ فتنہ میں مبتلا کردیں گے اور آپ کی تحریر اس فتنہ کے دبانے میں مدد و معاون ثابت ہوگی، اس قسم کے سوالوں کے متعلق آپ کی تحریریں موجود ہیں، اگرچہ ان تحریروں میں بھی جواب کے ساتھ ساتھ اس قسم کے فقرے بھی قلم مبارک سے نکلتے جاتے تھے مثلاً ایک مکتوب گرامی جس میں بعض اہم سوالوں کا جواب دیا گیا ہے، آخر میں بے ساختہ "مگر" کے ساتھ

"نہ قاضیم، نہ فقیہم، نہ مفتیم، نہ امام" (فیوض قاسمیہ)

کا مصرعہ بھی اسی کے ساتھ قلم پر آگیا ہے۔ اور اسی کے بعد یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ

"اگر دیگراں ہم صفیر شوند فبہا، ورنہ کالائے زبوں بریش خاوند، ایں دفتر بے معنی را بر سر من زنند و ہر چہ مناسب وقت دانند و موافق اشارات علماء ربانی کہ از اتباع قرآن و حدیث و دو رنیفگند اختیار فرمایند"

اور اس عادت کے خلاف بطور "ندرت" سوال کے جواب دینے کے بعد جو صورت حال پیش آتی ہے وہ اس مقصد کے لئے جس کے پیش نظر ان چیزوں کا میں تذکرہ کروں گا، بڑا اثر انگیز، اور عبرت خیز ہے اس قصے کے راوی حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہٗ ہیں، فرماتے تھے کہ

مولانا محمد قاسم صاحب میرٹھ میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص نے عشاء کے وقت ایک مسئلہ پوچھا"

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کوئی ایسے مولوی صاحب جو سوال کا جواب دے سکتے ہوں، وہاں موجود نہ ہوں گے اور سوال میں ٹالنے کی گنجائش نہ تھی، مجبوراً جیسا کہ حکیم الامت فرماتے ہیں،

"آپ نے (مولانا نانوتوی نے) اس کا (اس سوال کا) جواب دیا"

اس کے بعد جو واقعہ پیش آیا' وہی سننے کے قابل ہے' سوالوں کے جواب اور فتویٰ نہ دینے کی عادت سے وہ نتیجہ کہیں زیادہ قیمتی ہے' جو قدرت کی طرف سے اس واقعہ کے اتفاقاً پیش آجانے کی وجہ سے پیدا ہوا' حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ جواب تو آپ نے دیدیا۔ لیکن سائل جب چلا گیا' تو سیدنا الامام الکبیر کے

ایک شاگرد نے عرض کیا کہ مجھے یہ مسئلہ یوں یاد ہے .....؛

شاگرد نے استاذ کے سامنے اپنے علم کا اظہار کیا' استاذی اور شاگردی کے تعلقات کے نفسیات کا جن لوگوں کو تجربہ ہے وہی اندازہ کر سکتے ہیں' کہ شاگرد کی اس قسم کی جرأت استاذ میں کس کیفیت کو پیدا کرتی ہے' لیکن سنئے یہاں کیا اثر ہوا' حضرت تھانوی کا بیان ہے کہ

"آپ نے (مولانا نانوتوی نے) فرمایا کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔"

اور کیا بات صرف اسی پر ختم ہو گئی' یا اس کے بعد صرف یہ ارادہ کر لیا گیا کہ پوچھنے والے تک کسی طرح مسئلہ کی صحیح صورت پہنچا دی جائے گی' حضرت تھانوی ہی راوی ہیں' شاگرد کے بیان کی توثیق کرنے کے بعد وہی کہتے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر نے

"مستفتی (فتویٰ پوچھنے والے) کو تلاش کرنا شروع کیا"

عشاء کے وقت سوال پوچھا گیا تھا' نماز سے فارغ ہونے کے بعد شاگرد نے اپنے علم کو گوش گذار کیا تھا' پوچھنے والے صاحب مسجد سے جا چکے تھے' رات کافی گذر چکی تھی' تلاش پر اصرار جب زیادہ بڑھا تو

"لوگوں نے عرض کیا کہ رات زیادہ ہو گئی ہے' اب آرام فرمائیے ہم صبح ہونے پر اس کو بتا دیں گے"

لیکن فہمائش عرض و معروض اس سلسلے میں جو کچھ کئے گئے سب بیکار ثابت ہوئے' اور بقول حضرت تھانوی

"آپ نے قبول نہ فرمایا"

پھر کیا ہوا؟ کیا اسی شاگرد یا کسی اور کو پوچھنے والے کے گھر بھیجا گیا، سنئے مولانا تھانوی خبر دیتے ہیں کہ بہ نفس نفیس خود سیدنا الامام الکبیر اٹھے، اور رات کی اسی تاریکی میں۔

"اس کے (پوچھنے والے کے) مکان پر تشریف لے گئے، گھر میں سے اس کو بلایا"

غریب پریشان ہوکر باہر نکل آیا کہ آخر کیا افتاد پیش آئی کہ اس بھیگی، سونی رات میں حضرت والا نے اس کے گھر تک قدم رنجہ فرمانے کی زحمت برداشت کی، مگر وہ بھی سن رہا تھا، آسمان سن رہا تھا زمین سن رہی تھی، کہ ہندوستان جس کے علم و فضل تقویٰ و طہارت، ذہن و ذکاوت کے چرچوں سے گونج رہا تھا، وہی اس غریب عامی مسلمان کے سامنے کھڑا ہوکر یہ کہہ رہا تھا کہ

"ہم نے اس وقت مسئلہ غلط بتلا دیا تھا، تمہارے آنے کے بعد ایک شخص نے صحیح مسئلہ ہم کو بتلایا، اور وہ اس طرح ہے"

حقیقت تو یہ ہے، کہ باہر کی اس غلطی سے جو قدرت ہی کی طرف سے صادر کرائی گئی تھی، اندر کی صحت کے متعلق جتنی صحیح اور سچی روشنی میسر آرہی ہے، شاید یہ بات صحیح مسئلہ بتانے کی صورت میں حاصل نہیں ہوسکتی تھی،

بہر حال عام عادت والتزام پر اس قسم کے نادر استثنائی واقعہ کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا اور واقعہ وہی ہے، جو مصنف امام نے فرمایا ہے، کہ آپ فتویٰ نہیں دیتے تھے حضرت تھانوی اور ان کے سوا بھی دوسرے بزرگوں کی شہادتوں کے سوا ایک خط ہے جو "فیوض قاسمیہ" کے مجموعہ میں شریک ہے۔ خورجہ کے مشہور عالم و مصنف و طبیب مولانا نصراللہ خاں مرحوم کے نام یہ خط ہے کہ انھوں نے یزید کے کفر و ایمان کے متعلق سیدنا الامام الکبیر کی رائے دریافت کی تھی، اسی کے جوابی مکتوب میں یہ فرماتے ہوئے کہ

"میں حیران ہوں، نہ میں ایسا عالم، نہ ایسا محقق، مجھکو آپ نے کیوں اس کام کے لئے تجویز کیا"

آگے اپنے متعلق خود ہی یہ اطلاع دیتے ہیں کہ

"مجھکو تو کبھی فتوای لکھنے کا اتفاق نہیں ہوتا"

یہی نہیں کہ خود فتویٰ دینے سے پرہیز ہی فرماتے تھے، بلکہ مصنف امام کے ان الفاظ سے یعنی

"فتویٰ پر نام لکھنا اور مہر کرنا تو درکنار" ص۳۱

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسروں کے دیئے ہوئے فتووں پر تصدیقی دستخط اور مہر ثبت کرنا، علماء کا جو عام دستور اور طریقہ ہے اس سے بھی احتراز فرماتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فتوٰے وافتاء سے پرہیز وگریز کی عادت حضرت والا کی عام مسلمانوں میں مشہور بھی تھی، اپنے ایک مکتوب میں خود ہی ارقام فرماتے ہیں کہ

"از فتویٰ واستفتاء احتراز من مشہور ست" (فیوض قاسمیہ ص۲۹)

اسی موقعہ پر جہاں اس شہرت کا ذکر آپ نے فرمایا، کبھی کبھی بعض اصولی یا فروعی مسائل کے متعلق اپنے پوچھنے والوں کو جواب جو دے دیا ہے، اس کی وجہ بھی ان الفاظ میں ظاہر کر دی گئی ہے کہ

"من بغرض دعا، ایں کار کردہ ام"

اور سچ تو یہ ہے کہ اپنے ان ہی خطوط میں اپنے نیازمندوں کو بے جھجھک اس قسم کی باتوں کے لکھنے کا جو عموماً عادی ہو، مثلاً بھوپال جو اس زمانہ میں ہندوستان کے مولویوں کی چند خاص امیدگاہوں میں ایک بڑی اہم امیدگاہ تھی، اسی ریاست کے وزیر اعظم مولوی جمال الدین مرحوم کے پوتے جن کا نام مولوی ابوالقاسم تھا، ان ہی کے ایک علمی سوال کا جواب دیتے ہوئے پہلے تو کتابوں سے اپنی بے تعلقی کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے کہ

"آں مخدوم را خود معلوم ست ہمچو سپاہی کہ آلۂ ضرب بدست ندارد، و علمے کہ کتابے در بغلش نبود، بکار ے نیاید!"

آگے ارقام فرماتے ہیں کہ

"خصوصاً کسے کہ از علم ہم جز نام بدست نیاوردہ"

اور اس میں تو غنیمت ہے کہ نام ہی کی حد تک سہی، لیکن علم کی طرف انتساب کو قبول تو فرمایا گیا ہے،
حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ آج تقریباً ایک صدی سے ہندوستان میں علم دین کا چرچا جس کے دم قدم
سے قائم ہے، وہی اپنے ایک عقیدتمند کو انتہائی بے تکلفی کے ساتھ سادہ الفاظ میں اطلاع دیتا ہے
اپنے قلم سے تحریر کرتا ہے، یہ خط اردو میں ہے اسی میں فرماتے ہیں

آپ جانتے ہیں کہ میں خود ذی علم نہیں ہوں" (فیوض قاسمیہ ص[۶])

ان ہی خطوط میں ایک خط میر محمد صادق مرحوم کے نام فارسی زبان میں ہے اس میں میر صاحب
کو مخاطب کر کے ارقام فرمایا گیا ہے کہ

"میدانی وہمہ می دانند نہ سفینہ بہ گنجینہ آوردہ ام ونہ مکتوبات سفینہ را در سینہ سپردہ" ص[۲۴]

اسی طرح اپنے ایک معاصر عالم یعنی وہی خورجہ والے مشہور عالم وطبیب مولٰنا نصر اللہ خاں کے نام
جو مکتوب اردو زبان میں لکھا گیا ہے، اس میں بھی یہی اطلاع دی جاتی ہے کہ

"نہ میرے پاس اس کام (فتوی نویسی) کا سامان، نہ کتابیں، نہ متقدمین ومتاخرین
کی بیاضیں" (فیوض ص[۳۱])

اس قسم کے اعترافات کا ایک ذخیرہ آپ کے مرقومات ومکتوبات میں پایا جاتا ہے۔ اندازہ کرنے
کے لئے یہ مثالیں کافی ہیں، ایک طرف ان نمونوں کو رکھئے، اور ان کے مقابلہ میں سوچئے کہ خود تو اعتراف
کی جرءت کون کر سکتا ہے، میں نے تو دیکھا ہے کہ وسوسہ بھی کسی کے متعلق اگر اس کا محسوس ہوا کہ مولوی صاحب
کے علم کی وقعت اس کے دل میں نہیں ہے تو اس غریب کے مردود و ملعون ہونے کے لئے کافی سمجھا جاتا
ہے، خود بھی علم کے غرور میں بھرے ہوئے ہیں اور چاہتے بھی ہیں کہ ان کے غرور یا فریب کا دوسرا بھی شکار رہے، جو
ہتھکنڈے اس سلسلہ میں استعمال کرنے والے استعمال کرتے ہیں، بہ نسبت دوسروں کے خود استعمال
کرنے والوں ہی کو اس کا زیادہ علم ہو سکتا ہے، زبردستی دوسروں پر اپنے علم وفضل کا سکہ قائم کرنے
کے لئے کرنے والے جو کچھ کرتے رہے ہیں، یا آج بھی کرتے ہیں، ان کے لئے یہ کتنے عبرت آموز اسباق
ہیں، جو سیدنا الامام الکبیر اسی علمی گروہ کی عبرت پذیری کے لئے چھوڑ کر گئے ہیں، سننے میں آیا ہے اور

اہل علم ہی کے بعض مشہور ہستیوں کے متعلق یہ روایت نقل کی جاتی ہے کہ جس کتاب کا صرف نام سنا ہوا تھا، خود کتاب دیکھی بھی نہیں تھی، لیکن دوسروں پر علمی رعب قائم کرنے کے لئے جعلی عبارت بنا کر اسی کتاب کی طرف منسوب کر کر کے لوگوں کو وہی مولوی صاحب سنایا کرتے تھے، مگر جھوٹے علم کا یہ جھوٹا اثر تھا، اس کے مقابلہ میں علم صادق کے آثار کو ملاحظہ فرمائیے، کہ زبانی ہی نہیں، تحریروں میں بھی بار بار اس کو دہرایا جا رہا ہے کہ کتابوں کا ذخیرہ میرے پاس نہیں ہے، عوام کے سامنے بھی اس اقرار میں کسی قسم کی کوئی شرمندگی محسوس نہیں ہوتی، اور خواص کے آگے بھی اس کا اعتراف دل میں اس خیال کو آنے نہیں دیتا کہ اپنے معاصر مولوی پر اس اعتراف کا کیا اثر پڑے گا؟ اور کچھ قصہ اسی پر ختم نہیں ہو جاتا ہے، ان ہی خطوط جن میں بعض علمی سوالات کے جواب حضرت والا نے پوچھنے والوں کو دیئے ہیں، ان میں ایک خاص مکتوب جو حکیم ضیاء الدین صاحب مرحوم رامپوری کے نام ہے، اس میں ارقام فرمایا جاتا ہے کہ

"مصلحت دید من آں ست کہ جواب احقر را بخدمت مولنا رشید احمد صاحب فرستادہ از ملاحظہ شاں گذرانند"۔

کچھ بھی ہو، مولنا گنگوہی سے حضرت والا کے تعلقات کی نوعیت جو کچھ بھی رہی ہو، تاہم آپ کے ایک رفیق درس، اور ہم چشم و ہم عصر عالم ہونے کی حیثیت بھی رکھتے تھے، اپنے دیئے ہوئے جواب کی توثیق کے لئے مکتوب الیہ کو اس کی ہدایت فرمائی کہ مولنا گنگوہی کو بھی میری تحریر دکھا دیجائے اور صرف "دکھا دی جائے"، یہی نہیں آگے اسی مکتوب میں یہ بھی ہے کہ

"جواب و سوال دیگر از دست مبارک اوشاں نویسانند روانہ کنند"

جس کا مطلب میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ بجائے اپنے جواب کے مشورہ یہ دیا گیا کہ مولنا گنگوہی جو جواب تحریر فرمائیں وہی مستفتی کے پاس روانہ کیا جائے[1]۔

---

[1] یہ وہی مکتوب ہے جس میں وزیر بھوپال مولوی جمال الدین صاحب کے پوتے مولوی ابوالقاسم کے سوالوں کے جوابات دیئے گئے ہیں، سوالات حکیم ضیاء الدین کے توسط سے حضرت والا تک پہونچے تھے، حکیم صاحب کے اصرار سے جوابات تو لکھ دیئے گئے لیکن اپنی مصلحت دید یہ بتائی گئی کہ بجائے میرے مولانا گنگوہی سے جواب لکھوا کر بھیجنا زیادہ مناسب ہوگا"۱۲

اور مولٰنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تو خیر آپ کے رفیق درس وبیعت اور دوست تھے۔ مولٰنا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ یعنی ہمارے مصنف امام حالانکہ حضرت والا کے شاگرد بھی ہیں، مولٰنا نصر اللہ خورجوی والے مکتوب میں اپنی علمی بے سروسامانی وہیچمدانی کے اعتراف کے ساتھ ساتھ یہ بھی ارقام فرمایا گیا ہے

"اس پر مولٰنا محمد یعقوب صاحب آج کل اپنے وطن کو گئے ہوئے ہیں، پھر ایسے مسائل کا جواب لکھے تو کون لکھے" ص ۳۱

یعنی صحیح علمی جواب کے لئے بجائے اپنے یہ اقرار کیا گیا ہے کہ مولٰنا محمد یعقوب صاحب ہی زیادہ موزوں ومناسب ہیں، بلکہ اسی کے بعد آپ کے الفاظ

"ہاں! اپنی سمجھ اور خیال کی بات کہئے تو لکھ دوں"

بتایئے کہ اس کا حاصل بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ صحیح علمی جواب کے لئے تو اپنے شاگرد مستفید کو زیادہ موزوں قرار دیا جا رہا ہے۔ البتہ بدرجہ مجبوری چونکہ وہ اس وقت موجود نہ تھے۔ خود جواب نویسی کی گویا جبرًا یہ اور کرا تے ہوئے کی گئی کہ میرے یہ کچھ ذاتی خیالات ہیں۔ اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ فتوی وافتار سے پرہیز کی عام عادت کے برخلاف کبھی کبھی کچھ چیزیں جو ارقام فرمادی گئی ہیں منجملہ دوسرے اسباب کے ایک سبب اس کا یہ بھی تھا کہ جب کوئی دوسرا جواب دینے والا وقت پر میسر نہ آتا تب خود ہی قلم اٹھا لیتے، خصوصًا ایسے مسائل میں جن کے جواب کی تاخیر میں کسی وقتی فتنہ کا اندیشہ ہوتا، اور "افتا" یا فتوی نویسی کے متعلق تو کتابوں کا عذر بھی حیلہ بن سکتا ہے، لیکن ہم تو دیکھتے ہیں کہ "امامت" جس کے لئے نہ شامی کے مطالعہ کی ضرورت ہے اور نہ بحر الرائق اور عالمگیری کے ورق گردانیوں کی مشقت اٹھانی پڑتی ہے بلکہ ہر نمازی جن سورتوں سے اپنی انفرادی نمازیں پڑھتا ہے ان ہی سورتوں سے نماز پڑھا بھی سکتا ہے، عام مسلمانوں کی جماعت میں "مولوی" کا وجود استحقاق امامت کیلئے کافی سمجھا جاتا ہے، عوام بھی یہی سمجھتے ہیں اور خود مولوی صاحبوں کا عام احساس بھی ہے کہ ان کا یہ قدرتی حق ہے کسی وجہ سے ان کے اس "حق" سے لاپروائی کسی مسجد میں کبھی اختیار کی گئی ہے تو زبان کرنہ بھی

لیکن پیشانی کی شکنوں سے ناگواری کے آثار عموماً مترشح ہوتے ہوئے پائے گئے ہیں، لیکن جس کی بدولت ہندوستان کے طول وعرض میں بلا مبالغہ لاکھوں ائمہ پھیل گئے، خود اس کا حال اسی "امامت" کے متعلق بھی یہ تھا، مصنف امام کی شہادت ہے کہ

"اول امامت سے بھی گھبراتے تھے" [۱]

جس سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ دوسروں کو یہ فرما کر کہ امامت نہیں کرتا، دامن نہیں چھڑاتے تھے، بلکہ سیدنا الامام الکبیر کے مزاج شناسوں کا خیال بھی تھا کہ خود اپنے نزدیک بھی امامت کا مستحق اپنے آپ کو نہیں سمجھتے تھے، "گھبرانے" کا لفظ مصنف امام نے جو استعمال کیا ہے، میری سمجھ میں اس سے تو یہی بات آتی ہے، باقی دوسروں سے کیا فرمایا کرتے تھے، اس کے متعلق ایک دلچسپ ظریفانہ لطیفہ حکیم الامت تھانوی نقل فرمایا کرتے تھے، قصص الاکابر میں ہے کہ

"مولانا محمد قاسم فرمایا کرتے تھے کہ دعوت کا کھانا، اور جماعت کی نماز ایسی چیزیں ہیں کہ ان میں اپنے اوپر کچھ بوجھ نہیں پڑتا۔"

فرماتے کہ

"دعوت کے کھانے کی کچھ فکر نہیں ہوتی کہ کہاں سے آیا ہے"

یہ تو پہلی چیز ہوئی، دوسری چیز اسی سلسلہ کی فرماتے کہ

"اسی طرح جماعت میں اللہ اکبر کہہ کر کھڑے ہو گئے، اب کچھ خبر نہیں کہ کیا ہوگا سب بار امام کے ذمہ" [۱]

اور یہی میرا مطلب تھا معلوم ہوتا ہے کہ جب لوگ امام بننے پر زیادہ اصرار فرماتے تو اسی قسم کے لطیفوں میں آپ ٹال دیا کرتے تھے، اور اصلی وجہ وہی تھی جس کی طرف "گھبرانے" کے لفظ سے مصنف امام نے اشارہ فرمایا ہے۔

---

[۱] مولانا محمد احسن گیلانی مرحوم فقیر کے جد امجد جن کو میں نے خود نہیں دیکھا تھا بہار کے ممتاز علماء میں شمار ہوتے تھے، عربی زبان میں چند کتابوں کے مصنف بھی تھے ان کے متعلق بھی سنا ہے کہ امامت سے گریز کرتے ہوئے عوام سے فرمایا کرتے کہ یہاں تسبیح کے تمام دانوں کے اندر ایک ہی تاگا پہنایا جاتا ہے لیکن تسبیح کے امام میں بجائے ایک کے دو تاگے ڈالے جاتے ہیں، بھلا اس دوہری مصیبت کو کون اپنے سرلے ۱۲

اسی ملفوظ کے آخر میں ہے کہ حضرت تھانوی نے فرمایا کہ

"پھر تبسم کرکے (سیدنا الامام الکبیر نے) فرمایا کہ تیسری چیز بد شوق طالب علم کے لئے جماعت کا سبق ہے، کہ پڑھیں نہ، اور کتابیں ختم ہو جائیں" (قصص الہادی ماہ جمادی الاولیٰ ۵۵ھ)

بظاہر ظرافت کے موقعہ کا ایک لطیفہ معلوم ہوتا ہے، لیکن تعلیم کے متعلق سیدنا الامام الکبیر کے جو اساسی نظریات و کلیات تھے، میرے نزدیک ان میں ایک اہم اصولی بات یہ بھی ہے۔ جماعتی یا مدرسی تعلیم جس کا رواج زیادہ تر پچھلے دنوں سے زیادہ ترقی پذیر ہوا ہے، اور پرانے اساتذہ انفرادی درس جو دیا کرتے تھے، قدیم طریقہ تعلیم پر یہی رنگ زیادہ غالب تھا، الغرض تعلیم کے ان دو مختلف النوعیت طریقوں کے متعلق حضرت والا کے جو خاص خیالات ہیں ان کا تفصیلی ذکر جہاں آئے گا، اسی موقعہ پر اس اجمال کی تفصیل بھی انشاء اللہ کی جائے گی۔

یہاں تو صرف یہ عرض کر رہا تھا کہ "امامت" کے متعلق خود ذاتی احساس حضرت والا کا کیا تھا اور عذر کرتے ہوئے دوسروں کو کیا فرمایا کرتے تھے۔

لیکن جیسے باوجود پرہیز و گریز کے کبھی کبھی افتاء یا سوالوں کے جواب دینے پر آپ کو مجبور ہونا پڑتا تھا، مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ "امامت" کے متعلق بھی آپ کے انکار کی شدت آخر زمانہ میں کچھ نرمی سے بدل گئی تھی، خود مذکورہ بالا شہادت میں "اول" کا لفظ بھی یہی بتا رہا ہے، نیز آگے وہی یہ اطلاع بھی دیتے ہیں کہ

"آخر کو اتنا ہوا کہ وطن میں نماز پڑھا دیتے تھے" ص۲۱

وطن سے، مراد نانوتہ ہے، یہ نانوتہ کی خوش قسمتی ہے جو حضرت والا کے بزرگوں کا مسکن تھا، رشتے کے ان بزرگوں کی بات آخر کب تک ٹال سکتے تھے۔ سپر اندازی پر معلوم ہوتا ہے کہ نانوتہ کی اسی خصوصیت نے غالباً مجبور کر دیا تھا، واللہ اعلم بالصواب نانوتہ سے باہر بھی اس التزام سے ہٹنے کی کوئی صورت کبھی پیش آئی یا نہیں۔ اس وقت تک تلاش کے باوجود کوئی شہادت مجھے نہیں مل سکی ہے، یعنی نانوتہ کے سوا کسی اور جگہ بھی اپنی امامت میں نماز پڑھنے کا موقعہ لوگوں کو دیا گیا یا نہیں۔

اس کا پتہ نہیں چلا ہے، مصنف امام کے کلام کا نحوی تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ غالباً نانوتہ ہی کی حد تک یہ بات محدود رہی [۱]۔

[۱] جہاں تک امامت صلوٰۃ کے التزام کا تعلق ہے وہ بلا شبہ چند دن کے لئے نانوتہ تک محدود ہے، لیکن احیاناً و اتفاقاً کہیں کہیں گھر کر اور مجبور ہو کر امامت کرنے کے واقعات نانوتہ کے علاوہ دوسرے مقامات میں بھی پیش آئے ہیں منجملہ ان کے ایک واقعہ یہ ہے جو مجھ سے حاجی امیر شاہ خاں صاحب مرحوم نے بیان فرمایا کہ مسجد چھتہ دیوبند میں امامت کے فرائض حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ انجام دیا کرتے تھے اتفاقاً ایک روز مولانا کو فجر کی نماز میں آنے میں دیر ہوئی اور مقررہ وقت سے کچھ زیادہ وقت گذر گیا، تو سب کے اصرار پر حضرت والا نے امامت کرائی اور پہلی رکعت میں سورۂ حاقہ پڑھی جس میں قیامت کے ہولناک حالات کا ذکر ہے۔ امیر شاہ خاں صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ جب تک حضرت قراۃ کرتے رہے ہر شخص کے سامنے یہ عیاں تھا کہ میدان محشر قائم ہے۔ حساب کتاب شروع ہے، نامۂ اعمال ہاتھوں میں دیئے جا رہے ہیں اور میدان قیامت برپا ہے گویا جو جو مضامین سورۂ حاقہ میں وارد ہوئے ہیں وہ سب کے سب عیاناً متمثل ہو کر سب کے سامنے تھے، امامت ہی کا دوسرا واقعہ جناب موصوف ہی سے یہ سنا کہ حضرت جیسے امتیازی صورتوں (امامت و افتاء وغیرہ) سے گھبراتے تھے ایسے ہی امراء سے بھی بہت کتراتے تھے اور کسی طرح کسی امیر کو ملاقات کا موقعہ نہیں آنے دیتے تھے، خورجہ کے ایک رئیس کو اس کی بے حد تمنا تھی کہ میرے گھر پر ایک دفعہ حضرت والا آجائیں مگر وہ کامیاب نہ ہوتے، اتفاق سے جنگ روم و روس چھڑ گئی اور حضرت نے ترکوں کی اعانت کے لئے چندہ کی تحریک شروع کی جو اس زمانہ میں سلطانی چندہ کے نام سے معروف ہوئی۔ ان رئیس صاحب کے لئے یہ زریں موقعہ ہاتھ لگ گیا انھوں نے کہلایا کہ اگر حضرت والا ان کے گھر پر تشریف لا کر وعظ فرما دیں تو وہ سلطانی چندہ میں دس ہزار روپئے دیں گے۔ حضرت نے منظور فرما لیا اور ان کے یہاں وعظ فرمایا۔ انھوں نے حسب وعدہ دس ہزار روپیہ پیش کیا، ختم مجلس پر حضرت اٹھے تو مجمع بھی اٹھا اور لوگوں میں حضرت کی مہمانی کے بارہ میں کہا سنی اور رد و کد ہونے لگی۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ حضرت کو میں اپنے گھر لیجا کر مہمان بناؤں، لوگ تو اس جھگڑے اور بحث میں سرگرداں تھے اور حضرت اسی ہجوم میں آہستہ سے نکلکر روانہ ہو گئے، مغرب کا وقت آچکا تھا، اذان ہونے والی تھی، حضرت والا نہر کے کنارے ایک غیر معروف مسجد میں پہنچے۔ وہاں اتفاق سے امام مسجد موجود نہ تھا، لوگوں میں تشویش ہوئی کہ نماز کون پڑھائے، ہر ایک دوسرے پر ٹالتا تھا: چند ایک نے حضرت سے کہا کہ بھائی تم ہی نماز پڑھا دو، یہ لوگ حضرت کو پہچانتے نہ تھے، مگر حضرت عذر فرماتے رہے، جب کوئی بھی امامت کے لئے تیار نہ ہوا تو لوگوں نے حضرت کو یہ کہکر زبردستی امامت کے مصلے پر ڈھکیل دیا کہ بندہ خدا تو مسلمان تو ہے کیا تجھے دو چار سورتیں بھی قرآن شریف کی یاد نہیں جو امامت سے اتنا گھبرا رہا ہے۔ حضرت نے اب مجبور ہو کر امامت کرائی۔ مگر عجیب اتفاق یہ پیش آیا کہ پہلی رکعت میں تو قل اعوذ برب الناس پڑھ گئے اور دوسری میں قل اعوذ برب الفلق۔ ختم نماز پر اس مسجد کے ان پڑھ نمازیوں میں چہ می گوئیاں شروع ہوئیں کہ یہ عجیب آدمی ہے جس نے قرآن ہی الٹا پڑھ دیا۔ حضرت نے فرمایا بھائی

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

مولویت کے لوازم و آثار میں ایک وعظ گوئی کا پیشہ بھی ہے، جیسے افتاد و امامت کی توقع علوم دینی کے علماء سے لوگ کرتے ہیں، یا خود علماء ہی ان امور کا حقدار اپنے آپ کو سمجھتے ہیں، یہی حال وعظ و تلقین تذکیر و خطابت کا بھی ہے، اس میں شک نہیں کہ بہ نسبت افتاء و امامت کے آخر زندگی میں تقریر و بیان سیدنا الامام الکبیر کی زندگی کی ایک خصوصیت بن گئی تھی، صوبجات متحدہ خصوصاً جو آبادیاں اس صوبہ کی روھیلکھنڈ میں مشہور و معروف ہیں، شاید ہی کوئی شہر بلکہ ممتاز قصبہ ایسا ہوگا جس کے باشندوں کو حضرت والا کی تقریر کے سننے کا موقعہ نہ ملا ہو، خصوصاً سہارنپور، میرٹھ، دیوبند، خورجہ، رامپور، شاہجہانپور، رڑکی وغیرہ میں سننے والوں کو خطابت و بیان کے جس ملکہ فائقہ کے مسلسل تجربات ہوئے ان ہی کی بنیاد پر ارباب علم و بصیرت میں مشہور ہو گیا تھا کہ

"مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روح القدس کی تقریر ہو رہی ہے"[1]

لیکن خطابت و تقریر کے اس میدان میں خود اترے تھے، یا اتارنے والوں نے اصرار کر کے مسلمانوں کو حضرت والا کے بیانی کمالات سے مستفید ہونے کا موقعہ عطا کیا تھا؟ سب سے پہلی شہادت تو اس سلسلہ میں خود مصنف امام کی ہے کہ

(صفحہ ۳۹۵ کا باقی حاشیہ ملاحظہ فرمایئے) میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ میں امامت کے لائق نہیں ہوں، لوگوں نے کہا کیوں کیا پتہ تھا کہ تو قرآن بھی سیدھا پڑھنا نہیں جانتا، حضرت نے اس پر یہ فرمایا کہ مولویوں سے یہ سنا ہے کہ نماز اس طرح بھی ہو جاتی ہے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا، اس پر لوگوں نے تند لہجوں میں کہا کہ چوری اور سرزوری۔ ایک تو نماز الٹی پڑھا دی اور اوپر سے مولویوں کو بدنام بھی کرے ہے، یہاں یہ جھگڑا چل ہی رہا تھا کہ حضرت کو ڈھونڈتی ہوئی ایک جماعت ادھر آنکلی اور دیکھا کہ حضرت جاہلوں میں گھرے ہوئے ہیں، تب انھوں نے لوگوں کو بتلایا کہ تم کس کے ساتھ یہ معاملہ کر رہے ہو، یہ تو مولانا محمد قاسم صاحب ہیں اس پر لوگ نادم ہوئے اور عجز و نیاز سے معافی کے خواستگار ہوئے۔ بہرحال دونوں واقعات سے کہیں کہیں مجبور ہو کر امامت کرنا ثابت ہوتا ہے"

"محمد طیب"

متعلقہ صفحہ ہذا [1] یہ فقرہ اپنے عم محترم حضرت الاستاذ مولانا سید ابوالنصر الحافظ الحاج رحمۃ اللہ علیہ سے فقیر نے براہ راست متعدد بار سنا ہے، وہ اپنے والد یعنی فقیر کے جد امجد مولانا محمد احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے عموماً اس فقرے کو نقل کیا کرتے تھے ۱۲

"وعظ بھی نہ کہتے تھے" ص۱۳۱

مطلب یہ ہے کہ ابتدا میں حضرت والا کا یہی طرزِ عمل تھا، امیر شاہ خاں صاحب کے حوالہ سے بھی ارواح میں نقل کیا ہے کہ

"مولانا نانوتوی وعظ نہ کہتے تھے" ص۱۶۱

پھر اس طرزِ عمل میں تبدیلی کس راہ سے ہوئی؟ مصنف امام نے اس کی تاریخ یہ بیان کی ہے، کہ حضرت شاہ اسحٰق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذِ جلیل، عالم باعمل حضرت مولٰنا مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ جنھیں سیدنا الامام الکبیر غیر معمولی احترام و عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور اپنے اکابر میں ان کو شمار کرتے تھے[۱]، ان ہی

"مولٰنا مظفر حسین مرحوم کاندہلوی نے اول وعظ کہلوایا" ص۱۳۱

واللہ اعلم یہ پہلا تاریخی وعظ کہاں کہا گیا؟ بظاہر کاندھلہ ہی میں شاید یہ وعظ ہوا ہو، مصنف امام ہی نے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ آپ کے اس پہلے تاریخی وعظ میں

"خود (مولٰنا مظفر حسین نے) بھی بیٹھ کر سنا" ص۱۳۱

اور یہ بھی لکھا ہے کہ

"اور بہت خوش ہوئے" ص۱۳۱،

گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ دنیا کو خطابت و بیان کے اس غیر معمولی نمونہ سے استفادہ کا موقعہ جو ملا، مولٰنا

---

[۱] اسی قوت پر مصنف امام نے مولٰنا مظفر حسینؒ کا ذکر غیر معمولی الفاظ میں فرمایا ہے اپنی چشم دید شہادت درج کی ہے کہ اتباع سنت میں نہ ایسا دیکھا نہ سنا تقویٰ کا حال یہ تھا کہ مشتبہ لقمے کو معدہ قبول نہ کرتا تھا، پیادہ پا سات حج سے سرفراز ہوئے۔ مدینہ منورہ میں دفن ہونے کی آرزو تھی ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۵ء یعنی فتنہ غدر کے سات سال بعد ان کی یہ آرزو پوری ہوئی، مدینہ میں انتقال ہوا، عقد بیوگان کی ترویج میں غیر معمولی کوشش مولٰنا نے کی صرف نحو کے بغیر عورتوں کو قرآن کا ترجمہ بھی پڑھایا کرتے تھے، قصباتی زبان طرز وضع کی وجہ سے متعدد مواقع میں بعض دلچسپ قصے پیش آئے راستہ میں ایک دن ایک مسافر جو بار بار کہتا تھا کہ مولانا مظفر حسین کاندھلے والے بڑے زبردست عالم اور ولی اللہ ہیں۔ آپ فرماتے کہ نہیں بھائی صرف نماز بس وہ پڑھ لیتا ہے۔ مسافر غصہ میں الجھ الجھ پڑتا آخر کسی دوسرے آنے والے نے راز فاش کیا کہ ارے یہی تو مولانا مظفر حسین ہیں، ایک ہندو آپ کے عملی حالات سے سفر ہی کے زمانہ میں اپنے خاندان سمیت مسلمان ہو گیا، ارواح وغیرہ میں انکے غیر معمولی حالات درج ہیں ۱۲

مظفر حسین کے ہی دوسرے حسنات اور نیکیوں میں ایک بڑی نیکی یہ بھی تھی،

ایسا آدمی جو عمر میں بھی بڑا ہو، اور اس کے علم و فضل سے بیان کرنے والے کا دل و دماغ متاثر بھی ہو، تجربہ بتاتا ہے کہ یوں ہی اس کے سامنے تقریر و بیان کی ہمت پست ہو جاتی ہے، خصوصاً پہلی تقریر کے سننے والوں میں مولٰنا مظفر حسین مرحوم کی شرکت اور وعظ کی کامیابی پر اظہار مسرت، میرے نزدیک تو اس کی دلیل ہے کہ فطرۃً آپ خطیب تھے،

لیکن شاید اپنے اس جبلی کمال کا علم خود آپ کو بھی نہ تھا، خدا جزائے خیر دے مولٰنا مظفر حسین کو کہ لاہوتی علوم کے ایک بحر رواں کا دہانہ گویا ان ہی کی توجہ و برکت سے دنیا کے لئے کھل گیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مظفر حسین کے ارشاد کی تعمیل کے بعد پھر وعظ سے انکار پر اصرار باقی نہ رہا، یہ خبر دیتے ہوئے کہ پہلے مولانا نانوتوی وعظ نہیں کہتے تھے امیر شاہ خاں صاحب کہا کرتے تھے کہ

"کوئی بہت اصرار کرتا تو کہہ دیتے تھے" ص۱۷۰

جس سے معلوم ہوا کہ وعظ گوئی کو اپنا پیشہ تو آپ نے کسی زمانہ میں بھی نہیں بنایا، ہاں! مولٰنا مظفر حسین کے حکم کی تعمیل کے بعد اسی قسم کا اصرار جیسا کہ مولٰنا نے کیا تھا کوئی کرتا، تو بیان کر دیا کرتے تھے،

لیکن ظاہر ہے کہ اصرار کرنے والوں کی دنیا میں کمی کیا تھی، جب بے چارے عام مولویوں کو بھی اصرار کرنے والوں کا یہ گروہ نہیں چھوڑتا، اور بولنے پر مجبور ہی کر دیتا ہے، تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ ان ہی اصرار کرنے والوں کے سلوک کی نوعیت کیا ہوگی۔ جن جن شہروں یا آبادیوں میں حضرت والا کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ یا اتفاقاً کسی ضرورت سے جہاں قدم رنجہ فرمایا گیا ہے، مشکل ہی سے ان میں کوئی جگہ ایسی ہوگی، جہاں ان اصرار کرنے والوں نے تقریر کرنے پر مجبور نہ کیا ہو۔

آپ اپنی تقریروں میں "مؤید بروح القدس" تھے اس کا اندازہ شاہجہانپور کے میلہ خدا شناسی میں اس وقت ہوا جب ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسرے ادیان و مذاہب کے ہزار ہا ہزار افراد کو

دیکھا گیا تھا کہ بیان کرنے والا اپنے محبوب پیغمبر (فداہ ابی وامی) کے "خلق عظیم" کو بیان کر رہا ہے سارے مجمع کو خطاب کر کے آخر میں جس وقت یہ فرمایا جا رہا تھا کہ "انصاف سے کوئی صاحب تبلائیں تو سہی اس قسم کے اخلاق کا کوئی اور شخص ہوا ہے تو دیکھا گیا کہ سننے والوں پر

"ایک کیفیت تھی، ہر کوئی ہمہ تن گوش ہو کے مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کی جانب تک رہا تھا، کسی کی آنکھوں میں ستے ہیں آنسو، کسی کی آنکھوں میں حیرت"

اور یہ حال عوام ہی کا نہ تھا، اسی میلہ کی روئداد میں ہے کہ

"پادریوں کی یہ حالت تھی کہ ششدر، بے حس و حرکت" (روئداد میلہ خدا شناسی ص۲۷)

بنے ہوئے تھے، اسی کتاب میں یہ بھی ہے کہ ان ہی پادریوں میں ایک پادری غالباً جس کا نام اینک صاحب تھا شاہ جہاں پور سے بریلی پہنچکر ایک صاحب کے آگے سیدنا الامام الکبیر کی تقریر کی دل دوزیوں کا ذکر ان الفاظ میں کرنے لگا کہ۔

اگر تقریر پر ایمان لایا کرتے تو اس شخص (سیدنا الامام الکبیر) کی تقریر پر ایمان لے آتے" ص۴۴

اسی میلہ کی تقریر سننے والوں میں سے ایک نیک دل ہندو نے اپنے احساس کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ

"ایسی تقریریں بیان کیں کہ پادریوں کو جواب نہ آیا کوئی اوتار ہوں تو ہوں" ص۴۴

لیکن یہ احساسات تو دوسروں کے تھے، خود حضرت والا کا اپنے وعظ و تقریر کے متعلق کیا خیال تھا حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس کے راوی ہیں، یعنی اس تمہیدی کلیہ کو بیان کر کے کہ

"حضرت مولانا محمد قاسم صاحب فرمایا کرتے تھے کہ وعظ کہنا دو شخصوں کا کام ہے۔

ایک محقق کا، اور ایک بے حیا کا"

اس کے بعد حکیم الامۃ یہ روایت کیا کرتے تھے کہ

"اور اپنی نسبت (حضرت نانوتوی) فرماتے تھے کہ میں بے حیا ہوں، اس لئے وعظ کہہ لیتا ہوں"

(قصص ص۱۳ الہادی جمادی الثانی ۵۷ھ)

بھری مجلسوں میں اس قسم کے اعترافات بھی خواہ بطور کسر نفسی ہی کیوں نہ ہوں، آسان نہیں ہیں لیکن حضرت تھانوی سیدنا الامام الکبیر کے دیکھنے والوں میں تھے، ان کی فطرت اور جبلی خصوصیات سے واقف تھے، اسی لئے مذکورہ بالا فقرے کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ

"یہ تو آسان ہے کہ اظہار تواضع کے لئے ہر واعظ زبان سے یہ کہدے، مگر فرق یہ ہے کہ وہ بناوٹ سے ہوگا اور مولٰنا (نانوتوی) بے بناوٹ کہتے تھے"

مطلب یہ تھا کہ کمال کسی رنگ میں ہو، اپنی طرف اس کے انتساب کو سیدنا الامام الکبیر کی فطرت برداشت ہی نہیں کر سکتی تھی، آگے اسی کے بعد حضرت تھانوی کی طرف یہ بات جو منسوب کیگئی ہے کہ

"کیونکہ ان کو (سیدنا الامام الکبیر) کو کمالاتِ یقینیہ کا نبع معلوم تھا، اس کے سامنے اپنے کمالات ہیچ نظر آتے تھے"

بہر حال اپنے تقریری کمال کے متعلق یہ احساس تو سیدنا الامام الکبیر کا تھا، لیکن دوسرے آپ کی تقریروں سے غیر معمولی طور پر کیوں متاثر ہوتے تھے اس کا سراغ بھی حضرت والا ہی کے ایک حکیمانہ نکتہ کی روشنی میں لگایا جا سکتا ہے، امیر شاہ خاں مرحوم کے حوالہ سے ارواح میں یہ نقل کرتے ہوئے کہ

"ایک مرتبہ کسی نے (وعظ پر) اصرار کیا"

شاید اس وقت طبیعت آمادہ نہ تھی، یا کیا وجہ ہوئی۔ بہر حال کہنا یہ ہے، کہ اصرار کرنے والے صاحب سے خاں صاحب کا بیان ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے یہ فرماتے ہوئے کہ:

"وعظ ہمارا کام نہیں اور نہ ہمارا وعظ کچھ مؤثر ہو سکتا ہے"

آگے یہ ارشاد فرمایا کہ

"وعظ کام تھا، مولٰنا اسمٰعیل شہید صاحب کا اور ان ہی کا وعظ مؤثر بھی تھا"

پھر آپ نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ کو سمجھایا کہ تقریر و بیان کی ایک شکل تو یہ ہوتی ہے کہ بطور فن کے بعض لوگ خطابت کی مشق کرنے میں موجودہ اصطلاح میں گویا یوں سمجھئے کہ آرٹ کی حیثیت سے اس کو سیکھتے ہیں۔ اور جن لوازم و ضروریات کی حاجت اس فن کے حاصل کرنے میں ہوتی ہے

ان کو وہ حاصل کرتے ہیں، ان لوگوں کا بیان بیان تو ہوتا ہے اور شاعری، موسیقی، ظرافت، قصہ خوانی وغیرہ چیزوں سے لوگ عموماً متاثر ہوتے ہیں، اسی طرح اس نوعیت کے مصنوعی بیانات اور تقریروں کا بھی لوگوں پر اثر پڑتا ہے، گویا ان وعظوں کی حقیقت قریب قریب وہی ہوتی ہے، جو آج کل کے تماشا گھروں میں اداکاروں کی ہوتی ہے کہ جمالیاتی اثر پذیری کا جو فطری عاطفہ آدمی کے اندر پوشیدہ ہے تھوڑی دیر کے لئے وہ متحرک ہو جاتا ہے، وقتی لذت لوگوں کو مل جاتی ہے، لیکن یہ لذت بھی وقت کے ختم ہونے کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے اور ساری سنی ہوئی باتیں سننے والوں کے لئے مجلس سے اٹھنے کے بعد کچھ ان سنی سی بن کر رہ جاتی ہیں اور اس قسم کی تقریروں کے عدم تاثیر کا مطلب یہی ہے کہ ان سے سننے والوں کے اندر کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں ہوتا، اور سننے والوں میں اپنا کوئی دیرپا اثر ایسی تقریریں نہیں چھوڑتیں۔ برخلاف اس کے تقریر ہی کا ایک اور رنگ بھی ہے، سیدنا الامام الکبیر نے مثالوں سے اس کو سمجھاتے ہوئے فرمایا کہ انسانی فطری تقاضوں، بھوک پیاس یا قضاء حاجت وغیرہ کی جو حالت ہے کسی خاص نصب العین کی افادیت کے متعلق اسی قسم کی کیفیت بیان کرنے والوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً آدم کی اولاد کی گمراہی ان کی غیر آئینی زندگی کے دردناک عواقب اور انجام کا تصور ان کو تڑپا دیتا ہے اور انسانیت کی بہی خواہی کا جذبہ ان پر کچھ اس طریقہ سے مسلط ہو جاتا ہے کہ جیسے فطری تقاضوں کا حال یہ ہوتا ہے، کہ

"اس وقت تک بے چینی رہتی ہے جب تک ان سے وہ فراغت نہ حاصل کرلے۔"

اور بقول سیدنا الامام الکبیر

"اگر (فطری تقاضوں میں مبتلا انسان) کسی سے باتوں میں بھی مشغول ہوتا ہے یا کسی ضروری کام میں لگا ہوتا ہے تو اس وقت بھی قلب میں (مثلاً) پاخانہ پیشاب ہی کا تقاضا ہوتا ہے، اور طبیعت اس کی اسی طرف متوجہ ہوتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ جلد سے جلد اس کام سے فراغت پاکر قضاء حاجت کے لئے جاؤں۔"

بہرحال فطرت کے ان ہی ناگزیر وجدانی تقاضوں کا ذکر کر کے سیدنا الامام الکبیر نے وعظ پر اصرار

کرنے والے صاحب سے کہا کہ

"کم از کم اتنا تقاضائے ہدایت تو ضرور ہونا چاہیئے"

فرمایا کہ

"اگر اتنا بھی نہ ہو، تو نہ واعظ وعظ کا اہل ہے اور نہ اس کا وعظ مؤثر ہو سکتا ہے"

آگے امیر شاہ خاں صاحب کے بیان سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا نے تقاضائے ہدایت کی اس شرط سے اپنے آپ کو بھی اور اپنے جیسے دوسرے مولویوں کو بھی محروم قرار دیتے ہوئے اصرار کرنے والے صاحب کے سامنے تقریر نہ کرنے کا عذر پیش کیا، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت والا تقریر کے لئے اپنی طبیعت کو موزوں نہیں پا رہے تھے شاید ہدایت سے زیادہ کسی دوسرے مسئلہ کی طرف توجہ منعطف ہو، بہرحال آخر میں جیسا کہ امیر شاہ خاں مرحوم کی اسی روایت میں ہے کہ پھر پلٹ کر حضرت مولٰنا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کرنے لگے کہ

"ہاں یہ تقاضا دوسروں کی راہ نمائی وہدایت کا، مولوی اسمٰعیل صاحب کے دل میں پورے طور پر موجود تھا، اور جب تک وہ ہدایت نہ کر لیتے چین نہ آتا تھا" صلا

اگرچہ کوئی خاص اشارہ خاں صاحب مرحوم کی روایت کے الفاظ سے نہیں ملتا، لیکن بجائے دوسروں کے ابتدا میں بھی مولٰنا اسمٰعیل شہید ہی کا اس موقعہ پر تذکرہ فرمانا، اور آخر میں بھی پھر ان ہی کا حوالہ دینا اس کا میرا ذہن خطابت وتقریر ہی کی افادیت وتاثیر بخشی کے ایک خاص پہلو کی طرف منتقل ہو رہا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیرؒ نے غالباً اسی پہلو کی طرف اشارہ کیا ہو گا، لیکن راوی کے ذہن میں شاید اس کی چنداں اہمیت نہ تھی، اس لئے ممکن ہے کچھ الفاظ چھوٹ گئے ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ جیسے وعظ و بیان کے متعلق جہاں یہ نکتے ظاہر کئے گئے، کہ بعض لوگ فطرتاً بے جھجک اور غیر مرعوب دل و دماغ کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں بطور طبیعت کے اسی کیفیت کی تعبیر حضرت والا نے "بے حیائی" کے لفظ سے کی ہے۔ بہرحال اسی قسم کے لوگ بطور آرٹ اور فن کے تقریر کا پیشہ

اختیار کر لیتے ہیں، اسی طرح جن لوگوں کے قلوب پر وجدانی تقاضوں کی طرح کسی نصب العین کے اظہار واشاعت کا شدید تقاضا جب مسلط ہو جاتا ہے، اور یہی تقاضا ان کو تقریر کرنے پر آمادہ کرتا ہے، اس حالت میں بات چونکہ ان کے دل سے نکلتی ہے اس لئے دلوں پر اس کی چوٹ پڑتی ہے، سننے والے اسی قسم کی تقریروں سے حقیقی معنوں میں متاثر ہوتے ہیں، قوموں اور امتوں میں فکری و عملی انقلاب اسی نوعیت کی تقریروں سے رونما ہوا ہے، جیسے ہندوستان کے پژمردہ وافسردہ بلکہ کہنے کو کہہ سکتے ہیں بصورت زندہ درحقیقت مردہ قلوب رکھنے والے مسلمانوں میں اچانک بیداری کی لہر حضرت مولٰنا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تقریروں سے کسی زمانے میں جو دوڑ گئی تھی اور پشاور سے چاٹگام تک کی زمین ہلنے لگی تھی، سرفروشی اور جان بازی کے شوق میں مسلمان اپنے گھروں سے شمشیر بکف نکل پڑے تھے، تو یہ انقلابی رنگ پیشہ ورانہ مصنوعی خطابت کے زور سے پیدا نہیں ہو سکتا تھا، بلکہ راز وہی تھا کہ پہلے آگ خود کہنے والے کے دل میں لگی، اور اپنے دل کی اسی آگ کو زبان کی راہ سے وہ دوسروں کے دلوں میں منتقل کرتا چلا جا رہا تھا، جہاں تقریر و بیان کے متعلق ان دو اصولی باتوں کی طرف حضرت والا نے اشارہ فرمایا ہے، وہیں بار بار مولٰنا اسمٰعیل شہید کا ذکر اس موقعہ پر خصوصیت کے ساتھ جو فرمایا گیا ہے، حالانکہ خود ولی اللّٰہی خاندان میں حضرت شہید کے علاوہ حضرت مولٰنا شاہ عبد العزیز اپنے وقت کے بہترین خطیبوں میں شمار ہوتے تھے، ان کی ہفتہ واری تقریروں کا تذکرہ اب بھی لوگ کرتے ہیں، بیان کیا جاتا ہے کہ جس دن شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کا وعظ ہوتا تھا، گویا تمام دلّی آپ پر سمٹ کر جمع ہو جاتی تھی، اور دور دور سے لوگ صرف آپ کی مجلس وعظ میں شریک ہونے کیلئے دلّی آیا کرتے تھے۔ ...

کچھ بھی ہو حضرت شہید ہی کو تقریری میدان کے مثالی وجود کی حیثیت سے پیش کرنے ہی سے یہ بات میری سمجھ میں آتی ہے کہ شاید حضرت والا نے ادھر اشارہ کیا ہو، کہ ایسے مسائل جن کے متعلق دلی جوش و خروش کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً وہی کام جو حضرت شہید کے پیش نظر تھا یعنی مسلمانان ہند کو پنجاب کے مظلوم و ستم دیدہ مسلمانوں کی نجات و خلاصی کے لئے آپ آمادہ کرنا چاہتے تھے،

اور اسی نصب العین کے تحت پہلے بھیس بدل کر براہ راست پنجاب کا دورہ آپ نے بنفس نفیس خود کیا، جس سے غرض یہی تھی کہ سنی سنائی باتوں سے خود آپ ہی کا قلب اتنا متاثر نہیں ہو سکتا تھا جتنا مسلمانان پنجاب کے حال زار کے عینی مشاہدہ سے اثر پذیر ہوا۔ یوں اپنے دل میں پہلے خود آگ لگالی گئی، اور اسی جلے بھنے ہوئے دل کو لئے ہوئے وہ دلی سے نکلے اور حضرت سید شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی امارت میں ہندوستان کے شہروں، قصبوں، دیہاتوں کا دورہ شروع کر دیا، جو آگ آپ کے سینے میں لگی ہوئی تھی اس کی چنگاریاں اڑ اڑ کر دوسروں کے متاع صبر و سکون کو جلانے لگیں اور جہاں کچھ نہیں ہو سکتا تھا، دیکھا گیا کہ اسی ہندوستان کے مردہ دل مسلمانوں میں ایک ایسی طوفانی ہل چل پیدا ہو گئی کہ مقادیر کی مجبوریاں اگر نہ پیش آجاتیں تو بالاکوٹ کے دامن میں جو ایمانی تحریک دفن ہو گئی، شاید مسلمانوں کے کھوئے ہوئے سیاسی اقتدار کی واپسی کا سبب بن جاتی، ولکن ماقدر اللہ فسوف یکون لایسئل عما یفعل وھم یسألون۔

اس قسم کے وقتی جوش و خروش کے پیدا کرنے کا کام تو تقریروں سے لیا جا سکتا ہے لیکن بجائے وقتی کام کے دوامی نتائج کے لئے دیکھا گیا ہے کہ وعظ و بیان والی کوششیں عموماً دیرپا ثابت نہیں ہوتی ہیں۔ جب تک واعظ صاحب کے مواعظ کا سلسلہ جاری رہتا ہے، لوگوں میں محسوس ہوتا ہے کہ بیداری پیدا ہو گئی۔ غریب واعظ مطمئن ہو کر چلا جاتا ہے، کچھ دن بھی نہیں گذرنے پاتے کہ جاگنے والے پھر سو رہتے ہیں، گویا ان کی حیثیت کھینچے ہوئے ربر کی ہوتی ہے، کھینچنے والے کے ہاتھ سے چھوٹا نہیں کہ پھر اپنی اصلی حالت پر وہ واپس ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا امیر شاہ خاں صاحب کی روایت کے خود الفاظ سے تقریر و بیان کی اس خصوصیت کا اشارہ مجھے نہیں ملا ہے، لیکن مولنا شہید کے ذکر اور ان کے کام کی جو نوعیت تھی اس سے بے ساختہ میرا ذہن بیانی کوششوں کی اس خصوصیت کی طرف منتقل ہو گیا، گو اسی روایت کے آخر میں سیدنا الامام الکبیر کی طرف ایک فقرہ یہ بھی جو منسوب کیا گیا ہے یعنی حضرت شہید کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا کہ

"چنانچہ وہ ایک ایک دن میں بیس بیس جگہ وعظ کہتے تھے۔" صنا۱۶

"چنانچہ" کے اس لفظ سے جو ربط اول وآخر کے مقدمات میں پیدا کیا گیا ہے، کچھ عجیب سا ہے اسی لئے میرا خیال ہے کہ روایت میں کچھ الفاظ غالباً چھوٹ گئے ہیں، میرا ذہن جس مسئلہ کی طرف منتقل ہوا ہے اگر مان لیا جائے کہ حضرت والانے اس کی طرف اشارہ فرمایا تھا، تو بے ربطی کا ازالہ ہو جاتا ہے، اور یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ وقتی جوش وخروش ہی پیدا کرنا، چونکہ مقصود تھا، اس لئے کسی ایک جگہ زیادہ دن قیام کر کے کام نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ آگ لگانے والا جیسے آگ لگاتا چلا جاتا ہے "اسی طرح ایک ایک دن میں بیس بیس مقامات پر تقریر فرما کر حضرت شہید مسلمانوں کو "جہاد" پر آمادہ فرماتے تھے اور وعظ وتقریر کے سلسلہ میں یہ ایک بڑے پتہ کی بات ہے۔

اس موقعہ پر شاید ضرورت سے زیادہ مجھے کچھ کہنا پڑا، لیکن جو کچھ عرض کیا گیا، اس کے پڑھنے کے ...... لئے شاید ایک دو منٹ کافی ہو سکتے ہیں، لیکن بات اگر لوگوں کی سمجھ میں آجائے تو مسلمانوں کی دینی زندگی کی تنظیم جدید کے سلسلے میں وعظ وتقریر سے کام لیتے ہوئے جو حضرات یہ باور کئے ہوئے ہیں کہ دینی زندگی کے اس رنگ میں دوام واستمرار صرف وقتی ہل چل، جوش وخروش سے قائم ہو جائے گا، شاید ان کے عزیز اوقات ضائع ہونے سے محفوظ ہو جائیں گے، یہ یاد رکھنا چاہئے کہ دوام واستمرار کی اس کیفیت کے لئے وہی دستور قدیم جس کا عہد نبوت میں "صحبت" نام تھا، اور نبوت کے پچھلے نمائندوں میں ارادت وبیعت وغیرہ ناموں سے وہ موسوم ہوا، یہی نسخہ پہلے بھی کارگر ہوا تھا، اور اب بھی اگر کامیابی حاصل ہو گی، تو اسی سے ہو گی، لن یصلح اٰخر ھذہ الامة الا بما صلح بہ اولھا،

خیر مجھے پھر اپنے اصل کام کی طرف متوجہ ہونا چاہئے، عرض یہ کر رہا تھا کہ جیسے افتاء وامامت سے سیدنا الامام الکبیر پرہیز فرماتے تھے، یہی رجحان آپ کا شروع میں وعظ وتقریر کے متعلق بھی تھا، لیکن خارجی اثرات اور وقت کے اہم تقاضوں نے مجبور کیا اور اپنے طبعی اقتضاء کے خلاف اس میدان میں بھی آپ کو اترنا ہی پڑا، اگرچہ بجائے کسی کمال کے اپنے بیانی کمالات کو ہی سمجھتے رہے

کہ شرم و حیا کے کمالات سے محرومی کا یہ نتیجہ ہے ۔ یہی خود بھی سمجھتے تھے اور اعلانیہ بھری مجلسوں میں لوگوں کے سامنے بقول حضرت تھانوی بغیر کسی تصنع کے اپنی اس بے کمالی کا اظہار کیا کرتے تھے اور تقریر کی وہ قسم جس کا منشا مقرر کی بے حیائی ہو' اس کے مقابلہ میں تقریر ہی کی دوسری قسم کے مقرروں کو آپ "محقق" کے نام سے موسوم کرتے تھے، حضرت والا کا خود اپنے متعلق جو خیال بھی ہو ۔ لیکن جب میں یہ سوچتا ہوں، ریاست رامپور والی تقریر اور اس مجلس کو سوچتا ہوں جس کا ذکر کرتے ہوئے کسی موقعہ پر میں نقل کر چکا ہوں کہ

"شہر کے امرار، رؤسار، علمار، عمائد شہر، طلبار غرضکہ ہر طبقہ کے لوگ بھر گئے تھے ۔"

اور یہ کہ

"تمام مشاہیر علمار سوائے مولوی عبد الحق صاحب خیر آبادی کے اس وعظ میں موجود تھے مگر بولنے کی جرأت کسی کو نہ ہوئی" (ارواح ص ۱۹۹)

تو سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ "محقق والی تقریر" کے نام سے آخر تقریر و بیان کی کس قسم کو موسوم کیا جائے، غیر مسلم تک جن تقریروں کو سن سن کر کہتے ہیں کہ تقریروں ہی کی بنا پر اگر آدمی مسلمان ہو سکتا تھا تو میں مسلمان ہو جاتا، یا "اوتار" تک تسلیم کرنے کے لئے جس کی تقریریں لوگوں کو آمادہ کر دیتی ہوں، بتایا جائے کہ وہ "تحقیقی تقریر" کے سوا وہ اور کیا ہو سکتی ہے[۱]۔

---

[۱] امیر شاہ خاں مرحوم کے حوالہ سے ارواح میں یہ قصہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ حضرت نانوتوی کی مجلس وعظ میں ایک دفعہ مشہور معقولی عالم مولانا احمد حسن بھی شریک تھے غالباً یہ امروہی نہیں بلکہ مولانا احمد حسن کانپوری مرحوم ہیں، جو حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مرید و خلیفہ تھے ۔ مثنوی معنوی پر حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریروں کو اپنے الفاظ میں مولانا کانپوری ہی نے قلمبند کیا اور بڑی آب و تاب کے ساتھ مطبع نامی کانپور سے مثنوی کا یہ نسخہ شائع ہوا ۔ بہر حال کہنا یہ ہے کہ مولانا احمد حسن کو دیکھ کر حضرت نانوتوی کی توجہ اسلام کے ان مسائل کی طرف ہو گئی، جن میں قدیم عقلیات کی بنیاد پر اعتراضات کئے جاتے ہیں ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس وقت مولانا کی زبان سے عجیب و غریب عقلی نکات و حقائق ادا ہو رہے تھے کہ مولانا احمد حسن جو علمار دیوبند سے حسن ظن نہیں رکھتے تھے بے ساختہ کہنے لگے کہ اللہ اکبر یہ باتیں کسی انسانی دماغ کی نہیں ہو سکتیں یہ تو خدا ہی کی باتیں ہیں پھر اپنی اثر پذیری کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا کہ مجھ پر تو یہ اثر ہوا کہ میری خودی مٹ رہی ہے ۱۲ ص ۱۸۱ ارواح

لیکن خود تقریر کرنے والا اپنی ان ہی تقریروں کو اپنی بے کمالی کی دلیل خود بھی سمجھتا رہا اور دوسروں کو بھی بغیر کسی تصنع کے یہی سمجھاتا رہا۔ سوال یہی ہے کہ آخر یہ قصہ کیا تھا۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ بھنک بھی مقرر صاحب کو اس کی لگ جاتی ہے کہ کسی نے ان کی تقریر یا ان کے وعظ کو پسند نہ کیا، یا ستائش و مدح کے الفاظ سے اپنی زبان کو تر کرنے کی سعادت غریب سننے والا حاصل نہ کرسکا، تو ساری شقاوتوں اور بدبختیوں کا مرجع واعظ صاحب کے نزدیک بن جاتا ہے، عام حال دنیا کا یہی ہے، مگر اسی دنیا میں پیدا کرنے والے نے اسے بھی پیدا کیا تھا، جسے اپنے ہر کمال کے نیچے بے کمالی جھانکتی ہوئی نظر آتی تھی۔

اللہ اللہ فیاض ازل کی طرف سے جس کی سرفرازیوں کا یہ حال ہو، شاید کہیں پہلے بھی ذکر آچکا ہو کہ جس وقت تقریر کرنے کے لئے سیدنا الامام الکبیر کھڑے ہوتے اور بیان شروع ہو جاتا تو دیکھا جاتا تھا کہ بیچ بیچ میں کبھی خاموش ہو جاتے ہیں، رکنے کے بعد پھر آگے بڑھتے ہیں۔ جب اس کی وجہ دریافت کی گئی، تو فرمایا کہ

"ایک ہی مضمون کے بیسیوں پیرائے اور عنوان ذہن میں ایک دم آتے ہیں، تو طبیعت رک جاتی ہے اور میں اس پر غور کرنے لگتا ہوں کہ کس کو لوں اور کس کو چھوڑ دوں" صفحہ ۱۹۶ ارواح

لیکن باوجود اس کے وہ یہی کہتا رہا کہ

"میں بے حیا ہوں اس لئے وعظ کہہ لیتا ہوں"۔

اس میں شک نہیں کہ سیدنا الامام الکبیر کے تقریری مجاہدات کے چرچوں سے جیسے ہندوستان تقریباً نصف صدی سے زیادہ مدت سے اب بھی گونج رہا ہے، اسی طرح آپ کی تحریری خدمات کا بھی کافی ذخیرہ بحمداللہ محفوظ ہے، لیکن جو روداد حضرت والا کی وعظ گوئی کی لوگوں نے بیان کی ہے، کچھ ایسا ہی رنگ آپ کے تصنیفی کاروبار کا بھی معلوم ہوتا ہے، مصنف امام نے اپنی کتاب میں ایک موقعہ پر حضرت والا کے مصنفات کے متعلق یہ لکھتے ہوئے کہ

"اگرچہ مجموعہ ان کا کثیر ہے" صفحہ ۲۲

یہ خبر جو دی ہے کہ

"مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) نے اس عرصہ میں چند تحریرات کیں۔ بعضی جواب کسی سوال

کے بعض فرمائش کسی دوست کے بعض اتفاقیہ"

اس سے میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے، پہلے بھی کہیں لکھ چکا ہوں، تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں آپ کی خدمات کی نوعیت وہ نہیں ہے جو پیشہ ور مصنفین کی ہوتی ہے، بلکہ وہی بات کہ کسی نے تحریراً کچھ پوچھا خصوصاً ایسی بات جس کا تعلق اسلام کے اصول سے ہوتا، تو کبھی کبھی آپ نے ان ہی سوالات کے جواب میں کچھ ارقام فرمادیا۔ یا بعضوں نے کسی خاص مسئلہ پر لکھنے کی خصوصی فرمائش کی، اصرار سے مجبور ہو گئے اور قلم ہاتھ میں لے لیا، اور اتفاقاً ایسا بھی ہوا ہے کہ لکھ کر اپنے خیالات کے اظہار کی ضرورت محسوس ہوئی، مثلاً شاہ جہاں پور کے میلہ کے متعلق تحریریں یا رڑکی والے مناظرے کے سلسلے میں مشہور کتاب "قبلہ نما" وغیرہ کا یہی حال ہے۔

کچھ بھی ہو مستقلاً تصنیف کا ارادہ کر کے جہاں تک میری معلومات ہیں، کوئی خاص کتاب آپ نے نہیں لکھی[1]۔

آپ کے تحریری مآثر کے متعلق مصنف امام نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے اسی کتاب میں یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"جو تحریریں ناتمام رہ گئیں، اب بھلا کون اُن کو تمام کر سکتا ہے اور

جن میں کچھ نقصان ہو گیا، ان کی تکمیل کی کیا صورت ہو سکتی ہے" ص۱۵

کتابوں کے نقص اور ناتمام رہ جانے کی وجہ بھی وہی ہے کہ مصنف بننے کے لئے آپ نے تحریر کے میدان میں قدم ہی نہیں رکھا، وقتی محرکات اور بیرونی دباؤ سے متاثر ہو کر وقت پر جو کچھ لکھا گیا، لکھ دیا پھر اس کی تکمیل کا خیال نہ آیا۔

---

[1] ردّ شیعہ کے سلسلہ میں ہدیۃ الشیعہ لکھتے وقت چونکہ وراثت نبوی کی بحث سامنے آئی جو موت سے متعلق ہے تو آپ نے حیات نبوی اور نفی وراثت نبوی پر ایک مستقل رسالہ آبحیات تحریر فرمایا۔
اسی طرح تصنیف کی صورت سے تقریر دلپذیر تصنیف فرمانی شروع کی جو درمیان ہی میں رہ گئی، جیسا کہ مجھ سے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا۔ "محمد طیب"

بہرحال ناقص اور غیر مکمل حالت میں بچا کچا جو کچھ بھی تحریری سرمایہ امت کے ہاتھوں میں رہ گیا ہے، اس سرمایہ کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ تو انشاء اللہ اس وقت ہو گا، جب آپ کے خصوصی نظریات کی ترتیب و تدوین کا بحول اللہ و قوتہ وہ ارادہ پورا ہو، جو کیا گیا ہے، خیال یہی ہے کہ سوانح سے فارغ ہونے کے بعد دوسری مستقل جلد اس کے لئے لکھی جائے۔ اسی حصہ میں آپ کی تصنیفات کی تعداد اور جن جن مسائل اور عنوانوں پر یہ رسالے یا کتابیں ارقام فرمائی گئی ہیں سب کا تفصیلی تذکرہ کیا جائے گا۔

اس وقت تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر کا شمار بھی اردو زبان کے ابتدائی مصنفوں میں کیا جاتا ہے۔ آج بھی تجارتی کتب خانوں کی فہرست میں ایک مستقل عنوان تصنیفات مولانا محمد قاسم نانوتوی، کا لوگوں کو عموماً نظر آتا ہے، لیکن خود لکھنے والے نے یہ جو کچھ بھی لکھا ہے، مصنف امام کی شہادت آپ سن چکے کہ مصنف بننے یا لکھنے کے لئے اور لکھنے والوں کی جماعت میں شریک ہونے کے لئے کبھی نہیں لکھا۔

دوسروں کی شہادت سے زیادہ تو خود ان ہی کتابوں میں مختلف طریقوں سے اپنے احساسات کا اظہار حضرت والا نے جن الفاظ میں فرمایا ہے، ان کو دیکھ کر دل گواہی دیتا ہے کہ کسر نفسی اور مصنوعی تواضع کا رسمی طریقہ یہ قطعاً نہیں ہو سکتا۔ آب حیات میں اپنی ہیچ مدانی بے سرو سامانی، پریشانی وغیرہ جیسی چیزوں کا دیباچہ میں تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

"نہ اپنے گھر میں کوئی عالم جو بوجہ قدردانی علم کی طرف لگائے۔"

اشارہ شاید اپنے والد صاحب مرحوم کے عام مذاق کی طرف ہے، آگے فرماتے ہیں

"نہ اپنے دل میں شوق جو تحصیل علم میں مزہ آئے اور اس کام سے دل نہ گھبرائے۔"

اور آخر میں وہی بات جسے پہلے بھی نقل کر چکا ہوں کہ

"نہ گھر میں کوئی کتاب جو یہ بات ہو کہ جب جی چاہا اٹھایا، دیکھ لیا۔"

اسی طرح اسی "ہیچ مدانی" کا اعادہ اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں کہ

"میدانی دہمہ می دانند، نہ سفینہ بہ گنجینہ آوردہ ام نہ مکتوبات سفینہ را بہ سینہ سپردہ"

پہلے بھی کہیں افادۂ استغفار کے سلسلے میں اس اعلان کا کہ ہمارے پاس کتابیں نہیں ہیں، ذکر آچکا ہے۔

حیرت ہوتی ہے ایک حال یہ ہے کہ "کتابیات" یعنی اپنی تصنیف کے ماخذوں کی طویل فہرست دیئے بغیر دلوں کو چین ہی نہیں آتا، اشارۃً کنایۃً لفظ دو لفظ کی حد تک بھی جس کتاب سے استفادہ کیا جاتا ہے، تو فہرست کو طویل کرنے کے لئے عام قاعدہ ہے کہ اس کا ذکر بھی کر دیا جاتا ہے، مصنف کے مطالعہ کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ اس کے اظہار کا ذریعہ کتابیات کے اسی ضمیمہ کو ٹھہرالیا گیا ہے، عام مذاق بھی ہے لیکن اسی کے مقابلہ میں خاص مذاق ایک مصنف ہی کا یہ بھی تھا کہ اپنی کتابی بے نوائیوں کے ساتھ ساتھ بغیر کسی جھجک کے یہ بھی لوگوں کو باور کراتا چلا جاتا ہے کہ

"ذخیرہ ام ہمیں خیالات پراگندہ من اند"

اور کیسے خیالات پراگندہ خود فرماتے ہیں کہ گو کچھ لوگ اس کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں لیکن

"دیگراں آں را از جملۂ مضامین شعریہ می بینند"

سیدنا الامام الکبیر کے الہامی معارف و علوم سے جن لوگوں کو مناسبت نہیں ہے کبھی کبھی ان کی طرف سے اس قسم کے خیالات ظاہر کئے جاتے ہیں، اپنے نزدیک وہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ حضرت والا کے "علوم مخصوصہ" کے متعلق شاید یہ کوئی نیا نکتہ ان کے ذہن میں آیا ہے مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ سخن ناشناسوں کی اس ظالمانہ تنقید کی تاریخ نئی نہیں ہے، حضرت والا کی زندگی ہی میں اس قسم کی سرگوشیوں کی معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا ہو چکی تھی جن سے خود حضرت والا بھی واقف تھے۔ لیکن ان شپرہ چشموں کے اس گروہ کو اس کے ردعمل میں چشمہ آفتاب کی طرف سے کیا غیظ و غضب رنج و ملال کی گرم و تیز و تند شعاعوں کا کبھی تجربہ ہوا! سچ تو یہ ہے کہ جب مذکورہ بالا الفاظ کے بعد والے اس فقرے کا خیال آجاتا ہے، یعنی یہ لکھتے ہوئے کہ میرے پراگندہ خیالات جن کے سوا اور کوئی دوسرا سرمایہ میرے پاس نہیں ہے۔ بعض لوگ جن کو شعر و شاعری کی باتیں یا شاعرانہ خیالات قرار دیتے ہیں، آپ نے ان صاحب کو خطاب کرتے ہوئے جن کے سوال کے جواب میں یہ مضمون لکھا ہے، یہ ارقام فرمایا کہ

"اگر پسند خاطر خدام والامقام افتادہ فہو المراد ورنہ کالائے زبوں بریش خاوند،

نامۂ سیاہ خود باز خواہم گرفت" (فیوض قاسمیہ ص۲۴)

اس میں شک نہیں جیسا کہ پہلے بھی میں نے کہا ہے کہ بطور کسر نفسی کے اس قسم کے الفاظ دوسروں کی تحریروں میں مل سکتے ہیں، عام طور پر اس کو لوگ تصنع پر محمول کرتے ہیں، لیکن حضرت والا کی کتابوں میں اس قسم کی چیزوں کا ذکر کیا ہی گیا ہے کچھ ایسے سیدھے سادے بے ساختہ انداز میں کہ بناوٹ کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا، دیباچہ یا خاتمہ ہی میں نہیں، بسا اوقات یہ بھی ہوا ہے کہ لکھتے چلے جارہے ہیں، لکھتے لکھتے پھر اپنی نایافت کا شعور بیدار ہوتا ہے اور قلم سے اسی قسم کے الفاظ کتاب کے درمیانی مقامات میں نکل پڑتے ہیں، حضرت والا کی تصنیفات میں ایک "فائق تصنیف" آب حیات بھی ہے اس کے دیباچہ میں تو خیر جو کچھ لکھا ہے وہ لکھا ہی ہے۔ لیکن اسی کتاب کے ص۲۲۲ میں ایک موقعہ پر پھر خیال آگیا، ارقام فرماتے ہیں۔

"اپنے حال کو کون نہیں جانتا، نہ ذہن ہے، نہ فہم ہے، نہ محنت، نہ مشقت، نہ فرصت ہے، نہ فراغت، نہ علم در سفینہ، نہ علم در سینہ" ص۲۲۲

اپنے حال کا خود اپنے آپ کو واقف قرار دے کر اپنی تہی دامانیوں کا برملا، صرف اظہار نہیں بلکہ اس کو بھی موقعہ موقعہ سے تصنیفات کی ابتدا میں بھی، انتہا میں بھی بیچ میں بھی درج کرتے چلے جانا، اپنے اپنے سینوں پر ہاتھ رکھ رکھ کر سوچنا چاہئے کہ کیا یہ کوئی معمولی واقعہ ہے۔

بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ حضرت والا نے کتابیں بھی لکھی ہیں، اور آپ کے مقالات و مضامین بھی فارسی اردو اور قدرے عربی زبان میں پائے جاتے ہیں، لیکن بجائے خود ان میں سے ہر ایک اپنے نظریات فائقہ کے لحاظ سے کچھ بھی ہو، لکھنے والے نے ان کو بے کمالی ہی کے اظہار کا ذریعہ بنانا چاہا، جہاں بھی موقعہ ملا ہے اس پہلو کو نمایاں کرنے کی مصنوعی نہیں بلکہ واقعی کوشش کی گئی ہے۔ شاید تصنیف و تالیف کی دنیا کا یہ واقعہ اپنی آپ ہی نظیر ہے۔

اور جیسے ان کتابی سفینوں میں اتفاقاً سیدنا الامام الکبیر کے بعض الہامی علوم اور ذہنی افکار

و خیالات محفوظ ہو جانے کا نظم قدرت کی طرف سے ہوا، خود تو وہ کچھ لکھنا نہ چاہتے تھے، لیکن حالات کے تقاضوں سے مجبور ہو کر بہر حال ان کو لکھنا ہی پڑا، میرا خیال ہے کہ تقریباً یہی حال ان زندہ ہستیوں کا بھی ہے جو حضرت والا کے بعد آپ کے علوم کے امین و محافظ یعنی آپ کے شاگردوں کے نام سے مشہور ہوئے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ دیوبندی سلسلے کے مدارس اور تعلیم گاہوں کا طویل الذیل سلسلہ آج ہندوستان کے شمال و جنوب مغرب و مشرق میں جو پھیلا ہوا ہے، اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سب کی انتہا بالواسطہ یا بلا واسطہ سیدنا الامام الکبیر کے وجود باجود ہی پر ہوتی ہے، ان مدارس کا خیال ہی کوئی حضرت والا کے تصور کے بغیر نہیں کر سکتا، تقریباً ایک صدی سے اسلامی علوم کے درس و تدریس کا طوفان اس ملک میں جو امڈا ہوا ہے، سب جانتے ہیں اور مانتے ہیں کہ ابتدائی سرچشمہ اس کا آپ ہی کی ذات مبارک ہے۔

لیکن کیا کیجئے کہ اسی ذات ستودہ صفات کے متعلق تاریخ ہی کی شہادت یہ بھی ہے، کسی بیرونی گواہ کی نہیں صاحب البیت حضرت والا کے حفید رشید و سعید حضرت مولانا محمد طیب صاحب اپنے ایک مقالہ میں ارقام فرماتے ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر نے۔

"نہ دار العلوم کے احاطہ میں بیٹھ کر کبھی پڑھایا نہ اس کے انتظامات کے سلسلہ میں رسمی طور پر کبھی کوئی عہدہ قبول کیا"

پھر اسی کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہوئے کہ بظاہر دار العلوم دیوبند کے انتظامی قصوں سے حضرت والا تعلق نہیں رکھتے تھے مولانا طیب نے لکھا ہے کہ

"احاطہ مدرسہ میں بیٹھ کر مدرسوں کی طرح کبھی درس بھی نہیں دیا" (ص ۱۳ مقالہ سیدنا الامام الکبیر کی سیاسی خدمات)

صرف یہی نہیں بلکہ جہاں تک میری تلاش و جستجو کا تعلق ہے، فارغ التحصیل ہونے کے بعد جب تک دلی میں حضرت والا کا قیام رہا نہیں جانتا کہ وہاں کسی کو آپ سے پڑھنے کا موقعہ کبھی ملا اور ہمارے مصنف امام نے حضرت والا کی دوسری خصوصیتوں کے ساتھ ایک خصوصیت اپنی

کتاب میں جو یہ بیان کی ہے کہ

"مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) سے پڑھنا نہایت ہی دشوار تھا" صلا

دشواری کی وجہ خود ہی یہ بیان فرمائی ہے کہ

"جو شخص طباع ہو، اور پہلے سے اصل کتاب کو سمجھا ہوا ہو،

تب مولوی صاحب کی بات سمجھ سکتا تھا" صلا

جس کا مطلب یہ ہوا کہ ایسے عمیق اور گہرے مضامین بیان کرنے لگتے تھے کہ عربی کے عام طلبہ کی سمجھ سے آپ کی باتیں بہت زیادہ بلند و برتر ہوتی تھیں، حالانکہ اسی کے ساتھ مصنف امام ہی نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"ہر چند مولوی صاحب نہایت ہندی کی چندی کر کر بیان فرماتے مگر مشکل بات مشکل ہی ہوتی ہے" صلا

وہی یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

"آمد معانی اور مضامین کی ایسی بھی یوں فرماتے تھے کہ بعض بار حیران ہو جاتا ہوں کہ کیا کیا بیان کروں" ص۳۵

آپ کے درس کے متعلق خبر دیتے ہیں کہ

"اور اکثر تقریر طویل کے سبب کہیں سے کہیں نکل جاتے" ص۳۵

مصنف امام (یعنی حضرت مولٰنا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ) کی زبانی اسی سلسلہ میں ان کے ایک ذاتی تجربہ کا تذکرہ مولٰنا حبیب الرحمٰن فرمایا کرتے تھے، ارواح ثلٰثہ میں بھی یہ قصہ موجود ہے۔ مولٰنا حبیب الرحمٰن مرحوم فرماتے تھے کہ

"مولٰنا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے خود سنا، فرماتے تھے کہ ایک دفعہ میں نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی مسئلہ کے متعلق کچھ سوال کیا، اس وقت حضرت مولٰنا چھتے کی مسجد کے چھپر والے حجرہ میں تھے، اور کوئی خاص کیفیت طاری تھی، مولٰنا نے اس مسئلہ پر تقریر شروع کی، لیکن اس تقریر میں لفظ بھی غیر

مانوس تھے اور معانی بھی غیر مانوس، جن کو میں قطعاً نہ سمجھ سکا، میں نے عرض کیا کہ کچھ نازل ہو کر تقریر فرمائیے میں قطعاً نہیں سمجھا، پھر دوبارہ تقریر فرمائی جو اس سے کچھ نازل تھی، جس کے لفظ مانوس تھے، مگر معانی قطعاً بلند، اور غیر مانوس جن کو میں نہ سمجھا، تیسری دفعہ میں نے پھر کہا کہ میں نہیں سمجھا، کچھ اور نازل ہو کر فرمائیے، پھر اس سے اتر کر اور نازل تقریر فرمائی، جو کچھ قریب الفہم آگئی تھی، مگر پھر بھی نہ سمجھا اور میں نے عرض کیا کہ میں نہیں سمجھا، تو فرمایا کہ مولانا پھر کسی دوسرے وقت پوچھیے گا۔" ص ۱۹۷

ظاہر ہے کہ مولانا محمد یعقوب جیسے ذہین و فطین، عالم متبحر جن کے مطالعہ کے ذوق کا حال حضرت تھانوی نے یہ بیان کیا ہے کہ ہر فن کا ان کو شوق تھا، خود ان ہی کا لطیفہ حضرت تھانوی نقل کرتے تھے کہ طلبہ کو خطاب کر کے فرماتے

"میاں اگر گالیوں کی کتاب بھی ہو تو اس کو بھی دیکھ لینا چاہیئے، اور کچھ نہیں تو دو چار گالیاں ہی یاد ہو جائیں گی" (قصص ص ۱۱ حسن العزیز)

اور یہی غیر معمولی حال ان کی ذکاوت و ذہانت کا بھی تھا، حضرت تھانوی ہی فرمایا کرتے تھے کہ مولانا محمد یعقوب کی حسی ذکاوت کی یہ کیفیت تھی کہ

"کوئی گھنٹہ دو گھنٹہ چادر اوڑھ لے تو اس کو سونگھ کر بتا دیتے کہ مرد نے اوڑھی ہے یا عورت نے" قصص ص ۲۰ حسن العزیز)

بہر حال مذکورہ بالا شہادتوں کی روشنی میں بآسانی یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر سے پڑھنا آسان نہ تھا، وہی کتاب حضرت والا سے پڑھنے والے پڑھ سکتے تھے جس کے مطالب کو پہلے سے وہ سمجھے ہوئے ہوں، مصنف امام کی اس خبر کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ پڑھی ہوئی کتابوں ہی کو لوگ آپ سے پڑھ سکتے تھے، دوسرے لفظوں میں حاصل اس کا یہی ہوا کہ طالب العلم دوسرے اساتذہ سے پڑھ کر فارغ التحصیل ہو چکنے کے بعد حضرت والا کی باتوں کے سمجھنے کے لائق ہوتا تھا اور وہ بھی باین شرط کہ بذات خود وہ "طباع" بھی ہو اور

طباعیت بھی کیسی کہ بسا اوقات مولانا محمد یعقوب صاحب جیسے طباع آدمی بھی حضرت والا کی باتوں کے سمجھنے سے اپنے آپ کو معذور پاتے تھے۔

اور یہ جو میں نے کہا کہ زمانہ دراز تک خصوصاً جب تک دلی میں حضرت والا کا قیام رہا آپ کے حلقۂ تلمذ میں شریک ہونے والے لوگ نظر نہیں آتے تو اس کی وجہ غالباً یہی تھی، غور کرنے کی بات ہے کہ مسلمانوں کے اس عہد انحطاط و ضعف میں اچھے دل و دماغ کے ساتھ پیدا ہونیوالوں کی تعداد ہی کیا ہوگی، اور جو تھوڑے بہت گنے چنے افراد ہوں گے بھی تو اُن کے لئے یقیناً یہ آسان نہ تھا کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد پھر پڑھی ہوئی کتابوں کو دوبارہ پڑھنے کی ہمت رکھتے ہوں، مسلمانوں پر معاش کے دروازے تقریباً بند تھے، بڑے بڑے شریف گھرانوں کو اس کا انتظار رہتا تھا کہ لڑکے جوان ہو لیں، تو کسی طرح معاشی تگ و دو میں ان کو مشغول کر کے روزی روزی حاصل کی جائے، ایسی صورت میں اتنی فرصت کا تخیل بھی دشوار تھا کہ ایک دفعہ پڑھ لینے کے بعد پھر ان ہی کتابوں کو مزید معلومات کے حاصل کرنے کے لئے پڑھا جائے۔

رہا یہ سوال کہ حضرت والا کے درس کی جو خصوصیت مصنف امام نے بیان کی ہے، آیا یہ کسی ارادی فیصلہ کا نتیجہ تھا؛ یا حضرت والا اس میں مجبور و مضطر تھے، عام طور پر شاید یہی خیال کیا جاتا ہے کہ آپ کی غیر معمولی ذہانت و بلند نظری کا یہ شاید کوئی اضطراری نتیجہ تھا، ممکن ہے کہ واقعہ یہی ہو، مصنف امام نے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"ہر چند کہ مولوی صاحب ہندی کی چندی کر کر بیان فرماتے" ص۲

اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ کم از کم مصنف امام کے نزدیک کسی ارادی فیصلہ کا نہیں بلکہ آپ کی مشکل پسند فطرت کا یہ اثر تھا کہ عامیانہ دل و دماغ والوں کے لئے آپ کی باتیں کچھ ناقابل فہم سی بن کر رہ جاتی تھیں "مگر مشکل بات مشکل ہی ہوتی ہے" ان الفاظ سے ان کا اشارہ اسی طرف ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ میرے پاس کچھ ایسی معلومات بھی ہیں، کسی کتاب میں میں نے نہیں پڑھا ہے، لیکن علماء دیوبند کے حلقہ میں اس قصّہ کا عموماً لوگ تذکرہ کرتے رہتے ہیں کہ دلی کے مشہور مدرسہ

عبد الرب کے صدر مولٰنا عبد العلی مرحوم و معفور کو سیدنا الامام الکبیر سے پڑھنے کا موقعہ ملا، کتاب کا نام یاد نہیں رہا، غالباً حمد اللہ یا شمس بازغہ مولوی عبد العلی صاحب کی حضرت والا کے یہاں شروع ہوئی، بیان کیا جاتا ہے کہ مولوی عبد العلی صاحب نے کتاب کی عبارت پڑھنی شروع کی اور حضرت والا کے چہرۂ مبارک کا رنگ بدلنا شروع ہو گیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کتاب کی پھسپھسی بے مغز باتوں سے کافی گرانی محسوس فرما رہے ہیں، جوں توں کر کے عبارت پڑھنے کا مرحلہ پورا ہوا، اس کے بعد سیدنا الامام الکبیر کو دیکھا گیا کہ جھنجھلا کر فرما رہے ہیں کہ تم نے جو کچھ پڑھا یہ تو واضح ہے، اب تم قاسم کی سنو! یہ فرماتے ہوئے مسئلہ متعلقہ پر تقریر کا سلسلہ شروع ہوا، شروع ہوا اور بڑھنے لگا، مولوی عبد العلی بے چارے جواب تک دوسرے اساتذہ سے درس کے سلسلہ میں اس بات کے عادی تھے کہ عبارت کتاب کی ختم ہوئی، ترجمہ کرایا گیا اور ترجمہ کے ساتھ ساتھ بیچ بیچ میں بعض ایسے تشریحی الفاظ استاد بڑھاتا چلا گیا جن سے کتاب کا مطلب ذہن نشین ہو جاتا تھا[1]، لیکن یہاں تو رنگ ہی دوسرا نظر آیا، نہ کتاب کی عبارت ہی درست کرائی گئی، نہ ترجمہ کرایا گیا، اور نہ مصنف کا مطلب سمجھایا گیا، بلکہ نئے سرے سے ایک نیا قصہ شروع کر دیا گیا کہتے ہیں کہ دو تین روز تک تو مبہوت ہوئے درس کے اس طریقہ کو وہ برداشت کرتے رہے، ایک

---

[1] ہندوستان کے قدیم درس کا عام طریقہ یہی تھا، البتہ خیرآباد کے منطقی و فلسفی اساتذہ نے نیا طریقہ یہ جاری کیا تھا کہ طالب العلم جب عبارت ختم کر لیتا، تو ترجمہ سے پہلے اس مسئلہ کے متعلق ایک جامع مانع تقریر کر دیا کرتے تھے، اور اس کے بعد طالب العلم خود ترجمہ کر لیا کرتا تھا، کتابی عبارت پر اپنی زبانی تقریروں کے منطبق کرنے کے مسئلہ کو اہمیت نہیں دیتے تھے، پچھلے دنوں جب نظامیہ درس اپنی سکرات کی حالت میں دم توڑ رہا تھا، پہلے عام طریقہ درس کا رواج مولانا لطف اللہ علیگڈھی رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں آخر وقت تک جاری تھا، اور خیرآبادی درس والے اپنے اساتذہ کے طریقہ کو زندہ رکھے ہوئے تھے اور اب تو دونوں ختم ہو گئے، درس کے ان دونوں طریقوں میں افادیت کے لحاظ سے قابل ترجیح کون سا طریقہ تھا، اس زمانہ میں اس پر کافی بحثیں ہوئی تھیں، لیکن اب تو یہ بحثیں کرنے والے رہے نہ اس سے دلچسپی لینے والے۔ فتلك مساكنهم لم تسكن من بعدهم الا قليلا وتلك الايام نداولها بين الناس ۱۲

دن حضرت والا نے جب حسب معمول فرمایا کہ اب تم قاسم کی سنو تو مولانا عبد العلی نے جھنجھلا کر کہا کہ میں قاسم کی سننا نہیں چاہتا مجھے تو عبارت سے کتاب کا مطلب سمجھا دیجئے۔ اس پر حضرت مسکرا دیئے مگر کچھ زیادہ دھیان نہیں دیا اور سبق حسب معمول چلتا رہا۔ آخر کار مولانا عبد العلی کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ صورت حال یہی رہی کہ جو کتاب شروع کی گئی میرے لئے اس کا پڑھنا اور نہ پڑھنا دونوں برابر ہو جائے گا، یہی سوچ کر دبے پاؤں انھوں نے گھر کی راہ لی، وقت پر جب سبق پڑھنے کے لئے نہ آئے، تو حضرت نے دریافت کیا، معلوم ہوا کہ وہ گھر چلدیئے۔ سنا ہے کہ ان کا وطن عبد اللہ پور نامی گاؤں[ل] میں تھا جو ضلع میرٹھ میں ہے سیدنا الامام الکبیر کو ان کے چلے جانے کا سخت صدمہ ہوا، اور طے کر لیا کہ عبد اللہ پور پہنچکر اپنے روٹھے ہوئے طالب العلم کو مناؤں گا، آخر یہی ہوا حضرت عبد اللہ پور تشریف لے گئے، مولوی عبد العلی صاحب کے گھر پہونچے، حضرت کی تشریف آوری کی خبر سنکر مولوی عبد العلی صاحب عرق انفعال میں غرق ہو گئے شاید روپوش ہو گئے۔ اصرار کے بعد سامنے آئے، دریافت فرمایا گیا کہ بھائی تم چلے کیوں آئے۔ آخر اس وقت کھل کر ان کو عرض کرنا پڑا کہ

"حضرت میں تو آپ سے کتاب پڑھنے گیا تھا، لیکن بجائے کتاب کے آپ کے یہاں تو قاسم کی سنی پڑتی ہے"

یہ سن کر کہا جاتا ہے کہ حضرت والا مسکرانے لگے اور فرمایا کہ

"بھائی عبد العلی چلو اب تمہیں میں کتاب بھی سمجھا دوں گا"

اور اس کے بعد ان کے سبق میں یہ طرز عمل اختیار فرمایا کہ حضرت والا پہلے کتاب کا مطلب عبارت سے سمجھا کر فرماتے کہ سمجھ گئے؟ جب وہ اقرار کر لیتے تب وہ فرماتے کہ اب قاسم کی سنو اور یوں اپنے ایک روٹھے ہوئے شاگرد کو منا لیا گیا۔ اسی کے ساتھ اس روایت کو بھی ملا لیجئے، جو ارواح میں مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم کے حوالہ سے درج ہے۔ یہ فرماتے ہوئے کہ

"حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے چند دن اقلیدس کا درس بھی دیا ہے"

---

ل دیوبندی روایات میں ایک مشہور روایت یہ چلی آ رہی ہے کہ اسی عبد اللہ پور نامی گاؤں میں سیدنا الامام الکبیر نے جمعہ کی نماز ادا فرمائی تھی، مسئلہ الجمعۃ فی القری کے سلسلے میں یہ تحقیق طلب بات ہے کہ عبد اللہ پور کی آبادی اس زمانہ میں کیا تھی ۱۲

شاید اس زمانہ میں قیام چھتہ کی مسجد کے حجرے میں تھا، بہرحال مولانا حبیب الرحمن کہا کرتے تھے کہ "چھتہ میں جب اقلیدس پڑھاتے تھے، اور شکل کھینچنے کی ضرورت پڑتی تھی تو وہیں چٹائی کا کونہ اٹھا کر اور زمین میں انگلی سے شکل کھینچکر سمجھا دیتے تھے نہ پرکار تھی نہ اوزار تھے" [ارواح ۱۹۴]

یہی سوچنے کی بات ہے کہ اقلیدس جیسے مشکل فن کو پرکار اور اوزار کے بغیر صرف زمین پر لکیریں کھینچکر جو سمجھا دینے کی قدرت رکھتا ہو، بلکہ بقول مولانا حبیب الرحمن جو اقلیدس کی ان ہی شکلوں کو سمجھا دیتا ہو، اور یہی کیا، جو علم طلبہ کو نہیں بلکہ مطلق عوام کو بھی بڑے بڑے جلسوں، شاہ جہانپور کے میلوں تک میں مذہب کے لطیف حقائق کے ذہن نشین کرانے میں دیکھا جا رہا ہو کہ کامیاب ہو رہا ہے، اپنے تو اپنے غیر تک جس کی تقریروں سے اطمینان کی خنکی اپنے اندر پاتے ہوں اسی کے متعلق جب یہ سنایا جاتا ہے کہ پہلے سے کتابوں کے پڑھے ہوئے اہل علم ہی اس کے درسی افادات کو سمجھ سکتے تھے، ورنہ عام طلبہ کیلئے ان کا درس غیر مفید تھا، تو آپ ہی خیال کیجئے کہ ہم اس کو اضطراری یا جبلی خصوصیتوں کا نتیجہ کیسے قرار دیسکتے ہیں؟

اس میں شک نہیں کہ دقیقہ سنجیوں، اور نکتہ آفرینیوں پر فطرۃً حضرت والا مجبول ومخلوق تھے سیدھی سادی چیزوں سے بھی ان کا دل اور ان کا دماغ حیرت انگیز اور گہرے نتائج نکالنے کا عادی تھا، اگرچہ جہاں تک میرا ذاتی خیال ہے اپنے ارادات واذکار کی تعبیر وتحبیر کا بھی کافی حسن سلیقہ قدرت کی طرف سے آپ میں ودیعت کیا گیا تھا، جس کا پتہ آپ کے تحریری آثار اور کتابی باقیات صالحات سے بھی چلتا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ سنگین سے سنگین حقیقتوں کو اپنی بعض کتابوں میں آپ نے موم بنا کر دکھا دیا ہے، جس کا جی چاہے، حجۃ الاسلام اور "تقریر دلپذیر" کو پڑھ کر خاکسار کے خیال کی انشاء اللہ توثیق کر سکتا ہے،

مگر پتھر کو موم بنانے کے ساتھ مجھے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موم کو پتھر بنانے کی ضرورت اگر کسی مصلحت کے تحت محسوس ہوتی تھی تو شاید اس کا ملکہ بھی حضرت والا کو ارزانی ہوا تھا وہ "سنگ را موم کردن" ہی نہیں بلکہ "موم را سنگ کردن" کے کرتب سے واقف تھے۔ اپنی بعض

کتابوں میں اس طرز عمل کا اظہار بھی فرمایا گیا ہے، جس کی ایک اچھی مثال آپ کی کتاب "آبحیات" ہے اب خواہ کسی کو مجھ سے اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن اپنی معلومات اور غور و فکر کی رہنمائی میں اسی نتیجہ تک پہونچا ہوں، کہ زمانہ دراز تک لوگوں کو حضرت کے تدریسی کمالات سے استفادہ کی طرف متوجہ ہونے کا موقعہ اسی لئے اگر نہ ملا کہ آپ کی درسی تقریریں ان کے لئے برتر از فہم و تعقل تھیں، تو اس میں اضطرار سے زیادہ دخل مجھے تو آپ کے ارادی فیصلہ ہی کا نظر آتا ہے، آخر علم کے لوازم امامت و خطابت، افتار وغیرہ سے جیسا کہ سب مانتے ہیں، حضرت والا کا احتراز ارادی احتراز تھا، تو اسی سلسلے میں کیوں نہ سمجھا جائے کہ درس و تدریس کے مشغلہ سے بھی قصداً پرہیز و گریز کے لئے آپ نے ایسا رنگ اپنی تقریر کا اختیار فرمایا کہ پڑھنے والے ہی آپ کے حلقہ درس سے بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔

کچھ بھی ہو، اضطرار کا نتیجہ خیال کیا جائے یا اختیار کا، مگر یہ واقعہ ہے کہ مدت تک علم کے جس "دھبے" کے مٹانے کا فیصلہ آپنے فرمالیا تھا، جہاں اس راہ میں دوسری چیزوں سے بے تعلق رہنے کی کوشش بلیغ فرماتے رہے، لیکن حالات سے مجبور ہو کر کسی نہ کسی رنگ میں ان ہی چیزوں سے آپ کو حصہ لینا پڑا، کچھ یہی حال آپ کا درس و تدریس میں بھی نظر آتا ہے۔

دلی میں جب تک رہے، کوئی شہادت اس کی نہیں ملتی کہ وہاں آپ کے تلمذ کا فخر کسی کو حاصل ہوا، البتہ جب غدر کے بعد دلی کا قصہ ختم ہو گیا، اور تصحیح کتب کا کام میرٹھ میں جب آپ کرنے لگے تو معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں نے درسی استفادے کی کوشش کی، لیکن میرٹھ کے اس درس میں بھی جہاں تک میں جانتا ہوں کچھ اسی قسم کی کتابیں تھیں، مثلاً مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"مولوی صاحب نے میرٹھ میں مثنوی مولانا روم پڑھانا شروع کی" ص ۳۵

اور پڑھانے کی نوعیت کیا تھی، وہی لکھتے ہیں کہ

"دو چار شعر ہوتے اور عجیب و غریب مضمون بیان ہوتے" ص ۳۵

ان ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بجائے مثنوی کے کبھی حدیث کی کوئی کتاب بھی شروع کرادی

جاتی تھی، مصنف امام نے اطلاع دی ہے کہ

"اس وقت میں ایک جماعت نے مسلم پڑھی ص ۳۹"

جماعت میں کس قسم کے لوگ شریک تھے؟ اس کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے، مصنف امام اپنے متعلق فرماتے ہیں کہ

"احقر بھی اس میں شریک تھا" ص ۳۹

ظاہر ہے کہ مولانا محمد یعقوب جیسے متبحر علما جس درس میں شریک ہوں گے، اس درس کے حلقہ میں عام طلبہ کے لئے گنجائش ہی کیا پیدا ہو سکتی تھی،

دلی کے غدر کے بعد بقول مصنف امام

"سوائے وطن (نانوتہ) اور کوئی جگہ جانے کی نہ تھی، کبھی وطن کبھی دیوبند رہتے" ص ۲۹

بے کاری کے ان ایام میں بھی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ درس کا مشغلہ نانوتہ میں شروع فرما دیا گیا تھا، مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"اسی وقت میں (یعنی بے کاری کے اس زمانہ میں) احقر نے حضرت سے بخاری قدرے پڑھی" ص ۳۹

الغرض دیوبند کا دارالعلوم باضابطہ طور پر جب تک قائم نہ ہوا، یوں ہی بطور تفنن طبع کے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے اصرار پر حضرت والا نے مذکورہ بالا نوعیت کی چند کتابوں کا درس ان لوگوں کو دیا ہے جو خود عالم و فاضل تھے، ہاں! جب دیوبند کا مدرسہ قائم ہو گیا۔ اور جماعت بندی کا طریقہ مدرسہ میں نافذ ہوا، اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا کے قلب مبارک میں ایک نئی ضرورت کا احساس پیدا ہوا، وہ ضرورت کیا تھی؟ کسی موقعہ پر حضرت والا کا یہ لطیفہ فقیر نقل کر چکا ہے، راوی اس کے مرشد تھانوی ہیں۔ یعنی فرمایا کرتے تھے کہ چند چیزیں ایسی ہیں جن میں بوجھ نہیں پڑتا اور کام نکل جاتا ہے، پھر اسی سلسلہ میں دعوت کے کھانے اور جماعت کی نماز کے ساتھ ارشاد ہوتا کہ

"بدشوق طالب علم کے لئے جماعت کا سبق کہ پڑھیں نہ، اور کتابیں ختم ہو جاویں" (قصص ص )

شاید اسی ظریفانہ فقرے کی سنجیدہ اور متین شرح وہ تھی جس کا ذکر مولانا شبیر احمد مرحوم فرمایا کرتے تھے،

براہ راست خاکسار نے مولنا عثمانی سے یہ بات سنی ہے کہ حضرت مولنا نانوتوی یہ فرمایا کرتے تھے کہ مدرسہ کی اجتماعی تعلیم سے علم کی کمیت اور مقدار میں اضافہ ہوتا ہے یعنی اہل علم کی تعداد کا بڑھانا اگر مقصود ہو تو اس کی علمی تدبیر یہی ہے کہ اجتماعی درس کو رواج دیا جائے لیکن نقصان کا پہلو درس کے اس اجتماعی طریقہ میں یہ ہے کہ علم کی کیفیت روز بروز گھٹنے لگتی ہے، بایں معنی کہ طلبہ کی استعداد انحطاط وضعف کا شکار ہو جاتی ہے گویا مقدار تو مولویوں کی مدرسوں کے ذریعہ بڑھ جاتی ہے لیکن بالغ استعداد اور غیر معمولی قابلیت ولیاقت رکھنے والے افراد کی پیدائش میں اجتماعی درس کی وجہ سے کمی ہو جاتی ہے۔

سیدنا الامام الکبیر کا یہ علمی نظریہ تعلیمی سلسلے میں ایک ایسا تجربی نظریہ ہے جس کی تائید مشاہدات سے ہو رہی ہے، حضرت والا کے حفید سعید مولانا محمد طیب صاحب نے جو مقالہ آپ کی سیاسی زندگی کے متعلق لکھا ہے، اس میں بھی ایک موقعہ پر یہ فرماتے ہوئے کہ

"یہ ایک فطری امر ہے کہ شخصی تقوی سے جماعتیں بنی ہیں، لیکن جماعتی گٹھ جوڑ سے افراد تیار نہیں ہوتے، یعنی فرد اس طرح کبھی صالح ومتقی نہیں بن سکتا کہ کوئی جماعت باہمی مشورے سے اس کے متقی ہو جانے کے بارہ میں رزولیوشن پاس کردے، یا اس کے لئے تقوی وطہارت کا کوئی رسمی پروگرام بنا کر اس پر باقاعدہ ضابطہ میں اسے چلائے، بلکہ صرف اسی طرح بن سکتا ہے کہ وہ توحید مطلب کے ساتھ ایک مربی کا رنگ قبول کرے، اور اس کے چلے ہوئے راستہ پر اسی کی نگرانی ورہنمائی میں چل کر منزل مقصود تک جا پہونچے۔"

آخر میں لکھتے ہیں کہ

یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی تربیتی احاطہ میں جماعتی افکار وخیالات یا شورائی

طرزِ عمل کا تربیت میں دخل ہوا، اور شخصی تربیت باقی نہ رہی، جب ہی وہ احاطہ بھی بے عمل یا بے روح بن گیا"

بہر حال اس عام تجربی حقیقت کا اظہار فرمانے کے بعد مولٰنا طیب صاحب سلمہ اللہ تعالٰی نے بھی یہ اطلاع دی ہے کہ

حضرت (سیدنا الامام الکبیر) کو جہاں علم کی ترویج اور اسلام کی اشاعت و تبلیغ عام منظور تھی وہیں اپنے مخصوص جذبات و دواعی، اور مخصوص رنگ اخلاق و عمل سے تربیت دیکر ایک خاص جماعت بھی بنانی تھی اسی لئے ایک طرف تو تعلیمی ادارہ قائم فرمایا (یعنی دار العلوم دیوبند) جس کے اصول اساسی میں عمومیت اور طریق عمل میں ہمہ گیری و وسعت رکھی، اس کے لئے شورائی حلقہ تجویز فرمایا، اور اس کے احاطہ میں اہل علم و فضل کی ایک جماعت لاکر بٹھا دی۔

اسی کے بعد وہی ارقام فرماتے ہیں کہ

اور دوسری طرف تربیت خاص کی حد تک اپنی ذات گرامی کو مرکز بنایا، مخصوص طالب اور افراد اپنے لئے چھانٹ لئے، تربیت کی جگہ بھی تعلیمی احاطہ سے الگ رکھی، چھتہ کی مسجد کا حجرہ اپنے لئے مختص فرمایا، اور ان مستعد طالبوں کو سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھ کر انھیں اپنے رنگ میں رنگا" (مقالہ مخطوطہ ص۱۵)

جس ضرورت کے احساس کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا، وہ یہی ضرورت تھی، اور "بمدرسہ نمی رفت ولے بر ندش" والی مشہور ضرب المثل کا تعلق اگرچہ اس طفل سے تھا، جو پڑھنا نہیں چاہتا تھا، لیکن بہرحال بے چارے کو لوگ مدرسہ لے گئے تھے لیکن تاریخ ہی میں ایک دور ایسا بھی آیا کہ پڑھنے والا نہیں بلکہ پڑھانے والا پڑھانا نہیں چاہتا تھا، اور گو "اصطلاحی مدرسہ" میں پڑھانے کے لئے وہ پھر بھی داخل نہ ہوا، لیکن ہندوستان کی سب سے بڑی دینی درسگاہ بننا جس مدرسہ کے لئے مقدر تھا، اسی کے پڑوس کی مسجد کے ایک حجرے میں درس دینے پر مجبور ہونا پڑا، یہ قصبہ دیوبند کی مشہور تاریخی مسجد چھتہ والی مسجد تھی، جس کے

ایک حجرے کو حضرت والا کی قیام گاہ ہونے کا شرف حاصل ہوا، مولٰنا محمد طیب صاحب اپنی سیاسی مقالہ میں اسی حجرے کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"حضرت کی درسگاہ اور تربیت گاہ، اور جائے قیام چھتہ کی مسجد کا ایک حجرہ تھا جو اب تک محفوظ ہے۔" ص۳۱

آگے اسی کے بعد وہی رقمطراز ہیں کہ

اسی میں روز و شب گذارتے تھے۔ اور اسی میں علمی افاضہ، اور باطنی توجہات کا بازار گرم تھا، شاگرد اپنے لئے مخصوص منتخب فرمائے تھے"

مولانا محمد طیب صاحب کے قلم پر بے ساختہ اس موقعہ پر یہ فقرہ بھی آگیا ہے کہ

"بلکہ منجانب اللہ ان ...... (سیدنا الامام الکبیر) کے لئے مخصوص کر دئے گئے تھے"

سچ پوچھئے تو جہاں تک خاکسار کا خیال ہے واقعہ کی حقیقی صورت حال بھی کچھ یہی معلوم ہوتی ہے، اجتبائی رنگ والوں کے ساتھ "اللطیف الرحیم" کے الطاف خفیہ کا ظہور ان ہی شکلوں میں ہوتا ہے،

"بہرحال مولانا طیب صاحب نے ان ہی چیدہ و برگزیدہ معدودے چند طلبہ کی خصوصیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے کہ

"بجائے خود ذکی مستعد طالب حق، اور علم دین میں فنائیت کے جذبات رکھتے تھے"

ان میں سے چند کے نام کی تصریح بھی مولانا نے فرمائی ہے، لکھتے ہیں کہ

جیسے حضرت اقدس شیخ الہند مولٰنا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ محدث دار العلوم دیوبند، حضرت اقدس مولانا احمد حسن محدث امروہوی، حضرت اقدس مولٰنا عبد العلی صاحب محدث دہلوی، حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محی الدین مرادآبادی قاضی ریاست بھوپال، مولٰنا عبد الحق صاحب پور قاضوی وغیرہ وغیرہ"

لیکن وغیرہ وغیرہ" کے الفاظ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے تلامذہ کا دائرہ وسیع تھا جہاں تک میں جانتا ہوں، مذکورہ بالا بزرگوں کے سوا، بمشکل مولانا حکیم عبد الرحیم بجنوری، مولٰنا

حکیم منصور علی خاں صاحب مراد آبادی ثم حیدر آبادی کے ناموں کا اضافہ اس فہرست میں کیا جا سکتا ہے اور اس کی وجہ یہی تھی کہ جہاں علمی کاروبار کے دوسرے مظاہر سے حضرت والا اپنے آپ کو الگ رکھنا چاہتے تھے، اسی طرح درس و تدریس کے متعلق طریقۂ عمل بھی ایسا اختیار فرمایا تھا کہ عام طلبہ میں آپ سے استفادے کی ہمت ہی نہیں پیدا ہوتی تھی، اور اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ کسی نے پڑھنے کی درخواست پیش بھی کی، تو بجائے اپنے دوسروں کی طرف اس کو متوجہ فرما دیتے، "قاسم العلوم" کے نام سے حضرت کے چند "مقالات" کہئے یا مطبوعہ خطوط کا ایک مجموعہ کسی زمانہ میں شائع ہوا تھا، جواب نہیں ملتا ان ہی خطوط میں ایک خط کوئی صاحب مولوی فدا حسین نامی کے نام بھی ہے، صحیح طور پر تو پتہ چل نہ سکا کہ یہ کہاں کے رہنے والے تھے، لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ کلکتہ کے قرب وجوار میں کہیں ان کا وطن تھا، ان کو جواب دیتے ہوئے ان مجتہدی الفاظ کے بعد کہ

جامع کمالات مولوی فدا حسین صاحب زاد اللہ فی کمالہ۔ کمترین انام سراپا گناہ محمد قاسم پس از عرض سلام مسنون می طرازد، امروز ششم رمضان شریف روز چہارشنبہ نامہ آن شفیق بہ نشان میرٹھ رقم فرمودہ بودند، دریں قصبہ نانوتہ کہ مسقط الراس ایں نابکارست رسید، وممنون گردانید

جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نامہ فیض شمامہ اس زمانہ میں ارقام فرمایا گیا ہے، جب ہنگامہ غدر کے ساکن ہونے کے بعد میرٹھ میں حضرت والا کا قیام تھا، عرض کر چکا ہوں کہ قیام میرٹھ سے پہلے جب تک دہلی وغیرہ میں تھے، قطعاً کوئی شہادت اس کی نہیں ملتی کہ کسی کو آپ نے کوئی کتاب پڑھائی ہو، ہاں میرٹھ میں قیام کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ خاص خاص نوعیت کے علوم کی بعض کتابوں کا درس بھی کبھی دینے لگے تھے مگر سنئے مولوی فدا حسین صاحب نے حضرت والا سے حدیث پڑھنے کی آرزو اسی زمانہ میں ظاہر کی تھی، جواب میں ان کو ارقام فرماتے ہیں کہ

"شوق علم حدیث مبارکباد، مگر ایں قدر، مسافت طویلہ قطع کردن، آں ہم پیش ایں ہیچدان، رسیدن، قرین مصلحت نیست"۔

اور قصہ صرف اسی مشورہ پر ختم نہیں ہوا ہے، آگے فرماتے ہیں کہ

"عالم آباد است، غالباً در جوار اوشاں بسیارے از اہل کمال باشند"

مطلب وہی ہے کہ دنیا مولویوں سے بھری پڑی ہے، پھر سارے جہاں کے مولویوں کو چھوڑ کر آپ خواہ مخواہ اتنی طویل مسافت کے سفر کی زحمت کیوں برداشت کریں، اسی کے بعد یہ بھی مشورہ ان کو دیا گیا ہے کہ

"ورنہ کلکتہ بہ نسبت دہلی و اطراف آں ازانجا نزدیک باشد"

شاید مولوی فدا حسین نے عرض کیا ہوگا کہ حضرت خود اگر نہ پڑھائیں، تو حدیث پڑھنے کے لئے کیا دتی چلا آؤں؟ مگر بے چارے کو دلی کی طرف بھی رخ کرنے کی اجازت نہ دی گئی۔ اور دتی پر کلکتہ کو ترجیح دی گئی، اسی سے سمجھ میں آتا ہے کہ مولوی فدا حسین کا وطن غالباً کلکتہ کے قرب وجوار میں تھا خواہ بنگال میں ہو یا بہار میں۔ بہر حال علاوہ قرب مکانی کے کلکتہ کے مشورے میں حقیقی راز یہ پوشیدہ تھا، جس کا ذکر اسی کے بعد ان الفاظ میں فرمایا گیا ہے کہ

"بخدمت مخدوم العلماء، مطلع الفضلاء، حضرت استاذی مولوی احمد علی صاحب باید شتافت"

یہ وہی مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جو بعد کو محدث سہارنپوری کے نام سے مشہور ہوئے اور صحاح ستہ خصوصاً بخاری شریف کے تحشیہ و تصحیح کے ساتھ ساتھ درس حدیث کا باضابطہ حلقہ سہارنپور میں قائم کر کے علم و دین کی جو خدمات جلیلہ انھوں نے انجام دین ان کی وجہ سے وقت کے گویا وہ امام اور مرجع الانام قرار پائے لیکن یہ ساری باتیں بعد کی ہیں، جس زمانہ میں مولوی فدا حسین کو سیدنا الامام الکبیر نے یہ مشورہ دیا تھا، اس وقت وہ میرٹھ کے مشہور خانوادہ تجار لال کرتی والوں کی طرف سے چمڑے کے کاروبار میں وکالت کا کام کلکتہ میں انجام دیتے تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تجارتی مشاغل کے ساتھ ساتھ کلکتہ ہی میں درس حدیث کا بھی سلسلہ مولٰنا احمد علی صاحب نے شروع کر دیا تھا، اسی لئے مولوی فدا حسین کو ان کی طرف متوجہ فرمایا گیا، یہ سچ ہے اور میں پہلے

بھی کہیں ذکر کرچکا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر نے سنن ابوداؤد کا وہ حصہ جو حضرت شاہ عبدالغنی سے نہ پڑھ سکے تھے، اس حصہ کی تکمیل مولانا احمد علی صاحب سے فرمائی گئی تھی، اور بقول مولانا منصور علی خاں مرحوم حیدر آبادی کہ

"ایسے نکات حدیث وقت درس کے (سیدنا الامام الکبیر نے) بیان کئے کہ مولانا احمد علی صاحب مرحوم مجمع عام طلبہ فارغ التحصیل کے روبرو ان توجیہات مولنا مرحوم کو بیان فرماکر مولانا صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کی بڑی تعریف کیا کرتے" (ص ۱۸۲ مذہب منصور)

لیکن بایں ہمہ ان ہی مولوی فدا حسین صاحب کو مولانا احمد علی سے کلکتہ پہونچکر پڑھنے کا مشورہ جن الفاظ پر ختم کیا گیا ہے میری آنکھوں سے بے ساختہ آنسو ان کو پڑھ کر نکل پڑے، حضرت والا نے لکھا تھا۔

"کہ بہر طور کفش برداری اوشاں (مولنا احمد علی صاحب) ازمنت تہی برسر احقر در حق اوشاں بہتر ست"

اسی کے ساتھ اسی خط میں سیدنا الامام الکبیر نے یہ بھی ارقام فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی فدا حسین حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہو چکے تھے، اور وطن واپس لوٹنے کے بعد پھر حدیث پڑھنے کے لئے حاضری کی اجازت طلب کی تھی، بہرحال خط کے الفاظ آگے یہ ہیں کہ

"بااین ہمہ حال، مشغولیٔ احقر خود دیدہ رفتہ اند"

پھر اپنی مشغولیت کی کچھ تشریح بھی ان الفاظ میں فرمائی گئی ہے کہ

"از ہمہ مقدم کار مطبع ست"

جیسا کہ عرض کرچکا ہوں کہ یہ خط اس زمانے میں ارقام فرمایا گیا ہے جب آپ میرٹھ میں مقیم تھے اور منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع میں تصحیح کا کام انجام دیتے تھے۔ عجیب بات ہے کہ ہمارے مصنف امام نے میرٹھ کے مطبع کے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے حالانکہ لکھا ہے کہ

"منشی ممتاز علی صاحب نے میرٹھ میں چھاپہ خانہ قائم کیا اور مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کو پرانی دوستی کے سبب بلالیا، وہی تصحیح کی خدمت تھی، یہ کام برائے نام تھا

مقصود ان کا مولوی صاحب کو اپنے پاس رکھنا تھا" صا۲۱

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود منشی ممتاز علی صاحب مالک مطبع کی جانب سے کسی قسم کا کوئی قدغن آپکے کام کے متعلق نہ تھا، بلکہ حضرت والا کے قیام ہی کو کافی معاوضہ وہ خیال کرتے تھے۔ یہ منشی صاحب کی شرافت، اور علمی قدر دانی تھی، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں۔ خود حضرت والا کے اندر اپنی ذمہ داری کا احساس کتنا زندہ اور کتنا بیدار تھا، کہ سارے کاموں پر خود فرماتے ہیں مطبع کا کام مقدم ہے اور گو کتابوں میں ذکر نہیں کیا گیا ہے، لیکن بہ تواتر دیوبندی حلقہ کے علماء میں جو یہ مشہور ہے کہ سیدنا الامام الکبیر مطبع میں تصحیح کا کام جب کیا کرتے تھے، تو کام کا جو مقررہ وقت تھا، اگر ٹھیک اس وقت تک کسی وجہ سے پہونچنے میں تاخیر ہو جاتی، خواہ منٹ دو منٹ ہی کی تاخیر کیوں نہ ہو، تو اس کو فوراً نوٹ کر لیتے، درمیان میں یا آخر میں بھی اسی قسم کا عذر پیش آجاتا، تو بھی یہی کرتے، اور مہینہ جب ختم ہوتا، تو مہینہ بھر کے ان منٹوں کی میزان دی جاتی، اور تنخواہ کو گھنٹوں کے حساب پر بٹھا کر اتنی تنخواہ یا معاوضہ کے کٹوانے پر اصرار فرمایا جاتا تھا، آخر جب خود فرماتے ہیں کہ" از ہمہ مقدم کار مطبع ست" تو آپ کے اس طرز عمل سے کیوں تعجب کیا جائے۔

خیر یہ تو ایک ذیلی بات تھی، ذکر تھا مولوی فدا حسین کے خط کا، مطبع کے کام کا جو وقت مقرر ہے اس میں یہ فرماتے ہوئے کہ گنجائش پڑھانے کی کیا نکل سکتی ہے، آگے حضرت نے لکھا ہے کہ

"بازدران وقت قلیل کہ باقی ماند"

جس سے معلوم ہوا کہ زیادہ وقت دن کا مطبع کی تصحیحی خدمت ہی میں گذر جاتا تھا، اور دوسرے کاموں کے لئے بہت کم وقت بچتا تھا، پھر جیسا کہ خود ہی ارقام فرمایا گیا ہے کہ قلیل وقت میں بھی

"پارۂ بہر اشغال خود تجویز کردنی ست"

یعنی ذاتی ضرورتوں کے لئے بھی اسی "وقت قلیل" میں گنجائش نکالنی پڑتی ہے، آخر میں ہے کہ

"آنچہ باقی ماند بہر اسباق قدیماں ہم کافی نیست"

اور اسی سے پتہ چلتا ہے کہ میرٹھ پہونچنے کے بعد گو درس و تدریس کا کچھ سلسلہ شروع کر دیا گیا تھا،

مگر خود ہی فرماتے ہیں کہ کافی وقت اس کام کیلئے نہیں بچتا، پس قدیمان (یعنی پہلے سے جو لوگ پڑھ رہے ہیں) جب ان ہی کو کافی وقت نہیں ملتا تو جدید سبق کی گنجائش کیسے نکال سکتا ہوں،

یہ تحریری یادداشت جو گوناگوں معلومات پر مشتمل ہے۔ اس وقت اس کے پیش کرنے کی غرض یہی ہے کہ پڑھنے والے بے چارے پڑھنا بھی چاہتے تھے، تو ان کو آسانی کے ساتھ اس کا موقعہ نہیں ملتا تھا، اور مختلف معذوریوں کو پیش کرکے جواب دیدیا جاتا تھا،

البتہ اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر کیا جاتا ہے، بظاہر وہ حیرت انگیز ہے، تفصیلی طور پر اس قصے کا ذکر مرحوم نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی علیہ الرحمۃ والغفران صدر الصدور حکومت آصفیہ مرے لئے کر عموماً کیا کرتے تھے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ خاکسار کے سامنے نواب صاحب مرحوم نے اس واقعہ کا اعادہ کتنی دفعہ فرمایا ہوگا، خلاصہ جس کا یہ ہے کہ علیگڈھ جس کے ضلع میں نواب صاحب کی راج دہانی حبیب گنج واقع ہے، اسی علیگڈھ میں جب وہ کول کے نام سے مشہور تھا، ایک رئیس مولوی اسماعیل صاحب نامی تھے جن کو حدیث پڑھنے کا شوق ہوا، لیکن ریاست کے کاروبار کی مشغولیت اس کا موقعہ نہیں دیتی تھی کہ گھر سے باہر نکل کر اپنے شوق کو پورا کریں، نواب صاحب فرماتے تھے کہ مولوی اسماعیل صاحب نے حضرت مولانا محمد قاسم کی خدمت میں معروضہ پیش کیا کہ کسی عالم کو جو حضرت کے نزدیک قابل اعتماد ہوں، علیگڈھ بھیجدیا جائے تاکہ ان سے میں حدیث پڑھوں، جواب میں مولانا نے ارقام فرمایا کہ اور کسی عالم کو اپنے کاموں سے فرصت کہاں ہے جو آپ کے پاس جانے پر راضی ہو سکتے ہوں، البتہ ایک بیکار آدمی خود یہ فقیر ہے، حکم ہو، تو بندہ ہی حاضر ہو کر آپ کی خدمت کی سعادت حاصل کرے۔ مولوی اسماعیل بے چارے کے لئے یہ نوید، نوید جان افزا تھا کہ خود حضرت نانوتوی پڑھانے پر آمادہ ہو گئے ہیں، بدل وجان تشریف آوری کی تمنا انھوں نے ظاہر کی، کہتے تھے کہ صرف ان کو پڑھانے کے لئے علیگڈھ میں مولانا نے قیام فرمایا اور مولوی اسماعیل جو کتابیں پڑھنا چاہتے تھے، ان کو پڑھا کر آپ علیگڈھ سے تشریف لے گئے۔

نواب صدر یار جنگ بہادر اسی کے ساتھ دل چسپ کہئے، یا دل دوز معاوضہ[1] کی کمی و بیشی کا بھی ذکر فرمایا کرتے تھے، حاشیہ میں جس کی تفصیل پڑھ لی جائے۔ اور سچ پوچھئے تو زیادہ تر اس قصہ کا اعادہ نواب صاحب اسی آخری جزء کی وجہ سے کیا کرتے تھے، لیکن جیسا کہ حاشیہ میں فقیر نے عرض کیا' اس واقعہ کے اَدری ہونے کا واقعی استحقاق جس ہستی کو اس زمانے میں حاصل ہے یعنی مولٰنا محمد طیب کے نزدیک قصہ کا یہی جزء محل کلام اور موجب اشتباہ ہے۔

ورنہ سیدنا الامام الکبیر کا علیگڈھ تشریف لے جانا' اور کچھ دن کے لئے وہاں پڑھانا اس کا اجمالی ذکر تو قاسم العلوم والے مجموعے کے ایک خط میں حضرت والا نے خود فرمایا ہے، مکتوب دہم جو مولٰنا فخر الحسن گنگوہی مرحوم کے نام موسوم ہے' اس میں مولٰنا فخر الحسن کو کول کے متعلق یہ اطلاع دی گئی ہے کہ

---

[1] شروانی صاحب نور اللہ ضریحہ' کے بیان کا مرکزی جزء یہی تھا کہ تنخواہ کا مسئلہ جب پیش ہوا تو مولوی اسمٰعیل نے دست بستہ عرض کیا کہ حضرت والا جو کچھ فرمائیں گے، وہی رقم خدمت میں پیش کی جائے گی' جواب میں حکم ہوا کہ جب تک میں تمہارے یہاں رہوں' ماہوار پندرہ روپیہ مجھے دے دیا کرنا تا کہ گھر بھیج دوں' اس قلیل رقم کو سن کر مولوی اسماعیل شرمندہ تھے لیکن بات پہلے ہی طے ہو چکی تھی کہ یہ مسئلہ بجائے تمہارے فیصلہ کے میری رائے کا تابع رہے گا' اسی لئے خاموش ہو گئے' کئی مہینے حسب وعدہ پندرہ کی رقم پیش کرتے رہے' اسی عرصہ میں ایک دن مولوی اسمٰعیل جب پڑھنے کے لئے حاضر ہوئے تو مولانا نے فرمایا کہ میاں اسمٰعیل جو رقم اب تک تم دیتے تھے' اس پر نظر ثانی کی ضرورت پیش آگئی ہے، وہ خوش ہوئے کہ شاید کچھ اضافہ کی منظوری عطا فرمائی جائے گی' لیکن جب ان سے مولانا یہ فرمانے لگے کہ بھائی' پندرہ جو تم دیتے تھے' ان میں دس تو میں اپنے گھر کے لوگوں کو دیا کرتا تھا' اور پانچ روپے غالباً والدہ کی خدمت میں پیش کرتا تھا۔ کل خط آیا ہے کہ والدہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا ہے اس لئے اس پانچ کی ضرورت اب باقی نہ رہی آئندہ بجائے پندرہ کے دس ہی روپے دیا کرنا' مولوی اسمٰعیل ششدر و حیران تھے کہتے جاتے تھے کہ حضرت مجھ پر کوئی بار نہیں لیکن ادھر سے اصرار تھا کہ غیر ضروری روپئے کا بار اپنے سر بلا وجہ کیوں لوں۔ آخر بات دس ہی روپئے والی طے ہو گئی' فقیر کے سوا خدا ہی جانتا ہے شروانی صاحب سے اس قصہ کے سننے والوں کی تعداد کتنی ہو گی۔ مگر مولانا طیب صاحب جو صاحب البیت ہیں' اور اس قصے کو براہ راست نواب صدر یار جنگ سے انھوں نے بھی سنا ہے یہی خاکسار فرماتے تھے کہ اس قصے کے آخری جزء کے متعلق خیال گذرتا ہے کہ نواب صاحب کو کچھ اشتباہ ہو گیا تھا' مختلف وجوہ سے فرماتے تھے کہ اس جزء کی صحت میں مجھے کلام ہے' مثلاً یہی کہ تصحیح کے سوا مولانا نے درس و تدریس کا کبھی معاوضہ نہیں لیا' اس پر تمام اکابر دیوبند کا اتفاق ہے۔

"دراوائل عشرہ ماہ گذشتہ پس از ردوکد بسیار انجام کار رفتن کول تا اختتام بخاری و صحیح مسلم قرار یافتہ بود"

جس سے معلوم ہوا کہ کول جانے کا مسئلہ پیش آیا تھا، اور مقصد حدیث کی دونوں کتابیں بخاری و مسلم کا پڑھانا تھا، آگے یہ ارقام فرما کر کہ اس ماہ کے اوائل عشرہ میں گو کول پہونچنے کا موقعہ نکل گیا اور کسی وجہ سے نانوتہ، نانوتہ سے دیوبند میں قیام پر مجبور رہنا پڑا، پھر عید کی پندرھویں یا سولھویں تاریخ میں تقسیم انعام کا جو جلسہ دیوبند میں تھا، اس میں تقسیم انعام کی رسم انجام دے کر حضرت والا نے لکھا ہے کہ میں میرٹھ پہونچا، اور ایک شب وہاں گذار کر خورجہ میں دو راتیں گذاریں، آخر میں ہے کہ

"امروز روز یازدہم است غالباً کہ دریں جا رسیدہ ام"

یعنی گیارہ دن ہوئے کہ "دریں جا" پہونچنے کی خبر دی گئی ہے۔ مراد "دریں جا" سے کیا ہے، اس کا پتہ اسی مکتوب کے خاتمہ کی عبارت سے ہوتا ہے، خط کے آخر میں مولٰنا فخر الحسن صاحب گنگوہی سے یہ دریافت فرماتے ہوئے کہ

"غالباً بہ تقریب نکاح مولوی محمود حسن تا دیوبند قدم رنجہ فرمائید"

خاتمہ کے لفظ ہیں کہ

"افسوس کہ کول از راہ بہ یک سو افتادہ ست" ص۱۹

جس سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے عقد کی تاریخ اسی زمانہ میں مقرر ہو چکی تھی، اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ مولوی فخر الحسن صاحب اس زمانہ میں کسی ایسی جگہ تھے، جہاں سے دیوبند جاتے ہوئے علیگڈھ (کول) راستے میں نہیں پڑتا تھا، غالباً مولوی فخر الحسن صاحب اس زمانہ میں نگینہ کے عربی مدارس میں مدرس تھے، ظاہر ہے کہ نگینہ سے دیوبند جانے والوں کے لئے "کول یک سو افتادہ ست" کے سوا اور صورت بھی کیا تھی، بہر حال خاتمہ کے ان ہی الفاظ سے کہ کول از راہ بہ یک سو افتادہ ست" یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مولوی فخر الحسن صاحب کے نام یہ خط کول (علیگڈھ) ہی سے لکھا گیا ہے، اگرچہ مولوی اسماعیل صاحب کا نام اس خط میں نہیں لیا گیا ہے، لیکن یقیناً یہ اسی

زمانہ کی بات ہے کہ آپ مولوی اسمٰعیل کو پڑھانے کے لئے کول کچھ دنوں کے لئے تشریف فرما ہوئے تھے حیرت اسی پر ہوتی ہے کہ ایک طرف غریب مولوی فدا حسین صاحب جیسے کتنے تشنہ کامان علم کو دوسروں کے گھروں کا راستہ بتا دیا جاتا تھا، لیکن ان ہی کے مقابلہ میں ایک غیر معمولی بلند قسمت آدمی مولوی اسمٰعیل بھی تھے کہ کنواں ان ہی کے آنگن میں ابلنے لگا۔ واللہ اعلم بالصواب، مولوی اسمٰعیل کی اس قابل رشک خوش قسمتی کے ظاہری اسباب کیا تھے، سننے میں آیا ہے کہ مولوی اسمٰعیل پر غیر مقلدیت کا غیر معمولی اثر تھا، اس سلسلے میں ان کی طرف بعض ناگفتہ بہ باتیں بھی منسوب ہیں، ممکن ہے کہ ان کے اسی مرض نے طبیب کے دل کو تڑپا دیا ہو، اور بجائے اس کے کہ بیمار طبیب کے گھر آتا، طبیب ہی بے چین ہو کر مریض کے گھر پہنچ گیا، خدا ہی جانتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر سے بھی بخاری اور مسلم پڑھ لینے کے بعد مولوی اسمٰعیل صاحب مرحوم پر یہ راز واضح ہوا یا نہیں کہ صحیحین کی حدیثوں سے بھی بجائے تردید کے زیادہ تر حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے فیصلوں کی تائید ہی ہوتی ہے۔ اگر سیدنا الامام الکبیر سے براہ راست پڑھنے کے بعد بھی ان کی سمجھ میں یہ علمی راز نہ آیا، تو ظاہر ہے کہ ان بے چاروں کے دل سے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی بلا وجہ مخالفت کے جذبہ کو نکالنے میں اور کون کامیاب ہو سکتا تھا، انك لا تهدى من احببت ولكن الله يهدى من يشاء

بہر حال کچھ بھی ہو، میرا خیال تو یہی ہے کہ بجائے خود یہ واقعہ یعنی بڑے بڑے امیروں اور والیان ملک تک کی آرزوئے ملاقات کو جس نے آرزو سے آگے بڑھنے کا موقعہ نہ دیا، اسی کے متعلق یہ واقعہ کتنا حیرت انگیز ہے کہ پڑھنے کی انفرادی خواہش مولوی اسمٰعیل کی طرف سے پیش کی گئی، اور سارے مشاغل کو ترک کر کے بخاری و مسلم جیسی بڑی کتابوں کو ختم کرا دینے کا عزم کر کے کول پہونچ جانا، اور پڑھا کر واپس ہونا، وارستگیٔ مزاج کا یہ کتنا عجیب و غریب نمونہ ہے، افسوس ہے کہ اس قصہ کا تفصیلی تذکرہ حضرت والا کے حالات بیان کرنے والوں کی روایتوں میں نہیں ملا۔ صرف شروانی صاحب مرحوم اور مذکورہ بالا مکتوب کے سوا اس سلسلے میں دوسرے ذرائع سے کوئی بات معلوم نہ ہو سکی ورنہ آپ کی تدریسی زندگی کا یہ بڑا عبرت انگیز، سبق آموز قصہ تھا، اپنے قائم کئے ہوئے دارالعلوم کو

ایک دن کے لئے بھی جس نے اپنے تدریسی کمالات کے اظہار کے لئے استعمال نہ کیا ہو، آپ دیکھ رہے ہیں ضرورت کے احساس نے ایک ایسے کام کے کرنے پر اس کو آمادہ کرلیا، جس کا تصور بھی ہم شاید ان لوگوں کے متعلق نہیں کرسکتے جو مدرسی کی راہوں سے اپنی خودی کو نمایاں کرنے کی کوششوں میں مشغول رہتے ہیں، بیشک ایسوں کے لئے اس قسم کی خانگی نوعیت کی تدریس شاید ناقابل برداشت ہو، لیکن جو پڑھاتا ہی اس لئے ہو تاکہ لوگ مجھے مدرس، اور استاذ نہ سمجھیں، وہی یہ کرسکتا تھا اور اسی نے یہ کرکے دکھا بھی دیا، سچ تو یہ ہے کہ اپنے شاگردوں کی کفش برداری، واقعی کفش برداری کی ہمت اپنے اندر جو رکھتا تھا، جیسا کہ ارواح ثلاثہ میں محدث امروہوی مولٰنا احمد حسن کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ

"جس (طالب العلم اور شاگرد) کے اندر تواضع (سیدنا الامام الکبیر) دیکھتے تھے تو اس کے جوتے اٹھالیا کرتے تھے" ص۲۰۶ ارواح

اس کی تدریس کے اتفاقی مشغلہ کو ارباب عمائم وطیالسہ کے عام تدریسی مشاغل پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہوگا، یہ صحیح ہے جیسا کہ مسلسل عرض کرتا چلا آرہا ہوں کہ ضرورت محسوس فرمانے کے بعد آخر زندگی میں حضرت والا نے بعض لوگوں سے اس قسم کے تعلقات ضرور قائم کئے جو بظاہر دیکھنے والوں کو استادی اور شاگردی کے تعلقات نظر آتے تھے۔

لیکن استاد ہی جن شاگردوں کی جوتیاں اٹھاتا ہو، اور اس سے بھی زیادہ زہرہ گداز حضرت والا کا وہ فقرہ ہے جو ان ہی شاگردوں میں سے ایک شاگرد مولانا فخر الحسن گنگوہی مرحوم کے موسومہ ایک خط میں پایا جاتا ہے، خط کیا ایک علمی موضوع پر مقالہ ہے، قاسم العلوم کے مجموعۂ خطوط میں اس کا نمبر دسواں ہے، بہرحال اسی خط کی تمہیدی عبارت ختم کرتے ہوئے اپنے شاگرد مولوی فخر الحسن صاحب کو خطاب کرکے یہ ارقام فرمایا کہ مقصود اس مضمون کے لکھنے سے یہ ہے کہ

"زیر قلم کشیدہ نزد آں عزیز رسانم شاید بدعاے یاد کنند"

اور اسی کے بعد سیدنا الامام الکبیر کے خامۂ عبدیت شمامہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل پڑے ہیں کہ

"اے عزیز! دست ایں افتادہ باید گرفت بارگناہانم ندانم کجا برد"

اس پر مزید اضافہ میں اور کیا کروں، اسی سے سمجھا جاتا ہے کہ ان شاگردوں کا استاذ خود اپنے آپکو کیا سمجھتا تھا، اور یہ حال تو استاد کا تھا، خود ان شاگردوں کی شاگردی کے متعلق جو نہیں جانتے ہیں، وہ خواہ کچھ ہی سمجھتے ہوں لیکن مصنف امام کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں کہ حضرت والا کے دروس اور بیانوں سے مستفید ہونے کے لئے علاوہ "طباع" ہونے کے یہ شرط بھی تھی کہ طالب العلم پہلے سے کتاب کو سمجھے اور پڑھے ہوئے ہو، اور میں دیکھتا ہوں کہ جن بزرگوں کی حضرت نانوتویؒ کے مخصوص تلامذہ ہونے کی حیثیت سے شہرت ہوئی، ان میں اکثروں کا حال یہی ہے، مصنف امام سے بڑھ کر شہادت اس مسئلہ میں اور کس کی ہو سکتی ہے، اپنی مرتبہ سوانح عمری کے آخر میں یہ لکھ کر کہ

"جناب مولوی صاحب سے بہت سے لوگوں کو نسبت شاگردی ہے" ص۴۲

پھر شاگردی کی ان ہی نسبت رکھنے والوں میں سے بعضوں کے نام کی تصریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

"عمدہ ان میں سے ایک مولوی محمود حسن صاحب فرزند کلاں مولوی ذوالفقار علی صاحب دیوبندی ہیں" ص۴۲

مگر اسی کے ساتھ ان ہی عمدۃ التلامذہ کے متعلق وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ

"اکثر کتابیں مدرسہ دیوبند میں پڑھیں" ص۴۲

لیجئے یہ حال تو عمدۃ التلامذہ کا تھا، حضرت شیخ الہند کے بعد مصنف امام نے مولنا فخر الحسن گنگوہی کا نام لیا ہے، مگر ان کے متعلق وہ یہی فرماتے ہیں کہ

"انھوں نے بھی مدرسہ دیوبند میں تحصیل کی ہے، اور اول مولوی رشید احمد صاحب سے تحصیل کی تھی"۔ ص۴۲

جس کے معنی یہی ہوئے کہ پہلے ہی سے یہ لوگ پڑھے پڑھائے تھے، پڑھنے کے بعد پھر حضرت والا کی خدمت میں اپنی پڑھی ہوئی کتابوں کو پڑھتے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ نصابی کتابوں کی تخصیص بھی نہ تھی، ارواح ثلاثہ میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مولنا حبیب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ

علیہ کے حوالہ سے یہ روایت درج کی گئی ہے کہ

"حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آب حیات (حضرت مولانا نانوتویؒ کی تصنیف) وغیرہ حضرت (سیدنا الامام الکبیر) سے سبقاً سبقاً پڑھی ہے" ص۱۹۷

"وغیرہ" کا لفظ روایت میں جو ہے، اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ سبقاً سبقاً پڑھنے کا یہ قصہ کچھ آب حیات ہی کی حد تک محدود نہ تھا، اگرچہ اسی کے ساتھ نصابی کتابوں کے پڑھنے کا ذکر بھی بعض لوگوں نے کیا ہے۔ مثلاً مصنف امام نے ارقام فرمایا ہے کہ حدیث مولانا محمود حسن صاحب نے سیدنا الامام الکبیر سے پڑھی تھی، یا مولانا منصور علی خاں صاحب حیدر آبادی مرحوم ذکھا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے

مجھکو ملّا جلال اول سے آخر تک پڑھایا" ص۱۸۶ مذہب منصور

ان ہی کا بیان یہ بھی ہے کہ ملا جلال کے پڑھنے کا موقعہ ان کو اس زمانہ میں ملا جب حضرت والا کا قیام نانوتہ میں تھا اور اس زمانہ میں علاوہ ان کے

"مولوی محی الدین احمد خاں صاحب مراد آبادی اور مولوی عبد العلی صاحب میرٹھی اور مولوی رحیم اللہ بجنوری حاضر تھے، میں ان کے اسباق کی بھی سماعت کرتا تھا"

مولانا منصور علی خاں صاحب نے اپنے جن تین رفقاء کا ذکر فرمایا ہے، ان میں سے تیسرے صاحب یعنی حضرت مولانا حکیم رحیم اللہ بجنوری کی قدم بوسی اور لقاء کی سعادت فقیر کو بھی میسر آئی ہے، مجھے یاد آتا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ "رامپور کے علمی حلقوں میں درس نظامیہ کی تکمیل کرنے کے بعد وہ سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، واللہ اعلم ان بزرگوں کو کن کن کتابوں کے پڑھنے کا موقعہ حضرت والا سے ملا، ایک روایت مولانا حکیم رحیم اللہ بجنوری ہی کے متعلق بعض تحریری وثائق میں نظر سے گذری جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح بخاری کے درس میں بھی وہ شریک تھے۔[۱]

---

[۱] سیدنا الامام الکبیر کے حفید ثانی مولانا قاری محمد طاہر صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کی قلمی یادداشت میں خاکسار کو یہ روایت ملی ہے، قاری صاحب نے لکھا ہے کہ براہ راست حکیم رحیم اللہ صاحب نے بجنور میں اس واقعہ کا ان سے تذکرہ کیا تھا کہ جب مولانا محمد قاسم قدس اللہ سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوا تو صحیح بخاری کا درس دیا کرتے تھے میں بھی اس میں شریک ہو گیا (بقیہ آئندہ صفحہ)

بہر حال کہنے کی حد تک تو یہی کہا جاتا ہے کہ مذکورہ بالا حضرات سیدنا الامام الکبیر کے شاگرد تھے، اور حضرت والا ان بزرگوں کے استاد تھے۔ دوسرے ہی نہیں، خود حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا دستور بھی تھا کہ سیدنا الامام الکبیر کا ذکر ہمیشہ التزاماً استاذ[۵۱] علیہ الرحمۃ کے لفظ سے فرماتے، بارہا خاکسار نے ان سے یہی تعبیر سنی ہے لیکن جہاں تک واقعات کی شہادت ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاگردی اور استاذی کے عام تعلقات کے مقابلہ میں سیدنا الامام الکبیر سے ان بزرگوں کے تعلق کی نوعیت نرالی تھی۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ جہاں یہ فرمایا کرتے، اور دوسرے بھی یہی سمجھتے[۵۲] تھے کہ سیدنا الامام الکبیر سے گویا ان کو عشق تھا، میرا حافظہ اگر غلطی نہیں کر رہا ہے تو شاید براہ راست شیخ الہند ہی سے یہ بات فقیر نے سنی ہے کہ ابتداء میں دارالعلوم دیوبند میں میرا تقرر مدرسی کی خدمت کے لئے ہوا، اور اس کی خبر مجھے ملی تو میں روپوش ہو گیا، حضرت الاستاذ کو جب اس کی خبر ہوئی تو تلاش کر کے حاضر کیا گیا، پوچھا گیا کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳۴) ایک دن اتفاقاً مجھے وضو نہ تھا اور سبق میں جا کر بیٹھ گیا، حکیم صاحب کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا کہ حضرت ہاتھ سے منع فرما رہے ہیں، پھر بلا کر یوں فرمایا کہ

"میاں صحیح بخاری میں تو ایسا نہ چاہئے کہ بلا وضو بھی آدمی بیٹھ جائے"

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ہذا) [۵۱] سلف کا عام طریقہ شیخ کو استاذ کے لفظ سے تعبیر کرنے کا تھا غالباً اسی عنوان پر حضرت شیخ الہندؒ نے جو حضرت والا کو استاد سے تعبیر کیا ہے، ورنہ جہاں شیخ الہند کے علوم ظاہری کی تکمیل حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے فرمائی وہیں کمالات باطنی کی تکمیل بھی حضرت ہی نے فرمائی ہے چنانچہ میں نے اپنے متعدد اکابر سے سنا ہے کہ شیخ الہند کا رنگ باطن اور انداز اخلاق و کمالات بعینہ اپنے استاذ جیسا تھا لیکن حضرت نانوتوی تواضعاً متوسلین کی تکمیل فرما کر انھیں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منتقل فرما دیا کرتے تھے کہ اجازت ان سے لیلو شاید اسی انداز پر حضرت شیخ الہندؒ کو بھی گنگوہ کی طرف منتقل فرمایا ہے۔ بسا اوقات فتاوی میں بھی یہ صورت اختیار فرمائی ہے، کہ فتویٰ خود مرتب فرمایا۔ اپنے دستخط کے بجائے اسے بھیجدیا حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کہ ان کی طرف سے جانا چاہئے، غرض کمال تواضع سے طبیعت ثانیہ یہ بنالی تھی کہ ہر موقع پر کام میں سب سے آگے رہنے کے باوجود نمود کے موقع پر خود سے پیچھے رہنا چاہتے تھے۔ جیسا کہ اس قسم کا واقعہ متن میں پہلے گذر بھی چکا ہے۔ نیز افتاء و تدریس و وعظ سب میں یہی رنگ طبیعت نمایاں تھا اور یہی رنگ دائرۂ طریقت میں بھی متوسلین کے ساتھ استعمال فرمایا گیا ہے۔ (محمد طیب غفرلہٗ)

[۵۲] ارواح میں امیر شاہ خاں مرحوم کا بیان نقل کیا گیا ہے کہ مولانا محمد قاسم کے خدام آپ کے عاشق تھے (ارواح ص۲۰۲)

بھائی یہ تم روپوش کیوں ہوگئے، شیخ الہند فرماتے تھے کہ تب آبدیدہ ہوکر میں نے عرض کیا کہ حضرت! آپ کی خدمت میں فقیر تحصیل علم کے لئے کب حاضر ہوتا تھا، مجھے تو آپ کی باتوں میں صرف مزہ ملتا تھا، بس اسی مزے کے لئے حاضر ہوتا تھا، پڑھنے کے لئے پڑھتا تو مجھے کچھ آتا جاتا، ایسی صورت میں دوسروں کو بھلا کیا میں پڑھا سکتا ہوں، فرماتے تھے کہ میری باتوں کو سنکر حضرت نے مجھے قریب بلایا اور کمر کو تھپک کر ارشاد فرمایا کہ

"جاؤ! جاکر پڑھاؤ"

شاید یہ بھی فرمایا کہ تم تو بہت پڑھاؤگے، حضرت شیخ الہند کہتے تھے کہ اسی توجہ کا نتیجہ ہے کہ "ہم جیسے کانوں کتروں[۵۲] سے کچھ کام بن آیا" اسی کے ساتھ حضرت شیخ الہند ہی کے اس بیان کو ملائیے جس کا ذکر ارواح میں کیا گیا ہے، حاصل جس کا یہی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے قلبی تعلق کا حال ان کے ساتھ یہ تھا کہ "دن میں دس بار بھی حاضر ہوکر سلام کرتا، تو مجھے دیکھ کر ہر مرتبہ اتنے ہی خوش ہوتے تھے جتنا کہ ماں باپ کو اس اکلوتے بچے کے ملنے سے غیر معمولی خوشی ہوسکتی ہے جو کسی وجہ سے حبس دوام کی سزا پاکر ماں باپ سے ہمیشہ کے لئے جدا کردیا گیا ہو، اور وہی لڑکا جس کے ملنے سے زندگی بھر کے لئے ماں باپ مایوس ہوچکے ہوں قید سے چھوٹ کر ان کے پاس حاضر ہوجائے۔ ارواح ص۱۸۱

---

[۵۱] بعض روایات کے مطابق یہ واقعہ کافیہ پڑھانے کے زمانہ کا ہے یعنی مدرسی پر مامور ہونے کے بعد پڑھانا شروع کردیا تھا، اور ابتدائی کتب مثل میزان منشعب وغیرہا کا درس دیتے رہے لیکن کافیہ شروع ہونے پر جب خود یہ اندازہ کیا کہ وہ چل نہ سکے گی تو اسے شروع کرائے بغیر پڑھانا چھوڑ کر روپوش ہوگئے اس پر حضرت والا نے بلواکر وہ جملے ارشاد فرمائے جو متن میں مذکور ہوئے ہیں۔ . . . . . . . (محمد طیب غفرلہ)

[۵۲] کانوں کتروں کے الفاظ اب تک معلوم ہوتا ہے کہ حافظہ میں تازہ ہیں، شیخ الہند نے کچھ عجیب انداز میں یہ بات فرمائی تھی، توجہ کی شاید یہ وہی قسم ہے جس کی تعبیر شیخ محی الدین بن عربی توجہ بالید سے اپنی کتابوں میں کرتے ہیں مشہور صحابی حضرت جریر بن عبد اللہ البجلی گھوڑے کی پشت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ بالید ہی کی بدولت میخ کی طرح جم جاتے تھے حالانکہ اس سے پہلے گھوڑے کی پیٹھ پر ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سوء حفظ کی شکایت جب کی تو ان کو بھی توجہ بالید ہی سے سرفراز فرمایا گیا جس کا ذکر بخاری وغیرہ میں ہے۔ ۱۲

خود سیدنا الامام الکبیر نے "قاسم العلوم" کے اسی نامۂ دہم میں جو مولانا فخر الحسن گنگوہی کے نام ہے خط کے آخر میں یہ لکھ کر کہ "مرا یکے از مشتاقان دیدار خود دانند" اپنے قلم سے ارقام فرمایا ہے کہ

"من ندانم از طرف شما و مولوی احمد حسن و مولوی محمود حسن
بدلم چہ نہادہ اند اکثر موکشاں بکار پردازی شما می کشند" (مکتوب دہم، ص ۱۹)

امیر شاہ خاں مرحوم کا قول جو حاشیہ میں میں نے درج کیا ہے، جب وہ اس کو بیان کیا کرتے تھے تو سیدنا الامام الکبیر کے ان عشاق کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ فارسی کا یہ شعر بھی پڑھتے کہ

بگوش گل چہ سخن گفتہ، کہ خنداں ست　　بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالاں ست

سیدنا الامام الکبیر کے تلامذہ اور شاگردوں کے نام سے جو موسوم و مشہور ہوئے بلا شبہ ان میں تقریباً ہر ایک کا حال یہی تھا کسی موقعہ پر مولانا منصور علی خاں حیدر آبادی مرحوم کا قول نقل کر چکا ہوں حضرت والا کے ساتھ ان کے قلبی رابطہ کی جو کیفیت تھی اسے ان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ

" ان کی سی نزاکت اور دلیری کسی معشوق میں بھی نہ دیکھی، ان کا ذرا التفات اگرچہ جلالی ہو، دافع بلیات تھا، وہ سر تا پا اکسیر اور کندن تھے اور ان کا لطف اور التفات جمالی مفرح القلوب اور کفایۂ منصوری تھا" ص ۱۹۵

مگر اسی کے ساتھ آپ دیکھ رہے ہیں اپنے ان ہی نیازمندوں کے متعلق خود سیدنا الامام الکبیر کے باطنی احساسات کا پارہ کہاں تک چڑھا ہوا تھا ان ہی کے الفاظ میں "موکشاں (بال پکڑے) ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ تم لوگوں کا کام ہم سے لیا جاتا ہے۔ یہ سوال کہ دار العلوم کی وسیع درسگاہوں کی طرف خود بڑھانے کی نیت سے نظر اٹھا کر بھی جس نے مدت العمر نہیں دیکھا وہی شخص صرف ایک شخص کو پڑھانے ہی کے لئے کول (علیگڈھ) صرف جانے ہی پر نہیں بلکہ کافی مدت تک وہیں قیام کرنے پر کیوں آمادہ ہوا۔ یا جو خود لکھے پڑھے تھے، بجائے خود عالم و فاضل ہو چکے تھے، ان کو دوبارہ پڑھانے اور سکھانے پر آپ کیوں آمادہ ہو گئے، بلا شبہ اگر آپ کے پڑھانے کی نوعیت

وہی ہوتی، جو عام ارباب درس و تدریس کے کام کی ہوتی ہے، تو اس وقت یہ سوال معمہ بن سکتا تھا، لیکن اس معمہ کو بآسانی ہم اسی کلی اصول" کے تحت جب حل کر سکتے ہیں یعنی علم سے تعلق رکھنے والے جتنے کام بھی آپ سے لئے گئے، جیسے سب میں آپ کے قصد و ارادہ کو دخل نہ تھا جو کمالات بھی وہبی اور اکتسابی راہوں سے آپ کو ارزانی ہوئے تھے، بجائے نمایاں کرنے کے خود تو سب کو دبانا ہی چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ کھونا بھی چاہتے تھے لیکن کمالات کا بخشنے والا ان سے کام لینا ہی چاہتا تھا، یہی صورت آپ کے درس و تدریس کے قصے کی بھی نظر آتی ہے آپ دیکھ رہے ہیں، بولنے کی حد تک تو لوگ یہاں بھی استاد اور شاگرد، درس و تدریس کتابیں اور اسباق وغیرہ کے الفاظ ہی استعمال کرتے ہیں لیکن اجمال سے ہٹ کر جب تفصیلات کی حدود میں ہم داخل ہوتے ہیں، تو قدم قدم پر ایسی شہادتیں مسلسل ملتی چلی جاتی ہیں، جن کی روشنی میں اس تعلق کی صحیح تعبیر وہی درست معلوم ہوتی ہے جو عام طور پر تدریسی و تعلیمی حلقوں کے اساتذہ و تلامذہ میں پائی جاتی ہے، اور نہ اس کی تشریح ان روابط سے ہم کر سکتے ہیں، جو عام پیروں اور مریدوں میں ہوا کرتے ہیں، جھلک کچھ اگر نظر آتی ہے، تو شاید اسی نسبت کی جسے قرآنی آیت

| | |
|---|---|
| یتلوا علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة | جو (پیغمبر) ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو (عقائد باطلہ و اخلاق ذمیمہ سے) پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور دانشمندی (کی باتیں) سکھلاتے ہیں |

نے تیرہ سو سال پہلے اسی خادم کے مخدوم صلوات اللہ علیہ وسلامہ اور ان کے صحبت یافتوں کے درمیان پیدا کر دیا تھا، ہم اصطلاحی معنوں میں صحابۂ کرام کو جیسے رسول اللہ کے شاگرد ٹھہرا سکتے ہیں، اور نہ مرید لیکن باوجود اس کے دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ شاگرد اور مرید ہونے کا جو کچھ بھی مطلب ہو سکتا ہے اس کے لحاظ سے دنیا نے نہ ان صحابیوں کے جیسے شاگردوں کو دیکھا تھا اور نہ مریدوں کو کہتا چلا آرہا ہوں کہ ہر رنگ میں اپنے آقا کا جو غلام جس حد تک وفا شعار ہوگا، اسی حد تک سمجھا جاتا ہے کہ اس کی غلامی پختہ ہے، پھر عہد غلامی باندھ کر جینے کا بھی اور

مرنے کا بھی جو فیصلہ کر چکا تھا، کیوں تعجب کیجئے اگر زندگی کے اس پہلو میں بھی جس حد تک بھی ہو آفاقی کا رنگ اس کے اندر سے بھی منعکس ہو رہا تھا۔

بات بہت طویل ہو جائے گی، ورنہ سیدنا الامام الکبیر کی حیات طیبہ کا رخ کافی تفصیل و تفسیر کا طالب تھا، جن لوگوں کا انتخاب اپنی خاص صحبت و رفاقت کے لئے آپ نے فرمایا تھا ایک طرف جہاں قرآن کی آیتیں سنا سنا کر باتوں باتوں میں ان ہی کے متعلق ایسے علمی اسرار فاش ہوتے رہتے تھے کہ سننے والوں میں اس کی لذت آخر وقت تک باقی رہتی تھی، اور جب موقعہ ملتا حضرت والا سے ان سنے ہوئے حقائق کا تذکرہ مزے لے لے کر کیا کرتے تھے[۱]۔ اسی طرح الحکمت کی تعلیم کا ذریعہ حدیث کی کتابوں کو بنایا جاتا تھا، آپ سن چکے کہ اس معاملہ میں اتنے حریص تھے کہ مولوی اسمٰعیل کی طلبی پر خود ان کے گھر کول میں جا کر قیام فرمایا، حسی نزاکتوں کا حال اس باب میں یہ تھا کہ مولانا رحیم اللہ بجنوری چاہتے تھے کہ حدیث کے حلقہ میں بغیر وضو کے بیٹھ جائیں، لیکن حکمت کے علم کے لئے اتنی مسامحت بھی ناقابل برداشت بن جاتی تھی، پھر ان ہی لوگوں کے متعلق ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اپنی بڑائی سے جو دست بردار ہو جاتے تھے جہاں ان کی جوتیاں

---

[۱] مولانا منصور علی خاں حیدر آبادی مرحوم اپنی کتاب "مذہب منصور" میں حضرت والا کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے بیساختہ یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ مشہور قرآنی آیت لایستوی القاعدون (یعنی جہاد کی خدمت سے بیٹھنے والے ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے، جو اس خدمت کو انجام دے رہے ہیں) تفسیروں میں لکھا ہے کہ نابینا صحابی ابن ام مکتوم نے آکر عرض کیا کہ میں تو مجبور ہوں گویا ان کو افسوس ہوا کہ اگر یہ قدرتی عذر نہ ہوتا تو ہم بھی جہاد کی فضیلت حاصل کر سکتے تھے اس پر غیر اولی الضرر کے الفاظ پھر نازل ہوئے مطلب یہ تھا کہ قدرتی عذر والوں کا درجہ کم نہ ہو گا، اس پر اعتراض ہوا کہ اللہ میاں نے پہلے ہی ان الفاظ کو کیوں نازل نہ فرمایا۔ سیدنا الامام الکبیر اسی کے متعلق فرماتے تھے کہ قرآن میں القاعدون (جہاد سے بیٹھنے والوں) کا لفظ تھا اور المقعدون (جو جہاد سے بٹھا دئے گئے ہوں) یہ لفظ قرآن میں جب نہ تھا تو اسی سے سمجھ لینا چاہئے تھا کہ حکم صرف ان لوگوں کی حد تک محدود ہے جو جہاد سے خود بیٹھ گئے ہوں، باقی قدرت ہی نے جن کو معذور کر کے بٹھا دیا ہو، وہ اس کے نیچے داخل ہی نہ تھے۔ لیکن قرآن کا اشارہ کافی نہ ہوا تو اللہ میاں نے اجمال کی خود تفصیل کر دی۔

اٹھائی جاتی تھیں، وہیں محدث امروہوی یہ بھی فرماتے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر کا یہ قاعدہ بھی تھا کہ
جس طالب العلم کے اندر تکبر دیکھتے تھے اس سے کبھی کبھی جوتے اٹھوایا کرتے تھے" ص۲۰۶

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ قصہ خود اپنی بیتی کا بیان کرتے تھے تفصیل آپ کو ارواح ثلاثہ میں ملے گی واقعہ یہ تھا کہ محدث امروہوی جو امروہہ کے خاندان سادات سے تعلق رکھتے تھے، اور ناز و نعمت میں پلے ہوئے تھے، حضرت والا کی خدمت میں جب حاضر ہوئے تو کہتے تھے میں نے دیکھا کہ ایک جولاہہ نے حضرت سے دعوت قبول کرنے کی فرمائش کر کے عرض کیا کہ فقیر کے غریب خانہ کو رونق بخشی جائے اس زمانہ میں مسلمانان ہند کی ذہنیت شرافت و رذالت کی گھناؤنی گندگیوں سے اس حد تک مأوف ہو چکی تھی، کہ غریب جولاہہ کے گھر جا کر کھانا کھانے کی درخواست کی منظوری سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے جس وقت صادر ہوئی، تو مولانا احمد حسن کا بیان ہے کہ

"مجھکو اتنا ناگوار ہوا کہ جیسے کسی نے گولی ماردی"

مگر تلاوت آیات و تعلیم حکمت کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے تزکیہ کا کام بھی سیدنا الامام الکبیر کے سپرد ہوا تھا، اسی وقت سے مولانا احمد حسن کے اندر اترنے والی اس گولی کی طرف سے فکر پیدا ہوئی، فراست ایمانی نے حضرت والا نے مولانا امروہوی کے اس تاثر کو بھانپ لیا کہتے تھے کہ اس دن کے بعد سے یہ قاعدہ ہی حضرت نے مقرر کر لیا کہ دعوت کرنے والوں سے یہ شرط بھی کرلتے کہ مولوی احمد حسن کو بھی میں ساتھ لاؤنگا پھر خدا ہی جانتا ہے کہ اس سلسلہ میں ان کو کس کس کے گھر جانا پڑا، اور بقول ان ہی کے

"جب بالکل میرے قلب سے ناگواری نکل گئی تب مولانا نے میری دعوت کی شرط کو ترک کر دیا" ص۲۰۷

اور یوں دل میں ان کے جو گولی اتر گئی تھی اس کو نکال کر تزکیہ کے فرض کو انجام تک حضرت والا نے پہونچایا، اور تزکیہ کا یہ قصہ صرف مولنٰنا احمد حسن ہی تک محدود نہ تھا، کسی موقعہ پر صاحبزادہ والا تبار مولنٰنا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم کے حوالہ سے مولنٰنا منصور علی خاں صاحب مرحوم کے صوری ابتلاء و افتتان کے حادثہ کا ذکر کر چکا ہوں، اس موقعہ پر بھی جو کچھ کیا گیا تھا، وہ تزکیہ ہی کی تو ایک عملی شکل تھی؟

مولانا احمد حسن امروہوی رحمۃ اللہ علیہ جن کے متعلق حضرت تھانوی یہ روایت نقل کیا کرتے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر فرماتے تھے کہ مولوی احمد حسن کے دل و دماغ، ذکاوت و ذہانت کو میری طبیعت سے خاص مناسبت ہے، فرماتے کہ ذہین و فطین تو ممکن ہے لوگ ان سے بھی زیادہ ہوں لیکن سونے کی مقدار تھوڑی ہی کیوں نہ ہو، سونے کے ڈھیر سے جو مناسبت اس کو ہوگی، وہ چاندی کو نہیں ہوسکتی، خواہ چاندی کی تعداد زیادہ ہی کیوں نہ ہو (قصص ماہ جمادی ۵۲ھ)

بہر حال ان ہی باطنی مناسبتوں کی وجہ سے مشہور ہے کہ حضرت سیدنا الامام کے قلب مبارک میں ان کی خاص جگہ تھی، اور بقول مرشد تھانوی سید ہونے کی خصوصیت کو بھی اس میں دخل تھا، لیکن باوجود ان تمام باتوں کے تزکیہ کے فرض کا جب مطالبہ ہوتا، تو اس مطالبہ کی تکمیل میں کبھی ان کی رو و رعایت نہیں کی گئی، دعوت والی گولی کا قصہ تو آپ سن ہی چکے، مولانا احمد حسن صاحب ہی اسی سلسلہ میں ایک اور واقعہ کا بھی تذکرہ کیا کرتے تھے، عرض کر چکا ہوں کہ مولانا احمد حسن کی پرورش ناز و نعمت کے ماحول میں ہوئی تھی، وہ خود بھی کہا کرتے تھے کہ "میں بڑا خوش لباس تھا" اب سنئے اسی "خوش لباسی" کے جذبہ کا حشر ارواح میں ان ہی کا یہ بیان درج کیا گیا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں کسی نے گاڑھے کا ایک تھان پیش کیا، قبول کر لیا گیا، اور درزی کو بلا کر حکم دیا گیا کہ ایک انگرکھا تو میرا اس سے تیار کر دو، اور اسی کے ساتھ ان کو (یعنی مولانا احمد حسن) کو بلا کر درزی سے فرمائش کی گئی، کہ دوسرا انگرکھا ان کے لئے اسی کپڑے سے نکالو، کپڑا کافی تھا، درزی دونوں انگرکھے سی کر لے آیا۔ مولوی احمد حسن صاحب کے حوالہ گاڑھے کا وہی انگرکھا یہ ہدایت کرتے ہوئے کیا گیا کہ اسے تم پہنو، "خوش لباسی" کے جذبہ کی خوراک گاڑھے کے اس انگرکھے کی شکل میں مہیا کی گئی تھی، مولانا احمد حسن صاحب نے لینے کی حد تک تو لے لیا۔ مگر بجائے پہننے کے اس کو صندوق کے حوالہ کیا، کہتے تھے جب اس انگرکھے کو پہن کر حضرت کی خدمت میں حاضر نہ ہوا، تو وجہ پوچھی گئی، کوئی وقتی عذر پیش کر دیا گیا، مگر یہ فرمائش اتفاقی تو تھی نہیں جو ان حیلوں حوالوں سے ٹل جاتی۔ مولانا احمد حسن فرماتے تھے کہ

"مولانا روز دریافت فرماتے کہ بھائی، تم نے اس کو پہنا نہیں آخر جب میں سمجھ گیا
کہ مولانا مانیں گے نہیں تو مجبوراً میں نے اس کو پہنا" (ارواح ص۲۰۱)

اور اس قسم کے قصوں کی حضرت والا کی زندگی میں کیا کمی ہے، افسوس ہے کہ لوگوں نے قلم بند نہیں کیا ورنہ تلاوت آیات کے ساتھ تعلیم و تزکیہ کے دھارے ایک ساتھ جو بہ رہے تھے، ان کے بہترین عملی نمونے یہ واقعات ہو سکتے تھے۔

تاہم میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں غالباً اس کے سمجھنے کے لئے یہی چند مثالیں کافی ہو سکتی ہیں، آخر آپ ہی سے میں پوچھتا ہوں، مولٰنا احمد حسن امروہوی کی طرف یہ روایت جو ارواح میں منسوب کی گئی ہے کہ شاہ جہاں پور والے مشہور میلہ کی معرکۃ الآراء تقریر سیدنا الامام الکبیر نے جو کی تھی، شہر شاہ جہاں پور کے باشندوں نے جب اس کی غیر معمولی تعریفیں سنیں، تو میلہ سے حضرت والا جب شاہ جہاں پور تشریف لائے، شہر کے معززین کا ایک گروہ حاضر ہوا اور اصرار کرنے لگا کہ ہم لوگ اس تقریر کے سننے سے چونکہ محروم رہے، اس لئے وہی تقریر یہاں بھی فرمائی جائے۔ حضرت والا نے ان لوگوں کے غیر معمولی اصرار کو دیکھ کر فرمایا کہ اس تقریر کو آپ لوگ اگر سننا چاہتے ہیں تو ان سے (اشارہ مولوی احمد حسن امروہوی) سے سن لیجئے۔ کہتے تھے کہ میں تو یہ سنکر کچھ ششدر سا ہو کر رہ گیا کیونکہ حضرت والا کی تقریر کا اعادہ خصوصاً جب میں نے اس غرض سے سنی بھی نہ تھی، مجھے کچھ ناممکن سا نظر آیا۔ لیکن سیدنا الامام الکبیر کا حکم تھا، کھڑے ہو گئے، کچھ تمہیدی فقرات کے بعد ان کا بیان ہے کہ تقریر کا اعادہ میں نے شروع کیا۔

"پھر مجھے خبر نہ رہی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں"

لیکن جب تقریر ختم ہوئی تو میلے میں سیدنا الامام الکبیر کی براہ راست تقریر سننے والوں نے شہادت دی کہ

من وعن وہی تقریر تھی جو مولٰنا محمد قاسم صاحب نے فرمائی تھی"[۱] ص۱۰۸

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمایئے)

یہ واقعہ، یا خود سیدنا الاستاذ مولٰنا شیخ الہند نور اللہ مرقدہ کی تدریسی زندگی کے آغاز کا قصہ ابھی کچھ دیر پہلے جو سنا گیا تھا، بلکہ پڑھنے والوں کے حافظہ میں اگر اُس واقعہ کی یاد محفوظ ہو، جو دارالعلوم دیوبند کے اس طالب العلم کے ساتھ گذرا تھا، جسے مدرسہ کے قانون نے وظیفہ کے استحقاق سے محروم قرار دیا تھا، لیکن وظیفہ کا بھی سامان اس بے چارے کے لئے ہو گیا، اور حدیث کی کتابوں کی سماعت کے بعد غالباً پنجاب کی کسی مسجد کی امامت اختیار کر لی تھی، پھر ایک مخالف مولوی سے مناظرے کی نوبت آئی، اس وقت بھی سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے روحانی امداد کا تجربہ ان ہی صاحب کو جو ہوا تھا، یہ اور اسی قسم کے دوسرے واقعات و سوانح کو پیش نظر رکھتے ہوئے سوچئے کہ درس و تدریس کو بطور پیشہ کے اختیار کرنے والے اساتذہ اور ان کے تلامذہ کے درمیان کیا ان نمونوں کو ڈھونڈھنے میں ہم کامیاب ہو سکتے ہیں؟ پھر حضرت والا کے تدریسی مشاغل کی نوعیت اگر عام مدرسوں اور معلموں کے کاروبار سے مجھے الگ نظر آتی ہے، تو کیا اسمیں

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ۴۰۴) اسی کی مثل وہ واقعہ بھی ہے جسے میں نے حضرت مولٰنا عبداللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ انبہٹوی حضرت والا کے بڑے داماد اور مولانا محمد میاں مہاجر کابل مرحوم کے والد بزرگوار سے سنا ہے کہ حضرت کی عادۃ تھی کہ ماہ رمضان میں جب نانوتہ میں قیام تھا تو ہر جمعہ کو بلا ناغہ وعظ فرمایا کرتے تھے اور کوئی ایک آیت یا روایت اختیار فرمالیتے اور اسی کے علوم و معارف پورے رمضان بیان ہوتے رہتے۔ فرمایا کہ میں نانوتہ میں ایک رمضان میں حاضر تھا اور پورے رمضان مقیم رہا اس رمضان میں حضرت نے حدیث من صام رمضانَ ایماناً و احتساباً غفرلہ ما تقدم من ذنبہ کو اختیار فرمایا اور مسلسل تین جمعوں میں اسی کا بیان فرماتے رہے آخری جمعہ میں کچھ طبیعت ناساز ہوگئی تو مجھے فرمایا کہ مولوی عبداللہ اس جمعہ میں تم اسی حدیث کے سلسلہ میں بیان کر دو۔ میں شرح جامی پڑھتا تھا میں نے عرض کیا حضرت میں تو حدیث کے مدلول کو سمجھنے کی ہی اہلیت نہیں رکھتا تقریر و بیان کیا کروں گا۔ فرمایا بھائی اللہ پر بھروسہ کر کے تم کھڑے ہو جانا خدا مدد فرمائیگا۔ باوجود صد انکار کے مجھے حضرت نے کھڑا کر دیا میں لرزاں و ترساں منبر کے پاس کھڑا ہو گیا خطبہ بھی پڑھ لیا حدیث بھی پڑھ لی۔ اور کچھ ترجمہ وغیرہ شروع کیا اتنا تو میں نے دیکھا کہ حضرت باہر کی سہ دری میں گردن جھکائے میری طرف متوجہ ہیں، پھر مجھے خبر نہ رہی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں تقریباً دو ڈھائی گھنٹہ میں نے بیان کیا نہ بیان سے پہلے خبر تھی کہ کیا کہوں گا نہ بعد میں خبر ہوئی کہ کیا بیان کیا مگر لوگوں نے کہا کہ نہایت اونچے اونچے علوم بیان کئے۔

(محمد طیب غفرلہٗ)

میری نظر غلط بینی کے الزام سے متہم ہونے کی مستحق قرار پاسکتی ہے ؟

کچھ بھی ہو شہادتوں کا جو مواد اس وقت تک خاص طریقہ سے پیش کیا گیا ہے، میرا خیال تو یہی ہے کہ ان کو دیکھ کر ہر صاحب انصاف کم از کم اس فیصلہ پر تو اپنے آپ کو بہر حال مجبور پائیگا کہ علمی اور ذہنی کمالات کی جتنی بھی نمائش گاہیں تھیں، ان نمائش گاہوں کا استعمال اپنے کمالات کے اظہار کے لئے خود سیدنا الامام الکبیر نے خود کبھی نہیں فرمایا' اور اس سلسلہ میں جو باتیں بھی ظاہر ہوئیں اگرچہ بقول مصنف امام

اس شہرت پر بھی کسی نے کیا جانا' جو کمالات تھے وہ کس قدر
تھے کیا اس میں سے ظاہر ہوئے" (قدیم سوانح عمری صلا)

لیکن بایں ہمہ آپ دیکھ چکے کہ دنیا آپ کے جن کمالات سے واقف ہوئی' ان سے دنیا کو روشناس کرانے میں سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے قطعاً ان تدبیروں میں سے کوئی تدبیر نہیں اختیار کی گئی جن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یاد پڑتا ہے' ہمارے استاذ امام سید کشمیری مولانا انور شاہ نور اللہ ضریحہ تقریباً ہر سال دورۂ حدیث کو ختم کراتے ہوئے اُس سال کے فارغ ہونے والے طلبہ کو خطاب کرکے فرمایا کرتے تھے ،

"لو بھائی! تعلّم اور پڑھنے کا مرحلہ تو آپ کا ختم ہوتا ہے' اب زندگی کی دوسری منزل میں آپ لوگ داخل ہوں گے یہ بھی دیکھا جائیگا کہ کن کن ٹیلوں پر چڑھ چڑھ کے تم میں کون بازوؤں کو پھڑ پھڑا کر مرغوں کی طرح بانگ دیتا ہے' میں آج ڈربے کو کھول دیتا ہوں[1] "

---

[1] تقریباً تیس پینتیس سال کی بات ہے۔ روایت باللفظ کا دعویٰ درست نہ ہوگا اسی لئے بطور خلاصہ کے خاتمہ درس کی یہ تقریر درج کردی گئی ہے، حضرت شاہ صاحب یوں تو حد سے زیادہ خاموش آدمی تھے، لیکن خاموشی کے ساتھ خوش طبعی وظرافت سے بھی کافی حصہ ان کو ملا تھا، زیر لب تبسم کے ساتھ اپنی اس تقریر کو ختم فرماتے اسی کے ساتھ یاد آتا ہے کہ مولویوں کو مرغوں سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے کہ تم نے دیکھا ہوگا کسی جگہ سے مرغ کے کان میں دوسرے مرغ کے بانگ کی آواز آتی ہے تو فوراً اپنی گردن کھڑی کرلیتا ہے (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

حقیقت تو یہ ہے کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد کمالات کی نمائش گاہوں کے ان ٹیلوں، یا دید بانوں کی تلاش و جستجو میں بے چارے مولویوں کی سرگردانیوں اور سراسیمگیوں کے یہ ابتدائی ایام بڑے دردناک، زہرہ گداز ہوتے ہیں، قرآت و خطابت درآست تقریر و تحریر از یں قبیل مولویانہ کمالات کی حقیقی نمائش گاہیں ہیں، ان میں سے کسی ایک بلند ٹیلے، دید بان تک پہونچنے میں غریبوں کو جن ہفتخوانوں سے گذرنا پڑتا ہے، چڑھنے اور اترنے کا یہ تماشہ قابل دید ہوتا ہے، ہانپتے کانپتے چڑھ جانے میں جنھیں کامیابی بھی ہوتی ہے، ان بے چاروں کو بھی مدت تک اسی انتظار میں گذارنا پڑتا ہے کہ انسانوں کا کوئی گروہ کیا ان کے اردگرد اکھٹا ہوتا ہے، ان دنوں میں عوام کی بے رخیوں اور اپنی کس مپرسیوں کے احساس سے جب یہ جھنجھلاتے اور زمانہ کی سفلہ پروریوں کے چرچوں سے آسمانوں کو سر پر اٹھائے پھرتے ہیں تو یہ تماشا بڑا دلچسپ اور قابل دید ہوتا ہے رکھنے کی حد تک تو یہ بہت کچھ کہتے ہیں، لیکن "علی نفسہ بصیرۃ" کی قرآنی روشنی میں سوچنے والے اگر سوچیں گے، تو عام حالات میں ان پر یہی ہویدا ہوگا کہ سب کی خدائی اگر ممکن نہ ہو، تو چند ہی کے خدا بننے کا موقع مل جائے، محمود کل نہ بن سکتے ہوں تو بعض ہی کی محمودیت میسر آجائے، ان ساری سرگردانیوں کی تہ میں نفس کے اس شعوری اور زیادہ تر غیر شعوری مطالبہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اور جو کوا بن کر پیدا ہوا ہے، ہنس بننے کی اس کی کوشش اس کے سامنے ان ہی درماندگیوں اور قلبی رسوائیوں کو لائے گی، پھر جو بندہ بنا کر پیدا

(بقیہ صفحہ ۴۴۴) اور پہلے کچھ دھیمی دھیمی آوازوں میں برہمی کو ظاہر کرتے ہوئے پھر خود بھی اسی مرغ کی طرح چیخنے لگتا ہے، کہتے کہ اب پرانے مرغوں کی جگہ نئے مرغوں کو روانہ کیا جاتا ہے، یہی دیکھنا ہے کہ کون کتنے بلند ٹیلے پر چڑھ کر بازو پھر پھڑا کر اپنی آواز سے دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوتا ہے، حضرت شاہ صاحب کی بلیغ تشبیہ کے ساتھ یہ تبلیغ کافی اثر انداز ہوتی تھی، اور جیسے مولویوں کی ضیافت مرغوں والی اس تشبیہ سے فرمائی جاتی تھی اسی طرح عام اہل دنیا کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے، جانتے ہو یہ دنیا کیا ہے، خود جواب دیتے کہ میں نے اس کا نام "گدھا خانہ" رکھ چھوڑا ہے، چند گدھے جب ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو ایک ان میں دوسرے پر دولتیاں جھاڑتا ہے، اور دوسرا اس پر دانتوں کو نکال کر دوڑتا ہے، یہی حال باہم دنیا والوں کا نظر آتا ہے، اپنی اس تشبیہ کی تفصیلات کو بھی دیر تک بیان کرتے۔ ۱۲

کیا گیا ہے اگر خدا بننے کا جنون اس پر سوار ہو جائے، اور اپنے اس غیر طبعی اور قطعاً غیر فطری خواہش کے ہاتھوں ان الجھنوں میں مبتلا ہونا پڑے، تو غیر طبعی تقاضوں کی تکمیل کی ہر کوشش کوشش کرنے والے کے سامنے ہمیشہ اسی انجام کو لاتی رہی ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر وہبی خداداد ودیعتوں کے ساتھ پیدا ہی ہوئے تھے، ایک جامع الکمالات استاذ کی مشفقانہ تعلیم کی اکتسابی کمالات کا وارث ان کو بنا دیا تھا، ملک میں کمالاتی نمائش گاہوں کے ٹیلوں کی کمی نہ تھی، جس ٹیلے پر بھی چڑھنا چاہتے، بآسانی چڑھ سکتے تھے لیکن ان کی بڑائی کا راز ہی یہ تھا کہ ان چھوٹے، اور چھچھورے کاموں کی طرف ان کی توجہ ہی نہیں ہوئی، واقعات وشواہد کا کافی حصہ آپ کے سامنے گذر چکا، ان کی روشنی میں جو کچھ وہ مجھے نظر آتے ہیں دوسروں کو بھی اسی روشنی میں کیا وہ اور کچھ دکھائی دے سکتے ہیں؟ سب ہانپ رہے تھے، کانپ رہے تھے، اس لئے ہانپ اور کانپ رہے تھے کہ قدرت نے ان کو بندہ بنا کر پیدا کیا تھا، لیکن وہ بندہ بنے رہنے پر راضی نہ تھے، پر جو بندہ ہی بنے رہنے پر راضی تھا، اس کے سامنے نہ نمائش گاہیں تھیں، نہ ان نمائش گاہوں کے ٹیلے اور دیدبان، سامنے کوئی ٹیلہ یا دیدبان آ بھی جاتا، تو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا، کہ یہ کیا ہے، اور کام لینے والے ان سے کیا کام لیتے ہیں؟

طبعی مقام سے جب ہڈی سرک جاتی ہے، تو وہی وبال جان بن جاتی ہے، لیکن قدرت نے جس ہڈی کو جس مقام پر جمایا ہے، جب تک وہ اسی جگہ پر جمی ہوئی ہے، کیا اس سے بھی کسی میں کبھی کوئی خلش پیدا ہوئی ہے؟

مدرسوں میں جو علوم پڑھائے جاتے ہیں، اور ان کے پڑھنے سے پڑھنے والوں میں جو امتیازات پیدا ہوتے ہیں، ان کا حال تو آپ سن چکے، باقی وہ لاہوتی سرمایہ جس سے آپ کا باطن مالا مال تھا، اپنوں کی کیا براہ راست ان کے پیر و مرشد ہی کی یہ گواہی گذر چکی کہ

"ایسے لوگ کبھی پہلے زمانہ میں ہوا کرتے تھے اب مدتوں سے نہیں ہوتے"۔

(قدیم سوانح عمری)

"کمسنی میں ولایت" کی شہادت، وقت کے قطب الہند حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن رحمۃ اللہ علیہ جس کے متعلق دے رہے ہوں، کون کہہ سکتا ہے کہ باطن کی ان راہوں سے کیا کیا سرفرازیاں ہوئی تھیں مگر سننے، اس راہ کے کمالات کے ظہور کا جو عام ذریعہ ہے، یعنی حلقہ بیعت وارادت میں داخل کرکے لوگوں کو مرید کرنا، مصنف امام اسی کے متعلق فرماتے ہیں کہ

... مولنا (محمد قاسم صاحب) باوجود اجازت حضرت صاحب مخدوم ومکرم وقبلہ ایک زمانہ تک کسی کو بیعت نہیں کرتے تھے" (ص۲۱ قدیم سوانح عمری)

اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرید کرنے یا کسی کو اپنی بیعت میں لینے سے انکار پر اصرار کا زمانہ کافی دراز تھا، لوگ مرید ہونا چاہتے تھے اور خشک جواب پاکر مایوس ہوجاتے تھے، انتہا یہ ہے کہ اپنی خادم خاص اور دنیاوی معاملات میں حضرت کے گھر کے گویا جوداروغہ اور مختار کل تھے، یعنی دیوان حاجی محمد یسین مرحوم ان کے متعلق حضرت کے نور چشم مولنا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم یہ لطیفہ بیان کیا کرتی تھی کہ دیوان جی نے جب بیعت ہوجانے کی آرزو ظاہر کی، تو غریب کو حکم دیا گیا کہ جاؤ مولنا گنگوہی سے مرید ہوجاؤ، دیوان حاجی یسین اسی وقت اٹھے اور گنگوہ پہونچ کر مولنا گنگوہی سے بیعت کرلی، مرید ہوکر سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کرنے لگے کہ اب تو میری بیعت لے لیجئے، اور اپنا مرید مجھے بنا لیجئے۔ حضرت نے فرمایا کہ تم تو مولوی رشید احمد صاحب سے مرید ہوچکے، پھر اب میں کیا مرید کروں، حاجی یسین نے عرض کیا کہ مولنا رشید احمد کی خدمت میں میری حاضری اور ان سے میری بیعت صرف آپ کے حکم کی تعمیل تھی ورنہ بیعت تو آپ ہی کے ہاتھ پر کروں گا، یہ تدبیر بھی ایسی تھی اور استقامت کا ایسا غیر معمولی رنگ تھا کہ حضرت والا نے مجبور ہوکر حاجی یسین کی بیعت لے لی (ص۱۸۶ ارواح)

اسی طرح ایک دوسرا لطیفہ اسی سلسلہ میں وہ ہے جس کا ذکر حضرت حکیم الامت تھانوی کیا کرتی تھے یہ دوسرا لطیفہ پہلے سے زیادہ دلچسپ ہے، قصص میں ہے حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ

"مولنا نانوتوی کی خدمت میں ایک شخص شکر لے کر حاضر ہوئے، حاضرین میں وہ شکر تقسیم ہوگئی"

شکر پیش کرنے والے صاحب نے جب دیکھ لیا کہ اس کی لائی ہوئی شکر لوگوں میں تقسیم ہو چکی اور ہر ایک نے اپنا اپنا حصہ ختم بھی کر دیا۔ تب سیدنا الامام الکبیر سے وہی شکر والے صاحب عرض کرنے لگے کہ

"مجھے بیعت فرما لیا جائے"

حسب عادت انکار فرمایا، شاید عرض و انکار کا ردو بدل کچھ دیر ہوتا رہا، آخر میں شکر لانے والے صاحب نے کہا کہ

"خیر آپ میری بیعت نہیں لیتے، تو مت لیجئے، لیکن میری شکر واپس کر دیجئے۔"

حضرت نے حکم دیا کہ جتنی شکر یہ لائے تھے، اسی قدر واپس کر دی جائے۔ لطیفہ سننے کا یہی ہے کہ شکر لانے والے نے اصرار شروع کیا کہ

"میں تو اپنی لائی ہوئی شکر ہی لوں گا۔"

ظاہر ہے کہ ان کی لائی ہوئی شکر کو تو لوگ استعمال کر چکے تھے، اب حضرت حیران ہوئے اور فرمانے لگے کہ

"بھائی وہ تو صرف میں آگئی۔"

شکر والے صاحب نے کہا کہ کچھ بھی ہو یا تو میری لائی ہوئی شکر واپس کی جائے، ورنہ میری بیعت قبول فرمائی جائے۔

صورت حال ہی ایسی تھی کہ دوسری شق کے سوا یعنی بیعت قبول کر لینے کے سوا چارہ ہی کیا باقی تھا اور یوں شکر والے صاحب کو اپنی آرزو کے پوری کرنے کا مغتنم موقع مل گیا۔

شاید اس قسم کے غیر معمولی واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمانہ تک بیعت نہ لینے پر اصرار کرنے کے بعد آخر میں حضرت والا کو اپنے طریقہ کار میں کچھ ترمیم کرنے پر مجبور ہونا پڑا، خیال کیا جا سکتا ہے کہ جب بیعت کے تمنائیوں کا یہ حال ہو کہ وہ مذکورہ بالا شکر والے لطیفہ تک سے کام لینے لگیں تو آخر کہاں تک اپنے نیایش گروں کی نیاز مندیوں سے لاپروائی اختیار کی جاتی، مصنف امام

نے اسی خبر کے ساتھ کہ زمانہ تک بیعت نہ لیتے تھے ۔ آخر میں جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"پھر آخر بہت تاکید کے بعد چند لوگ بیعت ہوئے" صہ

واللہ اعلم بالصواب، یہ تاکید کن لوگوں کی طرف سے ہوئی، بظاہر خیال گذرتا ہے کہ غالبًا بیعت سے انکار کی خبریں حضرت حاجی صاحب قبلہ تک مسلسل پہونچتی رہیں، اور یہ تاکید ان ہی کی طرف سے ہوئی ہو، یا ممکن ہے آپ کے رفیق الدنیا والآخرۃ حضرت گنگوہی کی طرف سے قدغن ہوئی ہو۔

ارواح ثلٰثہ میں ایک صاحب مولوی نظر محمد خاں کا یہ لطیفہ جو نقل کیا گیا ہے کہ خاں صاحب نے

"ایک پرچہ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو بغرض بیعت لکھ کر دیا"

حضرت نے اس پرچہ کو "جیب" میں رکھ لیا، یہ واقعہ نانوتہ کا ہے، اسی کے کچھ دن بعد حضرت گنگوہی نانوتہ تشریف لائے، مولوی نظر محمد خاں جن کا وطن نانوتہ کے متصل تھا، حضرت گنگوہی کی تشریف آوری کی خبر سن کر نانوتہ پہنچے، اور پھر ایک پرچہ میں لکھ کر حضرت گنگوہی سے بیعت کی درخواست پیش کی، پرچہ میں یہ بھی لکھدیا تھا کہ حضرت نانوتوی کی خدمت میں بھی بیعت کرنے کے لئے خاکسار نے اسی طرح لکھ کر معروضہ پیش کیا، لیکن کچھ جواب نہ دیا۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں مولوی نظر محمد خاں نے اس وقت پرچہ پیش کیا تھا، جب نماز ظہر کیلئے وضو فرمارہے تھے، خود مولوی نظر محمد خاں پرچہ دے کر کھڑے رہے، اور سامنے حضرت نانوتوی بھی وضو ہی کرنے کیلئے تشریف فرما تھے مولنا گنگوہی نے پرچہ کو پڑھ کر مسکراتے ہوئے مولوی نظر محمد خان سے کہا کہ

"ایسے گونگے پیر کو خط ہی کیوں دیا تھا جنھوں نے جواب نہ دیا"

اس فقرے پر مولنا نانوتوی بے اختیار ہنس پڑے اور خاں صاحب کو خطاب کر کے فرمایا کہ

"لو اب بولتے پیر کے پاس (خط تمہارا) آگیا، اب جواب مل جائیگا" صہ ۲۰۶

بہر حال تاکید کسی کی طرف سے ہوئی ہو، لیکن بیعت سے انکار پر اصرار باقی نہ رہا۔ لیکن پھر بھی بیعت عام کا دروازہ جیسا کہ دستور ہے کھول نہیں دیا گیا تھا، اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ چند ہی گنے چنے خوش

قسمتوں کو اس سعادت سے بہرہ اندوزی کا موقعہ ملا

اور حضرت کے قرۃ العین مولٰنا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم کی طرف منسوب کر کے مولانا طیب الحمید

کے حوالہ سے یہ روایت جو درج کی گئی ہے

"حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ عموماً بیعت اپنے مرشد کی طرف سے کرتے تھے" ص۱۸۵

اس سے تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ معدودے چند افراد جن کی بیعت منظور فرمائی گئی تھی، ان میں بھی زیادہ تعداد ان ہی کی تھی جن کو گویا حضرت حاجی صاحب قبلہ ہی کی بیعت میں وکالۃً داخل فرمایا جاتا تھا معنے یہی ہوئے کہ مرید تو یہ لوگ حضرت حاجی صاحب قبلہ کے قرار دیئے جاتے تھے، اور حضرت والا نے اپنی حقیقت سفیر محض کی بنا رکھی تھی، البتہ محمد یٰسین صاحب مرحوم جیسے آدمی جن کا قصہ گذر چکا کہ سیدنا الامام الکبیر کے حکم کی تعمیل میں وہ گنگوہ پہنچکر مولٰنا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہو جانے کے بعد بھی مصر ہوئے کہ اب مجھے اپنا مرید بنا لیجئے، شاید اسی قسم کے غیر معمولی اصرار کرنیوالے جو بہر حال حضرت والا ہی کے مرید بننا چاہتے تھے اور سفیر محض والی بیعت پر راضی نہ ہوئے، ان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ مجبور ہو گئے۔ حافظ محمد احمد صاحب مرحوم نے ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ

"چند ہی لوگ ایسے تھے جن کو براہ راست سیدنا الامام الکبیر نے اپنے سے بیعت فرمایا" ص۱۸۵

لیکن ان چند غریبوں کا انجام بھی کیا ہوا، مصنف امام رحمۃ اللہ علیہ کی آنکھوں دیکھی بات ہے، انھوں نے بھی اس کی خبر دیتے ہوئے کہ چند آدمیوں کو حضرت والا کے براہ راست مرید بننے کا شرف حاصل ہوا، اور مرید ہی نہیں بلکہ وہی لکھتے ہیں کہ

"بہت سے ان میں (براہ راست مرید ہونے والوں میں) محنتی صاحب حال ہیں" ص۴۵

راہ و رسم منزل کے ایک باخبر باطنی البصیرت رکھنے والے بزرگ کی یہ شہادت ہے، اور گو انھوں نے تصریح نہیں کی لیکن کلام کا فحویٰ بتا رہا ہے کہ اپنی محنت اور محنت سے پیدا ہونے والے حال کی بنیاد پر کم از کم مصنف امام کے نزدیک یہ لوگ مستحق ہو چکے تھے کہ اجازت و خلافت کا افتخار بھی ان کو بخشا جائے،

لیکن ان بے چاروں کو کیا معلوم تھا کہ مریدی جس شخص کی انھوں نے اختیار کی تھی، جب خود ہی یہ فیصلہ کئے ہوئے تھا کہ مرید بنانے کا جائز استحقاق مجھے حاصل نہیں ہے تو مریدوں کو کیسے اجازت دے سکتا تھا کہ دوسروں کو اپنا مرید بنائیں۔ مصنف امام نے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) نے کسی کو اجازت عطا نہیں فرمائی[1]" ص۳۳

دراصل یہ ایک تاریخی شہادت ہے، شاید ان کے اسی تحریری وثیقہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی نے سیدنا الامام الکبیر کے بعد آپ کی خلافت یا جانشینی کا دعویٰ نہیں کیا، اور کرنے والے بھلا اس کا دعوے بھی کرتے، تو کس لئے کرتے؟

حضرت حکیم الامت تھانوی اپنے استاذ مولٰنا محمد یعقوب (یعنی ہمارے مصنف امام) کے حوالہ سے یہ فقرہ نقل فرمایا کرتے تھے کہ مولانا محمد قاسم جس حجرے میں (چھتّہ کی مسجد) تشریف رکھتے تھے، اسی

"حجرے کے آگے ایک چٹائی بچھی رہتی تھی، جس پر کبھی جھاڑو نہیں ہوئی

سیروں گرد پڑی ہوئی تھی[2]" (قصص) الہادی ماہ جمادی الثانی

---

[1] ممکن ہے کہ اجازت بھی خود اپنی طرف سے نہ دیتے ہوں جیساکہ بیعت میں بھی اپنے کو سفیر محض کے طور پر رکھتے تھے اور اس بنا پر حضرت مصنف امام نے عمومی طور پر اجازت و خلافت عطا کرنے کی نفی فرمادی ہو، ورنہ بعض حضرات کو اجازت و خلافت دینا ثابت ہے حضرت مولانا حکیم صدیق احمد صاحب مرادآبادی محلہ بغیا حضرت کے مشہور مجازین میں سے تھے جو مسلم طور پر اہل کمال سمجھے جاتے تھے نیز ابھی حال میں سفر حیدرآباد کے موقعہ پر مولانا حکیم مقصود علیخاں عمنا ابن مولانا حکیم منصور علیخاں صاحب مرادآبادی نے ایک بزرگ کا مجھ سے یہ کہکر تعارف کرایا کہ ان کے والد ماجد حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے مجازین میں تھے۔ "محمد طیب"

[2] اس موقعہ پر حکیم الامت یہ اضافہ بھی فرماتے کہ وہاں عقلاً کیوں جھاڑو ہوتی، جن کا مذاق یہ تھا کہ مولٰنا محمد یعقوب صاحب فرماتے تھے کہ جو مسجد میں دبا دبا کر جھاڑو دیتے ہیں، تو ہمیں بھلا نہیں معلوم ہوتا اتنا تو کرے کہ خدا کے سامنے خاکساری کی شکل تو بنالے وہ۔ بندہ ہی کیا ہوا جس میں ماتھے اور ناک میں مٹی نہ بھرے" ص شاید بخاری کی وہ مشہور حدیث لوگوں کو اس موقعہ پر قدرۃً یاد آجائے گی جس میں صحابی کا بیان نقل کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے فرش زمین پر سجدہ کرتے ہوئے دیکھا جس کی مٹی ناک اور پیشانی مبارک پر لگی ہوئی تھی۔ سیدنا عمر الفاروق نے بھی وفات سے کچھ دیر پہلے حکم دیا کہ پلنگ سے زمین پر ان کو ڈال دیا جائے پوچھنے والے نے وجہ پوچھی فرمایا کہ شاید میرے خاک آلود چہرے اور بال ہی پر ارحم الراحمین کو رحم آجائے۔ دیکھئے طبقات ابن سعد وغیرہ میں تفصیلات ۱۲

یہ حال تو باہر کا تھا، اندر کے سازو سامان کی روئداد بھی حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی سنئے

"ہمارے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے پاس کپڑوں کی گٹھڑی نہ تھی

نہ ٹرنک، بکس تھا"

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے بھی ارواح ثلثہ میں یہ روایت درج کی گئی ہے، اپنے حضرت الاستاذ کا ذکر کرتے ہوئے فرمانے لگے۔

"اس منقطع عن الخلق، اور زاہد فی الدنیا ذات (حضرت قاسم العلوم) کے حجرے میں کچھ بھی تو نظر نہ آتا تھا۔ چٹائی بھی اگر ایک تھی تو وہ ٹوٹی ہوئی، گویا عمر بھر کے لئے اسی چٹائی کو منتخب فرما لیا تھا، نہ کوئی صندوق تھا، نہ کبھی کپڑوں کی گٹھری بندھی تھی"۔

یہ حضرت کے سازو سامان کا رنگ تھا اور بے سنگ و میل والے سفر کا حال بھی شیخ الہند ہی کی زبانی سنئے فرماتے ہیں کہ سفر میں بھی

"کوئی اہتمام نہ تھا، اگر کبھی ایک آدھ کپڑا ہوا تو کسی کے پاس رکھوا دیا ورنہ اسی ایک جوڑے میں سفر پورا ہوتا، جو حضر میں پہنے ہوتے، البتہ ایک نیلی لنگی ساتھ رہتی تھی، جب کپڑے زیادہ میلے ہو گئے تو لنگی باندھ کر کپڑے اتار لئے اور خود ہی دھو لئے"۔

حضرت شیخ الہند اسی کے بعد یہ فرماتے ہوئے کہ "اور وہ لباس کیا تھا؟" یعنی سفر و حضر میں جو جسم مبارک پر رہتا، پھر خود ہی اس کی فہرست بتاتے کہ

"بغیر کرتے کے بندوں دار، اچکن (یا انگرکھا) اور پاجامہ، سردی ہوئی تو مختصر سا عمامہ ورنہ عموماً کنٹوپ تمام سردی میں سر پر رہتا تھا"[۱] صہ ۱۴۶

[۱] امیر شاہ خاں مرحوم نے براہ راست خاکسار کو یہ قصہ سنایا کہ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ نہ اچکن ہے اور نہ انگرکھا نہ مرزئی۔ اپنا حال کسی سے بیان نہ کرتے کھلے بدن باہر آجاتے اور رینٹ کی لپسی سرخی پیٹھ پر لگا لیتے، دیکھنے والے سمجھتے کہ شاید پھوڑے پر مرہم لگا ہوا ہے اور اسی لئے بدن پر کپڑے نہیں ہیں۔ حالانکہ درحقیقت حضرت کے پاس کپڑے اس وقت ہوتے تھے ۱۲

اور تاب نظر ہو، تو اس لباس پر بھی ہلکی سی نگاہ ڈالتے چلئے جسے اتار کر شاید پہنانے والوں نے دنیا کا آخری جوڑا (کفن) پہنایا تھا، امیر شاہ خاں راوی ہیں کہ آخری علالت کے دوران ہیں جس کے بعد پھر صحت واپس نہ ہوئی۔

"سر پر میلا اور پھٹا ہوا عمامہ تھا، جس میں لہرے پڑے ہوئے تھے، اور چونکہ سردی کا زمانہ تھا، اس لئے ایک دھوتر کی نیلی رنگی ہوئی، مرزئی پہنے ہوئے تھے، جس میں بند لگے ہوئے تھے اور نیچے نہ کرتا تھا اور نہ انگرکھا تھا[1]، اور ایک رضائی اوڑھے ہوئے تھے، جو نیلی رنگی ہوئی اور جس میں موٹی گوٹ لگی ہوئی تھی، جو پھٹی ہوئی تھی، اور کہنہ تھی، اور کہیں سے بالکل اڑی ہوئی تھی"۔ ص۱۶۲

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت آپ یہ سن چکے کہ میلے ہو جانے کے بعد لنگی باندھ کر حضرت والا اپنے میلے کپڑوں کو خود دھو لیا کرتے تھے، دھونے کے ساتھ اسی نیلی لنگی کے سکھانے کا جو تماشا مولنا احمد حسن امروہوی نے دیکھا تھا، آپ بھی دیکھ لیجئے، فرماتے تھے کہ شاہجہانپور نے "خدا شناسی والے میلہ" تک جانے کے لئے راستہ میں ایک ندی پڑتی تھی، مولنا پیدل جا رہے تھے، ندی میں پانی تھا۔

"پاجامہ پہنے ہوئے دریا میں اتر پڑے جس سے پاجامہ بھیگ گیا"

پار اتر کر وہی فرماتے ہیں،

"لنگی باندھی، اور پاجامہ اتار کر نچوڑ کر اور پیچھے لاٹھی پر ڈال کر جیسے گاؤں کے رہنے والے ڈال لیا کرتے ہیں، تشریف لے چلے" ص۲۰۵

خلاصہ یہ ہے کہ ظاہری علوم و فنون کے آثار و لوازم کے ساتھ جو برتاؤ آپ کا تھا، بے گانگی اور

---

[1] مولنا منصور علی خاں حیدرآبادی نے لکھا ہے کہ پاجامہ ڈھیلا (یعنی چوڑے پائنچوں کا) دو کلیہ یعنی دو پلتے والی ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ ۱۲

بے تعلقی کا یہی سلوک مسلسل ان نشانیوں اور علامتوں کے ساتھ زندگی بھر کرتے رہے، جن سے باطنی کمالات کے سرمایہ داروں کو پہچانا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فرائض وواجبات میں تو خیر مجبوری تھی لیکن حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جو یہ فرمایا کرتے تھے کہ

"مولانا محمد قاسم کے پاس کوئی بیٹھا ہوا ہوتا، تو اشراق وچاشت بھی قضا کر دیتے تھے[۱]"

(قصص الہادی ماہ ذی قعدہ ۵۰ھ)

اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عام صوفیانہ مشاغل ورسوم کے ساتھ آپ کے طرز عمل کی نوعیت اس باب میں کیا ہو گی۔ کیونکہ کچھ بھی ہو، مذکورہ بالا نمازوں کی مسنونیت صحیح حدیثوں سے ثابت ہے۔ لیکن جلوت کی صحبتوں میں جس کا مذاق یہ تھا کہ وہ ان کو بھی چھوڑ دیتا تھا یا چھوڑ سکتا تھا، ثبوت

---

[۱] نوافل کی یہ قضاء عبادات سے بے اعتنائی کے سبب سے نہ تھی بلکہ ان فانی فی اللہ حضرات کا دوستوں سے ملنا اور بات چیت کرنا عبادت اور بنیت عبادت ہوتا ہے وہ نوافل سے خدمت کی طرف جھک کر ایک عبادت سے دوسری عبادت کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں خصوصاً نفلی عبادت جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی احیانا ترک کے ساتھ ادا فرمایا ہے اور اسی لئے وہ نفل وتطوع کہلائی پس یہ ترک بھی ایک حد تک اتباع سنت کی شان آجانے سے عبادۃ ہی تھا۔ اس لئے یہ عادۃ سے عبادت کی طرف انتقال بھی عین عبادت ہی تھا، اور پھر یہاں قضاء کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ بھی ترک محض نہ تھا ممکن ہے کہ دوسرے اوقات میں ان معمولات کو پورا فرما لیتے ہوں جیسا کہ تطوعات میں بھی اہل اللہ کی شان مداومت ہی کی ہوتی ہے۔ اسی مقام پر پوری دنیا ان کے حق میں عین دین ہو جاتی ہے۔ آخر ابراہیم علیہ السلام کے حق میں صلوۃ ونسک کے ساتھ محیای ومماتی للہ ہی کو تو اسلام کہا جاتا ہے، میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جس سال میں نے حج کیا، مکہ مکرمہ میں ہیضہ بکثرت پھیلا اور میرے عام رفقاء ہیضہ کے شکار ہو گئے۔ بعضے چل بسے بعضے زندہ رہ گئے میں صبح سے شام تک ان کی تیمارداری میں مصروف رہتا، میں نے اپنے پیر ومرشد حضرت حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ سے عرض کیا کہ حضرت اس بیماری کے قصہ میں ہمارا تو نہ حج رہا نہ طواف وسعی۔ حضرت نے دانتوں میں انگلی دبا کر فرمایا کہ بیٹا کیا خدمت خلق حج سے کچھ کم ہے ہرگز اس کا وسوسہ مت لانا، یہ حج سے بڑھ کر حج ہو رہا ہے۔ مجھے خود حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مکہ مکرمہ میں میں نے حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ سے عرض کیا کہ حضرت ہم لوگ آپ کا وقت بہت سا لے لیتے ہیں اور حضرت کے معمولات میں حارج ہو جاتے ہیں۔ فرمایا کہ بھائی دوستوں سے ملنا اور باتیں کرنا بھی تو عبادت ہی ہے۔ اس لئے عرفی عبادت سے اس غیر عرفی عبادت کی طرف آنا اور عادت کو بھی عبادت بنا لینا ان اہل اللہ کا عام معمول رہا ہے۔ اسی کے تحت حضرت والا کے اس حال کو سمجھ لینا چاہئے جو ان کے مقام کا تقاضا تھا۔ "محمد طیب غفرلہ"

ہیں جن امور کا درجہ ان سے فروتر ہے، ان کے ترک میں اس کی جراتوں کا جو حال ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

سیدنا الامام الکبیر کے تلمیذ سعید مولٰنا منصور علی خاں صاحب نے اپنی کتاب مذہب منصور میں آپ کے عام عادات اور طریقہ کار کا ذکر کرتے ہوئے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"سب کے آگے نہیں چلتے تھے۔ برابر ملے جلے رہتے تھے"

لکھا ہے کہ اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ

"باہر کا آنے والا اوّل ان سے مصافحہ نہیں کرتا تھا"

اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ پہچاننے والوں کے لئے شناخت کی کوئی علامت اپنی پاس حضرت والا چاہتے تھے کہ باقی نہ رہے، اسی سلسلہ میں مولٰنا منصور علی خاں مرحوم حیدرآبادی نے جو یہ لکھا ہے کہ

"مولٰنا صاحب کو چھتری لگانے سے نہایت کراہت تھی" ص ۱۹۵

بلکہ مصنف امام نے اسی کی ساتھ جو یہ خبر دی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ

"ہمیشہ جب تک قوت تھی کبھی سواری کی طرف رخ نہ تھا" ص ۱۷

اور طویل مسافتوں کو پیادہ پا طے کرنے کے عادی تھے، ان التزامات میں علاوہ دوسری مصلحتوں کے شاید ایک حکمت یہ بھی ہو کہ عوام کے مقابلہ میں خواص کو نمایاں کرنے کے لئے لوگ ان ہی ذرائع کو اختیار کرنے کے عموماً عادی ہیں، مجمع میں بزرگوں کو چھتری لگا کر لے چلنا یا خود پیدل چلنا اور بزرگوں کو اصرار کر کے سوار کرنا وغیرہ۔

واقعہ یہ ہے کہ جس شخص کے متعلق سنانے والے جب یہاں تک سناتے ہوں، مصنف امام نے بھی لکھا ہے کہ

"جن دنوں دہلی میں مولٰنا احمد علی صاحب کے مطبع میں تصحیح کا کام حضرت والا انجام دیتے تھے، اس زمانہ میں یہ لطیفہ رہا کہ لوگ مولوی کہہ کر پکارتے اور آپ بولتے نہیں،

کوئی نام لے کر پکارتا تو خوش ہوتے" ص۳۱

مولوی کے اضافہ کے بغیر نام نہ لینے پر مولویوں کو بگڑتے ہوئے تو فقیر نے بھی دیکھا ہے لیکن مولوی نہ کہنے پر خوش ہونا اور مولوی کہنے والوں سے رنجیدہ و کشیدہ ہونے کی شاید یہ اپنی آپ مثال ہو۔

اور اس سے بھی دل چسپ قصہ جامع مسجد دہلی کے سابق امام کے چچا مولوی امیر الدین صاحب کا امیر شاہ خاں بیان کیا کرتے تھے، کہتے تھے کہ مولوی امیر الدین کی مولنا سے بہت بے تکلفی تھی یہاں تک کہ،

"مولوی امیر الدین صاحب اُبے تبے کے ساتھ گفتگو کرتے تھے"

کسی نے ایک دفعہ مولوی امیر الدین صاحب کو ان کے اس طرز خطاب پر توجہ دلائی تو بیچارے نے اپنی معذوری پیش کرتے ہوئے کہا کہ

میں کیا کروں، اگر میں اس انداز سے گفتگو نہیں کرتا اور ادب سے

کام لیتا ہوں، تو بولنا چھوڑ دیتا ہے" ص۱۶۶

لیکن جوں جوں کتمان کمالات میں آپ کی طرف سے زور دیا جا رہا تھا، اسی نسبت سے قانون قدرت جو کچھ چھپایا جا رہا تھا اسے کھولتا چلا جا رہا تھا۔ بالآخر حضر میں کتمان کا امکان جب باقی نہ رہا تو حضرت حکیم الامت کی روایت ہے کہ

"سفر میں اپنا نام کسی پر ظاہر نہ کرتے تھے اور ساتھیوں کو بھی ممانعت تھی کہ کسی پر نام ظاہر نہ کریں"

اسم گرامی کی شہرت سرزمین ہند میں از قاف تا قاف ہو چکی تھی، نام سننے کے ساتھ میلہ لگ جاتا تھا، یہ بھی حکیم الامت ہی کا بیان ہے کہ

"اگر کوئی آپ سے پوچھتا کہ جناب کا نام کیا ہے تو فرماتے کہ خورشید حسین [۱]"

---

[۱] خورشید حسین تاریخی نام ہے جس کی رُو سے حضرت کی عمر ۴۹ سال ہوتی ہے یعنی ۱۲۴۸ھ سن پیدائش نکلتا ہے اور ۱۲۹۷ھ سن وفات ۱۲ محمد طیب غفرلہ

اور وطن کے متعلق بھی توریہ سے کام لیتے۔ جس کا ذکر پہلے بھی کہیں آچکا ہے، یعنی بجائے نانوتہ کے الہ آباد نام سے اپنے مرزوبوم کو روشناس کراتے اور (بعد کو جاننے والوں سے فرمادیتے کہ ہر بستی اللہ ہی کی تو آباد کی ہوتی ہے، پھر نانوتہ الہ آباد نہیں تو اور کیا ہے، انتہا یہ ہے کہ جب شاہجہانپور کے میلہ میں اچانک شریک ہونے کا خیال پیدا ہوا، اور شرکت کے لئے تنہا روانہ ہوگئے اور آپ کے تلامذہ میں سے شیخ الہند اور مولانا احمد حسن امروہی آپ کی تلاش میں شاہجہانپور پہنچے، جہاں جہاں احتمال قیام کا تھا ڈھونڈھا نہ ملے تھک کر سرائے گئے۔ مولانا احمد حسن جو حضرت کے مذاق شناس تھے، جانتے تھے کہ ٹھہرنے والوں کے رجسٹر میں مشہور نام کبھی حضرت نے درج نہ کرایا ہوگا، اسی لئے جب سرائے پہنچے تو سرائے والے سے پوچھا کہ

"یہاں کوئی خورشید حسین بھی آئے ہیں"

وقت پر اُن کا ذہن منتقل ہوا، ورنہ "مولانا محمد قاسم" کے نام سے پوچھتے تو سرائے سے بھی ناکام ہی واپس ہونا پڑتا، فرماتے تھے کہ سرائے والے نے پتہ دیا کہ ہاں! اس نام کے ایک صاحب ٹھہرے ہوئے ہیں، دیکھا تو

"ایک کوٹھری کے اندر مولانا تشریف رکھتے تھے"[1] (ارواح ص۲۰۰)

واقعہ یہ ہے کہ خلوت وجلوت، طفولیت و ایام شباب، الغرض زندگی کی ہر ہر منزل کے ندائی رفیق حضرت مولانا محمد یعقوب ہمارے مصنف امام رحمۃ اللہ علیہ کی کھلی ہوئی واضح شہادت جب ان کی کتاب میں سیدنا الامام الکبیر کے متعلق ان الفاظ میں محفوظ ہے کہ

"تعظیم سے نہایت گھبراتے تھے، بے تکلف ہر کسی سے رہتے تھے" ص۳۱

---

[1] بظاہر اس روایت میں کچھ خلط ہوا ہے۔ کیونکہ رسالہ میلہ خداشناسی میں شاہجہاں پور کے واقعات سفر و مباحثہ میں اس کی تصریح موجود ہے کہ حضرت الامام اپنے ان مایہ ناز شاگردوں حضرت مولانا محمود حسن صاحب و حضرت مولانا احمد حسن امروہی وغیرہ اکٹھے ہی شاہجہانپور پہنچے ہیں۔ یہ روانگی دہلی سے عمل میں آئی اور ۶ رمئی کو شاہجہانپور پہنچ گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ رسالہ اسی زمانہ کی تالیف ہے جو قریب قریب مباحثہ کا زمانہ ہے اور ارواح ثلٰثہ کی روایت متأخر ہے جو چند وسائط سے منقول شدہ ہے۔ اس لئے صحیح روایت میلہ خداشناسی ہی کی سمجھی چاہئے۔ (محمد طیب غفرلہٗ)

ایسی صورت میں سنانے والے اس قسم کے قصّے جو سنایا کرتے تھے، مثلاً غریب اللہ دیا بیچارے کا قصہ ارواح ثلثہ، قصص الاکابر کے سوا سوانح مخطوطہ میں بھی جس کا ذکر کیا گیا ہے، اور اس وقت سوانح مخطوطہ ہی سے ہم اس کو نقل کر رہے ہیں، دیوان حاجی محمد لٰسین جو حضرت کی خانگی زندگی کی خدمات انجام دیتے تھے، ان ہی کی روایت ہے۔

کہتے تھے کہ دیوبند میں ایک غریب آدمی الہ دیا نامی تھا، مومن برادری سے اس کا تعلق تھا، حضرت والا کا عقیدت مند تھا، ایک دن حاضر ہو کر عرض کیا کہ آج رات کا کھانا فقیر ہی کے گھر تناول فرمایا جائے، بخوشی اس غریب کی دعوت منظور کی گئی۔ اتفاق دیکھئے کہ مغرب سے کچھ پہلے بارش بھی ہونے لگی، اور غریب اللہ دیا کے ساتھ خدا جانے کیا صورت پیش آئی، کہ گھر والوں کو اس کی اطلاع بھی نہ دے سکا کہ آج مولانا کی میں نے دعوت کی ہے۔ شاید کسی کام میں مشغول ہوا، اور بھول گیا۔ لیکن جو نواب کلب علی خاں والی رامپور اور نواب صدیق حسن خاں والی بھوپال کی تمنائے ملاقات کو ٹھکرا سکتا تھا۔ غریب اللہ دیا کی دعوت کا خیال اپنے دماغ سے کیسے نکال سکتا تھا، بارش تھی کہ تھمنے کا نام نہیں لیتی تھی، مغرب کے بعد اللہ دیا کا حضرت انتظار فرماتے رہے، کہ آکر ساتھ لے جائے گا، لیکن رات گذرتی جارہی تھی اور نہ اللہ دیا کا پتہ تھا، نہ اس کی طرف سے کسی دوسرے نمائندہ کا جو بلا کر ساتھ لے جاتا۔ یہیں سے سننے کی بات ہے، دیوان حاجی محمد لٰسین کہتے تھے کہ

"حضرت نے بہت انتظار کیا کہ کوئی بلانے آئے، مگر کوئی نہ آیا"

دیوان جی صاحب کہتے تھے کہ حضرت کے انتظار کی شدت اور بارش کی شدت کو دیکھ کر حاضرین میں سے بعضوں نے عرض کیا کہ اللہ دیا کے گھر سے ہم کھانا لا کر حاضر کریں۔ شاید ان بے چاروں کو خیال گذرا کہ حضرت والا کھانے کے انتظار میں بے چین ہیں، لیکن سب پر سکتہ طاری تھا جب دیکھا گیا کہ اس کالی پیلی برسات کی رات میں برستے ہوئے پانی کے نیچے اللہ دیا کے گھر پہنچنے کے ارادہ کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ کوئی کمل ہو، تو لاؤ، بیان کیا گیا ہے کہ جیسے

گاؤں والے کمل جوٹ باندھ لیتے ہیں، آپ نے کمل کا جوٹ باندھا، جوتیاں ہاتھ میں، اوپر سے بھی برس رہا ہے موسلادھار پانی اور نیچے بھی گلی کوچوں میں پانی ہی پانی، پانی کے سوا کچھ نہیں اور سیدنا الامام اسی ہیئت کذائی کے ساتھ غریب اللہ دیا کے گھر تک بہرحال پہنچ ہی کر رہے۔ اللہ دیا کو دعوت کا قصہ ہی یاد نہ تھا، دروازہ بند کئے گھر میں پڑا ہوا تھا کہ کنڈی کے کھٹکھٹانے کی آواز آئی، دروازہ کھولتا ہے، تو اپنی چوکھٹ پر اس کو پاتا ہے جس کی آستانہ بوسی کی آرزو میں بڑے بڑے والیانِ ملک تڑپتے تھے، حاجی محمد یٰسین مرحوم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو اپنے ساتھ چلنے کی بھی اجازت نہ دی، کہہ دیا گیا ہوگا کہ دعوت اس غریب نے صرف میری ہی کی ہے، اس لئے تنہا میں جاؤں گا، بہرحال بقول حاجی محمد یٰسین

"اندھیری رات، اوپر سے بارش، نیچے کیچڑ، کمل کا جوٹ باندھ جوتیاں ہاتھ میں تن تنہا اس کے (اللہ دیا کے) مکان پر تشریف لے گئے"

دعوت تم نے کی تھی، انتظار کرتے کرتے آخر میں خود آگیا، کچھ اسی قسم کے الفاظ نے غریب اللہ دیا کے ہوش اڑادیئے، اب خیال آیا کہ میں نے یہ کیا کیا، حاجی صاحب کے الفاظ ہیں کہ

"اپنے سہو پر کمال نادم ہوا، اور حاضر ہو کر گڑگڑا کر عرض کرنے لگا کہ غلام سے قصور ہوا"

وہ گڑگڑا رہا تھا اور جس سے معذرت کی جارہی تھی، اس کی زبان پر بقول حاجی صاحب مرحوم یہ الفاظ جاری تھے کہ

"کچھ مضائقہ نہیں، غریب لوگوں کو محنت و مزدوری سے کب چھٹکارا ہوتا ہے اور میں تو تمہارے گھر کا آدمی ہوں جو کچھ حاضر ہے وہی لے آؤ"

غریب اللہ دیا کو دعوت اگر یاد بھی رہتی تو زیادہ سے زیادہ گیہوں کی روٹی پیش کرنے کی ہمت کرسکتا تھا، ماحضر اس کے گھر کا اس دن، ماش ہی کے آٹے کی روٹی اور ماش ہی کی صرف کالی دال تھی، حاجی صاحب کہتے تھے کہ

"ڈرتا ڈرتا، آپ کے سامنے وہی لے آیا"

اب آگے واقعہ کی روداد حاجی صاحب ہی کے الفاظ میں سنئے، کہتے تھے کہ

"آپ نے (سیدنا الامام الکبیر) نے اس کو (ماش کے آٹے کی روٹی اور ماش کی کالی دال کو) ایسی ہی رغبت سے تناول فرمایا جیسے کوئی پلاؤ قورمہ کو کھاتا ہے"

بات اسی پر ختم نہیں ہوگئی، آگے وہی کہا کرتے تھے کہ

"جب حضرت اپنی معمولی غذا کھا چکے، اور ہاتھ کھینچا تو اس نے نہایت عاجزی سے عرض کیا کہ حضور آپ کے لائق تو نہیں، مگر کچھ اور بھی کھالیں، آپ نے اس کی دل داری کی وجہ سے اور چند لقمے تناول فرما کر ہاتھ کھینچا، اس سادہ لوح نے پھر عرض کیا کہ حضرت تھوڑا اور کھالیں، آپ نے باوجود سیری، چند لقمے اور تناول فرمائے"

یہ بھی ان ہی کا بیان ہے کہ اس دعوت شیرازی یعنی ماش کی۔

"دال اور روٹی کی تعریف فرما کر اسی کیفیت سے واپس تشریف لائے" (سوانح مخطوطہ ص۲۶)

شاید اپنی دعوت کی تعریف ہی سے میاں اللہ دیا کی جرات بڑھتی چلی گئی، اور لطیف و نفیس غذاؤں کے متعلق جس کا حال یہ تھا جیسا کہ مولانا منصور علی خاں مرحوم حیدرآبادی لکھا ہے کہ

"خوراک ان کی (سیدنا الامام الکبیر) کی نہایت قلیل تھی، کبھی غذا کو حرص و رغبت کے ساتھ نہیں کھایا۔ چھوٹا لقمہ لیا کرتے تھے" ص۱۹۱

جیسا کہ چاہیئے تھا اللہ دیا کے اس اصرار بے جا کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس

"غذا ثقیل بلکہ اثقل سے آپ کو بہت تکلیف پیش آئی، تین دن تک کھانا نہ کھایا"

مگر اللہ دیا تو اللہ دیا حاجی یٰسین صاحب کہتے تھے کہ اپنی اس تکلیف کا حال حضرت نے

"کسی پر ظاہر نہ کیا" ص

کہ غریب کا دل نہ دکھے، اس لئے خود جو دکھ اٹھانے پر بخوشی تیار ہو جاتا ہو، اسی کے متعلق مولانا منصور علی خاں صاحب حیدرآبادی نے جو اپنی آپ بیتی یہ سنائی ہے، یعنی جن دنوں وہ نانوتہ میں پڑھنے کی غرض سے حضرت والا کی خدمت میں حاضر تھے، اسی زمانہ کا ایک قصہ جوان ہی کے ساتھ

گذرا تھا، بیان کرتے تھے کہ مہمانوں کی نگہداشت اُن کے خواب وخور کی نگرانی ان ہی کے سپرد تھی، ہوا یہ کہ

"ایک دن چند مہمان کھانے کے واسطے ہاتھ دھونے کو اٹھے اور دوسرے صاحب نے ان کے ہاتھ دھلا دیئے، مگر ایک بڈھا مسکین شکستہ حال رہ گیا۔ اس کے کسی نے ہاتھ نہ دھلائے۔"

سیدنا الامام الکبیر اس تماشے کو دیکھ رہے تھے کہ بڈھے کو غریب ومسکین جان کر لوگوں کی توجہ اس کی طرف نہیں ہو رہی ہے، مولانا منصور علی خاں کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا کہ

"بڈھا خود لوٹے کے واسطے جھکا ہی تھا"

کہ ان کے سامنے گویا ایک بجلی سی کوندگئی، دیکھتے ہیں کہ

مولانا صاحب (سیدنا الامام الکبیر) نے جھپٹ کر اس قدر جلد وہ لوٹا اٹھا لیا کہ میں حیران رہ گیا، اور دونوں ہاتھوں سے نہایت ادب کے ساتھ لوٹا پکڑ کر اس بڈھے کے ہاتھ (سیدنا الامام الکبیر نے خود) دھلا دیئے۔" ۱۹۵

کچھ اسی نوعیت کے ایک واقعہ کا ذکر گلاؤٹھی کے رہنے والے مولوی حمید الدین صاحب نے اپنے ایک خط میں کیا ہے، سیدنا الامام الکبیر کے براہ راست مرید منشی سید رحیم الدین نے اس واقعہ کا ان سے تذکرہ کیا تھا کہ حضرت والا ایک دفعہ گلاؤٹھی (ضلع بلند شہر) وہاں کے لوگوں کی طلبی پر تشریف لے گئے، سید مہربان علی صاحب گلاؤٹھی کے نیک دیندار رئیس تھے، ان ہی کے یہاں مہمان تھے، سید صاحب نے حضرت والا کے اشارہ سے گلاؤٹھی میں عربی مدرسہ، اور جامع مسجد کی بنیاد ڈالی، یہ مدرسہ کسی زمانہ میں کافی مشہور تھا، بہرحال قصہ یہ ہوا کہ سید مہربان علی صاحب رئیس کے یہاں شب میں حضرت کا وعظ ہونے والا تھا، عصر کے وقت سید صاحب کی ڈیوڑھی پر کوئی سائل پہونچا، اور ملازمین کے منع کرنے پر بھی صدا لگاتا رہا، غصہ میں سید صاحب کے کسی ملازم نے سائل کو جھڑکا بھی اور ایک تھپڑ بھی رسید کیا جس پر روتے ہوئے سائل واپس

ہوگیا، اس واقعہ کی اطلاع کسی طرح حضرت والا تک پہنچی، لکھا ہے کہ سید صاحب سے تو کچھ نہ بولے، ملازم کو یہ کہتے ہوئے کہ "تم نے اس غریب کو کیوں مارا تم بھی دنیا میں ہمیشہ نہ رہو گے" عصر کی نماز کے بعد بجائے سید صاحب کے گھر آنے کے سیدنا الامام الکبیر غصہ میں جنگل کی طرف چلے گئے اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے، سید صاحب کو اس حال کی جب خبر ملی، حیران تھے، کسی میں ہمت نہ تھی کہ حضرت سے کچھ عرض کرے، جلال کی کیفیت طاری تھی، آخر سید صاحب نے اس فقیر کو تلاش کر کے پانچ روپے دیئے اور کہا کہ میری طرف سے تو حضرت سے معذرت خواہ ہو، یہی کیا گیا تب راضی ہوئے، اور وعظ فرمایا۔

بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے غریبوں اور بے کسوں کی تحقیر حضرت والا کیلئے ناقابل برداشت تھی، حکیم الامت تھانوی ہمارے مصنف امام مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی یہ قصہ سنایا کرتے تھے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب کو سبزی ترکاریاں دھنیہ پودینہ وغیرہ کی کاشت کا خاص شوق تھا، کسی زمیندار سے آپ نے کھاد کے لئے مینگنیوں کی فرمائش کی، زمیندار نے کسی رعیت کے سر پر لاد کر بھیجدیا، اس وقت سیدنا الامام الکبیر موجود تھے، مولانا یعقوب کہتے تھے کہ میں نے دیکھا غصہ میں بھرے ہوئے ہیں اور فرما رہے ہیں

"ضرور اس زمیندار نے زبردستی ظلماً اس بے چارے غریب شخص سے بیگار لی ہے"

(قصص ص ۲۹)

اور اسی وقت حکم دیا کہ اس غریب کی مینگنیاں واپس کردی جائیں جس کی فوری تعمیل ہوئی

سچی بات تو یہی ہے کہ اپنی دکان کو اونچی کرنے کی فکر میں تڑپنے والے، اگر اونچی دکانوں کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہوں، اور اپنی گردنوں کو بلند کرنے کی آرزو رکھنے والے گردن فرازوں کے گلی کوچوں کی خاک چھانتے پھرتے ہوں، تو جس تمنا کا گھاؤ اپنے اندر ان لوگوں نے پال رکھا ہے۔ اس گھاؤ کی خلش اور تپش کے یہ لازمی نتائج ہیں، دوسروں کی بڑائیوں میں قلم لگا کر یہ اپنی بڑائی کے پودے کو اونچا کرنا چاہتے ہیں، لیکن اپنی تعظیم و احترام کے مالیخولیا کو

ہمیشہ ہمیش کے لئے اپنے دماغ سے جو نکال باہر کر چکا ہو، اگر بجائے اونچوں کے اور بجائے بڑوں کے چھوٹوں ہی میں اس کا دل بہلتا ہو جنھیں کوئی نہیں پوچھتا ان ہی کے پوچھنے میں اسے لذت ملتی ہو، اور جن کس مپرسوں گروں پڑوں کے ملنے میں لوگ تکلف محسوس کرتے ہوں ان ہی سے بے تکلف ہو کر وہ ملتا جلتا ہو، تو آپ اس پر تعجب کیوں کرتے ہیں، چوٹ سے تو گھاؤ والے ڈرتے اور گھبراتے ہیں، لیکن جس نے اس گھاؤ کو پالا ہی نہیں وہ ہچکچائے کیوں، اور خود ساختہ مصنوعی احتیاطوں سے کام لینے پر آخر وہ کیوں مجبور رہو۔ سیدنا الامام الکبیر کی مجلس انس کا ذکر کرتے ہوئے حضرت حکیم الامت تھانوی فرمایا کرتے تھے کہ

"مولنا محمد قاسم صاحب کی مجلس میں ہنسی مذاق خوب ہوتا تھا، یہ معلوم ہوتا تھا کہ مولنا ایک یار باش ہیں" صلا۳ الہادی ۵۱ھ

سوانح مخطوطہ میں اسی "مجلس سعادت" کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس مجلس کے ایسے ارکان جو حضرت والا سے تلمذ یا ارادت کا تعلق رکھتے تھے ان تک کے ساتھ !

"اس طرح پیش آتے جیسے یاروں کے یار" مخطوطہ ص۲۶

اسی میں یہ بھی ہے کہ ان لوگوں تک کی (یعنی تلامذہ اور ارادت مندوں تک کی)

"ایسی تعظیم و توقیر فرماتے جیسے کوئی مرید یا شاگرد اپنے شیخ یا استاذ کی کرتا ہے"

اور التزام یہ تھا کہ

"ہر ایک کا پورا نام لیتے بلکہ اول میں میاں اور آخر میں صاحب بھی بڑھاتے"

اور یہ کہ ان میں سے کسی کے متعلق کبھی یہ نہیں فرمایا گیا کہ

"یہ میرا مرید، اور یہ میرا شاگرد ہے، بلکہ میرا دوست، میرا مہربان، میرا عنایت فرما"

غالباً امیر شاہ خاں مرحوم ہی کے حوالہ سے ارواح ثلثہ میں حضرت والا کی اس حلاوت ریز شیریں بیز مجلس کی ایک خصوصیت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ

"کوئی جلسہ مٹھائی سے خالی نہ ہوتا، اور اگر کہیں سے آئی ہوئی موجود نہ ہوتی تو خود

منگواکر تقسیم فرماتے" ص۲۰۲

اور گو بقول مولانا حکیم منصور علی خاں حیدرآبادی کہ اس مجلس مبارک میں تقسیم ہونے والی چیزوں میں خواہ میوہ ہو، یا شیرینی سب ہی کے متعلق حضرت والا کا دستور تھا کہ

"بقدر نمک چشی کے اس میں سے لیا کرتے، باقی سب کو دے دیا کرتے" ص۱۹۲

لیکن باوجود اس کے" ہنسی اور مذاق" جس کی خبر حضرت تھانوی نے دی، اس کی نوعیت کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے، امیر شاہ خاں مرحوم ہی اس قصہ کے راوی ہیں کہ ایک دن مٹھائی کی تقسیم کا کام مولوی فاضل صاحب نامی ایک صاحب کے سپرد ہوا، تقسیم کرنے کے بعد بھی کچھ مٹھائی بچ کر رہ گئی۔ سیدنا الامام الکبیر کی زبان مبارک پر جاری ہوا کہ" الفاضل للقاسم" (بچی ہوئی مٹھائی قاسم کی ہونی چاہئے) مگر بے تکلفی کے اس ماحول کا اندازہ کیجئے کہ معًا سننے کے ساتھ مولوی فاضل صاحب بھی" الفاضل للفاضل والقاسم محروم"[۱] کے فقرے سے جواب دے کر اس بچی ہوئی مٹھائی پر اپنے حق کو قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

حکیم الامت تھانوی قدس سرہ کے الفاظ کہ" مولانا محمد قاسم کی مجلس میں ہنسی مذاق خوب ہوتا تھا" یہ اسی کی ایک مثال ہے، یہ مولوی فاضل صاحب حضرت والا کے خدام میں تھے، لیکن کسی کے کرم ہائے فراواں کی چھاؤں میں انبساط اور بے تکلفی کی ان حدود تک چڑھ کر پہونچ جاتے تھے۔ کسی موقعہ پر ذکر آچکا ہے کہ حماسہ وسبعہ معلقہ کے مشہور شارح، اورنٹیل کالج لاہور کے پرنسپل مولانا شبلی اور مولانا عبداللہ ٹونکی وغیرہم حضرات کے استاذ محترم مولانا فیض الحسن سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ جب حضرت والا کی مجلس انبساط وانشراح میں رونق افروز ہوجاتے تو جانبین سے لطائف وظرائف کا تبادلہ ہوتا، اور خوب ہوتا، ایک طرف مولانا فیض الحسن فرماتے کہ

"ابے جا گنوار کے لونڈے تجھے ان چیزوں (علوم) سے کیا واسطہ تو جا کر ہل جوت، کھیتی کر"

---

[۱] الفاضل للفاضل کا مطلب ہے کہ بچی ہوئی مٹھائی فاضل کی ہوئی۔ یہ لفظی تناسب سے فائدہ اٹھایا گیا باقی دوسرا فقرہ والقاسم محروم یہ عربی زبان کا ایک عام محاورہ ہے کہ عمومًا بانٹنے والا بے چارہ ہی حصہ سے محروم رہ جاتا ہے۔

مولانا فیض الحسن کا رنگ سانولا بھی تھا اور طول و عرض میں بھی جسم کو ترقی کا کافی موقعہ قدرت کی طرف سے ملا تھا، رنگ اور ڈیل ڈول کی ان ہی خصوصیتوں کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے ان کو یہ جواب ملتا کہ

"خیر ایک بھینسا تو موجود ہے"

اور یہ تو گونہ غنیمت ہے، ایک اور لطیفہ کا ذکر اس موقعہ پر لوگ کیا کرتے ہیں، اگر وہ صحیح ہے، تو اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ شاید مولٰنا فیض الحسن کی ظرافت گدگدی پیدا کر کے تھوڑی دیر کے لئے حضرت والا کو بھی اتنا بے چین کر دیتی تھی کہ شاید روک نہیں سکتے تھے، میرا اشارہ ٹوٹی ہوئی ٹونٹیوں کے لوٹے کے لطیفے کی طرف ہے، کہتے ہیں کہ چھتہ کی مسجد میں مولٰنا فیض الحسن بھی اترے ہوئے تھے، استنجا کے لئے لوٹا تلاش کرنے لگے۔ جو لوٹا بھی ملتا اس کی ٹونٹی اتفاق سے دیکھتے کہ ٹوٹی ہوئی ہے، مزاج میں ان کے شاعری تو تھی ہی، جھنجھلا کر بولے کہ یہاں تو جو لوٹا بھی ہے سب مختون ہی مختون ہے، کچھ اس انداز سے مولٰنا نے فرمایا کہ سیدنا الامام الکبیر سے نہ رہا گیا اور بے ساختہ یہ فقرہ نکل گیا کہ

"پھر آپ کو تو بڑا استنجا نہیں کرنا ہے"[1]

اور مولٰنا فیض الحسن صاحب تو خیر آپ کے ہم عمر، ہم نوالہ و ہم پیالہ بزرگ تھے، مرید بھی دونوں ایک ہی شیخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تھے، میں تو دیکھتا ہوں کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کی دلداریاں سیدنا الامام الکبیر کی مجلس قدس میں جن شکلوں کے ساتھ کی جاتی تھیں اپنے وقار و عظمت کے محافظوں کے لئے تو شاید ان کا سننا بھی دشوار ہو۔ مولٰنا منصور علی خاں حیدر آبادی مرحوم بیان کیا کرتے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر

---

[1] حضرت تھانوی نے اس روایت پر اپنی طرف سے ایک نوٹ کا اضافہ فرمایا ہے کہ عام طور پر ادباب ظرافت کا ذہن اس فقرے سے جس چیز کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، اس کے سوا ایک سنجیدہ مطلب اس کا یہ بھی ہو سکتا ہو کہ ٹوٹی ٹونٹی کے لوٹے سے پانی منظم شکل میں نہیں نکلتا اور بڑے استنجاء کے لئے شاید ناکافی ہو ۱۲۔

"بچوں سے بہت خوش طبعی کیا کرتے تھے"

مگر اس خوش طبعی میں بھی، ظرافت کے ساتھ ساتھ سمجھ بوجھ کی باتیں بھی شریک ہوتی تھیں،
حکیم صاحب ہی نے ایک لطیفہ کا ذکر کیا ہے کہ.

"ایک بچے کو فرمایا کہ اس بیل کی دم سے اس کو باندھ دو"

لکھا ہے کہ "بچہ بگڑ گیا اور جھلا کر بولا کہ میں نہیں جاتا" تب بچے کی فہمائش ہونے لگی کہ

"بوجھ دونوں طرف برابر ہو جائے گا"

پھر بچے کو سمجھایا جاتا کہ دیکھ! بیل کے

"آگے سر اور گردن ہے، پیچھے تو لٹک جا" ص۱۹۶

یوں دونوں طرف کا وزن برابر ہو جائے گا'

سوانح مخطوطہ کے مصنف نے بھی یہ لکھ کر کہ "بچوں سے چھیڑ بھی فرماتے" یہ اطلاع دی ہے کہ

"خصوصاً مولانا مولوی محمد یعقوب صاحب کی ساری اولاد سے" ص۲۵

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مصنف امام کے بچوں کو شفقت و کرم عنایت و نوازش کا حصہ
زیادہ عطا فرمایا جاتا تھا' مولٰنا محمد یعقوب صاحب کے بچوں میں ایک صاحبزادے جن کا نام
جلال الدین تھا' امیر شاہ خاں صاحب اُن کا نام خصوصیت کے ساتھ لے کر یہ روایت بیان کیا
کرتے تھے کہ

"جلال الدین صاحبزادہ مولٰنا محمد یعقوب سے جو اس وقت بالکل بچے تھے بڑی
ہنسی کیا کرتے تھے، کبھی ٹوپی اتارتے، کبھی کمر بند کھول دیتے تھے" ص۲۰۳

اور حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے قصص الاکابر میں جو یہ اُظروفہ درج ہے کہ
ایک بچہ بڑے پیٹ والا سامنے سے (سیدنا الامام الکبیر) کے گذرا تو مسکرا کر فرمایا

"چلا کیھالا، گرا بڑ جھالا"

حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ

"یہ مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے شعر کا ٹکڑا ہے"

وہی یہ بھی فرماتے تھے کہ

"مولانا محمد یعقوب صاحب کا ایک لڑکا بڑے پیٹ کا تھا اس کے بارے میں (یہ شعر) فرمایا تھا" قصص الہادی ماہ جمادی الاول ۵۷ھ

واللہ اعلم بالصواب یہ وہی جلال الدین نامی مولانا کے صاحبزادے تھے، یا مولانا کے کسی دوسرے بچے کو یہ افتخار بخشا گیا تھا کہ خاص کر شعر ہی موزوں فرما دیا گیا تھا، اور جب وہ بچہ سامنے آتا تو زبان مبارک پر وہی شعر یا اس کا کوئی ٹکڑا جاری ہو جاتا، اور یہ بچے تو خیر برادری کے بچے اور شیخ زادوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ماسوا اس کے معصوم بچے تھے، مگر حضرت حکیم الامت تھانوی کی طرف قصص میں یہ روایت جو منسوب کی گئی، کہ دارالعلوم دیوبند کی طالب العلمی کے دنوں میں آموں کی دعوت طلبہ کی ہوئی اس دعوت میں مولانا تھانوی خود بھی شریک تھے فرماتے تھے کہ طلبہ باہم ایک دوسرے پر رس نچوڑنے لگے اور گٹھلیوں چھلکوں سے ایک دوسرے لے حملہ شروع کر دیا عام اساتذہ تو ہٹ گئے لیکن مولانا محمد قاسم صاحب طالب العلموں کے ساتھ تماشا دیکھتے رہے۔ الہادی ماہ رجب ۵۷ھ

ارواح ثلثہ میں روایت پائی جاتی ہے لکھا ہے کہ ایک پہلوان کشتی گیر جس کا نام نبو تھا،

"دیوبند کا رہنے والا تھا"

اس شخص کے نام اور کام دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عامی آدمی تھا لیکن سنئے، بیان کیا گیا ہے کہ دیوبند کے اسی مقامی پہلوان نبو نے

"باہر کے کسی پہلوان کو پچھاڑ دیا"

اس خبر سے دیوبند کے باشندوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، اور دوسروں کے ساتھ صرف یہی نہیں کہ

"مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بڑی خوشی ہوئی"

بلکہ راوی کا بیان ہے کہ فرط مسرت سے سیدنا الامام الکبیر نے فرمایا کہ

"ہم بھی نبّو کو اور اس کے کرتب کو دیکھیں گے"

اور بات خیال ہی کی حد تک محدود نہ رہی بلکہ

"حافظ انوار الحق کی بیٹھک میں اسے (نبّو پہلوان) کو بلایا گیا"

اس بیٹھک کے سامنے کوئی میدان تھا جس سے اکھاڑہ کا کام لیا گیا، اور نبّو پہلوان نے اسی میدان میں کشتی گیری کے کمالات کا مظاہرہ شروع کیا، اور جس کا خیال بھی اس زمانہ کے علمی غرور کیلئے ناقابل برداشت تھا، اسی غریب نبّو پہلوان کے

سب کرتب (سیدنا الامام الکبیر نے) دیکھے" ص۲۰۲

اور سچ تو یہ ہے کہ حال جس کا بقول صاحب سوانح مخطوطہ یہ ہو کہ

"دہلی میں مولٰنا (محمد قاسم) کا ایک ادنیٰ عامی شخص مہمان ہوا،

اور بپاس ادب اپنی حقہ نوشی کا اظہار نہ کیا"

معلوم ہوتا ہے کہ اس غریب کو ریاح کا عارضہ تھا، اور حقہ پینے سے فائدہ ہوتا تھا، رات کو حقہ پیئے بغیر جو وہ سو رہا تو لکھا ہے کہ

"پچھلی رات کو اس کو نفخ ہوا، اور سخت تکلیف پیش آئی"

واللہ اعلم کیا صورت پیش آئی، کہ اس غریب حقہ باز کی بے چینیوں کو مولٰنا نے بھانپ لیا، اور بغیر کسی ہنگامہ کے راوی نے بیان کیا ہے کہ

"اسی وقت دبے دبے پاؤں جاکر مولٰنا (محمد قاسم) نے خود

چلم بھری اور حقہ اٹھا کر اس کے (اس غریب آدمی) سامنے لائے"

ہاتھ میں حقہ تھا اور سنا جارہا تھا، معذرت پیش کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر اسی حقہ پینے والے سے فرمارہے تھے کہ

"آپ نے پہلے ہی کیوں نہیں فرمایا تھا کہ میں حقہ پیتا ہوں" ص۲۵

اسی کے ساتھ ہمیں مصنف امام کی اس اطلاع کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ سیدنا الامام الکبیر کو

جن چیزوں سے نفرت تھی ان میں حقّہ بھی تھا، اپنی کتاب میں انھوں نے لکھا ہے کہ

"مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کو حقّہ سے نفرت تھی" ص۳۵

مگر باوجود اس طبعی نفرت کے آپ دیکھ رہے ہیں کہ حقّہ کا انتظام ہی نہیں کر دیا گیا، بلکہ خود چلم بھر کر اس غریب آدمی کے سامنے آپ نے عذر کے ساتھ پیش کیا، اور حضرت مرشد تھانوی کے ملفوظات میں اس واقعہ کا جو ذکر کیا گیا ہے کہ

"ایک شخص، حضرت مولانا نانوتوی کی خدمت میں ایک چھینٹ کی ٹوپی لائے، اس میں شالباف کی گوٹ لگی ہوئی تھی، اور گوٹہ بھی ٹکا ہوا تھا"۔

یہ عجیب و غریب آدمی تھے کہ اس قسم کی ٹوپی کو پیش کرتے ہوئے بھری مجلس میں یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ حضرت والا اس ٹوپی کو استعمال فرمائیں۔ فرمائش اور عجیب فرمائش؛ کسی اور دربار میں یہ صورت پیش آتی تو خدا ہی جانتا ہے بے چارے پر کیا مصیبت ٹوٹ پڑتی لیکن سنئے مرشد تھانوی فرماتے تھے کہ چھینٹ کی یہی گوٹہ لگی ہوئی شالباف کے گوٹ کی ٹوپی اسی مجلس میں

"مولانا نے سر پر رکھ لی"

ٹوپی سر مبارک پر تھی، اور زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری تھے۔

"اس بیچارے کا دل خوش کرنے کیلئے میں نے (اسے) سر پر رکھ لی" (قصص الہادی جادی للاولی ص۳)

اس کا بھی دل خوش ہو گیا، اور سامنے ایک بچہ بیٹھا ہوا تھا پھر اسی کو یہ ٹوپی ہبہ کر دی گئی۔

اور اس سے بھی زیادہ دل دوز، عبرت آموز، سبق آفریں واقعہ وہ ہے جس کا تذکرہ امیر شاہ خاں مرحوم فرمایا کرتے تھے۔ ارواح ثلاثہ میں بھی اس قصہ کو شریک کیا گیا ہے، حاصل یہ ہے کہ منشی ممتاز علی مرحوم کے مطبع میں سیدنا الامام الکبیر تصحیح کی خدمت بہ مقام دہلی جس زمانہ میں انجام دیتے تھے، اسی زمانہ میں اسی مطبع میں ایک اور صاحب بھی ملازم تھے، جو حافظ جی حافظ جی کے نام سے مشہور تھے، نام کے تو حافظ جی تھے لیکن کام کے لحاظ سے ان کا حال یہ تھا کہ

"بالکل آزاد تھے، رندانہ وضع تھی چوڑی دار پاجامہ پہنتے تھے ڈاڑھی چڑھاتے تھے"
اور اسی کے ساتھ یہ بھی تھا کہ

"نماز کبھی نہیں پڑھتے تھے"

مگر مطبع کی ملازمت میں خواجہ تاشی کا رشتہ سیدنا الامام الکبیر سے قائم ہوا اور روز بروز ترقی کرتے ہوئے یہی ربط اس درجہ تک پہونچ گیا کہ بقول امیر شاہ خاں صاحب

مولانا نانوتوی سے اور ان سے (حافظ جی سے) نہایت گہری دوستی تھی

اسی "گہری دوستی" کے مظاہر یہ تھے کہ

"وہ (حافظ جی) مولانا (محمد قاسم) کو نہلاتے اور کمر ملتے تھے اور مولانا ان کو نہلاتے اور کمر ملتے تھے، مولانا ان کو کنگھا کرتے اور وہ مولانا کے کنگھا کرتے"

خاں صاحب ہی کا بیان ہے کہ ان حافظ جی کا خیال سیدنا الامام الکبیر اس حد تک فرمایا کرتے تھے

"کبھی مٹھائی وغیرہ اگر مولانا کے پاس آتی تو ان (حافظ جی) کا حصہ ضرور رکھتے تھے"

خاں صاحب مرحوم یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ

"مولانا کے مقدس دوست، مولانا کی ایک آزاد شخص کے ساتھ اس قسم کی دوستی سے ناخوش تھے، مگر وہ (سیدنا الامام الکبیر) اس کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے" ص ۱۲۲

واللہ اعلم مقدس دوست سے مراد خاں صاحب کی کیا ہے، تاہم اس سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ دوسروں میں مولانا کے اس طرز عمل سے گرانی بھی پائی جاتی تھی لیکن وہ اس کی پروا نہیں کرتے تھے۔ یہ سچ ہے جیسا کہ خاں صاحب نے آگے بیان کیا ہے کہ بالآخر یہ آزاد حافظ جی کی آزادی زیادہ دن تک زندہ نہ رہ سکی، ایک دن جب وہ اور مولانا تنہا تھے، کہا جاتا ہے کہ مولانا نے حافظ جی سے کہا کہ بھئی! ہماری دوستی کا مطلب یہ ہونا چاہئے کہ دونوں کا رنگ ایک ہی ہو، اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ تمہاری وضع قطع کچھ اور ہو، اور تمہارے دوست کی کچھ اور، فرمایا کہ لاؤ میں ہی تمہارا رنگ اختیار کرتا ہوں، خانصاحب کی روایت ہے کہ حافظ جی بے چاروں کی

آنکھوں سے آنسو نکل پڑے، اور اسی کے بعد پھر اپنے دوست کا ایسا پختہ رنگ اختیار کیا کہ پرہیزگار مسلمانوں کی وضع قطع بھی اختیار کر لی،

"اور اس روز سے پکے نمازی، اور نیک وضع بن گئے" ملک۱

ایسا اگر ہوا، تو نفسیات انسانی کا جو عام قانون ہے اس کا یہی مقتضا بھی تھا، آپ ناپاکوں کی تحقیر و توہین کر کے یقین مانئے ناپاکی کے ازالہ میں اتنا کامیاب نہیں ہو سکتے، حقیقی کامیابی اس تدبیر سے ہو سکتی ہے جس کا عملی نمونہ سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کے طرز عمل کی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔

لیکن یہ خیال کہ حضرت والا کے اس طرزِ عمل میں ابتدا ہی سے یہ اصلاحی غرض پوشیدہ تھی، یعنی حافظ جی کو راہ راست پر لانے کے لئے قصداً و ارادۃً ان کے ساتھ آپ نے میل جول بڑھایا تھا، شاید یہ نکتہ بعد الوقوع ہی کی حیثیت رکھتا ہے، میں تو سمجھتا ہوں کہ آپ کے فطری نہاد کا یہ اقتضا تھا اپنی مقدس پاکی کا خطرہ ہی جس کے قلب پر نہ گذرتا ہو وہ اپنے دامن کو بچانے کی فکر میں کیوں مبتلا ہوگا، آخر حافظ جی مرحوم کا یہ کوئی انفرادی واقعہ ہے، جو کچھ آپ اب تک سن چکے ان کی یاد کو بھی تازہ کیجئے۔ اور اسی کے ساتھ ملائیے، اس قسم کی روایتوں کو مثلاً وہی مولوی عبدالسمیع مرحوم کا واقعہ جن سے مسئلہ میلاد" کے متعلق علماء دیوبند سے تحریری مناظروں کا بھی سلسلہ جاری تھا، اور غالباً تقریری مباحثے بھی ہو جاتے تھے۔ "براہین قاطعہ" وغیرہ اس سلسلہ کی مشہور کتابیں ہیں مگر حضرت حکیم الامت تھانوی کی روایت ہے، فرماتے تھے

"ایک صاحب نے میرٹھ میں مولانا سے دریافت کیا کہ مولوی عبدالسمیع صاحب تو مولود شریف کرتے ہیں: آپ کیوں نہیں کرتے"؟

علماء دیوبند کی طرف سے اسی سوال کے جواب میں ہزارہا ہزار صفحات جس زمانہ میں شائع ہو رہے تھے، عین ان ہی دنوں میں جماعت کے امام کبیر کی زبان مبارک سے یہ جواب بھی سنا گیا تھا کہ

"بھائی! انہیں (مولوی عبدالسمیع صاحب) کو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ

"محبت معلوم ہوتی ہے، مجھے بھی اللہ تعالیٰ محبت نصیب کرے" ۵۶ قصص الہادی ن الحجۃ

حضرت تھانوی یہ بھی فرماتے تھے، یہ جواب جب مولوی عبد السمیع کے کانوں تک کسی طرح پہنچ گیا، خود حکیم الامت سے کہنے لگے کہ

"ایسے سے بھلا کوئی کیا لڑے"

وہی واقعہ جس کا ذکر ارواح ثلاثہ میں بھی کیا گیا ہے، اور قصص الاکابر میں بھی حضرت تھانوی کی زبانی یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ ایک صاحب جو طبقۂ مشائخ سے تعلق رکھتے تھے۔ علماء دیوبند نے جن امور کے بدعت ہونے کا فتویٰ دے رکھا تھا ان میں وہ بتلا تھے، لیکن سیدنا الامام الکبیر کی تعریف سن کر خدمت والا میں حاضر ہوئے، حضرت تھانوی کی روایت میں ہے کہ

"مولانا (محمد قاسم) نے نہایت عزت کے ساتھ ان کو مہمان بنایا"۔

اور بات اسی پر ختم نہیں ہوئی بلکہ اسی کے ساتھ جیسا کہ حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ

"سب طالب العلموں کو سمجھا دیا کہ خبردار کوئی گفتگو ان کے طریقہ کے خلاف نہ کیجائے کیونکہ مہمان کی دل شکنی نہ کرنی چاہئے"[1]۔

اسی موقعہ پر وہ صورت پیش آئی کہ حضرت گنگوہی تک آپ کے اس طرز عمل کی اطلاع پہونچائی گئی اور وہاں کی یہ تنقید کہ بدعتی کا اکرام کیوں جائز ہے، سیدنا الامام الکبیر کے سامنے نقل کرنیوالوں نے صرف نقل ہی نہیں کیا، بلکہ تنقید کا جو جواب دیا گیا تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو کافر مہمانوں کا بھی اکرام کرتے تھے، حضرت گنگوہی کو لوگوں نے جا کر سنایا۔ سن کر فرمایا کہ کافر کے اکرام میں

---

[1] حکیم الامت ہی کے حوالہ سے قصص الاکابر میں غالباً مزید اضافہ کے ساتھ یہی روایت دوسری جگہ بھی ملتی ہے، جس میں ہے کہ یہ صاحب ٹمسکہ کے رہنے والے تھے، حکیم الامت نے یہ بھی فرمایا کہ بدعات میں مبتلا ہونے کے باوجود خوبی ان میں یہ تھی کہ دکاندار نہ تھے یعنی دین فروخت کرکے دنیا کے خریدنے والے مشائخ میں نہ تھے، اسی میں ہے کہ حضرت نانوتوی نے رسم مشائخ کی پیروی کرتے ہوئے شاہ صاحب کی خدمت میں نذر بھی پیش کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ شاہ صاحب کی خاطر مدارات اپنے تلامذہ کے سپرد کرکے شاہ صاحب کے ساتھ جو بھنگی سائیس تھے ان کو خود کھانا کھلوایا۔ کہتے ہیں کہ چلتے ہوئے شاہ صاحب نے کہا کہ فقیر تو آپ ہیں ہم تو صرف نقال ہیں (قصص بحوالہ الہادی جمادی الثانی)

غلط فہمی اور فساد کا احتمال نہیں برخلاف اس کے بدعتی کے اکرام میں اندیشہ ہے کہ خود بھی غلط فہمی میں مبتلا ہو، یعنی سمجھنے لگے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں، اسکی تصحیح کی گئی، اور دوسرے بھی چاہیں تو یہی غلط نتیجہ نکال سکتے ہیں، کہتے ہیں کہ جب حضرت نانوتوی کے سامنے حضرت گنگوہی کا یہ قول نقل کیا گیا، تو جو صاحب اِدھر کی اُدھر اور اُدھر کی اِدھر پہونچا رہے تھے ان کو جیسا کہ حضرت تھانوی فرماتے تھے،

"مولنا (محمد قاسم) نے اس کو ڈانٹ دیا کہ یہ کیا واہیات ہے، اِدھر کی اُدھر لگاتے پھرتے ہو، بیٹھو اپنا کام کرو" (قصص) بحوالہ الہادی ماہ جمادی الاول ۵۷ھ

حالانکہ چاہتے، تو اس کا جواب بھی دے سکتے تھے، لیکن خیال میں اختلاف رکھنے والوں کے احترام میں بھی کسی کوتاہی کو جس کا بے نفس دل برداشت نہیں کرسکتا تھا کیا اس میں حضرت گنگوہی جیسے ہم مشرب ہم عقیدہ ہم خیال ہم استاذ وہم رفیق الدنیا والآخرۃ کے مقابلہ کا خطرہ بھی گذر سکتا تھا، لوگ فتنہ پیدا کرنا چاہتے تھے، لیکن ان کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کس سے کہہ رہے ہیں، میرا تو دماغ چکرا جاتا ہے، جب امیر شاہ خاں مرحوم کی وہ بات یاد آتی ہے، جو مولنا فضل رسول بدایونی کے سلسلے میں وہی بیان کیا کرتے تھے، موجودہ نسلیں شاید مولوی صاحب کی خصوصیتوں سے نا واقف ہو چکی ہیں، بس اتنی بات سمجھ لیجئے، کہ آج دیوبندی علماء کہئے، یا ولی اللہی خانوادہ کے اہل علم کے نام سے ان کو موسوم کیجئے۔ اس طبقہ کے مقابلہ میں "بریلویوں" کی جو جماعت آستینیں چڑھا کر تقریباً ایک صدی سے کھڑی ہوئی ہے اور گفتنی ناگفتنی، کردنی ناکردنی الغرض جو کچھ سوچا بھی نہیں جا سکتا، ان سارے حرکات کا ارتکاب مسلسل کرتی چلی آرہی ہے، یہ سارا قصہ درحقیقت بداؤن کے ان ہی مولوی فضل رسول صاحب پر منتہی ہوتا ہے، پہلی آستین ان ہی کی تھی، جو ولی اللہی تجدیدات و اصلاحات کے مقابلہ میں چڑھائی گئی۔

ولی اللہی خانوادے کے نیازمندوں میں مولوی فضل رسول صاحب کی جانب سے ایسی صورت

میں جس قسم کی گرانیاں پیدا ہوسکتی تھیں، قدرتاً وہ پیدا ہوگئی تھیں" امیر شاہ صاحب مرحوم اسی میدان کے ایک مرد خاص تھے، کہتے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر خورجہ تشریف فرما تھے کسی مجلس میں مولوی فضل رسول صاحب بدایونی کا ذکر چھڑ گیا" آگے امیر شاہ مرحوم ہی کی زبان سے سنئے" ازواج ثلاثہ میں بھی یہ روایت ان کے حوالہ سے درج ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ

"میری زبان (یعنی امیر شاہ خاں کی زبان) سے بجائے فضل رسول (بضاد معجمہ) فصل رسول (بصاد مہملہ) نکل گیا"

گویا ایک نقطہ کو فضل کے لفظ سے ساقط کرکے امیر شاہ خاں صاحب مولوی صاحب کو ایک ایسی ہستی قرار دے رہے تھے۔ جو رسول کی امت کو رسول کی راہ اور سنت سے جدا کرنے میں معاون ثابت ہورہی ہے، ظاہر ہے کہ تقریباً یہ وہی خیال تھا جو دیوبند کی جماعت مولوی صاحب کے متعلق رکھتی تھی، ان پر الزام ہی یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی جگہ بدعت کی ترویج سے دلچسپی رکھتے ہیں" شاید خان صاحب سمجھے ہوئے تھے، کہ ایک نقطہ کے ردو بدل سے جو نکتہ میں نے پیدا کیا ہے، وہ سیدنا الامام الکبیر کی خوشنودی کا باعث ہوگا لیکن بالکل خلاف توقع وہ سن رہے تھے کہ حضرت والا ان سے پوچھ رہے ہیں کہ

"لوگ ان کو (مولوی فضل رسول کو) کیا کہتے ہیں"

خاں صاحب نے عرض کیا کہ "فضل رسول کہتے ہیں" تب آپ نے فرمایا اور خان صاحب ہی کے الفاظ ہیں کہ ناخوش ہوکر فرمایا کہ

"تم فصل رسول کیوں کہتے ہو"

حوصلہ کی وسعت، نظر کی بلندی کی یہی وہ مثالیں ہیں، جن سے ہم سیدنا الامام الکبیر کے باطنی نفسیات کی خصوصیتوں کا اندازہ کرسکتے ہیں، مخالف سے مخالف شخصیتوں کی ہلکی سی ہلکی تحقیر خواہ کنایوں اور اشاروں ہی میں کیوں نہ ہو آپ کے لئے ناقابل تحمل بن جاتی تھی، ادھر امیر شاہ خاں

صاحب جیسی محبوب ہستی کے ساتھ بھی اس معاملہ میں کسی قسم کی رواداری پر تیار نہ تھے۔ بھری مجلس میں وہ ٹوک دیئے گئے، اور ہمیشہ کے لئے ان کو سبق مل گیا۔

نظائر و امثال کو میں کہاں تک نقل کروں، وہی واقعہ کیا معمولی واقعہ ہے، جس کے راوی بھی یہی امیر شاہ خاں ہیں۔

میرٹھ میں حضرت والا کا قیام تھا، سارے شہر کے مرجع اور منظور نظر بنے ہوئے تھے امیر شاہ خاں کا بیان ہے کہ ایک مکان تھا، جس کے بالاخانہ پر حضرت مولانا محمد یعقوب ٹھہرے ہوئے تھے اور نچلی منزل حضرت والا کی فرودگاہ تھی، اسی مکان میں خاں صاحب کی روایت ہے کہ

"ایک رنڈی اپنی چھوکری کو جو سیانی تھی اپنے ہمراہ لائی"۔

اور ہمراہ لاکر اس نے کیا کیا؟ خاں صاحب کے الفاظ ہیں کہ

"اور مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ میری چھوکری ہے، مدت سے بیمار چلی جا رہی ہے، میری اوقات بسر اسی پر ہے، آپ اسے تعویذ دیدیجئے یا دعا کر دیجئے"۔

پھر آگے کیا ہوا؟ چاہئے تو یہی تھا اور شاید لوگوں کو یہی سننے کی توقع بھی ہو گی کہ جھڑک کر وہ نکالدی گئی ہو گی، کم از کم اپنی علمی پوزیشن کی حفاظت ہی کے لئے سہی موقعہ اسی کا تھا کہ دھتکار کر باہر نکل جانے کا حکم اس کو دیا جاتا،

مگر امیر شاہ خاں مرحوم کی یہ اطلاع ہے کہ بجائے کچھ کہنے سننے کے (شاید ظرافۃً صرف یہ کیا) کہ بالاخانہ جس پر مولانا محمد یعقوب ٹھہرے ہوئے تھے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ

"اوپر ایک بزرگ ہیں تم ان کے پاس جاؤ"

حسب الحکم وہ زینوں پر چڑھتے ہوئے اچانک مولانا محمد یعقوب صاحب کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی، اور اپنا معروضہ پیش کیا۔ لکھا ہے کہ بگڑتے ہوئے مولانا محمد یعقوب صاحب نیچے اتر آئے اور دریافت فرمانے لگے کہ اس عورت کو میرے پاس کس نے بھیجا تھا، حضرت والا دم سادھے خاموش بیٹھے رہے، مولانا محمد یعقوب بھیجنے والے کو سخت وسست فرما رہے تھے اور مزے

لے کر حضرت سن رہے تھے[۵]۔

یہ، اور اس کے سوا کے بعد دیگرے شواہد و بینات کا طویل سلسلہ آپ کے سامنے جو پیش ہو چکا ہے، ان پھلوں کو دیکھ کر درخت کے پہچاننے میں شاید زیادہ دشواری باقی نہ رہی ہو گی؟

تاہم اس موقعہ پر یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حکیم الامت کے لقب سے رفع ذکر کی سرفرازی جس ذات گرامی کو چودھویں صدی ہجری میں قدرت کی طرف سے حاصل ہوئی تھی، ان ہی کے کلمات طیبات میں اس سوال کا جو جواب ملتا ہے، سوچنے والوں کے لئے اسے ایک جگہ جمع کر کے رکھ دوں،

قصص الاکابر میں ایک موقعہ پر اس کی تصریح فرماتے ہوئے کہ

مجھے مولٰنا گنگوہی کے ساتھ زیادہ عقیدت[۱] نہ ہے، بہ نسبت مولٰنا محمد قاسم کے اور بعض

---

[۱] قصہ کا تکملہ یہ ہے کہ عورت بیمار لڑکی کے ساتھ واپس چلی گئی' اور کچھ دن بعد پھر واپس ہوئی، عرض کرنے لگی کہ آپ لوگوں کی توجہ سے لڑکی میری اچھی ہوگئی، کہتے ہیں کہ اپنے ساتھ کچھ مٹھائی بھی بطور شکرانے کے لائی تھی، رکھ کر چلی گئی مولٰنا محمد یعقوب صاحب نے فرمایا کہ حرام کی کمائی ہے، اسکا کھانا حرام ہے، صرف مسکینوں پر بطور خیرات کے تقسیم ہو سکتی ہے ۔

[۵] ایک موقعہ پر آپ ہی کی طرف قصص الاکابر میں یہ بیان بھی منسوب کیا گیا ہے کہ ذکر مولود شریف کی مجلسوں کا ہو رہا تھا مولٰنا اشرف علی صاحب نے فرمایا کہ حضرت مولٰنا محمد قاسم صاحب سے کسی نے مولود کے متعلق دریافت کیا' تو فرمایا کہ بھائی دا تنا برا ہے جتنا لوگ سمجھتے ہیں اور نہ اتنا اچھا ہے جتنا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے، سیدنا الامام الکبیر کے اس قول کو نقل کر کے حضرت تھانوی نے فرمایا کہ اس قدر جامع جواب ہے کہ ایک سالہ کا رسالہ اسکی شرح میں لکھا جا سکتا ہے، لیکن یہ گول جواب ہے، عوام نہیں سمجھ سکتے، ہر فریق اپنی تائید میں اسکو پیش کر سکتا ہے۔ پھر آگے یہ بھی مولٰنا تھانوی نے اضافہ فرمایا کہ حضرت مولٰنا محمد قاسم صاحب کھلم کھلا کسی کو برا نہیں کہتے تھے، ایسے سوالات کے بہت نرم جواب دیتے تھے، پھر حضرت گنگوہی کی خصوصیت بیان کی کہ وہ بالکل صاف صاف کہتے تھے ایک ہی دفعہ میں چلاہے، ٹھیرو، یا جاؤ، لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے، حضرت تھانوی نے اس کے بعد اپنے تغیر مذاق کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا کہ پہلے میں بھی نرم جوابات کو پسند کرتا تھا، لیکن اب تجربہ کے بعد مولٰنا گنگوہی کا طرز نافع ثابت ہوا' نرم جواب میں یہ مصلحت سمجھی جاتی ہے کہ مخاطب کو وحشت نہ ہو، اور وہ ہم میں آجائے حالانکہ یہ غلط ہے وہ ہم میں نہیں آتے وہ تو اپنے ہی خیال کی بنا پر ہم میں آتے ہیں تو یہ در اصل آنا نہ ہوا، ہاں ہم ہی ادھر چلے گئے، وہ ہم میں نہیں رہے، بحوالہ حسن العزیز ص۱۷ م۲۸ ج اول. ظاہر ہے کہ حکیم الامت کی بات حکیم الامت ہی کی بات ہے لیکن ایسے مسائل جن کے متعلق شریعت کے محکم و منصوص احکام موجود ہوں ان کے متعلق تو دو ٹوک الفاظ میں جواب دینا شریعت کا تقاضا ہی ہے لیکن جن مسائل کے متعلق قطعی فیصلہ آسان نہ ہو ان میں ترجیحی رائے تو دی جا سکتی ہے لیکن قطعیت اور جزم کے الفاظ میں جواب اگر نہ دیا جائے تو شاید احتیاط کا پہلو بھی ہو سکتا ہے اور غالباً سیدنا الامام الکبیر پر اسی روش کا غلبہ تھا ۱۲

لوگ اس کے برعکس خیال رکھتے ہیں"۔

پھر مولنا گنگوہی کی خصوصیتوں کو نقل فرماتے ہوئے اپنا احساس سیدنا الامام الکبیر کے متعلق یہ ظاہر فرمایا ہے کہ

"مولانا محمد قاسم صاحب میں شان ولایت کا رنگ غالب تھا، اور مولنا گنگوہی میں شان نبوت کا"۔ (ص ۱۲۵ ہادی ماہ جمادی الثانی ۵۷ھ)

ظاہر ہے کہ "شان ولایت" خود ایک مجمل بات ہوئی، غالبًا اسی لئے اس کی تشریح ایک موقعہ پر ان الفاظ میں فرمائی گئی ہے، کہ

"مولنا محمد قاسم صاحب مغلوب الحال و مغلوب الاخلاق تھے، اپنے شاگردوں کو مخدوم و مکرم لکھتے تھے"

ممکن ہوسکتا ہے کہ اشخاص کے ساتھ حضرت والا کے اس ملاطفت آمیز طرز عمل کی وجہ تربیت ہو، ظاہر ہو کہ تربیت اور تعلیم میں زمین آسمان کا فرق ہے تعلیم سب کے لئے یکساں ہوتی ہے لیکن تربیت میں اشخاص کے مزاج اور طبیعت کی رعایت سے تدبیر کی جاتی ہے تعلیم کا مقصد علم پہنچا دینا ہے اور تربیت کا مقصد پہونچائے ہوئے علم پر عمل کرانا ہے جیسے تعلیم طب کا حاصل فن کے اصول و مسائل مستفید کے ذہن میں ڈالدینا ہے اور مطب کا حاصل ان اصول و مسائل کے تحت علاج کرنا ہے جس میں ہر مریض کے مزاج کی رعایت علیحدہ علیحدہ لازمی ہوتی ہے ایک ہی مرض کے چند مریضوں کے نسخے الگ الگ ہوتے ہیں کہ ان کے مزاج الگ الگ ہوتے ہیں۔ حضرت مولنا گنگوہی رحمہ اللہ سے ایک دیہاتی بیعت ہوا جسے افیون کی عادت تھی حضرت نے فرمایا کہ روزانہ کی مقدار سے آدھی مقدار کھالیا کر اور پھر چند دن کے بعد اس آدھی میں سے آدھی کر دینا ظاہر ہے کہ مسئلہ کی رو سے تو افیون کی پوری اور آدھی سب ہی مقداریں حرام تھیں لیکن یہ تعلیم نہ تھی تربیت تھی جس میں چند دن ایک فعل حرام کا تحمل کیا گیا تاکہ آئندہ ہمیشہ کے لئے عادۃً بدرفتہ رفتہ چھوٹ جائے، اگر ابتدا ہی میں اکدم اسے روک دیا جاتا تو یا بیمار پڑ جاتا یا اکتا کر اس تعلیم سے بیزار ہوجاتا اور ہمیشہ افیونی رہتا، اسی طرح حضرت نانوتوی رحمہ اللہ بہت سے مریضان نفوس سے اولاً موانستہ کے ذریعہ ان کے قلوب میں قبول کی استعداد پیدا فرماتے تھے اور جب ایک حد تک پیدا ہو جاتی تو آخر میں انھیں اپنے رنگ میں رنگ لیتے چنانچہ جہاں جہاں بھی حضرت والا کی یہ مسامحت قائم ہوئی ہے وہیں آخری نتیجہ مستفید کی اصلاح نکلی ہے۔ اندریں صورت مغلوبیت حال یا مغلوبیت اخلاق پر ان واقعات کو محمول کرنے کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ انھیں حکمت تربیت کے ماتحت سمجھنا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام تو مغلوب الحال کسی حال بھی نہیں ہوتے لیکن شخصی تربیتوں میں ان کے طریق عمل میں بھی اس قسم کی سامحتوں اور ملاطفتوں کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کفار قریش حاضر

(بقیہ صفحہ آئندہ)

مگر یہ محسوس کر کے کہ ان الفاظ سے بھی صحیح مقصد غالباً ادا نہ ہو سکا، ملفوظ نگار نے یہ لکھتے ہوئے کہ "پھر فرمایا" حضرت حکیم الامت کے آخری الفاظ یہ نقل کئے گئے ہیں کہ

"فانی وہ ہے جسے یہ بھی خبر نہ ہو، کہ میں فانی ہوں"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷۷)

ہوئے تو آپ نے توقیر فرمائی۔ بعض منافقین معلوم النفاق کے ساتھ برتاؤ دوستوں کا سا تھا، محض اس رعایت سے کہ نام ان پر رفیق صحبت کا آگیا تھا بعض کفار کی عیادت کے لئے حضور تشریف لیگئے معاذ اللہ یہ مداہنت نہ تھی بلکہ ملاطفت و رحمۃ کیساتھ اخلاقی تسخیر تھی جس سے سرکش جھک گئے عرب کے مشہور پہلوان رکانہ نے دعوت اسلام سن کر کہا کہ اے محمد میں تو پہلوان ہوں اگر آپ مجھے کشتی میں پچھاڑ دیں گے تو میں آپ کی صداقت کا قائل ہو جاؤں گا آپ نے بآسانی اسے پچھاڑا اور تین دفعہ زیر کیا ظاہر ہے کہ یہ مخاطب کے احوال مزاج کی رعایت تھی، ورنہ انبیاء کا موضوع اکھاڑے اور کشتیاں نہیں ہیں، سلاطین دنیا کے نام فرامین جاری کرتے ہوئے ان کے لئے حضور نے مُہر بنوائی اور ان پر مہر لگا کر بھیجا کہ اس کے بغیر سلاطین کسی مراسلہ کو قابل التفات نہیں سمجھتے تھے یہ محض مخاطبین کے احوال کی رعایت تھی کہ کسی طرح حق قبول کریں اور انکار کی کوئی حجۃ ان کے ہاتھ میں نہ رہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض ممنوعات شرعیہ تک میں محض اس لئے مسامحۃ فرمائی تھی کہ لوگ اسی بہانہ سے دین میں داخل ہو جائیں مرے مُردوں پر رسمی نوحہ و شیون کی ممانعت پر بعض نائحہ عورتوں نے کہا کہ مجھ پر فلاں میت کے سال چھ ماہ کا نوحہ جاہلیت کا باقی ہے اُسے چھوڑ دیا جائے تو میں ہمیشہ کے لئے نوحہ سے تائب ہوتی ہوں آپ نے اجازت دیدی ظاہر ہے کہ یہ محض شخصی حربیت تھی جواز نوحہ کی تعلیم نہ تھی، ورنہ ممکن تھا کہ ۶ ماہ کے نوحہ کی بندش اسے عمر بھر نوحہ زن رکھتی۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ مجھے زنا، شراب، چوری اور جھوٹ کی عادت ہے۔ مگر یہ سب حرکتیں اکدم نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ نے اس کی عادت اور مزاج کی رعایت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اچھا جھوٹ بولنا چھوڑ دے۔ حالانکہ جھوٹ ہی کی طرح بقیہ تینوں حرکتیں بھی ممنوع تھیں مگر یہ دیکھ کر جھوٹ کا ترک ہی انجام کار یہ سب برائیاں بھی چھوڑا دے گا، حضور نے ان برائیوں سے مسامحۃ فرمائی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایک شخص کے بارہ میں عرض کیا گیا کہ وہ چوری کرتا ہے۔ فرمایا نماز بھی پڑھتا ہے یا نہیں؟ عرض کیا گیا کہ نمازی ہے۔ فرمایا کہ عنقریب اس کی نماز یہ فعل بد چھڑا دے گی، یعنی ابھی اس فعل بد کے ترک کی استعداد کمل نہیں ہوئی اس لئے اس پر دارو گیر نہیں فرمائی بلکہ مسامحۃ سے کام لیا یمن کے گورنر اور قاضی حضرت ابو موسیٰ اشعری اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما کو آپ نے فرمایا کہ یمن کی

(بقیہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ فرمائیے)

جہانتک میرا خیال ہے حکیم الامت کے یہ آخری الفاظ سیدنا الامام الکبیر قدس اللہ سرہ کی باطنی کیفیت کی صحیح ترین تعبیر ہے، اور حکیم الامت کے استاذ گرامی ہمارے مصنف امام نے

(بقیہ صفحہ ۴۷۸)

عیسائی رعایا کے سامنے اولاً توحید پیش کرنا جب وہ اسے مان جائیں تب نماز بتلانا جب اس میں بھی اطاعت کرلیں تب زکوٰۃ کا فریضہ پیش کرنا یعنی اسلام قبول کرتے ہی سارے احکام یکدم پیش نہ کرنا، ظاہر ہے کہ عائد شدہ فرائض کی وقتی تبلیغ سی مختا جو اسلام لاتے ہی یکدم سب کے سب فرض ہوجاتے ہیں اسی ترتیب کے تحت میں ہیں ورنہ تعلیمی حیثیت سے تو سب اکٹھے ہی واجب ہو چکے تھے۔ پس ان کے چند روزہ ترک اور عدم ادائیگی پر چشم پوشی مداہنت نہیں مسامحۃ اور حکمت تربیت تھی۔ شراب کی حرمت جو بادل وہلہ ہی شارع کی نظر میں حرام قطعی تھی بتدریج آئی کہ اولاً محض اسکی برائی نازل ہوئی پھر اوقات نماز میں ممنوع ہوئی پھر مطلقاً ممانعت اتری پھر اس کے مخصوص برتن بھی ممنوع الاستعمال قرار پائے، ظاہر ہے کہ حرام ہونے والی چیز ابتدا ہی سے حرام تھی مگر آخری حکم حرمت تک اس حرام کو کسی نہ کسی حد تک جائز کئے رہنا محض مزاجوں کی رعایت تھی اگر ان شراب کے پشتینی خوگردں سے یکدم شراب چھوڑنے کیلئے کہا جاتا تو باستثناء خواص یا تو لوگ اس حکم کو قبول ہی نہ کرتے یا دلتنگی سے قبول کرتے اور شارع کو حکمت تشریع اور حکمت تربیت کے ماتحت دونوں سے بچنا تھا اس لئے اس ناجائز چیز کا کچھ عرصہ تحمل کیا جاتا رہا۔ بہرحال واجبات و ممنوعات کا یہ تجربہ اور اجزاء میں یہ مسامحہ معالجۂ نفوس کا ایک نفسیاتی اصول ہے جسے اطباء روح طب روحانی میں اور اطباء بدن طب جسمانی میں استعمال کرتے آئے ہیں، اس میں غلبۂ حال کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ پس حضرت والا کا مستفیدین و سالکین کے ساتھ ملاطفت کا یہ رویہ حکمت تربیت کے ماتحت ایک ارادی اور شعوری عمل تھا اور اگر یہ حال بھی تھا تو بمعنی سکر نہ تھا بلکہ بمعنی جذبہ و داعیہ تھا!

دوسرے یہ کہ اصول تربیت کے استعمال میں مربیوں کی طبعی افتاد کو بھی کافی دخل ہوتا ہے، ان کے طریق سے انکی طبیعت جدا نہیں ہوسکتی۔ جیسے انبیاء علیہم السلام کی طبیعت ہی پر شریعت اتری ہے اور اسی لئے احکام شرعیہ اور ان کے تحمل و ادا میں نبی کا طبعی رنگ بھی جھلکتا رہتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام بالطبع جلالی طبیعت رکھتے تھے تو ان کی شریعت میں جلال و تشدد کا رنگ موجود ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام جمالی طبیعت رکھتے تھے تو ان کی شریعت میں بھی تساہل و نرمی کی شان پائی جاتی تھی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اعدل المزاج اور اعدل الطبیعت ہیں تو آپ کی شریعت کے ہر حکم میں وہی عدل و کمال نمایاں ہے ایسے ہی اولیاء کے علوم و اخلاق اور تعلیم و تربیت کے بارہ میں جو خواطر و الہامات ان کی طبائع پر اترتے ہیں وہ بھی فطرۃً الگ طبع لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ بالطبع حلم و کرم و رحمۃ و رأفت کے مجسمہ تھے، ۱ : حسب روایت حکیم الامۃ تھانوی قدس سرہٗ جب مولانا محمد یعقوب صاحب سے پوچھا گیا کہ کتابیں آپ نے بھی وہی پڑھی ہیں جو حضرت نانوتوی نے پڑھی ہیں۔ پھر آپ دونوں ایک ہی استاذ کے شاگرد اور ایک ہی شیخ کے مرید ہیں۔ پھر حضرت نانوتوی میں یہ علوم کہاں سے آئے جو دوسروں میں نہیں پائے جاتے (باقی صفحہ آئندہ پر)

اسی حقیقت کا اظہار ان لفظوں میں جو فرمایا ہے یعنی سیدنا الامام الکبیر کے کمالات کا تذکرہ کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے کہ

(بقیہ صفحہ ۴۷۹) جواباً ارشاد فرمایا کہ اس کی کئی وجوہ ہیں، بڑی وجہ یہ ہے کہ مولانا نانوتوی کے دماغ کی ساخت اور طبیعت کی افتاد ہی ایسی تھی کہ اس پر یہی علوم فائز ہوسکتے تھے بس ظاہر ہے کہ جس ظرف میں کوئی چیز بھری جائیگی وہ ظرف کی خصوصیات سے الگ نہیں رہ سکتی۔ اس لئے حضرت کے تربیتی معارف کا طبعاً وہی رنگ ہونا ضروری تھا جو ان کی طبیعت کا تھا، اور طبیعت خلقۃً حلم وکرم اور رحمۃ ورأفت کے ساتھ کمال جامعیت سے بھرپور تھی اس لئے اس افادہ میں شفقت ورحمۃ کے ساتھ جامعیت اور ہمہ گیری کا بھی طبعاً غلبہ تھا، میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ فروعی اختلافی مسائل میں فرماتے اور یہی عمل بھی تھا کہ بیان مسئلہ تو کردیا جائے لیکن طبیعات سے دست وگریبان ہوکر محاذ نہ بنایا جائے، اور فرماتے کہ فی زمانہ کفار کا غلبہ ہے وقت نہیں ہے کہ مسلمانوں میں تفریق کو ہوا دی جائے جس سے ان کا کلمہ متفرق ہوکر مزید ضعف پیدا ہو بلکہ توڑنے کے بجائے جوڑنے کی فکر کی جائے۔ اسی بناء پر جماعت دیوبند کے ایک مفکر عالم (مولٰنا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ) حضرت گنگوہی کا لقب فقیہ اسلام اور حضرت نانوتوی کا حکیم اسلام بیان کیا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں بزرگوں کے کارنامے ان کے انہی القاب کے تحت میں ہیں۔ حضرت نانوتوی عموماً مجاہدانہ رنگ سے سد ثغور اور سرحدات اسلام کی حفاظت کرتے تھے کہ اغیار کا اس پر غلبہ وتسلط نہ ہونے پائے اس کا قدرتی اثر اپنوں کے ساتھ خواہ وہ نام ہی کے اپنے ہوں مسامحۃ ورواداری اور ملاطفت ہونا ہی چاہئے تھا اور حضرت گنگوہی خالص اپنوں کی تربیت فرماتے تھے اس کے لئے قدرتاً سخت گیری اور مربیانہ گھوٹ کی ضرورت تھی یہ دونوں شانیں درحقیقت انبیاء علیہم السلام ہی کی ہیں ایک اغیار کو اندر لانا اور بیرونی معاندین سے دینی سرحد کی حفاظت کرنا اور دوسرے اندر آئے ہوئے افراد کی تربیت کرکے ان میں رنگ پیدا کرنا، پہلی چیز حکمت سے سرزد ہوتی ہے اور دوسری تفقہ نفس سے پہلی شان کے لئے حکمت کیساتھ وسعت ہمہ گیری اور جامعیت کی ضرورت ہے اور دوسری شان کے لئے تفقہ کے ساتھ جمعیت اور تمکن کی ضرورت ہے اس لئے نبوۃ کی ان دونوں شانوں کو قدرتی اصول کے تحت اصولی شان کہا جائے گا غلبۂ حال سے تعبیر نہیں کیا جائیگا، اور اگر غلبۂ حال بھی کہا جائیگا تو یہ غلبۂ حال بمعنی سکر نہیں بلکہ غلبہ بمعنی رنگ طبع ہوگا، پس جبکہ یہ حضرات اپنی انہی طبیعتوں سے تربیت کی تدبیریں مجتہدانہ رنگ سے پیدا کرتے تھے تو نہ ان کے اجتہادات سے انکی طبیعت الگ رہ سکتی تھی اور نہ اجتہادات رنگ طبع سے کبھی خالی رہ سکتے تھے، اس لئے اگر اس طبعی رفتار کو غلبۂ حال بھی کہا جائیگا تو بمعنی رنگ طبع کہا جائیگا بمعنی سکر ومغلوبیت نہیں کہا جائیگا۔ حاصل یہ ہے کہ غلبۂ حال کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ کسی ایک حال سے مغلوب ہوکر دوسرے احوال صادقہ سے ذہول اور غفلت ہوجائے جسے صوفیاء کی اصطلاح میں سکر کہتے ہیں اور اکثر وبیشتر اسی حال کے آثار میں سے صوفیاء کی وہ شطحیات بھی ہیں جو بظاہر قواعد شرعیہ کے خلاف دکھائی دینے کے باوجود قابل تاویل سمجھی جاتی ہیں، دوسرے معنی یہ کہ ایک خاص حال غالب ہونے کے باوجود (بقیہ صفحہ آئندہ)

اللہ تعالیٰ نے اس کمال پر یہ ضبط عنایت فرمایا کہ کبھی کوئی کلمہ خودستائی کا یا کسی طرح کوئی صورت عونت
یا خودبینی کی خلوت جلوت تنہائی مجمع اپنے بیگانوں میں کبھی ظاہر نہیں ہوتی تھی (سوانح قدیم ص۴)

اگرچہ اس کا مطلب بھی وہی ہے، لیکن ہمارے مصنف امام کے کلام میں "ضبط" کا لفظ جو شریک ہو گیا۔ شاید اس سے غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ اس قسم کے رجحانات جیسے عام لوگوں میں تموج پذیر رہتے ہیں، سیدنا الامام الکبیر کے نفس میں بھی ابھرتے تھے لیکن ضبط کی قوت سے کام لے کر ان رجحانات کو ظاہر ہونے نہیں دیتے تھے، ہمارے مصنف امام کے تلمیذ رشید مولٰنا اشرف علی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی جب شہادت ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے اندر سے یہ چیزیں اس طریقہ سے فانی ہو چکی تھیں، کہ خود ان کے فانی ہو جانے کا احساس بھی ان میں باقی نہ رہا تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کے استاذ کے کلام کا مطلب بھی وہی لیا جائے، اور سمجھا جائے کہ "ضبط" کا لفظ عموماً تعریف کے مواقع میں چونکہ استعمال ہوتا ہی تھا ان کے قلم پر بھی وہی آگیا ورنہ مراد ان کی بھی وہی تھی کہ خلوت و جلوت تنہائی و مجمع اپنوں اور بے گانوں" میں کبھی کوئی چیز آپ کے اندر سے ایسی نہیں نکلی جو بتاتی ہو کہ کسی قسم کا کوئی ہلکا سا اثر "خودی" کا آپ میں باقی رہا تھا گویا جس حد تک کمالات سے حق تعالیٰ نے آپ کو سرفراز فرمایا تھا، اسی حد تک آپ پر یہ احساس دوامی طور پر ہر حال میں مسلط رہتا تھا کہ میرا کچھ نہیں ہے۔ سب اس کا ہے جو ان کمالات کو تقسیم فرماتا رہا ہے۔

اور یہ احساس تو کمالات کے متعلق تھا، کہ ان کے فانی ہونے کا احساس بھی آپ میں باقی نہ رہا تھا، یعنی یہ نہ تھا کہ اپنے کمالات کا خیال آتا تھا، اور پھر اس کی نفی فرماتے تھے، بلکہ یہ خیال ہی کلیۃً آپ کے اندر سے نکل چکا تھا کہ کسی قسم کا کوئی کمال بھی میرے اندر پایا جاتا ہے "فانی وہ ہے جسے اس کی خبر نہ ہو کہ میں فانی ہوں" حکیم الامت کے اس حکیمانہ فقرے کا یہی مطلب ہے برخلاف اسکے اپنی "بے کمالی" کے متعلق آپکی جو اندرونی کیفیت تھی شاید کسی موقعہ پر اس کا ذکر گذرا

(حاشیہ بسلسلہ ص۴) دوسرے احوال ضرور یہ ہیں نہ غفلت ہو نہ ہول اس حال کو شرعی اصطلاح میں شرح صدر استقامت اور تمکین وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے حضرت تھانوی قدس سرہ کی مراد غلبۂ حال سے یہی شرعی حال ہے جو طبیعت کی استقامت کا اوبھار ہے صوفیاء کی اصطلاح میں سکر

بھی ہے بہر حال جن واقعات کا تذکرہ اس سلسلہ میں کرچکا ہوں ان سے سمجھنے والے جو کچھ سمجھ سکتے ہیں وہ تو خیر سمجھنے کی چیز ہے لیکن اس سے زیادہ بین اور روشن شہادت اور کیا ہوسکتی ہے جو کسی مرید و معتقد یا نیاز مند شاگرد کی نہیں بلکہ آپ کے علمی رفیق اور معاصر جو حضرت مولنٰنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی ارواح ثلاثہ میں نقل کی گئی ہے یاد ہوگا، رامپور منہیاران میں ان دونوں حضرات (مولنٰنا گنگوہی و مولنٰنا نانوتوی) کے ایک دوست حکیم ضیا[۱] الدین صاحب مرحوم تھے، اس قصبہ میں ایک خاندان تھا، جو ان حضرات سے للّہی بغض رکھتا تھا، بیان کیا جاتا ہے کہ حکیم ضیار الدین صاحب سے ملنے کے لئے جب سیدنا الامام الکبیر رامپور جاتے، تو ان للّہی بغض رکھنے والوں کے گھر بھی ضرور تشریف لے جاتے، ایک دفعہ مولنٰنا گنگوہی کی معیت میں رامپور آنا ہوا، اور حسب دستور آپ ان مخالفوں کے یہاں بھی گئے، حکیم ضیا الدین صاحب مرحوم کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا، اور مولنٰنا گنگوہی سے کہنے لگے کہ دیکھئے ان مفسدہ پردازوں کے یہاں مولنٰنا نانوتوی پھر تشریف لے گئے، حکیم صاحب کو غیر معمولی طور پر متأثر پاکر حضرت گنگوہی نے اس وقت یہ کہتے ہوئے کہ

"حکیم صاحب! آپ کیا فرما رہے ہیں، آپ ان کے (سیدنا الامام الکبیر) کے قلب کی حالت ملاحظہ نہیں فرماتے"۔

آگے جو گواہی قلب قاسمی کے متعلق دی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کمالات سے فانی ہونے کے ساتھ

---

[۱] مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوری رحمۃ اللہ علیہ حضرت گنگوہی اور حضرت نانوتوی کے مخصوص دوستوں اور احباب میں سے تھے آپ حضرت محمد ضامن صاحب شہید رحمہ اللہ کے خلفاء میں سے تھے اور حضرت حافظ صاحب شہید حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ کے پیر بھائی اور نہایت ذوی النسبتہ حضرات میں سے تھے حتیٰ کہ حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی قدس سرہٗ نے وفات کے وقت حضرت حاجی امداد اللہ کو حضرت حافظ صاحب کے سپرد کیا تھا کہ اپنے چھوٹے بھائی کا خیال رکھنا۔ حضرت حافظ صاحب شہید ہی کے ہاتھ میں یوم جہاد شاملی میں علم تھا اور آپ پر شہادت کے جذبہ کی ایک غالب کیفیت طاری تھی چنانچہ آپ کی شہادت ہوتے ہی جہاد کا قصہ ختم ہوگیا۔ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ تکوینی طور پر جہاد کا قصہ ہی حضرت حافظ صاحب شہید کی شہادۃ کے لئے اٹھایا گیا تھا۔ اس کے ہوتے ہی جہاد ختم ہوگیا۔ ان ہی حضرت شہید کے خلیفۂ ارشد حضرت حکیم ضیاء الدین صاحب رحمہ اللہ تھے جو احقر کے دادا خسر ہوتے ہیں۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

(محمد طیب غفرلہٗ)

بے کمالی کے احساس وشعور میں آپ کے قلب مبارک کا کیا رنگ تھا. حضرت گنگوہی نے فرمایا تھا کہ

"جس شخص کو قلب میرا ایمان کی طرح یہ راسخ ہو چکا ہے کہ دنیا میں اس سے زیادہ ذلیل وخوار کوئی ہستی نہیں ہے"

یہ معمولی الفاظ نہیں ہیں، ایک محدث ثقہ وحجت کے الفاظ ہیں "ایمان کا رسوخ" یقین واذعان کے جس درجہ کی تعبیر ہے اس کو سوچئے اور اس کے بعد غور کیجئے کہ حضرت گنگوہی جیسی ہستی کی یہ شہادت ہو کہ کسی خاص طبقہ یا جماعت ہی میں نہیں بلکہ "دنیا میں اس سے زیادہ ذلیل وخوار ہستی کوئی نہیں ہے" اس کا یقین، ایمانی یقین کی طرح حضرت والا میں جاگزیں اور راسخ تھا، کیا اس کے بعد بھی بے کمالی کی یافت وشعور کا کوئی درجہ باقی رہتا ہے، کمالات سے خالی ہونے کی یہ کیفیت کہ خالی ہونے کا احساس بھی غائب ہو چکا ہے، اور بے کمالی کے یقین واذعان کا یہ حال کہ یقین واذعان کا جو آخری نقطہ ہو سکتا ہے. وہاں تک اس کا یقین ترقی کرکے پہونچا ہوا ہے، اور اسی سے شرح ہوتی ہے ان واقعات کی جن کا ذکر بطور مثال کے آپ کے سامنے کیا گیا، وہ جزئیات تھے، دراصل اسی کلی حقیقت کے "یہی بنیاد" تھی جس پر آپ کی زندگی کی تعمیر کھڑی تھی، اسی کا نتیجہ تھا کہ دوست تو دوست دشمنوں کی بھی تحقیر برداشت سے باہر ہو جاتی تھی، بدوضع انسانوں تک کو خدمت والا میں حاضری کی جرأت پیدا ہو جاتی تھی، کبھی نہ نماز پڑھنے والے حافظ جی کے لئے میل جول کی گنجائش نکل آتی تھی،

بہرحال اس زمانہ میں کدوکاوش، کسب وکوشش سے ہندوستان کے عام مولوی جن کمالات کو حاصل کرتے تھے سیدنا الامام الکبیر کو حالانکہ جبلۃً بھی اور کسباً بھی سب ہی میں کافی حصہ ارزانی ہو چکا تھا، انتہا یہ ہے کہ خط کی تحسین وتزئین کو اس عہد کے علمی حلقوں میں حالانکہ چنداں خاص اہمیت حاصل نہ تھی، بلکہ پنجاب وسرحد کے علماء کے متعلق سنا جاتا ہے کہ ان میں اکثر کا حال یہ تھا کہ ساری کتابیں ختم کر چکے ہیں، ان کو پڑھا رہے ہیں، لیکن ابتدائی حروف نویسی سے بھی عموماً وہ عاجز ہوتے تھے. کچھ لکھنے کی ضرورت پیش آتی. تو کسی نویسندہ سے اس کام کو لیتے، مگر اس زمانہ کے اس غیر اہم شعبہ میں بھی سیدنا الامام الکبیر کو امتیاز کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا. قصص الاکابر میں حضرت تھانوی نے ہمارے مصنف امام کا یہ قول حضرت

والا کے خط کی نوعیت کے متعلق نقل فرمایا ہے وہ کہتے تھے کہ[۱]

"مولانا محمد قاسم صاحب کا خط تو نہایت صاف تھا، نقطے و شوشے تک سب پورے پورے ہوتے تھے۔" (بحوالہ الہادی رجب ۵۰ھ)

اور جو حال ظاہری کمالات کا تھا آپ سن چکے کہ وہی کیفیت باطنی نعمتوں کی بھی تھی، الغرض اندر باہر سب بھرا ہوا تھا، لیکن جتنا زیادہ بھرا جاتا تھا، اسی قدر ان سے خالی ہونے کے احساس کو اپنے اندر پختہ کرتے ہوئے اس نقطہ تک پہنچ گئے تھے کہ اس احساس کا احساس اور شعور بھی بقول حکیم الامت تھانوی آپ میں باقی نہ رہا تھا. مختلف حیثیتوں سے حضرت والا کے اس قسم کے اقوال کہ دو حرف کے جاننے کی تہمت نہ لگی ہوتی تو اپنے آپ کو ایسا مٹاتا، کہ دنیا یہ بھی نہ جانتی کہ قاسم نامی کوئی آدمی پیدا ہوا تھا، یہ اور اسی کے قریب قریب اس سلسلہ میں قولی و عملی شہادتیں اس کثرت سے نقل کر چکا ہوں کہ شاید پڑھنے والے اکتا چکے ہوں گے، مگر کیا کروں، باتوں میں باتیں یاد آتی چلی جاتی ہیں، حضرت والا کے مشہور تلمیذ رشید مولانا عبد العلی مرحوم محدث مدرسہ عبد الرب دہلی کی زبانی سوانح مخطوطہ کے مصنف نے یہ روایت نقل کی ہے کہ میرٹھ میں حضرت نانوتوی سے ہم لوگ جب پڑھتے تھے، اور مخلوق خدا آپ کی طرف پلی پڑتی تھی، تب ایک دن گھبرا کر آپ نے اپنے شاگردوں کو جمع کر کے فرمایا کہ بھائی! اس مصیبت سے نجات کی کوئی صورت تم ہی

---

[۱] میری مراد مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ سے ہے، حضرت تھانوی اسی موقعہ پر ان ہی کا یہ دلچسپ لیکن حکیمانہ قول لوگوں کو سنایا کرتے کہ مولانا محمد یعقوب فرمایا کرتے تھے کہ دو باتیں مجھے سخت ناپسند ہیں، ایک تو تقریر میں لغت بولنا، دوسری تحریر میں شکستہ لکھنا، ناپسندیدگی کی وجہ یہ بیان فرماتے کہ تقریر و تحریر سے مقصد یہ ہے کہ اپنے دل کی بات دوسروں تک پہونچائی جائے، مگر لغت بول کر اور شکستہ لکھ کر بجائے افہام کے ابہام ہی میں زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے اور جو مقصد ہے وہ حاصل نہیں ہوتا، اور یہ واقعہ ہے کہ شکستہ حروف لکھنے کی عادت کا نتیجہ ہے کہ بیسیوں تحریریں اس زمانہ میں جن سے فائدہ حاصل کیا جا سکتا تھا، غیر مفید بن کر رہ گئی ہیں، گویا ان شکستہ حروف کے پڑھنے میں اسی قسم کی دشواریاں پیش آتی ہیں، جن کا تجربہ آجکل ہندی حروف کے پڑھنے میں ہو رہا ہے، اکبر مرحوم نے جس کی طرف اپنے مشہور شعر میں اشارہ کیا ہے کہ ع "بس کہ تھا نامہ اعمال مرا ہندی میں"۔

لوگ نکالو، مولانا عبد العلی کے الفاظ ہیں کہ حضرت نے حکم دیا کہ

" مجھے اس خلجان سے (جس میں مخلوق کی آمد و رفت کی وجہ سے) مبتلا ہو گیا ہوں چھڑاؤ"

اور فرمایا کہ

"میری عقیدت لوگوں کے دلوں سے نکالو ۔"

عقیدت پیدا کرنے کی کوشش کے مقابلہ میں عقیدت کے نکالنے کی مہم پر اپنے شاگردوں کو آمادہ کرنا، اور اس قدغن کے ساتھ بجد ہو کر ان کو مجبور کرنا کہ عقیدت مندوں کا یہ گروہ واقعی ازالۂ عقیدت کی اس مہم میں مشغول ہو گیا، مولانا عبد العلی کہتے تھے کہ ہم لوگوں نے یہ قاعدہ بنا لیا تھا کہ جہاں اس قسم کا کوئی آدمی حضرت سے ملنے آتا، تو دروازے ہی پر روک کر ہم لوگ اس کو سمجھاتے کہ

ارے بھائی! تو کس دھوکے میں ہے، مولوی صاحب (یعنی سیدنا الامام الکبیر تو) نرے مُلّان ہیں، یہ کیا جانیں فقیری کس کو کہتے ہیں، اگر تم کو کسی فقیر کی تلاش ہے تو کسی اور بزرگ کی خدمت میں جاؤ، یہاں کیا لوگے"۔ (ص ۳۵ سوانح مخطوطہ)

حاجی محمد عابد صاحب مرحوم جو دار العلوم دیوبند کے سب سے پہلے مہتمم ہوئے ہیں وہ بھی سیدنا الامام الکبیر کی زبان مبارک سے سنے ہوئے، یہ الفاظ نقل کیا کرتے تھے کہ

"اگر میں یہ جانتا کہ پڑھ لکھ کر یہ دقتیں پیش آئیں گی (یعنی لوگ میرا پیچھا کریں گے تو) میں نہ لکھتا، نہ پڑھتا، صرف سیدھی سادی، نماز روزے کے مسائل سیکھ لیتا" (سوانح مخطوطہ ص ۳۶)

یہ اور اس کے سوا جو کچھ بھی اس وقت تک آپ کے سامنے پیش ہو چکا ہے، اس کو سامنے رکھتے ہوئے میں ہر پڑھنے والے سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر کو عملی زندگی کے جن میدانوں میں سرگرم کار دم واپسیں تک پایا گیا۔ ان میں آپ خود اترے تھے، یا اتارے گئے تھے ان روشنوں میں نے بجز آخری شق کے پہلی شق کے تصور کی کسی قسم کی گنجائش باقی رہی ہے کم از کم میرا ذاتی خیال تو یہی ہے اور یہی محسوس ہوتا ہے کہ جس حد تک اپنے آپ کو چھپانے اور گم کرنے کی کوشش وہ کرتے رہے، اسی حد تک انکو نمایاں کرنیوالا، اور رفع ذکر کی نعمت سے سرفراز کرنیوالا انکو باہر نکالتا چلا جا رہا تھا گویا قرآنی

| آیت۔ واللہ مخرج ما کنتم تکتمون | اور اللہ نکال کر رہتا ہے اس چیز کو جسے تم چھپاتے تھے۔ |
|---|---|

جس کی تفسیر کرتے ہوئے مشہور صحابی حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بیان کیا کرتے تھے۔

| لو ان رجلاً عمل فی صخرۃ صماء لا باب فیھا ولا کوۃ تخرج عملہ الی الناس کائنا ما کان (رواہ احمد والحاکم وصححہ) | اگر آدمی کسی ایسی ٹھوس چٹان کے اندر گھس کر کوئی عمل کرے جس میں نہ کوئی دروازہ اور نہ دریچہ، تو اسکا عمل بہر حال لوگوں کے درمیان نکل کر آجاتا ہے، خواہ وہ کوئی ہو اور کسی قسم کا عمل ہو۔ |
|---|---|

ہم اس کی زندہ عملی مثال سیدنا الامام الکبیر کی ذات مبارک کو پاتے ہیں انھوں نے جس حد تک اپنے آپکو گھٹانے کی کوشش کی، بڑھانے والا ان کو اسی نسبت سے بڑھاتا چلا گیا، پست اور نیچے ہونے کی ساری تدبیروں کو بلندی بخشنے والا ان کو بلندی ہی عطا کرتا جاتا تھا، زندگی کے عملی میدان میں سب سے پہلے ان کو اس وقت اتارا گیا جب والدین نے ان کو متاہل کرنا چاہا، عملی زندگی کی گویا سمجھنا چاہیے کہ اسی سے ابتدا ہوئی، آیئے اور دیکھئے کہ عمل کے اس پہلے میدان میں وہ کس طرح اترے یا اتارے گئے۔

**تاہل کی زندگی** سچ پوچھئے تو اس خاک دان ارضی میں قدم رکھنے کے بعد ذمہ داریوں کا واقعی بار آدمی پر اسی وقت پڑتا ہے جب بجائے ایک کے وہ دو بنا دیا جاتا ہے، بار پڑتا بھی ہے اسی کے بعد، اور زندگی ایک بوجھ ہے اس کا احساس بھی عموماً دلوں میں ازدواجی زندگی کی منزل میں داخل ہونے کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے، اب آدمی سمجھتا ہے کہ مجھ پر کچھ لادا گیا ہے[1]۔

باوجود تلاش و جستجو کے اس کا پتہ نہ چل سکا کہ سیدنا الامام الکبیر کس عمر میں بیاہے گئے، آپ کے عقد کی تاریخ تو تاریخ سن تک کے متعلق ہم کوئی متعین بات نہیں کہہ سکتے، کچھ قرائن و قیاسات سے بمشکل یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترکوں کی جو جنگ روم وروس کی جنگ کے نام سے مشہور ہے، اور مسلمانان ہند میں پہلی دفعہ "خلافت اسلامیہ" کی اعانت و امداد کا جذبہ اسی جنگ کے سلسلے میں زندہ ہوا تھا، ترکی کی امداد کے لئے

[1] بعض ظریفوں کا یہ فقرہ جو مشہور ہے کہ آدمی درحقیقت اسی وقت تک آدمی رہتا ہے، جب تک دو ٹانگوں پر چلتا ہے۔ لیکن اس کی زندگی میں بیوی شریک ہو کر بجائے دو پایہ کے اسے چوپایہ بنا دیتی ہے ۔۱۲

چندہ کی ابتدا اسی روم و روس کی جنگ سے ہوئی جیسا کہ معلوم ہے کہ اس جنگ کا خاتمہ ۱۸۵۳ء مطابق ۱۲۷۰ھ میں روس کی شکست پر ہوا تھا، اسی سال یا اس سے چند ماہ آگے پیچھے جب حساب سے ۲۳ اور ۲۴ سال کے درمیان حضرت والا کی عمر ہوگی آپ کی زندگی کے اس نئے دور کا غالباً آغاز ہوا، یہ نتیجہ کس چیز سے نکالا گیا ہے، اس کا ذکر آگے آرہا ہے لیکن اس سے پہلے آپکے ازدواجی تعلق کی ابتدا کے متعلق منتشر طریقہ سے جو باتیں مجھ تک پہنچی ہیں مناسب ہے کہ ان کو پہلے سن لیا جائے۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ خوش قسمتی اور حسن اتفاق سے سیدنا الامام الکبیر کو اپنے والدین کے ظل عاطفت سے مستفید ہونے کا کافی موقعہ ملا گویا جن بلند اختر ماں باپ کی گود میں امت اسلامیہ ہندیہ کی یہ ذات ایک ننھے معصوم بچے کے قالب میں سپرد کی گئی تھی دونوں اپنے اس بچہ کو ان سارے فضائل و کمالات سے آراستہ و پیراستہ دیکھ کر دنیا سے رخصت ہوئے جنہیں ہم قاسمی کمالات وفضائل کے نام سے موسوم کرتے ہیں جس سے تقریباً ایک صدی سے مسلمانان عالم نفع حاصل کر رہے ہیں

آپ کے والد بزرگوار شیخ اسد علی صاحب مرحوم اور آپ کی والدہ ماجدہ بی بی حبیبہ نور اللہ مرقدھا کا تذکرہ مقدمہ میں کر چکا ہوں، بالوالدین احسانا اور اطاعت والدین کے قرآنی حکم کی تعمیل میں جو عملی نمونے آئے دن حضرت والا کی طرف سے پیش ہوتے رہتے تھے، اس وقت کون جانتا تھا کہ ان نمونوں کو آئندہ چل کر تاریخ تلاش کرے گی، ورنہ ان کو اگر جمع کر دیا جاتا تو اس قانون کی عملی حدود کے جاننے اور پہچاننے میں بڑی مدد ملتی، تاہم دوسری روایات وقصص کے سلسلے میں ذیلاً بعض نمونوں کا ذکر جو لوگوں نے کیا ہے۔ اندازہ کرنے کے لئے وہ بھی بہت کچھ ہیں۔ اور سب سے زیادہ فی الحال یہاں ان کے درج کرنے سے یہ ہے کہ نکاح کے متعلق واقعہ کا تذکرہ لوگوں نے کچھ اس طرح کیا ہے جس سے غلط فہمی کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔

مقدمہ میں آپ مجھ سے یہ سن چکے ہیں یاد ہوگا کہ حضرت والا کے پدر والا گہر شیخ اسد علی صاحب نے عربی اور اسلامی دینیات کی تعلیم تو حاصل نہیں کی تھی، لیکن اس زمانہ میں حکومت کی جو دفتری زبان فارسی تھی، اسمیں کافی دستگاہ رکھتے تھے، انھوں نے یہ تعلیم دلی میں پائی تھی لیکن وطن نانوتہ واپس ہو کر زمینداری کے جھگڑوں

یں کچھ اس طرح مبتلا ہوئے اور قصباتی زندگی کا رنگ ان پر کچھ اتنا غالب ہوا کہ دیکھنے والوں کے نزدیک معلوم ہوتا تھا کہ شاید کچھ زیادہ لکھے پڑھے نہیں ہیں، وضع قطع، طریقہ بود و ماند نشست و برخاست بول چال سب ہی میں ضلع سہارنپور کے قصباتی باشندوں کی خصوصیتیں ان میں نمایاں تھیں، لیکن جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے۔ سیدنا الامام الکبیر نے اول سے آخر تک اس زمانے میں بھی جب سارا ہندوستان آپ کے غیر معمولی کمالات کے چرچوں سے گونج رہا تھا، اور ؎

ہر کجا بوئے خدا می آید      خلق میں بے سرو پا می آید

کا منظر پیش ہو چکا تھا۔ اس وقت بھی ہمیشہ اپنے والد مرحوم کے ساتھ احسان و اطاعت کے قرآنی حکم کی تعمیل میں کسی قسم کی کوتاہی کیا معنے، شاید کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ سفر سے حضرت والا جب نانوتہ تشریف لاتے تو دستور تھا کہ گھر سے پہلے کچھ دیر کے لئے مسجد میں قیام فرماتے، واپسی سفر کی نفل ادا کرتے، ادھر برادری والوں اور قصبہ کے عام باشندوں کے کان میں آپ کی تشریف آوری کی خبر جس وقت پہنچی سب بے تحاشا مسجد کی طرف دوڑ پڑتے کافی مجمع ہو جاتا، اسی عام بھیڑ میں دوسروں کے ساتھ ملے جلے آپ کے والد بھی کھڑے ہوتے، جوں ہی حضرت والا کی نظر ان پر پڑتی تو راوی کے الفاظ ہیں:

"گھبرا کر لپکتے"

پھر جانتے ہیں آگے جو تماشا دیکھا جاتا تھا، وہ کیا ہوتا تھا، راوی کا بیان ہے کہ سیدنا الامام الکبیر اپنے والد بزرگوار کے

"قدموں پر گر جاتے"

اور اس کی بالکل پروا نہ کرتے کہ کون دیکھ رہا ہے، یا دیکھنے والے مجھے کیا سمجھتے ہیں، اور اس کا اقتضاء کیا ہے، کہتے ہیں کہ پھر والد کے قدموں سے سر اٹھاتے، اور

"ان کے ہاتھ کو چومتے"

اس موقعہ پر شیخ اسد علی صاحب اپنے بچے سے عموماً یہ فرماتے ہوئے کہ "بیٹا اچھے ہو" غالباً اپنی زندگی کی آخری نوں میں بھی کہا کرتے

"اب تو تم سفر میں بہت رہنے لگے! بیٹا ہمارا آخری وقت ہے اب تو ہمارے پاس ہی کہیں نہ جاؤ"

والد کی اس آرزو کو سن کر سیدنا الامام الکبیر فرماتے

"باداجی! جیسا حکم ہوگا، اسی کی تعمیل کی جائے گی"

لیکن شیخ صاحب نے اپنی آرزو کو کبھی حکم کا قالب عطا نہیں کیا "حکم" اور "آرزو" میں جوہری فرق ہے۔ اس کو اچھی طرح یاد رکھنا چاہئے، جس کو حکم دیا جاتا ہے، مطلب اس وقت حکم دینے والے کا یہ ہوتا ہے کہ اپنی خواہش اور اپنے ارادہ و اختیار سے دست بردار ہو کر میری مرضی کی پابندی ہو چلو، برعکس اس کے آرزو میں دست برداری کا سوال ہی نہیں ہوتا، بلکہ جس سے آرزو کی جاتی ہے اسکے معاملہ کو اس کی خواہش اس کے ارادے اور اختیار کے ساتھ وابستہ رکھا جاتا ہے، حضرت کے والد مرحوم آرزو اور تمنا کی شکل میں اپنی خواہش پیش کرتے رہے، اور حضرت چاہتے تھے کہ حکم دیں اور اس وقت جیسا کہ فرماتے تھے کہ "اسی کی تعمیل کی جائے گی" اس کے سوا اور کسی دوسری صورت کا امکان ہی نہ تھا! اور یہ تقاضا تو سفر سے واپسی کے بعد پیش ہوتا تھا، پھر جتنے دنوں تک نانوتہ میں حضرت والا کا قیام رہتا، تو یہ دوامی قاعدہ تھا کہ مسجد سے سیدنا الامام الکبیر جب گھر تشریف لاتے، تو سب سے پہلے شیخ صاحب (اپنے والد) کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت فرماتے کہ

"باداجی! آپ کی چلم میں آگ بھی ہے یا نہیں"

بوڑھے شیخ صاحب فرماتے کہ

"بھائی! بڑی دیر سے یوں ہی ٹھنڈا رکھا ہوا ہے"

اس پر حضرت یہ فرماتے ہوئے کہ "لائیے میں لاؤں" حقے کو اٹھاتے، اسے تازہ کرتے، اور والد کی خدمت میں تیار کر کے پیش فرما دیتے کہتے ہیں کہ بعض لوگ شیخ صاحب کو کبھی کبھی ٹوک دیا کرتے کہ اتنے بڑے بزرگ عالم سے آپ حقہ بھروانے کی خدمت لیتے ہیں، لوگوں کے کہنے سے شیخ صاحب کبھی کبھی متأثر بھی ہو کے کبھی کبھی اپنے اس تأثر کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے کہ

"بھائی! لوگ کہتے ہیں کہ ایسا مت کیا کرو، تم چلم نہ بھرا کرو"

جواب میں اپنے سعادت مند فرزند کی زبان مبارک سے یہ الفاظ سنتے کہ

"باواجی! لوگوں کو کہنے دیجئے، میں آپ کا بیٹا ہوں اور ادنیٰ غلام ہوں"[1]

حضرت والا کے لخت جگر نور نظر حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ جنھوں نے اپنے دادا شیخ اسد علی مرحوم کو اچھی طرح دیکھا تھا' ان کی وفات حافظ صاحب کے سامنے دیوبند ہی میں ہوئی، اسی لئے اب جس روایت کو میں درج کر رہا ہوں۔ بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حافظ صاحب کی غالباً یہ چشم دید شہادت ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند جب قائم ہو چکا تھا' اور اسی وجہ سے مولانا کا قیام زیادہ تر دیوبند ہی میں رہتا تھا' تو اپنے بیٹے سے ملنے کے لئے بھی اور یوں بھی شیخ صاحب کے رشتہ دار اور احباب دیوبند میں تھے۔ ان سے ملنے جلنے کے لئے ایک دفعہ دیوبند تشریف لائے۔ عمر کافی تھی بیمار پڑ گئے، حضرت کی سسرال دیوان محلہ کی بیٹھک میں مقیم تھے۔ ان کے بیمار ہو جانے کی وجہ سے سیدنا الامام الکبیر اپنی قیام گاہ چھتہ کی مسجد کو چھوڑ کر دیوان محلہ کے اسی مکان میں رہنے لگے، صرف نماز کے لئے مسجد جاتے، اور کبھی یہ بھی فرما دیتے کہ

"شریعت کی طرف سے مجھے رخصت ہے کہ میں خدمت والد کروں' اور یہیں نماز ادا کر دوں' تم لوگ نماز مسجد میں پڑھ آؤ" ۱۲

نیاز مندوں کے لئے حضرت والا کی یہ تجویز نا قابل برداشت ثابت ہوئی اور طے کیا گیا کہ شیخ صاحب مرحوم کو کیوں نہ وہیں چھتہ کی مسجد والے اس حجرے میں منتقل کر دیا جائے جو سیدنا الامام الکبیر کی قیام گاہ تھی، یہی کیا گیا' حضرت والا کی طرف سے بھی اس پر اعتراض نہ ہوا' یوں والد کی تیمار داری' اور خالق کی

---

[1] یہ دونوں روایتیں براہ راست حضرت والا کے فرزند دل بند مولانا حافظ محمد احمد مرحوم کے حوالہ سے "روایات طاہرہ" سے ماخوذ ہیں، ہمارے مصنف امام نے اس کی تو تصدیق کی ہے کہ لوگوں نے شیخ اسد علی صاحب کو حقہ بھروانے کی خدمت لینے پر ملامت کی لیکن ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حقہ بھرنے کا یہ واقعہ صرف ایک دفعہ پیش آیا اور ملامت کرنے والوں کی ممانعت سے متاثر ہو کر پھر یہ خدمت مولانا سے انھوں نے نہیں لی، ممکن ہے کہ ایسا بھی ہوا ہو مگر ایک ہی دفعہ یہ خدمت لی گئی اس باب میں ظاہر ہے کہ صاحب البیت یعنی حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان زیادہ مستحق ترجیح ہے ۱۲

در بار داری دونوں کی تطبیق کی عملی شکل نکالی، بیان کیا گیا ہے کہ، آخر دنوں میں اسہال کی شدت بڑھ گئی، اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد چوکی پر جانے کی ضرورت شیخ صاحب مرحوم کو پیش آنے لگی، قاعدہ یہ تھا کہ چوکی پر سے کھنکار کی آواز جب آتی تو لوگ شیخ صاحب کو واپس لانے کیلئے چلے جاتے، اور چوکی کے نیچے جو ٹھیکرا تھا اسکو اٹھا کر اسی وقت صاف کرنیکی کوشش میں حضرت اور آپ کے خدام میں مسابقت کی کشمکش پیدا ہو جاتی، حضرت چاہتے کہ اس سعادت کو میں حاصل کروں، اور خدام کی آرزو تھی کہ یہ خدمت ہم لوگوں کے سپرد کی جائے۔ لکھا ہے کہ شیخ صاحب مرحوم کش کش کے اس منظر کو دیکھتے اور فرماتے خدا کی شان ہے، کہ مجھ جیسے نا برسان حال آدمی کے ٹھیکرے کے پھینکنے اور صاف کرنے میں اتنے بڑے بڑے علماء ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنا چاہتے ہیں، فرماتے اور آبدیدہ ہو کر فرماتے کہ یہ سب کچھ اسی بچے کی بدولت دیکھ رہا ہوں ورنہ میں کہاں اور یہ علماء کہاں[1]۔

یہ اور اسی قسم کے معمولی اور غیر معمولی تماشے تو بالوالدین احسانا کے ایک رکن والد کے متعلق آئے دن دیکھے جا رہے تھے، اور والدہ مرحومہ بی بی جیبہ نور اللہ مرقدہا گھر کی رہنے والی شریف بیوی تھیں۔ باہر والے دیکھ تو نہیں سکتے تھے لیکن عام طور پر یہ مشہور تھا "روایات طاہرہ" میں ہے کہ

[1] سیدنا الاستاذ الامام حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ بھی جو بعد کو شیخ الہند کے نام سے مشہور ہوئے، ان ہی خدام میں شریک تھے، کہا جاتا ہے کہ ایک دن بجائے ٹھیکرے کے زمین ہی چوکی کے نیچے کی آلودہ ہوگئی اتفاقاً اس وقت سیدنا الامام الکبیر بھی موجود نہ تھے اور نہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ، کسی ضرورت سے باہر گئے ہوئے تھے خدام جو حاضر تھے۔ وہ مشورہ کر رہے تھے کہ زمین کو صاف کرانے کیلئے بھنگی بلوا لیا جائے۔ ابھی مشورہ ہو ہی رہا تھا کہ دونوں حضرات تشریف لے آئے، حضرت نانوتوی نے دریافت فرمایا کہ یہ مشورہ کس چیز کا ہو رہا ہے۔ ابھی سوال وجواب ہی ہو رہا تھا کہ چپکے سے حضرت شیخ الہند نے چوکی کے پاس جا زمین سے نجاست کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھا ٹھیکرے میں ڈال لیا۔ اور یوں ٹھیکرے کو لے کر پھینکنے کے لئے باہر نکل آئے۔
شیخ الہند کی اس جرأت وہمت نے سیدنا الامام الکبیر پر گویا ایک حال سا طاری کر دیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا تھا کہ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے فرما رہے تھے
"اے اللہ میرے دونوں ہاتھوں کی لاج رکھ لیجیو"
دیوبند کا ایک شہزادہ الہند کا شیخ بن کر دنیا سے رخصت ہوا، اسے تو دنیا دیکھ چکی اور دنیا کے بعد الدین کا دن جب آئیگا اس وقت دونوں اٹھے ہوئے ہاتھوں کی لاج کس رنگ میں سامنے آئیگی آج اسے کون بتا سکتا ہے۔

"دونوں وقت (غالباً قیلولہ اور شب خوابی کے وقت) پیر دبانا ان کا (حضرت نانوتوی کا) معمول تھا، تشریف لائے اور پیر دبانا شروع کیا"۔

مولوی طاہر صاحب نے اس روایت کو بھی اپنے والد مولانا حافظ محمد احمد مرحوم کی طرف منسوب کرکے درج کیا ہے، وہ گھر کے آدمی تھے، ان کی شہادت کے بعد کسی دوسری شہادت کی ضرورت ہی کیا باقی رہتی ہے، اور یہ تو خیر ایک معمولی بات ہے، حضرت والا کے عقد ازدواج کی جو رُوداد مجھ تک پہنچی ہے۔ اسکو پیش نظر رکھتے ہوئے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے صرف اپنی والدہ ماجدہ کی خدمت اور آرام ہی کے لئے تاہل کی زندگی کے بار کو اٹھانا منظور فرمایا تھا۔ اور اب وہی رُوداد آپ کے سامنے پیش ہوتی ہے، یاد ہوگا مقدمہ میں بیان کرچکا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر نانوتہ کے ایک ایسے گھرانے کے چشم و چراغ تھے جس کی چار پشتوں کی روشنی صرف آپ کے وجود باجود کیساتھ قائم تھی، بقول مصنف امام "چار پشت تک مولانا متفرد ہوئے" ایک تو یونہی والدین کے دل میں شادی رچانے کا خیال عموماً اپنے بچوں کے متعلق اس وقت پیدا ہی ہوتا ہے جب وہ عقد کے قابل ہوجاتے ہیں۔ پھر جہاں یہ حال ہو کہ ایک نہیں چار چار پشتوں کی پشتبانی صرف ایک ہی لڑکے کی ذات کیساتھ وابستہ ہو، تو اس وقت کی امنگوں کا اندازہ کون کرسکتا ہے۔ سیدنا الامام الکبیر لکھ پڑھ کر عالم و فاضل ہو چکے تھے، سن رشد کو بھی پہونچ چکے تھے، بات ہی کیا باقی تھی جس کے انتظار میں آپ کے والدین اپنی زندگی کی اس سب سے بڑی مسرت، سب سے بڑے ارمان کو حیز التوا میں ڈالنے پر آمادہ ہوتے چاہئے تو یہی کہ اس ارمان کی تکمیل کی خواہش والدین کی طرف سے بالواسطہ یا بلا واسطہ آپ تک پہنچائی گئی ہوگی، لیکن میرے پاس کوئی وثیقہ نہیں ہے جسکی بنیاد پر یہ دعویٰ کروں کہ والدین کے ارادے کی خبر آپ تک پہونچی، اور آپ نے انکار فرمایا مصنف امام نے حضرت والا کے نکاح کا ذکر کرتے ہوئے ایک مختصر اور مجمل خبر تو یہ دی ہے کہ

"مولوی صاحب نکاح نہ کرتے تھے" ص۳۲

اگر برّ بوالدیہ کا وہ آئینہ ہمارے ہاتھوں میں نہ ہوتا جسکی ہلکی سی جھلک چند نمونوں کی روشنی میں آپکے سامنے گذر چکی ہے یعنی حضرت والا کا اپنے والد ماجد اور والدہ ماجدہ کے ساتھ احسان و اطاعت، خدمت

وحسن سلوک کے جو تعلقات تھے، ان سے اگر ہم ناواقف ہوتے، تو ممکن ہے کہ مصنف امام کے ان مجمل الفاظ سے ہمارا ذہن ادھر منتقل ہو جاتا کہ نکاح نہ کرنے کا یہ واقعہ آپکے والدین کی تحریک کے بعد پیش آیا ہو لیکن ظاہر ہے کہ قرآنی حکم۔ ان اشکرلی ولوالدیک الی المصیر | گن گاتے رہو میرا اور اپنے والدین کا میری طرف ہے واپسی کے بعد یہ فرماتے ہوئے کہ شرک کے معاملہ میں ان کی اطاعت نہ کی جائے، صاحبھما فی الدنیا معروفا اور دنیا میں ان کا بھی ساتھ بھلائی کے ساتھ دو) کو واجب ٹھہرایا گیا ہے۔ اور جس کی عملی تفسیر کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر نے کہا تھا کہ والد کی تیمارداری کیلئے مسجد کی حاضری میرے لئے ضروری باقی نہیں رہی ہے، بلکہ اسی کے ساتھ یہ فقرہ آپ کا کہ "باواجی! جو حکم ہوگا اسکی تعمیل کیجائیگی" ان سب باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا ایک لمحہ کیلئے بھی یہ سوچا جا سکتا ہے کہ نکاح جیسے امر مسنون کے متعلق والدین کے حکم سے سرتابی کا آپکے قلب مبارک میں خطرہ بھی گذر سکتا تھا، زیادہ سے زیادہ کچھ گنجائش اگر پیدا ہو سکتی ہے تو اسی کی کہ حکم نہیں بلکہ تمنا اور آرزو کی شکل میں والدین کی طرف سے خواہش نکاح کی ظاہر کی گئی ہو، اور بات بہر حال آپکی مرضی ہی پر رکھی گئی ہو، تو اس وقت والدین کے عطا کئے ہوئے اختیار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نکاح نہ کرنے کے پہلو کو ترجیح دیتے رہے، لیکن اس کی گنجائش محض اسوقت پیدا ہوتی ہے جب اس نتیجہ کو جسکی طرف مصنف امامؒ کی خبر سے ذہن منتقل ہوتا ہے، اسکو ہم صحیح تسلیم بھی کرلیں۔ حالانکہ نفس خبر میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جو اس بے بنیاد نتیجہ کا صحیح منشار قرار دیا جا سکتا ہو۔ "نکاح نہیں کرتے تھے" بس اس کا علم تو اس خبر سے ہوتا ہے مگر کیوں نہیں کرتے تھے؟ اسکا جواب آپ مصنف امام کے اس مجمل فقرے کے کس لفظ سے پیدا کر سکتے ہیں؟ ایسی صورت میں یہ نتیجہ بجز ایک بے بنیاد ذہنی انتقال کے اور کیا باقی رہ جاتا ہے؟

بلکہ ہم اپنے اندوان معلومات کی یاد کو تھوڑی دیر کے لئے اگر تازہ کرلیں جو مصنف امام ہی کی اطلاعوں سے فراہم ہوئی تھیں یعنی ٹھیک عنفوان شباب انیس بیس سال کی عمر میں سیدنا الامام الکبیر کو جس حال میں پایا گیا تھا، مصنف امام کے الفاظ میں

"بال سر کے بڑھ گئے تھے، نہ دھونا، نہ کنگھی، نہ تیل، نہ کترنے نہ درست کئے" ص۳۰

اور اسی کے بعد وہی یہ بھی اطلاع دیتے ہیں کہ

"مولوی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہیبت عنایت کی تھی کہ انکے سامنے بولنے کا ہر کسی کو حوصلہ نہ تھا" صفحہ

لیکن یہ ہیبت تو عام ہیبت تھی کسی خاص وقت اور زمانہ کے ساتھ محدود نہ تھی، مگر خاص اس زمانہ میں اسکا رنگ ہی دوسرا تھا، خیال کرنیکی بات ہے کہ مصنف امام جو سیدنا الامام الکبیر کے ہم سن ہم وطن ساتھ کے کھیلے ہوئے، نانوتہ میں بھی ساتھ ہی دونوں رہے اور وہاں سے دلی بھی ساتھ آئے ایک ہی مکان میں نشست و برخاست خواب و خور نوشت و خواند وغیرہ سارے مشاغل ساتھ ساتھ جاری تھے، مصنف امام حضرت والا کے استاذ زادے بھی تھے، ان سے بڑھکر بے تکلفی کے تعلقات اور کس کے ساتھ ہو سکتے تھے، انھوں نے خصوصیت کیساتھ اس قصہ پر اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ فطرۃً حضرت والا

"نہایت خوش مزاج اور عمدہ اخلاق تھے" صفحہ ۳

مگر باوجود ان تمام باتوں کے کچھ کہنے سننے کی جرأت انکو بھی نہیں ہوتی تھی، مصنف امام کے الفاظ ہیں کہ

"میں تو کچھ نہ کہہ سکا، ایک اور دوست سے کہلایا" صفحہ ۳

بہرحال اگر یہ واقعہ ہے کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں اور عمر کی اسی منزل میں جو تحریک عقد و نکاح کیلئے موزوں ترین وقت ہو سکتا تھا، اسی زمانہ میں سیدنا الامام الکبیر پر رعب و جلال کی ایک ایسی کیفیت مستولی ہوگئی تھی کہ بالوں کے درست کرانے یا سر میں تیل ڈلوانے جیسی معمولی باتوں تک کے پیش کرنیکی ہمت آپ کے گھر سے گھر کے بے تکلف دوست بھی نہیں کر سکتے تھے، تو شادی بیاہ یا نکاح جیسے اہم معاملہ اور مسئلہ کے ذکر کی جسارت اس زمانہ میں آپ کے سامنے کون کر سکتا تھا۔ اسی کے ساتھ شریف گھرانوں کے اس دستور قدیم کو بھی اگر ہم پیش نظر رکھیں کہ شادی و نکاح جیسی باتوں میں بچوں کو براہ راست والدین مخاطب بنانے سے جھجکتے تھے اور حجاب و شرم اجازت نہیں دیتی تھی عموماً غیروں ہی کو واسطہ بنانے کا عام قاعدہ تھا، تو ان ساری باتوں کی روشنی میں یہی سمجھ میں آتا ہے کہ نکاح نہ کرنے کی خبر مصنف امام نے جو دی ہے اس کا زیادہ سے زیادہ مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اولاً تو جرأت ہی اس مسئلہ کے پیش کرنیکی کوئی اس زمانہ میں نہیں کر سکتا تھا، اور ڈھکے چھپے اور دبے لفظوں میں اشارۃً کنایۃً اسکا تذکرہ آپکے سامنے کسی طرح چھڑ بھی جاتا ہوگا تو آپ کی طرف سے کوئی جواب اسکا نہ ملتا ہوگا، الغرض یہ یا اسی قسم کے قصوں سے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ آپ نکاح کرنیکا سرے سے ارادہ نہیں رکھتے، کچھ بھی ہو، والدین کے حکم سے سرتابی کا نتیجہ نہ مصنف امام ہی کی خبر سے نکلتا ہے اور نہ ان نمونوں سے جو اطاعت والدین کے سلسلے میں

حضرت والا کی طرف سے والدین کی آخری سانس تک پیش ہوتے رہے ہیں، جو لوگ ان سے واقف ہیں کے قلوب میں اسکا خطرہ بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپکے خاص حالات اور ادا پر دائیوں کو دیکھ کر یہی نتیجہ پیدا کر لیا گیا تھا کہ آپ نکاح نہیں کرنا چاہتے۔ والدین نے آپکے ذاتی رجحانات کی رعایت کرتے ہوئے زیادہ زور دینا خصوصاً جلال و جبروت کے ان دنوں میں مناسب خیال نہ کیا ہوگا، لیکن والدین آپ کے بہرحال والدین تھے، انسانی جذبات اپنے اندر رکھتے تھے اکلوتا بچہ اور وہ بھی ایسا اکلوتا کہ مسلسل چار پشتوں کی نمائندگی جس کی ذات کے ساتھ وابستہ ہو۔ اسکو عدم ازدواج کے اس رجحان پر کب تک صبر کر سکتے تھے؟ خصوصاً آپکے والد شیخ اسد علی مرحوم جو گھر گرہستی سے تعلق رکھنے والے آدمی تھے انکے دل میں یہ تمنا مسلسل چٹکیاں لیتی رہتی تھی کہ اسی دلی سے پڑھ پڑھ کر نہ صرف گرد و نواح ہی میں بلکہ خود نانوتہ میں نوجوان آرہے ہیں اور ملازم ہو ہو کر اپنے گھروں کی فارغ البالیوں میں اضافہ کر رہے ہیں، اسی نانوتہ میں مولوی محمد احسن نانوتوی، احیاء العلوم اور کنز الدقائق وغیرہ کتابوں کے مترجم بھی تھے، جنکا مکان حضرت والا کے مکان سے ملحق تھا، مولنا طاہر صاحب قاسمی نے اپنے والد مرحوم کے حوالہ سے یہ روایت اپنی یادداشت میں درج کی ہے کہ شیخ اسد علی مولنا مولوی احسن نانوتوی کے والد سے کہا کرتے کہ

"ایک تمہارا بیٹا ہے کہ مطبع نول کشور میں سو روپے (اس زمانہ میں) پا رہا ہے اور ایک ہمارا بیٹا ہے کہ باہر سے کما کر تو کیا لاتا اور الٹا گھر سے خرچ کر رہا ہے"

بقول مصنف امام سیدنا الامام الکبیر کی ذات مبارک میں جو قدرتی کشش تھی، اور نو عمری ہی سے قلوب آپکی طرف کھنچے چلے جاتے تھے نتیجہ یہ تھا کہ باہر سے جب گھر نانوتہ تشریف لاتے اور اطراف و جوانب کے لوگوں کو اسکی خبر ہو جاتی، مہمانوں کا تانتا بندھ جاتا۔ سربراہی ان مہمانوں کی شیخ اسد علی صاحب مرحوم ہی کو کرنی پڑتی۔ مصنف امام کے الفاظ ہیں کہ جب

"وطن آتے، اور یہاں مہمان آتے، تو والدین کو دشواری ہوتی" ص۱۳

اور اس دشواری میں بھی سچ پوچھئے تو حضرت والا کے اس جرأت آزما ایمانی اقدام ہی کو بظاہر زیادہ

داخل تھا، جس کا اجمالاً ذکر میں مقدمہ میں کر چکا ہوں، یعنی علم سے فارغ ہونے کے بعد پہلا کام حضرت والا نے یہ کیا تھا کہ اپنی موروثی جائداد پر شریعت کے قانون میراث کی روشنی میں نظر ثانی کا انتظام فرمایا، جس کا نتیجہ بقول مولانا طیب صاحب یہ ہوا۔

"فصلوں پر علاوہ اہل حق کو تقسیم کیا جاتا رہا بہت کم مقدار تھی جو حقوق سے بچ کر گھر میں پہنچتی تھی چنانچہ گھر پر عسرت و تنگی رہتی تھی"

ظاہر ہے کہ یہ کوئی معمولی اقدام نہ تھا، مولانا طیب صاحب نے سچ لکھا ہے کہ

"دنیا فرائض نکلواتی تھی حصہ لینے کے لئے، لیکن یہاں دوسروں کو حصہ دینے کے لئے فرائض نکلوائی جاتی ہے، یہ پہلا موقعہ تھا جو لوگوں کے سامنے پیش آیا تھا"

کم از کم شیخزادوں کی اس برادری کے لئے جو اضلاع مظفر نگر و سہارنپور کے قصبات میں پھیلی ہوئی اور عموماً زمینداری پر جن کی معاش کا دار و مدار تھا۔ ان میں تو سیدنا الامام الکبیر کے اس عجیب و غریب علمی اقدام سے سنسنی سی پھیل گئی تھی، لوگوں پر سناٹا چھایا ہوا تھا، جائداد کی شرعی تقسیم کے اس قصہ کا ذکر مولانا طیب اور مولانا طاہر دونوں حضرات نے اپنی قلمی یادداشتوں میں کیا ہے، اجمالی روایت کے بعد جی چاہتا ہے کہ ان دونوں روایتوں کے بعض اجزاء کو یہاں درج کر دوں، مولانا طیب نے لکھا ہے کہ

"حضرت (نانوتوی) جب تحصیل علم سے فارغ ہو کر گھر پر آئے تو املاک کا جائزہ لیا اور تمام املاک کو مشتبہ اور بعض کو مغصوبہ پایا، والد کو بہت سمجھایا کہ یہ کمائی ناجائز اور مشتبہ ہے قیامت کے مواخذے کا تقاضا ہے کہ حقیقی حقداروں تک ان کے حصے پہونچا دیئے جائیں"

ابتداء میں تو جیسا کہ عرض کر چکا ہوں "گھر کھود" "گھر اجاڑ" وغیرہ خطابات والد کی طرف سے آپ کو اس عجیب و غریب مشورہ کے پیش کرنے پر ملتے رہے مگر حضرت والا نے

"ان زمینوں کے غلے کے استعمال میں احتیاط شروع فرمائی، اور والد کو بار بار ادب کے ساتھ سمجھاتے رہے"

اور اسی عرصہ میں یہ کام بھی آپ نے شروع کر دیا یعنی

"مفصل فرائض (شرعی حصے وارثوں کے) نکلوائے اور دادا پر دادا کی بعید بعید پشتوں کے حقوق اور حصے نکلوائے"

مولوی طیب صاحب نے اس موقعہ پر یہ اطلاع بھی دی ہے کہ

"فرائض کا یہ مسودہ حضرت (نانوتوی) کے قلم کا لکھا ہوا، حضرت ہی کے بیاض میں ہے اور میرے پاس محفوظ ہے۔"

خاکسار بھی اس کے مطالعہ سے براہ راست بہرہ اندوز ہوا ہے، اور خیال ہے کہ حضرت والا کے بعض قلمی "مآثر" کے ساتھ اس کا فوٹو بھی سوانح کے ساتھ شائع کر دیا جائے۔

بہرحال جس طرح بھی ممکن ہوا، ان ہی شرعی سہام کے مطابق حصہ داروں تک ان کے حقوق کے پہنچانے کیلئے کسی نہ کسی طرح آخر میں اپنے والد شیخ اسد علی صاحب کو آپ نے راضی کر لیا۔ مولوی طاہر کی قلمی یادداشت کی روایت میں ہے، کہ شیخ اسد علی کو جب یقین ہو گیا کہ حصہ داروں تک ان کا لڑکا بہرحال ان کے حقوق پہنچا کر ہی رہے گا،

"تو چارپائی پر پڑے ہائے ہائے کرتے تھے"

اور سیدنا الامام الکبیر دست بستہ ان کے سامنے کھڑے ہو کر عرض کر رہے تھے کہ

"باواجی میں اپنی اور آپ کی آخرت کی درستی کے لئے کر رہا ہوں، جو کچھ کر رہا ہوں۔"

مولانا طاہر سلمہ کی روایت میں ہے کہ اسی کے ساتھ یہ بھی فرماتے جاتے تھے کہ

"باواجی آپ کی اولاد میں ایک بیٹا میں ہی ہوں، انسان جو کچھ کرتا ہے اپنی اولاد ہی کیلئے کرتا ہے جب میں نہیں چاہتا اور مجھے یہ بات پسند نہیں تو آپ پھر ایسا کیوں فرماتے ہیں۔"

الغرض رد و کد کے ان قصوں کے بعد مولانا طیب کا بیان ہے کہ

"آخر کار آپ کے والد نے سکوت اختیار کیا اور فصلوں پر یہ غلہ اہل حق کو تقسیم کیا جاتا رہا"

مصنف امام نے جو اطلاع دی تھی کہ "مہمانوں کی آمد و رفت کی وجہ سے سیدنا الامام الکبیر کے والدین کو دشواری ہونے لگی تھی" جیسا کہ میں نے عرض کیا اسکی بڑی وجہ یہی تھی، بعد کو اس کا نتیجہ کیا ہوا، اور تقویٰ کی زندگی کشاکش کی راہ بہرحال پیدا کر کے رہتی ہے، اس قرآنی نظریہ کا تجربہ کن شکلوں میں کرایا گیا اسکی داستان تو اپنے وقت پر سنائی جائے گی، یہاں یہ کہنا ہے کہ آپ کے والد ماجد شیخ اسد علی حضرت والا کے بھانے بجھانے سے جیسا کہ مولانا طیب نے لکھا ہے چپ تو ہو گئے، لیکن آئے دن کی معاشی

پریشانیاں جن کے وہ عادی نہ تھے، قدرتاً ان کے دل و دماغ میں ہلچل ڈالے رکھتی تھیں ان دشواریوں کے حل کی صورت کیا نکالی جائیگی لے دیکر نوجوان صاحبزادے کے ساتھ امیدیں وابستہ تھیں، لیکن حضرت والا کے رجحانات کو دیکھ کر مایوس ہو جاتے ۔ مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"حضرت کے والد کو ..... ترک نوکری اور اختیار درویشی کا رنج تھا" ص۳۲

آخر ان کے دل میں بھی وہی خیال آیا جو عموماً اس قسم کے مواقع میں آیا کرتا ہے۔ یہ خیال حضرت والا کے نکاح کا تھا مصنف امام نے آپ کے نکاح کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ پر لکھا ہے کہ

"والد (یعنی شیخ اسد علی صاحب) کو یہ خیال تھا کہ ابنائے زمانہ کی طرح جب فکر ہوگا آپ ہی نوکری کرلیں گے۔" ص۳۳

یہی پرانا طوق ہے جو والدین کی طرف سے وارفتہ مزاج نوجوانوں کو فکر راہ پر لگانے کے لئے عموماً گلے میں ڈالا جاتا ہے، اور یہ ایک چلتا ہوا جادو ہے، شبابی اعصاب کا سارا کس بل عورت کے سوار ہو جانے کے بعد نکل جاتا ہے بیوی کی بشاشت کیلئے آدمی ہر اس بار کو اٹھانے کیلئے تیار ہو جاتا ہے، جس کا اس سے پہلے غریب شاید تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے، اسی عام مشاہدے اور قاعدے کے زیر اثر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چپکے چپکے اندر ہی اندر شیخ اسد علی صاحب نے مختلف خاندانوں میں آپ کی نسبت کے متعلق گفتگو شروع کی حسن اتفاق سے برادری کے ایک کافی فارغ البال صاحب ثروت خاندان والے رشتہ پر آمادہ ہو گئے۔ یہ قصبہ دیوبند کا وہی خانوادہ تھا، جو دیوان والوں کے نام سے مشہور ہے، مقدمہ میں تفصیل کے ساتھ اس خاندان کا ذکر کر چکا ہوں، بتا چکا ہوں کہ ان لوگوں سے برادری کے قدیم تعلقات شیخ اسد علی صاحب کے موروثی طور پر قائم چلے آرہے تھے، ایام طفلی میں سیدنا الامام الکبیر نے مکتبی تعلیم اسی گھر کے مکتب خانے میں پائی تھی سب ہی کے جانے پہچانے تھے۔ بلندی کا جو ستارہ آپ کی پیشانی میں بچپن ہی سے چمک رہا تھا، شعوری یا غیر شعوری طور پر لوگ اس سے بھی متاثر تھے اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ آپ کے غیر معمولی ذہن و ذکاوت علم و فضل کے چرچے اس خاندان تک نہ پہنچے ہوں گے۔

بہر حال کچھ بھی ہو، مصنف امام نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ شیخ اسد علی صاحب نے حضرت والا کا

"دیو بند رشتہ کیا تھا" ص۳۲

اس کا مطلب یہی ہے، اور مراد اس سے وہی دیوان کی ڈیوڑھی والوں کا خاندان ہے۔ خاندان کے امیر اس زمانہ میں شیخ کرامت حسین مرحوم تھے، ان ہی کی صاحبزادی بیوی امّ رحم سے یہ نسبت طے پائی تھی۔

مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے کھاتے پیتے، خوش حال گھرانے کے اس رشتہ کی شیخ اسد علی صاحب کے دل میں جیسا کہ چاہیئے تھا کافی قدر و قیمت تھی، اور چاہتے تھے کہ جس طرح بھی ممکن ہو۔ اس مغتنم موقعہ کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایک امیر گھرانے کی لڑکی بھی ملتی ہے، اور اسکی وجہ سے اسی کے معیار کے مطابق آمدنی حاصل کرنیکی طرف بچے کی توجہ بھی ہوگی، شیخ صاحب نے عقد کی تحریک حضرت والا کے سامنے پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس تحریک کو اُن کے سامنے پیش کون کرے؟ غور و فکر کے بعد نظر انتخاب حضرت والا کے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ پر پڑی۔ مصنف امام کا بیان ہے کہ

"آخر جناب حاجی امداد اللہ صاحب کی خدمت میں (شیخ اسد علی صاحب نے) عرض کیا۔" ص۳۲

حاجی صاحب نے وعدہ کر لیا، اور جیسا کہ توقع تھی، بقول مصنف امام

"حضرت (حاجی امداد اللہ) کے فرمانے سے نکاح پر راضی ہو گئے" ص۳۲

"ہرچہ برخود نہ پسندی بہ دیگراں مپسند" کے عام قانون کے ہوتے ہوئے اس چیز کے پسند کرنے پر حضرت حاجی صاحب نے اپنے مرید کو کیسے راضی کر لیا، جسے اس وقت تک کیا معنی زمانہ تک خود اپنے لئے پسند نہ فرماتے رہے[1]۔ یقیناً یہ قصہ کافی دل چسپ ہوگا، لیکن افسوس ہے کسی نے اسکی تفصیل نہ کی۔

---

[1] مطلب یہ ہے کہ سیدنا حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ جب تک ہندوستان میں رہے۔ ازدواجی تعلق سے آزاد رہے، حضرت تھانوی کے ملفوظات قصص الاکابر میں ہے کہ مکہ معظمہ کی ہجرت سے پہلے تھانہ بھون ہی میں حاجی صاحب کا جب قیام تھا تو بی بی خیر النساء سے "حضرت (حاجی صاحب) کا خطبہ (یعنی منگنی) ہوئی تھی مگر حضرت نے نکاح کرنے سے انکار کر دیا تھا" (بحوالہ الہادی ربیع الاول ۵۰ھ) اگرچہ اتفاق کی یہ عجب صورت پیش آئی کہ ہجرت کر کے حاجی صاحب قبلہ جب مکہ معظمہ ہی میں مقیم ہو گئے تو پہلے خدیجہ نامی ایک بیوی صاحبہ سے (بقیہ صفحہ ۵۰۰ پر)

بہرحال پیرو مرشد کے ارشاد کی تعمیل پر تو آپ ضرور آمادہ۔ لیکن اسی کے ساتھ ایک شرط بھی آپ کی طرف سے پیش ہوئی۔ بڑی دلچسپ شرط ؟ گویا جس پَر میں دلبر کا نامہ بندھا ہوا تھا، اسی پر کو آپ نے نوچ کر رکھدیا تھا، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ موروثی جائداد پر نظر ثانی کرنے کی وجہ سے شیخ اسد علی صاحب مرحوم جس زمانہ میں ہائے وائے کر رہے تھے تو ان کی ذات کی حد تک جیساکہ "روایات طاہرہ میں ہے" حضرت والا اپنے والد ماجد سے فرماتے

"اگر آپ اپنی راحت و آرام کے خیال سے یہ فرماتے ہیں (یعنی نظر ثانی سے روکتے ہیں) تو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی راحت و آرام کا مجھے ذمہ دار ٹھیرایا ہے"۔

اسی کے ساتھ یہ بھی عرض کرتے کہ

"آپ کو کھانے پینے کی جس قدر چیزیں مرغوب ہیں۔ مجھ سے فرمادی جائیں، جب تک میں زندہ ہوں انشاء اللہ تعالیٰ ان میں قصور نہ ہوگا"۔

الغرض پدر بزرگوار کے مصارف کی حد تک تو احساس ذمہ داری میں آپ کا یہ حال تھا۔ لیکن شیخ اسد علی صاحب کے سامنے راحت و آرام سے اہم تو اپنے ہم چشموں کی اولاد کی کمائی کی کیفیت تھی، بقول مصنف جسے دیکھ دیکھ کر شیخ صاحب کہا کرتے تھے کہ سب

"پڑھ پڑھ کر نوکر ہو گئے، کوئی پچاس کا کوئی سو کا۔ کوئی کم، کوئی زیادہ، سب خوش و خرم ہیں اور ان کا اپنے بچہ کا، حال ویسا ہی"

(بقیہ صفحہ ۴۹۹)

آپ نے نکاح کر لیا تھا، اور ان کا انتقال جب ہو گیا تو یہی تھانہ بھون والی بی بی خیر النساء جن سے حاجی صاحب نے نکاح کرنے سے انکار کر دیا تھا، وہی بیوہ ہو کر حج کرنے کے لئے مکہ معظمہ تشریف لائیں اور لوگوں کی تحریک سے عقد ثانی ان کا حضرت حاجی صاحب سے ہوا، مولانا نانوتوی فرماتے تھے کہ مثنوی شریف کی یہ بی بی خیر النساء بڑی عالمہ تھیں، جب بی بی خیر النساء کی بصارت جاتی رہی تو ایک دوسری معمرہ مہاجرہ عورت سے جن کا نام امۃ اللہ تھا ان کی خواہش کے مطابق آپ نے نکاح فرما لیا تھا۔ تاکہ خدمت کرنے میں دشواری پیش نہ آئے۔ الغرض حاجی صاحب قبلہ کے گو تین نکاح ہوئے لیکن یہ سارے نکاح ہجرت کے بعد حضرت نے کئے، لیکن جو زمانہ شادی کا ہوتا ہے، اس میں آپ مجرد ہی رہے۔ تحریک کی بھی گئی لیکن انکار فرما دیا تھا۔

اور اپنے ہم عصروں، ہم چشموں کی ہمدوشی کے شوق میں ایک کافی تونگر صاحب ثروت گھرانے میں اپنے بچے کے رشتہ کے طے کرنے میں وہ کامیاب ہوئے تھے۔ خیال ان کا یہی تھا کہ دولہن جب گھر میں آئے گی تو ہمارے لئے نہ سہی اپنی دلہن کے لئے تو کمانے کا خیال لڑکے میں زندہ ہوگا وہ تو اپنے اسی خیال میں مگن تھے، اور جب ان کو اس کی خبر ملی کہ نکاح پر حاجی صاحب نے ان کے لڑکے کو آمادہ کرلیا، تو سمجھے کہ تیر نشانے پر بیٹھ گیا، مگر ان کی مایوسی کی انتہا نہ رہی جب نکاح کی رضامندی کے ساتھ یہ شرط بھی سنائی گئی کہ وہ یعنی شیخ اسد علی صاحب

"تمام عمر زوجہ کے نفقہ اور اولاد کی پرورش کے لئے کچھ کما لانے کے مجھ سے متقاضی نہ ہوں،" ص۳۲

شرط کے یہی الفاظ مصنف امام نے نقل کئے ہیں، جو سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے اپنے نکاح کے متعلق والد ماجد کی خدمت میں پیش ہوئی تھی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ روایت باللفظ ہے، یا بالمعنی، کچھ بھی ہو، مطلب اس کا بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ بیوی بال بچوں کے نان نفقہ کے متعلق آدمی شرعاً مکلف ہے، لیکن ہر شخص اپنی حیثیت اور اپنے حالات ہی کے مطابق مکلف ہے ولینفق ذو سعة من سعته ومن قدر علیه رزقه فلینفق مما اٰتاه الله، کا قرآنی قانون حضرت کے سامنے تھا۔ مگر جانتے تھے کہ والد کا یہ خیال نہیں ہے، بلکہ بیوی بچوں کا نام لیکر وہ اپنے ہم چشموں کی اولاد کے مقابلہ میں مجھے اتارنا چاہتے ہیں اور اس شرط کے پیش کرنے کی غرض تھی بھی یہی، ورنہ العیاذ باللہ یہ مطلب نہ تھا اور نہ ہو سکتا ہے کہ خدائی ذمہ داریوں سے آپ راہِ گریز اختیار کرنا چاہتے تھے۔

بہرحال یہ شرط آپ کے والد کے سامنے پیش ہوئی وہ سمجھ تو ضرور گئے ہوں گے کہ بیٹے کی طرف سے یہ جوابی بینترا ہے مگر کرتے کیا۔ مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"بے چاروں نے (یعنی آپ کے والد ماجد نے) ناچار یہ شرط قبول کی" ص۳۲

اور اسی کے بعد وہ خبر دیتے ہیں کہ

"نکاح ہو گیا" ص۳۲

سیدنا الامام الکبیر کے نکاح کے متعلق مصنف امام نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ یہی ہے، لیکن "صاحب البیت" یعنی حافظ محمد احمد مرحوم حضرت والا کے قرۃ العین کے حوالہ سے مولانا طاہر سلمہٗ کی یادداشت میں ایک اور جزء کا بھی سراغ ملتا ہے۔ حافظ صاحب مرحوم اپنی والدۂ ماجدہ کا حال بیان کرتے ہوئے (مولوی طاہر صاحب نے لکھا ہے) یہ بھی فرماتے کہ والد یعنی سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے والدہ پر قدغن تھا کہ میری دادی صاحبہ یعنی حضرت نانوتوی کی والدہ کی خدمت گزاری میں کسی قسم کی کوتاہی نہ ہونے پائے، اسی سلسلہ میں حافظ صاحب مرحوم اپنی والدہ ماجدہ کی زبانی یہ روایت نقل کیا کرتے تھے کہ

"مجھ سے شادی کے اگلے ہی دن (حضرت نانوتوی نے) فرمایا تھا کہ میں نے نکاح صرف اپنی "بو" (والدہ) کی راحت کے لئے کیا ہے۔"

حافظ صاحب ہی یہ بھی فرمایا کرتے تھے، غالباً خود اپنے کانوں سنی ان کی یہ بات ہے کہ حضرت نانوتوی

"اپنی والدہ کی زبان سے کبھی ہلکا لفظ بھی خدمت کے متعلق سن لیتے تھے۔"

یعنی والدہ ماجدہ کی خدمت میں کسی قسم کی کوتاہی ان کی بیوی کی طرف سے ہوئی ہے، تو غصہ میں

"بار بار یہی فرمایا کرتے تھے کہ میں نے تو ان ہی کی خدمت کے لئے یہ بار اپنے ذمہ رکھا، ورنہ میں فقیر آدمی تھا، مجھے کیا ان چیزوں میں پھنسنے کی ضرورت تھی۔"

اس سلسلہ میں حافظ صاحب کا بیان ہے کہ کبھی کبھی شرعی قطع تعلق کی دھمکی کی نوبت بھی آجاتی تھی۔

اور سچ تو یہ ہے کہ بڑّبو الدتہ ہونے اور ماں کے ساتھ حسن سلوک میں جس کا حال یہ ہو، حافظ صاحب مرحوم ہی اس کے بھی راوی ہیں کہ آخر عمر میں سیدنا الامام الکبیر کی والدۂ ماجدہ مرض اسہال میں مبتلا ہوئیں، ترقی کر کے شدت اس نوبت تک پہنچ گئی تھی، کہ دن بھر میں تین تین چار چار کپڑے خراب ہو جاتے۔ حالانکہ حضرت والا کی اہلیہ محترمہ موجود تھیں، اور علاوہ دوسری خدمتوں کے کپڑوں کو بخندہ پیشانی خود دھویا کرتی تھیں۔ لیکن مولٰنا نانوتوی اصرار فرماتے کہ والدہ کے کپڑوں کے دھونے کی سعادت میں ہی حاصل کروں گا۔ میاں بیوی کا

آپس میں اس پر جھگڑا بھی ہوا، آخر اس فیصلہ پر راضی ہو گئے، کہ ایک دن تو وہ دھویا کریں گی اور ایک دن میں دھویا کروں گا، مولانا طاہر صاحب نے اس روایت کو اپنے والد مرحوم کے حوالہ سے درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی دادی صاحبہ یعنی حضرت نانوتوی کی اہلیہ محترمہ فرماتی تھیں کہ اس فیصلہ کے بعد میں یہ کیا کرتی کہ دھونے کے لئے دن بھر میں چار پانچ کپڑے جب جمع ہو جاتے تو تین چار کپڑوں کو میں خود دھو کر سکھا لیتی اور حضرت کے سامنے ایک کپڑا دھونے کی باری کے دن میں پیش کر دیا کرتی تھی۔

اپنی گم شدہ جنت الفردوس کو اپنی ماں کے قدموں کے نیچے جو اس طرح ڈھونڈھ رہا ہو اگر خدمت میں کوتاہی کی معمولی شکایت پر بیوی سے جدا ہو جانے کی دھمکی دیتا ہو تو اس پر تعجب کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

بہر حال گفتگو حضرت والا کے نکاح کے متعلق ہو رہی تھی، مصنف امام کے بیان سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے پیر و مرشد کے حکم کے مطابق نکاح کرنے پر راضی ہوئے، لیکن مذکورہ بالا روایت جو حضرت والا کے نور چشم کی روایت ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس رضامندی میں اپنی والدہ ماجدہ کی ضرورت و سہولت کا خیال بھی آپ کے سامنے تھا، بہر حال اسباب و وجوہ کچھ ہی ہوں، مگر ہوا یہی کہ جیسے امامت نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن امام بن کر آپ کو نماز پڑھانی پڑی، وعظ و خطابت سے بھاگتے تھے، لیکن ہندوستان کے بہترین خطیب و مقرر مشہور ہو کر دنیا سے رخصت ہوئے، درس دینا نہیں چاہتے تھے، لیکن درس دینا ہی پڑا، اور آپ کے ہاتھوں تدریس کے اس عظیم الشان کارخانے کی بنیاد بھی قائم ہوئی، جس سے بن بن کر خدا ہی جانتا ہے اب تک کتنے مدرس نکل چکے ہیں اور نکلتے چلے جائیں گے، آپ مصنف نہیں بننا چاہتے تھے، لیکن ایک درجن سے زیادہ کتابیں آپ سے لکھوائی گئیں۔

الغرض اپنے مٹانے کا جو فیصلہ کر چکا تھا، غیب میں قدرت اسی کے باقی رکھنے کا انتظام کر رہی تھی، بلکہ چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ بیرون ہند کو بھی جس کی روحانیت سے بھر دیا گیا،

اسی کے متعلق یہ دکھایا گیا کہ جو شادی نہیں کرنا چاہتا تھا، اس کی شادی بھی ہوئی اور صرف ایک ہی بیوی سے جسمانی اولادیں اتنی برکت عطا کی گئی کہ عمر کے حساب سے پچاس سال بھی جس کے پورے نہیں ہوئے تھے، اور وفات پر ابھی (۳۷) سال بھی نہیں گذرے ہیں، صدی بھی پوری نہیں ہوئی ہے کہ اب تک اسی کی جسمانی ذریت[1] اور نشانیوں کی تعداد سو سے متجاوز ہو چکی ہے[2]۔

[1] خاکسار کا یہ ایک اجمالی تخمینہ ہے، کاش! آپ کے اہل خاندان میں سے کوئی صاحب حضرت والا کی ذریت کا کوئی شجرہ مرتب فرما دیتے، تو اس کتاب میں اس کو شریک بھی کر دیتا، اور اسی سے لوگوں کو اندازہ ہوتا کہ حق تعالیٰ نے واقعی کتنی غیر معمولی برکت حضرت والا کی جسمانی یادگاروں میں بھی عطا فرمائی ۱۲

[2] حضرت مصنف دام مجدہ کا تخمینہ صحیح ہے، حضرت والا کی ذریت سو سے متجاوز ہے اور کافی متجاوز ہے، اگر صحیح تعداد کا پتہ چل جائے تو اندازہ یہ ہے کہ دو سو سے متجاوز ہو جائے گی جس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت والا کی بلا واسطہ دس اولاد ہوئی۔ مولانا محمد احمد۔ محمد ہاشم۔ محمد میاں۔ محمد میاں خورد سالی میں بعمر گیارہ ماہ فوت ہو گئے اور محمد ہاشم کا جوانی کی عمر میں مکہ معظمہ میں انتقال ہوا، پسری نسل صرف مولانا محمد احمد صاحب سے چلی، لڑکیاں سات ہوئیں۔ اکرام النساء، رقیہ، خدیجہ، مریم، عائشہ (دو کے نام معلوم نہیں ہو سکے) ان میں سے عائشہ زندہ ہیں مگر لاولد ہیں۔ خدیجہ، مریم اور نامعلوم الاسم لڑکپن ہی میں فوت ہو گئیں۔ دختری اولاد صرف دو سے چلی۔ اکرام النساء اور رقیہ۔ تفصیل بقدر علم درج ذیل ہے۔

مولانا محمد احمد کے پانچ اولاد ہوئیں۔ محمد طیب۔ طاہر اول۔ طاہر ثانی۔ فاطمہ۔ طیبہ۔ جن میں طاہر اول اور فاطمہ خورد سال فوت ہوئے اور نسل صرف تین سے چلی جس کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) محمد طیب کے نو اولاد ہوئی، چار لڑکے محمد سالم، محمد عاصم، محمد اسلم، محمد اعظم۔ پانچ لڑکیاں فاطمہ، ہاجرہ، حمیرا، عذرا، رشیدہ۔ ان میں سے محمد عاصم کا بعمر چودہ سال انتقال ہو گیا اور رشیدہ شیر خواری کی عمر میں فوت ہو گئی، باقی بحمد اللہ زندہ سلامت ہیں، اور ان میں سے چار الحمد للہ صاحب اولاد بھی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:۔

محمد سالم کے دو اولاد ہیں۔ ایک لڑکا سلمان سالم اور ایک لڑکی اسماء۔

فاطمہ کے چھ اولاد ہیں چار لڑکے۔ محمد سلیم، محمد وسیم، محمد نسیم، محمد شمیم، دو لڑکیاں سلمیٰ، رضیہ۔ ان میں سے رضیہ اسی سال شیر خوارگی میں انتقال کر گئی۔

ہاجرہ کے پانچ اولاد ہیں چار لڑکے طارق، خالد، سلمان منصور، ارشد منصور، ایک لڑکی شہناز بیگم

حمیرا کے ایک بچہ ہے، عارف احتشام سلمہٗ۔

(۲) مولوی محمد طاہر مرحوم (طاہر ثانی) کے گیارہ اولاد ہوئی۔ سات لڑکے، محمد زاہر، محمد فاخر، محمد عامر

بقیہ ۵۰۵ پر

یہ عجیب بات ہے کہ اس تاریخی شادی کے متعلق عام طور پر جن باتوں کے جاننے کی توقع ہوسکتی تھی، ان سے ہم تقریباً ناواقف ہیں۔ نانوتہ سے سولہ سترہ میل کا فاصلہ طے کرکے برات دیوبند کے ایسے رئیس کے گھر آئی ہے، جسکے متعلق مشہور ہے شاید پہلے کہیں اس کا ذکر آچکا ہے کہ سابقہ تیاریوں

(بقیہ حاشیہ ص۵۰۴) محمد شاکر، محمد آصف، سعید قمر، وحید ظفر۔ اور چار لڑکیاں، راشدہ، رشیدہ اولیٰ، رشیدہ ثانیہ۔ سعدیہ۔ ان میں سے رشیدہ اولیٰ فوت ہوچکی ہے۔ باقی دس نفر بحمد اللہ زندہ سلامت موجود ہیں، ان کی اولاد کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

محمد زاہر کے تین اولادیں ہیں، دو لڑکے جاوید، پرویز۔ ایک لڑکی زہرہ

راشدہ کے چار اولادیں ہیں دو لڑکے۔ راشد۔ شاہد۔ دو لڑکیاں۔ رشدی۔ بشریٰ۔

رشیدہ ثانیہ کے تین اولادیں ہیں منصور سالم۔ مسرور عالم۔ ایک لڑکی یاسمین۔

(۳) طیبہ مرحومہ کے گیارہ اولاد ہوئیں جن میں سے چار زندہ سلامت موجود ہیں۔ دو لڑکے سید محمد احتشام۔ سید محمد واصف، دو لڑکیاں سیدہ خاتون، خورشیدہ خاتون۔ ان کی اولادوں کی تفصیل یہ ہے۔

سید محمد احتشام کے ایک لڑکا ہے عارف احتشام۔ (جس کا تذکرہ حمیرا بنت طیب کی اولاد میں آچکا ہے)

سیدہ خاتون کے پانچ دختری اولاد ہیں۔ رفعت۔ طلعت۔ انجم۔ کشور۔ مسعودہ۔ نرینہ اولاد ابھی تک نہیں ہوئی۔ خدا بہرہ ور فرمائے۔

خورشیدہ خاتون کے چار اولاد ہوئی، تین لڑکے طارق۔ خالد۔ عبید اللہ۔ ایک لڑکی طاہرہ۔ ان میں سے طارق کا انتقال ہوچکا ہے۔ بقیہ بحمد اللہ زندہ سلامت ہیں۔ اس طرح حضرت کی پسری اولاد کی تعداد اناسی ہوتی ہے۔

ادھر حضرت والا کی لڑکیوں میں اکرام النساء اور رقیہ صاحب اولاد ہوئیں۔ جن کی اولاد اور انکے اولاد کی پوری تفصیل معلوم نہیں ہوسکی کیونکہ یہ اولاد معاشی معیار سے ملک اور بیرون ملک میں منتشر ہے۔ جہاں تک علم ہوسکا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

(۱) اکرام النساء کے (جن کی شادی مولانا عبداللہ صاحب انبہٹوی ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ سے ہوئی) پانچ اولاد ہوئیں۔ دو لڑکے مولانا محمد میاں (رفیق خاص سیاسی حضرت شیخ الہند، مہاجر کابل عرف مولانا منصور) مولانا احمد میاں (ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ) کے تین لڑکیاں امۃ السلام۔ امۃ المنان۔ کلثوم۔

مولانا محمد میاں مرحوم کے چار اولاد ہوئیں تین لڑکے محمود میاں۔ حامد میاں۔ حمید میاں۔ ایک لڑکی قدسیہ بیگم۔ جن میں سے محمود میاں لڑکپن میں فوت ہوگئے باقی بحمد اللہ زندہ سلامت ہیں۔ ہجرت کابل کے بعد ممدوح مرحوم نے دوسری شادی کابل میں کی۔ جن سے پانچ اولاد ہوئی۔ ان کے اسماء کا علم نہیں۔ ہندوستانی بیوی حضرت مولانا صدیق احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی تھیں جن سے (بقیہ صفحہ آئندہ)

کے بغیر اچانک بعض دفعہ گذرنے والی یا دیوبند آنے والی براتوں کے کھانے کھلانے کا نظم
بسہولت تمام کردیا جاتا تھا، ایک ایسے کھاتے پیتے خوش حال گھر میں براہ راست خود رئیس کی
قرۃ العین، اور صاحبزادی کی برات جب آئی ہوگی تو غیر شرعی قصوں سے قطع نظر بھی کرلیا جائے،

(بقیہ صفحہ ۵۰۵) چار اولاد ہوئی۔ ان میں سے مولوی حامد میاں الانصاری غازی سابق ایڈیٹر اخبار مدینہ بجنور حال ایڈیٹر اخبار "جمہوریت" بمبئی کے پانچ اولاد تو وہی ہیں جو سابق میں ہاجرہ بنت طیب کی اولاد دکھلائی گئی ہے اسلئے شمار میں یہاں نہیں لی گئی، اور ایک لڑکا پہلی بیوی سے ہے جس کا نام عابد میاں ہے۔ قدسیہ بیگم کے ایک لڑکا وصی نام ہے، مولانا احمد میاں مرحوم کے چار اولاد ہوئی۔ دو لڑکے محامد اللہ اور حمد اللہ اور دو لڑکیاں محمودہ اور حمیدہ جس میں سے حمیدہ خورد سال فوت ہوگئی اور محمودہ لاولد ہیں۔ صاحب اولاد صرف دو صاحبزادے ہیں جن کی نسل کی تفصیل یہ ہے کہ

محامد اللہ کے پانچ لڑکیاں وہی ہیں جو سیدہ بنت طیبہ مرحومہ کی دکھلائی گئیں۔ اسلئے یہاں شمار میں نہیں لی گئیں۔ حمد اللہ کے چار اولادیں ہیں دو لڑکے ساجد اور شاہد اور دو لڑکیاں حمیرا اور ناہید ہیں۔ امۃ السلام کے پانچ اولاد ہوئیں، دو لڑکے لطیف احمد، حنیف احمد۔ تین لڑکیاں۔ امۃ الرحمان، امۃ الدیان۔ امۃ السبحان۔ ان میں سے لطیف احمد کے چار اولاد ہوئی۔ حنیف احمد کے دو اولاد۔ امۃ الرحمان کے سات اولاد۔ امۃ السبحان کے چھ اولاد۔ امۃ المنان کے سات اولاد ہوئی، چار لڑکے۔ اسرائیل۔ الیاسین۔ یامین۔ سموئیل اور تین لڑکیاں نعیمہ۔ حسینہ۔ طیبہ۔ ان میں سے اسرائیل کے سات اولاد۔ الیاسین کی دو اولاد۔ یامین کی چھ اولاد۔ سموئیل کی اولاد کا علم نہیں۔ نعیمہ کے تین اولاد۔ حسینہ کے آٹھ اولاد۔ طیبہ کی اولاد کا علم نہیں۔ پھر ان اولادوں کی اولاد کافی ہے مگر مجھے تعداد اور اسمار کا علم نہیں۔

کلثوم کے دو اولاد۔ بشیر احمد۔ جمیل احمد ہیں۔ ان دونوں کے بھی اولادیں ہیں جن کی تعداد و اسمار کا مجھے علم نہیں۔ اسی طرح ان اولادوں کی اولاد بھی کافی ہے۔ جن کی تعداد اور کثرۃ کا تو علم ہے۔ لیکن تعداد اور اسمار کا پتہ نہیں ہے ان میں سے بہت سے تو پاکستان میں ہیں اور بہت سے ہندوستان میں ہیں مگر ان میں سے بعض نے دکن میں سکونت اختیار کرلی ہے اور بعض نے بمبئی اور دوسرے مقامات میں، اسلئے ان کے اعداد و شمار سعی سے ہی معلوم ہوسکتے ہیں جتنوں کا مجھے خود علم تھا یا حضرت والدۂ ماجدہ دام ظلہا اور حضرت عمۃ محترمہ مدظلہا سے دریافت کرنے پر علم ہوا، ان کے اسمار اور اعداد ذکر کردیئے گئے۔

(۳) رقیۃ کے صرف ایک صاحبزادے ہیں مولوی محمد عمر (ناظم متفرقات دارالعلوم دیوبند) اور ان کے نو اولاد ہیں۔

الحاصل یہ تفصیل بقدر علم حضرت والا کی صہری اولاد کی ہے جس کی تعداد نواسی تک پہونچتی ہے اور گذر چکا ہے کہ نسبی اولاد کی تعداد ۷۹ ہے۔ اس لئے نسب و صہر کی اولاد کی مجموعی میزان ۱۶۸ تک ہوجاتی ہے (بقیہ صفحہ ۵۰۷ پر)

مگر شرعی حدود کے تکلفات میں قیاس تو یہی چاہتا ہے کہ کوئی کمی نہ کی گئی ہو گی۔ ریل کا تو وہ زمانہ تھا نہیں۔ رتھوں، بہلیوں، چھکڑوں پر یہ برات نانوتہ سے دھوم دھام سے نکلی ہو گی کہ شیخ اسد علی صاحب کے اکلوتے قرۃ العین کی یہ شادی تھی، لیکن بجز اس بات کے جس کے راوی حضرت الا کے حفید سعید مولانا محمد طیب ہیں۔ براہ راست اپنی جدہ ماجدہ سے سن کر یہ روایت درج کی ہے لکھتے ہیں کہ

"احقر کی دادی صاحبہ (یعنی اہلیہ محترمہ حضرت نانوتوی قدس سرہ) فرمایا کرتی تھیں کہ میرے والد (شیخ کرامت حسین رئیس دیوبند) نے حضرت سے نکاح کر کے مجھے رخصت کیا، تو اس زمانہ کے لحاظ سے "جہیز بہت بڑا اور عظیم الشان" دیا"۔

پھر اس بڑے اور عظیم الشان جہیز کی تفصیل کرتے ہوئے مولانا ہی لکھتے ہیں کہ ان کی دادی صاحبہ کہتی تھیں کہ

"جس میں قیمتی زیورات، کپڑے، اور تانبے کے برتنوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا"!

بس لے دیکر رئیس دیوبند کی صاحبزادی کی تقریب شادی کے سلسلے میں یہی تین باتیں معلوم ہو سکیں کہ زیورات بھی قیمتی دیئے گئے تھے، اور کپڑوں کے ساتھ تانبے کے برتنوں کا بہت بڑا ذخیرہ جہیز میں دیا گیا تھا، لیکن براتیوں کی تعداد کیا تھی، برات کو کھانا جو کھلایا گیا تھا، اس کی نوعیت کیا تھی یہ اور اس قسم کی دوسری باتوں کے متعلق تلاش کے باوجود ہمیں کوئی آگاہی نہ حاصل ہو سکی۔ حالانکہ عموماً براتوں کی یہی باتیں مشہور ہوتی ہیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ خلاف توقع ایسی شادی کے متعلق ایسی باتوں سے واقفیت کی صورت نکل آئی ہے۔ جن کے علم کو کرامت کے سوا اور کیا سمجھا جائے۔

مطلب یہ ہے کہ شب عروسی میں دولھا دولہن جب پہلی دفعہ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو خلوت اور تنہائی کے اس عالم کی روئداد تک رسائی کی۔ آپ ہی بتایئے کہ صورت کیا ہے؟ لیکن سیدنا الامام الکبیر کی منجملہ دوسری خصوصیتوں کے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کی رفیقۂ حیات کے ذریعہ

(بقیہ صفحہ ۵۰۶) اگر نام معلوم الاسم والعدد اولاد کے اسماء و اعداد کا علم ہو جائے تو اندازہ یہ ہے کہ اس ذریۂ قاسمیہ کی تعداد دو سو سے متجاوز ہو جائے گی۔ "محمد طیب غفرلہ"

خلوت کی یہ مجلس جلوت والوں کے لئے ایک مستقل درس عبرت و بصیرت بن گئی ہے مولانا محمد طیب صاحب کی اسی تحریری یادداشت میں ہے، ارقام فرماتے ہیں کہ ان کی دادی صاحبہ یہ بھی فرماتی تھیں

"حضرت جب شب اول میں تشریف لائے تو آتے ہی نوافل شروع فرمائیں۔"

واللہ اعلم بالصواب "نوافل" کا یہ سلسلہ کب تک جاری رہا، فرماتی تھیں کہ

"نوافل سے فارغ ہونے کے بعد میرے پاس تشریف لائے۔"

پاس تشریف لانے کے بعد پھر کیا ہوا ان ہی کا بیان ہے کہ "انتہائی سنجیدگی اور متانت" کے ساتھ کچھ کہتے چلے جا رہے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب کیا کیا فرمایا، ہم تک جو روایتیں پہونچی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی اہلیہ محترمہ کو مخاطب کر کے پہلے ایک تمہیدی مقدمہ پیش کیا کہ

"جب تم کو اللہ نے میرے ساتھ وابستہ کر دیا، تو نبھاؤ کی ضرورت ہے۔"

پھر اسی تمہیدی مقدمہ کو بنیاد بنا کر ارشاد ہوا، اور کیسی حکیمانہ استوار بات ارشاد ہوئی۔

"مگر بصورت موجودہ نبھاؤ میں دشواری ہے کہ تم امیر ہو اور میں غریب و نادار ہوں۔"

عدم توافق کی اس صورت حال کو پیش کرتے ہوئے منطقی شکل میں توافق کے امکانات کو پیش کر کے حضرت نے فرمایا کہ

"صورتیں اب دو ہی ہیں، یا میں بھی تونگر بنوں، یا تم میری طرح نادار بن جاؤ۔"

اور اسکے بعد اپنے حال اور اپنے رجحانات کو ظاہر کرتے ہوئے پہلی دفعہ بیوی صاحبہ کو دوٹوک لفظوں میں مطلع فرمایا کہ

"میرا امیر بننا تو دشوار ہے۔"

عملی شکل صرف یہی رہ گئی حضرت نے فرمایا کہ

"اس لئے آسان صورت دوسری ہو سکتی ہے کہ تم میری طرح ہو جاؤ۔"

مولنا طیب صاحب نے بھائی صاحب (مرحوم) کے حوالہ سے اس روایت کو درج کر کے پھر اپنی سنی ہوئی روایت کو ان لفظوں میں پیش کیا ہے، یعنی ان کی دادی صاحبہ نے فرمایا کہ قریب آنے کے بعد متانت و سنجیدگی کے ساتھ حضرت ان لاسے کہہ رہے تھے کہ

"حق تعالیٰ نے تمہارے ساتھ میرا جو تعلق قائم فرمایا ہے، اس میں مجھے تربیت کا منصب اور تجھے اطاعت کا منصب دیا ہے۔"

یہ تو تمہید تھی، تمہید کے بعد ان کو سمجھایا جا رہا ہے، کہ قدرتی حق کے ساتھ

"اگر تم کو کسی بات کا حکم دوں، جس میں تمہارا ہی نفع ہو، تو کیا تم کو مجھ پر اعتماد ہوگا؟"

نئی نویلی بھولی بھالی دلہن سے یہ پہلا سوال تھا، ابتدا میں جیسا کہ چاہئے تھا ان ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خاموشی کے سوا ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ مگر جواب کے لئے جب اصرار آخری حدود تک پہنچ گیا تو کہتی تھیں کہ

"کئی بار فرمانے پر بالآخر میں نے عرض کیا کہ مجھے آپ پر پورا اعتماد ہے۔"

بہرحال جب قول و قرار میں عزم و ارادہ کی پوری قوت حضرت والا پر منکشف ہوئی تو نسوانی جنس سے تعلق رکھنے والے نازک دل پر آپ کی طرف سے پہلی دفعہ خلوت کی پہلی ہی مجلس میں ایسا بوجھ ڈال دیا گیا کہ اس وقت بھی جب میں اس کا تصور کرتا ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں۔

عورت اور زیور اگرچہ دونوں واقع کے لحاظ سے دو جداگانہ حقیقتیں ہیں، لیکن اس واقعہ کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عورت کا تخیل بھی زیور کے بغیر دوسرے نہیں کر سکتے۔ بلکہ جہاں تک مشاہدات کا تعلق ہے خود عورت بھی اپنے آپ کو زیور کے خیال سے الگ کر کے شاید سوچ نہیں سکتی، بناؤ سنگار زیب و زینت، آرایش و زیبائش اور جن چیزوں سے ان کے حاصل کرنے میں مدد ملتی ہو، ان کے خیال سے مشرق کی عورت ہو یا مغرب کی، نہ پہلے کبھی خالی نظر آئی ہے اور نہ آج تک اس خیال سے جیسا کہ چاہئے اسے آزادی میسر آئی ہے

آج بھی یورپ و امریکہ کے بازاروں کا سب سے زیادہ چالو سودا جنس نسوانی کے زیب و زینت کا سامان ہی بنا ہوا ہے، دنیا کی تجارتی روئدادیں اسی کی شاہد ہیں، قرآن میں بھی اومن ینشؤ فی الحلیۃ کے الفاظ سے صنف لطیف کی اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

بہر حال کہنا یہ ہے، راویوں کا بیان ہے کہ جب حضرت والا کی اہلیہ محترمہ نے آپ پر کامل اعتماد ہونے کا یقین دلایا تو اسی کے بعد وہ سن رہی تھیں کہ نوجوان دولھا اپنی دلہن سے یہ کہہ رہا ہے کہ

"اچھا سب زیور اتار کر مجھے دے دو"

زیوروں کو اتار کر حوالہ کر دینے کا حکم تو فوری تھا، اور اسی کے ساتھ یہ اختیار طلب کیا گیا کہ

"جس قدر تمہارے ساتھ کپڑے، اور برتن ہیں، ان کا بھی مجھے اختیار دے دو"

برتن سے تو خیر بناؤ سنگار، زیب و زینت کا تعلق نہ تھا، لیکن جذبات کی روح "زیورات" کا اسی وقت اتروا لینا، اور اسی پر بس نہ کرنا، بلکہ لے دے کر کپڑوں کی شکل میں ان جذبات کی تسکین کی، تھوڑی بہت جو ضمانت تھی، ان سے بھی محروم کر دینے کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے لینا کہہ دینے کی حد تک تو ممکن ہے کہ آسان سی بات معلوم ہو، لیکن تجربہ ہی بتا سکتا ہے کہ اس قسم کے مطالبات نسوانی عواطف و میلانات میں کس قیامت کو برپا کر سکتے ہیں، مولنا طیب صاحب کی روایت ہے کہ دونوں مطالبات یعنی زیور سے فوراً خالی ہو جانے پر تیار ہو جانا، اور کپڑوں اور برتنوں کے متعلق آئندہ اختیار بدست مختار سپرد کر دینا، دونوں ہی کے مطالبات کو سن کر آپ کی بانوئے بلند اختر نے بغیر کسی تذبذب اور دغدغہ کے عرض کیا کہ

"آپ کو کلی اختیار ہے"

آگے کیا ہوا؟ عام طور پر تواتر کی شکل میں یہ روایت مشہور ہے کہ "روم وروس" کی جنگ کے نام سے جو لڑائی خلیفۃ المسلمین کے مقابلہ میں لڑی جا رہی تھی، اسی جنگ میں ترکی کی امداد کے فنڈ میں اپنی دلہن سے پہلی شب کے اتروائے ہوئے ان ہی زیوروں کو سیدنا الامام الکبیر نے شریک فرما دیا۔

روم یعنی ترکی اور روس کے درمیان جنگوں کا قصہ انیسویں صدی عیسوی میں وقفہ وقفہ سے چھڑتا رہتا تھا، یقینی طور پر نہ معلوم ہو سکا کہ اس سلسلہ کی یہ کون سی جنگ تھی، تاہم قرائن و قیاسات کا اقتضا، یہی ہے کہ ہندوستان کی جنگ

آزادی ۱۸۵۷ء میں جو لڑی گئی، اس سے چار سال پہلے ۱۸۵۳ء میں کریمیا والی لڑائی روسیوں اور ترکوں میں جو ہوئی تھی، اور جیسا کہ اس جنگ میں حالات کا اقتضار یہ ہوا کہ فرانس اور انگریز دونوں ترکی کے طرفداروں میں شریک ہو گئے تھے۔ روس کو اس جنگ میں فاش شکست ہوئی تھی جس کے بعد پیرس کا عہدنامہ ترکوں اور روسیوں کے درمیان طے پایا تھا، اور کچھ دنوں کے لئے اسی عہدنامہ کی بدولت ترکی کو سر کھجانے کی فرصت روس سے گونہ مل گئی تھی، بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اسی جنگ سے اس امداد کا تعلق تھا۔ انگریزوں نے مسلمانان ہند کو ترکوں کی امداد سے اسی لئے نہیں روکا تھا کہ وہ خود اس جنگ میں ترکوں کے طرفداروں میں تھے۔

بلکہ اسی بنیاد پر یعنی اگر یہ مان لیا جائے کہ ۱۸۵۳ء زالی روم وروس والی جنگ سے اس واقعہ کا تعلق تھا، اسی سے یہ بھی متعین ہو جاتا ہے کہ ازدواجی زندگی کے دائرے میں سیدنا الامام الکبیر کی شرکت قریب قریب اکیس اور بائیس سال کی عمر میں ہوئی، ۱۸۵۳ء میں یہی عمر آپ کی ہونی چاہیئے۔

بہرحال کہنا یہ ہے کہ زیور تو پہلی ہی رات کو اتروا دیئے گئے، اور جب صبح ہوئی تو جیسا کہ مولانا طیب صاحب ہی کی روایت ہے کہ

"علی الصباح تمام زیورات، تمام جوڑے کپڑوں کے، اور
سارے برتن جو ہزاروں روپے کا سامان تھا، سب کا سب
چندۂ سلطانی میں دے دیا۔"

اور یوں دیوبند کے رئیس کی لڑکی، نانوتہ کے ایک فقیر کی حقیقی معنوں میں رفیقۂ حیات بن گئیں، کوتاہ بینوں نے سمجھا کہ جو آسمان پر تھیں زمین پر اتار دی گئیں، لیکن جن کی نظر ظاہر سے زیادہ باطن پر، اور حال سے زیادہ استقبال پر تھی وہ دیکھ رہے تھے کہ رات صرف ایک رات کی رفاقت نے ایک معمولی شہزادی کو ارتقار وعروج کے کتنے آسمانوں کو

طے کرادیا، باہر ہی سے خالی نہ ہو جانا، بلکہ دل سے بھی ان ساری چیزوں کا نکل جانا، جن سے بھری ہوئی وہ سسرال میں پہلی دفعہ آئی تھیں، بجز ولایت اور کرامت کے اس کی توجیہ اور کیا کی جائے حضرت شاہ فضل رحمٰن قطب العصر جو فرمایا کرتے تھے کہ مولانا محمد قاسم کو نوعمری ہی میں ولایت مل گئی۔ اس دعوے کے ثبوت کیلئے آخر اور کیا چاہا جاتا ہے، اکیس بائیس سال کی عمر عین ریعان شباب کا عہد شاداب ہے جس سازوسامان کی ضرورت اس عہد میں ہوتی ہے سب سامنے لاکر رکھدیئے جاتے ہیں، لیکن ہمت کی بلندی دیکھئے کہ ٹھکرانے والا سب ہی کو ٹھکراکر آگے نکل جاتا ہے، اور بات اسی پر ختم نہیں ہو جاتی ہے مولانا طیب ہی کی روایت میں ہے کہ باپ کے دیئے ہوئے طلائی و نقرئی زیوروں اور قیمتی جوڑوں سے خالی ہو کر جب سسرال سے پہلی دفعہ ان کی جدّہ ماجدہ دیوبند اپنے والد کے گھر تشریف فرما ہوئیں تو خود فرمایا کرتی تھیں کہ

"میں جب دیوبند (نانوتہ) سے واپس ہوئی، تو رئیس باپ نے میرے ہاتھ پاؤں، ناک کان کو خالی دیکھ کر پوچھا کہ "زیور کیا ہوا!"

جو واقعہ پیش آیا تھا، والد کے سامنے سب دہرادیا گیا سنکر شیخ کرامت حسین صاحب زبان سے تو کچھ نہ بولے لیکن دل میں خیال بےچارے کے آنے لگا کہ آخر میری بچی اعزہ اقربار کے سامنے ننگی بنی ہوئی کب تک رہیگی؟ خدا کے فضل سے کسی قسم کی تنگی بھی نہ تھی، شیخ صاحب نے جیسا کہ مولانا طیب نے لکھا ہے،

"پھر از سرِ نو پورا جہیز تیار کیا"

"پورا جہیز" سے غالباً مقصد یہی ہے کہ مافات کی تلافی صرف زیوروں ہی کی حد تک محدود نہ تھی، بلکہ کپڑوں جوڑوں، برتنوں، الغرض جو کچھ لیا گیا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھر ایک ایک چیز شیخ صاحب کی طرف سے تیار ہوئی اور جب دوبارہ میکے سے سسرال لڑکی رخصت ہونے لگی تو مولانا طیب صاحب نے اپنی دادی جان کے سنے ہوئے یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ

"میں پھر لد پھند کر، دوبارہ سسرال پہونچی"

دن تو خیر کسی طرح گذر گیا۔ رات آئی واپسی کے بعد پہلی رات آئی، اسمیں کیا ہوا، ان ہی کی زبانی سنئے، فرماتی تھیں،

"رات کو حضرت (سیدنا الامام الکبیر) تشریف لائے"!

دیکھا کہ جن چیزوں سے خالی کرانے میں کامیاب ہوا تھا، پھر وہی ساری چیزیں لپٹی ہوئی ہیں، گفتگو کی ابتدا، جیسا کہ ان ہی کا بیان ہے۔

"پھر ترغیب آخرت"

سے شروع ہوئی اور "کل" کی تیاری کیلئے "آج" کا اختیار پھر ان چیزوں کے متعلق آپ نے اپنے ہاتھ میں لے لینے کی خواہش ظاہر کی۔ "اختیار" جو پہلے ہی دیا جا چکا تھا، اسکی واپسی کا سوال ہی کب پیدا ہوا تھا، کہہ دیا گیا کہ آپ "مختار" ہیں۔

رات تو افہام و تفہیم، عہد و میثاق کے تذکروں میں گذری، صبح ہوئی، اور وہی تماشا جو پہلی رات کی صبح کے بعد دیکھا گیا تھا، اس رات کے بعد آنے والی صبح میں دیکھنے والوں کے سامنے تھا، خود وہی جن کے ساتھ واقعہ گذرا یعنی مولنا طیب صاحب کی دادی صاحبہ بیان کرتی تھیں کہ

"صبح ہی یہ ہزاروں روپے کا سامان پھر سلطانی چندہ میں دے ڈالا"۔

شبہ ہو سکتا ہے کہ فوری مرعوبیت کا ممکن ہے کہ یہ فجائی اور اضطراری نتیجہ ہو، لیکن معتبر راویوں ہی کی زبانی ہم تک یہ خبر پہنچ چکی ہے۔ مولانا طیب صاحب ہی کا بیان ہے کہ ان کی جدہ ماجدہ حضرت نانوتوی کی اہلیہ محترمہ عموماً کہا کرتی تھیں کہ،

"اس کے بعد (یعنی حضرت والا کے دوسری بار کے اس طرز عمل کے بعد) میرے قلب سے روپیہ پیسہ اور زیور وغیرہ کی محبت ہی قطعاً نکل گئی"!

صرف "قطعاً نکل گئی"، یہی نہیں بلکہ وہی فرمایا کرتی تھیں کہ

"بلکہ ان اشیاء (زیورات وغیرہ) سے ایک قسم کا تنفر پیدا ہو گیا"۔

بدلے ہوئے دل کی یہ کیفیت کتنی راسخ اور صادق کیفیت تھی کہ آئندہ ان ہی کا بیان ہے۔

"پھر عمر بھر نہ میں نے زیور بنوایا اور نہ فاخرہ لباس کی مجھ میں کبھی ہوس یا آرزو پیدا ہوئی"۔ صفحہ ۲۶

ظاہر ہے کہ چوبیس گھنٹہ ساتھ رہنے والے عزیزوں اور بچوں کے سامنے ان کا یہ دعویٰ کہ میں نے کبھی نہ

زیور ہی بنوائے اور نہ فاخرہ لباس کا شوق ہی پیدا ہوا۔ صرف دعویٰ ہی نہیں ہے بلکہ جس دعویٰ کے زندہ شاہد اور گواہ ان کے سامنے موجود تھے ان کے تائیدی مشاہدات بھی اس دعوے کے پیچھے پوشیدہ ہیں دیکھنے والوں کا علم خدانخواستہ اگر اسکے مطابق نہ ہوتا تو یقیناً انہیں کے سامنے اس دعوے کی جرات ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

کچھ بھی ہو توجہ دی گئی یا سننے والے کی ذاتی صلاحیت کا یہ نتیجہ تھا کہ نسوانی جذبات کا متلاطم سمندر کسی طویل کش مکش کے بغیر چند لمحوں میں جم کر ساکن ہو گیا اور ہمیشہ کیلئے ساکن ہو گیا۔

الغرض دینے والے سے شیخ کرامت حسین کو ملتا تھا' اور وہ اپنی لڑکی کے حوالہ کرتے تھے' لڑکی کو باپ سے جو کچھ ملتا تھا' سب کو اپنے شوہر کی مرضی اور اختیار کے سپرد کر دیتی' اور شوہر پھر دینے والے ہی کے قدموں پر سب کو لا کر نچھاور کر دیا کرتا تھا۔ لین دین' داد و ستد کا یہی ایک دلچسپ چکر تھا' جو گھوم رہا تھا' مولانا طیب صاحب کے بیان سے تو معلوم ہوتا ہے' کہ دو دفعہ یہی صورت پیش آئی' لیکن جس جذبہ کے تحت ایک دفعہ دینے کے بعد شیخ کرامت حسین مرحوم نے دوبارہ اپنی بچی کو نئے سرے سے پھر جہیز کا سامان تیار کرا دیا تھا' کیسے سمجھا جائے کہ لدی پھندی بھیجی ہوئی وہی صاحبزادی پھر ننگے ہاتھ پاؤں کان اور ناک کے ساتھ جب ان کے گھر واپس ہوتی ہونگی تو اس حال پر وہ صبر کر سکتے تھے۔ بلکہ ضیافت و مہمان نوازی کے سلسلے میں سیدنا الامام الکبیر کی اولوالعزمیوں کا ذکر کرتے ہوئے مصنف امام نے اپنی کتاب میں جو یہ اطلاع دی ہے' کہ

"جب وطن آتے' اور یہاں مہمان آتے' والدین کو دشواری ہوتی' تب یہ کیا کہ بی بی کا زیور اس کی اجازت سے بیچ کر صرف کر دیا" ص۳۲

ظاہر ہے کہ یقیناً یہ زیور وہ زیور تو ہو نہیں سکتے' جو جہیز کے نام سے پہلی دفعہ اور دوسری دفعہ آپکی اہلیہ کو والد کے یہاں سے ملے تھے۔ کیونکہ اس سلسلہ کی تو جتنی چیزیں تھیں' وہ سلطانی چندے کی نذر ہو چکی تھیں' بظاہر یہی خیال گذرتا ہے کہ شیخ کرامت حسین صاحب وقتاً فوقتاً بعد کو بھی اپنی صاحبزادی کو کچھ زیور بنوا دیا کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ جب تک ترکی فنڈ کی گرما گرمی کا زور رہا ہو' اس وقت

تک تو شیخ صاحب نے اس لئے خاموشی اختیار کرلی ہوگی، کہ جو کچھ دیا جائیگا ترکی کے چندے میں دے دیا جائیگا۔ لیکن گو نہ اس خطرے سے اطمینان کی صورت جب پیدا ہوئی ہوگی تب کچھ زیور پھر باپ کی طرف سے بیٹی کے لئے تیار کرادیئے گئے ہوں، لیکن شیخ صاحب بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ ترکی فنڈ میں چندہ دینے والا یا دلانے والا ترکی فنڈ میں نہیں، بلکہ اس کی خدمت میں پیش کر رہا تھا، جو ترکی فنڈ کے قائم ہونے سے پہلے موجود تھا، اور اس کے بعد بھی اس کا مطالبہ باقی رہتا ہے، ترکی فنڈ تو اسی کی خدمت میں پیش کرنے کا ایک ذریعہ تھا، وہ ذریعہ ختم ہوگیا، تو بے شمار ذرائع اسکے بعد بھی باقی تھے، جن میں اکرام ضیف یا مہمان نوازی کی مد بھی تھی، اسی مد میں پھر اس زیور کی قیمت خرچ ہوجاتی تھی جو باپ کی طرف سے بیٹی کو ملتے تھے۔

آخر روایتوں میں جب اس قسم کی روایت بھی ملتی ہے، مثلاً مولانا طیب صاحب ارقام فرماتے ہیں،

"ایک دفعہ کا ذکر ہے، کہ کسی معتقد نے ایک چادر بیش قیمت، اور ایک عدد زیور طلائی بی بی صاحبہ (یعنی حضرت نانوتوی کی اہلیہ محترمہ) کی ملک کر کے بھیجا۔"

خاص طور پر بی بی صاحبہ کی ملکیت کی تصریح پیش کرنے والے کی طرف سے اس لئے کی گئی تھی، کہ حضرت والا کے پاس خواہ عورتوں ہی کے استعمال کی چیز کیوں نہ پیش کی جاتی، لیکن عام دستور تھا کہ آپ بجائے اپنے گھر کے کسی دوسرے ضرورت مند کے گھر اسے بھیجدیا کرتے تھے، آپ کی اس عام عادت سے چونکہ پیش کرنے والے صاحب واقف تھے۔ اس لئے خاص کر کے انہوں نے کہا کہ بی بی صاحبہ کو میں ان چیزوں کا مالک بناتا ہوں۔ آپ صرف ان تک نفیر کے اس ہدیے کو پہنچا دیجئے۔ ظاہر ہے کہ شرعاً تصرف کی صورت اب باقی ہی کیا رہی تھی، حفظ ما تقدم کی اس احتیاطی تدبیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس کی امانت تھی اس تک امانت تو پہنچ گئی، لیکن ادار امانت کے بعد اپنے اختیار کی جو بات تھی بی بی صاحبہ کے سامنے باین الفاظ اسے پیش کرنے لگے کہ

"فی الحقیقت چادر اور زیور سے دل خوش ضرور ہوتا ہے لیکن چند روز کے استعمال سے یہ دونوں ہی چیزیں خراب ہوجائیں گی۔"

اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا کہ

"جو کام اس پشمین چادر سے نکلے گا، وہی لٹھے کی سفید چادر سے بھی نکل سکتا ہے"

ان دونوں باتوں کو ذہن نشین کرانے کے بعد فرمایا کہ خراب ہونے سے چاہتی ہو کہ تمہاری چیز محفوظ ہو جائے تو یہ دونوں چیزیں چادر اور زیور دونوں کو اس کی حفاظت میں دیدو، جس کی حفاظت میں پہنچ جانے والی چیزیں کبھی خراب نہیں ہوتیں، مطلب یہ تھا کہ کسی مستحق کے حوالہ کردو، حضرت کے الفاظ تھے کہ

"خداوند تعالیٰ ان کے عوض، عاقبت میں پائدار لباس، اور زیور عطا فرمائیں گے"

باپ کی عطا کی ہوئی چیزوں کو شوہر کی مرضی کے مطابق جو بار بار اسی راہ میں لٹا چکی تھیں۔ اسلام کی اس دلیر خاتون کے لئے غیر کے پیش کئے ہوئے تحفہ کی سپردگی میں ہچکچانے کی وجہ ہی کیا ہو سکتی تھی، مولنا طیب صاحب نے اطلاع دی ہے کہ

"بی بی صاحبہ نے فوراً (چادر پشمین طلائی زیور دونوں کو) دے دیا، اور دل پر میل نہ آیا"

میں نے جس "چکر" کا ذکر کیا اس سے اشارہ دراصل لین دین کے ان عجیب و غریب واقعات کی طرف ہے، دینے والا دیتا جاتا تھا، اور لے لے کر جو کچھ ملتا تھا اسے پھر اسی دینے والے کے سپرد کر دیا جاتا تھا، یہی قصہ تھا، جو جاری اور مسلسل جاری تھا، مولانا طیب صاحب کے الفاظ میں واقعہ کی صورت یہ تھی کہ

"مولانا (نانوتوی) کے معتقد آپ کی بی بی کے واسطے قیمتی لباس اور زیور بنا کر بھیجتے مگر مولانا (بجائے بی بی صاحبہ) کے مساکین کو دے دیا کرتے اور بی بی صاحبہ کو خبر بھی نہ کرتے"

شاید میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ عورت بہرحال عورت ہوتی ہے، عام حالات میں چاہیئے تو یہی تھا کہ داد و ستد لین دین کا یہ عجیب و غریب "چکر" کم از کم عورت کو چکرا دیتا، لیکن واقعات بتاتے ہیں، جن کے مشاہدہ کرنے والے اس وقت تک موجود ہیں کہ چکرانا تو چکرانا، اللہ کی یہ ایک نیک بندی اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں،

دل جس کی انگلیوں میں ہیں، جب اسی کو راضی کر لیا جاتا ہے، تو سارے دل والے بھی اس سے راضی ہو جاتے ہیں، اسی کا یہ کتنا زندہ ثبوت تھا، جس کا مشاہدہ عائلی زندگی کے اس نمونے میں کیا گیا تھا۔

زن و شو کے باہمی تعلقات کی خوش گواریوں کا شاید وہ تصور بھی نہیں کر سکتے، جو اپنی بیویوں کو بشاش و بشاش رکھنے کے لئے انکے نسوانی چوچلوں کی تکمیل ہی میں اپنی ساری توانائیوں کو گم کر دیتے ہیں، جہاں تک میری معلومات ہیں، میں نہیں جانتا کہ سیدنا الامام الکبیر کو اپنی رفیقۂ حیات زوجۂ محترمہ کے طرزِ عمل سے کسی زمانہ میں کسی قسم کی شکایت کبھی پیدا ہوئی، باپ کے گھر سے لائے ہوئے زیوروں اور جوڑوں سے بھی ان کو محروم کرتے چلے جارہے ہیں۔ دوسرے پیش کرتے ہیں، تو اس کے استعمال کی بھی اجازت نہیں دیتے، یہ سب کچھ ہو رہا ہے، لیکن بغیر کسی جھنجھلاہٹ کے بیوی نے اپنے آپ کو شوہر کی مرضی اور خوشی میں کچھ اس طرح جذب کر دیا تھا، کہ جو کچھ ہوتا جارہا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہی ان کا دل بھی چاہتا تھا، خانگی، یا عائلی زندگی کی خوش گواریوں کی روح سچ پوچھئے تو نہ دولت ہے، نہ غیر معمولی ثروت و امارت، میاں بیوی کے دل مل گئے، سمجھ لیجئے، کہ اسی زندگی میں آسمان کی جنت تھوڑی دیر کے لئے آپ کے گھر اُتر آئی۔

حیرت ہوتی ہے کہ دیوبند سے بیاہ کر جب آپ کی اہلیہ محترمہ نانوتہ تشریف لائی تھیں، اس وقت جیسا کہ بیان کر چکا ہوں، سیدنا الامام الکبیر کے والد اور والدہ دونوں ہی بقیدِ حیات تھے، ایک نئی نویلی الھڑ مومنہ غافلہ دلہن پر ایک نہیں، تین تین دلوں کی خواہشوں اور آرزوؤں کی تکمیل کا بار اچانک ایک دفعہ پڑ گیا تھا۔ مگر مصنف امام جیسے ثقہ و حجت راوی کی آنکھوں دیکھی یہ شہادت ہے کہ

"وہ آپ کی (اہلیہ محترمہ) ایسی تابعدار تھیں کہ والدین (یعنی حضرت والا کے والدین) کی خدمت میں جو مشقت اٹھائی، مولوی صاحب کی مزاج داری ان کو علاوہ براں ہوئی" ص ۳۲

اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں بظاہر ناخوشی کی وقتی صورت کبھی پیش بھی آجاتی تھی، تو مصنف امام ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، اس کا تعلق خود حضرت والا کی مزاج داریوں سے نہیں، بلکہ کوتاہی کا شبہ والدین کی خدمت کے متعلق کبھی کبھی شاید ہو جاتا، لے دے کر بس اس قسم کی وقتی ناخوشی کا تعلق عموماً اسی سے ہوتا ہے، مصنف امام کے ان الفاظ سے یعنی

"اور والدین کی رضا کے لئے جب ناخوش ہوتے تو ان ہی (اہلیہ محترمہ ہی) کو کچھ

کہہ لیتے "۔ ص۳۲

اس سے میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے، واللہ اعلم بالصواب، وقتی ناخوشی کے ان لمحوں میں زبان مبارک پر کس قسم کے الفاظ آجاتے تھے لیکن اپنی دادی صاحبہ قدس سرہا کی زبانی مولانا طیب صاحب نے یہ روایت جو نقل کی ہے، یعنی حضرت والا کی اس غذائی دستور کا ذکر کرتے ہوئے کہ

"حضرت (نانوتوی) کی عادت شب کو سوتے وقت دودھ کے استعمال کی تھی، گائے کا دودھ استعمال کرتے تھے، شب کی غذا عامۃً ہی یہ ہوتی تھی "۔

مولانا طیب صاحب کی جدہ ماجدہ نے فرمایا کہ

"جب حضرت نماز عشاء سے فارغ ہو کر آتے، اور بالا خانے پر تشریف لے جاتے تو دودھ کا پیالہ لے کر میں پہنچ جاتی "۔

آگے جس دل چسپ واقعہ کا تذکرہ کیا گیا ہے، اسی کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے، وہی فرماتی تھیں کہ قاعدہ یہ تھا کہ

"میرا انتظار اگر کرتے تو یہ علامت خوش دلی کی ہوتی، اور اگر انتظار کئے بغیر نوافل میں مشغول ہو گئے تو یہ علامت ناگواری کی ہوتی تھی "۔

عملاً اپنی ناگواری کو جو زیادہ سے زیادہ "نوافل کی مشغولیت" کی شکل میں ظاہر کرنے کا عادی ہو، اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ لفظی شکل میں بھی اس کی ناگواری کے ظہور کا رنگ کیا ہوگا؟ - اگرچہ "نوافل کی مشغولیت" والی یہ شکل بعض دفعہ ناقابل برداشت حد تک ترقی کر جاتی تھی، اسی روایت میں ہے کہ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ

"حضرت نے نوافل میں پوری شب گذار دی، اور میں بھی پوری شب پیالہ لئے کھڑی کی کھڑی رہ گئی "۔

مولانا طیب صاحب نے اس کے بعد اپنی طرف سے لکھا ہے کہ

"نہ معلوم مجاہدہ ہی کرانا مقصود ہوتا ہوگا "۔

آخر اپنی جن دادی صاحبہ میں مولانا طیب صاحب بھی سالہا سال تک ان خصوصیتوں کو تماشہ کرتے رہے ارقام فرماتے ہیں کہ

"اذان کی حی علی الصلوٰۃ پر کام کو چھوڑ کر اس طرح اٹھ جاتی تھیں کہ گویا اس کام سے کبھی کوئی واسطہ ہی نہ تھا، بالکل ہر چیز سے بے گانہ بن جاتیں۔"

علاوہ فرائض وسنن ونوافل کے دوامی التزام جن کا یہ تھا کہ

"بعد نماز صبح سر پر اور منہ پر اپنا دوپٹہ ڈال کر ہلکی ضرب سے ذکر کیا کرتی تھیں، آندھی ہو، مینھ ہو، سردی ہو، گرمی ہو، اس میں بال برابر فرق نہیں آتا تھا۔"

ناول خوانی اور رومانی خطوط نویسی کا سلیقہ جس تعلیم سے عورتوں میں عموماً زندہ اور بیدار ہو جاتا ہے اس نام نہاد تعلیم سے محروم رہ جانے کے باوجود خود مولانا طیب صاحب نے اپنی جن دادی صاحبہ میں گداز ورقت کی یہ کیفیت پائی ہو، ان ہی کے الفاظ میں سنئے فرماتے ہیں کہ

"میں نے (یعنی مولوی طیب نے) جب حدیث شروع کی، اور مشکوٰۃ میرے والد صاحب مرحوم کے یہاں شروع ہوئی، پھر دوسرے سال مسلم شریف بھی ان ہی کے یہاں ہوئی، تو میں سبق پڑھ کر گھر آکر سبق کی تقریر دادی صاحبہ کو سنایا کرتا تھا۔"

جانتے ہیں، نام نہاد تعلیم سے محروم رہ جانے والی اسلامی خاتون کے کانوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا ترجمہ اور ان کے مطالب جب پہنچتے تھے، تو ان پر کس قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی، مولوی طیب صاحب ہی کا بیان ہے کہ

"جب تک میں تقریر کرتا رہتا تھا، ان کی (دادی صاحبہ) کی آنکھوں سے آنسو مسلسل جاری رہتے۔"

یہی سوچنے کی بات ہے کہ مجاہدہ اور ریاضت کے بغیر عمل وعلم کی یہ ذوقی لطافتیں ہر ہر عامی آدمی کو کیا میسر آسکتی ہیں؟

بہر حال ازدواجی زندگی کے ابتدائی سالوں میں خوش گواریوں کے ساتھ کبھی کبھی ناگواری کی

تلخیاں اگر پیدا بھی ہو جاتی تھیں۔ تو ان کے متعلق بھی نہیں کہا جا سکتا کہ مقصود ان سے کیا تھا؟ اور گو کوئی واضح شہادت اب تک اس کی مجھے نہیں مل سکی ہے، لیکن بظاہر قرائن کا اقتضا ہے کہ زیادہ تر ظاہری ناگواریوں کے یہ قصے غالبًا اسی زمانہ تک محدود تھے۔ جب تک سیدنا الامام الکبیر کی والدہ ماجدہ بی بی حبیبہ قدس اللہ سرہا زندہ تھیں۔ ساس اور بہو اور دونوں میں چوبیس گھنٹہ کی رفاقت گھر میں رہتی تھی، ایسی صورت میں حضرت والا کی والدہ صاحبہ کو ہلکی سی شکایت بھی اپنی بہو کے کسی طرز عمل سے کبھی ہو جاتی، اور کسی طرح حضرت والا کو اس کی خبر ہو جاتی یا کسی وجہ سے اس کا وسوسہ بھی ہوتا کہ ماں کی خدمت میں کوتاہی ہوئی ہے پہلے بھی کہیں اس کا ذکر آ چکا ہے کہ اس وقت سیدنا الامام الکبیر فرماتے کہ

"میں نے تو ان ہی (والدہ ماجدہ) کی خدمت کے لئے یہ بار اپنے ذمہ رکھا، ورنہ میں فقیر آدمی تھا، مجھے ان چیزوں میں پھنسنے کی کیا ضرورت تھی" (روایات طاہرہ)

کچھ بھی ہو، خیال میرا یہی ہے کہ دو بادشاہ در اقلیمے نہ گنجند والی کیفیت گھروں میں اس وقت تک کسی نہ کسی شکل میں بہرحال باقی ہی رہتی ہے۔ جب تک گھر کے انتظام میں بہو کے ساتھ ساس اور ساس کے ساتھ بہو دونوں کو دخل دینے کا موقعہ باقی رہتا ہے۔ اسی لئے مصنف امام کی اس اطلاع کا کہ

"آخر میں ان کے (یعنی اپنی اہلیہ محترمہ کے سیدنا الامام الکبیر) بڑے شکر گزار رہے" ص۳۲

مطلب میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ ایک اقلیم کی دو بادشاہتوں کی شرکت کے اختتام کے بعد جو دور شروع ہوا۔ اس شکر گزاری کا تعلق اسی دور سے ہے، یعنی سیدنا الامام الکبیر کی والدہ ماجدہ کی وفات کے بعد وقتی ناگواریوں کے اسباب کا بھی خاتمہ ہو گیا اور سیدنا الامام الکبیر کی وفات کے بعد دیکھنے والوں کو جن "مبشرات" سے سرفرازی میسر آئی تھی، ان میں ایک رؤیا مولانا طیب صاحب کی علاتی والدہ مرحومہ یعنی حافظ محمد احمد مرحوم کے محل اول کو جو ہوئی تھی، بیان کیا جاتا ہے،

مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں بھی ہے کہ خواب میں ان کی علاتی والدہ صاحبہ نے دیکھا کہ رنگ برنگ کے پھولوں سے بھرا ہوا ایک پلنگ آسمان پر ان کے گھر کے صحن میں اترا ہے، جس پر سیدنا الامام الکبیر جلوہ فرما ہیں ارشاد فرمار ہے ہیں کہ میں وعظ کہنے کے لئے آیا ہوں، اور صبر کا اجر تم گھر والوں کے سامنے بیان کروں گا، اسی سلسلہ میں حضرت نے فرمایا کہ

"حافظ احمد کی والدہ (یعنی اپنی اہلیہ محترمہ) سے میں بہت خوش ہوں"

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا سمجھا جائے کہ شکر گزاری کا جو احساس حضرت والا کے قلب مبارک میں اپنی زوجہ محترمہ کی خدمات کی وجہ سے پیدا ہوا تھا، اسی کا سلسلہ ناسوتی زندگی کے قالب سے الگ ہو جانے کے بعد بھی روح مبارک میں مسلسل باقی رہا۔ بلکہ عزت و وقار، جلال و جبروت کے جن حالات کا مشاہدہ سیدنا الامام الکبیر کی وفات کے بعد آپ کی اہلیہ محترمہ کے متعلق کیا گیا، کون کہہ سکتا ہے کہ حضرت والا کی روح پاک کی ان ہی رضامندیوں کے یہ آثار نہ تھے۔ مولانا طیب صاحب نے اپنی یادداشت میں اپنی دادی صاحبہ کے ان دینی مشاغل اور پابندیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے جنھیں نقل کر چکا ہوں، ان ہی کے ساتھ اپنی چشم دید گواہیاں یہ بھی درج کی ہیں، کہ

"حضرت (نانوتوی) کی نسبت سے ان کا (آپ کی دادی صاحبہ کا) ایک خاص مقام تھا، جو برادری میں ممتاز تھا"

اسی امتیاز کو مثالوں سے سمجھاتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے کہ

"بڑی سے بڑی خاتون، ان کے لئے سرہانا چھوڑ دیتی تھیں"

اور عام دستور یہ ہو گیا تھا کہ

"برادری میں دلہن پالکی سے اس وقت تک نہیں اتاری جاتی تھی، جب تک کہ وہ (یعنی آپ کی دادی صاحبہ) سر پر ہاتھ نہ رکھ دیں، (اسی طرح) کھانا تقسیم نہ ہوتا تھا جب تک کہ ان سے اس کی ابتدا نہ کرائی جائے"

فرماتے ہیں کہ

"غرض امیر و غریب، سب انکی (دادی صاحبہ) کی عزت کرتے تھے، اور ان سے دبتے تھے"۔
دینے کا حال جیسا کہ مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے، یہ تھا کہ اور تو اور

"بسا اوقات حضرت شیخ الہند اور اکابر اساتذہ (دار العلوم دیوبند) پر کسی وجہ سے خفگی ہوتی، تو دروازہ پر بلا کر ڈانٹ دیتی تھیں۔ اور یہ سب حضرات چوں نہ کرتے تھے، بلکہ برضا و رغبت ان کی خفگی سہہ لینے میں اپنی ترقی سمجھتے تھے"۔

دار العلوم دیوبند کے اساتذہ و عمائد پر جو رعب ان کا تھا، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولٰنا طیب صاحب نے ایک واقعہ کا بھی ذکر کیا ہے، یعنی ایک دفعہ کسی خاص قصہ میں مشہور دیوبندی خطیب و مناظر مولٰنا مرتضیٰ حسن صاحب کی زبان پر مولانا طیب صاحب کی دادی صاحبہ کے سامنے تقویٰ کا لفظ آگیا، مولانا طیب صاحب کا بیان ہے کہ ان کی دادی صاحبہ پس پردہ بیٹھی ہوئی سن رہی تھیں، تقویٰ کا لفظ ادھر مولوی مرتضیٰ حسن صاحب کی زبان پر آیا، اور پردہ کے پیچھے سے گرجتی اور کڑکتی ہوئی یہ آواز آنے لگی۔

"ہم نے جن متقیوں کو دیکھا ہے، ان کے مقابلہ میں تم لوگوں کا تقویٰ ہماری نظر میں ہیچ نظر آتا ہے"۔

اسی کے ساتھ یہ بھی فرمارہی تھیں کہ

"پھر تقویٰ کی نصیحت تو وہ کریں جنھیں مخاطبوں کی حیثیت کا بھی لحاظ ہو"۔

آخر میں فرمایا کہ

"جاؤ! اپنے گھر والوں کو پہلے متقی بناؤ"۔

لکھا ہے کہ بے چارے مولوی مرتضیٰ حسن صاحب جو علمی مجلسوں، اور مناظروں کی محفلوں کے شیر سمجھے جاتے تھے دیکھا گیا کہ

"چپکے چلے آرہے ہیں اور (اپنی جسارت بے جا پر) نادم ہیں"۔

ایک قصباتی بی بی جو حرف آشنا بھی نہ تھیں، ہندوستان کی سب سے بڑی درس گاہ کے اساتذہ اور علماء پر ان ہی کا یہ رعب، یقیناً بلا وجہ قائم نہ تھا، اور کون کہہ سکتا ہے کہ وفات کے بعد بھی

اللہ کے دوست اور ولی کا دل جس سے راضی اور خوش تھا، اسی رضا اور خوشنودی کے ظہور کی یہ ناسوتی شکل تھی۔

کچھ بھی ہو، میرا خیال تو یہی ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر کی والدہ ماجدہ کی وفات کے بعد خانگی زندگی کی اقلیم کی بادشاہی جب دو عملی کش مکش سے آزاد ہو گئی، اس کے بعد جو وقت بھی گذرا وہ مصنف امام کی بیان کردہ "شکر گزاری" کے احساس ہی کے تحت حضرت والا کا گذرا،

طرفہ تماشا یہ ہے کہ دوسری طرف ان ہی بیان کرنے والوں سے ہم سنتے ہیں کہ اپنی جبلی شرم و حیا کی وجہ سے بقول مولانا طیب، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت والا کو گویا

"عورتوں سے بہت نفرت تھی۔"

اور یہ نتیجہ آپ کے اس طرز عمل سے نکالا جاتا تھا کہ

"کبھی گھر میں بیٹھ کر کھانا نہ کھاتے۔"

یہی نہیں بلکہ دیکھا جاتا تھا کہ

"گھر میں جانا، اور بیٹھنا، اور عورتوں سے باتیں کرنا۔"

اس قسم کی چیزوں سے دلچسپی کیا معنی بقول مولٰنا طیب کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ طریقہ

"بہت ناپسند تھا۔"

ازدواجی زندگی سے پہلے خواب و خور کے سلسلے میں غالبًا اسی وجہ سے یعنی عورتوں سے حتی الوسع دور رہنے کا فطری رجحان جو آپ میں تھا، شاید اسی کا نتیجہ یہ تھا، جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"مولوی صاحب مسجد میں رہتے، رات کو مسجد میں سو رہتے، کھانا مسجد میں کھاتے، پیر بھائی دو تین تھے۔ ان کو کہا تھا کہ سب کھانا لایا کرو، اور مل کر کھایا کریں گے۔" ص۳۵

لیکن نکاح کے بعد ظاہر ہے کہ آپ کی یہ وارستہ مزاجی اسی اطلاقی رنگ میں کیسے برقرار رہ سکتی تھی، اسی کے بعد شاید یہ دستور ہو گیا تھا، مولانا طیب کی روایتوں میں ہے کہ

"بعد عشا گھر تشریف لاتے۔"

مگر عشار کے بعد گھر میں قیام کی مدت کتنی دیر رہتی؟ وہی اطلاع دیتے ہیں کہ

"آخر شب میں مسجد میں تشریف لاتے"

اور اس کے بعد مسلسل قیام مسجد ہی میں رہتا تا اینکہ

"پھر عشار پڑھ کر گھر جاتے"

اسی سلسلہ میں مولانا طیب صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"اور جب گھر میں سے نہ ہوتیں، تو رات دن مسجد میں گذارتے"

مراد غالباً اس سے یہ ہے کہ عشار کے بعد آخر شب تک حضرت والا کا مکان کے زنانہ حصہ میں قیام اسی زمانہ میں ہوتا تھا جب آپ کے گھر میں یعنی اہلیہ محترمہ تشریف فرما ہوتیں، ورنہ ان کی عدم موجودگی میں اس درمیانی وقفہ کے قیام کے شرف سے بھی زنانہ حصہ محروم ہی رہ جاتا تھا،

حجاب و شرم کے جذبہ کی غیر معمولی گرفت ہی کا یہ نتیجہ بھی تھا؛ جس کی اطلاع مصنف امام نے ان الفاظ میں دی ہے کہ

"اول میں جب ضرورت نہانے کی ہوتی" ص۳۵

تو جیسا کہ دستور تھا آخر شب ہی میں اندھیرے منہ گھر سے باہر نکل آتے، حالانکہ بقول مصنف امام

"مسجد میں پانی گرم ہوتا تھا" ص۳۵

اور پچھلی رات کے سناٹے میں دیکھنے والی آنکھوں کا خطرہ بھی زیادہ نہ تھا، اور اپنی عادت کے مطابق جیسا کہ مصنف امام ہی نے لکھا ہے کہ

"تہجد کے وقت نہاتے" ص۳۵

مگر حیا اور شرم کا جذبہ باہر سے زیادہ سچ پوچھئے تو باطنی تقاضوں ہی کا تابع ہوتا ہے، اور ان ہی تقاضوں کے زیر اثر بجائے حمام مسجد کے گرم پانی کے مصنف امام کا

بیان ہے کہ

"شرم کے سبب، تالاب میں جاکر نہاتے"۔ ص۳۵

تالاب بھی کس علاقے کے؟ ہمالیہ کی برفستانی چوٹیوں کی برفبار ہواؤں کے جھونکوں کا جو خطہ پہلی گذرگاہ ہے۔ اس کو بھی پیش نظر رکھیئے اور سوچئے رات کی پچھلی گھڑیوں کے اس تاریک اور ڈراؤنے سماں کو، اور اسی میں تن تنہا جنگل کی طرف نکل جانا اور کھلے میدانوں کے کسی تالاب یا جوہڑ میں نہانے کے لئے کود پڑنا، اور وہ بھی ایسے موسم میں جب وضو کرنا بھی پانی کو گرم کئے بغیر لوگوں کے لئے ناقابل برداشت ہو۔ مصنف امام کے قلم سے بے ساختہ اس موقعہ پر یہ الفاظ نکل پڑے ہیں۔

"یہ کڑکڑاٹ کا جاڑا پالا، اور مولوی صاحب تالاب میں نہائیں"۔ ص۳۵

اسی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر پر شرم وحیاء کے جذبات کا تسلط، شدت قوت کی کن حدود تک پہنچا ہوا تھا۔

یہ اور اسی قسم کے دوسرے قرائن وشواہد کی روشنی میں کم از کم میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ عورتوں اور عورتوں کی سوسائٹی سے حضرت والا کی کنارہ کشی کے قصوں میں شاید دخل آپ کی اسی افتاد طبع کو تھا، ورنہ وفات کے بعد بھی رضامندی، وخوشنودی کی خنکیاں جس کے قلب مبارک میں عورت ہی کے متعلق پائی گئی ہوں، ہم یہ کیسے باور کریں کہ اسی کے جسمانی قالب کا عورتوں سے انحراف واعتزال کسی قلبی تنفر کا نتیجہ تھا، بلکہ جن مذاہب وادیان میں غریب عورتوں کو مذہبی تقدس کی پیشانی کا سیاہ دھبہ ٹھہراتے ہوئے بہشتی زندگی میں نسوانی وجود کے تصور تک کو بھی ناقابل برداشت بنادیا گیا ہے[۱]، ان کے مقابلہ میں ہم اسلام کے دوسرے حقائق وبینات

---

[۱] میرا اشارہ ان خیالات کی طرف ہے جو جنت کے متعلق عیسائیوں میں عموماً پھیلے ہوئے ہیں کہ جنت سے آدم کے نکلنے کی وجہ حوا ہوئیں، عورتوں کے وجود کو مجسم شیطنت گندگی قرار دیا گیا، اسی لئے عیسائی ذہن جنت میں حور یا ازواج مطہرات کے تصور کو برداشت نہیں کرسکتا۔ قرآن کی جنت کا نام یورپ والوں نے "حیوانی جنت" اسی بنیاد پر رکھ دیا ہے۔ حالانکہ حسن وجمال سے اثرپذیری حیوانی نہیں بلکہ انسان کی خصوصی فطرت کا (بقیہ ص۵۲۶ پر)

کے ساتھ ساتھ اس مبشرہ کو بھی پیش کر کے کہہ سکتے ہیں کہ بہشت تو بہشت عورت چاہے تو اپنی جگہ ان قلوب میں بھی پیدا کر سکتی ہے، جن کی طہارت و تقدس پر بہشتی زندگی کی بنیاد قائم ہے لیکن قلب سے جو قریب ہو، ضرور نہیں کہ قالب سے بھی اس کی قربت کا تماشا دوسروں کو کرایا جائے اور اس طرح کرایا جائے جیسے آج چڑا اور چڑیا کی زندگی کا نقشہ اپنی ازدواجی زندگی کے نمونوں سے دوسروں کے آگے کھینچتے رہتے ہیں۔ گویا کچھ ایسا باور کرایا جا رہا ہے کہ مرد اپنے بیرونی اور اندرونی احساسات کو نسوانی وجود کی لہروں سے ایک لمحہ کے لئے بے تعلق رکھنے سے معذور ہو چکا ہے[1]۔

خیر درمیان میں یہ چند فقرے بے ساختہ قلم سے نکل پڑے، میں ذکر سیدنا الامام الکبیر کی عائلی زندگی کا کر رہا تھا، کہ ابتداء تو اس کی تخلیہ و تجرید سے ہوئی، نکاح سے پہلے والد کی

(بقیہ صفحہ ۵۲۵) اقتصار ہے، سچ پوچھئے تو عیسائیوں کی روحانی جنت جس میں عام انسانی احساسات سے لوگ محروم کر دیئے جائیں گے، انسانی فطرت کی بدترین سزائی شکل ہو سکتی ہے اور لے دے کر سارے قصوں کی بنیاد اسی پر قائم ہے کہ جنت میں عورتوں کا وجود عیسائیوں کے لئے ناقابل برداشت ہے ۱۲

[1] آج تو شاید انسانیت کا وہ عام حصہ جو مغربی زندگی کے زیر اثر آ چکا ہے، اس کی یہ عمومی خصوصیت قرار پا چکی ہے، گھر، باہر، دفتر، اور کچہری، پارلیمان اور مجالس قانون ساز ہر ایک میں نسوانی تجلی گاہوں کا عموماً انتظام کر دیا گیا ہے، لیکن پہلے بھی عمومیت پر تو نہیں مگر کبھی کبھی افراد پر اس قسم کے اعصابی دورے پڑتے رہے ہیں۔ اقبال نامہ جہانگیری میں مالوہ کی حکومت جس کا پایۂ تخت شادی آباد مانڈو تھا، اسی کے ایک بادشاہ غیاث الدین خلجی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "پانزدہ ہزار زن در حرم خود فراہم آوردہ بود" لطیفہ اس سے زیادہ دلچسپ یہ ہے کہ "شہرے از زنان ترتیب دادہ" یعنی ایک شہر ہی اس بادشاہ نے آباد کیا تھا، جس میں عورتوں کے سوا کسی مرد کیلئے کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی تھی، لکھا ہے کہ شہری ضرورتوں کے لئے جس قسم کے حکام عہدہ داروں اور کارندوں کی ضرورت تھی، سب کی تکمیل عورتوں ہی سے کی گئی تھی، مورخ کے الفاظ میں "جمیع طوائف از اقسام و اصناف حاکم و قاضی و کوتوال و اہل حرفہ و انچہ بجہت نظام شہر درکار است از اناث مقرر نمودہ" العرض کچہری ہو یا بازار اندر ہو یا باہر، بادشاہ کا حکم تھا کہ عورتوں کے سوا وہاں اور کسی پر اس کی نظر نہ پڑے "و ہر جا خبر صاحب جمالے شنیدے تا بدست نیاوردے از پا نہ نشستے" ص ۹۵ کہتے ہیں کہ حکومت آصفیہ کے حکمرانوں میں نظام علی خاں آصف جاہ نے بھی ایک دفعہ شہر حیدر آباد کو مردوں سے خالی کر کے اس کا تماشا دیکھا تھا کہ عورتوں کے سوا شہر کی گلیوں میں کسی پر نظر نہ پڑے۔ دیکھئے رشید الدین خانی وغیرہ تاریخ دکن ۱۲

خدمت میں عرض کر دیا گیا تھا کہ بال بچوں کے لئے کما لانے کی خواہش مجھ سے نہیں کی جائے گی۔ گھر میں جب بیوی صاحبہ تشریف لائیں تو اپنے بھرے گھر سے ساتھ جو کچھ بھی لائی تھیں سب ان سے اتروالیا گیا، حقداروں تک ان کے حقوق کے پہنچانے کے سلسلہ میں موروثی اراضی کی آمدنی بھی گھٹ گئی، اور گھٹادی گئی، صرف عقلی روشنی میں دیکھنے والوں کے سامنے ظاہر ہے ایک ایسے گھر کا مستقبل جس حد تک خطرناک اور مہیب نظر آرہا ہو، تو یہی نظر آنا بھی چاہئے تھا، لیکن یہاں عقل سے بھی بالاتر ایمان و یقین کی آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر قدم اٹھایا جارہا تھا، ابتدا میں کچھ ابتلائی اور امتحانی دشواریوں سے بھی گذرنا پڑا۔ لیکن آئندہ جو کچھ ہونے والا تھا، وہ تو خیر ہونے والا تھا ہی، پہلی چیز اس سلسلہ میں جو سامنے آئی وہ آپ کی اہلیہ محترمہ کا فیصلہ تھا، وہی فیصلہ جس کے بعد خانگی زندگی میں زن و شوہر کے تعلقات سلجھتے ہوئے توافق اور ہم آہنگی کے اس نقطہ تک پہنچ جاتے ہیں کہ جنت جانے سے پہلے اسی زندگی میں بہشتی زندگی کی خوشگواریوں کا مزہ میاں بیوی دونوں کو ملنے لگتا ہے، اسباب خواہ کچھ ہی ہوں، لیکن یہی کہ جو کچھ حضرت والا چاہتے تھے آپ کی اہلیہ محترمہ نے اسی کے مطابق منشط و مکرہ، فراخی و تنگی، یُسر و عُسر ہر حال میں بغیر کسی کش مکش کے زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا وہی فیصلہ جس پر جہاں کہیں اور جب کبھی عمل کر کے دکھایا گیا ہے تو عارفوں کے کانوں میں بھی یہی قدرتی نغمہ گونج اٹھا ہے۔

شکر ایزد کہ میان من و اُو صلح فتاد

حوریاں رقص کناں نعرۂ مستانہ زدند

حالانکہ رسمی تعلیم سے، عرض کر چکا ہوں، مستفید ہونے کا موقعہ آپ کی رفیقۂ حیات رحمۃ اللہ علیہا کو نہیں ملا تھا، لیکن قدرت نے زیرکی اور فرزانگی کی جس باطنی نعمت سے

ان کو سرفراز کر رکھا تھا اس کا اندازہ اسی سے کیجئے، ایام عُسرا اور تنگی کے بعض حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے مولٰنا طیّب صاحب نے لکھا ہے کہ اُن کی دادی جان بیان کرتی تھیں

"کبھی میں نے حضرت (مولٰنا نانوتوی) پر اس مشقت کا احسان جتلانا تو بجائے خود ہے اپنے تعب (جسمانی دکھ اور ماندگی) کا بھی اظہار نہیں کیا۔

خدمت و احسان کی روح کی حفاظت کی یہ کتنی اہم جوہری تدبیر تھی۔ جتا دینے کے ساتھ سب کیا کرایا خاک میں مل جاتا ہے، یقیناً انسانی نفسیات کے اس ردعمل پر سطحی نظر نہیں پہنچ سکتی، وہ کئے چلی جاتی تھیں، حکم دیا جاتا تھا، اور وہ بجالاتی تھیں، اُن کے سپرد اپنی بیمار ساس کی تیمار داریوں کی خدمات کے ساتھ ساتھ دن میں بار بار ان ہی کے آلودہ کپڑوں کے دھونے اور پاک کرنے کا کام کیا گیا، اور آپ سن چکے کہ سعادت خیال کرکے وہ اس کام کو کرتی رہیں، حالانکہ رئیس دیوبند کے جس گھر سے وہ آئی تھیں، اس قسم کے گھروں میں اٹھ کر خود پانی پینے کی زحمت بھی عموماً ناقابل برداشت ہی ہوتی ہے، مگر باوجود اس کے ساری ساری رات ان کی کبھی یوں بھی گذر جاتی کہ ہاتھ میں دودھ کا پیالہ ہے، وہ کھڑی ہوئی ہیں، آنکھیں تو آنکھیں ٹانگوں کو بھی آرام لینے کا موقعہ نہ ملتا، اور اس پر طرفہ تماشا یہ تھا کہ گویا سیدنا الامام الکبیر کے والد ماجد کی غرض جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، آپ کو ازدواجی قید و بند میں لانے کی بھی تھی کہ اپنے ہم چشموں کے نوجوان لڑکوں کو کماتے دھماتے وہ دیکھ رہے تھے۔ خیال ان کا یہی تھا کہ جب بیوی بال بچوں کا بار پڑے گا، تو مزاج کی وارستگی باقی نہ رہے گی، اور جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے، گو شیخ اسد علی صاحب مرحوم آپ کے والد ماجد کا یہ خیال صحیح ثابت نہیں ہوا، یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

"جس زمانہ میں (حضرت نانوتوی کا) نکاح ہوا، اور والد کو یہ خیال تھا کہ ابنائے زمانہ کی طرح جب فکر ہوگا آپ نوکری کرلیں گے"۔ ص۳۳

مصنف امام نے اطلاع دی ہے کہ

"بعد گذرنے کتنی مدت کے کچھ نہ کیا، تب مایوس ہوگئے"۔ ص۳۳

جس کا مطلب بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اسد علی صاحب جس پیمانے پر اپنے اکلوتے بچے کی کمائی کی آمدنی کو دیکھنا چاہتے تھے۔ اس پیمانے پر روپیہ حاصل کرنیکی طرف توجہ حضرت والا نے نہ کی۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک کم پچاس سال کی مدت زمین کے اس خاکی کرّے پر اہل و عیال کے تعلقات کے ساتھ گذارنے کا موقعہ آپ کو بھی ملا۔ لیکن آپ کے خریطۂ حیات میں مشاغل اور کارناموں کے بیشمار خانوں میں سب سے چھوٹا سب سے مختصر خانہ آپ کی معاشی جدوجہد ہی کا نظر آتا ہے۔ آپ کی طرف منسوب کرتے ہوئے

"کچھ نہ کیا"

کے الفاظ مصنف امام کے قلم سے جو نکلے ہیں، واقعات کی رو سے ان کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ کرنا، اس سلسلہ میں گویا نہ کرنے کے برابر تھا اور اسی لئے والد ماجد کی نظر میں اس کی حیثیت گویا صفر ہی کی رہی "کچھ نہ کیا" سچ پوچھئے تو ان ہی کے نقطۂ نظر کی تعبیر ہے۔ ورنہ عرض کرچکا ہوں کہ نکاح کے بعد ہی نہیں بلکہ نکاح سے پہلے بھی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ہی جب دہلی میں حضرت والا مقیم تھے تو اپنی ضروریات زندگی کی فراہمی کے لئے اس زمانہ میں بھی کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہے تھے۔ تذکرہ علماء ہند کے مصنف مولوی رحمان علی کی اس خبر واحد[1] یعنی سیدنا الامام الکبیر کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے جو یہ لکھا ہے کہ

[1] حقیقتاً مولوی رحمان علی صاحب کی یہ روایت خبر واحد اور غریب ہونے سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس کے متابع اور شواہد نہیں ملتے بلکہ اس کے خلاف روایتیں ملتی ہیں۔ مجھے ۱۳۴۷ھ میں جب نیابت اہتمام دارالعلوم کا عہدہ سپرد کیا گیا تو میں اس سے کارہ تھا اور حضرت والد مرحوم نے ایک دفعہ بطور وصیت کے (باقی ص۵۳۰ پر)

"بعد از فراغ علوم چندے بمدرسہ انگریزی واقع دہلی تعلق گرفتہ"۔
اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں "مدرسی" کا کام بھی آپ نے انجام دیا تھا، لیکن چونکہ بجز مولوی رحمان علی صاحب کے تذکرہ کے اس واقعہ کا ذکر آپ کے عام سوانح نگاروں، یا حالات کے بیان کرنے والوں کے کلام میں نہیں ملتا، اس لئے اس سے قطع نظر بھی کر لیا جائے جب بھی اسی کے بعد یہ جو خبر دی گئی ہے کہ

"وبعد ترک آں تعلق (یعنی مدرسی چھوٹ جانے کے بعد) در مطبع احمدی بہ تصحیح کتب مقرر شد"۔

ظاہر ہے کہ یہ خبر واحد نہیں بلکہ متواتر ہونے کی حیثیت رکھتی ہے، مصنف امام کے حوالہ سے یہ نقل کر چکا ہوں کہ اسی زمانہ میں نکاح سے پہلے

"مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) نے مطبع احمدی میں تصحیح کتب کی کچھ مزدوری کر لی"۔ ص ۲۹

(بقیہ ص ۵۲۹) فرمایا بھی یہی تھا کہ تم انتظامی جھگڑوں میں مت پڑنا بلکہ اپنی جدی میراث یعنی علمی زندگی سنبھالنا مگر جب اُن ہی کی حیات میں مجھے دارالعلوم کے انتظامی سلسلہ میں لگا یا گیا تو میں نے دلگیر ہو کر حضرت والد مرحوم سے عرض کیا کہ آپ کی وصیت کے خلاف مجھے انتظامی لائن میں لیا جا رہا ہے اور آپ اس کے خلاف آواز نہیں اٹھاتے۔ فرمایا کہ میری وصیت بدستور قائم ہے باقی اس وقت مدرسہ کی مصالح کا تقاضا بھی ہے اور جب سب بزرگ مل کر ایک چیز سپرد کر رہے ہیں تو سب کے خلاف جانا بھی مناسب نہیں۔ اس پر بطور تسلی دہی کے فرمایا کہ حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ (حضرت نانوتوی رح) فرمایا کرتے تھے کہ میرے معاصرین میں سب مجھ سے بڑھکر ہیں مگر ایک خصوصیت ہے جو حق تعالیٰ نے مجھے ارزانی فرمائی ہے اور وہ یہ کہ میں نے تدریس کی ملازمت کبھی نہیں کی، اور تعلیم کو ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ یہ واقعہ نقل فرما کر والد مرحوم نے فرمایا کہ تمہیں بھی شکر کرنا چاہئے کہ تمہارے لئے ذریعۂ معاش انتظامی لائن میں پیدا کیا جا رہا ہے تعلیم پر اجرت کی صورت پیدا نہیں ہو رہی ہے۔ اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ حضرت والا نے ملازمتِ تدریس کبھی نہیں فرمائی۔ شخصی طور پر اگر کہیں اپنے کسی تعلق والے کو پڑھایا ہو اور اس نے بطور خود کچھ خدمت کی ہو تو اس سے اس دعوے پر اثر نہیں پڑتا کہ انہوں نے تدریس کو کبھی ذریعۂ معاش نہیں بنایا۔ بہر حال مصنف سلمہٗ نے بھی مولوی رحمان علی صاحب کی اس خبر کو خبر واحد یا خبر غریب کہہ کر واقعہ کی اسی ندرت اور غیر مؤید ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔
محمد طیب غفرلہٗ

ان ہی کی اطلاع یہ بھی ہے کہ مطبع احمدی میں تصحیح کے سوا بخاری شریف کے آخری پانچ چھ پاروں کی حاشیہ نگاری کی خدمت بھی اسی زمانہ میں آپ نے انجام دی تھی۔

ظاہر ہے کہ نکاح سے پہلے جب تصحیح و تحشیہ کا کام آپ کرتے تھے، تو گو والد ماجد سے نکاح کے وقت آپ نے عرض کر دیا تھا کہ بیوی اور بال بچوں کا نام لیکر روپے کمانے پر مجھے مجبور نہ کیا جائیگا جس سے بظاہر اشارہ وہی کمائی کے پیمانے کی طرف شاید کیا گیا تھا۔ ورنہ معاشی زندگی کے لئے کسب واکتساب کے دھندوں میں نکاح سے پہلے جو عملاً مشغول تھا۔ اسی کے متعلق یہ خیال یقیناً بے بنیاد ہوگا کہ مطلقاً کسب واکتساب سے آپ گریز کرنا چاہتے تھے۔

گریز کیا معنی، واقعہ یہ ہے کہ جب تک دلی میں یہ مطبع احمدی قائم رہا، آپ اس میں کام کرتے رہے، پھر ۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان کا عموماً اور دلی کا خصوصاً نظم درہم و برہم ہوگیا، اور اسی فتنہ کا شکار مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مطبع بھی ہوا۔ مصنف امام نے بھی لکھا ہے کہ

"غدر میں دہلی کا تو سب کارخانہ درہم و برہم ہو گیا تھا، مولوی احمد علی صاحب کا مطبع گیا گذرا ہوا" ص۳۹

اور جیسا کہ آیندہ بہ تفصیل معلوم ہوگا، ہندوستان کی آزادی کی اس جد و جہد میں براہ راست سیدنا الامام الکبیر بھی عملاً شریک تھے اور حکومت مسلطہ نے مجرم قرار دے کر آپ کے نام بھی وارنٹ گرفتاری جاری کر دیا تھا، دارو گیر، رست و خیز کے اس ہنگامہ میں اس میں شک نہیں کہ چند سال تک مطبع احمدی کی خدمت سے الگ ہونے کے بعد آپ کی زندگی اس طرح گذری کہ بقول مصنف امام

"اس زمانہ میں سوائے وطن (نانوتہ) اور کوئی جگہ جانے کی نہ تھی" ص۳۹

حکومت کے نمایندے آپ کی فکر میں تھے، اس لئے مصنف امام ہی کے بیان کے مطابق وقفہ کی اس مدت میں

"کبھی وطن (نانوتہ) اور کبھی دیوبند رہتے تھے" ص۳۹

اور آخر میں ہندوستان کو چھوڑ کر بادبانی جہاز پر سوار ہو کر حج کے ارادہ سے حجاز تشریف لے گئے بہرحال ان باتوں کی تفصیل تو آگے آرہی ہے، یہاں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں مطبع احمدی کی بربادی کے بعد ۱۸۶۱ء مطابق ۱۲۷۸ھ میں سفر حج سے جب ہندوستان آپ واپس تشریف لائے۔ تو چار سال وقفہ کی یہ مدت ایسی ضرور گذری ہے جس میں کسی خاص معاشی مشغلہ میں مشغول ہونے کی کوئی صورت ہی نہ تھی، اور یوں کسب و اکتساب کے قصوں سے کچھ دن کے لئے مجبوراً آپ کو الگ ہونا پڑا، لیکن حکومت مسلطہ کی نگرانی جوں ہی آپ سے اٹھائی گئی، تو دلی میں اگرچہ اپنی پہلی خدمت کی طرف واپسی کا موقعہ مطبع احمدی کے ختم ہو جانے کی وجہ سے باقی نہ رہا تھا لیکن جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے

"منشی ممتاز علی[۱] صاحب نے میرٹھ میں چھاپہ خانہ کیا" ص۴۹

---

[۱] یہ منشی ممتاز علی جن سے بقول مصنف امام سیدنا الامام الکبیر کی پرانی دوستی تھی، اپنے وقت کے مشہور خطاط اور خوشنویس تھے، خطاطی کی دنیا میں "نزہت رقم" کے لقب سے ملقب تھے، اور خوشنویسی کے اسی کمال کی وجہ سے مطبع کے قائم کرنے میں ان کو سہولت ہوئی، منشی ممتاز علی صاحب کے بعد ان کے دو صاحبزادوں منشی مشتاق علی و منشی عبدالغنی کو بھی خطاطی کے کمال میں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی، خصوصاً خط نسخ (عربی) میں منشی مشتاق علی کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی کتابت کے لئے سب سے پہلے ارباب مطابع کی نظر آپ ہی پر پڑتی تھی، اور یہ کمال منشی ممتاز علی صاحب مرحوم کا ان کے لڑکوں ہی تک محدود نہ رہا بلکہ آپ کے ان دونوں صاحبزادوں نے بکثرت اس فن کی عملی تعلیم لوگوں کو دی۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں جتنے کاتب پھیلے ہوئے ہیں ان کی بڑی تعداد کو بالواسطہ یا بلا واسطہ ان ہی دو صاحبوں سے شرف تلمذ حاصل ہے، یہاں اس کا ذکر بھی نامناسب نہ ہوگا کہ درس نظامیہ کے نصاب کی کتابوں کے خصوصاً اور اردو فارسی عربی زبانوں کی کتابوں کے عموماً دلی کے مشہور ناشر مولوی عبدالاحد مرحوم کا مطبع مجتبائی دراصل منشی ممتاز علی صاحب ہی کا وہ مطبع ہے جو اسی نام سے میرٹھ میں قائم ہوا تھا، پھر منشی ممتاز علی صاحب قیام کی نیت سے ہندوستان چھوڑ کر جب عرب جانے لگے، تو مولوی عبدالاحد مرحوم نے ان سے ان کے اس مطبع مجتبائی کو خرید لیا، اور کوئی شبہ نہیں کہ اسلامی علوم کی کتابوں کی اشاعت و طباعت میں غیر معمولی کام اس مطبع نے انجام دیا منشی ممتاز علی صاحب کچھ دن قیام کر کے عرب سے پھر ہندوستان واپس آئے اور دلی میں مطبع مصطفائی کے نام سے دوسرا جدید مطبع قائم کیا، جو کچھ دنوں چلتا رہا۔ محل وقوع اس کا کھڑکی تفضل حسین متصل زنانہ وکٹوریہ ہسپتال تھا جہاں اب بھی مطبع مصطفائی کا سائن بورڈ لگا ہوا ہے لیکن عملاً مطبع ختم ہو چکا ہے (باقی ص۵۳۳ پر حاشیہ ۱ ص۵۳۳ دیکھیں)

اور اسی چھاپہ خانہ میں وہی لکھتے ہیں

"مولوی صاحب (یعنی سیدنا الامام الکبیر) کو پرانی دوستی کے سبب بلالیا" ص۳۹

اور بلا کر وہی کام جو مطبع احمدی دلی میں آپ کر رہے تھے میرٹھ میں بھی آپ کے سپرد کردیا گیا مصنف امام نے میرٹھ کے اس مطبع سے آپ کے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس میں آپ کے ذمہ

"وہی تصحیح کی خدمت تھی" ص۳۹

(بسلسلہ صفحہ ۵۳۲) ان معلومات کے لئے حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب مدظلہ العالی کے خلف رشید مولانا حفیظ الرحمٰن کا ممنون ہوں۔ دریافت کرنے پر ان تفصیلات سے انہوں نے آگاہ فرمایا، واقعہ یہ ہے کہ طباعت واشاعت کے لحاظ سے منشی ممتاز علی مرحوم کی شخصیت نے غدر کے بعد ہندوستان میں اسلام کی تقریباً اسی نوعیت کی خدمت انجام دی جو فرض تدریس کے لحاظ سے دارالعلوم دیوبند نے ادا کیا۔

(متعلقہ ص۵۳۲) ۵۷ منشی ممتاز علی صاحب کی مہارتِ فن کتابت ایک مسلمہ حقیقت ہے جیسا کہ مصنف سلمہٗ نے حاشیہ بالا میں ذکر فرمائی ہے۔ منشی صاحب ممدوح کا سلسلۂ تلمذ شاہی سلسلہ ہے۔ مولانا اشتیاق احمد صاحب زید مجدہ صدر شعبۂ کتابت دارالعلوم نے جو فی زمانہ اس سلسلۂ فن کی ایک سنہری کڑی ہیں اور منشی ممتاز علی صاحب کے ہی سلسلۂ تلمذ میں بواسطہ منشی محبوب علی صاحب میرٹھی داخل ہیں مجھ سے بیان فرمایا کہ منشی ممتاز علی صاحب خط نسخ میں بہادر شاہ بادشاہ دہلی کے تلمیذ رشید ہیں۔ سلسلۂ تلمذ میں داخل ہونے کا واقعہ یہ ہے کہ انہیں بہادر شاہ سے فن حاصل کرنے کا جذبہ و شوق دامنگیر تھا۔ مگر بادشاہ تک رسائی مشکل تھی۔ اسلئے خط نسخ میں کچھ قطعات وعبارات طبعزاد طریق پر لکھ کر جامع مسجد دہلی میں اس جگہ آویزاں کر دیتے تھے جہاں بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ تھی ایک دن بادشاہ سلامت کی نظر ان کے قطعات پر پڑی۔ قدرتاً صاحب فن کو فن کی چیزوں کی طرف کشش ہوتی ہے دیکھتے ہی اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ منشی ممتاز علی لگے ہی ہوئے تھے۔ بادشاہ کے یہ دریافت کرنے پر کہ یہ قطعات کس نے لکھے ہیں فوراً سامنے آکر آداب بجالائے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ کسی سے تلمذ حاصل ہے؟ عرض کیا کہ کسی سے نہیں عرصہ سے جہاں پناہ ہی کے سلسلۂ تلمذ میں داخل ہونے کا شوق ہے۔ فرمایا کہ اچھا آجایا کرو۔ قلعداروں کو مطلع کر دیا گیا کہ اس نام کے شخص کو آنے سے نہ روکا جائے۔ چنانچہ منشی صاحب جاکر بادشاہ سے (جو اپنے دور میں اس فن کے یکتا مانے گئے ہیں) اصلاح لینے لگے اور وقت کے امام فن ہوئے۔ مولانا اشتیاق احمد صاحب ان ہی کے ایک واسطہ سے شاگرد ہیں اور آج اس فن کے ممتاز اور یگانہ مانے جاتے ہیں جو نہ صرف عملاً ہی ماہر فن ہیں بلکہ علماً بھی اس فن پر پوری طرح قابو یافتہ ہیں۔ اہل فن کے یہاں مولانا اشتیاق احمد صاحب کے سلسلے منشی مشتاق علی صاحب قابل ذکر نہیں ہیں گو ان کا صاحب فن ہونا مسلّم ہے۔

محمد طیب غفرلہٗ

اور جہاں تک میرا خیال ہے کم و بیش[۵] سات آٹھ سال تک مسلسل بغیر کسی انقطاع کے آپ میرٹھ کے اسی مطبع مجتبائی میں تصحیح کی خدمت انجام دیتے رہے۔ پھر جب منشی ممتاز علی صاحب عرب تشریف لے گئے اور اس مطبع کو مولوی عبدالاحد مرحوم خرید کر دلی لے آئے، اور سیدنا الامام الکبیر دوسری دفعہ اسی زمانہ میں حج کے ارادے سے مکہ معظمہ تشریف لے گئے، تو کچھ دن پھر وقفہ کا درمیان میں گذرا، لیکن جوں ہی کہ حج سے ہندوستان واپس ہوئے تو مصنف امام کا بیان ہے کہ :۔

"منشی جی (یعنی منشی ممتاز علی صاحب) کے پیچھے (جب وہ عرب میں مقیم ہو گئے تھے) میرٹھ میں مولوی محمد ہاشم صاحب کے مطبع میں کام کیا" ص ۳۹

ٹھیک طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ مطبع ہاشمی میں آپ کی ملازمت کی مدت کتنی تھی، تاہم جب تک منشی ممتاز علی صاحب عرب میں رہے، یہی تسلیم کرنا چاہیئے کہ مطبع ہاشمی میں حضرت والا کام کرتے رہے

---

[۵] کم و بیش سے میرا مطلب یہ ہے کہ مصنف امام کے بیان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۸۵ھ میں قیام کی نیت سے ہندوستان کو چھوڑ کر منشی ممتاز علی صاحب عرب چلے گئے تھے، اور ان کے بعد خیال یہی گذرتا ہے کہ اس مطبع سے سیدنا الامام الکبیر کا تعلق باقی نہ رہا۔ اس حساب سے ثابت ہوتا ہے کہ مطبع مجتبائی میں سات سال تک سیدنا الامام الکبیر کام کرتے رہے، لیکن اسی مطبع مجتبائی میرٹھ میں خاص اہتمام سے قرآن مجید کا ایک خاص نسخہ طبع ہوا تھا، کتابت اس کی خود اپنے ہاتھ سے منشی ممتاز علی صاحب نزہت رقم مالک مطبع نے کی تھی، اور تصحیح کی سعادت سیدنا الامام الکبیر نے حاصل فرمائی تھی۔ اسی نسخہ کی نقل بعد کو مولوی عبدالاحد اپنے خریدے ہوئے مطبع مجتبائی میں چھاپتے رہے، سیدنا الامام الکبیر نے فارسی زبان میں ایک خاتمہ اسی نسخہ کا ارقام فرمایا اور عربی فارسی اردو تینوں زبانوں میں اس طباعت کے تاریخی مادے بھی ابجد کے حساب سے نکالے تھے۔ تبرکاً مولوی عبدالاحد اس خاتمہ اور تاریخی مادوں کو بعد کے ایڈیشنوں میں شریک کرتے رہے، ممکن ہے کسی موقعہ پر فارسی نثر اور استخراج تاریخ کے ذیل میں ان امور کا آئندہ ذکر آئے ۔ یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ " امالا مثل لہ : لامثال " کا مادہ تاریخ عربی یا اس کے سوا دوسرے تاریخی مادوں کی میزان ۱۲۸۶ھ ہوتی ہے، اس سے یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ ۱۲۸۶ھ تک میرٹھ کے مطبع مجتبائی سے سیدنا الامام الکبیر کا تعلق باقی تھا اور یوں آپ کے قیام کی مدت بجائے سات سال کے مطبع مجتبائی میرٹھ میں آٹھ سال ہونی چاہیئے ۱۲

کچھ دن بعد منشی ممتاز علی صاحب عرب سے پھر ہندوستان واپس ہوئے۔ میرٹھ والا مطبع مجتبائی تو ان کا بک چکا تھا۔ اس لئے مطبع مصطفائی کے نام سے دلی ہی کے محلے کھڑکی تفضل حسین متصل وکٹوریہ زنانہ ہسپتال میں منشی جی مرحوم نے دوسرا نیا مطبع جاری کیا۔ مصنف امام نے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"پھر مولوی صاحب دہلی گئے، منشی جی (یعنی منشی ممتاز علی) کا چھاپہ خانہ دہلی میں ہوا" ص۳

اس کا مطلب یہی ہے کہ میرٹھ کے مطبع ہاشمی سے قطع تعلق کر کے منشی جی کی وجہ سے آپ پھر ان ہی کے نئے مطبع مصطفائی میں کام کرنے کے لئے دلی تشریف لے گئے۔ مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب خلف الرشید مولانا کفایت اللہ صاحبؒ نے بھی اپنے مکتوب سامی میں لکھا ہے۔ منشی ممتاز علی جب عرب سے ہندوستان واپس آئے اور اپنا مطبع دہلی میں جاری کیا، تو

"مولانا (سیدنا الامام الکبیر) کو بھی میرٹھ سے دہلی لے آئے"، مکتوب ص۲

افسوس ہے کہ کسی ذریعہ سے اب تک اس کا پتہ نہ چل سکا کہ دوبارہ دہلی میں آپ کا قیام مطبع مصطفائی کے تعلق سے کتنے زمانہ تک رہا۔ لیکن اتنا تو بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی عمر کا اکثر و بیشتر حصہ اسی طرح گذرا کہ آمدنی کا پیمانہ جو کچھ بھی ہو، لیکن معاشی جد و جہد سے آپ نے بہرحال اپنے آپ کو بے تعلق نہیں رکھا مختلف قرائن و قیاسات کی بنا پر میرا اندازہ یہی ہے کہ ایک کم پچاس کی عمر گرانمایہ میں سے تقریباً چالیس انتالیس سال کی عمر تک آپ مذکورہ بالا مختلف مطابع یعنی احمدی، مجتبائی، ہاشمی، مصطفائی میں علی الترتیب تصحیح کی خدمت انجام دیتے رہے۔

یہی زمانہ ہے جب ضلع سہارنپور کے قصبہ دیوبند میں ایک مدرسہ کی بنیاد پڑی، جو اب بحمد اللہ وماشاء اللہ دارالعلوم دیوبند کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے اس مدرسہ کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر کے تعلقات کا مسئلہ مستقل مسئلہ ہے جس پر آئندہ بحث ہوگی۔ اپنے مقام پر اس کی تفصیلات بیان کی جائیں گی، سردست تو مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اپنی ۴۹ سال کی عمر میں تقریباً چالیس سال تک حضرت والا کی خانگی زندگی جس طرز سے گذری، بلکہ اس کے بعد دارالعلوم سے متعلق ہو جانے کے بعد بھی چونکہ یہ مسلم ہے کہ ہر قسم کے مالی استفادہ سے کلی طور پر اپنے آپ کو سیدنا الامام الکبیر نے

قطعاً الگ تھلگ رکھا۔ سوانح مخطوطہ کے مصنف کی ذاتی شہادت جسے چشم دید گواہی سمجھنا چاہیئے ان ہی کے بجنسہ الفاظ میں نقل کر دیتا ہوں، لکھتے ہیں

"یہ سب کو معلوم ہے کہ مدرسہ اسلامی دیوبند آپ ہی کا (یعنی سیدنا الامام الکبیر ہی) کا ساختہ پرداختہ اور کیا کچھ اس کا کارخانہ کہ چھوٹی سی سرکار، مگر ہرگز، کبھی، اس کی کسی چیز سے نفع نہیں اٹھایا۔"

آگے وہی رقمطراز ہیں

"اوائل میں اہل شوریٰ نے درخواست کی کہ آپ بھی اس مدرسہ کی مدرسی قبول فرمایئے اور اس کے عوض کسی قدر تنخواہ، مگر قبول نہ فرمایا، اور کبھی کسی طور، یا ڈھنگ سے ایک حبہ تک کے مدرسہ سے روادار نہ ہوئے حالانکہ رات دن، مدرسہ کی (خوش) اسلوبی میں مصروف رہتے اور تعلیم میں مشغول۔"

آخر میں وہی ان لوگوں کے سامنے جو سیدنا الامام الکبیر سے بھی واقف تھے اور مدرسہ سے بھی سب ہی کے سامنے وہ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہیں یعنی یہ لکھتے ہوئے کہ

"یہاں تک مدرسہ کے مال سے احتیاط تھی"

تمثیلاً حضرت والا کی اس عام عادت کی اطلاع دیتے ہیں کہ

"اگر کبھی بضرورت مدرسہ کے دوات و قلم سے کوئی اپنا خط لکھ لیتے تو فوراً ایک آنہ مدرسہ کے خزانے میں داخل کر دیتے۔"

اور صرف داخل ہی نہیں کرتے بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی، جیسا کہ وہی لکھتے ہیں۔

"فرماتے کہ یہ بیت المال کی دوات ہے، ہم کو اس پر تصرف جائز نہیں ہے۔"

اسی سلسلہ میں انہوں نے ایک خاص قصہ کا بھی ذکر کیا ہے، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ

"آپ (یعنی سیدنا الامام الکبیر) کے مزاج میں حرارت بہت تھی، اور موسم گرما میں سرد مکان بہت مرغوب تھا۔"

اسی کے بعد قصہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

"مدرسہ میں ایک سردخانہ[1] تیار ہوا، اور گرمی کی بہت شدت، مولوی رفیع الدین (دارالعلوم کے مہتمم اول) نے عرض کیا کہ سردخانہ تیار ہے، وہاں دوپہر کو آرام کیا کیجئے۔"

یہی سننے کی بات ہے، مدرسہ کی دوات سے خواہ سیاہی کے چند قطرات ہی سہی، لیکن بہرحال لکھنے میں وہ خرچ تو ہو جاتے تھے۔ مگر اب سنئے "سردخانہ" ایک مکان تھا، گرمیوں میں گھنٹہ دو گھنٹے کے لئے لیٹنے کی وجہ سے "سردخانہ" میں کسی قسم کی کمی کا بھی اندیشہ نہ تھا، جوں کا توں اپنی اصلی حالت پر لیٹنے کے بعد بھی قائم رہتا، لیکن مولانا رفیع الدین صاحب کے معروضہ کے جواب میں فرمایا گیا سوانح مخطوطہ کے مصنف راوی ہیں کہ

"مولانا سیدنا الامام الکبیر نے فرمایا کہ ہم کون جو اس میں آرام کریں وہ حق ہے طالب علموں کا"

آگے اسی کے بعد وہی اطلاع دیتے ہیں کہ

"اور کبھی آپ نے سردخانہ میں جا کر استراحت نہ کی اور گرمی کی تکلیفیں سہا کیں" ص۱۶

سیدنا الامام الکبیر کے تقویٰ کا جو غیر معمولی معیار تھا، سچ پوچھئے تو اس کو دیکھتے ہوئے اس قسم کے واقعات کے ذکر کی بھی ضرورت نہ تھی، لیکن اس وقت بحث آپ کی خانگی زندگی، اور ان معاشی وسائل پر ہو رہی تھی، جن کے زیر اثر اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضرورتوں کو آپ پوری فرماتے رہے اس کے لئے تمہیداً یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوا کہ دارالعلوم کی سرپرستی کے تعلق سے پہلے ہی، اور اس کے بعد بھی، مدرسہ سے کسی قسم کا کوئی فائدہ مادی یا غیر مادی کسی شکل میں نہ آپ نے کبھی اٹھایا اور نہ اٹھانا چاہا، بلکہ استفادہ کی ہلکی سی ہلکی صورت بھی کسی وجہ سے پیش آجاتی، تو قصداً و عمداً اس سے احتراز ہی پر اصرار فرماتے رہے، ایسی صورت میں سوال ہوتا ہے کہ ایک کم پچاس سال کی عمر کا وہ حصہ جس میں اپنے اور اپنے متعلقین کے مصارف کی ذمہ داری آپ کے سر عائد ہوئی، عمر کا یہی حصہ کن معاشی

---

[1] یہی تہ خانہ سب سے پہلے تیار ہوا ہے جو دارالعلوم کے احاطہ مولسری میں دہ میان کی شمالی درسگاہ کے نیچے ہے۔ اسکے بعد دارالعلوم میں کئی تہ خانے اور بھی بنائے گئے جو بعد میں تعمیر ہوئے۔ محمد طیب غفرلہ

وسائل کے زیر اثر گذرا ؟

مناسخہ یعنی ورثہ کے سہام کی نظر ثانی کے بعد کٹ کٹا کر یہی بچائی زمینداری کی آمدنی جوڑ گئی تھی، اس کے سوا مطابع کی ملازمتوں کی آمدنی تھی صحیح طور پر تو اس کا پتہ نہ چل سکا کہ تصحیح کی جو خدمت ان مطابع میں آپ انجام دیتے تھے، اس کے معاوضے کی واقعی نوعیت، مقدار و کمیت کیا تھی، لیکن مصنف امام کا یہ فقرہ جسے شاید پہلے بھی کہیں نقل کر چکا ہوں، یعنی انہوں نے جو لکھا ہے کہ

"نوکری آپ نے اگر کی، تو کیا کی، کسی چھاپہ خانہ میں چار پانچ روپیہ کی تصحیح کی خدمت قبول کی۔" ص۳۲

ظاہر ہے کہ "چار پانچ روپیہ" کی اس آمدنی کا تعلق روز سے نہیں بلکہ یقیناً مہینے سے ہے، کیونکہ علاوہ عام شہرت کے چار پانچ روپے روز کی آمدنی خصوصاً اس زمانہ کے حساب سے تو غیر معمولی آمدنی تھی لیکن مصنف امام نے جس موقعہ پر ان اعداد کا ذکر کیا ہے، اس کا اقتضا یہی ہے کہ اس آمدنی کو وہ بہت ہی قلیل آمدنی اس زمانہ کے اعتبار سے بھی قرار دے رہے ہیں۔

یہ ممکن ہے کہ "چار پانچ" کے الفاظ تخمینی ہوں، لیکن اتنی بات بہر حال تسلیم ہی کرنی پڑتی ہے کہ حد سے زیادہ ناکافی آمدنی تصحیح کی اس خدمت سے حاصل ہوتی تھی،

اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ علاوہ اہلیہ محترمہ کے مدت تک والدین بھی آپ کی اس خانگی زندگی میں شریک رہے، اور ان کے علاوہ جیسا کہ معلوم ہوتا ہے کہ بال بچوں کا اضافہ بھی ہوتا رہا مصنف امام نے نکاح کے ذکر کے بعد اطلاع دی ہے کہ

"اول کئی لڑکیاں ہوئیں، جن میں دو زندہ اب ہیں۔" ص۳۴

جس سے معلوم ہوا کہ تاہل کی زندگی کے ابتدائی سالوں ہی سے اولاد کی پیدائش کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، نہیں کہا جا سکتا کہ اوائل میں پیدا ہونے والی ان لڑکیوں کی صحیح تعداد کیا تھی اور نہ یہ ہی معلوم ہو سکا کہ ان وفات یافتہ صاحبزادیوں کا انتقال عمر کی کن منزلوں میں ہوا تاہم آغاز تاہل ہی میں پیدا ہونے والی لڑکیوں میں سے دو لڑکیاں جیسا کہ مصنف نے لکھا ہے سیدنا الامام الکبیر کی وفات

کے بعد بھی زندہ رہیں، ان لڑکیوں کے بعد مصنف امام ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے "دو صاحبزادے اور چند لڑکیاں اور بھی ہوئیں۔ صاحبزادوں میں ایک تو مولانا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ گرامی ہے جو دار العلوم دیوبند کے تعلیمی و انتظامی نظام کے اساطین میں شمار کئے گئے[۹۷]، اور دوسرے صاحبزادے مولوی محمد ہاشم مرحوم تھے جن کی وفات سیدنا الامام الکبیر کی رحلت کے بعد مکہ معظمہ میں ہوئی، الغرض تاہل کی ابتدائی زندگی سے آخر تک آل و اولاد کا سلسلہ بھی جاری رہا جس کا مطلب یہی ہوا کہ ایک کافی بھرے بھرائے گھر کی ذمہ داری قدرت کی طرف سے آپ سے متعلق کی گئی تھی، اور ایک لمحہ کے لئے بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ کسی زمانہ میں عائلی زندگی کی ان جھنجھٹوں سے پریشان ہو کر ان لوگوں کا طریقہ آپ نے اختیار کیا ہو، جو تارک الدنیا بن جانے کا اعلان کر کے باور کر لیتے ہیں کہ ہر قسم کی ذمہ داریوں سے اب وہ عند الخلق و الخالق آزاد ہو گئے۔ بلکہ اول سے آخر تک گھر بار، یا بیوی بچوں کے جھمیلے ہی میں سیدنا الامام الکبیر نے اپنی آخری سانس پوری کی، والدین کی خدمت بیوی بال بچوں کی پرورش کے ساتھ ساتھ جیسا کہ مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، دو لڑکیوں کی شادی کی ذمہ داریوں سے بھی سیدنا الامام الکبیر کو ان ہی حالات میں سبکدوشی حاصل ہوئی اور اس عرصے میں ایک ہی نہیں دو دو حج کی نعمت سے سرفرازی کے مواقع میسر آئے۔ یقیناً یہ سوال اور دلچسپ سوال اس موقعہ پر پیدا ہوتا ہے کہ اس مختصر آمدنی (یعنی نانوتہ کی زمین کی محدود پیداوار اور تصحیحی خدمت کے معاوضے میں مطابع سے دس پانچ روپے ماہوار جو مل جاتے تھے، محض اسی سے ان مصارف کی تکمیل میں آپ کیسے کامیاب ہوئے؟

واقعہ یہ ہے کہ ضروریات جن سے خاکدان ارضی کی موجودہ عبوری زندگی میں گھر گرہستی رکھنے والوں کو دوچار ہونا پڑتا ہے، ان میں خورش پوشش کے سوا بڑا اہم مسئلہ مکانوں کا ہوتا ہے

---

[۹۷] اور دوران اہتمام ہی میں دکن کی عدالت عالیہ کے مفتی بنائے گئے اور چار سال دکن کے اس عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے۔ اس دوران میں آپ کو دار العلوم دیوبند کا صدر مہتمم بنایا گیا اور کار اہتمام حضرت ممدوح کے مشورہ سے مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ انجام دیتے رہے واپسیٔ دکن کے بعد آپ بدستور صدر مہتمم رہے اور مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم رہے۔ محمد طیب غفرلہٗ

سیدنا الامام الکبیر نے مکانی' اور تعمیری قصے کو تو معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ضروریات کی فہرست سے خارج ہی فرما دیا تھا۔ تو طن و قیام کا تعلق جب تک نانوتہ سے رہا' تو پرانے موروثی مکان ہی کو آپ نے کافی قرار دیا۔ پھر جب بجائے نانوتہ کے دیوبند اہل و عیال ------------

کے ساتھ منتقل ہوگئے تو یہاں بھی خود اپنے ذاتی قیام کے لئے جیساکہ مختلف طریقوں سے اس کا ذکر آچکا ہے کہ چھتہ کی مسجد کے اس حجرے کو آپ کی قیام گاہ کا شرف حاصل ہوا، جس کے طول و عرض کا آج بھی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، رہے اہل و عیال، سو قرائن کا اقتضا یہی ہے کہ غالباً کچھ دن آپ کی اہلیہ محترمہ اپنے والد شیخ کرامت حسین مرحوم کی حویلی یعنی دیوان کی ڈیوڑھی میں رہی ہونگی مولانا محمد طیب صاحب کے اس بیان سے کہ:

"جب دیوبند حضرت کا قیام ہوا، تو ہمارا مسکونہ مکان (یعنی جس میں مولانا سلمہ اللہ تعالیٰ آج کل رہتے ہیں اسی مکان کو) خدام نے حضرت کو پیش کرنا چاہا مگر انکار فرمایا"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا کی خدمت میں دیوبند والوں کی طرف سے مکان پیش ہوا، لیکن لینے پر راضی نہ ہوئے۔ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے بھی ایک موقعہ پر اپنے ذاتی احساس کو ان الفاظ میں درج کرتے ہوئے کہ

"بلامبالغہ عرض کرتا ہوں کہ چاہتے تو سونے کی دیواریں بنا لیتے"

آگے یہ اطلاع دی ہے کہ "مدرسہ دیوبند کے مکان کو لاکھوں اینٹوں سے تعمیر کرادیا"

"مگر اپنے گھر میں (سیدنا الامام الکبیر نے) ایک چھوٹا روڑا بھی نہ لگوایا" ص۶

"اپنے گھر" کا مطلب شاید وہی ہے جس کی طرف مولانا طیب صاحب نے اپنی یادداشت میں اشارہ فرمایا ہے۔ یعنی دیوبند کے خدام کی پیش کش جب مکان کے متعلق مسترد فرمادی گئی، تب سیدنا الامام الکبیر کے خادم خاص بلکہ عاشق زار حکیم مشتاق احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیوبندی کو ایک ترکیب سوجھی۔ مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ حکیم صاحب نے پہلے تو یہ کیا کہ قصبہ کے کسی صاحب سے ایک مکان خود خریدا، غالباً یہ اس لئے کیا گیا کہ موروثی مکانات جو لوگوں کی طرف سے پیش ہوئے تھے عموماً اسلام کے قانون وراثت (مما قل منه او کثر[۱]) کے لحاظ سے

[۱] یہ قرآنی الفاظ ہیں جن میں ہدایت کی گئی ہے کہ مرنے والے مورث نے زیادہ چھوڑا ہو یا کم ہر ایک میں وارثوں کا حق ہے مگر ہندوستان کے عام رواج کے مطابق موروثی مکانوں میں لڑکیوں کے شرعی حصہ کا (باقی ص۵۴۲ پر)

پیش کرنے والوں کی کلی ملکیت مشتبہ ہوتی تھی، مولانا طیب صاحب نے حکیم صاحب کے مذکورہ بالا طرزِ عمل کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ جس مکان میں آج کل وہ رہتے ہیں اسکو

"حکیم مشتاق احمد صاحب مرحوم دیوبندی نے خرید کر، اور اس کا ہبہ نامہ میری دادی صاحبہ (اہلیہ سیدنا الامام الکبیر) کے نام کرا کر یہ ہبہ نامہ ان کے قدموں پر لاکر ڈال دیا" ص۸ مکتوبات طیبات

"ان کے" کی ضمیر کا مرجع مولنٰا طیب صاحب کی دادی صاحبہ ہیں، حکیم صاحب جانتے تھے کہ براہ راست خریدے ہوئے مکان کی پذیرائی کی توقع بھی سیدنا الامام الکبیر کی ذات سے مشکل ہے یہی صورت ان کی سمجھ میں آئی کہ ملکیت کا تعلق ان سے رکھا ہی نہ جائے۔ یہی ترکیب چل گئی، اور اسی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ حکیم صاحب مرحوم کے اسی موہوبہ مکان میں حضرت والا کی اہلیہ محترمہ اپنے بال بچوں کے ساتھ اُٹھ آئیں۔ حکیم صاحب کا یہ مخلصانہ ہدیہ بڑا مبارک ثابت ہوا، آج سیدنا الامام الکبیر کی چوتھی بلکہ پانچویں[۱] پشت تک کی اولاد اسی مکان میں آباد و شاد ہے۔

ظاہر ہے کہ پانچ نسلوں سے جس مکان میں سکونت کا تعلق مسلسل قائم ہوتا چلا آرہا ہو، اس کی ظاہری شکل و صورت میں رد و بدل[۲] ترمیم و تغیر ایک قدرتی بات ہے۔ لیکن جب تک اس موہوبہ مکان سے سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق رہا سوانح مخطوطہ کے مصنف کی شہادت اسی کے

---

(بقیہ ص۵۴۱) بہت کم خیال کیا جاتا ہے، جائداد میں لڑکیوں کو جہاں شرعی حصہ دینے کا دستور ہے، وہاں بھی موروثی مکانوں کے متعلق عموماً لاپروائی ہی سے کام لیا جاتا ہے اگرچہ بھائیوں کے ساتھ اس معاملہ میں بہنیں بھی مسامحت ہی سے کام لیتی ہیں، لیکن رضامندی سے خود دست بردار ہوجانا اور بات ہے، مگر رواج کی وجہ سے بہنوں کو باپ کے متروکہ مکان میں شریک نہ سمجھنا اسلام کے قانون وراثت کا انکار ہے ۱۲

(متعلقہ صفحہ ہذا) [۱] یعنی مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا طیب صاحب اور مولانا طیب کے بال بچے جن میں بعض بحمد اللہ خود اس وقت صاحب اولاد ہیں، یوں سیدنا الامام الکبیر کے لحاظ سے گویا پانچویں پشت تک کو اسی گھر میں سکونت کا موقعہ مل چکا ہے ۱۲ [۲] باوجود کافی ردوبدل کے جو حضرت والا کی وفات کے بعد وقتاً فوقتاً ہوتا رہا حضرت والا کا جائے سکونت جو کوٹھا کے نام سے معروف ہے اپنی اسی قدیم حالت پر آج تک محفوظ رکھا گیا ہے۔ اس میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ محمد طیب غفرلہ

متعلق یہ ہے کہ

"اس میں ایک پھوٹا روڑا بھی نہ لگوایا۔"

حاصل یہی ہے کہ جس حال میں یہ مکان مولانا طیب صاحب کی دادی کو ہبہ کیا گیا تھا، سیدنا الامام الکبیر کی زندگی میں کسی قسم کا تعمیری اضافہ اس میں نہ ہوا، جوں کا توں اسی حال میں چھوڑ کر آپ دنیا سے تشریف لے گئے، گویا قیام دیوبند کے زمانہ میں چھتہ کی مسجد کا حجرہ دیوان خانہ اور حکیم مشتاق احمد مرحوم کا موہوبہ مکان سیدنا الامام الکبیر کا زنان خانہ رہا، کام چل ہی رہا تھا تو خواہ مخواہ غم منداری بزبخر کی دردسری میں مبتلا ہونے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

بہرحال مقابلہ کے میدان میں اترنے والے مسکینوں، عقل کے مسکینوں کی زندگی کے سب سے زیادہ تکلیف دہ ٹپکنے والے گھاؤ، سے الرؤف الرحیم کی رأفت و رحمت نے اپنے مخلص بندے کو یوں محفوظ فرما دیا، اور سچ پوچھئے تو بالمؤمنین رؤف رحیم کی خاص نیازمندی کا نتیجہ بھی یہی ہونا چاہئے تھا۔[۱]

دوسرا معرکۃ الآراء سوال اس سلسلہ میں لڑکیوں کا بھی تھا، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے اکثر صوبوں اور علاقوں میں مسلمانوں کی عائلی زندگی میں لڑکیوں کا مسئلہ جن خطرناک حدود تک پہنچ چکا ہے، گویا کہا جا سکتا ہے، کہ

| | |
|---|---|
| وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۭ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ۭ | اور جب ان میں کسی کو بیٹی کی خبر دی جاوے تو سارے دن اس کا چہرہ بے رونق رہے اور دل ہی دل میں گھٹتا رہے اور جس چیز کی اسکو خبر دی گئی ہو اسکی عار سے لوگوں سے چھپا چھپا پھرے آیا اسکو ذلت پر لئے رہے یا اسکو زندہ مٹی میں گاڑ دے |

کی قرآنی خبر کے مطابق جاہلیت کی مہیب تاریخ مسلمانان ہند کے گھروں میں واپس ہو چکی ہے،

[۱] صحیح حدیثوں میں ہے کہ تعمیراتی کاروبار سے دلچسپی لینے والوں کو صراحۃً تو روکا نہیں جاتا تھا لیکن ایمائی اشاروں میں اپنا منشا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عموماً ظاہر فرماتے رہتے ۱۲

یا قریب ہے کہ واپس آجائے۔شاید جاہلی تاریخ کے اعادہ کی ابتدا اسی زمانہ میں ہو چکی تھی جس زمانہ میں زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح قدرت کی طرف سے سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونہ سے اس مسئلہ میں بھی حصہ ارزانی فرمایا گیا تھا، یعنی بجائے اولاد ذکور کے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں پہلے ابو البنات ہی ہونے کی سعادت آپ کو حاصل ہوئی تھی، ہمارے مصنف امام نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ سیدنا الامام الکبیر کی

"اول چند لڑکیاں ہوئیں"

اسی کے بعد یہ اطلاع بھی دی ہے، کہ شیخ اسد علی مرحوم سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کے

"والد اکثر مکدر رہتے تھے، اور آرزو کرتے تھے کہ پوتا ہوتا تو اس سے امید نسل جاری ہونے کی بندھتی"۔ ص۳۴

پوتے کی آرزو تو خیر بے جا آرزو نہ تھی، اور حضرت حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ جیسا پوتا خدا نے ان کو عطا بھی کیا، مصنف امام نے اس لطیفہ کو نقل کر کے کہ

"ایک بزرگ نے (شیخ اسد علی صاحب) سے کہا تم یہ (یعنی پوتے کی) آرزو کرتے ہو، اور مولوی صاحب کو ناخوش رکھتے ہو، ان کو مکدر نہ کرو، اللہ تعالیٰ تم کو بھی خوش کریگا"۔ ص۳۴

بظاہر اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسلسل لڑکیوں ہی لڑکیوں کے پیدا ہونے کی وجہ سے شیخ صاحب مرحوم جو مکدر رہتے تھے، ان کے اس طرز عمل سے سیدنا الامام الکبیر کے مزاج میں گرانی رہتی تھی، بزرگ نے ان کو فہمایش کی، جس سے متاثر ہوئے، مصنف امام کا بیان ہے کہ

"تب اللہ تعالیٰ نے میاں احمد کو عنایت کیا"۔ ص۳۴

بہر حال لڑکیوں کے ساتھ نرینہ اولاد سے حق تعالیٰ نے شیخ صاحب کی آرزو کے مطابق سرفراز فرمایا لیکن اس سے ظاہر ہے کہ لڑکیوں کا مسئلہ تو بجائے خود پھر بھی باقی ہی تھا۔

مولانا طاہر صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ[۱] سیدنا الامام الکبیر کے حفید ثانی نے اپنی یادداشت میں ایک

[۱] مولانا کی اس تحریر کے وقت مولوی محمد طاہر حقیقتاً سلمہ اللہ تھے۔لیکن آج جب کہ اس (باقی ص۵۴۵ پر)

واقعہ کا تذکرہ کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اسد علی صاحب اپنی پوتیوں کے متعلق اسی قسم کے خیالات رکھتے تھے۔ جن خیالات میں میدان مقابلہ کے کھلاڑیوں کو غلطاں پیچاں پایا جاتا ہے اپنی برادری کے رواج کے مطابق وہ ساری باتیں کرنا چاہتے تھے جن کے نہ کرنے کی وجہ سے ناک رہتے ہوئے فرض کر لیا جاتا ہے کہ ناک والوں کی ناک کٹ گئی، غیر تو غیر خود ناک والا غریب اپنی ناک کٹنی کے مغالطہ کا شکار ہو جاتا ہے۔ شیخ صاحب کے اس قصہ کا ذکر تو آگے کیا جائے گا، پہلے یہ سن لیجئے کہ لڑکیوں کے باپ بننے کا فخر جسے حاصل ہوا تھا، وہ کیا سوچ رہا تھا، اور اسی سوچ کے مطابق عائلی زندگی کے سب سے زیادہ الجھے ہوئے مسئلہ کو اس نے کتنی سہولت کے ساتھ سلجھا لیا۔

واقعہ یہ ہے کہ زر زیور، لباس اور جوڑے، دان جہیز، لین دین، برادری کا کھانا دانہ، یہ سوالات تو بعد کے ہیں سب سے پہلا مسئلہ اس سلسلہ میں خود لڑکے کا مہیا ہونا ہے، وقت گذرتا چلا جاتا تھا، لیکن جہاں تک لوگوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ وقت سے پہلے شاید یہ سوال ہی حضرت والا کے قلب مبارک میں کبھی نہیں ابھرا کہ آخر ان لڑکیوں کیلئے بر تلاش کرنا چاہئے، ہمارے مصنف امام نے بھی لکھا ہے، اور مولانا طاہر سلمہ اللہ تعالیٰ کی یادداشت سے بھی اسی کا پتہ چلتا ہے کہ وقت آنے پر اچانک یہ سوال آپ کے سامنے آیا۔ مولوی طاہر صاحب کی روایت ہے، میں بجنسہ ان کے الفاظ میں نقل کر دیتا ہوں، لکھتے ہیں۔

"ایک دفعہ کا قصہ ہے، کہ حضرت (سیدنا الامام الکبیر) کی خالہ صاحبہ ...... آئیں اور انہوں نے (سیدنا الامام الکبیر کو مخاطب کر کے) فرمایا کہ بھائی عبداللہ (خالہ صاحبہ کے لڑکے کا نام تھا اس) کی شادی کی کیا فکر ہو گی "۔

فکر کی اہمیت کو ظاہر کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر کی خالہ صاحبہ نے جیسا کہ مولوی طاہر صاحب نے

---

(بقیہ صفحہ ۵۴۴) سوانح کی تصحیح اندر خواندگی ہو رہی ہے افسوس کہ وہ رحمۃ اللہ علیہ ہو چکے ہیں۔ ۱۳ محرم ۱۳۷۲ھ کو ان کا انتقال ہو چکا ہے  محمد طیب غفرلہٗ ۵ رجمادی الاولیٰ ۱۳۷۲ھ

لکھا ہے یہ عجیب بات فرمائی تھی کہ

"اس کو (یعنی ان کے لڑکے عبداللہ کو) کوئی لڑکی اس لئے نہیں دیتا کہ آپ نے جو نکاح ثانی کرایا تھا، اس کی وجہ سے جو بیاہ کرتا ہے۔ پہلی ہی شادی کی اولاد سے کرتا ہے۔"

بظاہر اس کا مطلب غالباً یہی ہے کہ عقد بیوگان کی تحریک جس کا مستقل ذکر آئندہ انشاء اللہ کیا جائیگا اس تحریک کو مسلمانان ہند کے عام رواج کے خلاف پورے جوش و خروش سے سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے اپنی برادری اور علاقے میں جب جاری کیا گیا تو اس سلسلہ میں جہاں بیسیوں واقعات پیش آئے ان میں ایک واقعہ شاید یہ بھی تھا کہ خود اپنی خالہ صاحبہ کو بیوگی کے بعد عقد کر لینے پر آمادہ فرمایا گیا۔ اور اس وقت اپنے جس لڑکے کے نکاح کی فکر کے متعلق آپ کی خالہ صاحبہ گفتگو فرما رہی تھیں، وہ عقد ثانی کے بعد ہی پیدا ہوئے تھے۔

مولنا طاہر صاحب کے اس بیان کا اقتضا تو یہی ہے کہ عقد بیوگان کی مخالفت کرنیوالوں کی طرف سے ایک رکاوٹ یہ بھی ڈالی گئی تھی کہ عقد ثانی سے پیدا ہونے والے بچوں کو برادری والے عقد اول کی اولاد کے برابر نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے عقد ثانی کی اولاد کی شادی بیاہ میں کافی دشواریاں پیدا کر دی گئی تھیں۔

بہر حال آپ کی خالہ صاحبہ کی طرف سے یہ سوال پیش ہوا، اسی کے جواب میں پہلی دفعہ دیکھا گیا، کہ سیدنا الامام الکبیر کی زبان مبارک پر اپنی صاحبزادی صاحبہ کے عقد کا مسئلہ آیا، مولانا طاہر صاحب نے لکھا ہے،

"حضرت نے فرمایا اسکو میں اپنی بیٹی دوں گا۔"

یہ فرمایا گیا، پھر کیا ہوا؟ کیا لڑکے والوں کی طرف سے فرمائشوں کی فہرست پیش ہوئی؟ یا آپ کی طرف سے کچھ شروط اور قیود کے قصے چھیڑے گئے؟ اللہ اللہ یہی بے چاری مسلمانان ہند کی لڑکیاں ہیں؟ پیدا ہونے کے ساتھ ہی اپنے ماں باپ کے لئے ان کا وجود سوہان روح بن جاتا ہے، پیدائش ہی کے دن سے ان کے زر زیور کی فکر کا بھوت والدین پر سوار ہو جاتا ہے، پھر

لڑکوں کی تلاش کی سرگردانیاں، خود لڑکوں کی طرف سے ان کے ماں باپ کی طرف سے ہوش ربا مطالبے برادری والوں کے سامنے ناک کٹنے کے اندیشے، الغرض لڑکی کیا کسی گھر میں پیدا ہوتی ہے کہ گویا گھر میں جہنم اتر آتی ہے۔ والدین سل اور دق کے دماغی و روحانی امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور سب کچھ کرنے دھرنے کے بعد بھی جو کچھ چاہا جاتا ہے بسا اوقات وہ پورا نہیں ہوتا۔ اب آئیے اور دیکھئے مسلمانان ہند ہی کے ایک شریف گھرانے کی لڑکی کا یہی مسئلہ کتنی سہولت کے ساتھ حل ہو جاتا ہے اپنی خالہ صاحبہ سے سیدنا الامام الکبیر نے وہ وعدہ فرمالیا، اور جیسا کہ مولٰنا طاہر صاحب نے لکھا ہے پہلا کام اس وعدے کے بعد صرف یہ کیا گیا کہ

"حضرت گنگوہی (مولٰنا رشید احمد رحمۃ اللہ علیہ) کو گنگوہ سے بلالیا"

بس نیوتہ دے کر یہی ایک مہمان تھے، جو باہر سے بلائے گئے، جب وہ آگئے، تو اچانک بقول مولانا طاہر سلمہ اللہ تعالےٰ

"جمعہ کے دن مؤذن سے (سیدنا الامام الکبیر نے) فرمایا کہ لوگوں کو کہدو کہ آج وعظ ہوگا"

یہ ہدایت تو مؤذن کو کردی گئی، اور جمعہ کی نماز سے کچھ دیر پہلے جیسا کہ مولٰنا طاہر نے لکھا ہے سیدنا الامام الکبیر

"خود بہ نفس نفیس مکان میں تشریف لے گئے"

مکان سے مراد مکان کا زنانہ حصہ ہے، مولانا طاہر صاحب کا بیان ہے کہ

"میری بڑی پھوپی صاحبہ جن کا نام اکرامن تھا، اتفاق سے اس روز ان کو بخار بھی ہوگیا تھا"

یہی بی بی اکرامن صاحبہ حضرت والا کی بڑی صاحبزادی تھیں "اپنی بیٹی دوں گا" کے وعدے کا تعلق ان ہی سے تھا، مصنف امام نے بھی ان ہی صاحب زادی صاحبہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"بی بی اکرامن یہ سب سے، میاں احمد سے بھی بڑی ہیں، مولوی صاحب (یعنی سیدنا الامام الکبیر) کی اول اولاد یہی ہیں" ص۴۶

میاں احمد سے مراد حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ بہرحال بخار ہی کی حالت میں اپنی قرۃ العین ان ہی صاحبزادی صاحبہ کے پاس حضرت والا پہنچے، لہٰذا بقول مولانا طاہر

" اور ان سے اجازت چاہی "

یعنی استیذان کے شرعی حکم کی تعمیل کی گئی، اجازت حاصل کر کے جمعہ کی نماز کے لئے جامع مسجد تشریف لائے، اور آج عائلی زندگی کا جو مسئلہ مسلمانان ہند کے لئے جان لیوا مسئلہ بنا ہوا ہے، دیکھا گیا کہ صرف دو لفظوں میں حل کر دیا گیا، مولوی طاہر کی اطلاع ہے کہ

" خود بہ نفس نفیس نکاح پڑھا "

نکاح پڑھنے کے بعد وہی لکھتے ہیں کہ

" پھر وعظ فرمایا "

افسوس ہے، کہ بیان کرنے والوں نے حد سے زیادہ اجمال سے کام لیا، باوجود تلاش کے اس کا پتہ نہ چل سکا کہ اس وعظ میں کیا فرمایا گیا تھا، مگر ظاہر ہے کہ ازدواجی فرائض و حقوق کے سوا ان خود ساختہ رسوم اور خود آفریدہ قیود پر تنقید کی گئی ہوگی، جن کی بدولت مسلمانوں نے اپنی لڑکیوں کے وجود کو اپنے سینوں کا بوجھ اور سروں کا درد بنا رکھا ہے۔ بہرحال قول کچھ بھی ہو اصل چیز دیکھنے کی تو "فعل" اور "عمل" ہے۔ عقد خوانی کے فرض سے سبکدوش ہونے کے بعد مولوی طاہر صاحب کی روایت ہے کہ سیدنا الامام الکبیر مسجد سے گھر آئے اور

" جب ہی ان ہی کپڑوں میں اپنی عزیز بیٹی کو ڈولی میں بٹھا کر رخصت فرما دیا "

مولوی عبد اللہ سیدنا الامام الکبیر کی خالہ صاحبہ کے صاحبزادے جن سے بڑی صاحبزادی کا عقد فرمایا گیا تھا، یہ وہی مولانا عبد اللہ صاحب ہیں جو علیگڈھ کالج میں ناظم دینیات کے عہدے پر تقریباً نصف صدی تک سر سید مرحوم ہی کے زمانہ سے سرفراز رہے، اور ناظم دینیات علیگڈھ کی حیثیت سے اپنے وقت میں کافی معروف و مشہور ہستیوں میں شمار کئے جاتے تھے، ہمارے مصنف امام

نے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ

"یہ احقر کے ہمشیرزادے ہیں، اور اولاد میں شاہ ابوالمعالی انبھٹوی کے ہیں، اور مولوی انصار علی صاحب مرحوم کے بیٹے ہیں۔ احقر سے اکثر کتابیں پڑھی ہیں، اور مولوی صاحب (یعنی سیدنا الامام الکبیر) سے بھی پڑھا ہے، نہایت عمدہ آدمی ہیں۔" ص۴۶-۴۷

غالباً حضرت سیدنا شاہ ابوالمعالی انبھٹوی قدس اللہ سرہ العزیز سے نسبی تعلق ہونے ہی کی وجہ سے جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے اپنی برادری والوں میں وہ

"میاں پیرجی مولوی عبداللہ صاحب" ص۴۶

کے نام سے مشہور تھے۔

اور قصہ کچھ ان ہی بڑی صاحبزادی بی بی اکرامن ہی کے عقد تک محدود نہ رہا، مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری صاحبزادی صاحبہ جن کا اسم گرامی بی بی رقیہ تھا، ان کے متعلق بھی یہ لکھتے ہوئے کہ

"ان کا نکاح مولوی پیرجی محمد صدیق سے کیا ہے، یہ مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کے ماموں مولوی امین الدین صاحب مرحوم کے نواسے ہیں اور اولاد میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں نہایت نیک و سنجیدہ مزاج ہیں۔" ص۴۷

آگے ان ہی کی روایت ہے کہ

"دونوں لڑکیوں کا نکاح بالکل سنت کے موافق کیا۔" ص۴۷

پھر "سنت کے موافق" کے اجمال کی تفصیل کرتے ہوئے وہی لکھتے ہیں کہ

"بدون اطلاع کسی کے، جمعہ کے روز بعد جمعہ نکاح کر دیا۔" ص۴۷

بظاہر مصنف امام کی اس اطلاع سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں صاحبزادیوں کا عقد ساتھ ہی ایک ہی دن کر دیا گیا تھا، کیونکہ اسکے بعد وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ

"البتہ جناب مولوی رشید احمد صاحب کو بلوایا اور ان کو غالباً اطلاع فرما دی تھی، اور کسی کو خبر نہ تھی۔" ص۴۷

مگر مولانا طاہر صاحب کی جس روایت کو پیش کر چکا ہوں، اس میں صرف بڑی صاحبزادی کے عقد کا ذکر کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب، اصل واقعہ کیا ہے، تطبیق کی شکل یہی ہو سکتی ہے کہ جمعہ کا دن، اور حضرت گنگوہی کی طلبی، یہ دونوں باتیں اتفاقاً عقد کے دونوں واقعات میں مشترک تھیں، آخر دونوں صاحبزادیوں کا عقد ساتھ ہی انجام پایا، تو مولوی طاہر صاحب والی روایت میں کوئی وجہ نہ تھی کہ صرف ایک ہی صاحبزادی صاحبہ کے عقد کا ذکر کیا جاتا۔[1]

مصنف امام کی روایت کے آخر میں ایک اضافہ یہ بھی ہے کہ

"اور نہ کچھ جہیز وغیرہ کی فکر کی گئی۔" ص ۴۲

اور مولوی طاہر کی روایت کے مطابق جب اسی کپڑے میں جو صاحبزادی صاحبہ پہلے ہی سے پہنے ہوئے تھیں ان کو سسرال ڈولی میں بٹھا کر رخصت فرما دیا گیا تھا، تو جہیز وغیرہ کی فکر کا بار بھلا کیوں اٹھایا جاتا۔

مولانا طاہر صاحب کی روایت کے آخر میں جو یہ جز پایا جاتا ہے کہ

"اس پر (یعنی عقد کے اس خاص طریقہ پر) حضرت (سیدنا الامام الکبیر) کے والد صاحب (شیخ اسد علی مرحوم) خفا ہو گئے اور خفا ہو کر نانوتہ میں بڑے دروازے میں چلے گئے۔"

واللہ اعلم بالصواب "بڑے دروازے" سے کیا مراد ہے۔ نانوتہ میں اس نام سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مکان مشہور تھا۔[2] وہیں خفا ہو کر شیخ صاحب بیٹے سے ناراض ہو کر شاید روپوش ہو گئے ہوں۔ لکھا ہے کہ پہلے تو سیدنا الامام الکبیر نے اپنی صاحبزادی صاحبہ کی رخصتی کا نظم فرمایا۔ جب اس سے فارغ ہو گئے تو مولوی طاہر صاحب کی روایت میں ہے کہ

"حضرت (یعنی سیدنا الامام الکبیر) نے رخصت کر کے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے

---

[1] صورت واقعہ یہی ہے کہ دونوں عقد الگ الگ دو زمانوں میں ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ کچھ مشترک واقعات کی وجہ سے دونوں واقعوں کو ایک سیاق میں ذکر کر دیا گیا ہو۔ محمد طیب

[2] بڑے دروازے کے نام سے شیخ محمد یٰسین صاحب کی حویلی مشہور تھی جو حضرت کے قریبی عزیز اور معتقد علیہ تھے۔ میرے والد صاحب ان کو چچا محمد یٰسین صاحب کہہ کر یاد کیا کرتے تھے۔ محمد طیب

والد کے پاس منانے کے لئے بھیجا۔"

بیان کیا ہے کہ شیخ صاحب کے پاس جب مولانا گنگوہی پہنچ کر معذرت چاہنے لگے، تو شیخ اسد علی صاحب نے جھنجھلا کر فرمایا۔

"کہ ہمیں کچھ نہ کرنے دیا، ہماری برادری میں ناک کاٹ دی۔"

یہی ناک کٹی کے اس عجیب وغریب مفروضہ کی طرف پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں، شیخ صاحب مرحوم تلملا رہے تھے، کہ میری پوتی اس بے کسی کے ساتھ ننگی بوچی سسرال روانہ کی گئی، نہ برات کی دھوم دھام ہوئی، نہ کھانا ہوا نہ دانہ، بہر حال جو جی میں ان کے آیا کہتے رہے، لکھا ہے کہ حضرت گنگوہی ان کی باتیں خاموشی سے سنتے رہے، جب اپنے دل کی بھڑاس شیخ صاحب نکال چکے تب مولانا گنگوہی نے عرض کیا، مولوی طاہر صاحب کی روایت میں ہے کہ

"حضرت گنگوہی نے نرمی کے ساتھ فرمایا کہ اب جو کرنا ہے وہ کیجئے، وہ (یعنی سیدنا الامام الکبیر) آپ کو منع تو نہیں کر رہے ہیں، انہوں نے تو صرف خدا اور رسول کے طریقہ سے نکاح کر دیا۔"

ظاہر ہے کہ اس کے سوا چارہ کار ہی کیا تھا۔ ایک طرف قوم اور ملت کا سوال تھا۔ غلط رسوم اور بیہودہ رواجوں کی جن بیڑیوں میں قوم جکڑتی چلی جا رہی تھی ان سے خلاصی کی عملی تدبیر پیش کرنی تھی، اور دوسری طرف قرآن کا اصرار

| فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ | سو اُن (ماں باپ) کو کبھی (ہاں سے) ہوں بھی مت کرنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور اُن سے خوب ادب سے بات کرنا (بنی اسرائیل رکوع ۳) |
| --- | --- |

پیش نظر تھا، شیخ صاحب مرحوم کو یہ سمجھانے کی جرارت کون کر سکتا تھا کہ ناک جب اونچی ہو رہی تھی اسی کو وہ اپنی ناک کٹی کا حادثہ خیال فرما رہے تھے، اور ہر بنیا بقال جو کچھ کرتا ہے، اسی کو اپنی شیخ زادگی کا امتیاز قرار دے رہے تھے۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے تو کچھ کہا بھی گیا، خود سیدنا الامام الکبیر تو شاید اتنا کہہ لینے کی بھی جرارت نہ فرما سکتے تھے، منانے کے لئے بجائے اپنے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو

بھیجنے کی غرض غالباً یہی تھی کہ وہ کچھ کہہ لینے کی ہمت کر سکتے ہیں[1]۔ بہرحال کہہ سن کر جس طرح ممکن ہوا، شیخ صاحب کو حضرت گنگوہی نے راضی کر لیا، لیکن رضامندی کی شرط وہی تھی کہ کٹی ہوئی ناک کو درست کرنے میں رکاوٹ نہ ڈالی جائیگی۔ مولانا طاہر صاحب نے لکھا ہے کہ ان کے دادا شیخ اسد علی صاحب مرحوم مولانا گنگوہی کے منانے پر من گئے۔

"تشریف لائے، اور پھر جو ان کے جی میں تھا، دعوت وغیرہ انہوں نے کی۔"

دعوت کے ساتھ "وغیرہ" کا لفظ بھی مولانا طاہر صاحب کے بیان میں جو پایا جاتا ہے، اس اجمال کی تفصیل جو کچھ بھی ہو لیکن اتنا تو بہرحال ماننا ہی پڑے گا، کہ جو کچھ بھی کیا گیا ہو گا وہ شرعی حدود ہی کے اندر ہو گا۔ اگرچہ یہ بھی جو کچھ انہوں نے کیا کون تھا جو ان کو سمجھاتا کہ ع "ہم جو زنجیریں توڑ چکے پھر لا کے وہی پہناتے ہو" کہنے والوں نے شاید ان ہی موقعوں کے لئے کہا ہے کہ

خود بخود آزاد بودی خود گرفتار آمدی

بیٹا خود اپنی اور اپنی قوم و ملت کی آزادی کا عملی درس پیش کر رہا تھا، لیکن رواج اور رسم کی گرفت کی شدت دیکھئے کہ اور تو اور قریب سے قریب تر آدمی بھی اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں کر رہا تھا[2]۔

بہرحال شیخ صاحب تو برادری کے رسوم اور رواج کے مطالبوں کی تکمیل میں مصروف تھے۔ لیکن سیدنا الامام الکبیر اسی کے مقابلہ میں ان مفروضہ اوہام کی زنجیروں کے توڑنے پر اپنا سارا زور صرف فرما رہے تھے۔ مولوی طاہر صاحب کی روایت میں ہے، کہ صاحبزادی صاحبہ کو سسرال روانہ کر دینے کے بعد

"آٹھ دن تک نہ بلایا اس زمانہ میں یہ بڑا عیب شمار ہوتا تھا۔"

[1] بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ مولانا گنگوہی کو بلایا ہی اسلئے ہو کہ حضرت والا سمجھے ہوئے ہوں کہ میرے اس سادہ طرز عمل سے والد کو گرانی پیش آئے گی اور میں کچھ بول نہ سکوں گا تو مولانا گنگوہی ہی انسے سنبھال سکیں گے۔ محمد طیب غفرلہٗ

[2] بالکل اسی طرح برادری کی رسوم کی پروا کئے بغیر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ نے بھی اپنے اُستاذ کی مثال کو سامنے رکھ کر انتہائی سادگی سے اپنی صاحبزادیوں کا عقد فرمایا۔ رحمہم اللہ رحمۃ واسعۃ۔ محمد طیب غفرلہٗ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسم کے خلاف سیدنا الامام الکبیر کے اس طرزِ عمل پر برادری والوں میں کانی چہ میگوئیاں ہوئیں، گویا کھلبلی سی مچ گئی، اور یہی مقصد مبارک بھی تھا، کہ واقعات کو واقعات کے رنگ میں دیکھنا چاہیئے

خدا ہی جانتا ہے کہ کیا کچھ کہا گیا، باپ پر قساوت کا، اور ماں پر کٹھور (طوطا چشم) ہونے کے الزام لگانے کے عموماً ان مواقع پر لوگ عادی ہیں، حالانکہ برسوں جس بچی کی پرورش کا بار والدین اٹھاتے رہے اگر ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ کیلئے کسی وجہ سے نہ بلائی جائے۔ تو اس میں بے رحمی، اور سخت دلی کی کیا بات ہے، لیکن ہوتے ہیں لوگ رسم ورواج کے غلام، لیکن اپنی اس غلامی کی توجیہ میں اسی قسم کی بے سرو پا باتوں کے بنانے کا عام دستور ہے، سیدنا الامام الکبیر کی اہلیہ محترمہ بے چاری بہرحال عورت تھیں ان سے زیادہ دن تک عوام کے طعنوں اور فقروں کی برداشت نہ ہو سکی۔ مولانا طاہر صاحب نے لکھا ہے کہ

"جب آٹھ دن پورے ہو گئے، تو اس وقت دادی صاحبہ (سیدنا الامام الکبیر کی اہلیہ محترمہ) نے اجازت لے کر انہیں (صاحبزادی صاحبہ) کو بلوایا۔"

اور یہ بھی مولوی طاہر صاحب ہی کی روایت ہے، کہ واپس بلانے کے بعد

"پھر جو کچھ سامان انہیں دیئے جانے کو مختصر سا دادی صاحبہ نے جمع کر لیا تھا، وہ دے دلا دیا۔"

مطلب بظاہر یہی ہے کہ پہلی دفعہ تو سسرال اسی لباس میں رخصت کر دی گئی تھیں، جو پہلے سے پہنے ہوئے تھیں۔ لیکن آٹھ دن کے بعد جب دوبارہ صاحبزادی صاحبہ اپنے میکے تشریف لائیں تب ان کی والدہ نے جامہ جوڑا، زر زیور، ظرف وظروف، الغرض ہندوستانی مسلمانوں کے شریف گھرانوں میں جو کچھ دینے دلانے کا عام دستور ہے، حضرت والا کی اہلیہ محترمہ کی طرف سے صاحبزادی صاحبہ کو عطا کیا گیا، دان جہیز کے اس سامان کی نوعیت کیا تھی؟ تفصیلی علم تو اس کو نہ ہو سکا۔ بااین ہمہ مولانا طاہر صاحب کی روایت میں "مختصر سا" کا جو لفظ ہے، اجمالاً اس سے نوعیت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

باقی مصنف امام نے اس کی خبر دیتے ہوئے کہ "نہ کچھ جہیز وغیرہ کی فکر کی گئی" آگے خود اپنا مشاہدہ یہ بیان کیا ہے کہ

"مگر بعنایت خداوندی دونوں (صاحبزادیوں) کے پاس زیور کپڑا جیسے ہماری برادری میں ہوا کرتا ہے موجود ہے، نہایت خوش وخورم گذران ہے، اللہ کا شکر واحسان ہے۔" ص۴۷

نہیں کہا جا سکتا کہ زیور اور کپڑے کے متعلق مصنف امام نے اپنی یہ شہادت جو درج کی ہے، ان کی فراہمی کی صورت کیا ہوئی؟ بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ کچھ تو سیدنا الامام الکبیر کی اہلیہ محترمہ کی طرف سے مہیا کیا گیا۔ اور اس کے بعد سسرال پہنچ کر بھی اس میں کچھ اضافہ ہوا، اور یوں مل ملا کر دونوں صاحبزادیوں کے پاس وہ سب کچھ قدرت کی طرف سے پہنچا دیا گیا جو بقول مصنف امام ان کی برادری کی عام سطح کے مطابق تھا اور جس کی فراہمی کی فکروں میں لڑکیوں کے ماں باپ ان کے پیدا ہونے کے ساتھ گھلنا شروع ہوتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، آپ نے دیکھا کہ خود سیدنا الامام الکبیر کو ایک لمحہ کے لئے اپنی صاحبزادیوں کے متعلق کسی قسم کی خود بافیدہ الجھنوں میں نہ پھنسنا پڑا، بلکہ آخر وقت تک بقول مصنف امام "جہیز وغیرہ کی فکر" آپ کے سامنے نہ آئی، لیکن من حیث لا یحتسب بغیر کسی فکر و تردد کے تقریب کی طعامی دعوت کا بھی نظم ہو ہی گیا، اور برادری کی سطح کے مطابق صاحبزادیوں کے پاس بہت کچھ پہنچا ہی دیا گیا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں شادیاں بڑی مبارک شادیاں ثابت ہوئیں، مصنف امام کے الفاظ میں

"نہایت خوش وخورم گذران ہے، اللہ کا شکر واحسان ہے۔" ص۴۷

لیکن جس حد تک خود سیدنا الامام الکبیر کے عمل کا تعلق ہے وہ اتباع سنت کے دائرہ سے ایک انچ بھی آگے نہ بڑھا اور اپنی جگہ پچھلوں کیلئے مثال ثابت ہوا۔

بہر حال گھر گرہستی یا عائلی زندگی کے اہم مسائل مصارف کے نقطہ نظر سے عموماً یہی تعمیر و تقریب کے قصے ہیں، ان ہی ضرورتوں کے لئے زمین کے قلابے آسمانوں سے ملانے والوں کو ہانپتے کانپتے ہی پایا گیا ہے۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر کی ایمانی دانش نے عائلی زندگی کے ان دونوں ہفت خوانوں کو قوت ارادی کی ایک ہی جست میں کچھ اس آسانی سے طے کرا دیا کہ ان کا ہونا

گویا نہونے کے برابر ہوگیا' بجائے پہاڑ کے غاروں کے' رہے وہ بھی مکانوں ہی میں' اور یکسوئی اور عزلت گزینی کی راہبانہ زندگی کے مقابلہ میں ساری زندگی بیوی بچوں ہی میں گذاری' سب کی تو نہیں لیکن آپ دیکھ چکے کہ دو دو لڑکیوں کے فریضۂ ازدواج سے سبکدوشی کا موقعہ بھی آپ کے سامنے آگیا اور سبکدوش ہو گئے' یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن اپنے آپ کو زندگی کی اہم ضرورتوں کا ایک لمحہ کے لئے تابع بنانے پر راضی نہ ہوئے۔ بلکہ ان ضرورتوں ہی کو اپنی عقل اور اپنے ایمان کا طفیلی بنا کر رکھا (جو درحقیقت قرآنی کلمہ تبتّل کی عملی تفسیر ہے کہ قلب غیر اللہ سے خالی ہو اور مخلوق سے انقطاع نہ ہو یعنی دل بیار دست بکار۔ محمد طیب غفرلہ) یہی فرق ہے جو ابن الوقتوں کو ابوالوقتوں سے جدا کر دیتا ہے' اور سچ تو یہ ہے کہ پورے پچاس سال بھی خاکدان ارضی پر ٹھہرنے کا موقعہ جسے نہیں ملا' اسی نے جو وقت زندگی کے اسی مختصر وقفہ میں اپنے مالک کی یاد' ذکر و فکر اور اس کی راہ میں ریاضت و مجاہدہ کے لئے نکالا اس کا علم تو خیر دوسروں کو کیا ہو سکتا ہے۔ یہ تو خدا اور اس کے بندے کا معاملہ ہے' لیکن خدا کے بندوں کے لئے جن بے نظیر خدمات اور محیر العقول کارناموں کی گنجائش اس کی زندگی میں پیدا ہوئی' کہ ان کی انجام دہی کے لئے اشخاص تو اشخاص انصاف کی بات تو یہی ہے کہ جماعتوں' بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ قوموں کی اجتماعی کوششیں بھی شاید عام حالات میں ناکافی ہی ثابت ہوں' یقیناً یہ گنجائش اسی وجہ سے پیدا ہوئی کہ تعمیر و تقریب جیسی چھچھوری باتوں کی آلودگیوں سے اپنے دل و دماغ کو پاک اور اپنی فطرت کو ان عامیانہ اقتضاؤں کے دباؤ سے آزاد کرنے میں وہ کامیاب ہو چکا تھا' اپنی نظر کو اتنا بلند' اور اپنے نقطۂ نگاہ کو اتنا اونچا کر چکا تھا کہ چھوٹوں' دل کے چھوٹوں کو جو باتیں بڑی معلوم ہوتی ہیں' اس کے نزدیک ان کی حیثیت پیشک شتر' اور پریشہ کے برابر نہ تھی' سڑی گلی پیازوں کی اسے کیا پروا ہو گی جس کی گود سیب و انگور سے بھر چکی ہو

باقی تعمیر و تقریب کے سوا زندگی کی دوسری عام ضرورتیں خورش و پوشش وغیرہ کی' سو بار بار اس کا ذکر مختلف پیرایوں میں گذر چکا ہے کہ ذاتی طور پر سیدنا الامام الکبیر کا کھانے کھلانے کے دن یعنی شباب ہی میں جب یہ حال تھا' مصنف امام کی شہادت گذر چکی کہ دلی میں جب ان کے

امکان میں فرد کش تھے تو کھانے کے متعلق یہ عام دستور سیدنا الامام الکبیر تھا کہ

"روٹی کبھی پکوا لیتے تھے اور کئی کئی وقت تک اسی کو کھا لیتے تھے"۔

اس موقعہ پر انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ آدمی جو اُن کی روٹی پکاتا تھا، اس کو حالانکہ مصنف امام نے حکم دے رکھا تھا کہ سالن دے دیا کرو، لیکن اس ہدایت کے باوجود ان ہی کا بیان کیا یہ چشم دید شہادت ہے کہ

"بدقت اس کے (باورچی کے) اصرار پر لے لیتے تھے، ورنہ وہی روکھا سوکھا ٹکڑا چبا کر پڑ رہتے تھے"۔ ص ۲۹

ان کے شاگرد سعید، مولانا منصور علی خاں مرحوم کی اس گواہی کا ذکر کر چکا ہوں کہ

"خوراک ان کی (سیدنا الامام الکبیر) کی نہایت قلیل تھی، کبھی غذا کو بہت رغبت اور حرص سے نہیں کھایا۔ نہایت چھوٹا لقمہ لیا کرتے تھے"۔ ص ۱۹۱

اسی سلسلہ کا وہ مشہور تاریخی لطیفہ ہے جس کے راوی شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ہیں کہ منشی نہال احمد صاحب مرحوم برادر کلاں منشی حبیب حسن صاحب وحشی نے (جن کو حضرت والا نے آریہ ورت کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی مہاراج سے مناظرہ کی شرائط طے کرنے کے لئے اُن کے پاس بھیجا) جب دیانند سرسوتی مہاراج کو رڑکی کے باغ میں دیکھا کہ سامنے تھاک کی تھاک لگی ہوئی پوریوں کا انبار ہے، اور بڑے پرات میں ترکاریاں بھری ہوئی ہیں، اور سرسوتی جی سب ہی کو چڑھا گئے، تو واپس آکر سیدنا الامام الکبیر سے عرض کیا کہ ہر چیز میں آپ پنڈت جی سے جیت سکتے ہیں۔ لیکن ایک کمال ان کا ایسا ہے جس میں آپ کو پسپا ہونا پڑے گا۔ یعنی اگر کھانے میں مناظرہ ہو گیا تو وہ تھاک کی تھاک چڑھا کر بھی دم نہ لیں گے اور آپ اس بارہ میں ان کے لگ بھگ بھی نہ جا سکیں گے۔ اسی کے جواب میں سمجھایا گیا تھا کہ میاں مقابلہ کمال میں ہوتا ہے نہ کہ نقص میں، زیادہ کھانا تو زیادہ احتیاج کی دلیل ہے، اور محتاجی کمال نہیں نقص ہے، مناظرہ علم میں ہوتا ہے نہ کہ جہل میں، بہیمیت شعبہ جہل و نادانی ہے، اور جو حالت خوراک کی تھی پوشاک کا حال بھی یہی تھا۔ ذکر اس کا بھی آچکا ہے۔ یوں

عام طور پر مشہور یہی ہے، مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں بھی ہے، کہ

"معمولی ایک جوڑہ کپڑے کے سوا کسی چیز کے مالک نہ تھے جو ان کے بدن پر رہتا تھا اور اس کی قیمت اس دور کے لحاظ سے روپیہ سوا روپیہ سے زائد نہ ہوتی تھی، صرف ایک جوڑہ[۱] رکھتے تھے، پاجامہ ایک پٹہ (یعنی چوڑے پانچوں کا) بلا کرتہ کا ایک بندوں والا اچکن جس میں بٹن نہ ہوتے تھے ..... (ان کے سوا) ایک نیلی لنگی، بس صرف یہی ایک جوڑہ رکھتے تھے، جب وہ میلا ہو جاتا تو تنہائی میں کسی تالاب پر جا کر اور لنگی باندھ کر اسے دھو لیتے، اور جب وہ سوکھ جاتا تو پہن کر چلے آتے" ص۳ یادداشت طیبہ

اور اس رنگ کو حضرت والا نے اپنی ذات ہی کی حد تک محدود نہیں رکھا تھا، مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں ہے، کہ

مولانا مرحوم کو جیسے اپنے نفس کی زیب و زینت مکروہ معلوم ہوتی تھی، ویسے ہی، اپنے اہل و عیال کی بھی مولانا مرحوم کا یہ حال تھا"

آگے خود وہی لکھتے ہیں کہ

"اسی طرح بی بی صاحبہ (سیدنا الامام الکبیر کی اہلیہ محترمہ) کے پاس بھی صرف دو جوڑے سادہ رہتے تھے"

سادہ کی تفصیل خود ہی کی ہے کہ،

[۱] جوڑا کا مطلب تو وہی ہے جسے مولانا طیب صاحب نے آگے بیان کیا ہے۔ لیکن بظاہر یہاں مولانا سے تشریح میں شاید کچھ مسامحت ہوئی ہے۔ خود ان ہی کی دوسری یادداشت میں ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کا عام دستور لباس کے متعلق یہ تھا کہ "صرف دو جوڑے رکھتے تھے ایک دھوبی کے ہاں دوسرا بدن پر" امیر شاہ خاں مرحوم سے خاکسار نے بھی جہاں تک یاد آتا ہے یہی سنا تھا۔ اب تطبیق کی دو ہی شکلیں ہو سکتی ہیں، یعنی زندگی کے مختلف ادوار پر اس کو محمول کیا جائے، کسی زمانہ میں صرف ایک جوڑا کافی خیال کیا جاتا تھا۔ شاید اس وقت تک جب خود دھو لینے کی فرصت مل سکتی تھی، لیکن جب اس کا موقعہ مشاغل کی کثرت کی وجہ سے باقی نہ رہا، تب بجائے ایک کے دو جوڑے رکھنے لگے جن میں ایک بدن پر اور ایک دھوبی کے یہاں رہتا، یا پھر "جوڑے" کے لفظ کو "زوج" کے عربی لفظ کا ترجمہ قرار دیا جائے۔ اور ایک جوڑے سے مراد بدن اور دھوبی والے دونوں کپڑے ہوں، اگرچہ اردو محاورے کے لحاظ سے یہ توجیہ کچھ زیادہ وجیہ نہیں ہے۔

"لباس کی زیب و زینت خلاف شرع شریف نہ تھی"

اہل یعنی بیوی صاحبہ کے زر زیور، اور قیمتی لباس وغیرہ کے متعلق کافی تفصیلات کا تذکرہ اپنے موقعہ پر کیا جا چکا ہے، جن کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ رہے عیال، سو مصنف امام نے آپ کی چھوٹی صاحبزادی صاحبہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہوئے کہ "چھوٹی صاحبزادی بی بی عائشہ، ان کی عمر چار برس کی، مولوی صاحب کو ان سے بہت محبت تھی" ص‍۲۴ ــــ بال بچوں کے متعلق حضرت والا کی طبیعت کے عمومی رجحان کے متعلق اگرچہ یہ لکھا ہے کہ

"بخلاف اور اولاد کے مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) ان کو پاس بٹھلا لیتے، اور ان سے باتیں کرتے" ص‍۲۴

لیکن باوجود اس کے اپنے بچوں کی اخلاقی تربیت کے متعلق آپ کی غیر معمولی کڑی نگرانیوں کا جو حال تھا، اس کا کچھ اندازہ اس قصے سے بھی ہوتا ہے، جس کے راوی حکیم الامت مرشد تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز ہیں، شاید اس روایت کے بعض اجزاء کا ذکر کہیں پہلے بھی آ چکا ہے، بہر حال یہ بیان کرتے ہوئے کہ سیدنا الامام کے پاس کپڑوں کی گٹھری نہ تھی، اور نہ کوئی ٹرنک بکس تھا، حضرت تھانوی نے فرمایا کہ ایک دفعہ

"کسی شخص نے مولانا (محمد قاسم) کی خدمت میں چند ٹوپیاں بھیجیں۔ آپ نے ان کو تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ صاحبزادہ (یعنی حافظ محمد احمد مرحوم) نے والدہ صاحبہ کی وساطت سے ایک ٹوپی مانگ لی، خود نہیں کہا"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بچوں کو کتنے داب میں رکھتے تھے کہ ٹوپی مانگنے کی خود جرات حافظ صاحب مرحوم کو نہ ہو سکی، ماں کو مانگنے میں واسطہ بنایا، لیکن سنئے نتیجہ کیا ہوا، حضرت تھانوی کی روایت ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر نے

"فرمایا، ہاں! تو بھی ایسی ٹوپی پہنے گا"

اور بات اسی پر ختم نہیں ہو گئی، روایت کے الفاظ آگے یہ ہیں کہ اسی کے ساتھ اپنے قرۃ العین لخت جگر کو خطاب کر کے فرمایا جا رہا تھا۔

"ایسا دماغ بگڑا ہے، اب یہ تکلف سوجھے گا، دیکھ تو کیسی ٹوپی پہناتا ہوں"۔

یہاں تک تو صرف "قول" تھا، قول کے مطابق "عمل" بھی شروع ہوا۔ حضرت تھانوی کا بیان ہے، کہ اس ڈانٹ کے ساتھ ساتھ

"ان کے (حافظ صاحب مرحوم) کے کپڑوں کی گٹھری دیکھی"۔

دیکھنا تھا کہ قیامت ہی ٹوٹ پڑی، حضرت تھانوی کہتے تھے کہ

"تقدیر سے صاحبزادے کی گٹھری بھڑکدار نکلی"۔

خدا ہی جانتا ہے کہ اس "بھڑکداری" کی واقعی نوعیت کیا تھی، لیکن بہر حال گٹھری کی شکل وصورت کچھ ایسی ضرور تھی جو سیدنا الامام الکبیر کے معیار کے مطابق "بھڑک دار" قرار دیئے جانے کے لئے کافی تھی، گٹھری کے بھڑک دار رنگ نے مزاج مبارک کو اتنا بھڑکا دیا کہ بقول حضرت تھانوی غصہ میں بے ساختہ یہ الفاظ سیدنا الامام الکبیر کی زبان سے نکل رہے تھے۔

"ادہو! اس بھڑکدار گٹھری میں آپ کا لباس رکھا جاتا ہے، یوں کپڑے تہ ہوتے ہیں، یہ اچکن بھی تہ ہوا رکھا ہے"۔

یہ غیظ وغضب کی آواز ادھر کانوں میں گونج رہی تھی، اور دوسری طرف دیکھنے والے یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر اسی بھڑکدار گٹھری سے تہ بہ تہ جمائے ہوئے کپڑوں کو نکال رہے ہیں، اور یوں سب کو

"کھول کھول کر صحن میں پھینک دیا"۔ الہادی جمادی الثانی ۵۰ھ

(اور اسکے ساتھ غصہ میں یہ بھی فرماتے جاتے تھے کہ باوا ہے نا کہیں کا نواب جو صاحبزادہ کو یوں جوڑے تہ بتہ رکھنے کی سوجھی ہے۔ محمد طیب غفرلہ) ظاہر ہے کہ یہ جو کچھ بھی سنایا اور دکھایا جا رہا تھا، اسی غیر معمولی فطری ربط اور تعلق ہی کا نتیجہ تھا جو قدرت کی طرف سے باپ اور بیٹوں کے درمیان پیدا کر دیا جاتا ہے لیکن اس قدرتی ارتباط ونسبت کے استعمال کرنے کا طریقہ مختلف ہے، یہی تعلق بڑے بڑوں کی عقلوں کو بچوں کی طفلانہ عقول کا تابع بنا دیتا ہے، بالغ بن جانے کے بعد بھی باوجود پیری کے ان ہی بالغوں کو

اور ان کے عقول کو نابالغ بنتے ہوئے دیکھا جاتا ہے، لیکن یہی اور بجنسہ اسی فطری رستہ کے استعمال کا ایک رنگ وہ بھی ہے جس کا جلوہ سیدنا الامام الکبیر کے اس طرز عمل میں نظر آرہا ہے، اور جو چھوٹوں کی چھوٹی عقلوں کو بڑائی کی طرف لے جانا چاہتا ہے، وہ یہی کرتا ہے اور یہی اس کو کرنا بھی چاہئے۔ اسی طریقہ سے چھوٹے بالآخر بڑے بن جاتے ہیں، ورنہ گنگا جہاں الٹی بہنے لگتی ہے، یا بہانیوالے اسے الٹ کر بہانے لگتے ہیں یہاں اپنی بڑی عقل کو چھوٹوں کی چھوٹی خام عقلوں، اور ان کے خام نارسیدہ تقاضوں کے دھاروں پر بہنے کے لئے آزاد چھوڑ دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اگر اس کا تجربہ ہو کہ بچوں کی عقلوں میں خامی ہی کا اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے، تو جو کچھ کیا جاتا ہے اسی کا تو یہ لازمی ناگزیر نتیجہ ہوتا ہے۔

اور یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ بظاہر اپنے بچوں کے ساتھ لاڈ اور پیار والے عام طریقہ کو جیسا کہ مصنف امام نے بھی لکھا ہے، سیدنا الامام الکبیر نے اختیار نہیں فرمایا تھا۔ لیکن قلبی اور باطنی طریقہ پر قلب اس درجہ اولاد پر شفقت سے بھر پور رہتا تھا کہ زندگی ہی کی حد تک نہیں بعد وفات بھی اولاد پر آپ کی وہی نگاہ شفقت قائم رہی، چنانچہ ان ہی صاحبزادے صاحب کے متعلق جن کی بھڑ کدار گٹھری کھولی گئی، اور نکال نکال کر کپڑے اسی گٹھری سے باہر صحن میں پھینکے جا رہے تھے۔ ان ہی کے متعلق براہ راست خاکسار نے مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم نائب مہتمم دار العلوم دیوبند سے جو بات سنی ہے جب کبھی اس کا خیال آجاتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور ظاہر حال سے باطن پر غلط استدلال کر کے

| انزلوا الناس علی منازلهم | لوگوں کو اُن ہی کے درجہ پر رکھو۔ |
|---|---|

کی وصیت نبویہ کی تعمیل کی سعادت سے جو محروم رہ جاتے ہیں، ان پر افسوس ہوتا ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم سے اس واقعہ کا ذکر خاکسار نے حیدر آباد دکن میں اس وقت سنا تھا جب مولانا حافظ محمد احمد صاحب حکومت آصفیہ کی شاہی عدالت عالیہ کے مفتی بن کر تشریف لائے تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن فرماتے تھے کہ حیدر آباد دکن میں مشہور حادثہ رود موسیٰ کے طوفان اور اس

طوفان کی غیر معمولی تباہ کاریوں کا پیش آیا تھا۔ اتفاقاً اس زمانہ میں مدرسہ کے کام میں حافظ صاحب مرحوم حیدرآباد ہی میں قیام فرما تھے۔ جہاں تک خیال آتا ہے خود اپنے متعلق مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے بیان کیا کہ خواب میں حضرت مولانا نانوتوی کو دیکھتا ہوں، کہ سخت پریشان ہیں اور پوچھ رہے ہیں کہ احمد کیسا ہے؟ نیند سے بیدار ہونے کے بعد اخباروں سے حیدرآباد کے طوفان کا حال معلوم ہوا۔ تب میں سمجھا کہ حضرت والا کی پریشانی کی وجہ یہی تھی، مولانا حبیب الرحمٰن نے فرمایا کہ وفات کے بعد بھی بزرگوں کی روحوں کا تعلق جب اولاد کے ساتھ باقی رہتا ہے، تو اسی سے اندازہ کرنا چاہئے کہ اس تعلق سے لاپرواہی برتنے والوں کو بزرگوں کے ساتھ عقیدت کا دعویٰ کس حد تک زیب دیتا ہے، فرماتے تھے کہ حافظ صاحب کے ساتھ میرے نیازمندانہ تعلقات پر بعضوں کو تعجب ہوتا ہے، مگر آج تیرے سامنے اصل وجہ بیان کر رہا ہوں۔ آب دیدہ تھے اور کہتے تھے کہ لیلیٰ کے کتے کو بھی مجنوں چومتا تھا۔ پھر جسے میں دوست رکھتا ہوں، اس کی اولاد سے میرا دل کیوں محبت نہ کرے رحمۃ اللہ علیہ۔

اس واقعہ سے جہاں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ کے مخلصانہ تعلق کی حقیقی بناء کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں حضرت والا کی اپنی اولاد پر شفقت بے پایاں بھی نمایاں ہو جاتی ہے جو بعد مردن بھی بدستور قائم رہی گو ظاہری طرز عمل تشدد آمیز تھا۔ کیونکہ تربیت اسی کی مقتضی تھی اور یہ بھی شفقت ہی کا ایک اہم جزو ہے۔

اور میرا ذاتی احساس تو یہ ہے کہ بچوں کے متعلق سیدنا الامام الکبیر کے جس عام طرز عمل کا تذکرہ ہمارے مصنف امام نے فرمایا ہے۔ غالباً اس میں زیادہ دخل شرم و حیا کے اس جذبہ کو بھی تھا جس پر فطرۃً وہ مجبول تھے، یوں بھی مسلمانوں کے شریف گھرانوں کا عمومی دستور اس زمانہ میں یہی تھا کہ والدین کے سامنے اپنے بال بچوں کے ساتھ نوجوان ماں باپ بے تکلف ہونے میں کچھ حجاب محسوس کرتے تھے۔ گویا جب تک والدین زندہ رہتے تھے، اپنے آپ کو بھی اور اپنے بچوں کو بھی ان ہی کی اولاد تصور کرتے تھے۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں سیدنا الامام الکبیر کے والد ماجد کی عمر کافی ہوئی

اور حضرت والا کی اولاد زیادہ تر اُن کی (شیخ اسد علی مرحوم) زندگی ہی میں پیدا ہوئی' اس لئے اُن کے رہتے ہوئے اپنے بچوں کے ساتھ ان تعلقات کے ظاہر کرنے پر آپ کی طبیعت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آمادہ نہ ہوتی تھی' جن کی توقع باپ ہونے کی وجہ سے ذوقاً کی جاتی ہے' آخر یہی سیدنا الامام الکبیر تو تھے مصنف امام ہی کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں کہ اپنی چھوٹی صاحبزادی صاحبہ بی بی عائشہ کو اپنے پاس بلا کر بٹھاتے بھی ادران سے باتیں بھی کیا کرتے تھے۔ غالباً اس وقت آپ کے والد ماجد کی وفات ہو چکی تھی' اسی لئے رنگ بدل گیا۔ بلکہ کسی موقعہ پر بچوں کے ساتھ حضرت والا کے خاص تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے مصنف امام کے صاحبزادے مولوی جلال الدین صاحب مرحوم کے متعلق یہ روایت گذر چکی ہے کہ ان کو خاص طور پر سیدنا الامام الکبیر چھیڑا کرتے۔ پیٹ ان کا بچپن میں کچھ غیر معمولی طور پر بڑا تھا اسی لئے جب کھیلتے ہوئے سامنے آتے تو فرماتے ع چلا کچھا لاگڑ بڑ جھالا

بہر حال بقول شخصے ؎ راحت دنیا اگر مطلوب ہو + حاجتوں میں مختصر ہو جائیے

کے حکیمانہ نقطۂ نظر کے مطابق راحت کی یہ زندگی جو سطح بینوں کو زحمت کی زندگی محسوس ہوتی ہے[۱]

---

[۱] دنیا کے مغالطوں میں ایک دلچسپ مغالطہ یہ بھی ہے کہ کار دنیا کو دیکھ کر اس کی نہ حد ہے نہ انتہا مختصر گیری کو اپنا ضابطہ حیات جن لوگوں نے بنالیا تھا بقول حافظ ؎ مرمنزل قناعت نتواں زدست دادن + اے ساربان فرو کش کیں رہ کراں ندارد + اپنا کجاوہ اتار کر جو بیٹھ گئے۔ اور جس راہ کا نہ اول ہے اور نہ چھور۔ اس پر چلنے والوں کو دیکھ دیکھ کر ؎ ہر آنکہ کنج قناعت بہ گنج دنیا داد + فروخت یوسف مصری بہ کمتریں ثمنے۔ کے ساتھ دوسروں کو بھی پکارتے رہے لیکن نادانوں کو ان کی راحت کی زندگی زحمت سے معمور نظر آتی ہے' اس راہ کے پیشوائے اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا ایک اہم رخ یہی ہے' لیکن بیان کرنیوالے آپ کی زندگی کے اس رخ کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سننے والوں میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ بجائے آسان زندگی کے اس کو وہ دشوار زندگی خیال کرنے لگتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک کے اس نکتہ کو صدیقہ عائشہ ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے پالیا تھا' ان کی روایت ماخیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین قط الا اخذ ایسرھما یعنی ایسی دو باتیں جن میں ہر ایک کا اختیار آپ کو دیا گیا تھا تو ہمیشہ آپ کا دستور یہی تھا کہ ان دونوں میں جو آسان تر ہوتی اسی کو آپ اختیار فرماتے تھے' یہ روایت بخاری ومسلم کی ہے جس کا حاصل یہی معلوم ہوتا ہے کہ سارے مباحات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی طریقہ تھا۔ اسی لئے سمجھ میں آتا ہے کہ رہنے کے لئے جس قسم کے مکانات' پہننے کے لئے جس قسم کا لباس کھانے کے لئے جس قسم کی غذائیں آپ استعمال فرماتے تھے ان میں "ایسرہا" یعنی سہل تر پہلو کو (باقی ص ۵۶۳ پر)

سیدنا الامام الکبیر نے اپنی ذات ہی کی حد تک اس کو محدود نہیں رکھا تھا، بلکہ اپنے اہل وعیال کو بھی چاہتے تھے کہ راحت کی اسی زندگی کا مذاق شناس بنا دیا جائے۔ (کسی عارف نے خوب ہی کہا ہے

کار دنیا کسے تمام نکرد　　　　ہرچہ گیرید مختصر گیرید)

حدیث نبوی میں اسی کلمہ عملی کو ان الفاظ میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ کن فی الدنیا کانك غریب او عابر سبیل وعد نفسك من اھل القبور یعنی دنیا میں بسر کرنے والے کے لئے درجہ بدرجہ تین مقامات ارشاد ہوئے ایک مثل مسافر کے ہو جاؤ۔ مسافر سے زیادہ کون مختصر سامان ہوتا ہے اس کا سارا گھر سمٹ کر ریل کی ایک سیٹ پر آجاتا ہے۔ دوسرا درجہ راہرو کا ہے جو راستہ سے گذر رہا ہو وہ یقیناً بینچ پر بیٹھے ہوئے سے بھی زیادہ مختصر سامان ہوگا اور تیسرا درجہ یہ فرمایا کہ اپنے کو اہل قبور میں سے سمجھ لو، ظاہر ہے کہ مردہ کے پاس بجز کفن کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا سیدنا الامام الکبیر نے اپنے کو قریب قریب اسی تیسرے مقام پر پہنچا دیا تھا۔ حد ہے کہ اہل وعیال کے لئے بھی یہی چاہتے تھے۔ محمد طیب غفرلہ) آخر وارستہ مزاجی جس کی اس حد کو پہنچی ہوئی ہو، کہ اسی لباس میں پہلی دفعہ اپنی لڑکی کو سسرال روانہ فرما دیا تھا، جو پہلے سے وہ پہنے ہوئے تھیں، اس کے بعد سچ پوچھئے تو اس راہ میں بلندی کا مرتبہ ہی کیا باقی رہتا ہے، صاحبزادہ کی بھڑک دار گٹھری سے کپڑوں کو نکال نکال کر پھینکنے پر، ممکن ہے اُن لوگوں کو شاید آج اچنبھا ہو، جو پیدا ہونے کے ساتھ ہی اپنے بچوں کو غلمانوں کی شکل میں رکھ کر اپنی آنکھیں سینکا کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے ممکن ہے ماں باپ کی آنکھوں کو اس سے خنکی ہی حاصل ہوتی ہو، لیکن اپنی آنکھوں کی خنکی کے لئے وہ شاید اندازہ نہیں کرتے کہ ان معصوموں کے نفسیات میں غیر ضروری خواہشوں اور نہ پوری ہونے والی تمناؤں کی کتنی خطرناک جہنم کو وہ سلگا رہے ہیں، جس سمت کی طرف انجن بھاگا جا رہا ہے، اسی کی طرف دھکا دینا

(بسلسلہ صفحہ ۵٦۲) آپ نے اختیار فرمایا تھا، جو مل گیا سو کھا لیا، پہن لیا، بہ سہولت جس قسم کے مکان میں زندگی بسر ہو سکتی تھی خواہ مخواہ اس میں طمطراق کے طریقوں کو آپ نے اختیار نہیں فرمایا۔ اگرچہ صوفی مزاجوں پر ممکن ہے میری تشریح کچھ گراں گذریگی لیکن عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بیان یہی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب ۱۲

یہ کمال نہیں ہے۔ کمال اسی کا ہے جو موڑ کر اس انجن کو مخالف سمت کی طرف دوڑا دے، اور یہ نہ ہو سکے تو خندقوں اور کھائیوں سے بھری ہوئی راہ پر کم از کم انجن کی رفتار ہی سست کر دے۔

خیر میں کیا کہنے لگا، بات ہو رہی تھی حضرت والا کے مصارف کے متعلق، عائلی زندگی میں حاجتوں کے اختصار کا ایک بہترین عملی نمونہ آپ کے سامنے پیش ہو چکا، مولوی ہونے کی وجہ سے خیال گذر سکتا ہے کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم کتابوں کی فراہمی اور ان کی خریداری کی مد آپ کے یہاں شاید ہو گی؟ مگر کسی دوسرے عنوان کے تحت یہ تفصیل بتا چکا ہوں، خود حضرت کے مکاتیب طیبہ سے ایسی شہادتیں اخذ کر کے پیش کر چکا ہوں جن میں خود ہی اس کا اقرار فرمایا گیا ہے، کہ میرے پاس کتابوں کا کوئی ذخیرہ نہیں ہے، اور میرا حافظہ اگر غلطی نہیں کر رہا ہے تو یاد آتا ہے کہ حضرت کے فرزند رشید مولانا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ سے براہ راست کان میں یہ بات پڑی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی وفات کے بعد قرآن مجید اور بخاری شریف کا وہ نسخہ جس کے آخری چند پاروں کے تحشیہ و تصحیح کا کام حضرت ہی نے انجام دیا تھا، غالباً بخاری کے ناشر حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے ہدیۃً عطا فرمایا تھا، ان دو کتابوں کے سوا شاید تیسری کتاب فصوص الحکم شیخ محی الدین بن عربی کی، لے دے کر کتابی متروکہ آپ کا یہی تھا، جس وقت حافظ صاحب حیدر آباد کی کسی مجلس میں اس واقعہ کا ذکر فرما رہے تھے، تو خیال آتا ہے کہ دماغ میں امیر مرحوم کا مشہور شعر ؎

چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط     بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

بے ساختہ چکرانے لگا، جی تو چاہتا تھا کہ پڑھ دوں، لیکن ادب مانع ہوا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس حد تک سوچتا ہوں، اور جو معلومات مجھ تک مختلف ذرائع سے سیدنا الامام الکبیر کے متعلق پہنچی ہیں، ان میں جہاں تک غور کرتا ہوں سب کا اقتضا یہی ہے کہ عموماً اپنے خرچ ہی کو حضرت والا نے اتنا محدود کر رکھا تھا کہ دخل کی توفیر و تکثیر کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی تھی، بس ان سارے قصوں میں صرف ایک چیز ایسی تھی جس کے متعلق کہہ سکتا ہوں کہ اس باب میں آپ کا حوصلہ بڑا اور کافی بڑا تھا۔ اس مد میں بجائے اختصار اور تنگی کے ممکنہ حد تک فراخی اور وسعت ہی کی طرف آپ کی فطرت کا

معلوم ہوتا ہے کہ کچھ جبلّی رجحان تھا، بلکہ "سوانح مخطوطہ" کے مصنف نے تو "مولویوں کے گروہ" یا "طبقہ" کے لحاظ سے اس کو آپ کی فطرت کا شذوذ، اور استثنائی حال قرار دیتے ہوئے اس لطیفہ کا ذکر کیا ہے کہ

"کسی شخص نے کسی حکیم سے پوچھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ عجیب چیز کیا ہے ؟"

لکھا ہے کہ حکیم نے جواب میں کہا کہ

"مولوی ہوکر سخی ہونا"

آگے پھر اپنے ذاتی احساس کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے کہ

"سو یہ عجیب چیز آپ ہی (یعنی سیدنا الامام الکبیر) کا حصہ تھا" ص۲۴ مخطوطہ

پہلی بات یعنی "مولوی کی سخاوت" کو دنیا کے عجائب میں شمار کرنا، اس کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا[1] لیکن دوسری بات یعنی سیدنا الامام الکبیر میں اس خاص وصف کا مشاہدہ کوئی شبہ نہیں کہ

---

[1] لکھنے والے صاحب کا تعلق چونکہ مولویوں ہی کے طبقہ سے ہے اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ان کے اس دعوے میں کافی وثاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن مشہور ادیب و متکلم جاحظ کا لطیفہ مشہور ہے کہ پیشہ وروں کی شہادت پیشہ وروں کے متعلق قابل اعتبار نہیں ہوتی۔ اس نے عام مولویوں کے متعلق تو نہیں لیکن اسی طبقہ کا ایک فرقہ قراء یعنی قرارت کرنے والوں کے مسئلے میں یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ کم از کم ان کی تنقید اپنے ہم پیشہ قاریوں کے متعلق عموماً رشک و حسد پر مبنی ہوتی ہے۔ میرے خیال میں تو مولویوں کو بخیل ٹھیرانے سے زیادہ بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعبیر یوں کی جائے کہ مولوی بخیل نہیں ہوتے بلکہ بخیلوں کو مولوی بن جانے کا موقعہ مختلف وجوہ سے چونکہ عموماً مل جاتا ہے، اسی کا نتیجہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ مولوی عموماً بخیل نظر آتے ہیں اور یہ کیوں ہوتا ہے اس کے لئے مستقل مضمون کی ضرورت ہے آج کل تو اس کی کھلی وجہ یہ ہے کہ زیادہ تر ان ہی گھرانوں کے بچوں کو اعلیٰ مذہبی تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ مل رہا ہے جن کا خاندانی ماحول حد سے زیادہ پست ہوتا ہے اسی لئے دل کھول کر خرچ کرنے کا بے چاروں میں حوصلہ ہی نہیں ہوتا۔ خاندانی روایات کا بھی فراخ چشمی اور تنگ ظرفی کا قانون پابند ہوتا ہے۔ منجملہ بہت سے تجربات کے ایک تجربہ فقیر کا ایسا ہے جس کا خواہ مخواہ اس موقعہ پر خیال آرہا ہے۔ مشکوٰۃ شریف کی شرح التعلیق الصبیح کے مصنف مولانا ادریس کاندھلوی سے علماء کا طبقہ عموماً واقف ہے، تین جلدیں اس کتاب کی دمشق میں طبع ہوئیں۔ آئندہ حصہ کیوں نہ چھپ سکا۔ دلوں میں سوال ہوتا ہوگا۔ اس حصہ میں براہ راست فقیر بھی شریک تھا۔ حیدر آباد کی مجلس اشاعت العلوم سے اس کتاب کی طباعت منظور تھی، ابتدائی منظوری تقریباً پانچہزار کی مجلس کے ایسے صدر نے دی تھی جو کا بر آعن کا بر رئیس تھے لیکن درمیان میں ان کی وفات ہوگئی (باقی ص۵۶۶ پر)

واقعات اور متواتر روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ حضرت والا نہ کسی ملک کے والی تھے، اور نہ کسی حکومت کے وزیر و امیر، نہ کسی شہر کے تاجر، اور نہ کارخانہ دار، الغرض جود و کرم کے "جبلی ملکہ" کے ظہور کے لئے جن امکانات کی ضرورت ہے، ان سے آپ کو دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ یہ سچ ہے (تقریباً ایک صدی سے جو یہ دیکھا جا رہا ہے، کہ خود دارالعلوم دیوبند کے مطبخ ہی سے نہیں، بلکہ دیوبند کے زیر اثر، یا اس کے نقش قدم کے مطابق ہندوستان کے طول و عرض کے بے شمار دینی مدارس کے باورچی خانوں سے کھانیوالوں کو جو کچھ کھلایا جا رہا ہے۔ اور اللہ و رسول کے مہمانوں، دین کے طلبہ کی ضرورتیں جو پوری ہو رہی ہیں بذل و نوال کے اس تماشے میں اسی کی ہمت اور اسی کے عزم اور ارادے کی قوت سب سے زیادہ نمایاں ہے، جس کے پاس کچھ نہ تھا، لیکن سب کچھ رکھنے والوں سے بھی جو کام بن نہ آیا، وہی کام اس کچھ نہ رکھنے والے سے قدرت کے غیبی ہاتھ نے لے لیا، گویا شکر خورے تک براہ راست نہ سہی بالواسطہ ہی سہی، شکر پہنچا دی گئی، بلاشبہ یہ ایک واقعہ ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس عام قصے سے قطع نظر واقعہ یہ ہے کہ ذاتی طور پر باوجود کچھ نہ رکھنے کے سیدنا الامام الکبیر جو کچھ کر گذرتے تھے، دیکھنے کا موقعہ تو مجھے نہیں ملا ہے لیکن دیکھنے والوں سے سن کر کم از کم میں تو مبہوت ہو جاتا ہوں، خصوصاً اس سلسلہ میں آپ کا یہ "فطری رجحان" اس وقت غیر معمولی طور پر نمایاں ہو جاتا تھا، اس سلسلہ میں دیکھنے والوں نے جو کچھ دیکھا اس کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ ہمارے مصنف امام جیسے محتاط بزرگ کے قلم سے شہادت کے یہ الفاظ بے ساختہ نکل پڑے ہیں، ارقام فرمایا ہے کہ

"مہمان نوازی مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) پر ختم ہے[۱۵]" ص ۳۳

(بقیہ ص ۵۶۵) نئے صدر صاحب حالانکہ ذاتی طور پر حکومت آصفیہ کی وزارت کے منصب پر فائز تھے۔ لیکن ذاتی ارتقار کا نتیجہ یہ تھا کہ ہزار روپے کی منظوری کیلئے ممکنہ ذرائع سے کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا لیکن ان کی سمجھ میں کسی طرح نہیں آیا کہ حدیث کی ایک کتاب کیلئے ہزار روپے کی منظوری کیسے دی جا سکتی ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخری حصہ کتاب کا شائع نہ ہو سکا ۱۲

[۱۵] اس موقعہ پر مصنف امام نے سیدنا الامام الکبیر کی اس رویا کا ذکر بھی فرمایا ہے جو بچپن میں آپ کو ہوئی تھی (باقی ص ۵۶۷ پر)

یہ ایک صوفی صافی، ثقہ وحجت محدث کی گواہی ہے، جس نے بچپن سے آخر عمر تک آپ کی زندگی کا مطالعہ کیا تھا، گرم وسرد سفر حضر میں جن کی زندگی آپ کے ساتھ گذری تھی، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے بھی جو کچھ دیکھا تھا اسی کی روداد کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے

"مہمان آپ کے یہاں دور ونزدیک سے امیر وغریب سب ہی قسم کے اکثر ہوتے رہتے تھے۔ جوق جوق لوگ ہر طرف سے آتے تھے۔ یہ شعر شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کا آپ کی شان کے مناسب تھا ؎

فطوبی لباب کبیت العتیق　　　حوالیہ من کل فج عمیق"

آگے اپنے مشاہدہ کو ان الفاظ میں قلمبند کرتے ہوئے کہ

"مگر اس کثرت پر کبھی تنگ دل نہ ہوتے اور کمال کشادہ پیشانی سے ان کی (مہمانوں کی) مدارات فرماتے"

ان ہی نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"جس دن مہمان زیادہ ہوتے اس دن بہت خوشی ہوتی، اور جس دن کوئی مہمان نہ ہوتا اس دن انتظار فرماتے"

اسی کے قریب قریب مولانا طیب صاحب کا بھی بیان ہے کہ

"مولانا مرحوم کے یہاں مہمانوں کی آمد ورفت بہت رہتی تھی، کوئی تاریخ کوئی دن خالی نہ جاتا تھا، جس میں کوئی مہمان نہ ہو، اور بعض اوقات بڑا مجمع ہو جاتا تھا"

آگے وہ بھی لکھتے ہیں کہ

"جس دن زیادہ مہمان ہوں، مولٰنا زیادہ تر خوش ہوتے اور جس دن کوئی مہمان نہ ہوتا مولانا

(بقیہ ۵۶۶) یعنی خواب میں دکھایا گیا کہ آپ کی وفات ہو گئی دفن ہونے کے بعد جبرئیل علیہ السلام معلوم ہوا کہ سامنے آئے اور کچھ نگینے سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ یہ تمہارے اعمال ہیں، ان ہی نگینوں میں ایک نگینہ غیر معمولی بڑا اور خوشنما تھا اسکی طرف اشارہ کرتے ہوئے جبرئیل امین نے کہا کہ یہ عمل حضرت ابراہیم خلیل کا ہے اس خواب کا تذکرہ کسی موقعہ پر آچکا ہے۔ میں نے بیان کیا تھا کہ مہمان نوازی میں آپ کی غیر معمولی اولوالعزمیوں کو بعضوں نے اس خواب کی تعبیر قرار دیا ہے ۱۲

ملول رہتے "

ایسا معلوم ہوتا ہے، اپنی ساری بے سرو سامانیوں کے باوجود سیدنا الامام الکبیر کے یہاں باضابطہ گویا "مہمان خانہ" ہی قائم تھا، اور کیا "مہمان خانہ" صرف کھانے پینے کی حد تک آپ کی مہمان نوازیاں محدود نہ تھیں، سوانح مخطوطہ کے مصنف کا بیان ہے کہ

"مہمانوں کے لئے جملہ سامان راحت کا تیار فرماتے اور باایں ہمہ عذر باقی رہتا" ص۲۸

مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں بھی ہے، کہ

"علاوہ کھانے کے مہمانوں کے جملہ حوائج اور سامان راحت کے مہیا ہوتے "

اسی سلسلہ میں سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اس قصہ کا ذکر کیا ہے کہ ایک نا پرسان حال غریب آدمی سیدنا الامام الکبیر کا مہمان ہوا، بے چارے کو حقہ پینے کی عادت تھی، ادباً وہ فرمائش نہ کر سکا، رات کو نفخ کی شکایت ہوئی تب پتہ چلا، معلوم ہونے کے ساتھ خود سیدنا الامام الکبیر چلم چڑھا کر اس کے سامنے لائے اور عذر فرمانے لگے کہ

"آپ نے پہلے کیوں نہیں فرمایا تھا کہ میں حقہ پیتا ہوں "

تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کو کسی دوسری جگہ بیان کر چکا ہوں۔

بہر حال مہمانوں کے آرام و آسائش کے سلسلہ میں اور کیا کیا جاتا تھا، اس کی پوری تفصیل تو معلوم نہ ہو سکی، لیکن اس مد کے ایک جزء یعنی دستر خوان جو چنا جاتا تھا، اس کی پہلی خصوصیت تو وہی تھی جس کا ذکر سوانح مخطوطہ نے کیا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر

"کھانا مہمانوں کے ساتھ کھاتے "

بڑے اور چھوٹے مہمان کی اس باب میں خصوصیت نہ تھی۔ بھلا ایک عامی غریب کے لئے باوجود شدید نفرت کے حقہ چڑھا کر پیش کر کے بھی جو کوتاہی کا عذر خواہ ہو سکتا ہو، اس کے متعلق بڑے اور چھوٹے کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے، یاد ہوگا، کسی موقعہ پر آپ کے تلمیذ سعید مولانا منصور علی خاں مرحوم کے حوالہ سے نانوتہ کے قیام کے حالات کو نقل کرتے ہوئے یہ بیان کیا گیا تھا کہ مہمان نوازی کا

یہ قصہ وہاں بھی جاری رہتا تھا، نانوتہ کی مسجد کی سہ دری میں جہاں حضرت والا کا قیام رہتا تھا، جب گنجائش مہمانوں کے ٹھہرنے کی باقی نہ رہتی تو اپنے ماموں صاحب کے مکان میں مہمانوں کو اتارتے، اسی موقعہ پر خود اپنے ساتھ اس گذرے ہوئے واقعہ کا تذکرہ مولانا منصور علی صاحب نے جو کیا ہے کہ ایک دفعہ چند مہمانوں کے ساتھ ایک بڈھا مسکین شکستہ حال بھی تھا، کھانے کے وقت دوسرے مہمانوں کے ہاتھ تو دھلا دیئے گئے، مگر بڈھے کی طرف کسی نے التفات نہ کیا، مولوی منصور علی خاں صاحب نے بیان کیا ہے کہ اچانک میں نے دیکھا سیدنا الامام الکبیر بے تحاشا جھپٹ کر اس بڈھے کے پاس آئے اور لوٹے کو خود اپنے ہاتھ میں اٹھا کر اس غریب کے ہاتھ بڑے ادب کے ساتھ دھلوا رہے ہیں، اور سچ تو یہ ہے کہ حضرت والا کے یہ بوڑھے مہمان جن کا تعارف مولانا منصور علی خاں صاحب مرحوم نے

"بڈھا، مسکین، شکستہ حال"

کے الفاظ سے فرمایا ہے، جو کچھ بھی ہوں، لیکن تھے تو بہر حال وہ مسلمان، اور حضرت کے عقیدتمندوں ہی میں ہوں گے لیکن مہمانوں کے متعلق جس کی نظر کی وسعت کا یہ حال ہو، کہ وہی ٹھسکہ والے درویش جن سے مشربًا گونہ حضرت والا کا اختلاف بھی تھا۔ ان ہی کو ذریعہ بنا کر جیسا عرض کر چکا ہوں حضرت گنگوہی اور سیدنا الامام الکبیر کے درمیان در اندازوں نے در اندازی بھی کرنی چاہی تھی، ان ہی کا قصہ بیان کرتے ہوئے حضرت مولانا تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز فرمایا کرتے تھے کہ شاہ صاحب گھوڑے پر آئے تھے، ساتھ اُن کے سائیس بھنگی ذات کے تھے، یہی سننے کی بات ہے کہ التزامًا ہمیشہ اپنے مہمانوں کے ساتھ کھانا کھانے کا جو عادی تھا، اسی کو دیکھا گیا ہے کہ شاہ صاحب کے دسترخوان پر خاطر مدارات کے لئے تو دوسروں کو بٹھا دیا گیا ہے، اور بقول حضرت تھانوی سیدنا الامام الکبیر نے

"ان کے (شاہ صاحب) کے سائیسوں کو خود کھلوایا"۔ الہادی جمادی الثانی ۵۱ھ

جب بھنگیوں کے محلہ میں مہاتما گاندھی نے اپنا مقامی "آشرم" کچھ دن کے لئے دہلی میں بنوایا تو

صرف ہندوستان ہی نہیں، ساری دنیا میں اس کا چرچا ہوا، لیکن دیکھ رہے ہو، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک تربیت یافتہ غلام کو اس واقعہ سے سالہا سال پہلے اسی ہندوستان میں بھنگیوں کو مہمان بنا کر ان کی مہمان نوازی کے سلسلہ میں یہ نمونہ پیش ہو رہا ہے کہ بھنگیوں کے آقا شاہ صاحب کو دوسروں کے حوالہ کر کے بہ نفس نفیس خود بھنگیوں کو کھانا کھلوایا جا رہا ہے۔ اور بھنگی بے چارے تو پھر بھی آدمی ہی تھے۔ مہمان کی طرف منسوب ہو جانے کے بعد اکرام و احترام کا استحقاق جانوروں کو بھی جس کے یہاں حاصل ہو جاتا تھا، اور کیسا استحقاق! ہمارے مصنف امام راوی ہیں۔

"ایک بار مہمانوں کی کسی سواری کے لئے دانے کی ضرورت تھی چنے نہ ملے"

چنے نہ ملے تھے تو جو وغیرہ جیسے اناج سے بھی کام چل سکتا تھا، اور اناج ہی کی سرے سے کیا ضرورت تھی۔ جانوروں کے لئے تو گھانس بھونسہ کی خوراک بھی کافی ہو سکتی تھی۔ لیکن اس وقت سوال جانور کی خوراک کا نہ تھا، بلکہ مہمان کی سواری کے جانوروں کا مسئلہ تھا۔ سنئے مصنف امام فرماتے ہیں کہ چنے جب نہ ملے تو،

"گھر میں کابلی چنے رکھے ہوئے تھے"

ہندوستان میں عموماً کم مقدار میں پیدا ہوتے ہیں، اور اناج کی اعلیٰ قسموں میں کابلی چنوں کا شمار ہے۔ لیکن مہمان کی سواری کے جانور کی مہمانی کے لئے سیدنا الامام الکبیر نے حکم دیا کہ کابلی چنے ہی دیئے جائیں، مصنف امام کا بیان ہے۔

---

۵۱ اس موقعہ پر بے ساختہ دلی ہی میں گذرے ہوئے واقعہ کا خیال آگیا۔ حضرت مولانا فخر دہلوی کے حالات میں لکھا ہے کہ بیرا نامی خاکروب دلی میں تھا۔ خانقاہ مبارک کی صفائی کا کام اس سے متعلق تھا۔ ایک دفعہ مسلسل دو دن تک بیرا پر مولانا کی نظر نہ پڑی دریافت فرمایا گیا معلوم ہوا کہ بیمار ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ "ہماں ساعت از جا برخاستند" جانتے ہو اٹھ کر کہاں گئے۔ دیکھا گیا کہ بھنگیوں کے محلہ کی طرف جا رہے ہیں اور بیرا غریب کا جہاں جھونپڑا تھا وہاں پوچھتے ہوئے پہنچے غریب پڑا ہوا تھا، مولانا اس کی بالیں پر کھڑے تھے اور فرما رہے تھے "میاں بیرا از دو روز نیامدید و از فقیر پرسش احوال شما تاخیر شد معاف خواہید فرمود۔" بجنسہ آپ کے سوانح نگار نے بھی یہی فقرہ نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ علاوہ نقد کے مولانا نے حکم دیا کہ میرے طبیب خاص میر حسن حکیم سے بیرا کا علاج کرایا جائے اور دوا وغیرہ کے مصارف میری طرف سے ادا کئے جائیں جو نہیں جانتے ہیں انکو معلوم ہونا چاہیے کہ محمد شاہ بادشاہ تک مولانا فخر رح کی خانقاہ میں حاضری دیا کرتے تھے ۱۲ سیر الاولیاء ص۱۱

"وہی دلواکر دانہ دے دیا" ص۳۳

صحیح طور پر اس کا پتہ نہ چل سکا، کہ سواری کے ان جانوروں کی تعداد کیا تھی؟ لیکن مصنف امام نے بجائے واحد کے جمع کا صیغہ "مہمانوں" کا ارقام فرمایا ہے۔ اگر یہ سواری گھوڑوں کی تھی، تو یقیناً ان کو ایک سے زیادہ تو بہر حال ہونا چاہئے، اس صورت میں کون کہہ سکتا ہے کہ کابلی چنوں کی کتنی مقدار دلوانی پڑی ہوگی؟

مہمانوں کے آرام و آسائش کی عام ضرورتوں کے سوا حضرت والا کا مذاق ضیافت کے سلسلہ میں یہ معلوم ہوتا ہے، کہ کھانا مقدار میں بھی کافی ہو، اور جس حد تک لذیذ و مزیدار بنایا جاسکتا ہو، اس کی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے۔ مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کو خود

"اپنے نفس کے لئے کبھی تکلف نہ ہوتا، مگر مہمان کے واسطے بہت تکلف کا کھانا تیار ہوتا تھا"

تکلف کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے، کہ "پلاؤ" جس کی تعبیر سیدنا الامام الکبیر چاول کے لفظ سے فرماتے، مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مہمان نوازی کا شاید لازمی جزو تھا، انہوں نے لکھا ہے کہ اسی "پلاؤ" کو پیش کرتے ہوئے مہمانوں سے دستور تھا کہ سیدنا الامام الکبیر عموماً یہ فرماتے کہ

"ہم نے تمہارے لئے چاول پکانے میں تکلف نہیں کیا، بلکہ ہمارے گھر آمدنی آراضی کے یہی چاول ہوتے ہیں" ص۳۲

اور یہ کیفیت تو ایک جز کی تھی، پلاؤ کے سوا اور جو چیزیں اس سفرۂ عام پر چنی جاتی تھیں اُن کے متعلق اس سے زیادہ لذیذ شہادت اور کیا ہو سکتی ہے، جسے اپنی یادداشت میں مولانا طیب صاحب نے نقل فرمایا ہے، لکھتے ہیں کہ

"کھانا ایسا لذیذ ہوتا تھا کہ بعض زبان کے چٹوروں کی آمد مولنا کے یہاں صرف اسی نیت سے بھی ہو جاتی تھی"

کیفاً تو ضیافتی دعوتوں کا یہ رنگ تھا، باقی کمّاً اور مقداراً ان کی نوعیت کیا ہوتی تھی، اسی جزئی واقعہ میں اس سوال کے جواب کو آپ پا سکتے ہیں، مصنف امام غالباً خود بھی اس وقت دسترخوان پر موجود تھے فرماتے ہیں کہ

"ایک بار دسترخوان پر کھچڑی کے ساتھ بہت سا گھی آیا، دس پندرہ آدمی تھے" ص۳۳

"بہت سا گھی" کا مطلب آپ نے سمجھا کیا تھا؟ سیدنا الامام الکبیر کے رفیق العلم والدین حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نور اللہ ضریحہ بھی کھچڑی والی اس دعوت میں اتفاقاً شریک تھے۔ مصنف امام راوی ہیں، کہ دس پندرہ آدمیوں کے حساب سے گھی کی یہ مقدار اتنی زیادہ تھی کہ

"مولوی رشید احمد صاحب نے فرمایا اتنا گھی یہ فضول ہے، اس میں سے آدھا رکھ لیا، اور آدھا گھر بھیجدیا" ص۳۳

حاصل جس کا اس کے سوا اور کیا نکلتا ہے کہ پچیس تیس کھانیوالوں کے لئے گھی کی جو مقدار کافی ہوسکتی تھی، وہ دس پندرہ آدمیوں کے سامنے لاکر رکھی گئی تھی۔ جب گھی جیسی چیز کے ساتھ کمّاً اور مقداراً یہ رنگ تھا کہ دونی مقدار اس کی مہمانوں کے سامنے پیش ہوتی تھی تو اس دسترخوان پر ہم سمجھ سکتے ہیں کہ دوسری عام چیزوں کی مقدار کا حال کیا ہوگا۔

سوانح مخطوطہ کے مصنف نے مہمانوں ہی کے متعلق اس عام دستور کا بھی ذکر کیا ہے کہ،

"جس وقت کوئی مہمان آتا اس سے استفسار فرماتے کہ کھانا کھایا یا نہیں؟" ص۲۴

گویا یہی پہلا سوال تھا جو مہمان سے دریافت فرمایا جاتا تھا۔ اور نظم کچھ ایسا قائم فرما دیا گیا تھا کہ بقول ان ہی کے

"جس وقت کوئی آیا اسی وقت اس کے لئے کھانا آتا"

ظاہر ہے کہ مہمانوں سے اس کی توقع کہ ٹھیک کھانے کے اوقات ہی میں آتے ہوں گے، خصوصاً ہندوستان جیسے ملک میں مشکل ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ کھانے کے مقررہ اوقات میں بھی بغیر سابقہ اطلاع کے مہمانوں کے لئے کھانے کا فوراً بندوبست کرنا آسان نہیں، خصوصاً جب ایک دو نہیں، بلکہ

بلکہ عموماً کافی تعداد میں ان کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہو، مگر کیا کیجئے بیان کرنے والوں کا بیان یہی ہے مصنف امام جیسے رفیق تک کی شہادت ہے کہ

"کبھی یاد نہیں کہ کسی وقت کوئی آگیا ہو، اور گھر میں کھانا نہ ملا ہو" ص۲۲

مولانا طیب صاحب نے بھی اپنے بزرگوں سے سنی ہوئی یہ روایت درج کی ہے کہ

"بسا اوقات ہر وقت کھانا تیار رہتا تھا"

جس کا مطلب بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ گھر کے روزمرہ عام کھانے والوں کے سوا مہمانوں کے لئے بھی دستور تھا کہ کچھ زیادہ پکا لیا جاتا تھا، کم ازکم ایسی چیزیں جن کی تیاری میں کچھ تاخیر کا امکان ہوتا ان کے ساتھ غالباً یہی صورت اختیار کی گئی تھی۔ تخمینہ کے مطابق مہمان آجاتے تب تو جو غرض تھی وہ پوری ہو جاتی، اور نہ آتے یا کم آتے، تو دوسروں کے مصرف میں آجاتا۔ اس موقعہ پر مولانا طیب صاحب نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ

"مولانا کو حاجت تاکید یا تیاری طعام کے لئے فرمائش یا حکم کی نوبت نہیں آتی تھی"۔

اپنی جدہ ماجدہ سیدنا الامام الکبیر کی اہلیہ محترمہ کے اس دستور یا تدبیر کو نقل کیا ہے کہ وہی

"بطور خود مہمانوں کی تعداد و لیاقت کو دریافت فرما کر طعام لذیذ با فراط بھیجدیا کرتیں"۔

خلاصہ یہ ہے کہ کچھ تو تخمیناً ہر وقت کھانے کی مقدار ہی زیادہ عموماً تیار ہوتی تھی، اور اسی کے ساتھ بی بی صاحبہ کی طرف سے معلوم ہوتا ہے کہ باضابطہ گویا ڈاک ہی بیٹھا دی گئی تھی کہ آنے کے ساتھ ہی مہمانوں کی تعداد، اور مقام و مرتبہ سے ان کو فوراً مطلع کر دیا جائے، ادھر یہ نظم تو خبر رسانی کے متعلق تھا، اور دوسری طرف جیسا کہ مولانا طیب صاحب کا بیان ہے کہ ان کی دادی صاحبہ

"کھانا پکانے میں ایسی چابکدست کہ منٹوں میں سینکڑوں آدمیوں کے واسطے کھانا تیار کر دیں"۔

وہی لکھتے ہیں کہ فن طباخی میں غیر معمولی مہارت کا نتیجہ یہ تھا کہ

"دن کو دس بجے، رات کو بعد مغرب کھانا تیار"۔

اپنے سن تمیز میں مولانا طیب صاحب کو چونکہ دادی صاحبہ کے دیکھنے اور کمالات کے مشاہدہ کا موقعہ ملا تھا، اس لئے ان کے مذکورہ بالا بیان کو تقریباً عینی شہادت کے برابر ہی سمجھنا چاہئیے، اور حق تو یہ ہے کہ خود سیدنا الامام الکبیر جیسا کہ مصنف امام نے نقل کیا ہے جب یہ فرمایا کرتے تھے کہ

"میری سخاوت احمد کی والدہ کی بدولت ہے، جو میں قصد کرتا ہوں، وہ مہمان نوازی میں اس سے بڑھ کر کرتی ہیں۔" ص۳۲

تو اس سے بڑی شہادت اور کیا ہو سکتی ہے۔

یہی نہیں کہ سیدنا الامام الکبیر جو کچھ چاہتے تھے اسی کی تعمیل ہوتی تھی، بلکہ اس قسم کے واقعات مثلاً مولینا منصور علی خاں صاحب مرحوم نے آنے والے مہمانوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک مہمان کے متعلق لکھا ہے کہ

"وہ مولانا صاحب کے پاس چند روز مقیم رہے۔"

قیام کی اس مدت میں ان کی خاطر مدارات کے سلسلہ میں جو کچھ کیا جاتا تھا وہ تو خیر تھا ہی لطیفہ یہ تھا کہ ان صاحب کو شکار کی دھت تھی، حکیم منصور علی خاں صاحب کا بیان ہے کہ کبھی کبھار نہیں بلکہ

"وہ روزمرہ شکار کو جاتے، اور دو چار تیتر اور مور کسی حکمت سے پکڑ لاتے، اور ہم سب ہر روز ان کا گوشت کھاتے، نہایت مزیدار ہوتا تھا۔"

اس میں شک نہیں کہ ان کے اس طرز عمل سے سالن کی ایک اچھی قسم کا اضافہ دسترخوان پر ہو جاتا تھا، لیکن بقول شخصے

دردسر کے واسطے صندل لگانا ہے مفید     اس کا گھسنا اور لگانا دردسر یہ بھی تو ہے

ذرا سوچئے تو سہی روز کی اس کھٹ کھٹ کو، بے چاری عورتیں ہی جانتی ہیں کہ اس قسم کے خصوصی پکوان کی وجہ سے ان پر کتنا غیر معمولی بار پڑ جاتا ہے۔ حکیم صاحب نے اس کی اطلاع دیتے ہوئے کہ مسلسل ان گرم مزاج پرندوں کے گوشت کے کھانے کی وجہ سے بیمار پڑ گئے۔

"ایک مہینہ کے بعد مجھ کو خون کا پیشاب چند سوراخوں سے آنے لگا۔" ص۱۸۹

گویا کم از کم ایک ماہ تک "روزمرہ شکار لانے اور ان کے پکانے کا" قصہ ضرور جاری رہا، میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت والا ہی کی چاہ پوری نہیں کی جاتی تھی بلکہ ان کے چاہنے والوں کی فرمائش کی تکمیل بھی بی بی صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا کو کرنی پڑتی تھی، آخر حکیم صاحب ہی کو دیکھئے۔ یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے۔ جب حضرت والا کا قیام اپنے وطن نانوتہ میں تھا، جب وہ بیمار پڑے ہوں گے تو ان کی دوا دارو پرہیز کے انتظام کی مسافرت کی اس حالت میں خود ہی سوچئے۔ اس کے سوا صورت ہی کیا تھی کہ حضرت ہی کے گھر سے سب کچھ بھیجا جائے۔

بہر حال جود و کرم، اکرام ضیف کے مسئلہ میں نقطۂ نظر کا غیر معمولی اتحاد جس کا تماشا سیدنا الامام الکبیر اور ان کی اہلیہ محترمہ کے درمیان ہم کر رہے ہیں، بجائے خود نادر الوجود ہے، وفاق و طباق کی اتنی یکسانی زن و شو کے درمیان کمیاب اور بہت زیادہ کمیاب ہے، ہمارے مصنف امام کا احساس بھی یہی تھا بی بی صاحبہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"وہ اللہ کی بندی خدا سلامت رکھے، ایسی سخی اور دست کشادہ ہے، کہ جناب مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کی مہانداری کو اسی کے باعث رونق تھی" ص۳۲

اور کوئی شبہ نہیں کہ روزمرہ کا تجربہ بقول مولانا طیب صاحب عموماً یہ ہے کہ

"بڑے بڑے امیروں کے کارخانوں میں دیکھا جاتا ہے جہاں بہت سے باورچی خدمتگار سب سامان نقد و جنس موجود، مگر دس مہانوں کی بھی دعوت ہوتی ہے تو دن کو دوپہر، اور رات کو پچھلا پہر ہو جاتا ہے"

مگر آپ سن چکے، کہ سیدنا الامام الکبیر کے مہانوں کے آگے صبح کو دس بجے اور شام کو بعد مغرب مولانا طیب صاحب کے الفاظ میں،

"کھانے کے خوان کے خوان لدے ہوئے چلے آتے ہیں، یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا من و سلویٰ آسانی سے پکا پکایا چلا آ رہا ہے"

اور بقول ان ہی کے

"یہاں نہ سامان، نہ خدمتگار، نہ باورچی"

زیادہ سے زیادہ یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ محلہ ٹولے کی بڑی بوڑھیاں جیسا کہ شرفاء کے گھرانوں میں دستور تھا ان کو کچھ مدد مل جاتی ہو، مولٰنا طیب صاحب نے اپنی ایک یادداشت میں پیرو نامی خادمہ کا ذکر بھی کیا ہے، جسے ان کی دادی صاحبہ نے مسلمان کیا تھا اور سن تمیز تک پہنچنے کے بعد ممکن ہے کہ صاحبزادیوں کی وجہ سے بھی بیوی صاحبہ کا کچھ بار ہلکا ہوا ہو، کیونکہ عام دستور اس زمانہ میں شرفا کے گھرانوں کا یہی تھا کہ سسرال جانے سے پہلے بچیوں کو میکے ہی میں کام کاج کا عادی بنا لیا جاتا تھا خود حضرت والا کی اہلیہ محترمہ بھی اس کی ایک بہترین مثال ہیں، کہ قصبہ دیوبند کے ممتاز رئیس کی حالانکہ صاحبزادی تھیں، ناز ونعمت میں پلی تھیں، لیکن سیدنا الامام الکبیر کے گھر پہنچ کر جس بار کو انہوں نے اٹھا لیا، غیر تربیت یافتہ ہونے کی صورت میں کیا یہ ممکن تھا۔؟

کچھ بھی ہو، باوجود ان تمام باتوں کے اصل سوال وہی رہ جاتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی مذکورہ بالا محدود آمدنی یعنی نانوتہ کی آراضی کی پیداوار کے ساتھ دس پانچ روپے جو تصحیح کے معاوضہ میں مطابع سے آپ کو مل جاتے تھے، محض اس معمولی آمدنی سے مہمان نوازی اور اکرام ضیف کا یہ غیر معمولی بلند و برتر معیار اور وہ بھی مہینے دو مہینے نہیں سال دو سال نہیں، زندگی کے آخری دنوں تک کیسے قائم رہا، عرض کر چکا ہوں کہ مدرسہ سے اول تو آپ کا تعلق بالکل عمر کی آخری منزل میں قائم ہوا، اور تعلق کے بعد بھی آپ سن چکے کہ مدرسہ کی دوات کی سیاہی کے ایک قطرے سے بھی استفادہ کے آپ روادار نہ تھے۔ یہ شاعرانہ مبالغہ نہیں بلکہ واقعہ ہے، لے دے کر احتمال کچھ اگر رہ جاتا ہے، تو اسی دستور کا جس سے سلفاً عن خلف علماء وصوفیہ مستفید ہوتے ہوئے چلے آئے ہیں[1]

[1] حضرت ابراہیم ادہم رح کے تذکرہ میں حافظ ابن عساکر نے لکھا ہے کہ بزرگوں کا طریقہ اس باب میں مختلف رہا ہے بعض تو ان میں ایسے تھے جو نہ سلطان ہی سے لیتے تھے اور نہ اخوان سے سلطان سے مراد حکومت اور اخوان سے مراد مسلمانوں کا وہ عام طبقہ ہے جو بزرگوں سے عقیدت رکھتا تھا۔ بہر حال کچھ لوگ تو ایسے تھے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس کی ایک اچھی مثال ہیں میں نے ان کی سیاسی زندگی میں اس کی پوری تفصیل بیان کی ہے، اسی طرح حافظ ابن عساکر ہی کے بیان کے مطابق بزرگوں ہی میں ایسی ہستیاں بھی گذری ہیں جو سلطان واخوان دونوں کی مالی امدادوں کو دباقی ص۵۸۷ پر)

ہندوستان میں جس کی تعبیر نذر و فتوحات وغیرہ کے الفاظ سے کی جاتی ہے، حکومت تو ختم ہو چکی تھی، اسلئے صرف "اخوان" والی مد باقی رہ گئی تھی، اس سلسلہ میں سیدنا الامام الکبیر کا جو مذاق تھا، اس کا اندازہ ان مختلف واقعات و روایات سے ہو سکتا ہے جن کا کچھ حصہ مختلف مواقع پر زیر تذکرہ آ چکا ہے۔

(بقیہ ص ۵۷۶) قبول فرمایا کرتے تھے، اور ان ہی میں کچھ ایسے بھی تھے جو سلطان سے تو لے لیا کرتے لیکن اخوان سے لینا پسند نہیں کرتے تھے بعض اس کے برعکس اخوان سے لے لیتے تھے، لیکن حکومت یعنی سلطان کے زیر بار احسان بننے کو مصلحت کے خلاف خیال کرتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ دینی اور ملی کاموں کی مشغولیت کی وجہ سے معاشی کاروبار کا موقعہ جن لوگوں کے لئے باقی نہیں رہتا۔ یا جس پیمانے پر دین و ملت کی خدمت وہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں معاشی جد و جہد میں شریک ہونے کی وجہ سے رکاوٹ پیدا ہوتی تھی تو ان لوگوں کے لئے حکومت کے بیت المال سے بھی بقدر ضرورت استفادہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا، اور عام مسلمانوں کی پیش کش کے قبول کرنے کا نمونہ بھی موجود تھا۔ پہلی بات یعنی بیت المال سے استفادہ وہ تو ظاہر ہی ہے، خلفاء راشدینؓ ہی کا نمونہ اس باب میں موجود تھا۔ خلیفہ منتخب ہو جانے کے بعد بھی حضرت ابوبکرؓ کو لوگوں نے دیکھا کہ کپڑے کی گانٹھ پیٹھ پر لئے بازار جا رہے ہیں لوگوں نے کہا یہ کیا تو بولے کہ ابوبکر کے بال بچوں کے لئے آخر کچھ کرنا چاہئے۔ تب صحابہؓ نے جمع ہو کر فیصلہ کیا کہ تجارت کے ساتھ خلافت کا کام صحیح طور پر انجام پانا ناممکن ہے اور بیت المال سے وظیفہ مقرر کر دیا گیا "مسلمانوں کی خدمت کو اپنا حرفہ یعنی پیشہ میں نے بنا لیا" یہی حضرت ابوبکرؓ نے اس فیصلہ کے بعد فرمایا یہی رسم بعد کو جاری رہی، فتوحات و غنائم کے بعد خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی اور آپ کے اہل و عیال کی ضرورتیں گو با بیت المال ہی سے پوری ہوتی تھیں، اور فتوحات سے پہلے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف فرما ہونے کے بعد علاوہ اس کے جیسا کہ بخاری وغیرہ میں ہے، کان الرجل یجعل للنبی صلی اللہ علیہ وسلم النخلات یعنی لوگوں نے اپنے اپنے نخلستانوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے درخت خاص کر دیئے تھے جنہیں قریظہ اور بنی نضیر کے فتوحات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالکوں کو واپس کر دیا تھا تفصیل کیلئے دیکھو بخاری کے ابواب مغازی سبہ خمس وغیرہ ان نخلات کے سوا جو مسلمانوں کی طرف سے پیش کئے گئے تھے وقتاً فوقتاً انصار کے خوش حال گھرانوں سے بھی پکا پکایا کھانا ہدیۃً آتا رہتا تھا سعد بن عبادہ کے جفنات (کونڈے) جن میں ثرید اور گوشت وغیرہ ہوتے ازواج مطہرات کے گھروں میں ان کی گردش مشہور ہی ہے دعوتیں بھی ہوتی رہتی تھیں ان ہی سعد بن عبادہ خزرج کے سردار کا دلچسپ قصہ ابوداؤد میں ہے کہ آنحضرت صلعم جب ان کے گھر پہنچے تو غسل کا انتظام کیا گیا اور ایک نئی زرد چادرہ راوی کا بیان ہے کہ زعفران میں رنگی ہوئی تھی غسل کے بعد پیش کی گئی پھر کھانا چنا گیا دعوت سے فارغ ہونے کے بعد ایک عربی گدھا کسا کسایا پیش ہوا جس پر جھالردار زین پوش پڑی ہوئی تھی سعد نے عرض کیا کہ اسی پر واپسی ہو آپ نے مان لیا مفصل ابوداؤد میں پڑھئے اسی طرح باغوں میں آنحضرت صلعم کا فصل کے زمانہ میں جانا وہاں پھل بھنے ہوئے کباب روٹیوں سے دعوت آپ کا باغ کے جھونپڑوں میں آرام فرمانا یہ اور اس قسم کی روایتوں کا ذخیرہ کتابوں میں موجود ہے جن سے بزرگوں کے اس طرز عمل کی تائید ہوتی ہے جو اخوان کے متعلق ہر زمانہ میں اختیار کرتے رہے ہیں۔ ۱۲

اس زمانہ میں شمالی ہند کے فیاض امیروں میں چھتاری کے رئیس نواب محمود علی خاں صاحب طاب ثراہ کا نام خاص طور پر اونچا تھا۔ علم و دین کی خدمت کا غیر معمولی ذوق رکھتے تھے، مگر ایک طرف یہ حال تھا کہ ان ہی نواب محمود علی خاں تک پہنچنے کے لئے سرسید مرحوم تڑپتے رہتے تھے، کالج کی رپورٹ ۱۸۸۳ء میں یہ لکھتے ہوئے کہ

"نواح کے بڑے رئیس نواب محمود علی خاں جن سے ہم کو بہت ہی مدد کی توقع تھی"۔

اور اس توقع کی تکمیل میں جو رکاوٹیں حائل تھیں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے بڑی حسرت کے ساتھ لکھتے ہیں،

"یہ (یعنی نواب محمود علی تک رسائی) بڑی مشکل ہے، اور اس پر غالب آنے کی امید کم ہے"۔ (ماہ نو کراچی مارچ ۱۹۵۱ء مضمون مولوی امین زبیری صاحب)

لیکن دوسری طرف سیدنا الامام الکبیر تھے کہ ساری عمر نواب ممدوح کی حضرت والا کی قدم بوسی کے لئے تڑپتے ہی گذری، امیر شاہ خاں مرحوم کے حوالہ سے یہ بات گذر چکی کہ بار بار اپنی اسی آرزو کو لے کر کبھی علیگڈھ کبھی میرٹھ بار بار پہنچے، لیکن ہمیشہ یہی ہوتا رہا کہ ادھر نواب صاحب پہنچے، اور ادھر سیدنا الامام الکبیر غائب ہو گئے اور ساری عمر ان کے سامنے نہ آئے صرف زبانی یہ پیغام پہنچانے کے لئے کہدیا کہ غازی آباد کے اسٹیشن پر مسجد اگر نواب صاحب بنادیں گے، تو ان کی پالکی کا پایہ پکڑ کر چلوں گا[۱] (ارواح ثلاثہ ص۱۵۱) میرٹھ ہی کے رئیس التجار، امیر و کبیر شیخ عبدالکریم رئیس لال کرتی والے کا قصہ یاد ہوگا جنہوں نے حضرت والا کی جوتیوں میں روپے ڈالدیئے، مگر جوتیوں کو جھاڑ کر کھڑے ہو گئے ہنس کر فرمانے لگے،

---

[۱] امیر شاہ خاں مرحوم بیان کرتے تھے کہ پیغام کو سن کر نواب مرحوم نے کہلا بھیجا کہ "میں کوشش کر چکا ہوں مگر منظوری نہیں ہوئی"، واللہ اعلم بالصواب غازی آباد کے اسٹیشن کا خاص قصہ کیا تھا جو تعمیر مسجد کی منظوری حکومت سے نہیں مل رہی تھی، امیر شاہ خاں یہ بھی کہتے تھے کہ پالکی کے پایہ پکڑ کر چلنے کی بات سن کر نواب صاحب ہنسنے لگے، دراصل دونوں حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مرید اور پیر بھائی تھے۔ دونوں میں کوئی خاص معاملہ تھا جس کی کرانا کاتبین راہم خبر نیست + واللہ اعلم بحال عبادہ الذین اصطفاہم، واحلہم لدی الدار ۱۲

"فرق کو دیکھو! کہ دنیا ہمارے قدموں پر گرتی ہے، اور دنیادار اس کے قدموں پر گرتے ہیں" (ارواح ثلثہ ص۲)

اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی بھولنا نہ چاہئے کہ ؎

ساقی دیرینہ را ساغر شکست
بزم رندان حجازی بر شکست

کے حادثے کے بعد ڈاکٹر اقبال مرحوم ہی کے الفاظ میں یہ دیکھا جا رہا تھا کہ

می شود ہر مو درازے خرقہ پوش — آہ ازیں سوداگرانِ دین فروش
با مریداں روز و شب اندر سفر — از ضرورتہائے ملت بے خبر

اس دردناک منظر نے شاید سیدنا الامام الکبیر کو اس فیصلہ پر مجبور کیا تھا، مولانا طیب صاحب کا بیان ہے، کہ اسلامی ہند کا

"کوئی گاؤں کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں کے باشندے آپ کی تشریف آوری کے آرزومند نہ ہوں، ہمیشہ آپ کے پاس درخواستیں دور دراز سے آتی رہتی تھیں کہ حضور یہاں آئیں۔"

لیکن وہ اطلاع دیتے ہیں کہ باوجود اس کے

"بہت جگہ کے لوگوں کی تمنائیں دل کی دل ہی میں رہ گئیں، اور مولنا مرحوم کا جانا نہ ہوا۔"

اسی سلسلہ میں آگے وہی آپ کے اس عمومی دستور کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ

"مولانا مرحوم کو بلا ضرورت پھرنا پسند بھی نہ تھا۔"

غالباً اسی رجحان اور فیصلہ کا یہ نتیجہ ہے کہ یو، پی، اور یو، پی میں بھی خصوصیت کے ساتھ روہیلکھنڈ کے خاص خاص مقامات جو وطن مالوف کے گرد و نواح میں ہیں ان کے سوا سیدنا الامام الکبیر کی سیر و سفر کا دائرہ بہت زیادہ مختصر اور تنگ ہے، الا یہ کہ حج کے سفر میں جن جن مقامات سے گذرنا پڑا علاوہ اس کے امیر شاہ خاں مرحوم کا یہ بیان بھی ہے کہ

"مولانا نانوتوی کا قاعدہ تھا کہ سفر میں ہدیہ نہ لیتے تھے"

کیوں نہ لیتے تھے، واللہ اعلم بالصواب اس کے صحیح اسباب کیا تھے، ایک بات ان ہی کی طرف منسوب کرکے خاں صاحب ہی روایت کیا کرتے تھے، کہتے تھے کہ سفر میں کسی صاحب نے کچھ پیش کیا، تو انکار کرتے ہوئے حضرت والا نے فرمایا کہ

"میرا معمول ہے میں سفر میں ہدیہ نہیں لیتا ہوں، اور مصلحت یہ ہے کہ کبھی آدمی کے پاس ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا ہے، سفر میں اپنے دوستوں سے ملاقات ضرور ہوتی ہے اب اگر کسی نے پہلے سفر میں کچھ دیا تھا، اور اس سفر میں اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے، تو وہ یا ملنے سے کترائے گا، اور اگر ملے گا بھی تو جھینپ اور شرمندگی کے ساتھ ملے گا" ص ۱۷۵

قصہ مختصر یہ ہے، کہ فتوحات کی آمدنی کی توسیع کا بڑا ذریعہ سفر ہے، پہلے تو اسی کا دائرہ محدود کر دیا گیا تھا، اور خاص خاص اہم ضرورتوں کے لئے سفر اگر فرماتے بھی تھے، تو اس میں بھی اس آمدنی کی راہ آپ نے خود بند رکھی تھی، اب رہ گیا حضر، سو اس کے متعلق بھی اس کلی ضابطہ کو براہ راست حضرت والا ہی کی طرف منسوب کرکے امیر شاہ مرحوم بیان کیا کرتے تھے، کہ سیدنا امام الکبیر فرماتے تھے،

"جو شخص ہم کو محتاج سمجھ کر دیتا ہے، اس کا ہدیہ تو لینے کو جی نہیں چاہتا، اور جو اس غرض سے دیتا ہے کہ ہمارے (یعنی دینے والے) کے گھر برکت ہو، اور ہمارے لے لینے کو ہمارا احسان سمجھے اس کا ہدیہ لے لینے کو جی چاہتا ہے، اگرچہ وہ چار پیسے ہی ہوں" ص ۹۱

اور اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ کیا دے رہا ہے، اس پر نظر نہ رہتی تھی، بلکہ کون دے رہا ہے اور کس جذبہ کے تحت دے رہا ہے۔ صرف اسی کو دیکھا جاتا تھا۔ جو ڈنڈے باندھ کر برستے ہوئے پانی میں اللہ دیا نور باف کے گھر پہنچ کر ماش کی دال کی روٹی جو کھا سکتا ہو، وہ چار پیسوں کے دینے والے غریب مسلمانوں کے دلوں کو توڑنے کی ظاہر ہے کہ اپنے قلب میں قوت ہی کہاں پا سکتا تھا۔

لوگوں کو بزرگوں کے نقطہ نظر کا صحیح علم نہیں ہے ورنہ غلط مثالوں کو دیکھ کر صحیح حقائق کے متعلق اشتباہ اور مغالطوں کے شکار وہ نہ ہوتے۔ خیال آگیا حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا، ان کے مشہور خلیفہ دفین اورنگ آباد دکن جو نظام الدین ثانی کے نام سے مشہور ہیں، لکھا ہے کہ ابتدا میں لوگوں کی پیش کشوں کو قبول نہیں فرماتے تھے، ان کے پیر کلیم اللہ جہاں آبادی تک یہ خبر پہنچی، آپ نے ان کو یہ خط لکھا جس میں یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

| | |
|---|---|
| مسموع شد کہ از یاران و مخلصان ہر کہ از قسم نذر برائے شما می آرد قبول نمی کنند، اگرچہ از مستحسن ست، | سننے میں آیا ہے کہ دوستوں اور مخلصوں کی طرف سے بطور نذر جو کچھ پیش آتا ہے، اس کو قبول نہیں کرتے، ہے تو یہ بات بہت اچھی۔ |

مگر اسی کے ساتھ توجہ دلائی گئی،

| | |
|---|---|
| امادل شکستگی محبان درین ست | لیکن دوستوں کی دل شکنی واپس کرنیکی وجہ سے ہوتی ہے |

نقطہ نظر کی تصحیح کے بعد پیر نے مرید کو حکم دیا کہ

| | |
|---|---|
| ہر کہ باخلاص چیزے بیارد بحکم لاردو لاکد البتہ قبول نمایند | اخلاص کے ساتھ جو لاکر حاضر کرے تو "لاردو لاکد" کے اصول کے تحت چاہئے کہ اسکو قبول کرلیا جائے۔ |

پھر یہ فرماتے ہوئے کہ جاہے لوگوں میں تقسیم ہی کردو، مگر رد کرنا مناسب نہیں ہے، آخری الفاظ حضرت جہاں آبادی کے یہ تھے

"درگرفتن الفت ست، و ناگرفتن وحشت و دلبری مخلصان صادق از ہمہ طریق فائق"۔

ص۱ کتاب تکملہ سیر الاولیاء

سوانح مخطوطہ کے مصنف نے سیدنا الامام الکبیر کی دوسری عام عادتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنا یہ مشاہدہ جو قلم بند کیا ہے، کہ

"آپ کا مخلص کوئی ادنیٰ شئے بھی پیش کرتا تو نہایت خوش ہو کر اس کو قبول فرماتے اور اس کے حق میں دعا دیتے"۔ ص۲۵

اور اسی کے ساتھ اس کی خبر دیتے ہوئے کہ امراء کے مقابلہ میں ہدیے اور تحفے

"غریبوں کا جو باخلاص پیش کرنا' برغبت قبول فرماتے"۔

اور اسی طرز عمل کا ذکر دعوتوں کے متعلق بھی ان الفاظ میں کیا ہے' کہ

"دعوت سب کی قبول فرماتے' خصوصاً غربا کی کمال خوشی سے"۔ ص۳

اور یہ کہ دعوت کے کھانے کے متعلق عام دستور یہ بھی تھا کہ

"کھانے کی آب و نمک کی تعریف فرماتے"۔

اور ان ہی کی روایت کے مطابق ماش ہی کی روٹی اور ماش ہی کی دال والی دعوت اللہ دیا نورباف کی جس نے رغبت سے کھائی ہو

جیسے کوئی پلاؤ قورمہ کو کھاتا ہے"۔ ص۲۶

ان سارے قصوں کی تہ میں سچ پوچھئے تو وہی "دل شکستگی محبان" والا راز پوشیدہ تھا "قلوب منکسرہ" یعنی ٹوٹے ہوئے دلوں میں اپنا پتہ جس نے دیا ہے' اس کے ڈھونڈنے والے اگر غریبوں کے شکستہ قلوب میں اسے ڈھونڈھ رہے تھے تو آپ ہی بتائیے کہ اسے کہاں ڈھونڈھتے امیر شاہ صاحب مرحوم نے تو قول نقل کیا ہے کہ "اخلاص سے دینے والے چار پیسے بھی دے رہے ہوں تو ان کے لینے کو جی چاہتا ہے"۔ لیکن حضرت تھانوی کی طرف منسوب کر کے قصص الاکابر کے جامع نے یہ روایت درج کی ہے کہ کوئی صاحب عبداللہ شاہ نامی تھے۔ کل چھ پیسے بے چاروں کو یومیہ آمدنی تھی' جنگل سے گھاس کھود کر بازار لاتے اور چھ پیسے جو دے دیتا' اسی کے ہاتھ بیچ دیا کرتے ان میں سے دو پیسے تو روز خیرات کر دیا' اور چار بال بچوں پر خرچ کرتے' ایک دن ان ہی چھ پیسے کمانے والے صاحب نے سیدنا الامام الکبیر اور ان کے ساتھ اور بھی چند بزرگوں کو جن میں مولانا محمد یعقوب ہمارے مصنف امام بھی شریک تھے' مدعو کیا۔ دعوت منظور کر لی گئی۔ منظوری کے بعد عبداللہ شاہ نے کہا کہ پکا کر آپ لوگوں کو کھانا کھلاؤں' یہ بات میرے بس کی نہیں' ہاں پیسے لیجئے اور میٹھے چاول پکا کر میری طرف سے کھا لیجئے۔ مولانا تھانوی فرماتے تھے کہ پیسے لے لئے گئے'

مولانا محمد یعقوب صاحب کی نگرانی میں کھانا تیار ہوا،

"سب نے مل کر دو دو لقمے کھائے" ملہ الہادی ماہ شعبان

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ خیرات والے دو پیسے بجائے خیرات[1] کرنے کے عبداللہ شاہ مرحوم نے

ملہ اس جملہ میں کچھ تسامح ہوا ہے۔ میں نے اپنے بزرگوں سے تواتر کے ساتھ یہ واقعہ اس طرح سے سنا ہے کہ یہ عبداللہ شاہ صاحب (دیوبندی جو اولیا کاملین میں سے تھے) گھاس کھود کر بیچتے اور اپنی معاش اسی طرح پیدا کرتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ روزانہ ایک گٹھری گھاس کی معمولاً چھ پیسے میں فروخت کیا کرتے تھے شہر والے جو گھانس خریدنے جاتے وہ شاہ جی کی گٹھری کے منتظر رہتے۔ جوں ہی شاہ جی گٹھری لئے ہوئے آتے دکھائی دیتے ووں ہی تمام خریدار ان کی طرف دوڑ پڑتے اور گٹھری خریدنے میں ہر ایک پہل کرنے کی کوشش کرتا ۔ شاہ جی کا معمول یہ تھا کہ چھ پیسے قیمت لیکر دو پیسے تو اسی وقت صدقہ کر دیتے اور دو پیسے روزان کے گھر کا خرچ تھا جس کا نمک تیل وغیرہ لے لیتے اور دو پیسے روز جمع کرتے تھے۔ سال بھر میں ان جمع شدہ پیسوں سے ہمارے ان اکابر حضرت نانوتوی حضرت گنگوہی مولانا محمد یعقوب صاحب وغیرہ حضرات کی دعوت کیا کرتے تھے۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا بیان ہے کہ ہم سال بھر تک اس دعوت کے منتظر رہا کرتے تھے اور جس دن یہ کھانا کھاتے تھے تو چالیس چالیس دن تک قلب میں نور محسوس ہوتا تھا اور راتوں عبادت و طاعت کرنے کو جی چاہتا تھا۔ مصنف سلمہٗ نے متن میں جو واقعہ نقل فرمایا ہے وہ صرف ایک جزئیہ ہے کہ شاہ جی نے فرمایا کہ پکانے کا بندوبست آج میرے یہاں نہیں ہے آپ خود پکا کر کھالیں۔ اس جزئیہ میں اتنا اضافہ اپنے بزرگوں سے اور سنا ہے کہ اس پکانے اور کھلانے کا ذمہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے لیا اور اتنا اہتمام فرمایا کہ اس کھانا پکانے کے لئے غسل کیا جگہ پکانے کی صاف ستھری بنائی اور طہارت و نظافت کا غیر معمولی اہتمام کر کے کھانا پکایا اور ان بزرگوں نے ایک ایک دو دو لقمہ بڑی عقیدت سے تناول فرمائے۔ یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اس میں وہ خیرات کے پیسے شامل نہیں تھے، جن کا ذکر قیاسی طور پر متن میں کیا گیا ہے۔

یہ عبداللہ شاہ اولیا کاملین میں سے تھے۔ ان کے بارے میں جناب مولانا اشتیاق احمد صاحب صدر شعبۂ کتابت دارالعلوم دیوبند نے بیان فرمایا کہ انہوں نے اپنے والد صاحب (شیخ ظفر احمد صاحب) سے سنا جو ان بزرگوں کے یہاں ہر وقت کے حاضر باش تھے کہ جب مدرسہ دیوبند قائم ہوا تو دیوبند کے تحصیلدار نے گورنمنٹ میں رپورٹ کی کہ یہ مدرسہ جہاد کی تعلیم کے لئے (اور بالفاظ دیگر گورنمنٹ کے خلاف بغاوت پھیلانے کے لئے) قائم ہوا ہے۔ یہ خبریں سنکر مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ نے عبداللہ شاہ صاحب کو بلایا اور فرمایا کہ ایسی خبریں ہیں اس کا خیال رکھئے۔ شاہ جی اس فہمائش کے بعد کچھ عرصے غائب رہے اور کچھ عرصہ کے بعد آکر ان حضرات سے ملے اور بہت ہنستے ہوئے ملے۔ غیر معمولی ہنسی اور فرحت کے لہجہ میں فرمایا خوب پڑھاؤ خوب پڑھاؤ۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طے کر لیا ہے یہ مدرسہ تو ہمیشہ رہیگا۔ ان خبروں کی کوئی پروا نہ کرو (باقی ص۵۸۳ پر)

پیش کردیئے ہوں گے' اسی لئے دو دو لقموں سے زیادہ کی گنجائش پیدا نہ ہوئی۔[۵۱]

بہرحال کہنا یہ ہے کہ نانوتہ کی زمینداری اور تصحیح کی آمدنی کے سوا' اخوان یعنی اہل عقیدت کی طرف سے جو کچھ پیش ہوتا تھا' مذکورہ بالا قیود اور خصوصیتوں کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر رد نہیں فرماتے تھے' میرے پاس کوئی مفصل فہرست یا اس سلسلہ میں جو آمدنی ہوتی تھی اس کا باضابطہ ہی کھاتہ تو نہیں ہے' لیکن چار پیسے' بلکہ اگر عبداللہ شاہ والی ؒ وابت کے متعلق میرا خیال غلط نہیں ہے تو چند پیسے تک بھی گویا لے لئے جاتے تھے' کسی موقعہ پر ذکر کر چکا ہوں کہ ایک غریب آدمی مجلس مبارک میں صرف شکر کی پڑیہ لیکر حاضر ہوا' اور اسے بھی قبول کر کے حسب دستور حاضرین میں تقسیم فرمانے کا حکم دیا گیا' اسی موقعہ پر بیعت کا لطیفہ بھی پیش آیا تھا' یاد ہوگا کہ شکر لانے والے کی

(بقیہ ص۵۸۳) اور مطمئن ہو کر پڑھاؤ۔ یہ بزرگ درحقیقت صاحب خدمت تھے اس لئے اس قسم کے انتظامی معاملات میں یہ اکابر بھی ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے اکابر اولیا کے پیسکا جو براہ راست دربار رسالت میں حاضر باشی اور معاملات رجوع کرنے کی سعادت سے بہرہ ور ہوں) اس درجہ پاک اور حلال وطیب ہونا کچھ زیادہ عجیب نہیں کہ دوسرے اولیاء اس کے سال بھر تک آرزو مند رہتے ہوں۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اکابر جو مخلصین کی دعوت بشوق و رغبت قبول کرتے تھے' اس کا راز یہی ہوتا تھا کہ ان مخلصین کے پیسہ میں اکل حلال ہونے کی نورانیت رچی ہوئی ہوتی تھی۔ ان اکابر کی یہ آرزو بعینہ اس سنت صحابہ کے عین مطابق ہے کہ ایک بوڑھی صحابیہ چقندر وغیرہ پکایا کرتی تھیں اور ہر ہفتہ بعد نماز جمعہ حضرات صحابہ کو بلا کر کھلایا کرتی تھیں۔ ہفتہ بھر تک ان حضرات صحابہ کو اس کھانے کا انتظار رہتا تھا اور جمعہ پڑھتے ہی یہ سب مقدسین ان ضعیفہ کے یہاں پہنچ جاتے اور انتہائی آرزو اور شوق کے ساتھ ان کے یہاں کا کھانا تناول فرماتے۔ بعینہ اسی طرح یہ اکابر واسلاف دیوبند بھی چونکہ خلوت و جلوت میں نمونۂ صحابہ تھے۔ بلکہ ان کی فطرتیں اور طبیعتیں ہی ان سلف صالحین کی رفتار کی تبع ہو چکی تھیں۔ اس اکل حلال کے سال بھر شائق اور منتظر رہا کرتے تھے۔ فرحمھم اللہ ورضی عنہم ورضوا عنہ     محمد طیب غفرلہ

[۵۱] انا عند المنکسرۃ قلوبہم (یعنی میں ٹوٹے ہوئے دلوں کے پاس رہتا ہوں) بطور حدیث قدسی کے صوفیہ میں بروایت جو مشہور ہے اس کا تجربہ اس موقعہ پر بھی ہوا' حضرت تھانوی سے مولانا محمد یعقوب صاحب بیان کرتے تھے کہ عبداللہ شاہ کے پیسوں سے پکے ہوئے چاول جیسے ہی حلق سے اترے ایک روحانی لذت اور نور محسوس ہوا' اور لطف یہ کہ اس کا اثر مدت تک رہا" الہادی ماہ شعبان ۵۱ھ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اسی قدسی حدیث کے حاصل کو اپنے مشہور شعر میں نظم کر دیا ہے ؎

نہ بچا بچا کے تو رکھ اسے' ترا آئینہ ہے وہ آئینہ     جو شکستہ ہو' تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں ۱۲

بیعت سے جب انکار فرمایا گیا تو اصرار کرنے لگا کہ بکری شکر واپس کردی جائے، اس دلچسپ تدبیر سے اپنے مقصد میں وہ کامیاب بھی ہوگیا تھا، مولانا حکیم منصور علی خاں کے حوالہ سے فتوحات ہی کے سلسلہ میں یہ روایت گذر چکی کہ لانیوالے نے سات روپے لاکر حاضر کئے، قربانی کی گائے اسی سے خریدی گئی، حضرت والا کے چند علمی مکاتیب فیوض قاسمیہ کے نام سے جو شائع ہوئے ہیں، ان میں ایک خط جو مولوی دائم علی صاحب کے نام لکھا گیا ہے (نگینہ کے ایک بڑے عالم تھے) اسی خط کی ابتدا میں ایک فقرہ یہ بھی ہے، کہ

"شاید آں رقمہ ام کہ باطلاع رسیدن دو اشرفی وچغہ رقم زدہ بمولوی عبدالرب صاحب سپردہ بودم نرسید" ص۳ فیوض قاسمیہ

جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ پیسوں کے علاوہ اگر اشرفیاں بھی پیش کی گئی ہیں تو ان کو بھی آپ نے قبول فرمالیا، اشرفیوں کے ساتھ "چغہ" کا ذکر بھی فرمایا گیا ہے، یہ اور ان کے سوا دوسری روایتوں سے بھی جن میں سے بعضوں کا ذکر کرچکا ہوں، ان سے بھی پتہ چلتا ہے، کہ علاوہ نقد کے استعمالی اور برتنے کی چیزیں بھی خدمت والا میں پیش ہوتی رہتی تھیں، گاڑھے کا تھان گوٹ لگی ہوئی ٹوپی یا معمولی ٹوپیاں، مختلف حکایات کے سلسلہ میں ان کا تذکرہ ہوچکا ہے۔ بلکہ مولانا طیب صاحب کے اس بیان سے جس میں ہے کہ حضرت والا کی اہلیہ محترمہ کے نام سے پیش کرنے والے نے ریشمین چادر اور طلائی زیور پیش کئے تھے، اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ گاڑھے کے علاوہ قیمتی لباس بھی لانے والے لاتے تھے، یہی "چغہ" جس کا اس خط میں ذکر ہے چاہئے تو یہی کہ معمولی نہ ہو، آخر نقد میں بجائے روپے کے جب اشرفی پیش کی گئی، تو "چغہ" بھی اشرفیوں ہی کے مطابق ہوگا۔ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے ان ہی باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"اکثر کھانے پینے پہننے برتنے کی چیزیں عمدہ عمدہ آپ کے پاس ہدیہ میں آتیں" ص۲۶

اور فتوحات ہی کے سلسلہ میں مصنف امام کا یہ بیان ہے کہ

"اللہ جل شانہ نے بہت کچھ عنایت فرمایا"۔ ص۳۲

ان سے بھی مراد یہی ہے۔

لیکن یہ سب کچھ جو "تقوی کی زندگی" "لا یحتسبی" رنگ میں آپ کے سامنے پیش کرنی تھی، اس کا مصرف کیا تھا؟ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اسی کا جواب یہ دیا ہے، کہ

"جو کچھ بلا طلب آپ کے پاس آتا تھا، وہ وقف تھا، جس کا جی چاہے کھاؤ پیو"۔

وہی یہ بھی اطلاع دیتے ہیں کہ

"فوراً اپنے شاگردوں اور مریدوں کو تقسیم کر دیتے، کبھی اپنے ہاتھ سے تقسیم فرماتے، کبھی یہ بھی فرماتے کہ جو چیز کسی کے پسند آئے لے لو"۔ ص۲۴

بظاہر اس دستور کا تعلق غیر نقدی تحائف وہدایا سے معلوم ہوتا ہے، مولانا منصور علی خاں صاحب نے لینے کے متعلق حضرت والا کی عام عادت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"کوئی شخص ادنیٰ شے بھی پیش کرتا اس کو بڑی خوشی سے لے کر خود بھی کھاتے، اور دوسرے حاضرین کو بھی کھلاتے"۔ ص۱۹۱ مذہب منصور

باقی نقدی پیش کش، سو ہمارے مصنف امام نے حضرت والا کی اہلیہ محترمہ کا ذکر کرتے ہوئے جو یہ ارقام فرمایا ہے، کہ

"جو کچھ فتوح ہوتے، ان کے (یعنی بیوی صاحبہ) کے حوالہ کر دیتے"۔ ص۳۲

درحقیقت مصنف امام کی اسی اطلاع میں اس سوال کا جواب پوشیدہ ہے، جس کے لئے یہ بحث اٹھائی گئی تھی، یعنی باوجود محدود آمدنی کے اتنے بلند معیار پر اکرام ضیف کا سلسلہ آخر عمر تک جو قائم اور جاری رہا، ظاہری اسباب کے اعتبار سے اس میں دخل فتوح کی اسی آمدنی کا سمجھنا چاہیئے کہ تھا، گویا سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے تو یہ التزام تھا کہ نقد جو کچھ آتا تھا، وہ بیوی صاحبہ کے حوالہ کر دیا جاتا تھا، اور جب کہ آپ دیکھ چکے پوری دیانتداری کے ساتھ حضرت والا کے حوصلہ کے مطابق ان کی مہمانوں کی مہمانداری میں جو کچھ ملتا تھا بیوی صاحبہ سب کو لگا دیتی تھیں

میر) مصنف امام کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں کہ مہمان نوازیوں کے اس قصے میں بے چاری بی بی صاحبہ کو ابتداء میں کافی دشواریاں پیش آتی تھیں۔ زیوروں کے بیچنے کی نوبت بھی آ گئی۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ جہاں اس قسم کا لنگرخانہ جاری ہو دہاں یہ دشواریاں ابتدائی زمانہ تک محدود رہی ہوں گی۔ اپنی دادی صاحبہ کی ضیافتی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا طیب صاحب نے اپنی یادداشت میں جو یہ لکھا ہے کہ کسی وقت

"اگر گھر میں کچھ نہ ہوتا تو ہمسایوں سے ادھار سدھار لے کر کام چلا لیتیں، مولنا سے نقد وجنس کا کچھ تکرار نہ تھا، نہ تقاضا نہ وقت بے وقت کا عذر۔"

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کیفیت کسی خاص زمانے ہی تک محدود تھی۔ مہمانوں کا نہ ٹوٹنے والا تانتا جہاں بندھا ہی رہتا تھا، وہاں اس قسم کی صورتوں کا پیش آجانا بعید نہیں ہے۔ مولنا حکیم منصور علیخاں مرحوم نے ایک موقعہ پر منجملہ دوسری عادتوں کے سیدنا الامام الکبیر کی ایک عادت یہ بھی جو بیان کی ہے کہ

"قرض اگر لینے کا کبھی اتفاق ہوتا، تو اس کو جلد ادا کر دیتے، اور فرماتے تھے کہ دوستوں کا قرض بہت جلد ادا کرنا چاہیئے۔" ط۱۹ مذہب منصور

اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ بیوی صاحبہ کو گھر میں کبھی ادھار سدھار لے کر اگر کام چلانا پڑتا تھا تو خود سیدنا الامام الکبیر کو بھی دوستوں سے دستگرداں قرض لینے کی ضرورت بھی وقتاً فوقتاً پیش آجاتی تھی، الغرض "فتوحات" کی یہ زائد آمدنی جو ہوتی تھی سچ پوچھئے تو جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے خمس کی آمدنی کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے۔

| | |
|---|---|
| هو مردود فیکم | وہ بھی تم لوگوں میں واپس ہو جاتی ہے۔ |

گویا آقا کی زندگی کے اس پاک نمونہ اور مقدس اسوہ کا جلوہ غلام کی زندگی میں بھی اس کی بساط کے مطابق چمک رہا تھا۔ چمکایا جا رہا تھا۔ اسی مکتوب میں جو حضرت مولانا نظام الدین اورنگ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سیدنا شاہ کلیم اللہ جہان آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے نذر و نذور یعنی فتوحات کے

متعلق لکھا تھا۔ اس میں یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ "البتہ قبول نمایند و بمحتاج بدہند" آگے بڑے بلیغ پیرایہ میں مشائخ کے فتوحات کے متعلق صحیح نقطہ نظر کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلائی گئی ہے کہ،

"کارسازی محتاجان بہتر و اولی تراست" ص۱۰ تکملہ سیر الاولیاء

آخر میں ایک حکیمانہ شعر بھی ہے یعنی

اینکہ ستانی و بیفشانیش　　بہتر ازاں ست کہ نستانیش

خاکسار نے اپنی کتاب "نظام تعلیم و تربیت" میں مشائخ کے اس خاص طرز عمل پر کافی بحث کی ہے اور حقائق و واقعات کی روشنی میں دکھایا ہے کہ آج لینے والے جن غلط اغراض میں لیکر خرچ کر رہے ہیں، ان سے بزرگوں کے طریقۂ کار کو دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے، کہ

| | |
|---|---|
| توخذ من اغنیائھم وترد علی فقرائھم | لیا جائے ان کے خوش حالوں سے اور دیا جائے ان ہی کے ناداروں کو۔ |

کے نبوی حکم کی ایک تعمیلی شکل وہ بھی تھی، کل یعمل علی شاکلتہ فربکم اعلم بمن ھو اھدٰی سبیلا دل کا حال دلوں کا پیدا کرنیوالا ہی جان سکتا ہے، بہرحال نتیجہ کلیۃً انما الاعمال بالنیات ولکل امرئٍ مانوی کے ساتھ وابستہ ہے۔

کچھ بھی ہو، مذکورہ بالا قیود و شروط کے ساتھ "فتوحات" کے سلسلے میں جو کچھ بھی قبول کر لیا جاتا تھا اس میں شک نہیں کہ دینے والوں ہی کی مہمان داریوں میں اس کو واپس کرکے اکرام ضیف کا فرض کہئے یا ذوق دینی کی تکمیل تو کسی نہ کسی طرح ہوتی رہی، لیکن جہاں تک واقعات سے پتہ چلتا ہے، یہ آمدنی بھی اتنی نہ تھی۔ دنیا تو دنیا بعض اہم دینی ضرورتوں کی تکمیل میں بھی دشواری باقی ہی رہتی تھی، کتاب "جواب ترکی بترکی" جس میں سیدنا الامام الکبیر کے خیالات کی تعبیر اپنے الفاظ میں مدرسہ عبدالرب کے شیخ الحدیث حضرت والا کے تلمیذ رشید مولانا عبدالعلی صاحب نے کی ہے۔ اس میں ایک موقعہ پر پنڈت دیانند سرسوتی اور سیدنا الامام الکبیر کے مابین مناظرہ وغیرہ کے جو واقعات پیش آئے ہیں ان

ہی کا تذکرہ کرتے ہوئے اور یہ لکھتے ہوئے کہ ان امور کی باضابطہ روئداد

"سب لکھے لکھائے مدت سے رکھے ہوئے ہیں"

شدید ضرورت تھی کہ سب کو شائع کردیا جائے، لیکن آگے وہی اطلاع دیتے ہیں کہ

"یہاں تو بوجہ تہی دستی نہ چھپ سکے نہ چھپنے کی امید" ص۳۷

اور یوں بھی سیدنا الامام الکبیر کے تالیفات فائقہ، جن کی ایک ایک سطر مستحق تھی کہ آب زر سے لکھی جاتی، جس قسم کے کاغذ پر وہ عموماً چھپی ہیں۔ اسی طرح طباعت وکتابت، کی جو نوعیت ان کتابوں کی ہے، خود ان ہی سے مولنا عبد العلی صاحب کے مذکورہ بالا بیان کی تصدیق ہوتی ہے، ان کتابوں کا حال کتب مدرسہ کا سا نہیں تھا، بلکہ گونہ اپنی ذاتی خود نمائی کا پہلو بھی ان میں پایا جاتا تھا، اسلئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا کا قلب مبارک عام چندوں وغیرہ کی آمدنی سے ان کتابوں کی اشاعت پر راضی نہ ہوا، ذرا ملاحظہ فرمائیے "قبلہ نما" جیسی اہم ترین بدیع تصنیف کو، اور اس کی لکھائی چھپائی کاغذ کو، کہ روزمرہ شائع ہونے والے اردو اخبارات بھی آج کل اس سے کہیں بہتر کاغذ اور کتابت کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔ "فیوض قاسمیہ" مجموعہ مکاتیب میں ایک خط میں اپنی کتاب "آب حیات" کے متعلق خود سیدنا الامام الکبیر نے بھی کتاب کے کسی طالب کو یہ جواب دیتے ہوئے کہ ابھی یہ کتاب شائع نہیں ہوئی ہے، یہ بھی ارقام فرمایا ہے کہ

" ورنہ بظاہر صورت طبعش قریب الوقوع است " ص۳۷

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، کہ فتوحات کی آمدنی میں اتنی گنجائش نہ تھی کہ اپنی کتابوں کی اشاعت کا نظم بھی اس سے فرماتے، یاد ہوگا، دلّی کے سید جلال الدین صاحب کا وہ بیان کہ ستّو رسالے مختلف علوم وفنون ہندسہ ہیئت فلاحت جرثقیل وغیرہ میں سیدنا الامام الکبیر سے وہ لکھوانا چاہتے تھے، لیکن شرط سید صاحب کی طرف سے یہ تھی کہ ایک ورق سے زیادہ کوئی رسالہ نہ ہو، اور حضرت والا چاہتے تھے کہ ایک جزو تک کی اجازت فی رسالہ دی جائے، سید صاحب نے لکھا ہے کہ اسی کش مکش کی وجہ سے یہ عجیب وغریب علمی کارنامہ حیز وجود میں آنے سے محروم رہا۔

آخر میں سید صاحب بے چارے نے لکھا ہے کہ حضرت والا کی فرمائش کی منظوری دینے سے اس لئے میں مجبور تھا کہ

"بوجہ اپنی بے سروسامانی چھپنے سے رہ جاویگی" ص۲ جمال قاسمی

اگرچہ اپنی بے سروسامانی کو سید صاحب نے مذکورہ الفاظ میں ادا کیا ہے، لیکن اسی سے خود مصنف کی بھی اسی تہی دستی کا پتہ چلتا ہے جس کی خبر مولانا عبدالعلی صاحب مرحوم نے دی ہے۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ دینی کتابوں کی اشاعت وطبع فتوحات کی آمدنی کا ایک اچھا مصرف ہوسکتا تھا، لیکن بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کتابوں کی تصنیف کا انتساب حضرت والا کی طرف شاید آمدنی کی اس مد سے استفادہ میں مانع آیا، گویا مہمانوں ہی سے جو آمدنی ہوتی تھی، وہ مہمانوں پر صرف ہو جاتی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ قیود وشرائط کی جن آہنی زنجیروں میں غریب فتوحات کی یہ آمدنی حضرت والا کے یہاں جکڑی ہوئی تھی، ان کو دیکھتے ہوئے یہی غنیمت معلوم ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح آپ کی اہلیہ محترمہ جیسی سلیقہ شعار بیوی کو اکرام ضیف کے اس معیار کے قائم رکھنے میں کامیابی حاصل ہوئی، تاہم باوجود ان باتوں کے جہاں تک دیکھا جاتا ہے،

الیس اللّٰہ بکاف عبدہٗ — | کیا اللہ اپنے بندوں کے لئے کافی نہیں ؟

کے قرآنی وثیقہ کی تفسیر آخر وقت تک آپ کی زندگی بنی رہی، حج ہی کا سفر دیکھئے، خیال پیدا ہوا اور ایک نہیں حج کے لئے تین طویل سفروں کو حق تعالیٰ نے آپ کے لئے آسان فرمادیا، جن کی تفصیلات کا تذکرہ انشاء اللہ تعالیٰ آپ کے حج کے عنوان کے تحت آئندہ کیا جائیگا۔ پھر آپ مجھ ہی سے سن چکے کہ ایک ہی نہیں دو دو لڑکیوں کے فریضہ عقد سے بھی آپ سبک دوش ہوئے، اور گو خود آپ کی طرف سے کچھ نہ کیا گیا، لیکن مہیا کردیا گیا تقریباً وہ سب کچھ جو آپ کی برادری کے معیار کا اقتضا، تھا اسی طرح دیکھتے ہیں کہ علالت کا طویل سلسلہ جب پیش آیا، جس کے بعد پھر بیمار پڑنے کی ضرورت نہ ہوئی، تفصیل تو اس علالت کی اپنے مقام پر آئے گی، یہاں میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خود سیدنا الامام الکبیر کے پاس تو شاید ایک دن کے علاج کا بھی سرمایہ موجود نہ تھا، لیکن اسی علالت اور بیماری کی متعلق

مصنف امام نے اپنی چشم دید شہادت بہ قلم بند کی ہے کہ

"وہ دوائیں مولانا کے لئے بسر ہوئیں کہ جو امرا کو بھی شاید بدشواری میسر آویں"

آخر میں ان کے محتاط قلم سے یہ الفاظ تک ادا ہوئے ہیں کہ

"اور ایسا علاج ہوا کہ جو بادشاہوں کو بھی شاید ہی نصیب ہو" ص۲۱

اور امیر شاہ خاں صاحب مرحوم کی یہ روایت جو ارواح ثلٰثہ میں پائی جاتی ہے کہ

"مولانا نانوتوی جب مرض وفات میں مبتلا ہوئے تو آپ نے مولوی محمود الحسن صاحب سے فرمایا کہ کہیں سے ککڑی لاؤ"

اب واللہ اعلم واقعہ کی صورت کیا تھی دیوبند وغیرہ میں ککڑیاں کم ہوتی ہیں، یا اس علاقے میں ان کے پھلنے کا زمانہ ابھی نہیں آیا تھا، خاں صاحب کا بیان ہے کہ

"مولوی محمود الحسن فرماتے تھے کہ میں تمام کھیتوں میں پھرا، مگر صرف ایک ککڑی چھوٹی سی ملی"

ظاہر ہے کہ ایک اور وہ بھی چھوٹی سی ککڑی کا ملنا نہ ملنے کے برابر تھا، بیماری میں قاعدہ ہے کہ مریض کی لَو کسی چیز کی طرف جب لگ جاتی ہے تو جب تک خواہش پوری نہ ہو لوگی ہی رہتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ یہی کیفیت سیدنا الامام الکبیر کی ککڑیوں کے متعلق ہوگئی تھی۔ اب یہی سننے کی بات ہے مانگ دل میں جس کے پیدا ہوتی ہے وہ دیوبند میں ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ دیوبند سے یہی خبر کہ مولنا نانوتوی میں ککڑیوں کی لَو پیدا ہوگئی ہے، اور وہاں نہیں مل رہی ہے، یہی خبر لکھنؤ پہنچتی ہے، اور بقول خاں صاحب کسی طرح اس کی خبر

"مولوی عبدالحیٔ صاحب فرنگی محلی کو ہوگئی"

پھر جانتے ہیں کیا ہوا؟ خاں صاحب راوی ہیں

"مولوی عبدالحیٔ صاحب نے لکھنؤ سے مولنا (سیدنا الامام الکبیر) کی خدمت میں بذریعہ ریلوے ککڑیاں بھیجیں، اور چند مرتبہ بھیجیں" ص۱۷۳

قطع نظر اس سے کہ دیوبند اور فرنگی محل کی علمی و دینی رقابت کے قصوں کو بے جان کرنے کیلئے خاں صاحب کی یہ روایت ایک بہترین وثیقہ کی حیثیت سے استعمال ہوسکتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ علمی نقاط نظر میں تھوڑا بہت اختلاف ہی باہم علماء میں کیوں نہ ہو، پھر بھی ذاتی تعلقات پر ان اختلافات کا اثر نہیں پڑتا تھا۔ یہاں تو مجھے یہ دکھانا ہے کہ بڑے سے بڑے امیروں کے لئے جس چیز کا مہیا ہونا دشوار تھا، آپ دیکھ رہے ہیں، جن بندوں کے لئے ان کا مالک کافی ہوجاتا ہے، ان کے لئے اسکی ناز برداریاں کیسی کیسی عجیب وغریب شکلوں میں سامنے آتی ہیں، صرف گگڑیوں ہی کو نہ دیکھئے، بلکہ بھیجنے والے کی شخصیت کا علم اگر آپ کو ہے تو اندازہ کرسکتے ہیں کہ کسی بڑے نواب اور رئیس کے لئے بھی مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ یقیناً یہ انتظام نہ کرتے جو ایک فقیر دبے نوا کی دل دہی کے لئے انہوں نے کیا، ریل سے ایک دفعہ نہیں، بار بار گگڑیوں کا بھجوانا مولانا فرنگی محلی کے قلب کے غیر معمولی تعلق کے بغیر ناممکن ہے، اپنے حلقہ اور علاقہ کے جو خود امام تھے جب خدمت لینے والا ان سے بھی خدمت لے رہا تھا، تو اسی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے علاج و معالجہ کے سلسلے میں جن تماشوں کو ہمارے مصنف امام کی آنکھوں نے دیکھا تھا اور ان ہی دیکھے ہوئے تماشوں کو متاثر ہوکر جن الفاظ میں اپنے احساس کا اظہار انہوں نے فرمایا ہے۔ شاید واقعہ کی تعبیر کی کوئی دوسری شکل ہو بھی نہیں سکتی تھی، اور سچ تو یہ ہے کہ سیدنا الامام الکبیر ہی نہیں بلکہ ان کے والد شیخ اسد علی مرحوم کی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے کچھ دیر پہلے مولانا طاہر صاحب کے حوالہ سے جو روایت گذر چکی ہے، الہند کے شیخ الکل حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو شیخ صاحب کی چوکی کے نیچے کی زمین سے اپنے ہاتھوں میں ان کی اجابت کو اٹھاتے ہوئے جب دیکھا جاچکا تھا تو سیدنا الامام الکبیر کی بیماری کے زمانہ کے مشاہدات جو کچھ بھی بیان کئے جائیں، ان میں شک کی گنجائش ہی کیا رہ جاتی ہے۔ اسی موقعہ پر یہ کہتے ہوئے کہ بادشاہوں کو بھی شاید ہی ایسا علاج میسر آسکتا تھا، مصنف امام نے خود بھی فرمایا ہے اور بالکل صحیح فرمایا ہے کہ

"کہاں طمع اور خوف کی بات، اور کہاں عقیدت قلبی" ص۱۴۷

زمین پر رہنے والوں کے قلوب کی یہ عقیدت حب آسمان والے کی محبت کا جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے عکس ہوتا ہے تو آسمان کے احاطے سے باہر کون ہو سکتا ہے

ہر کجا بوئے خدا مے آید — خلق بیں بے سروپا می آید

اسی قانون کی تو تعبیر ہے۔

اور ایک علاج و معالجہ اور قیمتی دواؤں ہی کا قصہ کیا' سچ تو یہ ہے کہ پیش کرنے کی حد تک سیدنا الامام الکبیر کی مہمان نوازیوں کے سلسلہ میں فتوحات کی آمدنی کی توجیہ میں نے پیش تو کر دی ہے' لیکن دل کی اگر پوچھتے ہیں' تو واقعہ یہ ہے' اس توجیہ سے خود میں بھی مطمئن نہیں ہوں' جن لوگوں نے دیکھا ہے' یا دیکھنے والوں سے سنا ہے' ان کا احساس یہی تھا اور شاید یہی ہونا بھی چاہیئے کہ "فتوحات" کی چادر تو اوپر سے پڑی ہوئی ہے' ورنہ درحقیقت یہاں بھی کام جو کچھ ہو رہا تھا بجائے زمین کے اس کا رشتہ بھی آسمان سے ملا ہوا تھا۔[1]

مولانا طیب صاحب نے اپنی یادداشت میں ایک موقعہ پر یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ زندگی کے ان ہی ایام میں جب نانوتہ ہی میں حضرت والا کا قیام تھا اور مہمانوں کا سلسلہ وہاں بھی جاری تھا' تو نانوتہ جو بقول مولانا طیب صاحب

"ایسا قصبہ ہے کہ وہاں نہ بازار نہ ہاٹ' خریدار کے لئے چیز نہیں' اور چیز کے لئے خریدار نہیں۔"

مگر بایں ہمہ وہی فرماتے ہیں کہ ان کی دادی صاحبہ کو چیزوں کی عدم دستیابی کی شکایت کبھی پیدا نہیں ہوئی' ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں کہ

"بی بی صاحبہ کو اس عذر کے پیش کرنے کا موقعہ کبھی نہیں آیا کہ اس وقت گھی نہیں' نمک

---

[1] مصنف دام مجدہ اب اصلی راستہ پر آئے ہیں۔ اہل اللہ کی مرضیات کی تکمیل کا راستہ حقیقتاً اسباب پر دائر نہیں بلکہ براہ راست مسبب الاسباب سے تعلق رکھتا ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس کی طرف صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا ایک طویل حدیث میں حضور اقدس کو خطاب کر کے اشارہ فرما رہی ہیں ان ربك يسرع في هواك (یا رسول اللہ آپ کی مرضیات پوری کرنے میں آپ کا پروردگار بہت ہی جلدی کرتا ہے۔ ع۔ می دہد یزداں مراد متقین۔ محمد طیب غفرلہ

نہیں، یا بازار میں ملتا نہیں، میں کیوں کر کھانا پکاؤں اور کہاں سے جنس لاؤں ۔"

مولانا طیب صاحب نے اس کے بعد لکھا ہے اور بالکل سچ لکھا ہے کہ

"بڑے بڑے شہروں میں جہاں بازار ہوتے ہیں، وہاں بھی کسی وقت کسی چیز کا ٹوٹا آجاتا ہے، کبھی نمک مصالحہ نہ ہونے سے کھانے میں دیر ہوتی ہے کبھی ترکاری کے بغیر بھی روکھی پھیکی پک جاتی ہے ۔"

لیکن ان ہی کا بیان ہے کہ حکم تھا کہ

"نانوتہ میں دلی کے چاندنی چوک کا سا کھانا لاؤ، اور پھر ایک دن نہ دو دن، نت نئے دن ۔"

آپ سن چکے کہ زندگی کے آخری دنوں تک یہی سلسلہ جاری رہا، ایسی صورت میں خود سوچئے کہ صرف "فتوحات کی آمدنی" کیا مہمان نوازی کی ان خصوصیتوں کی توجیہ کے لئے کافی ہو سکتی ہے؟ اسکے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے، جیسا کہ مولانا طیب صاحب نے بھی فرمایا ہے کہ

"یہ کرامت نہیں تو اور کیا ہے؟"

اور یہ تو خیر دیکھی نہیں مولانا کی سنی ہوئی باتیں ہیں، لیکن اپنے گھر میں سالہا سال تک جب تک ان کی جدہ ماجدہ طاب ثراہا زندہ رہیں۔ مولانا طیب صاحب یہ دیکھتے رہے، کہ نانوتہ کی زمین کی وہی آمدنی جو اناج کی صورت میں ان کی دادی صاحبہ کی وفات کے بعد آتی رہی، جو عموماً مصارف کے لئے کافی نہ ہوتی تھی، مگر دادی صاحبہ کی زندگی تک وہی فرماتے ہیں کہ کافی ہونا کیا معنی؟ حال یہ تھا کہ

"ختم سال پر جب نیا اناج زمینوں کا آتا تھا، تو ذخیرہ سابقہ کا باقی ماندہ دھڑیوں اور منوں کے حساب سے عزیزوں پر تقسیم فرما دیا کرتی تھیں ۔"

وہی لکھتے ہیں کہ علاوہ عام مصارف اور مہمان داریوں کے ان کی دادی صاحبہ کا ایک دستور یہ بھی تھا

"بلا کسی رسمی محرک (مثلاً شادی بیاہ وغیرہ تقریبوں کے بغیر) اقربا کو جمع کرنا، مدعو کرنا"

ان کا خاص ذوق تھا۔"

بتایا جائے کہ اس کی توجیہ اس کے سوا اور کیا کی جائے کہ "برکت" کے جس لفظ کو عصر حاضر کی خدا بے زار ذہنیتوں نے لفظ بے معنی قرار دے رکھا ہے، وہی اسی گھر میں "حقیقت" کا قالب اختیار کئے ہوئے تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس "حقیقت" سے صرف گھر ہی کے لوگ آگاہ نہ تھے بلکہ اس زمانہ کی یہ حقیقت مسلمہ تھی، مولانا طاہر صاحب کی یادداشت میں ایک اطلاع جو یہ دی گئی ہے کہ ان کی دادی صاحبہ کے زمانہ میں جو غلہ آتا تھا، اس کے متعلق عام عقیدہ تھا کہ یہ نہایت صاف پاک کمائی کا برکت دار غلہ ہے، اسی لئے وہی لکھتے ہیں کہ

"اکثر لوگ اس غلہ میں سے تھوڑا سا لے کر اپنے غلہ کی کوٹھی میں لے کر ملایا کرتے تھے۔"

مشہ طاہری یادداشت

اور میں سمجھتا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر کی خانگی زندگی کی تنظیم کے سلسلہ میں دیوان جی[1] کے نام سے حضرت والا کے سوانح نگاروں اور حالات کے بیان کرنے والوں نے غیر معمولی سیرت و کردار کی حامل ایک شخصیت کا ذکر کیا ہے۔ یاد ہوگا، کسی موقعہ پر ان ہی کے متعلق یہ لطیفہ گذر بھی چکا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر

[1] سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ شیخ زادوں کے کسی اونچے معزز خاندان سے ان کا تعلق تھا، بچپن میں اللہ دیا کے عرفی نام سے مشہور ہوئے۔ اصلی نام محمد یٰسین تھا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے گھر کا سارا کاروبار چونکہ ان ہی سے متعلق تھا، اس لئے "دیوان جی" کا لقب بھی ان کا نام بن گیا ۱۲ (از محمد طیب غفر لہٗ) یہی دیوان جی (جنہیں بچپن میں ہم نانا دیوان جی کہا کرتے تھے اور ان سے میری والدہ کا قرابت کا تعلق بھی تھا) بعد وفات حضرت نانوتوی رحمہ اللہ دارالعلوم کے کتب خانہ کے ناظم بنا دیئے گئے تھے۔ تقسیم کتب کیا کرتے تھے۔ قد وقامت بلند، رنگ سرخ و سفید، چہرہ نہایت وجیہ، سفید داڑھی پورے چہرے پر پھیلی ہوئی۔ حضرت والا کی کسی مجلس میں بیٹھے ہوتے اور کوئی اجنبی آجاتا تو انہیں ہی حضرت نانوتوی خیال کر کے اول ان ہی سے مصافحہ کرتا تھا۔ بعد میں پتہ چلتا کہ یہ خادم ہیں مخدوم دوسرے ہیں۔ مظفر نگر میں کسی اہم مناظرے میں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ انہیں بھی ساتھ لے گئے اور اسٹیج پر بٹھلا کر مناظرہ شروع کیا۔ مناظر مخالف اور مخالف گروہ نے کہا کہ ابھی تو یہ چھوٹا مولوی ہی بول رہا ہے جس نے ناطقہ بند کر رکھا ہے جب یہ اسٹیج والا بڑا مولوی بولے گا تو ہمارا کیا حشر ہوگا؟ اور حضرت شیخ کا مقصد بھی ان کے لیجانے سے یہی اثر ڈالنا تھا۔ محمد طیب غفر لہٗ

کے حکم سے مولانا گنگوہی کے دست حق پرست پر بیعت کرنے کے بعد پھر حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی درخواست کی، فرمایا گیا کہ تم تو مرید ہو چکے ہو، بولے آپ کے حکم کی تعمیل میں نے کی ہے، لیکن بیعت تو آپ ہی سے کروں گا، اور یوں حضرت کے حلقہ ارادت میں شریک ہوئے۔

بہرحال سوانح مخطوطہ کے مصنف نے ان ہی دیوان جی کے متعلق یہ خبر دی ہے کہ

"مولٰنا (سیدنا الامام الکبیر) کے گھر کا سارا کام اکثر آپ ہی کرتے تھے"

اور اس قابل رشک سند کے ناقل بھی وہی ہیں، کہ

"مولانا مرحوم فرمایا کرتے کہ دیوان جی ہمارے ہاتھ پاؤں ہیں"

ظاہری شکل وصورت، وضع وقطع کے لحاظ سے جیسا کہ سوانح مخطوطہ ہی کے مصنف کا بیان ہے دیوان جی

"بظاہر دنیا دار معلوم ہوتے ہیں"

لیکن ان ہی کا بیان یہ بھی ہے کہ

"بزرگی کی جو باتیں ان کے اندر موجود ہیں، وہ بعض بعض اس زمانہ کے مشائخ میں بھی نہیں"

اور آخر میں یہ لکھتے ہوئے کہ وہ اچھے خاصے بزرگ ہیں اپنا ذاتی احساس یہ درج کیا ہے کہ

"دیوبند کے بہت شخص مولٰنا مرحوم (سیدنا الامام الکبیر) کے مرید ہیں مگر سب میں درجہ اول یہی ہیں"

بظاہر ان ساری باتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ دنیاوی کاروبار میں دیوان جی کافی ہوشیار و بیدار مغز ہونے کے ساتھ ساتھ تقویٰ پرہیزگاری، دیانت وطہارت میں بھی غیر معمولی مقام رکھتے تھے۔ اب سوچئے اس بات کو جس نے اپنی ساری دنیاوی ضرورتوں کو ضرورتوں کے پورا کرنے والے اقتدار کے سپرد کر رکھا تھا۔ اس کے سوا اور کیا سمجھا جائے کہ اسی اقتدار نے بغیر کسی مُزد و معاوضہ کے ایک ایسی شخصیت کی خدمات کو آپ کے لئے مختص کر دیا، جس پر امانت و دیانت ہو، یا عقل و فراست کسی بھی پہلو سے غیر مطمئن ہونے کی کوئی وجہ ہی نہیں ہو سکتی تھی، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے

کہ یہ دیوان جی مرحوم

"مولانا کی خدمت میں اکثر حاضر رہتے، اور خلوص دل سے خدمت کرتے"

اور یہ کہ

"اول سے آخر تک مولنا کے جاں نثار رہے، اور کوئی فعل مولنا کے خلاف نہیں کیا"

اور صرف یہی نہیں جیساکہ وہی لکھتے ہیں کہ

"بہت بڑا حصہ اپنی عمر عزیز کا شیخ کی خدمت میں، اور مرضی میں گذار دیا اور دنیا و مافیہا کی طرف رخ نہ کیا"

بلکہ ان ہی کا بیان یہ بھی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے گھر کا سارا کام وفات کے بعد

"اب بھی اسی شوق و ذوق سے کرتے ہیں"

یہ روایت بھی اسی کتاب میں درج کی گئی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے

"مرض موت میں یہ بھی فرمایا کہ میرے اہل وعیال کی وارثی دیوان جی کریں گے"

وارثی سے مراد وہی دیکھ بھال اور خدمات ہیں، اور جو امید ان کی ذات سے وابستہ کی گئی تھی، اپنی زندگی کے آخری دنوں تک اسی کی تکمیل میں وہ مشغول رہے۔

کچھ بھی ہو، میں یہی دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آخر اس واقعہ کی توجیہ "فتوحات کی آمدنی" سے کیسے کی جائے۔

پس حق یہی ہے کہ خود فتوحات کی بھی نقطۂ نظر اور میلان طبع میں اہلیہ محترمہ کا اتحاد، دیوان جی حاجی محمد لیسین مرحوم کی مخلصانہ خدمات اور ان کے سوا اور بھی جن جن باتوں کا تجربہ سیدنا الامام الکبیر کی عائلی اور خانگی زندگی میں کیا گیا، توجیہ کرنے والے خواہ ان باتوں کی توجیہ جو کچھ بھی کریں، لیکن میرے نزدیک تو دین ہی کا نہیں، عقل کا اقتضا بھی یہی ہے کہ سب کو

من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ | جو اللہ پر بھروسہ کرے تو وہ اس کے لئے کافی ہے۔

کے قرآنی وعدہ کا ایفائی مرقع یقین کیا جائے۔ پڑھنے والوں کو چاہیے کہ بجائے کتابی اوراق کے اسی

"مرقع" کے آئینہ میں

| | |
|---|---|
| مایفتح اللہ للناس من رحمۃ فلا ممسک لھا | اللہ جس رحمت کو کھولے، اس کا روکنے والا کوئی نہیں |

اور اسی قسم کی دوسری قرآنی آیتیں مثلاً

| | |
|---|---|
| ان ینصرکم اللہ فلا غالب لکم | اگر اللہ تمہاری مدد فرمائے تو کوئی تم پر غالب آنیوالا نہیں۔ |

یا خبر دی گئی ہے کہ

| | |
|---|---|
| انا لننصر رسلنا والذین اٰمنوا فی الحیٰوۃ الدنیا ویوم یقوم الاشھاد | ہم ضرور اپنے رسولوں کی اور اُن کی جو ایمان لائے مدد کرینگے دنیا میں بھی اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہو جائیں گے (یعنی یوم قیامت) |

وغیرہ کی عملی تفسیروں کا مطالعہ کریں۔ یقیناً اول سے آخر تک سیدنا الامام الکبیر کی زندگی مبارک کا یہ پہلو قرآن کا ایک زندہ درس تھا۔

شخصی اور عائلی زندگی کے متعلق منتشر معلومات مختلف ذرائع سے جو فراہم ہو سکیں، ایک خاص ترتیب کے ساتھ وہ آپ کے سامنے پیش کر دی گئیں، افسوس ہے کہ جمع کرنیوالوں نے جمع نہیں کیا۔ ورنہ زندگی کے ان ہی دونوں شعبوں کے سلسلے میں ایسی نظیروں اور مثالوں کا کافی ذخیرہ دنیا کے سامنے آسکتا تھا، جن سے خدا ہی جانتا ہے کتنی مشکلات کے حل میں مدد مل سکتی تھی، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اپنے تاثرات کو ظاہر کرتے ہوئے بہت اجمالی باتوں کا تذکرہ کیا ہے مثلاً یہ کہ سیدنا الامام الکبیر کی عام عادتوں اور آپ کی خاص خاص روش طرز عمل کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ

"کبھی کسی کو بہ نظر حقارت نہ دیکھتے، کسی کا عیب ظاہر نہ کرتے، کسی شخص میں ہزار عیب اور ایک ہنر ہو، تو آپ اس کے ہنر کی تعریف کرتے، اظہار عیب نہ فرماتے۔"

بظاہر یہ چند لفظی فقرے ہیں لیکن تجربہ آپ کو بتائے گا کہ ان ہی چند کلیات میں امن و عافیت کی زندگی کا

راز پوشیدہ ہے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات طیبہ کا جو مجموعہ "کمالات اشرفیہ" کے نام سے موسوم ہے، اس سے بھی سیدنا الامام الکبیر کے متعلق بعض آگاہیاں حاصل ہوتی ہیں ایک جگہ ہے کہ خود اپنے اور اپنے پیر و مرشد حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے بعض التزامی ضوابط کا ذکر کرتے ہوئے حضرت تھانوی نے فرمایا کہ

"حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو روایات سنتے ہی نہ تھے، شروع ہی میں روک دیتے تھے۔" ص۱۹۱

روایات سے مطلب ادھر ادھر کی باتیں ہیں جنھیں پہنچانے والے عموماً بڑے لوگوں تک پہنچا کر اپنی خیر خواہی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، مثلاً یہ کہ فلاں آپ کی شان میں یہ کہہ رہا تھا آپ کی طرف فلاں بات منسوب کرتا تھا، وغیرہ، سیدنا الامام الکبیر نے اس قسم کی روایات رسانیوں کا دروازہ ہی اپنی مجلس میں بند رکھا تھا، کسی نے کچھ کہنا بھی چاہا تو ابتدا ہی میں روک دیتے، سکون کے ساتھ جینے کا یہ بڑا جوہری گر ہے، اس کی ضرورت ہی کیا ہے کہ دنیا آپ کو جو کچھ کہتی ہو اس کی خبریں آپ تک پہنچیں اور پہنچ بھی جائیں، تو آپ ان باد فروشوں، ہرزہ درائی کرنے والوں کا کر ہی کیا لیں گے۔ پس پتہ کی بات یہی ہے کہ آدمی سرے سے بدگوئی کرنے والوں کی بدگوئیوں کو اپنے آپ تک پہنچنے ہی نہ دے۔ ایذا رسانی جو اس قسم کی ژاژ خائیوں کا مطلب ہوتا ہی ہے، اس کا بہترین جواب یہی ہو سکتا ہے کہ ان بیہودگیوں کو ان ہی کی گندہ زبانوں تک محدود کر کے رکھ دیا جائے، اپنے کانوں تک پہنچنے کا موقعہ ہی نہ دیا جائے۔

سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اسی سلسلہ میں ایک عادت حضرت والا کی یہ بھی بتائی ہے کہ

"کیسا ہی کچھ نقصان ہو جاتا مگر کبھی چہرہ پر ملال نہ آتا، اور نہ اس سے یہ فرماتے کہ تجھ سے یہ نقصان ہوا، بلکہ اس کی تسلی فرماتے[۱]"

---

[۱] کاش کوئی عملی مثال بھی پیش کر دیتے تو اس کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی۔ اس موقعہ پر سیدنا الامام الکبیر کے صاحبزادے حضرت مولانا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بات جو خود فقیر کے ساتھ گذری (باقی ص۶۰۰ پر)

ان ہی کا بیان یہ بھی ہے، کہ گو

"خود اپنے نفس کے لئے نہ کبھی امیر کے پاس جاتے، نہ کوئی رقعہ اور پرچہ تحریر فرماتے"

لیکن اسی کے ساتھ یہ دستور بھی تھا کہ

"اگر اہل غرض حاضر ہو کر عرض کرتے کہ فلاں امیر سے مجھ کو یہ غرض ہے، یا فلاں محکمہ میں نوکری ہے۔ آپ سفارش کر دیجئے، تو آپ فوراً خط سفارش کا لکھ دیتے اور اکثر مکتوب الیہ کو اثر ہوتا اور حاجت مند کی حاجت بر آتی" ص۲۸

اور فیوض قاسمیہ مجموعہ مکاتیب میں سے ایک خط میں کسی صاحب کو جواب دیتے ہوئے آپ نے جو یہ لکھا ہے کہ دیوبند میں کمبل نہیں ملتے، ہاں مظفر نگر میں مل سکتے ہیں لیکن سردست وہاں جانا میرا دشوار ہے لیکن صرف اس لئے کہ فرمائش کی تعمیل کی کوئی صورت نکل آئے ان ہی کو یہ بھی ارقام فرمایا گیا ہے کہ

"بایں ہمہ ارادہ دارم کہ بہ یکے از احباب بنویسم شاید بہم رسد" ص۳۸

(بقیہ ص۵۹۹) اس وقت یاد آگئی، حکومت آصفیہ کے ہائی کورٹ میں اس وقت وہ مفتی کے جلیل عہدے پر سرفراز تھے، منجملہ بہت سی مراعات کے حضور نظام ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کی طرف سے ایک خاص استثنائی رعایت ان کے ساتھ یہ بھی تھی کہ خاص شاہی جوڑی سواری کے لئے مقرر تھی، فقیر ایک دن ان کے پاس گیا ہوا تھا، رات ہو گئی اور کافی رات گذر چکی تھی، میں گھر چلنے کے لئے اٹھا، تو فرمایا کہ کرایہ کی سواری راستہ میں اب کہاں ملیگی، اور حکم دیا گیا کہ شاہی جوڑی جو ان کے لئے مقرر تھی اسی پر مجھے گھر پہنچا دیا جائے، میرے ساتھ اور بھی چند حضرات گاڑی میں بیٹھ گئے، گاڑی چلی، راستہ میں اچانک ایک اونٹ سے گاڑی کے گھوڑوں کی مٹ بھیڑ ہو گئی۔ گھوڑے بری طرح بھڑکنے لگے حالانکہ چار چار کوچبین اس لینڈ و پر تھے، سب بھاگ گئے، اور گھوڑے رات کی اسی تاریکی میں اچھلنے بھاگنے لگے، چارہ کار اس کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا کہ ہم لوگ گاڑی سے اتر جائیں بمشکل اترنے میں کامیابی ہوئی، اس کے بعد گھوڑے لینڈ و کو لے کر بگ ٹٹ سرپٹ بھاگے۔ بیل گاڑی سے ان کی ٹکر ہوئی، ٹکر کی وجہ سے پولیس کے جوانوں کو پکڑ لینے کا موقعہ مل گیا۔ گاڑی کو کافی نقصان پہنچ چکا تھا۔ ہم ڈر رہے تھے کہ دیکھئے آج حافظ صاحب کا رنگ کیا رہتا ہے واپس لوٹ کر حادثے کی اطلاع دے کر ان کے ردعمل کا ڈرتے ڈرتے انتظار کرنے لگے لیکن دیکھا کہ خلاف توقع حافظ صاحب فرما رہے ہیں خدا نے بڑا فضل کیا کہ آپ لوگوں کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا، دیر تک وہ ہماری ہی تسلی کرتے رہے۔ گاڑی کے نقصان کا ذکر بھی ان کی زبان پر نہ آیا۔ اب سمجھ میں آتا ہے کہ یہ ایک موروثی ترکہ تھا اور سیدنا الامام الکبیر کی یہ عادت تھی ۱۲

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خاطر احباب کے آبگینوں کے متعلق آپ کے احساسات کتنے نازک تھے۔ میرا تو خیال ہے کہ مولنٰا طیب صاحب نے اپنی دادی صاحبہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک موقعہ پر جو یہ لکھا ہے کہ کسی کی تکلیف اور مصیبت برداشت نہیں کر سکتی تھیں، اس میں اپنے ذاتی رجحانات کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت والا کی رفاقت اور تربیت کو بھی دخل نہ تھا۔ آپ کے ان ہی خطوط سے جو اتفاقاً محفوظ رہ گئے ہیں پتہ چلتا ہے کہ دوسروں کے لئے آپ کی دل سوزیوں اور بے چینیوں کا کیا حال تھا۔ مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے نام ایک خط قاسم العلوم میں ہے، حالانکہ خط کا تعلق ایک علمی موضوع سے ہے، لیکن ابتدا میں دوسری ہی باتوں کے ساتھ مولوی فخر الحسن صاحب کو مدرسہ نگینہ کی ملازمت کے چھوٹ جانے کا جو خطرہ پیش آگیا تھا، اسی کے متعلق تسلی و تشفی کے ان الفاظ کو ارقام فرماتے ہوئے کہ

"خیر نظر بر خدا دارند، و ہیچ نہ ہراسند ان مع العسر یسرا ان مع العسر یسرا اگر درے بحکمت بندمی فرمایند چہ باک کہ درہائے دیگر خواہند کشاد۔"

پھر ان کو حضرت والا نے یہ عملی مشورہ دیا ہے کہ

"رائے ایں ہیچ مداں چناں مستحسن نماید کہ اول بدہلی رسند و بمنشی ممتاز علی صاحب و منشی عبد الرزاق صاحب ملاقات کنید شاید بمطبع صورتے پیدا آید۔" مکتوب ۱۱ ص ۲

ممکن ہے کہ ان لوگوں کو اشارہ کیا گیا ہو، یا مولوی فخر الحسن کا حضرت والا سے جو تعلق تھا اسی کو کافی قرار دیا گیا ہو۔ اسی سلسلہ میں اس کا بھی پتہ چلتا ہے، جیسا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف مرحوم نے لکھا ہے کہ

"جس بات میں کوئی مشورہ لیتا تھا، تو اس کے نشیب و فراز سے آپ مطلع کرتے تھے کہ اگر ساری عمر بھی اپنی وہ صرف کرتا تو اس قدر باریکیاں معاملہ کی اور پس و پیش معلوم نہ ہوتا۔" ص ۲۲۵

الغرض سفارش ہو یا مشورہ سب ہی سے مصیبت زدوں کی امداد و اعانت، سیدنا الامام الکبیر کی معلوم ہوتا ہے کہ فطری جبلت اور عام عادت تھی، جب موقعہ ملتا، فائدہ پہنچانے میں کبھی کوتاہی سے

کام نہ لیتے۔ مولانا منصور علی خاں صاحب نے اسی کا ذکر کرتے ہوئے کہ قصبہ منگلور جو ضلع سہارنپور میں دیوبند کے قریب مشہور قصبہ ہے اسی میں مدرسہ قائم ہوا، لکھتے ہیں کہ

"مدرسہ کے مہتمم نے مولٰنا صاحب (سیدنا الامام الکبیر) سے مشورہ لیا۔"

یعنی مدرس کس کو مقرر کیا جائے۔ حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ اس زمانہ میں ہاپوڑ (ضلع میرٹھ) میں بغرض علاج میں مقیم تھا، مشورہ طلب کرنے والے مہتمم صاحب کو حضرت والا نے ارقام فرمایا کہ

"ہاپوڑ سے منصور علی کو بلالو، اس کو ضرورت ہے۔" ۱۸۹ھ

اور اسی مشورہ کی بنیاد پر منگلور کے اس مدرسہ میں حکیم صاحب مدرس مقرر ہو گئے۔

اسی طرح بیماروں کی عیادت و نگرانی پرسش اور تسلی بھی آپ کا عام شیوہ تھا، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ

"بیماروں کی عیادت کرتے۔"

یہ عیادت صرف رسمی عیادت نہیں ہوتی تھی، بلکہ دل سوزی، اور غم خواری جو آپ کی جبلت تھی وہی کھینچ کھینچ کر مریض کے سرہانے پر آپ کو لاکر کھڑا کرتی رہتی تھی۔ مولٰنا منصور علی خاں مرحوم نانوتہ میں تیتر اور مور کا گوشت کھانے کی وجہ سے جب سخت بیمار ہو گئے، تو لکھا ہے کہ حضرت ان کو نانوتہ سے اپنے ساتھ دیوبند لے آئے اور دیوبند پہنچ کر اپنے خاص مخلص مرید و عاشق زار حکیم مشتاق احمد صاحب کو علاج کا حکم دیا، آرام کے خیال سے مولٰنا منصور علی خان صاحب نے لکھا ہے کہ

"حافظ کلو صاحب کی بیٹھک میں مولٰنا صاحب نے مجھے بھجوا دیا کہ وہاں آرام رہیگا۔"

ان ہی کا بیان ہے کہ

"عیادت کے واسطے ہر روز مسجد چھتہ سے تشریف لایا کرتے تھے۔"

حافظ کلو صاحب مرحوم کی بیٹھک کہاں پر ہے، خاکسار چونکہ اس سے ناواقف ہے، اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ چھتہ کی مسجد اور ان کی اس بیٹھک کا درمیانی فاصلہ

کتنا تھا[۱]؟ لیکن آگے اسی کے بعد مولانا منصور علی خاں صاحب نے خود ہی یہ خبر جو دی ہے کہ کسی ضرورت سے ان کی علالت کے ان ہی دنوں میں سیدنا الامام الکبیر کو سہارنپور جانا پڑا، ادھر مولوی منصور علی خاں صاحب کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی، گھبرا کر انہوں نے سہارنپور عریضہ روانہ کیا، ان کا بیان ہے کہ خط پانے کے ساتھ ہی سہارنپور سے دیوبند تشریف لے آئے اور

"فوراً آتے ہی میرے پاس تشریف لائے، اور فرمایا کہ تیری وجہ سے میں جلد چلا آیا ہوں" ص۱۸۹

ظاہر ہے کہ ایک معمولی غریب الوطن طالب علم سے زیادہ اس زمانہ میں مولانا منصور علی خاں صاحب کی حیثیت ہی کیا تھی، مگر ان کی اسی غریب الوطنی نے ان کو رحم و کرم کا زیادہ مستحق بنا دیا تھا، اور اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسروں خصوصاً اپنے عزیزوں، رشتہ داروں کے ساتھ اس معاملہ میں آپ کے طرز عمل کی نوعیت کیا ہوگی، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہی ہے کہ

"اپنے قریبوں کے ساتھ بہت سلوک فرماتے، صلہ رحمی کا بہت خیال[۲] تھا" ص۲۷

خلاصہ یہ ہے کہ خلق اور خالق دونوں ہی کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر کے تعلقات کی استواری سچ تو یہ ہے کہ شاید حد اعجاز تک پہنچی ہوئی تھی، دونوں پہلوؤں کو نباہنا اور پوری قوت کے

---

[۱] یہ بیٹھک اب تو موجود نہیں۔ میرے بچپن میں موجود تھی، میرے مکان سے (جو حضرت کا وہی مکان ہے جسے سکونت دیوبند کے لئے حضرت کی اہلیہ محترمہ کے سامنے پیش کیا گیا تھا) جانب شمال متصل مسجد کمال، اور مسجد چھتہ سے تقریباً سات آٹھ سو قدم کے فاصلہ پر واقع تھی۔ محمد طیب غفرلہ

[۲] میں نے اپنی پھوپی صاحبہ سے سنا کہ حضرت کی حقیقی پھوپی دیوبند محلہ ابوالبرکات میں بیاہی تھیں غربت بہت تھی۔ بعض وقت صاف گذر جاتے۔ حضرت وقتاً فوقتاً پھوپی سے ملنے جایا کرتے تھے اور ہر بار چپکے سے مٹھی بند کر کے انہیں کچھ نہ کچھ دے آتے تھے۔ وہ بھی اللہ کی بندی اس درجہ فراخ حوصلہ تھیں کہ کچھ ملتے ہی اگلے ہی دن چولھے پر کافی رونق آجاتی اور سب اہل محلہ سمجھ لیتے کہ کل کے مولانا کے آنے کا یہ اثر ظاہر ہو رہا ہے۔ یہی کیفیت اور اعزہ کے ساتھ بھی تھی محمد طیب غفرلہ

ساتھ زندگی کے آخری لمحات تک اس طریقہ سے نباہتے چلے جانا، کہ ایک طرف خلق کے متعلق سوانح مخطوطہ کے مصنف اگر اپنی چشم دید شہادت ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں کہ۔

"یتیموں اور شکستہ حالوں کی خبر گیری فرماتے، متوکل لوگوں کی خفیہ خدمت کرتے"

تو خالق کے ساتھ آپ کے تعلق بیدار کا حال یہ تھا، مولانا منصور علی خاں فرماتے ہیں کہ

"نماز باجماعت ادا کرتے، اور تکبیر اولیٰ کو کبھی ترک نہ کرتے، اذان ہوتے ہی نماز کا اہتمام شروع کر دیتے[۱]" ص ۱۹۲

سوانح مخطوطہ کے مصنف نے بالکل سچ لکھا ہے کہ

"مولانا مرحوم کی چال سہل ممتنع تھی"

اور جو کچھ انہوں نے دیکھا اور پایا تھا، اسی کو ظاہر کرتے ہوئے بے ساختہ ان کے قلم پر یہ الفاظ آ گئے ہیں

"آپ کے (سیدنا الامام الکبیر کے) اکثر حالات مناسبت رکھتے تھے حالات فیض آیات، حضرت سید الکونین، رسول الثقلین، ختم المرسلین، محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم سے" ص ۱۵

غلام کی زندگی میں آقا کے خط و خال کی یہی جھلک ہے، جس کی طرف مسلسل اشارے کرتا ہوا چلا آیا ہوں، اور اب آپ کے ذاتی حالات، اخلاق و عادات کی اس بحث کو اسی

---

[۱] میں نے اپنی دادی صاحبہ مرحومہ سے سنا فرماتی تھیں کہ عادت حضرت کی یہ تھی کہ اذان میں مؤذن کا کلمہ حی علی الصلاۃ جوں ہی کان میں پڑتا تو لیٹے ہوتے تو فوراً اٹھ کھڑے ہوتے اور کسی کام میں ہوتے تو اسی دم اس کام کو چھوڑ کر نماز کی تیاری میں مشغول ہو جاتے بعینہ یہی حال احقر نے دادی صاحبہ مرحومہ کا دیکھا۔ الصلوٰۃ لوقتہا کی پابندی ان کی مثالی تھی۔ اذان کی آواز سنتے ہی ہر کام کو (جس میں مشغول ہوتیں) اس طرح ایک دم چھوڑ کر نماز میں لگتیں کہ گویا انہیں اس مشغلہ سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں، اور اذان کے بعد ہر ایک سے اجنبی بن جاتیں

محمد طیب غفرلہ

چشم دید شہادت پر ختم کرتا ہوں، سیدنا الامام الکبیرؒ ہی کا ایک بیان اساتذہ سے کانوں تک پہنچا ہوا ہے، فرمایا کرتے تھے کہ درزی کو نمونہ کا کوئی کپڑا مثلاً قمیص اچکن دے دیا جاتا ہے اور حکم دیا جاتا ہے کہ اسی نمونے پر کپڑے سیتے چلے جاؤ، خراش تراش سلائی وغیرہ کے اعتبار سے جس حد تک اس نمونے کے مطابق کپڑوں کے سینے میں درزی کامیاب ہوگا، اسی حد تک سلانے والے سے مزد و انعام کا مستحق ہوگا "اس تمثیل کو پیش کرکے ارشاد ہوتا، کہ" اسوۂ حسنہ محمدیہ" قدرت کا بخشا ہوا نمونہ ہے، ساری انسانیت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ اپنے آپ کو رنگ میں ڈھنگ میں چال میں چلن میں فکر میں نظر میں اسی نمونے کے مطابق ڈھالتے چلے جائیں۔ جو جس حد تک اس نمونہ کے مطابق ہوگا اسکو اسی حد تک اپنے محبوب کی محبوبیت سے حصہ عطا کیا جائے گا ولکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ اور اتبعونی یحببکم اللہ کی یہی تفسیر فرمائی جاتی تھی۔ گویا جو کچھ کہا جارہا تھا، وہی کیا جاتا تھا۔ فصلی اللہ تعالیٰ علی النبی الخاتم المصطفیٰ وعلیٰ آلہ واصحابہ و الذین اتبعوھم باحسان۔

شخصی زندگی کا ایک پہلو یعنی سیدنا الامام الکبیرؒ کی آخری علالت، اور اس علالت کا آخری نتیجہ جس کے بعد علیل و بیمار ہونے کا قصہ ہی ختم ہوجاتا ہے اگرچہ بعض بعض مواقع میں کسی دوسرے مسئلہ کے سلسلہ میں اس "فاجعہ کبریٰ" کے بعض اجزا کا ذکر گذر ابھی ہے، لیکن درد کی یہ داستان ایک مستقل داستان ہے۔ چاہئے تو یہی تھا کہ ذاتی حالات کے سلسلے میں اس کو بھی درج کردیا جاتا، لیکن جی یہی چاہتا ہے، کہ جو کچھ ابھی لکھنا ہے، اس سے فارغ ہونے کے بعد آخر میں ماتم کی یہ صف بچھائی جائے۔ کیونکہ سیدنا الامام الکبیرؒ کی علالت کا یہ آخری حادثہ اگرچہ کوئی نیا واقعہ نہ تھا لیکن موت العالِم موت العالَم کا صحیح مرقع تھا۔

باوجود اعتدال قویٰ، اور استواری اعصاب کے جن کی تفصیل اپنے موقعہ پر کرچکا ہوں، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ بجائے سواری کے عموماً پیدل چلنے کے عادی تھے۔ سخت سے سخت سرد موسم اور کڑاکے کے جاڑوں میں میدانی تالابوں میں غسل کرتے تھے، لیکن کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ جہاں اختیاری سعادتوں میں اپنے محبوب پیشوا صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو کافی حصہ ارزانی ہوا تھا، وہیں اضطراری سعادتوں کے نمونوں سے بھی ان کو محروم نہیں رکھا گیا، صدیقہ عائشہ ام المؤمنین رضی اللہ تعالے عنہا کے حوالہ سے امام احمد بن حنبل کی مسند میں یہ روایت پائی جاتی ہے، ام المومنین فرماتی تھیں

| | |
|---|---|
| ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یسقم عند آخر عمرہ مسند احمد ج ۶ ص ۶۷ | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخر عمر میں کچھ نہ کچھ علیل رہتے۔ |

ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے خطوط جو عموماً وفات سے کچھ دن پہلے لکھے گئے ہیں، ان میں تفقد حال کرنے والوں کو اس قسم کی اطلاعیں حضرت والا کی طرف سے دی گئی ہیں۔ ایک خط جو حکیم عبدالصمد صاحب نامی کسی بزرگ کے نام ہے، ارقام فرماتے ہیں

"آپ کا عنایت نامہ پہنچا تھا، مگر امراض خفیفہ کی آمد وشد میں جو اس سال کسی قدر رہی، ناتوانی اکثر رہتی ہے" ص۱۲ فیوض قاسمیہ

معلوم نہیں یہ حکیم عبدالصمد صاحب کون تھے، اور کہاں رہتے تھے، لیکن خط کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں وہ تھے وہاں کے باشندوں کی طرف سے حضرت والا کی تشریف فرمائی کی تمنا پیش کی گئی تھی۔ اسی کا جواب دیتے ہوئے اور علالت کا عذر پیش کرتے ہوئے یہ بھی اطلاع دی گئی ہے کہ

"مدت سے احباب دہلی متقاضی ہیں، ادھر اپنا شوق بھی ادھر کو کھینچتا ہے، اس لئے ارادہ تھا کہ دیوبند پہنچا تو اُدھر سے اُدھر

دھلی بھی ہو آؤں گا۔ مگر تواتر امراض کے باعث یہ ارادہ ملتوی رہا۔" ص۴۷

ایک اور گرامی نامہ جو "جمال قاسمی" والے مجموعہ میں پایا جاتا ہے، اور حسن اتفاق سے "تاریخ بھی خط کی پیشانی پر پائی جاتی ہے، یعنی ۱۲۹۵ھ میں لکھا گیا ہے گویا سال وفات ۱۲۹۷ھ سے دو سال پہلے ارقام فرمایا گیا ہے، اسی کے شروع میں سید جمال الدین صاحب جن کے نام یہ خط ہے، تاخیر جواب کی معذرت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

"کیا کروں ان دنوں یہ خستہ مبتلائے بلا تھا، ڈاڑھ کے درد نے ایسا بے تاب و نتواں کر رکھا تھا کہ کیا عرض کروں، اس کے بعد ناتوانی نے کچھ ہونے نہ دیا، وہ کچھ کم ہوئی، تو کچھ کچھ اعضاء شکنی اور خفیف سا بخار دم ساز رہنے لگا۔" ص۸

اور مصنف امام نے آپ کے مرض الموت کا ذکر کرتے ہوئے جو یہ لکھا ہے کہ

"اور مولٰنا نے برخلاف عادت اس مرض میں جو علاج ہوا، اس کو قبول کیا، جو دوائی کھلائی، کھائی، جو تدبیر کسی نے کی اس کو کر لیا۔" ص۴۴

اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ اکثر و بیشتر علاج و معالجہ سے گریز ہی کا جذبہ آپ پر ابتداً ان بیماریوں کے سلسلہ میں غالب رہا، علاج اور تدبیر کچھ کرتے بھی تھے تو اس کی نوعیت کا اندازہ خود آپ ہی کے اس بیان سے ہوتا ہے، جو "فیوض قاسمیہ" کے ایک خط میں پایا جاتا ہے۔ خط کی زبان فارسی ہے اور آپ کے مشہور مخلص دوست مولٰنا حکیم ضیاء الدین کے نام ہے، اسی میں اپنی بیماری کی خبر ان الفاظ میں دی ہے،

"در اول رسید مبتلائے بخار لرزہ شدہ بودم، دو نوبت بشدت

گذشت، ہجوم استفراغ و غلبہ حرارت در سینہ و شدت تشنگی
چناں بیتابم نمود کہ تابِ ضبط ہم نمی ماند اول روز پس از
ہفت صد شاخہا تشنگی فرو شد و در نوبت دوم بہ شش صد
تدارک آن شد "

جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاید ملیریا کا حملہ ہوا تھا، جاڑے کے ساتھ بخار آتا تھا۔ مگر جانتے ہیں، کہ " دو نوبت بشدت گذشت" کا جو دورہ لرزہ بخار کا آپ پر پڑا تھا، اس کے علاج میں کیا تدبیر اختیار کی گئی، خود ہی ارقام فرماتے ہیں، کہ

"آخر کار از صبح روز دوم، بعلاج مسنون، غسل از آب تازہ
تدبیرہ کردہ شد "

جاڑا اور بخار کے اس شدید دورے میں نہانے کا آدمی تخیل بھی نہیں کر سکتا، لیکن " علاج مسنون " کی عقیدت نے اسی علاج کو آسان بنا دیا اور آب تازہ سے غسل فرمایا گیا، خدا جانے اطبا اور ڈاکٹروں کے نزدیک اس طریقۂ علاج کے اختیار کرنے کا نتیجہ کیا ہونا چاہئے۔ لیکن حضرت والا خود ہی اطلاع دیتے ہیں کہ

" خداوندِ حقیقی بہ برکتِ ایں عمل شفائم بخشید " صلا

سیرتِ قاسمی کے ایک فانی یعنی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کو خاکسار نے بھی ایک دفعہ دیکھا، شدید بخار میں مبتلا تھے، شدت حرارت سے جسم مبارک پر ہاتھ رکھنا بھی دشوار تھا، لیکن اسی حال میں خوب یاد ہے، حضرت شیخ الہند مدرسہ تشریف لائے اور مدرسہ کی مسجد کی مشرقی سمت میں جو کنواں ہے، اسی کے پاس آکر

بیٹھ گئے۔ طلبہ موجود تھے، حکم دیا گیا کہ ڈول نکالتے جاؤ اور مجھ پر ڈالتے جاؤ، غالباً اس عمل میں شرکت کی سعادت اس فقیر کو بھی ہوئی تھی۔ صحیح طور پر تو نہیں کہہ سکتا، لیکن حافظہ اگر غلطی نہیں کر رہا ہے تو کہہ سکتا ہوں کہ چمڑے کے بڑے ڈول سے تابڑ توڑ یکے بعد دیگرے تقریباً اسّی ڈول ڈالے گئے، طلبہ بھرتے جاتے تھے، ایک تھکتا تھا، تو دوسرا گھرنی کو گھمانے میں مصروف ہو جاتا تھا، حضرت بخار کی اسی حالت میں ڈول پر ڈول اپنے اوپر انڈلواتے چلے جاتے تھے۔ کانپ رہے تھے، میں حیران تھا سوچتا تھا، دیکھئے انجام کیا ہوتا ہے۔ خدا خدا کر کے بس کرنے کا حکم دیا گیا۔ آنکھیں سرخ تھیں، اُن کی سرخی کا جمال آج بھی قلب کے لئے مایۂ نشاط و سرور ہے، اُٹھ گئے کپڑے سے بدن پونچھا گیا۔ جہاں تک خیال ہے، بخار کا نام بھی اس عمل کے بعد باقی نہ رہا۔

بہر حال مصنف امام کے بیان سے جو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عموماً علاج و معالجہ کے سیدنا الامام الکبیر عادی نہ تھے، جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس سے غرض ان کی یہی ہے کہ عام طبی علاج کے عادی نہ تھے۔ پھر یا علاج ہی نہ کرتے تھے، اور دفع مرض کا موقعہ طبیعت ہی کو عطا فرمایا جاتا تھا، یا کہئے تو کہہ سکتے ہیں کہ براہ راست

| | |
|---|---|
| واذا مرضت فھو یشفین | اور جب میں بیمار پڑوں تو وہ ہی مجھے شفا دے گا۔ |

کے تحت اپنے آپ کو ڈال کر شافیٔ حقیقی سے شفاء کی نعمت حاصل کرنے کے عادی[۱]

---

[۱] اس سلسلہ میں حضرت والا کی عام زندگی پر (جو آخر کی اس زندگی سے پہلے کی رفتار ہے، جس پر متن میں بحث کی جا رہی ہے) ذیل کے اس واقعہ سے کافی (باقی صفحہ ۶۱۰ پر)

تھے، اور علاج بھی کرتے تھے، تو وہ طبیبوں اور ڈاکٹروں والا علاج نہ ہوتا تھا، بلکہ صحت میں جس کی زندگی اُن کے لئے واحد نمونہ بنی ہوئی تھی، مرض میں بھی

(بسلسلہ صفحہ ۶۰۹) روشنی پڑسکتی ہے۔ صورت واقعہ یہ تھی کہ حضرت والد مرحوم بیمار ہوتے تو معمولی بیماری میں بھی کول کراہ سے بے تابی اور بے چینی کا اظہار زیادہ کرتے۔ جیسے کوئی عظیم مرض لاحق ہوگیا ہے۔ ایک بار ملیریا میں مبتلا ہوئے اور حسب عادت کول کراہ اور ہائے وائے بہت کر رہے تھے تو میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ حضرت یہ اتنا آہ دبکا تو بظاہر صبر و توکل اور تسلیم و رضا کے خلاف معلوم ہوتا ہے، تو قدرے مسکرا کر فرمایا کہ بھائی میں نے اپنے تین بزرگوں کو دیکھا ہے اور دیکھا ہی نہیں برتا بھی ہے۔ حضرت قبلہ حاجی امداد اللہ صاحب (جو اُن کے شیخ تھے) حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ (یعنی حضرت نانوتوی قدس سرہٗ) اور حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ (جو اُن کے اُستاد حدیث تھے) بیماری میں تینوں کے تین حال تھے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو معمولی سی بیماری میں ہائے وائے اتنا کرتے کہ مکان کو سر پر اٹھا لیتے۔ عرض کیا گیا کہ حضرت کیا یہ تسلیم و رضا کے خلاف نہیں؟ فرمایا کہ تو کیا میں اپنے اللہ کے سامنے بہادر بنوں کہ آپ کے ابتلاء و امتحان کے تحمل کی مجھ میں بڑی طاقت ہے۔ یہ کہہ کر فرمایا کہ عبدیت کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے ابتلاء کے سامنے بندہ اپنے عجز و بے چارگی اور ناتوانی کو پیش کرے کہ خداوندا میں تیری آزمائش کو اٹھانے کے قابل نہیں، بہت ہی ضعیف و ناتواں ہوں، تو بلا آزمائش ہی مجھ پر فضل فرما دے۔ پھر والد مرحوم نے فرمایا اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی شان یہ تھی کہ بڑی سے بڑی بیماری سر پر آجاتی تو کبھی زبان سے اُف نہ فرماتے اور اس قدر خموشی اور سکون سے گذارتے کہ بہت سی بیماریوں کا تو پتہ بھی نہ چلتا۔ علاج و معالجہ تو بعد کی بات ہے۔ دفع مرض کے بعد کبھی خود ہی زبان سے نکل جاتا تو گھر اور باہر والوں کو پتہ چلتا کہ بڑی شدید بیماری آئی تھی، اور فرماتے کہ اللہ کی طرف سے جو حالت بھی آئے اُسے صبر و تسلیم کے ساتھ گذار دے کہ ع ہرچہ از دوست می رسد نیکوست۔ فرمایا کہ عبدیت کا تقاضا یہی ہے کہ دوسروں کے سامنے چون و چرا نہ کرے اور معاملہ شانِ مطلق پر چھوڑ دے (باقی صفحہ ۶۱۱ پر)

اسی "نمونہ" کو اختیار کرکے اپنے مرض کو بھی صحت ہی بنا لیتے تھے اور آخری علالت میں جس طرزِ عمل کو بقول مصنف امام اختیار فرمایا گیا، یعنی جو دوائی کھلائی کھالی، اور جو تدبیر کسی نے کی اس کو کرلیا، اگر ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی مذکورہ بالا روایت کے اس جزر کو پیشِ نظر رکھ کر دیکھا جائے جو مسند احمد ہی میں گذشتہ بالا الفاظ کے بعد ہے کہ

| | |
|---|---|
| کانت تقدم علیہ وفود العرب من کل وجہ فتنعت لہ الانعات وکنت اعالجہا لہ | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہر طرف سے عرب کے وفود کا سلسلہ لگا ہوا تھا، اور یہی آنے والے لوگ آپ کے لئے دوائیں بتاتے اور میں ان دواؤں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تیار کیا کرتی تھی۔ |

تو عادت کے برخلاف ہر بتانے والی دوا کے استعمال میں بھی کیا وہی رنگ نظر

---

(بسلسلہ صفحہ ۶۱۰) اور حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے بارہ میں فرمایا کہ وہاں بیماری آتی تو نہ سکوت تھا نہ شور بلکہ علاج و معالجہ کی طرف توجہ فرماتے اور اس بارہ میں کاحد من الناس ہوجاتے اور فرماتے کہ عبدیت کا تقاضا یہی ہے کہ منشط و مکرہ میں اتباع کا دامن نہ چھوڑا جائے، اور مرض میں علاج مسنون کیا جاتا رہے۔ یعنی اُن کے یہاں ظواہرِ سُنّت پر عملدرآمد ہی عبدیت کی روح تھی، یہ تینوں واقعے بیان کرکے فرمایا کہ بھائی میں بیماری کی حالت میں کبھی اپنے شیخ کی سنت پر عمل کرتا ہوں اور کبھی اپنے ان دونوں بزرگوں کے طریقہ کو معمول بناتا ہوں۔ اس واقعہ سے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی عام عادت فنائیت اور محوِ رضا و تسلیم ہوجانا نکلتی ہے۔ گویا آپ مظہر تام تھے۔ انما اشکو بثی وحزنی الی اللہ کے ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

محمد طیب غفرلہٗ

نہیں آتا جس رنگ پر جینے اور مرنے کا فیصلہ کرلیا گیا تھا، بلکہ اسی سلسلہ میں مصنف امام ہی نے یہ خبر بھی جودی ہے کہ ایک طرف یونانی طب کے ماہروں کا مشورہ جہاں قبول فرمایا جاتا تھا، وہیں انگریزی طریقۂ علاج ڈاکٹری جو اس زمانہ کے لحاظ سے ایک نئی چیز تھی اس سے بھی انکار نہیں فرمایا گیا، بلکہ آئندہ مرض الموت کی تفصیلات کا تذکرہ جہاں کیا جائے گا، وہاں معلوم ہوگا کہ علاج کے ان دونوں طریقوں کے نمائندوں کو ایک ہی نظر سے دیکھا گیا۔ طبقات ابن سعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری زندگی کی علالتوں کے سلسلہ میں یہ الفاظ جو پائے جاتے ہیں کہ

| | |
|---|---|
| کانت العرب تنعت له فيتداوى بما تنعت له العرب وكانت العجم تنعت له فيتداوى | عرب کے لوگ دواؤں کی نشاندہی کرتے پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو استعمال فرماتے، اور عجم والے بھی ان دواؤں کی نشان دہی کرتے تو ان کو بھی استعمال فرماتے۔ |
| ص۱۱۶ الجزء الاول من القسم الثانی۔ | |

اوران سے معلوم ہوتا ہے کہ مانوس اور غیر مانوس یعنی عربی اور عجمی علاج کے دونوں طریقوں کو اختیار فرمایا گیا تھا، اگر طبقات کی اسی روایت کا پرتو سیدنا الامام الکبیر کے مذکورہ بالا طرز عمل میں سوچنے والوں کو نظر آرہا ہو، تو کیا اس کو بے بنیاد ٹھہرانے کی کوئی معقول وجہ ہوسکتی ہے؟

# جلد اوّل تمام شد

مناظر احسن گیلانی

رجب ۱۳۵۴ھ

برائٹ پروسس سٹریٹ ۲۲ ریوے روڈ لاہور

# سوانح قاسمی

## جلد دوم

## خدمات و اصلاحات

ذاتی و شخصی حالات، یا خانگی و عائلی تعلقات کے بعد سیدنا الامام الکبیر سے لینے والے نے جو جو کام لئے، اور جن مہمات کی سرانجامی کے لئے آپ کا انتخاب فرمایا گیا۔ عقلی ترتیب کے ساتھ ہم ان کو چند حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ یعنی ہندوستان کی اسلامی آبادی یا کہئے تو کہہ سکتے ہیں کہ خود اپنی ملت اور قوم کے لئے جو کچھ آپ نے کیا، ہم اس کی تعبیر "داخلی اصلاحات" کے عنوان سے کریں گے، اور غیروں کے مقابلہ میں اسلام اور مسلمانوں کی جن خدمات کا ظہور آپ سے ہوا، "خارجی اقدامات و تحفظات" کے عنوان کے نیچے ان کی تفصیل انشاء اللہ تعالیٰ پیش کی جائیگی۔

## داخلی اصلاحات

یوں تو سیدنا الامام الکبیر کا وجود باجود ہی جیسا کہ آپ دیکھ چکے مسلمانوں کے لئے بجائے خود مجسم اصلاحی نمونہ تھا، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اس عام قاعدے کا ذکر کرتے ہوئے کہ

"علماء ربانی کا وعظ تین قسم کا ہوتا ہے، قولی، فعلی، حالی۔ قولی ادنیٰ مرتبہ کا وعظ ہے اور فعلی متوسط، حالی اعلیٰ درجہ کا، اور تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ قولی وہ وعظ ہے جو محض زبان سے احکام خداوندی لوگوں کو سنا دیئے جائیں اور خود ان پر عمل نہ کرے،

اور فعلی وہ ہے کہ خود عمل کرے، بعد میں لوگوں کو ہدایت کرے، یعنی
کر کے دکھلائے، اور حالی وہ ہے کہ حال غالب ہو جائے، یعنی نیکی کا کرنا، بدی کا چھوڑنا عادت
ہو جائے، اور اس کے کرنے میں تکلف کی حاجت نہ ہو۔"
پھر وہی سیدنا الامام الکبیر کے متعلق اپنا یہ مشاہدہ بیان کرتے ہیں کہ ان کے
"اصول میں یہ تھا کہ جس فعل کو اول خود نہ کر لیتے تھے دوسروں کو اس کے کرنے کی نصیحت
نہ کرتے۔"
جس کا مطلب یہی ہوا کہ گفتار کے ساتھ آپ کا وجود سراپا کردار تھا، اور یہی نہیں آگے وہی یہ
بھی لکھتے ہیں کہ
"مولانا رحمۃ اللہ علیہ پر حال غالب تھا۔"
جو کچھ اب تک آپ کے سامنے پیش ہو چکا ہے، بلاشبہ اس سے مصنف کے اس دعوے
کی تصدیق ہوتی ہے، دین ہی سیدنا الامام الکبیر کی زندگی تھا، اور ان کی زندگی دین کے سوا درحقیقت
اور کچھ باقی نہیں رہی تھی، اسی لئے "مسلمانوں کی داخلی اصلاحات" کے سلسلے میں تو گویا یہ سمجھنا چاہئے
کہ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ عمل کا پیغام بنا ہوا تھا، بلکہ سچ تو یہ ہے، کہ اس راہ میں "گفت" سے زیادہ آپ
اپنی "رفت" اور "روش" ہی سے کام لیتے رہے جس کا اندازہ ان لوگوں کے بیان سے بھی ہوتا
ہے، جنہوں نے آپ کی تقریریں سنی تھیں، مواعظ و خطبات کا بچا کھچا حصہ ہم تک جو پہنچا ہے
اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ عام مولویوں کی طرح مسلمانوں کی عملی کمزوریوں کا ذکر ان میں کم
پایا جاتا ہے، بلکہ عموماً اسلام کی اصولی باتوں پر آپ کی تقریریں مشتمل ہوتی تھیں۔
گویا زبان سے تو ہمیشہ علم تقسیم فرماتے تھے اور عمل کا وعظ بجائے قول کے عمر بھر صرف
اپنے عمل سے کہتے رہے۔ تاہم مسلمانوں کی عملی زندگی سے تعلق رکھنے والی بعض خاص اہم باتوں
کے متعلق اس کا پتہ چلتا ہے کہ "کردار" کے ساتھ ساتھ "گفتار" سے بھی ان کی تبلیغ و اشاعت میں کام
لیا جاتا تھا، اس سلسلہ میں سوانح مخطوطہ کے مصنف نے مسلمانان ہند کے ان چند غیر دینی رسوم کا

تذکرہ کیا ہے، جن کی گرفت اب تو بحمد اللہ بہت کچھ ڈھیلی پڑ چکی ہے، لیکن سیدنا الامام الکبیر جس زمانہ میں ان رسوم کی اصلاح پر آمادہ ہوئے تھے، جاننے والے جانتے ہیں کہ اسلامی گھرانوں میں ان کی پابندی کن حدود تک پہنچی ہوئی تھی، خوشی اور غمی، ولادت، شادی، موت کے مواقع پر اس ملک کے دوسرے باشندوں کی کچھ صحبت اور اس سے بھی زیادہ ثروت و دولت کی کثرت نے ان میں اتنی اہمیت پیدا کر دی تھی کہ اسلام کے قطعی مطالبات اور مکتوبات و فرائض سے بھی کہیں زیادہ ان کی پابندی پر سوسائٹی نے ان کو مجبور کر دیا تھا، تکاثر و تفاخر کی معرکہ آرائیوں میں دیوانوں کی طرح لوگ مشغول و منہمک تھے۔ امیر ہو یا غریب چونکہ ہر ایک اپنی حیثیت سے زیادہ اپنے آپ کو دکھانا چاہتا تھا۔ نتیجہ جیسا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے خوشی کی تقریبوں کے متعلق لکھا ہے کہ

"عمر گذشتہ کا سارا سرمایہ صرف کر دیں اور آئندہ عمر بھر کے واسطے قرض کر لیں۔"

اور موت کی غمی کے سلسلہ میں وہی لکھتے ہیں کہ مصارف کے لحاظ سے

"ایسی رسمیں مقرر تھیں جن سے نہ میت کو نفع، نہ اہل میت کو اور مثال یہ صادق آتی تھی "گھر لٹا اور سر پیٹا"۔" صلا

خلاصہ یہ ہے کہ ریاء الناس (لوگوں کے دکھانے کے لئے) بیہودہ مصارف کے ایسے ابواب کھلے ہوئے تھے کہ

| | |
|---|---|
| کمثل صفوان علیہ تراب فاصابہ وابل فترکہ صلدا | جیسے وہ صاف پتھر جس پر مٹی پڑ جائے پھر اس پر بارش برسے اور وہ صاف کا صاف ہی رہ گیا۔ |

کی مصداق مسلمانوں کی معاشی زندگی بنی ہوئی تھی، حکومت کا زور جب تک موجود تھا، "تلافی" کی شکلیں کسی نہ کسی طرح جائز و ناجائز ذرائع سے چونکہ نکل آتی تھیں، اسلئے جیسا کہ چاہیے کاروبار کے ان بیہودہ طریقوں کے برے نتائج کھل کر سامنے نہیں آتے تھے۔ لیکن حکومت کی یہ "جھول" بھی جب اتر گئی تو تنگی پشت سب کے سامنے آ گئی۔ رسی جل چکی تھی، اینٹھن باقی تھی۔ ان عام "رسوم قبیحہ" میں جن میں بچی بات یہی ہے کہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ کسی نہ کسی شکل میں دوسرے ممالک کے مسلمان بھی

مبتلا تھے۔ خاص کر اس ملک کو وطن بنا لینے کی وجہ سے معصیت کا جو پہاڑ مسلمانوں کے شریف
گھرانوں کی خواتین محذرات عفاف پر ٹوٹ پڑا تھا۔ وہ "عقد بیوگان" کا مسئلہ تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ بنی نوع انسانی میں شریک ہونے کے باوجود عام انسانی حقوق سے عورتوں
کی محرومی بنی آدم کی تاریخ کا کوئی نیا واقعہ نہیں ہے لیکن عرب اپنی جاہلیت کے تاریک دور میں جیسا
کہ بیان کیا جاتا ہے لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے تک کی بے رحمی کے مرتکب ہوتے تھے۔ ان کی اس
بے رحمی، ناخدا ترسی کی غیر معمولی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ قیام قیامت کی تباہیوں اور بربادیوں کا
ذکر کرتے ہوئے، اور اس کی اطلاع دیتے ہوئے کہ آفتاب کی روشنی ڈھانک دی جائے گی، ستارے
ماند پڑ جائیں گے، سمندر بھبک اٹھیں گے، کائنات کے ان ہائلہ حوادث کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ
زندہ درگور ہونے والی لڑکیوں کے متعلق پوچھا جائے گا کہ کس قصور میں ان کو قتل کیا گیا یعنی "اذا
الموؤدۃ سئلت بای ذنب قتلت" کا جو ترجمہ ہے۔ بظاہر اس خاص ترتیب کے سلسلہ میں
جنس نازک کی اس مظلومیت کا تذکرہ بتاتا ہے کہ قرآنی نقطۂ نظر سے یہ واقعہ بھی ایام قیامت کے
جانگسل، روح فرسا حوادث کا ہم پلہ وہم وزن اور اہمیت میں ان ہی کے مساوی ہے، لاتعداد بیشمار
جرائم اور گناہوں کے مقابلہ میں اس موقعہ پر عرب جاہلیت کے صرف اسی ظلم کی وجہ بھی کیا ہو سکتی ہے
اور ایک یہی کیا، عرب کی جاہلی زندگی میں جن فریب کاریوں سے مرد عورتوں کے حقوق کو پامال کرتے
تھے ان کی فہرست یقیناً بہت طویل ہے۔ [1]

[1] خود قرآن میں بھی اس سلسلہ کی بعض چیزوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جن میں ایک دلچسپ چال یہ بھی تھی
کہ جن جانوروں کا گوشت عرب کھاتے تھے مثلاً بھیڑ بکریاں وغیرہ ان کے متعلق قرآن میں ہے کہ وہ
کہتے تھے کہ زندہ بچے ان کے پیٹ سے جو پیدا ہوں وہ صرف مردوں کے لئے ہیں، ہاں! مردہ بچوں کے گوشت
میں مانتے تھے کہ عورتوں کا بھی حق ہے کہتے تھے ما فی بطون هذه الانعام خالصة لذكورنا
ومحرم على ازواجنا (سورۂ انعام) اس جاہلی دستور کی جو تشریح تفسیر کی کتابوں میں کی گئی ہے اس سے
معلوم ہوتا ہے کہ نر بچوں کے متعلق کہتے تھے کہ ان پر مردوں کا حق ہے، اسی لئے نر بچوں کو ذبح کر کے صرف مرد کھا جاتے
تھے، اور مادہ بچے جب پیدا ہوتے تو عورتوں سے کہا جاتا کہ ان کو اگر ذبح کر دیا جائے گا تو مویشیوں کا سلسلہ ہی گھر میں
ختم ہو جائے گا۔ یوں زندہ بچوں کے گوشت سے عورتیں ہمیشہ محروم رہتی تھیں، اتفاقاً مردہ بچہ اگر پیدا ہوا تب اسکے گوشت میں
بھی عورتیں شریک ہو سکتی تھیں ۱۲

لیکن باوجود ان مظالم کے بیوہ عورتوں کو آئندہ نکاح کے قانونی حق سے قطعی طور پر محروم ٹھہرانے کا فیصلہ عرب کے ان جاہلوں نے بھی نہیں کیا تھا ظلم کا یہ پہاڑ اس صنفِ نازک و ضعیف پر اسی ملک میں توڑا گیا' جہاں کی عورتیں مردہ شوہروں کے ساتھ جل کر اپنی غیر معمولی وفاداریوں[1] کا ثبوت پیش کر رہی تھیں گویا ان ہی وفاداریوں کا صلہ یہ تھا کہ عرب کے جاہلوں کی زندہ درگور لڑکیوں سے بدتر حال میں اس ملک کے مردوں نے یہاں کی عورتوں کو ہزارہا ہزار سال سے تڑپنے اور پھڑکنے کے لئے چھوڑ رکھا تھا۔[2] سچ تو یہ ہے کہ قبر میں دفن ہو جانے کے بعد زندہ رہنے کی صورت ہی کیا باقی رہتی ہے' اسی لئے میں تو کہتا ہوں کہ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کے جرم کے واقعی مجرم حقیقی معنوں میں درحقیقت ہمارے ملک کے باشندے تھے' اور ان میں کتنے اب بھی ہیں جن کو اپنے جرم پر اس وقت تک شرافت کا دھوکہ لگا ہوا ہے' اور تعجب اس امت پر ہے جو جاہلیت سے نکالنے ہی کے لئے برپا کی گئی تھی' اس ملک میں پہنچ کر اس نے بھی اپنی معیاری زندگی میں اسی کالے' بدترین کالے ظالمانہ گناہ کو شریک کر لیا' اور ایسا معلوم ہوتا ہے' کہ ہندی رسم ورواج

---

[1] ستی کی رسم بھی شاید عقد بیوگان کی ممانعت کی طرح ہندوستان کی خاص ملکی رسم تھی۔ ہندی خواتین کے جذبہ مہر و وفا کو اس رسم کا منشا ٹھہراتے ہوئے ایک صاحب اس ظالمانہ انسانیت سوز رسم کی داد دے رہے تھے' میں نے عرض کیا کہ "مہر و وفا" کے لئے کیا صرف غریب عورت پیدا ہوئی ہے۔ محبت والفت ہی کا تقاضا یہ تھا تو چاہئے تھا کہ مرد بھی بیوی کے مر جانے کے بعد اس کے ساتھ جل جاتا۔ لیکن یک طرفہ معاملہ خود بتا رہا ہے کہ عرب کے جاہل دھوکہ دے کر عورتوں سے جیسے کھیلتے رہتے تھے۔ اسی قسم کی بازیگری مردوں کے جذبات سے ہندوستان میں عورتوں کے ساتھ روا رکھی تھی۔ ۱۲ (از بندہ محمد طیب غفرلہٗ) یہ وفاداری نہیں تھی بلکہ اس مظلومیت اور ذلت آمیز زندگی سے چھٹکارے کے لئے جو بیوگی کے زمانہ میں عورت کو گذارنا پڑتی تھی یہ جل جانا ایک مذبوحی حرکت ہوتی تھی۔ عمر بھر کے جلاپے سے بچنے کیلئے وہ ایک ساعت کا جلاپا بہتر سمجھتی تھیں۔ [2] خود اس ملک میں بھی دختر کشی کی کب کمی تھی۔ پیدا شدہ لڑکیاں گلا گھونٹ کر اور بعض اوقات افیون نال پیدا شدہ لڑکی کے منہ میں رکھ کر زہر سے ماری جاتی تھیں۔ برطانیہ کی حکومت نے سرکاری قوت سے اس رسوم قبیحہ کو بند کیا ہے۔ پس ہندوستان عورت کی تذلیل و توہین اور بیخ کنی میں عرب سے کہیں آگے تھا۔ عرب میں عورت کی مظلومیت اور اس کی بیخ کنی کی رسوم بد کو حضرت خاتم الانبیاء صلعم کی نبوت کی روشنی نے ختم کیا اور ہند میں نائبان رسول نے عورت کی گلو خلاصی کے لئے مساعی جمیلہ انجام دیں جن میں حضرت قاسم العلوم قدس سرہ نے تو اس مسئلہ کو اپنی زندگی کے نصب العین کا جزو اعظم بنا لیا تھا۔ ۱۲ محمد طیب غفرلہٗ

اور دوسری خصوصیتوں کو تو مسلمانوں نے آہستہ آہستہ اختیار کیا، لیکن جنوبی ہند میں مسلمانوں کی آمد کا تذکرہ کرتے ہوئے خافی خان نے جو یہ لکھا ہے کہ

"دہ شادی وکد خدائی بہ طور پیروی آن جماعت (یعنی ہنود) بہ عمل می آوردند"

پھر اس کی اطلاع دیتے ہوئے کہ اسلامی دنیا کے کسی حصہ میں اس رسم بد کا رواج نہیں ہے، بلکہ

"وارثان آنہا نیز در بعقد کفو می آرند"

اپنے زمانہ یعنی عہد محمد شاہی تک کے متعلق یہ خبر دی ہے کہ

"در ہندوستان کہ میان شرفائے اسلام کہ مراد از اصل مشائخ عرب ست این عمل (عقد بیوگان) در ہندوستان قبیح وعیب دانستہ ترک روبہ آبا واجداد را کہ موافق حکم خدا و مطابق شرع محمدی ست نمودہ اند"

مسلمانوں نے اس ملک میں آباد ہو جانے کے بعد اس طریقہ کو کیوں اختیار کیا۔ اس کی توجیہ کرتے ہوئے خافی خان نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوؤں کا حال یہ ہے کہ

"اگر دختر شیر خوارہ را بہ عقد کسے در آرند، و شوہر ہماں شب اول بمیرد باز بہ نکاح دیگرے نمی آرند"

اور یہ بیان کرکے کہ شرافت ونجابت کا دار مدار ہندوستان میں چونکہ اسی رسم پر ہے، اور بقول خافی خاں کے عام قاعدہ ہے کہ

"چوں شرفا ہر قوم را بہ اشراف ہر دیار ہم جنسی بہ میان می آید، بہ تقاضائے غیرت کہ ما از چہ راہ کمتر ازیں جماعت باشیم تبعیت ایں رسم را سرمایہ آبرو وغیرت ونشان شرافت ونجابت دانستہ ترک روبہ بزرگان سلف نمودہ اند"

خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان میں شرافت ونجابت کا معیار چونکہ عموماً یہی قرار پا گیا تھا کہ بیوہ ہونے کے بعد کسی دوسرے مرد کا منھ عورت نہ دیکھے، اسی لئے مسلمانوں نے بھی اپنی شرافت کا معیار اسی کو ٹھیرا لیا، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] اس وقت

اس مسئلہ کے متعلق دلوں میں کچھ اصلاحی خیالات ابھرنے لگے تھے۔ کیونکہ آخر میں اپنے تاثرات کا اظہار بھی ان الفاظ میں کیا ہے،

"اگرچہ ایں طریقہ عقلاً و شرعاً محمود نیست و دریں ضمن مفسدہ بسیار حاصل می گردد کہ بہ توضیح آں نہ پرداختن اولیٰ" ص ج ۲

اور یہی وہ زمانہ ہے، جب مسلمانانِ ہند کو چونکاتے ہوئے منجملہ دوسری باتوں کے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

"یکے از عادت شنیعہ ہندوآں ست کہ چوں شوہر زنے بمیرد نگذارند کہ آں زن شوہر دیگر کند"

اور یہ بتاتے ہوئے کہ

"ایں عادت اصلاً در عرب نبود، نہ قبل از آں حضرت و نہ در زمان آنحضرت، و نہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم"

ان تمہیدی امور کے بعد شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مسلمانانِ ہند کو وصیت کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ یہ عبارت ان کے وصیت نامہ ہی کی ہے۔ مگر رسم و رواج نے مسلمانوں کے اندر بھی اس بری عادت کو اس حد تک مستحکم کر دیا تھا، کہ بجائے وصیت کے بے ساختہ اس موقعہ پر وہ دعا میں مشغول ہو جاتے ہیں کچھ کہنے سننے کی جگہ فرماتے ہیں۔

"خدا تعالیٰ رحمت کند بر آں کس کہ ایں عادت شنیعہ را متلاشی سازد"

جس سے یوں بھی شاہ صاحب کی بے بسی کا اندازہ ہوتا ہے، نیز آگے ان ہی کے ان فقروں سے کہ

اگر ممکن نباشد کہ از عموم ناس مرتفع شود، درمیان قوم خود اقامت ایں عادت عرب باید کرد و اگر ایں نیز ممکن نباشد ایں عادت را قبیح باید دانست در دل

اور اگر عام مسلمانوں سے اس رسم کا ازالہ ممکن نہ ہو تو چاہئے کہ خود اپنے کنبہ میں عرب کی اس عادت کو جاری کیا جائے، اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو، تو اس عادت کو چاہئے کہ دل سے برا سمجھا جائے۔

دشمن آں باید بود کہ ادنیٰ مراتب نہی منکر ہمیں ست صفحہ ۱۳۱ وصیت نامہ | اور اس کا دشمن بن جانا چاہئے کہ بری بات کے انسداد کا یہی آخری درجہ ہے۔

میں نے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب سے ان کی پوری عبارت اسی لئے نقل کی ہے کہ اس رسم بد کی گرفت کی سختی جس حد تک ہندوستان کے مسلمانوں میں پہنچ چکی تھی اس کو ان کے مذکورۂ بالا الفاظ سے ہم سمجھ سکیں، ان کا دل تڑپ رہا تھا چاہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کو اس کے ترک پر آمادہ کریں لیکن حالات ان کے سامنے ایسے تھے کہ بظاہر کامیابی سے کچھ ناامید نظر آتے ہیں اسی لئے آخر میں دل سے برا جاننے کی آخری تدبیر کے استعمال تک وہ اتر آئے ہیں، اور اسی سے امیر شاہ خان مرحوم کی ان روایتوں کی بھی تصدیق ہوتی ہے، جنھیں مسئلہ عقد بیوگان کے سلسلہ میں ہم ارواح ثلاثہ میں پاتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی نانیہالی قصبہ پھلت کے مستند بزرگوں کے حوالہ سے امیر شاہ خاں یہ روایت کرتے تھے کہ مولانا اسماعیل شہید جیسا کہ معلوم ہے حضرت شاہ ولی اللہ کے پوتے ہیں، مولانا شہید کی ہمشیرہ کا عقد گھر ہی میں مولانا رفیع الدین ابن شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے مولوی عبدالرحمن صاحب سے ہوا تھا، لیکن کچھ ہی دن بعد مولوی عبدالرحمن صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اور مولانا اسماعیل شہید کی ہمشیرہ صاحبہ بیوہ ہو گئیں، اب سنئے خود شاہ ولی اللہ کے گھرانے کا یہ قصہ ہے، مولانا اسمٰعیل کا یہ بیان امیر شاہ خان نے نقل کیا ہے کہتے تھے کہ

"جب میں اپنی بہن کو مشکوٰۃ وغیرہ پڑھاتا تھا، تو نکاح ثانی کے فضائل قصداً چھوڑ دیتا تھا کہ مبادا میری بہن کو ترغیب ہو، اور وہ نکاح کرے" صفحہ ۹۹ ارواح

عقد بیوگان کے مسئلہ میں خانوادہ ولی اللہی کے احساسات کی نزاکتوں کا یہ حال تھا، تو اسی سے سمجھنا چاہئے کہ ہندوستان کے عام مسلمانوں کی ذہنیت اس باب میں کیا ہی ہوگی، یا کیا ہو سکتی تھی۔

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کراہتے ہوئے دل کی دعا قبول ہوئی اور

حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اس رحمت کے مستحق ہوئے جس کی دعا شاہ صاحب نے مانگی تھی، یہ قصہ کافی طویل ہے، سیرت سید احمد شہید میں اس کی تفصیلات پڑھئے، امیر شاہ خان کہا کرتے تھے کہ مولانا اسماعیل شہید سے کسی نے پوچھا کہ اپنے چچا شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر سے زیادہ سید احمد صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ سے گرویدگی کی وجہ آپ کیلئے کیا ہوئی؟ تو جواب میں اسی کا حوالہ دیا کہ ان کی صحبت میں یہ جرأت مجھ میں پیدا ہوئی کہ اپنی بیوہ بہن کا عقد دوسرے کر دیں سے تجدید کرادیا۔ جس کی تفصیل خاں صاحب ہی یہ بیان کرتے تھے کہ پھلت میں "عقد بیوگان" کی طرف مسلمانوں کو ایک دن برسر منبر مولانا اسماعیل شہید توجہ دلا رہے تھے کہ مجمع میں کسی نے عرض کیا کہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں، مولانا شہید سمجھ گئے، اور منبر سے اتر گئے، فرمایا کہ جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو، پھر پوچھنا، یہ کہتے ہوئے سیدھے پھلت سے دلی پہنچے، اور اپنی بیوہ بہن کے قدموں پر عمامہ ڈال دیا، اور گڑگڑا کر عرض کرنے لگے کہ

"تم چاہو تو میں وعظ کہہ سکتا ہوں، ورنہ نہیں کہہ سکتا۔"

وہ بے چاری حیران تھیں کہ قصہ کیا ہے تب کھلے کہ تمہارے عقد نہ کرنے کی وجہ سے میری دعوت بے اثر ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ مولانا شہید کی ہمشیرہ صاحبہ حالانکہ بیمار تھیں، اور نکاح کی صلاحیت بھی ان میں باقی نہیں رہی تھی، لیکن بھائی کے اصرار سے راضی ہوگئیں، اور پھلت ہی کے مشہور عالم سید شہید کے رفیق مخلص مولانا عبدالحئی سے ان کا نکاح کر دیا گیا۔[1] واللہ اعلم بالصواب امیر شاہ صاحب کا یہ علم تھا، یا واقعہ یہی تھا کہا کرتے تھے کہ ہندوستان میں

"مولوی اسماعیل صاحب کی بہن کا نکاح ثانی سب سے پہلا نکاح ثانی تھا۔" ص۳۸

بظاہر اس کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ عقد بیوگان کی تحریک کا آغاز حضرت سید شہید اور ان کے رفقاء کی طرف سے ملک میں جب شروع ہوا تو اس سلسلہ میں مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ہمشیرہ صاحبہ کا

---

[1] بعینہ یہی صورت حال حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ کو بھی پیش آئی ہے اور انہوں نے بھی اپنی بڑی بہن کا نکاح اسی طرح کر کے اس دعوت (نکاح بیوگان) میں قوت پیدا کی تھی۔ (محمد طیب غفرلہٗ)

عقد ثانی پہلا عقد ثانی تھا۔ گویا اس رسم بد کے ازالہ کے سلسلے میں یہ پہلا تاریخی نمونہ تھا۔

ارواح ثلاثہ وغیرہ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید شہید رحمۃ اللہ علیہ کے زیر اثر علماء کا ایک طبقہ عقد بیوگان کی کوششوں میں بہک اور مشغول ہوگیا تھا، کوئی بے چارے مولوی عبدالرحیم صاحب تھے وہ تو "رانڈوں کی شادی والے" مولوی کے نام ہی سے مشہور ہوگئے تھے (دیکھو ارواح ثلاثہ ص۵۲) اس سلسلہ میں مولوی محبوب علی دہلوی مرحوم کا نام بھی خاص طور پر لیا جاتا ہے[1]۔ مگر یا ایں ہمہ نسلاً بعد نسل کی راسخ رسم جو دلوں کی گہرائیوں میں پشتہا پشت سے جاگزیں تھی، اس کی جڑوں کا نکالنا آسان نہ تھا، اور تو اور یہی دیوبند کا قصبہ جہاں آج دارالعلوم ہے، اسی کا ایک قصہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اسی سلسلہ میں نقل کیا ہے، لکھا ہے کہ پھلت کے ایک عالم باعمل مولانا وحیدالدین مرحوم تھے، وعظ ان کا عام طور پر مقبول تھا، خصوصیت کے ساتھ دیوبند کے شیخ زادوں میں غیر معمولی احترام کے ساتھ دیکھے جاتے تھے، ان کی اصلاحی باتیں عموماً لوگ مان لیتے تھے۔ ایک دن دیوبند ہی میں وعظ کہتے ہوئے، مولوی وحیدالدین بے چارے نے عقد بیوگان کے مسئلہ کا ذکر بھی چھیڑ دیا، کہتے ہیں کہ ابھی تمہید ہی شروع ہوئی تھی کہ مجلس سے قصبہ کے ایک رئیس شیخ زادے صاحب اٹھ کھڑے ہوئے، اور منبر کے پاس بے ساختہ دوڑتے ہوئے پہنچے، مولوی صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا، اور برسر مجلس ڈانٹتے ہوئے بولے کہ

"بس مولوی صاحب اس مضمون کو مت بیان کرو" منہ

---

[1] ابتدا میں حضرت سید شہید کی جہادی مہم میں یہ بھی شریک تھے۔ لیکن بعد میں اپنے بعض اختلافی نقاط نظر کی وجہ سے دہلی واپس آگئے تھے، ارواح ثلاثہ میں ان ہی کے کردار کے ایک غیر معمولی نمونہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ غدر کے ہنگامہ میں کہتے ہیں کہ مولوی صاحب کا فتویٰ تھا کہ حکومت قائمہ کے خلاف شورش وبغاوت جائز نہیں ہے جب ہنگامہ فرو ہوا تو اپنے اس فتوے کے صلہ میں انگریزی حکومت کی طرف سے گیارہ گاؤں کا وثیقہ پیش ہوا کہ تمہاری جاگیر میں حکومت کی طرف سے عطا ہوئے ہیں۔ لکھا ہے کہ وثیقہ کو لے کر اسی انگریز افسر کے سامنے مولوی صاحب نے پھاڑ دیا۔ جس نے وثیقہ پیش کیا تھا، غصہ میں کہہ رہے تھے کہ میں نے جو کچھ کیا تمہارے لئے نہیں کیا تھا بلکہ میرے نزدیک مسئلہ کی شکل یہی رہی تھی۔ ص۱۲۳ ارواح

بیان کیا ہے، کہ بے چارے مولوی صاحب مرحوم دم بخود ہوکر رہ گئے، کیونکہ مجلس میں کسی کی زبان سے یہ نہ نکلا کہ شیخ صاحب یہ کیا کر رہے ہو، گویا ساری مجلس شیخ صاحب ہی کی موید اور ہم نوا تھی،

بہرحال یہ اور اس قسم کے بیسیوں واقعات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ "عقد بیوگان" کی اس تحریک کی مخالفت میں بدبخت مسلمانوں کی طرف سے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا تھا، حتی کہ سید شہید کی جہادی مہم کی ناکامی تک میں معلوم ہوتا ہے کہ منجملہ دوسرے اسباب کے "عقد بیوگان" کے سلسلے کی کش مکش کو بھی دخل تھا۔ تاہم حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی دعا، اندر ہی اندر اپنا کام کرتی چلی جاتی تھی، سید شہید اور ان کے رفقاء کے بعد جیسا کہ ہمارے مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، اضلاع سہارنپور و مظفر نگر وغیرہ میں سیدنا الامام الکبیر کے استاذ حضرت مولانا مملوک علی اور کاندھلہ کے مشہور بزرگ مولانا مظفر حسین رحمۃ اللہ علیہ حسن تدبیر کے ساتھ اس تحریک کو آگے بڑھانے میں مشغول رہے، مولانا مظفر حسین کاندھلوی کا ذکر اپنی کتاب میں کرتے ہوئے وہی فرماتے ہیں کہ

"بیواؤں کے نکاح کی بنا ان اطراف میں اولاً ان ہی سے ہوئی، اور دالد مرحوم (مولانا مملوک علی صاحب) نے اس کو نہایت خوبصورتی سے اجرا فرمایا" صـ ۳۱

اور ان بزرگوں کے بعد، جیسا کہ مصنف امام ہی نے اطلاع دی ہے کہ

" ان دونوں بزرگواروں (مولانا مظفر حسین و مولانا مملوک علی) کے قدم قدم حضرت مولانا (سیدنا الامام الکبیر) نے اس کو پورا شائع کیا" صـ ۳۱

ان کی اس تاریخی شہادت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ "خدا رحمت کنا د براں کس کہ ایں عادت بشنیعہ را مستلاشی سازد" اس ولی اللہی دعا اور تمنا کی تکمیل بالآخر سیدنا الامام الکبیر کی ذات بابرکات پر ہوئی۔ "اس کو پورا شائع کیا" ہمارے مصنف امام کی یہ شہادت تو اجمالی الفاظ میں ادا ہوئی ہے، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اس اجمال کی تھوڑی تفصیل بھی کی ہے، اس کا ذکر

کرتے ہوئے کہ

"نکاح ثانی بیوگان کو ایسا برا اور سخت عیب سمجھتے تھے کہ کرنا تو کرنا' اگر کوئی نام بھی لے لیتا تھا' تو مارنے مرنے کو مستعد ہو جاتے تھے۔"

ان ہی حالات میں ان کا بیان ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے اپنے استاذ اور بزرگوں کے نقش قدم پر اس سلسلہ میں جدوجہد شروع کی' مواعظ و خطبات میں مسلمانوں کو اس طرف توجہ دلانے لگے' لکھا ہے کہ

"اوّل اوّل لوگوں کے کانوں میں جو نئی بات پڑی' تو چونکے' اور گھر گھر اس کا چرچا ہوا۔"

یہ بھی ان ہی کا بیان ہے کہ

"اور بعض بعض نے خلاف میں منصوبے گانٹھے۔"

واللہ اعلم بالصواب یہ کون لوگ تھے اور اضلاع سہارنپور و مظفر نگر کے کن مقامات کے رہنے والے تھے' بظاہر دیوبند اور نانوتہ ہی کے باشندے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر باوجود ان منصوبوں کے حضرت والا نے پوری استقامت کے ساتھ اپنے کام کو جاری رکھا' ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ مردوں کو سیدنا الامام الکبیر نے چمکار چمکار کر مانوس بنایا۔ لیکن ظاہر ہے کہ مردوں کے خیال میں تبدیلی پیدا بھی ہوئی تو کیا۔ رسم ورواج کی غیر معمولی تاثیری قوت کا نتیجہ یہ تھا کہ مردوں سے زیادہ خود عورتوں میں "عقد ثانی" کا خیال عفت و ناموس کے لئے داغ بن چکا تھا' کسی عورت کے لئے اس کا سوچنا بھی اس کے نزدیک گناہ اور پاپ بنا ہوا تھا' مردوں کے بعد ضرورت تھی کہ عورتوں کے اندر رسم ورواج کے پیدا کئے ہوئے غلط جذبات اور جھوٹے احساسات کا قلع قمع کیا جائے' اور یہی حکیمانہ تدبیر حضرت والا نے اختیار کی۔ مردوں کے مجالس کی تقریروں کے بعد اسی کتاب میں لکھا ہے کہ

"نوبت یہاں تک پہنچی کہ مستورات میں وعظ ہونے لگے' اور بیواؤں کے کانوں تک

مضامین نکاح ثانی پہنچنے لگے"۔

اور اس سلسلہ میں جدوجہد آپ کی اس نقطہ تک بقول ان کے پہنچ گئی کہ

"کوئی بیوہ، اور وارث بیوہ، ایسا نہ رہا جس کے کان تک نکاح ثانی کے فضائل نہ پہنچے ہوں"۔

الغرض آپ کی تبلیغ کا جو میدان تھا، اس میں اندر ہو یا باہر اپنی آواز آپ نے پہنچادی، اور یہ کوشش تو قول اور گفتار کے سلسلہ میں تھی، لیکن آپ سن چکے کہ کہنے سے پہلے جس کی عادت بھی تھی کہ جو بات دوسروں سے کہی جائے، پہلے خود کر کے دکھلادی جائے خصوصاً اس مسئلہ میں نفسیاتی طور پر اس کی زیادہ ضرورت تھی، سوانح مخطوطہ کے مصنف ہی نے یہ لکھتے ہوئے کہ

"جب مولانا نے اول اس کام کا بیڑا اٹھایا، تو کسی کو اس کی امید نہ تھی کہ یہ کام چل نکلے گا"۔

پھر وہی اطلاع دیتے ہیں کہ چل نکلنے کے لئے ترکیب یہ اختیار کی گئی کہ وہی دیوان جی حاجی محمد لیین مرحوم، حضرت والا جن کو اپنا ہاتھ پاؤں کہتے تھے، اور علاوہ برادری کے غیر معمولی محبت و اخلاص نے جنہیں آپ کے گھر کا رکن خصوصی بنا دیا تھا۔ ان کی ایک بیوہ بہن تھیں حضرت نے ان ہی کو آمادہ کیا کہ اپنی بہن کا عقد ثانی کر دیں۔ لکھا ہے کہ

"اول میاں محمد لیین صاحب کی بیوہ ہمشیرہ کا نکاح ثانی ہوا"۔

اور صرف ہمشیرہ ہی نہیں بلکہ دوسری جگہ وہی یہ بھی اطلاع دیتے ہیں کہ حاجی لیین مرحوم کی

"ایک بھاوج بیوہ کا نکاح ثانی بھی کرایا"۔

سوانح مخطوطہ کے مصنف کا بیان ہے کہ حاجی محمد لیین مرحوم

"چونکہ اپنی قوم میں عالی نسب ہیں، اس لئے ان کا یہ فعل زیادہ مؤثر ہوا"۔

اور دیوان جی ہی کے پیش کئے ہوئے عملی نمونوں کو کافی قرار نہیں دیا گیا۔ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں جب عقد بیوگان کی تحریک زور شور کے ساتھ

جاری تھی، یہ اتفاقی واقعہ پیش آیا کہ سیدنا الامام الکبیر کی

"ہمشیرہ اسی عرصہ میں بیوہ ہوگئیں"

یہ بھی ان ہی کا بیان ہے کہ آپ کی یہ بیوہ ہوجانے والی ہمشیرہ صاحبہ حالانکہ اولاد والی تھیں لیکن قدرت کی طرف سے اپنے گھر کی طرف سے ایک عملی مثال کے پیش کرنے کا موقعہ سیدنا الامام الکبیر کے سامنے آگیا۔ اور ٹھیک جیسے حضرت مولانا اسماعیل شہید نے اپنی بہن کا عقد کرکے قول کو فعل کے مطابق کرکے دکھایا تھا، سیدنا الامام الکبیر نے بھی جو کچھ دوسروں سے فرما رہے تھے خود کرکے دکھایا اور آل واولاد رکھنے والی اپنی بہن کو عقد ثانی کرنے پر آپ نے راضی فرما لیا، اور ان کا نکاح ہوگیا [1]

---

[1] اس کا تفصیلی واقعہ جو میں نے اپنے بزرگوں سے بمرات ومرات سنا ہے بعینہ اسی انداز کا ہے جو حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ دیوان میں نکاح بیوگان کا وعظ فرما رہے تھے، اثنا وعظ میں شیوخ میں سے ایک صاحب کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ حضرت انداز سے سمجھ گئے کہ وہ بطور اعتراض میری بہن کی بیوگی اور عدم نکاح کا ذکر کریں گے۔ فرمایا کہ آپ ذرا ٹھیریں مجھے ایک ضرورت پیش آگئی ہے میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔ یہ کہہ کر حضرت وعظ کی چوکی پر سے اترے اور گھر میں تشریف لے گئے مجلس اپنی جگہ جمی رہی۔ گھر میں پہنچ کر اپنی بیوہ بہن سے جو عمر میں بڑی تھیں اور کافی ضعیف ہوچکی تھیں پیر پکڑ کر بلجاجت سے عرض کیا کہ آپ کی ایک ہمت سے ایک سنت رسول زندہ ہوتی ہے اور میں احیاء سنت کے قابل ہوسکتا ہوں۔ بہن نے گھبرا کر کہا کہ بھائی ایسی کیا بات ہے میرے پیر تو چھوڑ دو میں کہاں اس قابل کہ کسی سنت رسول کے احیاء کا سبب بنوں؟ فرمایا کہ آپ نکاح فرمالیں، اس پر بہن نے کہا کہ بھائی تم دیکھ رہے ہو کہ میں ضعیف ہوچکی ہوں سر سفید ہوچکا ہے نکاح کی عمر نہیں ہے۔ فرمایا سب صحیح ہے مگر یہ نکاح محض عقد بیوگان کی سنت کے احیاء کے لئے ہوگا، کسی طبعی ضرورت کی بنا پر نہیں۔ اس پر بہن راضی ہوگئیں اسی وقت گھر ہی میں حضرت نے نکاح پڑھا اور نکاح سے فارغ ہوتے ہی باہر تشریف لائے۔ مجلس وعظ اسی طرح جمی ہوئی تھی۔ حضرت نے بقیہ وعظ شروع فرمایا۔ وہ معترض تو اعتراض کی ٹھانے ہی ہوئے تھے پھر کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ مجھے کہنا یہ ہے کہ آپ تو نکاح بیوگان کا وعظ فرما رہے ہیں اور آپ ہی کے گھر میں آپ کی بہن بیوہ بیٹھی ہوئی ہے؟ فرمایا کون کہتا ہے کہ وہ بیٹھی ہیں ان کے نکاح کے گواہ تو اس مجلس میں بھی موجود ہیں۔ چنانچہ گواہوں نے گواہی دی کہ ان کا نکاح تو ہماری موجودگی میں ہوا ہے اس پر تمام جلسہ متاثر ہوا اور اسی مجلس میں تقریباً پچاس ساٹھ نکاح ہوئے اور پھر یہ تحریک نہایت قوت سے آگے چلی۔

محمد طیب غفرلہ

ظاہر ہے کہ جہاں گفتار کردار کا قالب ان شکلوں میں اختیار کر رہا تھا۔ وہاں اگر یہ صورت پیش آئی ہو، جیسا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف کا بیان ہے کہ

"پھر تو اس دھوم دھام سے نکاح (ثانی) ہونے لگے، جیسے کنواری لڑکیوں کے"

ہمارے مصنف امام نے سیدنا الامام الکبیر کے متعلق جو یہ خبر دی تھی کہ "عقد بیوگان کی عام اشاعت ان ہی کی بدولت ہوئی" اس کا مطلب یہی تھا کہ عزت و ناموس کے منافی بیوہ عورتوں کے عقد کو جو معیوب سمجھا جاتا تھا، اس غلط نالائق خیال کا ازالہ ہو گیا، بقول مصنف سوانح مخطوطہ

"یہ تو نہیں کہ سب بیواؤں کا نکاح ہو گیا، مگر جو روگ دل کے اندر تھا کہ نکاح ثانی کو ننگ کٹی اور شرافت کے خلاف سمجھتے تھے وہ دور ہو گیا اور عیب نہ رہا۔" صلا

اس میں شک نہیں کہ بیان کرنے والوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ بیان کیا ہے، زیادہ تر اس کا تعلق اسی علاقہ کے مسلمانوں سے ہے۔ جس میں سیدنا الامام الکبیر نے اپنی تحریک جاری کی تھی، لیکن دارالعلوم دیوبند کے قائم ہو جانے کے بعد سارے ہندوستان میں پڑھ پڑھ کر علماء جو پھیلے آگے ان کی اور ان کے زیر اثر شخصیتوں کی بدولت ہمارے زمانے تک عقد بیوگان کے رواج میں کافی وسعت پیدا ہو چکی ہے۔[1]

[1] میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں اس رسم بد کے ازالہ میں جو کچھ کام ہوا براہ راست دارالعلوم دیوبند اور ان کے ہم خیالوں ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے، بلکہ حضرت سید شہید کے ماننے والوں میں ایک طبقہ اہل حدیث کا جو پیدا ہو گیا تھا، اس کی طرف سے بھی کافی جد و جہد ہوئی۔ مولانا حالی کی مشہور نظم بیوہ کی مناجات وغیرہ کا بھی کافی اثر پڑا، عجیب بات ہے کہ مسلمان تو مسلمان پچھلے دنوں خود ہندوؤں میں بعض لوگ "بدھوا بواہ" کی تحریک کو لے کر کھڑے ہوئے اور گو مسلمانوں کی جیسی کامیابی تو ان کو نہیں ہوئی ہے لیکن قدرت کا پھر بھی یہ تماشا ہی ہے کہ جن کو دیکھ کر مسلمان اس مسئلہ میں بگڑے تھے، خود ان ہی میں اس ظالمانہ رسم کے خلاف تجویزیں سوچی جانے لگیں، اور تھوڑا بہت عمل بھی ہونے لگا۔ بہرحال اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دارالعلوم دیوبند اور اس کے زیر اثر حلقوں کا بھی اس اصلاح میں غیر معمولی حصہ ہے۔ بہار کے جس علاقہ میں خاکسار کا وطن ہے، یعنی ضلع پٹنہ کا مشرقی علاقہ جسے مگدھ یا مگدہ بھی کہتے ہیں، جہاں تک میں جانتا ہوں اس علاقہ کی سادات برادری میں سب سے پہلے موضع دسنہ جو مولانا سید سلیمان ندوی کا مولد و منشاء ہے، اسی گاؤں کے ایک بزرگ حافظ تجمل حسین مرحوم نے (باقی صفحہ ۱۶ پر)

کچھ بھی ہو، آج "حقوق نسواں" کے نام نہاد مغالطی عنوان کی راہوں سے احترام و اکرام کے پیدائشی حقوق سے صنف نازک کی محرومی کا جو عام کاروبار جاری وساری ہے، جن نسوانی خصوصیتوں کا ذکر بھی انسانی مجالس میں عورتوں کے ناموس و عزت پر ناپاک حملہ سمجھا جاتا تھا، شریف گھرانوں میں جن کا تصور بھی گناہ بن جاتا تھا۔ آج تصویروں اور مجسموں میں ان ہی کو نمایاں کرکرکے بازاری چیزیں فروخت ہورہی ہیں، تجارت کی گرم بازاری کا واحد ذریعہ زراندوزی کا عام طریقہ صرف یہی رہ گیا ہے کہ اپنی ماؤں بہنوں بیٹیوں کی عریانیوں کا تماشا دکھا دکھا کر خریداروں کی توجہ مال کی طرف پھیری جائے۔ صابن کی ایک ٹکیہ کے بیچنے کے لئے نسوانی عزت و ناموس کو داؤ پر چڑھانے والے چڑھا رہے ہیں۔

حریم عفاف کا ایک ایک سرمایہ لٹ رہا ہے، لٹایا جارہا ہے، لیکن رسوائیوں ہی کو یہ سمجھایا جاتا ہے کہ عورتوں کی آبرو و احترام کی ضمانت پوشیدہ ہے، جو چیز بجز کثافتوں کے اور کچھ نہیں ہے باور کرایا جارہا ہے کہ اسی سے جنس لطیف کی لطافتوں میں لطافتوں کا اضافہ ہوتا جارہا ہے، اور نوع انسانی کی پیدائش، نشوونما کا سارا بار جو تنہا اٹھائے ہوئی تھی، اسی غریب عورت پر شاید یہ بھی چاہا جارہا ہے کہ معاشی جدوجہد کا بوجھ بھی اسی پر لاد دیا جائے۔ مردوں کا بے غیرت طبقہ معاش کی ہلکی ذمہ داری کو بھی چاہتا ہے کہ اپنی پیٹھ سے جھٹک کر الگ ہوجائے۔

---

(گذشتہ صفحہ سے) عقد بیوگان کا عملی نمونہ اپنی بیوہ لڑکی کا عقد کرکے پیش کیا، اور حافظ صاحب مرحوم سیدنا الامام الکبیر کے خاص وابستوں میں تھے۔ ابتداء میں جیسا کہ اپنی کتاب کمالات رحمانی میں انہوں نے لکھا بھی ہے، حضرت والا ہی سے شرف بیعت بھی ان کو حاصل ہوا تھا، بعد کو حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مرادآبادی سے بھی مستفید ہوئے۔ اگرچہ حافظ صاحب مرحوم کا عملی نمونہ بھی اقدامی جرات کے لئے کافی نہ ہوا لیکن آج سے تقریباً پچیس تیس سال پہلے برادری کے ایک سربرآوردہ وکیل مولوی محمد حسین مرحوم جو حکومت بہار میں وزارت تعلیم کے عہدے سے بھی سرفراز ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی جوان بیوہ لڑکی کا عقد کرکے دوسروں کے لئے راستہ صاف کردیا، اور اب الحمد للہ کسی قسم کا مخمصہ اس علاقہ کے مسلمانوں میں عقد بیوگان کی طرف سے باقی نہیں رہا ہے، بغیر کسی ہچکچاہٹ کے وقتاً فوقتاً اس کی مثالیں آئے دن پیش آتی رہتی ہیں من سن سنۃ حسنۃ فلہ اجرھا واجر من عمل بھا کا قانون ہر منزل پر کام کرنے والوں کو انشاء اللہ کام دے گا۔ ۱۲

خدا ہی جانتا ہے کہ حق کے لباس میں "باطل" کا یہ طوفان بنی آدم کے گھرانوں میں جو مچل مچا رہا ہے اس کا آخری انجام کیا ہوگا؟

لیکن عورتوں ہی کے حقوق کا ایک پہلو یہ بھی تھا، جو نامعلوم زمانہ سے سرزمین ہند میں انتہائی ظالمانہ پامالیوں کا شکار رہا ہوا تھا، کسی شور اور ہنگامہ کے بغیر اس بے زبان طبقہ کے حقیقی بہی خواہوں نے چیرہ دستیوں کے آتشیں سمندر سے ان کو نکال لینے میں کامیابی حاصل کی، سچ پوچھئے تو عورتوں کے حقوق کے احیاء اور حفاظت کا صحیح طریقہ یا اسی قسم کی باتیں ہو سکتی ہیں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ جنس نسوانی کے نجات دہندوں میں ہمارے سیدنا الامام الکبیر قدس اللہ سرہ العزیز کا وجود بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان آبرو باختوں کا غوغائی شیوہ تو آپ نے کبھی اختیار نہیں فرمایا، جو عورتوں، عورتوں کے حقوق کی چیخوں سے کانوں کو بہرا بنائے ہوئے ہیں لیکن قدرت کے عطا کئے ہوئے حقوق جن کا ہر طبقہ جائز طور پر حقدار تھا، ان کی پامالی آپ کے لئے ناقابل برداشت تھی "عقد بیوگان" کے مذکورہ بالا کارنامہ کے سوا آپ کو یاد ہوگا، کسی موقعہ پر اس کا ذکر کر چکا ہوں، جلال آباد جو ضلع مظفر نگر کا مشہور قصبہ تھانہ بھون کے نواح میں ہے، اسی قصبہ کے مسلمان باشندوں کی اس بری رسم کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ

"وہاں لڑکیوں کا حق نہیں دیا جاتا"

سیدنا الامام الکبیر یہ فرمایا کرتے تھے کہ جلال آباد کے مسلمانوں کی جائداد کا خریدنا اسی لئے جائز نہ ہوگا، یہ روایت حضرت مرشد تھانوی کی قصص الاکابر میں پائی جاتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے حضرت والا کے اس فتوے کی بدولت اپنے شرعی حصہ کے پانے میں کتنی غریب لڑکیاں کامیاب ہوئی ہوں گی جہاں تک میں جانتا ہوں، کم از کم مظفر نگر سہارنپور وغیرہ روہیلکھنڈ کے عام اضلاع کی اسلامی بستیاں اس باغیانہ طرز عمل کی آلودگیوں سے پاک ہو چکی ہیں اور یہ دعویٰ مشکل ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے نقطۂ نظر کو تطہیر کے اس عمل میں دخل نہ تھا، عرض کر چکا ہوں کہ وراثت کے مسئلہ میں بھی حسب دہی بلکہ اس سے بھی زیادہ کر کے آپ دکھا چکے تھے، جسے مسلمانوں کی زندگی میں آپ دیکھنا چاہتے تھے،

تو جیسے "عقد بیوگان" کے قولی وعظ کے ساتھ آپ کا عملی نمونہ اثر انداز ہوا۔ اسی طرح وراثت کے باب میں بھی آپ کے طریقۂ عمل کی پیروی لوگ کیوں نہ کرتے۔

بہر حال داخلی اصلاحات کے سلسلے میں جیسے عقد بیوگان کے مسئلہ میں سیدنا الامام الکبیر خانوادہ ولی اللٰہی کے تقاضے سے متاثر تھے اور ولی اللٰہی طریقہ کے بزرگوں ہی کے کام کی آپ نے تکمیل فرمائی تھی، اسی طرح جیسا کہ چاہئے بھی تھا دوسرے شعبوں میں بھی اسی خاندان کے دینی احساسات سے آپ کی اثر پذیری ایک قدرتی بات تھی، اسی خاندان کے تعلیم یافتہ بزرگوں کے حلقہ میں آپ کی علمی اور عملی صلاحیتیں بروئے کار آئی تھیں، قلب مبارک خانوادۂ ولی اللٰہی کے اکابر کی عظمت و احترام سے معمور تھا، خود شاہ صاحب رحمہ اللہ کا اور آپ کے تینوں صاحبزادوں، مولانا شاہ عبدالعزیز، مولانا شاہ عبدالقادر، مولانا رفیع الدین کا ذکر جس غیر معمولی عقیدت و ادب کے ساتھ آپ کیا کرتے تھے۔ اسی سے آپ کے دل کی کیفیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اپنی کتاب ہدیۃ الشیعہ میں شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا نام جہاں کہیں آپ نے لیا ہے، وہاں

"حجۃ اللہ فی العالمین، خاتم المحدثین والمفسرین عمدۃ المتکلمین زبدۃ الناظرین مولنا شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمۃ" صلا

یا قریب قریب اسی قسم کے الفاظ بے ساختہ آپ کے قلم سے نکلتے چلے گئے ہیں اور یہی حال ان کا دوسرے بھائیوں کے متعلق تھا۔ بقول امیر شاہ خان مرحوم جیسا کہ ارواح ثلاثہ میں ہے واقعہ یہ ہے کہ

"ولی اللٰہی خاندان کے ایک ایک فرد سے محبت اور فدائیت تھی" ص۱۵۱

لیکن ان ولی اللٰہی بزرگوں میں آپ کی خصوصی محبت و عقیدت کا مرکزی محور جیسا کہ دیکھنے والوں نے نقل کیا ہے، حضرت مولنا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی مبارک ہستی تھی، امیر شاہ خاں مرحوم تو کہا کرتے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر کو

"مولنا شہید سے عشق تھا" ص۱۵۱

اور مشہور قاعدہ من احب شیئاً اکثر ذکرہ (جس چیز سے آدمی کو محبت ہوتی ہے اس کا ذکر بھی وہ زیادہ کرتا ہے) کو پیش نظر رکھتے ہوئے عشق کے اس دعوے کے ثبوت میں خان صاحب مرحوم حضرت والا کی اس عادت کا بھی تذکرہ کیا کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ حضرت نانوتوی کا حال یہ تھا کہ مولانا اسماعیل شہید کا آپ کی مجلس میں

"کسی نے تذکرہ چھیڑا تو اس کی بات کاٹ کر خود ان کا تذکرہ شروع کر دیتے تھے"

سچ پوچھئے تو مولانا شہید کی علمی و عملی خصوصیات کے سوا اس غیر معمولی تعلق میں جہاں تک میرا خیال ہے

قاعدہ ہے کہ الجنس الی الجنس یمیل

کا قانون بھی کارفرما تھا۔ سیدنا الامام الکبیر کی ابتدائی زندگی کے حالات میں پڑھ چکے کہ ایک مدت زیادہ بزرگوں کو ایام طفولیت ہی میں نظر آگیا تھا کہ جیسے سیدنا الامام الکبیر کے طالع اور جبین میں چمکتے ہوئے نظر آتے تھے خود آپ کے استاد مولانا مملوک علی "ہمارے اسماعیل" کے لقب سے ان دونوں بزرگوں کی باہمی مناسبت اور فطری تشابہ کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔

ایسی صورت میں مسلمانان ہند کے داخلی اصلاحات کی فہرست دونوں بزرگوں کی اگر ایک ہو تو یہی ہونا بھی چاہئے تھا اور عام طور پر یہی کہا بھی جاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جن نئے حالات اور مؤثرات نے جہاں تک میرا خیال ہے اس مسئلہ کو سیدنا الامام الکبیر کے عہد میں زیادہ پیچیدہ اور دشوار بنا دیا تھا تفصیل کا تو موقع نہیں ہے لیکن اجمالاً اتنی بات تو کھلی ہوئی ہے کہ غیر اسلامی عناصر چپکے چپکے مسلمانوں کی دینی زندگی میں صدیوں سے جذب ہوتے چلے جا رہے تھے، تا آنکہ ہندوستان میں پہنچ کر وہی مکروہ و مہیب قالب سامنے آ چکا تھا جسے دیکھ کر بے ساختہ سیدنا الامام الکبیر یہ فرمانے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ

"کس منہ سے ہندوؤں کو برا اور اپنے آپ کو بھلا کہہ سکتے ہیں" (مشہ فیوض قاسمیہ)

دراصل یہی مسئلہ "سنت و بدعت" کا تھا اور کوئی شبہ نہیں کہ

أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ | آگاہ ہو کہ اللہ ہی کے لئے ہے دین خالص

کے قرآنی نصب العین کی طرف واپس لے جانے کے لئے بیرونی آلائشوں سے مسلمانوں کے دین کو پاک کرنے کا سلسلہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ سے جو شروع ہوا تھا۔ تطہیر و تزکیہ کا یہ کاروبار بہ تدریج آگے ہی بڑھتا چلا جا رہا تھا حضرت مجدد کے بعد خانوادہ ولی اللہی نے اس راہ میں غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ تا اینکہ حضرت مولانا اسماعیل شہید نے اپنے شیخ طریقت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں اس تحریک کو "ہمہ گیر تحریک" بنا دیا۔ سنت و بدعت کی کشمکش کے ان ہی دنوں میں یورپ کی ایک ایسی عیسائی قوم کی حکومت ملک پر قائم ہو گئی، جو صلیبی دین کے قدیم کلیسائی نظام کی تقلید کا جوا اپنی گردن سے اتار چکی تھی، بلکہ ایک طبقہ ان کا مذہبی مسلمات کے متعلق غیر معمولی طور پر بے باک ہو چکا تھا، اسی زمانہ میں مسلمانوں کے بعض ممالک میں بھی یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ اگلی نسلوں کے دین پر اعتماد کر کے پچھلی نسلیں جن باتوں کو مانتی چلی آ رہی ہیں ضرورت ہے کہ ان پر تنقید کی جائے۔ خصوصاً عرب جو مسلمانوں کا دینی مرکز ہے، اس تحریک کا وزن اسی کے بعض خاص علاقوں پر غیر معمولی طور پر پڑ رہا تھا۔ نجد کے باشندے، اور اسی علاقہ کے ایک عالم محمد بن عبد الوہاب اس تحریک کے سب سے بڑے علم بردار تھے۔

یہی پیچ در پیچ تاثیری اسباب تھے جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ سید شہید جس جماعت کو چھوڑ کر احیاء عمل "بیدھ بیزقون" کی قدسی صف میں شریک ہوئے تھے۔ اس جماعت کے بعض افراد تطہیر و تزکیہ کے اس عمل میں حدود سے تجاوز کرنے لگے۔ سڑے ہوئے گوشت کے ساتھ زندہ گوشت پر بھی عمل جراحی کرنے لگے، بے احتیاطیاں اس حد تک ترقی کر کے پہنچ چکی تھیں کہ مسلمانوں کی دینی زندگی کی شرائین اور شہ رگ تک کو نشتر زنی کی دھمکیاں دی گئی تھیں، اور بقول سیدنا الامام الکبیر

"علماء و فقراء جن کو خلاصۂ امت کہئے" ملک نیوش ناسیہ

اسی خلاصہ امت کو اپنے عمل جراحی کا تختۂ مشق ان لوگوں نے بنا کر بنا لیا جائے گویا اسلام

کی سیزدہ سالہ دینی و علمی تاریخ کے سارے اوراق ہی کو چاہتے تھے کہ بے دردی کے ساتھ پھاڑ دیا جائے۔

الغرض بدعت کے ساتھ ساتھ ایسی بے شمار چیزوں کو وہ بدعت ٹھہرانے لگے، جن کے بدعت ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ یہی دشواری اور پیچیدگی تھی جس سے سیدنا الامام الکبیر کو دوچار ہونا پڑا۔ ایک طرف وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ "اسلامی دین" کو غیر اسلامی آلودگیوں سے پاک کرنے کی کوششوں میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے لیکن اسی کے ساتھ ان کو سخت تکلیف ہوتی تھی، جب دیکھتے تھے کہ بے تمیزیوں سے کام لے کر نوچنے والے ان چیزوں کو بھی نوچ کھسوٹ رہے ہیں جن کے بغیر مسلمانوں کی دینی زندگی کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائیگا۔ اپنی کتاب توثیق الکلام میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے کہ ہندوستان کے مسلمان نمازوں میں امام ابو حنیفہ کی تحقیق پر بھروسہ کرتے ہوئے امام کے پیچھے سورہ فاتحہ جو نہیں پڑھتے ہیں، اُن کے اس طرز عمل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف ٹھہرا کر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو مورد طعن جو بنایا جا رہا ہے، سیدنا الامام الکبیر کے قلم سے اسی موقعہ پر یہ الفاظ نکل پڑے ہیں کہ

> "اس پر بھی امام ابو حنیفہ پر طعن کئے جائیں، اور تارکان قرأت پر عدم جواز صلوٰۃ کا الزام ہوا کرے تو کیا کیجئے، زبان قلم کے آگے کوئی آڑ نہیں، دیوار نہیں، پہاڑ نہیں۔"
>
> توثیق الکلام صلا

اسی سے ان کے ذہنی اضطراب کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی سلسلہ میں چند سطروں کے بعد ارقام فرماتے ہیں:۔

> "جس وقت امام علیہ الرحمۃ کی توہین سنی جاتی ہے، دل جل کر خاک ہو جاتا ہے اور یوں جی میں آتا ہے کہ ان زبان درازیوں کے مقابلہ میں ہم بھی لن ترانیوں پر آجائیں، اور دو چار ہم بھی سنائیں، پر آیہ اذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما، و اذا مروا باللغو

موجد اکرا ما" اور احادیث منع نزاع واقع ہیں" صـ

حلم و تحمل صبر و ثبات کے جبلی جذبات کا سیدنا الامام الکبیر کے خیال کیجئے اور پھر سوچئے کہ دماغی کوفت کی وہ کیا کیفیت ہوئی۔ جس نے ان الفاظ کے لکھنے پر آپ کو مجبور کیا۔

اپنے اساتذہ حضرت شیخ الہند اور مولانا عثمانی مولانا کشمیری رحمۃ اللہ علیہم کی زبانی اسی سلسلہ میں بعض لطیفے حضرت والا کے فقیر نے سنے ہیں، جن میں ایک مشہور لطیفہ یہ بھی ہے جو فرقہ اہلحدیث کے سرگرم رکن مولوی محمد حسین بٹالوی کے سوال کے جواب میں حضرت والا نے ارقام فرمایا ہے۔ بہرحال لطیفہ یہ سننے میں آیا ہے کہ مولوی محمد حسین صاحب نے (حضرت والا کو لکھا کہ مجھے تنہائی میں آپ سے بعض مسائل میں گفتگو کرنی ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ آپ کا کوئی شاگرد بھی وہاں موجود نہ ہو۔ حضرت نے منظور فرما کر جواب تحریر فرمایا کہ تشریف لے آئیں۔ (رضیب) چنانچہ مولانا موصوف حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر وہی عرض کیا کہ تنہائی میں آپ سے کچھ باتیں کرنی چاہتا ہوں اجازت دے دی گئی،

جہاں تک یاد پڑتا ہے، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ ہی سے یہ بات فقیر نے سنی تھی، فرماتے تھے کہ حجرہ بند کر دیا گیا، ہم طلبہ باہر تھے۔ دونوں میں گفتگو ہونے لگی، ہماری طالب علمی کا زمانہ تھا، بے اختیار جی چاہا کہ اس گفتگو کو کسی طرح سننا چاہئے (میں اسی دروازہ سے لگ کر بیٹھ گیا جس کے متصل ہی اندر یہ حضرات بیٹھے تھے) حضرت والا نے مولانا سے فرمایا کہ دیکھئے جس مسئلہ میں بھی گفتگو فرمانی ہو اس میں دو باتوں کا خیال رکھئے۔ ایک یہ کہ مسئلہ زیر بحث میں حنفیہ کا مذہب بیان فرمانا آپ کا کام ہوگا اور دلائل بیان کرنا میرا کام ہوگا۔ دوسرے یہ کہ میں مقلد امام ابوحنیفہ کا ہوں، اس لئے میرے مقابلہ میں آپ جو قول بھی بطور معارضہ پیش کریں وہ امام ہی کا ہونا چاہئے۔ یہ بات مجھ پر حجت نہ ہوگی کہ شامی نے یہ لکھا ہے اور صاحب درمختار نے یہ فرمایا ہے، میں ان کا مقلد نہیں۔ چنانچہ فاتحہ خلف الامام، رفع یدین آمین بالجہر وغیرہ بہت سے مختلف فیہ مسائل زیر گفتگو آئے اور حسب شرائط طے شدہ مولانا محمد حسین صاحب مذہب احناف

بیان فرماتے اور حضرت والا دلائل سے اسے ثابت کرتے حضرت کی تقریروں کے درمیان مولانا محمد حسین صاحب جھوم جھوم جاتے اور بعض اوقات تو جوش میں سبحان اللہ سبحان اللہ کہتے کہتے کھڑے ہونے کے قریب ہو جاتے جب گفتگو ختم ہو چکی تو (محمد طیب) مولوی محمد حسین صاحب کی زبان سے بے ساختہ یہ فقرہ نکلا کہ

"مجھے تعجب ہے کہ آپ جیسا شخص اور مقلد ہو (یعنی بایں زور علم و فراست و قوت استنباط تقلید کے کیا معنی ؟)"

جواب میں حضرت شیخ الہند کہتے تھے میں نے سنا حضرت والا ارشاد فرما رہے ہیں'

"اور مجھے تعجب ہے کہ آپ جیسا شخص اور غیر مقلد ہو (یعنی مدعی اجتہاد ہو)"

اسی طرح "خلاصہ است" کے دوسرے رکن "فقرا" کے طرز عمل اور طریق زندگی' ان کے خاص مشاغل اور احساسات و وجدانات' جن کی اجمالی تعبیر "تصوف" سے کی جاتی ہے' بیباکوں کی یہ ٹولی اس طبقہ پر جن حرفگیریوں اور نکتہ چینیوں سے کام لیکر غلط کے ساتھ صحیح عناصر کو بھی ملیامیٹ کرنے پر تلی ہوئی تھی' گھن کے ساتھ گیہوں کو بھی دینی بصیرت سے محرومی کی وجہ سے پیس رہی تھی۔ گویا دین کی روح ہی کے قبض کرنے کی فکر میں مشغول تھی' سیدنا الامام الکبیر اس طبقہ کے ان رجحانات سے بھی غیر معمولی طور پر متاثر تھے۔ اپنی بعض تحریروں میں بڑی دلسوزیوں کے ساتھ اسی سلسلہ میں "سنت و بدعت" کی صحیح حدود کو سمجھانے کی آپ نے کوشش کی ہے حکیم ضیاء الدین مرحوم (رامپور منیہاران والے) کے نام مطبوعہ مکتوب فیوض قاسمیہ کے مجموعہ میں جو شریک ہے' یہ تو چند صفحات ہی کا یہ خط لیکن "سنت و بدعت" کے متعلق جتنی بڑی چھوٹی کتابیں کم از کم فقیر کی نظر سے گذری ہیں' میرا احساس تو یہی ہے کہ شاید اتنی "جامعیت" کے ساتھ مسئلہ کا تصفیہ کسی ایک کتاب میں مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔ اسی میں منجملہ دوسری باتوں کے یہ سمجھاتے ہوئے کہ

"علاج میں بعض ایسے امور ہوتے ہیں' بعض اوقات وہ ضمناً اور عرضاً مامور بہ ہوتے ہیں

پر لکھنے یا کہنے میں نہیں آتے، کیونکہ عاقل اور بے وقوف سب ان کے مامور بہ ہونے کو سمجھ جاتے ہیں۔"

پھر مطلب کو مثال سے ذہن نشین فرماتے ہوئے ارقام فرمایا گیا ہے کہ

"جیسے شربت بنفشہ کہ بعض اوقات پنساری کی دوکان وغیرہ پر تیار نہیں ملتا اس صورت میں اس کی ترکیب کا دریافت کرنا پھر اس کے اجزا کا مثل بنفشہ وشکر، مار (پانی) وغیرہ اور اس کے سامان کا مثل دیگچی وآتشدان، وغیرہ فراہم کرنا بھی مامور بہ ہوتا ہے، اور اس مامور بہ کو لکھا پڑھا، ہر کس وناکس سمجھتا ہے۔"

ص۲۱ فیوض قاسمیہ

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں مریض یا مریض کے تیمار دار پر کوئی یہ اعتراض کرے کہ تم نے دیگچی میں دواؤں کو کیوں ڈالا، دیگچی کو چولہے پر کیوں چڑھایا چولہے کے لئے ایندھن کا بندوبست کیوں کیا۔ طبیب نے تو صرف "شربت بنفشہ" کے پینے کا حکم دیا تھا، اور یہ سارا کاروبار شربت کی کے سلسلے میں جو تم نے انجام دیا ہے اس سے طبیب کے منشار کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ تو بجز جنون کے اور بھی کچھ سمجھا جا سکتا ہے۔

سیدنا الامام الکبیر نے اسی طبی تمثیل کو پیش کر کے سمجھایا ہے کہ

"ایسے ہی علاج قلبی میں بہت سے امور ہوتے ہیں کہ وہ صراحۃً مامور بہ نہیں ہوتے، ضمناً وعرضاً مامور بہ ہوتے ہیں، اس وجہ سے ظاہر میں وہ بدعت معلوم ہوتے ہیں، حقیقت میں بدعت نہیں۔" ص۲۵

حقیقت یہ ہے کہ حضرات صوفیاء کرام کے بعض مشاغل جن کا حقیقی مقصد "تصفیہ باطن اور تصحیح نسبت" کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا ان کے متعلق یہ شبہ کہ کتاب وسنت میں ان کا ذکر نہیں ملتا، انصاف سے اگر کام لیا جائے تو بآسانی اس کا ازالہ ہو جاتا ہے، ہاں! بجائے وسیلہ کے ان مشاغل اور مقدمات کو دین کے حقیقی مطالبات میں ان کو شریک کرنا، یہ خیال

یا یہ عقیدہ بلاشبہ بدعت بن جائے گا خود سیدنا الامام الکبیر نے یہی لکھا ہے کہ

"اگر ان امور کو کوئی مقصود بالذات سمجھ بیٹھے، تو ظاہر ہے کہ اس وقت ان کی بجا آوری بوجہ ذریعہ ہونے امور مسنونہ کے نہیں، تو اس وقت میں یہی امور ماموربہ نہ رہیں گے۔"

اسی کے بعد فرماتے ہیں کہ

"تو اب لاریب یہ سب امور بدعت ہو جائیں گے۔"

اسی کے ساتھ آپ نے یہ بھی ارقام فرمایا ہے کہ شرعی مطالبات کی تکمیل کی صورت اگر ان امور کے بغیر کسی وجہ سے کسی کے لئے ممکن ہو جائے تو فرماتے ہیں کہ اس کی مثال یہ ہوگی کہ

"شربت بنفشہ کہیں تیار مل جائے تو پھر وہ امور جن کو ذریعۂ تحصیل شربت بنفشہ قرار دیا ہے، ماموربہ نہ ہے۔"

اور جیسے صوفیہ کے بعض مشاغل جن کا صراحۃً ذکر کتاب و سنت میں نہیں ملتا، لیکن امور مطلوبہ جیسا کہ خود ہی فرماتے ہیں کہ مثلاً

"توجہ الی اللہ، اور تحصیل محبت خداوندی، اور قلع قمع محبت دنیا اور اہل دنیا اور تہذیب اخلاق و ازالہ خصال ناشائستہ۔"

ان امور کے حصول میں ان مشاغل سے مدد ملتی ہے، اور بقول ان ہی کے

اہل عقل و تجربہ کاروں پر پوشیدہ نہیں کہ امور مذکورۃ الصدر کو بیشک ان مقاصد کے حصول میں مداخلت تام ہے۔ اس لئے ضمناً اور عرضاً ماموربہ ہوگئے۔"

اسی طرح ابتدا مکتوب میں اس قسم کی چیزوں کا مثالاً آپ نے ذکر فرمایا ہے کہ

"کون نہیں جانتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ کلام اللہ اس طرح من اولہ الی آخرہ اوراق میں لکھا ہوا تھا، نہ اس میں اس زمانہ تک زیر و زبر و نقاط یا جزم ایجاد ہوئے تھے، نہ کتب احادیث یوں تصنیف ہوئیں، نہ تدوین کتب فقہ و اصول فقہ

اور تفسیر کا دستور تھا۔"

طبقۂ علماء کی مذکورہ بالا خدمات یا اسی نوعیت کی جو دوسری چیزیں ہیں سب کو آپ نے اسی مد میں شمار فرمایا ہے جو سنت اور خصوصاً مامور بہ ہیں یعنی شریعت کے مطالبات کی تکمیل میں معاون و ممد ہیں۔

اسی سلسلہ کا ایک حکیمانہ فیصلہ سیدنا الامام الکبیر کا وہ بھی ہے، جسے آپ کی کتابوں میں تو میں نے نہیں پایا ہے[1]، لیکن آپ کے خلف رشید مولانا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حیدرآباد کی ایک مجلس میں اس کا تذکرہ فرمایا تھا، خاکسار بھی اس مجلس میں شریک تھا، جی چاہتا ہے کہ اسے یہاں درج کردوں۔ حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت والا کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ شرعی مطالبات کو دو حصوں میں تقسیم کر کے فرمایا کرتے تھے کہ ایک حصہ تو ان مطالبات کا ایسا ہے، جس کی روح اور قالب یا معنی اور صورت دونوں ہی کو شریعت نے متعین کردیا ہے۔ مثلاً نماز کا جو حال ہے کہ روح اس کی ذکر اللہ ہے۔ اقم الصلوٰۃ لذکری (قائم کرو نماز کو میری یاد کے لئے) شریعت نے اس کی تصریح بھی کی ہے، اور اسی کے ساتھ نماز کے قالب اور ظاہری صورت کو بھی متعین کردیا ہے، یعنی ہر رکعت میں قیام کے ساتھ طے کردیا گیا ہے کہ ایک رکوع دو سجدے ہوں، وغیرہ وغیرہ، پس اس قسم کے مطالبات میں تو روح اور معنی کے ساتھ شرعی مطالبات کی ظاہری شکل و صورت میں بھی کسی قسم کی ترمیم یا اضافہ کا حق کسی کو نہیں ہے، اسی کے مقابلہ میں شرعی مطالبات ہی کی ایک قسم ایسی بھی ہے، کہ اصل مقصد اور روح کا مطالبہ کر کے قالب اور شکل و صورت کے متعلق آزادی بخشی گئی ہے۔ مثلاً جہاد ہی کے حکم کو لیجئے، اعلاء کلمۃ اللہ اور کفر کی شوکت و قوت کا ازالہ اس حکم کی روح ہے، لیکن شریعت نے اس کا پابند لوگوں کو نہیں بنایا ہے کہ اس حکم کی تعمیل کا فلاں قالب کیا اختیار کیا جائے، عہد نبوت میں صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جہاد کے فرض کو

[1] سنت و بدعت کے بارہ میں اس حکیمانہ فیصلہ کی تفصیلات اور نہایت لطیف مباحث مصباح التراویح میں موجود ہیں جو شوق رکھتے ہوں اس میں مطالعہ فرمائیں۔ محمد طیب غفرلہ

اور برچھے، ڈھال، تیر و کمان وغیرہ آلات کے ذرائع کو اختیار کر کے ادا کرتے تھے، لیکن موجودہ زمانہ میں جنگ کے آلات بدل گئے ہیں، آج کل توپ بندوق نئے آلات حرب استعمال ہونے لگے ہیں، پس جہاد کے حکم کی تعمیل کی سعادت ان جدید آلات حرب کو استعمال کر کے جو حاصل کرنے کا یقیناً شریعت ہی کے مطالبہ کی وہ تعمیل کر رہا ہے، اس پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ جہاد میں خلاف مسنون چیزوں کا استعمال کر رہا ہے، اور بجائے سنت کے وہ بدعت کا مرتکب ہے۔

برسوں کی سنی ہوئی بات ہے، جہاں تک حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر سے بات سمجھ میں آئی تھی، اپنے الفاظ میں میں نے اس کو ادا کر دیا ہے۔ کچھ بھی ہو جو بھی تھوڑی بہت سمجھ رکھتا ہے، وہ حضرت والا کی مذکورہ بالا تقسیم کی واقعیت کا انکار نہیں کر سکتا، میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ جہاد کا جو حال ہے، تقریباً کچھ یہی صورت ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں ذکر اللہ کی بھی نظر آتی ہے۔ قیاماً وقعوداً وعلی جنوبھم (یعنی کھڑے بیٹھے لیٹے) ہر حال میں ذکر اللہ کو مشغلہ بنانے والوں کی قرآن میں تعریف کی گئی ہے، اللہ کے ذکر کا حکم بھی دیا گیا ہے، اور اسم اللہ کے ذکر کا مطالبہ بھی قرآن ہی میں پایا جاتا ہے، لیکن ان ذکری مطالبات کی تعمیل کا کوئی خاص قالب نماز وغیرہ مطالبات کی طرح شریعت نے مقرر نہیں کیا ہے، پس جہاد کے حکم کی تعمیل حالات و روقت زمانہ کے لحاظ سے جس شکل میں بھی کی جائے گی، جیسے وہ شرعی مطالبہ ہی کی تعمیل ہے، اسی طرح صوفیہ کرام رحمۃ اللہ علیہم نے حالات کے لحاظ سے جو قالب اور جو شکل بھی ذکر اللہ کے لئے جس زمانہ میں بھی اختیار کی ان کے اس طرز عمل کے متعلق یہ سوال کہ شریعت میں ان خاص طریقوں کا پتہ نہیں چلتا، خود ہی سوچئے کہ کیا صحیح دینی بصیرت کا یہی تقاضا ہے؟

بہرحال سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے مسلمانوں کی دینی زندگی کی تطہیر و تزکیہ کا کام تحریک سونی سے انجام پا رہا تھا، مقابلہ میں صرف وہی طبقہ تھا جو

ما وجدنا علیہ آباءنا الاولین | ہم نے اپنے پچھلے باپ دادوں کو اس پر نہیں پایا

کو حق و باطل کا معیار ٹھہراتے ہوئے اسی پر اصرار کر رہا تھا، لیکن تطہیر و تزکیہ کے اس اصلاحی

میدان میں سیدنا الامام الکبیر جس زمانہ میں اترے تو دوسری ٹولی مسلمانوں میں ان لوگوں کی پیدا ہو چکی تھی جو

| | |
|---|---|
| ان ھذا الا اساطیر الاولین | یہ تو صرف پہلوں کی کہانیاں ہیں |

کا حربہ بے دردی کے ساتھ ہر اس چیز پر بے محابا چلا رہی تھی جو اگلی نسلوں سے منتقل ہو کر پچھلی نسلوں تک پہنچی تھی، فقہ و تصوف کا سارا سرمایہ ان کے نزدیک

| | |
|---|---|
| ان ھذا الا افک قدیم | یہ محض وہی پہلی بہتان بندی ہے۔ |

سے زیادہ اور کوئی وقعت نہیں رکھتا تھا، لیکن ظاہر ہے کہ واقعی معیار حق و باطل کا نہ آبائیت ہی کا اول الذکر مسلک ہے اور نہ انکیت کا آخر الذکر طریقہ، ایسی صورت میں اس شخص کا کام قدرتاً بہت زیادہ دشوار ہو جاتا ہے، جو ان دونوں مختلف ذہنیتوں کے اثر سے آزاد ہو کر حق و باطل کے واقعی معیار پر چیزوں کو پرکھنا چاہتا ہو، سچ پوچھئے تو کچھ اسی قسم کی صورت حال سے مسلمانوں کی داخلی اصلاحات کے سلسلہ میں سیدنا الامام الکبیر دوچار تھے، ان کی دینی بصیرت پا رہی تھی کہ ان دونوں متخالف ذہنیتوں کے نتائج میں سچ کے ساتھ کچھ جھوٹ اور جھوٹ کے ساتھ کچھ سچ بھی شریک ہے، جھگڑوں رگڑوں کے اس طوفانی ہنگامہ میں حق و باطل کے انبارے اصل حقیقت کو کھینچ کر باہر لانا، اور آدمی خود جو کچھ دیکھ رہا ہو دوسروں کو بھی دکھانا، خود سوچئے کہ یہ کتنا نازک کام ہے، لیکن اسی حد سے زیادہ نازک کام کو جہاں تک آپ کے امکان میں تھا کمال حزم اور متانت احتیاط کے ساتھ آپ انجام دیتے رہے، اسی سنت و بدعت والے مسئلہ میں یہ سمجھانے کے بعد کہ بہت سی باتیں جو بدعت نہیں ہیں،

"ان کو بدعت کہنا اپنا قصور فہم ہے"

لیکن احتیاط دیکھئے کہ صاف لفظوں میں ان امور پر "سنت" کے لفظ کے اطلاق کو بھی آپ پسند نہیں فرماتے، بلکہ مذکورہ بالا تفہیمی کوششوں کے بعد آخر میں لکھتے ہیں تو یہ لکھتے ہیں کہ

"ہاں بسبب اس کے کہ ظاہر شرع میں یہ مامور بہ نہیں، اس وجہ سے ان کو اگر

سنت نہ کہا جائے اور ملحق بالسنت کہا جائے تو مضائقہ نہیں" ص۳۵ فیوض قاسمیہ

اسی زمانہ میں لوگوں نے "سماع موتی" کے پرانے مسئلہ کو پھر نئے سرے سے زندہ کرنا چاہا تھا، عام مسلمانوں کے قبری کاروبار کے ان قصوں کو دیکھ کر جن کے متعلق سیدنا الامام الکبیر کا یہ فقرہ نقل کر چکا ہوں کہ "کس منہ سے ہندؤوں کو برا اور اپنے آپ کو بھلا کہہ سکتے ہیں" بعضوں نے چاہا کہ موتی کے سماع ہی کا انکار کر دیا جائے مطلب ان لوگوں کا یہ تھا کہ بنیادی اڈے ہی کو اڑا دیا جائے۔ نہ بانس رہے گا نہ بانسری بجے گی۔

پوچھنے والے نے سیدنا الامام الکبیر سے بھی اسی مسئلہ کو دریافت کیا حضرت والا نے چند اوراق میں سوال کا جواب دیا ہے اور "جمال قاسمی" نامی مجموعہ مکاتیب میں یہ جواب شریک ہے، حاصل یہی ہے کہ سماع موتی کا آپ نے انکار نہیں فرمایا، لکھا ہے کہ جب

"قبرستان میں گذرے تو سلام سے دریغ نہ کرے، اور من پڑے تو ہدیہ مناسب وقت بھی پیش کرے، ورنہ سخت بے مروتی ہے، جو یوں آنکھیں چرائے چلا جائے" ص۲۱

اور یہ تو خیر قول ہے آپ کے تلمیذ سعید مولانا منصور علی خاں رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب میں آپ کے مسلک کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہوئے کہ

"بزرگوں کے مزار پر جایا کرتے، دعا کر کے چلے آتے"

آگے صراحۃً اپنی یہ شہادت قلم بند کی ہے کہ

"سماع اولیاء اللہ کے قائل تھے"

اور قائل ہی نہیں بلکہ آگے لکھتے ہیں کہ

"اگر اکیلے کسی مزار پر جاتے، اور دوسرا شخص وہاں موجود نہ ہوتا، تو آواز سے عرض کرتے کہ آپ میرے واسطے دعا کریں" ص۱۹۲

اسی سلسلہ میں حکیم صاحب مرحوم نے مکمل شاہ صاحب قدس اللہ سرہ کے مزار واقع مراد آباد کے اس قصہ کا بھی تذکرہ کیا ہے، جسے شاید کسی جگہ میں درج کر چکا ہوں، خلاصہ یہی ہے کہ

مکمل شاہ صاحب کے مزار کے پاس ایک دفعہ حکیم صاحب نے دیکھا کہ سیدنا الامام الکبیر تشریف فرما ہیں۔ حکیم صاحب بھی مزار کے قریب پہنچے اور بے خیالی میں ان کا پاؤں مزار شریف سے چھو گیا، حکیم صاحب کا بیان ہے کہ حضرت والا کو دیکھا کہ بے ساختہ دونوں ہاتھوں سے میرے پاؤں کو پکڑے ہوئے مزار سے الگ کر رہے ہیں۔ حکیم صاحب کہتے تھے کہ مجھ پر تو لرزہ طاری ہو گیا اور زمانہ تک اپنی اس جرأت بے جا پر دل نادم رہا۔

اور ایک حکیم صاحب ہی نہیں، مولانا طیب صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی یادداشت میں ارقام فرمایا ہے کہ حضرت نانوتوی

"اپنے بزرگوں سے میں نے یہ سنا ہے کہ کلیر شریف لے جاتے تو رڑکی سے پیدل، ننگے پاؤں ہو لیتے، اور شب کو روضہ میں داخل ہو کر کواڑ بند کر دیتے تھے، اور تمام رات حضرت صابر صاحب کے مزار پر تنہائی میں گذارتے تھے"

اسی یادداشت میں مولانا طیب صاحب نے مولانا منظور نعمانی مدیر الفرقان (لکھنؤ) کے حوالہ سے روایت بھی درج کی ہے کہ سنبھل سے مرادآباد جاتے ہوئے راستہ میں ایک جھاڑی کے اندر اینٹوں کا ڈھیر سا نظر آتا ہے۔ ایک دفعہ سیدنا الامام الکبیر اسی راہ سے بیل تانگے پر گذر رہے تھے، جوں ہی کہ تانگہ اس جھاڑی کے سامنے پہنچا، تانگہ کو رک جانے کا حکم دیا، اور اتر کر اینٹوں کے اس ڈھیر کے قریب پہنچے، مراقب ہو گئے، مراقبہ سے فارغ ہو کر تانگہ کی طرف جا رہے تھے اور زبان مبارک پر بے ساختہ یہ الفاظ جاری تھے۔

"اللہ اکبر بہت ہی جلالی آدمی ہیں"

مولانا منظور صاحب نے سنبھل کے رئیس نواب عاشق حسین صاحب سے یہ روایت سنی تھی، اس سفر میں حضرت والا کے ساتھ خود نواب صاحب موصوف اور ان کے ماموں منشی حمید الدین مرحوم تھے، جن کا شمار سیدنا الامام الکبیر کے عشاق ہی میں ہے۔

اور سچی بات تو یہ ہے جس شخص کے متعلق اس قسم کے مشاہدات، مکاشفات متواترہ تک

پہنچے ہوئے ہوں۔ مثلاً امروہہ میں سادات کا جو خاندان شیخ آتن کی اولاد میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن "شیخ" کے لفظ کی وجہ سے آتن صاحب کی سیادت پر لوگ شک کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ان ہی شیخ آتن کے مزار پر سیدنا الامام الکبیر مولانا احمد حسن امروہوی کے ساتھ تشریف لے گئے جن کا نسبی تعلق شیخ آتن سے تھا، مزار پر مراقبہ کے بعد سر اٹھا کر مولانا احمد حسن کو خطاب کر کے حضرت والا[۱] فرمانے لگے، کہ

"مولوی احمد حسن اب شبہ نہ کرو ایتی سیادت میں!"

یہ اور اسی قسم کی بہت سی باتیں لوگ جو نقل کرتے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے "سماع موتی" کے مسئلہ میں حضرت والا نے جس پہلو کو ترجیح دی ہے، ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور دوکر ہی کیا سکتے تھے۔ کیا اپنے مشاہدے کا انکار کرتے؟ لیکن بایں ہمہ اسی مشہور مکتوب میں جس میں "سماع موتی" کے متعلق اپنے نقطہ نظر کو نقلی و عقلی وجوہ کی روشنی میں پیش فرمایا ہے، اسی میں یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

"عوام اپنے خیال خام میں اولیاء کو قادر اور متصرف یعنی "غنی محتاج الیہ" سمجھتے ہیں، تو اگر اس زمانہ میں اس امکان استماع کا بھی چرچا کیا جائے تو اس خلل سے نفع رہنی تو کچھ متصور نہیں، البتہ تقویۃ مضامین شرکیہ کا گمان غالب ہے۔"

اس لئے مصلحت کا تقاضا آپ نے یہی قرار دیا ہے کہ

"مناسب ہے کہ عوام کو فقط طریقہ مسنونہ زیارت قبور کا تعلیم کیا جائے اور اس سے زیادہ کی اطلاع نہ ہونے دے۔" ص۲ جمال قاسمی

یہی آپ کا خیال بھی تھا، دیکھنے والوں کا بیان بھی یہی ہے، کہ اسی کے مطابق آپ کا عمل بھی تھا،

---

[۱] اس مکاشفہ کا تذکرہ مولوی اظہار الحق نجیب عباسی امروہوی نے اپنے خط میں کیا ہے، اسی میں یہ بھی لکھا ہے کہ مولوی محمود احمد صاحب عباسی نے بعد کو تاریخ امروہہ کی آپ لکھی ہے جس میں شاہی وثائق اور پرانے کاغذات پیش کئے ہیں جن سے شیخ آتن کی سیادت کی تاریخی شہادت بھی پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے ۱۲

حکیم منصور علی خاں نے بزرگان دین کے مزاروں کی حاضری کے متعلق مذکورہ بالا دستور کا جہاں ذکر کیا ہے کہ یہ دستور تو اس وقت تک تھا جب آپ تنہا ہوتے، لیکن بجائے تنہائی کے حکیم صاحب ہی کا بیان ہے کہ

"ہمراہیوں کے ساتھ آہستہ دعا، اور سورتیں پڑھ کر چلے آتے" (ص ۱۹۲ مذہب منصور)

"زیارت قبور کے طریقہ مسنونہ" سے غرض یہی تھی کہ سلام والی دعا کرکے قرآن پڑھ کر ثواب اس کا صاحب مزار کو پہنچا دیا جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک طرف عام مسلمانوں کے غلط رجحانات کی تصحیح بھی کرنا چاہتے تھے، اور جہاں تک ممکن تھا مصالح کے اقتضاؤں کی بھی رعایت فرماتے تھے، لیکن اسی کو ساتھ اپنے نزدیک جس چیز کو حق جانتے تھے، اس کو چھپاتے بھی نہ تھے، مصلحت کا مطلب آپ کے یہاں یہ نہیں تھا کہ کسی حقیقت اور واقعہ کا انکار کر دیا جائے خود اس کی مثال دین میں موجود تھی، اسلام سے پہلے شرک کی گرم بازاریوں میں جیسا کہ دنیا جانتی ہے، ملائکہ کے عقیدے کو بہت زیادہ دخل تھا، یہ بات کہ خالق تعالیٰ جل مجدہ کے علاوہ بھی ایسی نادیدہ مخلوق زندہ ہستیاں ہیں جن کے ساتھ نظام عالم کے مختلف شعبوں کی تنظیم و نگرانی متعلق ہے۔ بعض ان میں پانی کے، بعض ہوا کے بعض پہاڑ کے بعض موت کے بعض حیات کے، فرشتے ہیں، اور قدرت ان ہی کو ذریعہ بنا کر کائنات کے سلسلے کاروبار کو انجام دے رہی ہے، سمجھا جاتا ہے کہ فرشتوں یا دیوتاؤں کی پوجا پاٹ اور عبادت کا رواج اسی عقیدے کے غلط استعمال کی پیداوار ہے۔ ایسی صورت میں شرک کے قلع قمع کی یہ ایک کارگر تدبیر ہو سکتی تھی کہ "الملائکہ" کے عقیدے ہی کو دین سے خارج کر دیا جائے۔ مصالح کی وجہ سے اگر کتمان حق جائز ہوتا تو "الملائکہ" کا عقیدہ سب سے زیادہ کتمان کا مستحق تھا۔ لیکن اس عقیدے سے خاموشی تو بڑی بات ہے۔ کون نہیں جانتا کہ دینی دائرے میں داخل ہونے کے لئے جن امور پر ایمان لانے کا مطالبہ سب سے پہلے کیا جاتا ہے، اسی مطالبہ میں آمنت باللہ کے بعد ہی وملائکتہ کا جزو بھی شریک ہے "اللہ" سمجھایا ہی گیا ہے کہ "الملائکہ" کو منوا کر اس عقیدے

کے استعمال کا جو غلط اور مہلک طریقہ ہے اس سے لوگوں کو روکا جائے۔ اسلام کی تاریخ موجود ہے
مسلمان ملائکہ کے وجود کو بھی اپنے دینی عقیدے میں شریک کئے ہوئے ہیں۔ لیکن جہاں تک میں
جانتا ہوں شرک کی دوسری قسموں میں چاہے مسلمان کتنی ہی تباہیوں کے شکار ہوئے ہوں لیکن
"ملائکہ" یا دیوتاؤں کی عبادت کا رواج شاید ان میں کبھی واپس نہ ہوا، ایسی صورت میں سوچنا چاہئے
کہ "قبری کاروبار" رد کرنے کے لئے قطعی طور پر "سماع موتیٰ" کا انکار اور اسی کو دینی مصلحت کا اقتضا
قرار دینا کہاں تک درست ہو سکتا ہے

یہ دوسری بات ہے کہ شرعی نصوص کا نتیجہ ہی کسی کے نزدیک سماع موتیٰ نہ ہو۔ لیکن یہ جانتے
ہوئے کہ سماع موتیٰ ہی شرعی نصوص کا اگرچہ اقتضاء ہے، لیکن مصلحت کی بنیاد پر اس کا انکار کرنا
چاہئے میرے نزدیک تو یہ اسی قسم کی بات ہے، جیسے قرآن میں

| ولاتلبسوا الحق بالباطل وتکتموا الحق وانتم تعلمون | حق و باطل کو مت رلاؤ اور جانتے بوجھتے حق کو مت چھپاؤ۔ |
|---|---|

کے الفاظ میں یہود کا شیوہ قرار دیا گیا ہے، زیادہ سے زیادہ مصالح کی رعایت جائز بھی ہو سکتی ہے
تو اسی حد تک جیسا کہ سیدنا الامام الکبیر نے ارقام فرمایا ہے، کہ زیادہ چرچا اس مسئلہ کا عوام
میں مناسب نہ ہوگا، ان کو بس قبروں کی زیارت مسنونہ کا طریقہ بتا دیا جائے۔

بہرحال جہاں تک سیدنا الامام الکبیر کے اقوال و افعال ہم تک پہنچے ہیں، ان سے یہی معلوم
ہوتا ہے کہ ایک طرف خالق کائنات کے ساتھ آپ چاہتے تھے کہ عبدیت خالصہ، اور کامل بندگی
کا رشتہ اسلام نے جو قائم کیا ہے، اس میں کسی قسم کی لچک پیدا نہ ہو، مسلمانوں کے قدم ٹھیک ایاک
نعبد و ایاک نستعین پر پوری قوت کے ساتھ جمے رہیں، تو دوسری طرف وہ پوری نگرانی اس
کی بھی فرماتے رہے کہ اللہ کے انعام یافتہ بندوں کے ساتھ بھی مسلمانوں کا احترامی ربط مضمحل نہ ہو

لہ مکتوبات حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ میں حضرت ممدوح نے بھی اپنے ایک مکتوب میں تصریح فرمائی
ہے کہ ہمارا اور ہمارے بزرگوں کا یہی مسلک ہے کہ سماع موتیٰ ثابت ہے۔ محمد طیب غفرلہ

دوسرے لفظوں میں چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ

صراط الذین انعمت علیہم ـ اُن لوگوں کا راستہ جن پر آپ نے انعام فرمایا

پر قائم ودائم رہنے کی جو آرزو قرآن ہی نے مسلمانوں میں پیدا کی ہے، چاہتے تھے کہ اس آرزو کا زور بھی ان کے دلوں میں کم نہ ہو، ارواح ثلاثہ میں امیر شاہ خان مرحوم کے حوالہ سے یہ روایت جو نقل کی گئی ہے کہ

"کسی[1] عامی نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ حضرت یہ جو بزرگوں کے قریب دفن ہونے کی تمنا کرتے ہیں اس سے کیا فائدہ؟ جب کہ نہ کسی کی برائی کسی پر پڑیگی، نہ کسی کی نیکی کسی کے کام آئے گی۔"

شرکانہ آلودگیوں کے متعلق جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی پیدائش میں بزرگوں کے احترامی جذبات کی حوصلہ افزائیوں کو زیادہ دخل ہے۔ ان کے لئے بڑا اچھا موقعہ تھا کہ اس عامی کے عامیانہ[2] خیال کی تائید کرتے ہوئے کہہ دیتے کہ ہاں تم سچ کہتے ہو، لیکن امیر شاہ خاں مرحوم کا بیان ہے، کہ

---

[1] یہ سائل الہ دین نامی قصائی تھا جو دیوبند کا باشندہ تھا اس نے حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا دور اپنی ابتدائی عمر میں پایا تھا۔ بعد میں حضرت الاستاذ علامہ انور شاہ صاحب رحمہ اللہ سے بیعت ہوا۔ اس نے یہ واقعہ مجھ سے بھی بیان کیا تھا۔ محمد طیب غفرلہٗ

[2] میرا مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے قرآنی نصوص مثلاً لیس للانسان الا ما سعی (یعنی نہیں ہے آدمی کیلئے مگر وہی جو کچھ اس نے خود کوشش کی) یا لا تزر وازرۃ وزر اخری (ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھائے گا) کو پیش نظر رکھ کر اس قسم کا فیصلہ کرنا کہ نہ شفاعت ہی سے کوئی مستفید ہو سکتا ہے، اور خواہ مالی ہو یا بدنی کسی قسم کی عبادت کا ثواب دوسروں تک نہیں پہنچایا جا سکتا، ظاہر ہے کہ عامیانہ فیصلہ سے زیادہ اس کی کوئی وقعت نہیں ہے، کیونکہ شفاعت کا قانون ہو، یا ایصال ثواب کا ان سب کی بنیاد اس پر قائم ہے کہ آدمی پہلے ایمانی دائرے میں اپنے آپ کو داخل کر چکا ہو، ورنہ جو مومن نہیں ہے یقیناً نہ اسکے لئے شفاعت ہی مفید ہو سکتی ہے اور نہ ایصال ثواب کے قانون سے وہ مستفید ہو سکتا ہے، پس معلوم ہوا کہ ان امور سے بھی فائدہ ایمانی دائرے میں داخل ہونے کی سعی اور کوشش ہی سے آدمی کو پہنچتا ہے، پس ان صورتوں میں بھی یہی بات صادق آتی ہے کہ اپنی سعی اور کوشش ہی سے وہ مستفید ہوا۔ اگر مومن ہونے کی سعی اور کوشش اس کی طرف سے نہ ہوتی تو یقیناً وہ ان قوانین سے مستفید نہیں ہو سکتا تھا۔

سیدنا الامام الکبیر نے اس کے برعکس اس عامی کے اس غلط احساس کا ازالہ کرنا چاہا، چونکہ بے چارا عامی آدمی تھا، عالمانہ طریقہ سے فہمائش مناسب معلوم نہ ہوئی، بلکہ اس وقت وہ جس کام میں مشغول تھا، یعنی حضرت والا کو پنکھا جھل رہا تھا پنکھا بڑا تھا حضرت کے سوا اور بھی جو اس مجلس میں شریک تھے۔ پنکھے کی ہوا سے مستفید ہو رہے تھے۔ سامنے کی اسی مثال کی طرف توجہ دلاتے ہوئے پوچھنے والے سے دریافت فرمایا کہ "بھائی! تم اس مجمع میں پنکھا کس کو جھل رہے ہو؟" اس نے عرض کیا کہ "حضرت آپ کو" آپ نے پوچھا کہ "ہوا اوروں کو بھی لگ رہی ہے" اس نے کہا کہ ہاں - تب یہ کہتے ہوئے کہ "یہ جواب ہے تمہارے سوال کا" اس کو یہ سمجھانے لگے کہ

"حق تعالیٰ کی طرف سے جب رحمت و مغفرت کی ہوائیں چلتی ہیں، تو مقصود وہی بزرگ ہوتے ہیں، مگر حسب قرب و بعد پہنچتی ہیں، سب آس پاس والوں کو بھی۔" ملکا

کسی مولوی کے چپ ہونے کے لئے خواہ سامنے کی یہ مثال کافی ہو یا ناکافی، لیکن پوچھنے والا غریب عامی آدمی تھا۔ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تسلی اسی مثال سے ہو گئی، اب مسئلہ کی نوعیت خواہ کچھ ہی ہو، جس پر تفصیلی بحث کا یہاں موقع نہیں ہے[1]۔ میں تو صرف یہ دکھانا چاہتا تھا کہ مشرکانہ آلودگیوں کے خطرات سے جو خود بھی چوکنا رہتا تھا اور چاہتا تھا کہ

---

[1] مسئلہ کی اصل علمی حقیقت رہی ہے، جس کی طرف اپنے نوٹ میں خاکسار نے اشارہ کیا ہے، بزرگوں کے مکانی جوار سے بھی فائدہ مومن ہی کو پہنچ سکتا ہے، ورنہ ابوجہل خواہ مکہ ہی میں دفن ہوتا، اس غریب کو زمین کی پاکی سے کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ آخر دفن ہونے میں بزرگوں کے جوار اور قرب مکانی کا کوئی فائدہ اگر نہ ہوتا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ روضہ پاک میں دفن ہونے کی آرزو کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی آرزو کیوں قرار دیتے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے امیر شاہ خان کی اس روایت پر ایک حاشیہ بھی ارقام فرمایا ہے، جس میں مشہور حدیث هم القوم لا یشقی جلیسهم (اللہ والے لوگ ایسی قوم کے لوگ ہیں جن کا ہم نشین ناکام نہیں ہو سکتا) کی عمومیت سے بھی مسلمانوں کے اس خیال کی تائید کی شہادت پیدا کی ہے کہ بزرگوں کے قریب دفن ہونا مردے کے لئے فائدہ بخش ہے، ایک ضعیف روایت کا بھی اس سلسلہ میں لوگ تذکرہ کرتے ہیں جس میں صالحین کے مقبرہ میں دفن ہونے کی ہدایت کی گئی ہے، اگرچہ محدثین کو اس روایت کی سند پر اعتماد نہیں ہے (باقی صفحہ پر)

اللہ کے معاملہ میں مسلمانوں کی پوری پوری نگرانی کی جائے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہی اللہ والوں کی رفاقت و معیت کے عقیدے کی حفاظت میں کتنی غیر معمولی بیدار دماغی سے کام لے رہا ہے مرنے کے بعد بھی جسمانی رفاقت اور مکانی معیت کی قدر و قیمت کے احساس کی کمی جس کے لئے ناقابل برداشت تھی، سمجھا جا سکتا ہے کہ ان ہی بزرگوں کے معنوی حسن رفاقت کی قرآنی آرزو کی اہمیت اس کی نگاہوں میں کیا ہوگی یا کیا ہو سکتی ہے[1]۔

سچ پوچھئے تو "کج دار و مریز" کا یہی مسلک جس میں جام شریعت[2] کے ساتھ سندان عشق دونوں ہی کے حقوق اور اقتضاؤں کی تکمیل کا مطالبہ کیا جاتا ہے، عملی طور پر اس کو نباہنا اور کر کے دکھا دینا، مسلمانوں کی داخلی اصلاحات کے سلسلہ میں سیدنا الامام الکبیر کا اپنے عہد خاص میں ایک ایسا کارنامہ ہے، جس سے جیسا کہ چاہئے تھا، مسلمانوں کا نہ تو وہ رجعت پسند آبائی طبقہ ہی مانوس ہو رہا تھا۔ جو حق و باطل کی شناخت میں ہمیشہ یہ دیکھنے کا عادی تھا کہ ان کے والد مرحوم کا خیال کیا تھا، اور نہ بیباکوں کا وہ گروہ اس مسلک کو پسند کرتا تھا، جو مسلمانوں کی دینی تاریخ کے دباؤ سے آزاد ہو کر من مانے فیصلوں پر جری ہو گیا تھا۔ کچھ دن غیر معمولی کش مکش کی

(بسلسلہ گذشتہ) علامہ سخاوی جنہوں نے مقاصد حسنہ میں اس روایت کا ذکر کرکے محدثین کی تنقید کو نقل کیا ہے، اسی میں یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمانوں میں یہ خیال ہمیشہ مقبول رہا ہے ولم یزل عمل السلف والخلف علی ھذا "اللہ والوں کے جوار میں دفن ہونے کو اچھا سمجھتے رہے ہیں۔ ۱۲

[1] واقعہ یہ ہے کہ جتنے بلیغ پیرایہ میں ان دونوں تعلقات کا ذکر یعنی اللہ اور اللہ والوں کے ساتھ مسلمانوں کے ساتھ تعلق کی تربیت کیا جائے سورۂ فاتحہ میں کر دیا گیا ہے شاید دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ خالق کائنات الٰہی تبارک و تعالیٰ کے ساتھ ایاک نعبد و ایاک نستعین کے احساس کو پیدا کرنے کے بعد آگے حکم دیا گیا ہے کہ انعمت علیہم (جن لوگوں پر خدا نے انعام کیا) ان کے صراط پر مجھے چلایا جائے اسی کی دعا کی جائے اور سب جانتے ہیں کہ انعمت علیہم اللہ والوں کا گروہ ہے جس کی تفصیل اولئک الذین انعم اللہ علیہم من النبیین والصدیقین والشہداء والصالحین وحسن اولئک رفیقا میں فرمائی گئی ہے ۱۲ — عہ برمن جفا ہے اور پانی گرنے نہ دے۔ محمد طیب

[2] عہ اشارہ ہے اس شعر کی طرف: در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق ۔ ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن ۔ مقصد اس گروہ کی طرف اشارہ ہے جو علم و عشق شریعت و طریقت اور حال و قال دونوں کا جامع ہو یعنی عالم بامر اللہ ہونے کے ساتھ ساتھ عالم باللہ بھی ہو جسے عارف کہتے ہیں۔ محمد طیب غفرلہ

صورتیں دونوں کے ساتھ پیش آئیں لیکن بتدریج آبائی جمود کا زنگ بھی اترتا چلا گیا، اور حد سے گذری ہوئی آزاد خیالی میں آہستہ آہستہ اعتدال کا رنگ پیدا ہوا، اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانان ہند کی اکثریت اسی پھیر کر دانستہ یا نادانستہ اسی کو مسلمانوں کی صحیح دینی زندگی سمجھنے یا ماننے لگی ہے۔ جسے سیدنا الامام الکبیر اور آپ کے احباب واصحاب نے قولاً وعملاً اپنے اپنے زمانہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا یا آج بھی پیش کر رہے ہیں۔ اور ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ داخلی اصلاحات کے سلسلہ میں سیدنا الامام الکبیر کے رفیق الدنیا والآخرہ حضرت قطب گنگوہی مولانا رشید احمد رحمۃ اللہ علیہ کی گرانمایہ خدمات بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں، امام ربانی حضرت گنگوہی کو مختلف وجوہ سے اس راہ میں کام کرنے کے مواقع بہت زیادہ میسر آئے، اجمالی طور پر مسلمانوں کی دینی زندگی کے اس قالب کی عام تعبیر "دیوبندیت" سے کی جاتی ہے۔ اہل سنت والجماعت کے عقائد کے ساتھ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیقی تقلید اور اتباع سنت کے ساتھ صوفیانہ زندگی، اس جماعت کے اہل علم کی خصوصیت ہے۔ جس کی تفصیل کے لئے مجلدات کی ضرورت ہے، سیدنا الامام الکبیر کے تلمیذ سعید مولانا منصور علی خاں نے حضرت والا کے عقائد اور طریقۂ عمل کا ذکر کرتے ہوئے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

> "عمل ان کا حنفی تھا، مگر ہر سنت کے اتباع میں بہت خیال رکھتے تھے، اور کبھی کبھی خلافی مسائل پر بھی عمل کر لیتے تھے اور حضرت امام اعظم اور حضرت شیخ محی الدین ابن عربی اور حضرت مجدد الف ثانی کے کمالات اور حالات کے نہایت معتقد تھے، اور بہت تعریف کیا کرتے تھے، اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے علوم کو سب بزرگان دین کے علوم سے اعلیٰ وافضل بتلاتے تھے" صـ۱۹۲

اسی کے بعد حکیم صاحب نے اولیاء اللہ کے مزاروں کے ساتھ حضرت والا کے طریقۂ عمل کو بیان کرتے ہوئے مکمل شاہ صاحب مرادآبادی کے مزار والے اس قصہ کا تذکرہ کیا ہے، جسے نقل کر چکا ہوں، حاصل ان کے بیان کا بھی وہی ہے، جو فقیر نے عرض کیا۔

تاہم "مسلمانوں کی داخلی اصلاحات" کے سلسلے میں سیدنا الامام الکبیر کے طریقۂ کار کے متعلق اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اپنی اصلاحی کوششوں کو چاہتے تھے کہ حتی الوسع فتنہ و فساد کی کدورتوں سے پاک رہے۔ "فیوض قاسمیہ" میں ایک فارسی مکتوب مولوی عبداللطیف نامی کسی صاحب کے نام ہے' اس زمانہ میں لوگوں نے "علم غیب" کے عنوان سے ایک مسئلہ مسلمانوں میں چھیڑ دیا تھا' یعنی حق سبحانہ و تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف علم غیب کے لفظ کا انتساب شرعاً جائز ہے یا ناجائز۔ مولوی عبداللطیف صاحب نے حضرت سے اسی مسئلہ کو دریافت کیا تھا' اصل مسئلہ کی تحقیق آپ نے جو کی ہے۔ اس کا ذکر تو انشاء اللہ آپ کے علمی و فکری تنزیات کے سلسلے میں کیا جائے گا۔ یہاں تو باہمی مشاجرات و منازعات کے متعلق حضرت کے رجحان طبع کو پیش کرنا چاہتا ہوں

جواب کی ابتداء ان الفاظ سے کرتے ہوئے کہ

"عنایت نامہ رسید اما باعث ملال گردید"

پھر اس قسم کے لاحاصل مباحث کے جھگڑوں رگڑوں کے متعلق آپ کے دلی جذبات کا جو رنگ تھا اس کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے۔

"یارب ایں زمانہ چہ پرشور است اکہ بجائے محبت و اخوت اسلامی' عداوتہا برخاستند در آں مسائل کہ متفق علیہا بودند' اختلاف پدید آمد" ص۴۲

اسی قسم کے ایک دوسرے نزاعی مسئلہ کے متعلق اپنے ایک اردو گرامی نامہ میں ارقام فرماتے ہیں :-

"اس زمانہ میں یہ توقع بے جا ہے کہ اختلاف اٹھ جائے' اور اتفاق پیدا ہو جائے۔ ہاں جو بالعموم ابنائے روزگار میں فہم و انصاف ہوتا تو بعد فہمایش ممکن تھا کہ یہ اختلافات اٹھ جاتے' مگر آپ جانتے ہیں کہ آج کل یہ دونوں باتیں نصیب اعداء ہیں کہ یہ اختلاف ہی موجب عداوت ہے' اور یہ عداوت باہمی موجب تفریق دگر ہے' کوئی کسی کی

نہیں سنتا اور بے سمجھے دوسروں کی رسم وراہ کو غلط سمجھتا ہے " صفحہ

الغرض نئے نئے عنوانات سے معمولی معمولی جزئی باتوں کا مسلمانوں میں چرچا کر کے افتراق وشقاق پیدا کرنے کی عام مولویانہ عادت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر فطرۃً کارہ تھے، اور اس کو سخت ناپسند فرماتے تھے، اسی طرح فرعیات میں ایسے اختلافی مسائل جن میں سلفاً عن خلف نقاط نظر کا اختلاف علماء میں رہا ہے ان کے متعلق آپ کا خیال تھا، اور کتنا پاکیزہ خیال تھا، اس قسم کے ایک مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے اور یہ فرماتے ہوئے کہ

"طرفین میں بڑے بڑے اکابر ہیں"

اور اپنے اسی خیال کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہوئے کہ

"اگر ایک طرف ہو رہئے تو کسی نہ کسی طرف والوں کو برا سمجھنا پڑے گا"

آگے ارقام فرماتے ہیں۔

"اسلئے اہل اسلام کو یہ ضروری ہے کہ ایسے مسائل میں خواہ مخواہ ایسے پکے نہ ہو بیٹھیں کہ دوسری طرف کو بالکل باطل سمجھ لیں " صفحہ جمال قاسمی

آپ کا ایک طرز عمل اس نوعیت کے مسائل میں عموماً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اولاً ان پر بمشکل قلم اٹھاتے تھے، پوچھنے اور دریافت کرنے پر کسی نے زیادہ اصرار کیا، تب مجبوراً جو ترجیحی نقطۂ نظر اس خاص مسئلہ میں آپ کا ہوتا اس کو ظاہر تو کر دیا کرتے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ ایک جگہ نہیں متعدد مقامات میں تقریباً بالالتزام اس قسم کے الفاظ فرماتے چلے گئے ہیں، مثلاً جمعہ کی نماز کے متعلق علماء اہل السنت والجماعت کا ایک قدیم "خلافیہ" یہ چلا آرہا ہے کہ دیہاتی آبادیوں میں اقامت جمعہ جائز ہے یا نہیں۔ میر محمد صادق نے جو غالباً سہارنپور کے رہنے والے تھے اپنے خط کے ساتھ حکیم عبد السلام صاحب کا اسی مسئلہ کے متعلق ایک سوال بھی بھیجا تھا، اسی کا جواب دیا گیا ہے، "فیوض قاسمیہ" میں یہ بھی شریک ہے، جواب میں جن اجتہادی پہلوؤں کا اظہار فرمایا گیا ہے، ان کا ذکر تو اپنی جگہ پر کیا جائے گا، مگر ان کے سوا

مختلف عبرت آموز اجزاء پر یہ مکتوب مشتمل ہے۔ حکیم عبدالسلام کا ذکر باوجود "معاصرت" کے سننے کن الفاظ میں فرماتے ہیں،

"مجمع البحرین شریعت و طریقت، مخدوم و مطاع خاص و عام جناب مخدومنا مولٰنا سید عبدالسلام صاحب دام برکاتہ"۔

واللہ اعلم بالصواب یہ مولوی عبدالسلام کون صاحب ہیں، کوئی بھی ہوں۔ لیکن پچھلی نسلوں میں ہم نے ان کی شہرت نہیں سنی ہے۔ لیکن دیکھ رہے ہیں حضرت والا کن غیر معمولی القاب و آداب کے ساتھ ان کا ذکر فرما رہے ہیں۔ اسی خط میں کتابوں کی کمی کے سوا اس قسم کی باتیں بھی پائی جاتی ہیں، یہ فرماتے ہوئے کہ

"ہیچ مدانی، وایں بے سروسامانی نہ جرأت ہم چو کارہا بدل آمد نہ دل بدست کار فرماند"۔

آگے لکھتے ہیں

"ذخیرہ ام ہمیں خیالات پراگندہ من اند کہ کسے را اگر بدل می نشیند دیگراں را از جملہ مضامین شعریہ می بیند"۔

پھر یہ لکھ کر کہ حکم کی تعمیل کو ضروری خیال کر کے جواب تو دے رہا ہوں ارقام فرماتے ہیں۔

"اگر پسند خاطر خدام والا مقام افتادہ فہو المراد، ورنہ کالائے زبوں بریش خاوند، نامۂ خود را باز خواہم گرفت"۔

یہ فقرے تو خط کی ابتدائی تمہید کے ہیں، مضمون کو ختم کر کے یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

"ایں است انچہ ذہن نارسائے من بداں می رسد"

اور خود اپنے متعلق اس مصرعہ کو یعنی

نہ فاغیم نہ فقیہم نہ متقیم نہ امام

کو استعمال کر کے لکھا ہے کہ اجتہاد کا حق مجھے حاصل نہیں ہے۔ اسلئے خلق اللہ کو اپنے خیالات کے

ماننے پر مجبور نہیں کرسکتا اور یہ لکھ کر کہ

"اگر دیگراں ہم صفیر من شوند فبہا"

اسی کے بعد تمہید والے فقرے کا اعادہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے کہ

"ورنہ کالائے زبوں بریش خاوند' ایں دفتر بے معنی را بر سر من زنند"

اور یہ تو اپنے متعلق ہوا' لیکن بات اسی پر ختم نہیں ہوگئی ہے' علم کا باطل زعم دلوں میں تنگی نگاہوں میں کوتاہی کے امراض کو جو پیدا کر دیتا ہے' ان امراض کے علاج کے لئے پڑھنے والوں کو چاہئے کہ سیدنا الامام الکبیر کے ان الفاظ پر غور کریں۔ یہ فرمانے کے بعد کہ "میرے خیالات کو تو میرے سر پر مار دیجئے" بغیر کسی دغدغہ کے ارقام فرمایا گیا ہے کہ

"ہر چہ مناسب وقت دانند' موافق اشارات علماء ربانی کہ از اتباع قرآن و حدیث در نگذرند' اختیار فرمائند"

یہی نہیں آگے یہ بھی ہے کہ

"واین نیازمند را ہم مطلع فرمائند"

اطلاع بخشی کی یہ درخواست کس لئے کی گئی ہے! کیا اعتراض و تنقید کے لئے؟ نہیں' سنئے فرماتے ہیں

"تا پیروئ جم غفیر من ہم سر دہم' و در پے تفرق کلمہ نشوم" ۲۹

اور یہ مضمون کسی ایک جگہ آپ کے قلم سے اتفاقاً نہیں نکلا ہے۔ قاسم العلوم کے ایک مقالہ میں بھی یہی ارقام فرمایا گیا ہے۔

"ہر چہ بدل می ریزند بر صفحہ می گذارم اگر راست است آید از انطرف ست' ورنہ من خود بر ہیچ مدانی و نادانی خود گواہم"

حضرت والا کے مضامین اور کتابوں میں بہ کثرت اس کی مثالیں آپ کو مسلسل ملتی چلی جائینگی۔

لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ دوست تو دوست' دشمن بھی سیدنا الامام الکبیر کا نام جب لیتے ہیں تو

احترام ہی سے لیتے ہیں مشکل ہی سے اس کی نظیر پیش ہو سکتی ہے کہ مخالفوں نے بھی حضرت والا کی شان میں ان نا ملائم اور ناشائستہ الفاظ کو استعمال کیا ہو' جن کے استعمال کرنے کے عادی اس زمانہ کے مناظرہ باز مولوی عموماً ہو گئے تھے ؟

مگر مجھے اس پر اس لئے تعجب نہیں ہوتا کہ حضرت والا نے جس طرز عمل کو اختیار فرمایا تھا یہ اس کا لازمی نتیجہ تھا' قرآن ہی میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ دشمنوں کو بھی دوست بنانے کا یہ قدرتی طریقہ ہے' مگر ہر ہوسناک کا یہ کام نہیں ہے۔

| | |
|---|---|
| وما یلقّٰھا الا الذین صبروا<br>وَمَا یلقّٰھا الا ذو حظ عظیم ؕ | اور یہ مقام نہیں عطا کیا جاتا مگر انہیں کو جو صابر و بردبار ہیں اور نہیں دیا جاتا مگر انہیں کو جو بڑے صاحب نصیب ہیں۔ |

یعنی ہر دل کو یہ وسعت اور ہر آنکھ کو فراخی کی یہ دولت کب نصیب ہوتی ہے ؟

خلاصہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی دینی تربیت و اصلاح کا جو کام بھی آپ کرتے رہے' اس میں دل آزاری یا دوسروں کی تحقیر و توہین سے بچنے کی ممکنہ کوششوں میں بھی ہم آپ کو مشغول پاتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ "مداہنت" یا بے جا اغماض و چشم پوشی بھی آپ کی عادت نہ تھی۔ اس کی متعدد مثالیں گذر چکیں کہ ادنیٰ درجہ کے عامی آدمیوں کی دعوت بھی سیدنا الامام الکبیر رد نہیں کرتے تھے' اور شاید کر نہیں سکتے تھے۔ دیوبند کے نورباف اللہ دیا کا قصہ گذر چکا ہے کہ برستے ہوئے پانی میں کمل کا جوٹا باندھ کر اس غریب کے گھر اندھیری رات میں آپ پہنچے' اور باسی روٹی' ماش کی دال جو اس نے پیش کی' یہ جانتے ہوئے کہ انہضام اس کا دشوار ہوگا۔ محض اس کی دلدہی کے لئے نوش جان فرمایا۔ لیکن اسی کے ساتھ دعوتوں ہی کے سلسلہ میں مولانا حکیم منصور علی خان صاحب حیدرآبادی راوی ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر کا یہ کلی دستور تھا کہ

"جاہلوں کی نذر و نیاز کا کھانا کبھی نہیں کھاتے تھے" ص ۱۴۲ مذہب منصور

یہ "نذر و نیاز" کا قصہ جو ہندی مسلمانوں کی دینی زندگی کا کسی زمانہ میں تقریباً کچھ لازمی جزو کی

حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ جس کا افسانہ طویل ہے، خانوادہ ولی اللہی کے مصنفین کی کتابوں میں خصوصاً حضرت شاہ عبدالعزیز اور مولانا شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہما کی طرف خود ان کی کتابیں جو منسوب ہیں ان میں اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر آپ کو سیر حاصل بحثیں ملیں گی۔ اس زمانہ میں شیخ سدو کے نام کے بکرے، اور سید احمد کبیر و حضرت بوعلی قلندر کے نام کے گاؤ، حضرت شیخ عبدالقادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے اسم گرامی کے نام مرغ، کے چھوڑنے اور آخر میں ان کو ہار پھول پہنا کر ذبح کر کے دعوتوں کے اڑانے کا عام ذوق پھیلا ہوا تھا۔ مشکل ہی سے مسلمانوں کی کوئی آبادی شمالی و جنوبی ہند میں ہوگی، جس میں نذر کئے ہوئے مذکورہ بالا جانور گھومتے پھرتے نہ نظر آتے ہوں، اب تو بجز پیران پیر کے مرغ کے دوسرے قصے کم از کم شمالی ہند میں ختم ہو چکے ہیں[1]۔ اسی خاندان کے بزرگوں کی جدوجہد سے تطہیر و تزکیہ کا یہ کام پورا ہوا۔ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اس قسم کے نذر کئے ہوئے تمام جانوروں کو ما اھل بہ لغیر اللہ کے تحت داخل کر کے فتویٰ دیا تھا کہ ان کے گوشت کا کھانا جائز نہیں ہے جس پر بڑے ہنگامے برپا ہوئے۔ سیدنا الامام الکبیر نے بھی ایک مضمون حضرت شاہ صاحب کے فتوے کی تائید میں ارقام فرمایا تھا، جو قاسم العلوم نامی "مجموعہ مکاتیب" میں شریک ہے، انشاء اللہ کتاب کے اگلے حصہ میں اس کا تفصیلی تذکرہ کیا جائے گا، یہاں یہ کہنا ہے کہ خود حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ جن کے فتوے پر طوفان برپا ہوا تھا، وہی زندہ جانوروں کے متعلق جہاں اس پر مصر تھے کہ خدا ہی کے نام پر ان کو کیوں نہ ذبح کیا جائے، جب بھی ان کے گوشت کا کھانا درست نہ ہوگا۔ وہیں یہ فتویٰ ان ہی کی طرف ان کے مجموعہ فتاویٰ میں منسوب کیا گیا ہے کہ حیوانی نہیں بلکہ ما آلیدہ تشیر برنج (کھیر) پلاؤ وغیرہ جیسے کھانے پر اگر فاتحہ دیا گیا ہو تو ان کا حکم کیا ہے، کسی نے دریافت کیا، جواب میں لکھا ہے کہ شاہ صاحب نے ارقام فرمایا کہ

"اگر فاتحہ بنام بزرگے دادہ شد پس اغنیا را ہم خوردن ازاں جائز است"[2] ص۴۱

---

[1] یہ مرغ شمالی ہند سے بالکل ہی رخصت ہو چکا ہے، یہاں اس کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ محمد طیب غفرلہ [2] (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

میرے سامنے مسئلہ کی تفصیل نہیں ہے، حاشیہ میں حضرت شاہ رفیع الدین کے جن فتووں کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے تفصیل کے لئے ان کو پڑھنا چاہئے۔ بلکہ کہنا یہ ہے کہ شاہ عبدالعزیز کی طرف یہ فتویٰ حالانکہ منسوب تھا لیکن باوجود اس کے آپ دیکھ رہے ہیں اس احتیاط کو کہ سیدنا الامام الکبیر اس قسم کے مشتبہ کھانوں سے بھی پرہیز ہی فرماتے رہے، اور دعوت کرنے والوں کی دل شکنی کی پرواہ بھی اس راہ میں نہیں کی جاتی تھی حالانکہ آپ کی افتاد طبع کے لحاظ سے جہاں تک میں خیال کرتا ہوں یہ چیز ناقابل برداشت تھی۔

مگر عملی احتیاط کے ساتھ ساتھ عام مسلمانوں کی دینی کمزوریوں خصوصاً ان کی دینی زندگی کی بیرونی آلائشوں یعنی "بدعات" کے مسئلہ میں سیدنا الامام الکبیر کے نقطۂ نظر کا صحیح اندازہ اس حکیمانہ تقسیم سے ہو سکتا ہے جسے اس مسئلہ میں آپ نے اختیار فرمایا ہے، یعنی یہ فرماتے ہوئے کہ جو حیثیت کسی جاہل مریض کی طبیب کامل کے مقابلہ میں ہوتی ہے، یہی حیثیت امت کے عام افراد کی اللہ اور اس کے رسول کے مقابلہ میں ہے، یہی نہیں بلکہ اسی کے بعد جو یہ فرمایا گیا ہے، کہ

"طبیب کامل اور بیمار جاہل میں اتنا فرق نہیں، جتنا خدا و رسول، اور امت میں فرق

(متعلقہ صفحہ گذشتہ) کلام میں نے شاہ صاحب کے اس فتوے کے نقل کرنے میں قصداً تحریفی پیرایہ بیان اختیار کیا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف بزرگوں سے کان میں یہ بات پڑی ہے کہ فتاوی کا جو مجموعہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے شائع کیا گیا ہے، اس میں کچھ تصرفات بھی ہوئے ہیں واللہ اعلم بالصواب۔ مطبع مجتبائی کے مطبوعہ نسخے سے مذکورہ بالا الفاظ نقل کئے ہیں چند خاص فتوے شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے بھی شائع ہوئے ہیں۔ اس زمانہ کے علماء کو خصوصیت کے ساتھ ان جوابوں کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ نذر و نیاز وغیرہ الفاظ ہندوستان میں جو استعمال ہوتے ہیں "نہ بمعنی شرعی است کہ ایجاب غیر واجب ست از جنس عبادات مقصودہ بطریق تقرب الی اللہ" فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں ان الفاظ کا استعمال "بمعنی عرفی ست چہ عرف آن ست کہ آنچہ پیش بزرگان می برند نذر و نیاز گویند" لکھا ہے کہ شرعی معنی جو نذر کے ہیں "برائے اولیاء اللہ حرام است" اسی طرح فاتحہ میں بھی شاہ صاحب نے بڑی تفصیل سے کام لیا ہے اور لکھا ہے کہ بتوں اور شیاطین کے آگے بھینٹ چڑھانے کی جو نوعیت ہوتی ہے اگر فاتحہ دلانے والے کی نیت میں بھی کچھ اسی قسم کی باتیں شریک ہیں تو شرک کی مد میں فاتحہ داخل ہو جاتا ہے۔ لیکن ایصال ثواب کا مطلب ہے تو جائز ہے۔ مسلمانوں کو سمجھانا چاہئے کہ وہ چڑھاوے یا بھینٹ کا اعتقاد اگر رکھتے ہوں تو اس کو اپنے اندر سے نکالیں۔ ۱۲

ہے۔" (فیوض قاسمیہ ملکا)

یہی حقیقت کی صحیح اور واقعی تعبیر ہے' اور یہ مان لینے کے بعد جیسا کہ وہی ارقام فرماتے ہیں' خود بخود یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ

"جیسے بیمار جاہل کو اطبار متقدمین کے قواعد طب اور اطبار زمانہ کے نسخہ جات میں کمی وبیشی یا تغیر وتبدل نا روا ہے اور کرے تو اطبار سے دھتکار ملے' اور تمام خویش واقربا دوست آشنا کی بوچھاڑ پڑے۔"

اسی طرح حضرت والا فرماتے ہیں کہ

"تمام امت (کے لوگ) کو عالم ہوں' یا جاہل' فقیر یا صفا ہوں' یا دنیادار' خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں عقائد ہوں یا اعمال' قواعد کلیہ ہوں' یا صور جزئیہ' تبدل وتغیر کمی وبیشی کا اختیار نہیں' اور کریں تو خداوند تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مغضوب اور خلائق کے نزدیک بحکم عقل مغلوب ہونگے۔"

اس تمثیلی بیان کے بعد ارقام فرمایا گیا ہے کہ دین میں

"اسی تغیر وتبدل اور کمی وبیشی ہی کا نام بدعت ہے۔"

بدعت کی اسی حقیقت کو ذہن نشین کرانے کے بعد یہ بتاتے ہوئے کہ "تمام بدعات" کی نوعیت ایک ہی جیسی نہیں ہے اپنی حکیمانہ تقسیم کو ان الفاظ میں پیش فرماتے ہوئے کہ

"عقائد کے تغیر وتبدل کو ہم راس البدعات کہتے ہیں' اور قواعد کلیہ کے تغیر وتبدل کو ہم "بدعت کبریٰ" قرار دیتے ہیں۔"

بدعت کی ان دونوں اہم شکلوں کے ساتھ آخری شکل اسی کی یہ ٹھہراتے ہوئے کہ

"اعمال جزئیہ کی کمی وبیشی کو ہم "بدعت صغریٰ" کہتے ہیں۔"

بعض تشریحی اشاروں کے بعد اپنے اس فیصلہ کو جو قلم بند فرمایا گیا ہے' کہ

"بالجملہ ہم' تغیر وتبدیل عقائد کو جیسے تسنن وخوارج ومعتزلہ کیا "راس البدعات"

اور قواعد کلیہ کو مثل ایجاد تعزیہ و ماتم داری کو بدعت کبریٰ، اور کمی و بیشی صور جزئیہ کو بدعت صغریٰ کہتے ہیں "

اور لکھا ہے کہ

" برائی کی کمی و زیادتی بدعات میں بقدر بڑائی و چھوٹائی بدعات کے سمجھتے ہیں "

حاصل یہی ہے، کہ بدعت چھوٹی ہو، یا بڑی، بدعت ہی ہے، اور گمراہی و ضلالت کے سوا وہ اور ہو ہی کیا سکتی ہے۔ لیکن ایک ہی لاٹھی سے بدعت کی ہر قسم کو ہانکنا "شرعی حقائق" کی صحیح یافت سے محرومی کی دلیل ہے، اوروں کا خیال خواہ کچھ ہی ہو لیکن اس باب میں سیدنا الامام الکبیر نے اپنے احساس کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا ہے کہ

" وہ بدعتیں جن کو کبریٰ کہئے، بیشتر فرقہائے باطلہ مثل شیعہ و خوارج میں پائے جاتے ہیں اور کثر بعض جماعات اہل سنت میں نظر آتے ہیں "

اور "اہل سنت کے بعض جماعات" جن میں "بدعت کبریٰ کی بعض قسموں کی نشاندہی حضرت والا نے فرمائی ہے، سمجھا آپ نے یہ کون لوگ ہیں؟! الحمد للہ کہ اب ہندوستان میں ان کا پتہ نہیں ہے سیدنا الامام الکبیر جس زمانہ میں یہ لکھ رہے تھے، اس وقت تک ان لوگوں سے ملک پاک نہیں ہوا تھا، یہ بے قید فقیروں کی مختلف ٹولیاں تھیں، جن میں بعض رسول شاہی بعض امام شاہی، بعض نوشاہی، بعض خلیفہ شاہی، وغیرہ وغیرہ بیسیوں ناموں سے نکل پڑی تھیں [1]۔ بہر حال حضرت والا نے بھی "اہل سنت کے ان بعض جماعات" جن کی بدعات کو آپ نے "بدعات کبریٰ" کے ذیل میں شمار کیا ہے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسی موقعہ پر یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

---

[1] اس زمانے کے اباحیہ اور بے قید فقیروں کی تاریخ آپ کو کچھ تو امیر شاہ خان مرحوم کے ملفوظات (ارواح ثلاثہ) میں ملے گی، خاکسار نے بھی جو کتاب "اطلاقی تصوف" کے نام سے لکھی ہے، مقالات کی شکل میں اس کا کثیر بیش تر حصہ "المحق" نامی حیدرآباد کے ایک ماہوار رسالہ میں شائع بھی ہو چکا ہے اس میں بھی کچھ ان ٹولیوں کے حالات مل سکتے ہیں، "مناقب العارفین" صوفیہ ہند کا ایک تذکرہ رامپور کے ایک مصنف نے لکھا ہے، اس میں بھی کچھ چیزیں درج ہو گئی ہیں ۱۲

"ان کو اہل سنت والجماعت کہنا محض تکلف و مجاز ہے، فقط باعتبار اشتراک بعض علامات اہل سنت جن کے سبب سے اہل سنت فرقہائے باطلہ مشہورہ سے متمیز ہیں ان کو اہل سنت کہتے ہیں، ورنہ یہ لوگ بھی مثل دیگر فرقہائے باطلہ ایک مذہب باطل رکھتے ہیں۔"

آگے مزارپرست فقیروں کے ساتھ مثلاً رسول شاہی فقیروں کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔ کہ

"ان کے یہاں وضو، نماز اور حرمت شراب و بھنگ وغیرہ سے بالکل دست برداری اختیار کی گئی ہے تو سب اصحاب اور ماتم و تعزیہ داری وغیرہ میں شیعہ و خوارج کر متمیز ہیں۔" ص۱۲

بہرحال اس قسم کے دین باختہ طبقات کے سوا مسلمانوں کی عمومیت اور سواد اعظم سنی مسلمانوں کی جو ہے، ان کی بدعات کو "راس البدعات" یا "بدعات کبریٰ" کے مقابلہ میں حضرت والا نے بدعت کی آخری قسم یعنی "بدعت صغریٰ" ہی کے ذیل میں عموماً داخل فرمایا ہے، جن کی برائی بدعت کی دونوں اہم قسموں کے مقابلہ میں جیسا کہ آپ پڑھ چکے۔ حضرت والا کی نگاہ میں اتنی زیادہ سخت نہ تھی، جتنی شدت بدعت کی ان دو قسموں میں پائی جاتی ہے۔ آپ نے مثلاً بدعت صغریٰ کو سمجھاتے ہوئے لکھا ہے کہ

"جیسے اکثر اہل اسلام میں بعض مواقع پر رسم سلام مسنون موقوف ہو گئی، اور حضرت سلامت وغیرہ الفاظ نو احداث شائع ہو گئے۔"

یہی رسم بدعام مسلمانوں میں جو مروج ہو گئی تھی، حتیٰ کہ عوام سے منتقل ہو کر خواص کی مجلسوں تک اس کا اثر اس زمانہ میں پھیل گیا تھا، اس کا ذکر کر کے حضرت والا نے لکھا ہے کہ

"سو یہ صدور جزئیہ کی کمی و بیشی ہے۔" ص۱۲

اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ عام مسلمانوں میں جو بدعتیں پھیلی ہوئی تھیں ان کو بدعت تو آپ ضرور قرار دیتے ہیں، اور خود عملی حیثیت سے آپ کا اصرار اس باب میں جتنا شدید اور سخت تھا اس کا

پتہ اسی سے چلتا ہے، کہ جاہلوں کے نذر و نیاز کا کھانا خود کبھی نہیں کھاتے، مگر نظری و قولی حیثیت سے ان کی نوعیت بدعت ہونے میں ان امور کے مانند نہ تھی، جنھیں "بدعات کبریٰ" ذراس لیدنا آپ سمجھتے تھے۔ علمی حیثیت سے اس سلسلہ میں حضرت والا کی تنقیحات کے تفصیلی جائزہ کا تو یہاں موقعہ نہیں ہے، اس کے لئے تو اگلے حصہ ہی کا انتظار کرنا پڑے گا، یہاں تو عام مسلمانوں یا کہئے تو کہہ سکتے ہیں کہ اہل سنت والجماعت یا سنی مسلمانوں کی داخلی اصلاحات کے سلسلہ میں آپ کے رویہ اور طریقہ عمل کا تذکرہ مقصود تھا، انشاء اللہ اس کے سمجھنے کے لئے اتنی بحث اس مسئلہ پر کافی ہو سکتی ہے۔

اصلاحی دائرے میں "عقد بیوگان" کے مسئلہ کے بعد دوسری چیز تطہیر و تزکیہ کا بھی کام تھا خانوادہ ولی اللٰہی سے اس تحریک کی ابتداء ہوئی تھی، حضرت مولانا اسماعیل شہید کے زمانہ میں پروان چڑھی، اور ولی اللٰہی خدمات کا جائزہ قدرت کی طرف سے سیدنا الامام الکبیر اور آپ کے رفقاء کرام کے سپرد ہوا، تو ان بزرگوں نے بھی اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھا، لیکن جہاں تک حضرت والا کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے عام مولویوں کی طرح اصلاح کے اس خاص پہلو کو نہ آپ سب کچھ خیال کرتے تھے اور نہ جیسا کہ آپ نے دیکھا بدعت کی تمام قسموں کی نوعیت بھی آپ کی نظر مبارک میں ایک ہی جیسی تھی، اور نہ اہمیت ہی میں سب کا درجہ مساوی تھا، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے حضرت والا کی اصلاحی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک موقع پر یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ

"مولانا کی نظر اصول پر تھی، نہ فروع پر"

آگے جو یہ لکھا ہے کہ

"خود تو مستحبات بھی ترک نہ کرتے تھے، اور مکروہات سے پرہیز فرماتے تھے، مگر اوروں (یعنی عام مسلمانوں) کے ترک و اختیار سے کچھ پروانہ کرتے مگر فرض وواجب کے تارک پر صبر نہ کرتے اور اس کے روگ کو کمال حکمت سے دور فرماتے" ص ۲۹

یہ بڑے جتہ کی بات ہے ۔ اور قرآن وقیاسات، روایات وحکایات کی امداد سے فقیر جس نتیجہ تک پہنچا ہے اسی نتیجہ تک معلوم ہوتا ہے کہ اپنے دیدہ مشاہدات اور عملی تجربات سے وہ بھی پہنچ تھے حاصل وہی ہے کہ "فرق مراتب" کی جو قدرتی کیفیت شرعی مطالبات ومنہیات میں پائی جاتی ہے، مسلمانوں کی "داخلی اصلاح" کے معاملہ میں یہ نکتہ حضرت والا کی حکیمانہ نظر سے کبھی اوجھل نہ ہوا، چاہتے تو آپ بھی یہی تھے کہ مسلمانوں کی دینی زندگی غیر دینی آلائشوں سے پاک ہو کر صحیح اسلامی قالب میں ڈھل جائے لیکن بنی آدم کی فطری کمزوریوں کی بھی رعایت فرماتے، فرض وواجب کی حدود میں جو چیزیں داخل نہیں ہیں، ان کے متعلق بہ نسبت قول کے عملی درس آپ کے نزدیک بار آوری کا زیادہ ضامن تھا، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے جو یہ لکھا ہے کہ "مستحبات و مکروہات کے ترک واختیار سے کچھ پروا نہ کرتے" اس بے پروائی کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ زبان مبارک سے ٹوک ٹاک کے عادی اس نوعیت کے امور میں آپ نہ تھے۔ اس باب میں کرکے بتانا اسی کو کافی خیال فرماتے تھے۔ آپ کے قلمی مآثر میں ان کی ساخت کی بھی جو محویت ہوتی ہے، جن کا تعلق آپ ہی کی اصطلاح کی رو سے "بدعات غیرہ" سے ہے اس کا راز بھی یہی ہے۔ قلم کا درجہ تو زبان کے بعد ہے، زبانی ارشاد سے ان امور میں جو احتیاط سے کام لیتا ہو، سمجھا جا سکتا ہے کہ وہی ان پر قلم اٹھانے کو کس حد تک مفید خیال کر سکتا تھا، کاش اہل قلم کی عمومیت میں بھی شرعی مطالبات وممنوعات کے "فرق مراتب" کی یہ تمیز پیدا ہو جائے، تو چھوٹی چھوٹی باتوں میں جھگڑنے بلکہ لڑنے کے الزام میں مولویوں کی رسوائیاں اس حد تک نہ پہنچتیں، جہاں تک وہ پہنچ کر رہیں۔ مستحبات و مکروہات کے سلسلے کے ایک ایک جزئیہ پر طومار تیار کر دیا گیا ہے، اور علمی مباحث سے زیادہ بسا اوقات پھکڑبازیوں تک نوبت پہنچ گئی تھی،

غفر اللہ لنا ولھم فتلک امۃ قد خلت لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت

لیکن اسی کے ساتھ سوانح مخطوطہ کے مصنف کے بیان سے ایک نئی آگاہی بھی حاصل ہوتی ہے، یعنی اخذ وترک یا کرنا نہ کرنا جن باتوں کا استحباب وکراہت کی حدود سے تجاوز نہ کرتا

دوسرے لفظوں میں چاہیں تو حضرت والا کی اصطلاح کی رو سے کہہ سکتے ہیں کہ "بدعات صغیرہ" کے متعلق جہاں آپ کا یہ طرزِ عمل تھا، وہیں ان ہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے اصلاحی نظام نامہ میں علاوہ ان کے اس قسم کی چیزیں بھی شریک تھیں جن پر بدعت کے اصطلاحی لفظ کا اطلاق تو نہیں ہو سکتا تھا، لیکن امتدادِ زمانہ سے بدعت کا رنگ ان میں پیدا ہو چلا تھا، یا بجائے بدعت کے اسلامی تعلیمات کے دوسرے واقعات کا اقتضا تھا کہ ان کی طرف بھی توجہ کی جائے[1] -

---

[1] میرا مطلب یہ ہے کہ اخروی ثواب و عقاب کے نتائج کن اعمال و افعال پر مرتب ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس کے جاننے کا واحد ذریعہ صرف وحی و نبوت ہے، اسی لئے کسی قول و عمل حرکت و سکون پر یہ حکم لگانا کہ خدا اس سے خوش ہوتا ہے یا ناخوش، یہ کام صرف پیغمبروں کا ہے۔ اسی لئے بدعت نام ہے اسی اضافہ کا جس کے متعلق اخروی ثواب و عقاب یا حق تعالیٰ کی خوشی و ناخوشی کا خیال شریعت کے توسط کے بغیر قائم کر لیا جائے۔ ورنہ اس خیال کے بغیر کسی قسم کا کام اگر کیا جائے تو خواہ اس لئے کہ عہدِ نبوت و قرونِ مشہود لہا بالخیر میں اس کا پتہ نہیں چلتا، ہم اس کو بدعت نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ یہ الدین کے اس مجموعہ میں اضافہ نہیں ہے جس کے ساتھ خدا کی رضامندی و نارضامندی کا تعلق ہوتا ہے۔ من احدث فی امرنا ھذا (جس نے ہمارے اس کام میں نئی بات کا اضافہ کیا) بدعت کی حقیقت کی طرف ان الفاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اشارہ فرمایا ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ دین میں اضافہ ہی بدعت ہے، حضرت الاستاذ الامام الکشمیری رحمۃ اللہ علیہ اسی بنیاد پر فرمایا کرتے تھے کہ شادی بیاہ وغیرہ جیسی تقریبوں میں جن رسوم کا اضافہ مسلمانوں نے کر لیا ہے۔ مثلاً گشت کرانا، روشنی اور بھی واہی تباہی باتیں، تو ان رسوم کو بدعت کی مد میں ہم اس لئے داخل نہیں کر سکتے کہ ان اعمال و افعال سے ثواب و عقاب کا مسلمانوں کے نزدیک تعلق نہیں ہے، یہ کوئی نہیں سمجھتا کہ دولہا کو گھوڑے پر بٹھا کر شہر میں گشت اگر نہ کرایا جائے گا تو گناہ ہوگا یا کرنے پر ثواب ملے گا، فرماتے تھے کہ ان رسوم کو بجائے بدعت کے اسراف، فضول خرچی، لغو و لایعنی اعمال وغیرہ کی مدوں میں ہم داخل کر سکتے ہیں کہ شریعت ان امور کو بھی پسند نہیں کرتی بلکہ چاہیئے تو اس کو اطفی و حماقت کی مد میں شریک کر دیجئے۔ اپنے آپ کو احمق بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرنا یہ بھی غیر شرعی فعل ہے۔ اسی طرح فرماتے تھے کہ میت کے متعلقہ رسوم کی نوعیت ذرا مختلف ہے۔ موت کا تعلق عالمِ آخرت سے ہے، کرنے والے ثواب و عقاب کے خیال سے نہ بھی کریں لیکن موت کی خصوصی کیفیت میں اس کی صلاحیت ہے کہ رفتہ رفتہ اس خیال کو عوام میں پیدا کر دے کہ فلاں رسم کے کرنے سے مردے کو آرام و سکون ملتا ہے نہ کیا جائے گا تو دکھ ہوگا، یہ پھر وہی ثواب و عقاب کا خود تراشیدہ عقیدہ ہے جو اعمال و افعال میں بدعت کا رنگ پیدا کر دیتا ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

دیوبند کے مسلمانوں نے باہمی معاہدے کی شکل میں حضرت والا کے سامنے ایک اصلاحی وثیقہ پر دستخط کئے تھے۔ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اسی وثیقہ کا ذکر کرتے ہوئے، اس کے دوسرے مندرجات و مشتملات کے ساتھ لکھا ہے کہ حسب ذیل امور بھی اس میں تھے یعنی بیاہ شادی میں جو مسرفانہ فضول رسوم مقرر ہیں، اور ان کی پابندی سے بہت تکلیف اور زیر باری اٹھانی پڑتی ہے، بالکل موقوف کردیے جائیں گے، اسی طرح عیادت (بیمار پرسی) کے سلسلے میں رسوم بڑھاتے ہوئے لوگوں نے اس نوبت تک ان کو پہنچا دیا تھا کہ علاج و معالجہ کے ناگہانی مصارف کے ساتھ ساتھ ایک مستقل مالی مصیبت اس خاندان پر ٹوٹ پڑتی تھی جس میں اتفاقاً کوئی بے چارا مرض کا شکار ہوجاتا تھا۔ خصوصاً مستورات ڈولوں میں کس کس کر یکے بعد دیگرے بیمار کے گھر یلغار کردیتی تھیں۔ ان کی خاطر و مدارات سواری شکاری کے قصوں سے لوگوں کا ناک میں دم آگیا تھا، لیکن رسوم کی انہیں زنجیروں کا توڑنا آسان نہ تھا۔ دیوبند کے مسلمانوں کو اس پر راضی کرلیا گیا تھا کہ "مستورات جو مریض کی عیادت کو جاتی ہیں، اور اس میں بیمار، اور تیمار دار دونوں کو تکلیف ہوتی ہے" اس رسمی دستور کو ترک کردیں گے۔ مطلب یہی تھا کہ عیادت کے مسنون طریقہ پر مزید اضافے جو باعث گرانی بن گئے ہیں، وہ چھوڑ دیے جائیں گے

عیادت کے بعد پھر تعزیت اور پرسہ کے مراسم کے طول طویل قصے تھے۔ مرنے والے کے مرنے کے بعد ہر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے معاشی موت کی کش مکش میں پس ماندوں کو مبتلا ہونا پڑتا تھا، سوم، چہارم، دہم، چہلم، چھ ماسی، برسی کے نہ ختم ہونے والے دعوتی مطالبات

---

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) بدعت کی یہی روح جو اسے افترا علی اللہ والرسول کی حد میں داخل کردیتی ہے۔ وہ مادہ ہے جس کی وجہ سے مذہب نے اس کو غیر معمولی قرار دیا ہے۔ ۱۲ (حاشیہ کا مضمون بالکل حق ہے لیکن اگر اس کی تعبیر اس طرح کی جاوے کہ شادی بیاہ میں جو لایعنی امور انجام دیے جاتے ہیں انہیں تو رسوم سے تعبیر کیا جائے اور غمی میں جو فضولیات و خرافات برتی جاتی ہیں انہیں بدعات کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے حضرت گنگوہیؒ کی یہی اصطلاح تھی لیس رسوم کی دو قسمیں ہیں کہ ایک بدعت ہو اور ایک معاملات۔ مثلاً امور کی دو قسمیں ہیں ایک رسوم اور ایک بدعات یہ اصطلاح زیادہ واضح رہے گی حضرت الاستاذ الکشمیری قدس سرہ حضرت گنگوہی کی اصطلاح کی تفصیل و تشریح فرمایا کرتے تھے جس کا مصنف علام نے حاشیہ میں حوالہ دیا ہے)
محمد طیب غفرلہ

تھے، جو برادری والوں کی طرف سے مرنے والے کے پس ماندوں پر عائد ہو جاتے تھے، اور جس راہ سے بھی ہو، برادری کے ان مطالبات کی تکمیل پر غریب مجبور تھے۔ یہ طے کیا گیا تھا کہ تعزیت کے سلسلے میں بھی ساری غیر شرعی رسوم کو ختم کر دیا جائے گا، اسی کے ساتھ ایک دفعہ اسی "باہمی معاہدے" کے وثیقہ میں یہ بھی تھی، سوانح مخطوطہ کے مصنف کے بجنسہ الفاظ اس کے متعلق یہ ہیں کہ،

"مستورات کے لباس میں جو اسراف ہو رہا ہے اس کی اصلاح کی جاوے"!

یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ مولویوں کے عام طبقہ کی نظر زیادہ تر ان ہی امور پر مرکوز ہوتی ہے جنہیں اصطلاحاً "بدعات" کہتے ہیں۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں سیدنا الامام الکبیر کے اس اصلاحی نظام نامہ کی مذکورہ بالا دفعات کو، جیسا کہ میں نے عرض کیا ان میں بعض چیزیں ایسی بھی ہیں، جن میں حالاً یا مآلاً "بدعت" بن جانے کی صلاحیت تھی، مگر اسی کے ساتھ ہم ان ہی میں ان اجزا کو بھی پاتے ہیں، جن کے انسداد کی طرف اسی کی توجہ ہو سکتی ہے جس کی نظر میں معاد کے ساتھ مسلمانوں کے معاش اور معاشی مشکلات کو بھی کافی اہمیت ہو۔

میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ بھوکوں کو کھانے پر اور پیاسوں کو پینے پر آمادہ کرنے کے لئے آج کل ترقی و عروج وغیرہ کے عنوانوں پر وعظ فرمائیوں کا رواج عموماً جو جاری ہے اور انسانی جبلت جو نظرۃً شح (لالچ) اور ہلوعیت (بے صبری) کے تقاضوں کے ساتھ پیدا ہوئی ہے۔ اسی کو آمادہ کیا جاتا ہے کہ جس حد تک اس جذبہ کا بھڑکانا ممکن ہو، کوشش کا دقیقہ اس میں اٹھا نہ رکھا جائے لالچی بنو اور لالچی بنتے چلے جاؤ۔ حریص بنو اور بنتے چلے جاؤ، ان ہی عنوانوں پر دھواں دھار تقریریں کی جاتی ہیں، خطبے دئیے جاتے ہیں، منبر اور کرسیوں کے ساتھ ساتھ اب تو محراب و منبر تک حرص و آز کے ان ہی مواعظ سے ہل رہے ہیں۔ العیاذ باللہ شاید میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ سیدنا الامام الکبیر کا بھی کوئی حصہ وعظ و پند کے اس عجیب و غریب حصے میں تھا۔ یہ صحیح ہے کہ آپ کے عہد مبارک ہی میں دعاۃ و ہداۃ کا ایک بڑا طبقہ حکومت مسلط کے زیر اثر مسلمانوں کو اسی قسم کے وعظ سنانے لگا تھا۔

خود روتا تھا اور دوسروں کو رلاتا تھا۔ چھاتیاں پیٹی جارہی تھیں۔ کپڑے پھاڑے جارہے تھے۔ مخاطب قوم تھی، اور نصب العین ترقی "ترقی" کا لفظ تھا، اکبر مرحوم جسے دیکھ دیکھ کہا کرتے تھے۔

ترقی کے بجتے کیا کیجئے
کمیٹی میں چندے دیا کیجئے

ظاہر ہے کہ جس لاہوتی دانش اور ملکوتی فرزانگی سے سیدنا الامام الکبیر فطرتاً سرفراز تھے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس قسم کے انتساب کی جرأت کون کرسکتا ہے۔ میرا خیال تو ہے کہ ان نئے عنوانوں پر وعظ کہنے والے غریبوں کو شاید خود بھی اس کا شعور نہ تھا کہ حقیقی مضمون ان عنوانوں کا بالآخر کیا ٹھہرتا ہے "دنیا کے جس حد تک لالچی بن سکتے ہو، بنتے چلے جاؤ" انسانیت کا یہی سب سے بڑا کمال اور نقطہ عروج ہے۔ بھلا کوئی سنجیدہ آدمی اس موضوع پر وعظ کہنے کے لئے بہ ثبات عقل و ہوش ایک لمحہ کے لئے بھی آمادہ ہوسکتا ہے، مگر لفظی دل آویزیوں نے معانی سے ان کی توجہ پھیر لی تھی۔ اپنے نزدیک وہ یہی سمجھتے رہے کہ مسلمانوں کے آگے کسی بڑے نصب العین کو پیش کررہے ہیں۔ اسی لئے میں ان بزرگوں کو قابل معافی سمجھتا ہوں جنہوں نے دنیا طلبی کے مواعظ سے مسلمانوں کے کانوں کو بہرا بنا دیا تھا۔ غفر اللہ لہم۔ نیت بہرحال ان کی اچھی تھی اور اب بھی ترقی و تعلی کی ان ہی پرانی لکیروں کو جو پیٹے چلے جارہے ہیں، بجز اس کے کہ ان کی عقلوں پر ترس کھایا جائے اور کیا کیا جاسکتا ہے۔

خیر میں کیا کہنے لگا، عرض یہ کررہا تھا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف کے بیان کے مطابق دیوبند کے مسلمانوں کے راضی نامہ کے مذکورہ بالا دفعات کے پڑھنے سے اس کا اندازہ ضرور ہوتا ہے، کہ حکومت کے دور میں اپنی حاکمیت کے زمانہ کے رواجوں، اور دستوروں کے نباہنے کا جذبہ مسلمانوں پر جو مسلط تھا، جلنے کے بعد بھی رسی کی اینٹھن باقی تھی۔ اسی کی گرفت سے دل تو سب ہی بے کل اور بے چین تھے۔ لیکن زبان سے اپنی زبوں حالیوں کے اقرار پر کوئی آمادہ نہ تھا۔ حمیت اور غیرت کا مسلمانوں کے شاید یہی تقاضا تھا۔ مگر پانی سر سے اونچا ہوچکا تھا،

جو کچھ دلوں میں تھا، جرأت کر کے سیدنا الامام الکبیر نے چاہا کہ عمل میں بھی اس کو داخل کر کے پھیلاؤ کو چادر کی وسعت کے مطابق کر دیا جائے اور گو بظاہر اصلاح کے ان شعبوں کا تعلق، اگرچہ معاش ہی سے تھا لیکن عرض کر چکا ہوں کہ اسراف و تبذیر وغیرہ کے قوانین کو نافذ کر کے اسلام نے گویا اس حد تک مسلمانوں کی دنیا کو بھی دین اور دین کا ایسا جزء بنا دیا ہے۔ جس کی خلاف ورزی سے معاش کے ساتھ مسلمانوں کا معاد بھی متاثر ہوتا ہے۔ بلکہ بعض دفعات اسی راضی نامہ کی ایسی بھی ہیں، جن میں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، دین میں خود تراشیدہ اضافہ بن جانے کی بھی کافی صلاحیت تھی، ایسی صلاحیت کہ دین کا کوئی سچا ہمدرد اور خادم صادق اس سے قطع نظر نہیں کر سکتا، جیسا کہ میت کے متعلقہ رسوم وغیرہ کے حال سے ظاہر ہے،

خلاصہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی داخلی اصلاح کے سلسلہ میں بیان کرنے والوں نے یہ اور اسی قسم کی باتیں نقل کی ہیں، یہ راضی نامہ جو دیوبند کے مسلمانوں کے درمیان حضرت والا کی تحریک سے طے ہوا تھا، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اس کا تذکرہ کر کے یہ اطلاع بھی دی ہے، کہ صرف "کاغذی راضی نامہ" بن کر نہیں رہ گیا تھا، بلکہ وہی لکھتے ہیں کہ اسی کی بدولت،

"شادیوں میں بھی فضول خرچی اکثر موقوف ہو گئی، اور رسوم کی پابندی بالکل نہ رہی"

اسی طرح مسلمانان ہند پر خاندان کے کسی رکن کی موت جس نہ ختم ہونے والی مالی مصیبت کے طوفانی دہانے کو کھول دیتی تھی۔ اس کی طرف اشارہ کر کے وہی خبر دیتے ہیں کہ

"میت کے رسوم بہت کم ہو گئے، اکثر جگہ سے سیوم و دہم و بستم و چہلم موقوف ہو گیا"

لیکن اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ عمل کی دنیا سے منقطع ہونے والوں کو شرعاً عملی دنیا کے رہنے والوں سے جو امداد مل سکتی تھی فیض کا یہ دروازہ بھی بند ہو گیا تھا، بدقسمتی سے رسوم کے انسداد کے بعد بسا اوقات کچھ اسی قسم کی صورت حال پیش بھی آجاتی ہے، اگرچہ رسمی قالب میں مرنے والوں کے نام سے جو کچھ کیا جاتا ہے۔ چونکہ زیادہ تر سوسائٹی کے دباؤ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لئے عموماً

مروجہ رسوم سے بھی سچ پوچھئے تو مرنے والے کی روح کو مستفید ہونے کا موقع نہیں ملتا تھا، بہرحال سیدنا الامام الکبیر کی تحریک سے ایک طرف رواجی دستور کی زنجیریں جہاں کاٹی اور توڑی جارہی تھیں، وہیں دوسری طرف جیسا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف ہی نے لکھا ہے کہ

"ایصال ثواب میت کا پورا پورا طریقہ شرع شریف کے موافق ہو گیا"

یعنی رسمی قیود سے آزاد ہو کر مرنے والوں کے نام جن مالی اور بدنی عبادات کی راہوں سے ثواب پہنچانے کی شرعاً گنجائش تھی، اس کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ پوری قوت کے ساتھ باقی رکھنے کی کوشش کی گئی اور آج تک بحمد اللہ اس کا سلسلہ باقی ہے، چاہئے بھی یہی کہ ان طریقوں کو شرعی حدود کی پابندی کرتے ہوئے باقی رکھا جائے۔ عمل کی دنیا سے رخصت ہو جانے والوں کے ساتھ حسن سلوک کی بھی ایک راہ کھلی ہوئی ہے اور اسی تدبیر سے زندوں اور مردوں کے درمیان گونہ ایک قسم کا تعلق بھی قائم رہتا ہے، بہرحال اہل السنت والجماعت یا سنی مسلمانوں میں ایسے رسوم اور رواج جن کی کوئی بنیاد ہی نہ تھی، ان سے تو سنیوں کی دینی زندگی کو پاک و صاف کرنے میں جرأت اور کامل عزم و ارادہ کا اظہار آپ کی طرف سے ہوتا تھا، لیکن ایسے مسائل جن میں علماء اہل السنت والجماعت میں علمی اختلافات تھے۔ یعنی اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں ہر فریق کتاب و سنت ہی کے شواہد پیش کیا کرتا تھا، سیدنا الامام الکبیر ان مسائل میں اگرچہ خود اپنی ترجیحی رائے بھی رکھتے تھے۔ پوچھنے والے پوچھتے، تو وجوہ کے ساتھ اپنی رائے سے لوگوں کو آگاہ بھی کر دیا کرتے تھے۔

لیکن اسی کے ساتھ آپ کا اصولی مسلک اس قسم کے اختلافی مسائل میں یہ بھی تھا جس کا ذکر اپنے بعض مکتوبات میں فرمایا ہے۔ یعنی امت کے اکابر اور سربرآوردہ علماء جن مسائل میں باہم مختلف ہیں ان کے متعلق یہ فرماتے ہوئے کہ

"اگر ایک طرف بالکل ہو رہے تو کسی نہ کسی طرف والوں کو برا سمجھنا پڑے گا"

اپنے منشاء کا اظہار حضرت والا نے ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ

"اس لئے اہل اسلام کو یہ ضروری ہے کہ ایسے مسائل میں خواہ مخواہ ایسے پکے نہ ہو بیٹھیں کہ دوسری طرف کو بالکل باطل سمجھ لیں" صفہ جمال قاسمی

اور یہی ہے بڑے پتے کی بات جس کی پروا مناظرہ اور مباحثہ کی مناقشتوں میں مبتلا ہو کر لوگ بالکل نہیں کرتے، آخر جن بزرگوں کے ساتھ حسن ظن کا تعلق ان کے علم و عمل کی وجہ سے امت قائم کر چکی ہے، ان کو اچھا بھی سمجھنا اور پھر ان ہی کی طرف یہ بھی منسوب کرنا کہ کتاب و سنت کے اقتضاؤں سے بے پروا ہو کر انہوں نے فیصلہ کیا' خود ہی سوچئے کہ ذہنی تناقض کے سوا اور کیا ہے؟ اور جہاں ان اختلافی مسائل کے متعلق آپ کا یہ مشورہ تھا کہ "خواہ مخواہ ایسے پکے نہ ہو بیٹھیں، کہ دوسری طرف کو بالکل باطل سمجھ لیں" اسی طرح تکفیر مسلمانوں پر کفر کا فتویٰ لگانے کا جو رجحان مولویوں میں بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے متعلق حضرت والا کے نقطہ نظر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، اپنے ایک فارسی مکتوب میں خاص مسئلہ جو اس زمانہ میں چھڑا ہوا تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے اور یہ فرماتے ہوئے کہ

"در مسلماناں کیست کہ قرآن دین و ایمان او نباشد" صفہ

اور اسی واقعہ کو بنیاد بنا کر عام مشورہ آپ نے یہی دیا ہے کہ

"بنا ؤ علیہ تا مقدور کسے را کافر نباید دانست" صفہ فیوض قاسمیہ

خلاصہ یہ ہے کہ رائے میں اختلاف کی آزادی کے فطری حق کو محفوظ کرتے ہوئے اہل علم کو مذکورہ بالا نوعیت کے مسائل میں ایک ایسے اسلم و احکم طریقہ کی طرف راہ نمائی فرمائی گئی ہے جس کی اگر پابندی کی جائے تو ایک بہترین شائستہ باادب ماحول نزاعی مسائل کے سلسلہ میں پیدا ہو سکتا ہے۔ مقصد بہر حال یہ تھا کہ حتی الوسع لڑنے جھگڑنے میں مولویوں کا طبقہ عموماً اس زمانہ میں بہت زیادہ بدنام اور رسوا ہو رہا تھا۔ اس بدنامی اور رسوائی کو کم کیا جائے۔ اپنے بعض مکاتیب میں حضرت والا نے بڑے افسوس کے ساتھ لکھا ہے کہ

"یارب ایں زمانہ چہ پر شور ست کہ بجائے محبت و اخوت اسلامی عداوتہا برخاستند"

اور یہ عداوتیں، جو محبت واخوت کی جگہ اٹھ کھڑی ہوئی ہیں، فرماتے ہیں کہ بڑے اہم مسائل سے ان کا تعلق نہیں ہے، بلکہ

"دراں مسائل کہ متفق علیہا بود تدا ختلاف پدید آمد" ص۲۴ فیوض قاسمیہ

اور ایک دوسرے خط میں جس کی زبان اردو ہے، بڑے اندوہناک لہجہ میں ارقام فرماتے ہیں،

"یہ اختلاف ہی موجب عداوت ہے، اور یہ عداوت باہمی موجب تفریق دگر ہے" ص۳۹

فرماتے تھے کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھنا ہی بے معنی ہے، تیرہ سو سال سے امت جو کچھ مانتی چلی آرہی ہے خواہ مخواہ اس میں شاخسانے نکالے ہی کیوں جائیں، اور اختلاف کسی وجہ سے اٹھ کھڑا ہی ہو تو اختلاف سے عداوت کیوں پیدا ہو، باہمی منافرت کے بغیر بھی کیا مسائل کی علمی تحقیقات ممکن نہیں،

بڑی مایوسی کے لہجہ میں اپنے اردو زبان والے خط میں ارقام فرماتے ہیں۔

"اس زمانہ میں ہر توقع بے جا ہے کہ اختلاف اٹھ جائے اور اتفاق پیدا ہو جائے"

پھر مرض کے سبب کی تشخیص خود ہی یہ فرمائی ہے کہ

"ابنا روزگار میں فہم وانصاف ہوتا، تو بعد فہمائش ممکن تھا کہ یہ اختلافات اٹھ جاتے" ص۳۹

اور سچ پوچھئے تو ہماری یہ ساری رسوائیاں جو غیر قوموں کے سامنے ہوتی رہتی ہیں، "فہم وانصاف کی کمی" ہی کے نتائج ہیں، بلکہ فہم اور سمجھ لوگوں کی درست ہوتی، تو انصاف کا جذبہ خود بخود ابھر آتا مگر کیا کیجئے، بقول سعدی

گر از بسیط زمیں عقل منعدم گردد
بخود گماں نہ برد ہیچ کس کہ نادانم

اس زمانہ میں ہندوستان پر حاکمانہ اقتدار جس قوم نے اپنا قائم کر رکھا تھا، علمی تحقیقات کے سلسلے میں اس قوم کی عام روش اور طریقہ کا چرچا بھی یہاں پہنچنے لگا تھا، بظاہر میرا خیال ہو شاید اسی کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے اردو زبان والے اسی خط میں حضرت والا کی نوک قلم

سے یہ الفاظ بھی ٹپک پڑے ہیں۔ مکتوب الیہ کو مخاطب کر کے ارقام فرمایا گیا ہے ۔

"مگر آپ جانتے ہیں کہ آج کل یہ دونوں (فہم و انصاف) نصیب اعدا ہیں" ص۱۲۴

بہر حال باوجود ان مایوسیوں کے آپ کی طرف سے کوشش اسی کی جاری تھی کہ مسلمانوں میں جہاں تک ممکن ہو اختلافات کی ناگوار اور مکروہ شکل اگر کلی طور پر ختم نہ ہو تو ممکنہ حد تک ان کے دائرے کو کم کیا جائے۔

اسی قسم کے ایک مسئلہ کے متعلق اپنی ذاتی رائے کو درج کرنے کے بعد فارسی زبان کے ایک مکتوب میں مکتوب الیہ سے اس کی فرمائش کرتے ہوئے کہ دوسرے معتبر اہل علم و تقویٰ سے بھی استمزاج کر لیجئے۔ اور جو کچھ ان سے معلوم ہو مجھے بھی اس سے مطلع کیجئے کس لئے مطلع کیجئے؟ کیا اس لئے کہ پھر جواب الجواب تیار کر کے بھیجوں؟ نہیں ان ہی سے سنئے، ارقام فرماتے ہیں۔

"ایں نیاز مند را ہم اطلاع فرمائند تا بہ پیروی جم غفیر کنم سر و ہم و در پے تفرق کلمہ نہ شوم" ص۲۹ فیوض قاسمیہ

لیکن اپنی ذات کی حد تک ان ترجموں کے باوجود، اصل دین کے ساتھ آپ کی سرگرمیوں کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے، کہ ایک مسئلہ کے متعلق یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ شرعی[1] اصطلاحات

---

[1] قرآن مجید میں ایک سے زیادہ جگہ پر فرمایا گیا ہے کہ "الغیب" کا علم حق تعالیٰ کے سوا اور کسی کو نہیں ہے فقل انما الغیب للہ (یونس)، ان اللہ یعلم غیب السماوات والارض (حجرات) لیکن اسی کے ساتھ قرآن ہی میں ہے کہ اپنے رسولوں میں جسے چاہتا ہے اللہ تعالیٰ غیب سے مطلع فرماتا ہے وما کان اللہ لیطلعکم علی الغیب ولکن اللہ یجتبی من رسلہ من یشاء (آل عمران)، اب سوال یہی ہے کہ غیر اللہ کو غیب کا علم جو عطا ہوتا ہے اس پر بھی "علم الغیب" کا اطلاق ہو سکتا ہے یا نہیں۔ حضرت والا نے ارقام فرمایا ہے کہ عام مسلمانوں میں یہی خیال پھیل گیا ہے کہ بالذات اور بالغیر غیب کے علم کی ان دونوں قسموں کو علم بالغیب کہتے ہیں۔ پس غیر اللہ کی طرف علم غیب کو منسوب کرنے کا یہ مطلب کوئی نہیں سمجھتا کہ بالذات غیب کا علم ان کو حاصل ہے بلکہ یہی سمجھتے ہیں کہ غیب کے اس علم سے حق تعالیٰ نے ان کو سرفراز کیا ہے، ظاہر ہے کہ اسی صورت میں مسئلہ علم غیب کا اختلاف لفظی نزاع کی صورت اختیار کر لیتا ہے، تفصیل کے لئے دیکھئے فیوض قاسمیہ ص۲۱

سے اگر قطع نظر کر لیا جائے تو عوام کے احساسات کو پیش نظر رکھنے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ

"ایں نزاع لفظی بر باشد"

یعنی لفظی ہیر پھیر سے زیادہ مسئلہ کی نوعیت اور کچھ باقی نہیں رہتی۔ مگر باوجود اس کے فرماتے ہیں کہ:

"اگر چہ معنی مخترع عوام باشد بر اہل ایمان، ہمچو اطلاق دیگر کفریات اگر چہ بہ تاویل حسن باشد گراں باشد" ؎۴۹

مطلب یہ ہے کہ شرعی اصطلاحات کا خواہ کوئی عامیانہ مطلب کیوں نہ تراش لیا جائے اور اس عامیانہ مطلب کو پیش نظر رکھتے ہوئے بظاہر کسی قسم کا سقم بھی محسوس نہ ہو، لیکن اس دلچسپ مثال کو پیش کرتے ہوئے یعنی

"اگر کسے نام فرزند خود اللہ یا رسول اللہ بہ نہد"

سیدنا الامام الکبیر نے پوچھا ہے کہ نام رکھ لینے والے کو اجازت دے دی جائے گی کہ اپنے بچہ کو اللہ کے نام سے پکارے 'یا رسول اللہ' کے نام سے مخاطب کرے؟ ظاہر ہے جیسا کہ ارقام فرماتے ہیں

"اہل ایمان و ایقان و اہل عقل و نقل راگوارا نتواں شد"

آپ نے اس کے بعد اس مسئلہ کی طرف بھی اسی سلسلہ میں توجہ دلائی ہے کہ گالی یا دشنام میں جن الفاظ کو لوگ استعمال کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ واقعہ نہیں ہوتا۔ لیکن لفظ میں بھی قوت ہوتی ہے تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے کہ رد عمل گالیوں کا کیا ہوتا ہے۔ پس عوام اپنے باہمی تعلقات میں الفاظ کے لفظی تقاضوں کو بھی جب برداشت نہیں کر سکتے، تو اسی سے سمجھنا چاہئے کہ کتنا گزند، اور کتنی تکلیف ان الفاظ سے بھی ایمان والوں کو پہنچ سکتی ہے، جن کا مطلب خواہ وہ نہ ہو، جو ان الفاظ سے بظاہر سمجھ میں آتا ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایک طرف رسولوں کو فہمائش کی جا رہی ہے کہ اپنے آپ کو جو مسلمان.

کہتا ہو، اس کو خواہ مخواہ یہ کہنا کہ تم مسلمان نہیں بلکہ کافر ہو، یا مسلمان ہونے کے باوجود یہ باور کرنا کہ قرآن کو خدا کا کلام نہیں سمجھتا، جیسے حضرت والا چاہتے تھے کہ اس معاملہ میں مولویوں کو محتاط رہنے کی ضرورت ہے، اسی طرح عوام کو سمجھایا جا رہا ہے کہ جن الفاظ اور محاوروں کا ایک شرعی مطلب مقرر ہو چکا ہے، اس مطلب سے ہٹا کر اپنے خود ساختہ معنی یا مطلب کو ان ہی الفاظ کی طرف منسوب کر کے ان کو استعمال کرنے سے، چاہئے کہ اہل ایمان و ایقان کو گزند پہنچائیں، آخر کوئی بدبخت مسلمان اپنے بچے کا نام "رسول اللہ" اگر رکھ لے[1] اور کہے مراد اس سے یہ نہیں ہے کہ اس کا لڑکا اللہ کا پیغام پہنچانے والا ہے، بلکہ سب نام جیسے رکھے جاتے ہیں، اسی طرح یہ نام میں نے رکھ دیا ہے، تو خود سوچنا چاہئے کہ ایمانی جذبات کو وہ کتنی آزمائش میں ڈال دے گا

یہ تھے سیدنا الامام الکبیر کی ان خدمات کے نمونے جن کا تعلق مسلمانان ہند کی اکثریت یعنی اہل سنت والجماعت کی عموماً دینی زندگی کی تطہیر و تزکیہ سے تھا، جب تک زندہ رہے تحریراً و تقریراً آپ مسلمانوں کو ان اصلاحی امور کی طرف متوجہ کرتے رہے، آپ کے بعد آپ کے تلامذہ اور آپ کے قائم کردہ دارالعلوم کے فارغ التحصیل علماء نے ملک کے طول و عرض میں آئندہ بھی اسی سلسلہ میں اپنی کوششوں کو جاری رکھا، خدا کا شکر ہے کہ اب تک وہ جاری ہے۔

ان کے بعد باشندگان ہند میں جو طبقہ شیعوں کا آباد ہے۔ اہل السنت والجماعت کے بعد قدرتاً بہ نسبت دوسری قوموں کے وہی سامنے آسکتے تھے۔ مقدمہ میں عرض کر چکا ہوں کہ مغل حکومت کے آخری دور میں ملک پر زیادہ تر شیعوں ہی کا سیاسی اقتدار مختلف وجوہ سے قائم ہو گیا تھا۔

[1] اور کیا کہا جائے مسلمان تو یہ بھی کر گذرے، ہندوستان کے ایک مشہور بیرسٹر آگرہ میں مسٹر نبی اللہ نامی رہتے تھے، اور رسول خاں، نبی خاں تو گویا عام اعلام مسلمانوں میں مروج ہو گئے ہیں۔ حد یہ ہے کہ فقیر دارالعلوم دیوبند میں جن دنوں پڑھتا تھا، صوبہ سرحد کے ایک مولوی صاحب مدرسہ میں مدرس ہو کر تشریف لائے تھے۔ جن کا نام مولوی رسول خان تھا۔ ۱۲

اکثر صوبوں کے بھی وہی مطلق العنان حکمران بن گئے تھے - اور مرکز بھی ان ہی کے زیر تسلط ہو چکا تھا، اورنگ زیب عالمگیر انار اللہ برہانہ کے بعد تخت پر جن نام نہاد بادشاہوں کو ہم پاتے ہیں، ان میں بعض تو علانیہ شیعہ عقائد اختیار کر چکے تھے - براہ راست عالمگیر کا جانشین بہادر شاہ اول آپ سن چکے کہ علماء اہل سنت والجماعت کو دربار شاہی میں بلا بلا کر خود مناظرہ کر کے تشیع کی پشت پناہی کر رہا تھا، جمعہ اور عیدین کے خطبوں سے خلفاء ثلثہ کے اسماء گرامی کو خارج کرنے کا فرمان بھی اس نے صادر کیا تھا، اور مغل حکومت کے ان شاہان شطرنج میں جو بظاہر شیعہ نہ تھے، بلکہ نام کی حد تک اپنے آپ کو سنی ہی کہتے اور سنی ہی سمجھتے بھی تھے - لیکن عملاً ان کی دینی زندگی میں بھی تشیع کے عناصر و اجزاء کچھ اس طرح گھل مل چکے تھے کہ ان میں اور شیعوں میں بہت کم فرق باقی رہا تھا[1] - حکومت کے اسی رنگ میں بتا چکا ہوں کہ مسلمانوں کی اکثریت بھی رنگ چکی تھی - خصوصاً سیدنا الامام الکبیر نے جس علاقہ میں اپنی آنکھیں کھولی تھیں، مختلف شہادتیں پیش کر چکا ہوں، کہ اس علاقہ میں جو شیعہ نہیں بھی تھے، ان کی دینی زندگی بھی تقریباً تشیع کی زندگی بن چکی تھی - سنیوں اور شیعوں میں شادی بیاہ کے تعلقات چونکہ قائم تھے، اس لئے سیاسی اقتدار

---

[1] عالمگیر کے بعد لال قلعہ کا رنگ بدلتے ہوئے کہاں تک پہنچا تھا ایک چشم دید شہادت اسکی "بزم آخر" نامی کتاب ہے، جس کے مصنف کی زندگی کا بڑا حصہ لال قلعہ میں گذرا تھا، منجملہ دوسری باتوں کے اسی کتاب میں یہ اطلاع بھی دی گئی ہے - اکثر سلاطین (شاہی خاندان کے افراد) قلعہ میں تعزیہ داری کرتے تھے، تعزیہ بیک بنتے تھے کوئی نشان بھی کوئی نقیب بنتا تھا، کوئی تاشہ کوئی ڈھول، کوئی جھانجھ، تعزیوں کے آگے بجاتا تھا، کوئی مرثیے پڑھتا تھا، مرثیے خوانوں کو درگاہ میں چار چار طشتریاں، چکنی ڈلیاں، بھنے ہوئے خربوزے کے بیج اور دھنیے کی ملا کرتی تھیں - بڑی دھوم سے علم اٹھاتے تھے ۔ ص ۲۸ یہ حال تو مغل شاہزادوں کا تھا، باقی خود بادشاہ سلامت سو اسی کتاب میں لکھا ہے کہ "بادشاہ حضرت امام حسن حسین کے فقیر بنتے، سبز کپڑے پہنتے، گلے میں سبز کفنی جھولی ڈالتے" بادشاہ کے گلے میں زنجیریں ڈال کر سید کھینچتے تھے اور حضرت عباس علمدار کے سقے بھی بادشاہ بنتے تھے - لال کھاروے کی ایک لنگی باندھے، شربت کی بھری ہوئی ایک مشک کندھے پر رکھ کر معصوموں کو شربت پلایا کرتے تھے - ص ۳۷ الغرض عشرہ محرم میں جو کچھ شیعوں کے یہاں ہوتا تھا - لال قلعہ کے سنی بادشاہوں کے یہاں بھی ہر ایک کی نقل ہوتی تھی ۱۲'

باہرے اور معاشرتی تعلقات اندر سے اس رنگ کو پختہ سے پختہ تر کرتے چلے جارہے تھے پانی جب سر سے اونچا ہو چکا تھا، تب خانوادہ ولی اللہی کو اس مسئلہ کی طرف توجہ ہوئی، حضرت مولانا گنگوہی کے حوالہ سے تذکرۃ الرشید میں یہ تاریخی بیان درج کیا گیا ہے فرماتے تھے کہ شیعوں کے متعلق

"ہمارے اساتذہ تو شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وقت سے برابر تکفیر ہی کے قائل ہیں، بعضوں نے اہل کتاب کا حکم دیا ہے اور بعضوں نے مرتد کا" ص۲۸۲

خود سیدنا الامام الکبیر نے اپنے ایک مکتوب میں یہ اطلاع بھی دی ہے کہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی مالابدمنہ فارسی کے فقہی، متن کے مشہور مصنف نے کوئی "سیف مسلول" نامی ایک کتاب بھی لکھی تھی، جس میں بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیعوں اور سنیوں میں ازدواجی تعلقات کا جو عام رواج تھا، اس کی مخالفت کی گئی تھی، (فیوض قاسمیہ صـ ) ظاہر ہے کہ قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت مرزا مظہر جانجانان کے مرید اور خلیفہ تھے۔ بالکل آخر زمانہ میں مفاسد کی شدت کو دیکھ کر یہ کتاب تصنیف فرمائی ہو گی، خود میری نظر سے یہ کتاب قاضی صاحب کی نہیں گذری ہے۔

بہر حال حد سے زیادہ جو فتنہ بڑھ چکا تھا، اور سچ پوچھئے تو فتنے کی اسی آگ میں وہ سب کچھ جل گیا جس کا جلنا مسلمانوں کے لئے اس ملک میں مقدر ہو چکا تھا۔ درد کی یہ داستان طویل ہے اور ہندوستان کیا واقعہ تو یہ ہے کہ اسلام کی پوری تاریخ کا یہ جاں گداز حادثہ ہے اب اس قصے کو تو چھوڑئیے، میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ گو تشیع کے ساتھ سختی اور تشدد کا یہ برتاؤ ابتداء میں مناسب معلوم ہوا، لیکن اشتباہ و التباس کا جو غبار حق پر چھایا ہوا تھا گو وہ ہٹ گیا، تسنن و تشیع میں جو فرق تھا، وہ عوام کے سامنے بھی آگیا تو ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ تشدد میں قدرتاً نرمی پیدا ہو گئی، اور شیعہ جو بہرحال ہندوستان کی اسلامی آبادی ہی کے اجزاء تھے اور ہیں ان کے متعلق اور تو اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف جو فتویٰ منسوب

کیا گیا ہے، اس کا حاصل یہی معلوم ہوتا ہے کہ جان بوجھ کر شیعوں میں جو اصرار کرتے ہیں کہ قرآن اصلی قرآن نہیں ہے، بلکہ (العیاذ باللہ) یہ بیاض عثمانی ہے، اور یوں دین کی پہلی بنیاد الکتاب ہی کو مشکوک ٹھہرا رہے ہیں، اور صحابہ کی اکثریت جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی السنت مسلمانوں تک پہنچی ہے، ان ہی کو ناقابل اعتماد ٹھہرا کر دین کی دوسری بنیاد السنت کو سترد کر دینے کے مجرم ہیں۔ زیادہ تر اس قسم کے خیالات اور عقائد بجائے عوام کے چونکہ شیعوں کے خواص یعنی علماء ہی میں پائے جاتے ہیں، اس لئے ان کی حد تک تو شاہ عبدالعزیز اور ان کے بعد کے علماء کے فتوے کو برقرار رکھتے ہوئے، حضرت گنگوہی فرمایا کرتے تھے کہ ان کے (یعنی شیعوں کے)

"جہلا فاسق ہیں" ص۲۸

اور یہ بڑے پتے کی بات ہے، کہ جاہل مسلمان، خواہ سنی ہو، یا شیعہ، مسلمان ہونے کی وجہ سے قرآن کو بہر حال اللہ کی کتاب ہی مانتا ہے۔ اس غریب کو ان واہی تباہی قصوں سے کیا سروکار۔ جو شیعہ علماء کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔

فیوض قاسمیہ نامی والے مجموعہ مکاتیب میں سیدنا الامام الکبیر کا یہی ایک خط پایا جاتا ہے، جس میں شیعوں کے متعلق بعض دلچسپ حکیمانہ نکات کا ذکر کرتے ہوئے حضرت والا نے شیعوں کے دین کو برزخی دین قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں،

"بلحاظ آں کہ کلمہ شہادت برزبان و درجنان ست، و صوم و صلوٰۃ و حج و زکوٰۃ وغیرہا اعمال اسلامیان کہ اعمال دین اسلام باشند۔"

یعنی نماز روزہ حج زکوٰۃ وغیرہ اسلامی اعمال کے ساتھ شیعہ بھی

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

کی تصدیق کرتے ہیں، دل سے بھی مانتے ہیں، اور زبان سے بھی اسی کا اقرار کرتے ہیں، یہ پہلو تو شیعوں کا اسلامی ہے، اور اسی کے ساتھ

"منجملہ اعمال وافعال شان وعقائد باطلہ واہوا زالفنہ شعارشان است وبدعات شنیعہ ومعمولات قبیحہ کردارشان"

ایک پہلو شیعوں کی دینی زندگی کا یہ بھی ہے کہ اس قسم کی باتیں چونکہ

"از آثار کفر چہ انجام کفر ہمیں مخالفت قرآن وحدیث باشد"

ان ہی وجوہ کی بنیاد پر آپ نے لکھا ہے کہ شیعوں کا دین کفر و اسلام کے درمیان ایک قسم کا برزخی دین ہے کہ

"برزخ ہماں ست کہ از ہر طرف اثرے بجوذکشد ومظہر آثار اطراف خود گردد" ص۲

خلاصہ یہ ہے کہ غیر مسلم اقوام کے مقابلہ میں شیعوں کی مذکورہ بالا امتیازی خصوصیتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے سنیوں کے بعد شیعہ ہی اس کے مستحق تھے کہ ان کی طرف توجہ کی جائے اور اس سلسلہ میں بھی جو کچھ آپ سے ہو سکتا تھا، کرتے رہے، تصنیفی سلسلہ میں تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر کی کتابوں میں سب سے زیادہ ضخیم کتاب آپ کی وہی ہے جس میں انتہائی دل سوزیوں کے ساتھ شیعوں کی غلط فہمیوں کے مٹانے کی کوشش کی گئی ہے، ساڑھے تین سو صفحات سے نائد اوراق میں یہ کتاب طبع ہوئی ہے۔ تقطیع متوسط اور لکھائی بھی اس کی گھٹی ہوئی ہے۔ اپنے عام طریقہ تصنیف کے خلاف اس کتاب میں بکثرت دوسری کتابوں کے حوالوں کو بھی آپ نے پیش کیا ہے، اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی تاریخ پر آپ کی کتنی اچھی نظر تھی، اس کا نام "ہدیۃ الشیعہ" ہے، کتاب کے خصوصی نقاط نظر کا ذکر تو انشاء اللہ اگلی جلد میں کیا جائے گا یہاں حضرت الاالی کی "داخلی خدمات" کی دوسری منزل کا صرف تذکرہ مقصود ہے۔ بڑے دردناک لہجہ میں کتاب کو ختم کرتے ہوئے ارقام فرمایا گیا ہے کہ شیعوں کو چاہئے کہ

"اس عقیدہ بد سے باز آکر توبہ واستغفار سے تدارک مافات کریں آئندہ ما نیں تو وہ جانیں" ص۹

| | |
|---|---|
| ما نصیحت بجائے خود کردیم | روزگارے دریں بسر بردیم |
| ورنیارد بگوش اندر کس | بررسولاں بلاغ باشد وبس |

ایک یہی کتاب نہیں، آپ کے خطوط میں بھی جو شائع ہو سکے ہیں شیعوں کے متعلق مباحث و مسائل ہی کو ہم زیادہ پاتے ہیں، آپ اس سے زیادہ اور کیا کر سکتے تھے۔ پہلے بھی کہیں ذکر گذر چکا ہے کہ شیعوں میں وقت کے مشہور مجتہد مولوی حامد حسین صاحب لکھنوی تھے۔[1] اپنی شان اور اپنے مقام کا خیال کئے بغیر سیدنا الامام الکبیر ان کے پاس پہنچ گئے، جس منزل میں پہنچے تھے، اس کا ذکر اپنے ایک خط میں مولوی حکیم ضیاء الدین رامپوری سے ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

"بے عمامہ و رومال چنانکہ عادت من ست بمکانے کہ مولوی حامد حسین صاحب لکھنوی شیعی ...... فرودکش بود ند رفتم"

واللہ اعلم بالصواب صحیح طور پر اس کا پتہ نہ چل سکا کہ یہ واقعہ کہاں پیش آیا۔[2] یہ خیال کہ لکھنؤ پہنچکر مولوی حامد حسین صاحب سے حضرت والا نے ملاقات کی تھی، بظاہر کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتا، زیادہ قرینہ اسی کا ہے کہ میرٹھ یا سہارنپور یا ممکن ہے دہلی ہی کسی وجہ سے مولوی حامد حسین آئے تھے، اور حضرت والا ان کے پاس پہنچے۔ اس سلسلہ میں کچھ مناظرہ اور مکالمہ کی صورت بھی پیش آئی، اور مولوی حامد حسین صاحب کو اس کا پتہ نہ چل سکا کہ وہ مولانا محمد قاسم صاحب سے گفتگو کر رہے ہیں، اسی موقعہ پر بجائے مشہور نام کے تاریخی نام خورشید حسن آپ نے اپنا بتایا تھا، تحفہ اثنا عشریہ میں بھی شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنا تاریخی نام غلام حلیم ہی درج کیا ہے۔ اضطراراً بزرگوں کی سنت کی پیروی کی سعادت سمجھنا چاہئے کہ آپ کو حاصل ہو گئی۔

اور مجھ ہی سے یاد ہوگا آپ یہ سن چکے ہیں کہ شیعوں کی طرف سے یہ مطالبہ پور قاضی نامی قصبہ میں جب پیش ہوا کہ براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اگر مولوی محمد قاسم ہم لوگوں کو

---

[1] مولوی حامد حسین کے نام کے ساتھ مجتہد کا لفظ ہی بتا رہا ہے کہ شیعوں میں غیر معمولی امتیاز ان کو حاصل تھا حضرت والا نے بھی ان کا تعارف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "وہ جواب منتہی الکلام کتابے مبسوط کہ باستقصا والانجام نوشتہ اند و بزعم شیعیات درمیان زمین و آسمان نظیر ندارد آفتاب وقت و بدر منیر و بے نظیر اند" ص۵

[2] یہ واقعہ میرٹھ میں نواب محمد علی خاں کے مکان پر پیش آیا ہے۔ محمد طیب

کرادیں تو ہم تشیع سے توبہ کرلیں گے، توخلاف دستور حضرت کو جوش آگیا' اور ان کے مطالبے کی تکمیل پر آمادہ ہو گئے' مگر مطالبہ کرنے والے ہی بھاگ گئے۔

اسی پورقاضی ہی کے شیعوں کے متعلق مولانا طاہر صاحب نے اپنے والد ماجد حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر جس زمانہ میں پورقاضی پہنچے تھے تو اتفاقاً یہ محرم کا مہینہ تھا' حضرت والا کی تشریف آوری کی خبر پورقاضی کے شیعوں کو ہوئی تو ایک وفد ان کے سربرآوردوں کا خدمت گرامی میں حاضر ہوا اور یہ خواہش کی کہ ماتم کی مجلس میں شریک ہو کر پورقاضی کے شیعوں کو ممنون فرمایا جائے۔ خلاف توقع بجائے انکار کے حضرت نے فرمایا کہ میری ایک شرط بھی منظور کی جائے تو میں اس مجلس میں شریک ہو سکتا ہوں' جو شرط پیش کی گئی اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیعوں کے ساتھ حضرت والا کے قلبی تعلق کا کیا حال تھا؛ شرط یہ تھی کہ اسی مجلس میں

جو کچھ عرض کروں' اسے سن لیں؛

وفد نے اس شرط کو تو منظور کر لیا' مگر اسی کے ساتھ ان کی طرف سے مزید مطالبہ پیش ہوا کہ آپ کے وعظ سے

"پہلے مجلس ہوگی' اس میں حلوا بھی تقسیم ہوتا ہے' وہ بھی آپ کو قبول کرنا پڑیگا"

آپ نے اس اضافہ کو بھی مان لیا اور حسب وعدہ ماتم کی مجلس میں حاضر بھی ہوئے' حلوا جو دیا گیا اسے بھی لے لیا' جب شیعوں کی پیش کردہ شرائط پوری ہو گئیں' تب ماتم کی اسی مجلس میں حضرت والا نے کھڑے ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور وصیت

| | |
|---|---|
| ترکت فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی | میں تم میں دو بھاری چیزوں کو چھوڑتا ہوں' اللہ کی کتاب' اور اپنی اولاد |

پر ایک مفصل و مبسوط تقریر فرمائی' سننے والے خلاصہ یہ بیان کرتے تھے کہ ہدایت کے لئے حضرت والا نے فرمایا علم و عمل دو ہی چیزوں کی ضرورت ہے۔ علم کے لئے تو اللہ کی کتاب ہے اور

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عترت پاک میں نسلی مناسبت کی وجہ سے عمل کی صلاحیت نسبتاً زیادہ ہونی چاہئے۔

الغرض ماتم کی اس مجلس میں اسی اجمال کی تفصیل کچھ ایسے رنگ میں کی گئی کہ بجائے ماتم کے وہ تبلیغ کی مجلس بن گئی، روایت کے آخر میں مولانا طاہر صاحب نے اپنے والد ماجد کا حوالہ دیتے ہوئے یہ اطلاع دی ہے کہ

"اس وعظ کے بعد بہت سے لوگوں نے توبہ کی"

بظاہر اس کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ شیعی عقائد سے تائب ہوکر لوگ سنی بن گئے۔

اس میں شک نہیں کہ علمی وقار وعظمت کے رکھ رکھاؤ کے لئے عموماً مولویوں نے جن پابندیوں کی رعایت کو ضروری ٹھہرالیا ہے۔ فطرتاً سیدنا الامام الکبیر کی نظر میں ان کو چنداں اہمیت حاصل نہ تھی مولوی حامد حسین مجتہد شیعہ کے گھر میں جس شان سے آپ تشریف لے گئے، خود اس واقعہ سے بھی آپ کی افتاد طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک موقع پر ہدیۃ الشیعہ میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے یعنی خلیفہ سوم حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قرآن کی اشاعت ونشر میں چونکہ غیر معمولی حصہ تھا، گویا قرآن کے معلم اور استاد ہونے کی حیثیت ان کو حاصل ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ شیعہ باوجود غیر معمولی کدوکاوش کے قرآن کو زبانی یاد کرنے میں عموماً کامیاب نہیں ہوتے، یہ دلیل ہے کہ استاد کے باطنی فیض سے وہ محروم ہیں، اسی عام مشہور تجربہ کی تائید اپنے چشم دید مشاہدہ سے فرماتے ہوئے آپ نے شیعوں کے ایک عالم جن کا نام مولوی جعفر علی تھا، اور شیعوں کے دلی میں پیش امام تھے۔ اپنے زمانہ میں ان کی ہستی دلی کے شیعوں کی مرجع بنی ہوئی تھی، اور مشہور تھا کہ مولوی جعفر علی صاحب قرآن کے حافظ ہیں۔ ان ہی کا ذکر کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر نے لکھا ہے کہ

"ان کے حفظ کی یہ کیفیت ہے کہ رمضان شریف میں غدر سے پہلے بچشم خود اس احقر نے دیکھا ہے کہ جلسہ تلاوت قرآن میں جو دن کو نواب حامد علی خاں کی مسجد میں ہوا کرتا

تھا، مثل دیگر حضار شیعہ مذہب حمائل میں دیکھ دیکھ پڑھتے تھے۔ نص پر بھی دو جگہ
غلط پڑھ گئے" ۔ ہدیۃ الشیعہ

ظاہر ہے کہ حامد علی خاں کی مسجد میں یہ جلسہ جیسا کہ معلوم ہوتا ہے خاص شیعوں کی طرف سے منعقد ہوتا تھا۔ اور گویہ واقعہ غدر سے پہلے کا ہے، مگر حضرت والا کی زیادہ نہ ہوگی، ممکن ہے طالب علمی کے دنوں کی بات ہو۔ لیکن اس زمانہ میں خانوادہ ولی اللّٰہی کی وجہ سے شیعوں اور سنیوں کی باہمی کش مکش جس حد تک پہنچ چکی تھی۔ اس کے لحاظ سے میں تو اس کو بھی حضرت والا کی طبعی وارستہ مزاجی ہی کا نتیجہ سمجھتا ہوں، کچھ بھی ہو، کہنا یہ چاہتا ہوں کہ پور قاضی کے شیعوں کی ماتمی مجلس میں آپ کی شرکت اور اسی مجلس میں حلوے کا قبول فرمانا ایک ایسا واقعہ تھا کہ پور قاضی کے سنیوں میں معلوم ہوتا ہے جس کی وجہ سے کافی کھلبلی مچ گئی۔ عام سنی مسلمانوں پر علماء اہل السنت والجماعت کی وجہ سے اس زمانہ میں تو ذہن تھا کہ شیعوں کی ماتمی مجالس میں شرکت سے بھی پرہیز کریں اور ان مجالس میں جو چیزیں تقسیم ہوتی ہیں ان کو نہ لیا کریں۔ مولوی طاہر صاحب کی روایت میں ہے کہ حضرت والا سے پوچھنے والوں نے جب پوچھا تو پہلے کچھ اعراض فرمایا گیا۔ لیکن جب زیادہ اصرار اس کی طرف سے بڑھا تب لکھا ہے کہ واقعہ کو سمجھاتے ہوئے فرمایا گیا کہ

"بھائی اگر کوئی قوی آدمی تھوڑا سا زہر کھا لے تو اس کے حق میں وہ نقصان نہیں کرتا لیکن اسی زہر کو ضعیف اگر کھا جائے تو مر جائے"

اور اسی کے بعد دل کی جو بات تھی اس کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا گیا کہ ان کی مجلس میں شریک ہو کر

"اگر میں نے حلوا[1] لیا اور قبول کر لیا تو ان کی مجلس میں کلمۂ حق بھی تو پہنچا دیا"

---

[1] حلوہ لینا ثابت ہے۔ کھانا ثابت نہیں، اور جو بھی نہیں سکتا جو ذرا سے مشتبہ مال سے بھی اجتناب کر لینے کے عادی تھے وہ اس حلوہ کو کیسے کھا سکتے تھے۔ یہ قبول حلوہ محض تبلیغ کلمۂ حق کی ضرورت سے کیا گیا۔ جب کہ شیعوں نے کلمۂ حق سننے میں قبول حلوہ کی شرط لگا دی تھی یعنی اس کے بغیر وہ کلمۂ حق سننا نہیں چاہتے تھے۔ پس حضرت نے اس قبول حلوہ کو ادائے فرض کے مقدمہ کی حیثیت سے گوارا فرمایا۔ محمد طیب غفرلہ

روایت جس طریقہ سے ہم تک پہنچی ہے، اعتماد کی کافی ضمانت اپنے اندر رکھتی ہے اور گو یہ ایک جزئی واقعہ ہے، لیکن تبلیغی فرائض سے صحیح معنوں میں سبک دوشی کی اثر آفریں اور نتیجہ خیز راہ بھی ہو سکتی ہے، اگر شرط اول اس راہ میں یہی ہے کہ جبہ و دستار کے خود تراشیدہ احتزازی وساوس سے دل و دماغ کو پاک کرکے فرض کے حقیقی احساس کو اپنے اندر زندہ اور بیدار کیا جائے۔

ایک مشہور و معروف بزرگ نے لکھنؤ میں فقیر سے ایک دفعہ کہا تھا، ان کی بات یاد آتی ہے، ذکر شیعہ اور سنی مباحثوں اور مناظروں کا ہو رہا تھا۔ اسی آسمان کے ایک نجم ثاقب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ کے اسی بندے نے مجھ سے پوچھا کہ نصف صدی کی تحریری و تقریری کوششوں کا نتیجہ ان کے کیا ہوا؟ کیا تم نے سنا کہ کوئی شیعہ سنی ہو گیا ہو؟ اپنی معلومات کی حد تک نفی کے سوا خاکسار اور اس کا جواب کیا دے سکتا تھا۔ پھر بعض واقعات اپنے سنائے اور بتایا کہ فلاں فلاں آدمی کٹر شیعہ تھے لیکن تقریر و تحریر کی ہنگامہ آرائیوں کے بغیر جادۂ اسلام کی صادق اور سچی روح کے پانے میں وہ کامیاب ہو گئے ہیں۔

خود سیدنا الامام الکبیر بھی تقریری و تحریری کاروبار کی لاحاصلی سے واقف تھے۔ اپنی کتاب ہدیۃ الشیعہ میں شاید اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، ایک پہلو افادیت کا مولویوں کے اس کاروبار کا بھی آپ نے پیدا فرمایا ہے۔ یعنی یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ حقیقی مخاطب تو اس رسالہ کے وہی لوگ ہیں، جو شیعی عقائد رکھتے ہیں، اور بقول آپ کے یہ رسالہ شیعوں کے لئے

"اگر انصاف کریں تو ذریعہ حصول ایمان ہے"

لیکن اسی کے ساتھ آپ نے لکھا ہے کہ سنیوں کے لئے بھی ان مضامین کو غیر مفید نہ سمجھنا چاہئے۔ بلکہ حضرت والا کے الفاظ میں ان کا

"یہ فائدہ ہے کہ کچوں کے لئے مفید یقین اور پکوں کے لئے باعث اطمینان ہے" ص۳

اور کوئی شبہ نہیں کہ فائدہ کا یہ پہلو جس کا آئے دن تجربہ ہوتا رہتا ہے، کچھ کم قیمتی نہیں ہے، اسی لئے حضرت والا کی زندگی میں قصبہ پور قاضی کے واقعہ کی مثالیں جہاں ملتی ہیں، وہیں آپ اس کی کوشش بھی فرماتے رہتے تھے کہ ملک اور حکومت کے خاص حالات کے تحت خود سنیوں کی دینی زندگی جو شیعی عقائد و اعمال کے جراثیم سے مسموم ہو گئی ہے۔ اس زہر کو بھی جس طرح ممکن ہو، نکالا جائے۔

خود شیعوں کے تائب ہونے کی مثالیں تو بجز پور قاضی کے اس قصہ کے اور مجھ تک نہیں پہنچی ہیں[1] لیکن سنیوں میں جو کچے تھے، ان کے شکوک کو شاکرین کی روشنی پیدا کی گئی، اور جو

---

[1] اس سلسلہ میں مجھ تک جو واقعہ پہنچا ہے وہ عرض کرتا ہوں۔ مجھ سے حکیم بنیاد علی صاحب مرحوم ساکن لاوڑ ضلع میرٹھ نے بیان کیا اور انہوں نے یہ واقعہ حضرت مولانا عبد الغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ساکن پھلاودہ ضلع میرٹھ سے سنا جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص تلامذہ میں ایک زبردست عالم تھے اور آخر میں قوت نسبت و مناسبت سے اس درجہ پر پہنچ گئے تھے کہ چال ڈھال اور انداز گفتگو تک حضرت والا جیسا ہی ہو گیا تھا۔ حضرت کے دیکھنے والے بعد سے انہیں دیکھ کر حضرت نانوتوی کا شبہ کرنے لگتے تھے۔ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ اگر اپنے استاد کے تقریرات میں سے کسی چیز میں الجھ جاتے تھے تو بعض اوقات سفر کر کے پھلاودہ جاتے اور مولانا عبد الغنی صاحب مرحوم سے فرماتے۔ راقم الحروف کا تاریخی نام "خورشید قاسم" انہوں نے ہی ایک نظم کے ساتھ لکھ کر بھیجا تھا۔ جس میں حضرت نانوتوی کے نام و اسم تاریخی دونوں کے اجزاء جمع کر دیئے گئے۔ حضرت مولانا عبد الغنی صاحب نے فرمایا کہ جب حضرت نانوتوی مباحثہ شاہجہانپور کیلئے روانہ ہوئے تو شاہجہان پور کے قریب کسی گاؤں کے چند غریب سنیوں نے جو وہاں شیعوں کے اثرات میں دبے ہوئے بے بس تھے، کیونکہ زمینداری شیعوں ہی کا تھا، حضرت کو لکھا کہ جاتے یا آتے حضرت والا اس گاؤں کو اپنے قدوم سے عزت بخشیں اور ہمیں کچھ پند و نصیحت فرما دیں۔ تاکہ ہمارے لئے صلاح و فلاح اور تقویت کا باعث ہو۔ حضرت والا نے خوشدلی ان کی دعوت منظور فرمالی جیسا کہ غرباء کی دعوت و پیشکش بطیب و رغبت قبول فرمانے کی عادت تھی۔ اور جاتے یا آتے ہوئے اس گاؤں میں اترے۔ شیعوں میں اس سے کھلبلی مچی۔ فکر یہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہ ان کے وعظ کا اثر شیعوں پر ہو جائے اور شیعہ دباؤ کی تنظیم ٹوٹ جائے تو انہوں نے متوقع اثرات کی کاٹ کے لئے لکھنؤ سے چار شیعہ مجتہد تاریخ مقررہ پر بلائے اور پروگرام یہ طے پایا کہ مجلس وعظ میں چاروں کونوں پر چاروں مجتہد بیٹھ جائیں اور چالیس اعتراضات منتخب کر کے دس دس اعتراض چاروں پر بانٹ دیئے گئے کہ اثنائے وعظ میں اس طرح کئے جائیں کہ اول فلاں کونے کا مجتہد دس اعتراض کرے (باقی اگلے صفحہ پر)

سے بچے تھے ان کو اطمینان وسکینت کی خنکیوں سے سرفراز کیا گیا۔ اس کے لئے تو اضلاع مظفر نگر و سہارنپور وغیرہ کے قصبات اور دیہات کے مسلمانوں کی دینی زندگی جہاں تک میرا خیال

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) اس سے حضرت نمٹیں تو دوسرے کونہ کا اور پھر اسی طرح تیسرے اور چوتھے کونہ کا۔ اور اس طرح وعظ نہ ہونے دیا جائے۔ ان ہی اعتراض وجواب میں جتلا کرکے وقت ختم کر دیا جائے۔ صاحب قیمتی مدد اور حضرت والا کی کرامت کا حال سنئے کہ حضرت نے وعظ شروع فرمایا۔ جس میں گاؤں کی تمام شیعہ برادری بھی جمع تھی اور وہ وعظ اسی ترتیب سے اعتراضوں کے جواب پر مشتمل شروع ہوا جس ترتیب سے اعتراضات لے کر مجتہدین بیٹھے تھے۔ گویا ترتیب کے مطابق جب کوئی مجتہد اعتراض کرنے کے لئے گردن اٹھاتا تو حضرت اسی اعتراض کو خود نقل کر کے جواب دینا شروع فرماتے۔ یہاں تک کہ وعظ پورے سکون کے ساتھ پورا ہو گیا اور شیعوں کے ان مقررہ شبہات کے مکمل حل سے گاؤں کے شیعہ اس قدر مطمئن اور منشرح ہوئے کہ اکثریت نے توبہ کر لی اور سنی ہو گئے۔

مجتہدین اور مقامی شیعہ چودھریوں کو اس میں اپنی انتہائی سبکی اور خفت محسوس ہوئی تو انہوں نے حرکت مذبوحی کے طور پر اس شرمندگی کو مٹانے اور حضرت والا کے اثرات کا ازالہ کرنے کے لئے یہ تدبیر کی کہ ایک نوجوان لڑکے کا فرضی جنازہ بنایا اور حضرت سے آکر عرض کیا کہ حضرت نماز جنازہ آپ پڑھا دیں۔ پروگرام یہ تھا کہ جب حضرت دو تکبیریں کہہ لیں تو صاحب جنازہ ایک دم اٹھ کھڑا ہو۔ اور اس پر حضرت کے ساتھ استہزاء اور تمسخر کیا جائے۔ حضرت والا نے معذرت فرمائی کہ آپ لوگ شیعہ ہیں اور ہم سنی۔ اصول نماز الگ الگ ہیں۔ آپ کے جنازہ کی نماز مجھ سے پڑھوانے میں جائز کب ہوگی؟ شیعوں نے کہا کہ حضرت بزرگ ہر قوم کا بزرگ ہی ہوتا ہے۔ آپ تو نماز پڑھا ہی دیں۔ حضرت نے ان کے اصرار پر منظور فرما لیا۔ اور جنازہ پر پہنچ گئے۔ مجمع تھا۔ حضرت ایک طرف کھڑے ہوئے تھے کہ چہرہ پر غصہ کے آثار دیکھے گئے۔ آنکھیں سرخ تھیں اور انقباض چہرہ سے ظاہر تھا۔ نماز کے لئے عرض کیا گیا تو آگے بڑھے اور نماز شروع کی۔ دو تکبیریں کہنے پر جب طے شدہ کے مطابق جنازہ میں حرکت نہ ہوئی تو پیچھے سے کسی نے "ہونہہ" کے ساتھ صاحب جنازہ کو اٹھ کھڑے ہونے کی شہ دی۔ مگر وہ نہ اٹھا۔ حضرت نے تکبیرات اربعہ پوری کر کے اسی غصہ کے لہجہ میں فرمایا کہ "اب یہ قیامت کی صبح سے پہلے نہیں اٹھ سکتا" دیکھا گیا تو مردہ تھا۔ شیعوں میں رونا پیٹنا پڑ گیا۔ اور بجائے حضرت والا کی سبکی کے خود ان کی سبکی اور سبکی ہی نہیں بلکہ موت آ گئی۔ اس کرامت کو دیکھ کر باقی ماندہ شیعوں میں سے بھی بہت سے تائب ہو کر سنی ہو گئے۔

محمد طیب غفرلہٗ

ہے، زندہ شہادت کی حیثیت سے پیش ہو سکتی ہے۔ عرض کر چکا ہوں کہ مغل حکومت کے آخری دور میں بارہہ کے جن سادات نے کنگ میکر (بادشاہ گر) ہونے کی حیثیت حاصل کر لی تھی وہ اسی اطراف و جوانب کے رہنے والے تھے، جن کا اثر پھیلنا قدرتی تھا۔ ان کے سوا دوسرے[1] اسباب بھی تھے، کہ اور تو اور ضلع سہارنپور کا یہی قصبہ دیوبند جو آج سنیوں کا سارے ہندوستان میں ماوی و ملجا بنا ہوا ہے۔ کسی موقعہ پر امیر شاہ خاں مرحوم کی اس اطلاع کا ذکر کر چکا ہوں کہ میرٹھ، باپوڑ، گلاوٹھی، بلند شہر کے ساتھ ساتھ وہی کہتے تھے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ

"دیوبند میں بھی سب تفضیلی تھے" ملنا ارواح ثلاثہ

اسی موقعہ پر اگرچہ خاں صاحب کا یہ بیان بھی درج ہے کہ حضرت سید شہید کی کوششوں سے ابتداءً اس علاقے کے مسلمانوں کے تفضیلی رجحانات کے ازالہ میں غیر معمولی کامیابی ہوئی، لیکن صدیوں سے لوگوں میں جو زہر سرایت کئے ہوئے تھا۔ اس کا کلی استیصال ظاہر ہے کہ اچانک نہیں ہو سکتا تھا۔ سیدنا الامام الکبیر جن دنوں میں دیوبند کو وطن بنا کر یہاں مقیم ہو چکے تھے۔ اسی زمانہ کے ایک واقعہ کا ذکر لوگ کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوبند کے اچھے اچھے ممتاز گھرانوں میں تفضیل کا اثر موجود تھا، بلکہ سوانح مخطوطہ کے مصنف

---

[1] لیکن جہاں ان کنگ میکروں نے شیعیت کو اپنے اثر و اقتدار سے رواج دیا، وہاں حضرت والا کی تاثیری قوت خود ان کنگ میکروں پر بھی اپنا کام کر گئی۔ ان سادات بارہہ میں سے خانجہاں پور۔ رتھیڑی۔ اور منصور پور کے خاندان حضرت ہی کے ہاتھ پر تائب ہوئے، اور سنی بنے اور اس قدر گرویدہ اور محب بن گئے کہ ان کی دیوبند کی آمدورفت مثل اہل بیت کی آمدورفت کے ہو گئی ہے۔ احقر کے یہاں جب پہلی لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام فاطمہ ہے (مسلمہا) تو سید نور الحسن صاحب رئیس رتھیڑی اس کے لئے کپڑوں کے جوڑے اور بچگانہ زیور اسی انداز سے بنوا کر لائے، جیسے اپنے خاندان میں کسی قریبی عزیز کے یہاں ولادت ہونے پر یہ چیزیں لائی جاتی ہیں۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ مالٹا جاتے وقت اپنے قبیلہ اور عائلہ کو ہدایت فرما کر گئے تھے کہ مشکلات کے وقت مولوی سید محمد نبیہ صاحب رئیس خان جہان پور کی طرف رجوع کریں۔ یہ خاندان بحمد اللہ پکے سنی اور ریاستوں کے باوجود نہایت متدین اور متشرع ہیں۔ محمد طیب غفرلہٗ

لے بجائے تفصیل کے لکھا ہے کہ

"مادہ نفس کا غالب تھا"۔ ص۳۶

اسی وجہ سے آپ کے زمانہ میں بلکہ آپ کے ساتھ کش مکش کی صورت اسی دیوبند میں جو پیش آئی، وہ سننے کے قابل ہے، اس کا ذکر سوانح مخطوطہ کے مصنف نے بھی کیا ہے۔ تفصیل اس واقعہ کی مولانا محمد طیب الحفید کے مراسلہ سے معلوم ہوئی۔

واقعہ یہ ہے، یاد ہوگا کہ دیوبند میں سیدنا الامام الکبیر کے گھر کی عام ضرورتوں کی سربراہی کا تعلق دیوان جی محمد یٰسینؒ[1] صاحب سے تھا، حضرت والا کے فدائیوں میں تھے، ان ہی کا قصہ ہے کہ مرید ہونے کی خواہش سیدنا الامام الکبیر سے ظاہر کی۔ لیکن آپ نے حضرت گنگوہی سے مرید ہو جانے کا حکم دیا۔ اسی وقت گنگوہ جا کر حکم کی تعمیل کر کے سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں حاضر ہو کر پھر مستدعی ہوئے کہ اب تو مجھے اپنا مرید بنا لیا جائے۔ حضرت نے فرمایا کہ تم تو مرید ہو چکے، بولے مرید کہاں ہوا۔ صرف آپ کے حکم کی تعمیل کی سعادت سے سرفراز ہوا ہوں۔ عرض کا یہ طریقہ تھا

[1] دیوان جی کے کچھ حالات کا ذکر پہلے کر چکا ہوں، دریافت کرنے پر مولانا محمد طیب صاحب نے یہ اطلاع دی ہے کہ یٰسین نام کے دو صاحبوں کا خصوصی تعلق سیدنا الامام الکبیر سے تھا، جن میں ایک تو یہی دیوان جی دیوبند کے رہنے والے تھے اور بقول مولانا طیب صاحب دیوبند میں حضرت والا کی خانگی اور ذاتی امور کا تعلق ان ہی سے تھا، لکھا ہے کہ صاحب نسبت بزرگ تھے۔ اپنے زنانہ مکان کے حجرے میں ذکر کرتے۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند فرمایا کرتے تھے کہ اس زمانہ میں کشفی حالت دیوان جی کی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ باہر سڑک پر آنے جانے والے نظر آتے رہتے تھے۔ در و دیوار کا حجاب ان کے درمیان ذکر کے وقت باقی نہیں رہتا تھا، ان ہی دیوان جی کے ایک مکاشفہ کا تعلق دارالعلوم دیوبند سے بھی بیان کیا جاتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ مثالی عالم میں ان پر منکشف ہوا کہ دارالعلوم کے چاروں طرف ایک سڑک دھرا تا ہوا ہے، اپنے اس کشفی مشاہدہ کی تعبیر خود یہ کیا کرتے تھے کہ نصرانیت اور تجدد و آزادی کے آثار ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم میں نمایاں ہوں گے۔ دارالعلوم کے کتب خانہ کے سب سے پہلے محرر بھی یہی دیوان جی تھے۔ بقول مولانا حبیب الرحمن دارالعلوم کا یہ وہ زمانہ تھا کہ دربان سے لیکر مہتمم تک سب کے سب صاحب نسبت تھے۔ دیوان جی بڑے تنو توش کے آدمی تھے۔ سیدنا الامام الکبیر کی مجلس میں باہر سے آنے والوں کو اکثر یہ دھوکا ہوتا کہ یہی حضرت نانوتوی ہیں۔ دوسرے صاحب اسی نام کے نانوتہ کے رہنے والے تھے۔ اور عجیب بات ہے کہ جب تک توطن کا تعلق نانوتہ سے حضرت کا رہا، یہاں کے تمام خانگی کاموں کے متکفل یہی تھے۔

ایسا تھا کہ منظوری کے سوا دوسری صورت ہی کیا ہو سکتی تھی۔

بہرحال قصہ ان ہی دیوبند کے حاجی محمد یٰسین دیوان جی کا ہے، شمار اُن کا دیوبند کے سربرآوردہ شیوخ میں تھا، مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ اُن کے ننھیالی رشتہ داروں میں تھے۔ مگر خاندان میں دیوان جی کے جیسا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ

"ان کے ہاں کی تعزیہ داری مشہور تھی" ص۱۲

اور خاندان پر جب رفض کا رنگ چڑھا ہوا تھا، تو تعزیہ داری نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہو سکتی تھی

بہرحال سیدنا الامام الکبیر کے فیض صحبت کی اثر پذیری نے اس فیصلہ پر جب دیوان جی کو مجبور کیا، کہ اپنے اقتداری دائرے میں تعزیہ داری کی رسم کو ختم کر کے رہوں گا، تو دیوبند کی "تاریخ کا وہ ایک اہم واقعہ بن گیا۔ مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ

"محل کی مسجد جس میں آج کل مولانا حسین احمد صدر دارالعلوم دیوبند پانچوں وقت کی نماز پڑھتے ہیں۔

یہی مسجد دیوان جی کے محلہ کی مسجد تھی۔ تعزیہ اس مسجد میں بھی رکھا جاتا تھا اور محرم میں اسی مسجد سے وہ تعزیہ اٹھتا تھا، مولانا طیب صاحب نے اطلاع دی ہے کہ

"اٹھانے والے سنی ہوتے تھے، کچھ شیعہ گھرانے بھی اس جگہ تھے"

دیوان جی نے سب سے پہلے اپنے محلہ کی اسی مسجد کو تعزیہ کے قصہ سے پاک کرنے کا ارادہ کیا اور بروایت مولانا طیب صاحب

"اعلان کر دیا کہ اس سال اس مسجد سے تعزیہ نہیں اٹھے گا"

یہ کوئی معمولی اعلان نہ تھا، دیوبند کی شیعہ آبادی ہی میں نہیں بلکہ تعزیہ پرست سنیوں میں بھی اس اعلان سے کھلبلی مچ گئی۔ مولانا طیب صاحب کا بیان ہے کہ پہلے تو

"اس محلہ کے شیوخ بگڑ گئے، اور کہا کہ سر قلم ہو جائیں گے، مگر تعزیہ اٹھے گا"

یہ سن کر دیوان جی کی زبان سے بھی بے ساختہ یہ فقرہ نکلا کہ

"اگر گذرا تو میری لاش پر سے گذرے گا۔"

اور بتدریج محلہ سے آگے بڑھ کر فتنہ کی آگ سارے قصبہ میں پھیل گئی۔ بقول مولانا طیب صاحب قصبہ دیوبند کی

"شیوخ کی برادری دیوان جی کے خلاف متحد ہو گئی۔"

ظاہر ہے کہ یہ معمولی فتنہ نہ تھا' اس وقت دیوبند کے شیوخ کی برادری میں کافی ہیکڑی والے لوگ تھے۔ استعمال غلط ہو لیکن اس وقت مسلمانوں کے عزم و ارادہ میں کافی قوت تھی' دیوان جی کے خلاف قصبہ کے شیوخ برادری کے اس اتحاد کو کافی اہمیت حاصل ہو گئی' اندر ہی اندر جو کھچڑی پک رہی تھی' اس کی خبر سیدنا الامام الکبیر تک بھی پہنچی' مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ

"حضرت (نانوتوی) کے علم میں جب یہ آیا' اور معلوم ہوا کہ موقعہ پر شہر میں عظیم ترین ہنگامہ بپا ہونے کا خطرہ ہے۔

تو ایک دن جب دیوان جی حضرت والا کی مجلس مبارک میں حاضر تھے' اور بقول مولانا طیب صاحب اسی مجلس میں

"شہر کے اکابر شیوخ اور دوسری برادریوں کے بڑے موجود تھے۔"

سیدنا الامام الکبیر دیوان جی کو مخاطب بنا کر فرمانے لگے کہ

"بندۂ خدا اگر ایسا ہی کرنا تھا تو کم از کم مجھ سے ذکر تو کر لیا ہوتا۔"

یہ بات تو دیوان جی سے کہی گئی' اور اس کے بعد اسی بھری مجلس میں سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے بھی عام اعلان فرما دیا گیا کہ

"لیکن خیر اب اگر ایسا کہہ دیا گیا ہے' تو دوسرا سر قاسم کا لگا ہوا ہے۔"

مطلب یہ تھا کہ اپنی لاش پر دیوان جی نے اعلان کیا تھا کہ تعزیہ گذرے گا" اسی

لاش کے ساتھ دوسری لاش جسے تعزیہ لے جانے والے اپنے قدموں کے نیچے پائیں گے' وہ محمد قاسم کی لاش ہوگی۔

بھری مجلس کے اس خونی اعلان کا جو نتیجہ ہو سکتا تھا' وہی سامنے آیا۔ مولنا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ

"جب یہ جملہ (یعنی قاسم کا سر بھی لگا ہوا ہوگا) شہر میں مشہور ہوا' تو پیشہ ور برادریاں متحد ہو کر تیار ہو گئیں' کہ اگر شیوخ نے دیوان محمد یسین صاحب کے ساتھ کوئی نازیبا برتاؤ کیا' تو یہ ساری برادریاں ان شیوخ کے مقابل ہو جائینگی"

جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں' علاوہ عثمانی شیوخ کے دیوبند کے مسلمانوں کی آبادی مختلف پیشہ وروں مثلاً پارچہ بافوں' روغنگروں وغیرہ پر مشتمل ہے۔ پیشہ وروں کی یہ ساری برادریاں حضرت والا سے غیر معمولی عقیدت کا تعلق رکھتی تھیں' یہ سننے کے ساتھ ہی کہ دیوان جی کے سر کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر نے اپنے سر مبارک کو بھی باندھ دیا ہے۔ اس وقت اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس کا اثر ان عقیدت مند مخلص مسلمانوں پر کیا مرتب ہوا ہوگا۔ اور بات کچھ ان ہی پیشہ ور برادریوں تک محدود نہ رہی' بلکہ بقول مولانا طیب صاحب'

"خود شیوخ میں بھی دو گروہ ہو گئے' بڑا گروہ حضرت (نانوتوی) کی حمایت پر تل گیا"

اور یوں واقعہ اس رنگ میں لوگوں کے سامنے آگیا کہ مولانا طیب کے بیان کے مطابق'

"گویا پورا شہر ان شیوخ کے مقابلہ کیلئے تیار ہو گیا"

یوں بجائے ایک سر کے دیوان جی کے سر کے ساتھ دیکھا گیا کہ بے شمار سر لگے ہوئے ہیں' یہ صورت حال ہی ایسی تھی کہ اگر مولانا طیب صاحب یہ خبر نہ بھی دیتے کہ

"اس ایک جملہ ہی سے معاملہ ختم ہو گیا"

تو خود بخود اسی نتیجہ تک عقل بھی پہنچتی ، سارے شہر کے مسلمانوں سے مقابلہ کی ہمت آخر مخالفوں کا گروہ کیسے کرسکتا تھا، یوں ایک بڑے فتنہ کا بھی قلع قمع ہوگیا، باہمی خوں ریزی سے دیوبند والے بچ گئے، اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ایک طرف بقول مولٰنا طیب صاحب

"مسجد محل سے تعزیہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا"

اور جب ایک جگہ سے یہ قدیم رسم اٹھ گئی، تو ان ہی کی روایت ہے کہ

"شہر کی جن جن سنی مسجدوں میں سے تعزیئے اٹھتے تھے وہ سب ختم ہوگئے"

سوانح مخطوطہ کے مصنف نے بھی جن کے سامنے یہ سارے قصے گذرے تھے، لکھا ہے کہ

"انہوں نے (دیوان جی نے) اس کا (تعزیہ داری کا) استیصال کامل کردیا ہے

آفریں باد بریں ہمت مردانۂ تو" ص۲۲

ان کی اسی ہمت مردانہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا طیب صاحب نے بھی لکھا ہے کہ،

"یہ واقعہ دیوان جی مرحوم کے حسنات میں سے ایک بہترین حسنہ بلکہ سنتِ حسنہ ثابت ہوا"

کوئی شبہ نہیں کہ دیوان جی کی ہمت مردانہ یقیناً مستحق تحسین و آفریں ہے۔ لیکن طوطی کے ساتھ آئینہ کے پیچھے چھپے ہوئے سکھانے والے استاد پر جب نظر پڑتی ہے، تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ طوطی کی ساری گفتگو طوطی کی نہیں، بلکہ اس کی تھی، جو آئینہ کے پیچھے بیٹھ کر گفتگو کر رہا تھا،

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند — آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

خلاصہ یہ ہے کہ شیعی عقائد سے تائب ہو کر جو واقعی شیعہ تھے، وہ سنی ہوئے یا نہ ہوئے لیکن سنیوں میں جو کچے تھے، ان کے پکے بننے میں اور جو پکے تھے ان کو زیادہ پختہ بنانے میں سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے جو عملی اقدامات ہوتے رہے، ان کا اندازہ اسی قسم کی

مثالوں سے ہوتا ہے۔ گویا خانوادہ ولی اللّٰہی کی ساری محوری خدمات کو آگے بڑھانے اور ان کے دائرے کی وسعت میں ممکنہ حد تک جتنا آپ کے بس میں تھا، آخر عمر تک جدوجہد، سعی وکوشش کا سلسلہ آپ کی طرف سے مسلسل جاری رہا، اور قلب وقالب دونوں کے حساب سے اسلامی دین کو آلائشوں سے پاک کر کے حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے جانشینوں نے مسلمانان ہند کے آگے پیش کیا تھا، عملاً وتقریراً وتحریراً اسی کی طرف آپ عام مسلمانوں کو بھی دعوت دیتے رہے، اور درس وبیعت کی راہ سے چند چیدہ وبرگزیدہ نفوس عالیہ کی تربیت وتعلیم خاص توجہ سے فرمائی، جو آپ کے بعد اسی نصب العین کے زیادہ کام کرتے رہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ غیب سے کچھ اسباب بھی ایسے پیش آتے رہے، کہ جتنا زیادہ حسن قبول ولی اللّٰہی نصب العین کو سیدنا الامام الکبیر کے ذریعے سے حاصل ہوا، شاید یہ کیفیت ازل ہی سے آپ کے لئے مقدر تھی، بیوہ عورتوں کے عقد کا مسئلہ ہو، یا سنت وبدعت تقلیدیت وغیر مقلدیت، تصوف وتوہبیت[1] تشیع[2] وتسنن[3] وغیرہ کے قصے ہوں، ان سارے مسائل میں ولی اللّٰہی مسلک اور نقطۂ نظر کو ہمہ گیر عمومیت جیسی آپ کی بدولت میسر آئی، بلا خوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کام قدرت نے آپ ہی کی ذات بابرکات سے لیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دینی زندگی کے ولی اللّٰہی رنگ کا نام ہی اب دیوبندیت ہو گیا ہے، جو سچ پوچھئے تو "قاسمیت" ہی کے لفظ کی دوسری تعبیر ہے، رحمۃ اللّٰہ علیہ ونور اللہ ضریحہ د اللھم ارزقنا اتباعہ واحشرنا فی زمرۃ احبابہ آمین۔

---

[1] وہابیت [2] شیعیت [3] سنیت

# "دفاعی اقدامات"

سیدنا الامام الکبیر کی مذکورہ بالا اصلاحی خدمات جن کا تعلق خود مسلمانوں اور اُن کے مختلف طبقات کی دینی زندگی سے تھا۔ ان خدمات میں آپ کب سے مشغول ہوئے؟ صحیح طور پر اس کا متعین کرنا دشوار ہے زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ دین کا علم حق و باطل راست و ناراست کی امتیازی قوت جیسے جیسے نشوونما پاتی جاتی تھی' اس قوت کے اقتضاؤں کی تعمیل و تکمیل کا ذوق بھی بڑھتا چلا گیا' اپنی موروثی جائداد کی تقسیم پر نظر تامل غالباً اس راہ میں آپ کا پہلا نمایاں قدم تھا' گویا خود اپنے نفس سے چاہئے تو کہہ سکتے ہیں کہ اصلاح کی ابتدا ہوئی۔ اور عقد بیوگان کے مسئلہ کی نوعیت سمجھنا چاہئے'

| وانذر عشیرتک الاقربین | (اے پیغمبر) اپنے قریب کے رشتہ داروں کو (عذاب الٰہی) سے ڈراؤ۔ |
|---|---|

کے ربانی فرمان کی تمثیلی شکل تھی' بتدریج یوں ہی دائرے میں وسعت پیدا ہوتی چلی گئی' تا این کہ سنیوں کے بعد اپنے احاطہ میں شیعوں کو بھی اس نے سمیٹ لیا۔ آپ نے جن بزرگوں سے تعلیم پائی تھی۔ خصوصاً حضرت مولانا مملوک العلی صاحب اپنے زمانہ میں خانوادہ ولی اللّٰہی کے دلی میں واحد نمائندہ تھے' ان کے علمی و عملی رجحانات سے آپ کا متاثر ہونا ایک قدرتی بات تھی' مصنف امام کے حوالے سے یہ بات گذر چکی ہے کہ عقد بیوگان کی رواج پذیری میں مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی کافی حصہ تھا' لکھا تھا کہ

"والد مرحوم نے (یعنی مولانا مملوک علی نے) اس کا (عقد بیوگان کا) نہایت خوبصورتی سے اجرا فرمایا" ص۲۱

ان کے ساتھ مولانا مظفر حسین کاندھلوی کی کوششوں کا ذکر کرکے مصنف امام نے یہ ارقام فرماکر کہ

"ان دونوں بزرگواروں کے قدم بقدم حضرت مولانا (نانوتوی) نے اس کو پورا شائع کیا۔" صفحہ ۲۱

خود اس سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے کہ علم کے ساتھ اپنے استاد مولانا مملوک العلی کے عملی ذوق سے بھی سیدنا الامام الکبیر غیر معمولی طور پر متاثر تھے۔ بہرحال اس کے بیچ بات یہی ہے کہ آنکھیں حضرت والا نے جس ماحول میں کھولی تھیں، یہ سارا ماحول ہی حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے جانشینوں کے اصلاحی ہنگاموں سے اس زمانہ میں گونج رہا تھا حضرت مولانا سید احمد شہید بریلوی، مولانا اسماعیل شہید اور ان بزرگوں کا جو تعلق حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے تھا، خود سید شہید کی نانوتہ میں تشریف آوری، یہ اور اسی قسم کی بے شمار چیزوں کا ذکر ابتدائی تمہید میں بھی اور دوسرے مقامات پر بھی گذر چکا ہے۔ ان معلومات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کیسے بتایا جا سکتا ہے کہ اپنی زندگی کی کس منزل میں اصلاحی کاروبار کے اس سلسلہ کی باگ سیدنا الامام الکبیر کے مبارک ہاتھوں میں آئی۔ بلکہ یہی سمجھنا چاہئے کہ ان امور سے دلچسپی لینے کی صلاحیت جب سے آپ میں پیدا ہوئی اس میں مشغول ہو گئے اور جب تک زندہ رہے، اس راہ میں جو کچھ کر سکتے تھے کرتے رہے۔ آفتاب کے متعلق یہ سوال ہی بے معنی ہے کہ کب سے چمکنے لگا۔ اور کب تک چمکتا رہا۔ آفتاب نام ہی اس کا ہے جو خود روشن ہو اور دوسروں کو روشنی تقسیم کر رہا ہے۔

لیکن آپ کی ان "داخلی خدمات" جن کے متعلق پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر قدس اللہ سرہ کے ساتھ امتیازی خصوصیت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا، آپ کے ساتھ دوسرے اہل علم و دین کا بھی، ان خدمات میں کافی حصہ ہے، جن میں خود آپ کے رفقاء خصوصاً حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی خاص طور پر قابل ذکر ہے،

لیکن "داخلی خدمات" کے مقابلہ میں "دفاعی اقدامات" کے زیر عنوان سیدنا الامام الکبیر کی جن مخلصانہ مساعی اور سرفروشانہ مجاہدات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں، یہ عجیب بات ہے کہ عمر کی پیمنزل

جس میں داخل ہونے کے بعد کام لینے والے نے آپ سے یہ مہمات انجام دلائے۔ بمشکل
بیس تیس سال سے زیادہ مدت کی نہیں ہوتی۔ اسی محدود مدت میں حالات ہی کچھ ایسے پیش
آئے کہ پے در پے، یکے بعد دیگرے، ایسے مہمات کی سرانجامی کے لئے قدرت کی طرف
سے آپ کا انتخاب ہوا، جن کے آثار و نتائج، ثمرات و برکات سے نہیں کہا جا سکتا کہ مستقبل کی
کتنی صدیاں متاثر و مستفید ہوتی رہیں گی۔

تاریخ ہند میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے نام سے جو واقعہ مشہور ہے، کہنے والے اسی ہنگامہ
کو غدر کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں، اور کچھ دنوں سے آزادی کی پہلی جدوجہد کے عنوان سے
بھی اب لوگ اس کا چرچا کرنے لگے ہیں۔ حساب سے سیدنا الامام الکبیر کی عمر اس وقت
۲۷-اور ۲۸ سال کے درمیان ہونی چاہئے، جیسا کہ معلوم ہے کہ ایک کم پچاس یعنی ۴۹
سال کی عمر میں پیمانۂ حیات آپ کا لبریز ہو گیا، اور یہ سارے کارنامے جن کی داستان اب
سنائی جائے گی، چونکہ ان سب کا تعلق ۱۸۵۷ء والے ہنگامہ اور اس کے بعد کے زمانہ سے
ہے، اس لئے سمجھنا چاہئے کہ بجائے خود ان کارناموں کی نوعیت کچھ ہی ہو، لیکن مدت اور زمانہ
جس میں یہ ساری باتیں آپ سے بن آئیں، اور لینے والے نے جو کام آپ سے لیا، وہ بھی دس
گیارہ سال کی محدود مدت اور محدود زمانہ ہے۔

قبل اس کے کہ کچھ آگے بڑھوں، بے ساختہ اس وقت بھی ظل میں اصل کی زندگی کا
عکس معلوم ہوتا ہے کہ جھانک رہا ہے۔ ۶۳ سال کی زندگی میں وہاں بھی دیکھا گیا تھا کہ
انسانی تاریخ کے رخ کو پھیر دینے والے واقعات مدنی زندگی کے دس سال کی محدود
مدت ہی میں پیش آئے تھے۔ گویا اسی دس سال میں قیام قیامت تک اسلام کی بلکہ کہنے
تو کہہ سکتے ہیں کہ انسانیت کے مستقبل کی تاریخ پوشیدہ تھی، صلی اللہ علیہ وسلم کھونے والے جس
کی راہ میں اپنا سب کچھ کھوتے ہیں دیکھ رہے ہیں، کن کن راہوں سے وہ کیا کچھ نہیں پاتے۔[عله]

عله اختیاری اور اکتسابی امور میں جن کے لئے پیروی سنت اور اتباع محبوب حقیقی کی دولت (باقی اگلے صفحہ پر)

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔ کہنا یہ ہے کہ ہندوستان کی مقامی حکومت کو ختم کر کے بیرونی
اقتدار کے سیاسی تسلط کا جو واقعہ اس ملک میں پیش آیا تھا یعنی انگریزوں کی نئی حکومت اس
ملک میں جو قائم ہو گئی تھی، ان انگریزوں اور ان کی حکومت سے سیدنا الامام الکبیر کے احساسات کا

(گذشتہ صفحہ سے) مقدر ہوتی ہے ان کے لئے تکوینی اور غیر اختیاری امور میں بھی مطابقت و مشابہت کا دروازہ
پہلے ہی سے کھول دیا جاتا ہے، تاکہ ظل اور اصل میں خلقی اور اختیاری تطابق کی سعادت بہم پہنچا دی جائے
اور اصل کا پورا پورا عکس ظل میں نمایاں ہو جائے۔ مثلاً تمہید میں حضرت مؤلف سوانح دام مجدہ نے نانوتہ کی
جغرافیائی صورت کھجوروں کے جھنڈ کے جھنڈ نانوتہ کو ڈھانپے ہوئے ہیں، مدینۃ النبی سے مشابہ دکھلائی
ہے۔ دیوبند کی حالت قبل از ورود حضرت والا صاحب سوانح مخطوطہ نے انتہائی ظلم و جہل کی دکھلائی ہے
جس کا تذکرہ تاسیس مدرسہ دیوبند کے ضمن میں آ رہا ہے، جو اشبہ ہے زمانۂ جاہلیت کے۔ پھر حضرت
والا کے ورود سے علم و عمل کا ماحول بن جانا اور کمال کی روشنی پھیل جانا دکھلایا ہے جو اشبہ ہے طلوع آفتاب
رسالت کے۔ یہاں حضرت مؤلف سوانح دام مجدہ حضرت والا کی مدت اصلاح و تربیت دس سال دکھلا رہے
ہیں جو اشبہ ہے مدنی زندگی کے دس سال کے، اور حضرت شیخ المشائخ حاجی امداد اللہ صاحب نے
حضرت والا کے ایک خاص قلبی حال (انتہائی ثقل و بوجھ سے زبان کے متورم ہو جانے) پر حضرت والا
کو فرمایا کہ مبارک ہو، حق تعالیٰ آپ کو علوم نبوت سے سرفراز فرمائے گا، جو حسب ارشاد حضرت حاجی صاحب
اشبہ ہے ثقل وحی کے، پھر صاحب سوانح مخطوطہ نے نور نبوت کے زیر سایہ حضرت والا اور ان کے تین ساتھیوں
مولانا محمد یعقوب صاحب مولانا رفیع الدین صاحب اور حاجی محمد عابد صاحب کو خلفاء اربعہ سے تشبیہ دیتے
ہوئے دینی اصلاح کے عناصر اربعہ سے تعبیر فرمایا اور لکھا کہ حضرت والا علم و کرم، رحمت و شفقت اور وفور علم میں نسبت
صدیقی سے سرفراز تھے، مولانا محمد یعقوب صاحب جلال و شدت میں نسبت فاروقی سے ممتاز تھے، مولانا رفیع الدین
صاحب انکسار نفس اور حیا میں نسبت عثمانی سے مشرف تھے اور حضرت حاجی محمد عابد صاحب قوت فیصلہ اور
اصابت رائے میں نسبت مرتضوی رکھتے تھے، نور نبوت کی تربیت کے زیر سایہ و زیر سرکردگی حضرت والا حق تعالیٰ
نے انہی عناصر اربعہ سے تجدید و احیائے دین کا کام اس مدرسہ کے راستے سے لیا۔ اس طرح حق تعالیٰ نے ظل میں
اصل کا عکس ایک ہی جہت سے نہیں جہات متعددہ سے نمایاں فرمایا جو ثمرہ ہے عالم تکوین میں حضرت والا کے کمال اتباع سنت اور کمال
محبت نبوی کا، گویا اختیاری اتباع چونکہ آپ کی سرشت میں خلقۃً ودیعت کر دیا گیا تھا جسے نمایاں ہونا تھا، اس لئے تکوینی طور پر حضرت والا کی
طبیعت و فطرت ہی نہیں بلکہ آپ سے متعلقہ زمان و مکان اور احوال و سوانح نے بھی اصل کے متعلقہ زمان و مکان اور احوال و سوانح کے عکس اتارنے
کی سعادت پائی۔ کوئی جاہل یا معاند اس سے معاذ اللہ حضرت والا کیلئے نبوت کا اثبات یا عیاذاً باللہ شریک و مساوات نہ سمجھے بلکہ نبوت کی انتہائی
غلامی اور چاکری ہی بے اختیاری اور تکوینی مشابہت صاحب تصنیف کو نصیب ہوئی ہے جس میں برابری یا مساوات نہیں بلکہ انتہائی غلامی اور پیروی نبوت کی دلیل ہوتی ہے
محمد طیب غفرلہٗ

جو تعلق تھا، مختلف موقعوں پر اس کا ذکر کرتا چلا آیا ہوں۔ بجائے بٹن کے گھنڈی اور تکمہ کا استعمال پر زندگی بھر جو اس لئے اصرار کرتا رہا کہ بٹن لگانے کا طریقہ انگریزوں کا رواج دیا ہوا ہے، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انگریز اور انگریزیت کے متعلق اس کی نفرت کے جذبات کی شدت کا حال کیا ہوگا۔ اپنی کتاب ہدایت الشیعہ میں ایک موقعہ پر لوگوں کے طبعی رجحانات کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے اور یہ لکھ کر کہ مثلاً غذا میں

"کسی کو میٹھا بھاتا ہے، کسی کو نمکین، کسی کو ایک چیز کی طرف رغبت ہوتی ہے، کسی کو نفرت۔"

بے ساختہ تمثیل کے لئے آپ کے سامنے جو مثال آئی ہے، وہ یہ ہے،

"انگریزوں کو عطر نفیس سے تنفر، اور مچھلی کے اچار سے جسے سونگھ بھی لیجئے، تو دماغ چھوڑ جان کی خیر نہیں، رغبت۔"

آگے اسی کے بعد آپ کے الفاظ ہیں۔

"پاخانہ کے کیڑے گندگی میں خرم و شاد، عیش و آرام سے رہیں، اور خوشبو سونگھیں تو مر جائیں۔" ص۸

اور یہ تو خیر معمولی باتیں ہیں، مغل حکومت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکتے ہوئے انگریزوں کی طرف سے اس فیصلہ کا جب اعلان کیا گیا کہ لال قلعہ سے آل تیمور کا آستانہ کسی قسم کا کوئی تعلق باقی نہ رہے گا، اور بہادر شاہ مرحوم کے بعد شاہی خاندان کے لوگوں کو قلعہ سے نکال دیا جائے گا۔ حکم دیا گیا کہ آئندہ مہرولی میں بہادر شاہ کا بیٹا مسکن پذیر ہو۔ یہ فیصلہ ۱۸۵۲ء میں کیا گیا تھا۔ یاد ہوگا ٹھیک دس سال اسی دلی کے محلہ کوچہ چیلان کے ایک مکان میں جھلنگے پر سیدنا الامام الکبیر کو جس حال میں پایا گیا تھا، مصنف امام نے اپنے الفاظ میں اس زمانہ کی تصویر آپ کی جو کھینچی ہے۔ یعنی باوجود شگفتہ مزاج ہونے کے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں ترش رو مغموم رہتے تھے بال بکھرے ہوئے کپڑے میلے کچیلے، جوئیں سر میں بھری ہوئیں نہ کھانے کی خبر نہ پہننے کی پروا

کئی کئی دن کی پکی ہوئی خشک روٹیوں کے ٹکڑوں کو پانی میں بھگو بھگو کر چبا لینا، اور پھر اسی چیلنگے پر پڑ رہنا یہ اور اسی قسم کے دوسرے چشم دید مشاہدات مصنف امام کے جو نقل کر چکا ہوں نیز اسی کے ساتھ انگریزی حکومت کی بغاوت کا الزام آپ پر مختلف موقعوں پر جو لگایا گیا۔ پھر آپ کے بعد انگریزی حکومت کے ساتھ آپ کے تلامذہ[1] اور خلفاء کے تعلق کی آئندہ مسلسل جو نوعیت رہی جس کے دیکھنے والے اور جاننے والے اس وقت بھی موجود ہیں۔ ان ساری باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے قلب مبارک میں انگریزوں کی حکومت

[1] حضرت اقدس کے تمام تلامذہ میں انگریزوں سے نفرت کا یہ جذبہ قدر مشترک کے طور پر پایا جاتا ہے۔ لیکن حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ چونکہ آپ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اور آپ کے جذبات کا گہرا رنگ لئے ہوئے تھے۔ اس لئے وہ حضرت والا کے اس جذبہ نفرت کے بھی مظہر اتم تھے۔ مالٹا سے واپسی پر جب ترک موالات کا استفتاء حضرت شیخ الہند کی خدمت میں پیش کیا گیا تو اپنے تین شاگردوں حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب ؒ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رہ کو جمع کر کے فرمایا کہ یہ فتویٰ آپ لوگ لکھیں۔ ان حضرات نے عرض کیا کہ حضرت۔ آپ کی موجودگی میں ہم کیا لکھیں گے۔ فرمایا کہ مجھ میں انگریزوں سے نفرت کا جذبہ شدت لئے ہوئے ہے۔ مجھے اپنے نفس پر اطمینان نہیں ہے کہ حدود کی رعایت ہو سکے گی۔ اور حق تعالیٰ نے فرمایا ہے

| | |
|---|---|
| ولا یجرمنکم شنآن قوم علی ان لا تعدلوا | کسی قوم کی عداوت تمہیں عدل سے ہٹا نہ دے۔ |

اس لئے آپ ہی لوگ لکھیں۔ اس واقعہ سے جہاں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا انتہائی تقویٰ و تدین نمایاں ہے، وہیں اس جذبہ کا غلبہ بھی واضح ہے۔ میرے بھائی مولانا محمد طاہر مرحوم نے اس زمانہ میں حضرت سے پوچھا کہ حضرت ان انگریزوں کی کوئی بات اچھی بھی ہے؟ فرمایا کہ ہاں ان کے کباب بہت اچھے ہوں گے۔ خود انگریز بھی اسے محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ سر جیمس میسٹن جو اس زمانہ میں یو۔پی کے گورنر تھے، ایک موقعہ پر انہوں نے کہا تھا کہ اگر اس شخص (مولانا محمود حسن) کو جلا کر خاک بھی کر دیا جائے تو وہ بھی اس کوچہ سے نہیں اڑیگی، جس میں کوئی انگریز ہوگا نیز یہ بھی انہی کا مقولہ ہے کہ اگر اس شخص کی بوٹی بوٹی کر دی جائے تو ہر بوٹی سے انگریزوں کی عداوت ٹپکے گی جیسے حقیقت وہی سیدنا الامام الکبیر کے جذبات تھے جو حضرت شیخ کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھے۔ جب مستفیدین کا یہ حال تھا تو اندازہ کر لیا جائے کہ اصل کا مقام کیا ہوگا۔ محمد طیب غفرلہٗ

کی طرف سے کس کس قسم کے خیالات پیدا ہوتے رہتے تھے۔ آپ دیکھ رہے تھے کہ دنیا تو خیر ختم ہی ہو چکی، لے دے کر بچا کھچا سرمایہ مسلمانوں کے پاس دین کا رہ گیا ہے۔ سو بقول اکبر مرحوم؎

نئی نئی آنچیں لگ رہی ہیں، یہ قوم بیکس پگھل رہی ہے
نہ مغربی ہے نہ مشرقی ہے عجیب سانچے میں ڈھل رہی ہے

خواص ہی نہیں، غدر سے پہلے ہی جیسا کہ سرسید مرحوم نے اپنے رسالہ بغاوت ہند میں لکھا ہے،

"رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچ گئی، کہ رعایا ہندوستان کی ہماری گورنمنٹ کو میٹھے زہر اور شہد کی چھری، اور ٹھنڈی آنچ کی مثال دیا کرتی تھی" ص۱۲ ضمیمہ حیات جاوید

"رعایا ہندوستان" کے عوام کے تاثرات کے متعلق سرسید مرحوم کی جب یہ شہادت ہے تو سمجھا جاسکتا ہے کہ حال سے مستقبل کے نتائج تک پہنچنے کی جتنی زیادہ بصیرت جن لوگوں میں تھی، ان ارباب فکر و نظر کا حال کیا ہوگا، یوں بھی جب یہ سب کچھ دیکھا جا رہا تھا کہ اصلی اور مصنوعی (یعنی دیسی) پادریوں کا ٹڈی دل، ہندوؤں اور مسلمانوں کے دھرم اور دین کے چاٹ جانے کے لئے ملک کے طول و عرض میں پھیلا ہوا ہے۔ سرکاری حکام خفیہ اور بسا اوقات علانیہ بھی، دام سے قدم سے ان پادریوں کی ہمت افزائیوں میں مشغول و منہمک نظر آ رہے تھے، مسلمانوں اور ہندوؤں کے دینی پیشواؤں کی تحقیر و توہین کا بازار ہر طرف گرم تھا، دین کے ان خطرات کے ساتھ ساتھ دنیا کا حال یہ تھا کہ بڑے بڑے راجہ اور والیان ملک نواب اور رئیس نان شبینہ کے محتاج بن کر گلی کوچوں میں ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ عوام کی غربت اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ بقول سرسید مرحوم ڈیڑھ آنہ یومیہ یا ڈیڑھ سیر اناج پر ہر ہندوستانی اپنی گردن کٹوا لینے پر بخوشی تیار ہو جاتا تھا۔ ص۱۲ (بغاوت ہند)

یہ اور اسی قسم کے واقعات و حالات جن سے عام طور پر لوگ واقف بھی ہیں اور موقعہ موقعہ سے اس کتاب کے مقدمہ میں بھی، اصل کتاب میں بھی، ان امور کا تذکرہ کر چکا ہوں۔

اب اسی کے ساتھ جب ہم یہ سنتے ہیں، کہ فوج کی بغاوت عام کے بعد آگے پیچھے ہندوستان کے

مختلف علاقوں کے باشندے ہنگامہ غدر کی آگ میں جیسے کود پڑے تھے' اسی طرح سیدنا الامام الکبیر بھی عملاً اس میں شریک ہو گئے تھے۔ خود بھی شریک ہوئے اور آپ کے پیر و مرشد' حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ' نیز آپ کے رفیق الدنیا و الآخرۃ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کش مکش میں حصہ لیا' تو بظاہر اس پر کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ دارالعلوم دیوبند کے متوسلین عموماً اپنی مجلسوں میں اس کا تذکرہ بھی کرتے ہیں

واقعات و حالات سے بھی اسی کا پتہ چلتا ہے' اور لکھنے والوں نے جو اس زمانہ میں موجود تھے' انہوں نے بھی لکھا ہے کہ کسی باضابطہ اسکیم' یا لائحہ عمل کے تحت غدر کا یہ ہنگامہ پیش نہیں آیا تھا' اور نہ ہندوستان کی کسی خاص قوم یا کسی خاص طبقہ نے بغاوت کیلئے' یا آزادی کی جدوجہد کا پروگرام بنایا تھا' بلکہ صحیح یہی ہے کہ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ میں کامیاب ہونے کے بعد' ہندوستان کی حکومت کا باضابطہ چارج لینے کا فیصلہ انگریزی قوم نے جب کر لیا اور سو سال کی طویل مدت میں ہندوستان کے باشندوں کو انگریزوں اور انگریزی حکومت کے طور و طریقہ' رنگ ڈھنگ' کے تجربہ سے ان کے باطنی ارادوں کا پتہ جو کچھ بھی چلا' مجموعی طور پر سب سے ملک کے باشندوں میں بے زاری کے جذبات پرورش پاتے چلے جا رہے تھے' اس عرصہ میں انگریزی حکومت کا دائرہ بھی وسعت کی آخری حد تک پہنچ گیا۔ برہما سے سرحد کابل و قندھار' اور نیپال سے راس کماری تک کا کوئی خطہ ایسا باقی نہ رہا جس پر بالواسطہ یا بلا واسطہ انگریز قابض و دخیل نہ ہوں۔ فتوحات کی اس عجیب و غریب وسعت میں بجائے گوروں کی پلٹن کے ہندوستان کی کالی پلٹن کے اخلاص و جاں نثاری اور بہی خواہی کے ایسے حیرت انگیز تجربات انگریزوں کو ہوئے کہ گوری پلٹن کی گراں فوج کے مقابلہ میں کالی پلٹن کی ارزانی پر بھروسہ کر کے ہر فوج میں کالوں کو اکثریت حاصل ہو گئی' حتیٰ کہ جس سے گورے نا آشنا تھے ۔ ہندوستانی فوج اسی نمک کی کان انگریزوں کو نظر آئی' دوسری طرف کالی پلٹن اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی کہ جنگ کے جدید حربی آلات کی جگہ یہ سمجھنے لگی کہ اپنی کثرت تعداد نے انگریزوں کو

ہم لوگوں نے اتنے ممالک فتح کر کے حوالے کر دیئے ہیں، اور تو کچھ نہیں لیکن اس احساس نے کالی پلٹن کے ناز نخروں کے سمند پہ تازیانہ کا کام کیا۔ کالی پلٹن کا یہ بھی ایک نخرہ تھا کہ چربی ملے ہوئے کارتوس کو دانتوں سے نہیں کاٹیں گے۔ وہ تو خریداروں پر اپنا ناز دکھا رہے تھے لیکن تقدیر نے اسی ناز کو نار بنا دیا۔ انگریز کچھ اڑ گئے، غرور تو کالوں کے دماغ میں بھر ہی گیا تھا اٹھ کھڑے ہوئے، اور وہی ہندوستانی فوج جو خود ماڑا یعنی زیج پی کر اپنے گورے افسروں کو چاول کھلانے پر اصرار کرتی تھی، انگریزوں ہی کو نہیں، بلکہ ان کے بچوں، اور ان کی عورتوں کو اس طریقے قتل کرنے لگی، کہ گویا وہ انسان نہ تھے۔ فوج جب باغی ہو گئی، تو ملک کے عام باشندے جو سو سال کے اس عرصہ میں انگریزی حکومت سے تنگ آ چکے تھے۔ ان کے سامنے بھی نجات کی ایک صورت آ گئی، مختلف علاقوں کے برباد اور تباہ ہونے والے خاندانوں میں بھی کچھ ابال آیا، کچھ غنڈوں شہدوں کو بھی لوٹ مار کا موقع مل گیا، یوں مل ملا کر وہ صورت پیش آئی، جسے چاہے آپ غدر و بغاوت کہئے، چاہے اس کا نام آزادی کی جدوجہد رکھ دیجئے۔ اس میں ہندو مسلمان اور دونوں قوموں کے چھوٹے بڑے عوام و خواص سب ہی طرح کے لوگ شریک تھے لیکن بایں ہمہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جیسے پہلے کوئی لائحہ عمل لوگوں کے سامنے نہ تھا، بعد کو بھی ضبط و نظم کے قائم کرنے کا عام طور پر نہ لوگوں کو خیال ہی ہوا، اور وقتی طور پر کہیں کچھ کیا بھی گیا تو حد سے زیادہ بے جان مضمحل، گستہ و شکستہ تھا۔

جب سب سے بڑے مرکز، جسے فوجیوں نے بھی سب سے بڑا مرکز بنایا تھا۔ یعنی دلی یہاں کا نظم و ضبط جس کے دل و دماغ کے سپرد کیا گیا تھا۔ یعنی سراج الدین ظفر شاہ مرحوم سید احمد خاں ان کے دربار کے خطاب یافتہ درباری آدمی تھے، میں نہیں سمجھتا ہوں کہ یہ الفاظ ظفر شاہ کے متعلق ان کے قلم سے جو نکلے ہیں "بے بنیاد ہیں" لکھتے ہیں کہ

"ہمیشہ خیال کرتا تھا کہ میں مکھی اور مچھر بن کر اڑ جاتا ہوں، اور لوگوں کے ملکوں کی خبر لے آتا ہوں، اور اس بات کو اپنے خیال میں سچ سمجھتا تھا، اور درباریوں سے

تصدیق چاہتا تھا اور سب تصدیق کرتے تھے[1]“ ص۱۶

یہی نہیں بلکہ وہی یہ اطلاع دیتے ہیں کہ

”لوگ اس کے (ظفر شاہ) کے مرید ہوتے تھے کسی فائدہ کی نظر سے : بطور اعتقاد“

[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی الہامانہ معصومیت اس زمانہ میں سلاطین اور حکمرانوں کے کمالات میں شمار ہوتی تھی ' خاکسار ٹونک میں جب پڑھتا تھا تو ریاست کے والی مرحوم ابراہیم علی خان خلیل کے متعلق بارہا اپنے استاد مولانا برکات احمد صاحب کی زبانی اس قسم کی باتیں سنا کرتا تھا کہ بیٹھے بیٹھے نواب صاحب کو خیال ہو جاتا تھا کہ نگاہوں سے لوگوں کے پوشیدہ ہو گئے۔ دربار والے جو تاڑ جاتے تھے کہ اس وقت نواب صاحب اپنے غائب ہونے کے مالیخولیا میں مگن ہیں ' ایک دوسرے کو اشاروں اشاروں میں پوچھتے کہ سرکار کیا ہوئے۔ دوسرا تعجب سے سر ہلاتا کہ خدا جانے کیا ہوئے۔ چند لمحہ بعد پھر نواب صاحب کا نگوں کے بعد برآمد ہوتا اور درباری کہتے کہ سرکار کے ساتھ کیا صورت پیش آئی ' پوچھتے کہ کیا ہوا' تب درباری باور کراتے کہ گدی سے اچانک حضور ناپید ہو گئے مسکرا کر جواب دیتے کہ ان باتوں کا عوام سے چرچا نہ کرنا 'حیدرآباد کے نواب افضل الدولہ مرحوم جو غدر کے زمانہ میں حیدرآباد کے حکمران تھے سنا ہے کہ شکار میں حیدرآباد سے دو تین میل نکل جانے کے بعد کہتے کہ تم لوگ مجھے کہاں لئے جا رہے ہو۔ میں اپنے ملک سے باہر نہ جاؤں گا۔ لوگ کہتے کہ سرکار ابھی تو سیکڑوں میل تک آپ کا علاقہ ہے۔ تب بگڑ کر فرماتے کہ تم مجھے دھوکہ دے کر انگریزوں کے علاقہ میں داخل کر دینا چاہتے ہو۔ مرشدآباد کی مسند پر سراج الدولہ کے قتل ہو جانے کے بعد انگریزوں نے نجم الدولہ نامی خاندان کے کسی فرد کو بٹھایا۔ معاہدہ یہ طے پایا کہ بنگال بہار اڑیسہ تینوں صوبوں میں حکمرانی کا اقتدار انگریزوں کو حاصل ہوگا اور نجم الدولہ کو سالانہ پچاس لاکھ روپے بطور وظیفہ دیئے جاویں گے مشہور لارڈ کلایو جس سے یہ معاہدہ طے ہوا تھا' اس نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ نجم الدولہ اس معاہدہ سے بہت مسرور تھا اور رخصت کے وقت کہنے لگا کہ خوب ہوا اب تو جتنے چاہیں گے محل بنائیں گے (تاریخ راجہ شیو پرشاد ص۳۵) نوعمر لڑکے تجربہ کار حکمرانوں کو نکال کر تخت پر قبضہ کرنے کے لئے عموماً اس زمانہ میں بے چین نظر آتے ہیں یہی بنگال کا سراج الدولہ جو ۲۲ سال کی عمر میں قتل ہی ہو گیا' اپنے حقیقی نانا علی وردی خان ناظم بنگال جس نے یتیم ہو جانے کی وجہ سے سراج الدولہ کو لڑکے کی طرح پالا تھا اور اپنے بعد باضابطہ ولی عہد بھی بنا دیا تھا لیکن سراج الدولہ کی عمر غالباً پندرہ سولہ کی ہو گی کہ مرشدآباد سے بھاگ کر پٹنہ عظیم آباد آگیا' اور اپنے فدائی نانا کے مقابلہ میں اعلان جنگ دے کر کھڑا ہو گیا۔ حضرت آصف جاہ والی دکن دلی کے وزیر اعظم ہو کر دکن سے تشریف لے گئے۔ دکن میں اپنی جگہ اپنے بیٹے ناصر جنگ کو نائب بنا دیا تھا لیکن وزارت چھوڑ کر پھر اپنے ملک کی طرف جب نالیں ہونے لگے تو معلوم ہوا کہ صاحبزادہ والا تبار فوج لئے مقابلہ میں کھڑے ہیں (باقی اگلے صفحہ پر)

ان مریدوں میں ایک مرزا غالب بھی تھے جو چار شخص نسبتیں بادشاہ سے رکھتے تھے سید صاحب نے لکھا ہے کہ ظفر شاہ کو

"کوئی ولی اور مقدس نہیں سمجھتا تھا' اس کے منہ پر لوگ اس کی خوشامد کرتے تھے' اور پیٹھ پیچھے ہنستے تھے۔ ص۲۱

اور حال کچھ اسی غریب ظفر شاہ مرحوم کا نہ تھا' اس زمانہ میں ریاست و امارت کے لوازم میں منجملہ اور باتوں کے اس قسم کی اٹھپیاں بھی شریک تھیں۔

ایسی صورت میں عوام کے متعلق تو میں نہیں کہتا لیکن خواص اور خواص میں بھی سیدنا الامام الکبیر جیسے فہم و فراست' اور دینی ذمہ داریوں کے محسوس کرنے والی ہستیوں کے متعلق یہ دیکھتے ہوئے کہ آج کل فضل و کمال' بڑائی اور بزرگی کا سب سے بڑا معیار یہ ٹھہرایا گیا ہے کہ سیاسی کاروبار میں سب سے زیادہ حصہ جس نے لیا' وہی سب سے بڑا آدمی ہے' اور دوسرے میدانوں میں خواہ کچھ ہی حال ہو کسی مقام کا مالک ہو' لیکن سیاست کے میدان کا جو اپنے آپ کو کھلاڑی ثابت نہ کر سکا' وہ کچھ نہیں ہے۔ اسی عام سطحی معیار کو دیکھ کر بے دھڑک یہ مان لینا' کہ غدر کے ہنگامہ میں سیدنا الامام الکبیر نے اسی طرح حصہ لیا تھا' جیسے اس ملک کے عام باشندے اس کی آگ میں کود پڑے تھے۔ سیدنا الامام الکبیر کی شان ہی کے مطابق اس قسم کا عاجلانہ فیصلہ درست ہو سکتا ہے' اور نہ واقعات ہی سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

یہ صحیح ہے جیسا کہ میں عرض کرتا چلا آ رہا ہوں کہ یہ نئی قائم ہونے والی حکومت مسلسل اپنے اعلانیہ اور خفیہ طرز عمل سے ہندوستان کے باشندوں کو اپنی طرف سے بے زار اور حد سے زیادہ

---

(گزشتہ صفحہ سے) حضرت آصف جاہ کے بعد نظام علی خان دکن کے والی ہوئے تو ان سے بھی ان کے صاحبزادے عالی جاہ باغی ہو گئے' اور زمانہ تک ملک کے نظام کو درہم و برہم کرتے رہے۔ لکھنؤ میں بھی اسی قسم کی افراتفری پھیلی ہوئی تھی' ان قصوں کو کوئی لکھے تو بڑی کتاب بن سکتی ہے۔ حد یہ ہے کہ سکھوں کی تازہ دم قوم کے امراء کی ذہنیت جیسا کہ راجہ شیو پرشاد نے لکھا ہے یہ ہو گئی تھی کہ انگریزوں کے پنشن خوار بن جانے میں بجائے حکمرانی کے ان کو زیادہ سہولت محسوس ہوتی تھی' تاریخ جہاں نما ص۹۶

سے بیزار بناتی چلی جا رہی تھی۔ جن لوگوں میں بصیرت و دانائی کی روشنی جتنی زیادہ تھی، اسی حد تک نفرت اور بیزاری کے جذبات بھی ان کے شدید سے شدید تر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس باب میں سیدنا الامام الکبیر کے قلب مبارک کی گرانیاں جیسا کہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے، حد سے گذری ہوئی تھیں مولانا طیب الحفید سلمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک یادداشت میں لکھا ہے کہ غدر کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی نقاب اتار کر براہ راست انگریزی قوم نے ہندوستان کی حکومت کا جائزہ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور ملکہ وکٹوریہ کو ہندوستان کی قیصر بنا کر دہلی میں ملکہ کی تاج پوشی کا جشن منانے کا فیصلہ کیا گیا، اس زمانہ میں سیدنا الامام الکبیر کا قیام دہلی میں تھا۔ لیکن جوں ہی کہ اس جشن کے انعقاد کا ساز و سامان ہونے لگا، دیکھا گیا، جیسا کہ مولنا طیب صاحب فرماتے ہیں۔

"حضرت نانوتوی دہلی سے دیوبند چلے آئے، اور فرمایا کہ مجھ سے انکی (انگریزوں) کی شوکت نہیں دیکھی جاتی، اس لئے دہلی سے دیوبند چلا آیا کہ نہ دیکھوں گا، نہ کوفت ہوگی" (سیاسی یادداشت ص۱۷)

ظاہر ہے کہ کسی قوم اور حکومت کی طرف سے دل گرفتگی کی یہ آخری شکل ہو سکتی ہے لیکن اسی موقعہ پر آگے مولانا طیب صاحب کی اس روایت میں ایک اضافہ بھی ہے۔ اسی اضافہ کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں، لکھا ہے کہ

"نیز فرمایا کہ الحمد للہ اتنی طاقت تو ہے کہ سارا دربار درہم برہم کر دوں لیکن سنبھالنے والے نظر نہیں آتے، اس لئے دہلی چھوڑ کر چلا آیا، کہ نہ ان کا کر و فر دیکھوں گا، نہ کوفت و سوخت ہوگی" ص۱۸

حضرت والا کی طرف جس دعوے کو اس اطلاع میں منسوب کیا گیا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ دربار کے درہم و برہم کر دینے کے جس امکان اور طاقت کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے۔ کیا دعا و ہمت کی روحانی اور باطنی قوت کے امکانات کی طرف اس دعوے میں اشارہ کیا گیا ہے؟

بظاہر اول وہلہ میں ممکن ہے ذہن اسی کی طرف منتقل ہو جائے۔ لیکن اس راہ بغاوت اور رسوخ الکبیر کے ستر و اخفا کی غیر معمولی کوششوں سے جو واقف ہیں، اگر سوچیں گے، تو یقیناً ان کے عجب نہیں تو یہ بات خلاف دستور ضرور معلوم ہوگی، جہاں تک میں جانتا ہوں یا دوسروں سے سنا ہے، ناگزیر مجبوری کے بغیر اپنی زندگی کے اس باطنی پہلو کی ہوا بھی چاہتے تھے، کہ کسی کو نہ لگنے پائے۔

اسی لئے میں تو سمجھتا ہوں کہ اپنے رسالہ اسباب بغاوت ہند میں سرسید مرحوم نے انگریزوں کے دور از کار وسوسوں کا ازالہ کرتے ہوئے اپنی اس رائے کا جو اظہار کیا ہے، کہ

"میری رائے میں کبھی مسلمانوں کے خیال میں بھی نہیں آیا کہ باہم متفق ہو کر غیر مذہب کے حاکموں پر جہاد کریں"

بلکہ خروج کے متعلق بھی اپنا ذاتی احساس انہوں نے ظاہر کیا ہے۔

"فوج میں بھی ہرگز مشورہ اور پہلے سے صلاح نہ تھی"

اور وہی جو یہ اطلاع دیتے ہیں کہ "جہاد کے فتویٰ" کے نام سے باغیوں نے جس فتوے کو مشہور کیا تھا، اس پر علماء کے دستخط زیادہ تر جعلی تھے، حتیٰ کہ وہی لکھتے ہیں کہ

"ایک آدھ مہر ایسے شخص کی چھاپ دی گئی تھی جو قبل غدر مر چکا تھا" ص ۱۹

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی مستند سوانح عمری تذکرۃ الرشید کے حاشیہ میں جو خبر

---

[۱] ۵۷ء کے ہنگامہ کا تمدہ جب ایسان کا منارہ سے نکل کر سرکاری تحقیقات کنندوں اور کالج کے پروفیسروں اور استادوں کے سامنے آیا، تو کسی کو اس کی جڑ روس میں نظر آتی تھی۔ ایک صاحب کو ولی عہد ایران کے خیمہ میں کاغذ مل گیا تھا، جس میں بیرونی تسلط کے مصائب کو بیان کرتے ہوئے ایرانیوں کو ہندوستان کے حال سے عبرت پذیر ہونے کی وصیت کی گئی تھی، اسی کاغذ کو بنیاد بنا کر بعض کہتے تھے کہ سرچشمہ بغاوت کا ایران میں تھا، فقا حبا سے ہندوستانیوں نے کسی وبا وغیرہ کے مقابلہ میں بطور ٹوٹکہ کے گاؤں گاؤں میں روٹیاں بانٹی تھیں، سمجھا گیا کہ ان روٹیوں پر بغاوت کا پیغام لکھا ہوا تھا۔ لوگ ان کو چٹ کر چکے تھے۔ یہ چپاتیاں ۱۸۵۷ء میں تقسیم ہوئی تھیں، اور بھی طرح طرح کی بدخوابیاں تھیں، جن میں مدتوں انگریز مبتلا رہے۔ تفصیل کے لئے غدر کے لٹریچر کا مطالعہ کیا جائے۔ ۱۲

دی گئی ہے کہ،

"بتایا گیا ہے کہ ہمارے اکثر دینی حضرات نے اس کارروائی سے منع کیا" ج ۲ ص ۱۴۲ اول

یہ یا اسی قسم کی باتیں کتابوں میں جو ملتی ہیں، ان کو محض وقتی مصلحت اندیشیوں کا نتیجہ قرار دے کر خواہ مخواہ اس پر اصرار کرنا کہ کسی باضابطہ پروگرام کو طے کر کے آزادی کی یہ جدوجہد ہندوستان میں شروع ہوئی تھی، شاید درست نہ ہوگا، بلکہ واقعہ کی صحیح نوعیت وہی معلوم ہوتی ہے کہ ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی کے جیت لینے کے بعد سو سال تک انگریزی حکومت کے مسلسل تجربات ہندوستانیوں میں بے زاری کی آگ کو بھڑکاتی چلی جا رہی تھی، ایک اندرونی زخم تھا جو اندر ہی اندر شعوری و غیر شعوری طور پہ پکتا چلا جا رہا تھا۔ تا اینکہ ٹھیک سو سال کے بعد ۱۸۵۷ء میں چربی ملے ہوئے کارتوسوں کا قصہ منہ بن گیا، زخم پھٹ گیا، دبے ہوئے شعلے بھڑک اٹھے، چونکہ کسی باضابطہ نظام کے تحت اقدام نہیں کیا گیا تھا۔ افراتفری پھیل گئی۔ ایک علاقہ کی سن کر دوسرے علاقہ والوں میں تو چل میں چل کی کھلبلی مچ گئی، پھر جو کچھ ہونا تھا، ہوا، چاہیے اسے نوشتۂ تقدیر کہئے، یا زشتیِ اعمال کا قدرتی نتیجہ قرار دیجئے۔ ایک ہندو مورخ راجہ شیو پرشاد نے اپنی آنکھوں سے دلی میں جو کچھ اس نے دیکھا تھا، اور کتابوں میں "زشتیِ اعمال" کی نادری صورت کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ دونوں ہی کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے، کہ

"یہ سانحہ نادر شاہی سے بھی بڑھ کر ہو گیا" [۱] ص ۱۲۷

خصوصاً روایت کے جو الفاظ ہیں ان میں بجائے اس باطنی پہلو کے کافی گنجائش اس بات کی بھی

---

[۱] مگر عجیب بات ہے کہ نادر ہی بے چارہ اب تک بدنام ہے، یوں بھی تو سوچنا چاہیے کہ قتل عام جو نادر کے حکم سے دلی میں ہوا، مورخین کا بیان ہے کہ نصف یوم سے آگے نہ بڑھا۔ سیر المتاخرین میں ہے "چوں نصف روز بگذشت، نادر شاہ تدارک امان بقیۃ السیف نمود و دست لشکریان کوتاہ کردند" ص ۲۲ ج ۲ لیکن دلی پر قابض ہو جانے کے بعد ایام غدر میں شیو پرشاد کا بیان ہے کہ ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸ ستمبر ۱۸۵۷ء یعنی چار دن تک مسلسل دلی کی گلی کوچوں میں قتل عام کا بازار انگریزوں کی طرف سے گرم رہا۔ آدھا دن کے قتل عام اور چار دن کے قتل عام میں خود سوچنا چاہیے کوئی نسبت ہو سکتی ہے ۱۲

ہے کہ اس امکان کو ظاہری اسباب پر محمول کیا جائے۔ سیدنا الامام الکبیر اپنے اثر اور رسوخ
کے لحاظ سے جو کچھ کر سکتے تھے' اس کو تو جانے دیجئے۔ اس قسم کے رنگ میں بھنگ جب
مشاہدہ بتا رہا ہے کہ معمولی بم پھینکنے والے ہنگامی دہشت پسند بھی ڈال سکتے تھے' اور لارڈ
ہارڈنگ کے ساتھ اسی دلی میں جشن ہی کے موقعہ پر درہمی اور برہمی کے جس تماشے کو دیکھا گیا
تھا' اس کے دیکھنے والے تو اب بھی مل سکتے ہیں یوں بھی اصولاً تعمیر کے مقابلہ میں تخریب کا
مسئلہ چنداں دشوار بھی نہیں ہے۔ بلکہ آگے جو یہ فرمایا گیا ہے کہ

"مگر سنبھالنے والے نظر نہیں آتے"

خود یہی بتا رہا ہے کہ اسباب و علل کے جس عمومی نظام کے تحت دنیا چل رہی ہے سیدنا
الامام الکبیر کے سامنے اللہ کی یہی سنت اور قدرتی کارفرمائیوں کا یہی عام پہلو تھا' حاصل گویا
یہ سمجھنا چاہئے کہ حکومت مسلّطہ کے ختم کر دینے یا کم از کم اس کے نظام کو الٹ پلٹ دینے
کے امکانات کو پاتے ہوئے بھی' سیدنا الامام الکبیر یہ محسوس فرماتے تھے کہ اس تخریب کے
بعد تعمیر کی دشواریوں پر قابو حاصل کرنے کے لئے عام سنت اللہ کی رو سے جن ناگزیر حالتوں
اور اسباب و شروط کی ضرورت ہے ان سے اس زمانہ کا ماحول خالی اور مفلس نظر آ رہا تھا' اور یہی
چیز تھی' جو تخریبی امکانات سے فائدہ اٹھانے میں مزاحم ہو جاتی تھی' ملک اس زمانہ میں جس
حال میں تھا' عوام و خواص جس رنگ میں رنگین تھے جس نے حکیمانہ بصیرت کے ساتھ
ان کا مطالعہ کیا ہے' وہ اسی نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے' ظفر شاہ اور اسی عہد کے بعض دوسرے
حکمرانوں کے متعلق نوٹ میں جو معلومات درج کی گئی ہیں' کم از کم وہی اس دعوے کی توجیہ
کے لئے کافی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ مولانا طیب صاحب کی یہ روایت اگر صحیح ہے' اور نہ
صحیح ہونے کی بظاہر کوئی وجہ معلوم بھی نہیں ہوتی' تو خود یہی اس بات کی وافی شہادت
ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں آپ کی شرکت کسی باضابطہ سوچے ہوئے لائحہ عمل کا

نتیجہ[1] نہ تھی - بلکہ ۱۸۵۷ء سے پہلے تقریباً سو سال تک انگریزوں کے مقابلہ میں اصحاب علم و دین کی طرف سے جو خاموشی اختیار کی گئی، اور اسی کا یہ جواب کہ دینی ذمہ داریوں کا احساس علماء میں مردہ ہو چکا تھا کچھ عام حالات کے لحاظ سے ممکن ہے کہ کسی حد تک صحیح بھی ہو لیکن اسی زمانہ میں آخر سید شہید مولانا شہید اور ان کے راستباز مخلص رفقاء کی جاں بازیوں کو دیکھتے ہوئے یہ کلیت کا دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے - ان بزرگوں کی جدوجہد کا رخ بھی بجائے انگریز اور انگریزی حکومت کے پنجاب کی سکھ طاقت کی ہی طرف اول سے آخر تک جو پھرا رہا، خود اس واقعہ کی توجیہ نیز ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے فرو ہو جانے کے بعد مدت تک سکوت اور خاموشی کی فضا جو قائم رہی، اس حال کو دیکھ کر جہاں تک میرا ناچیز خیال ہے یہ عاجلانہ فیصلہ اور بڑی بے باکی کی بات ہوگی کہ ایمانی زندگی سے عوام کے ساتھ خواص بھی کلیۃً محروم ہو چکے تھے، اور کفر کی نہ سہی لیکن ان میں ہر ایک بخوشی و رضا جاہلیت کی زندگی پر قانع ہو کر بیٹھ گیا تھا، آخر میں پوچھتا ہوں کہ ۱۸۵۷ء میں جو کچھ بھی ہوا ہو، لیکن اس طوفان کے اتر جانے کے بعد خود سیدنا الامام الکبیر کی خاموشی اور سکوت

---

[1] کوئی شبہ نہیں کہ ۱۸۵۷ء کا فوجی ہنگامہ اور اس کی خبر پر انگریزوں کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے ہندوستانیوں کا جگہ جگہ کھڑے ہو جانا ایک وقتی جذبہ تھا جو اپنے اسباب کے لحاظ سے تو وقتی نہ تھا مگر نہفتہ (اٹھ جانے) کے لحاظ سے وقتی تھا - لیکن ان بزرگوں کا اس میں کھڑا ہونا کسی وقتی جذبہ اور ہنگامی حرکت کا نتیجہ نہ تھا - بلکہ ایک سوچے سمجھے لائحہ عمل کا ثمرہ تھا - حضرت سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید کا مشن ہمہ وقت ان بزرگوں کے پیش نظر تھا، اس کے لئے یہ وقت اور وقت کا ہنگامہ انہیں سازگار نظر آیا تو اس متوارث مشن کی روشنی میں میدان میں اتر آئے - چنانچہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فرمانا کہ مدرسہ دیوبند ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کے لئے قائم کیا گیا - جیسا کہ آئندہ اس کی تفصیل آئیگی اس کی واضح دلیل ہے کہ کوئی سوچا سمجھا لائحہ عمل تھا - جس میں ۱۸۵۷ء میں کامیابی نہ ہوئی تو اس کے لئے دوسرا راستہ سوچا گیا، اور بقول حضرت مؤلف سوانح کہ یہ ہنگامہ اگر اس وقت کی زمین ہند پر ختم ہو گیا تھا تو ان بزرگوں کے دل و دماغ سے ختم نہ ہوا تھا جو برابر مستعد رہے اور آگے بڑھتے چلے گئے - اس ہنگامہ کی ناکامی پر سیدنا الامام الکبیر اور ان کے شیخ اور اس حلقہ کے دوسرے بزرگوں نے ان اسباب ناکامی کو تاڑ لیا تھا - ان ہی اسباب کا ازالہ اس دوسری صورت سے کرنا چاہتے تھے یہ اسکی واضح دلیل ہے کہ ان حضرات کی اس میں شرکت غیر شعوری یا جذباتی رنگ سے نہ تھی بلکہ ایک مقصد کی روشنی میں تھی - محمد طیب غفرلہٗ

یقیناً بے معنی اور بلا وجہ نہ تھی۔ خدا جزائے خیر دے مولانا طیب صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کو کہ

"مگر سنبھالنے والے نظر نہیں آتے"

ان حقیقت افروز الفاظ پر مشتمل روایت کو بہت سی ذہنی الجھنوں کے سلجھانے کا سامان انہوں نے مہیا فرما دیا ہے۔

بلکہ سچ تو یہ ہے، کہ مصنف امام نے اسی غدر کے ہنگامہ کے متعلق اس کا ذکر کرتے ہوئے کہ سرکار میں اس کی مخبری کی گئی تھی، کہ حکومت سے بغاوت کے اس قصہ میں وہ بھی شریک تھے، آگے جو یہ ارقام فرمایا ہے، کہ

"مولٰنا فسادوں سے کوسوں دور تھے، ملک ومال کے جھگڑے اگر سر رکھتے، تو یہ صورت ہی کیوں ہوتی، کہیں کے ڈپٹی، یا صدر الصدور ہوتے" ص۱۹

اسی طرح حضرت گنگوہی بھی غدر ہی کے جرموں میں ماخوذ ہوئے تھے اور کچھ دن جیل میں گذارنے کے بعد رہائی ہوئی تھی، اس واقعہ کی تفصیل کرتے ہوئے، مولوی عاشق الٰہی صاحب نے حضرت گنگوہی کی سوانح عمری تذکرۃ الرشید میں بجنسہ ان ہی الفاظ کا تقریباً اعادہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"یہ کمل پوش، فاقہ کش، نفس کش حضرات فسادوں سے کوسوں دور تھے، ملک ومال کے جھگڑے اگر سر رکھتے، تو یہ صورت ہی کیوں ہوتی، کوئی کہیں کا ڈپٹی اور کوئی کسی جگہ کا صدر الصدور، کچہری کے عالی شان کمرے، اور عدالت کے وسیع اور اونچی چھتوں والے مکانات کو چھوڑ کر قبر کی تنگی یاد دلانے والی حجروں اور کھرے بوریا کے فرش والے تاریک گوشوں میں کیوں پڑتے"

ج۱ ص۷۴ تذکرۃ الرشید

خصوصاً خط کشیدہ الفاظ دونوں حضرات کے ایک ہی ہیں۔ واقعات سے جو واقف ہیں، اور سچ پوچھئے، تو ان حضرات کی عملی شرکت کا واقعہ کوئی راز درون خانہ تھا بھی نہیں، "مخفیا" میں جو بات طے ہوئی ہو، اور کی گئی ہو، راز بن کر وہ کیسے رہ جاتی، اسی کا نتیجہ ہے، کہ دونوں حضرات کے

اس بیان کو عموماً لوگ وقتی مصالح کا اقتضا قرار دے کر دل میں سمجھ لیتے ہیں کہ واقعہ کی تعبیر میں "توریہ" کے اس طریقہ کو اختیار کیا گیا ہے جس کی شرعاً واخلاقاً سمجھا جاتا ہے کہ اجازت ہے، ایک حد تک یہ صحیح بھی ہے، لیکن اگر غور کیجئے، تو واقعہ کی تعبیر کا عام پیرایہ بھی شاید یہی ہو سکتا تھا۔ سب سے زیادہ مستحق توجہ مذکورہ فقروں میں

"فسادوں"

کا لفظ ہے۔ دونوں حضرات انکار اس کا کر رہے ہیں کہ "فساد" کی شرکت سے دونوں حضرات بری تھے۔ آخر قرآن مجید ہی میں جب فرمایا گیا ہے کہ

| | |
|---|---|
| تلك الدار الآخرة نجعلها للذين لا يريدون علوا في الارض ولا فسادا | یہ دار آخرت ہم ان ہی کیلئے رکھینگے جو زمین میں بگاڑ اور تکبر نہیں کرتے |

اور ایک اسی ایک آیت میں کیا آپ قرآن پڑھئے، شروع سے آخر تک تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ایسی آیتیں آپ کو مسلسل ملتی چلی جائیں گی، جن میں زمین پر فساد اور بگاڑ پیدا کرنے والوں اور ان کے مفسدانہ کاروبار پر زجر و توبیخ انتہائی سخت اور کرخت لہجوں میں کی گئی ہے۔

پس ایسے بدترین قرآنی جرم' سے براءت کا دعویٰ اگر کیا گیا ہے، تو آپ خود سوچئے، کہ اس کے سوا اور کیا کیا جاتا، اسی لئے بجائے "توریہ" کے میرے نزدیک تو واقعہ کے اظہار کا یہ سیدھا سادہ طریقہ ہے، اور یہی سوچنے کی بات ہے، کہ "فساد" جس کی نفی کی گئی ہے، اس سے کیا مراد ہے۔ اور شرکت کا واقعہ جو یقیناً واقعہ ہے، اس کی صحیح نوعیت کیا تھی۔ اور اب میں اسی مسئلہ پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر اور آپ کے رفقاء خاص نے اس مہم میں یقیناً حصہ لیا تھا۔

اس سلسلہ میں آئندہ جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں اس سے پہلے ایک بات سن لی نے جن معلومات کی روشنی میں نتیجہ تک پہنچنے اور پہنچانے کی کوشش کروں گا، ان کا بڑا حصہ ایسی

کتابوں سے ماخوذ ہے جو عموماً رستخیز دار و گیر کی اس قیامت کے بعد لکھی گئی ہیں، جسے غدر کے بعد انگریزی قوم کے مجنونانہ انتقامی جذبات نے اس ملک میں برپا کر رکھا تھا۔ ع

بات پر یاں زبان کٹتی ہے

صرف شاعری نہیں، بلکہ اس عہد میں واقعہ بھی یہی گذر رہا تھا۔ اس روح فرسا جاں گداز حادثہ کا جصہ پر بیس اکیس سال بھی نہیں گذرے تھے، جب ہمارے مصنف امام نے اپنی کتاب مرتب فرمائی تھی، ان کے بعد مولٰنا عاشق الٰہی صاحب مرحوم نے حضرت گنگوہی کی سوانح عمری مدون کی، اب قصہ کافی ہو چکا تھا، اسی لئے بہت سی باتیں جو مصنف امام کی کتاب میں مجمل تھیں، مولٰنا عاشق الٰہی کی کتاب میں ان کی تفصیل کا موقعہ میسر آیا، سوانح مخطوطہ کے نام سے سیدنا الامام الکبیر کی جس غیر مطبوعہ ناقص سوانح عمری کا ذکر کرتا چلا آیا ہوں، صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ مصنف امام سے پہلے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ یا اس کے بعد تصنیف ہوئی[1] تاہم اتنا یقینی ہے کہ بزن و بکش، زد و برد، دھر پکڑ، کنج سیاہ، کا سلسلہ حکومت کی طرف سے ختم نہیں ہوا تھا، بظاہر اسی کا نتیجہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں سرے سے اس واقعہ کے متعلق خاموشی اختیار کی گئی ہے[2]، صرف ایک موقعہ پر دار العلوم دیوبند کی تاسیس کے تذکرے میں

---

[1] سوانح مخطوطہ ۱۲۹۷ھ میں لکھی گئی ہے۔ جبکہ سیدنا الامام الکبیر کی وفات پر ایک سال گذر چکا تھا۔ چنانچہ بنا مدرسہ دیوبند کے سلسلہ میں خود سوانح مخطوطہ سے ہی یہ اقتباس پیش کیا ہے۔ جیسا کہ آگے آئے گا، اور مصنف امام کی سوانح اس سے مقدم ہے جو سیدنا الامام الکبیر کے سن وفات ۱۲۹۷ھ ہی میں لکھی گئی ہے جیسا کہ اس سوانح کے اس قدیم نسخہ کے ٹائیٹل سے معلوم ہوتا ہے، جو مطبع صادق الانوار بہاولپور میں طبع ہوا ہے اس نسخہ کے ابتدائی بوسیدہ اور دیدہ اوراق میرے پاس محفوظ ہیں۔ محمد طیب

[2] جہاں تک احقر کا اندازہ ہے سوانح مخطوطہ میں اس مسئلہ سے خاموشی اختیار نہیں کی گئی۔ بلکہ صراحۃً و کنایۃً اس کا تذکرہ بھرپور الفاظ میں کیا گیا ہے۔ مگر افسوس جن اوراق میں حضرت والا کے مجاہدانہ کارناموں اور غزوں کا ذکر ہے وہ اوراق غائب ہیں۔ مگر فہرست مضامین میں اس کا مستقل عنوان دیکھ کر ان اوراق اور اس تذکرہ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جسے سکوت نہیں کہا جا سکتا۔ پھر اس اقتباس میں بھی جو حضرت مؤلف سوانح دام مجدہ نے فرمایا ہے۔ یہ تذکرہ مثل صراحت کے ہے۔ کیونکہ اس اقتباس سے تاسیس مدرسہ کا زمانہ ہندوستان کی اس قیامت کبریٰ کا زمانہ ہے۔ جس میں ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے پس منظر کے طور پر دار و گیر اور زن و کش کے حوادث رونما تھے اور خود حضرت مؤلف سوانح ہی کا بیان آگے آ رہا ہے (مسئلہ بنا دار العلوم کے سلسلہ میں باقی اگلے صفحہ پر)

یہ لکھتے ہوئے کہ

"یہ وہ زمانہ ہے، جس میں ملک ہندوستان میں ایک ہنگامہ سخت برپا ہوا تھا، جس کو عوام الناس غدر کہتے ہیں"

ضمناً اتنی بات ان کے قلم سے بھی نکل پڑی ہے۔

"اور یہ وہ معرکہ تھا، جس میں ملک ہندوستان میں شوکت اسلام بالکل زائل ہوگئی تھی، اور مغلیہ سلطنت کے جسم کی جان نکل گئی تھی، اور کارخانہ اسلام کا تہ وبالا ہوگیا تھا۔ مسلمان ہونا ہی جرم ہوگیا تھا۔ اکابر دین کا خاتمہ ہوگیا تھا، ہر مسلمان سراسیمہ حال تھا، ہر مؤمن شکستہ بال تھا۔ ہندوستان میں ایسی گہری اندھیری چھائی تھی، نہ ہیں مجھ نہ تو مجھ کا حال تھا، یا نفسی نفسی کا مقال تھا۔ جتنا جو بڑا تھا، اتنا ہی بڑا اس پر صدمہ تھا۔ اکثر اکابر دین جنت الفردوس کو سدھارے، اور بعض بعض جو پنجۂ اجل سے بچے، اس ملک سے ہجرت فرما گئے، ہندوستان میں اسلام پر قریب اسی کے صدمۂ عظیم واقع ہوا تھا، جیسے حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریف پر کل اسلام پر، مسلمانوں کی قلت کفار کی کثرت، کفر کی شدت بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب یہ دین نسیاً منسیا ہو جائے گا۔" صتلا

اس میں شک نہیں کہ جس زمانہ میں وہ لکھ رہے تھے۔ اس وقت اتنا بھی لکھ دینا غیر معمولی ایمانی قوت، اور اسلامی حمیت کے بغیر آسان نہ تھا۔ مگر یہ بات کہ جس شخص کی سوانح نگاری کا

(گذشتہ صفحے کا) ان سے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مدرسہ دیوبند کو استاد رحمۃ اللہ علیہ نے کیا محض تعلیم کے لئے قائم کیا تھا؟ نہیں، بلکہ شروع کے ہنگامہ کی ناکامی کی تلافی کے لئے جس سے حضرت کا ان واقعات میں دخل نمایاں ہے۔ بہرحال سوانح مخطوطہ کی فہرست میں حضرت کے جہاد کا عنوان اور واقعات جہاد کی سرخیاں اور اس اقتباس میں شئے کا پس منظر اور اس میں تاسیس دارالعلوم کی صورت سے حضرت والا کا عزم و مقصد اسی کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں کہ حضرت والا کی شرکت بھی اس میں اپنے مقاصد کے تحت ہوئی اور سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اس کے اظہار و اندراج سے سکوت و اغماض بھی نہیں کیا۔

محمد طیب غفرلہٗ

فرض وہ انجام دے سکے ہیں۔ اس کا بھی نفیاً یا اثباتاً اس ہنگامہ سے کسی قسم کا کوئی تعلق تھا یا نہیں، نہ یہ سوال ہی اٹھایا گیا ہے، اور نہ صراحۃً یا کنایۃً جواب ہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ البتہ ایک جگہ سیدنا الامام الکبیر کی غیر معمولی جامعیت کا تذکرہ کرتے ہوئے عالم عابد حافظ حاجی وغیرہ عنوانوں کے ساتھ

"غازی" بھی

کے عنوان کو بھی ہم پاتے ہیں، لیکن غزا کے اس فرض کو کب کہاں، کس شکل میں، کن حالات میں انجام دے کر "غازی" کے اس لقب کے آپ حقدار ہوئے۔ کتاب کا جتنا حصہ میرے پاس ہے۔ اس میں تو اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا۔

بہرحال مصنف امام کی کتاب، اور حضرت گنگوہی کی سوانح عمری تذکرۃ الرشید جسے مولانا عاشق الٰہی نے مرتب فرما کر جماعت دیوبند کے ذمہ دار بزرگوں کی خدمت میں پیش کی، اور کافی تنقیح و تحقیق کے بعد یہ کتاب شائع ہوئی، اس وقت تک کسی قسم کی تنقید اس کتاب کی روایتوں پر جہاں تک میں جانتا ہوں نہیں کی گئی ہے، ان دو مطبوعہ کتابوں کے سوا مولانا طیب صاحب، اور مولانا طاہر صاحب سیدنا الامام الکبیر کے دونوں سعید و رشید ثقہ پوتوں کی قلمی یادداشتوں کی معلومات کو پیش نظر رکھ کر اس سلسلہ میں واقعات کی جو ترتیب میری سمجھ میں آئی ہے اسے قلم بند کرتا ہوں[1]، واللہ ھو الملھم للصواب والیہ المرجع والمآب تمہیداً آغاز غدر کے بعض اجمالی پہلوؤں کا ذکر مناسب ہوگا۔

---

[1] ۱۳۵۸ھ میں مولانا طیب صاحب نے کابل کا مشہور سفر جب کیا تھا اور شاہ کابل ظاہر شاہ انار اللہ برہانہ کی ملاقات بلکہ مصافحہ اور معانقہ کے بعد ہم کلامی کا موقعہ بھی مولانا کو میسر آیا تھا، بڑے بڑے وزرائے شہستان فارسی کے چشم و چراغ کو اپنے سر دل اور آنکھوں پر بٹھایا۔ ظاہر شاہ کے والد نادر شاہ مرحوم کے پاس سیدنا الامام الکبیر کی ایک ٹوپی بطور تبرک محفوظ تھی۔ یہ ٹوپی ان کے یہاں اس وقت پہنچی تھی جب ان کا خاندان ہندوستان ہی میں مقیم تھا، دستور تھا اور شاید اب تک ہے کہ اس شاہی خاندان میں کوئی جب بیمار پڑ جاتا ہے تو شفا کی نیت سے یہ ٹوپی اسے پہنائی جاتی ہے۔ غالباً نادر شاہ کی والدہ یا دادی نے (باقی اگلے صفحہ پر)

پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ۱۷۵۷ء کے ٹھیک سو سال بعد جوں ہی کہ ۱۸۵۷ء کا سال شروع ہوا،
جنوری کا پہلا مہینہ تھا کہ کلکتہ کی چھاؤنی ڈم ڈم میں پہلی دفعہ کارتوسوں میں گائے اور سور کی چربی
کے قصہ کا آغاز ہوا۔ وہی قصہ بڑھتا رہا، کارتوسوں کو دانت سے کاٹنے کے حکم کی تعمیل سے جن ہندوستانی
سپاہیوں نے سرتابی کی تھی، ان کی پلٹن ہی کو گورنر جنرل نے برخاست کر دیا۔ جس سے کالی پلٹن
میں کافی خوف و ہراس اور آزردگی کے جذبات پیدا ہوئے، بارکپور (کلکتہ) کی چھاؤنی میں اسی کا
ردعمل اس شکل میں ہوا کہ ایک سپاہی نے افسر پر حملہ کر دیا۔ لیکن اس سپاہی کی گرفتاری میں دوسرے
ہندوستانی سپاہیوں نے کوئی دلچسپی نہ لی، اسی کو جرم قرار دے کر بارک پور کی سات پلٹنوں کی موقوفی
کے ساتھ ساتھ گورنر جنرل نے ایک جمعدار اور ایک سپاہی کو تو پھانسی پر چڑھا دیا، اور دو کو کالے پانی
کی سزا حبس دوام کی شکل میں دی گئی۔ جرم کے مقابلہ میں سزا کی سختی ہندوستانی فوجیوں کے لئے
ناقابل برداشت ثابت ہوئی، جہاں جہاں کنٹونمنٹ اور فوجی چھاؤنیاں تھیں، اندر ہی اندر سلگتے رہے

(گذشتہ صفحہ سے) خاص طور پر عرض کرکے سیدنا الامام الکبیر سے یہ ٹوپی حاصل کی تھی۔ بہرحال کہنا یہ ہے کہ کابل میں
مولانا طیب صاحب کو اپنے پھوپی زاد بھائی سیدنا الامام الکبیر کے نواسے مولانا محمد میاں جو عام طور پر منصور
انصاری مہاجر کابلی کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے گھر میں قیام کا موقع ملا، منجملہ بہت سی باتوں کے ان ہی مولانا
منصور انصاری نے اس مہم میں سیدنا الامام الکبیر کے عملی اشتراک کی متعلقہ روایتوں کو ایسے ذریعہ سے مولانا طیب
صاحب تک پہنچایا تھا کہ ان روایتوں کو چشم دید شہادتوں کی حقیقت حاصل ہو جاتی ہے۔ یاد ہوگا بچپن کے
خاص رفقاء میں سیدنا الامام الکبیر کے ایک صاحب مولانا منیر نانوتوی بھی تھے۔ اس مہم میں اول سے
آخر تک وہ شریک تھے اور شریک ہی نہ تھے بلکہ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو حکم دے
رکھا تھا کہ سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ ساتھ رہیں اور اس کی نگرانی کرتے رہیں کہ کسی خطرے میں مولانا
اپنے آپ کو نڈر ہونے کی وجہ سے نہ ڈال دیں۔ اس حکم کی تعمیل کی وجہ سے واقعہ کے ایک بہترین
گواہ وہ بن گئے تھے۔ ان ہی مولانا محمد منیر صاحب سے مولانا منصور انصاری تک معلومات
پہنچی تھیں۔ یہ ساری باتیں خود مولانا محمد طیب صاحب کی یادداشت میں درج ہیں۔ اسی طرح
مولانا محمد طاہر کی یادداشت کے بارے میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ براہ راست اپنے والد مرحوم مولانا
حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنی ہوئی روایتوں کو انہوں نے قلم بند کر لیا
تھا۔ ۱۲

یہ آگ بھڑکتی رہی، تا اینکہ ۵ رمئی ۱۸۵۷ء یعنی ۱۰ رمضان ۱۲۷۳ھ کو میرٹھ کی چھاؤنی میں بھی آگ بھڑک اٹھی۔ گوروں کی تعداد میرٹھ کی اس چھاؤنی میں دو ہزار دو سو سے زائد نہ تھی، اس کے مقابلہ میں کالی پلٹن والوں یعنی ہندوستانی فوجیوں کی تعداد دس ہزار کے قریب تھی، پھر غیر فوجی عملہ جو صرف ہندوستانی تھا، مزید برآں۔ فوج کے چاروں طرف آبادی ظاہر ہے کہ ہندوستانیوں ہی ہندوستانیوں کی تھی، جیل خانہ بھی توڑ دیا گیا تھا۔ ایسی صورت میں جو کچھ ہو سکتا تھا وہ ہوا، لیکن میں آگ لگا دی گئی، اور گورے چمڑے کا جو آدمی بھی سامنے آیا، مرد ہو یا عورت، بچے ہوں، یا جوان بلا امتیاز سب کا صفایا شروع ہو گیا۔

انگریزی افسروں نے روک تھام کی کوشش کی، لیکن ان کی کچھ پیش نہ گئی، اتوار کا دن مئی کی دس حساب سے رمضان کی پندرہ ہوتی ہے۔ واقعہ اپنے انتہائی حدود کو پہنچ گیا۔ اتوار کا دن گذار کر کالی پلٹن والے کھلی ہوئی چاندنی میں دلی چل پڑے۔ دلی میں پہنچ کر لال قلعہ پر قبضہ کیا گیا، اور ظفر شاہ بے چارے کو فوج نے مجبور کیا کہ فرضی نہیں بلکہ واقعی ہندوستان کے بادشاہ بن جائیں۔ دلی میں اس کے بعد جو کچھ بھی گذر رہی ہو، لیکن باہر ملک کے طول و عرض میں قدرتاً یہ خیال پھیل گیا کہ بجائے کلکتہ کے پھر دلی ہی ہندوستان کا پایہ تخت ہو گیا، اور ہندوستان کی حکومت پھر ہندوستانیوں ہی کے ہاتھ میں آ گئی۔ یوں ہر ہر علاقہ کو انگریزوں سے پاک و صاف کرنے کا ارادہ کر لیا گیا، صوبجات متحدہ اودھ کے ساتھ ساتھ بندیل کھنڈ، اور صوبہ بہار کے بعض حصوں تک بغاوت کہئے، یا آزادی کی یہ تحریک پھیل گئی، دور دور کی چھاؤنیاں، مثلاً مئو نیمچ، نصیر آباد کے علاوہ بعض بڑی ریاستیں مثلاً سندھیا (گوالیار)، ہلکر اندور وغیرہ بھی اسی لپیٹ میں آ گئیں۔

ظاہر ہے میرٹھ جہاں سے یہ آگ اٹھی تھی، روہیل کھنڈ کے سارے اہم مقامات اسی کے ارد گرد چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے نہ متاثر ہونے کی آخر وجہ ہی کیا ہو سکتی تھی، ظاہر ہے کہ اتنے طویل و عریض رقبہ کی بغاوت کا فرو کرنا آسان نہ تھا اور نہ چٹ منگنی پٹ بیاہ کی صورت کی توقع کی جا سکتی تھی۔ انگریز بھی جی جان چھوڑ کر مقابلہ کے میدان میں اتر آئے بعض

ہندوستانی طبقات کی طرف سے بھی کافی پشت پناہی کی گئی۔ آخر مئی ۱۸۵۷ء میں جو شرارہ اڑا تھا، جلتے اور جلاتے ہوئے بقول راجہ شیو پرشاد

"۱۸۵۸ء کے آخر ہوتے ہوئے جہاں کا تہاں ٹھنڈا ہو گیا"

(تاریخ جام جہاں نما صفحہ ۱۲۹)

اپنے موضوع سے ہٹ کر اجمالاً جو کچھ اس واقعہ کے متعلق مجھے عرض کرنا پڑا اس کی غرض بھی یہی تھی، کہ اس مدت کے بارہ میں پڑھنے والوں کو آسانی ہو، جس میں یہ واقعہ ہندوستان میں گذر رہا تھا۔ یعنی مئی ۱۸۵۷ء سے مارچ ۱۸۵۹ء تک۔ جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے، کہ ڈیڑھ سال سے دو سال تک کم و بیش ملک اس ہنگامہ کا شکار رہا۔ خبریں جن کا کوئی باضابطہ نظام تو نہ تھا۔ لیکن بہر حال صحیح یا غلط خبریں پھیلتی ہی رہتی تھیں۔ مصنف امام نے بھی لکھا ہے کہ،

"خبروں کا اس وقت میں چرچا تھا۔ جھوٹی سچی ہزاروں گپ شپ اڑا کرتی تھیں"۔ مثلاً کبھی معلوم ہوتا تھا کہ فلاں مقام پر ہندوستان کا پلّہ انگریزوں کے مقابلہ میں بھاری ہو گیا ہے۔ اڑانے والے زیادہ تر مزید دماغی اضافوں کے ساتھ اس قسم کی افواہیں زیادہ اڑایا کرتے تھے۔ اور کبھی یہ ماننے پر بھی لوگوں کو مجبور ہونا پڑتا تھا کہ انگریز غالب آ گئے، عوام تو خیر لیکن جہاں تک میرا خیال ہے، ملک کے ارباب فکر و بصیرت کی نظر زیادہ تر دلّی پر اور دلّی کے بعد تازہ مردہ حکومت کے پایہ تخت لکھنؤ[1] پر جمی ہوئی تھی، راجہ شیو پرشاد جو اسی زمانہ کے آدمی ہیں

[1] اختر پیا کی اختر نگری چھبیلوں والا شہر لکھنؤ واجد علی شاہ سے خالی ہو جانے کے بعد بن چکا تھا لیکن شاہ مرحوم کی جلاوطنی پر سال بھر کا زمانہ بھی نہیں گذرا تھا، یعنی ۷ فروری ۱۸۵۶ء کو انگریزی حکومت کی طرف سے ملک اودھ کی ضبطی کا اشتہار جاری ہوا اور ۱۸۵۷ء کی جنوری میں فوج کی کمپنیاں بدلنے لگی، مئی تک فوج اور فوج کے ساتھ ملک باغی ہو گیا۔ دراصل یہی وجہ تھی کہ جاندار چیونٹ والے سنجلوں سے لکھنؤ کی طبیعت خالی نہ ہو پایا تھا، غدر کے بعد شہزادہ برجیس قدر کو لوگوں نے واجد علی کی مسند پر بٹھا دیا۔ برجیس نو عمر تھا۔ اس کی ماں بیگم تانی نے حکومت کی باگ سنبھالی، انگریزوں کو لکھنؤ میں کافی دشواری پیش آئی۔ اگر نیپال کی امداد سات آٹھ ہزار فوج کی شکل میں دبانی کا صوبہ

ان کی تاریخ کے اس فقرے کا یعنی

"دہلی اور لکھنؤ کے ٹوٹتے ہی باغیوں کی کمر ٹوٹ گئی" ص ۱۲۹ جام جہاں نما

جس کا مطلب بھی یہی ہے۔

یہ اتفاق کی بات تھی کہ مقابلہ سب سے زیادہ ان ہی دونوں مقامات میں ہوا، اور کش مکش بھی سب سے زیادہ طویل ان ہی دونوں مقامات کی تھی۔ کافی وقفہ اسی لئے سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کا ان لوگوں کو مل گیا۔ جو عوام کے بھیڑ یا دھسان میں ابتداء ہی سے شریک نہیں ہوئے تھے، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس ہنگامہ میں شریک ہونے والوں میں ایک طبقہ تو ان لوگوں کا تھا، جن کے لئے "ہُو" کی آواز بس تھی، ہندو اور مسلمان دونوں ہی طرح کے مورخین کی کتابوں میں اس قسم کی باتیں جو ملتی ہیں۔ مثلاً راجہ شیو پرشاد نے لکھا ہے کہ

"اس عرصہ میں ہزار ہا قیدی چھٹے، اور انہوں نے شہر اور چھاونی کے لچے بدمعاش

(گذشتہ صفحہ سے) وقت پر انگریزوں کو میسر نہ آتی تو کہنے والے کہتے ہیں کہ لکھنؤ کا سقوط آسان نہ تھا۔ ریذیڈنسی کی کوٹھی بیلی گارڈ کے در و دیوار میں بھی جد و جہد کرنے والوں کی نشانیاں محفوظ ہیں۔ اس موقعہ پر بے ساختہ جی چاہ رہا ہے کہ ایک سنی ہوئی بات کا ذکر کر دوں، اگرچہ اب نہ ان باتوں کے سننے والے ہی رہ گئے ہیں اور نہ ماننے والے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی صدر الصدور سرکار آصفیہ قدس اللہ سرہ سے ایک دفعہ نہیں مختلف موقعوں پر یہ بات فقیر نے سنی تھی کہ انگریزوں کے مقابلہ میں جو لوگ لڑ رہے تھے، ان میں حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ بھی تھے۔ اچانک ایک دن مولانا کو دیکھا گیا کہ خود بھاگے جا رہے ہیں اور کسی چودھری کا نام لے کر جو باغیوں کی فوج کی افسری کر رہے تھے کہتے جاتے تھے کہ لڑنے کا کیا فائدہ خضر کو تو میں انگریزوں کی صف میں پا رہا ہوں۔ نواب صاحب ہی دوسرے واقعہ کا ذکر بھی فرماتے تھے کہ غدر کے بعد جب گنج مراد آباد کی ویران مسجد میں حضرت مولانا جا کر مقیم ہوئے تو اتفاقاً اسی راستہ سے جس کے کنارے مسجد ہے کسی وجہ سے انگریزی فوج گذر رہی تھی، مولانا مسجد سے دیکھ رہے تھے، اچانک مسجد کی سیڑھیوں سے اتر کر دیکھا گیا کہ انگریزی فوج کے ایک سائیس جو بانگ ڈور گھوڑے وغیرہ گھوڑے کا لئے ہوئے تھا اس سے باتیں کر کے پھر مسجد واپس آ گئے اب یاد نہیں ہا کہ پوچھنے پر یا خود بخود فرمانے لگے کہ سائیس جس کو میں نے گفتگو کی یہ خضر تھے میں نے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے تو جواب میں کہا کہ حکم یہی ہوا ہے۔ یہ روایت نواب صاحب سے سنی ہوئی ہے، باقی خود خضر کا مطلب کیا ہے؟ نصرت حق کی خاص شکل بھی اسی نام کی ظاہر ہوتی ہے تفصیل کیلئے شاہ ولی اللہ وغیرہ کی کتابیں پڑھئے گویا جو کچھ دیکھا جا رہا تھا اسی کے باطنی پہلو کا یہ مکاشفہ تھا۔ ۱۲

قصاب، ڈوم چمار فقیر بھک منگے، بھتر، سائیس گھسیارے، خدمت گار خانساماں اور جملہ کمین اور رذیل سے جو چپراس باندھ کر برقندازی کرتے تھے، خواہ بڑا بڑا چھا پا تلک لگا کر گھنٹوں تک گھنٹہ بجایا کرتے تھے شامل ہوئے، ص۱۲ جام جہاں نما یا سرسید کے رسالہ میں ہے کہ شریک ہونے والوں میں

"ایسے خراب، اور بدرویہ اور بد اطوار آدمی تھے کہ بجز شراب خوری اور تماش بینی اور ناچ اور رنگ دیکھنے کے کچھ وظیفہ ان کا نہ تھا" ص۱۹ ضمیمہ حیات جاوید

ممکن ہے کہ حکومت کو خوش کرنے اور ہندوستان کے عام باشندوں کے جرم کو ہلکا کر کے دکھانے کے لئے بھی اس قسم کی باتیں لکھی گئی ہوں۔ لیکن اس کا انکار مشکل ہے کہ جن لوگوں نے ہنگامہ میں حصہ لیا تھا، ان میں کافی تعداد اس قسم کے لوگوں کی بھی تھی، اسی ہنگامہ میں کیا ہر ہنگامہ میں اس قماش کے لوگوں کا ریل پڑنا، ایک عام بات ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ دعوی بھی قطعاً غلط ہوگا کہ سنجیدہ، و فہمیدہ طبقات کے افراد بھی اس میں شریک نہ تھے۔ یہ حقائق اور واقعات کی تکذیب ہے، البتہ فرق دونوں گروہوں میں یہ تھا کہ عوام کا بے قید طبقہ تو "ہو" کے ساتھ کود پڑا، اور وہ یوں ہی کود پڑنے کا عموماً عادی بھی ہوتا ہے۔ اس کے سامنے کوئی بڑی غرض ہوتی بھی نہیں، بے آئینی کے منافع سے فوری طور پر مستفید ہونا، کچھ پا کر نکل جانا، ان چھچھورے مقاصد کے سوا مشکل ہی سے ان کا قدم کسی بلند نصب العین کے لئے اٹھتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ عقل و فراست اور اس سے بھی زیادہ دین کی عائد کی ہوئی ذمہ داریاں جن کی زندگی تھی، بلکہ دین ہی کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے جو اٹھے تھے ان کے متعلق ایک لمحہ کے لئے کسی حیثیت سے بھی یہ سوچا جا سکتا ہے کہ وہ بھی اس عامیانہ "ہو" پر دوڑ پڑے مالکم کیف تحکمون

اوروں پر بحث کرنے کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔ لیکن سیدنا الامام الکبیر کے متعلق محض حسن ظن ہی کی بنیاد پر میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ معلومات کا جو سرمایہ معتبر ذرائع سے مجھ تک پہنچا ہے،

جو بھی ان سے واقف ہوگا، وہ میری ہمنوائی پر انشاء اللہ اپنے آپ کو مجبور پائے گا۔ اب خاص ترتیب سے اپنی ان معلومات کو پیش کرتا ہوں۔

۱

آپ مجھ سے یہ سن چکے کہ میرٹھ میں کارروائی کا آغاز ۱۸۵۷ء کی ۱۰ مئی سے ہوا۔ رمضان[۱] کی دسویں تاریخ تھی۔ اسی لئے لکھا ہے کہ کھلی چاندنی میں لوگ میرٹھ سے دہلی روانہ ہوئے۔ خیر یہ بات تو تاریخ جاتی ہے۔ اب سنئے، مصنف امام نے اپنی کتاب میں یہ خبر دیتے ہوئے کہ

"اسی عرصہ میں غدر ہو گیا۔" ص۳۶

آگے وہی سیدنا الامام الکبیر کے متعلق یہ اطلاع دیتے ہیں۔

"بعد رمضان احقر کو سہارن پور لینے کو تشریف لائے، چند آدمی اور وطن دار ساتھ تھے، اس وقت راہ چلنا بدون ہتھیار اور سامان کے دشوار تھا۔" ص۳۶

جس سے حسب ذیل نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) غدر کے زمانہ میں ہمارے مصنف امام اپنے وطن نانوتہ میں نہیں بلکہ سہارنپور میں تھے۔

(۲) لیکن سیدنا الامام الکبیر (بجائے دلی یا میرٹھ کے) معلوم ہوتا ہے کہ نانوتہ ہی میں قیام فرما تھے۔

(۳) یہ رمضان جس کا مصنف امام نے اس موقعہ پر ذکر کیا ہے، یقیناً رمضان کا وہی مہینہ ہے، جس میں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں میرٹھ کی فوج باغی ہوئی، اور باغی ہو کر دلی پہنچی۔ قدرتی طور پر دلی سے جو علاقے زیادہ متصل تھے جیسے مظفر نگر، سہارنپور وغیرہ معلوم ہوتا ہے کہ بے آئینی کے عام آثار سے رمضان ہی میں متاثر ہو چکے تھے۔ راستہ کا امن و امان ختم ہو چکا تھا۔ اب خواہ عوام نے خود قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا، یہ اس کا نتیجہ ہو، یا جیسا کہ مولوی عاشق الٰہی صاحب کا بیان ہے کہ

"گورنمنٹ نے باغیوں کی بغاوت کے باعث اپنا امن اٹھا لیا۔ اور بذریعہ اشتہار عام اطلاع دے دی کہ اپنی حفاظت ہر شخص کو خود کرنی چاہئے۔" ص۳ تذکرۃ الرشید ج ۱

---

[۱] جیسا کہ جنتری صد سالہ مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ مرتبہ مولانا ابو الحسنات قطب الدین احمد صاحب لکھنوی سے واضح ہے ۱۲

اس کی وجہ سے یہ صورت حال پیدا ہو گئی ہو۔

(۲) سیدنا الامام الکبیر کی جلادت اور بُردلی (بہادری) کی شہادت کے ساتھ ساتھ مصنف امام کے مذکورہ بالا بیان کا کھلا ہوا اقتضا یہ ہے کہ غدر کے شروع ہونے کے ساتھ ہی سیدنا الامام الکبیر قطعاً اس ہنگامہ میں شریک نہ ہوئے۔ بلکہ نانوتہ سے سہارنپور آنے کے بعد بجائے اس کے کہ جن میدانوں میں مقابلہ ہو رہا تھا، ان میں سے کسی میدان کی طرف چلے جاتے، اپنے ساتھ مصنف امام کو لے کر وطن نانوتہ ہی تشریف لے آئے۔

یہ بدیہی نتائج ہیں جو مصنف امام کی مذکورہ بالا اطلاع سے پیدا ہوتے ہیں۔ آگے یہ سوال کہ نانوتہ میں آپ کا کب تک قیام ایام غدر میں رہا؟ قطعی طور پر تو اس کا جواب دینا مشکل ہے لیکن مصنف امام اسی سلسلہ میں جب سہارنپور سے سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ نانوتہ پہنچے، اور ان دونوں بزرگوں کا قیام اسی قصبہ میں تھا۔ آگے جو یہ لکھا ہے کہ

"جب احقر وطن (نانوتہ) پہنچا، چند ہنگامے مفسدین کے پیش آئے جس میں لالا کی کمال جرات و ہمت ظاہر ہوئی" ص۲۳

بظاہر اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ خود نانوتہ پر بھی لوٹ مار کرنے والے غارتگروں نے حملہ کیا، اور قصبہ والوں کے ساتھ مل کر ان کی مدافعت میں سیدنا الامام الکبیر نے بھی امتیازی حصہ لیا۔ ایک نہیں بلکہ "چند ہنگامہ کے پیش آنے" کے لئے چاہئے تو یہی کہ "کافی عرصہ" تک مانا جائے کہ نانوتہ میں سیدنا الامام الکبیر کا قیام رہا، افسوس ہے کہ ان ہنگاموں کی تفصیلات کے جاننے کی کوئی صورت باقی نہ رہی، یہ کون لوگ تھے، اور نانوتہ پر بار بار حملہ کیوں کرتے تھے، ان سوالوں کا کیا جواب دیا جائے۔

شاید ان ہی ہنگاموں کی وجہ سے بھی، اور جیسا کہ مولانا عاشق الٰہی کا بیان ہے کہ حفاظت کی ذمہ داری حکومت نے اپنے سر سے اتار کر خود ہندوستان کے باشندوں کے سر ڈال دی تھی کچھ اس وجہ سے بھی، یا یہ کہ مستقبل میں کیا صورتیں پیش آنے والی ہیں۔ کچھ اس کے امکانات کو بھی

سوچ کر مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"اس زمانہ میں (یعنی جب ملک میں غدر برپا تھا اور ان کا قیام نانوتہ میں تھا) ہمارے بھائی ہم عمر، اکثر بندوق اور گولی لگانے میں مشق کرتے رہتے تھے۔"

جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ نانوتہ میں شیوخ کی جو عام برادری تھی، اس میں نشانہ بازی وغیرہ جیسے جنگی مشاغل کی مشق کا غیر معمولی ذوق اور شوق پیدا ہو گیا تھا۔ کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ شاید آئندہ شریک ہونے اور شریک کرانے کی یہ تمہید ہو۔ لیکن اب اسے کیا کیجئے۔ مصنف امام ہی نے اسی کے بعد جو کچھ لکھا ہے، اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے، کہ ان جنگی مشقوں سے کم از کم ذاتی طور پر سیدنا الامام الکبیر کا نہ کوئی تعلق تھا، اور نہ کسی خاص قسم کی دلچسپی ہی معلوم ہوتی ہے، کہ ان مشاغل سے آپ لیتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جس زمانہ میں نانوتہ کے نوجوان چاندماری کی مشق کر رہے تھے، کہ

"ایک دن آپ (سیدنا الامام الکبیر) مسجد سے آئے، ہم گولیاں لگا رہے تھے، اور نشانہ کی جائے پر ایک نیم کا پتہ رکھا تھا، اور اس کے گرد ایک دائرہ کھینچا تھا، قریب سے بندوق لگاتے تھے۔ گولیاں مٹی کی تھیں۔"

جس سے پتہ چلتا ہے کہ چاندماری میں مٹی کی گولیوں کے استعمال کرنے کا طریقہ ہندوستان میں مروج تھا۔ یا قلت سرمایہ کا یہ نتیجہ ہو، بہرحال وہی کہتے ہیں کہ مسجد سے نشانہ بازی کے اسی مقام پر پہنچ کر

"مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) نے فرمایا کہ بندوق کیونکر لگاتے ہیں، مجھے بھی دکھلاؤ۔" صفحہ

اس کے سوا اور مطلب اس کا کیا سمجھا جائے کہ غدر کے ہنگاموں میں کافی زور جس زمانہ میں پیدا ہو چکا تھا، اس وقت تک سیدنا الامام الکبیر بندوق چلانا بھی نہیں جانتے تھے۔ بندوق کیونکر لگاتے ہیں؟ پہلی دفعہ اپنی پوری زندگی میں بندوق چلانے والوں سے یہ پہلا سوال آپ کی طرف سے شاید

پیش ہوا۔ اب یہ آپ کی عبقریت اور فطرت فائقہ کا نتیجہ تھا جیسا کہ مصنف امام لکھتے ہیں کہ دریافت فرمانے پر

"کسی نے ایک فیر کی اور قاعدہ نشانہ کا ذکر کیا" ص۳۶

گویا کر کے بھی دکھایا، اور نشانہ پر گولی مارنے کا جو طریقہ ہے، اسے بھی زبانی بتا دیا۔ مصنف امام کا بیان ہے کہ بس ایک دفعہ دیکھ اور سن لینے کے بعد دیکھا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر نے،

"تب بندوق ہاتھ میں لے کر فیر کی" ص۳۶

لوگ نشانہ کی طرف دوڑے وہی لکھتے ہیں کہ دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ

"صاف گولی نشانہ پر لگی" ص۳۶

اس کے بعد مصنف امام نے اس قسم کی باتوں کا ذکر کر کے کہ نانوتہ کے دوسرے نوجوان جو زمانہ سے نشانہ بازی کی مشق کر رہے تھے اور نیم کے پتہ کی جگہ اس دائرے میں گولی کو پہنچا دینے کو کامیابی سمجھتے تھے جو پتہ کے اردگرد کھینچ دیا جاتا تھا، ان کے مقابلہ میں بغیر کسی سابقہ مشق کے محض ایک دفعہ دیکھ لینے اور سن لینے کے بعد پہلے فیر ہی میں ٹھیک نشانہ یعنی نیم کے پتہ کو اپنی گولی سے سیدنا الامام الکبیر نے جو اڑا دیا تھا، ممکن ہے کہ اس کو "بر ہدف زند تیرے" کا اتفاقی واقعہ سمجھا جائے۔ مگر اپنے ذاتی تجربات کی بنیاد پر اس خیال کی تردید کرتے ہوئے وہی لکھتے ہیں کہ

"یہ بات اتفاقی نہ تھی، اپنی فہم سے حقیقت نشانہ بازی کی سمجھ کر بدن ایسی وضع پر سادہ لیا جو فرق ہو جانے کی وجہ نہ ہوئی۔ تیر اندازوں کو دیکھا ہے کہ سر سے پا تک ایک خط مستقیم ہو جاتے ہیں" ص۳۷

اور جو بھی سیدنا الامام الکبیر کی فطرت فائقہ کی خصوصیتوں سے تھوڑا بہت واقف ہے۔ وہ مصنف امام کی رائے کی تائید ہی کرے گا۔ مگر مجھے اس موقعہ پر مصنف امام کے بیان کی روشنی میں یہ کہنا ہے کہ مقابلہ اور مقاتلہ میں عملی شرکت کا فیصلہ سیدنا الامام الکبیر اگر پہلے سے کئے ہوئے ہوتے، تو اس زمانہ تک آپ کا جنگی آلات کم از کم بندوق کے استعمال سے اس درجہ بیگانہ رہ جانا کیا ممکن تھا،

کچھ بھی ہو، اتنی بات بہر حال یقینی ہے۔ اور ان ناقابل انکار چشم دید گواہیوں کا کھلا ہوا اقتضاء ہے کہ مالی خولیا سے زیادہ اس قسم کی افواہوں کی کوئی قیمت نہیں ہے کہ غدر کے ہنگامہ کے برپا کرانے میں دوسروں کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر اور آپ کے علمی و دینی رفقاء کے بھی ہاتھ تھے۔ بلکہ واقعہ وہی ہے جو مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"مولنا فسادوں سے کوسوں دور تھے"

آخر حسب روایت مولنا طیب صاحب جب سنبھالنے والے حضرت والا کو نظر نہیں آرہے تھے تو تعمیر سے پہلے تخریب کی یا خروج سے پہلے دلوج کا خیال ممکن ہے حامیوں کے نزدیک ضروری نہ ہو لیکن سیدنا الامام الکبیر جیسے دین کی مثالی شخصیتوں کے متعلق اس قسم کے خود تراشیدہ اوہام بد خواہیوں کے سوا اور بھی کچھ ہو سکتے ہیں ؟ -

سیاست، جن لوگوں کے نزدیک صرف مار دھاڑ، اکھاڑ پچھاڑ کا نام ہے، وہ تو جو چاہے سوچیں، سوچ سکتے ہیں جو چاہے کریں کر سکتے ہیں۔ لیکن اسلام اپنے ماننے والوں کو جس قلب سلیم، ذہن سلیم، دماغ سلیم، فکر سلیم کا مالک بنا دیتا ہے، ان لوگوں سے غوغائیوں اور خورشیوں کی ہنگم حرکات کی توقع دلیل ہے اس بات کی کہ توقع کرنے والے اسلام کی روح سے قطعاً بے گانہ ہیں، ایک صحیح اسلامی وجود، امن کی حالت میں ہو یا جنگ کی حالت میں، کسی وقت اور کسی حال میں کسی کے لئے نہ وہ دھوکا ہے اور نہ فریب، ہر حال میں آئین اور اصول کی پابندی بھی مسلمان کی زندگی کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو ہے۔ اسی لئے اپنے ماحول میں رہنے والوں کے لئے امن و عافیت، طمانیت و سکینت، سلامتی اور خوش باشی کی وہ مجسم ضمانت ہوتا ہے۔ دوست تو دوست دشمن بھی اسی بھروسہ کو اپنے دل میں پاتے ہیں اور یہی ان کو پانا بھی چاہئے کہ غیر آئینی طریقے اختیار کر کے مسلمان کسی کے لئے کسی زمانہ میں کسی جگہ خطرہ نہیں بن سکتا۔ اس امتیازی خصوصیت سے جو جتنا زیادہ دور ہے، سمجھنا چاہئے کہ اسی حد تک وہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کی روح سے دور ہے۔

## ۲

بہرحال فسادوں سے قطعی دور ہونے کے باوجود پھر یہ سوال کہ آخر اس واقعہ کی صحیح نوعیت کیا تھی جس کی وجہ سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ۵۷ء والے ہنگامہ میں سیدنا الامام الکبیر نے بھی عملی حصہ لیا تھا جیسا کہ مسلسل کہتا چلا آرہا ہوں، اصل واقعہ کا انکار تو واقعہ کا انکار ہوگا، ایسے سارے ذرائع جن سے غیر مشتبہ یقین کے سوا اور کچھ پیدا نہیں ہوسکتا۔ یہ واقعہ پہلی نسلوں سے آئندہ نسلوں تک منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ قطعی طور پر ثابت ہے کہ آپ لڑے بھی، زخمی بھی ہوئے الغرض سوانح مخطوطہ کے مصنف کے لفظ "غازی" کے لئے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے، ان سب کے حاصل کرنے کے مواقع قدرت کی طرف سے آپ کے لئے آسان کئے گئے تھے۔

ایک چیز یعنی تاریخ وار تو ساری کڑیوں کا مرتب کرکے پیش کرنا مشکل کیا میرے لئے تو ناممکن ہے۔ جن وثائق اور کتابوں سے معلومات کی فراہمی میں مدد ملی ہے سب کے سب تاریخ کے ذکر سے خالی ہیں۔ واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن کب کس مہینہ میں مہینہ کی کس تاریخ میں یہ واقعہ پیش آیا، اس کا ذکر کسی نے نہیں کیا ہے۔ تاہم ان ہی بزرگوں کا صدقہ ہے کہ تاریخ کی تعیین کے بغیر ہی سہی لیکن واقعات تو بحمداللہ معلوم ہوگئے۔

---

غدر کا ہنگامہ ملک کے طول و عرض میں برپا تھا۔ اور جیسا کہ آپ دیکھ چکے کافی عرصہ تک اس زمانہ میں ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر اپنے آبائی وطن نانوتہ ہی میں مقیم رہے۔ نانوتہ کے قیام کے ان دنوں میں بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قصبہ پر شورش پسند غوغائیوں کی طرف سے متعدد بار حملے ہوئے، باشندگان قصبہ کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر بھی مدافعت میں حصہ لیتے رہے۔ بقول مصنف امام

"جس میں مولٰنا کی کمال جرأت و ہمت ظاہر ہوئی۔"

مدافعت کی ان کارروائیوں کو بھی غدری ہنگامہ کی شرکت قرار دی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ اس حد تک قیام نانوتہ ہی کے زمانہ میں گویا آپ شریک ہوچکے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ

شرکت آپ کی تو فرمان نبوی

| من قتل دون ماله فهو شهيد ومن قتل دون عرضه فهو شهيد الحديث | جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتا ہوا مارا گیا وہ شہید ہے اور جو اپنی آبرو بچاتے ہوئے مارا گیا وہ شہید ہے الخ |
|---|---|

کی تفصیلی شکل تھی

سوال یہ ہے کہ ہندوستان کی مقامی حکومت کو ختم کر کے باہر کی جس قوم نے اس ملک پر سیاسی اقتدار اپنا قائم کر لیا تھا۔ باہر سے مسلط ہو جانے والے اس بیرونی اقتدار کے ساتھ تصادم اور مقابلہ کی صورت کہاں اور کیوں پیش آئی کیونکہ مقصود اس مسئلہ میں مقابلہ اور مقاتلہ کا یہی پہلو ہے۔

اس پر غور کرنے کے لئے اس مقدس جماعت کی تاریخ اعلاء کلمۃ اللہ کو سامنے رکھ لینا چاہئے۔ یہ تو ہندوستان سے مسلمانوں کا اقتدار ختم ہو کر ایک بدیسی کے اقتدار کے سامنے آجانے کا مسئلہ تھا۔ ان حضرات کے سید الطائفہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے تو خود مسلم اقتدار میں بھی ہر مذہبی اور سیاسی باطل کے خلاف علم جہاد بلند رکھا تو ان کے تربیت یافتہ کفر کی شوکت کے زمانہ میں اعلاء کلمۃ الحق کے مقصد سے کیسے دست بردار ہو سکتے تھے اس لئے ان حضرات کے سامنے سب سے پہلے تو یہ اعلاء کلمۃ الحق کا مقصد سامنے تھا۔ ساتھ ہی قومی طور پر ہندوستان کی بسنے والی اقوام میں کوئی قوم ایسی نہ تھی جو انگریزوں کے ابتدائی طرز عمل اور مظالم سے تنگ آئی ہوئی نہ ہو، جس میں مسلمان خصوصیت سے زیادہ متاثر تھے۔ اس لئے ان بزرگوں کے سامنے اعلاء کلمۃ اللہ کے ساتھ ساتھ عام ہندوستانی اقوام کی بہبودی اور فلاح کا مسئلہ بھی پیش نظر تھا۔ جس کا حل اس کے سوا دوسرا نہ تھا کہ انگریزوں کا اقتدار اس ملک میں باقی نہ رہے۔

ساتھ ہی سیدنا الامام الکبیر کے ان اکابر حضرت سید احمد شہید اور حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمہما اللہ کا قریبی اسوہ بھی پیش نظر تھا۔ ان چند در چند وجوہات کے تحت ان اکابر میں یہ جذبہ بطور قدر مشترک کے موجزن تھا کہ اس ملک کی بہبود و فلاح انگریزوں کے قیام اور راج میں نہیں ہے بلکہ ان کے یہاں سے ہٹنے اور باہر ہو جانے میں ہے۔ البتہ اس جذبہ کے ساتھ جس طاقت کی

ضرورت تھی، وہ مسلمانوں میں باقی نہ تھی اگر وہ ہوتی تو ملک ہی ہاتھ سے کیوں جاتا۔ اس لئے رات دن ان بزرگوں میں اس کا ذکر و فکر رہتا تھا کہ یہ بھاری پتھر اس ملک کے سر سے کیسے اٹھایا جائے۔

اسی دوران میں ۵۷ء کا ہنگامہ پیش آیا۔ جب تک اس ہنگامہ کی صورت ایک غدر اور بلوہ کی رہی۔ ان بزرگوں کو اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن جب کہ اس نے طول کھینچکر ملک کی رعایا کو راعی کے مقابلہ پر لا کھڑا کیا اور اب سوال ہندوستانی اور انگریز کا پیدا ہو گیا جس میں اس کے امکانات نظر آنے لگے کہ انگریز کا پنجۂ استبداد ڈھیلا پڑ جائے یا اس کے پیر ہی اکھڑ جائیں تو یقیناً اس موقعہ سے فائدہ اٹھانا ان بزرگوں کے اصلی اور بنیادی نصب العین میں ممد و معاون ہوسکتا تھا اس لئے خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ بالخصوص جبکہ انگریزوں کے مظالم جو اس سلسلہ کے محرک تھے آخرکار اپنی انتہا کو پہنچ گئے تھے تو اب کون سی چیز رہ گئی تھی جو ان بزرگوں کے ارادوں میں حرکت پیدا نہ کرتی اور سیدنا الامام الکبیر کو جو اس سلسلہ کو بہت پہلے سے بچشم بصیرت و عبرت دیکھ رہے تھے اس میدان میں آنے سے روکتی۔

بہرحال جذبۂ اعلاء کلمۃ اللہ، مذہبی حمیت ملی غیرت اور برادران ملک کی مظلومیت عامہ کے پیش نظر ان کے استخلاص کا جذبہ وغیرہ اصل بواعث تھے جنہوں نے ان بزرگوں کو خاک و خون کے تماشوں میں لا کھڑا کیا۔

اس سلسلہ میں انگریزی مظالم کے بعض ناگفتہ حوادث بھی ایسے پیش آئے جس سے ان بزرگوں کے عزائم میں جلد حرکت ہوگئی اور خود ان حوادث میں بھی بعض شرعی پہلو ایسے تھے کہ ان کی بنا پر ان کے عزائم کو جلد متحرک ہو جانا چاہئے تھا جس میں سے مثلاً ایک یہ بھی ہے جس سے انگریزوں کی معاہدہ شکنی اور غداری کھلے طور پر واضح ہوتی ہے کہ

سب سے پہلے اس باب میں ایک اطلاع مولانا عاشق الٰہی مرحوم کی کتاب تذکرۃ الرشید میں ملتی ہے۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ تھانہ بھون جو سیدنا الامام الکبیر کے پیر و مرشد

حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا موطن پاک تھا۔ اسی تھانہ بھون کے قصبہ میں قاضیوں کا ایک اچھا خاصہ خوش حال رئیس خاندان بھی رہتا تھا۔ قاضیوں کے اس خاندان کے ٹوٹے پھوٹے مکانات خستہ اور بوسیدہ حال میں اب بھی تھانہ بھون میں موجود ہیں۔ سرسری نظر اس پر خاکسار کی بھی پڑ چکی ہے۔ مکانات کیا محل سراؤں کی شان ان سے اب بھی نمایاں ہے۔ بظاہر کافی آمدنی والی جاگیر حکومت مغلیہ سے قاضیوں کے اس خاندان کو ملی ہوئی تھی۔ جس زمانہ میں غدر کا فتنہ ملک میں شروع ہوا، قاضیوں کے اس خاندان کے رئیس قاضی عنایت علی خاں نامی تھے۔ مولنا عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ وہ

"تھانہ بھون کے نیک دل سرکاری خیر خواہ زمیندار" تذکرۃ الرشید ص۷۴ ج۱

تھے۔

بظاہر اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ عام بغاوت کے پھوٹ پڑنے کے بعد بھی سرکار یعنی حکومت مسلطہ کے ساتھ بہی خواہی اور مصالحت پسندی کا رشتہ جن لوگوں نے قائم رکھا تھا ان میں تھانہ بھون کے قاضیوں کا یہی رئیس خاندان بھی تھا۔ نیز تھانہ بھون کی شورش کے آغاز کے متعلق تذکرۃ الرشید ہی کے حاشیہ پر جو فقرہ درج کیا گیا ہے کہ

"اسی گھٹا ٹوپ اندھیاؤ میں جب کہ کئی جگہ غدر پڑ چکا تھا، اور دہلی اس کا آشیانہ تھا" ص۷۴

اس میں تو اس کی تصریح بھی کردی گئی ہے کہ عام بغاوت کی آگ ملک میں پھیل چکی تھی، اور میرٹھ وغیرہ چھاونیوں سے منتقل ہوکر دلی کو اپنی جدوجہد اور کش مکش کا مرکز جب لوگ بنا چکے تھے، تب کچھ دن بعد خلفشار کی ابتدا تھانہ بھون میں ہوئی۔

اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ اور کہیں جو کچھ بھی ہو رہا ہو لیکن جس قصبہ میں بتایا جاتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے عملی حصہ لیا تھا، ظہور غدر کے کافی عرصہ کے بعد اس قصبہ کی ابتدا ہوئی۔ بہرحال مولنا عاشق الٰہی مرحوم کی روداد کے مطابق ہوا یہ کہ تھانہ بھون کے ان ہی قاضی عنایت علی کے ایک چھوٹے بھائی بھی تھے، جن کا نام عبدالرحیم تھا۔ لکھا ہے کہ ریاست کے

بست وکشاد نظم و انتظام کا تعلق تو قاضی عنایت علی بڑے بھائی کے سپرد تھا، اور قاضی عبدالرحیم چھوٹے بھائی، جن کو قاضی صاحب گویا بیٹے کی طرح مانتے تھے۔ صرف امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، اب بچھ میں نہیں آتا کہ ایسے زمانہ میں جب ملک میں عام بدامنی پھیلی ہوئی تھی، بقول مولوی عاشق الٰہی صاحب مرحوم

"باہم رعایا میں برسوں کی دبی ہوئی عداوت نکلنے اور منداہا سے کس کس زمانہ کے انتقام لینے کا وقت آگیا، جدھر دیکھو مار پیٹ، اور جس محل پر نظر کرو معرکہ آرائی و جنگ۔" صفحہ

اس علاقہ روہیلکھنڈ میں جب سرسید احمد خاں کے ساتھ یہ صورت پیش آئی کہ بجنور جہاں وہ حکومت کے ایک ذمہ دار افسر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اسی بجنور سے میرٹھ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ لیکن باہر قدم نکالنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی بہ مشکل بجنور سے ہلدور نامی مقام تک ڈپٹی رحمت خاں کی معیت میں پہنچ پائے۔ سادات کو ہلدور سے پیادہ پا میرٹھ کے ارادہ سے نکلے کہ موضع پلانہ کی سرحد پر بقول مولانا حالی

"دو ہزار گنوار مسلح ان کے لوٹنے اور مار ڈالنے کے ارادہ سے دوڑے"

سید صاحب کی زندگی باقی تھی، بخشی نامی ایک پٹھان نے جاں بخشی کرائی، پلانہ سے گرتے پڑتے چاندپور پہنچے، چاندپور میں بھی

"کئی ہزار آدمیوں نے بندوقوں اور ہتھیاروں سے ان کو گھیر لیا"

یہاں بھی چاندپور کے رئیس میر صادق علی خاں فرشتہ رحمت بن کر آڑے آگئے اور سید صاحب کی جان بچ گئی۔ چاندپور پھر اؤں ہوتے ہوئے بہزار خرابی افتاں و خیزاں جس وقت میرٹھ تک پہنچنے میں سید صاحب کامیاب ہوئے تو مولوی حالی صاحب نے لکھا ہے کہ

"ان کے (سید صاحب) کے پاس چھ پیسے اور اس پھٹے ہوئے کرتے کے سوا جو وہ پہنے ہوئے تھے اور کچھ نہ تھا" ص۱۲ حیات جاوید

الغرض حالات تو ایسے گذر رہے تھے۔ لیکن قاضی عبدالرحیم قاضی عنایت علی خاں کے چھوٹے بھائی کو خدا ہی جانتا ہے ہاتھیوں کے خریدنے کا سودا دماغ میں کیوں سمایا! سہارنپور ہی اس علاقہ کا مرکزی شہر تھا، وہیں اس شوق کی تکمیل کا امکان تھا، مولانا عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ ہاتھیوں کی خریداری کے شوق میں تھانہ بھون سے

"مع چند احباب کے سہارنپور گئے۔ اور سرائے میں کسی دوست کے پاس ٹھہرے"

یہاں تک تو قاعدہ عام رنگ میں رہا۔ اب آگے تقدیر تدبیر کے جس پیچیدہ رنگ میں پیش ہوئی اور شرارہ کوہ آتش فشاں بن گیا، اس کی تفصیل سنئے، بظاہر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سہارنپور کا یا تو غدر کے قصوں میں کوئی حصہ ہی نہ تھا، یا کچھ تھا بھی تو بات دب چکی تھی بنکسی صاحب نامی کوئی انگریز افسر بقول مولانا عاشق الٰہی

"باغیوں کی سرکوبی کے لئے حکم موت کا مجاز بنا کر انتظاماً ضلع سہارنپور میں متعین کیا گیا تھا۔" ص۳۱

اتفاق کی بات کہ ایک بنیا جس کا نام تو معلوم نہ ہو سکا لیکن مولوی عاشق الٰہی صاحب کے ان الفاظ سے کہ سہارنپور میں وہی بنیا

"کئی دن سے ٹھہرا ہوا تھا۔"

قیاس یہی چاہتا ہے کہ سہارنپور کا باشندہ نہ تھا، اب خواہ تھانہ بھون کا ہو، یا تھانہ بھون کے قریب کسی جگہ کا، تھانہ بھون کے قاضیوں کے اس خاندان سے وہ صرف واقف ہی نہ تھا بلکہ کسی وجہ سے وہ ان لوگوں سے کھنچا ہوا تھا، مولوی عاشق الٰہی نے جو یہ لکھا ہے کہ

"زمینداری کے قصوں میں آدمی کے دشمن بہتیرے ہو جاتے ہیں۔"

اسی نوعیت کے کسی قصہ میں وہ قاضیوں کے اس خاندان کا دشمن بن گیا تھا۔ ایسے فتنہ اور فساد کے زمانہ میں تھانہ چھوڑ کر قاضی عبدالرحیم کا سہارنپور آنا اور یہ شہرت کہ ہاتھی خریدنے کے لئے آئے ہیں بات ہی ایسی تھی کہ انتقام کا معتنم موقعہ بنئے کو محسوس ہوا کہ سامنے آگیا ہے۔ بس جیسے ہی بنکسی صاحب کی

کوٹھی پر پہنچ گیا اور یہ اڑتی ہوئی بات اس انگریز کے کان میں پھونک دی کہ قاضی عبدالرحیم تھانہ بھون سے،

"دہلی کمک بھیجنے کے لئے ہاتھی خریدنے سہارنپور آیا ہوا ہے۔"

بنئے کے ذریعہ یہی یہ خبر ٹنکی صاحب تک پہنچی، نیز مولوی عاشق الٰہی صاحب کے حاشیہ والے بیان میں یہ فقرہ جو پایا جاتا ہے کہ

"ادھر دشمنوں نے گلی کوچوں میں اس افواہ کو پھیلا دیا۔"

جس کا بظاہر مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کمک بھیجنے کے لئے قاضی عبدالرحیم تھانہ سے سہارنپور ہاتھی کی خریداری کے سلسلہ میں آئے ہیں، یہ افواہ شہر میں عام طور پر کسی نہ کسی طرح پھیل گئی یا پھیلا دی گئی تھی۔ نتیجہ ان ساری باتوں کا جو ہو سکتا تھا وہ ہوا، لکھا ہے کہ ٹنکی صاحب نے فوراً حکم دیا اور

"ایک گارد سرائے روانہ کیا گیا، اور عبدالرحیم خاں مع ہمراہیاں بالزام بغاوت جیل خانہ بھیجد یئے گئے۔" ص

کوئی شبہ نہیں کہ غلط ہو یا صحیح۔ لیکن واقعہ جس رنگ میں خود بنئے کے ذریعہ اور شہر کی افواہ کی راہ سے ٹنکی تک پہنچا تھا، اس کے لحاظ سے اس حد تک ٹنکی کی کارروائی شاید چنداں قابل اعتراض نہ ہو سکتی تھی، بقول مولوی عاشق الٰہی،

"زمانہ تھا اندیشہ ناک اور احتیاط کا۔" ص

یہاں تک ٹنکی نے جو کچھ کیا تھا، کہا جا سکتا تھا کہ اس وقت کے لحاظ سے احتیاط کا تقاضا بھی شاید یہی ہو سکتا تھا۔

لیکن بات اسی حد تک پہنچ کر ختم نہیں ہو گئی، انگریزوں کا دماغ بوکھلایا ہوا تھا، اور حد سے زیادہ اختیار بھی قدرۃً آدمی کو بدمست بنا دیتا ہے۔ ٹنکی نے جیل کے بعد بے صبری سے کام لیا اور نہ اصل واقعہ ہی کی تلاش، جستجو، تفتیش و تحقیق کی زحمت گوارا کی اور اگر یہ صحیح ہو جیسا کہ

مولنا عاشق الٰہی کے حاشیہ والے بیان میں ہے کہ بعد کو حکومت نے شیکی کے فیصلہ کو غلط ٹھہراتے ہوئے اقرار بھی کیا تھا کہ

"غلطی سے یہ حرکت سرزد ہو گئی" صلا

جانتے ہیں حکومت کی یہ اعترافی غلطی جس کا مرتکب حکومت کا نمائندہ شیکی صاحب ہوا کیا تھی؟ بصد بے کسی و بے بسی ایک آدمی نہیں بلکہ قاضی عبدالرحیم اور ان کے رفقاء جو تھانہ سے ان کے ساتھ آئے تھے، مولوی عاشق الٰہی کی اطلاع ہے کہ اس

"ناکردہ گناہ جماعت کو پھانسی کا حکم ہو گیا"

ایک ایسا مجہول الحال بنیا جس کا نام آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ کیا تھا، کہاں کا تھا، کس رتبہ کا آدمی تھا اس کی خبر اور بازاری افواہ کی بنیاد پر یہی سوچنے کی بات ہے کہ کسی فرد کو نہیں، بلکہ ایک پوری امن پسند آئینی زندگی بسر کرنے والی جماعت کو صرف قید و بندی کی سزا نہیں بلکہ سب کو کسی تحقیق و تلاش کے بغیر پھانسی پر چڑھا دینا اور اس کا کچھ خیال نہ کرنا کہ جن لوگوں کو پھانسی دی جا رہی ہے، ان میں علاقہ کا ایک صاحب اقتدار رئیس بھی ہے، شیکی صاحب کا یہ مجرمانہ اقدام، اور قطعاً ظالمانہ فیصلہ قطع نظر اس سے کہ کتنا غیر مآل اندیشانہ تھا، سوچنے کی بات یہ ہے کہ حکومت کے آئین اور دستور کی بے حرمتی اور رسوائی کی اس سے زیادہ بدترین شکل اور کیا ہو سکتی تھی، غدر کا لفظ جس کا انتساب اور اطلاق اس زمانہ کے ہندوستانیوں کے طرز عمل پر کیا جاتا ہے۔ خدا جانے بولنے والوں کی غرض کیا ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ وہی قانونی اصطلاح ہے، جو ہماری فقہ کی کتابوں میں مستعمل ہے تو مطلب اس کا جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں یہی ہو سکتا ہے کہ اس ملک کے باشندوں نے حکومت وقت سے یہ معاہدہ جو کیا تھا کہ اس کے نافذ کردہ آئین و دستور کی پابندی کریں گے، اس معاہدہ کو توڑ کر غدر یعنی قانون شکنی کے لوگ مرتکب ہوئے تھے۔

اگر غدر کا یہی مطلب ہے، تو میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں، کہ اور کہیں جو کچھ بھی ہوا ہو[1]، لیکن

[1] پچھلے چند ورقوں سے جیسا کہ شاید ذکر کر چکا ہوں ۵۷ء کے ہنگامہ کا ذکر ہندوستانیوں کی پہلی (باقی اگلے صفحہ پر)

ضلع سہارنپور میں غدر کے اس جرم کا مجرم انصاف سے بتایا جائے صحیح معنوں میں کون تھا؟ حکومت کے آئین کو کس نے توڑا۔ یقیناً بنکلی صاحب اس الزام کے ملزم ہیں، اور ان کی وجہ سے ہم غدر کے اس الزام کو اس حکومت پر بھی عائد کر سکتے ہیں جس کی نمائندگی سہارنپور میں بنکلی صاحب کرتے تھے۔

آئندہ حوادث و واقعات کے جلد جلد رونما ہونے میں بظاہر بنکلی صاحب اور بنکلی کی آمریت اور اس کی غدارانہ اور ظالمانہ چیرہ دستیوں کو بھی دخل تھا۔ اور قرآن کی سورۂ شوریٰ میں اہل ایمان کے امتیازی اوصاف کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہوئے یعنی

| | |
|---|---|
| وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ | اور وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب کا کہنا مانا اور نماز قائم کی اور ان کا کام باہمی مشورہ سے تھا اور جو ہمارے دیئے ہوئے میں سے خرچ کرتے تھے۔ |

آخر میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ

| | |
|---|---|
| وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ (پارہ ۲۵ سورۂ شوریٰ رکوع ۴) | اور جو ایسے ہیں کہ جب ان پر ظلم واقع ہوتا ہے، تو وہ برابر کا بدلہ لیتے ہیں۔ |

(گذشتہ صفحہ سے) جنگ آزادی وغیرہ کے عنوانوں سے لوگ کرنے لگے ہیں۔ غدر کے لفظ کا اطلاق اس واقعہ پر ان کے نزدیک درست نہیں ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ غدر کے لفظ کو باقی بھی رکھا جائے۔ جب بھی سوال یہ رہ جاتا ہے کہ غدر یعنی آئین شکنی کی ابتداء کس کی طرف سے ہوئی۔ باشندگان ہند کی طرف سے یا حکومت کی طرف سے؟ میرے لئے تفصیل کا موقع نہیں لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ کارتوسوں میں چربی لگائے اور دانت سے ان کو کٹوانے کا حکم حکومت کی طرف سے دیا گیا، اور غلط ہو یا صحیح لیکن جن کو حکم دیا گیا تھا۔ ان کے نزدیک یہ ان کے دین اور دھرم میں صراحۃً دخل اندازی تھی۔ احتجاج ان کا قانونی حق تھا۔ جس پر بجبر دستر باد اس کے قطعاً برخلاف گورنر جنرل نے احتجاج کرنے والے سپاہیوں میں سے بعضوں کو پھانسی اور بعضوں کو عبور دریائے شور کی سزا دے دی، بارک پور میں بھی یہی صورت پیش آئی۔ میرٹھ میں بھی جو کچھ کیا گیا مارشل لا کے اعتبار سے بھی وہ درست نہ تھا۔ اسی طرح سہارنپور میں قاضی عبدالرحیم اور ان کے رفقاء کا افواہ پر قتل بھی قطعاً قانون شکنی اور غدر تھا۔ پس اگر غور کیا جائے تو غدر کی صورت ضرور پیش آئی، لیکن ہندوستان کے باشندوں کے بجائے غدر یعنی معاہدہ کی خلاف ورزی اور آئین شکنی کی ابتداء جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے حکومت ہی کی طرف سے ہوئی۔ پس غدر کا کیوں انکار کیا جائے۔ انکار اس کا کرنا چاہئے کہ ہم ہندوستانیوں نے غدر نہیں کیا تھا۔ اس جرم کی مجرم خود حکومت تھی۔

اسی ایمانی اقتضا کی تکمیل و تعمیل کے لئے کیا گیا تھا، جو کچھ کیا گیا تھا۔

بہرحال اس سلسلہ میں اس نقطۂ نظر (انتصار) پیقدم اٹھانا بھی بہرحال واجبات شرعیہ میں سے ایک واجب تھا، جس کی پیروی سیدنا الامام الکبیر اور ان کے رفقاء و اکابر نے اس موقعہ پر کی۔

عہد و میثاق کے اقتضاؤں سے لاپروا قطعاً لاپروا ہو کر توڑنے والوں نے آئین و دستور کو جو توڑا تھا، اور خود حکومت کے اعتراف و اقرار کے مطابق جو مجرم نہ تھے۔ ان کے ساتھ چیرہ دستی اور زیادتی، یعنی دشمنوں کا برتاؤ جو کیا گیا تھا، اس کے مقابلہ میں "انتصار" اور داد خواہی کے لئے ایک دوسرے کی مدد کرنے کے لئے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے، یہاں کامیابی اور ناکامی کے لئے، فتح و شکست ہار اور جیت کے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ "انتصار" کے لئے یعنی کی اس حالت میں جو کھڑے ہوگئے وہ کامیاب تھے اور جس حد تک اس باب میں جتنا زیادہ پیچھے رہ گیا اسی حد تک سمجھنا چاہئے کہ وہ ناکام ہوا۔

(۳)

حکومت وقت اور اس کے نمائندے کے غدر اور عہد شکنی کے اس فعل کے بعد یعنی جو مجرم نہ تھے، صرف جرم کے شبہ میں قطعاً خلاف آئین و دستور جن کو مجرم ٹھہرا کر موت کی آخری سزا جو کسی انسان کو کسی انسان کی طرف سے مل سکتی ہے دے دی گئی، اس بغی کی انتصاری شکلیں جو سامنے آئیں، اب ان کی تفصیل سنئے، اس تفصیل میں دیکھنے کی چیز صرف یہی ہے کہ دینی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے میں ہر ہر قدم پر کن کن نزاکتوں اور دقیقہ سنجیوں سے کام لینے والوں نے کام لیا۔

واقعہ یہ ہے کہ ناکردہ گنہگاروں کے اس "خون ناحق" کی خبر سہارنپور سے جب تھانہ بھون پہنچی اور معلوم ہوا کہ قاضی عبدالرحیم انسان کے ایک ایک رفیق کو پھانسی دے دی گئی تو جن کے اعزاء و اقرباء مارے گئے تھے ان پر جو اثر چاہئے تھا وہ تو ہوا ہی۔ گویا سمجھنا چاہئے کہ سارے قصبہ ہی میں کہرام مچا ہوا تھا۔ لیکن قاضی عبدالرحیم کی بصد بے کسی، بخلاف توقع موت اور اچانک اس کی خبر جب قاضی عنایت علی بڑے بھائی، ریاست کے امیر کے کانوں میں پہنچی تو بقول مولانا عاشق الٰہی۔

"اس صدمہ سے قاضی عنایت علی پر رنج و غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے"

ریاست تو ریاست زندگی بھی بھائی کے پھانسی پا جانے کے بعد ان پر دو بھر ہو گئی اور جیسا کر کے بھی دکھا دیا۔ اب نہ ریاست ہی کا خیال ان کے دماغ میں تھا، نہ جان کی پروا اور نہ عزت و آبرو کا احساس ان میں باقی تھا۔ گویا جنون کی سی حالت ان پر طاری ہو گئی، مولانا عاشق الٰہی کا بیان ہے کہ

"جوش حزن میں بھائی کے انتقام کا خیال پختہ ہو گیا"

یہاں پہنچ کر مولانا عاشق الٰہی صاحب کا قلم خاص حالات کے لحاظ سے بہت زیادہ محتاط ہو گیا ہے۔ بیان ان کا اتنا مجمل ہو کر رہ گیا ہے، کہ واقعات کی کڑیوں کے ملانے میں کافی دشواری پیدا ہو گئی۔ تاہم جو کچھ انہوں نے لکھا ہے، اور دوسرے بیانات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے سب کو سامنے رکھنے کے بعد واقعہ کی صحیح ترتیب میرے نزدیک حسب ذیل ہو سکتی ہے۔

یہ عرض کر چکا ہوں کہ ۵۷ء کا ہنگامہ چند دنوں میں ختم نہیں ہو گیا تھا۔ بلکہ سال بھر کے تقریباً بارہ مہینوں تک کسی نہ کسی شکل میں اس کی آگ ملک کے مختلف گوشوں میں بلند ہوتی رہی، اور مرکزی مقامات دلی اور لکھنؤ میں تو کافی عرصہ تک مقابلہ و مقاتلہ کا بازار گرم رہا، صحیح طور پر اس کا پتہ نہ چل سکا کہ سہارنپور میں بے گناہوں کی پھانسی پانے کا واقعہ اس سال کے کس مہینہ میں پیش آیا۔ تاہم قرائن و قیاسات کا اقتضاء یہی ہے کہ آغاز غدر کے چند مہینوں کے بعد یہ صورت سہارنپور میں پیش آئی۔ خبر تھانہ بھون پہنچی۔ قاضی عنایت علی انتقام کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ یعنی ادھر جو ان کا معاملہ ان کے ساتھ پیش آیا تھا، انتصار اور داد طلبی کہئے، یا انتقام کے لئے تھانہ بھون اور تھانہ بھون کے اطراف و جوانب میں جو قصبات و قریے تھے۔ وہاں کے باشندوں کو بھی انہوں نے پکارا۔ نانوتہ بھی منجملہ دوسری بستیوں کے تھانہ بھون ہی کے نواح کی ایک اہم اور بڑی بستی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کے نمائندے وہاں بھی پہنچے۔

اور نانوتہ تو خیر تھانہ سے صرف چند میل کے فاصلہ پر تھا مولانا طیب صاحب نے اپنی

تھانہ بھون میں قاضی عنایت علی خاں کا محل جس کے صحن کے چوک میں جو سامنے ہے علم جہاد بلند کیا گیا تھا
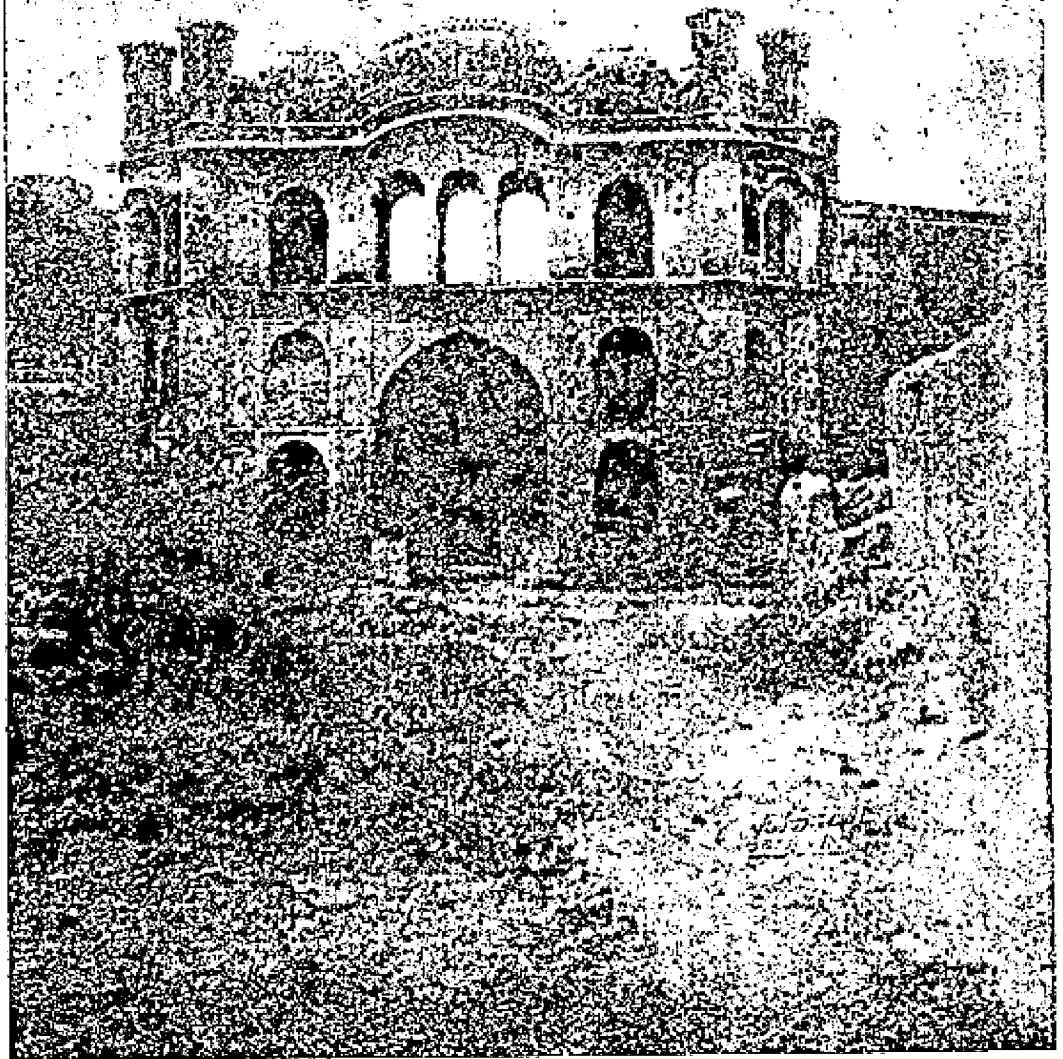
سیاسی یادداشت میں "تھانہ بھون" کی جس مجلس شوریٰ کا تذکرہ کیا ہے۔ ابھی اس کا حال بیان کیا جائے گا۔ ہم اس مجلس میں سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا گنگوہی کو بھی پاتے ہیں۔ اسی سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ انتقام کا ارادہ جب پختہ ہو گیا تو گنگوہ تک لوگ بھیجے گئے اور جن جن سے انتصار کی اس مہم میں صحیح راہ نمائی کی توقع ہو سکتی تھی ان کو تھانہ طلب کیا گیا۔ ان دنوں بزرگوں کے مرشد برحق حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا تو تھانہ وطن اور مستقر ہی تھا، ان کے سوا حضرت حافظ محمد ضامن شہید اور مولانا شیخ محمد تھانوی بھی تھانہ ہی میں موجود تھے۔

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاضی عبدالرحیم کے پھانسی پانے کے بعد تھانہ بھون کے ردِ عمل پر چونکہ حکومت کی نظر بھی تھی، احتیاط کا تقاضا بھی یہی تھا، اس لئے قاضی صاحب کی طرف سے جو انتصاری کہئے یا انتقامی کاروائیاں ہو رہی تھیں، ان کی خبریں گوئندوں کے ذریعہ حکومت تک پہنچتی رہتی تھیں۔ شاید اسی زمانہ کی یہ بات ہے جس کا ذکر مولانا عاشق الٰہی نے تذکرۃ الرشید کے حاشیہ پر کیا ہے، کہ قاضی عنایت علی کے پاس

"کمپنی کی طرف سے پیام پہنچایا گیا کہ تم فساد سے باز آجاؤ، اپنے بھائی کو صبر کرو غلطی سے یہ حرکت سرزد ہوئی ہے، اگر تم انتقام سے باز آ گئے، تو تم کو تھانہ کا نواب بنا دیا جائے گا۔" ص۷۵

مگر پیام کارگر ثابت نہ ہوا، جو بلائے گئے تھے۔ تھانہ بھون میں جمع ہو گئے۔

یہ بالکل ممکن تھا، کہ جمع ہونے کے بعد قاضی عنایت علی صاحب کی منشار کے مطابق جیسے ہر جگہ مار دھاڑ اکھاڑ پچھاڑ کی اندھا دھند کارروائیاں ہو رہی تھیں۔ تھانہ بھون میں اسی کو شروع کر دیا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا، بلکہ قرآن کی مندرجہ بالا آیت میں جہاں بغی کے بعد انتصار کو ایمانی زندگی کا امتیازی وصف قرار دیا گیا ہے۔ وہیں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ

| وامرھم شوریٰ بینھم | اور ان (مسلمانوں) کے معاملات باہمی مشورہ سے ہوتے ہیں۔ |
|---|---|

ایمانیوں کی شان ہے۔ مولانا طیب صاحب کی سیاسی یادداشت میں۔ ہے کہ تھانہ میں مجلس شوریٰ

قائم ہوئی،

"جس میں حضرت گنگوہی، اور دوسرے علماء شریک تھے"

یہ بھی ان ہی کا بیان ہے کہ اس مجلس میں

"باہم علمی گفتگو چھڑی"

سوال یہی تھا کہ واقعات جس رنگ میں پیش آ چکے تھے، یعنی اپنے قانون کو توڑ کر حکومت اور حکومت کا نمائندہ غدر اور قانون شکنی کا مرتکب ہو چکا تھا۔ اس بغی کے مقابلہ میں انتصار کے فرض کو محسوس کرتے ہوئے، جہاد وقتال پر آمادہ ہونے کا وقت کیا آ گیا ہے؟ مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے، کہ

"اس موقعہ پر جہاد کے سب خلاف تھے، صرف حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مدعیانہ طریقہ پر اس میں پیش پیش تھے"

تذکرۃ الرشید کے حاشیہ پر مولانا عاشق الٰہی نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

"سنا گیا ہے کہ قاضی عنایت علی کو ہمارے اکثر دینی حضرات نے اس کارروائی سے منع کیا۔ ص۷۵ ج۱"

اس سے بھی مولانا طیب صاحب ہی کے بیان کی تائید ہوتی ہے اور مطلب ان کا بھی یہی ہے کہ ابتداء میں اس قاہرہ حکومت کے خلاف بغیر مؤثر اسباب جہاد کیلئے کھڑے ہونے کو مجلس شوریٰ کے ارکان کی اکثریت نامناسب ہی قرار دیتی رہی۔ واللہ اعلم بالصواب مخالفت کرنے والوں کی طرف سے جو نقاط نظر پیش کئے گئے تھے، وہ کیا تھے۔ مولانا طیب صاحب نے اجمالاً بس اتنا لکھا ہے کہ،

"سب نے جو حجتیں خلاف میں پیش کیں، حضرت (نانوتوی) نے جوش کے ساتھ سب کا مسکت جواب دیا"

میرے سامنے نہ مخالفت کرنے والوں کی حجتیں ہیں اور ان حجتوں کا جو مسکت جواب دیا گیا تھا،

اس کے علم سے بھی محروم ہوں۔ بظاہر یہی خیال گذرتا ہے، کہ مخالفت کرنے والوں کے سامنے قوت
وضعف کا سوال ہوگا، مقابلہ میں ناکامی اور شکست کے سوا جیسا کہ ظاہر ہے اسباب کا اقتضا تھا،
کسی دوسرے احتمال کی شکل ہی سے گنجائش پیدا ہو سکتی تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ بغی کے بعد "انتصار"
کو مومن کی شان قرآن قرار دے چکا تھا۔ اس کا جواب خود ہی سوچئے کیا دیا جا سکتا تھا۔

بہر حال تھانہ بھون کی اس "مجلس شوریٰ" کے مکالمہ و مباحثہ میں جو کچھ بھی کیا گیا ہو لیکن آخری
نتیجہ سامنے یہی آیا، کہ جس بات کی دعوت دی گئی تھی، اس سے اعراض و قعود کی کوئی وجہ وجیہ ارکان کی
طرف سے پیش نہ ہو سکی۔ صرف مجلس کے ایک رکن حضرت مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی جو حضرت
شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے تھے، اور سیدنا الامام الکبیر سے عمر میں
بہت زیادہ بڑے تھے۔ مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں ہے، کہ انہوں نے آخری عذر یہ
پیش کیا، کہ

"اگر آپ کی حجتیں اور باتیں مان لی جائیں، تو سب سے بڑی شرط جہاد میں نصب امام کی ہے۔
امام کہاں ہے کہ اس کی قیادت میں جہاد کیا جائے"

سوال بالکل اسلامی روح کے عین مطابق تھا۔ جہاں تک واقعات سے پتہ چلتا ہے، ۱۸۵۷ء کے
ہنگامہ میں اسی روح کا خیال کم کیا جاتا تھا۔ "ہو" کے ساتھ لوگ اٹھ کھڑے ہوتے تھے، کثرت
جب تک وحدت کے نظام میں جکڑی نہیں جاتی۔ صحیح نتائج کی امید مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے
دین اور دنیا کے سارے اجتماعی کاروبار میں اسلام کو اس اصول پر جتنا اصرار ہے۔ اس کا اندازہ اسی
سے کیا جا سکتا ہے کہ نماز جو ظاہر ہے کہ بندے اور خدا کے دعائی و عبادتی تعلق کا مظہر ہے۔ لیکن
اس میں بھی کثرت کو وحدت کے قالب میں ڈھالنے کے لئے امام بنایا گیا ہے۔ سفر میں بھی چند
آدمی ساتھ ہوں تو حکم دیا گیا ہے کہ امامت اور امارت کا نظم اس میں بھی قائم کر دیا جائے۔

حدیثوں میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ غیروں کے مقابلہ میں چاہئے کہ مسلمان کید واحدہ (ایک
ہاتھ کی شکل میں) اپنے آپ کو پیش کریں، یا دیوار سے تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ہر مسلمان کی

حیثیت اس دیوار کی اینٹوں کی سی تھی جس میں ہر اینٹ دوسری اینٹ سے سہارا لے رہی ہو۔ بہر حال "جہاد" جیسے اہم اجتماعی اقدام کے لئے امارت و امامت کا مسئلہ بدیہی ہے۔ صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ مولانا شیخ محمد صاحب کی طرف سے یہ سوال جو اٹھایا گیا تھا، اس کا صحیح مقصد کیا تھا؟ جس لب و لہجہ میں ان کا بیان ہم تک پہنچا ہے۔ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ تھانوی غالباً یہ خیال کئے ہوئے تھے کہ تھانہ بھون جیسے مقام میں اس شرط کی تکمیل آسان نہ ہوگی۔ بظاہر قاضی عنایت علی قصبہ کے رئیس بھی تھے۔ اور سچ پوچھئے تو یہ سارا ہنگامہ ان ہی کے انتقامی جوش اور دعوت انتصار کی بنیاد پر برپا ہوا تھا، میں صحیح طور پر ان کے شخصی حالات سے واقف نہیں ہوں، لیکن مسلمانوں کو ہندوستان کی حکومت سے محروم کر دینے کا فیصلہ قدرت جس زمانہ میں کر چکی تھی، اس زمانہ کے عام حالات کی بنیاد پر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ

"قاضی عنایت علی خاں پسر نجابت علی خاں رئیس اعظم زمیندار تھانہ بھون ضلع مظفر نگر" ص۲۷

کے الفاظ میں مولانا عاشق الٰہی صاحب اس زمانہ کی جس ہستی کو روشناس کراتے ہوں، وہ رئیس اعظم و زمیندار ہی ہو کر رہ گئے تھے، یا قاضی ہونے کے لئے جن صفات اور خصوصیات کی ضرورت ہے، ان کی بھی نمائندگی کرتے تھے۔ عام حالت تو اس زمانہ کی یہی تھی، کہ خاندان کی کسی پشت میں قاضی کا عہدہ جس کو بھی کبھی میسر آگیا تھا، وہ خاندان قاضیوں کا خاندان بن جاتا تھا، گویا سید و شیخ پٹھان وغیرہ جیسے خانوادوں کے ساتھ ساتھ اس ملک میں قاضیوں کی بھی ایک نسل ہی پیدا ہو گئی تھی، اور سید شیخ کے الفاظ کے ساتھ مسلمانوں کی اس نسل کے افراد اپنے نام کے آگے قاضی کے لفظ کے استعمال کو اپنا خاندانی حق تصور کرتے تھے۔ خواہ قضا و افتاء سے ان کو دور کا بھی تعلق نہ ہو، اب چاہے دل چسپ لطیفہ ہو یا دل گداز سانحہ جو چاہے سمجھئے۔ مگر واقعہ کی صورت یہی ہو گئی تھی۔ کہ یا جج یا ڈپٹی وغیرہ کی ملازمت حاصل کرنے کے بعد اس زمانہ میں، ججوں یا ڈپٹیوں کی نسل جیسی پیدا ہو جائے کچھ اسی قسم کے مغالطہ کی شکل تھی۔ سرکاری عہدوں، اور مناصب کے پشتینی ہو جانے کی مصیبت جس کا شکار مغل حکومت اپنے ایام سکرات میں ہو گئی تھی۔ شاید اس قسم کی بعض نسلوں کے

پیدا کرنے میں اسی قطعاً غیر شرعی بلکہ غیر انسانی رواج کو زیادہ دخل تھا۔
کچھ بھی ہو، قیاس کا اقتضا یہی ہے کہ قاضی عنایت علی صاحب بن شیخ تھانوی پا رہے ہوں گے کہ امامت کی شرعی شروط نہیں پائی جاتیں۔ امام یا امیر ہو سکتے تھے تو وہی ہو سکتے تھے۔ خیال یہی ہوگا کہ شرط کے مفقود ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مشروط یعنی جہاد کی فرضیت کا مطالبہ بھی مفقود ہو جائیگا۔ مجلس شوریٰ کی اکثریت کی جو رائے تھی وہی پاس ہو جائے گی، لیکن اچانک دیکھا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر جواب میں فرما رہے ہیں کہ

"نصب امام میں کیا دیر لگتی ہے"

گویا ایسا معلوم ہوا کہ سیدنا الامام الکبیر کے نزدیک یہ مسئلہ سوچ بچار کا بھی مستحق نہ تھا، شاید لوگ سوچ ہی رہے ہوں گے کہ حضرت والا آخر کیا کہنا چاہتے ہیں اور اتنا دشوار مسئلہ اچانک اتنا سہل و آسان کیسے بن جائے گا کون جانتا تھا کہ جس کے متعلق تصور بھی کسی کا کیا نہ ہوگا کہ جہاد کی امارت قیادت کی باگ اپنے ہاتھ میں لیں گے، اسی کی طرف ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے سنا جا رہا تھا کہ سیدنا الامام الکبیر فرما رہے ہیں، (مولنا طیب کی روایت کے الفاظ ہیں)

"حضرت مرشد برحق حاجی صاحب موجود ہیں، ان ہی کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی جائے"

مسجد میر محمد صاحب کے حجرے میں رہنے والے ایک فقیر بے نوا سیدنا و سید الکل حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات مراد تھی۔ اس کے سوا کہ مجلس پر اس تجویز کے پیش کرنے کے ساتھ ہی سناٹا چھا جائے اور دوسری صورت ہی کیا تھی، کس کی مجال تھی کہ امامت کی تمام شرطوں کو پورا کرنے والی شخصیت کاملہ پر قدح کی ہمت کرتا، کلام اور فقہ کی کتابوں میں امام کے لئے جو شرطیں ضروری قرار دی گئی ہیں، وہی نہیں بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ مستحبات اور اولیٰ ہونے کی حیثیت جن امور کو حاصل ہے۔ حاجی صاحب کا وجود باجود سب ہی کا جامع تھا۔ مولنا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ اسی لئے

"سب ساکت ہو گئے اور متفقہ طور پر سب نے حاجی صاحب کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی۔"

مولانا عاشق الٰہی مرحوم نے بھی تذکرۃ الرشید میں اسی واقعہ کا ذکر کرنا چاہا ہے، لیکن جس زمانہ میں اپنی کتاب وہ لکھ رہے تھے، ظاہر ہے کہ اتنے کھلے الفاظ میں واقعہ کا تذکرہ نہ کر سکتے تھے، اور نہ ایسا کرنا مناسب تھا، انھوں نے لکھا ہے کہ "لوگ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ کسی حاکم کی سرپرستی کے بغیر گذران دشوار ہے، اور یہ معروضہ پیش کیا کہ

"آپ چونکہ ہمارے دینی سردار ہیں، اس لئے دنیاوی نظم حکومت کا بار بھی اپنے سر رکھیں اور امیر المؤمنین بن کر ہمارے باہمی قضئے چکا دیا کریں۔" ص۲۷۲

یہی مقام ہے، جہاں مولانا عاشق الٰہی کے پیرایۂ بیان میں توریہ کا رنگ پایا جاتا ہے، کہنا وہ بھی یہی چاہتے ہیں کہ حاجی صاحب کے دست مبارک پر جہاد کی بیعت کرنے کا ارادہ لوگوں نے پیش کیا، اور اطلاع دیتے ہیں، کہ

"اعلیٰ حضرت کو ان کی درخواست کے موافق ان کے سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا۔" ص۲۷۲

مطلب وہی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے حاجی صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی تجویز پیش کی لوگ راضی ہو گئے، اور حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس تجویز کو قبول کر لیا، یوں وہ اس علاقہ کے مسلمانوں کے "امیر المؤمنین" اور دینی امام ہونے کے ساتھ "سیاسی امام" بھی بن گئے، گویا کثرت منتشرہ کو شرعی حکم کے تحت پہلے وحدت کا قالب امام و امیر کا انتخاب کر کے کیا گیا، اب سارے پراگندہ افراد ایک شیرازے میں منسلک ہو گئے، اور قصہ صرف اسی سرسری تنظیم کی حد تک ختم نہیں کر دیا گیا، بلکہ مولانا طیب صاحب نے مولانا منصور انصاری کے حوالے سے سیدنا الامام الکبیر کے رفیق مولانا منیر صاحب کی زبانی جو روداد سنائی ہے، اس سے مزید تفصیلات کا بھی پتہ چلتا ہے۔

گویا اجتماعی حیثیت جو ایک وحدانی جسد کے پیکر میں تشکل پذیر ہو چکی تھی، چاہا گیا کہ اس کے

رئیس و مرؤ سے اعضا کو متعین کرکے ہر ہر عضو کا خاص خاص وظیفہ بھی مقرر کر دیا جائے ' سچ تو یہ ہے کہ کسی تنظیم کو مکمل کرنے کے لئے جو کچھ بھی اس وقت کرنا چاہئے تھا ' سب کچھ کرلیا گیا تھا۔ مولنا طیب صاحب کا بیان ہے کہ

"حضرت اقدس مولنا حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ مرکز بیعت جہاد تھے اور حضرت اقدس مولنا حافظ محمد ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ سب سے بڑے علم بردار جہاد تھے ' حضرت مولنا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ جامع مجاہدین تھے کہ وعظ و پند ترغیب و ترہیب سے مجاہدین کو مختلف مواقع دیہات و قصبات سے جمع کر کرکے میدان میں لائیں ' حضرت نانوتوی قدس سرہ امیر عسکر تھے "

مولنا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ کابل میں مولنا منصور انصاری مولنا محمد منیر صاحب کی اس روایت کو نقل کرتے ہوئے ' اسلامی ممالک خصوصاً کابل کی عصری اصطلاحوں میں تنظیم کے ان ہی پہلوؤں کی تعبیر ان الفاظ میں کرتے تھے ۔ یعنی حاجی صاحب قبلہ کی حیثیت تو خیر امیر المومنین کی تھی ' ان کے سوا :

"حضرت حافظ ضامن شہید ' امیر جہاد گویا صدر مجلس جنگ تھے ' مولنا محمد قاسم صاحب امیر الافواج چیف کمانڈر مولنا محمد منیر صاحب مولنا نانوتوی کے یاور حربی ' فوجی سکریٹری حضرت مولنا گنگوہی وزیر لام بندی تھے "

الغرض تھانہ بھون میں جہاد کی اس انتصاری مہم کے لئے شرعی تنظیم کے مطابق جو کچھ بھی کرنا چاہئے تھا ' وہ سب کچھ جب کرلیا گیا ' اور گو قاضی عنایت علی صاحب کو کوئی خاص عہدہ تنظیم کی اس اجتماعی ہیئت میں نہیں دیا گیا ' لیکن ظاہر ہے کہ علاقے کے وہ رئیس تھے ' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مالی امداد کا بار زیادہ تر ان ہی پر ڈالا گیا ہوگا ' اور جب اپنا سب کچھ اس راہ میں قربان کرنے کیلئے وہ تیار ہو چکے تھے ' تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اس ذمہ داری کو بخوشی وہ قبول نہ کرتے ' مجاہدوں کے طعام و قیام آلات حرب کی فراہمی ' اور از ین قبیل دوسرے جہادی مصارف کے متکفل جہاں تک میں سمجھتا ہوں '

تھانہ بھون کی اس مہم میں قاضی عنایت علی ہی کو ہونا چاہئے تھا، اگرچہ اس باب میں کوئی صریح شہادت مجھے نہیں مل سکی ہے۔

خیر جہاد کی شرعی تنظیم کا مسئلہ تو طے ہوگیا لیکن شرکت جہاد کے بعض ذیلی شرائط کی تکمیل کا مرحلہ باقی تھا، مطلب یہ ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ والدین یا ان میں کوئی ایک اگر زندہ ہو تو ان سے جنگ میں شریک ہونے کی اجازت بھی شرعاً ضروری ہے۔ ففیھما فجاھد (ان دونوں یعنی والدین کی خدمت گذاری میں جہاد کرو) خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صاحب کو حکم دیا تھا، جن کے والدین زندہ تھے، اور جہاد میں شریک ہونے کی آرزو دربار نبوت میں پیش کی تھی۔

اس باب میں نہ اوروں کا حال ہی مجھے معلوم ہے، اور نہ اس کتاب میں ان کے متعلق ذکر کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ اس شرعی شرط کی تکمیل میں جو صورت پیش آئی، مختلف یادداشتوں میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شرعی تنظیم کے بعد جب طے ہوگیا کہ رزم کا بازار گرم ہو کر رہے گا اور ظلم کرنے والوں سے بدلہ بہرحال لیا جائے گا، تو سیدنا الامام الکبیر جن کے والدین اس زمانہ تک زندہ تھے، آپ کے دل میں یہ دینی تقاضا پیدا ہوا کہ والدین سے اجازت کے مرحلہ کو بھی طے کر لیا جائے اسی تقاضے کے زیر اثر تھانہ سے آپ نانوتہ تشریف فرما ہوئے۔ مولوی طاہر صاحب سلمہ نے اپنی یادداشت میں اپنے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد مرحوم کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ،

"۷۵ھ میں جب اس پر اتفاق ہوگیا کہ اس وقت جہاد فرض ہے، تو حضرت اپنے مکان (نانوتہ) تشریف لے گئے، چونکہ اپنی والدہ کے بہت ہی مطیع اور فرماں بردار تھے، روزانہ دونوں وقت پاؤں دبانا ان کا معمول تھا"

اس معمول کے مطابق ابھی بھی جیسا کہ آگے بیان کیا گیا ہے،

"اپنی والدہ ماجدہ کے پاؤں دباتے ہوئے (ماں کو مخاطب کر کے) فرمانے لگے کہ خدا کی

راہ میں جان اور مال کو فدا کر دینا ایسا ہے، اور جو خوشی سے اپنی جان خدا کے حوالہ کر دیتا ہے، اس کا ایسا درجہ ہے وغیرہ۔"

مطلب یہ ہے کہ اظہار مدعا سے پہلے جہاد اور راہ حق کی جان فروشیوں، قربانیوں کے متعلق قرآن و حدیث میں جو فضائل بیان کئے گئے ہیں، پہلے اپنی اماں جان رحمۃ اللہ علیہا کو سمجھاتے رہے، روایت میں اس کے بعد ہے کہ

"اس قسم کی پر اثر تمہید بیان کر کے عرض کیا کہ جہاد فرض ہو چکا ہے۔"

اس سے مطلع کرنے کے بعد اپنے عزم راسخ کا اظہار والدہ ماجدہ کی خدمت میں بایں الفاظ فرمانے لگے کہ دین کا

"یہ مسئلہ ہے کہ اطاعت خالق میں والدین کی اطاعت اگر معارض ہو تو وہ ساقط ہو جاتی ہے۔"

مقصد مبارک یہی تھا کہ والدین کو میری ذاتی خدمات کی ضرورت نہیں، نہ ذاتی خدمات کی حاجت تھی، نہ مالی امداد کی، ایسی صورت میں خدائی مطالبہ کی تعمیل میں بلا وجہ رکاوٹ اگر والدین کی طرف سے بھی ڈالی جائے گی تو شرعاً اس قسم کی بے بنیاد رکاوٹ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ والدہ ماجدہ سے یہ بھی فرمایا کہ

"میں چاہتا ہوں کہ آپ خوشی سے مجھے اس کی اجازت دے دیں، تاکہ آپ کو بھی اجر ملے۔"

حافظ محمد احمد صاحب نے ان الفاظ کے بعد روایت کو جس پیرایہ میں ادا کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آگے کی تفصیل براہ راست اپنے والد ماجد سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ سے سنی ہوئی تھی، حافظ صاحب مرحوم کا بیان ہے،

"چنانچہ خود (سیدنا الامام الکبیر) فرمایا کرتے تھے کہ میری والدہ بڑی سمجھدار تھیں، فرمانے لگیں کہ بھائی تم اللہ ہی کی چیز ہو، میں خوشی سے تمہیں اللہ کے سپرد کرتی ہوں۔"

اللہ اکبر اسی کے ساتھ ایمان و یقین کے گھرانے کی اس پردہ نشین خاتون نے اپنے اکلوتے جوان

بیٹے کو خطاب کرکے یہی فرمایا کہ

"اگر تم زندہ آ گئے تو میں تم سے مل لوں گی' نہیں تو آخرت میں انشاء اللہ تعالیٰ جلد ہی ملنا ہوگا۔"

عرض کر چکا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر کی والدہ بی بی حبیبہ رحمۃ اللہ علیہا کو کتابی تعلیم کے حاصل کرنے کا موقعہ نہ ملا تھا' جو کچھ بھی علم و معرفت کی روشنی ان کے اندر تھی' اپنے بزرگوں اور ماحول کی پیداوار تھی۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں' سکینت کی اس خنکی اور طمانیت کی اس ٹھنڈک کو کہ مشاہدہ والی زندگی' اور مرنے کے بعد آنے والی ایمانی زندگی' دونوں کی حیثیت میں بال برابر فرق ان کے احساس میں نہیں پایا جاتا' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان نیک دل مومنہ خاتون کی نظر میں شہادت و غیب دونوں ایک ہیں' سب سے زیادہ حیرت تو مجھے اس فقرے کے لفظ "جلد ہی" پر ہے' جس کی یافت بآسانی بڑے بڑے صاحب علم و بصیرت کیلئے بھی دشوار ہے۔ عام خیال قیامت اور آخرت کے متعلق "تاخیر اور درنگی ہی کا ہے۔ کون جانے کہ کروڑوں برس بعد آخرت کا میدان سامنے آئے گا' یا لاکھوں برس بعد۔ لیکن یہ تاخیر اور درنگی صرف ان ہی لوگوں کے لئے ہے' جنہوں نے اب تک سمجھا ہی نہیں ہے کہ تاخیر اور درنگی کا موصوف یعنی خود زمانہ کی اصل حقیقت کیا ہے[1]۔ لیکن

[1] جنہوں نے قدیم یا جدید فلسفہ کا مطالعہ نہیں کیا ہے' ممکن ہے ان کے لئے یہ کچھ عجیب سی بات معلوم ہو' لیکن تھوڑی بہت بھی نظر فلسفہ میں جو رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ زمانہ جو عوام کے نزدیک سب سے زیادہ کھلی ہوئی چیز ہے' لیکن کہتے ہیں کہ ارسطو کے سامنے زمانہ کا مسئلہ جب آیا تو سوچ بچار کے بعد اس کو اعلان کرنا پڑا کہ اس سے زیادہ غریق فی التعریف کوئی حقیقت مجھے معلوم نہیں ہوتی۔ یعنی جتنا زیادہ سوچئے اسی قدر وہ چیستاں بنتی چلی جاتی ہے۔ زمانہ یعنی سال وماہ اور گھنٹے منٹ دقیقے پر جسے ہم تقسیم کرتے ہیں' ذرا سوچئے تو یہی کہ حواس میں سے کسی حاسہ کا اس سے تعلق ہے' میں پوچھتا ہوں کہ جمعہ یا جمعرات کے دن کی خود نوعیت کیا ہے؟ کیا وہ کوئی رنگین لال پیلی چیز ہے جسے ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ کیا چھو کر چکھ کر سونگھ کر سن کر ہم نے ان کو جانا ہے۔ ظاہر ہے کہ نہیں کے سوا اس کا جواب اور کیا ہو سکتا ہے' پھر زمانہ کے جاننے کا دعویٰ آخر کس بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی زمانہ کو ہم اپنی مذہبی معلومات میں شمار کرتے ہیں اصل یہ ہے کہ زمانہ کی حقیقت جب تک واضح نہ ہو' دیر اور سویر یا تاخیر و تعجیل کے متعلق ہمارے احساس کی بنیاد صحیح واقعہ پر قائم نہ ہو گی تفصیل کیلئے معلومات کا مطالعہ کرنا چاہئے ممکن ہو سیدنا الامام الکبیر کے نظریات کے سلسلے میں کتاب کے دوسرے حصہ تک یہ بحث

سمجھے سمجھائے بغیر ان کے قلب مؤمن کا فیصلہ تھا کہ آخرت والی یہ گھڑی جلد ہی آنے والی ہے۔
بہر حال جلد ہی کے اس لفظ کو ان جیسی مومنہ خاتون کی زبان کا شعوری لفظ سمجھئے یا غیر شعوری، لیکن اپنے
اکلوتے لختِ جگر کو بغیر کسی جزع فزع کے خندہ جبینی کے ساتھ رخصت کر دینا، یقیناً کوئی معمولی واقعہ
نہیں ہے۔ بالمیک شاعر رامائن کا تخیل خدا جانے اسکو کس چیز میں ادا کرتا۔[1]
سیدنا الامام الکبیر کے لئے ماں ہی کا مرحلہ سب سے بڑا مرحلہ تھا۔ لیکن آسان کرنے والے
نے اس کو آسان بنا دیا۔ ان کے بعد دوسری منزل پدر مہربان شیخ اسد علی صاحب مرحوم کی اجازت
کی تھی، مولوی طاہر صاحب کی یادداشت میں ہے

"اس کے بعد (یعنی والدہ ماجدہ کی رضامندی حاصل کر لینے کے بعد) حضرت (نانوتوی)
اپنے والد کے پاس تشریف لے گئے"

آپ کے والد ماجد شیخ اسد علی صاحب جیسا کہ مولوی طاہر صاحب نے لکھا ہے کہ

"نانوتہ میں ہمارا جو جدی مکان ہے، اس میں ایک چبوترہ بھی تھا اور حضرت مرحوم (نانوتوی) کے
والد مغفور چبوترے پر کھڑے تھے"

غالباً اس وقت تک سیدنا الامام الکبیر کے عزم اور ارادہ کی خبر شیخ اسد علی صاحب کو نہ تھی، جہاں وہ کھڑے
تھے، وہیں پہنچکر بیان کیا گیا ہے کہ

"نہایت عاجزی، اور نرمی کے ساتھ اپنے والد سے اس عزم کو ظاہر کیا"

شیخ اسد علی صاحب آپ کے والد ماجد جس رنگ کے آدمی تھے، اس پر تفصیلی بحث کر چکا ہوں،
مولوی طاہر صاحب نے اس موقعہ پر لکھا ہے کہ

"ہمارے پردادا (شیخ اسد علی صاحب) چونکہ پڑھے لکھے زیادہ نہ تھے، اس لئے

---

[1] ہمارے وطن ہندوستان کی مقامی روایات کا مجموعہ جو رامائن کے نام سے مشہور ہے۔ بالمیک اسی کتاب کے مصنف کا نام ہے، رام چندر جی روایت کے ہیرو اپنی ماں کوشلیا سے بن باس ہونے کے لئے جس وقت اجازت طلب ہوئے ہیں، اور ماں سے بیٹا جس وقت رخصت ہونے لگا ہے۔ شاعر نے اس واقعہ کو جن ناک تعبیروں میں ادا کیا ہے۔ ان کی طرف میرا اشارہ ہے ۱۲

انہوں نے الھڑتا ہوا جواب اس طرح دیا کہ حضرت کی والدہ سے کہا کہ ذرا میری پگڑی لے آؤ، وہ لے آئیں، اسے باندھا۔"

جہادی مہم میں اجازت طلبی کی درخواست کے جواب میں شیخ صاحب کا یہ طرز عمل یعنی پگڑی کا منگوانا اور اس کو باندھنا، ظاہر ہے کہ کچھ عجیب سی بات تھی، لکھا ہے کہ بجائے ہاں انہیں کے شیخ صاحب کے اس طرز کو دیکھ کر سیدنا الامام الکبیر نے فرمایا

"بادا جی! یہ کیوں باندھ رہے ہیں"

تب اپنے دل کی کیفیت کا اظہار شیخ صاحب نے ان الفاظ میں کیا کہ

"تیرے ساتھ سر کٹانے آخر جاؤں گا بھی"

مولوی طاہر صاحب کی روایت میں ہے کہ اپنے والد ماجد کی زبان سے یہ سن کر سیدنا الامام الکبیر نے والد کو مخاطب کرتے ہوئے،

"کسی قدر آواز سے یہ فرمایا کہ آپ میری وجہ سے کیوں سر کٹاتے ہیں۔ اگر آپ کو سر کٹانا ہے تو اللہ کے لئے کٹائیے اور میرے ساتھ چلئے"

مولوی طاہر صاحب کی یادداشت میں روایت سوال و جواب کے ان ہی الفاظ پر مشتمل ہے، اسی کے ساتھ مولنا طیب صاحب کی یادداشت کی اطلاع کو بھی جب ہم پیش نظر رکھ لیتے ہیں، یعنی انہوں نے والد کی اجازت طلبی کے مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"حاضری جہاد کی اجازت دینے میں کسی حد تک حضرت کے والد ماجد نے پس و پیش کیا تھا" (مقالہ۔ حضرت نانوتوی کا جوش جہاد)

اس سے ہم اسی نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ پگڑی طلب کر کے باندھنے اور اپنے سر کٹانے کا ذکر شیخ اسد علی صاحب نے جو فرمایا تھا، غالباً لب و لہجہ میں ان کے طنز کی آمیزش تھی۔ یا ایک خیال یہ بھی ہے کہ حکومت قائمہ مسلطہ افرنجیہ کی دار و گیر کے اندیشہ کو شیخ صاحب نے اس طریقے سے ظاہر کیا۔ گویا بیٹے کو سمجھانے لگے کہ تیری وجہ سے میں پھانسی کے تختے پر چڑھایا جاؤں گا۔ قبل

اس کے کہ حکومت مجھے پکڑے، پگڑی باندھ کر خود پھانسی پر چڑھنے اور گردن کٹانے پر طنزیہ لہجہ میں اپنی آمادگی وہ ظاہر کر رہے تھے۔ مطلب یہی تھا کہ جس چیز کی اجازت ان سے چاہی جا رہی تھی۔ اس سے وہ راضی نہ تھے۔ سیدنا الامام الکبیر کا یہ فرمانا کہ میرے لئے سر کیوں کٹاتے ہیں۔ اللہ کیلئے کٹائیے، اور میرے ساتھ چلئے" اس سے کچھ یہی بات سمجھ میں آتی ہے۔

بہرحال حاصل یہی ہے۔ جیسا کہ مولوی طیب صاحب نے لکھا ہے کہ اجازت دینے میں آپ کے والد صاحب نے پس و پیش سے کام لیا اور بقول ان ہی کے اس وقت

حضرت نے لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق (یعنی خدا کی نافرمانی کا جہاں اندیشہ ہو، وہاں مخلوق کی فرماں برداری کا قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ شریعت کے اس عام دستور) پر عمل فرمایا۔" ص۲ مقالہ مذکور

اس اجمال کی تفصیل مولوی طاہر صاحب کی یادداشت میں یہ ہے کہ والد سے مذکورہ بالا گفتگو فرمانے کے بعد سیدنا الامام الکبیر ان ہی سے یہ کہتے ہوئے کہ

"بندہ رخصت ہوتا ہے۔"

"السلام علیکم" کے ساتھ اپنے والد ماجد کے سامنے سے رخصت ہو گئے، جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ والد ماجد سے اجازت طلبی اور رضا مندی میں آپ کامیاب نہ ہو سکے لیکن مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں جو یہ اطلاع دی گئی ہے کہ

"مگر پھر والد بھی راضی ہو گئے۔"

اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ شیخ اسد علی نے شروع میں اپنے جس خیال یا احساس کا اظہار کیا، شاید وہ فوری جذبات کا نتیجہ تھا۔ لیکن ٹھنڈے دل سے جب تمام پہلوؤں پر غور و فکر کرنے کا موقعہ ان کو ملا، خصوصاً بیوی سے ملنے کے بعد جب ان کو معلوم ہوا ہو گا کہ باوجود عورت ہونے کے جب خوشی سے بیٹے کو اللہ کی راہ میں سرفروشی کی اجازت دے چکی ہیں، تو مرد ہونے کا اقتضا جو کچھ ہونا چاہئے تھا، اس سے ان کا متاثر ہونا بعید نہیں ہے۔ اسی لئے مولوی طاہر صاحب نے واقعہ کی

توجیہ کرتے ہوئے جو یہ لکھا ہے کہ "میرے پردادا صاحب زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے" گویا اجازت دینے میں پس و پیش کرنے کی وجہ مولوی طاہر صاحب کے نزدیک کم علمی تھی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ شیخ صاحب کی تعلیمی و عملی زندگی کا ذکر کر چکا ہوں۔ کم از کم اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ اپنی اہلیہ محترمہ سیدنا الامام الکبیر کی والدہ ماجدہ کے مقابلہ میں ان کی تعلیمی سطح بلند اور بہت زیادہ بلند تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کی توفیق کا تعلق بجائے علم کے ایمان سے ہے' اور اس موقعہ پر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ عورت کا ایمان مرد سے زیادہ وزنی ثابت ہوا' اور یہ خدائی دین ہے' یؤتیہ من یشآء

خیر جس طرح بھی ہو' آگے پیچھے والدین کی رضامندی کا قصہ ختم ہوا' اور سیدنا الامام الکبیر نانوتہ کی اپنے "جہادی مرکز" مستقر تھانہ بھون پہنچ گئے۔

اس کے بعد واقعات جس رنگ میں پیش آئے' ان کی کوئی تفصیلی روداد میرے پاس نہیں ہے۔ تاہم جستہ جستہ مختلف وثائق میں جو چیزیں ملی ہیں' ان کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کر دیتا ہوں۔

## تھانہ بھون کے مستقر سے پہلا حملہ باغ شیر علی کی سڑک پر

اس واقعہ کا ذکر مولانا عاشق الٰہی صاحب نے تذکرۃ الرشید کے حاشیہ میں کیا ہے واقعہ کی ابتدا مولوی صاحب کے بیان کے مطابق یوں ہوئی کہ انگریزی فوج کے

> "چند فوجی سوار کہاروں کے کندھوں پر کارتوسوں کی کئی بہنگیاں لدوائے سہارنپور سے کیرانہ کی طرف جا رہے تھے" ص۲۵۳

یہ وہی زمانہ ہے کہ جہاد کا مسئلہ تھانہ بھون میں تمام منزلوں سے گذر کر فیصلہ کی آخری صورت اختیار کر چکا تھا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ انگریزی فوج کے سوار جنگی ذخیرے یعنی کارتوسوں کو لئے ہوئے سہارنپور سے کیرانہ جا رہے تھے۔

یہ ایک ایسا واقعہ تھا کہ جس کی طرف مجاہدوں کی توجہ کا منعطف ہو جانا ایک قدرتی بات تھی' اور

کون کہہ سکتا ہے کہ قریش کے تجارتی قافلہ پر جو درحقیقت جنگی سرمایہ کے ساتھ شام سے واپس ہو رہا تھا، اس قافلہ کو روک لینے کا ارادہ تیرہ سو سال پیشتر جو کیا گیا تھا، اسلامی تاریخ کے مرقع کی اسی تصویر کی جھلک تھانہ بھون کے مجاہدین کے سامنے نہ آگئی ہوگی؟ کچھ بھی ہوا موقعہ کو مغتنم خیال کر کے قاضی عنایت علی (رئیس تھانہ بھون) کی سرکردگی میں ایک سریہ روانہ کر دیا گیا۔ مولوی عاشق الٰہی صاحب مرحوم کا بیان ہے کہ قاضی صاحب

"اپنے چند رفقا اور رعایا کو ساتھ لیکر شیر علی کے باغ کی سمت کی سڑک پر جا پڑے اور جس وقت سوار سامنے سے گذرے ان کا اسباب لوٹ لیا"

صرف اسباب ہی نہیں بلکہ آگے وہی جو یہ لکھتے ہیں کہ

"ایک سوار اسی جنگ میں زخمی ہو کر سمت مشرق جنگل کو بھاگا، مگر تھوڑے فاصلہ پر گھوڑے سے گر کر مرگیا" ج۱ ص۲۹ برحاشیہ تذکرہ۔

اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسباب کے ساتھ اسباب والے اور اسباب کے سارے محافظ بھی کام آئے، صرف ایک سوار بھاگنے میں کامیاب ہو سکا لیکن وہ بھی بالآخر گھوڑے سے گر کر لقمۂ اجل ہوا۔

تھانہ بھون کے مجاہدوں کی یہ پہلی حربی کامیابی تھی۔ افسوس ہے کہ مولوی صاحب نے قاضی عنایت علی کے "رفقاء" کے ناموں کی نشاندہی نہیں کی۔ اسی لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ سیدنا الامام الکبیر بھی اس پہلی چھڑپ میں بنفس نفیس شریک تھے یا نہ تھے۔ رجحان تو قلب کا اسی طرف ہے کہ اس "مقدس جنگ" کی بسم اللہ کی شرکت کی سعادت سے حق تعالیٰ نے ان کو محروم نہ رکھا ہوگا۔

## جنگ شاملی

مولوی عاشق الٰہی صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ باغ شیر علی کی سڑک کی یہی مہم اس مشہور واقعہ کی تمہید بن گئی، جس نے "جہاد تھانہ بھون" کے سلسلہ میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ یہ لکھتے ہوئے کہ

"اس فساد (یعنی باغ شیر علی کی سڑک والے فساد) کی خبر مظفر نگر (مستقر ضلع) پہنچی تو

حاکم ضلع کی طرف سے تھانہ پر فوج کشی کا حکم ہو گیا"

مولانا عاشق الٰہی نے یہ اطلاع دی ہے، کہ حکومت کے اس ارادے سے یعنی تھانہ بھون پر فوج کشی کا فیصلہ ہو گیا ہے، اس کی خبر جب تھانہ بھون پہنچی اور اسی کے ساتھ

"شاملی کی طرف انگریزی فوج کے جانے کی جھوٹی خبر پاکر (تھانہ بھون میں) نقارہ بجا دیا گیا، اور جتھے کا جتھا شاملی پر چڑھ دوڑا، اور کیا جو کچھ کیا" ص ۷۲

شاملی جو آج کل سہارنپور سے دلی شاہدرہ جانے والی چھوٹی لائن کا ایک اسٹیشن ہے، اور مشہور مردم خیز قصبہ کاندھلہ کے قریب ہے، اس قصبہ میں ایک چھوٹی سی گڑھی بھی تھی جو شاید کسی شکل میں آج بھی موجود ہو، تھانہ بھون کے مجاہدوں نے اس گڑھی پر حملہ کیا، اور اس کو فتح کیا، اتنی بات تو حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہے، اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اس مہم میں سیدنا الامام الکبیر اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہما بھی براہ راست شریک تھے۔ لیکن اس واقعہ کی تفصیلات کیا ہیں؟ مولانا عاشق الٰہی صاحب کا بیان تو حد سے زیادہ مجمل ہے۔ لیکن دوسرے ذرائع سے جو معلومات فراہم ہو سکی ہیں، ان کو میں پیش کر دیتا ہوں۔

ممکن ہے کہ شاملی کی گڑھی پر حملہ کرنے کی ایک وجہ وہ بھی ہو، جو مولانا عاشق الٰہی نے بیان کی ہے لیکن اسی کے ساتھ مولانا طیب صاحب کی یادداشت سے اس سے بھی زیادہ گہرے اسباب کا سراغ ملتا ہے۔ اپنے اسی جہادی مسئلہ میں ارقام فرماتے ہوئے کہ

"حضرت (نانوتوی) کے شاگرد خاص نواب محی الدین خان مراد آبادی کے والد ماجد نواب شبیر علی خان، حضرت (نانوتوی) کے معتقد اور بادشاہ دہلی کے مصاحب خاص اور معتمد علیہ تھے"

بادشاہ دہلی سے مراد ابو ظفر سراج الدین خادم السلاطین المغلیہ ہیں، نواب شبیر علی خان مراد آباد کے مشہور رئیسوں اور بڑے تعلقہ داروں میں شمار ہوتے تھے۔ عزت و جاہ کے جس مرتبہ پر تھے اس کے لحاظ سے شاہی دربار سے ان کا تعلق محل تعجب نہیں ہو سکتا۔ نواب شبیر علی مراد آبادی

اور سیدنا الامام الکبیر کے مذکورہ بالا عقیدت مندانہ تعلق کے ذکر کے بعد مولٰنا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ:

"حضرت (نانوتوی) نے ان کی (یعنی نواب شبیر علی) کی معرفت بادشاہ دہلی کو جہاد اور استخلاص وطن و ملت کی جنگ پر آمادہ فرمایا"

یہ بھی مولانا طیب صاحب ہی کا بیان ہے۔ کہ

"غرض یہ تھی کہ بادشاہ انگریزوں کے خلاف اپنی طاقت استعمال کرکے دلّی کو ان سے (انگریزوں سے) پاک کرنے کی سعی کریں' اور ہم تھانہ بھون اور شاملی سے جہاد کرتے ہوئے دہلی کی طرف بڑھیں۔ اگر صحیح اصول پر دو طرف سے یہ حملہ اور دفاع عمل میں لے آیا گیا تو دہلی کا آزاد ہو جانا عین ممکن ہے" مقالہ جہاد

کن ذرائع سے اپنی اس روایت میں مولٰنا طیب صاحب مستفید ہوئے ہیں[1]' سردست میں نہیں بتا سکتا

[1] احقر نے یہ واقعہ مولٰنا منصور (مولٰنا محمد میاں صاحب مرحوم مہاجر کابل رفیق خاص سیاسی حضرت شیخ الہند نوراللہ مرقدہ) سے کابل میں سنا اور قلمبند کیا۔ مولنا مرحوم احقر کے حقیقی پھوپی زاد بھائی اور حضرت نانوتوی قدس سرہ کے نواسے تھے۔ تحریکات آزادی ملک و ملت کے سلسلہ میں حضرت شیخ الہند کے خاص صاحب سر اور معتمد علیہ تھے۔ انہوں نے جہاد تھانہ بھون کے سلسلہ میں بہت سے مفصل واقعات بروایت مولٰنا محمد منیر صاحب نانوتوی مرحوم مجھ سے بیان کئے' جو انہوں نے مولانا محمد منیر صاحب سے خود بلاواسطہ سنے۔ غالباً اس سے پہلے کسی موقعہ پر تذکرہ آچکا ہے کہ مولٰنا محمد منیر صاحب حضرت نانوتوی کے قریبی عزیز اور اُن کے فدائی تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ نے بحیثیت امام جہاد اُن ہی کو حضرت نانوتوی کے ساتھ لگا دیا تھا کہ وہ ان کی حفاظت اور نگرانی کرتے رہیں۔ کیونکہ حضرت نانوتوی اپنی قلبی شجاعت اور جوش جہاد میں جا بجا بے دھڑک صفوف میں گھس جاتے تھے اور اپنی جان کی کوئی پروا نہ کرتے تھے۔ اسی خاص حیثیت کی بناء پر مولانا محمد منیر صاحب کو حضرت نانوتوی کے جہاد کے واقعات بہت محفوظ تھے جو چشم دید تھے اور بہت سے ایسے واقعات ان کی روایت سے بھائی صاحب مرحوم سے میں نے سنے جو اوروں سے سننے میں نہیں آئے ہیں۔ میں نے ان تمام واقعات کی ایک تفصیلی روداد قلمبند کرلی تھی۔ لیکن واپسی کابل کے وقت سیصرین کا مشورہ یہ ہوا کہ اسے ساتھ نہ رکھا جاوے۔ اس لئے یہ یادداشت بھائی صاحب مرحوم کے پاس امانت چھوڑ دی گئی کہ وہ کسی مناسب موقعہ پر بھیجدیں۔ لیکن ہندوستان کی آزادی سے تقریباً چھ ماہ پیشتر ان کا وصال ہوگیا اور موجودہ حکومت ہند کے بعض ذمہ داروں نے جب کہ یہ ارادہ کرلیا تھا کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

لیکن بہر حال وہ صاحب البیت ہیں، اور ان لوگوں کی آنکھیں دیکھی ہیں، بلکہ ان ہی لوگوں میں پوسے پالے گئے۔ سن شعور و تمیز تک پہنچے۔ جو سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کے براہِ راست صحبت یافتہ اور آپ کے حالات و واقعات کے امین تھے۔

میرا خیال یہ ہے، کہ تھانہ بھون میں تنظیم جہاد کے شرائط کی تکمیل کے بعد سیدنا الامام الکبیر نے نواب شیر علی مراد آبادی کو اس مہم پر آمادہ فرمایا کہ بادشاہ کو وہ تیار کریں۔ اور ادھر تھانہ بھون سے ارادہ کیا گیا کہ اقدام کرتے ہوئے، شاہدرہ کی راہ سے دلی پایۂ تخت پہنچ جائیں۔ حملہ کے لئے شاملی کا انتخاب جہاں دوسرے وجوہ سے کیا گیا تھا، منجملہ ان کے ایک بڑی اہم وجہ یہ بھی تھی۔

"ہم تھانہ بھون اور شاملی سے جہاد کرتے ہوئے دلی کی طرف بڑھیں"

مولنا طیب کی یادداشت کے اس فقرے کا یہی کھلا ہوا اقتضاء ہے۔

باقی مولانا عاشق الٰہی صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ شاملی کی طرف انگریزی فوج کے جانے کی جھوٹی خبر پاکر تھانہ بھون میں نقارۂ جنگ بجا دیا گیا۔ اس میں "جھوٹی" کے لفظ کا صحیح مطلب میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیونکہ جس وقت شاملی کی گڑھی پر تھانہ بھون کے مجاہدوں پر حملہ کیا گیا۔ عام مشہور بلکہ متواتریات سے ہے کہ اس وقت انگریزی فوج کے سپاہی اس گڑھی میں قلعہ بند تھے۔ پھر شاملی کی طرف انگریزی فوج کے جانے کی خبر کو جھوٹی قرار دینے کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں۔ ہاں! اگر یہ مراد ہو، کہ شاملی کی گڑھی میں انگریزوں کی فوج جو رہتی تھی۔ یا اس زمانہ میں متعین کی جا چکی تھی۔ اس کے سوا بھی انگریزوں نے تھانہ پر حملہ کرنے کے لئے مزید فوج شاملی کی طرف روانہ کی ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ خبر جھوٹی ہو۔

(گذشتہ صفحہ سے) اس قسم کی مظلومانہ جلا وطنی کی زندگی گذارنے والوں کو جو برطانیہ کی جابرانہ پالیسی کا شکار تھے، ہندوستان بلا لیا جائے۔ مرحوم اس سے پیشتر ہی دنیا سے رخصت ہو گئے جس سے وہ یادداشت بھی تقریباً لاپتہ ہو گئی، چند چند جستہ جستہ واقعات جو احقر کے حافظہ میں محفوظ رہ گئے تھے۔ ہندوستان پہنچ کر انہیں قلمبند کر لیا گیا تھا حضرت مصنف سوانح نے جہادی حالات کے نام سے اسی یادداشت کا جگہ جگہ حوالہ دیا ہے۔ میں نے اس یادداشت کا سلسلۂ سند اسلئے تفصیل سے نقل کر دیا کہ آئندہ حوالوں میں اس کی سند پیش نظر رہے۔ محمد طیب غفرلہٗ

بہر حال ابتدائی اسباب کے لحاظ سے اگرچہ تھانہ بھون کی یہ جہادی تحریک جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، انتصار اور انتقام کی ایک مقامی تحریک تھی، حکومت نے ملک کے باشندوں سے جو آئینی معاہدہ کیا تھا، اس معاہدہ کو توڑ کر وہ عہد شکنی اور غدر کے جرم کی مرتکب ہوئی تھی۔ اسی چیز نے اس علاقے کے باشندوں کو انتصار و انتقام کے قرآنی حکم کی تعمیل پر آمادہ کیا تھا۔ اسی طرح جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، اپنے آثار و نتائج کے لحاظ سے بھی اس تحریک کا دائرہ جیسا کہ خدا کی مشیت تھی زیادہ وسعت حاصل نہ کر سکا، لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے نواب شبیر علی صاحب مراد آبادی کے توسط سے اس تحریک کا ربط ہندوستان کے موروثی حکمران سراج الدین بہادر شاہ سے قائم کر دیا تھا، تو شاملی کی گڑھی پر تھانہ بھون کے مجاہدوں کا حملہ یہی سمجھنا چاہئے کہ شاملی کی گڑھی پر نہ تھا۔ بلکہ یہ اقدام درحقیقت پایۂ تخت دلی تک پہنچنے کے لئے کیا گیا تھا۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولنا طیب صاحب نے اپنی جہادی یادداشت میں لکھا ہے کہ

> "سرفروشان دین سروں کو ہتھیلیوں پر لیکر ایک منظم طاقت سے ٹکرانے کیلئے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے، اور تھانہ بھون سے شاملی کی طرف مارچ شروع کیا، جس کا نصب العین دہلی تھا۔" صلہ مقالہ جہادی

ظاہر ہے کہ ایسی صورت بجائے مقامی ہونے کے ایک ہمہ گیر تحریک کا قالب "تھانہ بھون کا جہاد" اختیار کر لیتا ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جن غیر معمولی، اولوالایدی والابصار شخصیتوں کے مبارک ہاتھوں میں تھانہ کی جنگی مہم کی باگ تھی۔ ان کے فلک گیر حوصلوں اور سیر بیادلوں کا اقتضا چاہے تو کچھ بھی ہو، لیکن قدرت کا فیصلہ کچھ اور تھا، مجاہدوں کی یہ یورش شاملی کی گڑھی پر پہنچکر ختم ہو گئی، ہم اس قصہ کو ان ہی معلومات کے ذکر پر ختم کر دینا چاہتے ہیں، جو شاملی کی گڑھی کی اس مجاہدانہ یورش کے متعلق ہمدست ہو چکے ہیں۔ کب، کس مہینے میں کتنے آدمیوں کے ساتھ شاملی کی گڑھی پر حملہ کیا گیا۔ حالات کے لحاظ سے ان تفصیلات کے قلم بند ہونے کی صورت ہی کیا تھی، بس اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ خود امیر المومنین یعنی حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو تھانہ ہی کے قیام کا

بشورہ دیا گیا۔ اسی لئے سمجھنا چاہئے کہ بجائے غزوہ کے سریۃ ہی کی شکل میں مجاہدوں کا فوجی دستہ شاملی کی طرف سے روانہ کیا گیا تھا۔

اسی سریہ کی تعبیر مولنا عاشق الٰہی صاحب نے ان الفاظ میں کی ہے کہ

"جتھے کا جتھا تحصیل شاملی پر چڑھ دوڑا" ۔ صلے

تصریح تو نہیں کی ہے لیکن ان کے بیان کا اقتضا ہے کہ تھانہ کے رئیس قاضی عنایت علی صاحب بھی اس جتھے میں کہئے یا سریہ میں شریک تھے۔ نیز تحصیل شاملی کی اس یورش کے متعلق منتشر طور پر کتابوں اور یادداشتوں میں جو روایتیں پائی جاتی ہیں، اور شہرت بلکہ کہہ سکتا ہوں کہ دیوبندی حلقہ میں تواتر کی حدود تک جو روایتیں پہنچی ہوئی ہیں، ان کی بنیاد پر اتنی بات بھی بہرحال یقینی ہے کہ دین کے یہ چار یار یعنی (۱) سیدنا الامام الکبیر مولنا محمد قاسم نانوتوی (۲) امام ربانی حضرت مولنا رشید احمد گنگوہی، (۳) حضرت مولنا حافظ محمد ضامن شہید (۴) مولنا محمد منیر صاحب نانوتوی بہ نفس نفیس اس یورش میں عملاً شریک تھے، باقی ان ابطال رجال کے سوا اور کون کون تھے۔ ہم ان کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتے کہ ان کی کافی تعداد تھی۔ "جتھے کا جتھا" کے الفاظ مولوی عاشق الٰہی صاحب نے جو استعمال کئے ہیں، ان کا اقتضا بھی یہی ہے، کچھ بھی ہو، مجاہدوں کا یہ فوجی دستہ تھا اور ثقالاً ان ہی آلات و اسلحہ کے ساتھ جوان کے پاس تھے۔ یا باغ شیر علی کی سڑک کی غنیمت کی شکل میں قدرت نے ان تک پہنچا دیا تھا وہ شاملی کی طرف روانہ ہو گئے۔

تھانہ سے جس وقت یہ سریہ یا مجاہدوں کا دستہ شاملی کے ارادہ سے روانہ ہونے لگا، تو اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وقت اور مقام کے امیر المؤمنین حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولنا محمد منیر صاحب جن کے متعلق مولنا منصور انصاری صاحب نزیل دربین کابل کے حوالہ سے عرض کر چکا ہوں کہ اس جہادی تنظیم میں "یاور حربی" کا عہدہ ان کو دیا گیا تھا، ان ہی مولنا محمد منیر سے سنی ہوئی یہ روایت نقل کی جاتی ہے۔ مولوی طیب صاحب کی یادداشت

شاملی کا میدان جہاد اور گنج شہیداں جس میں مجاہدین شاملی مدفون ہیں
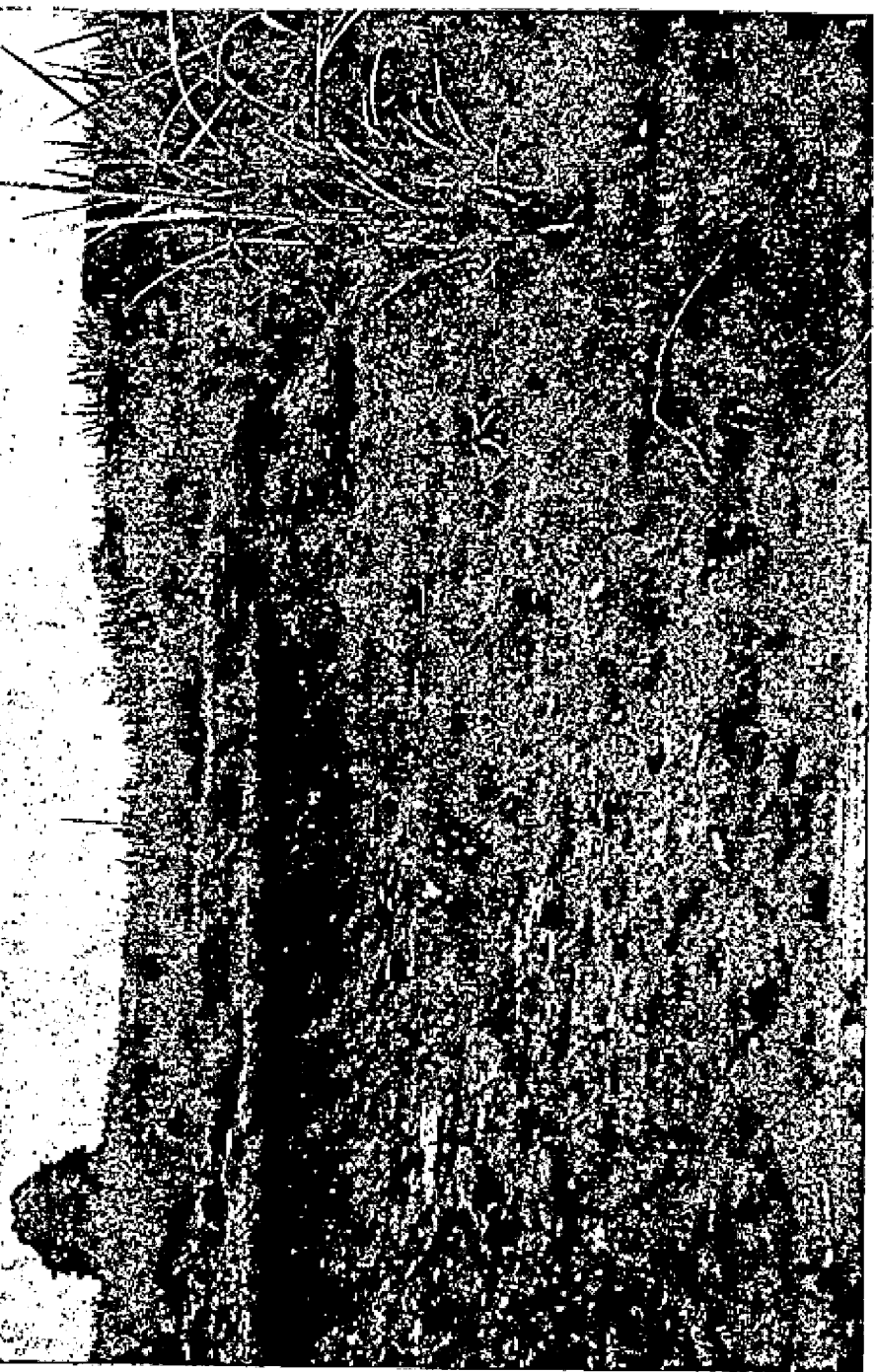
میں ہے کہ خصوصیت کے ساتھ ان کو مخاطب کر کے حاجی صاحب نے مجاہدوں کو رخصت کرتے ہوئے وصیت کی تھی۔

"مولنا (یعنی سیدنا الامام الکبیر) بالکل آزاد اور جری ہیں، ہر صف میں بے محابا گھس جاتے ہیں اس لئے آپ کسی وقت ان کا ساتھ نہ چھوڑیں" ص۔

خاص کر مولنا محمد منیر صاحب ہی کو یہ وصیت اسلئے کی گئی تھی کہ بقول مولنا طیب

"شدت محبت سے ان کو بھی بغیر (مولنا نانوتوی) کے قرار نہ آتا تھا"

گویا کام ایسے آدمی کے سپرد کیا گیا جو یہی کرنا بھی چاہتا تھا۔

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ بالا وصیت کا اقتضاء یہی ہے کہ حرب و ضرب کر و فر کے متعلق سیدنا الامام الکبیر کی افتاد طبع اور فطری رجحان کا تجربہ شاملی کی جنگ سے پہلے ہو چکا تھا، شیر علی کے باغ والی سڑک کی یورش میں سیدنا الامام الکبیر کی ذاتی شرکت کے دلائل میں ہم اسی امدادی وصیت کو بھی ایک دلیل قرار دے سکتے ہیں، آخر سیدنا الامام الکبیر کی ان فطری خصوصیتوں کے مشاہدے کا موقعہ اور کہاں مل سکتا تھا۔

چند میلوں سے زیادہ فاصلہ تحصیل شاملی اور تھانہ بھون میں نہ تھا۔ اب بھی ان دونوں مقاموں کے درمیان چند اسٹیشن پڑتے ہیں۔ مجاہدوں کے "جتھے کا جتھا" بآسانی وہاں پہنچ گیا۔ مولانا طیب صاحب کا بیان ہے کہ

"شاملی کے میدان میں رن پڑا، اور انگریزی فوج سے (مجاہدین کا) مقابلہ ہوا، مقابلہ میں مجاہدین ہی کو غلبہ نصیب ہوا"

اگرچہ یہ ایک اجمالی بیان ہے لیکن اس سے اس کا تو پتہ چلا، کہ جب شاملی تک مجاہدین پہنچ گئے، تو گڑھی میں جو انگریزی فوج کے سپاہی تھے، وہ مقابلہ کرنے کے لئے باہر نکل آئے۔ دونوں میں کافی کش مکش ہوئی۔ اس کش مکش میں کیا کیا صورتیں پیش آئیں۔ اب نہ ان کے دیکھنے والے موجود ہیں۔ اور سننے والے بھی ختم ہو چکے ہیں، مولنا منصور انصاری کی زبانی کابل میں مولانا طیب صاحب کو

جو باتیں معلوم ہوئیں۔ ان میں ایک ایمان افروز روایت یہ بھی نقل کی گئی ہے، جسے مولانا منصور انصاری نے براہ راست مولانا محمد منیر صاحب سے سنا تھا۔ اپنے امیر المومنین پیر و مرشد حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وصیت کے مطابق مولانا محمد منیر فرماتے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر کے

"پس پشت بطور محافظ اس طرح رہتا تھا کہ حضرت (نانوتوی) کو یہ احساس نہ ہو کہ وہ ان کی محافظت اور نگرانی کر رہے ہیں"

رن پڑا ہوا تھا، دارو گیر بزن و بکش کا ہنگامہ رستخیز ہر طرف برپا تھا، مولانا محمد منیر فرماتے تھے کہ

"اس ہنگامہ محشر خیز میں حضرت (نانوتوی) میدان جنگ کے ایک کنارے پر دم لینے کے لئے کھڑے تھے، کہ (انگریزی فوج) کا ایک سپاہی جو صورتاً سکھ (معلوم ہوتا) تھا، اور ڈیل ڈول میں اتنا طویل و عریض تھا، کہ حضرت (نانوتوی) کے جثہ کے آدمی اس جیسے تن و توش رکھنے والے سے چار بن سکتے تھے، (انگریزی فوج کے اسی سپاہی نے حضرت نانوتوی کو کنارے میدان کے کھڑا پاکر) دور سے تاکا، اور غصہ میں لپک کر اس طرف آیا"

اس کے بعد یہ الفاظ روایت میں اس کی طرف جو منسوب کئے گئے یعنی

"حضرت (نانوتوی) کو ڈانٹا، اور کہا کہ تم نے بہت سر ابھارا ہے"

جن سے معلوم ہوتا ہے، کہ حرب و ضرب میں سیدنا الامام الکبیر کی غیر معمولی سرفروشانہ جد و جہد عظیم کی فوج میں کافی امتیاز حاصل کر چکی تھی، بہرحال مذکورہ بالا الفاظ سے مخاطب کرتے ہوئے انگریزی فوج کے اسی دیو پیکر عفریت قالب سپاہی نے کہا، کہ

"اب آ! میری ضرب کا جواب دے"

اسی کے ساتھ تلوار جو اس کے ہاتھ میں تھی اس کو بلند کرتے ہوئے چلایا کہ

"یہ تیغہ تیرے لئے موت کا پیغام ہے"

یہ فقرہ ابھی تمام نہیں ہوا تھا کر دیکھا گیا

"دو دھارا تیغہ پوری قوت سے اٹھا کر حضرت (نانوتوی) پر چلانا ہی چاہتا تھا"

(حضرت کی زبان مبارک پر بے ساختہ یہ الفاظ جاری ہوئے، اسی فوجی گرد سے فرما رہے تھے کہ

"باتیں کیا بنا رہا ہے، اپنے پیچھے کی تو خبر لے"

کچھ ایسے لہجہ میں یہ بات اس کے کان میں ڈالی گئی، کہ

"اس نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا"

اس کا مڑنا تھا کہ سیدنا الامام الکبیر بجلی کی طرح تڑپے، مڑنے کے بعد آپ کی طرف رخ کرنے کا موقعہ بھی اس کو نہ ملا کہ دیکھنے والوں کے سامنے یہ تماشا پیش تھا، مولانا محمد منیر کا بیان ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر نے

"جھنیو کا ہاتھ اس کے داہنے کندھے پر مارا۔ وار اتنی قوت سے کیا گیا تھا کہ تلوار داہنے مونڈھے کو کاٹ کر گذرتی ہوئی بائیں پیر پر آ کر رکی"

دیکھا گیا، تو اس سپاہی کا عفریتی جسد اس طرح خاک پر پڑا ہوا تھا، کہ

"سر سے پیر تک دو پارہ ہو کر آدھا ادھر آدھا ادھر گرا ہوا تھا"، صدق جادی بعالہ

ھذا تبعو ھم باحسان کے قرآنی وصف کی تعبیر یوں ہی پوری ہوتی ہے، سعادت مندوں کو اسی قسم کی سعادت مندیوں سے نوازا جاتا ہے، گویا ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ہم شاملی کے میدان جنگ میں نہیں، بلکہ اس تاریخی خندق کے کنارے کھڑے ہیں۔ جہاں عرب کا سورما عمرو بن ود[1] ٹھیک اسی شکل میں دو پارہ ہو کر تڑپ رہا تھا۔ اس کا انجام تو یہ ہوا، اور سیدنا الامام الکبیر جو کچھ

---

[1] سیرت کی کتابوں میں اس کی تفصیل پڑھنی چاہئے، اور یوں بھی واقعہ مشہور ہے، کہتے ہیں کہ عمرو بن ود سو پہلوانوں کے برابر قریش میں سمجھا جاتا تھا، جو زرہ وہ پہنتا تھا، حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ سارے عرب میں ایسی زرہ کسی کے پاس نہ تھی، سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے باوجود تو عمر ہونے کے عرب کے اس مشہور سورما کو دو پارہ کر کے رکھ دیا تھا۔ زرہ کے متعلق دریافت کیا گیا کہ اس کی لاش سے اتار کیوں نہ لی تو فرمانے لگے کہ قتل ہوتے ہوئے (باقی اگلے صفحہ پر)

ماندگی محسوس فرمارہے تھے۔ اس غیر معمولی کامیابی نے چستی اور چالاکی کی نئی قوت آپ میں بھردی لکھا ہے کہ

"اسی بے جان لاشے پر پاؤں رکھتے ہوئے پھر صف قتال میں آگئے" صلہ

نہیں کہا جا سکتا کہ شاملی کے میدان کی یہ جنگ کب تک اور کتنی دیر تک جاری رہی۔

مولانا طاہر صاحب کی یادداشت جس میں اپنے والد حافظ محمد احمد صاحبؒ سے سنی ہوئی روایت اسی سلسلہ میں انہوں نے درج کی ہے، جس کے بعض اجزاء کا ذکر متفرق طور پر کرچکا ہوں۔ اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ اپنے والد ماجد شیخ اسد علی سے رخصت ہوکر سیدنا الامام الکبیر تھانہ آئے اور تھانہ کے بعد جب میدان جنگ میں جو ظاہر ہے کہ شاملی ہی کا میدان جنگ ہو سکتا ہے تشریف لے گئے، تو بیان کیا ہے، کہ تھانہ بھون میں میدان جنگ کی خبروں کے ساتھ ساتھ شہداء کی

"نعشیں بھی آتی رہتی تھیں"

اور تھانہ کر یہ قصے اطراف و جوانب کی آبادیوں میں پھیل جاتے تھے۔ لکھا ہے کہ

(گذشتہ صفحہ سے) اپنی شرمگاہ کو کھول کر میرے سامنے اس کا قرنے کردیا۔ مجھے شرم آئی اور چھوڑ کر چلا آیا۔ اس مبارزے کے دوسرے اجزاء کافی دلچسپ ہیں۔ خصوصاً حضرت علی اور عمرو کی باہمی گفتگو۔ اس موقعہ پر ایک بات اس کے عمل کا سامان بھی ملتا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور خالد بن ولید اسلامی جیسے نبرد آزما کشور کشا صحابیوں کی جنگی مہارتوں اور قتالی یا یک دستیوں کا ذکر جس وقت کیا جاتا ہے تو دل میں خیال آتا ہے، کہ جن غیر معمولی کرتبوں سے یہ کام لیتے تھے ان کی تعلیم ان بزرگوں نے کہاں اور کب اور کن لوگوں سے حاصل کی؟ تاریخ قوانگ ان کے جواب سے ساکت ہے۔ اصولاً آدمی یہی سوچ لیتا ہے کہ عرب ایک جنگجو قوم تھی اگرچہ کتب علیکم القتال وھو کرہ لکم "کی قرآنی خبر سے اس کی بھی تصدیق نہیں ہوتی، لیکن مشہور یہی ہے۔ اسی بنیاد پر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ عربوں میں جنگی فنون کے سیکھنے سکھانے کا عام رواج ہوگا۔ مگر سیدنا الامام الکبیر کے مذکورہ واقعہ کو سوچ کر اگر ذہن ادھر منتقل ہو کہ اللہ والوں کے ساتھ غیبی تائید جو ہوتی ہے۔ یہ اسی کے مظاہر و آثار ہیں تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے۔ سیدنا الامام الکبیر کی پچھلی زندگی میں کہیں اس کا پتہ نہیں چلتا کہ شمشیر زنی، بنوٹ یا بانک وغیرہ چیزیں آپ نے سیکھی ہوں۔ بندوق تک کے متعلق آپ ہی کو مصنف امام کی شہادت سن چکے کہ غدر کے ایام میں پہلی دفعہ نشانہ بازی کا موقعہ آپ کو ملا تھا ۱۲

"چونکہ تھانہ نانوتہ سے زیادہ دور نہ تھا"

اس لئے نسبتاً زیادہ آسانی کے ساتھ نانوتہ والوں کو میدان جنگ کی سرگذشتوں کے جاننے کا موقع مل رہا تھا، جن کو سن سن کر حضرت نانوتوی کے والد ماجد شیخ اسد علی صاحب جیساکہ مولوی ماہر صاحب نے لکھا ہے۔

"بہت روتے تھے اور فرماتے تھے کہو بھائی! میرا بیٹا کہاں ہے، میرا بیٹا کہاں ہے"

بلفظ ہٰذا اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ شاملی کے میدان کی جہادی کشمکش ایک دو دن میں ختم نہیں ہوئی تھی، لیکن پھر بھی وقت کی صحیح تعیین کا کوئی ذریعہ میرے پاس نہیں ہے۔ اسی قدر کہہ سکتا ہوں کہ فاش ہزیمت کے بعد انگریزی فوج کے آدمی شاملی کی گڑھی میں قلعہ بند ہو گئے، اور مجاہدوں نے گڑھی کو اپنے محاصرے میں لے لیا۔

## شاملی کی گڑھی کا محاصرہ اور تھانہ بھون کی جہادی تحریک کا خاتمہ

انگریزی فوج شاملی کی جس گڑھی میں پناہ گزیں ہو گئی تھی، اس کے صحیح محل وقوع کا اندازہ تو دیکھنے ہی سے ہو سکتا ہے، جس سے افسوس ہے کہ لکھنے والا محروم ہے، جی تو یہی چاہتا ہے کہ کوشش! خود اپنی آنکھوں سے اس گڑھی اور اس کے ماحول کا مشاہدہ کر کے جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں، اسے لکھوں لیکن موجودہ حالات میں میرے لئے یہ آسان نہیں ہے، تاہم پھر بھی میری آرزو اب بھی یہی ہے کہ یہ گڑھی اگر اب بھی موجود ہو۔ تو اس کا فوٹو لے لیا جائے، اور اس کتاب کے ضیمموں میں اس فوٹو کو بھی شریک کر دیا جائے۔ سیدنا الامام الکبیر کی سیرت طیبہ سے اس گڑھی کا خاص تاریخی تعلق ہے۔ گڑھی کے چاروں طرف جو میدان تھا، کون کہہ سکتا ہے، کہ اس حال میں اب بھی ہوگا لیکن کہنے والوں سے معلوم ہوا کہ اس میں رد و بدل نہیں ہوا ہے۔ یا کم ہوا ہے۔ تو فوٹو لینے والے کو چاہئے کہ کسی ایسے نقطے سے فوٹو لے جس میں کچھ نہ کچھ میدان کا حصہ بھی آ جائے۔

بہرحال کتابوں میں جو کچھ مل سکا ہے، اس کی مدد سے نیز براہ راست اس خاکسار نے سیدنا

الامام الکبیر کے فرزند سعید مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حیدرآباد میں جو روایت اس سلسلہ میں سنی ہے اس کو بھی پیش نظر رکھ کر تھانہ بھون کی جہادی تحریک کے اس دردناک خاتمہ کی تفصیل عرض کرتا ہوں۔

حافظ صاحب مرحوم نے جن دنوں آپ سلطنت آصفیہ کی عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) کے رکن بحیثیت مفتی ہونے کے تھے۔ اسی زمانہ میں نواب عبدالباقر مرحوم کی کوٹھی حسینی علم میں ایک خانگی مجلس جس میں فقیر بھی شریک تھا، یہ بیان فرمایا تھا کہ شاملی کی یہ گڑھی جس میں انگریزی فوج کے سپاہی روپوش ہوئے تھے ایک ایسے کھلے میدان میں واقع تھی کہ گڑھی کے چاروں طرف کوئی ایسی جگہ نہ تھی، جسے گڑھی سے باہر والے آڑ بنا سکتے ہوں، الا یہ کہ ایک مختصر سی مسجد اسی سمت میں تھی، جس طرف گڑھی کا پھاٹک تھا۔ محصوروں نے گڑھی کے پھاٹک کو بند کر دیا تھا، اور "چھتے کا چھتا" تھانہ بھون کے مجاہدوں کا جو گڑھی کے باہر والے بے پناہ میدان میں ٹڈیوں کی طرح پھیلا ہوا تھا، ان پر بندوقوں سے گڑھی والے انگریزی فوج کے بند ونچی دیوار کی آڑ لے کر مسلسل فائر پر فائر کرتے چلے جاتے تھے۔ تابڑ توڑ گولیاں برسا رہے تھے۔ وہ دیوار کے پیچھے محفوظ تھے۔ لیکن اس مختصر سی مسجد کے سوا جو میدان میں تھی غریب مجاہدوں کو گولیوں سے بچانے والی کوئی جائے پناہ نہ تھی۔

اسی کا نتیجہ تھا، جیسا کہ مولانا طیب صاحب نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ

"انگریزی فوج تحصیل شاملی میں قلعہ بند ہو گئی، اور ادھر سے مجاہدوں پر بندوقوں کی باڑھ مارنی شروع کی، جس سے سینکڑوں مجاہدین شہید ہو گئے۔

یہ وقت بڑا افراتفری کا تھا، زحف (گھمسان والی جنگ) کی صورت باقی نہ رہی تھی، اس لئے بظاہر قرآنی حکم فلا تولوھم الادبار (پس نہ پھیرو تم پیٹھوں کو) کا مکلف بھی مجاہدین کا یہ سراسیمہ گروہ باقی نہ رہا تھا، لیکن پھر بھی میدان سے پیٹھ پھیر کر ایسا معلوم ہوتا ہے بھاگنے پر کوئی آمادہ نہ تھا۔ گولیاں ان کے جسم میں اترتی چلی جاتی تھیں۔ روحیں پرواز کر رہی تھیں، لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، کسی نے

راہ گریز اختیار نہ کی، مولانا طیب نے لکھا ہے کہ

"اس وقت پریشانی یہ تھی کہ انگریزی فوج قلعہ بند اور محفوظ تھی، اور مجاہدین ان کے سامنے کھلے میدان میں تھے، ان کا (یعنی انگریز فوج کی بندوقچیوں کا حملہ کارگر اور کامیاب ہوتا تھا، اور مجاہدین کے حملے غیر مؤثر ہو کر رہ جاتے تھے۔"

ظاہر ہے کہ مجاہدین زیادہ سے زیادہ بندوقوں کا جواب بندوقوں سے دے سکتے تھے لیکن جو دیوار کی آڑ میں چھپے اور دبکے ہوئے تھے۔ ان پر دیوار سے باہر والوں کی بندوقوں کی گولیوں کا اثر ہی کیا مرتب ہو سکتا تھا، مولانا کا بیان ہے کہ

"اس طرح (یعنی یک طرفہ مار کی وجہ سے) مجاہدین کا کافی جانی نقصان ہوا"

تھانہ بھون میں لاشوں کے مسلسل پہنچنے کے جس قصہ کا ذکر گذر چکا ہے، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر یہ صورت حال محاصرہ کے بعد ہی پیش آئی۔

بس لے دے کر یہی ایک مسجد تھی۔ گھوم پھر کر اسی مسجد میں مجاہدین دم لینے کے لئے آجاتے، لیکن اس مسجد کی پناہ سے نکلنے کے ساتھ ہی ان پر گولیاں برسنے لگتیں۔ تدبیریں سوچی جاتی تھیں لیکن کوئی تدبیر اس وقت مفید اور کارآمد نہیں ہو رہی تھی۔ اس وقت اپنے ہوش و حواس کے توازن کو قائم کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر نے ایک غیر معمولی جرأت آزما اقدام کا عزم بالجزم فرمالیا ۔ میں بتا چکا ہوں کہ یہ مسجد اسی سمت میں واقع تھی، جس طرف گڑھی کا دروازہ تھا۔ مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں ہے کہ

"اسی دروازہ کے قریب چھپر کی ایک کٹی تھی، جو غالباً محافظ سپاہیوں کے سایہ لینے کے لئے بنائی گئی تھی،

مسجد سے سیدنا الامام الکبیر کی نظر مبارک دروازے کے اس چھپر پر پڑی، اور اچانک ایک "حربی مکیدہ یا "جنگی چال" کا گویا آپ کو الہام ہوا، سمجھ میں یہ آیا، کہ اس چھپریا تک پہنچنے کی صورت اگر کوئی نکل آئے، تو اس کو اکھاڑ کر دروازے کے کواڑوں پر رکھ دیا جائے۔ اور چھپریا میں آگ لگادی جائے جس سے

کواڑ بھی جل جائیں گے اور تحصیل کی گڑھی میں گھسنے کا موقعہ مجاہدین کے لئے بآسانی نکل آئے گا۔
لیکن ظاہر ہے کہ مسجد سے چھپر یا تک پہنچنا آسان نہ تھا۔ بندوقیں چھپائے انگریزی فوج کے سپاہی گڑھی کی دیواروں پر اور ان کی آڑ میں پوری نگرانی کر رہے تھے کہ گڑھی کے دروازے تک کوئی پہنچنے نہ پائے، نظر پڑتے ہی اس پر گولیاں برسانے لگتے تھے۔ چھپر یا تک پہنچنا، اس کو اکھاڑنا، اکھاڑ کر دروازے کے کواڑوں سے اس کا اتصال پیدا کر کے آگ لگانا، اتنا لمبا کام نہ بار تھا کہ بمشکل ہی اس کا موقع برستی ہوئی گولیوں کے درمیان نکالا جا سکتا تھا۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ اولوالعزموں کے عزم اور ارادے کا مظاہرہ ان ہی نازک مواقع پر ہوا کرتا ہے، تجویز بھی سیدنا الامام الکبیر کے دماغ میں آئی، اور تجویز پر عمل کرنے کا عزم بھی خدا نے آپ ہی کے نورانی قلب میں پیدا کیا۔ اس سلسلہ میں روایتیں جو مجھ تک پہنچی ہیں، ان سے یہی معلوم ہوتا ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر اپنی اس "آتشیں تجویز" پر عمل کرنے کے لئے تنہا آمادہ ہو گئے۔ کسی رفیق کو بھی رفاقت کی تکلیف نہ دی، اور دیکھا گیا کہ کوندتی ہوئی بجلی کی طرح آپ گولیوں کی اسی بارش کے درمیان نکلتے ہوئے چھپر یا تک پہنچ گئے، اور حسب روایت مولانا طیب صاحب

"حضرت (نانوتوی) نے پھرتی سے بڑھ کر اس چھپریا کو اپنی جگہ سے جلد جلد اکھاڑا اور اکھاڑ کر اسے تحصیل کے دروازے سے لا ملایا، اور اس میں آگ دے دی"

خدا ہی جانتا ہے کہ گولیوں کی بوچھاڑ سے نکلنے میں اور چھپر یا تک صحیح و سالم پہنچنے میں وہ کیسے کامیاب ہوئے۔ مگر دیکھا یہی گیا کہ چھپریا میں آگ لگی ہوئی ہے اور اس کے بعد بقول مولانا طیب صاحب۔

"آگ کا لگنا تھا، کہ گڑھی کے پھاٹک کے کواڑ بھی جل اٹھے"

صورت حال کچھ ایسی پیش آئی، کہ ان جلتے ہوئے کواڑوں کی آگ بجھانے کی ہمت گڑھی کے محصور فوجیوں کو نہ ہوئی۔ بجائے لکڑی کے صرف کوئلہ اور راکھ کے کواڑ بن کر وہ رہ گئے، مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے، کہ یوں گڑھی کا

"بند دروازہ مجاہدین کے لئے وا ہو گیا، اور یلغار کرتے ہوئے تحصیل کے اندر مجاہدین جا گھسے"

اس وقت چارۂ کار ہی محصوروں کے لئے اس کے سوا اور کیا تھا کہ نیام سے تلواروں اور کرچوں کو نکال نکال کر مجاہدین کے سامنے آجائیں۔ مولانا طیب کی یادداشت میں ہے کہ مجاہدین اور

"قلعہ بند فوج سے دست بدست جنگ ہونے لگی"

گڑھی کے اندر تو یہ دست بدست جنگ ہو رہی تھی، مجاہدوں کا حوصلہ بڑھا ہوا تھا کرایہ کے سپاہی ان کے مقابلہ میں کیا ٹھہر سکتے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسا کہ مولنا طیب صاحب نے لکھا بھی ہے کہ

"پانسہ مجاہدوں کے حق میں پلٹ آیا، انگریزی فوج کو شکست ہو گئی، تحصیل شاملی پر مجاہدوں کا قبضہ ہو گیا"

لیکن پردہ غیب کی لاہوتی مصلحتوں کا تقاضا کچھ اور تھا، اس موقعہ پر روایات میں کچھ اتنا اجمال ہے کہ واقعہ کے بعض اجزاء کی ترتیب میں الجھن سی پیدا ہو گئی ہے۔ تاہم جو معلومات مجھ تک پہنچے ہیں، ان کو سامنے رکھتے ہوئے جو نقشہ میرے دماغ میں قائم ہو گیا ہے اسے پیش کر دیتا ہوں۔

مجاہدوں کا جو دستہ تحصیل شاملی پر حملہ کرنے کے لئے تھانہ بھون سے روانہ کیا گیا تھا اس دستہ کے امیر الجیش جیسا کہ مولنا طیب صاحب کی یادداشت میں بیان کیا گیا ہے۔ حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ جن چار یاروں کی شرکت شاملی کے اس وقت دھاوے میں قطعی طور پر ثابت ہے۔ عرض کر چکا ہوں، ان میں ایک یہ حافظ صاحب بھی ہیں، دیوبندی حلقہ کے واقف کاروں کیلئے تو کسی تعارف کی محتاج حضرت حافظ شہید کی شخصیت نہیں ہے۔ لیکن جو نہیں جانتے ہیں ان کی رعایت بھی کرنی ہی چاہئے، حضرت حافظ شہید کا خاندانی تعلق تھانہ بھون کے فاروقی شیخ زادوں کے خانوادے سے تھا، ارواح ثلاثہ میں ان ہی کے متعلق جو یہ فقرہ پایا جاتا ہے کہ

"حضرت حافظ ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ سپاہی منش تھے" ص ۱۵۷

بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً ابتدائی زندگی سے آپ کو مجاہدانہ اور سپاہیانہ زندگی سے مناسبت تھی، اور گو حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے پیرو مرشد میاں جی نور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ

کی بیعت سے سرفراز ہو کر طریقہ صابریہ چشتیہ کے سیر و سلوک کی تکمیل میں کامیاب ہوئے، اور اس درجہ پر پہنچے کہ بقول مولانا طیب صاحب

"بوقت وفات حضرت میاں جی نور محمد صاحب نے حافظ صاحب کو وصیت فرمائی کہ دیکھنا اپنے چھوٹے بھائی امداد اللہ کا خیال رکھنا۔"

بہرحال آپ وقت کے خدا رسیدہ اور برگزیدہ لوگوں میں تھے۔ لیکن فطری طور پر حد سے زیادہ وارستہ مزاج تھے، لیکن مزاج کی وارستگی اور شگفتہ دلی کا حال یہ تھا کہ سب کچھ ہو جانے کے بعد مرتے دم تک بلکہ شاید مرنے کے بعد بھی یہ شگفتگی ان کی باقی رہی[1]، بڑے دل چسپ لطائف ان کی طرف منسوب ہیں، امیر شاہ خاں مرحوم کہا کرتے تھے کہ تھانہ بھون کی وہی مسجد جسے آخر میں حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے قیام نے ہندوستان کا ایک مرکزی مقام بنا دیا تھا، اسی مسجد میں ایک وقت وہ بھی گذرا تھا کہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شیخ محمد تھانوی، حافظ محمد ضامن شہید، ان تینوں بزرگوں کی بیٹھک قریب قریب ہی رہتی تھی۔ حضرت حاجی صاحب اسی مسجد کی متعلقہ سہ دری میں بیٹھتے تھے، اور مولانا شیخ محمد صاحب کی نشست بھی وہیں قریب تھی اور حافظ صاحب مسجد کے قریب ڈھلکن تلے بیٹھا کرتے تھے۔ آنے والے جب آتے تو لکھا ہے کہ حافظ صاحب اس کو مخاطب کر کے فرماتے کہ

"بھائی کوئی مسئلہ پوچھنا ہو، تو وہ (مولانا شیخ محمد تھانوی) بیٹھے ہیں، ان سے پوچھ لے، مرید ہونا ہے تو وہ (حاجی امداد اللہ) بیٹھے ہیں، ان سے مرید ہو جا، اور اگر حقہ پینا ہو، تو یاروں کے پاس بیٹھ جا۔" ص۱۵۶

قصص الاکابر، ارواح ثلاثہ وغیرہ میں حافظ صاحب شہید کے تفصیلی حالات پڑھئے، اس اجمالی

[1] ارواح ثلاثہ میں اس لطیفہ کا ذکر کیا گیا ہے کہ ایک صاحب کشف بزرگ حافظ ضامن شہید کے مزار پر جاتے بغیر کو یہ کس کی قبر ہے فاتحہ پڑھنے گئے۔ فاتحہ سے فارغ ہونے کے بعد لوگوں سے پوچھنے لگے کہ بھائی یہ کون بزرگ ہیں بڑی دل لگی کی بات کی ہیں جب فاتحہ پڑھنے لگا تو کہنے لگے جاؤ فاتحہ کسی مردہ پر پڑھیو یہاں زندوں پر فاتحہ پڑھنے آئے ہو۔ ص۱۵۶ لوگوں نے یہ اطلاع دی کہ شہید ہیں تب اس لطیفہ کا مطلب ان کی سمجھ میں آیا۔

تھانہ بھون میں پلکھن کا درخت جس کے نیچے حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہیدؒ امام جہاد شاملی کی نشست رہتی تھی

تعارف کے بعد میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ شاملی کی گڑھی کے کواڑ کو کوئلہ اور راکھ بنا کر گرا دیا گیا' اور مجاہدین کو گڑھی میں گھس کر انگریزی فوج کے سپاہیوں سے دست بدست جنگ کرنے کا موقعہ ملا' تو جیسا کہ چاہیے تھا کہ ایسا الجیش ہونے کی حیثیت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حافظ شہید کو اندر داخل ہونے والے مجاہدین اور جو باہر تھے' دونوں ہی کی نگرانی کی وجہ سے اندر سے کبھی باہر' اور باہر سے کبھی اندر مسلسل آمد و رفت جاری رکھنے پر مجبور ہونا پڑا' بیان کیا جاتا ہے' کہ آمد و شد کے اسی سلسلہ میں حافظ صاحب گڑھی کے باہر کھلے میدان میں گڑھی کی طرف رخ کئے کھڑے تھے۔ اب واللہ اعلم چاہے کہ مجاہدین کا فوجی افسر یہی ہے یا بے جانے انگریزی فوج کے کسی سپاہی نے گڑھی کی فصیل کہئے یا دیوار پر سے تاک کر ایک ایسی گولی چلائی کہ بقول مولنا طیب صاحب

"گولی ناف پر پڑی"

مولنا عاشق الٰہی کی روایت میں ہے کہ "گولی زیر ناف" لگی تھی' بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ سینے پر نشانہ لگایا گیا تھا۔ ٹھیک نشانہ پر تو گولی نہ بیٹھی۔ اور ناف یا زیر ناف پہنچکر حافظ شہید کے شکم مبارک میں (تذکرہ صفحہ ۱۲)
اتر گئی۔ مولنا طیب کی روایت میں ہے کہ گولی لگنے کے ساتھ ہی

"حضرت (حافظ شہید) اکدم اچھل کر زمین پر گر پڑے"

اتنا ہوش اس وقت بھی باقی تھا کہ گرتے ہوئے اس حد تک سنبھال لیا کہ دیکھنے والوں نے دیکھا'
(جیسا کہ مولنا طیب کی روایت میں ہے کہ)

"بہ ہیئت تشہد زمین پر بیٹھے ہیں"

یہ بھی اسی روایت میں ہے کہ اس وقت یہ بھی دیکھا گیا کہ وہ قبلہ رخ ہیں' جیسے کسی نے نماز کے قعدہ میں آپ کو بٹھا دیا ہے" صک جہادی مقالہ

آس پاس جو لوگ کھڑے تھے دوڑ پڑے۔ بیان کیا جاتا ہے' کہ اس وقت بھی اس زخم خوردہ بندۂ حق کی زبان سے جو پہلا فقرہ نکلا وہ یہی تھا کہ

"مجھے مسجد لے چلو' مسجد لے چلو"

نماز کے قعدہ کی ہیئت میں بیٹھے ہیں، اور آرزو صرف اس کی ہے کہ مسجد (سجدہ کی جگہ) تک پہنچا دو شاعر نے صرف شعر کہا تھا کہ

سر بوقت ذبح میراں کے زیر پائے ہے

لیکن کر کے دکھانے والا اسی کو آج کر کے دکھانا چاہتا ہے۔ اس کے دل کی آخری تمنا صرف یہی ہے مولنا عاشق الٰہی نے تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ "حافظ شہید" نے حضرت ملا گنگوہی کو شاملی کو جہاد کے موقعہ پر باصرار یہ وصیت کی تھی کہ

"میاں رشید میرا دم نکلے تو تم میرے پاس ضرور ہونا"

واللہ اعلم مولنا گنگوہی بھی ان لوگوں میں شریک تھے۔ جو حافظ شہید کے گولی کھانے کے بعد ان کی طرف دوڑ پڑے، یا امیر الجیش کے زخمی ہونے کی خبر آگ کی طرح مجاہدوں میں قدرتاً جب پھیلی اس وقت آپ مطلع ہوئے، کچھ بھی ہوا ہو، مگر جیسا کہ مولنا عاشق الٰہی صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے "مسجد لے چلو، مسجد لے چلو" کے حکم کی تعمیل کا موقعہ سب سے پہلے مولنا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو نصیب ہوا، تذکرۃ الرشید میں ان کے الفاظ ہیں کہ

"حافظ صاحب کا زخم سے چور ہو کر گرتا تھا، اور امام ربانی (حضرت گنگوہی) کا لپک کر تڑپتی نعش کو کاندھے پر اٹھانا، قریب کی مسجد میں لائے، اور حضرت (حافظ شہید) کا سر اپنے زانو پر رکھ کر تلاوت (قرآن) میں (مولنا گنگوہی) مصروف ہو گئے" ص۳۰۵

آگے ان ہی مولوی عاشق الٰہی نے یہ لکھتے ہوئے کہ "دیکھنے والوں سے سنا ہے" آئندہ کی سرگذشت کو ان الفاظ میں جو درج کیا ہے کہ

"حضرت مولنا (گنگوہی) کی اس مردانگی پر تعجب تھا کہ کس اطمینان کے ساتھ سنسان مسجد میں تنہا بیٹھے ہوئے اپنے نور دیدہ چچا (پیر) کے سفر آخرت کا سماں دیکھ رہے ہیں اور اپنے عاشق اور محبوب کے نزع کا آخری وقت نظارہ کر رہے تھے۔ آنکھوں میں آنسو تھے اور زبان پر کلام اللہ۔ یہاں تک کہ حافظ (شہید) رحمۃ اللہ علیہ کا آپ (یعنی مولنا گنگوہی) کے

زانو پہ سر رکھے رکھے وصال ہوگیا ۔ ؎۱

اس بیان میں "تنہا بیٹھے ہوئے" کے الفاظ کچھ عجیب معلوم ہوتے ہیں ۔ امیر الجیش کا زخمی ہونا ، یقیناً ایسا واقعہ نہیں ہو سکتا ، جو آس پاس کے مجاہدوں کی توجہ کو اپنی طرف منعطف نہ کراتا ، خود مولنا عاشق الٰہی صاحب کا یہ فرمانا کہ "دیکھنے والوں سے سنا ہے" اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کے دیکھنے والے ایک سے یقیناً زیادہ افراد تھے ۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے دیکھنے والے مسلمان مجاہد تھے جن کا امیر زخموں سے چور ہے ، خون میں شرابور ہے ۔ لیکن وہ صرف دیکھتے رہے ۔ اور اس کی توفیق کسی کو نہ ہوئی کہ جب حافظ شہید کے خستہ و نزار جسد مبارک کو حضرت گنگوہی اپنے کندھے پر اٹھا کر مسجد لے جا رہے تھے ۔ ان کا ساتھ دیتے ۔ حافظ شہید تو حافظ شہید ہی تھے جیش کے امیر بھی تھے ۔ ایسے موقعہ پر عام انسانی فطرت ہے کہ لوگ دوڑ پڑتے ہیں ۔ دیکھنے والوں کی یہ غیر فطری سنگدلی میری سمجھ میں نہیں آتی ، اسی لئے میرا خیال ہے کہ مولنا عاشق الٰہی مرحوم سے بظاہر واقعہ کی تعبیر میں کچھ مسامحت ہوئی ہے ، اور حافظ شہید جب مسجد میں لائے گئے ہیں ۔ اس وقت کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ حضرت گنگوہی تنہا مسجد پہنچے ہوں ۔ لیکن واقعہ کے ان "دیکھنے والوں" میں مسجد تک پہنچنے والے کون کون لوگ تھے ، ان ناموں کی تفصیل کا تو مجھے علم نہ ہو سکا ، تاہم اور کوئی ہو یا نہ ہو یہ ماننا بہت دشوار ہے کہ امیر الجیش کے زخمی ہو کر گر پڑنے کی خبر جب مجاہدین میں پھیلی ، تو اس کی خبر سیدنا الامام الکبیر کے گوش مبارک تک نہ پہنچی ، یا پہنچی ، لیکن دوسرے دیکھنے والے تو خبر سننے کے ساتھ دیکھنے کے لئے دوڑ پڑے لیکن ٹھیک اسی ساعت فرخ وقت سعید میں جس میں واقعہ یہ ہے کہ جیش کے امیر کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو پوری ہو رہی تھی گویا ع

کہ یارے برخورد از وصل یارے

---

؎۱ حضرت مولنا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ سے براہ راست خود فقیر نے بھی سنا ہے اور قصص الاکابر میں بھی حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بھی یہ روایت منسوب کی گئی ہے یعنی اپنے پیر و مرشد کی آخری (باقی اگلے صفحہ پر)

کا جان نواز' روح پرور تعبدی نظارہ پیش ہو رہا تھا، عین اسی مبارک گھڑی میں حضرت گنگوہی کے رفیق الدنیا والآخرۃ سیدنا الامام الکبیر نے رفاقت سے بلاوجہ اعراض کیا۔ اور زندہ ہونے کے لئے جو مر رہا تھا، اسکے بالین شہادت پر حاضر نہ ہو سکے' یا للعجب

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

خیر اس قصے کو چھوڑیئے' مولانا عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ حافظ شہید رحمۃ اللہ علیہ کو

"گولی کاری لگی' اور خون کا فوارہ بہنا شروع ہوا" ص۵۲ تذکرۃ الرشید ج ۱

فوارہ کی شکل میں خون جس کے اندر سے ابل رہا ہو۔ اس کا جو انجام ہو سکتا تھا' اسی مسجد میں وہ انجام پیش آیا۔ مولوی عاشق الٰہی صاحب کا بیان ہے کہ

"حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا آپ کے (حضرت گنگوہی) کے زانو پر سر رکھے رکھے وصال ہو گیا" ص۵۲

(گزشتہ صفحہ سے) منزلوں میں حافظ شہید رحمۃ اللہ علیہ پر ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ جس کی تعبیر خود وہی "تمنائے موت" سے کیا کرتے تھے۔ خود اس کی شرح ان الفاظ میں فرماتے کہ موت کی تمنا اس قدر غالب ہے کہ خوف ہے کہ میں خود کشی نہ کر لوں' مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں بھی اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید اضافہ یہ بھی ہے کہ "شوق شہادت کا یہ عالم تھا کہ خود فرماتے تھے کہ میرے قریب کوئی ہتھیار یا چھری چاقو نہ رہے۔ کہیں اپنی مغلوب الحالی میں خود کشی نہ کر لوں" ص۵ حافظ محمد احمد صاحب فرماتے تھے کہ رات کو جس حجرے میں ہمیشہ سوتے اور ذکر و فکر تہجد وغیرہ پڑھتے تھے۔ اس حجرے میں ممانعت تھی کہ کوئی آلہ جارحہ نہ رہ جائے۔ اندیشہ اسی کا تھا کہ غلبہ حال میں خدا جانے کیا کر بیٹھیں۔ حضرت حکیم الامت یہ بھی فرماتے تھے کہ اس حال پر "ولایت کی بشارت بھی حافظ شہید کو ملی تھی' جب انہوں نے خود اس حال کو خلاف سنت ٹھہراتے ہوئے خوف کا اظہار کیا تھا' سمجھایا گیا تھا کہ موت کی تمنا مصیبت اور تکلیف کے موقعہ پر ممنوع ہے' لیکن لقاء اللہ کی آرزو میں موت کی تمنا ولایت کی دلیل ہے' یہی اقتضاء النص ہے قرآنی آیت ان زعمتم انکم اولیاء للہ من دون الناس فتمنوا الموت کا۔ خاکسار نے بھی حیدرآباد کے غیر مشہور بزرگ مولانا محمد حسین رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا تھا جن پر اسی "تمنائے موت" کی حالت طاری تھی۔ فرماتے تھے کہ خود کشی کے جواز کی کوئی شکل نکل آتی تو اپنا خاتمہ کر دیتا' اس فقرے کو اتنے جوش و خروش' نشاط و سرور سے معمور ہو کر ادا فرماتے کہ تھوڑی دیر کے لئے سننے والوں میں بھی موت کی تمنائے مسرت افزا پیدا ہو جاتی تھی" ۱۲

یہ عجیب بات ہے کہ حافظ شہید کی شہادت کے بعد اسلامی دستور کے مطابق جیسا کہ چاہیے تھا کسی دوسرے امیر کا انتخاب مجاہدین کے جتھے سے کر لیا جاتا، خصوصاً جب مولنا طیب صاحب کی یادداشت سے نقل بھی کر چکا ہوں، کہ تحصیل کے کواڑ کو جلا دینے کے بعد مجاہدوں کو گڑھی کے اندر گھس کر دست بدست جنگ کا مغتنم موقعہ بھی میسر آ گیا تھا۔ اور بقول ان ہی کے اس دست بدست جنگ میں

"پانسہ مجاہدوں کے حق میں پلٹ آیا، انگریزی فوج کو شکست ہوئی، تحصیل شاملی پر مجاہدوں کا قبضہ ہوگیا" ص۵۲

گو بظاہر صرف ایک آدمی خواہ وہ امیر الجیش ہی کیوں نہ ہو، اسکی شہادت کی وجہ سے اس جیتی ہوئی جنگ کے میدان کو چھوڑ کر مجاہدوں کے پراگندہ، یا تتر بتر ہونے کی کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی۔

لیکن بیان کرنے والے جو کچھ بیان کرتے ہیں اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے، کہ حافظ شہید رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کے ساتھ ہی مجاہدوں کی ہمت کچھ چھوٹ گئی، ان میں فشلؔ اور بددلی کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ "فوجی ازل" کے زوال سے اس زمانہ میں فوجیوں کی جس نفسیاتی کیفیت کی تعبیر کی جاتی تھی، گویا سمجھنا چاہیے کہ کچھ اسی قسم کا حال ان پر بھی طاری ہوگیا۔ عموماً فوج کے کسی غیر معمولی افسر کے کام آجانے کے بعد ہی یہ صورت پیش آتی ہے۔ بظاہر خیال گذرتا ہے کہ حافظ شہید کے وجود باجود کا مجاہدوں کے حوصلوں اور ولولوں سے بھی شاید کچھ اسی قسم کا تعلق تھا۔ مولنا طیب صاحب نے اپنی یادداشت میں جو یہ خبر دی ہے کہ

"اس خبر یعنی حافظ شہید کی شہادت کی خبر نے مجاہدوں کی کمر توڑ دی، اور وہ امید جو مجاہدوں کی مشعل راہ تھی ٹوٹ گئی جس سے قلوب میں کم دہبری کی کیفیات پیدا ہوگئیں" ص۵۲

ایسے موقعہ پر اپنے آدمیوں کو پراگندگی اور انتشار سے بچاتے ہوئے باہر نکال لینا ہی سب سے بڑا فوجی کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ حافظ شہید کے بعد مجاہدین کے اس جتھے کی ذمہ دار ہستیوں کے

---

لہ فشل کا یہ لفظ قرآن سے ماخوذ ہے، سورۃ الانفال میں یہ فرماتے ہوئے کہ جب مسلمانوں کی مٹ بھیڑ (باقی اگلے صفحہ پر)

کے سامنے سب سے بڑا اہم سوال یہی ہوگا۔ جہاں تک واقعات سے پتہ چلتا ہے، اس نازک موقعہ پر نزاکت کا صحیح اندازہ کیا گیا، جس طرح بھی ممکن ہوا شکستہ خاطر فاتح مجاہدوں کو کامیابی کے ساتھ باہر نکال لینے میں وہ کامیاب ہوئے۔ مولوی عاشق الٰہی نے حضرت گنگوہی کے متعلق لکھا ہے کہ حافظ شہید کی آخری سانس جب ان کے زانو پر پوری ہوئی تو لہو سے لت پت، خون سے شرابور جسد مبارک کو اپنے زانو سے ہٹا کر انہوں نے لکھا ہے کہ

"باطمینان اٹھ کھڑے ہوئے" ص۵۸

"اطمینان" کی کیفیت کا ایسے مواقع میں دلوں کے اندر باقی رہ جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ بہرحال کہنے والے اب خواہ کچھ ہی کہیں۔ لیکن میں کیا کروں۔ تحصیل شاملی کا یہ واقعہ جو اپنے قالب کے لحاظ سے مختصر اور معمولی معلوم ہوتا ہو۔ لیکن ہاتھی کی سونڈ کو جس نے نہیں دیکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ مچھر کے سونڈ کو دیکھ کر اس کا خیال جا سکتا ہے۔ ملاقات کے کمروں کی میز پر تاج محل کی عمارت کے نمونے آج کل جو رکھے جاتے ہیں۔ یقیناً وہ تاج محل تو نہیں ہوتے۔ لیکن نمائندگی تو تاج محل ہی کے روضہ کی کرتے ہیں، بہرحال دل میں جو بات ہے اسے کھل ہی کر کیوں نہ کہہ دوں۔ خواہ اسے میرا ذاتی مالیخولیا ہی کیوں نہ ٹھہرایا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ انسانی کے جس مقدس دور کی نگینیوں میں جذب و فنا ہونے ہی کو جن لوگوں نے اپنی ہستی کا آخری نصب العین قرار دیا تھا، ان کو شاملی کے اس چھوٹے سے سریہ میں اس عہد پاک کے اہم معرکوں کا خواہ کسی پیمانے پر سہی مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید مشاہدہ اور تجربہ کرایا گیا تھا، ذرا سوچئے گڑھی سے باہر والے میدان میں انگریزی فوج کے باضابطہ تعلیم یافتہ فوجیوں کے مقابلہ میں جو اس زمانہ کے جدید افرنگی اسلحہ سے لیس تھے ان ہی کے مقابلہ میں جو کامیابی اور فتح کی مسرت ہوئی اگر بدر کے

(گزشتہ صفحہ سے) کسی بتھے سے ہو، تو ثبات و استقلال کے ساتھ ذکر اللہ میں مشغول ہیں۔ اسی کے بعد اطاعت اور ہم آہنگی کو کامیابی اور فتح کی کلید قرار دیتے ہوئے حکم دیا گیا ہے کہ واطیعوا اللّٰہ والرسول ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم (اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ آپس میں جھگڑو مت، ورنہ بزدل ہوجاؤ گے اور ہوا تمہاری اکھڑ جائے گی۔)

تاریخی معرکہ کی تصویر اس میں جھلکتی ہو' اور قلعہ بند ہونے کے بعد احد کا نقشہ ان لوگوں کے سامنے پیش ہو گیا' جو کھلے میدان میں قلعہ بند سپاہیوں کی بندوقوں کی گولیاں کھا کھا کر گر رہے تھے۔ پھر گڑھی کا پھاٹک جب توڑا اور اکھاڑا گیا' اس وقت "خیبر" کے قلعہ کا دروازہ اکھاڑنے والوں کی یاد تازہ ہو جائے۔ یا دیو پیکر انگریزی فوج کا سپاہی جیسا کہ عرض کر چکا ہوں' جب دو پارہ ہو کر گرا' تو دماغوں میں عرب کے اس سورما کا خیال اگر گھوم جائے جو ٹھیک اسی طرح دو ٹکڑے ہو کر خندق کے کنارے تڑپ رہا تھا۔ اب خواہ اسے خوش اعتقادی ہی کیوں نہ قرار دیا جائے لیکن جس رنگ میں واقعات پیش آئے۔ قدرتاً ذہنی انتقال میں ان ہی سے مدد مل رہی ہے۔ اپنے اس اضطراری احساس کا کیا کروں' آخری انجام مجاہدوں کی جدوجہد کا شاملی کے میدان میں جو ہوا۔ بظاہر ہزیمت شکست کے سوا اسے اور کیا سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن عہد سعادت میں موتہ کے میدان میں جو واقعہ پیش آیا' یعنی یکے بعد دیگرے اسلامی لشکر کے افراد شہید ہوتے چلے جا رہے تھے' پہلے حضرت زید' پھر جعفر طیار' پھر عبداللہ بن رواحہ شہید ہوئے۔ آخر میں خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جھنڈا اٹھایا' مگر با ایں ہمہ میدان جنگ کے چھوڑنے پر مسلمانوں کو مجبور ہونا پڑا تھا' گر باوجود پسپائی کے چونکہ ابتری و پراگندگی سے بچاتے ہوئے دشمنوں کے نرغہ سے ان مسلمانوں کو حضرت خالد باہر نکال لینے میں کامیاب ہو گئے تھے' ان کی اسی کامیابی کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ففتح لہ (بخاری) | پس فتح خالد بن ولید کی ہوئی

جس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ کبھی کبھی پسپائی بھی بجائے ہزیمت اور شکست کے "فتح و ظفر" قرار پانے کی مستحق ہوتی ہے۔ عہد نبوت کے اسی نمونہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے شاملی کے میدان سے تھانہ بھون کے مجاہدوں کی واپسی میں جنگ موتہ کی پسپائی کی جھلک محسوس ہو' تو آخر اس احساس کو قطعاً بے بنیاد ٹھہرانے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

آخر خود سوچئے' مجاہدین کی امنگیں مردہ ہو چکی ہیں' دلولے پست ہو چکے ہیں' غنیم کی فوج

انتقامی جذبات میں بھری ہوئی۔ ان کے پیچھے ہے لیکن اس قیامت خیز وقت میں جیساکہ مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ مولنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حافظ شہید کی لاش کو چارپائی پر ڈال کر

"یکے بعد دیگرے تھانہ میں سمت مغرب، زمین کی گود کے حوالہ کیا" ص۲

جس کا مطلب یہی ہوا کہ مجاہدین کی یہ واپسی اس شان میں ہو رہی تھی کہ اپنے شہید امیر الجیش کے جسد مبارک کو چارپائی پر ڈالے، تعاقب کرنے والے دشمنوں سے مقابلہ و مقاتلہ کرتے لڑتے بھڑتے تھانہ بھون تک پہنچ گئے، ایسی صورت میں مجاہدوں کی اس پسپائی کو بھی اگر فتح قرار دیا جائے، تو واقعہ جس رنگ میں پیش آیا ہے شائد اس کے لحاظ سے یہ دعوی بے جا نہ ہوگا۔

جو روایت حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی خاکسار تک پہنچی ہے، اسی میں یاد آتا ہے، کہ اسی واقعہ کا ذکر فرماتے ہوئے حافظ صاحب نے فرمایا تھا کہ جس وقت مجاہدین حافظ صاحب کے جنازے کو لے کر تھانہ کے قریب پہنچے، خبر ان کی شہادت کی تھانہ پہلے ہی سے آچکی تھی، ہر گھر میں کہرام مچا ہوا تھا، قصبہ سے باہر نکل کر جنازے کے استقبال کے لئے باچشم گریاں، و قلب بریاں حاجی امداد اللہ دوسروں کے ساتھ انتظار میں کھڑے تھے۔ عاشق کا جو جنازہ مجاہدین کے کندھوں پر دھوم سے چلا آرہا تھا، جوں ہی کہ حاجی صاحب کی نظر پڑی، بے ساختہ چیخ نکل گئی، اور اسی حال میں یہ فقرہ ان کی زبان پر جاری ہوا۔

"جس کے لئے یہ سب کچھ ہوا، وہ بات پوری ہو گئی، دیکھنا قصہ بھی ختم ہو گیا"۔

صحیح الفاظ یاد نہیں رہے، بطور روایت بالمعنی کہہ سکتا ہوں کہ حاصل یہی تھا۔ مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں اسی موقعہ پر یہ فقرے جو پائے جاتے ہیں، یعنی مجاہدین کی اس آخری پسپائی کے ذکر کو ختم کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"پابندان اسباب و وسائل نے تو شکست پر محمول کیا۔ اہل عارفین اور ارباب باطن نے اپنے غیبی ادراک سے بتایا کہ اس جہاد کا آخری نقطہ حافظ صاحب شہید کی شہادت تھی، تکمیل مقصد کے بعد مبادی کی گرم بازاری ختم ہو جاتی ہے، اس لئے حضرت شہید کی شہادت پر یہ سارا

ہنگامۂ رست وخیز ختم ہوگیا۔ مٹ
میری روایت کے اجمال کی گویا یہ تفصیل ہے۔

گویا تکوینی طور پر جہاد کے اختتام کا آخری نقطہ حضرت شہید کی شہادت تھی۔ جیسا کہ تشریعی اور اجتہادی طور پر اس جہاد کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ تھا۔ وہ رہا اور اختتام جہاد پر بھی اس مقصد میں کوئی فرق نہ آیا۔ بلکہ امن وسکون اور انقلاب کے بعد بھی اعلائی جذبات دوسرے رنگ میں نمایاں ہوتے رہے۔

بہرحال حافظ صاحب مرحوم سے فقیر نے جو کچھ سنا اور مولانا طیب صاحب نے جو کچھ ارقام فرمایا ہے سال سب کا یہی ہے کہ عالم تدبیر[1] میں واقعہ خواہ جس رنگ اور اسباب وعلل کے جن پردوں سے بھی گذر کر رونما ہوا ہو، لیکن عالم تقدیر کے جو محرم اسرار تھے ان پر کھولا گیا تھا کہ تمنائی موت کا جذبہ جس میں ابھارا گیا تھا، اسی کی تمنا نے تھانہ بھون کے اس طوفان کو پیدا کیا تھا۔ تمنا کرنے والے کی تمنا جب پوری ہوگئی تو طوفان بھی تھم گیا۔ یہی راز تھا جس کا افشا روفور حزن وغم میں ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ اسباب وعلل کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہماری عقول کے لئے شاید اس قسم کی غیبی اطلاعیں چنداں قابل لحاظ نہ ہوں، مگر اسی سلسلہ میں ایک واقعہ جو تواتر کے رنگ میں اگلوں سے پچھلوں تک پہنچا ہے یعنی کہا یہ جاتا ہے کہ "زدوبرد" "بزن وبکش" کے ان ہنگاموں میں جو شاملی میں برپا تھے سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کو بھی گولی لگی تھی، اپنی جہادی یادداشت میں مولنا طیب صاحب نے بھی لکھا ہے۔

---

[1] حضرت الاستاذ الامام الکشمیری عالم تدبیر وعالم تقدیر کے اس تعلق کو مثالوں سے سمجھایا کرتے تھے، فرماتے کہ مقصود مثلاً آم کا پھل ہوتا ہے۔ اسی تقدیری فیصلہ کو قدرت عالم تدبیر میں صرف ظاہر کرتی ہے کہ گٹھلی سے کلے پھوٹتے ہیں، جڑ نکلتی ہے، شاخیں پیدا ہوتی ہیں۔ بالآخر ایک تناور درخت ہمارے سامنے آتا ہے۔ تنے ڈالیوں، شاخوں سے گذرتے ہوئے جو اصل مقصود تھا یعنی آم کا پھل نمودار ہوتا ہے۔ یا فرماتے کہ تقدیری فیصلہ ہو چکا تھا کہ زمین کا خلیفہ آدم علیہ السلام کو بنایا جائے گا لیکن ظہور اس فیصلہ کا اس رنگ میں ہوا کہ سجدہ کا حکم فرشتوں کو دیا گیا۔ ابلیس نے انکار کیا ملعون ٹھہرایا گیا آدم کو حوا کے ساتھ جنت میں رہنے کا حکم اس شرط کے ساتھ دیا گیا کہ شجرہ (خاص قسم کا درخت) سے دور رہیں گے۔ مگر خدا کے اس حکم کی تعمیل نہ کر سکے تب حکم دیا گیا کہ زمین پر اتر جاؤ۔ یوں خلافت کا تقدیری فیصلہ سامنے آیا۔

"اسی سلسلہ میں حضرت (نانوتوی) کو بھی گولی لگی تھی، اور وہ بھی پٹ پڑی پر، جو انتہائی نازک مقام ہوتا ہے، اس سے ڈاڑھی کے کچھ بال بھی جل گئے، لوگوں نے سمجھا کہ شہید ہو گئے، مگر ایک دم ہمت سے اٹھے، اور چہرے پر ہاتھ پھیرا، تو ایسا تھا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں" ص

اسی واقعہ کا تذکرہ مولوی عاشق الٰہی صاحب نے تذکرۃ الرشید میں بایں الفاظ کیا ہے کہ

"حضرت مولانا قاسم العلوم ایک مرتبہ یکایک سر پکڑ کر بیٹھ گئے، بعض نے دیکھا کنپٹی پر گولی لگی، اور دماغ پار کر کے نکل گئی"

مزید اضافہ ان کے بیان میں یہ ہے کہ

اعلیٰ حضرت (مراد حضرت مولانا گنگوہی سے ہے) انہوں نے لپک کر زخم پر ہاتھ رکھا اور فرمایا "کیا ہوا میاں"

مولوی عاشق الٰہی لکھتے ہیں کہ اس کے بعد

"عمامہ اتار کر سر کو جو دیکھا، کہیں گولی کا نشان نہ ملا، اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر" ص

مولانا طیب اور مولانا عاشق الٰہی کی تو خیر سنی ہوئی روایت ہے لیکن ان سماعی روایتوں کے ساتھ ہم اپنے مصنف امام حضرت مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب میں بھی یہ پاتے ہیں، فرماتے ہیں کہ

"ایک بار گولی چل رہی تھی، یکایک سر پکڑ کر بیٹھ گئے، جس نے دیکھا جانا گولی لگی۔ ایک بھائی دوڑے، پوچھا کیا ہوا، فرمایا کہ سر میں گولی لگی، عمامہ اتار کر سر کو جو دیکھا، کہیں گولی کا نشان نہ ملا، اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر" ص

ہمارے مصنف امام نے جیسا کہ اس وقت کا اقتضاء تھا، اس کی تصریح تو نہیں کی ہے کہ یہ واقعہ کہاں کس موقعہ پر کیسے پیش آیا، لیکن ظاہر ہے کہ شاملی کے میدان ہی کے اسی واقعہ کا ذکر کر رہے ہیں، جس کا تذکرہ مولانا طیب اور مولوی عاشق الٰہی نے کیا ہے، میں نہیں سمجھتا کہ مصنف امام کی شہادت کے بعد،

واقعہ میں شک کی گنجائش ہی کیا باقی رہتی ہے، ان کے بیان میں "ایک بھائی" سے مراد حضرت مولانا گنگوہی ہیں۔ جن کے نام کی تصریح مولوی عاشق الٰہی نے کی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ مولانا طیب اور مولانا عاشق الٰہی نے تو صرف ایک ہی واقعہ کی حد تک اپنے بیان کو اس سلسلہ میں محدود رکھا ہے۔ لیکن ہمارے مصنف امام نے اس واقعہ کے سوا یہ بھی لکھا ہے کہ

"انہیں دنوں ایک نے متعدد دفعہ بندوق ماری جس کے سینچے سے ایک مونچھ اور ڈاڑھی (مولانا نانوتوی) کی جل گئی، اور کچھ قدرے آنکھ کو صدمہ پہنچا، اور خدا جانے گولی کہاں گئی، اور اگر گولی نہ تھی تو اتنے پاس سے سینچے ہی بس تھا، مگر حفاظت الٰہی بر سر تھی کچھ اثر نہ ہوا"[1]

جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ غدر ہی کے زمانہ میں یہ دوسرا حادثہ بھی سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ پیش آیا تھا۔

بہر حال حاصل یہی ہے کہ گولی کھانے کے بعد جو کچھ ہونا چاہئے تھا وہ نہ ہوا۔ یہی لوگوں کا مشاہدہ ہے، اب اس کی توجیہ کچھ بھی کی جائے۔ خواہ سیدنا الامام الکبیر کے باطنی تصرف کا نتیجہ اس کو ٹھیرایا جائے جیسا کہ مولانا طیب صاحب کی روایت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ یا حضرت مولانا گنگوہی کی توجہ کو اس میں دخیل مانا جائے، جس کی طرف مولانا عاشق الٰہی کے بیان میں ایما کیا گیا ہے۔ اب خواہ اسباب کچھ بھی ہوں۔ لیکن واقعہ بہر حال پیش آیا، سوال یہی رہتا ہے، کہ حافظ شہید کے ساتھ بھی اسی طرز عمل یا معالجہ

[1] گولی لگنے کے بعد حضرت والا کے محفوظ رہنے اور محض قدرے خون نکل آنے اور داڑھی مونچھ کے کچھ بال اڑ جانے پر بس ہو جانے کے ظاہری سبب کے بارہ میں مختلف روایتیں بیان کی گئی ہیں۔ مصنف امام کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ گولی کا بے اثر ہو جانا خود حضرت شیخ الاسلام کی کرامت تھی۔ میں نے اپنے متعدد بزرگوں سے سنا کہ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ نے حضرت والا کو فدا شدہ مزاج آزاد اور جوش جہاد میں جان سے قطعاً بے پرواہ دیکھ کر جہاں مولانا محمد منیر صاحب کو ان کے پیچھے بطور محافظ رہنے پر مامور کیا، وہیں ایک تعویذ بھی دیا کہ اسے پگڑی میں رکھیں۔ بعض ثقات سے مسموع ہوا کہ حضرت حافظ صاحب شہید نے انگلی سے اپنا لعاب دہن پیشانی پر لگا دیا تھا۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب نے اس سلسلہ میں حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے تصرف کی طرف ایما کیا ہے۔ بہر حال روایات مختلف ہیں۔ لیکن ان میں نہ تعارض ہے نہ ان میں سے کسی روایت کے انکار کی ضرورت۔ حاصل یہ نکلتا ہے کہ حضرت والا کے بڑے اور ہم عصر دوست سب ہی ان کی طرف متوجہ اور ان کی طرف سے فکر مند تھے اور چاہتے تھے کہ خصوصیت سے وہ محفوظ رہیں (باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

کی باطنی تدبیر کے اختیار کرنے میں کون سی چیز مانع تھی' جراحی یا دوسرے عام طبی ذرائع کی تو مجاہدین کے اس بے سروسامان بے نوا جتھے کی طرف سے مہیا ہونے کی صورت ہی کیا تھی' لیکن سیدنا الامام الکبیر کے متعلق دیکھنے والوں نے جو کچھ دیکھا' حافظ شہید کے ساتھ بھی چاہا جاتا تو یہی کر کے دکھایا جا سکتا تھا' یقیناً یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور شہید کے جنازے پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ جس راز کا افشا حضرت حاجی صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے ہو گیا اس کے سوا آپ ہی سوچئے کہ معقول جواب اس سوال کا اور کیا ہو سکتا ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ مرنے ہی کے لئے جو تڑپ رہا تھا' برسوں سے تڑپ رہا تھا' موت ہی کو جو اپنا مطلوب بنا چکا تھا جب اپنی اسی تمنا اور آرزو سے ہم آغوشی کا موقعہ اس کے سامنے آیا تو شاید اس میں خلل اندازی اگر بدبختی نہیں' تو سوء ادبی ضرور تھی' اسی موقعہ پر نہیں' تاریخ کے مختلف قرون و ادوار میں اسی قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو کر حقیقت کی یافت سے لوگ محروم رہے ہیں[1]۔

خلاصہ یہ ہے کہ جینے کے لئے جو جیتے ہیں' اور مرنے کے لئے مرتے ہیں' ان کی حیات و موت کے قصوں کو مجرمانہ مغالطہ ہوگا' اگر ان لوگوں کی حیات و موت سے ناپا اور جانچا جائے' جو جیتے بھی ہیں'

---

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ) کیونکہ ان کے علم و فضل اور قوت باطنی سے آئندہ کے بہت سے دینی و علمی جہات کی تکمیل محسوس کر رہے تھے۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کے ہجرت فرمانے کے وقت جب یہ دونوں خلیفہ (حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی) آخری طور پر ملنے کے لئے پنجلاسہ (پنجاب) پہنچے اور اصرار شروع کیا کہ حضرت ہم بھی آپ کے ساتھ اس ملک سے ہجرت کرنا چاہتے ہیں اور ہمیں بھی ساتھ ہی لے چلئے تو شیخ نے فرمایا کہ نہیں تم ہندوستان ہی میں رہو تم سے حق تعالیٰ کو بہت کچھ کام لینا ہے۔ محمد طیب غفرلہ

[1] مثلاً کربلا کے تاریخی حادثہ ہی کو دیکھئے۔ حق و باطل کی کشمکش میں بظاہر دیکھا گیا کہ باطل ہی کا سر اونچا ہوا' امام حسین رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اور یزیدی کامیاب ہوئے۔ لیکن اب یہ کون بتائے کہ ایک دفعہ نہیں' تین تین دفعہ کلی تخلیہ کر کے جو کچھ اس کے پاس تھا' اللہ کی راہ میں لٹا چکا تھا' کربلا میں رو کنے کے باوجود وہ کس آرزو اور تمنا کے ساتھ کس کے سامنے آیا تھا' ایمان والوں سے ان کے اموال و انفس جو خرید چکا ہے۔ اگر خریدنے والے کے سپرد اس کے خریدے ہوئے اموال و انفس کو بیچنے والے کر رہے ہوں تو خرید و فروخت کے معاملہ میں بتایا جائے کہ اندھیر ناہی کیا ہے۔ بہرحال جن کے بڑوں نے کربلائی مشاہدات پیش کئے' ان ہی کے چھوٹوں کی طرف سے شاملی کے میدان میں جو کچھ دکھایا گیا اس پر تعجب کیوں کیا جائے۔ ۱۲

توکسی مقصد کے لئے، اور مرتے بھی ہیں، تو اس سے بھی کسی نصب العین ہی کی تکمیل مقصود ہوتی ہے، سیدنا الامام الکبیر زندہ رکھے گئے، کہ جس مقصد کے لئے ان کی زندگی تھی ابھی وہ سامنے نہیں آیا تھا، اور حافظ شہید اٹھا لئے گئے کہ جس لئے وہ جی رہے تھے ان کی وہی تمنا بے نقاب ہو کر ان کے سامنے آچکی تھی، میں بہت دور نکلا جا رہا ہوں، مجھے واقعہ کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔

مولوی عاشق الٰہی کی اطلاع کے مطابق میدان کارزار سے دوش بدوش ادلتے بدلتے تھانہ بھون تک شہید کی لاش پہنچا دی گئی۔ شہید ہونے کی وجہ سے شرعاً نہ کفن ہی کا سوال تھا، اور نہ غسل کا، نماز پڑھ دی گئی اور قصبہ کے باہر غالباً جہاں پر حافظ شہید کا جنازہ اتارا گیا تھا، زمین کھود کر ان کو سپرد خاک کر دیا گیا، اب بھی بیری کے ایک درخت کے پاس خام قبر شہید کی موجود ہے جس پر فاتحہ پڑھنے کی سعادت فقیر کو بھی حاصل ہوئی ہے۔ وہ چاہیں یا نہ چاہیں لیکن ان کے لئے نہیں لوگ اپنے لئے ان پر فاتحہ پڑھنے کے عادی ہیں[۱]۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ مولنا طیب صاحب اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں کہ

"ادھر حضرت (حافظ شہید) کی شہادت ہوئی، اور ادھر دہلی سے خبر آئی کہ بادشاہ دہلی گرفتار ہو گئے اور دلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا!" صث

دلی کے آخری بادشاہ کی گرفتاری، اور زوال اقتدار کے بعد دلی پر انگریزوں کا دوبارہ انتقامی اقتدار و قبضہ کیا تھا، ہندوستان کے لئے عموماً اور مسلمانوں کے لئے خصوصاً قیام قیامت سے پہلے جاننے والے جانتے ہیں کہ گویا قیامت قائم ہو چکی تھی۔

ان ناقابل بیان، جاں گداز، روح فرسا، ہوش ربا واقعات کی تفصیل سے تاریخ کے خونیں اوراق

---

[۱] کشف قبور رکھنے والے صاحب دل کے لطیفہ کا ذکر کر چکا ہوں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا شہداء کے متعلق کچھ اسی قسم کا نقطہ نظر تھا اسی لئے جنازے کی نماز کی بھی شہید کے لئے ضرورت نہیں سمجھتے تھے لیکن حدیثوں میں جب آیا ہے کہ جنازہ کی نماز کا فائدہ پڑھنے والوں کو بھی حاصل ہوتا ہے۔ مغفرت کی بشارت بعض جنازے کی نماز پڑھنے والوں کو دی گئی ہے اور پڑھنے والوں کیلئے اجر و ذخر صاحب جنازہ بنتا ہے۔ یہی میرا مطلب ہے کہ فاتحہ پڑھنے والوں کی غرض بھی کچھ یہی ہو سکتی ہے حنفی مذہب میں شہیدوں پر بھی جنازے کی نماز اسی لئے پڑھی جاتی ہے کہ پڑھنے والوں کا اس میں فائدہ ہے۔ ۱۲

لب ریز ہیں۔ کچھ نہیں اردوئے معلّٰی غالب مرحوم کے خطوط کا جو مشہور مجموعہ ہے۔ صرف اسی کتاب کے چند خطوط کے بعض فقروں کا پڑھ لینا کافی ہے۔ دلی میں بیٹھ کر شاہی خاندان کو جس حال میں غالب نے پایا تھا، اس کے ان فقروں کو نقل کرتے ہوئے قلم کانپ رہا ہے۔ لکھا ہے کہ

"معزول بادشاہ کے جو بقیۃ السیف ہیں۔ وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں۔ اناث جو پیرزن ہیں وہ کٹنیاں، اور جوانیں کسبیاں" ص۳۲۳ اردوئے معلّٰی

العظمۃ للّٰہ ہوتی مسلمانوں کے دارالسلطنت کے متعلق دلی ہی میں بیٹھ کر یہ لکھتے ہوئے کہ

"جس شہر میں ہوں، اس کا نام دلی اور محلہ کا نام بلیماروں کا محلہ ہے لیکن ایک دوست بھی اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا"

آگے قسمیں کھا کر غالب ہی کی گواہی یہ بھی ہے کہ

"واللہ ڈھونڈھے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا" ص۶۵

ایک ملک سے دوسرے ملک جانے کے لئے پاسپورٹ یا پرمٹ وغیرہ کے قصے تو سنے جاتے ہیں لیکن اس وقت دلی میں دیکھا جا رہا تھا، خود مرزا غالب دیکھ رہے تھے کہ

"یہاں (دلی) باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا"

نگرانی میں تشدد اور قدغن کا حال یہ تھا،

"جو باہر کے گوروں سے آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں (تھانیدار) بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے یہاں پانچ پانچ بید لگتے ہیں، یا دو روپیہ جرمانہ لیا جاتا ہے، آٹھ دن قید رہتا ہے، اور سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کون بے ٹکٹ مقیم ہے، اور کون ٹکٹ رکھتا ہے" ص۲۱۶

کون اندازہ کر سکتا ہے ان مصائب و آلام کا کہ اپنے گھر میں بھی کوئی ٹکٹ یعنی پرمٹ کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا، اور شہر سے باہر جنگلوں اور پہاڑوں کی گھاٹیوں میں جھونپڑے ڈال ڈال کر جو پڑے ہوئے تھے ان کے متعلق بھی حسب اطلاع غالب

"کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں، جو مکان بن چکے ہیں انہیں ڈھا دو، اور آئندہ ممانعت کا حکم سنا دو" ص۲۱

اسی دلی میں جہاں مسلمانوں کا لال قلعہ اور جامع مسجد ہے، اسی کے متعلق غالب اپنے خط موسومہ دسمبر ۱۸۵۸ء میں اپنے اس احساس اور اندیشہ کو قلم بند کرتا ہے،

"دیکھا چاہیے مسلمانوں کو آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں" ص۶۶

ان ہی خطوط میں دلی کے اسی "شہر آشوب" کے متعلق غالب نے اپنی ایک ماتمی نظم کے چند اشعار کا بھی تذکرہ کیا ہے،

بسکہ فعال ما یرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جسکو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

(ص۳۰ اردوئے معلیٰ)

غالب نے جو کچھ دیکھا تھا دلی ہی میں دیکھا تھا۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ان اشعار میں درحقیقت ملک کے اکثر حصوں کی تصویر کھینچ آئی ہے، دلی اور دلی والوں پر جو کچھ گذر رہی تھی تقریباً سارے ماؤف آسیب رسیدہ علاقوں کا حال یہی تھا، اس برپا ہونے والی قیامت کے ہنگاموں سے بچ نکلنے کی ایک مختصر راہ تو یہی تھی جو حافظ شہید کو میسر آئی۔ بندوق کی گولی، صرف ایک گولی نے سارے قصوں کو صرف ختم ہی نہیں کر دیا، بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی وحی قرآنی سے علمی ربط قائم کر لینے کے بعد جو کچھ دکھایا جاتا ہے اور دیکھنے والے جو کچھ دیکھتے ہیں، ان کی نگاہوں کے سامنے سے اس جاں نواز نظارے کو کون ہٹا سکتا ہے کہ مغلوں کی حکومت ہو، یا پٹھانوں کی خلجیوں کی ہو، یا غوریوں کی، الغرض دنیا کی کوئی حکومت مشرقی ہو، یا مغربی، جباری ہو یا جمہوری، فرعونی ہو یا اشتراکی جسے مہیا نہیں کر سکتی، بلکہ مہیا کرنے کا خیال بھی نہیں کر سکتی، حافظ شہید امن و عافیت کی ان ہی لازوال راحتوں سکھ اور چین کی ان ہی نہ ختم ہونے والی

لذتوں میں زندگی گذار رہے ہیں۔ اب کیا ہوگا؟ کے نازل ہونے والے سوال کا یہ قلندری جواب تھا، جسے حافظ شہید نے اپنے مقدس اور پاک خون سے لکھ کر پوچھنے والوں کو دیا تھا۔ جسم کو چھید کر اور ہڈیوں کو توڑ کر نکل جانے والی گولیوں کی دشواریوں کو اپنے لئے حافظ شہید کی طرح جو بھی آسان بنا لے گا۔ اس کے لئے یہ قلندری راہ ہمیشہ کیلئے کھلی ہوئی ہے۔ لیکن کھانے[1] سے پہلے ہچکچانے والوں کو بھی کیسے چھوڑا جا سکتا تھا، اور کن پر چھوڑا جاتا، دینے والے نے ان ہی کے لئے یہ قربانی دی کہ گولی کھانے کی دشواریوں کو آسان بنا لینے کے بعد بھی اس قلندری راہ کو چھوڑ کر وہ واپس آگیا، ہائے اگر وہ واپس نہ ہوتا، تو جس ملک میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو باہر نکل جانے کی دھمکی دی جا رہی تھی، کون کہہ سکتا ہے کہ چلے جانے کے بعد پھر اس ملک میں وہ واپس ہو سکتا تھا، صدق مولنا الکریم

| | |
|---|---|
| من المؤمنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ فمنھم من قضی نحبہ ومنھم من ینتظر وما بدلوا تبدیلا (الاحزاب) | ان مؤمنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انھوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں سچے اترے پھر بعضے تو ان میں وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے۔ بعضے اور ہیں (شہادت کے) مشتاق ہیں اور (اب تک) انہوں نے ذرا تغیر و تبدل نہیں کیا۔ |

یقیناً جو چلے گئے وہ بھی سچے تھے، اور اپنے مالک سے جو عہد کیا تھا، اس میں پکے تھے لیکن انتظار کی سختیوں کو جھیلنے کے لئے جو رک گئے یا روک لئے گئے۔ انہوں نے بھی اپنی بات پوری کی، یہ حافظ شہید کے رفقا سیدنا الامام الکبیر اور قطب ربانی حضرت گنگوہی قدس اللہ اسرارہم وغیرہم حضرات تھے۔ بہر حال جو چلے گئے، وہ چلے ہی گئے، لیکن منتظر بنا کر جو روکے گئے، ان پر کیا گذری، جہاں تک معلوم ہو سکا ہے، اسے بھی سن لیجئے۔ مولنا عاشق الٰہی مرحوم نے تذکرۃ الرشید اور اس کے حاشیہ میں جو کچھ مصالح وقت کا خیال کر کے لکھا ہے۔ سب کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ

[1] صحاح (ترمذی ونسائی) کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ما یجد الشھید من مس القتل الا کما یجد احدکم من مس القرصۃ (یعنی قتل کی تکلیف شہید کو اس سے زیادہ محسوس نہیں ہوتی جتنی تکلیف کھٹمل مچھر وغیرہ جیسی چیزوں کے کاٹنے سے ہوتی ہے) ۱۲

شاملی کی تحصیل کے کواڑ کو توڑ کر جب گڑھی میں ملغار کر کے مجاہدین پہنچے اور دست بدست جنگ انگریزی فوج کے سپاہیوں سے شروع ہوئی تو موقع کو غنیمت دیکھ کر بعض منچلوں کا ذہن تحصیل کے خزانے کی طرف منتقل ہو گیا۔ خزانے پر بھی ہلّہ بول دیا گیا۔ اور جس وقت حافظ شہید کے جنازے کو کندھوں پر لئے ہوئے با چشم گریاں ' و دل بریاں مجاہدین کا طبقہ تھانہ بھون کی طرف جا رہا تھا ' اسی وقت ان ہی میں ملے جلے وہ لوگ بھی تھے جو تحصیل کے خزانے سے دست برد کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ یہ مال جو تحصیل کے خزانے سے لوٹا گیا تھا ' اس کا انجام کیا ہوا ؟ مستقر تھانہ کے امیر پر پیش کر کے اس کو " غنیمت " کا قالب عطا کیا گیا یا یہ لوٹا ہوا مال صرف لوٹا ہوا مال ہی ہو کر رہ گیا ' اس کا تو پتہ نہ چل سکا ' لیکن نتیجہ اس کا سب ہی کو بھگتنا پڑا۔ مولانا عاشق الٰہی کا بیان ہے کہ

" جس وقت گورنمنٹ کو اہل کاران تحصیل کے مارے جانے اور خزانے کے لوٹے جانے کی اطلاع ملی تو حاکم (غالباً مظفر نگر کا کلکٹر) شاملی پہنچا ' اور چار طرف نعشوں اور قصبہ کی ویرانی و بربادی دیکھ کر غصہ سے تھرا اٹھا "

لکھا ہے کہ غیظ و غضب کے اسی ارتعاشی حال میں زبان سے اسی انگریزی افسر کے یہ فقرہ نکلا کہ

" تھانہ بھون کو بھی اسی طرح مسمار کرا کر چھوڑوں گا " ص۷۲

اس وقت تو صرف اسی قول کو ساتھ وہ مظفر نگر واپس ہو گیا۔ لیکن جوں ہی کہ (جیسا کہ مولوی صاحب نے لکھا ہے)

" دہلی کے فتح ہو جانے کی خبر مشہور ہوئی "

ہر ایک کے سامنے اس کا قول " فعل " کی دھمکیاں تھانہ بھون والوں کو دینے لگا ' مولوی صاحب کا بیان ہے '

" تھانہ میں خبر گرم ہوئی ' کہ علی الصباح انگریزی فوج یہاں پہنچا چاہتی ہے "

تھانہ بھون کے رئیس قاضی عنایت علی تو حکومت کے نزدیک اس ہنگامہ کے بانی مبانی ہی تھے لیکن خود مولوی عاشق الٰہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے ' کہ اسی عرصہ میں یعنی شاملی کو دیکھ کر

مظفرنگر کا حاکم واپس ہوا، اور دلی کی فتح کی خبر پہنچی، اس درمیانی وقفہ میں سرکاری گوئندوں نے حکومت تک یہ خبر بھی پہنچائی، مولٰنا کے الفاظ یہ ہیں

"کہ تھانہ بھون کے فساد میں اصل الاصول یہی لوگ تھے"

یہی لوگ سے مراد تھانہ بھون کی جہادی مہم کے امیرالمومنین حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء سیدنا الامام الکبیر و مولٰنا گنگوہیؒ وغیرہم حضرات تھے۔ لکھا ہے کہ رپورٹ میں مخبری کی گئی تھی کہ

"شاملی کی تحصیل پر حملہ کرنے والا بھی یہی گروہ تھا، بستی کی دو دکانوں کے چھپر انہوں نے تحصیل کے دروازہ پر جمع کئے، اور اس میں آگ لگادی، یہاں تک کہ جس وقت آدھے کواڑ جل گئے، ابھی آگ بجھنے بھی نہ پائی تھی کہ ان نڈر ملاؤں نے جلتی آگ میں قدم بڑھائے اور بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھس کر خزانہ سرکار کو لوٹا تھا" ص ۷۵ تذکرۃ الرشید ج ۱

ادھر مخبری کی یہ کارروائی سرکار میں جاری تھی کہ حاکم مظفرنگر جو شاملی کے انتقامی غصہ کی آگ میں جل بھن رہا تھا، دلی کی فتح کی خبر سننے کے ساتھ ہی، اس کے زیر اقتدار فوجیوں کا جو دستہ تھا، اسکو تھانہ بھون

---

ل؎ جیسا کہ پڑھنے والے اندازہ کرسکتے ہیں کہ تقریباً یہ وہی بات ہے جس کی تفصیل مولٰنا طیب صاحب کی یادداشت سے پہلے نقل کرچکا ہوں، بیان میں اختلاف صرف اسی حد تک ہے کہ مولٰنا کی یادداشت میں دروازے کو باہر کی کٹیا کے چھپرے کا ذکر کیا گیا ہے جسکو نوچ کر کواڑوں کو جلانے کیلئے آگ لگادی گئی تھی، اور مولٰنا عاشق الٰہی بجائے کٹیا کے فرماتے ہیں کہ بستی کی دوکانوں کے چھپروں سے یہ کام لیا گیا، خاکسار نے حافظ محمد احمد صاحب مرحوم سے شاملی کی مہم کی جو داستان براہ راست سنی تھی۔ جہاں تک خیال آتا ہے، اس سے مولٰنا طیب صاحب ہی کی یادداشت والی روایت کے الفاظ کی تائید ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ چھپرا جو تحصیل سے باہر پڑا ہوا تھا۔ اس میں تحصیل والوں کی عام ضرورتوں کیلئے لوگ دکان بھی لگاتے ہوں۔ یوں کوئی چاہے تو دونوں روایتوں میں تطبیق بھی دے سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ مخبری کی اس رپورٹ میں ان بزرگوں کی طرف خزانے کی لوٹ کو جو منسوب کیا گیا ہے۔ میرا خیال وہی ہے کہ مجاہدین میں بعضوں سے یہ فعل سرزد ہوا، جس سے مخبروں کو موقع مل گیا جو ان حضرات کی طرف اس کو منسوب کردیا۔ اگر یہ جنگ کے مواقع میں قانون حیات کی رو سے غنیم کے مال کے ساتھ اس قسم کا تصرف غیر قانونی نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن بحث یہاں واقعات سے ہے، اس رپورٹ کے بارہ میں آج تک نہ کسی سے سننے ہی میں آیا نہ کہیں پڑھا کہ ان بزرگوں نے کوئی مالی استفادہ بھی کیا تھا۔ ۱۲

کی طرف مارچ کرنے کا حکم دے دیا۔ مظفر نگر سے تھانہ بھون کا فاصلہ ہی کتنا تھا، خبریں تو پہلے ہی سے آرہی تھیں، مولانا عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ

"صبح صادق نمودار ہوئی، تو بلائے بے درماں اپنے ساتھ لائی، تھانہ بھون کو سرکاری فوج سے گھیر لیا گیا۔"

لکھا ہے کہ

"مشرقی جانب سے گولہ باری شروع ہو گئی۔"

مولانا کے بیان میں تو اس کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے، کہ قصبہ والوں نے اس گولہ باری کے مقابلہ میں کیا کیا۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے براہ راست خاکسار نے یہ سنا تھا کہ شروع میں تھانہ والوں نے سرکاری فوج سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا، فصیل کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے، اور کوئی توپ جو تھانہ والوں کو کہیں سے مل گئی تھی، ممکن ہے کہ شاملی ہی کی گڑھی میں ہاتھ آئی ہو، بہرحال حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ کسی بلند مقام پر اس توپ کو چڑھا کر قصبہ والوں کی طرف سے جوابی فائر ہونے لگے، ایک دفعہ اتفاقاً یہ عجیب صورت پیش آئی کہ گولا جو قصبہ والوں کی توپ سے پھینکا گیا تھا، ٹھیک غنیم کی توپ کے دہانہ پر جا کر پڑا، انگریزی فوج کی یہ توپ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہاں بمشکل ایک آدھ توپ غریبوں کو میسر آ گئی تھی، گولہ بارود کی مقدار بھی ان کے پاس آتی کہاں سے ہوتی، جو انگریزوں کی توپوں اور گولہ بارود کے ذخیرے کے مقابلہ کے لئے کافی ہوتی، مولانا عاشق الٰہی صاحب کے بیان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قصبہ والے چند گھنٹوں سے زیادہ نہ ڈٹ سکے، ان کے الفاظ ہیں

"دن نکلنے پر فوج قصبہ میں داخل ہو گئی۔"

پھر کیا ہوا؟ انتقام کی وہی جہنم جو مظفر نگر کے کلکٹر کے سینے میں دبی ہوئی تھی، ابل پڑی، مولانا نے لکھا ہے کہ

"قتل و قتال، لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا، اور رات کی تاریکی کے چھانے سے پہلے پہلے شہر پناہ کے چاروں دروازے اڑا دئے گئے، اور مکانات پر مٹی کا تیل ڈال کر آگ دے دی گئی" صکے

ان الفاظ پر اضافہ کی ظاہر ہے کہ ضرورت ہی کیا ہے؟ تھانہ بھون کا سارا قصبہ دہی جہنم بن گیا جو منظفر نگر کے کلکٹر کے اندر چھپی ہوئی تھی، ان زندہ انسانوں جن کے گھروں سے باہر تو انگریزی فوج کی گولیاں برس رہی تھیں، اور گھروں کے اندر آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ عورتوں بچوں، بوڑھوں، معذوروں پر کیا گذری ہوگی یا ان حالات میں کیا گذر سکتی ہے، انسان تو اس کے سوچنے کی بھی تاب نہیں لاسکتا؟ لیکن منظفر نگر کا انگریز عیسائی حاکم نہتوں اور بیکسوں کے ساتھ یہی کر رہا تھا اور کر کے دکھا رہا تھا۔ صرف یہی نہیں کہ گھروں کے اندر آگ تھی، اور گھروں سے باہر بندوقوں کی باڑھ تھی، بلکہ مولٰنا عاشق الٰہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قصبہ چھوڑ کر جو بھاگنا چاہتے تھے، ان پر بھی راہ گیر تو اس لئے بند تھی، کہ

"عالم کس مپرسی میں نواح و حوالی کے دیہاتیوں کی لوٹ مار اور بے جا حرکتوں کا زیادہ موقع ملا" صکے

گویا عجائے ماندن جہر متقل شدہ، مسدود مفر

تاہم واقعات بتاتے ہیں کہ سب سے پہلے قصبہ کے رئیس بے چارے قاضی عنایت علی کو دیکھا گیا کہ وہ لاپتہ ہیں، مولٰنا عاشق الٰہی نے ان ہی کے متعلق یہ خبر دیتے ہوئے کہ

"خدا جانے کہاں گئے، اور کیا ہوئے کچھ پتہ نہ چلا"

کہنے والے کہتے تھے جیسا کہ مولٰنا ہی نے لکھا ہے کہ

"آدھی رات کے وقت قاضی صاحب مع چند ہمراہیان کے تھانہ بھون کو خیر باد کہی، اور بسمت نجیب آباد روانہ ہوئے"

اگر یہ صحیح ہے، تو یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ ہمالیہ کے کوہستانوں میں قاضی صاحب نے اپنے آپ کو شاید گم کر دیا ہو نجیب آباد جو دامن ہمالہ کی مشہور آبادی ہے اسکی طرف روانگی کا مطلب بظاہر یہی ہو سکتا ہے واللہ اعلم بالصواب

باقی تھانہ بھون کے جہاد کے امیر بیعت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ

اوران کے دونوں مرید عزیز سیدنا الامام الکبیر اور حضرت مولنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہم ان بزرگوں پر کیا گذری؟
معلومات جو ہم تک پہنچی ہیں' ان کی روشنی میں ان سوالوں کا صحیح جواب دینا میرے لئے کافی دشوار ہے
مطلب یہ ہے کہ شاملی سے واپس ہونے اور حافظ شہید کے دفن کر دینے کے ساتھ ہی یہ حضرات
منتشر ہو گئے' یا تھانہ ہی میں کچھ دن مقیم رہے' پھر حکومت کے نمائندے کی طرف سے جب تھانہ بھون
پر انتقام کی جہنم انڈیلی گئی' اس وقت یہ حضرات کہاں تھے؟
مولنا عاشق الٰہی صاحب کی کتاب میں بھی کوئی واضح جواب ان باتوں کا نہیں ملتا' ان کے بیان سے جو کچھ
بھی معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہی ہے کہ گو ئندوں کی مخبری کے بعد

"ان تینوں حضرات کے نام' چونکہ وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے' اور گرفتار کنندہ کے
لئے صلہ تجویز ہو چکا تھا' اس لئے لوگ تلاش میں ساعی اور جاسوس کی تگ و دو میں پھرتے
تھے" ص۷۸ تذکرۃ الرشید ج ۱

اس سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ تھانہ بھون میں حکومت کی رسائی ان لوگوں تک نہ ہو سکی' اور وارنٹ
جاری کر کے حکومت کے کارندے ان کی گرفتاری کی فکروں میں مشغول ہو گئے' ہمارے مصنف امام
نے اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ سیدنا الامام الکبیر پر دوسری دفعہ بندوق کی گولی جب چلائی گئی'
جس میں مونچھ اور داڑھی کا کچھ حصہ فائر کے سینکے سے جل بھی گیا تھا' اسی سلسلہ میں ان ہی کے حوالہ کو
یہ بھی نقل کر چکا ہوں کہ

"کچھ قدرے آنکھ کو صدمہ پہنچا"

آنکھ کے اس "قدرے صدمہ" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنف امام نے یہ اطلاع دی ہے کہ

"اس زخم کی خبر اچھالی' بعض دشمنوں نے جو سُنی' تو سرکار میں مخبری کی کہ تھانہ بھون کے
فساد میں شریک تھے" ص۳۷

گویا اس "زخم چشم" کو مجرم کی شناخت کی علامت بتانے والوں نے بتائی ہوگی۔ مخبروں کی ساعی گرا میدانہ
کے ساتھ اس "عینی شہادت" کے قصے نے قدرتاً بنسبت دوسروں کے سیدنا الامام الکبیر کے مسئلہ کو

زیادہ اہم بنادیا، لیکن اس اہمیت کا حال سنئے، جو تہیں ڈھونڈے جارہے تھے، مولنا طیب صاحب نے "متوسلین و خدام" کے عنوان سے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"متوسلین اور خدام نے عرض کیا کہ احتیاط خلاف توکل نہیں، حضرت روپوش ہو جائیں"

مگر انتقام کے زہر سے مملو و معمور حکومت زہریلے، سانپ کی طرح بل کھانے والی جسے ڈھونڈھ رہی تھی، خود اس کا حال کیا تھا مولنا طیب کی اسی یادداشت میں ہے کہ

"حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی فطری شجاعت اور ہمت قلب سے کھلے بندوں پھر رہے تھے"

مگر "روپوشی" کے مشورہ دینے والوں کا اصرار حد سے زیادہ بڑھ گیا تب جیسا کہ اسی یادداشت میں ہے،

"اپنی سسرال کے عالیشان مکان (دیوان) میں روپوش ہوئے"

لیکن یہ روپوشی جو اصرار بلیغ کے بعد اختیار کی گئی تھی، جانتے ہیں اس کا سلسلہ کتنے دنوں تک جاری رہا، سال و ماہ نہیں، دنوں کے حساب سے لے دے کر حسب روایت مولنا طیب صاحب تین دن سے آگے نہ بڑھ سکا مولنا کے الفاظ ہیں

"تین دن پورے ہوتے ہی، اکدم پھر باہر نکل آئے، اور کھلے بندوں پھرنے چلنے لگے"

ظاہر ہے کہ روپوشی کے سوا حفاظت و نگہبانی کا کوئی دوسرا ذریعہ جن بے چاروں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ اچانک باہر نکلنے کی اس جسارت پر جتنے بھی سراسیمہ ہوتے، اپنی یافت و عقل کے مطابق اُن کی سراسیمگی بالکل بجا تھی، مولنا طیب صاحب کا بیان ہے کہ

"لوگوں نے پھر منت روپوشی کیلئے عرض کیا"

اس موقعہ پر سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے جواب میں جس عذر کو پیش کیا گیا تھا، اسی کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں، انصاف سے کام لینا چاہئے، شاملی کے میدان کی سطح پر واقعات کا جو تن لکھا گیا تھا اور فقیر نے عرض کیا تھا کہ تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال پیش تر، تاریخ کے پاک ترین عہد میں جو واقعات

سرزمین عرب میں پیش آئے۔ اسی کی شرح مجھے شاملی کے میدان کا یہ قتل نظر آتا ہے۔ اس کو میری ذاتی خواہش اعتقادی قرار دینے والوں کو چاہئے کہ سیدنا الامام الکبیر کے اس جواب کو ذرا غور سے پڑھیں دوبارہ روپوشی کی طرف توجہ دلانے والوں سے فرمایا گیا کہ

"تین دن سے زیادہ روپوش ہونا سنت سے ثابت نہیں"

دعوے کی وضاحت کرتے ہوئے یاد دلایا گیا کہ

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے وقت غار ثور میں تین دن ہی روپوش رہے ہیں"

یہ روایت مولانا طیب صاحب کی ہے، اور دارالعلوم کے حلقہ میں حضرت والا کے اس جواب کا چرچا تقریباً حد تواتر تک پہنچا ہوا ہے، سوچنا چاہئے کہ اس جہادی مہم کے آغاز ہی سے امارت، بیعت، والدین کی اجازت وغیرہ ہر موقع پر تاریخ کے اسی مقدس دور کی طرف مڑ مڑ کر جو مسلسل دیکھتا رہا ہو، تا اینکہ مہم جب ختم ہوتی ہے، تو دیوان کی ڈیوڑھی کی روپوشی میں "غار ثور" کی تجلی جس کی نظروں کے سامنے تڑپ رہی ہو، الغرض غلام جو قدم بھی اٹھاتا ہو، یہ دیکھ کر اٹھاتا ہو، کہ اس کے آقا نے اپنا مبارک مسعود قدم کہاں کہاں رکھا تھا، کس طرح رکھا تھا، جس کے ادراک کی لطافت کا اس باب میں یہ حال ہو کہ "مطلق روپوشی" کے جواز کا نتیجہ "غار ثور" کے واقعہ سے جو نکلتا ہے، نتیجے کے اس اطلاق پر اس کا دل راضی نہیں ہے، بلکہ جتنے دنوں تک غار ثور میں روپوشی کا یہ سلسلہ جاری رہا تھا، دنوں کی اس اتفاقی قید کو بھی اتباع سنت کا لازمی جز کم از کم اپنی ذات کی حد تک قرار دے رہا ہو، اور جوں ہی کہ اس کی روپوشی کی مدت غار ثور والی روپوشی کے حدود سے آگے بڑھنے لگی، جان گسل روح گداز خطرات کی پروا کئے بغیر اپنی روپوشی کو ختم کر کے باہر نکل گیا ہو، کہنے والے لاکھ سمجھا رہے ہوں، لیکن تین دن سے زیادہ روپوشی پر آخر وقت تک آمادہ نہ ہوا، الغرض جو کچھ کر کے دکھایا گیا تھا، اس کے سوا جو کچھ دیکھنا ہی نہ چاہتا تھا، اگر اسی کو شاملی کے مختصر میدان میں وہ سب کچھ دکھایا گیا، جسے وہ دیکھنا چاہتا تھا، تو جزاءً وفاقاً کے قدرتی قانون کا اقتضا اس کے سوا خود ہی سوچئے کہ اور کیا ہوتا، آخر جس راہ میں چلنے والو

کو بشارت دی گئی ہو کہ ایک بالشت جو آگے بڑھتا ہے اس کی طرف بڑھنے والا ایک ہاتھ بڑھ جاتا ہے اور معمولی رفتار سے جو چلتا ہے اس کی طرف آنے والا دوڑ کر (ہرولۃ) آتا ہے، ایک حسنہ کو معاوضہ میں دس تک ایک حبہ (دانہ) کو سات سو تک بلکہ یضاعف لمن یشاء (بڑھاتا ہے اس کا معاوضہ جہاں تک چاہتا ہے) پہنچا دیتا ہے، وہاں جو کچھ ہوا لوگوں کو اس پر تعجب ہے۔ حالانکہ حیرت تو اس وقت ہوتی، جب یہ سب کچھ نہ ہوتا۔

جو ہو سکتا ہے، اسے کر کے دیکھو، پھر بظاہر جو نہیں ہو سکتا ہے، وہ بھی دکھایا جاتا ہے اور دل کو سوجھ رہا ہو یا نہ سوجھ رہا ہو لیکن جہاں نہیں دیکھا جا سکتا تھا، دیکھنے والوں کو وہیں بدر بھی دکھایا گیا اور احد بھی، خندق بھی اور خیبر بھی، موتہ بھی اور ثور کا غار بھی، بلکہ تھانہ بھون کے جہاد کے امیر حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ جو بالآخر اقطار ارض میں "مہاجر مکی" کے نام سے مشہور ہوئے ان کے دل میں جو یہ ڈالا گیا، جیسا کہ مولانا عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ

"وطن کو خیرباد کہی، اور بہ نیت حرمین گھر سے باہر نکلے"۔ ص۸۳ تذکرۃ الرشید

صرف مکہ معظمہ نہیں بلکہ حرمین کی نیت ہندوستان سے ہجرت کے وقت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہی تھی۔ تو مدینہ منورہ کی طرف تاریخی ہجرت تیرہ سو سال پیشتر ہوئی تھی، اس ہجرت کی پرچھائیں حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہجرت میں اگر دکھائی دے تو واقعہ نگاروں نے جو کچھ لکھا ہے کیا اس سے بھی ثابت یہی نہیں ہوتا،

بہر حال تھانہ بھون میں تو حکومت کی طرف سے آگ لگا دی گئی، قصبہ کے رئیس قاضی عنایت علی ہمالیہ کی وادیوں میں گم ہو گئے۔ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ تھانہ کے جہاد کے امیر حرمین کی نیت کر کے عرب کی سمت روانہ ہو گئے، مولانا عاشق الٰہی کا بیان ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی گنگوہ کے سوا زیادہ وقت اس زمانہ میں رامپور منہیاران کے طبیب اور اپنے مخلص دوست حکیم ضیاء الدین کے یہاں گذارتے تھے، اور سیدنا الامام الکبیر قصبہ دیوبند کی دیوان والی ڈیوڑھی میں تین دن روپوش رہنے کے بعد باہر نکل آئے۔ کیوں باہر نکل آئے۔ اس کی وجہ تو خود ان ہی کی زبانی سن چکے۔ لیکن

جس طرح نکلے، وہ بھی کم دلچسپ نہیں ہے۔ ہمارے مصنف امام نے اپنی کتاب میں اس کا تذکرہ کیا ہے، یہ لکھ کر کہ

"ایام روپوشی میں ایک روز دیوبند تھے۔ زنانہ مکان کے کوٹھے پر" ص۲۱۳

کہ اتفاقاً یہ صورت پیش آئی کہ گھر میں اس وقت

"مردوں میں سے کوئی نہ تھا، زینہ پر آکر فرمایا، پردہ کرلو، میں باہر جاتا ہوں" ص۲۱۳

ظاہر ہے کہ بے چاری عورتوں میں آپ کے اس خطرناک ارادے سے کافی کھلبلی مچ گئی، روکنے کی کوشش ان کی طرف سے کی گئی، لیکن کارگر نہ ہوئی۔ مصنف امام کا بیان ہے کہ

"عورتوں سے نہ رک سکے، باہر چلے گئے" ص۲۱۳

آگے مصنف امام نے واقعات کا ذکر ایسے مبہم اور مجمل الفاظ میں اختیار کیا ہے کہ صحیح طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ ان کا مطلب کیا ہے۔ بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ عورتوں نے جب دیکھا کہ حضرت تو باہر نکل جانے میں کامیاب ہو گئے، تو کسی ذریعہ سے گھر کے مردوں تک آپ کے نکل جانے کی اطلاع عورتوں نے پہنچائی، سرکاری جاسوس گھومتے ہی رہتے تھے، ان کو سن گن جو کچھ لگی، تو دیوان کی طرف پر دھاوا کر دیا۔ مصنف امام کے الفاظ ہیں کہ

"بعض مرد بازار میں تھے، ان کو اطلاع کی۔ وہ اتنے میں مکان پر پہنچے، دوڑ سرکاری آدمیوں کی پہنچ گئی تھی، انہوں نے آکر تلاشی لی۔" ص۲۱۳

لیکن ایسے وقت میں تلاشی اس مکان کی لی گئی، جب سیدنا الامام الکبیر اس مکان کے احاطہ سے باہر ہو چکے تھے۔ ناکامی اور نامرادی کے ساتھ سرکاری دوڑ کو واپس ہونا پڑا، خدانخواستہ باہر نکلنے کے بجائے حضرت مکان کے اندر ہوتے، تو گرفتار ہو جانا آپ کا یقینی تھا، لیکن لطیف خبیر کے لطف خفی کا اشارہ تھا کہ عین وقت پر اس مکان سے باہر ہو جانے کا خیال دل میں پیدا ہوا، اور مردوں کے نہ رہنے کی وجہ سے نکل جانے کا موقعہ بھی بآسانی مل گیا۔

عسیٰ ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم | قریب ہے کہ تم کسی بات کو مکروہ سمجھو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو

کی قرآنی خبر کی تجربوں سے یوں ہی تصدیق ہوتی رہتی ہے۔

مصنف امام نے اس کے بعد لکھا ہے کہ

"اس کے بعد سے (یعنی دیہان والوں کا گھر سرکاری مخبروں کی نگاہوں پر جب چڑھ گیا تھا) مسجد میں رہتے۔"

مسجد سے مراد بظاہر چھتہ کی مشہور مسجد ہی معلوم ہوتی ہے۔ مگر مسجد میں قیام کا یہ زمانہ بھی جس طریقہ سے گذرا، اس کا کچھ اندازہ مولنا طیب صاحب کی یادداشت کی اس اطلاع سے ہو سکتا ہے، یہ لکھ کر کہ

"مخبروں کی خبروں سے کہیں نہ کہیں پولیس حضرت کو پالیتی تھی، لیکن منجانب اللہ حفاظت ہوتی تھی۔"

اسی سلسلہ میں چھتہ کی مسجد کے قیام کے زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے وہی رقم طراز ہیں کہ

مخبر نے خبر دی کہ حضرت (نانوتوی) چھتہ کی مسجد میں ہیں، دوش آئی، مسجد کا محاصرہ کر لیا، کپتان پولیس مسجد میں آیا۔ حضرت ٹہل رہے تھے۔"

یوں کپتان کی نظر آپ پر پڑی اور آپ کی کپتان پر، مولنا نے لکھا ہے کہ

"کپتان نے خود حضرت (نانوتوی) سے پوچھا کہ مولنا محمد قاسم کہاں ہیں؟"

سیدنا الامام الکبیر کی طرف منسوب کر کے دارالعلوم دیوبند کے حلقوں میں ایک دلچسپ لطیفہ حاضر جوابی کے متعلق جو مشہور ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اسی موقعہ پر اس لطیفہ کا ظہور ہوا تھا۔ لطیفہ ہونے کے ساتھ ساتھ اگر سوچا جائے تو جہادی سنن میں ایک سنت کی تعمیل کی سعادت اس ذریعہ سے حاصل ہوئی، بہرحال ہوا یہ کہ جسے ڈھونڈھ رہا تھا، خود اسی سے اس کا پتہ جب کپتان دریافت کر رہا تھا، گویا غالبؔ ہی کی بات سے

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے      کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

کچھ یہی صورت جب پیش آئی تو جیسا کہ مولنا طیب نے لکھا ہے سیدنا الامام الکبیر نے

"ایک قدم ہٹ کر فرمایا کہ ابھی یہیں تھے دیکھ لیجئے۔"

حضرت ٹہل رہے تھے۔ ٹہلنے والے کا ہر دوسرا قدم ظاہر ہے کہ اس جگہ پر نہیں پڑتا جہاں وہ پہلے

ہوتا ہے جس جگہ کو چھوڑ چکے تھے۔ اسی جگہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا گیا کہ "یہیں تھے" جو بالکل واقعہ کے مطابق بات تھی، "دیکھ لیجئے" یعنی جسے ڈھونڈھ رہے ہو اسے تم دیکھ بھی سکتے ہو، لیکن جہاں

| | |
|---|---|
| تراھم ینظرون الیک وھم لا یبصرون | تو دیکھتا ہے کہ وہ تجھے دیکھ رہے ہیں لیکن انھیں سوجھ نہیں رہا تھا۔ |

کپتان غریب دیکھ رہا تھا، لیکن جسے ڈھونڈھ رہا تھا، وہ اسے سجھائی نہ دیا، اور بقول مولانا طیب صاحب

"کپتان دیکھ بھال میں مصروف ہوا"

اور جو دیکھا ہوا تھا، اس کو کپتان کی نظروں سے اوجھل ہونے کا موقعہ مل گیا، اور یوں

"حضرت (نانوتوی) غایتِ اطمینان سے مسجد سے باہر نکل آئے، اور پولیس کے گھیرے میں سے گذرتے ہوئے دوسری قریب کی مسجد شاہ رمزالدین کی طرف روانہ ہو گئے"

اس عرصہ میں کپتان بھی مسجد سے باہر نکلا، اب واللہ اعلم کیا صورت پیش آئی، اور کس علامت سے اس نے پہچانا، مولنا طیب صاحب کی یادداشت میں ہے کہ

"کپتان مسجد سے باہر نکلا، اور حضرت کو جاتے ہوئے دیکھ کر بولا، کہ مولنا تو یہی معلوم ہوتے ہیں، جو جا رہے ہیں، پولیس ادھر چلی، اور مسجد شاہ رمزالدین کا محاصرہ کر لیا"

آگے جو صورت پیش آئی، یعنی لکھا ہے کہ

"حضرت وہاں (مسجد شاہ رمزالدین) سے نکلے اور پولیس کے جتھے میں سے گذرتے ہوئے کسی اور مسجد میں پہنچ گئے"

کپتان کے یہ کہنے کے باوجود کہ "مولنا یہی معلوم ہوتے ہیں" پولیس کے جتھے سے گذرتے ہوئے نکل جانے کی توجیہ میں بجز اس کے کہ

| | |
|---|---|
| وجعلنا من بین ایدیھم سدا ومن خلفھم سدا فاغشینٰھم فھم لا یبصرون | اور ہم نے ایک آڑ ان کے سامنے کر دی اور ایک آڑ انکے پیچھے کر دی جس میں ہم نے (ہر طرف سے) ان کو (پردوں سے) گھیر دیا سو وہ (کسی چیز کو) نہیں دیکھ سکتے۔ |

اور کیا کہا جائے۔ اسلام کی تاریخ میں اس قرآنی حقیقت کا تجربہ پہلی دفعہ نہیں کرایا گیا تھا بلکہ عرض کر چکا ہوں کہ غلام قولاً ہی نعمتوں سے نوازا جا رہا تھا جن سے آقا کو سرفرازی بخشی گئی تھی لیکن غلامی کرے تو کوئی دیکھے پولیس والوں کے ساتھ آنکھ مچولی کا یہ کھیل جو کھیلا گیا تھا، اور مولنا طیب صاحب کی یادداشت میں آ گئے جو یہ الفاظ ہیں

"غرض پولیس کا چکر، اور حضرت کا یہ دور عرصہ تک جاری رہا، مگر بحفاظت الٰہی" پولیس حضرت پر قابو نہ پا سکی" ص۱

ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایک آدھ بار ہی یہ صورت پیش نہیں آئی، بلکہ بار بار مخبری کرنے والوں کے اشارے سے پولیس پیچھا کرتی تھی، لیکن یوں ہی تین چار چکروں میں اسے پیچھے چھوڑ کر چھڑانے والا اپنا پیچھا چھڑا لیا کرتا تھا، اور قصبہ دیوبند ہی تک محدود نہ رہا۔ مولنا طیب صاحب کی اسی یادداشت میں "چکولی" کے گاؤں کی سرگذشت کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ خیال آتا ہے کہ کسی موقعہ پر اجمالاً کسی دوسری صورت سے اس کا ذکر گذر بھی چکا ہے، اسی اجمال کی اب تفصیل سنئے۔

مولنا طیب صاحب کا بیان ہے کہ پولیس والوں کے بار بار تعاقب کی جھنجھٹوں سے تنگ آ کر آخر سیدنا الامام الکبیر کے نسبتی بھائی شیخ نہال احمد مرحوم رئیس دیوبند جن سے ہماری اس کتاب کے پڑھنے والے کافی طور پر شناسا ہو چکے ہیں، ان ہی شیخ صاحب نے

"حضرت نانوتوی کو مجبور کیا کہ چند دن، ان کے گاؤں موضع چکولی میں قیام فرمائیں"

اصرار اتنا شدید تھا کہ ان کے مشورہ پر عمل کرنا ہی پڑا، اور حضرت چکولی پہنچ گئے، چکولی کے محل وقوع کو بتاتے ہوئے مولنا طیب نے لکھا ہے کہ یہ گاؤں

"نانوتہ اور دیوبند کی درمیانی سڑک پر واقع ہے"

لیکن زیادہ دن تک اس گاؤں میں آپ کے قیام کا واقعہ پوشیدہ نہ رہ سکا، پتہ چلانے والوں کو خبر ہو گئی، یادداشت میں ہے کہ

"مخبر نے اس قیام کی گورنمنٹ میں اطلاع کر دی"

جیسا کہ چاہیے تھا'

"دوش جکوالی پہنچ گئی' پولیس نے گاؤں کا محاصرہ کر لیا۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ خود شیخ نہال احمد مرحوم بھی بطور رفاقت کے اسی گاؤں میں مقیم تھے۔ گاؤں کا محاصرہ پولیس والوں نے کر لیا ہے۔ اس واقعہ سے واقف ہونیکے ساتھ ہی جیسا کہ مولانا طیب صاحب کا بیان ہے۔

"شیخ نہال احمد صاحب کے تو چھکے چھوٹ گئے' سخت خائف اور ہراساں ہوئے۔"

لیکن خوف و ہراس کی اس کیفیت میں بقول مولانا طیب صاحب شیخ صاحب کے اس احساس کو زیادہ دخل تھا کہ

"مولانا (نانوتوی) کی گرفتاری میرے گاؤں میں ہو' جس میں میں ہی خود حضرت کو باصرار لے کر آیا ہوں۔"

لکھا ہے کہ شیخ صاحب کی پریشان حالی کو دیکھ کر حضرت نانوتوی نے ذرا درشت لہجہ میں فرمایا کہ

"اس طرح خوف زدہ صورت بنا کر تو آپ مجھے پکڑوا کر رہیں گے۔"

اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا کہ

"آپ بالکل مطمئن رہیں' میں اپنا بچاؤ خود کر لوں گا۔"

جکوالی میں شیخ صاحب کا جو مکان تھا' اس میں بھی زنانہ مردانہ دو حصے تھے۔ حضرت الاالکبیر شیخ صاحب اسی زنانہ حصہ میں رہا کرتے تھے۔ شیخ صاحب کو تو اسی زنانہ حصہ میں چھوڑ کر خود سڑک لکھا ہے کہ

"حضرت (نانوتوی) باہر نکل آئے۔"

سامنے پولیس کا کپتان کھڑا تھا' نظر پڑتے ہی' بغیر کسی اضطراب اور گھبراہٹ کے کپتان کو مخاطب بناتے ہوئے فرمانے لگے

"آئیے آئیے تشریف لائیے۔"

صرف یہی نہیں بلکہ اسی کے ساتھ روایت میں یہ بھی ہے کہ کپتان صاحب کے لئے چائے تیار کرنے کا حکم بھی صادر فرمایا۔ چائے تیار ہو کر آئی، پلائی گئی، کپتان بھی آپ سے مانوس ہو کر پوچھتا رہا کہ

"آپ مولانا محمد قاسم صاحب سے واقف ہیں؟"

جواب میں یہ کہتے ہوئے کہ

"جی ہاں میں ان کو خوب جانتا ہوں۔"

مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ

"اپنی زبان سے اپنے مناسب وقت حالات بیان فرماتے رہے۔"

اس پر کپتان نے کہا کہ

"ہم زنانہ مکان کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ تلاشی جس کے لئے کپتان صاحب لینا چاہتے تھے وہ تو ان کو ملا ہوا تھا، زنانہ مکان میں ان کو ان کا شکار کہاں ملتا۔ بخندہ جبینی ارشاد فرمایا گیا

"شوق سے تلاشی لے سکتے ہیں۔"

لکھا ہے کہ کپتان زنانہ حصہ میں داخل ہوا، اور

"کونہ کونہ چھان مارا۔"

لیکن جو کھویا ہوا ہوتا، اسے البتہ پا سکتا تھا۔ مگر جسے پائے ہوئے تھا، وہ اس کو کھویا ہوا سمجھ کر ڈھونڈ رہا تھا۔ اس ڈھونڈ ڈھاند اور تلاش کا جو نتیجہ ہو سکتا تھا، وہی ہوا، لطف یہ ہے، جیسا کہ مولانا طیب کی یادداشت میں ہے کہ

"حضرت (نانوتوی) کپتان کے ساتھ ساتھ تلاشی دلانے میں مصروف تھے۔" عنا

ناکامی اور نامرادی کے ساتھ غریب زنانہ مکان سے واپس ہوا، جب تلاش و جستجو کے سارے مراحل ختم ہو گئے، اور کپتان چھوٹی سے رخصت ہونے لگا تو لکھا ہے کہ

"حضرت بھی اس سے رخصت ہو کر نانوتہ روانہ ہو گئے۔"

اتنی تگ و دو کنج و کاؤ کے بعد یہ ناکامی و نامرادی کپتان کے لئے کافی ہیجان انگیز، اور تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ غزلے کے گرنے کے لئے مخبر کا ضعیف وجود اس کے ساتھ تھا، بیان کیا گیا ہے کہ اسی "عنصرِ ضعیف" کو مشق کا تختہ بنا کر

"کپتان نے بہت ڈانٹا، کہ تو غلط خبریں دیا کرتا ہے"

مخبر نے اس وقت کپتان صاحب سے عرض کیا کہ

"آپ نے غور نہیں کیا، کہیں مولانا ہی صاحب تو نہ تھے: جنہوں نے تلاشی دلوائی"

جب ٹھنک کر جڑیا کھیت سے اڑ چکی تھی، اس وقت مخبر صاحب بھی چونکے تھے، اور ان کی توجہ دلانے سے کہتے ہیں کہ

"کپتان نے وارنٹ جیب سے نکال کر حلیہ پڑھا تو حضرت نانوتوی۔ کے چہرے مہرے پر منطبق پایا"

مگر نانوتہ اور اس کے گرد و نواح کے گھپ اندھیرے گھنے نخلستانی جنگل کو جس نے دیکھا ہے وہی سمجھ سکتا ہے کہ چکوالی سے نکل جانے کے بعد راستہ میں گرفتار کرنا آسان نہ تھا۔ غصہ میں کپتان نے حکم دیا کہ دوشس نانوتہ کی طرف مارچ کرے۔ مولنا طیب صاحب کا بیان ہے کہ لوگ پہلے ہی سے لگے ہوئے تھے، قبل اس کے کہ دوشس نانوتہ پہنچے، سیدنا الامام الکبیر کو اطلاع ہو گئی اور بقول مولنا طیب

"دوسرے راستہ سے دیوبند پہنچ گئے"

پیدل چلنے پھرنے کی عادت آج کام آرہی تھی، ابھی چکوالی میں تھے، چکوالی سے نانوتہ پہنچے ابھی سانس لینے بھی نہ پائے تھے، کہ وہاں سے بھی روانہ ہو گئے، اور دم کے دم میں چوبیس میل کے دراز فاصلہ کو طے کر کے حضرت والا دیوبند میں رونق افروز تھے

پھر پھر کر پولیس والوں نے پھر دیوبند ہی کی مسجدوں میں آپ کا سراغ لگانا چاہا۔ لیکن یہاں وہی ایک مسجد سے دوسری مسجد، دوسری مسجد سے تیسری مسجد کا چکر جاری رہا، پولیس بھی گھومتی رہی لیکن گھومنے کے سوا جسے ڈھونڈھ رہی تھی اس کے پانے میں آخر وقت تک کامیاب نہ ہوئی،

مولانا طیب نے لکھا ہے

"غرض پولیس کو چکر میں رکھا، اور گرفتار نہ ہوئے"

اس قسم کے قصوں کا سنانا بھی آسان ہے اور سن لینا بھی آسان ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس کا قصہ سنایا گیا خود وہ جس آسانی کے ساتھ ان جان فرسا ہائلہ حوادث سے گذر رہا تھا، ہر شخص کے لئے گذرنا آسان نہیں ہے، بے پناہ قوت رکھنے والی ملوکیت کے سامنے سینہ تان کر انتہائی لاپروائی کے ساتھ صحیح معنوں میں وہی ٹھہر سکتا ہے، جس پر السموات والارض کی ملکوت (یا دشاہت) کا صحیح راز آشکارا ہو چکا ہو۔ پہاڑ بھی اس کے قدموں کے نیچے پانی بن جاتے ہیں۔ اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ اسی کا تماشا کیا نہیں دکھایا جا رہا ہے، کچھ ٹھکانا ہے اس سکینت قلب، جمعیت خاطر کا کہ وارنٹ جیب میں رکھے ہوئے گرفتار کرنے کے لئے جو آیا ہوا ہے، اسی کو چائے پلائی جاتی ہے اور جس کو گرفتار کرنا چاہتا ہے، وہی گرفتاری کی کارروائیوں میں گرفتار کرنے والے کی مدد کر رہا ہے، یہ سب کچھ ہو رہا ہے، لیکن بظاہر جس کا کوئی پشت پناہ نہیں ہے، اس کو گرفتار کرنے میں وہی قطعی ناکام ثابت ہوا جسے ظاہر بین فی الارض اور ملک کی سب سے بڑی قاہرہ سیاسی قوت کی پشت پناہی حاصل تھی۔

خیر سیدنا الامام الکبیر تو اِدھر دیوبند، نانوتہ اور چکوالی کے ادرے پھیرے میں مصروف تھے لیکن آپ کے پیر و مرشد امیر جہاد حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے "حرمین کی نیت سے گھر (تھانہ) کے باہر نکل چکے تھے" بقول مولانا عاشق الٰہی

"چند ماہ انبالہ، نگری، پنجلاسہ وغیرہ مواضع و قصبات میں اپنے آپ کو چھپایا اور آخر براہ سندھ کراچی عرب کا راستہ لیا" ص۷۶ تذکرۃ الرشید

یہی چند ماہ جو حضرت حاجی صاحب کے ان مقامات میں گذرے، اسی زمانے میں سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ پولیس کے تعاقب کے مذکورہ بالا قصے پیش آرہے تھے۔ ہمارے مصنف امام نے بھی ان ہی اتفاقات کی طرف اجمالی اشارہ کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے کہ

"اس زمانہ کی کیفیات عجیب و غریب گذری ہیں، لکھنا ان کا طول ہے"

"عجیب و غریب کیفیات" غالباً وہی تھیں، جن کی تھوڑی بہت تفصیل مولنا طیب صاحب کی یادداشت کی مدد سے سنائی گئی۔

اسی سلسلہ میں مصنف امام نے علاوہ دیوبند، نانوتہ، جیکوالی کے املیا نامی گاؤں کا بھی ذکر کیا ہے جہاں سیدنا الامام الکبیر کا قیام وارنٹ کے ان دنوں میں رہا تھا۔ آگے انہوں نے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ

"بوڑیہ، گنتھل، لاڈوہ، پنجلاسہ، جمنا پار کئی دفعہ گئے آئے"

کئی دفعہ آنے جانے کا ذکر جن مقامات کے متعلق کیا گیا ہے، بظاہر یہ اسی راستہ پر واقع ہیں جس سے گذرتے ہوئے حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سندھ (کراچی) عرب جانے کے لئے پہنچے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس قسم کا جرم آپ کی طرف منسوب کیا گیا تھا، یعنی وہی جہاد کے امیر تھے۔ اور بیعت جہاد کی ان ہی کے ہاتھوں پر کی گئی تھی۔ ایسی صورت میں وارنٹ کے بعد کھلے بندوں تو ان کے کراچی تک پہنچنے کی صورت ہی کیا تھی، بلکہ بقول مولنا عاشق الٰہی ان ہی آبادیوں میں چھپتے چھپاتے حضرت الاساحل سمندر تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے، جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں، ان سے یہی معلوم ہوتا ہے، کہ حکومت ان کا تعاقب کر رہی تھی، جس جگہ پہنچ کر پناہ لیتے، حکومت کے نمائندے وہیں پہنچکر آپ کو گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وہی "حفاظت الٰہی" گرفتار کرنے والوں کو ناکام بناتی رہی کہتے ہیں، اور یہ قصہ عام طور پر مشہور بھی ہے کہ مشرقی پنجاب کے قصبہ پنجلاسہ میں حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قیام اپنے پیر بھائی پنجلاسہ کے رئیس راؤ عبد اللہ مرحوم کے مکان میں تھا کہ پولیس کو خبر ہو گئی، لکھا ہے کہ اس علاقہ کا انگریز افسر پولیس کو لے کر راؤ عبد اللہ کے مکان پر پہنچ گیا، راؤ صاحب نے حاجی صاحب کو بنظر احتیاطاً اپنے اصطبل کی ایک ایسی کوٹھری میں جگہ دے رکھی تھی جس میں کسی شخص کے رہنے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی، جس میں گھوڑوں کا گھانس اور چارہ بھرا ہوا تھا مگر انگریز تک خبر اس تفصیل کے ساتھ پہنچی تھی کہ فلاں کوٹھری میں مجرم ٹھیرایا گیا ہے۔ اپنے آدمیوں کے ساتھ

ٹھیک اسی کوٹھری تک پہنچ کر انگریز نے کواڑ کھول دئے۔ راؤ عبداللہ کے تو ہوش اڑے ہوئے تھے لیکن کواڑ کے کھلنے کے بعد جب دیکھا گیا، تو مصلی بچھا ہوا تھا۔ پانی کا لوٹا بھی تھا لیکن کوٹھری میں کسی آدمی کا پتہ نہ تھا۔ انگریز حیران تھا، اس نے پوچھا کہ یہ مصلی اور پانی کا لوٹا کیسا ہے؟ راؤ صاحب نے فرمایا کہ ہم لوگ فرض نماز مسجد میں پڑھتے ہیں اور نوافل گھر آکر پڑھتے ہیں۔ بہرحال انگریز راؤ صاحب سے معافی مانگ کر شرمندامت واپس ہوا، اس کی سمجھ میں کوئی صورت نہ آئی۔ راؤ صاحب انگریز کو رخصت کرکے جب گھر میں لوٹے تو حیران تھے کہ حضرت حاجی صاحب اس عرصہ میں کوٹھری سے کیسے باہر ہوئے اور کہاں تشریف لے گئے۔ کوٹھری کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ حاجی صاحب بدستور اپنے مصلی پر تشریف رکھتے ہیں۔ عرض کیا کہ حضرت آپ ابھی تلاشی کے وقت کہاں تھے؟ فرمایا، میں تو یہیں بیٹھا ہوا تھا، عرض کیا کہ انگریز نے تو آپ کو نہیں دیکھا، فرمایا، وہ اندھا ہو جائے تو میں کیا کروں؟ یہ سب وہی حفاظت الٰہی کے کرشمے تھے جو ان واصلین کی کرامتوں کی صورت میں نمایاں ہو رہے تھے۔

بہرحال میرا خیال یہی ہے کہ جمنا پار کے ان قصبات اور مواضع تک سیدنا الامام الکبیر کی اس زمانہ میں آمد ورفت اپنے پیر و مرشد کی قدم بوسی و تفقد حال اور ان کی خیر و عافیت کی دریافت ہی کے سلسلے میں ہوتی رہتی تھی۔ کیونکہ اس کے سوا ان گمنام آبادیوں میں تشریف لے جانے کی بظاہر کوئی دوسری وجہ نہ تھی۔ روپوشی کے لئے جمنا کے اس پار کی آبادیوں میں کافی گنجائش تھی۔ نیز آپ سن چکے کہ حکومت کے نمائندوں سے بچنے کے لئے سیدنا الامام الکبیر زیادہ کنج دکاؤ سے کام بھی نہ لیتے تھے۔ زیادہ نرغہ ہوتا، تو اس مسجد سے اس مسجد کے چکروں ہی میں نرغہ والوں کا سانس پھول جاتا تھا۔ حتی کہ اسی بنیاد پر مولوی عاشق الٰہی صاحب نے یہاں تک لکھ دیا کہ دیوان والوں کی حویلی میں روپوشی کے تین دن گذار لینے کے بعد جب سیدنا الامام الکبیر باہر نکل آئے۔

"تو مسجد میں رہتے، اور کوئی کسی قسم کا تعرض نہ کرتا" تذکرہ ص۷۹

باوجود وارنٹ اور تفتیش کے تعرض نہ کرنے کا مطلب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تعرض کرنے والے چشم پوشی سے کام لیتے تھے، بلکہ پنجلاسہ کے اصطبل کی کوٹھری میں دیکھا گیا تھا کہ ڈھونڈھنے والا انگریز آنکھیں

رکھتے ہوئے گویا آنکھوں سے محروم کر دیا گیا ہے۔ عدم تعرض میں یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ کچھ اسی قسم کی کوششیں کو زیادہ دخل تھا، اور سچ تو یہ ہے کہ ایک مسجد سے نکل کر جب بجائے کسی دوسرے مقام کے مسجد ہی آپ کی قرارگاہ ہوتی تھی تو "مسجد میں رہتے تھے" اس کے سوا اور اس واقعہ کی تعبیر ہی کیا کی جا سکتی ہے

بہرحال میرا صرف یہ خیال ہی نہیں ہے کہ اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں حاضری کے لئے مذکورہ بالا مقامات میں سیدنا الامام الکبیر نے اپنی آمد و رفت کے سلسلہ کو جاری رکھا تھا۔ بلکہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مولوی عاشق الٰہی صاحب نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

"اپنے ہادی برحق (حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ) کی ہندوستان میں آخری زیارت کے شوق سے بے تاب ہو کر انبالہ، نگری اور پنجلاسہ کے سفر کو اٹھے اور مستور الحال مخفی طور پر اس حق کو ادا فرما کر واپس وطن (گنگوہ) ہوئے" ص۵۳

اس خبر سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے کہ ان مقامات کا سفر حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کے لئے اختیار کیا جاتا تھا، پیادہ پا چلنے کے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ چونکہ زیادہ عادی نہ تھے۔ شاید اسی لئے آپ کو اس سلسلہ میں ایک ہی دفعہ سفری صعوبتوں کی زحمت برداشت کرنی پڑی۔ مشکلات راہ کو عشق کی کشش نے آسان کیا۔ اس سفر کی دشواریوں کا اندازہ اسی سے کیجئے۔ دوسری جگہ مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ

"راتوں کو چلتے، دنوں چھپتے، خاردار جنگل، پیدل قطع کرتے" ص۵۳

اور اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ جمنا پار کے ان ہی مقامات کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف امام نے سیدنا الامام الکبیر کے متعلق جو لکھا ہے کہ

"کئی دفعہ آئے گئے"

اس کئی دفعہ کے آنے جانے میں کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا، مگر ابتدائے زندگی سے پیدل چلنے کے چونکہ آپ عادی تھے۔ کسی موقعہ پر لکھ چکا ہوں کہ پیادہ پا چلنے کی اسی عام عادت کی وجہ سے آپ کے والد ماجد شیخ اسد علی کے دل میں کافی گرانی بھی پائی جاتی تھی۔ لیکن اسی قسم کے نازک مواقع پر کام لینے

کے لئے قدرت شروع ہی سے انتظام کر رہی تھی۔ سواری رہتے ہوئے بھی اسی کا نتیجہ تھا کہ پیدل ہی چلنے کو آپ پسند فرماتے تھے۔

بہر حال رات کو چلنا، اور دن میں جنگلوں میں چھپنا، اور یوں تن تنہا، جمنا پار کے ان گمنام اور دشوار گذار مقامات کو طے کرنا جن سے ان آبادیوں یعنی پنجلاسہ وغیرہ تک پہنچنے کے لئے گذرنا ناگزیر تھا، اور بار بار آمد و رفت کے اس سلسلہ کو قدرت کی غیبی تائید و نصرت کے بغیر کیا قابل تصور بھی کہا جا سکتا ہے، قرائن کا اقتضاء یہ بھی ہے کہ یہ سارے پیادہ پا سفر اس عرصہ میں جو کئے گئے، تنہا طریق کے کسی رفیق کے بغیر کئے گئے، رفاقت پر کوئی آمادہ بھی ہوتا تو احتیاطاً اس ارادہ سے اس کو روک دیا جاتا تھا، سمجھایا جاتا تھا کہ ہماری وجہ سے تم اپنے لئے کوئی خطرہ کیوں خریدو، مولنا عاشق الٰہی صاحب نے حضرت مولنا گنگوہی کے سفر کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ پنجلاسہ جاتے ہوئے تنگری نامی مقام میں جب آپ پہنچے، جو دیوبندی حلقہ کے مشہور ربانی مستجاب الدعوات صاحب دل بزرگ مولانا عبد الرحیم رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کا آبائی وطن تھا۔ رائے پور میں بعد کو آپ نے قیام اختیار فرما لیا تھا۔ اس زمانہ میں جب مولنا عبد الرحیم رائے پوری اپنی عمر کے تیسرے سال میں تھے، تنگری کی نگری حضرت گنگوہیؒ کے قدوم میمنت لزوم سے مشرف ہوئی۔

اس گاؤں کے رئیس مولنا عبد الرحیم صاحب کے پدر بزرگوار راؤ اشرف علی خان مرحوم تھے۔ وہاں کے خوش حال زمینداروں میں گنے جاتے تھے۔ حضرت گنگوہی کو راؤ صاحب نے اپنا مہمان بنایا اخلاص و مودت کا ظہور غیر معمولی طور پر ان کی طرف سے جب ہوا، تو حضرت گنگوہی نے سفر کے نصب العین کو بتاتے ہوئے جو کچھ گذری تھی، اس سے ان کو آگاہ کیا۔ راؤ صاحب حالات کو سن کر اس درجہ متاثر ہوئے کہ باوجود نوجوانی کے بوڑھے راؤ صاحب حضرت گنگوہی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے آرزو مند ہوئے، لیکن حضرت کے یہ فرمانے سے کہ میرے پیر و مرشد تو آپ کے قریب ہی پنجلاسہ میں مقیم ہیں، بیعت کی تمنا ہے تو بجائے میرے اپنی آرزو ان ہی سے بیعت کر کے پوری کر سکتے ہیں۔ راؤ صاحب اس پر راضی ہو گئے، اور خواہش ظاہر کی کہ اپنے ساتھ مجھے پنجلاسہ لے چلئے،

سفارش کر کے مرید کرا دیجئے لیکن مولنا عاشق الٰہی کا بیان ہے کہ اپنی

"اندیشہ ناک حالت ظاہر فرما کر سمجھایا کہ بیعت قرین مصلحت نہیں، البتہ اگلے دن آپ آئیں، اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ) سے سفارش کا میں ذمہ دار ہوں"

صاٹ تذکرۃ الرشید

الغرض اصرار بلیغ کے باوجود رفیق سفر بنانے پر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ اور جیسے اب تک تن تنہا سفر کرتے ہوئے چلے آرہے تھے، پنجلاسہ بھی تنہا ہی پہنچے۔ حالانکہ نگری سے پنجلاسہ کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ غالباً ایک منزل کا سفر تھا۔ لیکن ایک دن کیلئے بھی رفیق طریق بنانے کو خلاف مصلحت جب قرار دیا گیا، تو سمجھا جا سکتا ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر جن کے آنے جانے کا سلسلہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلسل جاری تھا، اس میں کسی دوسرے کو رفیق بنانے پر کیسے آمادہ ہو سکتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہوئی کہ اس زمانہ میں جتنا یا حضرت والا نے جو سفر کئے، ان سفروں کے حالات اور تفصیلات سے کوئی دوسرا واقف نہ ہو سکا۔ اسی لئے کہیں اشارۃً وکنایۃً بھی ان کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے۔ حالانکہ کافی دلچسپ اور عبرت آموز حالات ہوں گے۔

بہر حال اب واقعہ کی صورت یہ تھی کہ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ تو حجاز کو منزل مقصود بنا کر کراچی تک پہنچنے کے لئے ایک آبادی کو چھوڑ کر دوسری آبادی اور دوسری آبادی سے تیسری آبادی کی طرف منتقل ہو رہے تھے، اور آپ کے دونوں دنا گیش خدام، راست باز اور جاں باز مرید سیدنا الامام الکبیر اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہما انتقام کے غصہ سے بھری ہوئی حکومت کے نشانہ بنے ہوئے جس طرح ممکن تھا، دن کاٹ رہے تھے۔ مولوی عاشق الٰہی صاحب نے حضرت گنگوہی کے متعلق لکھا ہے کہ پنجلاسہ پہنچکر اپنے پیر و مرشد حاجی صاحب کی خدمت میں

"اصرار کیا کہ بندے کو ہمرکاب لے چلیں"

مگر ہندوستان سے جو خود تو ہجرت کا فیصلہ کر کے اسی کی نیت سے سفر کر رہا تھا، مولوی صاحب کی شہادت ہے کہ اسی نے ہجرت ہی کی اس درخواست کو جو مرید رشید کی طرف سے پیش ہوئی تھی،

صاف لفظوں میں ستر دکردی، لکھا ہے کہ

"اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب) نے نہ مانا، اور فرمایا کہ جاؤ تمہیں خدا کے سپرد کیا"

صرف یہی نہیں بلکہ جس الٰہی الہام کے تحت حاجی صاحب نے ہجرت کا تہیہ فرمایا تھا حضرت گنگوہی کے متعلق اپنے اسی لاہوتی احساس کے زیر اثر رخصت کرتے ہوئے اس راز کا بھی افشاء فرمایا کہ

"اسی طرح خدا کا حکم ہے"

اور فرمایا کہ

"میاں رشید احمد تم سے حق تعالیٰ کو ابھی بہتیرے کام لینے ہیں گھبراؤ مت" ملہ

ایک دفعہ حاضری کے بعد جو واپس کیا گیا تھا، جب خدا کے حکم کا اظہار اس کے متعلق ان الفاظ میں فرمایا گیا، تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بار بار حاضری کے بعد مختلف مقامات سے جسے واپسی کا حکم دیا جاتا تھا، اور وہ واپس ہی ہوتا چلا گیا۔ میرا اشارہ سیدنا الامام الکبیر کی طرف ہے۔ سمجھنا چاہئے کہ ان کی واپسی بھی کیا صرف عقلی مشوروں اور ذہنی وسوسوں کی بنیاد پر ہورہی تھی حالانکہ کیف تحکمون؟

رہا یہ کہ تھانہ بھون کے جہاد کے امیر بیعت حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ تو راہی عرب ہوئے، اور اس کے سوا بظاہر ان کے لئے کوئی چارۂ کار بھی عالم اسباب میں نہ تھا۔ صحیح طور پر اس کا متعین کرنا تو دشوار ہے کہ حاجی صاحب کب ہجرت کے اس سفر پر روانہ ہوئے، اتنی بات تو یقینی ہے کہ دلی پر انگریزوں کا قبضہ حافظ ضامن شہید کی شہادت کے بعد ہی ہوگیا، اور تھانہ پر اس کے بعد جو مصیبت ٹوٹی۔ درد کی اس داستان کو بھی آپ سن چکے۔ تھانہ کو تو حاجی صاحب جہاں تک قیاس چاہتا ہے، اسی زمانہ میں چھوڑ چکے تھے۔ اس کے بعد کہاں کہاں رہے، بس اس سلسلہ میں ان ہی مقامات کا لوگ ذکر کرتے ہیں جن کا تذکرہ سیدنا الامام الکبیر کی آمد ورفت کے سلسلے میں گذر چکا ہے، کراچی تک اس طریقہ سے پہنچنے میں چاہئے تو یہی کہ کافی مدت گذری ہوگی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ براہ راست ہندوستان پر ملکہ وکٹوریہ کے قبضہ کا اعلان انگریزی پارلیمان کی طرف سے

۲۔ اگست ۱۸۵۸ء کو ہوا تین مہینے کے بعد یکم اکتوبر ۱۸۵۸ء میں بمقام الہ آباد لارڈ کیننگ نے ملکہ وکٹوریہ کے اس "عام معافی نامہ" کو پڑھ کر سنایا جس کے بعد عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ غدر کے مجرمین کو بخش دیا گیا۔ ہنگامے میں جو شریک تھے، حکومت کے دارو گیر کا کھٹکا ان کے لئے باقی نہ رہا لیکن واقعہ یہ ہے کہ معافی نامہ باوجود عام ہونے کے عام نہ تھا، بلکہ اس میں ان خاص امور کا استثنا بھی تھا کہ

"انگریزی رعایا کے قتل میں بغاوتہً جو شریک ہوئے ان کو رحم کا مستحق نہیں قرار دیا جائے گا۔ مزید برآں چند قیدیں بھی تھیں۔

(۱) جن لوگوں نے جان بوجھ کر قاتلوں کو پناہ دی ہو۔

(۲) یا جو لوگ باغیوں کے سردار ہوئے ہوں۔

(۳) یا جنہوں نے ترغیب بغاوت دی ہو۔

ان کے متعلق ملکہ وکٹوریہ کے اس معافی نامہ میں یہ الفاظ درج کئے گئے تھے کہ

"ان کی نسبت صرف وعدہ ہوسکتا ہے کہ ان کی جان بخشی ہوگی، لیکن ایسے لوگوں کی تجویز سزا میں ان سب احوال پر جن کے اعتبار سے وے اپنی اطاعت سے پھر گئے کامل غور کیا جائے گا۔"

اسی زمانہ میں ملکہ کے اس معافی نامہ کا انگریزی سے اردو میں جو ترجمہ ہوا تھا، یہ بجنسہ اسی کے الفاظ ہیں، مطلب یہی تھا کہ جان کی حد تک، مندرجہ بالا تینوں جرائم کے مجرموں کو مطمئن کر دیا گیا تھا لیکن اس کے سوا حکومت اندر جو کچھ بھی کر سکتی تھی، اس کا خطرہ موجود تھا، اور حکام کی صوابدید پر ان کی سزا کی نوعیت معلق کر دی گئی تھی۔

تھانہ بھون کی جہادی مہم میں جیسا کہ آپ پڑھ چکے، انگریزی رعایا ہی نہیں بلکہ انگریزی فوج کے ملازمین بھی شاملی میں قتل کئے گئے تھے۔ خود حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ شاملی کے سریہ میں موجود تھے، لیکن اس کا ثبوت آسان نہ تھا۔ اس لئے جان تک کے خطرے سے وہ محفوظ نہ تھے۔ کم از کم

قاتلوں کے پناہ دینے، باغیوں کی سرداری، بغاوت کی ترغیب ان الزاموں سے بری ہونے کی صورت کیا تھی، خود ان پر بھی یہ سارے الزامات تھے، اور جو فرد جرم آپ کے جاں باز دست گرفتوں سیدنا الامام الکبیر، اور محدث روشن ضمیر حضرت مولنا رشید احمد گنگوہی پر لگائی گئی تھی، اس کی فہرست بھی بجنسہٖ یہی تھی۔

ایسی صورت میں مان بھی لیا جائے کہ عرب روانہ ہونے سے پیشتر اس "عام معافی نامہ" کا اعلان ہو بھی چکا ہو، جب بھی نہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کے مطمئن ہونے کے لئے کافی تھا اور نہ ان کے دونوں نوجوان خدام رفیقوں کے لئے۔ اسی لئے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی نگاہوں سے ہٹے اور ٹلے رہنے کا سلسلہ تینوں صاحبوں کے لئے معافی نامہ کے اعلان کے بعد بھی جاری رہا۔ حاجی صاحب تو کسی نہ کسی طرح کراچی سے بادبانی جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظمہ پہنچ گئے، مولوی عاشق الٰہی صاحب نے بغیر کسی تعین تاریخ کے صرف یہی لکھا ہے کہ

"اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ) نے چند ماہ انبالہ کھری پنجلاسہ وغیرہا مواضع وقصبات میں اپنے آپ کو چھپایا، اور آخر براہ سندھ وکراچی عرب کا راستہ لیا ہندستان کو خیرباد کہی، اور ہوائی جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظمہ پہنچے" ص۲

ہوائی جہاز بادبانی جہاز کی عاشقانہ تعبیر ہے۔ ان بے چاروں کو کیا معلوم تھا کہ پانی سے بے تعلق ہو کر صرف ہوا پر چلنے والا جہاز بھی سامنے آنے والا ہے۔

بہر حال جہاں تک میرا خیال ہے حاجی صاحب کی روانگی جس خاص طریقہ سے اس زمانہ کی سست رفتار سواریوں پر ہوئی تھی اور جن حالات میں ہوئی تھی چاہیے تو یہی کہ ہند کے ان مختلف مقامات سے گذرتے ہوئے عرب تک پہنچنے میں مدت صرف ہوئی ہو۔ سال ڈیڑھ سال بھی یہ مدت اگر فرض کی جائے، تو قیاس کا اقتضا یہی ہے کہ زیادہ نہ ہو۔

رہے ان کے صاحبین (حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی) تو ان میں سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق اگرچہ عام طور سے یہ مشہور ہے کہ امن عام کے اعلان کے بعد ہی حکومت نے اپنی

نگرانی آپ سے ہٹالی تھی، غدر کے ہنگامہ کے فرو ہو جانے کے بعد حضرت والا جن خدمات کی طرف متوجہ ہوئے، ان کا ذکر کرتے ہوئے مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں جو یہ الفاظ پائے جاتے ہیں کہ

"یہاں تک کہ ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے امن عام کا مشہور اعلان ہو گیا، اور ہر شخص آزادی سے چلنے پھرنے لگا" ص۱۷

بظاہر اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر کو بھی آزادی کے ساتھ چلنے پھرنے کا موقعہ گویا مل گیا تھا، اور یوں بغیر کسی روک ٹوک کے ان مہمات میں مشغول ہوئے، جن کی باگ غدر کے بعد آپ کے مبارک ہاتھوں میں آئی۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ مصنف امام نے حضرت والا کی سوانح عمری میں آپ کے حج اول کا تذکرہ کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے، اس سے قطعی طور پر اس کی تردید ہوتی ہے، مگر سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ لوگوں میں یہی بات کیوں پھیلی رہی، کہ ملکہ وکٹوریہ کے اس اعلان کے بعد ان خطرات سے محفوظ ہو گئے تھے جنھیں حکومت کے وارنٹ نے آپ کے لئے پیدا کر دیا تھا۔

میرا مطلب یہ ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر کے پہلے حج کے متعلق یہ بیان کرتے ہوئے کہ اس سفر میں وہ بھی آپ کے ساتھ تھے مصنف امام نے ہندوستان سے روانگی کی تاریخ ۱۲۷۷ھ ماہ جمادی الثانی بتائی ہے۔ گویا سن عیسوی کے حساب سے ۱۸۶۰ء دسمبر کا مہینہ تھا، حساب کر کے دیکھ لیجئے اب اسی کے ساتھ وہ یہ بھی اطلاع دیتے ہیں کہ حج کے اس سفر کی

"روپوشی کی بلا کے سبب والدین نے بخوشی اجازت دے دی" ص۱۹

جس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ۱۸۶۰ء کے آخری مہینہ دسمبر تک "روپوشی کی بلا" سیدنا الامام الکبیر کے پیچھے لگی ہوئی تھی، اگرچہ تین دن کی اختیاری روپوشی کے بعد آپ کی روپوشی بھی برائے نام تھی، اور وہ بھی بقول مصنف امام جیسا کہ اس موقعہ پر بھی انہوں نے لکھا ہے کہ

"مولانا کی روپوشی محض عزیز و اقارب کے کہنے سے تھی، ورنہ ان کو اپنی جان کا کچھ خیال نہ تھا"

کچھ بھی ہو، مصنف امام کی اس تحریری شہادت کی بنیاد پر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ جیسے معافی نامہ کی استثنائی دفعات کے زیر اثر اس عام معافی نامہ سے مستفید ہونے کا موقعہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو نہ ملا، اسی لئے امن عام کے اعلان کے بعد بھی آپ کا سفر عرب کی طرف جاری رہا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کی صورت پیش آئی تھی۔

اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ امن عام کا اعلان جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، لارڈ کیننگ کی طرف سے ۱۸۵۸ء کی پہلی نومبر کو ہو چکا تھا، لیکن سیدنا الامام الکبیر کا نام ان مجرموں کی فہرست میں ۱۸۶۰ء کے آخر تک باقی تھا، جن کو حکومت کے رحم و کرم کے سلوک کا مستحق نہیں ٹھیرایا گیا تھا۔ اسی لئے میرا خیال تو یہ بھی ہے کہ حج کا یہ پہلا سفر گو حضرت والا نے تو خاص حج ہی کی نیت سے فرمایا تھا، لیکن آپ کے اعزہ و اقربا خصوصاً والدین کے سامنے یہ مصلحت بھی تھی کہ حکومت کی داروگیر سے بچنے کی بھی محفوظ ترین شکل یہی ہو سکتی ہے۔ ہمارے مصنف امام نے جو کچھ ارقام فرمایا ہے۔ کم از کم اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے

مصنف امام بھی جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، اس سفر میں آپ کے ساتھ تھے، لکھا ہے کہ،

"کشتیوں کی راہ پنجاب ہو کر سندھ کی طرف کو گئے، کراچی سے جہاز میں بیٹھے" ص۳۵

دیکھنے اور پڑھنے میں تو یہ چند الفاظ ہیں لیکن حکومت اور حکومت کے نمائندوں، اور چغل خور گوئندوں کی متجسس نگاہوں سے بچتے ہوئے براہ پنجاب کراچی تک پہنچنے کی دشواریوں کا صحیح اندازہ وہ نہیں کر سکتے، جن کو اس قسم کے اسفار کا اور وہ بھی خاص حالات میں سابقہ نہیں پڑا ہے۔ اسی راستے سے کئی سال بعد حضرت قطب ربانی مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ حج ہی کے لئے تشریف لے گئے تھے، ان کے سفرنامہ کی تفصیلات کو درج کرتے ہوئے مولوی عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ

"فیروزپور تک چھکڑے میں بیٹھے، اور وہاں سے کشتیوں میں بھاولپور کے نیچے گزرتے ہوئے حیدرآباد سندھ پہنچے، وہاں سے بغلہ[1] میں سوار ہو کر کراچی بندر آئے" ص۴۲ ج۱ تذکرۃ الرشید

---

[1] بغلہ کی تشریح مولانا عاشق الٰہی صاحب نے یہ کی ہے کہ بقدر تیس چالیس آدمی کی اس بڑی کشتی بغلہ نامی میں دریا ئی اگلو سفر پر

فیروزپور تک چھکڑے کی سواری میں مسافروں پر کیا گذرتی تھی۔ مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ

"ہچکولوں سے ہڈیوں کا چورا ہوتا ہے"

اور ہڈیوں کو چورا کرنے والی اس سواری میں بقول ان ہی کے "ہفتوں بیٹھنا پڑتا تھا" حیدرآباد سندھ سے کراچی تک پہنچنے کے لئے بتلہ کی بحری سواری میں کیا ہوتا تھا، مولوی صاحب ہی نے اطلاع دی ہے کہ

"مرطوب ہوا کے جھونکوں سے دوران سر میں مبتلا ہو کر ایک دوسرے پر جا پڑتے تھے، اٹھتے تو چکر اور استفراغ بے ہوش بناتا، اور پڑتے تو غشی کا بادل چھاتا چلا جاتا تھا"

ص ۲۳ ج ۱ تذکرۃ الرشید

سفر کی ان صعوبتوں سے تو ان کو بھی دوچار ہونا پڑتا تھا، جو آزادی کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ لیکن ہر چار طرف سے حکومت کی دار و گیر کا خطرہ جس کے لئے ہو سمجھا جا سکتا ہے کہ ان کی دشواریوں کا کیا ٹھکانہ ہو گا؟

لیکن شیخ اور پیر (حضرت حاجی صاحب رح) نے جس راہ سے عشق کی یہ وادی طے کی تھی، اسی راہ سے سعادت مند مرید (حضرت نانوتوی) بھی اللہ کے گھر پہنچا، مصنف امام نے لکھا ہے،

"کراچی سے جہاز بادبانی میں سوار ہوئے تھے"

یعنی ۵۷ء سے ۵۹ء تک ہندوستان میں حکومت کی اسی تیز نظر کے نیچے گذار کر ۵۹ء میں آپ حج کے لئے روانہ ہوئے، اس طرح ۵۷ء کے بعد ۶۰ء تک کے تمام سنین حضرت والا کے لئے درحقیقت اعلان آزادی سے مستفید ہونے کے نہ تھے۔ اور گویا سمجھنا چاہئے کہ جہاد کی جس مہم کا آغاز ۵۷ء میں ہوا تھا، سیدنا الامام الکبیر ستاون، اٹھاون، انسٹھ، ساٹھ بلکہ بقول مصنف امام

"بعد زیارت حرمین شریفین ایک برس کچھ کم و زیادہ میں وطن آئے" ص ۲۵

(گذشتہ صفحہ سے) گنجائش ہوتی ہے۔ بادبانوں کے ذریعہ ملاح ہوا کے رخ پر چلاتے تھے۔ دن بھر چلا کر شام کے وقت کسی بستی کے قریب کنارے پر باندھ دیا کرتے تھے ۱۲

یعنی ۱۸۱۸ء میں واپسی ہوئی گویا پانچ سال تک مسلسل بغیر کسی انقطاع کے جہاد ہی میں مشغول رہے۔ اور جہاد کے ساتھ ساتھ فریضۂ حج سے بھی سبکدوشی اسی مدت میں آپ کے لئے حق سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے آسان کی گئی۔

## حفظِ قرآن کی نعمتِ عظمیٰ

صرف حج ہی نہیں، بلکہ انزوا (یعنی فی الجملہ روپوشی) کے ان ہی مبارک ومقدس ایام میں جب حکومت کھلے ہوئے مشاغل میں حصہ لینے سے مانع تھی، فریضۂ حج کے ساتھ ایک ایسے عمل کی توفیق میسر ہوئی جس کا وجوبی مطالبہ تو بندوں سے ان کے پیدا کرنے والے نے نہیں کیا ہے لیکن سید الانبیاء والرسل صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل کے توفیق یافتوں کو بشارت سنائی ہے کہ

کانما ادرجت النبوۃ فی جنبہ | گویا کہ اس کے (یعنی حفظ قرآن کرنے والے کے) پہلو میں نبوت لپیٹ دی گئی۔

یعنی قرآن پاک کے حفظ کی دولت گرانمایہ سے بھی ان ہی جہادی دنوں میں آپ سرفراز ہوئے اگرچہ آپ کے حفظ قرآن کے متعلق یہی مشہور بھی ہے کہ آپ اسی پہلے حج کے موقعہ پر جہاز میں روزانہ ایک ایک پارہ یاد کرکے تراویح میں سنادیا کرتے تھے۔ خاکسار نے بھی بعض کتابوں کے حوالہ سے اپنی کتاب نظام تعلیم وتربیت میں یہی نقل بھی کردیا ہے۔ لیکن واقعہ کی صحیح اور تفصیلی شکل وہی ہے جس کا ذکر مصنف امام نے فرمایا۔ انہوں نے براہ راست حضرت کا بیان نقل کیا ہے۔

"فقط دو سال رمضان میں میں نے یاد کیا ہے، اور جب یاد کیا، پاؤ سیپارہ کی قدر، یا کچھ اس سے زائد یاد کرلیا۔"

بظاہر رمضان کے یہ دونوں مہینے اسی زمانہ کے ہیں جب حکومت کے وارنٹ کی وجہ سے انزوائی زندگی کا موقعہ آپ کو مل گیا تھا۔ اس زمانہ کا بہترین مشغلہ یہی ہوسکتا تھا کہ جس کی راہ میں یہ سب کچھ کیا جارہا تھا اس سے مکالمہ ومناجات کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔ اسی عرصے میں حج کا سفر پیش آگیا۔ جمادی الثانی میں گھر سے روانہ ہوئے، مصنف امامؒ نے یہ لکھتے ہوئے کہ کراچی میں بادبانی جہاز میں ہم سب سوار ہوئے

خبر دی ہے کہ ہم لوگوں کا سا داہوتا

"رمضان کا چاند دیکھ کر"

ہوا تھا۔ گویا یکم رمضان کو جہاز میں داخل ہوئے، اور وہی قرآن جو دو سال سے یاد کیا جا رہا تھا۔ تراویح میں اسی کے سنانے کا پہلا موقعہ اسی جہاز میں ملا تھا۔ مصنف امام کے الفاظ ہیں

"مولوی صاحب نے قرآن شریف یاد کیا تھا، اول وہاں (جہاز میں) سنایا"[1] ص۳۵

ختم تراویح کے موقعہ پر مٹھائی کی تقسیم کا جو عام دستور ہے، ظاہر ہے کہ جہاز میں اس کا کیا سامان ہو سکتا تھا، لیکن یہ بادبانی جہاز عرب کے ساحلی مقام حضرموت کی راج دھانی کے سامنے جس کا نام مکلا ہے کچھ دن کے لئے لنگر انداز ہوا، تو مصنف امام راوی ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر نے

"بعد عید مکلا پہنچ کر حلوائے مسقط خرید فرما کر (بطور) شیرینی ختم دوستوں کو تقسیم فرمایا" ص۳۵

الغرض اور عام لوگوں سے علاحدگی کے ان دنوں میں حفظ قرآن کا یہ پاک مشغلہ حضرت والا کا جو جاری تھا، اس کے متعلق یہ خبر دیتے ہوئے کہ

"مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) کا اس سے پہلے (یعنی جہاز میں قرآن سنانے سے پہلے)
قرآن یاد کرنا۔ کسی کو ظاہر نہ ہوا تھا، آہستہ آہستہ پڑھتے اور یاد کر لیتے" ص۳۵

اسی کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ

"حافظوں کے نزدیک ٹھیرا ہوا ہے کہ (قرآن) بلند آواز سے یاد ہوتا ہے" ص۳۵

لیکن سن رسیدہ ہونے اور آہستہ آہستہ یاد کرنے کے باوجود ان کی یہ شہادت ہے کہ

"جب سنایا، ایسا صاف سنایا، جیسے اچھے پرانے حافظ" ص۳۵

قرآن آپ نے کس لئے یاد کیا تھا، قطع نظر دوسرے اسباب و وجوہ کے فقیر نے جو یہ عرض کیا تھا کہ

---

[1] دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں ہو سکتا ہے کہ قرآن شریف یاد دو رمضانوں میں کیا ہو جو مفاد ہے، مصنف امام کی روایت کا اور روزانہ ایک ایک پارہ صاف کیا ہو، اس رمضان میں جس میں تراویح جہاز میں سنائی جو مفاد ہے مشہور روایت کا۔ محمد طیب غفرلہ

جس کی راہ میں یہ سب کچھ کیا جا رہا تھا، اسی سے مکالمہ اور مناجات کا رشتہ قائم کرنا بھی مقصود تھا۔
یہ کوئی سیراصرف خیالی حسن ظن نہیں ہے، بلکہ "القرآن العظیم" کا جو تعلق سیدنا الامام الکبیر کے نزدیک سورہ فاتحہ سے تھا، جس کا تفصیلی ذکر تو انشاءاللہ ان کے تحقیقی معارف اور لدنی مواہب کے ذیل میں آئے گا۔ لیکن اسی موقعہ پر مصنف امام نے اس واقعہ کا جو ذکر کیا ہے، یعنی یہ لکھتے ہوئے کہ

"پھر تو (قرآن) اکثر بہت بہت پڑھتے" ص۳۲

آگے یہ دل چسپ کہئے، یا دل دوز اطلاع دی ہے کہ

"ایک بار یاد ہے کہ ستائیس پارے ایک رکعت میں پڑھے" ص۳۲

یہ یاد تو مصنف امام کی ہے۔ اور فقیر نے یاد پڑتا ہے کہ اپنے اساتذہ میں سے کسی استاد گرامی سے سنا تھا کہ پہلی رکعت میں ستائیس پارے اور باقی تین پارے دوسری رکعت میں پڑھ کر سیدنا الامام الکبیر نے فرمایا تھا کہ "ایک دفعہ تو اھدنا الصراط المستقیم کے کامل جواب کو ایک ہی دفعہ میں سن لو" دل کی اسی تمنا کی تکمیل اس طرز عمل سے مقصود تھی۔

ایک ہی دوگانہ میں کامل تیس پاروں کو ختم کرنے کے سوا، مصنف امام ہی کی جو اطلاع ہے کہ

"اکثر بہت بہت پڑھتے"

اس سے بھی مراد ان کی بظاہر یہی ہے کہ قرآن کی کافی مقدار نمازوں ہی میں حفظ کے بعد پڑھنے کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا، کیونکہ اسی کے بعد انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"اگر کوئی اقتدا کرتا تو رکعت کر کر اس کو منع فرما دیتے، اور تمام شب تنہا پڑھتے رہتے" ص۳۲

شاید رات کے پچھلے حصہ میں تہجد کے وقت "بہت بہت" پڑھنے کا طریقہ اختیار کیا گیا تھا، اور گو حنفی مذہب میں بھی تداعی کے بغیر نوافل یعنی تہجد وغیرہ میں جماعت کی ممانعت نہیں ہے لیکن اگر کوئی شخص بلا اطلاع آپ کے ساتھ شریک ہو جاتا تو یہ خیال کر کے کہ ہر شخص کیلئے اتنی طویل قراۃ اور طویل قیام کا تحمل نشاط کے ساتھ آسان نہیں ہے اس رکعت کو مختصر کر کے نماز کو ختم کر دیتے اور اقتدا کرنیوالے کو شرکت سے منع فرما دیتے[1]

[1] میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ دیوان محمد یسین صاحب مرحوم نے ایک دفعہ حضرت کی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

بہرحال خلقت سے علٰحدگی کا اضطراری موقعہ وارنٹ کے زمانہ میں آپ کو جو اتفاقاً میسر آگیا تھا، بذات خود تو آپ کے جہاد ہی کا وہ تتمہ تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ حفظ قرآن اور فریضہ حج کی سبکدوشی بھی ان ہی دنوں میں ارحم الراحمین کی طرف سے آپ کے لئے آسان کی گئی۔

حیرت اس پر ہوتی ہے کہ معاشی حیثیت سے آپ کی جو حالت تھی، اس کو دیکھتے ہوئے یوں ہی سفر حج کے مصارف کی فراہمی دشوار تھی، خصوصاً ان دنوں میں تو "معاشی مشاغل" کا وہ قصہ بھی ختم ہو چکا تھا، لیکن بایں ہمہ اسی زمانہ میں بادبانی جہاز والے سفر کو آپ نے پورا کیا، اور جس طرح یہ سفر پورا ہوا، مصنف امام جو اس سفر میں حضرت کے ساتھ تھے، خود اپنے متعلق یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

"احقر بے سامان تھا، قلیل سا زاد راہ بہم پہنچایا تھا۔"

اسی کے بعد اپنا مشاہدہ ان الفاظ میں درج کرتے ہیں، کہ

"مگر مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کی بدولت وہ سب راہ بخیر و خوبی طے ہوئی۔"

حالانکہ وہی یہ بھی لکھتے ہیں کہ

"ہر چند مولوی صاحب بھی بے سامان تھے۔"

پھر یہ طول طویل سفر اور بقول ان ہی کے جمادی الثانی میں جو شروع ہوا تھا، اور رجب شعبان رمضان شوال کے کامل چار مہینوں کے بعد جیسا کہ وہی لکھتے ہیں کہ

"آخر ذیقعدہ میں مکہ معظمہ پہنچے۔" ص۳۳

گویا کم و بیش چھ ماہ میں یہ سفر پورا ہوا، سواری کے کرائے، خورد و نوش کا انتظام اس لمبی اور دراز مدت میں

---

(گذشتہ صفحہ سے) اقتدا کرتے ہوئے نیت باندھ لی جب پانچ چھ پارے ہوگئے تو انہوں نے ٹانگیں بدلنی شروع کیں اور آخر کار سات آٹھ پاروں پر بیٹھ گئے۔ دم لیکر پھر کھڑے ہوئے اور چند پارے سن کر پھر بیٹھے اور پھر بیٹھے ہی بیٹھے اقتدا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ حضرت والا نے ۲۵-۲۶ پاروں پر ایک رکعت کی اور پھر دوسری رکعت ذرا مختصر کرکے سلام پھیر کر ان سے فرمایا، تمہیں کس نے کہا تھا کہ اقتدا کرو؟ یہ سنتے ہی دیوان جی صاحب خفیف ہو کر یہاں سے اٹھے۔ محمد طیب غفرلہٗ

کیسے ہوتا رہا۔ افسوس ہے کہ بجائے تفصیل کے مصنف امام نے اس کے جواب میں صرف یہ اجمالی الفاظ درج کئے ہیں کہ

"بدولتِ توکل سب راہ بخیر و خوبی پوری ہوئی اور سب کام انجام ہو گئے" ص۳۴

اپنے اس توکل میں بنانے والے نے جسے اپنا وکیل بنایا تھا، اس نے اپنی وکالت کا حق کس طرح پورا کیا؟ حقیقت تو یہ ہے کہ کافی ایمان افروز واقعات ہوں گے، لیکن دیکھنے والوں ہی نے جب بیان نہیں کیا تو جس نے نہیں دیکھا وہ کیا بتائے۔ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے، کہ کافی خوشی اور خرمی انبساط و نشاط ہی کے ساتھ یہ سفر پورا ہوا تھا۔ جہاز میں تراویح کا سنانا، مکلا پہنچ کر مقلی حلوا خرید کر احباب میں ختم تراویح کی شیرینی کے طور پر تقسیم انبساط و انشراح قلب کی غمازی کر رہی ہے پراگندہ دلی و افسردگی میں ان باتوں کی بھلا کیا گنجائش؟ بلکہ اسی موقعہ پر بے ساختہ یہ جملہ معترضہ ان کے قلم سے جو ٹپک پڑا ہے، یعنی "جہاز میں کیا سیر تھا" ص۳۵ خود اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کافی سرور و نشاط کے ساتھ سفر پورا ہو رہا تھا۔

بہرحال جیسا کہ مصنف امام کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں کہ حج و زیارت کے اس مقدس سفر میں کم و بیش ایک سال کی مدت صرف ہوئی، ۱۸۵۷ء کو فتنہ پر گویا سمجھنا چاہئے تقریباً چار پانچ سال گذر چکے تھے یعنی ۱۲۷۷ھ میں حضرت کی روانگی ہندوستان سے ہوئی تھی اور ۱۲۷۸ھ میں واپسی ہوئی۔ اس عرصہ میں ہندوستان کی سیاسی حالت روز بروز بدلتی چلی جا رہی تھی، انتقام کی آگ حکومت کے سینے میں روز بروز جیسا کہ چاہئے تھا قدرتاً دھیمی پڑتی رہی۔ بیسیوں مجرمین جن کے نام عام معافی نامہ کے اعلان کے بعد بھی استثنائی فہرست سے نہ نکلے تھے۔ تدریجاً نکلتے چلے جا رہے تھے۔ اب کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کیا واقعہ پیش آیا، کہ حجاج کا وہی قافلہ جو پنجاب والی خشکی و تری کی راہ سے کراچی اور وہاں سے بادبانی جہاز پر حجاز پہنچا تھا، اسی کے پاس کس قسم کی اطلاعیں ہندوستان سے پہنچی تھیں، کہ اسی قافلہ کو یعنی سیدنا الامام الکبیر اور آپ کے رفقاء سفر کو دیکھتے ہیں کہ واپس لوٹتے ہوئے، بجائے کراچی کے بندر کے مصنف امام کا بیان ہے کہ

"مراجعت براہ بمبئی اور ناسک ہوئی' ریل ناسک تک تھی' وہاں سے گاڑیوں میں آئے" ص۸۸

ان ہی کی اطلاع یہ بھی ہے کہ

"ربیع الاول کے آخر میں بمبئی آئے۔ جمادی الثانی تک وطن پہنچے" ص۸۸

گویا بمبئی سے وطن تک پہنچنے میں دو ڈھائی مہینے صرف ہوئے'

اگرچہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ بمبئی کی راہ سے یہ واپسی بھی "روپوشی" ہی کی شکل میں تھی' یا یہ قصہ ختم ہو چکا تھا۔ لیکن قرائن کا اقتضا اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی نگرانی میں اضمحلال اور لاپروائی کی کیفیت ضرور پیدا ہو چکی تھی۔ اسی حج کے سفر سے واپسی کے تذکرے کو ختم کر کے مصنف امام نے لکھا ہے کہ'

"پیچھے بعد تحقیقات سرکار نے مطالبہ عام اٹھا دیا تھا' چند خاص شخصوں کی نسبت جن پر سرکار کا شبہ قوی تھا اشتہار جاری رہا"

واللہ اعلم بالصواب "پیچھے" کے لفظ سے ان کی کیا مراد ہے' بظاہر تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ان لوگوں کے پیچھے جب وہ عرب میں تھے حکومت کی طرف سے تحقیقات کے بعد "مطالبہ" کی گرفت ڈھیلی کر دی گئی تھی' اور صرف چند مخصوص شخصیتوں کی حد تک قصہ محدود ہو کر رہ گیا تھا۔

مصنف امام کے اس بیان کے سوا اس وقت تک مجھے کوئی ایسی چیز نہیں ملی ہے جس میں صراحۃً اس کا ذکر کیا گیا ہو کہ سیدنا الامام الکبیر کے اسم گرامی کو اشتہائی مجرموں کی فہرست سے نکال دیا گیا تھا۔ لیکن ان کے بیان کے نحوی سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ حج کے سفر سے واپسی کے بعد سیدنا الامام الکبیر کے لئے کسی قسم کا کوئی خطرہ باقی نہ رہا تھا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ حج سے واپس ہونے کے بعد حضرت والا

"پھر گھر پر اپنے رہے" ص۳۹

سمجھنا چاہئے کہ اسی نقطہ پر ۵۷ء کے جہاد کی مہم آپ کی ختم ہو گئی۔

باقی رہے حضرت حاجی صاحب کے صاحبین میں سے دوسرے صاحب یعنی قطب ربانی حضرت مولٰنا

رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تو جہاں تک میرا خیال ہے ملکہ وکٹوریہ کے عام معافی نامہ کے اعلان کے بعد بھی اپنے رفیق سیدنا الامام الکبیر کی طرح آپ کا شمار بھی ان ہی استثنائی مجرموں میں تھا، جو اس معافی نامہ سے مستفید ہونے کا حق نہیں رکھتے تھے۔ جیسا کہ معلوم ہے حضرت گنگوہی کو حکومت نے گرفتار بھی کر لیا تھا، اور حوالات میں ڈال کر چھ مہینہ تک آپ پر باضابطہ مقدمہ چلتا رہا، غیبی امداد سرگرم کار تھی، نہ بڑے بڑے وکیل تھے اور نہ بیرسٹر۔ لیکن اس آفت ناگہانی سے بخیر و خوبی آپ سالم و غانم ہو کر نکل آئے۔ جس کی تفصیلات تذکرۃ الرشید میں پڑھنا چاہئے۔ یہاں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ حضرت گنگوہی کی گرفتاری کا ذکر کرتے ہوئے مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ

"تخمینے سے یہ زمانہ ۱۲۷۵ھ ہجری کا ختم یا ۱۲۷۶ھ کا شروع سال ہے" ص۷۵

اگر یہی واقعہ ہے تو عیسوی سن کے حساب سے یہ ۱۸۵۸ء کا آخر اور ۱۸۵۹ء کی ابتدا کا زمانہ ہے، اور عرض کر چکا ہوں کہ ۱۸۵۸ء کے نومبر ہی میں عام معافی نامہ کا اعلان حکومت برطانیہ کی طرف سے ہندوستان میں کیا جا چکا تھا۔ ایسی صورت میں سمجھنا چاہئے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ پر مقدمہ عام معافی نامہ کے اعلان کے بعد چلایا گیا۔

حضرت مولانا گنگوہی کی گرفتاری کے زمانہ میں جو واقعات پیش آئے جن کا ذکر مولوی عاشق الٰہی صاحب نے کیا ہے۔ آج بھی ان کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ستر سواروں کو ساتھ لیکر ایک مسلمان غلام علی نامی کی مخبری اور رہنمائی میں کرنل گارڈن نے گنگوہ پر دھاوا کیا، مولانا گنگوہ میں موجود نہ تھے۔ لیکن ان کے اشتباہ میں حضرت کے ماموں زاد بھائی مولوی ابوالنصر صاحب مرحوم کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ جو مسجد کے کسی گوشہ میں گردن جھکائے بیٹھے تھے۔ مولوی عاشق الٰہی کی روایت ہے کہ سواروں میں سے ایک سوار نے مولوی ابوالنصر

"کی گردن پر زور سے ہاتھ مارا اور پکارا کہ چل کھڑا ہو، گردن جھکائے کیا بیٹھا ہے" ص۷۵

مولوی ابوالنصر حالانکہ جانتے تھے کہ مولانا گنگوہی کے شبہ میں مجھے گرفتار کر رہا ہے لیکن اس مرد خدا

اللہ کے بندے کی زبان سے یہ تو نکلا کہ

"میں رشید احمد نہیں ہوں"

اخلاص و وفا کی یہ مثالیں سلف[1] میں تو سننے میں آئی ہیں۔ لیکن روح القدس کا فیض خلف میں بھی ایسی روحوں کو پیدا کرتا رہا ہے۔ ایک زندہ شہادت تو اس کی یہی ہے۔

بہرحال کہا جاتا ہے کہ حضرت گنگوہی ایک مسلمان حکیم احمد امیر بخش کی مخبری سے رامپور منہیاران میں گرفتار ہو گئے' اور بقول مولانا عاشق الٰہی سہارنپور جیل کے اندر

"تین چار یوم کال کوٹھری' اور پندرہ دن جیل خانہ کی حوالات میں مقید رہے"

سہارنپور سے آپ کو مظفر نگر جیل میں منتقل کر دیا گیا' لکھا ہے کہ

"مظفر نگر کے جیل خانہ میں حضرت کو کم و بیش چھ ماہ رہنے کا اتفاق ہوا"

قرآن مجید کے حفظ کا کام تو فارغ التحصیل ہونے کے بعد ہی پورا کر چکے تھے جیل میں تلاوت و ذکر و شغل کے ساتھ ساتھ وعظ و تذکیر کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا' لکھا ہے کہ

"حراست کے زمانہ میں آپ کی نماز ایک وقت کی بھی قضا نہ ہوئی"

نماز صرف قضا ہی نہیں ہوئی' بلکہ

"محبس کی کوٹھری میں بھی نماز با جماعت ادا کرتے رہے" ملخص تذکرۃ الرشید ج ۱

سیرت و کردار اور تقویٰ کی زندگی کا اثر جیل خانہ میں بھی یہ ہوا' کہ قیدیوں میں

"بہتیرے وہیں آپ سے بیعت ہوئے"

اس سلسلہ میں ہماری کتاب کے موضوع کے لحاظ سے قابل ذکر اس واقعہ کا اہم ترین جزو وہ ہے جس کا

[1] طبقات ابن سعد میں نقل کیا ہے کہ ابراہیم نخعی کی گرفتاری کا حکم حجاج مشہور ظالم امیر نے دیا' وہ روپوش تھے' کوفہ ہی میں ایک دوسرے عالم و واعظ ابراہیم تیمی بھی تھے۔ حجاج کے آدمیوں نے ابراہیم نخعی کے اشتباہ میں ابراہیم تیمی کو گرفتار کر کے حجاج کے دربار میں پہنچا دیا' حجاج نے جیل بھی ان کو بھجوا دیا' ابراہیم تیمی جانتے تھے کہ میں نخعی کے شبہ میں پکڑا گیا ہوں۔ لیکن اس حقیقت کو آخر وقت تک ظاہر ہونے نہ دیا۔ تا اینکہ جیل ہی میں وفات بھی ہو گئی۔

تذکرہ مولوی عاشق الٰہی صاحب نے فرمایا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جس وقت سہارنپور سے پا بزنجیر مظفر نگر پولیس کی نگرانی میں حضرت گنگوہی جا رہے تھے، راستہ دو دن میں طے ہوا تھا۔ سڑک سہارنپور سے مظفر نگر جانے والی دیوبند ہو کر گذرتی تھی، وہی دیوبند جہاں ان کے رفیق الدنیا والآخرۃ عاشق زار، یار وفادار سیدنا الامام الکبیر مسجد دن میں اپنے اللہ کی پناہ میں زندگی گذار رہے تھے۔ حضرت گنگوہی کی دیوبند کی سڑک سے گذرنے کی خبر کسی طرح آپ تک پہنچ گئی۔ دل تڑپ اٹھا، تاکنے والی آنکھیں حالانکہ چاروں طرف لگی ہوئی تھیں۔ لیکن ان آنکھوں میں خاک جھونکتے ہوئے بیان کیا جاتا ہے، کسی ایسی جگہ پر جا کر کھڑے ہو گئے، جہاں سے ان کی نظر اپنے محبوب رفیق پر پڑ سکتی تھی۔ اچانک ہاتھوں میں بیڑیاں پاؤں میں زنجیر پہنے ہوئے، ہندوستان کا محدث اعظم ان کے سامنے آ گیا۔ پولیس کا پہرہ لگا ہوا تھا۔ بات تو بات شاید اشارے کی بھی گنجائش نہ تھی۔ زبان حال سے حضرت گنگوہی کی طرف سے روح کی فضاؤں میں یہ آواز گونج رہی تھی

بجرم عشق توام می کشند غوغا ئیست

تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشا ئیست،

گویا بفحوائے شعر مذکور یہ سارا قصہ جو کچھ بھی پیش آیا تھا، گذر چکا کہ سیدنا الامام الکبیر ہی کے اقدام و اصرار کا نتیجہ تھا۔ مولوی عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ

"سنا ہے کہ دیوبند کے قریب گزرنے پر مولٰنا قاسم العلوم نظر براہ راستہ سے کچھ ہٹ کر بغرض ملاقات پہلے سے آ کھڑے ہوئے تھے۔ گو خود بھی مخدوش حالت میں تھے مگر بے تابی شوق نے اس وقت چھپنے نہ دیا، دور ہی دور سے سلام ہوئے۔ ایک نے دوسرے کو دیکھا"

گویا ع، باہم نگرستیم و گذشتیم، کی صورت بجلی کی طرح سامنے کوند گئی، یہ مصرعہ عرفی کا ہے جس میں نگرستیم کے بعد "گرستیم" کا اس نے ذکر کیا ہے۔ لیکن مولوی عاشق الٰہی صاحب نے جس راوی سے یہ خبر سنی تھی، اس کا بیان تھا کہ باہم ایک دوسرے کو دیکھ کر "مسکرائے" "بے ساختہ

ٹونکی شاعر کیف مرحوم کا شعر بادنیٰ تصرف یہاں یاد آرہا ہے۔

ملتے ہی آنکھ رنج نہ تھا ظلم غیر کا
کیا جانے اس نگاہ نے سمجھا دیا مجھے

آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک نے دوسرے سے کچھ کہا، جانے والا مظفرنگر جیل میں داخل ہونے کے لئے مظفرنگر کی طرف روانہ ہوگیا، اور دیکھنے والا، جب تک دیکھ سکتا تھا، دیکھتا رہا، پھر ان ہی آنکھوں پر کیا گذرتی گی جو دیکھنے سے بھی محروم کردی گئیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں صاحبین کے شیخ نے تو خیر مکہ معظمہ ہی کو وطن بنالیا، اور یہی ان کے لئے مقدر بھی تھا، پیدا ہوئے تھے ہند میں، لیکن قدرت ان کو شیخ العجم والعرب بنانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ جس فیصلہ کی تکمیل اسلام کے قبلہ اور مرکز میں قیام کے بغیر ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ باقی صاحبین، تو دیکھ چکے کہ معافی عام کے اعلان کے بعد بھی دونوں پر حکومت کی نگرانی قائم رہی، حضرت گنگوہیؒ پر تو مقدمہ بھی چلا۔ جو خطرہ ان کے لئے تھا۔ وہ معمولی نہ تھا، تذکرۃ الرشید میں مولوی عاشق الٰہی نے ایک واقعہ کا تذکرہ کیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اور تو اور ان کے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ تک کا احساس تھا کہ حکومت حضرت گنگوہیؒ کو پھانسی دے دے گی، ایک دفعہ اپنے رفقاء سے فرمایا بھی کہ

"میاں کچھ سنا مولوی رشید احمد کو پھانسی کا حکم ہو گیا" ؂

اور جب پھانسی تک کی سزا کا اندیشہ حضرت گنگوہیؒ کے متعلق پیدا ہو چکا تھا، اور اس قسم کی خبریں اڑنے لگی تھیں، تو پھر جس نے شاملی کے دروازے کو جلایا تھا، جس کے جل جانے کی وجہ سے خدا ہی جانتا ہے کہ حکومت کی فوج کے کتنے آدمی مارے گئے۔ جنیو کا ہاتھ چلا کر عفریت پیکر فوجی کو جس نے دو پارہ کیا تھا۔ اس کے سوا خود اس کی تلوار نے کتنوں کو ٹھکانے لگایا تھا، زخم چشم کی عینی شہادت سے جس کا جرم پہچانا بھی جاسکتا تھا، اندازہ کیا جاسکتا ہے، کہ وہ خطرات کی کتنی گہری تاریکیوں میں گھرا ہوا ہوگا، جو کچھ بھی سوچا جاسکتا ہے۔ سمجھنا چاہئے کہ سب ہی کی گنجائش تھی لیکن حضرت

گنگوہی پر مقدمہ چلنے، اور جیل میں رہنے کے باوجود اور بقول مولنا عاشق الٰہی سہارنپور میں بھی

"تحقیقات پر تحقیقات اور پیشی پر پیشی ہوتی رہی" ص۸۳

اور مظفر نگر میں بھی حاکم کے سامنے بار بار پیش ہونے پر جس کا حال یہ رہا ہو، کہ

"جو کچھ وہ دریافت کرتا، بے تکلف اس کا جواب دیتے تھے، کبھی کوئی کلمہ دبا کر زبان کو موڑ کر نہیں کہا، کسی وقت جان بچانے کے لئے تقیہ نہیں کیا، جو بات کہی سچ کہی" ص۸۴

با این ہمہ پھانسی تک کا خطرہ کیا بلکہ گونہ یقین تک کی کیفیت جس کے متعلق پیدا ہو چکی تھی، دیکھا گیا کہ حاکم اس سے پوچھتا ہے کہ

"رشید احمد تم نے مفسدوں کا ساتھ دیا، اور فساد کیا؟"

جواب میں صرف چند الفاظ

"ہمارا کام فساد کا نہیں، نہ ہم مفسدوں کے ساتھی"

اور کچھ نہیں کہا گیا، پوچھا گیا

"تم نے سرکار کے مقابلہ میں ہتھیار اٹھائے؟"

بجائے زبان کے دیکھنے والوں نے دیکھا کہ پہلے ہاتھ اٹھا، جس میں تسبیح تھی، اسی تسبیح کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جا رہا تھا

"ہمارا ہتھیار تو یہ ہے"

"ہاتھ کا یار" یا ہاتھ کی یاری جس سے تھی، اسی کو دکھا دیا گیا، گویا ہاتھ کے اشارے سے حافظ کی غزل سنائی جا رہی تھی

| | |
|---|---|
| گرچہ ما بندگان بادشہیم | بادشاہان ملک صبحگہیم |
| گنج در آستین و کیسہ تہی | جام گیتی نما، و خاک رہیم |

اور یہ کہ ع روی ہمت بہر کجا کہ نہیم

| | |
|---|---|
| دشمنان را ز خون کفن سازیم | دوستان را قبائے فتح دہیم |

کچھ مصنوعی بندر بھبکیوں کے بعد دیکھا گیا، روایت متواتر ہے، مصدق بالشاہدہ ہے کہ "پھانسی کے حکم کا انتظار جس کے لئے کیا جا رہا تھا" اسی کے متعلق فیصلہ سنانے والا فیصلہ یہ سنا رہا تھا، یا اس سے سنوایا جا رہا تھا کہ

"رشید احمد رہا کئے گئے" ؎

اور یہاں تو خیر گرفتاری بھی ہوئی، مقدمہ بھی چلا، پیشی بھی ہوئی۔ پوچھ تاچھ سے بھی کام لیا گیا، لیکن جس کا جرم بھی سخت تھا، اور اپنے جرم کی عینی شہادت جس کی پیشانی پر چمک رہی تھی، اپنے تمام ممکنہ وسائل کے ساتھ حکومت کی لامحدود آنکھیں اسے ڈھونڈھتی رہیں، لیکن ان ہی آنکھوں کے نیچے چلتا پھرتا رہا، ان ہی کے درمیان سے گذرتا ہوا، پنجاب پہنچا، پنجاب سے سندھ، سندھ سے عرب تک سمندر پھلانگ کر پہنچ گیا۔ وہاں سے واپس بھی لوٹا، دیکھنے والے دیکھتے بھی رہے، لیکن وہ کسی کو نہ سوجھا، اور آج تک یہ سربستہ راز اسباب معمہ ہی بنا رہا کہ ڈھونڈھنے والوں کی اقطار ہند میں بکھری ہوئی نگاہیں اچانک کیوں سمٹ گئیں۔ جو مجرم اور سخت مجرم تھا، وہ جرم سے بری کیوں ٹھہرا دیا گیا۔ کم از کم میری جستجو اور تلاش کے لئے تو یہ سوال ابتداء میں بھی چیستان ہی تھا، اور سب کچھ الٹنے پلٹنے اور اسباب کے سارے دفاتر ممکنہ کے کھنگال ڈالنے کے بعد بھی، اب تک وہ چیستان ہی بنا ہوا ہے۔

لیکن میں جانتا ہوں کہ ایسے معموں کا حل ان نمائشی اسباب و مسببات کے پرپیچ سلسلوں میں تلاش کرنا ہے بھی نادانی۔ ایسے حیرت ناک امور اور ان کے حیرت افزا نتائج کا حل صرف ان غیبی میدانوں میں دستیاب ہو سکتا ہے جن کی سرحد عالم محسوسات کے ماوراء سے شروع ہوتی ہے۔ یقیناً وہ مختوم القلوب انہیں کبھی نہیں سمجھ سکتے جو ہر وقت محسوسات ہی کے دائروں میں تہ و بالا اور غلطاں و پیچاں ہوتے ہوئے بالآخر ایک دن اسی ناسمجھی کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں۔ کیا انہیں یہ نہیں معلوم کہ ع ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں

اس چیستان کا حل کہ حکومت کی نگاہوں میں ایک سخت ترین مجرم اس کی سپاہیوں کے

بعد بھی صاف بچا رہے اور وہ کہ جسے خود حکومت کا فیصلہ بری قرار دے رہا ہو، اسی کے ہاتھوں ۶ ماہ جیل میں بند رہے۔ ستاروں کے پیچھے ان ہی عرشی انسانوں کے واقعات کے مبادی ہیں تلاش کرو تو بآسانی مل جائے گا۔ خود حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ہی کے ایک جملہ سے یہ سارا مجمل متن حل ہو جاتا ہے۔ مولانا گنگوہیؒ نے جیل سے رہائی کے بعد فرمایا کہ جہاد شاملی کے مسئلہ میں مجھے ابتداءً کچھ تامل تھا۔ شاید اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ مجھے ۶ ماہ جیل میں رہنا پڑا اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو کسی وقت بھی کوئی تامل نہیں ہوا تو وہ اس ابتلاء سے نہیں گذارے گئے۔ آپ نے دیکھا کہ جس معمہ کو وابستگان اسباب کاوشوں کے بعد بھی حل نہ کر سکے، ایک وابستۂ غیب نے اسے چٹکیوں میں حل کر کے حیرتوں کا پردہ چاک کر دیا۔ یعنی معاملہ کا تعلق حسی اسباب سے زیادہ باطنی شئون سے نکلا۔ ہو سکتا ہے کہ اُن تنگ چشمان عالم محسوسات کے لئے یہ مسئلہ پھر بھی چیستان ہی رہے۔ جنہیں غیبی مقامات پر دھیان دینے کی نہ فرصت ہے نہ اہلیت، لیکن ان کی تنگیٔ چشم و داماں سے عالم روحانیات کی لامحدود وسعتوں اور ان سے وابستہ رہنے والوں کے وسیع ترین حوصلوں اور ذہنی وسعتوں میں اس سے فرق ہی کیا پیدا ہو سکتا ہے اور اگر اس تقدیری حقیقت کو تدبیر کے سلسلوں میں نمایاں کرنے کے وسائل کسی کے سامنے نہ آئیں تو اصل حقیقت پر اس سے کیا غبار آ سکتا ہے۔؟

ذوق و وجدان کی راہ کو چھوڑ کر جو لوگ خواہ مخواہ اصول اور استدلال ہی کی راہ پیمائی ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے لئے بھی آخر اس قدرتی اصول میں تامل کرنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے کہ جس کی راہ میں سو جان سے جان دینے کے لئے کھڑا ہونے والا کھڑا ہوا، اسی نے اس کی جان تک کسی متجسس کسی جاسوس اور کسی دَوِش کو نہ پہنچنے دیا۔

اگر اس اصول کے نیچے اس لمبی چوڑی تاریخ کو رکھ لیا جائے جو اس اصول کے لئے دلائل اور مظاہر کی حیثیت رکھتی ہے تو اس میں معمہ کی کیا بات رہ جاتی ہے۔ جاں سپاروں کی جانوں کو ملائکہ مسوّمین کے ذریعہ محفوظ کرا دیا جائے۔ رجال غیب کے ہاتھوں جلادوں کے ہاتھ شل کرا دئیے جائیں۔

اور حکام کے قلم پھیر دئے جائیں۔ خلیل کے ہاتھ کی چھری ذبیح کے گلے پر آکر کند کردی جائے۔ راہ ہجرت میں حبیب کے بچاؤ کے لئے دیکھتی آنکھوں سراقہ ابن مالک کے گھوڑے کی ٹانگیں زمین میں دھنسادی جائیں، جو غیبی طاقت ان حقائق میں بلا توسل اسباب بلکہ خلاف اسباب اپنے جاں بازوں کے لئے یہ کرشمے دکھلا سکتی ہے۔ اسی قوت نے اگر شاملی کے میدان اور میدان کے مابعد اپنے سچے جاں نثاروں کی جانوں کے تحفظ کے لئے دشمنوں کی کھلی آنکھوں کو نابینا، حکام کے رواں قلموں کو شکستہ اور ان کی بولتی زبانوں کو گنگ بنا دیا تو یہ کوئی نیا سانحہ اور حیرت ناک چیستاں کب ہے کہ اسے عقدۂ لاینحل بنا لیا جائے، بلکہ ہر دور اور ہر قرن کا ایک عام اصول ہے۔ جسے تاریخ دہراتی چلی آئی ہے۔ بہرحال ذوق و وجدان، اصول و استدلال اور تاریخ و مشاہدات سبھی اس پر ایک زبان ہیں کہ من کان للّٰہ کان اللّٰہ لہ۔ (محمد طیب غفرلہٗ)

۱۸۵۷ء میں جو طوفان اٹھا تھا، وہ اوروں کے لئے کسی وقت بھی ختم ہوا ہو۔ لیکن سیدنا الامام الکبیر کی حد تک کہا جا سکتا ہے کہ نشیب و فراز کی مختلف منزلوں سے گذرتے ہوئے صحیح معنوں میں اس وقت تھما، جب ۱۲۷۷ء کا سال گذر رہا تھا، اور پہلے حج کے سفر سے براہ بمبئی آپ نانوتہ واپس ہوئے، اسی کے بعد جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے

"پھر گھر پر اپنے رہے" ص ۲۳

حضرت والا کی زندگی مبارک کے یہی چند سال (پانچ چار سال کے قریب) وہ ہیں جن میں جہاد کے فرض کفایہ، اور حج کے فرض عین سے بھی سبکدوشی آپ کے لئے آسان کی گئی، اور اسی محدود مدت میں حفظ قرآن کی سرمدی دولت و سعادت سے بھی سرفرازی میسر آئی جو مصائب و آلام کا دباؤ آپ پر ڈالا گیا۔ ان کے یہ ثمرات و نتائج تو وہ ہیں جنہیں دیکھنے والوں نے دیکھا اور جاننے والوں نے جانا، لیکن عالم شہادت اور عالم محسوس کے پیچھے غیبی میدانوں کا لامحدود سلسلہ جس کے سامنے ہو، اس کے مدارک کو کوئی کیا بیان کر سکتا ہے کہ پانے والے نے ان مصائب کا صلہ کیا کچھ پایا۔ قرب و وصال کی کتنی کتنی بلند منزلیں طے کر ڈالیں

اور ان جاں بازیوں میں اس کے سلف کو جو کچھ ملا تھا اسے اس میں سے کیا کچھ مل گیا؟۔

شرح صدر کی نعمت پانے والوں کے لئے یقین مانئے کہ مصیبت کا ہر دباؤ قلبی صعود کا چڑھاؤ بنتا چلا جاتا ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ عروج وارتقاء کے آخری نقطہ تک چڑھائی کی جو صورت اسراء کی رات میں پیش آئی تھی، کون کہہ سکتا ہے کہ شعب ابی طالب کے ہولناک تاریخی دباؤ سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

فاتبعونی کی پکار پر چل پڑنے والوں کے سامنے کیسے بتایا جائے کہ اپنے اپنے ظرف اور اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق کسی نہ کسی رنگ میں وہ سب کچھ پیش آتا ہے، جس سے خود فاتبعونی کا پکارنے والا گذرا تھا، یا اسے گذارا گیا تھا۔ فصلے اللّٰہ تعالےٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہٖ وصحبہٖ اجمعین۔

حد سے زیادہ تاریک اور مہیب مستقبل جس سے اچانک سرزمین ہند میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت مرحومہ دوچار ہو گئی تھی' اس سے مقابلہ کرنے کے لئے اترنے والے میدان میں اتری' آپ دیکھ چکے کہ ایک طبقہ تو ان ہی میں ان لوگوں کا تھا جو بہ یک جست قلندرانہ کیفے یا شہیدانہ دوسروں کو نہ سہی لیکن خود اپنے آپ کو ایسے "روشن مستقبل" تک پہنچا دینے میں کامیاب ہو گیا' جس کے بعد تاریکی کا خطرہ ہی باقی نہیں رہتا' تھانہ بھون کی جہادی مہم میں اس طبقہ کے سرگروہ حضرت حافظ ضامن شہید نوراللہ مرقدہ تھے۔

لیکن فمنھم من قضی نحبہ[1] کے فرض سے سبکدوش ہونے والے اس گروہ کے مقابلہ میں و منھم من ینتظر کی قدرتی کمند نے جن کو "تاریک مستقبل" ہی کے ساتھ کش کرنے کے لئے روک لیا تھا' کیا آگے بڑھنے سے وہ رک گئے؟ بجائے گھٹنے کے تاریکی بڑھتی ہی چلی جاتی تھی بلکہ مرزا غالب جس زمانہ میں گا رہے تھے کہ

موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے

آستان یار سے اٹھ جائیں کیا!

اس زمانہ میں دیکھنے والوں نے چشم سر سے دیکھا کہ واقعی کسی کے سر سے خون کی موج ابل رہی تھی

---

[1] اشارہ قرآن کی اس آیت کی طرف ہے جس میں ارشاد ہوا ہے

| | |
|---|---|
| من المؤمنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ فمنھم من قضی نحبہ ومنھم من ینتظر (الاحزاب) | ایمان والوں سے کچھ لوگ وہ ہیں کہ سچ کر دکھایا جس کا خدا سے عہد و پیمان کیا تھا' پھر ان میں بعضوں نے اپنا ذمہ پورا کر دیا' اور بعض ان ہی میں انتظار کر رہے ہیں عہد کی تکمیل کا۔ |

پوچھنے والے پوچھ رہے ہیں کہ کیا ہوا؟ اور وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ کچھ نہیں ہوا کچھ نہیں ہوا' زد در زد ہو کر اس کے چہرے پر گولی چلائی گئی' بندوق کی گولی چلائی گئی۔ مونچھ اور داڑھی کا بھی کچھ حصہ جل گیا۔ آنکھوں کو بھی چشم زخم پہنچا۔ لیکن سوا آگے بڑھنے ہی کے لئے میدان میں اترا تھا وہ اس لئے اسی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا' جدھر جانے کا وہ فیصلہ کر چکا تھا' طوفان کا رخ پھیرا جائے گا' جو اندھیرا پھیلا ہے' اس کو روشنی سے بدلا جائے گا' اس کا یہ عزم صمیم اب بھی تر و تازہ تھا' اس کی امنگوں کا جوش اب بھی باقی تھا' بلکہ شاید کچھ زیادہ تیز' زیادہ قوی ہو گیا تھا' ۱۸۵۷ء تک تو اس کے ہاتھ میں تلوار بھی تھی' اس ہنگامہ کے فرو ہو جانے کے بعد تو یہ تلوار بھی چھن گئی' اور غالب ہی کے الفاظ میں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں'

آہنی اور نقرئی و طلائی الغرض سارے ہتھیار جن سے کام لیا جاتا ہے' وہ سب ہی سے نہتا ہو چکا تھا' لیکن اس کے ارادے کی بلندیاں اب بھی باقی تھیں' حالانکہ وقت تنگ ہو چکا تھا' لیکن اسی تنگ وقت میں اس سے جو کچھ ہو سکا کر گذرا' اس کی بھی کوشش بار آور اور سعی مشکور ہوئی' یوں اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک مستقل دینی و علمی تحریک کی بنیاد پڑ گئی۔ یہ وہی دینی و علمی تحریک ہے' جو ضلع سہارنپور کے قصبہ دیوبند کی طرف منسوب ہو کر "دیوبندیت" کے نام سے عوام و خواص میں موسوم و مشہور ہوئی۔

یہ دینی و علمی تحریک جس کا عرفی نام "دیوبندیت" ہے' اور اپنے بانی[1] کے نام کی نسبت سے اس کی تعبیر چاہئے تو یہی کہ

## "قاسمیت"

سے کی جائے۔ حقیقت کی آئینہ دار سچ پوچھئے تو یہی تعبیر ہو سکتی ہے۔

---

[1] مراد حضرت نانوتوی قدس سرہ ہیں ۱۲

بہرحال دیوبندیت کہئے یا قاسمیت کی تحریک، اپنی اصل حقیقت کی رو سے کیا ہے، کیا یہ کوئی بسیط حقیقت ہے؟ یعنی اسلامی علوم کی تعلیم کے لئے کسی خاص عصری نظام ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہے؟ بظاہر شاید یہی سمجھا جاتا ہے، لیکن حقائق آگاہ دیدہ وروں سے پوچھئے، وہ آپ کو بتائیں گے کہ جیسے یہ ایک تعلیمی نظام ہے، اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ خاص قسم کی دینی و روحانی تربیت کا ایک ایسا معتدل سانچہ اور قالب بھی ہے، جس میں ڈھل کر نکلنے والوں میں اسلامی مطالبات کے اعتقادی و عملی، ظاہری و باطنی، عناصر کا امتزاج کچھ ایسے رنگ میں ہو جاتا ہے، جس کی نظیر کم از کم اس زمانہ میں ہندوستان تو ہندوستان، شاید بیرون ہند کے کسی اسلامی ملک میں بھی بآسانی نہیں مل سکتی۔

صرف یہی نہیں بلکہ اسی کے ساتھ اس تحریک کے قیام میں ابتدا ہی سے کچھ ایسی چیزیں گھلی ملی ہوئی ہیں، جو ایک طرف خود ہندوستان کو بھی اپنے صحیح سیاسی مقام تک انشاء اللہ تعالیٰ پہنچا کر رہیں گی، اور دوسری طرف عام عالم اسلامی سے بھی رشتۂ اتحاد و اخوت کے استحکام میں ان سے کافی مدد ملتی رہی ہے، آئندہ بھی انشاء اللہ ملتی رہے گی۔ اور خواہ اعتراف کیا جائے یا نہ کیا جائے، لیکن ہندی مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں بھی اس تحریک سے غیر معمولی انقلاب ہوا، بلکہ انصاف سے اگر کام لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس قوم کے پس ماندہ طبقات کی معاشی حالت کے سدھارنے میں بھی اس تحریک سے کافی تقویت پہنچی ہے[1]۔ اور حق تو یہ ہے کہ حالات کی ناموافقت اگر آڑے نہ آجاتی، جس کی وجہ سے اس تحریک کے بعض اہم اجزاء کی عمر مختصر ہو کر رہ گئی، تو ہمارا وطن شاید آزادی تئے سے پہلے بہت پہلے آزادی کی ایک بڑی منزل طے کر لیتا۔ کم از کم حکومت متسلطہ کی تعبیر کا ایک اہم غیر معمولی

[1] کیونکہ اس نظام تعلیم سے زیادہ تر استفادہ کا موقع مسلمانوں کے ان پس ماندہ طبقات ہی کے بچوں کو ملا جو اپنی معاشی ابتر حالیوں کی وجہ سے حکومت کے قائم کئے ہوئے جوامع یا یونیورسٹیوں کی اس تعلیم کو حاصل نہیں کر سکتے تھے جس سے سرکاری ملازمت کا استحقاق پیدا ہوتا ہے، یہ نسل میں بہت سید مسعود صاحب نقاجن اکبر مرحوم کی یہ پیلوث خواہ حقیقی بھی جو صاف گسل ہو لیکن جس عہد سے ہم گذر رہے ہیں عربی اور دینی تعلیم کی عمومیت سے غریب مسلمانوں کی معاشی سطح کے بلند کرنے میں ضرور مدد ملی ہے۔ اپنے ایک مستقل مقالہ میں فقیر نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے جو شاید مجلہ دارالعلوم کے دور اول میں شائع ہوا تھا۔ ۱۲

ستون تو یقیناً گر جاتا' آئندہ اوراق میں ان ہی باتوں کی تفصیل اپنے اپنے مقام پر آپ کے سامنے آئیگی۔

الغرض نام کے لحاظ سے تو میں نہیں کہتا' لیکن کام جو انجام پایا' اسکو دیکھتے ہوئے بلا خوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ تعلیمی و تدریسی تحریک کے ساتھ ساتھ دیوبندیت ایک قسم کی معاشرتی تحریک بھی ہے' اور سیاسی بھی' دینی ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے پس ماندہ طبقات کی دنیاوی فلاح و صلاح مندی بھی اس کا کافی حصہ ہے' اور بوالعجبی یہ ہے کہ گونا گوں پہلوؤں والی اس تحریک کا سرچشمہ نہ تو باضابطہ کوئی سوسائٹی تھی' نہ انجمن' بلکہ سیدنا الامام الکبیر اپنے چند دا ستیار مخلص رفقار کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ ہوئے' پھر جس کے ہاتھ میں ہر کام کی آخری باگ ہے' وہ اس کو آگے بڑھاتا چلا گیا' واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون۔

بتا چکا ہوں کہ ۱۸۶۱ء مطابق ۱۲۷۷ ہجری میں سیدنا الامام الکبیر سفر حجاز سے واپس ہوئے' اور ۱۸۷۹ء مطابق ۱۲۹۷ ہجری میں کل (۴۹) سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہوگیا' گویا ۵۷ء کے فتنہ کے بعد اٹھارہ سال سے زیادہ وقفہ آپ کو خاکدان ارضی پر قیام کا نہیں ملا۔ اٹھارہ سال کے اس وقفہ میں بھی جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔ یک سوئی کے ساتھ آپ کی سرگرمی اور مشغولیت کی مدت کم و بیش ایک عشرہ یا دس گیارہ سال کے قریب قریب ہے' لیکن اسی مختصر زمانہ میں اس ہمہ گیر تحریک کی صرف بنیاد ہی قائم نہیں ہوئی' بلکہ ہر جہتی حیثیت سے وہ اپنے تمام شعبوں میں ترقی کے خاص حدود تک آپ کی زندگی ہی میں پہنچ چکی تھی۔

حیرت اس پر ہوتی ہے' کہ ان ہی چند گنے چنے سالوں میں ہندوستان کے ایک بدبختانہ شقاقی و افتراقی سیلاب کے مقابلہ میں بھی آپ کو سینہ سپر ہونا پڑا' یعنی مناظرے کے نام سے مشاتمہ و سبابہ کا جو بازار سیاسی بازیگروں کی اندرونی دسیسہ کاریوں کی بدولت اس ملک میں گرم ہوا تھا۔ اور پادریوں کے بعد یا ان کے ساتھ ساتھ ایک نیا محاذ پنڈت دیانند سرسوتی جی نے کھول دیا تھا۔ جیسا کہ آئندہ بتفصیل معلوم ہوگا' اپنی افتاد طبع کے برخلاف واقعات و حالات نے اس محاذ پر بھی آپ کو لا کر کھڑا کر دیا' کھڑے ہونے کے بعد دیکھنے والوں نے جو کچھ دیکھا تھا' اس کی یاد دلوں سے اس وقت تک محو نہیں ہوئی ہے' اور یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ آپ کی ساری تصنیفی یادگاریں

بھی دفعہ کی اسی قلیل مدت میں تیار ہوئیں لیکن اکثر و بیشتر حصہ یہ واقعہ ہے کہ اسی مختصر زمانہ میں قلم بند ہوا ہے، قدرتی کارفرمائیوں کے ان ہی استثنائی مظاہر کو دیکھ کر کہنے والے نے کہا تھا کہ

لیس علی اللہ بمستنکر

ان یجمع العالم فی واحد

وتُلبِسُ لکَ یُنبَسُ ی کی تفسیر پوچھیے تو اسی قسم کی ناقابل فہم سہولتیں اور آسانیاں ہیں، جن کی صحیح توجیہ عام واقعات وحوادث کی روشنی میں ہم نہیں کر سکتے۔ اور اب آپ کے سامنے اسی اجمال کی تفصیل انشاءاللہ پیش ہوگی۔ واللہ ولی الامر والتوفیق۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# دارالعلوم دیوبند

## کے

## اور اسکے

# آغاز و تاسیس کی داستان

دیوبندیت کے نام سے اسلامی ہند کی جو تحریک جانی اور پہچانی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ تدریس و تعلیم کے مستقل اور خاص نظام ہونے کی حیثیت، بھی اس تحریک کا سب سے زیادہ نمایاں، مشہور اور عام پہلو ہے، جس کی بنیاد دارالعلوم دیوبند کی مشہور عالم تعلیم گاہ پر قائم ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ دارالعلوم کے قیام و بناء کی ابتداء کا مسئلہ جب کبھی عوام ہوں، یا خواص کی مجلسوں میں چھڑا، یا چھیڑا جاتا ہے، تو ایک عمومی روایت جو زبان زد عام ہے، اسی کا تذکرہ کرکے سمجھ لیا جاتا ہے، کہ جو تاریخی سوال اٹھایا گیا تھا، اس کا یہی کافی و شافی جواب ہے۔ میرا اشارہ

## انار و محمود

والی مشہور روایت کی طرف ہے، دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والوں میں مشکل ہی سے کوئی ہوگا، جو انار و محمود کی اس داستان سے واقف نہ ہو، اور مزے لے لے کر اس قصہ کا ذکر نہ کرتا ہو۔[1]

[1] اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کر رہا ہے تو خیال آتا ہے کہ پڑھنے کیلئے ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۲ء میں خاکسار جب دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا تھا تو چھتہ کی مسجد میں یاد آتا ہے شرقی دیوار سے متصل انار کا ایک درخت تھا۔ پرانے طلبہ اسی درخت انار کی طرف اشارہ کرکے بتاتے تھے کہ اسی کے نیچے مدرسہ پہلی دفعہ کھلا تھا۔ ملا محمود اس کے پہلے مدرس پندرہ روپے ماہوار پر مقرر ہوئے تھے اور محمود (یعنی ہمارے زمانہ کے شیخ الحدیث و صدر دارالعلوم شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ) اسکے پہلے طالب علم تھے (باقی اگلے صفحہ پر)

چھتہ کی مسجد (دیوبند) میں انار کا درخت جس کے نیچے مدرسہ دیوبند کا افتتاح ہوا
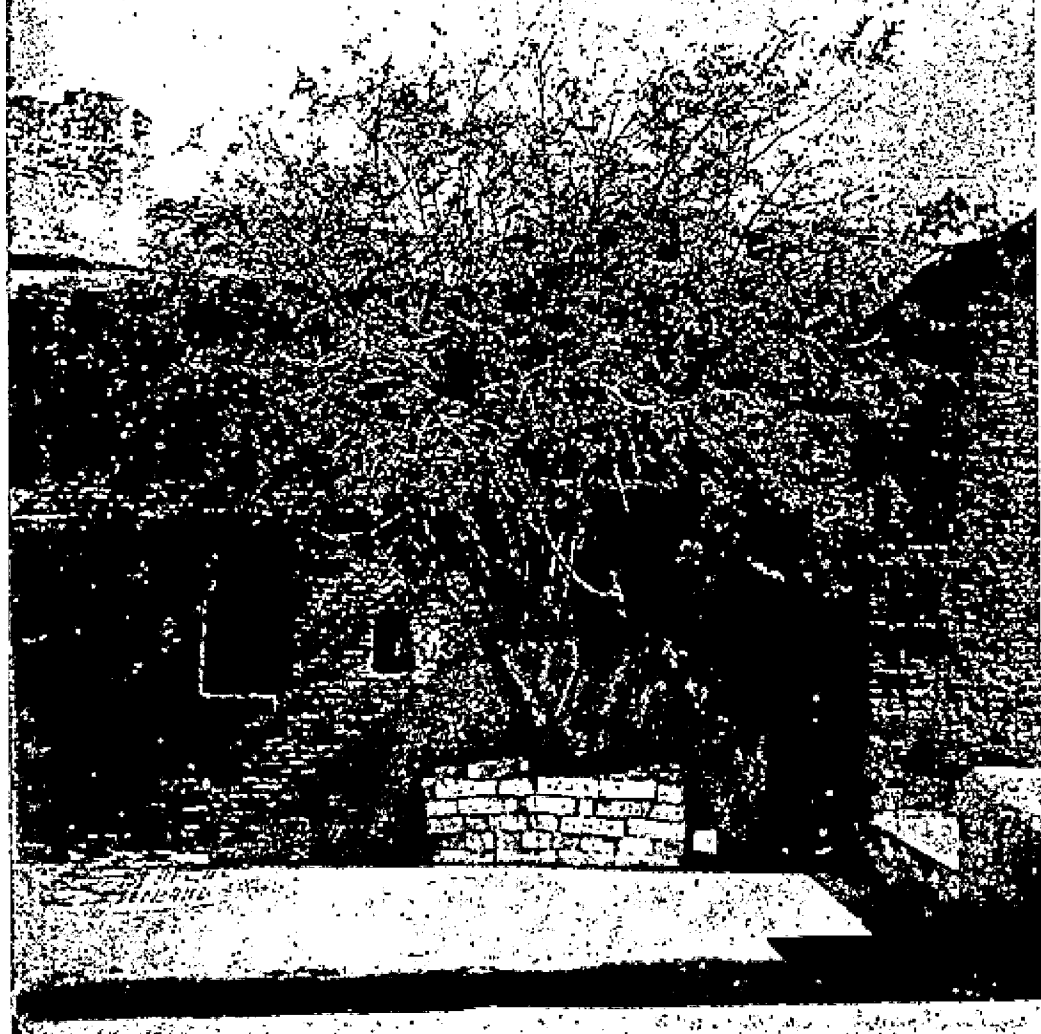
دیوبند کی اس اسلامی درسگاہ کی ابتداء کب ہوئی؟ اسی کا جواب دیتے ہوئے ہمارے مخدوم و محترم فاضل گرامی قدر مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ العلماء اپنی مشہور و مقبول کتاب "علماء ہند کا شاندار ماضی" میں یہ درج فرمانے کے بعد کہ

"۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء تقریباً یوم پنجشنبہ، اسلامی ہند کی تاریخ کا وہ مبارک دن ہے"

آگے "انار و محمود" والی حکایت لذیذ کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ

"تاریخ مذکور پر چند باخدا بزرگوں کا اجتماع ہوا۔ چندہ جمع کیا گیا، اور مسجد چھتہ کے فرش پر

## درخت انار

کی ٹہنیوں کے سائے میں ایک مدرسہ کا افتتاح ہوا۔"

"درخت انار کی ٹہنیوں کے سائے" کے بعد یہ خبر دیتے ہوئے کہ

"چندہ کا رومال پھیلانے والا، اور سب سے پہلے چندہ دینے والا عابد تھا۔"

یہ "عابد" کس ذات گرامی کی تعبیر ہے۔ اس کی تفصیل آگے معلوم ہوگی، اس وقت تو حکایت لذیذ کے اس دوسرے جزو "لفظ محمود" کا تذکرہ مقصود ہے، مولانا نے اسی جزو کا ذکر ان الفاظ میں کیا۔

"سب سے پہلا معلم محمود، اور متعلم بھی محمود" ص۶۵ حصہ پنجم (علماء ہند کا شاندار ماضی)

(گذشتہ صفحہ سے) ایک دو گرفتار تو عمر طالب علم ہونے کے باوجود خیال آتا ہے، دل میں اس وقت یہی وسوسہ ہوا تھا کہ تقریباً نصف صدی تک انار کے درخت کا باقی رہ جانا کیا عام حالات میں ممکن ہے، کیونکہ اس وقت تک تقریباً (۴۸) سال مدرسہ کے قیام پر گذر چکے تھے۔ نصف صدی کے لئے کل تین سال کی ضرورت تھی، واللہ اعلم یہ وہی قدیم درخت تھا، یا کوئی نیا درخت اس کی جگہ لگا دیا گیا تھا، جسے طلبہ تاریخی درخت حق کے ہوئے تھے معلوم نہیں اب بھی "یہ درخت انار" چھتہ کی مسجد میں موجود ہے یا نہیں۔ جذباتی حیثیت سے جی تو یہی چاہتا ہے کہ کاش انار کے اس درخت کو محفوظ رکھا جاتا، لیکن بودھ کے مقدس درخت کے انجام کو دیکھ کر اب سمجھ میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیعت رضوان والے درخت کو کیوں کٹوا دیا تھا۔ ۱۲

(نوٹ) یہ درخت انار بعینہٖ وہی ہے جس کا ذکر اس روایت میں کیا گیا ہے اور آج تک محفوظ ہے۔ (محمد طیب غفرلہٗ)

ابھی اس سے بحث نہیں کہ بجائے خود اس "روایت" کہئے "یا "حکایت" کی تاریخی قدر وقیمت کیا ہے، واقعات سے کس حد تک اس کی تائید ہوتی ہے، لیکن جہاں تک میرا احساس ہے سننے والوں پر ابتدائی اثر اس قصہ کا یہ مرتب ہوگا کہ شروع میں شاید کسی مقامی مکتب کی شکل میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد پڑی، پھر رفتہ رفتہ کچھ سازگار موافق و مساعد حالات پیش آتے چلے گئے، تو جیسے دنیا میں بہت سی چیزیں جو ابتدا میں چھوٹی تھیں، ان کو بڑا بن جانے کا موقعہ مل گیا۔ کچھ یہی صورت حال دارالعلوم دیوبند کے ساتھ بھی پیش آئی ہے۔ ماسوا اس کے اس "لذیذ حکایت" کی دلچسپیوں میں لوگ کچھ اس طرح محو ہو جاتے ہیں کہ "دارالعلوم دیوبند" اور اس کے تعلیمی نظام کے خصوصی پہلوؤں کے متعلق جن سوالوں کو اجاگر کر کے اٹھانا، اور ان ہی کی روشنی میں جوابوں کو حاصل کرنا چاہئے ان ہی سے توجہ آدمی کی ہٹ جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ بذات خود "تعلیم و تعلم" "درس و تدریس" کا مسئلہ مسلمانوں کے لئے نہ کوئی نیا مسئلہ ہے، اور نہ عجیب بات، جس امت کے دین کی بنیادی آسمانی کتاب "القرآن الحکیم" کی ابتدائی وحی میں اقرء (پڑھ) سے خواندگی کا مطالبہ کیا گیا ہو، اور سب سے پہلے اترنے والی اسی وحی میں علّم بالقلم (سکھایا قلم سے) کی نعمت کا ذکر خدائی نعمتوں کے سلسلہ میں قراۃ اور خواندگی کے مطالبہ کے بعد کیا گیا ہو، انسانی فطرت کی سب سے زیادہ نمایاں اور اہم ترین امتیازی خصوصیت علّم الانسان مالم یعلم (یعنی سکھایا خدا نے "الانسان" کو وہ جسے وہ نہیں جانتا) دوسرے لفظوں میں جس کا مطلب یہی ہوا کہ انجانی باتوں کے جانتے اور جانتے چلے جانے کی فطری استعداد و صلاحیت جو آدمی میں پائی جاتی ہے اسی ابتدائی وحی میں اس پر بھی تنبیہ کی گئی ہے، الغرض نوشت و خواند کی ابتدائی منزل سے تعلیمی ارتقاء کے آخری مراتب و منازل اور ان کے امکانات ہی پر جس دین کا گویا سنگ بنیاد رکھا گیا ہو، بھلا اس دین کے ماننے والوں کے لئے یہ بھی کوئی اچنبھے کی بات ہو سکتی ہے کہ ان ہی کے بعض افراد نے کسی خاص مقام میں پڑھنے پڑھانے کا نظم شروع کیا تھا، مسلمانوں کی تعلیم و تدریس کا دامن تو اس تعلیمی چبوترے کے ساتھ وابستہ ہے جو مسجد نبوی میں آج تک

تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال پہلے "صفہ" کے نام سے قائم ہوا تھا، بحمد اللہ اسی کا سلسلہ دنیا کے طول و عرض میں بغیر کسی انقطاع کے جاری رہا، اور امید ہے کہ قیامت تک انشاء اللہ تعالیٰ جاری رہے گا، اسی طرح تعلیم پانے والے طلبہ کے ساتھ مواساۃ و ہمدردی اور ان کے طعام و قیام کا نظم بھی اسلامی دنیا کا قدیم رواج ہے، "صفہ" میں داخل ہونے والوں ہی سے اس رواج کی بھی ابتدا ہوئی اور بعد کو مسلمانوں نے جہاں کہیں وہ گئے، کسی نہ کسی شکل میں اس رواج کو قائم رکھا۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ "انار و محمود" کی اس مقبول و مشہور ہر دل عزیز دلپذیر حکایت میں جو کچھ بھی بیان کیا جاتا ہے، اس کا حاصل یہی تو ہے کہ تعلیم و تدریس کا انتظام دیوبند میں مختصر ترین پیمانے پر کیا گیا تھا۔ لیکن کیا دیوبند کا تعلیمی نظام صرف اسی قدر ہے؟ مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے، وہ یہ جانتے ہیں کہ یوں تو تاریخ کے طویل و وسیع دور میں اس امت نے دنیا کے ان تمام حصوں میں جہاں جہاں وہ آباد اور توطن پذیر ہوئی، بڑے سے بڑے پیمانے پر تعلیم کا نظم کیا۔ اور گو تعلیم و تدریس کے لئے مدارس کی مستقل عمارتوں کی تعمیر کو مسلمانوں نے ضروری تو کسی زمانہ اور کسی ملک میں نہیں قرار دیا تھا، بلکہ بڑی بڑی مسجدوں یا خانقاہوں کے سوا سچی بات تو یہ ہے ابتدائی تعلیم کے منازل عموماً آباد کاروں کے مکانوں، اور ڈیوڑھیوں ہی میں طے ہو جاتے تھے، دور کیوں جائیے، دیوبندی نظام تعلیم کے بانی اعظم واکبر سیدنا الامام الکبیر کی تعلیم کا ابتدائی زمانہ جیسا کہ حضرت والا کے ذاتی حالات کے ذیل میں عرض کر چکا ہوں، اسی دیوبند کے ایک امیر شیخ کرامت حسین دیوبندی یعنی حضرت والا کے خسر کی ڈیوڑھی ہی پر تو گذرا تھا۔ وہی ڈیوڑھی جو آج بھی دارالعلوم کے مشرقی گوشہ میں "دیوان کی ڈیوڑھی" کے نام سے کسی نہ کسی شکل میں کھڑی ہے، اسی ڈیوڑھی کے کسی حصہ میں "مہتابی مکتب" قائم تھا۔ جہاں دوسرے بچوں کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کے بانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایام طفولیت و معصومیت میں ابتدائی تعلیم اپنے استاذ مولوی مہتاب علی صاحب مرحوم سے حاصل کی تھی اور اسی مکتب خانے میں عربی کی ابتدائی تعلیم آپ کو شروع کرائی گئی تھی۔

بہر حال باوجود اس اطلاقی نقطۂ نظر کے یعنی کسی خاص شکل وصورت کے مطابق قالب کے ساتھ تعلیم و تدریس جیسی عام اور اہم ترین ضرورت کو مقید کرنا مسلمانوں نے کسی زمانہ میں ضروری قرار نہیں دیا بلکہ ع

جس جگہ بیٹھ گئے بس وہی میخانہ بنا

بایں ہمہ تاریخ ہی آپ کو بتائے گی کہ اسی قوم نے تعلیم گاہوں کے لئے بھی بڑی بڑی عمارتیں دنیا کے مختلف حصوں میں تعمیر کیں۔ آج بھی ان کی بچی کھچی یادگاریں' دنیا کے مختلف حصوں اور گوشوں میں پائی جاتی ہیں۔ خاکسار نے بھی اپنی کتاب نظام تعلیم و تربیت میں ہندوستان کے بعض اہم تعلیمی ایوانوں کا تذکرہ کیا ہے۔ بعضوں نے اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں۔ تاہم جہاں تک تلاش و تحقیق کا اقتضاء ہے' عہد حاضر کا تعلیمی نظام جس سے مغرب نے دنیا کو روشناس کیا ہے اس میں جماعت بندی' امتحان خصوصاً تحریری امتحان' طلبہ کی حاضری کے رجسٹر وغیرہ اور اسی قبیل دوسرے لوازم و خواص جن کے ایک بڑے حصہ کو دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نظام میں نہ صرف قبول ہی کر لیا گیا ہے بلکہ پوری قوت و احتیاط کے ساتھ تعلیم کی ان جدید خصوصیات کی نگرانی بھی کی جاتی ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں' کہ ہندوستان کی عصری یونیورسٹیوں میں جتنا لحاظ و پاس ان امور کا کیا جاتا ہے' دارالعلوم میں بھی ان پر زیادہ نہیں تو کچھ کم توجہ نہیں کی جاتی' بلکہ کہا جا سکتا ہے' کہ امتحانی سوالات کے افشاء (آؤٹ ہو جانے) کا حادثہ عموماً بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں کبھی کبھی جو پیش آجاتا ہے' دارالعلوم کو تقریباً اپنی صد سالہ عمر میں اس حادثہ سے جہاں تک میں جانتا ہوں کبھی دو چار ہونا نہیں پڑا' جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تعلیم کی جدید خصوصیات جو عصری تقاضوں کی بنیاد پر دیوبندی نظام تعلیم میں جذب ہو چکی ہیں' ان کے آثار و لوازم کی حفاظت میں جو کامیابی دارالعلوم دیوبند کو میسر آئی ہے شاید وہ اپنی آپ نظیر ہے' جس میں زیادہ دخل اس خلوص و للہیت کو ہے جو دارالعلوم کے کارکنوں کے کاروبار کی روح ہے۔ حق تو یہ ہے کہ کرایہ اور بھاڑے پر کام کرنے والوں کو دارالعلوم کے کام کرنے والوں پر قیاس بھی نہ کرنا چاہئے۔ للحرب رجال وللقصعۃ رجال[1]

---

[1] عربی کی مشہور ضرب المثل ہے یعنی کچھ لوگ جاں سپاری اور جنگ کیلئے ہوتے ہیں اور کچھ لوگ صرف "پیالے" کیلئے۔۱۲

پس اصل سوال یہی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نظام میں موجودہ عصری جامعات اور یونیورسٹیوں کی خصوصیات کے شریک ہونے کے اسباب کیا ہوئے؟ کیونکہ کچھ بھی کہا جائے ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ دارالعلوم سے پہلے مسلمانوں میں تعلیم و تدریس کا جو عام طریقہ مروج تھا ۔ ان جدید خصوصیتوں کو ہم اس میں نہیں پاتے ۔ افادیت و عدم افادیت کی بحث جداگانہ ہے ۔ اس بحث سے اگر آپ کو دلچسپی ہو، تو خاکسار کی کتاب "مسلمانان ہند کا نظام تعلیم و تربیت" شائع کردہ ندوۃ المصنفین کا مطالعہ کیجئے ۔

بہرحال جہاں تک میرا ذاتی خیال ہے ۔ دارالعلوم دیوبند کے متعلق اس قسم کی باتیں کہ ابتدا میں کہاں کس حال میں قائم ہوا، جس کا جواب "انار و محمود" کی حکایت کو دہرا دہرا کر دینے والے دے دیا کرتے ہیں، ان سے زیادہ اہم یہی سوالات ہیں، شروع ہی سے ان کی طرف اشارے کرتا چلا آرہا ہوں، آپ کو یاد ہوگا کہ ہندوستان کی نئی قائم ہونے والی حکومت نے جو مدرسہ عربک کالج کے نام سے دلی میں قائم کیا تھا، مدرسہ سے زیادہ کالج ہی کی خصوصیات و لوازم پر جو مشتمل تھا، اور ان ہی عناصر پر اس کا مشتمل ہونا، قدرتی بات تھی ۔ اسی عربک کالج کے صدر والا قدر مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ سے ہمارے سیدنا الامام الکبیر بانی دارالعلوم نے تعلیم حاصل کی تھی، اور کیسی تعلیم؟ بجز علم حدیث کے عمومی طور پر عربی کی اعلیٰ نصابی کتابوں کے مولانا مملوک العلی ہی اُن کے استاد وحید تھے، الا یہ کہ مفتی صدر الدین سے بھی کچھ پڑھا ہو، بعضوں نے تو اس کی تصریح بھی کی ہے[1] ۔ حضرت والا کے ذاتی حالات کے ذیل میں خاکسار نے بھی قرائن و قیاسات کی بنیاد پر مفتی صاحب کے استاد ہونے کی طرف اپنے ذاتی رجحان کو ظاہر کیا ہے، کچھ بھی ہو، سچی بات تو یہی ہے، جیسا کہ عربی کا مشہور مقولہ بھی ہے کہ

الاب واحد والاعمام شتّی | باپ تو آدمی کا ایک ہی ہوتا ہے، اور چچا بہت سے ہوتے ہیں ۔

[1] مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ العلماء اپنی کتاب "علماء ہند کا شاندار ماضی" میں فرماتے ہیں کہ "حجۃ الاسلام یعنی سیدنا الامام الکبیر مولانا نانوتوی اور امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب کے دوسرے استاذ جناب مولانا مفتی صدر الدین صاحب تھے" ص ج ۵

اس مقولہ کی رو سے علمی اب اور تعلیمی پدر ہونے کی خصوصیت حضرت نانوتوی کے اعتبار سے
مولٰنا ملوک العلی ہی کو حاصل ہے، یہ بات کہ مولٰنا ملوک العلی سے سیدنا الامام الکبیر نے کالج
میں شریک ہو کر تعلیم حاصل کی تھی، یا کالج سے باہر ان کی تکمیل ہوئی تھی، اپنا خیال اس باب میں
جو کچھ تھا، اسے پیش کر چکا ہوں، لیکن کالج کے اندر ہو، یا باہر تعلیم تو آپ نے کالج کے استاذ
ہی نہیں، بلکہ صدر سے حاصل کی تھی، اور اسی زمانہ میں حاصل کی تھی، جب وہ یعنی مولٰنا ملوک العلی
عربک کالج کی صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ایسی صورت میں سیدنا الامام الکبیر
جیسی وقاد فطرت اور اخاذ طبیعت والے آدمی کے لئے اس تعلیم کے لوازم اور خصوصیات کا
سمجھ لینا بھلا کوئی بڑی بات ہو سکتی ہے۔ کھیل کود کے قصوں میں جس کی نظر ان کے بنیادی
اصول پر پڑتی تھی ان صبیانی ملاعب میں بھی طفولیت ہی کے ایام میں جو کلی قواعد پیدا کرتا ہو جس
کی تفصیل مصنف امام کے حوالہ سے گذر چکی، پھر ہمہ گیر وہمہ پذیر دماغ کے ساتھ ساتھ حضرت والا
کے سینے میں جو دردمند دل تھا، مسلمانوں کی زبوں حالیاں جیسے خون کے آنسو رلا رہی تھیں، آج
کون بتا سکتا ہے کہ اس ورطہ سے نکلنے کے امکانی تصورات کے سلسلہ میں ان کی نظریں کہاں کہاں
کن کن چیزوں پر پڑتی ہوں گی، تعلیمی تصورات کے سلسلہ میں کسی موقعہ پر حضرت والا کے اس حکیمانہ
نظریہ کا ذکر کر چکا ہوں۔ یعنی اس زمانہ کے علماء درس کی تعلیم کے انفرادی طریقہ تدریس کے متعلق یہ
فرماتے ہوئے کہ علم کی کیفیت میں تو ترقی اسی طریقہ سے ہوتی ہے، لیکن علم کی وسعت، اور علماء کی
مقدار وکمیت کے بڑھانے میں کامیابی کی واحد صورت یہی ہے کہ تعلیم کے قدیم شخصی وانفرادی طریقہ
کی جگہ درس وتعلیم کے اجتماعی طریقہ کو اختیار کیا جائے مسلمانوں کا شیرازہ بکھر چکا تھا، سیاسی
مرکز ان کا ٹوٹ چکا تھا، ان کی اجتماعی شیرازہ بندی کے سلسلے میں اپنے تعلیمی نظریہ کے مطابق
کوئی وجہ ہو سکتی تھی، کہ عربک کالج میں اجتماعی درس وتدریس کے جس طریقہ کا آپ مشاہدہ فرما رہے
تھے، اس سے استفادہ کی تدبیریں آپ کے دماغ مبارک میں نہ آئی ہوں گی، سیدنا الامام الکبیر کے
دست مبارک سے لکھی ہوئی ایک تحریر کا عموماً تذکرہ کیا جاتا ہے، کہا جاتا ہے کہ دار العلوم کی خزانے

وہ اصول جن پر یہ مدرسہ اور نیز اور مدارس

چندہ مبنی معلوم ہوتی ہیں

(۱) اصل اول یہ ہے کہ تا مقدور کارکنان مدرسہ کو ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے آپ کوشش کریں

اوروں سے کرائیں خیر اندیشان مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے

(۲) ابقاء طعام طلبہ بلکہ افزائش طعام طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیر اندیشان مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں

(۳) مشیران مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اسلوبی ہو اپنی بات

کی پچ نہ کی جائے خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئیگی کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے

کی موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آجائیگا القصہ تہ دل سے بروقت مشورہ

اور نیز اس کے پس و پیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے سخن پروری نہ ہو اور اس لئے ضروری ہے کہ اہل مشورہ

اظہار رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں اور سامعین بہ نیت نیک اس کو سنیں یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی

بات سمجھ میں آجائیگی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو بدل و جان قبول کرینگے اور نیز اسی وجہ سے یہ

ضروری ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ

مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد و صادر جو علم و عقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو اور نیز

اسی وجہ سے ضروری ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے کسی اہل مشورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئی اور بقدر ضرورت

میں یہ تحریر اس وقت تک محفوظ ہے۔ بدقسمتی سے براہ راست اس کی زیارت کی سعادت اس فقیر کو میسر نہیں آئی ہے لیکن یہ تواتر بزرگوں سے یہ سنتا رہا ہوں کہ اس تحریر خاص میں سیدنا الامام الکبیر نے بطور وصیت نامہ کے ان بنیادی کلیات کو قلم بند فرمایا ہے جن پر آپ نے اس دارالعلوم کی بنیاد قائم فرمائی تھی اور وصیت فرمائی گئی ہے کہ آئندہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں دارالعلوم کے نظم ونسق کی باگ آئے، وہ ان کلیات کی روح کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے

بہرحال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجلہ "القاسم" کے دارالعلوم نمبر مجریہ ۱۳۴۴ھ کے حوالے سے اسی "تحریر خاص" کے مشتملات ومضامین کو نقل کرتے ہوئے، ناظم مرکزی جمعیۃ العلماء (دہلی)، مولانا سید محمد میاں صاحب نے "علماء ہند کے شاندار ماضی" میں منجملہ دوسری دفعات کے ایک دفعہ کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ

"اس کا (یعنی دارالعلوم کا) تعلق عام مسلمانوں سے زائد سے زائد ہو، تاکہ یہ تعلق خود بخود مسلمانوں میں ایک نظم پیدا کرے، جو ان کو اسلام اور مسلمانوں کی اصل شکل پر قائم رکھنے میں معین ہو۔"

آگے اسی مقصد کی تفصیل فرماتے ہوئے آخر میں اختتام فرمایا گیا ہے کہ دارالعلوم کا مسلمانوں سے

"جمہوری تعلق ہو، جو ایک کو دوسرے کا محتاج بنائے رکھے۔"

اسی بنیاد پر آپ نے دارالعلوم کے لئے آمدنی کے کسی مستقل ذریعہ کے قائم کرنے کے خلاف یہ رائے ظاہر فرمائی ہے کہ عام مسلمانوں سے چاہئے کہ اس مدرسہ کا احتیاجی رشتہ ہمیشہ قائم رہے، حکومت، یا کسی رئیس کی دوامی امداد یا مستقل جائداد کی صورت میں عام مسلمانوں سے احتیاجی رشتہ دارالعلوم کا باقی نہ رہے گا۔[1]

[1] سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ سے بعض ملنے والوں نے یہ الفاظ سنے تھے یعنی فرمایا کرتے تھے کہ
دارالعلوم اس وقت تک مستقل رہے گا، جب تک اس کی آمدنی غیر مستقل رہے گی۔ لیکن جس وقت اس کی آمدنی کا ذریعہ مستقل ہو جائے گا، اسی وقت دارالعلوم کی بنیاد غیر مستقل ہو جائے گی۔"
مولانا سید محمد میاں صاحب مدظلہ نے بھی اصل علا کے عنوان سے یہ فقرہ نقل کیا ہے جسے حضرت الاالی کی طرف (باقی اگلے صفحہ پر)

خود براہ راست اپنے استاذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ سے خاکسار نے بھی بنا ردار العلوم کے متعلق قریب قریب کچھ اسی قسم کے الفاظ اس وقت سنے تھے، جس زمانہ میں یہ اختلاف رونما ہوا تھا کہ تعلیمی کاروبار کے سوا سیاسیات سے بھی مدرسہ کا کوئی تعلق رکھا جائے، یا نہ رکھا جائے۔ تفصیلاً اس قصہ کا ذکر مجلہ دار العلوم کے اس مضمون میں کر چکا ہوں جو

احاطۂ دار العلوم کے بیتے ہوئے دن

کے عنوان سے متعدد شماروں میں مسلسل شائع ہوا ہے، اور شیخ کے مقولہ کی حد تک اسکا تذکرہ ان اوراق میں بھی آگیا رہا ہو، اور سچ تو یہ ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر کو "دلی عربک کالج" کے ماحول سے گذرنے اور تعلیم جدید کے لوازم و خصوصیات کے تجربہ و مشاہدہ کا موقعہ اگر نہ بھی ملتا، تو ان کی "عبقریت" اور فکر و نظر کے جس قدرتی "ملکۂ فائقہ" سے وہ فطرۃً سرفراز کئے گئے تھے، خود ہی پیش آنے والی مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی کافی ضمانت تھی، مسلمانوں کی اجتماعی شیرازہ بندی، اور آئندہ ان کو دینی زندگی اور دینی علوم سے منحرف کرنے کی کوششیں اس ملک میں جو ہو رہی تھیں، ان کے مقابلہ کے لئے مسلمانوں میں دینی علوم کی عمومیت کے لئے کیا کرنا چاہیئے، اور نئے حالات کی رو سے تعلیم و تدریس کے نظام میں کن اصلاحات کی ضرورت ہے، ان مسائل کے حل کے لئے خود ان کا دماغ کافی تھا، اسے قدرتی تیسیر ہی کی ایک شکل سمجھنا چاہیئے، کہ "دلی عربک کالج" کے ماحول میں "نظریات" کو "عملی قالب" میں دیکھنے، اور برتے جانے کے مواقع بھی ان کے لئے آسان کئے گئے۔

جس وقت "شاملی" کے میدان سے وہ خود اور ان کے رفقاء کار بظاہر ناکامی کے ساتھ واپس

(گذشتہ صفحہ سے) براہ راست منسوب کیا گیا ہے یعنی اسی وصیت نامہ میں ہے کہ

"اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں، جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلتا رہیگا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہو گئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجا جو سرمایۂ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہیگا اور امداد غیبی موقوف ہو جائیگی، کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائیگا" $\frac{\text{مشہ}}{\text{ح}}$

اور اسی سے سمجھ میں آتا ہے کہ عام مسلمانوں کے ساتھ احتیاج کے رشتہ کا واقعی مطلب کیا تھا۔ سچ پوچھئے تو "رجوع الی اللہ" کا یہی واحد ذریعہ اور اسی کی یہ ایک گونہ تعبیر ہے۔ ۱۲

ہوئے۔ تو یقیناً ان کی یہ واپسی یاس اور نامرادی کی واپسی نہ تھی، اور نہ ہو سکتی تھی۔ ایمان و سکینت، ایقان و طمانینت کی جن لاہوتی خنکیوں سے خود انکا اور ان کے ساتھیوں کے سینے اور دل لبریز و معمور تھے۔ ان لاہوتی خنکیوں کے ساتھ بھلا قنوط و یاس کے غیر ایمانی جذبات کا کوئی تصور بھی کر سکتا ہے، واپس تو بے شک ہوئے تھے، لیکن یقیناً یہ واپسی

| متحرفا لقتال او متحیزا الی فئۃ | جنگ ہی کے لئے کتراتے ہوئے، یا کسی ٹولی کو ملنے کے لئے |
|---|---|

... ہو سکتی تھی، یقیناً اسی کے لئے تھی بھی، جس کی تصدیق آپ کے آئندہ اقدامات اور دفاعی مجاہدات سے ہوتی ہے۔

۵۷ء کی کش مکش کی ناکامی کے بعد قتال اور آویزش کے نئے محاذوں اور میدانوں کی تیاری میں آپ کا دماغ مصروف ہو گیا۔ دار العلوم دیوبند کا تعلیمی نظام، اسی لائحہ عمل کا سب سے زیادہ نمایاں اور مرکزی و جوہری عنصر تھا، وہ مشہور روایت یعنی شاملی کے میدان کے امیر جہاد سیدنا حاجی امداد اللہ المہاجر المکی رحمۃ اللہ علیہ سے اس زمانہ میں جب آپ مکہ معظمہ پہنچ چکے تھے۔ اور ہندوستان میں دار العلوم دیوبند کا افتتاح ہو چکا تھا، عرض کرنے والے نے جب یہ عرض کیا کہ

"ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے۔ اسکے لئے دعا فرمائی جائے۔"

بیان کیا جاتا ہے کہ سننے کے ساتھ شاملی کے میدان کے امیر جہاد یہ فرماتے ہوئے کہ

"سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں، ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے۔"

اس اطلاع سے سرفراز فرمایا تھا کہ

"یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں، اوقات سحر میں سر بسجود ہو کر گڑگڑاتی رہیں کہ خداوندا! ہندوستان میں بقاء اسلام اور تحفظ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر۔"

اور اسکے بعد اصل واقعہ کا اظہار حاجی صاحب نے ان الفاظ میں فرمایا کہ

"یہ مدرسہ (یعنی دار العلوم دیوبند) ان ہی سحر گاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔" (ارواح ثلثہ و علماء ہند کا شاندار ماضی)

جس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ شاملی کے میدان سے واپسی کے بعد سوچنے والوں نے نہ تو مایوس ہو کر سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا، اور نہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر وہ بیٹھ گئے تھے، بلکہ "بقاء اسلام اور تحفظ علم دین" کے نصب العین کو آگے بڑھانے کے لئے ان کے دماغ بھی مصروف فکر و نظر تھے، اور ان کے قلوب بھی کائنات کی مرکزی قوت سے لو لگا۔ "غیبی لطیفہ" کے ظہور کا انتظار کر رہے تھے۔ امامت اور قیادت (لیڈری) میں یہی اصولی فرق ہے کہ قیادت میں صرف دماغ کام کرتا ہے، اور امامت میں دماغ کے ساتھ دل پر بھی زور دیا جاتا ہے، بلکہ کامیابی کی "حقیقی کلید" دل ہی کے کاروبار کو یقین کیا جاتا ہے۔ "بدر" کے میدان میں صف بندیاں بھی ہو رہی تھیں، ہر قسم کے ہتھیاروں کا استعمال کے مواقع اور مقامات بھی متعین کئے جا رہے تھے۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ اسی کے ساتھ خدا کے سب سے بڑے بندے کی پیشانی مبارک خاک پر بھی پڑی ہوئی تھی، سننے والے سن رہے تھے کہ السموات والارض کی ملکوت و بادشاہت جس کے ہاتھ میں ہے، جس کے حکم اور اذن کے بغیر اس کی پیدا کی ہوئی دنیا میں کوئی چیز شریک ہی نہیں ہو سکتی تھی، اسی سے عرض کیا جا رہا تھا۔

| | |
|---|---|
| اللّٰھم ان تھلک ھذہ العصابۃ من اھل الاسلام لا تعبد فی الارض (صحاح) | اے اللہ! اہل اسلام کی یہ ٹولی اگر تباہ ہو گئی تو زمین پر آپ پھر پوجے نہ جائیں گے۔ |

بہرحال لوگ سوچتے نہیں ہیں، ورنہ یہی واقعہ جس کا ذکر کچھ دیر پہلے کر چکا ہوں، یعنی شاملی کے میدان سے واپسی کے بعد امیر بیعت حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ مشرقی پنجاب کے ایک قصبہ سے دوسرے قصبہ، اور ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں منتقل ہوتے ہوئے جس زمانہ میں عرب پہنچنے کی کوشش فرما رہے تھے، تو جیسا کہ مصنف امام نے یہ اطلاع دی تھی کہ دشت نوردی کے ان ایام میں بھی سیدنا الامام الکبیر اپنے امیر و پیر و مرشد سے، صرف مراسلاتی ربط ہی نہیں قائم کئے ہوئے تھے، بلکہ ان سے شفاہاً ملنے کے لئے ایک دفعہ نہیں، بلکہ بقول مصنف امام "بوڑیہ، گھلا، لاڈوہ، پنجلاسہ، جمنا پار کئی دفعہ گئے آئے" ص۳۸

ظاہر ہے کہ فتنے کے ان تاریک دنوں اور نازک ترین ایام میں حضرت والا کی آمد و رفت کا یہ سلسلہ صرف

پیرو مرشد کی قدم بوسی کے حصول برکت و سعادت ہی کی حد تک کیا محدود تھا ؟ یا محدود رہ سکتا تھا؟ ایظاہر
ایسی فاش شکست کے بعد ماموں کی اپنے امیر کے ساتھ بار بار کی یہ ملاقاتیں، یقیناً صرف گونگی بہری خشک
ملاقاتیں بن کر نہ رہ سکتی تھیں، اور نہ واقع میں ان ملاقاتوں کی یہ نوعیت تھی۔ دعا ہائے سحرگاہی اور نالہ ہائے
نیم شبی جنھیں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کسی ایک "پیشانی" کی طرف نہیں، بلکہ "پیشانیوں"
کی طرف منسوب کر رہے تھے، ان "پیشانیوں" میں کم از کم ان دونوں "امیر و مامور" "پیر و مرید" کی
"پیشانیوں" کو تو بہر حال شریک ہی تسلیم کرنا پڑے گا۔

سیدنا الامام الکبیر اس کے بعد جیسا کہ آپ سن چکے، روپوشی کے ایام میں خود حجاز پہنچ
جاتے ہیں۔ "امیر اور مامور" کے باہمی اجتماع کی یہ صورت کیا صورت ہی بن کر رہ سکتی تھی، جس کے
اندر ہم فرض کر لیں، بلاوجہ فرض کر لیں کہ کوئی "معنے" نہ تھے۔

الغرض واپس ہونے والا جب واپس ہوا تھا تو کسی نئے محاذ ہی کے قائم کرنے اور اس "فئۃ"
یا جماعت سے رشتۂ اتصال و ربط کو درست کرنے ہی کے لئے واپس ہوا تھا۔ جس کے اجتماعی
شیرازے کو درہم و برہم کر کے چاہا جا رہا تھا کہ ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیا جائے، جس
کتاب کو اس نے خدا کی کتاب مانا تھا، اور اس کے احکام کو خدا کا حکم یقین کرتا تھا، اس کا مطالبہ
بھی یہی تھا، اور جن لوگوں کے ساتھ وہ واپس ہوا تھا، ان کے بڑوں اور چھوٹوں کے متعلق بھی ہم اس
کے سوا اور کچھ نہیں سوچ سکتے کہ اس قرآنی مطالبہ کی تعمیل و تکمیل ہی کے لئے وہ واپس ہوئے تھے۔
خود اس کے بلند عزائم، اور وسیع حوصلوں کا اقتضا بھی یہی تھا۔

پس واقعہ یہی ہے کہ دیکھنے والوں نے ۵۷ء کے ہنگامۂ رستخیز کے دھیمے پڑ جانے
کے بعد اس کو جو کچھ کرتے ہوئے دیکھا، بذات خود اس کے لئے اور واپس ہونے والے ساتھیوں
کے لئے یہ سب کچھ دیکھا بھالا تھا، ایک طے شدہ "لائحۂ عمل" تھا۔ اپنے اپنے وقت پر اسی کے
نیصلے عملی قالب اختیار کرتے چلے جاتے تھے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ مصلحت الٰہیہ اور "اجل مسمیٰ"
کا اٹل قانون ہندی مسلمانوں کے اندر اس کے قیام کی مدت کو اگر حد سے زیادہ مختصر نہ کر دیتا، تو

دیکھنے والوں کو خدا ہی جانتا ہے، وہی کیا کیا کر کے دکھاتا جس کا تھوڑا بہت تذکرہ آئندہ اوراق میں بھی کیا جائے گا۔

تاہم اس نے دکھانے کی ابتدا جس انداز سے کی اس کا اجمالی خاکہ اس واقعہ سے ذہن میں آسکتا ہے جو خاکسار نے بلا واسطہ سیدنا الامام الکبیر کے سچے وارث اور جانشین الاستاذ الکریم حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے سنا، اور اس کا اجمالی تذکرہ پہلے بھی اسی کتاب میں کسی موقعہ پر کر چکا ہوں کہ میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمتہ اللہ علیہ (جو اس وقت دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم تھے) کے فرستادہ کی حیثیت سے حضرت الاستاذ شیخ الہند کی خدمت میں حاضر ہوا، اور بطور پیغام رساں حضرت سے دریافت کیا کہ آپ کا صحیح سیاسی مسلک کیا ہے؟ یہ پیغام سناتے ہی میں نے دیکھا کہ حضرت پر ایک خاص حال طاری ہے، اور ارشاد فرمایا

"حضرت الاستاذ (حضرت نانوتویؒ) نے اس مدرسہ کو کیا درس و تدریس تعلیم و تعلّم کے لئے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں ۵۷ء کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔"

آخر میں ارشاد فرمایا

(صرف) تعلیم و تعلم درس و تدریس جن کا مقصد اور نصب العین ہے۔ میں ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں۔ لیکن اپنے لئے تو اسی راہ کا انتخاب میں نے کیا ہے جس کے لئے دارالعلوم کا یہ نظام میرے نزدیک حضرت الاستاذ نے قائم کیا تھا۔[1]

مدرسہ دیوبند کی یہی وہ اساسی خصوصیت تھی جس نے اس مدرسہ کے تمام کاروبار حتیٰ کہ تعلیم میں بھی ایسی ہی حریت پرور خصوصیات پیدا کیں، اور وہ دینی اور مذہبی حمیت و غیرت کا ہندگیر ہی نہیں، عالمگیر جامعہ اور اقامتی ادارہ بن گیا۔ اس کے فضلاء کا ایک خاص مکتب خیال نمایاں ہوا اور اس کے مستفیدین ایک ایسا خاص ملا جُلا اور مرکب نصب العین لیکر باہر نکلے جس میں سب پر چھا جانیکی

[1] اس واقعہ کی مزید تفصیل میں نے اپنے مضمون "احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن" میں کی ہے۔ متعلقہ قسط ماہنامہ "دارالعلوم" بابتہ ماہ جمادی الثانی ۱۳۷۲ھ میں شائع ہوئی ہے ۱۲

اسپرٹ موجود تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ اساسی خصوصیت حضرت والا کے سوا کسی کے سامنے نہ تھی اور نہ ہی ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو اس وقت سامنے تھے، ہر ایک سے اتنی بلند نظری کی توقع ہی کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ سیدنا الامام الکبیر کی مجلس انس کے سب سے پہلے اور اہم رکن حاجی سید محمد عابد صاحب تھے جن کی بزرگی ہی کا نہیں دانشمندی اور اصابت رائے کا بھی اس زمانہ میں خاص شہرہ تھا۔ جیسا کہ آگے آ رہا ہے لیکن وہ بھی باوجودیکہ اجراء مدرسہ میں سیدنا الامام الکبیر کے دست راست ثابت ہوئے مگر اس تصور سے خالی تھے۔ مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ العلماء ہند نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ

"اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دار العلوم کے پر شوکت تصور سے حضرت حاجی صاحب (حاجی محمد عابد صاحب) کا ذہن خالی تھا۔[2] (علماء ہند کا شاندار ماضی ص...)

کسی موقعہ پر الاستاذ الاکبر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے خود سنا ہوا فقرہ اس کتاب میں نقل کر چکا ہوں جو ارواح ثلثہ میں بھی منقول ہے کہ دار العلوم دیوبند کی موجودہ پر شکوہ عمارتوں کے متعلق حضرت سید ح

---

[1] دیکھو سوانح قاسمی جلد اول ص ۱۹۹ ۱۲

[2] مولانا محمد میاں صاحب نے اس دعوے کی دلیل میں جو واقعہ شاندار ماضی میں پیش کیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے جو میں نے اپنے متعدد بزرگوں سے سنی ہے کہ مدرسہ جاری ہو چکا تھا لیکن اس کی کوئی مستقل عمارت نہ تھی۔ کرایہ کے مکانوں میں تعلیم دی جاتی تھی۔ جب سلسلہ تعلیم بڑھنے لگا اور مکان کی تنگی محسوس ہوئی تو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہوئی جس کے مؤید مولانا محمد یعقوب صاحبؒ، حضرت گنگوہیؒ اور حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری بھی تھے کہ مدرسہ کی کوئی اپنی مستقل جگہ اور عمارت ہونی چاہئے۔ (جیسا کہ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ نے ضمیمہ روداد مدرسہ بابت ۱۲۹۱ھ میں ظاہر فرمایا ہے) حاجی صاحب نے اس کی شدت سے مخالفت فرمائی کہ کیا ضرورت اتنے مصارف کی، مسلمانوں کا پیسہ ضائع ہوگا۔ جامع مسجد کی سہ دریاں اور حجرے اس کے لئے بالکل کافی ہیں۔ لیکن بقول حضرت شیخ الہندؒ کے کہ حضرت والا کے سامنے مدرسہ کا روشن مستقبل تھا، اسلئے انہوں نے فرمایا کہ حاجی صاحب مدرسہ کے لئے الگ ہی جگہ مناسب ہے۔ مسجد میں مدرسہ کا ہونا بہت سے اشکالات اور دشواریوں کا باعث ہوگا۔ یہ طلبہ کی قوم آزاد قوم ہوتی ہے کبھی شکایت ہوگی کہ مسجد کے لوٹے ٹوٹ گئے کبھی فریاد ہوگی کہ مسجد کی صفیں گم ہو گئیں لالٹینیں ندارد ہیں۔ غرض اس قسم کی بیسیوں مشکلات پیش آئیں گی۔ اس لئے مدرسہ کا مسجد سے الگ اپنے ہی (باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

نے فرمایا کہ

"حاجی صاحب (حاجی محمد عابد صاحبؒ) کے سامنے دارالعلوم کا نہ مستقبل نہ تھا جو حضرت استاذ (حضرت نانوتویؒ)

کو نظر آرہا تھا۔ آپکی فراست کے سامنے یہ مکتب مدرسہ اور پھر مدرسہ سے دارالعلوم ہونے والا تھا"

بہرحال مدرسہ کے اجراء و قیام کی حد تک وہ اپنے اور اپنے رفقاء کار کے اسی طے شدہ "لائحہ عمل" کے ساتھ نئی عمارت

کے کھولنے کیلئے صرف صالح اور قابل زمین کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ دینی تعلیم کا اجتماعی نظام جس میں عصری

(گذشتہ صفحہ سے) مکان میں رہنا مناسب ہے۔ مگر حاجی صاحب نے اس رائے کو تسلیم نہ کیا۔ آخر کار حضرت والا نے لوگوں سے فرمایا کہ مکان مدرسہ کیلئے اشتہار جاری کر دیا جائے۔ اس اشتہار میں اس کا تذکرہ نہ ہو کہ مدرسہ کا مکان الگ بنے گا یا مسجد ہی میں رہے گا۔ یہ وقت پہلے ہو تا رہیگا۔ اتنے عرصہ میں حاجی صاحب بھی انشاءاللہ موافقت فرمالیں گے۔ چنانچہ اشتہار جاری ہو گیا اور اس میں عام مسلمانوں کو دعوت دی گئی۔ جمعہ کا دن سنگ بنیاد رکھنے کا طے ہوا اور پروگرام یہ تھا کہ بعد نماز جمعہ حضرت والا وعظ فرمائیں گے اور ختم وعظ پر یہ سارا مجمع شہری اور بیرونی حضرات کا جائے مقررہ پر پہنچکر سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب میں شرکت کریگا جہاں آڑ کے حساب سے زمین کا معاملہ طے ہو چکا تھا۔ چنانچہ حسب پروگرام عمل ہوا۔ اطراف واکناف کے لوگ جمع ہوئے اور حضرت کے وعظ کی وجہ سے لوگوں کا ہجوم اور بھی زیادہ تھا۔ وعظ ہوا اور ختم وعظ پر حضرت نے فرمایا کہ چلئے بنیاد پر سب حضرات چلیں تاکہ سنگ بنیاد رکھ دیا جائے۔ یہ سنتے ہی حضرت حاجی صاحب نے غصہ کی آواز میں تند سے فرمایا' ہائیں! یہ کیا! حضرت نے فرمایا کہ حاجی صاحب یوں ہی مناسب ہے۔ آپ تشریف تو لے چلیں تو فرمایا کیوں چلوں! کیا ضرورت ہے اس اسراف کی! اور کیوں یہ بیکار اتنا بڑا بار اٹھایا جا رہا ہے! یہ الفاظ حضرت حاجی صاحب نے غصہ سے بھرائی ہوئی آواز میں فرمائے۔ حضرت نے فرمایا حاجی صاحب آپ وہ چیز نہیں دیکھ رہے ہیں جو مجھے نظر آرہی ہے۔ یہ مدرسہ بڑھنے والی چیز ہے۔ اس پر حاجی صاحب نے پھر زور سے انکار ہی میں جواب دیا حضرت نے فرمایا حاجی صاحب کو اختیار ہے سب صاحب چلیں اور سنگ بنیاد رکھیں۔ حاجی صاحب تو جامع مسجد سے روانہ ہو کر چھتہ کی مسجد میں اپنے حجرہ میں جا بیٹھے اور یہ مجمع اس ہجوم حضرت کے ساتھ مدرسہ کی طرف روانہ ہوا۔ جب اس جگہ پہنچے جہاں سڑک پر مدرسہ کا موجودہ بڑا دروازہ ہے۔ مجمع کو روک کر حضرت والا نے فرمایا کہ آپ لوگ یہاں ٹھہریں میں ابھی حاضر ہوا اور سیدھے چھتہ کی مسجد میں پہنچے اور حاجی صاحب کے حجرہ میں پہنچکر فرمایا۔ "ابی حاجی صاحب آپ تو ہمارے بڑے اور بزرگ ہیں اور ہم سب آپ کے چھوٹے ہیں۔ بھلا ہم آپکو یا آپ ہمیں چھوڑ سکتے ہیں" اور یہ کہکر حاجی صاحب کے پیروں پر ہاتھ رکھدیئے۔ اس طرز عمل کا حاجی صاحب پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ بے اختیار رو پڑے اور اتنا کہ آواز نکل گئی۔ انتہائی کسر نفسی سے فرمایا مولانا میرا قصور معاف فرما دیجئے۔ بات وہی حق ہے جو آپ فرما رہے ہیں۔ حضرت نے حاجی صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا اور لیکر جانب بنیاد پہنچے۔ مجمع ان دونوں بزرگوں کو آتے ہوئے دیکھ کر بے حد مسرور ہوا۔ سارے مجمع میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور پھر سب نے ملکر درسگاہ نودرہ کی بنیاد رکھی جو دارالعلوم کی سب سے پہلی عمارت ہے۔ — محمد طیب غفرلہ

اقتضاؤں کی تکمیل کا بھی سامان کیا جائے۔ اس کے اسی لائحہ عمل کا اہم ترین جز بلکہ قالب کے لحاظ سے سب کچھ وہی تھا کہ نئے محاذ کا یہ نیا قالب یا "عملی مرقع" کہاں قائم ہو۔ یہ سوال تھا جس کا جواب ڈھونڈھا جارہا تھا۔ جمعیت جہاد کے امیر حضرت حاجی صاحب نور اللہ ضریحہ کی جس اطلاع کا تذکرہ ابھی گذرا، راوی کا اسی روایت کے سلسلہ میں یہ بیان بھی تھا کہ آخر میں حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی فرمایا کہ

"یہ دیوبند کی قسمت ہے کہ اس دولت گرانمایہ کو یہ سرزمین لے اڑی" ج۵ ص۳ (علماء ہند کا شاندار ماضی)

اسی روایت کے بعض طریقوں سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ بجائے دیوبند کے "نئے محاذ" کے لئے دلوں میں تھانہ بھون، نانوتہ، اور اسی قسم کے دوسرے مقامات کے ترجیحی خطرات بھی گذرتے تھے[1]۔ اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، دیوبند میں اس "نئے محاذ" کی بنیاد ڈالنے کے بعد علاوہ دیوبند کے مرادآباد، نگینہ، تھانہ بھون وغیرہ میں اس کی شاخیں سیدنا الامام الکبیر کے منشاء کے مطابق کھلتی چلی گئیں۔ ناظم جمعیۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب نے مرادآباد کے ایک بزرگ مولانا سید غالب علی کے حوالہ سے یہ فقرہ اپنی اسی کتاب "علماء ہند کے شاندار ماضی" میں جو نقل فرمایا ہے کہ

"دارالعلوم دیوبند، مدرسہ شاہی مرادآباد، مظاہر العلوم سہارنپور کو آپ ان اسکولوں اور مدرسوں کی طرح نہ سمجھیں جن کو اتفاقیہ طور پر قائم کرلیا جاتا ہے"

اس کے بعد اپنے پیر و مرشد قاضی محمد اسماعیل (جو اپنے وقت کے ارباب کشف و الہام میں شمار ہوتے تھے) کا یہ قول بھی مولانا سید غالب علی دہراتے کہ

"یہ مدارس خاص الہامات کے بموجب قائم کئے گئے ہیں" ص۱۷۱ ج۵

---

[1] اپنے محبوب آقا اور پیشوا صلی اللہ علیہ وسلم کی راہوں پر چلنے والے بلکہ ان ہی پر مرمٹنے والے راستباز و وفا کیش غلاموں کے اس واقعہ کو پڑھتے ہوئے اگر آقا کی وہ بات یاد آجائے کہ مکہ کو چھوڑ دینے کے بعد کہاں جانے کا حکم دیا جائے گا، خیال کسی یمامہ یا ہجر کی طرف جاتا تھا لیکن معلوم ہوا کہ طابہ وطیبہ و مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بننے کے لئے یثرب کی سرزمین کا انتخاب ہوچکا تھا، فذهب وهلی الی انها الیمامة او هجر فاذا هی المدینة یثرب (بخاری)

(حوالہ)

دل کے لحاظ سے "الہامات" اور دماغ کے اعتبار سے چاہئے تو "عمل کے لمحات" سے بھی اس کی تعبیر کر سکتے ہیں۔ عرض ہی کر چکا ہوں کہ قیادت و امامت کی راہ نمائیوں میں بھی جوہری فرق ہے۔

اور یہی میرا مطلب بھی ہے کہ "نئے محاذ" کا کسی تعلیمی و تدریسی نظام کے تحت کھولنے کا ارادہ تو فیصل شدہ ارادہ اور الہامی محرکات کے زیر اثر قطعی فیصلہ کی صورت اختیار کر چکا تھا، اور بقول حضرت حاجی صاحب کے دیوبند کی سرزمین کی یہ قسمت تھی کہ قدرت کی طرف سے اسی کا انتخاب سب سے پہلی دفعہ اس نئے محاذ کے افتتاح کے لئے ہوا۔

لیکن ظاہر ہے کہ قسمت کہئے، یا ازلی تقدیر کا ظہور ہمیشہ اسباب و علل کے پردوں ہی میں ہوتا ہے دیوبند کی سرزمین کے لئے یقیناً یہ ایک تقدیری فیصلہ تھا، مگر "منصۂ شہود" پر یہی تقدیر تدبیر کے کس رنگ میں جلوہ گر ہوئی، اس کی حد سے زیادہ تشنہ اور قطعاً نامکمل تعبیر ہوگی۔ جسے لوگ "انار اور محمود" کی روایت کی حد تک محدود کر دیتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے، عرض ہی کرتا چلا آرہا ہوں، کہ اس نئے محاذ کے بانی سیدنا الامام الکبیر کے دیوبند والوں سے قرابت قریبہ کے موروثی تعلقات پشتہا پشت سے قائم تھے، یہ بھی آپ سن چکے کہ آج جس مقام پر دارالعلوم کی طویل و عریض عمارتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے اسی کے قریب دیوان کی ڈیوڑھی میں حضرت والا کی تعلیمی زندگی کا ابتدائی زمانہ گذرا تھا، نہ صرف دیوبند، بلکہ آپ کی طرف سے ۵۷ء کی ناکامی کے بعد "نیا محاذ" دیوبند کے جس قطعہ اراضی پر کھلنے والا تھا، خاص اسی قطعہ اراضی اور خطۂ پاک سے بچپن ہی میں مانوس بنانے کا قدرت نظم کر چکی تھی، آج جہاں دارالعلوم ہے یہی میدان اس کے باغ، تالاب، آپ کی بازیگاہ اور سیرگاہ تھی، پھر دیوبند کے دیوان کی یہی ڈیوڑھی آپ کی سسرال بھی بنی، اور جیسا کہ بہ تفصیل بتایا جا چکا ہے، ۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد سیدنا الامام الکبیر کی روپوشی کی کافی مدت دیوبند ہی میں گذری، حالات ہی ایسے تھے کہ نانوتہ سے اپنے اہل و عیال کو اس زمانہ میں دیوبند ہی منتقل کرنا پڑا، بلکہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے جو یہ خبر دی ہے جس کا پہلے بھی ذکر کر چکا

ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر نے دیوبند کو بجائے نانوتہ کے جب اپنا وطن ثانی قرار دیا تو

"شمس الاسلام کی رونق افروزی ہوئی"

ان ہی الفاظ کو بعض لوگوں نے آپ کی اس نئی ترطن پذیری کا مادہ تاریخ قرار دیا تھا، جس کے اعداد ۱۲۸۳ھ ہیں جو عیسوی سن کے حساب سے ٹھیک وہی ۱۸۶۶ء کا سال ہے، جس کے معنے یہی ہوئے کہ ۱۸۶۶ء ہی میں یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ بجائے نانوتہ کے حضرت والا کے اہل وعیال کا مستقل قیام دیوبند ہی میں رہے گا، اور ہوا بھی یہی زرد پوشی کے زمانہ کا بڑا حصہ حضرت الاکادیوان کی ڈیوڑھی کی مغربی پشت پر چھتہ کے نام سے جو ایک مسجد تھی، اور اس وقت تک بحمداللہ موجود ہے اسی میں گذرا۔ زمانہ دراز سے اس مسجد کے حجرے صاحب دل بزرگوں کی قیام گاہ بننے کی سعادت حاصل کرتے چلے آتے تھے، اور اس زمانہ میں بھی دیوبند کے دو مشہور معروف بزرگوں یعنی حاجی سید محمد عابد حسین صاحب اور مولانا رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہما کی قیام گاہ یہی چھتہ کی مسجد کے یہی حجرے تھے، ہم جنسی اور ہم مذاقی کے رشتہ کا اقتضا یہ ہوا کہ اس زمانہ میں "خلوت گاہ حق" بننے کا شرف چھتہ کی مسجد کے ایک حجرے کو سیدنا الامام الکبیر کے قیام کی وجہ سے حاصل ہو۔ [1]

چنانچہ صاحب سوانح مخطوطہ نے یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ

"اسی زمانہ میں جناب مولوی رفیع الدین صاحب وجناب حاجی محمد عابد صاحب دیوبندی جن کی تعریف ذیل میں مفصل درج کی جاوے گی، چھتہ کی مسجد میں قیام پذیر تھے"

آگے اطلاع دی ہے کہ

"مولانا سید نا الامام الکبیر نے ان بزرگوں کی وجہ سے اسی مسجد میں قیام کیا، اور ان دونوں

---

[1] ہمارے مخدوم ومحترم الحاج مولوی سید محی الدین صاحب بی۔اے (علیگ) بیرسٹر ایٹ لا، جو حکومت آصفیہ حیدرآباد دکن میں ایجوکیشن اور ریلیجن یعنی تعلیم ومذہب کے محکمہ کی معتمدی (سکریٹری) کے عہدہ سے وظیفہ یاب ہو کر اب بھائی البیاری دالحید رآبادی کے "اپنا کستانی" بنے ہوئے کراچی میں مقیم ہیں، ان کی یہ خوش قسمتی تھی کہ چھتہ کی مسجد کے اس "کمرے" کی فرسودہ دریدہ حالی کو دیکھ کر اپنے ذاتی مصارف سے از سر نو درست کرا دیا گویا ایک نیا کمرہ ہی بن گیا، جس سے طلبہ مستفید ہوتے ہیں اور سید صاحب کے حق میں دعا گو ہیں ۱۲

بزرگوں سے کمال درجہ کا انس اور ربط ضبط قائم ہو گیا تھا"

روپوشی کے زمانہ میں سرکاری دوش کا رخ اس مسجد کی طرف اگر ہوتا، تو آپ سن چکے ہیں کہ اس مسجد سے نکل کر دیوبند ہی کی دوسری مسجدوں میں آپ منتقل ہوتے رہتے تھے۔ ہندوستان سے نکل کر بہ نیت حج اسی زمانہ میں آپ حجاز پہنچے، اور "عام معافی نامہ" کے ساتھ حکومت کی طرف سے نگرانی جب اٹھالی گئی، تو حجاز کی واپسی کے بعد بھی وطن کی حیثیت گویا دیوبند ہی کی رہی، گو اس کے ساتھ ساتھ نانوتہ بھی آتے جاتے رہتے تھے، پھر جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے کہ مطالبہ عام کا سلسلہ حکومت کی طرف سے جب ختم ہو گیا تو

"منشی ممتاز علی صاحب نے میرٹھ میں چھاپہ خانہ کیا، مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) کو پرانی دوستی کے سبب بلالیا، وہی تصحیح کی خدمت تھی" ص ۲۹

تصحیح کتب کی اسی خدمت کی وجہ سے میرٹھ ہی گویا اس زمانہ میں آپ کا مستقر تھا، لیکن خدمت کی جو نوعیت تھی، اس میں کافی گنجائش تھی کہ اپنے وطن ثانی دیوبند میں آپ کی آمد و رفت کا سلسلہ باقی رہے، اور حالات و واقعات سے یہی معلوم بھی ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ باقی تھا۔

بس یہی سوچنے کی بات ہے کہ جس "نئے محاذ" کے کھولنے کا ولولہ آپ کے سینہ، صداقت گنجینہ میں جوش زن تھا جس کے لئے مناسب و صالح و قابل زمین کی تلاش میں جیسا کہ چاہئے، جب آپ سرگردان تھے تو یہ بتانا تو مشکل ہے کہ اس عہد تلاش و جستجو میں آپ کی نظر مسلمانوں کی کن کن آبادیوں پر پڑتی تھی، یہ واقعہ تھا کہ "مطالبہ عام" کے اٹھ جانے کے بعد بھی مسلمانوں کو اس کا اطمینان نہ تھا کہ حکومت نے ان کا تعاقب ترک کر دیا ہے۔

اللہ اللہ! مسلمانوں کی سلطنت و سیاست، تہذیب و معاشرت، علم و فن، صنعت و حرفت کا مرکز وحید مرحوم دلی تک کے متعلق غالب بے چارے کا جب یہ احساس تھا شاید پہلے بھی کہیں ذکر کر چکا ہوں یعنی

"دیکھا چاہئے مسلمانوں کو دلی میں، آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں" (اردوئے معلی ص ۱۱)

خود بھی دیوبند جو سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کی "پناہ گاہ" تھی۔ اور بقول مصنف سوانح مخطوطہ آپ کا وطن ثانی بھی وہ قرار پا چکا تھا، وہاں کے مسلمانوں کی بھی حالت جب یہ تھی جس کے راوی ہمارے مخدوم و محترم مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ العلماء (دہلی) ہیں کہ

"دیوبند کے ایک بڑے میاں نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ میں تہجد سے فارغ ہو کر انگریزوں کے لئے بد دعا کیا کرتا ہوں، مگر بد دعا سے پیشتر سارے مکان پر اور در و دیوار پر نظر ڈال دیتا ہوں کہ کوئی اجنبی شخص تو یہاں موجود نہیں" علماء ہند کا شاندار ماضی ص ۵۷

ایسی صورت میں یہی سمجھنا چاہئے، کہ آج کل کرفیو کے نام سے کبھی کبھی خاص مواقع پر آرڈر حکومت کی طرف سے چند خاص گھنٹوں کے لئے جو سر ہوتے رہتے ہیں، لفظاً نہ سہی، لیکن ہندوستان کے سارے مسلمان "کرفیو آرڈر" کے اسی دوامی حکم کے زیر اثر گویا زندگی کے دن پورے کر رہے تھے۔ کسی مقصد اور کسی غرض سے بھی چند مسلمانوں کا اجتماع گویا اس "کرفیو آرڈر" کی خلاف ورزی کا رنگ اختیار کر لیتا تھا، جس پر حکومت کی سخت اور کڑی نگرانی قائم تھی۔

ماسوا اس کے وہ "نیا محاذ" جسے سیدنا الامام الکبیر شاملی کے میدان سے واپس ہونے کے بعد کھولنا چاہتے تھے۔ اس "نئے محاذ" اور اس کے دور رس مضمرات و مکنونات خواہ کچھ ہی ہوں، لیکن ظاہری قالب تو اس کا یہی تھا کہ مسلمانوں کی دینی زندگی کی حفاظت کے لئے دینی تعلیم کا ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جس کے ذریعہ ملک کے طول و عرض میں جہاں تک ممکن ہو، بڑی سے بڑی تعداد دینی علوم کے علمبرداروں کی پھیل جائے۔ اس جدید تعلیمی نظام کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ ہمارے قدیم علماء کی تدریس و تعلیم کا آزاد اور انفرادی طریقہ سیدنا الامام الکبیر کے نزدیک قطعاً ناکافی تھا، اور مشاہدے سے اس کی تصدیق بھی ہو رہی تھی، اپنے اسی اصولی نقطۂ نظر کے زیر اثر آپ دینی تعلیم کا اجتماعی نظام قائم کرنا چاہتے تھے جس میں حتی الوسع تعلیم کے عصری لوازم اور تقاضوں کو بھی ممکنہ حد تک سمونے اور جذب کرنے کی صورت چاہا جاتا تھا کہ نکالی جائے۔ آج تو کالجوں اور اسکولوں کی کثرت، بلکہ دینی تعلیم کے اجتماعی نظام کے تحت چلنے والے عربی مدارس کی بھی اتنی کافی تعداد ملک کے طول و عرض میں

پھیل چکی ہے کہ تعلیم کے یہ عصری لوازم (امتحان، رجسٹر حاضری، جماعت بندی وغیرہ) پیش پا افتادہ حقیقتوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ تعلیم و تدریس کا شاید ان امور کے بغیر تصور بھی لوگ نہیں کر سکتے، لیکن اپنے "نئے محاذ" کے لئے ڈھونڈھنے والا جس زمانہ میں اس کے لئے صالح وسیر حاصل زمین ڈھونڈھ رہا تھا، آپ اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ ہمارے قدیم علماء کے لئے ان چیزوں ہی کی نہیں بلکہ ان کے تصور کی بھی کیا نوعیت تھی! نئے قائم ہونے والے اسکولوں اور کالجوں ہی کا عام نام صرف "مُجَھِّلے"[1] نہ تھا، بلکہ تعلیم کے اس اجتماعی نظام کے متعلق جس کی ابتداء دیوبند سے ہوئی تھی، ہمارے اگلے زمانہ کے علماء کی مجلسوں میں جو پھبتیاں اس پر کسی جاتی تھیں، اور جن جگر خراش، روح گداز استہزائی فقروں سے اس پر تنقید کی جاتی تھی، دردکی یہ داستان حد سے زیادہ افسوسناک ہے، شاید کسی موقعہ پر ان کی طرف کچھ اشارے بھی کئے جائیں گے۔ ان مولویوں کے نزدیک علم کی "کیفیت" کا مسئلہ تھا، اور "نئے محاذ" کے لئے کیفیت سے زیادہ "کمیت" اور "مقدار" کا مسئلہ اہم تھا۔

---

[1] یعنی جاہل کرنے والا، یعنی عربی ترجمہ کر لیا گیا تھا، کہتے ہیں کہ حضرت قاری عبدالرحمن صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ تلمیذ رشید حضرت شاہ اسحاق کا بنایا ہوا یہ لفظ تھا۔ تفصیل کیلئے قاری صاحب کی سوانح عمری دیکھئے۔ غالباً حیات جاوید میں بھی مولانا حالی نے اس کا ذکر کیا ہے جو قاری صاحب کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ انگریزی زبان پڑھنے کے متعلق کفر والا مشہور لطیفہ جسے مسلمانوں کے علماء کی طرف اب بھی لوگ منسوب کرتے ہیں بجائے خود یہ صرف پروپگنڈا تھا۔ ہندوستانی علماء کے استاذ الکل حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ کا مطبوعہ فتاویٰ موجود ہے جس میں آپ نے انگریزی زبان کے متعلق یہ فتویٰ دیا تھا کہ "تعلم انگریزی یعنی آئیں خط و کتابت و لغت و اصطلاح ایشاں دانستن باکے ندارد" ص۱۹۵ انگرانگریز اور انگریزی کی طرف جو چیز منسوب ہو مسلمانوں کی غیرت و حمیت واقعہ یہ ہے کہ اس وقت تک اس کو برداشت نہیں کر رہی تھی، جب تک استداد زمانہ اور دشمنوں کی تدبیروں نے از حد ملوث و مردہ بنا کر نہ رکھ دیا تھا، اسی فتاویٰ عزیزیہ میں ایک دل دوز کہئے یا دلچسپ واقعہ کا ذکر ملتا ہے۔ کلکتہ کے کوئی مسلمان مختار کار مولوی رعایت علی خان نامی تھے۔ شاہ عبدالعزیز کو حکومت کی طرف سے لکھا، کہ ایک ایسے عالم مفتی کی ضرورت ہے جو شریعت شریف کے مطابق فیصلہ یا رو رعایت کر سکتے ہوں۔ یہ بھی لکھا کہ انگریزوں کے محلہ کی دور انگ کوٹھی میں ان کا قیام رہے گا، اور شرع محمدی کے مطابق بے دغدغہ و بے وسواس حکم کا کلی اختیار ان کو ہوگا، شاہ صاحب کے مدرسہ کے ایک عالم کے متعلق یہ خبر شاہ غلام علی صاحب خلیفہ مرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ تک پہنچی کہ کلکتہ جانے پر آمادہ ہو گئے، اس خبر کو پا کر انہوں نے جو خط شاہ عبدالعزیز کے نام لکھا تھا تاریخی خط ہے، کلکتہ جانے سے شاہ صاحب نے پوری قوت سے روکنا چاہا ہے، یہ اقدام فرماتے ہوئے کہ ہرگز قصد ایں امر نامبارک نکنند، آخر میں لکھا ہے کہ "نفس، نفس آخریں" (انکاریم) "ص۹۱ فتاویٰ عزیزیہ

کچھ بھی ہو، دینی علوم کی تعلیم وتنظیم کا کام علماء ہی سے لیا جاسکتا تھا لیکن ان کی عمومیت سے اس مسئلہ میں کسی قسم کی مدد کے ملنے کی توقع نہ تھی۔ ماسوا اس کے اس قسم کے اجتماعی نظام کے تحت قائم ہونے والی "تعلیم گاہ" کے نظم وپرداخت کے لئے سب سے بڑی ضرورت اس بات کی تھی کہ انتظامی سلیقہ رکھنے والی کوئی بیدار مغز، راستباز، مخلص شخصیت ہر قسم کے معاشی مشاغل سے بے تعلق ہوکر "ہمہ وقتی" نگرانی کے لئے آمادہ ہو مگر جن معاشی زبوں حالیوں کے شکار اس زمانہ میں مسلمان ہوچکے تھے، ان کو دیکھتے ہوئے بھلا اس کی امید کیا باندھی جاسکتی تھی۔

اب اس کو اتفاق سمجھئے، یا ازلی تقدیر کے ظہور کا تشکیلی قالب، کہ دیوبند جہاں کے باشندوں میں سیدنا الامام الکبیر کو اپنے دل کی لگی آگ کے پھیلانے کا موقعہ بہ نسبت دوسری اسلامی آبادیوں کے زیادہ آسان کیا گیا تھا اسی دیوبند میں ٹھیک اسی زمانہ میں جب "نئے محاذ" کے لئے زمین کی تلاش کی مہم میں سیدنا الامام الکبیر سرگرم و منہمک تھے۔ دیکھا گیا، کہ ایک طرف اجتماعی تعلیم کے لوازم وخصوصیات کی ایک سے زیادہ عملی تجربہ رکھنے والی ہستیاں جمع ہوگئی ہیں، جن میں ایک تو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب تھے، اور دوسرے صاحب مولانا فضل الرحمن صاحب تھے جو مفتی عزیز الرحمن و مولانا حبیب الرحمن و مولانا شبیر احمد صاحب نور اللہ ضرائحہم کے پدر والا قدر تھے۔ یہ دونوں حضرات بھی جیسا کہ معلوم ہوا ہے، مولانا مملوک العلی صاحب کے شاگرد تھے، یوں دلی عربک کالج کے تعلیمی نظام کے مشاہدہ وتجربہ کا موقعہ بھی ان کو ملا تھا، اور تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد حکومت کے تعلیمی محکمہ میں ڈپٹی انسپکٹر ہوہوکر وظیفہ (پنشن) پانے کے بعد اپنے وطن دیوبند میں خانہ نشین ہوچکے تھے۔ اور خانہ نشینی کے بعد ہی غالباً یہ دونوں بزرگ مسجد چھتہ کی مجلس انس کا جزو ہوئے ہیں۔ اس ماحول کو ابتدائی دور میں جب سیدنا الامام الکبیر کی دیوبند میں رونق افروزی ہوئی جس کا تفصیلی تذکرہ آچکا ہے، ان بزرگوں کا نام نہ آنا شاید ان حضرات کی سرکاری ملازمتوں کی پابندی اور وطن میں مسلسل قیام نہ ہونے کی وجہ سے ہوگا، دور مابعد میں ان کے اسماء کا تذکرہ اسی کی علامت قرار دی جاسکتی ہے، کہ

اس وقت یہ بزرگ پنشن لے کر دیوبند آ چکے تھے، اور خانہ نشین ہو گئے تھے۔

شاید اسی لئے سوانح مخطوطہ کے مصنف کے کلام میں سیدنا الامام الکبیر کے عہد رونق افروزی و قیام دیوبند کے بارہ میں جو "عہد قدیم" کا لفظ پایا جاتا ہے اور اس قید "عہد قدیم" کے ساتھ جن خواص مجلس کے ناموں کا ذکر انہوں نے کیا ہے ان میں ان دونوں بزرگوں کا ذکر نہیں ملتا، سوانح مخطوطہ کے الفاظ یہ ہیں۔

"اس عہد قدیم" (زمانہ ورود حضرت نانوتوی رح یعنی ۱۲۸۳ھ) کے مجمع کے خاص لوگ یہ ہیں۔ حاجی دیوان محمد یٰسین صاحب عرف اللہ دیا، حافظ انوار الحق صاحب عرف حافظ کلّو۔ پیر جی ماجد علی صاحب، حاجی ظہور الدین صاحب حکیم مشتاق احمد صاحب (ایک جگہ ذیل کے دو نام اور اضافہ کئے ہیں) شیخ منظور احمد صاحب منشی نہال احمد صاحب"

گویا اس مجلس انس کی ابتداء چھتہ کی مسجد میں حاجی محمد عابد صاحب اور مولانا رفیع الدین صاحب کی رفاقت سے ہوئی اور رفتہ رفتہ اس میں دیوبند کے مختلف محلوں کے یہ چیدہ اور سر برآوردہ لوگ شامل ہوتے گئے، جن سے "عہد قدیم" کی مجلس کی قدرتی تشکیل ہوئی، اور قصبہ کی اصلاح اور نئے محاذ کی زمین ہموار کرنے میں اولاً یہی حضرات سیدنا الامام الکبیر کے دست و بازو ثابت ہوئے، جن کے احوال پر صاحب سوانح مخطوطہ نے بھی اجمالی روشنی ڈالی ہے۔ "عہد قدیم" کی قید کو سامنے رکھ کر جس کی ساتھ ان مخصوص ناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد والے دور کو جس میں یہ دونوں بزرگ مولانا ذوالفقار علی صاحب اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب بھی آ ملے۔ مسجد چھتہ کی مجلس کا "عہد جدید" کہنا چاہئے۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ "عہد قدیم" نئے محاذ کے لئے تہیۂ استعداد اور زمین ہموار کرنے کا دور تھا اور "عہد جدید" اس کی عملی تشکیلات اور فعلیت کے ظہور کا زمانہ تھا۔

اس "عہد قدیم" میں جیسا کہ ذکر کر چکا ہوں چھتہ کی مسجد کے گوشہ گزینوں میں حاجی سید محمد عابد و مولانا رفیع الدین دو ایسے بزرگ تھے، جن کو سیدنا الامام الکبیر کے بساط قرب و انبساط میں علاوہ ظاہری و باطنی فوائد کے جو حضرت والا کی مجالس انس و دانش کی خصوصیات تھیں۔ سب سے زیادہ

آپ کی اولوالعزمانہ امنگوں اور بلند حوصلوں سے شعوری اور غیر شعوری طور پر اثر پذیر ہونے کی کچھ ایسی قدرتی صورت پیدا ہو گئی، کہ وہ چاہتے یا نہ چاہتے۔ لیکن اس آنچ کے تاثیری عمل سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتے تھے، جو اندر ہی اندر ان کو پگھلاتی اور نئے سانچے میں ان کے جذبات و عواطف کو ڈھالتی چلی جا رہی تھی، اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ "گلیم خویش بدر می برد ز موج" کے جس طبقہ سے ان کا تعلق تھا، اس طبقہ کے عام حدود سے نکل کر "غریق گیری" کے نئے سودے کو لے کر یہ لوگ بھی میدان میں کود پڑے، مولانا رفیع الدین صاحب کی باقی زندگی جیسا کہ معلوم ہے اسی "غریق گیری" کی جدوجہد میں بسر ہوئی، حقیقی معنوں میں دارالعلوم کے مہتمم اول وہی ہوئے۔ اور اسی شغل پاک میں شاید آخری سانس ان کی پوری ہوئی۔[1]

اس شغل میں سیدنا الامام الکبیر سے ان کے تاثر یا باطنی استفادہ کا عالم یہ تھا کہ ان کا قلب بھی قلب قاسمی کا دوسرا رخ بن گیا تھا، انہوں نے اپنے زمانۂ اہتمام دارالعلوم میں جیسا کہ کسی موقعہ پر تذکرہ آ چکا ہے۔ خود ہی فرمایا ہے کہ دارالعلوم کا اہتمام میں نہیں کرتا، حضرت نانوتوی فرماتے ہیں، جو کچھ حضرت کے

---

[1] مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم جو اپنے عہد میں دارالعلوم کی روح رواں کی حیثیت حاصل کئے ہوئے تھے، اپنے تدبر، پیش بینی، مردم شناسی کے دانش مندانہ پہلوؤں کے ساتھ ساتھ کم از کم فقیر ان کی قلبیت و اخلاص سے زیادہ متاثر تھا، وہی فقیر سے براہ راست مولانا رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کے اہتمامی کارناموں کا ذکر کرتے کرتے کبھی کبھی ان کی طرف ایسی باتیں منسوب کر دیا کرتے، کہ مجھ جیسے عقلیت زدہ آدمی کے لئے اس کا ماننا دشوار ہو جاتا تھا۔ فرماتے کہ بسا اوقات مجھے اس کا تجربہ ہوا ہے کہ دارالعلوم کے متعلق کوئی مفید تجویز میرے دماغ میں آئی، لیکن عمل کرنے کے وقت اس کا پتہ چلتا ہے کہ مولانا رفیع الدین صاحب اپنے ایام اہتمام میں اس کی بنیاد ہموار کر چکے تھے۔ بہات ہی کی حد تک نہیں بلکہ مجھے خوب یاد ہے مولانا حبیب الرحمٰن فرماتے کہ مدرسہ کی عمارت میں کسی ترمیم و تجدید کا خیال آیا۔ کام جب شروع کرایا تو دیکھا کہ پہلی ہی اس ترمیم کی گنجائش قصداً پیدا کر کے مولانا رفیع الدین جا چکے ہیں۔ فرماتے کہ کسی چھت میں مجھے نالی بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی، جب بنوانے لگا تو دیکھا کہ پہلے ہی سے نالی اسی مقام پر بنائی جا چکی تھی، چونکہ اس وقت ضرورت نہ تھی اس لئے چھپا دی گئی تھی، گویا مجھے صرف اسی بنی ہوئی نالی کے کھلوا دینے کا کام کرنا پڑا، جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ سررشتۂ اہتمام کو ہاتھ میں لینے کے بعد اپنی بصر و بصیرت دماغی و قلبی ہر قسم کی قوتوں کو دارالعلوم ہی کی فلاح و بہبود میں مولانا رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ نے غرق کر دیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ مولانا رفیع الدین کے جو حالات میں نے سنے ہیں ان کا تقاضا ہے کہ کسی مستقل سوانح عمری کے ذریعہ ان کی زندگی کے عملی اسباق اور نمونوں کو محفوظ کر دیا جاوے ۱۲

قلب پر وارد ہوتا ہے بعینہ میرے قلب میں منعکس ہو جاتا ہے اور میں وہ گزرتا ہوں۔ چنانچہ میرے کر لینے کے بعد حضرت نانوتوی فرماتے کہ مولانا اللہ آپ کو جزاء خیر عطا فرمائے میرے دل میں یہی آرہا تھا جو آپ نے کر لیا۔ فرمایا کہ بارہا نہیں تقریباً میرے تمام کاموں میں حضرت سے ہم آہنگی کی یہی نوعیت قائم رہتی تھی اور حضرت نانوتوی اسی طرح اسے ظاہر فرمادیا کرتے تھے۔

رہے ہمارے سید مغفور و مرحوم حاجی سید عابد حسین صاحب،[1] انہوں نے سیدنا الامام الکبیر کے اس "نئے محاذ" کی افتتاحی منزلوں میں جو کارنامے انجام دیئے ہیں، ان سے وابستگان دار العلوم کے عوام نہ سہی، خواص اچھی طرح واقف ہیں۔ چنانچہ حاجی صاحب ممدوح کی اس جدید پرداز اور "غریق گیری" کی مخفی روح مولانا فضل الرحمٰن صاحب مرحوم نے سوا لطف قاسمی ہی کو ٹھیرایا ہے، وہ اپنے ایک مشہور قصیدہ میں ان کے مناقب کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ

| | |
|---|---|
| مرد حق "عابد" صداقت کیش | اولین گسترانندہ مالش |
| ہم باخلاص دل دماں بنہاد | چیزے از طیبات اموالش |
| گوئیا ایں ہمہ فتوح کشیر | در رسیدہ ہمہ بافضالش |

آگے اس مخفی روح کا ذکر کر رہے ہیں کہ

| | |
|---|---|
| لیک ایں "طائر ہمایوں فال" | شد ز قاسم عطا پرو بالش |

یہاں مجھے حاجی صاحب کے متعلق یہ عرض کرنا ہے کہ باطنی معرفت و سلوک کا جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے حاجی صاحب ممدوح کو نو عمری ہی سے شوق تھا، سوانح مخطوطہ کے مصنف کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ چشتی طریقہ کے ایک بزرگ جن کا نام نامی میاں جی کریم بخش تھا، لمبو منیہاران کے رہنے والے تھے۔ ان ہی سے حاجی صاحب مرید ہوئے، کسب و سلوک کے مراتب ان ہی کے زیر تربیت طے کئے۔ خلافت بھی حاجی صاحب کو میاں جی کریم بخش ہی سے شروع میں حاصل ہوئی تھی۔ اسی بنیاد پر لکھا ہے کہ سید صاحب

---

[1] یعنی حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

"جناب میاں جی کریم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ رام پوری چشتی کے خلیفہ ہیں" ص۳۶

اسی کتاب میں اس کی معاصرانہ شہادت بھی مصنف کتاب نے ادا کی ہے کہ

"اہل دیوبند کو آپ سے (یعنی سید محمد عابد صاحب سے) کمال درجہ عقیدت ہے"

ظاہر ہے کہ ایک سالک مسلک معرفت و حقیقت ہونے کے ساتھ ساتھ جب اپنے پیر و مرشد میاں جی کریم بخش رحمۃ اللہ علیہ چشتی کے خلیفہ مجاز بھی سید صاحب ہو چکے تھے، تو اس زمانہ کے لحاظ سے مسلمانان دیوبند کی عقیدت کیشیوں اور نیاز مندیوں کی مرکز ان کی ذات گرامی بن گئی ہو، تو اس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا تھا، بلکہ اسی کے ساتھ اسی کتاب میں سید صاحب مرحوم کی ایک خصوصیت جس کے گونہ مشاہدہ کا موقعہ خود اس فقیر کو بھی اس زمانہ میں ملا ہے جب دارالعلوم میں زیر تعلیم تھا، نہ صرف دیوبند، بلکہ دیوبند سے باہر حتیٰ کہ صوبجات متحدہ سے بھی آگے بڑھ کر بہار و بنگال تک سید صاحب کی اس امتیازی خصوصیت کا چرچا اور شہرہ پھیلا ہوا تھا، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ سید صاحب کے دیگر ظاہری و باطنی کمالات کے ساتھ ساتھ

"ان میں ادنیٰ تعویذ و گنڈہ ہے، جس کے سبب اہل دیوبند اور نواح دیوبند کے ہر قسم کے دکھ درد و دلدر دور ہوتے ہیں"

اسی کا نتیجہ تھا کہ سید حاجی صاحب کی ہر دل عزیزیاں خواص ہی کے حلقہ تک محدود نہ تھیں، بلکہ بقول مصنف کتاب

"دیوبند کے مسلمانوں میں شاید کوئی ایسا بچہ ہوگا جس کے گلے میں آپ کا (یعنی حاجی سید عابد صاحب کا) تعویذ نہ ہوگا، اور کم تر ایسی عورتیں ہوں گی، جن کے بازو پر آپ کا نقش نہ ہو"

سید صاحب کے اسی "نقش" کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت حکیم الامت نے مثنوی میں جو دارالعلوم کے متعلق کسی زمانہ میں آپ نے نظم فرمائی تھی یہ مصرعہ بھی لکھا،

" ع نقش و تعویذش مثال نقش قند" (منقول از ص۲۳ حصہ پنجم علماء ہند کا شاندار ماضی)

واقعہ یہ ہے کہ جبکہ جھاڑ پھونک، تعویذ گنڈوں کی مقبولیت کا حال جب یہ ہو جیسا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ

"آپ کا مطب (تعویذی) بڑے بڑے (دوائی) طبیبوں سے زیادہ گرم رہتا ہے، خصوصاً وبائی و موسمی امراض میں غرباء علاج کم کرتے ہیں، آپ ہی کے تعویذوں پر قناعت کرتے ہیں۔"

خواص و عوام کی فیض رسانی کی اس زمانہ میں یہ ایک صورت ایسی تھی کہ مصنف کتاب کو یہ گواہی دینی پڑی کہ

"آپ کی (سید صاحب کی) ذات فیض آیات سے خلائق کو بہت طرح کا نفع حاصل ہے۔"

"خلائق" کے اس لفظ میں اسی کتاب کے مصنف کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں ہی تک اس باب میں آپ کی فیض رسانیاں محدود نہ تھیں، بلکہ وہی لکھتے کیا اپنی عینی شہادت نقل کرتے ہیں کہ

"غیر مذہب والے بھی آپ کے تعویذوں کے معتقد ہیں۔"[1]

الغرض ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں حاجی سید محمد عابد صاحب کی ذات بابرکات پر گویا دیوبند اور اس کے باشندے سمٹے ہوئے تھے، جن میں مسلمانوں کے ساتھ جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں غیر مسلم بھی شریک تھے، علاوہ درویشی کے حالات کے شریعت کے ظاہری احکام کی پابندی میں ان کے رسوخ اور استواری کا یہ حال تھا کہ بقول مولانا سید محمد میاں صاحب علماء کے مشہور و سر برآوردہ عالم

[1] ارواح ثلثہ میں حضرت تھانویؒ کی طرف یہ روایت منسوب کی گئی ہے کہ حاجی سید محمد عابد صاحب کے ساتھ عورتوں کی عقیدت کا یہ رنگ تھا کہ ایک بیوی صاحبہ جن کا دوپٹہ چوری گیا تھا، کہتی تھیں کہ کچھ پروا نہیں، حاجی محمد عابد سے کہلا بھیجو، دوپٹہ میں آجائے گا۔ چنانچہ حاجی صاحب سے کہلا بھیجا گیا، انہوں نے تعویذ دے کر فرمایا کہ انگنی میں پر کر دو جو دوپٹہ چوری گیا ہے، اسی پر آجائے گا۔ چنانچہ دوپٹہ وہیں آگیا۔ اسی کتاب میں ہے کہ حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ شاید کوئی جن وغیرہ تابع ہے۔ ص۲۲۲ قصص الاکابر۔

(مناظر مولانا مرتضیٰ حسن مرحوم یہ کیفیت بیان فرماتے تھے، کہ

"ایک روز آپ کو (یعنی حاجی محمد عابد صاحب کو) بہت رنجیدہ دیکھا گیا، کبیدگی اور افسردگی کی یہ حالت تھی، کہ جیسے کسی جوان مرگ ...... پر ہو، جب سبب دریافت کیا گیا تو بہت اصرار کے بعد معلوم ہوا کہ اٹھائیس سال بعد آج جماعت صبح کی تکبیر تحریمہ فوت ہو گئی" ص۵ ج۵

اب صحیح طور پر تو میرے لئے یہ بتانا دشوار ہے کہ یہ کس زمانہ کی بات ہے، چھتہ کی مسجد میں سیدنا الامام الکبیر نے جو آتشدان روشن فرمایا تھا، اور بجائے "گلیم بری" کے "غرق گیری" کے ذوق کا شعلہ آپ کی وجہ سے دلوں میں بھڑک اٹھا تھا۔ اس کے بعد کا یہ واقعہ ہے یا پہلے کا، یعنی سوانح مخطوطہ کے مصنف کی روایت ہے کہ حاجی عابد حسین پر ایسا حال طاری ہوا کہ

"گھر، باہر، زمین، باغ، جس قدر آپ کی ملک میں تھا، سب کا سب راہ خدا میں دیکر محض خدا پر تکیہ کیا" ص۳۶

گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ دینی تعلیم کے اجتماعی نظام کے قالب میں "نئے محاذ" کے افتتاح کے لئے تعلیم کے اس جدید نظام کے چند عملی تجربہ کاروں کے ساتھ ساتھ کام کو ہاتھ میں لینے، اس کو پروان چڑھانے، آگے بڑھانے کے لئے ایک ایسی

"ہمہ وقتی توانائی"

کا جو اہم سوال تھا، یعنی ہر طرف سے سمٹ سمٹا کر کامل یک سوئی کے ساتھ اسی کا جو ہو کر رہ جائے، اسی سوال کا مجسم زندہ جیتا جاگتا جواب بن کر حاجی محمد عابد کی ذات گرامی نگاہوں کے سامنے دیوبند میں گویا کھڑی ہو گئی تھی،

"دیوبند کی قسمت ہے کہ اس دولت گرانمایہ کو یہ سرزمین لے اڑی"

حضرت حاجی امداد اللہ المہاجر المکی رحمۃ اللہ علیہ کے اس اجمالی ارشاد کا یہی تفصیلی مطلب یا قسمت و تقدیر کے ظہور کی یہی تدبیری شکل تھی، زمین بھی مل گئی، زمین پر کام کرنے والے بھی مل گئے، تو جس قالب

میں "نئے محاذ" کے کھولنے کا ارادہ کیا گیا تھا، وہ کھول دیا گیا۔

یہی دارالعلوم دیوبند ہے، جو بحمد اللہ اس وقت تک اپنے تاریخی وجود اور تاثیری نتائج و ثمرات کے ساتھ ہم سب کے سامنے ہے، دیوبند کی خوش قسمت سرزمین میں درخت انار کی چھاؤں کے نیچے محمود معلم و متعلم ناسیوں کو بٹھا کر کھولنے والوں نے "نئے محاذ" کے اس تعلیمی قالب کے کھولنے کی توفیق جس زمانہ میں توفیق یافتوں کو بخشی گئی تھی کھول دیا، اسی زمانہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمارے مصنف امام نے اپنی کتاب میں یہ خبر سنائی ہے کہ

"وہی زمانہ تھا کہ مدرسہ دیوبند کی بنیاد ڈالی گئی، اور مولوی فضل الرحمٰن اور مولوی ذوالفقار علی اور حاجی محمد عابد صاحب نے یہ تجویز کی کہ ایک مدرسہ دیوبند میں قائم کریں" ص ۳۹

اس سے پہلے خود ہی یہ اطلاع بھی دی ہے، کہ اس زمانہ میں خود وہ اور سیدنا الامام الکبیر مولانا محمد قاسم نور اللہ ضریحہما بھی میرٹھ میں مقیم تھے، اور مطبع مجتبائی جو پہلے میرٹھ ہی میں قائم ہوا تھا، اسی مطبع میں چھپنے والی کتابوں کی تصحیح کی خدمت دونوں حضرات انجام دیتے تھے، بطور خود میرٹھ میں انفرادی درس و تدریس کا سلسلہ بھی سیدنا الامام الکبیر نے جاری کر رکھا تھا، جس زمانہ میں قصبہ دیوبند میں مدرسہ کی بنیاد پڑی، پڑھنے والے آپ سے صحیح مسلم پڑھ رہے تھے[1]۔ پڑھنے والوں میں خود ہمارے مصنف امام بھی شریک تھے۔

---

[1] ایک بات یاد آگئی، بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیری (جن کا آبائی وطن دیوبند ہی کے قریب ضلع مظفر نگر کے ایک گاؤں محی الدین پور نامی متصل اسٹیشن کھاتولی ہے) اس زمانہ میں جب حضرت والا مونگیر کی خانقاہ رحمانیہ میں جلوہ افروز تھے۔ براہ راست اس قصہ کو فقیر سے بیان کیا کرتے تھے کہ طالب علمی کے زمانہ میں مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے درس حدیث میں شریک ہونے کی سعادت مجھے بمقام میرٹھ میسر آئی تھی۔ غالباً یہ وہی زمانہ تھا جب صحیح مسلم کا درس جاری تھا، مولانا مونگیری قدس سرہ العزیز فرماتے تھے، حدیث پڑھی گئی، حنفیوں اور شافعیوں کے کسی اختلافی مسئلہ سے حدیث کا تعلق تھا، میں نے دیکھا کہ مولانا نے ایک ایسی جامع و مدلل تقریر کی، جس سے کلیۃً شافعی نقطۂ نظر کی تائید ہوتی تھی طلبہ حیران ہوئے کہنے لگے کہ آپ کی اس تقریر سے تو معلوم ہوا کہ امام شافعی ہی کا مسلک صحیح ہے، اور حنفیوں کا مذہب حدیث کے مطابق نہیں ہے۔ مولانا مونگیری فرماتے تھے۔ تب میں نے دیکھا کہ مولانا نانوتوی نے رنگ بدلا، اور فرمانے لگے کہ شوافع کی طرف سے اس مسئلہ کی تائید میں زیادہ سے زیادہ (باقی اگلے صفحہ پر)

دیوبند کا یہی مدرسہ اور دارالعلوم جس کے اول و آخر، ظاہر و باطن، اندرو باہر، بلکہ جس کی اینٹ اینٹ، اور ذرہ ذرہ پر "قاسمیت" کی امٹ چھاپ پڑی ہوئی ہے، زمین والوں میں بھی قاسمیت ہی کے "امتیازی چھاپ" سے وہ پہچانا اور اسی نام سے پکارا جاتا ہے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ آسمانی غلغلوں کی یہ صدائے بازگشت نہیں ہے، جسے زمین کے رہنے والے جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے دہراتے ہیں، الغرض یہی جانی پہچانی، خواص کی مسلمہ اور عوام کی مانی ہوئی حقیقت کے زیر اثر زندگی گزارنے والے جب سنتے ہیں، مصنف امام دارالعلوم دیوبند کے صدر اول کی زبانِ قلم سے سنتے ہیں کہ جس وقت دیوبند میں دارالعلوم کا سنگ بنیاد رکھا گیا، اور انار کے تاریخی درخت کے نیچے اس کا افتتاح ہوا تو یہ "نیا محاذ" جس کے لئے کھولا جارہا تھا، وہی اپنے "نئے محاذ" پر موجود نہ تھا۔ پھر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں، اور پوچھتے ہیں کہ اس "نئے محاذ" کا تعلیمی قالب جس وقت سرزمین دیوبند میں واقعیت کی شکل اختیار کر رہا تھا۔ تو واقعۃً اس "قالب" کا "قلب" اور اس مرئی و دیدہ جسد کی جو روح تھی، وہ دیوبند میں موجود نہ تھی؟ "عقل" تو نہیں مانتی، لیکن جو واقعہ ہے، آخر اس کے انکار کی صورت ہی کیا ہے؟ نکتہ تراشیوں کا وہ سلسلہ اس سے بھی زیادہ عجیب تر ہے جب نہ ماننے والی عقل کو تھپکیاں دیتے ہوئے لوریاں سنائی جاتی ہیں، انار کے درخت کے نیچے چھتہ کی مسجد میں پندرہ روپے ماہوار کے ایک مدرس کا تقرر کر کے کھولنے والوں نے جس مدرسہ کو کھولا تھا، وہ مدرسہ ہی نہ تھا، ایک قصباتی مکتب مقامی بچوں کی تعلیم کے لئے کھولا گیا تھا، گویا دارالعلوم کی تاریخ کا جو سلسلہ انار والے درخت کے ساتھ باندھا جاتا ہے، چاہا جاتا ہے، کہ اس تاریخی رشتہ ہی کا انکار کر کے عقلی بےچینیوں کا ازالہ کر دیا جائے۔ اس سے بھی زیادہ دور کی کوڑیوں سے

(گذشتہ صفحہ سے) کہنے والے اگر کچھ کہہ سکتے ہیں تو یہی کہہ سکتے ہیں، جو تم سن چکے، اب سنو! امام ابوحنیفہ کے مسلک کی بنیاد دی ہے۔ اس کے بعد مولانا نانوتوی نے پھر ایسی تقریر کی کہ لوگ مبہوت بنے ہوئے سن رہے تھے۔ ابھی جس مسلک کے متعلق ان کا یقین تھا کہ اس سے زیادہ حدیثوں کے مطابق کوئی دوسرا مسلک نہیں ہو سکتا، اچانک معلوم ہوا کہ درحقیقت صحیح حدیثوں کا مفاد وہی ہے جسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے منقح فرمایا ہے۔ مولانا مونگیری اس کے بعد دیر تک مولانا نانوتوی کی خداداد ذہانت و ذکاوت کی تعریف فرماتے رہے۔ ۱۲

لانے والوں کا یہ سیاسی نکتہ ہے کہ اپنے خاص حالات کے لحاظ سے قصداً وارادۃً سیدنا الامام الکبیر نے اپنے آپ کو اس مقام سے غائب کردیا تھا۔ جہاں بہرحال ان کی حاضری عقلاً ضروری اور ناگزیر تھی۔ یعنی اشتباہی نظر حکومت کی جو آپ پر تھی یہ عدم حاضری اسی مصلحت سے تھی۔ الغرض بہ یاسی نوعیت کی "گُل شناسیوں" اور "دقیقہ آفرینیوں" کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جو پیش کرنے والوں کی طرف سے پیش ہوتا رہتا ہے۔

حالانکہ "درخت انار" کی چھاؤں میں ایک استاذ والا یہ مدرسہ، اس مدرسہ کے مستقبل کے اعتبار سے خواہ جس حد تک بھی مختصر نظر آرہا ہو، تقطیع اس کی اس زمانہ میں جتنی بھی چھوٹی ہو، لیکن بہرحال وہ عربی ہی کا دینی مدرسہ تھا، جیسے اپنے اس طویل وعریض ہیکل میں بھی دیوبند کا یہ دارالعلوم اس وقت بھی عربی ہی کا دینی مدرسہ ہے شروع میں جس وقت وہ قائم ہوا تھا اس وقت بھی یہی تھا، درمیان میں بھی وہی رہا، اور اس وقت تک وہی ہے۔ اس سے بڑھ کر محکم واستوار شہادت اس دعوے کے ثبوت کی اور کیا ہوسکتی ہے کہ درخت انار کی چھاؤں میں اس مدرسہ کا ۱۲۸۳ھ میں افتتاح ہوا، مدرسہ کے اسی پہلے سال کی پہلی مطبوعہ روداد میرے سامنے رکھی ہوئی ہے۔ روداد کو ان الفاظ سے شروع کرکے کہ

"الحمد للہ کہ سنہ ۱۲۸۳ ہجری بخیریت تمام ہوا"

آگے اسی میں یہ اطلاع دی گئی کہ

"یہ وہ سال مبارک ہے جس میں بناء

"مدرسہ عربی"

کی دیوبند میں قائم ہوئی"

نام ہی نہیں، امتحانی کتابوں کے ناموں کی فہرست بھی ہمیں جب ملتی ہے یعنی لکھا ہے کہ شرح وقایہ، شرح ملا، میبذی، قطبی، اصول شاشی، سراجی وغیرہ کتابوں میں طلبہ کا امتحان لیا گیا، اسی سے اس

"مدرسہ عربی" کے پہلے سال کے کاموں کا بھی پتہ چلتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بعد کو کیا' اس وقت تک "دارالعلوم" کے وسیع تدریسی احاطہ میں چند ابتدائی کلاسیں بھی مقامی ضرورتوں کے پیش نظر قرآن ناظرہ و حفظ' اردو فارسی حساب وغیرہ کی بھی ہیں، لیکن آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ عربی کتابوں کے پڑھائے جانے کے بعد جیسا کہ دوسرے سال کی روداد میں لکھا ہے' ان تحتانی کلاسوں کا اضافہ بعد میں ہوا ۱۲۸۴ھ کی روداد جو دوسرے سال کی رداد ہے' اس میں یہ لکھتے ہوئے کہ

"جب دیکھا گیا کہ طلبہ مبتدی بیرونجات و دیوبند کی کارروائی' بدون پڑھنے کتب فارسی کے نہیں ہوتی' اور فارسی تعلیم' عربی میں ابتدا دخل تمام رکھتی ہے' اور نیز خیال کیا گیا کہ اگر کتب فارسی ابتداء سے پڑھائی جاوینگی تو بالضرور لوگ اپنے چھوٹے لڑکوں کو مدرسہ بھیجیں گے' اور اس میں امید قوی ہے کہ رفتہ رفتہ شوق تعلیم عربی ہو" ص۵

جس کا حاصل یہی تو نکلا کہ عربی زبان کی کتابوں کے پڑھائے جانے کے بعد فارسی ادب کی کتابوں کے لئے گنجائش مدرسہ کے نصاب میں پیدا کی گئی' اسی روداد میں آگے اس کی خبر دیتے ہوئے کہ تعلیم قرآن کا درجہ بھی اسی کے بعد کھولا گیا' اور اس سلسلہ میں

"اوائل ماہ ذی الحجہ سے حافظ نامدار خان جن کی تعلیم اور حفظ قرآن مشہور ہے' بہ تنخواہ پانچ روپیہ ماہوار مقرر ہوئے"

ہمارے مصنف امام نے بھی دیوبند میں قیام مدرسہ کی خبر دینے کے بعد جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"چند ہی روز گذرے کہ چندہ کو افزونی ہوئی' اور مدرس بڑھائے گئے' اور مکتب فارسی حافظ قرآن مقرر ہوئے" ص۳۱

دیکھ رہے ہیں کہ قائم جب ہوا تو "مدرسہ عربی" ہی کے نام سے قائم ہوا' مکتبی کلاسوں کا اضافہ اس "مدرسہ عربی" میں بعد کو ہوا' ایسی صورت میں یہ دعویٰ کہ چھتہ کی مسجد میں دارالعلوم کی بنیاد ہی نہیں پڑی تھی' اور اسی سے لئے کردہ ایک مقامی قصباتی مکتب خانہ تھا' سیدنا الامام الکبیر اس کی افتتاحی تقریب میں

شریک نہ تھے۔ خود ہی سوچئے کہ یہ توجیہ واقعات کے مطابق کس حد تک ہو سکتی ہے، پھر مدرسہ کے پہلے سال کی اسی روداد میں

"نام مہتممان"

کے عنوان کے نیچے حسب ذیل ناموں کو جب ہم پاتے ہیں، یعنی

"حاجی عابد حسین، مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی، مولوی مہتاب علی صاحب، مولوی ذوالفقار علی صاحب، مولوی فضل الرحمن صاحب، منشی فضل حق، الشیخ نہال احمد"

بظاہر "ارکان مجلس شوریٰ" کی تعبیر "مہتممان" کے لفظ سے کی گئی ہے۔ جس کا مطلب یہی ہوا کہ دیوبند میں "مدرسہ عربی" جو قائم ہوا تھا، اس سے اپنے تعلق کو سیدنا الامام الکبیر قطعاً پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ جب "مجلس شوریٰ کے ارکان" میں آپ کا نام شریک تھا۔ وہی طبع بھی ہوا، شائع بھی ہوا، تو یہ کہنا کہ ابتداء میں حضرت والا اس مدرسہ سے سیاسی مصالح کے پیش نظر ایسا تعلق رکھنا نہیں چاہتے تھے، جس پر حکومت کی نظر پڑ سکتی ہو۔ بجز ایک خود تراشیدہ[1] مفروضہ کے اور بھی کچھ ہے، اسی سال کی روداد میں

---

[1] احقر کے خیال ناقص میں بسلسلہ تاسیس دارالعلوم حضرت والا کے کھلکر سامنے نہ آنے کو وقت کی سیاسی مصلحت پر محمول کرلیا جانا بھی کوئی ایسی بے سرو پا توجیہ نہیں کہ اسے خود تراشیدہ مفروضہ کہہ کر کلیۃً نظر انداز کردیا جائے۔ اس وقت کے نازک حالات، حضرت والا کا وارنٹ، روپوشی، سرکاری دادو شوں کا پیچھے پیچھے لگا رہنا، پھر حضرت والا کے اُن جذبات نظریات کا باہمی سوز پیکا تعقل کیلئے ہوتا جو اس وقت اجراء مدرسہ کی روح اور آج ایک مستقل مکتب خیال اور ملت کی تاریخ بنی ہوئے ہیں، جن کی رو سے یہ مدرسہ تعلیمی ہونے کے ساتھ ساتھ گویا اہل اللہ کی سیاست کا ایک مرکز بھی تھا، کچھ ایسی باتیں نہ تھیں جو کلیۃً پردۂ خفا میں ہوں یا کم از کم بحیثیت مجموعی حکومت وقت کی نگاہوں سے بالکل اوجھل ہوں ایسی صورت میں حضرت والا کا بحیثیت بانی یا بحیثیت کسی ذمہ دار عہدیدار کے سامنے آنا بلاشبہ مدرسہ کو خطرات وہلاکت کا شکار بنا سکتا تھا اور ابتداء ہی سے حکومت وقت کی نگاہیں اس پر کڑی ہو جاتیں جس سے وہ حریت پرور مقاصد بروئے کار نہ آسکتے جن کے لئے یہ تاسیس عمل میں آئی تھی، ان حالات میں حضرت والا کا کسی رسمی ذمہ داری کی صورت سے سامنے نہ آنا مدرسہ کے حق میں سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ بھی نہ ہونے کو نمایاں رکھنا ایک اچھی خاصی سیاسی مصلحت کی صورت ہو جاتی ہے۔ رہا ممبران یا متعینین کی فہرست میں حضرت والا کا نام شائع ہو جانا ان کی کسی رسمی ذمہ داری کو ظاہر نہیں کرتا اگر اس میں ذمہ داری نمایاں ہوتی ہے تو ایک جماعت کی اور وہ بھی اعزازی جس کا کسی مسئولیاتی منصب سے تعلق نہیں ہوتا پھر جس میں اکثریت ایسے حضرات کی تھی جو تارک الدنیا اور مسجد نشین بزرگ تھے جنھیں (باقی اگلے صفحہ پر)

"امتحان سالانہ"

کا عنوان قائم کرکے یہ رپورٹ درج کی گئی ہے کہ

"ماہ شعبان ۱۲۸۳ھ میں فاضل کامل مولوی محمد قاسم نانوتوی نے بشمول مولوی مہتاب علی و

مولوی ذوالفقار علی صاحب نہایت مستعدی اور سرگرمی سے امتحان لیا۔" ص ۲

کام کرنے کیلئے 'پیر بھی جو دیوبند مجلس شوریٰ میں شریک ہوئے' طلبہ کا امتحان لینے کیلئے آسکتا تھا! اسی مدرسہ کا سنگ بنیاد جسے کہا جا رہا تھا' افتتاح مدرسہ کی اس تاریخی مجلس سے بجائے حاضر ہونے کے غائب ہو لنگ کیوں ہو گیا! اور غائب ہو کر آخر اس مدرسہ کے اجراء افتتاح سے اسکے تعلق کی کیا نوعیت تھی؟ یقیناً مندرجہ بالا "معلومات" کے پیش نظر ایک دلچسپ سوال بن جاتا ہے۔ خدا جانے دماغوں میں اسکی اور کیا کیا توجیہیں آئی ہیں یا آسکتی ہیں لیکن میں کیا عرض کروں۔ اتنا لئے

(گذشتہ صفحہ سے) سیاسیات سے تو بجائے خود' عام شہری معاملات سے بھی کوئی خاص لگاؤ نہ تھا اور ایسے بزرگوں کی تھی جو گورنمنٹ کے قدیم ملازم اور حال پنشنر تھے جن کے بارہ میں گورنمنٹ کو شک و شبہ کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ ایسے سے سلسلے نامور ہی تھے تا کسی خاص شخصیت پر نگاہ عادتاً نہیں پڑ سکتی۔ اس پر بھی مخالفین مدرسہ نے حضرت ہی کے تعلق کو بنیاد قرار دیکر مدرسہ کو حکومت وقت کی نگاہوں میں مشتبہ کر دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ بغاوت کے الزامات بھی لگائے اور غیر ممالک سے سازش کی تہمتیں بھی تراشیں حتیٰ کہ گورنمنٹ کو تحقیقات کرانی پڑی' اس وقت بھی حضرات آگے بڑھے اور اپنے سرکاری اعتماد کو سامنے رکھ کر مدرسہ کی طرف سے صفائی پیش کی جو کارگر ہوئی۔ ورنہ اگر شخصی طور پر عہدیدارانہ ذمہ داریوں کے ساتھ حضرت الامام آگے آئے ہوئے ہوتے تو ظاہر ہے کہ مدرسہ کی طرف سے ان بزرگوں کی یہ صفائی اور یقین دہانی کبھی بھی کارگر نہ ہو سکتی۔ گویا حضرت والا کا پس پردہ رہنا جس مصلحت سے تھا' عملاً اس کا خوشگوار نتیجہ ظاہر بھی ہوا۔ اسلئے حضرت والا کی یہ حکمت عملی کہ مدرسہ کے سب کچھ ہونے کے باوجود وہ کچھ بھی نہ ہونا ہی دکھانا چاہتے تھے اور نہ صرف تاسیس مدرسہ ہی کی حد تک بلکہ آخر تک اسی کو نباہا گیا۔ بلا شبہ وقتی مصالح کے لحاظ سے ایک حکیمانہ روش تھی جس کو سیاسی مصلحت کے سوا اور کس نام سے تعبیر کیا جائے؟

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس اخفاء و تستر میں حضرت والا کی قلبی افتاد اور روحانی کسر نفسی اور تواضع کو بھی کافی دخل تھا اور کوئی شبہ نہیں کہ جس طرح وہ امامت خطابت' زعامت مشیخت افتاء اور تمام امتیازی مواقع سے گھبراتے تھے اسی طرح کارہائے مدرسہ کی قیادت سے بھی یقیناً گریز فرماتے ہوں جیسا کہ حضرت مصنف دام مجدہٗ کا نظریہ ہے اور واقعہ بھی ہے لیکن ان دونوں باتوں یعنی سیاسی مصلحت اور قلبی تواضع میں کوئی منافات نہیں۔ اگر قلبی افتاد کے ساتھ عقل کی انگیز بھی شامل ہو جائے تو اہل اللہ کے لئے یہ جمع اضداد کچھ مشکل نہیں۔ ایسے لوگوں کے قلب سلیم کی مقاماتی ترقی میں عقل معین ہوتی ہے اور عقل کے اونچے اونچے نظریات میں قلب کی سلامتی مددگار ہوتی ہے۔ اسلئے ہو سکتا ہے کہ قلب نے اپنے راستہ سے اور دماغ نے اپنے طریقہ سے حضرت والا کو اس باہمہ وجوہ حکمت عملی پر قائم کیا ہو' نظر بریں ہم اسے اعلیٰ ترین تواضع بھی کہہ سکتے ہیں اور بہترین سیاسی مصلحت کا عنوان بھی دے سکتے ہیں۔

محمد طیب غفرلہٗ

اور اکثر نے اپنے بچوں پر برتری اور فوقیت حاصل کرنیکا ذریعہ یا دھوکا عید کے اسی جوڑے کو جس پھونک کر رکھدیا تھا
طفولیت کو ایام بیہوشی میں جو ہوش کی ایسی باتیں کرتا تھا کہ بڑے بڑے ہوشیاروں سے بھی جنکی ہم توقع نہیں کر سکتے، لکھے
پڑھے حتیٰ کہ کھیلنے کودنے تک کے مشغلوں میں کام کو انتہائی منزلوں تک پہنچانے میں کامیاب ہونے کے ساتھ
ہی نام اور شہرۂ عام کے موقعہ پر جس کا جبلّی سجیّہ اور دوامی وطیرہ بجائے حاضری کے غائب ہوجانا
ہی قرار پاچکا ہو، ساری بلندیاں جن پر چڑھ چڑھ کر بجانے والے اپنے اپنے فضل و علم کی ڈگڈگیاں
پہلے بجاتے تھے، یا آج تک بجا رہے ہیں، کیا ہمیشہ ان سے اُترنے ہی پر اصرار کرتے ہوئے اسے
نہیں پایا گیا، حکومت کی ملازمت یا وکالت جیسی باتوں کو تو خیر دور رکھئے، آپ سن چکے کہ جس زمانہ میں
اس کے دیوان علم کے رفقاء وسیع صحراؤں کی طرف بگٹٹ بھاگے چلے جاتے تھے، ٹھیک ان ہی
دنوں میں وہ دلّی کے کوچہ چیلان نامی کے ایک مکان میں جھلنگے پر پڑا ہوا تھا۔ اسی طرح امامت،
خطابت، افتاء، دراست، تصنیف و کتابت، حتیٰ کہ ارشاد و بیعت تک کی راہوں میں آپ دیکھ
چکے کہ کبھی وہ خود آیا نہیں، بلکہ لایا گیا، علم و دین کی ان نمائش گاہوں پر خود چڑھا نہیں بلکہ چڑھایا گیا، بزور جبر
چڑھایا گیا، پھر کام کے بعد آج یہی نام کے مقام پر وہ کیوں ڈھونڈھا جارہا ہے، جو اس مقام پر پہلے
کب اور کہاں پایا گیا تھا۔ ان ہی پہنائیوں میں تو عرض کرچکا ہوں۔ اس کی "پیدائیوں" کا راز پوشیدہ
ہے، آج اس کے ظہور کی شدت ممکن ہے، بعضوں کے لئے ناقابلِ برداشت بنی ہوئی ہو۔
سرگوشیاں ہو رہی ہیں کہ وہ تو غائب تھا۔ پھر ہر جگہ وہی وہ آج کیوں پایا جارہا ہے۔ شاید قرآنی
قانون واللّٰہ مخرج ماکنتم تکتمون اور اس کی تفسیر جو انہیں سنائی گئی تھی، اسے وہ بھول
گئے، حالانکہ چاہئے تھا کہ بجائے اس کے ان معلومات کا جائزہ لیتے، اور ان میں اپنے اس سوال
کا جواب تلاش کرتے جوان کے "حافظہ" سے امید ہے کہ ابھی غائب نہیں ہوئے ہوں گے،
کچھ بھی ہو، سچی بات یہی ہے، یہی واقعہ ہے، اور اسی کو واقعہ ہونا بھی چاہئے کہ "جامعہ قاسمیہ" یا
"دیوبند کے دارالعلوم" کی جب بنیاد پڑی تھی تو سیدنا الامام الکبیر اس وقت دیوبند میں موجود تھے
اسی لئے قیام دارالعلوم کی ابتدائی داستان میرے دائرۂ بحث سے سچ پوچھئے تو خارج ہے۔

ان جزئیات کی سراغ رسانی یعنی مقامی طور پر" مدرسہ عربی " کے نام سے دیوبند کے قصبہ میں اس تعلیم گاہ کا افتتاح کب اور کن مقامی بزرگوں کی تحریک و تجویز سے ہوا۔ ان باتوں کی تحقیق کا صحیح مقام سیدنا الامام الکبیر کی سوانح عمری نہیں، بلکہ دارالعلوم کی تاریخ ہو سکتی ہے، لیکن آئندہ کی کڑیوں کی حلقہ بندی کے لئے یہاں بھی ضرورت ہے کہ ذیلی طور پر ان معلومات کو اس کتاب میں بھی درج کر دیا جائے، جو ان امور کے متعلق اب تک سیدنا الامام الکبیر کے اس ظلوم و جہول سوانح نگار تک پہنچے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ شاملی کے میدان کا زخم خوردہ شیر، اس میدان سے واپس ہونے کے بعد نئے داؤ اور نئے گھات کے لئے کسی نئی " کمین گاہ " کی تلاش میں جب سرگردان تھا، تو جیسا کہ عرض کر چکا ہوں اس کا پتہ چلانا تو دشوار ہے کہ اس زمانہ میں ان کی نظریں کہاں کہاں کن کن لوگوں پر پڑ رہی تھیں، تاہم قرائن و قیاسات کا اقتضاء ہے کہ سہارنپور تھانہ بھون مرادآباد میرٹھ وغیرہ جیسے مقامات جہاں سے آپ کے خاص تعلقات تھے۔ ان ہی کے ساتھ ساتھ کوئی وجہ نہ تھی کہ دیوبند اور اس کے امکانات آپ کے سامنے نہ آئے ہوں، جو اب بجائے نانوتہ کے آپ کا وطن ثانی بھی بن چکا تھا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اپنے اس

"کچھار"

کے پروردہ شیر بچوں سے جو آپ ہی کی آغوش تربیت میں پل رہے تھے، آپ کے طبعی رجحانات و میلانات، خود آپ کی " مجلس انس " میں شریک ہو ہو کر شعوری و غیر شعوری طور پر جو چوس رہے تھے ان ہی شیر بچوں سے توقعات کی لہریں آپ کے قلب مبارک سے زیادہ ٹکراتی ہوں، ان ہی سے آپ کا دل زیادہ امیدیں باندھتا ہو، تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے۔ لیکن بایں ہمہ اس کا کوئی تاریخی وثیقہ ہمارے پاس نہیں ہے کہ قیام مدرسہ کی تاریخ و سنہ یا اس کے ابتدائی مبادی طے کرنے کیلئے بقید وقت صاف صاف دو ٹوک الفاظ میں " دیوبند " کے باشندوں کو کوئی واضح تصریحی حکم آپ نے دیا تھا۔ اگرچہ آپ کی ہر حرکت اور ہر سکون ساری زندگی اس میں شک نہیں کہ مجسم سوال بنی ہوئی تھی لیکن اس سوال کا جواب کہاں سے آئیگا؟ اور کون لوگ لبیک کہینگے؟ اسی کے انتظار میں دن پر دن، مہینوں پر مہینے، سال پر سال گذرے چلے جاتے

تھے، ایک سال دو سال، تین سال، تا ایں کہ قریب تھا کہ سالوں کا ایک دہا یا عشرہ بھی گذر جائے اسی سوال کا جواب زمین پر بھی ڈھونڈھ رہا تھا اور عرض کر چکا ہوں، کہ تلاش کرنے والا آسمانوں میں بھی اسی سوال کے جواب کو تلاش کر رہا تھا کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں جب میرٹھ کا شہر اور اس کے مطبع مجتبائی میں انتظار کی گھڑیاں کاٹے نہیں کٹ رہی تھیں کہ دیوبند سے یہ "بشارت ثامنہ" موصول ہوا، یعنی حاجی عابد حسین صاحب نے سیدنا الامام الکبیر کو میرٹھ خط لکھا، جس کا اقتباس تذکرۃ العابدین میں دیا گیا ہے۔ حاجی نذیر احمد صاحب مصنف تذکرۃ العابدین یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ حاجی عابد حسین صاحب نے مدرسہ کے سلسلہ میں چندہ شروع کر دیا، خود بھی دیا، اور دوسروں سے بھی لیا اور جمع کیا۔ آگے لکھتے ہیں

"اگلے روز حاجی صاحب (حاجی عابد حسین صاحب) نے مولوی محمد قاسم صاحب کو میرٹھ خط لکھا کہ آپ پڑھانے کے واسطے دیوبند آئیے۔ فقیر نے یہ صورت فراہمی چندہ اختیار کی ہے"۔ (تذکرۃ العابدین ص۹۹ مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی)

اس خط کے بارہ میں جو بیان مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی استاد دار العلوم دیوبند کا شامل مواد سوانح قاسمی ہے اس میں اس خط کے کچھ اور فقرے بھی ملتے ہیں۔ جن سے بعض دوسرے پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مولانا ممدوح لکھتے ہیں

"حاجی عابد حسین صاحب کا یہ خط میں نے حاجی نذیر احمد صاحب کے پاس بچشم خود دیکھا ہے اور مجھے اس کا مضمون بجنسہ قریب قریب اسی کے الفاظ میں پوری طرح محفوظ ہے اس خط میں حاجی صاحب نے مولانا مرحوم کو لکھا ہے، کہ وہ جو آپ کے ہمارے درمیان مختلف مجالس میں مذاکرات ہوا کرتے تھے کہ کوئی مدرسہ قائم ہونا چاہیے۔ کیونکہ ایک ایک سوال پوچھنے کے لئے سہارنپور آدمی بھیجنا پڑتا ہے۔ فقیر کے دل میں اک دم خیال آگیا اور چندہ کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔ کل عصر مغرب کے درمیان تین سو روپے ہو گئے۔ اب آپ تشریف لے آئیے۔ (فائل مسودات مواد سوانح)

یہ سوال کا جواب اور لبیک" کی پہلی آواز تھی جو خوش قسمت دیوبند اور اس کے خوش نصیب، توفیق یافتہ باشندوں کی طرف سے تقریباً دس سال کی "تاذین عام"[1] کے بعد پہلی دفعہ سیدنا الامام الکبیر کے "قلب منتظر" سے ٹکرائی، سب پیچھے رہ گئے، دیوبند سب سے آگے بڑھ گیا اور "الفضل للمتقدم" کا "قدرتی حق" ضلع سہارنپور کے اس گمنام قصبہ "دیوبند" کے طالع ارجمند کے لئے ہمیشہ کے واسطے محفوظ ہو گیا، سبقت اور پیش قدمی کا ایسا حق جو کوئی اس سے اب چھین نہیں سکتا۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء

مندرجہ بالا "بشارت نامہ" حضرت سید حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارقام فرمودہ تھا جو چھتہ کی مسجد کی "مجلس انس" کے رکن رکین تھے

بشارت نامہ کے ان دونوں اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ارسال بشارت نامہ تک حضرت حاجی سید محمد عابد صاحب کی مساعی صرف فراہمی چندہ تک محدود ہیں۔ تعلیم کا افتتاح یا مدرسہ کا اجراء عمل میں نہیں آیا تھا اسی کے لئے انہوں نے سیدنا الامام الکبیر کو یاد فرمایا۔ اور ان مذاکرات کا حوالہ دے کر یاد فرمایا جو اجراء مدرسہ کے سلسلہ میں ان میں اور سیدنا الامام الکبیر میں ہوا کرتے تھے۔ گویا یہ اقدام ان مذاکرات کے نتیجہ کے طور پر ایک باہمی سمجھوتہ یا ایک معہود فی الذہن منصوبہ کے تحت عمل میں آیا تھا۔

ابتدائی مراحل کی اطلاع بشارت نامہ کے ذریعہ میرٹھ پہنچی جس کے قلب میں ۱۲۸۳ھ کے بعد سے ایک اساسی مقصد کی آگ لگی ہوئی تھی، اور جس کے بروئے کار آنے ہی پر بظاہر اسباب مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کی تعمیر ہونے والی تھی۔ جس کے لئے ۱۲۸۳ھ ہی سے دیوبند کی آمد و رفت مسجد چھتہ کی مجلس انس اور مذاکرات و تصرفات کا ایک لمبا سلسلہ قائم کیا گیا تھا۔ آج جبکہ اسی مقصد کے بارہ میں

---

[1] اقتباس از آیت واذن فی الناس بالحج یاتوک رجالا و علی کل ضامر یاتین من کل فج عمیق۔ اسقاطاً بناء دارالعلوم کے سلسلہ میں اسی آیت کے مضمون سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اقتباس کر کے اپنے استاذ حضرت نانوتوی کے بارہ میں یہ شعر لکھا ہے۔ اس کی آواز تھی یا بانگ خلیل الہٰی + کہ کے لبیک چلے اہل عرب اہل عجم۔ اسی تاذین اور اس کی لبیک کی داستان کی طرف حضرت مصنف لفظ تاذین سے اشارہ فرما رہے ہیں۔ محمد طیب غفرلہ

عملی لبیک کی خوش خبری سامنے آئی تو سیدنا الامام الکبیر کی خوشی و مسرت کا آج کون اندازہ کر سکتا ہے؟ اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت جلد سے جلد اصل مقصد کی عملی تکمیل کا ولولہ کس حد تک قلب مبارک میں جوش زن ہوا ہوگا۔ اس بشارت نامہ کے جواب میں آپ نے جو والا نامہ تحریر فرمایا اس کا یہ متعلقہ حصہ صاحب تذکرۃ العابدین نے نقل کیا ہے جس کے الفاظ بجنسہ یہ ہیں۔

"مولوی محمد قاسم صاحب نے جواب لکھا کہ میں بہت خوش ہوا۔ خدا بہتر کرے، مولوی ملا محمود صاحب کو پندرہ روپے ماہوار مقرر کر کے بھیجتا ہوں۔ وہ پڑھا دینگے اور میں مدرسۂ مذکور کے حق میں ساعی رہوں گا۔" (تذکرۃ العابدین ص۶۹)

سیدنا الامام الکبیر کے اس اذن اور عملی پیشقدمی پر جو تعلیمی صورت دیوبند میں نمودار ہوئی اس کے بارہ میں صاحب تذکرۃ العابدین ہی نے یہ اطلاع دی ہے

"چنانچہ ملا محمود صاحب آئے اور مسجد چھتہ میں عربی پڑھانا شروع کیا۔"

(تذکرۃ العابدین ص۶۹)

حاجی محمد عابد صاحب کے اس بشارت نامہ اور سیدنا الامام الکبیر کے جوابی والا نامہ سے یہی معلوم ہوتا ہے اور سوچنے والے اس کے سوا اور سوچ ہی کیا سکتے ہیں کہ دیوبند میں تعلیم کی اجتماعی شکل میں "نئے محاذ" کا افتتاح سیدنا الامام الکبیر ہی کے منشاء و صوابدید کے مطابق اور آخر کار ان ہی کے اذن صریح بلکہ افتتاح مدرسہ کے بارہ میں عملی پیش قدمی سے عمل میں آیا تھا۔ جس کے لئے سربراہ کار حضرت حاجی سید محمد عابد صاحب تھے، گویا سیدنا الامام الکبیر نے اگر ابتداء ہی سے انہیں اس کام کے لئے نگاہ میں رکھ کر چھتہ کی مسجد کا قیام اختیار فرمایا تھا۔ جیسا کہ سوانح مخطوطہ کی عبارت اس بارہ میں پیش کی جاچکی ہے۔ پھر مذاکرات کی داغ بیل ڈالی تھی، جیسا کہ حاجی صاحب کے اس بشارت نامہ کی عبارت سے واضح ہے تو حاجی صاحب ہی اس سلسلہ میں آگے بڑھے انہوں نے ہی قیام مدرسہ کے ابتدائی مراحل (فراہمی چندہ) طے کئے اور انہوں نے ہی حضرت والا کو بشارت نامہ بھیجکر گویا استیذان کیا اور بالآخر حضرت والا کے اذن اور مدرس بھیجنے پر چھتہ کی مسجد میں

مدرسہ کا افتتاح عمل میں آگیا۔

باقی یہ جو لوگ پوچھتے ہیں کہ مقامی طور پر مدرسہ کے افتتاح کی دیوبند میں کیا صورت پیش آئی؟ تحریک و تجویز میں کس نے پہل کی؟ وغیرہ سو میرے نزدیک تو یہ اسی قسم کا سوال ہے کہ دیوبند کے بعد سہارنپور، مرادآباد، تھانہ، کیرانہ، نگینہ، گلاوٹھی، مظفرنگر، رڑکی، انبہٹہ وغیرہ آس پاس کے قریٰ و امصار میں سیدنا الامام الکبیر ہی کے منشاء و ایماء کے متعلق مقامی درسگاہیں وقتاً فوقتاً جیسا کہ آگے معلوم ہوگا کھلتی رہیں، ان کے متعلق یہ تحقیق کی جائے کہ مقامی طور پر ان مقامات میں سب سے پہلے کس نے "درسگاہ" کے قیام کی تجویز پیش کی، تجویز کو کن کن لوگوں نے پہلی دفعہ قبول کیا، اور اہتمام و انتظام کا بار کن بزرگوں نے اپنے اوپر لیا، میرے نزدیک کوئی قابل توجہ بات نہیں۔

تاہم اس وقت مسجد چھتہ کی مجلس انس کے سربرآوردہ اور ذمہ دار اراکین میں حضرت حاجی سید محمد عابد صاحب اپنے تقدس اور درویشی کی حیثیت سے مقبول خلائق اور دیوبند میں مرجع عوام و خواص بنے ہوئے تھے جن کے بارہ میں مولانا ذوالفقار علی صاحب کا یہ نقرہ نقل کیا جاتا ہے کہ مدرسہ دیوبند کو سلطان روم بھی بغیر حاجی محمد عابد صاحب کی مدد کے نہیں چلا سکتا اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے اپنی مشہور نظم میں انہیں "مرد حق" - "عابد صداقت کیش" اور "طائر ہمایوں فال" وغیرہ کے الفاظ سے یاد کر کے اپنی گہری عقیدتمندی کا ثبوت دیا ہے، اور ادھر یہ دونوں نامبردہ بزرگ یعنی مولانا ذوالفقار علی صاحب اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں اپنی علمی حیثیت اور تعلیمی تجربہ کے لحاظ سے قصبہ میں ممتاز تھے۔ بقول مصنف امام ان تینوں حضرات نے تجویز کی اور گویا ارادہ کیا کہ دس سال سے جس کام کے لئے قلوب مستعد ہوتے چلے آرہے تھے اب وہ کام بروئے کار لایا جائے۔ پھر اس مبارک کام کو چھیڑنے کے لئے تحریک ان میں سے پہلے کس نے کی؟ سو تذکرۃ العابدین کی روایت کے مطابق حضرت حاجی محمد عابد صاحب نے اور سوانح مخطوطہ کی روایت کے مطابق مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے، ہمارے نزدیک یہ دونوں روایتیں متعارض نہیں ہیں۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ دونوں بزرگوں نے کی۔ کیونکہ جیسا کہ ذکر آچکا ہے کہ مسجد چھتہ کی مجلس انس کی تاثیری کارفرمائیوں سے

جبکہ یہ کام ان سب ذہنوں کی مشترک پکار بن چکا تھا تو جو زبان بھی پہلے ہلی۔ اُس نے اپنی ساتھ دوسرے کی ترجمانی بھی کی، اسلئے ہم اس پہل کو تذکیر سمجھتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وقتاً فوقتاً یہ صدا کبھی کسی کی زبان پر اور کبھی کسی کی زبان پر آتی رہی جو دوسروں کو اُبھارنے اور یاد دلانے کے لئے ہوتی تھی۔ کچھ بھی ہو، بہر حال اچانک دیکھا یہ گیا کہ حاجی محمد عابد صاحب تن تنہا گلے میں جھولی ڈال کر چندہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے جس کی تفصیلی روایت آگے آرہی ہے، اور روپیہ جمع کر کے اصل مقصد یعنی افتتاح تعلیم و اجراء مدرسہ کے لئے سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں میرٹھ بشارت نامہ بھیجدیا، اور وہاں کی تصویب تا ذین اور مدرس کا تقرر کر کے بھیجدینے پر افتتاح مدرسہ عمل میں آگیا، جیسا کہ ابھی آپ پڑھ چکے ہیں، حاصل اس کا یہی ہوا کہ اسی کے ہاتھوں اس کام نے عملی قالب اختیار کیا۔ جس کے قلب کا یہ جذبہ تھا، اور جس نے دوسرے قلوب کو بھی اس تپش سے تیار رکھا تھا۔ یعنی اجراء مدرسہ حضرت والا نے کیا گو پس پردہ میرٹھ میں بیٹھ کر کیا لیکن عملاً اس کام کو چلانے اور آگے بڑھانے کے لئے بہر حال ایک ایسی مقامی شخصیت کی ضرورت تھی جو اپنے اثر و اقتدار سے "مالی سرمایہ" کے فراہم کرنے میں بھی کامیاب ہو سکتا ہو، اور اسی کے ساتھ بڑا اہم مسئلہ یہ تھا کہ ہمہ وقتی نگرانی کے لئے دوسرے مشاغل سے وہ آزاد بھی ہو، کہہ چکا ہوں کہ ان دونوں خصوصیتوں یعنی اثر و اقتدار اور ہمہ وقتی توانائی" کی جو ضرورت اس ادارہ کو عملی گردش میں لانے کے لئے تھی۔ ان دونوں جوہری خصوصیتوں کی جامع ذات اس زمانہ میں حضرت حاجی محمد عابد صاحب قبلہ کے سوا جہاں تک معلومات کا تعلق ہے، دیوبند میں اس وقت شاید کوئی دوسری ہستی نہ تھی، حاجی صاحب کا اثر اور کافی گہرا اقتدار مسلمان مردوں اور عورتوں ہی کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ قصبہ کی غیر مسلم آبادی میں بھی جیسا کہ سن چکے، اپنے خاص حالات کے لحاظ سے وہ کافی مقبول اور ہر دل عزیز تھے، اور صرف یہی نہیں بلکہ سوانح مخطوطہ کے باخبر مصنف[لہ] نے حاجی صاحب کے متعلق یہ بیان کرتے ہوئے کہ

---

لہ پہلے تو ان کی شخصیت کچھ مجہول سی تھی لیکن معلومات ان کے متعلق جو فراہم ہوئے ہیں، ان کی روشنی میں تو دارالعلوم دیوبند کی تاریخ میں ان کی ہستی کافی ممتاز اور اہم بن جاتی ہے۔ مولانا طیب صاحب کے (باقی اگلے صفحہ پر)

"آپ کی صورت کو دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔"

آگے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ

"پابندیٔ وضع، استقلال طبع، اولو العزمی، خوش تدبیری آپ کی مشہور ہے۔"

اور گو لکھنے کے بعد اپنے مسودہ میں ان الفاظ کو نہ معلوم کیوں قلم زد کر دیا گیا ہے۔ لیکن بہرحال ہیں یہ قلم زدہ الفاظ بھی ان ہی کے قلم سے نکلے ہوئے، اور وہ یہ ہیں کہ

"باوجودیکہ (حاجی عابد صاحب نے) دنیا کو ترک کر دیا، مگر کوئی آپ سے مشورہ لیتا ہے، تو اس میں بھی ایسی اچھی صائب رائے ہوتی ہے، جیسے بڑے ہوشیار دنیا دار کی۔"

شاید آخری الفاظ میں کچھ تعبیری خامی محسوس ہوئی، اسی لئے وہ کاٹ دیئے گئے، مگر میرے سامنے جو سوال ہے، اسکے حل میں ان کے قلم کے نکلے ہوئے یہ تاریخی الفاظ کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ سمجھ میں آتا ہے کہ "اثر" د "فرصت" کے سوا حاجی صاحب میں وہ ساری خوبیاں جمع تھیں جن میں کسی اجتماعی نظام کے تحت چلائے جانیوالے ادارہ کی فلاح و بہبود، بقاء و ارتقاء کی ضمانت پوشیدہ ہے، حاصل یہی ہے کہ صاحب دل ہونے کے ساتھ حاجی صاحب "صاحب دماغ" بھی تھے۔

(گذشتہ صفحہ سے) بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے مصنف دیوبند ہی کے ایک بزرگ منشی فضل حق نامی ہیں، یہ وہی منشی فضل حق صاحب ہیں، جن کا اسم گرامی دار العلوم دیوبند کی سب سے پہلی مجلس شوریٰ کے ارکان کی اس فہرست میں درج ہے جو مدرسہ کے پہلے سال ۱۲۸۳ھ کی روداد میں شریک ہے، گویا ابتداء ہی سے مجلس شوریٰ کے رکن "منتخب ہوئے اور آخر تک رہے۔ دار العلوم کی بعض قدیم رودادوں سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ سنہ ۱۳۱۰ ہجری میں حاجی سید عابد حسین صاحب کی تحریک اور قطب ربانی حضرت گنگوہی کی ترشیح سے منشی فضل حق دار العلوم کے مہتمم بھی مقرر ہوئے تھے؛ حاجی عابد حسین صاحب نے اپنی تحریک مجلس شوریٰ میں جن الفاظ میں پیش کی تھی ان کی خصوصیات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ تحریک کے الفاظ یہ تھے۔ "منشی فضل حق ابتداء مدرسہ سے داخل اہل شوریٰ ہیں اور پہلے عرصہ تک اہتمام کا کام کر چکے ہیں" اور استعداد تحریر و تقریر کی دانی رکھتے ہیں، اور تدابیر وقت انتظامیہ کو بھی جاری نہیں، جیسے منشی صاحب کا خاندان اور کئی پشتوں کے حساب کر حاجی عابد حسین صاحب کے مل جاتا ہے، خود سیدنا الامام الکبیر کو بھی سسرالی رشتہ آپ کا تھا (رحمۃ اللہ علیہ وعلیہم) منشی صاحب کے ایک صاحبزادے مولانا ظہور الحق صاحب مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں مدرس ہیں اور ڈاکٹر شفیق احمد صاحب منشی صاحب مغفور کے نواسے ہیں، جو آج کل دیوبند کے ممتاز معالجوں میں شمار ہوتے ہیں۔ مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ منشی صاحب کا مکان دیوبند کے محلہ سرائے میں اب بھی موجود ہے، ان کے خاندان والوں سے مولانا کے گھرانے سے خوش گوار گھرے تعلقات ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس انکشاف کے بعد "سوانح مخطوطہ" اور اس کے مشتملات کی قدر و قیمت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ۱۲

بلکہ صاحب دل وصاحب دماغ ہونے کے ساتھ ساتھ حاجی صاحب کے متعلق اس قسم کے معلومات ہم تک جو پہنچے ہیں۔ مثلاً ارواحِ ثلاثہ میں حضرت تھانوی کی یہ روایت پائی جاتی ہے، حضرت والا اپنے استاد مولٰنا فتح محمد صاحب کے حوالے سے بیان فرمایا کرتے تھے کہ دارالعلوم دیوبند میں مولٰنا فتح محمد صاحب جب زیرِ تعلیم تھے، تو کسی ضرورت سے وہ حاجی سید محمد عابد صاحب قبلہ کی خدمت میں پہنچے، اس وقت وہی مدرسہ کے مہتمم بھی تھے لیکن ٹھیک اسی وقت کوئی ڈپٹی صاحب بھی حاجی صاحب کی ملاقات ہی کی غرض سے آدھمکے۔ حاجی صاحب نے حد سے زیادہ لاپروائی سے گویا کام لیتے ہوئے ڈپٹی صاحب سے سرسری گفتگو کی، ادھر اٹھ کر جانا ہی چاہتے تھے کہ مولٰنا فتح محمد جن کی حیثیت اس زمانہ میں مدرسہ کے ایک معمولی طالب علم سے زیادہ نہ تھی، دیکھا کہ وہ آرہے ہیں، ان پر نظر کا پڑنا تھا کہ پلٹ پڑے اور اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر مولوی صاحب سے آنے کی وجہ دریافت فرمانے لگے، مولوی فتح محمد صاحب نے یہ دیکھ کر کہ حاجی صاحب جا رہے تھے، خواہ مخواہ میری وجہ سے ان کو رکنا پڑا۔ ادباً عرض کرنے لگے کہ کوئی خاص بات نہ تھی۔ پھر کبھی عرض کردوں گا، مگر ان کو حیرت ہوگئی، جب وہ حاجی صاحب کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ان الفاظ کو سن رہے تھے۔

"تم اپنے کو ڈپٹی صاحب پر قیاس کرتے ہوگے، کہاں وہ دنیادار اور کہاں تم نائب رسول" ارواح ص۲۶۹

اسی کتاب ارواحِ ثلاثہ میں ایک دوسری روایت بھی پائی جاتی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مدرسہ کے کسی طالب علم اور حاجی صاحب کے درمیان باہمی رنجش کی کوئی صورت پیش آگئی تھی، طالب العلم نے منہ پر حاجی صاحب کو کچھ سخت وسست بھی سنا دیا تھا، طالب العلم ایک مسجد میں رہتا تھا، لکھا ہے کہ حاجی صاحب اسی مسجد میں بہ نفس نفیس پہنچے، دیکھا جا رہا تھا کہ طالب العلم کے

"سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھے ہیں۔ فرمایا کہ مولانا معاف کر دیجئے۔ آپ نائب رسول ہیں، آپ کا ناراض رکھنا مجھے گوارا نہیں" ص۲۶۹

"ملا اور صوفی" کے تعلقات جن کی طرف کتاب کے تمہیدی مقدمہ میں بقدر ضرورت بحث بھی کی گئی ہے۔ اور یہ جانتے ہوئے کہ حاجی سید محمد عابد صاحب پر درویشی ہی کا پہلو ابتدا سے غالب تھا گو شریعت کے ظاہر احکام کی پابندی میں بھی جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، وہ خاص امتیازی شان رکھتے تھے، لیکن بجائے انقباض کے غریب ملاؤں کی، حاجی صاحب کی درویشی میں اتنی گہری جگہ جس کا اندازہ مذکورہ بالا مثالوں سے ہوتا ہے۔ اب خواہ یہ رنگ جس راستہ سے بھی آیا ہو، سنہ ء کے بعد دیوبند کو وطن ثانی بننے کی عزت سیدنا الامام الکبیر کی بدولت جو حاصل ہوئی، اور چھتہ کی مسجد میں جو حلقہ درویشوں کا اس کے بعد قائم ہوا، بظاہر تو اسی حلقہ کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں جیسا کہ گذر چکا اس رنگ کے سب سے بڑے علمبردار حضرت قبلہ حاجی امداد اللہ صاحب سے بھی حاجی صاحب کا رشتہ قائم ہوا، اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ خلافت کی سعادت بھی آستانہ امدادی سے حاجی محمد عابد صاحب[1] کو حاصل ہوئی تھی۔ لیکن یہ بہت بعد کی باتیں ہیں[2]۔ بظاہر یہ قصے اس وقت کے ہیں جب دیوبند میں عربی کا مدرسہ شروع شروع میں قائم ہوا تھا۔ اس وقت تک حاجی عابد حسین صاحب میں یہ رنگ اس زمانہ کے لحاظ سے اگر منتقل ہو سکتا تھا تو مسجد چھتہ کی قاسمی محفل ہی سے منتقل ہو سکتا تھا۔ شاید اسی کی طرف مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے اشارہ فرمایا ہے۔ جو ان کے ایک قصیدہ کے شعر میں پایا جاتا ہے۔

لیک این طائر ہمایوں[1] فال　　　شد ز قاسم عطا پر و بالش

بہر حال صاحب دل، صاحب دماغ ہونے کے ساتھ علماء اور علماء کے علم کی عزت و احترام اور اسی قاسمی تصرفات سے پیدا شدہ غیر معمولی جذبہ جو حاجی صاحب میں پیدا ہو گیا تھا۔ یہ سارے اسباب و وجوہ تھے ہی ایسے کہ مدرسہ کے افتتاح کی تجویز کو عملی شکل میں لانے کے لئے نظر انتخاب دیوبند میں حاجی صاحب کے سوا آپ خود سوچئے، اور کس پر پڑتی؟ سارے

---

[1] سنہ ۱۲۸۲ھ میں معلوم ہوا ہے حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے ان کو خلافت حاصل ہوئی، یعنی قیام مدرسہ کے چند سال بعد ۱۲۔ [2] یعنی حاجی محمد عابد صاحب ۱۲

سازوسامان جن کی اس مہم کی سرانجامی میں ضرورت تھی یا ہو سکتی تھی ' ان سے وہ لیس تھے ۔
بہرحال حاجی عابد صاحب جب کام ہاتھ میں لینے کے لئے آمادہ ہو گئے ' تو جیسا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف کا بیان ہے ' اور ان کا یہ بیان کافی اہمیت رکھتا ہے ' لکھا ہے کہ

"ایک دن بوقت اشراق سفید رومال کی جھولی بنا ' اور اس میں تین روپیہ اپنے پاس سے ڈال ' چھتہ کی مسجد سے تن تنہا مولوی مہتاب علی صاحب مرحوم کے پاس تشریف لائے ۔ مولوی صاحب نے کمال کشادہ پیشانی سے چھ روپے عنایت کئے ' اور دعا کی ' اور بارہ روپیہ مولوی فضل الرحمٰن صاحب نے اور چھ روپے اس مسکین (یعنی سوانح مخطوطہ کے مصنف منشی فضل حق صاحب دیوبندی) نے دیئے ۔ وہاں سے اٹھ کر مولوی ذوالفقار علی صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کے پاس آئے ۔ مولوی صاحب ماشاء اللہ علم دوست ہیں ' فوراً بارہ روپے دیئے ' اور حسن اتفاق سے اس وقت سید ذوالفقار علی[1] ثانی دیوبندی وہاں موجود تھے ' ان کی طرف سے بھی بارہ روپے عنایت کئے ' "

---

[1] مدرسہ کی تاریخ میں مالی امداد کے ساتھ پہلی دفعہ پیش قدمی کرنے والوں کی اس تاریخی فہرست میں جن جن بزرگوں کے گرامی اسماء درج ہیں ' ہماری کتاب کے پڑھنے والے عموماً ان سے روشناس ہو چکے ہیں ۔ مولانا مہتاب علی صاحب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے تایا تو وہی بزرگ ہیں ' جن کے مہتابی مکتب دیوبند میں سیدنا الامام الکبیر نے عربی شروع کی تھی ۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب اور مولانا ذوالفقار علی صاحب کے علاوہ مصنف سوانح مخطوطہ کے حال سے بھی آپ آگاہ ہو چکے ہیں ۔ البتہ ڈپٹی ذوالفقار علی صاحب دیوبندی سو مولانا محمد طیب صاحب کی یہ اطلاع ہے ' کہ دیوبند کے مشاہیر میں ان کا شمار تھا ۔ قلعہ پراں کی شاندار حویلی اب تک موجود ہے ' جس میں اب اسلامیہ ہائی اسکول کھول دیا گیا ہے ۔ لاہور کا سب سے پہلا نسوانی مجلہ "تہذیب النسوان" ڈپٹی ذوالفقار علی صاحب کو بڑے صاحبزادے مولوی ممتاز علی کی نگرانی میں شائع ہوتا تھا مولوی ممتاز علی صاحب نے قرآنی مضامین کی ترتیب کر کے چار جلدوں میں " البیان فی مقاصد القرآن " کے نام سے شائع کی تھی ۔ عہد جدید کے ممتاز انشاء پردازوں میں مولوی ممتاز علی کے صاحبزادے منشی امتیاز علی تاج ہیں ۔ ۱۲

وہاں سے اٹھ کر یہ درویش بادشاہ صفت (یعنی حاجی محمد عابد صاحب) محلہ ابوالبرکات میں پہنچے۔"

آگے کے الفاظ مخطوطہ مسودہ میں کچھ کٹ گئے ہیں، جو صاف طور پر پڑھے نہیں گئے، بظاہر کچھ ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ محلہ کی اس مسجد میں بیٹھ کر حاجی عابد صاحب مرحوم نے چندے کی اپیل شروع کی، الفاظ اس کے بعد جو پڑھے جاتے ہیں وہ یہ ہیں،

"دو سو روپے جمع ہو گئے، اور شام تک تین سو روپے۔ پھر تو رفتہ رفتہ خوب چرچا ہوا، اور جو پھل پھول اس کو لگے وہ ظاہر ہیں۔"

ابتدائی چندے کی اس لطیف سرگذشت کو درج کرنے کے بعد مصنف نے لکھا ہے کہ

"یہ قصہ بروز جمعہ دوئم ماہ ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ میں ہوا۔"

ذی قعدہ کے بعد ۱۲۸۲ھ ہجری کا ایک ہی مہینہ ذی الحجہ کا باقی تھا، ان ہی دو مہینوں میں کوشش کی گئی اور اتنا سرمایہ فراہم ہو گیا کہ مدرسہ کھول دیا جائے، اور اسی مبارک تاریخی فیصلہ کے مطابق ان ہی کا بیان ہے کہ

"اور مدرسہ ۱۵ محرم سنہ ۱۲۸۳ھ میں جاری ہوا۔"

سن عیسوی کے حساب سے ۱۸۶۶ء ماہ اپریل کی غالباً ۳۰ تاریخ ہوگی، گویا بہار کا موسم ختم ہو رہا تھا لیکن ختم ہوا نہیں تھا، اور دیوبند کے علاقہ میں آموں کا موسم شاید شروع ہو چکا تھا، یا شروع ہونے والا ہی تھا۔

غرض سیدنا الامام الکبیر کی "تاذین عام" اور آخر میں میرٹھ والی "تاذین خاص" کے مقابلہ میں لبیک کا پہلا جواب سرزمین دیوبند سے جو بلند ہوا، اور ان ہی کے منشا کے مطابق مجوزین کرام نے "نئے محاذ" کی اس تعلیمی قالب کو دیوبند ہی میں قائم کرنے کی صورت پیدا کر کے جو مدرسہ کو کھول دیا تو واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ کے لحاظ سے ان بزرگوں نے بڑا بھاری کام انجام دیا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب کے قلم سے نکلے ہوئے عربی الفاظ میں دیوبند کے مدرسہ کے

کے افتتاح اور اس وقت کے ماحول کا ذکر ان الفاظ میں پایا جاتا ہے۔

| | |
|---|---|
| وان لم یساعدہ الزمان والمکان ولم یوافقه الحین والاوان | اگرچہ اس مدرسہ کے قیام کے لئے نہ زمانہ کے حالات ہی سازگار تھے، اور نہ وہ جگہ جہاں مدرسہ قائم ہوا اس کا ماحول ہی مناسب تھا۔ |

الغرض وقت بالکل ناموافق تھا۔

ایسی صورت میں اس کام کو اٹھانے والے، اس کی تحریک کو قبول کر کے اسے عملی شکل میں لانے والے، مالی امداد میں پیش قدمی کرنے والے، الغرض اس راہ میں دامے، درمے، قدمے، سخنے جس منزل میں بھی جن سے کچھ بن پڑا، حد سے زیادہ ناموافق حالات میں گزرنے والے سچ تو یہ ہے کہ اس سنت حسنہ کی راہ کھولتے ہیں جو بھی جس منزل میں بھی شریک ہوئے وہ صرف اپنے ہی عمل کی حد تک نہیں، بلکہ "دارالعلوم دیوبند" کے وجود کے سارے ثمرات ونتائج جو اس وقت تک سامنے آ چکے ہیں، اور آئندہ جب تک خدا کی مرضی ہو، سامنے آتے رہیں گے ہر ایک میں ان کے اجر وصلہ کا حق نبوی وثیقہ کی بنا پر وہاں محفوظ ہو چکا ہے، جہاں وہ پہنچ چکے ہیں، اور میں تو دیکھ رہا ہوں کہ اس دنیا میں بھی دارالعلوم ان "آباء صالحین" کے "ابناء صالحین" کی فلاح میں کافی معاون ثابت ہوا ہے آج[1] ان اسلاف کا وجود ان کے اخلاف کے لئے سرمایۂ نازو افتخار ہے۔

[1] چھتہ کی مسجد کے مجلس انس کے یہی تین اساطین جنہوں نے حضرت نانوتوی رح کے "ذہن" کو سب سے پہلے عملی صورت دی اور جن کا ذکر حضرت مصنف امام نے بجوزین کے نام سے کیا ہے، یعنی حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب اور حضرت حاجی محمد عابد صاحب نور اللہ مرقدہم ان ہی کود یکھئے مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی براہ راست اولاد میں حضرت اقدس مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب حضرت مولانا شبیر احمد صاحب رحمہم اللہ اپنے اپنے وقت میں علم و دین کے افق پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اسی زمانہ میں مولانا مطلوب الرحمٰن صاحب مدفیوضہم جو ان ہی مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ کے صاحبزادے ہیں مسلمانوں کی دینی اور روحانی تربیت جس وسیع پیمانہ پر کر رہے ہیں یقیناً اس کو بھی دارالعلوم ہی کے فیوض وبرکات میں شمار کرنا چاہئے۔ اسی طرح حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب کے صاحبزادے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ تو ہند کے شیخ الکل ہی بن کر رہے، اور سچ ہی کیا، کون گن سکتا ہے کہ آپ کے تلامذہ اور شاگرد (باقی اگلے صفحہ پر)

چھتہ کی مسجد دیوبند میں حضرت نانوتوی قدس سرہ کا حجرۂ مبارک جس میں اب طلبائے دارالعلوم رہتے ہیں

باقی دارالعلوم کی تاسیس و آغاز کے سلسلہ کی "حکایت لذیذ" یعنی قصہ "اثار محمود" یہ عجیب بتاتا ہے کہ سوانح مخطوطہ نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے مگران الفاظ کے ساتھ

(گزشتہ صفحہ سے) ایشیا و افریقہ کے کن کن علاقوں میں پھیلے ہوئے علم و دین کی خدمت میں مصروف ہیں اور ہیں، علمی و دینی پہلوؤں کے سوا ملک کے سیاسی انقلاب میں آپ کا جو حصہ ہے کیا اس کا کوئی انکار کرسکتا ہے؟ یقیناً آج جن قربانیوں' جاں فروشیوں' کی قیمت ملک کی آزادی کی شکل میں ہمارے سامنے آئی ہے کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اس قیمت میں کافی اور معقول سرمایہ شیخ الہند کی غیر معمولی اور اولوالعزمانہ قربانیوں کا بھی شریک ہے۔ حضرت شیخ الہند کے حقیقی بھائی مولانا حکیم محمد حسن رحمہ اللہ کی پوری زندگی دارالعلوم کی علمی خدمات کے ساتھ اس ... کے شعبۂ طب کی بہ وقت خدمت میں صرف ہوئی اور اساتذۂ دارالعلوم میں اپنی خصوصیات کے ساتھ علمی میدان میں ان کی شخصیت نمایاں رہی۔ شیخ الہند کے داماد مولانا قاضی مسعود احمد صاحب کو آج دارالعلوم کے شعبۂ افتاء کی خدمات میں زندگی کھپادینے کی توفیق ملی ہوئی ہے۔ مجلس انس کے تیسرے اور نمایاں رکن جن کی عقیدت و عظمت کے سامنے سابقہ ہر دو رکن بھی جھکے ہوئے تھے، یعنی حضرت اقدس حاجی سید محمد عابد صاحب قدس سرہ کے متعلق یہی کیا کم ہے کہ مرکزی جمعیۃ العلماء ہند کے ناظم مولانا سید محمد میاں صاحب سلمہ دیوبند کے اسی خانوادۂ سادات کے چشم و چراغ ہیں جس کے ایک رکن حضرت حاجی صاحبؒ بھی تھے۔ اپنے اس تعلق کا اظہار مولانا موصوف نے اپنی مشہور کتاب "علماء ہند کا شاندار ماضی" میں فرمایا ہے۔

علاوہ براہ راست اولاد کے ان حضرات کے احفاد و اسباط کو دارالعلوم کی برکات ظاہری و باطنی سے مستفید ہونے کے جو مواقع میسر آئے' ان کی فہرست بھی کافی طویل ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے پوتے یعنی حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کے صاحبزادے مولانا عتیق الرحمٰن صاحب ادارہ "ندوۃ المصنفین" اور مجلّہ "برہان" کے ذریعہ جن علمی مہمات کو انجام دے رہے ہیں' وہ ہم سب کے سامنے ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی قاری حافظ جلیل الرحمٰن صاحب دارالعلوم کے شعبۂ تجوید کی قابل قدر خدمات انجام دینے میں مصروف ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ کے نواسے مولانا محمد عثمان صاحب دارالعلوم کی تدریس کے ساتھ ملک کی سیاسی خدمات اور شہری معاملات کی تنظیم کے سلسلہ میں کافی متعارف ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ کے دوسرے نواسے یعنی مولانا قاضی مسعود احمد صاحب کے صاحبزادے مولوی محمد ہارون صاحب بھی دارالعلوم دیوبند کے دائرۂ تدریس میں کام کررہے ہیں' اور انہیں علمی اور دینی خدمات کی اہلیت نصیب ہوئی ہے' اور پھر ان تمام علمی قالبوں کی روح رواں یعنی حضرت اقدس مولانا نانوتوی قدس اللہ سرہ جن کے فلک رس جذبات آتش داں سے شکل بشکل گرمی اس سارے ماحول کو بنائے ہوئے تھی' اور آج تک یہ تپش اپنے کام میں مصروف ہے' ان کی روحانی اور معنوی ذریت کے ساتھ جو پورے عالم اسلام میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان کے نسبی سبط کو دیکھا جائے تو براہ راست ان کے خلف اکبر حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمہ اللہ مہتمم دارالعلوم دیوبند سے جو پھل پھول اس جمنستان قاسمی کو لگے آج ان کا کون انکار کرسکتا ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

"سب سے پہلے اس مدرسہ کے مدرس ملا محمود صاحب ہیں اور جائے مدرسہ فرش مسجد چھتہ طالب علم مولوی عبدالعزیز صاحب ہیں۔

حکایت کی اس تعبیر کو عجیب اسلئے قرار دے رہا ہوں، جیسا کہ آپ بھی دیکھ رہے ہیں کہ اس میں متعلم کا تو نہیں مگر معلم کا نام "محمود" ہی بتایا گیا ہے اور جگہ کے سلسلے میں بھی خبر دی گئی ہے کہ چھتہ ہی کی مسجد کے فرش پر پہلی دفعہ اس مدرسہ کا افتتاح ہوا لیکن انار کے مشہور زبان زد عام درخت کے ذکر کو ہم اس کتاب میں نہیں پاتے۔ اور اس سے بھی حیرت افزا چیز ان کی اس اطلاع کا یہ ہے کہ مدرسہ کے پہلے متعلم کا نام بجائے "محمود" کے وہ مولوی عبدالعزیز بتاتے ہیں، درخت انار کے عدم ذکر کے متعلق اگرچہ یہ مولویانہ توجیہ ہو بھی سکتی ہے کہ عدم الذکر عدم الوجود کو مستلزم نہیں، تاہم اس کا

(گذشتہ صفحہ سے) اُن کا چالیس سالہ دورِ اہتمام دارالعلوم کا تابناک دور اور یادگار زمانہ عہد کہا جاتا ہے جس میں دارالعلوم نے بہت سی ترقیات کے مدارج طے کئے اور وہ مدرسہ سے ایک بڑے دارالعلوم کے قالب میں ڈھلا تعمیری ترقیات ہوئیں، علمی حیثیت اونچی ہوتی گئی، حلقۂ اثر وسیع سے وسیع تر ہوا، اور بالآخر وہ مرکزیت جو اس ادارہ کی بنیاد میں چھپی ہوئی تھی۔ اسی دور میں شاخ در شاخ ہو کر نمایاں ہوئی۔ پھر ان کی دینی خدمات ان ہمہ گیر خدمات کے علاوہ ہیں۔ آگے کی اولاد میں حضرت والا کے نواسے ابو حامد مولانا محمد میاں رحمہ اللہ مہاجر کابل رفیق خاص سیاسی حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ احاطۂ دارالعلوم سے علم و سیاست کے میدان میں کام کرتے ہوئے کابل پہنچے تو انہوں نے دارالعلوم کے بنیادی مقاصد کو وہاں کی حکومت اور پبلک میں روشناس کرانے اور وہاں کے لوگوں کو تقریر و تصنیف کے ذریعہ ان مقاصد سے ہم آہنگ بنانے میں ۳۰ برس تک جو کردار ادا کیا، اُس سے عوام اگر زیادہ واقف نہ ہوں، تو خواص سے ان کی جانبازانہ مساعی مخفی نہیں ہیں، جو اسی دارالعلوم کے فیوض و برکات کا ثمرہ تھیں۔ حضرت نانوتوی کے پڑپوتے اور مولانا حافظ محمد احمد صاحب کے پوتے مولوی حافظ قاری محمد سالم سلمہٗ بھی بحمد اللہ دارالعلوم دیوبند میں فرائض درس و تدریس انجام دے رہے ہیں تصنیف میں بھی ان کا قلم تیز گام ہے۔ تبلیغ کے سلسلہ میں تقریر و خطابت بھی امید افزا انداز سے سامنے آرہی ہے۔ پھر عام افادیت کی لائن پر "ادارۂ تاج المعارف" قائم کر کے اشاعت دین کی جو قابل قدر خدمت وہ انجام دے رہے ہیں، وہ بلاشبہ اسی احاطۂ قاسمی کا فیض اور ان کی جدی نسبت کا مظاہرہ ہے۔ بہرحال مدرسہ کی تاسیس و افتتاح کے سلسلے میں اسلاف اور ان کی مساعی جس حد تک مقبول ہوئیں۔ اسی حد تک ان کے اخلاف رشیدہ بھی اس سلسلہ میں ان کے ساتھ شرف الحاق سے محروم نہیں رکھے گئے اور "اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ" کے خدائی قانون نے ان کی نسبتوں کے راستہ سے انہیں بہت کچھ اونچا کر کے دکھایا ہے فمتعنا اللہ بآثارھم ونفعنا بانفاسھم۔

محمد طیب غفرلہٗ

پتہ ضرور چلتا ہے کہ "شعورِ عام" میں انار کے اس درخت کا مقام وہ نہ تھا، جہاں پچھلے دنوں سے ہم اس کو پانے لگے ہیں، اور انار کے اس درخت کو تو چھوڑیے، ایک اتفاقی واقعہ تھا جس پر کچھ دنوں سے بیان کرنے کا اتفاق ہو گیا ہے، لیکن مدرسہ کے "پہلے متعلم" کے متعلق ان کی روایت میں ہم جو کچھ پا رہے ہیں، اس میں تو مذکورہ بالا اسلوبیاتی توجیہ کی بھی گنجائش نہیں، کیونکہ ذکر مدرسہ کے اولیات کا وہ کر رہے ہیں، روایت میں آئندہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے، وہ "سب سے پہلے" کے تمہیدی الفاظ کے نیچے درج ہے، یہ کہنا کہ "سب سے پہلے" کا تعلق صرف مدرسہ کے مدرس سے ہے، اس توجیہ کو تو ہمارا مولویانہ ذہن بھی شاید برداشت نہیں کر سکتا، پھر قصہ کیا ہے؟ اگر "انار محمود" والی حکایت صرف افواہاً منتقل ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی، تو "افواہ" کے مقابلہ میں سوانح مخطوطہ کے مصنف جیسے گواہ کی تحریری گواہی کی ترجیح پر شاید ہم مجبور ہو جاتے، لیکن کیا کیجیے کہ "انار محمود" والی حکایت کا اعادہ دارالعلوم دیوبند کی سب سے بڑی تاریخی "محفل" میں لکھ کر کیا گیا ہے، میں نے خود تو نہیں دیکھا ہے، لیکن مولانا طیب الحفید صاحب حال صدر مہتمم دارالعلوم سے معلوم ہوا کہ "دارالعلوم" کے عظیم الشان جلسۂ دستار بندی منعقدہ ۱۳۲۸ھ میں "زرین ماضی و مستقبل" کے نام سے ان کے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو تحریری بیان دارالعلوم کے ہزارہا ہزار فارغ شدہ علماء و اراکین کے آگے پیش کیا تھا، جن میں خود وقت کے صدر دارالعلوم حضرت مولانا محمود حسن شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بھی شریک اور موجود تھے، اسی تحریری بیان میں منجملہ دوسری باتوں کے علی رؤس الاشہاد "انار محمود" والی حکایت بھی بایں الفاظ دہرائی گئی تھی کہ

> "مدرسہ دیوبند کا افتتاح دیوبند جیسی گمنام بستی میں چھتہ کی مسجد کے اندر انار کے درخت کے نیچے ہوا، جناب مولانا ملا محمود صاحب دیوبندی مدرس تھے، اور مولانا محمود حسن صاحب پہلے طالب علم تھے، جنھوں نے کتاب کھولی، مدرسہ دیوبند نے اس سادگی کے ساتھ وجود میں قدم رکھا۔"

مولانا طیب صاحب کا بیان ہے کہ مطبوعہ شکل میں یہ تحریری مقالہ اس وقت دارالعلوم کے دفتر میں محفوظ ہے اور اس کے صفحہ ۲۲ پر مذکورہ بالا فقرات کو آج بھی پڑھنے والے پڑھ سکتے ہیں، حضرت مولانا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ جن کی حیثیت دارالعلوم کے لحاظ سے "صاحب البیت" کی تھی،

علماء کرام کی بھری مجلس میں ان کے اس تحریری بیان کے متعلق یہ خیال تو یقیناً بیہودہ خیال ہوگا کہ ایک زبان زد عام "سنی سنائی افواہی روایت جو لوگوں میں منتقل ہوتی چلی آرہی تھی" اسی کا ذکر بطور "حکایت لذیذ" کے آپ نے بھی فرمادیا۔ چونکہ دارالعلوم سے تعلق رکھنے والے سب اعلیٰ و ادنیٰ کے کان اس حکایت سے مانوس تھے، اور سوانح مخطوطہ کے مصنف کی نوشتہ شہادت سے لوگ واقف نہ تھے، اسی لئے خاموشی کے ساتھ سننے والوں نے اس کو سن لیا۔ کسی طرف سے کسی قسم کی تنقید اس پر نہیں کی گئی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اس قسم کا وسوسہ وہی پکا سکتا ہے، جو حضرت مولانا حافظ محمد احمد علیہ الرحمۃ و الغفران کی ذمہ دارانہ ہستی اور ان کے صحیح منزل و مقام سے ناواقف ہے، یہ صحیح ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کی اس ابتدائی تقریب میں حضرت حافظ صاحب خود موجود نہ تھے، اور سوانح مخطوطہ کی عصری شہادت کے مقابلہ میں ان کی روایت کی حیثیت یقیناً سماعی روایت کی ہے۔ لیکن سماعی روایت ہی، یہ دارالعلوم کے رکن رکین، اور جیسا کہ میں نے عرض کیا "صاحب البیت" کی روایت ہے۔ ماسوا اس کے یہ بھی تو سوچنے کی بات ہے کہ اس تاریخی "مجلس کبیر" میں جس وقت دارالعلوم کے صدر مہتمم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی یہ نوشتہ تحریر پڑھ رہے تھے کوئی وجہ نہیں ہوسکتی کہ اس وقت مجلس میں دارالعلوم کے صدر تدریس یعنی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ موجود نہ ہوں، یہ دعویٰ کہ "سب سے پہلے جنہوں نے کتاب کھولی" خود ان ہی کی ذات اقدس سے براہ راست تعلق رکھتا تھا، اگر یہ واقعہ نہ ہوتا، تو کیا سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ بجائے تصحیح کے آپ اس غیر واقعی امر کے متعلق خاموشی سے کام لے سکتے تھے۔ دونوں روایتوں میں تطبیق کا امکان جب باقی نہیں ہے، تو یقیناً حضرت حافظ صاحب کا بیان ہی ہر لحاظ سے ترجیح کا مستحق ہے۔[1]

---

[1] یہ حد سے زیادہ بیدردی اور عدم دادکا رنکتہ نوازی ہوگی کہ طالب علم ہونے کی حیثیت سے اول طالب علم مولوی عبدالعزیز کو قرار دیا جائے جیسا کہ سوانح مخطوطہ کی روایت کا اقتضاء ہے، لیکن اس زمانہ میں معلوم ہوتا ہے کہ کسی وجہ سے کتاب مولوی عبدالعزیز کے پاس نہ ہوگی۔ کتاب لانے والوں اور استاد کے آگے اس کو کھول کر پڑھنے والوں میں حضرت مولانا محمود حسن صاحب سب سے پہلے طالب علم تھے۔ اور یوں دونوں روایتوں میں تطبیق کی صورت پیدا کردی جائے (باقی اگلے صفحہ پر)

خیر واقعہ کچھ بھی ہو' پہلے متعلم مدرسہ کے حضرت شیخ الہند مولنا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ تھے' یا مولوی عبدالعزیز' جس زمانہ کی یہ بات ہے' اس وقت کے اعتبار سے یہ دونوں باتیں مساوی ہیں۔ ہاں حضرت مولنا بعد کو جو کچھ ہوئے' اس کے لحاظ سے دل تو یہی چاہتا ہے کہ اس بڑے مدرسہ کا آغاز بھی مولنا جیسے بڑے آدمی سے ہو' کیونکہ باوجود تلاش کے سوانح مخطوطہ والے مولوی عبدالعزیز کی شخصیت میرے لئے اس وقت تک مجہول ہے' مگر کیا کیجیے کہ متعلم محمود تو نہیں مگر "معلم محمود" کی بڑائیوں کے متعلق بھی ہمارے معلومات حد سے زیادہ محدود ہیں۔ کم از کم "متعلم محمود" اور دارالعلوم کی بڑائیوں میں جو مناسبت ہے' اس مناسبت کا دعوے معلم محمود کے متعلق مشکل ہی سے کیا جاسکتا ہے۔[1]

غالباً میری دل چسپیاں اس ذیلی مسئلہ کے متعلق کچھ حد سے زیادہ بڑھ گئیں' لیکن ایک عام اور مشہور روایت کے ساتھ ساتھ سوانح مخطوطہ میں بعض ایسی چیزیں مل گئیں' کہ دل ان کے قلم انداز کرنے پر راضی نہ ہوا' آئندہ دارالعلوم کی تاریخ پر قلم اٹھانے والوں کے لئے بحث کا یہ "جدید پہلو" بھی پیش نظر رہے گا' اور "آثار محمود" والی حکایت کی تحقیق میں امید تو یہی ہے کہ آئندہ لوگ کافی غور و خوض سے کام لیں گے۔ خیر اب اس قصہ کو ختم کیجئے' اپنے "موضوع بحث" کے لحاظ سے میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ دیوبند میں مدرسہ جس وقت ابتداء میں قائم ہوا' حسب تحریر مصنف امام وہ خود اور ہمارے سیدنا الامام الکبیر اس زمانہ میں بسلسلہ ملازمت مطبع مجتبائی (میرٹھ) میرٹھ ہی میں مقیم تھے۔ دیوبند میں خواہ جس پیمانہ پر بھی ہو' مدرسہ قائم ہوگیا' مدرس اور طلبہ بھی آگئے۔ چندہ بھی فراہم ہوا۔ اس کے بعد سیدنا الامام الکبیر تک

---

(گذشتہ صفحہ سے) میرے خیال میں تو "کتاب کھولی" کے الفاظ طالب علم ہونے کی یہ عام تعبیر ہے۔ اس عام اور اتفاقی تعبیر سے خواہ مخواہ ناجائز نفع اٹھانے کے مولویانہ کرتب کے سوا اور کچھ نہیں ہے ۱۲

[1] "نزہت ماضی و مستقبل" کے حوالہ سے جو عبارت نقل کی گئی ہے' اس میں ان کے نام کے ساتھ مولنا ہی نہیں بلکہ علامہ کے لفظ کو ہم پاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علم و تبحر کا اچھا خاصہ وزن اسا لین دارالعلوم کے قلوب میں تھا' لیکن اسی کے مقابلہ میں سوانح مخطوطہ کے مصنف نے ملا ہی نہیں بلکہ باضافہ نون "ملاں" ہی کے لفظ کو ان کے لئے کافی قرار دیا ہے' دارالعلوم کی تاریخ مدون کرنے والوں کے فرائض میں ہے کہ دارالعلوم کے ان پہلے مدرس و معلم کے صحیح حالات کا پتہ چلائیں ۱۲

یہ بشارت بھی پہنچائی گئی، کہ ان کے حسب منشا دیوبند والوں نے دینی تعلیم کے اجتماعی نظام کی افتتاح میں سبقت کی مدرسہ کی مجلس شوریٰ کے ایک رکن وہ بھی قرار دیئے گئے۔ ۱۲۸۳ھ جس میں مدرسہ قائم ہوا۔ اس کی روداد سے نقل کر چکا ہوں کہ طلبہ کے امتحان لینے والوں میں بھی دوسروں کے ساتھ آپ کا ذکر بھی خاص طور پر کیا گیا ہے، چندہ دہندوں کی فہرست میں آپ کے اسم گرامی کے آگے (رقم درج ہے، جو آخر وقت تک جاری رہی۔ اتنی بات تو یقینی ہے، کہ حاجی سید محمد عابد صاحب مرحوم کے بشارت نامہ میں دیوبند تشریف آوری کی دعوت آپ کو جو دی گئی تھی، اس وقت یہ دعوت دعوت ہی بن کر رہ گئی۔ صحیح طور پر یہ بتانا دشوار ہے کہ یہ صورت حال کب تک قائم رہی، بس مصنف امام ہی یکایک یہ اطلاع دیتے ہیں کہ

"مولوی محمد قاسم صاحب شروع مدرسہ میں دیوبند آئے، اور پھر ہر طرح اس مدرسہ کے سرپرست ہو گئے" ص۱۱

میرٹھ سے دیوبند حضرت والا کی یہ تاریخی تشریف آوری جس کے بعد بقول مصنف امام "ہر طرح" اور "ہر پہلو" کے لحاظ سے آپ مدرسہ کے سرپرست ہو گئے۔ کچھ اتنے دبے پاؤں، خاموشی کے ساتھ ہوئی، کہ تلاش کے باوجود اس کی چونکہ صحیح تاریخ معین نہ ہو سکی، اس لئے یہ بتانا بھی سخت دشوار ہے کہ قیام مدرسہ اور "ہر طرح سرپرست" بن جانے والی اس تشریف آوری کی درمیانی مدت کا وقفہ کتنے دنوں پر مشتمل ہے، ایک مطبوعہ حمائل شریف جو حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس ترجمہ کے ساتھ مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوا ہے۔ شاید کہیں پہلے بھی اس کا ذکر گذرا ہو اس حمائل میں بجائے عام دستور کے ترجمہ زیر سطور نہیں بلکہ ہر صفحہ کی آیتوں کا ترجمہ نمبر لگا کر حاشیہ پر چھاپا گیا ہے، شاید اب بھی ملتا ہو، اس حمائل کے آخر میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ ابتداً یہ نسخہ خاص طریقے سے میرٹھ کے مطبع مجتبائی سے ۱۲۸۶ھ میں شائع ہوا تھا[1]۔ اسی سلسلہ میں

---

[1] اسی حمائل کے طبع کی تاریخ بھی سید نا الامام الکبیر کی نکالی ہوئی "امالا مثل له ولا مثال" کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس سے بھی ۱۲۸۶ھ کے اعداد نکلتے ہیں، اگرچہ ہے تو ایک تاریخی مادہ اور "لیس کمثلہ شئ" (باقی اگلے صفحہ پر)

یہ اطلاع بھی درج کی گئی ہے کہ میرٹھ کے مطبع مجتبائی میں شائع ہونے والی اس حائل کی

"قاسم الخیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانی مدرسہ دیوبند نے اس کی تصحیح فرمائی"

اس کا اقتضاء بہر حال اتنا ضرور ہے کہ ۱۲۸۳ھ جس میں دیوبند کا مدرسہ قائم ہوا، اس کے تین سال بعد یعنی ۱۲۸۶ھ تک میرٹھ کے مطبع مجتبائی میں چھپنے والی کتابوں کی تصحیح کا کام سیدنا الامام الکبیر انجام دیتے رہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس کے لئے براہ راست میرٹھ میں قیام ضروری نہیں۔ اور تین سال تک اگر اسی بناء پر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ میرٹھ ہی میں آپ کا قیام رہا، تو مصنف امام کی اطلاع ہیں

"شروع مدرسہ میں دیوبند آئے"

اس میں "شروع" کے لفظ کی پھر کیا توجیہ کی جائے گی؟ کیا تین سال کے بعد تشریف آوری کے واقعہ کی تعبیر "شروع مدرسہ" کے لفظ سے کسی حیثیت سے صحیح ہو سکتی ہے؟

بمشکل ہم اگر کچھ کہہ سکتے ہیں تو وہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا کہ "لفظ شروع" سے حقیقی آغاز و ابتداء مدرسہ تو ہم مراد ہی نہیں لے سکتے کہ یہ واقعہ کے خلاف ہے، اور تین سال کے وقفہ کی بھی گنجائش "شروع" کے لفظ میں نہیں، کچھ اوسط ہی نکالنا پڑے، لیکن وہ اوسط بھی کیا ہو؟ اور تو کوئی بات ملی نہیں، البتہ ۱۲۸۵ھ جو قیام مدرسہ کا دوسرا سال ہے، اس کی جو روداد شائع ہوئی ہے، اس میں یہ خبر دیتے ہوئے کہ مدرسہ کی

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) کے کلام کی تاریخ کے لئے موزوں ترین مادۂ تاریخ یہ ہو سکتا ہے۔ لیکن یوں بھی جب ہم غور کرتے ہیں، کہ قرآن چودہ سورتوں اور پاروں کے ساتھ ساتھ رکوعوں میں تقسیم شدہ ہے، لیکن ہندوستان کے شائع شدہ قرآنی نسخوں میں ہر رکوع کے آیات پر نمبر اندازی کا رواج نہیں تھا۔ غالباً سیدنا الامام الکبیر کی یہ جدت طرازی تھی کہ ہر صفحہ کی آیتوں پر آپ نے نمبر لگائے، اور ان ہی نمبروں کے حساب سے حاشیہ پر ہر آیت کا اردو ترجمہ اس طرح سے درج ہو گیا ہے کہ سابقہ واحقہ آیتوں کے ترجمہ سے کسی قسم کا اشتباہ ان لوگوں کے لئے بھی باقی نہیں رہتا، جو براہ راست قرآن کی عربی عبارت سمجھنے سے معذور ہیں۔ زیر سطری ترجموں میں اگلی اور پچھلی آیتوں کے ترجموں کے الفاظ میں ان غریبوں کو جو دشواری قدرتاً پیش آتی ہے۔ نمبر اندازی کی اس تدبیر سے یہ دقت رفع ہو جاتی ہے، سچ پوچھئے تو اس لحاظ سے یہ اچھوتا کام تھا، جس کی تقلید نہیں کی گئی ۱۲

عمر کے اسی دوسرے سال میں

"ایسا امرِ عظیم اور حادثہ فخیم پیش آیا، کہ جس سے تمام اہلِ دیوبند اور جملہ مدرسین و طلبہ کو گمان غالب تھا کہ اب قائم رہنا اس مدرسہ کا مشکل ہے۔"

آگے اسی "امرِ عظیم" اور "حادثہ فخیم" کی تفصیل یہ درج کی گئی ہے کہ

"حاجی عابد حسین صاحب جو مہتمم مدرسہ، بلکہ اصل اصول اس کام کے تھے، اور باشندگان دیوبند و اطراف و جوانب کے دلوں میں ان کی عظمت و توقیر بدرجہ کمال تھی۔ ان کے لحاظ و پاس سے بہت سے طلبہ بیرونجات کے واسطے کھانا مقرر ہوا، اور چندہ بھی بہت آب و تاب سے تحصیل ہوا، یکایک عزم بیت اللہ کا کیا، اور قطع تعلق سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ پھر ہندوستان تشریف نہ لائیں گے۔"

ایک ایسے الہامی کام کو شروع کر کے اچانک حاجی صاحب قبلہ کا یہ تکوینی طرزِ عمل اور انقلابی اقدام اس کے ظاہری و معنوی اسباب کیا تھے؟ اس کا جواب کچھ نہیں دے سکتے، اب خواہ اسباب کچھ ہی ہوں، اسی روداد میں لکھا ہے کہ حاجی صاحب کے اس فیصلہ نے دلوں میں یہ اندیشہ پیدا کر دیا کہ

"بنیادِ مدرسہ از بیخ کندہ ہو جاتی تو عجیب نہ تھا۔"

با ایں ہمہ معلوم یہی ہوتا ہے کہ حاجی صاحب اپنے فیصلہ پر قائم رہے، اور جس مدرسہ کی باگ الہام کے زیرِ اثر جیسا کہ کہا جاتا ہے، انہوں نے اپنے ہاتھوں میں لیا، اس کے "از بیخ کندہ" ہو جانے کے نتیجہ سے بے پروا ہو کر وہی کر گذرے جس کا انہوں نے ارادہ کیا تھا، اور شاید یہی مطلب ہے ان لوگوں کا جو کہتے ہیں کہ دیوبند کا مدرسہ جس پیمانہ پر بھی شروع میں قائم ہوا تھا، حج کو چلے جانے کے اس ارادہ کے بعد ہی کم از کم اپنی ذات کی حد تک حاجی عابد حسین صاحب نے صرف یہی نہیں کہ اس مدرسہ کو ختم ہی کر دیا تھا بلکہ روداد ہی میں جو یہ لکھا ہے کہ

"قطع تعلق سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ پھر ہندوستان تشریف نہ لائینگے۔"

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اپنے طرزِ عمل سے مستقبل میں بھی لوگوں کو اس مدرسہ کی جانب سے مایوس

سنا چکے تھے، لیکن واقع میں یہ مدرسہ جس کا تھا، اور جو پیدا ہی کیا گیا تھا، اس مدرسہ کے لئے مدرسہ کے ختم ہونے کا یہی خطرہ یا حادثہ اسی حقیقت اور واقعہ کے ظہور کا ذریعہ بن گیا، اور اب اسی مسئلہ پر میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

## مدرسہ میں مستقل قیام

اب تک جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے، اس سے بہرحال اتنی بات عیاں ہو چکی کہ دیوبند میں مدرسہ عربی سیدنا الامام الکبیر کی چشم و ابرو کے اشاروں بلکہ صریح اذن اور عملی پیش قدمی کا رہین منت تھا۔ ۵۷ء کی ناکامی کے بعد اس "نئے محاذ" یا کمات کی "نئی کمین گاہ" کے کھولنے میں پیش قدمی بھی ان ہی کے کچھار کے پروردہ شیر بچوں کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی، اور فراہمی چندہ کے بشارت نامہ ہی میں آپ کو دعوت بھی دی گئی کہ براہ راست اپنے ہاتھ سے تعلیم کا افتتاح یا مدرسہ کا اجراء کریں۔ اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ قیام مدرسہ سے پہلے بھی، اور قیام مدرسہ کے بعد بھی روح اور قلب تو دیوبند ہی میں، لیکن جسم کہئے یا قالب جس پر دیکھنے والوں کی نظر پڑ سکتی تھی، کچھ خاص اسی موقعہ پر نہیں بلکہ اپنی فطری عادت اور دوامی وطیرے کے مطابق آج بھی نگاہوں سے وہ مخفی تھا۔ مگر عوام نہ سہی، خواص کی آنکھوں سے بھی دیوبند کے مدرسہ سے آپ کا واقعی تعلق کیا مخفی تھا، یا مخفی رہ سکتا تھا۔ مخفیانہ سہی، لیکن چھتہ کی مسجد کی "محفل" میں جو کچھ ہوتا تھا، وہ راز بن کر رہتا تھا، آخر میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں، دیوبند، جو عرض کر چکا ہوں، ضلع سہارنپور کے دوسرے مجہول الحال والاسم قصبات کے ساتھ ساتھ جس زمانہ میں دیوبند نہیں بلکہ عوام کا صرف دیبنڈ تھا۔ اسی دور افتادہ مقام میں مدرسہ قائم ہوتا ہے، مانا کہ حاجی عابد حسین رحمۃ اللہ علیہ کو قصبہ اور اس کے گردونواح میں غیر معمولی ہر دل عزیزی حاصل تھی، ان کا ان لوگوں پر کافی اثر و اقتدار بھی تھا، اسی لئے جیسا کہ روداد کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں، بیرونجات کے طلبہ کے قیام و طعام کے نظم میں سہولتیں بھی ہوئیں۔ یوں بھی "طلبہ نوازی" مسلمانوں کا موروثی ذوق تھا، اس زمانہ میں بھی اور اس سے پہلے بھی میں تو یہی جانتا ہوں کہ شہروں اور قصبوں ہی کی حد تک نہیں، بلکہ دیہاتوں تک میں بسنے والے

مسلمانوں کے یہاں "طالب علم کی جاگیر" ہندوستان کے ارباب ہمت و ثروت کے لوازم زندگی میں داخل تھی لیکن اسی کے ساتھ آپ آئندہ سالوں کی نہیں، بلکہ دیوبند کے اس "مدرسہ عربی" کے پہلے سال کی سطبوعہ روداد اٹھا لیجئے۔ اس کے ابتدائی اوراق میں آپ کو بیرونجات کے طلبہ کے متعلق یہ خبر بھی ملے گی:

"فقط قصبات ضلع سہارنپور و اضلاع ممالک مغربی کے طلبہ ہی نہیں بلکہ

**پنجاب و کابل و بنارس**

تک کے لوگ جمع ہو گئے تھے"

جس کا مطلب یہی تو ہوا کہ مغرب میں پنجاب سے گذر کر کابل تک طلبہ کو دیوبند کا یہ مدرسہ دامن کشاں اپنے احاطہ میں لئے چلا آ رہا تھا اور مشرق میں "بنارس" تک کے طلبہ پہلے ہی سال میں اس مدرسے کے طالب علم بن چکے تھے۔ بنارس کے نام کی تو روداد میں تصریح کی گئی ہے۔ طلبہ کے خانے پر میری نظر جب اسی روداد میں پڑی تو دوسرے ناموں کے ساتھ "مولوی بدرالدین عظیم آبادی" کا نام بھی دیکھا کہ پہلے سال کی اسی روداد میں شریک ہے، مولوی صاحب کی شخصیت سے تو واقف نہیں ہوں، لیکن "عظیم آبادی" کی نسبت بتا رہی ہے کہ بنارس سے آگے بڑھ کر عظیم آباد، پٹنہ (بہار) تک کے طلبہ اس مدرسہ کی آغوش تعلیم و تربیت میں اپنی جگہ بنا چکے تھے۔

اسی طرح مالی امداد کے سلسلہ میں ذرا ملاحظہ فرمائیے پہلے سال کی اسی روداد کا اور جائزہ لیجئے۔ ان ناموں اور مقاموں کا جن سے ضلع سہارنپور کی گمنام آبادی دیوبند میں چندے آنے لگے تھے میری آنکھیں تو پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب چندہ کے خانے میں ایک طرف راجپوتانہ کی پہاڑی ریاست ٹونک سے حکیم عبدالحمید نامی کے چندے کا اور دوسری طرف سینکڑوں میل دور دانا پور (بہار) کے باشندوں کے نام سے بھی پچاس روپے کی رقم کا ذکر کیا گیا ہے۔ سوچتا ہوں تاریکی، دہشت و خوف کے ان بھیانک دنوں کو سوچتا ہوں، چند ہی سال تو گذرے تھے کہ "شاملی" میں بزن و بکش، گیر و دار کے ہنگاموں سے ہندوستان کی زمین خصوصاً مسلمانوں کی آبادیاں کانپ رہی تھیں۔ اس خونی سمندر را دما آشین دوزخ

میں زیر و بالا ہونے کا تماشہ جنھوں نے کیا تھا' ان کی آنکھوں کے سامنے سے تو یہ تماشہ ضرور ہٹ چکا تھا
لیکن وہ مرے بھی تو نہ تھے۔ جو اپنے حافظے اور یادداشت کی قوتوں سے ان خونیں' جگر خراشش' روح گسل
ہیبت وہولناک' انسانیت سوز نظاروں کی یاد کو مٹانا بھی چاہتے تھے تو مٹا نہیں سکتے تھے۔ اپنے بزرگوں
عزیزوں' جگر پاروں' دوستوں' ہمسایوں کی پھانسیوں پر لٹکی ہوئی لاشوں' اور ان پا بزنجیر دست بطوق
سسکتے ہوئے جسموں کو بھولنا ہی چاہتے تھے جو ان ہی کے ساتھ جیل خانوں اور دریائے شور کے ویران
جزیروں کو بھرنے کے لئے گھسیٹے جا رہے تھے' لیکن بھول نہیں سکتے ظلم و ستم کے اس طوفانی تلاطم
میں گو نہ سکون کی کیفیت تو دس سال کے اس عرصہ میں یہ واقعہ ہے کہ پیدا ہو چکی تھی۔ لیکن یہ تو جو کچھ تھا'
باہر میں تھا' اندر میں تو اب بھی تہلکہ ہی برپا تھا' باطن تو اب بھی ان ستم دیدوں کا غیر مطمئن لرزاں و ترساں
ہی تھا' پھر مراسلات و مواصلات کے ذرائع بھی اس وقت تک حد سے زیادہ نامکمل تھے' غلغلہ انگیزیوں
اور مشاغبہ بازیوں کے عام ذرائع اخبار اور پریس کی قوت سے ملک اس وقت تک گویا کچھ ناآشنا ہی تھا
ٹوٹے پھوٹے شکستہ و بودہ حال میں کچھ ماہوار یا ہفتہ وار اخبار نکلے بھی تھے۔ یا گنتی کے چند مطابع
ملک کے مختلف گوشوں میں جاری بھی ہوئے تھے۔ سو ۵۷ء کی افراتفری میں ان کا نظام بھی درہم برہم
ہو چکا تھا۔ یہ اور اسی قسم کے وہ سارے اسباب و وسائل جن سے کسی چیز کے مشہور کرنے میں کام لیا جائے
یا اس وقت جن سے لوگ کام لے رہے ہیں' اس زمانہ میں ہم ان کا شاید تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن حیرت
ہوتی ہے کہ پنجاب و کابل' راجپوتانہ' بہار' جو اس زمانے کے لحاظ سے یقیناً دیوبند کے لئے دور دست
علاقے تھے۔ ان علاقوں سے طلبہ بھی' اور چندے بھی اس قصباتی مدرسہ میں قائم ہونے کے پہلے سال ہی
سے کیسے اور کیوں آنے لگے تھے۔ کیا دیوبند کے مقامی بزرگوں کے وجود اور ان کے وجود کے اثر و اقتدار
سے ہم اس کی من مانی نہیں' دل نشین اور واقعی صحیح منطقی توجیہ میں کامیاب ہو سکتے ہیں؟

وہی جس کا جسم دیوبند سے غائب تھا' لیکن روح اس کی ہمہ تن ابتدا ہی سے اس مدرسہ کی بنیاد
میں جذب تھی' اس کے تعلق کے سوا کوئی صحیح جواب اس سوال کا دل کو یا دماغ کو مل سکتا ہے؟ اور سچ تو یہ ہے
کہ مدرسہ کی پہلی مجلس شوریٰ کے ارکان اور مدرسہ کے پہلے امتحان تک کے کاموں میں روح کے ساتھ اسکے

جسم مبارک کو ہم جب حاضر ہی پاتے ہیں، تو قالب کی یہ مجازی غیر حاضری بھی مجازی ہونے کے سوا کچھ اور بھی ہوسکتی ہے؟ جن کی نظر مجاز پر تھی، وہ نہ سہی، لیکن ملک کے طول و عرض میں حقیقت شناسوں کا طبقہ بھی تو تھا، مسلمانوں کے دینی تعلیم کے اس سب سے پہلے اجتماعی نظام کے عملی قالب "مدرسہ عربی دیوبند" سے سیدنا الامام الکبیر کا جو تعلق تھا، ان کی نگاہوں سے بھی کیا یہ تعلق اوجھل رہ سکتا تھا؟ "غیب" کے "لا یحتسبی" قوانین کے نتائج و آثار کا جنھیں تجربہ نہیں ہے، وہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ ظاہری اسباب کی رو سے بھی ضلع سہارنپور کی اس قصباتی آبادی میں قائم ہونے والے مدرسے میں، پنجاب، کابل، بنارس، عظیم آباد، ٹونک (راجپوتانہ)، داناپور (بہار) سے طلبہ اور مالی امداد کے سلسلہ کا شروع ہو جانا محلِ حیرت و استعجاب نہیں ہوسکتا، واقعہ یہ ہے کہ دیوبند و اطراف دیوبند کی آبادیوں پر حاجی عابد حسین صاحب کا جو اثر و اقتدار تھا، سیدنا الامام الکبیر کی اس زمانہ تک تقریباً سارے ہندوستان کی اسلامی آبادیوں سے یہی نسبت قائم ہو چکی تھی، اور شاید یہی وجہ ہوئی کہ دیوبند کے جس مقامی مدرسہ کے لئے جہانگیر کیا سارے اسلامی ممالک کا "عالمگیر جامعہ" بن جانا مقدر ہو چکا تھا، اسی تقدیر کو تدبیر کے قالب میں لانے کیلئے کہ ایک طرف بظاہر بشر کی صورت میں یہ حادثہ پیش آیا کہ از بیخ کندہ ہو جانے کا خطرہ حاجی عابد حسین صاحب کے قطع تعلق کی وجہ سے مدرسہ کے لئے پیش آیا، اور دوسری طرف جیسا کہ اسی روداد میں لکھا ہے کہ

"باشندگان دیوبند میں بظاہر ایسا کوئی نظر نہ آتا تھا کہ اس کام کا متکفل ہوتا"

یہ صورت حال ہی ایسی تھی کہ مجاز کا جو پردہ حائل تھا، وہ بھی سامنے سے ہٹ جائے اور وہ ہٹ گیا، قلب کے ساتھ ساتھ قالب بھی اس کا دیوبند ہی پہنچ گیا، جسے ابتدا قیام مدرسہ کے وقت تاریخ کی آنکھیں ڈھونڈھ رہی ہیں۔ اور تھک تھک کر واپس ہوتی ہیں کہ آخر جس کا یہ مدرسہ تھا اور جو اس مدرسہ کے لئے تھا، وہی آج کیوں غائب ہے؟

صحیح تاریخ متعین ہوسکتی ہو، یا نہ ہوسکتی ہو، اور جس شخص کی ولادت کی تاریخ تو تاریخ مہینے تک کو اس کی طفولیت و شباب و کہولت کے رفیق ہمارے مصنف امام تک متعین کرنے سے اپنے آپ کو قاصر و معذور بتا رہے ہوں تو ایسی عجیب و غریب شخصیت کے متعلق دارالعلوم کی دوامی خدمت کیلئے

دیوبند میں مستقل قیام کی تاریخ ہم جیسے دور افتادوں کے لئے کچھ مبہم ہو کر اگر رہ جائے تو اس پر تعجب کیوں کیجئے۔ زیادہ سے زیادہ بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ مدرسہ کے کاروبار کا جو متکفل ہو' جب دیوبند میں کوئی ایسی ہستی بظاہر باقی نہ رہی' یا نظر نہ آئی' تب لانے پر دیوبند والے اور آنے پر سیدنا الامام الکبیر بھی مجبور ہو گئے۔ اسی کے بعد مدرسہ سے آپ کا وہ عجیب و غریب باہمہ و بے ہمہ رشتہ نفس واپسیں تک قائم رہا کہ ایک طرف مصنف امام تو سیدنا الامام الکبیر کے بارہ میں یہ فرماتے ہیں کہ

"ہر طرح اس مدرسہ کے سرپرست ہو گئے۔"

اور دوسری طرف سنانے والے مسلسل یہی سناتے چلے آ رہے ہیں کہ

"دارالعلوم دیوبند میں مولانا محمد قاسم نے نہ درس دیا' اور نہ اس کے اہتمامی و انتظامی شعبوں سے بظاہر بحیثیت عہدہ کے کسی قسم کا کوئی تعلق آپ کا کبھی قائم ہوا۔"

"باہمہ و بے ہمہ" کا یہ حیرت انگیز رشتہ اس لئے بھی عجیب تھا کہ "ہر طرح سرپرست" بن جانے کے بعد یہ واقعہ ہے کہ آپ دارالعلوم تھے اور دارالعلوم آپ ہی کا وجود یا جود تھا' لیکن مجھ ہی سے آپ سن چکے کہ مدرسہ کی دوات کی سیاہی کے ایک قطرہ کا بھی بلا معاوضہ صرف کرنا' فقط اسی کو اپنے لئے کبھی آپ نے جائز نہیں قرار دیا جس میں سیاہی کے چند قطرات ہی کچھ خرچ تو ہوتا تھا' بلکہ اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ "سرد خانہ" سے صفاتی استفادہ جس سے نہ سرد خانے کی ذات میں کوئی کمی پیدا ہوتی تھی' اور نہ صفات میں اس استفادہ کا بھی حقدار اپنے آپ کو نہیں خیال کیا' اور شدید طبعی حرارت مزاج کے باوجود موسم گرما کی تپش اور لو کی تکلیف کے برداشت کرنے ہی کو اپنی دلی راحت کی ضمانت ٹھیراتے رہے۔ قدس اللہ سرہ ونفعنا اللہ بمآثرہ الطیبۃ الطاہرۃ الزھرۃ الباہرۃ۔

بہرحال میرٹھ میں قیام مدرسہ کے بعد آپ جتنے دنوں بھی رہے ہوں' لیکن مصنف امام کے بیان کے مطابق اتنا ماننے پر بہرکیف ہم مجبور ہیں کہ

"شروع مدرسہ میں آپ دیوبند رہے اور ہر طرح اس مدرسہ کے سرپرست ہو گئے۔"

اب "شروع" کے لفظ کو سامنے رکھتے ہوئے "قالب" کی دوری کے ان دنوں کی نوعیت جتنی بھی جی چاہے

متعین کر لیجئے، ان دنوں میں مدرسہ میں کیا کیا ہوا؟ ہندوستان کے عربی دینی تعلیم کے قدیم نظام کے مقابلہ میں، دیوبندی سلسلہ کے اس جدید نظام میں جن امتیازی خصوصیات کو ہم پاتے ہیں، ان میں کتنی باتوں کا اضافہ سیدنا الامام الکبیر کی مستقل تشریف آوری اور ہر طرح سرپرست بن جانے کے پہلے اس مدرسہ میں ہوا، ان امور کی تفصیل جیسا کہ کہتا چلا آرہا ہوں، دارالعلوم کی تاریخ لکھنے والوں کا عملی فریضہ ہے۔ بالکل ممکن ہے کہ جماعت بندی، رجسٹر حاضری، امتحان تحریری جیسی باتیں جن سے حکومت قاہرہ کے نئے نظام تعلیم نے ملک کو روشناس کیا تھا، شروع ہی سے ان کی افادیت اور ضرورت کو محسوس کر کے قبول کر لیا گیا ہو، آخر حاجی سید عابد حسین صاحب مرحوم جن کے ہاتھ میں مدرسہ کے اہتمام و انتظام کی باگ ابتداء میں سپرد کی گئی تھی۔ وہ اجتماعی تعلیم کے ان عصری لوازم و خصوصیات سے مانا کہ کوئی تعلق نہ رکھتے ہوں، لیکن مولانا فضل الرحمٰن اور مولانا ذوالفقار علی طالب ثراہما کی تو عمر ہی ان چیزوں کے عملی تجربوں کی دشت نوردی میں گذری تھی، طالب علمی کے زمانہ میں بھی، اور ملازمت کے ایام میں بھی، دونوں دلی عربک کالج کے صدر مولانا مملوک علی سے تلمذ کا تعلق رکھتے تھے، اور حکومت کے محکمۂ تعلیمات میں منسلک ہو کر ڈپٹی انسپکٹر کے عہدوں تک پہنچے تھے۔ ان نئے اصلاحات کے لئے ان ہی دونوں بزرگوں کا وجود کافی تھا، پھر سیدنا الامام الکبیر بھی مکانی بُعد کے باوجود حقیقۃً اس مدرسہ سے جتنے قریب تھے، ان کے مشوروں سے بھی اثر پذیر ہونے کی راہیں اس زمانہ میں بھی کھلی ہوئی تھیں لیکن براہ راست حضرت والا کا قیام چونکہ مدرسہ میں ابھی نہیں ہوا تھا، اس لئے وقفہ کی اس مدت کے متعلق جو کچھ بھی عرض کیا گیا، اپنی بحث کے حقیقی دائرہ سے تجاوز کے بعد ہی عرض کیا گیا، لیکن میرٹھ چھوڑ کر دیوبند میں مستقل قیام کا فیصلہ کرنے کے بعد جب مدرسہ کے کاموں سے آپ کا وہ عجیب و غریب اچھوتا اور انوکھا رشتہ "باہمہ اور بے ہمہ" والا قائم ہوا، یعنی سب کچھ ہونے کے باوجود دیکھنے والے یہی دیکھ رہے تھے کہ آپ "کچھ نہیں" ہیں۔ اس "عہد" کے متعلق مجھے اعتراف کرنا چاہئے کہ جن جن سوالوں کے جوابوں سے واقف ہونے کی ضرورت ہے اور اس سلسلہ میں جس نوعیت کی "معلومات" کو دل ڈھونڈھتا ہے، جیسا کہ چاہئے، ان کی فراہمی میں تو کامیاب نہ ہو سکا، تاہم تلاش و جستجو سے اب تک جن امور تک

رسائی میرے لئے آسان کی گئی ہے، انہیں پیش کردیتا ہوں، جن سے اس کا بھی پڑھنے والوں کو اندازہ ہوگا کہ دینی نظام تعلیم کے اس نئے قالب و ہیکل بن جس کا مرکز دارالعلوم دیوبند ہے، اس میں سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کے منشار کے مطابق کتنی باتیں پوری ہوچکی ہیں، اور کتنی اس وقت تک تشنۂ تکمیل ہیں، و اللہ ولی الامر والتوفیق۔

# دارالعلوم کا نصابِ تعلیم

سب سے پہلا مسئلہ "نصابِ تعلیم" کا ہے۔ دارالعلوم میں جو کچھ پڑھا پڑھایا جاتا ہے۔ یا پڑھ پڑھ کر اب تک جو لوگ اس مدرسے سے فارغ ہوئے ہیں، ان کو دیکھ کر عام رائے یہی قائم ہوسکتی ہے کہ دارالعلوم کی تاریخ میں "نصابِ تعلیم" کے مسئلہ پر شاید کبھی غور نہیں کیا گیا، اور من وعن "درس نظامیہ" کا جو نصاب تھا اسی کو قبول کرلیا گیا ہے، الزام لگایا جاتا ہے، کہ زمانہ کے جدید تقاضوں کی طرف سے چشم پوشی اختیار کی گئی، اس میں شک نہیں کہ جو دیکھا جارہا ہے، اس کو دیکھ کر کہنے والے آخر اور کیا کہہ سکتے ہیں، لیکن سیدنا الامام الکبیر کا نقطۂ نظر اس باب میں کیا تھا، اس کا اندازہ حضرت والا کی اس تقریر سے کرسکتے ہیں جو خوش قسمتی سے سنہ ۱۲۹۰ھ کی روداد میں شریک کردی گئی ہے، وہی مطبوعہ شکل میں میرے سامنے ہے۔ طلبہ جو فارغ ہوئے تھے، ان کو سند و انعام دینے کے لئے ۱۹ ذیقعدہ سنہ ۱۲۹۰ھ مطابق ۹ جنوری سنہ ۱۸۷۴ء میں یہ جلسہ دیوبند میں منعقد ہوا تھا، گویا عصری یونیورسٹیوں میں "کانووکیشن" کے اجلاس کی جو نوعیت ہوتی ہے، کچھ اسی طرز کا جلسہ تھا، اطراف و جوانب سے بھی کافی تعداد مہمانوں کی اس تعلیمی تقریب میں شریک ہونے کے لئے دیوبند پہنچی تھی، فارغ ہونے والے طلبہ میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، منجملہ دوسری خصوصیتوں کے ایک خصوصیت اس "تعلیمی حفلہ" کی یہ بھی نظر آئی ہے، کہ جن علوم و فنون کی تعلیم فارغ ہونے والے طلبہ کو دی گئی تھی، ان میں سے کسی فن اور علم کے کسی خاص موضوع پر امتحانی مقالے لکھوائے گئے تھے، یہی مقالے لوگوں کو

سنائے گئے۔ یہ مقالے بھی روداد میں شائع کردیئے گئے تھے، جن کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں دیوبند کے اس مدرسہ کا تعلیمی معیار کتنا بلند ہو چکا تھا گویا سمجھنا چاہئے کہ مختلف یونیورسٹیوں کے آخری مدارج مثلاً ایم۔اے یا ریسرچ وغیرہ کی کلاسوں میں جیسے مقالے (تھیسس) لکھوائے جاتے ہیں، دارالعلوم کے نظام تعلیم میں اسی سال گویا ایک صدی پہلے یہ سنت جاری ہو چکی تھی، جو افسوس ہے کہ بعد کو جاری نہ رہی، اور کہہ سکتا ہوں کہ یونیورسٹیوں کے "کانوکیشن" کے جلسوں میں خطبوں، یا ایڈریسوں کا جو عام رواج ہے، تقریباً کچھ اسی رنگ میں سیدنا الامام الکبیر نے ایک تقریری خطبہ عطائے اسناد و انعام کے اس جلسہ میں ارشاد فرمایا تھا، خطبہ کافی طویل ہے، اور جیسا کہ چاہئے گوناگوں حقائق و معارف سے لبریز ہے، سارے نقاط جن پر اس خطبہ میں بحث کی گئی ہے، ان کے پیش کرنے کا نہ یہ موقع ہے، اور نہ ضرورت، بلکہ "نصاب تعلیم" کے متعلق اپنی اس تقریر میں حضرت والا نے جن اصولی پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے، صرف ان ہی کا ذکر یہاں مقصود ہے۔

لیکن اصل تقریر کے الفاظ کو پیش کرنے سے پہلے چاہئے کہ ایک بات سمجھ لی جائے۔ میرا مطلب یہ ہے، کہ ہمارے عربی و دینی مدارس کے تعلیمی نصاب کے متعلق سب سے زیادہ اہم سوال یہی ہے کہ عصر حاضر کے عام علمی حلقوں میں امتیاز و وقار یورپ کے جن جدید علوم و فنون اور السنہ یا زبانوں سے آگاہی حاصل کئے بغیر علمی کاروبار کرنے والے حاصل نہیں کر سکتے، ان کا پیوند اپنے یہاں کے دینی علوم، اور دوسرے عقلی و ذہنی قدیم فنون سے کیسے قائم کیا جائے۔

اب تو تقریباً علماء کی اکثریت اس سوال کی اہمیت کو محسوس کرنے لگی ہے، لیکن یہی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ پیوند قدیم و جدید علوم و فنون میں کیسے قائم کیا جائے۔ کیا دینی علوم اور قدیم تدریسی فنون کے ساتھ ساتھ جدید علوم و السنہ کی کتابیں بھی نصاب میں شریک کرنی چاہئیں؟ یا جدید علوم و فنون سے فارغ ہونے کے بعد اسلامی علوم کے سیکھنے کا موقعہ طلبہ کے لئے فراہم کیا جائے؟ یہ دونوں صورتیں تو ایسی ہیں جو ہندوستان کے بعض تعلیمی و تدریسی اداروں میں زیر تجربہ بھی آچکی ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) اور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے شعبۂ دینیات میں مشترک نصاب کے طریقہ کو اور مسلم یونیورسٹی میں

بی۔ٹی۔ایچ۔کی کلاسوں کو کھول کر دوسرے طریقہ کو عملاً آزمایا جا چکا ہے۔جس کے نتائج بھی لوگوں کے سامنے آچکے ہیں، لیکن اسی سلسلہ میں ایک تیسرا احتمال بھی عقلاً پیدا ہوتا ہے۔یعنی پہلے مسلمان بچوں کو دینی و اسلامی علوم سے کم از کم وقت میں قدر ضرورت کی حد تک واقف بنا لینے کے بعد ان کو جدید علوم و فنون کی یونیورسٹیوں میں شریک کیا جائے، اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انفرادی طور پر اس ترتیب سے بھی تعلیم پانے والے چند گنے چنے اشخاص ہندوستان میں جدید یونیورسٹیوں کے قیام کے بعد ضرور پیدا ہوئے ہیں، لیکن تقریباً ایک صدی کی طویل مدت میں اتنے طویل و عریض ملک جیسا کہ ہندوستان ہے، اس میں شاید اتنی تعداد بھی اس قسم کے تعلیم یافتوں کی نہیں مل سکتی، جن کو گننے کے لئے دس انگلیوں کے استعمال کی ضرورت ہو، مگر باوجود اس کے شاید یہ کہنا واقعہ کا اعتراف ہوگا کہ اسی تیسرے نہج پر تعلیم پانے والوں میں علم و عمل کے جن نمونوں کا اس وقت تک مشاہدہ کیا گیا ہے، شاید ان کی مثال مذکورہ بالا دو طریقوں پر تعلیم حاصل کرنے والوں میں ہم نہیں پا سکتے" الا ما شاء اللہ وقلیل ما ھم۔

بہرحال جدید و قدیم علوم کے "پیوند" کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے، عملی تشکیل کی یہی تین عقلی صورتیں ممکن ہیں، اب دیکھئے کہ سیدنا الامام الکبیر کا زاویۂ نگاہ اس باب میں کیا تھا، "مجلس عطائے اسناد و انعام" کے اسی جلسہ میں تقریر فرماتے ہوئے، دوسری باتوں کے ساتھ آخر میں یہ فرماتے ہوئے کہ

"اب ہم اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس سے معلوم ہو جائے کہ درباب تحصیل، یہ طریقہ خاص کیوں تجویز کیا گیا"۔

طریقہ خاص سے مراد یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں جدید علوم و فنون اور السنہ کی کتابیں کیوں شریک نہیں کی گئیں، خود ہی اجمال کی تفصیل آگے ان الفاظ میں فرمائی گئی ہے کہ

"اور علوم جدیدہ کو کیوں نہ شامل کیا گیا"۔

سب سے پہلی بات تو صرف اسی سوال سے یہ سمجھ میں آتی ہے، کہ جدید علوم و فنون کے سوال سے جو یہ باور کرایا گیا ہے، یا اب بھی باور کرایا جاتا ہے، کہ ہمارے علماء قطعاً خالی الذہن تھے، افترا یا اتہام کے سوا

وہ کچھ نہیں ہے۔ کم از کم دیوبندی حلقہ کے علماء کی ذمہ دار ہستیوں کا دامن تنگ خیالی اور جمود کے اس داغ سے پاک تھا۔ اس کے لئے تو یہی کافی ہے کہ اس طبقہ کے سب سے بڑے پیشوا "امام کبیر" کے سامنے یہی نہیں کہ صرف سوال ہی تھا، بلکہ جو جواب اس سوال کا دیا گیا ہے، اسے سنئے، اور انصاف سے کہئے کہ تقریباً ایک صدی پہلے حضرت والا کا ذہن جن اشتباہی پہلوؤں کو پاک کرکے نتیجہ تک پہنچ چکا تھا، کیا اس وقت تک فراخ چشمیوں کے مدعیوں کا گروہ وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوا ہے؟

اس سوال کی جوابی تقریر سیدنا الامام الکبیر کے ان الفاظ سے شروع ہوئی ہے، فرمایا گیا تھا کہ

"منجلہ دیگر اسباب کے، بڑا سبب اس بات کا تو یہ ہے"

"دیگر اسباب" جن کی طرف اجمالی اشارہ فرمایا گیا ہے، ان کا ذکر تو بعد میں کروں گا، پہلے "سب سے بڑے سبب" کی تفصیل ان ہی کے الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کر دیتا ہوں، ٹھنڈے دل کے ساتھ فکر معقول سے کام لیتے ہوئے، ان گرامی ارشادات کا مطالعہ کیجئے، سب سے پہلے ایک کلی قاعدے کو ان الفاظ میں پیش کیا گیا تھا کہ

"تربیت عام ہو، یا خاص، اس پہلو کا لحاظ چاہئے، جس کی طرف سے ان کے کمال میں رخنہ پڑا ہو"

مطلب یہ ہے کہ افراد ہوں، یا جماعتیں، ان کے اٹھان، اور جن کمالات تک ان کو پہنچانا مقصود ہو، سب سے پہلے توجہ کے مستحق اس سلسلہ میں وہی معاملات ہوتے ہیں، بلکہ چاہئے کہ وہی ہوں، جو سب سے زیادہ کس مپرسی اور لاپروائی کا شکار ہو چکے ہوں، ایک شخص جس کے بدن پر کھادی ہی کا کرتہ کیوں نہ ہو، لیکن کرتہ کے ساتھ یہ دیکھا جاتا ہو کہ نیچے کا بدن اس کے بالکل ننگا ہے، تو ظاہر ہے کہ کھادی کے کرتہ کی جگہ ریشمین قمیص کی فکر سے زیادہ اہم مسئلہ یہ ہوگا کہ بے ستری سے محفوظ کرنے کے لئے لنگی یا پائجامہ کا نظم اس غریب ننگے کے لئے کیا جائے۔

جس زمانہ میں یہ تقریر ہو رہی تھی، اس وقت تعلیمی راہ سے مسلمانان ہند کی تربیت و اصلاح کے

مسئلہ کی نوعیت مذکورہ اصول کی روشنی میں کیا ہونی چاہئے' اسی کا جواب دیتے ہوئے پہلا فقرہ یہ فرمایا گیا تھا

"سوا ہل عقل پر روشن ہے' کہ آج کل تعلیم علوم جدیدہ تو بوجہ کثرت مدارس سرکاری اس ترقی پر ہے' کہ علوم قدیمہ کو سلاطین زمانہ سابق میں بھی یہ ترقی نہ ہوئی ہوگی"

جس کا مطلب جیسا کہ ظاہر ہے یہی تھا کہ علوم جدیدہ کی افادیت ہی کے آپ منکر تھے' اور نہ آپ کا یہ خیال تھا کہ مسلمانوں کو ان علوم وفنون سے الگ تھلگ رہنا چاہئے' جن سے ملک کو نئی قائم ہونے والی حکومت نے روشناس کیا ہے۔ توجہ صرف اس پر دلائی گئی' کہ خود حکومت کی طرف سے جن علوم وفنون کی پڑھنے پڑھانے کا نظم وسیع پیمانے پر کیا جا چکا ہے اور آئندہ کیا جائے گا۔ اور کیسا نظم وسیع؟ کہ بقول حضرت والا اتنی سرپرستی قدیم علوم' اور اسلامی فنون کو گذشتہ سلاطین اور مسلمان بادشاہوں کی طرف سے بھی کبھی میسر نہیں آئی تھی'

علوم جدیدہ کی عام اشاعت وترقی کے اس تذکرہ کے بعد ارشاد ہوا کہ

"ہاں! علوم نقلیہ (یعنی خالص دینی واسلامی علوم) کا یہ تنزل ہوا کہ ایسا تنزل بھی کسی کارخانہ میں نہ ہوا ہوگا"

علوم جدیدہ' اور علوم اسلامیہ دینیہ دونوں کے باہمی تقابل کی تصویر جو حقیقت اور واقعہ کی عکاسی تھی' اس کو پیش کرنے کے بعد نتیجہ کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا گیا تھا کہ

"ایسے وقت میں رعایا کو مدارس علوم جدیدہ کا بنانا' تحصیل حاصل نظر آیا"

گویا مثال اس کی وہی ہوئی' کہ جو کرتہ ہی نہیں ریشمین قمیص پہنے ہوئے ہے' اس کی قمیص میں قمیصوں کا اضافہ کیا جا رہا ہے' لیکن جس وجہ سے غریب ننگا ننگا کہلاتا ہے' اور عریانی وبے ستری کی مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہے' اسی سے لاپروائی برتی جا رہی ہے۔

بہرحال جس چیز کی متکفل غیر محدود ذرائع رکھنے والی حکومت ہو' اسی کے اضافہ میں محدود ذرائع رکھنے والے محکوموں اور رعایا کی آمدنی کو خرچ کرنا' اور اس کے لئے امدادی چندوں کا بار ان ہی غریبوں

کے سر ڈالنا' حضرت والا کا خیال تھا کہ تحصیل حاصل کے سوا اسے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

آپ نے اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ پبلک کے عام چندوں' اور مالی امداد سے استفادہ کی اسی لئے قرین عقل و دانش یہی تدبیر نظر آئی کہ حکومت جن علوم کی سرپرستی کر رہی ہے' ان کو تو حکومت کے سپرد رکھا جائے لیکن مسلمان جس علم سے محروم رہ جانے کے بعد مسلمان باقی نہیں رہ سکتے' اور نئی حکومت اپنے خاص حالات کی وجہ سے مسلمانوں کے ان علوم کی سرپرستی سے صرف دست برداری نہیں ہو گئی ہے بلکہ واقعات بتا رہے تھے کہ نئی حکومت کے پیدا کئے ہوئے ماحول میں زبونی کے آخری حدود تک وہ پہنچ چکے ہیں' ان علوم کے احیاء و بقاء کا انتظام رعایا کی مالی امداد سے کیا جائے' اور یہی مطلب ہے ان الفاظ کا جو آگے اسی تقریر میں پائے جاتے ہیں' یعنی دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب میں اسی لئے ارشاد ہوا کہ

"صرف بجانب علوم نقلی (یعنی خالص اسلامی و دینی علوم) اور نیز ان علوم کی طرف جن سے استعداد علوم مروجہ اور استعداد علوم جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہے انعطاف ضروری سمجھا گیا۔"

آپ دیکھ رہے ہیں' دارالعلوم کے نصاب میں خالص دینی و اسلامی علوم (قرآن و حدیث و فقہ وغیرہ) کے ساتھ ساتھ عقلی و ذہنی فنون کی شرکت کی توجیہ کرتے ہوئے' حضرت والا نے جہاں اس عام اور مشہور غرض کا تذکرہ فرمایا ہے' یعنی مسلمانوں کے "علوم مروجہ" کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہوتی ہے قیل و قال' جواب و سوال سے فکری ورزش کرا کے طلبہ میں دقیقہ سنجیوں' موشگافیوں کے ملکہ کو ابھارا جاتا ہے "استعداد علوم مروجہ" سے یہی مراد ہے۔

خیر یہ تو عام بات ہے' بیان کرنے والے عموماً اس کو بیان بھی کرتے ہیں' لیکن خصوصی توجہ کے ساتھ پڑھنے کا مستحق توجیہ کا دوسرا پہلو ہے' یعنی یہ جو فرمایا گیا ہے کہ

"اور استعداد علوم جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہے"

جس کا مطلب اس کے سوا' اور کیا ہو سکتا ہے' کہ دارالعلوم کے مروجہ نصاب میں حضرت والا یہ سمجھانا چاہتے ہیں' ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس نصاب کو پڑھ کر فارغ ہونے والوں میں "علوم جدیدہ" کے

حاصل کرنے کی بھی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے "گویا "علوم جدیدہ" کی تعلیم کا مقدمہ بھی دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی نصاب بن سکتا ہے، اور چاہا جائے تو اس سے یہ کام بھی لیا جا سکتا ہے، دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب کے متعلق حضرت والا کا یہ جدید نقطۂ نظر ہے، جس کی طرف آپ نے صرف اسی اجمالی اشارہ سے ہی توجہ نہیں دلائی ہے، بلکہ خالص دینی و اسلامی علوم کے مقابلہ میں مدرسہ کے نصاب کے عقلی و ذہنی فنون کا "علوم دانش مندی" کے عنوان سے تذکرہ کرتے ہوئے اپنے صحیح تعلیمی نصب العین کو سیدنا الامام الکبیر نے کھلے کھلے واضح الفاظ میں پیش فرما دیا ہے، آگے اسی تقریر میں اس کا اعادہ کرتے ہوئے کہ کیوں

"علوم نقلیہ، اور ان کے ساتھ علوم دانش مندی کو داخل تحصیل کیا"

اپنی اس تجویز سے اسی زمانہ میں سننے والوں اور سمجھنے والوں کو آگاہ فرما دیا تھا کہ

"اس کے بعد (یعنی دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب سے فارغ ہونے کے بعد) اگر طلبہ مدرسہ ہذا، مدارس سرکاری میں جاکر علوم جدیدہ کو حاصل کریں تو ان کے کمال میں بات زیادہ مؤید ثابت ہوگی"

ذرا سوچئے کہ غم و غصہ، بے زاری، اور دل افگاری کے ان ایام کو جن میں مسلمانوں کو ہندوستان جیسے اقلیم کی شہنشاہیت سے محروم کر کے غلام بنایا گیا تھا، جو آسمانوں پر تھے زمین پر پٹک دیئے گئے تھے، ان کے قلوب میں جیسا کہ چاہئے تھا، قدرتاً اس قوم کی طرف سے انتقام اور نفرت کی آگ بھری ہوئی ہو جس کے ہاتھوں اس سیاہ انجام تک وہ پہنچے تھے۔ ہر وہ چیز جو اس قوم کی طرف منسوب تھی، فطرتاً اس سے مسلمان بھڑکتے تھے، بلکہ چڑھتے تھے۔ انگریزی مدارس اور ان مدارس میں جو کچھ پڑھایا جاتا تھا، اس کے تصور سے بھی وہ لرزہ براندام ہو جاتے تھے۔ "جو انگریزی پڑھے گا وہ کافر ہو جائیگا" مولویوں کی طرف اس تکفیری لطیفہ کو مسخروں نے جو منسوب کر رکھا ہے، بجائے خود افترا اور بہتان کی یہ جتنی بھی شرمناک مثال ہو، لیکن اس کا شاید انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ اسلامی آبادیوں کی فضا کچھ اسی قسم کی صداؤں سے معمور ضرور تھی، کس نے فتویٰ دیا، کب دیا، ان سوالوں سے بے تعلق ہو کر کہنے والے کچھ

اسی قسم کی باتیں کہہ رہے تھے، اور اسی نوعیت کے چرچے عموماً پھیلے ہوئے تھے۔

لیکن اسی مسموم فضا، اور غلط فہمیوں سے بھرے ہوئے ماحول میں سیدنا الامام الکبیر یہی نہیں کہ انگریزی مدارس میں داخل ہو کر تعلیم پانے کے جواز ہی کا فتوے دے رہے ہیں، بلکہ بغیر کسی جھجک کے مولویوں کی بھری ہوئی مجلس میں اعلان فرمارہے ہیں کہ سرکاری مدارس میں شریک ہو کر علوم جدیدہ کی تعلیم علمی کمالات کے چمکانے، اور آگے بڑھانے میں مولویوں کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ اللہ اللہ ایک طرف اسی زمانہ میں مولویوں کا ایک طبقہ تھا، بلکہ ان کی اکثریت یہ باور کئے بیٹھی تھی کہ جو کچھ انہوں نے پڑھ لیا ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسری چیز ایسی نہیں ہے، جسے سیکھا اور پڑھا جائے۔ ان ہی مولویوں کے درمیان پکارنے والا پکار رہا ہے کہ مولویوں میں اپنے علمی کمالات میں جو مزید فروغ، اور زیادہ وزن پیدا کرنا چاہتا ہے۔ چاہئے کہ یورپ کے جدید علوم و فنون کا مطالعہ کرے، ان کی علمی زبانوں کو سیکھے، جو سرکاری مدارس میں سکھائی جاتی ہیں، یقیناً حضرت والا کے ارشاد گرامی کا یہی مطلب ہے، اور "دین" یہی کہنا چاہتا تھا کہ یورپ کے جدید علوم و فنون کی اہمیت و ضرورت کا انکار جسے اُس زمانہ میں عموماً ہمارے علماء نے اپنا پیشہ بنا رکھا تھا۔ یہی نہیں، کہ صرف انکار ہی کی حد تک بات محدود تھی، بلکہ

"دیوبندی نظام تعلیم"

انکے امام اول واکبر نے ٹھیک وقت پر ان جدید عصری علوم کی ضرورت و اہمیت ہی کو تسلیم کر لیا تھا، بلکہ جن الفاظ میں حضرت والا نے اپنے نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے۔ اس سے آگاہ ہونے کے بعد بلا خوف تردید بآسانی یہ دعوے کیا جا سکتا ہے کہ علوم اسلامیہ کے ساتھ یورپ کے جدید علوم و فنون، والسنہ کے پیوند لگانے کے سلسلہ میں مذکورہ بالا تین عقلی شکلوں یعنی دونوں کی تعلیم ساتھ ساتھ دلائی جائے، یا عصری علوم سے فارغ ہونے کے بعد جو پڑھنا چاہتے ہوں انکے لئے اسلامی علوم کے پڑھنے کا نظم کیا جائے۔ یا مسلمانوں کو دینی و موروثی علوم میں بقدر ضرورت بصیرت حاصل کر لینے کے بعد مسلمان بچوں کو دانش نو سے مستفید ہونے کے مواقع فراہم کئے جائیں، ان ہی تین شکلوں میں تیسری شکل کو اپنے نصب العین میں حضرت والا نے شریک کرنا چاہا تھا، اپنی اسی تقریر میں آپ نے اس کا بھی جواب دیا ہے کہ بجائے تقدم و تاخر کی اس ترتیب کے

قدیم وجدید علوم کا مشترک نصاب دارالعلوم دیوبند میں کیوں جاری نہیں کیا گیا' یعنی ہر دو صنف کے علوم کی کتابیں ساتھ ساتھ پڑھائی جائیں' ایسا کیوں نہ کیا گیا' جواب میں فرمایا گیا ہے کہ

"زمانہ واحد میں علوم کثیرہ کی تحصیل سب علوم کے حق میں باعث نقصان استعداد رہتی ہے"۔

ایک مطلب تو اس کا ظاہر ہے کہ اسلامی دینی علوم کی صحیح بصیرت حاصل کرنے کے لئے جن فنون کی تعلیم بطور مقدمہ دی جاتی ہے' صرف ونحو' ادب' معانی' بیان' اصول فقہ' کلام اور علوم دانش بسندی جن سے ذہنی ورزش کا کام لیا جاتا ہے۔ ان سب کی چھوٹے سے چھوٹے مختصر ترین نصاب کے لئے بھی' اتنی کتابوں کی ضرورت ہے کہ ان کے ساتھ علوم جدیدہ کی کتابوں کی گنجائش بمشکل نکل سکتی ہے۔ اور طلبہ پر کسی نہ کسی طرح اس ناقابل برداشت بوجھ کو لاد بھی دیا جائے تو "طلب الکل فوت الکل" کے سوا عموماً کوئی دوسرا نتیجہ سامنے نہیں آئے گا' پوری محنت اور توجہ جس کے بغیر صحیح استعداد طلبہ میں پیدا نہیں ہو سکتی' سیدنا الامام الکبیر یہی فرمانا چاہتے ہیں۔ قدیم وجدید دونوں علوم اس سے محروم رہ جائیں گے۔ آپ کے بیان کا یہ تو خیر کھلا ہوا پہلو ہے' اسی کے ساتھ اگر اس کو سوچا جائے کہ جس زمانہ میں یہ تقریر کی گئی تھی' یعنی آج سے ستر اسی سال پہلے حالت یہ تھی کہ مشرقیات کے پڑھنے پڑھانے والے ہمارے علماء' اور مغربی علوم کے معلمین' پروفیسروں اور لیکچروں کا طبقہ دونوں کے پڑھنے پڑھانے کا صرف طریقہ ہی مختلف نہ تھا' بلکہ مشرقیات کو اساتذہ پر عموماً عقیدت ویقین وادب سلف کے احترام کے جذبات غالب تھے' اور اس کے برعکس مغربی علوم وفنون کی تعلیم جو دیتے تھے' وہ شک وارتیاب' بے اعتمادی' مطلق العنانی کی ذہنیت کے دباؤ کے نیچے دبے ہوئے تھے اور مرض متعدی کی طرح ان سے پڑھنے والوں میں اسی ذہنیت کے جراثیم قدرتاً منتقل ہوتے رہتے تھے اب تو مختلف اسباب و وجوہ کے کسر وانکسار کی بدولت ایک صدی کی طویل مدت میں دونوں طبقوں کے رجحانات میں اتنا بعد وتخالف باقی نہیں رہا ہے

لیکن جس عہد میں قدیم وجدید نصاب کے پیوند کے اس مسئلہ کو سیدنا الامام الکبیر نے اٹھایا تھا' اس وقت یہ واقعہ ہے کہ ان دو مختلف' قطعاً مختلف احساسات ورجحانات والے اساتذہ کو ایک ہی

زمانہ میں تعلیم پانے والوں کے متعلق اگر یہ تخمینہ کیا گیا تھا کہ قدیم ہو، یا جدید دونوں ہی سے صحیح مناسبت نہ پیدا ہو سکے گی، تو جو واقعات تھے، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے صحیح بصیرت کسی اور نتیجہ تک شاید پہنچ بھی نہیں سکتی تھی، الغرض "نقصان استعداد" کے جس اندیشہ کا اظہار مندرجہ بالا تقریر میں کیا گیا ہے۔ ایک پہلو اس اندیشہ کا یہ بھی ہو سکتا ہے۔[1] آخر استادوں کے ایک حلقہ میں جن علوم و مسائل کی قدر و قیمت طلبہ پر واضح کی جاتی ہو، اور معاً دوسرے حلقے میں پہنچنے کے ساتھ ان ہی کے وزن و وقار سے طلبہ کو خالی الذہن کر دیا جائے، اثبات و نفی کے اس قصہ میں اگر ہر دو کی نفی ہوتی رہے، تو ان دو مختلف طریقہ تعلیم کا خود ہی سوچئے دوسرا انجام ہی کیا ہو سکتا ہے۔

اور یہ وجہ تو اس بات کی تھی کہ قدیم و جدید علوم کا مشترکہ نصاب دار العلوم دیوبند میں کیوں نافذ نہیں کیا گیا۔ بلکہ بجائے اس کے سیدنا الامام الکبیر نے اپنے اس تعلیمی نظریہ کو پیش کیا ہے کہ پہلے دینی و اسلامی علوم کا نصاب دانش مندی کے فنون کے ساتھ ختم کرایا جائے، جن کے بغیر خالص اسلامی علوم، تفسیر، شروح احادیث و فقہ وغیرہ کی کتابوں کے مطالعہ ہی کی صحیح قدرت پیدا ہو سکتی ہے، اور جیسا کہ چاہئے، ان کتابوں سے استفادہ بھی بآسانی ممکن نہیں، اس کے بعد جیسا کہ آپ

---

[1] بعد کو ذاتی تجربہ و مشاہدہ سے خاکسار بھی اسی نتیجہ تک پہنچا، بلکہ اسی کے ساتھ جدید علوم و فنون و السنہ کو چونکہ حکومت کی سرپرستی و پشت پناہی حاصل تھی، اس کی وجہ سے یہ بھی دیکھا گیا کہ اسلامی دینی علوم کے جن آثار کی توقع پڑھنے والوں میں کی جاتی ہے، بجائے ان کے اکثریت میں وہی رنگ غالب ہو جاتا ہے، جو رنگ خالص مغربی علوم و فنون کی تعلیم پانے والوں کی خصوصیت ہے، رنگ ڈھنگ، وضع قطع، طریقہ فکر و بیان سب ہی میں پایا گیا کہ وہ مغربی علوم کے طلبہ کے طفیلی بنے ہوئے ہیں۔ الناس علی دین ملوکہم بات تو پرانی ہے، لیکن ہر نئے زمانہ میں اسی پرانی بات کا تجربہ کیا گیا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، مولانا حبیب الرحمٰن سابق مہتمم دار العلوم رحمۃ اللہ علیہ سے دار العلوم کے نصاب کے متعلق اسی سلسلہ میں ایک دن گفتگو ہوئی، تو پہلی دفعہ اسی "پیر دانا" نے نوجوانی کے زمانہ میں فقیر کو سمجھایا تھا کہ توازن کا باقی رہنا دشوار ہو جائے گا۔ طلبہ پر عموماً انگریزیت غالب آ جائے گی، دین کی ٹوٹی پھوٹی خدمت دار العلوم کے طلبہ سے اس وقت جو بن آتی ہے، تم دیکھو گے کہ اس سے بھی وہ محروم ہو جائیں گے۔ وقت جیسے جیسے گزرتا چلا گیا، مشاہدہ سے ان تجربہ کاروں کے خیال کی تائید ہوتی چلی جا رہی ہے ۱۲۔

دیکھ چکے صاف اور واضح لفظوں میں اپنی یہ تجویز پیش کی ہے' کہ علوم جدیدہ کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے سرکاری مدارس میں مسلمان بچوں کو داخل کیا جائے۔ اپنی اس تقریر میں یہ دعوے بھی کیا ہے' کہ اس ترتیب سے تعلیم دلانے کا تجربہ کیا جائے۔ عوام ہی کو نہیں' خود حکومت کو جوش میں آکر براہ راست مخاطب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا تھا کہ

"سرکار کو بھی معلوم ہو کہ استعداد اسے کہا کرتے ہیں۔"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دانش مندی کے قدیم علوم جن کو معقولات بھی کہتے ہیں' ان میں بال کی کھال نکالنے کی مشق کی وجہ سے قدرتاً فکر و نظر میں گہرائی کی کیفیت جو پیدا ہو جاتی ہے' نازک سے نازک بات تک پہنچنے اور پہنچانے کی اس عادت کے ساتھ جدید علوم و فنون میں حقیقت بینی' واقعات طلبی پر جو زور دیا جاتا ہے۔ قدیم و جدید تعلیم کی ان دونوں طبعی خاصیتوں کی باہمی ترکیب سے علمی استعداد کے جس رنگ کو پیدا کیا جا سکتا ہے' اس رنگ کو صرف قدیم' یا صرف جدید تعلیم کی راہ سے شاید حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا نے اپنے ہی زمانہ میں تعلیم کے تمام پہلوؤں' اور ان کے مختلف نتائج کا صحیح اندازہ کر لیا تھا' تعجب تو اس پر ہوتا ہے' کہ حکومت مسلطہ جس کی امداد کی طرف غلطی سے بھی آپ دیکھنا شاید پسند نہیں فرماتے تھے' لیکن قدیم و جدید علوم کے پیوند کی مجوزہ ترتیب کی افادیت کے خیال نے ایسا معلوم ہوتا ہے' کہ اس التزام کے حدود کے توڑنے پر بھی آپ کو شاید مضطر و مجبور کر دیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ سب سے بڑی رکاوٹ آپ کی تجویز کے "عملی نفاذ" میں حکومت کا وہ عجیب و غریب رویہ تھا' کہ "حصول علم" کو بھی طلبہ کی عمر کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا' فلاں عمر تک فلاں امتحان میں طلبہ شریک نہیں ہو سکتے' یا فلاں امتحان میں شرکت کے لئے ضروری ہے کہ امیدوار اتنی عمر کا ہو چکا ہو۔ امتحان میں شرکت کے حق سے وہ محروم ہو جائیں گے' جو حکومت کی مقرر کردہ عمر سے ایک دن بھی آگے بڑھ گئے ہوں' علم کے طلب کی غلامی کے ساتھ خود علم کی اس غلامی کو دیکھتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر نے محسوس فرمایا کہ میری مجوزہ ترتیب پر تعلیم پانے والوں کے لئے سرکاری مدارس میں

داخل ہوکر جدید علوم و فنون سے استفادہ میں رکاوٹیں پیش آئیں گی۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خلاف دستور دستگیری کے لئے اس موقعہ پر آپ نے حکومت کو پکارا ہے ارشاد ہوا تھا کہ

"کاش! گورنمنٹ ہے بھی قید عمر طلبہ نو داخل کو اڑا دے"۔ ؎

اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ دینیات و اسلامیات کی تعلیم کے بعد یورپ کے نئے علوم اور اس ملک کی نئی علمی زبانوں کے سیکھنے سکھانے کے متعلق حضرت والا کے خیالات و جذبات کی صحیح نوعیت کیا تھی؟

بہر حال مسئلہ کے جن جن زاویوں کو جس جس طریقہ سے اپنی تقریر میں حضرت والا نے پیش کیا ہے، ان کو دیکھتے ہوئے، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ صرف جواب دینے کے لئے سرسری طور پر اس کا ذکر کر دیا گیا تھا، گویا ذکر کرنے والے کے سامنے حقیقی معنوں میں کوئی مشخص تجویز اس باب میں نہ تھی۔

میں کیا عرض کروں، دارالعلوم دیوبند کی رودادوں سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے، کہ شروع میں مدرسہ کی تعلیمی مدت معلوم ہوتا ہے کہ دس سال مقرر کی گئی تھی، لیکن دو سال گذرنے کے بعد ۱۲۸۵ھ میں ہم دیکھتے ہیں، نصاب اور تعلیمی مدت وغیرہ پر نظر ثانی کرنے کے لئے ایک مجلس مقرر کی گئی، جس نے منجملہ دیگر تجویزوں کے ایک تجویز یہ بھی پیش کی کہ

"کل میعاد مدت تمام کتب اسباق ثلاثہ کے چھ سال معین ہوئے"۔ مثلہ روداد ۱۲۸۵ھ

"اسباق ثلاثہ" مراد یہ ہے کہ وقت واحد میں تین کتابوں سے زیادہ پڑھنے کی اجازت کسی طالب علم کو نہیں دی گئی تھی، چھ سال کی محدود مدت میں اس کا انتظام کیا گیا تھا کہ خالص دینیات یعنی حدیث و تفسیر و فقہ و اصول فقہ و فرائض کی وہ ساری کتابیں ختم ہو جائیں، جن کے پڑھنے پڑھانے کا عام رواج اس زمانہ میں تھا، اور جن کو پڑھ لینے کے بعد دینی علوم کے متعلق مزید کتابی تعلیم کی سمجھا جاتا تھا کہ ضرورت باقی نہیں رہتی، اس میں مشکوٰۃ کے ساتھ حدیث میں ہم صحاح ستہ کو بھی پاتے ہیں، فقہ میں ہدایہ، اصول فقہ میں توضیح تلویح تفسیر میں بیضاوی تک اس میں شریک ہے، ادب عربی کے لئے شرح ملا تک صرف و نحو کی کتابوں کے ساتھ نثر میں نفحۃ الیمن، حریری، کلیلہ دمنہ، تاریخ یمینی، اور نظم میں متنبی، حماسہ شریک ہیں، عربی سے اردو،

اردو سے عربی ترجمہ کے لئے بھی وقت نکالا گیا ہے، اور معقولات یا علوم دانش مندی میں فلسفہ کی حد تک اگرچہ صرف میبذی ہے، لیکن دماغی تربیت اور ذہنی ورزش کے لئے منطق کی چھوٹی بڑی کتابوں کی کافی تعداد باقی رکھی گئی تھی، مختصر رسالوں، ایساغوجی، قال اقول، مرقات، تہذیب، اور مبسوط کتابوں میں شرح تہذیب قطبی، میر قطبی سب کو باقی رکھا گیا ہے۔

چھ سال کی اس محدود مدت میں اس نصاب کو ختم کرانے کے لئے نقشہ میں سال بھر کے تعلیمی دنوں کی میزان کو پیش کر کے ہر دن اور ہر دن میں ہر سبق کے لئے کتنا وقت دینا چاہئے، تفصیل وار نقشہ میں ان سارے امور کا ذکر کر کے مدرسین کو ذمہ دار ٹھیرایا گیا ہے کہ فلاں کتاب کو اتنی مدت میں ختم کرا دیں۔

الغرض کوئی سوال اور کوئی پہلو ایسا نہیں ہے، جسے تشنہ چھوڑ دیا گیا ہو، نقشہ کو دیکھ کر سمجھ میں آتا ہے کہ دس سال کی عمر میں بھی، دار العلوم کے اس شش سالہ نصاب کو شروع کر کے سولھویں سال میں پڑھنے والے اس کو ختم کر سکتے تھے، اور یوں صرف خالص اسلامی علوم ہی نہیں، بلکہ مسلمانوں کے موروثی مروجہ فنون سے بھی کافی مناسبت پیدا کر لینے کے بعد سرکاری مدارس میں داخل ہو کر جدید علوم، اور نئی علمی باتوں کو سیکھ کر بائیس تیئیس کی عمر میں گریجویٹ بن جانے کا کافی اور معتنم موقعہ پیدا کر دیا گیا تھا، یعنی آج بھی گریجویٹ بننے کی جو عام عمر ہے، کم و بیش اسی عمر میں سیدنا الامام الکبیر کی مجوزہ ترتیب کے مطابق باضابطہ مولوی اور مستند گریجویٹ بن جانے کا وقوعی امکان، مسلمانوں کے سامنے آ گیا تھا، دین اور اپنے آبائی سرمایہ کی ضمانت کے ساتھ باہر کی چیزوں سے استفادہ کی صلاحیت کے لئے مزید وقت دینے کی ضرورت قطعی طور پر باقی نہیں رہی تھی،

صحیح طور پر یہ بتانا تو مشکل ہے، کہ اس تعلیمی نصب العین کے مطابق آئندہ عمل درآمد کی راہوں میں کیا رکاوٹیں پیش آئیں، کہ اس معتنم اور قیمتی امکان سے مستفید ہونے کا موقعہ نہ مل سکا۔

دیوبند کے مقامی مدرسہ کو ہمہ گیر جامعہ کے قالب میں ڈھالنے کی کوششوں میں بدترین ناسازگار ماحول میں جس کے عزم کی بے پناہ قوت سرگرم عمل تھی، چند ہی سال گذرے تھے کہ اچانک ہندی مسلمانوں کو اس کی ناسوتی خدمات سے قدرت کی نامعلوم مصلحتوں نے محروم کر دیا یعنی پچاس سال بھی

پورے نہیں ہوئے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر کی "اجل کتی" پوری ہوگئی۔ یہ حادثہ واقعہ تو یہ ہے دارالعلوم کی تاریخ کا ایسا حوصلہ گسل ہوش ربا حادثہ تھا کہ دیوبند کی یہ تعلیم گاہ باقی ہی کیسے رہ گئی، اور گو جو کچھ ہونا چاہئے تھا، مان لیا جائے کہ وہ نہ ہوا، لیکن جو کچھ بھی ہوا، حیرت اسی پر ہوتی ہے کہ یہی کیسے ہوگیا۔ پہلے سال میں جس ادارہ کا میزانیہ (بجٹ) (۳۹۳) روپیہ تھا۔ آج تقریباً پانچ لاکھ روپے کا بجٹ اسی ادارے کی مجلس شوریٰ نے بحمداللہ منظور کر رہی ہے، اور جس مدرسہ کی بنیاد قائم کرتے ہوئے قائم کرنے والوں کو یہ اندیشہ ستا رہا تھا کہ

"پڑھنے والے عربی کے کہاں سے آئیں گے" ص۱ پہلی روداد متعلقہ ۱۲۸۳ھ

آج اسی میں طلبہ کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہو کر ہزار سے بھی آگے بڑھی ہوئی ہے، اور جن کی اکثریت کی ہر جہتی ضرورتوں کا متکفل خود مدرسہ ہے۔

بہرحال بظاہر میرا خیال تو یہی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے تعلیمی نصب العین کے عملی نفاذ میں غالباً آپ کی وفات کا واقعہ زیادہ اثر انداز ہوا، ہر شخص کے بس کی بات یہ نہ تھی کہ جس زمانہ میں مدرسہ قائم ہوا تھا، اور جو ماحول اس عہد کا تھا، اس میں اس "تعلیمی نصب العین" اور اس کے ثمرات و فوائد کا صحیح اندازہ لگا سکتا۔ روداد میں درج ہونے کے باوجود آپ کے اس "تعلیمی نصب العین" کا چرچا لوگوں میں بعد کو نہیں کیا گیا، حتیٰ کہ اس کا خیال بھی لوگوں میں باقی نہ رہا، خود یہی واقعہ بتا رہا ہے کہ سوچنے والے کی بات شاید سوچنے والے کے ساتھ ہی دفن ہوگئی۔

باقی اس زمانہ کا "ماحول" جس کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں، آج تو اس کا سمجھنا بھی دشوار ہے لیکن اس "ماحول" میں جو جی رہے تھے، میں تو سمجھتا ہوں کہ بے چارے معذور تھے تفصیل کا تو موقعہ نہیں ہے، لیکن اجمالاً مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند خصوصی مؤثرات کا ذکر کر دیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ دیوبند کا مدرسہ سرزمین ہند میں جس وقت قائم ہوا تھا۔ اس وقت ایک طرف تو درس نظامیہ کے نصاب کے پڑھنے پڑھانے والے حضرات تھے، ان ہی کو "علماء" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، دوسری طرف عام مسلمان تھے، جن کے آباؤ اجداد مغل حکومت کی کشوری و فوجی خدمات انجام دیتے تھے،

مغل حکومت اگرچہ ختم ہو چکی تھی، لیکن مغل دربار کی کشوری و فوجی خدمات کیلئے شاہی زبان (فارسی) کا جو نصاب تھا۔ فارسی ادب (نظم و نثر) کا وزن و وقار ان کے دلوں سے خاندانی روایات کے زیر اثر نہیں نکلا تھا۔ نئی قائم شدہ حکومت کی خدمات کے حاصل کرنے میں مد د ملتی ہو یا نہ ملتی ہو۔ لیکن موروثی دباؤ کے نیچے لوگ فارسی کے اسی نصاب کو پڑھتے ہی چلے جاتے تھے۔ بجائے خود فارسی ادب کا یہ نصاب بھی کافی بوجھل اور وزنی تھا۔ گویا علماء کے مقابلہ میں یہ تعلیم یافتوں کا قدیم طبقہ تھا، اور اب نئی حکومت کے جدید دفاتر اور خدمات کے لئے نئے قائم شدہ سرکاری مدارس، اور یونیورسٹیوں سے ملک روشناس ہو رہا تھا۔ یہی جدید تعلیم یافتوں کا نیا گروہ تھا، جو خاص قسم کی ذہنیت لے کر آبادیوں میں پھیل رہا تھا، یا پھیلایا جا رہا تھا۔

گو واضح اور صریح شہادت تو میرے پاس نہیں ہے۔ لیکن دارالعلوم کے اس شش سالہ نصاب اور جو تبدیلیاں آئے دن اس نصاب میں ہوتی رہیں۔ انکو دیکھ کر یہی سمجھ میں آتا ہے، کہ چھ سال والے اس نصاب کو درس نظامیہ والے مولویوں نے تو اس لئے قبول نہیں کیا کہ سلمیات اور زواہد سے بھی یہ نصاب خالی تھا، اور میبذی کے سوا فلسفہ کی کوئی کتاب اس نصاب میں نہیں رکھی گئی تھی۔[1]

عام طور پر درس نظامیہ کے مولویوں میں دیوبند سے فارغ ہونے والوں کے متعلق ہلکے ہونے کا تصور لفظی نعرہ مشہور تھا۔ کہتے ہیں، کہ نظامیہ نصاب کے پڑھانے والے ایک مشہور و معروف

---

[1] سلمیات سے میری مراد محب اللہ بہاری کا مشہور منطقی متن "سلم" اور اسکی شروح حمد اللہ، قاضی مبارک، شرح سلم بحر العلوم، ملا مبین وغیرہ ہیں، زواہد ثلاثہ، عالمگیری عہد کے ایک معقولی مولوی مرزا زاہد کی تین کتابیں ہیں، جو میر زاہد ملا، میر زاہد ملا جلال، میر زاہد شرح مواقف کے ناموں ہی سے مشہور ہیں، مرزا زاہد کی ان کتابوں کے ساتھ نظامی مولویوں کے والہانہ شغف کا یہ حال تھا کہ جب تک ان تینوں یا ان میں سے کسی ایک کتاب پر اپنا خاص حاشیہ مولوی نہ لکھتا تھا، مستند مولویوں میں شمار نہیں ہوتا تھا۔ یہی حال سلم اور اس کی شروح کا تھا۔ ان کتابوں کی افادیت کے متعلق ہمارے علماء کا غلو اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ ندوۃ العلماء کے اجلاس میں نظامی نصاب کی ترمیم کا مسئلہ پیش کرتے ہوئے یہ تجویز جب سامنے آئی کہ ایسا غوجی منطق کے رسالہ کو نصاب سے خارج کر دیا جائے تو صدیار جنگ نواب حبیب الرحمٰن مرحوم مغفور رحمۃ اللہ علیہ جو اس اجلاس میں خود شریک تھے۔ اکثر اس قصہ کا ذکر کیا کرتے تھے کہ تین دن تک اس مسئلہ پر بحث ہوتی رہی۔ علماء کی اکثریت کو اصرار تھا کہ علم کی بنیاد ہی اکھڑ جائیگی اگر ایسا غوجی کو نصاب سے خارج کیا گیا۔ ۱۲

مولوی صاحب کا دستور تھا اگر ان سے پڑھنے والے طلبہ میں کوئی طالب علم کسی مسئلہ پر الجھنے لگتا اور نافہمی سے کام لیتا تو مولوی صاحب کہتے "دیکھو! اس کا چہرہ دیوبند کی طرف تو نہیں ہے" ظاہر ہے کہ یہ حال زیادہ دن تک قابل برداشت نہیں رہ سکتا تھا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دارالعلوم کے نصاب میں درس نظامیہ کی ایک ایک معقولی کتاب اپنے تمام منہیات و حواشی کے ساتھ اسی طرح بہ تدریج شریک ہوتی چلی گئی، جن کو خارج کرکے نصاب کو چھ سال کی محدود مدت میں ختم کرانے کا انتظام کیا گیا تھا۔

اسی طرح دارالعلوم کی رودادوں میں یہ بھی دیکھا جاتا ہے، شاید میں نے کہیں ذکر بھی کیا ہے، کہ فارسی ادب کی کتابوں کے درس کے اضافہ کو قرین مصلحت قرار دیا گیا، اور اسی سلسلہ میں گلستان بوستان کے ساتھ ابوالفضل، سکندرنامہ، انوار سہیلی، یوسف زلیخا، عبدالواسع، انشاء خلیفہ وغیرہ کتابوں کو بھی دارالعلوم کے درسی نصاب میں ہم شریک پاتے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس سے ملک کے قدیم تعلیم یافتہ طبقہ کی تسکین کا کام لیا گیا۔

اسی کے ساتھ میرا ذاتی تاثر یہ بھی ہے، کہ اس شش سالہ نصاب میں بھی ادب عربی کی نظم و نثر اور ترجمہ کو داخل کرکے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے، کہ سرکاری مدارس کے جدید تعلیم یافتوں کے اس مطالبہ کی تکمیل کی گئی تھی، کہ انگریزی زبان پڑھنے والے انگریزی میں بولنے اور لکھنے کی قدرت حاصل کرلیتے ہیں۔ لیکن مولویوں پر حیرت ہے کہ سالہا سال تک کہتے ہیں کہ انہیں عربی زبان ہی میں سب کچھ پڑھایا جاتا ہے، لیکن نہ ایک جملہ وہ بول ہی سکتے ہیں، نہ لکھ سکتے ہیں۔ ان کو اس سے بحث نہ تھی کہ ہندوستان کے مولویوں کے لئے عربی بولنے یا لکھنے کی ضرورت کیا ہے۔ لیکن چونکہ انگریزی پڑھنے والے انگریزی بولتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ عربی پڑھنے والے مولوی بھی عربی میں بول کر اور لکھ کر ہم کو دکھائیں۔ گویا اس کمال کے بغیر جدید تعلیم یافتہ طبقہ مولویوں کو مولوی ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ ان ہی کے مطالبہ کی تکمیل عربی ادب کی کتابوں کو نصاب میں داخل کرکے کی گئی تھی۔

بہرحال اسی کشمکش میں علم کا جو آشیانہ بن رہا تھا، قدرتاً ہر ایک کا دباؤ اس پر پڑنا ہی چاہیے تھا،

اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دارالعلوم کا تعلیمی نصاب کافی بوجھل اور عریض و طویل ہوتا چلا گیا' اسی نصاب کے ختم کرنے میں پڑھنے والوں کی عمر کا کافی حصہ صرف ہونے لگا' اور دینی تعلیم پانے کی وجہ سے عمر ثانی کے آلات (ریش و بروت) سے بھی کش مکش کا موقعہ ان کے لئے باقی نہ تھا' حقیقت کے چہرے پر مجاز کی نقاب چڑھانے سے مذہباً وہ معذور تھے' ظاہر ہے کہ لمبی لمبی داڑھیوں کے ساتھ سرکاری مدارس میں داخل ہو کر پڑھنے کی صورت ہی کیا تھی؟ اور یوں سیدنا الامام الکبیر کا تعلیمی نصب العین صرف ایک تاریخی نصب العین بن کر رہ گیا' عوام کے مطالبہ کی نوعیت ہی ایسی ہوتی ہے' جس سے قطع نظر کر کے کام کرنا آسان نہیں ہے' اور توارد اسی شش سالہ نصاب میں' عربی ادب کی نثر و نظم اور ترجمہ کا کافی زور جو نظر آتا ہے' میں تو نہیں سمجھتا کہ خالص اسلامی علوم (قرآن و حدیث فقہ و کلام وغیرہا) کی عربی عبارتوں کے سمجھنے کے لئے سیدنا الامام الکبیر جیسے دیدہ ور حضرات نصاب میں اس غیر ضروری اضافہ کو اسی طرح ناگزیر قرار دیتے تھے' جیسے حقائق و واقعات سے جو ناواقف ہیں' کچھ یہی باور کئے ہوئے ہیں۔

ممکن ہے میرا یہ خیال غلط ہو' لیکن اپنا ذاتی احساس یہی ہے' کہ ادب عربی میں ناقص رہ جانے کا جو اعتراض جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے مولویوں پر کیا جاتا تھا' اس اعتراض کا ازالہ کر کے چاہا گیا تھا کہ مولویوں سے انگریزی خواں مسلمانوں کو مانوس بنایا جائے' یہی دیکھا بھی گیا کہ شروع شروع میں ان ہی مولویوں کو حسن قبول جدید تعلیم یافتوں میں حاصل ہوا' جنہوں نے کسی نہ کسی طرح عربی ادب کی مہارت کا ثبوت اس زمانہ میں پیش کیا تھا۔ اور اس سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے' کہ مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی درس نظامیہ کے معقولاتی مولویوں کے مقابلہ میں زیادہ رعایت نصاب مرتب کرنے والوں کے مد نظر تھی۔

آخر اگر یہ نہ مانا جائے' تو پھر اس واقعہ کی کیا توجیہ کی جائے' کہ نظامیہ درس کی اکثر و بیشتر معقولاتی کتابیں خارج کر دی گئیں۔ وہی کتابیں جن کے پڑھے بغیر نظامی درس کے مولویوں کا عام خیال تھا کہ طالب علم سطحی بن کر رہ جاتا ہے۔ لیکن عربی ادب کی ایسی کتابیں جن کے نام سے بھی شاید اس زمانہ کے نظامی مولوی عموماً واقف نہ تھے' مثلاً کلیلہ دمنہ' تاریخ یمینی وغیرہ کا اضافہ شش سالہ نصاب میں کیا گیا'

اور کسی طرف سے کوئی مخالفانہ آواز مجلس شوریٰ میں نہیں اٹھائی گئی، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ درس نظامیہ کی خارج شدہ معقولاتی کتابیں سیدنا الامام الکبیر کی زندگی ہی میں جیسا کہ روداد وں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، تدریجاً دارالعلوم کے نصاب میں شریک ہوتی چلی جاری تھیں۔ سطحیت کا الزام دارالعلوم کے فیض یافتوں پر نظامی درس کے معقولاتی مولویوں کی طرف سے جو مسلسل لگایا جارہا تھا، اور طعن و تشنیع تعریض و تضحیک کا جو طوفان اٹھایا گیا تھا، اس کا مقابلہ آخر کب تک کیا جاتا، لیکن بایں ہمہ اس کا بھی پتہ چلتا ہے، کہ حلقۂ دیوبند کے بعض ذمہ دار اکابر آخر وقت تک اسی پر اصرار فرماتے رہے، کہ قدیم فلسفہ کی کتابوں سے دارالعلوم کے نصاب کو پاک رکھا جائے۔ ان اکابر میں سب سے زیادہ نمایاں سیدنا الامام الکبیر کے رفیق الدنیا والآخرۃ حضرت مولنا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات تھی حضرت والا کی وفات کے بعد دارالعلوم کے مستقل سرپرست اپنی زندگی کے آخری دنوں تک آپ ہی رہے، مسلمانوں کے شاندار ماضی میں مولنا محمد میاں صاحب نے بھی آپ کی مخالفت کا تذکرہ کیا ہے۔ بلکہ مکاتیب رشیدی میں حضرت گنگوہی کا خط مولنا صدیق احمد مرحوم کے نام جو پایا جاتا ہے، جس میں دارالعلوم دیوبند کے متعلق مولنا صدیق احمد صاحب کے ایک خواب کی تعبیر درج کرتے ہوئے ارقام فرمایا گیا تھا کہ

"مگر دیوبند کے مدرسہ کے خواب کی البتہ ضرورت تعبیر ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے، کہ اس حقیر کا خیال ہر روز یہ ہے، کہ فلسفہ محض بے کار امر ہے، اس سے کوئی نفع معتد بہ حاصل نہیں، سوائے اس کے کہ دو چار سال ضائع ہوں، اور آدمی خرد ماغ، اجنبی دینیات سے ہوجائے، فہم کج، و کج فہم شرعیات سے ہوجائے، اور کلمات کفریہ زبان سے نکال کر ظلمات فلاسفہ میں قلب کو کدورت ہوجائے، اور کوئی فائدہ نہیں"

اسی کے بعد یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ

"لہٰذا اس فن خبیث کا مدرسہ سے اخراج کر دیا تھا، چنانچہ ایک سال سے اس کی پڑھائی مدرسہ دیوبند سے موقوف کر دی گئی ہے"

آگے لکھا ہے کہ

"مگر بعض بعض مدرسین اور طلبہ کو خیال اس کا (یعنی فلسفہ کا) چلا جاتا ہے اور شاید خفیہ درس بھی اس کا ہوتا ہو" مثلاً مکاتیب رشیدی

مکتوب گرامی کے آخر میں تاریخ رمضان ۱۳۱۳ھ کی درج ہے جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ جیسے شش سالہ نصاب سے میبذی کے سوا فلسفہ کی ساری کتابیں اور معقولات کا سارا طومار دیوبند کے تعلیمی نصاب سے سیدنا الامام الکبیر کی زندگی میں خارج کر دیا گیا تھا۔ اسی طرح آپ کی وفات کے بعد داخل ہونے کے بعد کچھ دنوں کے لئے پھر فلسفہ کی کتابیں مدرسہ بدر ہوئیں۔ لیکن مولویت کا اس زمانہ میں جو ماحول تھا اس نے پھر مجبور کیا اور سڑی ہوئی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے میں لوگ پھر وقت ضائع کرتے رہے اور آج تک "اضاعت اوقات" کا وہی سلسلہ جاری ہے۔ چونکہ دار العلوم کی تاریخ میں معقولاتی کتابوں کی بے قدری اور بے ثمری کا خیال ابتداء ہی سے شریک ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پڑھنے کی حد تک ان کتابوں کو لوگ پڑھتے بھی رہے اور پڑھانے والے پڑھاتے بھی رہے، کافی وقت طلبہ کا اس میں صرف ہوتا ہے، لیکن حوصلہ شکن موروثی روایات نے اس توجہ و محنت سے اس فن کو محروم رکھا جس کی کوہ کندن، کاہ برآوردن کے اس شغل میں ضرورت ہے اور یوں ذہنی ورزش، فکری ریاضت کا فائدہ جیسا کہ سمجھا جاتا ہے عموماً طلبہ کو میسر نہ آسکا۔ ضرورت سے زیادہ اور بہت زیادہ طول کلامی سے اس موقعہ پر مجھے کام لینا پڑا، لیکن کرتا کیا؟ سیدنا الامام الکبیر کا صحیح تعلیمی نصب العین نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ اس کو سمجھانا، وثائق و شواہد سے دعویٰ کو مدلل کرنا اور سب سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ جب یہی چاہا گیا تھا کہ اسلامی و دینی علوم کی صلاحیت اور ان علوم سے کافی مناسبت پیدا کرا لینے کے بعد جدید علوم اور نئی علمی زبانوں سے استفادہ کا موقعہ مسلمان بچوں کے لئے فراہم کیا جائے۔ تو پھر ایسا کیوں نہ ہوا؟ اور تقریباً ایک صدی کی طویل تاریخ میں کوئی ایک "نمونہ" بھی اس تعلیمی نصب العین کے مطابق دیوبند کا دار العلوم پیش نہ کر سکا۔ یقیناً یہ کافی اہم اور دشوار سوال تھا۔ واقعات کی روشنی میں اس کا صحیح جواب اگر نہ دیا جاتا تو اس تعلیمی نصب العین کا سیدنا الامام الکبیر کی طرف انتساب کا دعویٰ، شاید

میرا ذاتی رجحان' یا صرف خوش اعتقادی بن کر رہ جاتا۔

بہت سے مخفی پہلو' اور دقیق اسباب پھر بھی باقی رہ گئے' لیکن واضح اسباب جن کی وجہ سے آپ کا تعلیمی نصب العین بر روئے کار نہ آسکا۔ اور قدیم و جدید علوم والسنہ کے پیوند' وگرہ اندازی کی جو مہم آپ سر کرنا چاہتے تھے۔ افسوس ہے کہ دار العلوم دیوبند کا نظام تعلیم مان لینا چاہیئے کہ اس وقت تک اس کے سر کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اگرچہ بہ تدریج جو حالات پیش آئے' اور مسلسل پیش آتے چلے جارہے ہیں۔ جن کی ان پر نظر ہے' وہ یہ امید قائم کرسکتے ہیں' کہ جو مہم اب تک سر نہ ہوسکی' اس کے سر کرنے کے لئے جس زمین کی ضرورت تھی' وہ بحمد اللہ چند در چند وجوہ سے کہا جاسکتا ہے کہ تیار ہوچکی ہے[1]۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذٰلک امرا۔

یہ عجیب بات ہے' کہ سیدنا الامام الکبیر کے تعلیمی نصب العین یعنی خالص اسلامی' اور دانش ہندی کے قدیم علوم سے فارغ ہونے کے بعد' سرکاری مدارس میں داخل ہوکر جدید علوم و فنون کو حاصل کیا جائے اس نصب العین کے مطابق جیسا کہ عرض کرچکا ہوں' اپنی پوری تاریخ میں دار العلوم دیوبند کسی "صحیح نمونہ" کو پیش کرنے سے اگرچہ اس وقت تک قاصر رہا ہے۔ لیکن ۱۳۲۸ھ میں عام دستاربندی کے لئے مشہور تاریخی اجتماع دار العلوم دیوبند میں جو ہوا تھا' جس میں پہلی دفعہ دیوبندی علماء کے جلسے میں جدید تعلیم یافتہ کی

[1] میرا مطلب یہ ہے کہ نظامی درس کے معقولات کی ہوا بھی اکھڑ چکی ہے' اور مغل دربار کے دفتریوں کی اولاد فارسی ادب کی اس اہمیت کو بھلا چکی ہے' جو صرف عدو قی روایات کی پیداوار تھی' اہل بصیرت پر عربی زبان کی دونوں قسموں کی نوعیت واضح ہوچکی ہے' یعنی خالص اسلامی علوم (قرآن و حدیث و فقہ وغیرہ) کی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے سمجھنے سمجھانے کے لئے عربی زبان کے جس حصہ سے واقفیت کی ضرورت ہے' وہ اس حصہ سے بالکل مختلف ہے' جس کی ضرورت صرف ان ہی لوگوں کو ہے' جو عربی زبان کے جاہلی و اسلامی ادبی ذخیروں پر عبور حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایسے قدرتی تغیرات ہیں' جن کی وجہ سے خالص اسلامی علوم کے نصاب میں کافی گنجائش اس بات کی پیدا ہوچکی ہے کہ جدید علوم و فنون کی تعلیم حاصل کرنے اور سرکاری مدارس میں داخل ہونے کیلئے بطور مقدمہ کے جن چیزوں کے سکھانے کی ضرورت ہے' ان کو نصاب میں شریک کرکے قدیم و جدید علوم میں سیدنا الامام الکبیر کے تعلیمی نصب العین کے مطابق رشتہ قائم کرنے کیلئے راہ درست کی جائے۔ خاکسار نے اپنی کتاب نظام تعلیم و تربیت میں بجائے ثنویت کے نظام تعلیم کی وحدت کا نظریہ جو پیش کیا ہے' اس میں بھی اس مسئلہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

بعض ممتاز او رسربرآوردہ ہستیاں شریک ہوئی تھیں، علیگڑھ کالج جو اب مسلم یونیورسٹی بن چکا ہے اس کی طرف سے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم گویا نمائندہ بن کر اس جلسہ میں تشریف فرما ہوئے تھے۔ اس وقت پھر یہی " قدیم و جدید علوم کے پیوند" کا مسئلہ چھڑا، اور چاہا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر کے نصب العین کے بالکل برعکس ترتیب ہی کا اس سلسلہ میں تجربہ کیا جائے۔ یعنی جدید علوم و فنون کے گریجویٹوں کو دارالعلوم دیوبند میں داخل کر کے اسلامی علوم و فنون کی تعلیم سے استفادہ کا موقعہ دیا جائے۔ تجویز پاس بھی ہوئی، اور اس کے مطابق علیگڑھ کالج کے گریجویٹ دیوبند کے مدرسہ میں زیر شریک بھی ہوئے۔ لیکن نتیجہ اس کا کیا ہوا؟ ناظم جمعیت العلماء مولانا سید محمد میاں صاحب اپنی کتاب " علماء ہند کا شاندار ماضی " میں یہ لکھتے ہوئے، کہ

"اس کا (یعنی اس تعلیمی ترتیب کا) ثمرہ نہایت تلخ تھا"

آگے وہی اطلاع دیتے ہیں کہ

"پہلی مرتبہ جو علیگڑھ سے عربی حاصل کرنے کے لئے آئے وہ انگریز کے سی۔ آئی۔ ڈی تھے جنہوں نے حضرت شیخ الہند کو گرفتار کرانے میں وطن دوستی اور قوم پروری کا حق ادا کر کے انگریز بہادر سے سپرنٹنڈنٹ سی۔ آئی۔ ڈی کا عہدہ حاصل کیا" صفحہ ۱۱ حصہ پنجم

اب جب کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بھی زندان خاکی سے آزاد ہو کر اپنے سلف صالحین تک عزد مقتدر کے مقعد صدق میں پہنچ چکے، اور ان کا دشمن انگریز بھی ملک کو خالی کر کے جا چکا۔ اس "ثمرہ تلخ" کی اجمالی خبر کی تفصیل فضول ہے۔ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا، اور میں نہیں سمجھتا کہ جس تلخی کا تجربہ ہوا، سیدنا الامام الکبیر کے نصب العین کے معکوس ترتیب کا تجربہ آخر اس کے سوا کس ثمرہ کو پیدا کرتا، انسانی جبلت کا یہ فطری قانون ہے، کہ خام عمری میں جس رنگ کو بھی پختہ کر دیا جائے، وہی پختہ ہو جاتا ہے۔ پختہ رنگ کا ازالہ کر کے نئے رنگ کا چڑھانا آسان نہیں ہے۔ سیدنا الامام الکبیر کی حکیمانہ بصیرت نفسیات انسانی کے اس راز کو تجربہ سے پہلے اگر نہ پالیتی تو اور کون پاتا۔

باقی میں نے افواہاً یہی سنا ہے، اور مولانا سید محمد میاں نے بھی لکھا ہے کہ معکوس ترتیب کے

کے تجربہ کے ساتھ ساتھ تجویز کا ایک جزء یہ بھی تھا کہ دارالعلوم سے فارغ ہونے والوں میں سے بھی انتخاب کر کے جدید علوم کی تعلیم کے لئے کچھ لوگوں کو علیگڈھ بھیجا جائے۔ گویا دوسرے لفظوں میں سیدنا الامام الکبیر کے تعلیمی نصب العین کے تجربہ کا بھی کہا جاتا ہے کہ ارادہ کیا گیا تھا۔ مولانا سید محمد میاں صاحب نے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"صاحبزادہ آفتاب احمد خان نے تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کے تعلیم یافتہ علیگڈھ کالج انگریزی پڑھنے جایا کریں" ص۱۱۱

اس کا مطلب یہی ہے۔ لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، ترتیب معکوس کا عملی تجربہ تو یقیناً کیا گیا، شاید دارالعلوم میں ایک سے زیادہ گریجویٹ، یا انڈر گریجویٹ حضرات شریک کرلئے گئے، اور اپنی بے سروسامانی کے باوجود میرا علم یہی ہے کہ ان میں بعضوں کو مدرسہ سے امداد (تعلیمی وظیفہ یا خوراک وغیرہ) کی شکل میں دی گئی۔ لیکن علیگڈھ بھی دیوبند سے اپنے خرچ، یا کالج کے خرچ پر کوئی بلایا گیا، شاید ایسی کوئی صورت عملاً پیش نہ آئی، کاش! ایک دو نمونے بھی سیدنا الامام الکبیر کے تعلیمی نصب العین کے مطابق تیار ہو جاتے، تو شاید معکوس ترتیب کے تجربہ کی تلخیوں کی تلافی کی کوئی صورت نکل سکتی تھی، لیکن یہ مسئلہ

خداوندان نعمت را کرم نیست

کریماں را بدست اندر درم نیست

کے جھولوں ہی میں جھولتا رہا، اور آج تک جھول رہا ہے۔

بہر حال دارالعلوم کے تعلیمی نصاب پر سیدنا الامام الکبیر کے تعلق سے جو کچھ کہنے کی ضرورت تھی، آپ اسے پڑھ چکے، البتہ اسی سلسلہ میں حضرت والا کے رفیق الدنیا والآخرہ مولانا گنگوہی کے گرامی نامہ سے فلسفہ کے متعلق جو الفاظ نقل کئے گئے ہیں، ممکن ہے کہ پڑھنے والوں کو کچھ زیادہ درشتی اور تلخی ان الفاظ میں محسوس ہوئی ہو۔ لیکن جب یہ سوچا جاتا ہے، کہ خواہ کتابوں میں "فلسفہ" کی فنی تعریف کچھ بھی کی جاتی ہو۔ لیکن واقعہ یہ ہے، کہ کائنات کے متعلق انسانی فطرت میں

بنیادی[1] سوالات جو پیدا ہوتے ہیں، ان سوالوں کے حل کی قدرتی راہ، یعنی وحی و نبوت سے بے نیازی اختیار کر کے جاننے بغیر اپنے اپنے زمانہ کے چرب زبانوں نے خود تراشیدہ وسوسوں کے جس مجموعہ کو فرض کر کے مشہور کر دیا کہ یہی ان بنیادی سوالوں کا صحیح جواب ہے، اسی کا نام "فلسفہ" رکھ دیا گیا، چونکہ ان جوابوں کا تعلق حقائق و واقعات سے نہیں ہوتا، بلکہ مفروضہ اوہام سے زیادہ وہ اور کچھ نہیں ہوتے، اسی لئے مقبول ہونے کے بعد تھوڑے تھوڑے دنوں پر ہر زمانہ کا فلسفہ مسترد ہوتا رہا ہے پہلے بھی یہی ہوتا رہا ہے، اور اب بھی ہو رہا ہے، آئندہ بھی یہی ہوتا رہے گا۔ ہمارے درس نظامیہ کے تدریسی حلقوں میں فلسفہ کے نام سے جو کچھ پڑھایا جاتا تھا، وہ اس زمانہ میں جس میں حضرت گنگوہیؒ نے یہ خط لکھا ہے، قطعی طور پر مردہ ہو چکا تھا۔ لیکن ہمارے علماء محض موروثی روایات کے زیر اثر اسی مرحوم و مدفون فلسفہ کی کتابیں پڑھاتے چلے جا رہے تھے، آپ ہی بتائیے کہ طلبہ کا قیمتی وقت اور عمر کا گرانمایہ حصہ ایک ایسے مہمل مشغلہ میں جو برباد ہو رہا تھا، اس پر سنجیدہ دماغوں کو جتنا بھی غصہ آئے کم تھا۔ دین کے لئے فلسفہ کے مطالعہ کی ضرورت صرف اس لئے ہوتی ہے، کہ فلسفہ کی راہ سے خام عقلوں کو جن مغالطوں میں مبتلا کر دیا جاتا ہے، ان کا ازالہ کیا جائے۔ اس لحاظ سے بجائے اس مسترد اور مردہ فلسفہ کے کچھ ضرورت تھی تو اس بات کی کہ اس زمانہ میں "فلسفہ" کے نام سے جن خیالات کو حسن قبول حاصل ہو رہا تھا، جو ظاہر ہے کہ مغرب کا جدید فلسفہ ہی ہو سکتا تھا، لیکن اس کی طرف نظامی درس کے معقولی علماء نگاہ غلط انداز بھی ڈالنا پسند نہیں کرتے تھے۔ سیدنا الامام الکبیر قدیم علوم کا جدید علوم سے جو رشتہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ حضرت والا کے منشاء کے مطابق یہ رشتہ اگر قائم ہو جاتا، تو بجائے اس مردہ فلسفہ کے یورپ کے "جدید فلسفہ" کے مطالعہ کا موقعہ ہمارے علماء کے لئے بآسانی

[1] یعنی یہ کائنات جن میں انسان بھی شریک ہے کیا ہے، اس کی ابتدا کیا ہے انتہا کیا ہے۔ اس کا مدعا کیا ہے، یہی وہ بنیادی سوالات ہیں، جن کے صحیح جوابوں کا علم حاصل کئے بغیر عالم کا یہ سارا نظام صرف گونگے کا ایک خواب بنکر رہ جاتا ہے، مذہب یا دین درحقیقت ان ہی سوالوں کے ان جوابوں کا نام ہے، جو وحی و نبوت کی راہ سے بنی آدم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وحی و نبوت کے سوا ان سوالوں کے حل کا کوئی علمی ذریعہ آدمی کے پاس نہیں ہے ۱۲

میسر آسکتا تھا، اور اس وقت بقول سیدنا الامام الکبیر دنیا دیکھ سکتی تھی کہ علماء کی علمی استعداد کیسی ہوتی ہے، کچھ بھی ہو، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مندرجہ مکتوب کے الفاظ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ علماء دیوبند کلیۃً "عقلی علوم" کے درس و تدریس، مطالعہ و مذاکرہ کے مخالف تھے۔ صحیح نہ ہوگا۔

آخر میں پوچھتا ہوں کہ مطلقاً عقلیات کے اگر وہ مخالف ہوتے تو شش سالہ نصاب میں بھی نصف درجن سے زیادہ چھوٹی بڑی کتابیں منطق کی کیوں باقی رکھی جاتیں۔ اور مفتی مبارک علی صاحب حال نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند، براہ راست مولنٰا سید برکات احمد بہاری ثم ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ سے سن کر جس قصہ کے راوی ہیں۔ یعنی مولنٰا برکات احمد مرحوم مفتی صاحب سے فرماتے تھے، کہ آج فلسفہ اور منطق کے درس و تدریس میں غیر معمولی شہرت مجھے جو حاصل ہوئی ہے، اس کو میں حضرت مولنٰا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی کرامت سمجھتا ہوں، کہتے تھے کہ بچپن میں ایک دفعہ اپنے والد مرحوم حکیم مولنٰا دائم علی خاں صاحب مرحوم کے ساتھ حضرت نانوتویؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، میرے والد نے حضرت والا سے استدعاء کی کہ اس بچے کے لئے دعاء فرمائی جائے، مولنٰا برکات احمد صاحب کا بیان ہے کہ

"حضرت مولنٰا نانوتوی کی زبان سے بے ساختہ نکلا، کہ اللہ تعالےٰ اس کو علم معقول میں کمال عطا فرمائے"

سننے کے ساتھ کہتے تھے کہ میرے والد حکیم دائم علی صاحب نے عرض کیا کہ

"حضرت نے یہ کیا دعا فرمائی، میری تمنا تو یہ ہے، کہ اس کو فقہ اور دین کا علم حاصل ہو"

مفتی صاحب کا بیان ہے کہ اس کے جواب میں حضرت نانوتویؒ نے جو کچھ فرمایا تھا، الفاظ تو یاد نہیں رہے، لیکن مولنٰا برکات احمد صاحب کی روایت کے مطابق خلاصہ اس کا یہی تھا کہ فتنے کے اس زمانہ میں

"دین پر قائم رہنا علم معقول حاصل کئے بغیر دشوار ہے"[1]

[1] مفتی مبارک علی صاحب دام مجدہ نے اپنے ایک نوازش نامہ میں جو فقیر کے نام انہوں نے لکھا تھا (باقی اگلے صفحہ پر)

گویا خود "دین" پر استقامت کے لئے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ "عقلیات" کے مطالعہ کی ضرورت محسوس فرماتے تھے، اور کیسی ضرورت کہ علم دین کے طالب کو عقلیات کے مطالعہ کا صرف مشورہ ہی نہیں دیا جاتا تھا بلکہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ دعا تک اسی کیلئے کی گئی۔

اور یہ روایت تو خیر مفتی مبارک علی صاحب کی ہے خود "صاحب البیت" حضرت نانوتوی کے لخت جگر فرزند سعید مولانا حافظ محمد احمد مرحوم سے براہ راست خاکسار نے جو قصہ "انگریزی زبان" کے سیکھنے کے متعلق سنا ہے۔ اپنی کتاب نظام تعلیم و تربیت میں تفصیلاً اس قصہ کو درج کر چکا ہوں، حاصل جس کا یہی ہے کہ حج کے سفر میں سیدنا الامام الکبیر جہاز کے کسی یورپین کپتان نے مذہبی سوالات کئے جن کا جواب "ترجمان" کے ذریعہ دیا گیا، کپتان آپ کے جوابوں سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوا، اس نے وعدہ بھی کیا تھا کہ ہندوستان آنے کا موقعہ ملا تو آپ کی خدمت میں حاضر ہونگا، حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے بعد عزم کر لیا تھا کہ حج سے فارغ ہونے کے بعد

---

(گذشتہ صفحہ سے) اس روایت کا تذکرہ فرمایا ہے یہ بھی اسی خط میں ہے کہ حکیم صاحب قبلہ نے تمام سرونج اس قصہ کو جس مجلس میں بیان کیا تھا، اس میں علی صاحب کے ساتھ حکیم فضل الرحمٰن ٹونکی بھی تھے جو مولانا برکات احمد کے خاص تلامذہ میں سے ہیں، تو کہا جا سکتا ہے کہ خیر آبادی خاندان کی عقلیت کا چراغ آخر دنوں میں مولانا برکات احمد صاحب ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ کی شکل میں جو روشن رہا، پس پردہ بانی دارالعلوم دیوبند کی دعا ہی سے اسے امداد ملی تھی، اس سلسلہ میں قدرتاً حضرت مرشد تھانوی کا وہ قول یاد آتا ہے جو بھی فرماتے تھے کہ ہم جیسا بخاری کے مطالعہ میں اجر سمجھتے ہیں میرزاہد امور عامہ کے مطالعہ میں بھی ویسا ہی اجر سمجھتے ہیں" (رسالہ النور ماہ ربیع الاول ۱۳۵۲ھ) اور اپنے استاد دارالعلوم دیوبند کے صدر اول مولانا محمد یعقوب صاحب علماء دیوبند کے استاذ الاساتذہ کا یہ قول بھی وہی نقل فرماتے تھے کہ "ہم کو تو امید ہے کہ جیسے بخاری اور مسلم کے پڑھانے میں ہم کو ثواب ملتا ہے، ایسے ہی فلسفہ کے پڑھانے میں بھی ملے گا" آخر میں فرماتے کہ "ہم اعانت فی الدین کی وجہ سے فلسفہ کو پڑھتے پڑھاتے ہیں (قصص الاکابر) اور صرف فلسفہ ہی نہیں، بلکہ حضرت مولانا یعقوب کا مذاق مطالعہ کے باب میں کتنا وسیع تھا، اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے، فرمایا کرتے تھے، کہ میاں اگر گالیوں کی کتاب بھی ہو، تو اس کو بھی دیکھ لینا چاہئے، اور کچھ نہیں تو دو چار گالیاں ہی یاد ہو جائیں گی" (قصص) سچ تو یہ ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی کتابوں کا مطالعہ صحیح معنوں میں وہی کر سکتے ہیں اور وہی ان کی تصنیفات سے مستفید ہو سکتے ہیں، جنہوں نے کسی نہ کسی حد تک عقلی علوم کا مطالعہ کیا ہو۔

ہندوستان پہنچکر میں خود انگریزی زبان سیکھنے کی کوشش کروں گا۔حضرت نانوتوی ؒ کا احساس تھا کہ ترجمان کے بغیر براہ راست تقریر سے کپتان زیادہ متاثر ہو سکتا تھا۔

مطلب جس کا یہی ہو سکتا ہے کہ دوسروں تک دین کی دعوت کو پہنچانے کیلئے انگریزی جیسی زبانوں کے سیکھنے کو بھی حضرت والا نے اپنے "دینی مجاہدات" کی فہرست میں شامل کر لیا تھا' اور حج سے واپسی کے بعد ہی آپ کا وقت پورا نہ ہو جاتا' تو کون کہہ سکتا ہے کہ آپ کا یہ عزم پورا ہونے سے رہ جاتا۔

آپ ہی بتائیے کہ "مذکورہ بالا معلومات" جن کا ذکر متن اور حاشیہ میں کیا گیا ہے۔ ان سے واقف ہونے کے بعد کیا علماء دیوبند کی طرف "تنگ نظری" کے الزام کے عائد کرنے کی اب بھی کوئی جرأت کر سکتا ہے۔مولنا سید محمد میاں نے اپنی کتاب "علماء ہند کا شاندار ماضی" میں حضرت الاستاذ مولنا سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق یہ لکھتے ہوئے کہ

"جملہ علوم عقلیہ و نقلیہ میں حضرت کو بھی کمال حاصل تھا' کسی فن کی کوئی کتاب ملی' اسکو شروع سے آخر تک ایک بار ضرور مطالعہ فرما لیا"

یہ اطلاع بھی دی ہے

"آپ نے بعض مخصوص تلامذہ کو سائنس جدید کی کتاب بھی پڑھائی تھی"

غالباً جدید سائنس یہ وہی ابتدائی کتاب ہے' جسے بیروت کی یونیورسٹی نے عربی زبان میں تالیف کر کے شائع کیا تھا' یہ بھی اسی کتاب میں ہے کہ شاہ صاحب رحمہ اللہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے' کہ

"اب علماء کو قدیم فلسفہ وہیئت کے ساتھ جدید فلسفہ وہیئت کو بھی حاصل کرنا چاہئے"

ص ۲۲۲ حصہ پنجم

جتنی مدت دارالعلوم دیوبند کے قیام پر اب تک گذر چکی ہے۔اس کے اول وسط آخر ہر دور میں اس تعلیمی ادارہ سے تعلق رکھنے والی ذمہ دار ہستیاں اپنے جن احساسات و تاثرات کو ظاہر کرتی رہی ہیں چاہئے تو یہی تھا کہ ان کے مطابق کچھ عملی نمونے بھی پیش ہوتے۔لیکن ایسا کیوں نہ ہوا۔اس کا کیا جواب دیا جائے مسلمانان ہند کے تقدیری کرشموں میں اس کو بھی شامل کر لیجئے۔

ایک یہی کیا، دارالعلوم دیوبند کو ہندگیر جامعہ بنانے کے لئے، یہی نہیں کہ ہندوستان بلکہ بیرون ہند کے طلبہ کو مدرسہ میں داخل کر کر کے ملک کے ہر حصہ میں پھیلانے کا کام جو کیا گیا، اور بحمد اللہ اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے، اس کے سوا بھی جہاں تک میرا خیال ہے "سیدنا الامام الکبیر کے زمانہ میں جس کوشش کا آغاز ہو چکا تھا، کچھ بھی اس کو آگے بڑھانے کا ارادہ کیا جاتا، تو غالباً ہندوستان کی عام یونیورسٹیوں کے مقابلہ میں دیوبند ہی کا جامعہ ایسا جامعہ بن جاتا، جس کی براہ راست نگرانی میں بے شمار مدارس ہر ہر صوبہ اور صوبہ کے ہر ضلع، ضلع کے ہر تعلقہ میں چاہئے تو یہی تھا کہ قائم اور جاری نظر آتے۔

واقعہ یہ ہے کہ دیوبند میں مدرسہ کے قیام کے کل دو سال بعد اس قصبہ کے ضلع کا جو صدر مقام تھا، یعنی سہارنپور، وہاں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی گئی، ۱۲۹۲ھ کی روداد میں سیدنا الامام الکبیر کی جو تقریر جلسہ تقسیم اسناد وانعام میں ہوئی تھی، اسی تقریر میں سہارنپور کے اسی عربی و دینی مدرسہ کا ذکر فرماتے ہوئے، ارشاد ہوا تھا،

"مخدوم العلماء و مطاع الفضلاء مولانا سعادت علی سہارنپوری مرحوم کو خیال مدرسہ جس کے باعث اہل سہارنپور نے کمر ہمت باندھ کر دوسرا چشمۂ فیض علم برپا کیا۔"

اسی کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا تھا،

"آج وہ مدرسہ اس مدرسہ کی ہم جہت ہے۔"

ہم جہتی کی تشریح اسی کے بعد ان الفاظ میں کی گئی تھی،

"غرض اصلی اس مدرسہ سے بھی یہی تعلیم علوم دین ہے۔ گویا یہ دونوں ایک دریا کے دو گھاٹ ہیں، جن پر ہزاروں تشنہ لب آتے جاتے ہیں، اور اپنی لیاقت کے موافق اپنا حصہ لے جاتے ہیں، اس نعمت غیر مترقبہ کا شکر کس زبان سے کیجئے۔" روداد ص۱۳ بابت ۱۲۹۲ھ

اور ایک سہارنپور ہی کی خصوصیت نہیں ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ دیوبند میں قیام مدرسہ کے بعد روہیل کھنڈ کی متعدد چھوٹی بڑی آبادیوں میں تدریجاً عربی مدارس کے گویا جال ہی ایسا معلوم ہوتا ہے،

بچے چلے جاتے ہیں۔ مظفر نگر، مراد آباد، رڑکی، خورجہ، منگلور، نگینہ وغیرہ میں آگے پیچھے، مدرسے جو قائم ہوئے، اور بحمد اللہ اس وقت تک ان میں اکثر و بیشتر کسی نہ کسی شکل میں اب تک باقی ہیں، ان کی تاسیس زیادہ تر سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کے چشم و ابرو کے اشاروں ہی کی رہین منت ہے نئے قائم ہونے والے ان مدرسوں کے ساتھ حضرت والا کے غیر معمولی تعلق و توجہ کی نوعیت کیا تھی، اس کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے، کہ نگینہ میں عربی کا مدرسہ جو قائم ہوا تھا، اور صدارت کیلئے حضرت والا ہی نے اپنے تلمیذ رشید مولانا فخر الحسن گنگوہی کا انتخاب فرمایا تھا، کچھ دن بعد اپنے ایک خط میں مولانا فخر الحسن مرحوم نے حضرت نانوتویؒ کو خبر دی کہ مدرسہ باشندگان نگینہ کی لاپروائی کا شکار بنتا چلا جا رہا ہے، شاید یہ بھی لکھا کہ ان حالات میں اب میرا قیام نگینہ میں مشکل ہے، اسی کے جواب میں حضرت والا کے قلم سے جو الفاظ نکلے ہیں، انہیں پڑھئے، جواب کی زبان جیسا کہ اس زمانہ میں دستور تھا، فارسی تھی، ارقام فرمایا گیا تھا کہ

"باقی باطلاع تزلزل بناء مدرسہ نگینہ بدو وجہ رنج دارم، یکے از طرف آن عزیز، دوم از طرف اہل نگینہ، کہ چہ کم حوصلگی کردند"

لہجہ اس کے بعد کافی تند و تیز ہو جاتا ہے، بے ساختہ نوک قلم سے یہ فقرہ نکل پڑا ہے۔

"آہے ہر نعمتے کہ بے سابقہ جد و جہدی رسد تا قدر شناساں ہمیں ساں ضائع می کنند"

بے چین ہو کر اپنی قلبی کیفیت کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا گیا

"یا رب! ایں چہ زمانہ است کہ از شرفاء فہم برگرفتند"

آخر میں نگینہ کے ان ہی شرفاء کے مرض کی تشخیص ان الفاظ میں فرماتے ہوئے کہ

"چوں بنظر غور بنگرم، ایں ہمہ نیرنگ بار بے نیازی ست، صدق رسولہ الکریم "یرفع العلم""

مطلب یہی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے علم کا جو نیا اور قیمتی سرمایہ مسلمانوں کو عطا کیا گیا تھا، اس کی ضرورت کا احساس لوگوں میں باقی نہیں رہا ہے، اسلئے باور کیا گیا ہے کہ مسلمان علم کی

اس نبوی سرمایہ سے بے نیاز اور مستغنی ہو چکے ہیں۔ مشہور حدیث جس میں پیشگوئی کی گئی ہے کہ وقت ایسا بھی مسلمانوں پر آئے گا کہ نبوت کی راہ سے علم کی جو دولت ان کو ملی تھی دینے والا اس کو واپس لے لے گا' وہی پیشگوئی پوری ہو رہی ہے' گویا علم ہی مسلمانوں کو چھوڑ رہا ہے' لیکن وہ سمجھ رہے ہیں' کہ ہم اس کو چھوڑ رہی ہیں۔ آخر میں نگینہ والوں کو اسی خط میں یہ دھمکی بھی دی گئی ہے کہ

"بظاہر چناں می نماید کہ اگر ایں خوان نعمت را از نگینہ خواہند برداشت باز نخواہند گسترانید انا للہ وانا الیہ راجعون" صـ۲ مکتوب یازدہم (مجموعہ قاسم العلوم)

شاید یہی دھمکی کارگر ثابت ہوئی' اسی کا نتیجہ ہے' کہ مدت دراز تک نگینہ کا یہ مدرسہ قائم رہا' اور نگینہ والے کسی نہ کسی طرح اس کو چلاتے ہی رہے۔

بہرحال قصبہ دیوبند کے سوا قرب و جوار کی چھوٹی بڑی آبادیوں میں مدرسے جو قائم ہو رہے تھے' آج تو عموماً یہ مدرسے جداگانہ ہستی' اور مستقل وحدت کی حیثیت میں نظر آتے ہیں۔ لیکن قدیم رودادوں کے جائزے سے اس کا انکشاف ہوتا ہے' کہ کافی مدرسے ان میں ایسے بھی تھے' جو باضابطہ دارالعلوم دیوبند کی مرکزیت کو تسلیم کر کے اس کے ساتھ اسی طرح ملحق تھے' جیسے جدید عصری جامعات اور یونیورسٹیوں کے ساتھ مختلف شہروں میں قائم ہونے والے کلیات اور کالج ملحق ہوا کرتے ہیں۔ ان الحاقی تعلیم گاہوں کی تعلیم و نصاب مدرسین کا تقرر' ان کے امتحانات' ان کی آمد و خرچ کا حساب و کتاب' یہ اور اس قسم کے سارے متعلقہ امور پر براہ راست دارالعلوم کی نگرانی قائم تھی' دستور یہ بھی تھا کہ دارالعلوم کی سالانہ روداد کے ساتھ ان الحاقی مدارس کے نتائج امتحانات' اور آمد و خرچ کے حسابات بھی بطور ضمیمہ التزاماً شریک ہو کر شائع کئے جاتے تھے' ۱۲۹۳ھ یعنی قیام دارالعلوم کے گیارہ سال بعد پرانی رودادوں میں ایک جدید عنوان یہ ملتا ہے' یعنی

"ذکر مدارس شاخہائے مدرسہ اسلامی دیوبند"

پہلی دفعہ ۹۳ھ کی روداد میں اس عنوان کے نیچے یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ

اس مدرسہ کی چند شاخیں بھی بعض اہل اسلام کی ہمت سے جاری ہیں" صـ۱۲

اس اجمال کی تفصیل یہ کی گئی ہے، کہ

"منجملہ ایک انبیٹھہ پیرزادگان' ضلع سہارنپور میں' اور دو تھانہ بھون ضلع مظفر نگر اور شہر مظفر نگر میں اور ایک گلاؤٹھی 'ضلع بلند شہر میں ہے ۔"

جس کا مطلب یہی ہوا کہ نئے قائم ہونے والے عام مدارس میں سے دس گیارہ سال کی مدت میں پانچ مدرسے تو ایسے تھے جن کا باضابطہ قانونی شکل میں الحاق مرکز یعنی دارالعلوم سے ہو چکا تھا' آگے ہر مدرسہ کے متعلق تفصیلی طور پر بتایا گیا ہے کہ ان میں سے کس مدرسہ میں امتحان لینے کے لئے مرکز نے اپنے یہاں سے کن کن مدرسین کو بھیجا۔ ان الحاقی مدارس کو کتنی اہمیت دی جاتی تھی' اس کا پتہ اسی سے چلتا ہے' کہ بجائے عام مدرسین کے عموماً امتحان لینے کے لئے دارالعلوم کے صدر اول مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بنفس نفیس تشریف لے جاتے تھے ۱۲۹۳ھ کی روداد میں گلاؤٹھی کے مدرسہ کے متعلق لکھا ہے کہ

"مولوی محمد یعقوب صاحب مدرس اول نے بہمراہی مہتمم مدرسہ دیوبند اس مدرسہ کا امتحان لیا" ص۴۳

اسی طرح انبیٹھہ کے مدرسہ کے امتحان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"اس مدرسہ کا امتحان سالانہ بھی جناب مولوی محمد یعقوب صاحب مدرس اول مدرسہ دیوبند نے لیا" ص۴۲

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان الحاقی مدارس کو کتنی اہمیت دی جاتی تھی' بلکہ ۱۲۹۳ھ کی روداد میں "اطلاع" کے عنوان سے الحاقی مدارس کے تذکرے کے بعد ایک اعلان بھی شائع کیا گیا تھا' جس میں درج تھا کہ

"ارباب مشاورت مدرسہ دیوبند کے نزدیک جن کے سپرد اب ان مدارس (یعنی الحاقی مدارس) کا امتحان وغیرہ رکھا گیا ہے' مناسب معلوم ہوتا ہے' کہ اگر مہتممان شاخہائے مذکور اپنے اپنے مدارس کے چندہ سے تھوڑی تھوڑی امداد فرمائیں' تو ان مدارس کے امتحان اور نگرانی تعلیم کے لئے ایک گروہ اور مقرر کیا جائے' جو ماہوار یا دوسرے مہینے جیسا کہ اتفاق پڑے' ان مدارس کا امتحان لیا کرے' اور جو کسی قسم کی ابتری یا خرابی دیکھا کرے' تو اس کے دور کرنے کی

حسب رائے مہتمان اس کی تدابیر کیا کرے۔" ص۱۳

اس کا پتہ تو نہ چلا کہ الحاقی مدارس کے مہتمموں پر اس اعلان اور مشورہ کا ردعمل کیا ہوا، لیکن بہر حال اس سے سیدنا الامام الکبیر کے تعلیمی نصب العین کا ایک ایسا پہلو تو سامنے آتا ہے، جس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ سرکاری مدارس کی نگرانی کے لئے جیسے انسپکٹروں کا تقرر حکومت کرتی تھی، چاہا جاتا تھا کہ اس کے مقابلہ میں آزاد تعلیم کا موازی نظام قائم کر کے اس آزاد نظام تعلیم کے تحت چلنے والے مدارس کی نگرانی کیلئے بھی مرکزی دارالعلوم کی طرف سے بھی انسپکٹروں کا تقرر کیا جائے۔ اسی لئے خواہش کی گئی تھی، کہ ہر الحاقی مدرسہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ مرکزی خزانہ میں داخل کرے۔

اس سلسلہ کی ایک دلچسپ خبر ان ہی رودادوں میں یہ بھی درج کی گئی ہے، کہ مشہور قصبہ کیرانہ میں بھی مدرسہ قائم کر کے مرکز سے اس کا الحاق کیا گیا تھا۔ عام چندے کے علاوہ وہاں کے باشندوں سے آمدنی حاصل کرنے کی یہ تجویز بھی پیش کی گئی تھی، جو روداد میں بایں لفظ درج ہے، کہ

"یہاں کے رقبہ میں چاہ بکثرت ہیں، اگر سر چاہ ایک من غلہ مقرر کیا جائے تو بہتر ہے، چنانچہ اس پر اکثر اصحاب راضی ہو گئے ہیں۔" ص۶ روداد ۱۲۹۴ھ

اس تجویز کا ذکر کر کے دارالعلوم کی روداد میں باشندگان کیرانہ کو توجہ دلاتے ہوئے لکھا گیا تھا کہ

"اگر یہ بات چل نکلی، تو پھر دیکھو کہ اس مدرسہ کا کام کس خوبی سے چلتا ہے، اور کیسے کیسے پھل پھول لگتے ہیں۔"

آخر میں یہ لکھتے ہوئے کہ "اب خدمت میں جملہ رؤسا قصبہ کیرانہ، و نواح کیرانہ عرض ہے" یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ

"علم سیکھو سکھاؤ، کہ علم ہی دونوں جہان کی کنجی ہے۔" ص۲

الغرض الحاقی مدارس کی آمدنی سے جہاں چاہا گیا تھا کہ مرکزی دارالعلوم کے خزانہ میں حسب استطاعت کچھ داخل کریں، وہیں ان الحاقی مدارس کی امداد پر بھی لوگوں کو آمادہ کیا جاتا تھا۔

لیکن ظاہر ہے کہ سرکاری مدارس کو حکومت اور حکومت کے خزانہ کی پشت پناہی حاصل تھی، اور

یہاں جو کچھ بھی تھا، سب کا دار و مدار رضاکارانہ خدمات پر تھا، سیدنا الامام الکبیر کے بعد مرکز تعلق پر جمع کرنے والی قوت باقی نہ رہی، نئے مدارس کا الحاق تو آپ کے بعد کیا عمل میں آتا۔ اپنے الحاق کو جو تعلیم گاہیں منظور کر چکی تھیں، بتدریج مضمحل ہوتے ہوئے دارالعلوم سے ان کا رشتہ بھی اتنا کمزور ہو گیا کہ اب رسمی تعلق سے زیادہ شاید ان کی کوئی حیثیت باقی نہ رہی۔[1]

بہر حال تاسیس دارالعلوم کے ابتدائی سالوں ہی میں یہ نصب العین سامنے تھا کہ سارے ہندوستان کے مناسب مقامات پر قومی خزانہ سے دینی تعلیم گاہوں کا جال اسی طرح بچھا دیا جائے، جیسے حکومت کے خزانے سے دنیاوی مدارس ہر جگہ کھولے جا رہے تھے۔ آپ کو مدرسہ کے تیسرے سال یعنی ۱۲۸۵ھ ہی کی روداد میں یہ عبارت مل جائے گی، روداد کے آخر میں خاتمہ کے عنوان سے دعا و شکریہ کی سرخی قائم کر کے منجملہ دوسری باتوں کے یہ اطلاع درج کرتے ہوئے کہ

"نہایت خوشی اپنی ظاہر کرتے ہیں۔ اس امر پر کہ اکثر حضرات باہمت نے اجراء مدارس عربی کو توسیع دینے میں کوشش کر کے مدارس بمقامات مختلفہ دہلی و میرٹھ و خورجہ و بلند شہر و سہارنپور دکن وغیرہ جاری فرمائے" اور دوسری جگہ مثل علیگڈھ وغیرہ اس کار خیر کی تجویزیں ہو رہی ہیں ۔"

آخر میں جامعاتی نصب العین کو ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے کہ

"امید کرتے ہیں، کہ ہم کو بھی وہاں کے حالات و حساب و کتاب سے کبھی کبھی جیسا کہ یہاں کے مہتمم کرتے ہیں، مطلع فرماتے رہیں، تاکہ جو عمدہ انتظام ان کے مدارس میں تجویز ہو، وہ یہاں بھی جاری کئے جایا کریں، اور یہاں سے وہاں، اور نتیجہ اس نیک تدبیر کا یہ ہوگا، کہ انتظام سب جگہ کے قریب یکساں ہو جاویں گے۔" ص۴۳ روداد ۱۲۸۵ھ

[1] دارالعلوم کے ادنیٰ خادم کی حیثیت سے خاکسار جب وہاں مقیم تھا، آج سے تیس چالیس برس پہلے کی بات ہے اس وقت تک اتنا اثر باقی تھا کہ چند خاص مقامات کے مدارس خصوصاً تھانہ بھون کی "بہ پانسی بریلی، نگینہ وغیرہ کے مدرسوں سے ہر سال چند ممتحنوں کو طلب کیا جاتا تھا، کبھی کبھی خاکسار بھی جاتا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب اب یہ رسم قدیم باقی ہے، یا یہ بھی ختم ہو گئی ۱۲ (بحمداللہ اب بھی باقی ہے، اور اس میں وسعت بھی ہو گئی ہے۔ محمد طیب غفرلہٗ)

آخری الفاظ یعنی "انتظام سب جگہ کے قریب یکساں ہو جاویں گے" اسی کو میں جامعاتی نصب العین کہتا ہوں۔

قومی سرمائے سے چلنے والے مدارس کو نظم و ضبط کے وحدانی قالب میں ڈھال دیا جائے، اس دعوے کے ثبوت کے لئے اس سے زیادہ واضح شہادت اور کیا مہیا ہو سکتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقتداری قوت کی پشت پناہی سے محرومی کا احساس کر کے اسی پر لوگوں کو آمادہ کیا جاتا تھا کہ بجائے لاگ ڈانٹ اور رقیبانہ تعلقات کے قومی مدارس میں ربط و ضبط کے مراسم ہی کو باقی رکھا جائے، اور تعلیم کا کوشش کرے کہ جس مدرسہ میں مفید طریقہ کا اختیار کیا جائے، بغیر کسی تعصب اور تنگ نظری کے دوسرے مدارس بھی اسی کو اختیار کریں۔

اب یہ واقعات ہی بتا سکتے ہیں کہ کرنے والوں نے کس حد تک ان قیمتی مشوروں اور تجویزوں پر عمل کیا۔ پیش کرنے والا وہ سب کچھ پیش کر کے جا چکا تھا۔ سوچنے والوں کو وہ سوچنا یا نہ سوچنا، ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری ان ہی لوگوں پر عائد ہو سکتی ہے، جن کے ہاتھوں میں درسِ نظامیہ کی باگ آئندہ سرزمین ہند کے ان مدارس کی آئی۔

تعلیم ہی کے سلسلہ میں ایک نئے اقدام کا پتہ ان ہی پرانی رودادوں سے چلتا ہے، مشکل کے حل ہو جانے کے بعد تو اب اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ لوگوں کو نہیں ہو سکتا، لیکن جس زمانہ میں یہ اقدام کیا گیا تھا، تعلیمی و تدریسی نقطۂ نظر سے شاید وقت کا وہ نازک ترین مسئلہ تھا۔

مطلب یہ ہے کہ مطابع اور پریس سے پہلے مسلمانوں میں ایک مستقل نظام "نقل کتب" کا قائم تھا، میں نے اپنی کتاب "مسلمانوں کے نظام تعلیم و تربیت" میں اس مسئلہ کے متعلق کافی معلومات جمع کر دی ہیں۔ حاصل یہی ہے کہ شہروں اور قصبوں تک میں "وراقیت" اور "نساخیت" یعنی کتابوں کو نقل کر کر کے بیچنے والوں کا ایک گروہ پایا جاتا تھا۔ جو نادر سی نادر کتابوں کے متعلق اپنے پاس معلومات رکھتا تھا کہ کہاں ہیں۔ ان کی نقل کس ذریعہ سے حاصل ہو سکتی ہے، ان امور کی واقفیت کے ساتھ اس کا سامان کئے رہتا تھا کہ فرمائش کے ساتھ ہی ضرورت مندوں تک وہ کتاب نقل کر کے پہنچا دی جائے، معتدل قیمتوں پر

بڑی سے بڑی کتابیں بآسانی ان وراقوں اور نساخوں کے ذریعہ سے مہیا ہو جاتی تھیں، اندازہ کے لئے یہی کافی ہو سکتا ہے کہ جہاں قرآن مجید کا ہدیہ پانچ پانچ سو تنک بھی تھا، وہیں صحیح تاریخی شہادتوں سے یہ بھی ثابت ہے کہ عام معمولی نسخہ ایک ایک تنکہ (روپیہ) میں بھی مل جاتا تھا، جو شاید آج بھی قابل تصور مشکل ہی سے ہو سکتا ہے، اسی کتاب میں مدراس کے مشہور انگریزی روزنامہ "ہندو" کے حوالے سے آپ کو یہ نوٹ بھی ملے گا یعنی ہندوستان میں پریس کا رواج کب سے ہوا، اس کا یہ جواب دیتے ہوئے کہ

"ہندوستان میں سب سے پہلی کتاب ۱۵۵۰ء میں چھپ چکی تھی۔"

گویا آج سے تقریباً چار سو سال پہلے ہی طباعت کا رواج حالانکہ اس ملک میں ہو چکا تھا، مگر باایں ہمہ اسی نے لکھا ہے کہ

"ملک کے مختلف حصوں میں چھاپے خانے بہت کم کھل سکے۔"

جس کی وجہ وہی یہ بیان کرتا ہے کہ

"ہندوستان میں چھاپہ خانوں کی ترقی میں سست رفتاری کی ایک وجہ یہ بھی کہ مشہور کتابوں کی نقل کیلئے خطاطوں کا انتظام مغلوں نے کر رکھا تھا۔" (اخبار ہندو مدراس ۱۹۴۳ء)

مغلیہ عہد کا یہی انتظام مغلوں کی حکومت کے ختم ہونے کے ساتھ درہم و برہم ہو گیا۔ لیکن اس کی جگہ نئی حکومت کی سرپرستی میں یوں قائم ہونے کو تو اس ملک میں مطابع قائم ہونے لگے تھے۔ لیکن عام مشرقی زبانوں کی طباعت و اشاعت کی طرف جیسا کہ چاہئے تھا، حکومت نے کافی توجہ نہ کی، انگریزوں کی ابتدائی عہد حکومت میں دفتر چونکہ فارسی زبان ہی میں تھا، اس لئے فارسی زبان کے پڑھنے پڑھانے کا رواج بھی زیادہ متاثر نہ ہو سکا، اور اس زبان کی خصوصاً درسی کتابیں ہی زیادہ ان مطبعوں میں چھپتی رہیں۔ فارسی کی جگہ انگریزی کے ساتھ حکومت نے اردو کی طرف اپنی توجہ جب مبذول کی، تو اردو کتابوں کی طباعت و اشاعت کا رواج بھی تھوڑا بہت ہوا، لیکن عربی زبان اور اس زبان میں مسلمانوں کی جو دینی و علمی کتابیں تھیں، ان کے چھاپنے چھپوانے کا محرک اگر کچھ ہو سکتا تھا، تو مسلمانوں کا مذہبی جذبہ، لیکن مسلمانوں کی عمومیت غریب عربی سے ناواقف تھی، لاکھوں لاکھ میں ایک دو ٹوٹے پھوٹے مولوی

غریبوں کی طلب کی تکمیل کے لئے کسی کو کیا ضرورت تھی کہ عربی زبان کی ان کتابوں کے چھاپنے میں اپنا سرمایہ لگائے۔

الغرض "وراقیت" یعنی نقل نویسی کے ذریعہ کتابوں کی فراہمی کا قصہ ایک طرف ختم ہوا، اور طباعت کے لئے پہلی شرط یہ تھی کہ جو کتاب چھاپی جائے، اس کے طلب کرنے والوں کی تعداد کافی ہو، لیکن ناکافی تعداد بھی جس چیز کے خواہش مندوں کی بازار میں بآسانی فراہم نہیں ہو سکتی تھی، خود سوچئے اس کے چھاپنے پر روپے صرف کرنے، محنت برداشت کرنے کے لئے کون آمادہ ہوتا، مگر دینی تعلیم کی عام اشاعت میں عربی زبان کی کتابوں کا مسئلہ کافی اہم تھا، اسی سے اندازہ کیجئے کہ دارالعلوم کے قیام کے بعد دوسری روداد ۱۲۸۴ھ کی جو شائع ہوئی تھی، اس میں اس کی شکایت کرتے ہوئے کہ

"ترقی خواندگی میں بالخصوص یہ امر بھی حارج رہا کہ کتب درسیہ خاصۃً کتب ادب انشاء عرب جس کی تعلیم بیش تر مدنظر ہے، بقدر کفایت بہم نہ پہنچ سکیں" صہ

اس سے جہاں ضمناً اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ادب عربی و انشاء کی طرف دارالعلوم کی تاسیس کے ابتدائی زمانے میں خاص توجہ کی جاتی تھی، آگے جن کتابوں کے دستیاب نہ ہونے کی اطلاع دی گئی ہے ان میں متنبی اور نفحۃ الیمن جیسی عام کتابیں بھی ہیں۔ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، کہ نہ دستیاب ہونے والی کتابوں کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ

"بالکل بہم نہ ہو سکیں"

اور یہ کہ ایسی دشواری ہے کہ

"رفع کرنا اس حرج کا اختیار مہتمان مدرسہ و طلبہ سے باہر ہے" صہ روداد ۱۲۸۴ھ

مطلب جس کا یہی ہوا کہ ایسا زمانہ بھی گذر چکا ہے جب "نفحۃ الیمن" اور "متنبی" وغیرہ جیسی عام متداول کتابوں کا بندوبست کرنا طلبہ ہی کے لئے نہیں بلکہ دارالعلوم دیوبند کے ارباب اہتمام و انتظام کے بس کی بات بھی نہ تھی۔ اللہ اللہ وقت کی نزاکتوں کا کچھ ٹھکانہ تھا۔

اب میں نہیں کہہ سکتا کہ حالات کی ان غیر معمولی نزاکتوں کا اندازہ کرتے ہوئے یہ تجویز کس نے پیش کی

لیکن اسی سال کی روداد میں ہمیں ایک تجویز ملتی ہے، درسی کتابوں کی نایابی وکمیابی کی دشواریوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے یہ لکھ کر کہ

"یہ مشکل بہ توجہ تاجران کتب، واہل مطابع حل ہو سکتی ہے"

گویا ملک کے اسی خاص طبقہ کو متوجہ کرکے تجویز بایں الفاظ پیش کی گئی ہے۔

"یعنی ان کتب کو بکثرت چھاپیں، اور فروخت کریں، اور کسی قدر وقف خرچ مدرسہ بھی فرما کر شامل نفع دین ودنیا ہوں"

جیسا کہ میں نے عرض کیا، یہ تجویز کس کی پیش کی ہوئی ہے، روداد میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا، لیکن دارالعلوم کا سارا کاروبار جس کی نگرانی اور مشورے کی روشنی میں انجام پا رہا تھا۔ بظاہر خیال یہی گذرتا ہے کہ ان ہی کی طرف[1] سے یہ تجویز پیش کی گئی ہوگی، اور ان ہی کے اشارے سے مہتمم صاحب مدرسہ نے روداد میں اس کو غالباً درج کیا ہے۔ یوں بھی سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کا مطابع سے خاص تعلق تھا، آپ کی عمر کا اکثر و بیشتر زمانہ گذر چکا کہ مطابع میں تصحیح کتب کی خدمت میں بکذرتھا بلکہ اسی تقرے کو پڑھ کر میرا ذہن خدا جانے لیکن کن مسائل کی طرف منتقل ہونے لگا۔ علمی خدمات کے سلسلے میں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ کا عربی کتابوں کے چھاپہ خانوں کی خدمت کو قبول کرنا، غدر سے پہلے زیادہ تر آپ کا اسی مشغلہ میں مصروف رہنا، فتنہ کے فرو ہونے کے بعد عربی خط نسخ کے سب سے بڑے مرکزی جگت استاذ نزہت رقم یعنی منشی ممتاز علی صاحب مرحوم کے ساتھ آپ کے خصوصی تعلقات جن کا ذکر کر چکا ہوں، ان ہی منشی ممتاز علی مرحوم کا

---

[1] فقیر سے بلا واسطہ مولانا نظام الدین مغربی حیدرآبادی مرید خاص حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ نے بیان کیا، جب میں حیدرآباد میں مقیم تھا، کہ ان سے حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم نے فرمایا، (نیز میرے والد صاحب نے بھی مجھ سے یہی واقعہ دوسرے عنوان سے بیان فرمایا) کہ حضرت نانوتوی کی حیات میں دارالعلوم کا اہتمام میں نہیں کرتا تھا بلکہ درحقیقت حضرت نانوتوی فرماتے تھے۔ کیونکہ انتظام کی جو چیز حضرت نانوتوی کے قلب پر وارد ہوتی تھی، اس کا بعینہ انعکاس میرے قلب پر ہو جاتا تھا، اور میں اس کام کو کر گذرتا تھا۔ میرے کام کر لینے پر حضرت نانوتوی فرماتے کہ مولانا اللہ آپ کو جزاء خیر عطا فرمائے، میرا دل بھی چاہتا تھا کہ ایسا ہو جائے۔ پھر یہی واقعہ میں نے حاجی امیر شاہ خاں صاحب سے بھی سنا، آگے متن میں بھی اسی روایت کا حوالہ آرہا ہے۔ محمد طیب غفرلہ

قائم کردہ وہ مطبع تھا جو بعد کو مطبع مجتبائی دہلی کے نام سے مشہور رہا۔ اور مولوی عبدالاحد مرحوم جیسے آدمی نے یہ مطبع خریدا، جس سے بالآخر وہ دلی کے رئیسوں میں شمار کئے گئے۔ الغرض صدی تک عربی مدارس کی درسی کتابوں کے طبع و اشاعت کا کام منشی ممتاز علی مرحوم کا قائم کردہ یہی مطبع مجتبائی انجام دیتا رہا۔ منشی صاحب کے دو صاحبزادے منشی مشتاق علی و منشی عبدالغنی اپنے والد کے بعد خط نسخ عربی کے سارے ہندوستان میں استاذ الکل سمجھے گئے۔ یاد ہوگا کتابی کاروبار سے براہ راست تعلق رکھنے والے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی کے نورچشم مولانا حفیظ الرحمن کے مکتوب گرامی سے خط نسخ کے ان ہی دونوں کاتبوں (منشی مشتاق علی و منشی عبدالغنی) کے متعلق یہ شہادت نقل کی گئی تھی کہ ان کے

"سینکڑوں تلامذہ ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔"

ہندوستان میں عربی خط نسخ کی طباعتی سرگذشت کی ان مجمل معلومات کو پیش نظر رکھتے ہوئے، آپ خود سوچئے مندرجہ روداد کی تجویز کے ان الفاظ کو جس کے مخاطب ارباب مطابع تھے یعنی

"ان کتب (عربی کی درسی کتب) کو بکثرت چھاپیں۔"

اگر تجویز کے اس جزء کو سیدنا الامام الکبیر کی طرف میرا ذہن منسوب کرتا ہے۔ بلکہ اسی کے ساتھ میرے دل میں اس قسم کے خیالات جو آرہے ہیں، کہ ہندوستان کے طول و عرض میں جیسے دینی علوم کی درس و تبلیغاً اشاعت کا ذریعہ سیدنا الامام الکبیر کی ذات مبارک کو دارالعلوم دیوبند قائم کرکے حق سبحانہ وتعالیٰ نے بنایا، کیا عربی کتابوں کی طباعت و اشاعت میں بھی کام لینے والے نے آپ ہی سے کام لیا، وہی ہندوستان جہاں نفحۃ الیمن، اور متنبی جیسی عام کتابیں بھی ڈھونڈھے نہیں ملتی تھیں، وہیں پھر عربی کتابوں کی طباعت و اشاعت کا کام طول و عرض اور عمق میں جتنا بڑھا، پھیلا پھولا، اور جو کچھ تماشا بھی دیکھا گیا، اور ۱۹۴۷ء تک جب تک ملک تقسیم نہیں ہوا تھا، عروج و ارتقاء کے ان تماشوں سے شمال و جنوب کے علاقے پٹے ہوئے تھے۔ عربی کی ضخیم ضخیم کتابیں جو کسی خالص اسلامی ملک میں بھی نہ چھپ سکیں، ہندوستان میں وہ چھاپی جا رہی تھیں، کون کہہ سکتا ہے، کہ اس کی تہ میں اور دوں کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر کی

توجہ دہت کی قوت پوشیدہ نہ تھی ؛ واقعات کی بکھری ہوئی کڑیوں کو جوڑ کر دیکھئے ۔شاید واقعہ آپ کے سامنے بھی اسی شکل میں آجائے، جیسے میرے سامنے آرہا ہے۔

بہر حال یہ تو تجویز کا پہلا حصہ تھا، یعنی ارباب مطابع کو کتابوں کے چھاپنے اور شائع کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ۔ دوسرا جزء اس کا جو یہ تھا کہ اپنی چھاپی ہوئی کتابوں کے کچھ نسخے بطور وقف مدرسہ میں بھی داخل کریں "بظاہر اس وقت یہ ایک معمولی تجویز تھی، لیکن جس کا جی چاہے آج دارالعلوم دیوبند میں آکر معائنہ کرسکتا ہے کہ تجویز کے اسی ابتدائی تخم نے کتنے بڑے تناور درخت کا قالب اختیار کرلیا۔ آج اسی کی چھاؤں میں علم کے غریب مسافروں کی کتنی بڑی تعداد آرام کی زندگی گذار رہی ہے۔ نیچے سے اوپر تک بیسیوں جماعتوں، اوران جماعتوں میں سو سو اور اس سے بھی کہیں زیادہ بہت زیادہ تعداد شریک ہوتی ہے۔ نہ جانے والوں کو سن کر تعجب ہوگا کہ اول سے آخر تک مدرسہ میں تعلیم پانے والے طلبہ میں مشکل ہی سے انگلیوں پر گنے جانے والے ایسے افراد ہونگے جو اپنی خریدی ہوئی کتابیں پڑھتے ہوں، بلکہ پڑھنے کے لئے ہر جماعت کے طالب علموں کو مدرسہ ہی کی طرف سے عاریۃً کتابیں دی جاتی ہیں، پڑھنے کے بعد طلبہ ان کو پھر مدرسہ میں واپس کردیتے ہیں۔ ان کتابوں میں بلامبالغہ عرض کررہا ہوں کہ جہاں بعض کتابیں روپے دو روپے کی ہوتی ہیں۔ وہیں ان میں ایسی کتابیں بھی ہیں، جن کی قیمت اس وقت بازار میں پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ روپے سے کم نہیں ہے۔ یقین مانئے کہ مدرسہ کی طرف سے مفت کتابوں کی فراہمی کا نظم اگر نہ قائم کیا جاتا، تو سب کچھ ہوتے ہوئے بھی سمجھ میں نہیں آتا ہے، کہ تعلیم و تدریس کے سلسلے کو جاری رکھنے کی شکل ہی کیا ہوتی۔ عربی مدارس میں پڑھنے والے طالب العلموں کی مالی حالت یقیناً ان کتابوں کی خریداری کے بار کو برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ بڑا مسئلہ تھا، جس کے حل کی صورت شروع ہی میں سوچ لی گئی تھی، بحمد اللہ اس میں کامیابی ہوئی۔ اور بہت غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ دارالعلوم کا کتب خانہ اسی لئے دو مستقل شعبوں پر منقسم ہے۔ ایک شعبہ صرف ان ہی کتابوں کا ہے جس سے ہر سال طالب العلموں کو عاریۃً پڑھنے کے لئے کتابیں دی جاتی ہیں۔ اسی لئے عموماً اس شعبہ میں صرف درسی کتابیں رکھی گئی ہیں۔ ایک ایک درسی کتاب کے

نسخے سو سو اور سو سو سے بھی زیادہ تعداد میں محفوظ ہیں، اور یہی شعبہ دارالعلوم کے کتب خانہ کا خصوصی شعبہ ہے۔ باقی دوسرا شعبہ عام کتابوں کا ہے۔ الحمد للہ کہ اس وقت تک اس شعبہ میں بھی پچاس ساٹھ ہزار کے لگ بھگ کتابیں جمع ہو چکی ہوں گی۔ اس شعبہ کی بنیاد بھی ابتداء ہی میں ڈال دی گئی تھی، مذکورہ بالا تجویز کے آخر میں جو یہ فقرہ ہے کہ

"تاکہ کتبخانہ کی توجہ سے جن کی کتابیں صندوق اور الماریوں میں رکھی ہوئی وقف خورش کرم دیمک ہیں، یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے"

الحمد للہ کہ یہ تحریک بھی کامیاب ہوئی، اور وقتاً فوقتاً ملک کے مختلف حصوں سے دارالعلوم میں چھوٹے بڑے کتب خانے ان علمی خاندانوں سے منتقل ہو ہو کر پہنچتے رہے، اور پہنچ رہے ہیں۔ جن میں اسلامی علوم کا شوق باقی نہیں رہا ہے۔ امید ہے کہ "وقف خورش کرم و دیمک" کی جگہ دارالعلوم کے کتب خانے میں وقف کر کر کے اپنے بزرگوں کی علمی یادگاروں کی حفاظت کی اس تدبیر سے آئندہ بھی لوگ غفلت نہ برتیں گے۔

اسی تجویز کے الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کتابوں کے وقف اور ہبہ کرنے ہی کا مشورہ نہیں دیا گیا تھا۔ بلکہ بجائے وقف کے توجہ دلائی گئی تھی کہ مدرسہ کی علمی خدمت کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ "کرم و دیمک والی الماریوں اور صندوقوں" سے نکال نکال کر دارالعلوم کے کتب خانے میں امانۃً و عاریۃً اپنی کتابوں کو لوگ محفوظ کرا دیں۔ یہاں ان کی دیکھ بھال بھی ہوتی رہے گی، اور اساتذہ و طلبہ کو ان کتابوں سے استفادہ کا موقع بھی ملتا رہے گا، مہتمم صاحب نے تجویز کے بعد اسی روداد میں یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

"جن حضرات نے اس شیوۂ پسندیدہ کو اختیار کر کے کتب عربی و فارسی وقف مدرسہ فرمائیں، یا عاریتاً واسطے استعمال مدرسہ کے سپرد مہتمم کیں، فہرست ان کی آخر روداد میں مندرج ہے"

---

له کتاب فرنگیوں کے جال میں ہے کہ ۱۹۲۳ء تک پچاس ہزار سے زائد کتابیں کتب خانہ میں موجود تھیں۔ صفحہ ۱
(اب ۱۳۸۵ھ میں یہ تعداد دو سو ستر ہزار تک پہنچ گئی ہے۔ محمد طیب غفرلہ)

جو فہرست عاریۃً دا دانشؒ مدرسہ میں کتابوں کے رکھوانے والوں کی درج کی ہے، اس میں سب سے پہلا اسم گرامی خود سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور کافی قیمتی کتابوں کا نام لیا گیا ہے، گویا اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سنت حضرت والا ہی کی جاری کی ہوئی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ قیام دارالعلوم کے ابتدائی دنوں سے کتب خانہ کے دونوں ہی شعبوں (تدریسی و غیر تدریسی) کی طرف پوری توجہ کی گئی، ہر سال کی روداد میں اس اہم علمی ضرورت کی طرف مختلف الفاظ میں مسلسل اور مؤثر اپیلیں شائع ہوتی رہیں، جن کا بحمداللہ اچھا خاصا اثر ہوا، گویا اپنے اپنے مطبع اور تجارتی کتب خانوں کی کتابوں کے چند نسخوں کا دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے میں داخل کرنا رفتہ رفتہ ایک رسم اور دستور کی صورت بن گیا، انتہا یہ ہے کہ علاوہ مسلمانوں کے اس سلسلہ میں غیر معمولی فراخ دلی کا ثبوت منشی نول کشور نے پیش کیا، ۱۲۸۶ھ کی روداد میں یہ لکھتے ہوئے کہ

"امداد کتب کی نسبت جو سال گذشتہ لکھا گیا تھا، بہت سے اہل ہمت نے اس طرف توجہ فرمائی اور بار سال کتب قیمتی و کارآمد مدرسہ کی امداد فرمائی۔"

آگے اسی کے بعد ہے کہ

"بالخصوص منشی نول کشور صاحب مالک چھاپہ خانہ اعظم مقام لکھنؤ اس امر میں زیادہ تر قابل مشکوری ہیں کہ باوجود بعد مسافت بہت سی کتب کارآمد سے معاونت کی ہے۔"

صرف اسی روداد میں نہیں، بلکہ آگے کی رودادوں میں بھی، منشی نول کشور کی توجہ خاص کا اس سلسلہ میں بار بار تذکرہ کیا گیا ہے۔ ۱۲۹۰ھ کی روداد میں ان کا اور ان کے عطیہ کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ

"ارباب شورہ مدرسہ نہایت شکر گزار ہیں جناب منشی نول کشور صاحب مالک مطبع اعظم لکھنؤ کے جنھوں نے مثل سابق کمال دریا دلی کو کام فرمایا، اور چند کتب مفید سے امداد مدرسہ میں ہمت فرمائی، فہرست ان کی ضمیمہ نمبر ۲ میں مندرج ہے، ان میں کو خاص کر نسخہ قاموس کہ کتب لغت میں بے نظیر ہے، اور منشی صاحب نے خاص اپنے مطبع میں اس کتاب کو نہایت خوبی اور صحت سے اس سال میں طبع فرمایا ہے، لائق بیان ہے۔"

آخر میں یہ الفاظ بھی درج کئے گئے ہیں کہ

"مدرسہ میں اس سے پہلے کوئی نسخہ اس کتاب کا نہ تھا۔ یہ کتاب ایسی محتاج الیہ ہے کہ ہر مدرس اور طالب علم کو اس کی حاجت رہتی ہے۔" صڈ روداد سال ۱۲۸۹ھ

گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ مدت تک دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ و طلبہ اپنی دینی و علمی ضرورتوں کو ای ایک غیر مسلم کے کتابی عطیہ کی مدد سے پوری کرتے رہے، قرآن سمجھتے رہے، حدیثوں کے لغوی مشکلات کو حل کرتے رہے، اور یہ تھا دور قاسمی کا وہ دارالعلوم جو سرزمین ہند میں ہندوستان کے خاص حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے قائم کیا گیا تھا۔

اور معاملہ کتابوں ہی کی حد تک محدود نہ تھا، ہندوستان کا یہ وہ زمانہ تھا کہ اردو زبان کے معدودے چند اخبار بعض بعض مقامات سے نکلنے لگے تھے۔ سب کو تو نہیں لیکن ایسے چند اخبار جن کے مالک مسلمان تھے۔ ان میں بعضوں کو توفیق ہوئی، اور مدرسہ میں بھی ایک ایک کاپی اپنے اپنے اخباروں کی ہدیۃً ارسال کرنے لگے، خصوصیت کے ساتھ اس سلسلہ میں کانپور کے اخبار نور الانوار کا ذکر کیا گیا ہے، جس کے مالک منشی عبدالرحمن مالک مطبع نظامی تھے، نیز "نجم الاخبار" نامی میرٹھ سے جو نکلتا تھا، اس میں مدرسہ کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ تائیدی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ لیکن ایک تو ان اخباروں کے مالک مسلمان تھے، اس لئے ان کی طرف سے ایک ایک کاپی مدرسہ میں اگر پیش ہوتی ہو، تو اس پر تعجب نہیں ہوتا، ماسوا اس کے ہفتہ میں ایک بار نکلنے والے اخبارات تھے۔ بلکہ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ یہی منشی نول کشور جو اپنے یہاں کی مطبوعہ کتابوں سے دارالعلوم کی ہر سال امداد کرتے تھے، اور ان ہی کے مطبع سے ایک روزنامہ "اودھ اخبار" نامی نکلتا تھا۔ جو غالباً ہندوستان کا پہلا روزنامہ تھا۔ منشی نول کشور کی طرف سے یہ اخبار بھی ہدیۃً دارالعلوم میں آتا رہا[1]۔ اسی طرح دیوبند کے نواح میں ایک قصبہ بڈھانہ ہے،

---

[1] ایک فہرست بھی اسی روداد میں آنے والے اخباروں کی دی گئی ہے، خصوصیت کے ساتھ اودھ اخبار کے سامنے یہ اضافہ بھی درج ہے کہ

"ان کا (یعنی منشی نول کشور کا) اخبار باوجود کہ روزانہ جاری ہوتا ہے اور بیش بہا ہے، عنایت فرماتے ہیں۔"

(باقی اگلے صفحہ پر)

وہاں کے ایک منچلے تھا کہ جن کا نام راؤ امر سنگھ تھا۔ "سفیر بوڑھانہ" کے نام سے ایک اخبار بھی اسی قصبہ سے نکالا کرتے تھے۔ اور اس کی ایک کاپی مدرسہ کے نذر بھی التزاماً کیا کرتے ۱۲۹۱ھ کی روداد میں ان دونوں (اودھ اخبار اور سفیر بوڑھانہ) کا ذکر کرتے ہوئے جن الفاظ میں شکریہ ادا کیا گیا ہے، جی چاہتا ہے کہ ان کو نقل کر دیا جائے۔

"شکریہ مہتمان اخبار و مطابع" کا عنوان قائم کر کے عمومی شکریہ کے بعد اسی روداد میں ہے کہ،

"جناب منشی نول کشور صاحب مالک اودھ اخبار لکھنؤ، اور جناب راؤ امر سنگھ مالک اخبار "سفیر بوڑھانہ" کا بالخصوص کہ باوجود دونوں صاحب اہل ہنود سے ہیں۔ مگر آفریں، صد ہزار آفریں ان کی سخاوت اور عنایت پر کہ اپنے اپنے اخبارات گراں بہا اس مدرسہ کو مفت عنایت فرماتے ہیں، جملہ ارباب شوریٰ مدرسہ ہذا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں"

اور بات اسی پر ختم نہیں ہوگئی، آگے کے الفاظ پڑھئے،

"اور سب صاحبوں کے حق میں اور ان کے اخبارات کے حق میں دعا خیر کرتے ہیں، کہ خداوند تعالیٰ ان کے اخبارات اور کارخانجات کو دم بدم ترقی عطا فرمائے"

اور آخر میں یہ کہ

"ان کی قوت اور آزادی کو قائم رکھے" ص۱۳ روداد ۱۲۹۱ھ

مدرسہ دیوبند کی پہلی مجلس شوریٰ جس کے جزو کل درحقیقت سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ ہی تھے، اسی مجلس شوریٰ کے "جملہ ارباب شوریٰ" کی طرف سے شکریہ اور دعا خیر کے ان الفاظ میں غور کیجئے، اور سوچئے کہ حکومت متغلبہ و متسلطہ کی بڑی سی بڑی امدادی پیشکشوں کو اپنی پوری تاریخ میں جس مدرسہ نے کبھی آنکھ نہیں لگائی، اسی کا طرز عمل اسی ملک کے دوسرے ہم وطنوں کے ساتھ کیا تھا، اور کس قسم کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) میش بہائی کے سلسلہ میں یاد آگیا، اسی اودھ اخبار کا ذکر غالب نے بھی اپنے خطوط (مندرجہ اردوئے معلی) میں کیا ہے کہ اس کو بھی منشی جی ہدیۃً یہ اخبار دیتے ہیں، لیکن محصول ڈاک ٹکٹوں کی شکل میں بیچارے غالب کو خود بھیجنے پڑتے تھے۔

تعلق کو وہ ان کے ساتھ قائم رکھنا چاہتا تھا۔

عہد قاسمی کی ان ہی قدیم رودادوں میں "دستور العمل چندہ" یا "ذکر آئین چندہ" کا عنوان قائم کر کے پہلی دفعہ اسی دستور اور آئین کی بابت الفاظ اس زمانہ کی ہر روداد میں جو ملتی ہے یعنی

"چندہ کی کوئی مقدار مقرر نہیں، اور نہ خصوصیت مذہب و ملت۔"

اسی کے ساتھ ان ہی رودادوں میں چندہ دینے والوں کی فہرست میں دیکھ لیجئے اسلامی ناموں کے باپہلو بہ پہلو، منشی تلسی رام، رام سہائے، منشی ہر دواری لال، لالہ بیجناتھ، پنڈت سری رام، منشی موتی لال، رام لال، سیوارام سوار وغیرہ اسماء بھی مسلسل ملتے چلے جاتے ہیں، سرسری نظر ڈال کر مثلاً چند نام جو سامنے آگئے، وہ چن لئے گئے ہیں۔

ظاہر ہے کہ دیوبند مسلمانوں کا خالص دینی مدرسہ تھا، اس مدرسہ کی امداد میں کسی ملت و مذہب کی خصوصیت کو قطعی طور پر ختم کر کے مسلمانوں کے سوا ملک کے دوسرے مذہبی اقوام و طبقات کے لئے دروازہ کو کھلے رکھنے کی پہلے ہمت ہی کیسے کی گئی، اور کسی مصلحت سے لکھنے کو اگر یہ لکھ بھی دیا جاتا تھا، تو عملاً غیر مسلم اقوام کی امداد اس دینی کام میں قبول ہی کیسے کی گئی، اور اس سے بھی زیادہ تعجب اس پر ہوتا ہے، کہ لینے والے لینے پر کسی وجہ سے آمادہ بھی ہو گئے تھے، تو یہ جانتے ہوئے کہ دیوبند کے مدرسہ میں مسلمانوں کے خالص دینی علوم پڑھے پڑھائے جاتے ہیں، غیر اسلامی دائرے کے افراد کی طرف سے امدادی رقوم کیسے پیش ہو رہی تھیں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ چندہ دینے والوں میں جیسا کہ چاہئے تھا، زیادہ اور بہت زیادہ تعداد مسلمانوں ہی کی تھی، مسلمانوں ہی کا یہ مدرسہ تھا، وہ اس کی امداد نہ کرتے، تو اور کون کرتا، لیکن بایں ہمہ جو مسلمان نہ تھے، وہ اس مدرسہ کی مدد کیوں کرتے تھے۔ مزید حیرت اس پر ہوتی ہے، کہ عموماً غیر مسلم افراد کے ان چندوں کی نوعیت وقتی چندے کی نظر نہیں آتی، بلکہ دوامی چندہ دینے والوں کی فہرست میں ان میں اکثر ناموں کو ہم پاتے ہیں۔ میرے لئے یہ سارے سوالات آج معمہ بنے ہوئے ہیں۔ آج کیا ہے۔ کل کیا تھا! آج کی تاریخ کل کی تاریخ سے کیوں بدل گئی، کیسے بدل گئی اور کس حد تک بدل گئی؟ اللہ اللہ دل ان باتوں کو سوچتا ہے، اور سوچ کر دم بخود ہو جاتا ہے۔ اف!

## اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

شاید یہ صورت جتنی خوفناک شکلوں میں آج سرزمین ہند میں پیش آئی ہے، انسانی تاریخ میں اس کی مثالیں مشکل ہی سے مل سکتی ہیں، معاملہ کہاں سے کہاں پہنچا دیا گیا۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا آخری زمانہ تقریری و تحریری مناظروں اور مباحثوں میں جو گذرا، جس کی بحث آگے آئے گی، شاید اس عجیب و غریب انقلاب کے بعض پوشیدہ اسباب سے اس بحث میں پردہ اٹھایا جائے۔ اس وقت تو "دارالعلوم دیوبند" کے ساتھ آپ کے تعلقات اور آپ کی خدمات کا ذکر کر رہا تھا۔ اس سلسلہ میں اپنے نزدیک جو پہلو مستحق تھا کہ اسے اجاگر کیا جائے۔ اپنی معلومات کی حد تک اس کام کو گویا پورا کر چکا ہوں۔

یاد ہوگا کہ پندرھواں سال بھی ابھی مدرسہ کا پورا نہیں ہوا تھا کہ سیدنا الامام الکبیر کی سرپرستی کی برکات سے وہ محروم ہو گیا، ان پندرہ سالوں میں بھی ابتداء کے چند سال عرض کر چکا ہوں، ایسے بھی گذرے ہیں، جن کے متعلق یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ قصبہ دیوبند کا یہ مقامی مدرسہ صحیح معنوں میں براہ راست سیدنا الامام الکبیر کے فیوض و برکات سے مستفید نہ ہو سکا، نام تو حضرت والا کا شروع ہی سے خصوصی ارکان کی فہرست میں شریک تھا۔ لیکن ہند گیر جامعہ بننے کے لئے آپ کی آغوش شفقت میں بعد کو آیا، پھر حج کا سفر بھی جس کا ذکر آگے آ رہا ہے، اسی زمانہ میں ہوا، جسمانی امراض و آلام کے ہجوم اور حملہ کا زمانہ بھی یہی ہے۔ ان ہی وجوہ سے پندرہ سال کی اس مدت کو پندرہ سال سے بھی کم ہی سمجھنا چاہئے، گویا دس سے بارہ سال تک کی مدت سے زیادہ اس کا تخمینہ مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے

حیرت اسی پر ہوتی ہے کہ اسی محدود مدت میں ضلع سہارنپور کے ایک غیر معروف قصبہ کا مقامی مدرسہ جس کے پہلے سال کی آمدنی بھر مد کی کل چھ سو انچاس (۶۴۹) روپے چار آنے (۴؍) تھی، امداد طلبہ کی مد کو نکال دینے کے بعد اصل مدرسہ کی آمدنی درحقیقت کل چار سو ایک روپیہ ہوئی تھی، کل دو مدرس یعنی ایک عربی، اور ایک فارسی و ریاضی وغیرہ کے لئے مقرر ہوئے تھے۔ کل بیس طالب علم شروع میں شریک ہوئے تھے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سال بھر کے سارے مصارف کے بعد بھی (۲۵۵) دو سو پچپن

خروج ہونے سے باقی رہ گئے (دیکھو روداد ۱۲۸۳ھ ص۸) سیدنا الامام الکبیر کے ظل عاطفت میں آجانے کے بعد چند سال بھی اس مدرسہ پر نہیں گذرے تھے یعنی تاسیس مدرسہ کا بارہواں سال تھا، دار العلوم کے اول صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جلسہ تقسیم اسناد کا خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے، طلبہ کی تعداد جو دو سو کے قریب پہنچ چکی تھی، اسی کی طرف اشارہ کر کے آخر میں یہ اطلاع بھی حاضرین جلسہ کو دی کہ ان میں ہندوستان کے سوا

"منجملہ پردیسیوں کے ایک ملک برہما کے رہنے والے ہیں، اور تین جزائر حبشان کے یعنی سمندر ٹاپو کے اور ایک ملک تبت کے" (ص۱۶ روداد ۱۲۹۵ھ)

حیرت ہوتی ہے، کہ اتنی مختصر مدت میں فراخنائے ہند کے طویل و عریض رقبوں کو پھلانگ کر ایک قصباتی مدرسہ کی شہرت برہما، تبت اور جزائر ہند کے باشندوں تک کیسے پہنچ گئی تھی، خصوصاً اس زمانہ میں جب نہ اخباروں، اور برقی پیاموں کے پھیلنے پھیلانے کا عام رواج اس ملک میں عموماً اور طبقہ علماء میں خصوصاً گویا نہیں ہوا تھا۔ اسی روداد میں ایک خبر یہ بھی دی گئی ہے، کہ ہندوستان کے اسی گمنام قصبہ دیوبند اور اس کے مدرسہ کی شہرت اس عہد کے اسلامی دار الخلافہ استنبول (قسطنطنیہ) تک پہنچ چکی تھی، اور اس امتیاز کے ساتھ پہنچ چکی تھی کہ دار الخلافت کے ایک بڑے سربرآوردہ عالم علامہ احمد حمدی آفندی نے ایک کتاب

"النجوم الدراری فی ارشاد الساری"

نامی تصنیف فرمائی تھی، کتاب طبع نہیں ہوئی تھی، مصنف نے صرف چار قلمی نسخے اپنی اس کتاب کے تیار کرائے تھے، جن میں دو نسخے تو خود دار الخلافت (قسطنطنیہ) کے کتب خانے میں داخل کئے گئے تھے، اور ایک نسخہ اس کا مصر بھیجا گیا تھا، چوتھا نسخہ اس کتاب کا قسطنطنیہ میں بیٹھ کر اسی مصنف نے خاص دیوبند کے اسی مدرسہ کے لئے لکھوایا تھا، اس زمانہ میں ترکی حکومت کا جو نمائندہ بمبئی میں رہتا تھا، یہ نسخہ اسی نمائندہ کے توسط سے دار العلوم تک پہنچایا گیا۔ قلمی کتاب کے ساتھ خود علامہ احمد حمدی آفندی کا ایک مکتوب بھی فارسی زبان میں اس علمی ہدیہ کے ساتھ شریک تھا، جو اسی سال کی

روداد میں چھاپ کر شائع کر دیا گیا تھا۔ خط میں ان ہی باتوں کا تذکرہ کر کے کہ کل چار قلمی نسخے اس کتاب کے تیار کئے گئے تھے، جن میں ایک نسخہ آپ کے مدرسہ کے لئے اس لئے بھیجا جا رہا ہے کہ

"مدرسۂ آنحضرت کہ منبع فیض عموم ست، فرستادہ آمد تا یادگار آں بزرگوار بر محل خود باشد"

اگرچہ یوں بھی طور پر خط میں مدرسہ کے مہتمم مولوی رفیع الدین اور صدر حضرت مولانا محمد یعقوب، اور مجلس شوریٰ کے ایک رکن حاجی محمد عابد کے نام بھی مکتوب کے عنوان میں درج ہیں، لیکن اس سلسلہ میں سب سے پہلے جسے علامہ احمد حمدی آفندی نے اپنا مخاطب اول بنانا چاہا ہے، وہ حضرت سیدنا الامام الکبیر ہی کی ذات مبارک تھی، مکتوب کا آغاز ان الفاظ سے ہوا ہے۔

"جناب فضائل مآب، مولوی محمد قاسم صاحب"

یہ "جناب فضائل مآب" کے الفاظ صرف حضرت والا کے اسم گرامی سے پہلے استعمال کئے گئے ہیں۔ باقی دوسرے بزرگوں کے نام کے ساتھ صرف "مولوی" کا لفظ ہے۔

کچھ بھی ہو، قاف تا قاف کی پرانی ضرب المثل کے متعلق تو نہیں کہہ سکتا۔ لیکن عصری تقریر دل میں ساحل باسفورس تا دیوار چین کا جو محاورہ مستعمل ہے، یہ واقعہ ہے کہ قریب قریب دس انگلیوں پر گنے جانے والے سالوں کے اندر اندر دیوبند کے قصبہ کا یہی مدرسہ، شاعرانہ رنگ میں نہیں، بلکہ فی الحقیقت اپنی شہرت و عظمت میں حیرت ہوتی ہے، کہ واقعی ان ہی حدود تک کیسے پہنچ گیا تھا۔ ہندوستان کے لحاظ سے چین کی دیوار برما اور تبت ہی کے علاقے تو ہیں، اور باسفورس کے ساحل کے خوبصورت شہر استنبول (قسطنطنیہ) سے آپ دیکھ رہے ہیں کہ علمی تحائف وہاں سے چلے آ رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ میں تو اس کی توجیہ سے اپنے آپ کو عاجز پاتا ہوں، کہ مصر کے سوا زمین کے اس کرے پر حالانکہ بیسیوں اسلامی ممالک چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن قسطنطنیہ کے اس عالم کی اپنی کتاب کے لئے مصر کے بعد نظر انتخاب ہندوستان جیسے دور دراز ملک اور اس ملک میں بھی ضلع سہارنپور کی ایک قصباتی آبادی کے مدرسہ پر کیوں پڑتی ہے۔ ہندوستان میں اس وقت مسلمانوں کا سیاسی اقتدار بھی ختم ہو چکا تھا، اور مسلم و غیر مسلم باشندوں کا ایک ایسا ملک وہ بن چکا تھا جس پر تیسری طاقت

حکمراں تھی، اس کے سوا اور کیا سمجھا جائے کہ جو اللہ کے لئے مٹنے کا قطعی فیصلہ کر چکا تھا، اٹھانیوالا اسی کو سرکو اٹھا رہا تھا، اونچا کر رہا تھا، اور یہ سب جو کچھ تھا، اسی کی رفعت و بلندی کے مختلف مشاہداتی مظاہر تھے، من تواضع للّٰہ رفعہ اللّٰہ کی گویا یہ بھی ایک عملی تفسیر تھی، اس کے سوا بتایا جائے کہ آخر کیا سمجھا جائے؟ تاویل و توجیہ میں اور کیا کہا جائے؟

بہرحال گنے چنے، انہی چند سالوں میں کرایہ کے خام مکانوں سے نکل کر اپنی موجودہ تدریسی و اقامتی عمارت میں بھی منتقل ہوا، جس کی تفصیل دارالعلوم دیوبند کی تاریخ لکھنے والے کے فرائض میں داخل ہے، یعنی یہ سوالات کہ شروع میں دیوبند کا یہ مدرسہ کہاں قائم ہوا۔! جن مکانوں میں مدرسہ کا افتتاح عمل میں آیا، ان کی تعمیری نوعیت کیا تھی، کن کن لوگوں کے مکانات کرایہ پر لئے گئے، کرایہ کی مجموعی رقم کیا تھی، پھر کن دشواریوں کا احساس ارباب اہتمام و انتظام کو ہوا، اور طے پایا کہ مدرسہ کی مستقل عمارت بنائی جانی چاہئے، اس سلسلہ میں پہلے دیوبند کی جدید جامع مسجد جو اسی زمانہ میں بعض ارباب ہمم کی جد و جہد کی بدولت بن کر تیار ہوئی تھی، فیصلہ کیا گیا کہ اسی جامع مسجد کے آس پاس چند حجرے اگر بنا لئے جائیں گے وہی کافی ہوں گے، حاجی عابد حسین صاحب مرحوم مدرسہ کے مہتمم اول نے اسی تجویز کے مطابق مسجد کے اردگرد کچھ حجرے تیار بھی کرا دیئے تھے، لیکن حال سے زیادہ جس کے سامنے مدرسہ کا مستقبل تھا، ہم آج جو کچھ دیکھ رہے ہیں، سب کچھ شاید اس کو پہلے ہی دکھایا جا چکا تھا، اپنی اسی لاہوتی بصیرت کی روشنی میں مدرسہ کے لئے پہلے زمین کا انتخاب کیا، زمین کیسے حاصل کی گئی، اور تقدیر کا وعدہ تدبیر کا قالب اختیار کر کے مسلسل کیسے سامنے آتا چلا گیا، ظاہر ہے "یہ دارالعلوم کی تاریخ" کے اہم اجزاء ہیں، جب کبھی لکھنے والوں کو اس کی طرف توجہ ہو گی، اور تحقیق کر کر کے ہر منزل کی روداد کو پیش کر سکتے ہیں۔ اس کتاب کی حد تک زیادہ سے زیادہ گنجائش اسی کی ہے کہ ان چند سالوں یعنی ۱۲۸۳ھ آغاز تاسیس سے ۱۲۹۷ھ تک جس سال سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی، اس درمیانی وقفہ میں جو کچھ ہوا، اس کا اجمالی ذکر کر دیا جائے۔

عرض کر چکا ہوں، کہ تاسیس مدرسہ کے دوسرے سال ۱۲۸۴ھ میں حاجی عابد حسین صاحب مرحوم مدرسہ کی

مہتممی سے سبکدوش ہو کر سفر حج پر روانہ ہو گئے ان کی جگہ مولانا رفیع الدین صاحب کو سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ نے مجبور کیا کہ وہ اہتمام کی ذمہ داری اپنے سر لیں۔ حاجی عابد حسین صاحب کی واپسی حجاز سے ۱۲۸۶ھ میں ہوئی۔ اہتمام کی خدمت پھر ان ہی کے سپرد ہو گئی۔ ۱۲۸۸ھ تک وہی مہتمم رہے، پھر ۱۲۸۸ھ میں مجلس شوریٰ نے حاجی عابد حسین صاحب مرحوم کو اس خدمت سے سبکدوش کر دیا۔ صرف جامع مسجد کی تعمیر ان کے سپرد رہی، اور مدرسہ کے اہتمام و انتظام کا کام پھر مولانا رفیع الدین صاحب کے سر ڈالا گیا۔ اور اسی سال جو قیام مدرسہ کا چھٹا سال تھا، ایک طویل الذیل اپیل روداد میں شائع کی گئی، جس میں مدرسہ کے لئے مستقل عمارت کی تحریک پیش کی گئی تھی۔ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کا یہ ایک خاص ورق، اور اہم تاریخی وثیقہ ہے، اس میں پہلے تو مدرسہ کی مکانی دشواریوں کا ذکر کیا گیا ہے، کرایہ کے جن مکانوں میں اس وقت تک مدرسہ تھا، کچھ ان کی حالت، درسگاہ، طلبہ کی قیام گاہ، کتب خانہ کا مکان ان سب میں کافی فاصلہ، نیز درسگاہ کے تنگ غیر تدریسی مکان میں پڑھانے والے اور پڑھنے والوں کو جو دقتیں پیش آ رہی تھیں، مثلاً اجتماعی تدریس کی وجہ سے شور کا بلند ہونا، اور شور کو محسوس کر کے

"ہر شخص کو اس ضرورت سے کچھ آواز بلند کرنی ہوتی ہے، اور جتنی جتنی آواز بلند ہوتی جاتی ہے، اتنا ہی شور بڑھتا ہے"

پھر قصبہ چھوٹے کی وجہ سے وسیع مکانوں کی دستیابی میں ناکامی، سب سے دلچسپ اطلاع یہ ہے، کہ قصبہ والوں کے خام کچے، ٹوٹے پھوٹے مکانوں کو کرایہ پر مدرسہ نے جو لے لیا تھا، تو جہاں اسی دیوبند میں ایک طبقہ ان مسلمانوں کا تھا، جو سب کچھ مدرسہ پر نچھاور کر رہا تھا، وہیں روداد کے اس فقرے کو پڑھ کر کہ

"مکان مدرسہ کا اول تو کرایہ کا ہے، اور ہر سال نیا معاملہ کرنا ہوتا ہے اور مالک مکان کے بسبب اس کے کہ حاجت مند جانتے ہیں ہر سال کچھ نہ کچھ کرایہ زیادہ کرنا چاہتے ہیں"

صہ روداد ۱۲۸۸ ہجری

ان الفاظ کو پڑھ کر کم از کم میری گردن تو جھک گئی، مسلمانوں پر جو افتاد پڑی تھی، اور پڑتی چلی جارہی ہے، اس کی تہ میں ٹٹولنے سے کچھ اسی قسم کے اسباب کا نشان ملتا ہے، ماظلمناھم ولکن کانوا انفسھم یظلمون کے قرآنی قانون کی یہی زندہ شہادتیں ہیں۔

بہرحال یہ اور اسی قسم کے متعدد اسباب و وجوہ کا تذکرہ کرنے کے بعد آخر میں مجلس شوریٰ کی اس تجویز سے مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا ہے کہ

"ایک مکان وسیع، بافراغت، جس میں قریب ایک سو طلبہ بآرام تمام رہ سکیں، اور چار پانچ درسگاہ بھی ہوں اور رفع حوائج ضروریہ کی جگہ بھی اس میں ہو، تیار ہو" ص۳

آج دارالعلوم دیوبند کی فلک پیما، کوہ ہیکل، عمارتوں کا سلسلہ طویل و عریض رقبہ میں پھیلا ہوا ہے یہی پہلی تجویز اس تناور درخت کا تخم اول تھی، تجویز شائع کردی گئی، تعمیر کی مد میں رقوم آنے لگیں۔ سنہ ۱۲۸۹ھ کی روداد سے معلوم ہوتا ہے، کہ حاجی عابد حسین صاحب حالانکہ مدرسہ کی مہتممی سے سبکدوش ہوچکے تھے، اور جامع مسجد کی تعمیر میں مصروف تھے، انہوں نے اپنی اسی جامع مسجد کے اردگرد چند چھوٹے بڑے حجرے بنوانے شروع کردیئے۔ حاجی صاحب مرحوم کا خیال تھا، کہ یہی حجرے دیوبند کے مدرسہ کے لئے کافی و وافی ہوں گے۔ اگرچہ ارباب شوریٰ نے حاجی صاحب کی اس رائے کی بظاہر مخالفت نہیں کی، بلکہ اسی سنہ ۱۲۸۹ھ کی روداد میں تعمیری مد کے زر اعانت کے متعلق یہ بھی لکھ دیا گیا تھا کہ تعمیر کا کام ان ہی کے ہاتھ میں ہے اس لئے چاہئے، کہ اس مد کی رقوم

"بخدمت حاجی صاحب ممدوح الصدر مہتمم جامع مسجد ہی کے ارسال فرمائیں" ص۱۰

لیکن سچ پوچھئے، تو مدرسہ کا مستقبل جس کے سامنے تھا، وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا، نہ دیکھنے والوں کے لئے اس کا دکھانا بھی دشوار تھا، اور جب تک وہی سب کچھ دوسروں کو بھی نہ سوجھتا، جو وہ دیکھ رہا تھا، لوگ یہ کیسے باور کرسکتے تھے، کہ ضلع سہارنپور کی ایک قصباتی آبادی کا نام تعلیم و تعلم، درس و تدریس کی تاریخ میں ایک ایسی ٹھوس حقیقت کا قالب اختیار کرنے والا ہے، کہ عام تعلیمی تاریخ نہ سہی لیکن اسلامی علوم کی تعلیم و تدریس کی ہندوستان ہی کی حد تک نہیں، بلکہ بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ سارے

عالم اسلام کی تعلیمی تاریخ کا یہ شعبہ اس کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ حال اور مستقبل کے متعلق نقطۂ نظر کے اسی اختلاف کا اثر دلوں میں کشمکش کی ایک ایسی نفسیاتی کیفیت کو پیدا کئے ہوئے تھا، جس پر زیادہ دن تک صبر شاید برداشت سے باہر ہو چکا تھا، حاجی صاحب مرحوم جامع مسجد کے ارد گرد جو حجرے بنوا چکے تھے، دوسری مسجدوں کے حجروں کی طرح طلبہ کی اقامت گاہوں کا کام ان سے لیا جا سکتا تھا، اور یہی کام ان سے بعد کو لیا بھی گیا، آج تک لیا جا رہا ہے۔ اس لئے ان کی تعمیر میں مزاحمت تو مناسب نہ خیال کی گئی، جو کچھ وہ کر رہے تھے، چھوڑ دیا گیا کرتے رہیں۔ اور خود مجلس شوریٰ نے جیسا کہ ۱۲۹۱ھ کی روداد میں مدرسہ کے مستقل اور وسیع مکان کی تعمیر والی تجویز کا ذکر کر کے یہ اطلاع دی گئی ہے کہ

"۱۹ ذیقعدہ ۱۲۹۱ ہجری صلعم بروز جمعہ عین جلسہ انعام طلبہ میں اس کے لئے گزارش کیا" ص۲۵

کاغذی اپیل کے بعد باضابطہ "جلسہ تقسیم انعام" میں تعمیر والی یہ تجویز عام مسلمانوں کے مجمع میں پہلی دفعہ پیش کی گئی۔ لکھا ہے کہ

"برابر فرد چندہ پر دستخط ہوتے چلے جاتے ہیں، جس میں بہت سا روپیہ وصول ہو تا جاتا ہے"

چند ہی دنوں میں اتنی رقم فراہم ہو گئی کہ اسی سال

"ایک قطعہ نہایت وسیع واسطے تعمیر مکانات کے خرید لیا گیا" ص۲۵ روداد ۱۲۹۱ھ

ان واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے، تمہید میں جو یہ الفاظ درج کئے گئے ہیں، کہ یہ

"آرزوئے دیرینہ جس کی سالہا سال سے امید تھی"

اسی سے سمجھ میں آتا ہے کہ جامع مسجد کے ارد گرد جو حجرے تعمیر ہو رہے تھے، ۱۲۸۹ھ کی روداد میں جس کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا تھا کہ اس کی طرف

"جناب عمدہ اہل صفا، خیر خواہ خلائق جناب حاجی محمد عابد صاحب مہتمم سابق مدرسہ ھذا، حال مہتمم تعمیر جامع مسجد نے توجہ تام فرمائی، اور احاطۂ مسجد ہی میں جملہ حوائج ضروریہ درسگاہ

قیام گاہ طلبہ ودیگر ضروریات) کے لئے موقع مناسب کے مکان تجویز فرمائے۔" صلا
یہ شاید حاجی صاحب مرحوم کی ذاتی تجویز تھی، جس کی مزاحمت نہیں کی گئی تھی، لیکن تعمیر کی دیرینہ آرزو، جس کی سالہاسال سے امید تھی، اس کے مقابلہ میں گویا اس کی حیثیت گونہ اصرار بے جا ہی کی سی تھی، شاید اسی لئے جامع مسجد کے حجروں والی تجویز بجائے ارباب شوریٰ کے براہ راست حاجی صاحب مرحوم کی طرف روداد میں منسوب کی گئی ہے، مدرسہ کی تاریخ میں آئندہ بعض ناگفتہ بہ ہنگامی اختلافات جو پیش آئے، بظاہر ان کی ابتدا شاید اسی واقعہ سے ہوئی، کچھ نہ کچھ جس کی کسک آج تک قلوب میں باقی ہے، مگر میری بحث کے موضوع سے یہ مسئلہ ہی خارج ہے، میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ دور قاسمی میں مدرسہ کن منزلوں کو طے کر چکا تھا۔ مدرسہ کی مستقل تعمیر کے لئے ۱۲۹۱ھ میں زمین خریدلی گئی، اور ۲ رذی الحجہ ۱۲۹۲ھ میں جیسا کہ ۱۲۹۲ھ کی روداد میں اطلاع دی گئی ہے، تقسیم اسناد وانعامات کا بھی جلسہ منعقد ہوا، جس میں غیر معمولی طور پر علاوہ دیوبند کے کافی تعداد باہر سے آنے والے معزز مہمانوں کی بھی تھی، ان میں وقت کے بعض سربرآوردہ علماء، اور امراء بھی تھے، آخر میں لکھا ہے کہ

"کل اہالیان جلسہ اس موقعہ پر تشریف لائے، جہاں تعمیر مکان مدرسہ کی بنیاد کھدی ہوئی تھی، اول پتھر بنیاد کا جناب مولانا مولوی احمد علی صاحب سہارنپوری نے اپنے دست مبارک سے رکھا، اور بعد میں جناب مولانا مولوی محمد قاسم صاحب و مولانا مولوی رشید احمد صاحب و مولانا مولوی محمد مظہر صاحب نے ایک ایک اینٹ[1] رکھی۔" صلا روداد ۱۲۹۲ھ

[1] تعمیر مدرسہ کی تاریخ کی یہ معلومات تو وہ ہیں جو براہ راست مدرسہ کی قدیم رودادوں سے فراہم کی گئی ہیں، مدرسہ العلوم کی تاریخ کے لکھنے والے مزید معلومات کا بھی اضافہ کر سکتے ہیں، فقیر نے بقدر ضرورت چیزوں کا انتخاب کر لیا ہے، اس موقعہ پر ارواح ثلاثہ کی اس روایت کا قدرتاً خیال آتا ہے جس کے بعض اجزا کا اسی کتاب میں مختلف موقعوں پر ذکر گذر بھی چکا ہے، ارواح ثلاثہ کی اس روایت میں سنگ بنیاد کے متعلق یہ اضافہ پایا جاتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے اشارہ سے حضرت مولانا اصغر حسین صاحب کے نانا جو میاں جی منے شاہ صاحب کے نام سے مشہور تھے، وہی طلب کئے گئے اور پہلی اینٹ انہی کے دست مبارک سے رکھوائی گئی۔ لکھا ہے کہ میاں جی منے شاہ صاحب علاوہ سید ہونے کے خود بڑے بزرگ تھے۔ بلکہ میرا حافظہ غلطی نہیں کر رہا ہے تو یاد آتا ہے کہ میر شاہ خان مرحوم حضرت نانوتویؒ کے حوالہ سے یہ بیان کرتے تھے کہ میاں جی منے شاہ ایسے آدمی ہیں جن کے دل پر گناہ کا شاید خطرہ بھی نہیں گذرا۔" واللہ اعلم دوسری بات (باقی اگلے صفحہ پر)

اس کے بعد مدرسہ کی تعمیر کا سلسلہ جاری رہا، دور دراز مقامات سے بھیجنے والے تعمیری مد میں رقوم مسلسل ارسال کر رہے تھے خصوصاً حیدر آباد دکن کے ارباب خیر نے تو گویا ایک مجلس ہی بنالی تھی، جو مدرسہ کی تعمیر کے لئے زراعانت وصول کرتے تھے، اور بھیجتے جاتے تھے، اس باب میں اسلامیان دکن کی دلچسپیاں اس حد تک پہنچ گئی تھیں کہ ۱۲۹۵ھ یعنی عام روداد کے علاوہ خاص حیدر آباد کے مسلمانوں کے امدادی چندوں کی تفصیل کے لئے ایک علیحدہ کتابچہ ۲۲ صفحوں کا مدرسہ کو شائع کرنا پڑا، جس کا ایک مطبوعہ نسخہ اس وقت میرے سامنے بھی ہے، تمہیدی عبارت اس "دکنی کتابچہ" کی یہ ہے، حمد و نعت کے بعد عام مسلمانوں کو مخاطب کر کے لکھا گیا تھا،

"ان دنوں چند بزرگواران والا ہمت مفصلہ ذیل ساکنان بلدۂ خجستہ بنیاد حیدر آباد دکن نے اپنے وجود باجود کو ابتغاءً لوجہ اللہ ومرضاتہ تائید مدرسہ عربیہ دیوبند کے لئے گویا وقف کر دیا ہے، اور اس کی اعانت کے واسطے کمر ہمت چست باندھی ہے" صا

آگے ہندوستان کے دوسرے شہروں کے مسلمانوں کو حیدر آباد کے غیور، اولوالعزم والا ہمت دیانتداروں کے نقش قدم پر چلنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ فراہمی چندہ کے لئے جیسے حیدر آباد میں ایک مستقل

---

گذشتہ صفحہ سے، یہ ہے کہ میاں جی صاحب مرحوم کے بعد حضرت نانوتوی ہی کی التجا پر حاجی عابد صاحب نے دوسری اینٹ رکھی، پھر حضرت گنگوہی نے لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ روداد کی روایت اور اس روایت میں کتنا فرق ہے، ترجیح کے لحاظ سے ظاہر ہے کہ تحریری وثیقہ کی روایت کا مقابلہ زبانی سینہ بسینہ والی روایت نہیں کر سکتی، اور تطبیق کی راہ اگر اختیار کی جائے تو اولیت کو بجائے حقیقی کے اضافی قرار دے کر کہہ دیا جا سکتا ہے کہ میاں جی صاحب تو صاحب دل ہونے کی حیثیت سے اول تھے علماء میں حضرت مولانا احمد علی صاحب اول اور شوریٰ کی مجلس کے ارکان میں اول حاجی عابد صاحب تھے۔ ارواح ثلاثہ میں حاجی عابد صاحب مرحوم کے اختلافی نقطۂ نظر کو بھی واضح لفظوں میں بیان کیا گیا ہے لکھا ہے کہ جلسۂ تقسیم انعام میں سیدنا الامام الکبیر نے جب سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب میں شریک ہونے کیلئے حاضرین جلسہ کو دعوت دی تو حاجی صاحب خفا ہو کر اٹھے" اور خود ہی چھتہ کی مسجد میں جا کر بیٹھ گئے، سیدنا الامام الکبیر مجمع کو ساتھ مدرسہ کی زمین کی طرف چل پڑے، مجمع آگے بڑھ گیا اور خود چھتہ کی مسجد میں پہنچ کر حاجی صاحب سے منت سماجت کی، جس پر دونوں بڑے دونوں بغل گیر ہوئے صفائی ہو گئی۔ ان کو ساتھ لیکر سیدنا الامام الکبیر بھی مجمع میں تشریف لائے، دلچسپ لطیفہ ارواح ثلاثہ کی روایت کا یہ ہے کہ ابن میں کہ شاکشی مدرسہ کی زمین حاجی عابد صاحب مرحوم ہی کے نام خریدی گئی تھی، لکھا ہے کہ "بیع نامہ" ان ہی کے نام لکھوایا گیا تھا۔ اس میں یہ بھی ہے کہ مدرسہ کی پہلی دفعہ زمین کا یہ قطعہ خریدا گیا تھا۔

مجلس قائم کردی گئی ہے، چاہئے کہ دوسرے شہروں میں بھی اس کی پیروی کی جائے۔

مدرسہ کی تعمیر کا کام بھی جاری رہا، اور اسی کے ساتھ ان ہی دنوں میں وقتاً فوقتاً بعض اصلاحی اقدامات کی طرف بھی توجہ کی گئی، خصوصاً عربی اور دینی تعلیم کے ساتھ "معاشی ذرائع" کے سکھانے کا انتظام ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ شروع ہی سے اس کا خیال بھی سامنے تھا، اس سلسلہ میں ہم دیکھتے ہیں، کہ خالص دینی و عربی تعلیم کی حد تک اس کا تجربہ ہونے لگا کہ دنیا میں ان علوم کے جاننے والوں کی مانگ ہے ۱۲۹۴ھ کی روداد میں یہ لکھتے ہوئے کہ مدرسہ کی تعلیم کا مطلب یہ نہیں ہے، کہ لوگ نکمے ہو کر بیٹھ جائیں، حکومت قائم کے دفاتر کی نوکری معاش کے بے شمار ذرائع میں ایک مختصر ترین محدود ذریعہ ہے، لیکن اس کے سوا

"اور بھی اعلیٰ و افضل طریقے ہیں، مثلاً تجارت، زراعت، حرفت" ص ۱۲

آگے یہ اطلاع بھی دی گئی ہے۔

"اس بات کے سننے سے اور بھی تعجب ہوگا، کہ خدا کے فضل و عنایت سے اکثر علاقہ (علاقۂ ملازمت) واسطے فارغ التحصیل طلبہ کے اطراف ہندوستان سے بشاہرہ معقول مدرسہ ہذا میں آتے رہتے ہیں، اور نوکری ان لوگوں کو ڈھونڈھتی پھرتی ہے"

پھر اس زمانہ میں ریاست بھاول پور، اور گجرات کے کسی مقام لاجپور سے جو مطالبے آئے ہوئے تھے، ان کا تذکرہ کر کے اطلاع دی گئی ہے، کہ باوجود اس نوکری کے، ملنے کے دارالعلوم کے فارغ التحصیل طلبہ میں کوئی ان نوکریوں کے قبول کرنے پر اب تک آمادہ نہیں ہوا ہے۔

بہرحال بات وہی ہے، جس کا ذکر شاید پہلے بھی کر چکا ہوں، اور اپنے متعدد مقالات و مضامین میں اس خیال کو فقیر نے ظاہر کیا ہے، کہ تقریباً اپنی صد سالہ زندگی میں دارالعلوم دیوبند سے دینی و علمی منافع جو حاصل ہوئے، وہ تو خیر بجائے خود ہیں، واقعہ یہ ہے، کہ معاشی حیثیت سے بھی مسلمانوں میں پست ماندہ طبقات کے خدا جانے کتنے گھرانوں کو اس کا موقع مل گیا کہ اگر دارالعلوم کے تعلیمی نظام سے استفادہ کا موقعہ ان کو نہ ملتا تو خوش حالی و فارغ البالی کی جو زندگی آج گذار رہے ہیں۔ ظاہر

اسباب کی رو سے شاید اس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ معاشی منافع دارالعلوم کی بدولت جن لوگوں کو حاصل ہوئے ہیں۔ ابتدائے تاسیس سے اس وقت تک ان افراد کی تعداد شاید لاکھوں سے متجاوز ہو چکی ہوگی۔ جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس سلسلہ میں مستفید ہوئے ہیں۔ ان میں بعضوں کو تو کافی بلند ہونے کے مواقع مل گئے، جن کی داستان طویل ہے۔

قطع نظر اس عام معاشی منافع کے عہد قاسمی ہی میں بعض ایسے امور کی طرف جیسا کہ رودادوں سے معلوم ہوتا ہے، توجہ مبذول ہو چکی تھی، جن کو سیکھ کر خدا ہی جانتا ہے، کتنوں کو روزی کمانے میں سہولتیں میسر آئیں۔ مثلاً ۹۰ھ یعنی قیام دارالعلوم کے چھٹے سال ہی میں لکھا ہے کہ

"حافظ محمد کوثر علی صاحب خوشنویس ساکن نگینہ نے ..... تعلیم خوش خطی طلبہ اپنے ذمہ کر لی۔" ص۱۲

ظاہر ہے کہ مطابع اور پریس، خصوصاً ہندوستان جہاں بجائے ٹائپ کے اس وقت تک لیتھو پریس ہی کے مطبوعات کو عوام بھی پسند کرتے ہیں، اور کتابوں کے نشر و اشاعت کے کام کرنے والوں کا بیان ہے کہ ٹائپ کے حساب سے لیتھو کی طباعت پر نسبتاً کم مصارف عائد ہوتے ہیں۔ اسی لئے خوشنویسی کا ہنر اس زمانہ میں روزگار کا ایک مستقل ذریعہ ہے، خصوصاً پڑھے لکھے عربی و فارسی کے جاننے والے خوشنویس چاہئے تو یہی کہ عام اردو خواں کاتبوں کے مقابلہ میں کتابت کے فرائض کو زیادہ بہتر طریقہ سے انجام دیں۔ یہ ایک ایسا معاشی پیشہ ہے، جو علم کے ساتھ کافی مناسبت رکھتا ہے، اور علم سے اس پیشہ کے فروغ میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

اسی طرح ۱۲۹۵ھ کی روداد کے آخر میں ایک اعلان میں اس کی خبر بھی دی گئی ہے، کہ دینی علوم کے ساتھ ساتھ دارالعلوم میں "طب یونانی" کے پڑھانے کا نظم کیا گیا ہے، لکھا ہے کہ

"مولانا محمد یعقوب صاحب مدرس اول اس علم کی کتابیں پڑھاتے ہیں" ص۲۵

اور گو اس خیال کی تکمیل کی طرف بعد کو توجہ نہیں کی گئی، لیکن اس راہ میں جن بلند حوصلوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کا اندازہ اسی اعلان کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے جو اسی طبی تعلیم کے شعبہ کی طرف ارباب خیر کو متوجہ

کرتے ہوئے ضرورت ظاہر کی گئی تھی کہ

"اس فن لطیف کے لئے ایک بڑا کتب خانہ کتب و بیاض ہائے معتبرہ حکماء حاذق، واطبار کامل"

اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ

"و آلات عمدہ جراحی وغیرہ طبیب و جراح تجربہ کار کا واسطے سکھانے طریقہ مطب و فن جراحی وغیرہ کے نہایت ضروری ہے" ص۸ روداد ۱۲۹۶ھ

دیکھ رہے ہیں، عہد قاسمی کے دارالعلوم کی امنگوں اور اولوالعزمیوں کا حال، وقت نے مساعدت نہ کی، باغ کے لگانے والے کے سامنے جو ارادے تھے، اولاً سب ظاہر نہ ہو سکے، اور ادھر ادھر جن کا کچھ پتہ چل جاتا ہے، تو ان پر عمل کی توفیق میسر نہ آئی، ۱۲۹۱ھ کی روداد کے اس جزو کو ملاحظہ فرمائیے۔ اخبار و مطابع کے ان کارپردازوں کا شکر یہ ادا کرتے ہوئے جو مدرسکی امداد اپنے اخبار اور کتابوں سے کرتے تھے۔ قسطنطنیہ کے ایک عربی اخبار "الجوائب" نامی کے متعلق یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ

"بلا اخذ قیمت محض، بنظر خیر خواہی اس مدرسہ اسلامی و فائدہ طلبہ اہل اسلام کے عنایت کرتے ہیں" ص۵۲

سب سے بڑا فائدہ عربی زبان کے اس اخبار کا یہ بیان کیا گیا ہے، کہ

"طلبہ عربی خواں کو زبان دانی کا فائدہ علاوہ فائدہ اخبار کے کمال درجہ حاصل ہوتا ہے"

ص۵۳ روداد ۱۲۹۱ ہجری

عربی زبان دانی، اور اخبار بینی کے ان منافع کی طرف عہد قاسمی کے بعد کتنی توجہ کی گئی، اس کا جواب "صورت ببیں حالت مپرس" "باتیاں راچہ بیاں" کے سوا اور کیا دیا جا سکتا ہے؟

بہر حال دارالعلوم کی عمر کی یہ مدت جو عہد قاسمی میں گذری، خواہ جتنی بھی مختصر ہو، لیکن جو شہادتیں آپ کے سامنے گذر چکیں، ان کی روشنی میں دیکھنے بعد کو دارالعلوم نے تاریخ کے جس طویل دور کو

پیدا کیا، قریب قریب ایک صدی گویا ختم ہو رہی ہے، اس عرصہ میں طولاً و عرضاً اس کے مختلف شعبوں میں جو ہر جہتی ترقیاں ہوئی ہیں۔ ان کا بھلا کون انکار کر سکتا ہے، لیکن بنیادی سالوں میں جن جن تخموں کو بونے والے بو کر چلے گئے، سچ تو یہ ہے کہ ابھی صحیح معنوں میں ان ہی کی نشو و نما میں کامیابی نہیں ہوئی ہے، اسی لئے دارالعلوم کی حد تک اپنا خیال تو یہی ہے کہ نئی تجویزوں سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ عہد قاسمی کے کلیات کی روشنی میں عملی اقدامات کی طرف توجہ کی جائے، جو کچھ اس وقت تک سوچا جا چکا تھا، اسی کو عمل کا قالب عطا کیا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ ماضی کی تاریخ کا صحیح اور مفید مطالعہ وہی ہو سکتا ہے جس سے مستقبل کے سلجھانے میں مدد لی جائے ورنہ گذرے ہوئے واقعات کا اعادہ، واقعات ہی کا اعادہ کیوں نہ ہو نتیجۃً ایک افسانہ سے زیادہ انصاف کی بات یہی ہے کہ وہ اور کچھ نہیں ہوتا۔

بحث کو ختم کرتے ہوئے آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عہد قاسمی کی جن رودادوں سے جو معلومات فراہم کی گئی ہیں، ان کو مرتب کر کے شائع کرنے والے یعنی حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حاجی عابد حسین صاحب مرحوم کے بعد جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، دارالعلوم کے مہتمم مقرر ہوئے تھے ان ہی کے بعض ذاتی اعترافات یہاں نقل کر دیئے جائیں۔ زبانی روایت تو اس باب میں ان ہی کے حوالہ سے ارواح ثلثہ میں یہ پائی جاتی ہے، فرماتے تھے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ دیوبند کا اہتمام کبھی خود نہیں فرمایا بلکہ اہتمام کیلئے مجھے طلب فرمایا، اور میں وہی کرتا ہوں، جو انہیں مکشوف ہوتا ہے۔"

صاف اور واضح لفظوں میں اپنے مافی الضمیر کی شرح خود مولانا رفیع الدین صاحب یہ کرتے تھے کہ

" علم ان کا (مولانا نانوتوی رح کا) عمل میرا ہے" ص۱۸۳

یہ روایت مولانا طیب صاحب کی ہے جسے موصوف نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے اسی کتاب میں درج کیا ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ واضح و روشن، خود مولانا رفیع الدین قدس اللہ سرہ العزیز کی خود نوشتہ تحریری شہادت ہے، جو ۱۲۹۵ھ کی روداد میں بعنوان التکبیر

کی وفات کے تذکرہ کے بعد نظم بند کی گئی ہے۔

حضرت مرحوم کے دینی جذبات عالیہ، اور عام اسلامی خدمات جلیلہ کی طرف اجمالی اشارہ کرنے کے بعد مولنا رفیع الدین مرحوم نے لکھا تھا۔

"خصوصاً اس مدرسہ (دیوبند) کو، کیونکہ اس چشمۂ فیض کے منبع، اور اس آب حیات کے مصدر، اور اس آفتاب عالمتاب کے مظہر آپ (یعنی سیدنا الامام الکبیر) ہی تھے"

آگے یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

"اللہ اللہ اس کارخانہ خیر (یعنی مدرسہ) کی ترقی میں کیسی کیسی ہمتیں لگائیں"

اپنی اعترافی شہادت وہ یہ درج کرتے ہیں

"حق تو یہ ہے، کہ اس شمس الاسلام ہی کے حسن سعی کا یہ نتیجہ ہے، کہ ملک ہند میں باوجود ضعف اسلام، و اسلامیان، علم دین کو کس زور شور سے پھیلایا کہ باید و شاید" ص
روداد ۱۲۹۶ھ

اس کے بعد، عہد قاسمی کی رودادوں کی تجویزوں کا حقیقی سرچشمہ حضرت والا کی فکر حکیمانہ کے سوا، خود ہی بتائیے، کہ اور کس چیز کو قرار دیا جائے۔ صراحۃً جو باتیں آپ کی طرف نہ بھی منسوب کی گئی ہوں، ماننا۔ یہی چاہئے، کہ ان کی تہ میں بھی حضرت والا کے چشم و ابرو کے اشارے کام کر رہے تھے،

انچہ استاذ ازل گفت ہماں می گویم

خود پس آئینہ والے طوطی ہی کا جب یہ اقرار ہو، تو سمجھنے والے آپ ہی بتائیے کہ آخر وہ کیا سمجھیں۔

خلاصہ یہ ہے، کہ دین و دنیا قدیم و جدید علوم کی پیوستگی و وابستگی یعنی باہم ایک کو دوسرے کے ساتھ ہم رشتہ کرنے کے لئے نصاب کی ترمیم و اصلاح کا مسئلہ، انتشار و پراگندگی کی جگہ سرزمین ہند کی اسلامی تعلیم گاہوں کو جامعاتی قالب میں لانے کے لئے کسی ایک مرکز پر ان کو مجتمع کرنا، دینی مدارس کے طلبہ اور فارغین کے معاشی سوال کا حل، ان کلی مسائل کے ساتھ ساتھ دوسرے تعلیمی جزئیات مثلاً کتابوں کی حفاظت و طباعت و اشاعت کے متعلق کافی رہ نمائیاں ان معلومات سے حاصل ہو سکتی ہیں جو عہد قاسمی کی

رودادوں سے فراہم کر کے پیش کی گئی ہیں۔ بلکہ آج مسلمانان ہند کے سامنے سب سے بڑا سوال اس ملک کے دوسرے آبادکاروں کے تعلقات کی بنیاد پر جو پیدا ہو گیا ہے، چاہا جائے تو اس سوال کے حل کی راہیں بھی ان ہی معلومات کی روشنی میں ڈھونڈھی جا سکتی ہیں۔ لمن کان لہ قلب او القی السمع وھو شھید۔

واقعہ تو یہ ہے، سیدنا الامام الکبیر کی زندگی کے جس پہلو کو اب پیش کرنا چاہتا ہوں، ایک حیثیت سے یہ سمجھنا چاہئے، کہ جہنم بن کر جو چنگاری آج ملک میں بھڑک اٹھی ہے، یہ چنگاری کیسے پیدا ہوئی؟ شاید آئندہ جو کچھ عرض کیا جائے گا، اسی میں اس سوال کا جواب بھی آپ کو مل جائے۔

آپ دیکھ چکے، سنے سنائے افواہی قصوں، اور زبانی روایتوں ہی کی بنیاد پر نہیں، بلکہ مسلمانان ہند کے سب سے بڑے مقدس دینی ادارہ کے متعلق یہ تحریری وثیقہ آپ کی نظر سے گذر چکا کہ وقت اسی ملک پر وہ بھی گذر چکا ہے، کہ ہندوؤں کے اخباروں (اودھ اخبار اور سفیر بوڈھانہ) کے لئے یہ دعا کی جاتی تھی کہ خدا

"ان کی قوت اور آزادی کو قائم رکھے"

گذر چکا کہ زر اعانت یا چندہ کے متعلق بالالتزام ہر سال کی روداد میں یہی اعلان مسلسل کیا جاتا تھا

"چندہ کی کوئی مقدار مقرر نہیں، اور نہ خصوصیت مذہب وملت"

اعلان بھی یہی کیا جاتا تھا، اور عمل بھی اسی پہ ہوتا رہا، اسی بنیاد پر بخوشی ان ہندوؤں کی مالی امداد بھی قبول ہوتی رہی، جو ان کی طرف سے پیش ہوتی تھی، خصوصاً کتابوں کی شکل میں بار بار ان رودادوں میں اس کا اعتراف کیا جاتا رہا کہ اس باب میں غیر معمولی فیاضیوں کا تجربہ ایک ہندو مالک مطبع ہی کے متعلق مدرسہ والوں کو ہوتا رہا۔ کتابوں کے سوا قیمتی اردو روزنامہ جو شاید ہندوستان میں وہی پہلا روزنامہ تھا، اسی سیر چشم، فراخ دل ہندو کی طرف سے ہدیۃً پیش ہوتا رہا، جیسا کہ چاہئے تھا۔ مدرسہ کی طرف سے بھی بار بار اس بذل ونوال کا شکریہ ادا کیا جاتا تھا۔ الغرض دنیاوی علوم وفنون کی تعلیم کے مدارس کا بار حکومت کے خزانے پر ڈال کر دینی وملی تعلیم کے لئے ہندوستان کے قومی خزانہ سے استفادہ کا ارادہ جو کیا گیا تھا، اس میں باشندگان ملک کے دینی نظریات، اور مذہبی احساسات کی قید گویا اٹھا دی گئی تھی، اسی لئے

ہر طرح کے رنگ دے بھی رہے تھے، اور مدرسے بھی رہا تھا، بلکہ اس کا اظہار کرتے ہوئے کہ گو مقصود اصلی اس مدرسہ کے بانی کا دینی علوم ہی کی اشاعت ہے لیکن بقدر ضرورت فارسی اور کچھ حساب و کتاب یعنی ریاضی کی تعلیم کا بھی مدرسہ کے ابتدائی کلاسوں میں انتظام کیا گیا ہے بجٹ ۱۲۹۲ھ کی روداد میں اطلاع بھی دی گئی ہے کہ

"یہاں تک کہ بعض بعض ہندو لڑکے بھی پڑھتے ہیں" ص ۱۳ روداد ۱۲۹۲ھ

"ہندو لڑکے پڑھتے تھے" ظاہر ہے کہ مطلب اس کا یہی ہو سکتا ہے، اور یہی ہے بھی، کہ خاص سہولتوں کی وجہ سے دیوبند کے مقامی ہندو باشندے بھی کبھی کبھی فارسی اور حساب وغیرہ کے پڑھنے اور سیکھنے کے لئے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے بچوں کو مدرسہ کی ان ابتدائی کلاسوں میں شریک کر دیتے تھے جن میں ان مضامین کی تعلیم ہوتی تھی، اس سے کچھ اور ثابت ہوتا ہو، یا نہ ثابت ہوتا ہو، لیکن تعلقات کی شگفتگی کا اس سے زیادہ واضح ثبوت کیا ہو سکتا ہے، کہ دارالعلوم دیوبند جیسی خالص دینی و اسلامی درسگاہ میں ان بچوں کو کشادہ پیشانی شریک کر لیا جاتا تھا، اور کتنے کھلے دل کے ساتھ شریک کر لیا جاتا تھا، کہ روداد تک میں تذکرہ کر کے سارے مسلمانان ہند کو اس سے مطلع کیا جاتا تھا، اس سے بھی زیادہ عبرت آموز سبق اسی اطلاع سے یہ ملتا ہے، کہ مسلمانوں کی ایک ایسی تعلیم گاہ میں جو مسلمانوں کے دین اور صرف دین کا خالص تعلیمی مرکز ہے، اس میں بغیر کسی دغدغہ کے اپنے بچوں کو ہندو شریک کرتے تھے، اور شریک کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں محسوس کرتے تھے۔ دلوں اور دماغوں پر آج جو تالے چڑھا دیئے گئے ہیں، ان کو دیکھئے، اور اندازہ کیجئے کہ اسی ہندوستان میں اسی آسمان کے نیچے اسی سرزمین پر اس تماشے کو بھی دیکھا جاتا تھا، اور بخوشی دیکھا جاتا تھا جس کا تصور کرنا بھی آج شاید دشوار ہے، ایسا کیوں ہوا؟ وہی ملک جس میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا وہی گردشیں بدلتے ہوئے موجودہ حالات تک کیسے پہنچا، ان سوالوں کا صحیح جواب تاریخ کے جن اوراق میں لکھے ہوئے تھے۔ افسوس ہے کہ وہ پھاڑ دیئے گئے، ان ہی لوگوں نے ان کو پھاڑ دیا جو دوسروں پر قومی تاریخ کے اوراق کے پھاڑنے کا مجرمانہ الزام لگاتے ہیں[1]۔

[1] شاید اب تو ندامت کے ساتھ کچھ سر جھک بھی رہے ہیں، ورنہ الفنسٹن وغیرہ نے ہندوستان کی (باقی اگلے صفحہ پر)

تاہم ان ہی چاک شدہ اوراق کے کچھ ٹکڑے کبھی کبھی ادھر ادھر مل جاتے ہیں سب کے درج کرنے کی اور ان سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں ان پر تفصیلی بحث کی تو اس کتاب میں گنجائش نہیں ہے لیکن ان میں بعض ٹکڑوں کو خاص ترتیب سے درج کر دیتا ہوں۔ پڑھئے اور جو نتیجے ان سے پیدا ہوتے ہیں ان کو خود سوچئے۔

کتاب کے مقدمہ میں بھی اور اصل کتاب میں بھی اس کا تذکرہ مختلف مقامات میں گذر چکا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت ختم کر کے اس ملک کی سیاسی باگ ڈور جس قوم کے ہاتھ میں آگئی تھی اس قوم کے ان حکمرانوں کی طرف سے پہلی کوشش تو اسی کی گئی کہ

"جس طرح سے ہمارے بزرگ کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہو گئے تھے اسی طرح یہاں (ہندوستان میں) بھی سب کے سب ایک ساتھ عیسائی ہو جائیں گے۔" (تاریخ التعلیم ڈاکٹر سید محمود منقول از مسلمانوں کا روشن مستقبل ص۱۳۱)

اور اسی نصب العین کے پیش نظر منجملہ اور تدبیروں کے جوہری تدبیر "انگریزی تعلیم" تھی۔ لارڈ میکالے جنہوں نے اپنے ایک ووٹ سے ہندوستان کے مشرقی نظام تعلیم کو مغربی نظام کے قالب میں

---

(گذشتہ صفحہ سے) تاریخ جس زمانہ میں لکھی ہے عموماً اس زمانہ میں یہ مشہور کر دیا گیا تھا کہ سرزمین ہند کی" مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے پیشتر کی کوئی مسلسل تاریخ نہیں ملتی" الفنسٹن صاحب کا دعوے تھا، مشہور جرمنی فلسفی شاعر کا قول نقل کیا جاتا تھا کہ تاریخ تو صرف روم اور یونان ہی کی تاریخ ہے، باقی قدیم قوموں میں مصر ہو، یا چین، یا ہندوستان کسی حالت میں ان کے حالات عجائبات سے زیادہ نہیں (سمتھ کی تاریخ قدیم ہند ص۱۱)

سمتھ ہی نے اپنی اسی کتاب میں یہ عجیب و غریب دعوے کئے ہیں کہ سکندر اعظم کا ہندوستان پر جو حملہ ہوا اسی کا نہیں بلکہ سومنات پر محمود غزنوی کی چڑھائی تک کے ذکر سے ہندوستان حتیٰ کہ گجرات تک کی تاریخیں خالی ہیں، اسی کا بیان ہے کہ ہندوستان پر باہر سے جو حملے ہوئے ان کے متعلق خاموشی کی ایک سازش پائی جاتی ہے (دیکھو تاریخ قدیم ہند ص۲۲ ترجمہ اردو) ان باتوں پر مجھے خیال آیا کہ آج کل یورپ والوں نے جو پھیلا رکھا ہے کہ مصر کی قدیم تاریخ کے جو وثائق مختلف شکلوں میں ملتے ہیں، ان میں بنی اسرائیل اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان تعلقات کا ذکر نہیں ملتا جن کے قصے تورات اور قرآن میں پائے جاتے ہیں، خیال بھی گذرا کہ قدیم قوموں کی سازش ہی جب تھی جس کا سمتھ صاحب نے دعویٰ کیا ہے، تو مصری تاریخوں کا بنی اسرائیل اور موسیٰ علیہ السلام کے ذکر سے خالی ہونا محل تعجب کیوں ہو۔ اگرچہ پچھلے دنوں بعض لوگوں نے ثابت کیا ہے کہ مصر کی تاریخ میں بنی اسرائیل کے آثار کا بھی سراغ ملتا ہے لیکن نہیں بھی ملتا تو خاموشی کی مذکورہ بالا سازش کے بعد ملنے کی توقع ہی کیا ہو سکتی تھی۔

ڈھال دیا۔ انہوں نے اپنی اس کامیابی کے بعد اپنے والد کے نام جو خط لکھا تھا۔ شاید پہلے بھی نقل کر چکا ہوں جس میں پیشگوئی کی گئی تھی کہ

"تیس سال بعد ایک بت پرست یعنی ہندو بنگال میں باقی نہ رہے گا" (روشن مستقبل ص۳۔)

اسی کا اندازہ کرنے کے لئے کہ انگریزی تعلیم کس حد تک اس نصب العین کے لحاظ سے بار آور ہو رہی ہے عموماً کام اور نتیجہ کا جائزہ بھی وقتاً فوقتاً لیا جاتا تھا۔ سر چارلس ٹریولین جو اس مسئلہ سے غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے اور ترقی کر کے گورنری کے عہدے تک پہنچے تھے انہوں نے لکھا تھا کہ

"کلکتہ چھوڑنے سے قبل میں نے تمام ان تعلیم یافتہ لوگوں کی فہرست بنوائی جو عیسائی ہوئے" ص۱۴۱ روشن مستقبل

اور گو عیسائیت کے قبول کرنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں بڑھی تھی۔ لیکن سلبی نتیجہ بہت زیادہ کامیاب تھا، لارڈ میکالے کے الفاظ میں جس کی تعبیر یہ تھی کہ

"کوئی ہندو جو انگریزی داں ہے، کبھی اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا"

الغرض انگریزی تعلیم کا یہ "سلبی اثر" کہ "اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا" جہاں اس کا پتہ چلتا تھا، اسی کے ساتھ ایجابی نتائج کے متعلق لاٹ صاحب ہی نے یہ بھی لکھا تھا کہ پھر

"ان میں بہت سے یا تو موحد ہو جاتے ہیں، یا مذہب عیسوی اختیار کر لیتے ہیں"

"موحد ہو جاتے ہیں" بظاہر ان الفاظ سے اشارہ شاید ان ہندوؤں کی طرف کیا گیا ہے۔ جو انگریزی تعلیم پانے کے بعد بنگال میں راجہ رام موہن رائے کے قائم کئے ہوئے "برہمو سماج" یا علاقہ بمبئی کے "پرارتھنا سماج" والی سوسائٹیوں میں شریک ہو کر موحدین جاتے تھے جن کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے جاننے والے ان سے کم و بیش واقف بھی ہیں، لیکن اسی سلسلہ میں اندرونی طور پر بے پاؤں ایک اور سیلاب بھی اس زمانہ میں جو دھمکیاں دے رہا تھا۔ تاریخ کے اسی حصہ کے متعلق "خاموشی والی سازش" شاید اختیار کی گئی۔

مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کے عام مشرکانہ نام کا اقرار کر کے یہ جو سمجھ لیا گیا تھا کہ قدرتاً لوگ عیسائی

مذہب کو قبول کرلیں گے، ایک تو یوں بھی صحیح نہیں تھا کہ عیسائیت کی توحید خود تثلیث کے معمہ میں الجھ کر چیستاں بنی ہوئی تھی، اور گو اس ملک میں اسلام کے نمائندے اسلام سے زیادہ خود اس ملک کے مشرکانہ اوہام ہی میں لفظوں کے ہیر پھیر سے غوطے کھا رہے تھے۔ لیکن مسلمان نہ بہی، مسلمانوں کی آسمانی کتاب اور اس آسمانی کتاب کے لانے والے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ان کی کتابوں میں موجود تھی، اسی کے ساتھ ایک غیبی لطیفہ اس ملک میں ٹھیک اسی زمانہ میں حضرت مولنا سید شہید بریلوی اور ان کے رفقار صدیقین وشہدا رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی شکل میں اچانک ظاہر ہوا تھا۔ یہ حضرات خالص اسلامی توحید کے مجسم نمونہ بھی تھے، اور اسی کی منادی بھی ملک کے طول وعرض میں کمال جوش وخروش کے ساتھ کر رہے تھے۔

پس ہندوؤں کا وہ طبقہ، جو اپنے آبائی مشرکانہ دین کی صداقت سے جیسا کہ میکالے نے لکھا ہے، ہٹ رہا تھا۔ ان میں عیسائیت، یا عیسائیت کے بغیر توحید کے قبول کرنے والوں کے ساتھ ساتھ واقعہ یہ پیش آیا تھا۔ ایک بڑا طبقہ تھا، جو اپنے ملک کے خالص توحیدی دین اسلام کو قبول کر رہا تھا، کس پیمانے پر قبول کر رہا تھا، اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے، کہ ۱۸۷۳ء میں تحفۃ الہند نامی مشہور کتاب ایک نومسلم مولوی محمد عبید اللہ صاحب کی جو شائع ہوئی تھی، اس میں مولوی صاحب نے اپنے قصبہ پائل (متصل لودھیانہ پنجاب) اور اسی کے گرد ونواح میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد جو بتائی ہے قریب قریب ستو تو ہی پہنچ جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ انگریزی حکومت کی بدولت ملک ایک نئے ماحول سے آشنا ہوا تھا اس ماحول کے دوسرے نتائج جو قصداً پیدا کئے جا رہے تھے۔ ان ہی کے ساتھ ساتھ قصد اور ارادہ کے بغیر اندہی اندر اسلام اور اسلامی توحید کی طرف بھی لوگ کھنچنے لگے۔ اسی کتاب میں بعض ایسے واقعات بھی مصنف کتاب نے نقل کئے ہیں، کہ اعلان اسلام سے پہلے اپنے خاندانی پروہت برہمن سے مذاقاً لکھا ہے کہ میں نے کہا کہ پروہت جی میں تو مسلمان ہو گیا۔ اس فقرے کو سن کر بجائے بگڑنے کے لکھا ہے کہ پروہت صاحب نے کہا کہ

"مہاراج جہاں ججمان وہیں پروہت"[1]

یعنی جو مرید کا دین وہی پیر کا دین بھی ہے۔ پہلے تو سمجھا گیا کہ یہ گفتگو دل لگی کے طور پر ہوئی لیکن بعد کو جیسا کہ مولوی عبید اللہ نے لکھا ہے کہ پروہت جی

"گھر بار چھوڑ کر مسلمان ہوئے" ملخصاً

مولوی عبید اللہ صاحب نے اسی کتاب میں مختلف طریقہ سے اپنے بعض ذاتی مشاہدات و تجربات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جن سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ علانیہ دین اسلام قبول کرنے والوں کے سوا کافی تعداد اس زمانہ میں اس قسم کے لوگوں کی بھی تھی، جو بظاہر اپنی شکل و صورت سے مسلمان نہیں معلوم ہوتے تھے لیکن واقعہ میں اسلام کو اپنا دین بنا چکے تھے، ایک دلچسپ قصہ اسی سلسلہ میں انہوں نے لاہور کا درج کیا ہے، یہ وہ زمانہ تھا کہ خود مولوی عبید اللہ صاحب نے اپنے اسلام کا اعلان نہیں کیا تھا۔ لکھا ہے کہ

"ایک مسافر ذی عزت، صاحب مکنت ساکن شاہ جہاں آباد (دہلی) سے ملاقات ہوئی، وے ظاہر میں سراوگی تھے، اور میں ان دنوں میں اپنا اسلام مخفی رکھتا تھا"

خلاصہ یہ ہے کہ اسی دہلوی مسافر سے ان کی ملاقات ہوئی۔ درمیان میں کچھ مذہبی گفتگو چھڑی، تا اینکہ آخر میں اس سراوگی نے اقرار کیا، کہ

"میں مدت سے پردہ میں مشرف باسلام ہوں اور نماز پنجگانہ ادا کرتا ہوں" ص۵۵

لیکن مصلحۃً دوسروں پر اس کو ظاہر نہیں کیا ہے" اس قسم کے متعدد واقعات کا تذکرہ مختلف مقامات پر اس کتاب میں کیا گیا ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل حکومت کے زوال کے بعد انگریزوں کی حکومت اس ملک میں جب قائم ہوئی، تو اسلام کی طرف غیر معمولی رجحان باشندوں کے قلوب میں پیدا ہو گیا تھا۔ خود مولوی عبید اللہ صاحب نے اسی کتاب میں ایک موقعہ پر یہ بھی لکھا ہے کہ

---

[1] پروہت کا مطلب مولوی صاحب نے خود ہی یہ لکھا ہے کہ خاندانی پیروں کی یہ ہندوانہ تعبیر ہے، شادی بیاہ اور موونڈن وغیرہ میں ان سے کام پڑتا ہے۔ ججمان یعنی مرید لوگ اپنے اپنے پروہتوں کو ان تقریبوں میں نذر و نیاز دیتے ہیں ۱۲

"باوجودیکہ فرنگی لوگ کھتا روپیہ خرچ کرتے ہیں، اس بات پر کہ لوگ ان کا دین (عیسائیت) اختیار کریں، چنانچہ پادریوں کو نوکر رکھنا، اور مدرسوں کا تعمیر کرنا، اور کتابوں کا تقسیم کرنا، اسی واسطے ہے۔"

پھر یہی نہیں وہی آگے لکھتے ہیں

"اور جو کوئی ان کا (فرنگیوں کا) دین اختیار کرتا ہے، اس سے نان و نفقہ کی بھی مروت کرتے ہیں۔"

مگر ان ہی کا بیان ہے کہ بجز "بے عقل حوادث زدہ" لوگوں کے عیسائی دین قبول کرنے والوں میں

"کوئی ہزار میں ایک آدھ ہوتا ہے۔"

برخلاف اس کے اسلام کے متعلق وہی لکھتے ہیں کہ

"اسلام باوجودیکہ بہ سبب نہ ہونے سلطنت اہل اسلام کے اس ملک میں ضعیف ہوگیا ہے اور اکثر اہل اسلام کو ستی، و اہل مروت میں چنداں اسباب دنیاوی موجود نہیں رکھتے کہ کسی شخص مشرف باسلام کا روٹی اور کپڑا اپنے اوپر کرلیں۔"

مگر باایں ہمہ اپنے زمانہ کا یہ حال انہوں نے درج کیا ہے کہ اس ضعف اور بے نوائی و بے کسی کے باوجود

"بہت سے آدمی اپنی حشمت دنیاوی چھوڑ کر دین اسلام کو اختیار کرتا، اور درویشی و مفلسی میں آنا غنیمت جانتے ہیں۔" مثلاً

واقعات جو سننے میں آتے ہیں، واقعی ان کو سن کر حیرت ہوتی ہے ایک طرف بہار کی ایک راجپوت ریاست کھیرا نامی کے راجہ کے بھائی جو بعد کو راجہ عبدالرحمٰن آف مرجا کے نام سے مشہور ہوئے، اور اس وقت ان کے خاندان کے لوگ مرجا میں موجود ہیں۔ تو دوسری طرف مولوی عبیداللہ صاحب نے ایک پہاڑی سردار کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پہلے ان کا نام

"کنور جوالا سنگھ تھا۔"

اپنی متعدد بیویوں اور ملازم کے ساتھ مسلمان ہوئے۔ شیخ غلام محمد اب ان کا نام ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ جس قسم کی نئی ذہنی ہلچل انگریزی حکومت کے قیام کے بعد اس ملک میں پیدا ہوئی، علاوہ ان یونیورسٹیوں کے، جن کے ذریعہ جدید مغربی علوم سے ملک کو آشنا بنایا جا رہا تھا، بقول سر چارلس ٹریلین

"بالواسطہ کتابوں، اخباروں، یورپینوں سے بات چیت وغیرہ"

سے دلوں اور دماغوں پر جو رنگ قدرتی طور پر چڑھ رہا تھا، یا قصداً حکومت اپنے خاص باطنی اغراض سے چڑھا رہی تھی۔ اب اس کو کیا کہئے، کہ خالی تو کئے جا رہے تھے لوگوں کے دل اور دماغ بپتسمہ کے پانی سے بھرنے کے لئے، لیکن عین اسی زمانہ میں کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ اس مقدس پانی سے دیکھا جا رہا تھا وہ بھرتے چلے جا رہے ہیں، جو اسلامی دین کے سرچشمے سے ابل رہا تھا، افسوس ہے کہ باوجود تلاش و جستجو کے حضرت سید شہید رحمۃ اللہ علیہ کی متعلقہ کتابوں میں اس قسم کی اجمالی اطلاعیں جو دی گئی ہیں، کہ جو دریائی سفر آپ کا دلی سے کلکتہ تک ہوا تھا۔ اس سفر میں مسلمانوں کی دینی اصلاح و تربیت کے ساتھ ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اسلام کے قبول کرنے والوں کی تعداد بھی لاکھ سے متجاوز تھی لیکن اس اجمال کی تفصیل کیا تھی، بجز مولوی عبید اللہ صاحب مرحوم کی اسی کتاب "تحفۃ الہند" کے جس میں سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے رفقاء کا ذکر غیر معمولی احترام سے کیا گیا ہے، اور اسی سے سمجھ میں آتا ہے، کہ خود مولوی عبید اللہ صاحب بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ سید شہید کی تحریک کے اثر پذیروں میں تھے۔ بس اس کے سوا اس زمانہ کی کسی تصنیف میں اب تک تفصیلات کا پتہ نہیں چل سکا ہے۔

سوال یہی ہے کہ گورنری تک پہنچنے والے حکام جس حکومت کے فہرست ان لوگوں کی جب تیار کر رہے تھے، جو حکومت کی نت نئی تدبیروں کے زیر اثر اپنے آبائی دین سے روگرداں ہو کر عیسائی دین قبول کر رہے تھے۔ کیا اسی حکومت کی نظر اس پر نہیں پڑ رہی تھی کہ زمین تو حکومت اپنی بالواسطہ یا بلاواسطہ مصارف سے تیار کر رہی ہے، لیکن اسی کی تیار کی ہوئی زمین سے فائدہ دوسرے اٹھا رہے ہیں، گویا پھل توڑنے کا موقعہ ان کو مل گیا ہے، جنہوں نے نہ درخت ہی لگائے، نہ ان درختوں کی

آبیاری و نشو و نما میں کوشش کی تھی، مطلب یہی ہے کہ اپنے موروثی دین سے بدگمان اور بدظن کرنے کا کام تو حکومت انجام دے رہی تھی، اور اسی لئے دے رہی تھی تاکہ اس ملک کے باشندوں کا مذہب بھی وہی ہو جائے جو اس کے حکمرانوں کا ہے، یعنی لوگ عیسائی ہو جائیں. لیکن بیچ میں یکایک اس صورت حال سے اسلامی دین کے دائرہ کی وسعت میں جو مدد مل رہی تھی، اور جوق در جوق لوگ اس زمانہ میں حلقہ بگوش اسلام جو ہو رہے تھے، کیا یہ سمجھ میں آنے کی بات ہے، کہ ان کی روشنی میں اپنی کد و کاوش کے اس عجیب و غریب نتیجے سے حکومت اندھی بنی بیٹھی رہ سکتی تھی۔

میں نے جو عرض کیا تھا کہ تاریخ کے اوراق پھاڑ دیئے گئے ہیں۔ ان پھٹے ہوئے اوراق میں ایک ورق یہ بھی ہے۔ اس زمانہ کی معمولی معمولی جزئیات سے بھی نتائج اس وقت جو پیدا ہو سکتے تھے، یا آئندہ جن کے پیدا ہونے کا احتمال ہو سکتا تھا۔ کتابیں اٹھا کر دیکھئے، سب ہی پر بحث کی گئی ہے اور حکمت و دانش کے دریا بہا دیئے گئے ہیں۔ لیکن جہاں تک اس سلسلہ کی کتابوں کا مطالعہ فقیر نے کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ اس کا خطرہ بھی حکومت اور حکومت کے کارندوں کے دلوں پر کبھی نہیں گزرا، سب کچھ ہو رہا تھا، لیکن حکومت کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس کی نگاہوں میں کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ مگر سچ یہ ہے کہ طریقہ عمل سے خواہ کچھ بھی باور کرایا جا رہا ہو لیکن یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا تھا حکومت اس کے سلسلہ کو یوں ہی آگے بڑھنے کے لئے چھوڑ دیتی۔ عقل کا اقتضا تو یہی ہے لیکن اس عقلی نتیجے کے لئے جن تاریخی شہادتوں کی ضرورت ہے، مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ تفصیلاً ان کے پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ صرف چند گرے پڑے ٹکڑے مل گئے ہیں، انہیں آپ کے سامنے رکھ دیتا ہوں، ان ہی کو جوڑ کر کچھ پڑھ سکتے ہو تو پڑھ لیجئے۔

(۱)

پہلی بات تو اس سلسلہ کی یہ ہے، کہ وہی کلکتہ جو اس زمانہ میں اس قسم کی کارروائیوں کا مرکز تھا، اسی شہر میں کچھ دن بعد یعنی ان ہی دنوں کے بعد جن میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں، اور شادیانے بجائے جا رہے تھے کہ

"تیس سال بعد بنگال میں ایک ہندو باقی نہ رہے گا"

بنگال ہی نہیں بلکہ پورے برِّ اعظم ہند کے متعلق توقعات قائم کی جارہی تھیں کہ

"جیسے ہمارے آباء و اجداد ایک دفعہ عیسائی ہو گئے تھے۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی سب کے سب ایک دفعہ عیسائی ہو جائیں گے"

انگریزی نظام تعلیم کے نفاذ میں کامیاب ہونے والے صاحبزادے لاٹ صاحب اپنے بوڑھے مسیحی باپ کو مژدہ سنا رہے تھے کہ

"کوئی ہندو جو انگریزی دان ہے کبھی اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا"

جس کلکتہ میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ اسی کلکتہ میں دیکھا جاتا ہے کہ گوری کھال، گورے رنگ کا آدمی یہ کہتے ہوئے کہ

"میری رگوں میں ایک بوند بھی غلامی کے خون کا نہیں ہے"

انگریزی زبان میں ہندوؤں کے ایک مجمع کو خطاب کر کے احسان جتلا رہا ہے کہ انگریزی حکومت نے انگریزی نظام تعلیم کو جاری کر کے ہندوؤں کی عام ذہنیت میں جو انقلابی کیفیت پیدا کر دی تھی، ان الفاظ میں یاد دلاتے ہوئے کہ

"مذہب کی تعلیم دلوں سے قریب قریب دور ہو چکی تھی، مغربی تعلیم اور مغربی تعلیم یافتہ ستادوں کا اثر اس قدر حاوی ہو گیا تھا کہ ہند تعلیم یافتوں کا پچاس فی صدی حصہ مادہ پرست اور روحانیت کا منکر، ۲۵ فیصدی سنشی وان (بتلائے شک) اور باقی ۲۵ فی صدی کٹر ہندو رہ گئے تھے"

صرف بنگال ہی نہیں، اس نے کہا

"کل ہندوستان میں تعلیم یافتہ جماعت کی یہی کیفیت ہو گئی تھی"

اسی نے کہا کہ اس زمانہ میں

"تعلیم یافتہ ہندوؤں کی چٹکی لی جاتی تھی، اور جب کبھی اہل مغرب کے سامنے اپنے

مذہبی عقائد اور قومی دھرم کا اظہار کرتے تھے، طعن و تشنیع کی صدا گوش زد ہوتی تھی۔"

اس کے بعد یہی مقرر یہ اطلاع دیتے ہوئے، کہ

"مگر اب زمانہ بدل گیا۔"

بدلے ہوئے زمانہ میں جو کچھ ہو رہا تھا، اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے، کہ اب

"زیادہ تر تعلیم یافتہ ہندو اپنے مذہب پر دشواش کرتے ہیں، اور لائق سے لائق جماعتوں میں اپنے عقیدوں کے ثابت کرنے میں مطلق شرم نہیں کرتے۔"

پھر اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ ہندو مذہب کے شاستروں اور کتابوں کی کس مپرسی کا زمانہ گذر گیا، اور اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ

"قدیم کتابوں کا مطالعہ کیا جا رہا ہے، غور سے وہ پڑھی جا رہی ہیں۔ بہت اعلیٰ درجہ کی کتابیں چھپ گئیں، اور چھپتی چلی جا رہی ہیں۔ بہتوں کا انگریزی اور دیسی بھاشاؤں میں ترجمہ بھی ہو گیا ہے، اور زمانہ حال کی تحقیقاتی معلومات کے زیر اثر ان کی تشریح کی جاتی ہے۔" ملخصاً

یہ ہے تاریخ کے دریدہ اوراق کا ایک ٹکڑا۔ یہ اقتباسات جن صاحب کی تقریر کے ہیں، ان کا نام تھا، کرنل اسکاٹ صاحب، یہ کون تھے، کہاں کے تھے۔ ان تفصیلات کو تو چھوڑیئے۔ لیکن کرنل کے نام کا جو جزء ہے، اسی سے معلوم ہوتا ہے، کہ کسی زمانہ میں شاید فوجی خدمت سے تعلق رکھتے، یہی صاحب ہیں، جو دنیا کی مشہور نام نہاد مذہبی سوسائٹی تھیاسوفیکل کے بانی تھے۔ میڈم بلیوٹسکی کی مددگار اور معاون تھیں۔ ہندوستان میں تو خود ان کی تشریف فرمائی ۱۸۸۰ء میں ہوئی، لیکن اس سوسائٹی اور اس کی شاخیں ۱۸۸۰ء سے بہت پہلے امریکہ اور یورپ میں قائم ہو چکی تھیں۔ یہی میں انہوں نے اعلان کیا تھا کہ میں ہندوستان کے "بودھ مذہب" کا پیرو ہوں۔ مسز اینی بیسنٹ ان ہی کرنل اسکاٹ کی ہندوستان میں جانشین بن کر نمایاں ہوئی تھیں۔ ہندو کالج بنارس جو اب ہندو یونیورسٹی ہے، اس کے سوا مسز اینی بیسنٹ ہی نے ہندوستان کے مختلف حصوں میں نت نئے ناموں سے مختلف تعلیمی اور دینی ادارے جاری کئے۔ مدراس میں بمقام اڈیار میلوں میل کے رقبہ میں ہندو کے

کے کنارے ایک آشرم یا خانقاہ بھی ان کی قائم کی ہوئی اس وقت تک موجود ہے، جس میں گو دنیا کے اکثر مذاہب کی نمائندگی کا دعویٰ کیا جاتا ہے، لیکن دراصل چھاپ اس پر ہندو دھرم ہی کی ہے۔

بہرحال یہی کرنل اسکاٹ صاحب ہیں، جنہوں نے کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے، ہندوؤں کی نئی انقلابی ذہنیت کا اعلان مذکورہ بالا الفاظ میں کیا۔ اور یہ سب کچھ فرمانے کے بعد آخر میں مجمع کے واقف کار شریف ہندو صاحبوں کو خصوصیت کے ساتھ مخاطب کرتے ہوئے پوچھا تھا کہ یہ ذہنی انقلاب جو ہندوؤں میں پیدا ہوا، اور بیداری کی نئی لہر اپنے آبائی اور موروثی دین کے متعلق ان میں جو اٹھی، اور جو نتیجے اس سے پیدا ہوئے۔

"ان تسکین بخش نتیجوں کی تکمیل کہاں تک تھیاسوفیکل سوسائٹی کے ذریعہ ہوئی ہے، آپ خود کہہ سکتے ہیں، میرے کہنے کی ضرورت نہیں ہے" صٹ

تاریخ کے پھٹے ہوئے ورق کا تو یہ ایک ٹکڑا تھا۔ دوسرا ٹکڑا بھی ملاحظہ فرمائیے۔

(۲)

تھیاسوفیکل سوسائٹی اور اس کی شاخیں امریکہ اور یورپ میں قائم ہو رہی تھیں، لیکن اس سوسائٹی اور اس کی مختلف شاخیں جن کا جال یورپ و امریکہ کے شہروں میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کے لئے سردار اور امام، حاکم، گرو اور استاد کی جگہ خالی تھی، کہ اچانک امریکہ و یورپ کے اخباروں میں ایک اعلان شائع ہوتا ہے، یہی کرنل اسکاٹ صاحب جو سوسائٹی کے بانی مبانی اور روح رواں تھے، ان ہی کا اعلان شائع ہوتا ہے، کہ ایک شخص، جو قطعی طور پر انگریزی زبان کے ایک حرف سے بھی آشنا نہ تھا۔ نہ یورپ کی دوسری زبانوں میں سے کسی زبان سے کسی قسم کا لگاؤ رکھتا تھا، جس نے نہ یورپ ہی کو دیکھا تھا، اور نہ امریکہ کو اور شاید امریکہ و یورپ کے باشندوں سے اس کے تعلقات بھی نہ تھے، وہ ہندوستان ہی میں پیدا ہوا تھا۔ ہندوستان کی عام بولی جانی والی زبانوں میں بجز گجراتی زبان کے اور کسی زبان کو نہیں جانتا تھا۔ خانگی طور پر متھرا کے بعض پنڈتوں سے البتہ سنسکرت زبان کی ادبی تعلیم اس نے کچھ

حاصل کی تھی۔ خود اس کی زندگی میں ایسی عام باتیں یعنی کہاں کا رہنے والا ہے، کس خاندان سے اس کا تعلق ہے،
ان باتوں کا صحیح علم لوگوں کو نہ تھا اور باوجود بلیغ کوششوں کے آج تک اس کی زندگی کے یہ ابتدائی سوالات تقریباً کچھ
نا فیصل شدہ شکل ہی میں ہیں۔ سناٹا چھا گیا، دنیا میں سناٹا چھا گیا، جب تھیاسوفیکل سوسائٹی اور یورپ
وامریکہ میں اس کی پھیلی ہوئی ساری شاخوں کی طرف سے یہ اعلان پڑھا گیا، کہ ہندوستان کے اسی
شخص کو

"ہم اس سوسائٹی کا سردار اپنا بڑا گرو رہنما اور حاکم قبول کرتے ہیں۔"

(کتاب سوامی دیانند اور ان کی تعلیم ص۵۱)

یہ پراسرار شخصیت پنڈت دیانند سرسوتی مہاراج کی تھی، جو آریہ سماج کے مشہور بانی اور بزرگ سمجھے
جاتے ہیں وہی غریب مشرقی اور مشرقیوں میں بھی مسکین ہندوستانی جس کے سینے تقریباً ایک صدی بلکہ
اس سے بھی زیادہ زمانہ سے چھیدے جا رہے تھے۔ بے دردی کے ساتھ برسانیوالے اس قسم کے
تحقیری تیروں کے برسانے کے عادی تھے، مثلاً کہا جاتا تھا کہ

"یورپ کے کسی اچھے کتب خانہ کی ایک الماری کی کتابیں ہندوستان و عرب کے سارے
علم وادب کے برابر ہیں۔"

دلوں میں بجلی تیزوں کی ایسی انیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کہنے والے کہتے پھرتے تھے کہ

"ایک انگریز نیم حکیم عطائی کے لئے (ہندوستانی طب) موجب ننگ و عار ہے۔"

صبح و شام قہقہوں کے ساتھ اس قسم کے فقرے دہرانے والے دہراتے رہتے تھے، کہ

"ان کو (ہندی معلومات نجوم و افلاک) کو پڑھ کر انگلستان کے زنانہ مدرسہ کی لڑکیوں کی
ہنسی رک نہیں سکتی۔"

یہ فقرے لارڈ میکالے کی اس مشہور تعلیمی رپورٹ میں استعمال کئے گئے ہیں، جو ہندوستان کے متعلق
لاٹ صاحب ممدوح نے تیار کرکے حکومت میں پیش کی تھی۔

اور یہ تو ادنیٰ نمونہ ہے، ان نکوہیدہ کوششوں کا جن کے ذریعہ ہندوستان کے باشندوں کے

قلوب میں اپنی اور اپنے اسلاف کی ہیچ میرزی، کم مائگی کی تخم پاشی میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور نئی قائم ہونے والی حکومت لگا رہی تھی۔ درد کی یہ داستان کافی طویل ہے۔

یہاں مجھے کہنا یہ ہے، کہ جس یورپ و امریکہ کے متعلق یہ باور کرایا جا رہا تھا۔ کہ وہاں کے زنانہ مدرسوں کی لڑکیاں بھی اپنی ہنسی کو ہندوستانی دل و دماغ کے علمی اور فکری نتائج کو سن کر روک نہیں سکتیں، تاریخ کے ہزارہا ہزار سال کی سرمغزیوں اور دماغ کاویوں کے بعد بھی علم کی جن شاخوں کے متعلق اس ملک کے باشندوں نے جو کچھ بھی سوچا سمجھا لکھا پڑھا تھا، اعلان کر دیا گیا تھا، کہ یورپ و امریکہ کی موجودہ تحقیقاتی تالیفات و تصنیفات کے مقابلہ میں ان کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہی ہے، جہل و حماقت کے سوا وہ اور کچھ نہ تھے، سوچنے کی بات ہے کہ اچانک اسی جہل کدہ اور حمق زار ہند کی ایک انفرادی شخصیت کے علم و فضل کا صرف اعتراف ہی نہیں کیا گیا، بلکہ تھیاسوفیکل سوسائٹی جو اس زمانہ میں قدیم و جدید علوم و معارف کے بڑے بڑے مستند ماہرین اور مسلم الثبوت فضلاء کی یورپ و امریکہ میں کافی باعظمت سوسائٹی سمجھی جاتی تھی، اسی سوسائٹی کا "بڑا گرو، رہنما، حاکم" تسلیم کر لیا گیا، ہندوستان کے اخباروں میں یورپ کے اخباروں سے منقول ہو کر جب یہ خبر شائع ہوئی ہوگی، ہندو قوم کے دل شکستہ، پست حوصلہ تعلیم یافتہ طبقات کے نفسیات پر اس خبر کا جو اثر مرتب ہو سکتا تھا، شاید موجودہ حالات میں ہم اس کا صحیح اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ ملک کے اس سپوت فرزند کی علمی عظمتوں سے قلوب اگر لبریز ہو گئے، تو جس طریقہ سے خبر کی اشاعت کی گئی تھی، اس کا یہ لازمی منطقی نتیجہ تھا خصوصاً جب یہ سوچا جاتا تھا کہ دوسروں سے کچھ لئے بغیر صرف اپنے خانہ ساز گھر کے علوم سے اس غیر معمولی وقار و عزت کے حاصل کرنے میں وہ ان ممالک میں کامیاب ہوا ہے، جہاں سمجھا جاتا تھا کہ جہل و حماقت، ابلہی اور نادانی کے سوا ہندوستان میں نہ پہلے کچھ تھا، اور نہ اب کچھ ہے۔

بہرحال دیکھا گیا کہ متھرا کے ایک نابینا پنڈت ورجانند جنہیں پندرہ روپے کی امداد کسی راجہ سے ملتی تھی، ان ہی کے خانگی پاٹھ شالہ کا ایک طالب علم یا برہمچری جس نے سنسکرت کے سوا کسی سے کچھ نہ پڑھا تھا، نہ سیکھا تھا۔ اچانک وہی، بمبئی کے جسٹس راناڈے کے کبھی مہمان بنا اور کبھی احمد آباد میں ایک دوسرے مرہٹہ

نج بائے بہادر پنڈت گوپال راؤ ہری دیش مکھ کی دعوت پر ایک مہینہ ان کے ساتھ راز و نیاز میں بسر کرتے ہیں۔ کلکتہ کے مشہور ممتاز تعلیم یافتہ افراد کیشپ چندر سین مہرشی دیبندر ناتھ ٹیگور بابو راج نارائن بوس وغیرہ سب ان کے دوست بنے ہوئے ہیں۔ الغرض جس بڑے شہر میں جاتے ہیں، وہاں کے تعلیم یافتہ ہندو جن میں پچھتر فی صدی افراد کا بقول اسکاٹ صاحب اپنے موروثی دھرم پر اعتماد باقی نہ رہا تھا اور اپنے مذہبی جذبات کی تسکین کے لئے اطمینان کے کسی نئے سرمایہ کی تلاش میں تھے، ان کو دیکھا جا رہا تھا کہ وہ پنڈت جی کو شمع محفل بنا کر خود پروانے بن بن کر ان پر اس لئے ٹوٹ رہے ہیں، کہ ان کو اپنے گھر ہی میں ایک ایسی شخصیت مل گئی۔ جسے یورپ و امریکہ کے اہل علم و فضل اپنا گرو اپنا رہنما اپنا عالم تسلیم کر چکے ہیں، ان ہندو تعلیم یافتوں میں اس وقت تک زیادہ سے زیادہ ایسے اشخاص تو پیدا ہو چکے تھے۔ جنہوں نے شاگرد بن کر یورپ و امریکہ کی جدید یونیورسٹیوں سے سند حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی، لیکن مغربی ممالک کی ان جدید یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتوں نے بھی جسے اپنا گرو اور استاد مان لیا ہو۔ ان ہی میں کیا شاید پورے مشرق میں پنڈت دیانند سرسوتی جی اس کی اپنی آپ مثال تھے۔

پنڈت جی کو یورپ کے ان نئے تعلیم یافتہ ہندو مفکرین، جن میں مذہبی اور سیاسی مختلف مذاق رکھنے والی ہستیاں تھیں، ان سے کیا کیا مشورے ملے، یا ان کے طرز عمل کو دیکھ دیکھ کر خود پنڈت جی کے دماغ میں کس کس قسم کے نئے خیالات پیدا ہوئے۔ میرے لئے اپنی اس کتاب میں سب کی نہ تفصیل کا موقع ہی ہے، اور سچی بات یہ ہے، کہ درون پردہ کی ان سرگوشیوں تک ہر کس و ناکس کی رسائی آسان بھی نہ تھی، لکھنے والوں نے پنڈت جی کی سوانح عمریوں میں کچھ لکھا بھی ہے، تو مشتے از خروارے سے زیادہ نہ وہ ہیں نہ ہو سکتے ہیں۔

پنڈت جی کو یورپ و امریکہ کی تھیاسوفیکل سوسائٹیوں کے صدر الصدور یا رئیس اکبر بنانے کے بعد جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، کرنل اسکاٹ زمانہ تک ہندوستان سے باہر ہی رہ کر کام کرتے رہے۔

اس عرصہ میں دیکھا گیا، کہ پنڈت جی جو پہلے سنسکرت زبان میں تقریر کیا کرتے تھے، کلکتہ کے

بابو کیشب چندرسین کے مشورے کے مطابق ایسی عام فہم زبان میں تقریر کی مشق بہم پہنچائی، جسے تعلیم یافتہ طبقہ ہندوؤں کا سمجھ سکتا تھا، ان تقریروں میں کیا ہوتا تھا۔ اس کا اندازہ رگ وید اور یجروید کی ان تفسیروں (بھاشیہ) سے ہوتا ہے، جسے کہ لکھ کر اس زمانہ میں پنڈت جی شائع کرتے رہتے تھے، اور پروفیسر میکس مولر نے جن کو "عجائبات کا ذخیرہ" قرار دیا تھا۔ اور سنسکرت زبان و علوم کے مستند استاذ، پروفیسر ڈاکٹر ایچ۔ ڈی گرد سولڈ ایم۔ اے نے اپنی رائے یہ دی تھی کہ

"سوامی جی وید کے وہی معنی لگا لیتے ہیں، جن سے ان کا مطلب نکلتا ہے (گویا ان کو وید کے الفاظ پر حاکمانہ تصرف کے اختیارات حاصل ہیں)" ص۱۹۹

گرد سولڈ صاحب ہی نے یہ لکھتے ہوئے کہ

"تفسیر کا یہ مطلب نہیں ہے، کہ اپنے خیالات ان کتابوں میں داخل کر دیئے جائیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ مصنف کے خیالات کو کتاب کی عبارت سے اخذ کیا جائے"

پنڈت جی کی تفسیری خصوصیت کی تعبیر یہ کی تھی کہ وہ یعنی پنڈت جی

"جس عبارت سے جو مطلب چاہتے ہیں نکال لیتے ہیں"

جیسا کہ پنڈت پانڈورنگ صاحب ایم۔ اے نے جو سنسکرت کے مستند فاضل تھے، اپنی رائے پنڈت جی کی تفسیروں کے متعلق یہ ظاہر کی تھی۔

"ان کی تفسیر میں وید کا اصل مطلب تو نہیں ہے، بلکہ وہی مطلب ہے جس کو وہ چاہتے تھے، کہ وید میں ہونا چاہیئے" ص۲۰۱

واقعہ یہ ہے کہ تمدن و تہذیب، سیاست و تدبیر تحقیق و تلاش کے جن نتائج تک یورپ پنڈت جی کے زمانہ میں پہنچ چکا تھا، صرف ان ہی کے متعلق نہیں بلکہ قیامت تک ان راہوں میں جن نتائج تک پہنچنے کا عقلی امکان ہے، یا آدمی جن کو فرض کر سکتا ہے۔ کھلے کھلے صاف صاف لفظوں میں پنڈت جی نے اصرار کے ساتھ اس دعوے کا اعلان کیا کہ ہمارے ویدوں میں سب کا ذکر موجود ہے، اور گذشتہ زمانہ میں وید کی ماننے والی قوم یہ سب کچھ کر کے ختم کر چکی ہے۔

ویدکی عبارتوں سے مطلب برآری کے حاکمانہ اقتدار کے بعد ظاہر ہے کہ پنڈت جی نے جو کچھ کیا اس کو بھی زیادہ کیا جاسکتا ہے، اور خواہ وید کی عبارتوں سے واقعی وہی مطالب نکلتے ہوں جنھیں پنڈت جی نکالتے تھے، یا نہ نکلتے ہوں لیکن اپنے آبائی دھرم کے دائرے سے ہندوؤں کا جو تعلیم یافتہ طبقہ باہر نکل چکا تھا، اور نکلنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جارہی تھی، جیسا کہ کرنل اسکاٹ صاحب کی شہادت گذر چکی، نکلنے کے بعد نکلے ہوئے بھی واپس ہونے لگے، اور آئندہ نکل جانے کا خطرہ بہت حد تک کم ہوگیا۔

بعد کو کرنل اسکاٹ صاحب اپنے مانے ہوئے گرو، حاکم و رہنما سے ملنے کے لئے ہندوستان بھی پہنچے۔ سہارنپور اور میرٹھ جو زیادہ تر پنڈت جی کی علمی جدوجہد کی آماجگاہ تھے۔ کرنل صاحب کی ڈائری سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی دونوں مقامات میں باہم دونوں کی ملاقات ہوئی، یہ لکھتے ہوئے کہ

"۳۰ / اپریل کو بہ مقام سہارنپور واقع ممالک مغربی و شمالی سوامی (پنڈت دیانند) سے پہلے پہل ہماری ملاقات ہوئی"

آگے کرنل صاحب کی ڈائری کے الفاظ ہیں

"ہمارے اور سوامی جی کے درمیان لمبی اور پرجوش بحثیں ہوئیں"

سہارنپور کے بعد لکھا ہے کہ

"۳ / ۴ / ۵ / مئی کو میرٹھ میں ہوتی رہیں" ص۲۵

یہ قصہ کہ براہ راست ملاقات کے بعد اسکاٹ صاحب اور پنڈت جی کے تعلقات میں کیا تغیرات ہوئیں اور ان تبدیلیوں کا کیا مطلب تھا، یہ ارادی تبدیلیاں تھیں، یا بخت و اتفاق کی پیداوار تھیں یہ سارے مسائل میرے دائرہ بحث سے خارج ہیں۔ اس موقعہ پر ذکر کرنے کی بات یہ ہے، کہ کرنل صاحب اور سوامی جی کی ملاقات سے چار پانچ سال پہلے، جب سارا ہندوستان پنڈت جی کے ان عجیب و غریب لکچروں، تقریروں کتابوں کے ذکر سے گونج رہا تھا۔ جن میں ثابت کیا جاتا تھا کہ آج یورپ والوں کے پاس توپ بندوق، دخانی گاڑی، دخانی جہاز، تار برقی جو کچھ دیکھا جارہا ہے، یا آئندہ جن اکتشافات

کی توقع کی جاتی ہے، یہ سب کچھ ہندوستان میں موجود تھا، ساری دنیا کا پایۂ تخت ہندوستان ہی تھا، یورپ وامریکہ، افریقہ اور ایشیا کے سارے ممالک ہندوستان کے باجگذار مقبوضات تھے، الیک لیک کر سنسکرت کے مجہول فقروں سے اسی قسم کے معلومہ نتائج پنڈت جی پیدا کرتے تھے، گو اس زمانہ میں اردو اور ہندی اخباروں کا چرچا زیادہ تو ملک میں نہ تھا۔ لیکن ہفتہ وار اخبار مسلمانوں اور ہندوؤں کے مختلف شہروں سے شائع ہوتے تھے، جن میں پنڈت جی کی ان محیر العقول تقریروں کا تذکرہ کیا جاتا تھا۔

ان تقریروں کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً پنڈت جی کی تصنیف کردہ کتابیں بھی شائع ہوتی رہتی تھیں، ٹھیک ۱۸۷۵ء جو ہجری کے حساب سے ۱۲۹۲ھ کا سال تھا۔ بنارس سے بزبان ہندی ایک کتاب شائع ہوئی، اسی کا نام "ستیارتھ پرکاش" تھا۔ اور لکھا ہوا تھا "شری سوامی دیانند جیت" یعنی سوامی دیانند جی کی لکھی ہوئی ہے۔ نویدن یا بشارت کے عنوان کے نیچے یہ عبارت درج تھی۔

"یہ پستک شری سوامی دیانند سرسوتی نے میرے دیہہ (خرچ) سے رچی ہے۔ میرے ہی دیہہ (خرچ) سے یہ ملات ہوئی (یعنی شائع ہوئی)"

نویدن کے عنوان سے یہ اعلان نئی قائم ہونے والی حکومت کی ایک بڑی خطاب یافتہ ہستی

"شری راجہ کرشن داس بہادر سی، ایس۔ آئی"

کی طرف سے کیا گیا تھا جن کی مہر بھی کتاب پر ثبت ہے،

جس سے معلوم ہوا کہ حکومت کے یہی سی۔ ایس۔ آئی راجہ صاحب بہادر نے باضابطہ اجرت دے کر یہ کتاب پنڈت جی سے لکھوائی اور اپنے ذاتی مصارف سے ان ہی راجہ صاحب نے اس کو طبع کرا کے شائع بھی کیا تھا۔

یوں تو اردو اور ہندی اخباروں کے ذریعہ پنڈت جی اور ان کے خیالات کی عام اشاعت سے لوگوں کی عام توجہ ان کی طرف منعطف ہو ہی چکی تھی۔ آج پنڈت جی نے سہارنپور میں یہ کہا، میرٹھ میں یہ بولے، کانپور میں یہ اشتہار شائع کیا۔ داناپور (بہار) میں ان کی تقریر اس موضوع پر ہوئی، ان عام

خبروں کے ساتھ ساتھ جوں ہی کہ یہ کتاب طبع ہو شائع ہو کر پبلک کے ہاتھوں میں پہنچی' تو ایک طرف خود ہندوؤں اور ان کے مختلف فرقوں میں تہلکہ مچا ہوا تھا' ان کے دینی پیشواؤں' ان کی کتابوں' ان کے عقائد پر تنقید ہی نہیں کی گئی تھی۔ بلکہ شرفاء کے کان جن الفاظ کے سننے کے عادی نہ تھے' اور جن فقروں کو شاید بے غیرت سے بے غیرت آدمی بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا' نہ معلوم پنڈت جی نے اپنی کن مصلحتوں سے انکے استعمال میں غیر معمولی فیاضی سے کام لیا تھا' خیر یہ تو جو کچھ تھا گویا پنڈت جی کا خانگی جھگڑا تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی مشہور ہو گیا کہ اپنی اسی کتاب میں پنڈت جی نے علاوہ ہندوؤں کے عیسائیوں اور مسلمانوں کے دین' ان کی آسمانی کتابوں' اور ان کے پیغمبروں کی بھی خبر لی ہے۔ ستیارتھ پرکاش کا پہلا ایڈیشن ہندی زبان میں شائع ہوا تھا۔ اسی لئے براہ راست عام مسلمانوں کے مطالعہ میں وہ کتاب تو نہ آسکی' لیکن بعد کو اسی کتاب کے اردو ایڈیشن میں پڑھنے والوں نے وہ سب کچھ پڑھا جس کا وہ شاید تصور بھی نہیں کر سکتے۔

کچھ بھی ہو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد پندرہ بیس سال کے اندر تھوڑے بہت سکون کی کیفیت ملک میں جو پیدا ہو گئی تھی۔ پنڈت دیانند جی کی تقریروں اور تحریروں کی بدولت پھر ملک میں نیا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اور جو باتیں پنڈت جی کی طرف منسوب ہو کر مسلمانوں میں پھیل رہی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ انوکھا اور نرالا بلکہ صحیح معنوں میں حد سے زیادہ طیش آفرین' بوکھلا دینے والا غیظ انگیز الزام یہ تھا جو ستیارتھ پرکاش میں آج بھی بایں الفاظ پایا جاتا ہے۔

"خدا اور مسلمان بڑے بت پرست اور پورانی (یعنی سناتن دھرمی ہندو) اور جینی یعنی جین مت کے پیرو چھوٹے بت پرست ہیں" (سمولاس ۱۴ ص ۱۲-۱۱۲)

اسلام اور مسلمانوں کے دین پر تنقیدوں یا اعتراضات کے قصوں میں کہنے والے بہت کچھ کہتے چلے آ رہے تھے' لیکن اس کی طرف تو شاید اسلام کے بڑے بڑے اشد الخصام کا دھیان بھی کبھی نہیں گیا ہو گا کہ اسلام جیسے خالص توحیدی دین پر شرک کی بدترین شکل بت پرستی کا بہتان بھی کبھی باندھا جا سکتا ہے۔ اپنی ساری ذہنی بلند پروازیوں' اور افتراء و بہتان کی انتہائی چابکدستیوں کے باوجود یورپ والوں کے

حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہ آئی تھی۔

لیکن پنڈت جی کی ذہانت واقعی قابل داد ہے کہ دن کی روشنی کیلئے جو سب کے سامنے پھیلی ہوئی تھی، دعویٰ لے کر اٹھے کہ نہیں صرف رات ہے سخن سازی کہئے یا سینہ زوری کی یہ اپنی آپ مثال تھی ہندستان کی اسلامی آبادی پنڈت جی کے اس اعتراض سے تلملا اٹھی۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے پنڈت جی اوران کی "آریہ سماجی" تحریک کا ذکر کرتے ہوئے، جو کچھ لکھا ہے صرف یہی لکھا ہے کہ

"ہندؤں میں ایک نیا فرقہ پیدا ہوا جو مسلمان جیسے موحدوں کو مشرک بتلانے لگا" ص۳۵۶

پنڈت جی کی اس ستم ظریفی کے نتائج و آثار کا تخمینہ آج مشکل ہے۔ لیکن اپنی سیزدہ صد سالہ تاریخ میں اس اچھوتے الزام کی پہلی آواز تھی۔ جو مسلمانوں کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ اس زمانہ کے اخباروں کے پرانے فائل کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شمال سے جنوب تک اور شرق سے مغرب تک ہندوستان کے طول و عرض میں ہلچل مچی ہوئی تھی، مسلمانوں کے ہر گھر میں اسی کا چرچا تھا۔

ادھر مدت کے بعد ہندوستان میں پادریوں کے بازاری واعظوں کے ساتھ ساتھ مذہبی چھیڑ چھاڑ کے سلسلہ میں اس ملک کی ایک رسم کہن نے تازہ جنم لیا تھا، قصہ تو اس کا طویل ہے مختصر لفظوں میں یہ سمجھئے، کہ مناظرہ یعنی مختلف عقائد و اعمال رکھنے والے مذہبی فرقوں کا تحریراً یا تقریراً واقعی اس لئے بحث و مباحثہ کرنا تاکہ الوسع حق تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ یہ تو کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے اس کا سلسلہ جاری ہے، اور جاری رہے گا۔ لیکن مناظرے کے مقابلہ میں دوسرا اصطلاحی لفظ "مکابرہ" کا جو پایا جاتا ہے جس میں بحث کرنے والوں کے سامنے صرف "ہم بڑے کہ تم بڑے" کے سوا اور کوئی بلند نقطۂ نظر نہیں ہوتا۔ ہر فریق پہلے ہی سے طے کئے ہوتا ہے کہ کچھ بھی ہو، بہر حال فلاں مذہب کو غالب کر کے دکھانا ہے۔ اسی پر کوشش مرکوز رہے گی، گویا مذہب کی طرف سے وہی فرض انجام دیا جاتا ہے، جو کام آج کل کی عصری عدالتوں میں وکلاء اور بیرسٹروں کا طبقہ انجام دیتا ہے جس کی فیس لے لی جاتی ہے۔ اسی کی حمایت سمجھا جاتا ہے کہ وکیلوں

اور بیرسٹروں کا منصبی فریضہ ہے۔

دوسرے ممالک سے اس وقت بحث نہیں لیکن ہندوستان کی دینی تاریخ کی ممتاز ہستی شنکر آچاریہ کی مذہبی معرکہ آرائیوں کی داستانیں جن کتابوں میں ملتی ہیں، ان کتابوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے سارا ملک مذہبی اور دینی کشتی گیروں کا گویا دنگل بنا ہوا تھا[1]، اور مسلمانوں کے عہد حکومت میں تو مختلف مذاہب و ادیان کے ماننے والوں کے درمیان اس قسم کی مکابرانہ یا وکیلانہ کش مکشوں کا پتہ نہیں چلتا، لیکن پنڈت دیانند سرسوتی جی کے گرو متھرا نواسی پنڈت ورجانند کے جو حالات سوامی دیانند کی سوانح عمریوں میں ملتے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے پنڈتوں میں شاید موروثی طور پر مذہبی مباحثوں کا ذوق منتقل ہوتا چلا آتا تھا[2]، پنڈت دیانند سرسوتی نے

---

[1] کہتے ہیں کہ بدھ مذہب اور جین مت کے ماننے والے اہل علم و فضل سے سارے ہندوستان میں گھوم گھوم کر شنکر اچاریہ نے مقابلہ کیا تھا، بڑی بڑی راجے، مہاراجے اپنی سرپرستی میں گفتگو کراتے تھے، اور شکست خوردہ بودھی اور جینی دوداوں کے متعلق واللہ اعلم بالصواب یہ قصے کہاں تک صحیح ہیں، کہ کھولتے ہوئے گرم تیل کے کڑاہوں میں ان کو تلوا دیا جاتا تھا، سمجھ میں تو یہ بات نہیں آتی ہے کہ سنگدلی اور قساوت قلبی میں انسانیت گرتے ہوئے اس حد تک بھی پہنچ سکتی ہے، شنکر آچاریہ کے ان مباحثوں کا تذکرہ "دگ وجے" یا "شنکر وجے" سنسکرت زبان کی جن کتابوں میں کیا گیا ہے۔ براہ راست ان کتابوں تک تو میری رسائی نہیں ہوئی ہے۔ لیکن ان ہی کتابوں کے حوالے سے بیان کرنے والوں نے کچھ باتیں بیان کی ہیں۔ پچھلے مورخین کا ایک طبقہ ان دونوں کتابوں کے تاریخی استناد کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اس موقع پر ضمناً ایک بات کا خیال آ گیا، ویدانتی وحدت الوجود جسے ہندوستان کے مذہبی حلقوں میں کافی حسن قبول حاصل ہوا۔ کہتے ہیں کہ شنکر آچاریہ ہی نے ویدیا گیتا کے بعض اشارات کو بنیاد بنا کر ایک مستقل نظریہ کا قالب عطا کیا۔ سنی ہوئی افواہی روایات سے متاثر ہونے والے بعض مسلمانوں میں یہ مشہور ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کے صوفیوں میں وحدت الوجود کا خیال ہندوستان کے اسی ویدانتی نظریہ کا عکس ہے، مگر لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ خود شنکر آچاریہ ملیبار میں اس زمانہ میں پیدا ہوئے تھے، جب اسی ملیبار میں تقریباً دو سو سال پہلے اسلام پھیل چکا تھا، اور مسئلہ وحدۃ الوجود کی کافی اشاعت ہو چکی تھی۔ ۱۲

[2] انگریزی زبان میں پنڈت دیانند سرسوتی جی کی ایک ضخیم سوانح عمری باوا چھجو سنگھ کی لکھی ہوئی پائی جاتی ہے، اسی کتاب کے حوالے سے کتاب "سوامی دیانند جی اور ان کی تعلیم" میں پنڈت ورجانند سرسوتی جی کے گرو کے متعلق اس قسم کے قصے نقل کئے گئے ہیں کہ مسٹر الکزنڈر کلکٹر سے پنڈت ورجانند نے مل کر یہ درخواست کی کہ کرشن شاستری جو ان کا مقابل تھا، اس سے میرا مباحثہ کرایا جائے، رندھیر سیٹھ جو خاندان کرشن شاستری کا طرفدار تھا اس کو (باقی اگلے صفحہ پر)

جو کچھ بھی پڑھا تھا، پنڈت ورجانند ہی سے پڑھا تھا۔

پنڈت ورجانند کی سیرت و کردار سے ان کا متاثر ہونا محل تعجب نہیں ہو سکتا، ان کی زندگی کا بڑا حصہ جب شروع شروع میں پڑھ کر وہ باہر نکلے پتہ چلتا ہے کہ پنڈتوں سے مناظرہ اور مباحثہ ہی میں گذرتا تھا، خود اپنی خودنوشت سوانح عمری میں پنڈت دیانند جی نے ریاست جے پور میں اپنے کارنامہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے کہ

"وہاں (یعنی جے پور میں) میں نے پرتھم ویشنومت کا کھنڈن کر کے (یعنی اس کو غلط ثابت کر کے) شیومت کی استھاپنا کی (یعنی اس کو مقبول یا مروج عزیز بنا دیا)"

جے پور ہی میں ویشنومت کے ایک پنڈت رنگاچاریہ نامی نے "شاستراتھ" یعنی مباحثہ یا سوتچھوں کی لڑائی کا پنڈت جی نے چیلنج دے رکھا تھا، اور بے چارے رنگاچاریہ کو پنڈت جی اس زمانہ میں لکھا ہے کہ رنڈاچاریہ کے نام سے موسوم کرتے تھے۔[1]

بہرحال کہنا یہ ہے کہ پنڈتوں کے خاص دائرے کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن مسلمانوں کی حکومت کی پوری تاریخ میں ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ مختلف مذاہب و ادیان کے ماننے والوں میں مکابرہ اور مجادلہ کا بازار کبھی گرم ہوا ہو۔ نہ عوام ہی میں اس نوعیت کے عام مذاق کا پتہ چلتا ہے، اور نہ سلاطین و امراء کی دوسری بازیوں کے ساتھ مذہبی نمائندوں کی گتھم گتھا کی اس بازی کا کسی نے ذکر کیا ہے، حتیٰ کہ اکبر تک کے زمانہ میں بھی حالانکہ سب ہی کچھ ہوا۔ مذاہب عالم کے نمائندے اکٹھے کئے گئے، لیکن بادشاہ کی سرپرستی میں مناظرہ کا کوئی دنگل قائم ہوا تھا کم از کم مجھے اس کا علم نہیں ہے۔

(گذشتہ صفحہ سے) پانچسو روپے کی پوری رقم مجھے دلائی جائے"۔ یہ بھی اسی کتاب میں ہے کہ ورجانند جو ہندو مذہب کے شیو فرقہ کے پنڈت تھے۔ ان کا مقابلہ دوسرے فرقہ وشنومت کے پنڈت سے ہوا، ورجانند کو شکست ہوئی۔ شکست کے بعد نفرت و غصہ کی حالت یہ تھی کہ وشنومت کی کتابوں کو ورجانند اپنی چارپائی کے نیچے ڈال دیا کرتے تھے، اور وشنومت کی ایک کتاب "سدھانت کومدی" کے مصنف کے متعلق ورجانند اپنے چیلوں کو حکم دیتے تھے کہ اس مصنف کے نام پر بھی اس کی تصویر پر بھی جوتیاں لگائیں۔ دیکھو سوامی دیانند اور ان کی تعلیم ص۲۲ مصنفہ خواجہ غلام الحسنین پانی پتی ۱۲

[1] یہ ساری باتیں آپ کو اسی کتاب "سوامی دیانند اور ان کی تعلیم" میں کتابوں کے حوالے سے مل جائیں گی۔ ۱۲

مسلمانوں کے اقتدار کے ختم ہونے کے بعد سب سے پہلے پادریوں کو دیکھا جاتا ہے کہ بازاروں اور میلوں ٹھیلوں میں پہنچ کر دوسروں کے عقائد و اعمال پر نکتہ چینی کر رہے ہیں۔ جس کے بعد قدرتاً ان سے مقابلہ کے لئے بھی لوگ کھڑے ہو جاتے تھے۔ لیکن عموماً یہ پادری جن میں زیادہ تر دیسی کالے رنگ والے پادری ہوتے تھے، جن کا علمی سواد بھی معمولی ہوتا تھا، اور کیا کہا جائے۔ لیکن جو واقعہ تھا، اس کا کیسے انکار کیا جائے کہ جن خاندانوں سے ان دیسی پادریوں تک رسائی عمل کرتے ہیں عیسائی مشنری کے لوگ کامیاب ہوا کرتے تھے، ایک تو موروثی روایات ہی ان کی حد درجہ پست ہوتی تھیں ثانیاً محض رفع حاجت کے لئے دین قبول کرنے والوں سے کردار کی بلندی کی توقع عام طور پر کرنی بھی نہ چاہیئے'

ہندوستان کے مروجہ مذاہب و ادیان پر اعتراضات کی ایک فہرست تیار کر لی گئی تھی، یہی فہرست ان کو رٹا دی جاتی تھی جس کا اعادہ کوچہ و بازار میں وہ کرتے پھرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ دل دکھانے والی اعتراضوں کے ان گرامو فونوں کی طرف اسلام کے سنجیدہ علماء توجہ کم کیا کرتے، سچی بات یہ ہے کہ ان سے گفتگو یا بحث و مباحثہ کو علمی وقار کے مناسب بھی عموماً خیال نہیں کیا جاتا تھا۔

صرف غدر سے پہلے فنڈر نامی ایک مغربی نژاد پادری جو عربی اور فارسی یعنی مسلمانوں کی زبانوں کا ماہر تھا۔ جب وہ دندنانے لگا، اور شورش زیادہ بڑھی، تو پس پردہ گو ایک اور صاحب تھے لیکن گفتگو کرنے کے لئے مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے مشہور بانی حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی میدان میں اتر آئے تھے ۱۸۵۴ء میں ایک تاریخی مناظرہ بمقام آگرہ عیسائیوں اور مسلمانوں کا جو ہوا تھا اس میں ایک طرف یہی فنڈر، اور دوسری طرف مولانا رحمت اللہ صاحب مرحوم تھے، اس مذہبی مناظرہ میں جیسا کہ مشہور ہے، فنڈر کو شکست فاش ہوئی تھی۔ مولانا رحمت اللہ نے عربی و فارسی دونوں زبانوں میں کافی کتابیں عیسائیوں کے موجودہ تثلیثی دین کی تنقید و تردید میں لکھیں، جن میں بعض مصر میں بھی شائع ہوئیں، بلکہ سنا ہے کہ ان کی کتاب دعوت الحق کسی زمانہ میں مصر کے دینی مدرسوں کے نصاب میں بھی شریک تھی۔

برگزیدہ ہستیاں علماء میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے سوا اگر یہی پادریوں سے مناظرہ و مباحثہ کے سلسلہ میں کسی اسلامی عالم کا نام مشکل ہی سے لیا جا سکتا ہے۔

البتہ مسلمانوں میں بعض غیر معروف افراد جو ہندوستان کے باضابطہ ممتاز علماء میں تو شاید شمار نہ ہوتے تھے لیکن انہوں نے اسلامیات کے ساتھ ساتھ عیسائیوں کے دین کے متعلق بھی کافی معلومات فراہم کرلی تھیں۔ انہوں نے گویا اس زمانہ میں پادریوں سے بحث و مناظرہ ہی کو اپنا پیشہ بنالیا تھا، جن میں دلی کے مولوی منصور علی صاحب نے خاص شہرت حاصل کی تھی، یہی امام فن مناظرہ کے خطاب سے مسلمانوں میں مشہور ہوئے۔ اس زمانہ میں بعض دلچسپ افراد بھی مسلمانوں میں پیدا ہو گئے تھے جن میں ایک صاحب نعمان بن لقمان[1] نامی بھی تھے، جو اپنے آپ کو

"وکیل مسیح باقرار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"

زبان سے بھی کہا کرتے تھے، اور ان کی مہر میں بھی یہی الفاظ [illegible] تھے

سچ تو یہ ہے کہ جہاں

"جھک وہی جاتا ہے پلہ جو گراں ہوتا ہے"

کا فیصلہ کنجڑن[2] اپنے ترازو کو دکھا کر کرتی ہے، اور اسی پر فتح کی تالی پٹ جاتی ہے، اس قسم کی مجلسوں میں

---

[1] میلہ خداشناسی کی روداد میں بھی ان کا تذکرہ کیا گیا ہے مصنف الامام الکبیر کے ساتھ شاہجہانپور کے مناظرہ میں یہ بھی آئے تھے۔ لکھا ہے کہ تحصیل علم ادبی گلستاں سے زیادہ نہ تھی لیکن پادریوں کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ ان ہی نعمان بن لقمان صاحب کی وہ مشہور نظم ہے جس کے بعض اشعار اب بھی پرانے لوگوں کی زبان سے سننے میں آتے ہیں یعنی

در نبی کا کھلا ہے آئے جس کا جی چاہے ۔۔۔ نہ آئے آتش دوزخ میں جلے جس کا جی چاہے

معاذ اللہ فرزند خدا کہتے ہیں عیسیٰ کو ۔۔۔ [illegible] جس کا جی چاہے

[2] کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ آسمان پر اٹھا لئے گئے اور تمہارے پیغمبر تو زمین ہی میں دفن ہوگئے، اسی کا جواب کنجڑن کی ترازو کو دکھا کر دیا گیا تھا۔ پادریوں کے مذاق کی پستی کا اندازہ اس تحریری شہادت سے بھی ہوتا ہے جس کا ذکر اسی میلہ خداشناسی کی روداد میں کیا گیا ہے کہ جب مسلمانوں کے وکیل نے کہا کہ مسیح تو بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے تھے تو اب انجیل کو ساری دنیا میں کیوں پھیلاتے پھرتے ہو تو کسی دیسی نہیں بلکہ ایک یوروپین پادری نے کہا کہ بنی اسرائیل انسان تھے پس بنی اسرائیل کی طرف جو مبعوث ہوا وہ انسانوں کی طرف گویا مبعوث ہوا، پادری صاحب نے اپنی چھڑی کو دکھا کر کہا کہ چھڑی یہاں ہے لکڑی بھی یہیں ہے۔ [illegible] کی ۱۲

سنجیدگی اور متانت و وقار کی گنجائش ہی کیا تھی گویا جیسی روح تھی ویسے ہی فرشتے۔ ہمارے مصنف امام نے بازاری پادریوں کا ذکر کرکے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"اسی زمانہ کے درمیان میں دہلی میں پادریوں کے وعظ کا چرچا تھا، اور مسلمانوں میں سے بعضے بے چارے اپنی ہمت سے ان سے مقابلہ کرتے تھے۔ کوئی اہل علم جن کا یہ کام تھا اس طرف توجہ نہ کرتا تھا" صلاا

اس عدم توجہ کا راز زیادہ تر یہی تھا کہ صحیح علمی طریقہ سے بحث و مباحثہ پادری کرنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ مغالطہ بازیوں مضحکہ انگیزیوں پر ان کی ساری کارروائیوں کا دارومدار تھا۔ لیکن باایں ہمہ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات کی تحقیر و توہین میں بھی بازاری پادری اپنی ہرزہ درائیوں، ژاژ خائیوں کو آخری حد تک پہنچا دیا کرتے تھے۔

سیدنا الامام الکبیر کے سینے میں جو دل تھا جب تک وہی دل اور دل کا وہی درد کسی میں نہ ہو، اندازہ ہی نہیں کرسکتا کہ حضرت والا پر ان یاوہ گوئیوں کی ان خبروں کو سن سن کر کیا گذر رہی تھی۔ کیا کیا جائے، ان دریدہ دہنوں کے منہ کس طرح بند کئے جائیں، منہ لگانے کے لائق ہوتے، تو خود ہی میدان میں اتر آتے۔ مصنف امام کا بیان ہے کہ شروع میں جب ضبط کا یارا نہ رہا، تو جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے۔

"مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیرؒ) نے اپنے شاگردوں کو فرمایا کہ تم بھی کھڑے ہو کر بازار میں کچھ بیان کیا کرو"

اور یہ کہ

"جہاں وہ لوگ (یعنی مسلمانوں کے وکلاء) بمقابلہ نصاریٰ بیان کرتے ہیں ان کی امداد کیا کرو" صلاا

یہ قصہ کس زمانہ کا ہے مصنف امام نے اس کی تصریح تو نہیں کی ہے، لیکن بظاہر یہ اسی زمانہ کی بات ہے، جب منشی ممتاز علی مرحوم کے مطبع مجتبائی میں ۱۸۵۷ء کے بعد ان ہی کے اصرار سے حضرت والا نے

تصحیح کا کام اپنے ذمہ لیا تھا، اور دلی میں دوبارہ قیام آپ کا اسی تعلق سے کچھ دنوں تک رہا تھا۔ کیونکہ عموماً اسی زمانہ میں شاگردوں کا ایک گروہ آپ کے گرد جمع ہو گیا تھا۔

مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ حسب ارشاد گرامی آپ کے شاگردوں نے بھی پادریوں کے مباحثوں میں حصہ لینا شروع کیا، بات نے غالباً طول کھینچا، اور باضابطہ مناظرہ یعنی وہی مکابرہ کا چیلنج پادریوں کی طرف سے دیا گیا، اس زمانہ میں ایک کالے پادری ماسٹر تارا چند نامی کی دلّی میں خاصی شہرت تھی۔ مشہور ہوا کہ عیسائیوں کی وکالت ماسٹر تارا چند صاحب ہی کریں گے۔ اس خبر سے لوگوں میں گونہ تشویش پیدا ہوئی۔ خبر حضرت والا تک بھی پہنچی، حالانکہ ساری زندگی میں اس قسم کے بازاری غل غپاڑے مچانے والوں سے آویزش کا موقعہ بھی آپ کو کبھی نہیں ملا تھا، اور آپ کی بلند علمی شان کے مناسب بھی نہ تھا کہ اس قسم کے بازاری لوگوں کو اپنا مخاطب بنائیں۔ لیکن۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ دلّی میں کسی وجہ سے اس مباحثہ کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی تھی، حالانکہ خود اسی دلی میں عیسائیوں کے مناظرے کے امام مولوی منصور علی صاحب موجود تھے۔ موجود ہی نہ تھے بلکہ مصنف امام نے خبر دی ہے کہ مناظرہ جب ہوا، تو منجملہ دوسروں کے ساتھ یہ امام فن مناظرہ بھی مسلمانوں کی طرف سے وہاں حاضر تھے، مولوی منصور علی صاحب کا ان الفاظ میں تعارف کراتے ہوئے، کہ وہ

"فن مناظرہ بائبل کتاب میں یکتا ہیں"

اور یہ کہ

"بائبل (توریت و انجیل وغیرہ) کے گویا حافظ ہیں، اور ان کا طرز مناظرہ بھی جداگانہ ہی، آپ ان ہی کے (یعنی مولوی منصور علی صاحب کے) شاگرد بمقابلہ پادریوں کے دہلی میں وعظ کیا کرتے ہیں"

مصنف امام نے یہ اطلاع دی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی مولوی منصور علی صاحب سے

"اسی زمانہ سے (یعنی جس زمانہ میں یہ مناظرہ ہوا) ملاقات ہوئی" ص۲۲

بہر حال باوجود ان تمام باتوں کے صورت حال کچھ ایسی تھی کہ خود سیدنا الامام الکبیر کا فیصلہ ہوا، یا دوسروں نے آپ کو آمادہ کیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو پادریوں کے اس مناظرہ میں حضرت والا کی شرکت ضروری ہے،

اللہ اللہ جو طے کئے ہوئے تھا کہ اپنے آپ کو خاک میں ملا کر رہوں گا، تاکہ مجھے کوئی نہ جانے اور جو کہتا ہو کہ جانوروں کے بھی گھونسلے ہوتے ہیں، لیکن میرے لئے یہ بھی نہ ہوتا، ساری زندگی جس کی اسی آرزو میں گذری یہ کاہش! کوئی میری ہوا تک نہ پاتا، عرض کر چکا ہوں، بار بار اسی کو دہرا چکا ہوں، وہ جتنا گھٹنا چاہتا تھا، بڑھانے والا اسی نسبت سے اس کو بڑھا رہا تھا، اس نے امامت سے انکار کیا، امام بنایا گیا۔ اس نے وعظ گوئی سے بچنا چاہا، ہندوستان کے سحر البیان خطیبوں میں وہی شمار کیا گیا، وہ پڑھانا نہیں چاہتا تھا، لیکن سارے ہندوستان بلکہ ہندوستان کے باہر بھی دینی علوم کے پڑھنے پڑھانے کی سنت اسی سے زندہ ہوئی، جو کسی کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا، اسی لئے غیر تو غیر خود مولویوں کے دائرے کے اختلافی مباحث و مسائل سے بھی اس نے بہت کم دلچسپی لی، لیکن آج ایک غیر مذہب کے مجادل و مکابر کا مقابل بن کر وقت کا تقاضا ہو رہا ہے کہ وہی میدان میں اترے۔ بقول شیفتہ مرحوم

کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے۔

افسوس ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی زندگی میں پہلی دفعہ یہ صورت دلی میں جو پیش آئی تھی، جیسا کہ چاہئے اس کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ مصنف امام کے بیان سے بس اسی قدر پتہ چلتا ہے کہ بہر حال آپ پادری تاراچند سے گفتگو کرنے پر تو آمادہ ہو گئے، شرط صرف یہ رکھی گئی، کہ نہ تاراچند ہی کو میرے نام اور میری شخصیت کا علم ہو، اور نہ عام پبلک کو۔ ایک عامی مسلمان کی حیثیت سے میں حاضر ہو جاؤں گا اور جو کچھ سمجھ میں آئے گا، عرض کروں گا۔ مصنف امام کی سوانح عمری میں اسی مناظرے کے متعلق یہ الفاظ جو پائے جاتے ہیں یعنی

آخر مباحثہ کی ٹھہری اور مولوی صاحب (یعنی سیدنا الامام الکبیر) بے کسی صورت و شکل بنائے

اور اپنا نام چھپا جا موجود ہوئے ۔"

ان الفاظ سے یہی سمجھ میں آتا ہے، آگے وہی ان پادری تارا چند کا ذکر ان الفاظ میں کرکے کہ

"ایک پادری تارا چند نام تھا ۔"

وہی سامنے آیا، اور بڑے زور شور سے اعتراضوں کی فہرست جیسا کہ دستور تھا، اسی کا آموختہ سنانے لگا، جواب دینے کے لئے مسلمانوں کی طرف سے ایک ایسا آدمی کھڑا ہوا، جو ان کی شکل و صورت سے مولوی بھی معلوم نہ ہوتا تھا، اور نہ پادریوں سے بحث و مباحثہ کرتے ہوئے دلی والوں نے کبھی اس کو دیکھا تھا، خود تارا چند پادری کے لئے بھی اس کی شخصیت اجنبی تھی، جوابی تقریر جس وقت ختم ہوئی، جیسا کہ چاہئے تھا، مجلس پر سناٹا چھایا ہوا تھا، مصنف امام کی خبر کے الفاظ ہیں کہ

"اس سے (یعنی تارا چند پادری سے) گفتگو ہوئی، آخر وہ بند ہوا، اور گفتگو سے بھاگا۔" ص۲۲

امام فن مناظرہ مولوی منصور علی صاحب کا سیدنا الامام الکبیر سے تعارف نہ تھا۔ قدرتاً تقریر اور جواب کے نئے رنگ نئے ڈھنگ کو دیکھ کر حضرت سے آکر ملے، ظاہر ہے کہ ان سے اپنے آپ کو چھپانے کی وجہ ہی کیا ہو سکتی تھی، حضرت والا اور مولوی صاحب سے پھر دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے، ان کو بڑی خوشی ہوئی، کہ ان کی پشت پناہی کے لئے ایک غیر معمولی علمی قوت میسر آ گئی۔ آئندہ بھی ان کا ذکر آئے گا۔

دوسری خداداد وو لیعتوں کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر کی "فطرت فائقہ" اور "جبلہ بدیعہ" کا ایک نیا پہلو تھا، جو پہلی دفعہ تارا چند پادری سے گفتگو کرنے کے بعد دلی کے مسلمانوں کے سامنے آیا، صحیح طور پر دلی کے اس پہلے مباحثہ کی تاریخ تو معلوم نہ ہو سکی، لیکن عرض کر چکا ہوں کہ قرائن کا اقتضاء یہی ہے، کہ شورش کے خلفشار کے فرو ہونے کے بعد جب گونہ امن اور اطمینان کا ماحول ملک میں پیدا ہوا، اسی زمانہ کی یہ بات ہے،

ادھر پادریوں کے ردّ و قدح، بلکہ اسلام کی تحقیر و توہین، اور مسلمانوں کی دل آزاری، اذیت رسانی کا یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ ان ہی کی دیکھا دیکھی، جہاں تک میں جانتا ہوں، مراد آباد کے ایک گمنام آدمی

پنڈت ان جو تھوڑی بہت اردو فارسی زبانوں کے ذریعہ اسلامی تعلیمات اور روایات کا مطالعہ کر سکتے تھے، ان کے دل میں بھی ہوک اٹھی، اور مسلمان جنہوں نے اپنے ایام حکومت میں آج تک ہندوؤں کے دین اور دھرم کی تنقید یا تردید، جرح و اعتراض کو موضوع بنا کر کوئی مستقل کتاب ہی لکھی تھی، اور اپنی محدود معلومات کی بنا پر یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ ضمناً بھی اس قسم کی باتوں کا تذکرہ ان کی کتابوں میں مشکل ہی سے کیا گیا تھا۔ بلکہ برعکس اس کے کافی ذخیرہ ایسا موجود ہے، جس میں ہندوؤں کے دین و آئین کے متعلق ہمدردی اور حسن ظن ہی کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ ابوالفضل کی آئین اکبری ہی میں نہیں، بلکہ نقشبندیہ طریقہ جو اتباع سنت اور دینی صلابت میں تمام دوسرے صوفیانہ طریقوں میں ممتاز سمجھا جاتا ہے، جس رنگ کو حضرت مجدد الف ثانی کی مجددیت نے بہت زیادہ نکھار کر چمکا دیا ہے، اسی نقشبندی مجددی طریقہ کے سرخیل حضرت مرزا جان جاناں اور ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہم جیسے بزرگوں کے کلام میں ڈھونڈھنے والوں کو آج بھی اس سلسلہ میں بہت کچھ مل سکتا ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔

کچھ بھی ہو، دوسرے ادیان و مذاہب کے ماننے والوں کی دل آزاری، اولاً اسلامی دین کی روح کے بھی خلاف ہے، اور مسلمان مصنفوں نے اس روح کی رعایت کسی اور مذہب و دین کے ساتھ کی ہو یا نہ کی ہو، لیکن ہندو دھرم کے ماننے والوں کو انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ اس باب میں مسلمانوں سے شکایت کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، اس قوم سے مسلمانوں کا تعلق تقریباً ہزار سال سے قائم ہے، اور تعلق بھی حاکمیت و محکومیت کا، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، عام طور سے ہمارے مصنفین اس سلسلہ میں احتیاط ہی سے کام لیتے رہے، اور مجھے اس کا بھی اعتراف کرنا چاہئے کہ جب تک مسلمانوں کا دور حکومت ہندوستان میں رہا، شاید ہندو مصنفین نے بھی اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ناشائستہ کلمات کے استعمال سے پرہیز ہی کیا، کم از کم میری واقفیت یہی ہے، جن زبانوں سے میں واقف نہیں ہوں، ان میں کچھ کہا گیا ہو، تو یہ الگ بات ہے۔

پہلی دفعہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مذہبی چھیڑ چھاڑ نوک جھونک کا مسئلہ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے۔

کمپنی قائم ہونیوالی حکومت ہی کے عہد میں شروع ہوا۔ پنڈت اندرمن مرادآباد میں بیٹھے کچھ لکھا کرتے تھے اور مرادآباد ضلع ہی کے مشہور
قصبہ بچھرایوں کے ایک عالم مولانا محمد علی صاحب ان کے مقابلہ میں ہندو مذہب کی تعلیمات و روایات
پر تنقید کرتے تھے۔ مولانا بچھرایونی کی کتاب "سوط اللہ الجبار" شاید کسی مسلمان مصنف کی پہلی کتاب ہے
جس میں دل کھول کر پنڈت اندرمن کے کلوخ کا جواب سنگ سے دیا گیا ہے۔ ان کے بعد غدر
سے پہلے ایک نو مسلم بزرگ کی کتاب "تحفۃ الہند"[1] شائع ہوئی۔

لیکن پنڈت اندرمن کی کچھ تو کم علمی، اور اس سے بھی زیادہ بے چارے کی ناداری و مفلسی، ساتھ ہی
قلم تو خیر کسی حد تک ان کا چلتا تھا، مگر پبلک جلسوں میں بولنے یا تقریر کرنے کی صلاحیت کلیۃً نہیں رکھتے
تھے۔ آئندہ خود ان ہی کا ذاتی اعتراف نقل بھی کیا جائے گا۔ ان کے افلاس اور بے کسی ہی کا نتیجہ یہ تھا،
کہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے نہیں، بلکہ مرادآباد ہی کے چند مقامی مسلمانوں کی درخواست
پر مرادآباد کے مجسٹریٹ نے ان کی کتابوں کے ضائع کرنے کا حکم دے دیا۔ اور پانچسو روپے جرمانہ

---

[1] خود اس کتاب میں مصنف نے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہ اپنے موروثی دھرم کو چھوڑ کر دین اسلام انہوں
نے کیوں قبول کیا۔ ہندو مذہب کی روایات پر بھی تنقید کی ہے، اور اسی کے ساتھ اس زمانہ میں ہندوستانی مسلمانوں
کی زندگی میں شرک و بدعات کے جراثیم بری طرح جو پیوست ہو گئے تھے، ان پر بھی کافی حملے کئے گئے ہیں
لکھا بھی ہے کہ مخاطب اس کتاب کے صرف ہندو نہیں بلکہ ہندوستان کے مسلمان بھی چونکہ ہیں۔ اسی لئے
بجائے تحفۃ الہنود کے کتاب کا نام میں نے تحفۃ الہند رکھا ہے۔ البتہ اس کتاب کے آخر میں کوئی شیخ سلیم نامی
صاحب کی ایک نظم بھی شریک کردی گئی ہے۔ کچھ نہیں معلوم کہ یہ شیخ سلیم کون تھے، کہاں کے تھے۔ نظم
کب لکھی گئی کس نے لکھوائی، لکھوانے کی ضرورت کیا تھی؟ ان سارے سوالوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ زبان بھی
اس میں جو استعمال کی گئی ہے۔ شمالی ہند کے مسلمان عموماً اس زبان ہی کو استعمال کرتے ہیں، اور نہ پورے
طور پر اس کو وہ سمجھ سکتے ہیں، ہاں تلسی داس کی رامائن کے سمجھنے والے ہندوؤں کی سمجھ میں خوب اچھی طرح آسکتی ہے۔ یہی مشہور
نظم ہے جس کی ٹیپ کا بند "کہو یہ کون دھرم ہے"، عجیب بات کہ قریب قریب ان ہی وزن کے لگ بھگ جنوبی ہند میں ایک
نظم جنوبی ہند کے مسلمانوں کی عام بولی میں بھی شائع ہو کر پھیلی جس کے ٹیپ کا شعر یہ ہے۔ یاد ہوئے گر تمہیں ہم کو بتاؤ برہمن + کاہے کو
پھیرتے ہو ناحق پوجی پتھر من۔ دکنی بولی کی اس نظم کا رنگ بھی وہی شیخ سلیم والی "کتھا سلونی" کا ہے۔ تعدادوں ہی کو ہندوؤں کے قلب
میں مسلمانوں کی طرف سے نفرت پیدا کرنے کا کام لیا جا سکتا ہے، یاد رکھنا چاہئے کہ تحفۃ الہند میں یہ نظم ۱۲۸۱ھ میں چھپی، اور دکنی بولی والی نظم بمبئی میں
۱۲۸۱ھ میں شائع ہوئی، ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کی تاریخ میں یہ دونوں نظمیں شمالی و جنوبی ہند کی خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں ۱۲

جرمانہ سے طلب کیا گیا۔ لکھتے ہیں کہ مقدمہ کی اپیل کی گئی اور جج نے جرمانہ کے متعلق فیصلہ میں لکھا کہ "چونکہ وہ (ملزم) غریب ہے اس لئے چار سو روپے معاف کئے گئے "جرم اس پر ثابت ہے اس لئے سو روپے بحال ہے۔[۱]

ممکن ہے کہ ملزم جیسے کچھ دوسرے نا پرسان حال گمنام لوگ دیگر طرف سے بھی اسلام کے خلاف تقریراً یا تحریراً لئے یا لکھنے کا سلسلہ نئی حکومت اور نئے قانون کی وجہ سے جاری رہا ہو لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں اس ملک کے عام آباد کاروں میں نہ کسی قسم کی ہلچل ہی پیدا ہوئی اور نہ عوام کی توجہ ہی ان مذہبی جھگڑوں رگڑوں کی طرف جیسا کہ چاہئے منعطف ہوئی۔

مگر جوں ہی کہ پرانے پنڈتوں کے اس حلقہ سے نکل کر جس کا سب سے بڑا مشغلہ ہندوؤں کے مختلف فرقوں کے عقائد اور مسلمات کے منڈن اور کھنڈن (تائید و تردید) کے سوا اور کچھ نہ تھا، اچانک اسی حلقہ کے محدود دائرہ سے نکل کر یورپ و امریکہ کی تھیاسوفیکل سوسائٹیوں کے گرد و حالم کی شہرت کے ساتھ میدان میں پنڈت دیانند سرسوتی جی تشریف لائے۔ جن کو ہندوؤں کے بڑے بڑے سرکاری حکام اور لیڈروں کی سرپرستی بھی حاصل تھی، اور اچانک وہی جو ابھی چند دن پہلے وشنو مت کے مقابلہ میں ہندوؤں کے شیو مت والے فرقہ کی حمایت میں اپنے علم اور بیانی قوت کا زور دکھا رہے تھے۔ ان کو دیکھا گیا کہ دنیا کے سارے مذاہب اور ان کے ماننے والوں پر برس رہے ہیں، ان کے مذاہب کی بھی اور ان کے پیشواؤں کی بھی دھجیاں بکھیر رہے ہیں۔

نہ گھر والوں کو چھوڑتے ہیں اور نہ باہر والوں کو، ایک طرف ہندوستان کے مقامی مذاہب سناتن دھرم، جین مت، بودھ مت والوں کو جو جی میں آتا تھا کہتے چلے جاتے تھے، اور دوسری طرف یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی کتاب قرآن اور ان کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بے تحاشا ایسے الفاظ استعمال کر رہے ہیں، جنہیں ان سے پہلے نہ کانوں نے سنا تھا، اور نہ آنکھوں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا، دنیا دم بخود تھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، اور کیوں ہو رہا ہے، مسلمان اور ہندو

---

[۱] منقول از زمانے شاستر غازی محمود دھرمپال صفحہ ۲۹۵ انہوں نے یہ الفاظ دیانند جی کی سوانح عمری سے نقل کئے ہیں ۱۲

توقیر مجبور تھے، معذور تھے، نہتے تھے، لیکن جس قوم کے ہاتھ میں ہندوستان کی حکومت کی باگ تھی، اسی حکومت کے اس شاہی فرمان کی سیاہی بھی شاید ابھی خشک نہ ہوئی تھی، جس میں وقت کے حکمران نے اپنے آپ کو عیسائی مذہب کی پشت پناہ قرار دیتے ہوئے یہ اعلان بھی کیا تھا کہ

"ہم کو مذہب عیسائی کے صدق کی نسبت یقین کلی حاصل ہے اور جو تسلی خاطر اس سے ہوتی ہے، اس کا بکمال شکر گزاری اعتراف ہے۔"

۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد ملکہ وکٹوریہ کا جو عام فرمان باشندگان ہند کے نام شائع ہوا تھا۔ یہ فقرہ اسی میں موجود ہے، مگر بایں ہمہ خدا ہی جانتا ہے کہ پنڈت جی کو آزادی کا ایسا پروانہ کیسے اور کہاں سے مل گیا تھا کہ اسی عیسائی مذہب اور اس مذہب کے پیشواؤں کے متعلق وہ ایسی باتیں نہ صرف عام مجمعوں میں کہنے پر جری تھے، بلکہ لکھ لکھ کر چھاپتے تھے، جنھیں نقل کرتے ہوئے آدمی کی انگلیاں کانپنے لگتی ہیں، آج بھی ستیارتھ پرکاش میں وہ موجود ہیں[1]۔ لیکن وہی حکومت جو غریب اندرمن کی کتابوں کو معمولی ایک اخبار جام جمشید نامی کے مطالبہ پر ضائع کر چکی تھی اسی کے کان پر جوں بھی نہ رینگی۔ حالانکہ یہ کتاب ہندی، اردو، گورمکھی، انگریزی زبان میں مسلسل شائع ہوتی رہی[2]۔

[1] مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام لے کر لکھا گیا ہے کہ "وہ غصہ ور تھا..... اس کی جنگلی آدمیوں کی سی خصلت تھی" یا یہ "ناممکن باتیں یسوع کی جہالت پر دلالت کرتی ہیں۔ اگر اسے (یعنی یسوع) کو کچھ بھی تمیز ہوتی تو ایسی بے ہودہ وحشیانہ باتیں کیوں کہتا" یا یہ کہ "یوسف نجار بڑھئی تھا، اس لئے عیسیٰ بھی بڑھئی تھا، کئی ایک برس تک بڑھئی کا کام کرتا رہا بعد پیغمبر خدا کا بیٹا بھی بن بیٹھا" یا وہ اسی قسم کے الفاظ حضرت مسیح علیہ السلام کی شان میں استعمال کئے گئے ہیں، اسی طرح موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نام لے کر لکھا ہے، "اس کا چال چلن غصہ وغیرہ بد صفات سے پر ہے، وہ انسان کی جان کشی کرنے والا، چور کے مانند بدکار سزا سے گریز کرنے والا تھا"..... "وہ دغلو بھی ضرور ہوگا" العیاذ باللہ "زناکار" تک کا لفظ ان کے متعلق استعمال کیا گیا ہے، عیسائی مذہب کوروی مذہب لیے جوڑے گھوڑے پھر عیسائی مذہب، وحشیانہ مذہب یہ سب جاہلوں کی باتیں ہیں، بجز چند ایک کے تمام خرافات سے بھرا ہوا، حد یہ ہے کہ عیسائیوں کے خدا تک کو نہ چھوڑا گیا۔ "وہ ایک گوشت خور شریر آدمی کے مانند ہے" ستیارتھ پرکاش کے باب ۱۳ میں یہ سارے الفاظ آپ کو مل جائیں گے۔ دل پر جبر کر کے خرواسے چند دانے بمشکل بھوسے سے چنے گئے۔

[2] ۱۹۱۱ء تک بیان کیا جاتا ہے کہ ایک لاکھ بیالیس ہزار نسخے مختلف زبانوں میں اس کتاب کے شائع ہو چکے تھے، ہندی ایڈیشن گیارہ مرتبہ اردو ایڈیشن دس مرتبہ انگریزی چار مرتبہ گورمکھی چار مرتبہ اس وقت تک چھپ چکا تھا۔ ۱۲

یوں تو پنڈت جی کے لکچروں کا یہ سلسلہ کئی سال سے جاری تھا۔ ہندوؤں اور عیسائیوں وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مناظرے اور مباحثے بھی ہوتے تھے۔ مناظرے اور مباحثے کے سلسلہ میں مدراس کے رہنے والے ڈاکٹر مرڈک ایم' اے نے اپنی کتاب "ویدک ہندوازم اینڈ آریہ سماج" میں پنڈت جی کے طریقہ کار کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے کہ

"مباحثہ میں ان کا (یعنی سوامی دیانند کا) طریقہ یہ تھا کہ تعریف کرنے والوں کی ایک منڈلی اپنے ساتھ رکھتے تھے' جب وہ بآواز بلند اپنے مخالفوں کی ہنسی اڑاتے اور قہقہہ لگاتے تھے' تو اس کام میں یہ لوگ (منڈلی والے) ان کے ساتھ شریک ہو جاتے تھے۔"

(منقول از سوامی دیانند اور ان کی تعلیم)

لیکن جیسا کہ عرض کر چکا ہوں' پنڈت جی کی کتاب ستیارتھ پرکاش سنہ ۱۸۷۵ عیسوی مطابق سنہ ۱۲۹۲ھ میں بنارس سے شائع ہوئی' اور جو کچھ پنڈت جی زبانی اپنی تقریروں میں اب تک کہتے پھرتے تھے' اسی نے مستقل تحریری لباس بھی پہن لیا' حکومت میں اس کی رجسٹری بھی کرائی گئی تھی' راجہ جے کرشن داس سی' ایس' آئی کے دستخط سے اسی اڈیشن میں یہ عبارت چھپی ہوئی ہے

"میری اور سے اس پستک کی رجسٹری قانون۔ ۲۵ سنہ ۱۸۶۷ء کے ازسار ہوئی ہے ہوائے میرے و میری آگیا کے اس پستک کے چھاپنے کا کسی کو ادھیکار نہیں ہے۔"

اسی سال ادھر یہ کتاب شائع ہوئی' اور ٹھیک اسی سال یعنی سنہ ۱۲۹۲ھ مطابق سنہ ۱۸۷۵ء میں ایک عام اعلان اخباروں میں بھی کیا گیا' اور علیحدہ اشتہارات بھی مختلف زبانوں میں تقسیم کئے گئے' عنوان تو ان اعلانوں' اور اشتہاروں کا تھا

"میلہ خدا شناسی"

اصل مضمون تو مجھے نہ مل سکا' خلاصہ اس کا جیسا کہ کتاب "گفتگوئے مذہبی" میں لکھا ہے' یہ تھا کہ

"پادری نولس صاحب انگلستانی' پادری شاہجہاں پور' اور منشی پیارے لال کبیر پنتھی ساکن موضع چاندا پور متعلقہ شہر شاہجہاں پور نے مل کر سنہ ۱۸۷۵ء میں ایک میلہ بنام میلہ خدا شناسی

موضع چاندا پور میں جو شہر شاہجہاں پور سے چھ کوس فاصلہ پر لب دریا واقع ہے، مقرر کیا اور

تاریخ میلے رئی ٹھیرائی" صا

یہ پادری نولس صاحب انگلستانی اور منشی پیارے لال کبیر پنتھی کون تھے، دونوں کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی، مختصر لفظوں میں اس کی کچھ تفصیل "مباحثہ شاہ جہاں پور" نامی رسالے میں جو کچھ کی گئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پادری نولس صاحب درحقیقت شاہ جہاں پور کے مشن اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، ہیڈ ماسٹری کے ساتھ ساتھ مشن کا کام بھی شاہ جہاں پور کے اطراف و نواح کی آبادیوں میں گھوم پھر کر کیا کرتے تھے، اسی سلسلہ میں "چاندا پور" جو شاہ جہاں پور کے متصل قصباتی آبادی تھی، وہاں بھی پادری صاحب کا دوغنط ہوا کرتا تھا۔ چاندا پور کے ایک خوش حال اور خوش باش باشندے منشی پیارے لال صاحب جو کبیر پنتھی تھے، ان کی تقریروں میں شریک ہوا کرتے تھے، پادری صاحب اور منشی جی میں تعارف پیدا ہوا، میل جول بڑھا، پادری صاحب کے توسط سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریز حکام تک بھی منشی جی کی رسائی ہونے لگی۔ صاحب رسالہ نے لکھا ہے کہ

"پادری صاحب کی ملاقات سے ان کی عزت و توقیر بھی بڑھ گئی" صا

غالباً ان الفاظ سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے، کچھ اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ منشی پیارے لال نے عیسائی دین تو قبول نہیں کیا، لیکن پادری اس حد تک ان کو متاثر کرنے میں غالباً کامیاب ہو چکے تھے، کہ منشی پیارے لال کے

"خیر خواہوں نے دیکھا کہ منشی صاحب اپنی حالت دیرینہ کی طرح اپنے آبائی عقیدہ کو بھی پارینہ سمجھنے لگے" صا

الغرض بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو پادری نولس صاحب کی تحریک اور کچھ منشی پیارے لال کے احباب اور دوستوں کے مشورہ سے طے پایا کہ چاندا پور کے متصل منشی پیارے لال کی زمینداری میں ایک گاؤں سارنگ پور نامی میں جہاں بقول مصنف رسالہ "مباحثہ شاہ جہاں پور" منشی جی کی

"مملوکہ زمین اور باغات"

تھے' اور ان کی اسی سلوک زمین و باغات کے درمیان ایک بڑی ندی بہتی تھی جس کا نام اسی رسالہ میں

"دریائے گرا"

بتایا گیا ہے' اسی ندی کے کنارے

"میلہ خدا شناسی"

کے نام سے ایک میلہ کیا جائے اور یہ کہ علاوہ عام لوگوں کے خصوصیت کے ساتھ جیسا کہ اسی رسالہ میں ہے

"علمار مذاہب مختلفہ کا مناظرہ ہو"

خدا شناسی کے اس میلہ جانے کا بظاہر مقصد تو یہ رکھا گیا کہ علمار مذاہب مختلفہ کے باہمی مناظرہ و مباحثہ سے

"تحقیق مذہب بھی ہو جائے گی"

یعنی دنیا کے مروجہ مذاہب میں "سچا مذہب" جو منشی جی کے لئے قابل تسلیم ہو' اس کا پتہ بھی چل جائے گا' مگر ظاہر ہے کہ زمیندار طبقہ کے ایک سرمایہ دار آدمی کے لئے صرف یہی وجہ کافی نہیں ہو سکتی تھی' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل میں میلہ کا سبز باغ بھی ان کو دکھایا گیا' شاید باور کرایا گیا کہ بیسیوں میلے ہندوستان میں معمولی معمولی بنیادوں یا حیلوں پر جمتے ہوئے بالآخر عظیم الشان میلوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ اپنی افتادہ شور زمینوں کو ان ہی تدبیروں سے لوگ "بہشتی ٹکڑہ" اسی زمانہ میں بنا رہے تھے۔

"اس میلہ سے کچھ اور فائدہ کی صورت ہوگی"

منشی جی کے خیر خواہوں کے مشورے کا یہ جزو جسے "مباحثہ شاہجہانپور" والے رسالہ کے مصنف نے نقل کیا ہے۔ اس سے تو کچھ یہی سمجھ میں آتا ہے۔

کچھ بھی ہو' میلہ کی پہلی روداد جو میرٹھ کے مطبع ضیائی کے کارپردازوں محمد ہاشم علی اور محمد حیات صاحبان کی مرتب کی ہوئی ہے' اور "گفتگوئے مذہبی یا واقعہ میلہ خدا شناسی" جس کا نام رکھا گیا تھا' اس میں اگرچہ منشی پیارے لال کے متعلق لکھا ہے کہ

"دولت مند اور وہاں کے (یعنی چاندا پور کے) رئیس ہیں" مـلا۔

تاہم ان کی طرف سے میلہ کے قیام کا انتظام ہی نہیں، بلکہ جیسا کہ اسی رسالہ میں خبر دی گئی ہے کہ

"سب کو کھانا اور خیمے وغیرہ انہیں (یعنی منشی پیارے لال) کی طرف کو ملے"

اس خبر میں "سب" کا لفظ اگرچہ حد سے زیادہ مجمل ہے۔ ہر وہ شخص جو میلہ میں شریک ہوا تھا، سب کو کھانا منشی جی کی طرف سے دیا جاتا تھا، اس کو واقعہ قرار دینا تو مشکل ہے۔ لیکن "سب" کے لفظ کو مذاہب کے نمائندوں ہی کی حد تک محدود رکھا جائے، تو ان کی تعداد بھی کافی تھی۔ مسلمانوں کے جن جن نمائندوں کا ذکر اس رسالہ میں بضرورت کیا گیا ہے، میرے خیال میں بیس پچیس تک تو ان ہی کی تعداد پہنچ جاتی ہے، اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ پادریوں کا بھی کافی مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ منشی جی خود ہندو تھے۔ قدرتاً ہندو مذہب کے نمائندوں کی تعداد بھی چاہئے تو یہی کہ کم نہ ہو، میلہ دو دن تک رہا، ایسی صورت میں ناشتہ نہ سہی کم از کم کھانا سب مہمانوں کو چار وقت تو ضرور کھلایا گیا ہوگا۔ روداد ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی نمائندوں کے سوا دوسرے ہندو مسلمان معزز مہمان بھی میلہ میں موجود تھے، جن میں عدالت کے وکلاء اور حکومت کے حکام مثلاً ڈپٹی کلکٹر وغیرہ بھی تھے۔ چاندا پور کی بستی شاہجہان پور کے شہر سے لکھا ہے کہ

"پانچ چھ کوس کے فاصلہ پر لب دریا واقع ہے"

موٹر وغیرہ سریع السیر سواریوں کا زمانہ نہ تھا کہ میلہ میں شریک ہونے والوں کے متعلق یہ توقع کی جائے کہ کھانا کھانے کے لئے شہر چلے آتے تھے۔ اسی لئے کم و بیش میرا تخمینہ یہی ہے کہ تین چار سو آدمیوں کو فی وقت منشی جی کو کھانا کھلانا پڑا ہوگا۔ مہمان بھی معمولی لوگ نہ تھے۔ دستور کے مطابق کچھ نہ کچھ تکلف ہی سے کام لیا ہوگا۔ پھر مزید برآں خیمہ و خرگاہ اور دوسری قسم کی آسائشوں کی فراہمی میں منشی جی پر چاہئے تو یہی کہ کم مالی بار عائد نہ ہوا ہوگا، اسی سے سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ میلہ کے پیچھے محرکات معمولی نہ تھے، اب یا یہ مان لیا جائے کہ "تلاش حق" کا کوئی غیر معمولی جذبہ منشی جی میں اشتعال پذیر ہوا تھا، جس سے اس درجہ مغلوب ہو گئے تھے کہ خرچ کے متعلق کم و بیش کا سوال ہی ان کے سامنے باقی نہ رہا تھا، اگرچہ آئندہ ان کے جس طرز عمل کا ذکر آ رہا ہے اس سے اس خیال کی چنداں تائید نہیں ہوتی، یا پھر مادی منافع کا جو سبز باغ ان کو دکھایا گیا تھا، ان منافع کی امید پر بطرز بیوپار یا تجارتی کاروبار کے ان مصارف کا بار انہوں نے اٹھایا تھا،

بہر حال کتابی شہادتوں کی حد تک تو بس ان ہی دو باتوں کا پتہ چلتا ہے، اور دلیل و شہادت کے بغیر کسی تیسرے احتمال کے اظہار کی جرأت کیسے کی جائے۔

دوسرے میلہ کی روداد سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے، کہ "یہ میلہ" حکومت کے امتزاج اور رضامندی سے منعقد کیا گیا تھا، اسی روداد میں جس کا نام "مباحثہ شاہ جہاں پور" ہے، سیدنا الامام الکبیر کے ایک تلمیذ سعید مولانا فخر الحسن گنگوہی کے قلم کی مرتب کی ہوئی یہ روداد ہے، اسی میں لکھا ہے کہ منشی پیارے لال صاحب نے

"مسٹر رابرٹ جارج گری صاحب بہادر کلکٹر و مجسٹریٹ شاہ جہان پور سے اجازت حاصل کر کے پارسال (یعنی ۱۸۷۶ء) ۷ رمئی کو جس شباب کی گرمی میں یہ میلہ منعقد کیا الخ"

صرف اجازت ہی نہیں بلکہ نظم و ضبط کی تمام ضرورتوں کے لئے پولیس کے سوا اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ کرسیوں مونڈھوں وغیرہ کا انتظام بھی غالباً حکومت ہی کی طرف سے کیا گیا تھا[1]

الغرض شاہ جہان پور کے مشن اسکول کے انگریز ہیڈ ماسٹر جناب پادری نولس صاحب کی ابتداءً اور مسٹر رابرٹ جارج گری کلکٹر شاہ جہاں پور کی اجازت و رضامندی اور ان کی اخلاقی وقت و مالی امداد سے یہ میلہ دریائے گمتی کے کنارے سانگیوگاؤں میں منعقد ہوا، ان ہی دو ابتدائی اور انتہائی قوتوں کے درمیان چاندا پور کے رئیس اور دولت مند منشی پیارے لال صاحب تھے، جن کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ پادری نولس کی دوستی کی بدولت حکومت میں عزت و توقیر حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

قابل توجہ اور مستحق فکر و نظر یہ مسئلہ بھی ہے، جیسا کہ مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی نے کچھ اشارہ بھی کیا ہے کہ پہلی دفعہ میلہ کے انعقاد کی تاریخ ۷ رمئی مقرر کی گئی، جب بقول ان ہی کے ہندوستان میں گرمی کے شباب کا زمانہ ہوتا ہے، گرمی بھی صوبہ یو۔پی کے بالائی اضلاع یعنی روہیل کھنڈ کی

---

[1] میلہ خداشناسی نامی والی روداد میں لکھا ہے کہ تقریباً ڈھائی سو کرسیاں وغیرہ اس خیمہ میں (جس میں مباحثہ ہوتا تھا) ملاکر بچھائی گئیں ص ۲۳ جس زمانہ کی یہ بات ہے اور اہتمام تمدن اس ملک کے باشندوں کا جو تھا اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ شہر سے دور ایک صحرائی مقام میں حکومت کی امداد کے بغیر ڈھائی سو کرسیاں کسی اجلاس میں مہیا ہو سکتی تھیں ۱۲

موسم بھی گرم اور مسلمانوں کی آبادی کے لحاظ سے نسبتاً خون کی گرمی، اس گئے گذرے زمانے میں بھی ناقابل توجہ نہیں ٹھہرائی جا سکتی۔ امیر الامرا نجیب الدولہ اور حافظ الملک رحمت خاں، اور محمد علی خاں روہیلہ کے سرحدی پٹھانوں کی نو آبادی جو ان ہی کے قومی نام کی طرف منسوب ہو کر روہیل کھنڈ کہلانے لگی تھی، گذرے ہوئے دنوں کی گرمی کے سوا چند سال بھی تو نہیں گذرے تھے کہ ۱۸۵۷ء میں سب سے زیادہ ابال کا تجربہ اسی علاقہ کے مسلمانوں کے بچھے ہوئے خون میں حکومت کو ہو چکا تھا۔

قدرتاً یہ سوال دلوں میں اگر پیدا ہو، کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مناظرہ اور مباحثہ تو خیر کوئی نئی بات نہ تھی، ہندوستان کے مختلف مقامات میں اس میلہ سے پہلے ان دونوں مذہبی جماعتوں میں کافی مقابلے ہو چکے تھے۔ شاید کوئی شہر بلکہ قصبہ اس زمانہ میں ایسا ہوگا، جس میں پادریوں سے پنجہ آزمائی کے لئے مسلمانوں میں بھی کچھ افراد نہ پائے جاتے ہوں، عرض ہی کر چکا ہوں کہ اپنی ترازو کے وزنی پلڑے کو دکھا کر کنجڑے تک پادریوں کے اعتراض کے جواب پر اس زمانہ میں اتر چکی تھیں، مولوی نعمان بن لقمان وہی جو اپنے آپ کو "وکیل سرکار ابد قرار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کے نام سے مشہور کئے ہوئے تھے ان کا شعر

معاذ اللہ فرزند خدا کہتے ہو عیسیٰ کو
تو دادا کون ہے ان کا بتائے جس کا جی چاہے

پادریوں کا مذاق اڑانے کے لئے زبان زد عام[3] ہو چکا تھا۔ اس نوعیت کے بیسیوں لطیفے نقل کئے

---

[1] صرف یہی نہیں بلکہ اسی رسالہ واقعہ میلہ خدا شناسی میں یہ لکھتے ہوئے کہ "گرمی کا موسم تھا گرمی ہی کا وقت تھا" یہ اطلاع دی ہے کہ "مکان جلسہ ایک صحرا اور شہر سے دور سایہ کے لئے خیمہ یا درخت آم جس کا سایہ آدھا، آدھی دھوپ، غرض نہ تپش سے بچنے کا کوئی عمدہ سامان نہ لو سے بچنے کے لئے کوئی مکان۔ ص ۲۳

[2] بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا محمد علی مونگیری قدس اللہ سرہ العزیز سے خاکسار نے سنا تھا کہ کلکتہ میں بھی ایک دفعہ پادریوں اور مسلمانوں کے مولویوں سے مقابلہ کی ٹھہری، طے ہوا کہ بند کمرے یا ایسے مکان میں جلسہ ہو۔ جہاں عوام کی رسائی نہ ہو، طرفین کے لوگ جمع تھے، باہر ایک دربان مقرر کر دیا گیا تھا، کہ آنے والوں سے نام پتہ پوچھ کر پہلے اندر کے لوگوں کو اطلاع دے، تب جلسہ میں شرکت کی اجازت دی جاتی تھی، بجز مشہور پادریوں اور مولویوں کے اس اجلاس میں دوسرے شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ اتنے میں عربی لغت کی مشہور کتاب منتہی الارب کے مصنف (باقی اگلے صفحہ پر)

جاتے ہیں۔ گویا لوگ مولویوں اور پادریوں کی چھیڑ چھاڑ کے عادی ہو چکے تھے۔ اب اس میں کوئی ندرت وجدت باقی نہ رہی تھی، برعکس اس کے منشی پیارے لال کا یہ میلہ جو اپنے موضوع بحث کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ تھا۔ "مذاہب وادیان کی تحقیق" کے لئے بھی یہ میلہ جایا جا سکتا تھا، بجائے خود یہ ایک اچھوتا خیال اور نیا اقدام تھا، اور اس سے بھی زیادہ اہم خصوصیت اس میلہ کی یہ تھی کہ دو فریق مسلمانوں کے مولوی، اور عیسائیوں کے پادری ہی میں صرف مقابلہ نہ تھا، بلکہ بقول مصنف رسالہ "واقعہ میلہ خدا شناسی" کہ اس مذہبی میلہ یا مناظرہ کی مجلس میں

"مناظرہ کرنے والے تین فریق قرار پائے تھے، مسلمان۔ عیسائی۔ ہندو" ص

جہاں تک میں جانتا ہوں ہندوستان کو وطن بنانے کے بعد مسلمان اس ملک میں جس زمانہ میں آباد ہوئے تھے، صدیوں پر صدیاں گذر چکی تھیں، لیکن تاریخ کے اس طویل عہد میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں مذہب اور دین کے موضوع پر اس قسم کے مناظرے اور مباحثے کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اسی زمانہ میں نہیں جب اس ملک کی حکمرانی کا اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا، بلکہ محکوم بن جانے کے بعد اور جو صورتیں بھی ان کے ساتھ پیش آئی ہوں لیکن فریق بن کر مسلمانوں کے دین پر اعتراض اور تنقید کرنے اور ان کے مولویوں سے مناظرہ و مباحثہ کرنے کے لئے ہندو کسی مجلس میں اب تک کھڑے نہیں ہوئے تھے۔ مراد آبادی پنڈت اندرمن کے قصے بھی صرف رسالوں اور کتابوں کی حد تک محدود تھے، اور پچھلے دنوں سے پنڈت دیانند سرسوتی جی نے اپنی تنقیدی یا تحقیری زور آزمائیوں کے سلسلہ میں مسلمانوں اور ان کے دین کو بھی جو گھسیٹ لیا تھا، تو تنہا "پیش قاضی روی راضی آئی" ہی کی حد تک ان کے تقریری و تحریری ہنگامے محدود تھے، باقاعدہ مناظرہ کی کسی مجلس میں پنڈت جی کا مسلمانوں اور ان کے علماء سے مقابلہ کی نوبت میرا علم یہی ہے کہ ابھی تک

گذشتہ صفحہ سے) مولوی عبدالرحیم صفی پوری جو اپنی ظرافت اور بذلہ سنجی و خوش مزاجی میں بدنام بھی تھے، یہ بھی پہنچے، دربان نے نام اور پوچھا، کہدیا کہ "مسیح کا دادا" یہ سن کر چونکا اور دربانوں سے کہہ دیا، دربان تو آگے روانہ ہوا، اور مولوی عبدالرحیم اس کے پیچھے پیچھے بغیر اجازت در آتے چلے گئے، دربان نے جلسہ میں کہا کہ ایک شخص جو اپنے آپ کو مسیح کا دادا کہتا ہے آنے کی اجازت چاہتا ہے، پادریوں میں غل مچا۔ مولوی عبدالرحیم ساتھ ہی لگے آ رہے تھے، نہایت اطمینان سے کہنے لگے، جب مسیح کا باپ ہو سکتا ہے تو دادا میں کیا خرابی ہے، زور کا قہقہہ لگا ۱۲

نہیں آئی تھی، اور تاریخ میں شاید یہ پہلا موقعہ تھا کہ ہندو کو بھی مسلمانوں کے مقابلہ میں دریائے گرّا کے ساحل پر منعقد ہونے والے اس صحرائی میلہ میں کھڑا کیا گیا تھا۔

ایسی صورت میں یہ وسوسہ دلوں میں اگر پیدا ہو کہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں اس میلہ کے لئے جس میں پہلی بار مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندو ایک دینی فریق بن کر شریک ہوئے تھے روہیلکھنڈ ہی کا انتخاب کیوں کیا گیا، اور فرض بھی کیا جائے کہ منشی پیارے لال جیسے فیاض، مہمان نواز، سیر چشم رئیس بجز چاندا پور کے اور دوسری جگہ نہیں مل سکتے تھے۔ لیکن مناظرے کے لئے بجائے صحرائی علاقہ کے منشی جی کے وطن چاندا پور کا مستقر ضلع شاہجہان پور میں کیا ایسا میدان یا ایسی جگہ نہیں مل سکتی تھی جہاں اس میلہ کو منعقد کیا جائے۔ شہر ہونے کی وجہ سے جو آسانیاں شریک ہونے والوں کو میسّر آسکتی تھیں۔ یقیناً سانگیور جیسے کوردہ گاؤں میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چاندا پور سے شاہجہان پور کا فاصلہ بھی زیادہ نہ تھا۔ گویا شہر کی نواحی آبادی ہم اس کو کہہ سکتے ہیں۔ منشی جی اپنے قصبہ سے شہر میں ضرورت کی چیزیں بآسانی مہیا کر سکتے تھے۔ جیسے سانگیور تک آخر ان ہی کو چیزیں پہنچانی پڑیں۔ معرضنا بے چارے مسلمان لڑنے مرنے کے مسئلہ میں یوں ہی بدنام ہیں، اور جیسا کہ اسی رسالہ "واقعہ میلہ خداشناسی" کے مصنف نے ایک موقعہ پر لکھا بھی ہے کہ پادریوں میں مشہور بھی تھا کہ

"مسلمانوں کو جواب نہیں آتا لڑنے کو دوڑتے ہیں" ص ۱۹

مسلمانوں پر اس الزام کی شہرت پادریوں ہی کے حلقہ تک محدود نہ تھی، بلکہ خود پنڈت دیانند جی بھی مسلمانوں کی طرف اسی قسم کی زیادتیوں کو منسوب کیا کرتے تھے۔ رڑکی میں پنڈت جی اور حضرت سید ناالامام الکبیر کے درمیان جو واقعات پیش آئے ہیں جن کی تفصیل اپنے موقعہ پر آگے آ رہی ہے، اس موقعہ پر بھی پنڈت جی نے رڑکی چھاؤنی کے مجسٹریٹ کے سامنے کہا تھا کہ مسلمانوں سے مجھے

"فساد کا خوف ہے"[1]

---

[1] حضرت مولانا تھانوی رحمہ کے حوالے سے "رڑکی کی سرگزشت" قصص الاکابر میں درج کی گئی ہے۔ یہ فقرہ پنڈت جی کی طرف اسی میں منسوب کیا گیا ہے۔ ۱۲

رسالہ ترکی بہ ترکی" میں بھی پنڈت جی کے متعلق لکھا ہے کہ

"فساد کا کھٹکا زبان پر آتا تھا" صفحہ ۲۱

بہرحال لڑنے کو دوڑنے 'یا فساد برپا کرنے کے یہ الزامات جو مسلمانوں پر لگائے جاتے تھے بجائے خود ان کی نوعیت کچھ ہی ہو' لیکن پادریوں 'اور پنڈتوں دونوں کے دلوں میں کچھ بھی خطرہ اگر اس کا تھا' تو حیرت ہوتی ہے کہ اس خطرہ کے باوجود بقول اسی رسالہ ترکی بہ ترکی کے مصنف کے

"فساد ہوتا تو چاندا پور میں ہوتا' جہاں کی بات کی حکام کو خبر بھی ہوتی تو بدیر ہوتی" صفحہ ۲۱

لیکن اب اسے کیا کہئے کہ وہی خطرات جنھیں پادری بھی اپنے دلوں میں پاتے تھے 'اور پنڈتوں کے پنڈت سوامی دیانندجی مہاراج کا بھی وہی قلبی تاثر تھا۔ ان خطرات کے باوجود "چاندا پور" جیسی جگہ کا انتخاب اس "مذہبی مقابلہ" کے لئے کیا گیا۔ اور جیسا کہ عرض کرچکا ہوں۔ میلہ کے لئے خدا ہی جانتا ہے کس مصلحت یا مجبوری کے زیر اثر گرم ترین موسم مئی کے مہینے کو ترجیح دی گئی' اور تاریخ بھی ۸ر مئی مقرر کی گئی' حساب سے معلوم ہوتا ہے 'چاندنی راتیں گذر چکی تھیں۔ اسی لئے قدرتاً رات میں بھی جلسہ کی گنجائش نہ تھی۔ "واقعہ میلہ خدا شناسی" میں خاص طور پر اسی بے ضابطگی کا اظہار ان الفاظ میں کیا بھی ہے

"گرمی کا موسم تھا' گرمی ہی کا وقت تھا' (یعنی جلسہ کا وقت دن کے اس حصہ میں مقرر کیا گیا تھا جس میں گرمی شدت پذیر ہو جاتی ہے)"

آگے ہے کہ

"مکان جلسہ ایک صحرا' شہر سے دور' سایہ کے لئے خیمہ یا درخت آم جس کا سایہ آدھا سایہ آدھی دھوپ"

اور طرفہ تماشا یہ تھا کہ ممکنہ حد تک گرمی کی تکلیفوں سے بچنے کی ممکنہ تدبیریں جو کی جاسکتی تھیں' ان کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں کی گئی تھی' جیسا کہ اسی میں یہ اطلاع بھی دی گئی ہے کہ

"نہ تپش سے بچنے کا کوئی عمدہ سامان' نہ لو سے بچنے کے لئے کوئی مکان"

لوگوں کی تکلیف جب حد سے گذر گئی تو فوری طور پر یہ کیا گیا تھا جیسا کہ اسی رسالہ میں ہے کہ

"قنات خیمہ کو جس کو بمنزلہ دیوار خیمہ کہیئے"

ان ہی قناتوں کے پردوں کو

"اٹھا کر پتلی پتلی چوبوں پر استادہ کیا، جس سے سایہ میں وسعت ہو گئی اور بہت سے شائق اس میں آ کھڑے ہوئے"

لیکن باوجود اس کے قنات کے پردوں کا یہ سایہ بھی کافی نہ ہوا، اسی رسالہ میں ہے کہ

"بہت کثرت سے آدمی تھے شوق گفتگو میں نہ لو کا خیال تھا، اور نہ دھوپ کا۔ جہاں جہاں تک آواز کے پہنچنے کا احتمال تھا آدمی ہی آدمی تھے"

بہرحال اسباب خواہ کچھ ہی ہوں، سوچ کر یہ سب کچھ کیا گیا تھا، یا بے سوچے کچھ اس قسم کے اتفاقات پیش آ گئے، لیکن اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ باوجود اس ہجوم کے جس کا ذکر صاحب رسالہ نے کیا ہے ان ہی کو یہ خبر بھی دینی پڑی کہ

"اگر یہ خرابیاں (زمانی و مکانی) نہ ہوتیں تو خدا جانے کس قدر انبوہ ہوتا" ص۲۳

میرے پاس کوئی تحریری وثیقہ تو نہیں ہے، لیکن ہندوستان کے عام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہی خیال گذرتا ہے، اور صاحب رسالہ کی اطلاع کا یہ حصہ یعنی "آدمی ہی آدمی تھے" غالباً اس میں زیادہ اکثریت ان ہی لوگوں کی ہو گی جو چاندا پور قصبہ اور اس کے اردگرد کے گاؤں اور کھیڑوں کے رہنے والے تھے، کیونکہ اس سخت موسم میں دور دور سے لوگوں کا پہنچنا آسان نہ تھا، خود شہر شاہجہان پور بھی جب پانچ چھ کوس کے فاصلے پر تھا تو سواری پر آنے والوں کے سوا تپش اور لو کے موسم میں پیادہ پا آنے والوں کے پہنچنے کی مشکل ہی سے توقع کی جا سکتی ہے۔ صاحب رسالہ نے سچ لکھا ہے، کہ "یہ خرابیاں نہ ہوتیں تو خدا جانے کس قدر انبوہ ہوتا" جلسہ تھا ہی اس رنگ کا کہ لوگ دور دور سے آتے خود یہی میلہ دوسری دفعہ اسی مقام پر صرف تاریخ کی تبدیلی سے جب منعقد ہوا، یعنی بجائے مئی کے مارچ کی ۱۹ اور ۲۰ تاریخ رکھی گئی تو اس دوسرے سال والے میلہ کی روداد میں اس کا تذکرہ بھی کیا

گیا ہے کہ

"علاوہ ساکنان شاہ جہاں پور، نواح شاہ جہاں پور، تلہر، میرٹھ، دلی، خورجہ، سنبھل، مراد آباد، رامپور، بریلی و دیوبند تک سے بعض بعض شائقین تشریف لائے تھے۔" ص۵

مباحثہ شاہ جہاں پور

اس کا بھی پتہ اسی روداد سے چلتا ہے، کہ سال گذشتہ کی طرح منشی پیارے لال صاحب ان نوآمدے مہمانوں کی مہمانی برداشت نہ کر سکے بلکہ لکھا ہے کہ

"موتی میاں نے مہمان نوازی کو کام فرمایا، خاطر تواضع سے سب کو مکلف کھانا کھلایا۔" ص۵

اسی سے معلوم ہوتا ہے، کہ روہیل کھنڈ کے مختلف مرکزی مقامات سے دوسرے سال جو لوگ آئے تھے، وہ عموماً مسلمان تھے، اسی لئے بے چارے موتی میاں کی موروثی سیرچشمی اور دریادلی کام آئی۔[1]

---

[1] موتی میاں کا ذکر خداشناسی کے ان دونوں میلوں کی روداد میں کیا گیا ہے۔ میلہ خداشناسی والی روداد میں لکھا ہے کہ ان کا اصلی نام محمد طاہر تھا، عرف میں موتی میاں کے نام سے مشہور تھے۔ اسی میں یہ بھی ہے کہ "موتی میاں رئیس شاہ جہاں پور جو مولوی مدن صاحب کی اولاد میں سے ہیں... اور یہ کہ بالفعل عہدہ آنریری مجسٹریٹی پر ممتاز ہیں، میلہ میں مذہبی مباحثہ جو ہونے والا تھا، ہندوؤں کی طرف سے تو منشی پیارے لال بانی میلہ ہی ذمہ دار تھے، اور عیسائیوں کی نمائندگی پادری نولس صاحب منشی جی کے دوست سے ہوئی تھی۔ شاید حکومت نے اسی لئے ایک مسلمان یعنی موتی میاں کو جلسے کے نظم کا ذمہ دار بنایا تھا، لکھا ہے کہ "سرکار کی طرف سے موتی میاں اہتمام مقرر ہوئے تھے" پہلے سال کے میلہ کے بھی، اور دوسرے سال کے بھی۔ باقی میں نے موتی میاں کی روایاتی سیرچشمی کی طرف جو اشارہ کیا، اس کا تعلق ان کے جداعلیٰ مولوی مدن صاحب سے ہے۔ غالباً یہی مولوی مدن صاحب ہیں، جن کا ذکر داڑھی والے شعر یعنی ؎ بڑھائی شیخ نے داڑھی ہے گرچہ سن کی سی + مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ کیا گیا ہے۔ مغل حکومت کی مرکزیت ٹوٹ کر طوائف الملوکی کے دور سے ہندوستان جب گذر رہا تھا، اس زمانہ کی چند اہم شخصیتوں میں ایک یہ مولوی مدن صاحب بھی تھے، عمادالسعادات نامی کتاب میں ہے کہ مولوی مدن کا شاہ جہاں پور کے قریب قصبہ شاہ آباد میں مقام تھا، مشہور تھا کہ حضرت غوث پاک شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں تھے۔ ایک زمانہ تک لکھنؤ کے نواب وزیر صفدر جنگ کے مشیر اور محرم اسرار رہے۔ صفدر جنگ کے مرنے کے بعد ناظم بنگالہ مہابت جنگ کے پاس مرشد آباد چلے گئے۔ وہاں بھی بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ رہے۔ [illegible] (باقی اگلے صفحہ پر)

بہرحال دوسرے سال والے میلہ کے متعلق تو نہیں لیکن شروع شروع میں ہوا میلہ جن خاص خصوصیتوں سے چل رہا تھا قرینہ کا اقتضاء یہی ہے کہ چاند اپور اور اس کے اردگرد کے دیہاتیوں کے سوا باہر سے آنے والوں کی تعداد زیادہ نہ تھی، اور گو چاند اپور اور اس کے اطراف و نواح کی آبادیوں کے متعلق کوئی صحیح ذاتی علم مجھے نہیں ہے۔ لیکن یو۔ پی کے عام حالات کے لحاظ سے خیال یہی گذرتا ہے کہ پہلے سال کے میلے میں مسلمانوں سے زیادہ، بہت زیادہ تعداد جیسا ہے تو یہی کہ دیہاتی ہندوؤں کی ہی ہو۔ میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ دریائے گنگا کے ساحل پر یہ صورت حال جو پیش آگئی تھی کسی سوچے ہوئے باضابطہ پروگرام کا نتیجہ تھی۔ لیکن اب اتفاق کیلئے یا باہمی اتفاق[1] سے جو تدبیریں اختیار کی گئی تھیں، ان کا

(گذشتہ صفحہ سے) معاملات میں مہابت جنگ ان ہی سے رائے لیا کرتا تھا۔ بنگال کی حکومت جب ختم ہو گئی تو پھر لکھنؤ کے نوجوان حکمران شجاع الدولہ سے تعلق قائم ہوا۔ شاہ آباد ضلع شاہجہان پور چونکہ لکھنؤ سے کافی فاصلہ پر تھا۔ اسی لئے لکھنؤ کے پاس ایک آبادی خالص پور میں مولوی مدن سے مکان تعمیر کرالیا۔ جہاں کہیں رہے جود و کرم کی بارش برساتے رہے۔ خالص پور کے قیام کے زمانے میں صاحب عماد السعادات کا بیان ہے کہ ہر سال در انجا عرس حضرت غوث الثقلین می کرد" اس عرس میں کیا ہوتا تھا۔ اسی مورخ کے الفاظ میں اس کا جواب سنئے، لکھا ہے

"جوق جوق علماء و طلبہ علوم و فوج فوج مشائخ و اولاد شیوخ از اطراف و اکناف ..... دراں عرس جمع می شدند"

لیکن اطراف و اکناف کا مطلب آپ نے سمجھا؟ وہی اس کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ

"مثل عظیم آباد، سہسرام، جونپور، الٰہ آباد، اودھ و شاہ آباد و شاہجہان پور و کوڑہ جہان آباد و کالپی و اٹاوہ و خیرآباد و سندیلہ و کاکوری و لکھنؤ و سلون و بریلی و ڈلمؤ"

لطیفہ یہ تھا کہ لکھنؤ کے شمال و جنوب مشرق و مغرب سے یہ آنے والے جو آتے تھے تو بہلی کا کرایہ آمد و رفت دونوں کا شاہ صاحب کی سرکار کی طرف سے ادا کیا جاتا تھا۔ آخر میں لکھا ہے کہ "تا سہ روز عجیب انبوہے و طرفہ تماشا می بود کہ یدلی داشت چند نفر قوال ترازو در دست گرفتہ می نشستند از صبح تا شام جنس را وزن کردہ بمردم می دادند، بعضے رذیل الطبعان دوبارہ و بعضے سہ بارہ دیگر رہ می گرفتند بقالان دم نمی زدند زیرا کہ مبیع از سرکار شاہ صاحب می یافتند"

بہرحال لکھا ہے کہ تخمیناً سی ہزار آدم فراہم می آمدند" گویا تین دن تک ۳۰ ہزار آدمیوں کو راشن شاہ صاحب کی سرکار سے تقسیم ہو جاتا تھا۔ کیا کیا چیزیں ملتی تھیں ان کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے جو مصنف نے بیان کیا ہے کہ جوگیوں، بیراگیوں کو علاوہ جنس و خوراک کے نقد بھی گانجہ بھانگ چرس پینے کے لئے دیا جاتا تھا۔ صفحہ ۱۱ عماد السعادات

[1] یہ لفظ میرا نہیں ہے، بلکہ دوسرے سال کے میلے میں جن لیسے خاص حالات جب پیش آئے (باقی اگلے صفحہ پر)

یہ منطقی اور لازمی نتیجہ تھا۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ پرلطف اظرو قہ یا اعجوبہ یہ ہے کہ یہ عجیب و غریب میلہ جو اپنے نام اور عنوان ہی کے لحاظ سے شہرت پذیری کی کافی ضمانت اپنے اندر رکھتا تھا۔ پھر باضابطہ اشتہاروں اور اخباروں سے عام اعلان اس میلہ کے انعقاد کا سارے ہندوستان میں نہ سہی، لیکن یوپی میں کیا جا چکا تھا۔ لیکن رسالہ "واقعہ میلہ خدا شناسی" میں یہ عجیب و غریب اطلاع درج کی گئی ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر تک جب یہ خبر پہنچی کہ شاہ جہاں پور کے پاس "مذہبی میلہ" قائم ہونے والا ہے، جس میں مختلف ادیان کے نمائندوں میں بحث و مباحثہ بھی ہوگا تو آپ نے اپنے دوست اور عزیز مولوی محمد منیر صاحب کو جو اس زمانہ میں بریلی رہتے تھے۔ یہ ارقام فرمایا کہ

"کیفیت مناظرہ اور محل نزاع سے اطلاع دیجئے"

اور مولوی منیر صاحب نے غایت احتیاط سے کام لیتے ہوئے براہ راست شاہ جہاں پور کی پولیس کے انسپکٹر جن کا نام مولوی عبد الحئی تھا، ان ہی سے واقعہ کی پوری تفصیل دریافت کی تو انسپکٹر صاحب جزئیات کی تفصیل ترک فرماتے بجائے اس کے جواب میں لکھا تو یہ لکھا کہ

"یہ قصہ بے اصل ہے، اظہار کے آنے کی کچھ حاجت نہیں" صلا

مولوی عبد الحئی صاحب شاہ جہاں پور کے انسپکٹر پولیس کی شخصیت سے میں واقف نہیں ہوں مگر حیرت ہوتی ہے کہ آخر یہ جواب ان کی طرف سے مولوی منیر صاحب کو جو دیا گیا۔ آخر اس کا منشا کیا تھا۔ بظاہر نام سے تو مسلمان آدمی معلوم ہوتے ہیں، اور جب تک کسی شخص کا حال معلوم نہ ہو حسن ظن ہی سے کام لینا ایمان اور اسلام بلکہ شاید شرافت کا بھی اقتضا ہے۔ مگر کیا کیجئے، یاد ہوگا کہ اس زمانہ کی

(گذشتہ صفحہ سے) جن سے پتہ چلا کہ بظاہر گو عیسائیوں مسلمانوں ہندوؤں تین مذہبی فرقوں میں مقابلہ ہے، لیکن درحقیقت عیسائی اور ہندو اندرونی طور پر ملے ہوئے ہیں، آگے اس کی تفصیل بھی کی جائیگی۔ "مباحثہ شاہ جہانپور" میں لکھا ہے کہ منشی پیارے لال سے موتی میاں نے "ترش رو ہو کر فرمایا کہ میں آخر سال شریک جلسہ نہ ہوں گا" پھر سلسل کارروائیوں کے رنگ و روغ کو دیکھتے دیکھتے جس نتیجہ تک موتی میاں پہنچے تھے غصہ میں اسے چھپا نہ سکے اور بولے "یہ بات بالکل سازش اور اتفاق باہمی پر دلالت کرتی ہے" مٹ

پولیس ہی کے ایک افسر تو وہ صاحب بھی تھے، جن کا نام بھی مسلمانوں ہی کے ناموں کی طرح "مخدوم بخش" تھا، اور قصبہ دیوبند میں حکومت کی طرف سے کوتوال شہر تھے۔ پنچایت کے ذریعہ دیوبند والوں کو مقدمات کے باہمی تصفیہ پر سیدنا الامام الکبیر نے جس زمانہ میں آمادہ فرمایا تھا، تو باوجود "مخدوم بخش" ہونے کے حضرت والا کو مخاطب کر کے ان ہی کوتوال صاحب نے کہا تھا کہ

"میں ابھی سرکار میں رپورٹ کرتا ہوں، کہ مولویوں نے سرکار کے خلاف میں محمدی جھنڈا کھڑا کیا ہے۔" (سوانح مخطوطہ ص)

کچھ بھی ہو، ایک ایسا معاملہ جس کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ شاہ جہاں پور کے انگریز کلکٹر مسٹر رابرٹ جارج کری صاحب کی باضابطہ منظوری نہیں حاصل تھی، بلکہ قرائن کا اقتضاء ہے کہ اس مذہبی میلہ کو سرکار کے اشارہ یا سرپرستی کا شرف اگر حاصل نہ تھا تو حکومت کی عملی ہمدردیاں اس کے انعقاد میں معلوم ہوتا ہے کسی نہ کسی حد تک ضرور شریک تھیں۔ بلکہ "واقعہ میلہ خداشناسی" والے رسالہ میں خلقت کے ہجوم کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک موقعہ پر جو یہ لکھا ہے کہ

"یا میاں پولیس اگر نہ روکتے تو (عوام الناس) سب اندر (خیمہ مباحثہ ہی) میں پہنچتے" ص

اس سے جیسا کہ ظاہر ہے یہی ثابت ہوتا ہے، کہ نظم و انتظام کے لئے جیسے شاہ جہاں پور کے مقامی رئیس اور آنریری مجسٹریٹ موتی میاں کو حکومت نے ذمہ دار بنایا تھا، اسی طرح شاہ جہاں پور کی پولیس بھی ذمہ دار ٹھہرائی گئی تھی، کہ میلہ میں کسی قسم کی بے ترتیبی اور گڑبڑ نہ پیدا ہو، اب آپ ہی بتائیے کہ اسی پولیس کے ایک ممتاز افسر انسپکٹر صاحب کو بھی اس کی خبر نہ تھی کہ اس میلہ میں کیا ہونے والا ہے اور کس مقصد سے یہ میلہ یہاں قائم کیا جا رہا ہے، کسی طرح یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔؟

بہر حال حقیقت تو یہ ہے، کہ جب میں یہ سوچتا ہوں کہ انسپکٹر صاحب کی یہ اطلاع خدانخواستہ اگر کارگر ہو جاتی، اور ہو جاتی کیا معنی، وہ تو کارگر گویا ایک حیثیت سے ہو ہی چکی تھی۔ اسی رسالہ کی تمہید میں ہے، کہ جب میلہ کے انعقاد کی خبر مشتہر ہوئی، تو شاہ جہاں پور کے مسلمانوں نے حالات کی نزاکت کا اندازہ کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر کو واقعہ کی نوعیت سے مطلع کرتے ہوئے، قدم رنجہ فرمانے کی زحمت

دی تھی۔ دوسرے ذرائع سے بھی حضرت والا تک مسلسل خبریں پہنچ رہی تھیں جب شاہ جہاں پور کے مسلمانوں کا دعوت نامہ پہنچا، تو نانوتہ جہاں اس زمانہ میں مقیم تھے۔ پیادہ پا وہاں سے روانہ ہوئے، ایک شب کے لئے دیوبند میں قیام فرمایا۔ یوں ہی ایک ایک رات راستہ میں مظفر نگر، اور میرٹھ میں گذارتے ہوئے دہلی پہنچے، دلّی میں شاہ جہاں پور کے انسپکٹر مولوی عبدالحی صاحب کا یہ پیام آپ تک پہنچا کہ

"علماء کے آنے کی کچھ حاجت نہیں"

جیسا کہ چاہئے تھا، وہی اثر اس پیغام کا آپ پر پہلی مرتبہ ہوا کہ شاہ جہاں پور جانے کا جیسا کہ لکھا ہے

"ارادہ سست ہو گیا"

مگر ایک طرف انسپکٹر صاحب کا یہ پیام تھا، اور دوسری طرف عام پھیلی ہوئی میلہ کی مشتہرہ خبر یعنی شاہ جہاں پور کے مسلمانوں کا دعوت نامہ، اسی دعوت نامہ کی بنیاد پر آپ کا چل پڑنا کہیں ذکر کر چکا ہوں کہ ٹھیک اسی سال یعنی ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں بنارس سے ستیارتھ پرکاش پنڈت دیانند کا شاہکار پریس سے باہر آیا تھا، جس میں دنیا کے سارے مذاہب وادیان کو جیسا کہ آپ سن چکے وہ کچھ سنایا گیا تھا، جسے دنیا کے کانوں نے کبھی نہیں سنا تھا۔

ادھر یہ کتاب پریس سے باہر آتی ہے، اور اسی سال شاہ جہاں پور کے ایک ایسے میلہ کے انعقاد کی خبر پھیلتی ہے، جس میں مذاہب وادیان کے نمائندوں کے درمیان اعلان کیا گیا تھا کہ مباحثہ اور مناظرہ ہوگا، اعلان ایک ہندو رئیس کی طرف سے تھا، اور اطلاع دی گئی تھی کہ پہلی دفعہ ہندو مذہب کے نمائندے بھی اس اکھاڑے میں اتریں گے یا اتارے جائیں گے۔

نانوتہ تو خیر ذرا ایک مضافاتی آبادی تھی لیکن میرٹھ مظفر نگر دہلی وغیرہ جیسے شہروں میں جو چہ میگوئیاں اس سلسلہ میں ہو رہی ہوں گی، ہم ان کا شاید آج صحیح اندازہ بھی نہیں کر سکتے، خصوصاً میرٹھ تو ایک حیثیت سے سوامی دیانند کا گویا گڑھ ہی تھا۔ میرٹھ ہی سے، پنڈت جی کے قائم کئے ہوئے نئے "سماج" یعنی آریہ سماج کا آرگن "آریہ سماچار" نامی اخبار نکلتا تھا، کچھ ان ہی باتوں کا اثر غالباً یہ ہوا کہ گو شاہ جہاں پور کے

سفر کا ارادہ سست پڑ چکا تھا، لیکن جیسا کہ اسی رسالہ میں ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے دہلی سے

بہ نظر احتیاط ایک خط شاہ جہاں پور کو لکھا کہ آپ بلاتے ہیں، اور مولوی منیر صاحب (جن کے

ذریعہ انسپکٹر صاحب کا پیغام پہنچا تھا وہی) یوں لکھتے ہیں (یعنی علماء کے آنے کی کچھ حاجت

نہیں) اس لئے تردد ہے " صـ۳

جن صاحب کے نام حضرت والا کا گرامی نامہ تھا، ان کو خاص طور پر تاکید کی گئی تھی کہ اس مذہبی میلہ

کی واقعی نوعیت کیا ہے۔

" مفصل لکھئے "

میلہ ۷ مئی کو منعقد ہونے والا تھا، اور یہ خط دہلی سے شاہ جہاں پور اتنے تنگ وقت میں پہنچا کہ انعقاد

میلہ کی تاریخ سے کل تین دن پہلے یعنی ۴ مئی کو اسی دن

" ۴ مئی کو (شاہ جہاں پور سے) اول تو ایک تار برقی آیا "

یہ وہ زمانہ تھا کہ تار کے پڑھنے والے دلی جیسے شہر میں بھی بآسانی ہر جگہ نہیں میسر آتے تھے، ۴ مئی کا دن

بھی گذر گیا، اور پتہ نہ چلا کہ تار کا مضمون کیا ہے، بہ مشکل تلاش کرنے کے بعد انگریزی جاننے والے

کوئی صاحب ملے تب

" قریب شام یہ معلوم ہوا کہ " ضرور ہی آؤ " "

یہی اس تار برقی کا مضمون ہے۔ شام کو یہ خبر ملی، اور دوسرے دن یعنی ۵ مئی کو تار کے سوا ایک خط بھی

شاہ جہاں پور کا ملا جس میں لکھا تھا کہ

مولوی عبد الحی (انسپکٹر پولیس شاہ جہاں پور) کو غلطی ہوئی، آپ آئیں، اور مولوی سید

ابو المنصور صاحب کو ساتھ لائیں " صـ۳

یہ سید ابو المنصور صاحب وہی امام فن مناظرہ کے لقب والے صاحب ہیں۔ پادریوں سے مقابلہ اور مناظرہ

میں جنہوں نے اس زمانہ میں خاص شہرت حاصل کی تھی، ان کو خاص طور پر اپنی رفاقت میں لانے کی

وجہ شاہ جہاں پور کے اس خط میں یہ بتائی گئی تھی کہ

"پادری نول (نولس) صاحب کہ جو بڑے لستان اور مقرر ہیں' یہ دعوے ہے کہ بمقابلہ دین عیسوی دین محمدی کی کچھ حقیقت نہیں" صلا

اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی طلبی میں پادریوں کا مقابلہ شاید خود شاہ جہاں پور والوں کے پیش نظر بھی نہ تھا' اور بظاہر اس لئے آپ کو بلانے کی چنداں کوئی خاص وجہ ہو بھی نہیں سکتی تھی' کیونکہ اولاً مناظرہ کہئے یا مکابرہ کے جو اکھاڑے اس زمانہ میں پادریوں کی بدولت قائم ہو گئے تھے' بجز ایک دفعہ کے جس کا ذکر کر چکا ہوں' یعنی تارا چند نامی پادری سے دلی میں اور وہ بھی باخفا رنام آپ کی گفتگو ہوئی تھی۔ آپ نے کبھی اس قسم کی دور از کار اور لا حاصل قصوں میں کبھی دلچسپی ہی نہیں لی تھی اور دلی والا مباحثہ اولاً ایک مقامی معاملہ تھا۔ ثانیاً اخفا رنام کی وجہ سے آپ کی طرف اس کے منسوب ہونے کی بھی کوئی وجہ نہ تھی۔

تاہم انسپکٹر صاحب شاہ جہاں پور کی مخالفت کے باوجود خود شاہ جہاں پور کے مسلمانوں کا آپ کی تشریف آوری پر اصرار اور کیسا اصرار؟ کہ خط ہی نہیں' بلکہ جس زمانہ میں تار پڑھنے والے دلی جیسے شہر میں بھی بآسانی نہیں مل سکتے تھے' اس زمانہ میں تار کے ذریعہ سے آپ کی طلبی جو اس زمانہ کے لحاظ سے غیر معمولی اہمیت کی حامل تھی بجائے خود خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔

مگر کوئی تحریری وثیقہ' یا ایسا بیان اب تک مجھے نہیں مل سکا' جس کی روشنی میں اس سوال کا صحیح جواب دوں۔

یہ صحیح ہے کہ جن خصوصیتوں کے ساتھ یہ میلہ چاندا پور میں منعقد ہو رہا تھا' وہ دینی اور مذہبی نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ دوسرے پہلوؤں کے لحاظ سے بھی خاص اہمیت رکھتا تھا۔ مذہب اور دھرم کا معاملہ اس ملک کے باشندوں کی سب سے زیادہ دکھتی رگ ہے' ابھی چند سال ہی تو گذرے تھے کہ ۵۷ء میں حکومت کو اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ حقیقی اسباب و محرکات کچھ ہی ہوں' لیکن پھٹا تھا تو زخم صرف "چربی لگے ہوئے کارتوس" ہی کے قصے سے' مذہبی زخم ہی سے چوٹ لگائی گئی تھی' جس سے سارا ملک گونج اٹھا اور فتنہ و فساد کی آگ بالآخر اسی "گونج" نے اختیار کی۔ ذرا سوچنے کی بات ہے کہ

چند سال پہلے جس ملک میں یہ تماشا دیکھا جاچکا تھا' اسی ملک کے ایک ایسے علاقہ میں جیسا کہ روہیلکھنڈ ہے' اور اس کے بھی کسی شہر میں نہیں' بلکہ ایک صحرائی مقام میں جمع کیا جاتا ہے۔ باشندگان ملک کے مختلف مذاہب وادیان کے نمائندوں کو' جن میں پادری عیسائیوں کے نمائندوں کے متعلق تو خیر کہا جاسکتا ہے کہ لوگ گونہ عادی ہو چکے تھے' بقول سرسید مرحوم

"پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل مقدس ہی کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے تھے' بلکہ غیر مذاہب کے مقدس لوگوں کو' اور مقدس مقاموں کو بہت بُرائی سے اور ہتک سے یاد کرتے تھے' جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور دلی تکلیف پہنچتی تھی"۔ ص۴۲ اسباب بغاوت ہند ضمیمہ حیات جاوید)

یہ تو خیر روزمرہ کا مشغلہ ہی بن چکا تھا۔ بار بار ایک ہی چیز سے انسان کب تک بھڑکتا رہے۔ لوگوں میں گویا پادریوں کے طرز عمل کی طرف سے گونہ جمود کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی لیکن سوال اس نئے فریق کا تھا' جو پہلی دفعہ اس دنگل میں اترا' یا اتارا گیا تھا۔ میری مراد ہندوؤں سے ہے۔

انصاف کی بات یہی ہے کہ مسلمانوں کے عہد حکمرانی میں ہندوؤں کا اسلامی دین اور اس دین کے پیشواؤں کے ساتھ جو سلوک بھی ہو' اس عہد کے متعلق تو بہت کچھ کہنے کی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے' لیکن جہاں تک میری معلومات ہیں۔ مسلمانوں کی حکومت کے ختم ہونے کے بعد بھی کم از کم ہندو مذہب کے فضلاء اور مذہبی زندگی بسر کرنے والے اس باب میں عموماً احتیاط ہی سے کام لینے کے عادی تھے "تحفۃ الہند" نامی کتاب جو ۱۸۵۱ء میں لکھی گئی ہے' یعنی ہنگامۂ غدر سے چھ سال پہلے اس کتاب میں بھی مصنف کتاب کے نومسلم مصنف مولوی عبیداللہ صاحب نے اس زمانہ کے بعض واقعات کا ذکر کیا ہے' جن کا تجربہ اظہار اسلام سے پہلے ان کو ہوا' جن سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے' منجملہ دوسرے قصوں کے ایک قصہ جوان ہی کے ساتھ پیش آیا' خلاصہ جس کا یہ ہے کہ اظہار اسلام سے پہلے بھی مذہبی امور کے متعلق اپنے بھائی برادری کے لوگوں سے گفتگو کرنے کے مواقع پیش آتے رہتے تھے' ایک دفعہ ایک ایسے ودوان جید پنڈت سے جو ہندو مذہب کے چھ شاستروں کا عالم تھا' اس سے بھی ان کی گفتگو

ہوئی لکھا ہے کہ

"اس پنڈت کو میرا (در پردہ) مسلمان ہونا معلوم نہ تھا، بلکہ یہ جانتا تھا کہ یوں ہی مناظرہ کرتا ہے" ص۶۳

اسی لئے منھ دیکھی بات کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی، سلسلۂ گفتگو میں اسی پنڈت سے ایک دفعہ مولوی عبیداللہ نومسلم کا یہ مکالمہ ہوا۔

مولوی عبیداللہ نومسلم ۔ پنڈت جی آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر مسلمان اپنے دین وطریق پر قائم رہیں، تو ان کی مکت (نجات) ہوگی یا نہیں؟

شاستری پنڈت ۔ ہاں کیوں نہیں ہوگی۔

مولوی عبیداللہ نومسلم ۔ مسلمانوں کا دین حق ہے یا نہیں؟

شاستری پنڈت ۔ ہاں! ان کے لئے حق ہے۔

مولوی عبیداللہ نومسلم ۔ ان کے (یعنی مسلمانوں کے) دین کی اصل قرآن شریف ہے، سو قرآن شریف سچی کتاب ہے یا نہیں؟

شاستری پنڈت ۔ کیوں نہیں سچی ہی کتاب ہے۔

مولوی عبیداللہ نے لکھا ہے کہ اس آخری سوال کو ذرا زیادہ زور دے کر میں نے پھر ان سے پوچھا کہ واقعی تم قرآن کو سچی کتاب مانتے ہو، ان کا بیان ہے کہ پنڈت جی نے جواب میں دہراکر پھر یہی کہا کہ

"ہاں قرآن سچا ہے" ص۶۴

ہے تو یہ ایک انفرادی بات، لیکن جس خاص طریقہ سے خاص موقعہ پر یہ گفتگو ہوئی ہے، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ پنڈت جی جو کچھ اس وقت کہہ رہے تھے، یہی ان کا بھی مذہبی عقیدہ تھا اور خواہ واقعہ کے لحاظ سے یہ خیال غلط ہو، یا صحیح[1] لیکن کہا جا سکتا ہے کہ

---

[1] مطلب یہ ہے کہ قرآن کو سچی کتاب مان لینے کے بعد پھر پنڈت جی کا یہ خیال کہ اسلامی رہنمائی ان کے لئے یعنی صرف مسلمانوں کے لئے حق ہے، اسی لئے مسلمانوں کی نجات کے لئے تو یہ دین کافی ہے لیکن (باقی اگلے صفحہ پر)

ہندوؤں کے اعلیٰ طبقات برہمنوں اور پنڈتوں کا احساس اسلام کے متعلق کچھ اسی نوعیت کا تھا۔

سب سے پہلے دیانند کے زمانہ میں ہندو قوم کی اس موروثی روایت کے برخلاف اسلام اور اسلام کی کتاب، اسلام کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں نئی جرأت اور جسارت اس قوم میں پیدا کی گئی تھی نئی بات تھی، نیا جوش تھا۔ یہ میلہ چاندا پور میں ٹھیک اسی زمانہ میں قائم کیا جا رہا تھا۔ اسی سال پنڈت جی کی کتاب ستیارتھ پرکاش پریس سے باہر آئی تھی۔ مذہبی مباحثہ کے سلسلے میں ہندوؤں کے نئے عنصر کا جو اضافہ اس میلہ میں ہوا تھا، اور جن حالات میں ہوا تھا، اور جن خطرات کا اندیشہ ایسی صورت میں کیا جا سکتا ہے، کیا حکومت جس کی طرف سے باضابطہ اس میلہ کے انعقاد کی اجازت دی گئی تھی، اس اندیشہ کی رعایت اس کے فرائض میں داخل نہ تھی۔ ؟

حیرت تو اس پر ہوتی ہے، کہ یہی پادری دوسروں کو جوش میں آ آ کر جیسے سناتے تھے، اسی طرح دوسروں سے بھی سب کچھ سننے کے عادی ہو چکے تھے، آخر ستیارتھ پرکاش میں عیسائی مذہب اور اس مذہب کے پیشواؤں کو جو کچھ کہا جا چکا تھا، جب حکومت کے ساتھ پادریوں کا طبقہ بھی اس کو سن کر خاموش تھا، ستیارتھ

(گزشتہ صفحہ سے) مسلمانوں کے سوا دوسرے ادیان و مذاہب کی طرف جو لوگ منسوب ہیں۔ ان کی نجات کیلئے اسلامی دین کا قبول کرنا ضروری نہیں بلکہ اسلام قبول کئے بغیر بھی ان کی مکتی (نجات) ہو جائے گی، حق پوچھئے تو پنڈت جی کے اس دعوے کی تردید ہے، یعنی قرآن بھی کتاب ہے۔ ان کا یہ دعویٰ غلط ہو جاتا ہے۔ مولوی عبیداللہ صاحب مرحوم نے بھی لکھا ہے کہ پنڈت جی کو میں نے مطلع کیا کہ جناب والا جس کتاب (قرآن) کو آپ بھی کتاب مان رہے ہیں، اسی میں لکھا ہے کہ اسلام کے سوا جس دین کی بھی کوئی پیروی کرے گا، اس سے اس کا دین قبول نہ کیا جائے گا یعنی ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ کا جو مطلب ہے۔ بہرحال اسلام کو دین العرب اور پیغمبر اسلام کو رسول العرب یا رسول الامیین قرار دینے والے درحقیقت نہ اسلام ہی کو حق مانتے ہیں، اور نہ اسلام کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتے ہیں۔ ایک عجیب انکشاف تحفۃ الہند ہی کے مصنف کے بیان سے یہ ہوتا ہے کہ برہمنوں نے عام ہندوؤں کو یہ باور کرا دیا تھا کہ گیتا میں یہ لکھا ہوا ہے کہ اپنا دین اگرچہ رائی کے معنی یعنی خردل کے دانہ کے برابر ہو اور دوسروں پر بت سمان یعنی پہاڑ کے برابر ہو جب بھی اپنا دین نہ چھوڑنا چاہئے ص۱۳۲ واللہ اعلم گیتا میں یہ بات پائی بھی جاتی ہے یا نہیں۔ لیکن اس سے اس کا تو پتہ چلا کر مذہب کے متعلق کتنے غلط نقطۂ نظر کو ہندوؤں میں پھیلا دیا گیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ مذہب نہ کسی خاص قوم کی وراثت ہے اور نہ کسی مخصوص امت کی ذاتی جائداد۔ بلکہ پیدا کرنے والے خالق نے اپنے بندوں کو ان کی زندگی کے جس قدرتی آئین اور دستور العمل سے آگاہ کیا ہے، انسانیت اپنے صحیح انجام تک جس کی پابندی کئے بغیر نہیں پہنچ سکتی (باقی اگلے صفحہ پر)

پرکاش ۱۸۸۴ء میں چھپ کر پبلک کے سامنے آئی تھی۔ مولوی ابوالوفا ثناء اللہ جنہوں نے آریوں کے ساتھ مناظرانہ کشمکش میں کافی حصہ لیا تھا، وہی اپنی کتاب "حق پرکاش" میں جو ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی تھی، اسی یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ

"ہندوؤں نے اپنے مضمون کے متعلق (یعنی ستیارتھ پرکاش کے جس حصہ میں ہندوؤں کے مختلف فرقوں پر اعتراضات کئے گئے تھے، ان کی طرف سے) اس کتاب (ستیارتھ پرکاش) کے متعدد جوابات دیئے ہیں چنانچہ بعض کے نام یہ ہیں۔ دیانند تمر بھاسکر، دیانند بھاگر دیانند بھاؤ پرکاش"

آخر میں لکھتے ہیں کہ

"عیسائیوں کا جواب کوئی سننے میں نہیں آیا"

مولوی صاحب کو عیسائیوں کی اس عجیب و غریب خاموشی پر حیرت ہوئی ہے، اپنے اسی استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے، لکھا ہے کہ

"مشنریو! کہاں ہو" (حق پرکاش صلے)

کم ازکم اس سے اس کا تو پتہ چلا کہ تینتیس[۳۳] سال تک کوئی جواب عیسائیوں کی طرف سے دیانند جی کی کتاب کے اس حصہ کا نہیں دیا گیا تھا، جس میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ عیسائیوں، اور ان کے دین کی متعلق کیا کچھ نہیں کہا گیا تھا۔

مگر یہی بے حس پادری جن کے کان پر ستیارتھ پرکاش کے فقروں سے بھی جوں نہیں رینگی، وہی نام نہاد خدا شناسی کے اس میلہ میں اتنے ذکی الحس بن کر شریک ہوئے تھے کہ ایک موقعہ پر بائبل کی تحریف کا قصہ چھڑا۔ خود پادری نولس نے یہ تسلیم کرلیا کہ "انجیل میں یہ فقرہ باہر سے بڑھا دیا گیا ہے"[۱] ان کے اس

(گذشتہ صفحہ سے) اسی کا نام مذہب اور دین ہے اصولاً اول سے آخر تک ہر قوم اور ہر امت میں اسی دین کو خدا کے فرستادہ حضرات انبیاء و رسل علیہم السلام پہنچاتے رہے ہیں۔ اسی کی آخری مکمل ترین شکل کا نام الاسلام ہے جو پیغمبروں کے خاتم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے تاریخ کے آخری دور میں دنیا کو دیا گیا ہے ۱۲

[۱] تفصیل کے لئے تو "میلہ خدا شناسی چاندپور" کی روداد ہی کو پڑھنا چاہئے، خلاصہ یہ ہے کہ انجیل کے اس (باقی اگلے صفحہ پر)

اعتراف پر سیدنا الامام الکبیر نے ان ہی سے صرف اتنی بات پوچھی کہ

"ایک پیالے پانی میں ایک قطرہ پیشاب کا گر جائے تو وہ قطرہ سارے پانی کو ناپاک بنا دیتا ہے"

بے ساختہ زبان مبارک سے یہ تشبیہی فقرہ کیا نکلا کہ پادریوں کے حلقہ میں غل مچ گیا کہ

"انجیل خدا کا کلام ہے، اس قابل نہیں کہ اس میں ناپاکی ملائی جائے"

حالانکہ سیدنا الامام الکبیر فرماتے رہے کہ باہر سے ملائے جانے والے جزو کو میں نے پیشاب کی تشبیہ دی ہے۔ انجیل کو تو پاک پانی ہی ٹھہرا رہا ہوں، لیکن پادریوں نے شور اور ہنگامہ کر کے اتنا دباؤ ڈالا کہ اس تشبیہ کو واپس لیتے ہوئے حضرت والا نے فرمایا کہ

"یہ مثال نہ سنئے، دوسری مثال سنئے" ص۳۱ مباحثہ شاہجہاں پور

الغرض ہندو بھی اب وہ ہندو نہ تھے، جو سوامی دیانند سے پہلے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خاص میلہ کی حد تک پادری بھی اپنی مصنوعی بردباری و حلم کے جذبات کے برخلاف دوسرے رنگ میں آکر شریک ہوئے تھے۔

رہا تیسرا فریق مسلمانوں کا، سوا ان کی آتش مزاجیوں اور دینی معاملات میں ان کی اشتعال پذیریوں کے پھیلائے ہوئے عام چرچوں کے سوا، جب ہندو مذہب ہی نہیں، بلکہ اس مذہب کی کتابیں عموماً جس زبان میں ہیں یعنی سنسکرت زبان تک کے متعلق یہ یاد کرایا جا رہا ہو کہ

"عام طور پر مسلمان اس کو (سنسکرت زبان کو) بت پرستوں کی زبان سمجھتے رہے، اسی لئے ان کے نزدیک وہ (سنسکرت زبان) قابل نفرت ہی رہی"[1] (دلسنٹ اسمتھ صاحب کی تاریخ قدیم ہند اردو ترجمہ ص۱۱)

(گذشتہ صفحہ سے) اور ترجمہ کر جو پہلی دفعہ مرزاپور میں مشنری والوں نے چھاپا تھا، اسی کو لیکر سیدنا الامام الکبیر کے اشارے سے امام فن مناظرہ مولوی ابو المنصور صاحب کھڑے ہوئے اور یوحنا کی انجیل باب ۵ درس ۷ میں جو یہ فقرہ پایا جاتا ہے کہ "تین ہیں جو آسمان پر گواہی دیتے ہیں باپ، کلام اور روح القدس اور تینوں ایک ہیں" اسی پر حاشیہ خود مرزاپور کی مشنری والوں کی طرف سے لکھا گیا تھا کہ یہ الفاظ کسی قدیم نسخہ میں نہیں پائے جاتے، گویا پادریوں کی یہ اعترافی شہادت تھی۔ خود پادری نولس نے بھی تصدیق کی کہ واقعی یہ الحاقی فقرہ ہے۔ دیکھو ص۱۲

[1] اس میں شک نہیں کہ یورپ کی جدید علمی تحقیقات میں مختلف قدیم زبانوں اور ان کے حروف کے (باقی اگلے صفحہ پر)

بجائے خود یہ یا اسی نوعیت کے پھیلائے ہوئے دوسرے الزامات یا اتہامات کی واقعی حقیقت جو کچھ بھی ہو لیکن جس زمانہ میں یہی سمجھا بھی جاتا تھا، اور یہی سمجھایا بھی جاتا تھا، اسی زمانہ میں مسلمانوں کو ہندوؤں کے مقابلہ میں دیانندی جسارتوں کی بہت افزائیوں کے بعد لاکر کھڑا کر دینے کا منطقی انجام خود ہی سوچنا چاہیئے کہ کیا ہو سکتا تھا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ کھڑے کرنے والوں نے چاندا پور کے اس میلہ میں جن مختلف ادیان و مذاہب کے نمائندوں کو لاکر جمع کیا تھا، پہلے سے کچھ اسی قسم کے انجام کا تصور کر کے خدا شناسی کے نام نہاد نام سے اس میلہ کے جانے کا نظم چاندا پور میں کیا تھا۔ پہلے بھی شاید کہہ چکا ہوں کہ اس کی کوئی واضح شہادت ہمارے پاس نہیں ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ جب اس میلہ کی ان دونوں رودادوں کو پڑھتا ہوں جن میں دو سالوں کی کارروائیوں کو معتبر و مستند صاحبان ہوش و گوش نے مرتب کر کے شائع کر دیا تھا، اور جہاں تک میں جانتا ہوں، واقعات جن کا تذکرہ ان رودادوں میں کیا گیا ہے، ان پر نہ اسی زمانہ میں کسی نے کسی قسم کی تنقید کی تھی، اور نہ آج تک ان کے خلاف کوئی آواز کسی طرف سے بلند ہوئی ہے، ان واقعات کے جاننے کے بعد نیتوں کے متعلق میرا خیال تو یہی ہے کہ اپنے حسن ظن کو مشکل ہی سے محفوظ

(گذشتہ صفحہ سے) پڑھنے کا عام مذاق خصوصاً یورپ و امریکہ کے علمی حلقوں میں جو پایا جاتا ہے مسلمانوں کے زمانہ میں اس مذاق کی عمومیت کا پتہ نہیں چلتا۔ سنسکرت ہی کیا یونانی زبان اور اس زبان کے حروف کے جاننے والے اور پڑھنے والے مسلمانوں میں کم ہی پیدا ہوئے ہیں لیکن باوجود اس کے جیسے یہ مسلم ہے کہ یونانیوں کا سارا علمی سرمایہ جو یورپ والوں تک پہنچا، اس سرمایہ کی منتقلی میں واسطہ کا کام زیادہ تر مسلمانوں ہی نے انجام دیا ہے۔ اسی طرح سنسکرت زبان کے جاننے والے یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں میں معدودے چند افراد مثلاً البیرونی وغیرہ ملتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کے علوم و فنون طب و نجوم ہیئت فلسفہ اور اس ملک کی ادبی کتابوں کے ترجموں سے یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے کافی فائدہ اٹھایا ہے، تقریباً اسی قدر جتنا نفع یونانیوں کے علوم و فنون سے ان کو پہنچا ہے، ایسی صورت میں سنسکرت زبان کے جاننے والوں کی کمی کو نفرت کا نتیجہ قرار دینا بجز تہمت تراشی کے اور بھی کچھ ہے۔ نفرت ہوتی تو پھر ہندوستان کے علوم و فنون کو مسلمان ہاتھوں ہاتھ کیوں لیتے، بغداد کا دارالحکمت ان کی کتابوں سے کیوں بھر جاتا؟

بت پرستی کا لطیفہ احمد صاحب نے جو پیش کیا ہے، میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ یونان کی بت پرستی کیا ہندوستان کی بت پرستی سے کچھ کم تھی؟

رکھنے میں کوئی کامیاب ہو سکتا ہے۔ یہ دونوں روداد یں عام طور پر ملتی ہیں' ان کو پڑھئے۔

اس میں شک نہیں کہ میلہ میں شرکت کی دعوت "خدا شناسی" ہی کے نام پر دی گئی تھی' اشتہار جس میں میلہ کے قائم کرنے کی غرض و غایت بیان کی گئی تھی' پہلے بھی نقل کر چکا ہوں' اس کا مضمون یہ تھا'

"میلے کے نام سے آپ کو میلہ کی غرض و غایت معلوم ہو گئی ہو گی' مگر مزید وضاحت کے لئے عرض ہے' کہ اصلی غرض "تحقیق مذہبی" ہے' اور اشتہار کا منشا یہ ہے' کہ میلہ میں ہر مذہب کے آدمی آئیں' اور اپنے دلائل سنائیں' قواعد کی تفصیل آئندہ طے ہو گی!"

لیکن ہوا کیا؟ پہلا سال جس میں باوجود توقع کے پنڈت دیانند سرسوتی جی شریک نہ ہو سکے' حالانکہ اسی سال ان کی کتاب ستیارتھ پرکاش شائع ہوئی تھی جس میں ہندوستان کے سارے مذاہب پر اعتراض کیا گیا تھا' یوں بھی سارے ہندوستان میں ہلچل وہ اسی زمانہ میں مچائے ہوئے تھے' اور اپنے ساختہ پرداختہ مذہب جس کا نام انہوں نے ویدک دھرم رکھ دیا تھا' چیلنج کرتے پھرتے تھے' کہ سارے ادیان و مذاہب کے مقابلہ میں صرف یہی ایک سچا دھرم اور صادق دین ہے۔ لیکن اب اسے کیا کہئے' کہ نہ صرف پنڈت جی ہی اس میلہ میں غائب تھے بلکہ شاہ جہان پور کے قریب ہی اسی روہیل کھنڈ میں منشی اندرمن جو زبان سے تو نہیں' لیکن قلم سے ہنگامہ برپا کئے ہوئے تھے۔ ان کو بھی میلے کے اس پہلے سال میں ہم نہیں پاتے بلکہ بجائے ان دونوں کے ہندو مذہب کی نمائندگی یا وکالت کرنے کے لئے جو آئے تھے' وہ اسی قسم کے لوگ تھے' کہ نہ ان رودادوں ہی میں ان کے ناموں کا اس زمانہ میں تذکرہ کیا گیا ہے' اور نہ باوجود تلاش کے کسی دوسرے ذریعہ ہی سے اس وقت تک مجھے کچھ نشان پتہ ان بے چاروں کا چل سکا۔ کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کون لوگ تھے' اور ان کی علمی حیثیت کیا تھی؟ دو دن تک جلسہ ہوتا رہا' ان پورے دو دنوں میں ان کی طرف سے کوئی گویا اٹھا ہی نہیں' اسی سال کی روداد میں ہے کہ دوسرے دن آخری جلسہ میں پادری نولس صاحب نے کہا کہ "اب بھائی ہندو اپنا بیان کریں" یہ سن کر بے چارا ایک پنڈت اٹھا ہی تھا کہ اچانک بقول صاحب روداد کے

"ایک دیسی پادری جو بڑے پادری صاحب (نولس صاحب) کے قریب ہی بیٹھے تھے اور

ان کے اٹھنے بیٹھنے سے یہ نمایاں تھا کہ بعد پادری نول صاحب کے انہیں کا رتبہ ہے '
وہی پادری صاحب (یعنی پادری نولس صاحب) کی طرف جھک کر کان میں کچھ فرمانے لگے" ص۳۸
کان میں کیا کہا گیا، دوسروں کے لئے اس کے جاننے کی صورت ہی کیا تھی۔ البتہ یہ دیکھا گیا کہ بجائے پنڈت صاحب کو تقریر کے اس مقام سے جہاں وہ آکر کھڑے ہوئے تھے ہٹا دیا گیا، اور کان میں جھک کر بولنے والے پادری کو نولس صاحب نے پنڈت جی کی جگہ تقریر کرنے کا حکم دیا، وہ تقریر بھی کیا تھی، کچھ مجذوب کی سی بڑ تھی جس کا نہ سر تھا نہ پیر۔ وقت ٹالنے کے سوا بظاہر پادری صاحب کی اس تقریر کا شاید کوئی دوسرا منشا معلوم بھی نہیں ہوتا۔ لکھا ہے کہ اسی کے بعد دو بج گئے ' اور جب دوسرے دن کا آخری اجلاس ختم ہو رہا تھا جس کے بعد میلہ ہی اس سال کا ختم ہو جاتا۔ اسی تنگ وقت میں دیکھا گیا کہ وہی پنڈت جی جو بٹھا دیئے گئے تھے، وہ آئے اور بجائے تقریر کے جس کے لئے وہ کھڑے ہوئے تھے دیکھا گیا کہ ایک تحریر پڑھ رہے ہیں

"وہ تحریر ناگری میں لکھی ہوئی تھی" ص۳۹

ناگری تو حرف تھا، باقی زبان سو لکھا ہے کہ

"اکثر الفاظ زبان سنسکرت کے تھے"

جسے مسلمان کیا جس علاقہ میں تحریر سنائی جا رہی تھی، اس علاقہ کے ہندو بھی عموماً نہیں سمجھ سکتے تھے لکھا ہے کہ ان پنڈت جی کے بعد

"ایک فقیر سرونگ آئے، اور ایک تحریر طویل جو بخط ناگری لکھی ہوئی تھی، لائے اور پڑھنی شروع کی، اکثر الفاظ سنسکرت کے تھے، اور اسی زبان کے دوہرے اس میں مرقوم تھے" ص۴۰

گویا یہ دونوں تحریریں پڑھی تو ضرور گئیں لیکن جب کسی نے ان کا مطلب ہی نہ سمجھا تو بجز اس بات کے کہ ہندوؤں کے نمائندوں نے بھی مباحثہ میں حصہ لیا، خانہ پری کی حد تک اتنی بات تو صادق آگئی اور کوئی مآل یا مقصد ان تقریروں کا معلوم نہیں ہوتا۔

ہاں! ایک سال بعد جب یہی میلہ اسی میدان میں جما تو بالکل گزشتہ سال کے برعکس اس سال پنڈت دیانند سرسوتی جی بھی تشریف لاتے ہیں، اور پنڈت اندرمن کو بھی ہم مجلس میں جلوہ فرما دیکھتے ہیں۔ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ گزشتہ سال ان دونوں صاحبوں میں سے ایک بھی نہ آیا۔ اور اس سال آئے تو دونوں ہی آئے، اور کس شان کے ساتھ آئے!

"مباحثہ شاہجہانپور" نامی دوسرے سال کی روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہفتہ پہلے سے پنڈت جی چاندا پور پہنچے ہوئے تھے، مباحثہ کی مجلس میں منشی پیارے لال کی طرف سے بزبان اردو پانچ سوالات اس مطالبہ کے ساتھ جو رکھے گئے کہ پہلے ان سوالوں کا جواب دیا جائے، لکھا ہے کہ

"حسب بیان بعض معتبرین سوالات مذکورہ پنڈت دیانند کے تجویز کئے ہوئے تھے۔" ص۵

اسی کے بعد یہ بھی ہے کہ

"جو شخص خود سوالات کرے گا، اور وہ بھی اس طور پر کہ ایک ہفتہ پہلے اسی کام کے لئے آیا ہوا ہو۔" ص۵

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ میلہ کے بانی منشی پیارے لال رئیس چاندا پور کا تعلق جیسے شاہجہانپور مشنری اسکول کے ہیڈ ماسٹر پادری نولس صاحب سے تھا، اسی طرح پنڈت جی سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے، منشی جی بے تعلق نہ تھے۔ بلکہ اسی روداد سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ دوسرے سال کے اس میلے کے برخواست ہو جانے کے بعد مسلمانوں کے نمائندے علماء وغیرہ تو شاہجہانپور

"حسب خواہش مولوی محمد طاہر صاحب (یعنی مولوی مدن والے موتی میاں کے) مکان پر فروکش ہوئے۔" ص۸

اور انہیں کے مہمان بھی رہے، اپنی موروثی روایت کے مطابق موتی میاں نے ان کی خاطر مدارات میں خاندانی خصوصیات کا اظہار جس پیمانے پر کیا تھا، اس کا اندازہ صاحب روداد کے ان الفاظ سے ہوتا ہے کہ

"ان کی مہمان نوازی اور دلجوئی، اس وقت آنکھوں میں پھرتی ہے۔" ص۸

مگر اس کے برخلاف سارنگپور جہاں کے باغ میں میلا جاپا گیا تھا' بجائے شہر یعنی شاہ جہاں پور آنے کے لکھا ہے کہ

"پنڈت صاحب یعنی سوامی دیانند سرسوتی اور منشی اندرمن چاندا پور کو چلدئیے" مث

یہ بھی اسی میں ہے کہ موتی میاں نے بعض لوگوں کی تحریک سے جن میں سیدنا الامام الکبیر کا اشارہ بھی تحریک تھا۔ منشی اندرمن کے پاس شاہ جہاں پور سے اپنا خاص آدمی چاندا پور یہ دعوت نامہ دے کر روانہ کیا کہ

"آپ براہ کرم بہمراہی پنڈت دیانند صاحب تشریف لاکر قبول دعوت سے مرہون منت فرمائیں"

غرض بلانے کی یہ بھی تھی کہ بعض تشنہ مسائل پر پنڈت جی اور منشی اندرمن سے گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ دعوت نامہ میں اس کی اطلاع بھی دے دی گئی تھی' مگر جواب میں منشی اندرمن نے بجائے شاہ جہاں پور کے لکھا کہ اپنے مولویوں کو لے کر آپ ہی چاندا پور آ جئیے' جہاں منشی پیارے لال کے مہمان بن کر منشی جی بھی اور پنڈت جی بھی فروکش تھے۔

ان ساری باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی اور منشی اندرمن دونوں ایک طرح سے منشی پیارے لال کو اپنا سرپرست سمجھتے تھے[1]۔ ایسی صورت میں طرفین کے متعلق بے تکلفی کا خیال خود ہی سوچنا چاہئے کہ کس حد تک درست ہو سکتا ہے۔

مگر باوجود اس کے میلہ جو پہلی دفعہ دھوم دھام سے منایا جا رہا تھا' اسی میں دونوں کا نہ آنا' اعلان کی جگہ گمنام پنڈتوں کا پہنچنا' آخر اس کی توجیہ کیا کی جائے۔ پنڈت جی کے ساتھ جب ہم جانتے ہیں کہ کام کرنے والوں کی کافی تعداد تھی۔ ڈاکٹر مرڈک صاحب ایم۔ اے کی شہادت بھی گذر چکی جس میں بیان کیا گیا ہے کہ "سوامی جی تعریف کرنے والوں کی ایک جماعت اپنے ساتھ رکھتے تھے" بلکہ کتاب "جواب ترکی بہ ترکی"

[1] منشی اندرمن کے جوابی خط میں یہ بھی تھا کہ "میں آپ کے (یعنی مولوی طاہر عرف موتی میاں کے) مکان پر نہیں آتا' ہاں! منشی گنگا پرشاد رہتے جن کی تبدیلی عہدہ ڈپٹی کلکٹری پر بہ مقام شاہ جہاں پور ہو گئی ہے' تو ان کے مکان پر آ سکتا تھا" مث مباحثہ شاہ جہاں پور شاید ان منشی گنگا پرشاد سے بھی منشی جی کا وہی سرپرستی کا تعلق تھا جو منشی پیارے لال تعلقدار چاندا پور کے زیر سایہ ان کو حاصل تھی۔ ۱۲

سے تو معلوم ہوتا ہے کہ دوسروں کو آگے بڑھا کر کام نکالنا یہ بھی سوامی جی کے مختلف طریقوں میں ایک خاص طریقہ تھا، میرٹھ کے ایک آریہ منشی اندرلال تھے ۔ اس کتاب میں ان ہی کے سوالوں کا جواب دیا گیا ہے، مگر یہ کہتے ہوئے کہ

"کون نہیں جانتا کہ پنڈت جی (یعنی سوامی دیانند جی) منشی جی (اندرلال) کے سرپول پر ہیں" صلے

اس موقعہ پر یہ مشہور شعر

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

"جواب ترکی بترکی" کے مصنف نے استعمال کیا ہے ۔

کون کہہ سکتا ہے کہ پہلے میلے میں پنڈت جی اور منشی جی کی عدم شرکت کی تہ میں کچھ اسی قسم کی بات تھی ہو واقعی مذہب کی تحقیق میلے کی غرض تھی تو ہندوؤں کی طرف سے جن سربرآوردہ ذمہ دار لوگوں کی شرکت کی توقع کی جا سکتی تھی، وہ اس میلے سے غیر حاضر کیوں ہوئے، اور ان میں جو آئے بھی تو گو ابتدا میں ہندوؤں کی طرف سے منشی پیارے لال صاحب نے پہلی جو تقریر کی، وہ عام فہم تھی، لیکن اٹھنے کے بعد جن پنڈت صاحب کو بٹھا دیا گیا، اور پادری نولس کی سرگوشی دوسرے پادری سے جو گویا ان کے نائب تھے جب ہوئی تو اس کے بعد ہندوؤں کے نمائندوں نے اولاً تقریر ہی نہ کی، بلکہ ان کی طرف سے تحریر پڑھی گئی اور تحریر بھی اسی زبان میں جسے جلسہ کے عام شرکا بھی نہ سمجھتے تھے، اور نہ دوسرے مذاہب کے نمائندے اس زبان سے واقف تھے ۔ اسی طرح دوسرے سال پنڈت دیانند جی اور منشی اندرمن حسب توقع تشریف تو ضرور لائے ۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس سال کے میلے میں جیسا کہ "مباحثہ شاہجہاں پور" میں لکھا ہے

"ہنود میں سوائے پنڈت صاحب کے اور کوئی صاحب اول سے آخر تک کھڑے ہی نہیں ہوئے" صلا

اور ان کی تقریر کا رنگ جو تھا اس کا اندازہ اسی روداد کے ان الفاظ سے ہوتا ہے کہ

"ان کی زبان میں الفاظ سنسکرت بہت ملے ہوئے تھے بلکہ اکثر جملے کے جملے سوائے ہے

کا وغیرہ حروف ربط کے سنسکرت میں ہوتے تھے" صلا

جس کا نتیجہ جیسا کہ ہونا چاہئے تھا یہی ہوا کہ

"سوائے دو چار آدمیوں کے حاضران جلسہ میں سے ان کے مطلب کو کوئی نہ سمجھا ہوگا"

ان دو چار آدمیوں کا حال یہی تھا کہ سوط اللہ الجبار کے مصنف پھلواروی کے مولانا محمد علی صاحب

جن کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ ہندو ادبیات کا کافی مطالعہ کئے ہوئے ہیں۔ اسی لئے سیدنا الامام الکبیر

نے ان سے کہا

"یہ نیاز مند تو پنڈت جی کی تقریر کچھ سمجھا نہیں اس لئے اب آپ ہی کو تکلیف کرنی پڑے گی"

مگر مولانا محمد علی صاحب نے جواب میں کہا کہ

"میں بھی پورا پورا نہیں سمجھا"

دلچسپ لطیفہ اسی روداد میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ

"مولوی محمد قاسم صاحب نے عین اس وقت جس وقت پنڈت صاحب تقریر کر رہے تھے اپنی

کرسی سے اٹھ کر آہستہ سے منشی اندرمن صاحب سے یہ کہا کہ آپ اگر خود کچھ نہیں بیان فرماتے

تو یوں ہی کیجئے کہ آدھے وقت میں تو پنڈت صاحب جو کچھ ان کو بیان کرنا ہو کر لیا کریں اور

آدھے وقت میں آپ اس کا ترجمہ کر دیا کریں جو ہم بھی کچھ سمجھیں"

اردو اور فارسی زبان کے مصنف منشی اندرمن یہ تو نہیں کہہ سکتے تھے کہ جلسہ کے حاضرین جس زبان کو

سمجھتے ہیں ہم اس سے ناواقف ہیں۔ اس لئے انہوں نے مولانا کی پیش کش کے جواب میں فرمایا کہ

"سچ تو یہ ہے کہ مجھ کو کبھی لکچر دینے کا اتفاق نہیں ہوا جو لوگ یہ کام کرتے رہتے ہیں انہیں

سے ہو سکتا ہے اس لئے میں معذور ہوں" صلا

یوں منشی جی بھی کترا گئے، حاصل یہی ہوا کہ شریک ہوئے اور بظاہر کچھ گفتگو میں ہندوؤں نے حصہ

ضرور لیا، لیکن میلے کے ان دونوں سالوں میں نتیجہ کے لحاظ سے ہندوؤں کی حیثیت گویا صفر ہی بن کر رہ گئی تھی۔

اور یہ حال تو مباحثہ میں حصہ لینے والے فریقوں کا تھا کہ مسلّم ایک فریق کا وجود قریب کالعدم ہی کے رہا۔ اب سنئے انعقاد میلہ اور مباحثہ میں حصہ لینے والے حضرات جب "مجلس مباحثہ" میں جمع ہو گئے، تو پادری نولس صاحب کی طرف سے گفتگو کی شرطوں، اور قیدوں کا سوال اٹھایا گیا، اور سب سے پہلے اس سلسلہ میں وقت کے مسئلہ کو اہمیت دی گئی، اصولاً خود سیدنا الامام الکبیر بھی تحدید وقت کے قاعدے کے حامی تھے۔ حضرت نے پادری نولس سے کہا بھی تھا کہ تعین وقت کی وجہ یہ ہے کہ

"مبادا کوئی شخص مفت مغز زنی کرنے لگے، اگر وقت محدود نہ کیا جائے گا، تو ایسا شخص بے وجہ مغز کھائے گا، اور اس کے سوا (دوسروں کو) بولنے کی گنجائش نہ ملیگی" منشور مباحثہ

آپ ہی کی طرف سے یہ تجویز بھی پیش ہوئی تھی، کہ واقعی دین کی تحقیق مقصود ہے تو ایک صورت اوقات کی تعیین و تقسیم کی یہ ہو سکتی ہے کہ

"مباحثہ تین دن تک اس طور پر رہے کہ ایک روز ایک مذہب والا اپنے دین کے فضائل گھنٹہ دو گھنٹے بیان کرے، اور پھر اس پر دوسرے مذہب والے اعتراض کریں اور جواب سنیں" ۵۱

اور کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو یعنی مباحثہ کے تینوں فریق (ہندو مسلمان عیسائی) کے لئے ایک ایک دن نہیں دیا جا سکتا، تو آپ ہی نے دوسری متبادل تجویز پادری صاحب کے سامنے یہ رکھی، کہ

"درس (یعنی تقریر) کے لئے کم از کم ایک گھنٹہ، اور زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے دیئے جانا مقرر ہوں، اور سوال و جواب (تنقیدی اعتراضوں) کے لئے دس منٹ سے بیس منٹ تک" ۵۱ ص۵

لیکن ہوا یہی کہ پہلے سال کے میلے میں تو خیر

"مدت وعظ (درس) پندرہ منٹ اور سوال و جواب کی مدت ۱۰ منٹ قرار پائی۔"

لکھا ہے کہ

"اگرچہ اس امر میں مولوی محمد قاسم صاحب نے چاہا کہ مدت وعظ اور بڑھادی جائے، اور یہ بھی فرمایا کہ اتنے عرصہ میں حقیقت مذہب کما حقہ ثابت نہ ہوسکے گی مگر عیسائیوں نے نہ مانا۔" ص

تاہم ۱۵ منٹ کی مدت بھی غنیمت تھی۔ دوسرے سال کے میلے میں تو حد ہی کردی گئی، کہ

"پادری نولس صاحب نے کہا کہ ہر ایک شخص کے درس و سوال و جواب کے لئے ۵ منٹ کی مدت مقرر ہو۔"

گھنٹہ دو گھنٹے کی جگہ درس یعنی تقریر، اور سوال و جواب (تنقیدی اعتراضوں) دونوں کے لئے پندرہ منٹ اور دس منٹ بھی، بلکہ یہ حکم کہ سب کچھ تقریر بھی، اور سوال و جواب بھی، ان سارے قصوں کو ۵ منٹ میں ختم کردیا جائے، لکھا ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے لاکھ کہا گیا کہ

"۵ منٹ میں تو کچھ بھی بیان نہیں ہوسکتا۔"

سمجھایا جاتا تھا کہ

"دنیوی جھگڑے جو فروع سمجھے جاتے ہیں، ان میں بعضوں پنچایت و بحث ہوتی ہے، یہ تحقیق مذہب ۵ منٹ میں کیونکر ہوسکتی ہے۔" ص

مسلمانوں کے نمائندے یہی کہتے رہے کہ

"ہم لوگ بھی تو اس جلسے کے ایک رکن ہیں، ہماری رائے کی رعایت ضرور ہے۔" ص مباحثہ شاہ جہان پور

سیدنا الامام الکبیر بار بار فرماتے کہ

"پہلے سے کون اپنے مطالب کو ناپ تول کر لاتا ہے، جو وقت قلیل محدود الطرفین میں بیان کرے۔" ص۴۵

لکھا ہے کہ ایک دفعہ تو آپ نے یہ بھی فرمایا کہ

"جس مذہب میں ایک دو فضیلت ہو، تو وہ دو چار منٹ میں بیان کر سکتا ہے، پر جس کے مذہب میں ہزاروں فضائل ہوں، وہ اتنے تھوڑے عرصہ میں کس طرح بیان کر سکتا ہے" ص۲۹

طرفہ ماجرا یہ ہے کہ پہلے ہی میلہ میں خود پادری نولس صاحب جنہوں نے بضد ہو کر ۵ منٹ سے زیادہ درس یا تقریر کے لئے دینے سے انکار کیا تھا، وہی خود جب درس دینے کیلئے کھڑے ہوئے اور ۵ منٹ ختم ہو گئے، اپنے خیال میں پادری صاحب کو محسوس ہوا کہ ان کی تقریر پوری نہ ہو سکی تو لکھا ہے کہ

"مولوی محمد قاسم صاحب وغیرہ کی طرف مخاطب ہو کر کیا کہتے ہیں"

سنئے کیا کہتے ہیں؟

"اگر آپ صاحب مہربانی فرما کر کچھ اور مہلت دیں، تو ہم کچھ اور بیان کر لیں"

مولویوں کے عام طبقہ کی طرف سے پادری صاحب کی اس درخواست کے جواب میں جو کچھ کہا گیا تھا، اس کا ذکر تو میں کسی دوسرے موقعہ پر کروں گا، لیکن سیدنا الامام الکبیر نے آگے بڑھ کر اس وقت فرمایا تھا کہ

"پادری صاحب ہم آپ کی طرح نہیں کہ اجازت ہی نہ دیں، ہماری طرف سے اجازت ہے۔ آپ پندرہ منٹ کی جگہ بیس منٹ بیان کریں، پچیس منٹ بیان کریں، تیس منٹ بیان کریں، آپ حسب دل خواہ بیان کر لیں" ص۳۲ میلہ خدا شناسی

مگر اس تجربہ کے بعد بھی دوسرے میلہ میں جب وقت کا مسئلہ چھڑا تو انہیں پادری نولس صاحب نے ۱۵ منٹ کو گھٹا کر جیسا کہ عرض کر چکا ہوں پانچ منٹ کر دیا۔ اگرچہ اسی دوسرے میلے میں دوسرے دن ایک اور پادری صاحب کو نولس صاحب نے اپنی امداد کے لئے طلب کیا تھا، جن کا نام پادری اسکاٹ تھا، اور مشہور تھا کہ وہ منطق کی کسی کتاب کے مصنف ہیں، ایسی اچھی کتاب فن منطق میں لکھی ہے کہ حکومت کی طرف سے مشہور تھا کہ پانسو روپے انعام کے طور پر ان کو دئیے گئے ہیں، بہرحال کہنا یہ ہے کہ جب یہی پادری اسکاٹ آئے اور ان کو معلوم ہوا کہ تقریر و درس کے لئے کل ۵ منٹ کا وقت دیا گیا ہے تو انہوں نے

اس کی مخالفت کی اور کہا

"درس کے لئے ایک گھنٹہ سے کم نہ ہونا چاہئے، اس باب میں مسلمانوں کی رائے ٹھیک ہے۔"

اسکاٹ صاحب بار بار کہتے تھے کہ

"ایک گھنٹہ سے کم میں کوئی کیا بیان کرے گا۔" ص۴۶

خیر یہ قصے تو وقت کی تحدید و تعیین کے متعلق تھے، گویا میلہ خدا شناسی کے اشتہار میں جن شرائط کی تفصیل کا وعدہ کیا گیا تھا، ان میں ایک شرط کا انجام تو یہ ہوا۔ دوسری شرط جس کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ پہلے میلے میں اسے کوئی اہمیت نہیں دی گئی تھی، لیکن دوسرے میلے میں دیکھا جاتا ہے کہ تمام شرطوں میں اسی کو اہم ترین شرط قرار دیا جا رہا ہے یعنی یہ چاہا گیا کہ مباحثہ سے پہلے یہ طے کر لیا جائے کہ کس ترتیب سے بحث ہوگی، مباحثہ شاہجہاں پور سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر فرماتے رہے کہ واقعی مقصد اس میلہ کا اگر اثبات تحقیق مذہب ہے تو اس کی طبعی ترتیب یہ ہونی چاہئے کہ

"اوّل ذات باری میں گفتگو ہو کہ وہ ہے یا نہیں، اور ہے تو ایک ہے یا متعدد، پھر صفات باری میں گفتگو ہو کہ صفات مخصوصہ ذات خالق کیا کیا ہیں، اور کون کون سی صفات اس میں پائی جاتی ہیں کون سی نہیں پائی جاتیں، پھر تجلیات باری میں گفتگو ہو۔"

تجلیات باری کا کیا مطلب ہے، اس کی طرف اجمالی اشارہ کے بعد فرمایا گیا کہ

"نبوت میں گفتگو ہو کہ انبیاء علیہم السلام کی ضرورت ہے کہ نہیں، اور کون ہے کون نہیں، اس کے بعد احکام میں مباحثہ ہو کہ کون سا حکم اصول مذکورہ پر منطبق ہو سکتا ہے اور کون سا حکم منطبق نہیں ہو سکتا، اور کون سا قابل تسلیم ہے۔" ص۵۲

[1] بحث کی حد تک آپ نے آخر میں اس سوال کو بھی فہرست مباحثہ میں شریک کر دیا تھا، لیکن اسی کے ساتھ جو اصل حقیقت اس باب میں ہے اس کا بھی تذکرہ کر دیا گیا تھا۔ لکھا ہے کہ حضرت والا نے یہ بھی اسی کے ساتھ فرمایا تھا کہ اگرچہ بروئے انصاف "بعد ثبوت نبوت شخص معین و صحت روایت" یعنی ثابت ہو جائے فلاں شخص نبوت کے دعوے میں صادق ہے، اس کی طرف جو حکم اور جو بات بھی صحیح ذریعہ سے منسوب ہو، بہر حال فرمایا گیا تھا کہ ان دونوں باتوں سے مطمئن ہو جانے کے بعد عقل نارسا سے احکام کی بھلائی اور برائی کی تفتیش امر لاطائل بلکہ نازیبا ہے (باقی ص۳۹۵ پر)

مگر بجائے اس ترتیب کے آغاز جلسہ ہی میں جیسا کہ لکھا ہے کہ منشی پیارے لال بانی جلسہ نے ایک کاغذ اردو لکھا ہوا پیش کیا کہ یہ پانچ سوال ہماری طرف سے پیش ہوتے ہیں سیدنا الامام الکبیر کے پیش کردہ سوالات کے درج کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے ' ان سوالوں کو بھی ملاحظہ فرمالیا جائے

(۱) دنیا کو پرمیشور (خداوند تعالیٰ) نے کس چیز سے بنایا' اور کس وقت اور کس واسطے۔ (۲) پرمیشور کی ذات محیط کل ہے یا نہیں' (۳) پرمیشور عادل ہے' اور رحیم ہے' دونوں کس طرح۔ (۴) وید' بائیبل' اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی کیا دلیل ہے۔ (۵) نجات کیا چیز ہے' اور کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔

یہی وہ سوالات ہیں' جن کے متعلق عرض کر چکا ہوں' سمجھا جاتا تھا کہ پنڈت دیانند جی نے ایک ہفتہ پہلے منشی اندرمن کے ساتھ چاندا پور پہنچکر کافی غور و خوض کے بعد مرتب کر کے منشی پیارے لال کے حوالہ کیا تھا۔

حیرت ہوتی ہے' کہ دوسرے میلہ میں بھی کل دو دن ہی خداشناسی پر بحث کرنے کے لئے مقرر کئے گئے تھے' لیکن ان دو دنوں میں بھی اب اسے کیا کہئے' کہ تحدید وقت' اور سوالات کی ترتیب ہی کے قصوں میں جیسا کہ مباحثہ شاہجہانپور میں لکھا ہے کہ

"روز اول اصرار اور انکار ہی میں وقت جلسہ گذر گیا اور گفتگو نہ ہونے پائی" [۱] ص۲۵

خود سوچنا چاہئے کہ جہاں اتنی بے دردی کے ساتھ غیر ضروری' اور ذلیل رگڑوں جھگڑوں میں وقت کو

---

(گذشتہ صفحہ سے) پھر کی بات اسی کے بعد یہ فرمائی گئی کہ عقل سے یہ کام (یعنی احکام کی برائی بھلائی کا پتہ لگانا) ممکن ہو سکتا تھا تو انبیاء علیہم السلام کی ضرورت ہی کیا تھی' اور نبی کا کہنا جب واجب التعظیم ہوگا تو پھر جو کچھ وہ فرمائیں بسر و چشم۔ ص۲۵ مباحثہ شاہجہان پور

[۱] پنڈت جی کو شاید اپنے اسی سوال پر سب سے زیادہ ناز تھا' سیدنا الامام الکبیر کی تجلیات باری پر بحث کرنے سے غرض ان کے اسی سرمایہ ناز سوال کی بیخ کنی مقصود تھی۔ کائنات حق تعالیٰ کی تجلی گاہ ہے" اسی میں اس سوال کا جواب پوشیدہ ہے کہ خدا نے عالم کو کس چیز سے بنایا' تفصیل کے لئے حضرت والا کی کتابوں کو یا نہ ہو سکے تو فقیر کی مختصر کتاب "الدین القیم" کو دیکھ لیا جائے ۱۲

ضائع کیا جائے، وہاں آدمی اپنے اس ظن کو کہاں تک قائم رکھ سکتا ہے کہ "خدا شناسی" کے نام پر لوگوں کو جو جمع کیا گیا تھا۔ واقعی مقصد اس اجتماع کا "خدا شناسی" ہی کی صحیح راہ کا پتہ چلانا تھا، سیدنا الامام الکبیر تو کبھی کبھی ان ہی حالات کو دیکھ دیکھ کر فرمایا بھی کرتے تھے، کہ واقعی خدا شناسی اگر مطلب ہے تو اس کا طریقہ یہ نہیں ہوتا، مباحثہ شاہجہان پور میں حضرت والا کا یہ فقرہ نقل بھی کیا ہے، کہ ایک دفعہ منشی پیارے لال کو مخاطب کر کے آپ نے کہہ بھی دیا تھا کہ یہ جو کچھ کیا جا رہا ہے، صرف حیلہ اور بہانہ ہے، حضرت والا کے بجنسہ الفاظ یہ تھے کہ

"منشی صاحب آپ نے دیکھا پادری صاحب نے کیسے کیسے حیلے اور بہانے کئے"

سوالات کی ترتیب کے قصے میں بھی آپ نے اسی حیلہ اور بہانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

"اگر اثبات و تحقیق مذہب پر نظر ہے تو ترتیب عقل (ان سوالوں) کی یہ ہے، جو ہم نے کل عرض کی، اور اگر اثبات مذہب سے کچھ بحث نہیں تو منشی پیارے لال صاحب ہی کے فرمانے کا اتباع ٹھیک ہے"

کل دو دن ان میں بھی کامل ایک دن کو اس قسم کے لایعنی مشاغل میں صرف ہوتے ہوئے دیکھ کر سیدنا الامام الکبیر نے جب یہ تجویز پیش کی کہ ایک دن بڑھا کر تین دن کر دیجئے، اور اس پر جیسا کہ لکھا ہے،

"پادری نولس کا یہ کہنا کہ ہم کو زیادہ فرصت نہیں آج اور کل ہی ٹھہر سکتے ہیں"

سیدنا الامام الکبیر سے نہ رہا گیا، جھنجھلا کر آپ نے پادری نولس کو خطاب کر کے کہا تھا

"یہ بات (یعنی عدیم الفرصتی کا عذر) ہمارے کہنے کی تھی، باوجود افلاس و بے سرو سامانی قرض دام لے کر اپنی ضرورتوں پر خاک ڈال کر ایک مسافت دور دراز قطع کر کے یہاں پہنچے ہیں، اور اس پر یہ قول ہے کہ جب تک حسب دل خواہ فیصلہ نہ ہو جائے گا، نہ جائیں گے"

اپنے اس حال کو بیان کرنے کے بعد جس میں جہاں تک میرا خیال ہے، واقعہ ہی کا اظہار کیا گیا تھا جس کی تائید کتاب "جواب ترکی بہ ترکی" کی اس اطلاع سے بھی ہوتی ہے کہ چاندا پور ہی نہیں بلکہ اس کے بعد رڑکی میں پنڈت دیانند سرسوتی اور سیدنا الامام الکبیر کے درمیان جو معرکہ پیش آیا دونوں کی مرتبہ روداد بھی سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے چھپ کر شائع نہ ہو سکیں لکھا ہے کہ

"بوجہ تہی دستی یہ امید ہی نہیں کہ روداد مباحثہ کو چھاپیں، ورنہ چاندا پور اور رڑکی کا واقعہ ہی کیوں آج تک یوں پڑا رہتا" ص۳

ظاہر ہے کہ جس زمانہ میں چند ورقوں کے ان مختصر رسالوں کی چھپائی کا سرمایہ مہیا نہیں ہو سکتا تھا، اسی زمانہ میں کیوں تعجب کیجئے اگر نانوتہ سے چاندا پور تک پہنچنے کے لئے قرض دام سے کام لینا پڑا ہو۔

بہر حال اپنے اس حال کو پیش کر کے پادری صاحب سے فرمایا گیا تھا کہ اب آپ اپنے حال کو ملاحظہ فرمائیے کہ

"آپ صاحب تو اسی کام کے نوکر، آنے جانے میں کوئی دقت نہیں" ص۲ مباحثہ شاہجہانپور

لیکن با ایں ہمہ جیسا کہ آگے لکھا ہے

"پادری صاحبوں پر کچھ اثر نہ ہوا"

خیر اس حد تک تو جو کچھ کیا جا رہا تھا، اس سے صرف یہی سمجھ میں آتا ہے کہ "تلاش حق" اور "تحقیق مذہب" کے نصب العین کا اعلان کر کے لوگوں کو جو بلایا گیا تھا، ان نئے نئے شاخسانے نکال نکال کر حیلوں اور حوالوں سے اسی کو پس پشت ڈالنے کی کوشش ہو رہی تھی، لیکن قصہ اسی پر ختم نہیں ہو جاتا، عرض کر چکا ہوں کہ مباحثہ کے فریق بظاہر خدا شناسی کے اس میلے میں تین تھے ہندو مسلمان عیسائی لیکن ان دونوں میلوں میں سے پہلے میلے میں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، ہندوؤں کی طرف سے ابتداء میں منشی پیارے لال صاحب بانی میلہ نے اردو ہی میں تقریر شروع کی، لیکن پادری نولس اور ایک دوسرے پادری جن کا مرتبہ سمجھا جاتا تھا کہ ان کے بعد ہے، ان دونوں کی باہمی سرگوشی کے بعد بجائے تقریر کے ہندوؤں کی طرف سے پڑھنے والوں نے ایسی تحریریں پڑھیں جن کی زبان کے سمجھنے والے پورے

میلے میں تین چار آدمی سے زیادہ نہ تھے، یہ تو خیر بجائے خود تھا، دلچسپ لطیفہ یہ پیش آیا کہ پہلے میلہ میں دوسرے دن یہ سوال اٹھایا گیا کہ مباحثہ کے ہر فریق کی طرف سے گفتگو میں حصہ لینے والوں کی تعداد معین کردی جائے۔ بات معقول تھی تسلیم کرلی گئی، طے ہوگیا کہ ہر فریق کی طرف سے پانچ پانچ آدمی اس کام کے لئے چُن لئے جائیں، مسلمانوں نے تو پانچ آدمی اپنے چن لئے، مگر ہندوؤں کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہوا،

"ہمارا ہر فرقہ جدا ہے، ہر ایک فرقہ میں سے پانچ پانچ آدمی چاہئیں"

مطلب جس کا یہی ہوا کہ دو فرقے بھی اگر ہندوؤں کی طرف سے جلسہ میں شریک تھے، تو ان کی تعداد مجموعی طور پر اس طریقہ سے دس ہوگئی، لیکن اس کا پتہ نہ چلا کہ کتنے فرقے ہندوؤں کے قرار پائے، بہرحال مطالبہ پیش ہوا، لکھا ہے کہ

"چنانچہ اسی کے موافق قرار پایا" ص۱۷ میلہ خدا شناسی

اس میلے کی حد تک تو معاملہ اسی پر ختم ہوگیا۔ لیکن دوسرے میلہ میں جو کچھ دیکھا گیا، اس کا سراغ ان اطلاعات سے ملتا ہے، جنھیں اس میلہ کی روداد میں ہم پاتے ہیں۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ شرائط وغیرہ کے طے و تصفیہ کے لئے فیصلہ کیا گیا کہ ایک سبجکٹ کمیٹی بنادی جائے جس کے لئے ہر فریق کے چند اشخاص چن لئے جائیں۔ یہی کیا گیا۔ ہندوؤں کی طرف سے سبجکٹ کمیٹی میں بجائے منشی پیارے لال بانی جلسہ اور ان کے ایک رفیق منشی مکتا پرشاد کے پنڈت دیانند سرسوتی اور منشی اندرمن پہلے شریک کئے گئے تھے، لیکن جب تعین اوقات وغیرہ کے مسئلے پر گفتگو ہونے لگی تو لکھا ہے کہ

"پادری صاحب یہ چال چلے کہ منشی پیارے لال اور مکتا پرشاد کو بھی رکن شوریٰ قرار دیا جائے اور یہ کہا کہ وہ بانی مبانی جلسہ ہیں، ان کی رائے لینی بھی ضروری ہے"

یہ بات بھی مان لی گئی، جب یہ سب کچھ ہولیا، تب سنئے، بیان کیا ہے، کہ پادری نولس صاحب نے سب کو خیمہ میں بلالیا، اور وہی پرانا حربہ جو ہندوستان کے مسلمانوں کے مقابلہ میں اول سے آخر تک استعمال ہوتا رہا ہے وہی ہتھیار نکل آیا، یعنی پادری نولس نے کہا۔

"اعتبار کثرت آراء کا چاہئے" ص

ادھر پادری صاحب کی طرف سے یہ اعلان ہوا، اور اس کے بعد اول سے آخر تک مسلمانوں کو مسلسل جس چیز کا تجربہ ہوتا رہا۔ مباحثہ شاہجہانپور میں بار بار مختلف پیرایوں میں اس کا اظہار کیا گیا ہے، مثلاً تحدید وقت ہی کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ منشی پیارے لال

"بوجہ توافق پنہانی اور نیز پنڈت صاحب بھی اُن کی (پادری صاحب کی) ہاں میں ہاں ملانے لگے" ص

آگے اسی کے بعد تقریباً اسی واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ

"غرض جس بات کو پادری نولس صاحب کہتے تھے، حضرات ہنود بھی ہاں میں ہاں ملا دیتے اور تسلیم کرتے تھے" ص

ایسے مواقع بھی پیش آئے کہ منشی پیارے لال کو براہ راست مخاطب کر کے سید ناالامام الکبیر کو یہ کہنا پڑا،

"منشی صاحب ہم کو آپ سے بڑی شکایت ہے کہ ہم اور پادری صاحب دونوں آپ کے بلائے ہوئے، دونوں آپ کے مہمان ہیں آپ کو لازم تھا کہ دونوں کو برابر سمجھتے، مگر جب آپ ڈھلتے ہیں، انہیں کی طرف ڈھلتے ہیں، جب تائید کرتے ہیں، ان ہی کی کرتے ہیں انہیں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں" ص۲۹

اور مولوی محمد طاہر یعنی مولوی مدن والے موتی میاں جو میلے کے مہتم تھے۔ انہوں نے تو کھرے کھرے صاف و صریح الفاظ میں منشی پیارے لال سے لکھا ہے کہ ترش رو ہو کر کہا کہ

"میں آئندہ سال شریک جلسہ نہ ہوں گا، اس کے کیا معنی کہ مسلمان جو کہتے ہیں، ان کے کہنے پر تو التفات بھی نہیں کرتے، اور پادری صاحبوں کے کہنے پر بے سوچے سمجھے ہاتھ اٹھا کر تسلیم کر لیتے ہو"

اور اسی موقعہ پر موتی میاں کی زبان سے بے ساختہ وہ فقرہ نکل گیا تھا، جسے پہلے بھی نقل کر چکا ہوں یعنی

"یہ بات بالکل سازش اور اتفاق باہمی پر دلالت کرتی ہے" ص

منشی پیارے لال ان باتوں کو سنتے تھے اور عذر و معذرت کے بارد الفاظ میں مختلف قسم کی مجبوریوں کا ذکر دیتے بہرحال خدا شناسی کے میلے کے پہلے سال ہی میں جو دیکھا گیا تھا، جیسا کہ اس سال کی روداد کے مرتب کرنے والوں نے لکھا ہے کہ

"اگرچہ بظاہر مناظرہ کرنے والے تین فریق قرار پائے تھے، مسلمان، عیسائی، ہندو، مگر درحقیقت اصل گفتگو مسلمان اور عیسائیوں میں تھی۔" ص۴

کھل کر اس کا جو مطلب تھا، وہ دوسرے سال کے میلے میں لوگوں کے سامنے اس شکل میں آگیا کہ عیسائی اور ہندو دونوں کو ایک فریق بنا کر مسلمانوں کے مقابلہ میں گویا کھڑا کر دیا گیا ہے، اور وہی ہندوستان جہاں کچھ ہی دن پہلے عیسائی پادریوں کی تبلیغی جد و جہد کے مقابلہ میں یہ سمجھا جا رہا تھا کہ

"ہر ہندوستانی (خواہ مسلمان ہو یا ہندو) عیسائیت کے عروج اور ترقی کو اپنے مذاہب کی بربادی سمجھتا تھا، اسی لئے رد نصاریٰ میں جو کتابیں چھپتی تھیں، ان کو ہندو مسلمان سب پڑھتے تھے۔"

اور صرف پڑھتے ہی نہ تھے، بلکہ رد نصاریٰ میں جو کتابیں لکھی جاتی تھیں، عموماً جن کے لکھنے والے مسلمان ہی ہوتے تھے، لکھا ہے کہ ان ہی کتابوں کو ہندو اپنے پریسوں میں چھپوا کر اشاعت کرتے تھے اس سلسلہ کی ایک مشہور کتاب "غایۃ الشعود تیج اعجم البرد" جسے لکھنؤ کے ایک عالم مولوی محمد شاہ لکھنوی نے لکھی تھی، یہ کتاب

"منشی نول کشور نے ۱۲۹۰ھ میں چھپوائی" "فرنگیوں کا جال ص۳۰"

چھپوائی کے لفظ کا بظاہر مطلب یہی ہے کہ طباعت کے سارے مصارف منشی نول کشور نے خود برداشت کئے تھے

اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز مثال اسی سلسلہ کی اسی کتاب میں یہ نقل کی گئی ہے کہ ٹانڈہ (پنجاب) ضلع ہوشیار پور کے ایک صاحب جن کا نام مولوی شیخ احمد تھا، اور پادریوں نے جو طوفان ملک میں برپا کر رکھا تھا، جانتے تھے کہ اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ منجملہ دوسری سیاسی چالوں کے ایک

چال یہی ہے اسی نے لکھا ہے کہ

"ان کا طریقہ تھا، جس جگہ شام کو پادری جاتا، اسی جگہ پر صبح کو جاتے اور وہ (یعنی پادری) پھنسانے کا جو جال بچھا کر آتا اس کو پاش پاش کرتے"

سننے کی بات یہ ہے کہ یہی شیخ احمد صرف مسلمانوں ہی کو نہیں، بلکہ

"ہندو مسلمانوں دونوں کو اپنے مذہب پر قائم رہنے کی تلقین کرتے" صلاٰ فرنگیوں کا جال

اللہ اللہ وہی ہندوستان جہاں ۱۲۹۰ھ میں دیکھا گیا تھا کہ رد نصاریٰ میں مسلمانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو اپنے خرچ سے ہندو چھاپ رہے ہیں، وہیں چند ہی سال کے ہیر پھیر میں یہ کیسا دردناک انقلابی نظارہ تھا کہ عیسائی پادری اور ہندوؤں کے پنڈت ایک صف میں بیٹھے ہیں، اور مسلمان دوسری صف میں اپنی دیدۂ عبرت نگاہ سے یہ دیکھ رہے ہیں کہ جو تجویز بھی ان کی طرف سے پیش ہوتی ہے، اس کو مسترد کرنے میں عیسائیوں کے پادری اور ہندوؤں کے پنڈت دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گویا کوئی اندرونی معاہدہ کئے ہوئے ہیں۔

آپ دیکھ رہے ہیں، میلہ کس نام سے جمع کیا گیا تھا، اور اس سے کام کیا لیا جا رہا تھا، اور یہ قصے تو شرائط و قیود کے تھے، باقی میلے کا حقیقی موضوع یعنی خدا شناسی پر مباحثہ، سو جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے، اور مباحثہ شاہجہان پور میں لکھا بھی ہے کہ

"قلت فرصت کا بہانہ کر کے مباحثہ کو مختصر کر دینا" صلا

پادری زیادہ تر اسی کے درپے تھے، بمشکل تھوڑا بہت وقت جو ملا بھی، اس میں سچ پوچھئے، تو سر جوڑ کر کسی مسئلہ کی تحقیق و تلاش کا جو عام طریقہ ہے، اس سے گریز ہی کی کوشش کی گئی، ہمارے مصنف امام نے اس میلہ کا جہاں تذکرہ اپنی کتاب میں کیا ہے، وہاں شرائط و قیود کے اجمالی ذکر کے بعد جو یہ ارقام فرمایا ہے، کہ

"آخر گفتگو ہوئی، طرز گفتگو کی نہ تھی، بلکہ ہر شخص اپنی باری پر کچھ بیان کرتا تھا" صلا

سوانح قدیم

اس سے ان کی غرض یہی ہے کہ حق کی تلاش و جستجو کا اس قسم کی مجلسوں میں جو علمی یا طبعی طریقہ ہے، وہ اختیار نہ کیا گیا، بلکہ وہی بات کہ اپنی اپنی باری پر بولنے یا لکھی ہوئی تحریروں کے پڑھنے کا صرف موقعہ لوگوں کو دیا گیا، مگر یہ گفتگو جو بطرز گفتگو نہ ہوئی" آپ سن ہی چکے کہ ایک مستقل فریق یعنی ہندوؤں کی طرف سے اگرچہ ابتدائی تقریر منشی پیارے لال کی اسی زبان میں شروع ہوئی جسے میلہ والے سمجھ سکتے تھے، لیکن پادری نولس اور ان کے نائب دوسرے پادری کی سرگوشی کے بعد یہ قصہ بھی ختم ہو گیا، اور منشی پیارے لال والی تقریر جو سمجھی گئی، اس کا رنگ بھی جو کچھ تھا، اس کا اندازہ اسی نمونہ سے ہو سکتا ہے، جو پہلے سال کے میلے کی روداد میں درج ہے، لکھا ہے، کہ منشی جی نے کھڑے ہو کر ایک تحریر پڑھی، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ

"میاں کبیر نے کنول کے پھول میں جنم لیا، اور ان کے پنتھ میں جاگتے سوتے، برابر سانس چلتا رہتا ہے" ص۵

اسی سے سمجھا جا سکتا ہے، کہ میلہ کے انعقاد کا جو نصب العین بتایا گیا تھا، خود منشی جی کو اس سے کتنی دلچسپی تھی۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ جس شخص کے دینی احساسات اتنے سطحی اور پست ہوں، اسی میں ایسے عظیم الشان مقصد کے لئے میلہ قائم کرنے کا تصور پیدا ہی کیسے ہو سکتا ہے، اسی روداد میں لکھا ہے، کہ جب جلسہ ختم ہو رہا تھا، تو منشی جی نے ایک دوسری تحریر بھی پڑھی جس میں

"گوشت کے حلال کرنے پر اعتراض تھا" ص۱۱

جس کے معنی یہی ہوئے، کہ دین اور مذہب کی حقیقی روح اور انسانی فطرت کی گہرائیوں میں جو پوشیدہ سوالات کا حل مذہب ہے، منشی جی بے چارے کو ان باتوں کی ہوا بھی نہیں لگی تھی، اور "باورچی خانہ میں لاکر مذہب کو بند کر دینا" اس عامیانہ خیال سے آگے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔

بہر حال یہ بھی غنیمت تھا کہ جو کچھ بھی انھوں نے پڑھا، ایسی زبان میں پڑھا جسے سننے والے سمجھ تو رہے تھے، لیکن ان کے سوا ہندوؤں کی طرف سے پہلے میلے میں بھی اور دوسرے میلے میں بھی "زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم" کے سبق کی مشق کی گئی۔ پہلے میلے میں "نفیر سربنگ" کے

تام سے جس تحریری بیان کا ذکر کیا گیا ہے' اس کے متعلق روداد میں لکھا ہے کہ اس کے سوا اور کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ

"ہندوؤں کی نسبت دربارہ اعمال و اقوال کچھ دور دیک تھی" ص

انتہا تو یہ ہے کہ دوسرے سال کا میلہ جس میں خصوصیت کے ساتھ جیسا کہ لکھا ہے اشتہاروں اور اخباروں کے ذریعہ سے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ اب کی پادریوں کے سوا بڑے بڑے نامی گرامی پنڈت بھی آئیں گے' مشہور تھا کہ

"مجمع بڑے بڑے ودیا نیتوں اور مشاہیر کا ہوگا" ص مباحثہ شاہ جہاں پور

اور اس میں شک نہیں کہ شہرت کے مطابق وقت کی سب سے بڑی مشہور ہستی خود پنڈت دیانند سرسوتی جی ہی میلہ میں جلوہ افروز ہوئے' اور ان کے ساتھ منشی اندرمن بھی موجود تھے۔ اپنی چند خاص کتابوں کی وجہ سے ان کا نام بھی کافی اونچا ہو چکا تھا' مگر عرض ہی کر چکا ہوں کہ منشی اندرمن مجمعوں میں تقریر سے معذوری کا عذر کر کے جیسے آئے تھے' اسی طرح واپس ہو گئے' رہے پنڈت جی سو آپ سن چکے کہ "کے کا" کے سوا سننے والے ان کی تقریر کا ایک لفظ نہ سمجھ سکے۔ عام طور پر چونکہ یہ مشہور تھا کہ پنڈت جی کا یہ عقیدہ ہے' کہ مادہ اور روح یہ دونوں بھی خدا ہی کی طرح غیر مخلوق ہیں' اور کمہار یا بڑھئی وغیرہ کاریگروں پر خدا کو قیاس کر کے کہتے ہیں کہ جیسے مٹی کے بغیر کمہار برتن' اور لکڑی کے بغیر بڑھئی کرسی نہیں بنا سکتا' اسی طرح مادہ کے بغیر خدا بھی عالم کی کارسازی پر قادر نہیں ہے' اسی وجہ سے لکھا ہے'

"ہاں ایک دو بات اس قسم کی سمجھ میں آئیں' کہ جیسے کمہار گھڑا وغیرہ برتن بناتا ہے"

اسی کے ساتھ اس کی بھی تصریح کر دی گئی ہے

"مگر ان دو ایک بات کے سوا اور کچھ کسی کی سمجھ میں نہ آیا" ص۶۲

الغرض ایک مسلم فریق کی نوعیت دونوں میلوں میں کچھ ایسی رہی کہ اس کی طرف سے جو کچھ بیان کیا گیا مطلب اس کا یہی تھا کہ گویا کچھ بیان نہیں کیا گیا' سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ پھر ان کو خدا شناسی کی تحقیق

سکے اس میلے میں شریک ہی کیوں کیا گیا تھا یا خود وہ کیوں اس میں شریک ہوئے اگرچہ یہی بات کہ خدا
شناسی کا یہ میلہ خدا شناسی کے لئے رچایا بھی گیا ہو؟

سچی بات تو یہ ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے تو خیر یہ طرز عمل جس وجہ سے بھی اختیار کیا گیا ہو لیکن روداد
کے پڑھنے سے تو حیرت ہوتی ہے کہ سب سے زیادہ پیش پیش پادریوں کا فریق اس میلے میں تھا، لیکن
ان کے نمائندوں میں بھی پادری نولس صاحب جن کے متعلق مشہور تھا کہ

"بڑے لسان، اور مقرر ہیں، (ان کا دعویٰ ہے کہ بہ مقابلہ دین عیسوی دین محمدی کی
کچھ حقیقت نہیں" ص۲۳

اور اگر پادریوں کے عام بیانات اور تقریروں کو سن کر جن میں خود پادری نولس صاحب بھی تھے، سیدنا
الامام الکبیر نے فرمادیا تھا کہ

"پادریوں میں کوئی اس قابل نہیں معلوم ہوتا جس سے بظاہر کچھ اندیشہ خاطر ہو، ہاں ان
کی بے انصافی سے دل افسردہ ہوتا ہے" ص۲۲ میلہ خدا شناسی

لیکن بایں ہمہ دوسرے پادریوں کے مقابلہ میں پادری نولس صاحب کی تعریف بھی حضرت والا نے ان
الفاظ میں کی تھی

"پادری صاحبوں کی طرف سے وہ لوگ کھڑے ہوئے تھے جن کو گفتگو کا سلیقہ نہ تھا الفاظ
سے اوقات کی خانہ پری کر دیتے تھے۔ مگر ہاں آج ہماری طبیعت محظوظ ہوئی، پادری صاحب
(یعنی نولس صاحب) بہت خوش تقریر اور صاحب سلیقہ ہیں" ص۲۲ میلہ خدا شناسی

مگر ان لسان مقرر جن کی خوش تقریری اور حسن سلیقہ کا سیدنا الامام الکبیر نے اعتراف بھی فرمایا تھا،
انہوں نے دونوں میلوں میں وقت تو کافی لیا۔ پندرہ منٹ کی مدت کی توسیع کی التجا بھی بے شرمی
کے ساتھ ان کی طرف سے جو پیش ہوئی تھی، اس کا ذکر تو کر ہی چکا ہوں لیکن بایں ہمہ دونوں میلوں میں
انہوں نے جو کچھ فرمایا کیا عرض کیا جائے کہ کیا فرمایا

دین عیسوی کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل یہ بیان کی کہ دین عیسوی کی کتاب انجیل،

"دو ڈھائی سو زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے" ص۸

جس پر مولوی ابوالمنصور نے چبھتا ہوا فقرہ کہا بھی کہ

"تو یوں کہو کہ اٹھارہویں صدی سے پہلے پہلے انجیل آسمانی کتاب نہ تھی" ص۹

مولوی صاحب نے جب دعوی کیا کہ انجیل کے ترجموں کی کثرت اٹھارہویں صدی اور اس کے بعد ہی ہوئی ہے، تو پادری صاحب نے مان بھی لیا کہ

"ہاں ترجموں کی کثرت تو اٹھارہویں صدی ہی میں ہوئی ہے" ص۹

اور اس سے بھی دلچسپ برہانی استدلال پادری نولس صاحب کا کرشچینٹی کے بنیادی عقیدہ تثلیث کے ثبوت میں یہ تھا کہ

"دیکھو درخت ایک ہے پر اس میں جڑ بھی ہے، شاخیں بھی ہیں، پتے بھی ہیں" ص۳۸

اور بھی کئی چیزوں میں تین پہلو نکال کر کہنے لگے کہ اس سے بڑھ کر تثلیث کے ثبوت کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے، اسی پر سیدنا الامام الکبیر نے فرمایا تھا کہ تثلیث ہی کیا، مثالوں ہی پر بات ٹھہری تو درخت ہی میں

"ہزاروں شاخیں، ہزاروں پتے، ہزاروں پھول، اور پھر ہر شاخ و برگ اور پھل پھول میں کس قدر رگیں اللہ نکلتیں ہیں" ص۳۲

فرمایا کہ

"خیر پادری صاحب نے تثلیث ہی پر کیوں قناعت فرمائی۔ تربیع، تخمیس بلکہ تسدیس، تسبیع، تثمین، بلکہ تالیف وغیرہ"

سب ہی کو عقیدہ بنا کر اسی قسم کی بیش پا افتادہ مثالوں سے بآسانی ثابت کر دیا جا سکتا ہے۔

یہ حال تو پادری نولس کی استدلالی قوت کا تھا، اور ان پر کسی نے جب اعتراض کیا کہ مسیح علیہ السلام نے تو فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لئے میں آیا ہوں، تو آپ بنی اسرائیل کے سوا دوسروں میں مسیحیت کی تبلیغ کیوں کرتے پھرتے ہیں، شاید اس لطیفہ کی طرف کہیں پہلے بھی اشارہ گذرا ہے کہ اپنے ہاتھ

کی چھڑی یا لاٹھی کی طرف اشارہ کر کے پادری صاحب نے فرمایا

"دیکھو! یہ لکڑی بھی ہے اور لاٹھی بھی ہے۔ لکڑی عام ہے اور لاٹھی خاص۔"

پس نتیجہ یہ ہوا کہ

"عیسیٰ علیہ السلام خاص بنی اسرائیل ہی کے لئے آئے تھے، مگر جہاں خاص ہوتا ہے وہاں عام بھی ہوتا ہے۔"

کہنے والے نے سچ کہا تھا کہ جب پادری نولس عیسائی ہو چکے تو انسان جو ان سے عام ہے وہ بھی عیسائی ہو گیا، اب تبلیغ کی حاجت ہی کیا رہی۔ میں ان تفصیلات کو اس لئے نقل کر رہا ہوں، تاکہ اندازہ ہو کہ "خدا شناسی" کیا واقعی اس میلے کی غرض تھی، کیا ایسے عظیم اور اہم ترین موضوع پر گفتگو کرنے کا یہی طریقہ ہو سکتا ہے۔

اور یہ مختصر داستان تو پادری نولس صاحب کی تھی، اب سنئے اسکاٹ صاحب جن کو دوسرے میلہ میں خاص طور سے میلے میں آنے کے بعد دعوت دی گئی تھی، وہی صاحب جن کو حکومت کی طرف سے پانسو روپے کا انعام منطق کی کسی کتاب کے ارقام فرمانے پر ارزانی ہوا تھا۔ ان کی آمد آمد کی خبر جب میلے میں گرم ہوئی، اور اسکاٹ صاحب کی خواہش پر پادری نولس نے ۵ منٹ کے طے شدہ وقت کی جگہ چاہا کہ ایک گھنٹہ تقریر کا وقت کر دیا جائے اس وقت سیدنا الامام الکبیر نے برہم ہو کر پادری نولس سے کہا تھا کہ

"کل ہم بہزار منت آپ سے اس بات کے خواستگار رہے کہ کم سے کم درس کے لئے ایک گھنٹہ عنایت کیجئے، ہمارے التماس اور عجز و نیاز پر تو آپ نے نظر نہ فرمائی، آج اگر کسی کے کہنے سے اپنا نفع نظر آیا تو آپ ہم سے اسی بات کے خواستگار ہوتے ہیں جس کا ہم سے انکار کر چکے ہیں۔"

اور ذرا تیز و تند لہجے میں فرمایا کہ

"جو ہو چکا سو ہو چکا، اب کیا ہوتا ہے، نہ وقت مقررہ میں تبدیلی ہو سکتی ہے، اور نہ پادری

اسکاٹ صاحب کو اجازت ہوسکتی ہے' یہ بات وقت شرائط کی تجویز کے ساتھ گئی'
اب کچھ نہیں ہوسکتا' ورنہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم باوجودیکہ رکن مباحثہ ہیں' مباحثہ کے
حساب سے کالعدم ہیں' جو کچھ ہوئے آپ ہی ہوئے"

خیر یہ تو ایک ذیلی بات تھی سیدنا الامام الکبیر نے خلاف دستور یہ رویہ کیوں اختیار کیا تھا' اسے تو چھوڑیئے' کہنا یہ ہے کہ اسکاٹ صاحب کے علم وفضل سے پادری نولس صاحب اس قدر متاثر تھے کہ سیدنا الامام الکبیر کے اصرار کو دیکھ کر بولے

"آپ پادری اسکاٹ صاحب کو ڈرتے ہیں"

گرم جواب بھی وقت پر خود سیدنا الامام الکبیر نے ان کو دے دیا تھا کہ

"خدا کی عنایت سے پادری اسکاٹ کے استاد ہوں' تو ان سے بھی نہ ڈروں' بلکہ انشاءاللہ
تمام پادری بھی اکٹھے ہوجائیں تو نہیں ڈرتا"

پھر اصرار کی وجہ بھی آپ نے ظاہر کردی

"مجھ کو فقط یہ جتلانا تھا کہ بات مقرر کرکے کون قائم رہتا ہے اور کون پھر جاتا ہے"

پادری نولس صاحب کی بے انصافی اور استبداد کے پردے کو چاک کرنے کے بعد ان کی التجا کی پذیرائی کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ

"گھنٹہ' ڈیڑھ گھنٹہ' دو گھنٹہ جس قدر چاہیں آپ درس مقرر کریں اور جسے چاہیں درس کے
لئے مقرر کریں" ص۴۸

بہر حال کہنا یہ ہے کہ آئے تو اسکاٹ صاحب اس دھوم دھام سے' اور اپنے دین کی سچائی کے ثبوت میں سب سے بڑی منطقی دلیل جو پیش کی وہ یہ تھی کہ

"جب تک عیسائیوں کی عملداری ہندوستان میں نہ تھی' ہندوستان میں کیسی کیسی غارتگری
اور فتنہ و فساد اور رہزنی ہوا کرتی تھی' جب سے عیسائیوں کی عملداری ہوئی کس طرح امن
وامان ہوگیا سونا اچھالتے چلے جاؤ کوئی پوچھتا نہیں' دیکھو کتا ہوں میں کتنی کمی آگئی" ص۶۷

جواب میں تو اس کے جیساکہ واقعہ تھا، سیدنا الامام الکبیر ہی نے فرما دیا تھا

"یہ امن وامان عیسائی عملداری کی برکت نہیں ہے، اس امن وامان کی علت بجز پاس ملک اور آرزوئے ترقی تجارت اور کچھ نہیں، مذہب سے اس بات کو کچھ علاقہ نہیں" مشت مباحثہ شاہ جہاں پور

اور گناہوں کی کمی کا جو ذکر پادری اسکاٹ نے کیا تھا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت والا نے ام الخبائث (شراب) اور ام الجرائم زنا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ شراب خواری کہ حالانکہ مذہباً ان کے یہاں بھی ممنوع ہے،

"نصرانیوں میں شاید ہی ایسا کوئی ہو جو اس گناہ سے بچا ہوا ہو"

اور رہا ام الجرائم زنا سو آپ نے دریافت کیا

"کیا پادری صاحبوں کو لندن کے اخباروں کی اب تک خبر نہیں کہ وہ کیا لکھتے ہیں، اور ہر روز کئی سو بچے ولد الزنا پیدا ہوتے ہیں اور صبح کو راستوں پر پڑے ہوئے ملتے ہیں" مشت

خیر سوال وجواب کی تفصیلات تو اصل روداد میں پڑھئے، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پادری نولس کی تقریر کے محوری عناصر اور اسکاٹ صاحب کے بیان کی روح جو آپ کے سامنے پیش کی گئی ہے کیا ان سے واقف ہونے کے بعد دل میں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ چاندا پور کا یہ میلہ خدا شناسی کے لئے قائم کیا گیا تھا یا بقول سیدنا الامام الکبیر "پاس ملک" کے جذبات ہی کی یہ کار فرمائیاں تھیں؟

اور بڑے پادری صاحبوں نے تو خیر جو کچھ کہا کہا۔ میرے رونگٹے تو اس وقت کھڑے ہو جاتے ہیں، جب سوچتا ہوں کہ سرزمین روہیل کھنڈ کے صحرائی مقام کے اسی میلہ میں جس میں موسمی حالات کی وجہ سے کم از کم پہلے سال شہر کے لوگوں کو شرکت کا موقعہ قدرتاً کم ہی ملا تھا، زیادہ تر قرب وجوار کے دیہاتوں کے لوگ میلہ میں بھرے ہوئے تھے کہ مباحثہ کی اس مجلس میں دیکھا گیا کہ ایک کالا پادری مولاداد نامی اپنی کور بختی میں کور بختی کا اضافہ (العیاذ باللہ) ان گندے الفاظ سے کر رہا ہے یعنی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوے نبوت کا ذکر کرکے اپنی زبان اور اپنے دہن کو ان نجس الفاظ سے

آلودہ کر رہا تھا کہ (استغفراللہ)

"بھنگیوں کا لال گورو بھی ایسا ہی کہتا تھا!"

اور اسی پر اس تیرہ نصیب نے اکتفا نہیں کیا، بلکہ خود اپنے آپ کو رسوا کرنے کے لئے انجیل کی ایک آیت کا غلط ترجمہ کرکے کہنے لگا کہ

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ فرمایا ہے کہ میرے بعد جو آئیں گے چور اور بٹ مار ہوں گے!" ص۱۹

قطع نظر اس سے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام پر افترا پردازی کر رہا تھا، اور اسی وقت امام فن مناظرہ مولانا ابوالمنصور نے ٹوک بھی دیا تھا کہ انجیل کی جس آیت کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے، اس میں تو

"یہ نہیں ہے کہ جو میرے بعد آئینگے چور اور بٹ مار ہونگے!"

بلکہ برعکس اس کے اس کا مفہوم تو یہ ہے کہ

"جو مجھ سے پیشتر آئے، وہ چور اور بٹ مار تھے!"

لیکن اس کو تو جانے دیجئے، سوچئے اس بات کو جس ماحول میں یہ جلسہ ہو رہا تھا، اچانک اسی جلسہ میں ایک دریدہ دہن کالے پادری کی زبان سے نکلے ہوئے ان فقروں کا انجام کیا ہو سکتا تھا۔ مسلمان سب کچھ برداشت کر سکتے تھے۔ ان کے مقرروں کو تقریر کے لئے وقت نہیں دیا جا رہا تھا، ان کی پیش کردہ ترتیب کے مطابق بحث کرنے کی اجازت نہیں دی جا رہی تھی۔ ان کے مقابلہ میں ہندوؤں کی نمائندہ پنڈتوں کو بھی ملا کر پادریوں اور ہندوؤں کی ایک صف قائم کر لی گئی تھی۔ ان کے عہد حکومت پر لعنت ملامت کرتے ہوئے، برطانوی راج کی قصیدہ خوانی ہو رہی تھی۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا، وہ برداشت کرتے چلے جاتے تھے، لیکن اس سیاہ سینہ، سیاہ دل کالے پادری کی نجس اور گندی زبان سے ان کو اب جو کچھ سنایا گیا تھا، کیا اس کو وہ برداشت کر سکتے تھے، ہوش و حواس ان کے اس کے بعد کیا بجا رہ سکتے تھے۔

تاریخ شاہد ہے، کہ اسی قسم کا کوئی واقعہ چنگاری بن کر اڑا ہے، اور آبادیوں، ملکوں، قوموں کو اس نے

جلاکر خاک سیاہ کر دیا ہے۔ اب میں کیا عرض کروں، دوسروں کے متعلق تو نہیں کہہ سکتا، لیکن خداشناسی کے ان دونوں میلوں کے مشتملات اور جو کچھ ان میں کہا گیا، اور کیا گیا، سب کو پیش نظر رکھتے ہوئے اشقی القوم مولاداد کی تقریر کے ان الفاظ کو جب سوچتا ہوں، تو کچھ ایسا خیال گذرنے لگتا ہے، کہ دیوبندی حلقہ میں مکہ معظمہ کے نیم مجذوب کی وہ پیش گوئی جس کا پہلے بھی کہیں شاید ذکر گذرا ہے، یعنی غدر کے بعد حکیم عبدالسلام ملیح آبادی مکہ معظمہ گئے تھے، وہاں ان سے ایک صاحب جو نیم مجذوب سے آدمی تھے، حکیم صاحب کا بیان ہے کہ

"بہت شدومد سے یہ فرمایا کہ تم یہیں (مکہ میں) رہو، ہندوستان مت جاؤ، اس واسطے کہ وہاں انقلاب ہو رہا ہے، جو غدر سابق سے بڑھ کر ہوگا" ص ۲۳۹ ارواح ثلثہ

مولانا محمد یعقوب ہمارے مصنف امام نے جیسا کہ اسی کتاب ارواح ثلثہ میں لکھا ہے، اس کو سن کر فرمایا تھا کہ

"یہاں کچھ نہیں ہوگا"

لیکن غدر کے اٹھارہ انیس سال بعد نام نہاد خداشناسی کے نام سے قائم کئے جانے والے میلوں میں جو کارفرمائیاں ہوئیں، اور جن کا اب تک ذکر کر چکا ہوں، ان کو دیکھتے ہوئے، کیسے کہا جائے کہ مکہ کے نیم مجذوب کی واقفیت جس کا ذریعہ خواہ کچھ ہی ہو، کشفی ہو، یا غیر کشفی، کلیۃً بے بنیاد تھی، آخر وہ بے چارے نیم مجذوب ہی تو تھے۔ بجائے "کل" کے واقعہ کا "کچھ حصہ" ہی ان کے سامنے آیا، اور اسی کو دیکھ کر کوئی رائے قائم کر لی ہو، تو جو کچھ ہو رہا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے کیا وہی پیشگوئی نہیں کی جا سکتی تھی، جو اس نیم مجذوب آدمی نے کی۔

واقعہ اب گذر چکا ہے، اور اسی طرز سے گذرا، جیسا کہ ہمارے مصنف امام نے فرمایا۔ بارود کے میگزین میں چنگاری ڈالی جا چکی تھی، لیکن دھماکہ کیوں نہیں ہوا، میں اسی کو اب کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، اور اسی سے معلوم ہوگا کہ شاید یہ ایک بڑے انقلاب کا پیش خیمہ تھا، ارحم الراحمین نے اپنے بندوں پر رحم فرمایا، خدا کی اسی رحمت کا باشندگان ہند کے ساتھ کس شکل میں ظہور ہوا۔ آئیے اور

واقعات کی روشنی میں اسی کا تماشا کیجئے۔ ان فی ذلک لذکری لمن کان لہ قلب او القی السمع وھو شھید

بات ذرا طویل ہوگئی لیکن جو کچھ سمجھانا چاہتا تھا شاید ان تفصیلات کے بغیر اسے ذہن نشین بھی نہیں کرا سکتا' یاد ہوگا' گفتگو یہ ہو رہی تھی کہ پہلی دفعہ چاندا پور کے اس مذہبی میلے کی شہرت ہوئی' سیدنا الامام الکبیر اس زمانہ میں اپنے قدیم آبائی وطن نانوتہ میں تھے۔ وہیں آپ کے پاس خطوط پہنچے' آپ پیادہ پا چل پڑے' دیوبند مظفر نگر میرٹھ ہوتے ہوئے دلی پہنچے' یہاں آپ کو یہ اطلاع دی گئی کہ شاہ جہاں پور کے انسپکٹر پولیس مولوی عبدالحئی نے کہلا بھیجا ہے کہ قصہ بے اصل ہے' علماء کے آنے کی کچھ حاجت نہیں۔ دلی میں جس وقت یہ خبر آپ کو ملی تو شاہ جہاں پور کے سفر کا ارادہ مضمحل ہوگیا' لیکن شاہ جہاں پور والوں کے تار اور خط کے بعد آپ کا وہی ارادہ جو سست پڑ چکا تھا' نئے سرے سے پھر تر و تازہ ہوا' لکھا ہے کہ

"۵ مئی کو بعد عشاء بمعیت مولوی فخر الحسن صاحب ساکن گنگوہ ضلع سہارنپور و مولوی محمود حسن صاحب ساکن دیوبند (ضلع سہارنپور) و مولوی رحیم اللہ صاحب ساکن بجنور ریل پر پہنچے" ص۳

ریل سے مراد یہ ہے کہ اسٹیشن پر پہنچے' کیونکہ آگے ہے کہ

"ادھر سے حسب وعدہ مولوی سید ابو المنصور صاحب دہلوی امام فن مناظرہ اہل کتاب بمعیت مولوی سید احمد علی صاحب دہلوی' و میر حیدر علی صاحب دہلوی تشریف لائے' اور سب مل جل کر گیارہ بجے ریل میں سوار ہو کر روز شنبہ ۶ مئی کو بعد عصر شاہ جہاں پور پہنچے"

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اپنی تشریف آوری کی تاریخ اور وقت سے شاہ جہاں پور والوں کو غالباً آپ نے قصداً اطلاع نہ دی تھی' اسی لئے اسٹیشن پر استقبال کے لئے کوئی نہ آسکا۔ شاہ جہاں پور والوں کو تو اس کی بھی خبر نہ ہوگی کہ آپ آئیں گے بھی یا نہیں آئیں گے' اس کو مغتنم موقعہ خیال کر کے

لکھا ہے کہ

"مولوی صاحب (یعنی سیدنا الامام الکبیر) نے آپ کو چھپانا چاہا اور یہ ارادہ کیا کہ رات کو سرائے میں گذر کر علی الصباح مجلس مناظرہ میں جا بیٹھیں گے"

اور یہی طے کر کے سفر کے دوسرے رفیقوں کو تو اجازت دے دی کہ بجائے سرائے کے شہر چلے جائیں، اور خود جیسا کہ "میلہ خداشناسی" نام والی روداد میں لکھا ہے، سرائے جاتے ہوئے اسٹیشن سے اپنے ساتھ رفقاء و تلامذہ کی جماعت میں سے صرف اپنے عاشق زار، جاں نثار خادم شیخ الہند مولانا محمود حسن کا خود انتخاب فرمایا تھا۔ یا ساتھ چلنے کی اجازت ان کو مل گئی، اس کے الفاظ ہیں کہ اسٹیشن شاہ جہاں پور پر

"مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) سب ساتھیوں کو چھوڑ کر مولوی محمود حسن صاحب کو اپنے ہمراہ لے کر چپکے سے شہر کو ہو لئے قصہ مختصر رات کو ایک سرائے میں آرام فرمایا"

الغرض اسٹیشن سے سرائے تشریف لے گئے، شیخ الہند مولانا محمود حسن بھی ساتھ تھے۔

اس سلسلہ میں کچھ اور روایتیں بھی پائی جاتی ہیں مگر وہ ثبوت کے لحاظ سے اس درجہ کی نہیں ہیں اس لئے انہیں نظر انداز کر دیا گیا ہے، یہاں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ پہلے میلے کے موقعہ پر شاہ جہاں پور کے اسٹیشن پر یہ پا کر شہر سے کوئی آدمی استقبال وغیرہ کے لئے نہیں پہنچ سکا، روداد میں لکھا ہے کہ

"مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) نے اپنے آپ کو چھپانا چاہا اور یہ ارادہ کیا کہ رات کو سرائے میں گذر کر علی الصباح مجلس مناظرہ میں جا بیٹھیں گے"

"اپنے آپ کو چھپانے کی" فطری آرزو آج بھی آپ پر اسی طرح مسلط ہے، جیسے ساری زندگی اسی تمنا اور اسی کوشش میں بسر ہوئی، اسی آرزو کے زیر اثر سفر کے معزز رفیقوں، اور اپنے چہیتے شاگردوں سے جدا ہونے پر بھی آمادہ ہو گئے، خدا ہی جانتا ہے کہ کتنی کش مکش کے بعد حضرت والا کو اپنے حال پر چھوڑ دینے کا فیصلہ سفر کے ان رفیقوں اور شاگردوں نے کیا ہوگا، اگر روداد والی ہی روایت صحیح ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ بمشکل حضرت مولانا محمود حسن کو ساتھ رہنے کی اجازت دی گئی، ذرا اس اخفاء کے جذبہ کی شدت کو

ملاحظہ فرمائیے کہ سرائے میں بھی اپنے آپ کو بجائے مشہور نام کے "خورشید حسین" غیر معروف تاریخی نام سے روشناس کرایا گیا۔ تاکہ دریافت کرنے والوں کو پوچھنے کے بعد بھی پتہ نہ چلے، مگر جیسی اخفار ذکر کی کوشش بندے کی طرف سے مسلسل جاری تھی، اسی بندے کے رفع ذکر کا فیصلہ اس کا مالک کئے ہوئے تھا۔ بعد کو جو کچھ ہوا وہ تو خیر آپ سنیں ہی گے، لیکن سرائے کی اس رات میں بھی کیا ہوا، روداد میں لکھا ہے کہ

"مگر ایک دو شخص (باشندگان شاہ جہاں پور کو خبر ہو ہی گئی، قریب دو بجے رات کے سرائے میں جا کر مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کو جا گھیرا"

خدا ہی جانتا ہے کہ خورشید حسین نام کے پردے کو چاک کرکے "مولانا محمد قاسم" تک پہنچنے میں یہ بیچارے کیسے کامیاب ہوئے، بہرحال کسی نہ کسی طرح پہنچے، لکھا ہے کہ

"پس از اصرار، ناچار مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) ان کے مکان پر تشریف لے گئے" ص

یوں سرائے سے اٹھ کر آپ شاہ جہاں پور والوں کے گھر تک تو کسی نہ کسی طرح آگئے، ۶ رمئی کا دن گذر چکا تھا، کل ۷ رمئی کو میلہ کے افتتاح کی تاریخ تھی، چاند اپور کا فاصلہ عرض کر چکا ہوں، اگر کافی تھا، سرائے میں تو جو کچھ چاہتے کر سکتے تھے، لیکن شہر والوں میں پہنچ جانے کے بعد کون راضی ہو سکتا تھا کہ آپ گرمی کے اس موسم میں پانچ چھ کوس کا فاصلہ پیادہ پا طے کریں۔ لیکن روداد کی روایت میں بھی اور ارواح ثلثہ میں مولانا احمد حسن امروہوی کی زبانی جو روایت درج کی گئی ہے، دونوں ہی میں یہ الفاظ وارد کئے ہیں،

"مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) صبح کی نماز پڑھ کر پیادہ پا ہی، چاند اپور میں جا چکے" ص

گویا میلے کی خبر پا کر جیسے پیادہ پا آپ نانوتہ سے دیوبند بارہ کوس کا فاصلہ طے کرکے پہنچے تھے، اسی طرح ریل سے اترنے کے بعد شاہ جہاں پور سے چاند اپور تک جو پانچ چھ کوس کا فاصلہ تھا اس کو بھی پیادہ پا ہی

طے فرمایا، اور اسی پیادہ پائی کی وجہ سے شاید وہ لطیفہ پیش آیا۔ جس کا ذکر میلے میں بھی اور میلے کے بعد بھی اب تک لوگ مزے لے لے کر کرتے ہیں۔

عرض کر چکا ہوں کہ میلہ چاند اپور میں بھی نہیں بلکہ اسی کے قریب ایک کھیڑے سارنگپور تای سرزمین میں قائم کیا گیا تھا، جہاں سے ایک ندی جو "دریائے گرا" کے نام سے مشہور ہے گذرتی ہے۔ حالانکہ مئی کا مہینہ تھا لیکن ندی پایاب نہیں ہوئی تھی، شاید اس کے ساحل کے انتخاب میں آب رسانی کی سہولت بھی میلہ قائم کرنے والوں کے پیش نظر ہو۔ شاہ جہاں پور سے سارنگپور جاتے ہوئے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راستہ میں یہی ندی ملتی تھی۔ مولانا احمد حسن امروہوی رحمۃ اللہ علیہ جو اب رفیق سفر ہو چکے تھے، کی روایت میں ہے کہ

"راستہ میں ایک دریا پڑتا تھا"

غالباً یہ وہی دریائے گرا تھا چونکہ بقول حضرت امروہوی

"مولانا پیدل تھے"

شاید سواری میں یہ صورت پیش نہ آتی، بہرحال پیادہ پا چلنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دریا جس میں پانی تھا، اس کو عبور کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ

"مولانا پاجامہ پہنے ہوئے دریا میں اتر پڑے، جس سے پاجامہ بھیگ گیا"

اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ جلسہ میں شریک ہونے کے لئے تعمداً کوئی خاص قسم کا بانا آپ نے ایسا اختیار نہیں کیا تھا، جس کی وجہ سے امتیازی نظر لوگوں کی آپ پر پڑے، بلکہ پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ ضلع سہارنپور کے شیخ زادوں اور شرفا کا جو عام لباس تھا۔ اسی لباس میں عموماً رہتے بھی تھے، اور آج بھی اسی لباس میں جا رہے تھے۔ اب یہ اتفاق کی بات ہے کہ پیدل چلنے کی وجہ سے آپ کو دریا میں اترنا پڑا، پانی اتنا تھا کہ پاجامہ آپ کا بھیگ گیا۔ حضر ہی میں جس کے پاس بیان کر چکا ہوں، بقول حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ

"نہ کوئی صندوق تھا، نہ کپڑوں کی کوئی گٹھری" ارواح ثلثہ ص۱۸۶

تو سفر میں بھلا اس کے بعد زائد کپڑوں کے ہونے کی کیا توقع کی جا سکتی تھی، حضرت شیخ الہند فرمایا بھی کرتے تھے کہ

"عموماً اسی ایک جوڑے میں سفر پورا ہوتا، جو حضر میں پہنے ہوتے تھے"

مگر اسی کے ساتھ وہی کہا کرتے تھے کہ

"البتہ ایک نیلی لنگی ساتھ رہتی تھی، جب کپڑے زیادہ میلے ہو گئے، تو لنگی باندھ کر کپڑے اتار دیئے، اور خود ہی دھو لئے" ۱۴۵۶ا

دریا میں اترنے کے بعد پاجامۂ مبارک جب بھیگ گیا تو آپ کی یہی دائمی رفیق "نیلی لنگی" بے چاری کام آئی مولانا امروہوی کی روایت میں ہے کہ

"مولانا نے پار اتر کر لنگی باندھی، اور پاجامہ اتار کر نچوڑ کر پیچھے لاٹھی پر جیسے گاؤں کے رہنے والے ڈال لیا کرتے ہیں، ڈال لیا"

اور اسی شان کے ساتھ آپ میلے کے میدان میں پہنچ گئے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ دریا پار کرنے کے بعد میلہ کا میدان کچھ زیادہ دور نہ تھا، اتنا وقفہ نہ گذر سکا کہ بھیگا ہوا پائجامہ آپ کا خشک ہو جاتا، دراصل یہی مجبوری تھی کہ بجائے پائجامہ کے "نیلی لنگی" ہی کے ساتھ آپ میلہ میں شریک ہو گئے، یہ گر جیسے قصداً و ارادۃً نمائش کے لئے نیلی لنگی نہیں باندھی گئی تھی، اسی طرح اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے، کہ خواہ مخواہ کسی خاص قسم کے لباس کا پابند اپنے آپ کو بنا کر عموماً کسی مجمع یا محفل کی شرکت سے لوگ ہچکچاتے ہیں۔ جب تک وہی زبردستی اپنے اوپر عائد کیا ہوا لباس فراہم نہ ہو جائے، مجمع میں جانا ان کے لئے گویا ناممکن ہوتا ہے، آپ دیکھ رہے ہیں، چاہا تو آپ نے بھی تھا کہ جس لباس کے پہننے کے عادی تھے اسی کے ساتھ میلے میں شریک ہوں، لیکن بھیگ جانے کی وجہ سے بجائے پاجامہ کے لنگی باندھنی پڑی، تو ہچکچائے بغیر آپ لنگی ہی کے ساتھ مجمع میں علماء کے تشریف فرما ہوئے۔ بلکہ خدا شناسی کے اسی میلے کے پہلے سال کی روداد کے آخر میں بریلی کے رہنے والے ایک ہندو کا یہ بیان جو نقل کیا گیا ہے کہ

"مسلمانوں کی طرف سے ایک پتلا سا آدمی میلے سے کپڑے نیلی لنگی بغل میں دبی ہوئی بیان

کرنے کھڑا ہوا" ۳۲۲

ان الفاظ سے سیدنا الامام الکبیر کی طرف یہ ہندو وزیٹر اشارہ کر رہا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خشک ہو جانے کے بعد پائجامہ پہن لیا گیا تھا، اور حسب دستور لنگی بغل میں دبی ہوئی تھی۔ یہی "نیلی لنگی" بعد کو "تاریخی نیلی لنگی" بن گئی۔ اسی کا تذکرہ فرماتے ہوئے حکیم الامت حضرت تھانوی رح بھی فرمایا کرتے تھے۔

"مباحثہ شاہ جہاں پور میں مخالفین اسلام کے مقابلہ میں بڑا عظیم الشان مناظرہ تھا، بڑے بڑے جبا و قبا والے موجود تھے، اور حضرت مولانا (نانوتوی) اسی معمولی کرتہ اور لنگی میں تھے" (قصص الاکابر الہادی ماہ جمادی الثانی ۱۳۵۸ھ)

مطلب یہی ہے، کہ قیمت "مغز" کی ہوتی ہے، چھلکے کی نوعیت خواہ کچھ ہی ہو "بے مغز" پھلوں کو کون خریدتا ہے۔

کچھ بھی ہو، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ روک دینے کی جو کوشش شاہ جہاں پور کے پولیس انسپکٹر مولوی عبدالحیٔ صاحب کی طرف سے کی گئی تھی، وہ کوشش کامیاب ہوئی، شاہ جہاں پور والوں نے اس کو مولوی عبدالحیٔ کی غلطی قرار دیا، اور ان کے علی الرغم سیدنا الامام الکبیر جبا شناسی کے اس میلے تک بہرحال پہنچ ہی گئے۔

سچ تو یہ ہے کہ مولوی عبدالحیٔ صاحب کے طرز عمل کی تعبیر "غلطی" کے لفظ سے شاہ جہاں پور والوں نے جو کی تھی۔ میری سمجھ میں تو اس کا مطلب بھی نہیں آتا۔ گذر چکا کہ دلی اور شاہ جہاں پور کے درمیان تار اور خط کے ذریعہ اس مسئلہ میں سوال و جواب ہمہ رُخی کو پیش آیا، اور میلہ کے افتتاح کی تاریخ ۷ رمئی تھی۔ اتنے قریب زمانہ میں شاہ جہاں پور کی پولیس کے ایک ذمہ دار افسر کا اس میلہ اور اس کی تفصیلات سے ناواقف ہو جانا جو اسی کے علاقہ میں منعقد ہو رہا تھا جس کی نگرانی بہرحال ان کے فرائض میں تھی، بلکہ نقل ہی کر چکا ہوں، کہ میلے میں پولیس موجود تھی۔ دوسرے سال کے میلے میں تو ان کے نام مولوی عبدالحیٔ کی تصریح کے ساتھ اطلاع دی گئی ہے، کہ وہ بھی میلے میں موجود تھے (مباحثہ شاہجہانپور ۳۲) پھر ان کا سرے سے قصہ ہی کو بے اصل ٹھہرانا، اور اس کو بے اصل ٹھہراتے ہوئے، اپنی یہ رائے پیش کرنا کہ "علماء کے آنے کی حاجت

نہیں" بتایا جائے کہ اعتراض کا کیا مطلب سمجھا جائے۔ اور غلطی کے لفظ کے اطلاق کی گنجائش کس جزمیں کس طریقہ سے نکالی جائے۔

کچھ بھی ہو، میرا ذاتی احساس تو یہی ہے کہ خدانخواستہ "مولوی عبدالحی کی غلطی" اگر صحیح ہو جاتی اور ان کی اطلاع سے سفر کا جو ارادہ سست ہو گیا تھا، وہ ختم ہو جاتا۔ یعنی سیدنا الامام الکبیر ان کی رائے کے مطابق دلی سے بجائے شاہ جہاں پور جانے کے گھر واپس ہو جاتے، تو ظاہر ہے کہ جس قصہ کو بے اصل ٹھہرایا گیا تھا، واقع میں بے اصل تو تھا نہیں۔ خدا شناسی کا یہ میلہ چاند پور میں منعقد ہو کر رہتا، اور پہلے سال کے میلے میں جیسے ہندوؤں کی طرف سے اسی قسم کے نمائندے اور وکلاء شریک ہوئے تھے، جن کے نام کا اب تک پتہ نہ چلا۔ کچھ اسی قسم کے گمنام، خام کار، ناتجربہ کار چند مولوی مسلمانوں کی طرف سے بھی اس میلہ میں ادھر اُدھر اکٹھے ہو جاتے، تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس میلہ کا کیا انجام ہوتا۔ اللہ اللہ کم بخت مولا داد کالے پادری کی شرر افشانی جس رنگ میں ہوئی تھی مسلمانوں کے جذبہ و صبر کی کتنی بڑی آزمائش تھی، شعلہ سامانیوں کی جو آگ اس دریدہ دہن موذی کے الفاظ میں دبی ہوئی تھی، کیا ان غریب مولویوں کے بس کی بات تھی کہ بھڑکنے سے اس کو روک دیتے۔

یہاں تو حال یہ تھا کہ جس وقت ۱۵ منٹ وقت درس و تقریر کے لئے مقرر کرنے کے بعد پادری نولس کو اپنی تقریر کی توسیع وقت کی ضرورت محسوس ہوئی، اور انتہائی وضاحت سے کام لیتے ہوئے وقت کے اسی مسئلہ میں مسلمانوں کے جن نمائندوں کی مسلسل تجویزوں اور درخواستوں کو انتہائی لاپروائی کے ساتھ برابر ٹھکراتا ہی چلا جاتا تھا۔ ان ہی سے التجا کرنے لگا کہ مزید پندرہ منٹ اور تقریر کرنے کا موقعہ اسے دیا جائے۔ تو علاوہ سیدنا الامام الکبیر کے مسلمانوں کے نمائندوں کی اس جماعت میں حالانکہ بعض کافی سرد و گرم چشیدہ، آزمودہ کار ہستیاں موجود تھیں، تاہم لکھا ہے سیدنا الامام الکبیر کے سوا جتنے بھی تھے ان کی

"رائے یہ تھی کہ ان کو (پادری نولس کو) مہلت دی جائے"

سب مولوی اور جوان کے ساتھ وہاں تھے یہی کہتے تھے کہ

"جب وہ ہم کو مہلت نہیں دیتے تو ہم کیوں دیں"
انتقام کا جذبہ پوری قوت سے ابھر آیا تھا، دل کی بھڑاس نکالنے کا موقعہ سمجھا گیا تھا کہ یہی ہے آپس میں
ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ
"اچھا ان کا (نولس صاحب کا) مضمون بھی ناتمام ہی رہے" ص۲۹
مگر آپ سن چکے، ذکر کر چکا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر نے عام سوریوں کے اس فیصلہ کے برعکس پادری
نولس کو بخندہ جبینی مزید وقت صرف کرنے کی اجازت دی، جس کا نتیجہ بھی اسی وقت اس رنگ میں سامنے
آیا کہ مقررہ وقت سے زیادہ وقت لے کر جو کچھ کہنا تھا پادری نولس صاحب کہہ چکے تو دیکھا گیا کہ سیدنا
الامام الکبیر کھڑے ہیں، اور مسکراتے ہوئے فرمارہے ہیں کہ
"لیجئے پادری صاحب اب ہم کو بھی تیس منٹ کی اجازت دیجئے"
چارہ کار ہی اب پادری صاحب کے لئے کیا تھا، اپنے دام میں خود گرفتار ہو چکے تھے، منت و سماجت
حق و انصاف جس مسئلہ کے حل میں بے کار ثابت ہو چکا تھا، ٹھیک وقت ان کی ایک کارآمد سوجھ سے وہی
مسئلہ کتنی سہولت کے ساتھ حل ہو گیا، لکھا ہے کہ
"لاچار ہو کر پادری صاحب کو بھی اجازت دینی پڑی"
میرے خیال میں اس حکم اور علم کی یہ ایک مثال تھی جس کے متعلق قرآن میں ایک سو زائد مقامات پر یہ اطلاع
دی گئی ہے، کہ دین میں مقام احسان تک پہنچنے میں جو کامیاب ہوتے ہیں، یعنی المحسنین ہی کو حکم و علم کی
یہ نعمت ارزانی ہوتی ہے، اس لاہوتی دولت کی صرف معلومات والے علماء میں توقع نہ رکھنی چاہئے۔
احسانی حکم و علم کے آثار کا تجربہ کچھ اسی ایک واقعہ کی حد تک محدود نہیں ہے، بلکہ اسی میلے میں
مسلسل ایسے مواقع پیش آتے رہے جن میں دیکھا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر کے ضمیر کی یہی روشنی چمک
اٹھی اور تاریکیوں کا ازالہ ہو گیا۔ اسکاٹ صاحب منطقی پادری کے قصے میں جب ان کی خواہش کے
مطابق یہ مسئلہ پیش ہوا کہ ان کو تقریر کا بھی موقع دیا جائے، اور وقت کم از کم ایک گھنٹہ ملنا چاہئے۔
عرض کر چکا ہوں کہ اس مسئلہ کے پیش ہونے پر خلاف دستور سیدنا الامام الکبیر اسکی مخالفت کرتے رہے،

بڑے ردوکد کے بعد راضی بھی ہوئے تو بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ منشی پیارے لال وغیرہ کی سعی و سفارش سے آپ راضی ہوئے ہیں۔ حالانکہ یہ بھی وقت کی ایک سوجھ ہی کا تقاضا تھا، قصہ تو طویل ہے تفصیل کے لئے اصل روداد ہی کا مطالعہ کیجئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ پہلے سال کے میلے میں دوسرے دن جب مباحثہ کی مجلس میں لوگ جمع ہوئے اور طے ہو چکا تھا کہ ہر فریق کی طرف سے صرف پانچ پانچ آدمیوں کو بولنے کی اجازت دی جائے گی۔ لیکن اتفاقاً ایک صاحب جن کا نام قاضی سرفراز علی تھا، لکھا ہے کہ شاہ جہاں پور کے بڑے رئیسوں میں تھے، غدر میں مالی حالت ان کی خراب ہو گئی تھی، پادریوں سے مقابلہ اور مناظرہ کا ذوق رکھتے تھے، وہی ایک لکھی ہوئی تحریر لائے، اور خواہش ظاہر کی کہ اپنی تحریر کے سنانے کا موقعہ ان کو بھی دیا جائے۔ سیدنا الامام الکبیر نے اپنی جگہ ان ہی کو کھڑا کر دیا، ان کو دیکھ کر پادری نولس نے کہا کہ کیا

"آپ بھی ان ہی پنجتن میں ہیں جو اس کام کے لئے مخصوص ہوئے ہیں"

جواب میں قاضی صاحب نے جب کہا کہ ان میں تو میں نہیں ہوں لیکن فلاں صاحب یعنی سیدنا الامام الکبیر کی طرف اشارہ کر کے بولے کہ

"ان کو اجازت ہے اور یہ مجھ کو اجازت دیتے ہیں"

جس پر نولس نے نہایت سختی کے ساتھ یہ کہتے ہوئے کہ

"ان کو اجازت نہیں ہو سکتی"

بے چارے قاضی صاحب کو کھڑے ہونے کے بعد بیٹھ جانے پر مجبور کیا۔

اس سال تو خیر یہ بات گذر گئی، میلہ جب دوسرے سال منعقد ہوا، اور اب کے بھی پانچ پانچ آدمی ہر فریق کی طرف سے مقرر ہو چکے تھے، لیکن بعد کو یہی اسکاٹ منطقی پادری نولس صاحب کے بلانے پر جب پہنچے، اور چاہا گیا کہ گفتگو میں ان کو بھی حصہ لینے کے لئے موقعہ دیا جائے، اور ایک گھنٹہ تقریر کے لئے اسکاٹ صاحب طالب ہوئے، یہی موقعہ تھا کہ قاضی سرفراز علی صاحب کے واقعہ کا بھی جواب دیا جائے۔ نیز پھراپوں والے مولانا محمد علی بھی اسی عرصہ میں پہنچ چکے تھے، جن کا نام

مسلمانوں کی طرف سے مقرر کئے ہوئے پانچ آدمیوں کی فہرست میں نہ تھا، قاضی سرفراز علی کے جلسے میں تجربہ ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کی طرف سے مزید کسی آدمی کو بولنے کی اجازت پادری نہیں دیں گے حالانکہ سیدنا الامام الکبیر ان کو بھی گفتگو میں شریک کرنا چاہتے تھے۔ درحقیقت اسکاٹ صاحب کے قصہ میں رد و کد کا راز یہی تھا، اسی لئے راضی ہو جانے کے بعد سیدنا الامام الکبیر نے فرمایا بھی کہ

"پادری اسکاٹ صاحب جب داخل مناظرہ کئے جاتے ہیں تو ہم نظیفہ مولوی محمد علی صاحب کو شامل کریں گے" ملاحظہ مباحثہ شاہجہاں پور

تو سیع وقت، اور پادری اسکاٹ صاحب کی شرکت کے مسئلہ میں جب حضرت والا کے پاس پادری نولس صاحب کی طرف سے منشی پیارے لال بہتک و دو کر رہے تھے، تو ایک دفعہ منشی جی سے سیدنا الامام الکبیر نے فرما بھی دیا تھا:

"منشی صاحب مجھ کو کسی بات پر خواہ مخواہ اڑ نہیں، مگر ہاں پادری صاحب کو اس کج رائی پر کہ ہم منتیں کریں اور وہ تسلیم نہ کریں، اسی لئے بالفعل ہماری طرف سے یہی جواب ہے کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا آپ ان کو سنا دیں"

آخر میں یہ سمجھاتے ہوئے کہ اس قسم کی معمولی باتوں کی کوئی قدر و قیمت میری نظر میں نہیں ہے، منشی جی کے کان میں یہ بات بھی آپ نے ڈال دی تھی کہ

"باقی جو کچھ ہوگا وقت پر دیکھا جائے گا" ص ۹

وقت جب آیا تو دیکھا بھی گیا کہ جو کچھ پادری نولس نے چاہا سب ہی کچھ منظور کر لیا گیا۔

اور یہ تو اس احسانی حکم و علم کی ایسی جزئی مثالیں ہیں، جن کا شاید ذکر بھی نہ کرتا۔ اگر اس راہ کے ان چند کلی نتائج کے ذہن نشین کرانے میں مدد نہ ملتی، جنہیں اب پیش کرنا چاہتا ہوں، اور یہ ایسے کلی نتائج ہیں جن سے سیدنا الامام الکبیر کی سیرت ہی کا ایک خاص پہلو نمایاں نہیں ہوتا، بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے اسلامی ہند آج جن مشکلات سے دوچار ہے، چاہا جائے تو ان مشکلات کے حل میں بھی ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

کہنا یہ ہے کہ مذہب کے نام سے شاہ جہاں پور کے علاقہ میں اس میلہ کے انعقاد کا جو اعلان کیا گیا تھا، اس میں شک نہیں کہ اس کے متعلق کبھی کبھی سیدنا الامام الکبیر کی زبان مبارک سے اس قسم کے الفاظ جنھیں نقل بھی کر چکا ہوں نکل جاتے تھے، مثلاً یہی بات کہ

"اگر اثبات و تحقیق مذہب پر نظر ہے تو ترتیب عقلی (ان سوالوں) کی یہ ہے، جو کل میں نے عرض کی، اور اگر اثبات مذہب سے کچھ بحث نہیں، تو غرض پیارے لال کے فرمانے کا اتباع ہے" ملخصاً

کہنے والے چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ میلے کے مقصد کے متعلق سیدنا الامام الکبیر کے دل میں بھی شک پیدا ہو جاتا تھا، اسی بنا پر ان کی طرف سے یہ تجویز پیش ہوئی کہ

"بہتر ہے کہ ہر فریق میں سے چند آدمی منتخب کئے جائیں"

دوسرے فرقوں کے نمائندوں نے بھی مسلمانوں کی یہ تجویز مان لی، اور عرض کر چکا ہوں کہ پانچ پانچ آدمی طے ہوا کہ ہر فریق سے تقریر کرنے کے لئے چن لئے جائیں۔ اور اسی سلسلہ میں مسلمانوں کی طرف سے پانچ آدمی جو مقرر ہوئے، ان میں دوسروں کے ساتھ ایک نام سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کا بھی تھا۔ لیکن بایں ہمہ مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ اس میلے کی بنیاد میں آج جو چیزیں ہمیں نظر آتی ہیں، جن کے مختلف پہلوؤں کی طرف اب تک اشارے کرتا چلا آیا ہوں، ایسی کوئی صاف اور صریح شہادت میرے پاس نہیں ہے، جس پر اعتماد کر کے یہ دعویٰ کروں کہ سیدنا الامام الکبیر نے ان میلوں میں جو کچھ کہا یا جو کیا، اس میں ان امور کا خیال بھی آپ کے سامنے کسی نہ کسی حیثیت سے تھا، بلکہ بیان کرنے والوں نے جو چیزیں مجھ تک پہنچائی ہیں، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ پہلا میلہ ہو، یا دوسرا، ہر ایک میں آپ کی شرکت مذہب ہی کے نام پر ہوئی۔ اسی کے نام پر اس میلے میں لوگ بلائے گئے تھے، پس مذہب ہی کے نام پر آپ ان میلوں میں داخل بھی ہوئے، اور ان میلوں سے نکلے بھی تو اسی خیال کے ساتھ نکلے کہ "مذہبی کاروبار" کے سوا ان کے پیچھے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے، پس باہر سے تو مذہب ہی کے نام نے آپ کو کھینچا تھا، یا آپ کے اندر کیا تھا، جو بیٹھ جانے کے

بعد بھی آپ کو اٹھا اٹھا دیتا تھا، دوسرے سال کے میلے کی اطلاع لکھا ہے کہ جب آپ تک پہنچی تو پہلے میلہ میں یاد ربوں کی بے انصافیوں کا خیال کر کے لکھا ہے کہ

"تہی دستی میں مفت کی زیر باری، اور بے فائدہ تضییع اوقات ہے، ارادہ جانے کا نہیں کیا۔"

ص۲۹ مباحثہ شاہ جہاں پور

مگر بیٹھ جانے کے بعد پھر اچانک اٹھ کھڑے ہوئے، کیوں اٹھ کھڑے ہوئے، اپنے ذاتی نام ونمود کا تو خیر اس شخص کے متعلق سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے جس کی ساری زندگی اسی کے دبانے میں گذری، عرض ہی کر چکا ہوں کہ پہلی دفعہ میلے میں شاہ جہاں پور تک توروفقار کے ساتھ پہنچے، لیکن ریل سے اترنے کے ساتھ ہی ہم سفروں کو شہر روانہ کر دیا، اور خود تنہا حضرت شیخ الہندؒ کو ساتھ لے کر شب گذاری کے لئے کسی سرائے میں تشریف لے گئے، اور سرائے میں بھی اسی لئے کہ مشہور نام سے پتہ چلانے والے پتہ چلا لیں گے۔ "خورشید حسین" اپنے تاریخی نام کے ساتھ داخل ہوئے، میلے میں جب ہر فریق سے طے ہوا کہ پانچ پانچ آدمیوں کا انتخاب تقریر وغیرہ کرنے کے لئے کیا جائے، اور مسلمانوں کی طرف سے پانچ ناموں میں سے ایک نام آپ کا بھی تھا تو اس وقت بھی فہرست جو بنی لکھا ہے کہ

یہ (مولوی محمد قاسم) نام ان کا نہیں لکھا گیا، بجائے مولوی محمد قاسم کے حافظ خورشید حسین صاحب لکھا گیا۔" ص۲۳ میلہ خداشناسی

مطلب وہی تھا کہ تقریر کی وجہ سے شہرت میلے میں اگر ہوگی بھی تو خورشید حسین کی ہوگی، محمد قاسم کی نہ ہوگی، اف! کسی کے "نام" پر جو اپنا سب کچھ لٹا اور مٹا چکا تھا۔ اپنا اور اپنے نام کا سوال ہی اس کے لئے کیا باقی رہا تھا۔ حالانکہ یہ دل کی بات تھی، دوسروں کو کیا معلوم کہ نانوتہ سے اٹھارہ انیس کوس پیدل چل کر دیوبند پہنچنے والا، اور وہاں سے سرگرداں مظفر نگر، میرٹھ، دلی ہوتا ہوا شاہ جہاں پور، شاہ جہاں پور سے پیادہ پا سارنگپور کے اس میدان تک دھاوا کرتا ہوا کیوں پہنچا تھا، پہلی دفعہ بھی پہنچا، اور ارادہ ملتوی کرنے کے بعد دوسرے میلے میں بھی آدھمکا، ظاہر ہے کہ اس کا تعلق دل کی باطنی کیفیت سے تھا۔

تاہم جو کچھ اندر بھرا ہوا تھا کبھی کبھی وہی چھلک پڑتا تھا۔ کس کی آبرو اور عزت کا سوال اسکو بے چین اور بے قرار کئے ہوئے یہاں سے وہاں، وہاں سے وہاں لئے پھرتا تھا۔

پہلے سال کی روداد میں تو نہیں، لیکن دوسرے سال والے میلے کی روداد مباحثہ شاہ جہاں پور نامی والے میں نقل کیا ہے کہ شاہ جہاں پور کے اسٹیشن سے تو سیدنا الامام الکبیر کو مولوی حفیظ اللہ خاں وغیرہ شہر لے گئے، اور اس دفعہ شاہ جہاں پور کی یہ رات بجائے سرائے کے مولوی عبدالغفور صاحب کے مکان پر گذری، لیکن کیا پوری رات گذری؟ لکھا ہے کہ

"مناظرین اسلام آخر رات ہی سے راہی میدان مباحثہ ہوئے"

اللہ اللہ یہ پچھلی رات کا وقت، سننے کی بات ہے، راوی کا بیان ہے کہ یہ میدان مباحثہ

"جو شاہ جہاں پور سے چھ سات کوس کے فاصلے پر تھا"

اس فاصلہ کو طے کرنے کے لئے

"سب صاحب سوار"

جا رہے تھے، لیکن

"مولوی محمد قاسم صاحب علیہ الرحمۃ پیادہ پا" صفحہ

راستہ میں پھر وہی ندی "گرّا" نامی آئی، اس کے بہتے ہوئے پانی میں طہارت و وضو سے فارغ ہوئے، مارچ کا مہینہ تھا، ۱۹ر تاریخ تھی، وضو کر کے بیان کیا ہے کہ

"نوافل ادا کئے اور نہایت خشوع و خضوع سے دعا مانگی"

گڑگڑا کر کسی کے قدموں پر سر رکھ کر مانگنے والا کیا مانگ رہا تھا، جس سے مانگ رہا تھا، اور جو مانگ رہا تھا، ان دونوں کے درمیان کا یہ راز تھا۔ لیکن آگے چند اوراق کے بعد صاحب روداد نے یہ خبر دیتے ہوئے کہ

"مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) نے جب سے شاہ جہاں پور کا ارادہ کیا تھا، جس سے ملتے تھے یا جس کو اہل دعا سمجھتے تھے، استدعاء دعا کرتے تھے"

آگے اس کے بعد لکھا ہے کہ

"خود یہ کہتے تھے کہ ہر چند ہماری نیت اور ہمارے اعمال اسی قابل ہیں کہ ہم مجمع عام میں ذلیل وخوار ہوں۔"

سیاسی حیثیت سے ذلت وخواری جو کچھ ہو چکی تھی وہ بجائے خود تھی۔ لے دے کر مسلمانوں کی دینی زندگی کا کچھ وزن باقی تھا، اب اس مذہبی سلسلے میں اس وزن کے زوال کا خطرہ سامنے آگیا تھا، اللہ اللہ جگر شق ہو جاتا ہے، مجرم اور جرم کی سزا و عقوبت کے استحقاق کا اقرار کرتے ہوئے، عرض کرنے والے کے اس معروضہ کو جب ہم پڑھتے ہیں۔

"مگر ہماری ذلت وخواری میں دین برحق کی ذلت۔"

اور آہ کہ اسی کے بعد یہ جگر شگاف، روح گداز الفاظ نقل کرنا چاہتا ہوں اقتل نہیں ہوتے۔

"اس رسول پاک کی ذلت متصور ہے، جو تمام عالم کا سردار اور تمام انبیاء کا قافلہ سالار ہے۔" ملخصاً

۔یہی باطنی احساس، اور آپ کا اندرونی جذبہ تھا، جو آپ کو تڑپائے ہوئے تھا، خود بھی تڑپتے تھے، اور دوسروں کو بھی تڑپاتے تھے۔ اور یہ دعا یعنی

"الٰہی! ہماری وجہ سے اپنے دین، اور اپنے حبیب پاک، شہ لولاک کو ذلیل وخوار مت کر، اور اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت اور طفیل میں ہم کو عزت افتخار سے مشرف فرما۔"

لکھا ہے کہ

"خود بھی یہی دعا کرتے تھے، اور اوروں سے بھی یہی دعا کراتے تھے۔"

تگ و دو کشش و کوشش، اضطراب اور بے چینی کے ان سارے قصوں کی تہ میں دل کی جو لگن، قلب کا جو سوز، روح کا جو قلق پوشیدہ تھا، اس کا کچھ اندازہ دعا کے ان الفاظ سے ہوتا ہے، بس ایک ہی نام تھا، جس کی عزت کے لئے جینے والا جی رہا تھا، اور اسی کے نام کی حرمت پر وہ مر گیا،

رحمۃ اللہ علیہ نور اللہ مرقدہ ۔

کچھ بھی ہو، میلے تک بھی آپ کا باطنی جذب کھینچ کھینچ کر لاتا رہا، لیکن کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میلے میں پہنچنے کے بعد اس قسم کے تماشے جو آپ کے سامنے پیش ہوئے کہ پنڈت صاحبان تو اپنی پنڈتائی کے کمالات کی نمائشوں میں مصروف ہیں، سنسکرت الفاظ کے استعمال کے شوق کو پورا کر رہے ہیں، اور عیسائیوں کی طرف سے کالے پادری جو شریک تھے، بقول صاحب روداد "میلہ خداشناسی" ان کی تقریروں کا حال یہ تھا کہ

"قالب میں الفاظ کے ایکن معانی ڈالنے کی نوبت نہ آئی تھی، اور الفاظ ہی سے خانہ پُری اوقات کرتے تھے۔ ص۲۱"

خود سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کالے پادریوں کی تقریروں پر تنقید یاد ہو گا کچھ اسی قسم کے الفاظ میں فرمائی تھی، باقی ان کے لسّان اور طرّار مقرر پادری نولس صاحب سوائے مضحکہ خیز مغالطوں، مثلاً لکڑی اور لاٹھی والے عام و خاص، یا جڑ شاخ پتہ والے تثلیثی مغالطہ وغیرہ کے سوا زیادہ وقت توانی وقوافی کی ترتیب، ہی میں خرچ کر رہے تھے، اسی طرح منطق کی کتاب پر پانسو روپے سرکاری انعام پانے والے پادری اسکاٹ صاحب وہ حکومت برطانیہ کی بھاٹ خوانی کو عیسائی مذہب کی وکالت قرار دے رہے تھے، الغرض یہ اور اسی نوعیت کے دوسرے والات سنجیدہ نفوس کو کبیدہ وافسردہ کرنے کے لئے کافی تھے، دوسرے سال میلے کے منعقد ہونے کی خبر پانے کے بعد اپنی شرکت کو بے فائدہ اور تضییع اوقات، سیدنا الامام الکبیر نے استحاریں جو قرار دیا تھا، تو اسباب آپ کے احساس کے اسی قسم کی باتیں تھیں ۔

بایں ہمہ اسی عجیب و غریب میلہ کی بدولت جس کے انعقاد کے در پردہ محرکات خواہ کچھ ہی ہوں، ایک عظیم موقعہ بھی سامنے آگیا تھا، دنیا کے دو بڑے مذہب عیسائیت، اور ہندو دھرم کے ماننے والوں کو ایک ساتھ مخاطب بنانے، اور دین کے آخری پیغام اور اس پیغام کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے روشناس کرانے کا اس سے زیادہ موزوں ترین وقت اور کیا ہو سکتا تھا، کہا تو یہی جاتا تھا کہ

"تحقیق حق" کے لئے ایک ہی جگہ شانہ سے شانہ ملا کر سب بیٹھے ہیں، میلے میں پہنچنے کے بعد اس اتفاقی اجتماع سے فائدہ اٹھانے کے خیال ہی کا بظاہر نتیجہ معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت اور پادری تو جن شغلوں میں بھی ہوں، لیکن سیدنا الامام الکبیر کو ہم دیکھتے ہیں کہ شرائط و قیود کے قصوں سے بالا ہو کر اپنی توجہ کو اپنی تبلیغی نصب العین پر مرتکز کر کے صرف اسی کوشش میں مصروف ہیں کہ جس طرح بھی ممکن ہو، اپنے خیالات کے پیش کرنے کا موقعہ ان کو دیا جائے۔ پہلے تو آپ نے اسی لئے چاہا تھا کہ تقریر کے لئے کافی وقت حاصل کیا جائے، لیکن اس میں جب کامیابی نہ ہوئی تو جلسہ کے اندر، جلسہ کے باہر جس طرح بھی آپ سے بن پڑا، جو کچھ سنانا چاہتے تھے، اس کو سناتے ہی چلے گئے، اسی سے اندازہ کیجئے کہ دوسرے سال کا میلہ، جس میں پنڈت دیانند سرستی جی اور منشی اندرمن بھی شریک تھے اور جلسہ سے پہلے سبجکٹ کمیٹی میں یہ طے ہو چکا تھا کہ پہلی تقریر درس کر نام سے آج پنڈت جی کی ہوگی اور عام مجمع میں تقریر کے لئے مقررین پہنچے، تو لکھا ہے کہ

"پنڈت صاحب (سوامی دیانند جی) سے کہا گیا کہ مجلس شوریٰ میں آپ کہہ چکے ہیں کہ آج ہم درس دیں گے سو آپ بیان کریں"

لیکن مجلس شوریٰ کے اس طے شدہ فیصلے کے برخلاف بیان کیا ہے کہ

"انہوں نے (پنڈت جی نے) پہلو تہی کی"

پادری نولس بھی حیران ہو گیا، مگر کسی طرح پنڈت جی کو فیصلہ کے مطابق عمل پر آمادہ نہ کر سکا تو لکھا ہے کہ مجبور ہو کر اس نے سیدنا الامام الکبیر سے کہا کہ جب پنڈت جی شروع نہیں کرتے، تو آپ ہی بیان کیجئے، یہاں کیا تھا، اول ہو یا آخر آپ کے سامنے تو صرف حق کی تبلیغ تھی، صرف یہ فرماتے ہوئے کہ

"انصاف کا مقتضیٰ اسی کا تھا کہ سب کے بعد ہم بیان کرتے، کیونکہ ہمارا دین سب سے پچھلا ہے"

جو کچھ پادری نولس نے کہا تھا، بلا چون و چرا آپ نے منظور فرما لیا۔

اسی طرح توسیع وقت کی جو تجویز آپ کی طرف سے پیش ہوئی تھی۔ جب کثرت رائے سے مسترد ہو گئی، تو اس وقت پادری نولس سے فرمایا کہ

"ہمارے بار بار کہنے سے افزائش وقت کو تسلیم نہ کیا تو خیر اس کو قبول کیجئے کہ بعد اختتام وقت جلسہ یعنی چار بجے کے بعد کل ہم ایک گھنٹہ وعظ کہیں گے آپ بھی محفل میں شریک ہوں، اور بعد ختم وعظ کے اعتراض کرنے کا بھی اختیار رہے"

غرض آپ کی یہ تھی کہ پادری نولس صاحب ہی اس میلے کی سب سے زیادہ ممتاز اور سر برآوردہ ہستی تھے، ان کی شرکت کی وجہ سے دوسرے بھی خارج از وقت والی میری تقریر میں شریک ہو سکیں گے اسی لئے آخر میں یہ بھی آپ نے فرمادیا تھا کہ اعتراض کا حق صرف پادری نولس ہی کی حد تک میں محدود نہیں کرتا ہوں۔

"بلکہ جس صاحب کے دل میں آئے وہ اعتراض کریں، ہم جواب دیں گے" ۔ الخ

آپ دیکھ رہے ہیں، جلسہ کے اندر حالانکہ نقد ... کے لئے پنڈت جی کی جگہ پہلے آپ کا کھڑا ہونا طے شدہ فیصلے کے خلاف تھا۔ لیکن آپ نے اس کی پروا نہ کی، اور تقریر کرنے پر آمادہ ہو گئے، اسی طرح جب آپ کو محسوس ہوا کہ دل کا حوصلہ وقت کی قید و بند کی پابندیوں میں نہ نکلے گا، تو خارج از جلسہ آپ نے نولس کو راضی کیا کہ بیان کرنے کا موقعہ آپ کو دیا جائے، اور وہی سب کچھ جلسہ سے باہر کیا جائے جسے جلسہ کے اندر کرنا چاہئے تھا۔

دوسرے میلے میں تو اس حد تک تبلیغ، اور حق رسانی کا یہ ولولہ آپ میں اشتعال پذیر ہو گیا تھا کہ دوسرے دن جلسہ کے اندر تقریریں اور سوال وجواب کا سلسلہ جاری تھا۔ آخر میں پنڈت دیانند سرسوتی جی نے مشرو خیر کے مسئلہ کو چھیڑ دیا، جلسہ صبح سے ہو رہا تھا، پنڈت جی نے بالکل آخر میں جب گیارہ بج رہے تھے اس مسئلہ کو چھیڑا تھا، لکھا ہے کہ ان کے بعد سیدنا الامام الکبیر اس مسئلہ پر بحث کرنے کے لئے تقریر کے مقام پر جب پہنچے، تو پادریوں نے اعلان کیا کہ گیارہ بج چکے۔

"بس جلسہ کا وقت ہو چکا"

حضرت والا کی بے کلی اس وقت دیکھنے کے قابل تھی، صاحب روداد نے نقل کیا ہے کہ جلسہ والوں کو خطاب کر کے

مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) نے فرمایا کہ دو چار منٹ ہماری خاطر سے اور ٹھیریئے چند درگاہ جھٹ پٹ پنڈت جی کے اعتراض کا جواب عرض کئے دیتا ہے۔ [1]

لیکن پادری کسی طرح دو چار منٹ کے لئے ٹھیرنے پر آمادہ نہ ہوئے، اس وقت آپ سے نہ رہا گیا، اور شاید یہ زندگی میں پہلا موقعہ تھا، کہ پنڈت دیانند سرسوتی جی کو شخصی مخاطب بنا کر حضرت والا کہتے گئے کہ

"پنڈت صاحب آپ ہی ٹھیر جائیں، وقت جلسہ ہو چکا ہے تو کیا ہوا، دو چار منٹ خارج از جلسہ ہی سہی!"

مگر حیرت ہوتی ہے، اتنے غیر معمولی اصرار کے باوجود پنڈت جی بھی چند منٹ کی گنجائش نہ نکال سکے، لکھا ہے کہ

"پنڈت جی نے بھی نہ مانا اور یہ فرمایا کہ بھوجن کا وقت آگیا ہے، اب ہم سے کچھ نہیں ہو سکتا۔"

[1] مباحثہ شاہجہاں پور

پنڈت جی تو یہ کہتے ہوئے روانہ ہو گئے، سیدنا الامام الکبیر نے جب دیکھا کہ پنڈت جی تو خیر ہاتھ سے نکل گئے، تو غایت اضطراب میں بیان کیا ہے کہ پنڈت جی کے ہمدم و ہمراز

"منشی اندرمن صاحب کا ہاتھ پکڑ کر یہ فرمایا کہ منشی صاحب! پنڈت صاحب تو نہیں سنتے، آپ ہی سنتے جائیں۔"

ہاتھ اگر پکڑ نہ لیتے تو شاید منشی جی بھی پنڈت جی کے پیچھے پیچھے چل دیتے، لیکن دست گرفتہ ہو جانے کی وجہ سے شاید مجبور ہو گئے، اور سیدنا الامام الکبیر جو کچھ سنانا چاہتے تھے ان کو سنا کر رہے۔

اور یہ قصہ تو دوسرے میلے کا ہے، پہلے سال ہی کے میلے میں آپ کے جوش تبلیغ کی شدت بڑھتے ہوئے اس نقطہ تک پہنچ چکی تھی، جب میلے کے دونوں ختم ہو چکے، اور اپنی فرودگاہوں میں لوگ

واپس ہوئے یہ طے تھا کہ کل میلہ کے میدان سے لوگ روانہ ہو جائیں گے، اسی عرصہ میں جیسا کہ پہلے سال کی روداد میں لکھا ہے کہ

"مولوی محمد قاسم صاحب نے موتی میاں صاحب سے کہا، یوں جی چاہتا ہے کہ پادری نولس صاحب سے تنہائی میں ملئے اور دعوت اسلام کیجئے"

آپ نے کچھ اس طریقہ سے اپنے دل کی آرزو بیان کی کہ موتی میاں حضرت والا کے منشار کے مطابق پادری نولس کے خیمے میں اسی وقت چلے گئے، اور کہا کہ

"ہمارے مولوی صاحب آپ سے تنہا ملنا چاہتے ہیں"

نولس بخوشی ملنے پر آمادہ ہو گیا اور یوں حضرت والا تنہا نولس صاحب کے پاس ان کے خیمہ میں پہنچے ان تمہیدی فقرات کے بعد یعنی

"ہم آپ کے اخلاق سے بہت خوش ہوئے اور چونکہ اخلاق باعث محبت ہو جاتے ہیں اور محبت باعث خیر خواہی ہو جایا کرتی ہے، تو ہمارا جی چاہتا ہے کہ دو کلمے آپ کی خیر خواہی کے آپ سے کہیں اور آپ سنیں"

نولس نے کہا کہ "ضرور سنائیے" تب جیسا کہ خود ہی بیان کیا کرتے تھے، پادری کے سامنے تبلیغ کا حق ان الفاظ میں ادا کیا، یعنی فرمانے لگے کہ

"دین عیسوی سے توبہ کیجئے، اور دین محمدی اختیار کیجئے، دنیا چند روزہ ہے۔ اور عذاب آخرت بہت سخت ہے"

"بیشک" اس لفظ کے سوا، نولس کی زبان سے کچھ نہ نکلا، وہ خاموش بیٹھا رہا، تب آپ نے فرمایا کہ

"اگر ہنوز آپ کو تامل ہے، تو اللہ سے دعا کیجئے کہ حق واضح کر دے"

یہ بھی تاکید کی گئی کہ

"اگر آپ اخلاص سے دعا کریں گے، تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے ضرور حق کو روشن کریگا"

تب جواب میں نولس صاحب نے کہا کہ

"میں روز دعا کرتا ہوں، کہ یا اللہ میرے دل کو روشن کردے"

کہتے ہیں، کہ اس پر آپ نے پادری صاحب کو ہدایت کی کہ

"یوں دعا کیجئے، کہ ان مذاہب مختلفہ میں جون سا مذہب حق ہو، وہ روشن ہو جائے، اور حق و باطل تمیز ہو جائے"

نولس نے یہ سن کر کہا کہ

"میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، کہ آپ نے میرے حق میں اتنا فکر کیا، اور میں آپ کی اس بات کو یاد رکھوں گا" ص

بہرحال اس میلے سے جس میں ہر طرح کے لوگ مذہبی احساسات کو بیدار کر کے شریک ہوتے ہیں، اس سے تبلیغی نفع حاصل کیا جا سکتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ پہلے اجلاس ہی میں اس کی طرف ذہن مبارک منتقل ہو گیا تھا، کیونکہ لکھا ہے، کہ پہلے اجلاس سے فارغ ہونے کے بعد ہی

"مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) نے واعظین (یعنی مسلمانوں کی طرف سے مولوی جو شریک ہوئے تھے اور وعظ کہہ سکتے تھے ان ہی) کو فرمایا کہ میلہ میں متفرق ہو کر وعظ بیان کرنا چاہئے"

بیان کیا ہے کہ آپ کی اس تجویز کے مطابق

"واعظین (اسلام)، نے جا کر بجز مولوی منصور علی صاحب کے علی الاعلان منادی اسلام و ابطال عیسائیت کو بیان کرنا شروع کیا"

عصر کے بعد سے مغرب تک میلے میں وعظ کہنے والے علماء پھیل گئے تھے، صاحب روداد نے لکھا ہے کہ

"قبل مغرب تک تمام میلے میں عجب کیفیت رہی اور عنایت ایزدی سے کوئی پادری مقابل نہ ہوا"

گویا جو پیشہ پادریوں کا تھا، حضرت والا کے اشارہ سے مسلمان مولویوں نے وہی کام میلے میں شروع کیا، خیال یہ تھا کہ گو رے نہ سہی ان کے سکھائے ہوئے کالے پادری ہی مقابلہ میں آئیں گے لیکن بقول

صاحب روداد گورے پادری ہوں یا کالے

"خدا معلوم کہاں جان چرائے پڑے رہے" ص۲۱ واقعہ میلہ خداشناسی

عصر سے مغرب تک سارے میلے میں یہی چرچا ہوتا رہا، مغرب کے بعد اندھیرا ہوچکا تھا، لوگ اپنی اپنی فرودگاہوں میں چلے گئے، علماء اسلام بھی جیسا کہ لکھا ہے، اپنے خیمہ میں

"صلاح و مشورہ کرتے رہے، اسی حالت میں عشاء کی نماز پڑھ کر اور کھانا کھا کر سو رہے"

دوسرے دن بھی محفل مناظرہ منعقد ہونے والی تھی، صبح ہوئی، نماز صبح کے بعد دیکھا گیا کہ ابھی اجلاس میں دیر ہے، اس لئے پھر حضرت نے موذیوں سے کہا کہ کل کی طرح آج بھی عام مناری اسلام کی میلہ میں کرنا چاہئے، یہی کیا گیا، صاحب روداد نے لکھا ہے کہ

"چنانچہ ان حضرات نے میلہ میں جاکر کما ینبغی حق اسلام ادا کیا۔ جزاہم اللہ عن جمیع المؤمنین خیر الجزاء" ص۲۲

بیان کیا ہے کہ دوسرے دن بھی

"۹ بجے تک برابر وعظ و درس کا شور تمام میلہ میں رہا"

بہرحال اعلان اور اشتہار کے مطابق اس میلہ میں کارروائیاں ہو رہی ہوں، یا نہ ہو رہی ہوں لیکن پہنچ جانے کے بعد سیدنا الامام الکبیر نے ایک طرف تو اس کی کوشش کی کہ تبلیغ حق کا فائدہ اس سے اٹھا لیا جائے۔ دوسروں کو بھی میلے کی افادیت کے اس پہلو کی طرف متوجہ فرمایا، اور خود ذاتی طور پر جو کچھ بھی کر سکتے تھے، آپ دیکھ چکے کہ کوئی دقیقہ آپ نے اس راہ میں اٹھا نہ رکھا تھا، لیکن آپ کے احسانی علم و علم کے آثار اسی حد تک محدود نہ تھے، بلکہ آپ کی اس خداداد نعمت کا مظاہرہ سچ پوچھئے تو ان تقریروں میں ہوا، جن کا ذکر دونوں میلوں کی رودادوں میں کیا گیا ہے، حیرت ہوتی ہے کہ میلہ کے درون پردہ محرکات سے ناواقف رہتے ہوئے آپ کی ہر تقریر ٹھیک مقتضی حال کے مطابق ہر اجلاس میں کیسے ہوتی رہی۔

میرا مطلب یہ ہے، کہ جن اشتباہی تاریکیوں کا تذکرہ اس میلے کے متعلق کر چکا ہوں، اگر یہ

مان لیا جائے کہ سیدنا الامام الکبیر کے سامنے یہ تاریکیاں نہ تھیں، اور اس میلہ کو صرف ایک مذہبی میلہ ہی سمجھتے ہوئے آپ تقریر فرماتے رہے تو اب اس کی توجیہ کیا کی جائے؟ کہ ان تاریکیوں سے کامل آگاہی کے بعد بھی جہاں تک میرا خیال ہے، ان سے زیادہ برمحل تقریروں اور عین موقع کے مناسب بیانوں کا ہم شاید تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہر اجلاس میں آپ نے وہی کہا جو کہنا چاہئے تھا، اور اس طریقہ سے کہا کہ نتیجہ ان میلوں کا جب سامنے آیا تو دیکھا گیا کہ اس نتیجہ سے وہ قطعاً مختلف تھا، جس کی توقع اس قسم کے میلہ کے بعد کی جا سکتی تھی۔ میں ان تقریروں کو پڑھتا ہوں اور مبہوت ہو کر رہ جاتا ہوں، اس کے سوا اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ورار طور عقل قرار دے کر چپ ہو جاؤں، عقل و قیاس کو اس کی توجیہ سے معذور پاتا ہوں۔ اس باب میں میرے جو احساسات ہیں، شاید صحیح طور پر ان کی تعبیر جیسی کہ چاہئے مجھ سے بن بھی نہ آئے، لیکن اپنی حد تک کوشش کرتا ہوں۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، کہ سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے بھی مرتبہ سوالات کی ایک فہرست مجلس مباحثہ میں اس تجویز کے ساتھ پیش ہوئی تھی، کہ علمی طور پر مذہبی موضوع پر بحث و تحقیق کا یہی طبعی طریقہ ہو سکتا ہے، لیکن آپ کی مجوزہ فہرست کی جگہ کثرت رائے سے اہل مجلس نے یہی طے کیا کہ سوالات کی جو فہرست منشی پیارے لال کی طرف سے پیش ہوئی ہے، سمجھا جاتا تھا کہ سوامی دیانند جی کے مرتب کئے ہوئے سوالات تھے، اسی کے مطابق بحث ہو۔ اس رنگ کو دیکھ کر چارہ کار ہی کیا تھا، کہ اکثریت کے فیصلے کے آگے سر جھکا دیا جائے، لیکن پھر بھی دونوں میلوں میں جلسوں کے اندر، یا باہر جہاں کہیں بھی جتنی دیر آپ کو بیان و تقریر کے مواقع ملتے رہے، عموماً ان میں وہی باتیں ہوتی تھیں جن کا ذکر آپ کی ایک تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے مباحثہ شاہ جہاں پور نامی والی روداد میں بایں الفاظ کیا ہے لکھا ہے، کہ

اس تقریر میں آٹھ باتیں تھیں۔ خداتعالیٰ کا ثبوت، اس کی وحدانیت، اس کا واجب الاطاعت ہونا، نبوت کی ضرورت، نبوت کی علامات اور صفات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت، آپ کی خاتمیت، آپ کے ظہور کے بعد انہیں کے اتباع میں نجات کا

مختصر ہو جاتا" ص۳۳

اگرچہ روداد میں ایک ہی تقریر کے مشتملات کا تجزیہ کیا گیا ہے، لیکن جس حد تک آپ کی دوسری تقریروں اور بیانات کا جو حصہ ان رودادوں میں نقل کیا گیا ہے، اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عموماً ان ہی ششگانہ عنوانوں کو محور بنا کر آپ تبلیغ کا حق ادا فرماتے رہے۔ دین کے ان اصولی عنوانوں میں سے ہر ایک کے متعلق سیدنا الامام الکبیر کے خصوصی افکار اور ان کی اچھوتی تعبیروں کی تفصیل کا صحیح اور موزوں مقام تو کتاب کا دوسرا حصہ ہے جو حضرت والا کے

"نظریات فائقہ"

کی تشریح و توضیح ہی کے لئے انشاءاللہ مرتب کیا جائے گا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس جلیل علمی و دینی خدمت کی سعادت کسے حاصل ہوتی ہے، اور توفیق ربانی کس کا انتخاب اس مہم کے لئے کرتی ہے، بجائے خود یہ ایک مستقل کام ہے۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ ٹھیک عصری تقاضوں کے مطابق دین کی تفہیم کا اس سے بہتر طریقہ شاید اس زمانہ میں سوچا بھی نہیں جا سکتا، ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ان اچھوتے اور نئے خیالات کا لباس بھی نیا کر دیا جائے، خدا ہی جانتا ہے کہ یہ کام کس کے لئے مقدر ہو چکا ہے۔

بہرحال "سیرت طیبہ" کے اس حصہ میں ان تقریروں اور بیانات کے صرف اس پہلو کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کی وجہ سے شاہجہاں پور کا دینی میلہ جسے آپ دیکھ چکے کہ اپنے دامن میں ہندو سوز فتنہ تک کی چنگاریوں کو چھپائے ہوئے تھا، سوچا گیا ہو، یا نہ سوچا گیا ہو لیکن میلہ کے جلسوں کی کارروائیوں کی رفتار ہی ایسی تھی، کہ غدر کے بعد غدر سے بھی زیادہ مہیب فتنے کا ہندوستان خدانخواستہ اگر شکار ہو جاتا، تو جو کچھ کہا جا رہا تھا، اور کیا جا رہا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے شاید وہ کوئی اچنبھے کی بات نہ ہوتی۔ اس سلسلہ میں مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا، تفصیل کے ساتھ اسے پیش کر چکا ہوں۔ آپ دیکھ چکے کہ پہلی دفعہ اسی میلے میں ہندوستان کے باشندوں کے ایک طبقہ یعنی ہندوؤں کے نمائندوں کو اسی ملک کے دوسرے دینی فرقہ مسلمانوں سے جدا کر کے عیسائی مذہب کے وکلاء یعنی پادریوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا گیا تھا، آج اس ملک میں اکثریت و اقلیت کا جو عفریت گرج رہا ہے، اس کی پرچھائیاں غالباً پہلی دفعہ اسی میلہ میں

احساسات کے سامنے نمایاں ہوئی تھیں، اور کون کہہ سکتا ہے، کہ اٹھارہ انیس سال پہلے جس ملک میں ہندو اور مسلمانوں نے مل کر عیسائیوں پر حملہ کیا تھا، اسی ملک میں انتقام کے اس تماشے کو کیا روکا جا سکتا تھا، کہ خود ہندو مسلمان باہم دست و گریبان ہیں۔ مگر اب اسے کیا کہئے، کہ وہ تماشہ تو کیا ہوتا، نتیجہ کی شکل میں جو نظارہ سامنے آیا، وہ اس سے مختلف اور قطعاً مختلف تھا، جس کی توقع میلہ کے بعد کی جا سکتی تھی، کہنے تو کہہ سکتے ہیں کہ وار ہی نہیں کہ خالی گیا، بلکہ جو کچھ آپ پڑھیں گے، اس کو پڑھ کر شاید ہر پڑھنے والا یہی کہہ سکتا ہے، کہ وار کو الٹ دیا گیا، گویا کہا جا سکتا ہے کہ لڑائی کے قانون ولا یحیق المکر السیئ الا باھلہ کی عملی تعبیر ایک دفعہ شاہ جہان پور کے اس میلے میں بھی قدرت کی طرف سے کی گئی، اور اب اسی دلچسپ سرگذشت کی میں تفصیل کرنا چاہتا ہوں۔

نہ ماننے والوں تک حق کے پہنچانے کا جو میدان اس میلے میں سیدنا الامام الکبیر کے سامنے آ گیا تھا، یہ واقعہ ہے کہ کسی کی رو رعایت کئے بغیر اگرچہ آپ سب کچھ اپنی ان تقریروں میں فرماتے رہے، عبادت کا مستحق صرف کائنات کا خالق ہے، اس مسئلہ کی تشریح و تبلیغ کرتے ہوئے صاف صاف لفظوں میں آپ اعلان کرتے رہے کہ خالق کے سوا مخلوقات خواہ ان کی نوعیت کچھ ہی ہو، جب مخلوق ہیں تو ان کی عبادت نہ نقلاً جائز ہو سکتی ہے، اور نہ عقلاً، آپ نے عیسائیوں اور ہندوؤں دونوں طبقوں کو خطاب کر کے کہا تھا۔

"ایسی صورت میں سوا خدا خالق کائنات کے، اوروں کی عبادت جیسے ہنود و نصاریٰ کرتے ہیں، بالکل خلاف عقل و نقل ہو گی۔"

پھر اس اجمال کی تفصیل کرتے ہوئے بھری مجلس میں آپ بار بار اس کا اعادہ فرماتے رہے، کہ

"خاص کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور سری رام چندر اور سری کرشن کو معبود کہنا یوں بھی عقل میں نہیں آ سکتا، کہ وہ کھانے پینے کے محتاج تھے۔ پاخانہ[1] پیشاب، مرض اور موت سے

---

[1] یہی لفظ تھا، جس پر پادری نولس صاحب نے نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپ پاخانہ پیشاب کا لفظ فرمائیں موتی میاں جو جلسہ کے مہتمم تھے انہوں نے یہ سن کر کہا کہ پاخانہ پیشاب نہ کہئے بول و براز کہئے۔ مشار باقی اگلے صفحہ پر)

مجبور تھے " ص۱۴ میلہ خدا شناسی

اور جیسے جیسے کھرے کھرے الفاظ میں "اسلامی توحید" کی منادی آپ کرتے رہے اسی طرح یہ مسئلہ کر

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب میں (یعنی سارے انبیاء و رسل میں) افضل سمجھتے ہیں اور بعد

خداوند عالم انہیں کو جانتے ہیں" ص۲۵ میلہ خدا شناسی

اور یہ کہ

"حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب میں افضل و اعلیٰ پایا" ص۲۱

پہلے سال کے میلے میں آپ نے ان ہی الفاظ میں اپنے دعوؤں کو پیش کیا، اور دوسرے سال کے میلے

میں بھی یہ دعوے کرتے ہوئے کہ

"یہ بات واجب التسلیم ہے کہ آپ (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) تمام انبیاء کے

قافلہ سالار اور سب رسولوں کے سردار اور سب سے افضل اور سب کے خاتم ہیں" ص۲۳

استدلال کا جو حق تھا، اسے ادا فرمایا، اور یہ میلہ جو ہندوؤں، عیسائیوں، مسلمانوں سے بھرا ہوا تھا بار بار مختلف

پیرایوں میں ان کے کان میں یہ ڈالتے رہے کہ

"آج کل نجات کا سامان بجز اتباع نبی آخر الزمان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کچھ

نہیں" ص۵۰ مباحثہ شاہجہاں پور

قطعاً غیر مشتبہ دو ٹوک الفاظ میں سناتے رہے کہ

"کوئی شخص اس زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر اوروں کا اتباع کرے، تو

بیشک اس کا یہ اصرار اور یہ انکار از قسم بغاوت خداوندی ہوگا، جس کا حاصل کفر و الحاد

ہے" ص۵۳ مباحثہ شاہجہاں پور

اور یہ فرماتے ہوئے کہ اب دین محمدی ہی کا وقت ہے، سب کو سنا دیا گیا کہ

(گزشتہ صفحہ سے) ایک دوسرے موقعہ پر بھی تمثیل میں پاخانہ کا لفظ سن کر پادری صاحب نے کہا تھا، میں جانوں پاخانہ کی مثال اچھی نہیں۔ ص۳۲

"عذابِ آخرت اور غضبِ خداوندی سے نجات اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں منحصر ہے۔

جن براہین اور دلائل کی روشنی میں ان اعلانات کو دونوں میلوں میں آپ نے پیش کیا تھا، آج بھی اپنی دل آویزیوں میں شاید وہ اپنی آپ نظیر ہیں، جن کے لئے ان روداروں کا مطالعہ کرنا چاہئے یا انتظار کیا جائے، سیرتِ قاسمی کے دوسرے حصہ کا جس میں ان ہی باتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش انشاء اللہ تعالیٰ کی جائے گی، اس باب میں سیدنا الامام الکبیر ایک مستقل فکری نظام کے بانی اور موجد ہیں، جدت طرازیوں کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ باوجود اس شدید نفرت کے جو انگریز اور انگریزی حکومت کی طرف سے آپ کے قلب مبارک میں تھی، عرض ہی کر چکا ہوں کہ ساری عمر آپ نے بٹن صرف اسی لئے استعمال نہیں فرمایا کہ بٹن کو انگریزوں کی برآمد کی ہوئی چیزوں میں آپ شمار فرماتے تھے۔ لیکن رسالتِ محمدیہ کی مذکورہ بالا خصوصیتوں کو سمجھاتے ہوئے، دوسرے وجوہ و اسباب۔ کے ساتھ ساتھ انگریزی حکومت کے انگریز وائسراؤں کا نام لے لے کر ایک سے زائد موقعوں پر تمثیلاً فرماتے تھے کہ

"جیسے اس زمانے میں باوجود تقررِ گورنر حال لارڈ لٹن، گورنر سابق لارڈ نارتھ بروک کے احکام کی تعمیل پر اگر کوئی شخص اصرار کرے اور لارڈ لٹن کے احکام کی تعمیل سے انکار کرے تو باوجود اس کے کہ لارڈ نارتھ بروک بھی سرکار ہی کی طرف سے گورنر تھا اس وقت یہ اصرار بیشک منجملہ بغاوت اور مقابلہ سرکاری سمجھا جائے گا۔" مٹک مباحثہ شاہجہان پور

کتنا دلچسپ لطیفہ ہے کہ بٹن کو جس نے کبھی اس لئے استعمال نہیں کیا کہ انگریزوں کا آوردہ ہے، وہی دینی ضرورت کے لئے لٹن انگریزی نام کو بے تحاشا دھڑلے کے ساتھ استعمال کر رہا ہے۔

بہرحال کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ماننے والوں کے ایسے مجمع میں جس میں مسلمان ہی مسلمان ہوں آدمی سب کچھ کہہ سکتا ہے لیکن سوچنا چاہئے کہ ماننے والوں کے ساتھ جس محفل میں نہ ماننے والوں کی بھی کافی تعداد ہو، اور کافی کیا معنی، اپنے محلِ وقوع کے لحاظ سے عرض کر چکا ہوں کہ اکثریت اس میلے میں نہ ماننے والوں ہی کی تھی، جو یہاں صرف سن لینے ہی کے لئے جمع نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ تنقید و اعتراض کا

حق بھی غیر اسلامی مذاہب کے نمائندوں کو حاصل تھا۔ مگر دیکھ رہے ہیں، آپ کی تقریروں پر کسی قسم کے دباؤ کا ہلکا سا اثر بھی محسوس ہوتا ہے، یقیناً خالص مسلمانوں کے مجمع میں جو کچھ کہا جا سکتا تھا، وہی سب کچھ مختلف مذاہب و ادیان کے ماننے والوں کی اس بھیڑ میں بے دھڑک کسی رنگ آمیزی کے بغیر آپ فرماتے رہے، مداہنت کی تو خیر گنجائش ہی کیا تھی، سچی بات تو یہ ہے، کہ اس معاملہ میں آپ نے رواداری اور مسامحت سے بھی کام نہ لیا، یہی نہیں، بلکہ جہاں ایک موقعہ پر آپ نے یہ فرماتے ہوئے کہ

"دو مذہبوں کو تو ہم یقیناً دین آسمانی سمجھتے ہیں، ایک دین یہود اور دوسرے دین نصاریٰ" ص۵

اسی کے مقابلہ میں ہندوؤں کے سامنے ان کے ہندو دھرم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"اس کی نسبت اگرچہ یقیناً ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ دین بھی آسمانی ہے" ص۱۳

گویا ہندو دھرم کے مقابلہ میں عیسائی دین کے ترجیحی پہلو کے اعتراف کی یہ ایک شکل تھی لیکن ایک دوسرے موقعہ پر جب توحید کے مسئلہ پر گفتگو ہو رہی تھی، ارشاد ہوا تھا کہ خالق کائنات کی وحدت کا عقیدہ ایک ایسا عقیدہ ہے جس سے

"کسی ملت اور مذہب والوں کو اس سے انکار نہیں"

اپنے اسی عام دعوے کی تشریح میں ہندوؤں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے جہاں یہ فرمایا تھا کہ

"وہ گو بت پرست اور اوتاروں کے پوجنے والے ہیں، پر جوتی سروپ نرنکار ایک ہی کو کہتے ہیں" ص۱۲

وہیں عیسائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ

"رہے نصرانی، وہ اگرچہ شرک میں سب سے اول نمبر ہیں، اور مشرک تو مشرک صفات ہیں، پر نصرانی تو مشرک ذات ہیں، یعنی ذات کے مرتبہ میں تین خداؤں کے قائل ہیں" ص۱۲

مطلب جس کا یہی ہوا کہ ہندوؤں کے مقابلہ میں عیسائیوں کا جرم زیادہ سخت اور زیادہ شرمناک ہے حالانکہ جس زمانہ میں یہ فرمایا گیا تھا، یاد ہوگا اسی زمانہ میں ہندوؤں کے آریہ سماجی گروہ کے پیشوا

پنڈت دیانند کہتے پھرتے تھے کہ" دنیا کی تمام بت پرست قوموں میں سب سے بڑے بت پرست مسلمان ہیں" لیکن سیدنا الامام الکبیر کا مقام اس قسم کی مخاصمتوں، یا بے جا جانب داریوں سے بلند اور بہت زیادہ بلند تھا، جس قوم یا مذہب میں آپ کے نزدیک واقعہ کی رو سے جو کچھ پایا جاتا تھا، صرف اس کا اظہار کر رہے تھے۔ نہ آپ عیسائیوں کو خوش کرنا چاہتے تھے، اور نہ ہندوؤں سے انتقام کا مسئلہ آپ کے سامنے تھا۔ اپنے عقیدے کی رو سے جو چیز جس رنگ میں آپ کے سامنے تھی، سننے والوں کے رجحانات سے آزاد ہو کر اسی کو پیش کر رہے تھے۔

تاہم دونوں میلوں کی روداددں میں آپ کے بیانات اور تقریروں کے اثر کو جن الفاظ میں پہنچانے والوں نے ہم تک پہنچایا ہے آئیے اور دیکھئے، وہ کتنا حیرت انگیز اور سوچئے تو عبرت خیز ہونے کے ساتھ ساتھ آج بھی اسلامی ہند والوں کے لئے کتنا سبق آموز ہے۔

ظاہر ہے کہ چاند اپور کے اس میلے میں جو مذہب کے نام سے قائم کیا گیا تھا، اس میں شریک ہونے والے عموماً ہندو مسلمان اور عیسائی تھے۔

مسلمان جس حد تک حضرت والا کی تقریروں سے متاثر ہوئے ہوں ان کے متعلق تو خیر پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ بقول صاحب روداد

"مسلمانوں کی جو کیفیت تھی سو تھی" مذاکرہ میلہ خدا شناسی

غالباً اسی کیفیت کی تفصیل کی گئی ہے کہ

"لوگوں پر کیفیت تھی، ہر کوئی ہمہ گوش ہو کے مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کی جانب تک رہا تھا، کسی کی آنکھوں میں سنتے ہیں آنسو، کسی کی آنکھوں میں حیرت" ص۲۵

مسلمانوں کے دل کی باتیں تھیں، جو کچھ وہ چاہتے تھے، وہی ان کو سنایا جا رہا تھا، ان کے عقائد اور مسلمات دلائل و براہین کے زیوروں سے آراستہ پیراستہ ہو کر ان کے سامنے پیش ہو رہے تھے۔ جو حال ان پر طاری ہوتا، اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے۔ جوش میں ایسے الفاظ اگر ان میں سے کسی کی زبان پر جاری ہو گئے ہوں، جیسے اس وقت میں ایک کالے پادری نے خواہ مخواہ اپنی غلط متعلق دانی کا ثبوت پیش کیا، اور

سیدنا الامام الکبیر نے اس کے مقابلہ میں کچھ کہنا چاہا تو لکھا ہے کہ

"مولوی احمد علی صاحب ساکن نگینہ نے روکا اور یہ کہا کہ کس کے مقابلہ میں کھڑے ہوتے ہو'

حق واضح ہو گیا' پھر کا ہے کو اٹھتے ہو" ملٹ ۲۹ میلہ خدا شناسی

اسی طرح عیسائیوں میں جو کالے پادری تھے ان کے متعلق تو نہیں' لیکن نولس صاحب اور اسکاٹ صاحب

جو یورپین نژاد پادری تھے' ان کے متعلق اس قسم کی باتیں نقل خصت ہوتے ہوئے نولس صاحب نے

حضرت والا سے کہا تھا

"آپ کے اخلاق کو سن بہت خوش ہوا' پھر نام و نشان مکان پوچھا"

یا بیان کیا ہے کہ

"تھوڑی دیر بعد موتی میاں صاحب نے آکر فرمایا' پادری کہتے تھے کہ گو یہ صاحب یعنی مولوی

محمد قاسم صاحب ہمارے خلاف کہتے تھے' پر انصاف کی بات یہ ہے کہ ایسی تقریریں اور ایسے

مضامین ہم نے نہ سنے تھے" (میلہ)

یا ان ہی موتی میاں کے حوالے سے یہ روایت درج کی گئی ہے کہ انہوں نے

"مولوی محمد قاسم صاحب سے فرمایا کہ پادری اسکاٹ صاحب آپ کی تعریف کرتے تھے' اور

کہتے تھے کہ اس شخص کی باتیں بہت ٹھکانے کی ہیں' یہ مولوی نہیں یہ صوفی مولوی ہے"

ملٹ مباحثہ شاہجہان پور

اس سے بھی زیادہ دلچسپ بیان ایک یورپین پادری نیگ نامی کا ہے۔ بریلی کے رہنے والے مولوی

عبدالوہاب سے ایک دن اس نے اقرار کیا کہ خدا شناسی کے اس میلہ میں میں بھی شریک تھا' کہتا تھا کہ

بہت سے اس قسم کے جلسوں میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا' اور بہت سے علماء اسلام سے اتفاق گفتگو

ہوا' پر نہ یہ تقریریں سنیں' نہ ایسا عالم دیکھا۔ ایک دبلا پتلا آدمی میلے کپڑے' یہ بھی معلوم نہ ہوتا تھا کہ یہ

کچھ عالم ہیں' ہم جی میں کہتے تھے کہ یہ کیا بیان کریں گے۔ لیکن تقریر سننے کے بعد اپنے تاثر کا اظہار

مولوی عبدالوہاب کے سامنے اسی نے ان الفاظ میں کیا تھا کہ

"ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ حق کہتے تھے، پر اگر تقریر پر ایمان لایا کرتے تو اس شخص کی تقریر پر ایمان لے آتے" ص۲۲ میلہ خداشناسی [1]

مگر باایں ہمہ ان ہی روداروں میں عام پادریوں (خواہ گورے ہوں یا کالے) کے متعلق یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حضرت والا کی تقریر کے بعد دیکھا جاتا تھا کہ

"پادریوں کی یہ حالت کہ ششدر و بے حس و حرکت" ص۲۵ میلہ

یا خاص پادری نولس صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"قصہ کوتاہ مولوی محمد قاسم صاحب کی خوش بیانی اور پادری صاحب کی افسردگی قابل دید تھی" ص۳۵ میلہ خداشناسی

اور اس کا تجربہ تو عموماً کیا گیا کہ اختتام وقت کو بہانہ بنا کر عموماً اکثر تقریروں میں پادریوں نے کوشش کی، کہ جس طرح ممکن ہو، سیدنا الامام الکبیر کی تقریروں کو مکمل ہونے نہ دیا جائے۔ پادری نولس نے تو یہ حد کردی کہ پہلے میلے کے پہلے اجلاس ہی میں آپ کے رنگ ڈھنگ کو دیکھ کر وہ اس دیدہ دلیری پر اتر آیا کہ دوسرے دن کا اجلاس جب شروع ہوا اور سیدنا الامام الکبیر نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ

"پادری صاحب کے ذمہ ہمارے کل کے اعتراض باقی ہیں، بغرض اتمام کلام ان کا جواب اول چاہیئے"

تو انتہائی بے شرمی سے کام لیتے ہوئے، بغیر کسی حجاب کے لکھا ہے کہ پادری نولس نے جواب میں کہا کہ

"کل کی بات کل کے ساتھ گئی" ص۴۶

پادری صاحب کی اس سینہ زوری کہئے، یا منہ زوری پر لکھا ہے کہ مسلمانوں میں کافی برہمی پیدا ہوگئی تھی،

---

[1] اسی پادری نے یہ بھی اسی موقع پر کہا تھا کہ تقدیر کے مسئلے کو پادری چھیڑتے ہیں جب کوئی تدبیر غلبہ کی باقی نہیں رہتی، پادری نولس نے لاچار ہو کر یہ باتیں شروع کی تھیں، کہتا تھا کہ پر اس شخص (یعنی سیدنا الامام الکبیر) نے ایسا ان سب کو اڑایا کہ پتہ نہ لگنے دیا۔ ۱۲

لیکن سیدنا الامام الکبیر نے مجمع کو تھاما' اور اعلان کیا کہ

"صاحبو! کل کے ہمارے اعتراضوں کا جواب پادری صاحب عنایت نہیں فرماتے ہم کو پادری صاحب کے انصاف سے یہ توقع نہ تھی' مگر جب نہیں مانتے تو کیا کیجئے بمجبوری ہم صبر کرتے ہیں' اور تازہ گفتگو کی اجازت دیتے ہیں" ملا میلہ خدا شناسی

بجائے مباحثہ و مناظرہ کے میلہ کو حق کی تبلیغ کا ذریعہ بنالیا جائے سیدنا الامام الکبیر کے اس نقطۂ نظر کی تائید آپ کے اس طرز عمل سے بھی ہوتی ہے۔

اس طرح دوسرے میلے کے موقعہ پر بھی حالانکہ حضرت والا کی طرف سے کہنے والوں نے لاکھ کہا کہ

"دو چار منٹ چار بجنے میں باقی ہیں' ان ہی میں ہم کچھ کہہ لیں گے"

مگر بیان کیا ہے کہ

"پادریوں نے ایک نہ سنی"

اور جلسہ سے اٹھ کر جانے لگے' اور اس بے ترتیبی سے اٹھ کر بھاگے' کہ بقول صاحب روداد'

"سراسیمگی اور پریشانی میں جو رنج پنہانی کے باعث پادریوں کو لاحق تھی' پادری نوٹ اپنی بعض کتابیں بھی وہیں چھوڑ گئے' ان کے اٹھانے کا بھی ان کو ہوش نہ رہا" مباحثہ

اسی موقعہ پر سیدنا الامام الکبیر نے جب اعلان کیا کہ پادری نہیں ٹھہرتے ہیں' تو نہ ٹھہریں۔ ہم اپنی طرف سے بیان کئے دیتے ہیں' تو اپنی تہذیب کا یہ نمونہ پادریوں نے پیش کیا کہ

"بغرض برہمی جلسہ شور کرنا شروع کر دیا" ملا

بہر حال عیسائیوں کا جو عنصر میلہ میں شریک تھا' اس پر تو سیدنا الامام الکبیر کی تقریروں کا جو اثر مرتب ہو رہا تھا۔ اس کا اندازہ مذکورہ بالا مثالی واقعات سے ہو سکتا ہے۔

لیکن مسلمانوں کے مقابلہ میں جیسے پادری تھے' ظاہر ہے کہ یہی حیثیت ہندوؤں کی بھی اس مذہبی میلہ میں تھی' بلکہ آپ سن چکے کہ بتدریج مسلمانوں سے الگ ہوتے ہوئے ہندو دھرم کے نمائندوں کا

یہ طبقہ تقریباً عیسائیوں ہی میں مدغم و مندمج ہو چکا تھا۔ لیکن عام ہندوؤں کے تاثرات آپ کی تقریروں سے عیسائیوں کے تاثرات و احساسات سے اس درجہ مختلف ہیں کہ حیرت ہوتی ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ہی کمان سے جو تیر نکل رہے تھے، دو مخالف طبقات میں ان ہی کے تاثیری نتائج میں اختلاف اور اتنا شدید اختلاف کیسے پیدا ہو گیا تھا۔

سیدنا الامام الکبیر کی تقریروں کا جو رنگ تھا، اسے بھی دیکھ چکے، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان میں عیسائیوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کی دل دہی، یا جانب داری کی کوشش کی جاتی تھی، تقریروں کا خلاصہ ان روداروں میں آج بھی موجود ہے، جو بھی ان کو پڑھے گا، وہ اسی نتیجہ تک پہنچے گا، اور یہ ماننے پر مجبور ہو گا کہ اس قسم کی وقتی سخن سازیوں سے سیدنا الامام الکبیر کی تقریریں قطعاً منزہ اور پاک ہیں۔ اعتراضات آپ نے کئے، تو دونوں ہی پر کئے، اور ترجیحی پہلوؤں کی طرف جو اشارے آپ کی تقریروں میں کئے گئے ہیں۔ اس معاملہ میں بھی کسی ایک فرقہ کی کوئی خصوصیت نہیں۔ بلکہ جس مذہب میں اس نوعیت کی جو چیز پائی جاتی ہے۔ جہاں جہاں اس کے ذکر کا موقعہ ملا ہے، انتہائی فراخ چشمیوں کے ساتھ ان کا اقرار کیا گیا ہے۔ نمونہ کی مثالیں پیش بھی کر چکا ہوں۔

میلہ میں شریک ہونے والے عام ہندوؤں کے ان عجیب و غریب تاثرات کی تفصیل تو آگے آ رہی ہے، مگر ان کے ذکر سے پہلے سوچنے کی بات یہی ہے کہ دو مختلف مذاہب کے ماننے والے فرقوں کے تاثر کے اس اختلاف کی آخر توجیہ کیا کی جائے، خود ان تقریروں اور جو کچھ ان تقریروں میں بیان کیا جاتا تھا، اس میں تو اثر پذیریوں کے اس اختلاف کا سراغ نہیں ملتا، پھر کیا سمجھا جائے؟

کیا حضرت والا کے باطنی تصرفات کا نتیجہ اس کو قرار دیا جائے۔ اس سلسلہ میں جن معلومات کا تذکرہ گذشتہ اوراق میں کیا گیا ہے، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ توجیہ بھی ناقابل لحاظ نہیں ٹھیرائی جا سکتی۔ اپنے وقت میں باطنی تصرفات و کرامات کی مرکزی ہستی حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت جس کے متعلق یہ ہو کہ ولایت کی باطنی نعمت سے نوجوانی ہی میں

سرفراز ہو چکے تھے۔ اسی سے اس باطنی نعمت کے ثمرات و آثار کا ظہور آخر محل تعجب کیوں ہو۔ صحیح طور پر تو یاد نہیں رہا کہ براہ راست حضرت شیخ الہند سے خاکسار نے سنا تھا، یا بالواسطہ یہ روایت مجھ تک پہنچی ہے کہ ایک خاص موقعہ پر سیدنا الامام الکبیر کو خدا شناسی کے میلے کی ان ہی تقریروں میں سے کسی تقریر میں اپنے قلب کے اس لاہوتی رخ سے کام لینا پڑا تھا۔[1] بلکہ ان ہی روداد وں میں

---

[1] جہاں تک یاد پڑتا ہے، واقعہ کی نوعیت یہ بیان کی گئی تھی کہ بے بس ہو کر پادری نولس نے تقدیر کے مسئلہ کو چھیڑ دیا اور کہنے لگے کہ تقدیر کی تعلیم دینے کی وجہ سے اسلام اپنی افادیت کو کھو چکا ہے، جو کچھ تقدیر میں لکھا جا چکا ہے۔ بندہ اسی کے کرنے پر جب مجبور ہے، تو دین کی تبلیغ و تکلیف کا فائدہ ہی کیا باقی رہا، پہلے سال کی روداد میں اس کا تذکرہ کیا بھی گیا ہو شاید کسی موقعہ پر خود میں نے بھی اس کی طرف کہیں اشارہ کیا ہے، لکھا ہے کہ نولس صاحب نے جب تقدیر کے مسئلہ کو چھیڑا، تو سیدنا الامام الکبیر نے یہ فرماتے ہوئے کہ پادری صاحبوں کا دستور ہے کہ جب کچھ بن نہیں پڑتی تو مسئلہ تقدیر کو لے بیٹھتے ہیں یہ آخری چال اور آخری تدبیر ان صاحبوں کی ہوتی ہے، پادری صاحب کی مغلوبیت کی پیشانی ہے جو اس مسئلہ کی نوبت آئی۔ اسی کے بعد آپ نے کہا کہ مگر بنام خدا ہم بھی انشاء اللہ اس کا جواب شافی دیتے ہیں" ملک صاحب روداد نے آپ کی اس تقریر کو نقل بھی کیا ہے۔ حضرت شیخ الہند سے جو روایت اس باب میں مجھ تک پہنچی ہے وہ یہی ہے کہ "ہم جواب شافی دیتے ہیں" یہ کہتے ہوئے کہ جب حضرت الاستاذ نے تقریر شروع کی، تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ایک گرہ مسئلہ کی کھلتی چلی جاتی ہے، ایک لاینحل عقدہ اتنی آسانی سے حل ہو گیا کہ خواص ہی نہیں، جلسہ میں عوام کا جو مجمع تھا، ہر ایک مطمئن نظر آتا تھا۔ اختتام جلسہ کے بعد میں نے اور مولوی احمد حسن امروہوی نے آپس میں کہا کہ آج حضرت نے عجیب و غریب تقریر کی ہے اس کو فوراً قلم بند کر لینا چاہئے، جب ہم دونوں قلم بند کرنے کے لئے بیٹھے اور آپس میں گفتگو ہونے لگی، تو پتہ چلا کہ بعض پہلو اس تقریر کے بعد بھی ہم لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے۔ حضرت الاستاذ کو اس کا ذکر ہم لوگوں نے کیا اور عرض کیا کہ جلسہ میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی قسم کی کوئی پیچیدگی اس مسئلہ کے متعلق باقی نہ رہی، مگر بحث کے بعد بعض الجھنیں نظر آتی ہیں کہ ہنوز باقی ہیں۔ اس پر کہتے ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر نے فرمایا تھا کہ تقریروں میں عام طور پر یہی کیا جاتا ہے کہ سننے والوں کی سمجھ پر وہ منطبق ہو، لیکن بضرورت کبھی یہ بھی کر لیا جاتا ہے کہ سننے والوں کی سمجھ ہی کو تقریر کے مطابق بنا لیا جاتا ہے، گویا اشارہ کیا گیا کہ جلسہ میں شاید اسی قسم کے تصرف سے کام لیا گیا تھا، اسی سلسلہ میں ایک عجیب لطیفہ جس کا اسی روداد میں تذکرہ کیا گیا ہے کہ اختتام جلسہ کے بعد ایک صاحب جو مرزا موحد کے نام سے مشہور تھے وہ پادری نولس کے خیمہ میں پہنچے، شاید پہلے سے دونوں میں جان پہچان تھی، کیونکہ مرزا صاحب رد نصاریٰ کی مہم کے حصہ داروں میں تھے۔ بہرحال پادری نولس سے مرزا صاحب نے کہا کہ "تقدیر کا ثبوت تو توراۃ میں موجود ہے، پھر آپ نے اسلام ہی کی طرف اس مسئلہ کو منسوب کر کے کیوں اعتراض کیا" نولس صاحب نے کہا کہ ہمارے یہاں دو فرقے ہیں، میرا تعلق عیسائیوں کے اس فرقہ سے ہے جو تقدیر کا منکر ہے ملخص روداد کے سوا ظاہر ہے جھگڑا ہی کیا تھا، اور ایک توراۃ کیا خدا کا اعتقاد جس مذہب میں بھی (باقی اگلے صفحہ پر)

شاہ جہاں پور کے منصف صاحب کا جو قصہ نقل کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم منصف صاحب مسلمان تھے، یا ہندو۔ میلے کے کسی جلسہ میں وہ بھی آکر شریک ہوئے۔ اتفاقاً اس وقت گفتگو انجیل کے اسی فقرے کے متعلق ہو رہی تھی، جس میں مسلمانوں کے مولوی تو مدعی تھے کہ یہ جعلی فقرہ ہے، بعد کو بڑھا دیا گیا ہے۔ ثبوت میں وہ خود انجیل کے اس مطبوعہ نسخہ کو پیش کر رہے تھے، جس کے حاشیہ میں چھاپنے والے پادریوں کی طرف سے لکھ دیا گیا تھا کہ

"یہ الفاظ کسی قدیم نسخہ میں نہیں پائے جاتے"

خود پادری نولس صاحب نے بھی اقرار کر لیا تھا کہ

"بیشک یہ فقرہ زائد ہے، اور جو کچھ پادریان مرزاپور نے حاشیہ پر لکھا صحیح و درست ہے" ص۲۲ مباحثہ شاہ جہاں پور

اسی مسئلہ پر گفتگو ہو رہی تھی، ایسا وثیقہ جس میں جعلی فقرہ ثابت ہو جائے کہ باہر سے ملا دیا گیا ہے بطور مثال کے اسی کا ذکر کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر فرما رہے تھے کہ تماشا ہے کہ مقدمات دنیاوی میں تو ایسی دستاویزیں قابل اعتبار نہ رہیں، حالانکہ متاع دنیا اہل عقل کے نزدیک

"چنداں قابل اہتمام نہیں، اور مقدمہ دینی میں ایسی دستاویز مخدوش لائق اعتبار ہو جائے" ص۲۲

لکھا ہے کہ یہ فقرہ زبان مبارک سے جس وقت نکل رہا تھا، تو دیکھا گیا کہ ہزاروں انسانوں کے اس مجمع میں منصف صاحب جو بیٹھے ہوئے تھے سیدنا الامام الکبیر ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پادری نولس کو خطاب کر کے فرما رہے ہیں کہ

"اس مقدمہ میں ہمارے آپ کے حکم منصف صاحب ہی رہے، اور دل کے مقدمات اور جھگڑے بھی یہی فیصل کرتے ہیں"

صرف یہی نہیں بلکہ براہ راست منصف صاحب کی طرف رخ کر کے یہ بھی ارشاد فرمایا جا رہا تھا کہ

---

بلکہ نسخۂ مطبوعہ ہی پایا جاتا ہے کسی رنگ میں مسئلہ تقدیر کا ماننا اس کے لئے ناگزیر ہے، دیکھو التفصیل فی الطلولات ۱۲

"کیوں منصف صاحب آپ ہی فرمائیں۔ اگر کوئی دستاویز جعلی آپ کے یہاں آئے، اور
اس کا جعل کھل جائے، خود مدعی اقرار جعل کرے یا اور کسی طریقہ سے اس کا جعلی ہونا ثابت
ہوجائے تو قانون سرکاری اس کی نسبت کیا ہے اور آپ اس مقدمہ میں کیا فیصلہ فرمائیںگے؟"

غریب منصف حیران تھا کہ اس سارے مجمع میں کسی سابقہ معرفت کے بغیر میری منصفی اور میری شخصیت کا علم ان صاحب کو کیسے ہوگیا۔ لکھا ہے کہ واپسی کے بعد شاہ جہاں پور پہنچ کر منصف صاحب لوگوں سے کہتے تھے کہ

"میں ان کو (سیدنا الامام الکبیر کو) نہیں جانتا تھا اور وہ مجھ کو نہیں جانتے تھے۔ خدا جانے
انہوں نے مجھ کو کہاں سے پہچان لیا جو بار بار میری طرف مخاطب ہو کر کہتے تھے کہ منصف
صاحب آپ ہمارے حکم ہیں، آپ اوروں کے مقدمے فیصل کرتے ہیں، ہمارا مقدمہ بھی
آپ ہی فیصل کیجئے۔" ص۵۲

پھر اپوں والے مولانا محمد علی صاحب سے بھی منصف صاحب کی جب ملاقات ہوئی، تو ان سے بھی اپنے تعجب کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ

"مجھ کو بڑا تعجب ہوتا ہے کہ مولوی صاحب اور میری ملاقات کبھی نہیں ہوئی، پھر نہ معلوم
انہوں نے کس طرح مجھ کو پہچان لیا۔" ص۵۳ مباحثہ شاہجہانپور

بہر حال نہیں کہا جا سکتا کہ یہ منصف صاحب ہندو تھے یا مسلمان، لیکن منطق کی کتاب کے مصنف پانسو روپے انعام پانے والے پادری اسکاٹ صاحب تو قطعاً مسلمان نہ تھے۔ عیسائی، اور عیسائیوں کے پادری تھے، حضرت والا کی تقریروں سے متاثر ہو کر ایک دفعہ نہیں، بلکہ روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ بار بار مختلف موقعوں پر کہتے پھرتے تھے کہ

"مولوی صاحب (یعنی سیدنا الامام الکبیر) مولوی نہیں صوفی مولوی ہیں۔" ص۵۴

سمجھا جائے، تو ان الفاظ میں گویا حضرت والا کے اسی باطنی پہلو کا اعتراف پوشیدہ نظر آتا ہے، اور صحیح تو یہ ہے کہ مٹاتے ہوئے جس نے اپنے آپ کو اس حد تک مٹا دیا ہو کہ تقریر سے پہلے اپنے آپ کو ان

الفاظ میں روشناس کرارہا ہو کہ

"میری خستہ حالی پر نظر کیجئے، اس سے بھی کیا کم کہ مجھ کو بھی بمنزلہ ایک بھنگی سمجھئے۔"

اور کہہ رہا ہو کہ

"شادی کرنے والے کا بھنگی ہوتا احکام دنیا کے احکام کے قبول کرنے اور تسلیم کرنے میں مانع نہیں، اس کو کوئی نہیں دیکھتا کہ سنانے والا بھنگی ہے، غریب ہے، یا امیر عام لوگ ہوں، یا نواب، بھنگی کی زبان سے احکام پادشاہی سن کر سر نیاز خم کرتے ہیں۔" مسئلہ مباحثہ

ذات و صفات کے اختیار میں جس کی کوشش اس نوبت تک پہنچ چکی ہو، کہ پادری نولس جو حضرت کے علم و بیان سے غیر معمولی طور پر متاثر تھا، مداح تھا، اس نے جب آپ سے آپ کا نام و نشان دریافت کیا تو لکھا ہے کہ اس وقت بھی یہی بتایا گیا کہ خورشید حسین نام ہے ضلع سہارنپور کا رہنے والا ہوں مسئلہ میلہ خداشناسی جو نہیں جانتے ہیں، ان سے کیا کہئے! لیکن راہ کے چلنے والے تو یہی کہتے چلے آرہے ہیں کہ جو واقعی "عبداللہ" بن جاتا ہے، دیکھا یہی گیا ہے کہ "گفتہ، اوگفتہ اللہ" اس کے لئے اجر فقد بنا ہوا ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ بداعتقادی کے اس زمانہ میں اس کو خواہ مخواہ خوش اعتقادی قرار دینے پر اگر اصرار کیا جائے، تو یوں بھی ایک بات یہ سمجھ میں آتی ہے، کہ ہندو جوگو یا تاریخ میں مسلمانوں کے مقابلہ میں "مذہبی مباحثہ کے لئے پہلی دفعہ خداشناسی کے اس میلہ میں لاکر کھڑے کئے گئے تھے۔ پہلے سے خاص اغراض اس میلے کے پیچھے مان بھی لیا جائے کہ پوشیدہ نہ ہوں۔ پھر بھی عام حالات میں ہندو مذہب، اور ہندوؤں کے پیشواؤں کے متعلق جن خیالات کے اظہار کی توقع مسلمانوں کے عام مولویوں سے پادریوں کا طبقہ کر سکتا تھا، اور واقعہ یہی ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر کے رد کر دئیے جانے میں اگر خدانخواستہ کامیابی ہو جاتی، اور اس میلے میں مولا داد جیسے کالے پادری اور وہی جس نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شان گرامی میں اپنی یاوہ گوئیوں، اور ہرزہ سرائیوں سے مسلمانوں کے قلوب کو خواہ مخواہ اذیت پہنچائی تھی، کچھ اسی طرح کے ہلکے پھلکے، خام کار، ناتجربہ کار مولوی ادھر ادھر سے اکٹھے ہو جاتے تو کون کہہ سکتا ہے کہ ان سے پادریوں کی امید پوری نہ ہوتی، خصوصاً ایک ایسے زمانے میں جب پنڈت دیانند سرسوتی کے طرز عمل سے

زمین بھی تیار ہو چکی تھی، اور عرض کر چکا ہوں کہ نئی قائم ہونے والی حکومت کے بعد کتابیں بھی ہندو مذہب کی تنقید و اعتراض کے متعلق شائع ہو چکی تھیں، اور شمال و جنوب دونوں علاقوں میں مسلمانوں میں بولی جانے والی زبانوں میں کسی شیخ سلیم نامی صاحب کی "کتھا سلونی" یعنی ع کہو یہ کون دھرم ہے، ترجیح بند والی نظم اور دکنی زبان میں صفدر تخلص رکھنے والے کسی گمنام شاعر والی مسدس جس میں ٹیپ کا شعر ؎

یاد ہووے گر تمہیں ہم کو بتاؤ برہمن

کاہے کو پھرتے ہو ناحق پوجتے پتھر تمن

عام طور پر ملک کے طول و عرض میں پھیلائی جا چکی تھی، چاہئے تو کہہ سکتے ہیں، کہ کافی ہتھیار مسلمانوں میں گویا تقسیم ہو چکے تھے۔ ان حالات میں کیسے کہا جا سکتا ہے، ان بانٹے ہوئے ہتھیاروں کے استعمال کی نوبت خدا شناسی کے اس میلے میں نہ آتی۔ آخر مولا داد پادری مسلمانوں کو جب وہ سب کچھ سنا سکتا تھا، جو اس نے سنایا، تو ان مولویوں کو بھی کون روک سکتا تھا، اگر ہندوؤں کو وہی سب کچھ سنانے لگتے، جس کے سنانے کی توقع پادری کر سکتے تھے۔

اب یہ خدا کی طرف سے بات تھی، کہ روکنے کی تدبیروں کے باوجود سیدنا الامام الکبیر رک نہ سکے، اور ایک ہی میلے میں نہیں، بلکہ دوسرے سال کے میلے میں بھی عملاً آپ شریک ہوئے، شریک ہوئے کیا معنی؟ سچی بات تو یہ ہے، کہ اول سے آخر تک مسلمانوں کی طرف سے پہلا میلہ ہو یا دوسرا، گویا سمجھنا چاہئے، دونوں ہی میں آپ ہی آپ تھے، جو کچھ کہا، آپ ہی نے کہا، اور جو کچھ کیا، آپ ہی نے کیا، اس سلسلہ میں اور تو جو کچھ آپ نے کہا سنا، وہ تو خیر بجائے خود ہے، خاص کر ہندوؤں کے دین، اور دینی پیشواؤں کے ذکر کے جو مواقع پیش آئے، ان میں خود سوچنا چاہئے، اپنے اس کلی عقیدے کو پیش کرتے ہوئے کہ

"ہمارا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ اور ادیان و مذاہب اصل سے غلط ہیں، دین آسمانی نہیں ہیں"

جو یہ اعلان کر رہا ہو کہ

"دین ہنود اس کی نسبت اگرچہ ہم یقیناً نہیں کہہ سکتے، کہ اصل سے یہ دین بھی آسمانی ہے"

لیکن جیسے یقیناً نہیں کہہ سکتے، ساتھ ہی آپ نے یہ بھی فرمایا، کہ

"مگر یقیناً یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ دین اصل سے جعلی ہے۔ خدا کی طرف سے نہیں آیا"

اسی کے بعد ان قرآنی شواہد کو پیش کرتے ہوئے، جن میں اطلاع دی گئی ہے کہ خدائی نمائندوں سے کسی قوم وملت کو ان کے پیدا کرنے والے نے محروم نہیں رکھا، بھرے مجمع میں یہ کہہ رہا ہو کہ

"پھر یہ کیوں کر کہہ دیجئے کہ اس ولایت ہندوستان میں جو ایک عریض وطویل ولایت ہے کوئی ہادی نہ پہنچا"

اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ اضافہ

"کیا عجب ہے کہ جس کو ہندو صاحب اوتار کہتے ہیں، اپنے زمانہ کے نبی یا ولی یا نائب نبی ہوں"

اور اسی کے ساتھ قرآنی آیت جس میں بیان کیا گیا ہے کہ قرآن میں بعض رسولوں کا ذکر کیا گیا ہے، اور ایسے بھی انبیاء ورسل ہیں جن کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے یعنی منھم من قصصنا علیک ومنھم من لم نقصص علیک کو تلاوت کر کے اسلام اور مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے یہ فرما رہا ہو کہ

"کیا عجب ہے کہ انبیاء ہندوستان بھی ان ہی نبیوں میں سے ہوں، جن کا تذکرہ آپ سے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے) نہیں کیا گیا"

پھر یہی نہیں، بلکہ جیسے عیسائیوں کے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تقدیس وتنزیہ کی ذمہ داری مسلمانوں کے سپرد کی گئی، غلط عیسائیت یا کرشچانیٹی کی بدولت، یا غلط یہودیت کی راہ سے حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف ایسی باتیں جو منسوب ہو گئی ہیں جن کا انتساب ان کی برگزیدہ ذات کی طرف کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا، ان آلودگیوں سے حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی کو پاک کر کے دنیا میں پیش کرنا، یہ مسلمانوں کا دینی فرض ہے، ٹھیک اسی طرح ہندو مذہب کے جن پیشواؤں کی طرف ناسزا باتیں منسوب ہو گئی ہیں، ان سے تزکیہ وتطہیر کے فرض کو بھی خواہی اور احترامی جذبات کے ساتھ ان الفاظ میں ادا کر رہا ہو کہ

"جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف دعویٰ خدائی نصاریٰ نے منسوب کر دیا ہے، اور دلائل عقلی ونقلی اس کے مخالف ہیں، ایسے ہی کیا عجب ہے کہ سری کرشن اور سری رام چندر کی طرف بھی یہ دعویٰ

(خدائی وغیرہ کا) بدروغ منسوب کر دیا گیا ہو۔"

اور جیسے بنی اسرائیل کے بعض انبیاء حضرت داؤد و حضرت لوط علیہا السلام کی طرف یہود نے ناگفتہ بہ باتیں منسوب کی ہیں لیکن ان سے ان بزرگوں کا تبریہ و تنزیہ مسلمانوں کا دینی عقیدہ ہے، اسی طرح ہندو مذہب کے جن پیشواؤں کی طرف منسوب کرنے والوں نے کچھ اسی قسم کی نکوہیدہ، ناگفتہ باتیں منسوب کر دی ہیں، ان کا ذکر کرتے ہوئے، جو عیسائی پادریوں کو یہ سنا رہا ہو کر

"کیا عجب ہے کہ سری کرشن و سری رام چندر بھی ان عیوب مذکورہ سے مبرا ہوں، اوروں نے ان کے ذمے یہ تہمت (زنا و سرقہ) لگا دی ہو۔" ملک مباحثہ

آج سننے والے سیدنا الامام الکبیر کی ان تقریروں کے نہیں ہیں، اور نہیں کہا جا سکتا کہ جو کچھ ان مواقع پر آپ نے فرمایا تھا، بجنسہ اس کے قلم بند کرنے میں روداد کے مرتب کرنے والے کامیاب بھی ہوئے ہیں لیکن جب ہم جانتے ہیں کہ اس باب میں جو کچھ بھی فرمایا جا رہا تھا، کسی وقتی مصلحت کے زیر اثر نہیں کیا جا رہا تھا کیونکہ واقعات اور جو کچھ ان میلوں میں گذرا، ان کو ایک خاص نقطۂ نظر سے مرتب و مربوط کرنے کے بعد آج خواہ جس نتیجے تک ہم پہنچتے ہوں، لیکن عرض کر چکا ہوں کہ ایسی کوئی شہادت میرے پاس نہیں جس کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہو کہ پورے طور پر نہ سہی کسی نہ کسی حد تک سیدنا الامام الکبیر کو بھی خدا شناسی کے ان میلوں کے عقبی محرکات کا جن کا سراغ آج مل رہا ہے اندازہ ہو گیا تھا، بلکہ جہاں تک قرائن اور حالات کا تقاضا ہے ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان سے آپ قطعاً خالی الذہن تھے، ماسوا اس کے کچھ اسی میلے کی تقریروں ہی کی حد تک آپ کے مذکورہ بالا خیالات محدود نہیں ہیں۔ آپ کی دوسری کتابوں میں بھی یہی باتیں مختلف تعبیروں میں مل جاتی ہیں۔ وہی کتاب جس کا نام "جواب ترکی بہ ترکی" ہے، مختلف حوالے اس کتاب کے گذر چکے بھی ہیں۔ اس کتاب کے سرورق پر چھپا ہوا تو یہی ہے کہ حضرت والا کے تلمیذ سید مولانا عبدالعلی صاحب کی تصنیف ہے لیکن عموماً مشہور یہی ہے اور مصنف امام نے اس کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ

"مولانا (سیدنا الامام الکبیر) نے کچھ بیان فرمایا، اور کچھ تحریر شروع کی، جس کو مولوی

عبدالعلی صاحب نے بطرز جواب لکھا اور نام "جواب ترکی بہ ترکی" رکھا ہے ص۲۷
مطلب جس کا یہی ہے کہ ترتیباً نہ سہی لیکن مضموناً یہ کتاب درحقیقت خود حضرت والا ہی کی ہے۔ خود اسی کتاب میں یہ عبارت جو پائی جاتی ہے یعنی

"مزید تحقیق کو مکتوب دوم نمبر اول قاسم العلوم پر حوالہ کر کے یہ عرض کرتا ہوں" ص۲۹ جواب ترکی بہ ترکی

جو جانتے ہیں کہ "قاسم العلوم" حضرت والا کے چند خاص مکاتیب اور مقالات کے مجموعہ کا نام ہے، وہ اگر یہ سمجھیں کہ قاسم العلوم ہی کے مصنف کے قلم یا زبان سے یہ نکلا ہوا فقرہ ہے، تو ایسا باور کرانے کی یہ کافی وجہ ہے۔ کچھ بھی ہو، اتنا بہرحال اب بھی کتاب کے سرورق پر چھپا ہوا ہے کہ

"بایما حضرت حجۃ الاسلام والمسلمین جناب مولٰنا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند لکھے گئے۔"

نظر بوجوہ بالا اتنی بات مسلّم ہے کہ کتاب کسی نے لکھی ہو، لیکن اصل مضامین کی حد تک اس کتاب میں جو کچھ ہے، وہ سب حضرت والا ہی کے براہ راست مصدقہ افکار و مسلمات ہیں۔ اسی کی تعبیر ان الفاظ میں فرماتے ہوئے کہ

"ہم نے اب تک نہ وید کو برا کہا ہے، نہ پیشوایان دین ہنود کو برا کہا ہے، اور برا کہیں تو کیوں کہیں" ص۴

آگے جو یہ ارشاد ہوا ہے کہ ہندو دھرم کے

"پیشواؤں کو برا کہیئے تو ان کا کیا قصور۔"

یہ کتنی معقول اور انصاف کی بات ہے۔ فرض کیجئے کہ موجودہ نسلوں سے ان کی مسلمانوں کو تکلیف و اذیت بھی پہنچی، لیکن اس میں ان کے گذشتہ پیشواؤں اور بزرگوں کا کیا قصور ہے کہ موجودہ نسلوں کے اعمال کا بدلہ گزرے ہوئے بے قصور لوگوں سے لیا جائے۔ کاش دوسری قومیں بھی انصاف و عدل کے اس نظریہ کی رعایت کریں، اور موجودہ زمانہ کے مسلمانوں سے ان کو کوئی شکایت پیدا ہو تو وہ بھی اپنی عقلمندی کو محسوس کریں کہ مسلمانوں کے بزرگوں سے ان کی قبروں سے، ان کے مآثر سے انتقام لینے کا بھلا کیا مطلب

ہو سکتا ہے، چوٹ آپ کو پہاڑ سے اگر لگی ہے، تو گھر کا سل بٹہ اس کا بدلہ لینا خود ہی سوچئے کہاں تک انصاف کا، عقل کا، انسانیت کا تقاضا ہو سکتا ہے۔ اسی مقام میں نہیں، بلکہ اسی کتاب کے ابتدائی اوراق میں بھی اسی مسئلہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے، منشی اندرلال کو جنکے جواب میں یہ کتاب لکھی گئی ہے، سمجھایا گیا ہے کہ

"تمہارے بڑوں کو سنائیں، تو ان بے چاروں کا کیا قصور" ص۱۲

اور ٹھیک جیسے میلہ کے جلسوں میں سری کرشن، اور سری رام چندر جی کے متعلق آپ نے فرمایا تھا، اسی کتاب میں بھی ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"پھر یہ بھی خیال کر شاید اپنے زمانہ کے بزرگ ہوں، اور جو حرکات ناشائستہ ان کی طرف منسوب ہیں، عجب نہیں غلطی تاریخ کی ہو"

صرف پیشواؤں ہی کی حد تک نہیں، بلکہ ہندو دھرم کی اساسی کتاب وید کا تذکرہ کر کے اسی کتاب میں لکھا ہے کہ

"ویدوں کو برا کہئے، تو کیا ضرورت، اور پھر یہ احتمال کہ شاید کوئی مضمون الہامی ہو، اور شرک وغیرہ امور باطلہ کی تعلیم جو اس میں درج ہے، کیا عجب ہے، از قسم تحریف ہو" ص۱۲

بہرحال ہندوؤں کے دینی پیشواؤں، اور ان کی دینی کتاب وید کے متعلق جس کے عام احساسات کی نوعیت یہ ہو، سوچا جا سکتا ہے کہ اسی نے جس وقت میلے میں اپنے ان احساسات کو جو کم از کم پادریوں کی توقعات کے بھی قطعاً خلاف تھے، آخر جس زمانہ میں یہ پھیلایا جا رہا تھا کہ ہندو مذہب ہی نہیں، بلکہ جس زبان میں ہندوؤں کا مذہب ہے یعنی سنسکرت، مسلمانوں کو اس زبان سے ابدی نفرت رہی ہے، یا اسی قسم کی غلط فہمیوں سے لبریز معمور ماحول میں اچانک مسلمانوں کے ایک مسلم الثبوت عالم باعمل کی زبان مبارک سے مذکورہ فقرے نکل نکل کر کانوں سے جس وقت ٹکرا رہے ہوں گے، تو وقتی مصلحت کے تقاضوں کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا، بلکہ وہی واقعی آپ کے خیالات و احساسات تھے، قدرتاً لب و لہجہ کا جو رنگ، اور بیان میں زور و قوت کی جو کیفیت پیدا ہو جاتی ہے،

ایسی صورت میں نہ پادریوں کے چہروں کی افسردگی، و خستگی ہی محل تعجب ہو سکتی ہے، اور میلے میں عام ہندو

جو شریک تھے، ان میں اس کے برعکس آثار کا مشاہدہ اگر کیا گیا تھا تو یہی کیا یہ کوئی اچنبھے کی بات ہو سکتی ہے؟ بلکہ اسی کے ساتھ انصاف کی بات یہی ہے کہ گو خدا شناسی کے ان دونوں میلوں میں ہندوؤں یا ہندو مذہب کے نمائندے، پنڈتوں کی طرف سے بعض اشتعال انگیز اقدامات ضرور ہوئے۔ پادریوں کے ساتھ بتدریج ان کا مل جانا، ملجانا کیا معنی؟ ان ہی میں مدغم ہو کر کھپ جانا، ہندوؤں کے متعدد فرقوں کا نام لے کر ہر فرقہ کی طرف سے نمائندگی کا مطالبہ پیش کر کے اکثریت حاصل کرنے کی کوشش، رائے دہی کے مواقع میں عموماً پادریوں ہی کے ساتھ ان کا ہاتھ اٹھانا، یہ اور اسی قسم کے کام قوان کی طرف سے بھی ایسے کئے جا رہے تھے جن سے مقابل پارٹی کے نمائندے مشتعل ہو سکتے تھے۔ سیدنا الامام الکبیر نے منشی پیارے لال سے بطور شکایت کے کہا بھی تھا کہ پادریوں ہی کی طرف آپ لوگ ڈھل جاتے ہیں، ہندوؤں کے نمائندے جو کچھ کر رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے آخر جلسہ کے مہتمم موتی میاں صاحب سے بھی نہ رہا گیا تھا اور ترش رو ہو کر بول اٹھے تھے کہ

"پادری صاحبوں کے کہنے پر بے سوچے سمجھے ہاتھ اٹھا کر تسلیم کر لیتے ہیں۔ یہ بات سازش اور اتفاق باہمی پر دلالت کرتی ہے۔" مٹ

کوئی شبہ نہیں کہ تنگ ظرفی اور تنگ نظری چاہتی تو اسی ترش روئی کو بڑھاتے ہوئے نفرت اور دشمنی و عداوت تک پہنچا سکتی تھی، لیکن پہلی بات تو یہی تھی کہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا، ہندو مذہب کے نمائندوں کی طرف سے ہو رہا تھا، لیکن میلے میں عام ہندو جو شریک تھے، ان بے چاروں کا اس سے دور کا بھی تعلق نہ تھا، پھر ان پنڈتوں یعنی ہندو مذہب کے وکلاء کی طرف سے کرنے کی حد تک جو کچھ کیا گیا ہو، لیکن انہوں نے جو کچھ کہا، تقریر کی، یا تحریر پڑھی، اس میں ایسی بات شاید نہیں کہی گئی، جس سے مسلمانوں کو شکایت پیدا ہوتی، اب خواہ اس کی وجہ یہ ہو کہ واقع میں ان کی تقریروں اور تحریروں میں ایسی کوئی چیز تھی ہی نہیں، یا سنسکرت آمیز بھاشا والی زبان جو وہ استعمال کر رہے تھے، وہ پردہ پوش بن گئی۔

مگر برخلاف اس کے عیسائیوں کی طرف سے اول سے آخر تک وہی کیا گیا، اور وہی کہا گیا، جس سے نفرت و حقارت کی آگ قدرتاً مسلمانوں میں بھڑکتی رہی۔ ان کی سینہ زوریاں ہر ہر قدم پر اپنی برتری کا

اظہار اپنے قابوچی بننے پر اصرار، اپنی منہ زوریوں میں مسلمانوں کے پیغمبر ختمی مآب صلی اللہ علیہ وسلم تک کے متعلق جب ان کی طرف سے گندگیاں اچھالی جا چکی تھیں، تو اس کے بعد بات ہی کیا باقی رہ گئی تھی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ سوچ سمجھ کر یہ کیا گیا تھا، لیکن حالات کے قدرتی نتائج کا ظہور اگر اس شکل میں ہوا کہ گو مسلمانوں کے مقابلہ میں عیسائیوں کی طرح ہندو بھی اس میلے میں کھڑے ہوئے تھے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی طرف سے سب کچھ کرنے والے اور سب کچھ کہنے والے سیدنا الامام الکبیر ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ عیسائیوں ہی کو اپنا مدمقابل بنائے ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مذہب کے اساسی کلیات کی تشریح کرتے ہوئے جہاں جہاں ضرورت ہوئی ہے، وہاں آپ نے ہندو مذہب کے بعض عقائد کا بھی تمثیلاً ذکر کیا ہے۔ لیکن بایں ہمہ دونوں سالوں کے میلوں میں حقیقی نشانہ آپ کی تقریروں کا عیسائی ہی نظر آتے ہیں۔ یاد ہوگا کہ پہلے سال کے میلے کا پہلا دن جب ختم ہوا اور مولویوں کو آپ نے میلے میں گھوم گھوم کر تبلیغ کا حکم دیا، تو لکھا ہے، میں نے شاید پہلے بھی نقل کیا ہے۔ کہ

"چنانچہ واعظین (اسلام) نے جا کر علی الاعلان منادی اسلام و ابطال عیسائیت کو بیان کرنا شروع کیا" ص۲۱

ابطال کے کام کو عیسائیت ہی کی حد تک کیوں محدود رکھا گیا۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، کہ ہندوؤں کی طرف رخ مولویوں کی تقریروں کا نہ تھا۔ نیز اس قسم کے واقعات جن کا تذکرہ ان رودادوں میں کیا گیا ہے۔ مثلاً محی الدین لشاوری نامی ایک کالے پادری نے کسی ریاض الدین نامی شخص کی کتاب کا حوالہ پیش کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ حضرت مسیح ؑ میں الوہیت کی شان پائی جاتی تھی، یہی اسلامی عقیدہ ہے، ریاض الدین رومی نے یہی لکھا ہے، جو مسلمانوں کے معتبر پیشواؤں میں تھے، سیدنا الامام الکبیر نے اس کے جواب میں دوسری باتوں کے ساتھ اسی کالے پادری کو مخاطب کرتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ

"آپ بھی تو محی الدین لشاوری ہیں، آپ کی شکل و صورت مسلمانوں کی سی ہے، نیچی ڈاڑھی کرتہ پہنے ہوئے ہیں، نام بھی مسلمانوں کا سا ہے" ص۹۲ مباحثہ

جس سے اس جھنجھلاہٹ کا اندازہ ہوتا ہے، جو سیدنا الامام الکبیر کے قلب مبارک میں پادریوں کے اقوال واعمال سے طبعًا پیدا ہوگئی تھی اور جیسا کہ کہتے ہیں، چور کی داڑھی میں تنکے کی تلاش کرتا ہے، ہم ان عیسائی پادریوں ہی کو پاتے ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر کی تقریروں کا نشانہ وہ بھی اپنے آپ ہی کو قرار دیئے ہوئے تھے، ایک موقعہ پر اس کا تذکرہ فرماتے ہوئے کہ خالق تعالیٰ جل مجدہ کی ذات پاک کو مخلوقات سے کیا نسبت ؟ جب دو مخلوقوں، بلکہ دو آدمیوں کا حال یہ ہے کہ پادری صاحب کو کوئی اگر چمار کہہ دے، تو آپے سے باہر ہوجائیں، حالانکہ پادری صاحب اور چمار میں کیا فرق ہے۔ یہ بھی مخلوق، وہ بھی مخلوق، وہ بھی انسان یہ بھی انسان، ان کے پاس بھی دو آنکھیں ایک ناک اور دو کان، تو اس کے پاس بھی یہی سب کچھ، حالانکہ یہ ایک بالکل برجستہ تمثیلی بات تھی، لیکن لکھا ہے کہ یہی کالے پادری صاحب محی الدین پشاوری کھڑے ہوکر سیدنا الامام الکبیر کو براہ راست مخاطب بناتے ہوئے چلانے لگے کہ

"آپ نے کل بھی بعض کلمات سخت کہے تھے۔ اور آج بھی اب آپ نے بعض کلمات سخت بیان کئے" ملہ مباحثہ

یعنی کل انجیل کے الحاقی فقرے کو نجاست سے تشبیہ دی، اور آج پادری کو چمار سے تشبیہ دی گئی، لکھا ہے کہ چیں بجبیں ہوکر اس نے سیدنا الامام الکبیر کو خطاب کر کے یہ بھی کہا کہ

"ہم تمہارے سن وسال کا لحاظ کرتے ہیں"

بہرحال عیسائی جیسی کہتے تھے، ان روداد وں سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے ویسی نہیں، تو کچھ نہ کچھ اس جیسی بات کبھی کبھی ان کو سنا بھی دی جاتی تھی، لیکن اسی میدان مباحثہ میں مسلمانوں کے مقابلہ میں حالانکہ ہندو بھی صف آرا تھے، اور آپ دیکھ چکے کہ کرنے کی حد تک کافی اشتعال انگیز اقدامات ان کی طرف سے بھی مسلسل ہوتے رہے، لیکن ان کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر کا رویہ اول سے آخر تک دونوں ہی میلوں میں، میلوں کے ہر اجلاس میں، اجلاسوں کے اندر بھی، اور ان سے باہر بھی کچھ ایسا رہا کہ شاید صلح وعفو، درگذر کے سوا، ہم آپ کے اس رویہ اور روش کو کویا اور کچھ نہیں کہہ سکتے، کہنے والا چاہے، تو کہہ سکتا ہے کہ ان دونوں متقابل فرقوں میں سے ایک کے ساتھ یعنی عیسائیوں کے ساتھ

آپ کا جو طرزِ عمل تھا، جیسے وہ قرآنی حکم

| | |
|---|---|
| جزاء سیئة سیئة مثلها | برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی ہے۔ |

کی تمثیلی شکل تھی، اسی طرح قرآن میں اسی کے بعد قانون کے دوسرے پہلو کی طرف

| | |
|---|---|
| فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللّٰہ | اور جو عفو و صلاح کی بات کرے تو اس کا اجر اللہ پر ہے۔ |

کے الفاظ سے جو اشارہ کیا گیا ہے اس کا عملی تجربہ گویا اس سلوک سے کرایا جا رہا تھا، جو ہندوؤں کے ساتھ کر کے دکھایا جا رہا تھا، قرآنی قانون کے اسی دوسرے پہلو کا ثمرہ قرآن ہی میں جو یہ بتایا گیا ہے، یعنی اسی پہلو کی تعبیر

| | |
|---|---|
| ادفع بالتی ھی احسن | سب سے زیادہ بھلے طریقے سے جواب دو |

سے فرماتے ہوئے، اطلاع دی گئی ہے کہ

| | |
|---|---|
| فاذا الذی بینک و بینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم | تو اچانک وہ کہ تم میں اور اس میں عداوت تھی مخلص دوست ہو جائے گا۔ |

گویا ذمہ داری لی گئی ہے کہ "مدافعت بالحسنیٰ" پر بہرحال یہی نتیجہ مرتب ہو کر رہے گا، انسانی نفسیات کو ڈھالنے والے نے اسی سانچہ میں ڈھالا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں سیدنا الامام الکبیر کے خطبات اور تقریروں کے تاثیری نتائج ان دونوں قوموں پر قطعاً متخالف رنگ میں اگر نمایاں ہو رہے تھے، تو آپ خود ہی سوچئے کہ اس کے سوا دیکھنے والے اور دیکھتے کیا، دوسرے لفظوں میں چاہئے تو اس بنیاد پر کہہ سکتے ہیں کہ خدا شناسی کے ان میلوں کو قائم کرنے والوں نے خواہ جس مقصد و نیت سے قائم کیا ہو، لیکن سیدنا الامام الکبیر نے جیسے ان کو اسلام کے بنیادی حقائق کی تبلیغ کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ اسی طرح مذکورہ بالا قرآنی قانون کے ان دونوں پہلوؤں کی عملی تجربہ گاہوں کا قالب بھی ان ہی میلوں نے آپ کی بدولت اختیار کر لیا تھا۔ اب خواہ اسباب کچھ ہی ہوں، باطنی تصرفات کا نتیجہ سمجھا جائے، یا خلافِ توقع ہندو دھرم اور ہندو دھرم کے پیشواؤں کے متعلق سیدنا الامام الکبیر نے اپنے جن احساسات کا اظہار فرمایا یا بجائے مجازاۃ بالمثل کے

ہندوؤں کے ساتھ "مدافعت بالحسنیٰ" کے قرآنی حکم کے تجربہ کا یہ اثر تھا' یا واللہ اعلم بالصواب ان کے سوا کوئی اور بات ہو' مگر آنکھوں نے جو دیکھا تھا اور کانوں نے جو کچھ سنا تھا' ان رودادوں میں آپ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے' کہ ایک طرف جیسا کہ گذر چکا عیسائیوں کے متعلق تو عموماً یہی لکھا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی تقریروں کے بعد ششدر و حیران' سراسیمہ و پریشان نظر آتے تھے' کالے پادری ہوں' یا گورے سب ہی پر افسردگی چھا جاتی تھی۔ عموماً غصہ میں بھرے ہوئے الفاظ ان کی زبانوں سے نکلتے تھے۔ چین بجبیں ہو کر گفتگو کرتے' کہنا کچھ چاہتے تھے' اور منھ سے کچھ نکلتا تھا' بعض دفعہ تو ایسی صورتیں بھی پیش آئیں' جیسا کہ لکھا ہے کہ کالا پادری محی الدین پشاوری جو کئی دفعہ اپنی بے محل گفتگو سے پادریوں کو رسوا کر چکا تھا' جب تقریر کرنے کیلئے اٹھا' تو

"اور پادری ان کی طرف گھورنے لگے" ۵۴ مباحثہ

اسی سلسلہ میں یہ لطیفہ بھی پیش آیا' کہ امام فن مناظرہ مولوی ابوالمنصور نے باہم پادریوں کے اس رنگ کو دیکھ کر کہا کہ

"دیکھنا ان کو نہ کھڑا کرنا' نہیں تو پھر اسی طرح فضیحت کرائیں گے" مباحثہ

مرعوبیت کا حال یہ تھا کہ کالے تو کالے ایک یورپین نژاد گورے پادری جن کا نام جان ٹامسن صاحب تھا' لکھا ہے' کہ بولنے کے لئے کھڑے ہوئے' مگر

"ایک دو لفظ کہنے پائے تھے' کہ رہ گئے" ۵۵ مباحثہ

اور آگے کچھ بول نہ سکے' اپنی مغلوبیت کو محسوس کر کے شور اور ہنگامہ مچانے لگے' اور تو اور آخر میں تو پادری نولس تک کے متعلق لکھا ہے' کہ ان کا آخری سرمایہ بھی یہی رہ گیا تھا کہ

"چلا چلا کر اپنے مذہب کے فضائل بے دلیل بیان کرتے رہے" ۵۶ مباحثہ

بدحواسی میں اپنی کتابیں جلسہ میں چھوڑ کر بھاگے' مسئلہ تقدیر یا ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان کے گستاخانہ اشارے' اس قسم کی باتوں کو مذبوحی حرکات کے سوا اور کیا سمجھا جائے' مگر آئیے' اور دیکھئے ہندوؤں کا حال کیا تھا؟

ہندو مذہب کے نمائندے پنڈت دیانند یا منشی اندرمن کے ایسے اعترافات مثلاً رسالہ مباحثہ شاہ جہاں پور میں نقل کیا ہے کہ جلسہ برخاست ہونے کے بعد جب سیدنا الامام الکبیر اپنی فرودگاہ میں پہنچے، تو وہیں حاضر ہو کر

"موتی میاں، مولوی قاسم صاحب سے فرمانے لگے، کہ پنڈت دیانند سرستی اور منشی اندرمن آپ کی، اور مولوی منصور علی صاحب کی بہت تعریف کرتے تھے، اور دونوں صاحبان کی تقریر اور علم کے بہت مداح تھے" ص۵۵

اس کے متعلق تو کہا جا سکتا ہے، کہ اس قسم کی منہ دیکھی تعریف تو پادری نولس وغیرہ نے بھی کی تھی مگر نولس صاحب کی تعریف تو واقعی سیدنا الامام الکبیر کے سامنے منہ پر کی گئی تھی، اور پنڈت جی یا منشی جی کی تعریف منہ پر نہ تھی، بلکہ پیٹھ پیچھے موتی میاں کے آگے کی گئی تھی

اسی طرح ایک موقع پر جب پنڈت جی کے سوال کا جو صحیح مطلب تھا، پادری اسکاٹ نہ سمجھ سکے اور پنڈت جی کے منشا کی وضاحت سیدنا الامام الکبیر نے فرمائی، تو منشی پیارے لال کے ہمدم دیرینہ لالہ لکتا پرشاد کی زبان سے بے ساختہ یہ فقرہ نکل پڑا کہ

"ہاں مولوی صاحب یہی مطلب ہے جو آپ نے بیان کیا" ص۵٦

اسی طرح مقصد تخلیق پر سیدنا الامام الکبیر نے جو تقریر فرمائی تھی، تو ختم تقریر پر لکھا ہے، کہ یہی لالہ لکتا پرشاد تھے یا منشی پیارے لال بانی میلہ، بہرحال ان دونوں میں سے کوئی ایک بے اختیار ہو کر بول اٹھا تھا، کہ

"جواب اس کو کہتے ہیں" ص۲۲ مباحثہ

یا کہا کہ "جواب تو یہ ہوا"

سچ پوچھئے، تو میرے تعجب کا تعلق اس قسم کی چیزوں سے نہیں ہے، جلسوں میں مقرروں اور خطیبوں کے ساتھ عموماً ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، بلکہ حیرت میں مجھے جس چیز نے ڈالا ہے، وہ ان عام ہندوؤں کا حال ہے، جو دونوں سال کے میلوں میں شریک تھے، اور قرائن کا اقتضاء

یہی ہے کہ ہر سال کے میلے میں اکثریت ان ہی کی تھی۔

ایسی صورت میں سیدنا الامام الکبیر کی تقریروں کے متعلق جہاں جہاں ایسی خبریں دی گئی ہیں، مثلاً پہلے سال کی روداد کی وہی اطلاع جس کا شاید پہلے بھی کہیں ذکر گذرا ہے یعنی لکھا ہے، کہ

"یہی تقریر ہو رہی تھی، اور لوگوں پر ایک کیفیت تھی، ہر کوئی ہمہ تن گوش ہو کے مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کی جانب تک رہا تھا، کسی کی آنکھوں میں سنتے ہیں آنسو، اور کسی کی آنکھوں میں حیرت" ص۳۲ میلہ

اسی طرح دوسرے سال کے میلے کی روداد میں بھی آپ کی تقریر کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے، کہ

"ایسا زور وشور کا وعظ ہوا، کہ تمام جلسہ حیران رہ گیا ہے، اور ہر شخص پر سکتہ کا عالم تھا"

ص۹ واقعہ شاہ جہاں پور

اثر پذیریوں کی یہ تصویر جن الفاظ میں کھینچی گئی ہے، ان کا اقتضاء تو یہی ہے کہ حاضرین جلسہ کے کسی خاص طبقہ کے ساتھ ان کو مخصوص نہ سمجھا جائے، کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ "ہر کوئی" یا "تمام جلسہ" جیسے عام الفاظ سے ہندوؤں کو مستثنیٰ کر کے جلسے کے ان ہی شرکاء تک ان کو محدود کر دیں جو مسلمان تھے۔ خصوصاً جب یہ تسلیم کر لیا جائے، کہ اکثریت ان جلسوں میں ہندوؤں ہی پر مشتمل تھی، یوں بھی بیان خطابت کا جو تعلق عام انسانی احساسات کے ساتھ ہے، ان احساسات کو کسی خاص مذہب کے ماننے والوں ہی تک کیوں منحصر سمجھا جائے۔ مگر یہ حال تو اس وقت کا تھا، جب سیدنا الامام الکبیر کی تقریر ہوتی تھی لیکن تقریر سے فارغ ہونے کے بعد جو تماشے دیکھے گئے۔ اچنبھا تو ان ہی پر ہوتا ہے، بیان کرنے والوں نے بجائے اجمال وعمومیت کے صاف صاف واضح الفاظ میں ان کو بیان بھی کیا ہے، درحقیقت مقصود ان ہی کا تذکرہ ہے، ذرا ملاحظہ فرمائیے، لکھا ہے، کہ جلسہ جس وقت برخاست ہوا، تو

"باہر آتے ہی، مولوی محمد قاسم صاحب کے گرد ایک ہجوم تھا، ہندو مسلمان سب گھیری کھڑی تھی"

آگے اسی کے بعد ہے کہ

"مسلمانوں کی اس وقت جو کیفیت تھی سو تھی مگر ہنود بھی بہت خوش تھے، آپس میں کہتے تھے کہ نیلی لنگی والے مولوی نے پادریوں کو خوب مات دی" ملا مباحثہ

کیا عجیب بات ہے کہ پادریوں نے ہندو مذہب کے نمائندے پنڈتوں کو جلسہ کی حد تک تو ہم نوا بنالیا تھا۔ لیکن جلسہ سے باہر ہونے کے بعد ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ الٹ جاتا تھا، میلہ کے عام ہندو مسلمانوں کے ساتھ مل کر پادریوں کی ہزیمت و شکست کا گویا شادیانہ بجائے ہے تھے۔

یاد ہوگا، پہلے سال کے میلے میں یہ صورت جو پیش آئی تھی یعنی جلسہ کے برخاست ہونے کے بعد گھوم گھوم کر سیدنا الامام الکبیر کے اشارہ سے مسلمانوں کے مولوی اسلام کی منادی اور عیسائیت کا ابطال کر رہے تھے، تو اس موقعہ پر بھی نقل کیا ہے، کہ پادری جب سامنے آجاتے، تو ان کو دیکھ کر

"عوام بھی کہتے تھے کہ پادری صاحب ہم کو ہی دھمکاتے تھے اب تو کچھ بولئے"

اور یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ کہنے والے عوام میں مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندو بھی تھے، اسی کے بعد روداد میں تصریح بھی کر دی گئی ہے کہ

"اور جملہ ہنود بھی خوش تھے" ملا میلہ

اور اپنی خوشی کا اظہار پادریوں پر فقرے کس کس کر کرتے تھے۔

صرف یہی نہیں کہ جلسہ سے باہر نکلنے کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کا مجمع سیدنا الامام الکبیر کو گھیر لیتا تھا۔ بلکہ دوسرے سال کی روداد کے مرتب کرنے والے مولنا فخر الحسن گنگوہی جو اس سال کے میلہ میں خود بھی شریک تھے۔ اپنی یہ چشم دید شہادت بھی مولنا نے درج کی ہے کہ

"راقم الحروف نے دیکھا کہ اس وقت بعض ہندوؤں نے کہا کہ "واہ مولوی صاحب" اور بعض ہندو آتے تھے، اور مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کو سلام کرتے تھے" ملا مباحثہ

الغرض جلسہ کے اختتام کے بعد اسی قسم کے حیرت انگیز نظارے تھے، جو میلے میں دیکھے جا رہے تھے، غریب پادریوں کے لئے یہ سماں عجیب ہوگا۔ سوچا کیا گیا تھا، اور ہو کیا رہا ہے، لکھا ہے کہ میلہ اور میلہ کے میدان ہی تک نہیں، بلکہ لوگ میلہ کے منتشر ہونے کے بعد بھی اپنے اپنے گھروں کی طرف جس وقت لوٹ رہے تھے، تو جس راستہ سے سیدنا الامام الکبیر گذرتے،

"میلہ کے ہندو وغیرہ مناظران اسلام کی طرف اشارہ کرکے اوروں کو بتاتے کہ "یہ ہیں" " ص۲۳ میلہ

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر میلہ سے رخصت ہونے والوں کے کلام کا موضوع خاص سیدنا الامام الکبیر کی ذات مبارک اور آپ کی تقریریں بنی ہوئی تھیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب کسی ٹولی کے سامنے سے گذرتے، تو لوگ بتاتے کہ جس شخص کا ہم ذکر کر رہے تھے، وہ یہی ہیں۔

اور چاندا پور کے صحرائی میدان سے لوٹ کر شہر یعنی شاہ جہاں پور پہنچنے کے بعد بھی معلوم ہوتا ہے کہ میلہ میں شریک ہونے والوں میں یہی چرچا ہوتا رہتا تھا، لکھا ہے کہ شاہ جہاں پور کے

"بازاروں میں مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) اور ان کے رفقاء کو نکلنے کا اتفاق ہوا، تو ہندوؤں کا نمازوں کی بھی انگلیاں اٹھتی تھیں" ص۹۲ مباحثہ

الغرض آپ کی تقریروں کی تاثیری کیفیات، جلسوں ہی تک محدود نہ تھیں، بلکہ جلسوں کے بعد بھی، میلہ کے اندر میلے سے روانہ ہونے کے بعد راستوں میں اور شہر پہنچنے کے بعد بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ عام ہندوؤں میں تروتازہ تھیں، اور پادریوں کے مقابلہ میں جو کامیابیاں ہوئی تھیں، وہ مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ ہندو ان کو اپنی کامیابی بھی یقین کرتے تھے، اور فخر و مباہات کے ساتھ اپنی ان کامیابیوں کا ذکر کرتے رہتے تھے۔

لطف تو یہ ہے کہ شہر یعنی شاہ جہاں پور کے سوا جو لوگ دوسرے شہروں تک پہنچے، ان میں مسلمان ہی نہیں، بلکہ ہندو بھی، ملنے جلنے والوں سے اپنے تاثرات کا اظہار جن الفاظ میں کرتے تھے، وہ بھی سننے کے قابل ہیں، بریلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ چند کھتری جو اس میلہ میں شریک ہوتے

کے بعد میاں پہنچے، وہ باہم ہندوؤں سے سنا گیا کہ کہہ رہے تھے کہ

"مسلمانوں کی طرف سے ایک پتلا سا آدمی، میلے کپڑے، نیلی لنگی بغل میں دبی ہوئی بیان کرنے کھڑا ہوا، ایسی تقریر بیان کی کہ پادریوں کو کچھ جواب نہ آیا۔"[1]

صرف یہی نہیں، بلکہ یہی صاحب جنہوں نے کھتریوں کی یہ گفتگو سنی تھی، وہی کہتے تھے کہ آخر میں ان ہی کھتریوں میں سنا کہ کوئی اپنے قلبی تاثر کا اظہار ان الفاظ میں کر رہا ہے، یعنی سیدنا الامام الکبیر کی طرف اشارہ کر کے اس نے کہا کہ

"کوئی اوتار ہوں، تو ہوں تا ۹۲"

تقریباً یہ اسی قسم کی بات ہے، جو یورپین نژاد پادری اسکاٹ نے کہی تھی یعنی

"یہ مولوی نہیں، صوفی مولوی ہیں۔"

اسی طرح سہارنپور میں بھی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو ڈپٹی انسپکٹر تعلیمات تھے، ان سے ایک اچھے صاحب ذوق ہندو لیکھراج نامی کی ملاقات ہوئی، جو میلے کے بانی منشی پیارے لال کے خاص آشناؤں میں تھے۔ میلے میں وہ بھی شریک تھے، بہرحال لیکھراج نے مولانا ذوالفقار علی صاحب سے کہا تھا کہ

"ایک مولوی صاحب قاسم علی نام اسی طرف کے تھے، ان کا حال کیا بیان کیجئے۔"

پھر جو کچھ دیکھا اور سنا تھا، اس کی تعبیر اپنی خاص اصطلاح میں کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"ان کے (سیدنا الامام الکبیر کے) دل پر تو علم کی مستی برس رہی تھی۔" ص ۹۲

یہی سوچنے کی بات ہے، مسلمانوں کے مقابلہ میں پہلی دفعہ ہندوؤں کو اس میلے میں لا کر کھڑا کیا گیا تھا،

---

[1] مولانا اشتیاق احمد صاحب نے بیان فرمایا کہ مجھ کو میرے والد صاحب (شیخ ظفر احمد صاحب دیوبندی) نے بیان فرمایا کہ اسی زمانہ میں جب مباحثہ شاہجہانپور ہوا، شاہجہانپور کے کسی ہندو کا خط مولوی محمد منعم صاحب مظفرنگری وکیل کے پاس آیا۔ اس میں اس مباحثہ کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ایک مولوی جن کا حلیہ یہ تھا، دوپلی ٹوپی ایک پٹا پاجامہ، ٹخنے کڑ کی چال ودتانت کی رفتار، اس نے پادریوں کو نشانہ گیا کر یہاں کی (ہندوستان کی) ساری قوموں کی لاج رکھ لی۔ یہ خط مولوی محمد منعم صاحب کے پاس سے لایا گیا اور پڑھا گیا۔ ۱۲ محمد طیب غفرلہ

گھڑا کرنے والوں کا جو مطلب بھی ہو' قرائن وقیاسات سے اس سلسلہ میں جن باتوں کا پتہ چل سکتا تھا۔
تفصیلاً نہیں پیش کر چکا ہوں' لیکن کچھ بھی ہو' اس کی بھلا کون توقع کر سکتا تھا' کہ مسلمانوں کے نمائندے
مولوی کو اوتار تک کے درجہ تک پہنچانے والے اسی میلہ میں پیدا ہو جائیں گے' اور سرستی یعنی
علم کی دیوی' یا کہئے تو کہہ سکتے ہیں کہ روح القدس کا تائید یافتہ وہی ہندوؤں کو نظر آنے لگے گا'
اسی سلسلہ میں ایک ہندو جوگی کی داستان کتنی دلچسپ ہے' پہلے سال کے میلہ کا قصہ ہے
میلہ جب اکھڑنے لگا' اور واپسی کے وقت مسلمانوں کے اصرار سے بجائے پیادہ پا چلنے کے بہلیاں
جن پر شاہ جہان پور سے لوگ آئے تھے ان ہی میں سے ایک بہلی پر سیدنا الامام الکبیر کو بھی سوار ہونے
پر مجبور کیا گیا' اور قطار باندھ کر بہلیاں شہر کی طرف جا رہی تھیں۔ لکھا ہے' کہ میلے سے تھوڑی دور بہلیوں
کی یہ قطار پہنچی تھی' دیکھا گیا جیسا کہ لکھا ہے

"گاڑیوں کی قطار سے بیس قدم پر ایک جوگی جا رہا تھا' پاؤں میں کھڑاویں' سر پر لمبے لمبے
بال' برہنہ سر' ہاتھ میں دست پناہ' دو چار معتقد اس کے ساتھ"

اسی شان سے جوگی جا رہا تھا' کہ اچانک اس بہلی پر اس کی نظر پڑی' جس پر سیدنا الامام الکبیر سوار تھے بیان کیا
ہے کہ نظر پڑتے ہی

"مولوی محمد قاسم صاحب کی طرف اشارہ کر کے اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا"

صاحب روداد نے اس کے بعد جوگی کے تلفظ خاص میں اس کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں یعنی اشارہ
کر کے کہہ رہا تھا کہ

"جی مَنو لبی ہے"

یعنی "یہ مولوی ہے" جوگی کی زبان سے یہ الفاظ نکل ہی رہے تھے' لکھا ہے' کہ

"اتفاقاً مولوی محمد قاسم صاحب کی نظر ادھر کو پلٹی"

دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں' سامنا ہوتے ہی جوگی ہی نے پیش قدمی کی' اور سیدنا الامام الکبیر کو سلام
کیا' جوگی کے اس سلام کی نوعیت کیا تھی' اس کو تو صاحب روداد نے نہیں بیان کیا ہے لیکن جنہ جوگی

کے سلام کا جواب دارالعلوم دیوبند کے بانی سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے جس طریقہ سے دیا گیا تھا، وہ سننے کے قابل ہے، لکھا ہے کہ

"مولوی محمد قاسم صاحب نے التفات کے ساتھ، ہاتھ اٹھا کر جواب دیا۔"

اس سے پہلے میلے میں جو کچھ کہا اور کیا جا رہا تھا، اگر سمجھا جائے کہ ہندوؤں کے مقابلہ میں "مدافعت بالحسنیٰ" والے قرآنی قانون کی تعمیل کی وہ اجتماعی شکل تھی، یعنی اس کا رخ ان عام ہندوؤں کی طرف تھا، جو اس میلے میں شریک تھے، تو قرآن کے اسی حکم کا ایک شخصی اور جزئی تجربہ حضرت والا کے اس طریقہ کار کو ہم شاید قرار دے سکتے ہیں جو اسی ہندو جوگی کے ساتھ اس وقت اختیار کیا گیا، نتیجہ بھی اسی وقت اس شکل میں سامنے آگیا، لکھا ہے کہ

"اس نے (جوگی نے) جو دیکھا کہ مولوی صاحب التفات سے جواب دیتا ہے تو وہاں سے (یعنی جہاں پردہ کھڑا ہوا تھا) دوڑا اور گاڑی کا ڈنڈا پکڑ کر گاڑیبان سے کہا تھام دے"

کانہ ولی حمیم (گویا وہ ایک گرم جوش دوست ہے) نتیجہ کے ان قرآنی الفاظ کی یہ کتنی واضح اور کھلی ہوئی تصویر ہے مسلمانوں اور ہندوؤں میں مذہب کے معاملہ میں مقابلہ ہوگا، اسی خبر کو سن کر ظاہر ہے کہ اپنی قوم کی طرف سے گویا مقابل بن کر اس میلہ میں یہ جوگی پہنچا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ سے خاص دلچسپی بھی رکھتا تھا، آگے معلوم ہوگا کہ بجائے عام لوگوں کے اسی لئے خیمہ کے اندر اس جوگی کو جگہ دی گئی تھی،

بہرحال دوڑ کر جوگی نے گاڑی کے ڈنڈے کو پکڑا، اور "تھام دے" کی اصطلاحی آواز دے کر بہلیوں کی ساری قطار کو رکوا دیا۔ قاعدہ ہے کہ قطار میں چلنے والی گاڑیوں کے مقدمۃ الجیش کو جب دیہات والے کہتے ہیں کہ "تھام دے" تو وہ خود بھی تھم جاتا ہے، اور پیچھے لگی ہوئی گاڑیوں کو بھی تھم جانے کا حکم دیتا ہے، یہی صورت یہاں پیش آئی۔ اب آگے کیا ہوا، یہ لکھ کر کہ

"القصہ گاڑیاں تھم گئیں۔"

صاحب روداد نے بیان کیا ہے کہ اس کے بعد سیدنا الامام الکبیر کو مخاطب بنا کر جوگی نے کہا کہ

مصنف امام نے کہا تھا کہ

"وہ یہ تھا کہ تمام مذاہب کے جتھے میں اسلام کی ایک منادی ہو جائے اور خدا کی حجت ہندوں پر پوری ہو جائے سو وہ اس میلہ خداشناسی میں ہو چکی" ۔ ص ۳۱

اسی روایت کے آخر میں یہ بھی ہے کہ

"چنانچہ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ وفات ہو گئی"

مطلب مصنف امام کے اس بیان کا اگر یہ سمجھا جائے کہ اسی تبلیغی نمونہ کا قائم کرنا بھی سیدنا الامام الکبیر کے وجود باجود کا آخری نصب العین ان کے نزدیک تھا تو جو کچھ انہوں نے فرمایا ہے خود ہی سوچئے کہ اس سے اور کیا سمجھا جائے اور مجھ سے اگر پوچھتے ہیں تو چاندا پور میں جو کچھ سیدنا الامام الکبیر نے کہا اور کیا اگر ایک طرف دین حق کی تبلیغی ذمہ داریوں میں اس سے جاگ پیدا ہوتی ہے تو دوسری طرف اگر ہم فکر معقول سے کام لیتے ہوئے آپ کے طریقہ سے چاہیں تو یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ بغیر کسی تلخی اور ناگواری کے غیر قوموں کے درمیان بود و باش اختیار کر کے تبلیغ حق کے اس فرض سے سبکدوشی حاصل کرنے کا حکیمانہ طریقہ کیا ہو سکتا ہے آپ کے اس حکیمانہ طریقہ کار کی تفصیل واقعات و شواہد کی روشنی میں پیش ہو چکی ہے اس کو بار بار پڑھئے اور جو نتیجے اس سے حاصل ہو سکتے ہیں ان کو حاصل کیجئے حق تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی بادشاہی کے زمانے میں

"ہندوی تند شمشیر اسلام"

کا تماشا اگر دیکھا گیا تھا تو شاید یہ اتنا تعجب انگیز نہ تھا، لیکن خداشناسی کے اسی میلہ میں جب مسلمانوں کے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شان گرامی میں کالے پادری مولیٰ داد کی طرف سے گندگی اچھالی جا رہی تھی اور سیدنا الامام الکبیر اسی کے مقابلہ میں مسلمانوں کی طرف سے عیسائیوں کے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ اعلان کر رہے تھے۔

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین بھی ہمارے نزدیک مثل توہین حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم موجب کفر و ارتداد ہے" ۔ میلہ

اسی لئے آگے مکالمہ یوں ختم ہوا۔

"مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) نے فرمایا آپ نے بڑی مہربانی کی جو آپ آئے"

جواب میں جانکی داس جوگی نے یہ عجیب و غریب الفاظ کہے۔

"ہم تو تمہارے بیٹا بیٹی ہیں"

یہ کہا اور

"سلام کرکے چل دیا"

سچ پوچھئے تو "انی لاٹ ولی حمید" ہی کا اپنے الفاظ میں جوگی نے گویا ترجمہ کر دیا تھا، سیدنا الامام الکبیر کے برتاؤ اور حسن سلوک نے جو اثر خود اس کے دل پر ڈالا تھا، اور کہا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اپنی قوم یا کم از کم اس میلے میں اس جوگی کے ہم مذہب لوگ جو شریک تھے، سب ہی کو "بیٹا بیٹی" ٹھیراتے ہوئے اسی اثر کی عمومیت کا گویا جوگی اعتراف و اقرار کر رہا تھا، کیسا عجیب اور طراوت بخش نظارہ ہے کہ دشمن بنانے کے لئے جو لائے گئے تھے، دوست یا جوگی کے الفاظ میں "بیٹا بیٹی" بن کر ہی واپس ہو رہے تھے، اور جوگی بے چارا تو خیر جوگی تھا، اسی روداد میں ایک واقعہ یہ بھی نقل کیا ہے، کہ جن پنڈتوں کو مقابلہ ہی کے لئے خاص طور پر بلایا گیا تھا، ان میں ایک پنڈت صاحب جنہوں نے جلسہ میں عملی حصہ بھی لیا تھا، اور سنسکرت آمیز بھاشا والی تقریر کی وجہ سے ان کی تقریر جلسہ کے عام حاضرین نہ سمجھ سکے تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ دیا نندی تحریک سے وہ بھی کافی متاثر تھے۔ تاہم تقریر کے وقت بھی ان کو دیکھا گیا تھا کسی خاص مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر کی طرف خاص اشارہ کر رہے ہیں، اور اشارہ کرکے کہہ رہے ہیں،

"خاص ان مولوی صاحب سے پوچھتا ہوں"

اسی سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت والا کے علم و عمل سے وہ یوں ہی متاثر تھے، لیکن جلسہ جب برخاست ہو گیا تو بیان کیا ہے، کہ

"وہ پنڈت صاحب بھی اس وقت مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کے پاس آبیٹھے"

جنہوں نے جلسہ میں یہ کہا تھا۔ میں سب سے پوچھتا ہوں اور مولوی محمد قاسم صاحب کی طرف
اشارہ کر کے کہا تھا' خاص کر ان سے " صلا
بہر کیف کہنا یہ ہے کہ یہی پنڈت جی جیسا کہ لکھا ہے' حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہو کر کہتے
تھے کہ

"میں سچے جی سے مذہب کے مقدمہ میں پوچھنا چاہتا ہوں"

اور جلسہ میں حضرت والا کی تقریروں نے جو اثر ان کے اندر قائم کیا تھا' اس کا اظہار ان الفاظ میں کرنے
لگے کہ

"ہر آدمی اس سے پوچھے جو دوسرے کو سمجھا سکے"

جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ سمجھا سکنے کے اس حسن سلیقہ کا تجربہ چونکہ سیدنا الامام الکبیر میں پنڈت
جی کو محسوس ہوا تھا' اسی لئے آپ کے پاس وہ حاضر ہوئے تھے۔ پنڈت جی کے اس معروضے
پر حضرت والا نے جو کچھ فرمایا تھا' اس سے آپ کی تقریروں کی خصوصیت کا اندازہ ہوتا ہے' کہا
گیا تھا کہ

"جو کچھ ہم کہیں گے' آپ بھی اس کو صداقت ہی پر محمول کریں گے' تعصب
اور سخن پروری نہ سمجھیں گے"

یہی تعصب اور سخن پروری سچ پوچھئے تو مذہبی واعظوں کی تقریروں کو عموماً بے جان بنا دیتی ہے' اثر انداز ی
کا سب سے بڑا گر یہی ہے' لیکن ظاہر ہے کہ دین کا معاملہ اتنا ہلکا اور آسان تو نہیں ہے' کہ کسی جلسہ
کی چند تقریروں اور زبانی باتوں سے کام چل جائے' اسی لئے پنڈت جی کو آپ نے مشورہ دیا تھا' کہ

"مذہب کے باب میں اطمینان ہے اس کے منصور نہیں کہ ہمیشہ چند روز آپ اور ہم ساتھ
رہیں اور باہم مذہب کی باتیں کرتے رہیں" صلا

تاکہ گفتار کے ساتھ رفتار کا' قول کے ساتھ کردار کے تجربہ کا بھی موقعہ ملے۔ لکھا ہے کہ بیچارے
پنڈت جی نے ساتھ رہنے کا اقرار بھی کر لیا تھا' پھر نہ معلوم کیا عوائق پیش آئے' کہ ایفاء عہد؟

ذکر سکے

بہر حال ہندوؤں پر عیسائیوں کے برعکس سیدنا الامام الکبیر کی تقریروں کا اثر پڑ رہا تھا، گویا وہی مثال صادق آرہی تھی، کہ کپڑے کو سکھانے کے لئے دھوپ میں دھوبی کھڑا ہوتا ہے، ایک ہی آفتاب ہوتا ہے جس کی شعاعوں سے دھوبی غریب کا چہرہ تو کالا پڑتا جاتا ہے، اور ٹھیک اسی وقت یہ بھی دیکھا جاتا ہے، کہ کپڑا جسے دھوبی سکھا رہا تھا سفید سے سفید تر بنتا چلا جاتا ہے۔ آثار کے اس اختلاف کا جو دعوی میں نے کیا تھا۔ کیا اب بھی اس میں شک کی گنجائش باقی ہے! حد تو یہ ہے کہ چاند اپور، اور سارنگپور نیز ان کے گرد ونواح کے دیہاتوں کی طرف سے میلے کے جو بعض لوگ گذرے، وہی بیان کرتے تھے۔ کہ

" راہ میں جو ہندو گنوار ملے، ان کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ پٹھان جیتے "

پٹھان شاہ جہاں پور کے علاقہ میں مسلمانوں کی تعبیر ہے۔ جیسے عام طور پر ترک بھی مسلمانوں کو ہندوستان میں کہتے ہیں۔ مطلب یہی ہے، کہ مسلمانوں کے ساتھ اس علاقہ کے ہندو گنوار بھی مسلمانوں کی کامیابی، اور عیسائیوں کے مقابلہ میں ان کی جیت کا ذکر کر کے خوشیاں منا رہے تھے، گویا صحرائی علاقہ کا انتخاب اگر واقعی ناسد اغراض کے تحت کیا گیا تھا، جن کی غمازی قرآن و قیاسات کر رہے ہیں تو سمجھنا چاہئے، کہ معاملہ الٹ گیا عسی ان تکرھوا شیئا وھو خیر لکم کے قرآنی اصول کی تفسیر پہلے بھی ان ہی شکلوں میں ہوتی رہی ہے، اور آئندہ بھی ہوگی۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ حکمرانی، اور بادشاہی کو اپنا موروثی حق یا پیشہ قرار دینے والے مسلمانوں نے ہندوستان پہنچ کر تبلیغ اسلام کے دینی فرض کے ساتھ جو رویہ بھی اختیار کیا ہو، لیکن ہندوستان ہی کیا، شاید بادشاہی اور ملوکیت کے اس ذوق کی تسکین کی گنجائش دنیا کے کسی گوشہ میں باقی نہیں رہی ہے، مصر جو تقریباً خالص اسلامی ملک ہے، وہاں کے معزول شاہ فاروق نے خواہ مزاحاً ہی کہا ہو کہ انگلستان کے سوا شاید کسی ملک میں بادشاہت اب باقی نہ رہے گی۔

چاہا جائے یا نہ چاہا جائے، مگر حالات کا بظاہر قدرتی اقتضا یہی ہو چکا ہے، ایسی صورت میں

مسلم و غیر مسلم باشندوں کی ملی جلی آبادیوں کے رہنے والے مسلمانوں کیلئے پہلے نہیں تو اب جب بادشاہی کا خواب صرف خواب بن چکا ہے کیا یہ سوچنے کا وقت نہیں آگیا ہے کہ جس دینی فرض کو حکومت کے جھگڑوں میں مبتلا ہو کر ان کے اگلوں نے لاپروائی برتی تھی، اس فرض کی ذمہ داری کو وہ محسوس کریں، اور سوچیں۔ اس بات کو کہ غیر اسلامی آبادیوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کا ایسا صحیح راستہ کیا ہو سکتا ہے جس پر چل کر دین کا فرض بھی ادا ہوتا رہے، اور دنیا میں دوسری قوموں سے ان کے تعلقات خوش گوار رہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے۔ بہر حال اس باب میں مسلمانوں کو فیصلہ تک پہنچنا ہی پڑے گا۔ میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ دوسری باتوں کے ساتھ چاہا جائے تو روشنی کا مینار سیدنا الامام الکبیر کے ان نمونوں کو بھی بنایا جا سکتا ہے، جنھیں خدا شناسی کے ان میلوں میں آپ کی رفتار و گفتار سیرت و کردار نے پچھلی نسلوں کے لئے چھوڑا ہے۔

آپ دیکھ چکے کہ دہی میلہ جس میں اور کچھ نہیں تو کم از کم اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ اسلام اور مسلمانوں کی دینی تحقیر و توہین کا ارادہ کر کے عیسائی مذہب اور ہندو دھرم کے نمائندے شریک ہوئے تھے۔ لیکن میلے میں پہنچنے کے بعد سیدنا الامام الکبیر نے اسلام کے بنیادی حقائق کی تبلیغ کا ذریعہ ان ہی میلوں کو جو بنا لیا تھا، اس باب میں آپ کی سعی و کوشش جن حدود تک پہنچی تھی، اس کی داستان سنا چکا ہوں۔

بلکہ ارواح ثلثہ میں مولانا طیب صاحب کے حوالہ سے یہ روایت جو درج کی گئی ہے کہ ان کے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ

"جب مباحثہ شاہ جہاں پور ہو چکا، اور حضرت مولانا نانوتوی مظفر و منصور ہو کر واپس تشریف لائے تو مولانا محمد یعقوب صاحب نے فرمایا کہ اب مجھے مولانا کی وفات قریب معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کو ان سے جو کام لینا تھا، وہ پورا ہو چکا۔"

"کام جو لینا تھا" اپنے ان الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مولانا محمد یعقوب یعنی ہمارے

"تم نے بڑا کام کیا"

اس سے یہ سن کر لکھا ہے کہ

"مولوی محمد قاسم صاحب نے کہا میں نے کیا کیا!"

مخاطب چونکہ ایک ہندو جوگی تھا، اس لئے آگے فرمایا گیا، کیا فرمایا گیا؛ معلم العلماء کی زبان مبارک سے اس فقرے کو سنئے "میں نے کیا کیا" یہ کہنے کے بعد ارشاد ہوا تھا کہ

"پرمیشر نے کیا"

"سچ کہتے ہو" ان تصدیقی الفاظ کے بعد بیان کیا ہے کہ

"پھر جوگی مذکور نے ہاتھ اٹھا کر چار انگشت سے اشارہ کرکے کہا کہ جب تم نے "بولی ماری" (یعنی تقریر کی) تو ہم نے دیکھا کہ اس کا یعنی پادری کا اتنا سر رہ سوکھ گیا تھا، یا یوں کہا کہ گھٹ گیا تھا"

دیکھ رہے ہیں۔ آپ ایک ہی تقریر کے ان دو مختلف اعترافی آثار کو، پادری کا سر یا جسم، سوکھ یا گھٹ رہا تھا، اور جوگی جس کی حیثیت ہندوؤں میں گویا وہی تھی، جو پادریوں کی عیسائیوں میں ہوتی ہے، اس کے دل کی مسرت ان الفاظ کی شکل میں جھلک رہی تھی،

اس کے بعد کسی "دلی جسم" سے میل ملاپ جیسی گفتگو ہوتی ہے، یہی گفتگو دونوں میں جس طریقہ سے ہوئی روداد میں وہ بھی نقل کر دی گئی ہے لکھا ہے کہ جوگی سے

"مولوی محمد قاسم صاحب نے فرمایا کہ تم کہاں تھے خیمہ کے باہر تھے؟"

جواب میں جوگی نے کہا کہ

"ہم بھی خیمہ کے اندر تھے"

حضرت والا نے دریافت کیا کہ

"آپ کا نام کیا ہے؟"

جوگی نے کہا مجانکی داس، شاید یہ گفتگو دیر تک ہوتی لیکن روداد ہی میں ہے، بہلیوں کی قطار رکی ہوئی تھی۔

جانتے ہیں اس کا نتیجہ کیا ہوا، مسلمان تو مسلمان لکھا ہے کہ مولانا ادہ بدبخت کو

"ہندو بھی برا بھلا کہہ رہے تھے"

صرف یہی نہیں بلکہ جوش میں دیکھا گیا، اسی روداد میں لکھا ہے کہ

"ایک ڈپٹی صاحب ہندو مذہب، جن کا نام غالباً اجودھیا پرشاد ہے، کھڑے ہوئے، اور اس مضمون کو دیر تک بیان کرتے رہے کہ کسی کے پیشواؤں کو برا کہنا چاہئے" (رودادِ میلہ)

جس کا مطلب یہی تو ہوا کہ مسلمانوں کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت و عزت کی حفاظت کے لئے ایک ہندو ڈپٹی کلکٹر کھڑا ہو گیا، اور یوں ہندو ہی زندہ تمثیر اسلام کا جاں پرور روح افزا نظارہ مسلمانوں کے عہدِ محکومیت میں اس وقت سامنے آ گیا تھا، جب چاندا پور کے اس میلے میں عیسائیوں اور ہندوؤں کے نمائندوں کو اسلامی دین پر اعتراض و تنقید کے لئے اکٹھا کیا گیا تھا۔ اس تمام روداد میں ادفع بالتی ھی احسن یعنی مدافعت بالحسنیٰ کے قرآنی حکم کے قرآنی نتیجہ کو مشاہدہ بنا کر اس میلہ میں جس جس طریقہ سے دکھایا گیا تھا، چاہئے کہ کافی توجہ سے اس کو پڑھا جائے، اور آج جن مشکلات سے نکلنے کی راہیں مسلمان اس ملک میں اپنے اوپر بند پا رہے ہیں، میرا خیال تو یہی ہے کہ ان مشکلات کے حل کی ایک واضح راہ ان شاء اللہ تعالیٰ ان کے سامنے آ جائے گی، پیدا کرنے والے نے بنی آدم کو جن نفسیاتی قوانین کا پابند بنا کر پیدا کیا ہے۔ ان سے اور ان کے اقتضاء سے کوئی جدا ہونا بھی چاہے تو جدا نہیں ہو سکتا۔ برائی کا بدلہ بھلائی کے ساتھ جب دیا جاتا ہے، تو دشمن خواہ کامل دوست نہ بن جائے لیکن گویا کہ وہ ایک گرم جوش دوست یعنی کانہ ولی حمیم بنا ہوا ہے۔ قرآن کی یہ اطلاع بظاہر غیر منطقی ہی کیوں نہ نظر آتی ہو، لیکن کیا کیجئے کہ تجربہ سے ہمیشہ اس کی تصدیق ہوئی ہے، بنی آدم تو بنی آدم تجربہ کرنے والوں نے تو حیوانی نفسیات تک کے اوپر اسی قانون کو محیط پایا ہے۔ لیکن ہر تجربہ اپنے ساتھ کچھ شرائط رکھتا ہے۔ اس قانون کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں جو یہ فرمایا گیا ہے یعنی۔

| وما یلقاھا الا الذین صبروا | اور یہ بات ان ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے مستقل |
|---|---|

| | |
|---|---|
| وما یلقاھا إلا ذو حظ عظیم | مزاج ہیں، اور یہ بات ان ہی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا صاحب نصیب ہے۔ |

میرے نزدیک تو اس تجربہ کے عملی نتائج کے شرائط ہی کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے۔ کافی صبر بڑے ظرف اور وسیع حوصلہ کی ضرورت اسی لئے ہے کہ برائی کرنے والوں کے مقابلہ میں بھلائی پر اپنے دل کو آمادہ کرنا ہر کس و ناکس کے لئے آسان نہیں ہے، اور اس راہ میں دل ہی کی آمادگی در اصل آمادگی ہے۔ دل میں نفرت و عداوت کی آگ بھری ہو اور زبان یا قلم سے خوبصورت، خوش کن الفاظ نکل بھی رہے ہوں، تو جس نتیجہ کا قرآن میں وعدہ کیا گیا ہے۔ اس کے ظہور کا انتظار بڑی خطرناک غلطی ہوگی۔ اس طریقہ سے دھوکہ دینے والے ممکن ہے کہ خود دھوکہ کا شکار ہو جائیں، اس میں شک نہیں کہ بجائے غیر کے اپنے دل پر قابو بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ اکثروں کے لئے یہی آسان بات عموماً دشوار ہوگئی، عملاً اسی لئے نفرت کا جواب نفرت ہی سے لوگ دیتے رہتے ہیں، شیطان کا یہی وہ چرخہ ہے، جس کا چکر کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ شاید "دافعت بالحسنیٰ" والی آیتوں کے بعد

| | |
|---|---|
| واما ینزغنک من الشیطان نزغ فاستعذ باللہ انہ ھو السمیع العلیم | اور اگر (ایسے وقت میں) آپ کو شیطان کی طرف سے کچھ وسوسہ آنے لگے تو (فوراً) اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے، بلاشبہ وہ خوب سننے والا ہے خوب جاننے والا ہے۔ |

پر کلام کو جو ختم کیا گیا ہے، اس سے یہی سمجھانا مقصود ہے کہ "شیطان" "دافعت بالحسنیٰ" والی راہ (یعنی برائی کا مقابلہ بھلائی سے کرنا) پر آدم کی اولاد کو چلنے نہیں دیتا، برائی کے مقابلہ میں برائی ہی کے جذبات کو ابھارتا ہے۔ علاج اس کا یہی بتایا گیا ہے کہ سارے شیطانی خطرات جو بظاہر عقلی مشوروں کے رنگ میں سامنے آتے ہیں، ان سے خدا کی پناہ ڈھونڈھی جائے، برائی کے مقابلہ میں واقعی دل سے ہم اگر بھلائی کریں گے تو خدا جو ہمارے دلوں کے حال سے آگاہ ہے وہ اپنے بنائے ہوئے قانون کے مطابق نتیجہ کو بہرحال سامنے لائے گا۔

میں اپنے موضوع بحث سے اس مسئلہ میں شاید زمانہ زیادہ دور ہٹ گیا، زندگی کے ایک اہم قرآنی دستور کا ذکر چونکہ چھڑ گیا، سب کچھ کہنا تو دشوار تھا، لیکن کچھ نہ کہا جائے یہ بھی مناسب نہ معلوم ہوا، یہ گفتگو تو سیدنا الامام الکبیر کے ان قولی و عملی نمونوں کے متعلق ہو رہی تھی، جو خداشناسی کے ان میلوں میں آپ کی طرف سے پیش ہوئے، جن کے متعلق اپنا ذاتی احساس پیش کر چکا ہوں، ان نمونوں کو آپ کے احسانی حکم و علم کے آثار میں شمار کرتا ہوں۔

تاریخ کے جس عہد میں یہ نمونے مسلمانان ہند کے درمیان پیش ہو رہے تھے، یہ وہی زمانہ تھا، جب مسلمانوں کی حالت زار سے متاثر ہو کر ملک کے مختلف گوشوں میں مصلحین اس لئے کھڑے ہو رہے تھے کہ جو کچھ ہونا تھا، وہ تو خیر ہو چکا، لیکن ان ہی حالات میں اس ستم رسیدہ قوم کے جینے کا جو سامان بھی ممکن ہو، اسے فراہم کرنا چاہئے۔

ان کی کوششیں بھی جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے، اخلاص اور سچی بہی خواہیوں، دلی ہمدردیوں ہی پر مبنی تھیں، لیکن وہ جو کچھ سوچتے تھے، عقل سے سوچتے تھے، عقل جن مشوروں کو پیش کرتی تھی ان پر عمل پیرا تھے، اور اس کے سوا وہ بے چارے آخر کرتے کیا، احسانی علم و حکم کی دولت ہر ایک کو ارزانی نہیں ہوتی،

سچ پوچھئے تو سیدنا الامام الکبیر کی خدمات کی صحیح قدر و قیمت سے اسی لئے مسلمانوں کی عمومیت جیسا کہ چاہئے واقف نہ ہو سکی، اس کے مقابلہ میں عقلی علم و حکم والوں ہی کی باتیں زیادہ مشہور اور زیادہ پسند کی گئیں، ان ہی کے مشوروں کے مطابق پروگرام بنتے رہے، اور جو نتیجے ان پر مرتب ہو سکتے تھے، وہ مرتب ہوتے رہے اور آج تک ہو رہے ہیں۔

خصوصاً خداشناسی کے یہ میلے جو بقول مصنف امام سیدنا الامام الکبیر کی پیدائش کے نصب العین کی تکمیل و ظہور کے آخری جلوہ گاہ تھے، وفات کی پیش گوئی تک اپنے اسی باطنی مکاشفہ کی روشنی میں انہوں نے کر دی تھی، لیکن اب اسے کیا کہئے، پتہ یہی چلتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی جس میں یہ میلے منعقد ہوئے، اور اس کے بعد بھی یہ میلے اور ان میلوں میں جو کچھ ہوا، سب ہی کے متعلق زیادہ سے زیادہ

عمومی تاثر یہی رہا کہ ان میلوں میں مسلمانوں، عیسائیوں اور ہندوؤں سے باہم مذہبی مسائل پر کچھ بحث ہوئی، اوروں کا حال تو معلوم نہ ہو سکا، لیکن مسلمانوں میں یہی مشہور ہوا کہ مولانا محمد قاسم کی بدولت ان ہی کی جیت ہوئی حاشیہ آرائیوں کے ساتھ چند خاص لطیفوں کا چرچا بھی سیدنا الامام الکبیر کے متعلق مسلمانوں کی مجلسوں میں ہوتا رہا، جن کی یاد اب بھی کبھی کبھی بطور گرمی بزم تازہ کر لی جاتی ہے۔

باقی مسلمانوں کے سوا عیسائیوں اور ہندوؤں میں چاند اپور کے ان میلوں اور ان کے نتائج کو کن نظروں سے دیکھا گیا، اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پہلے سال کے میلہ کی روداد مطبع ہاشمی کے مہتمم مولوی محمد ہاشم، اور مطبع ضیائی کے مہتمم مولوی محمد حیات صاحبان، دونوں نے مل کر، اور دوسرے سال کی مولانا فخر الحسن گنگوہی مرحوم نے مرتب کی تھی۔ کتاب جواب ترکی بہ ترکی میں اس کا ذکر کرتے ہوئے، کہ مسلمانوں کی طرف سے جو روداد چاند اپور کے میلوں کی مرتب ہوئی ہے، اسی کے متعلق یہ لکھتے ہوئے کہ

"کیفیت میلہ چاند اپور بھی جس میں پنڈت جی (دیانند سرسوتی) بھی رونق افروز تھے، نہ چھپنے پائی"

آگے بیان کیا ہے کہ

"اور پنڈت جی نے کیفیت مذکورہ چھوڑ، رڑکی و میرٹھ وغیرہ مقامات کے تمام واقعات حسب دل خواہ گھڑ گھڑ کر چھپوا دیں" صنے

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی کی طرف سے بھی چاند اپور کی سرگذشت مرتب ہو کر شائع ہوئی تھی، مگر مجھے یہ تحریر نہیں مل سکی، اور اس کا تو پتہ بھی نہ چلا کہ عیسائیوں کی طرف سے بھی کوئی رپورٹ چھاپی گئی تھی یا نہیں چھاپی گئی تھی۔

قرینہ کا اقتضا تو یہی ہے کہ عیسائی مشنریوں کی طرف سے اس زمانہ میں جو اخبار اور رسالے نکلتے تھے کم از کم ان میں ان میلوں کی کارروائیوں کا تذکرہ ضرور ہوتا ہو گا، لیکن کیا کیجئے کہ اس قسم کی کوئی چیز مجھے نہ مل سکی۔ "تھوڑی مروڑی ہی" لیکن اس کا تو اندازہ ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کے سوا دوسرے

قرنوں میں خدا شناسی کے ان میلوں اور ان کی کارروائیوں کو کن نگاہوں سے دیکھا گیا تھا۔

زمانہ بھی کافی گذر چکا ہے، صدی نہیں تو پون صدی میں تو کوئی شبہ ہی نہیں، اس زمانہ میں ہندوستان کا اسلامی پریس ہو، یا غیر اسلامی، دونوں بالکل ابتدائی منزلوں میں تھے، گنتی کے چند ہفتہ وار اخبار بعض مقامات سے نکلتے تھے، ممکن ہے کہ ڈھونڈھنے والوں کو بیرے بعد شاید کوئی جدید مواد مل جائے، لیکن عام حال جیسا کہ میں نے عرض کیا، بظاہر ایک وقتی بحث و مباحثہ کی زیادہ اہمیت شاید کسی فرقہ میں ان میلوں اور ان کی کارروائیوں کو نہیں دی گئی، یہ بات کہ آئندہ نسلوں کی راہ نمائی کا کام بھی ان عملی نمونوں سے لیا جاسکتا ہے جو سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے ان میلوں میں پیش ہوئے، شاید فرط عقیدت یا میری خیال آرائی، بلکہ ممکن ہے اس پر تک بندی تک کا شبہ بھی کرنے والوں کو ہو، لیکن یہ اپنا اپنا خیال ہے، میں دوسروں کو ان نتیجوں تک پہنچنے کے لئے مجبور نہیں کرسکتا، ایک بات میری سمجھ میں آئی، وہ پیش کردی گئی۔ اور دنیا خواہ اس روشنی کو قبول کرے یا نہ کرے، مگر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جن نفوس قدسیہ نے زندگی کی دوسری شاخوں میں سیدنا الامام الکبیر کی خدمات کو آگے بڑھایا، آپ کے نصب کئے ہوئے پودوں کو پروان چڑھایا، ان بزرگوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے اول سے آخر تک اس باب میں بھی جو عملی مثالیں پیش کیں، اور آج تک جس راہ پر وہ چل رہے ہیں، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے، تو یہی کہا جاسکتا ہے، کہ چاندا پور کے نمونوں سے جو عملی درس مل سکتا تھا، اس پر وہ عمل پیرا ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے، کہ پادریوں کا طبقہ جسے ان میلوں میں اس غیر ملکی حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی، جو ہندوستان پر مسلط ہوگئی تھی اور براہ راست نہ سہی، لیکن بالواسطہ درحقیقت اسی حکومت مسلطہ کی ان میلوں میں نمائندگی کر رہے تھے، اور سچ پوچھئے تو اسی حکومت کے پنجوں کو مضبوط کرنے کی دوسری تدبیروں میں سے ایک تدبیر وہ بھی تھی، جسے پادری انجام دیتے تھے، الغرض اس طبقہ کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر نے جو تعلق قائم کیا تھا، یا آپ کے طرز عمل سے

جو تعلق حکومت کے ان نمائندوں سے چاندا پور میں قائم ہو گیا تھا بجنسہ اسی تعلق کو سیدنا الامام الکبیر کے ان جانشینوں نے اس غیر ملکی اقتدار کے ساتھ مسلسل قائم رکھا، اور گو ہندوؤں کو بھی ان میلوں میں پہلی دفعہ مسلمانوں کے مقابلہ میں لاکر کھڑا کر دیا گیا تھا، لیکن آپ دیکھ چکے کہ بجائے دو۔ ہونے کے ان میلوں میں ہندوؤں کی قومیت سیدنا الامام الکبیر سے جیسے قریب ہی ہوتی چلی گئی ٹھیک یہی رنگ آپ کے جانشینوں کا بھی اس ملک کی غیر مسلم آبادی خصوصاً ہندوؤں کے ساتھ نظر آتا ہے۔ چاندا پور کے ان میلوں کے بعد تاریخ کا ایک طویل سلسلہ ہے جس سے ملک گذرتا ہوا موجودہ حالات تک پہنچا ہے اس طویل عرصہ میں ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات نشیب و فراز کی گھاٹیوں سے گذرتے رہے، سلجھاؤ کے ساتھ الجھاؤ، سیدھ کے ساتھ ٹیڑھ کی بیسیوں شکلیں سامنے آئیں لیکن سیدنا الامام الکبیر کے جانشینوں نے ان تمام حالات میں اپنی حد تک کوئی ایسی صورت اختیار نہیں کی، جس کی بنیاد پر یہ سمجھا جا سکے کہ ان کے کسی خاص طریقہ کار سے ملک کے ان دونوں طبقوں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشیدگی، یا منافرت پیدا ہوئی۔

بلکہ پہلے سال کے میلے میں یاد ہوگا، مباحثہ و تقریر وغیرہ کی مجلسوں کے اختتام کے بعد ایک پنڈت جی سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں تحقیق حق کے لئے یہ کہتے ہوئے حاضر ہوئے کہ

"میں سچے جی سے مذہب کے مقدمہ میں پوچھنا چاہتا ہوں" ص۱۴

پنڈت جی کی دل دہی کرتے ہوئے منجملہ دوسری باتوں کے سیدنا الامام الکبیر نے آخر میں ان سے فرمایا تھا کہ

"مذہب کے باب میں اطمینان ہے اس کے متصور نہیں کہ مہینہ پندرہ روز آپ اور ہم ساتھ رہیں اور مذہب کی باتیں کرتے رہیں" ص۱۴

ایک جزئی واقعہ یا شخصی مکالمہ سے زیادہ بظاہر اس فقرے کا وزن محسوس نہ کیا جائے، مگر میں پوچھتا ہوں کہ ایک انفرادی شخصیت تک دین حق کی تبلیغ کا جو فرض مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے، جب اس فرض سے سبکدوشی کے لئے سیدنا الامام الکبیر کے نزدیک مہینہ پندرہ روز کی رفاقت کی ضرورت تھی، تو

سیدنا الامام الکبیر کے جانشینوں کا یہ فیصلہ کہ کروڑہا کروڑ انسانوں تک حق کی تبلیغ کا موقعہ قدرت کی طرف سے مسلمانان ہند کے لئے جو آسان کر دیا گیا ہے' اس میں دشواری نہ پیدا کی جانے' بتایا جائے کہ اس فیصلہ کو بے جا ٹھہرانے کی آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے' سیدنا الامام الکبیر کے جواب کا یہ جزء یعنی

"باہم مذہب کی باتیں کرتے رہیں"

یقیناً ملے جلے رہنے ہی کی صورت میں یہ زیادہ آسان ہے۔

بہر حال ختم نبوت کے بعد جیسا کہ معلوم ہے' شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا بھی ہے کہ "خود امت مسلمہ مبعوث کی گئی ہے'

| | |
|---|---|
| کنتم خیر امۃ اخرجت للناس | تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کے نفع و ہدایت) کیلئے بھیجے گئے ہو۔ |

کا مطلب شاہ صاحب کے نزدیک یہی ہے' ایسی صورت میں اگر یہ سمجھا جائے کہ دنیا کے جس حصہ میں مسلمانوں کو خدا نے پہنچایا اور پہنچا کر آباد کر دیا ہے' وہاں کے غیر مسلم باشندوں کی طرف آباد کاروں کا اسلامی طبقہ مبعوث ہے' اور اسی بنیاد پر مسلمانان ہند میں جو لوگ اپنے تبلیغی فرض کو محسوس کر کے سیدنا الامام الکبیر کے جانشینوں کے مشورے کے مطابق وطنی تبدیلیوں پر راضی نہ ہوئے' بلکہ جہاں تھے' وہیں پڑے ہوئے ہیں' تو بتایا جائے کہ تبلیغ کے کفائی فرض سے سبکدوشی کی آخر دوسری شکل مسلمانان ہند کے لئے اور کیا ہو سکتی تھی۔

یہ صحیح ہے کہ اس تبلیغی فرض کا ڈھنڈورا تو کبھی نہیں پیٹا گیا' لیکن سیدنا الامام الکبیر کے جانشینوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ عملاً اس سے وہ کبھی غافل نہیں رہے ہیں' وقتاً فوقتاً ان بزرگوں کے ذریعہ مشرف باسلام ہونے کی سعادت جن خوش نصیبوں کو حاصل ہوتی رہی ہے' یوں بھی مختلف اسباب و وجوہ کے تحت اس ملک کے غیر اسلامی طبقات کے لیڈروں اور زعیموں سے ان کے ایسے خوش گوار تعلقات قائم رہے' جس سے دوسروں کیلئے اسلامی تعلیمات سے مانوس ہونے کی زمین قدرتاً ہموار ہوتی رہی'

گویا مذہب کی باتیں کرنے کی ایک صورت یہ بھی تھی۔ اور گو عام طور پر لوگوں کو اس کا شاید علم نہ ہو لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ "دارالعلوم دیوبند" میں جب کبھی موقعہ میسر ہوا، ہندو دھرم کی علمی زبان سنسکرت اور بھاشا کے سکھانے کا نظم بھی مدرسہ میں کیا گیا، یا وظیفہ دے کر طلبہ کو ان زبانوں کے سیکھنے کے لئے بھیجا گیا۔[1]

لیکن با ایں ہمہ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ خود مسلمانوں کے مختلف احزاب اور جماعتوں کی طرف سے دارالعلوم دیوبند اور دیوبندیت پر عقلی بھی نکتہ چینیاں کی گئیں ہوں، بسا اوقات خود قصبہ دیوبند میں بھی دارالعلوم کے متعلق مسلمان باشندوں کے اندر کشمکش کی صورتیں پیدا ہوئیں۔ لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، قیام دارالعلوم سے اس وقت تک جو زمانہ گذرا ہے، قریب قریب صدی ہی پوری ہو رہی ہے۔ اس طویل مدت میں ہندوستان کی غیر اسلامی آبادی کو مسلمانوں کے اس خالص دینی مرکز سے

---

[1] مدرسہ کی رودادوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بھاشا اور سنسکرت زبانوں کے سکھانے کے لئے وقتاً فوقتاً مولانا ابوحجت حسن میرٹھی اور مولانا غلام محمد سیتاپوری، ڈاکٹر غلام محمد وغیرہ کی تدریسی خدمات دارالعلوم نے حاصل کیں، اسی طرح مولانا شہید اللہ صاحب (مشرقی بنگال کے مشہور فاضل سنسکرت کی خدمت میں تعلیمی وظائف دے کر طلبہ دارالعلوم سنسکرت زبان کے سیکھنے کے لئے بھیجے گئے (دیکھئے روداد ۱۳۱۲ھ یا کتاب فرنگیوں کا جال ص۱۸۱۔ اور آج بھی ضرورت ہے کہ کچھ نہیں تو کم از کم ہندوستان کے مروجہ مذاہب و ادیان کے متعلق صحیح معلومات سے دارالعلوم کے طلبہ کو روشناس کرنے کی ممکنہ صورتیں اختیار کی جائیں، بلکہ ہندی زبان ناگری خط کے ساتھ جب اس ملک کی دفتری زبان مانی جا چکی ہے تو قدرتاً اس کی وجہ سے اس زبان کی تعلیم کا انتظام زیادہ آسان ہو چکا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ اسلامیات کا جو ذخیرہ اردو زبان میں پایا جاتا ہے، اس سے بھی زیادہ سرمایہ اسلامی تعلیمات کا ہندی زبان میں منتقل کر دیا جائے، ہمارا یہ ایک تبلیغی فرض ہے، اور انشاء اللہ تعالیٰ یہ خواب پورا ہو کر رہے گا۔

از بندہ محمد طیب غفرلہٗ عرض ہے کہ انقلاب ۱۹۴۷ء کے بعد اسی سال احقر کی طرف سے دارالعلوم کے درجہ فارسی میں ہندی اور رسم ناگری جاری کر دیئے جانے کی ہدایت بھیج دی گئی، اور ایک مستقل مدرس ہندی کے لئے مامور کیا گیا، جو آج تک جاری ہے، بعد میں اسے تمام بزرگان دارالعلوم نے پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ اور اب یہ ہندی کی تعلیم ضابطہ سے جزو نصاب درجۂ فارسی بنا دی گئی ہے۔ محمد طیب غفرلہٗ

تصادم و تزاحم تو خیر دور کی بات ہے، شاید کسی قسم کی کوئی قابلِ ذکر شکایت بھی نہیں پیدا ہوئی، نہ باشندوں کی طرف سے کبھی ایسی کوئی آواز بلند ہوئی ورنہ خود قصبہ میں باوجودیکہ ہندوؤں کی کافی آبادی ہے ان ہی کو شکایت کا موقعہ میری دانست میں کبھی ملا ہے۔[1]

بہرحال یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ چاندا پور کے میلوں میں جو کچھ دیکھا گیا تھا اگر سوچا جائے تو یہ نظارہ ان ہی میلوں کے ساتھ ختم نہیں ہو گیا، بلکہ "دارالعلوم دیوبند" کی پوری تاریخ میں اس باغ کے باغبان کی وہ روش اب تک نظر آتی ہے، جسے دیکھنے والوں نے ضلع شاہجہان پور کی مقامی ندی گرّا نامی کے ساحل پر دیکھا تھا، جہاں تک میرا خیال ہے اسلامی ہند کی موجودہ مشکلات کے حل میں چاہا جائے تو اس روش سے آج بھی استفادہ کا امکان باقی ہے، واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم

اور عمل کے لئے خداشناسی کے ان میلوں سے جہاں یہ روشنی ملتی ہے، وہیں یہ عجیب بات ہے کہ علم کے دائرہ میں ہم جن "نظریات تازہ" کی تعبیر "حکمت قاسمی" سے کر سکتے ہیں، یا چاہئے کہ کریں، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی میلوں کی بدولت پہلی دفعہ وہ قلم بند ہوئے، میرا اشارہ سیدنا الامام الکبیر کی مشہور کتاب "حجۃ الاسلام" کی طرف ہے۔ اس کتاب میں کیا ہے، ظاہر ہے اس پر بحث کا موزوں ترین مقام تو سیرت طیبہ کی بعد کی جلد ہی ہو سکتی ہے، جس میں آپ کے خصوصی نظریات کی ترتیب و تبویب کا کام کیا جائے گا، مختصر لفظوں میں سر دست اس سلسلہ میں بس اتنی بات کافی ہے کہ اس کتاب کا خاص اڈیشن جب شائع ہوا تھا تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب کا تعارف کراتے ہوئے ارقام فرمایا تھا کہ

---

[1] ہاں افراتفری کے ان مہیب دنوں کا ایک تو ذکر ہے جب ۱۹۴۷ء میں غیر ملکی حکومت اچانک اپنے سیاسی اقتدار سے دست بردار ہو کر اس ملک سے رخصت ہو رہی تھی، جہاں دست و خیز کے اس ہنگامہ میں سب کچھ دیکھا گیا، دارالعلوم کو بھی بعض ناگوار حالات سے دوچار ہونا پڑا، لیکن تحقیق نے اس وقت بھی یہی ثابت کیا کہ شکایت کا مستحق دارالعلوم نہیں، بلکہ وہی لوگ تھے، جنہوں نے گھن کے ساتھ گیہوں کے پیس دینے کا غلط اقدام کیا تھا۔

"اس تحریر کی نسبت حضرت مولانا و سیدنا الامام الکبیر کی زبان مبارک سے یہ بھی سنا گیا کہ
جو مضامین تقریر دل پذیر میں بیان کرنے کا ارادہ ہے، وہ سب اس تحریر میں آ گئے، اگر چہ
تفصیل سے نہ سہی، بالاجمال ہی سہی" ص۳

جیسا کہ معلوم ہے "تقریر دل پذیر" نامی کتاب میں اسلام کے علمی و عملی نظام کو تعبیر و استدلال کے نئے
پہلوؤں میں ڈھالنے کا ارادہ سیدنا الامام الکبیر نے فرمایا تھا، لیکن چند ابتدائی ابواب سے زیادہ یہ کتاب
لکھی نہ جا سکی۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آگے لکھا تھا کہ

"تقریر دل پذیر کے تمام نہ ہونے کا قلق شائقان اسرار علمیہ کو ہے، اس کی مکافات کی صورت
بھی اس رسالہ (حجۃ الاسلام) سے بہتر دوسری نہیں ہو سکتی"

پھر اسی کتاب حجۃ الاسلام کے متعلق اپنے ذاتی احساس کو ظاہر کرتے ہوئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ
نے ارقام فرمایا تھا کہ

"تائید احکام اسلام، اور مدافعت فلسفہ قدیمہ و جدیدہ کے لئے جو تدبیریں کی جاتی ہیں،
ان کو بجائے خود رکھ کر حضرت خاتم العلماء (سیدنا الامام الکبیر) کے رسائل کے مطالعہ میں
کچھ وقت ضرور صرف فرمائیں، اور پورے غور سے کام لیں، اور انصاف سے دیکھیں، کہ
ضروریات موجودہ زمانۂ حال کے لئے وہ سب تدابیر سے فائق اور مختصر اور بہتر و مفید تر
ہیں، یا نہیں" ص۲

بظاہر ان الفاظ کا تعلق اگر چہ عام رسائل سے معلوم ہوتا ہے، لیکن زیادہ تر "حجۃ الاسلام" ہی کے افادی
پہلوؤں کی طرف حضرت شیخ الہندؒ نے ان جامع و مانع الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے، آپ کے اس دعوے
کی توثیق تجربہ سے ہوتی ہے،

بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ چاندا پور کے یہ میلے خواہ کسی نیت اور ارادے سے جائے گئے ہوں،
لیکن منجملہ دوسرے فوائد کے ایک بڑا علمی و دینی فائدہ ان میلوں کا یہ بھی ہوا، جیسا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ
اللہ علیہ نے اپنے اسی دیباچہ میں لکھا ہے کہ

"بندہ محمود، حمد و صلوٰۃ کے بعد طالبان معارف الٰہیہ اور دلدادگان اسرار ملت حنیفیہ کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ ۱۸۷۶ء میں پادری نولس صاحب اور منشی پیارے لال صاحب ساکن موضع چاندا پور متعلقہ شاہ جہاں پور نے جب ایک میلہ بنام "میلہ خدا شناسی" موضع چاندا پور میں مقرر کیا، اور اطراف و جوانب میں اس مضمون کے اشتہار بھجوائے کہ ہر مذہب کے علماء آئیں اور اپنے اپنے مذہب کے دلائل سنائیں، تو اس وقت معدن الحقائق، مخزن الدقائق، مجمع المعارف، مظہر اللطائف، جامع الفیوض والبرکات، قاسم العلوم والخیرات سیدی و مولائی حضرت مولانا محمد قاسم متعنا اللہ بعلومہ و معارفہ نے اہل اسلام کی طلب پر میلہ مذکور کی شرکت کا ارادہ ایسے وقت میں مصمم فرمایا کہ تاریخ مباحثہ ۷ رمئی سر پر آگئی، چونکہ یہ امر بالکل معلوم نہ تھا کہ مذاہب اور بیان دلائل کی کیا صورت تجویز کی گئی، اعتراضات و جوابات کی نوبت آئے گی، یا زبانی اپنے اپنے مذہب کی حقانیت بیان کیا بیانات تحریری ہر کسی کو پیش کرنے پڑیں گے، تو اس لئے بنظر احتیاط حضرت مولانا قدس اللہ سرہ کے خیال مبارک میں یہ آیا کہ ہر ایک تحریر جو اصول اسلام اور فروع ضروریہ بالخصوص جو اس مقام کے مناسب ہوں، سب کو شامل ہو، حسب قواعد عقلیہ منضبط ہونی چاہئے، جس کے تسلیم میں عاقل منصف کو کوئی دشواری نہ ہو اور کسی قسم کے انکار کی گنجائش نہ ملے"۔

اسی کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے یہ اطلاع دی ہے کہ

"چونکہ وقت بہت تنگ تھا، اس لئے نہایت عجلت کے ساتھ غالباً ایک روز کامل اور کسی قدر شب میں بیٹھ کر ایک تحریر جامع تحریر فرمائی"۔

لیکن جیسا کہ گذر چکا تحریری مقالے کے سنانے کا موقعہ سیدنا الامام الکبیر کو نہ ملا، بلکہ بقول شیخ الہند

"جلسہ مذکور میں تو مضامین مندرجہ تحریر مذکور کو زبانی ہی بیان فرمایا، اور درباره حقانیت اسلام جو کچھ بھی فرمایا، زبانی ہی بیان فرمایا"۔

مگر میلے کے بہانے سے "قاسمی معارف" کا ایک قیمتی حصہ، اور صدیوں کام آنے والا سرمایہ جو تیار ہوگیا تھا، اس نے تو تحریر کا قالب اختیار کرلیا، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اسی سلسلہ میں یہ خبر بھی دی ہے کہ

"مولانا مولوی فخر الحسن رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس کے (یعنی قلم بند شدہ تحریر کے) مضامین کے لحاظ سے اس کا نام "حجۃ الاسلام" تجویز فرما کر اول بار شائع فرمایا تھا۔" مٹ

"خداشناسی کے میلہ" کی سرگذشت کو ختم کرتے ہوئے، سیدنا الامام الکبیر کی کتاب "حجۃ الاسلام" کے ذکر کی تقریب سے، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر کے اکثر حصہ کو میں نے اس لئے بھی نقل کردیا ہے، کہ براہ راست اس میلہ میں اپنے حضرت الاستاذ سیدنا الامام الکبیر کی ہمرکابی میں شیخ الہندؒ بھی شریک تھے، اسی لئے جو کچھ آپ نے لکھا ہے شنیدہ نہیں دیدہ ہے، آپ کے قلم مبارک کی لکھی ہوئی اجمالی روداد کو مناسب معلوم ہوا کہ اس کتاب میں بھی تبرکاً درج کیا جائے۔ اور ضمناً یہ اشارہ

---

لہ تعارف کے اسی مضمون میں یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

"صاحبان مطابع اس عجالہ مقبولہ (حجۃ الاسلام) اور نیز دیگر تصانیف حضرت مولانا (سیدنا الامام الکبیر) رحمۃ اللہ علیہ کی اشاعت دیکھ کر، صرف بغرض تجارت معمولی طور پر ان کو چھاپتے رہے، کسی زائد اہتمام کی حاجت ان کو محسوس نہ ہوئی، اس لئے فقط کاغذ اور لکھائی چھپائی ہی میں کوتاہی نہیں ہوئی، بلکہ تصحیح عبارت میں نمایاں خلل پیدا ہو گئے۔"

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے "حکمت قاسمیہ" کی نشر و اشاعت کی تجویز کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

"اس حالت کو دیکھ کر کہ شش برادران قاسمی و دل دادگان اسرار علمی کو بے اختیار اس امر پر کربستہ ہونا پڑا کہ صحت و خوش خطی وغیرہ تمام امور کا اہتمام کرکے اس عجالہ مقدسہ کو چھاپا جائے اور بغرض توضیح حاشیہ پر ایسے نشانات کردئیے جائیں جن سے تفصیل مطالب ہر کسی کو بے تکلف معلوم ہو جائے، اور

جملہ تصانیف حضرت مولانا نفع اللہ المسلمین بفیوضہ

کو اسی کوشش اور اہتمام کے ساتھ چھاپ کر ان کی اشاعت میں کوشش کی جائے، واللہ ولی التوفیق۔"

لیکن شاید حجۃ الاسلام کے سوا سیدنا الامام الکبیر کی دوسری کتابوں کے متعلق اس تجویز کے مطابق عمل کا باقی نکلتے پر

بھی کرنا چاہتا ہوں کہ بہت سے واقعات تاریخ میں ایسے گذرے ہیں، جن کے دور رس نتائج کا اندازہ ان کے وقوع کے زمانہ میں نہیں کیا جا سکتا تھا، جو بعد کو لوگوں کے سامنے آئے، یہی حجۃ الاسلام کتاب ہے لکھی تو گئی ہے کل ایک دن اور رات کے کچھ حصے میں، لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ اس کے مضامین سے دنیا کب تک کن کن حالات میں کس حد تک مستفید ہوتی رہے گی، اور کتنوں کی دینی راتیں اس کتاب کی روشنی سے دن بنتی چلی جائیں گی، مجھے تو یہی رنگ ان عملی نمونوں کا بھی معلوم ہوتا ہے، جو ان میلوں میں سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے خواہ جتنے مختصر زمانہ میں بھی پیش ہوئے ہوں، مگر فائدہ اٹھانے کا ارادہ کیا جائے، تو ہندوستان کی اسلامی آبادی اپنے بود و باش کے الجھے ہوئے مسائل کو چاہے تو ان نمونوں کی مدد سے آج بھی سلجھا سکتی ہے۔ وما یلقاھا الا الذین صبروا وما یلقاھا الا ذو حظ عظیم۔

بہر حال خدا شناسی کا یہ میلہ تو ختم ہو گیا، معلوم نہیں کہ اس کا سلسلہ آئندہ سالوں میں جاری رہا یا ان ہی دو میلوں تک قصہ ختم ہو گیا، جو بقول ہمارے مصنف امام درحقیقت قائم ہی اس لئے ہوا تھا، اور قدرت کی غرض ہی یہ تھی کہ

گذشتہ صفحے سے متعلقہ حاشیہ: میں نے اس تجویز کے الفاظ کو بجنسہ اس لئے نقل کر دیا ہے، کہ دارالعلوم دیوبند اور اس کے ارباب نسبت و کشاد بلکہ شاید تمام وابستوں پر ایک قرض ہے، جو چڑھا چلا آ رہا ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ یہ قرض کب ادا ہو گا، دلچسپ لطیفہ یہ ہے کہ دیوبند کے اس معنوی سرمایہ کو جب اس کے شایان شان لباس پہنانے کا ارادہ کیا گیا، تو یہ عجیب اتفاق ہے کہ نظر انتخاب علیگڈھ پر پڑی، اور حجۃ الاسلام کا یہ خصوصی اڈیشن مطبع احمدی علیگڈھ میں چھاپا گیا، اسلام کی معنوی و صوری یا قلب و قالب کی خدمت کے سلسلہ میں تقسیم عمل کا یہ حسن اتفاق، باہمی وفاق کا کتنا اچھا اشارہ ہے۔ ۱۲

ع۱ اس قرض کی ادائگی الحمد للہ شروع کر دی گئی ہے، حضرات کارکنان دارالعلوم نے یہ بار ذاتی طور پر اپنے سر لے لیا ہے، ایک مستقل ادارہ بنام ادارۂ نشر و اشاعت قائم کر کے اس میں ایک مستقل شعبہ اسی لئے کھول دیا گیا ہے کہ اس میں اسلاف دارالعلوم بالخصوص حضرت بانی دارالعلوم کے علوم اور تصانیف کو اچھے لباس کے ساتھ منظر عام پر لایا جانے کا کام شروع کر دیا گیا ہے، اور امید ہے کہ عنقریب جدیہات قاسمیہ اور حکمت قاسمیہ کے مظاہر (تصانیف قاسمیہ) سامنے آنی شروع ہو جائیں گی۔ واللہ ولی التوفیق ۱۲ محمد طیب غفرلہٗ

"ان دو سال کے جلسوں میں عام مخلوق نے جان لیا کہ یہ شخص (یعنی سیدنا الامام الکبیر) کس پایہ کا ہے' اور فضل الٰہی کی کیا صورت ہوا کرتی ہے۔ "جز بہ تائید آسانی نیست" کا نقشہ ظاہر ہو گیا" ملا سوانح قدیم

اور گو عام طور پر علمی حلقوں میں سیدنا الامام الکبیر کی علمی و عملی عظمت کا سکہ پہلے ہی سے بیٹھا ہوا تھا لیکن ہندوستان کے طول و عرض میں آپ کی شہرت کا ذریعہ بظاہر ان ہی میلوں کی غیر معمولی کامیابیاں بن گئیں ان میلوں سے فارغ ہو کر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں جب

"بحمد اللہ نصرت اسلام کا پھریرا اڑاتے ہوئے حضرت مولنا المعظم واپس تشریف لائے" ملا (تعارف حجۃ الاسلام)

عرض کر چکا ہوں کہ دوسرے سال کے میلے کے بعد چند دن آپ کا قیام شہر شاہ جہاں پور رہا' مہمان نوازی کا فرض مولوی طاہر صاحب آنریری مجسٹریٹ یعنی ملا دن والے موتی میاں نے ادا کیا' اسی زمانہ میں جب موتی میاں کے یہاں دوسرے علماء جو میلے میں شریک ہوئے تھے' ان کے ساتھ مقیم تھے' یہ تحریک کی گئی تھی کہ منشی اندرمن اور پنڈت دیانند سرسوتی دونوں صاحبوں کو چاندا پور سے جہاں منشی پیارے لال بانی جلسہ کے یہاں یہ دونوں مہمان تھے' شاہ جہاں پور بلایا جائے۔ خط لیکر آدمی چاندا پور گیا' بتا چکا ہوں کہ جواب میں دونوں صاحبوں نے آنے سے معذرت کی' اور لکھا کہ آپ ہی لوگ چاندا پور آ جائیں' مزید ادھر لکھا ہے کہ اس کے بعد

"مولوی محمد طاہر صاحب (موتی میاں) نے باشارہ مولوی محمد قاسم و حسب صلاح مولوی محمد علی صاحب (مصنف سوط اللہ الجبار) پھر مکرر لکھا کہ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا' وہاں کا (یعنی چاندا پور کا) مجمع برخاست ہو گیا' اب وہاں کون ہے جو مباحثہ کا لطف اٹھائیگا"

ملا مباحثہ شاہ جہاں پور

لیکن باوجود دوبارہ تقاضے کے نہ منشی اندرمن ہی شاہ جہاں پور آنے پر راضی ہوئے' اور نہ پنڈت جی ہی آئے۔ لکھ بھیجا تھا کہ

"آپ کے (یعنی موتی میاں کے) مکان پر نہیں آتا، ہاں! اگر منشی گنگا پرشاد ہوتے، جن
کی تبدیلی عہدہ ڈپٹی کلکٹری پر مقام شاہ جہاں پور ہوگئی ہے، تو ان کے مکان پر میں آسکتا
تھا" مباحثہ شاہ جہاں پور

اور اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی یہ کوشش تھی کہ منشی اندرمن، یا پنڈت دیانند سرسوتی
جیسے لوگوں سے جو اس زمانہ میں اچانک مسلمانوں اور مسلمانوں کے دین پر اعتراض و تنقید کرنے کے
لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، براہ راست ملیں لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ براہ راست
ملاقات اور مکالمے سے گریز کی راہ وہ کیوں اختیار کرتے رہے۔

شاہ جہاں پور کا یہ قصہ تو خیر شاہ جہاں پور ہی پر ختم ہوگیا، اس کے بعد سیدنا الامام الکبیر گھر واپس
ہوئے، چند ہی مہینے گذرے تھے کہ اچانک تیسرے حج کے سفر کا ارادہ کرکے آپ حجاز روانہ ہوگئے
آپ کے اس حج کا جو آپ کی زندگی کا آخری حج تھا، اس کی تفصیل تو آگے آرہی ہے، آمد و رفت میں
تقریباً چھ مہینے صرف ہوئے یعنی دوسرا میلہ تو ۱۲۹۴ھ کے ماہ مارچ میں منعقد ہوا تھا اسی سال کے
ماہ اکتوبر میں آپ راہی حجاز ہوئے، اور جیسا کہ مصنف امام نے خبر دی ہے، اس حساب سے دوسرے
سال ۱۲۹۵ھ ماہ مارچ میں ہندوستان واپس تشریف لائے۔ گویا حج و زیارت کا یہ سفر چھ مہینے
میں پورا ہوا تھا۔

مارچ کے بعد صرف اپریل و مئی و جون کے تین ہی مہینے گذرے تھے، واپسی بھی اتنے طول و
طویل سفر سے ہوئی تھی، اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، مکہ معظمہ سے واپس ہوتے ہوئے، مکہ اور جدہ کے
درمیان آپ پر اس مرض کا حملہ ہوا، جو آپ کی ناسوتی زندگی کی گویا آخری علالت تھی۔ کسی نہ کسی طرح
ہندوستان آنے والے جہاز پر آپ کو سوار تو کر دیا گیا تھا لیکن جہاز ہی میں مصنف امام نے لکھا ہے کہ
"ایک دن یہ نوبت ہوئی، کہ ہم سب مایوس ہوگئے" ص۲۲

گو یہ مایوسی واقعی مایوسی اس وقت ثابت نہ ہوئی، لیکن مرض کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ وطن پہنچنے کے
بعد بھی زیر علاج رہے، کلی صحت تو پھر بھی حاصل نہ ہو پائی تھی، لیکن بقول مصنف امام

"مرض دفع ہوا، گو نہ طاقت آئی، مگر کھانسی ٹھیر گئی، اور کبھی کبھی دورہ سانس کا ہوتا۔ زیادہ بولنا، دیر تک کچھ فرمانا مشکل ہو گیا، پھر اس میں بھی کچھ تخفیف ہوئی۔" ص۳۳

"کچھ تخفیف ہوئی" کے الفاظ ہی بتا رہے ہیں کہ تکلیف کا کلی ازالہ نہیں ہوا تھا، آپ ان ہی حالات میں تھے، کہ وہی پنڈت دیانند سرسوتی جی نے ہندوستان کے طویل و عریض رقبہ میں خدا ہی جانتا ہے کہ کن مصلحتوں کے زیر اثر اپنی کدوکاوش کا مرکز ضلع سہارنپور کے قصبہ رڑکی کو بنالیا، سیدنا الامام الکبیر نے اپنی کتاب قبلہ نما کے دیباچہ میں خود ہی ارقام فرمایا ہے کہ

"بعد حمد و صلوٰۃ بندۂ ہیچمدان، سراپا گناہ محمد قاسم ناظرین اوراق کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ سن بارہ سو پچانوے ہجری رجب (مطابق ۱۸۷۸ء ماہ جولائی) میں پنڈت دیانند صاحب نے رڑکی میں آکر سربازار مجمع عام میں مذہب اسلام پر چند اعتراض کئے۔" ص۲

نہیں کہا جا سکتا کہ رجب کے جس مہینہ کا ذکر کیا گیا ہے، اس مہینہ کی کس تاریخ سے پنڈت جی کی گل افشانیاں کہئے، یا شرر باریوں کا یہ قصہ رڑکی میں شروع ہوا تھا، بظاہر قیاس کا اقتضاء ہے کہ آخری رجب میں پنڈت جی نے رڑکی پہنچکر پادریوں کے طریقہ سے بر سربازار اسلام کو اپنے تیروں کا نشانہ بنالیا، رڑکی کے مسلمان بے چین ہو گئے، شاہجہانپور کے میلوں کی سرگذشت عام طور پر مشہور بھی ہو چکی تھی، نیز قرب مکانی کی وجہ سے قدرتاً رڑکی کے مسلمانوں کی نظر سیدنا الامام الکبیر ہی پر پڑ سکتی تھی، واللہ اعلم آدمی رڑکی سے آئے، یا ڈاک سے اطلاع دی گئی، مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ اختتام رجب کے بعد شعبان میں یہ خبر سیدنا الامام الکبیر تک پہنچی، انہوں نے لکھا ہے کہ

"اسی سال (۱۲۹۵ھ جس میں حجاز سے واپسی ہوئی تھی) شعبان میں رڑکی سے خبر لی کہ پنڈت دیانند تشریف لائے ہوئے ہیں، اور مسلمانوں کے مذہب پر کچھ اعتراض مشتہر کئے ہیں، اہل رڑکی مجبر ہوئے کہ آپ تشریف لائیں۔"

مشتہر کرنے کا مطلب وہی ہے کہ پادریوں کی ریس میں پنڈت جی نے بھی بر سربازار اپنی گل افشانیاں کی

باشرر باریوں کا سلسلہ شروع کیا تھا، پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں، پنڈت جی اپنی ذہانت کے زور سے اس
دعوے کا اعلان کرتے پھرتے تھے کہ دنیا کی تمام بت پرست قوموں میں سب سے بڑی بت پرست
قوم مسلمانوں کی ہے۔ بنا بریں رڑکی میں بھی اپنی اسی اچھوتی اور انوکھی اپچ سے مسلمانوں کے دل و دماغ
کو مجروح کر رہے تھے۔ پنڈت جی کے اعتراضوں میں گل سرسبد کی حیثیت اسی اعتراض کو حاصل تھی،
اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے، کہ رڑکی کے اسی قصے کے سلسلے میں سیدنا الامام الکبیر نے "قبلہ نما"
نامی اپنی کتاب اسی اعتراض کے جواب میں لکھی ہے، بہرحال شعبان میں پنڈت جی کی آمد کی خبر ملی،
رڑکی کے مسلمانوں نے تو خیر طلب ہی کیا تھا، لیکن اس بیرونی کشش کے سوا سچ پوچھئے، تو خود
سیدنا الامام الکبیر بھی رڑکی کی آئی ہوئی خبروں سے تلملا اٹھے تھے، اسی کتاب قبلہ نما کے دیباچہ
میں ارقام فرماتے ہیں کہ

"حسب الطلب بعض احباب (رڑکی) اور بتقاضائے غیرتِ اسلام یہ ننگِ اسلام بھی
شروع شعبان میں وہاں (رڑکی) پہنچا" ص۲

اس میں شک نہیں کہ رڑکی کا فاصلہ زیادہ نہ تھا، لیکن ذرا سوچئے تو سہی ان باتوں کو کہ حجاز کے طول و
طویل سفر سے ابھی آپ واپس ہوئے ہیں، اور واپسی بھی ایسی شدید علالت کے ساتھ ہوئی ہے، گو مرض
میں وقتی طور پر گونہ افاقہ کی صورت ظاہر ہو چکی تھی، لیکن ضعف ہی نہیں، بلکہ مصنف امام نے جو اطلاع
دی ہے، کہ

"مولانا (سیدنا الامام الکبیر) باوجود ضعف اور مرض کے تشریف لے گئے"

اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ مرض کا لگاؤ بھی باقی تھا۔ مولانا حکیم منصور علی خاں صاحب نے اپنی کتاب
مذہب منصور میں رڑکی کے اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے جس کا آگے ذکر آرہا ہے،
اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ رڑکی کا یہ سفر بہلی میں کیا گیا تھا۔ بیل کی اس گاڑی کے ہچکولوں کی
اچھے اچھے تندرستوں کے بھی انجر پنجر ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، پھر مرض اور مرض کی نقاہت کے
ساتھ یہ سفر جس حد تک تکلیف دہ ہو سکتا ہے، خصوصاً راستہ بھی جب ہموار نہ ہو، قبلہ نما کے

دیباچہ میں "راہ کی خرابی" کا ذکر بھی کیا گیا ہے، مگر آپ دیکھ رہے ہیں، کہ "غیرتِ اسلام" کے تقاضے نے ہر تقاضے کو سامنے سے ہٹا دیا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی توہین کا خیال، ہر خیال پر غالب ہے، جس حال میں تھے "کھنچے ہوئے رڑکی پہنچ گئے" اور عجیب شان کے ساتھ پہنچے، مصنف امام نے لکھا ہے، کہ رڑکی کے اس سفر میں یہی نہیں کہ

"بہت سے خادم ساتھ ہو لئے" ص۱۲

بلکہ شاہ جہاں پور کے قصے مسلمانوں میں جو پھیلے ہوئے تھے، بظاہر ان ہی کا اثر تھا، کہ لوگوں کو جب خبر ہوئی، کہ سیدنا الامام الکبیر اور پنڈت دیانند جی میں مباحثہ و مناظرہ بہ مقام رڑکی ہونے والا ہے، تو

"اطراف و جوانب سے بہت سی مخلوق مولانا کی تقریر کے اشتیاق میں جمع ہو گئی" ص۱۲۴

خلافِ دستور کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ رڑکی کے اس معرکہ میں قصداً اپنے خاص خاص شاگردوں کو جو دوسرے مقامات میں تھے، آپ نے طلب کر لیا تھا، مولانا حکیم منصور علی صاحب جو اس زمانہ میں منگلور نامی قصبہ میں کسی مدرسہ میں مدرس تھے جو دیوبند اور رڑکی کے درمیان راستہ میں ملتا تھا، حکیم صاحب نے لکھا ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر نے

"ایک تلمیذ رشید (مولانا فخر الحسن گنگوہی) کو منگلور بھیجا، کہ اس کو (یعنی حکیم صاحب کو) ملنے کے لئے بلا لاؤ۔ میں یہ مژدہ سنتے ہی مولوی فخر الحسن گنگوہی کے ہمراہ چلا گیا، شرکت پر بہلی کو ٹھیرا کر فرمایا، تم بھی ضرور رڑکی آ جانا۔ حسب الارشاد دو تین روز بعد میں بھی رڑکی پہنچا" ص۱۹ مذہب منصور

بہر حال خدام خاص (تلامذہ وغیرہ) کے سوا عام مسلمانوں کا بھی کافی مجمع معلوم ہوتا ہے، کہ رڑکی میں اکٹھا ہو گیا تھا، گویا ایک برات ہی اتر پڑی تھی۔ اسی کے ساتھ جب ہم حضرت والا ہی کی براہ راست دی ہوئی اس اطلاع کو پڑھتے ہیں یعنی رڑکی پہنچنے کے بعد ارقام فرمایا گیا ہے، کہ

"آرزوئے مناظرہ میں سولہ سترہ دن وہاں (رڑکی) ٹھیرا رہا" قبلہ نما ص۲

تو یہ کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے ' نصف ماہ سے زیادہ دن تک باہر سے آئے ہوئے اتنے بڑے مجمع کے رہنے سہنے ' کھانے پینے کا نظم ' اور وہ بھی اس طریقہ سے کہ ہر شخص اپنے کھانے پینے کا خرچ خود برداشت کرے ' یہی حکم سیدنا الامام الکبیر کا تھا ' جس کی تفصیل آگے آرہی ہے ' اور معیتہ بھی جولائی آغاز موسم برشگال کا۔

"علاوہ بریں برسات کا موسم"

ان الفاظ سے قبلہ نما کے اسی دیباچہ میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے۔

لیکن اپنے ذاتی ضعف مرض ' اور اتنے بڑے مجمع کے قیام و طعام کی دشواریوں سے بے پروا ہو کر تین چار دن نہیں بلکہ سولہ[۱۲] سترہ دن تک آپ رڑکی میں کیوں مقیم رہے؟

بظاہر جیسا کہ خود آپ کے ذاتی بیان سے بھی معلوم ہوتا ہے ' اور دوسروں نے بھی لکھا ہے کہ پنڈت جی سے آپ براہ راست دو بدو ہو کر گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ قبلہ نما کے دیباچہ میں آپ کے الفاظ ہیں کہ

"ہر چند چاہا کہ مجمع عام میں پنڈت جی سے اعتراض سنوں اور بالمشافہ بعنایت خداوندی اسی وقت ان کے جواب عرض کروں"

لیکن جیسا کہ مصنف امام نے اجمالاً یہ خبر دی ہے ' کہ

"وہ اللہ کا بندہ (پنڈت دیانند سرسوتی) گفتگو پر یکانہ ہوا۔ اینڈی بینڈی شرطیں کرتا تھا" ص۱۲

ان اینڈی بینڈی شرطوں" کی تفصیل تو آپ خود سیدنا الامام الکبیر ہی کے حوالے سے آگے سنیں گے لیکن ان سے زیادہ دلچسپ حصہ مصنف امام کی خبر کا یہ ہے ' کہ

"وہ اللہ کا بندہ گفتگو پر یکانہ ہوا"

آپ مجھ ہی سے سن چکے ہیں کہ گفتگو یعنی بحث و مباحثہ ' مناظرہ و مجادلہ کے میدان کے پنڈت جی اپنے وقت میں دھنی تھے ' جے پور پہنچکر راجہ رام سنگھ والی جے پور کے دربار کے فاضل پنڈت

دنگا یاریہ کو جیلنج پر جیلنج دے رہے تھے 'آگرہ' اجمیر' پشکر جہاں پہنچے اشیوست کا جس کے پنڈت جی شدہ دع میں پابند تھے۔ منڈن یعنی تائید اور دشنومت کا کھنڈن یعنی تردید اسی کو اپنا پیشہ بنا رکھا تھا۔ پنڈتوں کے قدیم دائرے سے باہر نکلنے کے بعد جب عیسائیوں' مسلمانوں وغیرہ ہندستان کے مختلف مذہبی گروہ کے دین پران کے اعتراضات کا سلسلہ شروع ہوا تھا' سہارنپور سے داناپور تک پنڈت جی نے اندھم مچا رکھی تھی' اپنی تقریروں اور مباحثوں میں پنڈت جی جن ہتھکنڈوں سے کام لیتے تھے' مدراس کے ڈاکٹر مرڈک ایم۔اے ایل ایل ڈی کی شہادت ان کے متعلق گذر چکی کہ پنڈت جی کے ساتھ ان کی تعریف کرنے والوں کی ایک منڈلی رہتی تھی' اور جب پنڈت جی مباحثہ میں اپنے مخالف فریق کی

"ہنسی اڑاتے' قہقہہ لگاتے' تو یہ لوگ (منڈلی والے) اس کام میں ان کا ساتھ دیتے تھے"

اور یہی گواہی ڈاکٹر فارکوہار کی بھی نقل کر چکا ہوں جس میں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ پنڈت جی

"مباحثہ میں تند و ترش' بہت چیخنے والے اور مخالف پر ناجائز دباؤ ڈالنے والا تھا"

"سوامی دیانند اور ان کی تعلیم" نامی کتاب سے ان شہادتوں کو پہلے اپنے موقعہ پر پیش کر چکا ہوں لیکن یہ عجیب بات ہے' کہ سیدنا الامام الکبیر کے مقابلہ میں آنے کے بعد خدا ہی جانتا ہے کہ پنڈت جی پر کیا حال طاری ہوا' کہ خدا شناسی کے میلے میں سنسکرت آمیز بھاشا یعنی اسی زبان میں تقریر کی جس کے سمجھنے والے میلے میں دس پانچ آدمی بھی نہ تھے' نہیں کہا جا سکتا کہ پنڈت جی کے دل کا جو ارمان میلہ میں تھا دل ہی کے اندر رہ گیا تھا' اسی ارمان کو نکالنے کے لئے رڑکی پہنچے تھے اور رڑکی کے انتخاب کرنے کی وجہ یہی تھی کہ سیدنا الامام الکبیر کا وطن ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ اسی علاقے میں ہے' مگر اب اسے کیا کہئے' جب حضرت والا باوجود ضعف اور مرض کے رڑکی پہنچ گئے تو وہی پنڈت جی جنہوں نے رڑکی کے مسلمانوں کو بیٹھے بٹھائے بے چین کر دیا تھا' اور تنہا پیشِ قاضی روی راضی آئی' والی مثال کے مطابق حضرت کی تشریف آوری سے پہلے سب کچھ

کہہ رہے تھے، وہی بجائے آگے بڑھنے کے گریز اور فرار کی راہ ڈھونڈھنے لگے، اور ان کے سارے ہتھکنڈے، داؤ پیچ جو مباحثوں میں خرچ ہوتے تھے، رڑکی میں بالکل اس کے برعکس مباحثہ اور گفتگو کے روکنے میں استعمال ہوتے رہے۔ اگر کوئی دوسرا لکھتا تو شاید شک و شبہ کی کچھ گنجائش بھی ہو سکتی تھی، لیکن اس سے زیادہ معتبر ذریعہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی براہ راست شہادت ہے، قبلہ نما کے دیباچہ میں فرماتے ہیں

"مگر پنڈت جی ایسے کاہے کو تھے کہ میدان مناظرہ میں آتے، جان چرانے کے لئے وہ وہ داؤ کھیلے کہ کاہے کو کسی کو سوجھتے ہیں"

"داؤ کھیلنا" تو پنڈت جی کا عام دستور تھا، فرق یہی تھا کہ پہلے یہی کھیل وہ مباحثہ اور گفتگو کرنے میں کھیلتے تھے اور اب اسی داؤ کو وہ مباحثہ اور گفتگو کو ملتوی کرانے کے لئے کھیل رہے تھے۔ اس طرف پنڈت جی تو اپنے سارے کرتب اسی کوشش میں صرف فرما رہے تھے کہ کسی طرح سیدنا الامام الکبیر کا سامنا نہ ہو، اور دوسری طرف ٹھیک اس کے توڑ پر سیدنا الامام الکبیر کو دیکھا جا رہا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو، پنڈت جی کو میدان میں اترنے پر مجبور کر رہے ہیں، خود ہی ارقام فرماتے ہیں، کہ بر سر عام مباحثہ پر آمادہ کرنے کے لئے

"منتیں کیں، غیرتیں دلائیں، حجتیں کیں، سعیئیں کرائیں، مگر وہاں (یعنی پنڈت جی کے یہاں) وہی نہیں کی نہیں رہی"

افسوس ہے کہ ان منتوں، غیرتوں، حجتوں، سعیوں کی پوری تفصیل کا علم نہ ہو سکا، مصنف امام نے بھی حد سے زیادہ اجمال سے کام لیا ہے۔ "اینڈی بینڈی شرطیں" بس ان ہی الفاظ میں سب کو لپیٹ کر انہوں نے رکھ دیا، اور دوسرے ذرائع سے بھی ان تفصیلات کا جیسا کہ چاہیے پورا پتہ نہ چل سکا۔ چونکہ سولہ سترہ دن تک رد و بدل سوال و جواب کا یہ سلسلہ جاری رہا ہے، اس لئے بظاہر یہی خیال گذرتا ہے کہ باتیں کافی دلچسپ ہوں گی۔ حکیم الامت تھانوی رح کے حوالہ سے قصص الاکابر میں ایک لطیفہ کا ذکر کیا گیا ہے کہ پنڈت جی نے ایک دفعہ یہ عذر پیش کیا کہ۔

"میں اس ارادہ (یعنی مناظرہ و مباحثہ کے ارادہ) سے نہیں آیا ہوں"

تو معاً سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے جواب میں کہا گیا کہ

"ارادہ تو فعل اختیاری ہے اب کر لیجئے"

"جھتیں کیں" کے اجمال کی یہ ایک مثالی تفصیل ہے اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً نصف ماہ کے اس طویل عرصے میں کتنے نشاط انگیز، روح پرور لطائف پیش آئے ہوں گے لیکن افسوس کہ ذکر کرنے والوں نے عموماً خاموشی سے کام لیا، تاہم ادھر ادھر سے جن معلومات تک رسائی ہو سکی ہے، انہیں پیش کر دیتا ہوں زیادہ تر یہ معلومات خود حضرت کی کتاب قبلہ نما کے دیباچہ ہی سے فراہم کی گئی ہیں۔ اسی کتاب میں ہے کہ رڑکی کی عام آبادی سے جہاں آپ مقیم تھے، ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر وہ جگہ تھی، جہاں پنڈت جی فروکش تھے۔ غالباً پنڈت جی کے کسی معتقد کا باغ تھا، سیدنا الامام الکبیر نے اطلاع دی ہے کہ

"ہماری فرودگاہ سے بلکہ شہر سے ان کا (پنڈت جی کا) مکان ڈیڑھ میل پر تھا" قبلہ نماص۲

پنڈت جی کی یہی وہ قیام گاہ تھی، جہاں ان کے کھانے کا وہ تماشا دیکھا گیا تھا جس کا ذکر غالباً پہلے بھی کہیں گذرا ہے، امیر شاہ خان صاحب کے حوالے سے ارواح ثلاثہ میں یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر اور پنڈت جی کے درمیان نامہ و پیام کے لانے اور لے جانے کا فرض اس زمانہ میں منشی نہال احمد مرحوم انجام دیتے تھے، خاں صاحب روایت کرتے تھے کہ

"منشی نہال احمد کو جو نہایت ذکی تھے، دیانند کے پاس شرائط مناظرہ طے کرنے کے لئے بھیجا گیا" منشا ارواح

ایک دفعہ جب منشی نہال احمد صاحب پنڈت جی کے پاس موجود تھے۔ پنڈت جی کی رسوئی کا وقت آگیا، بقول خاں صاحب مرحوم انہوں نے دیکھا کہ

"کئی بڑی بڑی تھالیں پوریوں کی تھیں، اور سیروں مٹھائی تھی جس کو یہ (منشی نہال احمد) کئی آدمیوں کا کھانا سمجھے، مگر وہ اکیلے کے لئے آیا تھا، اور اسی تنہا نے وہ سب تھالیں

صاف کردیں[1]"

اسی سلسلہ میں وہ لطیفہ پیش آیا تھا، جب سیدنا الامام الکبیر تک اس کی خبر پہنچی کہ منشی نہال احمد پنڈت جی کے کھانے کی یہ رپورٹ لائے ہیں، اور کہتے ہیں کہ کھانے میں مقابلہ کی پنڈت جی سے مولانا کی اگر ٹھن گئی، تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوگا؟ منشی نہال احمد مرحوم جو خود بھی پرخوری میں کافی نیک نام تھے ان کو بلا کر حضرت والا نے فرمایا تھا کہ اس کے لئے آپ تو ہمارے ساتھ ہیں، تم ہی کو پنڈت جی سے بھڑادوں گا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ مقابلہ کمال میں ہوتا ہے، اور زیادہ کھانا تو زیادہ احتیاج کی دلیل ہے اور احتیاج کمال نہیں نقص ہے، نقص میں بھلا کیا مقابلہ کیا جائے گا، خاں صاحب کے بیان میں یہ بھی ہے کہ آخر میں فرمایا گیا تھا کہ کھانے میں مقابلہ کی ٹھہر جائے تو

"کسی بھینسے یا ہاتھی کو لاکر کھڑا[2] کر دینا"

---

[1] پنڈت جی کے کھانے پینے کے قصے جیسا کہ ان کی سوانح عمریوں سے معلوم ہوتا ہے، کافی دلچسپ ہیں، انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے کہ برہم چاری ہونے کی وجہ سے اپنا کھانا خود پکانا پڑتا تھا جس کی وجہ سے میری خواندگی میں حرج واقع ہوتا تھا، بنا بریں اس بکھیڑے کو چھوٹنے کیلئے میں نے ارادہ کیا کہ حتی الامکان کوشش کر کے سنیاس آشرم کے چوتھے عہدہ میں داخل ہو جاؤں (سوامی دیانند اور ان کی تعلیم ص۲۹ بحوالہ خود نوشت سوانح عمری) یوں گویا بے چارے پیٹ ہی کی مجبوری سے سنیاسی بنے۔ لذیذ کھانوں کا خاص شوق تھا، جس کے لئے رسوئیا کہار وغیرہ رکھنے کی ضرورت ہوئی۔ اپنی حسب منشاء کھانا تیار کرانے کیلئے لکھا ہے کہ میزبانوں سے عموماً نقد روپیہ سوامی جی لے لیا کرتے تھے۔ لاہور پہلی دفعہ جب پہنچے تو ارزانی کے اس زمانہ میں بارہ روپیہ فی ہفتہ میزبانوں سے وصول کیا کرتے تھے۔ آخر میں ایک رسوئیا (باورچی) نے جیسا کہ ان کی سوانح عمریوں میں لکھا ہے زہر کھلا دیا۔ اور اسی زہریلے کھانے سے وفات ہوئی۔ تفصیل کے لئے پنڈت جی کی سوانح عمریوں کو پڑھئے۔ نیز کتاب "سوامی دیانند اور ان کی تعلیم" کا مطالعہ بھی کافی ہو سکتا ہے، خوش خوراک ہونے کے ساتھ پنڈت جی اپنی زندگی کے آخری دنوں میں کافی خوش پوشاک بھی ہو گئے تھے۔ مرنے کے بعد جیسا کہ میرٹھ کے اخبار آریہ سماچار میں چھپا تھا، متعدد سرخ زرد کامدار دوشالے، پشمینہ کی چادریں، پشمینے کے چغے، ریشمی دوشالے، وصیب چھاپا کے ریشمی دوپٹے، ریشمی چغے، ریشمی کرتے، سرخ پٹکا، ریشمی کناری کی دھوتیاں، کلابتوں کا دوپٹہ وغیرہ وغیرہ نکلے تھے۔ پنڈت جی کو تبا کو ہی نہیں بلکہ بھنگ وغیرہ چیزوں کے استعمال کی بھی عام عادت تھی ۱۲

[2] اس واقعہ میں یہ جز دہلی میں نے اکابر سے سنا ہے کہ حضرت والا نے فرمایا کہ مقابلہ کمال میں ہوتا ہے نہ کہ نقص میں اور یہیں بچپن ہو کر منشی نہال احمد سے فرمایا کہ تم اتنے دنوں صحبت میں رہے تمہارے ذہن میں (باقی اگلے صفحہ پر)

بہرحال پنڈت جی شہر سے ڈیڑھ میل دور والے اسی مکان میں بیٹھے بیٹھے سوال و جواب کا سلسلہ جاری کئے ہوئے تھے حضرت والا کی طرف سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ جیسے برسر بازار آپ نے اعتراضات کئے ہیں، ان کے جواب سننے کیلئے چاہئے کہ آپ برسر بازار آئیں، اپنے اعتراضات کو بیان کریں، اور سب کے سامنے مجھ سے ان کے جوابات سنیں۔ لیکن بجائے شہر آنے کے پنڈت جی کا اصرار تھا کہ گفتگو کے لئے آپ ہی میری قیام گاہ پر آئیے۔

صرف یہی نہیں، بلکہ دوسری شرط پنڈت جی کی طرف سے یہ پیش ہوئی کہ آنا ہو، تو مجمع عام کے ساتھ نہ آئیے۔ زیادہ[1] سے زیادہ پچاس آدمیوں کے سامنے گفتگو کا موقعہ دیا جا سکتا ہے، واللہ اعلم ان پچاس آدمیوں میں پنڈت جی کے طرفداروں کا طبقہ بھی شریک تھا، یا حضرت والا کو پچاس آدمی کی حد تک اپنے ساتھ لانے کی اجازت دی گئی تھی۔ ان ہی باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر نے قبلہ نما میں ارقام فرمایا ہے کہ

"اعتراض تو مجمع عام میں کئے۔ پر مناظرہ میں اپنی غلطی کھلنے کا وقت آیا تو پچاس آدمیوں سے زیادہ پر راضی نہ ہوئے"

لکھا ہے کہ وجہ آدمیوں کی تحدید کی جب پوچھی گئی، تو

"اندیشہ فساد زیب زبان تھا"

"اندیشہ فساد" کی جو آڑ پنڈت جی نے لی تھی۔ غالباً اسی سلسلہ میں حجت کو تمام کرنے کیلئے اپنی فطرت

---

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ

یہ سوال پیدا کیوں ہوا کہ اگر کھانے میں مقابلہ ہو گیا تو کیا ہوگا؟ یہ سوال کیوں نہ پیدا ہوا کہ اگر نہ کھانے میں مقابلہ ہو گیا تو کون جیتے گا یہ کہہ کر فرمایا کہ ہمیں بھی اور پنڈت جی کو کسی بند کوٹھری میں بند کر دیا جائے اور چھ مہینے تک بلا خورد و نوش بند رکھا جائے، اور چھ ماہ بعد کھولا جائے تو جو ترو تازہ نکلے اس سے حق و باطل کا فیصلہ کیا جائے۔ محمد طیب غفرلہ

[1] "جواب ترکی بہ ترکی" میں یہ لکھ کر کہ "چاندا پور سے پہلے بھی مولوی محمد قاسم صاحب سے ان کو (پنڈت جی کو) پالا پڑا تھا۔ اس لئے وہاں نہ دس آدمیوں کی قید تھی نہ مجمع عام کو انکار نہ فساد کا اندیشہ نہ قتل کا کھٹکا، نہ تحریر کی ضرورت تھی نہ گوشۂ تنہائی کی حاجت" صفحہ ۲۱ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں پنڈت جی نے کل دس آدمیوں کو ساتھ لانے کی اجازت دی تھی، پچاس تک رد و کد کے بعد راضی ہوئے تھے ۱۲

عام روش کے برخلاف حضرت مولانا اس اقدام پر مجبور ہوئے جس کا ذکر قصص الاکابر میں حکیم الامت تھانوی کے حوالے سے بایں الفاظ کیا گیا ہے

"مولانا محمد قاسم صاحب رڑکی دیانند سے مناظرہ کرنے کے لئے گئے اور بھی چند آدمی ساتھ ہو گئے۔ سنا ہے کہ مولانا ایک جگہ ٹھیرے اور ساتھ والوں سے کہہ دیا تھا کہ کھانا بازار میں کھائیں، مجسٹریٹ کو خبر پہنچی، تو اول وہ سمجھا کہ دعوت خورے آئے ہوں گے، مگر جب واقعی بات کی خبر ہوئی، کہ وہ اس طرح کے لوگ ہیں، تو اس کے دل مجسٹریٹ کے دل میں بڑی قدر ہوئی، اور اس نے مولانا کو بلایا، اور اشتیاق ظاہر کیا۔"

حضرت حکیم الامت نے اس کے بعد بطور جملہ معترضہ کے یہ بیان کرتے ہوئے کہ

"مولانا کی عادت تھی کہ کبھی کسی بڑے آدمی سے نہ ملتے تھے۔ ایک دفعہ رامپور (ریاست) گئے نواب صاحب کو خبر ہوئی، تو مولانا کو بلایا۔ مگر مولانا نہیں گئے، اور یہ حیلہ کیا کہ ہم دیہاتی لوگ آداب شاہی سے واقف نہیں ہیں۔ خدا جانے کیا بے ادبی ہو جاوے۔ نواب صاحب نے کہا کہ آپ کو آداب وغیرہ سب معاف ہیں۔ آپ تشریف لائیں۔ ہمیں آپ سے ملنے کا اشتیاق ہے۔ مولانا نے جواب دیا کہ کیا تعجب کی بات ہے کہ اشتیاق تو آپ کو ہو ملنے کا، اور آؤں میں۔ غرض نہ گئے۔"

مگر پنڈت جی کو جس طرح بھی ہو، راہ پر لایا جائے۔ محض اس نصب العین کے تحت مجسٹریٹ کے بلانے پر حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ

"ملنے سے انکار نہ کیا۔ کیونکہ اس سے ملنے میں دینی مصلحت تھی۔"

مجسٹریٹ سے ملاقات ہوئی، اور اسی سلسلہ میں پنڈت جی کے طرز عمل کی شکایت کی کہ اعتراض تو انہوں نے برسر بازار کیا، اور اب جواب سننے کے لئے مجمع عام میں اس لئے آنا نہیں چاہتے، کہ ان کو فساد کا اندیشہ ہے۔ مجسٹریٹ سے بڑھ کر فساد کے اس بے بنیاد اندیشہ کے متعلق اور کون اطمینان دلا سکتا تھا۔ حضرت تھانوی کا بیان ہے کہ

"مجسٹریٹ نے کہا کہ فساد کے ہم ذمہ دار ہیں"

اسی پر کہتے ہیں کہ پنڈت جی نے فرمایا تھا کہ میں نے مناظرہ کا ارادہ نہیں کیا۔ حضرت والا نے جس کے جواب میں کہا تھا کہ اب ارادہ کر لیجئے مگر اس اختیاری فعل پر بھی وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوئے۔

جیسا کہ قبلہ نما کے حوالے سے براہ راست حضرت والا کے الفاظ نقل کر چکا ہوں کہ "پنڈت جی نے رڑکی میں سر بازار مجمع عام میں مذہب اسلام پر چند اعتراضات کئے" اسی لئے آپ نے چاہا کہ مجمع عام میں پنڈت جی سے اعتراض سنوں اور بالمشافہہ بعنایت خداوندی اسی وقت ان کے جواب عرض کروں"

الغرض مجمع عام میں جو اعتراضات اسلام پر کئے گئے تھے، آپ کا مقصد تھا کہ جواب بھی ان کا مجمع عام ہی میں دیا جائے، اسی بنیاد پر یہ سوال ہوتا ہے کہ مجمع عام میں جب جواب سننے سے پنڈت جی گریز کرتے رہے، اور اس حد تک اپنے گریز پر ان کا اصرار قائم رہا کہ علاقہ کے مجسٹریٹ کی سفارت وہاں بھی اس اصرار سے ان کو ہٹا نہ سکی۔ ایسی صورت میں چاہئے تو یہی تھا کہ قصہ کو ختم کر دیا جاتا کہ اصل مقصد یعنی مجمع عام میں جواب سنانے کا موقعہ باقی نہ رہا تھا۔ مگر دیکھا جاتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے پنڈت جی کا تعاقب جاری رکھا اور کس حد تک جاری رکھا، قبلہ نما کے دیباچہ ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ مجمع عام میں جواب سننے کے لئے پنڈت جی جب آمادہ نہ ہوئے بلکہ حضرت والا نے ارقام فرمایا ہے:

"مجمع عام کی جا بد شواری دو سو تک آئے"

یعنی بجائے مجمع عام کے پنڈت جی نے کہلا بھیجا کہ زیادہ سے زیادہ دو سو آدمیوں کے درمیان آپ کے جوابوں کو سننے کے لئے میں تیار ہو سکتا ہوں۔ بظاہر جس کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ مناظرہ و مباحثہ کے دونوں فریقوں کے آدمیوں کی تعداد دو سو سے متجاوز نہیں ہو سکتی، اور پنڈت جی کی ضد کہئے یا ہٹ دھرمی اسی نقطہ پر ختم نہیں ہو گئی، بلکہ اسی کے ساتھ یہ فرمائش بھی پیش ہوئی کہ جس جگہ میں ٹھہرا ہوا ہوں وہیں آپ آئیں، میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ آگے حضرت والا نے قبلہ نما میں جو یہ اطلاع دی ہے کہ

"مگر اپنے مکان تنگ کے سوا اور کہیں راضی نہ ہوئے"

اس کا یہی مطلب ہے کہ اپنی فرودگاہ ہی پر سیدنا الامام الکبیر کو آنے پر پنڈت جی نے مجبور کیا، جیسا کہ عرض

کرچکا ہوں کہ پنڈت جی کی یہ قیام گاہ اس جگہ سے جہاں حضرت والا ٹھیرے ہوئے تھے، ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر تھی، یہی نہیں بلکہ شہر جہاں عام مسلمانوں کی آبادی تھی۔ اس سے بھی یہی فاصلہ تھا۔ فساد کا اندیشہ جیسے پنڈت جی کو تھا، یہی اندیشہ دوسری طرف سے بھی کیا جاسکتا تھا۔ لیکن پنڈت جی کی یہ شرط بھی مان لی جاتی ہے، فاصلہ کی درازی کی وجہ سے وقت بجائے شام کے چاہا گیا کہ صبح کو رکھا جائے۔ تاکہ آمد و رفت میں کسی قسم کی دشواری نہ ہو، لیکن پنڈت جی نے اس تجویز کو بھی مسترد کر دیا، اور بجائے اس کے اپنی طرف سے شام کا وقت پیش کیا اور شام کو بھی چھ بجے کا وقت دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ چھ بجے کے بعد دن ہی کتنا باقی رہتا ہے۔ وقت کی تنگی کی شکایت کی گئی تو کہلا بھیجا کہ چھ بجے سے نو بجے تک میں وقت دے سکتا ہوں۔ ان ہی باتوں کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہوئے کہ

"وقت صبح کے بدلے چھ بجے شام کے ٹھیرائی۔ کمی وقت کی شکایت کی تو نو بجے تک اجازت آئی۔"

قید و بند کے ان سارے قصوں سے مطلب کیا تھا، حضرت والا نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے کہ

"نو بجے فارغ ہو کر چلو (تو ڈیڑھ میل کی مسافت کو طے کر کے) دس بجے (شہر) پہنچے، ایک گھنٹہ میں نماز سے فارغ ہوئے۔ اس وقت نہ بازار کھلا ہوا جو کھانا مول لیجئے، نہ خود پکانے کی ہمت جو یوں انتظام کیجئے۔ علاوہ بریں برسات کا موسم، مینہ برس گیا، تو اور بھی اللہ کی رحمت ہوگئی۔"

تہ کی بات یہ تھی جیسا کہ حضرت ہی نے لکھا ہے کہ

"ان کی (پنڈت جی کی)، یہ غرض تھی کہ یہ لوگ (یعنی سیدنا الامام الکبیر اور ان کے رفقاء) تنگ ہو کر چلے جائیں اور ہم بغلیں بجائیں۔"

کچھ تحریری و تقریری مناظرے کی بحث بھی معلوم ہوتا ہے پنڈت جی کی طرف سے چھیڑی گئی حضرت کے الفاظ

"پھر اس پر تحریر و تقریر کی شاخ اوپر لگی ہوئی۔"

سے بھی سمجھ میں آتا ہے۔

بہرحال جہاں تک واقعات کا اقتضا ہے۔ ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی سیدنا الامام الکبیر سے سامنا کرنے کے لئے درحقیقت کسی شرط پر آمادہ نہ تھے۔ لیکن ٹھیک اس کے مقابلہ میں سیدنا الامام الکبیر کے طرزِ عمل سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو آپ چاہتے تھے کہ دوبدو گفت گو کرنے کا موقعہ پنڈت جی سے مل جائے۔ اسی لئے جو شرطا اور قید و بند کی جو صورتیں بھی ان کی طرف سے پیش ہوتی رہیں، سیدنا الامام الکبیر ہر ایک کو تسلیم کرتے چلے جاتے تھے، خود ہی لکھا ہے کہ

بنام خدا ہم نے سب باتوں کو سر رکھا "

گویا مان لیا گیا۔ کہ آپ نہیں آتے، ہم ہی آتے ہیں۔ صبح کو نہیں شام ہی کو آئیں گے۔ کھانے پینے کا نظم ہو یا نہ ہو بہرحال برسات کی کالی چیلی راتوں میں دس بجے ہی ہم واپس ہوں گے لیکن پنڈت جی نے اپنی فرودگاہ والی شرط جو پیش کی تھی، اسی میں ایک قانونی راز مضمر تھا۔ رڑکی میں فوجی چھاؤنی اس وقت تک قائم ہو چکی تھی۔ اور باغ جس میں پنڈت جی ٹھیرے ہوئے تھے، کنٹونمنٹ ہی کی حدود کے اندر واقع تھا۔ فوجی قانون کی رو سے کنٹونمنٹ کی حدود میں مذہبی بحث و مباحثہ کے جلسوں کی قانوناً اجازت نہیں ہوتی، پنڈت جی اس فوجی دستور سے غالباً واقف تھے۔ کنٹونمنٹ والوں کو جب اس کا علم ہوا کہ چھاؤنی کی حدود میں اس قسم کا قصہ پیش آنے والا ہے، تو جیسا کہ حضرت والا نے لکھا ہے

"حکام وقت نے قطعاً ممانعت کر دی کہ سرحد چھاؤنی رڑکی میں مناظرہ نہ ہونے پائے، ہاں اس سے خارج ہو تو کچھ ممانعت نہیں " ؎

یوں پنڈت جی کی قیام گاہ کا قصہ ختم ہو گیا، اور یہی پنڈت جی کی غرض بھی تھی، مگر اس کے بعد بھی سیدنا الامام الکبیر نے چاہا کہ قصہ ختم نہ ہو، کنٹونمنٹ کی حدود کے باہر بعض محفوظ مقامات تھے۔ انتہا یہ ہے کہ عیدگاہ جس کی حیثیت گو نہ مسجد جیسی تھی اس کے میدان تک میں حضرت والا راضی ہو گئے کہ پنڈت جی

آنا چاہیں، تو ہم ان کا استقبال کریں گے، خود ان کے الفاظ ہیں کہ

"ہم نے میدان عیدگاہ وغیرہ میں پنڈت جی سے التماس قدم رنجہ فرمائی کیا۔"

مگر خدا ہی جانتا ہے کہ وہی پنڈت دیانند سرسوتی جو دنیا بھر کو مناظرہ اور مباحثہ کا چیلنج دیتے پھرتے تھے ان پر کیا حال طاری تھا، کہ کسی طرح وہ رو در رو ہونے پر آمادہ نہ ہوئے، اور اس سے بھی حیرت انگیز سیدنا الامام الکبیر کا طرز عمل ہے، کہ روز دو روز نہیں، نصف ماہ سے زیادہ مدت تک تمام مشاغل سے الگ ہو کر رڑکی ہی میں صرف اس لئے خیمہ زن ہو گئے، کہ جس طرح بھی ممکن ہو پنڈت جی سے براہ راست مکالمہ و گفتگو کا موقعہ پیدا کیا جائے۔ پنڈت جی کی طرف سے شروط پر شروط کے اضافے ہوتے چلے جاتے تھے، اور آپ ہیں کہ ان کی ایک ایک شرط کے سامنے سر تسلیم خم کئے چلے جاتے ہیں گویا طے کئے ہوئے ہیں کہ کچھ بھی ہو جائے لیکن ایک دفعہ تو اپنی بات ان کے کانوں تک پہنچا کر رہوں، آخر میں تو حد ہو گئی، یعنی جب آپ کو معلوم ہوا کہ کسی وجہ سے زبانی مکالمہ پر پنڈت جی تیار نہ ہوں گے، تو آپ کی طرف سے پنڈت جی کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ

"مرضی ہو، تو آئیے، مناظرہ تحریری ہی۔"

حضرت والا نے اپنے اس پیغام کو نقل کرنے کے بعد یہ اطلاع دی ہے، کہ

"مگر جواب تو درکنار، پنڈت جی نے اپنی راہ لی۔ شکرم میں بیٹھ، یہ جا وہ جا۔" ص۳

حقیقت تو یہ ہے، کہ پنڈت جی کا ناقابل فہم گریز، اور سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کا اس کے مقابلہ میں تعاقب حیرت انگیز، دونوں ہی کی حقیقت ایک معمہ کی سی معلوم ہوتی ہے۔ پنڈت جی کی سیدنا الامام الکبیر کی ملاقات خداشناسی کے میلے میں ہو چکی تھی، بیان کر چکا ہوں کہ دونوں میں انفرادی طور پر گفتگو بھی ہوئی تھی، آپ نے پنڈت جی کو روک کر کچھ کہنا چاہا تھا، لیکن پنڈت جی یہ کہتے ہوئے کہ

"اب بھوجن کا وقت آگیا ہے اب ہم سے کچھ نہیں ہو سکتا۔" ص۳ مباحثہ شاہجہاں پور

کچھ بھی ہو، دونوں میں گو دشتناسائی بھی پیدا ہو چکی تھی، پھر میلے کے جلسوں میں حضرت والا کی تقریریں کے سننے کا کافی موقعہ بھی پنڈت جی کو مل چکا تھا، آپ کی علمی قابلیت کا اعتراف بھی جیسا کہ نقل

کر چکا ہوں۔ پنڈت جی کر چکے تھے آپ کی افتادِ طبع، فطری نرم مزاجی صلح پسندی وغیرہ کے اندازہ کرنے کے لئے جن باتوں کی ضرورت تھی، جہاں تک میرا خیال ہے ان کا مشاہدہ کیجئے یا تجربہ بھی پنڈت جی کر چکے تھے، باایں ہمہ رڑکی میں سامنے آنے سے پنڈت جی کیوں گریز کرتے رہے جیسے مرے لئے یہ سوال کچھ ناقابلِ حل سا معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح حضرت والا کے طرزِ عمل کی صحیح توجیہ سے اپنے آپ کو عاجز پاتا ہوں۔ صرف اعتراضوں کا جواب ہی دینا تھا تو اس میں شک نہیں بہتر صورت تو یہی تھی کہ جیسے مجمعِ عام میں پنڈت جی نے اعتراضات کئے تھے، جوابات بھی اسی مجمعِ عام میں ان کو اور مجمع والوں کو سنا دیئے جاتے لیکن جب اندازہ ہو گیا تھا کہ پنڈت جی اس پر راضی نہیں ہو رہے ہیں، تو اعتراض کے سننے والے مجمع کے سامنے جوابوں کی تقریر کافی ہو سکتی تھی، جیسا کہ بعد کو یہی کیا بھی گیا، خود ہی ارقام فرماتے ہیں کہ

"مجبور ہو کر یہ ٹھہرائی کہ جو ان کے اعتراض سننے والوں سے سنتے ہیں، ان کے جواب مجمعِ عام میں سنا دیں، مگر چونکہ یہ بات ایک جلسہ میں ممکن نہ تھی، اور ہم کو دربارۂ توحید رسالت وغیرہ ضروریاتِ دین (اسلام) بھی کچھ عرض کرنا تھا، اور بوجہ ہجومِ بارش و خرابی راہ و قربِ رمضان شریف زیادہ ٹھہرنے کی گنجائش نہ تھی (اس لئے) ایک جلسہ میں تو ان تین اعتراضوں کے جواب سنائے جو سب میں مشکل تھے اور دو جلسوں میں توحید و رسالت کا ذکر کر کے شبِ بست و سوم ماہِ شعبان کو رڑکی سے روانہ ہوا، اور ایک دن منگلور اور تین دن دیوبند ٹھہر کر نانوتہ پہنچا، اس قصبہ ویرانہ میں جس کو نانوتہ کہتے ہیں، اور اس خاکسار کا وطن بھی یہی ہے پہنچا۔"

حاصل جس کا یہی ہے کہ "بیجا دو جا" کا ایوس کن نظارہ پنڈت جی کی طرف سے جب پیش ہوا، اور یقین ہو گیا کہ شافہتہً ان سے مکالمہ کی کوئی صورت باقی نہ رہی، تو تین جلسوں میں رڑکی والوں کو مخاطب بنا کر تقریریں کی گئیں جن میں پنڈت جی کے اعتراضوں کے جوابات بھی دیئے گئے، جو دوسروں نے حضرت والا تک پہنچائے تھے۔ چونکہ پنڈت جی کے ان اعتراضوں کا چرچا رڑکی کے سوا دوسری جگہوں میں بھی

پھیلا ہوا تھا۔ خصوصاً جہاں جہاں پنڈت جی نے تقریریں کی تھیں۔ ان لوگوں تک جوابوں کو پہنچانے کے لئے، اور شاید اس لئے بھی کہ کتابی صورت میں ممکن ہے کسی نہ کسی شکل میں پنڈت جی تک بھی ان کے اعتراضوں کے جوابات پہنچ جائیں۔ آپ نے اپنی کتاب قبلہ نما مرتب فرمائی جیسا کہ دیباچہ کے آخر میں فرماتے ہیں۔

"میاں دنا نوتہ آ کر یہ چاہا کر بنام خدا در بارہ اعتراض پنڈت جی صاحب اپنے ارادہ مکنون کو پورا کروں، یعنی ان کے جوابوں کو لکھ کر نذر احباب کروں، تاکہ اس نامہ سیاہ کے حق میں دعا کا ایک بہانہ ہاتھ آئے، اور خدا تعالیٰ کی عنایت اور رحمت و مغفرت کو اپنی کارگزاری کا موقعہ ملے، الحمد للہ کہ خدا تعالیٰ نے میرا ارادہ پورا کیا، اور میری فہم نارسا کے اندازے کے موافق اعتراضات مذکورہ کے جوابات مجھ کو بجھائے"

اسی کے بعد پنڈت جی کے اعتراضات میں سے پہلے اعتراض کو بایں الفاظ نقل فرما کر یعنی،

"مسلمان ہندوؤں کو بت پرست کہتے ہیں، اور خود ایک مکان کو سجدہ کرتے ہیں جس میں بہت سے پتھر ہیں، جو مسلمان جواب دیتے ہیں، بعینہ بت پرست کہہ سکتے ہیں، اس لئے مسلمان بھی بت پرستوں سے کم نہیں"

سیدنا الامام الکبیر نور اللہ قلوبنا بانوار علومہ و معارفہ نے جواب میں حقائق و اسرار کے سربمہر گنجینوں کو وقف عام فرما دیا ہے، صرف اسی اعتراض کا جواب "قبلہ نما" کے نام سے شائع ہوا، جس کے مضامین پر بحث کرنے کا موقعہ یہاں نہیں ہے کتاب اردو زبان میں ہے پڑھنے والے چاہیں تو پڑھ سکتے ہیں۔ پنڈت جی کے باقی اعتراضات کیا تھے، ان اعتراضوں کے جوابوں کو قلم بند کرنے کا موقعہ حضرت والا کو ملا یا نہ ملا اس کا پتہ نہ چل سکا۔ قبلہ نما کے دیباچہ کی مذکورہ بالا عبارت خصوصاً یہ ارقام فرما کر "ان کے جوابوں کو لکھ کر نذر احباب کروں" آگے یہ اطلاع جو دی گئی ہے، کہ

"الحمد للہ کہ خدا تعالیٰ نے میرے ارادہ کو پورا کیا"

بظاہر اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اس اعتراض کے سوا پنڈت جی کے دوسرے اعتراضوں کا

جواب بھی زیر تحریر آچکا تھا، لیکن کسی وجہ سے وہ شائع نہ ہو سکا۔

مگر سچ یہ ہے کہ اسی ایک اعتراض کے جواب میں جو کچھ ارقام فرمایا گیا ہے۔ وہی بیسیوں اعتراضوں کے جواب کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے، اسی سے اندازہ کیجئے کہ اعتراض جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں، کل تین سطروں میں ختم ہو گیا لیکن متوسط تقطیع کے ایک سو سولہ[۱۱۶] صفحات صرف اسی ایک اعتراض کے جواب میں اس لئے کافی ہوئے ہیں کہ سطریں حد سے زیادہ گنجان اور گھنی ہیں، ورنہ عام کتابت کے لحاظ سے جہاں تک میرا تخمینہ ہے کم از کم تین سو صفحات سے کم میں یہ کتاب ختم نہیں ہو سکتی تھی۔

بہرحال پنڈت جی کا مسلمانوں پر کعبہ پرستی، اور کعبہ کی دیواروں کے پتھروں کی پرستش و عبادت کا الزام بجائے خود اس کی نوعیت جو کچھ بھی ہو، ان کے علم و فضل، فکر و نظر کے متعلق جو رائے بھی اس اعتراض کے سننے والے قائم کریں، لیکن ہم تو پھر بھی سپاس گزار ہی ہیں، کہ ان ہی کے بھڑکائے ہوئے شر سے خیر کا دروازہ ہم پر کھل گیا، سیدنا الامام الکبیر نے ان کی اسی مضحکہ خیز اپچ کے جواب میں حقائق و معارف کے مخفی خزانوں کو قبلہ نما میں وقف عام فرمادیا، پس محرک اور باعث تو اس خیر کے پنڈت جی ہی ہوئے، ورنہ سچ یہ ہے کہ الکعبہ (یا اول[۱] المساجد) کی طرف رخ کر کے خالق کائنات کی عبادت

---

[۱] جیسا کہ معلوم ہے کہ مخلوقات نہیں، بلکہ خالق کائنات کی عبادت و پرستش کے لئے قرآن نے اطلاع دی ہے، کہ سب سے پہلا گھر وہی ہے جو بکہ یعنی وادی مکہ میں تعمیر ہوا، اسی لئے الکعبہ کو ہم اپنی سب سے پرانی مسجد سمجھتے ہیں، اس کی قدامت ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن میں البیت العتیق (پرانا گھر) کے نام سے بھی اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ الغرض اپنی سب سے پہلی تاریخی مسجد کو مرکز بنا کر دنیا کے جس حصہ میں مسلمان پائے جاتے ہیں اسی کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھا کرتے ہیں۔ اسی لئے حدیثوں میں آیا ہے کہ جعلت لی الارض مساجداً (زمین کا سارا کرہ ہی میری سجدہ گاہ ہے) یعنی الکعبہ کی مرکزی مسجد کا صحن بسیط ارض کو قرار دے کر نماز کا جہاں وقت آجاتا ہے ہم اپنی اس پرانی مسجد کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لیتے ہیں، یا زمین کے کرے پر جہاں کہیں مقامی مسجد بناتے ہیں اس کو مرکز سے مربوط کرنے کے لئے رخ اس مسجد یعنی الکعبہ ہی کی طرف کرتے ہیں، اپنی عبادت میں مسلمان اسی لئے مشرق و مغرب و شمال و جنوب وغیرہ سمت کے پابند نہیں ہیں۔ ہندوستان والے مغرب کی طرف رخ اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے حساب سے یہ پرانی مسجد مغربی سمت میں واقع ہوئی ہے۔ علی ہذا القیاس جہاں کے مسلمانوں کے لحاظ سے جس سمت پر بھی یہ پرانی مسجد واقع ہوئی ہے اسی طرف نمازوں میں ان کا رخ ہوتا ہے خود الکعبہ کی (یا قبلہ کو) مغرب

جو مسلمان کرتے ہیں۔ اس کو دیکھ کر اگر واقعی پنڈت جی اس مغالطہ میں مبتلا ہو گئے کہ مسلمان کعبہ اور کعبہ کی دیواروں کو پوجتے ہیں، تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، کہ اسلامی تعلیمات کی ابتدائی اور عام بنیادی معلومات سے واقفیت حاصل کئے بغیر اسلام پر تنقید کرنے کے لئے وہ آمادہ ہو گئے تھے، بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ مسجدوں میں مسلمانوں کو نمازیں پڑھتے ہوئے دیکھ کر آج تک کسی عامی سے عامی ناخواندہ ہندو کو بھی اس کا شبہ نہیں ہوا کہ مسجد کی دیوار یا دیوار کی اینٹوں کو مسلمان پوجتے ہیں، یا کھیتوں، میدانوں میں ان کی نمازوں کو دیکھ کر آج تک کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہوئی کہ سامنے کی ہوا، یا درخت پہاڑ وغیرہ جو نظر آتے ہیں، ان کی مسلمان عبادت کرتے ہیں، حیرت ہوتی ہے کہ پنڈت جی جیسے آدمی کی سمجھ میں اتنی بات بھی نہیں آئی۔ سیدنا الامام الکبیر نے صحیح ارشاد فرمایا ہے کہ

"اگر خود پنڈت جی کو ایسی باتوں میں فرق کرنا نہیں آتا، تو یہ شہرہ کمال کس خیال پر مبنی ہے" ص ۲

حق تو یہ ہے، کہ اسلامی دین سے اتنی ناواقفیت کا انتساب بھی پنڈت جی کی طرف مشکل ہے، اور نہ اتنی سبک مغزی، خوابیدہ دماغی، کہ ان سے توقع ہو سکتی ہے، جیسے ایک جاہل اور ناخواندہ آدمی کی طرف منسوب کرنے کی بھی ہم جرات نہیں کر سکتے۔

بلکہ پنڈت جی کی ذہانت شاباشی اور داد کی مستحق ہے کہ جاہلیت و شرک، و بت پرستی کے تاریک ایام میں بھی سب کچھ پوج ڈالنے کے باوجود عرب کے جاہلوں کے دلوں میں بھی کعبہ اور ان پتھروں کی عبادت کا خطرہ نہ پیدا ہوا جن سے اس عمارت کی تعمیر ہوئی تھی۔ ان اصنام اور بتوں یا مورتیوں کو تو وہ ضرور پوجتے تھے، جنھیں جہالت کے ان ایام میں کعبہ کے اندر انہوں نے داخل کر دیا تھا، لیکن جس عمارت میں ان کے یہ بت رکھے ہوئے تھے، اس کو قطعاً انہوں نے نہ کبھی پوجا اور نہ اپنا معبود سمجھا، اور وہی کیا، دنیا کی بت پرست قوموں نے شاید ان مندروں اور شوالوں یا بتخانوں کی

---

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) عمارت کا براہ راست سامنے ہونا بھی ضروری نہیں ہے، بلکہ تعمیری ضرورت یا کسی اور وجہ سے کعبہ کی یہ پرانی مسجد شہید بھی ہو جائے جب بھی نمازوں میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا۔ تفصیل کے لئے قبلہ نما مطالعہ کرنا چاہئے۔ ۱۲

عمارتوں کو کبھی نہیں پوجا، اور نہ معبود بنایا، جن میں اپنے بتوں کو وہ بٹھاتے تھے، یا آج تک بٹھاتے ہیں۔ گویا انسانی تاریخ میں پنڈت جی پہلے آدمی ہیں، جن کے سینے میں کسی معبد کی عمارت کی معبودیت کا انوکھا خیال جلوہ گر ہوا، اور اپنے دل کے اسی خود آفریدہ خیال کو غریب مسلمانوں کے سر انہوں نے منڈھ دیا، جیسے ان کا یہ ذہنی انتقال بے نظیر ہے، اسی طرح بلکہ شاید اس سے بھی کچھ زائد ہی ان کی یہ دیدہ دلیری اپنی آپ مثال ہے کہ منڈھنے کے لئے کسی اور قوم کا نہیں، بلکہ مسلمانوں ہی کا سر ان کو موزوں نظر آیا، کچھ بھی ہو، پنڈت جی کو اتنا بھولا بھالا، سیدھا سادھا انجان یا طفل نادان کیسے مان لیا جائے کہ واقع میں کعبہ کو وہ مسلمانوں کا معبود سمجھتے تھے، پس صحیح بات وہی معلوم ہوتی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر نے ارقام فرمایا ہے کہ

"اگر دیدہ و دانستہ یہ حال ہے، تو پھر کچھ اور احتمال ہے، میں کیا عرض کروں، عاقلاں خودمی دانند۔"

میں تو حضرت والا کے ان الفاظ میں حد سے زیادہ اجمال دیکھتا تھا کہ وہ ان مجمل الفاظ میں کچھ کہنا چاہتے تھے، مگر مصلحتاً قلم روک لیا گیا، تاہم آخر میں

"عاقلاں خودمی دانند"

کا جو فقرہ بے ساختہ قلم مبارک سے نکل گیا ہے، مجھے تو اس میں کچھ الہام کا رنگ نظر آتا ہے، جس احتمال کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے، قطعاً اپنے اصلی رنگ روپ میں اس وقت تک سامنے نہیں آسکتا، جب تک عقل انسانی ابھارے ہوئے جذبات کے بھپاروں کے نیچے دبی رہے گی۔

ہاں پچھوڑے جذبات کے بھپاروں کی گندگی سے ملک کے باشندوں کی عقلیت جب پاک ہو کر آزاد ہوگی، اور کبھی نہ کبھی تو بہر حال یہ ہو کر رہے گا، آج ہو یا کل، تب صحیح حقیقی قیمت حضرت والا کے الفاظ

"عاقلاں خودمی دانند"



کی پہچانی جائے گی، ورنہ اس وقت ہم جس حال میں ہیں، ملک کے اچھے اچھوں کو سعدی کے اس

مشہور شعر یعنی

چراغے کہ بیوہ زنے[ملہ] برفروخت

بسے دیدہ باشی کہ عالم بسوخت

کا مطلب سمجھانا آسان نہیں ہے مگر تاریخ گواہ ہے کہ کسی بڈھی بیوہ عورت کے جلائے ہوئے

---

ملہ ہائے بے چارے برج لال رعت کا وہ نوحہ کہئے یا بین جس میں رونے والے نے یہ کہہ کہہ کر خود رویا اور دوسروں کو رلایا ہے۔

یہی دن ہے جو ہوئے جب ملک خستہ حال کے ٹکڑے — ہوئے پنجاب کے ٹکڑے ہوئے بنگال کے ٹکڑے
اڑے تہذیب آدم کے بکھرے جال کے ٹکڑے — گرے کٹ کٹ کہیں ماں کے کہیں اطفال کے ٹکڑے
یہی وہ دن ہے جب اغیار کی امید بر آئی — سحر آئی وطن میں ظلمتیں لے کر مگر آئی

اور اسی کے بعد بے چارے کی یہ کراہ

یہی وہ دن ہے جس کے ساتھ ہی آئی قیامت بھی — دلوں میں جاگ اٹھی نفرت بھی دیرینہ عداوت بھی
نہ کام آئی ہزاروں سال کی آپس میں الفت بھی — وہ حشر اٹھا کہ اب تک رو رہی ہے آدمیت بھی
جو ایوانوں میں رہتے تھے وہ بے گھر ہو گئے سارے — جو اپنے وقت کے قارون تھے بے زر ہو گئے سارے

ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ جب خالص عقلی تنقید کی روشنی میں کیا جائے گا تب عقل والے جانیں گے ان باتوں کو جنھیں آج ہم شاید سن بھی نہیں سکتے، یہ مسئلہ کافی طویل و تفصیل طلب ہے۔ ہندوستان کی سیاسی تاریخ سے پنڈت جی کا بھی کچھ تعلق ہے، پہلے تو اسی کا سراغ لگانا پڑے گا۔ پھر پنڈت جی کی خود نوشت اور دوسروں کی لکھی ہوئی انگریزی ہندی اردو زبانوں کی سوانح عمریوں سے پنڈت جی کے نظری رجحانات کا پتہ چلانا، جب شیومت اور وشنومت کے چکر میں تھے اس وقت جے پور پہنچ کر ادھم مچانا، وشنومت کی توہین و تحقیر میں اتنا غلو کہ راجہ صاحب جے پور کے اصطبل کے گھوڑوں کے گلے میں بھی شیومت کی نشانی پیدائش کی مالائیں ڈلواتے پھرتے تھے۔ اس سلسلہ میں پنڈت جی کا انگریزوں کے بڑے بڑے عہدہ داروں مثلاً گورنر، ڈپٹی کمشنر وغیرہ سے ملاقات کر کے اس خیال میں امداد طلب کرنا کہ جھوٹے متوں (یعنی وشنومت کے سوا سارے متوں اور فرقوں) کو مٹانا چاہئے، یہ حال تو ابتدا میں تھا، پھر جب ہندو مذہب کے مختلف فرقوں کے دائرے سے باہر نکل کر میدان میں آئے اس کے بعد انہوں نے جو کچھ لکھا اور کہا ہے اس کا حاصل یہی تھا کہ جس مت کو پنڈت جی نے آریہ سماج کے نام سے قائم کیا ہے اس کے سوا کسی مت یا مذہب کے ماننے والے کو جینے کا حق نہیں ہے، خواہ وہ ہندو ہو، مسلمان ہو، عیسائی ہو، سکھ ہو، یہ ایسی عام باتیں ہیں جو پنڈت جی کی سوانح عمریوں بلکہ خود نوشت تصنیفوں میں بھری ہوئی ہیں ۱۲

مٹی سے کے دیا سے شہر کا شہر خاک سیاہ ہو کر رہ گیا۔

بہر حال جس "احتمال" کے سمجھنے کے لئے عاقلوں کی ضرورت سیدنا الامام الکبیر نے محسوس کی ہے، یہ ایسی ضرورت ہے کہ جب تک صحیح معنوں میں عقل اپنی جگہ واپس نہیں ہوتی، لاکھ سمجھانے کی کوشش کی جائے لوگ اسے سمجھ نہیں سکتے، اور تو اور ایسے سنجیدہ دل ودماغ والے لوگ جیسے لالہ لاجپت رائے تھے ان تک کا خیال یہ ہو کہ

"سودیشی اور نان کوآپریشن کے اصول مہاتما گاندھی کے میدان عمل میں آنے سے بہت پہلے سوامی دیانند سے سیکھے تھے۔" دیانند اور ان کی تعلیم ص۱۳۱ بحوالہ اخبار بندے ماترم مورخہ ۱۵ر جنوری ۱۹۲۱ء

گویا گاندھی جی کی تحریک کا رشتہ لالہ جی کے نزدیک پنڈت جی کے دل و دماغ سے ملا ہوا تھا اسی طرح گروکل کانگڑی کے سابق پرنسپل پروفیسر رام دیو بی۔اے جن سے ملاقات کا موقعہ فقیر کو بھی ملا تھا وہ بھی صاف صاف لفظوں میں لکھتے ہوں کہ

"مہاتما گاندھی تو سوامی جی کی پولٹیکل فلاسفی کو صرف عملی صورت دے رہے ہیں۔"

(اخبار جیون تتو مورخہ ۷ر فروری ۱۹۲۱ء)

(درحالیکہ گاندھی جی اپنے بعض مضامین میں یہ لکھ کر چھاپ چکے ہیں کہ ستیارتھ پرکاش میں گندگی اچھالنے کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ یہ وہی مثل ہوئی کہ مدعی سست گواہ چست۔ محمد طیب غفرلہٗ)

جہاں یہ اور اسی قسم کی باتیں سمجھی اور سمجھائی جاتی ہوں، وہاں غریب عقل کے لئے راہ پانے کی امید ہی کیا کی جا سکتی ہے۔

پس مناسب یہی ہے کہ آنے والے عاقلوں کا انتظار کرتے ہوئے ہم بھی اس داستان کو سر بمہر چھوڑ کر دوسرے مسئلہ کی طرف متوجہ ہو جائیں۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پنڈت جی سے براہ راست مکالمہ اور مخاطبہ کے مواقع کی تلاش میں سیدنا الامام الکبیر کے حد سے گذرے ہوئے اصرار کی یہ توجیہ کہ مسلمان کعبہ کے معبد اور مسجد کو

نہیں پوچھتے، پنڈت جی کے ذہن نشین ان مسائل کے ساتھ خصوصیت سے اسی مسئلہ کو کرنا چاہتے تھے، اور صرف اتنی سی بات سمجھانے کے لئے مرض و ضعف کی حالت میں پندرہ سولہ دن تک رڑکی میں آپ ٹھیرے رہے، اس راہ میں پنڈت جی کی ابتدائی بیتڈی شرطوں کو مسلسل تسلیم کرتے چلے گئے تاآنکہ آپ کی فطرت کے لحاظ سے آج بھی ہم جس کا تصور نہیں کر سکتے۔ یعنی اسی سلسلہ میں انگریز حاکم کی کوٹھی تک پہنچے، اور قیام امن کے سلسلہ میں امداد کے طالب ہوئے، خود سوچنا چاہئے کہ کس حد تک قرین عقل و قیاس توجیہ ہو سکتی ہے، یہی نہیں بلکہ پنڈت جی کی طرف سے "یہ جا وہ جا" کا تماشا جب پیش آیا، یعنی شکرم میں بیٹھ کر رڑکی سے روانہ ہو گئے۔ اور اس کے بعد آپ کو بھی مجبوراً رڑکی چھوڑنی پڑی۔ اسی کا ذکر فرماتے ہوئے یہ جو ارقام فرمایا گیا ہے۔

"بوجہ ہجوم بارش، وخرابی راہ و قرب رمضان شریف زیادہ ٹھیرنے کی گنجائش نہ تھی" ص۳

بظاہر ان الفاظ سے یہی سمجھ میں آتا ہے، کہ یہ وقتی رکاوٹیں اگر پیش نہ آجاتیں، تو آپ کے قیام کی مدت شاید اور بھی زیادہ دراز ہو جاتی۔ قبلہ نما ہی کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں کہ ابتداء ماہ شعبان میں آپ رڑکی پہنچے تھے، اسی کتاب میں یہ اطلاع آپ نے دی ہے کہ

"بست و سوم ماہ شعبان کو رڑکی سے روانہ ہوا"

گویا کم و بیش یہی سمجھنا چاہئے کہ ماہ شعبان کا اکثر و بیشتر حصہ رڑکی ہی میں گذرا، اور موانع نہ پیش آجاتے خصوصاً قیام و صیام کا مہینہ رمضان سر پر نہ ہوتا، تو کون کہہ سکتا ہے کہ پنڈت جی کے تعاقب کا یہ سلسلہ کہاں تک پہنچتا، اور پہنچتا کیا معنی؟ "جواب ترکی بہ ترکی" میں جن واقعات کی طرف اجمالی اشارے کئے گئے ہیں، افسوس ہے کہ تفصیلات کا تو ان کے علم نہ ہو سکا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ متعدد مقامات میں اس قسم کے فقروں کے ساتھ مثلاً

"پنڈت جی بھاگتے پھرتے ہیں، اور مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) ان کے پیچھے پیچھے ہیں" ص۵۹

یا دوسرے موقعہ پر اس مشہور شعر کو درج کرتے ہوئے، یعنی

ہم وہ نہیں کہ تم ہو کہیں اور کہیں ہوں میں

میں ہوں تمہارا سایہ جہاں تم وہیں ہوں میں

حضرت والا کی طرف سے پنڈت جی کو خطاب کر کے لکھا ہے کہ

"غرض جس چال آپ چلتے ہیں، ہم بھی ساتھ ہی پیچھے چلے آتے ہیں" [۳۵]

اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ عام ہتھکنڈا زیادہ تر مسلسل تعاقب کے ان مواقع میں پنڈت جی کی طرف سے جو استعمال ہوتا تھا، وہ وہی فساد اور ہنگامہ کے اندیشہ کا تھا، اسی کتاب جواب ترکی بہ ترکی میں جس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"فساد کا وقت تو وہ تھا کہ پنڈت جی مجمع عام میں جی کھول کر مسلمانوں پر اعتراض کرتے تھے" [۳۶]

اور زیادہ تر یہی صورت پنڈت جی نے اختیار کر رکھی تھی، لیکن سیدنا الامام الکبیر جب ان سے بالمشافہت گفتگو کرنے کی کوشش کر رہے تھے، رڑکی میں آپ سن چکے کہ علاقہ کا انگریز مجسٹریٹ امن و امان کی ضمانت دے رہا تھا، پھر رڑکی میں بھی انگریزوں کی فوجی چھاؤنی تھی، یہی حال میرٹھ کا بھی تھا، ان ہی باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسی کتاب میں لکھا ہے کہ

"کوتوالیاں کنسٹیبل بکثرت سالہ پلٹن، رجمنٹ لال کرتی موجود، اس پر بھی پنڈت جی کو خوف ہو"

انگریزوں کے جلال و جبروت کی قوتوں سے اس زمانہ میں سارا ہندوستان کانپ رہا تھا بقول مصنف کتاب کے

"فرماں روائے لاہور، اور بادشاہ لکھنؤ، راجائے بڑودہ، اور کابل تو سرکار (انگریزی) سے مقابلہ ہی نہ سکیں"

آگے اسی کے بعد ان ہی کے الفاظ ہیں

"فساد کریں گے تو کون؟ مولوی محمد قاسم صاحب جو طلبوں کی مزدوریاں کر کر اپنا پیٹ پالیں" [۳۷]

اسی کے ساتھ ان ہی کی یہ بات کتنی صحیح ہے کہ

"علاوہ بریں اگر فساد ہوتا تو اول مولوی محمد قاسم اور ان کے ہوا خواہ گرفتار ہوتے پنڈت جی کو اتنا ہی کافی تھا کہ ہم تو پہلے کہیں تھے"

حقیقت یہ ہے کہ ان باتوں کو جب ہم سوچتے ہیں، تو قسمت کے سوا کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ پنڈت جی سیدنا الامام الکبیر سے مل کر گفتگو اور بات چیت کرنے سے کیوں کتراتے رہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ ملنے کے بعد دونوں کے درمیان کن کن مسائل کا ذکر آسکتا تھا۔ آخر رڑکی ہی میں دیکھنے والوں نے اسی زمانہ میں جب دیکھا تھا، حکیم الامت تھانوی قدس اللہ سرہ اس روایت کے راوی ہیں کہ رڑکی کا وہی انگریز مجسٹریٹ جس نے حضرت والا کو بلا کر ملاقات کی تھی، اور امن وامان کی ضمانت لی تھی، انیسویں صدی کا اسی انگریز نے اس وقت جو انگریزی قوم کے الحاد اور بے دینی کا گویا عہد شباب تھا، اسی نے باتوں باتوں میں سیدنا الامام الکبیر سے

"بارش کی کمی کی وجہ پوچھی"

حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ جواب میں

"مولانا نے دلائل عقلیہ سے ثابت کر دیا کہ گناہ سبب ہیں کمی بارش کے"

یہاں تک تو خیر کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر تعجب ہو، لیکن آگے حضرت تھانوی نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

"وہ (یعنی انگریز مجسٹریٹ) بہت ہی محظوظ ہوا، اور مولانا کے علم کا قائل ہو گیا، اور بہت اچھی طرح پیش آیا" قصص الاکابر الہادی ۱۳۵۳ھ ماہ جمادی الاولیٰ

ہم جب اس خبر کو پڑھتے ہیں، تو خیال گذرتا ہے، کہ انیسویں صدی میں جب ایک انگریز کو سیدنا الامام الکبیر یہ سمجھا سکتے تھے، کہ بارش کی قلت اور قحط خدا کی نافرمانیوں کا نتیجہ ہے۔ آپ کے علمی احترام کی وجہ آپ کی یہی تقریر بن سکتی تھی، تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ پنڈت جی سے براہ راست گفتگو کرنے کی کوشش میں سیدنا الامام الکبیر اگر کامیاب ہو جاتے تو آپ کے خیالات واحساسات سے پنڈت جی

بھی متاثر نہ ہوتے، اور جو رنگ ان پر چڑھا ہوا تھا، یا چڑھایا گیا تھا، ازالہ نہ ہی، شدت اور تیزی میں اس کے کچھ کمی نہ ہو جاتی،

لیکن جو واقعہ پیش ہی نہ آیا، اب اس کے ثمرات و نتائج کے متعلق کیا سوچا جائے۔ بظاہر تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ آئندہ ہندوستانی تاریخ میں ثریا تک جو دیوار اس لئے کج ہوتی چلی گئی کہ پہلی اینٹ ہی اس کی کج رکھی گئی[1]، شاید اس کی کجی اس حد تک نہ پہنچتی، کہ بالآخر اپنے اور پردہ خود گر پڑی گھر کے چراغ ہی سے گھر میں آگ لگ گئی، پرانا قدیم تجربہ ہے کہ سلائی سے جس جھرنے کے منھ کو بند کرنا ممکن تھا، جب جاری رہنے کیلئے وہی کھلا چھوڑ دیا گیا تو

"چو پر شد نتاں گذشتن بہ پیل"

ہاتھیوں سے بھی دیکھا گیا ہے کہ اس کی روک روک کا ناممکن نظر آرہا ہے۔

آخر یہی انگریز مجسٹریٹ تو تھا، عرض کر چکا ہوں، کہ حضرت والا اور آپ کے رفقار کی طرف سے ابتدائی احساس اسی کے دل میں بقول حضرت تھانوی یہ پیدا ہوا تھا کہ

---

[1] پہلے بھی کچھ اشارے کر چکا ہوں کہ ایک خاص طبقہ کا جس میں ہندوستان کے اچھے لکھے پڑھے تعلیم یافتہ لوگ شریک ہیں۔ خیال تھا کہ ہندوستان میں سیاسی جدوجہد کی ابتدا پنڈت دیانند سرسوتی جی نے کی پروفیسر رام دیو جی۔ اسے تو ہندوستان کی پولیٹکل بیداری کا جنم داتا اور بانی مبانی پنڈت جی کو کہا کرتے تھے، (دیکھو اخبار جیون تتو مورخہ ۷ فروری ۱۹۲۴ء) ڈاکٹر ستیہ پال کی تقریر لاہور کے انگریزی اخبار ٹریبون میں چھپی تھی۔ اس میں انہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ جو محبان وطن اس سرزمین (ہند) میں کبھی پیدا ہوئے ان میں سب سے بڑے محب وطن رشی دیانند تھے (اخبار مذکور مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۲۵ء) ایسے کلمات بھی شائع ہوتے رہے جن میں ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کے بانی اول کی حیثیت سے پنڈت جی ہی کی تصویر کو سب سے اونچی جگہ دی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ اس میں کچھ فرط عقیدت کو بھی دخل ہو۔ لیکن بعض وجوہ سے کلیۃً اس قسم کے دعوؤں کو بے بنیاد ٹھیرانا بھی شاید درست نہ ہوگا۔ جس کی تفصیل کا موقعہ میری اس کتاب میں نہیں ہے۔ مناسب ہوگا کہ اس کے لئے وہی کتاب سوامی دیانند اور ان کی تعلیم کا مطالعہ کیا جائے۔ مندرجہ بالا اقتباسات اسی کتاب سے نقل کئے گئے ہیں ۱۲۔

[2] خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

"دعوت خود ہی آئے ہوں گے"

لیکن ملنے اور باہم بات چیت کرنے کے بعد ان ہی سے آپ سن چکے کہ

"مولنا کے علم کا قائل ہوا اور بہت اچھی طرح پیش آیا"

جب ایک انگریز جو غیر ملک، غیر قوم کا رہنے والا تھا، ہندوستان کی زبان بھی پوری طرح سمجھ نہیں سکتا
جب اس میں اس انقلاب کا مشاہدہ کیا گیا تھا تو پنڈت جی بہر حال اپنے گھر کے آدمی تھے۔ سیدنا
الامام الکبیر سے ملاقات اور گفتگو کے بعد ان کے احساسات میں کسی تبدیلی کی توقع، بے معنی توقع
کیوں قرار دی جا سکتی ہے ولکن ما قدر اللہ فسوف یکون

سچ تو یہ ہے کہ اپنی حد تک سیدنا الامام الکبیر جو کچھ کر سکتے تھے، کوشش کا کوئی دقیقہ آپ
نے اٹھا نہیں رکھا، بلکہ کہنے والا چاہے تو یہ کہہ سکتا ہے کہ آپ کی زندگی کا آخری حصہ شاید اسی کوشش
میں صرف ہوا،

ذرا سوچئے تو سہی، رڑکی کا واقعہ تو خیر وفات سے تقریباً دو سال پہلے کا ہے، لیکن رڑکی کے
بعد پنڈت جی کے تعاقب کے سلسلہ میں میرٹھ کی جس سرگذشت کی طرف کتاب جواب ترکی بہ ترکی
میں بایں الفاظ اشارہ کیا گیا ہے کہ

"مولوی محمد قاسم صاحب نے پنڈت جی کو میرٹھ سے بھگا کر کہیں کا کہیں
پہنچایا" ۳۹

اسی کی اطلاع ان الفاظ میں دیتے ہوئے کہ

"پھر پنڈت دیانند کہیں پھر پھرا کر میرٹھ پہنچے؛ اور وہاں بھی ان کے وہی
دعوے تھے"

مصنف امام نے آگے یہ خبر دی ہے کہ

"ہر چند مرض کے بقیہ؛ اور ضعف کے سبب قوت نہ تھی؛ مگر ہمت کر کے
(میرٹھ) پہنچے"

اور حسب دستور براہِ راست مکالمہ اور گفتگو کے لئے آپ جو کچھ کر سکتے تھے کرتے رہے
لیکن بقول مصنف امام

"وہ (پنڈت جی) بہانہ و حیلہ کر کے وہاں سے کافور ہو گیا"

اگرچہ صحیح طور پر میرٹھ کے اس واقعہ کی تاریخ کا علم نہ ہو سکا لیکن مصنف امام نے
اسی کے بعد بیان کیا ہے کہ اسی زمانہ میں کتاب "جواب ترکی بہ ترکی" خاص طور پر اس
لئے لکھی گئی کہ

"پنڈت کے بعض معتقدوں نے کچھ تحریر بجواب مولانا
(نانوتوی) بے سر و پا لکھی تھی، اور کچھ اوٹ پٹانگ مسلمانوں
کے مذہب پر اعتراض کئے تھے، یہ رسالہ اسی کے
جواب میں ہے"

پہلے بھی نقل کر چکا ہوں، کہ سیدنا الامام الکبیر کے تلمیذ سعید مولانا عبد العلی
صاحب مرحوم کی طرف کتاب کی تالیف منسوب ہے۔ اگرچہ علمی افادات اس کے خود
حضرت والا کے ہیں۔

بہر حال اس سے معلوم ہوا کہ یہ کتاب "جواب ترکی بہ ترکی" تقریباً اسی زمانہ میں
لکھی گئی کہ جب میرٹھ میں پنڈت جی سے گفتگو کرنے کی کوشش سیدنا الامام الکبیر
کی طرف سے جاری تھی، اب ہم دیکھتے ہیں جیسا کہ اسی کتاب کے آخر میں لکھا ہے۔

"نویں رمضان شریف ۱۲۹۶ھ کو لکھنا شروع کیا تھا اور
بحمد اللہ ۲۱ ماہ مذکور بروز سہ شنبہ ختم کیا" ص ۵۹

جس کا مطلب یہی ہوا کہ سیدنا الامام الکبیر کی وفات کی تاریخ ۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ
سے کم و بیش چھ سات مہینے پہلے یہ کتاب ختم ہوئی گویا اس بنیاد پر سمجھنا چاہئے کہ
میرٹھ میں پنڈت جی کے تعاقب میں آپ کی تشریف آوری بحالت مرض و نقاہت تقریباً

اسی زمانہ میں ہوئی۔ پھر اسی کتاب میں پنڈت جی کے نام یہ چیلنج بھی ہمیں ملتا ہے، یعنی لالہ استدلال جن کے مضمون کے جواب میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ ان ہی کو مخاطب کر کے لکھا گیا تھا کہ

"آپ پنڈت جی سے کہہ دیکھئے، ہزار منتیں کرو گے، تب بھی
مباحثہ کی طرح مباحثہ پر مولوی محمد قاسم صاحب کے مقابلہ
میں آمادہ ہو جائیں تو ہم جھوٹے تم سچے" ص۳۱

جیسا کہ معلوم ہے، پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں، کتاب "جواب ترکی بہ ترکی" لفظی حیثیت سے سیدنا الامام الکبیر کی تصنیف نہ ہو، لیکن معناً آپ ہی کی تصنیفات میں یہ کتاب شمار ہوتی ہے، کم از کم اتنی بات تو بہر حال مسلّم ہے۔ خود لوح کتاب پر بھی لکھا ہوا ہے، سیدنا الامام الکبیر کے ایماء سے یہ کتاب لکھی گئی، ایسی صورت میں مذکورہ بالا چیلنج کے متعلق اگر یہ سمجھا جائے کہ پنڈت جی کے نام سیدنا الامام الکبیر ہی کی طرف سے یہ چیلنج تھا تو اس کے سوا آخر اور کیا سمجھا جائے۔

اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ میرٹھ کے تعاقب کا قصہ اگر وفات سے چھ سات مہینے پہلے پیش آیا تھا تو اسی پر قصہ ختم کہاں ہوا تھا، بلکہ اس کے بعد بھی پنڈت جی سے بلاواسطہ براہ راست مباحثہ و مکالمہ کی کوششوں کا سلسلہ جاری ہی رہا، تا آنکہ دل کی حسرت سیدنا الامام الکبیر نور اللہ مرقدہ کے ساتھ ہی دفن ہو گئی۔

حق تو یہ ہے کہ "عاقلاں خود می دانند" کے الفاظ سے پنڈت جی کے طرز عمل کے جس پہلو کی طرف حضرت والا نے اشارہ کیا ہے، اور کسی کی سمجھ میں آیا ہو یا نہ آیا ہو، لیکن خود ان کی عقل و دانش سے پنڈت جی کے طریقۂ کار کا یہ پہلو کیسے مخفی رہ سکتا تھا، اور اس سے واقف ہونے کے بعد حساس دلوں میں قلق اور بے چینی، اضطراب اور بے کلی کی جو کیفیت بھی پیدا ہو، تو اسے پیدا ہی ہونا چاہئے۔[۱]

---

[۱] اور تو اور لالہ لاجپت رائے جیسے لوگوں نے لکھا ہے کہ لاہور میں دیانند اینگلو ویدک کے نام سے جو کالج قائم کیا گیا تھا، گو ویدک کا لفظ اس کے آخر میں بڑھا دیا گیا تھا جس سے بظاہر عوام پر یہ اثر ڈالا جاتا تھا کہ ویدک دھرم کی تعلیم کا خاص اہتمام اس کالج میں کیا گیا ہے لیکن یہ بیان کرتے ہوئے کہ گریبالڈی اسپرنی وغیرہ یورپ کے مشہور سیاسی خطیبوں کی (باقی اگلے صفحہ پر)

کہنے والوں سے میں نے جو یہ سُنا ہے کہ بالآخر یہی قصہ تمام اسباب میں سیدنا الامام الکبیر کے لئے جان لیوا ثابت ہوا، تو اس پر کم از کم مجھے تو تعجب نہ ہوا۔

بہر حال ہم تو مؤمن ہیں۔ ظاہر اسباب خواہ کچھ ہی ہو لیکن ہم سے منوایا گیا ہے، اور اسی کو ہم مانتے ہیں کہ

| | |
|---|---|
| ما کان لنفس ان تموت الا باذن الله کتاباً موجلا | نہیں ہے کسی جیتی جان کیلئے کہ وہ مرے مگر اللہ ہی کے حکم سے لکھے ہوئے مقررہ وقت کے مطابق۔ |

ایک کم پچاس یعنی (۴۹) سال کی نوشتہ عمر کے ساتھ زمین کے اس خاکی کُرے پر سیدنا الامام الکبیر بھیجے گئے تھے اور اسی "کتاب موجل" کے مطابق جس کے حکم سے آئے تھے، اسی کے اذن سے "الحیٰوۃ الدنیا" (پست زندگی) کو چھوڑ کر خیر و ابقیٰ والی زندگی سے سرفراز ہوئے، بلکہ جس ظاہری سبب کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے، اس کے ماننے کی گنجائش بھی ایمان ہی کی بنیاد پر پیدا ہوتی ہے لیکن صحیح طور پر تفصیلات ہی کا علم نہ ہو سکا اور نہ کوئی کتابی شہادت ہی اس سلسلہ میں مجھے مل سکی۔ مگر ذکر کرنے والے چونکہ کبھی کبھی اس کا ذکر کرتے ہیں،

---

(گذشتہ صفحہ سے) سوانح عمریوں اور کارناموں سے طلبہ میں سیاسی ذہنیت کو ابھارا جاتا تھا۔ لالہ جی لکھتے ہیں کہ

دیانند ویدک کالج کے حسابات کی جانچ پڑتال اگر کی جائے تو یہ بات معلوم ہوگی کہ اس کے کل اخراجات کا سواں حصہ بھی مذہبی تعلیم یا ویدک تعلیم کی اشاعت کے لئے خرچ نہیں ہوتا۔ (اخبار بندے ماترم مورخہ ۲ر جنوری ۱۹۲۱ء)

جس کا مطلب یہی ہے کہ سیاسی کامیابیوں کے لئے مذہب کے نام کو استعمال کیا جاتا تھا، اور جس قسم کی سیاست پنڈت جی کے پیش نظر تھی۔ علاوہ ان کی کتابوں اور ان کے پیروکاروں کی شہادتوں کے اس کا تماشا متھرا میں خود اس ملک کے ان ہندوؤں نے کیا، جو آریہ سماجی خیالات نہیں رکھتے تھے۔ شتابدی کے نام سے پنڈت جی کی صد سالہ برسی متھرا میں ۱۹۲۵ء میں منائی گئی تھی۔ اخباروں میں شائع ہوا تھا کہ پنڈت جی کے ماننے والے متھرا پہنچ کر بگل بجاتے تھے۔ لاٹھیاں لے کر مندروں میں زبردستی گھستے تھے، اور اردو پر دیانند جی کی جے لکھتے تھے، کرشن کی مورتی پر تاج رکھا ہوا تھا، جسے لاٹھی سے ڈھکیل دیا گیا۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے سوامی دیانند جی اور ان کی تعلیم ص۱۷۵) باوجود ہندو نام کے موسوم ہونے کے جب ان کی درگت یہ بنائی گئی، تو اس ملک کے جو باشندے ہندو نہیں ہیں ان بیچاروں کی خود ہی سوچئے، اس قسم کی تنگ ذہنیت میں کتنی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے۔ ۱۲

اس لئے اجمالی اشارہ اس کتاب میں بھی اس کی طرف مناسب معلوم ہوا۔[1]

اب ہم اس قصہ کو ختم کرتے ہیں، اِدھر اُدھر سے معلومات جو کچھ بھی اس سلسلہ میں فراہم ہو سکیں وہ پیش کردی گئیں، کچھ طول بیانی سے کام ضرور لینا پڑا، جس کی ضرورت اس لئے تھی کہ عام طور پر اس قصہ کو سیدنا الامام الکبیر کی زندگی، اور زندگی کے کارناموں میں وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کا یہ واقعی مستحق تھا، میں خیال کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا شہادتوں کی روشنی میں انشاء اللہ واقعہ کی اصل حقیقت سامنے آجائیگی اور جیسا کہ عرض کرچکا ہوں آپ کی حیات طیبہ کی آخری منزل سچ پوچھئے تو اسی قصہ پر ختم ہوئی، اور عین ان ہی دنوں میں جب اس راہ میں آپ کی جدوجہد کا سلسلہ جاری تھا، "کتاب مؤجل" کی رو سے آپ کا وقت موعود آگیا، اور اب ورق کی اسی داستان میں ہم مشغول ہوتے ہیں جس کے ذکر کا وعدہ ذاتی حالات کو ختم کرتے ہوئے کیا گیا تھا۔

## ربیع الاول سوانح قاسمی جلد ثانی تمام ہوئی [illegible]

[1] براہ راست حضرت والا کے نور چشم فرزند سعید مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم سے خاکسار نے یہ روایت سنی ہے کہ مرض الموت والی بیماری کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ سیدنا الامام الکبیر پر سحر کیا گیا ہے، سحر اور سحر سے متاثر ہونے کا عقیدہ اسلامی روایات کا عام اقتضاء ہے، خود ختمی مآب رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم تک کے متعلق صحیح بخاری میں اس کا ذکر کیا گیا ہے، بعد کو بھی بڑے بڑے اکابر اولیاء اللہ خصوصاً ہندوستان کے خواجگان چشت میں حضرت بابا فرید اور سلطان جی نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہما کے متعلق مستند کتابوں میں ہم یہ پاتے ہیں کہ دونوں بزرگوں پر سحر کیا گیا، جس سے کافی تکلیف اٹھانی پڑی۔ کرمانی کی سیر الاولیاء میں جس کی تفصیل آپ پڑھ سکتے ہیں، خاکسار نے بھی اپنی کتاب مسلمانوں کے نظام تعلیم و تربیت میں ان قصوں کا ذکر کیا ہے۔ سچ پوچھئے تو مصنوعی روحانیت جس کا ترجمہ آج کل اسپریچولزم کیا جاتا ہے، اور نفسیاتی ورزش کے جو قدرتی نتائج ہیں، روحانیت کی اس مصنوعی اور جعلی شکل میں اور وہ روحانیت جو براہ راست تعلق باللہ سے پیدا ہوتی ہے، دونوں میں دوسری امتیازی وجوہ کے ساتھ بڑی وجہ اس قسم کے واقعات سے ان لوگوں کو مل سکتی ہے جو آسانی درمیان دونوں میں فرق نہیں کرسکتے اپنے سرچشمہ کے لحاظ سے روحانیت کی یہ دونوں راہیں ایک دوسرے سے قطعاً الگ ہیں۔ یعنی ممکن ہے کہ مصنوعی روحانیت والے اپنے نفسیاتی کرشموں کو تعلق باللہ والی روحانیت رکھنے والوں کو متاثر کریں۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی پہلوان کشتی گیری کے کرتبوں سے کسی خدا پرست آدمی کو گرا دے، لیکن پہلوان کے فن کو خدا پرستی پر اس سے ترجیح تو حاصل نہیں ہوتی ۱۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# آخری سفر
## اللہ کے گھر سے، اللہ کی طرف

آخری حج سے واپس ہوتے ہوئے مکہ اور جدّہ کے درمیان آپ پر مرض کا حملہ ہوا۔ گذر چکا کہ سفر حج سے واپسی کی یہی علالت، بالآخر آپ کی زندگی کی آخری علالت اور بیماری ثابت ہوئی۔ اسی اجمال کی تفصیل میری اس کتاب کا آخری باب ہے۔

سیدنا الامام الکبیر کی زندگی کے دوسرے واقعات و حالات جیسا کہ آپ دیکھ چکے، صرف گذرے ہوئے واقعات و حالات ہی نہیں ہیں، بلکہ آئندہ زندگی گذارنے والے چاہیں تو بصیرت و عبرت کے اسباق بھی ان کو اپنے لئے بنا سکتے ہیں۔ اسی حج کے قصہ کو دیکھئے، معاشی راہ میں آپ کی جد و جہد کا جو پیمانہ تھا، اسی پیمانے پر حاصل ہونے والی آمدنی سے روزی روزی اور شدید و ناگزیر ضرورتوں کی فراہمی بھی عام حالات میں آسان نہیں ہے۔ لیکن ادھر تو جو کچھ ہوا سو ہوا حیرت اس پر ہوتی ہے کہ اپنی اسی محدود عمر میں ایک چھوڑ تین تین حج کا زاد راحلہ حق سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے آپ کے لئے آسان کیا گیا۔ پہلے حج کا ذکر تو ۵ء والے فتنے کے ذیل میں

کرچکا ہوں۔ بتا چکا ہوں کہ داروگیر کے ان ہی تاریک دنوں میں پنجاب اور سندھ کے آبی راستہ کو کشتیوں سے طے کر کے کراچی پہنچکر بادبانی جہاز پر سوار ہوئے، اور اللہ کے گھر اپنے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانے تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ آپ کا یہ سفر ۱۸۶۰ء ماہ دسمبر یعنی ہجری کے حساب سے ۱۲۷۷ھ ماہ جمادی الثانی میں شروع ہوا تھا۔ اور دوسرے سال ۱۲۷۸ھ کے اسی جمادی الثانی کے مہینہ میں ہندوستان واپس ہوئے۔ حج کے اس سفر کے متعلق جو باتیں معلوم ہو سکیں، انہیں پیش کر چکا ہوں۔ آپ کی جہادی مہم کا تتمہ اس کو سمجھنا چاہیئے۔ اسی لئے ان کے ذکر کا موزوں مقام وہی سمجھا گیا، اسی طرح اس دنیا سے آخری سفر کا ذریعہ اور مقدمہ آپ کے آخری حج کا سفر چونکہ بن گیا مناسب معلوم ہوا کہ اس آخری حج کا تذکرہ بطور مقدمہ کے اسی باب میں کیا جائے۔ اول و آخر کے ان دونوں حجوں کے درمیان تیسرے حج کی جس نعمت سے آپ سرفراز ہوئے۔ یہ سفر کچھ اتنی خاموشی سے کیا گیا، کہ ذکر کرنے والے عموماً آپ کے دو ہی حجوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اچھے اچھے جاننے والوں سے پوچھا، جواب میں تیسرے حج کے علم سے انہوں نے ناواقفیت کا اقرار کیا۔ اسی لئے اس تیسرے حج کے سلسلہ میں جیساکہ چاہیئے معلومات بھی حاصل نہ ہو سکیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اول و آخر کے ان دو مشہور حجوں کے سوا آپ نے تیسرا حج بھی کیا ہے، ہمارے مصنف امام نے درمیان کے اسی تیسرے حج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"۱۲۸۵ھ میں مولٰنا (نانوتوی) کو حج کی پھر سوجھی، چند رفقاء کو ساتھ لیکر حج کر آئے" ص۳۹

ظاہر ہے کہ ۱۲۷۷ھ میں حج کا جو سفر کیا گیا، یا آخری حج جس کا ذکر اس باب میں کرنے والا ہوں، مصنف امام ہی نے اس کے متعلق لکھا ہے،

"شوال ۱۲۹۴ھ میں روانہ ہوئے" ص۴۲

یقیناً اس کا مطلب یہی ہے کہ اول و آخر والے دونوں حجوں کے سوا درمیان میں ایک دفعہ

اور حجاز کا سفر آپ کیلئے آسان کیا گیا، لیکن آپ کا یہ حج زیادہ مشہور نہ ہوا، اور شاید اسی کا نتیجہ ہے، کہ مصنف امام جیسے بزرگ نے ذکر کرنے کی حد تک اس درمیانی حج کا ذکر نو کر دیا ہے، لیکن سن کے اندراج میں بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ شاید سہو ہوا جس کی وجہ یہ ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی مشہور کتاب "آب حیات" کے دیباچہ میں خود اپنے قلم سے اس کتاب کی تصنیف کے اسباب و وجوہ میں جو باتیں لکھی ہیں جن کا ذکر ابھی آ رہا ہے، آپ کی اس خود نوشتہ تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا یہ سفر ۱۲۸۶ھ میں شروع ہوا تھا۔ مصنف امام کے قلم سے بجائے (۸۶) کے (۸۵) کا ہندسہ درج ہو گیا ہے۔ اب اسے زلت قلم سمجھا جائے، یا شاید تخمینہ میں کچھ چوک ہوئی ہو، اس سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے، کہ مصنف امام بھی اس حج کے حال سے پورے طور پر آگاہ نہ تھے۔ اس زمانہ میں جیسا کہ اسی کتاب میں لکھا ہے، بہ سلسلۂ ملازمت (ڈپٹی انسپکٹری) بریلی لکھنؤ وغیرہ مختلف شہروں میں مصنف امام کا قیام رہتا تھا۔

بہر حال خود حضرت والا کی تحریری شہادت سے جو تاریخ معلوم ہوتی ہے یعنی ۱۲۸۶ھ ہجری عیسوی حساب سے یہ ۱۸۷۰ء کا سال تھا، اور پہلا حج ۱۸۶۰ء میں ہوا تھا، گویا اسی کے دس سال بعد دوسرے حج کیلئے آپ ہندوستان سے روانہ ہوئے، واپسی کب ہوئی، نہ اس کا ذکر ہی کسی نے کیا، اور نہ کسی ذریعہ سے صحیح علم اس کا ہو سکا، مصنف امام نے صرف اسی قدر لکھا ہے۔

"چند رفقاء کو ساتھ لے کر حج کر آئے"۔

کب واپس ہوئے، نہ اسی کا پتہ آپ کے اس اجمالی بیان سے چلتا ہے، اور نہ یہی معلوم ہوا کہ ان رفقاء میں کون کون سے حضرات کو ہمرکابی کی سعادت میسر آئی تھی۔ البتہ آگے انہوں نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

"منشی ممتاز علی صاحب بھی اسی سال بقصد قیام عرب کو گئے، مگر ایک سال بعد واپس آ گئے"۔ ص ۳۹

یہ منشی ممتاز علی وہی صاحب ہیں، جن کا ذکر مختلف موقعوں پر گذر چکا ہے، یعنی خطی لقب جن کا

"نزہت رقم" تھا۔ ہندوستانی مطابع میں خط نسخ (عربی) کی کتابت کرنے والوں کا بنا چکا ہوں
کہ زیادہ تر ان ہی منشی ممتاز علی اور ان کے بیٹوں منشی مشتاق علی و عبدالغنی مرحومین پر سلسلۂ تلمذ
منتہی ہوتا ہے۔

دلی کا مشہور مطبع مجتبائی، اس کے بانی یہی منشی ممتاز علی مرحوم تھے، ان ہی سے مولوی
عبدالاحد نے اس مطبع کو خریدا، اور اسی کی بدولت دلی کے رؤسائے اعظم میں گنے گئے مصنف
امام ہی کے حوالہ سے کہیں نقل کر چکا ہوں کہ منشی ممتاز علی اور سیدنا الامام الکبیر کے درمیان
"پرانی دوستی" تھی۔ میرٹھ میں منشی صاحب ہی نے آپ کو بلا کر رکھ لیا تھا۔ قرینہ کا اقتضاء ہے
کہ منجملہ دوسرے رفیقوں کے منشی جی بھی حج کے اس دوسرے سفر میں آپ کے رفیق ہی نہ تھے
بلکہ تعجب نہیں کہ زاد و راحلہ کی پیش کش بھی ان ہی کی طرف سے ہوئی ہو، چونکہ اس وقت تک
یعنی ۱۲۹۷ھ تک دخانی جہاز سے حج کا سفر شروع ہوگیا تھا۔ اس لئے قیاساً یہی سمجھنا چاہئے کہ
پانچ چھ مہینہ سے زیادہ آمد و رفت میں صرف نہ ہوا ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب

چاہیئے تو یہی تھا کہ مصنف امام جیسے بزرگوں نے اس دوسرے حج کے ذکر میں جب حد
سے زیادہ اجمال سے کام لیا تو ہم بھی اس سے زیادہ اس کے متعلق اور کچھ نہ لکھتے لیکن خوش
قسمتی سے سیدنا الامام الکبیر ہی کی کتاب "آب حیات" کے دیباچہ میں بعض دلچسپ اور دل آویز
باتیں اسی دوسرے حج کے متعلق پائی جاتی ہیں، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ آخری حج کے
تذکرہ کے ساتھ "آب حیات" کی ان باتوں کا بقدر ضرورت یہاں ذکر کر دیا جائے۔

آپ کی یہ کتاب "آب حیات" جو شاید حضرت والا کی تمام تصنیفات میں سب سے زیادہ مشکل
کتاب ہے، اس میں بقول آپ کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنوز قبر میں زندہ ہیں اور مثل گوشہ نشینوں اور چلّہ
کشوں کے عزلت گزین ہیں۔

کتاب و سنت کے بینات کو عقلی استدلال کے رنگ میں پیش کرنے کی یہ ایک ایسی کوشش ہے کہ

آدھی کتاب کو پڑھنا جاتا ہے، اور ایسے نتائج ان ہی بیانات سے نکالے ہوئے اس کے سامنے آتے جاتے ہیں، جن کی طرف خیال بھی نہیں گذرتا تھا کہ ان ہی سے وہ پیدا ہو سکتے ہیں۔ کتاب کے مضامین کی قدر و قیمت مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتی ہے، اگرچہ اس کے مطالعہ کے لئے کمال استعداد کے ساتھ کافی صبر و استقامت کی ضرورت ہے۔ اس وقت صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ درحقیقت سیدنا الامام الکبیر کی ایک قدیم تصنیف "ہدیۃ الشیعہ" جو رفض کی تردید میں لکھی گئی ہے۔ اسی کتاب ہدیۃ الشیعہ کا "آب حیات" دراصل تتمہ یا تکملہ ہے۔ باغ فدک وغیرہ کی وراثت کے قصوں میں یہ یہ سوال جو پیدا ہوتا ہے، کہ وارثوں میں ترکہ کی تقسیم کا مسئلہ تو مورث کی وفات اور موت کے بعد پیدا ہوتا ہے، لیکن مورث کی زندگی میں وراثت کی فکر میں الجھنے کی ضرورت ہی کیا ہے، اسی سلسلہ میں اہل سنت والجماعت کا جو یہ عقیدہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بجسدہ اپنے روضہ پاک میں زندہ ہیں، اسی کو بنیاد بنا کر سیدنا الامام الکبیر نے گویا سمجھنا چاہئے کہ حیات و موت اور اس کے ظہور کی مختلف شکلوں کے متعلق ایک مستقل نظام ہی کو مرتب کر کے پیش کیا ہے۔

آب حیات کے دیباچہ میں ان ہی باتوں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے لکھا ہے، کہ

"۱۲۸۶ھ ہجری میں قبل رمضان شریف سراپا کرم و عنایات مہتمم مطبع ضیائی واقع میرٹھ منشی محمد حیات نے تحریر مذکور مسمی بہ ہدیۃ الشیعہ کو چھاپنے کا ارادہ کیا اور اس کی تصحیح میرے ذمہ ڈالی" ص۳

اس کے بعد آپ نے ارقام فرمایا ہے کہ تصحیح کے موقع پر خیال آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بجسدہ زندگی کا جو دعویٰ ہدیۃ الشیعہ میں کیا گیا تھا استدلالی طور پر جیسی کہ چاہئے اس پر بحث نہ ہو سکی تھی پس مناسب معلوم ہوا کہ

"اول اس دعوے کو موجّہ کیا جائے۔ دوسرے اعتراض تعارض آیت کریمہ انک میت اور علی ہذا القیاس اعتراض تعارض بعض احادیث کا جواب دیا جائے۔"

اسی خیال کے پیش نظر ہدیۃ الشیعہ کے اس مقام کی تفصیل میں آپ مشغول ہوئے، اسی عرصہ میں رمضان شریف کا مہینہ آگیا، جس میں کام پورا نہ ہوسکا۔ اسی کے ساتھ کچھ اور موانع اور رکاوٹوں وغیرہ کا ذکر کرکے آخر میں اطلاع دیتے ہیں کہ

"ہنوز اس تقریر کے اتمام کی نوبت نہ آئی تھی کہ سامان غیبی باعثِ عزمِ سفرِ حج ہوا، آٹھویں شوال کو وطن سے رخصت ہوکر گردا فشانئے راہِ بیت اللہ اختیار کی" ص۳

اور یہی میں عرض کرنا چاہتا تھا، کہ دوسرے حج کا یہ سفر ۱۲۸۶ھ ماہ شوال میں شروع ہوا۔ آپ کی خود نوشتہ تحریری شہادت سے یہی ثابت ہوتا ہے[1]۔

حج کے اس سفر کی وجہ سے چاہئے تو یہی تھا کہ ہدیۃ الشیعہ کی تصحیح و نظر ثانی کا جو کام شروع ہوا تھا، وہ ملتوی ہوجاتا لیکن آپ ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی محمد حیات نے اصرار کیا کہ سفر میں بھی جہاں جہاں موقع ملے، اس کام کو جاری رکھا جائے۔ کیونکہ ہدیۃ الشیعہ کے بعض تصحیح شدہ اجزا چھپ بھی چکے تھے، حضرت والا نے بھی التوا کو مناسب خیال نہ کیا، اور مسودہ کو ساتھ لے کر بمبئی پہنچے۔ عام طور پر جیسا کہ اب بھی ہوتا ہے، یعنی جہاز کے انتظار میں حاجیوں کو عموماً کچھ دن بمبئی میں ٹھیرنا پڑتا ہے، یہی صورت آپ کے ساتھ بھی پیش آئی۔ لکھا ہے کہ

"بمبئی پہنچا تو ہر چند دس بیس روز تک وہاں رہنا پڑا، مگر کچھ دن بوجہ کاہلی امروز و فردا میں گذرے، اور کچھ دن بیماری کے بہانہ میں رائگاں گئے، آخر ایام قیام میں طبیعت پہ بوجھ ڈال کر بیٹھا، اور جوں توں بن پڑا، پانچ یا چار دن میں تمام کیا" ص۳

---

[1] مصنف امام کے الفاظ یعنی "۱۲۸۵ھ میں مولانا کو حج کی سوجھی" اس فقرے میں "سوجھی" کے لفظ کا مطلب اگر یہ لیا جائے کہ حج کا خیال پیدا ہوا اور دوسرے سال ۱۲۸۶ھ میں غیب سے اس سفر کا سامان مہیا ہوگیا، تو گویا تطبیق کی ایک شکل نکل آتی ہے ۱۲

جس سے دوسرے سفرِ حج کے موقعہ پر بمبئی کے قیام کی مدت کا بھی پتہ چلتا ہے، اور اس کا بھی کہ بمبئی پہنچنے کے بعد طبیعت بھی حضرت کی کچھ ناساز ہو گئی تھی۔ لیکن بااین ہمہ سفر کے اسی حال میں آپ نے ہدیۃ الشیعہ کے اس ضمیمہ کو جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بجسدہ زندہ رہنے کو ثابت کیا گیا تھا، پورا کیا۔ چاہیئے تو یہی تھا کہ بمبئی ہی سے اس کو میرٹھ منشی محمد حیات کے پاس بھیجدیتے۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ کیوں نہ ہوا؟ اسی کا جواب دیتے ہوئے جو کچھ ارقام فرمایا گیا ہے کان والوں کو چاہیئے کہ اس کو سنیں، اور جو آنکھیں رکھتے ہیں، ان ہی کو میں دکھانا چاہتا ہوں۔

مکہ معظمہ میں جیسا کہ معلوم ہے حضرت والا کے پیر و مرشد حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان سے ہجرت کر کے مقیم ہو چکے تھے، اور خود کیا مقیم ہوئے تھے۔ اسی دیباچہ میں سیدنا الامام الکبیر نے براہ راست اپنی یہ شہادت قلم بند کی ہے، یعنی حاجی صاحب قبلہ کا ذکر کر کے لکھا ہے، کہ

"ہنگامہ رستخیز، غدر ہندوستان کے بعد وطن قدیمی تھانہ بھون ضلع سہارنپور و مظفر نگر کو چھوڑ کر بحکم اشارات باطنی بلد اللہ الامین مکہ معظمہ زادہا اللہ شرفاً و عزۃً میں مقیم ہیں" ص۴

آپ دیکھ رہے ہیں حضرت والا کے ذمہ دار قلم سے "بحکم اشارات باطنی" کے الفاظ جو اس موقعہ پر درج ہوئے ہیں، یقیناً یہ صرف الفاظ نہیں ہیں۔

بہر حال اس وقت تو میں کہنا چاہتا ہوں کہ ہدیۃ الشیعہ کا یہ ضمیمہ اگرچہ بمبئی ہی میں لکھا جا چکا تھا،

---

لہ آپ کی اس عبارت میں ۵۷ء کے فتنہ کی تعبیر "غدر" کے لفظ سے کی گئی ہے۔ ممکن ہے عام شہرت کی وجہ سے یہی لفظ قلم پر آگیا ہو۔ علاوہ اس کے ۵۷ء میں غدر یعنی عہد شکنی تو ہوئی تھی لیکن ابتداء عہد شکنی کی حکومت کی طرف سے ہوئی تھی، یا رعایا کی طرف سے؟ اس کی تفصیل اپنے مقام پر آپ پڑھ چکے ہیں۔ اس لئے غدر کے لفظ پر لوگوں کو متنبہ ہونا چاہئے۔ دوسرا لطیفہ تھانہ بھون کے ضلع کے مستقر کے متعلق سہارنپور اور مظفر نگر دونوں ہی کے نام درج کر دیئے گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ تھانہ اپنے محل وقوع کے لحاظ سے دونوں ہی شہروں سے تعلق رکھتا ہے اور دونوں ہی کی طرف منسوب ہو سکتا ہے ۱۲

اور ابتدا ہیں چاہا گیا تھا کہ

"بعد اتمام اصل (ترجمہ) کو میرٹھ روانہ کیجئے اور نقل بغرض پیش کش حضرت پیر و مرشد دام اللہ فیوضہ ساتھ لیجئے۔"

لیکن ظاہر ہے کہ سفر کی بے اطمینانیوں کے زمانہ میں اصل ہی کا لکھنا آسان نہ تھا، چہ جائیکہ اصل کے ساتھ اس کی نقل بھی لکھی جائے۔ ارقام فرمایا گیا ہے۔

"نقل کا اتفاق نہ ہوا، زمانہ روانگی کا جلد آگیا۔ ناچار ہوکر میرٹھ کا بھیجنا موقوف رکھا۔"

گوش حقیقت نیوش کے لئے جس چیز کو پیش کرنا چاہتا ہوں، اسے اب سنئے، حضرت حاجی صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مشہور بھی ہے، اور تفصیلاً اسی کتاب میں لکھ بھی چکا ہوں کہ معمولی فارسی اور عربی میں صرف و نحو کے ابتدائی رسالوں تک آپ کی ظاہری تعلیم محدود تھی، لیکن صرف پیش کش کرنے کے لئے نہیں، بلکہ سیدنا الامام الکبیر کی تمام کتابوں میں سب سے زیادہ ادق اور حد سے زیادہ عمیق لطائف و حقائق پر جو کتاب مشتمل ہے، جانتے ہیں، حاجی صاحب کی خدمت میں اس کو کس لئے پیش کرنے کے لئے، لئے جارہے تھے۔ ان ہی سے سنئے، پہلا فقرہ تو اس سلسلہ کا یہ ہے، کہ

"بامید ہائے چند در چند، ایک بار حضرت پیر و مرشد دام اللہ فیوضہ کے گوش گذار کردینا، یا ملاحظہ اقدس سے گذار دینا ضروری سمجھا۔"

ان ہی چند در چند امیدوں میں اپنی بعض امیدوں کا ذکر آپ نے خود ہی اس موقعہ پر فرمایا ہے جب کتاب حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو سنادی گئی لکھتے ہیں کہ

"اس ہدیۂ مختصرہ کو قبول فرما کر صلہ و انعام میں دعائیں دیں۔"

شاید یہ پہلی امید تھی، جو پوری ہوئی، لیکن اس پر نہیں، حیرت جس پر ہوتی ہے، وہ آگے کے فقرات ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"علاوہ بریں تصحیح وجدانی اور تحسین زبانی سے اس ہیچ مدان کی اطمینان فرمائی۔"

صرف یہی نہیں، سنئے اسی کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ

"اپنی کم مائگی اور ہیچ مدانی کے سبب جو تحریر مذکور کی صحت میں تردد تھا، رفع ہوگیا۔"

اور یہ ہے "نایافتگی کا وہ کمال جس کے بعد "یافت" کا دروازہ کھل جاتا ہے" اسی موقعہ پر سیدنا الامام الکبیر نے اس مشہور بات کا خود اقرار بھی فرمایا ہے، لکھا ہے کہ

"پھر کوئی یہ سمجھے، اور متعجب ہو، کہ قاسم نادان کی تحقیق اور تنقیح اور ایسی تحسن و صحیح۔ ع

زبان گنگ و چنین نغمہ خوش آئندہ

میں کہاں اور یہ مضامین عالی کہاں، یہ سب اسی شمس العارفین (حاجی صاحب قبلہ) کی نور افشانی ہے، یہاں بھی مثل زبان و دست و قلم، واسطہ ظہور مضامین مکنونہ دل عرش منزل ہوں۔"

اسلام اور سارے اسلامی علوم ہی کی بنیاد ہی "اُمیت" پر اگر قائم نہ ہوتی، اور علم کی غیر معمولی راہ کی اطلاع "اتیناہ من لدنا علما" کی قرآنی آیت میں اگر نہ دی جاتی، تو جس واقعہ کا اعتراف فرمایا گیا ہے، شاید اس کا باور کرنا بھی آسان نہ ہوتا، آخر اسی دنیا میں تو ہم دیکھ رہے ہیں کہ دوسروں کے افکار و نظریات کو اپنی طرف منسوب کر لینے کا عام رواج ہے، لیکن علمی سرقات و انتحالات کی اسی دنیا کا ایک معکوس تماشا وہ بھی ہے، جو اس اعترافی آئینہ میں دکھایا گیا ہے۔ خیر یہ تو ایک ضمنی بحث تھی، ذکر آپ کے اس درمیانی حج کا ہو رہا تھا۔ اسی کتاب کے دیباچہ میں ہے، میرٹھ بھیجنے کا ارادہ مسودہ کے متعلق جو تھا، اس کو ملتوی کر کے فرماتے ہیں کہ

"اوراقِ مسودہ کا پشتارہ باندھ کر جہاز پر چڑھا"

جہاز پرکن احساسات کے ساتھ سوار ہوئے، اور جدہ پہنچے، پڑھئے اور سر دھنئے، ارقام فرمایا گیا ہے

"اور محض بامداد خداوندی، باوجود دگمراہی، اور نامہ سیاہی کے جس کی وجہ سے اپنی رسائی تو درکنار ہمراہیوں کی گم گشتگی کا بھی اندیشہ تھا، دریا پار ہو کر جدّہ پہنچا" ص۱۱

یہ ہے، عبدیت اور بندگی کی وہ شان، کہ سب کچھ مل رہا ہے، لیکن بندے کی نظر اپنی بندگی سے ایک لمحہ کیلئے نہیں ہٹتی، جدہ پہنچنے کے بعد آگے بیت اللہ الحرام کی طرف روانگی کا ذکر کرتے ہوئے جو کچھ ارقام فرمایا گیا ہے، وہ بھی سننے کے قابل ہے، ارشاد ہوا ہے۔

"اور وہاں سے (یعنی بندرگاہ جدّہ سے) بسواری شتر دو روز میں دونوں قبلوں[1] کی زیارت سے مشرف ہوا"

حالانکہ مکہ معظمہ میں ایک ہی قبلہ ہے، لیکن بجائے اس ایک قبلہ کے آپ دیکھ رہے ہیں۔ حلقہ دیوبند کے سیدنا الامام الکبیر فرماتے ہیں

"دو قبلوں کی زیارت سے مشرف ہوا"

پہلے قبلہ کی تشریح ان الفاظ میں فرمانے کے بعد یعنی

"بیت اللہ زادھا اللہ شرفاً وعزۃً الی یوم القیمۃ کا طواف میسر آیا"

اسی مکہ معظمہ بلد اللہ الامین میں اپنے دوسرے قبلہ[1] کی نشاندہی جن الفاظ میں فرمائی گئی ہے

---

[1] مسلمانوں میں "قبلہ و کعبہ" کے الفاظ یوں تو بزرگوں والدین وغیرہ کے متعلق عام طور پر مستعمل ہیں۔ بظاہر علماء کی طرف سے جہاں تک میں جانتا ہوں اس پر داروگیر عموماً نہیں کی گئی۔ یوں بھی جس کی طرف رخ کیا جائے حقیقتاً اس کو قبلہ کہتے ہیں۔ پھر حق سبحانہ وتعالیٰ کو اپنا مطلوب مقصود بنا کر عموماً شیخ طریقت کی طرف رخ کیا جاتا ہے، جیسے کعبہ کی طرف بھی رخ حق تعالیٰ ہی کی عبادت کے لئے آدمی کرتا ہے۔ وجہ تشبیہ ظاہر ہے، نیز صحاح کی اس حدیث کی رو سے جس میں ہے کہ کعبہ کی طرف ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (باقی اگلے صفحہ پر)

میں ان کو نقل کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن حیران ہوں کہ ان مسکینوں، دین اور عقل کے مسکینوں کی شکم پروری کا ذریعہ کیا باقی رہے گا۔ جو کوچہ و بازار میں اکابر دیوبند پر توہب کی تہمت تراشیوں سے ناواقف مسلمانوں کی جیبیں تراش رہے ہیں۔

اور بیداری کا پیغام ان چھوٹوں کے لئے بھی ہے، جن کے چھوٹے حوصلوں، اور تنگ سینوں میں اپنے بڑوں کے احترام و عقیدت کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے، وہی جو کچھ نہ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو سب کچھ باور کئے بیٹھے ہیں، لیکن دیکھئے اس پوری کتاب میں جس کی بڑائیوں کا نظارہ مسلسل آپ کے سامنے گذرتا رہا ہے، اپنے بڑوں کے آگے وہ کتنا چھوٹا بن جاتا تھا، سنئے، دوسرا قبلہ جس کی زیارت سے شرف اندوز ہونے کا موقعہ مکہ معظمہ پہنچکر میسر آیا، ان ہی کے الفاظ میں سنئے، فرماتے ہیں۔

"اعنی بزیارت مطلع انوار سبحانی، منبع اسرار صمدانی، مورد افضال ذی الجلال و الاکرام، مخدومنا و مطاع خاص و عام، سر حلقہ مخلصان، سراپا اخلاص، سر لشکر صدیقان باختصاص، رونق شریعت، زیب طریقت، ذریعۂ نجات، وسیلہ سعادات، دستاویز مغفرت نیاز مندان، بہانۂ واگذاشت مستمندان، ہادی گمراہان، مقتدائے دین پناہان، زبدۂ زمان، عمدۂ دوران سیدنا و مرشدنا

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) اشارہ کر کے فرمایا کہ خدا کے نزدیک تو سب سے زیادہ محترم ہے۔ لیکن ایک مومن کا احترام تجھ سے بھی زیادہ ہے۔ اس حدیث کی بنیاد پر بھی سیدنا الامام الکبیر کی تعبیر میں خلجان کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی کرامات امدادیہ میں حضرت تھانوی نے نقل کیا ہے کہ مکہ معظمہ کے شریف کا کوئی مصاحب تھا جو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے دل میں کچھ کدورت رکھتا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ نمامی کر کے نقصان نہ پہنچائے۔ ایک دن وہی حاجی صاحب کی مجلس مبارک میں حاضر ہوا تو اس سے کہنے لگے، کہ خالق کے سوا کسی مخلوق سے میں نہیں ڈرتا، اور فرمایا کہ "زیادہ سے زیادہ مکہ معظمہ سے مجھے کوئی جلاوطن کرا سکتا ہے، مگر یاد رکھو کہ جہاں بیٹھ جاؤں گا میرا تو ہی مکہ اور وہی مدینہ ہے" اس کے بعد کعبہ کی حقیقت بیان کر کے یہ بھی ارشاد ہوا کہ البتہ جو لوگ جامع ہیں وہ حقیقت کے ساتھ صورت کی بھی رعایت کرتے ہیں اور ظاہری مکہ و مدینہ کو بھی نہیں چھوڑتے" صفحہ ۲، حضرت تھانویؒ نے اسی کے ذیل میں لکھا ہے کہ کوئی شخص مکہ و مدینہ میں رہے لیکن اصلاح باطن نہ کرے تو اس کا وہاں رہنا ہیچ ہے ۱۲

مولانا الحاج امداد اللہ لازال کاسمہ امداداً من اللہ للمسلمین واہل اللہ"

دیکھا آپ نے؟ دوسرا قبلہ مکہ معظمہ میں آپ کا کون تھا، اپنے بزرگوں کے احترام و عقیدت کا اس سے زیادہ بہتر نمونہ اور کیا پیش کیا جا سکتا ہے۔

بہرحال مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد اپنے پیر و مرشد حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو "ہدیۃ الشیعہ" کا وہ ضمیمہ سنایا گیا، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بجسدہ زندہ رہنے کے دعوے کو مدلل کیا گیا تھا، یہ ارقام فرمانے کے بعد

"حسب زبان فیض ترجمان (حاجی صاحب) سے آفرین و تحسین سن لی، تو اصل مضامین کی حقیقت تو اپنے نزدیک محقق ہو گئی" ص۵

آگے حضرت حاجی صاحب کے اس حکم اور مشورہ کو نقل کیا گیا ہے کہ

"تقریر اثبات حیات، سید الموجودات، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدیۃ الشیعہ سے جدا کر کے جدا نام رکھ دیجئے"

اسی حکم کی تعمیل میں ارادہ کیا گیا کہ مستقل کتاب کی شکل میں اس خاص مسئلہ کے مباحث کو مرتب کر دیا جائے، اور حج کے اسی سفر میں جیسا کہ ارقام فرمایا گیا ہے کہ

"دل میں یہ ٹھان کر قلم اٹھایا، اور ٹھہرائی کہ شروع تو خدا کے گھر سے کیجئے اور بن پڑے تو بوسہ گاہ عالم، در سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر اختتام کو پہنچا دیجئے۔ تاکہ ابتداء اور انتہا دونوں مبارک ہوں، ورنہ جس قدر بن پڑے سے غنیمت ہے کیونکہ اس وسیلہ سے اس ظلوم و جہول کو امید صحت اور ظنِ حسن قبول ہے" ص۶

متوسط تقطیع پر حضرت والا کی یہ کتاب "آب حیات" (۲۵۸) صفحات پر ختم ہوئی ہے، نہیں کہا جا سکتا کہ کتاب کی ابتدا اور انتہا کے متعلق یہ ارادہ جو طے کیا گیا تھا، کام اسی ارادہ کے مطابق پورا ہوا یا نہیں، امید تو یہی ہے کہ "خدا کے گھر" میں جو نیت کی گئی تھی، خدا نے اس نیت کو پورا ہی کیا ہو گا، آخری فقرے جس پر کتاب کا یہ دیباچہ ختم ہوا ہے وہ یہ ہیں

"سو تادم تحریر سطور تو بہ کمترین انام آستانہ خداوندی پر جبہ سا ہے، اور پرسوں چھبیسویں ذی الحجہ سنا ہے کہ مشتاقان زیارت کا مدینہ منورہ کو ارادہ ہے، ان کے ہمرکاب، انشاء اللہ تعالیٰ یہ ننگ امت بھی روانہ ہونے والا ہے"۔ صلہ

آپ کے دو مشہور حج کے درمیان اس تیسرے حج کے متعلق مذکورہ بالا عبارت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے، کہ حج کے مناسک سے فارغ ہونے کے بعد ۲۲۔ ذی الحجہ تک مکہ معظمہ ہی میں قیام رہا۔ اور جو اطلاع دی گئی ہے، اسی کے مطابق اگر مدینہ کا قافلہ ۲۵۔ ذی الحجہ کو مکہ معظمہ سے روانہ ہوا، تو مدینہ منورہ جانے کی تاریخ بھی گویا متعین ہو جاتی ہے، اور آب حیات کے دیباچہ کی اسی عبارت سے یہ نتیجہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ حضرت والا کی تصنیفات میں ایک کتاب ایسی بھی ہے جو حرمین میں لکھی گئی، یا کم از کم اس کتاب کا کچھ حصہ ایمان و دین کے ان ہی دونوں مرکزوں میں قلم بند ہوا۔ "قبہ خضراء" کے سامنے بیٹھ کر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی گوشہ نشینی، اور عزلت گزینی کی استدلالی تصویر کشی کی۔ وجدانی حلاوتوں اور کشفی لذتوں کا کون اندازہ کر سکتا ہے اور کیسے کہا جائے کہ جو کچھ دیکھا جا رہا تھا، نہ دیکھنے والوں کو مانوس بنانے کیلئے دلائل و براہین کے لباس میں اسی کو جلوہ گر کیا جا رہا تھا، لیکن جو خود (راقم الحروف) نابینا ہو، دوسرے نابیناؤں کو کیا بتائے۔

کچھ بھی ہو، ذاتی طور پر اپنے حج کے اس سفر میں جن نعمتوں سے سرفرازیاں ہوئیں، ان کے سوا اس میں شک نہیں کہ "آب حیات" کی شکل میں دوسروں کے لئے بھی ایک ایسا عرفانی و علمی ہدیہ آپ ہندوستان لائے، جس سے خدا ہی جانتا ہے کہ نفع اٹھانے والے کب تک نفع اٹھاتے رہیں گے، علاوہ اس خاص مسئلہ کے جو اس رسالہ کا خاص موضوع ہے ذیلی طور پر بے شمار نکات و اسرار سے پردہ اٹھایا گیا ہے خصوصاً اس پر بحث کرتے ہوئے کہ امہات المومنین ازواج مطہرات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عقد کی اجازت

اسی بنا پر نہیں دی گئی کہ جس قسم کی موت سے عقد نکاح ختم ہو جاتا ہے، اس قسم کی موت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر طاری ہی نہیں ہوئی تھی۔ اسی سلسلہ میں "تعدد ازواج" کا مسئلہ بھی آپ کے سامنے آگیا ہے۔ عام مسلمانوں کو چار بیویوں کی حد تک اجازت اسلام میں کیوں محدود کر دی گئی، اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو تحدید کے اس قانون سے کیوں مستثنیٰ رکھا گیا، یا بجائے بیویوں کے مماملکت ایمانکم یعنی شرعی لونڈیوں کے متعلق عام مسلمانوں پر تحدید کا یہی قانون کیوں نہ عائد کیا گیا۔ پڑھنے والے اس کتاب کو اگر غور سے پڑھیں گے، تو وہ بھی اسی فیصلہ پر پہنچیں گے، کہ بحث کرنے والوں نے خصوصاً اس زمانہ میں حالانکہ ان مسائل پر بہت کچھ لکھا ہے، لیکن اسلام کے ان ہی ضوابط کی جو دل آویز، دل نشین توجیہیں حرمین کے اس ہدیہ علمیہ یعنی "آب حیات" میں پائی جاتی ہیں، شاید روح القدس کی لاہوتی تائید کے بغیر ذہن کا ان کی طرف منتقل ہونا آسان نہ تھا۔

تفصیلاً نہ سہی، لیکن اجمالاً آپ کے اس درمیانی سفر حج کے متعلق جو "معلومات" "آب حیات" کے دیباچہ کی مدد سے مہیا ہو گئیں وہی غنیمت ہیں، ان کا درج کرنا اس لئے بھی مناسب معلوم ہوا کہ حافظوں میں آپ کے اس حج کی یاد باقی نہ رہی تھی۔ حالانکہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ بجائے خود آپ کا یہ حج بھی کافی اہمیت کا حامل ہے۔

اب آئیے! سیدنا الامام الکبیر کے اس "آخری حج" کی داستان سنئے، جو اللہ کے گھر کا آخری سفر تھا، اور اللہ کے گھر کا یہی سفر اللہ کی طرف سفر کا مقدمہ اور ذریعہ بن گیا۔

## آخری وداعی حج

سیدنا الامام الکبیر کے پہلے حج اور دوسرے حج میں یاد ہوگا، حساب کر کے بتایا گیا تھا، کہ تقریباً دس سال کا فاصلہ تھا، اور زندگی مبارک و مسعود کا یہ آخری حج جس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عاشق الٰہی مرحوم نے اپنی کتاب تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے، کہ اسی حج سے واپس ہوتے ہوئے راستہ میں

"مولانا محمد قاسم صاحب کو علالت لاحق ہوئی"

اور ان ہی کے الفاظ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ

"آہستہ آہستہ بڑھ کر آخر وہی بیماری مرض الموت بنی" ص۲۲۴ ج ۱

گویا اسی واقعہ نے حضرت والا کے اس حج کو وداعی حج بنا دیا۔ اللہ اللہ جس میں کھو کھو کر پانے والا سب کچھ پاتا چلا جا رہا تھا، سرفرازیوں کی اس کی کوئی حد ہے۔ کام تو کام اپنے آقا کے کام کے نام تک سے حصہ پانے کیلئے ان قدرتی حیلوں یا الٰہی تیسرات کو آپ دیکھ رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ کے اس "آخری وداعی حج" اور جو صورت اس میں پیش آئی، اس کو سوچتے ہوئے "حجۃ الوداع" کے تاریخی لفظ کی طرف ذہن منتقل ہو جائے، تو اس پر متعجب نہ ہونا چاہئے۔

پہلے بھی بار بار کہہ چکا ہوں کہ "فاتبعونی" کی صلائے عام پر لبیک کہنے والوں کے انعام اور صلوں کا اندازہ وہ نہیں کر سکتے، جو کرنے کے لئے نہیں بلکہ سننے، اور صرف سننے ہی کے لئے سنتے ہیں۔ خیر کہنا یہ ہے، مصنف امام نے اس آخری وداعی حج کے متعلق جو یہ خبر دی ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر

"شوال ۱۲۹۴ھ میں روانہ ہوئے، اور ربیع الاول ۱۲۹۵ھ کے اول پھر اپنے وطن واپس آئے"

جس کا مطلب عیسوی سن کے حساب سے یہ ہوا کہ ۱۸۷۷ء اوائل ماہ اکتوبر یا اواخر ستمبر کی کسی تاریخ میں روانہ ہوئے، اور ۱۸۷۸ء ماہ فروری کی کسی تاریخ میں ہندوستان واپس لوٹے۔

اس سے پہلے درمیانی جیسا کہ گذر چکا آپ نے ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) میں کیا تھا، گویا ابھی پورے آٹھ سال بھی نہیں گذرے تھے کہ اچانک تیسرے حج کے سفر کے لئے قدرتی آسانیاں غیب سے مہیا ہو گئیں۔ اور اس طور پر مہیا ہوئیں، کہ پہلے سے اس سال کے حج کا شاید خطرہ بھی قلب مبارک پر نہ گذرا تھا۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جانے والے جیسے ارادہ کر کے جاتے ہیں۔ اسی طرح پہلے دونوں حج کے لئے تو آپ نے خود جانے کا ارادہ کیا، اور پہنچانیوالا

منزلِ مقصود تک پہنچاتا رہا۔ لیکن اس تیسرے حج کے متعلق چاہا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ

ع "میں آپ آیا نہیں، لایا گیا ہوں"

کی جیسی کوئی صورت شاید پیش آگئی تھی، خود مصنف امام ہی کے الفاظ کو پڑھئے، اس تیسرے حج کا ذکر چھیڑتے ہوئے فرماتے ہیں

"اسی سال ارادہ جناب مولٰنا مولوی رشید احمد صاحب کا حج کو جانے کا تھا،

احقر بھی تیار ہوا۔"

احقر سے مراد خود ہمارے مصنف امام حضرت مولٰنا محمد یعقوب صدر اول دار العلوم دیوبند ہیں، مطلب یہی ہے کہ یہ دونوں حضرات تو حج کے لئے خود تیار ہوئے، بلکہ مولٰنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ پہلے ہی سے اس سال حج کرنے کا ارادہ فرما چکے تھے، اب آگے سنئے، وہی سیدنا الامام کے متعلق فرماتے ہیں۔

"چلنے میں مولٰنا کو بھی ساتھ لے ہی لیا۔"

"لے ہی لیا" کا فحویٰ بتا رہا ہے کہ لے جانے والے جسے اپنے ساتھ لئے جا رہے تھے، خود اس کے اندر اس سال کے حج کے متعلق کسی قسم کا کوئی خیال پہلے سے نہ تھا، اور "دلے بر ندش" کا ذریعہ عالم میں ان ہی لے جانے والوں کو بنایا گیا۔

اور یہ تو خیر ایک استنباطی نتیجہ ہے، براہ راست خاکسار نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اور امیر شاہ خان صاحب وغیرہم حضرات سے جو باتیں اس حج کے متعلق سنی ہیں۔ خلاصہ جن کا یہی ہے کہ مولٰنا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اس سال حج کے لئے جانے والے ہیں، عام طور پر لوگوں میں اسی کا چرچا اور شہرہ تھا۔ تا اینکہ روانگی کی تاریخ بھی متعین ہو گئی، مولٰنا گنگوہی کو رخصت کرنے کے لئے سیدنا الامام الکبیر بھی گنگوہ تشریف فرما ہوئے، دونوں رفیق الدنیا والآخرۃ میں جب ملاقات ہوئی، تو حضرت گنگوہی نے رفاقت کی خواہش پیش کی، آپ بالکلیہ اس خیال سے خالی تھے۔ وقت بھی اتنا تنگ ہو چکا تھا کہ اس عرصہ میں زاد راحلہ اور

دوسری ضرورتوں کی فراہمی کی بظاہر کوئی صورت نہ تھی، حضرت نانوتوی کی طرف سے معاذیر جو واقعی معاذیر تھے، پیش ہوتے رہے۔ لیکن دوسری طرف سے اصرار بڑھتا ہی چلا گیا، رات کا بڑا حصہ اسی ردّ وکد میں ختم ہوا، اور اسی فیصلہ پر ختم ہوا کہ سامان ہو یا نہ ہو، لیکن بہرحال رفاقت کی جائیگی، کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ حضرت گنگوہی نے بمبئی تک کے مصارف کی ذمہ داری اپنے اوپر لی تھی، آگے کیا ہوگا اس مسئلہ کو اسی کے سپرد کر دیا گیا، جس نے حضرت گنگوہی کے قلب منور میں رفاقت کے اس خیال کو ڈالا تھا،

"ساتھ لے ہی لیا"

مصنف امام کے اس متن متین کی شاید یہی شرح ہے، جو بزرگوں سے مجھ تک پہنچی ہے، ساتھ لینے والوں نے پھر راستہ بھر کیا کیا دیکھا، اور قادر و مقتدر کی اقتداری نیرنگیاں کن کن شکلوں میں سامنے آئیں، ان کا ذکر تو آگے آرہا ہے، اس وقت تو

"میں آپ آیا نہیں لایا گیا ہوں"

کا جو خیال سیدنا الامام الکبیر کے اس آخری وداعی حج کے متعلق میرے دل میں آیا ہے اور یہی آپکے اس تیسرے حج کی سب سے بڑی خصوصیت کم از کم مجھے جو نظر آئی ہے۔ منجملہ دوسرے اسباب و وجوہ کے اس خیال کا جو واضح منشاء بن سکتا ہے آپ بھی اسے دیکھ رہے ہیں، اور یہی کیا اس تیسرے حج و زیارت کی سعادت جس سال آپکو حاصل ہوئی یاد ہوگا، یہ وہی سال تھا جس میں خداشناسی کے دوسرے میلے سے سیدنا شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں

"بحمد اللہ نصرت اسلام کا پھریرا اڑاتے ہوئے، حضرت مولانا المعظم و سیدنا الامام الکبیر، واپس تشریف لائے" صـ۲ دیباچہ حجۃ الاسلام طبع جدید علیگڈھ

میں نے عرض کیا تھا کہ مارچ ۱۸۷۷ء میں آپ خداشناسی کے دوسرے میلہ سے واپس ہوئے، اور اسی سال کے اواخر ماہ ستمبر یا اوائل ماہ اکتوبر میں دیکھا جا رہا ہے کہ بے سان و گمان، بغیر کسی سابقہ تیاری کے لیجانیوالے اپنے ساتھ حضرت الاکو اللہ کے گھر، اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے آستانے کی طرف لئے چلے جارہے ہیں، ادھر تو یہ لوگ لئے چلے جا رہے ہیں، اور اب میں کیا بتاؤں، افشا کرنیوالے راز کا جب افشا کر ہی چکے ہیں،

قید تحریر ہی میں نہیں، بلکہ چھپ چھپا کر مدت ہوئی عام طور پر شائع و ذائع بھی ہو چکا ہے، تو اسے ہم کیوں چھپاؤں، اللہ اللہ آج سے تقریباً آٹھ سال پہلے اپنے دوسرے حج کے موقعہ پر بجائے ایک قبلہ کے مکہ معظمہ میں دوسرے قبلہ کو جو ڈھونڈھ رہا تھا، اور پانے کے بعد خدا کا شکر ان الفاظ میں ادا کرتا ہے کہ مکہ ہی میں

"دونوں قبلوں کی زیارت سے مشرف ہوا"

کیسی عجیب بات ہے کہ اس تیسرے حج میں دیکھا گیا، اپنے ڈھونڈھنے والے کو وہی تلاش کر رہا ہے جو دوسرے حج کے موقعہ پر اس کا دوسرا قبلہ بنا ہوا تھا، صاف لفظوں میں سنئے حضرت تھانوی کی ایک مشہور کتاب "کرامات امدادیہ" بھی ہے، اسی میں انہوں نے الہ آباد کے مشہور عالم و صوفی مولانا محمد حسین الہ آبادی جنکی وفات ہی بحالت وجد و حال اجمیر شریف میں ہوئی، ان ہی کے حوالہ سے یہ روایت درج کی ہے کہ مولانا الہ آبادی کی ایک دوست مولوی افضال الحق نامی تھے، لکھا ہے کہ حضرت حاجی صاحب کے غلاموں میں تھے۔ یہی مولوی افضال الحق بیان کرتے تھے کہ مکہ معظمہ میں

"جن دنوں میں حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر تھا"

یہی زمانہ تھا، جس میں اس تیسرے و داعی حج کیلئے لیجانیوالے سیدنا الامام الکبیر کو اپنے ساتھ لئے ہوئے حجاز کا سفر کر رہے تھے، مولوی افضال الحق صاحب کا بیان ہے کہ اسی عرصہ میں ایک دن یہ واقعہ پیش آیا کہ

"اشراق کی نماز کے بعد مراقبے سے آپنے (یعنی حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ نے) سر اٹھایا اور فرمایا"

جو کچھ ارشاد فرمایا، اسے سنئے، خود حاجی صاحب مکہ معظمہ میں ہیں، اور ارشاد فرما رہے ہیں کہ

"عجب نہیں کل مولوی محمد قاسم وغیرہ یہاں آجائیں!!"

جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، حجاج کا یہ ہندی قافلہ تقریباً ایک سو سے زائد علماء پر مشتمل تھا، خود حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس میں شریک بلکہ گویا امیر قافلہ تھے لیکن بجز اس کے جسے لانیوالے اپنے ساتھ لئے آرہے تھے، آنیوالوں میں سے نام کسی کا نہیں لیا جا رہا ہے، صرف "وغیرہ" کے لفظ سے ان کی طرف اشارہ اس موقعہ پر کافی سمجھا گیا، اور بات اسی پر ختم نہیں ہوگئی، مولوی افضال الحق صاحب حضرت حاجی صاحب سے اس خبر کو سنکر جیسا کہ چاہیئے تھا عرض کیا کہ

"کیا کوئی خط آیا ہے؟"

جواب میں جو کچھ فرمایا گیا، اسی کا سنانا مقصود ہے، حالانکہ حاجی صاحب کا جیسا کہ معلوم ہے اس قسم کی باتوں کا اظہار آپ کا عام دستور نہ تھا، لیکن اس وقت رنگ ہی دوسرا تھا، مولوی افضال الحق صاحب سن رہے تھے، مکہ میں بیٹھے بیٹھے حاجی صاحب ان سے کہہ رہے ہیں۔

"مجھے اس وقت (مراقبہ میں) جہاز کا مستول نظر آیا کہ اس نے جدہ میں لنگر کیا، اس جہاز پر غالباً یہ لوگ ہیں"

دوسرے حج میں جو ڈھونڈھا جا رہا تھا، تیسرے حج میں اپنے ڈھونڈھنے والے کو وہی اپنے مراقبہ میں تلاش کر رہا ہے، کیا اس دعوے کے ثبوت کیلئے مزید کسی تشریح کی ضرورت ہے، اپنا حال کیا عرض کروں اس روایت پر جس وقت نظر پڑی، بچپن کا وہ زمانہ یاد آگیا، جب الحماسی کے وہ اشعار پڑھائے گئے تھے جو مکہ میں تھا، اور اس کی محبوبہ یمن کے ناقہ سواروں کے ساتھ جا رہی تھی، اسی کو یاد کر کے "زندان مکہ" میں اس نے چند اشعار کہے تھے، جن میں دو شعر یہ بھی ہیں۔

هوای[1] مع الرکب الیمانین مصعد ۔۔۔ جنیب وجثمانی بمکة موثق

عجبت لمسراها وانّی تخلّصت ۔۔۔ الیّ وباب السجن دونی مغلق

شاعر غریب نے تو شاعری کی تھی، لیکن کون جانتا تھا کہ صدیوں بعد اسکے یہی اشعار حقیقت اور واقعیت کا قالب اختیار کریں گے، اس نے صرف خیالی آمد و رفت پر تعجب کا اظہار کیا تھا، لیکن اس کا یہی خیال "واقعہ" بن کر جب ہمارے سامنے آیا ہے، تو ہم بھی صرف یہ کہتے ہوئے ششدر ہو کر رہ جائیں، کہ جو مکہ میں تھا، مکہ میں رہتے ہوئے جدہ کے ساحل تک کیسے پہنچ گیا۔ اور جو لایا جا رہا تھا، اسی کو لینے کیلئے چالیس پچاس میل کا یہ فاصلہ لمحوں میں کیسے طے کر لیا گیا، مولوی افضال الحق صاحب جنھیں استقبال کی اس عجیب و غریب کیفیت سے مطلع کیا گیا تھا، دوسرے دن انھوں نے یہ دیکھا کہ

---

[1] میرا محبوب یمن کے ناقہ سواروں میں چڑھا چلا جا رہا ہے، ہم سے دور، اور میرا جسم مکہ میں مقید ہے، رات کو اس کے آنے پر مجھے حیرت ہے، کہ مجھ تک وہ کیسے پہنچ گیا، حالانکہ میرے اور اس کے درمیان قید خانہ کا بند پھاٹک تھا لطیفہ یہ ہے کہ ہندی حاجیوں کا میقات یلملم وہی ہے، جو یمن والوں کا میقات ہے یعنی اسی میقات سے ہندوستان اور یمن کے حجاج احرام حج باندھ لیتے ہیں

"آپ کے (یعنی حاجی صاحب قبلہ رح کے) فرمانے کے موافق یہ سب لوگ (یعنی سیدنا الامام الکبیر وغیرہ) پہنچ گئے" صلاً کرامات امدادیہ

پہنچ جانے کے بعد مذکورہ بالا امر اقباتی استقبال کے ساتھ ساتھ دیکھنے والوں نے مکہ معظمہ کے اسی دوسرے قبلہ کے ناسوتی استقبال کا نظارہ جس رنگ میں کیا تھا وہ بھی کچھ کم اثر انگیز اور رقت خیز نہ تھا مولانا عاشق الٰہی راوی ہیں کہ

"جس وقت قافلہ باب مکہ پر پہنچا، تو سب نے دیکھا کہ اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب) پٹکے سے کمر باندھے فصیل کے پاس کھڑے ہیں"

وہی یہ بھی لکھتے ہیں کہ

"باوجود ضعف و نقاہت کے سنت استقبال اور جوش محبت میں شہر سے باہر ملنے کی خواہش پوری کئے بغیر نہ رہ سکے، خدا جانے کس وقت سے منتظر کھڑے تھے اور راستہ کی جانب آنے والے قافلہ کا انتظار کر رہے تھے" صلاً تذکرۃ الرشید

جو لایا جا رہا تھا جب وہی اپنے لانے والے ساتھیوں کے ساتھ "چشم سر" کے سامنے بھی آگیا، تو پھر دیکھنے والوں نے کیا کیا دیکھا، اس کا ذکر انشاء اللہ تعالیٰ ہم آئندہ کریں گے۔

اس وقت تو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ خود آنے کا ارادہ جس نے اس سال نہیں کیا تھا لیجانیوالے اس کو کس طریقہ سے لئے جا رہے تھے اور مکہ میں اپنا دوسرا قبلہ جس ذات بابرکات کو وہ بنائے بیٹھے تھا، وہی لانے کیلئے آپ دیکھ رہے ہیں کیا کیا نہیں کر رہا ہے، رحمۃ اللہ علیہم

اگرچہ اور تو کسی نے ذکر نہیں کیا ہے لیکن اسی "وداعی حج" کے رفقاء میں سیدنا الامام الکبیر کے تلمیذ سعید مولانا حکیم منصور علی خاں حیدرآبادی بھی تھے، انھوں نے اپنی کتاب "مذہب منصور" میں ذیلاً اس "آخری حج" کے بعض حالات اور واقعات کا بھی تذکرہ فرمایا ہے، اسی سلسلہ میں ایک اجمالی اطلاع وہ یہ بھی دیتے ہیں کہ

"۱۲۹۴ھ ہجری میں اخیر حج اپنے والد ماجد کی طرف سے کیا تھا" صفحہ ۱۷۹

جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اپنے اس تیسرے حج کے ثواب کو سیدنا الامام الکبیر نے نیت کر لی تھی

کہ ان کے والد ماجد مرحوم تک پہنچے، اور اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ آمادہ کرنیوالوں نے جب آمادہ ہی کر لیا، تو آپ نے چاہا کہ اپنے اس حج کا فائدہ اور ثواب اپنے والد مرحوم کو پہنچا دیا جائے گویا حج تو آپ نے والد مرحوم کی طرف سے کیا، ہی آپ کی ذات، سو آپ خود گئے کب تھے، بلکہ آپ پڑھ چکے کہ لے جانیوالے آپ کو لے گئے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ خدا شناسی کے میلہ کے اختتام کے ساتھ ہی آپ کی طلبی کی جو غیبی صورتیں پیش آگئیں، بلانیوالے کی غرض اس سے کیا تھی؟ میدان جیتتے تھے، تو کیا اسی کے صلہ و انعام کے لئے دربار الٰہی اور آستانۂ نبوت تک طلب کئے گئے تھے؟ یہ راز و نیاز کی باتیں ہیں قرائن و قیاسات سے کچھ کہنا اپنی حد سے آگے بڑھنا ہے، اسی لئے اس قصہ کو اسی حد پر ختم کر کے اس آخری حج میں دیکھنے والوں کو جو کچھ دکھایا گیا اور ان ہی کے ذریعہ ہم تک جو کچھ بھی پہنچ سکا ہے اسے پیش کر دیتا ہوں۔

"چلنے میں مولانا کو ساتھ لے ہی لیا" عرض کر چکا ہوں کہ ساتھ لیجانیوالوں کا یہ فیصلہ گنگوہ میں ہو چکا تھا، اسی فیصلہ کے مطابق سیدنا الامام الکبیر گنگوہ سے پہلے یہاں تشریف لائے، جہاں آپ کے اہل و عیال اس زمانہ میں مقیم تھے، اب خواہ دو نانوتہ ہو یا دیوبند، غالب خیال یہی ہے، کہ اس زمانہ میں آپ کے گھر کے لوگ نانوتہ میں تھے، گھر پہنچکر اچانک آپ نے حجاز کے اس تیسرے سفر کا اعلان کیا، سنا گیا ہے کہ جو جوڑا جسم مبارک پر تھا، اسکے سوا دوسرا جوڑا دھوبی کے یہاں تھا، وہ منگوایا گیا، جیب میں کچھ روپے پڑے ہوئے تھے، اہلیہ محترمہ کے ہی حوالہ کئے گئے اور کہہ دیا گیا کہ مقامی ذرائع اور وسائل سے گھر کے مصارف کو واپسی تک چلاتی رہیں، سہارنپور کا اسٹیشن جہاں سے مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اپنے رفقاء کے ساتھ ریل پر سوار ہونیوالے تھے۔ طے پایا تھا کہ وہیں آپ بھی فلاں تاریخ کو پہنچ جائیں، گھر سے رخصت ہو کر سہارنپور پہنچنے کیلئے روانہ ہوئے لیکن کس شان کے ساتھ روانہ ہوئے ہیں ہزار ہا ہزار میل کا سفر کرنا ہے لیکن جیب میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے، ساز و سامان میں بدن کے جوڑے کے سوا یہی دوسرا دھلا ہوا جوڑا تھا، ممکن ہے ایک دو لنگیاں اوڑھنے بچھانے کیلئے ایک آدھ کمبل چادر وغیرہ بھی ہو، الغرض اسی تفریدی شان اور تجریدی آن کے ساتھ آپ بھی سہارنپور پہنچ گئے یہاں پہنچنے کے بعد ایک عجیب تماشا پیش ہوا، خیال تو صرف یہ تھا کہ حضرت گنگوہی اپنے خاص خدام کے ساتھ ہونگے، لیکن دیکھا یہ گیا، جیسا کہ مولانا عاشق الٰہی مرحوم نے لکھا ہے کہ ایک مولانا گنگوہی کیا، بلکہ

"سرزمین ہندوستان کے منتخب چیدہ علماء سب ہی معیت کیلئے طیار ہوگئے" ص۲۲۹ تذکرۃ الرشید

مطلب یہ ہے کہ مشائعت اور پہنچانے کیلئے سہارنپور کے اسٹیشن پر انسانوں کا جو سیلاب امنڈ پڑا تھا، وہ تو بجائے خود تھا، اور جس قسم کے نفوس طیبہ سفر حج کیلئے جارہے تھے، انکو رخصت کرنے کیلئے جتنا بڑا مجمع بھی اکٹھا ہوجائے، یہ تو خیر عام اور معمولی بات ہے، بلکہ حیرت کی جو بات تھی وہ یہ تھی کہ عوام ہی نہیں بلکہ وقت کے چیدہ اور برگزیدہ علماء اور صلحاء کی ایک بڑی تعداد سفر میں ہمرکابی کیلئے اسٹیشن پر موجود تھی، جن میں چند کے نام جیسا کہ تذکرۃ الرشید میں ہے، یہ تھے۔

"حکیم ضیاء الدین (رامپور منہیاران) مولانا محمد مظہر نانوتوی (صدر مظاہر علوم سہارنپور) مولانا محمد اسماعیل صاحب (کاندھلہ) مولوی سخاوت علی انبیٹھوی، مولانا حافظ عبد العدل (گلاوٹھوی) مولانا محمد منیر صاحب (نانوتوی) مولوی الطاف الرحمٰن، حاجی عبد المجید گنگوہی، حاجی ظہور احمد انبیٹھوی"

انکے سوا دار العلوم دیوبند کے صدر اول یعنی مولانا محمد یعقوب صاحب، اور دار العلوم ہی کے مہتمم مولانا رفیع الدین صاحب حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہم اجمعین بھی تھے، بہرحال علاوہ عام لوگوں کے مولوی عاشق الٰہی کا بیان ہے کہ

"سارا قافلہ کچھ اوپر سو حضرات کا تھا" ص۲۲۹

ان بزرگوں میں سے بڑی تعداد تو سہارنپور ہی کے اسٹیشن پر پہنچکر رفاقت کا حق ادا کرنے کیلئے حاضر ہوگئی تھی، اور کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو پہلے ہی سے راہی بمبئی ہوچکے تھے، مولوی عاشق الٰہی صاحب نے اطلاع دی ہے کہ

"مولانا محمود حسن و حکیم محمد صاحب (شیخ الہند کے بھائی) اور مولانا رفیع الدین صاحب ۷ شوال کو وطن (دیوبند) سے روانہ ہوکر بمبئی پہنچ گئے تھے"

باقی جو نہ آگے روانہ ہوسکے اور نہ سہارنپور پہنچنے کا موقعہ ان کیلئے باقی رہا، ان ہی کا بیان ہے کہ ان لوگوں کے لئے،

جس ریلوے اسٹیشن سے ساتھ ہونا آسان ہوا، سوار ہوئے، اور آگے پیچھے بھی روانگی بہ نیت معیت و ہمرکابی کا تار بندھا رہا ص۲۳۰ ج۱ تذکرۃ الرشید

ایک دفعہ ہندوستانی علماء کی اتنی بڑی تعداد حجاز کے اس سفر میں ساتھ دینے کیلئے کیوں تیار ہوگئی تھی؟ مولانا عاشق الٰہی صاحب نے اس سوال کو اٹھاکر جو جواب دیا ہے، وہ بجائے خود حیرت انگیز، اور سمجھا جائے تو ایک خاص انکشاف ہے

جس کا ذکر ان کی کتاب کے سوا شاید سننے میں نہیں آیا۔

اتنی بات تو صحیح ہے، کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں جب یہ قافلہ ہندوستان سے روانہ ہوا ہے، ترکی حکومت اور روس کے درمیان وہ معرکۃ الآرا جنگ چھڑی ہوئی تھی، جس میں پلونا نامی مقام کی لڑائی کو کافی شہرت حاصل ہوئی اسی جنگ میں غازی عثمان پاشا ترکی سپہ سالار نے خود اپنی اور اپنی فوج کی سرفروشیوں اور جاں بازیوں کے لازوال نقوش اسلامی تاریخ کے اوراق پر چھوڑے، بہر حال اسی مشہور لڑائی کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ

"لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ یہ حضرات (یعنی حضرت گنگوہی و نانوتوی) دینی معاونت کے لئے بحیلہ سفر حجاز حقیقت میں ملک روم (ترکی) کا سفر کر رہے ہیں، اور ترکی سلطنت کی طرف سے والنٹیر جماعت میں شامل ہو کر مجاہد فی سبیل اللہ بنیں گے" ص ۲۲۹ / ۱ تذکرۃ الرشید

گویا حج سے زیادہ جہاد فی سبیل اللہ کا ولولہ ان لوگوں میں جوش زن تھا جنکی رفاقت کا بقول مولنا عاشق الٰہی

"تار بندھا ہوا تھا"

نقل کرنے کی حد تک مولانا نے اس کو نقل کر دیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ آخر میں اس پھیلے ہوئے خیال کو خود انہیں نے قرار دیا ہے، کہ "بے بنیاد" تھا، اپنی رائے بھی درج کی ہے، کہ بجز حج و زیارت اور کسی قسم کا کوئی مقصد اس سفر کا ان بزرگوں کے پیش نظر نہ تھا۔

ظاہر ہے کہ اس خیال کے راوی بھی وہی ہیں، اور وہی جب اسے بے بنیاد ٹھیرا رہے ہیں تو ہم اس کے متعلق اور کیا سمجھیں یا کیا مانیں، تاہم خیال بجائے خود بے بنیاد ہی کیوں نہ ہو[1]، لیکن اسی خیال کے زیر اثر

---

[1] لیکن اسی کتاب میں اسی سفر کے اختتام کا تذکرہ کرتے ہوئے مولوی عاشق الٰہی صاحب نے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حج و زیارت سے فارغ ہونے کے بعد حجاز سے واپسی کا ارادہ یہ لوگ کر ہی رہے تھے کہ اچانک یہ خبر مکہ معظمہ میں پہنچی کہ پلونا میں ترکی کو شکست ہوئی اور روس نے پلونا فتح کر لیا" یہ خبر ملنے کے ساتھ مجمع پر افسردگی طاری ہوگئی، اور واپسی کا جو ارادہ تھا، وہ ملتوی کر دیا گیا، بعد کو حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرماتے ہوئے کہ

"جو مقدر تھا ہوا، اور جو ہونا ہے ہو کر رہے گا"

ہندوستان واپس ہونے کا جب حکم دیا، تب یہ لوگ واپس ہوئے (دیکھو تذکرۃ الرشید ص ۲۴۱) غالباً اسی واقعہ کا ذکر کسی موقعہ پر میں کر بھی چکا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ پلونا کی شکست کے اس قصے کو جب اس پھیلے ہوئے خیال سے ہم ملاتے ہیں جس کا ذکر مولوی عاشق الٰہی نے کیا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس پھیلے ہوئے خیال کو کلیۃً بے بنیاد کیسے مان لیا جائے۔ واللہ اعلم بالصواب ۱۲

قافلہ میں شریک ہونیوالے ہندی مسلمانوں کے ایمان واخلاص کی یہ یادیں کی گئی ... ان کا جو سرا ... لانا
عاشق الٰہی کی اس روایت سے مل رہا ہے، وہ آج تک کے سلطانوں کے پیغام ... بصیرت ... حال
اور ظلم کے طوفانوں کا عرض وطول خواہ حقیقتاً زیادہ بڑھا ہوا نظر آ رہا ہو لیکن عمق یا گہرائی میں ان کا جو حال ہے
اس سے ہم میں شاید کوئی خود واقف ہو یا سوچے تو واقف ہو سکتا ہے، جو بولتے نہیں تھے، کرنے
کیلئے وہ کہاں تک جانے کیلئے بیچین اور مضطر تھے اور بولنے یا لکھنے کے سوا جن مسلمانوں کا شاید کوئی دوسرا
مشغلہ باقی نہیں رہا ہے، اپنے دلوں سے ان کو پوچھنا چاہئے کہ کرنے کیلئے کہاں تک جانیکی ہمت
کر سکتے ہیں، مگر کیا کیجئے کہ ان ہی گندی ہندی نسلوں پر آج الزام لگایا جا رہا ہے کہ ان کا اسلام صرف نماز
اور روزہ تک محدود تھا، پورے کا پورا جیسا کہ وہ ہے اس سے بیگانہ ہو چکے تھے۔[ل]

بہر حال سہارنپور کے اسٹیشن سے سوار ہونے والے حجاز کے مسافر اپنے اپنے ٹکٹ
لے کر گاڑی میں سوار ہو رہے تھے، ان ہی مسافروں میں ایک مسافر وہ بھی تھا، جو آخر تک
ان لوگوں کے ساتھ سفر میں ساتھ دینے کے لئے اسٹیشن پر حاضر ہوا تھا، لیکن جیب میں
اس کے پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، بمبئی تک کا ٹکٹ تو مولانا گنگوہی
رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے حسب وعدہ خرید لیا گیا تھا، آپ کو پتہ بھی نہ چلا کہ ٹکٹ کس نے
لیا اور کتنے میں لیا، تذکرۃ الرشید میں مولانا عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت گنگوہی ...

---

ل اس سلسلہ میں سیدنا الامام الکبیر کے ان قصائد کا مطالعہ مفید ہوگا، جو سلطان عبدالحمید خان مرحوم کی شان میں بزبان عربی و فارسی ...
منظوم ہوئے تھے، آپ کے ان قصائد کے ساتھ شیخ الہند مولانا محمود حسن ... مولانا ذوالفقار علی اور مولانا فخر الحسن ... اور
مولانا محمد یعقوب صاحب یعنی ہمارے مصنف امام کے قصائد بھی جو عربی زبان ہی میں لکھے گئے تھے، ان کا مجموعہ ... ہو کر
شائع ہو چکا ہے۔ سیدنا الامام الکبیر کے اشعار میں چند اشعار عربی قصیدہ میں یہ فرماتے ہوئے کہ

لولا مھالك فی مھالك دونكم — من دونها اخری وھن كذلكم
ومواتع وعلائق وعوائق — عاقت منی عرض المنی بحیالكم

ارشاد ہوا ہے کہ

لرئتنا وتخورنا كسیوفكم — من دون تحرك عصبة لاتالكم

یہ قصیدہ اس زمانہ میں لکھا گیا تھا، جب غازی عبدالکریم پاشا نے ... کا میدان جیتا تھا، ایسی صورت میں پلونا والی
لڑائی میں شرکت کا ولولہ ان حضرات کے قلوب میں موج زن ہوا ہو، تو اسے مستبعد نہیں قرار دیا جا سکتا ۱۲

"اپنے مجمع کو ساتھ لے کر بارھویں شوال (۱۲۹۴ھ) کو سہارن پور کے اسٹیشن پر ریل پر سوار ہوئے" ص ۲۲۷

اس مجمع میں مولانا گنگوہی ہی کے خریدے ہوئے ٹکٹ کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر بھی تھے۔ اسی کے بعد جو کچھ دیکھا گیا، خاکسار نے براہ راست مولانا حبیب الرحمٰن صاحب (سابق مہتمم دارالعلوم) رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی جو کچھ سنا ہے، اور آج تک بحمد اللہ وہ محفوظ ہے، صرف اتنی بات صحیح طور پر یاد نہ رہی کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے خود اس تماشے کو دیکھا تھا، یا دیکھنے والوں سے سنا تھا،

سیدنا الامام الکبیر ریل پر جس وقت سوار ہوئے، اس وقت آپ کے پاس کچھ نہ تھا، لیکن جوں ہی کہ سہارنپور سے گاڑی آگے بڑھی، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب فرماتے تھے، کہ کچھ نہیں معلوم کہ کس نے یہ خبر پھیلا دی کہ فلاں گاڑی سے مولانا نانوتوی، سفر حج کے لئے جا رہے ہیں، نتیجہ یہ تھا کہ جس قابل ذکر اسٹیشن پر بھی گاڑی ٹھیرتی تھی، خلق اللہ کا ایک ہجوم اس پر نظر آتا تھا، لوگ مولانا کو ڈھونڈتے ہوئے اس ڈبے تک پہنچتے تھے جس میں آپ جلوہ فرما تھے۔ ملاقات و مصافحہ کے بعد ملنے والے عام ہدایا اور تحف کے ساتھ ساتھ اپنی اپنی استطاعت اور ہمت کے مطابق حضرت والا کی خدمت میں رقمیں بھی پیش کرتے چلے جا رہے ہیں۔ کہتے تھے کہ پھلوں اور مٹھائیوں کا ڈھیر تھا، جو جمع ہو گیا تھا۔ غازی آباد پہنچ کر گاڑی بدلنی پڑی، وہاں سے الہ آباد جانے والی گاڑی پر لوگ سوار ہوئے، راستہ میں پھر وہ تماشا پیش نظر تھا۔ اسٹیشنوں پر لوگ آ رہے ہیں، اور کچھ پیش کر کرکے جا رہے ہیں۔ تا اینکہ گاڑی اٹاوہ کے اسٹیشن پر پہنچی۔ رفقاء سفر میں جیسا کہ بیان کر چکا ہوں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے صدر اول مولانا محمد مظہر نانوتوی بھی اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ تھے۔ ان کی بیوی صاحبہ کے بھائی اٹاوہ میں بسلسلہ ملازمت مقیم تھے، ان کا اصرار ہوا کہ ایک شب کی دعوت سارے قافلہ کی میری طرف سے منظور کی جائے،

مولانا محمد منظہر کی شخصیت کی وجہ سے لوگوں کو اتر جانا پڑا۔ اٹاوہ کے ایک رئیس نواب ممتاز علی خاں بزرگوں کے اس مجمع کو اپنے شہر میں پاکر مُصر ہوئے کہ ان کی خاطر سے دو دن قافلہ کی مہمان داری کی سعادت وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، نواب صاحب کی یہ درخواست کچھ ایسے اخلاص اور الحاح کے ساتھ پیش ہوئی کہ وہ بھی مسترد نہ ہو سکی۔ اٹاوہ سے پھر یہ مجمع ریل پر سوار ہوا، اور بقول مولنا عاشق الٰہی

"جس اسٹیشن پر گاڑی ٹھیرتی، زیارت کے شوق میں بھرا ہوا اھلِ اسلام کا مجمع استقبال کرتا ہوا نظر آتا، اور جس کے نصیب میں یہ معیتِ مبارکہ مقدر ہو چکی تھی، وہ اجازت لے لے کر ساتھ ہوتا جاتا تھا" ص ۲۳۳

گاڑی الہ آباد پہنچی۔ الہ آباد سے جبل پور جانے والی گاڑی پر بمبئی جانے والوں کو سوار ہونا پڑتا تھا، مگر اس زمانہ میں ریلوے کا یہ عجیب دستور تھا، جس کے راوی مولنا عاشق الٰہی ہیں، یعنی الہ آباد سے جبل پور دو گاڑیاں روانہ ہوتی تھیں، جن میں ایک تو ڈاک گاڑی تھی، وہ تو حسب دستور سیدھے بمبئی چلی جاتی تھی، لیکن دوسری گاڑی (پسینجر) کے متعلق اس زمانہ

---

ؔلہ مولوی عاشق الٰہی صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اٹاوہ میں مولوی منظہر صاحب کی وجہ سے قافلہ کا اترنا خط و کتابت کے ذریعہ سے پہلے سے طے شدہ تھا۔ اسی لئے مولنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بجائے بمبئی کے اپنے اور اپنے رفقاء کا ٹکٹ اٹاوہ ہی تک کا لیا تھا۔ مگر بعض لوگ جو اٹاوہ کی منزل سے ناواقف تھے، بمبئی تک کا ٹکٹ ان کے پاس تھا۔ اسی لئے اٹاوہ میں جب قافلہ اترنے لگا تو ٹکٹ کی مجبوری کی وجہ سے ان لوگوں نے معذرت چاہی جن کے پاس بمبئی تک کا ٹکٹ تھا، نواب ممتاز علی صاحب جو خود پلیٹ فارم پر استقبال کے لئے آئے ہوئے تھے، ان کو جب یہ معلوم ہوا تو سب کو اتار لیا، اور ٹکٹ کے متعلق کہا کہ آپ لوگ بے فکر رہیں، میں سب کچھ کر لوں گا۔ یہی کیا گیا جب لوگ اٹاوہ سے چلنے لگے تو بمبئی تک ٹکٹ والوں کو جدید ٹکٹ کی ضرورت نہ ہوئی، طویل سفر میں سفر کو مسافر منقطع کر سکتا ہے، یعنی بریک جرنی کے قانون کا یہ نتیجہ تھا، یا نواب صاحب نے اٹاوہ سے بمبئی تک کیلئے نیا انتظام کیا، مولوی عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ اس کا پتہ نہ چل سکا، اگر دوسری صورت پیش آئی تو نواب صاحب کی فراخ چشمی کی یہ دلیل ہے ۱۲

میں جیساکہ وہی لکھتے ہیں یہ قاعدہ تھاکہ

"دن بھر چلتی تھی، اور جس اسٹیشن پر رات ہو جاتی تھی، وہیں شب گذارتی تھی" ص۲۳۱

قدرتاً دوسری گاڑی میں وقت زیادہ صرف ہوتا تھا، لیکن کرایہ اس کا کم تھا، اور ڈاک گاڑی کا کرایہ زیادہ تھا۔ الہ آباد پہنچنے کے بعد رائے اور مشورہ سے یہی طے ہوا کہ ڈاک گاڑی ہی میں سفر کیا جائے، قافلہ میں آدمی کافی تھے، مولوی عاشق الٰہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ حاجیوں کے لئے اسپیشل ٹرین کا بندوبست کرلیا گیا اور کرایہ

"سارے قافلہ پر منقسم کر دیا گیا"

حساب سے ان ہی کے بیان کے مطابق الہ آباد سے

"بمبئی تک کا کرایہ فی کس پچیس روپیہ پڑا"

اس انتظام کی وجہ سے اور سہولتیں جو پہنچیں، ان کے سوا سب سے بڑا اثر انگیز نظارہ راستہ کے ان اسٹیشنوں پر پیش ہوتا تھا، جہاں نماز کا وقت آجاتا تھا، مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ وضو وغیرہ کا انتظام تو لوگ پہلے ہی کر لیتے تھے، اور

"اکثر نماز باجماعت ریلوے اسٹیشن پر اتر کر ایسی جگہ ادا کی جاتی تھی جہاں ریل کا قیام باطمینان فراغت نماز تک مقرر ہو" ص۲۳۲

لیکن جہاں اتر کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا موقعہ نہ ملتا، تو مولوی صاحب نے لکھا ہے، کہ ریل ہی پر نماز پڑھ لی جاتی۔ خواہ ٹھیری ہوئی ہو یا چل رہی ہو، لیکن ہر حال میں جو نماز بھی ادا کی جاتی تھی وہ

"جماعت کے ساتھ"

ادا ہوتی تھی، مگر اسی کے ساتھ اس کی بھی اجازت تھی کہ جو

"کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکتے وہ بیٹھ کر پڑھتے تھے"[1]

[1] بظاہر اس سے شخصی اعذار مراد ہیں ورنہ محض ریل کی حرکت سقوطِ قیام کے لئے عذر شرعی نہیں ہے۔ محمد طیب غفرلہٗ

اسی طرح

"جن کو پانی نہ مل سکا تھا، وہ تیمم کرتے اور نماز میں شریک ہو جاتے"

عموماً امامت حضرت گنگوہی ہی فرماتے، مصنف امام ربانی مولانا محمد ایوب صاحب کے سپرد تھی، مولوی عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ مولانا سخاوت علی نامی کوئی بزرگ امام بنائے گئے، نماز ریل سے اتر کر ادا کی جا رہی تھی، مولوی سخاوت علی صاحب نے قرأۃ میں کچھ طوالت سے کام لیا۔ سلام سے جب فارغ ہوئے تو دیکھا گیا کہ حضرت مولانا گنگوہی ان سے فرما رہے ہیں کہ

"کہیں ایسی نماز ایسے سفر میں پڑھی جاتی ہے" ص۲۳۳

الغرض حاجیوں کی یہ اسپیشل ٹرین ایک [illegible] کے ساتھ [illegible] کی تعلیم بھی لوگوں کو مسلسل مل رہی تھی۔ اور ظاہر ہے ساتھ ساتھ ان بزرگوں کے باطنی کمالات کی تجلیوں سے نگاہیں خیرہ ہو رہی تھیں، مولوی عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ

"راستہ میں بہتیری کرامتیں ان حضرات سے صادر ہوئیں" ص۲۳۳

لیکن باوجود جاننے کے افسوس ہے، مولانا نے اختصار کی راہ اختیار کی، صرف ایک واقعہ کا تذکرہ کیا ہے، جسے ہم بھی درج کر دیتے ہیں، اسٹیشن کا نام تو نہیں لکھا ہے، بہرحال جبل پور بمبئی لائن کے درمیانی اسٹیشنوں میں سے کوئی اسٹیشن تھا، جہاں گاڑی طلوع آفتاب سے پہلے ٹھیک نماز صبح کے وقت پہنچ کر رکی تھی، یہ خیال کر کے کہ گاڑی ابھی ٹھیرے گی، صبح کی نماز گاڑی سے اتر کر لوگ پڑھنے لگے، امامت حضرت مولانا گنگوہی فرما رہے تھے۔ نماز ہو رہی تھی کہ گاڑی نے سیٹی دے دی، بیچارے عام نمازیوں میں سیٹی کی وجہ سے کافی خلفشار برپا ہو گیا، جن کے دل کمزور اور اختلاج کے مریض تھے، ان سے نہ رہا گیا، اور نیت توڑ گاڑی میں یہ کہتے ہوئے جا بیٹھے کہ

"خوب نماز پڑھی، بڑی خوب نماز پڑھی!"

لیکن خود حضرت گنگوہی اور آپ کے ساتھ نمازیوں کی کافی تعداد سیٹی کی آواز سے قطعاً
بے پرواہ ہو کر نماز ہی میں مشغول رہے حضرت گیلانی کہتے ہیں کہ مجھ سے مولانا حبیب الرحمن جو ان نمازیوں
میں شریک تھے، [illegible] کہتے تھے کہ

"ادھر نماز ہو رہی تھی، اور ادھر گاڑی سیٹی دے رہی تھی، مگر ایک قدم آگے کو
سرک نہیں سکتی تھی"

وہی یہ بھی کہتے تھے کہ

"۷ منٹ کا وقفہ ہوا"

یعنی مقررہ وقت گاڑی کا جو تھا، اس پر ستر منٹ گذر گئے، انجن آگے نہیں بڑھ رہا
تھا، آخر باطمینان تمام سلام پھیر کر جب سارے نمازی گاڑی میں سوار ہو گئے، تب چیخنے والا
انجن بھی متحرک ہو گیا۔

خدا ہی جانتا ہے، کہ اس سلسلہ میں دیکھنے والوں نے اور کیا دیکھا، ان کو کیا کیا دکھایا گیا،
البتہ سیدنا الامام الکبیر کی حد تک یہ کہہ سکتا ہوں، کہ حاجیوں کی یہی "اسپیشل ٹرین" جب
بمبئی پہنچی، تو اسٹیشنوں پر پہنچ پہنچ کر پیش کرنے والے حضرت والا کی خدمت میں جو کچھ
پیش کر رہے تھے جن صاحب کے پاس یہ رقمیں جمع ہو رہی تھیں، انہوں نے حساب
کر کے حضرت والا کو اس کی میزان سے جب آگاہ کیا۔ تو مولانا حبیب الرحمن صاحب کی
زبانی فقیر نے سنا ہے، کہ میزان سے مطلع ہونے کے بعد آپ نے حکم دیا کہ فلاں فلاں
صاحب کو تار دے دیا جائے کہ حج کا ارادہ ہو تو میرے پاس بمبئی پہنچ جائیں۔ تعداد تو مولانا
حبیب الرحمن صاحب مرحوم نے نہیں بتائی تھی، لیکن کافی لوگ تھے، جن کے نام تار روانہ
کئے گئے، ایک غیر مترقبہ نعمت تھی۔ لوگ تار پانے کے ساتھ ہی چل پڑنے پر آمادہ ہو گئے
اور آگے پیچھے بمبئی پہنچتے چلے گئے۔ ان ہی بلائے ہوئے حضرات میں [illegible] ایک قصہ

بھی پیش آیا، جس کا ذکر مولوی عاشق الٰہی صاحب نے تذکرۃ الرشید میں بھی کیا ہے۔

مطلب یہ ہے، عرض کر چکا ہوں کہ سہارنپور ہی کے اسٹیشن سے حجاج کا یہ قافلہ ۱۲ ارشوال کو روانہ ہوا تھا، گذر چکا کہ دو تین دن اٹاوہ میں بھی صرف ہوئے، کم از کم تین دن اور بھی بمبئی تک پہنچنے میں خرچ ہوئے ہوں گے۔ گویا سمجھنا چاہئیے کہ شوال کے دو عشرے بمبئی پہنچتے پہنچتے ختم ہو چکے تھے، اور گو اس زمانہ میں دخانی جہازوں سے سمندر کا راستہ طے ہونے لگا تھا، بادبانی جہازوں کے حساب سے نسبتاً جدہ لوگ بہت کم وقت میں پہنچ جاتے تھے، لیکن پھر بھی دخانی جہازوں کے رواج کا ابتدائی زمانہ تھا۔ ریل ہی میں آپ دیکھ چکے کہ پسنجر ٹرین اس زمانہ میں صرف دن کو چلتی تھی، اور شب گذاری کے لئے رات بھر کسی اسٹیشن پر ٹھیر جاتی تھی، کچھ یہی حال دخانی جہازوں کا بھی تھا، اور وہ بھی غریب حاجیوں کا جہاز، جس کے ساتھ طرح طرح کے شاخسانے لگے ہوئے تھے، کہیں قرنطینہ ...... کی مصیبت تھی، کہیں کچھ تھا، کہیں کچھ تھا۔ رفتار میں بھی اتنی سرعت پیدا نہیں ہوئی تھی۔

بہرحال بمبئی تک تو حاجیوں کا قافلہ پہنچ گیا، عام خیال یہی تھا کہ تین چار دن میں جہاز مل جائے گا، لیکن سنئے مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ

"بمبئی پہنچ کر قافلہ کو بائیس دن تک ٹھیرنا پڑا"

جس کے معنی یہی ہوئے، کہ شوال کا مہینہ ہی نہیں بلکہ ذیقعدہ کا بھی ایک عشرہ بمبئی ہی میں

---

لہ قرنطینہ کی مصیبت کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ فقیر جس زمانہ میں حج و زیارت کے شرف سے مشرف ہوا، اس سال جزیرہ کامران میں صرف ایک دن کے لئے حاجیوں کو اتارا گیا، اور دوسرے دن ہم لوگ جہاز پر سوار ہو گئے، لیکن اسی کتاب تذکرۃ الرشید میں مولوی عاشق الٰہی صاحب نے حضرت گنگوہی کے تیسرے حج کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"دس دن تک قرنطینہ میں حاجیوں کو ٹھیرنا پڑتا تھا۔ جہازوں کی رفتار کا حال یہ تھا کہ عدن تک سات دن میں جہاز پہنچا تھا" صفحہ ج ۱

گذر رہا تھا، اس زمانہ کے بحری سفر کی نزاکتوں کا اندازہ کرتے ہوئے، سوچئے کہ قافلہ والوں پر کیا گذر رہی ہوگی، بقول مولوی عاشق الٰہی صاحب قافلہ والوں کو

"جہاز کا انتظار تھا، مگر اگبوٹ تھا کہ آنے کا نام نہ لیتا تھا، لوگ گھبراتے اور تنگ آئے جاتے تھے" ص۲۳۵

جن لوگوں نے چند دن پہلے دیکھا کہ سیٹی دینے کے بعد بھی ڈاک گاڑی "روک لی گئی" اور تقریباً آدھ گھنٹہ تک صرف چیختی ہی رہی تھی، ان ہی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بمبئی پہنچنے کے بعد آخر یہ رکاوٹ کیوں پیدا ہو رہی ہے۔ آخر وہی خدا اس اگبوٹ کو کیوں نہیں بھیج رہا ہے، جس نے چلنے والے انجن کو روک لیا تھا، صبر کا پیمانہ جب قافلہ والوں کا لبریز ہو گیا، تب اور کسی کو تو جرأت نہ ہوئی، لیکن ہمارے مصنف امام جو سیدنا الامام الکبیر کے محرم راز ہونے کے ساتھ ساتھ بہر حال استاد زادے بھی تھے، ان سے نہ رہا گیا، اور اگبوٹ کی تاخیر کا جو راز تھا اس کا افشاء انہوں نے کر ہی دیا۔ قافلہ کی پریشانی کو دیکھ کر جیسا کہ مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے،

"ایک دن مولنا محمد یعقوب صاحب (قافلہ والوں سے) فرمانے لگے کہ آج معلوم ہوا ہے کہ سارے قافلہ کو مولنا محمد قاسم صاحب روک رہے ہیں"

کیوں روک رہے ہیں؟ تار دے کر جو بلائے گئے تھے، ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ

"ان کے (یعنی مولنا محمد قاسم صاحب کے) چند رفقاء و متوسلین ضلع مظفر نگر سے آنے والے ہیں، جب تک وہ نہ آجائیں گے، اس وقت تک نہ جہاز آوے نہ جاوے" ص۲۳۵

اور یہی دیکھا بھی گیا، مولوی عاشق الٰہی کا بیان ہے کہ

"چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ مظفر نگر کا قافلہ جب [illegible] بمبئی پہنچا، [illegible]
ایک جرمنی جہاز کا حاجی قاسم مظفر نگر [illegible] ہی لوٹ
کھول دیا" [illegible]

واللہ اعلم بالصواب۔ مظفر نگر کے قافلہ کے نام [illegible] آدمیوں پر مشتمل تھا۔ لیکن "قافلہ" کے نام [illegible] کافی تعداد ہوگی، یہ بھی صحیح طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ اس قافلہ میں [illegible] تھے یوتار پر بلائے گئے تھے "یا ان کے ساتھ اور بھی کچھ لوگ شریک ہو گئے تھے۔ [illegible] ارواح طیبہ میں میر شاہ خاں مرحوم کے حوالے سے یہ روایت بھی درج کی گئی ہے کہ حج کی اسی سفر کے موقعہ پر مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں "ایک گروہ" حاضر ہوا، اور اپنی یہ آرزو پیش کی

"ہم بھی آپ کے ہمراہ حج کو چلیں گے"

لیکن زاد راہ کے متعلق جب اس "گروہ" سے دریافت کیا گیا، تو جواب میں انہوں نے کہا کہ

"ایسے ہی توکل پر چلیں گے"

یہ سن کر مولانا گنگوہی نے برافروختہ ہو کر ان لوگوں سے کہا کہ

"جب ہم جہاز کا ٹکٹ لیں گے، تو تم منیجر کے سامنے توکل کی پوٹلی رکھ دینا"

گویا وہی بات جو کتابوں میں ملتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے بھی "توکل" کا نام لے کر کچھ لوگ حج کرنے پر آمادہ ہوئے تھے، کہتے تھے کہ نحن متوکلون (ہم لوگ توکل کرنے والے ہیں) حضرت عمرؓ نے ان کی زبانوں سے یہ سن کر فرمایا تھا کہ بل انتم متاکلون (بلکہ تم لوگ کھانے والے ہو) گویا یہی

کھانے پینے ہی کا ایک ڈھنگ ہے[۱] امیر شاہ خاں کہتے تھے کہ حضرت گنگوہی نے ایک صاحب سے یہ بھی فرمایا تھا کہ

"بڑے آئے توکل کرنے، جاؤ، اپنا کام کرو۔"

بظاہر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تار بھی بھیجنے کے بعد یہ صورت پیش آئی تھی، کیونکہ اسی روایت میں ہے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے مایوس ہونے کے بعد یہی گروہ مسلمانوں کا سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اپنی دیرینہ تمنا حج کرنے کی ظاہر کی۔ تار دے کر جو بلائے جا چکے تھے وہ تو آئے ہوئے تھے، اب مسلمانوں کا یہ نیا گروہ آپ کے سامنے آگیا۔ اگر مصارف کی بجائی کی کوئی صورت نہ ہوتی تو ظاہر ہے کہ جو جواب ان لوگوں کو حضرت گنگوہی رح کی طرف سے ملا تھا، یہاں بھی اس کے سوا اور کیا جواب ملتا لیکن دینے والوں نے اسٹیشنوں پر پہنچ پہنچ کر جو رقم حضرت والا کے پاس جمع کر دی تھی کہ تار پر بلائے ہوئے لوگوں کے سوا ان لوگوں کے لئے بھی آپ کو محسوس ہوا کہ اس میں گنجائش پیدا ہو سکتی ہے۔ گنجائش کے اسی احساس کا نتیجہ جیسا کہ خان صاحب کی اسی روایت میں ہے یہ ہوا کہ

"آپ نے (یعنی سیدنا الامام الکبیر نے) اجازت دے دی۔" ص ۲۲۲ ارواح

اور میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ خاں صاحب کی اسی روایت کے آخر میں یہ خبر بھی دی گئی ہے، کہ راستہ کی آمدنی

---

[۱] خود قرآن ہی میں حج کا ذکر کرتے ہوئے تزودوا (زاد راہ اپنے لئے مہیا کر لیا کرو) کا حکم دیا گیا ہے، ارباب تفسیر نے متعدد روایتیں اسی قرآنی حکم کے ذیل میں درج کی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یمن میں خصوصیت کے ساتھ یہ رواج تھا کہ بلا زاد راہ کے لوگ حج کرنے کے لئے نکل پڑتے، اور کہتے کہ ہم لوگ توکل والے لوگ ہیں، حالانکہ در اصل بھیک مانگنے کا ذریعہ اپنے حج کو بناتے تھے جہاں تک یاد پڑتا ہے۔ بخاری کی شرح عینی میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فقرہ بل انتم متاکلون نقل کیا گیا ہے۔ ۱۲

"ان لوگوں کو (یعنی غیر مستطیع لوگوں کو) دے دیتے تھے"

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا سمجھا جائے کہ ان لوگوں کے مصارف کی ذمہ داری بھی سیدنا الامام الکبیر نے اپنے ذمہ لے لی تھی، صحیح طور پر اگرچہ نہ اسی کا پتہ چلتا ہے کہ آمدنی جو ہوئی تھی، اس کی مقدار کیا تھی، اور نہ ان لوگوں کی واقعی تعداد بتائی جا سکتی ہے جن کے مصارف سفر حضرت والا کی طرف سے ادا کئے گئے۔ لیکن آگے اسی روایت میں میر شاہ خاں مرحوم کی اطلاع کے الفاظ یعنی سیدنا الامام الکبیر سے

"ساتھیوں نے کہا کہ حضرت آپ تو سب ہی دے دیتے ہیں کچھ تو اپنے پاس رکھئے"

تو جواب میں برجستہ مشہور حدیث نبوی

| انما انا قاسم و اللہ یعطی | میں تو سوائے اس کے کہ بانٹنے والا ہوں اور کچھ نہیں ہوں، دے تو رہا ہے اللہ |
|---|---|

کے الفاظ زبان مبارک پر جاری ہوئے یہ عجیب و غریب حدیث آج بھی دار العلوم دیوبند کی تاریخی یادگاروں، اور نمایاں کاغذات میں بطور "طغرائے امتیاز" یا مونوگرام استعمال ہوتی ہے، اور نبوت ہی کے دوسرے انکشاف یعنی الاسماء تنزل من السماء (یعنی لوگوں کے نام جو رکھے جاتے ہیں، وہ بھی آسمان ہی سے نازل ہوتے ہیں۔) سے اسکی تصدیق ہوتی ہے۔

خیر یہ قصہ تو ایک مستقل قصہ ہے مسلسل عرض کرتا چلا آرہا ہوں کہ مٹنے پر جو تل جاتا ہے اس کو کس کس رنگ میں بقا بخشی جاتی ہے، اور کہاں کہاں سے کتنا حصہ دیا جاتا ہے، پس سرفرازیوں کی اسی مد میں اس کو بھی شمار کرنا چاہئے اس وقت تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر نے ان لوگوں کو جو اجازت دی تھی، وہ سوچ سمجھ کر دی تھی، آپ کے پاس جو کچھ جمع کرایا گیا تھا، وہ بانٹنے ہی کے لئے جمع کیا گیا تھا۔

اس میں گنجائش جب پائی جاتی تھی، تو ان بے چاروں کو رہ کنے کی وجہ ہی کیا ہوسکتی تھی، آپ گھر سے لے کر کیا چلے تھے، جو گھرلانے کی (العیاذ باللہ) آپ کو فکر ہوتی۔

پس جن لوگوں میں بانٹنے کے لئے دیا گیا تھا، ان ہی میں جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں، سب کچھ آپ بانٹتے چلے گئے، بلکہ سچ پوچھئے تو آپ کے ذریعہ سے "توکّل صادق[1]" یعنی

| | |
|---|---|
| ومن یتوکّل علی اللہ فھو حسبہ | اور جو اللہ پر بھروسہ کرلیتا ہے پس اللہ اس کے لئے کافی ہے۔ |

کے قرآنی دعوے کا تجربی مشاہدہ دیکھنے والوں کو، اور دیکھنے والوں سے سننے والوں کو جو ہوا، اور ہوتا رہے گا، اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے، گھر سے جو کچھ لے کر نہیں چلا تھا، کیا عجیب تماشا ہے کہ بمبئی پہنچنے تک اسی کے پاس اتنا کچھ جمع ہوگیا، کہ خود ہی نہیں بلکہ اپنے ساتھ کتنوں کو حج وزیارت کی سعادت سے شرف اندوز ہونے کا موقعہ اس کی وجہ سے مل گیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں جہاز کا کرایہ موجودہ زمانہ کے حساب سے بہت کم تھا۔ مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے، کہ

"چھتری کا محصول، ۱۰ للعہ، اور تتق کا کرایہ ۵۰ عہ تھا" ص ۲۳۵

اونٹوں کے کرایہ کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے، کہ جدہ سے مکہ معظمہ دو منزل کی راہ کا کرایہ مولوی صاحب کے بیان کے مطابق،

"شبری کے اونٹ کا کرایہ ۴ للعہ تھا اور شغدف کا ۵ ؁"

خورد ونوش وغیرہ کی ارزانی کا تخمینہ بھی اسی سے کر لیجئے۔ تاہم تار پر جو بلائے گئے، اور مظفر نگر

---

[1] اپنی حاجات و ضروریات میں حق سبحانہ وتعالیٰ ہی کو وکیل اور کارساز بنالینا، دراصل یہ ایک قلبی کیفیت ہے، اور اسی کا نام "توکل صادق" ہے جس کی بنیاد ایمانی قوت کے رسوخ اور پختگی پر قائم ہے باقی زبان سے توکل کا لفظ کمزور ایمان والے استعمال کرتے ہیں۔ ۱۲

کے قافلہ کے نام سے بمبئی پہنچے، یا جو "گروہ" زاد سفر کے بغیر حج کے لئے آمادہ ہوا تھا، چاہئے تو یہی کہ ان کی تعداد کافی ہو، یہی نہیں بلکہ مولانا حکیم منصور علی خاں صاحب حیدر آبادی نے اپنی کتاب "مذہب منصور" میں جو یہ اطلاع دی ہے کہ

"مولانا صاحب (یعنی سیدنا الامام الکبیر) کے ہمراہ علیگڈھ سے بیت اللہ گیا تھا" ۱۹۰ء

قطعی طور پر تو نہیں کہہ سکتا، لیکن حکیم صاحب قبلہ نے اسی کتاب میں جستہ جستہ اپنے جن حالات کا ذکر کیا ہے ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے بظاہر خیال یہی ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں وہ علیگڈھ سے بہ نیت حج سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ ہوئے، اس وقت ان کی معاشی حالت اتنے طویل سفر کے مصارف کی شاید متحمل نہیں ہو سکتی تھی، سیدنا الامام الکبیر چونکہ ان پر بہت مہربان تھے، کچھ تعجب نہیں کہ حضرت ہی کے اشارے سے ہمرکابی پر وہ آمادہ ہوئے ہوں۔ ایسی صورت میں سمجھنا چاہئے، کہ علیگڈھ کے اسٹیشن تک اتنی رقم جمع ہو چکی تھی، کہ حکیم صاحب قبلہ بھی حضرت والا کے ساتھ سفر کر سکتے تھے، اور کون جانتا ہے، کہ جیسے علیگڈھ سے حکیم صاحب ساتھ لے لئے گئے تھے، دوسرے اسٹیشنوں پر بھی ایسی صورت پیش نہ آئی ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ بمبئی پہنچنے کے بعد جو تار پر بلائے گئے، اور بلا زاد والے جس "گروہ" کو اجازت دی گئی، یا حکیم صاحب قبلہ کی طرح راستہ کے اسٹیشنوں سے جو حضرت والا کے ساتھ ہوئے، وہ تین چار آدمی تو قطعاً نہ ہوں گے، ان سب کو لئے ہوئے وہی جس کی جیب میں گھر سے رخصت ہوتے ہوئے پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی، جہاز میں بھی سوار ہو رہا ہے، اونٹوں پر بھی سب کو سوار کرا رہا ہے، اور بحر و بر کی طویل مسافت، اور اس کے مصارف کو خود برداشت کئے ہوئے ہے۔

ومن یتق اللہ یجعل لہ | اور جو اللہ سے ڈرتا ہے، اللہ اس کے لئے

| مخرجاً ویرزقہ من حیث لا یحتسب | راہ نکال دیتا ہے، اور اسے ایسی طرح رزق پہنچاتا ہے کہ اس کا شان گمان بھی نہیں ہوتا۔ |
|---|---|

جیسی آیتوں کی حقیقی تفسیر درحقیقت اسی قسم کے واقعات اور مشاہدات ہیں۔

بہرحال بمبئی میں ۲۲ دن کے قیام کے بعد حاجی قاسم کے ٹھیکہ والے جہازی آگبوٹ میں حاجیوں کا یہ قافلہ سوار ہوگیا۔ یہ اتفاق بھی گویا حسن اتفاق ہے۔

بیان کرنے والوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ جہاز پر سوار ہونے والے اس قافلہ میں حالانکہ معقول تعداد ایسے لوگوں کی تھی، جن کے مصارف سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے ادا کئے گئے تھے۔ لیکن جہاز میں پہنچ جانے کے بعد آپ لوگوں میں کچھ اس طرح گھل مل گئے، کہ کسی قسم کے امتیاز کا خطرہ بھی دیکھنے والوں کے دلوں پر گذر نہیں سکتا تھا، کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ جہاز کے ان مسافروں کی بڑی تعداد حضرت والا کے طفیل میں سفر کر رہی ہے۔

کہنے والے ایک قصہ دوشالہ والے صاحب کا بیان کرتے ہیں، جن سے کسی شخص نے عاریتاً چند دنوں کے لئے کسی تقریب کی وجہ سے دوشالہ مانگ لیا تھا، کہتے ہیں کہ بات بات میں اپنے دوشالہ کا وہ ذکر کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ہر واقعہ جو دوشالہ دینے کے بعد پیش آتا، اس کی تاریخ کا حساب دوشالہ دینے کے دن ہی سے کرنے لگے۔ تنگ ظرفی کی جہاں ایسی مثالیں ملتی ہیں، وہیں آپ دیکھ رہے ہیں ظرف کی اس وسعت کو، سب کچھ دیا جا رہا ہے، لیکن اس طریقہ سے دیا جا رہا ہے کہ نہ لینے والوں ہی میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کی امداد سے جا رہے ہیں، اور نہ دوسروں ہی کو اس کے سمجھنے کا موقعہ دیا جاتا ہے

بہرحال حضرت والا کی یہ اخفاء اور لاامتیازی کی شان ہر ہر قدم پر نمایاں رہتی تھی، سیدنا الامام الکبیر باوجودیکہ خلق اللہ کی خدمت علمی افادہ کے ساتھ فرما رہے تھے لیکن

کیا مجال تھی کہ اس میں امتیاز کا کوئی پہلو نمایاں ہو جائے، جیسا کہ ان کے رفیق الدنیا والآخرت حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی انتظامی شان جا بجا نمایاں نظر آتی تھی، لوگوں کے مال و متاع کی حفاظت ہمراہیوں کی ایک ایک چیز پر نظر ہر ایک کی دیکھ بھال وغیرہ، بقول مولانا عاشق الٰہی صاحب مرحوم

"جہاز کے سارے سفر میں بھی (ان دونوں) حضرات کا فرق طبائع اپنا اپنا رنگ جدا جدا دکھلاتا رہا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اکثر اوقات مجمع میں گھرے رہتے، اور خلق اللہ کو کلمات طیبات سے مستفید فرماتے رہتے تھے۔ مگر حضرت امام ربانی (حضرت گنگوہی) حجاج کی خدمت و راحت رسانی اور تمام رفقاء کے مال و متاع کی محافظت اور انتظام و نگرانی میں مشغول رہتے تھے"۔ تذکرۃ الرشید ص ۲۳۶

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے رفیق الدنیا والآخرت حضرت گنگوہی رح نے حضرت والا کے فطری رجحان یعنی سب کچھ ہونے کے باوجود مجھے کچھ نہ سمجھا جائے، اس منشار کی تکمیل کا موقعہ بھی فراہم کر دیا۔ زیادہ سے زیادہ جیسا کہ لوگوں نے بیان کیا ہے، یہ دیکھ لیجئے اتفاقاً اہل علم کا ایک اچھا خاصہ مجمع اس قافلہ میں شریک ہو گیا ہے۔ "انما انا قاسم" کے فرض کو علاوہ مادی قالب کے معنوی شکل میں بھی حضرت والا ادا کرتے رہے

لیکن یہ بھی جو کچھ کیا جاتا تھا، اسی وقت تک اس کا سلسلہ جاری رہتا، جب تک کہ کسی امتیاز کا خطرہ سامنے نہ ہوتا، مگر جوں ہی کہ کسی قسم کی برتری یا امتیاز کا موقعہ آتا، سیدنا الامام الکبیر پیچھے ہٹ جاتے اور قافلہ کا سالار جسے مان لیا گیا تھا (یعنی حضرت گنگوہی رح) اسی کو آگے بڑھا دیا جاتا، یلملم جہاں سے ہندوستان کے حجاج احرام باندھتے ہیں، مولوی عاشق الٰہی نے اسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"یلملم کے قریب جس وقت جہاز پہنچا، اور کپتان نے اطلاع دی کہ "حاجیو! احرام باندھ لو" تو حضرت امام ربانی (مولنا گنگوہیؒ) نے وعظ بیان فرمایا، اور ارکان وضروریات حج سے لوگوں کو آگاہ کیا" ص۲۳۲

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر اپنے جن کلمات طیبات سے لوگوں کو مستفید فرماتے تھے، ان کی نوعیت باضابطہ وعظ اور تقریر کی نہ تھی، بلکہ لوگوں میں ملی جلی بطور عام گفتگو اور بات چیت کے جو کچھ فرمانا ہوتا، فرماتے۔ اور ہمارے مصنف امام مولنا محمد یعقوب صاحب جب تشریف لے آتے، تو علاوہ علمی نکات کے مولوی عاشق الہی نے لکھا ہے، کہ کچھ تصوّف کے رنگ کی باتیں بھی ہوتیں، ان کے الفاظ یہ ہیں کہ

"حضرت مولنا محمد یعقوب، اور مولنا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہما میں کشوف کونیہ کے اکثر ذکر و تذکرے ہوتے، مکاشفات بیان کئے جاتے، خوابیں ظاہر کی جاتیں۔ غلبۂ ظن پر رائے زنی ہوتی، اور درویشانہ صوفیانہ چھیڑ چھاڑ برابر قائم رہتی تھی" ص۲۳۳

زیادہ تر یہ رجحان مولنا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ پر غالب تھا، جس کا اندازہ ان کے حالات سے ہوتا ہے، ارواح طیبہ میں میر شاہ خاں صاحب کے حوالہ سے یہ قصہ ان ہی کے متعلق بیان کیا گیا ہے، کہ خود ہی فرماتے تھے، رات اللہ میاں سے کچھ عرض معروض کر رہا تھا، لیکن شنوائی نہ ہوتی تھی۔ اصرار جب میری طرف سے زیادہ بڑھا، تو مجھے جھڑک دیا گیا، اور ارشاد ہوا کہ "بس چپ رہو، بکو مت" پھر میں نے توبہ استغفار کیا، اور معافی ہوگئی، لکھا ہے، کہ اس قصہ کو سیدنا الامام الکبیر کے سامنے ایک صاحب دہرانے لگے، تو آپ اٹھ بیٹھے اور فرمانے لگے،

"اخو مولوی یعقوب نے ایسا کہا، توبہ توبہ توبہ، بھائی یہ انہیں کا کام تھا"

نماز کے دوران ... ایسی گستاخی کرتے تو ہماری گردن نپے

حاشیہ ص۲۳۵ ارواح

بہرحال کچھ ادھر ادھر سے ... مشغولوں پر دریا کا یہ بحری سفر پورا ہو رہا تھا۔

سب سے زیادہ ولولہ انگیز نظارہ جیسا کہ مولوی عاشق الہٰی نے لکھا ہے نماز کے وقت پیش ہوتا، یعنی جس وقت

"جہاز میں بڑی لمبی صف بندی ہو کر پانچوں نمازیں جماعت سے ادا ہوا کرتی تھیں"

تو ان ہی کا بیان ہے کہ اور تو اور جہاز کا فرنگی نژاد کپتان

"اس پیاری عبادت کو سکون و سلیس انداز کے ساتھ ادا ہوتے دیکھتا تو خوش ہوتا، اور مسلمانوں کی اس عبادت پر تعریف کیا کرتا تھا" ص۲۳۶

گویا پانچوں وقت جماعت کی یہ شاندار، پُرشوکت نماز جہاز کے غیر مسلم عناصر کے لئے اسلامی دعوت کا ایک خاموش قالب تھا۔ کپتان اس درجہ ان لوگوں سے متاثر تھا، کہ اسی کی خواہش سے جب ایک سرٹیفکٹ حج کرنے والے مسافروں کی طرف سے دیا گیا، تو لکھا ہے کہ

"کپتان نے اس کو چوما، اور آنکھوں سے لگایا، پھر سر پر رکھ لیا اور کہا کہ "یہ میرے لئے سند ہے"" ص۲۳۶

راستہ بھر بجائے کسی قسم کی تحقیر کے دیکھا جاتا تھا کہ آتے جاتے ہوئے راستہ کپتان کو نہ ملتا، تو لجاجت سے کہتا

"حاجی بابا! ذرا سا راستہ دے دو، ہم نکل جائے" ص۲۳۵

ماشاءاللہ یہی دین اور مذہب ہے جس کے متعلق مشہور کر دیا گیا ہے، کہ جنگ و جدال

فتنہ و فساد کی وہی جڑ ہے، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں، اس جہاز میں مذہب ہی کس رنگ کو پیدا کر رہا ہے۔ پس سچ وہی ہے کہ خود مذہب یا دین پر تو یہ بہتان ہے۔ البتہ مذہب کے غلط استعمال نے کبھی کبھی اس کے برعکس نتیجہ کو بھی پیدا کیا ہے۔ لیکن ذمہ دار اس کا مذہب نہیں، بلکہ وہ لوگ ہیں، جو مذہب کے صحیح استعمال سے واقف نہیں ہیں، یا قصداً و عمداً اپنے پوشیدہ ذاتی اغراض کیلئے غریب مذہب کو استعمال کرتے رہے یا اس وقت تک کر رہے ہیں، مولوی عاشق الٰہی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان مسلمانوں کی صحیح دینی زندگی کو دیکھ کر

"کپتان بھی حج کو جانے والے مسافروں سے کچھ اس درجہ مانوس ہوا، کہ بلا محصول سویز کی سیر کرانے کی خود اپنی سواریوں ہی درخواست کی" ص ۲۳

لیکن شکریہ کے ساتھ اس کی درخواست پر عمل کرنے سے معذوری ظاہر کی گئی، بظاہر اس کی وجہ شاید یہی ہوگی کہ کپتان کو اس قسم کے تصرفات کا قانونی استحقاق نہ تھا۔

بہر حال حج کرنے والوں کا یہ قافلہ بقول مولنا عاشق الٰہی آٹھ دن میں عدن پہنچا، اور

"ایک دن رات وہاں ٹھیر کر جہاز روانہ ہوا، چوتھے دن جدہ کی بندرگاہ نظر آنے لگی"

اور ان ہی کی اطلاع کے مطابق

"سارا قافلہ نہایت آرام اور راحت کے ساتھ تیرھویں دن بمبئی سے چل کر جدہ آپہنچا"

بہر حال جدہ تک تو سیدنا الامام الکبیر اسی حال میں پہنچے، کہ دوسرے آپ کو لئے جا رہے ہیں، اور آپ ان کے ساتھ جا رہے ہیں، عرض کر چکا ہوں کہ لانے کے لئے ناسوتی طور پر

نہ سہی، لیکن ان دیکھی راہ سے مکہ معظمہ میں سیدنا الامام الکبیر کے دو قبلوں میں جو ایک قبلہ تھا، خود ہی پہنچ گیا تھا، مکہ مکرمہ میں بیٹھے بیٹھے یہ اطلاع مولوی افضال الحق کو دی گئی کہ

"مجھے اس وقت جہاز کا مستول نظر آیا"

لیکن جدہ پہنچ جانے کے بعد حالات ہی کچھ ایسے پیدا ہوئے، کہ سیدنا الامام الکبیر بھی اپنے اندرونی جذبات کو دبا نہ سکے۔

یوں تو عام طور پر حج کے مسافروں کے ساتھ یہ صورت پیش آتی ہے، کہ جدّہ میں وقت پر سواری کے نہ ملنے کی وجہ سے بلا ضرورت قیام پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ لیکن مولٰنا عاشق الٰہی صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال علاوہ عام اسباب کے سواریوں کی راہ میں بڑی رکاوٹ خاص وجہ سے بھی پیدا ہو گئی تھی، قصہ تو طویل ہے، حاصل یہ ہے کہ ہندوستان (شہر میرٹھ) کے ایک صاحب مولوی محمد احسن مرحوم نے مکہ معظمہ[1]

---

[1] مطوفی کے اس پیشہ کی ابتدا حج کے سلسلہ میں کب سے ہوئی، ایک دلچسپ تاریخی سوال ہے، یوں تو ایسے مقامات جہاں کسی وجہ سے نو وارد مسافروں کی آمد و رفت کا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے، وہاں راہ نمائی کے لئے کچھ لوگوں کا آمادہ ہو جانا ایک قدرتی ضرورت ہے، مکہ معظمہ جہاں ایشیا و افریقہ کے دور دراز مقامات سے ہر سال ہزارہا ہزار آدمی آتے جاتے رہتے ہیں، وہاں کوئی ایسا طبقہ جیسا کہ مطوفین کا ہے، محل تعجب نہیں ہو سکتا۔ لیکن پچھلی چند صدیوں سے مطوفیت کے اس پیشہ نے جو رنگ اختیار کیا ہے، اسے دیکھ دیکھ کر لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ خدا کے سب سے زیادہ مقدس و پاک گھر والے شہر میں یہ کیا ہو رہا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تیرتھ گاہوں میں پنڈوں کی طرف سے جو کچھ کیا جاتا ہے، اسی کا چربہ ان مطوفوں نے اتار لیا ہے، تعجب میں اضافہ اس لئے بھی ہوتا ہے، کہ اسلام تو اسلام مکہ والے جب جاہلیت میں لت پت تھے، اس زمانہ میں بھی باہر سے آنے والوں کی رفادت[2] (مہمان نوازی) وسقائت (پانی پلانے کا انتظام) اپنی طرف سے کرتے تھے۔ بجائے کچھ لینے کے جس سے جس حد تک ممکن تھا حج کے لئے آنے والوں کے ساتھ حسن سلوک ہی کے ساتھ پیش آتا تھا، واللہ اعلم بالصواب اسی قسم کے لوگ جس کی مثال بھی میرٹھ والے مولوی احسن ہیں، انہوں نے ہندوستان سے جا جا کر مطوفی کے اس پیشہ میں ہندوستانی پنڈوں کے رنگ کو بھرا۔ آخر آج کون بتا سکتا ہے کہ مطوفوں کا طبقہ آجکل جو مکہ معظمہ میں پایا جاتا ہے۔ یہ کہاں سے اس شہر میں آیا، اور عربوں میں کچھ اس طرح گھل مل گیا کہ بظاہر وہ اسی ملک کے قدیم باشندے نظر آتے ہیں۔۱۲ [2] دیکھو اگلے صفحہ پر۔

پہنچ کر کوشش کی، کہ مطوفی کا حق ان کو بھی دیا جائے، کوشش ان کی کامیاب ہوئی، مطوفی کی باضابطہ سند حکومت سے ان کو مل گئی، ان کی مطوفی کا یہ پہلا سال تھا، حضرت حاجی صاحب قبلہ سے اجازت لے کر مولوی احسن جدہ اس لئے پہنچ گئے، کہ اس ہندی قافلہ کی مطوفی کا فرض وہی انجام دیں گے، مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے، کہ مولوی احسن ہندی مطوف نے جدّہ کی،

"بندرگاہ پر سارے قافلہ کا استقبال کیا، اور خیر مقدم کہا"

مگر مولوی احسن مطوف کی یہ پیش قدمی اس ہندی قافلہ کے لئے مصیبت بن گئی، ان کے دوسرے ہم پیشہ مطوفین جو پہلے سے اس کاروبار کو انجام دے رہے تھے، ان پر یہ بات شاق گذری، کہ حاجیوں کی اتنی بڑی تعداد اس شخص کو مل گئی، خصوصاً یہ دیکھ کر کہ اس ہندی قافلہ میں ہندوستان کے مستند علماء شریک ہیں، جن کی مطوفی مختلف وجوہ سے فائدہ مند ثابت ہو سکتی تھی، اس سے محرومی ان کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی، اور بقول مولانا عاشق الٰہی صاحب ان پیشہ ور مطوفوں نے

"وہ دراندازیاں کیں کہ تین دن تک مولوی محمد احسن صاحب کو کرایہ کے

---

بسلسلہ صفحہ ۴۲

۵ے رفادت و سقایت کی روایات کے ساتھ ساتھ زمانہ جاہلیت ہی میں اس قسم کی روایتیں بھی ملتی ہیں، جو ہندوستانی پنڈتوں کی طرف منسوب کر کے حضرت مصنف نے نقل کی ہیں۔ بناء ابراہیمی میں تغیر کر کے جب اہل جاہلیت نے کعبہ کو تعمیر کیا تو بجائے دو دروازوں کے صرف ایک ہی در رکھا، اور اسے قد آدم سے بھی اونچا رکھا، تاکہ کوئی بھی ان کی اجازت و اعانت کے بغیر داخل کعبہ نہ ہو سکے، اور اس سے کلید برداران کعبہ کچھ وصول کر سکیں، جیسا کہ احادیث میں اسکی خبر دی گئی ہے، اس سے واضح ہے کہ مکہ میں یہ مجاوری کی روایتیں فی زمانہ ہندوستان کے پنڈتوں سے نہیں پہنچیں، بلکہ زمانہ جاہلیت کا ورثہ ہے جو مکہ ہی میں شروع ہوا تھا، ایسے مقبول اور مرجع خلائق مقامات یا اشخاص کے ماحول میں ایسی باتوں کا پیدا ہو جانا جس سے اہل ہوٰی اپنی حرص و آز کی تسکین کا سامان بہم پہنچا سکیں امر طبعی ہے محض تقلیدی نہیں ہے۔ ہندوستان کی درگاہوں کا عامۃ بھی نقشہ ہے جو صاحب خانقاہ کے گذر جانے پر قدرتاً بے معرفت اخلاف میں پیدا ہو جاتا ہے۔ فخلف من بعدہم خلف اضاعوا الصلوٰۃ واتبعوا الشہوات فسوف یلقون غیّا - ۱۲

محمد طیب غفرلہ

اونٹ بھی نصیب نہ ہوسکے، پھر اس قافلہ کو سوار کیا گیا۔

گویا پرانے مطوفوں نے اونٹ والوں کو بہکا دیا، اور اس سید ہی قافلہ کو مکہ معظمہ پہنچانے پر اسی لئے کوئی راضی نہ ہوتا تھا۔ معاملہ کافی پیچیدہ تھا۔ مولوی احسن صاحب بیچارے راہ مطوفی کے نوگرفتاروں میں تھے۔ مقابلے میں پرانے پرانے گھاگ مطوفوں کا گروہ تھا، نہیں کہا جا سکتا تھا، کہ اونٹ والوں کی اس اٹک کا یہ قصہ آباد تاک دراز ہوگا، اور دن پر دن گذر رہی تھی، وہ تو خیر گذر رہی تھی، لیکن لے جانے والے جسے لے جا رہے تھے خود وہ بھی پہنچنے کے لئے درحقیقت کتنا بے چین تھا، مطوفیت کی اس کش مکش میں یہ راز درون سینہ باہر نکل پڑا۔ مولانا حکیم منصور علی خان حیدرآبادی عرض کر چکا ہوں کہ اس سفر میں سیدنا الامام الکبیر کے ہمرکاب تھے، اپنی کتاب مذہب منصور میں اس کا تذکرہ فرماتے ہوئے کہ

"جدہ میں پہنچ کر چند روز قیام کرنا پڑا، سواری نہیں ملی"

اسی سلسلہ میں اپنی چشم دید، گوش شنید شہادت، سیدنا الامام الکبیر کے متعلق یہ درج فرمائی ہے، کہ

"اس وقت (یعنی جب سواری نہیں مل رہی تھی۔ دن پر دن جدہ میں گذرتے جا رہے تھے) یہ شعر زبان فیض ترجمان پر جاری تھا

مانگا کریں گے ہم بھی دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ" مذہب منصور ۱۷۹

شاید "وعدہ وصل" کے قرب و نزدیکی نے 'دل کی چھپی دبی آگ کو تیز سے تیز تر کر دیا' اتنا بھڑکا دیا کہ کم از کم اپنے خاص حلقہ میں شعر ہی کے پردے میں سہی، جو کچھ آپ پر گذر رہی تھی، اسے ظاہر ہی کر دیا، مگر با ایں ہمہ اضطراب والتہاب، یہ سننے کی بات ہے، کہ سواری کے بندوبست میں جس قسم کی افراتفری پیشہ ور مطوفوں کی باہمی لاگ ڈانٹ کی وجہ سے پیدا

ہوگئی تھی، اسی کا نتیجہ جیسا کہ مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے، یہ ہوا، کہ کافی تگ و دو، کنج و کاؤ کے بعد مولوی احسن صاحب بھی اونٹوں کے بندوبست کرنے میں تین چار دن بعد کامیاب ہوئے، لیکن بہ یک وقت پھر بھی قافلہ کی روانگی ممکن نہ ہو سکی۔ مجبوراً دو ٹولیوں میں قافلہ منقسم ہو گیا، کچھ لوگ پہلے روانہ کر دیئے گئے، اور جو باقی رہے، وہ ان کے بعد جدہ سے نکلے، قافلہ کی اس تقسیم کی وجہ سے نشستہ و آمد منزل میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا۔ بقول مولوی عاشق الٰہی صاحب

"جو اونٹ اول وقت چل نکلے، انہوں نے بحرہ (نامی منزل) میں
اور باقی قافلہ نے حدّہ (نامی منزل) میں قیام کیا، اس طرح قافلہ کے
دو حصے ہو گئے"

معلوم ہوتا ہے، کہ قافلہ کی یہ دونوں ٹولیاں، اسی لئے مکہ معظمہ بھی ایک ساتھ نہ پہنچیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف مولوی عاشق الٰہی صاحب تو یہ اطلاع دیتے ہیں کہ

"اگلے دن شب کے وقت مکہ معظمہ پہنچے"

لیکن اسی کے مقابلہ میں سیدنا الامام الکبیر کے تلمیذ رشید، رفیق سعید، مولانا منصور علیخاں صاحب حیدر آبادی اپنے استاد کے متعلق خبر دیتے ہیں کہ

"قریب صبح صادق کے وہاں داخل ہوئے" [۱۷۹]

بظاہر دونوں روایتوں میں کچھ تضاد کی کیفیت نظر آتی ہے، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے، جدہ میں جب یہ طے ہی ہو گیا کہ ایک ساتھ قافلہ کا روانہ ہونا ممکن نہیں، تو جیسا کہ عام دستور ہے، لوگوں نے جدہ سے نکل جانے کی کوشش کی ہو گی۔ لیکن جس کی ساری زندگی اس دستور عام کے خلاف گذری تھی، وہ یہ کیسے کر سکتا تھا، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دوسروں کو نکل جانے کا موقعہ دیا گیا، اسی لئے پہلے جو روانہ ہوئے، وہ رات ہی کو مکہ معظمہ پہنچ گئے، اور بقیہ قافلہ جو بعد کو جدّہ سے نکلا، بجائے بحرہ کے حدّہ نامی منزل

ہیں پڑاؤ کرنے کے بعد صبح صادق کے قریب مکہ معظمہ پہنچا، اسی بقیہ قافلہ میں آپ شریک تھے۔ یہ عجب تقدیری کرشمہ ہے کہ واپسی کے وقت بھی مکہ معظمہ سے روانہ ہوکر اسی حدہ نامی منزل میں سیدنا الامام الکبیر کی اس علالت کی ابتدا ہوئی، جو آپ کی آخری علالت بالآخر ثابت ہوئی، اور جاتے ہوئے بھی بجائے بحرہ کے اتفاق ہی کچھ ایسا پیش آیا کہ حدّہ ہی میں آپ کو قیام کرنا پڑا تھا۔

بہرحال بقول مولانا عاشق الٰہی صاحب آگے پیچھے قریب قریب ۲۲ ذی قعدہ کو جدّہ سے ہندوستانیوں کا یہ قافلہ مکہ معظمہ جانے کے لئے روانہ ہو گیا، ان ہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ بجائے شغدف کے سیدنا الامام الکبیر خود اونٹ پر سوار ہوئے، اور ردیف اس سفر میں اپنے بھائی مولانا محمد منیر نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو بنائے ہوئے تھے۔ یعنی پیچھے کمر پکڑ کر ہی بیٹھے تھے، مولانا منصور علی خاں صاحب مرحوم بھی ساتھ ساتھ تھے، انہوں نے لکھا ہے،

"مکہ شریف جب قریب آیا غسل فرمایا"۔

شاید اس غسل کا ارادہ پہلے ہی سے کر لیا گیا تھا، اسی لئے علاوہ عام ضرورتوں کے غسل کے لئے بھی پانی ساتھ رکھ لیا ہوگا، ورنہ عرب کی سرزمین میں "غسل" کا مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے، کہ جہاں جی چاہا، نہانے بیٹھ گئے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے، کہ ۱۲۹۶ھ ہجری ذی قعدہ کا یہ مہینہ ٹھیک نومبر کے مہینے کے مطابق تھا، صبح صادق کا وقت، عرب کا صحرا، باسی پانی اور غسل کی ہمت، وہ بھی سفر کی حالت میں، یہ دلیل ہے کہ اس وقت تک سیدنا الامام الکبیر کی عام صحت جادۂ اعتدال سے منحرف نہیں ہوئی تھی۔

ادھر تو یہ تیاریاں ہو رہی تھیں، اب سنئے دوسری طرف کا حال، یوں تو جدّہ پہنچنے سے پہلے ہی جیسا کہ معلوم ہو چکا کسی نہ کسی رنگ میں اس جہاز تک آپ کے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ پہنچ ہی چکے تھے۔ جس پر لانے والے اپنے ساتھ سیدنا الامام الکبیر کو

لا رہے تھے، اور اب آئیے دیکھئے، مولٰنا منصور علی خاں حیدر آبادی راوی ہیں کہ جب قریب صبح صادق حدود مکہ معظمہ میں آپ داخل ہوئے تو

"جناب حضرت حاجی امداد اللہ صاحب بطور استقبال کے تشریف لائے" ص۱۷۹

جہاز جس وقت ساحل سے ابھی لگا بھی نہ تھا، سطح سمندر ہی پر تیر رہا تھا، اس وقت نادیدہ راہ سے استقبال کے لئے آنے والا کیسے آیا تھا، نہ دوسروں نے اس کو دیکھا تھا، اور نہ اس کی کیفیت وہ بیان کر سکتے تھے، لیکن اب وہی استقبال ناسوتی رنگ میں سب کے سامنے تھا، اس ناسوتی استقبال کا شوق و ذوق کہاں، کس شکل میں پورا ہوا تھا، مولٰنا عاشق الٰہی نے اس کی کچھ تفصیل بھی بیان کی ہے۔ ہم اسی سے اخذ کر کے حسب وعدہ ان تفصیلات کو درج کرتے ہیں۔

یہ یاد رکھنا چاہئے، کہ حضرت حاجی صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ یوں تو بقول مولٰنا تھانوی

"کچھ خلقۃً ضعیف، خفیف اللحم تھے" ص۴۹ کرامات امدادیہ

حساب سے عمر بھی حضرت والا کی اس زمانہ میں ساٹھ سال سے متجاوز ہو چکی تھی، اور بقول حضرت تھانوی

"اس پر مجاہدات و ریاضات و تقلیل طعام و منام"

کے ساتھ ساتھ ۵۷ء کے رست وخیز میں ہندوستان سے عرب تک پہنچنے میں ع

فیوماً بحزوی ویوماً بالعقیق

کے حالات سے آپ کا گذرنا، انتہائی سراسیمگی و بے نوائی کی حالت میں کسی نہ کسی طرح مکہ معظمہ تک گو رسائی تو ہو گئی، لیکن اپنی غیور طبیعت کی وجہ سے فاقوں پر فاقوں کی مسلسل مصیبتوں کے جھیلنے کی وجہ سے ضعف و اضمحلال کے جس درجہ تک پہنچ گئے تھے، اس کا اندازہ کچھ آپ

کے حالات ہوا کے پڑھتے ... ہوتا ہے مگر باایں ہمہ آنے والوں کے استقبال کا ولولہ آپ کی تمام جسمانی ناتوانیوں پر غالب آیا" ان ہی باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ

"باوجود ضعف و ناتوانی بہت ... کے سنت استقبال اور جوش محبت میں شہر مکہ معظمہ ... باہر ملنے کی خواہش پوری کئے بغیر نہ رہ سکے"

ص ۲۳۷ تذکرۃ الرشید

آپ کو اس کی خبر تو مل گئی تھی، کہ مولوی احسن مطوف جدید نے سواریوں کا بندوبست قافلہ کے لئے کر دیا ہے، اور قافلہ جدہ سے چل بھی پڑا ہے۔ لیکن صحیح طور پر اس کا اندازہ مشکل تھا کہ قافلہ ٹھیک کس وقت مکہ معظمہ پہنچے گا۔ احتیاطاً اسی لئے وقت سے بہت پہلے شہر سے نکل کر آپ اس جگہ پہنچ گئے، جہاں قافلے کے پہنچنے کی امید کی جاسکتی تھی، نہیں کہا جا سکتا کہ اس مقام پر آپ کس وقت پہنچ گئے تھے، مولوی عاشق الٰہی کے الفاظ ہیں کہ

"خدا جانے کس وقت سے منتظر کھڑے اور راستہ کی جانب آنے والے قافلہ کا انتظار فرما رہے تھے" ص ۲۳۷

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، قافلہ دو ٹولیوں میں تقسیم ہو گیا تھا، جن میں ایک ٹولی تو مکہ معظمہ پہلے پہنچ گئی تھی۔

"شب کا وقت تھا"

غالباً یہ الفاظ مولوی عاشق الٰہی صاحب نے پہلی ٹولی کے متعلق لکھے ہیں، اور صبح صادق کے وقت وہ ٹولی پہنچی جس میں سیدنا الامام الکبیر شریک تھے مطلب جس کا یہی ہوا کہ تقریباً ساری رات ہی حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی ذوق استقبال کے نذر فرما دی، پہلی ٹولی کے بعد دوسری ٹولی کے پہنچنے کا انتظار کرتے رہے۔

مولوی عاشق الٰہی کا بیان ہے کہ

"جس وقت قافلہ باب مکہ پر پہنچا، تو سب نے دیکھا کہ اعلیٰحضرت (حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ) پٹکے سے کمر باندھے ہوئے فصیل کے پاس کھڑے تھے"

جوں ہی کہ لوگوں کی نظریں حاجی صاحب پر پڑیں، یقیناً انہیں کے

"جاں نثار خدام" اسی وقت سواری سے نیچے اتر پڑے، اور بغل گیر ہو ہو کر خوب دل کھول کر ملے"

حیرت اس پر ہوتی ہے، کہ اس رتجگے اور شب بیداری کے بعد بھی حضرت حاجی صاحب میں اتنی قوت باقی تھی، جسے ایمانی قوت کے سوا ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں، کہ

"قافلہ کے ایک ایک متنفس سے اجنبی ہو یا واقف کار بغل گیر ہوئے"

مولوی عاشق الٰہی کا تخمینہ ہے، کہ اس موقعہ پر تقریباً ایک سو آدمیوں سے آپ کو بغل گیر ہونا پڑا، ہر ایک کی مزاج پرسی بھی مسکرا مسکرا کر فرماتے جاتے تھے، نئے ہندی مطوف مولوی احسن میرٹھی ان لوگوں کا تعارف کراتے جاتے تھے، جنہیں حضرت حاجی صاحب خود پہچان نہ سکے، لطف یہ تھا کہ ان ہی لوگوں میں جو حضرت حاجی صاحب سے بغل گیر ہو رہے تھے، بعض ایسے حضرات بھی تھے، جو بے چارے حاجی صاحب کی جسمانی ناتوانیوں کی پروا کئے بغیر دیر تک معانقہ کے سلسلہ کو دراز کرتے چلے جاتے تھے۔ لیکن آج حاجی صاحب پر جو رنگ تھا، قلبی مسرت کی کیفیت قالب کے ضعف پر غالب آگئی۔ مولوی عاشق الٰہی صاحب نے اسی قسم کے لوگوں کے متعلق لکھا ہے کہ

"جب تک وہی (یعنی بغل گیر ہونے والا) علٰحدہ نہ ہوگیا۔ اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب) نے اپنے سینۂ علم و معرفت گنجینہ سے علٰحدہ نہ کیا" ص ۳۳

صبح ہو ہی رہی تھی، نماز کے بعد باب مکہ سے قافلہ بلد اللہ الامین کی طرف روانہ ہوا، عام دستور کے مطابق خیال یہی تھا کہ ان نو وارد مسافروں کے قیام و طعام وغیرہ ضرورتوں کا نظم مطوف صاحب نے کیا ہوگا، لیکن قدرت اپنے ایک نئے کرشمہ کا تجربہ کرانا چاہتی تھی، یاد ہوگا، آج سے تقریباً بیس سال پہلے تھانہ بھون کی جہادی مہم میں جہاں اور سب کچھ دیکھا گیا تھا، اسی سلسلہ میں ایک جگر خراش دردناک منظر وہ بھی تھا، کہ امیر بیعت جہاد اور اس کے دو مخلص ترین خادم یعنی خود حضرت حاجی صاحب، حضرت مولٰنا گنگوہی اور سیدنا الامام الکبیر ایک دوسرے سے بچھڑے تھے، اور اس طور پر بچھڑے تھے، کہ پھانسی کے تختے اور تانت کے پھندوں کے سوا شاید ان کے سامنے اور کچھ نہ تھا، حضرت مولٰنا گنگوہی کی پھانسی پر جانے کی خبر جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، پھیل بھی چکی تھی۔ الغرض ایک تیرہ و تار مہیب مستقبل تھا، جو ہر ایک کی طرف بڑھتا چلا آرہا تھا۔ پھر جو کچھ گذرنے والا تھا، گذرتا رہا، تا اینکہ آج پھر ان ہی تینوں بچھڑنے والوں کو "باب مکہ" میں مکہ کے دروازہ پر بلانے والا بلاتا ہے، اور کس شان کے ساتھ بلاتا ہے، حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو اسی مکہ مکرمہ تک بے سرو سامانی کی حالت میں پہنچے تھے، ان کی طرف سے یہ اطلاع دی جاتی ہے، کہ آپ دونوں حضرات، اور آپ کے ساتھ جتنے ہیں، سب اس رُباط کہئے، یا مکان میں ٹھیرائے جائیں گے، جو مکہ معظمہ کے محلہ حارۃ الباب میں حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں کسی نیاز مند کی طرف سے پیش کیا گیا ہے[۱]۔ مولوی

[۱] کرامات و کمالات امدادیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں کافی دشواریوں سے حاجی صاحب کو مکہ معظمہ میں دوچار ہونا پڑا۔ لکھا ہے کہ فقر و فاقہ کی نوبت یہاں تک پہنچی، کہ نو روز تک بجز آب زمزم کے (باقی اگلے صفحہ پر)

عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے، کہ

"یہ مکان اسی سال ملا تھا، بلکہ ابھی تک آپ نے اس میں سکونت مستقل نہ فرمائی تھی۔"

یہ وہی مکان تھا، جس کے متعلق کرامات امدادیہ میں حضرت تھانوی رحمہ نے یہ روایت درج کی ہے، کہ

"ایک مخلص نے ایک مستقل مکان حارۃ الباب میں خرید کر کے حضرت ایشان (یعنی حاجی صاحب) کے نذر کیا تھا۔" ص ۳۲ کرامات امدادیہ

اور گو حارۃ الباب مکہ معظمہ کا ایک ایسا محلہ تھا، جس میں سب سے زیادہ تکلیف پانی کی تھی، کرامات امدادیہ ہی میں ہے کہ موسم حج ہی میں نہیں، عام زمانہ میں بھی

"انتہائی درجہ ایک روپیہ میں دو مشک آتی تھی۔"

(بسلسلۂ صفحۂ گذشتہ) کچھ نہ ملا۔ لیکن تقویٰ کی زندگی کے آثار جب اسی مکہ میں سامنے آنے لگے، تو دیکھا گیا کہ ایک ایک وقت میں پانچ پانچ ہزار تک کی رقم پیش کرنے والے پیش کر رہے ہیں، اور حاجی صاحب اہل استحقاق پران کو بکشادہ پیشانی تقسیم فرماتے جاتے ہیں۔ آخر میں تو ایک طرف حکومت ترکیہ سے تحریک ہوئی، کہ حاجی صاحب جن کا نسلی تعلق حضرت ابراہیم بن ادھم سے تھا، ان کے مزار مبارک کے اوقاف جو شام میں تھے، ان اوقاف کا متولی آپ کو بنا دیا جائے اس وقف کی خصوصیت یہ تھی، کہ متولی کو ہر قسم کے تصرفات کا اختیار اس کی آمدنی میں وقف کرنے والے کی طرف سے دیا گیا تھا، حکومت کی طرف سے یہ بھی ظاہر کر دیا گیا تھا کہ وقف کے انتظام کے لئے حاجی صاحب کو شام جانے کی ضرورت نہ ہوگی، ان کا نائب وہاں سب کچھ کرے گا لیکن آپ نے شکریہ کے ساتھ ترکی حکومت کی اس پیش کش کو یہ فرماتے ہوئے نامنظور کیا کہ حضرت سلطان ابراہیم نے تو سلطنت کو لات ماری تھی، پھر میں ان کی صالح اولاد کیسے رہوں گا، اگر دنیا کے ان بکھیڑوں کو اختیار کروں، دوسری طرف حکومت حیدرآباد نے بھی لکھا کہ مکہ معظمہ میں دو سرکاری رباطوں میں سے ایک رباط کی کنجی حاجی صاحب کے حوالہ کر دی جائے۔ لیکن اس عنایت سے بھی مستفید ہونے کا موقعہ آپ کو نہ ملا، یہ اور اسی قسم کے واقعات کا ذخیرہ کرامات امدادیہ و کمالاتِ امدادیہ میں جمع کر دیا گیا ہے جو پڑھنے کے قابل ہے۔ ۱۲

مگر جوں ہی کہ یہ مکان اس محلہ میں حاجی صاحب کے سپرد ہوا، نہر زبیدہ کی ترمیم جدید کا سوال اٹھا، ترمیم ہوئی، اس نئی ترمیم کی بدولت پانی کا راستہ کچھ اس طریقہ سے بنا کہ یہ مکان جہاں پر واقع تھا، اس کے

"کوچہ میں اور (مکان خاص کے) دروازہ پر چشمہ کا پانی جاری ہوگیا۔"

وسعت کا اس کے اندازہ اسی سے کیجئے، یہ سارا قافلہ (بجز چند لوگوں کے) بقول مولانا عاشق الٰہی صاحب

"اعلیٰ حضرت (حاجی امداد اللہ رح) کی اسی رباط میں مقیم رہا۔" ص۲۳۵

اللہ اللہ جن کے سامنے پھانسی کے تختہ کے سوا اور کچھ نہ رہا تھا، آپ دیکھ رہے ہیں، اللہ کے گھر میں آج وہی تینوں کس طریقہ سے داخل ہو رہے ہیں۔

ان کو اپنے گھروں میں بھی واپس ہونے کی آج سے بیس سال پہلے امید نہ تھی، لیکن جہاں ان کا گھر نہ تھا، وہیں ان کو گھر دلایا جاتا ہے، راحت و آرام کے ساز و سامان سے جو لیس ہے، اور وہی حاجی صاحب جو اسی مکہ میں جب داخل ہوئے تھے، تو خود ان کے کھانے کا بھی کوئی نظم نہ تھا، آج اپنے ان ہی دو جاں نثار عزیزوں یا روحانی فرزندوں سے فرما رہے ہیں کہ

"میری خوشی اسی میں ہے کہ سب احباب میرے یہاں کھانا کھاویں۔"

تذکرۃ الرشید ص۲۳ ج ۱۔

حضرت گنگوہی رح فرماتے بھی ہیں کہ

"آدمی بہت ہیں۔"

لیکن اس کی کوئی پروا نہ کی گئی، باب مکہ سے جب حارۃ الباب کے اس رباط عظیم میں لوگ پہنچے تو کھانا تیار تھا، اس وقت کا کھانا سارے قافلہ والوں کو حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کی طرف سے کھلایا گیا، اسی مکان کے متعلق مولانا حکیم منصور علی خان

یہ بتاتے ہوئے کہ "دو منزلہ تھا" اور یہ کہ اتنا

"وسیع تھا کہ سب ہمراہی اس میں جابجا ٹھیر گئے"

اور مکان کا وہ خاص حصہ جو مکہ اور مدینہ کے مکانوں میں گویا شہ نشیں ہونے کی حیثیت رکھتا ہے، یعنی صدر دروازہ کے بالاخانہ کی جو عمارت ہوتی ہے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکیم صاحب قبلہ نے لکھا ہے کہ

"دروازے کے اوپر کے مکان پر مولانا صاحب (یعنی سیدنا الامام الکبیرؒ) اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی نے قیام کیا" ص۱۶۹

گو حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رونق افروزی سے یہ جدید حاصل شدہ مکان مشرف نہیں ہوا تھا، لیکن رہن سہن میں حضرت حاجی صاحب قبلہ کا جو فطری مذاق تھا حضرت تھانویؒ نے جس کا ذکر کرتے ہوئے کمالات امدادیہ میں ارقام فرمایا ہے، کہ

"حضرت (حاجی صاحب) کے مزاج میں لطافت و نفاست نہایت درجہ تھی۔ اور بہت صاف اور ستھرے رہتے تھے" صفحہ ۳۰ کمالات امدادیہ

اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے خیال تو یہی گذرتا ہے کہ عربی تہذیب و سلیقہ کا نمونہ مہمان خانے کے یہ بالائی کمرے بنے ہوئے ہوں گے۔

بہرحال ذرا سوچئے تو سہی، کہ تھانہ بھون کی جہادی مہم میں باہم ایک دوسرے سے یہ تینوں بچھڑنے والے پہلی دفعہ مکہ معظمہ کے اس ایوان عالی میں جس وقت جمع ہوئے ہوں گے، ان کے قلوب کی کیا کیفیت ہوگی، کہا جائے تو کہا جا سکتا ہے، کہ

| | |
|---|---|
| للذین احسنوا فی ھذہ الدنیا حسنة وارض اللہ واسعة انما یوفی الصابرون اجرھم | جن لوگوں نے نیکی کی اس دنیا میں اُن کے لئے نیک بدلا ہے۔ اور خدا کی زمین وسیع ہے۔ صابروں کو پورا ہی بدلہ دیا جاوے گا' |

بغیر حساب (الزمر) | بغیر حساب کے

جیسی قرآنی آیتیں چلتی جاگتی شکلوں میں ان کے سامنے کھڑی ہوئی تھیں، اور ان کی مجاہدانہ مساعی کا پاکیزہ صلہ دنیا میں بھی ان کے سامنے تھا۔ جس کی طرف آیۃ کریمہ اشارہ کر رہی ہے۔ بلکہ ہم جب سوچتے ہیں کہ یہی حج سیدنا الامام الکبیر کا آخری وداعی حج تھا۔ اور ٹھیک اسی سال مکہ معظمہ کا یہ ایوان عالی حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کیا گیا، اسی مختصر زمانہ میں مکہ جیسے شہر میں نہر زبیدہ کھینچ کر اس مکان کے دروازے پر اس طریقہ سے پہنچا دی گئی، کہ حارۃ الباب کا وہی محلہ جہاں بقول حضرت تھانوی رح

"آب شیریں حکم چشمۂ آب حیات رکھتا تھا" ص۳۲ کرامات امدادیہ

وہیں کے گلی کوچوں میں نہر کا پانی دوڑتا پھرتا تھا، اور اسی مکان کے دروازے پر نہر کا ایک چشمہ ابل رہا تھا، کون کہہ سکتا ہے کہ یہ سب کس کیلئے تھا، اور کسے اپنے احسانی اعمال کے نتائج کا تجربہ کرانا مقصود تھا۔ بغیر حساب و شمار کے جس صبر کا اجر سامنے آنے والا تھا، کیا اسی کی ہلکی سی جھلک تھی جو بلد اللہ الحرام میں دکھائی جا رہی تھی۔

مکہ معظمہ کے اس مکان میں اتر جانے کے بعد نشاط و انبساط کی جن کیفیتوں سے ان بزرگوں کے منور قلوب معمور تھے، اس کا اندازہ حکیم منصور علی خاں حیدر آبادی کی اس روایت سے بھی ہوتا ہے

انہوں نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہ دروازے کے اوپر کے بالاخانہ پر ٹھہرا دینے کے بعد حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ دستور تھا، کہ اپنے دونوں عزیز مہمانوں سے ملنے کے لئے کبھی کبھی خود اوپر تشریف لے جایا کرتے، جوں ہی حاجی صاحب پر دونوں کی نظر پڑتی،

"کھڑے ہو کر تعظیم دیا کرتے تھے، اور نہایت مؤدب دوزانو ہو کر ان کے روبرو بیٹھ جاتے"

لکھا ہے، کہ اسی سلسلہ میں ایک دن ایک دل چسپ لطیفہ پیش آیا، کمرے میں سیدنا الامام الکبیر اس وقت موجود نہ تھے، صرف حضرت مولٰنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تشریف فرما تھے، اور حکیم صاحب ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں ڈھول بجنے کی آواز مکان کے نیچے سے آنے لگی، اور اسی کے ساتھ آہٹ محسوس ہوئی کہ سیڑھیوں سے اوپر کی طرف کوئی آرہا ہے، مولٰنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی نشست جہاں پر تھی، وہ ایسی جگہ تھی کہ سیڑھیوں سے آنے والے آدمی پر ان کی نظر نہیں پڑسکتی تھی، صرف آہٹ سن کر ان کو خیال گذرا کہ غالباً سیدنا الامام الکبیر مولٰنا محمد قاسم نیچے سے اوپر آرہے ہیں۔ خدا جانے اس وقت حضرت گنگوہی پر انبساط کی کیسی کیفیت طاری تھی، کہ اپنے مزاج اور افتادِ طبع کے برخلاف ڈھول کی آواز کے ساتھ حضرت نانوتوی کے آنے کی آہٹ کا خیال کر کے فرمانے لگے، کہ

"اپنے یاروں کو بھی ساتھ لائے"

گویا سیدنا الامام الکبیر کے صوفیانہ رجحان پر ایک تفریحی تعریض تھی۔ لیکن واقعہ یہ تھا کہ آنے والے صاحب جن کے آنے کی آہٹ محسوس ہوئی تھی، یہ سیدنا الامام الکبیر نہیں، بلکہ خود حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، اور نیچے ڈھول بجانے والے فقراء تھے، جو دف بجا بجا کر عرب کے دستور کے مطابق کچھ مانگ رہے تھے بہرحال جوں ہی کہ مولٰنا گنگوہی کی زبان مبارک سے یہ فقرہ یعنی "اپنے یاروں کو بھی ساتھ لائے" نکلا، کہ حاجی صاحب ان کی پشت پر کھڑے ہوئے جواب دے رہے تھے کہ "یہ سائل ہیں" یہ سننا تھا کہ مولٰنا گنگوہی گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے، اور

"حضرت حاجی صاحب کے روبرو مؤدب بیٹھ گئے"

بات آئی گئی ہوئی، حکیم صاحب نے اطلاع دی ہے، کہ

"میں نے یہ واقعہ مولٰنا مرحوم (سیدنا الامام الکبیر) سے عرض کیا"

یعنی آج آپ کی چشتیت پر مولٰنا گنگوہی نے یہ فقرہ چست فرمایا تھا، جو ظاہر ہے ایک تفریحی مذاق کے سوا اور کچھ نہ تھا لکھا ہے "کہ یہ سن کر سیدنا الامام الکبیر صرف "مسکرانے لگے" ص۱۸۰

اور کچھ نہ فرمایا۔

اور یہ تو خیر ایک لطیفہ تھا، حکیم صاحب ہی نے اسی سلسلہ میں یہ جو ارقام فرمایا ہے، کہ

"دونوں صاحبوں میں کبھی کبھی خوش طبعی اور مذاق ہوا کرتا تھا" ص۱۸۰

اس سے تو بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ملہ مکرمہ کے قیام کا یہ زمانہ کافی مسرتوں اور اور سرمستیوں میں گذر رہا تھا، سیدنا الامام الکبیر پر تو تعجب نہیں ہوتا کہ طیبت و ظرافت آپ کی فطرت کا ایک نمایاں پہلو تھا، جس کی تفصیل گذر بھی چکی ہے، لیکن تعجب تو حضرت گنگوہی پر ہوتا ہے جو جبلۃً جبلِ وقار کوہِ سکینت تھے، زندگی کے تمام شعبوں میں ان کا یہی حال تھا، ہمارے مصنف امام ان کی اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کبھی کبھی فرماتے، کہ

"میاں حضرت مولٰنا رشید احمد کی عالی ظرفی کا کیا ٹھکانا ہے، سب کچھ پیئے بیٹھے ہیں، مگر کیا ممکن کہ ذرہ برابر ظاہر ہو جائے"

(تذکرۃ الرشید ص۲۳۳ ج ۱)

مولوی عاشق الٰہی نے اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے، کہ "ہر وقت مغموم و محزون نظر آتے تھے" ان ہی کا بیان ہے، کہ اتفاقاً "مجلس مبارک میں طیبت و مزاح کی کوئی گفتگو چھڑ بھی جاتی" اور

"جن باتوں پر سننے والوں کے پیٹ میں بل پڑتے، درد ہونے لگتا"

تو اس وقت بھی ان ہی کا بیان ہے کہ

"آپ پر ہلکی سی مسکراہٹ سے زیادہ، اور وہ بھی کبھی کبھی مطلق اثر نمایاں نہ ہوتا۔" ص۲ ج۲ تذکرۃ الرشید

لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ مکہ معظمہ کے قیام سے ان دنوں میں حضرت گنگوہی ہی کی طرف سے خوش طبعیوں کی ابتدا بھی ہوتی ہے، مذاق اور مزاح کی باتیں بھی ہو رہی ہیں، اور مولوی عاشق الٰہی مرحوم کی یہ روایت، یعنی اپنے حج کے اس سفر میں حج و زیارت سے فارغ ہونے کے بعد "حارۃ الباب" کے اسی رباط میں مدینہ منورہ سے واپسی کے بعد جب یہ دونوں حضرات آکر مقیم ہوئے، رفقاء سفر واپسی وطن کے لئے بیقرار تھے، لیکن لکھا ہے کہ حضرت گنگوہی فرمادیا کرتے کہ

"جس کو عجلت ہو، وہ چلا جائے۔" ص۲۴

حالانکہ ہندوستان سے ہجرت کا خیال آپ کے دل میں شاید کبھی پیدا نہیں ہوا، گذر چکا کہ بہ نیت ہجرت مولٰنا رفیع الدین صاحب سابق مہتمم دارالعلوم نے مدینہ منورہ ہی میں اقامت گزین ہوجانے کا ارادہ جب فرمایا، تو ان ہی حضرات کے اصرار سے ان کو اپنا ارادہ بدلنا پڑا، اور ہندوستان واپس ہوئے لیکن باوجود اس کے آپ دیکھ رہے ہیں، کہ اپنے اس سفر میں جس قسم کی زندگی ان بزرگوں کو میسر آئی تھی، چاہتے تھے، کہ دراز ہی ہوتی چلی جائے۔

ہندوستان میں یہ تینوں بزرگ یعنی پیر و مرشد حضرت حاجی صاحب اور ان کے دونوں عزیز خلفا، جس حال میں ایک دوسرے سے الگ ہوئے تھے، کیا جانتے تھے کہ پھر اسی زندگی میں اور وہ بھی اس راحت و آرام کے ساتھ تینوں کو خدا کے عزیز ترین اور محبوب ترین شہر بلد اللہ الامین میں اس طریقہ سے جمع ہونے کا موقعہ ملے گا، مولانا حکیم منصور علی خاں صاحب نے لکھا ہے، کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ عموماً تشریف

لاتے، اور تصوف کے عام مسائل کے سوا مسئلہ

"وحدت الوجود پر تقریر فرماتے"

اکثریت اس قافلہ میں مولویوں ہی کی تھی، ان کے سامنے اور وحدت الوجود جیسے مُوحِش مسئلہ پر تقریر ایک خاص رنگ پیدا کرتی، حکیم صاحب کا بیان ہے، کہ

"جناب مولوی محمد مظہر صاحب (نانوتوی صدر مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور) اس تقریر پر شبہات پیش کرتے، ان کا جواب بھی حاجی صاحب نہایت متانت اور آسان طریق پر ادا کرتے"

لیکن تقریر کا واقعی روئے سخن جن کی طرف تھا، یعنے مسئلہ وحدت الوجود کی ان تقریروں کے متعلق ان کا حال کیا تھا، حکیم صاحب نے لکھا ہے، کہ

"مولنا مرحوم (سیدنا الامام الکبیر) کبھی کوئی شبہ بھی بیان نہ کرتے، اسی طرح مولنا رشید احمد صاحب بھی خاموش بیٹھے سنا کرتے، اور کچھ چون وچرا نہ کرتے" ص۱۸۰

کچھ بھی ہو، ان ہی تینوں پر تقریباً بیس سال پہلے جو وقت گذرا تھا، اپنے وطن (ہندوستان) میں گویا بے وطن بنائے گئے، لیکن ان ہی کو بیس سال بعد غریب الوطنی کی زندگی میں آج جس حال میں دیکھا جا رہا ہے، اور جس مقام میں دیکھا جا رہا ہے، یعنی مکہ مکرمہ کے اسی تاریخی سرزمین پر ایک اور واقعہ گذرا تھا، جن کے یہ تینوں غلام تھے، ان ہی غلاموں کے آقا اور پیشوا پر مکہ کی یہی زمین تنگ کی گئی تھی، اس وقت بھی دیکھا گیا تھا کہ بیس سال گذرنے کے بعد یہی تنگ زمین آقا کے لئے کشادہ کی گئی، اور کیسی کشادگی؟ کہ جو رقبہ مکہ کے حدود میں تھا، وہ تو خیر مکہ ہی کے حدود میں تھا، لیکن زمین کے کرے کا وہ سارا علاقہ جو مکہ کے حدود سے باہر تھا وہ بھی اسی کے حدود میں داخل ہو گیا، اور آج تک داخل ہے۔ رہتی دنیا تک انشاء اللہ تعالیٰ داخل رہے گا۔ القریٰ اور روئے زمین کی آبادیاں

اپنی ام کہئے، یاماں کی گود میں جو ڈال دی گئی تھیں، وہ اسی کی آغوش میں قیامت تک پڑی رہیں گی، اب کوئی ان کو اپنی ماں سے جدا نہیں کرسکتا[1]۔

خیر اس وقت جو کچھ ہوا، اس سے تو دنیا واقف ہے۔ لیکن اپنی "اصل" کا "ظل" اور "ہلکا عکس" اپنے آقا کے ان تین غلاموں میں کوئی دیکھنا چاہے، تو دیکھ سکتا ہے، تنگی کے بعد ان کے آگے بھی فراخی لائی گئی، اور کیسی فراخی! حاجی صاحب جس وقت مکہ معظمہ پہنچے تھے تنہا پہنچے تھے۔ مگر حارۃ الباب کی اسی رباط سے اپنے ان عزیز روحانی فرزندوں کو آستانہ نبوت کبریٰ کی زیارت کے لئے رخصت کر رہے تھے، تو اس وقت مکہ ہی نہیں، بلکہ مکہ کے باہر رہنے والے وحشی بدو اور بدوؤں کے بعض سر برآوردہ شیوخ تک آپ کی حلقہ بگوشی اختیار کرچکے تھے، جن میں ایک مشہور شیخ نفاع نامی بھی تھے، کرامات امدادیہ میں حضرت تھانوی رح نے نقل کیا ہے کہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نفاع کا ذکر کرکے فرمایا کرتے تھے کہ

"اس کو (نفاع بدوؤں کے شیخ کو) مجھ سے عقیدت و محبت تھی"۔

---

[1] اس مسئلہ کی طرف استقبال قبلہ کے مسئلہ کے سلسلہ میں بھی کچھ اشارہ کیا جاچکا ہے، کعبہ کو قبلہ قرار دے کر سارے روئے زمین کو اس کا صحن بنادیا گیا ہے، جس کی طرف مشہور حدیث جعلت لی الارض مسجدا (ساری زمین میرے لئے مسجد بنادی گئی)، اسی میں اشارہ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ سورہ بقرہ (پارہ سیقول) کے ابتدائی رکوع میں مسلمانوں کو مشرق و مغرب کے درمیان کی مرکزی امت وسط قرار دیتے ہوئے ان کے قبلہ کو مرکزی قبلہ، ان کے نبی کو مرکزی نبی، ان کی کتاب کو مرکزی کتاب ٹھیراتے ہوئے، مختلف پیرایوں میں چند بار ادھر ادھر اکر جو اس حکم کا اعادہ کیا گیا ہے، کہ شطر المسجد الحرام کی طرف اپنا رخ کرو، اور جہاں مسلمان مقیم ہوں فرمایا گیا ہے کہ وہیں سے اپنے رخ کو نمازوں میں اسی مرکزی مسجد کی طرف کرلیا کریں، سب کا حاصل وہی ہے کہ جو کچھ مکہ کے حدود میں پہلے تھا، وہ تو تھا ہی لیکن اب ان علاقوں کو بھی جو مکہ کے باہر سمجھے جاتے تھے اسی قبلہ کے حدود میں سب کو داخل کردیا گیا ہے، اسی کا اعلان قرآن میں کیا گیا، اور اسی اعلان کے مطابق مسلمان مشرق و مغرب کے آخری گوشوں میں پھیلتے چلے گئے جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے، اور آئندہ بھی انشاء اللہ تا بقیام قیامت جاری رہے گا۔ ۱۲

بعض تجربات اس کو ہوئے تھے، جن کی وجہ سے حالت اسی نفاع کی یہ ہو گئی تھی، حاجی صاحب ہی فرماتے تھے، کہ ان کی

"کبھی دست بوسی کرتا کبھی پابوسی" ص۱۳۴

اسی کا نتیجہ جیسا کہ ہونا چاہئے تھا، یہ تھا، یہ بھی حاجی صاحب ہی کا بیان ہے، کہ

"جب مدینہ منورہ کو قافلہ جاتا تھا، اول میرے احباب کو لیتا تھا، بعد کو وہ دوسرے مسافروں کا متلاشی ہوتا تھا" ص۱۳۴ کرامات امدادیہ

ظاہر ہے، کہ احباب ہی نہیں بلکہ "ایشان بجائے من و من بجائے ایشان" کے خطاب سے سرفراز ہونے والے حاجی صاحب کے روحانی فرزندوں کی مدینہ منورہ کی طرف روانگی کا مسئلہ جب پیش آیا ہوگا، تو جو سہولتیں میسر آئی ہوں گی، ان کو آنا ہی چاہئے تھا، گویا سمجھنا چاہئے، کہ مکہ سے مدینہ تک اپنی ہی سواریوں پر یہ حضرات روانہ ہوئے ہوں گے، مولانا عاشق الٰہی مرحوم نے لکھا ہے کہ

"بعد حج سلطانی راستہ سے مدینۃ الرسول روانہ ہوئے" ص۲۳۹

اسی سلطانی راستہ پر مدینہ منورہ کے پاس وہ مقام آتا ہے، جہاں سے "قبۂ خضرا کی دید کے تمنائیوں کی، آرزو کی تکمیل کا آغاز شروع ہو جاتا ہے، عام طور پر جبل مضرج کے نام سے موسوم ہے، مولانا حکیم منصور علی خان صاحب حیدرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے، کہ

"جب منزل بمنزل، مدینہ شریف کے قریب ہمارا قافلہ پہنچا، جہاں سے روضہ پاک، جناب لولاک نظر آتا تھا"

---

سلہ بدوؤں ہی کے کسی دوسرے شیخ سے نفاع کی جنگ ہوئی تھی، جس میں بندوق کی گولی اس کی ٹانگ میں پیوست ہو گئی تھی، جو کسی طرح باہر نہیں ہوتی تھی، خواب میں حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس نے دیکھا کہ اس کے پاؤں کو دبا رہے ہیں، اور گولی کو باہر نکال کر پھینک دیا۔ صبح کو گولی خود بخود باہر نکل گئی ۱۲

تو پھر کیا ہوا، گردنیں جھک جاتی ہیں، لوگ ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں،

واعظم ما یکون الشوق یوماً

اذا دنت الخیام من الخیام

یہ تو خیر اسی مقام تک پہنچنے والوں کے عام آثار ہیں۔ حکیم صاحب کا بیان ہے کہ

"فوراً جناب مولانا مرحوم نے اپنے نعلین اتار کر بغل میں دبالیں، اور پا برہنہ چلنا شروع کیا۔"

شاید ان کی کتاب کے اس فقرے کو کسی دوسرے موقعہ پر بھی نقل کر چکا ہوں، اسی سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس مقام پر پہنچنے سے پہلے سیدنا الامام الکبیر اونٹ سے اتر کر نعلیں پہنے ہوئے پیادہ پا ہی چل رہے تھے، لیکن "قبۂ خضرا" کے روبرو ہو جانے کے بعد کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ نعلین کے ساتھ آگے بڑھنے کا یارا نہ رہا، اور ننگے پاؤں چلنے لگے، یاد ہوگا، کہ راستہ اول سے آخر تک پتھر کے نوکیلے ٹکڑوں سے بھرا ہوا تھا، حکیم صاحب بے چارے جنہوں نے اپنے استاذ کی تقلید میں اپنے پاؤں کی جوتیاں اتار لی تھیں چند ہی قدموں کے بعد خود لکھا ہے، کہ چلنے سے اپنے آپ کو معذور پانے لگے دوبارہ پہن لینے پر ان کو مجبور ہونا پڑا، لیکن بقول ان ہی کے "جو از فرق تا بقدم نہایت نازک و نرم اندام تھے" ان ہی کو دیکھتے رہے، جیسا کہ خود ہی ارقام فرماتے ہیں کہ

"مولانا مرحوم مدینہ منورہ تک کئی میل آخر شب تاریک میں اسی طرح چل کر پا برہنہ پہنچ گئے" صـ ۱۸۱

حکیم صاحب قبلہ کے اس بیان کو اور اسی کے متعلق دوسری تفصیلات جن کا اپنی کتاب "مذہب منصور" میں انہوں نے تذکرہ کیا ہے، پڑھئے، جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر کی وارفتگیوں کی تفصیل کے سلسلہ میں حکیم صاحب کی ان چشم دید شہادتوں کو چونکہ نقل کر چکا ہوں، اس لئے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں، مولوی عاشق الٰہی کے

بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ رات ہو جانے کی وجہ سے مدینۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دروازہ کھل نہ سکا۔

"اس لئے قافلہ کو مناخہ (اونٹوں کے اترنے کی جگہ بیرون شہر جو ہے، اسی) میں ٹھیرنا پڑا۔" ص۲۳۹

صبح ہونے کے ساتھ ہی شہر کا دروازہ کھول دیا گیا، حسب روایت مولٰنا عاشق الٰہی

"علی الصباح حضرت امام ربانی (مولٰنا گنگوہی رح) مع دیگر حضرات صلوٰۃ صبح ادا کرنے کے لئے قافلہ سے باہر نکلے، اور مسجد نبوی کی جانب روانہ ہوئے۔ نماز سے فارغ ہو کر روضۂ اطہر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضر ہوئے، اور بڑے جوش و شوق کے ساتھ صلوٰۃ و سلام عرض کیا۔"

ان ہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ صلوٰۃ و سلام کے بعد مواجہہ شریف میں بیٹھ کر مراقبہ بھی کیا گیا، تا اینکہ آفتاب نکل آیا۔ لیکن بقول حکیم صاحب قبلہ جس کا حال یہ ہو کہ

"اسم گرامی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سن کر لرزہ بدن پر پڑ جاتا تھا، اور چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔" ص۱۸۱

نام ہی کے ساتھ جس کے قلب کے سوز و گداز کا یہ حال ہو، سوچا جا سکتا ہے، کہ اسی پرع

ہم تمہارے سامنے ہوں تم ہمارے سامنے

کا منظر جس وقت پیش آجائے، تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس پر کیا گذری ہوگی؟

سامنے بیٹھے ہوں وہ کس طرح لاؤں اسکی تاب
جس سے دل ڈرتا تھا یارب وہ مقام آ ہی گیا

حکیم صاحب بے چارے حالانکہ بیان کرنا چاہتے ہیں، یہ خبر دیتے ہوئے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک کے ساتھ ہی

"ایک عجیب حالت نمایاں ہوجاتی تھی، جو معرض بیان میں نہیں آسکتی۔"

بیان کرنے کا ارادہ کرنے کے باوجود حکیم صاحب جیسے بزرگ بیان سے اپنے آپ کو جب عاجز و معذور قرار دے رہے ہوں، تو بے چارے مولوی عاشق الٰہی مرحوم جنہوں نے بیان کرنے کا ارادہ ہی نہیں کیا، ان کے یہاں ذوق و سرمستی کی ان سرگذشتوں کی تفصیل بھلا کیسے مل سکتی ہے؟ اور سچ تو یہ ہے کہ اس قسم کی گذرنے والی باتیں جس پر گذرتی ہیں، وہی کچھ ان سے واقف ہو سکتا ہے، لیکن بیان کرنا چاہے، تو شاید "معرض بیان" میں اس "اپنی آپ بیتی" کو شاید وہ خود بھی نہیں لا سکتا، صدق من قال

ذوق ایں مے نہ شناسی بخدا تا نچشی

چکھنے کا موقعہ کسی کو ملا ہو، تو اس سے بھی "چنانکہ افتد دانی" کے سوا شاید اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

بہر حال جہاں حاضر ہونے کے لئے سارے جہان سے غائب ہوئے تھے، وہاں کی حاضری سے شرف اندوز ہونے کے بعد جیسا کہ مولنا عاشق الٰہی صاحب نے خبر دی ہے،

"حضرت شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔" ص۲۳۹ تذکرۃ الرشید

اور حسب اطلاع مولنا حکیم منصور علی خاں حیدرآبادی

"مدینہ شریف میں جناب شاہ عبدالغنی صاحب کے مکان پر قیام کیا۔" ص۱۸۱ مذہب منصور

مکہ معظمہ میں قیام کا نظم جس طریقہ سے کیا گیا، اسے تو آپ سن ہی چکے، لیکن مدینہ منورہ پہنچ کر ان عزیز مہمانوں کو جس کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا، سمجھا بھی آپ نے یہ کون تھے؟ ۔

حضرت شاہ عبد الغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام تو دو میں نے لیا ہے اور یاد رہا ہو، یا نہ یاد رہا ہو۔ مگر سیدنا الامام الکبیر کی تعلیمی زندگی کے زیر عنوان آپ کے جن استاذوں کا تذکرہ کیا گیا تھا، ان ہی بزرگوں میں عرض کیا گیا تھا کہ علم حدیث کی اکثر و بیشتر کتابیں سیدنا الامام الکبیر نے دلی میں ان ہی شاہ عبد الغنی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی تھیں حضرت گنگوہی ؒ نے بھی حدیث شاہ صاحب ہی سے پڑھی تھی، جس کا مطلب یہی ہوا کہ استاد نے اپنے سعید شاگردوں کو اپنا مہمان بنا یا تھا، لیکن کیا۔ انفعہ صرف اسی حد تک محدود تھا؟ سنئے، یہ حضرت شاہ عبد الغنی یوں تو مجددی کی نسبت سے عام طور پر مشہور رہیں۔ لیکن ان کے مجددی ہونے کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ خاندان مجددیہ کے طریقہ میں مرید اور اسی خانوادہ صوفیہ کے مشائخ میں تھے۔ بلکہ حضرت مجدد سرہندی قدس اللہ سرہٗ سے نسبی تعلق بھی رکھتے تھے۔[لہ]

---

لہ شاہ عبد الغنی کے والد ماجد حضرت مولانا شاہ ابو سعید مجددی، حضرت مجدد کے صاحبزادے شاہ محمد معصوم کی اولاد میں تھے۔ شاہ ابو سعید مجددی کے والد ماجد کا نام شاہ صفی القدر تھا۔ ابا عن جد اپنی خاندانی خانقاہ کی مسند کی زینت بنے ہوئے سرہند ہی میں مقیم تھے کہ سکھوں کا فتنہ پنجاب میں اٹھ کھڑا ہوا، اور تو جو کچھ ہوا سو ہوا، حضرت مجدد کے وطن پاک کو بھی فتنہ کی اسی آگ نے گھیر لیا۔ الیانع الجنی کے مصنف مولانا محسن بہاری نے لکھا ہے کہ

| | |
|---|---|
| جلا عنها عامرو ها و تفرقوا فی البلاد (الیانع الجنی، ص۸۳) | سرہند کے باشندوں کو سکھوں نے سرہند سے جلاوطن کر دیا، ملک کے مختلف حصوں میں وہ تتر بتر ہو گئے۔ |

سرہند کے ان ہی مہاجرین میں حضرت شاہ صفی القدر بھی تھے۔ رامپور پہنچ کر انہوں نے پناہ لی رامپور ہی میں ان کے صاحبزادے شاہ ابو سعید پیدا ہوئے، وہیں تعلیم کی تکمیل کرنے کے بعد دلی پہنچے اور شاہ ولی اللہ دہلوی کے صاحبزادوں شاہ عبد العزیز اور شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہما سے علم حدیث کی سند حاصل کی، دلی ہی میں حضرت مرزا مظہر جانجاناں کے مشہور خلیفہ شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ سے طریقہ مجددیہ کی عملی تربیت حاصل کرنے کے بعد ان کے خلیفہ و جانشین ہوئے۔ حج و زیارت کے سفر سے واپسی کے موقعہ پر ریاست ٹونک ہوتے ہوئے دلی آ رہے تھے کہ ٹھیک عید الفطر کے دن ٹونک ہی میں آپ کا وقت پورا ہو گیا۔ عام خلقت کے سوا خود نواب وزیر الدولہ فرماں روائے ریاست جنازے میں حاضر ہوئے، چالیس دن بعد آپ کا تابوت ٹونک سے دلی منتقل کیا گیا، اور اپنے شیخ (باقی اگلے صفحہ پر)

علم حدیث کی سند حضرت شاہ اسحاق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی۔ دینی تربیت اپنے خاص خاندانی طریقہ مجددیہ کے اصول کے مطابق والد ماجد سے پائی تھی۔ کچھ دن فقر و قناعت کی زندگی کے ساتھ حدیث کا درس دلّی ہی میں دیتے رہے، کہ غدر کے فتنہ میں دلّی کی زمین آپ پر تنگ ہوئی۔ ہجرت کر کے حجاز پہنچے مدینہ منورہ میں قیام اختیار فرمایا، اور وہیں کی ارض نبوت و رسالت میں آسودہ ہوئے، مدینہ منورہ کے قیام کے اسی زمانہ میں دلّی کے پڑھائے ہوئے، دونوں خاص شاگرد، حضرت گنگوہیؒ اور سیدنا الامام الکبیرؒ خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر مہمان بننے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

مدینہ منورہ ہی میں بیٹھ کر مولانا محسن بہاری نے "الیانع الجنی" میں یوں تو شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی مقام کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ

| | |
|---|---|
| فھو الیوم عذیقھا المرجب والمحدث بین لابتیھا | مدینہ منورہ کے سب سے زیادہ بار دار درخت آج کل وہی ہیں اور اس کی دونوں پہاڑیوں کے درمیان کے تنہا محدث وہی ہیں۔ |

لیکن اسی کے ساتھ ذرا سوچئے اس بات کو "طریقہ مجددیہ" کا خانوادہ گو اصلاً ہندوستان سے تعلق رکھتا تھا، مگر اسی ہندی "خانوادہ صوفیہ" کے چشم و چراغ بنے ہوئے جس زمانہ میں شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ میں اپنے محبوب پیغمبر کی حدیثوں کی نشر و اشاعت میں منہمک و مشغول تھے، اس وقت تک جانتے ہیں صوفیہ کے اس ہندی خانوادہ یعنی طریقہ مجددیہ کی عظمت و شہرت کا آفتاب چڑھتے ہوئے کہاں تک پہنچ گیا تھا، یہی مولانا محسن[۱] بہاری اسی کتاب "الیانع الجنی" میں راوی ہیں۔

(گذشتہ صفحہ سے) شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ کے پہلو میں دفن کئے گئے۔ (تلخیص از الیانع الجنی ص۸۶ تا ۸۹)

[۱] ہندوستان سے نکل کر حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے تجدیدی کارنامے اور ان کا خاص طریقہ تصوف اس زمانہ میں جب طریقہ مواصلات کی موجودہ آسانیاں خواب و خیال تھیں، اسلامی ممالک کے مشرقی و مغربی حدود کے آخری کناروں تک جو پہنچ چکا تھا حقیقی اور واقعی سبب (باقی اگلے صفحہ پر)

لاتری ناحیة من نواحی المسلمین من بلاد الهند وخراسان وماوراء النهر من بلاد الترك والتتر الی اقصی ثغره بالمشرق ثم ارض العراق والجزیرة وبلاد الحجاز والشام وقسطنطنیه وما

یعنی اسلامی ممالک ہندوستان خراسان ماوراء النہر جن میں ترک اور تاتاری مسلمان آباد ہیں، ان ممالک کے آخری مشرقی سرحدوں تک اسی طرح عراق جزیرہ اور حجازی علاقے، شام اور قسطنطنیہ اور جو بھی ان کے قریب ہیں کوئی علاقہ ایسا نہ تھا کہ یہ طریقہ وہاں پھیل نہ گیا ہو، اور لوگ اسکی

(بسلسلۂ صفحۂ گذشتہ) تو اس کا وہی ہے، جو دنیا کے سارے آثار و حوادث کا واحد سبب ہے، یعنی حق سبحانہ وتعالیٰ کا ارادہ قاہرہ لیکن ظاہر اسباب کی رو سے جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں۔ شیخ خالد کردی رحمۃ اللہ علیہ اس طریقہ کی عام اشاعت کا ذریعہ بنے۔ طریقہ مجددیہ کے شیخ وقت حضرت شاہ غلام علی سے دلی پہنچ کر شیخ خالد نے اس طریقہ کی عملی تربیت حاصل کی۔ وطن واپس ہو کر اس طریقہ کے مطابق تعلیم دینے لگے، عام اسلامی ممالک میں جس نے غیر معمولی حسن قبول حاصل کیا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ شیخ خالد کردی اپنے وطن شہرزور (کردستان) سے دلی جس شخص کی رہنمائی میں پہنچے، وہ بہار ہی کے ایک بزرگ مرزا رحیم اللہ بیگ تھے جو عام طور پر محمد درویش عظیم آبادی کے نام سے اپنے زمانہ میں مشہور تھے۔ حضرت شاہ عبدالغنی رح نے اپنے والد ماجد شاہ ابو سعید کے مختصر حالات کا اضافہ "مقامات مظہری" میں جو فرمایا ہے، اسی میں ارقام فرماتے ہیں کہ یہ مرزا رحیم اللہ بیگ بہاری، جہاں گشت سیاح تھے۔ روم و شام، حجاز، عراق، مغرب و ماوراء النہر خراسان وغیرہ میں گھومتے رہتے تھے۔ اثنائے سیاحت میں کردستان بھی پہنچے، جہاں ان کی ملاقات شیخ خالد کردی سے ہوئی جو اپنے علاقہ کے ممتاز علماء میں گنے جاتے تھے۔ مرزا رحیم اللہ بیگ نے شاہ غلام علی کا تذکرہ ان سے کیا جن کے وہ مرید اور خلیفہ تھے۔ ان ہی کی نشاندہی پر شیخ خالد کردی دلی شاہ غلام علی کی خدمت میں حاضر ہوئے، نو مہینے تک قیام کیا، خلافت و اجازت سے سرفراز ہو کر وطن واپس ہوئے قلوب ان کی طرف کھنچتے چلے جاتے تھے "گویا سلطنت آں دیار بایشان تعلق داشت" حضرت شاہ عبدالغنیؒ کے محتاط قلم سے یہ الفاظ شیخ کردی کی شان میں نکل پڑے ہیں، یہ بھی شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ شیخ خالد اگرچہ مرید خلیفہ حضرت شاہ غلام علی کے تھے لیکن اپنے مریدوں کو "باطاعت والد ماجدم حکم کردہ بودند" حج و زیارت کے لئے حجاز شاہ ابو سعید شاہ عبدالغنی کے یہی والد ماجد پہنچے تو لکھا ہے کہ شیخ خالد کے مریدوں کا مجمع آپ کے سامنے یہ کہتے ہوئے جمع ہو گیا کہ مولانا (خالد کردی) بعد حضرت ایشان (یعنی شاہ غلام علی کے بعد) شما را مقدم می داشت ص۲۰۔ ؏

| | |
|---|---|
| والاها الآن وقد انتهى طريقته وجرى على السنة اهلها ذكره اليه ينتمون وبه يتبركون | طرف اپنے کو منسوب نہ کرتے ہوں، اور اس سے برکت نہ حاصل کرتے ہوں۔ |

اور مدینہ منورہ ہی میں بیٹھ کر آگے اپنی ذاتی شہادت وہی یہ بھی قلم بند کرتے ہیں کہ

| | |
|---|---|
| وقد دخلت طريقته الى اقصى المغرب مثل فاس[1] وغيرها | حضرت مجدد کا طریقہ مغرب کے بھی آخری حدود تک مثلاً فاس وغیرہ میں داخل ہو چکا ہے۔ |

بیرون ہند کے مسلمانوں میں "طریقہ مجددیہ" کو غیر معمولی حسن قبول جو حاصل ہوا، اگر یہ صحیح ہی کہ بظاہر اس میں زیادہ دخل[2] شیخ خالد کردی رحمۃ اللہ علیہ ہی کے وجود باجود کو ہے، حاشیہ میں جس کی طرف اجمالی اشارہ کیا گیا ہے، اسی میں شاہ عبد الغنی رحمۃ اللہ علیہ کی براہ راست اپنے قلم سے لکھی ہوئی یہ شہادت بھی نقل کی گئی ہے کہ شیخ خالد کردی اپنے مریدوں کو حضرت شاہ عبد الغنی کے والد ماجد کی اطاعت کا حکم دیتے تھے۔ ان کے اسی حکم کے مطابق

---

[1] الیانع الجنی کے حاشیہ پر انہوں نے مغرب اقصیٰ کے بعض علماء و مصنفین کی کتابوں مثلاً محمد بن عبد الرحمٰن الفاسی کی کتاب "المنہج البادیہ" اور العباسی کی کتاب کا حوالہ بھی دیا ہے، جن میں اطلاع دی گئی ہے کہ مغرب اقصیٰ کے ممالک وبلاد تک ہندوستان کا "طریقہ مجددیہ" کس طرح پہنچا اور وہاں احترام واکرام کی کن نظروں سے دیکھا جاتا ہے ۱۲

[2] یہ میں نے اس لئے لکھا ہے کہ علاوہ شیخ خالد کردی کے حضرت شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ کے متعدد ایسے خلفاء ہیں۔ جن کے ذریعہ طریقہ مجددیہ کی نشر واشاعت بیرون ہند کے مسلمانوں میں ہوئی، جن میں ایک تو وہی بہاری بزرگ مرزا رحیم اللہ بیگ معروف بہ شیخ محمد درویش عظیم آبادی ہیں۔ سارے اسلامی ممالک کا دورہ کر کے اور حضرت مجدد کے کارناموں سے لوگوں کو روشناس کرنے کے بعد آخر میں مرزا رحیم اللہ بیگ خراسان کے شہر "              " نامی میں مقیم ہو گئے وہاں کی حکومت نے جاگیر میں ایک گاؤں بھی نذر کر دیا تھا۔ بڑی خانقاہ قائم ہو گئی۔ لیکن بعض مقامی حکام کے اشارہ سے وہیں آخر میں شہید کر دیئے گئے، رحمۃ اللہ علیہ۔ اسی طرح شیخ جان محمد شیخ الحرم نامی بھی شاہ غلام علی کے خلفاء میں تھے۔ عرب میں قیام اختیار کر لیا تھا، قسطنطنیہ کی ترکی حکومت کے حکام ان سے خاص عقیدت رکھتے تھے۔ خلیفہ وقت کی راں ان کے خاص عقیدت مندوں میں تھی۔ ضمیمہ مقامات مظہری ص۳۶

شیخ خالد[1] کے مرید عرب میں شاہ عبدالغنی صاحب کے والد ماجد شاہ ابوسعید کی خدمت میں قدم بوسی کے لئے حاضر بھی ہوتے تھے۔

ذرا ان معلومات کی روشنی میں اندازہ کیجئے کہ ہندوستان سے ہجرت کر کے حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ میں جب توطن پذیر ہو گئے تھے، اس وقت ان کا کیا حال ہوگا۔ مدینہ منورہ جہاں ان ہی اسلامی ممالک کے باشندوں کا تانتا ہی بندھا رہتا تھا، وہاں وہ کن نظروں سے دیکھے جاتے تھے، ان ہی کے مہمان بننے کا نظم قدرت کی طرف سے جن لوگوں کے لئے مدینہ منورہ میں کیا گیا تھا، بقول مولٰنا عاشق الٰہی

"شاہ صاحب کو اس مجمع کے ساتھ جو کچھ تعلق یگانگت تھا، اس کا پوچھنا ہی کیا" ص ۲۳۹

ایسی صورت میں اگر یہ سمجھا جائے کہ سیدنا الامام الکبیر کے اس آخری دواعی حج کے موقعہ پر مکہ معظمہ میں جو کچھ دیکھا گیا تھا، مدینہ منورہ میں وہی یا اس سے بھی زیادہ کچھ دکھایا گیا ہو، تو اس پر متعجب نہ ہونا چاہئے، بیان کرنے والوں نے تفصیل نہیں کی ہے، لیکن صرف ایک ہی واقعہ کہ مدینہ منورہ میں اپنے استاذ حضرت شاہ عبدالغنی مجددی رحمۃ اللہ علیہ کی مہمانی کی سرفرازیاں آپ کو میسر آئی تھیں، سب کچھ سمجھنے کے لئے کافی ہے، شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عزیز مہمان مدینہ منورہ والوں ہی کے لئے نہیں، بلکہ عرب و عجم روم و شام مغرب و مشرق سے آنے والے زائرین کے مہمان عزیز بن گئے ہوں، تو واقعات کا آپ ہی بتائیے کہ اس کے سوا دوسرا اقتضا ہی کیا ہو سکتا تھا[2]۔ مولوی عاشق الٰہی مرحوم نے لکھا

---

[1] شاہ عبدالغنی نے اسی ضمیمہ میں شیخ خالد کردی کا ایک خط جو ان کے والد ماجد شاہ ابوسعید کے نام ہے نقل کیا ہے، جس میں شیخ خالد نے شاہ ابوسعید کو خبر دی ہے کہ یک قلم تمامی مملکت روم و عربستان، و دیار حجاز و عراق و بعضے ممالک قلم رو عجم و جمیع کردستان انجذبات و تاثیرات طریقہ علیہ سرشار و ذکر محامد حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہ السامی آناء اللیل والنہار در محافل و مجالس، مدارس و مساجد زبان زد صغار و کبار است ص۲ ضمیمہ

[2] مولانا شبلی نعمانی نے اپنے سفرنامہ شام و روم میں لکھا ہے کہ قسطنطنیہ پہنچنے سے پہلے (باقی اگلے صفحہ پر)

ہے کہ

"مدینہ منورہ میں اس مقدس قافلہ نے کم وبیش بیس دن قیام کیا" ص۲۴۴

بیس دن کی اس مدت میں کیا کیا دکھایا گیا، کیا کیا سنایا گیا، دیکھنے والوں اور سننے والوں کے سوا دوسرے اُسے کیا جان سکتے تھے، اور اُسے کیا بتا سکتے ہیں۔

حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ کی غیر معمولی نوازشوں کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے، کہ بقول مولوی عاشق الٰہی

"شاہ صاحب نہایت کم گو تھے ..... بلا ضرورت ایک بات بھی زبانِ مبارک سے نہ نکالتے تھے۔

اسی طرح جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں، عام طور پر ملنے جلنے میں بھی وہ حد سے زیادہ محتاط تھے۔ لیکن صرف اس لئے کہ ان کے خاص چہیتے شاگردوں کے ساتھ آئے ہیں مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ

مجمع میں جو اجانب اور ناواقف اصحاب تھے، ان سے بھی شاہ صاحب نے اخلاق کریمانہ کے ساتھ مصافحہ فرمایا"

یہ بھی ان ہی کا بیان ہے کہ ان مہمانوں سے مل کر

"بہت مسرور ہوئے، اور عرصہ تک حالات پرسی میں مشغول رہے" ص۲۳۹

حضرت شاہ صاحب کا جو حال تھا، اس کے لحاظ سے یہ معمولی واقعہ نہ تھا، اپنی کتاب میں خاص طور مولوی عاشق الٰہی نے اس کا جو تذکرہ کیا ہے، وہی دلیل ہے کہ ان کے عام طریقہ

---

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) جہاز میں ان کی ملاقات ان ہی شیخ خالد کے بھتیجے شیخ عبدالفتاح سے ہوگئی تھی لکھا ہے کہ "شیخ عبدالفتاح کی یہی ملاقات میری تمام آئندہ کامیابیوں کا دیباچہ بنی" ص۲۱۲ مولوی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "شیخ خالد کی عظمت کا قسطنطنیہ میں یہ حال تھا کہ بجائے نام کے فرط ارادت و عقیدت سے لوگ ان کو صرف "حضرت" کہتے تھے" افسوس ہے کہ اس موقعہ پر بجائے شاہ غلام علی صاحب کے مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ شیخ خالد مرزا مظہر جانجاناںؒ کے مرید تھے حالانکہ مرزا صاحب تو ان کے دادا پیر تھے ۱۲

عمل کے پیش نظر گویا اس میں کچھ غیر معمولی ندرت تھی۔

حضرت شاہ صاحب کے دردولت پر ان حضرات کے قیام کا زمانہ تو خیر اُن کی ملکوتی مجلس ہی میں گذرتا تھا، لیکن ان بیس دنوں میں مدینہ و اطراف مدینہ کے مآثر و مزارات پر حاضری کی تمنا جب مہمانوں کی طرف سے شاہ صاحب کی خدمت میں پیش ہوئی تو اپنے ایک خادم خاص عالم باعمل جو بخارا کے رہنے والے تھے، جن کا نام ہی ملا سفر تھا، شاید سیر و سفر ہی میں ان کی عمر گذری تھی، ان ہی ملا سفر بخاری کو شاہ صاحب کی طرف سے حکم دیا گیا کہ اپنے ساتھ لے جائیں، بلکہ مولانا عاشق الٰہی مرحوم کی روایت کے ان الفاظ سے کہ

"حضرت شاہ صاحب نے ایک شخص ملا سفر نامی بخاری کو ان حضرات کے حوالہ فرمادیا"

تو معلوم ہوتا ہے، کہ بخارا کے ان عالم صاحب ہی کو حضرت شاہ صاحب نے اپنے ان عزیز مہمانوں کے سپرد فرمادیا تھا، اور بقول ان ہی کے حکم دیا تھا کہ

"جہاں حاضر ہونا چاہیں، وہاں لیجائیں"

بیس دن کی مدت ناکافی مدت نہ تھی، مدینہ منورہ کی گلی گلی، کوچہ کوچہ سے بخارا کے یہ ملا سفر صاحب واقف تھے، راہ نمائی کے لئے جب وہی بخش دیئے گئے تھے، تو ظاہر ہے کہ جانے کی ہر وہ جگہ جہاں جانا چاہیئے تھا، وہاں نہ پہنچنے کی وجہ ہی کیا ہوسکتی تھی، شاید مولوی عاشق الٰہی نے چند خاص مقامات کا نام لیتے ہوئے لکھا بھی ہے کہ

"مسجد قبا، وقبلتین، ابیار سبعہ (یعنی مدینہ منورہ کے وہ سات کنویں جن میں سمجھا جاتا ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا لعاب دہن شریک کیا گیا تھا، جبل احد وغیرہ سب ہی زیارتگاہوں پر حاضری دی اور خوب خوب گلہائے نعم خداوندی سے دامن دل بھرا" صـ۲۴

دس دن کم تقریباً ایک ماہ کی یہ مدت نبی العالم صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر طیبہ و پاک میں

اپنے شیخ الحدیث مرجع العرب والعجم کی مہمانی میں گذارنے کے بعد واپسی کا ارادہ جب کیا گیا، تو پہلے کہیں اس کا ذکر کر چکا ہوں، یعنی قافلہ کے ایک رفیق دار العلوم دیوبند کے مہتمم مولٰنا رفیع الدین حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت عالی میں گڑگڑا کر عرض کرتے رہے کہ

"حضرت مجھے تو اپنے قدموں سے جدا نہ کیجئے"

یاد ہوگا، حضرت شاہ عبد الغنی مجددی قدس اللہ سرہ ہی جیسے محتاط[1] بزرگ کی زبان مبارک سے جواباً وہی یہ سن رہے تھے۔

"بھائی! دین کی خدمت بڑا کام ہے، شریعت محمدیہ کی خدمت خوش نصیبوں کو ملتی ہے، جب حق تعالیٰ تم سے اپنے دین کا کام لے رہے ہیں، تو اس میں حرج ڈالنا معصیت سے خالی نہیں"

تذکرۃ الرشید ص ۱۴۱ / ۲۴ ج ۱

"معصیت سے خالی نہیں" شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے واقعی یہی الفاظ نکلے تھے، تو ہجرت کے مسئلہ کی جو شہرت عوام تک جس شکل میں پہنچائی گئی ہے، اس میں اور مسئلہ کی اصل حقیقت میں کتنا فرق پیدا ہو جاتا ہے، یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس وقت تک ہندوستان وہ سب کچھ بن چکا تھا، جس کے بعد زمین کا کوئی علاقہ دار الاسلام باقی نہیں رہتا، اور مدینہ تو بہرحال مدینہ ہی تھا، نبی اور اصحاب نبی (صلوات اللہ علیہ وعلی صحبہ وآلہ وسلامہ) کا وہ دار الہجرۃ تھا، اور اس کے سوا بھی وہ کیا کچھ نہ تھا،

[1] اور تو اور ڈاکٹر سر سید احمد خان کی شہادت آثار الصنادید میں شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق یہ قلم بند ہوئی ہے کہ صرف اس خیال سے کہ ہندوستان میں جو طریق بیع وشراء (خرید وفروخت) بعض فوائد وغیرہ کا جاری ہے وہ از روئے شرع شریف درست نہیں، ان چیزوں کے مزے سے واقف نہیں (باب چہارم ص۵۰) یعنی صرف اس اشتباہ سے جب تک دلی میں رہے ان پھلوں کو شاہ صاحب نے چکھا بھی نہ تھا۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ ان کے دینی حزم واحتیاط، تقویٰ وپارسائی کا کیا حال تھا۔ ۱۲

مگر باایں ہمہ مولانا رفیع الدین کو صرف حکم ہی نہیں دیا گیا، بلکہ اصرار کر کے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مدینہ منورہ سے ہندوستان واپس ہونے پر ان کو مجبور کیا، اور بقول مولانا عاشق الٰہی مرحوم

"مدینہ منورہ میں تخمیناً بیس یوم قیام فرما کر یہ مقدس (درمیان مجمع جس میں مولانا رفیع الدین بھی تھے) مکہ واپس ہوا۔"

مکہ پہنچ کر پھر حارۃ الباب والی وہی رباط جو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں اسی سال پیش ہوئی تھی، وہی ہندوستان واپس لوٹنے والے اس قافلہ کی فرودگاہ قرار پائی، مولوی عاشق الٰہی صاحب کی اطلاع ہے کہ واپسی کے موقعہ پر

"باطمینان ایک مہینہ سے زیادہ مکہ معظمہ میں قیام کیا" ص ۳۴

واپسی کے موقعہ پر مکہ معظمہ کے قیام کی مدت ایک مہینہ سے بھی زیادہ کیوں بڑھ گئی، منجملہ دوسرے اسباب کے بظاہر اس کا سبب جیسا کہ مولوی عاشق الٰہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، شاید یہ بھی تھا، پہلے بھی اس کی طرف کچھ اشارہ کیا جا چکا ہے یعنی ترکوں اور روسیوں میں جو جنگ پلونا نامی مقام پر ہو رہی تھی، اس جنگ کے نتیجہ کا غالباً انتظار تھا، مولوی صاحب ہی کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں کہ پلونا میں ترکوں کی شکست کی خبر جس وقت مکہ پہنچی، تو علاوہ طبعی رنج واندوہ کے انہوں نے لکھا ہے کہ واقعہ کی

"تحقیق کی طلب وفکر کے باعث پھر قصد سفر ملتوی کرنے پر مجبور کیا۔"

صحیح طور پر نہیں کہہ سکتا کہ اس واقعہ کی تحقیق کی ضرورت اس حد تک کیوں محسوس کی گئی کہ مکہ معظمہ سے ہندوستان واپس ہونے کے لئے جو سفر شروع ہونے والا تھا وہ اچانک ملتوی ہو گیا، کس قسم کے سیاسی حالات تھے، اور ان بزرگوں کو اپنے خاص حالات کے لحاظ سے یہ فیصلہ کیوں کرنا پڑا۔

مگر "معصیت کا رنگ" مدینہ منورہ میں حضرت مولانا شاہ عبد الغنی رحمۃ اللہ علیہ کو مولانا رفیع الدین مرحوم کے اس فیصلہ میں نظر آیا تھا کہ "اب ہندوستان واپس نہ لوٹیں گے" دیکھئے مکہ معظمہ میں بھی التوار سفر کا جو فیصلہ کیا گیا تھا، اس فیصلہ کے متعلق مہاجر مکّی حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے عزیز روحانی فرزندوں کو کیا حکم دے رہے ہیں' ان کا یہ فقرہ تو شاید کسی دوسری جگہ بھی نقل کیا جا چکا ہے کہ "جو کچھ مقدر تھا، ہوا، اور جو ہونا ہے، وہ ہو کر رہے گا" اسی کے بعد جیساکہ مولوی عاشق الٰہی نے نقل کیا ہے' کہ حاجی صاحب نے حکم دیا کہ

"جاؤ! بسم اللہ کرو"

اور وہی حاجی صاحب ہی کے ان الفاظ کے بھی راوی ہیں، مولانا گنگوہی کو خطاب کر کے فرما رہے تھے،

"آپ کی ذات سے اہل ہند کو جو نفع ہے، وہ ظاہر ہے' اسلئے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب ہندوستان واپس ہوں" ص۲۱۱ تذکرۃ الرشید ج۱

ہندوستان کے باشندوں کو نفع پہنچانے کے لئے جس وقت حضرت مولانا گنگوہی مذکورہ بالا وداعی الفاظ کے ساتھ رخصت کئے جا رہے تھے۔ اور بقول مولوی عاشق الٰہی مرحوم

"اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب رحمہ اللہ) کے حکم پر حضرت مولانا (گنگوہی) سوائے تعمیل کیا کر سکتے تھے' واپسی کا قصد فرما لیا"

اور اسی قصد کے مطابق واپس بھی ہو گئے' ان ہی کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر کو بھی دیکھنے والے تو یہی دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان ہی کی طرف واپس ہو رہے ہیں لیکن ہمارے مصنف امام جنہوں نے حج کے اس وداعی سفر کے متعلق لکھا تھا کہ "چلنے میں مولانا نانوتوی کو بھی ساتھ لے ہی لیا" وہی پلٹنے کی گھڑی کا ذکر کرتے ہوئے اطلاع

دیتے ہیں کہ اس سفر میں حضرت حاجی صاحب نے فرمایا تھا کہ

"مولوی صاحب (یعنی سیدنا الامام الکبیر) کی تحریر و تقریر کو محفوظ رکھا کریں"

اور اسی کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی بھی لوگوں کو وصیت کی کہ ان کو

"غنیمت جانو" ص۳۲ سوانح قدیم

اس وقت کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ کیا فرما رہے ہیں، اور اپنی اس وصیت سے ان کا مقصد کیا ہے۔ لیکن نہ دیکھنے والوں کو مذکورہ بالا الفاظ سے حضرت حاجی صاحب جو کچھ دکھانا چاہتے تھے جب واقعہ بن کر وہی سب کے سامنے آگیا، تو اس کو دیکھ کر جیسا کہ چاہیئے تھا، کہنے والے بقول مصنف امام کہنے لگے کہ

"ہائے افسوس! یہ خبر نہ تھی، کہ اس کے یہ معنی ہیں" اور یہ "واقعہ" اچانک آجائے گا" ص۳۴

اب ایک طرف حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ان کنائی اشاروں کو رکھئے، اور پھر ذرا اپنی اپنی یادداشتوں میں ان معلومات کو ترو تازہ کر لیجئے، جو کچھ دیر پہلے آپ تک پہنچائے گئے تھے، یعنی حج کے جس سفر میں رخصت کرتے ہوئے حضرت حاجی صاحب چونکنے والوں کو مذکورہ بالا الفاظ سے چونکا رہے تھے۔ یہ سفر ٹھیک اسی سال پیش آیا تھا، جس میں چند مہینے پہلے خداشناسی کے آخری میلہ سے بقول حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ

"بحمد اللہ نصرت اسلام کا پھریرا اڑاتے ہوئے حضرت مولٰنا المعظم واپس تشریف لائے" (مقدمہ کتاب حجۃ الاسلام ص۲)

یاد ہوگا، ہمارے مصنف امام مولٰنا محمد یعقوب صدر اول دار العلوم دیوبند نے بھی خداشناسی

کے اس آخری میلہ سے واپسی کے بعد اپنے باطنی احساس کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا تھا کہ

"حق تعالیٰ کو ان سے (یعنی سیدنا الامام الکبیر سے) جو کام لینا تھا وہ پورا ہو چکا" ۔ (ارواح ثلاثہ)

یہ بھی عرض ہی کر چکا ہوں کہ اس تیسرے حج کے سفر کا ارادہ آپ کے پیش نظر نہ تھا، بلکہ ساتھ لینے والوں نے کسی نہ کسی طرح آپ کو ساتھ لے ہی لیا تھا، ساتھ لے جانے والے ساتھ لئے جا رہے تھے، اور وہ بھی دیکھ رہے تھے۔ ہر دیکھنے والی آنکھ عظمت و احترام کے ان نظاروں کو دیکھ رہی تھی۔ کانوں سے رفع ذکر کے ان چرچوں کو سننے والے سن رہے تھے، جو اس شخص کے سامنے یکے بعد دیگرے لایا جا رہا تھا، جو تقریباً آج سے بیس سال پہلے یہ کہتے ہوئے کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے وقت غار ثور میں تین ہی دن روپوش رہے ہیں"

دیوان کی ڈیوڑھی والے مکان کے زنانہ حصہ کے اس کمرے سے باہر نکل آیا تھا، جہاں روپوش ہونے کا مشورہ اس کو اس لئے دیا گیا تھا کہ آفتاب جس کے مقبوضہ علاقہ میں غروب نہیں ہوتا، وہی جبار حکومت اور اس کے ہرکارے اس کو پھانسی کے تختے پر چڑھانے کے لئے اسی طرح ڈھونڈھ رہے ہیں، جیسے ہندوستان کے ہزارہا ہزار باشندوں کو جوش انتقام میں انتہائی سنگدلی سے مسلسل پھانسی دیتے چلے جا رہے ہیں، پھانسی کے یہی کھمبے ملک کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک گڑے ہوئے تھے، جن سے ہر تھوڑی دیر بعد مردہ لاشیں اتاری جاتی تھیں، اور جیتے جاگتے زندہ انسانوں کو ان ہی پر چڑھا چڑھا کر تڑپنے اور دم نکلنے کا تماشا دیکھا جا رہا تھا، ہندوستان کے بڑے رقبہ کا گوشہ گوشہ ان ہی تماشا گاہوں سے پٹا ہوا تھا، یہ سب کچھ جانتے ہوئے

سب کچھ سنتے ہوئے، بلکہ دیکھتے ہوئے، اسی تنگ و تاریک حجرے سے نکل کر اپنے آپ کو اسی نے ڈھونڈھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے دن کی روشنی میں پیش کر دیا تھا۔ صرف اس لئے پیش کر دیا تھا کہ

وکان حقا علینا نصر المؤمنین | اور ہم پہ مؤمنین کی نصرت کا حق ہے۔

یہی اس کو باور کرایا گیا تھا، اس شخص کی طرف سے باور کرایا گیا تھا، جس کے مقابلہ میں وہ طے کر چکا تھا کہ کسی کی کوئی بات باور نہیں کروں گا۔ دنیا جہان کے سارے باشندے بھی شک اندازی پر اکٹھے ہو جائیں گے، جب بھی اس کا فیصلہ یہی تھا، وہی سنوں گا جو وہ سنائے گا، وہی دیکھوں گا جو وہ دکھائے گا، وہی مانوں گا جو وہ منوائے گا، یہ اس کے محبوب، اس کی جان، اس کے دل کے مالک خاتم النبیین رحمۃ للعلمین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سمات تھی۔

جس کے پاس سب کچھ تھا، اسی قاہرہ، حکومت جابرہ کے مقابلہ میں اپنی ایمانی، صرف ایمانی طاقت کے ساتھ آکر کھڑا ہو گیا، وہی ان ہی آبادیوں، ان کی گلیوں، کوچوں میں دن دھاڑے، کھلے بندوں پھرتا رہا۔ جہاں اسی طاغیہ حکومت کے ہر کارے اپنی آنکھیں پھاڑے پھاڑے اس کو ڈھونڈھ رہے تھے، اور خدا ہی جانتا ہے، کہ کب تک ڈھونڈتے رہے۔ پھر اپنی روپوشی کے گوشہ سے وہ تین دن بعد اس لئے باہر نکل آیا تھا، کہ جسے اس نے اپنا محبوب بنایا تھا، اس کی جان اور دل کا وہی مالک بھی تین دن سے زیادہ ثور کے غار میں نہیں روپوش ہوا تھا تو جس نے اعلان کیا تھا کہ جسے تو محبوب رکھتا ہے، اسی کے ساتھ تو رہے گا، یعنی انت مع من احببت کی بشارت سنانے والے کی یہ بشارت پوری نہ ہوتی؟ معیت اور رفاقت جب اپنے اصلی رنگ میں حقیقت بن کر سامنے آئے گی، اس وقت اپنی اپنی پونجی، اپنے اپنے ظرف کے مطابق تجربہ کرنے والوں کو اس رفاقت و معیت کا تجربہ جن جن رنگوں میں

کرایا جائے گا، ان کا نظارہ تو اسی وقت کیا جائے گا۔ جب "پیش گاہ حقیقت" میں ہر مجاز واقعہ کا قالب اختیار کر کے سامنے آجائے گا۔ لیکن اس سے پہلے بھی، دکھاتا چلا آرہا ہوں۔ زندگی کے ہر موڑ پر، یہی موعودہ رفاقت اور یہی معہودہ معیت کن کن شکلوں میں محبت کرنے والے کے سامنے آتی رہی، پھر یہی خاکی زندگی اپنی تمام منزلوں سے گزرتے ہوئے آخری موڑ پر جب پہنچ چکی تھی، تو اس کے محبوب کی یہی معیت و رفاقت کیا اس کا ساتھ چھوڑ سکتی تھی؟

بات چنداں غیر مشہور بھی تو نہیں ہے؟ آخر تاریخ اسلام کی اس روایت کا ذکر جنہوں نے پڑھا نہیں ہے تو کیا سنا بھی نہ ہوگا، کہ روپوشی کے گوشۂ عافیت سے تین دن کے بعد جن کا نام لے کر، اور جن کے نمونہ اور اسوہ کو پیش کر کے نکلنے والا نکل پڑا تھا۔ ان ہی کو یہ اطلاع دی گئی تھی کہ "اللہ کی نصرت جب آگئی اور فتح ہو گئی، اللہ کے دین میں تم نے دیکھ لیا کہ لوگ جوق جوق داخل ہونے لگے"، یعنی "اذا جاء نصر اللہ والفتح ورأیت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجا" والے الفاظ سے شروع ہونے والی سورۃ "النصر" نامی نازل ہوئی، تو یہی سمجھا گیا؛ جیسا کہ بخاری وغیرہ میں ہے، کہ

| | |
|---|---|
| ھو اجل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعلمہ اللہ لہ | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت (ناگزیر) کی یہ خبر تھی، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے آگاہ کیا تھا کہ دنیا میں آپ کے قیام کی مدت کے ختم ہونے کی گھڑی آگئی۔ |

تو پیروی کرنے والے تابع اور خادم کے سامنے بھی جس پیمانہ پر سہی، لیکن اپنے متبوع اور مخدوم کی زندگی کے یہی نمونے جب جھلکنے لگے تو ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ وہ تنہا چھوڑ دیا گیا ہے۔ مگر توّاب یعنی جو سب سے بڑا رجوع کرنے والا تھا، اس نے تنہا اس کو چھوڑ نہیں دیا، بلکہ اپنی نصرتوں کے ساتھ وہ سامنے آیا، جس میدان میں دنیا

کے بڑے بڑے مذاہب و ادیان کے وکلا، اسلام کے مقابلہ میں جمع ہوئے تھے، اسی میدان سے فتح و کامرانی کا پھریرا اڑاتے ہوئے وہ واپس ہوا۔ جس کے بعد ہندوستان تو ہندوستان، آپ دیکھ چکے کہ حالات ہی قدرت کی طرف سے کچھ ایسے پیش آتے چلے گئے، کہ وہ عرب میں بھی پہچانا گیا، مصر و شام، ترکی اور مغرب اقصیٰ کے مسلمانوں میں بھی احترام کی نظروں سے دیکھا گیا، اور اس نظارے کو تو دنیا اب تک دیکھ رہی ہے کہ دیوبند کے قصبہ کا مقامی مدرسہ اسی کی بدولت ہمہ گیر جامعہ کی شکل اختیار کرنے کے بعد، صرف ہندوستان ہی کے مسلمانوں کا مرجع بنا ہوا نہیں ہے، بلکہ کابل بخارا چینی ترکستان، جاوا، سماٹرا، حد تو یہ ہے کہ مشرقی یورپ علاقہ روس وغیرہ کے طلبہ اس کی قائم کی ہوئی اسی جامعہ میں داخل ہو ہو کر تقریباً ایک صدی سے دینی تربیت حاصل کر کر کے اپنے اپنے اوطان کی طرف واپس ہو رہے ہیں۔

الغرض یہ اور، اس کے سوا اسی نوعیت کی دوسری چیزیں جب گذر رہی تھیں، تو اس پر تعجب کیوں کیجئے، اگر سمجھنے والے ان کو دیکھ کر وہی سمجھنے لگے، جو سورۃ النصر کے نزول کے بعد سمجھا گیا تھا۔

میں تو حیران رہ گیا، جب اسی سلسلہ کی روایتوں میں یہ روایت نظر سے گذری یعنی ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مشہور شاگرد قتادہ اسی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ ان کے استاذ ابن عباس اسی سورہ النصر کے متعلق یہ فرماتے تھے کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر دی گئی ہے، اور آگاہ کیا گیا ہے کہ

| | |
|---|---|
| انک لن تعیش بعدھا الا قلیلا | اس کے بعد نہ جیو گے تم مگر تھوڑی مدت کے لئے |

قتادہ نے اس کے بعد یہ اطلاع دی ہے کہ

| | |
|---|---|
| ما عاش بعدھا الا سنتین | اس سورۃ کے نازل ہونے کے بعد نہ زندہ |

| | |
|---|---|
| ثم توفی۔ | رہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مگر صرف دو سال |
| فتح القدیر شوکانی | (یعنی دو سال گذرنے کے بعد آپ کی وفات ہوگئی) |

ادھر یہ روایت تو تفسیر کی کتابوں میں ملی دوسری طرف تذکرۃ الرشید میں، اسی تیسرے حج کے سفر کے سلسلہ میں مولوی عاشق الٰہی صاحب مرحوم نے یہ لکھتے ہوئے کہ

"الحمد للہ سارا سفر سہولت و راحت کے ساتھ انجام کو پہنچا"

آگے یہ لکھنے کے بعد جسے پہلے بھی کہیں نقل کر چکا ہوں یعنی

"البتہ مولانا محمد قاسم صاحب کو علالت لاحق ہوئی، جو بظاہر خفیف محسوس ہونے کی وجہ سے سفر کی مزاحم یا رفقاء کو پریشان بنانے والی تو نہ ہوئی، مگر آہستہ آہستہ بڑھ کر آخر کار وہی بیماری مرض الموت بنی"

اپنی اسی خبر کو ان الفاظ پر مولوی صاحب مرحوم نے ختم کیا ہے۔ لکھا ہے کہ

"اور تیسرے سال ۱۲۹۷ھ میں جان ہی لے کر گئی" ص ۲۴۲

گویا دو سال کا وقفہ یہاں بھی اس وقت کے حساب سے پیش آیا، جس وقت مجھنے والے دوسروں کو سمجھانے لگے تھے،

"مولوی صاحب کی تقریر و تحریر کو محفوظ رکھا کرو، اور غنیمت جانو"

یہ وہی فقرہ ہے جسے تیسرے حج سے رخصت کرتے ہوئے، سیدنا الامام الکبیر کے متعلق یاد ہوگا، ان کے پیر و مرشد حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا، مصنف امام نے جسے نقل کر کے لکھا تھا، کہ ان الفاظ میں حضرت والا کی وفات کی خبر دی گئی تھی، اللہ اللہ اختیاری اعمال و افعال میں اتباع و پیروی کا ارادہ کر لیا جاتا ہے تو ارادہ کرنے والوں کی لاہوتی محبوبیت کا ثبوت کن کن شکلوں میں پیش کیا جاتا ہے زندگی تو زندگی، موت تک میں پانے والے "محبوبیت کبریٰ" کے رنگ سے حصہ

پاتے ہیں، اور یہی ہے واقعی تفسیر ومحیای ومماتی للہ رب العلمین کی قرآنی آیت کی "روپوشی" کی عقل گداز، ہوش ربا، مصیبت میں بھی "غار ثور" کی مصیبت کی یاد جس کے حافظہ سے نہ نکل سکی، "فاتبعونی" کی پکار پر اس حال میں بھی لبیک کہتا ہوا وہ نکل پڑا، تو "یحببکم اللہ" کے وعدے سے اپنا حصہ آخر خود سوچئے، وہ کیوں نہ پاتا؟ "فالحیات حیاتہ والممات مماتہ"

بہرحال تیسرے حج کے اسی سفر میں رخصت کرتے ہوئے حضرت حاجی صاحب کو جو آگاہی بخشی گئی تھی، اس سے دوسروں کو بھی حالانکہ چونکا چکے تھے، لیکن ظہور وقوع سے پہلے آگہی اگر ملتی بھی ہو، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس سے کچھ کتراتا ہی چاہتے ہیں۔

واقعہ تو یہ ہے کہ نصرت ہو، یا فتح، یا دین اللہ میں جوق درجوق لوگوں کا داخلہ یا انفرادی طور پر سیدھی راہ پر کوئی ڈالا جائے، قرآنی محکمات میں بار بار صاف صاف واضح غیر مشتبہ الفاظ میں یہی یقین دلایا گیا ہے، کہ اللہ کے یہ سارے کام خود ہی اللہ انجام دیتا ہے، ماضی میں جو کچھ ہوا، حال میں جو کچھ ہو رہا ہے، مستقبل میں آئندہ جو کچھ ہوتا رہے گا، سب کی ضمانت تنہا صرف اسی کا ارادہ قاہرہ و باہرہ ہے، جو حی و زندہ ہے، نہ اسے نیند پکڑتی ہے، اور نہ غنودگی اس کو چھو سکتی ہے، مگر یہ سب کچھ جانتے اور مانتے ہوئے بھی پہلے بھی یہی دیکھا گیا ہے، اور اب بھی یہی دیکھا جاتا ہے کہ ٹھیک ان ہی گھڑیوں میں جن میں سب سے زیادہ اس شعور کو بیدار اور اس یقین کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، ذہول اور بھول کا پردہ آدمی کے اس علم و یقین پر پڑ جاتا ہے، کام لینے والا اپنے وقت میں جس سے کام لیتا ہے، اور اپنی کارفرمائیوں کا ذریعہ یا جارحہ جن انفرادی ہستیوں کو بنا لیتا ہے، بجائے ذریعہ اور جارحہ کے کچھ ایسا باور کر لیا جاتا ہے کہ سامنے سے اگر وہ ہٹ گیا، یا ہٹا لیا گیا، تو کاروبار کا سارا سلسلہ ہی درہم برہم ہو کر رہ جائیگا، کچھ اسی قسم کے شعوری یا غیر شعوری احساسات کو ذہول

اور بھول کے ان قصوں میں بظاہر زیادہ دخل ہوتا ہے، ذرا دیکھئے یہی ناگزیر واقعہ جو اس وقت زیرِ تذکرہ ہے اور تو اور ہمارے مصنف امام مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسے بزرگ جو صبر و سکینہ میں شاید اپنے وقت میں اپنی آپ نظیر تھے[1] خدا شناسی کے میلہ میں جو کچھ دیکھا گیا تھا، صرف اسی کو ملاحظہ فرمانے کے بعد جہاں اپنے باطنی احساس کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا تھا، سنا ہی چکا ہوں، کہتے تھے کہ حق تعالیٰ کو ان سے (یعنی سیدنا الامام الکبیر سے) جو کام لینا تھا، وہ پورا ہو چکا، صرف یہی نہیں، بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی کہ

"مجھے مولانا کی وفات قریب معلوم ہوتی ہے" ص۱ ارواح ثلاثہ

لیکن وہی وقت جب قریب سے قریب تر ہو گیا، براہ راست ان ہی مولانا محمد یعقوب صاحب کو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ بالا وصیت سیدنا الامام الکبیر کے متعلق فرماتے ہیں، جس کا مطلب ان ہی کے بیان کے مطابق وہی تھا، جس کا احساس خدا شناسی کے میلے کے واقعات کے بعد ہی ان کے قلب مبارک میں پیدا ہو چکا تھا، لیکن جب حاجی صاحب نے چونکایا تو یہی نہیں کہ جو چیز ان کو خود اپنے قلبی اشراق کی روشنی میں نظر آ چکی تھی، وہ ان کے دماغ سے اوجھل ہو گئی، حاجی صاحب کی تنبیہ پر بھی وہ یاد نہ آئی، بلکہ اس واقعہ کو سامنے کر کے جیسا کہ خود ہی اتمام فرماتے ہیں۔

"نہ کچھ پہلے حج سے ہی طبیعت ناساز تھی" ص۴۳ سوانح قدیم

---

[1] قصص الاکابر میں حضرت تھانوی رح کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ چودہ آدمی ان کے گھر کے ان سے پیشتر چند ہفتوں کے اندر اندر مر چکے تھے حکیم الامت رح نے جو ان کے براہ راست شاگرد تھے مذکورہ بالا الفاظ کے بعد یہ بھی فرمایا کہ وہ یعنی مولانا محمد یعقوب صاحبؒ بڑے صابر تھے کبھی نہ روئے نہ کوئی بے صبری کی بات منہ سے نکالی" صرف ایک دفعہ مولانا تھانوی رح نے سنا تنہائی میں مولانا روم کا یہ شعر پڑھتے تھے ؎ جز تسلیم و رضا کو چارۂ + در کف شیر نر خونخوارۂ۔ (قصص الاکابر ص۳۲)

اس خیال سے گریز ہی کی راہ ان کا دماغ بناتا رہا، گویا حج سے پہلے سیدنا الامام الکبیر کی طبیعت کا ناساز نہ ہونا، اس کو انہوں نے دلیل بنالیا کہ ابھی وہ واقعہ دور ہے، یہی نہیں حاجی صاحب سے رخصت ہونے کے بعد مکہ معظمہ سے قافلہ نکل کر پہلی منزل میں پہنچتا ہے، مصنف امام ساتھ ہیں خود لکھتے ہیں۔

"حضرت (حاجی صاحب) کی زیارت سے اور ان متبرک مکانوں کی زیارت سے مشرف ہوکر جب واپس ہوئے، ہدّہ پہنچ کر مولٰنا کو بخار ہوگیا"

جدہ اور مکہ مکرمہ کی درمیانی سڑک کی یہ وہی منزل ہے، یاد ہوگا جہاں جدہ سے جاتے ہوئے بھی سیدنا الامام الکبیر نے بجائے بحرہ کے اسی ہدّہ نامی مقام میں منزل کی تھی، واپسی میں بھی پڑاؤ قافلہ کا اسی منزل میں ہوا۔ معلوم ہوا کہ حضرت والا کو کچھ بخار ہوگیا ہے، حاجی صاحب کی قولی تنبیہ کے بعد یہ دوسری فعلی تنبیہ قدرت کی طرف سے تھی۔ لیکن مصنف امام کے دماغ نے اس کو بھی ٹال ہی دینا چاہا، خود ہی فرماتے ہیں، کہ

"یہ خیال ہوا کہ جدائی ایسے بزرگ، اور بزرگ مقاموں، اور پیادہ پا زیادہ چلنے کے سبب سے ہے"

گویا سمجھا گیا کہ تعب اور تکان کی وجہ سے کچھ معمولی سی حرارت ہوگئی ہے، اسی حال میں جدہ پہنچے، مولوی عاشق الٰہی کی روایت ہے کہ

"جو جہاز (ہندوستان) جانے کو تیار کھڑا ہوا تھا، گو تنگیٔ جگہ کی تکلیف تھی" ص۲۴۱ تذکرۃ الرشید

لیکن ان ہی کا بیان ہے، کہ اسی جہاز سے واپسی کا ارادہ کرلیا گیا، بقول ان ہی کے اسی جہاز کے ٹکٹ لے لئے گئے، اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے بخار کو چنداں اہمیت نہ دی گئی، خود مصنف امام نے بھی لکھا ہے کہ

"جدّہ پہنچتے ہی، جہاز پر سوار ہوگئے"

آگے یہ بھی ارقام فرمایا ہے کہ

"اس جہاز کا لنگر اٹھنے والا تھا، اور دیگر جہازوں کی خبر عشرہ بلکہ دو ہفتہ تک کی تھی، اس لئے یہ خیال کیا کہ پندرہ روز میں بمبئی جا پہنچینگے"

اس جہاز میں جگہ کی تنگی تھی، اس کی طرف انہوں نے بھی ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے کہ

"اتنی تکلیف اٹھالیں گے"

اور یہ بھی بیان کیا ہے،

"واقعی اس جہاز میں اتنی ہی تکلیف ہوئی، جتنی جاتی دفعہ جہاز میں آسائش وراحت پائی تھی"

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا کی ناسازی مزاج کی اہمیت کا احساس جہاز میں سوار ہونے کے بعد ہی ہوا، خدا ہی جانتا ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر کا واقعی حال کیا تھا، لیکن ساحل جدہ سے کشتیوں پر سوار ہو کر جہاز پر چڑھنے کے لئے قافلہ جب جا رہا تھا، یاد ہوگا، کسی موقعہ پر مولانا حکیم منصور علی خاں صاحب حیدر آبادی کا یہ بیان اسی کے متعلق گذر چکا ہے کہ

"وقت واپسی کے جدہ میں کشتیوں پر سوار ہو کر جب قافلہ جہاز پر سوار ہونے کو جا رہا تھا، تو اس قدر تیز و تند ہوا چلنے لگی، کہ کشتیاں دونوں اِدھر اُدھر قریب غرق ہونے کے جھک جاتی تھیں، ہر ایک کا رنگ زرد ہوجاتا تھا، مگر مولانا مرحوم (سیدنا الامام الکبیر) اپنے حال پر رہے" ص ۱۸۲

ظاہر ہے کہ دیکھنے والے آپ کے اس حال کو دیکھ کر اگر یہ سمجھ رہے تھے کہ معمولی خفیف حرارت کے سوا کسی خاص توجہ طلب بیماری میں آپ مبتلا نہیں ہیں، تو آخر اس کے سوا

وہ اور کیا سمجھ سکتے تھے، بہر حال جس طرح بھی ممکن ہوا، قافلہ جہاز میں سوار ہو گیا، ساحلِ جدہ سے جہاز کا لنگر اٹھا دیا گیا، مصنف امام کا بیان ہے کہ

"دو روز جہاز پر چڑھے ہوئے، ہوئے ہی تھے کہ مولٰنا کو دورہ صفراء معمولی ہوا اور بخار بھی" ص۲۴۲

بخار پر مزید اضافہ غلیان صفراء کا بھی شروع ہوا، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں، ہمارے مصنف امام اب بھی "معمولی" کا لفظ بڑھا کر اپنے دماغ کے سامنے خود اپنے قلب منور کے اشراقی احساس کو ابھرنے نہیں دیتے۔ مگر آہستہ آہستہ یہی صفراء کا غلیان بجائے معمولی ہونے کے غیر معمولی شکل اختیار کرنے لگا۔ مولٰنا حکیم منصور علی خاں مرحوم حیدر آبادی نے واپسی کے وقت جہاز میں سیدنا الامام الکبیر کی علالت کا تذکرہ کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی صفراوی غثیان نے بڑھ کر یہ صورت جہاز ہی میں اختیار کی، کہ

"بار بار استفراغ ہوتا تھا، یہ خادم (یعنی خود حکیم صاحب قبلہ مرحوم) اٹھا کر بٹھاتا، سلفچی میں استفراغ کراتا تھا، صرف صفراء ہی صفراء نکلتا تھا، کلی کرا کر پھر لٹا دیتا تھا"

وہی آگے یہ خبر بھی دیتے ہیں کہ

"دن اور رات میں کسی وقت اس قدر سکون نہ تھا کہ اچھی طرح خوابِ راحت ہو، ذرا دیر ہوئی، کہ استفراغ کا تقاضا ہوا"

مگر اسی کے ساتھ اپنی چشم دید شہادت حکیم صاحب قبلہ نے یہ بھی ثبت فرمائی ہے کہ "جب نماز کا وقت آتا، وہ استفراغ موقوف ہو جاتا، اور بیٹھ کر اطمینان سے نماز پڑھتے"

لیکن جوں ہی نماز ختم ہوتی، ان ہی کا بیان ہے کہ

"پھر وہی دورہ پے در پے شروع ہو جاتا"۔
ایک دو دن نہیں، اسی عجیب و غریب حال کو یعنی نماز کے وقت نہ صفرا ہے نہ استفراغ، اور نماز کے بعد پھر اسی کا سلسلہ شروع ہو جاتا، لکھا ہے کہ
"آٹھ روز تک یہی حالت رہی"
اور ہر دن کے پانچ وقتوں میں حکیم صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہی صورت پیش آتی رہی۔

بظاہر تعجب ہوتا ہے کہ جاتے ہوئے حج کے جس سفر میں دیکھا گیا تھا، کہ سیدنا الامام الکبیر گویا خود نہیں جا رہے ہیں، بلکہ لے جلئے جا رہے ہیں۔ سہارنپور کے اسٹیشن پر جس وقت پہنچے، ایک حبہ بھی آپ کی جیب مبارک میں نہ تھا، لیکن ریل پر سوار ہونے کے ساتھ فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اتنا بڑھا کہ جو بے چارے حج کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے خدا ہی جانتا ہے کہ ان میں کتنوں کو یہ دولت میسر آئی، جہاز میں جو سہولتیں میسر آئیں، مصنف امام ہی سے سن چکے کہ "جتنی جاتے دفعہ جہاز میں راحت و آسائش پائی تھی"۔ پھر مسلمانوں کے دونوں پاک مقدس شہروں، بلد اللہ الامین اور مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں جو کچھ دکھایا گیا، اسے بھی آپ دیکھ چکے، صحت بھی جیسا کہ گذر چکا کہ اچھی رہی، لیکن "ذہاباً" جو کچھ بھی دیکھا گیا، بالکل اس کے برعکس "ایاباً" پہلی ہی منزل جدہ میں داخل ہوتے ہوئے، آپ بخار میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جدہ پہنچکر بجائے جہاز پر سوار ہونے کے وہیں چند دن اگر ٹھیر جاتے، تو اس زمانہ میں علاج کی جو ممکنہ صورتیں اس شہر میں میسر آسکتی تھیں ان سے استفادہ کا موقعہ مل جاتا، لیکن بخار ہی کی حالت میں جہاز پر آپ کو سوار کر دیا گیا، دو دن تک خیر جہاز میں صرف جگہ کی تنگی ہی کی شکایت تھی، لیکن ساحل کو چھوڑ کر جب سمندر کے درمیان جہاز ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں سے کسی قسم کی امداد خشکی سے نہیں پہنچ سکتی تھی، وہیں سے مرض کے اشتداد کا

سلسلہ شروع ہوتا ہے، یوں تو خود مصنف امام ہی طبیب تھے، حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک زمانہ میں طبابت ہی مشغلہ تھا، لیکن بیچ سمندر کی اس آبی آبادی میں جس کے چاروں طرف سینکڑوں میل تک پانی ہی پانی تھا، بقول مصنف امام

"وہاں نہ جگہ راحت کی، نہ دوا، نہ کچھ تدبیر" ص۴۲

اور قصہ اسی پر ختم نہیں ہو جاتا ہے، مصنف امام اسی کے ساتھ اس کی خبر بھی دیتے ہیں کہ جہاز کی اس منقطع عن الدنیا آبی آبادی میں اچانک وبا بھی پھوٹ پڑی، اور کیسی وبا؟ وہی لکھتے ہیں کہ

"ہر روز ایک دو آدمی انتقال کرتے تھے" ص۴۲

پہلے جہاز پر سوار ہونے کا یہ فائدہ جو سوچا گیا تھا کہ بمبئی چودہ پندرہ روز میں پہنچ جائیں گے، یہ امید بھی اس لئے پوری نہ ہوئی کہ عدن کی بندرگاہ پر پہنچنے کے بعد بقول مصنف امام

"وہاں قرنطینہ ہو گیا" ص۴۲

جس کی وجہ سے پہنچنے میں بجائے تعجیل کے تاخیر ہو گئی، اور قرنطینہ کی وجہ سے جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے

"نہ جہاز کے آدمی کنارہ پر اتر سکے، اور نہ شہر کے آدمی جہاز پر آ سکے" ص۴۳

مطلب جس کا یہی ہوا کہ عدن سے بھی دوا وغیرہ کے ملنے کی تھوڑی بہت توقع جو کی جا سکتی تھی، اس کا راستہ بھی بند ہو گیا، ذہاب وایاب یا جانے اور واپس لوٹنے کے ان متضاد حالات کو خود سوچئے، کہ کہاں تک بخت واتفاق کا ان کو نتیجہ قرار دیا جا دے، جاتے ہوئے وہ نظارے کیوں پیش آئے تھے، اور آتے ہوئے، یہ سب کچھ جو دکھایا جا رہا تھا، اس کا واقعی راز کیا تھا؟ علام الغیوب کے سوا اس کا صحیح جواب کون دے سکتا ہے؟ لیکن رخصت کرتے ہوئے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

نے جس پیش آنے والے واقعہ سے آگاہ کر دینا چاہا تھا، اگر یہ سمجھا جائے اور یہی سمجھا بھی گیا ہے، کہ اسی واقعہ ناگزیر کی تمہید تھی، جس کی ابتداء واپسی کی پہلی منزل ھذہ ہی میں شروع ہو گئی تھی، تو یہ جو کچھ ہو رہا تھا، ہم اس پر حیران کیوں ہوں، معصومیت کے انتہائی نقطۂ عروج میں مغفرت طلبی کا مطالبہ جیسا کہ لوگ کہتے ہیں، اس لئے کیا گیا تھا کہ غیر معصوموں کی رائے بھی وہاں پربت کا حکم رکھتی ہے، ایسی صورت میں غیر معصوم طبقہ سے تعلق رکھنے والوں کا استغفار ان حالات کو اگر پیدا کرے جن کا سلسلہ اس سفر سے واپسی کی پہلی منزل سے شروع ہو گیا تھا، تو قطعی طور پر پاک و صاف کر کے اپنے جن بندوں کو ارحم الراحمین اپنے سامنے بلانا چاہتے ہیں، ان کے ساتھ اس کے رحم و رافت، عفو و مغفرت کا ظہور جیسا کہ صحیح حدیثوں میں ہے، عموماً ان ہی شکلوں میں ہوتا ہے[۱]۔

[۱] مسئلہ سے جو واقف ہیں، ان کے لئے تو میرے یہ اجمالی اشارے بھی ان شاء اللہ کافی ہو سکتے ہیں، لیکن جو نہیں جانتے ہیں، ان کو چاہئے کہ قرآن کی آیت من یعمل سوءً یجز بہ (یعنی کسی قسم کی برائی کوئی کرے اس کا بدلہ اسے دیا جائے گا) کی تفسیر کا مطالعہ کریں۔ حاصل یہ ہے کہ قرآن کی یہ آیت جب نازل ہوئی، تو صحابہ جن میں سب سے پیش پیش خود صدیق رسالت حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض رسا ہوئے کہ یا رسول اللہ آپ پر ہمارے ماں باپ قربان ہوں، ہم میں ایسا کون ہے، جس سے کوئی برا کام نہ ہوا ہو، مطلب آپ کا بھی تھا کہ قرآن میں جب اعلان کیا گیا ہے کہ ہر برائی کا بدلہ دیا جائے گا، تو عفو و درگذر، مغفرت کے قانون کا مطلب پھر کیا ہو گا؟ جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابو بکر تمہیں اور دوسرے اہل ایمان کو دنیا ہی میں برائی کا بدلہ اس طور پر دے دیا جاتا ہے کہ حتی تلقوا اللہ لیس لکم ذنوب (اللہ سے اس طور پر ملو کہ کسی قسم کا کوئی گناہ تمہارے ساتھ نہ ہو گا) دوسری روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایمان والوں کو کسی قسم کی بیماری، یا جسمانی تکلیف غم، الم دکھ وغیرہ جو کچھ بھی پہنچتا ہے اس کو پاک ہی کرنے کے لئے پہنچتا ہے۔ تا اینکہ پاؤں میں کوئی کانٹا بھی جو چبھ جائے، یا کسی معمولی چیز کے گم ہو جانے کی وجہ سے تردد دل میں پیدا ہو۔ یہ بھی ہے کہ چیونٹی بھی مومن کو اگر کاٹتی ہے تو گناہوں سے اسی دنیا میں اس کو پاک ہی کرنے کے لئے کاٹتی ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بہر حال دوسرے خواہ کچھ ہی سمجھیں، لیکن جس کے پیار اور محبت ہی کا مظاہرہ ذباب کے موقعہ پر کیا گیا تھا، اپنا خیال تو یہی ہے، کہ اب بھی ایاب اور واپسی کے وقت جو کچھ ہوا یا تھا، وہ بھی اسی کے کرم و نوازش ہی کا ایک قالب تھا، روح ہر حال میں ایک ہی تھی۔

مصنف امام نے لکھا ہے کہ بے کسی اور بے بسی کے اسی حال میں مرض کی شدت کبھی کبھی بڑھ بڑھ کر اس درجہ تک پہنچ جاتی،

"ایک دن نوبت یہ پہنچی کہ ہم سب مایوس ہو گئے" ص۱۸۴

مولٰنا حکیم منصور علی خاں حیدرآبادی مرحوم نے بھی یہ خبر دیتے ہوئے کہ آٹھ دن تک جہاز پر حالت ایسی ہو گئی، کہ دن تو دن، راتوں کو بھی سیدنا الامام الکبیر کے بالین علالت پر مسلسل جاگنا پڑتا، خود اپنے متعلق لکھا ہے کہ

"ایک دن مجھ کو کئی رات جاگنے کی وجہ سے زیادہ تھکن اور اضمحلال ہو گیا"

اس دن بجائے حکیم صاحب کے ان ہی کا بیان ہے کہ

"اس رات کو جناب مولوی محمد منیر صاحب پاس بیٹھے رہے" ص۱۸۵

یہ وہی مولٰنا محمد منیر صاحب ہیں جو بقول حکیم صاحب مولٰنا مرحوم کے بچپن کے دوست

(گذشتہ صفحہ سے) آپ کو یہ ساری روایتیں درمنثور سیوطی میں ایک جگہ مل جائیں گی حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے بطور قانون کے اسی مسئلہ کی تعبیر یہ کی ہے کہ گناہوں کی سزا کی جگہ تو جہنم ہے لیکن مومن جب استغفار کرتا ہے تو جہنم والی سزا میں تخفیف کر دی جاتی ہے، بجائے جہنم کے برزخ یعنی قبر میں سزا بھگتتا ہے، لیکن مغفرت طلبی میں زیادہ زور لگایا جاتا ہے تو بجائے برزخ کے دنیا ہی کی تکلیفوں کا قالب جہنم کی سزا اختیار کر لیتی ہے، شاہ صاحب نے اسی لئے اس کا نام قانون تخفیف و تحویل رکھا ہے" جیسے چھ مہینے کی قید کو عذر و معذرت کے بعد مالی سزا، اور مالی سزا کو بھی زجر و توبیخ ڈانٹ ڈپٹ کی شکلوں میں تبدیل کر کے سزا کی نوعیت کو حکومتیں ہلکی کر دیتی ہیں۔ کچھ یہی حال اس قانون کا ہے، بس مکافات و مجازات کا قانون بھی باقی رہا، یعنی برائی کی سزا کسی نہ کسی شکل میں بھگتنی ہی پڑتی ہے اور تخفیف و تحویل کر کر کے مغفرت و عفو کا قانون بھی عمل کرتا ہے ۱۲

مخلص تھے، حج کے اس سفر میں اونٹوں کی سواری میں عموماً وہی ردیف بنائے جاتے تھے۔

مگر باوجود ان یاس انگیز حالات کے ہمارے مصنف امام اپنی ناامیدیوں کو مسلسل امیدوں ہی سے بدلنے کی کوششوں میں آخر وقت تک سرگرم ہی رہے، خود ہی لکھا ہے کہ دل کو یہی سمجھاتے رہے کہ

"چند بار شدت مرض ہو کر اللہ نے شفا دی تھی، اب کی بار بھی وہی خیال باندھ رکھا تھا" ص ۳۴

اسی لئے تدبیر وسعی کا کوئی دقیقہ چاہتے تھے کہ اٹھا نہ رکھا جائے، دنیا سے منقطع ہو جانے کے بعد دواؤں وغیرہ کے نہ ملنے کی وجہ سے جو ذہنی کوفت ان کو ہوئی ہوگی، اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے، مگر کچھ کر بھی تو نہیں سکتے تھے، خدا خدا کر کے عدن کے قرنطینہ سے جہاز کو نجات ملی، وہ آگے بڑھا، اور حضر موت کی بندرگاہ پہنچا، مصنف امام نے لکھا ہے کہ جہاز نے

"مکلّہ (حضر موت کی بندرگاہ) میں قدرے قیام کیا"

قدرے کا مطلب شاید یہی ہے کہ چند گھنٹوں کے لئے اس بندرگاہ میں جہاز مال وغیرہ اتارنے کے لئے ٹھیرایا گیا۔ مکلّہ کی آبادی سے ضرورت کی چیزیں لے کر لوگ ساحل پر آجاتے تھے، ان ہی لوگوں سے جیسا کہ لکھا ہے

"وہاں سے (یعنی مکلّہ سے) لیموں بکنے آئے وہ لئے، تربوز اور گلاب"

ان تر و تازہ چیزوں کے ساتھ مسافروں کے پاس بھی بعض دواؤں کا پتہ چلا ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ

"بعض ادویہ جہاز میں مل گئیں"

جہاں کچھ نہیں مل سکتا تھا، وہاں یہ بھی جو کچھ مل گیا، اسی کو غنیمت شمار کیا گیا، مگر کچھ ایسا معلوم

ہوتا ہے، کہ ان سے بھی مرض کی شدت میں تخفیف کی صورت شاید پیدا نہ ہوئی، اگرچہ جہاز میں کمپنی کی طرف سے ایک ڈاکٹر بھی رہتا تھا، لیکن اس زمانہ کی ذہنیت کے مطابق ایلوپیتھک طریقہ علاج سے حتی الوسع گریز ہی کی کوشش کی جاتی تھی، مگر جب گھر کی دواؤں سے فائدے کی کوئی صورت ظاہر نہ ہوئی، تو مصنف امام ہی کا بیان ہے کہ

"جہاز کے ڈاکٹر نے کونین دی، اور مرغ کا شوربا غذا کو کہا"

کونین کا لفظ اس زمانہ میں دلوں میں جس اثر کو پیدا کرتا تھا، اب تو شاید اس کے جاننے والے ہم میں موجود نہ ہوں، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ایک قسم کا زہر ہی اس کو سمجھا جاتا تھا، اسی لئے اصلاحی بدرقہ کے بغیر کونین کے استعمال کا شاید کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، مرغ کے شوربہ کی تجویز غالباً بدرقہ ہی کے لئے کی گئی تھی، مگر بقول مصنف امام مصیبت یہ تھی کہ

"وہاں (یعنی اس منقطع عن الدنیا آبی آبادی میں) مرغ کہاں میسر تھا۔" ص۴۳

اصلاحی بدرقہ کے بغیر یہ زہر (کونین) کیسے استعمال کیا جائے؟

وہی جہاز کا ڈاکٹر جو غالباً کوئی فرنگی نژاد عیسائی ہی ہوگا، کونین کو استعمال کرانے کے لئے لکھا ہے کہ

"آخر مرغ بھی اپنے پاس سے دیا" ص۴۳

کسی نہ کسی طرح کونین کے استعمال پر لوگ راضی ہو گئے، پہلا فائدہ اس کا مصنف امام ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے یہ محسوس ہوا کہ

"مولانا سیدنا الامام الکبیر کو دورہ میں غذا سے نفرت مطلق ہو جاتی تھی، اب کچھ رغبت ہوئی" ص۴۳

جہاز کا یہ سفر ختم بھی ہو رہا تھا، مولانا حکیم منصور علی خاں نے لکھا ہے کہ

"جب بمبئی کے قریب پہنچے تے موقوف ہو گئی"

غذا کی طرف کچھ رغبت کے ساتھ قے کی موقوفی ان ہی دونوں باتوں کا نتیجہ جیسا کہ حکیم صاحب

نے اطلاع دی ہے یہ ہوا کہ

"اٹھنے بیٹھنے لگے"

ورنہ جہاز میں نماز کے وقتوں کے سوا، حکیم صاحب ہی نے لکھا تھا کہ

"ہر وقت لیٹے رہتے تھے"

لیکن نشست و برخاست کی جو صلاحیت پیدا ہوئی تھی، اس کا اندازہ مصنف امام کے ان الفاظ سے ہوتا ہے

"بمبئی ایسے پہنچے کر بیٹھنے کی طاقت دشواری سے تھی" ص۴۳

اسی لئے جہاز سے اترنے کے ساتھ ریل پر سوار کرادینا مناسب نہ خیال کیا گیا، بمبئی پہنچ جانے کے بعد مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"دو تین روز ٹھیر کر وطن کو روانہ ہوئے" ص۴۳

ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ قیام بمبئی کے ان دنوں میں نہ کسی قسم کا دورہ ہی قے وغیرہ کا پڑا، اور نہ کوئی دوسری شکایت محسوس ہوئی، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکیم صاحب نے لکھا ہے، کہ

"بمبئی میں اچھے رہے"

جیسا کہ پہلے کہیں لکھ چکا ہوں، کہ اس آخری وداعی حج کے سفر سے واپسی ۱۲۹۵ھ ہجری ماہ ربیع الاول کے اوائل میں ہوئی تھی، حساب سے ۱۸۷۸ء کے مارچ کے گویا ابتدائی دن تھے جس میں کافی خنکی عموماً ہندوستان میں باقی ہی رہتی ہے، مصنف امام نے وطن کی طرف روانگی کا ذکر کرتے ہوئے جو یہ لکھا ہے کہ

"ہر چند موسم سرما تھا"

اس کا مطلب یہی ہے کہ سرما کا موسم ابھی پورے طور پر ختم نہیں ہوا تھا، مگر سردی کا زور ظاہر ہے کہ مارچ کے مہینے تک ٹوٹ جاتا ہے، گونہ دو رسے موسم کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی

ہے' اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ گو ریل پر سیدنا الامام الکبیر سوار تو کرا دیئے گئے لیکن بقول حکیم منصور علی خاں حیدر آبادی مرحوم

"مگر نقاہت باقی تھی، ریل میں اٹاوہ تک لیٹے ہوئے تشریف لائے۔"

اور ان کی یہ خوش قسمتی تھی جیسا کہ خود ہی فرماتے ہیں کہ

"میری رانوں پر قدم مبارک رکھ لیا کرتے تھے۔" ص۱۸۵

ریل جارہی تھی کہ مارچ کے دور سے موسم کا اثر نمایاں ہوا، جس کا ذکر مصنف امام نے بایں الفاظ کیا ہے

"جبلپور کے میدانوں میں دوپہر کو لو چلنے لگی۔"

ایک ایسا مریض جو بمشکل ریل میں لیٹے لیٹے سفر کی منزلوں کو پوری کر رہا تھا' اچانک پہاڑوں سے ٹکرا ٹکرا کر چلنے والی گرم ہواؤں سے جوں ہی کہ اس کا سابقہ ہوا۔ مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"مولانا کی طبیعت بگڑی" ص۴۳

یہ نہیں لکھا ہے' کہ کیا بگڑی بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ صفراہی میں پھر ہیجان و غلیان کی کیفیت پیدا ہوئی کیونکہ آگے وہی ارقام فرماتے ہیں کہ

"الحمد للہ اس وقت نارنگی، لیمو' یہ چیزیں پاس تھیں، کھلائیں
پانی پلایا۔" ص۴۳

عموماً صفراہی کے دبانے کے لئے اس قسم کی ترش چیزیں استعمال کرائی جاتی ہیں۔
واللہ اعلم بالصواب۔ جبل پور کے میدانوں تک یہ حالت رہی' یا آگے بھی دورے کی صورتیں پیش آئیں، جس طرح بھی ہوا، گاڑی اٹاوے تک پہنچی' اسی اسٹیشن پر جو صورت پیش آئی وہی لائق توجہ ہے، مولانا حکیم منصور علی خاں کے حوالہ سے عرض کر چکا ہوں کہ مرض کی آخری اشتدادی کیفیت میں بھی ایک چیز یعنی نماز کا وقت جب آجاتا تھا'

سیدنا الامام الکبیر بیٹھ کر نماز پڑھ لیا کرتے تھے، اپنے مالک و خالق کے ساتھ حضرت والا کے قلبی تعلق کی بیداری کا جس سے پتہ چلتا ہے، اب دیکھئے اسی کے ساتھ مخلوق کے حقوق کا کتنا اور کس حد تک خیال کیا جاتا تھا۔ حکیم صاحب ہی اس واقعہ کے راوی ہیں، بلکہ ان ہی کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا، عرض کر چکا ہوں کہ منجملہ دوسرے رفقار کے حج کے اس سفر میں سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ حکیم صاحب قبلہ بھی علیگڈھ سے ساتھ ہو گئے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ممکن تھا، اپنے استاد کی خدمت میں وہ اس سفر میں کچھ زیادہ پیش پیش رہے، خصوصاً واپسی میں حضرت والا جب بیمار ہوئے تو حکیم صاحب کی زبانی یہ بھی آپ سن چکے کہ مسلسل راتوں کو جاگ جاگ کر بسر کیا، جب قے ہوتی تو سلفچی لے کر حاضر ہوتے، کُلیاں کراتے، حکیم صاحب تو اپنے اخلاص اور نیازمندی کے صادق جذبات کے تحت یہ سب کچھ کر رہے تھے، ان کے سامنے صلہ کا سوال ہی کیا ہو سکتا تھا، لیکن جس کے ساتھ وہ یہ سب کچھ کر رہے تھے، وہ ان کو ان خدمات کے صلہ سے کیسے محروم رہنے دیتا، حکیم صاحب نے لکھا ہے کہ گاڑی جب اٹاوے کے اسٹیشن پر پہنچی، تو سب سے پہلی نوازش تو حضرت والا کی طرف سے یہ ہوئی، جیسا کہ حکیم صاحب نے لکھا ہے

"کہ اٹاوہ سے مجھ کو وطن جانے کی اجازت عطا فرمائی" ۱۸۵

حالانکہ ایسے مخلص خادم کی علالت میں زیادہ ضرورت تھی، لیکن طویل مقدس سفر کے بعد حکیم صاحب واپس ہوئے تھے، قدرتاً وطن پہنچنے کی آرزو دلوں میں ہیجان انگیز ہوتی ہے، اوّلاً تو اسی جذبہ کی رعایت کی گئی، اور صرف اسی پر اکتفا نہیں فرمایا گیا، بلکہ اسی کے ساتھ حکیم صاحب کو کچھ اور بھی دیا گیا، بظاہر دیکھنے میں تو وہ کوئی بڑی چیز نہ تھی، یعنی حکیم صاحب نے لکھا ہے کہ

"اور چار روپے اپنے پاس سے عنایت کئے"

مگر یہ چار روپے کیا واقعی صرف چار روپے تھے، میں تو سمجھتا ہوں کہ اسی کے ساتھ حکیم صاحب ہی نے یہ خبر جو دی ہے، کہ

"اور پانچ روپے مکہ شریف میں مسجد ابراہیم علیہ السلام کی حد میں مجھ کو لے جا کر عطا فرمائے تھے"

اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی سمجھ گئے تھے کہ رخصت کرتے ہوئے ان کو چار روپے جو دیئے گئے، وہ درحقیقت چار روپے نہ تھے، بلکہ ان سے پیش تر مسجد ابراہیم جس سے غالباً مراد "خانہ کعبہ" والی مسجد حرام ہی معلوم ہوتی ہے، یا ممکن ہے کہ دخول کعبہ کے وقت حکیم صاحب کے ساتھ یہ نوازش فرمائی گئی تھی، بہرحال میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ اللہ کے خلیل نے جس مقام میں رزق کی برکت کی دعاء آنے والی نسلوں کے لئے کی تھی، اسی سرزمین میں پانچ روپے دے کر حکیم صاحب کو شاید رزقی برکت کی بشارت سے سرفراز فرمایا گیا تھا، وہ پانچ روپے بھی اسی کی علامت تھے، اور آخر میں رخصت کرتے ہوئے بھی کچھ اسی قسم کا اشارہ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ کیا گیا تھا[1]، بہرحال حکیم صاحب اٹاوے سے وطن یعنی مراد آباد روانہ ہو گئے، اور

[1] بزرگوں کے حالات میں لوگوں نے اسی قسم کے واقعات کا ذکر کیا ہے، خاکسار نے براہ راست حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیری نور اللہ مرقدہ سے سنا تھا کہ ان کے پیر و مرشد حضرت مولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ رخصت کرتے ہوئے ایک مٹھی چنے آپ کی گود میں ڈال دیئے اور فرمایا کہ لو یہ دنیا دیتا ہوں، گو دینے کو تو صرف ایک مٹھی چنے ہی حضرت نے دیئے تھے لیکن حق سبحانہ وتعالیٰ نے مولانا محمد علی صاحب قدس اللہ سرہٗ کو دین کے سوا دنیا میں بھی رفاہیت و کشادگی و فراخی عطا فرمائی تھی، شاید بڑے بڑے نوابوں اور امیروں کے لئے آپ کی زندگی کا یہ رخ قابل رشک بنا ہوا تھا۔ خاکسار نے خود دیکھا تھا کہ صرف چار جو خانقاہ رحمانیہ میں خرچ ہوتی تھی پندرہ سیر یا آدھ من روزانہ سے کم شکر کے صرفہ کا تخمینہ اس کے لئے نہیں کیا جا سکتا۔ ایک باغ میں کوٹھی مسجد خانقاہ سب کا انتظام غیب سے کیا گیا تھا، جو بحمد اللہ آج تک موجود ہے مجھے تو کچھ یہی حال مولانا حکیم منصور علی خاں مرحوم کا نظر آتا ہے، ان کی طالب علمی کا زمانہ کافی عسرت میں گذرا تھا، تقدیر نے ان کو (باقی اگلے صفحہ پر)

حضرت والا اپنے رفقاء کے ساتھ اپنے وطن واپس ہوئے مصنف امام نے لکھا ہے،
"وطن پہنچنے کے بعد مرض رفع ہوا" گونہ طاقت آئی"
حکیم صاحب نے بھی اطلاع دی ہے، کہ
"میں جب وطن آیا' چندروز قیام کر کے نانوتہ پہنچا' اس وقت مولنا
صاحب کو اچھا تندرست پایا" ص۱۸۶ مذہب منصور
مگر رفع مرض' یا تندرستی جس کا مشاہدہ وطن پہنچنے کے بعد کیا جا رہا تھا" واقعی حقیقت
اس کی جو کچھ تھی' اس کا اندازہ مصنف امام کے ان الفاظ سے ہوتا ہے، لکھتے ہیں کہ
"مگر کھانسی ٹھیر گئی' اور کبھی کبھی' دورہ سانس کا ہونا' زیادہ بولنا
دیر تک کچھ فرمانا مشکل ہو گیا" سیرت قدیمہ
الغرض جدہ کی منزل میں اسی آخری وداعی حج میں بخار میں جو آپ مبتلا ہوئے' اس کا
سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں باقی ہی رہا۔ البتہ اس میں کبھی کبھی کچھ تخفیف کی صورت پیدا ہوجاتی
تھی لیکن حال جس کا یہ ہو' ابھی حکیم صاحب کی زبانی آپ سن چکے کہ زیادہ دن نہیں بلکہ
چندروز ہی قیام کر کے اپنے وطن مرادآباد سے حضرت والا کی خدمت میں بہ مقام نانوتہ
حاضر ہوتے ہیں' بظاہر پندرہ بیس روز سے زیادہ یہ مدت نہ ہوگی' مگر فرماتے ہیں، کہ

(گذشتہ صفحہ سے) حیدرآباد دکن پہنچا دیا' جہاں وہ طبیہ کالج کے پرنسپل ہو گئے تھے' اپنے علم و
فضل اور تقوی کی زندگی کی وجہ سے عزت وجاہ کے سوا دنیاوی حیثیت سے بھی فارغ البالی کی زندگی آخر وقت
تک بسر کرتے رہے اور یہ تو اپنی آنکھوں دیکھی بات ہے' خاکسار کے سامنے ان کے صاحبزادے حکیم
منصور علی خاں حضور نظام کے دربار سے نواب مقصود جنگ کے خطاب سے سرفراز ہو کر حیدرآباد کے نوابوں
میں شریک ہوئے' اعلیٰ حضرت حضور نظام کے دربار میں احترام و اکرام کا جو مقام حکیم صاحب کو حاصل ہے
شاید وہ حکیم صاحب ہی تک محدود ہے۔ ہندوستان جب آزاد ہوا تو صدر جمہوریہ ہند کے خصوصی معالجین
میں بحیثیت یونانی طبیب کے حکیم صاحب قبلہ ہی چنے گئے۔ بجائے ایک دفعہ کے دو دفعہ حکیم
منصور علی خاں روپے سے جو سرفراز کئے گئے۔ شاید اس میں یہ اشارہ پوشیدہ تھا کہ دنیاوی فراغ
بالی آئندہ بھی حکیم صاحب کی نسل میں جاری رہے گی۔ ۱۲

اسی زمانہ میں

"مجھ کو ملا جلال اول سے آخر تک پڑھایا"

صرف وہی نہیں بلکہ ان کے سوا بھی دوسرے تلامذہ کی بھی کتابیں شروع ہو گئی تھیں، حکیم صاحب نے لکھا ہے کہ

"ان کے اسباق کی بھی سماعت کرتا تھا"

جس کے معنی یہی ہوئے، کہ مرض کے اتنے شدید حملہ کے بعد پندرہ بیس روز بھی آرام لینے کا موقعہ نہ ملا، اور ملا جلال جیسی معقولات کی اہم کتابوں کی درس و تدریس کے مشغلوں میں آپ مصروف ہو گئے، حالانکہ حکیم صاحب کا بھی بیان ہے کہ پڑھانے کی حد تک تو آپ پڑھا رہے تھے، اور پڑھانے کی رفتار کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے، کہ ملا جلال اول سے آخر تک حکیم صاحب نے پڑھ لی، تاہم وہی یہ بھی اطلاع دیتے ہیں،

"لیکن پہلی سی قوت نہ تھی"

اور بات صرف پڑھنے پڑھانے تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ چند مہینے بھی واپسی پر نہ گذرے تھے، ربیع الاول میں واپسی ہوئی تھی، کہ اسی سال شعبان میں گویا کل پانچ مہینے کے اندر اندر آپ کو پنڈت دیانند سرسوتی کے مقابلہ میں رڑکی کا سفر کرنا پڑا، رڑکی کا وہی سفر جس کی تفصیل گذر چکی، رڑکی کے بعد پنڈت جی ہی سے رو در رو ہونے کے لئے اسی زمانہ میں میرٹھ کا سفر بھی آپ کو کرنا پڑا۔ اسی عرصہ میں "قبلہ نما" جیسی نادر روزگار کتاب بھی لکھی گئی، اور "جواب ترکی بہ ترکی" کا مسودہ بھی اسی زمانہ میں تیار ہوا، جسے بعد کو مولنا عبد العلی نے مرتب کر کے شائع کیا۔ الغرض درس و تدریس، وعظ و تقریر، تالیف و تصنیف کے ساتھ ساتھ مدرسہ کے کام کا بار بھی حسب دستور اٹھاتے رہے، بیچ بیچ میں طبیعت پھر بگڑتی، مگر سنبھل سنبھل جاتی، تاہم کب تک؟ میرٹھ سے واپسی کے بعد مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"اس عرصہ میں چند بار جلد جلد وہی دورہ ہوا"

وہی دورہ کا مطلب بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ تنفس اور ضیق النفس کے دورے کم کم وقفوں کے ساتھ پڑنے لگے۔ مصنف امام کے ان الفاظ سے یعنی

"کئی بار صورت سانس کی سی ہو گئی" ص۴۴

یہی سمجھ میں آتا ہے۔

الغرض جو کچھ پیش آنے والا تھا، حالانکہ یہ سب جو کچھ بھی ہو رہا تھا، اسی کا مقدمہ تھا رخصت کرتے ہوئے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس پر تنبیہ فرما چکے تھے، اور اس سے بہت پہلے اپنے قلبی اشراق کی روشنی میں خود مصنف امام بھی دیکھ چکے تھے، دوسروں کے سامنے اپنے اس باطنی احساس کا اظہار بھی ان الفاظ میں کر چکے تھے کہ "اب مولنا کی وفات قریب معلوم ہوتی ہے" لیکن اسی کے مقدمات جب سامنے آنے لگے، تو ان کا دماغ مسلسل اسی کوشش میں رہا، کہ جو واقعہ قریب آچکا ہے، جہاں تک ممکن ہو، سمجھا جائے کہ ابھی وہ دور ہے، سانس کے یہی دورے جب جلد جلد پڑنے لگے اور سانس یعنی دمہ کی کیفیت پیدا ہو گئی، لیکن وقتی طور پر کچھ افاقہ ہو جاتا، تو وہی ارقام فرماتے ہیں،

"یوں خیال تھا کہ اب یہ مرض ٹھیر گیا (یعنی مزمن ہو گیا ہے) خیر دودہ ہے" (جس سے مایوس ہونے کا کوئی موقعہ نہیں) ص۴۴

گویا مریض نہ ٹھیرے گا، مرض کے ٹھیر جانے سے یہ کیوں نتیجہ نکالا جائے؟ ان کا دماغ یہی سمجھاتا رہا اور دلاسا دیتا رہا کہ

"چند بار شدت مرض ہو کر اللہ تعالیٰ نے شفا دی تھی، اب کی بار بھی وہی خیال باندھے رکھا"

الغرض اتار، چڑھاؤ، گھٹاؤ، بڑھاؤ کے یہ قصے یوں ہی جاری رہے، جس کا ذکر کرتے ہوئے

مصنف امام نے ارقام فرمایا ہے کہ

"دو برس اسی کیفیت پر گذر گئے، کہ گاہ کچھ صورت تخفیف کی ہو کر قدرے طاقت آئی، اور پھر دورہ سانس کا ہوا، اور وہی صورت ضعف کی ہو گئی"

لکھا ہے، کہ ضعف کی یہ صورت جو سانس کے حملہ کے بعد پیش آجاتی تھی، اس کی نوعیت یہ ہوتی تھی کہ

"ایک روز کے مرض میں مدتوں کی طاقت سلب ہو جاتی تھی"

مگر دو سال کے اس الٹ پھیر میں کام کرنے والا اپنے کام میں بہر حال مشغول تھا، پڑھنے والوں کو پڑھاتے بھی رہے، جہاں وعظ و تقریر کی ضرورت ہوتی، وہاں پہنچ پہنچ کر وعظ و تقریر کے سلسلہ کو بھی جاری رکھا، لکھنے کی ضرورت ہوئی، تو اس ضرورت کو بھی پورا فرماتے رہے۔ اور اس کے سوا بھی آنے جانے والے اپنے وساوس و شبہات کو آآ کر پیش کرتے، آپ ان کے خیالات کی تصحیح میں جہاں تک ممکن تھا، سعی و کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے، اسی قصہ سے اندازہ کیجئے جس کا ذکر میر شاہ خاں مرحوم کے حوالہ سے ارواح طیبہ میں کیا گیا ہے، تفصیل کے لئے تو اسی کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ لکھنؤ کے ایک مشہور عالم اور طبیب جن کا نام مولانا حکیم عبدالسلام تھا۔ یہ بھی لکھا ہے، کہ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے کسی زمانہ میں طبیب خاص بھی رہ چکے تھے، ان کو سیدنا الامام الکبیر سے ملنے کا شوق تھا، جو پورا نہ ہوتا تھا، اسی زمانہ میں جب سانس کے دورے جلد جلد پڑنے لگے تھے اور علاج کے لئے دیوبند ہی میں حضرت والا کا قیام تھا، یہ حکیم صاحب وہیں پہنچے، وہ چاہتے تھے کہ کسی اہم علمی مسئلہ پر براہ راست مولانا کی تقریر سے مستفید ہوں، لیکن اس زمانہ میں حالت ایسی تھی کہ اس قسم کی تقریر کا بار ڈالنا کوئی پسند نہ کرتا تھا،

مگر حکیم صاحب کی خوش قسمتی تھی کہ مجلس مبارک میں جس وقت حاضر ہوئے، ایک صاحب سہارنپور کے بھی بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے کسی پادری کے اس اعتراض کا ذکر چھیڑ دیا کہ قرآن ہی میں ہے کہ خدا کے کلام کو کوئی بدل نہیں سکتا، اور اسی میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے، کہ تورات وانجیل میں تحریف کی گئی ہے، لکھا ہے کہ اعتراض کا سننا تھا کہ حضرت والا پر جوش کی سی ایک کیفیت طاری ہو گئی، اس کے بعد کیا ہوا؟ میر شاہ خاں صاحب راوی ہیں، کہ

"دن کے آٹھ بجے سے کھانے کے وقت تک تقریر فرمائی.... ظہر کے بعد حکیم عبدالسلام نے پھر یہی مضمون چھیڑ دیا، اور مولٰنا نے ظہر سے عصر تک یہی مضمون بیان فرمایا، اور مغرب سے عشا تک یہی مضمون بیان فرمایا، اور عشار کے بعد پھر یہی مضمون شروع کر دیا"

پھر اس کا سلسلہ کہاں تک دراز ہوا، میر شاہ خان صاحب کہتے تھے کہ

"جب رات کے بارہ بج گئے، تب میں نے زور سے کہا کہ حکیم صاحب اٹھئے، بہت دیر ہو گئی، اور اب مولٰنا کو آرام کرنے دیجئے، تب حکیم صاحب اٹھے اور تقریر ختم ہوئی[۱]" ص۱۶۴ ارواح ثلاثہ

[۱] میں نے خود بھی یہ واقعہ بہت تفصیل کے ساتھ حاجی امیر شاہ خان صاحب کی زبان سے سنا ہے اور غالباً ارواح ثلثہ میں اسی تفصیل کے ساتھ یہ واقعہ شائع بھی ہو چکا ہے۔ حضرت والا کی تقریر کا ماحصل یہ تھا کہ قرآن کلام اللہ ہے جس کا تکلم حق تعالیٰ نے فرمایا ہے گو اسے لکھ کر بھی دیا گیا ہے، جس سے اس کو کتاب مرقوم بھی فرمایا گیا ہے، اور توراۃ وانجیل کتب الٰہیہ ہیں۔ کلام نہیں ہیں، کلام صفت خداوندی ہے جس میں تبدیل و تغییر ناممکن ہے۔ کتب اور مضامین میں تبدیلی اور ضیاع ممکن ہے نیز کلام تکلم کے بعد جو اور فضا میں محفوظ ہو جاتا ہے، جسے کوئی مٹا نہیں سکتا (چنانچہ آج سائنس دانوں نے اسے تسلیم کر لیا ہے کہ بنی آدم نے اپنی ابتدا آفرینش سے جو کلام کئے ہیں وہ سب جو میں محفوظ ہیں، ماہرین سائنس مدعی ہیں کہ ہم نے آلات کے ذریعہ یہ قدیم آوازیں سن لی ہیں، مگر شور کی شکل میں ایک کلام کو دوسرے کلام سے ہم تمیز نہیں کر سکے ہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

دو سال کی طویل علالت کا یہ آخری زمانہ ہے، کیونکہ اسی روایت میں ہے کہ یہ اس زمانہ کی بات ہے، جب شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کے مکان میں سیدنا الامام الکبیر مقیم تھے، اور یہ معلوم ہے کہ ایام علالت کے آخری دنوں میں آپ اس مکان میں لاکر ٹھیرا دیئے گئے تھے، مرض بھی دمہ اور ضیق النفس کا تھا، جس میں کھانسی کا ایک ٹھسکہ مریض کے ہوش و حواس درہم و برہم کر دیتا ہے، لیکن اب اسے کیا کہئے کہ آٹھ بجے دن سے رات کے بارہ بجے تک بجز ضروری وقفوں کے آپ مسلسل تقریر فرماتے رہے۔ میر شاہ خان موجود تھے، کہتے تھے کہ اس طویل عرصے میں یہ عجیب اتفاق پیش آیا کہ

"اثنائے تقریر میں ایک مرتبہ بھی کھانسی نہ اٹھی، اور تقریر کی برجستگی میں ذرا بھی خلل نہیں آیا"

حکیم صاحب والی اس تقریر کے موقعہ پر تو خیر کھانسی نہ اٹھی، جس کے اسباب خواہ کچھ بھی ہوں، لیکن واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ کھانسی کے اٹھنے کی بھی بسا اوقات پروا نہیں کی جاتی تھی۔ مصنف امام ہی نے لکھا ہے کہ وفات سے چند روز پہلے جب طبیعت کچھ ذرا سنبھل گئی تھی، تو اپنے صاحبزادے مولوی علاء الدین صاحب کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ

"علاء الدین بندہ زادہ کی استدعا پر کچھ پڑھانا بھی شروع کیا،"

---

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) لیکن اس تمیز کے حاصل کرنے کے لئے مساعی اور تجربات جاری ہیں، اور ہم عنقریب دنیا کو وہ خطبہ سنوا دیں گے جو حضرت مسیح علیہ السلام نے حواریوں کے سامنے ارشاد فرمایا تھا، جس سے اندازہ کر لیا جائے کہ جب مخلوق کا کوئی بولا ہوا کلام ضائع نہیں ہو سکتا، اسے فضاء نے چوس رکھا ہے اور وہ اس کے خلاء میں محفوظ ہے، تو خالق کے بولے ہوئے کلام کو کون سی طاقت ہے کہ فنا کر دے، یا بدل ڈالے۔ لیکن کتاب یا مضمون بدلا بھی جا سکتا ہے اور ضائع بھی ہو سکتا ہے۔ ۱۲ محمد طیب غفرلہ

بعد عصر کچھ ترمذی کی ایک دو حدیث ہوتی، جب تک کھانسی نہ اٹھتی بیان فرماتے تھے، اور جب کھانسی کم ہوتی، تب بھی ذرا ٹھیر کر بیان فرماتے، اور جب شدت ہوجاتی، موقوف فرمادیتے۔ ص۴۵

گویا وہی حسرت مرحوم کا مشہور زبان زد عام شعر یاد آجاتا ہے کہ ؎

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
ایک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

مرض بھی ہے، تکلیف بھی ہے، لیکن ع

جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

کا سلسلہ شاید اسی وقت ٹوٹا جب اس خاکدان ارضی ہی سے رشتہ ٹوٹ گیا۔

ادھر سیدنا الامام الکبیر تو اپنے مشاغل میں مصروف تھے، دوسری طرف علالت کی اسی طوالت کی وجہ سے آستانہ قاسمی کے نیاز مندوں کو علاج و معالجہ کے متعلق اپنے ارمانوں کے پورا کرنے کا وسیع موقعہ اس لئے میسر آیا، کہ خلاف دستور اپنی اس بیماری میں حضرت والا نے اپنے آپ کو تیمار داروں کے سپرد فرمادیا تھا، مطلب یہ ہے کہ یوں تو پیدائشی طور پر حضرت والا جیساکہ مصنف امام کا قول نقل کرچکا ہوں،

"معتدل القویٰ اور معتدل المزاج تھے"

اسی لئے بیمار بھی کم پڑتے تھے، اور اتفاقاً کبھی ایسی صورت پیش بھی آجاتی تو علاج و معالجہ کے بہت کم عادی تھے، اس سلسلہ میں کچھ کرتے بھی، تو اس کا اندازہ اسی واقعہ سے کیا جاسکتا ہے، پہلے بھی اس کا ذکر گزرا ہے کہ شدت بخار میں تازہ ٹھنڈے پانی سے جیساکہ حدیثوں میں آیا ہے غسل کرلیتے، اور اسی قسم کی علاجی تدبیروں سے شفایاب بھی ہوجاتے، لیکن اپنی اس آخری علالت میں شروع ہی سے دوسرا رنگ تھا،

مصنف امام نے بھی لکھا ہے کہ

"مولنا نے برخلاف عادت اس مرض میں جو علاج ہوا، اس کو قبول کیا،
جو دوا کھلائی کھالی، جو تدبیر کسی نے کی، اس کو کر لیا" ص۳۴

ابتداء علالت ہی میں آپ دیکھ چکے، کہ جہاز کے ڈاکٹر کے علاج سے بھی آپ نے انکار نہیں فرمایا، اور جس شخص کا حال انگریزوں کی طرف منسوب ہونے والی چیزوں کے متعلق یہ تھا کہ ساری عمر بجائے بٹن کے گھنڈیوں ہی کے استعمال پر اس لئے اصرار کرتے رہے کہ بٹن کو بھی ان ہی چیزوں میں شمار کرتے تھے، جن سے ملک کو انگریزوں نے روشناس کیا تھا، مگر باوجود اس کے کونین جو اس زمانہ میں اچھی خاصی بدنام دوا تھی، انگریزوں کی اس دوا کو بھی بخوشی آپ نے استعمال فرمایا، اور کونین ہی کی وجہ سے انگریز ڈاکٹر کے احسان کو جو شوربے کے لئے مرغ دے کر اس نے کیا تھا، اس احسان کے اٹھا لینے پر بھی آمادہ ہو گئے، اور یہ واقعہ تو خیر جہاز کا تھا، وہاں تو گونہ ایک قسم کی مجبوری کا بھی عذر کیا جا سکتا ہے لیکن وطن واپس ہونے کے بعد پہلے تو آپ کے مشہور فدائی طبیب دیوبند کے رہنے والے حکیم مشتاق احمد صاحب[۱] مرحوم نے آپ کا علاج اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

---

[۱] حکیم صاحب مرحوم کا ذکر مختلف مقامات پر گذر چکا ہے، مولنا طیب صاحب نے اپنے خط میں ان کے متعلق لکھا ہے، کہ

"دیوبندی شیوخ کی برادری میں اول نمبر کے آدمی سمجھے جاتے تھے، حاذق طبیب تھے جنکی طرف سارا شہر رجوع کرتا تھا"

سیدنا الامام الکبیر سے نیازمندی اور فدائیت کا جو تعلق رکھتے تھے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولنا نے لکھا ہے کہ

"حضرت کے خاص لوگوں میں تھے، اور حضرت کے فدائی تھے"

یہ بھی ان ہی کا بیان ہے کہ

"حکیم صاحب مرحوم نے اپنے مال کا وافر حصہ حضرت (سیدنا الامام الکبیر) پر خرچ کیا"

(باقی اگلے صفحہ پر)

اخلاص و نیاز کے غیر معمولی تعلقات کے سوا حکیم صاحب اپنے وقت کے طبیب حاذق تھے، مشہور ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر کبھی کبھی فرمایا کرتے کہ دیوبند میں کل ڈھائی ذہین ہیں، پورے ذہین ایک حکیم مشتاق احمد صاحب اور دوسرے منشی نہال احمد کو فرمایا اور شیخ منظور احمد کو نصف ذہین قرار دیا تھا اور فرماتے کہ جب ان میں سے کوئی میرے وعظ میں سامنے بیٹھ جاتا ہے تو طبیعت کھل جاتی ہے، اور مضامین کی آمد شروع ہو جاتی ہے کہ سمجھنے والے موجود ہیں۔ الغرض دل و دماغ دونوں ہی لحاظ سے علاج کے لئے حکیم صاحب سے بہتر آدمی دیوبند میں اور کون ہو سکتا تھا، جو کچھ ان کے بس میں تھا، ظاہر ہے کہ بھلا کوئی دقیقہ انہوں نے اٹھا رکھا ہوگا، مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"حکیم مشتاق احمد صاحب دیوبندی آخر تک مصروف رہے"

گویا معالج بھی وہی تھے، اور تیمار دار بھی، علاج جب تک ممکن ہوا، کرتے رہے جب اپنی یونانی ترکیبوں سے تھک گئے، تب حضرت والا کے عاشق زار اور مرید خاص ڈاکٹر عبد الرحمٰن صاحب[لہ] نے اپنے آپ کو پیش کیا، حکومت کی طرف سے مظفر نگر جیل

---

(گذشتہ صفحہ سے) اس کا ذکر کر بھی چکا ہوں، کہ آج کل سیدنا الامام الکبیر کے اہل بیت دیوبند کے جس مکان میں سکونت پذیر ہیں۔ حکیم صاحب ہی نے اس کو خرید کر حضرت والا کی اہلیہ محترمہ یعنی مولانا طیب صاحب کی دادی صاحبہ کے نام باضابطہ وثیقہ کے ساتھ نذر کر دیا تھا، اور بعد کو بھی اپنی طرف سے اس مکان کی ترمیم و تعمیر پر کافی روپیہ صرف فرمادیا، بلکہ سیدنا الامام الکبیر کی آخری خواب گاہ کے ہونے کا شرف دیوبند کی جس خاک پاک کو حاصل ہوا، اور آج خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے اہل علم و فضل، اصحاب تقویٰ و دیانت کا جو مقبرہ ہے۔ زمین کا یہ مقدس قطعہ بھی حکیم صاحب ہی کا پیش کیا ہوا ہے، خود بھی سیدنا الامام الکبیر کی پائنتی میں دفن ہیں۔ دار العلوم کے ابتدائی دور میں حکیم صاحب ممدوح اس کے ممبر اور رکن رکین بھی رہے ہیں۔

لہ ڈاکٹر عبد الرحمٰن صاحب مرحوم کے متعلق خاکسار نے مولانا طیب صاحب سے پوچھا تھا کہ کچھ حالات ان کے معلوم ہوں، تو لکھئے، جواب میں مولانا نے ارقام فرمایا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر سے ڈاکٹر صاحب والہانہ تعلق رکھتے تھے۔ حضرت والا کے بال بچوں میں کسی کی بیماری کی خبر جوں ہی ان تک پہنچی (باقی اگلے صفحہ پر)

کے پیشکار ی ڈاکٹر تھے، یہی نہیں کہ وہ صرف معالج مقرر ہوئے، بلکہ مولٰنا حکیم منصور علی خاں حیدرآبادی کا بیان ہے کہ

"ڈاکٹر عبد الرحمٰن صاحب نے علاج کے واسطے اپنے پاس مظفرنگر میں مولٰنا صاحب کو رکھا، اور بہت خدمت، و تیمارداری کی"

اسی زمانہ میں حکیم صاحب ممدوح مرادآبادی اپنے وطن سے حضرت والا کی عیادت کے لئے مظفرنگر ڈاکٹر عبد الرحمٰن صاحب کے گھر پہنچے تھے، اطلاع دی ہے کہ

"قدرے افاقہ تھا، مگر اصل مرض باقی تھا، ٹھسکا اور خفیف بخار رہتا تھا" ص۱۹۰

الغرض دو سال کی اس طویل مدت میں طب یونانی، اور ڈاکٹری دونوں طریقہ ہائے علاج کی آزمائش کا موقعہ آپ کے ان جاں باز خدام کو ملا، حضرت والا نے بھی اپنے آپ کو ان لوگوں کے حوالہ کر دیا تھا، جو چاہا کھلاتے رہے، پلاتے رہے۔

نہیں کہا جا سکتا کہ دو سال کے اس طویل عرصہ میں علاج ان ہی دونوں بزرگوں یعنی حکیم مشتاق احمد صاحب اور ڈاکٹر عبد الرحمٰن صاحب ہی تک محدود رہا، بلکہ مصنف امام نے اپنی کتاب میں جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"یونانی طبیبوں نے ہر قسم کا علاج کیا، ڈاکٹروں نے ہر طرح کی تدبیر کی"

---

(گذشتہ صفحہ سے) دوائیں لے کر دیوبند پہنچ جاتے، ضرورت محسوس ہوتی، تو اپنے ساتھ مریض کو مظفرنگر لے جاتے اور صحت کے بعد واپس کرتے۔ سیدنا الامام الکبیرؒ کی وفات کے بعد غالباً بعد حصول پنشن گنگوہ میں حضرت گنگوہی کے زیر سایہ قیام اختیار کر لیا تھا، مولٰنا نے لکھا ہے کہ بچپن میں میں گنگوہ حاضر ہوتا، تو مجھے اپنے گھر لے جاتے اور بڑی خاطر مدارات کرتے۔ ڈاکٹر صاحب کا گنگوہ میں یہ دستور تھا کہ ہر تیسرے روز پلاؤ پکوا کر حضرت گنگوہی کی خدمت میں حاضر کرتے۔ حضرت کچھ تناول فرما کر دوسروں میں تقسیم کر دیا کرتے، اور مولٰنا طیب صاحب جیسے بچے تو یہ ماُلش ان ہی کے لئے مختص ہو جاتا تھا ۱۲

ان الفاظ سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ایک ہی طبیب اور ایک ہی ڈاکٹر تک علاج محدود نہ تھا، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حکیم مشتاق احمد صاحب اپنے ہم پیشہ اطبار، دیوبند و بیرون دیوبند سے بھی مشورہ لے کر علاج کرتے رہے، اسی طرح ڈاکٹر صاحب جب اپنی ذاتی تدبیروں سے تھک جاتے ہوں گے، تو دوسرے ڈاکٹروں کی آرار حاصل کرتے ہوں گے، اور بات صرف یونانی و ڈاکٹری ہی کی حد تک محدود نہ تھی، مصنف امام کے ان الفاظ کا یعنی

"ہندی ادویہ، کشتے، رس وغیرہ برتے"

مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے تیسرے طریقۂ علاج ویدک سے بھی جہاں تک استفادہ ممکن تھا، فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی، الغرض وہی بات جس کی طرف حضرت والا کے ذاتی حالات کے خاتمہ میں طبقات ابن سعد کی اس روایت کو پیش کرتے ہوئے، یعنی آخر زمانہ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ بیمار ہونے لگے تو دیکھا گیا تھا کہ

كانت العرب تنعت له فيتداوى بما تنعت العرب وكانت العجم تنعت له فيتداوى

ص۱۱۶ الجزء الاول من القسم الاول

عرب کے باشندے دواؤں کی نشان دہی کرتے، آپ ان کی بتائی ہوئی دواؤں کو بھی استعمال کرتے، اور عجم (غیر عرب) کے لوگ بھی دوائیں بتاتے، تو ان کو بھی استعمال کرتے۔

عرض کیا گیا تھا، کہ اختیاری اعمال و افعال میں پیروی کا جب ارادہ کیا جاتا ہے تو پیروی کرنے والوں کے سامنے اسی کا صلہ اس شکل میں بھی پیش ہوتا ہے، کہ غیر اختیاری امور میں بھی اس کو نمونہ سے حصہ دیا جاتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں، سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی اس دعوے کی کیسی جیتی جاگتی تصویر ہے، صحت تو صحت، مرض

اور بیماری میں جو مستحق تھا، اس کو اپنے نمونہ سے حصّہ بخشا جا رہا ہے، وہاں بھی علاج کے جن طریقوں سے عرب والے مانوس تھے اس کو بھی اختیار کیا گیا، اور عرب کے باہر عجم والوں سے اسی علاج و معالجہ کے سلسلہ میں جو مشورہ ملتا، اسے بھی قبول کیا جاتا تھا۔ یہاں بھی ملاحظہ فرمائیے، عشق و محبت کی کرشمہ سازیوں کا مطالعہ بچشم عبرت کیجئے کہ سرے سے علاج و معالجہ کی ہی جس کی نگاہوں میں چنداں اہمیت نہ تھی، اسی نے اپنی آخری علالت کے ان دنوں میں یونانی و ڈاکٹری و یدک، دیسی بدیسی الغرض علاج کے سارے مروجہ طریقوں کی آزمائش کے لئے اسی نے اپنے آپ کو تیمار داروں کے سپرد کر دیا۔ علاج کرنے والے تو سمجھ رہے تھے کہ ہم اس کا علاج کر رہے ہیں وہ شفاء کی امیدیں باندھ رہے تھے، لیکن در پردہ اپنے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری علالت کے نمونوں میں سے جو حصہ اس کے لئے مقدر تھا آپ دیکھ رہے ہیں اسی سعادت سے بہرہ اندوزی کا موقعہ غیب سے گویا مہیا کیا جا رہا تھا۔

ذاتی حالات ہی کے سلسلہ میں اس کا ذکر بھی کر چکا ہوں، کہ علاج کے ان تمام طریقوں میں سیدنا الامام الکبیر تک جیسی اعلیٰ اور قیمتی دوائیں ہر طرف سے بہم پہنچائی جا رہی تھیں، ان کے لئے اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ مصنف امام جیسے محتاط بزرگ کے قلم سے ایسے الفاظ نکل پڑے ہیں، کہ ہم ان الفاظ کو اگر استعمال کریں تو شاعری کے سوا غالباً انہیں اور کچھ نہ سمجھا جائے۔ آخر ان کے یہ فقرے جنہیں پہلے بھی نقل کر چکا ہوں، یعنی

"وہ دوائیں مولانا کے لئے میسر ہوئیں، کہ جو امراء کو بھی شاید بدشواری میسر آتیں"

یا اس سے بھی آگے بڑھ کر

"اور دیسا علاج ہوا کہ جو بادشاہوں کو بھی شاید ہی نصیب ہو"

یہ دوسروں سے سنی سنائی خبریں نہیں ہیں، بلکہ اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھ رہے تھے، اپنی دینی اور علمی ذمہ داریوں کے ساتھ اسی کی تعبیر مذکورہ بالا الفاظ میں وہ فرمارہے ہیں۔ اسی موقعہ پر لکھنؤ کی ککڑیوں کا وہ قصہ بھی فقیر نے یاد دلایا تھا جس کا ذکر ارواح ثلاثہ میں کیا گیا ہے، یعنی حضرت مولانا عبد الحیؒ فرنگی محلی مرحوم تک کسی ذریعہ سے یہ خبر پہنچی کہ سیدنا الامام الکبیر کے دل میں ککڑیوں کے کھانے کی خواہش پیدا ہوگئی ہے۔ جو دیوبند اور اطراف دیوبند میں آج کل نہیں مل رہی ہیں۔ بیان کیا گیا تھا کہ سننے کے ساتھ ہی لکھنؤ سے ایک دفعہ نہیں، بلکہ متعدد بار بذریعہ پارسل ککڑیوں کے بھجوانے کا نظم مولانا فرنگی محلی نے فرمایا، اور وہ برابر حضرت والا کی خدمت میں پہنچتی رہیں، میں نے اس وقت بھی عرض کیا تھا، کہ کسی حکمرانِ وقت، یا بادشاہ کے لئے بھی یقیناً مولانا فرنگی محلی اس زحمت کو برداشت کرنے پر شاید ہی آمادہ ہوتے۔ اسی لئے مصنف امام نے جو کچھ ارقام فرمایا ہے، کم از کم مجھے تو اس پر تعجب نہیں ہوتا۔

مگر یہ سب کچھ ہوتا رہا، عرب و عجم یا دیسی بدیسی علاج و معالجہ کے ہر طریقہ کا ممکنہ وسیع سے وسیع پیمانہ پر انتظام کرنے والے کرتے رہے، سچ تو یہ ہے کہ اپنے خون، اور شاید ان عاشقان صادق کی جان کی بھی ضرورت ہوتی، تو اس کے پیش کرنے میں غالباً وہ پس و پیش نہ کرتے[۱]۔ مگر بقول مصنف امام

"مرض رفع نہ ہوا، دو برس اسی کیفیت پر گذر گئے، کہ گاہ کچھ صورت تخفیف کی ہو کر قدرے طاقت آئی، اور پھر دورہ سانس کا ہوا، اور وہی صورت ضعف کی ہو گئی" صـ۴۲

---

[۱] آگے اس کا ذکر کیا بھی جائے گا کہ ظاہری اسباب سے مایوسی کے بعد ہمارے مصنف امام مولانا محمد یعقوب صاحب ہی نے دربار الٰہی میں یہ درخواست پیش کی تھی کہ میری بقیہ عمر جتنی مدت باقی ہے، وہ مولانا کو عطا فرمادی جائے، جان کے پیش کرنے کے سوا آپ ہی بتائیے کہ اسے اور کیا سمجھنا چاہئے ۱۲

تاہم ان تجربوں کے بعد بھی مصنف امام کو نہ خود اپنا اشراقی احساس ہی یاد آرہا تھا، اور رخصت کرتے ہوئے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ فرمایا تھا، اس کا جو واقعی مطلب تھا، نہ اسی کی طرف ان کا ذہن منتقل ہوا، دوا و تدبیر کی بے اثری کے مسلسل مشاہدوں نے آخر میں جس کیفیت کو ان کے قلب میں پیدا کیا تھا، اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے کہ

"ہر چند صحت اور نجات کی امید پوری نہ تھی"

گویا پہلے جو ان کا خیال تھا کہ جس طرح پہلے بھی خطرناک طور پر علیل ہو جانے کے بعد سیدنا الامام الکبیر شفایاب ہو چکے ہیں، اب کی بار بھی یہی صورت انشاء اللہ پیش آئے گی، اس خیال میں گونہ تبدیلی پیدا ہوئی، شفا کی کامل توقع کی جگہ کچھ کچھ نا امیدی کی بھی جھلک محسوس ہونے لگی، مگر پوری امید نہ سہی، کچھ نہ کچھ امید صحت کی اب بھی باقی ہی تھی۔

سچ تو یہ ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر کا جمال جہاں آرا جن لوگوں کی "جنت نگاہ" اور آپ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والا ایک ایک فقرہ "فردوس گوش" بن جاتا ہو، انصاف کی بات یہی ہے، اپنے سامنے سے نگاہ کی اس جنت، اور گوش کے اس فردوس کے ہٹ جانے کا تصور بھی جن لوگوں کے لئے ناقابل برداشت تھا، وہی قطعی طور پر اپنے آپ کو نا امیدی پر آخر کیسے راضی کر سکتے تھے۔ البتہ رجاء کے ساتھ اب کچھ کچھ خوف، امید کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی "دہشت" کے جھونکے بھی ان کے قلوب پر گذر جاتے تھے، اور وہ چاہتے تھے کہ بجائے ٹھیرنے کے وہ گذر ہی جائیں لیکن دن گذرتے جاتے تھے، اور واقعات نا امیدی ہی کے پلّے کو زیادہ جھکاتے چلے جاتے تھے، شہادت اور عالم محسوس ہی میں نہیں، بلکہ غیب کے نامحسوس دوائر تک سے اشارہ پانے والوں کو اس قسم کے اشارے جب ملنے لگے، مثلاً کہا جاتا ہے،

مولٰنا طیب صاحب نے اپنی یادداشت میں اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے کہ

"حافظ بہادر دیوبندی نے دو ماہ پیش تر از وفات خواب دیکھا کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے دایاں ہاتھ حافظ بہادر کے سر پر رکھا اور بائیں ہاتھ سے بہت زور سے اپنی دائیں پسلی کو پکڑا، حافظ بہادر نے عرض کیا کہ حضرت آپ نے پسلی کیوں پکڑی، فرمایا میری پسلی میں شدت سے درد ہے"

حافظ بہادر کی آنکھ اس کے بعد کھل گئی، خواب سے وہ غیر معمولی طور پر متاثر تھے، سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں حاضر ہو کر جو کچھ خواب میں دیکھا تھا، بیان کیا، مولٰنا طیب صاحب نے ارقام فرمایا ہے کہ خواب کو سننے کے بعد اسی کی تعبیر کے متعلق اس اصولی مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے کہ

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دائیں پسلی سے مراد علماء باعمل ہیں، اور بائیں پسلی سے مراد فقراء"

خواب کی تعبیر یہ دی گئی کہ

"معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں میں کسی بڑے عالم کا انتقال ہوگا"

اہل مجلس جو بیٹھے ہوئے تھے سب ہی نے یہ تعبیر سنی۔ لیکن تعبیر دینے والا ہی خود اس خواب کی تعبیر ہے، بھلا اس کی طرف اپنے ذہن کو منتقل ہونے کی کون اجازت دے سکتا تھا؟

حالت تو یہ تھی، خواب ہی کا ایک قصہ ہمارے میر شاہ خاں مرحوم بیان کرتے تھے یہ رؤیا خود ان ہی کی تھی، خاں صاحب مرحوم کو حضرت والا کی ذات مبارک سے جو والہانہ عقیدت تھی، جو اس سے واقف ہیں، غالباً ان کے اس خواب پر انھیں تعجب نہ ہوگا، کہتے تھے کہ اسی زمانہ میں جب حضرت والا کی علالت خطرناک صورت اختیار

کر چکی تھی۔

"میں نے دیکھا کہ کوئی صاحب جو اپنی ظاہری شکل و صورت سے معلوم ہوتے تھے کہ اہل اللہ کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، میں نے ان کو دیکھ کر عرض کیا کہ ہمارے مولانا محمد قاسم صاحب کو اس شدت کی تکلیف مرض کی کیوں ہو رہی ہے، انہوں نے تین مرتبہ فرمایا کہ کیا مولوی محمد قاسم صاحب کے مثل کوئی دوسرا شخص بھی ہے؟"

پھر خود جواب دیا کہ "نہیں ہے"

میر شاہ صاحب فرماتے تھے کہ

"میں نے خواب ہی میں ان بزرگ سے عرض کیا کہ اسی وجہ سے تو میں بھی عرض کرتا ہوں کہ باوجودیکہ مولانا بے مثل ہیں، پھر ان کو تکلیف کیوں ہے؟"

بزرگ صاحب نے خان صاحب کو جواب دیا کہ

"مولانا کو کچھ تکلیف نہیں ہے، اور نہ کوئی مرض ہے"

اسی کے ساتھ خواب ہی میں خان صاحب کو ان ہی بزرگ صاحب نے مطلع کیا کہ

"ایک بہت بڑا معاملہ درپیش ہے، اور اسی کی وجہ سے ظاہر میں معلوم ہوتا ہے کہ مولانا بیمار ہیں"

خان صاحب کہتے تھے کہ میں نے تب دریافت کیا، "معاملہ کیا ہے؟ جواب میں ان سے کہا گیا کہ

"مولانا نے جناب باری میں یہ درخواست پیش کی ہے، مجھ کو جو حضور نے طلب فرمایا ہے، تو میں بخوشی حاضر ہوں، مگر میری ایک عرض

ہے کہ جس خدمت پر یہ بندہ دنیا میں مامور کیا گیا تھا، اس خدمت
پر بندہ کے روبرو دوسرے شخص کو مقرر فرما دیا جائے"
بزرگ صاحب نے کہا کہ بارگاہ الٰہی سے مولٰنا کی اس عرضداشت کا
"جواب اب تک نہیں حاصل ہوا ہے"

مولٰنا طیب صاحب نے "منامی یادداشت" میں خاں صاحب مرحوم کی اس رؤیاء کا ذکر کیا ہے، تعبیر تو اس خواب کی جو کچھ بھی ہو، لیکن "وابستگان دامن قاسمی کے نفسیات کی بھی غمازی جہاں تک میرا خیال ہے، یہ خواب کر رہا ہے۔ بزرگ صاحب سے خاں صاحب یہ نہیں پوچھتے کہ اس مرض کا انجام کیا ہوگا۔؟

حضرت والا کی تکلیف کی وجہ سے جھنجلاہٹ کی جو کیفیت ان کے دل میں پائی جاتی تھی، اسی کے زیر اثر دریافت کرتے ہیں تو صرف یہی دریافت کرتے ہیں کہ ہمارے حضرت کو اتنی تکلیف کیوں ہے؟ اور کیا تعجب ہے، کہ آخر میں بزرگ صاحب نے جو یہ خبر خاں صاحب کو خواب میں دی کہ مولٰنا کی عرضداشت کا جواب بارگاہ الٰہی سے ابھی تک حاصل نہیں ہوا ہے خواب کے اس آخری جزء سے بیداری میں خاں صاحب نے یہ امید قائم کر لی ہو، کہ طلبی کے مطابق روانگی کا وقت ابھی قریب نہیں ہے، کم از کم جواب آنے تک تو تاخیر کا موقعہ ان کے ذہن نے ڈھونڈھ ہی لیا ہوگا۔

مگر وقت جلد جلد گزر رہا تھا، اور قرآن کا "کتاب مؤجّل" (موقت نوشتہ) اسی کے گذرنے کے ساتھ قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ وداعی حج سے واپسی پر دو سال کی مدت بھی گذر چکی تھی،

اسی عرصہ میں سہارنپور سے خبر آئی، ناشر کتب الآثار والحدیث مصحح ومحشی صحیح بخاری حضرت مولٰنا احمد علی صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ پر فالج کا دورہ پڑ گیا ہے، حضرت

سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ سے گذر چکا کہ سیدنا الامام الکبیر صرف تلمذ ہی کا تعلق نہیں رکھتے تھے، بلکہ حدیث کی کتابوں کی خدمت میں مدت تک ان کے رفیق کار بھی رہ چکے تھے، بخاری شریف کے آخری حصہ کی تحشیہ کا کام حضرت مولنٰا سہارنپوری کے حکم سے حضرت والا نے انجام دیا تھا، ان ہی گوناگوں تعلقات، اور قلبی ارتباط کا نتیجہ یہ ہوا، کہ باوجود علالت کے مولنٰا احمد علی صاحب کی عیادت کے لئے سہارنپور جانے پر سیدنا الامام الکبیر مصر ہوئے، اصرار اتنا زیادہ تھا کہ تیمارداروں کو بھی راضی ہونا پڑا۔ مصنف امام نے لکھا ہے، کہ مولنٰا احمد علی صاحب کی عیادت کے لئے

"سہارنپور تشریف لے گئے"

یہ خبر بھی انہوں نے دی ہے، کہ مولنٰا احمد علی صاحب کو دیکھنے، اور ان کے علاج کے لئے

"ڈاکٹر، حافظ عبدالرحمٰن صاحب کو مظفرنگر سے بلایا تھا"

گویا ڈاکٹر صاحب تو مظفرنگر سے ریل پر سوار ہوئے، اور دیوبند کے اسٹیشن سے حضرت والا ان کے ہمراہ سہارنپور تشریف لے گئے، لیکن معلوم ہوتا ہے، کہ لوگوں کے سمجھانے بجھانے یا خود مولنٰا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اصرار پر سہارنپور میں زیادہ قیام نہ فرما سکے، بلکہ بقول مصنف امام

"اسی روز گئے، اور شام کو واپس ریل میں آئے"

ایک صحت مند، تندرست آدمی کے لئے تو دیوبند سے سہارنپور، اور سہارنپور سے اسی دن دیوبند واپس ہو جانے میں تو کسی زحمت کا اندیشہ نہیں ہو سکتا، لیکن حضرت والا جس حال میں گئے، اور آئے، اسکا جو نتیجہ ہو سکتا تھا، وہی ہوا، مصنف امام نے خبر دی ہے، کہ دیوبند واپس ہونے کے بعد

"تکان کے سبب طبیعت علیل ہو گئی"

علیل تو تھے ہی، بظاہر مراد ان کی یہ ہے، کہ تکان کی وجہ سے طبیعت زیادہ بگڑ گئی، یوں بھی آپ سوچئے، دیوبند کا اسٹیشن بھی قصبہ سے کافی فاصلہ پر ہے، اور یہی حال سہارنپور کے شہر کا اسٹیشن سے ہے۔ صبح کو دونوں مقامات کے ان فاصلوں کو طے کر کے شام کو اسی راستہ سے واپسی سواری ہی پر کیوں نہ ہو، ایک ایسے شخص کے لئے جو مہینوں سے بیمار ہو، جس حد تک تعب اور تکان کا سبب ہو سکتی ہے، ظاہر ہے، حسب دستور پھر کچھ تدبیریں کی گئیں، گو نہ طبیعت بظاہر پھر کچھ بحال ہو گئی، حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کی عیادت اس روا روی کے ساتھ کہ اسی دن گئے، اور واپس آ گئے، سیدنا الامام الکبیر کے جی کو لگی ہوئی تھی، معمولی افاقہ جوں ہی کہ آپ کو کچھ محسوس ہوا، پھر حضرت سہارنپوری کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے تڑپنے لگے، بقول مصنف امام

"پھر اسی عرصہ میں سہارنپور کا قصد کیا

اور اسی قصد کے مطابق عمل کا عزم بالجزم بھی فرما لیا گیا، جس میں مزاحمت کی ہمت کوئی نہ کر سکا، سہارنپور پہنچنے کے بعد دیکھا گیا کہ فالج کے آثار میں بہت کچھ تخفیف ہو چکی ہے یعنی مصنف امام کے الفاظ میں

"جناب مولوی احمد علی صاحبؒ کو تخفیف اصل مرض (فالج) میں ہو گئی تھی، مگر بخار اور ضعف شدید تھا"

پہلی دفعہ جب حاضری ہوئی تھی، فالج کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ مولانا احمد علی صاحب اپنے دل کی آرزو ظاہر نہ کر سکے، لیکن اب کی دفعہ فالج کے آثار گھٹ چکے تھے، بول چال کی قدرت پیدا ہو چکی تھی، واللہ اعلم دونوں میں کیا راز تھا؟ استاد نے شاگرد سے کچھ کہا، اور باوجود خود بیمار ہونے کے سیدنا الامام الکبیر نے سر تسلیم خم کر دیا، مولانا احمد علی صاحبؒ کی طرف سے فرمائش ہوئی، کہ کچھ دن میرے پاس ٹھیر و،

حضرت والا ٹھیر گئے، یہی مطلب ہے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"مولوی صاحب (یعنی مولانا احمد علی صاحب) ٹھیرنے کے باعث ہوئے"

یا تو پہلی دفعہ کی عیادت میں اسی دن واپسی ہوگئی، اور اب سنئے راز و نیاز کی ان باتوں کو کون جانے مصنف امام نے اطلاع دی ہے کہ ٹھیرنے کی خواہش مولانا احمد علی صاحبؒ کی طرف سے جو پیش ہوئی، تو

"دو ہفتہ وہاں قیام فرمایا"

یہ بھی انہیں نے لکھا ہے کہ

"اتنا قیام خلاف عادت تھا"

جو کچھ ہونے والا تھا، اسے کون روک سکتا تھا، لیکن ظاہر اسباب کی رو سے کہا جا سکتا ہے کہ جس قسم کی دیکھ بھال، احتیاط اور تدبیر کی آسانیاں مستقر دیوبند میں میسر تھیں، ان کا سفر کی حالت میں مہیا ہونا ظاہر ہے کہ سہل نہ تھا، خواب و خور، نشست و برخاست کی پابندیوں کا نباہنا، یوں ہی اس قسم کے موقعوں پر آسان نہیں ہوتا، اور حضرت والا کی طبیعت کا جو رنگ تھا، آنے جانے والوں کی خاطر سے اشراق و چاشت کی نمازوں سے جو دست بردار ہو جاتا ہو، سمجھا جا سکتا ہے کہ سہارنپور کے رہنے والوں میں ایک دو دن نہیں دو ہفتے ٹھیرنے کا مغتنم موقعہ جب مل گیا تھا، تو لوگوں نے جیسا کہ دستور ہے، آپ کے ساتھ کیا رعایت کی ہوگی، اسی قسم کی بے احتیاطیوں کا نتیجہ جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے، بظاہر یہ ہوا کہ

"وہاں دورہ ہوا"

دورے سے غالباً مراد وہی سانس کا دورہ معلوم ہوتا ہے، معمولی بے احتیاطی

سے جو ابھر آتا ہے، اور یہ دورہ تو خیر معمولی تھا، جس کے حضرت والا گویا عادی ہی ہو چکے تھے، لیکن سہارنپور کے اس دورے کے ساتھ مصنف امام نے اطلاع دی ہے کہ

"ساتھ ہی اس کے ذات الجنب بھی ہوا"

مزمن مرض کے ایک مریض پر ذات الجنب کا حملہ؟ اس کی نزاکت کا بھلا کون اندازہ کر سکتا ہے، اب ایک طرف حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ اپنے بستر علالت پر فریش تھے، اور دوسری طرف ان کے تلمیذ سعید قدیم رفیق کار اپنے بالین علالت پر ذات الجنب کی تکلیف میں تلملا رہے تھے، مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"یہاں (دیوبند) دوسرے دن خبر ہوئی"

سناٹا چھا گیا، ان ہی کا بیان ہے کہ

"اسی روز حافظ انوار الحق صاحب روانہ ہوئے، اور صبح کو مولوی صاحب کو (یعنی سیدنا الامام الکبیر کو) ریل میں لے آئے"

جس حال میں دیوبند واپسی ہوئی تھی، مصنف امام نے اس کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے

"مگر کیا آئے، کہ سانس نہ آتی تھی"

گویا یالادی کی سی ایک کیفیت پیدا ہو گئی، وداعی حج سے واپسی پر دو سال گذر جانے کے بعد تقریباً دو مہینے ربیع الاول اور ربیع الثانی کے گذر چکے تھے، یا شاید ربیع الثانی کی آخری تاریخیں ہوں، جب سہارنپور سے ذات الجنب کے حملہ کے بعد آپ دیوبند لائے گئے، صحیح تاریخ کا تو پتہ نہ چل سکا، بظاہر ایک ہفتہ کا وقفہ درمیان میں اور گذرا، وقفہ کے اسی زمانہ میں جو ممکنہ تدبیریں

تھیں ہو کرنے والے انہیں اختیار کرتے رہے، ان ہی تدبیروں میں پہلی تدبیر ذات الجنب کے لئے جیساکہ مصنف امام نے لکھا ہے یہ کی گئی کہ

"فصد لی"

یوں فصد دے کر کچھ خون نکالا گیا، ان ہی کا بیان ہے، یہ فوری تدبیر وقتی طور پر کچھ کارگر بھی ثابت ہوئی، یعنی بقول ان ہی کے

"درد موقوف ہوا"

مگر درد میں یہ سکون بھی وقتی سکون ثابت ہوا۔

"پھر کچھ درد کا اثر معلوم ہوا"

فصد کے بعد دوسری تدبیر خون ہی کے نکالنے کی یہ کی گئی کہ

"جونک لگائی"

لکھا ہے کہ اس کے بعد

"دو تین دن طبیعت صاف رہی"

بظاہر درد کی تکلیف کا اعادہ شاید ان دو تین دنوں میں نہیں ہوا، دیوبند قصبہ تھا، بعض دواؤں کی ضرورت تھی جو وہاں نہ مل سکیں، آدمی دلی دوڑایا گیا، جو اسلئے پیر دوائیں لے کر دیوبند پہنچا، یہ دوائیں استعمال کرائی گئیں، دلی کی ان دواؤں کے استعمال سے جو غرض تھی، اس کا ذکر کرتے ہوئے مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"دلی سے کچھ دوائیں مقوی آئی تھیں، ان کا استعمال ہوا، ضعف نہایت تھا، بات کرنی دشوار تھی"

گویا اسی ضعف کا ازالہ ان مقوی دواؤں سے مقصود تھا، مگر بقول ان ہی کے۔

"اس میں (یعنی ان مقوی دواؤں کے استعمال کرنے میں) حرارت کو شدت ہو گئی"

یہی حرارت بڑھی، اور بڑھ کر اس درجہ تک پہنچی، کہ شدت حرارت کی وجہ سے بقول ان ہی کے

"کبھی کبھی غفلت ہو جاتی تھی"

پہلے تو صرف ضعف تھا، کہ بات کرنا چاہتے تھے، لیکن شدت ضعف کی وجہ سے کر نہیں پاتے تھے، اب مزید غفلت کا اضافہ حرارت کے بڑھ جانے کی وجہ سے ہو گیا، غفلت کی اس حالت کو دیکھ کر مصنف امام ہی نے لکھا ہے کہ

"ایک ملیّن دیا"

لیکن جب اس کا اثر ظاہر نہ ہوا، تو وہی خبر دیتے ہیں کہ

"رائے ہوئی کہ پھر ملیّن دیا جائے"

جو دیا گیا، اور اس کا اثر بھی نمایاں ہوا، ان ہی کا بیان ہے کہ

"دو دست ہوئے"

یہ تو ملین دینے کا اثر تھا، لیکن دست آجانے کی وجہ سے لکھا ہے،

"غفلت کو شدت ہو گئی"

مصنف امام کا بیان ہے کہ

"یہ منگل کا دن تھا"

غفلت کی شدت لمحہ لمحہ سے بڑھتی ہی چلی جاتی تھی، تاہم وہی لکھتے ہیں کہ

"ظہر کے وقت تک جواب دیتے تھے، مگر ہوش نہ تھا"

"ہوش نہ تھا" ظاہر ہے کہ "غفلت" ہی کے لفظ کی یہ شرح ہے، لیکن پوچھنے والوں کو چونکہ جواب کچھ نہ کچھ مل رہا تھا، اس لئے سمجھا گیا کہ یہ غفلت اور بیہوشی ابھی حد سے نہیں گذری ہے، مگر جب ظہر کی نماز کا وقت آگیا، اور وہی جس کی ساری زندگی ہی کسی کے قدموں پر سر رگڑنے میں بسر ہوئی تھی، "حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ" کی آواز پر

دیکھنے والوں نے کبھی نہیں دیکھا کہ حالت بدل نہ گئی ہو، لیٹے ہوئے ہوتے تو اٹھ بیٹھتے اور بیٹھے ہوتے، تو کھڑے ہو جاتے، کھڑے ہوتے تو چل پڑتے، جہاز میں جس وقت تے پرتے کے مسلسل دورے پڑ رہے تھے، ابھی کچھ دیر پہلے سن چکے کہ "نماز کے وقت ہر چیز سے بے پروا ہو کر جس طرح ممکن تھا، اسے ادا کرتے" لیکن آہ! کہ آج اسی کو پکارنے والے پکار رہے ہیں، یاد دلا رہے ہیں، کہ ظہر کی نماز کا وقت ہے۔ مصنف امام موجود تھے، لکھتے ہیں کہ

"نماز کے لئے کہا، تو سوائے "اچھا" کے اور کچھ نہ کر سکے، نہ تیمم کی طرف توجہ ہوئی، نہ نماز کی طرف"۔

تب سمجھا گیا کہ غفلت اپنے آخری حدود سے گذر چکی ہے، تکلیفی ہوش و حواس سب غائب ہو چکے ہیں، وقتی نمازوں کا پڑھنے والا اب ؎

عاشقاں ھم فی صلاۃ دائمون

کے حال میں غرق ہے، رحمۃ اللہ علیہ۔

مصنف امام جو صحت کی پوری امید سے دست بردار ہونے کے بعد اس وقت تک کچھ نہ کچھ آس لگائے ہوئے تھے۔ نماز کی طرف سے بھی بیہوشی اور غفلت کی اس حالت میں بے توجہی دیکھ کر کتاب میں تو یہی لکھا ہے، کہ

"تب ایک صورت یاس کی ہوئی"

جس کا مطلب یہی ہوا کہ "کامل یاس" کے تصور سے اب بھی اپنے آپ کو وہ معذور ہی پا رہے تھے، بجائے "کامل یاس" کے اس حال کو بھی وہ یاس کی ایک صورت ہی قرار دیتے رہے۔

منگل کا دن جس وقت ختم ہو رہا تھا، تو ان ہی کی یہ اطلاع ہے، کہ پوچھنے والوں کو کچھ جواب جو مل جاتا تھا،

"وہ جواب بھی موقوف ہو گیا"

اللہ اللہ میرا قلم جب کانپ رہا ہے، انگلیاں تھرا رہی ہیں، خدا ہی جانتا ہے کہ مصنف امام کا اس وقت کیا حال ہو گا، جب کاغذ ان الفاظ سے سیاہ ہو رہا تھا۔

"ایک تشنج کی آمد شروع ہوئی، اس کو نزع سمجھا، اور یوں جانا کہ اب وقت آخر ہے"

مگر جیسا کہ ان ہی کا بیان ہے کہ اس کیفیت میں ذرا طوالت پیدا ہو گئی، منگل کا دن ختم ہو کر بدھ کی رات داخل ہو چکی تھی، وہی لکھتے ہیں کہ

"وہ رات اور دن، اور اگلی رات، اور دوپہر جمعرات کی اسی کیفیت پر گذری"

گویا بدھ کی رات کے ساتھ اس کا دن بھی، اور دن کے بعد جمعرات کی شب، کے بعد دوپہر تک جمعرات کا دن بھی اسی کیفیت میں گذرا۔

عالم محسوس اور شہادت میں رہنے والوں کے سامنے تو یہ جگر خراش، اور روح گداز فاجعہ پیش تھا، لیکن غیب میں کیا ہو رہا تھا، ان ہی چند دنوں، یا ان سے ایک دو دن پہلے بعضوں پر کبھی کبھی بحالت خواب کوئی تجلی اس کی پڑ جاتی تھی، سیدنا الامام الکبیر کے خادم خاص حاجی محمد یٰسین دیوبندی جن کا ذکر متعدد حیثیتوں سے گذر چکا ہے، مولنٰا طیب صاحب کی یادداشت میں ہے کہ ان ہی حاجی محمد یٰسین صاحب کو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے سرفرازی ہوئی، حاجی صاحب پر ظاہر کیا گیا کہ

"واسطے عیادت مولانا مرحوم کے تشریف لائے ہیں"

اسی طرح دارالعلوم کے ایک طالب علم مولوی احمداللہ نامی جو نجیب آباد کے رہنے والے تھے، انہوں نے تو جمعرات ہی کے دن چند گھنٹے پہلے خواب میں دیکھا،

مدرسہ کے احاطہ میں ایک مکلف مکان ہے، جس کے اندر ایک مرصع کرسی بچھی ہوئی ہے، اس پر سرورکائنات خاتم المرسلین رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ فرما ہیں، اور آپ کے اردگرد آپ کے خلفاء اربعہ راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کھڑے ہیں۔ دوسری طرف ایک پرا ان کو فرشتوں کا بھی نظر آیا، مولوی احمد اللہ نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا، کہ کیسے تشریف آوری ہوئی، جواب میں ارشاد ہوا کہ

"مولوی محمد قاسم صاحب کو لینے آیا ہوں"

مولوی احمد اللہ کا بیان ہے کہ

"سامنے ایک پلنگ پر سوار دیکھا کہ مولنا آئے"

اس کے بعد مولوی احمد اللہ صاحب کو جو کچھ دکھایا گیا، ان ہی کے الفاظ میں سنئے، کہتے تھے، میں نے دیکھا

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مولنا کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے فرما رہے ہیں

اے حبیب آنے میں کیا دیر ہے"

مولنا طیب صاحب کی یادداشت میں ہے کہ نزع کی کشمکش کے اختتام سے دو گھنٹے پہلے کہتے ہیں، کہ مولوی احمد اللہ صاحب کو یہ رؤیا ہوئی تھی، اللہ اللہ فداہ ابی وامی ؎

بجز نازرفتہ باشد زجہاں نیاز مندے
کہ بجاں سپردن او بسرش رسیدہ باشی

اور یہ مکاشفات یا منامی مبشرات تو ان لوگوں کے تھے، جو غیبی تجلیات سے اثرپذیری

اور عکس گیسوی کی فطری مناسبتوں، جبلّی صلاحیتوں سے سرفراز تھے، وہ تو جو دیکھ رہے تھے، یا ان کو جو کچھ دکھایا جا رہا تھا، اسے تو چھوڑیئے، میں تو پوچھتا ہوں، کہ اسی عالم محسوس یا دائرۂ شہادت کے مشاہدات، یعنی غشی کا طاری ہونا، دو راتیں اور تقریباً ڈیڑھ دن تک تشنج کی اسی کیفیت کا تسلسل جسے مصنف امام بھی "نزع" ہی کی کیفیت سمجھتے رہے، ان کو بھی باور ہی کرنا پڑا کہ یہ "وقت آخر" ہے۔ سوال یہی ہے، کہ جن کے حافظہ میں بخاری شریف کی روایت کا جزء

| | |
|---|---|
| غشی علیہ | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وفات سے پہلے غشی طاری ہوگئی تھی، |

محفوظ ہوگا۔ اور اسی کتاب کی مشہور حدیث کا فقرۂ نبویہ

| | |
|---|---|
| لا الٰہ الا اللہ ان للموت لسکرات | لا الٰہ الا اللہ موت میں سکرات کی کیفیتیں ہیں۔ |

---

ل موت کے وقت کی یہ کیفیت جس کی تعبیر قرآن میں بھی سکرۃ الموت کے لفظ سے کی گئی ہے، مرنے والوں پر اس وقت کیا گذرتی ہے، عام خیال تو وہی ہے جس کی تائید حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالٰی عنہا کے قول سے بظاہر ہوتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ بعض علماء مثلاً زرقانی نے شیخ ابو محمد فرجانی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ تلك السكرات سكرات الطرب یعنی مسرت اور نشاط کی شدت سے سکرات کی یہ حالت طاری ہوتی ہے، ان کا خیال ہے کہ عربی زبان میں سکرہ کے معنی تکلیف یا دکھ کے نہیں ہیں۔ بلکہ نشہ کی حالت کو سکرہ کہتے ہیں۔ علامہ فرجانی اپنے قول کی تائید میں یہ بھی فرماتے تھے کہ وفات کے وقت حضرت بلال رضی اللہ تعالٰی عنہ کی زبان مبارک سے سننے والے یہ سن رہے تھے کہ واطرباہ (میری مسرت کا کوئی ٹھکانہ ہے) اور یہ شعر پڑھتے ؎ غدا نلقی الاحبہ۔ محمدا وحزبہ (یعنی کل ہم اپنے دوستوں سے ملیں گے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ کے جتھہ سے) بہر حال اگر سکرات میں تکلیف ہی کا کوئی پہلو ہوتا ہے، جسے مرنے والوں کے سوا دوسرے جان نہیں سکتے، تو پھر یہی سمجھنا چاہئے کہ تزکیہ وتطہیر کا رفع مراتب کے لئے نیک بندوں کے ساتھ یہ معاملہ کیا جاتا ہے، ان ہی روایتوں میں جن میں ہر مصیبت اور غم کو مومن کی تطہیر اور پاکی کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے، ان ہی میں ایک روایت یہ بھی ہے۔

| | |
|---|---|
| المؤمن يوجر فی کل شئ حتی الغط فی الموت (تفسیر درمنثور ص۲۲۷ ج ۱۲) | مومن کے لئے ہر بات میں اجر وثواب ہے، یہاں تک کہ موت کی گھٹن میں بھی۔ |

سے ساتھ صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا قول

| | |
|---|---|
| لا اکرہ شدت الموت لاحد بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم | موت کے وقت کی سختی کو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ناپسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتی، |

جن کو اس موقعہ پر یاد آگیا، اور چاہیے کہ یاد آجائے، کیا ان روحانی پرچھائیوں کو اپنے سامنے سے وہ ہٹا سکتے ہیں، جنھیں دیکھ کر بے ساختہ مؤمن اللّٰھم صلّ وسلّم علی حبیبك النبی الامی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم وبارك کے پڑھنے پر مضطر و مجبور ہو جاتا ہے۔

اور یہی کیا سچ تو یہ ہے کہ ٹھیک ان ہی نازک گھڑیوں میں جب دوسرے تو دوسرے خود ہمارے مصنف امام مولنٰنا محمد یعقوب صاحب تک کا یہ فیصلہ جسے نقل کر چکا ہوں یعنی

"اب آخر وقت ہے"

لیکن بایں ہمہ باوجود صدیقی ہونے کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان پر اچانک فاروقی نسبت پر تو فگن ہے، اور چھپے دبے لفظوں میں نہیں بلکہ بھری مجلسوں میں دیکھا گیا کہ وہ اعلان کرتے پھرتے ہیں کہ

"گھبراؤ مت! ابھی دس برس مولنٰنا اور زندہ رہیں گے"

قصص الاکابر

حضرت حکیم الامت تھانوی رح اس کے راوی ہیں، ان ہی کی روایت کے یہ الفاظ ہیں، براہ راست اس قصہ کو خود مصنف امام سے حضرت تھانوی نے سنا تھا، فرماتے تھے کہ

"جب مولنٰنا (محمد قاسم صاحب) کی شدت مرض سے زندگی

سے مایوسی ہوئی، تو مولٰنا محمد یعقوب صاحب رحؒ (ہمارے مصنف امام) رجوع الی اللہ ہوئے، اور براہ ناز اس طرح دعاء کی کہ ہماری عمر انہیں عطا فرمادی جائے ؎

ف واقعہ یہ ہے کسی موقعہ پر ذکر کر چکا ہوں کہ مولٰنا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کا حال جہاں صبر وتمکین میں یہ تھا کہ چودہ چودہ جنازے ان کے گھر سے، دیوبند میں وبا پھیل جانے کی وجہ سے ہفتہ دو ہفتے میں پیاپے نکلے جن میں خود ان کی اولاد کی بھی کافی تعداد تھی، لیکن زبان سے بے صبری کا کوئی کلمہ ہی نکلا، اور نہ بے قراری ان کے کسی طرزِ عمل سے ظاہر ہوئی۔ لیکن مالیں ہمہ ان میں ایک دوسرا پہلو بھی تھا، جسے چاہیں تو ہم جذب و سرمستی کی کیفیت کہہ سکتے ہیں۔ آج سے تقریباً ۳۰ سال پہلے سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی سیرت طیبہ میں اس دعوے کو پیش کرتے ہوئے کہ مسلمانوں کے مجاذیبؒ بہالیل طبقہ کے سرگروہ صحابہ کرام میں حضرت ابوذر غفاری کی ذات مبارک نظر آتی ہے، فقیر نے مولٰنا محمد یعقوب صاحب کے بھی بعض واقعات وحالات کی طرف اسی موقعہ پر اشارہ کیا تھا، اس وقت تک حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے نہ خاکسار ہی کو نیاز حاصل کرنے کا موقعہ ملا تھا، اور مجھ جیسے نارسان طالب العلم کے حال سے حضرت والا کے واقف ہونے کی کوئی صورت ہی تھی لیکن تحریر کا یہی حصہ القاسم دارالعلوم کے مجلہ میں جب شائع ہوا، اور حضرت تھانوی کی اس پر نظر پڑی، تو اسی وقت مولٰنا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم سابق مہتمم دارالعلوم کے نام ایک خط لکھا گیا، جس میں ایک مکتوب خاص فقیر کے نام بھی تھا۔ "سید الکاتبین احسن اللہ مساعیہ" کے خطاب سے مخاطب کرتے ہوئے شاباشی دی گئی اور ارقام فرمایا گیا تھا کہ مضمون نگار اگر محقق ہو چکے ہیں، تو یہ مضمون ان کی محققیت کی دلیل ہے، ورنہ "محققیت متوقعہ" کی اُمید تو بہرحال ہے۔ بہرحال حضرت مولٰنا محمد یعقوب صاحب کی جذبی کیفیت کی بھی اس گرامی نامہ میں توثیق کی گئی تھی، اسی کتاب میں کسی موقعہ پر یہ بھی گذر چکا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر سے مولانا محمد یعقوب صاحب کے کسی قول کا ذکر کسی نے کیا، تو آپ اٹھ بیٹھے، اور فرمایا کہ وہی ایسی باتیں کر سکتے ہیں ہم جیسوں کے تو فوراً کان پکڑ لئے جائیں (اوکما قال) حضرت تھانوی رحؒ نے "براہ ناز" سے ان کی لاہوتی زندگی کے اسی پہلو کی طرف شاید اشارہ فرمایا ہوگا، ہو سکتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نسماتی وجود کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے غیب کے کسی عالم میں پیش ہوئے، تو ان کے غیر معمولی حسن سے متاثر ہو کر حضرت آدم علیہ السلام نے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ اور عمر ان کی کیا ہے؟ نام کے ساتھ بتایا گیا کہ ساٹھ سال عمر ان کی ہوگی حضرت آدمؑ نے فرمایا زدہ من عمری اربعین سنۃ

(باقی اگلے صفحہ پر)

آگے اسی روایت میں ہے، کہ مولٰنا محمد یعقوب صاحب اپنی دعاء کے بعد کہتے تھے کہ "میری تسلی کی گئی، کہ ابھی دس سال مولٰنا اور زندہ رہیں گے"۔

خود سوچئے کہ دارالعلوم دیوبند کے صدر اول مولٰنا محمد یعقوب صاحب کی طرف سے یہ اعلان جس وقت کیا جارہا ہوگا، اس وقت کے سماں کو یاد کرکے اپنے ذہن کو کون روک سکتا ہے، اگر اس کے آگے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے کا وہ نظارہ پیش ہو جائے کہ

سل عمر بن الخطاب سیفه وتوعد بالقتل من یقول مات رسول الله صلى الله عليه وسلم۔ ¹

کھینچ لی عمرؓ بن الخطاب نے تلوار اور قتل کی دھمکی ہر اس شخص کو دینے لگے، جو یہ بولے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی۔

(گذشتہ صفحہ سے، یعنی اے پروردگار میری عمر سے چالیس سال ان کو دے دیئے جائیں) یہ حدیث ترمذی وغیرہ کی ہے۔ ممکن ہے کہ مصنف امام کے سامنے کچھ اسی قسم کی چیزیں ہوں ۱۲

¹ یہ عجیب بات ہے کہ مولٰنا محمد یعقوب صاحب بھی یہی فرماتے تھے، جیساکہ حضرت مولانا تھانوی رح ان ہی سے سن کر نقل کیا کرتے تھے کہ دعاء کرنے کے بعد ان کو "مھدی" کے لفظ کا القاء ہوا، فرماتے تھے کہ میں نے مہدی کے اعداد جو نکالے تو میزان (۵۹) آئی، مولٰنا محمد قاسم صاحب کی عمر اس وقت (۴۹) سال تھی، میں سمجھا کہ (۵۹) سال آپ کی عمر ہوگی اسی لئے اعلان کر دیا کہ دس سال ابھی اور زندہ رہیں گے۔ لیکن جب ۴۹ سال ہی کی عمر میں وفات ہوئی، تب محسوس ہوا کہ القاء کے سمجھنے میں مجھ ہی سے غلطی ہوئی۔ مراد یہ تھی کہ مہدی علیہ السلام کی عمران کو ملے گی، روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ چالیس سال کی عمر میں حضرت امام مہدی کا ظہور ہوگا اور (۹) سال قیام فرما کر وفات پائیں گے۔ کہنا یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو یہ فرمارہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات نہیں ہوئی ہے تو اس میں بھی ابن اسحاق کی روایت کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی کچھ اجتہادی نتیجے ہی کی نیرنگی تھی، سیرت ابن اسحٰق کے حوالہ سے زرقانی نے شرح مواہب میں نقل کیا ہے کہ قرآنی آیۃ یکون الرسول علیکم شهیدا سے اپنے نزدیک وہ یہی سمجھتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اس وقت تک نہیں ہو سکتی، جب تک مؤمن کو منافق سے شہادت دیکر آپ جدا نہ کرلینگے۔ ص ۲۷۸ زرقانی ج ۸

حقیقت تو یہ ہے کہ دیکھنے والوں کو جو کچھ دکھایا گیا تھا، حالانکہ بعض وجوہ سے سب کا ذکر مناسب نظر نہ آیا[۱]، لیکن ناقابل تردید وثائق کی روشنی میں جو کچھ بھی پیش کر دیا گیا ہے، میرے نزدیک تو ایک طرف نہ ماننے والوں کے سامنے سوءِ اتفاق و بخت کی توجیہ کی بیڑیاں ٹوٹنے کے لئے اگر وہ کافی ہے تو دوسری طرف ماننے والوں پر خوش عقیدگی کی تہمت کی گنجائش بھی اپنا خیال تو یہی ہے، کہ ان شہادتوں نے باقی نہیں رکھی ہے

صدق وصفا، اخلاص ووفا کے ساتھ کوئی آگے بڑھنے کی ہمت تو کرے، خواجہ کی روشِ بندہ پروری[۲] ان ہی شکلوں میں اس کے سامنے آئے گی، پہلے بھی اسی کا تجربہ کیا گیا ہے، اور اب بھی جس کا جی چاہے تجربہ کر کے دیکھ سکتا ہے۔

---

[۱] مثلاً یہی بات کہ علالت کے آخری دنوں میں "ذات الجنب" کے عارضہ میں بھی سیدنا الامام الکبیر مبتلا ہو گئے تھے، اس میں شک نہیں کہ روایتوں ہی میں یہ بھی آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات جس بیماری میں ہوئی وہ ذات الجنب کی بیماری نہ تھی، لیکن ان ہی روایتوں میں یہ بھی ہے کہ آپ کی وفات ذات الجنب ہی کی بیماری میں ہوئی، حافظ ابن حجر نے دونوں روایتوں میں تطبیق دیتے ہوئے لکھا ہے، کہ ذات الجنب کی ایک قسم تو ایسی ہے جس کے متعلق حدیثوں میں آیا ہے کہ شیطان کو اس میں دخل ہوتا ہے، لیکن ذات الجنب ہی کی ایک قسم اور ہے جس میں پسلی کی ہڈیوں کے اندر ریاح اٹک جاتی ہے۔ لکھا ہے کہ یہ عام عارضہ ہے پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ فرمانا کہ ذات الجنب کی بیماری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، ہم اس حدیث کو دوسری قسم پر محمول کریں گے (دیکھو فتح الباری ص۱۲۱ ج ۸)

طرفہ ماجرا یہ ہے کہ مصنف امام کے بیان سے جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی وفات ذات الجنب کے اس عارضہ کے بعد ہوئی، لیکن ۱۲۹۷ھ کی روداد میں مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ نے لکھا ہے کہ بمرض ضیق النفس ۴۹ سال کی عمر میں بمقام دیوبند اس عالم ربانی کا اس عالم فانی سے انتقال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ص۲ گویا یہاں بھی اس مسئلہ میں کچھ اختلاف کا رنگ باقی ہی رہا ۱۲

[۲] اس شعر کی طرف تلمیح ہے ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرطِ مزد مکن
کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند (حافظ)

محمد طیب غفرلہ

صدق من قال

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد
اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

قصہ اب ختم ہی ہو رہا ہے، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے سیدنا الامام الکبیر کے ایک معاصر بزرگ جو دیوبندی علقہ کے اکابر میں تو شمار نہیں ہوتے، لیکن اس کتاب میں لکھا ہے کہ

"صاحب مکاشفہ و مراقبہ ہیں، اور عمدہ لوگوں میں ہیں"

یہ انبالہ کے مشہور، بیدار دل صوفی، سائیں توکّل شاہ نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جن کی وفات پر زیادہ زمانہ نہیں گذرا ہے۔ اپنے وقت میں ان کی ذات بھی مرجع انام تھی، سیدنا الامام الکبیر کو سائیں جی نے اس وقت تک دیکھا بھی نہ تھا صرف نام سنا تھا، اسی زمانہ میں ان کو ایک رؤیا، ہوئی، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے ان کے اسی خواب کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"ایک وسیع شاہراہ ہے، اس میں بہت سے نقش قدم معلوم ہوتے ہیں، اور چلنے والا کوئی نظر نہیں آتا، (شاہ صاحب نے) پوچھا کہ یہ نشان کس کے قدم کے ہیں، (جواب میں) آواز آئی کہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری اسی راہ سے گئی ہے، اور جملہ صحابہ وتابعین و تبع تابعین بھی اسی راہ سے گئے ہیں"

لکھا ہے کہ اس غیبی آواز کو سن کر

"شاہ جی کو شوق زیارت حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا از حد ہوا، اور کمال شوق میں بے تحاشا دوڑے کہ جلد تر زیارت سے

مشرف ہوں، اسی دوا دوش میں کبھی شاہ جی کا قدم نشان قدم
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑتا، اور کبھی صحابہ کرام، اور کبھی
تابعین، کبھی تبع تابعین پر، اسی حالت میں جو یکایک پیچھے
نظر (شاہ جی صاحب) کی پھری، تو دیکھا کہ ایک اور شخص بھی
اسی راستہ کو آتا ہے، مگر آہستہ آہستہ اور کچھ دیکھتا ہوا"۔
اس آنے والے شخص کو اس طریقہ سے چلتے ہوئے دیکھ کر بیان کیا ہے کہ
"شاہ جی کو حیرت ہوئی کہ یہ کیسا کاہل شخص ہے، کہ ایسا
آہستہ آہستہ سے چلتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس کو شوق
کم ہے"۔
دل میں سائیں توکل شاہ صاحب فرماتے تھے کہ میں یہی باتیں کر رہا تھا، آخر بے
اختیار ہو کر مجھ سے
"نہ رہا گیا، اور اس شخص کے پاس آکر پوچھا، کہ تم کون ہو؟"
جواب میں سائیں توکل شاہ صاحب سن رہے تھے کہ کہنے والا ان سے کہہ رہا
ہے، کہ میں
"محمد قاسم"
ہوں، لکھا ہے، کہ یہ سن کر اپنی پنجابی زبان میں سائیں جی فرمانے لگے کہ
"بابا شوق نال بھجیا"
جس کے معنی ہیں، کہ "بابا شوق کے ساتھ دوڑ" سائیں جی نے سنا کہ اس کے
جواب میں ان سے کہا جا رہا ہے
"میں تو نشان قدم رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر قدم رکھ
رکھ کر چلتا ہوں، اور جس جگہ قدم خوب محسوس نہیں ہوتا، وہاں

تامل کرتا ہوں، جب تک خوب یقین نہیں ہوجاتا کہ یہی نشانِ
قدم ہے، اس وقت تک دوسرا قدم نہیں اٹھاتا۔"

آخر میں یہ بھی فرمایا گیا کہ

"گو دیر میں پہنچوں، مگر قدم بقدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ہی کے چلوں گا۔" [۱] ص۵۶ سوانح مخطوطہ

سوانح نگار نے سائیں جی رحمۃ اللہ علیہ کی اس رویار کے ساتھ یہ خبر بھی دی ہے
کہ بیدار ہونے کے بعد سائیں جی کے قلب مبارک میں سیدنا الامام الکبیر کی
ملاقات کا شدید اشتیاق پیدا ہوا،

آخر کسی نہ کسی طرح اپنی اس آرزو کے پوری کرنے میں کامیاب ہوئے، سیدنا
الامام الکبیر پر جوں ہی سائیں جی توکل شاہ کی نظر پڑی لکھا ہے کہ

"دیکھتے ہی بلا استفسار پہچان لیا، اور معتقدانہ ملے۔" ص۵۶ "

اور کیسے نہ پہچانتے ع

رقم مہر تو بر چہرۂ من پیدا بود

اللہ اللہ جس کا قال ہی نہیں بلکہ حال، واقعی حال

اے گل بہ تو خرسندم تو بوئے کسے داری

بن چکا ہو، گلاب کے پھول کو دیکھ کر اس لئے تڑپ اٹھتا ہو کہ منسوب کرنے والوں
نے کسی کی طرف اس پھول کو منسوب کیا ہے [۲]۔ جس کی فنائیت اس درجہ تک پہنچی

---

[۱] میں نے اپنے بزرگوں سے اس رؤیا کا ایک جزو اور سنا ہے اور وہ یہ کہ سائیں صاحب اسی دوڑ دھوپ کے ساتھ بالآخر جب مجمع کو چیرتے پھاڑتے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گئے تو دیکھا کہ حضرت نانوتوی وہاں حضور کے پاس پہلے سے موجود ہیں ۱۲ محمد طیب غفرلہ

[۲] تذکرۃ الرشید ارواح طیبہ وغیرہ میں ہے کہ حضرت گنگوہی نے ایک دفعہ لوگوں سے پوچھا کہ گلاب کے پھول سے مولانا محمد قاسم کو کیوں زیادہ محبت تھی پھر خود ہی اس راز کو فاش فرمایا کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

ہوئی ہو، یاد ہوگا، سوانح مخطوطہ ہی کے حوالہ سے کسی دوسرے صاحب دل کا روحانی مکاشفہ نقل کرچکا ہوں، یعنی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں ان صاحب نے دیکھا کہ معانقہ کا شرف سیدنا الامام الکبیر کو بخشا گیا ہے۔ معانقہ کے اسی حال میں ان کو محسوس ہوا کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک مولنٰا کے جسم مبارک میں سمانا شروع ہوا، یہاں تک کہ ہر عضو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر عضو مولنٰا میں سما گیا الاسرمبارک" ص۱۵

اور یہ سارے تماشے جو آپ کے سامنے پیش ہو رہے ہیں، اسی مٹ جانے ہی کے تو تماشے ہیں، بات بہت پھیل جائے گی، آئیے، اور آخری نظارے کو بھی دیکھ لیجئے۔

مصنف امام کے حوالہ سے سنا چکا ہوں کہ تقریباً شب چہارشنبہ سے پنجشنبہ کی دوپہر تک وہی تشنج وہی غشی کی حالت طاری رہی، اسی سلسلہ میں مولنٰا حکیم منصور علیخاں صاحب حیدرآبادی نے اپنی کتاب میں یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ سیدنا الامام الکبیر کی نزاکت حال کو دیکھ کر

"مولوی رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ (دیوبند) کے خطوط جابجا پہنچے کہ اب حالت مرض ترقی پر ہے "جلد چلے آؤ"۔

(بسلسلہ صفحۂ گزشتہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پسینے سے گلاب کی خوشبو آتی تھی، ہے تو یہ حدیث ضعیف، لیکن پھر بھی حدیث ہی ہے، اشارہ آپ کا اس حدیث کی طرف تھا۔ جس میں آیا ہے کہ من اراد ان یشم رائحتی فلیشم رائحۃ الورد (یعنی میری خوشبو جو سونگھنا چاہتا ہے چاہئے کہ وہ گلاب کے پھول کو سونگھے)، ہاشم بن عروہ کی سند سے سیوطی نے لآلی مصنوعہ میں اس کا ذکر کیا ہے لیکن عوام میں جو یہ مشہور ہے کہ گلاب کا پھول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پسینہ سے پیدا ہوا، محدثین نے اس روایت کو موضوع اور جعلی قرار دیا ہے۔ (دیکھو لآلی مصنوعہ ص۱۴۶ ج۲ مطبوعہ مصر)

اس گشتی چٹھی کا پہنچنا تھا، کہ دیوانہ وار جو جہاں تھا، وہیں سے دوڑ پڑا، حکیم صاحب نے لکھا ہے کہ

"سب احباب امروہہ، مرادآباد، میرٹھ، سہارنپور، گنگوہ، نانوتہ وغیرہ سے جمع ہو گئے تھے۔" ص۱۲۸

مرادآباد کے قافلہ کے ساتھ حکیم صاحب بھی افتاں خیزاں پہنچے، لکھا ہے کہ

"بندہ بھی خدا دیکھتے ہی دیوبند پہنچا۔"

جس وقت وہ دیوبند پہنچے ہیں، ان کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا

"مولوی ذوالفقار علی صاحب کے مکان پر بڑا مجمع تھا۔"

یہ مولوی ذوالفقار علی صاحب سیدنا الاستاذ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد ہیں۔ ذکر کر چکا ہوں کہ علالت کے آخری دنوں میں سیدنا الامام الکبیر کو لوگ اسی مکان میں لے آئے تھے، علاج و معالجہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا، اسی مکان میں ہو رہا تھا حکیم صاحب نے بھی لکھا ہے کہ

"طرح طرح سے علاج کیا گیا، کارگر نہ ہوا۔"

اسی کے بعد وہی خبر دیتے ہیں کہ

"جمعرات کے دن قریب دوپہر کے سب کا مشورہ ہوا کہ مولانا صاحب کو مکان پر لے جانا مناسب ہے۔"

اور یوں حضرت شیخ الہند کے مکان سے سیدنا الامام الکبیر کے ذاتی مکان جہاں آپ کے اہل و عیال تھے، لوگ آپ کو لے چلے، کس طرح لے چلے، حکیم صاحب لکھتے ہیں کہ

"چارپائی کو تمام خدام آہستہ آہستہ اٹھائے ہوئے مکان پر لے گئے۔"

دن کے آٹھ پہروں میں سے جمعرات کے دن کے دو پہر تو گذر ہی چکے تھے گھڑی کے حساب سے دو بجے کا وقت ہوگا کہ وہی جس پر غشی طاری تھی، چارپائی پہ آہستہ آہستہ لانے والے سمجھے ہوئے تھے کہ اب کچھ باقی نہیں رہا ہے۔ نہ حواس ہی باقی رہے ہیں، نہ ہوش ہی باقی رہا ہے، اور نماز کی طرف توجہ دلانے کے بعد جب "اچھا" کے سوا منگل کے دن ظہر کے وقت سے سننے والوں نے کچھ نہیں سنا تھا، تو سمجھنے والے ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور کیا سمجھ سکتے تھے۔

گویا آخری لفظ اس وقت تک خیال یہی تھا کہ زبان مبارک سے جو نکلا ہے، وہ یہی "اچھا" کا لفظ ہے، لیکن حکیم صاحب راوی ہیں کہ حضرت والا کو پہنچانے والوں نے اپنے ذاتی مکان میں جب پہنچا دیا، تو

"دو بجے کے بعد پاس انفاس کی آواز اس زور سے آنے لگی کہ باہر دروازے کے بھی میں نے سنی۔" ص۱۹۰

کون بتائے کہ اتنی طویل غفلت و خاموشی کے بعد یہ "پاس انفاس" کی آواز اور وہ بھی اتنی بلند اور جہری کہ گھر کے اندر پاس والے ہی نہیں، بلکہ باہر والے بھی اسے سن رہے[۱] تھے۔ اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ ؎

ما را وداع کرد دل و عقل ہر چہ بود

الا سر نیاز بر آں آستاں کہ بود

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد ماجد شیخ سیف الدین کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے اخبار الاخیار کے خاتمہ میں لکھا ہے کہ "چشم کشادند و آہستہ گفتند پاس انفاس از برائے امروز کاری آید کہ اعضا ہمہ از کار رفتہ است و قوت دم زدن نماندہ است۔" اس ارشاد کے بعد لکھا ہے کہ ان کے والد نے

"چند بار زور نمودند و بلند تر ذکر لا الہ الا اللہ فرمودند و ساکن شدند و بپاس انفاس مشغول شدند۔" اسی کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ اخبار ص۳۱۱

گویا یہ زندہ شہادت تھی اس بات کی، کہ ؎

بخدا کہ سینہ ام رابشگاف و جاں بروں کن
کہ درونِ خانۂ تو دگرے چہ کاردارد (خسروؒ)

عارف رومی والی نماز ع

عاشقان ھم فی صلاۃ دائمون

کا یہ ناقابل انکار ثبوت تھا، یا سمجھئے کہ اسی دوامی نماز کی یہ عملی شکل تھی۔ اللہ اللہ جو ہمہ تن وہمہ جان کے ساتھ نماز ہی میں مستغرق ومستہلک تھا، اسی کو عقل وہوش والی نماز کا مکلف بناکر توجہ دلانے والے جو توجہ دلا رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ "اچھا" کے سوا ان کو اور جواب ہی کیا دیا جا سکتا تھا۔

کچھ بھی ہو، سچی بات تو یہی ہے کہ آج کوچہ چیلان (دلی) کے "ہو" والے مکان کی محنت کام آرہی تھی، رحم اللہ قائلہ

خسرو زغمت عشاں نہ تابد
تا مرکب عمر سر نیائد

مرکب عمر کا سوار اپنی آخری منزل پر ہے، زندگی کے سارے دن، صرف اسی ایک دن کی فکر میں جس کے بسر ہوئے تھے، آج اپنی محنت کا ثمرہ اس کے سامنے نہ آتا تو کب آتا، تمنا کرنے والے نے تمنا کی تھی کہ

زندگی مرنے کے کام آئے تو خوب

آج زندگی اور زندگی کی ساری جدوجہد کا حاصل کام آرہا ہے، اور کس طریقہ سے کام آرہا ہے، سننے والے تو "پاس انفاس" کی آواز سن رہے تھے، اور دیکھنے والے دیکھ رہے تھے، حکیم صاحب بھی سننے والوں کے ساتھ اس واقعہ کے دیکھنے والوں میں تھے، خود ہی لکھتے ہیں کہ

"مولنا رشید احمد صاحب قریب چارپائی کے تشریف رکھتے تھے"
مصنف امام نے لکھا ہے کہ
"بدھ کے روز دوپہر سے پہلے مولوی صاحب (یعنی مولنا گنگوہیؒ)
تشریف لائے"
تقریبًا ۲۴ گھنٹے پہلے گویا تشریف لا چکے تھے، اور اس وقت وہی چارپائی کے
پاس آکر بیٹھ گئے تھے۔
آپ نے سمجھا؟ دم واپسیں کی اس نازک کڑی گھڑی میں بالین مبارک پر کسے لاکر بٹھایا
گیا ہے؟ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ایک رشتہ تو رفاقت و محبت کا تھا،
طالب العلمی کے دنوں سے جس رشتہ کی ابتدا ہوئی تھی، دونوں اس کے بعد رزم کے
میدانوں میں بھی، اور بزم کی مجلسوں میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ رہے، ہم استاد
وہم شیخ تھے، تقریبًا چالیس سال تک ناسوتی عالم میں یہ رشتہ بغیر کسی انقطاع کے
یوں ہی مسلسل قائم رہا
کوئی شبہ نہیں کہ اس تعلق کو پیش نظر رکھتے ہوئے نہیں کہا جاسکتا کہ حضرت گنگوہی پر
کیا گذر رہی ہوگی۔ مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چوبیس گھنٹوں میں،
"سکوت اور نماز میں اکثر گذرتی تھی"
وہی یہ بھی لکھتے ہیں کہ مولوی صاحب (مولنا گنگوہی) کو ایسا صدمہ ہوا ہے کہ
"اس سے زیادہ کیا متصور ہو" اُف

اندیشہ بھی جس حال کا اندیشۂ جاں تھا
آنکھوں سے اسی حال کو میں دیکھ رہا ہوں

جو اس حال میں مبتلا کیا گیا ہو، کیا پوچھتے ہیں، کہ کیسی بجلیاں اس کے اندر کوند رہی ہونگی
تاہم اسی کے ساتھ یہ بھولنا نہ چاہیئے کہ وقت کے محدث و فقیہ ہونے کے ساتھ ساتھ

جو نہیں جانتے ان کو کیسے بتایا جائے کہ "قطب عالم" کا لفظ خلق کی زبان پر ان کے متعلق کس نے جاری کرا دیا تھا، اور کیوں جاری کرا دیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ باہر سے دیکھنے والے تو صرف یہی دیکھ رہے تھے کہ وہ "چار پائی" کے قریب بیٹھے ہیں" مگر ان کے اندر جو تلاطم برپا تھا، جو آگ لگی ہوئی تھی، ستر و اخفاء کی انتہائی کوششوں کے باوجود بے اختیار ہو کر خود ہی خدام خاص کی ایک مجلس میں جیسا کہ ارواح طیبہ میں ہے ایک دفعہ کھل پڑے، فرمانے لگے کہ

"اگر وہ بات نہ ہوتی تو میں مولانا کے صدمہ کا تحمل نہیں کر سکتا تھا"

"تحمل نہیں کر سکتا تھا" جانتے ہیں کہ اس کا مطلب کیا تھا، خود ہی اس کا یہ جواب حضرت والا نے دیا کہ

"مرجاتا"

گو، آج بجائے ایک جنازے کے اسی گھر سے دو جنازے [۱] نکلتے۔ یہ بیان وقت کے حجت اور حدیث کے شیخ کا ہے، مگر ایک "بات" تھی جس کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا، پوچھنے والوں نے پوچھا بھی کہ "حضرت وہ بات کیا؟" بھلا اس کا جواب وہ خود کیا دے سکتے تھے، تاہم اتنا اشارہ کر دیا گیا کہ

"میاں وہی چیز جس کی وجہ سے تم میرے پاس آتے ہو [۲]"

---

[۱] میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ حضرت گنگوہی رح اس صدمۂ جانکاہ کے بعد عمر بھر کھل کھلا کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھے گئے۔ محمد طیب غفرلہ

[۲] حکیم الامت تھانوی رح نے اپنی اسی روایت کے ذیل میں ارقام فرمایا ہے کہ کسی راوی سے یہ الفاظ سنے ہیں کہ "وہی چیز جس کی وجہ سے تم مجھے بڑا سمجھتے ہو" پھر خود اس کی شرح یہ فرمائی گئی ہے کہ مراد نسبت باطنیہ سے ہے کہ اسی سے ایسی مقاومت کی قوت ہوتی ہے۔" آگے یہ بھی اضافہ کیا گیا ہے کہ "اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ حزن طبعی، منافی کمال باطنی کے نہیں۔ مگر ناقص کی طبیعت غالب ہو جاتی ہے اور کامل کی عقل۔" ص۲۱۵ ارواح ثلاثہ

اسی کے ساتھ شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کی اس روایت کا (باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

میں کیا کروں۔ ارواح طیبہ کی اس روایت کو نقل کر رہا ہوں، اور معرفۃ الصحابہ کی کتابوں کا یہ فقرہ دماغ میں گھوم رہا ہے

| | |
|---|---|
| كان سبب موته كمدا لحقه على وفاة رسول الله صلى الله عليه وسلم مازال يذيبه | حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کی وجہ ان کا وہ کمد تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی وجہ سے ان کے دل میں جاگزیں تھا، یہی کمد آپ کو گھلاتا چلا جا رہا تھا۔ |

علامہ الدمیری نے اسی فقرے کو نقل کر کے "کمد" کا مطلب یہ بیان کیا ہے

| | |
|---|---|
| الكمد الحزن المكتوم (حیات الحیوان الکبریٰ ص۲۴۴ ج۱) | کمد سوز درونی اور غم پنہانی کو کہتے ہیں۔ |

ایک طرف ہمارے مصنف امام تھے جو کہتے پھرتے تھے کہ

"گھبراؤ مت! ابھی دس برس مولانا اور زندہ رہیں گے"

اب دوسری طرف حضرت گنگوہی کے اس کمد یا سوز درونی کو دیکھئے، لیکن باوجود اس کمدیت اور سوزش نہانی کے، جاننے والے بھی جانتے ہیں، کتابوں میں بھی لکھا ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر کے صدمہ اور قائم مقامی کا سارا بار اسی حال میں اپنے سر پر اٹھائے ہوئے، جیتے رہے، جب تک زندہ رہنا ان کے لئے مقدر

(گذشتہ صفحہ سے) جب خیال آتا ہے جس کا ذکر بھی اسی کتاب ارواح ثلاثہ میں کیا گیا ہے یعنی سیدنا الامام الکبیر کی وفات کے بعد مولانا گنگوہی نے حضرت شیخ الہند رح سے فرمایا کہ تیس برس کی محنت سے جو بات قائم ہوئی تھی وہ آج نہیں ہے" ص۲۸۳ ارواح ثلاثہ۔ واللہ اعلم اس کا کیا مطلب ہے۔ لیکن اگر باطنی نسبت ہی کی طرف اشارہ ہے تو حضرت گنگوہی کو اس صدمہ کے تحمل میں جو کچھ برداشت کرنا پڑا ہوگا، اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے، تحمل کی بنیاد اسی باطنی نسبت پر قائم تھی، اسی میں اضمحلال کی کیفیت آپ کو محسوس ہوئی، تو باوجود اس کے بھی مصیبت کے اس پہاڑ کو سر پر اٹھا لینا ان ہی کا کلیجہ اور جگر تھا ۱۲

تھا۔ نیز دارالعلوم دیوبند کی جو روداد سیدنا الامام الکبیر کی وفات کے سال یعنی ۱۲۹۷ھ میں شائع ہوئی تھی، اس میں بھی اس حادثہ جاں گداز، روح گسل کی خبر دیتے ہوئے، مولٰنا رفیع الدین نے یہ ارقام فرمانے کے بعد کہ

"یہ واقعۂ جانکاہ ایسا نہیں ہے کہ یکایک زمانہ اور اہل زمانہ بھول جائیں"

پھر مختصر لفظوں میں سیدنا الامام الکبیر کی جلیلہ خدمات کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہوئے کہ

"مدت العمر اسلام، اور اہل اسلام کی خیر خواہی میں رہے اور تمام عمر عزیز کو اعلاء کلمۃ اللہ میں صرف فرمایا، واقعی ایسے عالی قدر اولوالعزم صاحب کمال خیر خواہ کافہ اہل اسلام کا انتقال فرمانا عموماً گروہ پاک اسلام پر ایک سخت حادثہ ہے، خصوصاً اس مدرسہ کو کیونکہ اس چشمۂ فیض کا منبع، اور اس آب حیات کا مصدر اور اس آفتاب عالمتاب کے مظہر آپ ہی تھے"

آخر میں مولٰنا رفیع الدین صاحب نے ارقام فرمایا ہے کہ

"مگر اللہ تعالیٰ جل وعلا نے ان (مسلمانان ہند اور اہل مدرسہ) پر رحم فرما کر نعم البدل عطا فرمایا، اور ان کی مصیبت کو نسیاً منسیا کر دیا۔ یعنی جناب مولانا مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی سلمہ اللہ تعالیٰ نے جو مثل مولٰنا مرحوم کے ہیں۔ اور شہرہ آفاق، سرپرستی مدرسہ و اہل مدرسہ کی قبول فرمائی اور اپنا دست شفقت ان کے سر پر رکھا اور جیسے مولٰنا رحمۃ اللہ علیہ ظاہری و باطنی امداد اس مدرسہ کی فرماتے تھے، ایسے ہی مولٰنا موصوف فرماتے ہیں" (روداد ۱۲۹۷ھ صہ ۲)

میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے مصنف امام کے طرزِ عمل اور اعلان میں جیسے فاروقی رنگ جھلک رہا تھا، ٹھیک اسی کے مقابلہ میں رسالت کبریٰ کے صدیق اکبر کی تجلی نگاہوں کے سامنے حضرت گنگوہی کو چارپائی کے پاس دیکھ کر اگر کوندگئی ہو، تو آپ ہی بتائیے کہ یہ کوئی اچنبھے کی بات ہو سکتی ہے؟ آخر اس زمانہ میں دیکھنے والے جو یہ چلا اٹھے تھے، کہ

"وفات[ل] سرورِ عالم کا یہ نمونہ ہے"

تو آخر وہ کچھ دیکھ ہی تو رہے تھے، تاریخ کے بیسیوں مادوں میں سے سب سے بہتر اسی مادۂ تاریخ کو وقت کے صالحین و قانتین نے جو قرار دیا تھا۔

اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو کچھ وہ دیکھ رہے تھے، ان کو جو کچھ دکھایا جا رہا تھا، اسی کی تصویر تاریخ کے اس مصرعہ میں اتر آئی تھی۔

بہرحال چارپائی کے پاس تو یہی قطب عالم، محدث وقت، حضرت گنگوہی تشریف فرما تھے، اور جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے۔

"سب احباب امروہہ، مرادآباد، میرٹھ، سہارنپور، نانوتہ وغیرہ کے جمع ہو گئے تھے"

اندر سے پاس انفاس کی آواز کانوں میں آرہی تھی، کہ جمعرات کے دن بقول مصنف امام

---

[ل] سیدنا الامام الکبیر کی وفات کی تاریخیں بہت سی لکھی گئی تھیں، لیکن بالاتفاق پسند کرنے والوں نے سب سے بہتر مادہ تاریخ اسی مصرع کو قرار دیا تھا، یہ مولانا شبیر احمد صاحب کے والد ماجد مولانا فضل الرحمٰن صاحب مرحوم کا نکالا ہوا مادۂ تاریخ تھا۔ چند دوسرے اشعار کے ساتھ مادہ تاریخ کے اس مصرعہ کو انہوں نے یوں موزوں فرما دیا تھا۔

وہ غم ہے قاسمِ بزمِ ہدیٰ کی رحلت کا — کہ جرعہ نوشِ الم جس سے ہر درونہ ہے
یہ ایسا غم ہے کہ جس غم سے بزمِ عرفاں کا — مثالِ خُمِ فلک جام واژگونہ ہے
کچھ اک زمیں ہی نہیں زرد رنگ اس غم سے — لباس چرخ بھی ماتم میں نیلگونہ ہے
سن وفات لکھی فضل نے زروئے الم — وفاتِ سرورِ عالم کا یہ نمونہ ہے

۱۲۹۷ھ

"بعد نماز ظہر اچانک دم آخر ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون"

اگرچہ ۱۲۹۷ھ کی مذکورہ بالا روداد میں مولٰنا رفیع الدین صاحب نے بالکل صحیح لکھا ہے، کہ

"صفحۂ جہاں پر، اس قسم کے وقائع اکثر درج ہیں"

اور حیات جاودانی کے سب سے بڑے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی جب

| | |
|---|---|
| انک میّت وانہم میتون۔ (الزمر) | تم بھی مرنے والے ہو، اور وے بھی مرنے والے ہیں۔ |

کے قانون کے نیچے داخل کرتے ہوئے، مسلمانوں کو آگاہ کر دیا گیا تھا،

| | |
|---|---|
| وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افأن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم ومن ینقلب علی عقبیه فلن یضر اللہ شیئًا (آل عمران) | نہیں ہیں محمد مگر ایک رسول، گذر چکے ان سے پہلے بہت سے رسول کیا وہ (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اگر مر جائیں، یا قتل ہو جائیں تو تم پلٹ پڑو گے اپنی ایڑیوں پر، اور جو پلٹ پڑے گا اپنی ایڑیوں پر، وہ اللہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچائے گا۔ |

قرآن کی اسی بخشی ہوئی آگاہی سے تاریخ اسلام کے سب سے بڑے وقت میں بیہوشوں کو ہوش میں لایا گیا تھا، لیکن بایں ہمہ اسلامی ہند کی امت اسلامیہ جن تیرہ و تار خونیں دنوں سے گذرتے ہوئے اس وقت تک پہنچی تھی، اس حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے بے ساختہ خسرو رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر یاد ہی آجاتا ہے کہ

پیوستہ روز غمزدگان تیرہ بود تنگ
از روزگارِ تیرۂ من تیرہ تر نہ بود

کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانان ہند کی تاریخ کے تاریک دنوں میں اپنی وقتی نزاکتوں کے

لحاظ سے آج کا یہ دن شاید سب سے زیادہ بھیانک سب سے زیادہ سیاہ تھا۔ بہرحال جوں ہی کہ یہ خبر قصبہ اور قصبہ کے اطراف و نواح میں پہنچی، حکیم منصور علی خاں صاحب کا بیان ہے،

"ہزارہا آدمی اطراف و جوانب سے اس وقت چلے آئے" ص۱۹۱

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاروں طرف سے خلق اللہ ٹوٹی پڑتی تھی، جو جہاں تھا وہیں سے گویا یہی کہتے ہوئے چل پڑا کہ ؎

اے دل زچشم زخم زمانہ فگار شو
اے چشم از تراوش دل اشکبار شو

گریہ و بکا کا ہنگامہ برپا تھا، بقول مصنف امام

"ایک قیامت برپا ہوگئی"

یہ الفاظ بھی ان ہی کے ہیں، کہ

"مولوی صاحب کے انتقال کا سا غم و الم کبھی نہ دیکھا تھا، ایک ماتم عام تھا، ہر چند شور و غوغا اور سر پیٹنا اور کپڑے پھاڑنا، نہ تھا۔ کیونکہ بہ برکت صحبتِ مولانا جتنے لوگ تھے، حدود شرعی سے باہر نہ ہوتے تھے، مگر ایسا غم عام ہم نے دیکھا نہ سنا"

اپنے اوپر قربان ہوجانے والے عاشق جاں باز کی آخری دید کی تمنا میں جو بھی تھا، قریب سے قریب تر ہونے کی کوشش میں تھا۔ لیکن اس چھوٹے سے مکان میں انسانوں کے امنڈے ہوئے اس سیلاب کی بھلا کیا گنجائش نکل سکتی تھی، مصنف امام نے لکھا ہے،

"گھر میں وسعت نہ تھی، مدرسہ میں لاکر جنازے کو رکھا"

لیکن جنازہ ابھی تیار نہیں ہوا تھا، حکیم منصور علی خاں حیدر آبادی کی روایت ہے،

"مدرسہ میں غسل دیا گیا تھا۔"

باوجودیکہ ظہر کی نماز کے بعد جیسا کہ بیان کر چکا ہوں۔ یہ حادثۂ فاجعہ پیش آیا تھا، لوگوں کے ہجوم اور اژدہام کو بھی آپ دیکھ رہے ہیں، لیکن حیرت ہوتی ہے، حکیم صاحب نے لکھا ہے کہ

"جنازے کو عصر کی نماز کے بعد اٹھایا گیا۔"

جس کا مطلب یہی ہوا کہ عصر کی نماز تک جنازہ تیار ہو گیا، اور نماز پڑھ کر لوگ لے چلے، اس لئے لے چلے کہ نماز کے لئے مدرسہ میں بھی دیکھا گیا کہ گنجائش نہ نکل سکے گی۔ مصنف امام کا بیان ہے کہ

"باہر شہر کے میدان میں نماز ہوئی۔"

افسوس کہ اس میدان کی صحیح نشاندہی نہیں کر سکتا[1]۔ میرے پاس جو وثائق ہیں، ان میں اس کی اطلاع نہیں دی گئی ہے[2]۔ بہرحال نماز مدرسہ میں نہیں، بلکہ شہر کے باہر کسی میدان میں ہوئی، لوگ جنازے کو کندھوں پر اٹھائے لئے جا رہے تھے، حکیم صاحب نے لکھا ہے کہ

"سینکڑوں آدمی جنازہ کو اٹھانا چاہتے تھے۔"

---

[1] کسی صاحب کو معلوم ہو، تو اس تاریخی میدان کی تعیین فرمادیں۔ بظاہر قیاس یہی چاہتا ہے کہ مدرسہ کے شمال کی طرف قبرستان کے ارد گرد آبادی کے باہر جو زمین ہے اسی کے کسی حصہ میں نماز جنازہ ادا ہوئی ۱۲

[2] احقر نے اپنے اکابر سے سنا ہے کہ جس مقام پر حضرت والا کی قبر ہے، یہ پہلے وسیع میدان تھا، اور بہت کافی وسیع تھا، اسی سے ملحق ایک بہت بڑا باغ تھا، اسی میں نماز جنازہ پڑھی گئی تھی۔ مذکورہ میدان اسی دن قبرستان کے لئے وقف کیا گیا، حضرت والا کی وصیت تھی کہ مجھے گور غریباں میں دفن کیا جائے اسی وصیت کے مطابق حضرت کے فدائی مرید حکیم مشتاق احمد صاحب نے یہ پورا میدان وقف کر کے قبرستان کیلئے دیدیا، سب سے پہلی قبر اس میں حضرت والا کی ہوئی، اور آج یہ ہزارہا علماء و صلحاء کا مدفن ہے۔ یہ زمین دار العلوم کے جانب شمال واقع ہے، اب اس میں قبرستان کے ارد گرد زراعت بھی ہونے لگی ہے اور قبرستان کے نگراں فقیروں کے کوٹھے اور رہائشی کچے مکان بھی بن گئے ہیں جس سے میدانی صورت باقی نہیں رہی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اس کش مکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ

"چار پائی چر چر کرنے لگی"

یہ بھی ان ہی کی روایت ہے، کہ اس حال کو دیکھ کر

"حاجی محمد عابد صاحب نے غل مچایا کہ اس قدر ہجوم جنازہ اٹھانے کو سب مت کرو، چار پائی ٹوٹ جائے گی"

اس شان کے ساتھ اپنے اوپر مٹ جانے والے کو مسلمان اس میدان تک لائے حکیم صاحب نے اس موقع پر اسی میدان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"قریب مغرب کے باغ میں جا کر جنازے کو رکھا"

جس وقت نماز جنازہ کی صف بندی ہونے لگی، علاوہ عام مسلمانوں کے حکیم صاحب نے یہ بھی دیکھا تھا کہ

"بہت آدمی جنازہ میں کمبل پوش فقراء موجود تھے"

مصنف امام کا بیان ہے کہ

"مغرب سے پہلے نماز ہوئی"

عام مسلمانوں نے جن میں اہل علم وفضل، ورع وتقویٰ کے ساتھ کمل پوش فقراء کی بھی کافی تعداد تھی، جنازے کی نماز پڑھی، اور زمین کا وہی قطعہ جس کے متعلق مولنا طیب صاحب نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ

"بوقت وفات حضرت (سیدنا الامام الکبیر) نے وصیت فرمائی کہ مجھے گورِ غریباں میں دفن کیا جائے"

جس کا مطلب یہی ہوا کہ دیوبند کے شیوخ اور سر برآوردہ حضرات کے مقبروں کی جگہ عام اور غریب مسلمان جہاں دفن ہوتے ہیں، وصیت فرمائی گئی تھی کہ ان ہی غریبوں کے

(گذشتہ صفحہ سے) آگے متن میں مصنف نے اسے تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔ محمد طیب غفرلہٗ

پاس انہیں سلا دیا جائے، ہندوستان کے آخری اسلامی حکمراں نے بھی یہی آرزو کی تھی کہ ؎

شاہوں کے مقبروں سے الگ مجھ کو گاڑیو

ہم بےکسوں کو گورِ غریباں پسند ہے

اسی شاہانہ آرزو کا اعادہ ہندوستان کے ایک فقیر کی طرف سے بھی کیا گیا تھا، اسی آخری وصیت کی تکمیل، بقول مولٰنا طیب صاحب سیدنا الامام الکبیر کے فدائی حکیم مشتاق احمد دیوبندی نے یوں کی، کہ

"وفات ہی کے دن اپنی ایک ذاتی زمین وقف کر کے اسے گورِ غریباں بنا دیا"

مصنف امام کے اس قول سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ

"باہر شہر ایک قطعہ زمین کا حکیم مشتاق احمد صاحب نے خاص قبرستان کے لئے اسی وقت وقف کر دیا"

بہر حال مغرب سے پہلے اسی باغ والے میدان میں جو شہر سے باہر تھا، جنازے کی نماز ادا ہوئی، اور بقول حکیم منصور علی خاں حیدر آبادی رحمۃ اللہ علیہ

"بعد نماز مغرب کے، جب شب جمعہ شروع ہوئی دفن کیا گیا"

حیرت اسی پر ہوتی ہے کہ ظہر کی نماز کے بعد عصر سے پہلے وفات ہوئی، اور نماز مغرب کے بعد تجہیز و تکفین کے سارے کاروبار سے فراغت ہو گئی۔ عام حالات میں ایسا بہت کم ہوتا ہے، مصنف امام نے بھی یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ "بعد مغرب دفن کیا" لکھا ہے کہ حکیم مشتاق احمد صاحب مرحوم کی اسی ارض موقوفہ میں جو گور غریباں کے نام سے موسوم کی گئی تھی،

"اول مولٰنا صاحب یعنی سیدنا الامام الکبیر کو دفن کیا"

اور یہی اطلاع مولانا طیب صاحب کی بھی ہے کہ اس گورِ غریباں میں

"پہلی قبر حضرت (سیدنا الامام الکبیر) ہی کی ہوئی"

دفن کے وقت تک تو انسانوں کے ہجوم کا یہ حال تھا، جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"اتنا مجمع ان بستیوں میں کبھی دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا"

ان بستیوں سے مراد آپ کی اطراف و جوانب کے وہ قصبات ہیں، جہاں شیوخ و سادات و شرفاء آباد ہیں۔ یعنی دیوبند۔ تھانہ بھون، نانوتہ وغیرہ۔ اسی کے ساتھ حکیم صاحب مرحوم کا ایک عبرت انگیز مشاہدہ یہ بھی تھا کہ کمل پوش فقراء جو اچانک خدا جانے کہاں سے سمٹ آئے تھے نماز اور دفن کے وقت تو وہ دیکھے گئے، لیکن لکھتے ہیں کہ

"بعد دفن سب غائب ہو گئے"

دفن کے بعد ہی یہ غائب ہو جانے والے رجال کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے کہاں چلے گئے؟ اس کا جواب کیا دیا جا سکتا ہے۔ رات ہو چکی تھی، ایسے وقت میں بجائے قیام کرنے کے ان کا غائب ہو جانا کچھ عجیب سی بات ہے، ورنہ ان کمل پوش فقراء کے سوا رات ہو جانے ہی کی وجہ سے اور جتنے آدمی بھی جہاں کہیں سے آئے تھے دفن کے بعد دیوبند ہی میں قیام کرنے پر مجبور ہوئے۔ حکیم صاحب نے آگے جو یہ خبر دی ہے کہ

"دوسرے دن سے مخلوق رخصت ہونے لگی" ص ۱۹۱

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، کہ عام خلقت رات گذارنے کے بعد دوسرے دن اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف واپس پلٹی۔ یہ جمعہ کا دن تھا، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کی نماز کے بعد لوگوں کی روانگی کا سلسلہ شروع ہوا ہوگا، اس سلسلہ میں جیسا کہ لکھا ہے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کش مکش کی ایک خاص حالت میں مبتلا ہو گئے۔ حادثہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے جو کچھ تھا، اس کا اقتضاء یہی تھا کہ اور کچھ نہیں تو پس ماندوں ہی کی تسلی کیلئے

چند دن قیام سرما ہی ۔ لیکن سہارنپور میں حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کا وقت بھی آخر ہو رہا تھا ' سیدنا الامام الکبیر پندرہ دن ان کی فرمائش کے مطابق قیام کر کے ذات الجنب میں مبتلا ہو کر دیوبند لائے گئے تھے ۔ حضرت والا کے قیام کے زمانہ میں مولانا احمد علی صاحب کی طبیعت بظاہر دیکھنے والوں کے نزدیک کچھ سنبھل گئی تھی ۔ لیکن درحقیقت حالت ان کی کچھ وہی تھی کہ

ان کے آنے سے جو آجاتی ہے منھ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

یہی ہوا بھی کہ حضرت والا کے رخصت ہونے کے ساتھ ہی پھر نڈھال ہوئے ، اور ایسے نڈھال کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی دوسرے دن اسی وجہ سے ' جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے

"جمعہ کے روز سہارنپور کو تشریف لے گئے "

نماز کے بعد اگر روانگی ہوئی ہوگی ، تو جمعہ کی شام کو سہارنپور پہنچے ہونگے ، صرف رات ہی گذرنے پائی تھی کہ بقول مصنف امام

" شنبہ کے روز جناب مولوی احمد علی صاحب کا انتقال ہوگیا "

یہ بھی ان ہی کا بیان ہے ، کہ اس زمانہ میں

"مولوی صاحب (یعنی حضرت گنگوہیؒ ) کی طبیعت پہلے سے ہی ناساز تھی "

اپنی ناسازی طبع کے ساتھ گنگوہ سے دیوبند ' اور دیوبند سے سہارنپور کی آمد و رفت ان جاں گداز روح فرسا حوادث کے ساتھ حقیقت یہ ہے ، کہ حضرت گنگوہیؒ کے لئے ابتلاء کی ایسی شکل تھی کہ ان کا عام الحزن چاہیئے تو یہی کہ یہی سال ہو ' ذاتی تعلقات کے سوا اللہ کے دو دو مقبول بندوں ' اسلام اور مسلمانوں کے راستباز دو خادموں کی وفات ایک دن کے فاصلے سے

ان کے سامنے ہوئی تھی۔ ایک کو دفن کر کے فارغ ہوئے کہ دوسرے کی تدفین میں مشغول ہونا پڑا، مصنف امام نے لکھا ہے کہ یوں

"مصیبت پر مصیبت آئی"

اعداد حروف جوڑنے سے یہی "مصیبت پر مصیبت آئی" کا فقرہ معلوم ہوا کہ دونوں بزرگوں کے سن وفات کا مادۂ تاریخ بھی ہے۔ جیسے "رضی اللہ عنہما دائما" کے فقرے میں دونوں بزرگوں کے سال وفات کا مادۂ تاریخ مولوی عبدالرحمن شاکر مالک مطبع نظامی کانپور کو ملا تھا، یہ اطلاع بھی مصنف امام ہی نے دی ہے۔

الغرض وداعی حج سے واپسی کے دو سال بعد ۱۲۹۷ھ ہجری روز پنجشنبہ دو بجے کے بعد جب نماز ظہر ہو چکی تھی، سیدنا الامام الکبیر اسلام اور مسلمانوں کی نصح و بہی خواہی میں اپنی ساری توانائیوں کو صرف فرماتے ہوئے خاکدان ارضی کی وقتی فرودگاہ یا مستقر الی حین سے "اجل مسمّی" کو پورا کر کے اپنے خالق اور مالک کے قدموں میں زبان حال ہی گویا ہم ہندی مسلمانوں کو یہ فرماتے ہوئے پہنچ گئے، کہ

مرا ہو ما نصیحت[1] بود کردیم
حوالت با خدا کردیم در فستیم

گو دارالعلوم دیوبند کے قیام پر کل پندرہ سال ہی گذرے تھے، اور صحیح معنوں آپ

---

[1] سعدی کی گلستاں کے خاتمہ کا یہ مشہور شعر ہے، آج کل عموماً پند و موعظت کا مرادف قرار دے کر نصیحت کے لفظ کو اردو زبان میں لوگ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن عربی زبان میں ابتدائی مفہوم تو اس کا سینا (فارسی دوختن) کا تھا۔ بعد کو بہی خواہی، خیر اندیشی، وغیرہ ایسے کام میں جس میں دوسروں کی شکستگی کی اصلاح مقصود ہو، نصیحت کے لفظ کا اطلاق عربی زبان میں ہونے لگا۔ صحیح حدیثوں میں اسی مفہوم کے لحاظ سے فرمایا گیا ہے الدین النصیحۃ (دین صرف نصیحت یعنی بہی خواہی ہے۔) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کس کی بہی خواہی؟ فرمایا گیا۔ اللہ کی اللہ کے رسول کی، مسلمانوں کے ائمہ یعنی حکمرانوں کی اور خود عام مسلمانوں کی بہی خواہی بس اسی کا نام (بقیہ بر صفحہ ۱۴۶)

کی خدمات سے استفادہ کی مدت جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، اس سے بھی کم ہے، تاہم یہ واقعہ ہے کہ ایسے محدود زمانہ میں بجائے مقامی مدرسہ کے ہمہ گیر جامعہ کے قالب میں یہ ادارہ آ چکا ہے۔ واللہ اعلم میرا خیال تو یہی ہے کہ حضرت گنگوہی کو خواب میں دلہن[۱] یا عروس کی شکل میں سیدنا الامام الکبیر کی یہی خدمت غالباً پیش کی گئی تھی، کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت تک دارالعلوم دلہن بن چکا تھا، آئندہ اس کی سرپرستی اور نگرانی کا تعلق مولٰنا گنگوہی سے جو پیدا ہوا، اسی کا تمثل بشکل نکاح ہوا تھا۔

درد کے اس افسانہ، اور غم کی اس کہانی کو ختم کرتے ہوئے اس کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ باوجود کافی تلاش اور جستجو کے اس کا علم نہ ہو سکا کہ سیدنا الامام کے جنازے کی نماز کس نے پڑھائی۔ حضرت مولٰنا گنگوہی کے ہوتے ہوئے خیال تو یہی گذرتا ہے کہ کسی دوسرے کو کیسے آگے بڑھایا گیا ہوگا، لیکن نہ کوئی تحریری شہادت ہی اس سلسلہ میں اب تک مجھے ملی ہے، اور نہ بزرگوں سے کوئی سماعی روایت مجھ تک پہنچی ہے، نیز ان بزرگوں کے ناموں کا بھی پتہ نہ چل سکا، جو "آخری خواب گاہ" میں "بالین آسائش" پر لٹانے کے لئے مرقد انور میں اترے تھے، مصنف امام کے ان الفاظ سے کہ

(بسلسلہ صفحۂ گذشتہ) دین ہے، دیکھا جائے تو سیدنا الامام الکبیر کی پوری زندگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی فرمان کے مطابق گذری ۱۲

[۱] تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ حضرت گنگوہی فرماتے تھے کہ "میں نے خواب میں دیکھا کہ مولانا محمد قاسم صاحب عروس (دلہن) کی صورت میں ہیں اور میرا ان سے نکاح ہوا" ص۲۸۹ خواب حالانکہ کھلا ہوا تھا، حضرت گنگوہی نے خود ہی تعبیر میں فرمایا تھا کہ ان کے بچوں کی تربیت کرتا ہوں۔ دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پانے والے طلبہ بھی ان بچوں میں شریک ہیں۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ بزرگوں کی بزرگی کی پیمائش کے عارضہ میں مبتلا ہونے والوں نے اس خواب سے بھی پیمائش کے گز یا فیتہ کا کام لینا چاہا، اللہم اغفر لہم ۱۲

"اس خزانہ خوبی[1] کو سپرد زمین کر دیا، اور ہاتھ جھاڑ کر چلے آئے" ص۱۴

کچھ ادھر دھیان جاتا ہے، یا جا سکتا ہے کہ اتارنے والوں میں دوسروں کے ساتھ غالباً ہمارے مصنف امام مولنا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ صدر اول دار العلوم بھی تھے، اگرچہ قطعی طور پر ان الفاظ کا مدلول یہ نہ ہو، لیکن ظاہر الفاظ اس فقرے کے کچھ اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

بہر حال دار العلوم دیوبند کی موجودہ عمارتوں سے بجانب شمال کچھ فاصلہ پر پلکھنوں[2] اور اسی قسم کے دوسرے تناور گھنے درختوں کی چھاؤں میں حکیم مشتاق احمد دیوبندی مرحوم کے موقوفہ گورغریباں میں لاتعداد قبور کے درمیان سیدنا الامام الکبیر حضرت مولنا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کا خام، کلیتہً خام، صرف مٹی کا مزار پایا جاتا ہے بعد کو دوسری نمایاں مبتیوں کے ساتھ آپ کے بالین مزار پر پتھر کی ایک لوح نصب کر دی گئی ہے، جس میں حضرت والا کا اسم مبارک تاریخ وفات کے ساتھ کندہ ہے، باہر سے دیکھنے والے صرف اسی لوح مزار سے آپ کی اس آخری خواب گاہ کو پہچانتے ہیں۔ لیکن باطنی شعور کی بیداری سے کچھ بھی حصہ جن کو ملا ہے، ان ہی سے پوچھئے کہ وہاں وہ کیا پاتے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ سپہر پیما گنبدوں، فلک بوس قبوں میں بھی شاید آج سکینت و طمانینت کی خنکیاں مشکل ہی سے میسر آسکتی ہیں۔ جنھیں ان ہی کچی خام سادہ قبروں والے اس قبرستان میں پانے والے پاتے ہیں، خصوصاً سیدنا الامام الکبیر کا مرقد پاک جسے دیکھ کر بے ساختہ حماسی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

---

[1] مصنف امام نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ منجملہ دوسرے تاریخی مادوں کے "خزانہ خوبی" بھی ایک مادہ تاریخ ہے ۱۲

[2] میں نے اپنے متعدد بزرگوں سے سنا ہے کہ حضرت والا کے دفن ہی کے روز حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ نے حضرت کے اس مزار پر یہ پلکھن اور گولر کے درخت نصب کئے اور اسی دن دار العلوم کے بڑے احاطہ میں مولسری کے دو درخت لگائے جو آج تناور درخت کی صورت سے سایہ افگن ہیں، اور یہ احاطہ ہی آج احاطہ مولسری کے نام سے معروف ہے ۱۲
محمد طیب غفرلہٗ

| | |
|---|---|
| عجبا لاربع اذرع فی خمسۃ | اس چار پانچ ہاتھ کے طول و عرض میں تعجب |
| فی جوفہا جبل اشم کبیر | ہے کہ اتنا اونچا بڑا پہاڑ کیسے سما گیا۔ |

کہتے ہیں کہ دفن کرنے والے جس وقت دفن کر رہے تھے، اسی وقت بے ساختہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے یہ شعر نکل پڑا، روتے جاتے تھے، اور کہتے جاتے تھے،

مٹی میں کیا سمجھ کے دباتے ہو دوستو
گنجینۂ علوم ہے، یہ گنج زر نہیں"

(اس کے بعد گنجینۂ علوم (شیخ الہند) بھی اسی جگہ دفن ہو کر اپنے اصلی معدن سے جا ملا۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔ محمد طیب غفرلہٗ)

اس وقت تو علوم کا ایک ہی گنجینہ یہاں دفن کیا گیا تھا، لیکن اب خدا ہی جانتا ہے کہ علم و اخلاص، ایمان و عرفان کے کتنے خزانے اب تک اسی سرزمین میں محفوظ ہو چکے ہیں۔ اور کتنے پردیسی، غریب الوطن، ابناء السبیل کو رحمت کے اس جوار میں پہنچ کر آسودگی میسر آچکی ہے۱۔ ونعم ما قیل ؎

---

۱ ارواح طیبہ میں نقل کیا ہے کہ کسی نے سیدنا الامام الکبیر سے ایک دفعہ پوچھا کہ بزرگوں کے قریب دفن ہونے کا کیا فائدہ؟ کہ ہر شخص کو اپنی ہی نیکی کام آتی ہے، پوچھنے والے صاحب اس وقت حضرت کو پنکھا بھی جھل رہے تھے۔ فرمایا کہ تم اس مجمع میں پنکھا کسے جھل رہے ہو، کہا کہ آپ کو، پنکھا کافی بڑا تھا، دوسروں کو بھی ہوا پہنچ رہی تھی، اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوا کہ یوں ہی حق تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کے جھونکے جب چلتے ہیں، تو مقصود کوئی ہو، لیکن آس پاس والے بھی اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ (تلخیص از ارواح ثلاثہ ص۱۸۱) مشہور حدیث ھم القوم الذین لایشقی جلیسھم (اہل اللہ وہ لوگ ہیں جن کا ہم نشین کبھی نامراد نہیں ہوتا) حکیم الامت تھانوی نے اس روایت کو تائیداً پیش کرتے ہوئے سخاوی کی مقاصد حسنہ کی اس روایت کا بھی ذکر کیا ہے جس میں حکم دیا گیا ہے کہ "اپنے مُردوں کو نیک صالح لوگوں کے درمیان دفن کیا کرو" مگر اس روایت کا ایک راوی سلیمان بن موسیٰ مجروح اور ناقابل اعتبار ہے۔ کچھ بھی ہو ہندوستان میں تو گورغریباں کا اطلاق (باقی اگلے صفحہ پر)
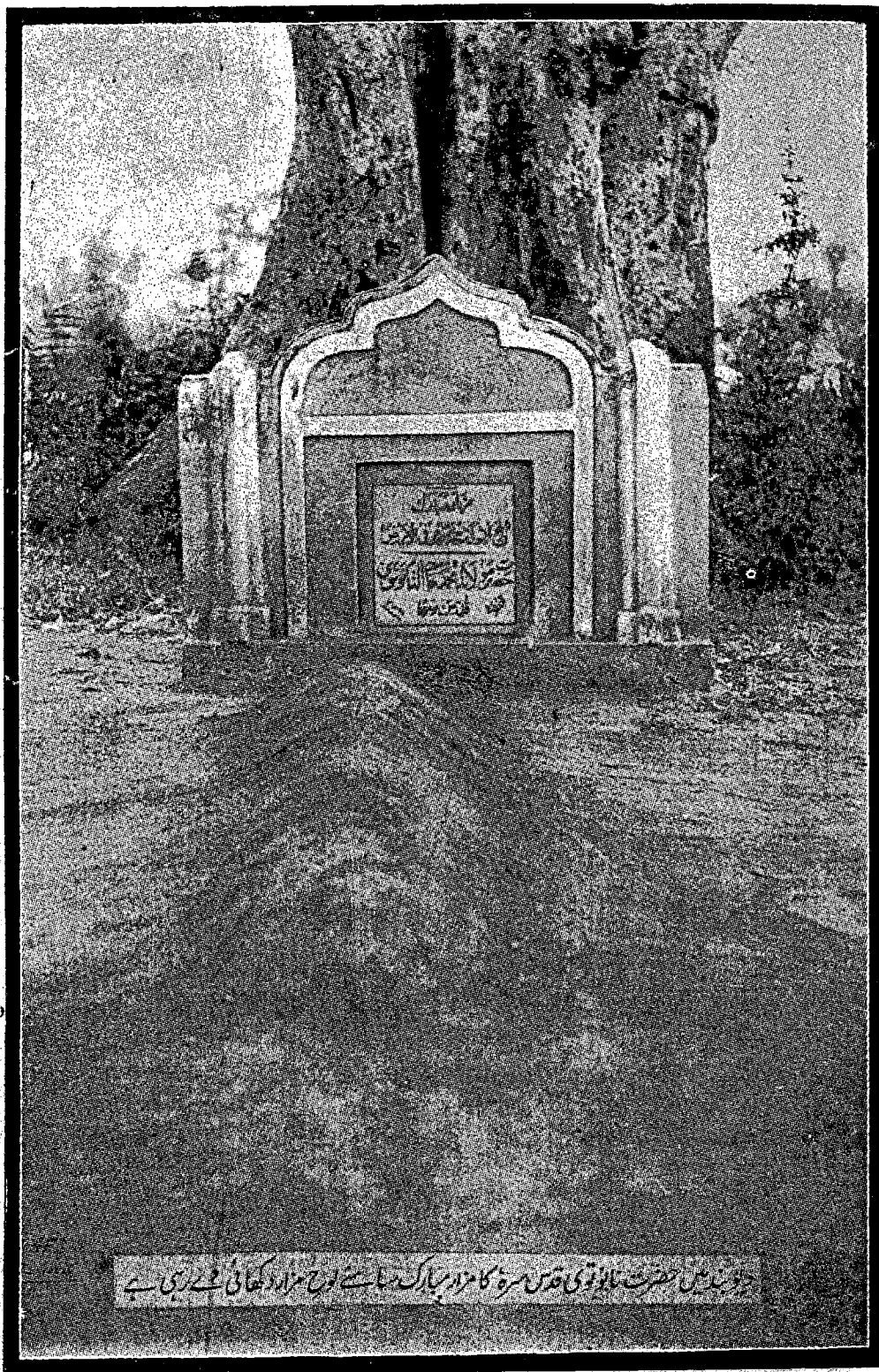
دیوبند میں حضرت نانوتوی قدس سرہ کا مزار مبارک سامنے لوح مزار دکھائی دے رہی ہے

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اسکی ہیں
جس کے شانوں پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

کون جانتا ہے کہ باطنی فیض رسانی کا یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔

کچھ بھی ہو سیدنا الامام الکبیر بظاہر اب ہم میں نہیں ہیں۔ لیکن کہنے والے نے کہا تھا،

لعمرك ما وارى التراب فعاله
لكنها وارى ثيابا واعظما

آج ہند ہی نہیں، بیرون ہند کی کتنی اسلامی آبادیاں آپ ہی کی جلیل دینی و علمی خدمات کی روشنیوں سے جگمگا رہی ہیں، اور سچ تو یہ ہے کہ سمجھنے والوں کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے، لیکن اللہ کی راہ میں قتل کے بعد طاری ہونے والی موت سے مرنے والوں کو قرآن کی نص قطعی میں حکم دیا گیا ہے کہ نہ ان کو مردہ کہا جائے، اور نہ مردہ سمجھا جائے، بلکہ یقین دلایا گیا ہے کہ وہ احیاء اور زندہ ہیں، تو جس کی ساری زندگی ہی اللہ ہی کی راہوں پر چلنے میں صرف ہوئی، جب تک زندہ رہا، اسی راہ پر چلتا رہا، اور وفات بھی اس کی جس وقت ہوئی، وہ اسی راہ پر رواں دواں تھا، ایسی صورت میں کیوں اصرار کیا جاتا ہے کہ اس کی "موت" کے بعد ہم اس کو مردوں میں شمار کریں، یاد ہوگا کہ ایک دفعہ نہیں، متعدد مواقع پر مشاہدہ کرنے والوں نے وفات کے بعد دیکھا کہ

(گذشتہ صفحہ سے) ان مقبروں پر کیا جاتا ہے، جہاں آبادی کے پس ماندہ غریب لوگوں کے مرنے دفن ہوا کرتے ہیں۔ لیکن عربی محاورے کی رو سے غریب مفلس کو نہیں، بلکہ اجنبی مسافر کو کہتے ہیں مشہور حدیث بدء الاسلام غریبا وسیعود غریبا فطوبیٰ للغرباء کا مطلب بھی یہی ہے کہ شروع میں بھی اسلام اور اسلامی زندگی سے لوگ ناآشنا تھے، بعد کو بھی ناآشنا ہوجائیں گے، مبارک وہی لوگ ہیں جو ناآشنائی کے ان دنوں میں اسلامی زندگی کی وجہ سے سوسائٹی میں اجنبی بن گئے ہیں۔ اس لحاظ سے سیدنا الامام الکبیر کی وصیت کے مطابق صحیح معنوں میں "گور غریباں" کا مصداق دیوبند کا یہ گور غریباں ہی ہوسکتا ہے۔ ایک جگہ اتنے پردیسی مسافر خدا جانے کس کس ملک اور علاقے کے یہاں اب تک دفن ہوچکے ہیں اور آئندہ ہوں گے۔ فطوبیٰ لھولاء الغرباء ۱۲

"مولٰنا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جسد عنصری کے ساتھ میرے پاس
تشریف لائے تھے" ۱۸۵؎ ارواح ثلاثہ

یہ مولٰنا رفیع الدین سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کا بیان ہے۔ تفصیل اس واقعہ کی اپنے محل پر گذر چکی ہے، اسی طرح مدرسہ کے وظیفہ سے قانونی طور پر محروم رہ جانے والے طالب علم کا قصہ بھی سنا چکا ہوں۔ جن کے سامنے بھی کچھ اسی قسم کی صورت پیش آئی تھی۔ ان کے سوا بھی دوسرے ذرائع سے جو روایتیں مجھ تک پہنچی ہیں، ان کے ہوتے ہوئے، ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ ان منامات و مبشرات کا بھی ذکر کیا جائے، جو عموماً اس قسم کے بزرگوں کی وفات کے بعد مناسبت رکھنے والے نفوس کو دکھائے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ کی بھی بعض چیزوں کا بعض مواقع میں ذکر کر بھی چکا ہوں۔ جن میں سب سے درد انگیز خواب حضرت والا کے صاحبزادے حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ اولیٰ کا تھا۔ جس میں منجملہ اور اجزاء کے انہوں نے خواب ہی میں دیکھا کہ ہمارے مصنف امام مولٰنا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔ دکھایا گیا تھا کہ رنگ رنگ کے پھولوں سے بھرے ہوئے ایک پلنگ پر سیدنا الامام الکبیر آسمان سے ان کے گھر میں اتر آئے گھر کے لوگ سب جمع ہیں۔ سیدنا الامام الکبیر ان کو خطاب کر کے صبر کے مسئلہ پر تقریر فرما رہے ہیں، صبر کی اس تلقین پر دیکھا کہ آگے بڑھ کر مولٰنا محمد یعقوب صاحب حضرت والا سے عرض کر رہے ہیں کہ

"حضرت ہم لوگوں نے بہت صبر کیا، مگر جس وقت عائشہ اور ہاشم نظر
پڑتے ہیں، صبر نہیں ہو سکتا"

عائشہ حضرت والا کی سب سے چھوٹی صاحبزادی کا نام ہے، وفات کے وقت ان کی عمر کل چار سال کی تھی، اور ہاشم آپ کے چھوٹے صاحبزادے کا نام تھا جن کی عمر اس وقت کل آٹھ سال کی تھی۔ کم عمری ہی میں بمقام مکہ معظمہ جن کا انتقال ہوا، خواب میں دیکھا گیا کہ حضرت

# حضرت حاجی اِمداد اللہ قدس سرہٗ کا خط جو اُنھوں نے
# حضرتِ نانوتویؒ کی تعزیت میں مولانا رفیع الدین صاحب کو مکہ مکرمہ سے لکھا

مولٰنا محمد یعقوب صاحب کے کہنے پر سیدنا الامام الکبیرؒ نے جواب میں فرمایا

"صبر تو ایسے ہی وقت ہے"

اور اسی قرآنی وصیت، حکیمانہ و عارفانہ فقرے پر اپنی اس کتاب کو فقیر بھی ختم کرتا ہے۔

فالحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات

فان اَبْكِ اَبْكِ علیٰ فاجع

وان یك صبرٌ فمثلی صُبَّرٌ

سید الانبیاء والمرسلین، محبوب رب العالمین، خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روپوشی پر امت صبر کر چکی ہے، آپ کے جانباز فدائیوں کی آمدورفت کا یہ سلسلہ رہتی دنیا تک جاری ہی رہے گا، ہم میں جب وہ آئیں گے تو ہم شکر کریں گے، اور اپنے اپنے وقت کو پورا کر کے جہاں سے آئے تھے جب وہیں چلے جائیں گے تو ہم صبر کریں گے، اللہ کے ان برگزیدوں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ان راستباز مخلص وفادار عشاق وخادمین کی پاک روحوں کو سلام پہنچاتے ہوئے، ان ہی الفاظ کو دہراتے ہیں جو ہمیں سکھائے گئے ہیں۔

انتم لنا سلف ونحن بالاثر، اتاکم ماتوعدون، غدا مؤجلون، وانا انشاء اللہ بکم لاحقون، یرحم اللہ المتقدمین منا والمستاخرین

آپ لوگ ہمارے سلف ہیں، ہم آپ کے پیچھے ہیں، جس چیز کا آپ سے وعدہ کیا گیا تھا، وہ آگیا، کل (اٹھنے کے لئے) وقت مقرر کیا گیا ہے، ہم بھی آپ کے ساتھ آکر ملنے والے ہیں،

اللہ رحم کرے ان لوگوں پر جو ہم سے پہلے گذر گئے اور ان پر بھی جو بعد میں گزریں گے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

کہف الایمان گیلان (بہار)

یوم الاثنین (روز دوشنبہ) ۱۳۷۲ھ رجب المرجب ۶ر اپریل ۱۹۵۳ء

اس سلسلہ میں کاغذات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت والا کے مرثیے بیشمار لکھے گئے، جن کا تذکرہ تو ملتا ہے مگر یہ قصائد نہیں ملتے۔ ناچار صرف وہ قصائد درج کئے جاتے ہیں جو مطبوعہ یا مخطوطہ دستیاب ہوئے۔ ان میں اردو کے قصائد میں حضرت مولٰنا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، اور حضرت اقدس شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قصائد اور فارسی میں حضرت مولٰنا ذوالفقار علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولٰنا محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند (حفید رشید حضرت نانوتوی قدس سرہٗ) کے قصائد، اور آخر میں عربی کا ایک مرثیہ از حضرت مولٰنا ذوالفقار علی صاحب رحمہ اللہ درج کیا جا رہا ہے۔

# قطعۂ تاریخ وفات

قبلۂ اربابِ دین کعبۂ اصحابِ یقین حضرت مولانا مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ بانی و سرپرست مدرسہ اسلامیہ دیوبند کہ بتاریخ ۴ جمادی الاولیٰ یوم پنجشنبہ وقت صلوٰۃِ ظہر ۱۲۹۷ھ کو دار آخرت کی طرف رحلت فرمائی۔

(از نتائج طبع مولوی فضل الرحمٰن صاحب منبر سلمہٗ)

وہ غم ہے قاسمِ بزمِ ہدا کی رحلت کا — کہ جرعہ نوشِ الم جس سے ہر دروغنہ ہے

یہ ایسا غم ہے کہ جس غم سے بزمِ عرفاں کا — مثالِ خمِ فلک جام واژگونہ ہے

کچھ اک زمیں ہی نہیں زرد رنگ اس غم سے — لباسِ چرخ بھی ماتم میں نیلگونہ ہے

ہے حامیانِ شریعت کو گر غم بے حد — تو سالکانِ طریقت کو اس سے دونہ ہے

کہاں ہے مدرسۂ دیں کا حامیِ برحق — کہ ملکِ علم و عمل اس بغیر سونہ ہے

نہ پوچھ حالِ دلِ زارِ تشنگانِ علوم — کہ ان کی زیست ترے ہجر میں چگونہ ہے

کیا ہے شعلۂ ہجراں نے گر جگر کو کباب — تو آتشِ غمِ فرقت نے دل کو بھونا ہے

مگر مزارِ مقدس سے تیرے اے خوش خو — ترے فدائیوں کو صبر ایک گونہ ہے

سرِ الم سے لکھی فضل نے سنین وفات

وفات سرورِ عالم کا یہ نمونہ ہے

۱۲۹۷ھ

# مرثیہ حضرتِ نانوتوی مشتمل بر کیفیت اجراءِ دار العلوم دیوبند

جس کو حضرت مولانا شیخ الہند مرحوم نے جلسہ منعقدہ ۲۰ صفر المظفر سنہ ۲۴ھ میں سنا کر حضارِ مجلس کو مضطرب و بے قرار بنا دیا تھا۔

ہیں منن اور محن دونوں جہاں میں توام — حکمتِ حق کا ہے دونوں میں نرالا عالم

رحمت و فضل خدا جب ہے غضب پر سابق — کیوں نہ پھر قہر کو اس کے کہیں لطف و کرم

اس کی آغوشِ غضب میں ہیں ہزاروں رحمت — اُس کے ہر لطف میں ہیں سیکڑوں الطاف و کرم

فضل سے اس کے کسی وقت نہ ہونا مایوس — خواہ پیش آئے مسرت تجھے اور خواہ الم

رحمتِ حق کی ہے تمہید سمجھ او ناداں — پیش دنیا میں جو کچھ آتا ہے اندوہ و الم

انقلاباتِ جہاں واعظِ رب ہیں سُن — ہر تغیر سے صدا آتی ہے فَافْهَمْ فَافْهَمْ

للہ الحمد میری جان اور سلامتا اللہ — مرغِ ایمان کی ہیں بازوئیں دو مستحکم

دور اندیش وہی ہے کہ مصائب کے عوض — ہو کے خوش مرضیِ مولیٰ کی کرے بیع سَلَم

جزر و مد بحرِ حوادث کا بچشمِ حق بیں — طرۂ شاہدِ تقریر کا ہے پیچ و خم

گردشِ دہر دکھاتی ہے ہمیں آنکھوں سے — كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ کا نقشہ ہر دم

کل کی ہے بات کہ تھی جہل کی گھن گھور گھٹا — جس طرف آنکھ اٹھاتے تھے محیطِ عالم

آبِ حیواں کی طرح علم ہوا تھا مخفی — ظلمتِ جہل سے مخلوق تھی اَعمیٰ و اَصم

رحمتِ حق ہوئی حامی تو یکایک اٹھے — چند مردانِ خدا باندھ کے صف ٹھوک کے خم

یوسفِ علمِ شریعت کے خریدار بنے — جمع کر کے سرِ اخلاص سے معدود دِرم

سلسلہ ڈالا فقیرانہ بنامِ ایزد — کورہ عه ۵۷ میں کہ جہاں بیٹھے ہیں اربابِ ہمم

شوق کہتا تھا بڑھو ضعف یہ کہتا تھا ٹھیرو — ناتوانوں کا تھا کیا کہیے عجب ضیق میں دَم

اتنے میں دیکھتے کیا ہیں کہ اک مردِ خدا عه ۵۸ — آ رہا تیز روی سے ہے لئے ساتھ عَلَم

---

عه ۵۷ مراد دیوبند عه ۵۸ مراد حضرت نانوتوی رح

بے نیازی و توکل رخِ روشن سے نمود — قطع منزل کے لئے دونوں قدم تیغ دودم
کس بلاکی تھی نظر پڑتے ہی جس کی فی الفور — پڑگئی جان میں جان آ ہی گیا دم میں دم
ناتوانوں کو ملا اس کی حمایت سے یہ دور — زینۂ بامِ ترقی پہ بڑھا سب کا قدم
تھی نرالی ہی کچھ اس مردِ صفا کی سج دھج — تھے عجائب کچھ اس شیرِ خدا کے دم خم
گاڑ کر اس نے علم ایک ندا کی ایسی — یک بیک چونک پڑے اہل مدد اہلِ خیم
اس کی آواز تھی یا بانگِ خلیل اللّٰہی — کہہ کے لبیک چلے اہل عرب اہلِ عجم
عقل و انصاف کا جس سر میں ذرا بھی تھا اثر — ذوق علمی کا تھا جس سینہ میں تھوڑا سا بھی دم
دین کا ذرہ بھی تھا قلب میں جس کے مُودَعْ — خیر کا شمّہ بھی تھا جس کے مقدّر میں رقم
باندھ کر حیبت کمر رہتے ہوئے نحن معک — جس جگہ اُس یم رحمت کا پڑا نقشِ قدم
اس مربی دل و جاں کی مسیحائی سے — علم دیں زندہ ہوا جہل نے لی راہ عدم
ابرِ علم و عمل و فضل کا بادل برسا — جس جگہ اس یم رحمت کا پڑا نقشِ قدم
جہل کے جب سبھی کہنے لگے اِحسا اِحسا — چلدیا پاؤں دبے چپکے سے با بختِ دژم
علم کو لا کے ثریا سے ثری پر رکھا — آنکھوں سے دیکھ لیا عَلَّمَ مَا لَمْ يَعْلَمْ
دولتِ علم سے سیراب کیا عالم کو — قاسم علم بھلا کیوں نہ ہو پھر اس کا علَم
اس کی آواز تھی بیشک قُم عیسیٰ کی صدا — جس کے صدقہ سے لیا علم نے دوبارہ جنم
طائرِ علم شریعت کے لئے یہ دینین — برکتِ حضرتِ قاسم سے ہے مامون حرم
سلسلے علم کے امصار و قرے تک جاری — اس کی ہمت سے ہوئے بل بے ترا فیض اعم
جملہ اعیان و اکابر تھے جبلو میں اس کی — اس کی شوکت کو پہنچتی تھی کہاں شوکتِ جم
یک بیک حکمتِ باری نے جو پلٹی کھائی — چلدیئے چھوڑ کے یہاں سب کو کلُّ بانی غلام
لوٹتے آگ پہ تھے حضرتِ یعقوب ورفیع — خون آنکھوں سے بہاتے تھے رشید عالم
دیکھ کر حضرت امداد کی زاری کو ملک — پر سمیٹے ہوئے کہتے تھے الٰہی اِرحم

اہلِ علم و اہلِ ورع خاص، عوام عالم — سب نے تقسیم کیا پر نہ ہوا کم یہ غم
فرقِ درجات کا قصہ تو جدا ہے لیکن — عام تھا عالمِ اجسام میں اس کا ماتم
متزلزل ہوئے سب مدرسہ کے رکن رکین — ہل گئے ہائے غضب سلسلۂ خیر کے تھم
علم آتا تھا نظر ایک یتیم بے بس — اہلِ علم آہ تھے مایوس بچشمِ پُر نم
قاسمِ علم چلے علم بھی لو ساتھ چلا — کس کو تھاموگے کہو پکڑوگے کس کس کی قدم
ایک کا کرنا سفر دوسرے کا عزم سفر — جانِ عالم کیلئے دونوں تھے سوہانِ الم
ہوگیا سب کو یقین باندھ لیا سب نے خیال — سلسلہ علم کا بس ہوگیا درہم برہم
اسی مایوسی و مجبوری و حیرانی میں — مجتمع ہوکے اکابر بچشمِ پُر نم
حضرت مرشدِ عالم سے تمنا یہ کی — آپ اب اپنے تصرف میں لیں یہ کار اہم
غایتِ خلق سے فرمایا کہ تمہا ہوں میں — باقی ہر حال میں ہوں ساتھ تمہارے منضم
چند کلمے کہے نرمی سے تسلی آمیز — ہوگئے زخم رسیدوں کے جگر کے مرہم
ہائے وہ نیچی نظر ہائے وہ شیریں الفاظ — کس غضب کے تھے کہ سب دور ہوئی تلخی غم
آپ کی پاک توجہ سے ہوا سب کو سکون — علم کے اکھڑے ہوئے جم گئے واللہ قدم
کام اس مدرسہ کا فضل و کرم سے اسکے — الغرض رو بترقی ہی رہا ہر ہر دم
مذہبی جتنے سلاسل تھے رہے سب جاری — کام کوئی نہ رکا سہل تھا وہ یا اہم
بعد چندے ہوا نیرنگیٔ قدرت کا ظہور — یعنی یعقوب شد فیع ہر دو وزیر اعظم
ہوکے مشتاق لقا پہنچے یکے بعد دگر — خدمت قاسم خیرات میں شاد و خرم
دست و پا بھی لو چلے سر تو تھا پہلے ہی گیا — قلب بس باقی رہا یعنی رشید عالم
وہ بھی مجروح ستم دیدۂ ہجر احباب — جُرعہ نوشِ ستم و دُرد کشِ ساغرِ غم
اسی اندوہ و غم و یاس میں سبحان اللہ — رحمتِ حق ہوئی مبذول بحالِ عالم
بھر دیا قلبِ مقدس میں تمام عالم کا — درد و غم خیر و صلاح خوب ملاکر باہم

ھ/ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ

خاص کر تر کہ قاسم کی محبت واللہ ‏ سب طرح اس دل اقدس میں ہوئی مستحکم

سب کی الفت پہ تھی اسکی ہی محبت غالب ‏ سب غموں پر جو تھا ممتاز یہی تھا وہ غم

پھر تو کیا تھا دی خدا نے وہ ترقی ہا اسکو ‏ دیکھ لیں آپ کہیں اپنی زباں سے کیا ہم

پوچھتے کیا ہو و ماغوں کا ہمارے احوال ‏ ہم غریبوں کا زمیں پر نہیں پڑتا تھا قدم

نہ رُکا پر نہ رکا پر نہ رُکا پر نہ رُکا ‏ اس کا جو حکم تھا تھا سیف قضائے مبرم

نہ چلا کوئی فساد ایسا کہ پاؤں نہ کٹے ‏ فتنہ نے سر نہ اٹھا یا کہ ہوا ہو نہ قلم

کلفتیں جھیلیں سبھی پر نہ ہوا چین بجبیں ‏ دقتیں دیکھیں ٹلا اپنی جگہ سے نہ قدم

دشمن و دوست کے چہرے ہیں تفاوت ہے عیاں ‏ سر سوں پھولی تھی وہاں اُسنے ملا تھا عدم

سب مریضوں کے لئے ایک شے ہی تھا آنار ‏ سیکڑوں زہر تھے تریاق تھا بس اسکا دم

قاسم و حضرتِ امداد کو مرنے نہ دیا ‏ بلکہ زندہ ہی رکھا سب کو علیٰ وجہ اتم

مُردوں کو زندہ کیا زندوں کو مرنے نہ دیا ‏ اس مسیحائی کو دیکھیں ذری ابن مریم

ہائے غم ہائے ستم ہائے غضب ہائے الم ‏ آج اُس سے بھی ہوا دیکھ لو خالی عالم

آگے کہنے کی ہے کچھ بات نہ سننے کی تاب ‏ لب تلک آتا ہے لیکن یہ مقولہ ہے ہیہم

رحم بر حال کسیم ہیچ نکردی رفتی ‏ ایکہ کفش کف پائے تو بود تاج سرم

آج تو قاسم و امداد سبھی مرتے ہیں ‏ اس کا کیا ذکر ہے برباد ہوئے تم یا ہم

منتظر بیٹھے ہیں اب ہم پہ گذرتا کیا ہے ‏ قہر کا خوف ہے پر ساتھ ہے امید کرم

تو رحیم و ملک و بار ہے سلّمو سلّمو ‏ ہم جہول اور زیاں کار ہیں ارحم ارحم

اے اسیرانِ غمِ قاسمِ خیر و برکات ‏ دے فقیران سیر کوئی رشید جانم

پیروی کرتے رہو سعی کو ہاتھوں سے نہ دو ‏ بدے یا درمے یا قدمے یا بالقلم

بے نمک ہیں مرے اشعار مگر تلخ نہیں،

خالی از درد نہیں گرچہ ہیں لشٹم پشٹم،

# ازافادات

## حضرت رأس المحدثین مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی قدس سرہٗ

# در تاریخ وفات

## بحر العلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

| | |
|---|---|
| ہر چشم مثلِ ابر ہے کیوں اشکبار حیف | ہر سینہ مثلِ لالہ ہے کیوں داغدار حیف |
| کس کی لگی ہے یہ نظرِ بد جہان کو | دم میں ہوئی خزاں سے مبدل بہار حیف |
| ہے کیا سبب جہاں میں آتا نہیں نظر | جز آہِ دردناک و دمِ شعلہ بار حیف |
| ہر ایک کی زباں پہ ہے جاری دعائے مرگ | آتا نظر ہے ہر کوئی زار و نزار حیف |
| زیب جبیں ماہ میں کیوں ہے داغدار | زخمی جگر ہے کیوں گہر آبدار حیف |
| مسکن پذیر دل میں ہے کیوں یاس و اضطراب | صبر و سکوں سے آتی ہے کیوں ہم کو عار حیف |
| آنکھوں میں جوشِ اشک ہے سینہ میں درد ہے | دل میں غم و الم ہے زباں پر ہزار حیف |
| مونس الم رفیق فغاں غمگسارِ غم | ہمدرد درد ہمنفس اف یارِ غار حیف |
| سو ٹکڑے ٹکڑے سینہ ہوا چاک چاک اُف | دل پارہ پارہ جامہ ہوا تار تار حیف |
| یہ زندگی ہے یا کوئی طوفان مرگ ہے | غم جی میں اشک آنکھ میں دل میں غبار حیف |
| کیسی خوشی کہاں کی ہنسی کیا نشاط و عیش | وردِ زبان اب تو ہے لیل و نہار حیف |
| دشنہ کا کیوں گلو کو ہے اس درجہ اشتیاق | خنجر پہ غش ہے کیوں جگر بے قرار حیف |
| جینے پہ جان دیتے تھے ہم کل کی بات ہے | زہر آبِ مرگ آج ہے کیوں خوشگوار حیف |
| کل تک تو آرزو تھی ہمیں عمرِ خضر کی | ہر دم اجل کا آج ہے کیوں انتظار حیف |

رشکِ خزاں بہار ہوئی دشمنِ نشاط — محسودِ مرگ زیست ہوئی غمگسار حیف

یہ کون اٹھ گیا ہے کہ جی بیٹھا جائے ہے — یہ کون چھپ گیا کہ ہے حشر آشکار حیف

خورشیدِ علم آج ہوا کون سا غروب — عالم تمام کیوں نظر آتا ہے تار حیف

کس خاکسار کا ہے یہ ماتم کہ جائے اشک — برسے ہے چشمِ دہر سے پیہم غبار حیف

کس ضابط و صبور کا شیون ہے یہ کہ آہ — سینہ سے لب تک آتی نہیں زینہار حیف

جو باعثِ نشاطِ دلِ ناصبور تھا — روتے ہیں اس کی ہجر میں اب زار و نزار حیف

ہر بات جس کی مایۂ صبر و شکیب تھی — عالم ہے اس کے ہجر میں اب بیقرار حیف

جب باعثِ حیات ہی ہو موجبِ ممات — اللہ کیا کرے دلِ امیدوار حیف

وہ آج بارِ دوشِ احبا ہے حسرتا — جو ڈالتا کسی پہ نہ تھا اپنا بار حیف

عالم میں جس کا مثل عدیم الوجود تھا — لو اٹھ گیا جہان سے وہ کوہِ وقار حیف

محرومِ زیست قاسمِ بزمِ ہدیٰ دریغ — آغوشِ گور عارفِ شب زندہ دار حیف

تقریرِ دلپذیر ہو جس کی غذائے روح — وہ لقمۂ اجل ہو ستمِ روزگار حیف

عیسیٰ دم اور صرصرِ مرگ اے فلک دریغ — گنجِ علومِ وہبی و کنجِ مزار حیف

موسائے وقت و سحرِ اجل وا مصیبتا — خضرِ زمان و گوشہ نشینِ حصار حیف

یوسف لقا و چاہِ لحد ہمدم الحذر — ویوِ قضا و آصفِ دوراں شکار حیف

زیرِ زمیں طائرِ عرش آشیانہ اف — بالائے چرخ زیب وہ روزگار حیف

بادِ خزان و گلشنِ دیں اے زمانہ آہ — برقِ فنا و خرمنِ صبر و قرار حیف

کشافِ علمِ دیں ہوا در پردۂ عدم — موجِ قضا ہو کشتیِ عالم سے چار حیف

جانِ جہاں ہو رہنِ عدم وائے بیکسی — پامالِ خاکِ رہ ہو درِ شاہوار حیف

آیا قرار آپ کو بس جا کے زیرِ خاک — اللہ رے غضب ہوس انکسار حیف

گردن پہ تیرے خون ہے سارے جہان کا — تیرا بھلا نہ ہو ہوسِ انکسار حیف

سنتے تھے سے ہے عدم میں نظیر جناب پر — کیوں قصد آپ نے کیا با جسم زار حیف

سو ہاں جان ہیں آپ کے الطاف جاں فزا — بد قسمتی سے نور ہوا ہم کو نار حیف

گنتے تھے ہم بھی جاں نثاروں میں آپ کو — اس دعوئے غلط سے ہیں اب شرمسار حیف

ہیں آپ زیر خاک ہوں اور ہم بقید زیست — کیا منہ دکھائیں گے تمہیں روز شمار حیف

اس مایۂ حیات کی فرقت میں یا نصیب — ہو پائدار ہستی نا پائدار حیف

ہوتی نہ سخت جانی اگر مونس فراق — تو کام کر چکا تھا غم ہجر یار حیف

ہم دولت وصال سمجھتے تھے لازوال — تھی کیا خبر کہ ہوگا یہ انجام کار حیف

کیونکر جئیں یہ آپ کے خادم بتائیے — امید مرگ ہی نہ ہو گر غم گسار حیف

رنج و فراق و کلفت غم صدمہائے ہجر — لائق اسی عطا کے تھے کیا جاں نثار حیف

بن جائے اپنے واسطے خضر رہ عدم — آتا نہیں ہے ایسا نظر دوستدار حیف

ہاں اے اجل خدا کیلئے چشم التفات — بے روئے یار زیست ہے اب ہم کو بار حیف

یاں جاں بلب ہیں آپ کو اصلا خبر نہیں — ایسا شفیق اور ہو غفلت شعار حیف

وہ قلب جو کہ محو نیاز حضور تھے — اب ان کو تیغ غم سے کریں یوں فگار حیف

پائے جناب جن سے دباتے تھے کل ہیں آج — وہ ہاتھ زیر سینہ و فرق و عذار حیف

وہاں ہم سے خستہ جانوں کی کیا قدر ہو جہاں — غلماں ہوں اور ملائکہ خدمت گذار حیف

وا حسرتا جو آپ کے حلقہ بگوش تھے — پھرتے ہیں آج جوں شتر بے مہار حیف

علم و ذکا سے آپ کے جو بہرہ مند تھے — پھرتے ہیں کوہ و دشت میں دیوانہ وار حیف

پھرتے ہیں آج فکر میں آب حیات کی — کل تھے جو آہ آپ کے بیمار دار حیف

سرگشتۂ تلاش اطبا جو کل تھے آج — فکر مسیح و خضر میں ہیں دل فگار حیف

اب اپنی موت کی ہیں وہ تدبیر سوچتے — جو آپ کی حیات کے تھے خواستگار حیف

ہو آپ کی حیات تلک خاک دسترس — جب اپنی موت ہی پہ نہیں اختیار حیف

پھولا نہیں سماتا ہوں کہتا ہے جب کوئی — کیا اعتبار ہستی بے اعتبار حیف

زیوز میں ہی چل کے رہو ہمد مو کہ ہاں — کچھ لطف زندگی نہیں بے رُوئے یار حیف

سر پہ ہو کوہِ غم تو تڑپنا بھی ہے محال — نکلیں گے کس طرح مرے دل کے بخار حیف

اب خوابِ وصل ان کو ہے سرمایہ نشاط — جن کو خیال ہجر بھی تھا ناگوار حیف

فقرہ ہنر کمال و سخا جود و اتقا[۱] — دستِ قضا سے ہوں بے سر و پا ہزار حیف

ق ن ما خ و تق
۷ ۹ ۲ ۱ ھ

مل[۲] جائیں فضل و علم و عمل اف زمیں میں — پیوند خاک زہد و سخا ہوں ہزار حیف
۷ ۹ ۲ ۱ ھ

جائیں[۳] عدم میں فضل و کرم جود ہائے ہائے — عالم ہوا در ماتم و حسرت ہزار حیف
۷ ۹ ۱۲ ھ — ۷ ۹ ۲ ۱ ھ

گو دم نہیں پہ[۴] نکلے ہے دل سے یہی صدا
۴۴
پژمردہ آہ ہو گل خنداں ہزار حیف
۱۳۴۱ - ۴۴ = ۱۲۹۷ھ

---

[۱] فقرہ - ہنر - کمال - سخا - جود - اتقا - کے بے سر و پا ہو جانے پر جو الفاظ باقی رہتے ہیں وہ مادہ تاریخ ہیں اور وہ یہ ہیں ق - ن - ما خ - و - تق - ان کے اعداد (۱۲۹۷) ہیں جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے ہجری سنہ کے ہیں ۱۲

[۲] فضل - علم - عمل - زمین کے اعداد (۱۲۹۷) ہیں - خاک - زہد - سخا - کے اعداد (۱۲۹۸) ہیں - بعد غور خیال میں آتا ہے کہ خاک کو درمیان سے کھود کر پیوند خاک کیا جاتا ہے - جب لفظ خاک درمیان سے کندہ کیا جائے گا الف علاحدہ ہو جائے گا اور ۱۲۹۷ باقی رہ جائیں گے - غالباً حضرت کا یہی مقصد ہوگا ۱۲

[۳] مادہ تاریخ کے لئے فضل - کرم - جود کو عدم کے ساتھ شامل کیجئے - عالم - ماتم و حسرت - کے اعداد (۱۲۹۶) ہیں - ایک کی کمی ہے - تاریخ وفات کے مادہ میں ایک کی کمی اگر رہے تو معیوب نہیں بلکہ مستحسن ہے جس طرح تاریخ ولادت کے مادہ میں اگر ایک زائد ہو مستحسن ہے - یہ مادہ تاریخ غالباً اسی قاعدہ کے لحاظ سے نکالا ہے ۱۲ [۴] دوسرا پورا مصرعہ بتخرجۂ (دم) مادۂ تاریخ ہے - ۱۲

# مرثیہ حضرت نانوتوی رح

بزبانِ فارسی

از حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی

مددے سوز درونم کہ شدم غرق بخون ۔۔۔ رحمے اے گریہ کہ من سوختم از سوز درون
ایں چہ شور است کہ کردست مرا گرد جنون ۔۔۔ مرگ بشتاب کہ از زیست بجانم اکنون

وقت آنست کہ من جامۂ جان چاک تنم
آتشین آہ برین خرگہ افلاک زنم

فلکِ تفرقہ پرداز چہ کردی ہے ہے ۔۔۔ با چنیں غمزدگان بازچہ کردی ہے ہے
سخت کج باختی کجبازچہ کردی ہے ہے ۔۔۔ مد بیداد شدہ بازچہ کردی ہے ہے

ساختی بے سروپا بے سروسامانی را
سوختی ز آتش جان سوز مسلمانی را

مرشد و ہادیِ ما شاہ محمد قاسم ۔۔۔ رہ نمایندۂ گمراہ محمد قاسم
با دل روشن و آگاہ محمد قاسم ۔۔۔ رفت زین دار فنا آہ محمد قاسم

حالیا زیستنم مشکل و مردن مشکل
ہر نفس خوردن زخمی و نخوردن مشکل

تا شدہ از سر ما سایۂ ان سرو روان ۔۔۔ روز و شب صبح دمسائیم چو قمری نالان
دور از ان جان جہانیم چو جسم بیجان ۔۔۔ یا چو آن گلہ کہ رفت از سرِ وے آہ شبان

آہ ازین فرقت جاوید کہ پایانش نیست
داد ازین درد روان سوز کہ درمانش نیست

شمع از جمع شد و محفلِ ما شد تاریک ۔۔۔ رفت خور زیر زمیں ارض و سما شد تاریک
ہادیٔ ما بشد و راہ ہدیٰ شد تاریک ۔۔۔ خانہ شرع و طریقت بخدا شد تاریک

بعد ازین کیست کہ زیسان غم اسلام خورد

فکر ایتام کند یا غمِ ناکام خورد

ہائے آن لطف و عنایات کجا شد ہیہات — ہائے آن حسن اشارات کجا شد ہیہات

ہائے آن رمز و حکایات کجا شد ہیہات — ہائے آن شارح آیات کجا شد ہیہات

وائے برما کہ شد از دست چنین دوست دریغ

مغز مارفت و نماندہ است مگر پوست دریغ

اے غم غمزدگان ہیچ نخوردی رفتی — رحم برخستہ دلان ہائے نکردی رفتی

گرم جوشیت چنین بود بسردی رفتی — چست و چالاک کنون راہ نوردی رفتی

عجب از خلقِ کریم تو کہ بے ما رفتی

دوستان با تو کمر بستہ و تنہا رفتی

جان ما بے تو بجانیم تو بے ما چونی — شہر وحشت کدہ شد بیتو بصحرا چونی

ایکہ خورسند بما بودہ تنہا چونی — در تہ خاک بگو اے گل رعنا چونی

یاد تو در دل و ذکرت بزبانم جاری ست

زخم ہجران تو بر روح و روانم جاری ست

جامۂ علم و عمل برقد زیبائے تو راست — خلعت فقر ببالائے نکویت زیباست

چون تو سرو روی گلستان عجم کم برخاست — خود ازین است کہ از رفتنِ تو حشر بپاست

مردمان اشکِ خود از بہر تو کردند سبیل

حالیا غیر جمیل است مگر صبر جمیل

ایکہ برما بگزیدی ملاءِ اعلیٰ را — ایکہ بر پست پسندیدۂ تو بالا را

برکہ بگزاشتہ خود تو بفرما ما را — غیر ازین نیست کنون ورد زبان شیدا را

سایۂ رحمتِ غفار مبارک شاہا

قربتِ احمدِ مختار مبارک شاہا

(از حضرت مولانا محمد طیب صاحب دامت برکاتہم) **فکرِ حزیں** (خصیہ رشید حضرت نانوتوی قدس سرہٗ)

چند حروف کہ از غوائل حشو و اطناب خالی نہ بمحض حُبِّ قلبی نوشتم ایں چند سطور از صنائع اشعار و بدائع مصارع خالی مگر از درد قلبی و ہیجانِ عشقی لبریز ہر کہ بیند مرا بدعائے خیر یاد دارد کہ بندہ بایں دارِ فانی بجز دعائے خیر محتاج چیزے نیست ؎

خدارا انتظار احمد ما نیست — محمدؐ چشم در راہِ ثنا نیست

محمد از تو مے خواہم خدارا — خدارا از تو حبِ مصطفیٰ را

## گلستانِ علم (دار العلوم دیوبند) ومن بنہا

ہمیں گلشن کنوں کو رشک ہند است — ہمیں دار العلوم دیوبند است

بمشرعان چمن فضلش ہویدا — چمن اندر چمن مارانش پیدا

بہر ہر مرغِ خود گوید کہ اُعطِیَ — فَاَنیْ قَاسِمٌ وَاللہُ یُعْطِی

بماہِ ہند آمد ضوء از یں مہر — بر اعدائے چنیں مہرے شود قہر

بارضِ ہند بے شک آں فلک ہست — بچشم ہند انسانش ملک ہست

بذات پائیش رحمت بیاری — بہ قرب رحمت جانش ورآری

بہر سو دین برحق زاں علم شد — حکایتہائے شرک و کفر کم شد

جہادے کردہ و دیں را فزودہ — کہ شرک و کفر از عالم ربودہ

بہم ایمان و دیں از بس سیدند — ز نوش کفر و بے دینی رمیدند

بعلمی جہل از گیتی رواں شد — بیامد حق و باطل از جہاں شد

محمد قاسم الخیرات ذی شان — گرفتہ دین برحق رد تقے زاں

بباغِ دین احمد باغبانست — کہ ایں گلشن بعہد نوجوانست

شریعت راہزاراں بر عِلم کرد　　طریقت را بلوح دل رقم کرد

شدہ در شرق و غرب انروئے فسانہ　　جنوب و در شمال ازوئے ترانہ

کہ صیت فضل و فیض او محیط است　　چو نور مہر بر عالم بسیط است

# انقلابِ دہر

وتلک الایّام نداولھا بین النّاس

ہماں گوہر کہ او بودہ جہانتاب　　جہاں از آب فیضش گشتہ بیتاب

بصد حیفم کہ نور مہر رخشاں　　نہ ہر ذرہ بود از مہر رخشاں

بافسوسم کہ ابر آب حیواں　　نبارد از پئے اطفالِ بستاں

بفریادم کہ فیض لاتناہی　　گزارد تشنہ اندر آب ماہی

خدارا اے وفاداران دلریش　　بمن گوشے کہ گویم غم خویش

چہ غم! افسانہ صد دردو ماتم　　بہ ہول روز رستا خیز ہمدم

چہ غم! جور فلک ہر صبح و ہر شام　　چہ غم! تیر قضا بے وقت و بنگام

چہ غم! من زندہ و جانم تہ خاک　　چہ غم! تن سالم و در سینہ صد چاک

چہ غم! بے چادری وا بر باراں　　چہ غم! بے مادری و شیر خواراں

چہ غم! با بینوائی ساز کردن　　چہ غم! فریاد بے آواز کردن

چہ غم! ماہی و ریگ گرم و گرما　　چہ غم! مفلوج و آب سرد و سرما

چہ غم! جام تہی از بادۂ غم　　چہ غم! راہم دراز و زادرہ گم

چہ غم! روپوشی ایمان و جانم　　چہ غم! بربادگی خان و مانم

چہ غم! بے تو جہاں پر نالہ و شور　　چہ غم! بے تو ہزاراں زندہ در گور

تو اے مولائیم آخر کجائی

زمارو پوش بے چون و چرائی

کجائی روز ما را آفتابی | کجائی اے شبم را ماہتابی
کجائی داروئے مطلق کجائی | کجائی مرشد برحق کجائی
کجائی راحت جانم کجائی | کجائی نور ایمانم کجائی
کجائی داروئے دردِ دلِ من | کجائی ساکن آب و گل من
کجائی آنکہ بر تو بود نازم | کجائی ایکہ سویت چشم بازم
کجائی اے سروسامان مایان | کجائی روح مایان جان مایان
کجائی تا ترا خدمت گزارم | بمیرم زیر پایم جاں سپارم
سرم بر زانویت چشمم بسویت | کفن از دامنت قبرم بکویت

نہ تختے تا تنِ خاکت فگندند
نہ رازے تا کہ پنہانت پسندند

اگر نوری بخال من قدم زن | اگر خالی بیا در مردم من
اگر خود مرد می در چشم من شو | اگر چشمی بیا در حدقہ ام رو
اگر تنہایت مقصود باشد | ہزاراں خلوتم موجود باشد
دلم دارم ز دردِ غیر خالی | بیا بنشیں قدم نہ لاابالی
سرے دارم ز سودائے دگر پاک | بیا بنشیں قدم نہ چست و چالاک
نہاں دارم درون سینہ خانہ | بیا بنشیں قدم نہ ما لکانہ
دو چشم و اندرونش پردہ ہایم | بیا بنشیں قدم نہ اے نگاہم
دما غم شد تہی از فکر اغیار | بیا بنشیں قدم نہ مست و سرشار

ولیکن من کجایم تو کجائی
کہ در ویرانۂ قلبم درآئی

تو ُو با ذاتِ حق رازو نیازے | من و بے ذات تو سوز و گدازے

تو ہر دم حصول مقصد خویش | من و چشم پُر آب و سینہ ریش
---|---
تو قدوسیان و سبحہ رانی | من و جان حزین و نوحہ خوانی
تو لاہوتیان و اسم اعظم | من و ناسوتیان و نوحۂ غم
تو گرو بیان عیش و عشرت | من و ماتم سرا و کنج وحشت
تو با تو جمال جاودانی | من و با من و بال زندگانی

دلے از خاک مولانا برون آ

کہ بینم روئے زیبا قد رعنا

چہ دیدی کز سرم سایہ بریدی | چہ افتادت کہ تا دامن کشیدی
---|---
ز پہلوئے محبان پاک رفتی | جفا کردی کہ زیر خاک رفتی
مرا باشد اگر صد چشم بینا | بود روئے ترا ہر دیدہ جویا
کشائم دیدہ تا روئے تو بینم | گل نظارہ از حسن تو چینم
ترا ہر لحظہ دیدن با خداوند | مرا از دیدن تو دیدہ ئے بند
ترا از دیدن ما گشتہ پرہیز | مرا بے تست جام عمر لبریز

دلے اے طیّب غافل ندانی

کہ نور مہر را ظلمت بدانی

نہ موتست اینکہ دانی بل وصالست | کہ نزد آشنا افزون کمالست
---|---
دگر نہ موت کامل ارتحالست | کہ از حالے بحالے انتقالست
چو خورشید لیست زیر ابر پیدا | بگیتی روز روشن زاں ہمہ جا
منور تربتش از فضل خود ساز | در رحمت بروئے او کنی باز

سقی اللہ الکریم ثراہ ھمّا

بفیض علے بسیط الارض نعما

# ایقاظِ نفسِ خود کہ اصلِ اصولِ معرفت ست

خداوندا بایں مردانِ میداں
کنی انجامِ من بر خیر و احساں

بکامِ نفسِ خود مشغول ہستم
زیاد و ذکرِ تو معزول ہستم

زمانہ شد بعیش و کامرانی
ندارم ہیچ زادِ جاودانی

نصیحت گوش کن اے نفسِ دون کیش
حذر کن بنگر اندر رہ پس و پیش

بیا بشنو کہ دنیا بے ثبات ست
جہانے دیگر از بہرِ حیات ست

بسا کس اندریں رہ پا نہادند
با سر نہادہ پا نہادند

نگہ کن بر شہانِ آسمان جاہ
نہ بردند از جہاں جز حسرت و آہ

نگر آنکہ بحالِ خوبرویاں
بعالم آنکہ بودہ مشکبویاں

بہارِ شاں خزاں بگرفت و بگذشت
بسانِ لالہ بر دل داغ در دشت

نگہ کن بر جمال حسنِ یوسف
ہمہ عالم ازو شد در تأسف

ہمہ حسنش سمومِ مرگ پژمرد
بجز نامِ گرامی نیست چوں مرد

ببیں بیشیں زمانہا گذشتہ
ہزاراں کس وحید دہر گشتہ

چوں مرگ شاں کشیدہ جان ز اجسام
نماندہ یاد در عالم بجز نام

حذر از محنتِ دنیا ضرور است
کہ دنیا از وفا پاک است و دور است

بجز نقد گنہ چیزے ندارم
مگر از فضلِ او امید دارم

بحالِ زارِ من یا رب نظر کن
چو واماندم بفضلِ خود گذر کن

بیا طیب ز این و آں گذر کن
بسوئے رحمت و فضلش نظر کن

طیب ابن احمد ابن قاسم

# مرثیہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ تعالیٰ بزبان عربی

از حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی

| | |
|---|---|
| یا قاسم الخیر من للعلم والدین | اذا ارتحلت وفی ارشاد وتلقین |

(ترجمہ) اے قاسم الخیر جب آپ رحلت کر گئے، تو علم دین، اور ارشاد و تلقین کا کون کفیل ہوگا۔

| | |
|---|---|
| یا قاسم الخیر من للطارقین ومن | للضارعین مکروب ومحزون |

(ترجمہ) اے قاسم الخیر اب مہمانوں، بے وسیلہ سائلوں غم زدوں اور بے چینیوں کا کون کفیل ہوگا

| | |
|---|---|
| یا قاسم الخیر اسمع من لکربتنا | یا قاسم الضیر قل من للمساکین |

(ترجمہ) اے قاسم الخیر سن تو سہی! اے نقصان کی تلافی کرنے والے تو ہی کہہ مسکینوں کا کفیل اب کون ہوگا

| | |
|---|---|
| من للمدارس من للوعظ من لھدی | من للنکات توضیح وتبیین |

(ترجمہ) مدارس، وعظ و ہدایت، نکتہ سنجی اور توضیح وتشریح مطالب (یعنی دقیقہ سنجیوں) کا کون کفیل ہوگا۔

| | |
|---|---|
| من للشریعۃ او من للطریقۃ او | من للحقیقۃ اذ رسیت فی الطین |

(ترجمہ) شریعت، طریقت، اور حقیقت کا محافظ کون ہوگا جبکہ تو زیر زمین مقیم ہوگیا۔

| | |
|---|---|
| رحلت عنا ولم یوجد عدیلک فی | العلوم والفضل من عرب الی الصین |

(ترجمہ) تو ایسے حال میں ہم سے جدا ہو کر عازم سفر ہوا جبکہ علم و فضل میں عرب سے چین تک تیرا کوئی ہمسر موجود نہیں۔

| | |
|---|---|
| یا عین جودی بدمع غیر منقطع | علی الذی جل من مدح وتابین |

(ترجمہ) اے میری آنکھ مسلسل آنسو بہاتی رہ ایسی ذات کے لئے جو لوگوں کی قصیدہ گوئی اور مرثیہ خوانی سے بالاتر ہے۔

| کہفٌ لوریٰ حجۃ الاسلام مرشدٌ | | نجم الھدایۃ رجم للشیاطین |
|---|---|---|

(ترجمہ) (وہ جو) مخلوق کے لئے پناہ گاہ، اسلام کی حجت اور اس کا رہنما، ہدایت کا ستارہ اور شیاطین کے لئے شہاب ثاقب تھا۔

| بحر العلوم امام الکون اکرمہٗ | | مبارک الاسم والزیتون والتین |
|---|---|---|

(ترجمہ) تین اور زیتون کی قسم وہ علوم کے بحر بیکراں، کائنات کے امام، ان میں سب سے زیادہ معزز اور بابرکت نام والے تھے۔

| لقد مضیٰ صاحبی من فی مصیبتہ | | برئت من ذکر اسلاء و تسکین |
|---|---|---|

(ترجمہ) واللہ میرا وہ ساتھی گذر گیا جس کی مفارقت کی مصیبت میں میں تسلی و تشفی کے مرحلہ ہی سے آگے نکل چکا ہوں (کہ اب مجھے کوئی تسلی دے اور میں تسلی پا جاؤں)

| من لی بصدر عن الاحزان منقطع | | من لی بقلب بصبر غیر مقرون |
|---|---|---|

(ترجمہ) (ا) وہ سینہ کہاں سے لاؤں جو غم و اندوہ سے خالی ہو، وہ قلب کہاں سے لاؤں جو صبر سے خالی ہو۔

(ب) کوئی ہے جو میرے لئے ایسے سینہ کا ضامن ہو، جو دوسرے تمام غموں سے خالی یکسو ہو۔ کوئی ہے جو میرے لئے دل بیقرار کا ضامن ہو۔

| الیک صبری فشئٌ لیس یشغلنی | | عن الخلیل الا یا سلونی بینی |
|---|---|---|

(ترجمہ) اے میرے صبر مجھ سے دور رہ اور اے تغافل میرے پاس سے ہٹ جا۔ (اس لئے کہ کوئی شے مجھ کو اس دوست کی یاد سے غافل نہیں کر سکتی۔

| وکیفما ستروہ فی التراب ولا | | یکون للشمس من ستر و تدفین |
|---|---|---|

(ترجمہ) حیرت ہے کہ لوگ اس ذات کو مٹی میں کس طرح چھپا سکے حالانکہ "خورشید" کو نہ تو چھپایا جا سکتا ہے اور نہ اسے دفن کیا جا سکتا ہے۔

| | |
|---|---|
| وھونَ البین انی لاحق بکم | اذا ارتحلتم وان اُحیی الحین |

(ترجمہ) جب آپ روانہ ہو ہی چکے ہیں تو آپ کی مفارقت کو میرے حق میں اس خیال نے آسان اور ہلکا بنا دیا ہے کہ میں بہرحال آپ سے جاملوں گا، اگرچہ زمانہ دراز تک زندہ رہوں۔

سقی الالٰہ ضریحاً انت ساکنہ
وَیرحم اللّٰہ مَنْ یمدُّ بتامین

(ترجمہ) اللہ اس قبر کو سیراب رکھے جس میں آپ سکونت پذیر ہیں اور ان پر خدا کی رحمت ہو جو آمین کہہ کر (اس دعا میں میری) اعانت کریں۔

# حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ
# سرسید مرحوم کی نظر میں

**رسالہ دارالعلوم بابت ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۶ھ مضمون سید محبوب رضوی صاحب**

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحؒ کی وفات پر سرسید مرحوم نے "علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ" کی اشاعت مورخہ ۲۴ر اپریل ۱۸۸۰ء میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اس مضمون میں حضرت نانوتوی رحؒ کے متعلق سرسیدؒ نے اپنے تاثرات کا جن الفاظ میں اظہار کیا ہے وہ الفاظ معاصرانہ چشمک سے مبرا ہونے کے علاوہ حضرت نانوتوی رحؒ کے علم وعمل اور صلاح وتقویٰ کا جو مقام متعین کرتے ہیں، اسکے متعلق یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ وہ عقیدتمندانہ جذبات کے غلو سے قطعاً پاک ہیں۔

کسی ایسے شخص کا اپنے کسی ایسے معاصر کے بارے میں اظہار رائے کرنا جو اس شخص کے عقائد و افکار اور رجحانات سے شدید اختلاف رکھتا ہو ظاہر ہے کہ کس بے لاگ حیثیت کا حامل ہو سکتا ہے، یہ حضرات ایک دوسرے کو ذاتی حیثیت سے کس نظر سے دیکھتے تھے اس کا اندازہ تصفیۃ العقائد کی اس مراسلت سے ہو سکتا ہے جو ان حضرات کے مابین ہوئی ہے، اس مراسلت میں سرسید اپنے ایک دوست (منشی محمد عارف صاحب) کو خط میں لکھتے ہیں

"اگر جناب مولوی محمد قاسم صاحب تشریف لادیں تو میری سعادت ہے، میں اُن کی کفش برداری کو اپنا فخر سمجھوں گا"[1]

متذکرہ بالا مکتوب کے جواب میں سرسید کے ان ہی دوست کو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا تھا کہ:۔

"ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ سنی سنائی سید صاحب (سرسید) کی اولوالعزمی اور دردمندیٔ

---

[1] تصفیۃ العقائد صفحہ ۳ مکتوب سرسید بنام منشی محمد عارف۔

اہل اسلام کا معتقد ہوں اور اس وجہ سے ان کی نسبت اظہار محبت کروں، تو بجا ہے۔ مگر اتنا یا اس سے زیادہ ان کے فساد عقائد کو سن کر ان کا شاکی اور اُن کی طرف سے رنجیدہ خاطر ہوں[۱]۔"

اس مختصر تقریب کے بعد سرسید کا متذکرۂ صدر مضمون درج ذیل ہے:۔

"افسوس ہے کہ جناب ممدوح (حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رح) نے ۵ اپریل ۱۸۸۰ء کو ضیق النفس کی بیماری میں بمقام دیوبند انتقال فرمایا۔ زمانہ بہتوں کو رو یا ہے، اور آئندہ بھی بہتوں کو روے گا۔ لیکن ایسے شخص کے لئے رونا جس کے بعد کوئی اس کا جانشین نظر نہ آوے نہایت رنج اور غم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ دلّی کے علماء میں سے بعض لوگ جیسے کہ اپنے علم و فضل اور تقویٰ اور ورع میں معروف اور مشہور تھے، ویسے ہی نیک مزاجی اور سادہ وضعی اور مسکینی میں بھی بے مثل تھے۔ لوگوں کو خیال تھا کہ بعد جناب مولوی محمد اسحاق صاحب کے کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے۔ مگر مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دینداری اور تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اس دلی کی تعلیم و تربیت کی بدولت مولوی محمد اسحاق صاحب کی مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ۔

بہت لوگ زندہ ہیں جنہوں نے مولوی محمد قاسم صاحب کو نہایت کم عمر میں دلّی میں تعلیم پاتے دیکھا ہے۔ انہوں نے جناب مولوی مملوک علی صاحب مرحوم سے تمام کتابیں پڑھی تھیں، ابتدا ہی سے آثار تقویٰ اور ورع اور نیک بختی اور خدا پرستی کے ان کے اوضاع اور اطوار سے نمایاں تھے۔ اور یہ شعر اُن کے حق میں بالکل صادق تھا ؎

[۱] تصفیۃ العقائد صفحہ ۶ مکتوب حضرت نانوتوی رح بنام منشی محمد عارف صاحب ۱۲

بالائے سرش زہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

زمانہ تحصیل علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم و فراست میں معروف و مشہور تھے۔ ویسے ہی نیکی اور خداپرستی میں بھی زبان زد اہل فضل و کمال تھے، اُن کو جناب مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی کی صحبت نے اتباع سنت پر بہت زیادہ راغب کردیا تھا اور حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فیض صحبت نے اُن کے دل کو ایک نہایت اعلیٰ رتبہ کا دل بنادیا تھا۔ خود بھی پابند شریعت اور سنت تھے۔ اور اور لوگوں کو بھی پابند شریعت اور سنت کرنے میں زائد از حد کوشش کرتے تھے۔ بایں ہمہ عام مسلمانوں کی بھلائی کا بھی ان کو خیال تھا، انھیں کی کوشش سے علوم دینیہ کی تعلیم کے لئے نہایت مفید مدرسہ دیوبند میں قائم ہوا۔ اور ایک نہایت عمدہ مسجد بنائی گئی۔ علاوہ اس کے اور چند مقامات میں بھی ان کی سعی اور کوشش سے مسلمانی مدرسے قائم ہوئے۔ وہ کچھ خواہش پیر اور مرشد بننے کی نہیں کرتے تھے۔ لیکن ہندوستان میں اور خصوصاً اضلاع شمال و مغرب میں ہزارہا آدمی ان کے معتقد تھے اور اُن کو اپنا پیشوا اور مقتدا جانتے تھے۔

مسائل خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے اور بعضوں سے وہ ناراض تھے۔ مگر جہاں تک ہماری سمجھ ہے۔ ہم مولوی محمد قاسم مرحوم کے کسی فعل کو خواہ کسی سے ناراضی کا ہو خواہ کسی سے خوشی کا ہو، کسی طرح ہوائے نفسانی یا ضد اور عداوت پر محمول نہیں کرسکتے۔ ان کے تمام کام اور افعال جس قدر کہ تھے بلاشبہ للہیت اور ثواب آخرت کی نظر سے تھے اور جس بات کو وہ حق اور سچ سمجھتے تھے اُس کی پیروی کرتے تھے۔ ان کا کسی سے ناراض ہونا صرف خدا کے واسطے تھا، اور کسی سے خوش ہونا بھی صرف خدا کے واسطے تھا، کسی شخص کو مولوی محمد قاسم اپنے ذاتی تعلقات کے سبب

اچھا یا برا نہیں جانتے تھے بلکہ صرف اس خیال سے کہ وہ برے کام کرتا ہے یا بری بات کہتا ہے، خدا کے واسطے برا جانتے تھے مسئلہ حب للّٰہ اور بغض للّٰہ کا خاص ان کے برتاؤ میں تھا۔ اُنکی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی خصلتیں تھیں ہم اپنے دل سے اُنکے ساتھ محبت رکھتے تھے، اور ایسا شخص جس نے ایسی نیکی سے اپنی زندگی بسر کی ہو، بلاشبہ نہایت محبت کے لائق ہے۔

اس زمانہ میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں اور شاید وہ لوگ بھی جو اُن سے بعض مسائل میں اختلاف کرتے تھے تسلیم کرتے ہونگے کہ مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثل تھے، اُن کا پایہ اس زمانہ میں شاید معلومات علمی میں شاہ عبدالعزیز رح سے کچھ کم ہو الا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھکر تھا مسکینی اور نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی محمد اسحٰق سے بڑھ کر نہ تھا، تو کم بھی نہ تھا۔ درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے اور ایسے شخص کے وجود سے زمانہ کا خالی ہو جانا ان لوگوں کے لئے جو اُن کے بعد زندہ ہیں نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہے۔

افسوس ہے کہ ہماری قوم بہ نسبت اسکے کہ عملی طور پر کوئی کام کرے زبانی عقیدت اور ارادت بہت زیادہ ظاہر کرتی ہے ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے شخص کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد صرف چند کلمے حسرت و افسوس کے کہہ کر خاموش ہو جائیں یا چند آنسو آنکھ سے بہا کر اور رومال سے پوچھ کر چہرہ صاف کر لیں بلکہ ان کا فرض ہے کہ ایسے شخص کی یادگاری کو قائم رکھیں۔

دیوبند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگاری ہے اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے اور اس کے ذریعہ سے تمام قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش جما رہے "

(نقل بأصلہ از علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ

مورخہ ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء صفحہ ۷۶۴ و ۴۶۸)

# تشنہ کامی اور حسرت و قلق

## چوتھی جلد کی تمہید

الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ - آج جبکہ سوانح قاسمی کی یہ تیسری جلد پایۂ تکمیل کو پہنچکر شائع ہو رہی ہے افسوس کہ مؤلف سوانح حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی اس دنیائے فانی میں موجود نہیں ہیں - آج اُن کے صرف مآثر اور علمی آثار ہی اُن کے وجود کی دلیل ہیں لیکن وہ وجود بانجیر خود سامنے نہیں - تاہم اگر آثار سے مؤثر کا پہچانا جانا ایک مسلّمہ اور فطری اصول ہے تو مولانا مرحوم کی شناخت میں آج بھی کوئی دشواری لاحق نہیں ہو سکتی ہ آج وہ اپنے محدود جثہ کے ساتھ ہم میں نہیں ہیں، لیکن اپنے غیر منقطع اور لا محدود اثرات کے ساتھ اب بھی ہم میں جلوہ گر ہیں جو بلاشبہ پہلے وجود سے زیادہ قوی اور پائدار وجود ہے جس کے لئے کبھی انتہا و اختتام نہیں -

مولانا مرحوم سوانح کی یہ تینوں مجلدات مکمل کر کے اپنی حیات ہی میں بھیج چکے تھے - دو جلدیں طبع ہو کر اُن کی نگاہوں کے سامنے آچکی تھیں - یہ تیسری جلد اُن کے بعد شائع ہو رہی ہے جس کی تمنا لے کر ممدوح رخصت ہوئے - سوانح کی ان مجلدات کی تکمیل پر میں نے عریضۂ تشکر لکھتے ہوئے اُس میں عرض کیا کہ آپ نے سوانح قاسمی کے ایک ہزار صفحات لکھ کر بھیجے، اُس کا شکریہ میں کیا ادا کروں پورے علمی حلقے اور قوم کے سارے سنجیدہ طبقے ادا کریں گے اور کرتے رہیں گے البتہ میں شکریہ کو کچھ مؤثر کرتے ہوئے اتنا عرض کروں گا کہ ابھی حضرت سیدنا الامام الکبیر کی حقیقی سوانح آپ نے لکھی ہی نہیں - کیونکہ حضرت والا کی حقیقی سوانح یہ نہیں ہے کہ وہ کب پیدا ہوئے کب وفات پائی اور اس درمیان میں کہاں کہاں اُن کی کیا کیا نقل و حرکت ہوئی - حقیقی سوانح یہ ہے کہ انھوں نے اپنے لدنی اور وہبی علوم سے جس حکمت کی بنیاد ڈالی وہ کیا ہے کن اصولوں پر مبنی ہے

اور ذہنی اور علمی دنیا میں اس نے کیا انقلاب پیدا کیا؟ دیوبند کے فضلاء جس حقیقت سے بنے اور بن رہے ہیں ان کی وہ بنیادیں کیا ہیں جو حضرت بانی نے قائم کیں اور ان کے لئے انداز فکر کی ایک ممتاز اور مؤثر راہ ڈالی بلاشبہ آپ نے تاسیس دارالعلوم کی پوری سرگزشت تحریر فرمادی اور وہ اپنی جگہ حق ہے۔ لیکن دارالعلوم کی معنویت کی تاسیس کن لطیف اینٹوں سے کی گئی اُس کی سوانح باقی ہے اور وہی حضرت قاسم العلوم کی اصلی سوانح حیات ہے۔ کیونکہ صورت دارالعلوم کی تاسیس میں کتنے ہی مقدسین ان کے شریک اور معاون تھے لیکن دارالعلوم کی اس معنوی اور علمی تاسیس میں جو کام ہوا وہ یقیناً بلاشرکت غیرے تھا جس کا نام "دیوبندیت" ہے اور آپ ہی نے خود رکھا ہے جس کی طرف جلد ثانی میں بسلسلۂ تاسیس دارالعلوم آپ نے اشارے فرمائے ہیں۔ سو جب تک ان اشاروں کی تفصیلات سامنے نہ آئیں۔ تاسیس دارالعلوم کی داستان نامکمل اور سوانح قاسمی تشنہ رہیگی۔

میری اس عرضداشت کو مولانا مرحوم نے محسوس کیا اور اُن کے فکری گوشوں میں یہ منصوبہ اُتر گیا۔ لکھا کہ آپ نے برمحل تنبیہ کی۔ مگر میں کیا کروں کہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہوں تاہم جدھر توجہ دلائی گئی ہے وہ ایک حقیقت ہے اور اُس کا حق ہے کہ قلم کو ابھی قلمدان میں نہ رکھا جائے۔ اس لئے میں جیسا بھی ہوں جس حال میں بھی ہوں، اللہ کے بھروسہ پر قلم اٹھاتا ہوں اور حکمت قاسمیہ کے بارہ میں اپنی محدود معلومات کی حد تک سعی شروع کرتا ہوں۔

اس مراسلت کے چند ماہ بعد میرا گیلان جانا ہوا، اور مولانا سے آخری ملاقات ہوئی، خوش تھے اور خوشی سے فرمایا کہ میں نے اُس "حقیقی سوانح" کی تمہید اور تحریر مضامین کے اصولی عنوانات مشخص کر کے لکھنے شروع کر دیئے ہیں۔ ساتھ ہی فرمایا کہ اس دوران میں قلب کا دورہ بھی ہوتا رہا۔ جب دورہ ہوا تو تحریر بند ہو گئی جب ذرا طبیعت سنبھلی پھر کام شروع کر دیا۔ اب تک کا سرمایہ یہ ہے جو مجھے پڑھنے کے لئے عنایت فرمایا۔

تمہید حقیقتاً براعت استدلال کا نمونہ ہے اس میں پورا منصوبہ اپنی اجمالی شکل میں سامنے آگیا ہے۔ آج یہ تحریر ہمارے لئے ایک مستقل حسرت وقلق کا سامان بنی ہوئی ہے جیسے پیاسے کو ایک گھونٹ پلاکر گلاس ہاتھ سے لے لیا جائے تو اُس کی حسرت و قلق کا کون اندازہ کرسکتا ہے۔ گلاس سامنے نہ کرنے کی صورت میں یاس کی راحت تو میسر تھی لیکن نمونہ سامنے رکھ کر اصل سے محروم ہوجانے کی صورت میں یاس کے ساتھ قلق کی آمیزش بھی ہوگئی اور وہ بھی دوامی۔ اس لئے مصنف مرحوم کی وفات کے صدمہ سے یہ صدمہ دہ چند ہے والی اللہ المشتکی وبہ المستغاث وعلیہ التکلان ولا حول ولا **قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔**

مگر اپنے قلق کو بانٹنے اور کچھ کم کرنے کے لئے میں چاہتا ہوں کہ اس میں اوروں کو بھی شریک کرلوں۔ اسلئے ارادہ ہوا کہ سوانح کے آخری حصّہ میں اس تمہید کو مصنف مرحوم ہی کے الفاظ میں بجنسہ سپرد قلم کردیا جائے تاکہ میرا بار کچھ ہلکا ہوجائے۔

لیکن یہ مقصد بہرحال خود غرضی کا ہے جس کی ناظرین سے معافی چاہتا ہوں مگر اس میں ایک پہلو اصولی بھی ہے اور وہ یہ کہ تمہید کے ان عنوانات خمسہ کو دیکھ کر ممکن ہے کہ کسی صاحب ذوق میں یہ جذبہ ابھر آئے کہ وہ ان میں سے کسی عنوان پر تحقیق اور تحریر کے لئے تیار ہوجائے تو مصنف اور اُن کے علمی پسماندوں کی مدفون شدہ تمناؤں کا خزانہ شاید باہر آجائے۔ بہرحال دنیا میں اہل ذوق فنا نہیں ہوگئے۔ فضلاء دار العلوم میں بحمد اللہ ایسے حضرات ابھی موجود ہیں وما ھم الا قلیل کہ اس "حکمت قاسمیہ" کے مطالعہ سے اسے ذہن میں تازہ کرکے اُس کی بنیادوں کو نگاہوں میں لے آئیں اور اُن پر حضرت قاسم العلوم ہی کے ذوق کی نئی تعمیر تیار کردیں۔ اس لئے مولانا مرحوم کی یہ تمہیدی سطریں محض غم ہلکا کرنے ہی کے لئے تحریر کی قید میں **نہیں** لائی جارہی ہیں بلکہ وہ مستقبل کی روشنی کے لئے مینارہ بھی بن سکتی ہیں۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

ذیل میں یہ تمہیدی مضمون ملاحظہ کریں۔

محمد طیب غفرلہ

مدیر

دارالعلوم دیوبند

۴ ۳/۷۶ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

# مآثر قاسمی

"سوانح قاسمی" کی تدوین وترتیب کی تاریخی سرگزشت کی داستان اس کتاب کی جلد اوّل کے مقدمہ میں مولٰنا قاری محمد طیب الحفید صدر مہتمم دارالعلوم کے خامہ فیض شمامہ، کی نوک زبان سے سنائی جا چکی ہے۔ اسی مقدمہ میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر نور اللہ مرقدہ کی وفات حسرت آیات کے بعد ایک ہی دفعہ نہیں بلکہ مختلف زمانہ میں اس کتاب کے لکھنے اور لکھوانے کا ارادہ کیا گیا، لیکن عجیب وغریب عوائق واتفاقات پیش آتے رہے، زیادہ تر تو یہی ہوا کہ ارادہ ارادہ ہی بن کر ختم ہوگیا، البتہ چند توفیق یافتہ بزرگوں کو اس ارادے کی تکمیل کا موقعہ ملا۔ جن میں ایک تو ہمارے مصنف امام مولانا محمد یعقوب صاحبؒ صدر اول دارالعلوم کا "کتابچہ" ہے خاکسار نے اپنی کتاب کا گویا "متن متین" اسی کتابچہ کو قرار دیتے ہوئے بطور ضمیمہ کے اپنی کتاب کے ساتھ تبرکاً و تیمناً ہی نہیں بلکہ اس لئے بھی شائع کرنے کا مشورہ دیا کہ شرح کے ساتھ گویا متن بھی پڑھنے والوں کے سامنے رہے بلکہ تاریخی نقطۂ نظر سے ان مختصر نوٹوں کی قدر وقیمت کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جو جانتے ہیں کہ بچپن سے زندگی کے آخری ایام تک سیدنا الامام الکبیر کی رفاقت ہی میں گذرا۔ یہ سچ ہے کہ سوانح عمریوں کے سلسلہ میں بیاگرافی (یعنی اپنی خود نوشتہ سوانح عمری) سب سے زیادہ قابل اعتماد سمجھی جاتی ہے لیکن تقویٰ و دیانت کی ذمہ داریوں کا سوال ان خود نوشتہ سوانحمریوں کے متعلق بھی بہرحال باقی رہتا ہے، ہم جب مولانا محمد یعقوبؒ کے کردار وسیرت اور جس قسم کے حزم واحتیاط کی ذمہ داریوں کا احساس اس نوعیت کے سیرت وکردار سے طبعاً

پیدا ہو سکتا ہے۔ ہم ان خصوصیتوں کو جب سوچتے ہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ دوسرے امتیازات کے ساتھ ساتھ یہ بھی سیدنا الامام الکبیر کی خصوصی شان ہے کہ جس خاص ذریعہ سے آپ کی سوانح کی متعلقہ معلومات ہم تک پہنچی ہیں۔ استناد ووثاقت میں عام بیاگرفیاں بھی مشکل سے ان کی ہم رتبہ قرار پاسکتی ہیں۔ اس باب میں ہمارے مصنف امام کا بیان خواہ جتنا بھی مجمل یا بعض مواقع پر غیر مرتب نظر آتا ہو۔ لیکن یقین و اطمینان کی جو خنکی عقلاً ان سے پیدا ہوتی یا ہو سکتی ہے۔ اسی خصوصیت نے ان کے متن مبین کو مستحق بنا دیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، چشم دید مشاہدات کے اس مجموعہ کو

"بندہ نے جناب مولٰنا مرحوم (سیدنا الامام الکبیر) کی سوانح عمری لکھی ہے، اور جو عجائب واقعات گذرے ہیں، اور جو جو کار نمایاں مولٰنا مرحوم نے کئے ہیں اُن کا مفصل حال بیان کیا ہے۔"

یہ اطلاع دیتے ہیں کہ اپنی اسی مرتبہ سوانح عمری میں

"بہت سے متفرق واقعات علمی و عملی جن سے جناب مولانا کا یکتائے روزگار ہونا علوم ظاہری و باطنی میں ظاہر ہوتا ہے، مشرح مرقوم کئے ہیں" ص۴ انتصار الاسلام

صرف یہی نہیں بلکہ آگے وہی یہ بھی ارقام فرماتے ہیں کہ اسی کتاب میں

"یہ بھی بیان کیا ہے کہ جناب مولانا مذکور کیا کیا چیزیں اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں۔"

گویا سمجھنا چاہئے کہ اس کھوئی ہوئی سوختہ و برشتہ "کتاب" کی اور کچھ نہیں تو ایک اجمالی فہرست ہمارے سامنے آجاتی ہے، کوئی شبہ نہیں کہ مولانا فخر الحسن مرحوم کی مرتب کی ہوئی یہ سوانح عمری اگرچہ جل کر ناپید ہو چکی ہے۔ لیکن ان کی اس کتاب کی نوعیت اور قدر و قیمت کا سرسری اندازہ ان کے اس تحریری بیان سے ہوتا ہے، بلکہ چاہا جائے تو ان کی مرتبہ سوانح عمری کے مشتملات و مضامین کی اجمالی فہرست ان کے اسی بیان کو ہم قرار دے سکتے ہیں، پھر اسی کے ساتھ

جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ ساری معلومات جن کے اندراج کی اطلاع اس کتاب کے متعلق دی گئی ہے، یہ "حلقۂ قاسمی" کے ایک ایسے رکن رکین کی فراہم کردہ معلومات ہیں، جو علاوہ زمانی معیت اور مکانی قرب کے سیدنا الامام الکبیر کے ممتاز ترین تلامذہ میں شمار ہوتے تھے۔ ان کو براہ راست خود حضرت والا سے ان مضامین عالیہ کے سمجھنے کا موقعہ ملا تھا جن پر اس حکمت قاسمی کی بنیاد قائم ہے، گو اپنا تعارف کراتے ہوئے اسی موقعہ پر مولانا فخر الحسن صاحبؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"بندہ کا بھی ایک ادنیٰ شاگردوں میں شمار ہوتا ہے، اگرچہ سب میں ادنیٰ ہے لیکن اس انتساب کو اپنا فخر جانتا ہے"

لیکن سوانح نگاری کی اس مہم میں غیر معمولی کامیابی جو ان کو میسر آئی تھی، اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے باایں ہمہ انکسار و ہضم نفس جوش مسرت میں بے ساختہ یہ الفاظ ان کے قلم سے چھلک پڑے ہیں، ارقام فرماتے ہیں کہ

"یہ سوانح عمری لائق دید ہے، شاید ایسی عجیب چیز بھی اس زمانہ میں اور کوئی ہو"

گویا یہی ہوا کہ جیسے صاحب سوانح کی شخصیت اپنے عہد کی ایک عجیب و غریب بے مثال ہستی تھی، اسی طرح ان کی سوانح عمری بھی مرتب کتاب کے نزدیک اپنے زمانہ کے عجائب و نوادر ہی میں شمار ہونے کی مستحق تھی۔

سچ پوچھئے تو جب سے مولٰنا فخر الحسن مرحوم کے مندرجہ بالا الفاظ میری نظر سے گذرے ہیں، ان کی کتاب اور ان کی غیر معمولی محنت و مشقت کی بربادی پر زیادہ اور بہت زیادہ افسوس ہو رہا ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ اپنی اس کتاب میں انھوں نے کیا کچھ لکھا ہوگا، ان ہی کے بیان سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ہمارے مصنف امام کی مرتبہ سوانح عمری ضخامت کے لحاظ سے جیسے ایک "کتابچہ" ہے، اس کے برعکس

مولانا فخر الحسنؒ کی لکھی ہوئی سوانح عمری مستقل کتاب کا قالب اختیار کر چکی تھی، ان کے الفاظ ہیں کہ

"یہ سوانح عمری چونکہ ایک کتاب ہوگئی ہے"

اور گو ضخامت تو نہیں بتائی گئی ہے لیکن آگے انھوں نے جو یہ لکھا ہے کہ

"اسلئے بالفعل شائع ہونا اس کا ذرا دشوار ہے"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صفحات اس کتاب کے کافی ہوں گے۔ مگر اب اس پر بحث ہی فضول ہے۔ البتہ مولانا فخر الحسن مرحوم کے مذکورہ بالا بیان سے ان کی کتاب کے مضامین کی جو اجمالی فہرست ہمارے سامنے آگئی، آئندہ سیدنا الامام الکبیر کے سوانح نگاروں کے لئے روشنی کے مینار کا کام دے سکتی ہے۔ خصوصاً ان کے بیان کا یہ آخری جز یعنی

"جناب مولانا مذکور کیا کیا چیزیں اپنی یادگار چھوڑ گئے"

مولانا فخر الحسن نور اللہ مرقدہ کی فہرست مضامین کے اسی جز کی تعبیر خاکسار نے

"مآثر قاسمی"

سے کی ہے، اور اسی سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ "سوانح قاسمی" کی مطبوعہ اور شائع شدہ دو جلدوں کے بعد بھی کام تشنۂ تکمیل ہے، یہ پچھلوں کی اپج، یا غیر ضروری مطالبہ نہیں ہے۔ بلکہ اس راہ کے اگلے پیش رو بزرگوں کی ایک ایسی موروثی تجویز ہے جس پر کسی نہ کسی حد تک کام کیا جا چکا تھا، اور ان ہی بزرگوں نے "سوانح قاسمی" کا ایک ناگزیر ضروری باب اس عنوان اور اس کی تفصیلات کو بھی قرار دیا تھا، چونکہ کتاب ناپید ہو چکی ہے، اس لئے صحیح طور پر نہیں بتا سکتا کہ اس عنوان کے نیچے سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کی کون کون سی چھوڑی ہوئی چیزوں کی تفصیل کی گئی تھی۔

لیکن معمولی غیر اہم جزئیات سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر سوچا جائے تو کلی حیثیت

سے عقلاً اس عنوان کے تحت چاہیئے تو یہی کہ حسب ذیل امور کا تذکرہ کیا جائے ۔

(۱) آپ کی جسمانی یادگاریں، آل و اولاد، بنین و بنات، حفدہ و ذریات ۔

(۲) آپ کے تعلیمی ثمرات جو تلامذہ کی شکل میں آپ کے بعد دینی علوم کے درس و تدریس، تالیف و تصنیف، اشاعت و نشر میں مشغول رہے ۔

(۳) آپ کی باطنی تربیت کے فیض یافتہ نفوس عالیہ جنھیں تصوف و سلوک کی اصطلاح میں ہم خلفاء و مریدوں کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں ۔

(۴) ملک کے اطراف و اقطار میں آپ کی بلا واسطہ یا بالواسطہ قائم کی ہوئی درسگاہیں جن میں گل سرسبد اور شاہکار ہونے کی حیثیت دار العلوم دیوبند کو حاصل ہے، ان تمام درس گاہوں کا پتہ چلانا، ان کی خدمات اور آخر میں دار العلوم کی ارتقائی تاریخ، عہد بعہد کے انقلابات اور تبدیلیاں جن سے گذر کر موجودہ دور تک دار العلوم اپنے تمام ذیلی شعبوں کے ساتھ پہنچا، ان امور کی تفصیل ہو ۔

(۵) آخر میں سیدنا الامام الکبیر کے تصنیفی مآثر، اور تالیفی باقیات صالحات، ان کتابوں کے مشتملات و مضامین کی اہم خصوصیتوں کی طرف اشارے، ان سے استفادہ کی ممکنہ صورتوں کو امثال و نظائر کی روشنی میں سمجھایا جائے ۔

واقعہ یہ ہے کہ "سوانح قاسمی" کی مطبوعہ دو جلدوں میں جو ہزار صفحات سے تلاش کرنے والے "مآثر قاسمی" کی مندرجہ بالا تحلیلی فہرست کی متعلقہ معلومات کو اگر تلاش کرنا چاہیں گے تو چند اجمالی امور کے سوا مشکل ہی سے ان کی تفصیلات کے پانے میں ہم کامیاب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً پہلی بات ہی کو لیجئے۔ اسی کتاب کی جلد اول کے صفحہ ۵ پر فٹ نوٹ میں مولنا طیب صاحب خانوادہ قاسمی کی جسمانی یادگار اور ذریات کی اپنی معلومات کی حد تک تفصیل بھی کی ہے اور صاحب البیت ادری بما فیہ (اپنے گھرانے کے حال سے گھر والا ہی سب سے زیادہ واقف ہوتا ہے) کے قاعدے کی رو سے یہی اس تفصیل

کے مستحق بھی تھے۔ لیکن باایں ہمہ اپنے اسی فٹ نوٹ کے مختلف موقعوں پر اس قسم کے الفاظ اور فقروں کو درج فرماتے ہوئے کہ

"فلاں کی اولاد کا علم نہیں ہے"

یا یہ کہ

"مجھے تعداد اور اسماء کا علم نہیں ہے"

آگے اس کی خبر دیتے ہوئے کہ

"ان میں بہت سے تو پاکستان میں ہیں۔ اور گو بہت سے ہندوستان میں ہیں مگر ان میں بعض نے دکن میں سکونت اختیار کر لی ہے، اور بعض بمبئی اور دوسرے مقامات میں ہیں"

گویا اپنی تفصیل کو بھی مولانا نے تشنۂ تکمیل بنا کر چھوڑ دیا ہے۔ اسی طرح "مآثر قاسمی" کے دوسرے چارگانہ ارکان کے متعلق بھی اس میں شک نہیں جستہ جستہ اپنے اپنے موقعوں پر بقدر ضرورت کچھ نہ کچھ معلومات ضرور درج ہو گئی ہیں۔

جہاں ضرورت پیش آئی ہے، وہاں سیدنا الامام الکبیر کے ممتاز تلامذہ کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے، کہیں کہیں آپ کے خلفاء اور طریقت کی راہ سے تربیت یافتوں کا بھی ذکر ہے، عام مدارس جو آپ کی توجہ سے قائم اور جاری ہوئے خصوصاً دارالعلوم دیوبند کے متعلقہ معلومات کے پیش کرنے کی حاجت جہاں محسوس ہوئی ہے پیش کرنے کی حد تک ان معلومات کو سامنے رکھ دیا گیا ہے۔ یوں ہی سیدنا الامام الکبیر کی بعض خصوصی تصنیفات اور ان کے مندرجات و حالات سے بھی بحث کی گئی ہے۔ لیکن باایں ہمہ مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہیئے، کہ ان امور کے متعلق ان سارے ذکر و اذکار کی نوعیت ضمنی اور ذیلی مباحث ہی کی ہے۔ مقصود بالذات بناکر "مآثر قاسمی" کے تحلیلی اجزاء اپنی تفصیل و توضیح کے اب بھی محتاج ہیں اور گو بظاہر دیکھنے والوں کو ابھی ان کی اہمیت

محسوس نہ ہو، لیکن ان اجزاء پر کام کرنے کے لئے لوگ جب کھڑے ہوں گے، تب راہ کی دشواریوں کا بھی ان کو صحیح اندازہ ہو گا۔ اور تلاش و جستجو ہر باب کے متعلق عجیب و غریب انکشافات سے پردہ اٹھاتی چلی جائے گی۔

سیدنا الامام الکبیر کے حلقہ میں بیٹھنے والوں کا ہی صرف دور ختم نہیں ہو چکا ہے۔ بلکہ اب تو حضرت والا کے دیکھنے والوں کو بھی ہم شاید نہیں پا سکتے۔ ان راہوں میں فراہمئ معلومات کی صورتیں اب بھی رہ گئی ہیں کہ بچے کھچے تحریری وثائق مطبوعہ اور غیر مطبوعہ شکل میں جہاں تک مل سکتے ہوں ان میں ڈھونڈھا جائے۔ یا ممکنہ حد تک قابل اعتماد راویوں کی بالواسطہ روایتوں پر بھروسہ کر کے ان گوشوں کو بھرا جائے، جن میں خلا پایا جاتا ہے۔ ان معلومات کی حالت یہ ہے کہ جہاں سان و گمان بھی نہیں ہوتا، وہیں سے اس سلسلہ میں بعض قیمتی چیزیں برآمد ہو جاتی ہیں۔ مثالاً یاد دلانا چاہتا ہوں، پہلی جلد کے شروع ہی میں خاکسار نے بہار کے ایک بزرگ مولانا حافظ تجمل حسین صاحب مرحوم کی کتاب "کمالات رحمانیہ" کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی طاب ثراہ کا یہ قول نقل کیا تھا کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو جوانی ہی میں ولایت مل گئی تھی۔ حافظ تجمل حسین مرحوم کو ذاتی طور پر خاکسار بھی جانتا ہے۔ بڑے بڑوں کو پایا کہ حافظ صاحب کا ذکر احترام کے ساتھ کرتے ہیں، جن میں حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات بھی تھی، مولانا مونگیری سے ان کی ملاقات بارہا دیکھا کہ ایک قریب ترین عزیز اور دوست کے طور پر ہو رہی ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات طیبات میں بھی حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر ملتا ہے، مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم تو ان کے ہم وطن اور اخص ترین عزیزوں میں تھے۔ مجموعی طور پر وہ مستحق تھے کہ ان کی روایت پر بھروسہ کیا جائے۔ اسی لئے ان کے اس دعوے میں کہ سیدنا الامام الکبیر مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پرست پر

بیعت کی سعادت ان کو حاصل ہوئی تھی۔ شک کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔[۵۱]

لیکن اسی کے مقابلہ میں "مشائخ بنارس" نامی کتاب جو حال میں شائع ہوئی ہے اسی میں بنارس کے ایک مولوی جو اپنے زمانہ میں کافی شہرت کے مالک تھے۔ جس کی بڑی وجہ تو یہی تھی کہ براہ راست حلقہ بگوش اسلام ہوکر اسلامی علوم کی تعلیم انھوں نے عربی زبان میں حاصل کی تھی، کہتے ہیں کہ جید استعداد رکھنے والے مولویوں میں ان کا شمار تھا۔ لیکن مشرباً اس زمانہ کے حدیث العہد طبقۂ علماء میں چونکہ صرف شریک ہی نہیں ہوگئے تھے، بلکہ مولویوں کی اس نئی جماعت کے سرگرم ممبروں میں تھے۔ اس لئے یہ بات کہ دیوبند یا علماء دیوبند سے بھی کوئی نسبت رکھتے ہونگے دل پر اس کا خطرہ بھی کبھی نہیں گذرا تھا مگر مشائخ بنارس کے مصنف مولٰنا ابوالاثر عبدالسلام ان ہی مولوی سعید کو "مولٰنا سعید بن سردار کھڑک سنگھ پنجابی" کے الفاظ سے روشناسی کراتے ہوئے یہ اطلاع دیتے ہیں کہ

> "بعد قبول اسلام دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولٰنا محمد قاسم نانوتوی رح سے حدیث کی کتابیں پڑھیں، اور تمام علوم وہیں حاصل کئے" ص۱۰۱ مشائخ بنارس

میرے لئے اس اطلاع کی نوعیت ایک جدید انکشاف کی ہے۔ مولٰنا سعید کھڑک سنگھ پنجابی کے صاحبزادے تھے۔ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہوسکتی، میرے لئے یہ نئی خبر نہ تھی۔ نیز عرض ہی کرچکا ہوں کہ مذہب کی گرفت کو ڈھیلی کرنے کے لئے حکومت مسلطہ نے تعلیم کے جس نظام کو جاری کیا تھا۔ امید یہ تھی کہ ہندوستان کے

---

[۵۱] حضرت نانوتوی رح کے ساتھ غیر معمولی گرویدگی وعقیدت مندی کا شاید یہ اثر تھا کہ اپنے صاحبزادے کا نام انھوں نے محمد قاسم رکھا۔ دارالعلوم دیوبند میں بھی ان کو داخل کیا۔ پٹنہ کے مدرسہ شمس الہدیٰ میں درس کی خدمت انجام دیتے ہوئے وظیفہ یاب ہوکر (موضع دسینہ) میں خانہ نشین ہوئے ۱۲

عام باشندے اس تدبیر سے عیسائی مذہب کو قبول کر لینگے ـ جسے نئی تعلیم سے پیدا ہونے والی ذہنیتوں سے قریب تر بنا لینے کی کوشش صدیوں سے جاری تھی، اور یہ نہ بھی لیکن اپنے آبائی دین دھرم کو چھوڑ بیٹھیں گے۔ یوں حکمراں طبقہ سے مذہبی نفرت و تعصب ان میں باقی نہ رہے گا، لیکن نتیجہ جب سامنے آنے لگا تو بجائے عیسائیت کے اسلام کی طرف لوگوں کا رحجان بڑھنے لگا۔ پس کھڑک سنگھ کے صاحبزادے کا اسلام قبول کر لینا اس زمانہ کے لحاظ سے کوئی اہم بات نہ تھی، کافی طویل فہرست اس عہد کے نومسلم باشندوں کی پیش کر چکا ہوں۔

اور اس میں بھی کوئی حرج نہیں، اگر یہ مانا جائے کہ قبول اسلام کے بعد دارالعلوم دیوبند میں مولوی سعید صاحب نے دینی علوم کی تعلیم حاصل کی ہو۔ پچھلے دنوں کی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے والے ملک کے مشہور عالم مولٰنا عبیداللہ سندھی بھی ان ہی خوش قسمتوں میں تھے۔ یعنی اسلام قبول کر کے دارالعلوم دیوبند میں اپنی دینی تعلیم کی مولٰنا نے تکمیل کی تھی، اسی طرح دیوبند میں تعلیم پانے کے بعد مسلک عدم تقلید کو اختیار کرنے والوں کی تاریخی مثال مولٰنا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری مرحوم کی ہمارے سامنے ہے۔ ہم اسی راہ کے ایک راہ رو مولوی سعید صاحب بنارسی کو بھی قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن مولوی عبدالسلام صاحب کی روایت کا یہ جز کہ مولوی سعید صاحب نے

"مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رح سے حدیث کی کتابیں پڑھیں"

اور اس کے بعد بھی وہ غیر مقلد ہو گئے، نہ صرف میرے لئے بلکہ سیدنا الامام الکبیر کی درسی خصوصیات سے جو بھی واقف ہیں، ان کے حق میں یہ روایت مستحق تحقیق و تنقید بن جاتی ہے۔ قرین عقل و قیاس یہی ہے کہ دارالعلوم کی تعلیم کو مولٰنا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کرنے والوں نے منسوب کر دیا ہے، اور نہ جاننے کی وجہ سے

مولانا ابو الاثر عبد السلام صاحب اس غلط فہمی کے شکار ہوئے، ورنہ اگر وہ یہ جانتے کہ سب کچھ ہونے کے باوجود درساً وتعلیماً ونظماً وانتماءً سیدنا الامام الکبیر دارالعلوم سے کچھ نہ ہونے کا رشتہ رکھتے تھے۔ اسی لئے بجز خاص لوگوں کے دارالعلوم میں داخل ہونے والے عام طلبہ کو نہیں پڑھاتے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مآثر قاسمی کو گو خاکسار نے پانچ مدوں میں تقسیم کرکے پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہر مد کا صحیح حق اسی وقت ادا ہو سکتا ہے کہ ہر ایک مد کے متعلق الگ الگ مستقل جلد لکھی جائے۔ پہلی مد یعنی حضرت والا کے آل واولاد میں جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں ایسی شخصیتیں بھی شریک ہیں جو مستحق ہیں کہ انکی مستقل سوانح عمری لکھی جائے۔ براہ راست صاحبزادے حضرت مفتی حافظ محمد احمد صاحبؒ خود بھی اور ان کے بڑے نجل رشید مولانا محمد طیب صاحب کے سوا مولانا طیب صاحب کے مرحوم چھوٹے بھائی مولانا محمد طاہر باوجودیکہ عمر کا کم حصہ ان کو عطا ہوا۔ لیکن ان کی زندگی کے مختلف علمی وسیاسی کارناموں کا اقتضاء ہے کہ ان کا تفصیلی تذکرہ کیا جائے۔ اسی طرح دودمان قاسمی کے ایک روشن چراغ مولانا منصور انصاری الغازی المجاہد الہندی منشاءً والکابلی ہجرةً بھی اسی سلسلہ کی ایک خاص تاریخی شخصیت تھے، خود وہ بھی اور انکے فرزند سعید مولانا حامد الانصاری غازی کی قلمی خدمات بھی حق رکھتی ہیں کہ شجرہ طیبہ قاسمیہ میں ان کو نمایاں کیا جائے، اور ان بزرگوں کے علاوہ ڈھونڈھنے والوں کے سامنے دوسری ہستیاں بھی آسکتی ہیں۔

یوں ہی سیدنا الامام الکبیر کے تلامذہ اور شاگردوں کی تعداد خواہ کتنی بھی کم ہو لیکن نہ صرف ایک شیخ الہندؒ بلکہ ان کے دوسرے رفقاء درس مولانا احمد حسن امروہوی مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمہم اللہ جیسے اس کا بجا حق رکھتے ہیں کہ مستقل جلد میں ان بزرگوں اور ان سے نفع اندوزوں کا ذکر کیا جائے۔

تلامذہ کے سوا جن لوگوں کو باطنی تربیت کا موقعہ حضرت والا کو میسر آیا۔ تلاش کرنے والے ان کا بھی سراغ لگا سکتے ہیں جستجو و تلاش سے معلوم ہو گا کہ اس نوعیت کے مستفیدوں کے تفصیلی حالات کے لئے مستقل جلد کی ضرورت ہے۔ گویا یوں تین جلدیں تو یہی ہو جاتی ہیں۔

باقی خود دارالعلوم دیوبند اور اس کے سوا ملک کے طول و عرض میں سیدنا الامام الکبیر کی تحریک و توجہ کی بدولت جو دوسری اسلامی درسگاہیں قائم ہوئیں۔ جن کی اچھی خاصی تعداد اب بھی موجود ہے۔ ان کی تفصیلی تاریخ کے لئے ایک جلد کافی ہو جائے تو اس کو غنیمت شمار کرنا چاہئے۔ ورنہ ممکن ہے، کہ اس مضموں کو دو جلدوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت ان لوگوں کو محسوس ہو، جو اس کام کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہیں گے۔ یعنی ایک جلد براہ راست دارالعلوم کی صد سالہ تاریخ پر اور دوسری جلد دارالعلوم کے سوا دوسری درس گاہوں کے لئے مختص کر دی جائے، تو حالات سے جو واقف ہیں۔ وہ اس تخمینے کو بے بنیاد ٹھیرانے کی جرأت نہیں کر سکتے۔

اور گو تصنیفی و تالیفی مآثر کا دائرہ حد سے زیادہ تنگ ہے تاہم جن اچھوتے اور نت نئے خیالات پر یہ کتابیں مشتمل ہیں۔ کم از کم ایک جلد تو اس کے لئے بھی مختص ہی کرنی پڑے گی۔

کام کی طوالت کی اسی کیفیت کو دیکھ کر فقیر نے ارادہ کر لیا تھا کہ اپنے کام کو صرف ان ہی دو جلدوں تک محدود کر دے۔ جن کا اکثر حصہ بحمد اللہ شائع ہو چکا ہے، لیکن ہمارے مخدوم و محترم مولانا محمد طیب صاحب نے دوسری جلد کو خاص بات پر ختم کر کے فقیر کے نوشتہ مسودہ کے آخری حصہ کو اس لئے روک لیا ہے کہ کچھ اضافہ کر کے تیسری جلد اس سے تیار کر لی جائے۔ اسی عرصہ میں فقیر طویل علالت کا شکار ہوا، اور ایسا شکار کہ اس وقت تک اسی پھندے میں تڑپ اور پھڑک رہا ہے، مدتوں

چند سطروں کا لکھنا بھی میرے لئے دشوار ہے۔ کبھی کبھی خفت کی کیفیت محسوس ہوتی ہے مولانا کا حکم ہے کہ خفت کے ان ہی وقفوں میں کم از کم اس تیسری ناقص جگہ کی تکمیل کی کوشش جاری رکھو۔ جس خاندان کی رہین منت میری نہ صرف دینی بلکہ دنیاوی زندگی بھی ہے، "الاولیٰ" میں جو کچھ مل چکا ہے اور "الآخرہ" میں بھی دودمان عالی کے فیض یافتوں کی نظر کرم کا امیدوار ہوں، ان سب کا تقاضا ہے کہ "امر طیب" کے امتثال وتعمیل کی سعادت جس طرح بھی بن پڑے حاصل کی جائے۔ لیکن "درد کر دل کے جو دورے پڑجاتے ہیں" خود تو گذر جاتے ہیں، لیکن جس پر سے گذر جاتے ہیں مدتوں کسی کام کا وہ باقی نہیں رہتا" حیص وبیص کے ان ہی حالات میں تہ و بالا ہوتا رہتا ہوں، آپ دیکھ رہے ہیں کہ "مآثر قاسمی" کا یہ دو لفظی عنوان بظاہر جتنا بھی کمتر ومختصر نظر آتا ہے۔ لیکن **تحلیل** و تجزیہ کے بعد ہی تحقیق وتلاش تدوین و ترتیب کی بھی وادی طول وعرض وعمق میں پھیل کر کتنی وسیع ہو جاتی ہے، اسی قدر وسیع کہ پانچ جلدیں بھی بہ مشکل اس کے لئے کافی ہو سکتی ہیں۔ مجھ جیسا بیمار، رفتہ از کار تو شاید اس کی پہنائیوں کو اب سوچ بھی نہیں سکتا۔ بس دعا ہی کر سکتا ہے کہ توفیق یافتہ افراد کو ہمت عطا فرمائی جائے۔ حق سبحانہ وتعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ ان مہمات کی سرانجامی کے لئے کن بیدار بختوں کا ازل میں انتخاب ہوا ہے۔ وہی تقدیر و تدبیر کی دنیا میں کن انتخابی ہستیوں سے سر نکالتی ہے ؎

دادیم ترا ز گنج مقصود نشاں

ما نرسیدیم، تو شاید برسی

اور یہ کہ اپنا خیال تو یہی ہے کہ بجائے کسی ایک آدمی کے مناسب ہوگا کہ اس سلسلہ کی ایک ایک جلد فرزندانِ دارالعلوم میں سے ایک ایک صاحب کے سپرد کر دی جائے۔ خاکسار نے اپنی حد تک یہ سوچا ہے کہ "مآثر قاسمی" کی آخری مدینی آپ

کی تصنیفات و تالیفات کے تذکرہ و تبصرے کی حد تک سعی کا ارادہ کرے ۔ دو جلدوں کے اتمام کا کام جس نے پورا کرایا کیا بعید ہے کہ وہی علی کل شی قدیر اپنے اس زار و نزار فقیر و بیمار بندے سے اس کام کو بھی پورا کرا دے ۔

وما ذلك على الله بعزیز

سیدنا الامام الکبیر حضرت مولانا محمد قاسم النانوتوی قدس سرہ

## حصہ سوم

رئیس القلم حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ تعالیٰ

مکتبہ رحمانیہ
اقرا سنٹر غزنی سٹریٹ
اردو بازار
لاہور